جنوری ۱۹۲۳ء تا دسمبر ۱۹۲۳ء

(فروری، اپریل، مئی، جولائی، نومبر، دسمبر ۱۹۲۳ غائب)

جنوری ۱۹۲۵ تا دسمبر ۱۹۲۵

(جون تا دسمبر ۱۹۲۵ غائب ہیں)

جنوری ~~جون~~ ۱۹۲۶ء تا دسمبر ۱۹۲۶ء

(جنوری تا جون ۱۹۲۶ء غائب ہیں)

رجسٹرڈ نمبر اے ۴۷۸

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الناظر

ایڈیٹر - ظفر الملک علوی

نمبر ۱۳۶ | ماہ جنوری ۱۹۲۳ء | جلد ۲۴

فہرست مضامین

الناظر پریس لکھنؤ میں چھپا

پرنٹر و پبلشر - اسحاق علی علوی

بسم اللہ الرحمن الرحیم

اردو کی بہترین کتابیں

مرزا غالب مرحوم

- اردوئے معلیٰ ۱۲/
- عود ہندی ۱۲/
- دیوان غالب با کث (ایڈیشن) ے/
- نکات غالب عہ/

سر سید احمد خان مرحوم

- تفسیر القرآن جلد ۲ عہ/
- خطبات احمدیہ ۱۲/
- آثار الصنادید للعہ/
- مضامین تہذیب الاخلاق للعہ/
- مکمل مجموعہ لکچر للعہ/
- اسباب بغاوت ہند ۱۲/

نواب محسن الملک مرحوم

- مضامین تہذیب الاخلاق للعہ/
- مجموعہ لکچر للعہ/
- آیات بینات ۳ جلد للعہ/

مولوی حبیب اللہ عباسی

- تاریخ الاسلام للعہ/
- الاسلام ۱۲/
- زاہدہ عہ/
- تزک ... ے/

مولانا آزاد مرحوم

- آب حیات ے/
- دربار اکبری عہ/
- سخندان فارس ے/
- نگارستان فارس ے/
- نیرنگ خیال ۱۲/
- دیوان ذوق ۱۲/

مولوی سید احمد دہلوی مرحوم

- راحت زمانی عہ/
- رسوم دہلی عہ/
- تحفۂ شوہر ۱۲/
- مہ افروز بیگم ۱۰/
- انشاء ہادی النساء عہ/
- لغات النساء للعہ/
- علم اللسان ۸/

مرزا حیرت دہلوی

- سیرۃ الرسول ۶ جلد ے/
- کتاب شہادت ۵ جلد ے/
- قصۂ حاجی بابا اصفہانی ۱۲/
- روز البیرونی کامل ے/
- الف لیلہ دنیا زاد ے/
- الف لیلہ شہر زاد ے/

مولانا حالی مرحوم

- حیات جاوید مجلد عہ/
- یادگار غالب ے/
- حیات سعدی عہ/
- دیوان حالی عہ/
- مقدمہ شعر و شاعری عہ/
- مسدس حالی مع ضمیمہ عہ/
- جواہرات حالی عہ/
- بیوہ کی مناجات ۲/

مولانا شرر مرحوم

- حیات قیس ۱۲/
- لیشائن شاعی عہ/
- نور جہاں بیگم ۸/
- ٹیپو سلطان عہ/
- حیدر علی سلطان عہ/
- اردو کی ڈالی ۳/
- اردو کا گلدستہ ۳/

مولانا اسلم جیراجپوری

- حیات حافظ عہ/
- حیات جامی ۸/
- علوم عرب عہ/
- خواتین عہ/

مولانا نذیر احمد مرحوم

- ترجمۃ القرآن بالمقابل ے/
- حمائل شریف مترجم ے/
- مطالب القرآن عہ/
- اجتہاد عہ/
- مبادی الحکمۃ عہ/
- رویائے صادقہ عہ/
- موعظۂ حسنہ عہ/
- ابن الوقت عہ/
- ایامیٰ عہ/
- فسانۂ مبتلا عہ/
- مراۃ العروس ۱۰/
- بنات النعش ۱۲/
- توبۃ النصوح ۹/
- منتخب الحکایات ۶/
- چند پند ۶/
- نمونۂ نظم بے نظیر عہ/
- مکمل مجموعہ لکچر ۲ جلد عہ

مولوی حبیب الرحمن خان شروانی

- سیرۃ الصدیق عہ
- علمائے سلف عہ/
- اسلامی اخلاق ۸/

مولانا شبلی مرحوم

- سیرۃ النبی جلد اول مجلد بعوصہ/
- جلد دوم مجلد عہ/
- آغاز اسلام ۸/
- الفاروق ۲ جلد ے/
- سیرۃ النعمان عہ
- الغزالی عہ
- المامون عہ
- سوانح مولانا روم ۱۲/
- تنقید ... عہ
- مضامین عالمگیر عہ/
- رسائل شبلی عہ
- مقالات شبلی ۱۲/
- موازنۂ انیس و دبیر ے/
- شعر العجم جلد اول ے/
- ″ جلد دوم ۱۲/
- ″ جلد سوم ۱۲/
- ″ جلد چہارم ۱۲/
- ″ جلد پنجم ۱۲/
- نمونۂ ... ۱۲/
- کلیات فارسی ۱۲/
- اسلامی حکومت ۲/
- اسلامی مدارس ۱۲/
- مثنوی صبح امید ۴/

مولانا ذکاء اللہ مرحوم

- تاریخ ہندوستان جلد ...
- تاریخ عہد انگلشیہ ے/
- آئین قیصری عہ/
- کرزن نامہ ۱۲/
- صحیفہ فطرت ۱۲/
- محاربات عظیم ۸/
- تمام الانتظام ۸/
- فلسفہ اخلاق عہ/
- اہل یورپ کا مقابلہ ۶/
- معاون تہذیب ۱۲/

مولوی چراغ علی و نواب اعظم یار جنگ

- اعظم الکلام ۱۲/
- الاستدلال ے/
- حکمت عملی ے/
- تسہیل البلاغت ے/
- تمثیلے دید ۱۰/

مولوی انشاء اللہ خان ایڈیٹر وطن

- تزک تیموری عہ/
- حالات قسطنطنیہ عہ/
- تاریخ ارکان دولت عثمانیہ ۱۲/
- حالات ترکان ۱۲/

الناظر بک ایجنسی لکھنؤ

سنہ ۱۹۲۲ء کی جدید کتابین

تبرکات آزاد

نگارستان فارس ۔ یہ آبحیات کے طرز پر شعرائے فارسی کا تذکرہ ہے جسمین رودکی سے لیکر واقف بٹالوی تک ۴۰ کاملین شعراء کے حالات و کلام پر نہایت دلآویز پیرایہ مین تبصرہ کیا گیا ہے قیمت عہ/ دستہ

سیر ایران ۔ اسمین روزنامچہ ایران اور وہ دلچسپ لکچر ہے جو آزاد مرحوم نے سفر ایران سے واپس ہو کر لاہور کے ایک بڑے جلسہ مین تہذیب شہر کے روبرو بیان کیا تھا قیمت ۴/

نوستان ۔ ترجمہ علامہ قیسی کی تحقیقات سے [illegible] اپنی بیاری زبان مین [illegible] ایک ایک فقرہ دلکشی ہے قیمت ۱۰/

مطبوعات انجمن ترقی اردو

نکات الشعراء ۔ اردو شعراء کا تذکرہ [illegible] شعراء اور ان کے کلام سے متعلق [illegible] زبان کے خاص [illegible] قیمت ۱۲/

محاسن کلام غالب ۔ مرزا غالب کے کلام [illegible] سید عبدالرحمن بجنوری مرحوم [illegible] قیمت ۴/

تذکرہ شعرائے اردو ۔ [illegible] صنف [illegible] کا لکھا ہوا ہے جو بہ تصحیح و تنقیح جناب مولوی حبیب الرحمن خان صاحب [illegible] شائع ہوا ہے قیمت عہ/

نفح الطیب ۔ علامہ مقری کی مشہور کتاب کا ترجمہ ہے اسلامی عہد کی تاریخ اسپین کے معلومات کا خزانہ کہنا چاہیے [illegible] اندلس [illegible] کو اس کی خوشہ چینی کرنا ہوتی ہے قیمت سے/

مطبوعات دارالمصنفین

اسوۂ صحابہ ۔ مولفہ مولوی عبدالسلام ندوی جسکی پہلی جلد مین صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کے عقائد عبادات و اخلاق کے پراثر واقعات درج کیے گئے ہین۔ اور دوسری جلد مین اون کا نظام سیاسی ان کے ملکی انتظامات اور علمی [illegible] کی تفصیل ہے نیز تفسیر۔ حدیث۔ فقہ۔ اسرار دین تصوف [illegible] جو بقدر ان کے عہد مبارک مین پیدا ہو چکے تھے سب کا [illegible] بیان درج کیا گیا ہے قیمت جلد اول ۲/ جلد دوم للعہ/

سیر الصحابیات ۔ از مولوی سعید انصاری۔ اسمین ازواج مطہرات، بنات طاہرات اور اکابر صحابیات کے سوانح زندگی [illegible] علمی، مذہبی، اخلاقی کارناموں کی تفصیل درج ہے [illegible] کے مطالعہ سے واضح ہوتا ہے کہ ابتدائے عہد اسلام مین [illegible] کی خواتین موجود تھین قیمت عہ/

متفرقات

دیوان جگر ۔ حضرت جگر مرادآبادی کا قابل قدر دیوان جسے مرزا احسان احمد بی اے وکیل اعظم گڈھ نے مرتب کیا اور ایک [illegible] مقدمہ مین حضرت جگر کے کلام پر نہایت لطیف [illegible] کیا ہے قیمت عہ/

حزن اختر ۔ سلطان عالم واجد علی شاہ کی یہ وہ نادر [illegible] ہے جسمین انھون نے اپنے زمانۂ قید فرنگ کے حالات لکھے ہین ابتدا مین مولانا عبدالحلیم شرر کا عجیب مقدمہ ہے جس سے واجد علی شاہ کے اصلی حالات زندگی پر کافی روشنی پڑتی ہے قیمت عہ/ و ۱۸/

مکاتیب اکبر ۔ حضرت اکبر الہ آبادی مرحوم کے خطوط جناب عزیز لکھنوی کے نام قیمت عہ/

لغات اردو ۔ از خواجہ عبدالرؤف عشرت لکھنوی قیمت عہ/

ملنے کا پتہ ۔ الناظر بک ایجنسی لکھنؤ

بسم اللہ الرحمن الرحیم

الناظر

نمبر ۱۳۹ جلد ۲۴ ماہ جنوری سنہ ۱۹۲۳ء

عرفت ربی بفسخ العزائم

یکم اگست سنہ ۱۹۲۰ء کو جبکہ تمام ہندوستان مین مسلمانون نے عام ہڑتال اور جلسے کرکے حکومت انگریزی سے "ترک تعاون" کا اعلان کیا تھا مین نے بھی ترک تعلق کے عنوان سے ایک مضمون لکھکر الناظر اور اوس کے متعلقہ کاروبار سے علیحدگی اختیار کرنے کا ارادہ ظاہر کیا تھا چنانچہ اس مضمون مین مینے لکھا تھا کہ

"تحریک خلافت جس پر تقریبًا ایک سال سے مسلمانان ہند کی تمام قوت و توجہ صرف ہو رہی ہے اب ہمین اس منزل پر لے آئی ہے کہ محض زبان، قلم کی جنبش اور غلامانہ عرض و منت سے کام لینا کافی نہین بلکہ ہر اس شخص سے جو خلافت اسلامیہ کو زوال سے بچانا، اماکن مقدسہ کی حرمت برقرار رکھنا اور توحید کو تثلیث کی حکمبرداری سے آزاد کرانا چاہتا ہو، قربانی کا مطالبہ ہے مہاتما گاندھی کی سرکردگی مین ترک تعاون یا عدم اشتراک عمل کی جو تجویز اہل ملک کے سامنے پیش کی گئی ہے اسکے مخاطب تنہا وہی لوگ نہین ہین جو خطابات، اعزازی عہدون اور کونسل کی نشستون سے سرفراز ہین۔ یہ تو محض ابتدائی منزل ہے اس کے بعد کی منزلین اس سے زیادہ عمومیت لیے ہوئے ہین۔ بلکہ اون لوگون پر جنھون نے تحریک خلافت کے متعلق ہر قسم کی جد و جہد جاری رکھنے کا حلف لے رکھا ہے نہایت عظیم الشان ذمہ داری اس طریقے سے عاید ہوتی ہے۔ اپنے دوسرے احباب کی

متعلق اگرچہ مین کوئی راے ظاہر کرنا مناسب نہین سمجھتا لیکن خود مین مجبور ہون کہ اب دوسرے
مشاغل پر اپنی ہمت صرف کرنے سے قاصر ہون۔

خود را بشادی بپرستیم زین پس
در راہ عشق جادۂ دیگر کنیم طرح

اسی مضمون مین کسی قدر تفصیل کے ساتھ تحریر تھا کہ آیندہ کے لیے اس کل کاروبار کے متعلق کیا کیا انتظامات تجویز کیے گئے ہین لیکن قبل اس کے کہ الناظر کا دوسرا پرچہ نئے اہتمام سے شائع ہو ۲۵ اگست ۱۹۲۰ء کو الناظر پریس سے پانچسو روپیہ کی ضمانت اس خطا پر طلب کی گئی کہ ۱۹ مارچ ۱۹۲۰ء کو جو یوم خلافت منایا گیا تھا اوس کے لیے مساجد مین پڑھنے کی غرض سے ایک دعا اور وہ خلافت کمیٹی کے واسطے الناظر پریس نے چھاپی تھی۔ الناظر پریس مین ۱۹ مارچ کے بعد سے بہت سے اہم کاغذات تحریک خلافت کے متعلق چھپے تھے اس لیے کوئی وجہ نہ تھی کہ گورنمنٹ صرف پانچ سو کی ضمانت پر اکتفا کرتی اور یہ امر میری استطاعت سے قطعًا باہر تھا کہ مین الناظر پریس کی طرف سے بیش قرار رقمین داخل کرتا اور اون کو ضبط ہو جانے دیتا اس بنا پر مجبورًا پریس کو بند کرنا پڑا۔ الناظر کے متعلق چونکہ حکومت کی طرف سے ایک بار کے سوا کبھی کسی قسم کا اعتراض نہین اوٹھایا گیا اس لیے مجھے امید تھی کہ کسی دوسرے مطبع سے اوس کی اشاعت کا انتظام بہ آسانی ہو جائیگا خصوصًا جبکہ جدید انتظام کے ماتحت الناظر ایک ایسے شخص کے سپرد کیا گیا تھا جس کے دماغ پر سیاسیات مین حصہ لینے کا کوئی داغ موجود نہ تھا۔ چنانچہ ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ سے مل کر مین نے چاہا کہ دوسرے مطبع مین چھاپنے کا ڈیکلریشن داخل کرنے کی اجازت حاصل کر لی جائے۔ مگر ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ صاحب سے جس دن ملاقات کی نوبت آئی اوس سے غالبًا دو روز قبل مسٹر ولوبی ڈپٹی کمشنر کھیری کے قتل کا واقعہ پیش آچکا تھا اور اس سبب سے تمام اینگلو انڈین حکام صوبہ کی طرح صاحب موصوف بھی اس واقعہ سے حد درجہ متاثر تھے۔ اس تاثر کے باعث اونھون نے صاف صاف کہدیا کہ بغیر ضمانت داخل کیے الناظر کو کسی دوسرے مطبع مین چھاپنے کی بھی اجازت نہ دی جائیگی۔ اسی ملاقات مین مجھ پر یہ بھی واضح ہو گیا کہ یکم اگست ۱۹۲۰ء کو بمقام عام کے عظیم الشان جلسے مین جو نامکمل تقریر مین نے ترک موالات کی تجویز پیش کرتے ہوے کی تھی، اوسکی بنا پر مجھپر مقدمہ چلایا جائیگا۔ ان حالات مین الناظر کو بند کر دینے کے سوا کوئی چارہ نہ تھا۔
الناظر اور الناظر پریس دونون کو بند کر کے کانگریس مسلم لیگ و خلافت کانفرنس کے خاص اجلاسون کی شرکت

کے لیے کلکتہ چلا گیا اور سابقہ تہیہ کے بموجب جس کا حوالہ مضمون ترک تعلق آخر مین دیا گیا تھا ذہن مہاتما گاندھی کے ساتھ شریک سفر ہو جانا چاہیے تھا مگر جب مہاتما جی سے گفتگو آئی تو ان کی راے سے عزم سفر ملتوی کر کے مجھے لکھنؤ واپس آنا پڑا۔ جہان ۲۹۔ ستمبر کو زیر دفعات ۱۲۴ الف۔ ۱۵۳ الف و ۵۰۰ میری گرفتاری عمل مین آئی اور تقریباً تین ہفتے تک حوالات مین رہنے کے بعد ۲۳۔ اکتوبر ۱۹۲۱ء کو دو سال کی سزا پاکر فتح گڈھ سنٹرل جیل مین پہونچا دیا گیا۔

زندانِ فرنگ کے مشاہدات و تجربات کا مفصل تذکرہ ہرچند کہ بجاے خود دلچسپی و سبق آموزی سے خالی نہین مگر مضمون ہذا سے غیر متعلق ہونے کی بنا پر بیان نظر انداز کیا جاتا ہے۔ البتہ اس موقع پر صرف اتنا عرض کر دون گا کہ علاوہ دیگر ذرائع کے لیڈر اور ہمدم دو روزانہ اخبارون کے مطالعے سے واقعات و حالات برابر معلوم ہوتے رہتے تھے اور جو جو تبدیلیان وقتاً فوقتاً صورت حال مین واقع ہوتی رہین۔ نیز خود دوران اسیری مین جو اثرات میری رفتار ذہنی، صحت جسمانی اور قواے عمل پر پڑے ان سب کو ملحوظ رکھکر ضروری ہوا کہ آیندہ زندگی کے نظام عمل پر از سر نو غور و خوض کیا جاے۔ گذشتہ تجربات نے اگرچہ بخوبی یہ امر عیان کر دیا تھا کہ عنان زندگی جس کے قبضہ و اختیار مین ہے تمام انسانی عزائم اوسی کی مرضی مطلق کے تابع ہین اور اس لحاظ سے حقیقتاً مستقبل کے بارے مین کچھ سوچ بچار فضول تھا تاہم بہ تقاضاے فطرت رہائی سے چند ماہ قبل شبانہ روز یہی فکر دامنگیر رہنے لگی اور بالآخر جب یکم جولائی ۱۹۲۳ء کو مین جیل خانے سے باہر نکلا تو بزعم خود ایک مکمل نظام عمل ساتھ لایا جس کا لب لباب یہ تھا کہ اس تمام کاروبار سے قطع نظر کر کے مجھے ہمہ تن کھدر کی ترویج مین منہمک ہونا چاہیے۔ کہ ترک موالات کے موجودہ تعمیری نظام عمل مین میرے نزدیک یہی سب سے اہم مفید اور زود اثر شق تھی جس پر اپنے حالات و خیالات موجودہ کی بنا پر مین اپنی ساری ہمت و توجہ صرف کر سکتا تھا

خود غلط بود آنچہ ما پنداشتیم

ایک طرف تو باوجود فکر و تلاش کوئی شخص ایسا نہ ملا جو اس بار عظیم سے مجھے سبکدوش کرنے پر آمادہ ہوتا دوسری طرف تھوڑے ہی دنون کے تجربے سے یہ اندوہناک حقیقت منکشف ہوئی کہ جن احباب کے ساتھ ملکر اسیری کے قبل کام کیا جا رہا تھا اونھین اس قسم کے تعمیری کام سے حقیقتاً و عملاً کوئی دلچسپی نہ تھی اگر صرف کاروبار ہی مشکل حائل راہ ہوتی تو شاید مین کھدر کی خاطر اسے بھی گوارا کر لیتا کہ کاروبار کو کلیۃً بند کر دیا [illegible] اور اوس صورت مین زبان اردو کی خدمت کا جو سلسلہ اس کے ذریعے سے جاری ہے وہ یقیناً

ایک عرصے تک کے لیے منقطع ہو جاتا اگرچہ کہ اتنی قوت وہمت نہین کہ کھدر کی تحریک کو یکہ وتنہا اپنی ذمہ داری پر چلاتا اس لیے مجبوراً راہ عمل تبدیل کرنا پڑی۔

کوئی نہین جانتا کہ خلافت اور سواراج کی تحریکین آیندہ کن منزلون سے گذرینگی۔ بہرحال جب تک اس کا اطمینان نہ ہو جائے کہ ادبی خدمت کے اس سلسلہ کو منقطع کرکے زیادہ مفید طریقے پر قوم و ملک کی خدمت انجام دینا ممکن ہے مین الناظر اور پریس کے جملہ متعلقات کی خدمت مین مصروف رہنا چاہتا ہون وما توفیقی الا باللہ

میری عدم موجودگی مین الناظر کے چھ پرچے مکرمی شاہ نذیر ہاشمی صاحب کی ادارت مین شائع ہوے الناظر پریس ضمانت داخل کرنے کے بعد جاری ہو گیا اور الناظر بک ایجنسی کا کام بھی برابر چلتا رہا۔ اگرچہ جو انتظامات ۱۹۲۰ء مین کیے گئے تھے اون کے درہم برہم ہو جانے کی وجہ سے ہر شعبہ مین کافی نقصان ہوا۔ اور اگر مشین کی فروخت سے ایک معقول رقم فراہم نہ ہو گئی ہوتی تو غالبًا اتنی منزل بھی نہ طے ہو سکتی۔ بہرحال مالی زیرباریون کے باوجود جو کچھ بھی ہو سکا غنیمت جاننا چاہیے۔ اور مین اپنا فرض سمجھتا ہون کہ برادر شفیق مولوی محمد حسن علوی کا دلی شکریہ ادا کرون جن کی پرمحبت کوششون کے بغیر شاید ان تمام مراحل کا طے ہونا محال تھا۔

الناظر پریس اور بک ایجنسی سب کو پوری طرح لائق خدمت بنانے کے لیے امکانی جد وجہد کیجا رہی ہے۔ اللہ تعالے جل شانہ کے فضل وکرم سے امید کارسازی ہے کہ تائید ایزدی کے بغیر ان تمام مشکلات کا دفعیہ ناممکن ہے۔ جو ایک بگڑے ہوے کاروبار کو سدھارنے مین لاحق ہوتی ہین۔ لیکن بے موقع نہ ہوگا اگر الناظر کے قدیم قدردانون اور اپنے دیرینہ کرمفرماؤن کی خدمت مین یہ عرض کرون کہ اس نازک وقت مین اونھین بھی میرا ہاتھ بٹانا چاہیے۔

الناظر کا یہ پرچہ جس عجلت و بے سروسامانی مین شائع کیا جا رہا ہے اوس پر نظر رکھکر احباب کرام کو زیادہ مایوس نہ ہونا چاہیے۔ انشاءاللہ العزیز جیسے جیسے فراغت واطمینان حاصل ہوتا جائے گا الناظر کی حالت بہتر ہوتی رہیگی۔

ظفرالملک

راجہ صاحب سے معذرت

اسیری کے ابتدائی زمانے مین چند ماہ تک جو خلوت حاصل رہی اوس مین اکثر موقع ملا کہ الناظر کی یازدہ سالہ اڈیٹری کے واقعات پر کامل سکون کے ساتھ غور کرون۔ الحمدللہ کہ میں اس بارے مین پورا مطمئن رہا کہ اس طویل زمانے مین جو کچھ مین نے اپنے قلم سے لکھا اوس مین سے کوئی حصہ اس قابل نہین کہ اوسے واپس لینے کی ضرورت ہو۔ یہ نہین کہا جا سکتا کہ جو کچھ لکھا گیا اوس مین کسی قسم کی غلطی نہ ہوئی ہوگی۔ اس لیے کہ انسان ضعیف البنیان خطا و نسیان کا پتلا ہے۔ البتہ ایک اخبار نویس کا یہ فرض اولین ہے کہ اوس کی تحریرین صداقت اور فتواے ضمیر سے کامل مطابقت ہو۔ اور مین نے ہمیشہ اس کا لحاظ رکھا ہے کہ جب کبھی کوئی خفیف سی بھی فروگذاشت معلوم ہو تو جلد سے جلد اوس کی اصلاح کر دیجاے۔

اپنے معاصرین کی روش عام کے خلاف میرا یہ عقیدہ رہا ہے کہ اشخاص کی پرائیویٹ اور پبلک زندگیان یکسان طور پر لائق تصرہ ہین اور اسی وجہ سے مین نے کبھی مجالس قومی اور امور عامہ کے تذکرہ مین اصحاب متعلقہ کے ذاتی اعمال پر تنقید کرنے سے احتراز نہین کیا جس کی وجہ سے اکثر رہنمایان قوم اور دیگر نمایان ہستیون کو مجھ سے کافی شکایت پیدا ہوئی۔ لیکن مین نے جو کچھ لکھا ہے اوس مین چونکہ کسی قسم کی ذاتی غرض پنہان نہ تھی اس لیے مجھے بفضلہ تعالے کسی سے شرمندگی نہین۔ البتہ ایک موقع پر مجھے اعتراف کرنا چاہیے کہ میرے قلم سے شدید لغزش واقع ہوئی جس کے متعلق مین آج الناظر کو دوبارہ اپنے ہاتھ مین لینے کے وقت اپنا فرض سمجھتا ہون کہ کھلے لفظون مین اظہار معذرت کرون۔

دسمبر سنہ ۱۰ء مین جب مسلم لیگ کے سالانہ اجلاس (دہلی) کے موقع پر دفتر لیگ کی ابتریون اور جناب آنریری سکریٹری صاحب کی بدعنوانیون کا راز فاش کیا گیا ہے تو مجھے ایک کرمفرما کی زبانی یہ معلوم ہوا کہ عالی جناب راجہ صاحب محمود آباد نے میرے طرز عمل سے کمال درجہ ناراضی کا اظہار فرماتے ہوے یہ دھمکی بھی دی کہ اگر الناظر مین اب ایک حرف بھی اون کے خلاف لکھا گیا تو فوراً میرے خلاف عدالتی چارہ جوئی کی جائیگی۔ چنانچہ جنوری سنہ ۱۹۱۱ء کے پرچہ مین جب سیاسی رہنماؤن کے کارنامے کا مضمون لکھا گیا تو خاتمے پر اس تہدید کا تذکرہ کرتے ہوے مین نے بعض ایسے فقرات لکھدیے جن کے اندر تخویف و تہدید کا پہلو مضمر تھا۔ اور یہ حصہ تحریر گو عام نظرون مین قابل اعتراض سمجھے جانے کے بجاے لائق تحسین خیال کیا گیا ہو مگر چونکہ مین محسوس

کرتا ہوا ۔ اس کا مقصد اظہار حقیقت سے زیادہ خود اپنے جذبۂ انتقام کا مظاہرہ تھا۔ اس لیے مین دلی افسوس کے ساتھ اس عبارت کو واپس لیتا اور جناب راجہ صاحب کی خدمت مین عذر خواہی کرتا ہون۔ امید ہے کہ جناب ممدوح اسے قبول فرماکر مجھے رہین منت بنائین گے۔

میرے ایک نہایت ہی عزیز و محترم دوست نے جن کی رایون کو مین ہمیشہ بہت قدر و منزلت کی نگاہ سے دیکھتا ہون اوسی زمانے مین مجھے اس لغزش کی طرف توجہ دلائی تھی مگر اوس وقت مجھے اپنی غلطی محسوس نہین ہوئی ورنہ اب سے بہت پیشتر اعتراف کر لیا جاتا۔ خدائے کریم سے دعا ہے کہ اپنے رحم و کرم سے اس قصور کو معاف فرمائین اور اس قسم کی نفسانیتون سے ہمیشہ محفوظ رکھین۔ آمین ثم آمین

ظفر الملک

ماہ گذشتہ

دسمبر کی مجلس آرائیون کا مرکز اب کی صوبۂ بہار کا مشہور مقام گیا تھا۔ جو گوتم بدھ کی عظیم الشان شخصیت سے نسبت تاریخی رکھنے کی وجہ سے برادران ہنود کا ایک نہایت ہی مقدس معبدگاہ ہے کانگریس جمعیۃ العلما اور خلافت کانفرنس کے علاوہ تقریبًا تیس اور مجلسون کے سالانہ اجلاسون کی شرکت کے لیے ہزارون اشخاص تمام اقطاع ہند سے جمع ہوے تھے اور شہر کے باہر دریا کے کنارے ایک وسیع و ویران قطعہ پر سواراج پوری، حریم شریعت اور خلافت آباد کے نام سے جو آبادیان ان تینون مجالس کے شرکا کی بسائی گئی تھین اون سے ایک بڑے میلہ کی سی چہل پہل تھی جس سے ہر شخص نے بقدر ذوق و استطاعت لطف حاصل کیا۔ صوبۂ بہار مین اس سے پیشتر کبھی اتنا بڑا قومی اجتماع نہین ہوا اس لیے منتظمین کو اہتمام و انتظام مین گوناگون مزاحمتون اور دشواریون کا سامنا کرنا پڑا ہوگا۔ پس اگر بعض امور مین اون سے کوتاہی ہوئی ہو یا زائرین قومی کو کبھی کبھی تھوڑی سی زحمت برداشت کرنا پڑی ہو تو اوسپر تعجب اور غصہ نہ کرنا چاہیے۔ خلافت آباد کی صاف اور ستھری فضا کے رہنے والون کو یقینًا شکایت کا موقع نہین۔ حریم شریعت کی عروسانہ آرائشین ممکن ہے کہ علما سے مقدسین کی ثقاہت و سادگی کے منافی پڑتی ہون لیکن منتظمین کے حسن انتظام اور مذاق لطیف پر ... دلالت کرتی ہین اور جب اسی کے ساتھ اس واقعہ کو پیش نظر رکھا جاے کہ جملہ مہمانان حریم شریعت کو برابر بلا معاوضہ مرغن اور لذیذ کھانے کھلاے گئے تو میزبانان بہار کی فیاضانہ مہمان نوازی مین کوئی سر باقی نہین رہتی۔ یہ دوسری بات ہے کہ مہمانون کے رخصت ہو جانے پر خود میزبانون کے ہمسایہ یہ کہکر حق شماتت ادا کر رہے ہون کہ

قرض کی پیتے تھے مے لیکن سمجھتے تھے کہ ہان
رنگ لائے گی ہماری فاقہ مستی ایک دن

سواراج پوری مین نہ تو خلافت آباد جیسی صفائی تھی نہ حریم شریعت کا سا مطبخ۔ لیکن ... قوم کے دیوانون کی پرشور نالہ زنی کی بدولت حقیقی زندگی کے آثار یہین نمودار تھے۔ سردی کی راتون مین نصف شب تک دریا کے کنارے کھلے میدان مین جمع ہو کر قومی لیڈرون کی تقریرین سننا کوئی آسان کام نہین مگر سواراج کے شیدائیون کی جماعت کثیر کے لیے یہ ایک معمولی بات تھی اور ہمارے قومی لیڈرون کی

ہمت و سرگرمی لائق صد آفرین ہے کہ دن بھر کمیٹیون اور مشورہ کے جلسون مین مصروف بحث و گفتگو رہنے کے بعد بجاے اس کے کہ تھک کر طالب آرام ہوتے راتون کو اوس سے زیادہ چاق و چست نظر آتے اور اپنی دھوان دھار تقریرون سے کانگریس کے نمایندون کو مستفیض کرتے تھے۔

داخلۂ کونسل یا یون کہیے کہ شرکت انتخاب کے مسئلہ نے ملک کے اس سرے سے اُس سرے تک ایک ہیجان پیدا کر دیا تھا اور کانگریس کی تحقیقاتی کمیٹی کی رپورٹ شائع ہونے کے وقت سے کارکنانِ کانگریس کی جمعیت کثیر حصول سوراج کی تمام عملی کوششون سے فارغ ہو کر ہمہ تن اس فروعی بحث مین منہمک تھی۔ اجلاس کانگریس کے موقع پر بھی جملہ نمایندون، کارکنون و قومی لیڈرون کی توجہ اسی پر صرف ہوتی رہی۔ کانگریس کے علاوہ جمعیۃ العلما اور خلافت کانفرنس کے شرکا مین بھی نمایان اصحاب کار اسی جنگ زرگری مین مشغول رہے۔ اور چونکہ جمعیۃ العلمار کا اجلاس کانگریس اور خلافت کانفرنس کے جلسون سے پہلے شروع ہو گیا تھا اس لیے حامیان کونسل کو پہلا مورچہ یہین جمانا پڑا۔ علماے مقدسین کی مقتدر مجلس مین اگرچہ صرف مخصوص اور خاص قابلیتون کے اصحاب شریک ہو سکتے ہین تاہم اُس کی کارکن جماعت مین طبقۂ علما کے بعض بزرگ اور نیز چند غیر عالم اصحاب ایسے موجود تھے جو کانگریس یا خلافت کانفرنس کے سیاسی اکھاڑے کے پورے مرد میدان ہین۔ اور ان کی بدولت جمعیۃ العلمار کو اس مسئلے کے تصفیہ مین کافی کشمکش مین مبتلا ہونا پڑا۔

مولانا عبد الماجد بدایونی اور مولانا سید سلیمان ندوی ایک طرف کوشان تھے کہ جمعیۃ العلما داخلۂ کونسل اگر نہین تو کم از کم شرکت انتخاب کی موافقت مین فیصلہ صادر کرے۔ اور ان کوششون کی رہنمائی وہ بزرگ قوم فرما رہے تھے جن کی سچا نفسی پر ملک کے ہندو مسلمانون کا اتفاق ہے اور جنھین مہاتما گاندھی نے چلتے وقت گویا اپنا وصی و جانشین قرار دیا تھا۔ مولانا آزاد سبحانی دوسری طرف ساعی تھے کہ کونسل اور شرکت انتخاب کا دروازہ جمعیۃ العلما کے فتوے سے مسلمانون پر یک قلم مسدود ہو جائے کہ یہی مہاتما گاندھی کی تحریک ترک موالات کا اصلی منشا تھا۔ صدر جمعیت العلما جناب مولانا حبیب الرحمن صاحب دیوبندی اور مولوی عبد الرؤف صاحب داناپوری صدر مجلس استقبالیہ دونون کی رائین اون کے صدارتی خطبون سے ظاہر ہو چکی تھین اور اون کا رجحان فریق اول کے موافق تھا لیکن بالآخر جب جمعیۃ العلما نے فتوے صادر کیا تو وہ فریق ثانی کی خواہشات کے عین مطابق تھا۔

کہ باقی رہ گئی کہ جمعیت کی تجویز میں شرکت انتخاب و داخلۂ کونسل حرام یا ناجائز قرار دینے کے بجائے صرف ممنوع کہا گیا۔

جمعیت العلما کے فیصلے نے مسئلۂ کونسل کا وہی حشر کیا جو جرمن کے ساتھ برتی کیا کرتی ہے حامیان کونسل کے غم و غصہ کا اندازہ اس سے کیا جا سکتا ہے کہ جب کانگریس کمیٹی میں اس مسئلے پر بحث ہو رہی تھی اور صدر کانگریس نے بعض مسلمانوں کو اظہار خیال کی دعوت دی تو ہمارے ایک دوست جو بیرسٹری کی قربانی چڑھا چکے ہیں آپے سے باہر ہو گئے اور انھوں نے اس بری طرح جمعیت العلما کے طرز عمل سے اپنی بیزاری ظاہر کی کہ ہندو لیڈر دنگ رہ گئے اور ہمیں ندامت کرنا پڑی ہمیں جب اس واقعے کی اطلاع ملی تو دلی صدمہ ہوا اگرچہ اصل یہ ہے کہ اس میں زیادہ قصور نہیں ہے عام طور پر ہمارے تعلیم یافتہ ان دوست یہ چاہتے ہیں کہ علما اور جمعیۃ العلما دونوں ان کے اشارہ ہائے انگشت پر کام کرتے رہیں جب کبھی ان کو عامۃ المسلمین پر اثر ڈالنے یا غیروں کا منہ بند کرنے کے لیے فتووں کی ضرورت ہو تو یہ حضرات تعمیل ارشاد کر دیا کریں اور تعلیمی اجتماعی کاموں سے علما کی دیرینہ علیحدگی نے منصب علما کے دشوار واہم فرائض سے ان کی بے پروائی اور مختلف الخیال علما کی باہمی جنگ زرگری کا لازمی نتیجہ یہی تھا کہ قوم و ملت کی رہنمائی و رہبری کے اصلی مستحق و سزاوار ہونے کے باوجود ان کے بجائے دوسروں کے ہاتھوں میں قوم کی باگ چلی جائے۔

غنیمت ہے کہ اس نازک وقت میں جمعیۃ العلما نے اپنا حق ادا کر دیا اور بعض اصحاب کی خواہش کے مطابق تصفیہ کو کانگریس اور خلافت کمیٹی کی رائے پر نہیں اٹھا رکھا۔

کانگریس کے نمائندوں پر بھی اس فیصلے کا بہت اثر ہوا اگرچہ مسلمان حامیان کونسل نے آل انڈیا کانگریس کمیٹی کو یہ باور کرانا چاہا کہ جمعیۃ العلما کی یہ تجویز مسلمانوں کے لیے واجب العمل نہیں ہے۔ کانگریس کمیٹی اور پھر اجلاس کانگریس نے اگرچہ کثرت رائے سے شرکت انتخاب کونسل کی تحریک کو مسترد کر دیا لیکن افسوس ہے کہ حامیان کونسل کی اقلیت نے اس کو قبول کرنے کے بجائے اس سے ناراض ہو کر ایک نئی پارٹی کی بنیاد قائم کر دی جس کا نام کانگریس خلافت سوراج پارٹی ہے۔ اعتدال پسندوں اور آزاد خیالوں کی کانگریس سے علیحدگی نے متحدہ قومیت کو جس قدر نقصان پہونچایا تھا اس سے زیادہ اس جدید پارٹی کے قیام سے مضرت پہونچنے کا اندیشہ ہے اس لیے کہ اب کارکنان کانگریس کی ساری قوتیں کسی نظام عمل

کی تکمیل پر صرف ہونے کے بجائے تمام تر باہمی زور آزمائی مین مشغول رہین گی۔ معتدلین اور اوس سے زیادہ دفتری اقتدار کے حاملین اب تک جس چیز کے مقابلے سے گھبراتے تھے وہ ہمارا باہمی اتفاق تھا اس کا خاتمہ ہو جانے کے بعد اون کی مشکلات خود بخود رفع ہو جاتی ہین۔

مسئلہ کونسل کے بعد سب سے زیادہ اہمیت جس تجویز کو اجلاس کانگریس مین حاصل تھی وہ انگریزی مال کے مقاطعہ کی تجویز تھی۔ کانگریس کمیٹی مین یہ تجویز اگرچہ تھوڑی کثرت راے سے منظور ہو گئی تھی مگر اجلاس عام مین کامیابی نہ ہوئی۔ کانگریس کی تاریخ مین یہ ایک غیر معمولی واقعہ سمجھا جاتا ہے اور چونکہ اس تجویز کی حمایت وہی فریق کر رہا تھا جو کونسل کے مسئلے مین کمال درجہ غلو رکھتا ہے اس لیے اس حادثے کا خاص اثر اس پر ہوا جس کے بعد اوسے اچھی طرح معلوم ہو گیا کہ ہوا کا رخ کس طرف ہے اور مہاتما گاندھی کے مرتب کردہ نظام عمل کی حمایت کرنے والون کو باقی ماندہ تجاویز کے بارے مین کسی شدید مخالفت کا اندیشہ نہ رہا۔ کانگریس کے اجلاس کا زمانہ پہلے تین دن تھا۔ کلکتہ مین پانچ دن رہا اور اب کے پورے چھ دن صرف ہوے جن مین سے صرف ایک دن عام اجلاس نہین ہو سکا۔ اور شمول جلسہ آل انڈیا کانگریس کمیٹی ان ہر دو تجاویز پر تقریباً چار روز تک بحث و مباحثہ ہوتا رہا۔ بقیہ تجاویز مین سے خاص اہمیت کی یہ تجویز تھی کہ ملک کو سول نافرمانی کے لیے تیار کرنے کی غرض سے پچاس ہزار رضاکار بپابندی اقرار نامہ و شرائط معہودہ اور پچیس لاکھ روپیہ فراہم کیا جائے۔

مہاتما گاندھی کی تحریک ترک موالات، تقریباً تین سال سے اہل ملک کے سامنے ہے۔ اور دو سے زائد سال تک وہ اخبار ینگ انڈیا، مین بذریعہ تحریر اور کثیر التعداد جلسون مین بذریعہ تقریر اپنے خیالات اصول کار اور مصالح کی توضیح فرماتے رہے۔ مگر گنتی کے چند اصحاب ایسے شمار کیے جا سکتے ہین جنھون نے پوری طرح اوس کو سمجھا اور دل سے اوس کو قبول کیا ہو ۲۴۔ فروری کے جلسہ آل انڈیا کانگریس کمیٹی منعقدہ دہلی کی کارروائی پر تبصرہ کرتے ہوے مہاتما جی نے خود نہایت مایوسانہ الفاظ مین اس حقیقت کا اعتراف کیا تھا اور اس وقت جو صورت حال درپیش ہے اوس سے سواے اس کے کوئی دوسرا نتیجہ نکالا ہی نہین جا سکتا اسکے یہ معنے نہین کہ نفس تحریک غلط یا ناقابل فہم و عمل ہے جیسا کہ بدنصیبی سے ایک جماعت کا خیال ہے بلکہ واقعہ یہ ہے کہ تہذیب مغربی کے تصادم و شیوع سے خود ہمارے اندر جو خرابیان پیدا ہو چکی ہین وہ ایک دو سال کے جد و جہد سے اصلاح پذیر ہونے والی نہ تھین اس لیے باوجود اون تمام قربانیون کے

اہل ملک نے گذشتہ دو سال کے اندر کین کچھ تعجب کا مقام نہین کہ ہنوز منزل بہت دور ہے۔

جو لوگ آج حامی کونسل کہے جاتے ہین یہی سب حضرات بعض مستثنیات کے سوا کلکتہ کانگریس مین مہاتما جی کی تحریک ترک موالات سے مخالفت پر اپنی متحدہ قوت صرف کر رہے تھے۔ لیکن جب کانگریس نے کثرت رائے سے اوس تحریک کو قبول کر لیا تو ان حضرات مین سے اکثر نے مہاتما جی کا ساتھ دیا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ پندرہ مہینے کی مختصر مدت مین اس سرے سے اوس سرے تک سارا ملک بیدار ہو گیا۔ کاش اس وقت بھی یہی یک جہتی قائم رہتی تو اگرچہ ہم مہاتما جی کی رہنمائی سے محروم تھے مگر اس بیداری عام سے پورا فائدہ اٹھانے کی کوشش مین کامیابی کی زیادہ اور حقیقی امید ہو سکتی تھی۔ لیکن تفرقہ و نااتفاقی کی صورت مین بجز اس کے کہ حرمان و مایوسی حاصل ہو کیا امید کیجا سکتی ہے۔

ملک کی سب سے بڑی قومی مجلس کے سر آوردہ رہنماؤن کے درمیان اس قسم کا اختلاف پیدا ہونا ممکن ہے کہ بعض علمائے سیاست کے نزدیک ہماری قوت و توانائی کا ثبوت اور ہمارے بالغ و راشد ہونے کا لازمہ ہو مگر واقفان کار اور نظر بازان حال کے لیے یہ نکتہ شناسی و عقل آرائی بمشکل قابل قبول ہو سکتی ہے اور اگرچہ ہمین یہ یقین کامل ہے کہ جس طرح بعض دانایان رموز سیاست کی یہ پیشین گوئی صحیح ثابت نہ ہوئی کہ سنہ ۲۲ء مین کانگریس کی قبر تیار ہو جائیگی۔ یا مہاتما گاندھی کنج گمنامی مین دفن ہو جائین گے اوسی طرح سنہ ۲۳ء مین کانگریس کے پاش پاش ہو جانے یا مسٹر راجا گوپال چاری کے رزمگاہ سیاست سے رخصت ہو جانے کی جو امیدین قائم کی گئی ہین وہ بھی بارور نہ ہونگی۔ تاہم اس مین کچھ شبہ نہین کہ ملک کے فلاح و بہبود اور قوم کی ترقی و نشو و نما کے لیے یہ اختلاف و انتشار حد درجہ خطرناک و مہلک ہے۔

جن اصحاب نے کلکتہ مین مہاتما جی کے نظام عمل سے اختلاف رکھنے کے باعث کانگریس سے علحدگی اختیار کر لی اور پھر ماڈریٹ (اعتدال پسند) یا ڈیماکریٹ (جمہوریت پسند) بنکر حکومت کی کونسلون مین شرکت پسند فرمائی اون کی جدائی سے اس نظام عمل کو کچھ کم نقصان نہین پہونچا جس کی بنا پر مہاتما جی نے سنہ ۲۱ء کے اندر بار بار انھین اس قومی تحریک مین شرکت کی دعوت دی پھر بھلا اس کی کیا توقع ہو سکتی ہے کہ خود کانگریس کے کارکنون مین کشمکش پیدا ہو جانے کے بعد اوس کی تکمیل ممکن ہوگی۔

اگر مہاتما جی کی تحریک پر اون اصحاب کو اعتماد باقی نہین رہا جو ابتدا مین بھی اوس کے مخالف تھے اور اب بھی قولاً اگر نہین تو عملاً اوس کی بربادی کا سامان کر رہے ہین تو صحیح راستہ یہ تھا کہ وہ صاف طور پر اوس سے

انحراف کا اعلان کر دیتے مگر خدا معلوم اس مین کیا مصلحت اندیشی ہے کہ ایک صاحب بھی کھل کر اپنا میلان ظاہر نہین فرماتے۔ بلکہ برخلاف اس کے یہ باور کرانے کی کوشش ہے کہ وہ اب تک اونھین کے نظام عمل پر مضبوطی کے ساتھ قائم ہین اور اوسی کی تکمیل کے لیے یہ سب ساز و سامان ہو رہا ہے۔

راجا گوپال اچاری صاحب کو اگرچہ اپنی خاموشی اور فقیرانہ زندگی کے باعث یہ امتیاز حاصل نہین کہ مہاتما گاندھی کی طرح سارا ملک اون کا رتبہ شناس ہو لیکن جن لوگون نے ینگ انڈیا مین اون کی تحریرین دیکھین اور کانگریس مین اون کی تقریرین سنین وہ بخوبی اس بات کا اندازہ کر سکتے ہین کہ مہاتما جی کے بعد اگر کوئی شخص اون کی تحریک کی حقیقی رہنمائی کر سکتا ہے تو مدراس کا یہی مرد ضعیف و بیمار ہے۔ اس لیے کہ اس مین ذرا شک و شبہہ نہین کہ اونھون نے نہ صرف مہاتما جی کے طرز تحریر و انداز تقریر کے اتباع کامل مین حیرت انگیز کامیابی حاصل کی ہے بلکہ اون کے فلسفہ اخلاق اور ضابطۂ کار کو بھی بدرجۂ اتم قبول کرنے مین وہ پوری طرح کامیاب ہوئے ہین۔

کانگریس مین تفریق پیدا ہونے کا جو اندیشہ تھا اوس کو حتی المقدور ٹالنے کے لیے بعض رہنمایان ملک نے بخیال خود مفاہمت کی راہین نکالنا چاہین مگر اون کی تجاویز کثرت رائے سے مسترد ہو گئین لیکن جب تک کہ نئی پارٹی عالم وجود مین نہین آئی تھی گمان غالب یہ ہے کہ تفرقہ کی حقیقی نوعیت اور اوس کے اثرات کی پوری اہمیت لوگون نے محسوس نہین کی تھی اب کہ یہ بلا سر پر آگئی ہے یہ توقع کچھ بعید قیاس نہین کہ کانگریس کی قلیل و کثیر دونون جماعتون مین از سر نو مفاہمت کی تلاش کا خیال پیدا ہو۔ اور ایسی صورت مین کہ جدید پارٹی اپنے پیشرو ون سے مانند کانگریس کی وابستگی دامن سے بیزاری کا اظہار نہین کرتی تمنا ہے کہ رہروان سیاست مین سے کسی نکتہ رس کو ایسا نقطۂ اتصال سوجھ جائے جو آخرکار دونون جماعتون کو متحد کرنے مین کامیاب ثابت ہو۔ گو جہان اصولی اختلافات درپیش ہون سمجھوتہ کی امید کرنا عبث ہے۔

مسٹر سیتل [illegible] کی اس رائے کو مہامیان کونسل کے اکثر [illegible] مانتے کے [illegible] تیار تھے کہ مسئلہ [illegible] بحث [illegible] تین ماہ تک ملتوی رکھا جائے اور اس مدت مین سب اگر متفق ہو کر [illegible] سے خود مقام عمل پر کار پرداز ہون اور بعد ازان اجلاس خاص منعقد کر کے کانگریس [illegible] اس مسئلہ کا قطعیہ [illegible] کانگریس کی تجویز متعلقہ سول نافرمانی مین چار ماہ کی مدت [illegible] ہے کہ اوس کے

مدبر پچاس ہزار رضاکار اور پچیس لاکھ روپیہ فراہم ہو جائے۔ اب اگر دونوں فریق متحد ہو کر اسکے لیے سعی کریں اور کامیاب ہو جائیں تو کوئی وجہ نہیں معلوم ہوتی کہ پھر کونسل کی طرف رخ بھی کیا جائے اس لیے کہ سول نافرمانی کے مقابلے میں کوئی تارک موالات کونسل کو لایق التفات نہیں سمجھتا اور داخلہ کونسل کی سب سے بڑی وجہ یہی ظاہر کی جاتی ہے کہ سول نافرمانی کے لیے راہ مسدود ہے لیکن خدانخواستہ دونوں کی متحدہ مساعی کے باوجود بھی یہ مدعا حاصل نہ ہو تو اس وقت بھی شرکت انتخاب کونسل کے لیے کافی وقت مل سکتا ہے اور بہت ممکن ہے کہ اس جزوی ناکامی کے بعد موجودہ مخالفین کونسل میں سے بہت سے اور اصحاب کونسل کی حمایت پر آمادہ ہو جائیں جس سے موجودہ اکثریت اقلیت میں بدل جائے کہا جائیگا کہ کانگریس کے فیصلہ کی موجودگی میں یہ صورت مفاہمت کی نہیں بلکہ جماعت قلیلہ کے لیے ایک زینہ تنزل کرنے اور اکثریت کے مقابلے میں ہتھیار ڈال دینے کے برابر ہے لیکن ایسی صورت میں کہ حامیان کونسل کے اصول پر اس سے کوئی صدمہ نہیں پہونچتا ملکی آزادی اور قومی سرفرازی جیسے اعلے اور بلند مقاصد کے لیے اقلیت کی جانب سے اکثریت کی خاطر یہ کوئی بڑی قربانی نہیں کہی جا سکتی۔ اگر حقیقت میں حامیان کونسل ترک موالات کے نظام عمل سے قطعاً بیزار ہو کر اس بہانے سے اپنا پیچھا نہیں چھڑانا چاہتے۔

مفاہمت کی ایک دوسری صورت یہ زیر بحث تھی کہ کونسل کے معاملے میں صوبجات کو آزادی عمل حاصل رہے اور حامیان کونسل اسے ماننے کو بھی تیار تھے مگر اکثریت نے اسے مسترد کر دیا لیکن اگر ایک معتدبہ اقلیت کی رائے کا احترام کر کے آل انڈیا کانگریس کمیٹی کسی ایک صوبہ کو کانگریس کی منظور شدہ تجویز پر عمل کرنے کے لزوم سے مستثنی کر کے اس بات کی اجازت دیدے کہ وہاں کے کارکنان کانگریس انتخابات کونسل میں شریک ہوں تو اگرچہ وہ صوبہ ایک بڑی حد تک کانگریس کے نظام عمل پر کاربند ہونے سے محروم رہیگا لیکن دونوں فریق کو اس کے عملی نتائج کا موازنہ کرنے کا جو موقع اس طور پر کل اہل ملک کو حاصل ہوگا وہ یقیناً خالی از منفعت نہیں۔ اور جن لوگوں کو ترک موالات کے موجودہ نظام عمل پر اعتماد کلی ہے انہیں یہ توقع کرنا چاہیے کہ ایک صوبہ کا تجربہ ہونے کے بعد انشاء اللہ دوسرے صوبجات کے ارباب کار پھر کونسل کا رخ بھی نہ کریں گے۔ اور چونکہ باقی ماندہ تمام صوبجات میں کانگریس کے منظور کردہ نظام عمل پر ساتھ ہی ساتھ دونوں جماعتوں کی متحدہ کوششیں صرف ہوتی رہیں گی اس لیے امید ہے کہ جو نتائج مترتب ہوں گے وہ

حامیان کونسل کے جذبات یاس کو امید کامرانی مین بدل دینے والے ثابت ہونگے۔ بے شبہہ سارے ملک مین یکسان قوت و توجہ سے ایک ہی نظام عمل کی تکمیل کے لیے کوشش کرنے سے جو شاندار نتائج پیدا ہو سکتے ہین اون مین کسی ایک صوبہ کی علحدگی سے بھی تھوڑا نقص واقع ہوجائے گا لیکن رہنمایان و کارکنان کانگریس کے درمیان جو شدید اختلاف رونما ہے اوسکا سدباب کرنے اور اوسکے مضر نتائج سے بچنے کے لیے یہ خرابی ناقابل برداشت نہ ہونا چاہیے۔ بشرطیکہ جدید پارٹی کے رہنما اکثریت کی اس قربانی کو بناے مفاہمت قرار دیکر خلوص و سرگرمی کے ساتھ دیگر تمام صوبجات مین کانگریس کے نظام عمل کی تکمیل کے لیے سعی فرمانے پر آمادہ ہوجائین۔

مہاتما گاندھی کے زیر اثر آنے کی وجہ سے کانگریس اب دو سال سے سرتاپا کھدر مین ملبوس ہوتی ہے۔ اور اسی کی برکت سے کانگریس کے اندر زمین پر نشست کا انتظام بھی کیا جاتا ہے جس سے علاوہ اس کے کہ پنڈال مین نشست کے لیے گنجایش خوب پیدا ہوتی ہے ایک ضمنی فائدہ یہ بھی حاصل ہوا کہ کرسیون کی کھڑکھڑ سے نجات مل گئی اور اب مقررین کی تقریرین پہلے سے زیادہ آسانی سے سنی جا سکتی ہین گو اس بغ‍ـ کانگریس کا پنڈال اچھا نہ بننے کی وجہ سے لوگون کو شکایت پیدا ہوئی۔ ان فوائد کے ساتھ ساتھ ان لوگون کے لیے جو نعلین و نعلین پر عمل نہ کر سکے جوتون کی تلاش مین کافی زحمت کا سامنا تھا۔ لیکن شرکت کے اس اہتمام کے باوجود یہ امر قابل لحاظ ہے کہ پنڈال کے اندر جس قدر کتبے آویزان تھے اونکی تعداد کثیر انگریزی زبان مین تھی۔ اور بہی خواہان اردو کو اس بات کی شکایت کا پورا حق حاصل ہے کہ پنڈال بھر مین اردو کا ایک کتبہ بھی نہ تھا حالانکہ ہندی کے چند کتبے موجود تھے۔ منتظمین جلاس کانگریس کو حتے الامکان یہ اہتمام کرنا چاہیے کہ جملہ صوبجات کے باشندون کو جس طرح کانگریس مین نمایندگی کا حق حاصل ہے اسی طرح جملہ صوبجات کی زبانون کو پنڈال کے اندر نمایندگی کا موقع رہے اور اردو جیسی مشترک زبان کو تو اس بارہ مین سب پر فوقیت ہونا چاہیے۔

کانگریس مین تھیٹرون کی طرح اب کے پردہ نشین خواتین کے لیے ایک بالاخانہ الگ بنا دیا گیا تھا مگر ایسی صورت مین کہ پردہ نہ کرنے والی خواتین کے لیے صدر کے چبوترہ سے بالکل ہی قریب نشست کی گنجایش کی گئی تھی اس بالاخانے کے دروازے پر یہ کیون نہ لکھ دیا گیا کہ یہ پردہ نشینون کے لیے مخصوص ہے۔ کہ اس مخلوط انتظام کے باعث کبھی کبھی چلمنین اولٹ جاتی اور بے پردگی ہوجاتی تھی۔

کانگریس کے جلسے عموماً ایک بجے سے شروع ہوکر مغرب کے بعد ختم ہوتے تھے جس کی وجہ سے اون مسلمانون

کے لیے جو فریضۂ نماز کو شرکت کانگریس سے مقدم جانتے ہین کافی دشواری پیدا ہوتی تھی۔ اول تو جلسے بار بار اوٹھنے اور سیکڑون آدمیون کے درمیان سے گذر کر نکلنے مین اہل جلسہ کی یکسوئی اور جلسہ کے سکون مین خلل پڑتا تھا۔ دوسرے بہت سے مسلمان اس ضرورت سے اوٹھ جانے کے باعث تقریرون کے بعض ضروری حصون کے سننے سے محروم رہتے تھے اور ایسے اصحاب کی بھی کمی نہ تھی جو کانگریس کی دلچسپیون مین منہمک ہوکر اپنے اہم ترین فرض کی ادائی سے قاصر رہتے تھے۔ اس لیے اگر آئیندہ سے کانگریس کا وقت اجلاس ۹ بجے سے ۲ بجے تک رہا کرے تو زیادہ مناسب ہوگا۔ خلافت کانفرنس کے جلسے اوس صورت مین شب کو باسانی ہوسکتے ہین۔ نیز کانگریس پنڈال کے احاطے مین نماز پڑھنے کے لیے کوئی جگہ مخصوص کی جائے اور وہان ضروری سامان وضو و نماز مہیا کیا جائے۔

خلافت کانفرنس کا اجلاس کئی حیثیتون سے خاص اہمیت رکھتا تھا۔ ترکون کی کامرانیون نے جہان مسلمانان ہند کو سالہا سال کے بعد مسرت و شادمانی سے ہم کنار ہونے کا موقع بخشا وہان حکومت قسطنطنیہ اور سلطان وحید الدین کے عزل و فرار اور لوزان کانفرنس مین اتحادیون کی روش سے نئی پیچیدگیون مین مبتلا ہونے کا اندیشہ پیدا کر دیا تھا۔ اس بناپر توقع تھی کہ خلافت کانفرنس مسلمانونکی رہنمائی کے لیے حالات موجودہ پر لحاظ رکھکر سال رواں کے لیے اپنا نظام عمل مرتب کریگی۔ تاہم عبرت و حسرت کا مقام ہے کہ اتنی ٹھوکرین کھانے پر بھی مسلمان نہین چونکتے۔ خلافت کانفرنس کی تجاویز کی ترتیب کا کام موجودہ دستور کے مطابق مجلس مرکزیہ خلافت کے متعلق تھا لیکن اوسکی قوتین بجاے اسکے کہ اس اہم ضرورت پر صرف ہوتین تمام تر نہایت ناپاک باہمی نزاعون پر رائگان ہوتی رہین۔ کئی مہینے پیشتر سے مجلس مرکزیہ کے مالی انتظام، روپیہ کے صرف بیجا اور بعض کارکنان مجلس پر قومی خزانہ مین نکتہ چینیان ہو رہی تھین جسکے جواب مین جماعت متصرفین کے ہمنوا مختلف تحریرون اور جلسون کے ذریعہ خاص خاص اشخاص پر اعتماد رکھنے کی تلقین کرتے رہتے تھے۔ مجلس مرکزیہ کے گذشتہ اجلاس دہلی مین خود اوس مجلس کے اندر ایک جماعت نے علم بغاوت بلند کیا جسکی بدولت دفتر بمبئی کی جانچ پڑتال کے لیے ایک کمیشن مقرر ہوا۔ اس کمیشن نے جو رپورٹ مرتب کی وہ بعد طبع کلکتہ کے جلسے مین پیش ہوئی لیکن ارباب حل و عقد کی راے مین وہ اس درجہ شر انگیز تھی کہ اوسکی تمام کاپیان تلف کر دی گئین مگر اصلاح طلب جماعت کو اسپر بھی تسکین نہ ہوئی اور مسودات سابقہ کی مدد سے اونھون نے پھر ایک رپورٹ مرتب کرکے گیا مین پیش کی جسپر کئی دن تک بحث و مباحثہ ہوتا رہا۔ اس مباحثے کے دوران مین دو باتین اچھی طرح سے واضح ہوگئین۔ اول یہ کہ

موجودہ عہدہ داران مجلس مرکزیہ کے درمیان اتحاد عمل کے بجاے نہایت شدید ذاتی خلافات ہین جنکی اصلاح نہ ہونے کی صورت مین ناممکن ہے کہ مجلس خلافت کا کام قابل اطمینان طریقہ پر انجام پا سکے اور دوم یہ کہ مجلس خلافت کا گذشتہ نظم ونسق حد درجہ گندہ رہا جس کی بناپر قطعًا ناممکن ہے کہ با ہوش مسلمانون کو آیندہ مزید مالی امداد رسانی کی ہمت ہو ۔ بدبختی سے ہم ہندوستانیون کے عمومًا اور مسلمانون کے خصوصًا اخلاق ایسے بگڑگئے ہین کہ ہماری جس مجلس کا حال دیکھیے وہان طرح طرح کی ابتریون کے سوا مالی انتظام بالکل ناقص پایا جائیگا ۔ مسلمانون مین افلاس وغربت کے باوجود ایثار وفیاضی کی روح اب بھی پژمردہ نہین ہوئی لیکن قومی مجالس کے کارکن صرف غریبون سے روپیہ وصول کرجانتے ہین اوسکو مصرف صحیح مین دیانت و امانت کے ساتھ صرف کرنا اور اوس کا باقاعدہ ومنضبط حساب رکھنا ضروری نہین خیال کرتے جسکا نتیجہ سواے حرمان ومایوسی کے کیا ہو سکتا ہے ۔ قومی ضروریات روزافزون ہین جنکے لیے بغیر سرمایہ کثیر فراہم کیے چارہ نہین مگر ازبراے خدا مہتممین ومنتظمین مجالس اس پر بھی تو غور فرمائین کہ غریب مسلمان تنگی ترشی جھیل کر اور بسا اوقات اپنا اور اپنے اہل وعیال کا پیٹ کاٹ کر جو کچھ فراہم کرتے ہین وہ بیان نہین تو کسی دوسری جگہ انھین ضرور حساب دینا ہے ۔ اور ہمارے رہنمایان قوم کی یہ ہمت مردانہ قابل داد ہے کہ جہان کہین کوئی شخص یا جماعت بر سر حساب نظر آئی فورًا سب صاحب متحد ہو کر معاملات دبا دینے اور منظر عام پر لائے جانے سے روکنے کی انتہائی کوشش کرتے ہین ہم دیکھتے ہین اور صاف طور پر کہدینا چاہتے ہین کہ کانگریس اور خلافت کمیٹیون کے ارباب حل وعقد بھی دفتری اقتدار کے نمونے کا جو تسلط قایم کرنا چاہتے ہین یہ بالآخر خود اون کے لیے حد درجہ مہلک ثابت ہوگا اور کم سے کم اسکی موجودگی مین ناممکن ہے کہ اہل ہند اوس منزلت عالی پر فایز ہو سکین جو ترک موالات کے نظام عمل کی حقیقی غایت ہے ۔ مہاتما گاندھی کی ساری جد وجہد کا یہ منشا نہین جیسا کہ اونھون نے بہ تکرار اور صاف صاف لکھا ہے کہ اہل ہند غیر ملکی دفتری اقتدار کے دست ستم سے آزاد ہو کر خود اپنے ملکی دفتری اقتدار کے پنجہ ظلم مین گرفتار ہون ۔ اسی وجہ سے وہ ہمیشہ حکومت کا دل پھیرنے اور اخلاقی انقلاب پیدا کرنیکے آرزومند وساعی رہے ۔ کاش کارکنان خلافت وکانگریس بھی اپنے اندر عمدہ اخلاق پیدا کرنے کو تمام دوسری باتون پر مقدم سمجھین کہ افراد اور ہیئت اجتماعیہ دونون کی حقیقی فلاح وبہبود کا انحصار اسی پر ہے ۔

خلافت کانفرنس مین محض کسی منتظم پر اعتماد کا ووٹ پاس کر دینا مسلمانون کے اطمینان کے لیے کافی نہین بلکہ وہ یہ جاننا چاہتے ہین کہ اگر گذشتہ پر خاک ڈالی جاتی ہے تو آیندہ کے لیے اصلاح کی کیا صورتین

نکالی گئی ہین۔
جمعیۃ العلما اور کانگریس کے فیصلون کی موجودگی مین خلافت کانفرنس مین مسئلہ کونسل کا چھیڑا
جانا نہایت مناسب ہوا مگر برطانوی مال کے مقاطعہ کی تجویز کو کانگریس کے علے الرغم منظور کرنیکے بعد ظاہر ہے
کہ نتیجہ کیا ہوتا ہے۔ مانا کہ مسلمان اپنی موجودہ حالت کے لحاظ سے کھدر جیسی خاموش تحریک پر عمل پیرا ہونے کی
اہلیت تمام نہین رکھتے۔ مگر برطانوی مال کا مقاطعہ کیا آسان کام ہے۔ طیارہ فنڈ، سرمایۂ خلافت، جامعہ ملیہ
اور انگورہ لیجن کے واسطے فراہمی سرمایہ بجائے خود لاینحل ہے ۔۔۔ ہم ہین کہ تمام رہنمایان قوم و کارکنان خلافت کی
متحدہ کوششون کے باوجود اسکی توقع نہین ہے کہ اندرا اندر کیا مقاصد ہوسکیگی۔ ایسی صورت مین بہتر ہوتا
کہ کسی دوسرے خیال سے اگر نہین تو کم از کم اجتماعی کوشش کے ناممکن العمل ہونے کی بنا پر اس بحث کو نہ چھیڑا جاتا
جلاس کے دوران مین لوزان سے جو خبرین موصول ہوئین انھون نے بعض رہنمایان قوم کو حد درجہ
فکرمند و مضطرب بنا دیا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ خلافت کانفرنس نے ترکون اور انگریزون کے درمیان جنگ چھڑ جانے
کی صورت مین فوراً سول نافرمانی قوانین شروع کر دینے کی تجویز بڑے جوش کے ساتھ منظور کی۔
اس تجویز پر عمل کرنے کا ممکن ہے کہ ابھی بہت دنون تک وقت نہ آئے مگر جب آ جائیگا تو ہمارے خلوص و ایثار
کی آزمایش کا وہی اصلی وقت ہوگا۔ اللہ تعالے مسلمانون کو توفیق دین کہ وہ اسلام کی خاطر اپنے ترکی بھائیون
کے دوش بدوش اس غیر متشددانہ جنگ مین مال و جان قربان کرنے پر آمادہ رہین۔
گیا خلافت کانفرنس کے صدر استقبالیہ ایک ہندو بزرگ تھے جو اس بات کا ثبوت ظاہر ہے کہ جو برادران وطن
تحریک خلافت مین دل سے ساتھ مین کارکنان خلافت ونکی حوصلہ افزائی کے لیے بھی طیار رہتے ہین۔ لیکن اس قسم
کی کارروائیون کا یہ غلط مفہوم نہ سمجھنا چاہیے کہ ہندو و مسلمانون مین جیسے اتفاق و اتحاد کی ضرورت ہے وہ بہار یا
کسی دوسرے صوبہ مین فی الوقت پایا جاتا ہے۔
ہندوستان کی ان دونون بڑی جماعتون کے درمیان مین حقیقی پائدار اور وسیع پیمانے پر اتحاد پیدا کرنیکے لیے ضرورت
ہے کہ مسٹر سی آر داس صدر کانگریس کی اس تجویز پر عمل کیا جائے کہ دونون فرقون کے درمیان جو اسباب اختلاف ہین
اونکی کامل تحقیق کرکے حتے الامکان دونون طبقون کے رہنماؤن مین ایک مفاہمت قائم ہو جائے اور پھر اس
مفاہمت کو موثر بنانے کے لیے جمعیۃ العلما کی تجویز کے مطابق ہر ہر مقام پر مصالحتی بورڈ قائم ہون۔ انتخاب کونسل یا
برطانوی مال کے مقاطعہ پر قوتین رائگان کرنیکے بجائے اگر پوری توجہ مسئلہ اتحاد اقوام ہند پر عموماً اور ہندو مسلمانون

اتفاق پر خصوصًا صرف ہون تو نہین ہے کہ حصول سواراج و تصفیۂ خلافت دونون مین کامیابی آسان ہوجائیگی اس لیے کہ تمام کمزوریون جملہ خامیون اور کل بیماریون سے زیادہ غیر ملکی دفتری اقتدار کا مقابلہ کرنے مین بھی بغیر حائل راہ ہے جب تک یہ مرض دفع نہ ہوگا ناممکن ہے کہ ہم منزل مقصود تک پہونچ سکین

مجالس سکھ دستور عام کے برخلاف ڈاکٹر مختار احمد انصاری صدر خلافت کانفرنس و بابو دیپ نارائن سنگھ صدر مجلس استقبالیہ خلافت کانفرنس گیا دونون مین سے کسی صاحب نے خطبہ صدارت تحریر نہیں کیا تھا اس بنا پر اگرچہ ان کے خطبون مین کانگریس کے صدارتی خطبون کی سی عبارت آرائی نہ تھی تاہم ہر حیثیت سے دونون بزرگون کی تقریرین مناسب موقع اور مفید مطلب تھیں خصوصًا ڈاکٹر صاحب کی تقریر جو ایک دن کے بجاے دو دن تک جاری رہی نہایت درجہ قابل داد تھی کہ اوس مین حالات حاضرہ اور واقعات گذشتہ دونون مین سے ہر ضروری مسئلے پر نہایت مدلل اور پر مغز بحث کی گئی تھی۔

جمعیۃ العلما کے زیادہ جلسون مین شرکت کا اتفاق نہین ہوا مگر جس جلسہ مین کونسل کے متعلق جمعیۃ العلما کی منظور کردہ تجویز کا اعلان کیا گیا تھا جناب مولانا شبیر احمد عثمانی دیوبندی کی تقریر سے بہت لطف حاصل ہوا اور اگرچہ مسئلہ کونسل پر مسٹر سی آر داس نے جو فاضلانہ بحث کی تھی اوس کے تمام پہلوؤن پر مولانا کو بحث کرنے کا موقع نہین ملا تاہم حامیان کونسل کی طرف سے جس قدر دلائل شرکت کی جانب کی موافقت مین عمومًا پیش کیے جاتے ہین صاحب موصوف نے اون سب کے نہایت مؤثر ... جوابات بیان فرمائے سارکان جمعیۃ العلما کے انتظامی اور عام جلسون مین اون لوگون کو جو شرکت کی اجازت نہین ہوتی جو عوام کالانعام کہے جاتے ہین اس لیے افسوس ہے کہ عام مسلمانون کو فریقین کے دلائل براہین سنکر کوئی راے قائم کرنے کا موقع نہین ملتا مگر ارباب راے کا خیال ہے کہ مختلف الخیال علما کے باہم دست و گریبان ہونے کے واقعات کا نظر عام سے پوشیدہ رہنا ہی فی الحال مناسب ہے۔

ان مجالس کے ساتھ بلکہ جب انمین سے بعض کا وجود بھی نہ تھا مسلم لیگ کے جلسے بھی ہوا کرتے تھے مگر امسال وہ قومی میلے مین اپنی غیر حاضری سے ممتاز رہی۔ یاران دور افتادہ جنھین سال بھر مین صرف ایک بار لیگ کی یاد ستاتی ہے فرمائین گے کہ عہدہ داران لیگ کی غفلت اسکی ذمہ دار ہے اور اون سے پوچھا جائے تو وہ یہ بنا بطلہ کا عذر پیش کرین گے کہ وقت پر گیا سے دعوت نہین آئی۔ اور غالبًا دونون ایک حد تک برسرحق ہین مگر حقیقت حال کچھ اس سے زائد ہے جو انشاء اللہ آیندہ عرض کی جائیگی۔

اورنگ زیب کے اصول و عمل

اورنگ زیب کے منصوبہ و فرامین سے صرف اُسکے آئینِ سلطنت، اصولِ حکمرانی، اور ممالک مقبوضہ کے نظم و نسق پر ہی کافی روشنی نہیں پڑتی بلکہ شہزادوں کی تعلیم و تربیت اور درستیِ اخلاق و آداب اور فرائض سے بھی کے متعلق بھی اسکے ہی خیالات کا اندازہ ہوجاتا ہے۔ ان خطوط و مراسلات کے علاوہ اوسکے ارشادات و ملفوظات جو اُسنے وقتاً فوقتاً اپنے امراء و ارکانِ سلطنت کی تنبیہ و تادیب اور راہنمائی کیلئے بیان فرمائے وہ اصولِ حکمرانی اور منصوبہ جاتِ حکومت کا ایک مکمل دستور العمل ہیں جو ہر زمانہ میں سودمند اور قابلِ تقلید ہوسکتے ہیں۔ یورپ کے مورخین انکو دیکھ کر انگشت بدندان رہجاتے ہیں۔ اونکی سمجھ میں نہیں آتا کہ کس طرح انکو اُس شخص کے خیالات و معتقدات کہ سکیں جسکو وہ ایک جابر اور مکار بادشاہ ثابت کرنے میں اپنا تمام زورِ قلم اور تاریخی معلومات صرف کرچکے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ اورنگ زیب کی پالیسی اور اُسکے کیرکٹر کے متعلق بیان قائم کرنے میں ہمیشہ بیجا تعصب یا غیر ضروری جنبہ داری سے کام لیا گیا ہے۔ اور اس طرح اس بدقسمتی اور غلط فہمی کے شکار بادشاہ کو دوستوں کی حمایت نے بھی اسی قدر نقصان پہونچایا ہے جس طرح مخالفین کی ہٹ دھرمی اور مخاصمانہ نکتہ چینی نے۔ اگر بے لاگ تحقیق و مورخانہ نقادی سے کام لیکر اُسکی سیرت اور طریقہ حکومت کے متعلق چھان بین کیجائے تو معلوم ہوگا کہ اپنے طویل اور پُرآشوب زمانہ حکومت میں اُسنے کوئی کام ایسا نہیں کیا جو ان خیالات اور فلسفیانہ ارشادات کے خلاف ہو۔

اُسکے طریقہ زندگی اور پابندی اوقات کا اندازہ ذیل کے نہایت مکمل اور واضح احکامات و ہدایات سے ہوسکتا ہے جو اُسنے اپنے بڑے بیٹے کو ارسال فرمائے۔ ۱۶۵۲ء میں جب اورنگ زیب صوبہ داری دکن پر مامور تھا۔ اُسکا خلف اکبر سلطان محمد جسکی عمر اُسوقت صرف پندرہ سال کی تھی شاہجہاں کی خدمت میں باریابی کی غرض سے اجمیر روانہ ہونے کی تیاریاں کر رہا تھا، اورنگ زیب جانتا تھا کہ نوخیز اور ناتجربہ کار سلطان محمد حضوری شہنشاہ میں، امراء و عمائدین سلطنت کے سامنے اپنے طریقہ عمل سے یہ ثابت کردے کہ اُس نے ایک قابل باپ کی نگرانی میں نہایت اعلیٰ تعلیم و

تربیت حاصل کی ہے اور شاہانہ ادب و آداب سیکھے ہیں۔ اس غرض سے اُنہے مفصلہ ذیل ہدایات اپنے بیٹے کی رہنمائی کیلیے ارسال کیں اور اُنپر پوری احتیاط کے ساتھ نہایت پابندی سے عمل پیرا ہونے کی سخت تاکید تھی۔ وہ دستور العمل یہ ہے :۔

سفر و حضر میں تم کو ہمیشہ طلوع آفتاب سے ایک گھنٹہ بارہ منٹ قبل بیدار ہونا چاہیے۔ اور تیس منٹ غسل اور دیگر حوائج ضروریہ سے فارغ ہونے میں صرف کرو اور پھر فوراً اول نماز کیلیے کمرہ سے باہر نکل آؤ۔ نماز اور وظائف مقررہ سے فارغ ہونیکے بعد ایک پارہ کلام مجید کا ضرور پڑھو۔ اسکے بعد اندرونی کمرہ میں جاکر ناشتہ کرو۔ حالت سفر میں طلوع آفتاب سے اڑتالیس منٹ بعد گھوڑے پر سوار ہو۔ اگر تم سے راہ میں شکار کھیلنے کا اتفاق ہو تو اسکا پورا اہتمام رکھو کہ وقت مقررہ پر جائے قیام پر ضرور پہونچ جاؤ۔ وہاں پہونچ کر اگر تمہارا دل چاہے اور کافی وقت میسر ہو تو عربی کا کچھ مطالعہ کر لیا کرو۔ ورنہ آرام کرو۔ بارہ بجکر چالیس منٹ پر جب وقت زوال شروع ہو جائے تو نماز ظہر کی تیاری کرو نماز ہمیشہ خیمۂ شاہی کے باہر با جماعت ادا کیا کرو۔ کھانے سے فارغ ہونے کے بعد کچھ دیر آرام کرو۔ اس عرصہ میں نماز عصر کا وقت ہو جائیگا۔ لیکن اگر کھانے کے بعد استراحت کا موقع نہ ملے تو یہ وقت خطوط کے جوابات لکھنے میں اور فارسی نظم و نثر کی کتابیں پڑھنے میں صرف کیا کرو۔ نماز عصر پڑھنے کے بعد تھوڑی دیر تک عربی کا مطالعہ کیا کرو۔ اور نماز مغرب سے فارغ ہونیکے بعد دربار خاص منعقد کرو۔ شام ہونے سے اڑتالیس منٹ بعد تک دربار خاص میں رہا کرو۔ اسکے بعد دربار سے اُٹھکر ایک پارہ قرآن شریف کی تلاوت بلاناغہ کیا کرو۔ پھر دیوان خاص میں جاکر سو جاؤ۔ حالت سفر میں منزل پر پہونچکر تمام متذکرہ بالا امور حسب ہدایت پابندی کے ساتھ انجام دو۔ لیکن علی الصباح سواری کے میدان میں اڑتالیس منٹ تک تیر اندازی کی مشق اور چاند ماری کر لیا کرو۔ اور طلوع آفتاب کے بعد جب پورا ایک گھنٹہ اور چوبیس منٹ گذر جائیں تو دربار عام منعقد کرو اور امور سیاسی و معاملات ملکی کے بارے میں صلاح و مشورہ کرنے میں اڑتالیس منٹ یا اس سے کم و بیش وقت صرف کیا کرو۔ بعد ازاں اگر کسی خاص اور اہم کام کے لیے مشورہ و تبادلۂ خیالات کی ضرورت ہو

> تو اہلِ خاص کو بلا کر اُنسے نصح کے طور پر صلاح لیا کرو۔ یا اتنا وقت مطالعہ عربی میں صرف کرو۔ سفر کے دن دو پارے ورنہ تین پارے قرآن شریف کے پڑھا کرو۔ اگر منزلِ مقصود تک پہونچنے میں زیادہ وقت کی ضرورت ہو، تو نمازِ فجر سے فارغ ہوتے ہی روانہ ہو جایا کرو اور راستہ میں ناشتہ کیا کرو، ورنہ قبل از روانگی ناشتہ سے نپٹ جاؤ۔ بوقتِ یعنی صبح کو اُجالا ہونے سے قبل اور رات کو نو بجے بعد کبھی روانگی سفر کے لیے تیار نہ ہو۔ راستے میں اگر تم شکار میں مشغول ہو جاؤ تو اپنی فوج کو بخشیِ فوج کے ہمراہ جائے قیام پر بہت نزدیک راستہ سے روانہ کر دو۔ اور شکارگاہ میں بعض معدودے چند ہمراہیوں کو اپنے جلو میں رکھو۔

چونکہ سلطنت مغلیہ کا استحکام بادشاہوں کی جنگی قابلیت، فنونِ سپہگری میں مہارت اور دلیرانہ شجاعت پر مبنی تھا، اور چونکہ اورنگ زیب خود نہایت اولوالعزم جرنیل اور جری سپاہی تھا، اسلیے اُسکو ہر وقت یہ خیال رہتا تھا کہ اُسکے لڑکوں کے دل و دماغ میں عیش پسندی اور آرام طلبی کے جراثیم سرایت نہ کر جائیں۔ چنانچہ وہ کوئی موقعہ انکو محنت و مشقت، فنونِ جنگ و سپہ گری کی حرفت حاصل کرنے کا ہاتھ سے نکلنے نہیں دیتا تھا۔ شہزادہ موصوف کو وہ نصیحت کرتا ہے کہ

> رفتہ رفتہ تم کو ہتھیاروں کے ٹھیک استعمال اور انکو اپنے بدن پر سجانے میں ورزش و مشق کر لینا چاہیے۔ جسوقت تک پسینہ بالکل خشک نہ ہو جائے اپنے جسم سے فوجی سامان مت اتارو اسلیے کہ ایسا کرنے سے بیمار پڑ جانے کا اندیشہ ہے۔

فوج میں نظام و ترتیب قائم رکھنے کے بارے میں وہ ہدایت کرتا ہے :-

> سوائے محمد طاہر (اتالیق) کے کسی دوسرے افسر کو جو بارہ ہزار سوار سے کم رتبہ کے منصبدار ہوں کو اپنی فوج سے آگے مت چلنے دو۔ دربار میں یا کوچ کے وقت ضروری گفتگو کیا کرو۔ جو لوگ حیثیت اور مرتبہ میں اس قابل نہیں ہیں کہ تم سے ہمکلام ہو سکیں، انکو نہایت نرمی و ملاطفت سے ٹالدو۔ اس قسم کا طرزِ عمل اُنکے دل میں تمہاری جانب سے خوف اور وقعت پیدا کر دے گا۔

انکے علاوہ اور بہت سی ہدایات ہیں جو بالخصوص شہزادوں کے لیے نہایت مفید اور حرزِ جاں بنانے کے قابل ہیں۔ شہزادہ کو شکار میں زیادہ وقت ضائع کرنے اور تعلیم کی غفلت برتنے پر سرزنش کرتا ہے

کبھی ترکی علوم کی تحصیل پر توجہ دلاتا ہے۔ پابندی نماز اور آئین و دستور شاہی کی نگہداشت کی تاکید کرتا ہے۔ انشاپردازی اور طرز عبارت کی اصلاح پر خاص ہو سے اُس نے شہزادہ کو مطلع کیا ہے:-

"جبوقت تک الفاظ کے معنی اور محل استعمال کو بخوبی نہ سمجھ لو ہرگز استعمال نہ کرو"
غرض اُنکے تمام مرسلات اور فرامین اس قسم کے مفید اور نتیجہ خیز ہدایات و نصائح پر مشتمل ہیں جن پر عملدرآمد ہر زمانہ اور ہر حالت میں بادشاہوں سے لیکر معمولی آدمی تک کے لیے نہایت ضروری و کارآمد ہے۔

بادشاہوں کی تعلیم اور طریقۂ تعلیم کے متعلق اُسکے دلچسپ اور سبق آموز خیالات کا اندازہ اُنکی ایک تقریر سے ہو سکتا ہے جسکو ہم ذیل میں درج کرتے ہیں۔

جسوقت عالمگیر تخت طاؤسی پر صدرنشین ہوکر اورنگ زیب و زینت کو دوبالا کیا اور تاج شاہجہانی اپنے سر پر رکھکر عالمگیری کے شادیانے بجوانے لگا تو ہر طرف غلغلہ اُٹھا، اُسکے ملازمین متوسلین قدیم جو ہندوستان کے دور دراز مقامات اور ممالک میں تھے جوق در جوق پیش کش لیکر حاضر دربار ہوئے تا کہ اپنی دیرینہ خدمات و احسانات یاد دلا کر خلعت و انعام و مناصب جلیلہ و اکرام شاہانہ حاصل کریں۔ ان میں بادشاہ کے سابق اُستاد ملا شاہ بھی تھے۔ اورنگ زیب نے ابتدائے زمانہ طالب علمی میں عربی و فارسی کی چند کتابیں دیکھی تھیں۔ اس صلہ میں شاہجہاں نے اُنکے نام افغانستان میں کچھ جاگیر کردی تھی۔ جہاں آپ سکونت پذیر تھے۔ جب اورنگ زیب کی اپنے برادران یوسف پر کامیابی اور تخت حکومت پر جلوہ فرما ہونے کی خبر آپ تک پہونچی تو فوراً ہی عازم ہندوستان ہوئے، تاکہ اپنے حقوق جتا کر اُنکا صلہ حاصل کریں۔ تین ماہ تک آپ بلاناغہ بلا کشاں دربار کے زمرہ میں سب سے آگے نظر آتے رہے، لیکن اورنگ زیب نے مطلق آپکی جانب توجہ نہ کی آخرکار جب بادشاہ اُنکی روزانہ حاضری سے عاجز آگیا تو ایک روز حکم دیا کہ آپ کمرۂ خاص میں تخلیہ کے وقت تشریف لائیں۔ آپ ہزاروں دلخوش کن امیدوں کو ہمراہ لیے ہوئے خلوت میں حاضر ہوئے۔ اُسوقت کمرۂ خاص میں بادشاہ کے علاوہ حکیم اعظم دانشمند خان (دبرنیر کا آقا) اور

تین چار دیگر نہایت سربرآوردہ اور باکمال ارکان سلطنت موجود تھے۔ ملّا جی کو دیکھکر بادشاہ نے اُن سے خطاب کیا :-

"فرمائیے ملا جی! آپ کیا چاہتے ہیں؟ کیا آپ کی یہ خواہش ہے کہ سلطنت کے کسی عہدۂ جلیلہ پر آپکو سرفراز کر دوں؟ اچھا پہلے میں آپکے دعوٰے قابلیت اور استحقاق اعزاز کو جانچنا چاہتا ہوں۔ بیشک آپنے مجھکو مناسب اور موزوں تعلیم دی ہوتی تو آج میں آپ کی عزت کرنا اپنا فخر سمجھتا اور آپ کو ہر قدر و منزلت کا اہل جانتا۔ کسی اعلیٰ تربیت یافتہ شخص کی نسبت آسانی سے یہ نہیں کہا جاسکتا کہ وہ اپنی کمال اور حسن تعلیم اور دماغی نشو و نما کے لئے اپنے والدین کا زیر بار احسان ہے یا کسی استاد کا۔ لیکن آپ سے مدت دراز تک شاگردی کرنے سے مجھے کیا حاصل ہوا؟ آپ نے مجھکو یہ بتلایا کہ تمام فرنگستان (یورپ) ایک معمولی اور چھوٹا سا جزیرہ ہے اور وہاں پہلے تو پرتگال کا بادشاہ سب میں زیادہ طاقتور تھا، لیکن اُسکے زوال کے بعد شاہ ہالینڈ، اور بعد ازاں شاہ انگلستان کی قوت سب سے زبردست شمار کی جانے لگی۔ دیگر والیان یورپ مثلاً فرانس و اندلس کے متعلق آپنے میری معلومات میں یہ اضافہ کیا کہ اُنکی سلطنتیں ہندوستان کی کسی معمولی ریاست کے پلہ کی بھی نہیں ہیں اور سلاطین ہند کے مقابلہ میں اُنکی تمام شان و شوکت ایک ذرۂ بیمقدار کی حیثیت رکھتی ہے

"ہمایون - اکبر - جہانگیر اور شاہجہان کا ہم مرتبہ کوئی بادشاہ صفحۂ ہستی پر نہین گزرا، اور ایران و کاشغر، چین و ماچین اور دیگر ممالک کے حکمران، فرمانروایان ہند کے نام سے کانپ اُٹھتے ہیں۔ آپ کی جغرافیہ دانی اور تاریخی معلومات لائق صد آفریں ہیں۔ کیا آپ کا یہ فرض نہیں تھا کہ دنیا کی ہر قوم کی خصوصیات اور اُنکی تاریخ سے مجھکو واقف کرتے، اُنکی دولت و قوت، اُنکے طریقۂ جنگ و جدال، سیرت و اطوار، مذہب و رواج، آئین حکومت اور اُنکے سیاسی اغراض و مقاصد آپ مجھکو بتاتے! اور تاریخ کا باقاعدہ مطالعہ کرنے کی آپ مجھکو ترغیب دیتے تاکہ مین سلطنتون کے قیام اور اُنکے عروج و زوال کے فلسفہ اور اسباب پر غور کرتا، اور اُن واقعات و اسباب اور غلطیون اور فروگذاشتون سے واقفیت حاصل کرتا، جو دنیا مین بڑے بڑے سیاسی تغیرات اور عظیم الشان انقلابات پیدا کرنے کا باعث ہوئی ہین۔ تاریخ اقوام کا صحیح اور وسیع مطالعہ تو کجا، آپکی تعلیم سے مجھے اپنے

مشہور عالم اسلاف اور سلطنت مغلیہ کے شہرۂ آفاق بانیوں کے نام بھی نہیں معلوم ہو سکے۔ اُنکے سوانح زندگی، اور واقعات گذشتہ اور اُنکی قابلیت و اُولوالعزمی (جس سے اُنھوں نے ایسی فتوحات حاصل کیں) کے متعلق آپنے مجھکو بالکل تاریکی میں رکھا۔ بادشاہوں کے لیے اپنے ہمسایہ قوموں کی زبانیں جاننا نہایت ضروری ہے، لیکن آپ نے صرف زبان عربی سیکھنے کی ضرورت میرے ذہن نشیں کی اور میرے وقت کا بیشتر حصہ ایک ایسی زبان کی تحصیل میں صرف کرایا جسکو کوئی شخص بغیر دس بارہ برس کی محنت شاقہ کے پورے طور سے حاصل نہیں کر سکتا۔ آپ کو یہ بھی نہیں معلوم تھا کہ شہزادوں کا نصاب تعلیم کن مضامین پر مشتمل ہونا چاہیے۔ پس آپ نے میرا تمام وقت الفاظ کو رٹانے میں ضائع کیا، جس سے نہ کوئی فائدہ ہو سکتا ہے، نہ اُس میں کوئی دلچسپی ہے اور نہ یہ سلسلہ ختم ہو سکتا ہے۔ کیا آپ کو یہ لازم نہیں تھا کہ آپ مجھے اس امر کی جس کا جاننا بادشاہوں کے لیے ناگزیر ہے تعلیم دیتے کہ بادشاہ اور رعایا کے باہمی فرائض کیا ہونا چاہیے؟ یہ امر ہمیشہ آپ کے پیش نظر رہنا چاہیے تھا کہ مجھے کسی وقت اپنے بھائیوں سے مجادلہ آرا ہونا پڑیگا اور تعاسے زندگی وحصول سلطنت کیلیے (جو باہم لازم و ملزوم ہیں) تلوار اُٹھانا پڑیگی۔ آپ خوب جانتے ہیں کہ فرمانروایان ہند کی اولاد و احفاد کو ایسے ناگزیر واقعات کا پیش آنا یقینی ہے۔ کیا آپنے کبھی مجھکو فنون جنگ۔ کی، محاصرہ کرنے کی، اور فوج کو میدان میں ترتیب دیکر لڑانے کی تعلیم دی؟ یہ میری خوش قسمتی تھی کہ میں نے آپ سے زیادہ عقلمند اور تجربہ کار لوگوں کی تربیت و تعلیم سے اس معاملہ میں استفادہ کیا۔ آپ اپنے قصبہ کو واپس جائیے اور آئندہ کسی شخص پر آپ یہ ظاہر نہ ہونے دیجیے کہ آپ کون بزرگ ہیں یا آپ پر کیا بیتی ہے۔"

پروشیائی عظمت و اقتدار کے بانی مبانی، فریڈرک اعظم کے متعلق لارڈ میکالے اپنے ایک مضمون میں لکھتا ہے کہ "ابتدائے زمانۂ حکومت سے وہ سرکاری کاموں کی دیکھ بھال میں اس قدر منہمک رہتا تھا کہ جسکی نظیر دنیا کا کوئی حکمران نہیں پیش کر سکتا۔ لوئی چہاردہم شہنشاہ فرانس، وزارت خاص کے فرائض خود انجام دیا کرتا تھا، اور تمام دفاتر و محکمہ جات اُسکے زیر نگرانی کام کرتے تھے۔ لیکن فریڈرک کچھ اس سے بھی آگے بڑھ گیا۔ وہ اسپر قانع نہیں تھا کہ اپنا وزیر خاص خود ہی رہے، بلکہ وہ بذاتہ کیہ وتنہا وزیر

م سلطنت کے لیے ہوا چاہتا تھا۔ حکام بالاترین محض اُسکے محرروں کے طور پر کام کرتے تھے اور انیز اُسکو اتنا بھی اعتبار نہ تھا جتنا کہ ایک محکمہ کا افسر اپنے زیر دست منشیوں پر کیا کرتا ہے۔ وزیراعظم، سپہ سالار افواج، منصرم امور مالیہ، معتمد تجارت، اور وزارت داخلیہ و خارجیہ، غرضکہ کل اہم اور معمولی انتظامات کی نگرانی اپنے ذمے رکھی تھی۔ اگر کوئی مسافر فوجی نمائش کی سیر دیکھنا چاہتا تو اُسکو براہ راست فریڈرک کے پاس درخواست بھیجنا ہوتی تھی، اور بادشاہ کے ہاتھ کا لکھا ہوا پروانہ اُسکو ملتا تھا۔

نپولین اعظم کی خوش قسمتی سے اُسکو ایسے اچھے کارکن اور مشیر میسر آئے تھے کہ یورپ کا کوئی ملک اُنکے مثل اس زمانے میں نہیں لا سکتا تھا، لیکن دنیا جانتی ہے کہ وہ صرف نپولین کے احکام و فرامین لکھنے اور اُنکا اجرا کرنے کی ایک مشین تھے۔ معاملات سیاست، اور تدابیر جنگی میں اُسنے کبھی کسی وزیر یا سکرٹری کی رائے کو اپنی زبردست قوتِ تدبیر کے مقابلہ میں قابلِ وقعت نہیں سمجھا اور یہ ایک واقعہ ہے کہ اُسکی پیش بندیاں اور تدابیر کبھی غلط ثابت نہیں ہوئیں۔

اس سے یہ سمجھنا نہیں چاہیے کہ ان مشاہیر کو اپنے ماتحتوں پر اعتبار نہیں تھا یا وہ انکو نااہل سمجھتے تھے، بلکہ اسکا سبب یہ ہے کہ اُنکو اپنی ذاتی قابلیت اور قوت عمل پر زیادہ بھروسہ تھا۔ اورنگ زیب کی بدقسمتی سمجھیے یا مورخین کی ستم ظریفی، کہ اورنگ زیب کے انھیں خصائص نے، جو دوسرے لوگوں کے محاسن و محامد میں شمار کیے جاتے ہیں، اُسکی فرد جرم میں ایک اور نہایت سنگین الزام کا اضافہ کر دیا ہے ہمارا مقصد اسوقت یہ نہیں ہے کہ ہم مورخین کے اس الزام کو جانچیں کہ اورنگ زیب کو اپنے کسی ملازم یا مقرب حتی کہ اپنے بیٹوں اور دیگر اقارب پر بالکل بھروسہ نہیں تھا اور خلقۃً وہ نہایت شکی مزاج واقع ہوا تھا۔ ہم صرف ایک واقعہ بیان کرنا چاہتے ہیں، جس سے اصول حکومت اور فرائض شاہی کے متعلق اُسکے زریں خیالات کا اندازہ ہوتا ہے۔ اور یہ ظاہر ہو جاتا ہے کہ وہ کیوں اپنی آسایش اور صحت کو معرض خطر میں ڈالکر سلطنت کے معمولی سے معمولی کاموں کی نگرانی اور درستی میں ہمہ تن مشغول رہتا تھا۔

امور سلطنت کے انصرام میں اورنگ زیب کی ہمہ تن مشغولیت، اور شب و روز انہماک سے بعض ہوا خواہوں کو یہ اندیشہ ہو گیا تھا کہ اسکی وجہ سے بادشاہ کی صحت پر مضر اثر پڑے گا۔ اسکے علاوہ بادشاہ کی نگرانی کی وجہ سے، امرا و اراکین اور عمال سلطنت کی ناجائز آمدنی اور

غیر واجب اختیارات کے دروازے بند ہوگئے۔ چنانچہ ایک دفعہ بادشاہ کے مقرب ترین امراء میں
سے ایک نے بادشاہ کو اسطرف توجہ دلائی اور اسقدر محنت و مشقت سے باز رہنے کی [illegible]
صلاح دی۔ اسکے جواب میں بادشاہ نے یہ فصیح و بلیغ اور نہایت پرجوش خط تحریر فرمایا۔
"بادشاہ کے ان فرائض اور ذمہ داریوں کے متعلق آپ لوگوں میں کوئی غلط فہمی نہیں ہونی
چاہیے کہ مشکلات اور خطرات کے موقعوں پر اسکا فرض ہے کہ اپنی زندگی کو سب سے پہلے معرض
ہلاکت میں ڈالے اور اگر ضرورت ہو تو اُن لوگوں کی حفاظت میں جو اسکی نگرانی میں دیے گئے
ہیں تلوار ہاتھ میں لیے ہوئے اپنی جان دیدے۔ تعجب ہے کہ تم جیسا ایک محتاط آدمی مجھکو یہ مشورہ د
ے رہا ہے کہ رعایا کی فلاح و بہبود کا خیال میرے لیے کوئی پریشانی کا باعث نہیں ہونا چاہیے
اور انکی بہتری کی تدابیر سوچنے میں میری ایک شب کی نیند بھی خراب نہ ہونا چاہیے۔ اور نہ اس وجہ
سے میرا کوئی دن خواہشات نفسانی کو پورا کرنے میں صرف ہونے سے بچ سکے۔ اسکی وجہ یہ ہے
کہ صحت جسمانی کے تحفظ کا خیال میرے نزدیک سب سے زیادہ اہم ہونا چاہیے اور مجھے بالخصوص
اُن اسباب و ذرائع کو تلاش کرتے رہنا چاہیے جو میرے ذاتی آرام و آسائش میں معین و مددگار ہوسکیں۔
بلاشک اُسکی یہ خواہش ہے کہ میں امور سلطنت کا انتظام کسی دوسرے کے ہاتھ میں دیدوں۔ اُس نے
ہرگز یہ خیال نہیں کیا کہ ایک بادشاہ کے گھر میں پیدا ہونے اور تخت حکومت پر متمکن ہونے کی وجہ سے
گویا قدرت نے مجھکو اس خدمت پر مامور کرکے دنیا میں بھیجا ہے کہ میں یہاں اپنے لئے نہیں بلکہ دوسروں
کی خاطر زندہ رہوں اور مشقت کروں۔ کیونکہ یہ میرا فرض ہے کہ میں اپنی سہولیت اور آرایش کا
صرف اُس حدتک لحاظ کروں جہانتک وہ عوام کی فلاح و بہبود سے متعلق ہیں۔ رعایا کی خوشحالی
اور آسایش ہمیشہ میرے مدنظر رہنا چاہیے۔ اور انصاف و عدل کی خواہش، اقتدار شاہی کی بحالی
اور تحفظ سلطنت کے علاوہ اور کسی غرض کیلیے انکو نظرانداز کرنا مناسب نہیں ہے۔ یہ شخص اُن نتایج
کو نہیں جان سکتا جو میرے تساہل سے پیدا ہونگے۔ اور یہ اُن قبائح سے بالکل ناواقف ہے جو دوسروں
کو اختیارات سونپ دینے سے معرض ظہور میں آئیں گے۔"

سترہویں صدی کے اس "ظالم و جابر" اور مطلق العنان بادشاہ کے ان خیالات کو پڑھیے
اور اس دور تہذیب و تمدن کے کسی شہرۂ آفاق ماہر تعلیم، یا کسی حریت نواز و آزاد خیال سیاسی

اہل الرائے کے خیالات سے موازنہ کیجیے۔ اور پھر سوچیے کہ کیا یہ انصاف کشی اور اخفائے حقیقت کی ایک مجرمانہ کوشش نہیں ہے کہ ہماری تمام تاریخی معلومات اور دماغی کدوکاوش صرف یہ ثابت کرنے میں صرف ہو ع

کہ عالمگیر ہندو کش تھا، ظالم تھا، ستمگر تھا

محمد حامی الدین خاں رفیق پروفیسر تاریخ مہاراجہ کالج (جے پور)

غزل

تربت پہ وہ جو آ گئے عالم نیا ہوا | پھولوں میں جان پڑ گئی سبزہ ہرا ہوا
پیوند پیرہن میں مرے جا بجا ہوا | تھا قیس کے کفن کا جو ٹکڑا بچا ہوا
دیکھا گیا نہ اشکوں کا دریا چڑھا ہوا | پانی برس رہا تھا کہ قاصد ہوا ہوا
شامت ہے دل کی کون سہے پوچھے کیا ہوا | تنہا رکو جا رہا ہے کوئی کوستا ہوا
نے بھلائے وہ مرے دل کی حسرتیں | آئے اجاڑنے کو مرا گھر بسا ہوا
وہ دیکھتے ہیں ہوئے وفا کے نام میں | خون شہید ناز بھی عطر حنا ہوا
رنگ چمن نہ پوچھیے ساقی مئے کدہ میں | ہر جام گل ہے خون جگر سے بھرا ہوا
تم نے دیا تھا داغ جو اے مہربان کبھی | ہے آج تک وہ میرے جگر سے لگا ہوا
کیا طرز دلنوازی بیمار یہ بھی ہے | بالین سے اٹھ گیا ہے کوئی کوستا ہوا
حصے میں آ گیا وہی سیماب برق کے | جو اضطراب تمہارے دل سے بچا ہوا
کیا کیا بناؤ بگڑے ہوئے تیوروں میں ہیں | غصے میں بھی پیار کا نقشہ کھنچا ہوا
آ آ کے جا چکے کئی موسم بہار کے | اب تک اسیر دام ہے کوئی رہا ہوا
داغ دل فسردہ ہے سینے میں اس طرح | جیسے کوئی چراغ لحد ہو بجھا ہوا
کرتا ہے شکر خنجر قاتل کا بخیہ گر | رہنے دے زخم دل کا ابھی منہ کھلا ہوا

پوچھا کسی نے حال جو صفدر کا یوں کہا
زندہ تھا رات صبح کو کیا جانے کیا ہوا

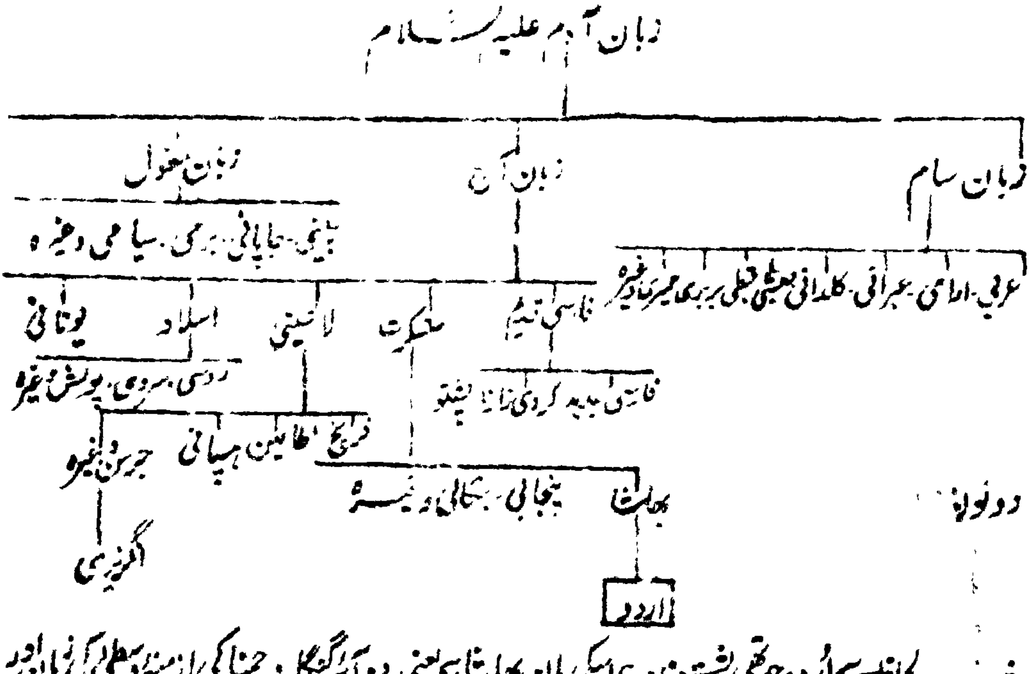
صفدر مرزاپوری

اُردو کی نثر

غالباً دنیا کی کوئی زبان اتنی نوعمر نہین جتنی ہماری اُردو زبان ہو۔ زبان بھی انسان کی طرح پیدا ہوتی ہو۔ جوان ہوتی ہو۔ بوڑھی ہوتی ہے۔ صاحب اولاد ہوتی ہو اور پھر مرجاتی ہو اُس کی اولاد بڑھتی ہو اور مدارج زمانہ کے ساتھ نئی صورت مین موجود ہوتی ہو۔ جسمین اگرچہ کچھ آبائی ورثہ باقی رہتا ہو مگر سطحی طور سے وہ ایک نئی مخلوق سمجھی جاتی ہو۔ اگر یہ سلسلہ پیچھے دور تک بڑھاؤ تو آخر مین بابا آدم کی زبان پر ختم ہوکر ایک مرکز پر آجاتی ہو مادی توریت نے غالباً غلط نہین کہاکہ زبان کا اختلاف بابل کے منارے کے بننے کے وقت سے شروع ہوا ہو جسکو عام فہم بنانے کے لیے جیساکہ مذہبی کتابون کا قاعدہ ہوتا ہو موٹے پیرائے مین اس طرح بیان کردیا ہو کہ خدا کو منارۂ بابل کا بننا جو گویا اُس کی خدائی کے مقابل اعلان جنگ کے برابر تھا بڑا معلوم ہوا اور اس لیے اُس نے تمام مزدورون کی زبان مین اختلاف کرکے یہ سلسلہ مسدود کردیا۔ اسکو نظر انداز کرکے ہمین یہ ماننے مین پس و پیش نہین ہو کہ مخلوق کی ابتدا جس طرح ایک فرد واحد انسان سی ہوتی ہو اسی طرح ایک زبان سے جب اُس کی اولاد کثرت یا ابتدائی خانگی جھگڑون سے باپ کے گھر مین نہ سما سکی تو جس نے جدھر کا راستہ پایا روانہ ہوگئی۔ ان لڑکون نے اپنے نئے گھر مین ملک کی آب و ہوا کے موافق ایک نئی معاشرت کی ابتدا کی۔ اس کی اولاد کثرت سے بڑھی اور اپنے اپنے مرکز کے دائرہ مین پھیلتی گئی اور جیسے جیسے یہ پھیلی اُس کی گفتگو۔ رنگ روپ مین فرق آتا گیا۔ لہذا تاریخ کے رُو سے پہلی تقسیم سام۔ آریج۔ اور مغول کی قرار پائی۔ سام وہ تھے جو اپنے گھر مین رہے اور ہم یہ بھی مان لیتے ہین کہ وہ بابل تھا جو اولین گہوارۂ انسانی کہلاتا ہو۔ بابل وہی ہو جسکو آج کل ہم عراق کہتے ہین اس کی جغرافی کیفیت یہ ہو کہ مغرب کی طرف تا انتہاے اطلانٹک ایک مسلسل و مسطح میدان جسمین کوئی بڑا پہاڑ یا سمندر حائل نہین چلا جاتا ہو۔ شمال و مشرق مین عراق کا میدان پہاڑون سے محدود ہو۔ ابتدائی نسل جب پھیلی تو اُس نے فطرتاً وہی راستہ اختیار کیا جو قدرتی رُکاوٹون سے پاک تھا اور چنانچہ جیسا واقعہ ہو سامی نسل کا پھیلاؤ مغرب اور جنوب کے رُخ عراق۔ شام۔ عرب۔ مصر۔ اور افریقہ مین ہوا۔

مرور زمانہ سے جبل زگورس وجودی کے دامن سے لیکر تا منتہاے افریقہ سامی زبان نے رواج پایا اور آب وہوا کے لحاظ سے اُن مین بدرجہ بدرجہ تبدل اور تناسل ہوتا رہا۔ سامی زبان کی شاخون مین ارامی۔ کلدانی۔ عبرانی۔ عربی۔ قبطی۔ فنیقی۔ بربری۔ حبشی زبانین پیدا ہوئین جن مین سواے عربی کے نہ کوئی کثیر الاولاد ہوا اور نہ زندہ۔

دوسری شاخ آریج جن کے مورث اعلی نے جبل زگورس (موجودہ کوہ پشت کوہ) کے دشوار گذار قطعے کو عبور کر کے اپنے آبائی گھر سے بالکل قطع تعلق کرنیکا تہیہ کیا تھا اُس پر دشت وکوہ میدان مین پھیلی جو ہمالیہ یورال پامیر اور کوہ قاف سے محدود تھا۔ اُن مین بھی وہی سلسلہ قائم رہا جو اُن کے بھائی سامیون مین تھا اور امتداد ایام مین آریج زبان کی شاخون سے سنسکرت۔ قدیم پارسی یونانی۔ لاطینی۔ سلاو زبانین پیدا ہوئین۔ اور پھر اُن کی اولاد در اولاد ہوئی۔ بعضون کی پیدائش بہت پرانی ہے بعضون کی نئی۔ اس طرح اُردو کا سلسلہ نسب یون بنتا ہے۔



دونون

لحاظ سے اُردو چوتھی پشت مین ہے اسکی مان بھاشا ہے یعنی دوآبہ گنگا وجمنا کی ازمنۂ وسطی کی زبان اور
پوتی اسی آریج زبان کی پرپوتی ہے جسکی خالائین فرنچ جرمن ہسپانی فارسی جدید کردی پشتو پنجابی
وہ ہین اور جسکی صرف ایک چچیری بڑی بہن انگریزی ہے جو اس سے عمر مین تقریباً مان کے برابر ہے اور جو
سن کی لڑکی ہے۔

شخص
دیکھ
معم
عیا

(۱)

اس نوخیز زبان نے بعضوں کا خیال ہے کہ شاہجہان اور اکبر کے گہوارۂ شفقت مین نشو ونما پائی اور بعض اس کو سلاطین تغلق و خلجی کی پروردہ بتلاتے ہین۔ خسرو نے جو کچھ بھاشا مین لکھا ہے وہ یقیناً ٹھیٹھ بھاشا نہین ہے اور اگرچہ صاف اُردو بھی نہین مگر اُردو کی بہن ضرور معلوم ہوتی ہے۔ مجھے یاد نہین آتا مگر بابر کا ایک اُردو شعر موجود ہے اور وہ بہت کچھ ہماری اُردو سے ملتا ہے۔ تو اگر ان دونون رایون کو پیش نظر رکھ کر سلطنت مغلیہ کے عہد مین اوسطاً اُردو کی ابتدا کہی جائے تو بیجا نہ ہوگا۔ یعنی جو زبان آج ہندوستان مین برسر رواج ہے اُس کو پیدا ہوئے کل تین سو برس ہوتے ہین۔ اس نوخیز زبان نے اس تین سو برس مین کیا ترقی کی۔ اسپر مجھ سے زیادہ واقف کارون نے قلم فرسائی کی ہے اُردو شاعری کے لیے آزاد کی آبحیات یا حال مین ایک ہندو بزرگ لالہ سری رام ایم اے کی لاجواب کتاب خمخانۂ جاوید کافی معلومات رکھتی ہے۔ اس مضمون کا جو موضوع ہے وہ لٹریچر کی دوسری شاخ یعنی نثر پر ایک سطحی نظر ڈالنا ہے۔

(۲)

سب سے پہلے لفظ اُردو کو دیکھنا ہے۔ اُردو ترکی لفظ ہے جسکے معنی کیمپ یا لشکر کے ہین اور موجودہ ترکی فوجی اصطلاح مین آرمی کور کے مرادف۔ یعنی لشکر والون کی زبان۔ اور میرامن، آزاد، سرسید، سب متفق القول ہین کہ شاہجہان کی فوج مین مختلف قومون کی زبانون سے ملکر یہ زبان پیدا ہوئی ہے۔ بزرگون پر نکتہ چینی کرنا جسارت ہے۔ مگر مجھے اس قول سے قطعاً اختلاف ہے۔ اول تو یہ کہ دنیا مین شاہجہان سے پہلے بڑے بڑے اولوالعزم بادشاہ گذرے ہین جن کی فوج شاہجہان کی فوج کے آدمیون سے زیادہ قومون اور نسلون پر مشتمل تھی۔ مگر کسی لشکر نے کوئی زبان پیدا نہین کی۔ دوسرے لوگوا ٭ ٭ یہ خیال غلط ہے کہ اگر کسی زبان مین کئی غیر زبانون کے الفاظ پائے جاتے ہین تو اُسکے یہ معنی ہے کہ کئی زبانون سے مخلوط ہو کر بنی ہے۔ عربی زبان مین کتنے غیر الفاظ ہین۔ اسی طرح فارسی مین بھی ہین۔ انگریزی مین سیکڑون، فرانسیسی، ہسپانی، لاطینی الفاظ مین اور دنیا کی شاید کوئی زبان تجارتگاہ عالم مین آکر اپنے کو پاک دکھلا سکے۔ اصل یہ ہے کہ زبان مین امتیاز اور فرق زیادہ اسماء فعلیہ وحرفیہ پر موقوف ہین۔ الفاظ اسمیہ کسی زبان مین خلط سے پاک نہین۔ فعل وحرف کے اد ایک زبان دوسری سے شناخت ہوتی ہے اور اپنی جدا گانہ حیثیت قائم رکھتی ہے۔ مثلاً ایک مختصر

کہ آفس کا بابو یہ کہے کہ "فلان شخص میرے انڈر مین ورک کرتا ہی" اس کو ہم یقیناً اردو نہ کہین گے بلکہ لشکری زبان لیکن اگر وہ یہ کہے کہ آفس مین جلد آیا کرو ورنہ مین ہیڈ اسسٹنٹ سی شکایت کرون گا" تو اگرچہ آفس اور ہیڈ اسسٹنٹ کا غیر لفظ استعمال کیا ہی۔ مگر یہ جملہ اردو زبان کا جملہ ہی پس ایسے فعل جیسے آنا۔ جانا۔ کھانا۔ پینا یا ایسے حرف جیسے۔ مین۔ کو۔ پر یہان وہان وغیرہ جب ان مین کوئی تبدیلی کی جائیگی تو اُس وقت زبان کا مخلوط ہونا کہا جائیگا۔ اور ایسی زبان لال کرتی اور انگریزی دفترون مین بنگالی بابوؤن کے اندر رائج ہے۔ اس لحاظ سے مجھے اس مین بھی تامل ہی کہ ہماری زبان کو اردو کہنا بجا ہی یا نہین یعنی جن معنون مین ہم اسکو لیتے ہین۔ اُردو بہ لحاظ لشکری زبان نہین اور مناسب یہ ہی کہ اُردو کی جگہ یا تو نیا لفظ ہندوستانی یا قدیم لفظ ریختہ کا رواج دینا چاہئے۔ معلوم نہین کہ اس کا نام اُردو کیون پڑا۔ اگر اس سے فوجی زبان سے مراد ہو یعنی ان ہندوستان کے مسلمانون کی زبان جن کا قدیم پیشہ سپہگری تھا تو خیر ورنہ اُردو کو اس حیثیت سے کہنا کہ یہ زبان مخلوط ہی سخت نادانی ہی۔

(٣)

اردو کی نثر کا آغاز سب سے پہلے شاہ عبد القادر دہلوی سے ہوا ہی جنھون نے قرآن شریف کا ترجمہ اُردو زبان مین کیا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب کہ دولت مغلیہ آخری سسکیان لے رہی تھی چاہیے تو یہ تھا کہ اُن کے بعد اُن کی اولاد رشید اس نئے طریقہ کو اختیار کرتی۔ مگر شاہ عبد العزیز شاہ رفیع الدین وشاہ اسمٰعیل صاحبان نے جو کچھ تصانیف چھوڑی ہین وہ تمام کی تمام فارسی زبان مین ہین۔ اور اس ۔۔ت دہلوی نے اُٹھایا جنھون نے پہلا اُردو فسانہ لارڈ ولزلی کی فرمائش سے لکھا اس کے ۔۔۔رو کا وہ دلچسپ دور داستان نگاری شروع ہوا جس کے ابتدا مین مرزا رجب علی سرور ۔۔انہ عجائب اور آخر مین پنڈت رتن ناتھ سرشار صاحب فسانہ آزاد ہین۔ داستان نگاری ۔۔ین۔ یہ تخیلات کی وہ شان ہی جس مین شعرا کی محدود پابندیون اور قیود سے آزادی ۔۔تی ہی۔ مگر مرزا رجب علی نے غالباً نثر نگاری کو پوری طرح نہ سمجھا۔ اور تک باندھنے ہی کو اپنا ۔۔بڑا کمال جانا۔ غالب نے برا انھین کہا جو اُنھون نے مرزا کی تحریر کو بھٹیارون کی گفتگو ۔۔ری۔ مرزا رجب علی سرور کا فسانہ اس حیثیت سے قابل لحاظ ہی کہ قصے کا پیرایہ نیا اور نرالا ہی

اور اُردو بھی اگر تک بندی کو نظر انداز کر دیا جائے تو بہت ثقیل اور گران خاطر نہین مرزا کے بعد کسی نے اوریجنل فسانہ نہ لکھا۔ فارسی اور عربی کا کثیر ذخیرہ پہلے سے موجود تھا اور صرف اسی کو اردو کا جامہ پہنانے کی کوشش کی گئی۔ قصہ حاتم طائی۔ چہار درویش داستان امیر حمزہ وغیرہ اُردو کے لحاظ سے معمولی اور قصے کے لحاظ سے کہنہ اور فرسودہ ہین لیکن اُردو کی نثر نگاری مین جو چیز تمام عیوب سے مبرا ہے وہ پنڈت سرشار کا فسانہ آزاد ہے۔ اور حقیقت یہ ہے کہ اُنھون نے داستان گوئی کے ساتھ نثر نگاری مین جان ڈالدی۔ سنجیدہ مذاق۔ طبایع انسانی کے مختلف پہلوؤن کے خاکے یقیناً بے مثل ہین صرف عیب یہ ہے کہ بڑی لمبی داستان ہے اگرچہ اُس زمانہ مین جب وثیقہ دارون اور چانڈو بازون کی تعداد زیادہ تھی لوگون کو اسکے پڑھنے کی فرصت رہی ہو مگر آجکل کی کاروباری نسل دنیاوی انہماک مین مشکل سے داستان آزاد کو لیکر بیٹھے گی۔ یہ ایک بڑے تعجب کی بات ہے کہ تنقید مین آزاد کے آب حیات مین مشکل سے ایک شاعر کی نثر نگاری پر ریویو کیا گیا ہے۔ انشا۔ ذوق۔ امیر مینائی سودا اور غالب جیسے شاعر تھے ویسے ہی نثار بھی تھے۔

غلام امام شہید۔ منشی غلام غوث (صاحب فغان بےخبر) سرشار اور سرسید کی درمیانی کڑی ہین اور ان کی کتاب کا تبصرہ زیادہ برین نیست کہ ایک نے لغت اور دوسرے نے طول و تفصیل بطالت کے سوا کوئی بڑی گامزنی نہین کی۔

(۴)

مگر جدید دور مین اردو زبان کی تقدیر سرسید نے کھولی۔ سرسید نے تمام مغلق اور مقفےٰ عبارتون کو یک قلم برطرف کر دیا۔ اور مجھے شبہ ہے کہ اگر سرسید مقفےٰ اور رنگین عبارت لکھنے کی کوشش کرتے تو کر بھی سکتے تھے۔ پہلی کتاب جو اُنھون نے خیالات جدیدہ کے پہلے لکھی ہے وہ صنادید عجم ہے اُن اگرچہ اُنھون نے کوشش اسی بات کی کی ہے کہ عبارت آرائی کرین۔ مگر بُری طرح ناکامیاب رہے بعد کی سادہ آرائی مین بھی اگرچہ کمال حاصل نہ کیا مگر اسکی بنیاد رکھدی جسکو اُن کے پہلے نے نہایت خوبی اور کامیابی سے انجام دیا۔ سرسید کی اُردو ذرا بھونڈی ہے اور حالی نے اسکی ان کی ہے کہ وہ اس شخص کے الفاظ کے مانند ہے جو ایک جلتے ہوئے مکان کو دیکھکر گھبراجائے ان اضطراری کے الفاظ جو اُس کے مُنھ مین آتے ہین بغیر اسکے کہ وہ اُنکی بلاغت اور فصاحت پر غور کرے چلائے۔

سرسید کی بقیہ تمام تصانیف مذہبی ہین۔ اُن کے مختلف مضامین جواُن کے تہذیب الاخلاق رسالے
مع کیے گئے ہین، کتابخانون مین ملتے ہین یہی اُن کی نثرنویسی کا پورا مرقع ہو۔ مذہبی تصانیف
مین خطبات احمدیہ، ابطال غلامی۔ تفسیرانا جیل۔ تفسیر قرآن وغیرہ عام اس سے کہ ہم اُن سے کے
خیالات کی کیسی ہی مخالفت کرین۔ سادگی کی وجہ سے اِن بزرگان دین کو اس حیثیت سے
ہدایت کا ذریعہ ہوسکتی ہین کہ مذہبی لٹریچر کا اصل مقصد کہ عوام پر صاف اور کھلے الفاظ مین تغیر ہو
وہ ابتک کسی مولوی کے ذہن مین نہ آیا تھا۔ اُن کی تمام تحریر کا مقصد یہ ہوتا تھا کہ پڑھنے والون کو
نفس مضمون کے بجاے یہ جتا دین کہ ان کو کتنی عربی لغتین اور کتنی منطق اور فلسفی اصطلاحین
یاد ہین وہ اُردو لکھتے تھے جو اُن کے سوا اور کوئی نہین سمجھتا تھا۔ رتن ناتھ سرشار نے ایسے ہی علما
کی تحریر کا اپنے فسانے مین خوب خاکہ اُڑایا ہو۔ سرسید کے بعد مہدی علی۔ چراغ علی، حالی، شبلی
نذیر احمد، ذکاء اللہ کی تصانیف علمی۔ مذہبی تاریخی ہونے کے ساتھ یہ وصف رکھتی ہین کہ سب اسی
اصول عام فہمی۔ سادہ آرائی اور مقصد نمون پر مبنی ہین۔ نذیر احمد نے اُردو کو دہلی کے گھرانے اور
محلسرا سے نکال کرشاہراہ پر ٹہلا دیا۔ جب تک اُردو اور دہلی زندہ ہو۔ لوگ اُن کے قصے کی کتابون
کو پڑھین گے اور مزے لین گے۔ مگر ہر چیز کی ایک حد ہو۔ مولانا نے ترجمہ قرآن مین ایسی ہی سواجی
اور خانگی اُردو کو ٹھونس دیا ہو۔ اور قرآن عظیم کی اعلی متانت اور بلاغت کی مناسبت کا خیال
نہین کیا۔ اُن کا ترجمہ قرآن ناپسندیدہ اور قابل تبدیل بلکہ تنسیخ ہے۔ دور سیدی مین ہماری نظم
دو اور بزرگون پر ہے ایک تو مولانا محمد حسین آزاد دوسرے سجاد حسین صاحب اڈیٹر اودھ پنچ۔ ان
دونون نے اُردو کو اپنے مطلب کے مطابق اور اپنے رنگ مین رنگا ہو اور اُردو کی سرافرازی کی ہو۔

(۵)

دور سرسید کے اختتام پر اگرچہ بہت سے اُردو نثرنویس تھے۔ مگر اُن مین قابل لحاظ صرف تین
شخص ہین۔ ایک بوڑھے اور دو نوجوان۔ بوڑھے سے میرا مطلب یہ ہو کہ جنھون نے سرسید کی آنکھین
دیکھی ہین اور ابتک ہم مین موجود ہین۔ لکھنؤ کا مشہور ناول نگار جو انگلستان کے سر والٹر اسکاٹ اور
مصر کے جرجی زیدان کی طرح خشک تاریخ کو مضمون کی چاشنی مین ہمارے دسترخوان پر پیش کرتا ہے۔
عبدالحلیم شرر ہے۔ اس کی فہرست تصانیف اگر اسکاٹ اور جرجی زیدان سے بڑھی نہین تو کم بھی نہو

لوگ کہتے تھے کہ ادلیسن فلسفہ کو مقصورہ سے نکال کر مجمع احباب مین لایا۔ شرر نے تاریخ کے پرعزت کو نازنین دلچسپ ناہرد کے جلوے مین پیش کیا ہی۔ کون ہی جو حسن بن صباح کے فدائیون کا حال جاننا نہین چاہتا مگر کون اسکو کامل ابن اثیر یا ابن خلدون کی زبانی سننے کا شوقین ہی۔ ہان [illegible] کے دلچسپ پیرایے مین ہم سب کو مشتاق بنا دیتا ہی۔ اسیطرح زوال بغداد۔ ماہ ملک۔ ملک العزیز ورجینا فلورا فلورنڈا۔ منصور موہنا۔ لعبت چین۔ بابک خرمی۔ فاتح مفتوح۔ اسلامی زمانے کی جدا جدا تحریکین ہین جو قصے کے پیرایے مین ہم کو اپنی قوم کی گذشتہ کارنامون کا زمانہ یاد دلاتی ہین۔ شرر کی فسانہ نویسی مین جو کمی مجھے نظر آتی ہی وہ یہ ہی کہ اُن کے ہیرو اور ہیروئین عموماً ایک ہی قطع کے لباس پہنے ہوئے نظر آتے ہین۔ اور بعض جگہ اُنھون نے یوسف زلیخا اور سکندر نامہ کی بزم کا رنگ دے دیا ہے جو موجودہ تہذیب جائز نہین رکھتی۔ اس مین ان کی تازہ تالیفین درباری حرامپور۔ غیب دان دلہن وغیرہ ہین۔ دو نوجوان نثر نگارون مین مسٹر سجاد حیدر اور خواجہ حسن نظامی ہین۔ سجاد حیدر کو مین ذاتی طور سے نہین جانتا ہون مگر مین نے اُن کے مضامین خیالستان پڑھے ہین اُسمین زیادہ تر ترکی اور انگریزی کی خوشہ چینی ہی مگر یہ بھی کمال ہی کہ دوسرے ملک کے پھول کو غیر مانوس [illegible] اُسی آب و نکہت سے باقی رکھے۔ اُن کی اُردو نہایت شستہ دلچسپ ہے۔ [illegible] مثال پہلے اُن کا وہ حصہ ہو جسمین عورت و مرد کے ابتدائی جذبات کشش کا نقشہ کھینچا ہی۔ یہ کہانی کا قصہ ہی اور اصل مین یونان کی قدیم متھیالوجی (روایات مذہبی) کے ایک دلچسپ قصے پر رنگ آمیزی کی گئی ہی۔ چونکہ میری نظر سے یہ مضمون اصل مین گذر چکا ہی اس لیے مین کہہ سکتا ہون کہ اصلی قصہ ترکی مین اتنا دلچسپ نہین جتنا یہ قصہ اُردو مین ہی۔ اور ایسی مثال بجز فٹز جیرالڈ کے ترجمہ رباعیات عمر خیام کے جو اصل سے بہتر کہا جاتا ہی کہین نہین ملتی۔ خواجہ حسن نظامی کی شیرین کلامی اور انداز بیان واقعی نرالا اور مزیدار ہی۔ نذیر احمد کی اُردو ایک زمانہ شناس بڑی بی بی معلوم ہوتی ہی۔ حسن نظامی کی اُردو ایک شوخ طبع اور کمسن لڑکی۔ میرے خیال مین موجودہ اُردو کی بہترین انشا ہی۔ کاش وہ اپنے سب مضمون جمع کر کے شایع کر دین۔ مگر اتنی خرابی ہے کہ بعض پر تصوف اور سوفسطائیت کا بہت بھدا رنگ چڑھا ہوا ہی اور جن کو میری طرح تمام صوفیانہ وارفتہ حرکتون سے بیزاری ہی۔ پسند نہ ہوگا۔

(۶)

اس مضمون کے لکھتے وقت میرے سامنے اردو ادب کا مشہور پرچہ الناظر ہے جو میرے مکرم شاہ ذیشان
کی توجہ اور عنایتوں کا نتیجہ ہے۔ ہندوستان میں اردو جرنلزم برسات کے کیڑے کی طرح ابلتی ہے اور
جہاں غیر موافق ہوا لگی اور خاتمہ۔ الناظر کے پہلے کتنے رسالے اردو کی خدمت پر کمربستہ ہوئے اور کتنے
باقی ہیں۔ مخزن میں نے آج پانچ سال سے نہیں دیکھا۔ اور دوسرے رسالے ایسے گم ہو گئے کہ مجھے
اُن کا نام بھی یاد نہیں رہا۔ دلگداز نے مولانا شرر کی زندگی میں کئی پلٹے کھائے اور اب مولانا صدیق سلمہ
اُن کے بیٹے نے اُسکے چلانے کا بیڑا اُٹھایا ہے۔ ابتک تو وہ کبھی سالانہ کبھی ششماہی قسط پر نکلا کیا۔ مگر
اب مجھے معلوم ہوا ہے کہ مولانا صدیق آئندہ سے اسے وقت پر نکالیں گے زمانہ ایک اور رسالہ ہے
اور اچھا ہے بلکہ بہت اچھا ہے۔ مگر اڈیٹر صاحب کو نہ میں جانتا ہوں اور نہ اُن کے رسالہ کی ہسٹری اور اسواسطے
نہیں کہہ سکتا کہ یہ کب تک زندہ رہے۔ خیر الناظر اگست کا پرچہ میری محترم شاہ صاحب کو معلوم ہے کہ مجھے ایک نظر
نہیں بھایا اور میں نے جو کچھ نکتہ چینی کی ہے وہ ذاتیات پر مبنی نہیں۔ بلکہ عزیز اردو کی خاطر۔ ستمبر کا پرچہ
بارے کچھ ترقی پر ہے۔ "دوشیزگان مغرب کا جزیرۂ حورستان" میں متحیر ہوں کہ اُس کو کس ڈھب پڑھوں۔ "گے
بر طارم اعلیٰ نشینم۔ گے بر پشت پائے خود نہ بینم" خیالات کی یہ بلند آفرینی اور پھر جا کر گرا کہاں۔ لندن
اور پیرس کے اسکم (Scheme) میں۔ بہرحال برا نہیں اور پر واز اور آواز غیر طبعی ہے۔ سید احمد رفاعی
قدس سرہٗ، معلوم نہیں کہ صاحب مضمون کو اسپر روشنی ڈالنے کی ضرورت کیا پڑی تھی۔ کیا مولانا شرر کی
کتاب الحکم الرفاعی اردو میں موجود نہیں ہے۔ "ترک قلم" میں جدت ہے اور کسی کہنہ مشق کا معلوم ہوتا ہے۔
"دانست" میری سمجھ سے باہر ہے۔ اور مجھے اتنی فرصت نہیں کہ اس پر غور کروں۔ حیات عالمگیر میں صاحب مضمون
کچھ کر کے دکھلانے والے ہیں۔ جس سے پروفیسر سرکار اور شبلی کی روح غالباً سبق لے گی۔ انتظار ہے۔
کہکشاں کا جلوہ معقول نکتہ چینی اور اردو کی نہایت لابدی خدمت ہے اور ہمارے شکریہ کے قابل۔

سید مقبول احمد الہ آبادی

اُردو اگو راج چار سو تیرا ہے
شہروں میں رواج کو بکو تیرا ہے
پر جب تک انیس کا سخن باقی ہے
تو لکھنؤ کی ہے لکھنؤ تیرا ہے
(حالی)

فلسفۂ حرکت

تمہید قارئین کرام کو لفظ "حرکت" سے شاید یہ شبہ ناشی ہوگا کہ اس سے مراد خدانخواستہ علم الحرکت ہے۔ یا وہ چیز ہے جو عثمانیہ یونیورسٹی کے "علمیات" میں بشمول "معاشیات" "ریاضیات" "شلث" وغیرہ کے اپنا وجود رکھتی ہے۔ یا "طبیعیات" کا وہ عنصر ہے جو بصورتِ شدت مستحیل بہ آتش ہوجاتا ہے اور بہت ممکن ہے کہ اس شبہ کے ساتھ ہی ساتھ مضمون کی خشکی کا تخیل بھی تغافل و بے نیازی کو دعوت دے اور ناچیز راقم الحروف کی ساری محنت محض سرسری ورق گردانی کی نذر ہوجائے۔ بس اس کا ارتفاع اور دفع دخل کچھ ایسا زیادہ نامناسب بے تکا نہیں ہے۔ چنانچہ لفظ حرکت کا مفہوم یہاں پر وہ شئی ہے جس سے حیات کا وجود ہوتا ہے اور جس سے پوری زندگی رفتہ رفتہ متشکل ہوجاتی ہے اور جو جمود و سکون کا متضاد اور شورش و ہنگامہ آرائی کا مترادف ہے اور جس کا پورا تصور ہیجان، تلاطم، طغیان، ہیجان، کشت و خون وغیرہ کی انقلابی ڈکشنری میں پنہاں ہے۔ ظلم و جبر، عدوان، سفاکی، توہین، تذلیل، وغیرہ جس کے محرکین ہیں۔ اور حریت، آزادی، ایثار، فدویت جس کے نتائج ہیں۔

تقسیم حرکت کی تحریک ہمیشہ دو پہلو رکھتی آئی ہے، جنکو اسکی دو قسمیں بھی کہہ سکتے ہیں: پہلی انفرادی دوسری اجتماعی۔ یہ دونوں حیثیتیں باعتبار مدارج کے پیدا ہوتی ہیں اور انکی علحدگی صرف بلحاظ منازل کے ہے نہ باعتبار فرق کے۔ اور حرکتِ انفرادیہ کے لیے لازمی ہے کہ کسی نہ کسی وقت وہ حرکت اجتماعیہ کو وقوع میں لے آئے گویا حرکت کی پہلی منزل حرکتِ انفرادیہ ہے اور دوسری منزل جو منزل اول کا لازمی نتیجہ ہے حرکتِ اجتماعیہ ہے۔ البتہ یہ امر غور طلب ہے کہ ان ہر دو حرکتین کے وسطی مدارج کیا ہونا چاہیئے، اور وہ کونسی صورتیں ہیں جو حرکت انفرادی کے حرکت مجتمعہ تک پہونچنے کے زمانہ میں پیدا ہوتی ہیں اور جنکے بغیر کوئی منفرد حرکت مجتمعہ حرکت کا منہ نہیں دیکھ سکتی یا بہ الفاظ دیگر وہ شرائط و لوازم کون کون ہیں جو ایک حرکت کو اجتماعی صورت میں نمودار کرسکتی ہیں چنانچہ اس مسئلہ کو حل کرنے کیلیے بہتر یہی ہوگا کہ مذکورہ سادی تقسیم میں دو اور

قسمیں بھی بڑھائی جائیں تاکہ یہ تقسیم فلسفہ حرکت کے تمام پہلوؤں پر باحسن وجوہ حاوی ہوسکے اور حقیقت یہ ہے کہ فلسفہ حرکت کے یہی چار عناصر ہیں جن پر حرکت کا وجود، ابتدا، ارتقا، اور اختتام منحصر ہے۔ یعنی:۔

ا۔　حرکت انفرادیہ

ب۔　حرکت منفردۂ اجتماعیہ

ج۔　حرکت مجتمعۂ انفرادیہ

د۔　حرکت اجتماعیہ

غایت۔ قبل اسکے کہ ان اقسام کی تعریف بتفصیل کیجائے حرکت کی غایت، مراد کا جان لینا اُنکی دلچسپی اور اہمیت کو اور گہرا کردیگا۔ ہرچند کہ یہ بات کچھ زیادہ محتاج بیان نہیں کہ حرکت کی غایت کیا ہوتی ہے تاہم اس امر کی طرف توجہ دلانا کہ حرکت کا منشا کیا ہے تحصیل حاصل بھی نہیں کہا جاسکتا۔

حرکت کی فطرت، اپنی ہستی کا پورا پورا احساس کرلینا ہے۔ مختلف افراد کا یہ محسوس کرلینا کہ ہم کیا ہیں، ہماری ہستی اور ہمارے وجود کا منشا کیا ہے؟ کس قسم کے قیود و حدود میں گھرے ہوے ہیں، ہمارے مذہب، اخلاق، معاشرت، سیاست، مادیت، نسل، رنگ، زبان، وطن وغیرہ لوازمات ہم سے کس قسم کے تمدن کے طالب ہیں؟ ہمارے ذاتی خصوصیات اور باہمی تعلقات کیا ہیں، ہماری ترقی کیا تعریف رکھتی ہے اور ہمارا تنزل کیا معنی رکھتا ہے؟ ہماری بقا کے لیے کونسی چیزیں مضر اور ہماری فنا کے لیے کونسی چیزیں مفید ہیں۔ ہم کہاں ہیں اور ہمکو کہاں ہونا چاہیے۔ تنازع للبقا کے کس درجہ اور جہد للحیات کی کس منزل میں ہیں، آیا مائل بہ تنزل ہیں یا رو بترقی ہیں، آزاد ہیں یا غلام، اگر آزاد ہیں تو حقیقی طور پر اور اگر غلام ہیں تو کس قسم کے؟ خلاصہ یہ کہ یہ معلوم کرلینا کہ بحیثیت ایک قوم ہونے کے ہمارا وجود کس مقام پر ہے حرکت کی ذمہ داری کو پورا پورا ادا کردیتا ہے اور حرکت کی آبرو یہی ہے کہ مذکورہ کل لوازمات اُسکے جلو میں ہوں۔

تعریف حرکت کی ابتدا انفراد یا افراد سے متعلق ہے اور حرکت انفرادیہ احساس قومیت کی اُس شکل کا نام ہے جب کسی گروہ یا جماعت کے مختلف افراد اپنی قومیت کے متعلق اپنے اندر

ایک نہایت دُھندلا سا تصور پیدا کرتے ہیں اور سمجھنے لگتے ہیں کہ ہم میں کیا کیا قوتیں مخفی ہیں اور بحیثیت القوم ہماری کیا وقعت ہے - ہم کس قسم کی فضا میں ہیں اور ہمارا ماحول ہم سے کس قسم کے خیالات و افعال کا مستحق ہے - یہ محض شخصی احساس ہوتا ہے اور قومیت کے لحاظ سے اصولاً اسکو حرکت کا بچپن سمجھنا چاہیے اور اسی انفرادی احساس کو بیداری - حقوق طلبی وغیرہ کے نام دیے گئے ہیں اور چونکہ تصور حرکت نہایت مدھم اور مبہم ہوتا ہے اسلیے نرمی اور اعتدال اسکے واسطے ناگزیر ہیں - تاہم اس حرکت شخصیہ کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ نئی نئی آوازیں اور عجیب عجیب صدائیں اور غیر مانوس خیالات عدم سے وجود میں آتے ہیں - اختلاف شدید ہوتا ہے - اور علاوہ ازیں نقائص کے جو اس حرکت فردیہ کے تنہا حامل ہوتے ہیں، عام طور پر بے پروائی، تغافل اور استہزا بھی اسی مرتبہ پر ہوتا ہے جتنا اختلاف ہوتا ہے - گویا فطرت حرکت کی دایہ اپنے چھوٹے چھوٹے بچوں کو پہلے پہل قومیت کے کھلونوں سے روشناس کراتی ہے جنپر وہ لڑتے ہیں، ضد کرتے ہیں، چھینا جھپٹی کرتے ہیں، اور جھگڑا بکھیڑا کیا کرتے ہیں مگر چونکہ حرکت کی رفتار توالد و تناسل کی رفتار ہے کہ ایک [illegible] متحرک ہو کر پھر کیا مجال ہے کہ بند ہو جائے یا رک جائے اسلیے رفتہ رفتہ قومیت کی نئی [illegible] پرانی اور اجنبی تخیلات سے مانوس ہوتی جاتی ہیں اور اس گروہ کی چھوٹی چھوٹی جماعتیں بعض طور پر اس ابتدائی حرکت کے اصول و فروع کو منضبط کر لیتی ہیں جسکا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ نوعیت قومیت کے متعلق چند نقاط متحد علیہ ہو جاتے ہیں اور اصول خود بخود متشکل ہونے لگتے ہیں اور ایک ایسا طبقہ پیدا ہو جاتا ہے جو پوری جماعت میں جذبات حیات پیدا کرنے کا خواہشمند ہو جاتا ہے - مگر چونکہ یہ جذبہ افراد سے آگے بڑھنے نہیں پاتا اور نہایت محدود ہوتا ہے لہذا عام قومیت ظاہر نہیں ہوتی ہر چند کہ چند افراد کا جذبۂ قومی متفقہ حیثیت سے قومیت کا سبق پڑھانا شروع کر دیتا ہے - حرکت کی اس منزل کو حرکت منفردۂ اجتماعیہ کہتے ہیں اور یہ گویا حیات قومی کا دوسرا زینہ ہے - اس میں اختلافات تقریباً نابود ہو جاتے ہیں - جمہور عامہ میں ایک بے چینی پیدا ہوتی ہے - میٹھی نیندیں سونے والے کسی قدر چونکنے لگتے ہیں جلسوں اور رزولیوشنوں، کانفرنسوں اور کانگرسوں کی کثرت ہو جاتی ہے مگر حقیقی جذبہ ایک خاص گروہ اور ایک محدود طبقہ سے جو حرکت انفرادیہ کا ثمر ہوتا ہے، آگے نہیں بڑھنے پاتا - اور نمود و نمایش کے لیے ایک وسیع میدان، نیز شہرت و عزت کیلیے ایک

وبعض جولان گاہ مہیا ہو جاتی ہے۔ مگر اس منزل میں جو امر بہت زیادہ قابل غور ہے یہ ہے کہ تعین حریت کا طبقہ اور طلب حقوق کا گروہ عموماً ایک ہی ہوتا ہے دو پارٹیں نہیں ہوتے۔ اور جو حیات کو حرکت کے لیے لازمی ہے وہ منقسم نہیں [illegible] جدو جہد ایک ہی کائنات جدو جہد اور ایک ہی جذبہ قومیت کے اندر [illegible] ہے [illegible] خیالات کہ اس قسم کی تحریک اپنے ساتھ لاتی ہے انکے مدعی اور ذمہ دار وہی لوگ اپنے کو سمجھتے ہیں جو منفرد اپنی معلومات سے اپنے حقوق کا احساس کرتے ہیں اور حقوق شناسی کے بعد ہی حقوق طلبی کا [illegible] رکھتے ہیں۔ اور چونکہ مطالبات ان کے صریح اور زیادہ دور بیں اور نتیجہ خیز نہیں ہوتے لہذا منفرد اجتماع بہ نسبت حرکت کی اشاعت و تبلیغ کے اپنے طبقہ نے مخصوص و متعین افراد کو آزاد خیالی کی بناپر ذاتی شہرت و شخصیت عطا کر دیتا ہے حریت کے سچے مفہوم اور طلب حقوق سے یہ لوگ محروم ہوتے ہیں میمونہ اور کورانہ تقلید کو بھی طبقہ بعض ترقی سمجھتا ہے۔ جان دہی و جانستانی [illegible] نہیں ہوتا۔ اصلاح و درستی کا صرف شور و غل مچایا [illegible] ارادہ کی قوت مفقود ہوتی ہے اور اس منزل میں "حرکت" گویا لڑکھڑا کر چلنا سیکھتی ہے لیکن اس حالت پر ایک مدت گزرتی ہے۔ حرکت اپنے دور ارتقاء میں نئے نئے احساسات کو جلوہ دیتی ہے۔ زمانہ ہمیشہ رخ باستقبال رہتا ہے۔ آئندہ سے ہمیشہ موجودہ اور گذشتہ پر ترجیح پائی ہے۔ قومیت کا جذبہ زور پکڑ جاتا ہے۔ اپنی ہستی کا احساس زیادہ گہرا ہونے لگتا ہے۔ دنیا کے حالات و واقعات متاثر کرتے ہیں۔ اور ایک نئی جماعت پیدا ہوتی ہے جو پچھلے طبقہ کے افراد پر نکتہ چینی کرتی ہے۔ نفروہ اجتماعیہ کے دور کے افراد کو خلوص و ایثار سے معرا ہونے کا الزام دیتی ہے۔ انکو ذاتی نام و نمود اور جاہ و ثروت کا طالب ٹھیراتی ہے۔ تقلید و تصنع کو کفر سمجھتی ہے۔ اپنے خاص قومی خصوصیات پر عمل پیرا ہوتی ہے۔ ایثار و حریت کے سچے نمونے پیش کرتی ہے اور ایک عام بیداری پیدا کر دیتی ہے۔ عوام میں بھی قومیت کا احساس مبہم و مجمل طور پر پیدا ہونے لگتا ہے۔ ہر کام قومیت کے رنگ میں رنگ جاتا ہے۔ ملک کے طبقات اپنے مطالبات پر متحد ہو جاتے ہیں۔ عزم راسخ اور فدویت کے بیشمار مظاہرات رونما ہو جاتے ہیں۔ طلب حقوق میں بیخوفی بڑھ جاتی ہے اور قوم میں قومی عقائد طرح طرح کی شکلوں میں نمودار ہوتے ہیں اور ہر فرقہ کو اپنے اثر میں لاتے ہیں۔ لاتعداد چلتے مختلف سیاسی اثرات کے وجود میں آگئے ہیں

اور پبلک کو خالص قومی ذائقہ سے لذت اندوز کرانے لگتے ہیں۔ حرکت کے اس دور کو حرکت مجتمعہ انفرادیہ سے موسوم کرتے ہیں، ملک کے جدید و قدیم قومی عقائد میں تصادم شدید واقع ہوتا ہے۔ غیر خالص خیالات اور کمزور و خود غرضانہ مقاصد فنا و ذلیل ہو جاتے ہیں اور یہی قومیت خود اپنے آپ کو پیش کرتی ہے۔ بیشمار چھوٹی چھوٹی جماعتوں کا پیدا ہو جانا ایسے حالات میں مقتضائے فطرت قومیہ کے بالکل مطابق ہے۔ اور یہ بھی ضرور ہے کہ ہر جماعت اپنے سیاسی اصول و فروع مستقل رکھے۔ چنانچہ باوجودیکہ مجموعی حیثیت سے بیداری و روشن خیالی کی کثرت ہو جاتی ہے تاہم ہر قومی جماعت انفرادی اپنی قومی فضا کو قائم کر لیتی ہے اور مختلف سیاسی عقائد کے گروہ اپنے مخصوص ماحول کی بنا پر قومیت کے جداگانہ مفہوم تراش لیتے ہیں۔ اور اس اجتماعی انفراد کے مختلف اور منفرد طبقات کا کوئی متحدہ نقطۂ عمل نہیں ہوتا۔ ہر طبقہ فرداً فرداً اپنے دائرۂ سعی کے اندر حسب مقدور قومی ترقی کی کوشش کرتا ہے لیکن اپنی جماعت کے ساتھ ساتھ۔ اس انفرادی اختلاف کا باعث عموماً خارجی دخل اندازیاں اور اضافی جبر ہوا کرتا ہے۔ سخت کشمکش پیدا ہوتی ہے۔ کوئی مخصوص نظام قومیت متعین نہیں ہو سکتا۔ شیرازہ منتشر رہتا ہے۔ قوائے عمل معطل رہتے ہیں۔ انفرادی جماعات کی کوششیں باطل ثابت ہوتی ہیں اور باہم ٹکراتی رہتی ہیں۔ اور بظاہر یہ نظر آتا ہے کہ تمام قومی عمارت اکیلا۔گی بھربھرا کر زمیں بوس ہو جائیگی۔ اور چرخ نیلوفری کی ایک ہی گردش میں نادر اور نادری نابود ہو جائیگی۔ فرقہ بندی کے اختلافات ایسے سخت ہوتے ہیں کہ اُنکا علاج کرنا مریض کے فنا کر دینے کے برابر ہو جاتا ہے۔ اور ہر چند کہ ابتدا میں یہ اختلاف اصولی ہوتے ہیں مگر رفتہ رفتہ شخصی ہو جاتے ہیں۔ اجتماع انفرادیہ کے مختلف اشخاص باہم ایک دوسرے کے سخت دشمن ہو جاتے ہیں۔ قومی حرکت معطل سی معلوم ہونے لگتی ہے۔ لیکن باوجود ان تمام باتوں کے خود حرکت نہایت شدت کے ساتھ مخفی طور پر بڑھتی رہتی ہے۔ جمود پر کاری ضرب لگتی ہے۔ سکون و خاموشی کا خاتمہ ہو جاتا ہے۔ حقوق طلبی گو کہ رنگ برنگ کی صورتوں میں نمودار ہوتی ہے مگر بکثرت پھیل جاتی ہے۔ اعتدال پسند، انتہا پسند، شہرت پسند، جلسہ طراز، کھرباز، وفادار، بیوفا، غرضکہ اس عہد مجتمعہ انفرادیہ میں طرح طرح کے سکے ڈھل جاتے ہیں اور باہم تنازع کے ذریعہ سے بالواسطہ حرکت کو تقویت پہنچاتے ہیں اور آپس میں ایک دوسرے

کا ذریعہ بقا ثابت ہوتا ہے۔ اس قسم کے جماعتی اختلافات ایک مدت تک جاری رہتے ہیں، لیکن قدرت کے قوانین کی بنیاد تو اتحاد و موانست پر قائم ہے۔ درندے بھی انسانوں کے ساتھ بسر کر لیجاتے ہیں۔ البتہ خاص خاص اسباب کی ضرورت ہوتی ہے۔ پھر شیر بکری کا ایک گھاٹ پر مجتمع کر دینا کتنی بڑی بات ہے۔ بس جو لوگ ایک مدت تک یہ سمجھتے رہے کہ

ہے آدمی بجائے خود اک محشر خیال

اُنپر ایسی بجلیاں گریں، وہ وہ قیامتیں نازل ہوئیں کہ ساری چناں وچنیں بھول گئے اور جب دیکھا کہ خود قوم ہی پر ضرب لگنے والی ہے تو بیچارے

شاد باید زیستن ناشاد باید زیستن

سب آپس میں متحد ہونے لگے۔ اور حرکتِ اجتماعیہ کا آغاز ہوا۔ قوم کے مختلف فرقے ملاپ اتباط دینے لگے اور شیرازہ بندھ گیا۔ پھر کیا تھا۔ اسکے بعد تو جو قدم آگے بڑھتا ہے پیچھے نہیں ہٹتا۔ جو آواز بلند ہوتی ہے بغیر اثر کیے نہیں رہتی ہے۔ خلاصہ یہ کہ جس طرح ایک صحیح و تندرست انسان کے تمام قویٰ ہر پہلو سے منشاء قدرت کو پورا کرتے ہیں اُسی طرح حرکتِ اجتماعیہ کے حصول کے بعد قومیت اپنی قدرتی شان میں نمودار ہو جاتی ہے۔　　　　(باقی آیندہ)

ندیم محسن

از شیوۂ ناصواب توبہ　　　　از خوردن این شراب توبہ
چون خواب برادرست با موت　　　　از کثرت خورد و خواب توبہ
در حالت نزع توبہ کردم　　　　زین توبۂ بے حساب توبہ
چون باعث قوت گناہست　　　　از خوردن این کباب توبہ
صد کوہ خطا کشد در آغوش　　　　از بیع چو کشد نقاب توبہ
در صحبت غیر نیست فیضے　　　　از صحبت ناصواب توبہ
زین پس من و گوشۂ قناعت　　　　از ہمت شیخ و شاب توبہ
ہر کس کہ ز توبہ باز گردد　　　　ہم توبہ شود عذاب توبہ
بر عمر چو نیست اعتمادے　　　　باید کہ کنی شتاب توبہ

[illegible]

شکر سکاریہ

جنگ سکاریہ کا ادبی پہلو

اگست و اکتوبر ۱۹۲۱ء مین فتح انگورہ کے لیے یونان نے کثیر التعداد فوجون کے ساتھ حملہ کیا تھا جنھین خیال تھا کہ ترکون کی ترکی تمام ہوجائیگی مگر انگورہ سے آگے ہی خلیج سکاریہ پر ترکون نے اس زبردست حملہ کو روکدیا اور یونانیون کو کامل شکست کے بعد پسپا ہونا پڑا

مضمون ذیل مین اُسی معرکہ پر نظر ڈالی گئی ہے۔

عین اُس وقت (۱۹۱۸ء) جبکہ قسطنطنیہ کی دلکش رنگینیان اغیار داب شب کی دست و برد سے خاک وخون مین ملائی جا رہی تھین اور اُسکے دل آمیزہ [illegible] کی نورانیان اپنے وداعی لمحات حسرت وحرمان کے ساتھ گذار رہی تھین عشق [illegible] کی ایک جماعت تھی جسے ظلمت وضلالت کی بڑھتی ہوئی تاریکیون [illegible] تھا یہ وہ کسی ایسے مامن وملجا کی تلاش مین زمین کی تمام وسعتون پر نظر ڈال رہی تھی جو اُسے اپنے دامن مین چھپا لے مگر آہ کہ اُسے کوئی جائے پناہ نظر نہ آتی تھی قسطنطنیہ کے سامنے باسفورس کا زخار دریا اپنی پوری ہیبت وجلالت کے ساتھ خموش وساکت تھا [illegible] تیبان تیرہ دل غرق [illegible] ہو چکے ہین، مگر اُس نے بھی اس عشق دوست جماعت کو اپنے اندر چھپا لینے سے انکار کردیا تھا دانیال کی تمام کوہ مثال موجین اپنے پورے خروش وہیجان کے باوصف بھی سکون پذیر تھین اور انھون نے اس جماعت کے حفظ وبقا سے منھ پھیر لیا تھا جزیرہ نمائے "گیلی پولی" کی تمام سرسبز وشاداب وسعتین ان عشق بازون کو اپنے دامون وبطون دامن مین چھپا لینے سے انکار کرچکی تھین۔ مگر اے دریائے سکاریہ تو تھا اور صرف تو تھا کہ تو نے ان سوختہ سامانون کی جماعت کو اپنے شفقت اندوز دامن مین لے لینے کے لیے بےچینی سے دعوت دی، تو اپنی تمام وسعتون اور پہنائیون کے ساتھ اس جماعت کی امن وعافیت کی خطرناک ذمہ داری لینے پر تیار ہوگیا۔ تو نے اپنے تمام پرفضا کنارون کو اُسکے حفظ و امن کے لیے ایک عاشق

عاشق مثال آغوش کی طرح کشادہ کردیا۔ تیری تمام دلکش و دل پذیر شادابیون نے اپنی پوری بہار و دلکشی کے ساتھ اسے اپنی طرف بلا دادیا۔ اور تیری تمام نظر فریب وادیان اپنی پوری دل آویزیون کے ساتھ اُسے اپنے یہان پناہ کے لیے اک خموش اشارہ کررہی تھین۔ اور تیری ہلکی ہلکی موجون نے اپنی تمام اضطراب انگیز روانیون کے ساتھ اُسے اپنی طرف کھنچ آنے کا اذن دیا۔ پس عین اُسی حالت مین جبکہ ان درماندگان عشق و الفت کو مادر وطن بھی بکمال دردمندی اپنے جان پرور آغوش سے جُدا کر چکی تھی تو صرف تو تھا۔ کہ تو اُن کی اس خستگی اور آوارگی پر غمدیدہ نظر آیا۔ اور صرف تو تھا۔ کہ اُن کی اس تباہ کاری پر بکمال تحمل آنسو گرا رہا تھا۔ اور گو تو چپ تھا مگر تیری تمام طوفان خیزیان اور تیری تمام متلاطم موجین اُن کی اس درماندگی پر بیچین و مضطر تھین۔ تو اس انتشار و بے بسی پر غمناک تھا۔ ہان آمین یہ بھی یاد ہے کہ اُسوقت تیرے کوہ شکن سیلاب مین ایک حیرت فزا انجماد پیدا ہوگیا تھا۔ تیری دل نواز تین اپنی وادی کے ہرے بھرے کنارون سے اٹھکیلیان بھول گئی تھین۔ ہان ہمنے تیری اُن رنگا رنگ مچھلیون کی دلگدازیان بھی دیکھی تھین جو تیری صاف و شفاف سطح پر تڑپ تڑپ کر مزدارہ ہو رہی تھین

پس اے عزیز و محترم دریاے سکاریہ! جب یہ تشنہ کامان عشق و عاشقی کوہی یار کی عزیز ازجان زمین سے نکالے گئے تو اُنھون نے سمجھ لیا کہ اب ہماری حفاظت و سرپرستی کی تمام ذمہ داری تیری ہی الفت و محبت مین مضمر ہے۔ اور واقعی تو ہی تھا کہ اُن کو اپنی دلربا شادابیون مین خوش آمدید کہنے کو تیار ہوا۔ پس وہ بھی بکمال دردمندی تیری طرف بڑھے۔ اور تیرے آغوش الفت مین اُنھون نے ایک مقام پر پناہ لی۔ اور پھر بکمال الفت اس مقام کا نام "انگورہ" رکھا۔ پس جب عشاق کی یہ غم نصیب جماعت تیرے شفقت اندوز دامن مین پناہ گزین ہوئی تو تو نے اپنی تمام گلبار و گل ریز وادیان اس کے امن و عیش کے لیے وقف کردین۔ تو نے اپنے تمام شیرین چشمے ان شیرخوار بچون کے لیے کھول دیے جن کی دمساز و غمگسار مان بہنین اپنی عصمت و پاکدامنی کی حفاظت مین کام آچکی تھین۔ اور اس کمسنی کی حالت مین یہ محبت کرنیوالے اُنھین اپنے ہمراہ لے آئے تھے۔ اور تیری وادی کی گھنی جھاڑیون مین متعاقب دشمن کے خوف سے چھپا دیا تھا۔ ہان اس جماعت مین کچھ دماغ ایسے بھی تھے جو علم و حکمت کے ممتاز سرمایہ دار تھے۔ کچھ لوگ ایسے بھی تھے جو وطن کے دلکشا گلزارون کی سیر و تفریح مین اپنی تمام عمر گذار چکے تھے۔ کچھ ایسے ادیب و فلاسفر بھی تھے جنھین اپنے وطن مین دنیا جہان کا سکون و فراغ حاصل تھا۔ اور کچھ دماغ ایسے بھی تھے جو

عشق و عاشقی کے حیات افزا مشغلہ مین اپنی عمر کا تمام ہیجان طلب حصہ صرف کرکے اب ایک سکون بخش وقار آگین تصور کے لیے کسی نہ سکون گوشہ کی تلاش مین سرگردان تھے۔ مگر آہ۔ کہ کوے یار کی تمام ہماہمین اب اُن سے چھین لی گئی تھین۔ اور وہ سیکڑون میل کے پاپیادہ سفر سے اسدرجہ افسردہ ہوگئے تھے گویا اب وہ زندہ بھی نہ رہین گے۔ گرے۔

اے دریاے سکاریہ کی دلولہ انگیز شفقتو!

خداے اقدس و کبریا کے جلال و جمال کی قسم کر تونے اور صرف تونے اِن چاک گریبانون کی دلبستگی کے لیے اپنی بہار و دلکشی کا تمام کھار وقف کردیا اور آخر یہ لوگ تیرے فیض وکرم سے مستفید ہوکر پھر ایک مرتبہ تازہ دم ہوگئے۔ مگر اُف۔ کہ ابھی یہ جماعت تیرے سبزہ زارون سے کافی طور پر سیر بھی نہونے پائی تھی کہ تیون کی نظرین تیری ان دلفریبیون پر بھی پڑین اور اُنھون نے کمال دیدہ دلیری سے چاہا کہ تیری ان شادابیون کو بھی لوٹ لین۔ مگر تو سمجھ لے کہ رقیب تیری دلربا موجون کی طرف بڑھنا نہین چاہتا تھا وہ تیرے سرسبز و شاداب کہسارون کی رنگینیان لوٹنا نہین چاہتا تھا بلکہ وہ چاہتا تھا کہ ان دل ہلون کی اس ٹمٹماتی ہوئی شمع کو بھی گل کردے جو اُنھون نے عہد عاشقی کی یادگار کے طاق پر تیری پناہ لیکر انگورہ مین روشن کی تھی۔ وہ چاہتا تھا کہ عشق و الفت کی اُن نورانیون پر حملہ آور ہو جو سقوط قسطنطنیہ کے بعد بھی تیرے شام افروز افق پرخون شہیدان کی تمام رنگینیون کے ساتھ جھلملا رہی تھین۔ وہ تجھے پامال و عبور کرکے عشق بازون کی اُس جان بخش و جانفزا آرزو کو خاک مین ملانا چاہتا تھا جسکی حفاظت مین شہید کربلا نے اپنی معصوم جان یزید کے ناپاک ہاتھون کے سپرد کردی تھی وہ چاہتا تھا کہ خداے حسن و یکتائی کی اُن پرفسون رنگینیون کو انگورہ والون سے چھین لے جنکی حفاظت مین حجاز و بطحا کے ایک کمبل پوش عاشق نے بدر و حنین کی کرب انگیز مصیبتین برداشت کین وہ چاہتا تھا کہ تجھے عبور کرکے عشق و عاشقی کی اس نام لیوا جماعت کو برباد و بے ہم کردے جسکی عزت و عظمت کی قسم کھانے کے لیے آج بھی طور و فاران کی مقدس چوٹیان تیار ہین۔ وہ چاہتا تھا کہ انگورہ کے اُن سبز و نیلگون گنبدون کو زمین دوز کردے جنپر صبح درخشان کی ہلکی ہلکی نورانیون مین عشق و الفت کی وجد آفرین یاد تازہ کی جاتی تھی پس عین اسوقت (اگست ۱۹۲۰ء) جبکہ یہ تیرہ باطن رقیب ان ناپاک و ناکارہ ارادون کے ساتھ (پانچ لاکھ کی تعداد مین) تیری طرف بڑھا تو ہمنے دیکھا کہ تیری پُرکیف روانیون مین ایک دفعۃً آثار سکون پیدا ہوگیا ہمنے دیکھا کہ تیری

متلاطم شورخون کی ہر لہر کے منہ سے کف جاری تھے۔ گویا وہ غصے سے آپے مین نہ تھین ہم نے دیکھا کہ تیری غضبناک امواج امنڈ امنڈ کر کناروں سے ٹکرا رہی تھین۔ گویا تو چاہتا تھا کہ اپنے چڑھتے ہوئے رقیب کا سر اپنے کوہ مثال کناروں سے ٹکرا کر پاش پاش کر دے۔ ہم نے دیکھا کہ تیرے زعفران زار مرغزاروں مین ایک خشم آگین تمکنت پیدا ہو گئی تھی اور اسکے جھومنے والے درخت خموش ساکت تھے گویا تو بحال دردمندی سوچ رہا تھا کہ کس طرح مین اپنے ان ہرے بھرے درختوں کی مدد سے اس تیرہ دل رقیب کو برباد و برہم کر دون۔ ہمنے دیکھا کہ تیری گلبار و گل ریز وادیوں مین چہکنے والے پرند خموش و ساکت تھے۔ گویا تو سوچ رہا تھا کہ کس طرح مین اپنے ان طائران نغمہ سنج کی مدد سے اس کو تباہ و برہم کر دون۔ ہم نے دیکھا کہ تجھے آس پاس سے گھیرے ہوئے پہاڑوں کی فلک پیما چوٹیاں تیری طرف جھک پڑی تھین۔ گویا تیرا خیال تھا کہ مین اپنے فلک نما پہاڑوں کے ذریعہ رقیب کی اس جماعت کو پیس کر سرمہ کر دون جو تیرے حسن و جمال کی دل آویز وادیوں پر حملہ آور ہو رہا تھا۔ مگر افسوس کہ اے دریاے سکاریہ! تو نے ایک مرتبہ انگورہ کے ان میدانوں پر بھی نظر ڈالی جہان تیری مست چتون کی ایک ہی جھلک پر مٹ جانے کے لیے سیکڑون سرباز و سرمست سروں سے کفن باندھے پرے جمائے کھڑے تھے۔ اور اُف کہ تیری یہ دلدوز نگاہ سب سے پہلے اُس عشق و دست فدائی پر پڑی۔ جو عاشقوں کی تمام صفوں سے آگے کھڑا ہوا۔ تیرے ایک ہی اشارہ کا منتظر تھا۔ لوگ کہتے ہین کہ تیرے عالم افروز حسن و جمال پر اس شوق سے مر مٹنے والے کا نام مصطفے کمال تھا۔ پس وہ پشت سمند رہوار پر تڑپ گیا اور تیری اس تاب شکن نگاہ کو وہ بہت جلد تاڑ گیا گویا تو نے اپنی پوری محبت بھری نگاہ سے ان تشنہ کامان آرزو کو اشارہ کیا تھا کہ بڑھو اور میرا جوبن لوٹنے والے رقیب کو میرے سرسبز و شاداب کناروں کے اُس پار ہی ڈھیر کر دو۔ پس۔

دریاے سکاریہ کی دل پذیر روانیو!

تمھاری پُرکیف اداؤن کی قسم کہ اس اشارہ کے پاتے ہی تجھ پر مر مٹنے والا مصطفے کمال بڑھا۔ اور اس طرح بڑھا کہ اسکے پیچھے سیکڑون عشاق و سر بازی تھے۔ جنگ دونوں مین تیری جان پرور ... لاکھوں بیچینیاں تڑپ رہی تھین۔ ہان یہ وہ سرشار اور سرمست تھے۔ جو تیری زلف پر پیچ کی دل آویز اداؤن پر مر مٹنے کی قسم کھا چکے تھے۔ یہ وہ عشاق و شیدائی تھے جو تیرے تبسم کی ہلاکت فریب ادون پر فدا ہوتے

ہونے کا آخری تہیہ کر چکے تھے۔ آخر کار عشق و عاشقی کے سرمست مصطفٰے کمال نے حکم دیا کہ بڑھو اور پیاری "سکاریہ" کے حسن و جمال لوٹنے والے رقیب کو پامال کر دو۔ پس تیرے چاہنے والوں کا یہ لشکر (۲۴ ستمبر ۱۹۲۱ء کو) بڑھا۔ کہتے ہیں کہ تیرے ان عاشقوں پر غلمان و ملائک اپنے سبز و سنہرے پروں کا سایہ کیے ہوئے تھے۔ پس تو نے دیکھ لیا کہ یہ لشکر بہت جلد دشمنوں سے گتھ گیا۔ اور تو جانتا ہو کہ کس طرح تیری محبت کے متوالے تیری دلربا موجوں سے بھی آگے اپنے سر تیرے قدموں پر نثار کر رہے تھے۔ اور گو ان کے پاس کامل دس دن تک لڑنے سے سامان قتل و قتال بھی ختم ہو گیا تھا۔ اور قریب تھا کہ جنگ و آویزش کی اس مہلک شدت سے تیرے ان سربازوں کے کلیجے منھ کو آ جائیں کہ عین اسی وقت میں تیری الفت انگیز نگاہوں کا ایک اور سرمست میدان قتال میں داخل ہوا اور اس نے بکمال جرات ان فدا کاران ملت کو مخاطب کر کے کہا کہ اگر تم ایسے ہی خستہ اور درماندہ ہو گئے ہو تو تم پیاری "سکاریہ" کیطرف پلٹ کر دیکھ لو۔ کہ وہ کس شوق و اضطراب سے تم کو دیکھ رہی ہے اور اپنی تمام دلپسند رنگینیوں کے ساتھ تمھیں اپنے آغوش محبت میں لے لینے کے لیے تیار ہے۔ مگر شرط یہ ہے کہ تم پہلے اپنی گرانبہا جانیں اسکے قدموں پر نثار کر دو۔ سنا ہے کہ اس مخاطب کرنے والے سرمست کا نام عصمت پاشا تھا۔ جو مصطفٰے کمال کے بازوئے بازو بلاکے تیرے فدا کاروں کے حوصلے بڑھا رہا تھا۔ پس اس کے اس وجد آفرین بڑھاوے سے ان سربازوں کی آنکھوں میں تیری تمام و کمال محبت کا نقشہ آ گیا اور پھر وہ اس درماندگی کے عالم میں کامل بیس دن تک داد وفا دیتے رہے۔ اور آخر میں انھوں نے وہ جان توڑ کوشش کی (۲۴ سے ۸ ستمبر ۱۹۲۱ء تک دست بدست تلواروں سے لڑائی جاری رہی) کہ رقیب کے بھی حواس باختہ ہو گئے۔ آخر کار اکیسویں دن (۱۴ ستمبر ۱۹۲۱ء) کی صبح کو جبکہ ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا اڑ رہی تھی مصطفٰے کمال نے تیرے نام کا سبز جھنڈا بلند کر دیا اور اس طرح داد وفا دیکر تیرے اس رقیب کو خاک و خون میں ملا دیا جو تیرے جمال و رعنائی پر حملہ آور ہوا تھا یعنی تجھ پر فدا ہونے والے اس طرح حق الفت ادا کر چکے۔ پس اے عزیز و محبوب دریاے سکاریہ! اب تو ان جان بازوں کے مقدس خون کو قبول کر لے۔ اور اسے اپنی روح پرور روانیوں میں ملجانے کی اجازت دے کہ یہی وصال ہے ان سرفروشوں کا۔ مگر

اے مقدس و محترم دریاے سکاریہ۔

تیری محبت کا جوش عشاقِ عالم پر فرداً فرداً عائد ہوتا ہے اُس کے اثر سے میرا عشق سرشت وجود بھی زیر بار ہے۔ مگر مین بکمال دردمندی تجھے یقین دلاتا ہون کہ مین تجھ سے ہزارہا میل دور ہون۔ اور ہندوستان کے ایک غم بتکدہ مین پڑا ہون۔ لیکن پھر بھی تجھ پر فدا کر دینے کو میرے پاس مال و دولت بھی ہے میرے عزیز و اقارب بھی ہین میری قوم اور افرادِ قوم بھی ہین۔ اور میرے وطن کی تمام وسعتین ہین اور مختصر یہ کہ میری گرامی قدر جان بھی ہے۔ جسے تجھ پر اور تیری سیاہ زلفون کی دلکشی پر فدا کر سکتا ہون۔ مگر مین چاہتا ہون اور بکمال منت چاہتا ہون کہ تو میرے حقیقی ذوقیات کی اُس نہایت ہی نازک سی تڑپ کو قبول کر لے جسکا نام "محبت" ہے اور بس۔

تیرا نام لیوا! **توحیدی** (فاضل الٰہیات)

افادات شاد

اداؤن مین کرامت نازمین اعجاز ساقی کا
نہ بھولیگا ہمین اے میکشو انداز ساقی کا

تھکے وہ لب مست جس سے نکلے ساغر کی
خدا رسوا کرے اُسکو جو ہو غماز ساقی کا

کسی دن میکشون کا مسندِ عز و شرف ہوگا
یہی عرش معظم فرش پا انداز ساقی کا

بجز پیرِ مغان کے کس نے کی توقیر ساقی کی
وہی کچھ جانتا تھا میکشو اعزاز ساقی کا

سبو و ساغر و مینا دختر تاک کو خدا کہتا
نفیری کی طرح ہوتا جو مین ہمراز ساقی کا

سبو ہو جام ہو مینا ہو سب منہ تکنے والے ہین
بھری محفل مین آخر کون ہے جانباز ساقی کا

خمون پر خم لنڈھانے کی اجازت کسنے دی آخر
بجا پیرِ مغان کی ذات پر ہے ناز ساقی کا

ملائک سے بھی اُس کی منزلت اے شاد برتر ہے
خوشا وہ مست جو دل سے رہا ہمساز ساقی کا

انگریزی ڈرامہ

کسی قوم کا لٹریچر اُسکی ترقی۔ اُسکی تہذیب۔ اُسکے اخلاق و آداب کا بہترین معیار ہے۔ جوں جوں کوئی قوم ترقی کرتی ہے ویسے ہی رفتہ رفتہ ترقی یافتہ خیالات و جذبات اُس قوم کے لٹریچر مین مخلوط ہوتے جاتے ہین۔ اور اسی طرح انحطاط اور تنزل کے ساتھ مخرب اخلاق خیالات لٹریچر مین رونما ہوتے ہین۔ عرب کا لٹریچر خود ایک سبق آموز نمونہ ہے۔ اسلام کے قبل اور ظہور اسلام کے بعد کا عربی لٹریچر اگر ہم بنظر غائر دیکھین اور ایک دوسرے کا مقابلہ کرین تو ایک نمایان فرق نظر آئے گا۔ اسلام سے پہلے عرب انتہائی "وحشیانہ حالت" مین تھے اور اُسوقت کا علم ادب اُن خیالات کا خزینہ تھا جن کا تذکرہ بھی ہمارے تہذیب یافتہ ضمیر کے لیے تکلیف دہ ہے۔ لیکن ظہور اسلام کے ساتھ ہی جون جون تہذیب کی روشنی پھیلتی گئی عرب ایک معجزنما طریقہ سے مہذب ہوتے گئے اور پھر عربی علم ادب ترقی کے اُن مدارج پر پہنچ گیا جسکی مثال کسی دوسری قوم مین ملنا مشکل ہے۔ عرب کا لٹریچر گویا دمخالف کے تند جھونکون سے شکار ہوگیا لیکن یورپ آجتک قرطبہ۔ غرناطہ۔ اور بغداد کے دارالعلوم کا رہین منت ہے اور در اصل یورپ کو مہذب بنانے والے عرب ہی تھے،

انگریزی علم ادب بھی انھی قوانین فطرت کا تابع ہے۔ جسوقت رومی فوجین انگلستان کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک پھیلی تھین۔ وہان کے لٹریچر مین مفتوحانہ خیالات کی جھلک نظر آتی ہے۔ قاعدہ ہے کہ جب کوئی قوم قعر ذلت مین گرتی ہے اور اُس کو اپنی حالت کا احساس ہوتا ہے تو پرانے خیالات کی تجدید کے لیے اسلاف کے کارنامے بیان کیے جاتے ہین۔ اِن کارنامون کا بیان آئندہ ترقی کے لیے مہیج کا کام دیتا ہے۔ اُس زمانہ کا انگریزی علم ادب انھی کارنامون کے بیان اور رومیون کے خلاف اظہار نفرت و حقارت سے معمور ہے۔

رومیون کی حکومت ختم ہوتے ہی یہ رنگ جاتا رہا۔ جو قوم اب تک غلامی کا رونا رو رہی تھی وہ اب آزادی کے راگ الاپ رہی ہے۔ جس قوم نے غربت اور عسرت مین صدیون تکالیف جھیلی تھین وہ اب امارت اور آزادی مین خوش ہو رہی ہے۔ جو قوم رومیون مین جذب ہو چلی تھی جسکی قومیت کا امتیازی

ستان مٹ چکا تھا جسکی تجارت تباہ ہو چکی تھی وہ آج آزاد ہو، اور آزادی کے ساتھ خودداری
کے جذبات پیدا ہو چلے ہیں۔ پرانا مفتوحانہ رنگ انگریزی علم ادب سے مٹ چکا ہو۔ اور رچاوٹ
ہاتھوں پرانے طرز تحریر کا آخری مرثیہ لکھا جا چکا ہو۔

ملکہ الزبتھ کا زمانۂ حکومت شروع ہوتے ہی انگریز ایک گوشہ سے دوسرے گوشہ تک دُنیا
میں پھیل گئے۔ اور جہان گئے کامیابی کا سہرا اُن کے سر رہا۔ اس وقت کے لٹریچر میں نئے خیالات نئے
جذبات۔ نئے طرز تحریر کا آغاز ہوتا ہو۔ اُس کو علمی جوش یا موافقت زمانہ کا نتیجہ کہیے یا اور اسباب سے
منسوب کیجیے۔ لیکن یہ مسلمہ ہو کہ اس دور حکومت میں انگریزی علم ادب معراج کمال کو پہنچ گیا۔

... ہ کمال زوال کے ماتحت پھر انحطاط کا زمانہ شروع ہوا۔ جیمس کے تحت حکومت پر ... ہی وہ علمی مشاغل مفقود ہو چلے۔ ملٹن نے کچھ سنبھالنے کی کوشش کی لیکن کہاں تک۔ بادشاہ کی
لاپروائی اور سیاسی اختلافات کی وجہ سے نہ سنبھلنا تھا نہ سنبھلا۔ ڈرائڈن اور پوپ نے پرانے رنگ کو مٹا دیا
جس طرز تحریر کی داغ بیل ڈالی اُس کا لازمی اور یقینی نتیجہ یہ ہوا کہ انگریزی علم ادب میں ہذیان گوئی
اور بیہودہ گفتاری کے سوا اور کچھ باقی نہ رہا۔ لٹریچر کی ترقی و تنزل کے مد نظر یہ زمانہ اخلاقی تنزل کے
لیے خاص طور سے ممتاز ہے!

ارتقاء ڈرامہ کے اچھی طرح سمجھنے کے لیے اس مختصر دیباچہ کی ضرورت تھی اب ہم اصل مضمون کی طرف
رجوع کرتے ہیں۔

ڈرامہ پر سب سے پہلے مذہبی رنگ چڑھا۔ کیوں؟ اس لیے کہ ڈرامہ کی پیدائش ہی اُس زمانہ
میں ہوئی جب کہ تمام یورپ مسلمانوں سے مقدس مقامات خالی کرانے کے لیے دست بگریبان تھا۔
اُس وقت گو یورپ کو فتح حاصل نہیں ہوئی اور سلطان صلاح الدین کی تلوار نے عیسائیوں کی امیدیں
یکقلم منقطع کر دیا لیکن اس کا کم سے کم یہ نتیجہ ضرور ہوا کہ تمام یورپ میں مذہبی جوش پھیل گیا۔ اسلامی جوش
عیسائیوں کے لیے ایک نمونہ تھا۔ "زمانہ جہاد" میں عیسائیوں پر یہ واضح ہو گیا تھا کہ مسلمانوں کے نزدیک
مذہب سے بڑھ کر کوئی چیز نہیں۔ مذہب کے لیے وہ بڑی سی بڑی قربانی کرنے کو تیار تھے۔ اسلام کے لیے
جان و مال کسی چیز کی پروا نہیں کرتے تھے۔ جہاں مسلمانوں میں اسقدر جوش تھا۔ بچہ بچہ مذہبی جوش سے

جو رنظر آتا تھا۔ وہان عیسائیون مین یہ جوش مفقود تھا فرانس اور اٹلی جو عیسائیون کی رہنمائی کرتے تھے اُن کی جان توڑ کوشش یہ تھی کہ مسلمانون کا سا جوش اُن کی قوم مین بھی پیدا ہو جائے۔ یہ کوشش کہانتک کامیاب ہوئی اسکی تاریخ شاہد ہی۔ جو ذرایع اس جوش کے پھیلانے کے لیے تجویز کیے گئے تھے انمین ایک ذریعہ ڈرامہ بھی تھا۔ انجیل کے واقعات اور نبیون کے معجزات ڈرامہ کی شکل مین پیش کیے جاتے تھے۔ گرجے اور دیگر مقدس مقامات تھیٹر گھر اور ڈرامہ کو دیکھنے والے صرف "مقدس لوگ" ہوتے تھے۔

لڑائی ختم ہو گئی۔ مسلمانون کو فتح ہوئی۔ عیسائیون کی امیدون پر پانی پھر گیا۔ لیکن علم ادب مین ڈرامہ کا جو اضافہ ہوا تھا وہ ویسا ہی قائم رہا۔ بارھوین صدی عیسوی مین فرانسیسی علم و ادب جون جون انگلستان مین اپنا اثر قائم کرتا گیا۔ وہان فرانسیسی تشبیہ استعارات کے ساتھ ساتھ مذہبی ڈرامہ بھی رائج ہو گیا۔ انگلستان کے گرجون مین "مذہبی ڈرامے" مسلسل پیش ہونے لگے۔ اور جہان فرانس مین صرف "مقدس لوگون" کو دیکھنے کی اجازت تھی وہان انگلستان مین اب عام اجازت ہو گئی۔ یہ ڈرامے اسقدر مقبول عام تھے کہ لوگون کو گرجون مین جگہ نہین ملتی تھی۔ اول تو گرجون مین وسعت کی کمی دوسرے بعض مقدس لوگون کا خیال تھا کہ پاک مقام کو لامذہب لوگون کے وجود سے ناپاک کرنا چاہیے چنانچہ یہ "مذہبی ڈرامے" اب گرجون سے باہر بھی شروع ہو گئے۔

گرجون سے آزاد ہو کر "مذہبی ڈرامے" نے بھی نیا رنگ اختیار کیا باہر کی تازی آب و ہوا مین اگر ڈرامے مین نئی شاخین نکلین تو کیا تعجب تھا۔ نیا مقام نیا ماحول نئے لوگ اور پھر انگلستان کی قوت۔ غرض فرانسیسی "مذہبی ڈرامہ" تھوڑے سے عرصہ کے بعد اخلاقی ڈرامہ مین تبدیل ہو گیا۔ اس ڈرامہ کا مقصد مذہبی حکایات کے پیرایہ مین لوگون کو تعلیم دینا تھا۔ استقلال۔ بیداری۔ ایمانداری اور سچائی کے مقابلہ مین بے ایمانی۔ ظلم شقاوت۔ بے دردی اور جھوٹ کی شکست کے نظارے پیش ہوتے تھے۔

چودھوین صدی کے آخر تک ڈرامہ کا اصل مقصد لوگون مین مذہبی جوش پیدا کرنا اور اُن کے اخلاق کو درست کرنا تھا۔ لیکن در اصل ڈرامہ کا یہ مقصد نہین ہی۔ ڈرامہ بھی ناول کی ایک دوسری شکل ہی جسطرح ناول مین زندگی کے واقعات واضح اور بیّن طور سے بیان کیے جاتے ہین۔ لوگون کی کمزوری اُن کے گناہ اُن کی خودداری اُن کی بہادری کے واقعات پیش کیے جاتے ہین اور سبق کا اخذ کرنا ناظر کی ذاتی قابلیت

ذہانت اور لیاقت پر چھوڑ دیا جاتا ہے۔ اسی طرح ڈرامہ کا مقصد واقعات زندگی کو پیش کرنا ہے نہ کہ مذہبی اور اخلاقی سبق دینا۔ جب تک ناول مذہبی لباس مین ملبوس رہا اصل واقعات نہ پیش کر سکا۔ اصل واقعات زندگی مذہبی پردہ میں روپوش ہو جاتے تھے ان جسوقت یہ پردہ علٰحدہ ہو گیا اُسی وقت سے ناول کی ترقی شروع ہوئی اور ہم زندگی کے پیچ در پیچ واقعات پر نظر غائر ڈالنے کے عادی ہو گئے۔ ڈرامہ بھی مذہبی حیثیت مین کوئی دلچسپی نہ پیدا کر سکا مذہبی لباس ہر جسم پر موزون نہیں ہوتا۔ ڈرامہ مین اگر دیرینہ واقعات بیان کیے جائین تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ بہت فاصلہ پر ایک واقعہ ہو رہا ہے۔ اور بغیر کسی خاص دلچسپی کے ہم اوسے دیکھ رہے ہین۔ برعکس اس کے اگر واقعات زندگی بیان کیے جائین تو ہم کو اُس مین ذاتی دلچسپی پیدا ہوتی ہے زندگی خود پیچیدہ واقعات کا محور ہے اور اسمین رہبر کی ضرورت پڑتی ہے۔ ڈرامہ کا ایک مقصد یہ بھی ہے کہ وہ ہماری رہنمائی کرے۔ رہنمائی سے یہ مراد نہین ہے کہ ہم کو احکام ،، دیے جائین بلکہ مختلف لوگون کا مختلف اوقات و مختلف احوال مین ایک خاص طریقے سے عمل پیرا ہونا۔ اُن کے عمل کے نتائج ہماری رہبری کا کام انجام دیتے ہین۔

جسوقت تک انگلستان مین مذہبی ڈرامہ کی ضرورت تھی۔ جب تک یہ ڈرامہ بعض مقاصد کے حصول کا ذریعہ بنا رہا۔ لوگ اسمین دلچسپی لیتے رہے۔ لیکن جب پیچیدگی معاملات نئے رہبر کی متقاضی ہوئی۔ ڈرامہ مین وہ پُرانی دلچسپی مفقود ہو گئی۔ پندرھوین صدی کے اوائل مین ترکون کی بڑھتی ہوئی فوجین قسطنطنیہ پر قابض ہو گئین۔ یونانی اور رومی مہاجرین کے سیلاب سے تمام یورپ بھر گیا۔ مذہبی پیچیدگیون کے علاوہ سیاسی۔ تمدنی اور معاشرتی پیچیدگیون کا زمانہ شروع ہو گیا۔ زمانہ کا اقتضا یہ تھا کہ نئے ڈرامہ کی ابتدا ہو۔ اُسکے لیے اسباب مہیا تھے یونانی علوم جو اسوقت تک راز سربستہ تھے ترکی فتوحات کے ساتھ یورپ مین شایع ہونے شروع ہو گئے۔ یونانیون کی تتبع کر کے ایک نئے ڈرامہ کی ابتدا ہوئی جو انٹرلوڈس Interludes کے نام سے مشہور ہے۔ اس کا پہلا مقصد یہ تھا کہ واقعات زندگی بیان کیے جائین اور انسان کے حسن و قبح پر تنقیدی نظر ڈالی جائے۔

انٹرلوڈس کے بعد ہی ٹریجڈی (Tragedy اور کیڈی (Comedy) کا زمانہ شروع ہو گیا اور اسمین بھی یونانیون کی اتباع کی گئی۔

انگریزی ڈرامہ نویس جنھون نے یونانیون کی اتباع کر کے ٹریجڈی اور کیڈی کی بنا ڈالی۔ ان مین

کڈ اور مارلو کے نام خاص طور سے ممتاز ہین۔ مارلو نے اپنی علمی قابلیت اور زور قلم سے اس ڈرامہ کی ابتدا کی جو آگے چلکر شیکسپیر کے لیے شمع ہدایت بنا۔ مارلو کے ڈرامہ ایڈورڈ سیکنڈ (Edward II) مین ہم حسن و عشق۔ درد فراق۔ لذت وصل۔ خودداری۔ حب الوطنی۔ بیرحمی۔ بیوفائی کے کرشمون کا مطالعہ کرتے ہین۔ بادشاہ جو چند ہی دن قبل سنجیدگی اور متانت کا مجسمہ تھا گیوسٹن کی محبت سے سرشار ہوتا ہی اور اپنے جذبات مین اپنی سلطنت تک کی پرواہ نہین کرتا۔ بیوفا بیوی ایک نمکحرام لارڈ سے عہد موافقت کرکے سلطنت کو تباہ کرتی ہی۔ بادشاہ قید ہوکر بیوی کی بیدردانہ چالون کا شکار رہتا ہی۔ بادشاہ کا نوعمر بچہ اپنی جرات اور بہادری سے باغی لارڈ کی سعیت کا خاتمہ کرتا ہی۔ مارلو کا یہ ڈراما کشمکش جذبات کا مرقع ہی۔

مارلو کے بعد شیکسپیر کا زمانہ شروع ہوتا ہی۔ یہ وہ زمانہ ہی جبکہ ملکہ الیزبتھ کے ہاتھ مین عنان حکومت ہی۔ انگریزی فتوحات کا سلسلہ شروع ہوچکا ہی۔ صنعت وحرفت مین انگریزی قوم نے کافی ترقی حاصل کرلی ہی۔ دنیا کے عجائبات کے انکشافات کا سودا دماغون مین سما چکا ہی۔ مصنفین بادشاہ کی فیاضی سے مستفید ہورہے ہین۔ ترقی کے آثار ہر طرف نمایان ہین۔ ڈرامہ نے بھی اس دور ترقی مین شیکسپیر کے ہاتھون عجیب عروج حاصل کیا۔ بلکہ کہنا چاہیے کہ معراج کمال کو پہنچ گیا۔ انگلستان کے ایک مشہور مصنف نے شیکسپیر کی بابت لکھا ہی کہ "دنیا اُسکے ہاتھون مین بطور کھلونے کے تھی اور وہ اُسے جسطرح چاہتا تھا گھما کر انسانی جذبات کا مطالعہ کیا کرتا تھا"۔ شیکسپیر نے جو کچھ لکھا ہی اسطرح لکھا ہی کہ معلوم ہوتا ہی کہ وہ خود ان جذبات کا محور تھا انسانی خیالات۔ جذبات۔ حرکات تخیلات کو اسطرح بیان کیا ہی کہ آنکھون کے سامنے اُن کا نقشہ کھنچ جاتا ہی۔ شیکسپیر نے ڈرامہ کے اصلی ضروریات کو بوجہ احسن پورا کیا۔ غم، مسرت، خوف، غضب، رحم، شقاوت، یاس وامید شرم وحیا کی کہانی ہم کو شیکسپیر کے مختلف ڈرامون مین ملتی ہی۔ حسن کی فتنہ خیزیا، عشق کی کرشمہ سازی، خودغرضی کی کمینگی، کی داستان کا ہم مطالعہ کرتے ہین۔ رومیو پر جولیٹ کے حسن کا جادو چلتا ہی۔ رومیو عشق کی بدولت حسرت ویاس وناامیدی کا شکار ہوکر طعمۂ اجل بنجاتا ہی۔ جولیٹ کس جوش مسرت مین رومیو کے پاس آتی ہی لیکن اُسے مردہ دیکھ کر کس دردناک طریقہ سے اپنا کام تمام کرتی ہی!

ارسطاطالیس نے لکھا ہی کہ ٹریجڈی کا اصل مقصد یہ ہی کہ خوف وہراس، ناامیدی وناکامی کے مناظر پیش کرکے انسان کے جذبات کو پاک کرے۔ شیکسپیر نے اس مقصد کو کہانتک پورا کیا اسکا جواب اس کی مشہور ٹریجڈی (Tragedy) آتھیلو (Othello) ہی۔ ڈسڈیمونہ (Desdemona) ایک مشہور معزز

رکن سلطنت کی لڑکی آتھیلو کے دام محبت مین گرفتار ہوکر اسکے ساتھ چلی جاتی ہو۔ آیاگو بہیمیت سبعیت اور شیطنت کا مجسمہ رشک وحسد مین آتھیلو کی تباہی وبربادی کے تدابیر پر غور کرکے ڈسڈیمونہ کو ایک دوسری رکن سلطنت کے ساتھ متہم کرتا ہو۔ آتھیلو جو محبت وعشق کی فتنہ خیزی سے ناواقف تھا عفت وپاکدامنی کی دیوی ڈسڈیمونہ کو قتل کرتا ہو۔ ڈسڈیمونہ کے آخری الفاظ سخت سے سخت دل کو پگھلانے کے لیے کافی ہین۔ لیکن شقی القلب آیاگو رحم وہمدردی کے اثرات سے موثر نہین ہوسکتا۔ آیاگو کے ان شیطانی حرکات پر ہمارے غم وغصہ کی کوئی انتہا نہین رہتی۔ اور جسوقت ڈسڈیمونہ کی بیگناہی ثابت ہوجاتی ہو۔ اور آتھیلو کثرت افسوس وپشیمانی سے مجبور ہوکر خودکشی کرتا ہو ہمارا دل خود بخود آیاگو پر کسی آفت سماوی کے نزول کا خواہشمند ہوتا ہو۔ اور ہمکو اُسی وقت تسکین ہوئی جب آیاگو قتل ہوتا ہو۔

شیکسپیر کی کمیڈی شوخی، رنگینی، مزاح وظرافت کا مخزن ہو۔ کمیڈی کا مقصد ہنسانا نہین بلکہ خوش کرنا ہو مسرت۔ اور خوشی، ہنسی سے ایک جُدا چیز ہو۔ یہ کوئی ضروری نہین ہو کہ جسوقت ہم خوش ہون ہمارے لب بھی تبسم آشنا ہون شیکسپیر کو اسمین کہانتک کامیابی حاصل ہوئی۔ خود اُسکے ڈرامے اسکے شاہد ہین۔

شیکسپیر کے بعد تنزل کا زمانہ شروع ہوتا ہو۔ الزبتھ کے عہد حکومت کے بعد وہ پرانے فاتحانہ جذبات انگریزون کے دل ودماغ سے مٹ چکے تھے۔ اور شاہ جیمس کے دور حکومت مین تو شاہی دربار تعیش کا نمونہ تھا۔ ڈرامہ پر زمانہ کے مذاق کا بیحد اثر پڑتا ہو جسوقت۔ لوگ مذہب کے دلدادہ تھے اُسوقت مذہبی ڈرامہ عام پسند تھا۔ جب فاتحانہ جذبات موجزن تھے تو الزبتھ کے زمانہ کے ڈرامہ کو لوگ پسند کرتے تھے۔ جب زمانہ کا مذاق بدلا اور بیہودہ گفتاری کا مخزن بن گیا تو جن لوگون نے ڈرائڈن (Dryden) کی تصانیف پڑھی ہین خوب واقف ہین کہ اُس وقت کا مذاق کیا تھا۔

شیکسپیر کے بعد بعض مصنفین نے پُرانے مذاق کو قائم رکھنے کی کوشش کی لیکن زمانہ نے موافقت نہ کی۔ اور بالآخر فورڈ اور شرلی کے ہاتھون یہ جھلملاتی ہوئی شمع گل ہوگئی اور جس ڈرامے کو مارلو (Marlowe) نے قائم کیا تھا وہ ہمیشہ کے لیے ختم ہوگیا۔

سید محمد حسین ترگانوی۔ بی اے علیگ

کیا یاد آیا؟

بیٹھے بیٹھے ہمیں کیا جانیے کیا یاد آیا　　دل میں اک درد اٹھا آنکھوں میں آنسو بھر آئے

بیٹھے بیٹھے یہ دردِ دل کیوں اٹھا - اب تک خود درد کو بھی یہ معلوم نہیں کہ کیوں مشتعل ہو رہا ہے جیسے بعض وقت بغیر کسی وجہ کے طبیعت اداس ہو جاتی ہے اور دل اکتاتا ہے۔ ویسے ہی آج درد بھی اٹھ رہا ہے - اس درد سے اگر ایک طرف آنکھوں میں آنسو بھر آتے ہیں تو دوسری طرف آہ آتشیں قعر قلب سے اٹھتی اور روح درواں پر ایک بال لاتی ہے - گویا ایک طرف سیل اشک ہے اور دوسری طرف شعلۂ آہ - سیل اشک سے نکلتا ہوں تو شعلۂ آہ سدِ راہ ہو رہا ہے اور اگر شعلہ سے بچتا ہوں تو سیل اشک میں گرتا ہوں -

این قطرۂ دریا چہ خروش است　　از اشک مپرسید کہ در دل چہ خبر داشتہ باشد

نہ آنسو بند ہوتے ہیں اور نہ آہ ہی رکتی ہے - گو دونوں متضاد کیفیات رکھتے ہیں مگر سلسلہ بند نہیں ہوتا لوگ کہا کرتے ہیں کہ حافظہ کی کمی اور فراموشی کا دور زندگی کے واسطے ایک عیب یا نقص ہے - بات تو درست ہے لیکن جب حافظہ کبھی کبھی بعض باتیں ایسی یاد کرا دیتا ہے جنکی یاد دل و دماغ کے واسطے ایک صدمہ اور ایک تکلیف ہے، تو اسوقت کہنا پڑتا ہے کہ اس حافظہ سے تو فراموشی ہی اچھی بیداری سے نیند ہی بہتر - مے فراموشی پینے سے وہ باتیں اور وہ واقعات تو یاد نہیں کرتے جو رہ رہ کر دل و دماغ کے واسطے ایک تکلیف اور صدمہ ہیں - بعض وقت اس قسم کی باتیں یاد یاد آجاتی ہیں کہ زندگی وبال ہو جاتی ہے - کچھ اسوجہ سے کہ اب کیا کریں اور کچھ اسوجہ سے کہ بعض باتیں اور بعض کرتوتیں شرم دلاتی اور قعر ذلت میں دھکیلتی ہیں - دل پر صدمہ ہی نہیں ہوتا بلکہ دل یہ بھی سوچتا ہے کہ جب یہ کرتوتیں سرزد ہوئیں اسوقت عقل کہاں تھی اور تجربہ کس خواب میں تھا ایسی آندھی آئی تھی جس میں کچھ بھی نہ دیکھ سکے - آنکھوں اور کانوں پر کیسا پردہ پڑ گیا تھا - فرشتۂ عزم کس خوابِ خرگوش میں تھا ایک طرف آنکھوں سے آنسو جاری ہیں اور دوسری جانب وہ آتشیں جلا کر خاکِ سیاہ کئے دیتی ہے اور اندرونہ میں سے ادھر یہ آواز آرہی ہے۔ -

ما خود نداده ایم دل اے پند گو خموش   چشمش بزورِ تیغ دل از ما گرفتہ است

آخر کہو تو سہی بیٹھے بیٹھے کیا یاد آگیا۔ سینہ پر ہاتھ رکھکر تو دیکھو دل کیا کہتا ہے۔ آنکھوں میں آنسو ہی نہیں آرہے ہیں ایک قسم کی غنودگی سی بھی ہے۔ چہرہ زرد ہی نہیں پڑا کچھ سیاہی مائل بھی ہے۔ مردمک چشم کہہ رہی ہے کہ جو واقعہ یاد آیا ہے، اسکی تصویر آنکھوں میں بھی کھنچ چکی ہے۔ تماشہ یہ ہے کہ یہ تصویر سیل اشک میں بھی محو نہیں ہوتی۔ جس طرح حسین کو دیکھکر یادِ حُسن دل سے اُترتی نہیں نگاہِ ناز کام کر جاتی ہے۔ اسی طرح تصویر یار آب اشک یا سیل اشک میں بھی اپنی ہستی نہیں چھوڑتی۔ آنکھوں میں جو آنسو آتے ہیں اُن میں یہ تصویر ایسے ہی دکھائی دیتی ہے جیسے موتی میں کوئی تصویر ہو۔

جو واقعات گزر چکے گزشتہ را صلوٰۃ گو۔ مشکل تو یہ ہے کہ جو تمنائیں پوری نہیں ہوتیں وہ یاد آآکر زور شن تکلیف کا موجب ہوتی ہیں۔ خونِ تمنا کے داغ اب تک دامنِ حافظہ یا دامنِ یاد سے نہیں چھوٹے۔

دل کو مسل مسل کے ذرا ہاتھ سونگھیے   ممکن نہیں کہ خونِ تمنا کی بُو نہ ہو

اس پر طرہ یہ کہ انھیں تمناؤں کے سایہ میں اور تمنائیں بھی نشو و نما پاتی جاتی ہیں۔ باوجود خونِ تمنا کے بھی یہ سلسلہ بند ہونے میں نہیں آتا۔ جس طرح کروروں خاموش بستیاں دیکھنے پر بھی لوگ زندگی کے انجام حسرتناک سے اکتاتے نہیں اسی طرح ایک تمنا کے خون سے دوسری تمنا موجود ہوتی ہے بارش کے قطرات جانتے ہیں کہ زمین پر گرتے ہی پیوند زمیں ہو جائیں گے مگر ایک قطرہ کے بعد دوسرا قطرہ گرتا اور پیوند زمیں ہوکر رہ جاتا ہے۔ دوسروں کو عبرت نہیں ہوتی۔

کہا جب اُسنے تہِ تیغ کون آتا ہے   پکار اُٹھا دلِ مشتاق و ناصبور۔ آیا!

شمع پر پروانہ دیوانہ وار گرتا اور جان دیکر نذر شمع ہو جاتا ہے، دوسرے پروانے اس خوفناک حشر کو دیکھتے ہیں عبرت نہیں ہوتی۔ وہ بھی باری باری اسی گرم گھاٹ اُترتے ہیں۔ پروانوں کی دیوانگی سمجھو محبت کا ولولہ سمجھو، جنون سمجھو، کچھ تو بات ہے کہ جو اس ننھی سی ہستی کے دل و دماغ میں آتی اور یہ جان پر کھیل جاتی ہے۔ شاید کوئی تناسخ ماننے والا کہدے کہ یہ بھی پروانہ کے کسی گذشتہ قصور کی سزا ہے۔ سزا کیوں۔ کہیں پروانہ کو کوئی مجبور تھوڑے کرتا ہے کہ جلتی شمع میں جل بجھے۔ جنون محبت کیوں نہ کہیں۔

جوابِ وصل سے کیونکر نہ ہوں میں شادی مرگ　　　خوشی بھی اور خوشی دلربا کے آنے کی

دل اس قدر مستقیم اور مضبوط ہو کر بھی درد کے اُٹھنے، کسی واقعہ کے یاد آنے اور کسی تمنا کے نشوونما پانے سے درد اور تکلیف میں پڑنے کے بغیر نہیں رہ سکتا۔ تو غریب آنکھیں کیوں سوزاں اور اشک ریز نہ ہوں؟ دل کی ہمدردی میں آنکھیں سوائے اسکے اور کیا کر سکتی ہیں کہ آہِ سوزاں کی منقل میں گرم ہو کر گریہ کناں ہوں

باعثِ گریہ نہ پوچھ اے ہمنشیں　　　کیا کہوں میں۔ آ گیا تھا یاد کیا؟

یاد رفتگاں سے دل و دماغ پر صدمہ کیوں نہ ہو، وہ جو اپنی آنکھوں کے سامنے ہی پیوند زمین ہو گئے۔ جنھیں ہم خود ہی تہ زمیں رکھ آئے۔ جو باوجود برسوں رہنے کے بھی اس زندہ بستی میں اور دو چار گھنٹے بھی نہ ٹھہر سکے، اُنکی یاد کم صدمہ رساں نہیں ہو سکتی، باوجود اس سوچنے کے بھی کہ دنیا کے تمام عیش و رنج کا مآل یہی ہے رفتہ رفتہ اس کشتی زندگی کے مسافر اسی گھاٹ اُتر ینگے پھر بھی جانیوالوں کی یاد صدمہ پہونچائے بغیر نہیں رہتی۔

دیدہ ام گونہ گونہ درد و الم　　　گریہ صد رنگ میتوانم کرد

ہم نیند ہی میں خواب نہیں دیکھتے بیداری میں بھی خواب دیکھتے ہیں۔ صرف یہ فرق ہے کہ بیداری کے خواب میں ظاہری حواس معطل نہیں ہوتے اور خواب میں حواس ظاہری معطل ہو جاتے ہیں۔ یہ خواب ہی تو ہے کہ ہم بیداری کے عالم میں یاد رفتگاں میں محو ہوتے ہیں، اور ظاہر میں اُنکا کوئی نشان اور کوئی نقش قدم نہیں پاتے۔ رفتگاں کی یاد سے دل و دماغ پر صدمہ ہوتا ہے اور زندگی کا انجام اور حشر بھی پیش نظر، مگر بایں ہمہ ہم لعبتِ زندگی کے اُسی طرح گرویدہ اور مشتاق رہتے ہیں جیسے پہلے تھے۔ ساحل زندگی پر ٹھہر کر روز دیکھتے ہیں کہ ہزاروں اس کشتی میں بیٹھنے والے آنکھوں کے سامنے غرق آب ہوتے ہیں اور ہمارے ارد گرد ہی صدہا شہر خاموشاں بھی بستے جاتے ہیں، پھر بھی آبِ زندگی کے آبِ لال ہونے میں اس تلخی پر بھی کوئی شک نہیں رہتا۔ ایک طرف وہ صدمہ رساں سماں اور ایک طرف یہ طرب افزا خواہش۔

یہ اگر نغموں سے ہو لبریز وہ نالوں سے گرم　　　عیش خانہ ہو کہ ماتم خانہ ایسا چاہیے

اس ہستی بے ثبات پر توجہ کرنے والوں کے مقابلہ میں ایسے لوگ بھی ہیں کہ جو باوجود یقین اس بے ثباتی اور دام فنا کے بھی ایک حد تک خود کو کامیاب و آزاد جانتے ہیں وہ کہتے ہیں ہم ایک منڈی میں بسائے گئے ہیں۔ بسانیوالے کی یہ مرضی ہے کہ جب تک ہم اسکے کرایہ دار ہیں باوجود اس بے ثباتی اور

گرفت نہ ہوکے بھی خوشی خوشی اس میں رہیں۔ گو موت کے پنجے سے ہم چھوٹ نہیں سکتے مگر یورش موت کے پہلے ہی کیوں ہم خودکشی کریں۔ خودکشی سے صرف اپنی جان ہی نہیں جاتی دوسروں کو بھی حسب متعلقات اسکا خمیازہ اُٹھانا پڑتا ہے۔ جہاں چندروزہ رہنا ہو وہاں شوق اور بھی زیادہ ہونا چاہیے۔ سیاح سفر میں بھی ساری چیزیں وسعت نظر اور شوق سے دیکھتا ہے۔ دم رخصت یار کا خیال زیادہ ہوتا ہی جب ہجرت کی گھڑی سر پر آجاتی ہے تو ذوق محبت میں بیتابی اور بھی بڑھتی ہے۔ بار بار نگاہیں لڑتی اور دل میں ولولے اُٹھتے ہیں۔ جو شئے قابو سے نکلنے والی ہو اُسکے قابو میں لانے کا خیال اور بھی زیادہ ہوتا ہے۔ بعض وقت پریشانی بھی جمعیت کا موجب اور محرک ہو جاتی ہے۔ ریل پر جانے والے مسافر دیکھو کس اضطراب اور کس شوق سے بار بار گھڑی دیکھتے اور سفر کا اسباب باندھتے ہیں۔ کبھی راستہ میں وصل کی آواز جو سُن لیتے ہیں تو دوڑتے بھاگتے اسٹیشن پر جا پہونچتے ہیں۔ زندگی کی بے ثباتی یہی یقین دلاتی ہے کہ ہمیں یہ سفر پیش آئیگا۔ اس واسطے جو کچھ کرنا ہو کرلو۔ ہمارا عدم سے آنا ہی جانے کی نشانی ہے۔ یہ دنیا لہو ولعب ہی سہی، متاع الغرور ہی سہی، دیکھنے اور ٹھہرنے کی جگہ تو ہے۔ جب ایکدفعہ گھر سے نکل پڑے تو آنکھ بند کرکے کیوں چلیں۔

ہم تو اُس داغ کے قائل ہیں جو چمکے تا حشر　　　دل کے پردے میں چراغ تہ داماں ہوکر

جو ہمیں ہستی میں لایا اور جسنے ہمیں اس سفر پر آمادہ کیا ہے اگر اُسکا بھی یہی منشا ہوتا کہ ہم اس وادی حیات میں آکر صُم بُکم بیٹھے رہیں تو ہمیں ہاتھ پاؤں، عقل و فراست، ارادہ، آنکھیں اور کان نہ دیے جاتے۔ ہماری پیدائش ہی بصورت جماد ہوتی۔ اگر ہم اپنی ہستی کے دلدادہ نہ ہوں تو ہمیں فانی ہونے کے خیال سے تکلیف کیوں ہوتی ہے اور ساتھ ہی اسکے یہ خیال بھی کیوں آجاتا ہے کہ شاید ہمیں زندگی کے بعد کوئی اور زندگی بھی آئے۔ زندگی کی اس منزل پر پہونچکر عقل اور دل میں پرخاش شروع ہو جاتی ہے۔ عقل کچھ کہتی ہے اور دل کچھ۔ رہ رہکر ارادہ بھی عقل کی حمایت چھوڑکر دل کے ساتھ ہو جاتا ہے۔ کبھی کبھی بقول حضرت اقبال خود بھی یہ ضرورت پڑ جاتی ہے کہ عقل سے تھوڑی دیر کے واسطے جدا ہوکر دیکھیں۔

اچھا ہے دل کے ساتھ رہے پاسبان عقل　　　لیکن کبھی کبھی اُسے تنہا بھی چھوڑ دے

جب ہم منازل مافوق العادۃ میں جانے کی خواہش کرتے ہیں تو اُس وقت یہ عقل وفراست دُور

ہی سے دیکھا کرتی ہے، یہ نہیں کہ وہ یہ تماشا دیکھنا نہیں چاہتی، دیکھنا تو چاہتی ہے وہاں تک رسائی کی سکت نہیں ہوتی۔ دیکھتے ہی آنکھیں خیرہ ہو جاتی ہیں، کیونکہ یہ کرہ عقل و فراست کے واسطے ایک بیگانہ کرہ ہے۔ اس منزل میں آنا اسکی فطرت کے خلاف ہے۔ دل اس کرہ میں پہونچکر ہی حیرت زدہ ہو جاتا ہے۔ کیونکہ یہاں بھی وہی بے ثباتی زندگی کی کہانی سننے میں آتی ہے۔

کیا ماجرا کہوں دلِ اُمیدوار کا　　اک آرزو ہزار مصیبت سے کم نہیں

عدم سے آبادیِ ہستی میں اچھے آئے، کسی ڈھب چین ہی نہیں۔ جو کروٹ بدلتے ہیں وہی تکلیف دہ جو پہلو لیتے ہیں وہی رنج آور۔ شاید اس آبادی کی ریت ہی یہی ہے کہ جو اس میں آکر بسے، جو بسیرا لے اُسی کی جان پر بنے، وہی تختۂ مشق ہو۔

اندوہ و درد و یاس غم و رنج اپنے پاس　　جو کچھ ہے وہ تمھاری عنایت سے کم نہیں

رہ رہ کر ہمیں اپنا اشرف المخلوق ہونا ہی جب یاد آجاتا ہے تو دل میں ایک نشتر سا چبھ جاتا ہے۔ کہنے کو تو اشرف المخلوق۔ دیکھنے کو سب کچھ، مگر بضاعتِ زندگی وہ کہ باوجود استعدادِ عادی اور اس سامان کے بھی بے حقیقت طفلی میں یوں گزری۔ شباب آندھی کی طرح آیا، اور بگولے کی طرح گزر گیا، پیری نے ساری زندگی ہی تلخ کر دی اور اسپر طرہ یہ کہ جب اس عمر اور اس عہد میں گذشتہ باتیں شباب کی اُمنگیں یاد آتی ہیں، تو سارے عالم کی مایوسیاں آگرد ہوتی ہیں۔ پیری کیا ہے؟ مایوسیوں کا الم ہے ستم یہ ہے کہ باوجود ان سب مایوسیوں اور ناتوانیوں کے بھی دل مرنے سے ڈرتا ہے۔ دربارِ حسن میں رسائی نہیں۔ نگاہِ ناز کے قتیل ہیں، مگر اسپر بھی جامِ محبت پینے کی خواہش و تمنا ہے۔

ادا تیری فغاں میری بلا کب چین لیتی ہے　　جگر تھامے ہوئے خلقت تری محفل سے نکلیگی

زندگی تو ہیچ اور بے ثبات ہے، حباب آسا اسکا کوئی اعتبار نہیں، مگر حباب کی طرح بحرِ زندگی کی لہروں سے اسے رہائی نہیں۔ اسی میں اسنے نشو و نما پایا اور اسی میں اپنے وقت پر فنا بھی ہو جائیگی۔ قدرت سے تو ہم یہ بھی نہیں منوا سکتے کہ ہمیں اس کشمکش سے رہائی دے اور آئندہ کے لیے یہ راہ ہی بند کر دے سچ پوچھو تو خودکشی بھی نہیں کر سکتے۔ ہماری ڈوری کسی اور کے ہاتھ میں ہے۔ ہم زندہ ہیں مگر موت کے منہ میں، آزاد ہیں مگر مقید۔ حیوانات کی زندگی ہم سے بعض باتوں میں اچھی ہے۔ ایک تو اُنھیں ہماری طرح استعداد افکار اور ترددات کے بکھیڑوں سے گزرنا نہیں پڑتا، قدرت خود انکی ذمہ دار اور کفیل

اور دوسرے انہیں عقل و تہذیب کی بدولت ہمیں طوطا اور کوا اسقدر سال جینے پر بھی ویسا ہی معلوم ہوتا ہے یا بہت ہی کم فرق آتا ہے اور ہم اشرف المخلوق اس زمانہ میں ۴۰ سال سے گذرتے نہیں کہ گوشت پوست الگ آنکھوں میں بصارت کم کانوں میں ثقل سماعت دانت تدر نزلہ بال سیاہ سے سفید رگ رگ میں کمزوری ریشہ ریشہ میں فساد گویا اور ان کے مقابلہ میں ہم ہی تختہ مشق کون ہوتا دن رہے ہیں گو ہم بھی اس تھوڑی سی زندگی میں فساد و اختلال میں کمی نہیں کرتے پھر بھی لطیف ہو کر ہمارا انجام کثافت کا پیش خیمہ ہوتا ہے شکر و صبر کر کے بھی ہم تو خاموش رہتے ہیں اور فراموشی کے گرویدہ پھر بھی یہ حافظہ اور یہ یاد پیچھا نہیں چھوڑتی رہ رہ کر گئے گذرے بکھیڑے سامنے لے آتی ہے دل پر ایک صدمہ ہوتا ہے اور دماغ ماؤف ہو جاتا ہے خصوصاً کسی کے مظالم یاد آتے ہیں تو اسوقت تو رہ رہ کر یہ کہنا پڑتا ہے کہ آزادی کا خون کر کے انسان ہاں بقدر انسان دوسرے انسانوں پر کیا کیا آفات لاتے اور اپنا منشا پورا کرتے ہیں - اس قسم کی باتیں تو یاد آکر تکلیف افزا ہوتی ہیں یہ بات بھی سمجھ میں آئی کہ جب تک انسان اپنی زندگی اور اپنی زندگی کی تمام قسم کی یادداشتوں کو خدا پرستی اور سیرت حسنہ کے قالب میں نہ ڈھالے تب تک وہ طمانیت اور شناسی کا شناسا نہیں ہو سکتا یہی بات جب کبھی یاد آتی ہے تو دل پر چھریاں چلتی اور جوف دماغ میں خلش کے نشتر چبھتے ہیں فقط بر-

گو دل آزار ہوا چھوں کے خیال اچھا ہے ؛ سو بلاؤں سے ہیں ارمان وصال اچھا ہے

سلطان احمد

حیات جاوید

تو ستم پیار سے کرتا ہے ستم کے صدقے　　شان والے میں تری شان کرم کے صدقے
میں نے راحت سے ترے ہجر کی راتیں کاٹیں　　چارہ سازان بداندیش کی باتیں کاٹیں
دل جو تڑپا تری فرقت میں تو آرام رہا　　رات دن تیرے تصور سے مجھے کام رہا
کیا گلا خواب میں صورت نہ دکھائی مجھکو　　نیند ہی جب نہ شب غم کبھی آئی مجھ کو
دل مرا جلوہ گہ طور نظر آتا ہے　　ہر ستارے میں ترا نور نظر آتا ہے

رات کو جلوہ مستور ترا پھیلا ہے — چاند کا نور نہین نور ترا پھیلا ہے
شب کو وا دیدۂ بیدار رہا کرتا ہے — ہر ستارہ مجھے حیرت سے تکا کرتا ہے

ساتھ میرا ترا اے آئینہ رُو رہتا تھا
وہ بھی دن یاد ہین جب سامنے تُو رہتا تھا

دور ہوتا تھا گلی سے دل مُضطر نہ کبھی — آستان سے ترے ہٹتا تھا مرا سر نہ کبھی
شوق کا جوش زمانے مین عیان ہے ابتک — سنگ در پر مرے سجدے کا نشان ہے ابتک
راہرو در پہ مرے پاس نہین آتے تھے — دیکھتے تھے جو تڑپتے وہ تڑپ جاتے تھے
تیرے ہمسائے اُٹھاتے تھے مجھے راہون سے — نیند اُڑتی تھی جو راتون کو مری آہون سے
آرزو تیری تھی ارمان ترا رہتا تھا — یہ وہی دل ہے جسے دھیان ترا رہتا تھا
مٹ گیا راہ محبت مین وفا کی مین نے — ہان خطاوار ہون بیشک یہ خطا کی مین نے
کیا قیامت ہے کہ وہ رسم وہ راہین نہ رہین — وہ عنایت وہ محبت کی نگاہین نہ رہین
تجھکو بیچین نہ کر دین کہین نالے میرے — جی مین ڈرتا ہون مین او بھولنے والے میرے
اور حسرت نہین اب اسکے سوا میری ہے — تجھ پہ مر جاؤن یہ بیدرد دعا میری ہے
خوش نصیبو نہین کوئی میری طرح کم نکلے — تو مرے سامنے ہو اور مرا دم نکلے
جان دینے سے ملے لطف ثبات جاوید — جان لیکر مجھے دے عشق حیات جاوید
عرش والے بھی سُنین عرش پہ نالے میرے — تو کہے آ ادھر او چاہنے والے میرے
رنگ کا کوئی نہ احساس کوئی بُو کا رہے — مل کے آپس مین نہ کچھ فرق من و تو کا رہے

لطف اندوز رہون عیش ابد ساماں سے
دل جگر دل سے ملے جان ملے جانان سے

(حکیم جگر صدیقی زمیندار جالندھر)

نظرے خوش گذرے

گیا مین جلسون کے علاوہ دو چیزین خاص توجہ کی مستحق تھین۔ گذشتہ چند ماہ کے اندر اکالیون نے گرو کا باغ مین جس انداز سے خاموش مقابلہ کی چپ مین لڑائی لڑی اُسکی وجہ سے کل اہل ہند کو بجا طور پر اُن کی ذات پر نازش و افتخار کا موقع ہے اور اس تصادم کی وجہ سے جو قوت و توانائی اُنھین حاصل ہوئی اُس نے خود اُن کی قلیل جماعت مین ایک عجیب ولولہ پیدا کر دیا۔ جسکے مظاہرہ کے لیے ان کے کچھ آدمی گیا پہونچے تھے۔ اکالیون کا پڑاؤ حرم شریعت کے پشت پر قائم کیا گیا تھا۔

وہان وہ گردوارہ پربندھک کمیٹی کا کوئی اجلاس منعقد کرنے نہین آئے تھے بلکہ اُن کی حاضری کی غرض و غایت صرف اس قدر تھی کہ بابت زندگی کا جو عملی نمونہ اُنھون نے پیش کیا تھا اُس سے ہندوستان کی دیگر اقوام کو سبق آموزی و عبرت انگیزی کا پورا پورا موقع دین اس مقصد کے لیے ایک طرف اُنھون نے لنگر قائم کیا تھا جہان بلا تفریق مذہب و ملت ہر شخص کو کھانا کھلایا جاتا تھا کہ اسی قسم کے ایک لنگر سے گرو کا باغ کے قضیہ کی بنیاد پڑی تھی اور دوسری طرف متحرک تصاویر کے ذریعہ وہ اکالی جتھون کی اولوالعزمانہ قربانیون اور دفتری اقتدار کی مدہوشانہ دست درازیون کے مناظر دکھاتے تھے جنکی اصلی حقیقت اخبار کے کالمون سے ظاہر ہونا محال تھی۔

گذشتہ محاربہ عظیم مین سکھون کی بہادر قوم نے جس طرح داد شجاعت دی اُسکے واقعات شاید فراموش نہین ہوے ہونگے اُسکے بعد ہی عدم تشدد کی لڑائی مین اکالیون کا یہ تحمل و استقلال درحقیقت مہاتما گاندھی کی تحریک کا ایک نہایت ہی روشن باب ہے اکالیون نے اپنے عمل سے ثابت کر دیا کہ صرف آہنی ہتھیارون اور آتشین آلات جنگ کے استعمال ہی سے کسی قوم کی بہادری و شجاعت ظاہر نہین ہوتی بلکہ کسی اصول یا مقصد عالی کے خاطر برداشت مظالم مین استقامت و بردباری کے جوہر دکھانے کے لیے بھی اُنھین صفات مردانہ کی ضرورت ہوتی ہے۔

جو لوگ حکومت کے تشدد سے گھبرا کر اپنے اصول کو خیرباد کہنے پر آمادہ ہو جاتے ہین اُن کو اکالیون سے

سبق لینا چاہیے۔

آل انڈیا کھادی نمائش مین بھی خاص جذب وکشش تھی اُسکے پھاٹک پر صبح سے شام تک ہجوم لگا رہتا تھا۔ اور امید کرنا چاہیے کہ اس انبوہ کثیر مین کافی تعداد ایسے لوگون کی ہوگی جو صرف سیر و تفریح کی غرض سے نمائش گاہ مین نہین جاتی تھی بلکہ وہان طرح طرح کے چرخے، باریک سے باریک کتے ہوے سوت کے نمونے اور نہایت دیدہ زیب مضبوط اور ہر قسم کی ضرورتین پوری کرنیوالے کپڑے دیکھکر اُنکی توجہ چرخا اور کھدر کی ترویج عام کے امکانات پر بھی مائل ہوتی ہوگی۔ جو لوگ کھدر کی تحریک کو قبول کر چکے ہین اُن کے لیے بھی اس نمائش مین کافی دلچسپی کا سامان موجود تھا کیونکہ اول تو متعدد مقامات پر سوت کاتنے، دُور اوٹنے، کپڑا بُننے اور رنگنے کے کام دکھائے جاتے تھے۔ جنسے اندازہ ہوتا تھا کہ کافی شوق و مہارت کے بعد کیا کام ہو سکتا ہے۔ دوسرے چرخون کے نمونے اور مختلف حصص ملک کے بنے ہوے سوت اور کھدر کو دیکھکر انھین اپنے یہان کی چیزون سے مقابلہ کرنے اور حسب ضرورت اس باب مین رائے قائم کرنے کا موقع ملتا تھا کہ اپنی مقامی حرفت مین اصلاح و ترقی کی کتنی گنجائش ہے اور اُسکے لیے ان نمونون سے کیا مدد لی جا سکتی ہے۔

یہ بات البتہ قابل افسوس تھی کہ نمائش گاہ کے منتظمین نے اُسے اسم بامسمیٰ بنانے کی کوشش نہین کی۔ کھادی کی نمایش کے ساتھ عام مصنوعات کی نمائش کی ضرورت نہ تھی اور اگر کانگریس کی سابقہ صنعتی نمائشون کی روایات کو زندہ قائم رکھنے کا خیال تھا تو کم ت کم اس کا نام بدل دیا جاتا اس سے قطع نظر کرکے دخانی کارخانون کے کپڑون کا تو وہان قطعاً وجود نہونا چاہیے تھا۔

الناظر کا یہ پرچہ ایسی حالت مین شایع ہو رہا ہے کہ خود مجھے دوسری فکرون اور مصروفیتون نے حسب معمول مضامین کا موقع دیا اور نہ دفتر مین کوئی موزون مددگار موجود تھا جو اس خدمت کو انجام دے سکتا اسلیے جو مضامین پہلے سے دفتر مین موجود تھے انھین پر قناعت کرنا پڑی۔ امید ہے کہ جلد کوئی صاحب سب ایڈیٹری کی خدمت کے لیے مل جائینگے اور مین بھی آئندہ زیادہ توجہ صرف کرسکونگا۔ اُسوقت انشاءاللہ ناظرین کرام کو الناظر مین کافی دلچسپی کا سامان نظر آئیگا جو احباب کرام الناظر کی قلمی اعانت فرماتے رہے ہین اُنکو خانگی تحریرین تو بھیجی ہی جاتی ہین مگر مین الناظر کے ذریعہ بھی انھین یاد دلانا چاہتا ہون کہ اسوقت پہلے سے بہت زیادہ سب صاحبون کی عنایت و توجہ درکار ہے۔ اگر الناظر، الناظر پریس یا الناظر بک ایجنسی کے متعلق کسی صاحب کو میری عدم موجودگی مین کوئی شکایت پیدا ہوئی ہو تو وہ براہ کرم مطلع فرمائین تاکہ حتی المقدور اس کے دفعیہ کی کوشش ہو سکے۔

...ینائی مرحوم

- ...عشق
- ...الغیب
- خیابان آفرینش
- ...مخانہ الیقین ۸/
- ...ہاے سخن

منشی سجاد حسین مرحوم

- احمق الذین ۸/
- حاجی بغلول ۸/
- میٹھی چھری ۶
- پیاری دنیا ۸/
- کایا پلٹ ۸/
- طلسمی فانوس

پنڈت رتن ناتھ سرشار

- فسانۂ آزاد ۴ جلد
- سیر کہسار
- خدائی فوجدار
- جام سرشار
- الف لیلہ بطرز ناول

منشی جوالا پرشاد برق

- رتنالی ۱۲/
- مار آستین ۱۲/
- بنگالی دلہن ۱۲/
- پرتاب ۱۲/
- معشوقۂ فرنگ ۱۲/

مولانا عبد الحلیم شرر

- ابو بکر شبلی
- خواجہ معین الدین چشتی ۱/
- صقلیہ میں اسلام ۱۲/
- قیس و لبنیٰ
- مقدس نازنین
- ایام عرب ۲ جلد
- یوسف و نجمہ
- فتح اندلس
- ماہ ملک
- حسن کا ڈاکو
- دربار حرام پور ۲ جلد ۱/
- مفتوح فاتح
- جویاے حق ۲ جلد
- لعبت چین
- عزیزۂ مصر
- غیب دان دلہن
- فردوس بریں
- فلپانا
- رومۃ الکبریٰ
- الفانسو ۱۲/
- شہید وفا ۸/
- حسن انجلینا ۱۰/
- ملک العزیز ورجنا ۱۰/
- آغا صادق کی شادی ۱۰/
- افسانۂ قیس ۳/
- حسن بن صباح ۶/
- تاریخ بغداد ۴/

نواب مرزا داغ مرحوم

- آفتاب داغ
- مہتاب داغ
- یادگار داغ ۸/
- انتخاب داغ
- فریاد داغ ۴/

مولوی بشیر الدین احمد دہلوی

- دار الحکومت دہلی ۳ جلد
- تاریخ بیجاپور ۳ جلد
- حرز طفلان
- نشاط عمر
- عصاے پیری
- فتح ہدایت
- بخت جگر ۲ جلد
- حسن معاشرت
- اقبال دلہن

نیاز فتحپوری

- گہوارۂ تمدن
- ترجمہ گیتان جلی
- کیوپڈ اینڈ سائکس ۸/

سیماب اکبر آبادی

- خدیجۃ الکبریٰ
- بنت الرسول ۵/
- سیرۃ الحسین
- جام کوثر ۵/

حکیم محمد علی خاں مرحوم

- عبرت کامل
- محسن سو کامل
- امام بہاری کامل
- دیول دیوی
- گورا
- نیل کا سانپ
- جعفر و عباسہ
- اندر حسینہ کامل

منشی احمد علی شوق قدوائی

- ترانۂ شوق
- قاسم و زہرہ ۸/
- سیکفرن اور یوسی ۴

شبیر حسین جوش ملیح آبادی

- روح ادب
- مقالات زریں ۱۱/
- آوازۂ حق ۸/
- اوراق سحر ۵/
- جذبات فطرت ۳/

منشی تیرتھ رام

- فسانۂ لندن ۲ جلد
- وطن پرست
- منزل مقصود
- روحوں کا خروج ۱۰/
- خونی ہیرا

جلال لکھنوی مرحوم

- مضمونہاے دلکش
- نظم نگارین
- سرمایۂ زبان اردو
- مالا تکیفانیف ۸/
- افادۂ تاریخ ۸/
- قواعد المنتخب ۴/

خواجہ عشرت لکھنوی

- لغات اردو
- اصول اردو ۶/
- جان اردو ۶/
- قواعد میر ۶/
- شاعری کی پہلی کتاب ۸/
- شاعری کی دوسری کتاب ۸/
- شاعری کی تیسری کتاب ۸/
- اصلاح زبان اردو ۶/
- گلدستۂ ظرافت ۶/
- زباندانی ۶

صفدر مرزا پوری

- مرقع ادب
- بزم خیال
- نشاط سخن

مولوی محمد حسین محوی

- ازواج الانبیا
- انسانی قربانیاں ۸/

حکیم احمد حسین الہ آبادی

- ترجمہ تاریخ ابن خلدون اول
- " " دوم
- " " سوم
- " " چہارم
- " " پنجم
- " " ششم
- " " ہفتم
- جلد ہشتم و نہم زیر طبع ہیں
- " " دہم
- " " یازدہم
- سلطان صلاح الدین
- سلطان نور الدین محمود

مولوی سعید احمد مارہروی

- آثار اکبری
- حیات صالح ۶
- حیات خسرو ۱۲/
- امراے ہنود

مولوی سید ممتاز علی

- تذکرۃ الانبیا
- شیخ حسن ۱۲/

منشی نوازش علی خاں

- سفرنامہ ابن بطوطہ
- قسطنطنیہ
- ڈیوٹی

جسٹس محمود مرحوم

- کتاب الطلاق عا/
- کتاب الشفعہ ۶/
- شرح قانون شہادت ے/

مولوی عزیز مرزا بی اے

- خیالات عزیز عا/
- وکرم اُروسی عہ/

خواجہ غلام الثقلین مرحوم

- روزنامہ سیاحت ۶/
- فلسفیانہ لکچر اسلام پر ۴/

منشی محمد لطیف مرحوم

- اکبر عہ/
- اورنگ زیب عہ/
- لارڈ کلایو عہ/
- رنجیت سنگھ عہ/

مسٹر عنایت اللہ خاں بی اے

- دعوت اسلام ہے
- ارض القرآن ۴/
- زلفی ۵/

مسٹر ظفر عمر بی اے

- نیلی چھتری عہ/
- بہرام کی گرفتاری عہ
- چوروں کا کلب عہ/

مولوی محمد علی ایم اے

- سیرۃ خیر البشر عا/
- النبوت فی الاسلام عا/
- جمع قرآن عہ/

پروفیسر نواب علی ایم اے

- تذکرۃ المصطفے عا/
- معارج الدین عہ/
- صحف سماوی ے/
- شمع سخن ۱۰/

مفتی انوار الحق ایم اے

- تذکرۃ الحبیب عہ/
- حقائق اسلام عا/
- اثبات واجب الوجود عہ/
- تاریخ ابو البشر عہ
- قوت خیال ۶/

پروفیسر الیاس برنی ایم اے

- اسرار حق ے/
- معارف ملت عہ
- مناظر قدرت عہ
- جذبات فطرت عہ
- علم المعیشت عہ

سید ہاشمی فرید آبادی

- مشاہیر یونان و روم کا علم عہ
- تاریخ یونان قدیم عا/

مرزا محمد ہادی بی اے

- امراؤ جان ادا عہ/
- شریف زادہ ۱۰/
- خونی عاشق عا/
- خونی مصور عہ
- خونی شہزادہ عا/
- مثنوی امید و بیم ۲/

ڈاکٹر اقبال ایم اے

- ملت بیضا ۵/
- کمال ترانہ ۲/
- شکوہ ۲/
- جواب شکوہ ۴/
- نالہ یتیم ۲/
- فریاد امت ۳/
- بلال ۱/
- اکبری اقبال ۳/
- شمع و شاعر ۲/
- خضر راہ ۴/

مولوی ظفر علی خاں بی اے

- معرکہ مذہب و سائنس عہ
- خیابان فارس جلد اول عہ
- انڈیا جنگ روس و جاپان عہ
- جنگل میں منگل عا/
- فلسفہ ابن سینا ۶/
- معاشرت ۸/
- اپیل نول ۱۰/

منشی احمد علی بی اے

- تاریخ تمدن ۲ جلد ہے
- شباب لکھنؤ عہ

مولوی عبد الماجد بی اے

- فلسفہ جذبات عا
- فلسفہ اجتماع عا/
- تاریخ اخلاق یورپ ۲ جلد ے
- مکالمات بیرکلے عہ
- زود پشیمان ۸/

خواجہ عباد اللہ اختر بی اے

- مشاہیر اسلام عہ
- دمشق ے
- بغداد عا
- صدیق اکبر عہ
- ترجمہ شرح دیوان حافظ عہ

مسٹر سچدانند سنہا بی اے

- خیالستان عہ
- زہرا عہ
- ثالث بالخیر ۸/

مسٹر انیس احمد عباسی بی اے

- زلیخا ۱۲/
- نازنین آرمینیا عہ
- ایرہ کی کامیابی ۱۲/
- احمد کیتھرینا عا/

مولوی عبد الحق بی اے

- قواعد اردو عا/
- انتخاب کلام میر عا

مولوی معشوق حسین خاں بی اے

- مبادی سائنس عا
- بجلی کے کرشمے عا
- محاربات ہیلین عہ

مولوی سید سلیمان ندوی

- ارض القرآن جلد دوم عہ
- حیات امام مالک عہ
- خلافت اور ہندوستان
- بہادر خواتین اسلام ۴/
- اہل السنۃ والجماعت ۸/

پروفیسر عبد الباری ندوی

- مبادی علم انسانی عہ
- برکلے کا فلسفہ عہ
- مذہب و عقلیات ۶/

مولوی محمد حلیم انصاری

- تمدن اسلام ۲ جلد عہ/
- الاسلام والنصرانیہ ۱۲/
- اسلام اور سوشلزم ۱۲/
- جواہر قرآنی عہ/
- فتح اندلس عا/
- فلاح دارین عہ/

خواجہ حسن نظامی

- سیپارہ دل عا/
- روزنامہ ممالک اسلامیہ عہ
- میلاد نامہ عہ/
- محرم نامہ عہ/
- [illegible] نامہ عہ
- محفل نامہ گیارھویں ۱۲
- کرشن بیتی ۱۰
- [illegible] عہ/
- بیوی کی تعلیم عہ
- بیوی کی تربیت عہ
- آپ بیتی [illegible] ۱۲
- [illegible] نظامی ۱۲/
- بیگمات کے آنسو
- فاطمی دعوت اسلام ے
- چٹکیاں اور گدگدیاں ۱۲

مولوی عبد الرشید آکر المیر

- صبح زندگی عہ
- شام زندگی عہ
- شب زندگی عہ/
- نوائے زندگی ۱۰/
- مناظر السائرہ عہ/
- الزہرا ۱۲/
- عروس کربلا عہ
- جوہر قدامت عہ
- یاسمین شام عہ
- مودودہ ۸

الناظر بک ایجنسی لکھنؤ

بسم اللہ الرحمن الرحیم

تصنیف و تالیف

اے ۲۷۸۴

الناظر

ایڈیٹر ـ ظفر الملک علوی

جلد ۲۴	ماہ مارچ سنہ ۱۹۲۳ء	نمبر ۱۴۱

فہرست مضامین

الناظر پریس لکھنؤ مین چھپا

قیمت فی پرچہ

پرنٹر و پبلشر اسحاق علی علوی

بسم اللہ الرحمن الرحیم

اردو کی بہترین کتابیں

[illegible]

[illegible]

مرزا غالب مرحوم

- اردوئے معلٰی ع/
- عود ہندی ۱۲/
- دیوان غالب کشیدہ سے
- نکات غالب عہ/

سر سید احمد خان مرحوم

- تفسیر القرآن جلد
- خطبات احمدیہ عا/
- آثار الصنادید للعہ/
- مضامین تہذیب الاخلاق للعہ/
- مکمل مجموعہ لکچر للعہ/
- اسباب بغاوت ہند ۸/

نواب محسن الملک مرحوم

- مضامین تہذیب الاخلاق للعہ/
- مجموعہ لکچر للعہ/
- آیات بینات ۳ جلد معہ/

مولوی احسان اللہ عباسی

- تاریخ الاسلام للعہ/
- الاسلام عا/
- زاہرہ عہ/
- [illegible] سے/

مولانا آزاد مرحوم

- آب حیات سے/
- دربار اکبری عہ/
- سخندان فارس سے/
- نگارستان فارس سے/
- نیرنگ خیال ۱۲/
- دیوان ذوق عا/

مولوی سید احمد دہلوی مرحوم

- راحت زمانی ۳/
- رسوم دہلی عہ/
- تسخیر شوہر ۱۲/
- مہر افروز بیگم ۱۰/
- انشاء ہادی النسا عہ/
- لغات النسا للعہ/
- علم اللسان ۸/

مرزا حیرت دہلوی

- سیرۃ الرسول ۶ جلد سے/
- کتاب شہادت جلد سے/
- قصہ حاجی بابا اصفہانی عا/
- روز البیرٹ کامل سے/
- الف لیلہ دنیا زاد سے/
- الف لیلہ شہرزاد سے/

مولانا حالی مرحوم

- حیات جاوید مجلد عہ/
- یادگار غالب سے/
- حیات سعدی عہ/
- دیوان حالی عہ/
- مقدمہ شعر و شاعری عہ/
- مسدس حالی عہ و ۸/
- جواہرات حالی عہ/
- بیوہ کی مناجات ۲/

مولانا شرر مرحوم

- حیات انیس عا/
- ایشیائی شاعری عہ/
- نور جہان بیگم ۸/
- ٹیپو سلطان عہ/
- حیدر علی سلطان عہ/
- اردو کی ڈالی ۳/
- اردو کا گلدستہ ۳/

مولانا اسلم جیراجپوری

- حیات حافظ عہ/
- حیات جامی ۸/
- علوم عرب عہ/
- خاتین عہ/

مولانا نذیر احمد مرحوم

- ترجمۃ القرآن المقابل سے/
- حمائل شریف مترجم سے/
- مطالب القرآن عہ/
- الحقوق و الفرائض عہ/
- اجتہاد عہ/
- مبادی الحکمۃ عہ/
- رویائے صادقہ عہ/
- موعظۂ حسنہ عہ/
- ابن الوقت عہ/
- ایامٰی عہ/
- فسانۂ مبتلا عہ/
- مراۃ العروس ۱۰/
- بنات النعش ۹/
- توبۃ النصوح ۹/
- منتخب الحکایات ۶/
- چند پند ۶/
- مجموعہ نظم بے نظیر عہ/
- مکمل مجموعہ لکچر ۲ جلد عہ/

مولوی حبیب الرحمن خان شروانی

- سیرۃ الصدیق عہ/
- علمائے سلف عہ/
- اسلامی اخلاق ۸/

مولانا شبلی مرحوم

- سیرۃ النبی جلد اول مجلد عہ/
- جلد دوم مجلد عہ/
- آغاز اسلام ۸/
- الفاروق سے/ و عا/
- سیرۃ النعمان عہ/
- الغزالی عا/ و عہ/
- المامون عہ/
- سوانح مولانا روم عا/
- سفرنامہ مصر و شام و روم عہ/
- مضامین عالمگیر عہ/
- رسائل شبلی عہ/
- مقالات شبلی عہ/
- موازنہ انیس و دبیر سے/
- شعر العجم جلد اول سے/
- " جلد دوم عا/
- " جلد سوم عا/
- " جلد چہارم عا/
- " جلد پنجم عا/
- مجموعہ کلام شبلی اردو ۱۲/
- کلیات فارسی عا/
- اسلامی حکومت ۲/
- اسلامی مدارس ۴/
- مثنوی صبح امید ۳/

مولانا ذکاء اللہ مرحوم

- تاریخ ہندوستان جلد
- تاریخ عہد انگلشیہ سے/
- آئین قیصری عہ/
- کرزن نامہ عا/
- صحیفۂ فطرت عا/
- محاربات عظیم ۸/
- تعلیم الانتظام ۸/
- فلسفۂ امثال عہ/
- اصل کتاب جبر و مقابلہ ۶/
- معاون الحساب ۱۲/

مولوی سجاد مرزا بیگ دہلوی

- الانسان عا/
- الاستدلال سے/
- حکمت عملی سے/
- تسہیل البلاغت سے/
- منائے وید ۱۰/

مولوی انشاء اللہ خان وطن

- تزک تیموری عہ/
- حالات قسطنطنیہ عہ/
- تاریخ مراکش و مغرب الاقصیٰ عا/
- حالات عرق و عربستان عا/

الناظر بک ایجنسی لکھنؤ

سنہ ۲۳-۱۹۲۲ء کی جدید کتابیں

(تصانیف مولانا راشد الخیری دہلوی)

شب زندگی - حصہ دوم - پہلا حصہ متعدد بار چھپ کر مقبول ہو چکا ہے یہ حصہ کل ہی میں شائع ہوا ہے قیمت عہ/

سمرنا کا چاند - اس دلچسپ ناول کے بالعموم تہذیب جدید کے خط و خال نمایاں طور پر پیش نظر ہو جائیں گے قیمت عہ

آفتاب دمشق - اس تاریخی ناول میں اسلام و نصرانیت کی معرکہ آرائی کا نقشہ دکھایا گیا ہے قیمت عہ

(تصانیف منشی امیر احمد علوی بی اے)

اردو شاعری - یہ مضمون پہلے حصہ وار رسالہ اردوئے معلی میں شائع ہو کر بہت مشہور ہو چکا ہے اب کتابی صورت میں چھاپا گیا ہے قیمت ۸/

تذکرۂ رند - یعنی آتش کے شاگرد نواب سید محمد خان رند کے حالات مع اشعار منتخب قیمت ۴/

(متفرقات)

بندگی - یعنی امام ابن تیمیہ کی کتاب العبودیت کا ترجمہ از میر ولی اللہ بی اے ایل ایل بی جس کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ آزادی و غلامی میں کیا فرق ہے اور اتباع سنت اور جہاد فی سبیل اللہ کے کیا معنی ہیں قیمت ۲/

نظام حیات انسانی - یہ اسم با مسمی رسالہ سنسکرت کی ایک قدیم کتاب کا ترجمہ ہے جو انگریزی میں منتقل ہونے کے بعد بابو بہاری لال سنگھ وکیل ہائیکورٹ نے لباس اردو سے مزین کیا ہے قیمت ۸/

بحر المحبت - مولوی عبد الماجد بی اے نے مصحفی کی اس نایاب مثنوی کو جدید طرز تصنیف پر باضافہ مقدمہ و [illegible] شائع کیا ہے قیمت ۱۲

دیوان حسرت موہانی - مولانا حسرت موہانی کے متعدد چھوٹے چھوٹے دیوان وقتاً فوقتاً چھپتے ہیں اب ۱۹۰۳ء سے ۱۹۱۹ء تک کا کلام یکجا شائع ہوا ہے عہ/

مثنوی دردِ دل - مولوی بشیر الدین احمد دہلوی خلف مولانا نذیر احمد مرحوم جن کی متعدد تصانیف [illegible] میں یہ انھیں کی نالۂ دلگیر کی صدا ہے قیمت ۸/

تصویر خیال - عدم سے جنت کی طرف سفر زندگی کی کشمکش دنیا کی نظر فریب دلچسپیاں موت کے بعد کی کیفیت دوزخ اور جنت کے نظارے اس خیالی تصویر میں دکھائے گئے ہیں مصنف کا فرضی نام مذاق سنجیدہ ہے قیمت ۹/

اسلامی مساوات - از مولوی محمد حفیظ اللہ آنریری سکریٹری مسلم ایسوسی ایشن پھلواری شریف - رسالہ کا مقصد خود کتاب کے نام سے ظاہر ہے قیمت ۸/

مجموعۂ کلام جوہر - مولانا محمد علی بی اے کا کلام قیمت ۴/

سیاحت ہوا - فرانس کے مشہور ناول نویس جولس ورن کے ایک مشہور علمی فسانہ کا ترجمہ سید محمود اعظم فہمی نے کیا ہے قیمت عہ/

مالابار و موپلا - ۱۹۲۱ء کے ہنگامہ سے پہلے شمالی ہند میں موپلا کا نام بالکل اجنبی تھا مگر اب سب جانتے ہیں کہ جنوبی ہند میں مسلمانوں کی ایک قوم کا نام موپلا ہے جو ساحل مالابار پر رہتی ہے مولانا آزاد سبحانی صاحب نے اس رسالہ میں اس قوم کے مکمل حالات لکھے ہیں قیمت ۸/

ملنے کا پتہ - الناظر بک ایجنسی، لکھنؤ

کلکتہ کے مشہور ڈاکٹر ایس کے برمن کی تیار کردہ سنہ ۱۹۲۳ع کی کافوری جنتری نہایت خوبصورت چکنے کاغذ پر چھپی ہی۔ اگر آپ دیکھنا چاہتے ہین تو ایک کارڈ لکھکر بھیجدیجیئے۔ مذکورہ بالا جنتری آپ کی خدمت مین روانہ کردی جائے گی۔

خاص ڈاکٹر ایس کے برمن کے کیمیا خانہ کا تیّار کردہ کیشراج تیل
فائدہ اور خوشبو کے لحاظ سے یہ ایک ہی تیل ہے

آج کل سیکڑون قسم کے خوشبودار تیل بازار مین بکتے ہین جو ظاہری چمک دمک اور خوشبو مین ایک دوسرے سے بڑھ بڑھکر ہوتے ہین۔ مگر ان تیلون مین اسٹ آئل عموماً جز ہوتا ہی جو بجاے فائدہ کے دماغ اور بالون کو سخت نقصان پہنچاتا ہی۔ ایسے تیلون کے چند روزہ استعمال سے بال بیوقت سفید ہوجاتے ہین۔ آنکھ اور دماغ سے خاص تعلق ہی اس لیے ایسے تیل دماغ مین گرمی پہنچاکر آنکھ کو بھی نقصان پہنچاتے ہین اور یہی وجہ ہی کہ آج کل کے نوجوانون کو بے وقت چشمہ کی ضرورت ہوجاتی ہی۔ ان سب خرابیون کو مدنظر رکھ کر کیشراج تیل کی تیاری مین خوشبو سے زیادہ فائدہ کا خیال رکھا گیا ہی۔ اسکے لگانے سے جڑین مضبوط اور بال مثل بھونرے کے سیاہ اور گھونگھر والے ہوجاتے ہین۔ یہ دماغ کو ٹھنڈک اور دل کو فرحت پہنچاتا ہی۔ قیمت فی شیشی عہ۔ محصولڈاک ۷ر

ہیلاک

یہ ہر قسم کے گھاؤ۔ درد۔ ہاتھ موچ۔ گانٹھ۔ گلٹی۔ جھانئی۔ مہاسہ۔ نکپتہ۔ ہاتھ پیرون کا پھٹنا۔ ردکھاین۔ بواسیر۔ آگ سے جلے ہوئے گھاؤ۔ جلن۔ چوٹ کی وجہ سے درد یا خون کا بہنا وغیرہ وغیرہ کے لیے حکمی دوا ہی۔ جو بہلی۔ بکری۔ برنی۔ بچھو وغیرہ کی کاٹی ہوئی جگہ سے زہر دور کرنے کے لیے ہیلاک ایک تسطیہ دوا ہی۔ فٹ بال۔ کرکیٹ۔ جمناسٹک کے کھلاڑیون کے لیے ہیلاک روزانہ استعمال کی چیز ہی۔ اسکے لگانے سے کسی قسم کی جلن وغیرہ نہین ہوتی۔ فی زمانہ اس قسم کی تمام دوائیون کے تجربہ کرنے پر ہیلاک سب سے زیادہ مفید ثابت ہوئی ہی۔ ہر گھر گرہست کو ہیلاک کی ایک ڈبیہ ضرور رکھنا چاہیے۔ قیمت فی ڈبیہ ۱۰ر محصولڈاک ۶ر

ایجنٹ۔ ڈاکٹر گنگا رام جیتلی، چوک لکھنؤ

ڈاکٹر ایس کے برمن نمبر ۵ تاراچند دت اسٹریٹ کلکتہ

بسم اللہ الرحمن الرحیم

الناظر

نمبر ۱۴۱ جلد ۲۴ ماہ مارچ ۱۹۲۳ء

فیہ مافیہ

(اثر "چلبی")

ایڈیٹر صاحب کی عنایت سے اس اشاعت کے ساتھ یہ ایک جدید سلسلۂ شذرات شروع ہوتا ہے۔ اس سلسلہ مین عموماً اُن عنوانات پر نظر کی جایا کرے گی جو باوجود اپنی اہمیت کے کسی طویل مقالہ یا مفصل بحث کے محتاج نہین۔ مقصد اس تحریر کا انشاء اللہ ہمیشہ یہ رہیگا۔ کہ علمی، سیاسی، معاشری ہر قسم کی تحریکات حاضرہ و حوادث حالیہ پر حق و صداقت کے ساتھ اسلامی نقطۂ خیال کی ترجمانی ہوتی رہے۔ اشخاص و حوادث دونون پر تنقید ہوگی۔ گو کوشش یہ رہیگی۔ کہ تنقید مخالفانہ کے وقت حتی الامکان ذاتیات سے دامن آلودہ ہونے پائے۔ البتہ اگر بعض صورتون مین اس سے مفر نہ ہو گا۔ الناظر کے ایڈیٹوریل کی تائید لازمی نہ ہوگی۔ منصب الحیان اصلاح رہیگا۔ رائے مین غلطی ہونا لازمۂ بشریت ہے۔ لیکن اگر خدا کو منظور ہے تو نیت مین فساد نہ پیدا ہوگا۔ وما تشاؤن الا ان یشاء اللہ۔

یہ مقاصد و عزائم ایک بیکس و درماندہ بندہ کے ہین، جسکو اپنی خطا کاریون کا پورا اعتراف ہے۔ ان ارادون کا نباہ صرف اُسکے ہاتھ مین ہے جو سب اسباب پر قدرت رکھتا ہے، جو دلون کے اسرار سے واقف ہے اور جو عاجزون اور درماندون کی اپنی توفیق سے دستگیری کرنے والا ہے۔ جو عدم محض سے ساری کائنات کے

پیدا کرنے پر قادر ہے، جو پانی کی ناپاک بوندوں کو ارسطو و فلاطون، کینٹ و ڈارون بنا دیتا ہے، اور جس نے کفر و شرک کی گمراہیوں میں پڑے ہوئے افراد کو صحابہ کرام و اولیا اعظام کے مرتبہ پر پہنچا دیا ہے، اُس کے فضل و کرم سے کیا بعید ہے، کہ ایک عصیان مجسم کو اس کی توفیق دے دے، کہ وہ راہ حق و دیانت میں کچھ خدمات انجام دے سکے۔ ایک مُسلِم ہستی کو بعد اعتراف توحید سب سے پہلی جو تعلیم دی جاتی ہے وہ یہی ہے کہ فضل خداوندی کی طلب کرے، اور بعد تضرع و الحاح مُنھ پھوڑ کر یہ عرض کرے،

اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ صِرَاطَ الَّذِيْنَ اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ غَيْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ وَلَا الضَّآلِّيْنَ ٥	"ہمیں راہ راست دکھا، یعنی ان لوگوں کا راستہ جن پر تو نے اپنا فضل و کرم کیا ہے، نہ کہ ان لوگوں کی روش جو تیرے غضب میں آ چکے ہیں یا بھٹکے ہوئے ہیں۔"

غرض اپنی بے بساطی و نااہلی کے احساس کے باوجود محض توفیق خداوندی کے بھروسہ پر خدائے قادر و توانا کا نام لیکر اس خدمت کا آغاز کیا جاتا ہے۔ وَمَا تَوْفِيْقِيْ اِلَّا بِاللّٰهِ عَلَيْهِ تَوَكَّلْتُ وَاِلَيْهِ اُنِيْبُ —

سال رواں کے واقعات میں اسلامی ہند کے لیے ایک اہم واقعہ ڈاکٹر اقبال کا نائٹ کے خطاب سے سرفراز ہونا ہے۔ متعدد مسلمان اخبارات نے اس واقعہ پر سخت ناخوشی کا اظہار کیا ہے، بخلاف اس کے بعض نے مبارکباد پیش کی ہے۔ لیکن اگر مزید غور و تعمق سے کام لیا جائے، تو دونوں فریق افراط و تفریط میں مبتلا نکلیں گے۔ موجودہ خطابات کے معنی بجز اسکے اور کچھ نہیں، کہ حکومت کی جانب سے خطاب یاب فرد کی عزت یا عظمت کا اعتراف ہے۔ عزت کے متعلق ہر مسلم ہستی کا عقیدہ یہ ہے کہ اس کی اصل مستحق صرف ذات رب العزت ہے کہ

وَلَهُ الْكِبْرِيَآءُ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ (جاثیہ ع ۴)	زمین و آسمان کی سب بڑائیاں اسی کو سزاوار ہیں۔ —

حقیقی عزت کا اہل صرف رب الارباب و مالک الملوک ہے، جو خود اپنے متعلق ارشاد فرماتا ہے، کہ

اِنَّ الْعِزَّةَ لِلّٰهِ جَمِيْعًا (یونس ع ۷)　　عزت ساری کی ساری خدا ہی کی ہے

آفتاب کے پرتو سے ذرات خاک بھی جگمگا اُٹھتے ہیں۔ اسی طرح اس عظمت و کبریائی کا ایک حصہ اُن انسانی ہستیوں کے بھی نصیب میں آجاتا ہے، جو اپنے تئیں صفات الٰہیہ سے متصف کر چکے ہوتے ہیں۔ یعنی انبیائے کرام اور عام صالحین و مومنین۔ ارشاد ہوتا ہے کہ

وَلِلّٰهِ الْعِزَّةُ وَلِرَسُوْلِهٖ وَلِلْمُؤْمِنِيْنَ وَلٰكِنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ ۔ (منافقون۔ع ۱)

عزت کہ خدا اُس کے رسول، اور مومنین کی ہی البتہ منافقین اس کو نہیں سمجھتے۔

نوع انسانی کی تقسیم مرد و عورت، اور مختلف قبایل و جماعات مین تو باہمی شناخت و

يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ اِنَّا خَلَقْنٰكُمْ مِّنْ ذَكَرٍ وَّاُنْثٰى وَجَعَلْنٰكُمْ شُعُوْبًا وَّقَبَآئِلَ لِتَعَارَفُوْا ؕ اِنَّ اَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللّٰهِ اَتْقٰىكُمْ (حجرات۔ع ۲)

امتیاز کی سہولتون کی غرض سے کر دی گئی ہے ورنہ جہانتک عزت و تکریم کا تعلق ہی جو شخص جتنا زیادہ صاحب تقوی و پرہیزگار ہے وہی خدا کی نظر مین اس کا زیادہ حقدار ہی۔

جو بارگاہ رب العزت سے راندہ ہو چکا، اُسے کوئی مجازی دربار معزز نہین بنا سکتا۔

وَمَنْ يُّهِنِ اللّٰهُ فَمَا لَهٗ مِنْ مُّكْرِمٍ (حج ع ۲)　جسکو خدا ذلیل کرے، اُسے کوئی عزت دینے والا نہین

حصول عزت کی تمنا ہے تو یاد رہے کہ ساری عزت کا سزاوار تو حق سبحانہ وتعالی ہے

مَنْ كَانَ يُرِيْدُ الْعِزَّةَ فَلِلّٰهِ الْعِزَّةُ جَمِيْعًا ؕ اِلَيْهِ يَصْعَدُ الْكَلِمُ الطَّيِّبُ وَالْعَمَلُ الصَّالِحُ يَرْفَعُهٗ (فاطر۔ع ۲)

اور اسکے سامنے باعزت ہونے کا ذریعہ صرف اعمال صالحہ ہیں جو اس کے حضور تک پہنچتے ہین اور وہی حق تعالی نیک عمل کرنے والون کے درجہ کو بلند کرتا رہتا ہی۔

بعض نادان ایسے بھی ہین، جو مسلمانون کے علی الرغم کفار سے میل ملاپ رکھتے ہین شاید اس طمع

الَّذِيْنَ يَتَّخِذُوْنَ الْكٰفِرِيْنَ اَوْلِيَآءَ مِنْ دُوْنِ الْمُؤْمِنِيْنَ ؕ اَيَبْتَغُوْنَ عِنْدَهُمُ الْعِزَّةَ فَاِنَّ الْعِزَّةَ لِلّٰهِ جَمِيْعًا ؕ (نساء ع ۲۰)

مین کہ اس سے حصول اعزاز ہو سکے گا، سو یہ نادان اس پر بھی حقیقت کو فراموش کیے ہوئے ہین کہ عزت تو صرف خدا ہی کی ہی۔

کفر واسلام ظلمت و نور کے درمیان رشتہ موالات بہر صورت و بہر حال ممنوع ہی۔ چہ جائیکہ ایسی قوم سے رشتہ موالات جوڑنا اور اُس کے سامنے دست طلب پھیلانا، جو اپنی عداوت اسلام کا بارہا ثبوت دے چکی ہو۔ ایسی قوم کے ساتھ محبت و دوستی رکھنے کی قطعی ممانعت کی تصریح ایک جگہ نہین متعدد مقامات پر کلام خداوندی مین موجود ہی، مثلاً

لَا يَتَّخِذِ الْمُؤْمِنُونَ الْكٰفِرِيْنَ اَوْلِيَآءَ مِنْ دُوْنِ الْمُؤْمِنِيْنَ وَمَنْ يَّفْعَلْ ذٰلِكَ فَلَيْسَ مِنَ اللّٰهِ فِيْ شَيْءٍ ۔ (آل عمران ع ۳)	مسلمانوں کو نہ چاہیے کہ مسلمانوں کو چھوڑ کر کفار کو اپنا دوست بنائیں اور جو کوئی ایسا کرے گا تو اس سے اور اللہ سے کچھ سروکار نہیں

یا مثلاً

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّخِذُوا الْكٰفِرِيْنَ اَوْلِيَآءَ مِنْ دُوْنِ الْمُؤْمِنِيْنَ اَتُرِيْدُوْنَ اَنْ تَجْعَلُوْا لِلّٰهِ عَلَيْكُمْ سُلْطٰنًا مُّبِيْنًا (نساء ع ۲)	ایمان والو! مسلمانوں کو چھوڑ کر کفار کو اپنا دوست نہ بنانا۔ کیا تم یہ چاہتے ہو کہ خدا کا صریح جرم اپنے اوپر عائد کرو۔

یا پھر مثلاً۔

لَا تَجِدُ قَوْمًا يُّؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ يُوَآدُّوْنَ مَنْ حَآدَّ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ وَلَوْ كَانُوْٓا اٰبَآءَهُمْ اَوْ اَبْنَآءَهُمْ اَوْ اِخْوَانَهُمْ اَوْ عَشِيْرَتَهُمْ (مجادلہ ع ۳)	جو لوگ خدا اور روز آخرت پر یقین رکھتے ہیں ان کو تو (اے پیغمبر) تم نہ پاؤ گے، کہ خدا اور رسول خدا کے دشمنوں کے ساتھ دوستی رکھیں، خواہ وہ لوگ اُن کے باپ، یا بیٹے یا بھائی یا او رکنبہ والے ہی کیوں نہ ہوں

پس اگر یہ ثابت ہو جائے، کہ ڈاکٹر اقبال نے حکومت وقت سے دوستی و محبت رکھی، اور اسکے سامنے اس عزت کی طلب کی، تو بے شبہ اُن کا یہ فعل سخت ترین سرزنش و نفرین کا مستحق قرار پائیگا۔ لیکن اس کے لیے قطعی ثبوت اور شہادت معتبرہ کی ضرورت ہو۔ محض خطاب پانی اس امر کی دلیل نہیں ہو سکتی کہ موصوف نے کارکنان حکومت سے تعلقات محبت قائم رکھے اور اُن کے سامنے حصول خطاب کی خواہش پیش کی۔ جب تک یہ صورت ثابت نہ ہو جائے، ہر مسلمان کو بدگمانی کے گناہ سے بچنا چاہیے (يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اجْتَنِبُوْا كَثِيْرًا مِّنَ الظَّنِّ اِنَّ بَعْضَ الظَّنِّ اِثْمٌ۔ حجرات ع ۲) اسکے بعد دوسرا احتمال یہ رہ جاتا ہو کہ حکومت نے از خود ڈاکٹر اقبال کی ادبی و حکیمانہ عظمت کا اعتراف کیا ہو۔ اگر ایسا ہو تو موصوف پر قطعاً کسی طرح کا الزام نہیں عائد ہو سکتا۔ کمال جب ایک مرتبہ خاص سے متجاوز ہو جاتا ہو، تو اکثر ایسا ہوتا ہو کہ مخالفین تک کو اعتراف کرنا پڑتا ہو اور صاحب کمال کی اس سے بڑھ کر خوش نصیبی اور کیا ہو سکتی ہو۔

تاریخ اسلام اس قسم کے واقعات سے بیگانہ نہیں حضرات صوفیہ میں بہ کثرت ایسی ہستیاں نظر آئیں گی جن کے معتقدین میں مسلمانوں سے زیادہ اقوام غیر کی تعداد ہو، یہ اعتقاد و ارادت کیا ہو؟ ایک مسلم کی روحانی قوت کا غیر مسلموں کی طرف سے اعتراف۔ بعض صحابہ کرام کی دیانت پر کفار کو یہ قدر اعتماد تھا، کہ اپنے آپس کے خصومات میں وہ ان حضرات کو ثالث بناتے تھے اس سے بڑھ کر واضح تر و محکم تر سند اسوۂ یوسفی میں ملتی ہو حضرت یوسف علیہ السلام کی بیگناہی، عصمت، و عظمت اخلاق کا سکہ جب ملک پر بیٹھ گیا، تو غیر مسلم فرمانروائے وقت نے انھیں "مکین و امین" کے لقب سے ممتاز کیا (قَالَ إِنَّكَ الْيَوْمَ لَدَيْنَا مَكِينٌ أَمِينٌ) اس پاس نبی برحق نے نہ کچھ برہمی کا اظہار کیا نہ اس عزت کو واپس فرمایا، بلکہ اُلٹے اور مطالبہ کیا، کہ اگر مجھ کو اس اعزاز و اعتبار کا اہل سمجھتے ہو، تو مجھے وزارت مال (فنانس ممبری) کا منصب دو۔

قَالَ اجْعَلْنِي عَلَىٰ خَزَائِنِ الْأَرْضِ إِنِّي حَفِيظٌ عَلِيمٌ ۝ (یوسف ع ۷)	مجھے سرکاری خزانوں کا حاکم مقرر کیجئے کیونکہ میں خوب حفاظت کر سکتا ہوں، اور اس کاروبار سے خوب واقف ہوں۔

سب سے بڑی اور سب سے زیادہ مضبوط نظیر حضور سرور کائنات صلعم کی ہو۔ کفار مکہ جس درجہ کی عداوت رکھتے تھے معلوم ہو۔ بایں ہمہ سردار دو عالم صلعم کی امانت و دیانت و پاکیزگی اخلاق کا اعتراف ان اشتیار کو بھی کرتے ہی بنا، اور انھیں نے "امین" کا خطاب دیا۔ تاریخ و سیر میں یہ واقعہ درج ہو، لیکن کہیں نہیں درج ہو کہ سرور انبیاء صلعم نے اس خطاب کو واپس فرمایا ہو، یا اس لقب سے بیزاری ظاہر فرمائی ہو۔ پس اگر اقبال کی ادبی و حکیمانہ عظمت کا اعتراف حکومت وقت نے از خود کر کے انھیں اس خطاب سے سرفراز کیا، تو اس میں غریب اقبال کا کیا قصور؟ یہ تو اُن کے انتہائے کمال کی دلیل ہو، اُس عاشق کی خوش نصیبی میں کسے کلام ہو سکتا ہو، جسے رقیب روسیاہ تک سرٹیفکٹ دے۔

"دانایان فرنگ نے بالآخر دفعۃً علی الاطلاق کے طور پر اپنے ہاں ایک عظیم الشان مجلس "اقوام" کا صنم اکبر پیدا ہی کر لیا، جو پرستاران سیاست کی نظر میں "رب الارباب" کا حکم رکھتا ہو۔ اس مجلس کا ایک شعبہ علمی بھی ہو جس کا مقصد تمام مہذب شائستہ و روشن خیال اقوام کے درمیان علمی تعلقات، اخوت و محبت پیدا کرنا ہو۔ اس شعبہ کی جانب سے حال میں جو روداد شایع ہوئی ہو اُس کے اقتباسات انگریزی

اخبارات کی وساطت سے ہندوستان بھی پہونچے ہین۔ یورپ کی رفتار تمدن اُسے جس آخری منزل کی جانب لیے جا رہی ہے، اس کی کیفیت خود اس کی زبان سے سننے کے قابل ہے۔

کمیٹی کے ارکان محققین اِس تمہید کے بعد کہ یورپ کے اکثر علمی و ذہنی مرکزون کی حالت حد درجہ تاسف انگیز ہے، تحریر فرماتے ہین کہ

"مشہور اور قدیم یونیورسٹیان جان بلب ہو رہی ہین"

اور

"قریب ہے کہ اعلیٰ ترین بیوت الحکمۃ (اکاڈمیون) اور سائنٹفک تجربہ گاہون (لیبوریٹریون) کو بالکل ٹوٹ جانا پڑے۔"

پھر اتنا ہی نہین کہ کاغذ و سامان طباعت کی گرانی نے اشاعت علوم و کتب کو سخت صدمہ پہنچا دیا ہے بلکہ بعض ممالک مین تو یہ نوبت پہنچ گئی ہے کہ

"افلاس و تنگدستی عنقریب ہر قسم کی علمی زندگی کا خاتمہ کیا چاہتی ہے۔"

روس کی حالت اور زیادہ نازک و مایوس کن ہے۔

یہ حالت کن ممالک کی ہے؟ اُن کی جنھین کل تک اپنے علوم و فنون، تہذیب و شائستگی پر ناز تھا۔ یہ عالم سکرات کن اقوام پر طاری ہے؟ اُن پر جو کل تک نشۂ قوت و زعم شباب مین سرمست تھین۔ یہ شام زوال کس تمدن کی ہے؟ اُس کی جسکا آفتاب اقبال ابھی نصف النہار پر تھا۔ یہ لازمی نتیجہ ہونا تھا، بداعمالی، خود پرستی و خدا فراموشی کا۔ قانون فطرت ہمیشہ سے یہ رہا ہے کہ جن قومون نے آیات الٰہی حق، صداقت، دیانت، ایمان، و اعمال صالحہ کو پس پشت ڈالکر اپنا معبود جاہ و سلطنت، ملک و مال، قوت و مادیت کو ٹھہرا لیا، اُنھین آہستہ آہستہ غیر محسوس طریقہ پر زوال و ہلاکت کے گڑھے کی جانب گھسیٹ کر لا ڈالا گیا ہے ان کا سب سے بڑا بھروسا اپنی تدبیر و حکمت پر رہا کیا ہے لیکن بالآخر ہمیشہ وہی ہستی اُن پر غالب آئی ہے جو اُن کے تمام مدبرون سے مدبر تر اور اُن کے تمام حکما سے حکیم تر ہے۔

وَالَّذِیْنَ کَذَّبُوْا بِاٰیٰتِنَا سَنَسْتَدْرِجُھُمْ مِّنْ حَیْثُ لَا یَعْلَمُوْنَ وَاُمْلِیْ لَھُمْ اِنَّ کَیْدِیْ مَتِیْنٌ (اعراف ۲۳)

جن لوگون نے ہماری نشانیون کو جھٹلایا ہم اسطرح آہستہ آہستہ انھین ہلاکت و بربادی کی طرف کھینچتے لے جاتے ہین کہ انھین خبر بھی نہین ہوتی اور ہم انکو مہلت بھی دیتے رہتے ہین اسلیے ہماری چال نہایت پکی چال ہے

اس ارشاد سے چند سطرین پہلے ایک اور قوم کا ذکر ہے، جس کے جزئیات تک موجودہ متمدن اقوام پر منطبق ہوتے ہین۔ یہ ایسی قوم تھی، جو الطاف الٰہی سے سرافراز کی گئی تھی، طرح طرح کی نعمتین اُسے دی گئی تھین، لیکن اُس نے اپنی یہ کینچلی اُتار دی، اور شیطان کے ورغلانے مین آکر گمراہ ہوگئی۔

وَاتْلُ عَلَيْهِمْ نَبَاَ الَّذِىْٓ اٰتَيْنٰهُ اٰيٰتِنَا فَانْسَلَخَ مِنْهَا فَاَتْبَعَهُ الشَّيْطٰنُ فَكَانَ مِنَ الْغٰوِيْنَ (اعراف۔۲۲)	اے پیغمبر ان سے اس کا حال بیان کرو جس کو ہم نے اپنی آیتین عنایت کی تھین پھر اُس نے وہ کینچلی اُتار دی، اور شیطان اُس کے پیچھے لگا اور اُس نے گمراہی اختیار کی۔

آج یورپ کو دولت، جاہ، حکومت، سب طرح کی دنیوی نعمتین حاصل تھین لیکن بجاے خداپرستی کے اُس پر خودپرستی کا شیطان سوار ہے۔

اگر وہ قوم راہ نیک اختیار کرتی، تو خدا مزید برکات سے سرافراز کرتا، لیکن اُس نے نفس پرستی کی روش اختیار کی۔

وَلَوْ شِئْنَا لَرَفَعْنٰهُ بِهَا وَلٰكِنَّهٗٓ اَخْلَدَ اِلَى الْاَرْضِ وَاتَّبَعَ هَوٰىهُ ۔	اگر ہماری مشیت ہوتی تو ہم اس کا مرتبہ بلند کرتے، لیکن اُس نے پستی مین گرنا چاہا اور اپنے خواہش نفس کے پیچھے لگا رہا۔

بعینہ یہی حال یورپ کا ہے، بجاے اس کے کہ وہ انعامات الٰہی کی قدر کرتا اور نیک کاری و خداترسی اختیار کرکے اپنے تئین مزید لطف و کرم کا مستحق بناتا، اُلٹے ہوس پرستیون مین لگ گیا، خشیت الٰہی مظلومون کی حمایت، کمزورون پر شفقت، اور محتاجون کی دستگیری چھوڑ کر ظلم و ستم، مکر و فریب سے اپنی خودپرستی کے دوزخ کو بھرنا شروع کردیا۔

اُس پچھلی بدبخت قوم کی مثال حریص کتے کی سی ہوگئی تھی کہ اُسے دُھتکارو تو بھی زبان لٹکائے رکھتا ہے، اور اُس کے حال پر چھوڑ دو تو بھی۔

فَمَثَلُهٗ كَمَثَلِ الْكَلْبِ اِنْ تَحْمِلْ عَلَيْهِ يَلْهَثْ اَوْ تَتْرُكْهُ يَلْهَثْ ذٰلِكَ مَثَلُ الْقَوْمِ الَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا ۔ (اعراف۔۲۲)	اسکی مثال کتے کی ہوگئی کہ اُسے نکالو یا کچھ کرو تو بھی زبان باہر لٹکائے رکھتا ہے اور اُس کے حال پر چھوڑ دو تو بھی یہی مثال اس قوم کی ہے جس نے ہماری نشانیون کو جھٹلایا

ٹھیک یہی مثال آج یورپ کی سلطنتون پر چسپان ہوتی ہے، جوع الارض (امپریلزم) اور زر پرستی (کیپٹل ازم) ان پر اسدرجہ غالب آچکی ہے کہ یہ اپنی چالون مین کامیاب ہون تو اور نہ کامیاب رہین تو دونون

ـسورتوں مین بعث، ہوس اُن کا پیچھا نہین چھوڑتی۔

چند لفظوں کا فرق دیکر اِس قوم کے مزید خصوصیات ارشاد ہوتے ہین۔

لَهُمْ قُلُوبٌ لَّا يَفْقَهُونَ بِهَا وَلَهُمْ أَعْيُنٌ لَّا يُبْصِرُونَ بِهَا وَلَهُمْ آذَانٌ لَّا يَسْمَعُونَ بِهَا أُولَٰئِكَ كَالْأَنْعَامِ بَلْ هُمْ أَضَلُّ أُولَٰئِكَ هُمُ الْغَافِلُونَ (اعراف - ۲۲)

اُن کے دل ہوتے ہین مگر سوچنے سمجھنے کا کام نہین لیتے اُنکے آنکھین ہین مگر دیکھنے کا کام نہین لیتے اُن کے کان بھی ہین مگر سننے کا کام نہین لیتے۔ یہ لوگ تو گویا چارپایہ ہین بلکہ اور اُن سے بھی گئے گذرے۔ یہی وہ لوگ ہین جو مدہوش غفلت ہین

یورپ کی موجودہ زندگی حرف بحرف اِن بیانات کی مصداق ہے اِن کے کان ہین مگر ٹرکی، مصر، ہندوستان، ایران، افریقہ کے مظلوموں اور زیردستوں کی صداے نالہ و فریاد سننے کے لیے نہین اُن کے آنکھین ہین مگر ہندوستانی مخلوق کی فاقہ کشی، سمرنا مین ترکی خواتین کی بیحرمتی، اور سارے مشرق مین مساجد، مقابر، و معابد کی توہین دیکھنے کے لیے نہین اُن کے دل ہین مگر زیردست اقوام کی خواہش آزادی کے شور و غل، مطالبہ و مظاہرہ سے متاثر ہونے کے لیے نہین۔ ایسی صورت مین اگر اُن کو چوپایون سے بھی گیا گزرا ہوا سمجھا جائے تو کیا بیجا ہے؟

ایسی قوم کا جو انجام ہوتا ہے اُس کی پیش بینی ہر عقل سلیم کر سکتی ہے۔

چند ہفتے ہوئے یورپ سے ایک مشہور رقاصہ ایکٹرس مس میری لائڈ کی وفات کی خبر موصول ہوئی جس کے اندر تاریک خیال مشرق کے لیے بہت کچھ سامان عبرت موجود ہے۔ مس لائڈ نے جب اول اول اسٹیج پر قدم رکھا ہے تو حسن و شباب کا مجسمہ تھین۔ رعنائی و زیبائی اُن کی سہیلیان تھین۔ نزاکت و لطافت اُن کی ایک ایک ادا پر قربان تھی، حسن پرستون نے آنکھون پر بٹھایا۔ رنگین مزاجون نے آستانۂ ناز کو بوسہ دیا، شہرت نے تالیان بجا کر اُنھین ہاتھون ہاتھ لیا، اور مقبولیت نے اُن کے کمالات کا نقارہ بجایا۔ اخبارات نے تصاویر شایع کین، رسائل نے مضامین لکھے، اور ارباب ذوق دنیاے متمدن کے گوشہ گوشہ مین اُس حسن کی دیوی کا راگ گانے لگے۔ آمدنی کی یہ کیفیت کہ اسٹیج پر اِس پیکر محبوبی کا نمودار ہونا درشنی ہنڈی یا نقد چیک کے مرادف تھا۔ شکل دیکھتے ہی قدر دانوں کی جماعت بے اختیار ہو جاتی اور سیم و زر کی بارش شروع ہو جاتی۔ سنڈے ٹائمز کی روایت ہے کہ موصوفہ سے بڑھکر انگلستان مین آج تک کسی رقاصہ کی آمدنی نہین

ہوئی۔ ہزارہا روپیہ ایک شب مین ملجانا دشوار نہ تھا۔

لیکن آفتاب شباب کبتک نہ ڈہلتا۔ امتداد وقت نے بالآخر اپنا اثر دکھایا۔ رخساروں کے پھول کملا گئے۔ چہرہ پہ بجائے آب الشباب کے رنگ و روغن کے جھریون نے اپنا تسلط جمایا۔ تازگی گئی، اداسی آئی۔ شادابی کی جگہ پژمردگی چھائی۔ توانائی اٹھی، ناتوانی اُبھری۔ آواز کی دلآویزی و شیرینی کی جگہ کرختگی و ناہمواری نے لی۔ نوبت یہان تک پہنچی، کہ گذشتہ ستمبر مین جب یہ معمر ضعیفہ اسٹیج پر تشریف لائین تو حاضرین اُن کے بوڑھے منہ دن پر ہنسی نہ ضبط کر سکے، اور بے اختیار آوازہ کسنا شروع کر دیے۔ کسقدر عبرت کا مقام تھا کہ کل تک جس اسٹیج پر اُسے پریرویون کا سرتاج سمجھا جاتا تھا آج اُس بڑھیا ڈائن کے ساتھ اُسی اسٹیج پر معمولی رواداری کے برتاؤ سے بھی گریز تھا! یہی معنے ہین اس ارشاد ربانی کے کہ ہم جسکی عمر بڑھاتے ہین

وَمَنْ نُّعَمِّرْهُ نُنَكِّسْهُ فِي الْخَلْقِ — اُس کے قویٰ کو کمال پر پہنچاتے ہین، اُسے پھر بناوٹ مین

اَفَلَا يَعْقِلُوْنَ — الٹا گھٹاتے بھی ہین۔ اور کمال کو زوال مین تبدیل کرتے ہین۔

(یٰس ۔ ع ۵) — کیا یہ لوگ ہماری اس قدرت و حکمت کو نہین سمجھتے۔

اکتوبر مین یہ تصویر عبرت آخری مرتبہ اسٹیج پر آئی، اسوقت ایک ڈاکٹر سہارا دینے کے لیے ہمراہ تھے۔ تماشہ کے بعد ہی غش آیا۔ تیمار دار اُٹھا کر مکان لائے۔ مگر یہ مکان ذاتی نہ تھا۔ بڑھاپے کی تنگدستیون نے ذاتی مکان فروخت کر دینے پر مجبور کر دیا تھا، اور آخر عمر مین سکونت ایک عزیزہ کے ہان تھی یعنی کل تک جسکی ایک ایک ٹھوکر پر سیم و زر کا انبار لگ جاتا تھا، وہ آج ایک ایک کوڑی کو محتاج تھی۔ ہفتون غذا تقریباً ترک رہی کسی وقت خواہش ہی نہین ہوتی تھی۔ ہر وقت ایک غفلت و غنودگی بلکہ نیم بیہوشی کی کیفیت طاری رہتی تھی، زندگی کی آخری رات، اسی کی ساری آتشدان کے سامنے اکڑون بیٹھے ہوئے گذاری۔ دوسری صبح کو طایر روح قفس جسم سے آزاد تھا۔ یہ کائنات ہمارے حسن و جمال، دلربائی و دلبری کی، اور یہ ہے بساط ہمارے لاف عشق و جانسازی، محبت و سرفروشی کی!! اس قسم کے حسن و عشق کا یہ انجام ہونا لازمی تھا ؎ (مولانائے روم)

عشقہائے کز پئے رنگے بود
عشق نہ بود عاقبت ننگے بود

فارسی شاعری کے اولین نمونے

ہماری اُردو کی طرح فارسی ادبیات کی بسم اللہ بھی شعر سے ہوتی ہو، مگر کب، کس شخص سے اور کس شعر سے؟ اِن سوالات کا کوئی فیصلہ کن جواب آج تک دیا نہ جا سکا۔ غیر محتاط فارسی تذکرہ نویسون نے اپنی عادت کے موافق فارسی شاعری کو نہایت قدیم زمانون سے منسوب کر دیا ہو کسی نے بہرام گور متوفی ۴۳۸ء اور اُس کی معشوقہ دل آرام کی متحدہ فکر کو جو ایک شعر نابول کی صورت مین ظاہر ہوا فارسی شاعری کا سنگ بنیاد قرار دیا۔ کسی نے قصر شیرین کی دیوار پر جو خسرو پرویز متوفی ۶۲۸ء کی یادگار تھی ایک شعر کندہ سُنا۔ کسی نے ابوحفص حکیم سغدی کے اس شعر کو پہلی سعی بتایا ہو ؎

آہوی کوہی در دشت چگونہ رودا　　اوندارد یار، بے یار چگونہ بودا

بعضون نے ابو العباس مروزی کے ع "اے رسانیدہ بدولت فرق خود بر فرقدین" والے قصیدے کا ذکر کیا ہو جو ۱۹۳ء مین المامون عباسی کے ورود مرو کی تقریب مین نظم کیا گیا۔ اِس قصیدہ کے چند شعر تذکرون مین ملتے ہین جن مین سے دو یہ ہین۔

کس بدین منوال پیش از من چنین شعری نگفت　　مر زبانِ پارسی را ہست با این نوع بین

لیک زان گفتم من این مدحت ترا تا این لغت　　گیرد از مدح و ثنائے حضرتِ تو زیب و زین

اگر یہ شعر معتبر تسلیم کر لیے جائین جب بھی خود اِنھین شعرون سے اتنا تو ماننا پڑے گا کہ ابو العباس سے پہلے کسی نے فارسی مین کوئی قابل ذکر شعر نہین کہے۔ دولت شاہ اور شمس قیس صاحب معاییر اشعار عجم نے اضطراری مصرعہ "غلطان غلطان ہمے رود تا لبِ گور" کو رباعی کی بنیاد بتایا ہو، اور رباعی فارسی شاعری کی اولین صنف ہو۔ لہٰذا یہ مصرع فارسی شاعری کی بنیاد ٹھہرا۔

مگر یہ دعاوی مختلف اسباب سے ناقابل قبول اور کم از کم مشتبہ ہین۔ ان کی تحقیق و تنقید کا موقع کوئی اور ہوگا سر دست ہم مختلف ذرائع سے فراہم کر کے وہ نمونے پیش کرتے ہین جو زیادہ تر غیر مختلف فیہ اور نسبتہً معتبر ہین۔

۱؎ فارسی مین تذکرۂ دولت شاہ سمرقندی جو صنف روایات مین ممتاز ہو۔ اور مجمع الفصحا (بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۱ پر ملاحظہ ہو)

جسطرح ولی دکنی اُردو شعر کا باوا آدم مانا جاتا ہو حالانکہ اس سے پہلے کئی ریختہ گو ہو گذرے ہین اسی طرح رودکی فارسی شاعری کا باوا آدم تسلیم کیا جاتا ہو۔ اگرچہ اس سے پہلے اور اُس کے زمانے مین کئی فارسی گو ہو گذرے مگر اُن کے کلام کی کمیابی نے اُن کو دولت شہرت سے محروم رکھا۔

قریب قریب مسلم ہو کہ فارسی شاعری کی ابتدا صنف رباعی سے ہوتی ہو۔ یہ ابتدائی کلام تمام صنایع و بدایع سے معرا فطری جذبات سے مملو، اور اپنی سادگی کے سبب سے کسقدر دلپذیر و موثر ہین۔

حنظلہ بادغیسی متوفی ۲۱۹ھ

یارم سپند گرچہ بر آتش ہمے فگند ... از بہر چشم تا نہ رسد مر ورا گزند
او را سپند و مجمرہ نا ید ہمے بکار ... با روے ہمچو آتش و با خال چون سپند

ولہ

مہتری گر بکام شیر در ست ... تو خطر کن ز کام شیر بجوے
یا بزرگی و ناز و نعمت و جاہ ... یا چو مردانت مرگ رو باروے

نظامی عروضی کی روایت کے موافق مندرجۂ بالا قطعہ نے احمد الخجستانی کے دل مین حکومت و عظمت کی اُمنگ پیدا کی اور صفاریون کے مقابلہ پر آمادہ کیا جسکا نتیجہ یہ ہوا کہ معمولی گدھا ہانکنے والے کے پیشے سے ترقی کرکے تاجدار بن گیا۔

محمود وراق ۲۵۹ھ

نگارینا بنقد جانت ندہم ... گرانی در بہا ارزانت ندہم
گرفتستم بجان دامان وصلت ... نہم جان از کف و دامانت ندہم

فیروز مشرقی متوفی ۲۸۳ھ

مرغیست خدنگ او عجب دیدی ... مرغے کہ شکار او ہمہ جانا
دادہ پر خویش کرگسش ہدیہ ... تا بچہ اش برا برد مہمانا

بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۰) اُردو مین سخندان فارس آزاد و دولت شاہ کے تذکرے زیادہ غیر معتبر ہین اور شعرالعجم شبلی جو فارسی شاعری کی بہترین تاریخ اور محققانہ و مبصرانہ تذکرہ ہے ان سب مین یہ شعر مذکور ہین۔ ناظرین اُن مین ملاحظہ فرما سکتے ہین ۱۲

ابو سلیک گرگانی ۲۹۰ھ

بمژہ دل زمن بزدیدی — اے بلب قاضی وبمژگان دزد
مزد خواہی کہ دل زمن بردی — اے شگفتا کہ دیدہ دزدی و مزد

شہید بلخی

ابرہمے گرید چون عاشقان — باغ ہمے خند د معشوق وار
رعد ہمے نالد مانند من — چونکہ بنالم سحر گاہ زار

ولہ

اگر غم را چو آتش دود بودے — جہان تاریک بودے جاودانہ
درین گیتی سراسر گر بگردی — خردمندے نیابی شادمانہ

رودکی متوفی ۳۲۹ھ

سلطان محمود غزنوی کے دربار کے ملک الشعرا عنصری جیسے جلیل القدر شاعر نے اعتراف کیا ہر کہ غزل مین مجھے رودکی کی ہمسری کی مجال نہین، رودکی کا کلام جو کچھ ہم تک پہنچا ہر عنصری کے قول کی تصدیق کرتا ہر۔ تغزل کا نقش اول ہر۔ ہر بیت مطلع ہر پھر بھی تازگی تشبیہ اور بلندی تخیل سے زور بیت نمایان ہر۔ ملحوظ خاطر رہے کہ آج جو تشبیہات غزل مین فرسودہ اور اس لیے بے مزہ معلوم ہوتی ہین وہ رودکی کے کلام مین اول اول نظم ہوئی ہین۔ لہذا وہ اُس عصر مین کس قدر نظیف و لطیف اور تازہ و شگفتہ ہون گی۔ ذرا ایک ہزار سال کے فاصلہ سے اُسی نظر سے ملاحظہ فرمائیے

بیار آن مے کہ پنداری روان یاقوت نابستے — و یا چون برکشیدہ تیغ پیش آفتابستے
بپاکی گوئی اندر جام مانند گلابستے — بخوشی گوئی اندر دیدۂ بیخواب خوابستے
سحابستے قدح گوئی و مے قطرہ سحابستے — طرب گوئی کہ اندر دل دعائے مستجابستے
اگر مے نیستے یکسرہ دلہا خرابستے — وگر در کالبد جان را ندیدستے شرابستے
اگر این مے بہ ابر اندر بچنگال عقابستے — ازان تا ناکسان ہرگز نخوردندے صوابستے

سلہ ڈاکٹر ایتھے نے اسدی (پسر اسدی طوسی شاعر محمودی) کی لغات الفرس قلمی مولفہ ۴۵۸ھ سے جو دنیا بہ قدیم ترین قلمی فارسی نسخہ سمجھا جاتا ہر اور دوسرے ذرائع سے رودکی کی ۲۴۴ بیتین جمع کی ہین مسلم۔

ولہ

چون کشتہ بینی ام دو لب کردہ فراز — وز جان تہی قالب فرسودہ باز
بر بالینم نشستہ می گوی بناز — کای کشتہ ترا من و پشیمان شدہ باز

شیخ ابو العباس فضل بن عباس معاصر رودکی

پادشاہے گذشت خوب نژاد — پادشاہے نشستہ فرخ زاد
زان گذشتہ زمانیان غمگین — زین نشستہ جہانیان دلشاد
بنگر اکنون بچشم عقل و بگو — ہر چہ بر ما ز ایزد آمد داد
گر چراغے ز پیش ما برداشت — باز شمعے بجائے او بنہاد
ور زحل نحس خویش پیدا کرد — مشتری نیز داد خویش بداد

ایک بادشاہ کی موت کے بعد دوسرے کی تخت نشینی، غم و شادی دونون کا اظہار شاعر نے نا اچھا پیرایہ اختیار کیا ہے اور اس نازک فرض سے کس خوبی سے عہدہ برآ ہوا ہے۔

شیخ ابو زراعہ معماری گرگانی

خراسان کے ایک امیر نے شیخ سے رودکی کے مقابلہ کے شعرون کی فرمائش کی۔ شیخ نے جواب دیا۔

اگر بدولت با رودکی نہ ہم نامم — عجب مکن از رودکی نہ کم دانم
اگر بکوری چشم او بیافت گیتی را — ز بہر گیتی من کور بود نتوانم
ہزار یک زان کو یافت از عطائے ملوک — بمن دہی، سخن آید ہزار چندانم

ولہ

آنجا کہ درم باید دینار بر اندازم — و انجا کہ سخن باید چون موم کنم آہن
چون باد ہمے گردد با باد ہمے گردم — گہ بافتہ دیبا گہ بازرہ و جوشن

ابو اسحاق ابراہیم بن محمد بخاری

ابر نیسان کرد آفتاب تابان را — بسبزہ بنہفت آن لالہ برگ خندان را
بسوے ہر دو ہش برد و شاخ ریحان بود — بشاخ مو دو لے پوست شاخ ریحان را

لہ رودکی نابینا تھا۔ کہتے ہین کہ شعر زیادہ تر بربط بجا کر پڑھا کرتا تھا۔ مسلم

بتے کہ خستہ دلان را ز بوسہ درمان ست — دریغ دارد ازین درد دیدہ درمان را
بابر نیسان مانم کنون من از غم او — سزد کہ صنعت خوبست ابر نیسان را
بیک گذر کہ سحر گاہ بر گلستان کرد — بہشت کرد سراسر ہمہ گلستان را

دقیقی طوسی

اکثر سخن سنجون کا خیال ہو کہ اگر دقیقی اپنے محبوب ترکی غلام کے خنجر سے اپنے کرتوت کی سزا نہ بھگتتا تو آج شاہنامہ کا سہرا فردوسی کے سر کے عوض دقیقی کے سر پر جلوہ نما ہوتا اسکے ایک ہزار شعر کا شاہنامۂ فردوسی مین علی حالہ منقول ہونا فردوسی کی قدردانی و رتبہ شناسی کا بین ثبوت اور بہترین سند ہو۔

کاشکے اندر جہان شب نیستے — تا مرا ہجران آن لب نیستے
زخم عقرب نیستے بر جان من — گر ورا زلف معقرب نیستے
ور نبودے کوکبش در زیر لب — مونسم تا روز کوکب نیستے
ور مرکب نیستے از نیکوئی — جانم از عشقش مرکب نیستے
ور مرا بے یار باید زیستن — زندگانی کاشش یارب نیستے

ولہ

من این جا دیر ماندم خوار گشتم — عزیز از ماندن دایم شود خوار
چو آب اندر شمر بسیار ماند — عفونت گیرد از آرام بسیار

ولہ در مدح جام بر خاب - چہ خوش گفت!

نگہ کن آب و یخ در آبگینہ — فروزان ہر سہ ہمچو شمع روشن
گداز یدہ دو تا یکتا فسردہ — بیک لون ای سہ گوہر زین ملون

ولہ

دقیقی چار خصلت برگزیدہ است — بگیتی از ہمہ خوبی و زشتی
لب یاقوت رنگ و نالۂ چنگ — مے خوشرنگ و کیش زردہشتی

ہمارے علماے اسلام کثرت تکفیر کے لیے بدنام ہین، لیکن آج کل علماے یورپ اس ہنر مین

بھی ہمارے علما پر سبقت لے گئے ہین - چنانچہ ڈاکٹر ایتھے، نولدیکے، ہورن (جرمن) نے مندرجۂ بالا قطعہ کی بنا پر دقیقی کو زردشتی قرار دیکر تاریخ اسلام سے ایک ممتاز فرد کو جدا کر لینے کا حظ حاصل کیا ہی کیش زردشتی سے محض میگساری مراد ہی، عہد اسلام مین مجوسیون کے سوا کسی کو شراب فروشی کی اجازت نہ تھی- مجوسیت میفروشی اور بادہ گساری قریب المعنی الفاظ تھے - پیر مغان اور مغ بچہ آج تک اسی معنی مین بندھتے چلے آتے ہین - دقیقی کی مجوسیت کو مین ناممکن نہین سمجھتا مگر اِس قطعہ کی بنا پر یہ فتوی مضحکہ انگیز ہی

منصور منطقی رازی

دربار دیلم کے مشہور علم پرور وزیر صاحب اسمعیل بن عباد کی مدح کے قصیدے کے چند شعر ہین-

مہِ گردون گمر بیار گشت است — بنالید و شبش بگرفت نقصان
سپر کردار و سیمین بود اکنون — برآمد بر فلک چون نوک مژگان
تو گفتی خنگ صاحب تاختی کرد — فگند این نعل زرین در بیابان

ابو منصور عمارہ مروزی متوفی ۳۶۵ھ

جام شراب کی صفت مین یہ قطعہ کہا ہی-

آتش اگر ندیدی باآب ممتزج — اینک نگاہ کن تو بدین جام و این شراب
جامِ بلور و لعل مے صاف اندرو — گوئی کہ آتشے ست برآمیخت آب

محمد مسلم ایم اے - ایم او ایل

غازی ز پے شہادت اندر تگ و پوست
غافل کہ شہیدِ عشق فاضل تر ازوست
در روز قیامت این بآن کے ماند
این کشتۂ دشمن ست و آن کشتۂ دوست

(ابو سعید اشرف)

اہل قلم کی قدر و قیمت

مغرب اور مشرق مین

مغرب کا مقابلہ مشرق کسی بات مین بھی کرنے کی استطاعت نہین رکھتا - یہ بات اور ہی ہے کہ ہم اپنے کو یورپ والون سے برتر اور بہتر تصور کرین - اور باتون سے قطع نظر صرف اس امر پر غور فرمایئے کہ اہل قلم کی یورپ اور امریکہ مین کیا قدر ہی - اور یہ کہ ہندوستان مین اس کی کیا حالت ہی - اس امر پر خصوصیت سے زور دینا فضول ہی - کہ قومی ترقی اور تمدنی شوکت مین تصنیف و تالیف کا کیا دخل ہی - یہ امر بلا شبہ مسلم ہی کہ قومون کی ترقی اور ملکون کی اقبال مندی کا دار و مدار اہل قلم کے دماغ کی بہترین اپج اور اہل فکر کی پرواز خیال پر ہوتا ہی - اسے تسلیم کرنے مین کسی سمجھدار کو تامل نہین ہو سکتا کہ دنیا مین خیال کی حکومت سب سے زبردست اور ہمہ گیر ہی - اس کے دائرۂ اثر سے کسی کو گریز نہین ہی - اس کے اقتدار کے سامنے سب کا سر خم ہے - اس کا لوہا ہر فرد بشر مانتا ہی - تخیل افراد کو ابھارتا اور راہ ترقی مین تیز گامی کی تحریک دیتا ہی - تخیل وہ قوت محرکہ ہی جس سے قومون کو اپنی حالت سدھارنے کی طاقت بہم پہنچتی ہی - یہ ایک خیال تھا جو امریکہ کی خانہ جنگی کا محرک ہوا - اس سے کئی لاکھ جانین بالواسطہ یا بلا واسطہ تلف ہوئین - اور اربون روپے کا مال برباد ہوا - مگر ستر اسی لاکھ بنی آدم جن سے جانورون کا سا سلوک ہوتا تھا - شرف و استحقاق انسانیت سے دوچار ہوئے - اور انھون نے اپنا وہ کھویا ہوا ورثہ پایا - جس سے وہ اپنی نادانی سے سیون برس پہلے محروم ہو چکے تھے - مگر اس خیال لطیفہ کی بانی ایک گمنام مگر فرشتہ خصلت عورت کی تصنیف "انکل ٹامس کے بن" (چچا سام کی جھونپڑی) تھی.
نپولین اعظم کی شوکت کی بنیاد ایک شخص کی تصانیف سے پڑی تھی - بلکہ یون کہنا چاہیے کہ انقلاب فرانس کی تحریک کے سامان ایک مصنف کی دو کتابون سے بہم پہنچے تھے جس سے کئی برس تک خانہ جنگی رہی - اور لاکھون انسانون نے اپنی جانون سے قبل از وقت رخصت حاصل کی تھی. مگر اس سے یورپ مین شخصی آزادی اور جمہوریت کے اقتدار کی بنیاد پڑ گئی - اور نپولین اعظم کی

شوکت و عظمت کے لیے میدان صاف ہو گیا۔ ۱۸۰۶ء مین نپولین کے معرکۂ عظیم واقعہ جینیہ مین فریڈرک اعظم کی لاثانی شوکت خاک مین ملا دی گئی۔ اور پرشیا کی عظمت کے نشانات نیست و نابود ہو گئے لیکن اِس رسوائی اور ذلت کا احساس جن دلون مین پیدا ہوا تھا اُنھون نے ایسے طریقہ سے اُن کا اعلان کیا۔ کہ ہر کس و ناکس کے سینہ مین قومیت کا طوفان اُمنڈ آیا جس سے نصف صدی مین پرشیا نے وہ عروج حاصل کیا کہ جو فریڈرک اعظم کے شاندار خواب کی بلند ترین پرواز مین کبھی نہ آیا ہوگا۔ قصّہ کوتاہ خیالات کی حکومت سب سے زبردست ہے۔ ان کی بدولت قومون کی ترقی اور عظمت کی بنیاد قائم ہوتی ہی۔ جو باتین انسان کو دل و جان سے عزیز ہین اور جن کی خاطر وہ جان شیرین کی بھی پروا نہین کرتا۔ اسی بےنظیر وسیلہ سے نصیب ہوتی ہین۔

اِس مختصر بحث کا نتیجہ یہ ہی کہ جس تناسب سے ان خیالات کی قدر و قیمت افراد قوم کرتے ہین اسی نسبت سے ان کی ترقی کے مدارج قائم ہوتے ہین۔ اب اصل مضمون کی طرف رجوع ہونا ضروری ہی۔ اہل قلم جو خیالات کے بانی اور محرک ہوتے ہین۔ اُن کی قدر ہمارے ہان جیسی ہے اُس کے بیان کرنے کی ہم کو چندان ضرورت نہین ہی۔ ہان مغرب مین اُس کی جو کیفیت اب ہے اس کا اجمالی تذکرہ خالی از لطف و استفادہ نہ ہوگا۔ پچھلے سال جون جولائی مین ولایت سے اِس مضمون کی خبر آئی تھی کہ مسٹر لائڈ جارج وزیر اعظم برطانیہ سے بعض لوگون نے جو کتابین شایع کرنے کے لیے خاص شہرت رکھتے ہین۔ اِس قسم کی درخواست کی ہی کہ وہ اگر گذشتہ سات آٹھ سال کے حالات بالخصوص جنگ اعظم کی ابتدا اور ترقی اور انتہا اور زیر متعلقہ معاملات پر روشنی ڈالنے کی کوشش کرین گے تو ان کی اِس تصنیف کا نذرانہ نوے ہزار پونڈ یعنی ساڑھے تیرہ لاکھ روپیہ ملے گا۔ اہل الرائے نے یہ تخمینہ کیا تھا کہ موصوف کو پندرہ روپے فی لفظ حق المحنت ملے گا جس کے مساوی اِس سے پیشتر کسی مصنف کو نصیب نہ ہوا تھا۔ یہ کمال تصنیف لاثانی ہی۔ اِس کے متعلق یہ امر بھی قابل لحاظ ہے کہ مسٹر لائڈ جارج دنیا کے مدبرون مین بےنظیر حیثیت رکھتے ہین۔ ممدوح کی شخصیت کو تصنیف محولۂ بالا اور نیز لاثانی معاوضہ سے خاص لگاؤ ہی۔

مسٹر لائڈ جارج سے دوسرے درجہ پر مسٹر ونسٹن چرچل کی معرکۃ الآرا تصنیف "سیکرٹ ہسٹری آف دی وار" (جنگ اعظم کی تاریخ مخفی)، ہی جو ماہ جنوری سے ٹائمز مین طبع ہو رہی ہی۔ اِس کے جملہ حقوق

حاصل کرنے کے لیے پچاس ہزار پونڈ یعنی ساڑھے سات لاکھ روپیہ حق المحنت ادا کیا گیا ہو۔ صاحب موصوف نہ صرف مقتدر مدبر ہی ہین۔ بلکہ قلم کے بھی دھنی ہین۔ کئی برس ہوے کہ اُنھون نے جنگ بوئران کے چشم دید حالات بحیثیت وقایع نگار لکھکر بڑی شہرت حاصل کی تھی۔ لیکن سب سے زیادہ نیکنامی انھین اپنے والد گرامی قدر لارڈ چرچل کے سوانحی حالات لکھنے سے نصیب ہوئی تھی۔ قیصر ولیم سابق شہنشاہ جرمنی کا درجہ تیسرا ہو۔ اپنی زندگی کے حالات قلم بند کرنیکے لیے اُن کو چالیس ہزار پونڈ یعنی چھ لاکھ روپیہ نذرانہ ملا تھا۔ سابق وزیر اعظم برطانیہ سے دوسرے درجہ پر اس عورت کو رقم عظیم امریکہ کے کتب فروشون کیطرف سے وعدہ ہوئی تھی جو فرانسس جوزف شہنشاہ آسٹریا کی اہل خانہ سمجھی جاتی ہو۔ کتب فروشون نے دس لاکھ روپیے دینے کا وعدہ کرکے اُس سے یہ استدعا کی تھی کہ اپنے اور مرحوم تاجدار آسٹریا کے حالات حوالۂ قلم کیے جائین۔ مگر برطانیہ کے مدبرون مین سب سے زیادہ قلم کے دھنی مسٹر اسکویتھ سابق وزیر اعظم برطانیہ ہین جو جنگ اعظم کے وقت لبرل گورنمنٹ کے لیڈر رہے۔ اور اصل حالات کے ماہر ہین۔ لیکن مسز اسکویتھ کو اپنے روزنامچہ کے لیے تین لاکھ روپے وصول ہوے ہین۔ جرمنی کے ممتاز ماہران جنگ ہنڈن برگ اور لڈن ڈوراف کو دس اور بارہ ہزار پونڈ علی الترتیب جنگی تصانیف کے لیے ملے۔ لارڈ مکالے کو اپنی تاریخ انگلستان کے لیے بیس ہزار پونڈ یعنی تین لاکھ روپیہ نذرانہ لانگ مین کمپنی نے دیا تھا۔ دس ہفتے مین ساڑھے (۲۶) ہزار جلدین اس ضخیم کتاب کی فروخت ہوگئی تھین لارڈ مارلے نہایت مشہور اہل قلم مدبر اور فلاسفر ہین آپ کو گلیڈ اسٹون کی زندگی کے حالات مرتب کرنے کے لیے ڈیڑھ لاکھ روپیہ معاوضہ ملا تھا۔ لارڈ رابرٹس آنجہانی کو اپنے تجربات ہند کی تصنیف کے لیے بھی ڈیڑھ لاکھ روپیہ محنتانہ دیا گیا تھا۔ پرنس رنجیت سنگھ (مہاراجہ نوانگر) کو "جوبلی بک آف کرکٹ" کے لیے ساٹھ ہزار روپیہ بلیک وڈ کمپنی نے معاوضہ نفرز کیا تھا۔

فی زمانہ قصہ نویسون اور ناول تصنیف کرنیوالون کو سب سے زیادہ معاوضہ ملتا ہو۔ وجہ یہ ہو کہ ناولون کی قدر سب سے زیادہ ہو۔ ہر کس و ناکس اُن کا شیدا ہوتا ہو۔ اس وجہ سے ناول شایع کرنے والے دھڑا دھڑ روپیہ کماتے ہین۔ برخلاف اس کے علمی کتابون کی قدر ایک محدود دائرہ کے اندر ہوتی ہو۔ اس وجہ سے اُن کی اشاعت بھی محدود رہتی ہو۔ اور حق المحنت بھی اُسی نسبت سے دیا جاتا ہو۔ جارج ماریڈتھ کو ڈریل پی کا تین لاکھ روپیہ معاوضہ ملا تھا اور ہچنسن کو "اگر جاڑا آے"

لکھنے کے لیے ستر ہزار پونڈ مل چکے ہین۔ یہ کتاب پچھلے سال شایع ہوئی تھی۔ مگر ہاتھوں ہاتھ لاکھون جلدین فروخت ہو چکی ہین۔ اگر اسے بائیسکوپ مین نمایان کیا گیا۔ یا ڈرامہ مین ڈھالا گیا۔ تو کئی لاکھ روپیہ اور ملے گا۔ گویا بجنس مسٹر لائڈ جارج سے بھی بڑھ گیا ہی۔ امریکہ کے غیر فانی ظریف مصنف کو اپنی کتابون سے ڈھائی لاکھ پونڈ یعنی ساڑھے (۳۷) لاکھ روپے وصول ہوے تھے۔ امریکہ کے مشہور مصنف جنرل والس کو اپنی غیر فانی تصنیف "بن ہور" کے لیے اسی ہزار پونڈ یعنی بارہ لاکھ روپیہ وصول ہوے تھے۔ فرانس کے مصنفون مین دآد کو چالیس ہزار پونڈ ایک ناول کے لیے اور روکٹر ہیوگو کو "دل آویز ناول "لے مازرابل" کے لیے سولہ ہزار پونڈ دیے گئے تھے۔ بنجمن ڈسرائلی کو "ان ڈمنٹن" کے لیے دس ہزار پونڈ اور جارج ایلیٹ کو "اموکہ" کے لیے سات ہزار پونڈ اور ولکی کالینس کو "ارم ڈیل" کے لیے پانچ ہزار پونڈ۔ سروالٹر اسکاٹ برسون تک ناول لکھ لکھ کے پندرہ ہزار پونڈ سالانہ کماتا رہا۔ جو اُس زمانے کے اعتبار سے بالکل لاثانی ہی۔ اور اِسی وسیلے سے اِس نے اپنا وہ قرضہ ادا کیا تھا جو کتب فروش کمپنی کے دیوالے سے اُس کے حصے مین آیا تھا۔ سر والٹر اسکاٹ کو نپولین کے سوانحی حالات لکھنے کے واسطے بیس ہزار پونڈ ملے تھے۔ اگر چارلس ڈکنس زندہ رہتا تو اُسے "ایڈون ڈرووڈ" کے لیے نو ہزار پونڈ ملتے۔ اِس سے ظاہر ہی کہ ناولون کی کیسی اعلیٰ قدر ہی۔ اور اچھا۔ قابل قدر۔ دل چسپ ناول تصنیف کرنے کے لیے کیسا بھاری نذرانہ ملتا ہی!

شاید آپ یہ سوال پوچھین گے کہ اتنا بھاری معاوضہ کیون دیا جاتا ہی؟ اہل قلم کو بھاری بھاری نذرانے کیون دیے جاتے ہین؟

یہ سوال واقعی دلچسپ اور غور طلب ہی۔ اس کے جواب مین دو تین ضروری باتون کا تذکرہ غیر مناسب نہ ہوگا۔ اول تو تعلیم عام ہی۔ ہر ایک آدمی پڑھ لکھ سکتا ہی۔ چھکڑے اور گاڑی چلانے والے۔ موٹا کام کرنے اور نوکری ڈھونے والے اپنے خطوط آپ لکھتے ہین۔ تعلیم کا رواج عام ہونے کے ساتھ ہی لوگون مین کتب خوانی کا عام شوق ہی۔ وہان ہر ایک آدمی اِسی فکر مین مبتلا پایا جاتا ہی کہ اپنی فرصت کا وقت کسی مفید مشغلہ مین صرف کرے۔ مگر یہ بھی قاعدہ سے کیا جاتا ہی۔ اگر چھ گھنٹے دفتر یا آٹھ دس گھنٹے کارخانے مین کام کیا جاتا ہی تو گھر واپس آنے یا کسی کلب مین جانے مین تفریح حاصل کرنے کی کوشش کی جاتی ہی۔ دوم عوام کے خیالات اور عادات بھی ہم سے مختلف ہین جہان اور باتون کے خرچ کا تخمینہ

کیا جاتا ہی۔ وہان اخبارون اور کتابون کے لیے بھی رقم خاص علحدہ کی جاتی ہی۔ کپڑے تفریح اور دیگر ضروریات مین اخبار اور کتابین بھی شامل ہین۔ سوم۔ عوام اپنا اخبار خریدنے اور پڑھنے کو اپنی خودداری کا جزو لازمی سمجھتے ہین۔ جب کوئی آدمی اپنا اخبار یا کتاب پڑھتا ہو تو اُسے آگے بڑھ کر دیکھنا یا ورق کھینچکر پڑھنے مین مصروف ہوجانا بہت معیوب سمجھا جاتا ہی۔ ہان یہ اور بات ہی کہ دو آدمی دو مختلف اخبارات یا کتابین ایک دوسرے سے پڑھنے کے بعد تبادلہ کر لین۔ مگر یہ بات خاص رسم معذرت اور اظہار تاسف کے ساتھ کی جاتی ہی۔ جب یہ کیفیت ہو۔ تو اخبارات کی لاکھون کی اشاعت اور اہل قلم کے بھاری معاوضے معمولی بات ہی۔ عوام قدردان ہین۔ کتب فروش تاجرانہ اصول پر کتابون کی طباعت اور فروخت کا کام کرتے اور معقول منافع کماتے ہین۔ برخلاف اس کے ہمارے ہان اول تو خواندگی عام نہین ہی اور جو لوگ پڑھے لکھے ہین۔ وہ اپنا اخبار یا کتاب خریدکر پڑھنا ہی پسند نہین کرتے۔ اگر کوئی آدمی کتب بینی کے بیحد شوق سے مجبور ہوکر ایسا کرے۔ تو پاس پڑوس کے سبھی اُس کے پاس جمع ہوجاتے ہین دیہات مین تو یہی دیکھنے مین آتا ہی۔ کہ اگر ایک آدمی کوئی کتاب یا رسالہ خریدتا ہی تو دو دو میل سے شوقین پڑھنے کو آتے ہین۔ گو خود روپیہ خرچ کر سکتے ہین۔ مگر عموماً یہ خیال کرتے ہین "جب مُفت مین پڑھنے کو مل جائے تو روپیہ کون خرچ کرے"۔ اس سے آپ بیقدری اور بدشوقی کا اندازہ کر سکتے ہین ملٹن کو اپنی لاثانی منظوم تصنیف کا دو پونڈ معاوضہ ملا تھا۔ اور گولڈ اسمتھ کو "وکر آف ویک فیلڈ" کے پانچ پونڈ ملے تھے۔ اِس لحاظ سے ہندوستان مین اہل قلم کی اب وہی قدر ہی جو انگلستان مین اب سے ڈیڑھ سو برس پہلے تھی۔ جب تمدن اور علم کی یہ قدر ہو تو ہم ترقی کیسے کرین! نہ تو پولیٹیکل ترقی ممکن ہی۔ اور نہ اقتصادی پیش قدمی کا امکان ہی!

جے۔ آر۔ رائے

دردِ ارباب ہنر را چارہ کردن مشکل ست
صاف نتوان کرد آب گوہر نا صاف را
از جہان بے چشم بستن کے شود راحت نصیب
از تا باشد نہ بیند دیدہ روئے خواب را

نونہالون کی موت

قدرت نے لگایا ہے اک باغِ طرب افزا
میوون سے لدی شاخین ہین جھومتی یان ہر جا
پودون مین وہ سرسبزی قدرت نے عیان کی ہے
جس پر کہ نظر پڑتی سب اہلِ جہان کی ہے
ناگاہ فرشتہ اک ہوتا ہے یہان داخل
جس طرح کسی گھر مین ہو سیلِ روان داخل
خون اُس کی نگاہون سے ہر لحظہ ٹپکتا ہے
ہے ہاتھ مین جو چاقو بجلی سا چمکتا ہے
سب کاٹتا اک دم وہ سرسبز نہالون کو
رحم اُن پہ نہ کیون آئے سب دیکھنے والون کو
میوون سے لدی شاخین پودون سے جدا کرکے
لے جاتا ہے اور خوش ہے یہ جور و جفا کرکے

اِک دن یہ فرشتے نے سوچا کہ مرا چاقو
میوون کے درختون کے کرتا ہے جدا بازو
پتون سے مگر چھپ کر جو پھُول سے سکتے ہین
پھندے سے مرے بچ کر کیا کیا نہ تھرکتے ہین
یہ سچ ہے کہ حسن اِن پر اِک نور ہے برساتا
جب سانس یہ لیتے ہین گلشن ہی مہک جاتا

پھولون ہی کے دم سے ہے اِس باغ کی آبادی
گاتے ہین مگن ہو کر یہ نغمۂ آزادی
شبنم کے مگر آنسو ہر صبح بہاتے ہین
چاک اپنے گریبان کا گلچین کو دکھاتے ہین
لازم ہے کہ پاس اس کے مین جاؤن انھین لیکر
یہ جس کی جدائی مین رہتے ہین سدا مضطر

یہ کہہ کے فرشتے نے غنچون پہ نظر ڈالی
افسوس کیا لیکن دل رحم سے تھا خالی
مُنھ بند جو تھین کلیان چاقو سے اُنھین کاٹا
دیکھا اس کی بیدردی تھا باغ مین سناٹا
دامن مین سمیٹا اُس نے غنچے وہ لیے سارے
پھر ہنس کے کہا:- کیون ہین افسردہ یہ بیچارے
لے جاؤن گا مین ان کو مالک کی حضوری مین
ہر صبح یہ روتے ہین جس کے غم دوری مین
ہین غنچہ و گل اُس کے ہین اُس کے چمن سارے
اُلفت مین اُسی کی ہین پودے یہ مگن سارے
پھولون کا ہر اک پودا خوش ہو گا وہان جاکر
پھولین گے پھلین گے سب جنت کی ہوا پاکر
جب ڈوب کے اُبھرینگے یہ دودھ کی نہرون مین
پھول ان کے نہائین گے سب نور کی لہرون مین
جنت مین جو ہین روشین پاکیزہ و نورانی
ہین پھول بھی جن سے زینت ہے انھین پانی

کہتے ہین یہ فرشتہ ہے — یہ موت کا پیغامی
پھولون کو جو کرتا ہے — پامال بدانجامی
سرسبز نہالون کو — جو کاٹتا پھرتا ہے
اک برق بلا بنکر — جو باغ پہ گرتا ہے
ہے توڑتا آفت یہ — کھیتون پہ کسانون پر
بے درد ہے نام اس کا — دنیا کی زبانون پر

یہ سچ ہے مگر جن کو — تھوڑی سی بصیرت ہو
یہ اُن کی نگاہون مین — اک قاصدِ رحمت ہے
یہ کاٹ کے جو پودے — اس باغ سے ہے لیتا
فردوس کے باغون مین — ہے سب کو لگا دیتا
پروان چڑھین گے یہ — جنت کی ہواؤن سے
خوراک یہ سب لین گے — رحمت کی فضاؤن سے

کچھ روز مہکتے یہ — دنیا مین اگر رہتے
آتی جو خزان ان پر — پھر اُس کی جفا سہتے
جنت مین مگر ان پر — برسے گا سدا جوبن
کر سکتی نہین ان سے — کچھ بادِ خزان اَن بن
یان لایق عبرت ہے — ہستی ہے جو آج اِن کی
مالک کی نظر مین وان — بڑھ جائے گی لاج اِن کی

وحیدالدین سلیم

از قعر گل سیاه تا اوج زحل — کردم همه مشکلات عالم را حل
بیرون جستم ز قید هر مکر و حیل — هر بند گشوده شد مگر بند اجل

(بوعلی سینا)

نکولو میکیولی اور اس کا فلسفہ

یونان کے مایۂ ناز حکما افلاطون و ارسطا طالیس کے بعد جن کی شہرۂ آفاق تصانیف نے فلسفہ سیاسیات کی بنیاد ڈالی، اس فن سے بحیثیت ایک مستقل علم کے بحث کرنیوالون مین کسی شخص کو اس قدر شہرت حاصل نہین ہوئی، جتنی سرزمین اطالیا کے ایک محب وطن نکولو میکیولی کو۔ اگرچہ اس نے مختلف مباحث پر بہت سی کتابین چھوڑی ہین۔ ناول، ڈراما، سیاسی مراسلات اور ذاتی خطوط۔ غرضکہ لٹریچر کی کوئی شاخ ایسی نہین ہے جو اُس کے رشحات دماغ سے بارآور نہوئی ہو۔ لیکن حیرت افزا امر یہ ہے کہ اسکی شہرت اور بقائے دوام کا باعث ایک چھوٹا سا رسالہ ہے جس کو خود اُس نے کبھی کوئی اہمیت نہین دی اور جسمین بقول ڈیوڈ ہوم کے کوئی ایسا مسئلہ نہین ہے جس کو ہر شخص نہ جانتا ہو۔

میکیولی ۳ مئی ۱۴۶۹ء کو فلارنس مین پیدا ہوا اور ۱۵۲۷ء مین اُس نے انتقال کیا چودہ برس سے زیادہ وہ جماعت صلح و آزادی کا امین خاص رہا۔ یہ جماعت فلارنس کے تمام فوجی و ملکی معاملات کی نگران و محافظ تھی۔ داخلی و خارجی انتظامات و معاملات کے متعلق جسقدر خط و کتابت ہوتی تھی۔ وہ میکیولی کیا کرتا تھا اور یہ فرائض اُس نے اس قدر خوبی کے ساتھ انجام دیے کہ اُس کے سیاسی تجربات سے فائدہ اُٹھانے کی غرض سے اُس کو کم از کم ۳۵ سفارتہاے خارجیہ پر مامور کر کے بھیجا گیا اور جمہوریہ فلارنس کے ماتحت جو ریاستین تھین اُن کے تصفیہ طلب معاملات کا فیصلہ اور عہدنامہ جات کی ترتیب اُس کے توسط سے ہوا کرتی تھی۔ اُس کے سیاسی مراسلات جو ۱۷۶۷ء مین پہلی مرتبہ شایع ہوے نہایت دلچسپ اور بیش قیمت معلومات سے لبریز ہین۔ اُس کی سیاسی زندگی کا زمانہ ملک اٹلی کی تاریخ کا زرد تاریک دور ہے جبکہ ملک بیرونی دشمنون کی باہمی رقابت اور ہنگامہ آرائیون کا دنگل بنا ہوا تھا۔ فرانس اسپین اور مقدس سلطنت روم کے۔ فرمانروایان سبزہ زار گلستان کی سرزمین پر جنگ آزمائی کیا کرتے تھے تمام ملک چند خود مختار ریاستون مین بٹا ہوا تھا اور اُن مین باہمی کوئی رشتہ یگانگت یا موانست نہین تھا۔ بعض حصے فرانس ہسپانیہ اور آسٹریا کے زیر تسلط تھے۔ غرضکہ ملک اُس وقت علمی سیاسی اور قومی انحطاط کے اُس دور سے گذر رہا تھا۔ جبکہ افراد قوم مین جذبۂ وطنیت، یا احساس قومی بالکل مردہ ہو جاتے ہین اور

اعلیٰ مقاصد و بلند مطامح کے حصول تک پہنچنے سے پہلے اُن کی نسبت اُن آنکھوں میں خیرگی پیدا ہوجاتی ہی۔ اِس زمانہ میں اُس کو دومرتبہ سیزر بورجیا (Cesare Borgia) کی خدمت میں باریابی حاصل ہوئی جن لوگوں کو پاپائے روم کی پاپس زندگی اور تقدس و روحانیت کے پردہ میں نہایت مکروہ اور شنیع افعال کے ارتکاب کا پتہ ہی وہ شاید اس ... شیطان سیرت انسان کے محیر العقول کارناموں کو سُن کر اور اُس کی انسانی جذبات سے یکسر معرا زندگی کا حال سُن کر انگشت بدندان نہ ہوں۔ اس لیے کہ اُن کو معلوم ہی کہ جن تاثرات کے ماتحت اُس کی نشو و نما ہوئی تھی اُن کا لازمی نتیجہ ایسی ناپاک و مکروہ ہستیوں کا عرصۂ وجود میں آنا تھا۔ لیکن جو لوگ یورپ کے ازمنہ وسطیٰ کی تاریخ کا سطحی مطالعہ کرنے سے قبل رینالڈز کے مشہور ناول رومان اوسٹ کو پڑھتے ہیں اُن کے دل پر الگزنڈر بورجیا سیزر بورجیا اور لوکریزیا کے کارناموں کا جو بہت گہرا اثر پڑتا ہی وہ ناقابل بیان ہی اُن کو یہ تمیز کرنا مشکل ہوتا ہی کہ امن و عافیت دنیا اور انسان کی روحانی مسرت و اطمینان قلب کے لیے شیطان کا وجود زیادہ خطرناک ہی یا اس خاندان کا جس کا ہر فرد ... شیطانی صفات طاغوتی کا ایک مجسم نمونہ نظر آتا ہی اول موقع ملاقات کا وہ تھا جب بورجیا نے اپنی بے مثال بے ایمانی کی مدد سے ایک عظیم الشان کامیابی حاصل کی تھی اور اپنے تمام حریفوں کو ایک ہی دم میں گرفتار کر کے ایک ہی جھٹکے میں موت کے گھاٹ اُتار دیا تھا دوسری ملاقات اُس وقت ہوئی تھی جب وہ بیماریوں سے تباہ و خستہ حال ہو کر اور ناکامیوں اور نامرادیوں سے عاجز آکر اپنے خاندان کے سب سے زبردست دشمن کے چنگل میں پھنس گیا تھا اپنے مراسلات میں میکیولی نے یہ واقعات بالتفصیل درج کیے ہیں بعض لوگوں کا خیال ہی کہ اِن دونوں شخصوں میں گہری دوستی و موافقت تھی اور میکیولی کے سر یہ الزام تھوپا جاتا ہی کہ اس بے رحم اور شقی القلب ظالم کے افعال شنیعہ اور حرکات مذمومہ کا محرک وہ ہوا کرتا تھا لیکن سرکاری کاغذات کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہی کہ اُن کی ملاقاتیں اور مشورے اگرچہ بظاہر اتفاق و مراسم دوستانہ پر مبنی نظر آتے تھے۔ لیکن حقیقت میں وہ معاندانہ و مخالفانہ پہلو لیے ہوئے تھے مگر اسمیں شک نہیں کہ میکیولی کے دماغ نے اِن صحبتوں کا بہت اثر قبول کیا اور یہ تو ایک قدرتی بات تھی کہ حکومت و طریقۂ حکومت کے متعلق اسکے خیالات ایک ایسے شخص کی رائے کا عکس ہوں جس نے نہایت مخالف حالات و اسباب کے مقابلہ میں درخشاں کامیابیاں حاصل کیں۔ سیزر بورجیا وہ شخص تھا جسکے قوائے دماغی کو جب خواہشات

نفسانی وغلبۂ شہوت سے تحریص وتحریک نہین ہوسکتی تھی تو حصول سلطنت اور دشمنون سے انتقام لینے کے عزم سے وہ اپنی بے چین طبیعت کو آمادہ کار بناتا تھا۔ وہ پہلا شخص تھا جو کلیسائے رومہ کے پرعیش اور قوائے عمل کو شل کر دینے والے ماحولات سے نکل کر بادشاہ اور جنرل ہوا۔ اپنے حیرت انگیز مکروفریب سے دشمنون کو تباہ کرکے سلطنت حاصل کی اور پھر ان ہی لوگون کو جو اسکے حصول مقصد کا آلہ بنے تھے تباہ کرکے بدنامی کے داغ کو دُھونا چاہا۔ اور نیکنامی حاصل کرنے کی کوشش کی۔ اُس کے بعض نہایت مکروہ وشنیع افعال کے متعلق اپنا فیصلہ صادر کرتے وقت ہم کو یہ خیال ضرور رکھنا چاہیے کہ وہ پندرھوین صدی کا ایک اطالوی تھا اور اُس زمانہ مین اُسکے جرائم اُس معیار اخلاق سے نہین جانچے جاتے تھے جس پر وہ اب پرکھے جاتے ہین اُس کی موت پر جو میکیولی نے افسوس کیا ہو وہ ممکن ہو کہ جذبات حب الوطنی پر مبنی ہو جنھون نے اُس کو ایک ایسے شخص کی موت پر اظہار حسرت وغم کرنے پر آمادہ کیا ہو، جو ملک اطالیا کی خودمختاری کو قائم رکھنے اور اغیار کی دستبرد سے بچانے کا اہل تھا اور اُن لوگون کا مقابلہ کرسکتا تھا جو اُس کے ملک کے حصہ بخرے کرنے پر تُلے ہوے تھے۔

اپنے ملک کی حفاظت مین میکیولی نے بھی اپنے مقدور بھر حصہ لیا ملک کی بربادی اور کمزوری کے اسباب اور اُن کا دفعیہ اُس نے اچھی طرح سمجھ لیا وہ اس نتیجہ پر پہنچا کہ نظام فوجی کی خرابی اور بے ترتیبی نے اطالیون کو یہ روز بد دکھایا ہو کہ ملک خودمختاری سے ہاتھ دُھو بیٹھا ہے اور اجانب کی حرص وآز کا شکار ہو رہا ہو اُس نے کرایہ کی فوجون سے لڑنے کا طریقہ جو ملک مین عام ہو رہا تھا بالکل منسوخ کر دیا اور ایک قومی فوج قائم کی۔ اس مقصد کے لیے فن جنگ کا بغور مطالعہ کیا اور اُسکے تمام اصول اور جزئیات پر بخوبی حاوی ہو گیا۔ اُس کی یہ کوششین جو دانشمندی اور جوش حب الوطنی پر مبنی تھین بہت کچھ مفید ثابت ہوئین۔ لیکن اٹلی اُس وقت ایک طرف تو بیرونی خطرات سے گھرا ہوا تھا اور دوسری طرف سیاسی جتھہ بندی اور اتحاد عمل کے فقدان نے اندرونی خدشات پیدا کر دیے تھے چنانچہ وہ اپنی اسکیم کو پورے طور سے عملی جامہ پہنا بھی نہین سکا تھا کہ ۱۵۱۲ء مین فلارنس کی جمہوری سلطنت کا چراغ گل ہو گیا اور پوپ اور امیر کی مدد سے میڈی سی (MEDICI) شخصی حکومت قائم ہو گئی میکیولی کی تکالیف ومصائب کا دور اب شروع ہوا اُس کے تمام مناصب اُس سے چھین لیے گئے اور بالآخر فلارنس سے نکل جانے کا اُس کو حکم دیا گیا۔

اِس طرح اُس کی سیاسی زندگی کا خاتمہ ہوا۔ اب اُس نے اپنے وطنی گاؤن مین سکونت پذیر ہوکر اس جبریہ فرصت کو مطالعہ و تالیف مین صرف کیا اگرچہ اُس کو حکومت کی جانب سے سخت اذیتین دی گئین یہانتک کہ ایک سازش مین شرکت کے جُرم مین اُسکو داخل محبس بھی کیا گیا لیکن ان تمام مصائب کو میکیولی نے نہایت صبر و استقلال سے برداشت کیا۔ چنانچہ وہ خود کہتا ہے ”قریب تھا کہ مین اپنی زندگی کو خیرباد کہدیتا لیکن خدا نے اور میری بیگناہی نے مجھکو بچایا مین نے قید اور دیگر مشکلات کا مردانہ وار مقابلہ کیا“ اِن واقعات سے اُسکی غیرمعمولی شجاعت و شہامت اور عدیم النظیر ثبات و استقلال کا اندازہ ہو سکتا ہے یاس وناامیدی سے گھبرانے کے بجائے اُس نے اپنی قسمت کو مطالعہ کتب و تعلیمی شغف سے بلند کرنے کا ارادہ کیا۔

اکثر اُس کو علما و فضلا سے اپنے مسودات کے متعلق بحث کرنے اور مشورہ لینے کا بھی موقع مل جاتا تھا اپنی عمر کے آخری زمانہ مین اُس نے حکمران فلارنس سے مصالحت کرلی اور جلاوطنی کی مدت ختم کرکے فلارنس واپس آیا اور یہان کی تاریخ ترتیب دینے مین مصروف ہو گیا اپنی ملازمت اور سیاسی مصروفیتون کے دوران مین اور مختلف ممالک مین سفرا کی حیثیت مین کام کرنے کی وجہ سے اُس کو جو مفید معلومات و تجربات یورپ کی سیاسی و معاشرتی حالات کے متعلق حاصل ہوے تھے اُن سے اپنی تصنیفات مین اُس کو بہت مدد ملی۔ ان واقعات اور حالات سے اُس نے جو فلسفیانہ نتائج مستنبط کیے ہین اُن سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کی معلومات و مشاہدات بہت وسیع و غائر تھے بخلاف اکثر لوگون کے جو اپنے علم و مطالعہ سے تجربات حاصل کرنے مین مدد لیتے ہین، میکیولی نے اپنی مفید اور وسیع تجربات و مشاہدات سے اپنی تصانیف مین مدد لی۔

ملازمت سے سبکدوش ہوجانے کے بعد اُس نے اپنا وقت قدیم مورخین کی کتابون کے مطالعہ مین صرف کیا۔ پلوٹارک کی شہرہ آفاق تالیف ”سوانح مشاہیر یونان و روما“ سے اُس کو عشق تھا۔ ایک خط مین وہ خود اپنے شوق و شغف کا اظہار اس طرح کرتا ہے ”دن بھر کی پریشانیون اور تفکرات کے بعد مین نے اپنے گرد آلود کپڑون کو اُتار کر پھینکدیا اور ایک خلعت شاہی پہن کر گویا ان مشاہیر متقدمین کے دربار مین بصد تعظیم و نیاز حاضر ہوا۔ وہان مین نے اِن زندہ جاوید ردحون سے ہمکلام ہونے کی قابل فخر عزت حاصل کی اور میرے کام و دہن ایک ایسی غذا الطیف سے لذت یاب ہوے جو صرف میرے لیے ہی مخصوص تھی اور جس سے شیرین کام ہونے کے لیے مین پیدا کیا گیا تھا۔ ان اوقات مین مین تمام دنیوی تفکرات و آلام کو بھول گیا مفلسی کا سوہان روح خیال میرے ذہن سے بالکل محو ہو گیا اور موت کے اطمینان کش خوف سے قطعاً

آزاد ہو گیا مین ہمہ تن ان برگزیدہ و پاک روحون کے ہمیشہ زندہ رہنے والے کارنامون کا مطالعہ کرنے مین مصروف ہوا" وہ صرف پڑھنے اور غور کرنے پر ہی اکتفا نہین کرتا تھا جو کاہلی و تن آسانی کی بہترین پیرایہ ہے اُس کے قوائے عملی و تشویق کار اُس کو مجبور کرتے تھے کہ میدان عمل مین وہ اپنی دماغی تگ و تاز کے جوہر دکھائے۔ چنانچہ تصنیف و تالیف تحریر و ترتیب مین وہ پورے شوق اور انہماک کے ساتھ مشغول ہوا۔ حکمران فلارنس نے اُس کو ملک کی انتظامی و سیاسی خدمات پر مامور کرکے اُس کو اظہار قابلیت کا اور موقع دیا۔ معدہ کی شکایات نے اس کو بہت کمزور کر دیا تھا آخر کار ۲۲ جون ۱۵۲۷ء کو ملک اٹلی کا یہ مشہور محب وطن، فلسفی مورخ اور مدبر دنیا سے رخصت ہو گیا۔ اطالیہ کا قومی اتحاد اور اُس کی سیاسی آزادی کا زمانہ ابھی بہت دور تھا، اُس کی تاریخ کے صفحات منزینی، گریبالڈی اور کیوور ایسے مایہ ناز فرزندان کے مخلصانہ و مدبرانہ کارنامون سے ہنوز خالی تھے لیکن افسوس ہے صدیون کے ان پیغمبران سیاسی و علمبرداران حریت نے جس مقصد کی تکمیل کی اُس کی اہمیت اور ضرورت پندرھوین صدی مین میکیولی کے ذہن نشین ہو چکی تھی اور اُسکے حصول مین اُس نے اپنے مقدور بھر حصہ بھی لیا۔ اب ہم اُس کی تصانیف و اُن اصول سیاسیات پر ایک ناقدانہ نظر ڈالنا چاہتے ہین جن کی وجہ سے حریت و جمہوریت کا کوئی نام لیوا اور راستی و حق پرستی کا کوئی شیدائی اُس کا نام بغیر ملامت کیے ہوئے نہین لیتا۔

اگرچہ میکیولی کی کل تصانیف ایک شان امتیاز اور مخصوص حیثیت رکھتی ہین لیکن ہمارے زیر بحث اس وقت اس کا مشہور اور ہدف نکتہ چینی رسالہ پرنس ہے جسمین اُس نے وہ اصول حکمرانی اور ذرایع حصول و تحفظ سلطنت و حکومت بالتفصیل بیان کیے ہین جن کی وجہ سے خود کتاب اور صاحب کتاب پر سخت نکتہ چینی ہوئی ہے۔ لیکن مضمون کتاب پر کوئی رائے ظاہر کرنے سے قبل یہ بیان کر دینا ضروری ہے کہ میکیولی ایک راسخ العقیدہ جمہوریت پسند مدبر تھا، اور جمہوریت فلارنس کے انتزاع پر بھی اُس کے اعتقادات مین تزلزل واقع نہین ہوا تاریخ ملک قدیم کا بڑی دلچسپی و تعمق کے ساتھ مطالعہ کرنے کے بعد وہ اس نتیجہ پر پہنچا تھا، کہ زمانہ جمہوریت کے واقعات اور اصول نظم و نسق موجودہ زمانہ مین بھی ملک کو ادبار اور غلامی سے نجات دلا سکتے ہین۔ اُس کا اعتقاد تھا کہ بقا و تحفظ سلطنت کے لیے دو چیزین ناگزیر ہین ایک مذہب دوسری فوجی قوت۔ اس لیے کہ بغیر فوجی قوت اور ہتھیارون کے مفید قوانین کا اجراء ملک مین نہین ہو سکتا، اور بغیر مذہب کے قوت و اسلحہ کا استعمال طوائف الملوکی اور بدنظمی کا باعث

ہوتا ہے

لیکن سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اگر واقعی میکیاولی جمہوریت کا معتقد اور دلدادہ تھا اور روما قدیم کی عظمت و شوکت پر اس قدر نازاں نیز موجودہ اٹلی کو اُس کی سابقہ حالت پر دیکھنے کا متمنی تھا تو پھر اُس نے پرنس کس غرض سے تصنیف کیا؟ اس رسالہ میں جو اصول بیان کیے ہیں وہ جمہوریت کی بیخ کنی منظور ہے اور جن کا اطلاق بالکل روما قدیم کی حالت پر نہیں ہو سکتا۔ ظاہرا اس کی وجہ یہ معلوم ہوتی ہے کہ اُس کے پاس کوئی مفید شغلہ نہیں تھا اور وہ افلاس سے گھرا ہوا تھا۔ اُس کا دماغ کسی مفید کام کی جستجو میں تھا اور اُس کی زبوں حالت دنیوی اعزاز کے حصول کی متقاضی تھی۔ اُس کو ایک مہربان مربی کی تلاش تھی جو اُس کی دستگیری کر سکے۔ فلارنس میں جمہوریت کی بحالی ایک امر محال تھا۔ میڈیسی حکمران فلارنس کا خاندان اپنے اچھی طرح قدم جما لیے تھے اور ملک کی بہبود و ترقی میں سرگرمی سے کوشاں تھے۔ میکیولی کی دلی خواہش تھی کہ اپنے ملک کی خدمت کا اُس کو پھر کوئی موقع ملے تاکہ جس طرح جمہوریت کے زمانہ میں اُس نے اپنے وطن مالوف کی خدمت کی تھی اب بھی کرے۔ وہ یہ بھی بخوبی جانتا تھا کہ اپنی ذات سے ملک کے لیے وہ کیا مفید کام کر سکتا ہے۔ اگر اُس کو کسی سے ذاتی عناد ہو سکتا تھا تو وہ فلارنس کے امرا و نوابان تھے جنھوں نے ملک کے ساتھ دغا کی تھی اور حکومت کی بیخ کنی میں حصہ لیا تھا۔ میڈیسی سے اس کو کوئی وجہ پرخاش نہیں تھی کیونکہ اُس نے تو ابنا وطن کی غداری اور اندرونی بغاوت سے فائدہ اُٹھایا تھا۔

ان خارجی اسباب سے معلوم ہوتا ہے کہ ذاتی رسوخ اور دنیوی اعزاز حاصل کرنے کی غرض سے اُس نے یہ کتاب لکھی لیکن ان کے علاوہ ایک اور قوی وجہ بھی اس کی محرک ہوئی۔ وہ اپنے ملک میں ایک خاص تحریک پیدا کرنا چاہتا تھا اور ایک خاص مقصد کی اشاعت مد نظر تھی۔ جیسا کہ بیان کیا جا چکا ہے اٹلی کی حالت ناقابل اصلاح ہو گئی تھی۔ قومی آزادی حاصل کرنے اور اغیار کی دستبرد سے محفوظ رہنے کے لیے یہ ضرور تھا کہ ملک کی بنیاد از سر نو ڈالی جائے لیکن حالات موجودہ میں اجتماعی کوشش کی بہ نسبت انفرادی کوشش اور سرگرمی زیادہ مفید اور کارآمد ہو سکتی تھی۔ میکیولی کا یہ خیال بمنزلہ یقین کے پہنچ چکا تھا کہ سلطنت کی تاسیس و قیام کسی زبردست ہادی اور الوہیت انتساب ہستی کے مافوق العادت کارناموں کے مرہون منت ہوتے ہیں۔ اندرونی بدامنی اور باہمی مناقشات کی موجودگی میں جمہوری

استقرار قریب قریب ناممکن ہوتا ہے۔ ملک کو اِس وقت ایک موسس اور ہادی کی ضرورت تھی جو قابل بھی ہو اور رہبر بھی ہو۔ ایسا آدمی اُس کو سیزر بورجیا نظر آتا تھا۔ سیزر بورجیا نے ایک ریاست کے قیام کا سنگ بنیاد رکھا تھا، میکیولی کا خیال تھا کہ اسی بنیاد پر اطالیا کے قومی و سیاسی اتحاد کی عمارت نصب کی جائے۔ لیکن سیزر بورجیا کو آخر میں اتفاقی واقعات کی وجہ سے ناکامی حاصل ہوئی۔ اب میکیولی کو اسی قابلیت کے کسی اور شخص کی تلاش ہوئی جو اُسکے مقصد میں معین ہو سکے۔ قدرتاً اب اس کا ذہن حکمران فلارنس کی جانب منتقل ہوا، جو اس کی دستگیری کر سکتا تھا۔ لیکن لورنزو ڈی میڈیسی نے جس کے خاطر یہ رسالہ لکھا گیا تھا اس کی طرف کوئی توجہ نہیں کی، اور میکیولی کو اپنی تمام دماغی مشقت کا صلہ آنے والی نسلوں کی جانب سے ایک قابل رشک قدر دانی کی صورت میں ملا۔

جس نیت اور مقصد سے یہ رسالہ لکھا گیا وہ بیان ہو چکے ہیں، یہ بات بھی یاد رکھنے کے قابل ہے کہ جب یہ پہلی مرتبہ شایع ہوا تو اس نقطۂ نگاہ سے نہیں دیکھا گیا، جس سے وہ موجودہ زمانہ میں جانچا گیا ہے۔ ایک غلطی جو میکیولی کے اصول فلسفہ کے متعلق راے قایم کرنے میں ہوتی ہے، یہ ہے کہ یورپ کے دور وسطی اور بالخصوص اطالیہ کی اخلاقی، سیاسی، معاشرتی زندگی، قومی انحطاط اور جن حالات و تاثرات میں خود میکیولی نے اپنی زندگی کا کثیر حصہ گذارا، نیز دیگر معاصرانہ خصوصیات کو مد نظر نہ رکھ کر موجودہ زمانہ کے اصول سیاسی اور تمدن و اخلاق کی کسوٹی پر پرکھنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ اُس کی زندگی کا بیشتر حصہ ناکامی و نامرادی میں بسر ہوا تھا۔ اُس کو انسانی فطرت کے خوش آیند پہلو کے مطالعہ کرنے کا بہت کم موقع ملا تھا، اُس کا ملک ادبار و نکبت کی آخری منزلیں طے کر رہا تھا۔ اور کوئی امید اُس کی ترقی و عروج کی نظر نہیں آتی تھی، ایسی حالت میں اگر اُس کا معیار اخلاق پست ہو اور اس کے اصول اخلاقیات کی تعلیم سے مُضر اثر نظر آئیں تو کوئی تعجب نہیں ہے۔ اس کا خیال ہے کہ انسان بد طینت واقع ہوا ہے۔ محض ضرورتاً یا مجبوراً وہ کبھی کبھی نیک ہو جاتا ہے، عوام الناس احسان فراموش، متلون مزاج، دغاباز، بزدل اور طامع ہوتے ہیں اگر تم اُن کے کسی مقصد میں مفید ثابت ہو سکو، تو جب تک اُن کی غرض پوری نہ ہو وہ تمہاری خاطر اپنا خون بہانے کو آمادہ نظر آتے ہیں، مال، زندگی اور اولاد تک سے دریغ نہ کریں گے۔ لیکن جوں ہی اُن کا مطلب پورا ہوا، وہ تمہارے مخالف ہو جائیں گے۔ جب لوگوں کا یہ حال ہے تو بادشاہ اور حکمران کیسے نیک طینت ہو سکتے ہیں۔ ایسی حالت میں نیک نفسی کا لازمی انجام تباہی و بربادی ہے۔ بادشاہ کی

پالیسی رعایا کے رجحان طبع اور اطوار پر منحصر ہوتی ہے جب رعایا کی یہ حالت ہے تو بادشاہ کو لازم نہین کہ وہ ایفاے عہد ایمانداری، رحم و انصاف کو اپنا شعار بنالے۔ اس کو بہائم صفتی و انسان سیرتی کا نمونہ ہونا چاہیے اور اپنے اصلی عادات و خصائل کو پردۂ خفا مین رکھکر فریب و تصنع سے کام لے اور دوسرون پر اُن صفات کا اظہار کرے جو حقیقت مین اُس کی ذات مین موجود نہین ہین۔ عوام الناس چونکہ خود غرضی کی وجہ سے یہ چاہتے ہین کہ انکا حکمران خیر محض اور جملہ کمالات بشری کا اہل ہو۔ اس لیے اُن کو خوشگوار دھوکہ مین ڈالنے کے لیے ہمیشہ اُن کے سامنے اپنا بغایت امن پسند۔ صادق القول۔ رحمدل۔ ایماندار اور مذہب پرست ہونا ظاہر کرے۔

بادشاہون کی صفات و اہلیت کے متعلق میکیولی کی راے کا اندازہ اس سے بخوبی ہوسکتا ہے کہ وہ فرڈنینڈ فاتح اسپین کو جس نے مذہب کی آڑ مین یہودیون اور موروان پر ناقابل بیان مظالم کیے بہترین اور کامیاب ترین حکمران سمجھتا تھا۔ سیزر بورجیا کا باوجود اس کے حیا سوز حرکات کے وہ بیحد مداح تھا، کیونکہ یہ دونون اُسکے مقرر کردہ معیار مذہب و قوت کے اعتبار سے ہر طرح سلطنت و حکومت کے اہل تھے۔

ریاکاری، مکر و فریب، قتل و غارت، زور و ظلم کی یہ عریان تعلیم، حصول مقصد کی غرض سے ہر جائز و ناجائز، معیوب و مستحسن ذرایع پر عمل کرنے کی بے حجابانہ تلقین اخلاق کش، اور مذہب سے یکسر مُعرّا اصول کی یہ بیباکانہ تبلیغ، کوئی تعجب نہین اگر اس دور تمدن و تہذیب مین نشانۂ ملامت و ہدف تشنیع ٹھہرے۔ "پرنس" کی رد و تکذیب اور نکتہ چینی مین جو لٹریچر لکھا گیا ہے اُس پر نظر ڈالنے کا یہ موقع نہین ہے۔ بہت کم تصانیف ایسی ہین جو اسقدر بحث و مباحثہ کا باعث ہوئی ہون جسقدر یہ مختصر رسالہ۔ مشہور فرانسیسی اہل قلم والٹیر، فریڈرک اعظم والی پرشیا کو رسالہ کے متعلق یہ ہدایت کرتا ہے "بورجیا ایسے لوگون کے واسطے یہ کتاب مفید اور قابل تعریف ہوسکتی ہے، کیونکہ وہ جرائم و دغابازی کے ذریعہ سے دنیا مین عزت و حکومت حاصل کرنا چاہتے ہین، لیکن تمھین لازم ہے کہ اِن اصول پر کان نہ دھرو اور ان کو بُرا سمجھو، جس طرح زہر کا استعمال ہمارے مقصد مین بعض وقت معین ہوسکتا ہے، اسی طرح ان اصول پر کاربندی ممکن ہے کہ مفید مطلب ہو لیکن اصلی مسرت اور حقیقی عظمت و بزرگی ان سے ہرگز حاصل نہین ہوسکتین" خود فریڈرک کی راے بھی اس رسالہ کے متعلق بہت خراب تھی، لیکن اپنے زمانۂ حکومت مین اسکو تسلیم کرنا پڑا کہ اس کے بعض اصول نہایت مفید و کارآمد ہین۔

حقیقت میں میکیاولی نے سائنٹفک طریقہ سے وہ ذرایع بیان کیے ہیں، جن سے مطلق العنان حکومت قائم کی جاتی ہو اور محفوظ رہ سکتی ہو، نیز اُن افعال کا اظہار کردیا ہو جو بادشاہوں کی ذات سے سرزد ہوتے ہیں، وہ جو اُن کو کرنا چاہئیں۔ ارسطاطالیس نے اسی انداز سے ایک کتاب سیاسیات کے موضوع پر لکھی ہو، جسمیں (جبریہ حکومت) کے متعلق بحث ہو، اُس کی نیک نیتی میں کوئی شبہ نہیں کرسکتا۔ اگر سمیات سے طریقہ استعمال و موقعہ استعمال کے متعلق کوئی کتاب لکھی جائے، جسمیں اُس کی مقدار استعمال بیان کی جائے یا اور دیگر ضروری ہدایات مہیا کی جائیں اُن حالات کا بیان ہو جب زہر کام میں لایا جائے یا نہ لایا جائے تو اُس سے ہرگز یہ مراد نہیں ہو کہ کسی شخص کو اُن ذرایع کے استعمال پر اکسایا جاتا ہے۔ لیکن اس میں بھی شک نہیں کہ اگر کوئی زہر سے کام لینا چاہے تو اُسکے لیے یہ کتاب اور ہدایات مندرجہ بہت مفید ہوسکتی ہیں۔ اس کے علاوہ بادشاہوں کی خفیہ حرکات و شنیع افعال کی بدترین مذمت کا اور عوام کو اُن کی خوفناک چالوں سے آگاہ کرنے کا بہترین طریقہ یہ ہو کہ اُن کو خوب کھول کھول کر بیان کیا جائے۔ اس نظر سے جانچا جائے تو جیسا بیکن کا خیال ہو، یہ رسالہ گویا سنجیدگی سے ترتیب دی ہوئی ایک ہجو ملیح ہو۔ میکیولی خود کہتا ہو کہ اس رسالہ میں سوائے مشاہیر اور بادشاہوں کے کارناموں کے تذکرہ کے اور کچھ نہیں ہو۔

میکیولی کے اصول کو موجودہ دور تہذیب و تمدن کی روشنی میں اگر جانچا جائے تو اس کا سب سے بڑا جُرم یہ نظر آتا ہو کہ اُس نے اُن خفیہ کارستانیوں اور سازشوں کی قلعی کھول دی جو کمزور قوموں کا گلا گھونٹنے اور اُن کے حقوق و آزادی سے محروم کرنے کے لیے یورپ کے ایوانہاے وزارت میں ترتیب دی جاتی ہیں مدبرین یورپ کی امن سوز و عافیت کش پالیسی اور طرز عمل کو دیکھ کر یا ٹریشکی، فان برن ہارڈی اور ایک حد تک ڈاکٹر اقبال کے جارحانہ و خوددارانہ اصول فلسفہ کا مطالعہ کرنے کے بعد کوئی شخص یہ کہہ سکتا ہو کہ میکیولی کے اصول محض دور بربریت و ظلمت کے شایان تھے اور اس ترقی و شایستگی کے زمانہ میں اُس کا تاریک فلسفہ ایک دفتر بےمعنی کی حیثیت رکھتا ہو؟

محمد حامی الدین خان

غزل نعتیہ

پڑھتا ہوا محشر مین جب صل علیٰ آیا
رحمت کی گھٹا اُٹھی اور ابر کرم چھایا

جب وقت پڑا نازک اپنے ہوے بیگانے
ہان کام اگر آیا تو نام ترا آیا

پرسش تھی گناہون کی اور یاس کا تھا عالم
بیکس کی خبر لینے محبوب خدا آیا

یہ نام مبارک تھا یا حق کی تجلی تھی
دم بھر مین ہوا فاسق ابدال کا ہمپایہ

چرچے ہین فرشتون مین اور رشک ہے زاہد کو
اس شان سے جنت مین شیدائے نبی آیا

کعبہ سے بھی کچھ بڑھکر ہے اس کی کشش دلمین
جس شہر نے مرقد سے ہے تیرے شرف پایا

کیون نزع کی دشواری آسان نہو جاتی
تھا نام ترا لب پر اور سر پہ ترا سایہ

اک عمر کی گمراہی اک عمر کی بیتابی
خیر تیری غلامی کے آخر ثمر پایا

حکمت کا سبق چھوڑا عزت کی طلب چھوڑی
دنیا سے نظر پھیری سب کھو کے تجھے پایا

تجھ سے تھی سیہ کاری اپنی ہی فزون حد سے
دیکھا تو کرم تیرا اس سے بھی سوا پایا

ناسق کی ہے یہ میت پر ہے تو تری اُمت
ہان ڈال تو دے دامن کا اپنے ذرا سایہ

تین اور تیرہ

سات اور پانچ

جسطرح کل انسانی مخلوق نفس واحدہ سے خلقت پذیر ہوئی ہی جیسے کل انسانی نسلون کا تولیدی سلسلہ ایک ہی شروع رکھتا ہی اسی طرح کل ہندسے بھی ایک ہی ہندسہ (۱) کی ذریات مین سے ہین شروع مین ایک ہی ہندسہ (۱) کا تھا رفتہ رفتہ اُسی سے تمام دوسرے ہندسے بنتے گئے یا بنائے گئے۔ دیکھو دس تک سوائے ہندسہ جات (۵) (۷) (۸) کے باقی کل ہندسے ایک ہی شکل کے ہوتے ہین۔ تھوڑی سی تبدیلی اور بیشی سے (۱) کا ہندسہ ۲ - ۳ - ۴ - ۶ - ۹ - اور (۱۰) بنتا گیا۔ ذرا غور سے اِن چھ ہندسون کو دیکھو کہ تھوڑی سی زیادتی اور تبدیلی کرکے ایک ہی سے کسطرح یہ دوسرے ہندسے بنائے گئے ہین۔ رہے ہندسہ جات ۵ - ۷ - ۸ - اگر مزید غور کروگے تو ان مین بھی ہندسہ (۱) کی ہستی مشہود ہی۔ اگر ہم ہندسہ ۷ - ۸ - کو اُلٹ کر دیکھین تو اُن مین بھی (۱) کا ہندسہ پایا جائے گا ہندسہ (۱) کو اگر گولائی دی جائے تو (۵) کا ہندسہ بن جاتا ہی۔

دس سے آگے بڑھو تو وہی صورتین ہیر پھیر کرکے لائی جاتی ہین یہ مان لینا چاہیے کہ شروع سب مفرد اور مرکب ہندسون کا (۱) ہندسہ ہی ہی گویا ہندسی دُنیا مین (۱) کا ہندسہ ہندسون کا نفس واحدہ ہی۔ دوسری زبانون کی ہندسی اشکال سے بھی یہی ثابت ہوتا ہی کہ ہندسہ (۱) ہی سے سب دیگر ہندسون کی تدوین اور ترکیب ہوئی ہی۔

ہندسہ

بعض لوگ کہتے ہین کہ چونکہ ہندسہ یا ہندسون سے اندازہ ہوتا ہی اس واسطے یہ اندازہ کا اُلٹ ہی ہماری رائے مین یہ درست نہین غالباً چونکہ یہ علم ہند سے نکلا ہی اس واسطے ہندسہ کو ہندسہ کہتے ہین۔ علم ہندسہ وہ علم ہی جسمین ہندسی قوتون اور ہندسی جوڑ میل کا بیان ہوتا ہی۔ کاروباری زندگی مین ہر ایک اور ہر قوم کے اندر ہندسہ سے جو کام شب و روز پڑتا ہی وہ مخفی نہین جو قوم علمی رنگ مین علم ہندسہ اور قیمت ہندسہ سے بے بہرہ ہی وہ گویا اپنی زندگی کی قیمت اور ضروریات سے بے بہرہ ہی

ریاضی مین ہندسہ ہی پردھان ہی اور ریاضی کی قوت جو کچھ اس وقت دنیا مین کام کر رہی ہی وہ ظاہر ہی جو شخص علم ہندسہ جانتا ہی وہ مہندس ہی مہندس کون ہی جو علم ہندسہ جانتا ہو۔

ہندسون کی طاقت

شروع کے ہندسہ (۱) کی طاقت بہت بڑی طاقت ہی اسی طاقت کی بدولت اس کی ذریات بے اندازہ مانی گئی ہی ایک کا ہندسہ اگرچہ ایک ہی مگر تھوڑی سی تبدیلی سے اسکی طاقت بڑھتی جاتی ہی ایک ہی طاقت اپنی وسعت کے تحت مختلف طاقتون کی مددن اور مرتب ہو رہی ہی خلقت مین ایک ہی کی طاقت کام کر رہی ہی چونکہ ایک ہی یا واحد طاقت کل طاقتون کی بنیاد ہی اس واسطے ہر نوع کے شروع کی ایک ہی طاقت بھی تحت اس بنیادی ایک طاقت کے خلقت صورتون مین وحدت سے ترقی کر کے کثرت کی طاقت مین منتقل ہو رہی ہی اور ہمارے اردگرد سب کچھ اسی کا ظہور اور حدوث ہی۔

ایک کی طاقت سب طاقتون سے زبردست اور سب تحتی طاقتون کو محتوی ہی اس سے نیچے اتر کر جسقدر اضافی طاقتین ہین وہ نسبتاً اس طاقت ایک سے کم درجہ رکھتی ہین۔ ہندسہ (۲) کی طاقت اگرچہ ہندسہ (۳) کی طاقت سے کم ہی مگر اس مین شامل ہی اسی طرح ہندسہ (۳) کی طاقت ہندسہ (۴) مین شامل ہی اور مقابلتاً ہر ایک دوسرے ہندسہ کی طاقت نئے ہندسہ یعنی پہلے ہندسہ کی طاقت سے زیادہ ہی بہ خلاف ایک کے جو باوجود پہلے ہونے کے بھی آخری یا دوسرے ہندسون سے زیادہ تر طاقتور ہی کیونکہ بالمقابل دیگر اضافی ہندسون کے وہی ایک بنیادی ہندسہ یا بنیادی طاقت ہی۔

صفر

علم ہندسہ صفر کی ایک بڑی طاقت ہی لغوی معنی اگرچہ لفظ صفر کے خالی اور تہی کے ہین مگر ہندی حساب مین صفر سے وہ نقطہ مراد ہی جو عدد کے دائین جانب ہونے سے دس گنا طاقت بڑھاتا ہی اور بائین جانب ہونے سے کچھ قیمت نہین پاتا ہی صفر کی صورت پانچ (۵) کے ہندسہ سے مشابہ ہی انگریزی مین اب یہی صورت رائج ہے مگر عربی فارسی اور اُردو مین نقطہ نما (۰) لکھتے ہین صفر کی بے قیمتی اور دائین جانب لگ کر قیمت وار ہو جانا ثابت کرتا ہی کہ ایک طاقت کے استعمال سے کسقدر دوسری طاقت قیمتی اور طاقتور ہو جاتی ہی جس ہندسہ کے ساتھ صفر ہوگا اُس کی طاقت دس گنا کر دے گا

بعض ہندسون کی اضافی قیمت

بعض ہندسے اضافی قیمت بھی رکھتے ہین قیمت کہہ لو یا خصوصیات اور تاثرات مختلف زبانون اور مختلف بول چال مین بعض ہندسے ایک اضافی خصوصیت اور اضافی قیمت یا طاقت رکھتے ہوئے بالخصوص شہرت رکھتے ہین۔ دنون کی طرح کوئی ہندسہ کچھ خصوصیت رکھتا ہے اور کوئی کچھ محاورات اور بول چال مین ایسی خصوصیت اور قیمت کا علم ہوتا ہے کبھی کبھی ایسی قیمت اور طاقت کسی وجہ سے موجب ہوتی ہے۔ اور کبھی کبھی وہی رنگ مین مختلف تعبیرین کی جاتی ہین۔

ہندسون مین سے پانچ۔ سات۔ تین اور تیرہ کو خصوصیت سے تعبیری پہلوسے شہرت حاصل ہے۔ تنقیدی رنگ مین یہ نہین کہا جا سکتا کہ کیون رفتہ رفتہ لوگون کے خیالات اور اذہان ایسی ایسی انوکھی تعبیرات یا تاویلات اور اجتہادات کے یون رہین ہوتے گئے ہین اور کیون ان تعبیرات کی یہ وقعت ہوئی اور کیون ایسی قیمت لگائی جاتی ہے علم ہندسہ مین تو بظاہر ان تعبیرات کی بابت براہ راست کچھ نہین کہا گیا ہان ہندسہ کی شاخ جفر رمل اور جوتش مین ہندسون کی کچھ نہ کچھ قیمت لگائی گئی ہے

کسی قدر تعبیرات ہندسی

جب ہم نے اپنے رنگ مین چند ہندسون کی تعبیرات اور اجتہادات و تاویلات کی تقریرون اور تحریرون مین تفصیل دیکھتے ہین تو یہ کہنا پڑتا ہے کہ ان ہندسون کی طاقت اور وقعت اثر او خصوصیت کا سلسلہ ہر ایک ملک اور ہر ایک زبان مین جاری اور معمول رہتا ہے مثلاً

سات پانچ کرنا	تکرار
سات پانچ لانا	جھگڑا اٹھانا۔
سات پردون مین رکھنا	نہت احتیاط
سات پردے لگنا	جدید طرز
سات تودن سے منہ کالا کرنا	پرلے درجہ کی لعنت۔
سات [illegible]	پھوٹ پھوٹ کر رونا۔
سات [illegible]	[illegible] کے ساتوں درجے۔

سات سمندر	دنیا کے کل بحر اعظم
سات سنگار	عورتون کی سات آرائشین
سات سو چوہے کھا کے بلی حج کو چلی	باوجود پاپی ہونے کے ادعاے نیکی۔
سات سہاگنون کو کھلانا	منت کی ایک رسم
سات سہیلیون کا جھمکا	عقد ثریا۔
سات پھیرے۔	طواف وقت شادی۔ طواف گرد آتش
ست نار دھن	گرگ بندی۔

بعض لوگ فال دیکھتے ہین تو اول سطر دیکھ کر پھر ساتوین سطر دیکھتے ہین اور پھر ساتوان ورق یا ساتون صفحہ ایسے ہی کہتے ہین سات آسمان اور سات زمین۔

تین اور تیرہ

سات کے ہندسے کے مقابلہ مین ہندسہ جات (۳) اور (۱۳) کی قیمت اور تعبیر اچھا دیکھا اور یہی رنگ رہتا ہے جھگڑے کے وقت کہتے ہین یہان تین دفعہ کہدو مجھے منظور ہوگا تین دفعہ کلمہ پڑھ کر کہو فیصلہ ہو جائے گا۔ تین لکیرین کھینچ دو بس فیصلہ ہو۔ تین تیرہ مت کرو اصل بات کہو۔

تین بلائے تیرہ آئے دال مین پانی

تین پانچ۔

تین پانچ کرنا۔

تین پیڑ بکائین میان باغبان۔

تین تیرہ۔

تین تیرہ کرنا۔

تین حرف بھیجنا۔

تین دن قبر مین بھی بھاری ہین۔

تین کانے۔

(۱۳)

تیرا تیزی	منحوس مہینہ صفر کا
تیرھواں	ہنود کی ایک ماتمی رسم کریا کرم کا دن
تیرھوین صدی	منحوس اور خراب صدی۔

انگریزی کھانے مین اگر میز یا دسترخوان پر ۱۳ مہمان ہون تو نحس ہے۔

نہ تینون مین نہ تیرون مین	بے حقیقت
وہ تو بڑی تیرا تالی ہے۔	ایک چالاک عورت۔

اِن تعبیرات کی فلاسفی

کبھی کبھی ہم یہ کہا کرتے ہین کہ بعض پُرانی باتون یا بعض پُرانے اجتہادات اور پرانی تعبیرات کی کوئی فلاسفی اور دلیل نہین ہوتی ہان بعض تعبیرات اور بعض اجتہادات ایسے ہی ہوتے ہیں کہین بعض تعبیراتی اور اجتہادی استدلال مدلل اور موجہ بھی ہوتے ہین مزید غور کی ضرورت ہے۔ پنجاب مین فقرہ (نہ تینون مین نہ تیرون مین) کی بابت ایک کہانی بنائی ہوئی ہے نہین کہا جا سکتا کہ وہ کہان تک درست ہے وہ یہ کہ ایک عیاش مزاج آدمی نشۂ عیش پرستی مین بہت کچھ برباد رہکر یہ دریافت کرنا چاہتا تھا کہ مطلوب کے نزدیک اُس کا کیا درجہ ہے ایک دوست نے خانمان سوز مطلوب سے پوچھا تو اُس نے جواب مین کہا کہ میرے طالبون کے کئی ایک درجے ہین یہ طالب نہ تینون مین ہے اور نہ تیرون مین گویا اُس کی کوئی حقیقت ہی نہین۔ اِس کہانی سے بھی فلسفیانہ رنگ مین یہ پتہ نہین چلتا کہ تین اور تیرہ عدد کی تخصیص کی ضرورت کیا تھی یہ بھی کہا جا سکتا تھا کہ نہ چار مین اور نہ چودہ مین۔ اِسی طرح سات پانچ کے بجاے سات اور چار نو اور چھ بھی کہا جا سکتا تھا۔

دراصل ہندسون اور اعداد مین سے بعض ہندسے مثل سات پانچ اور تین و تیرہ کے بعض وجوہ کی بنیاد پر رفتہ رفتہ خاص کر لیے گئے ہین اِس تخصیص کی وجہ سے ایسے اعداد ضرب الامثال کہاوتون اور خاص مقولات مین لائے جاتے ہین جیسے کہا جاتا ہے (نہ نو من تیل ہوگا اور نہ رادھا ناچے گی) ایسے ہی (نہ تینون نہ تیرہ مین) اِس محاورہ کی اصل بھی کسی بیسوا کے خاص قصہ سے منسوب ہے۔ اِسی طرح نو دو گیارہ ہو جانا۔ اور نو نقد نہ تیرہ اُدھار۔ اور نو سو چوہے کھا کے بلی حج کو چلی کے محاورات بھی ہین بعض محاورات ہندسی

کے وجوہ تو مبہم نہین لیکن بعض کے وجوہ سرسری طور پر معلوم نہین ہو سکتے۔

محاورہ

محاورہ کیا ہے وہ کلمہ یا وہ کلام جسے چند ثقات نے لغوی معنی کی مناسبت یا غیر مناسبت سے کسی خاص معنی کے واسطے مختص کر لیا ہو جیسے پانچون انگلیان برابر نہین آپ بھی پانچون سوارون مین ہین۔ پانچون سوارون مین نام لکھوانا۔ پانچ مین پرمیشر۔

کوئی محاورہ سوائے کسی خاص وجہ اور رابطے کے نہین ہوتا عام اس سے کہ ایسی خصوصیت وجہ اور ربط موجہ ہو یا غیر موجہ مناسب ہو یا غیر مناسب وہ محاورات جن کی ترکیب کسی قدر غیر مناسب بھی ہوتی ہے۔ چونکہ عام بول چال اور روزمرہ مین آ چکے ہوتے ہین اس واسطے کسی زبان مین اور اہل زبان کے نزدیک اُنکی ہی کچھ نہ کچھ قیمت ہوتی ہے جیسے کہ بعض غلط العام الفاظ بھی بعض صورتون مین تسلیم کر لیے جاتے ہین اگرچہ اُن کی قیمت کچھ بھی نہین ہوتی یا جیسے کہ بعض تابع مہمل الفاظ غیر مہمل الفاظ کے ساتھ بولے جاتے ہین۔

آخر تخصیص ہندسون کی وجہ

بعض ہندسون کی تخصیص یہ دیکھتے ہوے کہ تقریر اور تحریر مین اُن کا اطلاق ایک سہولت اور ایک خصوصیت کے ساتھ ہوتا ہے کچھ نہ کچھ ہونی چاہیے۔ میری راے مین ہر مخصوص ہندسہ کی خصوصیت کی وجہ مناسب یا غیر مناسب کچھ نہ کچھ تو ہوتی ہے مثلاً ہندسہ (۳) کی خصوصیت یون ہوئی کہ بعض حالات مین تین ہی دفعہ قسم کھانے اور انکار یا اقرار کرنے پر بات کا فیصلہ ہو جاتا ہے۔ اس واسطے دوسری صورتون مین پہلی تعبیر مقدم رکھی گئی۔ اسی طرح سات پانچ کا اطلاق بھی ہوتا ہے بعض وقت ایسے مخصوص ہندسون کا ایک خاص صورت مین اطلاق اس وجہ سے بھی کرتے ہین کہ لوگون کے عام کاروبار مین ان ہی مخصوص ہندسون کے مطابق عمل بھی ہے۔

اور یہ بھی وجہ ہو سکتی ہے کہ عام بول چال اور عام کاروبار مین مقابلتاً بعض ہندسون کی طاقت زیادہ تر تسلیم کر لی گئی ہے۔ جیسے فن نقوش اور تعویذات مین پندرہ نقش اور تیرہ نقش کی طاقت اور کشش اس فن کے مشاق خصوصیت سے تسلیم کرتے ہین۔ یہ جدا بات ہے کہ نقوش پندرہ اور تیرہ مین عقلی اور عملی پہلو سے کوئی جذب اور کوئی اثر ہو یا نہ ہو لیکن جو لوگ ان اعداد کو ایک خصوصیت دیتے ہین اُن کے خیال میں تو اُنمین

ایک طاقت اور جذب ہوتا ہے اور ان ہی کی ریس سے اور لوگ بھی اُن کو مخصوص سمجھ لیتے ہین.

علم الاعداد

علم الاعداد نہ صرف معمولی کاروباری امور مین کارآمد ہے بلکہ دوسرے فنون اور تجارت مین بھی ان کی بہت کچھ قیمتین اور خصوصیتین تسلیم کی گئی ہین. یہ جدا بات ہے کہ بعض لوگ اُن کی تصدیق نہ کرین بعض لوگون نے اعداد کی قیمتون پر جداگانہ بحث کی ہے اور ہر عدد کو دوسرے عدد کے مقابلہ مین خصوصیات اور کشش کے لحاظ سے زیر بحث لاکر ایک جداگانہ قیمت قرار دی ہے گو ان کی ایسی توجیہات دوسرون کے نزدیک کیسی ہی عام یا خام خیالات کا عکس ہون. عوام ہی اس قسم کے خیالات نہین رکھتے بلکہ خواص اور بڑے بڑے فلاسفر بھی اس کے حامی ہین. علامہ ابن خلدون کے مقدمہ تاریخ مین اس قسم کی بحثین پائی جاتی ہین۔

سلطان احمد

افادات شاد

تہِ شمشیر کیا مشکل ہے رکھنا اپنی گردن کا
مگر آسان نہین پہچاننا قاتل کی چتون کا

کوئی صہبا کشی مین طاق کوئی مے پرستی مین
خراباتِ مغان مین جمع ہے اُستاد ہر فن کا

کہان چھوڑا ہے مجھ وحشی کو قاتل نیجان تونے
وہ کالی رات، سناٹے کا عالم، بولنا رن کا

نکالے بیٹھ کر کانٹے نہ اپنے پاے زخمی سے
کبھی بھولے سے دل توڑا نہ ہمنے اپنے دشمن کا

جُھکے پڑتے ہین موتی کان کے رُخسار رنگین پر
خدا حافظ ہے اس نازک صُراحی دار گردن کا

تہِ خنجر کہین مین مٹ نہ جاؤن شرمساری سے
ادب لازم ہے اے خونِ گلو قاتل کے دامن کا

ترے در سے ہمین دیر و حرم مین کھینچتے کیون ہین
نہ لُوٹا شیخ کو ہم نے نہ گھر چھینا برہمن کا

بہارِ باغ جاتی ہے کہو بلبل سنبھل بیٹھے
قریب آیا زمانہ نالۂ و فریاد و شیون کا

وہ میکش ہون حیا سے اُٹھ نہین سکتین مری آنکھین
گوارا کب ہے جھکنا بزم مین شیشے کی گردن کا

مین بے بس ہون مرا آرام ہے غیرون کے ہاتھون مین
پھر اے پیری زمانہ آگیا اپنے لڑکپن کا

ہے ڈر ان واعظان شہر کی کافر نگاہون کا
کیے رکھتا ہون ساغر پر ہمیشہ سایہ دامن کا

وہ زلف مشکبو لپٹی نہ ہو کانون کے بُندون سے
سبب کھلتا نہین اے شاد اپنے دل کی اُلجھن کا

غزل نعتیہ

فروری کے الناظر مین حضرت جوہر و جناب آجا کی ہم طرح غزلین پڑھکر دل مین ایک تحریک ہوئی جسکا نتیجہ ذیل مین ہدیۂ ناظرین ہے
ایک عرصہ کے بعد مہر خاموشی ٹوٹی تو سب سے پہلے جو اشعار نظم ہوئے وہ حضور سرور کائنات رحمۃ للعالمین صلی اللہ علیہ وسلم کی شان مین ہین۔ یہ امر اتفاقیہ ہی لیکن اس خیال سے مجھے روحانی مسرت ہے (ف)

تھین عشق و محبت کی اللہ رے کیا گھاتین
معراج کے پردہ مین ہوتی تھین ملاقاتین

کچھ اشک ندامت کے، کچھ طور خجالت کے
دربار رسالت مین لایا ہون یہ سوغاتین

فردوس کی بخشش ہے، انعام ہے جنت کا
اک بندۂ عاصی کی اس درجہ مداراتین

مینوش پہ کیا کھلتے اسرار حقیقت کے
ہین ساقیِ کوثر کی ساری یہ کراماتین

رحمت کی گھٹائین ہین، غفران کے ہین بادل
کیا وادیِ بطحا کی دلچسپ ہین برساتین

کیا نالۂ وشیون تھے، کیا گریۂ پیہم تھا
او غارِ حرا تجھ کو سب یاد ہین وہ باتین

ہے شوقِ حضوری سے اک دُھن سی لگی دل مین
دن ہے تو دعائین ہین شب ہے تو مناجاتین

فاروق تصور ہے ہر وقت مدینہ کا
کٹتے ہین اسی مین دن کٹتی ہین یونہین راتین

(سید محمد فاروق شاہ پوری)

شکریہ

مٹنے والا تم پر مٹ گیا۔ فدا ہوگیا۔ مگر اے جانِ جہان! تم نے اُس وقت اُسکی کچھ بھی قدر نہ کی۔ ارمانون۔ آرزوون کا خون کیا۔ اس کی حسرتون کو بیدردی سے ٹھکرا دیا ....!

چشم التفات کا ذکر ہی کیا ہے۔ تم نے تو کبھی اس پر اجنبی نگاہین بھی نہ ڈالین! آہ تمھاری بیرخی بے التفاتی تھی کہ گردشِ قسمت!.....

عقل نے اسے دھوکا دیا۔ دل چسپیون [illegible] امیدون کا [illegible] گیا۔ ظالمون نے یہان تک مجبور کردیا کہ تمھارے جمالِ جہان آرا سے دور رہنے ہی مین لذت [illegible] دی۔ مگر دل! شریف دل!! سچی محبت کے پاک جذبات سے بھرا ہوا دل!!! وہ دل [illegible] لیا تھا!!! ویسا ہی وفادار رہا۔ تمھاری یاد اس مین ویسی ہی قائم رہی۔

خدا جانے تم نے کیا خیال کیا۔ مگر دنیا نے تو اُسے بوالہوس کا خطاب دیا۔ رقیبون کو فتحمندانہ اطمینان حاصل ہوا۔ غمخوار بے فکر ہوئے۔ دوستون مین [illegible] چہ میگوئیان ہوئین۔ اور رفتہ رفتہ یہ تغیر بھی پرانا پڑگیا۔

جذب عشق کب تک بے اثر رہے گا۔ سچی محبت کی کشش کب تک اثر نہ کرے گی؟ .... قطب نمائے حسن کی سوئی کب تک اضطرار کی حالت مین رہیگی؟..... سوسائٹی کی بیجا یا بجا علائق کا کب تک [illegible] رہیگا؟ .... پاک معصوم اور بھولا بھالا دل کب تک متاثر نہوگا؟ ..... بوالہوسون کی عارضی نمایش کا کب تک رنگ نہ کھلے گا؟ ...... نیک کانشنس نادانستہ ظلم کی تلافی بغیر کب تک مطمئن رہیگا؟........

عاشقِ ہجران نصیب کی برگشتہ قسمت نے پلٹا کھایا۔ تغافل کا عکس شروع ہوا۔ نامرادی کی بختِ خفتہ نے کروٹ لیکر آنکھین کھولدین۔ خرمنِ حسن مین عشق کی چقماق سے آگ لگ گئی اور ایسا شعلہ بھڑک اُٹھا کہ تمام خس وخاشاک اُس سے جل کر خاکستر ہوگئے۔ سوسائٹی کی بندشین تارِ عنکبوت ہوگئین۔ اور مسیحا خود بیما

بڑھ کر اپنے بیمار کی زیارت کو چلا!! . . . .

یا وہ بے رخی تھی کہ آنکھیں اٹھا کر دیکھنا بھی گوارا نہ تھا یا یہ التفات ہے کہ آنکھیں اٹھنے کی خود منتظر ہیں !!

ناگہاں مریض کو یہ خواب کا گمان ہوا آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھا کہ وہ قلب تڑپ کر اپنے مرکز سے ہٹ گیا اور اپنی بساط سے بڑھ کر دل دھڑکنے لگا . . . .

حسن نے اپنی الوہیت کی انتہا کر دکھائی ... نے ت دیر کی!! . . . . . بسمل نیم جان پر شادی مرگ کی حالت طاری ہو گئی!! . . . . . . پرستارِ حسن نے لن ترانی کی جگہ نیچی نظریں پائیں . . . . .

آخر اس گستاخی کا تحیر کا خاتمہ ہوا شعور نے اپنی موجودگی کا یقین دلا کر خواب کے خیال کو دھو ڈالا . . . . .

مگر آہ! . . . . . . اس احسان کے شکریہ کے اظہار کے لیے تمام دنیا کی زبانیں گونگی ہیں اور تمام مذاہب کے سجدے بیکار!! . . . .

اے وفا ہرگز نہ بود پیشہ ات
از تو این لطف تو بالاتر است

م۔ ح۔ مسلم

محفل میں اُن کے سامنے گو میں خموش تھا — ظاہر نگاہِ شوق سے اُلفت کا جوش تھا
مجنوں کی خاک دوشِ صبا پر تھی نجد میں — لیلیٰ کی جستجو میں وہ خانہ بدوش تھا
بیخود وہ ہو گئے تری کافر نگاہ سے — دعوائے صبر تھا جنہیں دعوائے ہوش تھا
مجھ سا گناہگار سرِ حشر بچ گیا — دامن ترے کرم کا مرا پردہ پوش تھا
پروانے کی خطا نہیں اے شمعِ بزمِ یار — تجھ سے لپٹ گیا یہ محبت کا جوش تھا
قاضیِ شہر، شیخِ حرم ہو کہ محتسب — ساقی نے جس کو دیکھ لیا بادہ نوش تھا

دل جل رہا تھا صورتِ پروانہ بزم میں
باسط مثالِ شمع مگر میں خموش تھا

باسط۔ بسوانی

"پردہ"

پردہ اگر نہ ہوتا تھا انتظام مشکل — پردے مین ہو رہے ہین دنیا کے کام مشکل
کس طرح چین آتا کیونکر حیات ہوتی — دن کی جو روشنی پر پردہ نہ رات ہوتی
پردہ اگر نہ ہوتا دل مین لہو بھرا تھا — پردہ اگر نہ ہوتا کعبہ مین کیا دھرا تھا
تو ماہ پہلے قیدِ فطرت مین چین پایا — پردہ جو لازمی تھا پھر گور نے چھپایا

پردہ کی سب ہے قوت اعضا مین پیدا نہ ہوتا
پردہ اگر نہ ہوتا دنیا مین کچھ نہ ہوتا

کس طرح جان کھوئے پروانہ نیم جان ہے — فانوس کا تو پردہ اے شمع درمیان ہے
پردے مین تو چھپی ہے لیکن جلے وہ کیونکر — بیتاب ہو رہا ہے تجھ پر جلے وہ کیونکر
پروانے کا نہ سننا اپنا نہ حال کہنا — اے شمع کس سے سیکھا پردہ مین بیٹھ رہنا
تو زرد ہو گئی ہے آنسو ترے بہے ہین — پردے مین راز تیرے پروانے لے رہے ہین
پردے مین تو چھپی ہے کیا جانستان ادا ہے — تو جان لے رہی ہے وہ جان دے رہا ہے
دعویٰ ترا بجا ہے فانوس مین نہان ہے — انداز حسن تیرا پردے سے بھی عیان ہے

پروانے کو میسر ہرگز تپش نہ ہوتی
پردہ اگر نہ ہوتا ایسی کشش نہ ہوتی

تاثیر اپنے دل پر کیا کیا اثر فزا ہے — پیشِ نظر نہین ہے پردے مین ہر صدا ہے
برسون پھرے چمن مین برسون تلاش کی ہے — گل سامنے عیان ہے پردے مین تو چھپی ہے
پردے کی رہنے والی کیا لطف آ رہے ہین — تیرے نسیم جھونکے دل گدگدا رہے ہین
شاید نہ تھی چمن مین امیدِ کامگاری — بے پردہ ہو کے شبنم پردے مین پھر سدھاری

پردے مین رکھ کے یارِ پردہ نشین نے مارا
پردے سے اُس نے ہمکو سو طرح پکارا

کوئی صدا سنی جب یاد نگار آئی
دل نے کہا تڑپ کر آواز یار آئی

نالے نہ در بدر ہم یوں دلخراش کرتے
پردہ جو وہ نہ کرتا کس کو تلاش کرتے

بے پردہ سامنے تو اے پردہ در کھڑا ہے
پردہ دوئی کا اپنی آنکھوں پہ خود پڑا ہے

انداز کون ہے جو قائل نہیں تمہارا
پردے سے باہر آنا مشکل نہیں تمہارا

ہستی جلا کے ہم بھی اٹھ جائیں گے جہاں سے
پردہ کو پھونک دیں گے آہ شرر فشاں سے

آنکھوں میں پھر رہا ہے پردہ میں چھپا ہے
او دل کے رہنے والے کیوں ہم سے تو چھپا ہے

پردے میں کیوں چھپا ہے اے نور بے نیازی
ہر شان سے عیاں ہے ہر شان کرشمہ سازی

نکہت چھپی ہوئی ہے سمجھے ہیں خوب ہم بھی
گل میں ہے رنگ تیرا گلشن میں بو ہے تیری

باغ جہاں پہ تیرا احسان ہے نمایاں
ہر برگ کہہ رہا ہے ہم سے ترا فسانہ

سامان کارسازی پردے میں ہو رہے ہیں
انداز دلنوازی پردے میں ہو رہے ہیں

روتے ہیں منہ چھپا کر راتوں کو رونے والے
پردے میں ہو رہے ہیں سب کام ہونے والے

دل میں ہمیں جگر وہ دیر آشنا نہ ملتا
پردہ اگر نہ ہوتا پھر بھی مزا نہ ملتا

حکیم جگر صدیقی زمیندار بسوان

اب قفس سے نہ جدا کر مرے صیاد مجھے
آشیاں یاد ہے ظالم نہ چمن یاد مجھے

کچھ بھی شکوہ نہیں تجھ سے ستم ایجاد مجھے
کر دیا میری تمناؤں نے برباد مجھے

دلکشی خانۂ زنداں کی بتاؤں کیونکر
کر نہ دیں اہل ستم قید سے آزاد مجھے

درد دل کہنے پہ مجبور نہ کر اے صیاد
مہرباں پا کے تجھے کچھ نہیں یاد مجھے

دل سودا زدہ پھر جان سے بیزار ہوا
لیچلا پھر طرف کوچۂ جلاد مجھے

خوشنوایان گلستاں کی نشانی ہوں میں
ذبح کر کے کہیں پچھتائے نہ صیاد مجھے

اپنی تقدیر کی خوبی پہ ہوں نازاں سرشار
بعد مدت کے قاتل نے کیا یاد مجھے

نقد و تبصرہ

(از "ناظر")

(الف) ادب

(۱) مجموعہ کلام جوہر - مولانا محمد علی کے کلام کا مجموعہ، حجم ۵۴ صفحہ، تقطیع جیبی، مع تصویر مولانا۔ قیمت ۸ / ملنے کا پتہ: جامعہ ملیہ اسلامیہ (نیشنل مسلم یونیورسٹی) علی گڑھ

فطرت کبھی کبھی غیر معمولی فیاضی سے کام لیکر ایسے افراد بھی پیدا کرتی رہتی ہے، جن کی ذات مختلف و متعدد صفات عالیہ کی جامع ہوتی ہے اس قسم کے افراد میں سے ایک ہمارے مولانا محمد علی جوہر بھی ہیں ان کی انگریزی انشا پردازی ایک زمانہ سے مسلم چلی آتی ہے، فن صحافت (جرنلزم) میں اُن کے کمالات کا اعتراف تمام ماہرین فن کر چکے ہیں، اُن کی قوت تقریر مخالفین پر بھی اپنا سکہ بٹھا چکی ہے، اُن کا حُب قوم شک و تذبذب کے مرتبہ سے مدت ہوئی ارفع ہو چکا ہے، لیکن کم لوگوں کو معلوم ہو گا کہ وہ جس پایہ کے انگریزی ادیب ہیں اسی درجہ کے اُردو کے شاعر بھی ہیں۔ ان کی شاعری رسمی قافیہ پیمائی نہیں۔ دل سے نکلے ہوئے شرارے ہیں۔ درد و اثر سے کوئی مصرع خالی نہیں "آنچہ از دل خیزد بر دل ریزد" قدیم فارسی مقولہ ہے پیش نظر دیوان اس کلیہ کی پوری تصدیق کریں گے۔ زبان کی سلاست اور بیان کی صفائی اس پر مستزاد ہیں آورد و تصنع کی جھلک ایک شعر میں بھی نہ ملے گی، ساری کتاب "آپ بیتی"، آمد، بے تکلفی، برجستگی کا ایک مسلسل مرقع ہے چند شعر ملاحظہ ہوں ؎

تم یوں ہی سمجھنا کہ فنا میرے لیے ہے
پر غیب سے سامان بقا میرے لیے ہے

پیغام ملا تھا جو حسینؑ ابن علیؑ کو
خوش ہوں وہی پیغام قضا میرے لیے ہے

میں کھو کے تری راہ میں سب دولت دُنیا
سمجھا کہ کچھ اس سے بھی سوا میرے لیے ہے

توحید تو یہ ہے کہ خدا حشر میں کہدے
یہ بندہ دو عالم سے خفا میرے لیے ہے

کیوں ایسے نبیؐ پر نہ فدا ہوں کہ جو فرمائے
اچھے تو سبھی کے ہیں بُرا میرے لیے ہے

دورِ حیات آئے گا قاتل قضا کے بعد　　ہے ابتدا ہماری تری انتہا کے بعد
قتلِ حسین اصل میں مرگِ یزید ہے　　اسلام زندہ ہوتا ہی ہر کربلا کے بعد
تجھ سے مقابلہ کی کسے تاب ہے ولے　　میرا لہو بھی خوب ہی تیری حنا کے بعد
لذت ہنوز مائدہ عشق میں نہیں　　آتا ہے لطف جرمِ تمنا سزا کے بعد

جہان کہیں نعتیہ مضامین باندھے ہیں، وہان کلام میں غیر معمولی لطف و کیف پیدا ہو گیا ہے جس کی قدر اہل دل ہی کر سکتے ہیں۔ مثلاً ؎

تنہائی کے سب دن ہیں تنہائی کی سب راتیں　　اب ہونے لگیں اُن سے خلوت میں ملاقاتیں
کوثر کے تقاضے ہیں تسنیم کے ہیں وعدے　　ہر روز یہی چرچے ہر رات یہی باتیں
معراج کی سی حاصل سجدون میں ہے کیفیت　　اک فاسق و فاجر میں اور ایسی کراماتیں
بے مایہ ہیں ہم لیکن شاید وہ بلا بھیجین　　بھیجی ہیں درودون کی کچھ ہم نے بھی سوغاتیں

تمام محاسن ظاہری و معنوی کے ساتھ مرتب صاحب سے دو ایک فروگذاشتین بھی ہو گئی ہین مثلاً صفحہ ۹۲ پر جو مطلع "سلام کے بعد" والی غزل کا درج ہی، یہ مطلع حضرت جوہر کا نہین بلکہ حضرت آغا علی زی پوری کا ہی جو اُن کے مطبوعہ دیوان میں موجود ہی۔ اسی طرح صفحہ ۳ پر جوہر کا ایک دلچسپ شعر درج ہونے سے رہ گیا ہی ؎

تم تو کعبہ کے خدا تھے پھر نکالے کیون گئے
اے بتو کیسی خدائی ہوتے ہوتے رہ گئی

(۲) انتخاب زرین۔ مرتبہ مسٹر سید راس مسعود ڈائرکٹر تعلیمات حیدرآباد دکن۔ حجم ۲۷۸ صفحہ۔ تقطیع خورد کاغذ چکنا کتابت و طباعت خوشنما۔ ملنے کا پتہ نظامی پریس بدایون۔ قیمت فی نسخہ مجلد عہ/

مختلف شعرا کے کلام کو اپنے مذاق کے مطابق انتخاب کر کے بیاض یا کشکول مرتب کرنا قدیم مشرقی دستور چلا آتا ہی، سید راس مسعود صاحب ناظم تعلیمات سرکار دکن نے بھی گذشتہ و موجودہ اُردو شعرا کا کلام اسی طرز پر اپنے مذاق کے مطابق منتخب کر کے شایع کیا ہی۔ اصول انتخاب مرتب صاحب کے الفاظ مین یہ رہا ہے :-

"مین نے وہی کلام انتخاب کیا ہی جس کو میرے دل نے پسند کیا جن اشعار نے مجھ پر گہرا اثر کیا انھین کو مین نے اس تذکرہ مین لیا ہی اور جن اشعار سے صرف عارضی یا فوری ولولہ پیدا ہوتا تھا اُن کو ترک کر دیا ہی" دیباچہ صفحہ ۱)

ظاہر ہی کہ کوئی انتخاب ایسا نہین ہو سکتا جو ہر مذاق کے موافق ہو تاہم یہ دیکھ کر مسرت ہوتی ہی کہ پیش نظر مجموعہ کا بیشتر حصہ ایسا ہی جو ہر صحیح المذاق شخص کے انتخاب مین آسکتا تھا، مولف صاحب کا نشو و نما تمام تر انگریزی صحبتون مین ہوا ہی اس بنا پر خیال یہ تھا کہ اُن کا ذوق بھی تمام تر غربی ہوگا۔ اور ہندوستان کی مادری زبان اُن کے عرصۂ التفات سے خارج ہوگی۔ یہ تالیف اس خیال کی تردید کے لیے بالکل کافی ہی اور اُردو کا ہر بہی خواہ یہ دیکھ کر خوش ہوگا کہ سید احمد خان کے خاندان سے ابھی خدمت زبان کا ولولہ اور ذوق ابھی بالکل رخصت نہین ہو گیا ہی،

مجموعہ کا اکثر حصۂ غزلون پر مشتمل ہی، لیکن دیگر اصناف سخن (مرثیہ، سلام، قطعات، مسدس وغیرہ) کو بھی نظر انداز نہین کیا گیا ہی، کل ۹۵ شعرا کا انتخاب دیا گیا ہی جسمین ولی دکنی سے لیکر عزیز لکھنوی تک تقریباً تمام قابل ذکر شعرا آ گئے ہین، منتخب نظمون کی تعداد ۱۲۰۲ تک پہنچی ہی، ہر شاعر کے مختصر حالات بھی چند سطرون مین مندرج ملتے ہین صحت سنین ولادت و وفات کا خاص اہتمام رکھا گیا ہی۔ غالب حالی اقبال میر پر زیادہ توجہ رہی ہی، جو بالکل بجا ہی، البتہ پورے ۶ صفحے چکبست صاحب کی نذر کر دینا، اور حضرت اکبر کی صرف ایک غزل کا انتخاب کرنا ایک طرف اسراف بے محل اور دوسری طرف بخل بیجا کا ثبوت دیتا ہی جا بجا مسامحات بھی ملین گے مثلاً غالب کا مدفن احاطہ درگاہ حضرت محبوب الٰہی بتایا ہی۔ یہ صحیح نہین، احاطہ درگاہ سے دو فرلانگ کے فاصلہ پر ایک جُداگانہ مختصر حلقہ مین غالب کی قبر ہی۔ نظم طبا طبائی کا سال ولادت بھی محتاج تحقیق رہ گیا ہی۔

(۳) انتخاب مخزن۔ ضخامت ۲۰۰ صفحہ۔ تقطیع ۱۸ × ۲۲۔ کاغذ و طباعت درجہ اوسط قیمت ۱۲/ ملنے کا پتہ:۔ شیخ مبارک علی تاجر کتب۔ لوہاری دروازہ۔ لاہور

مخزن (لاہور) کی ابتدائی جلدون کا انتخاب پندرہ سال ادھر شایع ہو کر ملک مین مقبول ہو چکا ہے، یہ انتخاب بعد کی ۹ جلدون کا ہی۔ نوعیت مضامین کا اندازہ عنوانات ذیل سے ہوگا:۔ موسیقی، خوشی، خدا کی ہستی، فریب دولت، تولہ بھر ریڈیم، نابینا بیوی، حضرت کُن وغیرہ، مضمون نگارون مین خواجہ حسن نظامی شیخ عبدالقادر، سلطان حیدر جوش، سجاد حیدر، لالہ لاجپت راے، باقر علی داستان گو کے اسماء گرامی قابل ذکر

ہین۔ حصہ نظم مین اکبر، اقبال، محمد علی جوہر، ناظر، تسلیم و وحشت کی جادو بیانیان اپنی جانب متوجہ کرینگی
مجموعہ فی الجملہ عجیب ہی البتہ فہرست مضامین کا فقدان بار بار ناگواری کے ساتھ محسوس ہوتا ہی۔

(ب) سیرت و تاریخ

(۱) تاریخ الامت حصہ اول سیرۃ رسول اللہ صلعم (۲) تاریخ الامت حصہ دوم خلافت راشدہ	مولفہ حافظ محمد اسلم صاحب استاد تاریخ اسلام جامعہ ملیہ اسلامیہ علی گڈھ مجموعی ضخامت ۔۔۔ ۴۰۰ صفحہ تقطیع ۲۰×۲۶ کاغذ و طباعت درجۂ اوسط ملنے کا پتہ :۔ دفتر جامعہ ملیہ اسلامیہ علی گڈھ۔ قیمت عہ و ۶/

جامعہ ملیہ اسلامیہ مسلمانان ہند کی بہترین توقعات کی مرکز ہی اس کا بانی (محمد علی) اسلام اور حضور شارع اسلام صلعم کے ان شیدائیون مین ہی جو صدیون مین پیدا ہوکر بلال حبشی رض و اویس قرنی رح کی یاد تازہ کرتے رہتے ہین، جامعہ کا دعوی یہ تھا کہ وہ قوم کو ذہنی غلامی اور دانائی فرنگ" کی مرعوبیت سے آزادی دلاکر ذوق صحیح و طلب حق پیدا کرے گی۔ اس اسلامی دار العلوم مین تاریخ اسلام کی مسند درس حافظ محمد اسلم صاحب کے سپرد ہوئی تھی جن کا تازہ کارنامہ تاریخ الامت کی شکل مین دنیا کے سامنے ہی۔

سیرت نبوی پر قلم اٹھانا، ایک مسلمان کے نزدیک دنیا کے سامنے دشوارترین کامون مین سے ہے حضور سرور کائنات صلعم کے متعلق قلم کی ایک معمولی غیر ذمہ دارانہ جنبش بھی ایک مسلمان کے عقیدہ مین انتہائی جرم ہی چنانچہ اس زمانہ کے آزاد خیال علما تک اس جرأت کا قصد کرکے مدتون ہچکچاتے رہے۔ مولانا شبلی کی وسعت نظر، ذوق تحقیق، اور پھر آزاد خیالی مین کس کو کلام ہوسکتا ہی، بااینہمہ جب انھون نے تالیف سیرۃ نبوی کی تحریک پیش کی تو صاف اعتراف کیا:۔

> مین مدت سے ان باتون کا احساس کررہا تھا لیکن اس بنا پر قلم اٹھانے کی جرأت نہین ہوتی تھی کہ آنحضرت کے واقعات مین ایک حرف بھی صحت کے اعلی معیار سے ذرا اتر جاے تو سخت جرم ہی یہی وجہ ہی کہ عربی زبان مین سیکڑون ہزارون کتابین لکھی گئین لیکن جو گروہ زیادہ محتاط اور ادب شناس تھا اس نے بہت کم جرأت کی۔ کبار محدثین ۔۔۔۔ نے سیرت نبوی مین کوئی کتاب نہین لکھی" (الندوہ، جنوری ۱۹۱۲ء)

لکھنے کے لیے قلم اٹھاتے ہین، لیکن یہ حالت ہی کہ کام کے احساس عظمت سے ہاتھ کانپنے جاتے ہین۔ فرماتے ہین :۔

"اس شدید ضرورت کو تسلیم کرتا ہون لیکن یہ کام انجام دینا آسان نہین ہین اُن مشکلات کو کسی قدر توضیح سے لکھتا ہون تاکہ قوم اپنی اور میری ذمہ داریون کو اچھی طرح سمجھ لے" (ایضاً)

خود سیرت کے دیباچہ مین بھی ان مشکلات کا اعتراف ملتا ہے:-

"میرا فرض اولین یہی تھا کہ تمام تصنیفات سے پہلے مین سیرت نبوی کی خدمت انجام دیتا لیکن ایک ایسا اہم اور نازک فرض تھا کہ مین مدت تک اسکے ادا کرنے کی جرأت نہ کرسکا...... واقعہ یہ ہے کہ کوئی تصنیف اس تصنیف سے زیادہ دیر طلب و جامع مشکلات نہین ہوسکتی" (سیرۃ نبوی حصہ اول جلد اول صفحہ دوم)

یہ اعتراضات شبلی کے تھے، لیکن ہمارے اُستاد تاریخ اسلام، کا فضل و تبحر اس قسم کی مشکلات سے ارفع تھا۔ اُن کے پیش نظر قدماء کی تصانیف کا اسقدر عظیم الشان ذخیرہ موجود تھا، کہ

"اُن سے اس زمانہ کی تاریخ کا مرتب کرلینا آسان کام ہے" (تاریخ الامت حصہ اول صفحہ ۱)

ہمارے محقق کو جو کچھ دشواری محسوس ہوئی، وہ صرف یہ تھی، کہ ان قدیم مصنفین نے

"صرف واقعات کو سلسلہ وار جمع کردیا ہے نہ اُن کے اسباب سے تعرض کیا ہے نہ انکی نسبت اپنی رائین لکھی ہین" (صفحہ ۱)

اس قدیم طریقہ تصنیف پر اگرچہ عقلاً و نقلاً کوئی اعتراض وارد نہین ہوتا، خود حافظ اسلم صاحب کے نزدیک بھی۔

"اصولاً و انصافاً یہ طریقہ پسندیدہ تھا" (صفحہ ۸)

تاہم اس حقیقت کبریٰ سے یہ روشن خیال محقق کیونکر قطع نظر کرسکتا تھا کہ

"اب زمانہ بدل گیا ہے، لوگ مورخ کی راے کو ضروری سمجھنے لگے، اس لئے خود مسلمان بھی اپنی روش بدلنے پر مجبور ہوگئے" (صفحہ ۸)

اللہ اکبر! اسقدر قوی دلیل اور کسقدر معقول وجہ ارشاد ہوئی ہے، یہ نہین کہ قدماء کے طرز تحریر مین کوئی مذہبی سقم تھا، یہ نہین کہ ان کا طریق بیان حق و صداقت سے الگ ہوتا تھا، یہ نہین کہ اس پر عقلاً کچھ اعتراضات وارد ہوسکے ہین، بلکہ یہ اور صرف یہ جُرم اُن پر عائد ہوتا ہے کہ اُنھون نے موجودہ مغربی معیار کی پیروی نہین کی! ہمارا روشن خیال محقق اور سب کچھ سہہ سکتا ہے، لیکن اس کی برداشت اُس کے امکان سے باہر ہے کہ اس کی تحریر کا ایک حرف بھی موجودہ مغربی معیار سے گرا ہوا سمجھا جاسے۔ اس کی روشن خیالی کا قدرتی نتیجہ یہ تھا کہ اس نے قدماء کے ذخیرۂ تصانیف کو خرافات و ناقابل التفات سمجھا اور بجاے ماخذ اصلی کی طرف رجوع کرنے کے اپنے پیش نظر

اپنے ایک ہمعصر اور ہم چشم (اس لیے کہ وہ صاحب بھی جامعہ مصریہ میں اُستاد تاریخ اسلام ہیں) کی تالیف کو رکھا۔ یہ کوئی قیاس و بدگمانی نہیں، حضرت مولف ایک ایسی جسارت کے ساتھ جو جرم بے نیازی مجرمون کے ساتھ مخصوص ہے، اپنی اس روشن خیالی کی تصریح فرماتے ہیں:-

> مین نے جسوقت اس کتاب کے لکھنے کا ارادہ کیا، تو دیکھا کہ قدیم تاریخون سے کاربرآری مشکل ہوا ہے۔ جدید تصنیفات پر نظر دوڑائی ان مین علامہ شیخ محمد الخضری استاذ تاریخ الاسلام جامعہ مصریہ ۔۔ کی تاریخ الامم الاسلامیہ مجھے ملی جس سے وہ مشکل آسان ہوگئی" (صہ ۲)

اس مشکلکشا کا ذرا وصف مخصوص بھی سن لیجیے۔ یہ نہیں کہ اسکے مصنف قدیم ذخیرہ تصنیف پر کوئی بڑی گہری یا وسیع نظر رکھتے ہیں، یہ بھی نہیں، کہ ذات حضور سرورکائنات صلعم کے ساتھ کوئی قلبی نسبت رکھتے ہیں، اور پھر یہ بھی نہیں کہ روایات کی عقلی تنقیح و تنقید مین کوئی خاص دستگاہ رکھتے ہیں، بلکہ یہ اور صرف یہ، کہ جیسے ہماری جامعہ ہندیہ کے استاد تاریخ اسلام کی طرح یہ جامعہ مصریہ کے استاد تاریخ اسلام بھی روشن خیالی سے بہرہ وافر رکھتے ہیں، ارشاد ہوتا ہے:-

> مشکل آسان ہوگئی، کیونکہ شیخ موصوف نے اس کتاب کو موجودہ اصول تاریخ نویسی کے مطابق مرتب کیا ہے!! (صہ ۲)

انا للہ وانا الیہ راجعون۔ کس قدر عبرت کا مقام ہے کہ ایک سچا عاشق رسولؐ (محمد علی) مغربیت و فرنگیت سے تنگ آکر ایک خالص اسلامی درسگاہ قائم کرتا ہے، مسلمانون کو یورپ کی دماغی غلامی سے نجات دلانے کی سعی مین اپنی دنیا برباد کردیتا ہے، اپنی درسگاہ مین قرون اولی کی فضا پھیلانا چاہتا ہے، اسی درسگاہ کا ایک تنخواہ دار معلم جس کے سپرد تاریخ اسلام جیسا مقدس مضمون ہے، اس مقدس درسگاہ کے احاطہ کے اندر وہی مسموم فضا پھیلاتا ہے، جس کے اندر خود اُس کی عمر کا بیشتر حصہ (قدیم علیگڈھ کالج مین رہکر) گذر چکا ہے اور اپنی دماغی غلامی کو کھلے خزانہ طلبہ تک متعدی کر رہا ہے

تہذیب جدید کا یہ آنریری مشنری اپنی روشن خیالی کا مزید ثبوت یون دیتا ہے:-

> "تاریخی حیثیت سے ہم کسی شخص کی صرف اُس فضیلت کو لکھ سکتے ہیں جسکا ثبوت واقعات سے ملے" (صفحہ ۳)

لیکن یہ لکھنا شاید سہواً نظر انداز ہوگا، کہ کسی "واقعہ" کی واقعیت کا کیا معیار ہے؟ یقیناً یہ کہ وہ روایت جسے یورپ والے تسلیم کرلیں۔

کانِ عقلیت کے چند جواہر ریزے بھی قابل ملاحظہ ہین :-

"مسلمان بھی دوسری قومون کی طرح اپنے پیشوایان مذہب کے ساتھ عقیدت مندی مین غلو کرتے ہین اور سمجھتے ہین کہ ان سے کسی قسم کی غلطی کا ہونا محال تھا یہی وجہ ہے کہ اکثر ائمہ و بزرگان دین کی سوانحعمریان . . . تاریخی معیار سے دور جا پڑی ہین . . . . . ہمارے بیان کی بنیاد علم پر ہے نہ کہ عقیدت پر، ہم نے یہ فرشتون کی تاریخ نہین لکھی ہے بلکہ انسانون کی" (دیباچہ ۳)

اِس بیگانۂ عقیدت مدعی علم و دانش سے کوئی یہ دریافت کرے، کہ صحابہ کرام کا انسان ہونا بالکل مسلم لیکن کیا وہ اِس درجہ اور اسی طرز کے انسان تھے، جیسے وہ خود، یا سطور ہذا کا راقم، یا اُن کے ناظرین ہین؟ اور کیا اُن کے مشاجرات اور "باہمی نزاعات" پر اسی طرح رائے قائم کی جا سکتی ہے جیسی آج لائڈ جارج و پوئنکارے کی باہمی جوتی پیزار پر ہو سکتی ہے؟ حافظ اسلم صاحب کی علمی قابلیت، اخلاق و عادات پر آج اگر ایک تین چار سال کے بچہ سے رائے لی جائے تو حافظ صاحب کہانتک اسے جایز رکھین گے؟ بعینہ یہی نسبت حافظ صاحب کو حضرات صحابہ کرام کے ساتھ ہے۔ آج ایک جاہل گنوار اگر ڈاروِن کے اصول ارتقا یا کینٹ کے فلسفہ پر تنقید کرنے لگے، تو حافظ صاحب غالباً اُسے آگرہ کی ایک مخصوص سرکاری عمارت مین بند کیے جانے کی تجویز فرمائین لیکن بااینہمہ اِس سے بڑھ کر یہ جسارت دیبا کی ہے کہ حضرت شیر خدا کرم اللہ وجہہ کو "بے تدبیری" "بے صبری" "کمزوری ارادہ و تعجیل کاری" کا ملزم قرار دیا جائے (صفحہ ۳۴۴)، انھین عجیب غریب عجلت کا مرتکب گردانا جائے (صفحہ ۳۴۳) حضرت عثمان ذوالنورینؓ کے اخلاق کریمانہ پر یہ تنقید کی جائے کہ

"یہ خلق کسی حکیم یا عالم مین ہو تو بہت قابل تعریف ہے لیکن فرمانروا و خلیفہ کے لیے پسندیدہ نہین (صفحہ ۳۲۶)

اور خلفاء ثلثہ کی شہادت کے واقعہ کو "قتل" کے عام لفظ سے موسوم کیا جائے!

حافظ صاحب نے جس قسم کے "واقعات" رقم فرمائے ہین، اور جسطرح اُن کو اُن کی محض تاریخی حیثیت پر نازہ ہے، اِن کے لحاظ سے یہ خدمت آج سے بہت پیشتر میور، مارگولیس وغیرہ متعدد مستشرقین یورپ انجام دے چکے ہین حافظ صاحب نے اگر بجائے جامعہ مصر کے استاد تاریخ کے، آکسفرڈ کے اساتذہ، تاریخ اسلام کو اپنا ماخذ بنایا ہوتا تو مدعیان "علم" و "حکمت" یقیناً چند قدم اور آگے بڑھ کر لبیک کہتے۔ شاید اِس فروگذاشت کا سبب حافظ صاحب کی انگریزی مین عدم مہارت ہو۔ اگر ایسا ہے، تو جوان ہمتی سے کام لیکر اب انگریزی زبان کی تحصیل و تکمیل پر پورا وقت صرف کرنا چاہیے کہ بغیر اِس کے معراج عقلیت و فرنگیت نصیب ہونا ممکن نہین۔

ساری کتاب میں اول سے آخر تک بجائے مذہبیت و اسلامیت کے یہی عقلیت و فرنگیت کی روح سرایت کیے ہوئے ہے کسی ایسی روایت کا سایہ تک نہیں پڑنے پایا ہے جسکا قبول کرنا موہوم عقل پر کچھ بھی بار ہو اس کا قدرتی نتیجہ یہ ہے کہ صحابہ بیچارے تو الگ رہے، خود حضور آقائے دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے مخصوص فضائل، ہاں وہ فضائل جو با وجود حضور صلعم کی بشریت کے عام بشری سطح سے آپ کو ممتاز کرتے ہیں۔ اُن کے تذکرہ سے یہ نام نہاد "سیرۃ الرسول" یکسر خالی ہے۔ اُن کے بجائے حضور سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کے صرف عام محاسن اخلاق، حلم، کرم، تواضع، راستی، وغیرہ کے چند واقعات مندرج ہیں گے، جن سے "دانایانِ فرنگ" و "عقلاے یورپ" کو بھی مجالِ انکار نہیں، بلکہ جن کا اعتراف ابوجہل و ابولہب تک کو تھا۔

حضور صلعم کے سفرِ طائف کی کل کائنات اس مسلمان محقق کے نزدیک اتنی ہے کہ آپ

"زید بن حارثہ کو لیکر طائف کی طرف گئے ...... اسلام کو پیش کیا، لیکن اُن لوگوں نے مطلق توجہ کی بلکہ سخت کلامی سے پیش آئے، اور آپ جس وقت وہاں سے چلے، اُنھوں نے اپنے غلاموں اور بازار کے اوباشوں کو اُبھار دیا، جنھوں نے پتھر برسانے شروع کیے ...... وہاں سے ناکامیاب کہیں واپس آئے، خانہ کعبہ کا طواف کیا، نماز پڑھی، اور گھر تشریف لے گئے" (صـ۶۳)

ذکر میلاد مبارک کے لیے صرف الفاظ ذیل کافی خیال کیے گئے ہیں :-

"دوشنبہ کے دن صبح کے وقت ۹ ربیع الاول مطابق ۲۰ اپریل ۵۷۱ء کو اسی سال جس میں اصحاب فیل کا واقعہ ہوا تھا، آنحضرت صلعم کی ولادت ہوئی" (صـ۲۶)

گویا ظہور قدسی بھی مولف کتاب یا ریویو نگار کی ولادت جیسا واقعہ تھا آغاز جہاد کے اسباب کی تشریح کرنا بھی شاید اس روشن خیال مورخ کے نزدیک داخلِ عقیدت تھا، اس لیے ذیل کے تشفی بخش عبارت پر اکتفا کی گئی :-

"قریش کا قافلہ تجارت کے لیے ہر سال ملک شام کو جایا کرتا تھا، اور یہی ان کا ذریعہ معاش تھا، مدینہ چونکہ اُن کے راستہ میں تھا اس لیے مسلمانوں نے سوچا کہ ان کی اس تجارت کو روک دیں تاکہ وہ عاجز ہو کر صلح کر لیں" (صـ۹۱)

گویا موجودہ مہذب و متمدن سلطنتوں کی طرح یہ بھی فریق مخالف کی ناکہ بندی کی ایک صورت تھی۔ جن لوگوں کے قلوب عقیدت اسلام سے بیگانہ، اور عشق رسول کی نعمت سے محروم ہیں، خدا معلوم

اسپنے تمایں حامی اسلام کے پردہ مین کیون ظاہر کرتے ہین۔ زبان پر خواہش وصل یار ہی اور مرد ی کا عالم ہو کہ رقیب کے نام سے لرزتے جاتے ہین۔ خدا محمد علی کے سوز دل کے طفیل مین ان کی جامعہ کے کارکنون کو توفیق نیک و عقل سلیم دے۔

نظرے خوش گذرے

مسٹر جلیل احمد (علیگ) کے مضمون کو ہزار داستان اور ادیب اُردو مین چھپا ہوا دیکھ کر جو خیالات گذشتہ نمبر مین ظاہر کیے گئے تھے اُن کے جواب مین صاحب مضمون کی یہ تحریر وصول ہوئی ہی :-

"الناظر بابتہ فروری سنہ ۱۹۲۳ء دیکھا، اپنا مضمون بھی پڑھا اور نظرے خوش گذرے، بھی نظر سے گذرا۔ واقعات یہ ہین کہ مین نے اس مضمون کو پہلے "ہزار داستان" مین بھیجا لیکن وہان سے عرصہ تک کوئی رسید نہین آئی۔ مین نے متواتر دریافت کیا اور رسید بھی طلب کی گر بے سود۔ آخر مین نے ناامید ہو کر آپ کی خدمت مین روانہ کیا۔ ادیب اُردو مین مین نے نہین بھیجا بلکہ میرے ایک دوست اختر ہاشمی نے اپنی طرف سے اُسے روانہ کر دیا۔ مجھ سے وہ مضمون دیکھنے کے لیے لے گئے تھے گر جانتا مجھے خبر نہین کہ اُنھون نے وہان بھیجدیا"

اسکے بعد ظاہر ہی کہ صاحب مضمون سے کسی قسم کی شکایت نہین رہ سکتی۔ مگر الناظر کے نوٹ سے فائدہ کی ایک صورت یہ نکل آئی کہ مکرمی جناب مولوی وحید الدین سلیم پانی پتی نے اس خیال سے کہ جلیل احمد صاحب سے جو شکایت پیدا ہوئی اُسکا تکدر رفع ہو جاے، اُن کے مضمون کو جو دراصل ایک انگریزی نظم کا ترجمہ تھا نظم کا جامہ پہنا کر الناظر مین شایع ہونے کے لیے ارسال فرمایا۔ یہ نظم اسی پرچہ مین درج کر دی گئی ہی اور امید ہی کہ ناظرین کرام کی خاص دلچسپی کا موجب ہوگی۔

کانگریس کی اکثریت و اقلیت کے درمیان جو افتراق پیدا ہو گیا ہی اسکے رفع کرنے کے لیے مولانا ابو الکلام آزاد کی کوششین اس حد تک توضرور بارور ہوئی ہین کہ رہنمایان اقلیت نے آخر اپریل تک گیا کانگریس کے فیصلہ پر اکثریت کے ساتھ مل کر کام کرنا منظور کر لیا۔ مگر اس کی توقع نہین کہ

ان دو مہینون کے اندر کوئی بڑا کام کیا جاسکے۔ کم سے کم صوبجات متحدہ آگرہ و اودھ مین تو سان میونسپل اور ڈسٹرکٹ بورڈون کے انتخابات نے تمام کارکنون کے وقت و توجہ کو اپنے لیے مخصوص کرلیا ہے اور ان کے اندر کوئی کام نہین ہوسکتا۔ بظاہر حالات جو عارضی مفاہمت اس وقت ہوئی ہے اس کا مقصد بجز اس کے کچھ نہین کہ موجودہ انتشار و تفریق کے نقصانات کا احساس دونون جماعتون کو ہوگیا ہے اور اس میعاد کے ختم ہوجانے سے پہلے پہلے رہنمایان کانگریس کسی ایسے طریق کار پر متحد ہوجائینگے جو اصولاً گیا کانگریس کی تجویزات پر مبنی ہو۔ گو مسٹر سی آر داس کے اس اعلان سے کہ جدید پارٹی کی تنظیم کا کام برابر جاری رہے گا۔ احتمال ہوتا ہے کہ حالات کے مطالعہ سے جو نتیجہ ہم نے اخذ کیا ہے وہ کہین غلط نہ ثابت ہو۔

خفتہ بخت مسلم لیگ کا سالانہ اجلاس گیا کے بجاے لکھنو مین منعقد ہونے والا ہے۔ مسلم لیگ سے خود اس کے اراکین کو کس قدر دلچسپی ہے اس کا اندازہ تو صرف اسی ایک واقعہ سے ہوجاتا ہے کہ لیگ کے اکثر جلسون کی کارروائی محض نصاب (کورم) کے پورا نہ ہونے سے رُک جاتی ہے لیکن کچھ اور لوگ ہین جو اپنی سنہری روپہلی مصلحتون کی بنا پر اس حالت بیہوشی مین بھی مسلم لیگ کی قدر افزائی کو تیار رہتے ہین۔ ان حضرات کی کوشش تھی کہ مسلم لیگ کا جلسہ سالانہ دہلی مین منعقد ہو۔ مگر اتفاق سے اُن کی نہ چلی۔ آئندہ جلسہ لیگ مین اس کی تو توقع نہین کہ کوئی بڑا اجتماع ہوگا۔ البتہ ایک جماعت اس تاک مین ضرور ہے کہ موقع ملے تو لیگ پر تصرف حاصل کرلے۔ لیگ کے تارک موالات اراکین علی الخصوص ڈاکٹر انصاری صاحب کو خبردار رہنا چاہیے کہ اگر ان کی طرف سے ذرا بھی غفلت برتی گئی تو لیگ ان لوگون کے قبضہ مین چلی جائے گی جو خود دوسرون کے اشارون پر کام کرنے کے عادی ہین یا موجودہ قومی تحریک سے علی الاعلان مخالفت رکھتے ہین۔

عزیز مکرم شیخ مشیر حسین قدوائی کے خلوص و آزادمنشی کے ہم ہمیشہ مداح رہے ہین اور اسی وجہ سے باوجود اختلاف راے کے ہم اُن کی بہت عزت کرتے ہین۔ لیکن گذشتہ دو سال کے اندر اُن کی اکثر تحریرون کو دیکھکر ہمین اندیشہ پیدا ہوگیا ہے کہ وہ بھی اُسی بلا مین مبتلا ہوگئے جو لیڈری کے لیے

گویا لازمی ہے۔ اگست ۱۹۲۱ء مین بمقام لنڈن مسٹر تلک کی برسی کے موقع پر اُنھون نے بحیثیت صدر جو تقریر کی تھی۔ اُس کا بڑا حصہ تحریک ترک موالات کی مدح سرائی کے لیے وقف تھا جس کے متعلق خدا معلوم اُن کو یہ غلط فہمی کیون ہے کہ وہ اُس کے بانیون مین ہین) حالانکہ عدم تشدد، کونسل عدالت و مدارس کا مقاطعہ یہ سب چیزین شروع ہی سے اس کا جزو لاینفک تھین۔ مگر اب صرف وہ اس مقاطعہ کی مخالفت فرمانے سے دریغ نہین کرتے بلکہ عدم تشدد کا علی الاعلان مضحکہ اڑا رہے ہین۔ کیا یہ صرف اس لیے ہے کہ غازی مصطفےٰ کمال پاشا کی رہنمائی مین ترکان احرار نے یونانیون کو شکست دیکر مسلمانان ہند کو موجودہ تحریک سے ایک حد تک بے نیاز کر دیا ہے۔ میدان کارزار سے مولانائے فرنگی محل کی پسپائی کے لیے تو شاید یہ حیلہ شرعی قابل قبول ہو سکتا ہو مگر قدوائی صاحب کو تو ہمارے مولوی صاحبان سے زیادہ باخبر اور واقف راز ہونا چاہیے۔ یہ ضرور ہے کہ وہ شے جسے مہاتما گاندھی نے [illegible] (غلامی ذہنی) کا لقب دیا ہے کم و بیش ان تمام لوگون پر اثر انداز ہوتی رہتی ہے جو تہذیب جدید اور علوم مغربی سے حصہ وافر حاصل کر چکے ہین۔ مگر قدوائی صاحب کی سادگی مزاج، محبت دینی اور آزادہ روی کو یقیناً اس سے بالاتر ہونا چاہیے۔

قدوائی صاحب کی ایک اور بات بھی بہت سے لوگون کے لیے ناقابل فہم ہے۔ وہ پہلے اپنی بے لاگ تحریرون کے لیے کافی شہرت حاصل کر چکے ہین مگر اب تو شاید ہی اُن کا کوئی مضمون ایسا شائع ہوتا ہو جو کچھ لوگون پر طعن و تشنیع یا کسی صاحب کی ثنا و صفت سے خالی ہو۔ اس کا شکوہ نہین کیا جا سکتا کہ اُن کی طعن و تشنیع کے مخاطب تمام تر وہی لوگ ہوتے ہین جو اگرچہ صاحب ثروت نہین مگر سالہا سال سے قوم کی بُری بھلی خدمت کر رہے ہین اور اُس گروہ سے تعلق رکھتے ہین جو حریت دوست اور آزادی طلب کہا جا سکتا ہے۔ یا اُن کی ستائش و اعتماد کے سزاوار صرف بمبئی کے لوگ کیون ہین بلکہ افسوس اس بات کا ہے کہ وہ رمز و کنایہ کی عبارت چھوڑ کر کھلے میدان مین کیون نہین لوگون پر وار کرتے اور جس شخص کی امانت کا حال ظاہر ہو چکا ہے اُس پر مسلمانون کو اعتماد رکھنے کی تلقین کیون فرما رہے ہین۔

اگر جامعۂ ملیہ پر جسے وہ محمد علی صاحب کا کھلونا کہتے ہین دس ہزار روپیہ صرف ہونا یا ڈاکٹر محمود صاحب کی کتاب پر بائیس ہزار کی لاگت آنا اُن کے نزدیک قابل اعتراض ہے تو اس کی کیا

ضرورت ہو کہ ہمدم کے کالمون مین برسبیل تذکرہ اس اسراف پر طعن کشی کی جائے۔ وہ مرکزی خلافت کمیٹی کے رکن ہین اور اسی کے جلسہ مین اس کی بحث اُٹھا سکتے تھے یا اخبارات مین کھلے لفظون مین ان باتون سے اپنی بیزاری ظاہر کرنا چاہیے تھی۔

اسی طرح اگر یہ واقعہ صحیح ہو کہ انگورہ فنڈ کا سولہ لاکھ روپیہ جو سیٹھ چھوٹانی صاحب کی تحویل مین تھا اب نقد موجود ہونیکے بجائے ساکھو اور شیشم کی لکڑی بن گیا ہو تو پھر اس تلقین اعتماد کے کیا معنی؟ اگر آپ کو دوسرون کے برخلاف امید بلکہ یقین ہو کہ روپیہ محفوظ ہو اور عند الطلب مل سکتا ہو تو صاف صاف کہیے کہ لوگون کو جو خبرین پہنچ رہی ہین اور افراد قوم کے دل مین جو بے چینی و بد اعتمادی پیدا ہو رہی ہو اُس کا دفع ہو جانا بہتر ہو ورنہ آئندہ بیوقوفون اور غرضمندون کے سوا کوئی قومی فنڈون مین چندہ نہ دے گا۔

مہاتما گاندھی کے فلسفۂ سیاسی اور اصول کار پر متعدد اطراف و جوانب سے اعتراضات ہوے اور ہون گے لیکن مسلمانون کے لیے ہرگز یہ پسندیدہ نہین کہ جب تک مصائب کے شدائد مین مبتلا رہے وہ مہاتما جی کی ہر صدا پر ہندوٴون سے زائد بلند آہنگی کے ساتھ آمنا و صدقنا کہتے رہے لیکن جیسے ہی کہ ہوا کا رُخ پلٹا اور اُنھین ذرا دم لینے کا موقع ملا اُنھون نے مہاتما جی سے مُنھ موڑ لیا اور اپنی سابقہ روش پر واپس آنے کے لیے بیتاب ہین۔ جو مسلمان یہ سمجھتے ہین کہ ہم تنہا رہکر یا حکومت کا ساتھ دیکر فلاح و خیر حاصل کرسکتے ہین اُنھین ہندوٴون سے برسرپیکار رہنا اور شملہ و لندن کو کعبۂ مقصود بنائے رکھنا مبارک ہو لیکن وہ اصحاب جو کل تک تارک موالات ہونیکا ادعا رکھتے اور ترک موالات کو بہترین حربۂ سیاسی جانتے تھے اُنھین تو ذرا ٹھنڈے دل سے غور کرنا چاہیے کہ وہ کہان جا رہے تھے اور کدھر چل رہے ہین۔ مرزا غالب نے ایسے ہی مواقع کے لیے کہا ہو کہ

وفاداری بشرط استواری اصل ایمان ہو

بے شبہ مہاتما گاندھی کی تحریک ہمین اس نتیجہ پر نہین پہنچا سکی جس کی ہم نے توقع کی تھی لیکن کیا یہ بھی کہا جاسکتا ہو کہ اہل ہند نے من حیث المجموع اور مسلمانون نے اپنے خاص مقاصد مین کوئی کامیابی حاصل نہین کی۔

اگر خداے قادر و توانا کے فرستادہ انبیا و رسل مختلف مذاہب کے مقتدر مصلحین و مبلغین اور دنیا کے

دوسرے اولوالعزم انسان ایک دن مین شہر دمہ کی تعمیر کو انجام تک نہین پہونچا سکے تو یقیناً تحریک ترک موالات سے مایوسی و بیزاری ظاہر کرنے مین مسلمان حق بجانب نہین کہے جا سکتے ۔ اور عجلت پسندی و تلون مزاجی یا مایوسی و ناامیدی کے نتائج سے تو یقیناً کوئی مسلمان بے بہرہ نہین ہو سکتا۔

اردو کی تہذیب کے عنوان سے جو مضمون گذشتہ نمبر مین شایع کیا گیا تھا اُس کے متعلق دو گریجویٹ نوجوانون نے اپنی خانگی تحریرون مین تائیدی خیالات ظاہر کیے ہین۔ بہتر ہوگا اگر وہ اصحاب اور نیز دیگر ارباب فکر و رائے اس مسئلہ پر اپنے مفصل خیالات الناظر مین ظاہر فرمائین تاکہ غور و بحث کے بعد کوئی صورت عمل پیدا ہو سکے۔

امیر مینائی مرحوم

- صنم خانۂ عشق
- مراۃ الغیب
- خیابان آفرینش
- محامد خاتم النبیین
- مینائے سخن

منشی سجاد حسین مرحوم

- احمق الذین
- حاجی بغلول
- میٹھی چھری
- پیاری دنیا
- کایا پلٹ
- طلسمی فانوس

پنڈت رتن ناتھ سرشار

- فسانہ آزاد ۴ جلد
- سیر کہسار
- خدائی فوجدار
- جام سرشار
- الف لیلہ لیلیٰ ناول
- پی کہاں

منشی جوالا پرشاد برق

- ناگنی /۱۲
- مار آستین /۱۲
- بنگالی دلہن /۱۲
- پرتاب /۱۲
- معشوقۂ فرنگ /۱۲

مولانا عبدالحلیم شرر

- ابوبکر شبلی
- خواجہ معین الدین چشتی /۶
- صقلیہ میں اسلام /۱۲
- قیس و لبنیٰ
- غدر نازنین
- ایام عرب ۲ جلد
- یوسف نجمہ
- فتح اندلس
- ملک العزیز ورجنا
- حسن کا ڈاکو
- دربار حرامپور ۲ جلد
- منصور فاتح
- جویائے حق ۲ جلد
- لعبت چین
- عزیزہ مصر
- زینب ان لعبی
- فردوس بریں
- فلپانا
- رومتہ الکبریٰ
- الفانسو /۱۲
- شہید وفا /۸
- حسن انجلنا /۱۰
- ملک العزیز ورجنا /۱۰
- آغا صادق کی شادی /۱۰
- افسانۂ قیس /۳
- حسن بن صباح /۶
- تاریخ بغداد /۴

مرزا داغ مرحوم

- آفتاب داغ
- مہتاب داغ
- یادگار داغ
- انتخاب داغ
- فریاد داغ /۴

مولوی بشیر الدین احمد دہلوی

- دار الحکومت دہلی ۳ جلد
- واقعات دار الحکومت دہلی ۳ جلد
- تاریخ بیجاپور ۳ جلد

(مولوی نذیر احمد)

- ابن الوقت
- مراۃ العروس
- توبۃ النصوح
- ایامیٰ
- فسانۂ مبتلا
- محصنات

نیاز فتحپوری

- گہوارۂ تمدن /۶
- ترجمہ گیتانجلی /۶
- کیوپڈ اینڈ سائکس /۸

سیماب اکبر آبادی

- خدیجۃ الکبریٰ
- بنت الرسول /۵
- سیرت الحسین
- جام کوثر /۵

حکیم محمد علی خان اثر

- جنت کا لال ہے
- حسن کا لال ہے
- دہری جیادی کا لال
- دیوان دہری
- آگورا
- نیل کا سانپ
- ہجو دلی
- در سینہ کا لال

منشی محمد علی شوق قدوائی

- ترانۂ شوق
- قاسم و زہرہ
- سیاہ فام لڑکی

شبیر حسین جوش ملیح آبادی

- روح ادب
- مقالات زریں ۱۱
- آوازۂ حق /۸
- اوراق سحر /۵
- جذبات فطرت /۳

منشی تیرتھ رام

- فسانۂ لندن ۴ جلد
- وطن پرست
- منزل مقصود
- رحم کا خروج /۱۰
- خونی ہیرا

جلال لکھنوی مرحوم

- (…) ۔۔۔
- نظم نگارین
- سرمۂ زبان اردو
- رسالۂ تذکیر و تانیث
- افادۂ تاریخ
- قواعد المنتخب /۴

خواجہ عشرت لکھنوی

- لغات اردو
- اصول اردو /۶
- زبان اردو /۶
- قواعد میر /۶
- شاعری کی پہلی کتاب
- شاعری کی دوسری کتاب
- شاعری کی تیسری کتاب
- اصلاح زبان اردو /۶
- گلدستۂ ظرافت /۶
- نادانی /۶

صفدر مرزا پوری

- مرقع ادب
- بزم خیال
- مشاطۂ سخن

مولوی محمد حسین محوی

- ازواج الانبیاء
- انسانی قربانیاں /۸

حکیم محمد حسن الہ آبادی

- (…) ۔۔۔
- دوم
- سوم
- چہارم
- پنجم
- ششم
- ہفتم
- جلد ہشتم و نہم زیر طبع ہیں
- دہم
- یازدہم
- سلطان صلاح الدین
- سلطان نور الدین محمود

مولوی سعید احمد مارہروی

- آثار اکبری
- حیات صالح /۶
- حیات خسرو
- امرائے ہنود

مولوی سید ممتاز علی

- تذکرۃ الانبیاء
- شیخ حسن /۱۲

منشی نوازش علی خان

- سفرنامۂ ابن بطوطہ
- قسطنطنیہ
- ڈیوٹی

جسٹس شاہ محمود مرحوم

کتاب الطلاق
کتاب القضاء
شرح قانون شہادت

مولوی عزیز مرزا بی اے

خیالات عزیز
دکرم ازدسی

خواجہ غلام الثقلین مرحوم

روزنامہ سیاحت
فلسفیانہ اسلام

منشی محمد لطیف مرحوم

اکبر
اورنگ زیب
لارڈ کلائیو
رنجیت سنگھ

مسٹر عنایت اللہ خاں بی اے

دعوت اسلام
ارض قرآن
زلفی

مسٹر ظفر عمر بی اے

نیلی چھتری
بہرام کی گرفتاری
چوروں کا کلب

مولوی محمد علی ایم اے

سیرۃ خیر البشر
النبوۃ فی الاسلام
مباحث قرآن

پروفیسر نواب علی ایم اے

تذکرۃ المصطفیٰ
معالم الدین
صحف سماوی
شمع سخن

مفتی انوار الحق ایم اے

تذکرۃ الحبیب
حقائق اسلام
اثبات واجب الوجود
تاریخ ابو البشر
قوت خیال

پروفیسر الیاس برنی ایم اے

اسرار حق
معارف ملت
مناظر قدرت
جذبات فطرت
علم المعیشت

سید ہاشمی فرید آبادی

مشاہیر یونان و روما
تاریخ یونان قدیم

مرزا محمد ہادی بی اے

امراؤ جان ادا
شریف زادہ
خونی عاشق
خونی مصور
خونی شہزادہ
مثنوی امید و بیم

ڈاکٹر اقبال ایم اے

ملت بیضا
کمل ترانہ
شکوہ
جواب شکوہ
نالہ یتیم
فریاد امت
بلال
اکبر و اقبال
شمع و شاعر
خضر راہ

مولوی ظفر علی خاں بی اے

معرکہ مذہب و سائنس
خیابان فارس
جنگ روس و جاپان
جنگل میں منگل
فلسفہ ابن سینا
معاشرت
اپریل فول

منشی احمد علی بی اے

تاریخ تمدن ۲ جلد
شباب لکھنو

مولوی عبد الماجد بی اے

فلسفہ جذبات
بحر المحبت
تاریخ اخلاق یورپ ۲ جلد
مکالمات برکلے
زود پشیمان

خواجہ عباد اللہ اختر بی اے

مشاہیر اسلام
دمشق
بغداد
صدیق اکبر
ترجمہ شرح دیوان حافظ

مسٹر سجاد حیدر بی اے

خیالستان
زہرا
ثالث بالخیر

مسٹر انیس احمد عباسی بی اے

زلیخا
نازنین مینا
احمد کی کامیابی
احمد گیتی نما

مولوی عبد الحق بی اے

قواعد اردو
انتخاب کلام میر

مولوی معشوق حسین خاں بی اے

مبادی سائنس
بجلی کے کرشمے
محاربات صلیبی

مولوی سید سلیمان ندوی

ارض القرآن جلد دوم
حیات امام مالک
خلافت و ہندوستان
ہنادر اسلام
اہل السنۃ والجماعت

پروفیسر عبد الباری ندوی

مبادی علم انسانی
برکلے کا فلسفہ
مذہب و عقلیات

مولوی محمد حلیم انصاری

تمدن اسلام ۲ جلد
الاسلام والنصرانیہ
اسلام اور سوشلزم
جواہر قرآنی
فتح اندلس
فلاح دارین

خواجہ حسن نظامی

سیپارۂ دل
روزنامچہ ممالک اسلامیہ
میلاد نامہ
محرم نامہ
یزید نامہ
فضل ...
آتش جیون
آم
بیوی کی تعلیم
بیوی کی تربیت
آئینہ خطوط نویسی
خطوط حسن نظامی
جگ بیتی کہانیاں
فاطمی دعوت اسلام
چٹکیاں اور گدگدیاں

مولوی عبد الراشد الخیری

صبح زندگی
شام زندگی
شب زندگی ۲ جلد
نوحۂ زندگی
منازل السائرہ
الزہرا
عروس کربلا
جوہر قدامت
یاسمین شام
موذہ

الناظر بک ایجنسی لکھنؤ

رجسٹرڈ نمبر — اے ۴۵۰۸

بسم اللہ الرحمن الرحیم

الناظر

ایڈیٹر۔ ظفر الملک علوی

نمبر ۱۴۴ | ماہ جون ۱۹۲۳ء | جلد ۲۴

فہرست مضامین

الناظر پریس لکھنؤ میں چھپا

پرنٹر و پبلشر:۔ اسحاق علی علوی

مطبوعات جدیدہ

ترکی دلھن حسن دمشق کے دلفریب کرشمے۔ بیجود و مال کے سچے جذبات رنج و غم کی دلچسپ تصویرین کے ہمراہ اگر آپ زنان ایران اور یورپ کی خوبیان دیکھنا ہون تو ظفر احمد صاحب ظفر سہارنپوری کا بہترین ناول ترکی دلھن پڑھیے۔ قیمت

اسوۂ صحابیات مولانا شبلی مرحوم کے شاگردوں مین جن لوگون نے اپنی زندگی علمی خدمات کے لیے وقف کر دی ہین مولانا سعید الانصاری ندوی وہ قابل بزرگ ہین جن کی خاموش و مسلسل علمی کوششون نے اسوۂ صحابہ اور انقلاب امم جیسے زبردست تصانیف سے ملک کو روشناس کیا ہے انہی بزرگ نے اب اسوۂ صحابیات جیسی گران بہا تصنیف سے ملک کو مرہون منت فرمایا ہے۔ حقیقتاً اسوۂ صحابہ کے بعد اسوۂ صحابیات سے متعلق کسی معقول و مستند تصنیف کی حاجت تھی اور اسوۂ صحابہ کے مصنف کے علاوہ شاید کسی اور کو اس کا حق بھی نہ تھا کہ وہ اسوۂ صحابیات پر قلم اُٹھاتا۔ قیمت عہ

حیات جاوید جناب محترمہ بیگم ڈاکٹر محمود صاحبہ نے شہید کربلا حضرت امام حسینؑ کی شہادت کے جانگداز واقعہ کو نظم کیا ہے اس حیثیت سے کہ یہ صنف نسوان کے ایک فرد کی تصنیف ہے ضرور قابل تعریف ہے۔ ہر مسلمان کو جو حضرت جوہر کے اس مصرع پر ایمان رکھتا ہے ع اسلام زندہ ہوتا ہے ہر کربلا کے بعد + اسمین بہت کچھ عملی سبق کا مواد ملے گا۔ قیمت ۵/

المشتہر:۔ الناظر بک ایجنسی لکھنؤ

کلکتہ کے مشہور ڈاکٹر ایس کے برمن کی تیار کردہ سنہ ۱۹۲۳ء کی کانوری جنتری نہایت خوبصورت چھپنے کا نمبر چھپ رہا ہو اگر آپ دیکھنا چاہتے ہیں تو ایک کارڈ لکھ کر بھیجدیجیے مفت وہ جنتری آپ کی خدمت میں روانہ کردی جاوے گی۔

خاص ڈاکٹر ایس کے برمن کے کیمیا خانہ کا تیار کردہ کیشرنجن تیل
فائدہ اور خوشبو کے لحاظ سے یہ ایک ہی تیل ہے

آج کل بہت سی قسم کے خوشبودار تیل بازاروں میں بکتے ہیں جو ظاہر میں پاس اور خوشبو میں ایک دوسرے سے بڑھ چڑھ کر ہوتے ہیں مگر ان تیلوں میں دو ایک کا ملاؤ ہوتا ہے جو بجائے فائدہ کے دماغ اور بالوں کو سخت نقصان پہنچاتا ہے ایسے تیلوں کے چند روزہ استعمال سے بال بے وقت سفید ہو جاتے ہیں آنکھ و دماغ سے بس تعلق ہے اس لیے ایسے تیل دماغ میں گرمی پہنچا کر آنکھ کو بھی نقصان پہنچاتے ہیں [illegible] آج کل کے نوجوانوں کو نہایت تیز خوشبو کی ضرورت ہوجاتی ہے ان سب خرابیوں کو مد نظر رکھ کر کیشرنجن تیل کی تیاری میں خوشبو سے زیادہ فائدہ کا خیال رکھا گیا ہے اس کے لگانے سے جڑیں مضبوط اور بال گھنے سیاہ اور گھونگھر والے ہوجاتے ہیں۔ یہ دماغ کو ٹھنڈک اور دل کو فرحت پہنچاتا ہے قیمت فی شیشی ۱ع محصولڈاک

ہیلاک

یہ ہر قسم کے گھاؤ [illegible] ہاتھ [illegible] موچ - گنٹھیا - چھائی - مہاسہ - چکتہ - ہاتھ پیروں کا پھٹنا دور کرتا ہے بواسیر آگ سے جلے ہوئے گھاؤ جلن چوٹ کی وجہ سے درد یا خون کا بہنا وغیرہ وغیرہ کے لیے حکمی دوا ہے [illegible] کاٹی ہوئی جگہ سے زہر دور کرنے کے لیے ہیلاک ایک شرطیہ دوا ہے [illegible] کے کھلاڑیوں کے لیے ہیلاک روزانہ استعمال کی چیز ہے اس کے لگانے سے [illegible] کی جلن وغیرہ نہیں ہوتی۔ فی زمانہ اس قسم کی تمام دوائیوں کے تجربہ کرنے پر ہیلاک سب سے زیادہ مفید ثابت ہوا ہے۔ ہر گھر میں ہیلاک کی ایک ڈبیہ ضرور رکھنا چاہیے قیمت فی ڈبیہ ۱۰ محصولڈاک [illegible]

ایجنٹ ڈاکٹر [illegible] رام [illegible] چوک لکھنؤ

ڈاکٹر ایس کے برمن نمبر ۵ تاراچند دت اسٹریٹ کلکتہ

بسم اللہ الرحمن الرحیم

الناظر

نمبر ۱۴۳ جلد ۲۴ — ماہ جون سنہ ۱۹۲۳ء

فیہ ما فیہ

از "ناظر"

انجمن ترقی اُردو کے سہ ماہی رسالہ اُردو کی نئی اشاعت میں ادبیات اُردو سے متعلق بعض نہایت قابل قدر مضامین شایع کرتے ہیں منجملہ آنکے وہ مبسوط تنقیدی مضمون بھی ہے جو شعرالعجم پر پروفیسر محمود خان شیرانی کے قلم سے تین نمبروں میں نکل چکا ہے تنقید کا ماحصل یہ ہے کہ شعرالعجم مین تالیف کی ہر قسم کی کمزوریاں بکثرت موجود ہین۔ تناقض بیانی ضعف روایت نقل اسناد مین بے احتیاطی تاریخی لغزشین، وغیرہ عقیدت مندون کا گروہ ملول ہے کہ خواہ مخواہ ایک محقق یگانہ کو غلط اعتراضات کا ہدف بنایا گیا ہے حریفون کی جماعت مسرور ہے کہ "محمود" وقت کے ہاتھون خوش عقیدگیون کا ایک صنم اعظم "سومنات ادب" مسمار ہو گیا۔ کچھ لوگ اس تنقید کا رد لکھ رہے ہین کچھ لوگ تردید کی فکر مین ہین

نظر حقیقت سے دیکھا جائے تو دونون فریق راہ راست سے دور نظر آئین گے حریفون کا فخر و ناز اور عقیدت کیشون کا حزن و ملال دونون بیجا ہین، معترض صاحب کی بہت سی گرفتین بجائے خود قابل گرفت، اور متعدد اعتراضات بادر ہوا ہین۔ دوسری طرف شبلی معصوم نہ تھے کسی نے اگر انکی لغزشون پر ٹوکا تو اس مین چڑھنے اور چین بر جبین ہونے کی کیا بات ہے؟

اصل یہ ہی کہ جو غلطیان اور کمزوریان آج شبلی کی تحقیق مین ثابت ہو رہی ہین، اُنکی ذمہ دار شبلی کی شخصیت نہین، بلکہ بشریت ہی، وہ لاکھ محقق و نکتہ رس سہی بہرحال بشر تھے، اور خطا و نسیان، نقص و ذہول، لوازم بشریت ہین۔ فلاطون نے غایت غور و فکر کے بعد اپنا فلسفہ دنیا کے سامنے پیش کیا، لیکن ابھی اسکی سیاہی بھی نہین خشک ہونے پائی تھی کہ ارسطو نے دھجیان اڑا دین۔ کل شام تک مدارس کے در و دیوار کمینٹ دیسوم کا کلمہ پڑھ رہے تھے، آج صبح دکھا، تو ان کی تصانیف کے اوراق نخاس مین ردی کے مول بک رہے تھے! ایک زمانہ تھا، کہ فیثاغورث کے نظام ہیئت سے انکار کرنا، علم و حکمت سے انکار کرنا تھا، ایک یہ زمانہ ہی کہ مدرسہ کا بچہ بچہ اس بلند پروازی پر مضحکہ کرتا ہی!

سائنس ہو یا فلسفہ، تاریخ ہو یا طب، فنون لطیفہ ہون یا نافعہ، حکمت یونان ہو یا اجتہاد یورپ، علوم ہند ہون یا فنون چین، کمالات مصر ہون یا تحقیقات عرب،

فَوْقَ کُلِّ ذِیْ عِلْمٍ عَلِیْمٌ (ہر عالم سے بڑھ کر ایک اور عالم ہی)

کا ازلی و ابدی قانون کسی حال مین ٹوٹ نہین سکتا، اور زمانہ و اہل کی دستبرد سے ان مین کسی شے کو بھی مفر نہین۔ بڑے سے بڑے متبحر عالم، بڑے سے بڑے محقق، بڑے سے بڑے کامل فن کی کاوش و جانفشانی کے نتائج اپنی عمر معین کے خاتمہ کے بعد بالآخر ناقص، غلط و مغالطہ پرور ہی نظر آنے لگتے ہین، کُلُّ شَیْءٍ ہَالِکٌ اِلَّا وَجْہَہٗ اور "شے" کے دائرہ اطلاق مین علوم، فنون، سب ہی کچھ آجاتے ہین، اس کشمکش اور الجھن سے اگر بچنا ہی، تو اسی علم کی جانب رجوع کرنا چاہیے، جس کی تعلیم کے لیے بڑے سے بڑے کتبخانون کی بجاے صرف لوح دل کا مطالعہ کافی ہی، اور جس کے نتائج پر موسیٰ و عیسیٰ، سری کرشن و گوتم بدھ، جنید و عطار، نانک و کبیر، گاندھی و ٹالسٹاے سب متفق ہین، ؎

این خبرہا وین روایات محق — صد ہزاران پیر بر وے متفق
یک خلافے نے میان این عیون — آنچنانکہ ہست در علم ظنون
آن تحری آید اندر لیل تار — این حضور کعبہ و وسط نہار

گذشتہ چند ماہ مین مرکزی خلافت کمیٹی کے حسابات سے متعلق اخبارات مین بڑی سرگرم بحث

جاری رہی بحث کا آغاز ایک رپورٹ کی اشاعت سے ہوا، جس پر تین یا چار ارکان مرکزی کمیٹی کے دستخط تھے اور جس میں کارکنوں پر غفلت، بے احتیاطی بلکہ دبی زبان سے بددیانتی تک کے الزامات عائد کیے گئے تھے۔ کارکن جماعت پر یہ وقت نہایت نازک تھا، اور جو طبقہ شروع سے خلافت کمیٹی کا مخالف تھا، اُس نے اس نادر موقع سے پورا فائدہ اُٹھایا، چنانچہ موالاتی جماعت کے تمام اخبارات (بشمول اینگلو انڈین و لبرل اخبارات) نے ملک میں اس سرے سے اُس سرے تک آگ لگا دی، اور کارکنان مجلس مرکزی کی خیانت کی آواز طبل منادی کی، لیکن کچھ عرصہ کے بعد بالآخر جب جماعت کارکنان کی جانب سے جواب شائع ہوا اور ایک ذمہ دار کارکن نے لکھنؤ اور بمبئی و کلکتہ میں جا جا کر تمام کاغذات تنقیح و جانچ کے لیے سب کے سامنے پیش کر دیے، تو فاذا ھی تلقف ما یافکون کا سماں ایک بار پھر نظروں کے سامنے پھر گیا اور دلوں کو وہ منظر یاد آگیا، جب عصائے موسوی نے اژدہا بن کر جب دوسرے تمام سانپوں کو نگلنا شروع کر دیا تھا، دنیا میں شاید ہر کذب و ناراستی کا یہی انجام ہوتا ہے، بالآخر معترضین نے اپنے اعتراضات واپس لیے، مرکزی انجمن کے محاسبان نے پوری تنقیح و تنقید کے بعد کارکنوں کو سند اعتماد دی، کلکتہ کا جو انگریزی روزنامہ مخالفت میں سب سے پیش پیش تھا، اُس نے حسابات کی جانچ پڑتال کے بعد اپنی سابقہ عبارت پر معذرت چاہی۔

راقم سطور نے بذات خود حسابات کی جانچ مطلقاً نہیں کی، اس لیے اپنی ذاتی ذمہ داری پر نفیاً یا اثباتاً کسی رائے کے اظہار سے وہ معذور ہے، لیکن دنیا کے اس مسلمہ و متعارف اصول کی بنا پر کہ جب تک کسی شخص پر کوئی جرم ثابت نہ ہو جائے اُسے بے قصور سمجھتے رہنا چاہیے اگر وہ کارکنوں کو بددیانتی و غبن کے الزامات سے بری سمجھے تو شاید عند اللہ وعند الناس غیر مسؤل رہے، لیکن کارکن حضرات کی خدمت میں بہ صد خلوص و نیاز عرض ہے کہ وہ اپنی اس نمایاں کامیابی پر نازاں نہوں انھیں ابھی ایک اور امتحان دینا ہے، جو اس امتحان سے کہیں زیادہ سخت و نازک ہوگا، ابھی انھیں اُس محاسب کے سامنے جواب دینا باقی ہے، جسکی میزان عدل میں ایک ذرہ کے عشر عشیر کی برابر بھی گھٹ بڑھ ہونا ممکن نہیں وَيَعْلَمُ مَا فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ وَمَا تَسْقُطُ مِن وَرَقَةٍ إِلَّا يَعْلَمُهَا وَلَا حَبَّةٍ فِي ظُلُمَاتِ الْأَرْضِ وَلَا رَطْبٍ وَلَا يَابِسٍ إِلَّا فِي كِتَابٍ مُّبِينٍ ○

ابھی انھین اُس محتسب کو مطلع کرنا باقی ہی جسکی گرفت کائنات کے ذرہ ذرہ پر محیط ہی اور جس کے سامنے قلب بشری کے گہرے سے گہرے اسرار وخفایا آئینہ ہین۔ اَمْ يَحْسَبُوْنَ اَنَّا لَا نَسْمَعُ سِرَّهُمْ وَنَجْوٰىهُمْ بَلٰى وَرُسُلُنَا لَدَيْهِمْ يَكْتُبُوْنَ اُسی کے فضل وکرم سے دعا ہے کہ اس آخری امتحان مین ہم سب کا پردہ ڈھکا رہے۔ اس آخری احتساب مین ہم مین سے کسی کی رسوائی نہ ہو اور اُس کی رحمت ومغفرت اس نازک گھڑی مین ہم سب کی غفلتون اور کوتاہیون، ہم سب کی خطا کاریون اور بداعمالیون، ہم سب کی خیانتون اور چوریون کی پردہ پوش رہے۔

اسلام مین امانت ودیانت کے احکام نہایت سخت ہین، سرور عالم صلعم کا وصف امانت اسقدر ممتاز تھا کہ بڑے سے بڑے دریدہ دہن وگستاخ مخالفین کو اسکے اعتراف مین تامل نہ تھا، صدیق اکبر رضی کی دیانت ضرب المثل تھی، شیر خدا کی احتیاط کے نظایر سے کتب آثار لبریز ہین۔ فاروق اعظم کو حسابات کے صاف رکھنے مین جو غلو تھا، اُس کا شاہد حضرت خالد کا واقعہ معزولی ہی، یہ واقعہ، ہمارے زمانہ مین عہد فاروقی کے مورخ نے تفصیل سے لکھا ہی، اقتباسات ذیل خاص طور پر سبق آموز ہونگے:-

"خالد کی عادت تھی کہ وہ کاغذات حساب دربار خلافت کو نہین بھیجتے تھے، اس لیے ان کو تاکید لکھی کہ آیندہ سے اس کا خیال رکھین۔ خالد نے جواب مین لکھا کہ مین حضرت ابو بکر کے زمانہ سے ایسا ہی کرتا آیا ہون"

غور کرو خالد رض پر خدا نخواستہ خیانت کا جُرم عاید نہین" وہ ایک جلیل القدر صحابی ہین سیف اللہ کے لقب سے ملقب ہین، اسوقت سپہ سالاری افواج اسلامیہ کے ممتاز وذمہ دار عہدہ پر فائز ہین تمام مملکت اسلام ان کی جانبازی کی شہادت دے رہی ہی۔ علاقہ شام کو انھین کی قوت شمشیر مسخر کر چکی ہی، باانہمہ محض اس جُرم پر کہ حسابات باضابطہ نہین بھیجتے۔ حضرت خلیفۃ المسلمین کے دربار سے حکم پہونچتا ہے کہ

"تم اسی شرط پر سپہ سالار رہ سکتے ہو کہ فوج کے مصارف کا ہمیشہ حساب بھیجتے رہو۔ خالد نے اس شرط کو نامنظور کیا اور اس بنا پر وہ سپہ سالاری کے عہدے سے معزول کر دیے گئے" الفاروق حصہ اول صفحہ ۱۳۲)

۱۷ہجری مین یہ واقعہ پیش آتا ہی کہ حضرت خالد ایک شاعر کو دس ہزار درہم انعام مین دیتے ہین - بارگاہ خلافت مین اطلاع پہنچتی ہی حضرت ابو عبیدہؓ کے نام فرمان پہنچتا ہی کہ

" خالد نے یہ انعام اپنی گرہ سے دیا، تو اسراف کیا، اور بیت المال سے دیا، تو خیانت کی - دونون صورتون مین معزولی کے قابل ہین "

خلیفہ کا قاصد مجمع عام مین اس سپہ سالار اعظم کو معزول کرتا ہی اور وہ اس طرح کہ قاصد نے معزولی کی علامت کے طور پر انکے سر سے ٹوپی اتار لی اور انکی سزا کیلیے انھین کے عمامہ سے انکی گردن باندھی "

آگے چلکر عہد فاروقی کا مورخ لکھتا ہی کہ

" یہ واقعہ کچھ کم حیرت انگیز نہین کہ ایسا بڑا سپہ سالار جسکا نظیر تمام اسلام مین کوئی شخص موجود نہ تھا اور جس کی تلوار نے عراق و شام کا فیصلہ کر دیا تھا، اس طرح ذلیل کیا جاتا ہی اور مطلق دم نہین مارتا، اس واقعہ سے ایک طرف تو خالد کی نیک نفسی اور حق پرستی کی شہادت ملتی ہی اور دوسری طرف حضرت عمر کی سطوت و جلال کا اندازہ ہوتا ہی " (صـــــ۱۳۳)

ان دونون تاریخی واقعات سے بڑھکر اس امر کا ثبوت ملتا ہی کہ اسلام نے امانت و دیانت کا معیار کس قدر بلند رکھا تھا، لیکن آج عمر فاروق اور خالد سیف اللہ دونون کے نمونے عنقا ہین -

---

اسلام سے متعلق جو شدید ترین غلط فہمیان پھیلی ہوئی ہین، اُن مین سے ایک یہ خیال بھی ہی کہ اسلام تمام قدیم مذاہب کا دشمن اور بجز اپنے سب کو جھوٹا ٹھہرانے والا ہی - اور لطف یہ کہ اس غلط فہمی مین دوست و دشمن اپنے اور بیگانہ دونون گرفتار رہین یعنی غیر مسلمون کی طرح اکثر مسلمان بھی یہی عقیدہ رکھتے ہین - حال مین اس کا اظہار افریقہ کے ایک دشمن اسلام، پادری شا، اور ہندوستان کے ایک ہمدرد اسلام، بابو بھگوان داس، دونون کی جانب سے ہوا ہی - پادری شا نے سرور عالمؐ کی شان مبارک مین اپنی خباثت نفس کا اظہار کیا، اس پر مسلمانون کی طرف سے لے دے ہوئی، شا نے اپنی برأت مین ایک مضمون لکھا، اسکے ضمن مین اپنے اس خیال کو بھی ظاہر کیا ہی کہ اسلام و بانی اسلام حضرت مسیحؑ کے منکر ہین " بابو بھگوانداس نے حال مین ہندو مسلمانون کے اتحاد پر بعض مضامین اخبار لیڈر مین شایع کرائے ہین، انکا ویزا اتحاد اس خیال پر مبنی ہین کہ گویا اسلام ہندو مذہب کا مخالف ہی - یہ دو نمایان مثالین

حال مین پبلک کے سامنے آئی ہین، ورنہ یہ خیال تو نہایت قدیم اور ساتھ ہی عالمگیر بھی ہے،

لیکن حقیقت یہ ہے کہ یہ خیال تمامتر بے بنیاد اور خود اسلام کی تصریحات کے قطعاً منافی ہے، اسلام کا دعویٰ، صراحت و تکرار کے ساتھ یہ ہے کہ وہ کسی معنی مین بھی کوئی جدید مذہب نہین۔ بلکہ مذاہب قدیم کی تصدیق کرنے والا، اور ادیان سابقہ کے حق مین ایک مہر استنا دہے۔ کلام مجید کے آغاز ہی مین، یعنی سورۂ بقر کے رکوع اول مین مومنین کی شناخت یہ بتائی گئی ہے کہ وہ لوگ ہین، جو اے پیمبر

اَلَّذِیْنَ یُؤْمِنُوْنَ بِمَآ اُنْزِلَ اِلَیْكَ وَمَآ اُنْزِلَ مِنْ قَبْلِكَ	نہ صرف تمھارے الہامات پر ایمان رکھتے ہین بلکہ تم سے پیشتر جو جو الہامات نازل ہو چکے ہین، سب پر ایمان رکھتے ہین۔

مومنین کے لیے حکم ہے کہ وہ قرآن ہی کی طرح تمام کتب سابقہ کی بھی تصدیق کرتے رہین۔

یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اٰمِنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَالْكِتٰبِ الَّذِیْ نَزَّلَ عَلٰی رَسُوْلِهٖ وَالْكِتٰبِ الَّذِیْٓ اَنْزَلَ مِنْ قَبْلُ (نساء۔ ع ۲۰)	اے مومنو، ایمان لاؤ خدا پر، اور اُس کے رسول پر، اور اُس کتاب (قرآن) پر، جو اس نے اپنے رسول (محمدؐ) پر اتاری ہے، اور اُن کتابون پر جو اس سے پیشتر (دوسرے ہادیون پر) اتر چکی ہین

آقاے دوعالم صلعم کا ایمان جسطرح اپنی رسالت پر تھا، اُسی طرح اپنے پیشروون کی رسالت پر بھی تھا اور عام مومنین بھی اسی ایمان پر مامور ہین۔

اٰمَنَ الرَّسُوْلُ بِمَآ اُنْزِلَ اِلَیْهِ مِنْ رَّبِّهٖ وَالْمُؤْمِنُوْنَ كُلٌّ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَمَلٰٓئِكَتِهٖ وَكُتُبِهٖ وَرُسُلِهٖ (بقر۔ ع ۴۰)	یہ رسول (محمدؐ) اس کتاب پر ایمان رکھتے ہین، جو اُن کے پروردگار کی طرف سے اُن پر اتری ہے، اور عام مسلمان بھی یہ سب کے سب (یعنی رسول خدا اور عام مومنین) خدا اُس کے فرشتون اس کی کتابون اُس کے پیمبرون سب پر ایمان رکھتے ہین،
اُن کو یہ کہنے کی تاکید ہے، کہ لَا نُفَرِّقُ بَیْنَ اَحَدٍ مِّنْ رُّسُلِهٖ (بقر ع ۴۰)	ہم اُن تمام انبیا، مین کسی طرح کا فرق نہین سمجھتے (اس لیے کہ سب کی دعوت ایک ہی ہے)

دوسرے مذاہب کے پیرو کہا کرتے ہین کہ صرف ہمارا دین سچا، صرف ہماری کتاب الہامی؛ اور صرف ہمارا ہادی برحق ہے۔ مسلمانون کو جو تعلیم دی گئی، وہ اسکے بالکل برعکس ہے۔ انھین حکم ہوا، کہ تم سب انبیا کو برحق تسلیم کرو، تمھارا دین تو خالص توحید و خدا پرستی کا ہے، اور تمام ہادیان طریقت اسی مسلک کی دعوت دیتے آئے ہین، پس تم کیونکر کسی سے انکار کر سکتے ہو۔

قُوْلُوْٓا اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَمَآ اُنْزِلَ اِلَيْنَا وَمَآ اُنْزِلَ اِلٰٓى اِبْرٰهٖمَ وَاِسْمٰعِيْلَ وَاِسْحٰقَ وَيَعْقُوْبَ وَالْاَسْبَاطِ وَمَآ اُوْتِيَ مُوْسٰى وَعِيْسٰى وَمَآ اُوْتِيَ النَّبِيُّوْنَ مِنْ رَّبِّهِمْ لَا نُفَرِّقُ بَيْنَ اَحَدٍ مِّنْهُمْ وَنَحْنُ لَهٗ مُسْلِمُوْنَ

(بقر ع ۱۶)

اے مسلمانو! (مخالفین سے) کہدو، کہ ہمارا ایمان تو خدا پر ہے اور جو کتاب ہم پر اتری (یعنی قرآن) اُس پر اور جو کچھ ابراہیم و اسمٰعیل و اسحٰق و یعقوب اور اولاد یعقوب پر اُترا اُس پر اور جو کچھ موسیٰ و عیسیٰ پر اُترا اُس پر اور جو کچھ دوسرے پیغمبرون پر اُن کے پروردگار کے ہان سے اُترا، اس سب پر ہم تو ان مین سے کسی مین جُدائی نہین سمجھتے اور (یا اس لیے کر) ہم اُسی خدائے واحد کے فرمان بردار ہین۔

یہی مفہوم بحیثیت تغیر الفاظ کے ساتھ ایک دوسرے مقام پر بھی ارشاد ہوا ہے،

قُلْ اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَمَآ اُنْزِلَ عَلَيْنَا وَمَآ اُنْزِلَ عَلٰٓى اِبْرٰهِيْمَ وَاِسْمٰعِيْلَ وَاِسْحٰقَ وَيَعْقُوْبَ وَالْاَسْبَاطِ وَمَآ اُوْتِيَ مُوْسٰى وَعِيْسٰى وَالنَّبِيُّوْنَ مِنْ رَّبِّهِمْ لَا نُفَرِّقُ بَيْنَ اَحَدٍ مِّنْهُمْ وَنَحْنُ لَهٗ مُسْلِمُوْنَ

(آل عمران ع ۹)

اے پیغمبر ان سے کہدو کہ ہمارا دین تو یہ ہے کہ ہم ایمان رکھتے ہین اللہ پر اور ہم پر جو کتاب اتری ہے اس پر اور جو کچھ ابراہیم و اسمٰعیل و اسحٰق و یعقوب اور اولاد یعقوب پر اترا تھا اس پر اور جو کتابین موسیٰ و عیسیٰ اور دوسرے پیغمبرون کو اُن کے پروردگار کی جانب سے عطا ہوئین اُن سب پر۔ ہم ان پیغمبرون مین کسی مین فرق نہین کرتے اور ہم تو خدائے واحد کے آگے سر جھکانے والے ہین،

ہر دو آیات کے آخری ٹکڑے مین یکسانیت ایمان انبیا و عدم تفرقہ کا گویا فلسفہ بیان کر دیا ہے یعنے ہم کو تفریق و تفرقہ کی حاجت کیا، ہم تو خدائے واحد کے ماننے والے ہین ونحن لہ مسلمون اور یہ سب کے سب اسی کے داعی ہوکر آتے رہے ہین،

قرآن کا یہ دعوی ہرگز نہیں کہ وہ دنیا کے لیے کوئی انوکھی اور اچھوتی تعلیم لیکر آیا ہی، یا یہ کہ اسکے قبل آسمانی کتابیں لانے والے (نعوذ باللہ) جھوٹے تھے۔ بلکہ اُس کے برعکس وہ تو صراحتاً اس کا مدعی ہی، کہ میں سب پچھلی آسمانی کتابوں کی تصدیق دتسلیم ہی نہیں بلکہ انکی حفاظت کے لیے دنیا میں آیا ہوں"

وَاَنْزَلْنَآ اِلَيْكَ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ مُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ مِنَ الْكِتٰبِ وَمُهَيْمِنًا عَلَيْهِ (مائدہ ۔ ۷)	اے پیغمبر ہم نے تمھاری طرف یہ کتاب برحق اُتاری ہی، جو اپنے سے قبل والی کتابوں کی تصدیق بھی کرتی ہی اور اُن کی محافظ بھی ہی،

کلمہ گویان اسلام جب اہل غرض کی سیاست گاہ میں ماخوذ و مجرم ہوکر پیش ہوتے ہیں تو اپنے جُرم کا اقبال ان الفاظ میں کرتے ہیں۔

هَلْ تَنْقِمُوْنَ مِنَّآ اِلَّآ اَنْ اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَمَآ اُنْزِلَ اِلَيْنَا وَمَآ اُنْزِلَ مِنْ قَبْلُ (مایدہ ع ۹)	تم ہمارا یہ جُرم پاتے ہو نا، کہ ہم ایمان رکھتے ہیں خدا پر، قرآن پر، اور جو کتابیں اس سے قبل اُتری ہیں، اُن پر

یہانتک صراحت موجود ہی، کہ حضور سرورِ انبیا پر جو وحی نازل ہوتی ہی، یہ اپنی نوعیت میں کوئی نئی چیز نہیں، یہ بعینہٖ اُسی قسم کا شرف و امتیاز ہی جو اس سے قبل تمام پیامبران حق کو حاصل ہوچکا ہی،

اِنَّآ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ كَمَآ اَوْحَيْنَآ اِلٰى نُوْحٍ وَّالنَّبِيّٖنَ مِنْۢ بَعْدِهٖ وَاَوْحَيْنَآ اِلٰٓى اِبْرٰهِيْمَ وَاِسْمٰعِيْلَ وَاِسْحٰقَ وَيَعْقُوْبَ وَالْاَسْبَاطِ وَعِيْسٰى وَاَيُّوْبَ وَيُوْنُسَ وَهٰرُوْنَ وَسُلَيْمٰنَ وَاٰتَيْنَا دَاوٗدَ زَبُوْرًا (نساء ع ۲۳)	اے پیغمبر ہم نے تمھاری طرف اُسی طرح کی وحی بھیجی ہی جس طرح نوح، اور اُن کے بعد والے پیمبران پر بھیجی تھی اور جس طرح ہم نے ابراہیم، اسمٰعیل، اسحٰق، یعقوب، اولادِ یعقوب، عیسیٰ، ایوب، یونس، ہارون و سلیمان کی طرف بھیجی تھی، اور داؤد پر ہم نے زبور اُتاری تھی۔

کہیں یہ دھوکا نہو کہ جن انبیا علیہم السلام کے اسمارِ گرامی کی تصریح کی گئی ہی، دائرہ ایمان انھیں تک محدود ہے۔ ہادیان طریقت و داعیان حق کی تعداد، درحقیقت حد شمار سے متجاوز ہی قلب مسلم کی وسعت بے پایاں ان سب کی عقیدت و تصدیق کو اپنے اندر سمیٹے ہوئے ہی۔
حشر کے دن کوئی قوم ایسی نہوگی، جس پر اتمام حجت کے لیے خود اسی قوم کے مبلغ یا ہادی کو اس کے سامنے پیش کیا جائے۔

وَيَوْمَ نَبْعَثُ مِنْ كُلِّ أُمَّةٍ شَهِيدًا (نحل ع ۱۲)	جس روز ہم ہر اُمّت میں سے ایک گواہ اٹھا کھڑا کرین گے

یہ گواہان ثبوت، کہیں باہر سے لائے ہوئے نہ ہون گے۔ خود اسی قوم کے افراد ہون گے "مِنْ أَنْفُسِهِمْ" [illegible] نہین۔

وَيَوْمَ نَبْعَثُ فِي كُلِّ أُمَّةٍ شَهِيدًا عَلَيْهِمْ مِنْ أَنْفُسِهِمْ (نحل ع ۱۲)	جس روز ہم ہر امت میں انہی میں سے ایک گواہ اٹھا کھڑا کرینگے۔

ظاہر ہے کہ جب تک ہر قوم میں نبی یا رسول موجود نہیں رہ چکے ہیں، حشر کے روز شہادت [illegible] کیا مطلب ہو سکتا ہے؟

[illegible] قرآن [illegible] ایک جگہ نہیں، متعدد مقامات پر واضح الفاظ میں [illegible] کہ زمین کی کوئی قوم، کوئی امت، کوئی انسانی بستی ایسی نہیں [illegible] نہ ہو چکا ہو [illegible]

وَإِنْ مِنْ أُمَّةٍ إِلَّا خَلَا فِيهَا نَذِيرٌ (فاطر ع ۳)	کوئی امت ایسی نہیں جس میں ہم نے ایک ڈرانے والا نہ بھیجا ہو۔

ایک اور موقع پر ہے۔

وَمَا مِنْ قَرْيَةٍ إِلَّا خَلَا فِيهَا نَذِيرٌ۔	کوئی بستی ایسی نہیں جس میں ہماری طرف سے ڈرانے والا نہ آیا ہو

ایک اور مقام پر ارشاد ہوتا ہے

وَلَقَدْ بَعَثْنَا فِي كُلِّ أُمَّةٍ رَسُولًا (نحل ع ۵)	ہم تو ہر اُمت میں ایک رسول بھیج چکے ہیں۔

ان داعیان حق، ان ہادیان طریق، ان پیامبران صدق کو کہیں رسول کا لقب دیا ہے، وَلِكُلِّ أُمَّةٍ رَسُولٌ (یونس ع ۵) "ہر اُمت کے لیے ایک رسول ہے"

اور کہیں ہادی کے نام سے یاد کیا ہے،

وَلِكُلِّ قَوْمٍ هَادٍ (رعد ع ۱)	ہر قوم کے لیے ایک ہادی ہے۔

ان مین سے بعض کی تفصیلی سرگذشت کلام مجید مین بیان کی گئی ہی، اور بعض کے متعلق سکوت سے کام لیا گیا ہی،

وَرُسُلًا قَدْ قَصَصْنَاهُمْ عَلَيْكَ مِنْ قَبْلُ وَرُسُلًا لَمْ نَقْصُصْهُمْ عَلَيْكَ ۔ (نساء ۔ ع ۲۳)

اے پیمبر (تمھاری طرح تم سے قبل) ہم کتنے پیمبر بھیج چکے ہین جن کا حال تم سے بیان کر چکے ہین اور کتنے ایسے ہین جن کا حال نہین بیان کیا ہی۔

قرآن مجید سب کے اسماء گرامی کا رجسٹر نہین ۔ حضرت ختم المرسلین کو اجمالاً صرف اتنا بتا دیا گیا کہ

وَلَقَدْ أَرْسَلْنَا رُسُلًا مِّنْ قَبْلِكَ مِنْهُم مَّنْ قَصَصْنَا عَلَيْكَ وَمِنْهُم مَّنْ لَّمْ نَقْصُصْ عَلَيْكَ (مومن ۔ ع ۸)

تم سے پہلے کتنے پیمبر ایسے ہم بھیج چکے ہین جن کا حال تم کو سنا چکے ہین اور کتنے ایسے ہین جن کا حال نہین سنایا ہی۔

لیکن مجملاً سب پر ایمان بغیر چارہ نہین۔

تصریحات بالا کے بعد کس کو ایک لمحہ کے لیے بھی اس حقیقت مین شبہ باقی رہ سکتا ہی کہ دنیا کے تمام ہادیون، تمام رہنماؤن، تمام رہبرون پر ایمان رکھنا اور اُن کی تصدیق کرنا، عام اس سے کہ اُن کے اسماء مبارک کا علم ہو یا نہو، اسلام مین جائز و بہتر ہی نہین بلکہ عین فرائض مین داخل ہی؛ ٹھیک اسی طرح کہ جیسے کل ملائکہ پر ایمان رکھنا شرط اسلام ہی، درآنحالیکہ کلام مجید مین نام صرف دو ایک فرشتون کے وارد ہوے ہین۔

یہ شان مومنین کی نہین، گمراہون کی ہی، وہ ایک کتاب آسمانی پر اپنا ایمان رکھنا ظاہر کرتے ہین، اور باقی کی تکذیب کرتے رہتے ہین،

وَإِذَا قِيلَ لَهُمْ آمِنُوا بِمَا أَنزَلَ اللَّهُ قَالُوا نُؤْمِنُ بِمَا أُنزِلَ عَلَيْنَا وَيَكْفُرُونَ بِمَا وَرَاءَهُ وَهُوَ الْحَقُّ مُصَدِّقًا لِّمَا مَعَهُمْ (بقر ۔ ع ۱۱)

ان سے جب کہا جاتا ہی کہ خدا نے جو کچھ اُتارا ہی اُس پر ایمان لاؤ، تو یہ کہتے ہین کہ ہم تو اُسی کتاب پر ایمان لاتے ہین جو ہم پر اتری ہی اور اس کے سوا دوسری کتاب کو نہین مانتے حالانکہ یہ (قرآن) بھی کتاب حق ہی اور اُن پر اتری ہوئی کتاب کی تصدیق کرتا ہی

مومنین کی شان تو یہ ہو کہ وہ جملہ ادیان طریق پر یکسان ایمان رکھتے ہین کسی کے درمیان تفرقہ روا نہین رکھتے اور اُس کے صلہ مین رضاے الٰہی کا اجر عظیم حاصل کرتے ہین۔

وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِاللّٰهِ وَرُسُلِهٖ وَلَمْ يُفَرِّقُوْا بَيْنَ اَحَدٍ مِّنْهُمْ اُولٰٓئِكَ سَوْفَ يُؤْتِيْهِمْ اُجُوْرَهُمْ وَكَانَ اللّٰهُ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا (نساء - ع ۱۲)

جو لوگ خدا اور اُس کے رسولون پر ایمان لائے اور اُن مین سے کسی کو ایک دوسرے سے جدا نہ سمجھا، تو ایسے ہی لوگ ہین جنہین خدا ان کا اجر عطا فرمائے گا، اور خدا تو غفور رحیم ہے۔

یہی نہین، کہ انبیاء سابقین کی تکذیب اسلام مین ممنوع ہو، یہی نہین کہ ادیان گذشتہ کی تصدیق قانون اسلام مین واجب ہو، یہی نہین کہ سب کے احترام و ایمان کی تاکید کلام الٰہی مین وارد ہوئی ہو، بلکہ اس حکم کی تعمیل و عدم تعمیل کو کفر و اسلام کے درمیان فارق و امتیاز قرار دیا گیا ہو، اور یہ فرمان ربانی صاف الفاظ مین سنا دیا گیا ہو، کہ جو لوگ بین بین کا راستہ اختیار کرنا چاہتے ہین، یعنی بعض انبیاء کی تصدیق کرتے ہین اور چند کی تکذیب، وہ خاطی ہی نہین، مجرم ہی نہین، گنہگار ہی نہین بلکہ سرے سے حلقہ اسلام سے خارج، اور حقیقی کافر ہین۔

اِنَّ الَّذِيْنَ يَكْفُرُوْنَ بِاللّٰهِ وَرُسُلِهٖ وَيُرِيْدُوْنَ اَنْ يُّفَرِّقُوْا بَيْنَ اللّٰهِ وَرُسُلِهٖ وَيَقُوْلُوْنَ نُؤْمِنُ بِبَعْضٍ وَّنَكْفُرُ بِبَعْضٍ وَّيُرِيْدُوْنَ اَنْ يَّتَّخِذُوْا بَيْنَ ذٰلِكَ سَبِيْلًا ۝ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْكٰفِرُوْنَ حَقًّا وَاَعْتَدْنَا لِلْكٰفِرِيْنَ عَذَابًا مُّهِيْنًا ۝ (نساء - ع ۲۱)

جو لوگ خدا اور اُس کے رسولون سے منحرف ہین اور خدا اور اُس کے رسولون کے درمیان جدائی ڈال دینا چاہتے ہین، اور کہتے ہین کہ ہم بعض پیغمبرون کو مانتے ہین، اور بعض کے منکر ہین اور چاہتے ہین کہ پیغمبرون کے درمیان مغایرت ڈال کر کفر و ایمان کے مابین کوئی راستہ اختیار کرین، سو ایسے لوگ پکّے کافر ہین، اور کافرون کے لیے ہم نے ذلت کا عذاب تیار کر رکھا ہے۔

دوسرے پیشوایان مذاہب کی تعظیم و تصدیق، عزت و احترام کا اس سے زیادہ موکد و قطعی حکم اسلام کے سوا، دنیا کے کسی مذہب مین مل سکتا ہے؟ اس وسیع الخیالی، اس رواداری کی نظیر بجز قرآن کے کسی آسمانی کتاب مین دکھائی جا سکتی ہے؟ بیدردون کی سنگدلی کا کوئی نمونہ اس سے بڑھ کر خیال مین آسکتا ہے کہ

ایسے مذہب کی جانب نادر دورانِ تنگ خیالی کا ایک لمحہ کے لیے بھی انتساب کیا جاسکے؟

کلام مجید کا ایک خاص جزو یہ ہے کہ وہ حکم دیتا ہے اُسکے مصالح و اسباب بھی بیان کر دیتا ہے ایمان بالانبیاء کی یکسانیت کی جو اسقدر تاکید کی تو خود ہی وجہ بھی ارشاد کر دی کہ سب کی تعلیم متحد رہی ہے،

شَرَعَ لَكُمْ مِنَ الدِّيْنِ مَا وَصّٰى بِهٖ نُوْحًا وَّالَّذِيْٓ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ وَمَا وَصَّيْنَا بِهٖٓ اِبْرٰهِيْمَ وَمُوْسٰى وَعِيْسٰٓى اَنْ اَقِيْمُوا الدِّيْنَ وَلَا تَتَفَرَّقُوْا فِيْهِ (شوریٰ ع ۲)

اس نے تمہارے لیے دین کا وہی راستہ ٹھہرایا ہے جس پر چلنے کا اُس نے نوح کو حکم دیا تھا، اور اے پیغمبر جس راستہ کی ہم نے وحی کی ہے اور اسی کا ہم نے ابراہیم، موسیٰ اور عیسیٰ کو بھی حکم دیا تھا کہ اسی دین کو قائم رکھنا اور اس میں تفرقہ نہ ڈالنا۔

جزئیات تعلیم میں اختلاف ہونا لازمی تھا۔ ہر قوم کی سیرت جداگانہ ہر جماعت کے خصوصیات الگ۔ ہر زمین کے حالات علیحدہ۔ تفصیلات تعلیم میں اختلاف ہونا بالکل قدرتی اور لازمی تھا۔ تاہم اصولاً تمام داعیان حق میں اتنا جزو دعوت مشترک رہا ہے کہ

نَحْنُ لَهٗ مُسْلِمُوْنَ

ہم تو اسی خدائے واحد کے آگے سر جھکانے والے ہیں۔

مذہب توحید کے ابوالآباء اور مسلک اسلام کے بانی اعلیٰ حضرت ابراہیم خلیل اللہ ہوئے ہیں آج تک ہر پیغمبر انھی کی زبان اُنھیں کے پیام توحید کا اعادہ کرتی آرہی ہے۔ چنانچہ جب اُن سے اُن کے

اِذْ قَالَ لَهٗ رَبُّهٗٓ اَسْلِمْ قَالَ اَسْلَمْتُ لِرَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۔ وَوَصّٰى بِهَآ اِبْرٰهِيْمُ بَنِيْهِ وَيَعْقُوْبُ يٰبَنِيَّ اِنَّ اللّٰهَ اصْطَفٰى لَكُمُ الدِّيْنَ فَلَا تَمُوْتُنَّ اِلَّا وَاَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ ۔ (بقرہ ع ۱۶)

پروردگار نے کہا کہ ہماری فرمان برداری کرو تو عرض کیا کہ میں پروردگار عالم کا فرمان بردار ہو لیا۔ اور اسی طریقہ کی بابت ابراہیم اپنے بیٹوں کو وصیت کر گئے، اور یعقوب بھی کہ بیٹا خدا نے تمھارے لیے اسی طریق اسلام کو پسند کیا ہے پس تم اسی طریق اسلام پر مرنا۔

چنانچہ خلیل خدا کی ذریت صالحہ ہمیشہ اسی دعوت کی مبلغ، اور اسی تعلیم کی حامل رہتی چلی آئی ہے اور باوجود انقلابات دہر کے یہی حقیقت ازلی و ابدی تغیر و انقلاب کی دسترس سے بالاتر رہی ہے کہ

نَحْنُ لَهٗ مُسْلِمُوْنَ

ہم تو اسی خدائے واحد کے آگے سر جھکانے والے ہیں

انسان کی بولیان بدلتی رہتی ہین، زبانین مختلف ہوتی ہین مصطلحات تدریجاً متروک ہو تی جاتی ہین، اور جدید رائج ہوتی جاتی ہین لیکن اگر آپ دل سے جویاے حقیقت ہین اگر آپ سچی طلب صادق لیکر نکلے ہین، تو خدا کے لیے اختلاف الفاظ و مصطلحات کے گورکھ دھندے مین نہ پڑیے اس بھول بھلیان مین ٹھوکرین نہ کھائیے، معنویت پر نظر رکھیے اور وہ ہر جگہ یکسان ملے گی۔ وضع لباس کے تغیرات سے دھوکا نہ کھائیے، یار کے "انداز قد" کو حافظہ مین رکھیے، تو ہر نقاب سے پہچان لیجیے وہی مستور ملے گا محفل مین جام و ساغر، بلحاظ ساخت و پیمانہ بیشک ایک دوسرے سے مختلف نظر آئین گے لیکن براے خدا یہ فرمائیے، کہ اُن کے اندر کی "آتش سیال" تو مختلف نہین؟ ؎

ہر تنی و ہر دلی را مسلکے ست
یک حقیقت می بہر جامہ یکے ست

ہندو کہتے ہین کہ نرگن برہمن (ذات مطلق) کو جب اپنا اظہار مقصود ہوا تو اس نے سب سے پہلے ایشور اپنے مظہر اتم کو ظاہر کیا، اور اُسی سے پھر تمام عالم پیدا کیا تصوف اسلام کہتا ہے کہ ذات احدیت کو جب مرتبہ تنزہ و اطلاق سے درجہ تعین و تشخص مین آنا منظور ہوا تو اس نے سب سے اول حقیقت محمدی کو پیدا کیا، اور اس کو خلقت کائنات کا واسطہ بنایا۔ غور کرنا کہ دونون دعوون مین معنوی حیثیت سے کچھ بھی فرق ہے؟ پس کیسی بدنصیبی و محرومی اُس ہندو کی ہوگی جسے محض یہ امر کہ مسلمان اپنے عقیدہ کو ان مختلف اصطلاحات مین ظاہر کرتا ہے، اُسے قبول اسلام و تصدیق رسالت حضرت سرور عالم سے باز رکھے!

اتحاد انبیاے کرام کے مسئلہ کو حضرت مولانا ے روم اپنے مخصوص حکیمانہ انداز کے ساتھ کس قدر دلنشین پیرایہ مین بیان فرماتے ہین ؎

چون بہ صورت بنگری چشمت دو است — تو بہ نورش بنگری کان یکتو است
لاجرم چون بر یکے افتد نظر — آن یکے بینی دو ناید در بصر

آنکھین تعداد مین دو ہین لیکن بلحاظ نور، دونون واحد کے حکم مین داخل ہین جس چیز پر نظر کرتے ہو اگرچہ دو آنکھون سے دیکھتے ہو لیکن وہ شے ایک ہی معلوم ہوتی ہے!
آگے چلکر کچھ اور تشبیہین دیتے ہین ؎

ده چراغ ار حاضر آید در مکان — هر یکی باشد بصورت غیر آن

فرق نتوان کرد نور هر یکی — چون بنورش روی آری بی شکی

اطلب المعنی من الفرقان و قل — لا نفرق بین احد من رسل

(مکان میں اگر دس چراغ روشن ہوں تو اگرچہ تعداد میں دس ہیں لیکن سب کی روشنی ایک ہے روشنیاں دس نہیں)

گر تو صد سیب و صد آبی بشمری — صد نماند یک شود چون بفشری

(صدہا سیب اور بہی لیکر جمع کرو، اور ان کا عرق نچوڑو عرق ایک ہی ہوگا، سیکڑوں نہونگے)

در معانی قسمت و اعداد نیست — در معانی تجزیہ و افراد نیست

اتحاد یار با یاران خوش است — پای معنی گیر صورت سرکش است

(تعداد و تفرقہ جو کچھ ہے، صورت و قالب میں ہے، معنی و باطن پر اگر نظر قائم رہے تو سب ایک ہی دکھائی دے گا)

نور آفتاب ایک ہوتا ہے، شعاعیں بیشمار ہوتی ہیں جو روئے ارض پر ایک ایک گھر کو منور کیے ہوئے ہیں۔ نور حقیقت، توحید الٰہی، ایک ہے، ناقابل تقسیم و ناقابل تجزی۔ اس کے مظاہر و مشاہد، تجلیات و شئون غیر محدود ہیں، عام انسان، جو کثافتوں میں سر بسر غرق ہیں تفریق و علیحدگی کے نمونہ ہوتے ہیں، باقی انبیاء جو پیکر لطافت و نورانیت ہیں، اُن میں دوئی و غیریت کہاں؟

جان گرگان و سگان هر یک جداست — متحد جانهای شیران خداست

جمع گفتم جانهاشان من به اسم — کان یکی جان صد بود نسبت بجسم

همچو آن یک نور خورشید سما — صد بود نسبت بصحن خانها

لیک یک باشد همه انوارشان — چونکه برگیری تو دیوار از میان

خوابِ ہستی

کہتی ہے بُرا دُنیا تم کو — کانوں سے تم اب سنتے ہو
کیوں ترکِ فرائض کرتے ہو — مذہب کے اگر تم سچے ہو

دُنیا سے ہے تم کو دلچسپی
اللہ کو بھولے بیٹھے ہو

کہتے ہو زباں سے سب کچھ — کرتے بھی ہو لیکن کام کوئی
وہ کام ہے کوئی کیا اچھا — جس کا نہ ہو نیک انجام کوئی

دُنیا سے ہے تم کو دلچسپی
اللہ کو بھولے بیٹھے ہو

رکھتے ہو اگر کچھ عقل بھی تم — اللہ سے غفلت خوب نہیں
فانی ہے بہارِ گلشن کی — دُنیا کی محبت خوب نہیں

دُنیا سے ہے تم کو دلچسپی
اللہ کو بھولے بیٹھے ہو

سوچو تو ذرا اپنے دل میں — کیا فرض تمہارا ہے بندو
مانا کہ رسولِ برحق سے — بخشش کا سہارا ہے بندو

دُنیا سے ہے تم کو دلچسپی
اللہ کو بھولے بیٹھے ہو

نفرت نہ کرو محتاجوں سے — مرعوب نہ ہو زرداروں سے
لاؤ نہ جبیں پر اپنی شکن — خوش ہو کے ملو ناداروں سے

دُنیا سے ہے تم کو دلچسپی
اللہ کو بھولے بیٹھے ہو

ہر ورا ہٹ سے ہو سدت — کرتے ہو حسینوں سے اُلفت
کھاتے ہو دلوں پر تیر نظر — ہے ان کی جفاؤں سے رغبت
دُنیا سے ہے تم کو دلچسپی
اللہ کو بھولے بیٹھے ہو

دونوں میں بناتے ہو مسکن — جنت میں نہ جانے پاؤ گے
یہ قول ہمارا یاد رہے — محشر میں بہت پچھتاؤ گے
دنیا سے ہے تم کو دلچسپی
اللہ کو بھولے بیٹھے ہو

مغرور ہو تم عشرت پہ عبث — بیکار ہے گرمی دولت کی
دُنیا کے بکھیڑوں کو چھوڑو — گر تم کو ہوس ہے جنت کی
دُنیا سے ہے تم کو دلچسپی
اللہ کو بھولے بیٹھے ہو

معبود کو اپنے پہچانو — جو دونوں جہان کا مالک ہے
غافل نہ ہو اس کی طاعت سے — وہ کون و مکان کا مالک ہے
دُنیا سے ہے تم کو دلچسپی
اللہ کو بھولے بیٹھے ہو

صدرالدین سرشار کمنڈوی

کس کے آنے کی خبر آئی ہے — کیوں چمن محوِ خود آرائی ہے
پھر سمائی ترے کوچے کی ہوا — پھر ہمیں شوقِ جبیں سائی ہے
آئینہ خانہ کی اب خیر نہیں — حسن سرگرم خود آرائی ہے
وہ ہیں اور مشغلۂ سیرِ چمن — میں ہوں اور بادیہ پیمائی ہے
آنکھیں در پہ جو لگی ہیں آسفؔ — کس کے آنے کی خبر آئی ہے

فنِ خطّاطی

فنِ خطاطی جسکا دوسرا نام خوشنویسی ہی مشرقی فنون مین بلحاظ قدامت اور اہمیت نہایت قابلِ عزت فن ہی۔ اسکا شمار بھی فنونِ لطیفہ مین ہی اور اِس فن کی گوناگون دلچسپیان بھی دیگر فنون لطیفہ کی طرح دل کو اپنی طرف کھینچنے مین کامیابی کی سند حاصل کر چکی ہین۔ ہر علم اور زبان کے حروف تہجی کے ساتھ خطاطی یا خوشنویسی وابستہ ہی اور دُنیا کا کوئی حصہ اِس سے خالی نہین نظر آتا اور مشکل سے کوئی ایسا انسان مل سکے گا جو حُسن اور اچھے خط و خال کا دلدادہ ہو اور اچھے خط کو بالطبع پسند نہ کرے بقول شخصی ع

"خطِ خوش ہر کہ دارد دلپذیر ست"

خطاطی ایک عجیب خداداد جوہر ہی انسان کا ہاتھ بلا جوہرِ خطاطی کے ایک گونگے کی زبان ہی۔ اِس خیال کو افصح العرب لالی حضرت علیؑ نے اسقدر بلیغ لفظون مین ظاہر فرمایا ہی الخط لسان الید۔ یہی صورت کی طرح اچھا خط بھی اپنی طرف طبیعت کو کھینچتا ہی لیکن پھر تمدن کی خود رولہر اور ایجادِ تحریر کی حکمت نے کسی خط مین اِس جذبہ کو کمزور کر دیا ہی اور کسی خط کے شکل و شمائل مین سامان دلفریبی زیادہ کر دیے ہین۔ بعض خطوط خود ایسے ہین جو اپنی نوعیت کے لحاظ سے بعض پہاڑی یا بادیہ نشینون کے حُسن کی طرح خود حُسن کے قابل نہین اور بعض ایسے ہین جو خوبرویانِ کشمیر و گجرات کی طرح حُسن کی بہار سے بھرے ہوے ہین اور مشرق کے رہنے والے اور مغرب کے تمدن مین ڈوبے ہوے دل کسی محبوب کے حُسنِ خداداد کی طرح یکسان طور پر اُس کے گرویدہ نظر آتے ہین۔ بہرحال کوئی خط بھی ہو اگر وہ اپنے حدود مین درست طور پر لکھا گیا ہی تو اُس مین کم و بیش گرویدگی کے جوہر ضرور پنہان ہوتے ہین اور ہر سرزمین کے حسن والون کی طرح ہر زبان کے خط کا ناز اپنے حُسن پر بجا ہی۔ ہم کو اِس مضمون مین خطاطی کے عام تذکرے کے بعد صرف مشرقی فنِ خطاطی پر کچھ لکھنا ہی اور وہ اِسلیے کہ فنِ خطاطی کی قدر کرنے کے لیے تہذیب ہمیشہ ہمیشہ مشرقی دُنیا کی رہین منت رہیگی کیونکہ اِس فن کو مشرقی سرزمین کے رہنے والون نے آسمان کمال کے کنگرہ تک پہنچا دیا اور انسانی طباعی اور نگاہ کی قوت اور ہاتھ کی انگلیون کا وہ زور دکھلا دیا کہ آج دُنیا انگشت بدندان ہی۔ یہ بھی عجیب بات ہی کہ اکثر خطوط کی ایجاد اور اِس فن کے کمال کا سہرہ ہمیشہ اہلِ اسلام ہی کے سر رہا۔ خطوط کی ایجاد سے پہلے جانور اور طیور کی شکلون کے ذریعے

خیالات ظاہر کرنے کا رواج تھا۔ اسلام سے پہلے عرب کے حصوں مین جسقدر خطوط ایجاد ہوچکے تھے انکی کوئی تاریخ نہین ملتی نہ اس موجودہ فن خطاطی پر آجتک کسی اہل فن کو کوئی تاریخ لکھنے کی توفیق ہوئی ممکن ہر کہ دنیا کے کسی کتب خانے مین کوئی قلمی تاریخ اس فن کی تدریجی ترقی کے متعلق موجود ہو لیکن مدتہای مدید سے مین ہندوستان کے بڑے بڑے کتب خانون مین ایسی کتاب ڈھونڈھ رہا ہوں مگر نہین ملتی کچھ کتابین فن خطاطی کے قواعد کے متعلق ملتی ہین۔ اساتذہ فن کے کچھ خفی وجلی حرفون کے کتبے جابجا پائے جاتے ہین۔ چھاپہ کی ایجاد کے بعد ارژنگ چین اور پنجہ نگارین اور تزلات الجواہر اور طلسم پرین وغیرہ وغیرہ جیسی کتابون کی صورت مین وہی خطون کے نمونے نظر فریب عنوان سے سامنے لائے جاتے ہین۔ تذکرۃ الشعرا کی طرح خوشنویسون کے تذکرے بھی لکھے گئے ہین اور اسمین بہت کچھ مولوی سید احمد صاحب نے دلچسپی ظاہر فرمائی۔ رسالہ زمانہ کانپور نے بھی مدتوں اپنے صفحات کو خوشنویسون کے تذکرہ سے زینت بخشی مگر بااین ہمہ آجتک اس فن پر کوئی ایسی کتاب دنیا کے ہاتھ مین نہ دیکھی جو مختلف دور اور زمانہ کی طرز تحریر اور فن خطاطی کے تغیرات متروکات مختلف شیوہائے خطوط کے حالات اور دیگر کارآمد تاریخی معلومات سے مالامال ہوتی۔

جہانتک منتشر افسانون سے سُراغ ملتا ہر وہ یہ ہر کہ معقلی اور کوفی خطوط اس وقت عرب مین رائج تھے جب اسلام گہوارۂ تمدن مین نشو ونما حاصل کر رہا تھا۔ پیشوایان اسلام کے خطوط کے نمونے اگر کہین دنیا مین زیارت کے لیے نکل آتے ہین تو وہ کوفی خط مین ملتے ہین۔

یہانتک تو پتہ چلا ہر کہ سنہ ۳۱۰ ہجری نبوی مین خطاط ابن مقلہ نے کوفی اور نقلی خط سے چھ خطوط ایجاد کیے جن کے نام یہ ہین (۱) ثلث (۲) ریحان (۳) محقق (۴) نسخ (۵) توقیع (۶) رقاع

اس زمانہ سے بہت پہلے جبکہ اہل اسلام فتوحات کے علم لیے ہوئے آگے بڑھ رہے تھے اور ایران فتح ہوچکا تھا عرب اور عجم مین رابطہ اتحاد قائم ہونے پر دنیاوی ضرورت نے قوت ایجاد کو حرکت دی۔ ایک مدت گذرنے کے بعد امیر تیمور گورکان بادشاہ صاحبقران کے عہد مین جو تقریباً ۸۰۰ھ کا زمانہ ہوگا ایک طبیعت دار ایرانی میر علی تبریزی نے اس وقت کے رائج خطوط میں سے خط تعلیق اور نسخ کو ترکیب دیکر ایک نیا خط ایجاد کیا جسکا نام نستعلیق رکھا تعلیق ایک ایسا خط ہر جس مین سوا خاص خاص حصون کے حروف کے تمام حصے نوک قلم سے لکھے جاتے ہیں اور جسطرح تپ دق کے مریضوں میں صرف ڈھانچہ ہی ڈھانچہ نظر آتا ہے ویسا ہی تعلیق کا خط ہوتا ہر۔ یہ خط اب رائج نہین یعنی خدا بخشے یہ تپ کہنہ کا مریض دنیا سے اٹھ گیا خط نسخ کو

اس نام سے سمجھنے مین عوام کو دقت ہوتی ہو اس لیے اس کا دوسرا نام عربی خط ہو گیا ہو۔ اسکی مختلف قسمین ہین اور جسطرح مختلف حصۂ ملک کی ایک ہی زبان مین تھوڑا بہت فرق ہوتا ہو اسی طرح اس خط کے مختلف اقسام مین فرق ہو یاقوتی۔ تبریزی اور بصری وغیرہ اس کی مختلف قسمین ہین۔

نستعلیق اسی خط کو کہتے ہین جسمین آجکل اردو اور فارسی کتابین بالعموم لکھی جاتی ہین۔ یہ خط نہایت نازک اور خوبصورت ہوتا ہو اور جب تک بہت ہاتھ سنبھال کر نہ لکھا جاے وہ حسن اور خوبصورتی جو اس خط کے شایان شان ہو پیدا نہین ہوتی۔ معلوم ہوتا ہو کہ جب فن خطاطی کی قدر تھی تو ایک طرف زود نویسی کی ضرورت دوسری طرف حرفوں مین خوبصورتی قائم رہنے کی آرزو نے کچھ عرصہ تک دنیا کے اکثر ہمدردان فن کو بیچین رکھا اور اُن کو ایسے خطوط کی ایجاد کی ضرورت ہوئی جس سے وہ روزمرہ تحریر و مراسلت کا کام بآسانی چلا سکین شاید یہی ضرورت خطوط شکستہ اور شفیعہ کو عالم وجود مین لائی۔

شفیعہ خط مین روانی قلم کے ساتھ نستعلیق کا عنصر غالب ہو گویا یہ معلوم ہوتا ہو کہ نستعلیق خط سکون کی حالت سے بیچین ہوکر کسی صحرا کی طرف دوڑتا ہوا جاتا ہو شکستہ خط مین نستعلیق اور نسخ دونون کی چاشنی ہو گویا یہ دونون خط عالم بیخودی مین دست و گریباں ہوکر ایک بادۂ سر دواں دواں ہین شفیعہ اور شکست دونون کارآمد خطوط ہین مگر افسوس یہ ہو کہ اب اس کے لکھنے والے زمانہ کی بیقدری سے شاید ڈھونڈنے سے کہین خال خال ملین تو ملین۔ زیبائش اور حسن کی بہار دکھانے والے کچھ ایسے خطوط ہین جو کتابت کی دنیا مین بیکار ہین ان نام نہاد خطوط مین ایک خط گلزار ہو کسی لفظ کو جلی حرفون مین اگر لکھین اور حرف کے کنارے باریک خط سے بنا لیے جائین اور درمیان کی جگہ پھول بوٹون سے بھر دی جاے تو اُس کا نام خط گلزار ہوتا ہو اسی طرح خط ماہی ہو جسمین بجاے پھول بوٹون کے مچھلیون کی صورت سے حرف کی اندرونی جگہ بھر دیجاتی ہو۔ خط غبار مین وہی جگہ عبارت لکھکر یا باریک باریک نقطہ دیکر پُر کردی جاتی ہو۔ خط توام مین دو صفحے آمنے سامنے جڑے ہوئے ہوتے ہین اور ان صفحون پر ایسی ہوشیاری سے پھول بوٹے اور گلدستے بنائے جاتے ہین۔ کہ دیکھنے مین بظاہر کوئی خط نہین معلوم ہوتا لیکن روشنی کی طرف دونون صفحون کو ملاکر دیکھنے سے پھول بوٹون اور جھاڑیون مین سے کوئی عبارت جو لکھی گئی ہو پیدا ہوتی ہو اسی طرح اور بہت سے خطوط ہین مثلاً خط طغرا۔ سنبل۔ درہمی۔ آئینہ۔ زلف عروس ریحان۔ پیچان وغیرہ وغیرہ حقیقی معنون مین یہ سب کوئی خط نہین مگر ایشیائی نازک خیالی اور طباعی کو بہت ہر ایک قسم کے خط سے چلتا ہو اور یہ سب خطوط اس بات کو ظاہر کرتے ہین کہ اہل اسلام اور اہل ایشیا نے جسطرح اپنی

نازک خیالی کی باگ موڑ دی ایک نیا سامان دکھا دیا اور جس چمن میں اُن کے نقش قدم گئے قدم قدم پر ایک تازہ باغ کھل گیا اور دوسرے لوگ اس سے سبق لینے لگے اور ہر طرف یہ دھوم ہے

چمن میں گل کھلائے کر کے نقش پائے رنگین نے   کہ گلچین بھرتے ہیں جھولیاں اُنکی گلستان سے

اور علوم و فنون کا ذکر خارج از بحث ہے صرف فن خطاطی کو دیکھا جائے تو اس سے ہی غازہ رازدار سکے جس بھیڑے بھیڑیا بان اور نیرا میں یہ سلمان نکل گئے اس میں ایک جان آگئی خطاطی کا حق مٹ گیا اور مٹتا جا رہا ہے اور مسلمان خود اپنے بزرگون کے نادر اپنے ہمدمین کے کارنامون کو مٹا رہے ہین اور اس شہر خطاطی کی آبادی بیابان ویران ہو چکین مگر اس صحرا اور اس ویرانہ سے کبھی جو اہل فن ابھی ابھی گزرتے ہوے نکل گئے ہین ان کے قدم کی ہر لکیر اور ہر نقش سے یہ صدا آرہی ہے

کازین رہ گذر کرد بشوخی دشت   نقش یا دہ خبید سینۂ صحرا گرم ست

ایک روز سیر گذرا ایک درویش اہل دل کی خانقاہ میں جا جہان زمین پر ایک بوریا بچھا تھا اور دیوارون پر پرانے وقت کی یادگار رکھے تھے آویزان تھے فن خطاطی سے شوق ذوق نے میری نظر کو کتبون کی طرف متوجہ کر دیا ۔ عالمگیر بادشاہ اور خاندان مغلیہ کے آخری تاجدار کے کتبے میری نظر سے گذر چکے تھے مجھے اچھی طرح یہ معلوم تھا کہ کسطرح علوم و فنون مین اس فن شریف کی تعلیم کا کسقدر زیادہ چرچا تھا اور اب کیا حالت ہے ۔ ادھر یہ خیال دل مین موجزن تھا ادھر ایک نظر اٹھائی تو نئی بزم مین طبیعت بشر کلمات کچھ پُر درد اشعار اور کچھ نصیحت آمیز ابیات نہایت اعلیٰ قسم کے خط مین لکھے ہوے بلحاظ جذبات تزکیۂ نفس کا کام دے رہے تھے یہ احساس ہوتا جاتا تھا کہ دل کو دل بنانے مین یہ کتبے کس قدر مددگار ہین خوشنویسی اور خطاطی کا جادو ایک ایک کتبے سے پورا ہو رہا تھا ۔ اسی حالت مین جبکہ زمانہ پیشین اور حال کا صحیفہ خط توام کی طرح میرے پیش خیال تھا فن خطاطی کے اندرونی جذبات کو عالم خاموشی مین ظاہر کرنیوالا ایک کتبہ مجھے خوشخط نستعلیق کی شان مین ان لفظون مین نظر آیا ۔

از لب کہ در زمانہ کے اہل درد نیست   اظہار درد خویش بدیوار می کنم

مین یہ پڑھ کر آبدیدہ ہو گیا اور مجھے اس قوم کے غیرت شعار دل پر حیرت ہوئی جو اپنے بزرگون کے ایجاد کیے ہوے اس نازک فن کو یون مٹتا ہوا دیکھ رہی ہے اور زندہ ہے

اسی منزل پر مجھے یہ بھی خیال آیا کہ ہم مین اکثر اصحاب ایسے بھی ہین جو فن خطاطی کو ایک غیر ضروری

فن سمجھ رہے ہین۔ موجودہ ہندوستان کا یہ ایک بڑا معرکۃ الآرا مسئلہ ہو کہ خوشنویسی یا خطاطی کی کیا ضرورت ہو؟ اِس خیال کے نشو و نما کے متعلق طرح طرح کی روایتین یونانیون کے قدیم قصص کی طرح مشہور ہین۔ کوئی تو یہ کہتا ہو کہ ایک صاحب کو کسی خوشنویس نے کچھ خوشخط لکھ کر دیا اُس نے بجائے قدر کرنے کے یہ کہا کہ تم نے گھنٹون مین یہ لکھا اور بہت قیمتی وقت ضایع کیا ہو اسی کو ہم چند منٹ مین لکھ دیتے ہین اور دونون کے لکھنے کی غرض ایک ہو خوشخطی و بدخطی تو ایک امتیازی بات ہو۔ بعض حضرات کے دل مین اِس تخئیل کا عکس کچھ ایسا پڑ گیا ہو کہ [illegible] گر دنیا مین ایسا زمانہ آ [illegible] جو بدخطی اور ایسے لکھنے کو جو پڑھا نہ جاسکے ناسمجھتا ہو اور یہ فراموش کر کے کہ بقائے تحریر [illegible] بد [illegible] خدا کا [illegible] وقت بدخطی کے حروف پڑھنے اور لفظون کو [illegible] ہوگا اور کتنے بیگناہون کو روحانی اذیت اس کے پڑھنے مین غیر محدود مدت تک دنیا [illegible] ہوتی [illegible] اپنی [illegible] بدخطی پر سعدر نازان ہین کہ العظمۃ للہ۔

اُردو کانفرنس کے پہلے ہی جلسہ مین ایک بار رسم الخط کی بحث کے سلسلہ مین اس پر بھی زور دیا جا رہا تھا کہ سب جھگڑے مٹا کر ٹائپ والے اردو حروف رائج کر دیے جائین لیکن اس رائے کو کامیابی نصیب نہوئی اُردو کا ٹائپ ایجاد ہو یا کچھ اور ارضی و سماوی آفت آئے۔ وقت کی قدر اچھی چیز ہو کوئی بھی کام کی بات ہو وہ قابل قدر ہو یہ موضوع جس پر یہ مضمون لکھا گیا ہو وہ فن خطاطی [illegible] اور اُسکے بقا کی ضرورت ایک ایسا [illegible] جسکو کسی ایجاد پر قربان کر دینا ضرورتی نہین۔

فن خطاطی کی ضرورت ایک قدرتی ضرورت ہو۔ بچپن مین جب کسی زبان کی تعلیم دی جاتی ہو تو اُسکے حروف تہجی کو [illegible] زبان سے دہرانے اور نظر سے شناخت کرنے کو مشق بہم پہنچائی جاتی ہے اسی طرح ہاتھ سے اس کی صورت کو کاغذ پر [illegible] نے کی مشق کرائی جاتی ہو [illegible] ضرورت ہو جس سے فن خطاطی کی ابتدا ہوتی ہو [illegible] وقتون [illegible] بہتر حروفون کی تصویر بنانے کی مشق کی جاتی تھی مگر اب پیرانہ سالی کے جذبہ عشق کی طرح اِس آرزو کا رنگ [illegible] ہلکا ہو گیا ہو کہ اگر [illegible] خانہ مین فن خطاطی کی مسخ صورت کا چربہ اتارنے کی ضرورت نہ ہوتی تو خوشنویسی کا جنازہ نکل چکا ہوتا۔

بظاہر معلوم ہوتا ہو کہ کوئی اب اچھی صورتون والے حروف کا قدردان نہین رہا نہ رئیسون مین کوئی ذوق باقی ہو نہ پبلک مین قوت اساس حکومت کی طرف سے کچھ مدد نہین پہونچتی اس لیے اب

اُس کی ترقی کی ضرورت نہین سمجھی جاتی لیکن اس خیال کو اس جگہ یونہی چھوڑ دینا ایک گناہ ہے مین اس کی ضرورت کے فلسفہ پر اہل درد کو توجہ دلانا چاہتا ہون یہ سچ ہی کہ اقتصادیات کے اصول پر فن خطاطی کے گاہکون کی کمی ہے اس فن کے نمونے بازار شہرت مین لانے کا ولولہ جاتا رہا مگر اب یہ دیکھنا ہی کہ خطاطی کی ضرورت بھی دنیا کو ہی یا نہین خطاطی سے مراد خط کے نقوش بنانا اور عمدہ اور خوشنما طرز پر بنانا ہی خطاطی کی ضرورت ہر علم و زبان کی بقا کے ساتھ ساتھ ہی اور رہتی دنیا تک قائم رہیگی۔ خوشنما مضمون کی تصویر اُتارنا اور اس کی مشق کرنا بھی مفید اور ضروری ہی

اس خیال کو پورے طور سے سمجھنے کے لیے نقاشی کی ضرورت اور اُس کے معین فنون پر سب سے پہلے نظر کر لین مناسب ہی ڈرائنگ یا نقاشی کی ضرورت ایک مسلمہ ضرورت ہی کسی کام کے کرنے سے پہلے اس کا خیال دلمین پیدا ہوتا ہی پھر عمل کا آغاز ہوتا ہی چنانچہ دنیا کے اکثر کامون مین نقاشی ایک ایسی چیز ہی جو تخیل اور عمل کے درمیان ایک رابطہ اتحاد پیدا کرتی ہی جیسے ایک مکان یا کوٹھی بنانے کا خیال پیدا ہوتا ہی پھر اُسکے انداز عمارت کا نقشہ چند لکیرون کے ذریعہ سے کاغذ پر ظاہر کیا جاتا ہی پھر اُسی کی بنا پر کام شروع ہوتا ہی کپڑا بننے دری اور قالین بنانے یا کشیدہ کاری کے مختلف کام کا خاکہ تیار کرنے لکڑی کی چیزون دھات اور ظروف کے کامون مین نقاشی کی ضرورت پڑتی ہی خطاطی دنیا مین ملی نقاشی ہی یہ نقاشی آسان اور سب سے ضرورت مگر معمولی نقاشی اور ڈرائنگ سے گذر کر اعلی درجہ کی مصوری سے بھی زیادہ مشکل اور طرح طرح سے کارآمد ہی خطاطی خود بھی بالذات مفید ہے اور مفید ڈرائنگ وغیرہ کی مصوری کی تو مشق کی معین ہونے کی حیثیت سے بالواسطہ بھی مفید ہی

یہ خود بھی بالذات مفید ہی اسکا ذکر آخر مین ہوگا اس کے بالواسطہ مفید ہونے کی دلیل یہ ہی کہ فن خطاطی مین ہر حرف بجائے خود ایک انوکھی خیالی تصویر ہوتا ہی اور مصوری یا نقاشی کے تجربہ کار جانتے ہین کہ تخیل کی تصویر کا اُتارنا کس قدر مشکل ہوتا ہی صورت کی ایک مثالی صورت اور اس کا خیالی نقش مصور کے دماغ کے پردہ پر کھنچا ہوتا ہی اور وہ نہایت نازک حدود اور باریک ضبط نظام کے اندر پیچیدگیون سے اس تصویر خیالی کو کاغذ پر اُتارتا ہی فن خطاطی سے مصور کی تخیلی صورت اور اس کا حسن سلیقہ عام تخیلی تصویر اُتارنے والون سے بڑھا ہوا ہوتا ہی اور اگر یہ ہی مان لیا جائے کہ اس کا پایہ اور اُس کا سلیقہ کچھ کمتر

ہوتا ہی تو کیا اس کے تسلیم کرنے مین بھی کوئی تکلف ہو سکتا ہی کہ فن خطاطی کا کامل تھوڑی سی مشق اور تھوڑی سی توجہ اور ذرا سے تصرف خیال سے مصوری کے صنف مین وہ وہ جوہر دکھا سکتا ہی جو خود ایسے مصور کو حیرت مین لانے کے لیے کافی ہی اور خوشنویسون نے ہزارہا بار عمل کر کے اسے دکھا دیا اور ثابت کر دیا ہی لیکن کتنے مصور دنیا مین ایسے مین گے جو باوجود کمال اس پر قادر ہون کہ میر علی اور میر عماد کے کتبون کے مثل ایک حرف اپنے خیال اور مشق مصوری سے لکھ دین۔ اس بنا پر یہ آرزو بیجا نہین کہ بچپن ہی سے فن خطاطی کی تعلیم اعلیٰ پیمانہ پر بچون کو دی جاے تاکہ ان کے ہاتھ مین زور نگاہ مین استعداد اور دل مین ایک ایسی قوت احساس پیدا ہو جاے کہ وہ ڈرائنگ اور نقاشی کو محض چٹکی بجاتے اور اعلیٰ سے اعلیٰ درجہ کی مصوری مین تھوڑی مشق اور توجہ سے کمال حاصل کر سکین۔

خوشنویسی یا خطاطی حقیقتاً ایک بہت بڑی ریاضت کا نام ہی اور اس ریاضت مین تین اعضاے بدن یعنی دل، آنکھ اور ہاتھ مین اتحاد عمل جب تک نہین ہوتا کوئی قلم ایک اچھی صورت والا حرف نہین پیدا کر سکتا۔ یہ الفاظ حیرت کی نگاہ سے دیکھے جائین گے کیونکہ اب اس فن کا چرچا نہین رہا اور صناعانہ خوشخط لکھنے والے کی زیادہ سے زیادہ یہ تعریف کی جاتی ہی کہ یہ ایسا اچھا لکھا ہی کہ چھپا معلوم ہوتا ہی لیکن مین یہ کہے بغیر نہین رہ سکتا کہ ان الفاظ مین پچھلے زمانہ کے ان خوشنویسون اور خطاطون کے جذبات و تمنا کا خون بھرا ہوا ہی جو برابر چھ چھ روز تک مشق خط کیا کرتے تھے اور ایک دن ترک مشق کرنے پر پھر لکھنے وقت حسرت سے کہنے پر مجبور ہوتے تھے کہ ایسا نازک فرق محسوس ہو رہا ہی کہ گویا اب وہ بات خطین باقی نہین رہی۔ میر علی الکاتب اور میر عماد کے اصلی کتبے یعنی ایک قدرتی سانچہ مین ڈھلے ہوے حروف کی تصویرین آج بھی اس دعوی کی تصدیق کے لیے تیار ہین۔

قوت تخیل جو دنیا مین ایک بڑی زبردست قوت ہی وہی خطاطی اور خوشنویسی کی فوج کی علمبردار ہی اسکے زیر اثر نظر کی ممیزی قوت ہاتھ کی انگلیون کو پکڑ کر کاغذ پر وہ صورت تیار کر دیتی ہی جو دل کو مطلوب ہوتی ہی۔

اب نفس خطاطی کی بالذات ضرورت اور فوائد پر نظر کرنا چاہیے۔ مطبع اور پریس کی طرح اسکی ضمنی ضرورتین صدہا جگہ مین۔ یہ مانا کہ سلاطین وقت کے دربارون اور ایوان امارت کے فراین سے اچھی خوشنویسی محروم ہو گئی مگر راج پاٹ مین کچھ لکھ کر پیش کرتے وقت اب بھی خوشنویسی کی پرسش ہو جاتی ہی کبھی نوشتہ کا

بلاک یا ٹھپہ جب تک ابتداءً تشنویسی کا رہینِ منت نہ ہو لے فوٹوگرافی اور مصوری خود کوئی نقش تیار نہیں کر سکتی۔ اس میں مصوری اپنا ہنر دکھانے میں اسکی محتاج ہے کہ پہلے کچھ لکھ کر اُسکے سامنے لایا جائے۔ غرض کہ تحریر کی دنیا میں خوب نظر دوڑا کر دیکھ لیا جائے جہاں کہیں خواہ وہ چھاپہ کا پتھر ہو یا بلاک ہو یا کسی نامراد کے لوحِ مزار کا کتبہ ہو یا کسی یاراں کے عشرت کدہ کے پتھر پر کوئی یادگار تحریر ہو۔ یا جہاں کہیں بھی تحریر کے نقشِ اول کی ضرورت پڑ گئی بغیر فن خطاطی کی پرستش کے چارہ نہیں۔

مکان کی آرائش میں تصویریں گلدستے اور طغرے کام میں لائے جاتے ہیں شیر اور چیتے کی کھال اور ہرن کے سینگ جنگل سے اور مگر کے جسم کا ڈھانچہ دریا سے لا کر ایک محل سرا سج کر درست کیا جاتا ہے لیکن کیا اس سے انکار کیا جا سکتا ہے کہ بہت سے اشعار اور بہت سے کلام ایسے ہیں جو دل پر بہت کچھ اثر پیدا کر سکتے ہیں۔ یہ کلام ہی میں اثر ہے کہ روتے ہوئے کو ہنسا دے اور ہنستے ہوئے دل کو رلا دے دل کو دل بنانے اور روحانی قوت بڑھانے کے لیے دل میں سوز و گداز اور اثر پیدا کیا جاتا ہے اور ایک وقت آتا ہے کہ اس سے بڑے بڑے کام نکلتے ہیں۔ ایک عزلت نشین کے مونسِ خلوت چند کلمات ہیں چند آیات ہیں، چند اقوال ہیں اور چند اشعار ہیں خواہ وہ سامنے کہیں آویزاں ہوں یا کسی صفحہ قرطاس پر ہوں۔ مضامین و مطالب کا اثر حروف کے حسن کے ساتھ بلکہ وہی کام دیتا ہے جو موسیقی کے پردہ میں نظم و اشعار سے کام لیا جاتا ہے جیسے موسیقی جانِ شاعری ہے۔ اسی طرح جذبات مضامین کی جان خطاطی ہے یہی وجہ تھی کہ پچھلے وقتوں میں منتخب اشعار اور منتخب اقوال نہایت خوشخط لکھ کر مکانوں میں اور نشستگاہوں میں آویزاں کیے جاتے تھے۔ وہ دور تھا جب روحانیت کو ترقی تھی۔ اگلے لوگ اس سے کام لیتے تھے اور وہ کتبے کام دیتے تھے اب وہ زمانہ آگیا کہ کتبے اتار کر پھینک دیے گئے۔ خطاطی کی ضرورت سے انکار کرنے والے گروہ پیدا ہو گئے تو خطاطی بھی زبانِ حال سے یہ کہنے پر مجبور ہوئی ؎

جب سے دلِ زندہ تو نے ہم کو چھوڑا
ہم نے بھی تری رام کہانی چھوڑی

ممتاز حسین جونپوری

تذکرۂ صوفیائے کرام نمبر ۱

حضرت داتا گنج بخش علی الہجویری اللاہوری رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ

الناظر کے قدیم قدر دانوں کو یاد ہوگا کہ ایک زمانہ میں ہمارے قابل اور عارف مقالہ نویس عبد اللہ کے قلم سے صوفیائے کرام کے تذکرے ان کے ... شائع ہوئے تھے۔ انھیں بزرگ نے اب اپنے نتائج فکر کی تجدید میں ۱۵ نمبر وعدہ فرمایا ہے اور ... اس مضمون کو ... عنایت کیا ہے۔ انشاء اللہ اسی طرح اکابر طریقت کے تذکرے برابر نکلتے رہیں گے۔ ... اردو میں ایک معقول مجموعہ تذکرۃ الاولیاء ... کے لیے اجنبی نہیں لیکن ذاتاً وہ طریقت میں جب ... قدم رکھتے ہیں اور اپنی ... آپ کے ... ہو کر گزرتے ہیں ہم بھی اس سے زیادہ کچھ عرض نہیں کر سکتے کہ ع ایک معشوق ہے اس پردۂ زنگاری میں۔

(ایڈیٹر الناظر)

سر حلقۂ جملہ اقطاب محرم جمیع ابواب حقیقت بہ اوصاف معنوی شیخ علی بن عثمان بن علی الغزنوی قدس سرہ کمل اولیائے زمانہ سے تھے۔ آپ کی کنیت ابوالحسن تھی۔ ہجویر آپ کا وطن ہے جو مضافات غزنی سے ہے۔ سلطان محمود غزنوی کے پہلے حملے کے زمانہ میں شہزادہ مسعود کے ساتھ ہندوستان تشریف لائے اور لاہور میں اقامت فرمائی اور داتا گنج بخش کے لقب سے مشہور ہوئے۔ آپ ہی کے قدوم میمنت لزوم کی برکت سے لاہور کے اطراف واکناف میں اسلام پھیلا۔ مرآۃ الاسرار میں آپ کے پیر و مرشد کا نام نامی ابوالحسن خضری مرقوم ہے جو تصوف میں حضرت جنید کا مذہب رکھتے تھے۔ نفحات الانس میں ہے کہ کنیت وے ابوالحسن است عالم و عارف بود مرید شیخ ابوالفضل بن حسن ختلی است و بہ صحبت از مشائخ دیگر رسیدہ است غالباً مرآۃ الاسرار میں سہو کاتب ہوا ہے۔ مرآۃ الاسرار میں ہے کہ خواجہ احمد حمادی سرخسی جو اپنے زمانہ میں مبارز العباد کہلاتے تھے ان کا اور حضرت کا بہت ساتھ رہا ہے۔ ایک روز آپ نے پوچھا کہ اے خواجہ احمد آپ کے توبہ کا باعث کیا ہوا۔ کیا واقعہ گذرا جو آپ نے پہلے پہل توبہ کی اور تمام مشاغل دنیاوی سے کنارہ کشی فرمائی۔ خواجہ نے فرمایا ایک زمانہ کا واقعہ ہے کہ سرخس سے میں نکل کر ایک بیابان میں پہنچا

جہاں اونٹ چرا کرتے تھے اس مقام پر میں نے ایک عرصہ تک قیام کیا۔ ہمیشہ بھوکا رہتا اور اپنا
کھانا دوسرے کو دیدیتا تھا۔ ایک روز کیا دیکھتا ہوں کہ جنگل سے ایک شیر نکلا اور ایک اونٹ کو لگیا
اور ایک اونچے ٹیلہ پر لیجا کر اُسے مارا۔ اور آواز دی۔ آواز کے سنتے ہی جنگل سے طرح طرح کے درندے
گرگ۔ شغال و روباہ وغیرہ دوڑے اور اونٹ کا گوشت کھانا شروع کیا جب یہ سب سیر ہو کر چلے گئے
تو شیر خود آیا اور کچھ کھانا چاہا کہ دور سے ایک لومڑی دکھائی دی شیر لومڑی کو آتا دیکھ کر ہٹ گیا اور لومڑی
کو کھانے دیا۔ جب یہ لومڑی کھا کر چلی گئی تو پھر خود آیا اور تھوڑا سا گوشت کھایا۔ حضرت داتا گنج بخش رح یہ سب
تماشا دور سے دیکھ رہے تھے جب شیر جانے لگا تو مجھ سے گویا ہوا کہ اے ابو احمد لقمہ کا ایثار کرنا کتوں کا
کام ہے۔ مردان دین کا ایثار یہ ہے کہ جان پر کھیل جائیں۔ اُس سے یہ کلمات سنکر میں نے تمام
مشغلوں سے کنارہ کشی اختیار کی۔

نفحات الانس میں ہے کہ ایک مرتبہ حضرت شیخ علی الہجویری نے حضرت شیخ المشائخ ابوالقاسم گرگانی
سے دریافت کیا کہ درویش را کمتر چیزے بباید تا اسم فقر بروے درست گردد حضرت شیخ المشائخ نے فرمایا کم سے کم تین
چیزیں (۱) یار راست بتواند دوخت (۲) سخن راست بتواند گفت و شنود (۳) پائے راست بر زمین
بتواند زد۔ آپ فرماتے ہیں کہ ہمارے ساتھ درویشوں کی ایک جماعت تھی۔ اپنے مکان پر پہونچکر
ہم نے کہا آؤ ان کلمات کے شرح میں ہر ایک کچھ کچھ بیان کرے۔ ہر ایک نے اپنی سمجھ کے موافق بیان
کیا لیکن جب شیخ علی الہجویری رح کی نوبت آئی تو انھوں نے فرمایا کہ یار راست دوختن آن بود کہ بفقر
دوزند نہ بزینت۔ سخن راست آن باشد کہ بحال شنود نہ بمنیت۔ یعنی ان دونوں سے تحقیق ہونا چاہیے نہ کہ
از روی تصور۔ و بجد و جد در ان تصرف کنند نہ بہزل۔ و بزندگانی مر آنرا فہم کنند نہ بعقل۔ و پای عدالت بر زمین
زدن آن باشد کہ بوجد بر زمین زنند نہ بلہو۔ شیخ علی الہجویری کے اس کلام کو لوگوں نے شیخ المشائخ
ابوالقاسم گرگانی کے سامنے بیان کیا آپ نے فرمایا۔ اصاب علی جبرہ اللہ تعالی۔

حضرت داتا گنج بخش علی الغزنوی ثم الہجویری ثم اللاہوری رحمۃ اللہ علیہ صاحب دیوان تھے۔ ایک مرتبہ
ایک صاحب آپ کے دیوان کو مانگ کر لے گئے اتفاق سے صرف وہی ایک نسخہ تھا ان حضرت نے اس
دیوان کو اُلٹ پلٹ کر دیا۔ اور حضرت شیخ کا نام نکالکر اپنے نام سے اُسے مشہور کر دیا چنانچہ اس واقعہ کو آپ
خود کشف المحجوب میں بیان فرماتے ہیں۔ اسی طرح آپ نے تصوف میں ایک کتاب تصنیف فرمائی تھی جس کا

نام منہاج الدین تھا۔ ایک دوسرے صاحب اُس کو مانگ کر لے گئے اور سرقہ کر کے اپنے نام سے لوگون مین شایع کیا۔ افسوس ہے کہ وہ دیوان اور کتاب اب کہین نہین ہے۔ اس کے بعد پھر آپ نے ایک اور کتاب تصنیف فرمائی جو آج تک امہات کتب تصوف مین شمار کی جاتی ہے۔ اس کا نام کشف محجوب ہے۔ اس کتاب کے بعض مضامین پر انشاء اللہ تعالیٰ آگے بحث کی جائے گی۔

ابو سعید ہجویری نے آپ سے دریافت کیا کہ تصوف کے طریقہ کی تحقیق کیا ہے اور اہل تصوف کے مقامات کی کیفیت اور اُن کے اقوال و مذاہب اور اُن کے رموز و اشارے، خدائے بزرگ و برتر کی محبت و حقیقت۔ دلون پر اس کے اظہار سے جو کیفیت پیدا ہوتی ہے اور اسکی ماہیت تک پہونچنے مین عقول کے محجوب بننے کا سبب کیا ہے، نفس اسکی حقیقت سے کیون متنفر ہے اور روح کو اپنی پاکیزگی و صفائی سے کیا آرام پہونچتا ہے اور روح کی پاکیزگی کے متعلقات؟ انھین سوالون کے جواب مین غالباً کشف المحجوب تصنیف فرمائی گئی ہے۔ آپ کہتے ہین کہ ہمارے زمانہ مین یہ علم حقیقت پرانا ہو گیا ہے۔ ہمارے ملک نفسانی خواہشون مین مبتلا اور رضائے الٰہی کے راستہ سے بھٹکے ہوئے ہین۔ عام علما نے جو طریقت کی صورت بیان کی وہ اصل کے خلاف ہے۔ مگر کہتے ہین کہ ہم حق کو پہچانتے ہین اور خواص دلون کی آرزو و محبت نفوس اور میلان سر کو رؤیت کا شوق اور محبت کی سوزش چھوڑ کر سود و خاطر مین۔ مریدون نے مجاہدہ سے ہاتھ اُٹھا لیا ہے اور معلول ظن کا نام مشاہدہ رکھا ہے۔ زمانہ کی اس حالت کو بیان کر کے آپ فرماتے ہین کہ مینے اس مضمون پر پہلے کئی کتابین لکھی تھین مگر وہ سب ضایع ہو گئین۔ جھوٹے مدعیون نے لوگون کو پھانسنے کے لیے اسمین سے بعض اقوال لے لیے اور باقی کو ترک کر دیا اور نابود کر دیا۔ بعض پڑھنے کے لیے بیٹھے مگر پڑھا نہین۔ بعض نے پڑھا مگر سمجھا نہین۔ دل مین کسی کے طلب کا درد نہین تھا۔ اگر ہوتا تو اپنے درمان کی ہر در جستجو کرتا ؎

لعل فی فوادہ وجع لیطلب شیئا یوافق الوجعا

چونکہ کسی کو درد طلب نہ تھا اس لیے ان کتابون کو ضایع کر دیا۔

غزنی پہنچنے پر آپ نے ایک کتاب لکھی تھی جسکا نام اسرار الخرق والمؤنات ہے۔ اُس زمانہ مین مریدین مین اسکا رواج تھا مگر اب کہین نظر نہین آتی۔ اپنے حالات مین ایک جگہ حضرت تحریر فرماتے ہین کہ ایک مرتبہ ماوراء النہر کا سفر پیش آیا۔ وہان فقرائے ملامتیہ مین سے ایک کی صحبت مین بیٹھنے کا مجھے اتفاق ہوا۔ ایک دفعہ انھین خوش پاکر مین نے سوال کیا کہ بھائی صاحب ان شوریدہ اور پریشان افعال سے آپ کا مقصد کیا ہے؟

اُنھوں نے فرمایا کہ لوگوں سے پیچھا چھڑانا بہت مشکل ہے کہ لوگ بہت ہیں اور تم کم ہو۔ آپ اُن سے پیچھا نہیں چھڑا سکتے پھر خود ہی کیوں نہیں اُن کا پیچھا چھوڑ دیتے۔ تاکہ ان تمام مشاغل سے آپ کو نجات مل جائے۔ یہ بیان کر کے آپ فرماتے ہیں کہ ایسے لوگ بہت ہوتے ہیں جو لوگوں میں مشغول ہوتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ لوگ اُن کی طرف مشغول ہیں۔

حضرت خود ایک مرتبہ کا اپنا واقعہ بیان فرماتے ہیں کہ مجھے ایک واقعہ پیش آیا جسکے حل کی میں نے بہت کوشش کی مگر کامیابی نہ ہوئی۔ آخر شیخ بایزید بسطامیؒ کے مزار اقدس پر مجاوری شروع کی۔ آخرکار وہاں حل نصیب ہوا۔ لیکن اس کے بعد پھر ایک واقعہ پیش آیا اور اس کے حل کرنے کے لیے تین ماہ میں مزار شیخ بایزید پر مجاوری کرتا رہا مگر کوئی فائدہ نہ ہوا۔ حل ہونے کی امید پر ہر روز تین دفعہ نہاتا اور تین۳ دفعہ وضو کرتا تھا۔ جب یہ سب کچھ کر چکا تو وہاں سے اٹھا اور خراسان کا رخ کیا۔ رات کو شہر کُش کے ایک گاؤں میں پہنچا۔ وہاں ایک خانقاہ میں صوفیوں کی ایک جماعت مقیم تھی۔ میری حالت یہ تھی کہ ایک گدڑی بدن پر تھی اور ہاتھ میں عصا اور چمڑے کا ایک لوٹا اور بس۔ اس جماعت نے مجھے بہت حقیر اور ذلیل سمجھا۔ مجھے ایک بالاخانہ پر جگہ ملی اور وہ جماعت صوفیہ اُس سے بلند تر دوسرے بالاخانہ پر مقیم ہوئی۔ وہ خود اچھا اچھا کھانا کھاتے تھے حتی کہ میری ناک میں بو آتی تھی اور مجھے صرف ایک سوکھی روٹی جو پڑے پڑے سبز ہو گئی تھی کھانے کو دی اور تحقیر طنز اور طعنے پھینکنے لگے۔ جب وہ کھانا کھا چکے تو خربزے کھانے لگے اور میری حقارت اور اپنی خوش طبعی کے طور پر چھلکے میرے سر پر پھینکتے جاتے تھے۔ میں اپنے دل میں کہتا تھا کہ اے اللہ اگر میں ان لوگوں میں سے ہوتا جو تیرے دوستوں کا لباس پہنے ہوئے ہیں تو میں اُن سے الگ نہ ہوتا۔ جس قدر وہ لوگ تحقیر زیادہ طنز و طعن کرتے تھے اُسی قدر اپنے نفس کی تحقیر دیکھ کر میں خوش ہوتا جاتا تھا۔ یہاں تک طعنوں کا بوجھ اُٹھاتے اُٹھاتے وہ عقدہ جسکے حل کے لیے میں سرگردان تھا حل ہو گیا اور اس وقت میں نے جانا کہ بزرگوں نے کس لیے جاہلوں کی حرکتوں کو روا رکھا ہے اور کس لیے اُن کے بوجھ اُٹھائے ہیں۔

اپنے پیر و مرشد کے حال میں کشف المحجوب میں لکھتے ہیں کہ ایک مرتبہ میں آپ کو وضو کرا رہا تھا اور ہاتھ پر پانی ڈال رہا تھا کہ میرے دل میں آیا کہ جب سب کام تقدیر اور قسمت سے ہیں تو کیوں حصول کرامت کے لیے لوگ اپنے ہم جنسوں میں سے پیر بنایا کرتے ہیں۔ میرے دل کے اس خطرے پر مطلع ہو کر آپ نے فرمایا

کہ ہر حکم کے لیے ایک سبب ہوتا ہے جب خداے بزرگ و برتر چاہتا ہے کہ سختی کرنے والے اور ظالم بچہ کو ملک کا تاج عطا فرمائے تو پہلے اُسے توبہ بخشتا ہے اور اپنی ایک دوست کی خدمت میں مشغول کرتا ہے تاکہ یہ خدمت اُس کے لیے کرامت کا سبب ہو۔ پھر حضرت آپ تحریر فرماتے ہیں کہ وفات کے وقت میرے پیر و مرشد حضرت ابو الفضل حسن ختلی کا سر مبارک میری گود میں تھا۔ اپنے دوست میں سے ایک شخص سے میرے دل میں کچھ رنج تھا۔ شیخ علیہ الرحمۃ میرے اس حال سے مطلع ہو گئے۔ فرمانے لگے کہ بیٹا کیا کہتا ہوں کہ ایک مسئلہ میں تمھیں بتاؤں اگر اسے [illegible] تو سب رنجوں سے چھوٹ جاؤ گے۔ یاد رکھو کہ ہر محل کے نیک و بد تمام احوال خدا نے [illegible] پیدا کیے ہوتے ہیں تمھیں چاہیے کہ خدا کے فعل پر خصومت نہ کرو اور دل میں کوئی رنج نہ رکھو۔

حضرت شیخ علی الہجویری داتا گنج بخش نے جن مشائخ کو دیکھا اور اُن کی صحبت میں رہے اُن کے نام نامی یہ ہیں حضرت شیخ ابو الفضل حسن ختلی، ابو القاسم عبد الکریم قشیری، ابو العباس احمد بن محمد شقانی، ابو القاسم علی بن عبد اللہ الکرکانی، ابو احمد مظفر بن حمدان [illegible] ان بزرگوں کے علاوہ حضرت شیخ نے کشف المحجوب کے باب ہفتم میں ان [illegible] نام [illegible] ہیں جو ان کے معاصر تھے۔ جو یگانۂ قوم اور ارباب معانی میں سے تھے اُن کی تعداد [illegible]

آپ فرماتے ہیں کہ حضرت شیخ ابو العباس احمد سے میری بڑی دوستی تھی بلکہ بعض علوم میں وہ میرے استاد تھے۔ میں نے اُن سے زیادہ شریعت کی تعظیم کرنے والا اور موجودات سے قطع تعلق کرنے والا کوئی نہیں دیکھا۔ آپ کا قول تھا کہ وہ ہستی جو دیدار میں [illegible] بہشت سے بہتر ہے جو حجاب میں ہو اور جب خدا کی ہستی ہو سپرد عدم جائز نہیں تو پھر اگر میں ایسا [illegible] ہو جاؤں کہ میری ہستی کو بہشت نصیب نہ ہو تو کیا مضائقہ ہے۔

آپ فرماتے ہیں کہ ایک دن میں حضرت شیخ ابو القاسم علی بن عبد اللہ الکرکانی کے سامنے بیٹھا ہوا تھا اور اپنی وارداتوں کا تذکرہ کر رہا تھا تاکہ حضرت کھرے کو کھوٹے سے الگ فرما دیں۔ آپ میرے حال کو بہت توقیر کے ساتھ سمع فرما رہے تھے میرے دل میں یہ خیال گزرا کہ شاید ابتدا میں آپ کا گزر اس کوچہ میں نہیں ہوا ہے۔ شیخ علیہ الرحمہ کو میرے باطن کا حال معلوم ہو گیا اور فرمایا یہ فروتنی و نیاز تمھارے لیے نہیں ہے بلکہ اُس کے لیے ہے جس نے یہ حال تمھیں بخشا تھا۔ اسمیں تمھاری خصوصیت نہیں ہے تمام طالبوں کے لیے یہ عام ہے۔ میں یہ سُنکر چُپ رہ گیا۔ شیخ نے پھر فرمایا کہ بیٹا اس طریق میں آدمی کو حضرت

اسی قدر نسبت حاصل ہے کہ جب اس طریقت کو اس سے متعلق کرتے ہیں تو وہ اس کی بافت کے پندار کو اختیار کرتا ہے اور جب اُسے معزول کرتے ہیں تو پندار کی صرف عبارت ہی عبارت باقی رہ جاتی ہے نفی و اثبات عدم و وجود دونوں پندار میں داخل ہیں۔ اس قید سے آدمی کو کبھی رہائی حاصل نہیں ہوتی۔ اس لیے اُسے چاہیے کہ بندگی کی راہ اختیار کرے اور مردانہ روشی اور فرمانبرداری کے سوا تمام نسبتیں گم کردے۔

ایک مرتبہ حضرت داتا گنج بخش حضرت خواجہ ابو احمد مظفر بن احمد بن حمدانؒ کی خدمت میں بیٹھے تھے اور نیشاپور کا ایک مدعی بھی پاس بیٹھا ہوا اپنی عبارت میں یہ کہہ رہا تھا کہ فانی ہوگا اور پھر باقی۔ خواجہ مظفرؒ نے فرمایا کہ فنا پر بقا کی صورت کیونکر ہوسکتی ہے۔ اس لیے کہ فنا سے نیستی مراد ہے اور بقا ہستی کی بات دلالت کرتی ہے۔ فنا سے ہر ایک اپنے صاحب کے نفی کرنے والا ہوتا ہے پس فنا فنا سے معلوم ہے۔ جب معلوم نیست ہوتا ہے تو عین باقی رہتا ہے نیست نہیں ہوتا کیونکہ وہ شے دیگر ہے اور یہ روا نہیں ہے کہ حقیقتیں فنا ہوجائیں۔ فنا صفت کے لیے مخصوص ہے اور سبب کا فنا ہوجانا جائز رکھا گیا ہے۔ پس صفت اور سبب جب فنا ہوجاتے ہیں تو موصوف اور سبب باقی رہتا ہے جس کے ذات پر فنا کا اطلاق نہیں کیا جاسکتا۔

حضرت خواجہ ابو احمد مظفر کے اس بیان کی تشریح آپ یوں فرماتے ہیں کہ بندہ کا اختیار بندہ کی صفت ہے اور اپنے اختیار میں بندہ جناب باری تعالیٰ کے اختیار سے محجوب ہے۔ پس بندہ کی صفت اس کی اور حق کے درمیان میں حجاب بن جاتی ہے۔ جناب باری عز اسمہ کا اختیار ازلی و ابدی ہے اور بندہ کا اختیار حادث۔ جو شے ازلی و ابدی ہے وہ فنا پذیر نہیں ہوسکتی اور حادث فانی و غیر باقی ہے۔ چنانچہ جب خدا جل جلالہ کا اختیار بندہ کے حق میں بقا پاتا ہے تو اُس وقت بندہ کا اختیار فانی اور اس کا تصرف منقطع ہوجاتا ہے۔

گرمی کے موسم میں ایک دن آپ پریشان حضرت خواجہ ابو احمد مظفرؒ کی خدمت میں آئے انھوں نے فرمایا ابوالحسن کیا حال ہے۔ میں نے عرض کیا کہ مجھے سماع چاہیے۔ حضرت خواجہؒ نے اسی وقت ایک آدمی کو بھیجا اور قوال اور نیز اہل عشرت کی ایک جماعت کو طلب فرمایا۔ عشق کی آگ۔ ارادہ کی قوت اور ابتدا میں پڑنے کی کوشش نے سماع کے چند کلموں کے بعد ہی مجھے بیقرار کردیا۔ اور کچھ عرصہ بعد جب جوش میں کمی ہوئی تو حضرت خواجہ نے مجھ سے پوچھا کہ اس سماع میں تمھارا کیا حال ہوا۔ میں نے عرض کیا کہ بہت خوش ہوں۔ آپ نے فرمایا کہ ایک وقت آنے والا ہے کہ اس سماع اور کوے کی آواز تمھارے لیے برابر ہوگی۔ آپ کا مطلب یہ تھا کہ سماع کی اسی وقت تک قوت ہوتی ہے جب تک مشاہدہ نہ ہو۔ جب

مشاہدہ حاصل ہو جاتا ہے تو دلالت سماع کی ضرورت باقی نہیں رہتی۔ حضرت خواجہ رحمۃ اللہ علیہ نے تاکید فرمائی کہ سماع کو عادت و طبیعت نہ بنانا اور نہ اس پر قیام کرنا۔

شیخ ابو القاسم گورگانی کا واقعہ آپ خود بیان فرماتے ہیں کہ شیخ کی زیارت کا خیال ایک مرتبہ جبکہ میں طوس میں مقیم تھا پیدا ہوا۔ چنانچہ میں گیا اور انھیں مسجد کے حجرہ میں تنہا پایا۔ وہ میرا واقعہ ہو بہو ستون سے کہہ رہے تھے۔ میں نے عرض کیا حضرت یہ کس سے کلام ہو رہا ہے۔ ارشاد ہوا کہ اس ستون سے جسے خدا نے میرے واسطے گویا کیا۔ اور اس نے مجھ سے اک سوال کیا۔ اسکا جواب دے رہا ہوں۔

ایک مرتبہ آپ سلانگ نامی ایک گاؤں میں جو علاقہ نسا سے تھا ایک درویش سے ملنے تشریف لے گئے۔ انھوں نے آنے کا سبب پوچھا آپ نے کہا کہ آپ کی زیارت کے واسطے حاضر ہوا ہوں۔ فرماتے ہیں کہ یہ سن کر انھوں نے محبت کی نظر سے مجھے دیکھا اور فرمایا کہ فلاں روز سے تمھیں دیکھ رہا ہوں اور جب تک مجھ سے غائب نہ کریں میں دیکھنا چاہتا ہوں۔ جب میں نے حساب کیا تو معلوم ہوا کہ وہ فلاں دن میری توبہ کی ابتدا کا دن تھا۔ درویش نے فرمایا کہ اے میاں پا سے سفر کرنا ادنیٰ کا کام ہے اگر زیارت کرنے آئے ہو تو خلوص دل سے زیارت کرو کیونکہ حضور قلب کے سامنے حضور جسم کوئی شے نہیں۔

آپ فرماتے ہیں کہ ایک مرتبہ میں صوفیوں کی مبتدی جماعت کو بعض مسائل سکھایا کرتا تھا میں ایک مرتبہ اونٹ کے صدقہ کا بیان کر رہا تھا کہ ایک جاہل آیا اس نے میرا بیان سنا تو گھبرانے لگا اور منہ بنا کر اٹھ کھڑا ہوا۔ میں نے کہا کہ اے شخص جیسا کہ ہمیں زکوٰۃ دینے کے لیے علم حاصل کرنا چاہیے اسی طرح زکوٰۃ لینے کے لیے بھی۔ اگر کسی کے پاس مال ہو اور نہ حصول مال کی طاقت ہو تب بھی حصول علم کا فریضہ اس سے ساقط نہیں ہو جاتا۔ نعوذ باللہ من الجہل۔

آپ صاحب عیال تھے چنانچہ خود فرماتے ہیں کہ "مقدر نے اس آفت میں مجھے پھنسا دیا اور اہل و عیال کی صحبت میں دل و جان سے گرفتار ہو گیا اور ایک سال تک اس آفت میں غرق رہا یہاں تک کہ قریب تھا کہ میرا دین تباہ ہو جائے مگر خدائے جل و علیٰ نے اپنی کمال مہربانی بخشش سے دل بیچارہ کے استقبال کے واسطے عصمت کو بھیجا اور اپنی رحمت سے خلاصی عطا فرمائی۔ والحمد للہ علیٰ جزیل نعمائہ۔

آپ فرماتے ہیں کہ ایک دن میں شیخ ابو العباس شقانی کے پاس آیا وہ یہ آیت پڑھ رہے تھے ضرب اللہ مثلا عبداً مملوکاً لا یقدر علی شیء اور رو رہے تھے اور نعرہ مارتے تھے میں سمجھا کہ دنیا سے گذر جائیں گے

مین نے عرض کیا یہ کیا حال ہی فرمایا گیارہ سال ہوے کہ میرا درد یہان تک پہنچا ہی اور اس جگہ سے مین نہین گذر سکتا۔

آپ فرماتے ہین کہ ایک مرتبہ مین مرو مین تھا۔ وہان حدیث کے ایک امام تھے جنھون نے کہا کہ مین نے سماع کی اباحت مین ایک کتاب لکھی ہی۔ مین نے کہا غضب ہوا جناب نے جو امام ہین ایک لہو کو جو گناہون کے اصل ہی حلال کیا ہی۔ اُنھون نے فرمایا اگر تم خود حلال نہین سمجھتے ہو تو کیون سماع سنتے ہو۔ مین نے عرض کیا اس کی کئی صورتین ہین یعنی اگر دل مین حلال کی تاثیر ہو تو سماع حلال ہی اور اگر حرام کی تاثیر ہو تو حرام ہی۔ اور اگر مباح کی ہو تو مباح ہی۔ جس چیز کو بظاہر اسباب گناہ کہا جاتا ہی اور باطناً اُس کی رفتار کئی وجہون پر ہی تو ایک چیز پر اُس کا اطلاق کرنا محال ہوتا ہی یعنی سماع مین جو کوئی صواب کو صواب دیکھے اور خطا کو خطا اُسکے کے لیے سماع حلال ہی۔ آپ فرماتے ہین کہ شیخ مسلم فارسی سے مین نے سنا ہی کہ ایک درویش سماع مین بہت بیقراری ظاہر کرتا تھا۔ ایک شخص نے اسکے سر پر ہاتھ رکھدیا اور کہا کہ بیٹھ جا جونہی بیٹھا روح پرواز کر گئی۔ مرید کو سماع کے غلبہ مین اسقدر حال چاہیے کہ اس کا سماع گنہگارون کو گناہ سے چھڑا دے۔ آپ فرماتے ہین کہ مین نے اپنی آنکھون سے ایک درویش کو دیکھا ہی جو آذربائجان کے پہاڑون مین فکر مین ڈوبا ہوا یہ اشعار پڑھتا جاتا تھا ؎

والله ما طلعت الشمس ولا غربت — الا وانت فی قلبی و وسواسی
ولا جلست الی قوم احدثهم — الا وانت حدیثی بین جلسائی
ولا ذکرتک محزونا ولا طربا — الا وحبک مقرونا بانفاسی
ولا هممت بشرب الماء من عطش — الا رایت خیالا منک فی کاسی
ولو قدرت علی الاتیان زرتکم — سحبا علی الوجه او مشیا علی الراسی

وہ درویش ان اشعار سے ایسا متغیر و متاثر ہوا کہ ایک پتھر پر بیٹھ گیا اور روح پرواز کر گئی۔ آخر مین آپ فرماتے ہین کہ مین علی بن عثمان جلابی اس کو زیادہ دوست رکھتا ہون کہ اپنے مریدون کو سماع مین نہ پڑنے دون تاکہ اُن کی طبیعت پریشان نہو کیونکہ اسمین بڑے خطرے اور بڑی آفتین ہین۔

صاحب مراۃ الاسرار کی روایت کے بموجب آپ کا سنہ وفات ۴۶۵ھ (خمس وستین واربعمائۃ) ہی اور لاہور مین حضرت کا مزار مبارک ہی جو مرجع خاص و عام اور خود حضرت خواجہ غریب نواز خواجہ معین الدین سنجری

فرما اجمیری رحمۃ اللہ علیہ نے بیان کیا ہے

آپ کے چند کلمات طیبات درج ذیل کیے جاتے ہین تاکہ تازگی بخش ارواح طالبین ہون

آپ فرماتے ہین کہ ہمارے زمانہ مین علم حقیقت پرانا ہوگیا ہے خاصکر اس ملک مین کہ سب لوگ نفسانی خواہشون مین پیوستہ ہین [illegible] طریقہ الٰہی [illegible] سے الگ ہین۔ مدعیان زمانہ اور علماے دنیا نے طاقت [illegible] ہمت کر دی ہے پس ہمت کرو اُس چیز کے لیے کہ اتصال حق کے سوا خواہ [illegible] زمانہ پر افسوس ظاہر کرتے ہوے آپ فرماتے ہین کہ خداے جل علی نے ہم کو اس زمانہ مین پیدا کیا ہے جس مین لوگون نے حرص ولالچ کا نام [illegible] ریاست کی طلب کا نام عزت [illegible] ریا کا نام خوف الٰہی اور کینہ پوشیدہ رکھنے کا نام حلم [illegible] جھگڑے کا نام [illegible] کینہ کا نام [illegible] نفاق کا نام زہد خواہش [illegible] معرفت [illegible] نفسانی حرکات قلب کا نام محبت خدا کے لیے راستے سے [illegible] نام فقر [illegible] جان بوجھ کر انکار کرنے کا نام صفائی۔ زندقہ اور حق تعالی اور آخرت پر ایمان نہ رکھنے کا نام فنا فی اللہ پیغمبر خدا صلعم کی شریعت ترک کر دینے کا نام طریقت اہل زمانہ کے آفت کا نام معاملہ رکھا ہے۔ آپ فرماتے ہین کہ علم [illegible] سیکھنا فرض ہے جس سے عمل درست ہو کیونکہ بیفائدہ علم سیکھنے والون کی حق تعالی نے مذمت فرمائی ہے۔ ویتعلمون ما یضرہم ولا ینفعہم اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے پناہ مانگی ہے اعوذ باللہ من علم لاینفع۔ علم باعمل ہونا چاہیے پیغمبر خدا صلعم نے فرمایا ہے کہ المتعبد بلا فقہ کالحمار فی الطاحون۔

آپ فرماتے ہین کہ موحد جبری القول اور قدری الفعل ہونا چاہیے تاکہ قدر اور جبر مین اسکی رفتار درست آئی۔ حضرت ابوبکر وراق ترمذی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہین کہ التوحید دون الجبر وفوق القدر

فقر وغنا کے باب مین آپ فرماتے ہین کہ غنا کا نام خاص خداے جل وعلی کے لائق ہے لوگ اس نام کے مستحق نہین ہوسکتے اور فقر کا نام لوگون کے لیے ہے خداے بزرگ وبرتر کے لیے روا نہین۔ مجازاً ایک شخص کو غنی کہا جاتا ہے مگر حقیقۃً وہ غنی نہین ہوتا۔ غنا وجود اسباب سے متعلق ہے ہم قبول اسباب غنا کی حالت مین اسباب کے محتاج ہین اور حق تعالی مسبب الاسباب ہے۔ غناے حقیقی حق تعالے کی صفت ہے یہ ہے کہ اسکو کسی کی حاجت نہین یفعل ما یشاء ویحکم ما یرید۔ کوئی اسکی مراد کو

رفع نہین کر سکتا۔ نہ کوئی اُسکی تعریف کیونکر سکتا ہی وہ حقیقت موجودات کو اُلٹ دینے اور خلق اضداد
پر قادر ہی ہمیشہ اُسی صفت سے رہا ہی اور رہیگا نہ سبب مجازی ہونیکی صفت ہی اسباب زندگی کا
بافرصت و فراغت حاصل ہونا یا کسی بلا مصیبت یا کسی مشاہدہ سے آرام پانا ہی یہ سب حدث
و تغیر طلب و حسرت کا سلسلہ اور عاجزی اور خواری پر مقدم ہی۔ یا ایہا الناس انتم الفقراء
الی اللہ واللہ ہو الغنی الحمید۔ فقر سواے دل کی فراغت ہی اور غنا سوا کی چیزوں کا مشغول
ہونا جب فراغت حاصل ہوگی تو فقر غنا سے بہتر نہین اور نہ غنا فقر سے بہتر ہی غنا متاع کی کثرت
ہی اور فقر متاع کی قلت اور متاع سب خدا کی ہی۔ جب سب طالب ملک سے ترک کی خواہش کی تو شرکت
درمیان سے اُٹھ گئی اور دونوں ناموں سے فارغ ہوگیا ... دونوں عبارتوں مین عدم و فنا سے مراد
بُرے اسباب اور ناقابل تعریف صفات کو نیست و نابود ... وہ اسباب طلب مین ترک کر دینا ہی

صوفی اُس کو کہتے ہین جو باطنی عادات و اخلاق کو صفا بناے اور طبیعت کی آفتوں سے کنارہ
کرے یہ اسم لطیف اسما اعلام سے ہی جیسا آپ فرماتے ہین کہ اللہ تعالی نے اس زمانہ مین بہت لوگون کو
تصوف اور اہل تصوف سے حجاب مین کر دیا ہی ... گمان کرتا ہی کہ یہ طریق صرف ظاہری اعمال
کی ورزش ہی اور باطن کے مشاہدے سے کوئی تعلق نہین رکھتا اور کوئی کہتا ہی کہ یہ ایک بے حقیقت
اور بے اصل رسم ہی یہانتک کہ علماے ظاہر نے تصوف سے انکار کیا ہی اور باطن کی صفائی کی خواہش
کو دل سے دور کر دیا ہی اور گذشتہ بزرگوں اور اصحاب کے طریق کو ترک کر دیا ہی۔

ان الصفاء صفة الصدیق ان اردت صوفیا علی التحقیق

صفائی کی جڑ خداے جل و علی کے سوا سب سے دل کو ہٹا لینا ہی اور شاخ اُس کی دنیا سے علیحدگی اختیار
کرنا ہی آپ فرماتے ہین کہ اس معاملہ مین تین قسم کے آدمی ہوا کرتے ہین صوفی متصوف اور مستصوف۔
صوفی وہ ہی جو اپنے آپ سے فانی ہو اور حق تعالی کے شوق مین باقی ہو طبیعتوں کی قید سے آزاد اور
حقیقتوں سے وابستہ ہو۔ متصوف وہ ہی جو اس درجہ کے مجاہدہ کا طلبگار رہے اور طلب مین اپنے تئین
انکے معاملہ پر درست رکھتا ہو اور مستصوف وہ ہی جس نے مال مرتبے اور دنیا کی نگاہ رکھنے کیلیے اپنے
تئین ان لوگون کے مانند بنایا ہو اور ان دونوں کے معاملات سے بیخبر ہو۔

آپ تصوف کی تعریف یہ کرتے ہین کہ التصوف حقیقة لا رسم له اس لیے کہ رسم معاملات بندہ سے

متعلق ہے اور اُسکی حقیقت خدا سے وابستہ ہے جب تصوف خلق سے مُنہ پھیرنا ہوا تو یقیناً اُس کے لیے کوئی رسم نہیں ہو سکتی۔

آپ فرماتے ہیں کہ رضا دو طرح کی ہوتی ہے ایک حق تعالیٰ کی رضا ہے بندہ سے اور دوسرے بندہ کی رضا ہے حق تعالیٰ سے رضی اللہ عنہم ورضوا عنہ۔ حق تعالیٰ کی رضا یہ ہے کہ بندہ کو نعمت اور ثواب کی کرامت کرنے کا ارادہ فرمائے اور بندہ کی رضا یہ ہے کہ خدائے بزرگ و برتر کے فرمان پر قائم رہے اور اس کے حکم سے سرتابی نہ کرے۔ آپ فرماتے ہین کہ رضا قضا کے وارد ہونے سے پہلے درست نہین ہوتی بلکہ بعد میں۔ حضرت حسین بن علی علیہ السلام نے مناجات میں یہ دعا فرمائی ہے کہ اللھم انی اسئلک الرضاء بعد القضاء یعنی اے خدا میں تجھ سے اس بات کا سوال کرتا ہوں کہ جب تیری طرف سے قضا آئے تو اپنی وارد ہونے پر مجھے راضی رکھ۔ رضا اگر پہلے ہو تو عزم رضا ہے اس لیے قضا کی حالت ہی رضا ظاہر کرنا یعنی ہے۔ اہل خراسان کہتے ہین کہ رضا احوال میں سے ہے اور اہل عراق کہتے ہیں کہ رضا مقامات میں سے ہے۔

آپ فرماتے ہین احوال وہ لطیفت ہے جو خدائے بزرگ و برتر کی طرف سے انسان کے دل میں آئے اور کسب سے دفع نہ کی جا سکے اور آئے تو کسب سے حاصل نہ ہو سکے۔ اور مقام طالب کا راستہ اور اسکی جنگاہ ہے اور راہ حق میں بندہ کی جب کا درجہ ہے۔ حال خدا کی عطا ہے اور مقام مجاہدہ سے قائم ہوتا ہے ایک گروہ حال کا دوام روا رکھتا ہے اور دوسرا نہین رکھتا۔ اول الذکر میں شیخ حارث محاسبیؒ کا گروہ ہے۔ اسی واسطے وہ رضا کو احوال مین شمار کرتے ہین ثانی الذکر مین حضرت جنیدؒ کا گروہ ہے۔ یہ لوگ کہتے ہین الاحوال کالبروق فان ثبتت فحدیث النفس۔ یہ لوگ رضا کو مقامات مین سے شمار کرتے ہین۔

سکر وصحو کے بیان مین آپ فرماتے ہین کہ خدا کی محبت کے غلبہ کو سکر کہتے ہین اور مراد کے حصول کو صحو کہتے ہین۔ ایک گروہ کے لوگ جنمین حضرت بایزید بسطامیؒ بھی ہین سکر کو صحو سے افضل سمجھتے ہین۔ یہ لوگ کہتے ہین کہ صحو آدمیت کے صفت کے اعتدال اور تمکین پر جو سالکون کا ایک مقام ہے حاصل ہوتا ہے اور یہ خدا کی طرف سے بہت بڑا حجاب ہے۔ اور سکر آفت کے جاتے رہنے صفات بشریت کے دور ہونے۔ تدبیر و اختیار بندہ کے اٹھ جانے۔ بندہ کے تصرف کے فنا فی الحق ہونے اور جو قوت بندہ مین اُس کی جنس کے خلاف ہے اسکی فنا ہونے سے حاصل ہوتا ہے دوسرے گروہ کے لوگ صحو کو سکر پر فضیلت دیتے ہین۔ اُن کے امام حضرت جنیدؒ ہین۔ یہ لوگ کہتے ہین کہ سکر آفت کا محل ہے کیونکہ وہ احوال کی

پریشانی اور صحت کا چلا جانا اور اپنے سررشتہ کا گم کرنا۔ مطلب اگر صحیح لحاظ نہیں ہے تو عشق کا فائدہ حاصل نہیں ہوتا اس لیے کہ اہل حق کا دل تمام موجودات سے تنہا ہونا چاہیے۔ لوگ اشیاء کو جیسے کہ وہ ہیں نہیں دیکھتے۔ اس لیے اس کی ماسوا میں پھنسے رہ جاتے ہیں۔ اشیاء کا دیکھنا دو طرح پر ہوتا ہے ایک تو بقا کی نظر سے دوسرے فنا کی نظر سے۔ بقا کی نظر سے دیکھنا یہ ہے کہ کل موجودات کو اپنی بقا میں ناقص پائے اور فنا کی نظر سے دیکھنا یہ ہے کہ کل اشیا کو خدا کی بقا کے مقابلہ میں فانی پائے اور دراصل ان دونوں کا نقطہ اتصال ایک ہی ہے یعنی ایک ہی مقصود کو دیکھنے کے دو پہلو ہیں۔ صحو و سکر کے بیان میں حضرت شیخ علی الہجویری داتا گنج بخش کی رائے جنیدیوں کی رائے کے موافق ہے۔ آپ کہتے ہیں کہ صاحب سکر کے حال کا کمال صحو ہوتا ہے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام صاحب سکر تھے ایک تجلی کے برداشت کی طاقت نہ رکھی اور بیہوش ہو گئے۔ حضرت سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم صاحب صحو تھے۔ مکہ سے قاب قوسین تک عین تجلی میں تھے اور لحظہ زیادہ ہوشیار اور زیادہ بیدار ہوتے جاتے تھے ؎

شربت الراح کاسا بعد کاس
فما نفد الشراب وما رویت

سکر سب فنا کی پنداشت ہے اور بقائی صفت کا عین ہے اور یہ حجاب ہے اور صحو سب صفت کے فنا میں بقا کا دیدار ہے اور یہ عین کشف ہے۔ سکر کی دو قسمیں کی گئی ہیں۔ مودتی اور محبتی۔ مودتی باعلت ہوتا ہے کیونکہ اس کا پیدا ہونا نعمت کے دیکھنے سے ہوتا ہے اور محبتی بے علت ہوتا ہے کیونکہ اس کا پیدا ہونا منعم کے دیکھنے سے ہوتا ہے۔ اسی طرح پر صحو کی دو قسمیں ہیں غفلتی اور محبتی۔ غفلتی بہت بڑا حجاب ہے اور محبتی امانت دار کشف ہے۔ غفلتی اگرچہ صحو ہو مگر سکر ہوتا ہے اور محبتی اگرچہ سکر ہو مگر صحو ہوتا ہے۔ درحقیقت یہ دونوں سالکوں کے قدمگاہ ہیں اور سلطان حقیقت جب جلوہ دکھاتا ہے تو صحو و سکر کے دونوں ایک ہی وسیلے نظر آتے ہیں ؎

اذا طلع الصباح بنجم راح
تساوی فیہ سکران وصاح

آپ فرماتے ہیں کہ ایثار کی حقیقت یہ ہے کہ صحبت میں اپنے ساتھی کا حق نگاہ رکھے اور اپنا حصہ اسی کو دیدے اور ساتھی کے آرام کے لیے خود رنج اٹھائے۔ اس کی دو قسمیں بیان کی جاتی ہیں ایک وہ ایثار جو صحبت میں ہوتا ہے اور دوسرا جو محبت میں ہوتا ہے۔ ایثار صحبت تو وہ ہے جس کا ذکر ہوا۔ ایثار محبت وہ ہے جس میں رنج و اندوہ کا نام

نہ ہوا ور سب راحت ہی راحت ہو۔

نفس اور روح کے بارے مین آپ فرماتے ہین کہ یہ دونون لطیف چیزون مین سے ہین۔ لیکن اصطلاح صوفیہ مین ایک خیر کا محل ہو اور دوسرا شر کا۔ جیسے کہ آنکھ بینائی کا مقام ہو اور کان شنوائی کا۔ نفس کی مثال شیطان کی سی ہو اور روح کی فرشتہ کی سی۔ اور نفس کی خلاف ورزی کی تلقین قرآن پاک مین فرمائی گئی ہو۔ ونھی النفس عن الھویٰ فان الجنۃ ھی الماویٰ۔ آپ فرماتے ہین کہ طلب علم معرفت سب طالبون پر فرض ہو بندہ معرفت باری تعالیٰ پر مکلف کیا گیا ہو۔ پس جب بندہ خدا اسے جل وعلا کی معرفت پر مکلف ہو تو اسکو اپنی معرفت بھی حاصل کرنی چاہیے۔ اپنی سے مراد انسانیت کی معرفت ہو۔ اس مین لوگون کے مختلف اقوال ہین۔ ایک گروہ کہتا ہو کہ انسان سے مراد صرف روح ہو اور یہ بدن اُس کی زرہ اور شکل ہو اور اس کا گھر اور جاے پناہ ہو تاکہ طبیعتون کے خلل سے حفاظت مین رہے۔ مگر یہ خیال باطل ہو اس لیے کہ انسان کا اطلاق مردہ پر بھی ہوتا ہو اور چار پائی مین بھی جان ہوتی ہو مگر وہ انسان نہین کہلاتا۔ دوسرا گروہ کہتا ہو کہ یہ نام روح اور بدن پر ایک جگہ مین واقع ہوتا ہو اور جب ایک دوسرے سے جدا ہوتا ہو تو یہ نام ساقط ہو جاتا ہو مگر یہ خیال بھی باطل ہے اس لیے کہ اللہ جل شانہ فرماتا ہو ھل اتی علی الانسان حین من الدھر لم یکن شیئاً مذکورا۔ آدم کی بیجان مٹی کو بھی قبل روح انسان کہا ہو۔ ایک دوسرا گروہ ہو جو کہتا ہو کہ انسان ایک جزو لا یتجزیٰ ہو اور اس کا محل دل ہو مگر یہ خیال بھی باطل و محال ہو کیونکہ اگر ایک آدمی کو مار ڈالین اور اس کا دل باہر نکال لین تب بھی انسانیت کا نام اسپر عائد کیا جاتا ہو۔ ایک اور باطل دل عیون کا گروہ ہو جو کہتا ہو کہ کھانے پینے والا اور جو تغیر ہونے والا ہو وہ انسان نہین ہو سکتا۔ انسان سر الٰہی ہو اور یہ جسم اس کا لباس ہے۔ اس خیال کی غلطی بالکل بین ہو اس لیے کہ مجنونون کا فرون اور فاسقون کو بھی انسان کہتے ہین۔ اور اُن مین کوئی سر الٰہی نہین ہو۔ اور سب تغیر پذیر اور کھانے پینے والے ہین۔ خود اللہ بزرگ و برتر فرماتا ہو ولقد خلقنا الانسان من سللۃ من طین ثم جعلناہ نطفۃ فی قرار مکین ثم خلقنا النطفۃ علقۃ فخلقنا العلقۃ مضغۃ فخلقنا المضغۃ عظاماً فکسونا العظام لحما ثم انشاناہ خلقاً آخر فتبارک اللہ احسن الخالقین۔ پس انسان وہ ہو جو اس مخصوص صورت مین ہو اور تغیر پذیر ہو وہ ایسا ہی ہو جو تندرستی اور بیماری قبول کرتا ہو کیونکہ موت اس اسم کو صورت معہودہ اور آلہ موسومہ (یعنے

جنون عقل) سے ظاہراً یا باطناً زائل نہین کردیتی۔ انسان کی کامل ترین ترکیب تین عنون سے ہوتی ہر ایک روح۔ دوسرا نفس۔ تیسرا بدن۔ ان مین سے ہرایک کے لیے ایک صفت مخصوص ہر جو عین کی وجہ سے قائم ہر۔ روح کے لیے صفت عقل ہر نفس کے لیے ہوا اور بدن کے لیے حس اور آدمی کل عالم کا نمونہ ہر عالم سے یہ جہان اور آخرت کا دوسرا جہان دونون مراد ہین۔ اس جہان کی نشانی پانی۔ خاک۔ ہوا اور آگ ہر۔ اور بلغم۔ دم۔ صفرا۔ اور سودا سے اُسکی ترکیب ہر اور اس جہان کی نشانی بہشت۔ دوزخ اور میدان قیامت ہر۔ جان بہ باعث لطافت کے بہشت کے مانند ہر۔ اور نفس بہ باعث آفت و وحشت کے بمنزلہ دوزخ کے ہر۔ اور جسم گویا میدان قیامت ہر۔ بہشت خدا کی رضا کی تاثیر ہر۔ اور دوزخ اُس کی ناخوشی کا نتیجہ۔ مومن کی روح راحت و معرفت سے ہر اور اس کا نفس حجاب و گمراہی سے مرکب ہر پس جبتک مومن دوزخ سے خلاصی نہ پائے اور بہشت مین نہ ہو سبحے لقاے الٰہی کی حقیقت سمجھ ہی نہین سکتا اسی لیے کہا گیا ہر دع نفسک و تعال۔ طالب خدا کے لیے عقل مدبر کامل ہر۔ اور روح چونکہ بمنزلہ بہشت کے ہے اس لیے اپنے معنوی شریک کی طرف ہر مومن کو بلاتی ہر۔ اور نفس اپنے شریک معنوی کی طرف بُلاتا ہر۔ اس لیے لازم ہر کہ نفس کی مخالفت کی جاے۔ اور روح و عقل کو مدد پہونچائی جاے۔ غرضکہ نفس کی مخالفت بڑا مجاہدہ ہر۔ آپ فرماتے ہین کہ من طلب وجد اور من وجد طلب مین جو اختلاف ہر وہ محض ظاہر معنون مین ہر حقیقت مین کوئی اختلاف نہین۔ اس لیے کہ مقصود مشاہدہ ہر جو ایک عطاے ربانی ہر۔ اگر مجاہدہ سے حاصل ہوا تو کہنا چاہیے کہ توفیق الٰہی نے مجاہدہ کی راہ بتائی۔ اور اگر بغیر مجاہدہ کے حاصل ہوا تو یہ کہنا چاہیے کہ توفیق الٰہی اسی کے مجاہدہ مین ڈالے گی۔ لیکن یاد رہے کہ مجاہدہ مین مجاہدہ کی رویت آفت ہر مجاہدہ کے نفی کرنیوالون نے عین مجاہدہ کے نفی مراد نہین لی۔ بلکہ رویت مجاہدہ کے نفی مراد لی ہر پس جہانتک ہوسکے اپنے فعل کو درمیان مین مت لاؤ۔ اور کسی طرح نفس کی پیروی نہ کرو۔ کیونکہ غرض نفس کی وصفون کا فنا کرنا ہر نہ کہ عین نفس کا اور اسی کو حقیقی فنا کہتے ہین ورنہ تمھارا وجود حجاب مین ہو جاے گا۔ ع وجودک ذنب لا یقاس بہا ذنب۔

فنا و بقا کے لغت مین اور معنی ہین اور حال کی زبان مین اور معنی ہین۔ حال کی زبان مین بقا و فنا سے یہ مراد ہر کہ جب جہل فانی ہر تو ضرور علم باقی ہوگا۔ جب گناہ فانی ہوتے ہین تو طاعت باقی رہنے والی ہر۔

ان الحسنات یذھبن السیئات۔ اسی طرح جب بندہ علم و طاعت سے حاصل کرتا ہے او غفلت سے فانی ہوتا ہے تو دوسری بقاسے باقی ہوتا ہے اور یہ دوسری بقا بُری صفتوں کو دور کرنے اور نیک صفتوں کے قیام کرنے مین ہوتی ہے۔ لیکن اہل طریقت فنا و بقا کی اصطلاحون کو اہل ولایت کے کمال کے درجہ کے سوا اور کسی مین استعمال نہین کرتے۔ جو لوگ مجاہدون کے رنج سے آزاد۔ مقامون کی قید اور احوال کے تغیر سے فارغ اور طلب مقصود مین رسیدہ۔ قابل دید چیزون کو دیکھے اور قابل سمع چیزون کو سُنے ہوے اور دل کے جاننے کے لائق تمام باتون کو جانے ہوے۔ بھیدکے سب بھیدون کو پاے ہوے ہین اُنھون نے اپنے بھیدون کے پانے مین اپنی نعمت مین خود بینی کی آفت کو دیکھا۔ اور سب سے منھ موڑلیا۔ مراد مین اُن کا ارادہ فانی ہوا۔ رسیدہ ہونے کی وجہ سے دعوی کو ترک کردیا۔ عین مراد مین مراد سے بے مراد ہوے کل سے اپنی مشرب کو الگ کرکے دنیا دی اشیا سے دل کو ہٹالیا۔ بس جب بظاہر بندہ وجود صفات کی حالت مین عادات صفات سے فانی ہوگیا تو مراد کی فنا مین مراد کی بقا سے باقی ہوا اس لیے قرب و بعد۔ وحشت و محبت۔ صحو و سکر۔ فراق و وصل۔ طمس و اصطلام۔ اسم و عمل۔ نقوش و رقوم کی قید سے آزاد ہوگیا۔ بعض لوگون کا یہ خیال ہے کہ کسی شے سے فنا اس چیز سے محجوب ہونے کے سوا درست نہین ہوتی۔ مگر یہ غلط خیال ہے۔ ایسا نہین ہے کہ کوئی شخص کسی چیز کو اگر دوست رکھتا ہے تو کہا جاے کہ وہ اُس سے باقی ہے۔ یا اگر اُسے دشمن رکھتا ہے تو کہا جاے کہ وہ اُس سے فانی ہے اس لیے کہ یہ دونون صفتین طالب کی ہین اور فنا مین نہ محبت ہوا اور نہ عداوت اور بقا نہ جمع کی رویت ہے نہ تفرقہ کی۔ نہ فنا کے معنی ذات مین گم ہوتے اور وجود کے نیست ہونے کے ہین اور نہ بقا کے معنی بقاے الٰہی کے بندہ سے ملنے کے ہین اس لیے کہ کلیت کی فنا نہین ہوسکتی اور نہ کسی سرشت کے اجزا کا فنا ہونا اور اُنکا بالکل منقطع ہونا جائز سمجھا گیا ہے بندہ کے لیے فنا صرف خدا کے جلال کے دیکھنے اور دل پر اُس کی عظمت کے کشف ہونے سے مترتب ہوتی ہے اس کے جلال کے غلبہ مین دین و عاقبت فراموش ہوجاتا ہے اور اُسکی بزرگی کے سامنے احوال و مقام حقیر نظر آنے لگتے ہین۔ اس حال مین فانی ہوتا ہے اور اس فنا کے میدان مین بندہ زبان حق سے ناطق اور تن عاجزی و فروتنی کرنیوالا ہوتا ہے ؎

نفی فنائی فنافنائی | دفی فنائی وجدت انت
محوت اسمی و رسم جسمی | سئلت عنی فقلت انت

حضور و غیبت کے معاملہ میں آپ فرماتے ہیں کہ حضور سے مراد حضور دل بہ دلالت یقینی ہے تاکہ غیبی حکم اس کے لیے عینی حکم کی طرح ہو اور غیبت سے مراد ماسوائے دل کا غائب ہونا ہے اس حد تک کہ اپنے سے بھی اور غیبت سے بھی غائب ہو۔ جو اپنے سے غائب ہوا وہ حق کی درگاہ میں حاضر ہوا اور جو اپنے سے حاضر ہوا وہ حق کی درگاہ سے غائب ہوا لیکن جب جذبۂ الٰہی طالب کے دل کو مقہور کر دیتا ہے تو غیبت حضور ہو جاتی ہے اور منافات باقی نہیں رہتی۔ ابن عطاؒ حسینؒ بن منصور ابوبکر شبلیؒ ابو حمزہ بغدادیؒ اور سمنونؒ غیبت کو حضور پر تقدم دیتے ہیں اور حارث محاسبیؒ جنیدؒ سہل تستریؒ ابو حفص حدادؒ ابو حمدون قصار۔ ابو محمد حریریؒ حصریؒ اور محمد بن خفیف حضور کو غیبت پر مقدم سمجھتے ہیں۔

جمع و تفرقہ کی تعریف میں آپ بیان کرتے ہیں کہ الجمع ما جمع باوصافہ والتفرقۃ ما فرق بافعالہ یعنی ارادہ کا قطع کرنا اور خدائے تعالیٰ کے ارادہ کے ثبوت میں لوگوں کے تصرف کو ترک کرنا ہے۔ مگر ان الفاظ کے استعمال میں لوگوں نے مختلف راہیں اختیار کی ہیں۔ ایک جماعت کہتی ہے کہ اُس کا تعلق توحید سے ہے۔ اور اُس کا ایک درجہ خدائے بزرگ و برتر کی صفات سے متعلق ہے اور دوسرا بندہ کی صفات سے اول الذکر میں بندہ کا کسب منقطع ہے۔ یعنی حق تعالیٰ کی صفتیں قدیم ہیں اور ؟ ہے مخصوص ہیں۔ ایک دوسرا گروہ ہے جو علم سے متعلق کرتا ہے اور کہتا ہے کہ الجمع علم التوحید والتفرقۃ علم الاحکام۔ مگر اہل تصوف مونا لفظ تفرقہ سے مراد مکاسب اور لفظ جمع سے مراد مواہب لیتے ہیں۔ حق تعالیٰ کی خصوصیت بندہ کے لیے جمع ہوتی ہے اور بندہ کی عبودیت حق تعالیٰ کے لیے تفرقہ کہلاتی ہے۔ لیکن جمع دو طرح پر ہے ایک جمع سالم دوسری جمع تکسیر جمع سالم یہ ہے کہ جو حق تعالیٰ غلبہ حال۔ قوت وجد اور قلق شوق میں ظاہر کرتا ہے اور خود بندہ کی حفاظت کرتا ہے اور اس کے ظاہر حال پر اپنا فرمان جاری فرماتا ہے اور نگاہ رکھتا ہے کہ بندہ اسے ادا کرے اور جمع تکسیر یہ ہے کہ بندہ ہونے کی حیثیت سے بیہوش مجنونوں کی طرح۔ یعنی معذور ہو۔ لان التفرقۃ فصل والجمع وصل۔ بعض لوگ کلام کو مشکل اور دقیق بنانے کے لیے جمع الجمع کا لفظ بھی استعمال کرتے ہیں حضرت شیخ علی الہجویریؒ فرماتے ہیں کہ بہتر یہ ہے کہ تو جمع الجمع نہ کہہ جب جمع ایک مرتبہ تفرقہ سے جمع ہوئی اور پھر اپنے احوال سے تجاوز نہیں کرتی تو پھر جمع الجمع کیسے ہو سکتی ہے۔ آپ فرماتے ہیں کہ یہ لفظ ہمت کے محل میں استعمال ہوا ہے اس لیے کہ جو جمع کے محل میں ہو اُسکو اپنے سے اوپر نیچے اور باہر دیدار نہیں ہوتا۔ چنانچہ جب معراج میں حضور سرور کائنات صلعم کو دونوں جہان دکھائے گئے تو آ۔ پنے

کسی کی طرف توجہ نہ فرمائی کیونکہ آپ حضور خدا میں جمع تھے اور جو جمع کے محل میں ہو وہ تفرقہ کو نہیں دیکھتا
۔ مازاغ البصر وماطغیٰ

آپ فرماتے ہیں کہ معرفت دو طرح پر ہے ایک علمی اور دوسری حالی۔ علمی معرفت دنیا و آخرت کی سب نیکیوں کی بنیاد ہے معرفت اس کی صفات ہے اور با سواے اقرارات کرتا ہے علما و فقہا کہتے ہیں کہ خداے بزرگ و برتر کی معرفت سے مراد صحت علم ہے اور مشائخ الفت فرماتے ہیں کہ حق تعالیٰ کی معرفت صحت احوال ہے اور یہ معرفت علمی معرفت سے زیادہ افضل ہے اس لیے کہ حال کی صحت بدون علم کی صحت کے نہیں ہو سکتی ہے جب علم کی صحت حاصل ہو جائے یعنی جسے ذات باری تعالیٰ کا علم نہ ہو وہ عارف بھی نہیں ہو سکتا مگر عالم ایسا ہو سکتا ہے جو عارف نہ ہو بعض معتزلہ کے نزدیک خداے بزرگ و برتر کی معرفت صرف عقل سے ممکن ہے مگر اہل سنت والجماعت کے نزدیک عقل کی صحت اور نشانی کا دیکھنا معرفت کا ذریعہ ہے نہ کہ علت۔ اور علت محض خداوند تعالیٰ کا ارادہ ہے اسی لیے حضرت سیدنا علی مرتضیٰ کرم اللہ وجہہ سے جب لوگوں نے معرفت کی نسبت دریافت کیا تو آپ نے فرمایا عرفت اللہ باللہ وعرفت مادون اللہ بنور اللہ جب خداوند جل مجدہ نے بندہ کو اپنی معرفت سے واقف فرمایا تو اس نے پہچانا مگر اس شناخت کے ذریعہ سے نہیں جو سبب سے حاصل ہوتی ہے بلکہ اس کے ذریعہ سے جس میں بندہ کا وجود عاریت کے طور پر ہوتا ہے آپ فرماتے ہیں کہ تمام سے معرفت ممکن نہیں اس میں بندہ کا یقین کبھی زیادہ ہوتا ہے اور کبھی کم لیکن اصل معرفت میں کمی بیشی نہیں ہوتی اس لیے معرفت کی زیادتی بھی نقصان میں داخل ہے۔ آپ فرماتے ہیں کہ خداوند تعالیٰ کی شناخت پر تقلید کرنی نہیں چاہیے۔ اور اس کو اس کے کمال کی صفتوں سے جاننا چاہیے۔ معرفت کے لیے سبب کا ثبوت معرفت میں کفر ہے اور ماسوا کی طرف توجہ کرنا شرک ہے۔ داخل ہے من التفت الی الاغیار فمعرفته اثبات اللہ جل تعالیٰ جس طرح چاہتا ہے بندہ کو اپنی طرف راستہ دکھاتا ہے اور در معرفت اس پر وا کرتا ہے حتیٰ کہ معرفت میں اس درجہ تک بندہ پہنچ جاتا ہے کہ عین معرفت اس کو غیر دکھائی دیتی ہے اور معرفت کی صفت اس کے لیے آفت ہو جاتی ہے۔

حضرت ذوالنون مصریؒ فرماتے ہیں ایاک ان تکون بالمعرفة مدعیا۔ معرفت کی حقیقت صرف خداے بزرگ و برتر کو تمام اشیا میں متصرف ماننا اور جاننا ہے

آپ فرماتے ہیں کہ توحید تین قسم کی ہے ایک تو خدا کی توحید ہے خدا کے لیے اور یہ ایک یگانگی ہے

اس کا علم ہے۔ دوسری خدا کی توحید مخلوق کے لیے ہے اور یہ بندہ کے لیے توحید پر خدا کا حکم ہے اور بندہ کے دل میں توحید کا پیدا ہونا اور تیسری لوگوں کی توحید خدا کے لیے ہے اور یہ لوگوں کا علم ہے خدائے جل وعلی کی وحدانیت پر چونکہ توحید کسی شے کی وحدانیت پر حکم کا نام ہے اور علم کے سوا کوئی حکم نہیں لگایا جاسکتا۔ اس لیے اہل سنت والجماعت نے تحقیق کی رو سے خدائے جل وعلی کی وحدانیت پر یقین کیا ہے جو کوئی توحید کو بندہ کا فعل کہتا ہے تو چونکہ بندہ کا فعل خدا کے کشف کے واسطے علت نہیں ہو سکتا بلکہ ایک طرح کا حجاب ہوتا ہے۔ اور بندہ اپنی صفات کے لحاظ سے غیر ہوتا ہے۔ اس لیے اگر وہ اپنی صفت کو حق جانیگا تو صفت کے ساتھ موصوف کو بھی حق جاننا پڑے گا۔ اس وقت موحد توحید اور واحد تینوں ایک دوسرے کے وجود کی علت ہو جائیں گے جو نصاریٰ کے ثالث ثلاثہ کے مشابہ ہوگا جو باطل محض ہے اس لیے کہ جب تک کوئی صفت طالب کے لیے اپنی فنا سے توحید کو مانع ہوتی ہے۔ اس وقت تک وہ محجوب رہتا ہے اور جب تک محجوب ہے موحد نہیں ہوتا ہے۔ الا کل شیء ما خلا اللہ باطل حقیقت یہ ہے کہ خدا کی توحید بندہ کے اسرار میں سے ایک سر ہے اور عبارت میں ظاہر نہیں ہوتی عبارت اور عبارت بنانے والا غیر ہوتا ہے اور توحید میں ثبوت غیر ثبوت ماسوا کہلایا جاتا ہے۔

آپ فرماتے ہیں کہ اہل تصوف میں سے بعض کہتے ہیں کہ قول و تصدیق و عمل ایمان ہے ان لوگوں میں حضرت فضیل بن عیاض بشر حافی۔ خیر نساج۔ سمنون محب۔ ابو حمزہ بغدادی اور محمد جریری وغیرہ رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین۔ بعض لوگ جن کی جماعت زیادہ بڑی ہے کہتے ہیں کہ ایمان سے مراد صرف قول اور تصدیق ہے۔ ان میں حضرت ابراہیم ادہم۔ ذوالنون مصری۔ بایزید بسطامی۔ سلیمان دارانی۔ حارث محاسبی جنید بغدادی۔ سہیل بن عبد اللہ تستری۔ شقیق بلخی۔ حاتم اصم۔ اور محمد بن فضیل بلخی ہیں۔ رحمۃ اللہ علیہم اجمعین۔

ایمان کی اصل تصدیق قلبی ہے اور اسکی فرع امر الٰہی کی رعایت کرنی ہے۔ ایمان میں جبر و قدر کو دخل نہیں اس لیے کہ طریق توحید اسوا جبر و فوق القدرۃ و لا امر بین الامرین۔ ایمان کی حقیقت نگاہداری توکل ہے۔ وعلی اللہ فتوکلوا ان کنتم مومنین۔

آپ فرماتے ہیں کہ طہارت کی دو قسمیں ہیں۔ ایک ظاہری۔ اور دوسری باطنی جس طرح بدن کی پاکیزگی اگر نہ ہو تو نماز درست نہیں ہوتی اسی طرح اگر دل کی پاکیزگی نہ ہو تو معرفت درست نہیں ہوتی۔ طہارت ظاہری یعنی بدن کی طہارت پانی سے ہوتی ہے۔ اور دل کی طہارت توحید سے ہوتی ہے۔ جو طہارت ظاہری پر

مداومت کرتا ہی فرشتے اُسے دوست رکھتے ہین اور جو طہارت باطنی یعنی باطن مین توحید پر قیام کرتا ہی، خداے تعالیٰ اُسے دوست رکھتا ہی پس لازم ہی کہ ظاہری اور باطنی دونون طہارتون مین موافقت رہے۔ یعنی وضو کے بیٹھے ہاتھ دھوئے تو دل کو دنیا کی دوستی کو دھو ڈالے جب پانی سے دہن صاف کرے تو لازم ہی کہ دہن کو غیر کے ذکر سے خالی رکھے اور جب نتھنون مین پانی ڈالے تو شہوتون کو اپنے اوپر حرام کرلے۔ اور جب منھ دھوئے تو لازم ہی کہ تمام ماسوا مالوف سے منھ پھیر کر خدای بزرگ برتر کی طرف منھ کرے۔ اور جب ہاتھ دھوئے تو تمام نصیبون سے کنارہ کرلے اور سر پر مسح کرے تو اپنا امر کو خداے جل وعلیٰ کے سپرد کردے اور جب پانون دھولے تو حکم الٰہی کی موافقت کی نیت کرے جب یہ کرے گا تو ظاہر و باطن دونون کی پاکیزگیان اُسے حاصل ہو جاینگی۔

حدیث شریف مین ہی کہ الندم توبۃ یعنی پشیمانی توبہ ہی اس قول مین توبہ کی سب شرطین موجود مین جب طالب [illegible] ندامت ہوتی ہی اور وہ [illegible] غم ہوتا ہی نفس کو ذلت ہوتی ہی اور اعادہ گناہ سے احتراز ہوتا ہی۔ توبہ کے متعلق مشائخ کے اقوال مختلف ہین حضرت سہل بن عبداللہ تستری فرماتے ہین التوبۃ ان لاتنسیٰ ذنبک اور حضرت جنید فرماتے ہین کہ التوبۃ ان تنسیٰ ذنبک اول الذکر مین دوام پشیمانی مقصود ہی اور آخرالذکر کا مطلب یہ ہی کہ توبہ کرنیوالا محب ہوتا ہی اور محب کے لیے مشاہدہ ونسیحت سے اور مشاہدہ مین گناہ کا ذکر جفا ہی [illegible] اہل تصوف کے نزدیک توبہ تین طرح پر ہوتی ہے۔ ایک خطا سے صواب پر اَلَّذِیْنَ اِذَا فَعَلُوْا فَاحِشَۃً اَوْ ظَلَمُوْا اَنْفُسَہُمْ ذَکَرُوا اللّٰہَ فَاسْتَغْفَرُوْا لِذُنُوْبِہِمْ دوسرا صواب سے صواب تر کی طرف۔ جیسے حضرت موسیٰ علیہ السلام نے کہا تُبْتُ اِلَیْکَ تیسرا اپنی خودی سے حق تعالیٰ کی طرف جیسے حضرت سرور کائنات صلعم فرماتے ہین انی لاستغفر اللہ فی کل یوم سبعین مرۃ

آپ فرماتے ہین کہ نماز مین داخل ہونے کے واسطے حسب ذیل شرطین چاہیئین:-

(۱) ظاہری پلیدی سے صفائی اور نجاست باطنی یعنی شہوات سے پاکی

(۲) کپڑے کی پاکی ظاہری یہ کہ اسمین نجاست لگی نہ ہو اور باطنی یہ ہی کہ حلال کا ہو۔

(۳) جگہ کا پاک ہونا۔ ظاہر مین حادثون اور آفتون سے اور باطن مین فساد و گناہ سے۔

(۴) قبلہ رخ منھ کرنا۔ ظاہر مین کعبہ کی طرف منھ کرنا اور باطن مین عرش اور بنگرش کا مشاہدہ کرنا۔

(۵) قیام ظاہر [illegible] قدرت کے حال میں اور باطن [illegible] قرب میں پہلا شریعت ہے دوسرا حقیقت۔

(۶) خلوص نیت اور توبہ۔

(۷) ہیبت و فنا کے [illegible] تکبیر کہنا [illegible] قیام کرنا ترتیل و عظمت سے قرآن پڑھنا۔ دل کی عاجزی سے رکوع [illegible] اجتماع کے موافق تشہد کہنا اور فنا کی صفت سے سلام کہنا۔ کان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یصلی وفی جوفہ ازیز کازیز المرجل

آپ فرماتے ہیں کہ [illegible] کسی چیز کے لیے آلہ نہیں ہوتا حضور کی علامت میں [illegible] اور غیبت سے [illegible]

آپ فرماتے ہیں کہ روزہ کی حقیقت [illegible] پیٹ کو اکل و شرب سے بچانا آنکھ کو شہوت کی نظر سے بچانا۔ کان کو غیبت کے سننے سے [illegible] زبان کو بیہودہ گفتگو سے تن کو دنیا کی پیروی اور شرع کی مخالفت سے بچانا ہے۔ اذا صمت فلیصم سمعک وبصرک ولسانک [illegible] یدک وکل عضو منک

آپ فرماتے ہیں [illegible] رسول اللہ صلعم [illegible] نے عرض کیا کہ اوصینی یا رسول اللہ آپ نے فرمایا احبس حواسک الخمس یعنی پانچ حواس کو خدا کی محبت میں مقید کر۔ حواس کو بند کرنا چاہیے [illegible] علم کا [illegible] پانچ دروازوں سے ہوتا ہے یعنی سامعہ باصرہ ذائقہ شامہ لامسہ [illegible] محل تمام اعضا میں ہے اس کے لیے ایک ایک محل مخصوص [illegible] دروازوں میں سے جو شے مخالف شریعت و فرمان الٰہی داخل ہونا چاہے اسے [illegible] کم من صائم لیس لہ من صومہ الا الجوع والعطش

آپ فرماتے ہیں کہ حج کے [illegible] احرام باندھے عرفات میں قیام کرے۔ اور زیارت کے وقت طواف کرے۔ [illegible] حضرت ابراہیم علیہ السلام کے دو مقام ہیں ایک تن کا اور ایک دل کا تن کا مقام [illegible] اور دل کا مقام خلت۔ لوگ عموماً تن کا ارادہ کرتے ہیں لیکن جو کوئی دل کے مقام کا ارادہ کرتا ہے وہ اشیا، مال و نعمت، [illegible] لذت کو ترک۔ ذکر غیر سے انحراف دنیا سے اعراض کرنے والا ہوتا ہے پھر معرفت کے عرفات میں قیام کر کے الفت کے مزدلفہ کا ارادہ کرتا ہے وہاں سے اپنے

بھید کو حرم الٰہی کے طواف کے لیے بھیجتا ہے حرص و اندیشہ ہاے فاسد کے کنکریوں کو منا میں پھینکتا اور نفس کو مجاہدہ کے مقام میں قربان کرتا ہے اس لیے مقام خلت میں پہنچکر طبیعت کے اندیشہ سے اسی طرح امان پاتا ہے جسطرح حرم کعبہ میں دشمن شمشیر دشمن سے امان پاتا ہے۔

آپ فرماتے ہیں کہ حج دو طرح پر ہوتا ہے ایک غیبت میں اور ایک حضور میں جو کہ میں ہوتا ہے وہ غیبت میں ہوتا ہے اور جو مشاہدہ میں ہوتا ہے وہ حضور میں ہوتا ہے حج کا مقصود گھر کا دیدار نہیں ہوتا بلکہ مشاہدہ حق ہوتا ہے۔ اور مشاہدہ حق یا قدرت حق وہ شے ہے جسے ہم دل کی زندگانی دیجسے معرفت کے نام سے بھی موسوم کیا جائے تو زیبا ہے نہیں۔

آپ فرماتے ہیں کہ مشاہدہ کی حقیقت دو طرح پر ہے۔ ایک یقین کی صحت کے ساتھ اور دوسرے غلبہ محبت سے جب دوست کی محبت کا غلبہ اس حد تک پہنچ جاتا ہے کہ محبت کی کلیت سب حدیث محبوب ہو جاتی ہے تو دوست کے سوا اسے کچھ نظر نہیں آتا۔ حضرت محمد بن واسع فرماتے ہیں ما رأیت شیئاً قط الا ورأیت اللہ فیہ ای بصحۃ الیقین۔ اور حضرت شیخ شبلی فرماتے ہیں ما رأیت شیئاً قط الا اللہ۔ یعنی بغلبات الحب وغلیان المشاہدۃ صحت یقین سے پہچاننے والا غیر کو بیگانہ نہیں دیتا اور محبت رکھنے والا غیر پر نظر نہیں ڈالتا۔ حضرت ابن عباس رض سے روایت ہے کہ معراج کی رات آنحضرت صلعم نے خدا کو دیکھا اور حضرت عائشہ صدیقہ رض سے روایت ہے کہ نہیں دیکھا۔ لوگ اس اختلاف میں پڑ گئے مگر حقیقت یہ ہے کہ حضور صلعم نے ایک ہے جو یہ فرمایا کہ میں نے دیکھا تو آپ کی مراد یہ تھی کہ میں نے بھید کی آنکھ سے دیکھا حضرت ابن عباس اہل باطن سے تھے اُن سے آپ نے اس طرح سخن فرمایا اور حضرت ستنا عائشہ رض اہل ظاہر سے تھیں اُن سے آپ نے اہل باطن کی زبان میں کلام نہیں فرمایا۔ بھید کی آنکھ سے دیکھنے کے معنی حضرت جنید کی اس حکایت سے واضح ہونگے جنھوں نے ایک بار فرمایا کہ اگر خداوند تعالیٰ مجھ سے کہے کہ مجھے دیکھ تو میں کہوں گا کہ میں نہیں دیکھتا۔ اس لیے کہ آنکھ دوستی میں غیر اور بیگانہ ہوتی ہے اور غیریت کی غیرت مجھے دیدار سے باز رکھیگی اور بڑی بات یہ ہے کہ جبکہ دنیا میں اُسے آنکھ کے واسطے کے سوا دیکھا کرتا تھا تو عاقبت میں کیوں واسطہ بناؤں

وانی لاحسد ناظری علیک　　فاغض طرفی اذا نظرت الیک

مشاہدہ کی تعریف یہ بھی کی گئی ہے کہ المشاہدۃ تصور الجنان بحضور الجنان اس کی تفات زبان عاجز ہے کہ

واردات قلبی کو بیان کرسکے، سکوت مشاہدہ کی علامت ہے اور گویائی کسی چیز پر گواہی دینے کا نشان ہے اور اُن دونوں میں بڑا فرق ہے۔ لا احصی ثناءً علیک انت کما اثنیت علی نفسک سے اسی مشاہدہ کی حالت کا پتہ ملتا ہے یعنی حضور پُرنور صلعم کا منشا مبارک یہ ہوگا کہ زبان کو اس لائق میں نہیں دیکھتا کہ میرے حال کو بیان کرسکے اور بیان کو اس کا مستحق نہیں جانتا کہ میرے حال کو ظاہر کرے اس لیے تیرا کہا ہوا میرا کہا ہوا ہے اور تیری ثنا میری ثنا ہے۔

تمنیت من اہوی فلما رایتہ بُہت فلم املک لساناً ولا طرفاً

"عبداللہ"

علّامہ چانکیا کے اقوال

عالم

ایک شہنشاہ اولوالعزم اسقدر عزت کبھی حاصل نہیں کرسکتا جسقدر کہ ایک عالم متبحر کو حاصل ہوتی ہے کیونکہ شہنشاہ اولوالعزم کی عزت اسکی سلطنت میں ہوتی ہے اور عالم متبحر کی ہر جگہ ــــ !!

شریف لڑکا

جھاڑی ایک خوشبودار درخت سے معطر ہو جاتی ہے اسی طریقہ ایک شریف الطبع متدین لڑکے کے وجود سے اُس کے خاندان کی عزت میں چار چاند لگ جاتے ہیں ــــ !

شریر لڑکا

جسطرح ایک گھنا جنگل ایک چھوٹی سی چنگاری سے جل کر خاکستر ہو سکتا ہے۔ اسی طرح ایک بد طوار لڑکے کے وجود سے اُس کا خاندان تباہ ہو جاتا ہے ــــ !!!

بدمعاش آدمی

شریر آدمی سے ہمیشہ احتراز کرو خواہ وہ کیسا ہی عالم ہو اُس کی مثال بعینہٖ اس سانپ کی ہوگی جسکے سر میں ایک چمکتا ہوا من ہو ــــ !!!

لیکن کیا وہ اس حالت میں خطرناک نہیں ہے؟

(سید محمد احمد عثمانی (علیگ)

تنقید عالیہ

جواب ہاتف

از مولوی سید ابو محمد ثاقب کانپوری

رسالہ تحریک کے فروری نمبر میں جناب شبیر حسن خان صاحب جوش ملیح آبادی کی "جمہوری غزل" پر ہاتف صاحب کے چند اعتراض دیکھکر یہ تو کیونکر کہوں کہ مجھے ہنسی آئی، مگر اشک عبرت نے اس احساس سے ضرور منفعل کیا کہ کیا انسان اپنی محدود معلومات پر بھی تقاضاے انسانیت کسی دوسری ہستی پر الزام دینے کا ارتکاب کرسکتا ہے، عام اس سے کہ خود اس کی رسائی ذہن اُس کے گرد قدم تک کی دسترس نہ رکھتی ہو۔

ایک یورپین فلاسفر کا قول ہے کہ تنقید جہاں مقابل کی لغزشوں اور اغلاط کی پردہ در ہے وہیں خود صاحب نقد کی حقیقت قابلیت کی بھی منکشف ہے، ہاتف صاحب نے حضرت جوش کے رشحاتِ طبیعت پر جو تنقید فرمائی ہے وہ قطع نظر اس کے کہ کوئی بالاصول تو ان میں سے کسی ایک کے زیر اثر ہو، افسوس ہے کہ ارباب فن کے نزدیک ان ضروریات سے بھی خالی ہے جو لوازم نقد میں، اس لیے کہ دنیا میں تنقید کرنے کا دستور یہ ہے کہ جہاں معایبِ فن معرض بحث میں آئیں وہیں محاسن خیال سے بھی خلق کو روشناس کیا جائے، اسی لیے ہاتف صاحب کا آئینِ تنقید نہ صرف ناواقفیت علوم و فنون کا مظہر ہے بلکہ اُس غیر معتدل رویہ کا بھی انکشاف کرتا ہے جو آپ نے نقائص فن یا محاسن خیال سے اعتراض کرتے ہوے محض اپنی فہم و ادراک کی لغزشوں کی بنا پر اختیار کیا ہے، ورنہ سچ یہ ہے کہ حضرت جوش کا ذوق شاعری جس اسکول کا درس آموختہ ہے وہاں ہاتف صاحب کا مدرسہ ابجد خوان ہونا بھی شاید خلاف واقعہ ہو، یہی وجہ ہے کہ حضرت جوش کے طبعی مد و جزر اور رشحات فکر کو ہاتف صاحب نے جس تاریک عینک سے دیکھا ہے وہ درحقیقت اُن کی نگاہ سے اسی قدر اوجھل رہنے کے حق دار ہیں۔

لیکن انصاف یہی کہتا ہے کہ ہاتف صاحب کو نہ صرف اردو زبان سے اتنا بعد ہے جتنا کہ اُن کے

لہ اس نئی ترکیب کے مالک اور ذمہ دار خود ہاتف صاحب ہیں۔

نزدیک اہل پنجاب کو، بلکہ آپ کی شعر فہمی بھی اسی قدر قابل بحث ہے؛ ورنہ کوئی وجہ نہ تھی کہ ذیل کے اشعار کو بے معنی ثابت کرنے میں ہاتف صاحب اس بیدردی دل فہمی سے کام لیکر سخن سنج و سخن فہم جماعت میں قابل الزام ٹھہرتے۔

مجھے افسوس ہے کہ جب ہاتف صاحب کی مبادرت ذہنی اُن اشعار کے معانی و مطالب سے ناآشنا تھی تو انھوں نے یہ کیونکر جان لیا کہ یہ اشعار درحقیقت صحت معانی کے لحاظ سے اہل نظر کی نگاہ میں خالی از حسن ہیں

نکال لیتے ہیں ظالم دلوں کو سینوں سے
خدا بچائے نہ پھر بھی مجھے حسینوں سے

اس مسئلہ کے متعلق آپ تحریر فرماتے ہیں۔

"دل لینا، دل چرانا سب کہتے آئے ہیں لیکن دل کو سینے سے نکال لینا شاید کسی نے نہیں کہا، گویا معشوق نہ ہوا کوئی ڈاکٹر یا جرّاح ہوگیا"

اس تنقید کو دیکھنے کے بعد ہر شخص کو ہاتف صاحب کی وسعت نظر کا قایل ہونا پڑے گا، یعنی اس کا اعتراف کرنا ہوگا کہ حقیقت میں "دل نکال لینا" کسی نے نہیں لکھا، مگر قسمتی سے دیوان داغ و سفینۂ عشق ملک میں اسقدر رائج ہوگئے ہیں کہ ہر اُردو پڑھا لکھا شخص جسے ذرا سا بھی ذوق ہو انھیں اپنے مطالعہ میں رکھتا ہے اور جب وہ "سفینۂ عشق" کی ورق گردانی کرتا ہے تو اُسے سیکڑوں جگہ غزل میں بھی "دل نکال لینا" مِلتا ہے، جس کے بعد ہاتف صاحب کی وسعت نظری قطعاً مشکوک ہوجاتی ہے۔

حضرت رئیس اکبرآبادی مرحوم جو اپنے وقت کے ایک باکمال استاد گذرے ہیں تحریر فرماتے ہیں سہ

"سینے سے لے گئی وہ نظر دل نکال کے"

حضرت امیر مینائی مرحوم

"بیدرد لے چلا ہے کلیجہ نکال کے"

حضرت بیدل کا واضح شعر ہے سہ

ستمگارا دل نکالا عاشق ناشاد کا
او ستم ایجاد کیا کہنا ہے اس ایجاد کا

اسی مطلع کے متعلق آپ پھر لکھتے ہیں۔

"اول مصرعہ کا آدھا حصہ 'یعنی نکال لیتے ہیں ظالم' پہلو سے ذم پیدا کرتا ہے"

معلوم نہیں ہاتف صاحب شعر کی تنقید کرتے ہیں یا اپنے مذاقِ باطنی و حال کی شکوہ سنجی اس لیے کہ کسی علم دوست کی جودتِ ذہن اس مذموم پہلو کے سمجھانے سے قطعاً معذور ہے۔

اس کے بعد ہاتف صاحب نے وہ بے ربط اور حیا سوز فقرے لکھے ہیں جن کے اعادے سے بھی قلم کو شرم آتی ہے اس لیے انھیں ترک کیا جاتا ہے۔

حسین جو ملتا ہے تا دیر دیکھتا ہے مجھے
لگاؤ دل کو ہے دنیا کے مہ جبینوں سے

اس شعر کے متعلق ہاتف صاحب کو بڑی سے بڑی شکایت یہ ہے کہ پہلے مصرعہ کو دوسرے مصرعہ سے کوئی تعلق نہیں، لیکن افسوس یہی بے تعلقی ہاتف صاحب کی بے تعلقیٔ فن اور شعر فہمی کا ثبوت ہے اس لیے کہ اربابِ فن کے نزدیک مصرعوں میں ارتباط اسی قدر کافی ہے کہ قائل کا مقصود حاصل یا وہ دعویٰ جو پہلے مصرع میں کیا گیا ہو ثابت ہو جائے، اور اس پر پہلے کی کسی نہ کسی صنف کا اطلاق ہو سکے یہ بات ان دونوں مصرعوں میں موجود ہے۔

چنانچہ ہر سامع کا ذہن اس کا مطلب سمجھنے سے قاصر نہیں، معمولی سی معمولی عقل کا آدمی بھی یہ جان سکتا ہے کہ صاحبِ شعر اس کا مدعی ہے کہ جو حسین جہاں کہیں مجھے ملتا ہے دیر تک دیکھتا رہتا ہے اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ میرے دل کو دنیا کے حسینوں سے کچھ لگاؤ ہے۔

اب رہی یہ بات کہ دیر تک دیکھتے رہنے کی وجہ ہاتف صاحب کے نزدیک کسی عجیب الخلقتی کی بنا پر ہے اس کے متعلق سوا اس کے اور کیا کہا جا سکتا ہے کہ ہاتف صاحب جوش کے آئینۂ خیال میں اپنے آپ کو دیکھنا چاہتے ہیں، ورنہ اصل یہ ہے کہ یہی طرزِ بیان شاعر کی انتہائے ندرتِ خیال پر دلالت کرتا ہے۔ جس نے کمالِ عشق کے ساتھ انتہائے جاذبیتِ حسن کا دعویٰ کیا ہے جو شاعر کو آئے دن حسینوں کی محبت بھری نظروں کے التفات سے تجربۃً حاصل ہوتا رہتا ہے، یعنی ہر حسن اسے دیکھ کر یہ محسوس کر لیتا ہے کہ اس کے دل میں وہی عاشقانہ کیفیت ہے جو حسن کی مایۂ ناز ہے۔

حریم ناز سے صادر ہوا ہے حکم نیاز — دیارِ حسن کو روشن کرو جبینوں سے

ہاتف صاحب کا اس شعر کے متعلق یہ کہنا کہ "یہ لفظی رعایتوں اور لفاظی کا گورکھ دھندا ہی جو شاید ناسخ و آتش کی روح کو ایصالِ ثواب کرنے کے لیے کہا گیا ہی" قطعاً ہاتف صاحب کی جسارت ہی مگر اسمین شک نہین کہ حضرت جوش نے جس لطفِ شعریت سے اربابِ ذوق کو روشناس کرنا چاہا ہی وہ باوجود ان دلکش الفاظ کی رعنائی کے اتنا بے نقاب نہین ہوا جسے ہاتف صاحب کی آنکھ دیکھ سکے،

جوش کا مطلب یہ ہی کہ محبوب کی بارگاہ سے عشاق کے لیے یہ حکم ہوا ہی کہ میرے آستانے پر اتنی جبہ سائی کرو کہ سنگِ آستان خود یا سبین دشمن بنجائے"

کیا اس معنی کے اظہار کے لیے ہاتف صاحب ان الفاظ کے علاوہ اور الفاظ بتا سکتے ہین؟

کلیجہ تھام کے وہ دوریا دکرتا ہون
جو صحبتین کبھی رہتی تھین نازنینون سے

ہاتف صاحب فرماتے ہین۔

"کلیجہ تھامنے کی خوب کہی کیا بغیر کلیجہ تھامے یاد نہین کیا جا سکتا یہ تو ہاتھون پر ظلم ہی کہ بلا وجہ اُن سے کام لیا گیا، دوسرے مصرع مین لفظ کبھی بالکل حشو ہی جس نے پورا مصرع مہمل کر دیا۔ نازنینون سے صحبت رہنا عیاشانہ زندگی کا اچھا فوٹو ہی"

ہم چاہتے تھے کہ اس کے ثبوت کے لیے کوئی مثال نہ دیتے لیکن شاید ہاتف صاحب اسمین ہماری کوئی کمزوری سمجھین اس لیے داغ مرحوم کا صرف ایک شعر لکھا جاتا ہی،

کلیجہ تھام لوگے جب سنوگے
نہ سنو لے خدا شیون کسی کا

اسی طرح ہاتف صاحب نے حضرت جوش کے مقطع مین بھی اس غلط فہمی سے کام لیا ہی لیکن آنکی سوءِ تاویل کے مقابل کسی حسنِ توجیہ کا اظہار طوالت ہی، اس لیے مین اس پر اظہارِ خیال کے بجائے صرف اس قدر کہنا چاہتا ہون کہ

خموشی معنی دارد کہ در گفتن نمی آید

ثاقب (کانپوری)

سبدِ گل فروش

شعر سمجھنے سے جو لطف حاصل ہوتا ہے وہ ایک وجدانی کیفیت ہے، اُس کا بیان الفاظ مین نہین سما سکتا، معانی کی وسعت جانے دیجیے، زبان کی سلاست، وشستگی، ترکیبون کی جدت و دلپسندی، بندش کی چستی و خوبصورتی، اور بحرون کا ترنم ہی کیا کم ہے جو کیف انگیز نہ ہو، اور جب معانی کے وسیع میدان مین جولانی کی قدرت ہو، صنائع بدائع سے واقفیت ہو، مضامین کی بلندی اور نکتہ آفرینی تک دسترس ہو تو شعر اُس کے لیے ایک قیامت ہے،

شعر وسخن کا انتخاب اور انتقاد ایک مشکل کام ہے، اشعار حسب مذاق منتخب کیے جاتے ہین اور تنقید فن شعر کی رو سے، لیکن لطف شعر سے وہی دل آشنا ہو سکتا ہے جو درد مند ہے بلکہ اس طرح جیسا کہ نشتر اُس چیز مین چبھتا ہے جو لازم ہوتی ہے،

مجھ کو اپنی فقدان لیاقت کا اعتراف ہے اور اب بھی جو بیس سال کی عمر تک تو میرا مذاق باستعداد سلیم نہین ہوا ہے کہ کما حقہ، فہم فہمی کر سکون، تاہم جو شعر پسند آتا ہے اپنے ذہن مین محفوظ کر لیتا ہون۔ ابتک کوئی بیاض مرتب نہین کی اس لیے بعض مقبول بزرگ اُستادون نے جو اشعار یاد تھے قلمبند کر کے ناظرین الناظر کو "دعوت فہم" دیتا ہون تاکہ بقدر ذوق استفادہ و استلذاذ کرین۔

حضرت غالب کے قول کے مطابق تو مجھ کو اندیشہ کرنا چاہیے کہ انتخاب اشعار ایک قسم کی رسوائی ہے لیکن مجھ کو اطمینان ہے کہ مصرع

بزم مین اہل نظر بھی ہین تماشائی بھی

ولی احمد خان

سخت کافر تھا جس نے پہلے میر مذہب عشق اختیار کیا — میر

مرے دل مین ہے غالب شوق وصل و شکوہ ہجران — غالب — خدا وہ دن کرے جو اُس سے مین یہ بھی کہون وہ بھی

فقط اک دوستون سے تم بچے تھے — مومن — سو اب تم بھی نصیب دشمنان ہو

ہے اسکی سادگی بھی تو کس کس بھبن کے ساتھ — ذوق — سیدھی سی بات بھی ہے تو اک بانکپن کے ساتھ

عیش بھی اندوہ فزا ہو گیا — داغ — ہائے طبیعت تجھے کیا ہو گیا

فغان و آہ کی لذت جو دل ملے تو ملے — اکبر — نشان نکہت گل جب کلی کھلے تو ملے۔

گلشن سے کہیں بوئے دمساز نہیں آتی — اے مدرسے سناٹا آواز نہیں آتی

بیگانہ ہوئی دنیا رسم و رہ الفت سے — ثاقب — اک میری طبیعت ہے جو باز نہیں آتی

رکھ کے منھ سو گیا ان آتشیں رخساروں پہ — ہیں حنا دل کو تو نیند آ گئی انگاروں پر

تم نہ دیکھو کہ میرے چہرے پر — جوش — اک تبسم سی پائی باقی ہے

کٹ گئی احتیاط عشق میں عمر — حسرت موہانی — ہم سے اظہار مدعا نہ ہوا

ایمان شکن آنکھیں دل میں ہیں زباں میں ہیں — مضطر — تجھ سے نہیں کعبہ کے کعبہ میں ہے بتخانہ

یوں گفتگو کی شان ہویدا سکوت میں — جگر — ہر نگاہ میں اک داستان رہے

مقام عشق میں اے دل وہ رنگ پیدا کر — اکبر — فلک زمیں پہ رہے سب ترس دعا کے لیے

غنچۂ ناشگفتہ کو دور سے مت دکھا کہ یوں — غالب — بوسہ کو پوچھتا ہوں میں منہ سے مجھے بتا کہ یوں

شکوے میں ترس مدعی، شکر میں ترک مدعا — ذوق — سوچ رہا ہوں کہ حال دل یوں کہوں کہ یوں

ایک ہی بار رہو میں وجہ گرفتاریٔ دل — حسرت موہانی — التفات ان کی نگاہوں نے دوبارہ نہ کیا

تم مرے پاس ہوتے ہو گویا — مومن — جب کوئی دوسرا نہیں ہوتا

تم ہمارے کسی طرح نہ ہوئے — ورنہ دنیا میں کیا نہیں ہوتا

عمر خیام

از منزل رفتگان این راہ دراز — باز آمدہ کو کہ تا بپرسم ز راز

پرسیدہ این سراچہ از روی نیاز

چیزے بگذارید کہ نمی آئی باز

جامی

شاہ عربی قبلۂ ارباب نجات — کاینہ ذات احد و مرآت صفات

از پیروی اوست علوی درجات — لازال علیہ زاکیات الصلوات

غزلیات ومنظومات

غزل نعتیہ

(ہوش بلگرامی)

کیا جانے اُنھین زاہد جو ہم سے رہین باتین
محفل کی نہین ہوتین خلوت کی ملاقاتین

جب ایک ہوئے دو دل بیکار ہین سوغاتین
یہ رنگِ تکلف ہے اُٹھوا دو مداراتین

بُلبُل یہ نظر کرنا اِس پھولون کے پنجرے پر
خالی نہین مطلب سے ظالم کی مداراتین

آخر ہے شبِ ایمن ہُشیار رہو اے موسیٰ
ہر بار نہین آتین یہ نورفشان راتین

دیوارِ لحد خم ہے چھت شق ہے زمین بیٹھی
ٹوٹا ہوا یہ گھر ہے اور سر پہ ہین برساتین

اے ہجر کی بیتابی دن یاد ہین ایسے بھی
جب ایک ہی کروٹ سے ہوتی تھیں بسر راتین

کچھ پیاس سے سرور کی شرماتے نہین بادل
اے کرب و بلا تجھ مین ہوتی بھی ہین برساتین

دلجو ہے تو اے تیغ سے دیکھے مجھے ساقی
بے ہوشیون کی خاطر ہین ہوش مداراتین

غزل

زینت حُسن بڑھانیکو ستمگارون مین / دل کے آئینے لگائے گئے دیوارونمین
یون تو گل دیکھنے کو دیکھے ہین گلزارونمین / پر نہ دیکھا جو ہے رنگ آپ کے رخسارونمین
جب نکھرتے ہین بدل جاتا ہے رنگِ عالم / وہ جب آتے ہین بہار آتی ہے گلزارونمین
شب کو جب بزم مین تم اپنے نہ تھے ساقی / یہ تو پوچھو کسے ہوش تھا میخوارونمین
موت سے بڑھ گئے تشہیرِ اسیری کے ستم / میرا صیاد مجھے لے گیا بازارونمین
اُسکی رحمت نے دمِ حشر جو دیکھا مضطر / اک ہمین پوچھا ہم ایسے تھے گنہگارونمین
حسن کھاتا ہے تری اُٹھتی جوانی کی قسم / ناز کرتا ہوا رنگ آتا ہے رخسارونمین
نام پہلے تو لیا پھر یہ تجاہل سے کہا / وہ محبت ہین زمانہ کے وفادارونمین

سید واجد حسین محبت

غزل

کیا ہمکو سروکار غم و رنج و الم سے / نشہ کبھی گھٹتا نہین ساقی ترے دم سے
ہم دن کو کہین رات جو پوچھے کوئی ہم سے / مانوس ہین آنکھین جو سوادِ شبِ غم سے
ارمان ہے ہر آنکھ کو جلوہ ترا دیکھے / اسواسطے لوگ آتے ہین ہستی مین عدم سے
قبرون کے نشان کہتے ہین افسانۂ عبرت / یون باتین ہوا کرتی ہین یاران عدم سے
وہ ظلم کے شکوے پہ یہ کہدیتے ہین ہنسکر / زندہ ہو جو تم باز نہ آئین گے ستم سے
یون آنکھ ملی اُن کی ملا خاک مین دل بھی / انداز کرم بڑھ گئے انداز ستم سے
جائین گے قفس سے نہ رہا ہوکے چمن کو / راحت وہ ملی ہے ہمین صیاد کے دم سے
تم خود دلِ مضطر کو سنبھالو تو سنبھالو / ہم خاک سنبھالین یہ سنبھلتا نہین ہم سے
ویران تھا دل لے غمِ دلدار ہمارا / آباد ہوا گھر یہ مرے فیضِ قدم سے
دیدار بتان کی ہے جگر دل کو تمنا / تھانے ہمین پہنچا لے خدا کنج حرم سے

حکیم جگر صدیقی زمیندار سیوان

هَلْ جَزَآءُ الْاِحْسَانِ اِلَّا الْاِحْسَانُ

یہ کہنے لگا مجھ سے اک معتدی — جہان میں ہے نیکی کا بدلا بدی
کچھ احسان میں نے کیا جسکے ساتھ — دہی میرے پیچھے پڑا دھو کے ہاتھ
غرض جس سے امید نیکی رکھی — اُسی سے بُرائی کی لذت چکھی

تو میں نے کہا اُس سے ای خوشخصال — سراپا غلط ہے یہ تیرا خیال
ہر ممکن نہیں ہو یہ حالت ردی — کہ نیکی کے بدلے میں پائیں بدی
ہر قرآن میں صاف لکھا ہوا — کہ احسان ہی احسان کی ہر جزا

مگر جب کہ نیکی سے تیری غرض — تمنؑ ہو، یا اکتساب عوض
تو خود اک بدی ہے وہ نیکی تری — ذرا غور سے سُن یہ باتیں مری
پھر اس کے عوض میں بدی پاکے تو — نہیں حق بجانب جو ہو تُرش رو

مگر اِدعا تھا جو نیکی ہی کا — تو رکھتا خدا سے امید جزا
جو ہر خلق سے چشم احسان تجھے — مسلمان کہینگے مسلمان سے تجھے
مرے دوست! امید احسان زغیر — مدان کمتر از سجدۂ بُت بُدیر

جو بہر خدا آپ نے کی نہیں
وہ نیکی حقیقت میں نیکی نہیں

تمنا (عمادپوری)

خریداران الناظر کی خدمت مین ایک مفید مشورہ

یہ اعلان پھر درج نہوگا

علم طب مین ہزارہا کتب ایک سے ایک مفید درجہ تجربہ ہو چکی ہین لیکن طب نفیس جو طبیب صاحب جے تھاری کی تصنیف سے ہے اور جسکی تعریف بیسیون اخبارات و طبی رسائل کے علاوہ حکماء حاذقین علماء صالحین درویش کاملین اور ممتاز مشہور معروف اصحاب نیز منعم طبقہ اور صحت یاب مریضون نے فرمائی ہے بالکل صحیح ہے ذی علم مصنف نے وہ مجربات ظاہر فرمائے ہین جو اطباء بصیغہ راز محفوظ رکھکر سینہ مین مدفون اپنے ساتھ لے جاتے تھے میرے نزدیک شاید کسی دوسری کتاب کو علم طب مین ایسی مقبولیت و شہرت حاصل ہوئی ہو قدیم و جدید امراض کو دو دو ہفتہ مین کم و بیش صحت یابی ہو جاتی ہے نیز اشتہاری ادویہ سے بے پناہ کرنے والی نیم حکیم کے پنجہ سے بچانیوالی کاروباری اصحاب کو نفع عظیم پہنچانے والی ہے قیمت معہ محصولڈاک ایک روپیہ بارہ آنہ ہے (المعلن حاجی مولوی سید احمد علی قصبہ سمرن ضلع فرخ آباد) ذیل کا علاج درج ہے مطلق گئے گذرے یا یوسی کی خمی لاغری اعتدالی نیز گرمی ... امراض چند یوم مین علاج ہفتہ عشرہ مین صحت ... سال بھر صحت شافی ... قوت باہ کے عجیب و غریب طبیب تجربہ شدہ چٹکلے جریان احتلام سرعت دو ہفتہ مین کافور بواسیر خونی بادی سوزاک قدیم و جدید آتشک طحال ... چار پانچ سال مین صحت عمر بھر کو آرام پتھری بلا اپریشن چند گھنٹہ مین ذریعہ پیشاب خارج ذیابیطس سل فالج برص جذام ... علاج طاعون ہیضہ ضعف معدہ (مصنف سے ذیل کے پتہ پر ملیگی) سیلان الرحم یا یوسی اولاد خضاب و دیگر امراض کے تجربہ شدہ نسخے -

حکیم ڈاکٹر مولوی سید محمود الحسن طبیب سرکاری مصنف طب نفیس مقام تحصیل جے تھاری براہ گاڈروارا ریاست بھوپال

زندگی کی اہم ضروریات

حسن یوسف کے ذریعہ سے پوری ہوسکتی ہین -

۱ - جو شریف نوجوان عصمت و پاکیزگان کی خواہش بقدر رکھتے ہون
۲ - جن معزز والدین کو اپنی دختروں کیواسطے بلند پایہ پاکیزہ ...
۳ - جو صاحب اپنی زندگی مین کسی اہم انقلاب کے خواہشمند ہون
۴ - جو بیوائین اپنی معصومانہ زندگی بسر کرنا چاہتی ہون
۵ - جو لوگ امراض اور افلاس سے تنگ ہون
۶ - جو بلند ہمت اپنے خاندان کی دستگیری کرنا چاہتے ہون

وہ حسن یوسف ملاحظہ فرمائین

کیونکہ حسن یوسف ،، ہی ایک ایسی کتاب ہے جس مین علمی اور عملی طور پر تمام ضروریات و خواہشات کی کامیابی کے بہترین ذرائع بتلائے گئے ہین قیمت ایکروپیہ چھ آنہ - خریداران الناظر سے محصولڈاک فیس وی پی آور جلد ۹ معاف کیے جاتے ہین

حسن یوسف

علم و عمل کا بہترین اور زبردست انتخاب

لٹریری دلچسپی رکھنے والے اشخاص جو حسن کا ذخیرہ طبع فرمایا ... عمر بسر کرنیکے شائق نوجوان ترک موالات کے تحت مین بیکار ہو جانے والے ملازمت پیشہ مذہبی رنگ مین ڈوبے ہوئے بزرگ اگر آپ اپنے جذبات اور احساسات کے لحاظ سے کامیاب زندگی بسر کرنا چاہتے ہون تو ان کو حسن یوسف سے مستفید ہونا چاہیے جو القا کے رنگ مین ایک بہترین تصنیف ایک سچا رہنما ایک حقیقی ہمدرد مہیا کیا گیا ہے اور کتابی صورت مین لاکر قیمت اسکی صرف ایک روپیہ چھ آنہ رکھی گئی ہے محصولڈاک وغیرہ خریداران الناظر کے واسطے معاف کیا جاتا ہے -

خریداران طب نفیس کی تحریک پر یہ کتاب طبع ہوئی ہے جنکی فرمائشات کا سلسلہ نہایت کثرت سے جاری ہے بضرورت تجھین جلد طلب فرمائین -

ملنے کا پتہ - سید محمود الحسن طبیب سرکاری ڈاکخانہ جے تھاری گورنمنٹ بھوپال

امیر مینائی مرحوم

- صنم خانۂ عشق
- مراۃ الغیب
- خیابانِ آفرینش
- محامد خاتم النبیین
- مینائے سخن

منشی سجاد حسین مرحوم

- حمق الذین ۸/
- حاجی بغلول ۸/
- [illegible] ۶/
- پیاری دنیا ۸/
- [illegible] ۸/
- طلسمی فانوس

پنڈت رتن ناتھ سرشار

- فسانۂ آزاد ۴ جلد
- کہسار
- خدائی فوجدار
- شمس سرشار
- [illegible] لیلۃ القدر ناول
- [illegible]

منشی جوالا پرشاد برق

- [illegible] ۱۲/
- [illegible] ۱۲/
- [illegible] ۱۲/
- [illegible] ۱۲/
- [illegible] ۱۲/

مولانا عبد الحلیم شرر

- ابوبکر شبلی
- خواجہ معین الدین چشتی ۶
- مقلبۂ من سلیم ۱۲/
- قیس و لبنیٰ
- مقدس نازنین
- ماہ ملک
- یوسف نجمہ
- فتح اندلس
- ماہ ملک ۶/
- حسن کا ڈاکو
- [illegible] ۲ جلد
- مفتوح فاتح
- جویائے حق ۲ جلد
- لعبت چین
- عزیز مصر
- غیب دان دلھن
- فردوس بریں
- فلپانا
- رومۃ الکبریٰ ۱۲/
- الفانسو
- شہید وفا
- حسن انجلنا ۱۰/
- ملک العزیز ورجنا ۱۰/
- آغا صادق کی شادی ۱۰/
- افسانۂ قیس ۱۳/
- حسن بن صباح ۶/
- تاریخ بغداد

نواب مرزا داغ مرحوم

- آفتابِ داغ
- مہتابِ داغ
- یادگارِ داغ
- انتخابِ داغ
- فریادِ داغ

مولوی بشیر الدین احمد دہلوی

- حکومت الٰہی ۲ جلد
- تاریخ بیجاپور ۳ جلد
- [illegible] طلان
- [illegible]
- عصائے پیری
- قسیم ہدایت
- لخت جگر ۲ جلد
- حسن معاشرت
- اقبال دلھن

نیاز فتحپوری

- گہوارۂ تمدن
- ترجمہ گیتان جلی
- [illegible] ۸/

سیماب اکبر آبادی

- خدیجۃ الکبریٰ
- بعثت الرسول ۵/
- سیرۃ الحسین
- عالم گو فر ۵/

حکیم محمد علی خان مرحوم

- محبت کامل
- [illegible] کامل
- ماہ پیاری کامل
- [illegible]
- گورا
- نیل کا سانپ
- جعفر و عباسہ
- [illegible] کامل

منشی احمد علی شوق قدوائی

- ترانۂ شوق
- قاسم و زہرہ ۸/
- سیکنڈ ادر لوسی ۲/

شبیر حسین جوش ملیح آبادی

- روحِ ادب
- مقالات زرین ۱۱/
- آوازۂ حق ۸/
- اوراق سحر ۱۵/
- جذبات فطرت ۳/

منشی تیرتھ رام

- فسانۂ لندن ۲ جلد
- وطن پرست
- منزل مقصود
- روحونکا جرگہ ۱۰/
- خونی ہیرا

جلال لکھنوی مرحوم

- [illegible]
- [illegible]
- [illegible]
- [illegible]
- [illegible]
- قواعد المنتخب ۴/

خواجہ عشرت لکھنوی

- لغات اردو
- اصول اردو ۶/
- جانِ اردو ۶/
- قواعد میر ۶/
- شاعری کی پہلی کتاب
- شاعری کی دوسری کتاب
- شاعری کی تیسری کتاب ۸/
- اصلاح زبان اردو ۶/
- گلدستۂ ظرافت ۶/
- زباندانی ۶/

صفدر مرزا پوری

- [illegible]
- بزم خیال ۸/
- مشاطۂ سخن

مولوی محمد حسین محوی

- ازواج الانبیا
- انسانی قابلیت ۱۰/

حکیم احمد حسین الہ آبادی

- مرتبت ابن [illegible]
- دوم
- سوم
- چہارم
- پنجم
- ششم
- ہفتم
- [illegible]
- دہم
- یازدہم
- سلطان صلاح الدین
- سلطان نور الدین محمود

مولوی سعید احمد مارہروی

- آثار اکبری
- حیات صالح ۶
- حیات خسرو
- [illegible] ہنود

مولوی سید ممتاز علی

- تذکرۃ الانبیا
- گنج حسن ۱۲/

منشی نواب زین العابدین علی خاں

- سفرنامہ [illegible]
- قسطنطنیہ
- ڈولی

جسٹس محمود مرحوم
- کتاب الطلاق
- کتاب الشفعہ
- شرح قانون شہادت

مولوی عزیز مرزا بی اے
- خیالات عزیز
- [illegible]

خواجہ غلام الثقلین مرحوم
- روزنامچہ سیاحت
- فلسفیانہ نظر اسلام پر

مولوی محمد لطیف مرحوم
- اکبر
- دور حکومت عرب
- لارڈ کلائیو
- [illegible]

عنایت اللہ بی اے
- دعوت اسلام
- ارض مقدس
- دہلی

مسٹر ظفر عمر بی اے
- نیلی چھتری
- بہرام کی گرفتاری
- چندرن کا قلب

مولوی محمد علی ایم اے
- سیرۃ خیر البشر
- ختم نبوت [illegible]
- حمائل قرآن

پروفیسر نواب علی ایم اے
- تذکرۃ المصطفےٰ
- مصالح الدین
- صحت سادی
- شمع سخن ۱۰/

مفتی انوار الحق ایم اے
- تذکرۂ [illegible]
- [illegible] اسلام
- اثبات [illegible]
- تاریخ ابو البشر
- قوت خیال ۱۹/

پروفیسر الیاس برنی ایم اے
- اسرار حق
- معارف [illegible]
- منازل قدرت
- جذبات فطرت
- علم الہیئت

سید ہاشمی فرید آبادی
- مشاہیر یونان [illegible]
- تاریخ یونان قدیم

مرزا محمد ہادی بی اے
- امراؤ جان ادا
- شریف زادہ ۱۰/
- خونی عاشق
- خونی مصور
- خونی شہزادہ
- مثنوی امید و بیم ۳/

ڈاکٹر اقبال ایم اے
- [illegible] ۵/
- مکمل ترانہ ۲/
- شکوہ ۲/
- جواب شکوہ ۲/
- نالۂ یتیم ۲/
- [illegible] ۳/
- بلال ۱/
- [illegible] ۳/
- شمع و شاعر ۱۲/
- خضر راہ ۴/

مولوی ظفر علی خاں بی اے
- معرکۂ مذہب و سائنس
- [illegible]
- [illegible]
- جنگل میں منگل
- فلسفۂ ابن سینا
- معاشرت
- [illegible] ۱۰/

منشی حامد علی بی اے
- تاریخ تمدن ۲ جلد
- شباب لکھنؤ

مولوی عبد الماجد بی اے
- فلسفۂ جذبات
- [illegible] ۱۲/
- تاریخ اخلاق یورپ ۲ جلد
- مکالمات برکلے
- [illegible]

خواجہ عباد اللہ اختر بی اے
- مشاہیر اسلام
- دمشق
- [illegible]
- [illegible]
- [illegible]

مسٹر سجاد حیدر بی اے
- خیالستان
- زہرا
- ثالث بالخیر

مسٹر ظفر احمد عباسی بی اے
- [illegible]
- [illegible]
- [illegible] ۱۲/
- [illegible]

مولوی عبد الحق بی اے
- قواعد اردو
- انتخاب کلام میر

مولوی معشوق حسین خاں بی اے
- مبادی سائنس
- بجلی کے کرشمے ۱۲/
- تجارت [illegible]

مولوی سید سلیمان ندوی
- ارض القرآن جلد دوم
- حیات امام مالک
- خلافت [illegible]
- [illegible] اسلام
- [illegible]

پروفیسر عبد الباری ندوی
- [illegible]
- برکلے کا فلسفہ
- مذہب و عقلیات ۶/

مولوی محمد حلیم انصاری
- تمدن [illegible]
- الاسلام [illegible] ۱۲/
- اسلام اور [illegible]
- [illegible]
- فتح [illegible]
- فلسفۂ [illegible]

خواجہ حسن نظامی
- سیپارۂ دل
- [illegible]
- میلاد نامہ
- محرم نامہ
- [illegible]
- [illegible]
- کرشن بیتی
- الم و موت
- [illegible]
- [illegible]
- [illegible]
- [illegible]
- [illegible]
- [illegible]

مولوی اکرام [illegible] رشدی
- صبح زندگی
- شام زندگی
- شب زندگی جلد
- [illegible] ۱۲/
- [illegible]
- الزہرا ۱۲/
- عروس کربلا
- [illegible]
- [illegible]
- [illegible]

الناظر بک ایجنسی لکھنؤ

رجسٹرڈ نمبر

ا ۔ ۷۸۴

بسم اللہ الرحمن الرحیم

الناظر

قیمت سالانہ للعہ

بیرون ہند سے ۳ ع

ایڈیٹر ظفر الملک علوی

نمبر ۱۴۶	ماہ اگست ۱۹۲۳ء	جلد ۲۵

فہرست مضامین

قیمت فی پرچہ ۸؍

الناظر پریس لکھنؤ میں چھپا

ششماہی ...

پرنٹر و پبلشر سید اسحاق علی علوی

بسم اللہ الرحمن الرحیم

اردو کی بہترین کتابیں

[illegible]

[illegible]

مرزا غالب مرحوم

- اردوئے معلے ۲ عہ/
- عود ہندی ۱۲/
- دیوان غالب کتب دانش ۔ مع/
- مکاتیب غالب عہ/

سر سید احمد خان مرحوم

- تفسیر القرآن جلد عہ
- خطبات احمدیہ ۶/
- آثار الصنادید للعہ/
- مضامین تہذیب الاخلاق للعہ/
- مکمل مجموعہ لکچر للعہ/
- اسباب بغاوت ہند ۸/

نواب محسن الملک مرحوم

- مضامین تہذیب الاخلاق للعہ/
- مجموعہ لکچر للعہ/
- آیات بینات ۲ جلد معہ/

مولوی حسان اللہ عباسی

- تاریخ الاسلام للعہ/
- الاسلام ۶/
- زاہدہ عہ
- نشتر سخن ستہ/

مولانا آزاد مرحوم

- آب حیات ے/
- دربار اکبری عہ/
- سخندان فارس ے/
- نگارستان فارس ے/
- نیرنگ خیال ۲ حصہ عہ
- دیوان ذوق ۶/

مولوی بشیر الدین احمد دہلوی مرحوم

- واحسرتا ۳ عہ
- رسوم دہلی عہ
- تسخیر شہر ۱۲/
- مہر افروز بیگم ۱۰/
- انشائے ہادی النسا عہ/
- لغات النسا للعہ/
- علم اللسان ۸/

مرزا حیرت دہلوی

- سیرۃ الرسول جلد ے/
- کتاب شہادت جلد ے/
- قصہ حاجی بابا اصفہانی ۶/
- روز البیر مکمل ے/
- الف لیلہ نیا زاد ے/
- الف لیلہ شہرزاد ے/

مولانا حالی مرحوم

- حیات جاوید مجلد عہ/
- یادگار غالب ے/
- حیات سعدی عہ
- دیوان حالی عہ
- مقدمہ شعر و شاعری عہ
- مسدس حالی عہ و عہ/
- جواہرات حالی عہ
- بیوہ کی مناجات ۲/

مولانا شرر مرحوم

- حیات انیس ۶/
- ایشیائی شاعری عہ/
- نورجہان بیگم ۸/
- ٹیپو سلطان عہ/
- حیدر علی سلطان عہ
- اردو کی ڈالی ۳/
- اردو کا گلدستہ ۳/

مولانا اسلم جیراجپوری

- حیات حافظ عہ
- حیات جامی ۸/
- علوم عرب عہ
- خاتمین عہ

مولانا نذیر احمد مرحوم

- ترجمۃ القرآن بالمقابل ے/
- حمائل شریف مترجم عہ
- مطالب القرآن عہ/
- الحقوق والفرائض عہ
- اجتہاد عہ/
- مبادی الحکمۃ عہ/
- رویائے صادقہ عہ
- موعظۂ حسنہ عہ
- ابن الوقت عہ
- ایامیٰ عہ
- فسانۂ مبتلا عہ
- مراۃ العروس ۱۰/
- بنات النعش ۹/
- توبۃ النصوح ۹/
- منتخب الحکایات ۶/
- چند پند ۶/
- مجموعۂ نظم بے نظیر عہ
- مکمل مجموعہ لکچر ۲ جلد عہ

مولوی حبیب الرحمن خان شروانی

- سیرۃ الصدیق عہ
- علمائے سلف عہ/
- اسلامی اخلاق ۸/

مولانا شبلی مرحوم

- سیرۃ النبی جلد اول مجلد عہ/
- جلد دوم مجلد عہ
- آغاز اسلام ۸/
- الفاروق ے/ و ۶/
- سیرۃ النعمان عہ
- الغزالی ۶ و عہ
- المامون عہ
- سوانح مولانا روم ۶/
- سفرنامہ مصر و شام و روم عہ
- مضامین عالمگیر عہ/
- رسائل شبلی عہ
- مقالات شبلی عہ
- موازنۂ انیس و دبیر ے/
- شعر العجم جلد اول ے/
- جلد دوم عہ
- جلد سوم عہ
- جلد چہارم عہ
- جلد پنجم ۶/
- مجموعۂ کلام شبلی اردو ۱۲/
- کلیات فارسی ۶/
- اسلامی حکومت ۲/
- اسلامی مدارس ۴/
- مثنوی صبح امید ۴/

مولانا ذکاء اللہ مرحوم

- تاریخ ہندوستان جلد عہ
- تاریخ عہد انگلشیہ ے/
- آئین قیصری عہ/
- کرزن نامہ ۶/
- صحیفۂ فطرت ۶/
- محاربات عظیم ۸/
- تعلیم الانتظام ۸/
- فلسفۂ امثال عہ/
- اصل کتاب جبر و مقابلہ ۶/
- معاون حساب ۱۲/

مولوی سجاد مرزا بیگ دہلوی

- الانسان ۶/
- الاستدلال ے
- حکمت عملی ے/
- تسہیل البلاغت ے/
- تمنائے دید ۱۰/

مولوی انشاء اللہ خاں ایڈیٹر وطن

- تزک تیموری عہ
- حالات قسطنطنیہ عہ/
- تاریخ مراکش و مغرب الاقصیٰ ۶/
- حالات طرق عرب و عثمان ۶/

الناظر بک ایجنسی لکھنؤ

مطبوعات جدیدہ

سکھ قوم اور اُس کے بانی۔ گرونانک اور سکھ قوم کے متعلق مسلمانون کی جو راے ہو اُسے مصور فطرت ادیب المشایخ حضرت خواجہ حسن نظامی صاحب نے اپنے مخصوص و دلفریب انداز مین تحریر کیا ہو ۶/

حلال خور۔ فرقہ حلال خور کی تحقیق۔ اُس کے عادات و خصائل۔ اُس کے آداب معاشرت اسکے مذہبی معلومات جمع کرکے خواجہ حسن نظامی صاحب نے مبلغین اسلام کی محنت کو ہلکا کر دیا ہو۔ داعیان اسلام کے لیے اسکا مطالعہ ناگزیر ہو۔ خواجہ صاحب موصوف کو اِسی جُرم کی پاداش مین بعض ستم ظریفون نے حلال خورون کے امام کا لقب دیا تھا جسکا جواب انھون نے صرف یہ دیا کہ "مین حلال خورون کا امام ہون حرام خورون کا نہین" غرض اِسی قِسم کی دلچسپ و دلفریب معلومات و لطائف سے تمام کتاب لبریز ہو۔ قیمت ۸/

روپیہ عالم سکرات مین۔ خواجہ صاحب کا رخش قلم ہر میدان مین جولانی دکھاتا ہے اِس مختصر کتاب مین آپ نے دکھایا ہو کہ کس طرح معدنیات سے ڈھلے ہوے سکے رفتہ رفتہ دم توڑ رہے ہین اور انکی جگہ کاغذ کے پُرزون نے لی ہو۔ اسی دوران مین دولت۔ سرمایہ پرستی اور سوشلزم پر بھی آپنے اظہار خیال فرمایا ہو۔ کتاب نہایت دلچسپ اور دیکھنے کی چیز ہو۔ قیمت ۱/

لے دور کا سلام۔ سرورِ کائنات حضور پُرنور رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم سے ایک ہندی مسلمان کا خطاب۔ قیمت ۱/

داعی اسلام۔ اشاعت اسلام و حفاظت دین متین کی تدبیرین سوچنا اور اُن کو ملک و قوم کے روبرو پیش کرنا ہر مسلمان کا مذہبی فریضہ ہو، خداوند جل و علی کلام پاک مین فرماتا ہے ولتکن منکم اُمّۃ یدعون الی الخیر ویامرون بالمعروف وینھون عن المنکر واولئک ھم المفلحون (آل عمران) اسی جذبہ سے متاثر ہوکر خواجہ حسن نظامی صاحب نے داعی اسلام تصنیف کی ہو جسمین انھون نے اپنے غور و فکر کے مطابق جو ذرایع اسلام کی تبلیغ کے بہتر سمجھے ہین وہ بھی خواہان اسلام کے روبرو پیش کیے ہین۔ قیمت ۳/

بسم اللہ الرحمن الرحیم

الناظر

نمبر ۱۴۶ جلد ۲۵ ماہ اگست ۱۹۲۳ء

صبحِ حرم

سوتے سوتے جو رات آنکھ کھلی — کہ رہا تھا یہ مُلہمِ غیبی
سونے والو اُٹھو سحر آئی — نیند بس خوب رات بھر آئی
اب نہین ہے یہ وقت سونے کا — دم ہے اشکون سے منھ کو دھونے کا
کاش غفلت سے باز آجاتے — ہوش مین آکے نیند کے ماتے
آخری شب مین چین سے سونا — وقت کی جان کا ہے بس کھونا
وقتِ دربارِ خاص ہولے ہے — اِس گھڑی جاگنا ہی اولے ہے
کِس کو یہ وقت ہاتھ آتا ہے — سَو مین اِک آدھ اس کو پاتا ہے
حضرت اُٹھ بیٹھ آدھی رات رہی — کام دے گی دعاے نیم شبی
کھُل گیا ہوگا اب تو بابِ حرم — لوٹ لے جا کے تو ثوابِ حرم
ہے یہی فرحت و سرور کا وقت — بزمِ خالق مین ہے حضور کا وقت
سنتے ہی یہ صدا مین اُٹھ بیٹھا — لیکے نامِ خدا مین اُٹھ بیٹھا
اُٹھتے ہی چلد یا وضو کے لیے — اپنی عقبےٰ کی آبرو کے لیے

کرچکا جب وضو ہوا تیار   تاکہ ہو جاؤں حاضرِ دربار
دل میں روشن ہوا چراغ حرم   لے اُڑی پھر ہوائے باغ حرم
کیا بتاؤں میں جاکے کیا دیکھا   چمن بزم کبریا دیکھا
صنعتِ حق عیان ہیں چار طرف   سادگی کا سمان ہیں چار طرف
در و دیوار و صحن و سقف و منار   سر سے پا تک ہیں سب کے سب احجار
خانۂ کعبہ کی بنا پتھر   حجرِ اسود ایک کونے پر
نہ شجر ہے نہ کوئی گل بوٹا   نہ ہے فوّارہ آب کا چھوٹا
ارضِ مکہ بھی کیسی سادی ہے   غیر ذی زرع ایک وادی ہے
مگر اس سادگی میں لاکھ بناؤ   ڈھونڈھ کر اس کا تم جواب تو لاؤ
دینِ اسلام کا وہ پیارا باغ   اُسی وادی کی آنکھ کا ہے چراغ
رشکِ جنت ہے دامن کہسار   خشک وادی ہے غیرتِ گلزار
چل رہی ہے نسیم رحمت کی   بوئے گُل ہے شمیم رحمت کی
نیک بندوں کے دل جو ملتے ہیں   آرزوؤں کے پھول کھلتے ہیں
گلِ رحمت کی بھینی بھینی مہک   صبحِ قدرت کی ہلکی ہلکی چمک
کہیں تہلیل کے بلند اشجار   سروِ تسبیح کی کہیں ہے قطار
ذکر کے پھول چشم و دل کے چراغ   گُلِ رنگین حمد لالۂ باغ
دے رہا ہے صدا ہر ایک نہال   جو یہاں آگیا ہوا وہ نہال
ہیں نرالے تمام یاں کے شجر   فصل بے فصل دیتے ہیں جو ثمر
شامیانہ سحابِ رحمت کا   فرش پر نور آب رحمت کا
نہرِ حمد و ثنا کی جاری ہے   ہر مصلّٰے حرم کا کیاری ہے
نغمۂ طائران سے حمد عیان   ٹھنڈی ٹھنڈی ہوائیں گرمِ بیان
محو ہیں ایسے حق پرستی میں   جھولے جاتے ہیں جوشِ مستی میں
کیا مزے کی غذائے روحی ہے   صبح کیا ہے مئے صبوحی ہے

پڑھ رہا ہے ہر ایک وہ تسبیح — جس سے ہوتی ہے روح کو تفریح
کیا نوا سنجیان ہین وقت صباح — یعنی سُبحان فالقُ الاِصباح

ق

ساکنانِ نشیمنِ تشبیہ — ہمصفیرانِ گلشنِ تنزیہ
کیا ملک کیا طیور کیا آدم — مل کے کہتے ہین کیف[۱] اَصبحتُم
جوش چہرون پہ ہے مسرت کا — غازہ کل آئے ہین صباحت کا
رنگ ہر شے مین نورِ خالق کے — کچھ کچھ آثار صبحِ صادق کے
آسمان سے زمین تک اک نور — خاص شانِ نزول وقتِ ظہور
وقت پُر لطف اور دھندلکا سا — کچھ اندھیرا سا کچھ اُجالا سا
جبلِ بوقبیس کی جانب — ہوتی جاتی ہے رات کچھ غائب
جس جگہ تھا کبھی قمر[۲] کا چاک — ہے وہین دامن سحر کا چاک
وہ غلس مین ملا ہوا اسفار — نور ظلمات و ظلمتِ انوار
جھلملی وہ حرم کی قندیلین — جیسے تارے دم سحر چمکین
چاندنی کی بہار پچھلے پہر — رحمتِ کردگار پچھلے پہر
لبیک ماہی سے تا بہ مہ کا حضور — وحدہٗ لاشریک لہٗ کا ظہور
شبِ کعبہ ہے منبع الاسرار — صبح کعبہ ہے مطلع الانوار
صبح کی بات ہی یگانہ ہے — صبح کا وقت ہی سہانا ہے
مرحبا تیری شان صبح حرم — لاکھ صبحون کی جان صبح حرم
صبحِ روزِ ازل تمام ہے تو — سحر مسجد الحرام ہے تو
ابتدا اس سے یہ نورِ خالق ہے — انتہا تک تو صبح صادق ہے
شان رعب و جلال چھائی ہوئی — ساتھ ہی ساتھ رحمت آئی ہوئی
پوچھنا کیا ہے یان کی ہیبت کا — اِس جگہ سر جھکا ہے حضرت کا

۱؎ عربی کا مقولہ جو صبح کی ملاقات مین بولا جاتا ہے ۱۲

۲؎ معجزۂ شق القمر کا محل وقوع جبل ابو قبیس ہے اور وہی مکہ کرمہ مین سمت طلوع آفتاب ہے ۱۲

حرم کبریا کا جلوہ ہے — کعبہ کیا ہو خدا کا جلوہ ہے
جس نے کی ہو عبادتِ کعبہ — وہی جانے حقیقتِ کعبہ
لطفِ قرآن کا ہو کعبے مین — حسنِ ایمان کا ہو کعبے مین
کعبہ مسجود حکمِ قرآن سے — کعبہ مقصود امرِ یزدان سے
کبریائی کی شان کعبے مین — عظمت کا نشان کعبے مین
سب کے سر روبروے بیت اللہ — جھکے جاتے ہین خود بخود واللہ
زیرِ دیوارِ کعبہ سر بسجود — کہہ رہا ہے ہر ایک یا معبود
با ادب بندہ ہاے طاعت مند — ہاتھ باندھے ہوے ارادت مند
کوئی محوِ نمازِ با اخلاص — کوئی مصروفِ ذکر، حالتِ خاص
عاجزی کا بیان قیام و قعود — بندگی کا نشان رکوع و سجود
شوق مین کوئی کر رہا ہے طواف — سجدہ گہ ہے کسی کی فرشِ مطاف[1]
ہین جو گردش مین آسمان و زمین — یہ بھی کرتے نہون طواف کہین
کوئی قرآن کی تلاوت مین — کوئی مشغول ہو عبادت مین
لوگ شب زندہ دار بیٹھے ہین — کچھ تہجد گذار بیٹھے ہین
رات بھر شمعِ دل جلائے ہوے — صبح کعبہ سے لو لگائے ہوے
رخ پہ آنسو ہین چشمِ پُرنم کے — دامنِ گل مین قطرے شبنم کے
دلِ عابد نعیم کا غنچہ — دمِ زاہد نسیم کا جھونکا
نیتِ عابدان ہو ڈانوا ڈول — چاہِ زمزم مین پڑ رہا ہو ڈول
ذوق مین جس نے پی لیا پانی — دودھ[2] کا دے گیا مزا پانی
ہر بیمار ہے شفاے مرض — چاہو پی لو اسے براے غرض
ہین حکمت خواصِ طب کو لیے — آب و تاب لِمَا شُرِبَ[3] کو لیے

۱؎ طواف کرنے کی جگہ کو عربی مین مطاف کہتے ہین ۱۲ ۲؎ مشہور بات ہو کہ پہلا ڈول جو آخر رات مین زمزم سے نکلتا ہو اُس کا مزا دودھ کا ہوتا ہو ۱۲ ۳؎ آبِ زمزم کی نسبت حدیث مین لِمَا شُرِبَ لَہٗ وارد ہوا ہو یعنی جس مقصد کے لیے بھی پیا جائے

بھر گیا ہے مصلیون سے حطیم[1] — بلکہ سارا مقام ابراہیم[2]
آرہی ہے صدائے فیض اتم — دے رہا ہو ندا سحاب کرم
بارش عفو مین نہا جاؤ — زیر میزاب رحمت آجاؤ
ہے جو کعبہ سے یکساں حطیم — جزو کعبہ ہو خود بلال حطیم
اس عبادت کو غور کر لین خود — پڑھتے ہین جو حدیث اَن تَعبُد[3]
کھلتے ہین راز عابد و معبود — سرّ اسرار ساجد و مسجود
داغ عصیان کو کوئی دہوتا ہے — کوئی پردہ پکڑ کے روتا ہے
پردہ جدھر ہوا سے ہلتا ہے — دل بھی خوف خدا سے ہلتا ہے
کعبے کا کیون سیاہ ہے پردہ — پردہ پوش گناہ ہے پردہ
کھینچ لیتا ہے سب گناہون کو — پردکھاتا ہو کب گناہون کو
داغ عصیان کے صبحگاہی مین — مل کے رہ جاتے ہین سیاہی مین
جس نے جا کر پکڑ لیا پردہ — عمر بھر اُس کا پھر رہا پردہ
اُسکے وابستگان کا کس کو شمار — ایک عالم نہین ہے ہژدہ ہزار
دیکھکر یہ سمان مین لوٹ گیا — جو مین پہونچا وہان مین لوٹ گیا
جی مین آیا نثار ہو جاؤن — صدقے بے اختیار ہو جاؤن
عفو مانگون زمین پر گر کے — رحم چاہون مین گرد پھر پھر کے
پاؤن پڑھنے لگے برائے طواف — ہو گئین دونون آنکھین فرش مطاف
گرد کعبے کے جب مین گھوم لیا — حجر اسود آکے چوم لیا
کیا نرالا حجر ہے کالا سا — جس کے اندر ہے کچھ اُجالا سا
لیکے ہاتھون مین پردۂ کعبہ — ملتزم[4] سے لگا دل و سینہ

[1] کعبۂ مکرمہ کا وہ بیرونی حصہ جسکا احاطہ ہلالی ہو اُسے حطیم کہتے ہین [2] باب کعبہ کی سمت مقابل مین محل نشان قدم حضرت ابراہیم علیہ السلام جسکی نسبت وارد ہوا ہو کہ وَاتَّخِذُوا مِن مَّقَامِ إِبرَاهِيمَ مُصَلًّى ۱۲ [3] اشارہ طرف حدیث اَن تَعبُدَ اللّٰهَ کَاَنَّکَ تَرَاهُ الخ ۱۲ [4] درمیان حجر اسود اور باب کعبہ کے جو جگہ ہو اُسے ملتزم کہتے ہین جسکی نسبت فرمایا گیا کہ خاص محل اجابت دعا ہو ۱۲

کانپ کر عرض کر رہا تھا کھڑا | جاری آنکھوں سے اشک کا دریا
کون مقصود ہے سوا تیرے | کون معبود ہے سوا تیرے
اور کچھ بھی نہیں دعا میری | چاہتا ہوں فقط رضا تیری
پردہ پکڑے ہوں میں ترے گھر کا | اور دامن شفیع محشر کا
رازداں ہے جو پردہ دار کا تو | پردہ رکھ لے گناہگار کا تو
کہہ رہا تھا یہی کہ چونک اٹھا | ایسی حالت ہوئی کہ چونک اٹھا
آئی کانوں میں اک صدا دلدوز | پُراثر پُرجلال اور پُرسوز
خاص شانِ جمال ساتھ لیے | رحمتِ ذوالجلال ساتھ لیے
کرم ذاتِ ہُو کا پرتو تھا | بلکہ لَا تَقنَطُوا کا پرتو تھا
کیا بتاؤں یہ میں صدا کیا تھی | کیا کسی سے کہوں ندا کیا تھی
درد سے کوئی کہہ رہا تھا کہ یا[١] | اَرحَمَ الرَّاحِمِین اِرحَمنَا
ساتوں مینار گونج اٹھے اک بار | وجد میں آگئے در و دیوار
اس صدا نے ہلا دیا مجھکو | کیا کہوں کیا دکھا دیا مجھکو
ذرہ ذرہ پکارتا تھا یہی | سَبَقَت رَحمَتِی عَلٰی غَضَبِی
چار جانب نگاہ جا دوڑی | ہوکے بیتاب آہ جا دوڑی
سوے مینار گھوم کر دیکھا | جانب کعبہ جھوم کر دیکھا
بانگِ ترحیم تھی کہ رحمت تھی | صوتِ تذکیر[٢] تھی کہ وحدت تھی
اسکے بعد آگیا عجیب سماں | دی مؤذن نے صبح کی جو اذاں
اللہ اللہ بلند کی تکبیر | عرش اعظم کی ہل گئی زنجیر
کشتۂ دین کی تھی شہادتِ نگاہ | وحدتِ لَا اِلٰہ اِلَّا اللہ

---

[١] طلوع صبح صادق سے پہلے ہی دیر تک مؤذنین منارہ ہاے حرم پر آواز بلند یا ارحم الراحمین ارحمنا کی تکرار کیا کرتے ہیں تا اذان صبح اور عربی اصطلاح میں اُسے ترحیم کہتے ہیں ١٢

[٢] قبل ترحیم کے تکرار کلمۂ طیبہ کی مناروں پر مثل ترحیم کے کی جاتی ہے جسکو تذکیر کہا جاتا ہے ١٢

لا سے مقصود نفی شرکت پر　　الف الّا کا دالِ وحدت پر
منزلِ شرع کا وہ رہبرِ راہ　　نام پاک آپ کا رسول اللہ
ہوتے ہی پھر نماز کی تکبیر　　مستعد ہو گئے صغیر و کبیر
اپنے مرکز پہ لوگ چار طرف　　آ گئے دائرون مین باندھ کے صف
کعبہ یون تھا نماز والون مین　　مہ کا دل ہو جیسے ہالون مین
یا خدا اِس نماز کے صدقے　　بندہ و رب کے راز کے صدقے
عمر بھر اِس نماز مین رکھنا　　اسی سوز و گداز مین رکھنا
سب مصلون پہ ہو چکی جو نماز　　روز روشن کا کھل گیا بس راز
بھر گیا پھر مصلیون سے مطاف　　جسکو دیکھو وہ کر رہا ہے طواف
گرد پھر پھر کے سب صغار و کبار　　اپنے مالک کے ہو رہے ہین نثار
پڑی مجھپر شعاعِ مہر آکر　　بولی افسوس مجھکو چونکا کر
صبحدم کی یہ ساری باتین ہین　　دیکھ یہ دن مین ایسی راتین ہین

ہو چکی صبح دِن نکل آیا
پھر یہی دیکھنا جو کل آیا

"محمد ابوالاشرف مجددی"

شذرات

علم طبیعیات کے ماہر رفتہ رفتہ سیاسیات مین بھی قابلیت کا ثبوت دے رہے ہین۔ سر جی سی آئی کے یہ الفاظ کہ موجودہ متمدن نظام حکومت سے طوائف الملوکی ہزار درجہ بہتر ہی، ابھی کانون مین گونج ہی رہے تھے کہ یورپ کے مشہور سائنس دان انسٹین نے لیگ اقوام سے علٰحدگی اختیار کرلی، اسکے اسباب و علل خود اُس نے یہ بیان کیے ہین:۔

لیگ کی اسوقت تک کی کارروائیون نے مجھے یقین دلادیا ہی کہ دول متحدہ کے جتھون مین سے جو سلطنت جو طرز اختیار کرتی ہی خواہ وہ کتنا ہی بیہانہ ہو لیگ اقوام اُس مین دخل دینے سے عاجز ہے مین کنارہ کشی کررہا ہون اس لیے کہ لیگ کے دائرۂ عمل سے صرف وہ مقصد اصلی خارج ہی نہین جسکو تحریک بین الاقوامی کا گرانبہا لقب دیا گیا تھا بلکہ اُس کی تضحیک بھی ہوتی ہی۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

خدا کرے مستقبل مین لیگ اقوام ان ترش الفاظ کو جو مین نے اسکے لیے استعمال کیے ہین، غلط ثابت کرے۔

فطرت بشری کی ستم ظریفیان قابل داد ہین، باغی مصطفےٰ کمال کا نمائندہ جس سے دول اتحاد کے مدبر ملنا تک گوارا نہین کرتے جسکے ساتھ لوزان مین طفلانہ تخویف و تحریص کا برتاؤ کیا جاتا ہی آج مظفر و منصور واپس آتا ہی،

سیاسیات مشرق کے واقفین اس حقیقت کو تسلیم کرنے مین یک زبان ہین کہ جنرل عصمت پاشا نے جس تدبر و حلم کا ثبوت دیا ہی وہ ایشیا کی برتری و ترقی کا پیش خیمہ ہی،

سر آغا خان فرماتے ہین کہ "یہ تاریخ کا پہلا موقع ہی کہ مسلمانون نے دول اتحاد سے مساویانہ صلح کی ہو"۔ یہ ہی نہین بلکہ یہ پہلا موقع ہی کہ کسی ایشیائی مدبر نے یورپ کی متحدہ ڈپلومیسی کو شکست دی ہو،

صلح ہو گئی۔ ہندوستان مین جشن منائے گئے لیکن کیا واقعی مسلمانون کے مطالبات پورے ہوگئے؟ کیا فلسطین و عراق غیر مسلم اثر سے پاک ہوگئے؟ کیا شام و حجاز مسلمانون کو واپس مل گئے۔ نہین!

ہرگز نہیں! پھر یہ لایعنی شور و شغب کیوں،

رئیس الاحرار بطل حریت مولانا محمد علی ہم میں مع دیگر رفقا کے واپس آگئے۔ ہم حیران ہیں کہ انھیں مبارکباد دیں یا اُن کے ساتھ تعزیت کریں،
شوق و عقیدت کی فراوانی مبارکباد کا ہدیۂ مختصر پیش کرنیکی ہدایت کرتی ہے لیکن پردرد اکی بعید دوح موجودہ ملکی صورت حال پر گریہ کناں سامنے آجاتی ہے اور ہم کو ہندو مسلم اتحاد کی جوانا مرگی پر تعزیت کی ترغیب دیتی ہے۔

مولانا ممدوح نے زندان فرنگ میں جس وقت قدم رکھا تھا اس وقت اتحاد و یگانگت کی حکمرانی تھی، لیکن آج جس تاریک و تنگ کوٹھری سے مولانا! ہر تشریف لائے ہیں ملک کی فضا اُس سے زیادہ مسموم ہے۔ اُنھوں نے باہر قدم رکھتے ہی اسے محسوس کر لیا ہے اور اپنے ہر تار میں اس بات کو واضح کر دیتے ہیں کہ میں چھوٹے جیلخانے سے بڑے جیلخانہ میں آگیا ہوں،

کانگریس کے ارباب حل و عقد اُس خلیج پر پُل باندھنے کی کوشش کر رہے ہیں جو کانگریس کے دونوں فریقوں کے درمیان روز بروز چوڑی ہوتی جاتی ہے مگر دیکھنا یہ ہے کہ یہ ممکن بھی ہے کہ نہیں،
غور کیجیے تو اس وقت کانگریس میں دو گروہ ہیں ایک آئینی ذرایع سے سوراج حاصل کرنا چاہتا ہے اور ایک ترک موالات کے ذریعہ سے آئینی ذرایع کے دلدادہ سوراج کو نوآبادیوں کے مثل حکومت خود اختیاری سمجھتے ہیں۔ تارکین موالات اُسے کامل آزادی سے تعبیر کرتے ہیں۔ دونوں کے مطامح نظر میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ حیرت ہے کہ اس وسیع خلیج پر جو اُن کے خیالات کے درمیان واقع ہو گئی ہے کس طرح تختہ بندی کی جا سکتی ہے۔

ہم نے مانا کہ زیر بحث صرف کونسل میں جانا یا نہ جانا ہے لیکن ہم دیکھ رہے ہیں کہ عدم تعاون کے موجد کے بنا کردہ اصول کن اغراض کو پیش نظر رکھ کر بنائے گئے تھے کیا کونسلوں میں بیٹھنا انکے

شکست کر دینے سے ہندوستان اقتصادی غلامی سے آزاد ہوجائیگا۔ کیا وہ مسموم تعلیم جس نے ہماری روح کو کمزور بنا رہا ہے اخلاق کو خراب کر دیا ہے بدل جائیگی۔ کیا اپنے جھگڑے بجائے عدالت مین لے جانے کے کونسلون کے ممبر آپس مین طے کرادین گے۔ یہ سوالات ہین جو ہر ہندوستانی کے دل مین اس وقت پیدا ہو رہے ہین۔

کینیا جنوبی افریقہ کے ساحل پر ایک نو آبادی ہے۔ یہان ہندوستانی۔ عرب۔ افریقی۔ اور یورپین، آبادی کے اعداد حسب ذیل ہین۔

یورپین	۹،۶۵۱
ہندوستانی	۲۲،۸۲۲
عرب	۱۰،۱۰۰
افریقی	۲۵،۵۰،۰۰۰

وہان سفید و سیاہ کا فرق اس حالت کو پہونچ گیا ہے کہ باوجود اس کے کہ سفید رنگ کے لوگون کی تعداد بمشکل سے ساڑھے نو ہزار ہے مگر حق نمائندگی انھین کو زیادہ ملا ہے۔ ہندوستانی اسپر چراغ پا ہین۔ لیکن کیا وہ مسلمانون اور عیسائیون کو ہندوستان کے اندر انکی تعداد کے مساوی حقوق دینے پر تیار ہین، اگر نہین تو وہ کس منھ سے کہتے ہین کہ ان کے حقوق وہان نظر انداز کر دیے گئے ہین

تعداد نمایندگان حسب ذیل ہے:-

یورپین	۱۱
ہندی	۵
عرب	۱
افریقی	۱

اور ستم ظریفی ملاحظہ فرمایئے کہ افریقی ممبر کے نامزد کرنیکا بھی حق مشنری جماعت کو ہے،

حیرت اس بات کی ہے کہ ہندوستانی تو کچھ غل غپاڑہ کر کے اپنے احتجاج کو غیر قومون پر ظاہر

کردیتے ہین۔ لیکن عرب اور افریقی کیون خاموش ہین معلوم ہوتا ہو کہ غلامی کی مسموم فضا نے ان کے لبون پہ مہر سکوت لگا دی ہو۔ اسے جزیرۃ العرب کو غیر مسلم اثر سے پاک کردینے کا خواب پریشان دیکھنے والو ذرا اس احساس قومی کو غور و تعمق سے دیکھو اور پھر کہو ع

مجھ کو اٹھنے دو روانہ ترا نالہ ہوجاے گا

جناب شاستری کی ہمنوائی مین ماڈریٹ اخبار انتقام کے جذبات مین سرشار گلا پھاڑ پھاڑ کر اپنے ہم خیال اصحاب کو احتجاجی دعوت عمل دے رہے ہین ؎

کیا لطف جو غیر پردہ کھولے	جادو وہ جو سر پر چڑھکے بولے

لوگ استعفے اور استعفون کی دھمکیان دے رہے ہین مگر کیا اس انتقامی جذبہ کا حشر بھی محصول نمک پر احتجاج جیسا ثابت ہوگا ایک ستم ظریف نے خوب کہا ہو کہ اعتدال پسندون کا انتقام بھی معتدل ہوگا لیکن ہمین یہ دیکھنا ہو کہ ایک محکوم قوم اعتدال پسند رہ کر استبدادی قوتون سے انتقام بھی لے سکتی ہو کہ نہین کیا آئرلینڈ کے مشہور محب وطن پارنل کی آئینی کوششین ناکامی کا منھ نہین دیکھ چکین۔ کیا وہی طریقہ قانون سازان ہند کے حیطۂ اختیار و اقتدار سے باہر ہو۔ ہمین تو مہاتما گاندھی کے الفاظ مین صرف یہ عرض کرنا ہو کہ ہندستانیون کی آزادی کی جنگ کا فیصلہ غیر ممالک مین نہین بلکہ خود بھارت ماتا کی سرزمین پر ہوگا

بعض لیڈران مسلمانون کو مشورہ دے رہے ہین کہ علما کا کام ختم ہوچکا اب اُن کو بساط شطرنج سے علیحدہ کردو۔ ہماری سمجھ مین نہین آتا کہ علما کو کیون دودھ کی مکھی کی طرح علیحدہ پھینکا جا رہا ہے، واقفان رموز سیاست کو شاید اب یہ حقیقت تلخ معلوم ہونے لگی ہو کہ مسلمانون کی سیادت رفتہ رفتہ اُن کے ہاتھ سے نکل کر طبقۂ علما کے ہاتھ مین پہونچ گئی ہو۔ بہرحال اگر اسلام مین سیاست و مذہب کا چولی دامن کا ساتھ ہو تو وہ جیسے ۱۹۱۵ء مین تھا ۲۳-۱۹۲۲ء مین بھی ہو اور انشاءاللہ تا ابد رہے گا،

ہمین یہ معلوم کر کے انتہائی مسرت ہوئی ہو کہ مسلم کلب لکھنؤ کے احیا کا کام چند تعلیمیافتہ

نوجوانون نے اپنے ذمہ لے لیا ہی، لکھنؤ مین مسلم نوجوانون کا نہ کوئی کلب ہی اور نہ کوئی لائبریری ایسی حالت مین مسلم کلب کو معرض وجود مین لانا قابل صد ستایش ہی۔ لیکن ہمین اندیشہ ہی کہ مسلمانون کا جوش بالکل سوڈا واٹر کا اُبال ہوتا ہی اور کہین یہ مردہ کو زندہ کرنے کی کوشش یکدم پھسپھسا کے بیٹھ نہ جائے بہرحال پبلک کو اس طرف توجہ کرنا چاہیے تاکہ مسلم کلب کے زندہ کرنے والون کی ہمت بڑھے،

ہماری جناب صدر و معتمد صاحبان سے گذارش ہی کہ جب تک اتنا معقول چندہ نہ ہو جائے کہ کلب مستقلاً اُس کی آمدنی سے چلایا جا سکے براہ کرم اِس مردہ کو دفن ہی رہنے دیجیے ورنہ تجہیز و تکفین کا بار پبلک پر گران گذرتا ہی،

جولائی کا پرچہ مدیر الناظر کی غیر حاضری مین بدیر شایع ہوا اور آج اگست کے پرچہ کی اشاعت بھی بتاخیر ہو رہی ہی جسکے لیے مین ناظرین کرام سے نادم ہون،

عرفت ربی بفسخ العزائم۔ جو جو ارادہ کیے قضا و قدر کے زبردست ہاتھ نے کسی نہ کسی طرح اُنکو فسخ کرنے پر مجبور کیا بہرحال جبکہ عم مکرم حاجی ظفر الملک صاحب کی واپسی مین بمشکل ایک عشرہ باقی رہ گیا ہی ستمبر کے الناظر کی طباعت کا انتظام کیا جا رہا ہی جسکی اشاعت مین اُن کی موجودگی سے انشاء اللہ العزیز تعجیل کی امید ہی سب سے بڑی دقت مضامین کی کمی ہی۔ فراہمی مضامین کے لیے باوجود اپنی کوتاہیون کے جو کچھ مین کر سکتا تھا وہ کیا۔ خطوط برابر لکھے مگر اکثر جواب یہی ملا کہ "انشاء اللہ جلد لکھون گا" عم مکرم سے روانگی کے وقت اکثر کرمفرماؤن نے قلمی اعانت کے وعدے کیے تھے مگر مجھے افسوس کے ساتھ اس حقیقت کا اعلان کرنا پڑتا ہی کہ باوجود پے در پے کوششون کے وہ وعدہ ہی وعدہ رہے اور مجھے اندیشہ ہی کہ وعدہ ہی رہینگے

ع - وہ وعدہ ہے کیا جو وفا ہو گیا

عم مکرم کا آخری گرامی نامہ جدہ سے آیا ہی۔ اُن کا ارادہ تھا کہ جہاز "شجاع" پر روانہ ہون مگر مکہ مکرمہ سے روانگی مین اتنی تاخیر ہوئی کہ جب وہ جدہ پہونچے تو "شجاع" روانہ ہو چکا تھا بہرحال اب جو جہاز جدہ سے روانہ ہوگا اُسمین یقیناً اُنکی واپسی ہو سکے گی۔ حج سے فارغ ہوتے ہی اُن کی طبیعت کسی قدر ناساز ہو گئی تھی تپ آنے لگی تھی مگر الحمد للہ کہ اب خیریت سے ہین اور جو ضعف و نقاہت بخار سے ہو گیا تھا وہ بھی مکہ مکرمہ کے کیا یہ قیام سے دور ہو گیا

(معاون مدیر)

فرامین بادشاہ اورنگ زیب عالمگیرؒ

شاہنشاہ اورنگ زیب عالمگیر نوراللہ مرقدہ کے متعلق جو غلط روایات اور بے بنیاد الزامات جن سے بادشاہ ممدوح کو ایک متعصب فرمانروا ظاہر کرنے کی کوشش کی گئی تھی، اُن کی تردید علامہ شبلی کے موشگافِ قلم سے کما حقہ ہوچکی ہے لیکن ان روایات والزامات کی عملی تردید اُن فرامین سے بھی ہوتی ہے جو اُس کے زمانۂ حکومت میں نافذ ہوئے اور جن کا خاص تعلق اہل ہنود خصوصاً برہمنوں اور اُن کے معابد کی حفاظت و نگہداشت سے تھا۔ ہندوستان میں اِس وقت بھی اکثر قدیم الخاندان ہندوؤں کے پاس اِس قسم کے شاہی نوشتے موجود ہیں اور اگر کوئی محقق طلب صادق سے کام لیکر اُن کی تلاش و جستجو میں سعی کرے تو یقیناً یہ کافی تعداد میں مل سکیں گے،

اِس موقع پر میں شاہنشاہ جنت مکان کے دو فرامین کا ذکر کسی قدر اختصار سے قلمبند کرنا چاہتا ہوں۔ ایک وہ ہے جسکے اندر بنارس کے معابد ہنود کی محافظت اور برہمنوں کے حقوق کی نگہداشت کے متعلق ہدایات مندرج ہیں۔ مسٹر راجن راجن سین نے غالباً ۱۹۱۲ء میں اس فرمان کی بچشم خود زیارت کرنے کے بعد ایشیاٹک سوسائٹی بنگال کے رسالے میں اسکی نسبت ذیل کے الفاظ میں روشنی ڈالی تھی :۔

"مسٹرس سعید برادرس فوٹو گرافر بنارس نے مجھے شاہنشاہ اورنگ زیب کے ایک فرمان کا فوٹو دیا، کہ جس میں بنارس کے مندروں وغیرہ کی حفاظت کا ذکر تھا . . . . . مجھے اصل فرمان کے دیکھنے کا موقع ملا۔ بنارس کے محلہ منگلا گوری میں گوپی اُپادھیا ایک برہمن رہتا تھا جسکے پاس نسلاً بعد نسل یہ نوشتہ شاہی چلا آرہا تھا، اُس کے بعد اسکے نواسے منگل پانڈے کو اپنے نانا کے کاغذات ملے۔ یہ منگل ایک گھاٹیا برہمن ہے جو دریا کے گھاٹ پر اشنان کرنیوالوں کی پوجا پاٹ کا منتظم ہے، کسی موقع پر اُسے ضرورت پیش آئی کہ اس گھاٹ پر بیٹھنے کا اپنا حق ثابت کرے اور اس طرح یہ بیش قیمت نوشتہ روشنی میں آیا۔

مسٹر موصوف آگے چلکر لکھتے ہیں :۔

یہ فرمان ۲ فیٹ ½ ۱ انچہ لمبا اور ۱ فٹ ½ ۵ انچہ چوڑا ہر اور بہت اچھی حالت مین ہر عبارت سیاہ روشنائی سے لکھی ہوئی ہر۔ پیشانی پر طغرا سُرخی سے لکھا گیا ہر۔ طغرا کے بائین طرف اورنگ زیب کی مہر ہر۔ پشت پر ایک مختصر چٹھی ہر جس سے ظاہر ہوتا ہر کہ شہزادہ سلطان محمد بہادر کے توسط سے یہ بھیجا گیا تھا۔

اس فرمان شاہی کی نقل حسب ذیل ہر:۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم

منشور لامع النور اورنگ زیب شاہ بہادر غازی

محمد اورنگ زیب شاہ
بہادر غازی ابن صاحبقران ثانی

لایق العنایت والمرحمت ابوالحسن بالتفات شاہانہ اُمیدوار بودہ بداند کہ چون بمقتضاے مراحم ذاتی و مکارم جبلی ہمگی ہمت والا نہمت و تمامی نیت حق طویت با مر رفاہیت جمہور انام و انتظام احوال طبقات خواص و عوام مصروف ہست و از روی شرع شریف و ملت حنیف مقرر چنین است کہ دیرہاے دیرین برانداخت نشود و بتکدہا تازہ بنا نیابد۔ و درین ایام معدلت انتظام بعرض اشرف اقدس وارفع اعلی رسید کہ بعض مردم از راہ عنف و تعدی بہنود سکنۂ قصبہ بنارس و برخے اسکنہ دیگر کہ نواحی آن واقع است و بجماعہ برہمنان سدنۂ آن محال کہ سدانت بُت خانہا قدیم آنجا بآن ہا تعلق دارد مزاحم و معترض میشوند و میخواہند کہ ایشان را از سدانت آن کہ از مدت مدید بانہا متعلق است باز دارند و این معنی باعث پریشانی و تفرقۂ حال این گردہ میگردد۔ لہذا حکم والا صادر میشود کہ بعد از ورود این منشور لامع النور مقرر کنند کہ من بعد احدے بے حساب تعرض و تشویش باحوال برہمنان و دیگر ہنود متوطنہ آن محال نرساند تا آنہا بدستور ایام پیشین بجا و مقام خود بودہ بجمعیت خاطر بدعاے بقاے دولت و خدام داد ابد مدت ازل بنیاد قیام نمایند۔ درین باب تاکید دارند بتاریخ ۱۵ شہر جمادی الاول سنہ ۱۰۶۹ ہجری نوشتہ شد برسالہ نواب قدسی القاب، نوبادۂ بوستان خلافت، ثمرۂ شجرۂ رفعت، چراغ دودمان اُبہت، فروغ خاندان شوکت، قرۂ باصرۂ دولت و اقبال، طرۂ ناصیۂ حشمت

واجلال، گرامی نسب، سمی المکان المدوح بلسان العبد والحر شہزادۂ نامدار کامگار والا تبار محمد سلطان بہادر

عـــــا زی
زیب شاہ بہادر
جہـ

بہادر ابن محمد ادر
سلطان محمـــد

(۲)

ذیل میں شاہنشاہ اورنگ زیب کے ایک مطول فرمان کی نقل پیش کی جاتی ہے جو فی الحال رئیس پڈرونہ ضلع گورکھپور کے قبضہ میں ہے اور جس کو ریاست مذکور کے استقرار حقوق کا قبالہ سمجھنا چاہیئے۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

(طغرا بخط عربی)

(مہر شاہی)

درین وقت فرمان والاشان شرف صدور یافت کہ مبلغ پنجہزار پانصد روپیہ جمع موضع کہیپا وغیرہ سی و سہ موضع دربست معمولہ پرگنہ سدہوہ سرکار جونپور مضافات صوبہ الہ آباد در وجہ انعام نانکار نا تھوزمیندار پرگنہ کہ مالگذارست و شیوۂ رعیت گیری را شعار خود ساختہ در چبوترہ عمال و جاگیرداران حاضر می باشد از فصل خریف ییلانت ئیل حسب الضمن مقرر باشد کہ حاصلات مواضع مذکورہ را بامتعلقان صرف معیشت نمودہ بدعای بقای دولت روز افزون اشتغال نماید و در سر براہی و ازدیاد آبادانی مقید باشد. باید کہ حکام و عمال و جاگیرداران و کروریان حال و استقبال مواضع مزبورہ را بتصرف او واگذارند اصلا و مطلقا تغیر و تبدیل بدان راہ ندہند و بعلت مالوجہات و سایر جہات و اخراجات مثل قلعہ و حریبانہ و ضابطہ و کل تکالیف دیوانی و مطالبات سلطانی مزاحم نشوند کہ بفراغ خاطر در آبادانی پرگنہ مقید باشد. بتاریخ نہم شہر شعبان المعظم سنہ ۲۷ جلوس معلی تحریر یافت۔

شرح یادداشت واقعۂ شاہی روز سہ شنبہ بست و چہارم شہر ربیع الثانی سنہ ۲۵ جلوس والا موافق سنہ ۱۰۹۳ ہجری مطابق امرداد ماہ آلہی برسالہ موتمن الدولۃ العلیہ السلطنۃ البہیہ عمدہ وزراے رفیع الشان زبدۂ خوانین بلند مکان شایستہ انواع عنایت سزاوار اصناف مرحمت خان سعادت نشان جملۃ الملکی مدار المہامی اسدخان و نوبت واقعہ نویسی کمترین بندگان درگاہ خلایق پناہ حبیب اللہ قلمی میگردد کہ بعرض مقدس معلےٰ رسید کہ تھوز معیندار پرگنہ سدہوہ سرکار جونپور صوبہ الہ آباد مالگذار و در تنخواہ سرکار والا است حکم جہان مطاع عالم مطیع صادر شد کہ مبلغ پنجہزار و پانصد روپیہ جمع دام کھیپا وغیرہ سی و سہ موضع بہ نسبت عملہ پرگنہ مذکور در وجہ انعام او را مرحمت فرمودیم واقعہ شاہی ۱۵ شہر ربیع الثانی سنہ ۲۵ مطابق یادداشت قلمی شد ....

تفصیل مواضع :

پڈرونہ ضلع گورکھپور مین ایک تعلقداری ہے جسکی ایک مفصل تاریخ مولوی عبدالغفور فاروقی مرحوم مغفور نے شجرۂ شاداب کے نام سے مدون کی ہے جس کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ اس ریاست کے ساتھ شاہان مغلیہ کے کیا کیا احسانات رہے ہین۔ مولوی صاحب مرحوم کسی زمانہ مین سب ججی کے عہدہ پر ممتاز تھے اور اِسی سلسلہ مین انھین ایک عرصہ تک ریاست پڈرونہ کا منیجر رہنا پڑا اور آپکے زمانۂ انتظام مین ریاست کے کاروبار مین نمایان ترقی ہوئی جسکا احساس موجودہ رئیس کو سُنا جاتا ہے بیحد ہے۔ ریاست کے پاس قدیم شاہی اسناد کا ایک کافی ذخیرہ ہے اور اُن مین زیادہ تر بادشاہ عالمگیر کے عہد کے ہین جنکے متعلق مرحوم مندرجۂ ذیل معتدل الفاظ مین فرماتے ہین :۔

شاہنشاہ عالمگیر مین ہرچند شاہجہان کی سی فیاضی اور اکبر شاہ کی سی یکرنگی ہندو اور مسلمانون کے ساتھ نہ تھی مگر پھر بھی اُن کا دربار دولت ہند و خیر خواہون کے لیے بالکل بند نہ تھا .... معزز خاندان کے مہذب آدمی جن کے صلات عطایاے شاہی سے بہرہ مند ہونے کے لائق تھے اور خوش نصیبی کے ساتھ بہرہ مند بھی ہوے، وہ ابتک شکرگذاری کے ساتھ شاہان سلف کو ادب کے ساتھ یاد کرتے ہین چنانچہ ہم نے ایک تحریر راے الیسری پرتاب راے کی دیکھی ہے جسمین اُنھون نے

شاہنشاہ عالمگیر کا نام ان الفاظ کے ساتھ لیا ہے "ظل سبحانی خلیفۃ الرحمانی پیر و دستگیر حضرت اورنگ زیب شاہ غازی"

ان واقعات پر ٹھنڈے دل سے غور کرو، اور انصاف کے جذبات کو اپنے دل میں جگہ دو پھر ایمانداری کے ساتھ اگر کہہ سکتے ہو تو کہو کہ

"عالمگیر ہندو کُش تھا، ظالم تھا ستمگر تھا"

سید محمد فاروق (شاہ پوری)

سنہ ۱۹۲۰ء میں جبکہ تحریک ترک موالات اپنے شباب پر تھی اور کراچی کے تاریخی مقدمہ کی وجہ سے جگت گرو سری شنکراچاریہ جی کا نام ہر ہندوستانی کی زبان پر تھا، سری شنکراچاریہ جی سے ایک ملاقات کے دوران میں ہندو مسلم اتحاد پر گفتگو آئی۔ سلسلۂ بیان میں معلوم ہوا کہ اسی قسم کے چند فرامین صاحب موصوف کے پاس بھی محفوظ ہیں۔ اُنھوں نے یہ بھی فرمایا کہ میں تمام ہندو پبلک کو اطلاع عام دیتا پھرتا ہوں کہ مسلم فرمانرواؤں کی بے تعصبی کا ثبوت اگر انھیں چاہیے تو میرے سجادہ خاص شاردھا پیٹھ میں آکر ان فرامین شاہی کو بچشم خود ملاحظہ فرمالیں۔ جہاں تک مجھے معلوم ہوا ہے ان منشور سلطانی کا تعلق سلطنت میسور کے اُس مشہور فرمانروا سے ہے جسکو انگریز مورخین نے نہایت ہی متعصب لیٹرا اور سنگدل ظاہر کیا ہے۔ اسکولی تاریخوں کے پڑھنے والوں میں سے کون ہے جو نہیں جانتا کہ اُس کے دماغ کے مختصر کیمرہ میں ٹیپو سلطان کی کس قدر بھیانک اور تاریک تصویر منعکس ہے۔ کیا اچھا ہوتا کہ کوئی صاحب ان فرامین شاہی کے نقول حاصل کر کے اس دستاویزی شہادت کو مکمل کر دیتے

(ایڈیٹر)

ترک تعلق

(۱)

مغموم کا نام اکثر اخبارون رسالون اور کتابون مین نظر آتا اُسکے مضامین مین جدت، زبان کی صفائی، بیان کی خوبی غرض سب صفتین موجود ہوتین ناظرین کی نظرین اُس کے مضامین کا چھپنے سے انتظار کرتی رہتین. اکثر نومشق مضمون نگارون کا قاعدہ ہو کہ جب وہ علمی و ادبی میدان مین اترتے ہین تو گمنام رہ کر دیکھنا چاہتے ہین کہ ہمارے مضامین کے متعلق پبلک کی کیا راے ہو لیکن مغموم اس قاعدہ کا پابند نہ معلوم ہوتا تھا۔ اسکو مضمون نویسی کرتے، نظمین لکھتے کم و بیش سات آٹھ برس ہو چکے تھے۔ وہ ہر مہینہ تین چار مضمون ضرور لکھتا۔ اِس عرصہ مین اُس نے ادبی و علمی دنیا مین بہت کچھ مقبولیت حاصل کر لی تھی. لیکن خدا جانے کیا بات تھی کہ وہ اپنی ہستی کو مغموم کے پردہ مین چھپاے ہوے تھا۔ دنیا کا قاعدہ ہو کہ لوگ دوسرون کے رازون کو معلوم کرنے کی اتنی ہی کوشش کرتے ہین، جتنی اپنے رازون کو چھپانے کی لیکن مغموم کی ہستی معلوم کرنے کی جتنی کوششین کیگئین بیکار ثابت ہوئین۔ اخبارون اور رسالون کے ایڈیٹرون سے اُس کا پتہ پوچھا گیا اور اُنھون نے نہایت خوشی سے اُس کا پتہ لکھ بھیجا لیکن اُس پر جو خطوط بھیجے گئے اُن مین سے ایک کا بھی جواب نہ آیا

(۲)

مغموم کی نامعلوم ہستی کا پتہ نہ چلنا تھا نہ چلا۔ ایک دن مین ایک مشہور رسالہ مین مغموم کی ایک تازہ نظم پڑھ پڑھ کر اُس کا لطف اُٹھا رہا تھا۔ کہ میرے ایک دوست مجھسے ملنے آئے۔ اُن کا نام تصدق حسین تھا۔ وہ میرے بہت بے تکلف دوستون مین سے تھے۔ اور نیز اُن کا زمانہ طالب علمی مین ساتھ بھی رہ چکا تھا۔ مین نے اُنکو بھی مغموم کی تازہ نظم "نالۂ غم" پڑھکر سنائی اُنھون نے نظم کی بہت تعریف کی اور میرے مذاق سلیم کی داد دی لیکن دبی زبان سے دو ایک جگہ اعتراضات بھی کیے. مین نے اُن اعتراضات کا جواب دینے کی کوشش کی۔ غرض ہم دیر تک گفتگو کرتے رہے، لیکن گفتگو زیادہ تر مغموم ہی کے متعلق تھی۔ دوران گفتگو مین میرے دوست نے

سوال کیا کہ آپ مغموم سے واقف بھی ہین؟ مین نے لاعلمی ظاہر کی۔ اور کہا کہ اکثر اُن کے مضامین نظر سے گذرتے ہین، نظمین دیکھنے مین آتی ہین۔ لیکن باوجود انتہائی کوشش کے مین یہ نہین معلوم کر سکا کہ یہ ہین کون صاحب؟ میرے دوست ایک خاص انداز سے مسکرائے۔ اور کہنے لگے "بھائی معاف کرنا، ایک خاص وجہ سے مین نے اسے صیغۂ راز مین رکھا تھا مغموم اور تصدق ایک ہی ہستی کی دو نام ہین۔ حیرت کی وجہ سے میرے ہاتھ سے رسالہ چھوٹ پڑا اور دیر تک اُن کا مُنھ تکتا رہا

(۳)

میرے دوست نے کہا تعجب کی کوئی بات نہین۔ مین تمام واقعات کو تمھارے سامنے بیان کیے دیتا ہون۔ قریب چار برس کے ہوے جب مین ایک مکان کے قریب سے ہو کر گذر رہا تھا۔ شام ہو رہی تھی، سورج غروب ہونے کو تھا۔ مین حسب معمول تفریح کے لیے باغ کی طرف جا رہا تھا۔ لیکن جب مین اُس مکان کے قریب پہونچا، تو مین نے سُنا کہ کوئی بیری ایک نظم نہایت شیرین آواز اور خوش الحانی سے گا رہا ہے مین اُس مقام پر ٹھہر گیا اور اُسکے سُننے مین ایسا محو ہوا کہ کچھ ہوش نہ رہا۔ جب گانا ختم ہوا مین وہان سے بادل ناخواستہ روانہ ہوگیا، اب مین نے یہ طریقہ اختیار کیا کہ روز شام کے وقت اُدھر سے گذرتا اور کان اُسی نغمۂ جانفزا کے سننے کے مشتاق رہتے۔ روز تو نہین لیکن کبھی کبھی وہ روح پرور آواز ضرور کانون مین آجاتی تھی۔

"مین نے تفتیش کی کہ آخر اِس پردۂ زنگاری کی آڑ مین کون ہے؟ بڑی کوشش کے بعد پتہ لگا کہ مکان ایک وکیل صاحب کا ہے، اور اُن کی صاحبزادی جو نہایت تعلیم یافتہ ہین، موسیقی مین بھی دخل رکھتی ہین۔ مجھے یہ بھی معلوم ہوا کہ اُن کی شادی کی تجویز ہو رہی ہے۔ اور ایک خوش قسمت نوجوان کا انتخاب بھی ہو گیا ہے۔ تم جانتے ہو کہ مین ابتک مجرد زندگی بسر کر رہا ہون گو کہ امید کم تھی، لیکن مین نے بھی سلسلہ جنبانی شروع کی۔ میری خوش قسمتی کہ مجھ کو ترجیح دی گئی اور پہلی نسبت چھوٹ گئی اس کے بجاے کہ مین خود وکیل صاحب سے ملنے جاتا، مین نے مناسب سمجھا کہ اپنی تصویر وکیل صاحب کے پاس بھیجدون۔

"تصویرین میرے پاس پہلے سے بھی موجود تھین۔ لیکن وکیل صاحب کے پاس بھیجنے کے لیے مین نے نئی تصویرین کھنچوانے کا ارادہ کیا اور اِس غرض سے شہر کے اعلیٰ ترین فوٹوگرافر کے پاس گیا،

(۴)

"فوٹوگرافر نے نہایت خندہ پیشانی سے میرا استقبال کیا، اور تصویر کھینچنے کے لیے مجھے دوکان کے پچھلے حصہ مین لے گیا۔ جب مین کرسی پر بیٹھا تو مجھسے فوٹوگرافر نے کہا "جناب آپ اپنی بائین ٹانگ اُوپر کو اُٹھا لیجیے اور ایک آنکھ بند کر لیجیے" مین نے اُسکو تیز نظر سے دیکھا اور دو چار سخت باتین بھی کہین۔ اِس پر اُس نے جیب سے ایک بڑا سا تیز چاقو نکالا اور کہا "یا تو میرے کہنے کے مطابق عمل کیجیے ورنہ یہان سے زندہ نکلنا غیر ممکن ہے"

"بھائی اُس وقت مجھے معلوم ہوا کہ واقعی جان بڑی پیاری ہوتی ہے۔ مین نے اسکی ہدایت پر عمل کیا۔ اُسکے بعد اُس نے مختلف مضحکہ خیز حالتون مین میری تصویرین کھینچی۔ کیونکہ مین اُسکے حکم ماننے پر بالکل مجبور تھا، اور وہ جو کہتا تھا مجھے طوعاً و کرہاً وہی کرنا پڑتا تھا۔

"جب ظالم فوٹوگرافر اپنا کام کر چکا، تو اُس نے مجھے کرسی سے اُٹھنے اور اپنے گھر کا رستہ لینے کی اجازت دی۔ جب مین چلنے لگا تو اُس نے کہا کہ مجھے آپ پاگل نہ خیال کرین مین نے انتقام لے لیا ہے۔ اور انتقام کی سب سے عمدہ تدبیر یہی تھی۔ مین نے پوچھا کہ آخر مین نے تمھارا کیا نقصان کیا ہے؟" اُس نے جواب دیا کہ اِس سے بڑھکر اور کیا نقصان ہوگا کہ تم نے میری لگی لگائی نسبت چھڑوا دی خیر اب تم وکیل صاحب کے ہان شادی کر لوگے تو دیکھون گا"

"مین وہان سے چلا آیا اور چاہا کہ کسی دوسرے فوٹوگرافر سے تصویر کھنچوا کر وکیل صاحب کے ہان بھیجون لیکن مجھے معلوم ہوا کہ اِس واقعہ کے آٹھ گھنٹہ بعد میرے نام سے بارہ تصویرین وکیل صاحب کے پاس پہونچ گئین اور گو وکیل صاحب اسوقت اپنے کمرے مین اکیلے تھے لیکن دیر تک اُن کے کمرہ سے قہقہون کی آواز آتی رہی،

"تیسرے دن، مشاطہ نے مجھے وکیل صاحب کا یہ قطعی فیصلہ سنا دیا کہ اب میرے ہان سلسلہ جنبانی کرنیکی کی ضرورت نہین" بھائی اِس واقعہ کو قریب قریب تین ماہ گذر چکے ہین۔ جب سے نہ مین کوئی نظم لکھ سکا ہون اور نہ مضمون، اگر یہی حالت رہی تو شاید، ادبی و علمی دنیا مغموم کو بہت جلد فراموش کر دے گی۔ اب تک میری کوشش ہوتی تھی کہ ہر مضمون پچھلے مضمون سے بہتر اور ہر نظم دوسری نظمون سے بڑھی ہوئی ہو امید یہ ہوتی تھی کہ شاید یہ "کسی" کی نظر سے گذرے لیکن اب تام امیدون پر پانی پھر گیا ہے۔ خدا جانے سنده نظم مین قدرت، اور دل مین لکھنے کا جوش پیدا ہوتا ہو"

عاکی لکھنوی

ایک غیب دان

یہ بات انسان کی سرشت مین داخل ہر کہ وہ ہمیشہ ان باتون کی ٹوہ اور تلاش مین رہتا ہر جو اُسکی دریافت اور حیطۂ ادراک سے مخفی یا اوجہل ہین مخفیات کے علم کے واسطے وہ بہت کچھ ہاتھ پیر مارتا رہتا ہر صرف اپنی بابت ہی نہین دوسرون کی بابت بھی اُسکو تلاش رہتی ہر وہ ہمیشہ اسی تلاش اور ٹوہ مین رہتا ہر کہ لوگون کے سینون کو ٹٹول کر دیکھے کہ ان مین کیا کچھ بھرا ہوا اور آنے والی گھڑیون مین کیا کچھ آنے اور ہونے والا ہر وہ خود بھی اپنی قسمت اور تقدیر کی دریافت مین بعض وقت سرگردان رہتا ہر ان خیالات اور ان تمناؤن کی سرسبزی کے واسطے وہ دور تک پہنچتا ہے جوتش اور نجوم سے کام لیتا ہر جفر اور رمل کا دروازہ بھی بے صبری کے ساتھ کھٹکھٹاتا ہر ہتھیلیون یا خطوط دست وپا اور خطوط پیشانی سے بھی کبھی استدلال کرتا ہر قیافہ اور استخارہ سے بھی کام نکالتا اور تفاول بھی کرتا ہر غرض مختلف طریقون سے غیب دانی کا شائق یا کشتۂ غیب دانی ہر۔ نہ صرف عوام ہی اس تمنا کے تختۂ مشق رہتے ہین بڑے بڑے خواص اور علم والے بھی اس کے گاہک ہین منجم وہ لوگ بھی ہین جو اپنے وقت مین بادشاہون کے دربارون مین گران بہا مواجب پاکر غیب دانی کا دم بھرا کرتے ہین۔ جہان اس وقت تہذیب اور علم وفضل اور سائنس کا بھی شور وشغب ہر وہان بھی اس قماش کے لوگ بہ کثرت پائے جاتے ہین وحشی نسلین بھی اس کی شایق رہتی ہین اُن کے دل ودماغ بھی اس ضرورت یا اس خبط سے خالی نہین ہین غریبون کے مقابلہ مین ہر ملک اور ہر قوم مین وہ لوگ زیادہ تر ان باتون کے جویان اور خواہشمند رہتے ہین۔ جو خصوصیت سے برکات دنیا سے متمتع ہوتے ہین جسطرح بعض لوگ ہمیشہ کیمیاگری اور سونا چاندی بنانے کے متوالے رہتے ہین اسیطرح اکثر لوگ کشتۂ غیب دانی بھی ہین جو لوگ غیب دانی پر یقین بھی نہین رکھتے وہ بھی کسی حد تک اس کے گاہک اور مشتاق رہتے ہین حکومتون نے جب کچھ اور ذریعہ غیب دانی کا نہ دیکھا تو جاسوسون اور خفیہ پولیس سے بھی کام لے لیا۔ کون سی اس وقت حکومت ہر جسمین یہ صیغہ ایک وسعت کے ساتھ کھلا نہین ہے سچ پوچھو تو حکومتون کا خفیہ پولیس رکھنا بھی ایک چلتا رازدار صیغہ ہر،

(خبط غیب دانی)

جسطرح بعض فلاسفرون نے بھی اس پر روشنی ڈالی ہے اسی طرح بعض ادبی ارکان بھی اس سے غافل نہین رہے ادباے زمان نے چیستانون اور معماؤن سے غیب دانی کا چسکہ ڈالنے مین کسر نہین رکھی بعض فلاسفرون کی یہ راے ہے کہ بعض مجانین جو بعض وقت ٹرین مار کر الاپنے رہتے ہین اُنکی قوتین بھی سمٹ کر کبھی کبھی غیب کی باتین کہجاتی ہین جو درست بھی گاہ گاہ نکلتی ہین ان کی راے مین جب بوجہ جنون کے قوتین اور جذبات یکسو ہو جاتے ہین تو ان کے ادراک مین بھی یہ ملکہ پیدا ہو جاتا ہے کہ وہ مغیبات پر بھی کچھ کہہ سکین اس سلسلہ مین مسمریزم والون کو رکھ لو وہ بھی قوتون کی اجتماعی ادراک ہونے کی وجہ ہی سے معمولون سے کچھ کچھ غیب کی باتین کہلوا لیتے ہین معمول اپنی قوتون اور ہوش وحواس سے بیگانہ ہوکر بولے جاتا ہے اور لبسا اوقات ناظرین یہ کہنے پر تیار ہوجاتے ہین کہ بعض باتین اُن کی درست بھی نکلتی ہین،

بعض وقت بعض لوگ کوئی لکڑی یا کوئی تصویر کسی کی چھاتی پر جو خواب مین ہو رکھکر یہ سنا کرتے ہین کہ اسکے اندرون سے کیا آواز آتی ہے ایسے لوگون کا یقین ہے کہ اس عمل سے بعض ہستیان جو معمول ہوتی ہین راز کی باتین کہدیا کرتی ہین۔

(راز)

اگرچہ بہت سی ہستیان اپنے راز کی باتین یا اپنے راز ساتھ ہی لیجاتی ہین لیکن بہت سے راز کھل بھی جاتے ہین اور یون دوسرے لوگ اس کوشش مین بھی رہتے ہین کہ کسی نہ کسی طرح راز کا انکشاف ہو سکے حکومتون کی جانب سے حروف اور الفاظ مقرر ہین راز کی باتین لکھی اور کہی جاتی ہین مگر بعض لوگ اُن پر بھی عبور کر لینے کی مشق رکھتے ہین راز کا دریافت کرلینا گویا ایک فتح شمار ہوتی ہے۔

(کانا پھوسی)

لوگ بہتیری کانا پھوسیان کرتے اور راز چھپانے کی کوشش مین رہتے ہین مگر یار لوگ بھی کچھ نہ کچھ اُڑا ہی لیتے ہین گویا دیوار ہم گوش دارد کی فلاسفی اور پیش بینی پر بھی عمل کرنے سے چوکتے نہین کتنی دنیا اور کتنی ایسی ہستیان ہین جو راز کا نکلنا پسند نہین کرتین اور اس پر بھی رازون کی

باتین کبھی نہ کبھی طشت از بام ہو ہی جاتی ہین راز دان بھی کھول ہی دیتے ہین۔

(ایک غیب دان کی خواہش)

دنیا یا انسانون کی منڈیون مین ایک ہی قسم کے لوگ نہین ہوتے جسطرح باغون اور جنگلون مین مختلف قسم کے درخت اور پودے ہوتے ہین یہی کیفیت انسانی پود اور انسانی نسلون کی بھی ہر کوئی کسی کام مین مصروف ہر تو کوئی کسی مین اگر ایک نمایش کرکے دیکھا جائے تو انسانی خیالات کے تنوع کا پتہ لگنا کچھ مشکل نہین،

ایک شائق غیب دان ہمیشہ اس فکر و تردد مین رہتا تھا کہ کسی نہ کسی طرح وہ غیب دانی سیکھ سکے جوتش اور نجوم بھی سیکھا جفر اور رمل مین بھی دست گاہ پیدا کی مگر بات تو اتہ پر چڑھی آخر مرمٹ کر ایک روز اسی خبط مین جو سو گیا تو خواب مین کیا دیکھتا ہر کہ ایک نورانی ہستی اُسسے ہنس ہنس کر یہ سند لیا دیتی ہر کہ آخر تمھاری آرزو سُنی گئی اور تمھین غیب دانی کچھ عرصہ کے واسطے دی جاتی ہر، یہ لو اسے حضرت من سینہ کے ڈبہ مین حفاظت سے رکھو اور وقت پر کام مین لاؤ۔

(غیب کی باتین)

کلید غیب کے ملتے ہی غیب دان کا سینہ کھل گیا جسطرف نظر پڑتی ہر اندرونی راز منکشف ہو جاتے ہین، اس نعمت کے ملنے سے غیب دان کی خوشی کی کوئی حد نہ رہی رہ رہ کر غیب دانی سے کام لینا شروع کیا نہ کچھ ہینگ لگی نہ پھٹکری یون ہی یہ کمال حاصل ہو گیا جس شے کی نسبت خیال آتا جو شخص سامنے آتا اور دل چاہتا اسکی مخفی حالت کھل جاتی،

(سنتے چلو)

(غیب دان) کہو تو مین تمھارے سینہ کی باتین بتلا دون،

(کوئی) یہ کیسے ہو سکتا ہر سوائے رب العالمین کے اور کون غیب دان ہر،

(غ) یہ بھی کوئی بات ہر کہو تو سب کچھ بتا دون

(ک) اچھا میرے دل پر نظر کرو اور بتاؤ۔

(غ) بہت اچھا۔ مین دیکھتا ہون کہ اس وقت تمھارے دل و دماغ مین مختلف خیالات دورہ کر رہے ہین ایک تو تم میری نسبت ہی یہ سوچ رہے ہو کہ یہ کیسا پاگل آدمی ہر غیب کون جان سکتا ہر

دوسرے تمھین یہ خدشہ بھی لگ رہا ہو کہ کل کیا ہوگا تو مین تمھین بتا دون کل تمھارا قرض خواہ آئے گا اور اسکی اور تمھاری لڑائی ہوگی سمجھے،

(ک) پہلی بات تو درست کہی مگر ہے قیاس اور کل کی بات کل دیکھی جائے گی.

(غ) اور بتلاؤن اس وقت تم اس فکر مین ہو کہ کس طرح قرضہ دور ہو بہتر ہو کہ قرض خواہ کو کوئی جُل دیا جائے،

(ک) یہ بھی ٹھیک

(غ) اور کیون کل تمھارے گھر مین ایک جھگڑا ہوا اور تم نے فلان .... کی نسبت سوچا کہ اگر وہ نہ مانے تو اُس کے ساتھ یون کیا جائے،

(فلان) این میری نسبت یہ بات۔ ایک ہی کہی،

یہ کہا اور دہم سے (ک) کو پکڑ لیا اور دونون گتھم گتھا ہو گئے

(غ) غیب دان یہ دیکھ کر حیران سا رہ گیا اور پوچھتا یا کہ کیون یہ راز بتا دیا،

ان ہی خیالات مین تھا کہ (ک) نے غیب دان کو پکڑ لیا اور کہا کہ او کم بخت تو خواہ مخواہ لوگون مین لڑائی ڈلواتا ہو تو کہان کا غیب دان آگیا اسپر فلان بھی اُس کا گلو گیر ہو گیا یہ دیکھ کر غیب دان پاؤن سر پر رکھ کر بگ ٹٹ بھاگا اور گھر مین جا چھپا،

گھر مین پہنچتے ہی دیکھا کہ بیوی چولھے پر بیٹھی رو رہی ہو سینہ اور دل پر جو نظر پڑتی ہو تو کیا دیکھتا ہو کہ بیوی کا دل ایک خاص صدمہ کی وجہ سے ماؤف ہو پوچھنے پر کچھ بتلاتی نہین مزید غور سے پتہ لگتا ہو کہ بیوی بعض باتون سے تنگ ہو کر میکے مین جانا چاہتی ہو،

(غ) کیون تو میکے جانا چاہتی ہو،

(ب) نہین۔

(غ) نہین کیون، مین تمھارے دل کی بات کہہ رہا ہون سچ کہو،

بیوی خاموش رہتی ہو غیب دان خاوند سر پر ایک چپت رسید کرتا ہو۔ غوغا سُن کر بیوی کا بھائی اور باپ آجاتے ہین اور گتھم گتھا ہو کر غیب دان کو خندق مین پر گرا دیتے ہین۔ غیب دان سر بغل مین لیکر بھاگتا ہو اور بازار مین جا کر دم لیتا ہو،

پولیس کا افسر بدحواسی میں بھاگتے ہوے دیکھ کر غیب دان کو بازار میں کھڑا کر لیتا ہی

(پ) کیا بات ہی اور کیا واقعہ ہی یون بھاگے جاتے ہو،

(غ) کچھ بات نہین مین تمھارے دل کی تختی پڑھ رہا ہون، تم فلان تفتیش مین فلان ملزم سے اتنا مال لے چکے ہو اور اب اس فکر مین ہو کہ کوئی شکایت نہ کر دے،

(پ) او بدحواس بدمعاش مجھپر یہ الزام لگانے سے تجھے شرم نہین آتی

(غ) مین تو تمھارے دل کی بات کہہ رہا ہون۔

پولیس افسر زور سے ایک تھپڑ جو مارتا ہی تو خود بدولت غیب دان دہم سے زمین پر گر جاتے ہین، پولیس افسر خاموشی سے اپنی راہ لیتا ہی غیب دان اُٹھکر اپنے ایک دوست کے گھر مین گرتا پڑتا پہنچتا ہی تو کیا دیکھتا ہی کہ میان بیوی دونون ایک میز کے گرد بیٹھے ہوے کسی خانگی معاملہ پر غور کر رہے ہین آپ کی پہلی نظر جو دونون کے سینہ پر پڑتی ہی تو ساری حقیقت کھل جاتی ہی۔

(دوست) کہان سے آئے اور کیون حیران کھڑے ہو،

(غ) مین حیران ہون کہ تم اس وقت خواہ مخواہ کس کشمکش مین پڑے ہو یہ کام نہین ہونیکا،

(دوست) تم کس طرح کہتے ہو،

(غ) مین دلون کی باتین جان سکتا ہون کیون سچ نہین ہی،

(دوست کی بیوی) سچ تو ہے مگر کیا تم اس قابل ہو کہ کسی شریف کے گھر مین آسکو بدبخت دیکھتے نہین ہو اسد میان دلون کی سب باتین جانتا اور دیکھتا ہی اور کسی پر ظاہر نہین کرتا تم گھر بہ گھر بھیری بھیری کر کے لوگون کی پردہ دری کرتے پھرتے ہو۔

(دوست) نکل جاؤ کم بخت تم ہی بڑے غیب دان آگئے۔

(غ) مین تو جو کچھ دلون مین دیکھتا ہون وہی کہتا ہون اور بے کم و کاست کیون جو کچھ کہا ہی ایمان سے کہو وہ درست نہین

(دوست) مصیبت تمھارے ایمان کے سر پر خدا کی مار۔ غصہ مین آکر دوست کی بیوی نے اتنی گالیان دین کہ گویا گالیون کی ساری ڈکشنری ہی ختم کر دی کانپتے ہوے حضرت غیب دان جلدی جلدی گھر کی چار دیواری سے باہر نکلے تو دم مین دم آیا۔ راہ جاتے ایک ناواقف شخص مل گئے،

رہ رو کے دل پر جو نظر پڑتی ہے تو بیاختہ بول اُٹھتے ہین،

(غ) او جانے والے کس خیال مین جاتا ہو دیکھ اور سُن تو ورثہ لینے کے واسطے کیا کچھ سوچ رہا ہے اگر مین تیرے شر کا اور ثہ کو بتا دون تو کیا ہو بات سچی تھی رہرو حیران ہوکر بولا تم کون ہو جو راہ چلتے دلون کی تختیان پڑھتے پھرتے ہو۔

(غ) تم کہو تو سہی کیسی پتہ کی کہی ہے،

رہ رو غصہ مین آکر پکڑتا ہے اور دھپ مارتا ہے اور خود ز د جکڑ ہو جاتا ہے حضرت غیب دان اپنا سا مُنھ لیکر روان روان گھر کی راہ لیتے ہین گھر مین جاکر دیکھتے ہین نہ بیوی ہے نہ بال بچہ ہے کتے اور بلیان گھر کا جائزہ لے رہی ہین۔ یہ کیفیت دیکھ کر گھٹنون مین مُنھ دیکر بیٹھ گئے۔ نہ جائے رفتن نہ راہ ماندن۔

(اپنے)

آنے والے دن کی تختی پر جو دیکھتے ہین تو اس مین کچھ اور ہی لکھا پاتے ہین نصیبون کو روتے اور واویلا کرتے ہین اس اُدھیڑ بُن مین تھے کہ وہی غیب کی کلید دینے والی ہستی آگئی اور غصہ سے کلید واپس لیکر چلتی بنی۔

(ہوش آگیا)

دو تین دن کی غیب دانی نے وہ لطف دکھایا کہ اگر اور دو روز رہتی تو غیب دانی کے نشہ مین جان ہی جاتی پشیمان ہوکر سجدہ مین گر کر دعا کرتے ہین،

(دعا)

اے رب العالمین اے سینون کو سلامت روی سے ٹٹولنے والے اے دلون کے پردون کو سکون اور حوصلہ سے کھولنے والے اے سب اسرار کے جاننے والے اے عالم الغیب اے غیب کی چابیان رکھنے والے، اے ستار اسرار غیب، اے سب مخفیات کے عالم اے سب رموز خفی وجلی کے اندازہ لگانے والے عالم الغیبی صرف تجھے ہی سجتی ہے اور تو ہی اس کا اہل اور بنانے والا ہے، تونے انسانون کو ہان ہم کو جو علم غیب نہین دیا ہے تونے جو ہمین بمصداق وما اوتیتم من العلم الا قلیلا ایک خاص حد تک علم دیا ہے اسمین بھی ایک حکمت ہے اب مجھے دو دن مین ہی معلوم ہوگیا کہ ہم اس کے اہل نہین ہین۔ ہماری زندگیان اسی صورت مین

طمانیت سے گذر سکتی ہین کہ جب ہم ایک دوسرے کے مخفی حالات اور اسرار سے واقف نہ ہون یا ایک خاص حد تک واقف ہون اور ہم آئندہ کی باتین نہ جان سکین کیونکہ ہم محافظ اسرار نہین ہین ہم وہ بات نہین رکھتے جو تو رکھتا ہر تو ہمارے عیوب کو جانتا اور اُن پر نظر کرتا ہر لیکن ایک دوسرے پر افشا نہین کرتا، اے غیب دان تو ہماری وہ باتین جانتا ہر جن کے اظہار سے ہماری زندگیان تلخ ہو سکتی ہین اور ہم ایک دوسرے کے مقابلہ مین ذلیل ہوتے ہین اے ستار عیوب تیری ہی قدرت ہر کہ تو دیکھتا اور جانتا ہر اور پھر افشا نہین کرتا، لون کی تختیان تیری نظر مین رہتی ہین اور تو اُنھین پردۂ غیب مین رہنے دیتا ہر اگر ہماری طرح تو بے حوصلہ ہوتا اور زبان قدرت دلون کے حالات علانیہ کہتی تو آج ہم ایک سخت مصیبت مین گرفتار ہوتے، اے قدوسون کے قدوس اے ستار العیوب اے دلون پر نظر کرنے والے مین کبھی بھی غیب دانی کی کوشش نہین کرون گا اور اگر کسی کا راز زندگی مجھے کسی طرح معلوم بھی ہو جائیگا تو اُس کے اظہار سے حتی الامکان بچون گا،

سلطان احمد

دل کی پاکیزگی ہمارا عمدہ سے عمدہ خزانہ، بڑی سے بڑی عزت اور شریف سے شریف جائداد ہر اس کا نام شعاع معرفت ہر (گلیڈسٹن)

دوسرے کے دل کو فتح کرنے کے لیے اس بات کی ضرورت ہر کہ تم اپنا دل اسکے کام مین لگا دو (گولڈ اسمتھ)

مین نے صرف ایک مدرسہ مین تعلیم پائی ہر اور وہ مدرسہ بھی "دنیا" ہر جسمین محنت اور مصیبت دو بڑے چست و چالاک اُستاد درس دیتے ہین (ہگ مر)

دُنیا مین کافی سے زیادہ عداوت ہر کافی سے زیادہ بغض و حسد، کافی سے زیادہ نفرت جیسے اتفاقی ہین وہ لوگ جو نیکی و ہمدردی کی لاف مارتے ہین سُن لین کہ وہ اس خلیج کے عرض کو بڑھانیکا موجب نبنین بلکہ عملی طور پر انکی زندگی کا مشن یہ ہر کہ وہ نفرت کو گھٹائین اور محبت کو ترقی دین (کولرج)

"ہمایون"

جنوبی ہند کی عظمت

سچ پوچھا جائے تو ہندوستان تاریخی نقطۂ نظر سے ایک معمہ ہی جو کبھی نہ حل ہوا ہے اور نہ آئندہ حل ہونے کی امید، قطع نظر اس سے کہ ہندوستان کو ایک برّاعظم کہا جائے یا ایک ملک، خود اس کا نام ہی ایک تشریح طلب مسئلہ ہی آج لفظ ہندوستان کو جن وسیع معنی مین استعمال کیا جاتا ہی یہ بہت بعد کی ترقی ہی ورنہ حقیقت مین ہندواستھان یا ہندوستان کا لقب مسلمانون نے صرف اسی حصۂ ملک کو دیا تھا جسے ہندو مصنفین آریہ ورت لکھتے آئے ہین۔

زمانہ قدیم مین سنسکرت کے ایک لفظ دکھشنا (جنوب) سے تمام جنوبی جزیرہ نما مراد لی جاتی تھی مگر آج دکھن کا ملک، صرف دریاے تاپتی سے دریاے تنگ بھدرا تک محدود سمجھا جاتا ہے، اور اس کے بعد جنوب مین تنگ بھدرا سے راس کماری تک ”دتا ملکم“ کا علاقہ ہی،

ابتداے تاریخ سے ہندوستان بدقسمت ہندوستان کو بیرونی حملون کے خطرے ہی نے کبھی اتنی مہلت نہ دی کہ وہ اپنی اندرونی پیچیدگیون کو سلجھانے کی طرف متوجہ ہوتا چنانچہ آج ایک ظاہر بین نگاہ شمالی ہند مین فوجون کی دھوم دھام، دربارون کا تزک و احتشام، عمارات کی شوکت و استحکام کو دیکھ کر ایسی خیرہ ہو جاتی ہی کہ وہ جنوبی ہند کو سکوت مردہ کا مرادف سمجھنے لگتی ہے مگر تاریخ کے بغور مطالعہ نے ثابت کر دیا ہی کہ یہ خیال حقیقت کے سراسر منافی ہی۔

آج یہ ایک مسلم حقیقت ہی کہ جو خصوصیت اور امتیاز جنوب کو حاصل ہی شمالی ہند کی تاریخ اس سے قطعی نابلد ملیگی۔ جسوقت شمالی ہند مین اٹھارہ پُرانون کا دور شور تھا۔ جنوب بھی علیحدہ اپنے پُران رکھتا تھا ابتدائی تین صدی عیسوی مین اس کی تہذیب و شایستگی نہایت عروج پر پہونچی ہوئی تھی تامل قوم کی تہذیب آرین لوگون سے بالکل جُداگانہ تھی اُس نے اپنی تامل زبان مین علم ادب کا اچھا ذخیرہ بہم پہونچا لیا تھا جسمین رزم و بزم کی نظمون سے لیکر فلسفہ تک کے مضامین فراہم کر لیے گئے تھے،

شروع شروع مین شمالی ہند کے جو جلا وطن جنوب مین آکر اقامت گزین ہو گئے تھے جب

اُنھون نے ذات پات کے مسلہ کو اُٹھایا ہے تو ان کی سخت مخالفت کی گئی اِس سے خیال ہوتا ہے کہ چھوت چھات کا یہ رواج جسپر اب جنوبی ہند مین کئی سو برس سے نہایت سختی کے ساتھ عمل درآمد ہو رہا ہے اسوقت بالکل ابتدائی اور ناکمل حالت مین تھا،

اس سے انکار نہین کیا جا سکتا کہ فن سنگ تراشی مین جو ترقی جنوبی ہند نے کی ہے وہ دنیا کے کسی حصہ مین نہین پائی جاتی، چلوکیا خاندان کی یادگارون مین غار ہاے اجنٹا، اب تک موجود ہین جو اُس وقت کی فن مصوری اور نقاشی کی اعلیٰ ترقی کا بزبان حال پتہ دے رہے ہین. یہ صنعت دکن مین فارس اور یونان سے لائی گئی تھی اور ایرانی سفیرون کی دکن مین آمد و رفت کی سند تاریخ سے بھی ملتی ہے، بقول چینی سیاح ہیون سیانگ یہ غار چھٹی صدی عیسوی مین راجہ پلاکشن ثانی نے اپنی قوت مادی کے اظہار کے لیے بنوائے تھے اور اسی راجہ کی زبردست طاقت تھی جس نے شمالی ہند کے راجہ ہرش وردہن کی فوج کشی کے وقت جنوب کے واسطے سد باب کا کام دیا۔

ایلورہ مین کیلاش کا مندر راسٹرکوٹ خاندان کے راجہ کرشن اوّل کے نام نامی سے منسوب کیا جاتا ہے، یہ قابل دید عمارت دنیا کے نادر عجائبات مین شمار کی جاتی ہے سنگتراشی کا اس سے بہتر نمونہ مشکل سے پیدا ہو سکے گا، لہذا کوئی قوم جسقدر بھی اس پر فخر و ناز کرے کم ہے اور اُس کے بانی کی جسقدر بھی عزت و توقیر روا رکھے تھوڑی ہے، راجہ اموگھ ورش اس خاندان کا سب سے زبردست راجہ مانا گیا ہے اُس نے ساٹھ برس سے زیادہ مدت تک حکومت کی، نوین صدی عیسوی کے اسلامی مورخین اسکو دنیا کی بڑی بڑی طاقتون مین چوتھے نمبر مین شمار کرتے ہین انین خلیفۂ بغداد فغفور چین اور شاہ روم (قسطنطنیہ) کی سلطنتین ایک دوسرے کی ہم پلہ تھین۔

جنوبی ہند مین اِسکے علاوہ اور بھی بکثرت مندر پائے جاتے ہین جین اور بدھ مت کی دیکھا دیکھی ہندوؤن مین بھی دیوتاؤن کے مندر پہاڑون مین تراش کر بنانے کا رواج ہو گیا تھا چنانچہ اکثر وشنو اور شیو جی کے مندر چھٹی صدی کی یادگار موجود ہین ان مین سے ایک بادامی مین راجہ منگلیش چلوکیا کا بنوایا ہوا اور دوسرا تنجور مین راجہ راجہ چولا کی شاندار فتوحات کی یادگار ہے،

یہ سچ ہے کہ دکن مین بھی حکومتون کے باہمی تنازعات نے ناگوار صورتین اختیار کی ہین، بڑی بڑی جنگون کا سامنا ہوا ہے۔ لیکن جو بات وہان قابل تعریف تھی وہ یہ ہے کہ آپس مین دو ایک

دوسرے کی ملکی آزادی، قومی عزت، خودداری و وقار کے خیالات کو مدنظر رکھتے تھے کسی کے مذہبی معاملات مین دخل دینا مندرون کو تباہ کرنا، یا صنعت و حرفت کے مٹانے کی کوشش کرنا بمنزلہ حرام سمجھا جاتا تھا قدیم تامل قوم مین غلامی کا نام و نشان تک نہ تھا چنانچہ میگستھینز لکھتا ہے کہ تمام ہندوستانی آزاد ہین اور تمام ملک مین ایک بھی غلام نہین ملتا۔

جنوب مین تمام سلطنتون کے پاس بڑے بڑے بحری بیڑے تھے اور ہمیشہ مشرق سے چینی مغرب سے عرب اور رومی تاجر آتے رہتے تھے؛ یہ لوگ یہان سے موتی، گول مرچ، فیروزہ، اور ہندوستان کی دیگر کارآمد اشیا لیجاتے تھے، اور اُن کے عوض سونا، چاندی اور اپنے اپنے ملکون کی دستکاری کے نمونے دے جاتے تھے۔ اور یہ امر بھی قابل وثوق ذرایع سے ثابت ہے کہ تیسری صدی عیسوی سے قبل جنوبی ہند مین رومی رعایا کی بکثرت نوآبادیان قائم تھین ان مختلف قومون کی آمدورفت کا اثر اُس زمانہ تہذیب اور شائستگی مین نمایان طور پر نظر آتا ہے،

ہم دیکھتے ہین کہ فن نقاشی اور مصوری کے ساتھ ساتھ سنسکرت علم ادب کی صنعت نے بھی خاصا عروج حاصل کرلیا تھا۔ اس کے علاوہ فنون سنگتراشی، ڈرامہ نویسی اور موسیقی نے بھی بہت کچھ ترقی کرلی تھی کہا جاتا ہے کہ اس وقت ڈرامہ کی دو قسمین تھین ایک وہ جو تامل یا دیسی کہلاتا تھا اُس مین ملک کی اندرونی حالت پر مختلف صورتون سے تبصرہ کیا جاتا تھا اُس مین حسن و عشق کی چاشنی بھی دی جاتی تھی، دوسرا ڈرامہ شمال کے آرین لوگون سے متعلق تھا۔ وہ بہت خشک اور غیر دلچسپ ہوا کرتا تھا۔ اُس کا میدان عمل محض شاہی خاندانون کے عروج وزوال تک محدود رکھا گیا تھا۔

جنوبی ہند کی سب سے بڑی خصوصیت اس کا مذہبی پہلو ہے۔ اور اسی پر تفصیل سے بحث کرنا ہمارے مضمون کا اصلی مقصد ہے۔ دکن مین مذہبی حالت نے واقعات کی تبدیلی کے ساتھ ساتھ بہت سی کروٹین بدلین۔ بدھ مت نے اول تو کئی صدی تک اچھی ہر دلعزیزی نہین پیدا کی اُسپر جین اور ہندو مذہب کی شدید جدوجہد نے اُس کو زیادہ اُبھرنے کا موقع نہ دیا۔ حتیٰ کہ بارھوین صدی عیسوی کے بعد سے اُس کا وجود و عدم یکسان سمجھا جانے لگا۔ اِس مین شک نہین کہ جنوبی ہند مین مہندر (اشوک کے بھائی اور بعض نے بیٹا لکھا ہے) نے تبلیغ کا فرض خوب ادا کیا۔ چنانچہ جو کچھ بھی

کامیابی بدھ مت کو جنوب مین ہوئی وہ سب اسکی اور اُسکے چند اور شریک کار مبلغین کی کوششون کا نتیجہ تھی۔

یہ آج تک تحقیق نہ ہوسکا کہ جین مذہب جنوبی ہند مین کیونکر آیا اور کون لایا مگر اتنا ضرور کہا جا سکتا ہے کہ بُدھ مت کے دوش بدوش جین مذہب بھی جنوب مین رائج ہوگیا، لیکن اسمین شبہ کی بالکل گنجائش نہین کہ جین مذہب نے ابتدا ہی سے جنوب مین نہایت استحکام حاصل کرلیا تھا اور سو برس تک اُس کو قائم اور برقرار رکھا؛ ساتوین صدی مین جب بدھ مت کا زوال شروع ہوا تو جنوبی ہند کو ہندو دھرم سے دوچار ہونا پڑا۔ اور کئی موقعون پر اُسکو اپنے نئے مقابل کا نہایت سختی اور زور شور کے ساتھ سامنا کرنا پڑا۔

راجہ اموگھ ورش۔ جین مذہب کا پیرو اور جین مت کے ڈگمبر فرقہ کا خاص مربی و سرپرست تھا ڈگمبر فرقہ کے جینیون نے جتنی جلد ترقی کی۔ وہ نہایت حیرت انگیز ہے اُسکے فدائیون مین سے دو روحانی رہنما جان سین اور گونابھدر قابل ذکر ہین اُنھون نے جنوب مین کئی راجاؤن کے عہد دیکھے اور بُدھ مت کے زوال مین ان دونون کے خاص ہاتھ تھے۔

لیکن ادھر بُدھ مت کو زوال شروع ہوا اُدھر ہندو دھرم نئے سرے سے جنم لیکر کھڑا ہوگیا۔ ہندو مذہب مین قربانی کی رسم پر کثرت سے چھوٹے چھوٹے رسالے تصنیف کیے گئے ہندو دھرم کے پرانون مین جو طریقے اور رواج درج ہین وہ عام طور پر پسند کیے جانے لگے، اور ہر مقام پر بڑے بڑے عالیشان مندر وشنو، شیوجی یا کسی دوسرے دیوتا کے نام پر تعمیر کرائے گئے۔ غرض یہ کہ جین مت اور ہندو دھرم کو ایک مدت تک چولی دامن کا ساتھ رہا پھر بھی اُن مین سخت دشمنی قائم رہی اور اُس زمانہ کی جتنی لڑائیان اور معرکے ہم کو معلوم ہوے ہین اُن سب مین یہ عداوت صاف جھلکتی ہے۔

۱۱۶۰ء مین دکن ایک مذہبی انقلاب سے یک بیک بیدار ہوجاتا ہے شیوجی کو ایک دوسرے معنی پہنا کر بسرشیوا یا لنگایت کے نام سے ایک نئے فرقہ کی بنیاد ڈالی گئی جو آج بھی پوری جماعت کے ساتھ موجود ہے اس وقت مین بجالا ایک جینی راجہ روبہ اقتدار تھا۔ اُس نے اس فرقہ کے دو بزرگون کی آنکھین نکلوا ڈالین۔ چنانچہ وہ اُس کی پاداش مین قتل کردیا گیا، جیسا قاعدہ ہے کہ مقدس لوگون کا خون نئے مذہب کے درخت کی آبیاری کیا کرتا ہے۔ یہ فرقہ بھی خود بجالا کے ایک برہمن بسونا

کے ہاتھون ترقی پکڑ گیا، اس فرقہ کے لوگون کی ایک معقول تعداد کنارے کے اضلاع مین اب بھی آباد ہی اور یہ لوگ شیو کے ایک خیالی مجسمہ کی پرستش کرتے ہین۔ ویدون کو مستند کتابین نہین تسلیم کرتے مسئلہ تناسخ کے قائل نہین، بچپن کی شادی کے خلاف ہین اور بیوہ کے بیاہ پر زور دیتے ہین اِن سب باتون کے علاوہ برہمنون سے سخت نفرت بھی کرتے ہین۔ حالانکہ خود اُن کے مذہب کا بانی ایک برہمن تھا،

اس جدید فرقہ کی رفتار نے جین مت کی ترقی کو بکایک روکدیا، کیونکہ تجارت پیشہ جماعتون مین اس نئے فرقے نے ایک روح پھونکدی اور اُسکے بیشمار پیرو بن گئے، صرف یہی ایک جماعت تھی جو جین اور بُدھ مت کی قوت بازو سمجھی جاتی تھی، لہذا جین مت کو اس سے بہت بڑا نقصان پہونچا اور بُدھ مذہب بالکل تیرہی مین جا لیٹا، اکثر راجاؤن نے وشنو کو اوتار مانا ہی اور اُسکی پوجا کو اپنے لیے فخر سمجھا، مگر بعد کے زمانے مین بعضون نے شیوجی کے مجسمہ کو بھی قابل پرستش تسلیم کیا ہی اُنھون نے بیل کی شکل کو اپنے خاندان کے لیے طرۂ امتیاز قرار دیا کیونکہ یہی اس دیوتا کی نشانی تھی،

۱۱۰۰ء مین ترچناپلی کے قریب جنوبی ہند کا سب سے بڑا فلاسفر رامانجا ظاہر ہوا اُس نے وشنو کے پردہ مین وحدانیت کی تبلیغ شروع کردی اس عہد مین چولا خاندان کا راجہ کولا تنگا حکمران تھا، وہ شیوجی پر ایمان رکھتا تھا اس لیے یہ لوگ اسکی دست برد سے بچنے کے لیے میسور کے علاقہ مین چلے آئے اور اُس کے مرنے تک جنوب مین قدم نہ رکھا۔ انھین کا یہ اثر تھا کہ ہوسالہ سلطنت کے راجہ وشنو یا تبیگا نے شیومت کو خیرباد کہکر وشنو دھرم اختیار کر لیا۔

الغرض یہ مثالیں ظاہر ہین کہ جنوبی ہند مین مذہبی رنگ ابتدا سے تاریخ سے برابر بدلتا رہا ہی یہان کی مذہبی روح کبھی مردہ نہین ہوئی، جنوب کسی وقت بھی اپنی ترقی کے خیال سے غافل نہین رہا بلکہ عمیق نظر سے دیکھنے والے جانتے ہین کہ وہ ہمیشہ صلح و امن کا گہوارہ اور روحانی طاقت کا علم بردار رہا ہی۔

اس مقام پر سوامی وویکانند کا ایک خط جو اُنھون نے اپنے ایک چیلہ کو سفر مغرب سے قبل لکھا تھا، ناظرین کے لیے خالی از دلچسپی نہ ہوگا، یہ خط کچھ عرصہ ہوا کہ پرابدھ بھارت مین شائع ہوا تھا اُس کا

ُردو ترجمہ حسب ذیل ہے،

"جنوبی ہند نے ہندو دھرم کو مسلمانون کے عہد مین بھی ایسا ہی پاک و محفوظ رکھا ہے جس طرح ان سے پیشتر رکھا تھا، یہ جنوب ہی تھا جس مین شنکر آچاریہ جیسے بزرگ پیدا ہوے اور وہ بھی ایسی قوم مین جو ماتھے پر بال رکھنا اور کھانے مین ناریل کا تیل ڈالنا اپنا طرۂ امتیاز سمجھتی تھی، یہی وہ ملک تھا جس نے رامانجا کو پیدا کیا اور مادھو متی کا مولد قرار پایا جدید ہندو مذہب بھی آج صرف اُنھین چند ہستیون کا زیر بار احسان ہے ورنہ چیتن کے پیرؤن مین ایک دشنو فرقہ ہی ایسا ہے جو مادھو فرقہ کا اصلاح یافتہ معلوم ہوتا ہے، قطع نظر اس کے شمالی ہند مین جو بعض مصلح مثلاً کبیر، دادو، نانک اور رام سانہی ہوے ہین تمام اُسی ایک شنکر آچاریہ کی صداے بازگشت تھے، رامانجا کے ماننے والے تم کو اجودھیا اور دیگر مقامات پر بکثرت ملین گے،

یہ جنوب کے برہمن شمالی ہند کے برہمنون کو حقیقی معنون مین برہمن تو کیا بلکہ پیر دبھی نہین سمجھتے، کیا تعجب جو کل اُن کو سنیاس سے بھی خارج کر دین، یہ مدراسی لوگ اب بھی تمام اہم ترین مذہبی مقامات پر پھیلے ہوے ہین، جنوبی ہند ہی کو یہ فخر حاصل ہے کہ جس وقت شمالی ہند کے لوگ مسلمان فاتحون کے مقابلہ مین اپنا مال و متاع، بیوی و بچون اور اپنے خاندانی دیوتاؤن کو چھوڑ چھوڑ کر جنگلون اور پہاڑون مین چھپتے پھرتے تھے اُس وقت بھی اُنھون نے وجیانگر مین اپنی علیحدہ سلطنت نہایت مستحکم بنیادون پر قائم رکھی تھی،

"اسی جنوب مین وہ غیر معمولی ذہانت کا شخص سیان آچاریہ پیدا ہوا۔ جس نے نہ صرف راجہ بوکا کی گدی کو برقرار رکھا، بلکہ مسلمانون سے بھی اپنی جنگی قابلیت کا اعتراف کرالیا، جسکے قابل قدر مشورون نے ریاست بیجےنگر کو پہلے سے زیادہ مستحکم کر دیا، اور جس نے اپنی خداداد لیاقت اور غیر معمولی محنت و جانفشانی سے چارون وید پر ایک ضخیم تفسیر لکھ ڈالی، اور جسکے حیرت انگیز ایثار و تحقیق کا نتیجہ ویدانت کا ایک رسالہ ہے پنچ داسی۔ اسی شخصیت کے ہاتھون اس ملک مین سنیاسی بدیارن منی (سمیان) وجود مین آیا۔

"یہ صوبہ مدراس اُس قوم کا مسکن ہے جسکی تہذیب دنیا مین سب سے زیادہ پُرانی ہے، اور جس کی ایک شاخ سومری نامی نے نہایت قدیم زمانہ مین دریاے فرات کے کنارون پر دور دور تک پھیلا رکھی تھی

جس کا علم نجوم، مذہبی فضل و ہنر، اصول زندگی، رسم و رواج وغیرہ وغیرہ سیریا اور بابل کی تہذیب و شائستگی کے لیے حقیقی سنگ بنیاد تھے اور آگے چلکر اُسی قوم کے مذہبی قصے کہانیاں عیسوی انجیل کے لیے اصل الاصول قرار دیے گئے،

ایک دوسری شاخ ان تامل لوگون کی مالابار ساحل پر پھیل گئی تھی، چنانچہ کہا جاتا ہے کہ حیرت انگیز مصری تہذیب اسی سرچشمہ سے نکلی تھی، بلکہ خود آرین لوگ بھی بہت سی باتون مین اسی تامل قوم کے احسانمند ہین، جنوب مین آج بھی وشنو اور شیوجی کے عالیشان مندران دونون فرقون کی عظمت و شان کا پتہ دے رہے ہین، ہندوستان کے سب سے بڑے وشنو مذہب نے بھی تامل کے ایک ذلیل ترین طبقہ ست کوپ مین جنم لیا جو تاڑ کے پنکھے بناتا تھا اور ہمیشہ جوگی رہا، لیکن آج تامل اور (بجاری) لوگ تمام وشنو فرقہ کا نہایت ادب واحترام کرتے ہین، اسوقت بھی ویدانت کے دویت، وسشٹ دویدا اور ادویت اصول اسی طرح قائم رکھے گئے، بلکہ انکی تعلیم و تلقین کا سلسلہ جتنا جنوبی ہند مین پایا جاتا ہے اور کہین نہ ملیگا، مختصر یہ کہ اب جتنی مذہبی تشنگی یہان غالب نظر آتی ہے کسی دوسری جگہ دشوار ہے"

جنوبی ہند کا مذہبی نقطۂ نظر ہمیشہ سب سے نرالا رہا ہے خصوصاً شمالی ہند کی تو ہمیشہ اُس نے اس معاملہ مین رہنمائی کی ہے، سوامی ودیکانندجی کا خط اس مسئلہ پر خاص روشنی ڈالتا ہے غرضیکہ سیاسی نقطۂ خیال سے جنوبی ہند کتنا ہی پیچھے کیون نہ رہ جائے مگر روحانی ترقیات مین شمالی ہند جنوب سے سبقت نہین لیجا سکتا،

مرزا مظفر حسین (علیگ)

رموز زندگی

دل من روشن از سوز درون ست جہان بین چشم من از اشک خون ست
ز رمز زندگی بیگانہ تر باد کسی کو عشق را گوید جنون ست

(علامہ اقبال)

ساکنین خلا کے عجائبات

تحقیقات فلکی کے تازہ ترین انکشافات

یہ سوال اکثر پیدا ہوتا ہے "خلا کے اندر کیا ہے؟" اور اُس کا مختصر جواب ارباب تحقیقات کی طرف سے یہ ملتا ہے "خلا کے اندر ستارے ہین کہ جن کا دوسرا نام اجرام فلکی" اور "ما فی السما ہے"، لیکن اشتیاق تجسس ایسے مختصر اور عامیانہ جواب سے اطمینان حاصل نہین کر سکتا۔ اس وجہ سے تازہ ترین فلکی تحقیقات کی روشنی مین اجرام فلکی کا اجمالی تذکرہ امر ضروری ہے،

گذشتہ دس سال کی فلکی تحقیقات سے باوجود جنگ اعظم کے دہشت ناک انہماک سے عالم بالا کے ایسے اسرار منکشف ہوے ہین، کہ جن سے اہل علم بیگانہ تھے۔ یہان پر یہ بیان کرنا خالی از لطف نہوگا کہ سائنس کے سب شعبون سے زیادہ ترقی فلکیات مین عمل پذیر ہوئی ہے۔ فلکی طریقۂ تحقیقات مین کوئی حیرت انگیز انقلاب واقع نہین ہوا ہے۔ بلکہ مسلمہ اور کہنہ سال وسائل سے کام لیا گیا ہے آسمان مین بیشمار نکشترون اور تارون کے جھومرون کے ایک نہایت دور افتادہ مجموعۂ ستارگان ہیٹل گیز بھی ہے وہ عرصہ سے صفر نور معلوم ہوتا تھا۔ جسے اقلیدسی اصطلاح مین نقطہ پکارا جاتا ہے، یا یون کہیے کہ پچاس میل کے فاصلہ پر عظیم الحجم دوربین کے وسیلہ سے جتنی روشنی دکھائی دیتی ہے اتنا یہ نکشتر نظر آتا تھا مگر سنہ ۱۹۲۰ء مین امریکہ کی مشہور رصدگاہ واقع مونٹ ولسن مین اسکی از سر نو مساحت ہوئی تو اُس کا وتر زاویہ کے رُخ پر بیس کروڑ میل پایا گیا۔ ذرا غور فرمایئے۔ کہ جس ستارے کا وتر بیس کروڑ میل لمبا ہے۔ وہ آسمان مین کتنا بے اندازہ رقبہ گھیرے ہوے ہے۔ یہ فقط ایک نکشتر ہے مگر خلا مین ایسے ستارے لاکھون اور کرڑورون کے شمار مین ہین۔ اِس سے آپ خلا کی حدود کا بھی قیاس کر سکتے ہین،

ستارون کی روشنی کا اسپکٹروسکوپ کے وسیلہ سے تجزیہ کیا گیا ہے اور اُس سے بہت سی حیرت انگیز باتین ظاہر ہوئی ہین۔ ستارون کے اجزاے ترکیبی کی ماہیت اور اُن کی سطح کے درجہ حرارت و برودت کی کیفیت بھی اسی وسیلۂ تحقیقات سے ظاہر ہو گئی ہے۔ اور یہ امر بھی عیان ہوا ہے کہ آیا فلان ستارہ اپنے ارتقا کے کس مرحلہ مین ہے۔ آیا وہ ابتدائی مرحلہ مین ہے یا عالم شباب مین آیا وہ اپنی زندگی

کی زحمت خیز مسافت طے کرچکا ہو یا عالم نزاع مین ہو! علاوہ ازین ذرون کی نوعیت اور برقی سالمات (الکٹرون) کی نسبت محققان طبیعیات نے جو تحقیقات کی ہو۔ اس سے یہ معلوم ہوسکتا ہو کہ جب غائت درجہ کی حرارت پہونچے تو سیابی مادہ کا استحالہ کس طور پر ہوتا ہو۔

ان وسائل تحقیقات سے حیرت افزا نتائج مرتب ہوے ہین۔ پروفیسر ریڈنگ ٹن نے جو فلکیات کے نہایت ممتاز ماہر ہین اپنے ایک لیکچر مین اُن کا مختصر ذکر کیا ہو۔ اجرام فلکی کی بابت یہ تصور کیا جاتا ہو کہ وہ سیابی مادہ سے جو بادل کے نہایت عظیم تودون کی صورت مین آسمان مین محیط نظر آتا ہو۔ ارتقا پذیر ہوئے ہین۔ مگر بہت عالمون کا یہ بھی گمان ہو کہ سیاب مین عمل انقباض پیدا ہونے سے پہلے عناصر کی ابتدائی ہیئت ارتقا کی عالم گیر گرفت مین آئی تھی۔ اس گمان کی اس امر سے تائید وتقویت ہوتی ہو کہ بہت سے ستارون کے اندر ہیڈروجن کی ہلکی مقدار پائی جاتی ہو۔ اور ہیڈروجن ابتدائی عناصر مین شمار ہوتی ہو۔ ایک اور یہ امر معرض انکشاف مین آیا ہو کہ جب ابتدائی سیابی مادہ مین انقباض پیدا ہوا۔ اور اجرام فلکی بننے لگے تو ہیولی کی مساوی مقدار ان کی ترکیب مین کام آئی۔ عالم بالا مین جو کروڑون ستارے چمکتے اور سیارے گردش کرتے پھرتے ہین اُن کی کثافت طبعی آفتاب سے ڈیڑھ گنا سے لے کر پانچ گنا تک اجرام فلکی کے سائز کے تناسب کے اعتبار سے پائی گئی ہو جو اس امر پر دال ہو کہ یہ کیفیت خاص طبعی قوانین کے عمل سے وقوع پذیر ہوئی ہو۔ کوئی امر اتفاقی نہین ہو۔ بہت سے ستارون کی کثافت پانی پر فائق ہو، ہمارا آفتاب اسی قبیل مین شمار ہوتا ہو اور بہت سے ایسے بھی ہین کہ اُن کا وزن خصوصی پانی سے کہین ہلکا ہو۔ اس ذیل مین بٹیل گیزر اور دیگر ہزارہا نوزائیدہ ستارے آتے ہین۔ مگر ایسے بھی لاکھون تارے ہین کہ جن کی ہیئت گیس سے مشابہ ہو جب تک وہ اس مرحلہ مین پھنسے رہتے ہین اُن کے حجم کا تخمینہ ریاضی کے تمام اعداد سے تجاوز کر جاتا ہو نظام شمسی کا مرکز آفتاب۔ کرۂ ارض سے دس لاکھ گنا بڑا ہو۔ لیکن ستارہ بٹیلی گیزر کا حجم آفتاب سے ایک کروڑ گنا زیادہ ہو اس سے آپ اندازہ کر لیجیے کہ آسمان کے ستارے حجم مین کیسے عظیم الوسعت ہین۔

ان نہایت وسیع قطعات سیاب کا درجۂ حرارت وبرودت بھی بیحد مختلف ہو۔ اور اس کا اندازہ اس روشنی سے کیا گیا ہو۔ کہ جو ستارون کے مادہ ابتدائی سے خارج ہوتی ہو بٹیل گیزر کا ٹمپریچر تین ہزار درجہ سنٹی گریڈ ہو لیکن یہ کیفیت اُس کے ایک دور افتادہ گوشہ کی ہو، ماہران طبیعیات کا گمان

ہو کہ مرکزی درجۂ حرارت بیس لاکھ درجہ سے لیکر دو کروڑ درجہ تک مختلف ستارون مین پایا جاتا ہی اس سے آپ اندازہ کر لیجیے کہ اجرام فلکی کے اندر جتنی ضرورت ہے اُس کا مقابلہ اس دُنیا کی گرم سے گرم چیز کے ساتھ قطعی نہین ہوسکتا۔ اب اس امر پر غور کرنا مناسب ہو کہ ستارون کے ہیولی کے بے قیاس تودون کے اندر اتصال و اتحاد کسطرح قائم رہتا ہی۔ اُس کی نسبت تازہ ترین تحقیقات سے یہ عیان ہوتا ہی کہ قوت کشش سے انقباض اور حرارت سے جو انتشار پیدا ہوتا ہی۔ اس کی بدولت اُن کا توازن داخلی قائم رہتا ہی جس حرارت سے کشش کی مزاحمت ہوتی ہی وہ دو قسم کی ہی۔ اول وہ حرارت کہ جو سالمات کے تموج اور تلاطم سے پیدا ہوتی ہی، دوم ایتھر کہ جس کی حرارت سے کرۂ ارض ناآشنا ہی۔ گر سوا نو کروڑ میل سے آفتاب کی حرارت ایتھر کی لہرون ہی کی وساطت سے ہمارے پاس آتی ہی، بڑے بڑے عظیم الجثہ ستارون مین ہر دو قسم کی حرارت قریب قریب مساوی الوزن پائی جاتی ہی۔ اور ان کے عمل باہمی کے وسیلہ سے ہر ستارہ کی کثافت اور اُس کا حجم برقرار رہتا ہی۔

ان متضاد طاقتون کے توازن باہمی کا تناسب قائم رہنا محال ہی۔ اگر ایتھر سے پیدا شدہ حرارت خارج ہوکر خلا مین نہ جائے۔ اس نظریہ کی تقویت اس امر سے ہوتی ہی کہ مختلف ستارون کی روشنی ہمارے ہان آتی ہی اور یہ امر مسلمہ ہی کہ خلا سے روشنی کی حرکت و رفتار صرف ایتھر کے تموج ہی سے ممکن العمل ہی۔ علاوہ ازین یہ امر بھی غور طلب ہی کہ اگر حرارت یونہی خارج ہوتی رہے۔ تو بالآخر چند ہزار سال کے بعد اُس کا ذخیرہ تمام ہوجائے مگر بقول پروفیسر ریڈنگٹن جس عمل سے اُس کی کمی پوری ہوتی رہتی ہی۔ وہ ہربرٹ اسپنسر کے الفاظ مین "سالمات کا باہم دگر عمل اتصال اور حرکت کا اخراج" ہی۔ بالفاظ دیگر اس کا مفہوم یہ ہی کہ ستارون کے قلب مین جو قیامت خیز بھاؤ جل رہے ہین ان سے عناصر وجود مین آتے رہتے ہین۔ وہ ایک دوسرے سے اتحاد پیدا کرتے رہتے ہین کہ جس سے حرارت وجود پذیر ہوتی ہی۔ ہیڈروجن سے ہلیئم معرض ہستی مین آتی ہی کہ جس سے (۰.۸) فی صدی حجم نابود ہوجاتا ہی اُس سے قوت یعنی ایتھر کی لہرین پیدا ہوتی ہین۔ اگر کسی ستارے کے وجود مین پانچ فی صدی ہیڈروجن ہو کہ جو ہلیئم مین تبدیل ہوتے وقت لطیف تر عناصر کی ہستی کی محرک ہوتی ہی تو اس سے اُس نظریہ کی بخوبی تائید ہوتی ہی سالمات کے اندر جو حیرت انگیز قوت مقفل ہی وہ عالم و مافی العالم کی قوت محرکہ کا منبع آخری ہی۔

جے۔ آر۔ رائے

فی نعتہ صلی اللہ علیہ وسلم

عالمِ قدس کی چھائی ہے فضا آنکھوں میں ۔۔۔ نقشہ روئے پیمبرؐ ہے کھنچا آنکھوں میں
پی گئے ان کو ہوا علمِ لدنی حاصل ۔۔۔ پا گئے تھے جو علیؑ آبِ بقا آنکھوں میں
میں نے دیکھی ہے رسولِ عربیؐ کی صورت ۔۔۔ پتلیاں ہیں یہ مری قبلہ نما آنکھوں میں
صلِّ یا ربِّ علیٰ روحِ محمدؐ جو کہا ۔۔۔ پھر گئی شکلِ رسولِ دوسرا آنکھوں میں
نیچی نظروں کی قسم مست نگاہوں کی قسم ۔۔۔ میں بٹھالوں گا اُنھیں روزِ جزا آنکھوں میں
میں کہوں اور کہوں انت احد اے احمد ۔۔۔ تم جو آجاؤ کہیں نام خدا آنکھوں میں
آئی دینے کو مجھے نعتِ پیمبر کا صلہ ۔۔۔ زرِ گل جھونک گئی بادِ صبا آنکھوں میں
داورِ حشر کے آگے مجھے جب جانا ہو ۔۔۔ کچھ نہ ہو روئے محمدؐ کے سوا آنکھوں میں
جذبۂ عشق سے پُرنم ہوئیں آنکھیں انکی ۔۔۔ آج دیکھو اثرِ آہ رسا آنکھوں میں
واہ کیا قرب ہے اے صلِّ علیٰ کیا کہنا ۔۔۔ جم گئی سُرخیِ خونِ شہدا آنکھوں میں
اے نسیمِ سحری ان کو کہاں ڈھونڈوں میں؟ ۔۔۔ بول اُٹھا ہاتفِ غیبی کہ ذرا آنکھوں میں
شبِ معراج سے ہے عرشِ بریں چکر میں ۔۔۔ ابتلک پھرتی ہے وہ گردشِ پا آنکھوں میں
تیرے انوار سے روشن ہوا کاشانۂ دل ۔۔۔ تیرے دیدار سے آئی ہے ضیا آنکھوں میں
تم جو آئے مری بالیں پہ دمِ بازپسیں ۔۔۔ آگئی جسم سے جاں بہرِ فدا آنکھوں میں
جب ترے روئے منور پہ نظر پڑتی ہے ۔۔۔ عالمِ نور کی آتی ہے ہوا آنکھوں میں

چاہیئے فضلیؔ مسکین کے لیے روزِ جزا
اے طبیبِ تسلّیٔ تھوڑی سی جا آنکھوں میں

فضلی (امیٹھوی)

لہو کی بوند

جلوۂ رخ کو مین رنگینی بستان نہ کہون   پرتو حسن کو آئینۂ حیران نہ کہون
گردش چشم کو پیمانۂ رقصان نہ کہون   وسعت وحشت خاطر کو بیابان نہ کہون

لیلی عشق بنون آہوی صحرائی ہون
بزم قدرت کے کرشمون کا شیدائی ہون

بھر رہا ہو گل تصویر کو دامان مین کوئی   اشک گلگون لیے بیٹھا ہو گریبان مین کوئی
لذت اندوز طرب محفل خوبان مین کوئی   محو اندوہ و الم فرقت جانان مین کوئی

کوئی سرگرم فغان ہو تو کوئی ہے دلشاد
لب پہ نغمہ ہے کسی کے تو کسی کے فریاد

تھا اسی فکر مین غلطان کہ سر راہ گزر   مجھ کو اک شاخ پہ آیا گل صد چاک نظر
جا بجا داغ تھے سرخی کے نمایان جس پر   اور شبنم کے چمکتے تھے درخشان گوہر

موج نکہت مین تھے گیسو کی طرح پیچ و تاب
اسکا ہر داغ تھا رعنائی مین گلشن کا جواب

منظر اک عالم عبرت کا دکھایا اُس نے   دیدۂ شوق کو مبہوت بنایا اُس نے
اپنا افسانۂ غم گو نہ سنایا اُس نے   جنبش لب سے مگر اتنا بتایا اُس نے

ساغر عیش نہ تصویر سبو کی ہون مین
صفحۂ دہر پہ اک بوند لہو کی ہون مین

زیر اب تک نہ ہوئی ہمت مردانہ مری   غیرت دل سے سبق لیتا ہے پروانہ مری
خاک کے ذرون سے لپٹا تھا کبھی دیوانہ مری   اُس کے ہر پھول مین ہے نکہت مستانہ مری

رہا محفوظ یہ گلچین کی جفا سے اب تک
اُسکی شاخین نہ جھکین دست صبا سے اب تک

کشتۂ تیغ جفا سے مری توقیر کو پوچھ
رہبرِ ملکِ علم سے مری تنویر کو پوچھ
بسملِ خستہ جگر سے مری تفسیر کو پوچھ
گردشِ چرخ سے جا کر مری تاثیر کو پوچھ
شمع ملت کی مرے داغ میں تابانی دیکھ
میرے ذرات میں آئین جہانبانی دیکھ

محمود حسن محمود اسرائیلی

فتح مکہ

فتح جس روز ہو گیا مکہ
زورِ کفر اور شرک کا ٹوٹا
موسمِ گل چمن میں پھر آیا
ماہِ مکہ وطن میں پھر آیا
مژدہ باد صبا پکار آئی
باغِ کعبہ میں پھر بہار آئی
ہر در و بام ہو گیا روشن
مہرِ اسلام ہو گیا روشن
آپ مکے میں جس گھڑی آئے
ساتھ میں دس ہزار غازی تھے
خانۂ حق بتوں سے صاف کیا
بعد ازان کعبے کا طواف کیا
دیکھ کر فوج کی فراوانی
دشمنوں کی بڑھی پریشانی
بہت اہلِ قریش گھبرائے
سامنے ہاتھ جوڑ کر آئے
سب تھے حضرت کے دشمن جانی
سب کو حاصل ہوئی پشیمانی
آپ نے مسکرا کے فرمایا
بھائیو ہے تمھارا مطلب کیا
بولے مکی نژاد ہو کے خجل
قتل کر ہم ہیں قتل کے قابل
تجھ سے ہم نے نہ کچھ بھلائی کی
آپ اپنے لیے بُرائی کی
جوش دریائے رحم کو آیا
رحمت العالمین نے فرمایا
دل کو میں اپنے صاف کرتا ہوں
سب خطائیں معاف کرتا ہوں
شاد ہو شاد کر دیا میں نے
جاؤ آزاد کر دیا میں نے
اس سے بڑھ کر ہو اور کیا احسان
دشمنوں پر کیا بڑا احسان

رحم کی ہو گئی جہان میں دھوم　　　رہے دشمن نہ رحم سے محروم
سرکشون نے جھکا لیے اپنے سر　　　لائے ایمان خدائے واحد پر
ابن بوجہل عکرما دشمن　　　آپ کا سب سے بڑھ کے تھا دشمن
دل میں اُس کے سمایا خوف ایسا　　　جانب مصر مکے سے بھاگا
سرو پا کی رہی نہ اُس کو خبر　　　ہوا جا کر سوار کشتی پر
ساتھ اُسکے جو تھی نحوست بھی　　　دو قدم بھی نہ چل سکی کشتی
اہل کشتی نے اعتراض کیا　　　اُس کو ملاح نے اُتار دیا
ہو گئے ناکام وہ جوان قریش　　　آیا مکہ میں خستہ و دل ریش
شب کو بزم رسول میں آیا　　　اپنی بی بی کو ساتھ وہ لایا
ہو چکی تھیں وہ پہلے داخل دین　　　اپنے شوہر کو ساتھ لائین
پھر کہا رو کے یا رسول خدا　　　بخش دے عکرمہ کے جرم و خطا
آپ نے مسکرا کے فرمایا　　　میں نے بھی میرے حق نے بھی بخشا
یون دکھاتے ہیں شان رحمت کو　　　یون بناتے ہیں بگڑی قسمت کو
عکرمہ لایا آپ پر ایمان　　　ہو گیا دل سے تابع فرمان
ظرف عالی تھا حوصلہ تھا بڑا　　　دشمنون سے نہ انتقام لیا
رحم کی ہے یہی صفت پوری　　　رحم کھانے پہ ہو نہ مجبوری
جس طرح دوستون پہ رحم آئے　　　دشمنون پر بھی رحم فرمائے
رحم کا تجھکو حوصلہ ہے اگر　　　دوست دشمن کا امتیاز نہ کر
رحم حال جگر پہ کر یارب　　　دیکھ لے لطف سے ادھر یارب

حکیم جگر صدیقی (زمیندار بسوان)

نقد و تبصرہ

(رسائل)

(۱) پیمانہ (اکبرآباد) جلد ا نمبر ۲ بابت ستمبر ۱۹۲۳ء حجم ۳۲ صفحہ تقطیع ۲۰×۳۰ - ایڈیٹر ساغر نظامی سیمابی علیگڈھی قیمت سالانہ عیصر

خمخانہ ادب کا یہ نیا پیمانہ بادۂ نظم و نثر کے وہ جرعہ پیش کرتا ہے جس کی لذت بادیہ پیمایان سخن کو مست کر دیتی ہے جسکے ایک ایک صفحہ کا دور دماغ کو پُرکیف بنا دیتا ہے۔ یاران میکدہ مین مشاہیر شعرا کے اسماء گرامی نظر آتے ہین۔ جناب مخمور و جناب ساغر کی نثر کے پُرخمار چھینٹے بھی کچھ کم کیف انگیز نہین لکھائی چھپائی دیدہ زیب ہے۔ کاغذ بھی بُرا نہین۔ ٹائیٹل پیمانہ و ساغر کے التزام مین بادۂ انگوری کے ہمرنگ ہے۔ دیکھیے یہ خمار کتنے دنون رہتا ہے۔

(۲) مشاہیر (بدایون) جلد ا نمبر ۴ بابت ماہ اگست ۲۳ء حجم ۳۰ صفحہ تقطیع ۲۶×۲۰ - مدیر ظہیر الحق مقتدری قیمت سالانہ چار

زیر نظر نمبر رئیس الاحرار مولانا محمد علی کے نام نامی پر محمد علی نمبر کے نام سے نکالا گیا ہے نظم و نثر کے مختلف چھوٹے چھوٹے مضامین کے علاوہ مولانا محمد علی، مہراج ناک، مہاتما گاندھی، مولانا حسرت موہانی مولانا ابوالکلام کے مختصر سوانح زندگی ہین ان کے علاوہ بیرلوئی اور راسپوٹین کے جیسے باکمال قائدین کی بھی سوانح حیات ہین۔ کتابت۔ تصحیح۔ اور طباعت ان تمام محاسن کو خاک مین ملا دیتی ہے۔ کیا اچھا ہوتا کہ مدیر صاحب اس کی طرف خاص توجہ فرماتے،

(۳) درویش (دہلی) یکم ستمبر ۲۳ء (پندرہ روزہ) حجم ۳۶ صفحہ۔ مدیر:۔ ملا محمد الواحدی قیمت سالانہ عہ/

مصور فطرت خواجہ حسن نظامی صاحب کے جادو طراز قلم کی گلکاریون کے نمونہ "آریون کی خفیہ ریشہ دوانیون کا کچھا چٹھا۔ اگر دیکھنا ہو تو دہلی کا پندرہ روزہ درویش دیکھیے۔ تجلیات و خرافات کی دلچسپ سُرخیان قابل دید ہوتی ہین۔ اسپر قیمت اس قدر کم ہے کہ حیرت ہوتی ہے۔ مضامین بھی بُرے نہین ہوتے طباعت کا انتظام بھی بُرا نہین۔

(۴) اتالیق (حیدرآباد دکن) جلد ۶ نمبر ۷ و ۸ حجم ۳۲-۳۲ صفحہ علی الترتیب۔ مدیر:۔ مولوی فاضل عبدالرب صاحب کوکب۔ قیمت سالانہ عہ

ادب و زبان کی ترقی کے ساتھ ساتھ حیدرآباد دکن مین عورتون اور بچون کی ترقی کو بھی نظرانداز نہین کیا گیا ہو۔ مختلف جرائد عالم وجود مین آچکے ہین۔ مگر جس خصوصیت کے ساتھ اتالیق بچون کی علمی ترقی اور اخلاقی نشو و نما مین مدد دے رہا ہو وہ اظہر من الشمس ہو۔ مضمون سب بچون کے لیے ہوتے ہین اس لیے زبان کا خاص طور پر لحاظ رکھنا چاہیے۔ زیر نظر نمبر مین ایک نظم "ریشم کی چوری" ہے جسے سرسری طور پر دیکھا تو زبان کے وہ نمونے نظر آے جنھین دیکھ کر انگشت بدندان رہ گیا اور اسلیے کہ مرتب صاحب موصوف کی خود فکر تھی زیادہ تعجب ہوا ملاحظہ ہو:—

ناز سے ملنے کے لیے وہ آئی		کام کرنے مین اُس کا ہاتھ بٹائی
ایک ہفتہ کے بعد ناز نے جب		کپڑے سینے نکالے پیچھے سب
اپنے آگے کے درخت بیری پر		اُڑ کے جا پہونچا اُسکی چوٹی پر
ہو رہی تھی بڑی کہانی جس کے لیے		ناز بیگم امیر بیگم سے

اسی نمبر مین "ہمدردی" پر "نامی" صاحب کی نظم ہو۔ اسمین شاعری و زبان دونون کو کند چھری سے ذبح کیا گیا ہو۔ جسکے دیکھنے سے "شعر گفتن چہ ضرور" والا ماجرا یاد آجاتا ہو۔ نثر مین البتہ اس قسم کے نمونے میری نظر سے نہین گذرے۔ با وصف اسکے بچون کے لیے اچھا ہے۔ کاغذ بھی اگر بہتر کر دیا جاے تو بہتر ہو جاے۔

(۵) دی مسلم (سنگاپور) جلد ۱ نمبر ۲ بابت ذی الحجہ ۴۱ھ مطابق اگست ۱۹۲۳ء حجم ۳۰ صفحہ۔ مدیر اعزازی ایس قدرت شاہ۔ قیمت دس شلنگ۔ تقریباً سیر سالانہ۔

علمبرداران تبلیغ جس جس مقام پر پہونچے ہین اُنھون نے ایک خاص رنگ قائم کر لیا ہو۔ خواجہ کمال الدین صاحب نے جو عرصہ سے ووکنگ مین مقیم ہین انگلستان مین جو اثر پیدا کر لیا ہے وہ محتاج بیان نہین۔ اسی طرح ڈاکٹر مفتی محمد صادق شکاگو دارالسلطنت ممالک متحدہ امریکہ مین خدمت سلام انجام دے رہے ہین۔ حلقہ بگوشان اسلام کے لیے یہ خبر یقیناً باعث مسرت ہو گی کہ ان کی کوشش سے تقریباً ۹۰۰ انسان زمرۂ مسلمانان مین شامل ہو چکے ہین۔

اِن تمام باتون سے متاثر ہو کر عیسائی مبلغین بھی مسلمانون کو عیسائی بنانیکی جان توڑ کوششین کر رہے ہین نیو یارک سے پادری ڈاکٹر ایس ایم زیومر "مسلم ورلڈ" کے نام سے ایک رسالہ مسلمانون کے مرتد کرنے کے لیئے نکالتے ہین اور جزائر ہند و جزیرہ نماے ملایا مین مفت انجیلین بانٹ رہے ہین فتنہ ارتداد کے انسداد کے لیے باہمت اور جوشیلے مسلمانون نے ایک انجمن "انجمن اسلام" قائم کی ہے "دی مسلم" اسی انجمن کی زیر سرپرستی انگریزی مین شایع ہوتا ہے۔ مضامین اسلام پر ہوتے ہین اور زیر نظر نمبر مین حاجی غلام سرور صاحب سرپرست انجمن مذکور کا ارتقا پر مضمون نہایت ہی عمدہ اور قابل دید ہے۔ مسلمانون کو اسکی طرف خاص طور پر توجہ کرنا چاہیے ہے،

(۶) تمدن (دہلی) جلد ۱۹ نمبر ۳ بابت جولائی ۱۹۲۳ء حجم ۳۲ صفحہ۔ اڈیٹر محمد عباس حسین قاری قیمت سالانہ عہ

تمدن نے موت و زندگی کے مختلف دور دیکھے ہین۔ کبھی وہ دہلی سے نکلتا تھا اور کبھی لکھنؤ سے ایک زمانہ مین وہ موقر رسائل مین شمار کیا جاتا تھا اور مشہور انشا پردازون کے نظم و نثر کے بے بہا جواہر اُسکے صفحات کو زینت دیتے تھے۔ قاری عباس حسین صاحب نے جو مختلف روزنامون مین عرصہ سے کام کرتے رہے ہین اب اسے پھر اپنے وطن اور تمدن کے مولد دہلی سے جاری کیا ہے زیر نظر نمبر مین مصور فطرت خواجہ حسن نظامی۔ مصور غم علامہ راشد الخیری اور سیاح جاپان و انگلستان جناب قاری سرفراز حسین صاحب عزمی دہلوی کے جیسے مستند مضمون نگارون کے اسمار گرامی اسکی ادبی قدر و قیمت کو دوبالا کر رہے ہین۔ خدا کرے اِس مرتبہ تمدن کو حیات جاوید حاصل ہو،

(۷) تصویر وفا (لودھیانہ) جلد ۲ نمبر ۲ بابت جون ۱۹۲۳ء حجم ۳۲ صفحہ۔ اڈیٹر راجمی داس گاجریہ

ٹائٹل پیج پر اڈیٹر کے نام کے ساتھ ساتھ مختلف کارکنون کے اسما گرامی کے اظہار کے متعدی مرض مین یہ رسالہ بھی مبتلا ہے۔ اِسکے مقاصد "مین علمی ادبی۔ اخلاقی۔ تواریخی تمدنی طبی ظریفی سدھاتی دلچسپیون کی اشاعت ہے" معلوم ہوتا ہے سیاسی، اقتصادی، مذہبی، تصوفی اور اسی قسم کے اور الفاظ اِس فہرست سے اتفاقاً نظر انداز ہو گئے ہین۔ باین ہمہ رسالہ ہر نوعیت سے عمدہ ہے مضامین بھی برے نہین۔ مولانا حسرت موہانی کی ایک مختصر غزل رسالہ کی جان ہے۔ مگر اسکو بالکل ختم پر جگہ دی گئی ہے، باوجود اتنے عظیم الشان اسٹاف کے ترتیب کی یہ کمزوری قابل گرفت ہے،

(۸) مظاہر جدید (دہرہ دون) جلد انمبر ا بابت اگست ۱۹۲۳ء حجم ۲۴ صفحہ۔ ایڈیٹر آغا عبدالرسول قادری ملول (علیگ) قیمت عا/

یہ رسالہ سائنٹفک مضامین کا عمدہ ذخیرہ ہے جسمین صنعت و حرفت پر بھی مضامین شایع ہوتے رہین گے۔ آغا عبدالرسول صاحب (علیگ) کی یہ کوشش قابل قدر ہے کہ علم طبعیات علم الکیمیا، علم الحیوۃ پر مختلف چھوٹے چھوٹے مضامین لکھکر قوم کو ان اشیا کی قیمت بتلا دی جائے جو بالکل فضول و بیکار سمجھکر نظری کردی جاتی ہین۔ یہی نہین بلکہ اُن اشیا کا بہترین مصرت بھی بتادیا جائے جو آجکل غیر مفید طریقون سے مستعمل ہین۔ ہندوستان کے بہی خواہ یقیناً آغا صاحب موصوف کی ہر قسم کی اعانت کرینگے،

مظاہر جدید کے زیر نظر نمبر مین مادہ کی ساخت، سالمات کی تعریف، اجزائے مادہ، اور انکی تعریف اور علم نباتات پر مضامین ہین جو خود جناب ملول کی جوہر فکر کا نتیجہ ہین۔ ہندوستان بھر مین دلگداز کے علاوہ جہانتک ہمارا علم ہے کوئی رسالہ نہین ہے جسکے مضامین تمام و کمال اُسکے ایڈیٹر ہی کے لکھے ہوے ہون۔ ہم ملول صاحب کو اُن کی اس جانفشانی پر مبارکباد دیتے ہوے اپنے اس نئے ہمعصر کا پرتپاک خیر مقدم کرتے ہین۔ ع

اللہ کرے حسن رقم اور زیادہ

(کتب)

(۱) حضرت رشید: مولفہ سید آغا اشہر لکھنوی تقطیع ۲۰×۲۶ حجم ۱۴ جزو، ناشر اصح المطابع لکھنؤ قیمت عہ/

یہ حضرت رشید کے سوانح زندگی ہین جن کو بڑی تحقیق و تدقیق سے مولف مذکور نے جمع کیا ہے سید محمد مصطفیٰ مرزا عرف پیارے صاحب رشید لکھنؤ کے ان باکمال اساتذہ مین سے تھے جنھون نے لکھنؤ کی رہی سہی ادبی عظمت کو سنبھال لیا تھا۔ انجم و جاوید رشید و حمید کا نام اُردو کے اساتذہ باکمال مین لیا جاتا تھا، مگر افسوس سے

جو سپہر سخن پہ تھے تابان ؎　　آج وہ آفتاب ہم مین نہین

انیس و انیس کے خاندان کا یہ آفتاب جس نے شاعری کی گود مین پرورش پائی۔ جانعالم واجد علی شاہ کے

سنہ جلوس میں طلوع ہوا۔ عشق کی ریاضت نے غزل کو چمکایا، تعشق کی ندرت فکر اور انیس کی زبان سے معراج کمال کو پہونچایا۔ ددھیال اور ننھیال کے ذاکرین اہل بیت میں ممتاز و معروف تھے اس لیے بچپن سے مرثیہ گوئی کی مشق کی۔ شروع شروع غزل کی طرف طبیعت کا رجحان زیادہ تھا۔ یہی وجہ ہوئی کہ جب خدائے سخن حضرت انیس کی مسند جناب نفیس نے خالی کی تو حضرت رشید نے اپنے آپ کو صرف اس کا اہل ہی نہیں ثابت کیا بلکہ مرثیہ میں وہ رنگ تغزل بھر دیا جو ادب کی جان ہے۔ سلاست انکی لونڈی تھی اور محاورہ بندی اُن کی باندی۔ مرثیہ اس قدر عام فہم اور ثقل سے مبرا ہوتے تھے کہ اِدھر مصرع زبان سے نکلا اُدھر سامع کے دل میں تیر بنکر ترازو ہو گیا۔ وہ مرثیہ میں ساقی نامہ و مضمون بہار کے موجد ہیں۔ اور لطف یہ کہ اس خوبی سے یہ مضامین اُن کے مراثی میں دست و گریبان ہیں کہ دیکھنے سے تعلق رکھتے ہیں حضرت انیس کی طرح رشید کے رخش قلم نے رباعی کے میدان میں بھی خوب خوب جولانیاں دکھائی ہیں۔ حضرت پیری کے مضمون پر جتنی دلفریب رباعیاں ان کے قلم سے نکلی ہیں اتنی شاید ہی کسی نے کہی ہوں۔ اور لطف یہ ہے کہ ہر جگہ اس نئے انداز اور اس دلفریب پیرایہ میں ایک ہی مضمون کو پیش کیا ہے، کہ کسی طرح طبیعت نہیں بھرتی۔ سلام و قصائد بھی اچھے اچھے کہے ہیں مگر جو انتخاب غزلیات و قصائد یا سلام و مراثی کا جناب آشہر نے بطور نمونہ دیا ہے وہ کسی قدر کم ہے۔ ایک بڑی فروگذاشت ایک مولف کی حیثیت سے جناب آشہر سے ہو گئی ہے اور وہ جناب رشید کے کلام پر بے لاگ تنقید کی کمی ہے۔ ضرورت تھی کہ جہاں جہاں اُن کے کلام کے نمونے پیش کیے گئے ہیں وہاں اُن کے محاسن و معائب کو بھی عقیدت کے جذبہ کو تھوڑی دیر کے لیے بالائے طاق رکھ کر ملک کے روبرو پیش کیا جاتا۔ امید ہے کہ جدید ایڈیشن میں جناب مولف اس کمی کو دور کر دیں گے۔ بہر کتاب من حیث المجموع اچھی ہے اور اس حیثیت سے کہ حضرت رشید کی سوانح عمری ہے کتب خانوں میں جگہ پانے اور دیکھنے کے قابل ہے۔ الناظر بک ایجنسی لکھنؤ سے مل سکتی ہے۔

عزت علی علوی

امیر مینائی مرحوم

- صنم خانۂ عشق
- مرآۃ الغیب
- خیابان آفرینش
- محامد خاتم النبیین
- مینائے سخن

منشی سجاد حسین مرحوم

- احمق الذین
- حاجی بغلول
- میٹھی چھری
- پیاری دنیا
- کایا پلٹ
- طلسمی فانوس

پنڈت رتن ناتھ سرشار

- فسانۂ آزاد ۴ جلد
- سیر کہسار
- خدائی فوجدار
- جام سرشار
- الف لیلہ بطرز ناول

منشی جوالا پرشاد برق

- مرنالنی
- مار آستین
- بنگالی دلہن
- پرتاب
- معشوقۂ فرنگ

مولانا عبد الحلیم شرر

- ابوبکر شبلی
- خواجہ معین الدین چشتی
- صقلیہ میں اسلام
- قیس و لبنیٰ
- مقدس نازنین
- ایام عرب جلد
- یوسف و نجمہ
- فتح اندلس
- ماہ ملک
- حسن کا ڈاکو
- دربار حرامپور ۲ جلد
- مفتوح فاتح
- جویائے حق ۲ جلد
- لعبت چین
- عزیزہ مصر
- غیب دان دلھن
- فردوس بریں
- فلپانا
- رومۃ الکبریٰ
- الفانسو
- شہید وفا
- حسن انجلنا
- ملک العزیز ورجنا
- آغا صادق کی شادی
- افسانہ قیس
- حسن بن صباح
- تاریخ بغداد

مرزا داغ مرحوم

- آفتاب داغ
- مہتاب داغ
- یادگار داغ
- انتخاب داغ
- فریاد داغ

مولوی بشیر الدین احمد دہلوی

- دار الحکومت دہلی ۳ جلد
- تاریخ بیجاپور ۳ جلد
- حرز طفلان
- شاعر
- عصائے پیری
- شمع ہدایت
- بخت جگر ۲ جلد
- حسن معاشرت
- اقبال دولھن

نیاز فتحپوری

- گہوارۂ تمدن
- ترجمہ گیتانجلی
- کیوپڈ اینڈ سائکس

سیماب اکبر آبادی

- خدیجۃ الکبریٰ
- بعثت الرسول
- سیرۃ الحسین
- جام کوثر

حکیم محمد علی خاں مرحوم

- عبرت کامل
- حسن کا کامل
- رام پیاری کامل
- دیول دیوی
- گورا
- مسیحائے عالم
- جعفر و عباسہ
- اختر حسینہ کامل

منشی علی محمد شوق قدوائی

- ترانۂ شوق
- قاسم و زہرہ
- سیکفرن اور لوسی

جوش شبیر حسین ملیح آبادی

- روح ادب
- مقالات زرین
- آوازۂ حق
- اوراق سحر
- جذبات فطرت

منشی تیرتھ رام

- فسانۂ لندن ۴ جلد
- وطن پرست
- منزل مقصود
- روح کا اخراج
- خونی ہیرا

جلال لکھنوی مرحوم

- مضمون ہائے دلکش
- نظم نگارین
- سرمایۂ زبان اردو
- رسالہ تذکیر و تانیث
- افادۂ تاریخ
- قواعد المنتخب

خواجہ عشرت لکھنوی

- لغات اردو
- اصول اردو
- جان اردو
- قواعد میر
- شاعری کی پہلی کتاب
- شاعری کی دوسری کتاب
- شاعری کی تیسری کتاب
- اصلاح زبان اردو
- گلدستۂ ظرافت
- زنانہ دانی

صفدر مرزا پوری

- مرقع ادب
- بزم خیال
- نشاط سخن

مولوی محمد حسین محوی

- ازواج الانبیاء
- انسانی قربانیاں

حکیم احمد حسین الہ آبادی

- ترجمہ تاریخ ابن خلدون جلد اول
- " دوم
- " سوم
- " چہارم
- " پنجم
- " ششم
- " ہفتم
- جلد ہشتم و نہم زیر طبع ہیں
- " دہم
- " یازدہم
- سلطان صلاح الدین
- سلطان نور الدین محمود

مولوی سعید احمد مارہروی

- آثار اکبری
- حیات صالح
- حیات خسرو
- امرائے ہنود

مولوی ممتاز علی

- تذکرۃ الانبیاء
- شیخ حسن

منشی نوازش علی خاں

- سفرنامہ ابن بطوطہ
- قسطنطنیہ
- ڈیوٹی

جسٹس محمود مرحوم
- کتاب الطلاق
- کتاب الشفعہ
- شرح قانون شہادت

مولوی عزیز مرزا بی اے
- خیالات عزیز
- وکرم اروسی

خواجہ غلام الثقلین مرحوم
- روزنامہ سیاحت
- فلسفیانہ نظر اسلام پر

منشی محمد لطیف مرحوم
- اکبر
- اورنگ زیب
- لارڈ کلائیو
- رنجیت سنگھ

عنایت اللہ بی اے
- دہریہ اسلام
- ارض مقدس
- ولفی

مسٹر ظفر عمر بی اے
- نیلی چھتری
- بہرام کی گرفتاری
- چوروں کا کلب

مولوی محمد علی ایم اے
- سیرۃ خیر البشر
- النبوت فی الاسلام
- جمع القرآن

پروفیسر نواب علی ایم اے
- تذکرۂ مصطفے
- مصابیح الدین
- صحف سماوی
- شمع سخن

مفتی انوار الحق ایم اے
- تذکرۂ حبیب
- حقائق اسلام
- اثبات واجب الوجود
- تاریخ ابو البشر
- قوت خیال

پروفیسر الیاس برنی ایم اے
- اسرار حق
- معارف ملت
- مناظر قدرت
- جذبات فطرت
- علم المعیشت

سید ہاشمی فرید آبادی
- مشاہیر یونان و روما
- تاریخ یونان قدیم

مرزا محمد ہادی بی اے
- امراؤ جان ادا
- شریف زادہ
- خونی عاشق
- خونی مصور
- خونی شہزادہ
- مثنوی امید و بیم

ڈاکٹر اقبال ایم اے
- ملت بیضا
- مکمل ترانہ
- شکوہ
- جواب شکوہ
- نالۂ یتیم
- فریاد امت
- بلال
- اکبری اقبال
- شمع و شاعر
- خضر راہ

مولوی ظفر علی خاں بی اے
- معرکۂ مذہب و سائنس
- خیابان فارس
- ذاتی جنگ روس و جاپان
- جنگل میں منگل
- فلسفۂ ابن سینا
- معاشرت
- اپریل فول

منشی احمد علی بی اے
- تاریخ تمدن ۲ جلد
- شباب لکھنو

مولوی عبد الماجد بی اے
- فلسفۂ جذبات
- بحر المحبت
- تاریخ اخلاق یورپ ۲ جلد
- مکالمات برکلے
- زود پشیمان

خواجہ عباد اللہ اختر بی اے
- مشاہیر اسلام
- دمشق
- بغداد
- صدیق اکبر
- ترجمہ و شرح دیوان حافظ

مسٹر سجاد حیدر بی اے
- خیالستان
- زہرا
- ثالث بالخیر

مسٹر افضال حسین عباسی بی اے
- [illegible]
- نازنین آسمیلیا
- آدمی کی کامیابی
- اعصاب کی تربیت

مولوی عبد الحق بی اے
- قواعد اردو
- انتخاب کلام میر

مولوی معشوق حسین خاں بی اے
- مبادی سائنس
- بجلی کے کرشمے
- محاربات صلیبی

مولوی سید سلیمان ندوی
- ارض القرآن جلد دوم
- حیات امام مالک
- خلافت اور ہندوستان
- بہادر خواتین اسلام
- اہل السنۃ والجماعت

پروفیسر عبد الباری ندوی
- مبادی علم انسانی
- برکلے کا فلسفہ
- مذہب و عقلیات

مولوی محمد علی زری
مولوی محمد ندیم صاحب ایم اے
- تمدن اسلام ۲ جلد
- الاسلام و النصرانیہ
- اسلام اور سوشل نظام
- جواہر قرآنی
- فتح اندلس
- فلاح دارین

خواجہ حسن نظامی
- سیپارۂ دل
- روزنامہ ممالک اسلامیہ
- میلاد نامہ
- محرم نامہ
- یزید نامہ
- فضل نامہ گیارھویں
- کرشن جیون
- الم موت
- بیوی کی تعلیم
- بیوی کی تربیت
- اتالیق خطوط نویسی
- خطوط حسن نظامی
- جگ بیتی کہانیاں
- فاطمی دعوت اسلام
- چٹکیاں اور گدگدیاں

مولوی عبد الرشید اکبر آبادی بی اے
- صبح زندگی
- شام زندگی
- خواب زندگی ۲ جلد
- نوحۂ زندگی
- منازل السائرہ
- الزہراء
- عروس کربلا
- جوہر قدامت
- یاسمین شام
- مودودہ

رجسٹرڈ نمبر اے ۴۷۸

بسم اللہ الرحمن الرحیم

الناظر

قیمت سالانہ للعہ/
قیمت ششماہی ۳/

ایڈیٹر ظفر الملک علوی

نمبر ۱۳ و ۱۴ | ماہ ستمبر و اکتوبر ۱۹۲۳ء | جلد ۲۵

فہرست مضامین

قیمت فی پرچہ ۱۲/
الناظر پریس لکھنؤ میں چھپا
پرنٹر و پبلشر محمد اسحاق علی علوی
قیمت فی پرچہ ۱۲/

بسم اللہ الرحمن الرحیم

اردو کی بہترین کتابیں

مرزا غالب مرحوم
- اردوئے معلے
- عود ہندی
- دیوان غالب پاکٹ ایڈیشن
- نکات غالب

سر سید احمد خاں مرحوم
- تفسیر القرآن جلد
- خطبات احمدیہ
- آثار الصنادید
- تہذیب مضامین الاخلاق
- مکمل مجموعہ لکچر
- اسباب بغاوت ہند

نواب محسن الملک مرحوم
- تہذیب مضامین الاخلاق
- مجموعہ لکچر
- آیات بینات ۳ جلد

مولوی حسان الہند مولانا عباس
- تاریخ الاسلام
- الاسلام
- نشتر سخن

مولانا آزاد مرحوم
- آب حیات
- دربار اکبری
- سخندان فارس
- نگارستان فارس
- نیرنگ خیال حصہ ۲
- دیوان ذوق

مولوی سید احمد دہلوی مرحوم
- فرہنگ آصفیہ ۴ جلد
- راحت زمانی
- تسخیر شوہر
- مہافروز بیگم
- انشاء ہادی النسا
- لغات النسا
- علم اللسان

مرزا حیرت دہلوی
- سیرۃ الرسول ۲ جلد
- کتاب شہادہ ۲ جلد
- قصہ حاجی بابا اصفہانی
- روز الیبرٹ کامل
- الف لیلہ نیا زاد
- الف لیلہ شہرزاد

مولانا حالی مرحوم
- حیات جاوید مجلد
- یادگار غالب
- حیات سعدی
- دیوان حالی
- مقدمہ شعر و شاعری
- مسدس حالی
- جواہرات حالی
- بیوہ کی مناجات

مولانا شرر مرحوم
- حیات مائیس
- ایشیائی شاعری
- نورجہان بیگم
- ٹیپو سلطان
- حیدر علی سلطان
- اردو کی ڈالی
- اردو کا گلدستہ

مولانا اسلم جیراجپوری
- حیات حافظ
- حیات جامی
- علوم عرب
- خواتین

مولانا نذیر احمد مرحوم
- ترجمۃ القرآن بمقابل متن
- حمائل شریف مترجم
- مطالب القرآن
- الحقوق و الفرائض ۳ جلد
- اجتہاد
- مبادی الحکمۃ
- رویائے صادقہ
- موعظۂ حسنہ
- ابن الوقت
- ایامیٰ
- فسانۂ مبتلا
- مراۃ العروس ۱۰
- بنات النعش ۹
- توبۃ النصوح ۹
- منتخب الحکایات
- چند پند ۶
- مجموعہ نظم بینظیر
- مکمل لکچر ۲ جلد

مولوی حبیب الرحمن خاں شروانی
- سیرۃ الصدیق
- علمائے سلف
- اسلامی اخلاق

مولانا شبلی مرحوم
- سیرۃ النبی جلد اول مجلد
- " جلد دوم مجلد
- آغاز اسلام
- الفاروق
- سیرۃ النعمان
- الغزالی
- المامون
- سوانح مولانا روم
- سفرنامہ مصر و شام و روم
- مضامین عالمگیر
- رسائل شبلی
- مقالات شبلی
- موازنۂ انیس و دبیر
- شعر العجم جلد اول
- " جلد دوم
- " جلد سوم
- " جلد چہارم
- " جلد پنجم
- مجموعہ کلام شبلی اردو
- کلیات فارسی
- اسلامی حکومت
- اسلامی مدارس
- مثنوی صبح امید

مولانا ذکاء اللہ مرحوم
- تاریخ ہندوستان ۱۰ جلد
- تاریخ عہد انگلشیہ
- آئین قیصری
- کرزن نامہ
- صحیفۂ فطرت
- محاربات عظیم
- تعلیم الانتظام
- فلسفۂ استدلال
- اہل عرب کا جبر و مقابلہ
- معاون الحساب ۱۲

مولوی اسحاق مرزا بیگ دہلوی
- الانسان
- الاستدلال
- حکمت عملی
- تسہیل البلاغت
- تمنائے دید ۱۰

مولوی انشاء اللہ خان ایڈیٹر وطن
- تزک تیموری
- حالات قسطنطنیہ
- تاریخ مراکش و مغرب الاقصیٰ
- حالات عراق و عرب و عمان

الناظر بک ایجنسی لکھنؤ

مطبوعاتِ جدیدہ

مکمل دیوانِ غالب

مرزا غالب نے جب اپنا دیوان چھپوایا ہے تو اصلی دیوان کے بڑے حصہ کو نظری کرکے خود ہی انتخاب کر دیا تھا۔ یہی دیوان اسوقت تک ملک میں رائج تھا۔ کچھ عرصہ ہوا کہ اصلی دیوان کا نسخہ کتبخانۂ بھوپال میں مل گیا لہذا اب پورا دیوان شائع کیا گیا ہے۔ قیمت ۱۲؎

تبرکاتِ آزاد

بیاضِ آزاد - مولوی محمد حسین آزاد نے دیگر اُستادانِ سخن کے صحیح اپنے مذاق کے مطابق شعرای اُردو کا کلام انتخاب کرکے اپنی بیاض پر لکھ لیا تھا۔ یہ بیاض اب چھپ گئی ہے۔ ملاحظہ ہو قیمت ۱۲؎

تذکرۂ علما - یعنی ہندوستان کے چالیس مشاہیر علما اور انکے تصنیف وغیرہ کے حالات۔ قیمت ۵؎

تصانیفِ شرر

ولادتِ سرورِ عالم محدث ابن جوزی کے میلاد النبی کا ترجمہ مع اصل متن کے الناظر پریس میں چھپ چکا ہے۔ یہ دوسرا ترجمہ مولانا شرر نے اپنے خاص رنگ میں کیا ہے۔ اسمین متن شامل نہیں ہے قیمت ۸؎

طاہرہ - مولانا عبد الحلیم شرر لکھنوی کا تازہ ترین ناول جسکا پلاٹ واجد علی شاہ کے قیام (مٹیا برج) کلکتہ کے زمانہ سے لیا گیا ہے جہاں مولانا سے موصوف کو خود قیام کرنے کا موقع ملا تھا قیمت ۱۲؎

جدید تراجم

مواہبِ رحمانی (۲ جلد) علامہ عبد الوہاب شعرانی کی مشہور و معروف کتاب میزانِ شعرانی کا اُردو ترجمہ جسمیں مسلک غیر مقلدین کے دلائل و براہین کی نہایت زبردست تردید ہے اور ائمۂ اربعہ کے درمیان مسائل میں جو اختلافات ہیں انکی حقیقت و نوعیت کو کمال تبحر و تحقیق کیسا تھ دکھایا ہے تاکہ جو لوگ حقیقت حال سے ناواقف ہونیکی وجہ سے ان اختلافات کو دیکھکر مذبذب ہو جاتے ہیں انکے عقائد درست ہوں اور وہ قرآن و حدیث کی روشنی میں حضرت ائمہ کی مقاصد کو تسلیم کرسکیں۔ حجم ہر جلد ۸۸۸ صفحے قیمت ۱۲؎

اخبار الاندلس

(جلد سوم) اسکاٹ کی ضخیم تاریخ کی دو جلدوں کے تیار ہونیکا اعلان اپریل نمبر میں کیا گیا تھا۔ اب اُسکی تیسری اور آخری جلد بھی تیار ہو گئی ہے۔ قیمت جلد اول مجلد ۱۲؎ جلد دوم مجلد ۱۲؎ جلد سوم ۱۲؎

پیامِ امن - مولوی عبد الماجد بی۔ اے کی تازہ ترین کتاب جو مشہور فرانسیسی معلم پال رچرڈ کی کتاب کا ترجمہ ہے مگر جسمیں صاحبِ موصوف نے اپنی طرف سے اسقدر اضافے کیے ہیں کہ اصل کتاب سے ترجمہ کی تحریروں کی ضخامت بہت بڑھ گئی ہے۔ پال رچرڈ کا خطاب یورپ کی جنگ آزما قوموں سے تھا مگر کتاب اکی موجودہ صورت تمام دُنیا کیلئے پیامِ امن کا کام دیتی ہے قیمت ۱۲؎

غازی مصطفےٰ کمال پاشا کی خود نوشت سوانحعمری قابل دید ہے قیمت ۱۲؎

ایامِ غدر - ایک فرانسیسی خاتون پر جو مصائب غدر کے پُرشور ایام میں گزرے اُنکو اپنے خاص ادیبانہ رنگ میں اُس نے شائع کیا تھا۔ یہ اُسی کا ترجمہ ہے۔ قیمت ۱۲؎

دورِ فلک مشہور ناول نگار ایسٹلن کے ایک مشہور فسانہ کا ترجمہ جو علیگڈھ یونیورسٹی کے پروفیسر محمد انعام اللہ خان نے کیا ہے۔ ۲ جلد قیمت ۱۲؎

جدید تالیفات

حضرت رشید لکھنؤ کے مشہور شاعر جناب پیارے صاحب رشید کی مفصل سوانحعمری مع انتخابات مراثی و رباعیات و قصائد و سلام و غزل وغیرہ مولفہ سید آغا شہر لکھنوی قیمت ۱۲؎

مطالب الغالب مرزا غالب کے دیوان کی متعدد شرحیں پہلے شائع ہو چکی ہیں۔ اب یہ شرح جناب تنہا (علیگ) نے لکھی ہے۔ حجم ۶۰۰ صفحے قیمت ۱۲؎

نمبر ۹

فصلی بخار و طحال کی دوا

فصلی بخار و طحال کے لیے یہ ایک ہی دوا ہی۔آج کل سیکڑون اشتہار فصلی بخار و طحال کی دوا کے آپ دیکھتے ہون گے مگر ان مین عموماً کونین جزو رہتی ہی اس لیے یہ دوائین بخار کو کچھ وقت تک تو روک دیتی ہین مگر جڑ سے آرام نہین کر سکتی ہین۔ایسے بخار کے لیے ڈاکٹر ایس کے برمن کی فصلی بخار و طحال کی دوا چند روز مین ایکدم آرام کرنے کا خاص دعوی رکھتی ہی۔ اور عوام کے فائدہ کو مدنظر رکھکر قیمت بھی بہت کم رکھی گئی ہی۔اس مین تین خاص صفتین ہین (۱) یہ ملیریا کے کیڑ دن کو مار دیتی ہے اس لیے چار پانچ ہی خوراک کے استعمال سے بخار کا آنا بند ہو جاتا ہی (۲) یہ خون کو گاڑھا کرتی ہی اور اُس کی خرابیون کو مٹاتی ہی۔ (۳) یہ طحال کو گلاتی ہی۔قیمت فی شیشی کلان عہ/ شیشی خورد ۱۰/ محصولڈاک شیشی کلان ۸/ اور خورد ۷/

پرانے ملیریا بخار کی گولیان

لرزہ بخار پرانا ہو جانے پر باری سے نہ آکر دن رات تھوڑا بہت چڑھتا ہی۔جسم کا خون پانی سا ہو جاتا ہی۔اور آدمی کا رنگ پھیکا میلا ہو جاتا ہی۔تھوڑی محنت سے کلیجہ کا پنپنے لگتا ہی۔سانس پھولتی ہی کھانے کی خواہش اور قوت بہت ہی گھٹ جاتی ہی۔تلی کے بڑھنے سے پیٹ نکل آتا ہی۔کبھی مُنھ اور ہاتھ پیرون مین ورم آجاتا ہی اور زندگی وبال ہو جاتی ہی ایسی حالت مین یہ گولیان فائدہ کرتی ہین اور چار پانچ ہی خوراک مین بخار کا آنا بند ہو جاتا ہی۔قیمت پچیس گولیون کی ڈبیہ کی ۱۰/ محصولڈاک ایک سے دو ڈبیہ تک ۶/

کونین کی گولیان

یہ چار گرین کی خوبصورت چھوٹی چھوٹی ٹکیان ہین بنتی ہین اور سنہری پٹینٹ ڈبیہ مین ہوتی ہین کونین کا استعمال کرنا ہو تو یہ گولیان پاس رکھیے اس مین نہ وزن کی ضرورت ہی۔نہ کھانے مین تلخ ہے قیمت پچیس گولیون کی ڈبیہ عہ محصولڈاک ۶/

ڈاکٹر ایس کے برمن نمبر ۵ تاراچند دت اسٹریٹ کلکتہ

ایجنٹ:۔ڈاکٹر گنگارام جیتلی چوک لکھنؤ

بسم اللہ الرحمن الرحیم

الناظر

نمبر ۶، ۴۶ و ۷، ۴ جلد ۲۵ ماہ ستمبر و اکتوبر سنہ ۱۹۲۳ء

چو کفر از کعبہ برخیزد کجا ماند مسلمانی

سفر حج پر جانے سے قبل جب کبھی مین مسلمانان ہند کی حالت سے مایوس ہوتا۔ تو بے اختیار میرا دل چاہتا کہ ہجرت کر کے ارض مقدسہ حجاز مین چلا جاؤن اور بقیۃ العمر وہین بسر کرون۔ چنانچہ اس دفعہ جب حضرت رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم کے روضۂ اطہر کی تمنائے زیارت نے اس ملک مین چین سے بیٹھنے نہ دیا اور باوجود مالی مشکلات اور خانگی موانعات کے درپیش ہونے کے مین ہندوستان سے چل کھڑا ہوا تو خیال تھا کہ حرمین شریفین کی زیارت کے ساتھ ہی ساتھ مین مدینہ منورہ یا مکہ معظمہ مین آئندہ قیام مستقل کی کوئی صورت نکالون گا۔ چنانچہ اسی خیال کی بنا پر دونون مقامات مقدس کی معاشرتی و کاروباری زندگی کا بہ غور مطالعہ کرتا رہا اور دونون جگہ کے متعلق تبادلہ خیال بھی کیا۔ اور اب اُن نتائج کو جو مین نے اس تحقیق و تفحص کی بنا پر اخذ کیے ہین مسلمانان ہند کی آگاہی کے لیے حوالۂ قلم کرتا ہون۔

مکہ معظمہ یا مدینہ منورہ دونون مقامات پر آج جسقدر آبادی ہے وہ سب بیرونی لوگون کی ہے قدیم عربی خاندانون کا کہین وجود نہین۔ مکہ معظمہ مین صرف دو گھرانے اصل مکی لوگون کے بتائے جاتے ہین ایک شریف صاحب کا گھرانہ اور دوسرا شیبیون کا خاندان جسکے سپرد کلید برداری خانۂ کعبہ کی خدمت ہے،

ان مین سے بھی خاندان شرفا کے متعلق تحقیق یہ ہو کہ یہ لوگ مین سے آکر آباد ہوے۔ اور شیبی اگرچہ بلا اختلاف خالص نکی ہین۔ لیکن سوڈانی عورتون کے مسلسل اختلاط نے ان کی نجابت خاندانی کا بھی خاتمہ کر دیا ہو۔

بیرونی لوگون مین تقریباً دُنیا کے ہر حصہ کے مسلمان ہین جن مین غالب تعداد اُن عربون کی ہو جو شام اور ارض مغرب سے آکر آباد ہوے تھے۔ عربون کے بعد تعداد کے لحاظ سے سوڈانیون اور حبشیون کا شمار ہے اور اسکے بعد ہندوستانیون کا نمبر آتا ہو۔

بخارا۔ جاوا اور چین کے بھی کچھ لوگ ہین۔ ترکون کی تعداد پہلے زیادہ تھی اب یہ بہت کم ہین او جو ہین وہ بھی اپنے تئین عرب ظاہر کرتے ہین۔ البتہ مکہ معظمہ مین کچھ وہ ترک نظر آتے ہین جو سلطان وحید الدین کے ہمراہ مالٹا سے آئے تھے اور اب یہین پڑے ہوے ہین۔ اور باستثنا چند خاندانون کے جنھون نے اپنے بیرونی علائق کو ابتک خالص رکھا ہو بیشتر حصہ آبادی مخلوط النسل ہو۔

حکومت کے تمام چھوٹے بڑے عہدے عموماً عربون ہی کے ہاتھ مین ہین۔ فوج اور پولیس مین البتہ حبشی و سوڈانی بھرتی ہین۔ اور چند ترک افسر بھی ہین۔

مکہ معظمہ قدیم الایام سے تجارتی مرکز ہو اور آج بھی تجارت کا بازار وہان خوب گرم ہو۔ تاجرون مین ہر طبقہ کے لوگ ہین۔ بڑی بڑی کوٹھیان عموماً شامی اور ہندی تاجرون کی ہین۔ اور چھوٹے چھوٹے دوکاندارون مین سب قومین بقدر آبادی نظر آتی ہین۔ حجازی عربون کی بسر اوقات یا تو مسجد الحرام کی متعلقہ خدمات سے ہوتی ہو یا چھوٹی دکانون اور پیشہ کے کامون سے۔ حمالی۔ خدمتگاری۔ وغیرہ کے کامون کی انجام دہی کے لیے سوڈانیون کی کثیر تعداد موجود ہو۔ اور شہر کے ... بھی اُنھین کامون مین مشغول رہتے ہین۔ ہر قوم کے متوکلین کی تعداد بھی اچھی خاصی ہو۔ اور اسمین شاید طغرائے امتیاز ہندوستانیون کو حاصل ہو۔ سائلون اور محتاجون کی یہان بہتات ہو اور ان مین مسجد الحرام کے متعلقین کے علاوہ بدو۔ سوڈانی اور ہندوستانی خاص طور پر نمایان ہین۔ شہر کے گلی کوچون مین پھرنے کے علاوہ خاص حرم شریف کے اندر بھی سائل ہر وقت گھومتے رہتے ہین۔ اور ایام حج مین مکانون پر بھی بہت سے شریف صورت اور خوش پوش سائل پھیرے لگاتے رہتے ہین۔ خوش پوش سائل تو گویا یہین کی خصوصیت ہے۔ ہمارے ملک مین جہان افلاس کی کوئی حد نہین عموماً خیرات مانگنے والے پھٹے پرانے چیتھڑے لگائے رہتے

ہین - مگر مکہ معظمہ اور نیز مدینہ منورہ مین جبہ و دستار والے بے تکلف دست سوال دراز کردیتے ہین ایک اجنبی آدمی کے لیے یہ منظر ابتداءً نہایت درجہ دردناک ہوتا ہے اور وہ بے اختیار ہوکر کچھ خیرات دیدیتا ہے گو رفتہ رفتہ جب آنکھین اس نظارہ کی خوگر ہو جاتی ہین تو پھر کم اثر ہوتا ہے اور اگر ہو بھی تو ہر شخص کی جیب اس قدر سائلین کی کفالت نہین کر سکتی ہے

ایام حج اس ملک مین گویا موسم درو ہے - کہ ہر شخص بقدر موقع و حسب صلاحیت اپنا سال بھر کا آذوقہ پیدا کرلیتا ہے تاجرون کی دوکانداری پیشہ ورون کی مزدوری اور سائلین کی بھیک غرضکہ سب کو اس مبارک و مسعود زمانہ مین چمکنے کا موقع ملتا ہے چونکہ ایام حج مین ہر ملک کے مسلمان یہان آتے ہین اس لیے دنیا کی ہر ضروری چیز یہان کے بازارون مین فروخت ہوتی ہے - اور بسبب اسکے کہ خود ملک حجاز مین نہ تو غلہ پیدا ہوتا ہے نہ کسی قسم کی صنعت و حرفت ہے - اس لیے تقریباً کل سامان باہر سے براہ جدہ آتا ہے اور اشیاء خوردنی کے سوا بیشتر سامان ضرورت یورپ اور جاپان کی ساخت کا ہوتا ہے کپڑا البتہ کچھ ہندوستان کی ملون سے جاتا ہے اور کچھ شام و مصر سے - سبز ترکاریان اور تازہ میوے طائف شریف سے روزانہ آتے ہین - اس بلد مقدس مین جسے وادی غیر ذی زرع کا لقب حضرت ابراہیم علی نبینا و علیہ السلام نے دیا تھا ما یحتاج زندگی اور اسباب معیشت کی فراوانی دیکھکر خدا کی قدرت نظر آتی ہے اور اگر دوسرے ممالک متمدنہ کی طرح یہان کے لوگون کی آمدنی و صرف کا اوسط نکالا جائے تو یقین ہے کہ ہندوستان اور دیگر ممالک مشرقیہ کے اکثر بڑے بڑے شہر اسکے سامنے شرما جائین گے -

یہان کے مکانات عموماً کئی کئی منزلون کے ہوتے ہین - اور شہر مین کشادہ سڑکون کا وجود نہین اس لیے نہایت مختصر رقبہ مین ڈیڑھ لاکھ آدمیون کی بود و باش ہے جسکے باعث ہر گلی کوچہ مین چہل پہل رہتی ہے - اہل مکہ لباس کے بارے مین بہت اہتمام کرتے ہین سخت گرمی کے باوجود تلے اوپر کئی کئی کپڑے پہنتے ہین اُن کے کرتے (توب) ٹخنون سے نیچے بالکل گھٹنون سے ملے ہوئے ہوتے ہین اور سفید کرتے کے اوپر دوسرا ریشمی یا رنگین کرتا پہننا یہان کی خصوصیت ہے کرتا پہن کر کمر مین رومال کے کئی پھیرے باندھتے ہین اِس عادت کی بدولت لوگون کا بیان ہے کہ اس ملک مین کبڑے نہین ہوتے کرتون کے اوپر صدری یا کوٹ عموماً ریشمی یا رنگین کرتے کے مثل پہنا جاتا ہے اور اسکے اوپر ریشمی عبا ہوتی ہے - سر پر یا تو ٹوپی و عمامہ ہوتا ہے یا رومال ڈالکر اسپر خوشنما سا ڈیا کسا پہن لیتے ہین -

کھانے مین عربون کا بہت روپیہ خرچ ہوتا ہی گو ان کے کھانے ہمارے مذاق کے مطابق نہین ہوتے گوشت یہان بہت کھایا جاتا ہی۔ چائے قہوہ اور تمباکو نوشی مین شاید ہی کسی ملک کے باشندے یہان کے ہمسر ہون۔

مکہ کا یہ تمدن اس قدر ہمہ گیر ہی کہ عربون کے سوا دیگر ممالک کے جتنے لوگ ہین وہ بھی عموماً انھین طریقون کے پابند ہین۔ جسکی وجہ سے بسا اوقات اجنبی آدمی کو ان مین تمیز نہین ہوسکتی، یہان کے لوگ اُن تمام قیود سے آزاد نظر آتے ہین جو ہمارے ملک کے مذہبی طبقہ مین مرغوب ہین ڈاڑھی منڈانے کا اگرچہ دستور یہان عام نہین لیکن ہندوستان کی سی لمبی ڈاڑھیان یہان قطعاً خلاف فیشن سمجھی جاتی ہین۔ ایام حج مین تو ہندوستان سے کثیر تعداد مین لمبی ڈاڑھیان آجاتی ہین لیکن حاجیون کے چلے جانیکے بعد جب کوئی ڈاڑھی والا ملے تو سمجھ لینا چاہیے کہ وہ صوفی ہی یا نو وارد ہندوستانی کیونکہ صرف ہندوستانی و بخاری صوفیا ہی ابتک لمبی ڈاڑھی اور ٹخنون تک کرتے کی وضع کو نباہے ہوے ہین۔

عربی یہان کے لوگون کی مادری زبان ہی، اس لیے قرآن شریف کی آیتین تو ہر شخص کے نوک زبان رہتی ہین لیکن اسکے آگے علمی چرچا بالکل نہین ہی۔ کیونکہ یہان تعلیم کا کوئی معقول انتظام نہین۔ پہلے ارباب علم حرم شریف کے اندر بیٹھکر سبق دیا کرتے تھے اور اُن کے حلقۂ درس سے بہت لوگ مستفیض ہوا کرتے تھے۔ اب یہ سلسلہ بھی براے نام رہ گیا ہی البتہ چند نام کے مدارس رہوگئے ہین جہان لڑکون کی ابتدائی تعلیم دیجاتی ہی۔ اعلیٰ تعلیم کا نام نہ لینا چاہیے ان مدارس مین مدرسہ صولتیہ اور مدرسۃ الفلاح غنیمت ہین۔ مدرسہ صولتیہ ایک ہندوستانی بزرگ کی یادگار ہی اور اب تک ہندوستان کے روپیہ اور ہندوستانی انتظام مین چل رہا ہی مدرسۃ الفلاح جدہ کے ایک عرب تاجر کی فیاضی سے قائم ہے۔

علم کی کمی اور سامان معیشت کی فراوانی نے ملکر یہان کے باشندون کی اخلاقی و مذہبی حالت کو بالکل برباد کردیا ہی، شریعت کی پابندی یہان کے لوگون کے نزدیک ایک ایسی بدعت ہی جس کا کسی نہج سے تحمل نہین کیا جا سکتا۔

بے شبہ مسجد الحرام مین نماز پڑھنے والون یا طواف کرنیوالون کی کمی نہین ہوتی لیکن اس شہر کی وسعت اور اس حرم محترم کی تقدیس پر نظر کیجیے تو ایام حج کے بعد نمازیون کی تعداد بھی کچھ زیادہ نہین رہتی اور جب ان نماز پڑھنے والون کی حیثیت پر غور کیا جاے تو صاف نظر آے گا کہ ان مین تعداد کثیر

اُن لوگون کی ہو جو صرف اسی غرض سے ہجرت کرکے یہان آبسے ہین۔

مسجد الحرام کے متعلق ایک بہت بڑا عملہ ہو جسکو اپنے فرائض منصبی کی ادائی کے لیے حرم محترم مین موجود رہنا پڑتا ہو لیکن بسا اوقات آپ دیکھین گے کہ اُن مین کے بھی بعض اشخاص نماز کے اوقات مین اِدھر اُدھر کی گپین مارتے رہتے ہین۔ چونکہ حرم محترم مین مغرب کے سوا ہر وقت چارون مصلون پر یکے بعد دیگرے جماعت ہوتی ہو اس لیے لوگون کو ان پر شبہ کا موقع نہین ملتا۔ حرم شریف کے چارون طرف مکانات اور دوکانین ہین ان کے رہنے والے بھی نماز پڑھنا اپنے اوپر لازم نہین سمجھتے۔ مطوفین اور اُن کے ملازمین کے لیے حرم شریف کے اندر نماز پڑھنے یا طواف کرنے کے لیے وضو بھی شاید ضروری نہین۔ اخلاقی ذمائم مین طمع و اسراف کی وجہ سے جسقدر زیادتی ہو اُس سے اگر قطع نظر کی جائے تو زنا اغلام اور اس سے بڑھ کر عورتون کی عورتون کے ساتھ بدکاری یہان عام ہو۔

بیشک ہندوستان اور دوسرے ممالک کی طرح یہان چکلہ خانون اور زنان بازاری کا دستور نہین لیکن کم گھر ایسے ہون گے جن پر حقیقی معنون مین چکلہ کا اطلاق نہو سکے۔ مجھے بڑا دکھ ہوا جب ایک ثقہ واقف کار بزرگ سے یہ معلوم ہوا کہ ہر شب جمعہ کو جنت المعلیٰ مین جہان بی بی آمنہ اور حضرت خدیجۃ الکبریٰ رضی اللہ تعالے عنہا جیسی محترم خواتین کے مزار ہین بکثرت شہر کی عورتین جاتی اور اپنی حیا سوزیون اور حسن فروشیون سے ہر گناہ ہے کہ کسی درشب آدینہ بکن کی حرف بحرف تعمیل کر دیتی ہین۔ الامان والحفیظ۔

پردہ جس کا ہندوستان مین اس قدر چرچا ہو اور جسکے متعلق نہایت شد و مد سے ہمارے یہان گذشتہ تیس سال کے اندر مباحثہ و مناظرہ ہوتا رہا ہو یہان بھی اپنی ظاہری صورت مین موجود ہو یعنی بکثرت عورتین طرح طرح کے خوش وضع برقعون کے اندر ملفوف چلتی پھرتی نظر آتی ہین۔ مگر حیا جو پردہ کی حقیقت و اصل ہے مفقود ہو۔ یہان کے مکانات کی ساخت بھی پردہ کے تحفظ مین مانع ہو۔ اونچے اونچے مکان پاس پاس بنے ہوے ہین جنمین صحن ہوتے نہین۔ نتیجہ یہ ہو کہ روشنی اور ہوا کی ضرورت سے ہر شخص کو اپنے مکانون کی کھڑکیان کھلی رکھنی ہوتی ہین جس کے باعث پڑدسیون سے پردہ قائم نہین رہ سکتا،

ایام حج مین مین نے دیکھا کہ اچھے اچھے ہندوستانی گھرون کی بی بیان بھی اپنا رواجی پردہ قائم نہین رکھ سکتین اور عربی عورتون کی طرح اجنبیون سے پردہ کرنے پر قناعت کرتی ہین اور اکثر

مواقع پر منھ کھلا رکھتی ہین۔

شریف مکہ کو ناز ہے کہ اُن کے ملک مین شراب کی دوکانین نہین ہین لیکن خود وہ بھی شاید اس سے بیخبر نہین کہ خاص اُن کے بیٹون اور دوسرے صاحب ثروت و اقتدار عربون کے گھرون کے اندر میخانے قائم ہین اور بالمرہ شرابین اُڑتی ہین۔ جدہ مین شرابخواری زیادہ عام ہے۔ الحمدللہ کہ مدینہ منورہ کے باشندون کی اخلاقی حالت نسبتاً بہت بہتر ہے۔

معاملات کیطرف نظر ڈالیے تو حالت اور بھی بدتر ہے ادنیٰ عمال حکومت تو شاید دنیا بھر مین اسی لیے بیچا ہین کہ دیانت و امانت کو حرف غلط کی طرح ناپید کر دین۔ مگر یہان کے متوسط اور اعلیٰ عہدہ دار بھی بالعموم اسی مین رنگے ہوے ہین بلکہ یہان کی آبادی کا حصہ غالب زر پرستی کے مرض مین مبتلا ہے ایک شخص نے بالکل صحیح کہا کہ اگر یہان کسی سے کہو کہ تم ذرا ہماری ہتھیلی پر تھوک دو تو وہ بغیر معاوضہ لیے اتنی خدمت بھی انجام نہ دیگا اور دنیا کے تمام خود غرض لوگون کی طرح یہان والون کا مطلب نکل گیا پھر وہ تم سے بات بھی نہین کرتے۔

مین نے ابتدا بہت کوشش کی کہ اپنے حسن ظن کو ہاتھ سے نہ جانے دون اور اس قسم کے جتنے واقعات پیش آتے تھے ان کی تاویل کر کے اپنے یقین اور حتی الامکان اپنے ساتھیون کو تسکین دیدیا کرتا تھا۔ لیکن پے درپے تجربات اور مسلسل مشاہدات نے باآخر میرا عزم متزلزل کر دیا اور مجھے واقعات کو اپنی اصلی حالت مین دیکھنا پڑا۔

لیکن میرے لیے سب سے زیادہ روح فرسا نظارہ وہ تھا جو خود مجھے بیت اللہ شریف کے اندر پیش آیا۔ خاندان شیبی نے جو خانہ کعبہ کے کلید بردار ہین۔ اول تو یہ دستور مقرر کر دیا ہے کہ عام داخلی کے چند مواقع کے سوا جبکہ ہر شخص بیت اللہ شریف کے اندر حاضر ہو سکتا ہے وہ کسی شخص کو بغیر کچھ لیے بیت اللہ شریف مین نہین جانے دیتے۔ چنانچہ موسم حج مین اکثر عشا کے بعد بیت اللہ شریف کا دروازہ کھول کر یہ لوگ بیٹھ جاتے ہین اور جو اشخاص مقررہ فیس ادا کرتے جاتے ہین انھین ایک مختصر زینہ سے اوپر چڑھا کر بیت اللہ شریف کے اندر جانے دیتے ہین۔ ہمارے علما نے اس طرح معاوضہ دیکر داخلی کرنے کو منع کیا ہے مگر لوگون کا اشتیاق دیکھکر کبھی کبھی اجازت دیدیتے ہین اور اس رقم کو بہ نیت خیرات دیدینے کی ہدایت فرماتے ہین۔ پس مین نے بھی اسی قسم کے اذن کی بنا پر تین روپیہ دے کر داخلی کا

شرف حاصل کیا۔ بیت اللہ شریف کے اندر داخل ہونے کے وقت انسان پر ایک عجیب کیفیت طاری ہوتی ہے۔ اور وہ چاہتا ہے کہ اسی کیف کے عالم مین دل کھول کر گریہ وزاری کرے اور نمازین پڑھ پڑھ کر اپنی دلی مرادین طلب کرے۔ عام داخلی کے وقت کثرت ازدحام کی وجہ سے لوگون کو کافی سکون نصیب نہین ہوتا۔ اس لیے اس موقع کو لوگ غنیمت جانتے ہین۔ مگر حیرت و غم کی کوئی انتہا نہ رہی جب مین نے دیکھا کہ ملتزم شریف (بیت اللہ شریف کے دروازہ کی چوکھٹ) پر داخلی کی معینہ رقم دینے کے بعد بھی خاندان شیبی کے زیر پرست ارکان سے نجات نہ ملی۔ چنانچہ بیت اللہ شریف کے اندر داخل ہوتے ہی پہلے تو ایک صاحب نے دعا پڑھوا کر خیرات طلب کی جلدی سے اُن کو کچھ دے کر مین نے اپنی جان چھڑائی اور پھر تین نماز و دعا مین مصروف ہونا چاہا تو اب مین نے دیکھا کہ بیت اللہ شریف کی مختصر عمارت کے ایک جانب ایک دروازہ ہے جس سے بیت اللہ شریف کی چھت پر جاتے ہین۔ اس دروازہ کا نام لوگون نے درِ توبہ رکھ چھوڑا ہے اور جو لوگ اُس کے اندر داخل ہونا چاہتے ہین۔ ایک شخص اُن سے کچھ لیکر چند لمحہ کے لیے اُس مین جانے دیتا ہے بیت اللہ شریف کے اندر بیع و شرا کی یہ کیفیت دیکھکر میرا سارا کیف رخصت ہوگیا اور مین نے دل ہی دل مین بار بار اس مصرع کا اعادہ کیا کہ

چو کفر از کعبہ برخیزد کجا ماند مسلمانی

مین نے بعد کو خاندان شیبی کے رکن اعظم شیخ عبدالقادر شیبی سے اس بارہ مین گفتگو کی اور بہت چاہا کہ اس طریقہ کی نامعقولیت ان کے ذہن نشین کردون۔ مگر اُن پر کوئی اثر نہین ہوا خود اُنھین کی زبانی یہ معلوم ہوا کہ اسلامی سلطنتون اور ہندوستان کی مسلمان ریاستون سے ان کی تنخواہین مقرر ہین اسکے علاوہ شریف کے یہان سے بھی سو گنی ماہوار اُن کو ملتا ہے۔ مگر داخلی کے ذریعہ سے جو ایک ہزار گنی سالانہ کی آمدنی ان کو ہوتی ہے اس سے وہ کسی صورت مین دست بردار ہونے کو تیار نہین ہین بلکہ اس کو جائز ثابت کرنے کے لیے اُنھون نے بعض فتوے حاصل کیے ہین جن کی کچھ نقلین مجھے بھی عنایت ہوئی ہین۔

حالات مندرجۂ بالا کو دیکھکر مجھے ذرا بھی تعجب نہین کہ ترکی حکومت جس کی زرپاشیون اور فیاضیون سے عرب کا بچہ بچہ صدیون تک مستفیض ہوتا رہا ہے اہل عرب اس سے محروم کر دیے گئے اور اب اُن پر ایک ایسا حکمران مسلط ہوگیا ہے جسے لوگ حجاج بن یوسف سے بھی بڑھکر ظالم بتاتے ہین۔

میری ناچیز راے مین صوفیا اور جماعت مصلحین مین سے جس شخص کو اللہ تعالی توفیق عطا فرمائین اسلام کے مرکز اصلی پر جاکر عربون کی اصلاح مین سعی کرنا چاہیے خود میرا خیال ہوا تھا کہ مکہ معظمہ سے ایک عربی اردو اخبار انھین مقاصد کو پیش نظر رکھ کر جاری کرون مگر حکومت موجودہ کے زمانہ مین شخصی آزادی چونکہ عنقا ہے اور عام اس کے باوجود کوئی شخص مامون نہین اس لیے مین اپنی موجودہ حالت پر قانع رہنا چاہتا ہون۔

(جہاز دارا در بحیرۂ عرب) ظفر الملک

سفرِ حجاز کی مختصر روداد

پہلی منزل

دوشنبہ ۱۶ اپریل ۱۹۲۳ء کو رات کے دس بجے جب چار باغ اسٹیشن (لکھنؤ) پر اعزا و اقربا سے رخصت ہوا تو تیسرے درجہ کے ایک ڈبہ مین بیٹھنے بھر کی جگہ ملی۔ دن بھر لوگون سے ملنے اور رختِ سفر باندھنے مین مصروف رہا تھا اور مسلسل حرکت کے باعث خستگی و ماندگی سے بدن چور چور ہو گیا تھا۔ اِس بنا پر قدرتاً جی چاہتا تھا کہ پاؤن پھیلا کر لیٹون اور سو جاؤن مگر درجہ مین مسافرون کی کثرت نے اِس کا موقع نہ دیا اور ناچار گھٹنون پر سر ٹیک کر جسقدر سونیکی کوشش ممکن تھی کی گئی۔ کانپور کے اسٹیشن پر کچھ مجمع چھٹا تو مین نے فراغت کے ساتھ لیٹنے کی امید باندھی لیکن تھوڑے ہی وقفہ کے بعد نئے رنگروٹون کی بھرتی ہونے لگی جسکے بعد پھیلے ہوے پاؤن پھر سکڑ گئے اور اسی عالم مین رات تمام ہونے کے بعد علی الصباح نماز فجر کے وقت جھانسی پہونچا۔ سامان گاڑی پر سے اتر کر اُس چبوترہ پر پہونچا جہان بمبئی کی گاڑی آکر ٹھہرتی تھی اور مین نے قریب کے نل سے پانی لیکر وضو کیا اور نماز فجر ادا کی طلوع آفتاب کے بعد چائے کی تلاش مین اسٹیشن سے باہر نکلا تو مجلس خلافت جھانسی کے ایک کارکن سے ملے جو ریلوے مین ملازم ہین اور جن سے فتح گڈھ جیل مین ایک بار نیاز حاصل ہوا تھا جبکہ وہ میرے رفیق مجلس مکرمی سید محمد ہادی صاحب سکرٹری مجلس خلافت جھانسی سے ملاقات کرنے آئے تھے اور اُنھون نے مجھے پہچان کر ازراہ کرم چائے کی ضیافت فرمائی اور دیر تک اسٹیشن پر میرے ساتھ ٹہلتے اور مقامی حالات سناتے رہے۔ جب وہ اپنے کام پر چلے گئے تو مجھکو تلاوت کلام مجید کا موقع ملا۔ اِس سے فارغ ہوتے ہی بمبئی جانے والا ایکسپرس آگیا اور ایک نہایت ہی محفوظ اور کم مسافرون والے ڈبہ مین قلی نے میرا سامان پہونچا دیا۔ قلیون اور یکہ گاڑی والون کی جماعت سے ہمیشہ مسافرون کو شکایت رہتی ہے اور جھانسی اسٹیشن پر اس سے قبل متعدد دفعہ مجھے کافی پریشانی اُٹھانا پڑی تھی مگر اب کی بار مین گھر سے تہیہ کر کے چلا تھا کہ ہر مقام پر مُنھ مانگی اُجرت ادا کر دونگا تاکہ اِس سفر مین کسی سے جھک جھک نہو۔ چنانچہ جھانسی مین اسی طرز عمل کی بدولت بہت فراغت سے رہا اور

اچھی جگہ بھی مل گئی، جس ڈبہ میں میں جھانسی سے سوار ہوا یہ تیسرے درجہ کی عام گاڑیوں کے مانند نہ تھا بلکہ اس کی ساخت قریب قریب اُس قسم کی تھی جیسے ڈاک گاڑیوں میں اول و دوم درجہ کے متصل ڈبے ہوتے ہیں جنھیں شاید ریلوے اصطلاح میں "بوگی کیرج" کہتے ہیں۔ ایک طویل گاڑی میں پانچ کمرے بنے ہوئے تھے جن کے ایک جانب آمد و رفت کے لیے برآمدہ چھوٹا ہوا تھا اور بیرونی جانب چوروں سے محفوظ رکھنے کے لیے پائدان نہیں لگائے گئے تھے۔ ایک طرف کے کنارے کا کمرہ ذرا چھوٹا رکھا گیا تھا اور جو گنجائش اس طور سے نکلی تھی اس میں پاخانہ تھا جسکا دروازہ سب کمروں کے دروازوں کی طرح برآمدہ میں تھا۔ ڈبہ میں داخلہ کے لیے کنارہ کی طرف دونوں جانب دروازے لگے تھے۔ رات بھر آرام سے سونے نہ پایا تھا اس لیے ریل چلی تو تھوڑی ہی دیر میں غافل ہو کر سو گیا، کئی گھنٹہ کے بعد آنکھ کھلی تو پاس والے کمرے میں ایک صاحب نہایت فصیح انگریزی میں اور کسی قدر بلند آواز سے سیاست حاضرہ پر گفتگو کر رہے اور اپنے کم عمر مخاطب کے سامنے اہل ہند کی بدبختی۔ تحریک ترک موالات کی عدم کامیابی اور حکومت دفتری کی چیرہ دستی پر نوحہ خوان ہو رہے تھے۔ میں دیر تک استفادۃً اُن کی گفتگو کو توجہ سے سنتا رہا تا آنکہ مجھے خطرہ ہوا کہ میرا یہ فعل کہیں اُن کی ناگواری کا باعث نہ ہو اور وہ یہ شبہ نہ کرنے لگیں کہ میں کوئی جاسوس ہوں۔ لہذا میں نے اُن سے معذرت کرتے ہوئے سلسلہ مکالمت شروع کر دیا۔ یہ صاحب اگرچہ سرکاری ملازم تھے مگر خیالات آزادانہ اور فکر بلند رکھتے تھے اس لیے حکومت کی کمزوریوں اور بدعنوانیوں کے اعتراف میں ذرا دریغ نہ تھا۔ مہاتما گاندھی کی دل سے عظمت کرتے۔ تحریک ترک موالات کے اصولوں کو بغایت پسندیدہ نگاہوں سے دیکھتے اور اُسکی ناکامیابیوں کے اسباب و علل کا نہایت صحیح اندازہ رکھتے تھے۔ ان سے ملکر بہت جی خوش ہوا اور دن میں متعدد بار مختلف مباحث پر تبادلہ خیال ہوتا رہا۔ ۲ بجے دن کو بھوپال کے اسٹیشن پر گاڑی پہونچی تو ایک عزیز بھائی سے ملاقات ہوئی۔ جن کو روانگی سے قبل تار دیدیا گیا تھا۔ وہ کچھ عرصہ سے ریاست میں ایک ممتاز عہدہ پر مامور تھے مگر اب بددل ہو کر مستعفی ہو گئے ہیں اور عنقریب اپنے وطن واپس جانے والے تھے۔ تقریباً بیس منٹ تک اُن سے بات چیت ہوتی رہی۔ اسکے بعد ریل کے انجن نے سیٹی دی اور میں اُن سے رخصت ہو کر اپنے ڈبہ میں آبیٹھا۔ میرے کمرے میں دو صاحب الہ آباد کے رہنے والے جھانسی سے سوار ہوئے تھے اور بمبئی تک برابر ساتھ رہے۔ اُن کے ہمراہ ایک آٹھ نو سال کا لڑکا بھی تھا جسکو دیکھکر مجھے بار بار اپنے

بچون اور خصوصاً داؤد سلمہ کی یاد آجاتی تھی۔ بچون کے ساتھ مجھے طبعاً ایک خاص دلبستگی ہے اس وجہ سے جو بچہ بھی مجھکو ملجاتا ہے میرے لیے سامان تفریح اور موجب راحت قلب بنجاتا ہے۔ رات کو خوب اطمینان سے سونے کا موقع ملا اور صبح کو نماز و تلاوت سے فارغ ہوتے ہی منزل پر پہونچنے کا انتظار شروع ہو گیا۔ وہ الہ آبادی لڑکا اب چونکہ مجھسے کسی قدر مانوس ہو گیا تھا اس لیے اُسکی بچپین طبیعت کو زیادہ آزادی ملی اور جب تک ریل وکٹوریہ ٹرمینس پر نہین ٹھہری وہ برابر اپنی شوخیون اور اضطراری حرکتون سے میرے اور اپنے ہمراہیون کے لیے دلچسپی کا ذریعہ بنا رہا۔ ۹ بجے کے قریب گاڑی بمبئی پہونچی اور ہم لوگ ایک دوسرے سے رخصت ہوے۔ قلی نے سامان اُتار کر چبوترہ پر رکھا تو مین اُس صندوق کو حاصل کرنے کی غرض سے آگے بڑھا جو بریک وان مین رکھا ہوا تھا۔ چند قدم چلا ہون گا کہ ایک پولیس کانسٹبل سے مُدبھیڑ ہوئی جس نے فوراً ہی سوالات کی بوچھاڑ کر دی۔ آپ حاجی ہین؟ کہان سے آئے ہین؟ کہان ٹھہریئے گا؟ اِن سوالات کے مختصر جوابات دیتا ہوا مین بریک وان تک پہونچا۔ جہان معلوم ہوا کہ میرا صندوق پچھلے بریک وان مین ہے۔ واپس ہونا چاہتا تھا کہ ایک دوسرے کانسٹبل صاحب سر پر آدھمکے اور وہی سوالات اُنھون نے بھی شروع کر دیے۔ مین اس ملک کی پولیس کے کارنامون سے بخوبی واقف ہون۔ اِس لیے یہ خیال کر کے کہ مجھے اجنبی جانکر ستانا مقصود ہے مین نے کہا کہ آپ میری فکر نہ کرین اپنی راہ لین۔ اور جب دیکھا کہ یہ بلا اس طور پر نہین ٹلی تو انگریزی مین کسی قدر ترش ہو کر اُس سے کہا کہ مین بمبئی سے خوب واقف ہون۔ اور کسی کی رہنمائی کا محتاج نہین۔ انگریزی دانی کے اظہار کی یہان صرف یہ ضرورت تھی کہ کانسٹبل صاحب کے یہ ذہن نشین ہو جائے کہ کسی سادہ لوح ملا سے سابقہ نہین ہے جسے وہ لوٹ سکے گا۔ جیسا کہ میرے لباس اور چہرے بشرے سے غالباً اس نے سمجھا ہو گا۔ چنانچہ یہ نسخہ فوراً کارگر ہوا۔ اور وہ کانسٹبل کچھ بڑبڑاتا ہوا چلا گیا۔ اور جب ایک تیسرے کانسٹبل صاحب نے میرے حال پر توجہ فرمانی چاہی تو اُس نے اُس کو بھی روک دیا۔ خدا خدا کر کے پچھلے بریک وان پر پہونچکر بابو کو بلٹی حوالہ کی اور اپنا صندوق لے کے قلی پر لدوایا اور گاڑی پر سامان رکھ کے سوار ہوا۔ عین اُس وقت جبکہ گاڑی روانہ ہونے والی تھی ایک اور صاحب نازل ہوے اور پوچھنے لگے کہ یہ کیا سامان ہے۔ کہا گیا کہ بستر۔ کپڑے۔ ناشتہ اور دیگر اشیاے خوردنی۔ حکم ملا کہ کھولکر دکھاؤ۔ مین نے پوچھا کہ کیون آپ کون ہین جو میرا سامان دیکھین گے۔ مین متعدد بار بمبئی گیا تھا۔ اور کبھی کسی نے میرا سامان نہ دیکھا۔

اب کی دفعہ یہ نیا انداز دیکھکر خیال پیدا ہوا کہ

کوئی معشوق ہر اِس پردۂ زنگاری مین

دریافت کرنے پر اُس شخص نے اپنے کوٹ کا دامن اُٹھا کر اپنی پیٹی دکھائی جس سے ظاہر ہوا کہ محکمہ جنگی کا سپاہی ہر۔ مین جانتا تھا کہ ممبئی مین اُترنے والے مسافرون پر یہ پابندی کبھی عائد نہ تھی اور میرے لیے آسان بھی نہ تھا کہ اپنے وزنی صندوق کو جو رسی کے جال سے کسا ہوا تھا تنہا اُلٹ پلٹ کر کھولتا اس لیے مین نے کہا کہ بستر اور کپڑون کا بورہ کھلا ہوا ہر آپ شوق سے اس کا معائنہ کیجیے۔ اور از راہِ بندے کنجی کھول کر پیش کی کہ بکس بھی کھولکر دیکھ لیجیے مگر اُس کو اصرار تھا کہ مین گاڑی پر سے نیچے اترون اور سب چیزون کو اپنے ہاتھ سے کھولکر دکھاؤن۔ مین نے کہا کہ جس وقت سامان اسٹیشن کے چبوترہ پر تھا اور قلی موجود تھا تم کو سامان دیکھنا چاہیئے تھا۔ اب تو یہ میرے مان کی بات نہین کہ اتنا بھاری صندوق گاڑی سے نیچے اتارون اور اُسے کھولون۔ اگر تم کو دیکھنا منظور ہر تو ہرچند کہ یہ امر خلاف ... ہر مگر چونکہ مجھے اس بات کا اطمینان ہر کہ میرے سامان مین کوئی چیز لائق گرفت نہین اس لیے بخوشی اجازت دیتا ہون کہ تم سامان دیکھ لو۔ مگر وہ کسی طرح اِس پر راضی نہوا۔ اور جب گاڑی والا گھوڑا بڑھانا چاہتا تھا تو وہ اُسی وقت لگام روک دیتا تھا۔ تب مین نے کہا کہ تم اپنے افسر کے پاس گاڑی لے چلو مین اُس سے بات چیت کر لون گا مگر اُسے اصرار تھا کہ یہ کوئی قاعدہ نہین ہر سامان یہین دکھانا ہو گا مجبور ہو کر مین نے کہا کہ تم جو کہتے ہو اُس کی تعمیل سے مین قاصر ہون۔ اب جو تمھارا جی چاہے کرو۔ اس پر وہ بہت بگڑا اور کہنے لگا کہ یہ گاندھی کی بات ٹھیک نہین ہر تم سامان دکھاؤ۔ ورنہ بہت پریشان ہوگے۔ مین نے پھر کہا کہ خیر جو کچھ ہو۔ سامان دکھانے مین مجھے عذر نہین مگر یہ بکس میرے کھولے نہین کھُل سکتا۔ اس لیے مین مجبور ہون۔ تمھارا جی چاہے کنجی لیکر کھولو اور دیکھ لو ورنہ جو تمھارے اختیار مین ہو کرو۔ وہ دیر تک اُلجھتا رہا مگر جب اُس نے دیکھا کہ کوئی دھمکی کارگر نہین ہوتی تو ذرا سیدھا ہوا اور پوچھنے لگا کہ کوئی نشے کی چیز تو نہین ہر۔ مین نے کہا نہین تب اُس نے پیچھا چھوڑا اور مین سیدھا ابو صدیق کے مسافرخانے پہونچا جو اسٹیشن سے تقریباً دو فرلانگ کے فاصلہ پر ہے۔ مسافرخانہ مین عبدالقادر سکندر تعلم حجاج مقیم لکھنؤ کے بیٹے حسن سکندر پہلے سے جس کمرہ مین ٹھہرے ہوئے تھے، اُسی کمرہ مین مجھکو بھی ٹھہرنے کی جگہ دی گئی۔ جس سے معلوم ہوا کہ جہاز اکبر و زیانی دو روز پیشتر روانہ ہو چکے ہین۔ اب ۲۱ کو ہمایون جانے والا ہر جسکے ٹکٹ برابر فروخت ہو رہے ہین۔ لہذا مین

تھوڑی دیر ٹھہر کر بازار ہوتا ہوا جناب مولوی عبد اللہ احمد صاحب محافظ حجاج کی خدمت میں حاضر ہوا۔ وہ میرے دیرینہ کرمفرما ہیں۔ اِس وجہ سے بڑے تپاک سے ملے اور فوراً ہی پاسپورٹ بنوا دیا۔ اور مغل کمپنی کے ایک ملازم (بایدلال) کو جو دفتر میں موجود تھا بلا کر میرے ساتھ بھیجا کہ ٹکٹ خریدنے میں میری رہنمائی کرے۔ چنانچہ کمپنی کے دفتر میں جا کر ایک سو روپیہ کا ٹکٹ خرید لیا گیا۔

میں ۱۰ اپریل کی صبح کو بمبئی پہونچا تھا اور چونکہ پہونچنے کے دو ہی گھنٹہ کے اندر حصولِ پاسپورٹ اور خریداری ٹکٹ کے مراحل سے فراغت مل گئی تھی اس لیے دو ڈھائی دن ضروری سامان کی خریداری اور دوستوں سے ملاقات کے لیے مل گئے اور جب اتفاق سے ۱۲ کے بجائے ۱۴ اپریل کو جہاز کی روانگی ہوئی تو دو دن فرصت کے اور ہاتھ لگے۔ چار پانچ دن کی اس فرصت سے فائدہ اٹھا کر میں نے ضروری سامان بھی خریدا۔ مرکزی خلافت کمیٹی اور اخبار خلافت کے دفتروں میں بھی حاضری دی اور اس مجلس ملی کے پیچیدہ معاملات کے متعلق معلومات بھی فراہم کی۔ اور ضمناً بمبئی کی تھوڑی سی سیر بھی ہو گئی۔ گو سابق کی طرح حقیقتاً اس کا کم موقع ملا۔ بمبئی اتنا بڑا شہر ہے کہ اُسکی سیر کرنے کے لیے ہفتوں بلکہ شاید مہینوں کی اقامت درکار ہے۔ پھر آئے دن کے تغیرات کی وجہ سے ایک ایسے شخص کو جو برسوں کے بعد بمبئی آتا ہو ہمیشہ اسکی ضرورت ہوتی ہے کہ کوئی رفیق و رہنما سیر کے وقت ساتھ ہو۔ میرے پاس نہ اتنا وقت تھا اور نہ کوئی ایسا رہبر۔ اس لیے بمبئی کی شہری زندگی کے متعلق کچھ کہنے کا موقع نہیں۔ البتہ یہ ضرور کہہ سکتا ہوں کہ بمبئی کی سابقہ چہل پہل میں کوئی کمی محسوس نہیں ہوئی۔ اور جدید عمارتوں کو دیکھکر تو یہی خیال کیا جا سکتا ہے کہ یہ شہر جو ہندوستان کا عروس البلاد کہا جاتا ہے برابر ترقی کر رہا ہے۔

خلافت کمیٹی کے دفتر میں جب حاضری کا اتفاق ہوا تو دوپہر کا وقت تھا اور کوئی صاحب دفتر میں موجود نہ تھے۔ البتہ دفتر کے متعلقہ مہمانخانہ میں محترمہ بی اماں صاحبہ کے تشریف رکھنے کی خبر ملی۔ چنانچہ میں نے اپنی حاضری کی اطلاع کر کے محترمہ موصوفہ کی قدمبوسی اور رخصتی دعائیں حاصل کیں۔ اور وہاں سے بمعیت چودھری عبد الغنی صاحب ایڈیٹر روزنامہ خلافت اُن کے دفتر چلا گیا۔ وہاں کئی گھنٹہ ٹھہرا رہا۔ کیونکہ اتفاق سے مکرمی خواجہ غلام الحسنین پانی پتی تشریف لے آئے اور چونکہ وہ ایک سال سے زائد عرصہ تک عراق میں سفر کرنے کے بعد واپس آئے تھے اِس لیے دیر تک عراق کے تمدنی و سیاسی حالات اُن سے سنتا رہا اور یہ معلوم کر کے بہت خوش ہوا کہ عراق کے عربوں علی الخصوص علما و مجتہدین نے کمال ہمت

واستقامت سے برطانوی اقتدار کا مقابلہ کیا ہے اور نام نہاد شاہ عراق امیر فیصل کو ناکون چنے چبوادیے ہین۔ ساتھ ہی یہ دریافت کرکے بہت صدمہ ہوا کہ جیسا اندیشہ تھا انگریزی قبضہ کی بدولت عراق کی مقدس زمین پر وہ تمام شیطنتین مسلط ہو گئی ہین جو گویا تہذیب جدید کے لوازم مین داخل ہین اور جنھین قرآن کریم نے مسلمانون پر مطلقاً حرام کیا ہے۔ برطانوی مدبرین و وزرا از راہ تبختر کہا کرتے ہین کہ خدا نے دنیا مین تہذیب پھیلانے کی خدمت ان کے سپرد کی ہے لیکن معلمین تہذیب کے چند سالہ تصرف عراق نے اس ملک مین بداخلاقیون کی جو فراوانی کردی ہے اُس کو دیکھ کر کوئی منصف مزاج شخص یہ کہے بغیر نہین رہ سکتا کہ

اے خدا مجھے میرے دوستون سے بچا

یہ بالکل جُدا گانہ امر ہے کہ آجکل خود حق و انصاف کے معنی ومفہوم مین ایک تغیر عظیم واقع ہو گیا ہے اور جن باتون کو ہم مسلمان بداخلاقی سمجھتے ہین دانایان فرنگ کے لیے وہ روزمرہ کی معمولی باتین ہین جنپر حرف گیری کرنے والون کو وہ بڑی خوشی سے بیوقوفون اور جاہلون کی فہرست مین داخل کردینے کے لیے تیار رہتے ہین۔

۱۸ر اپریل کو جب مین بمبئی پہونچکر مسافرخانہ مین ٹھہرا تو میرے کمرہ مین حسن سکندر داد رکمہ معظمہ کے ایک دوسرے مطوف کے بھتیجے سید احمد جعفری پہلے سے ٹھہرے ہوئے تھے۔ سامان رکھکر مین ٹکٹ لینے گیا اور وہان سے دو گھنٹہ کے بعد واپس آیا۔ تو اپنے بستر کے قریب ہی ایک اور صاحب کا سامان رکھا ہوا دیکھا اُس شخص کی صورت اور وضع اور اُسکے لباس اور مختصر ساز وسامان کو دیکھ کر مجھے گمان ہوا کہ یہ کوئی خفیہ پولیس کا آدمی ہے۔ ۱۹۱۹ء مین مہاتما گاندھی کی تحریک ستیاگرہ کی شرکت کے بعد سے برابر خفیہ پولیس جو کہ میرے حرکات وسکنات کی نگران رہی تھی اس لیے خیال ہوا کہ اس سفر مین بھی میری معیت کے لیے ایک فرشتہ معین کیا گیا ہے اور اگرچہ اس بات کا بجائے خود مجھکو اطمینان کامل تھا کہ مین کوئی مجرمانہ ارادہ نہین رکھتا تاہم کوئی وجہ نہ تھی کہ مین ایسے شخص کے مقابلہ مین کسی قدر احتیاط نہ برتتا۔ چنانچہ بمبئی کے قیام مین جب کبھی رحمت شاہ نے مجھ سے گفتگو کرنا چاہی یا ضروری سامان کی خریداری مین شرکت کا خیال ظاہر کیا تو مین نے ہمیشہ ٹالدیا۔ اور حتی الامکان اس کی موجودگی مین اپنے دوسرے ساتھیون سے بھی زیادہ بات چیت نہ کی۔

۲۰ر اپریل کو خبر ملی کہ دوسرے روز دوپہر کے بعد جہاز پر سب مسافرون کو سامان پہونچانا ہوگا

اِس سے پیشتر جتنی دفعہ بحری سفر کا موقع ملا کبھی ایسا نہین ہوا تھا اِس لیے پہلے کسی قدر تذبذب ہوا۔ مگر جب معتبر ذرایع سے اُس کی تصدیق ہو گئی اور اسکی ضرورت بھی سمجھ مین آگئی تو دوسرے روز مین بھی سامان باندھنے لگا۔ چونکہ حسن سکندر رحمت شاہ کے بھی معلم قرار پا گئے تھے اِس لیے اُنھون نے میرے اور اُن کے سامان کے لیے ایک ہی بیل گاڑی والے سے طے کیا۔ جب سامان بالائی منزل سے نیچے آیا اور مین اپنے صندوق کو رسیون سے باندھنے لگا تو رحمت شاہ ازراہ ہمدردی اِس محنت کے کام مین میرے معین بن گئے اسکے بعد حسن سکندر ہی کے مشورہ کی بنا پر رحمت شاہ تو بنڈی (بیل گاڑی) پر سامان کے ہمراہ آئے اور مین اُن کے ساتھ ٹریم کار مین بیٹھکر گودی (ڈاک یارڈ) پہونچا۔ گودی بعینہ جہاز کے لیے وہی حیثیت رکھتی ہو جو اسٹیشن کا مال گودام ریل سے تعلق رکھتا ہو۔ گودی کی وسیع عمارت کے سامنے سمندر کی طرف جو چبوترہ تھا ہمارا جہاز اُس سے چند گز کے فاصلہ پر لنگر انداز تھا اور اُسکے تختے دونون سمتون مین زینے لگے ہوئے تھے جن سے مسافر جہاز پر جا سکتے تھے، چاہیے یہ تھا کہ جیسے جیسے حجاج آتے جاتے اپنا اپنا سامان جہاز پر پہونچاتے جاتے لیکن ایسا نہین ہوا بلکہ پہلے تو جملہ حجاج اُس کھلے چبوترہ پر جمع ہو کر اپریل کی تیز دھوپ مین تقریباً دو گھنٹہ کامل تک سکھلائے گئے اسکے بعد جب مولوی عبداللہ احمد صاحب محافظ حجاج تشریف لائے تو ایک ڈاکٹر صاحب بغرض معائنہ طلب کیے گئے۔ پھر جب مولوی صاحب موصوف نے کمپنی کے کارکن سے دریافت کیا کہ حجاج کو ٹھہرانے کے لیے گودی کیون نہین کھلوادی جو اُن کو دھوپ کی تپش سے نجات ملتی۔ تو معلوم ہوا کہ اتوار کا دن ہونیکی وجہ سے گودی نہین کھولی گئی اور خود کمپنی والون نے محض اس اعتماد پر کہ جب حجاج سامان چڑھانے جاتے ہین تو گودی کھلی رہتی ہو۔ کوئی خاص تحریک نہ کی۔ بہرحال اب کیا ہو سکتا تھا لیکن آئندہ کے لیے مجھے امید ہو کہ کمپنی کے کارکن ایسی غفلت نہ کرین گے۔ کچھ توقف کے بعد ایک ڈاکٹر صاحب تشریف لائے اور اگرچہ انھون نے کسی کا معائنہ نہین کیا لیکن اُن کا آنا حاجیون کے لیے موجب نجات ہو گیا۔ اِس لیے کہ فوراً ہی جہاز پر جانے کی اجازت مل گئی۔ اجازت پاتے ہی دفعتاً تمام حاجی دوڑ پڑے اور ہر شخص کوشش کرنے لگا کہ سب سے پہلے وہی جہاز پر پہونچکر اپنے لیے بہترین جگہ انتخاب کر لے اور اِس غرض سے کہ انتخاب کرتے ہی اُس جگہ پر فوراً قبضہ بھی ہو جائے لوگ اپنے ہاتھون مین چٹائیان، کمل، دریان اور طرح طرح کے بچھونے لیے ہوئے تھے۔ بعض لوگ جو اپنا سامان کسی معتبر شخص کے پاس نہین چھوڑ سکتے تھے پورا سامان لیکر

چڑھ رہے تھے، غرضکہ اس وقت کا یہ ہنگامہ اچھا خاصہ تماشہ بن گیا تھا۔
مین اُس وقت تک نیچے ہی کھڑا رہا جبتک زینہ پر چڑھنے والون کا ریلا رہا جب بھیڑ چھٹ گئی تو مین بھی چٹائیان لیکر اوپر پہونچا۔ مولوی عبداللہ احمد صاحب نے اپنے ایک ماتحت کو اس ہدایت کے ساتھ میرے ہمراہ بھیجدیا تھا کہ وہ مجھے کوئی اچھی سی جگہ تلاش کر دین مگر جو جگہ اُنھون نے تجویز کی وہ مجھے پسند نہ آئی اور مین نے خود اپنی رائے سے ڈیک کے بالائی حصہ پر ایک جگہ منتخب کی، اور وہین اپنی چٹائی بچھا دی۔ تھوڑی دیر بعد جب سامان اوپر آیا تو رحمت شاہ نے بھی میرے پاس ہی اپنی چٹائی بچھالی۔ یہ امر اگرچہ میری مصلحت کے خلاف تھا لیکن پے درپے اتفاقات نے رحمت شاہ کو میرا ساتھی بنا دیا اس لیے مجھے چار و ناچار سر تسلیم خم کرنا پڑا۔ جہاز پر سامان کی حفاظت کا انتظام بمبئی کی پولیس کے سپرد تھا جو ان معاملات مین محافظ حجاج صاحب کے تحت مین کام کرتی ہے اور جب سب حجاج کا سامان پہونچ گیا تو حجاج اپنے اپنے جائے قیام پر واپس آگئے۔

دوسرے دن معائنہ طبی کا مرحلہ تھا۔ جسکے لیے سویرے ہی سے حجاج روانہ ہونا شروع ہوے۔ مین رات کو ایک دوست کے یہان مدعو تھا اور کھانے کے بعد دیر تک اُن سے بات چیت کرتا رہا۔ جسکی وجہ سے صبح کو سویرے نہ اُٹھ سکا، کچھ تو دیر مین اُٹھنے کی وجہ سے اور کچھ اس سبب سے کہ مجھکو پھلون کی خرید کرنا باقی تھی مین سب سے آخر مین روانہ ہوا۔ پھر بھی جب مین بھپارے کی جگہ پہونچا تو معائنہ طبی ختم نہ ہوا تھا۔ پہلے جب ہندوستان مین طاعون کسی قدر اجنبی تھا تو عموماً معائنہ طبی کے موقع پر حجاج کے کپڑون کو بھپارہ بھی دیا جاتا تھا مگر اب کہ یہ مرض مثل بخار اور درد سر کے ہندوستان کے عام امراض کی فہرست مین شامل ہو چکا ہے۔ بھپارہ دینے کی ضرورت نہین سمجھی جاتی۔ بھپارہ کا مکان ایک گودام کے مانند بنایا گیا ہے۔ مگر اس کی ساخت مین چونکہ اس بات کا پورا لحاظ رکھا گیا ہے کہ اندر بند کیے جانے والے ذی روح مال کو باہر کی کافی ہوا پہونچتی رہے۔ اس لیے باہر سے کھڑے ہو کر اندر کی کارروائیون کا تماشا دیکھنا آسانی سے ممکن ہے۔ چنانچہ پیش آنے والے معائنہ کی نوعیت کو سمجھنے کے لیے مین نے بھی کچھ دیر تک اس تماشہ کی سیر کی اور جب حجاج کی آخری جمعیت اندر جانے لگی تو مین بھی اُسی گودام مین داخل ہو گیا۔ اس مقام پر حجاج کے ساتھ تقریباً وہی سلوک کیا جاتا ہے جو گنتی کے وقت جیلخانون کی بارکون مین ہوتا ہے۔ پہلے تو جملہ حجاج کو ایک قطار مین بیٹھنے کا حکم دیا گیا۔ پھر

کہا گیا کہ سب لوگ اپنے اپنے پیٹ کھولکر کھڑے ہون۔ اُسکے بعد ڈاکٹر صاحب تشریف لائے اور اُنھون نے ہر شخص کی جا بجا ٹٹول کر دیکھی کہ کسی کے گلٹی تو نہین ہے۔ پھر حکم ملا کہ سب لوگ اپنے ٹکٹ اپنے سینون پر کھولکر رکھین۔ اور ایک شخص نے آکر ان ٹکٹون اور حجاج کے ہاتھون پر مہرین لگائین جسکے بعد گنتی شروع ہوئی۔ اور متعدد آدمیون نے کئی کئی دفعہ شمار کیا۔ شمار ختم ہونے کے بعد ہدایت ہوئی کہ سیدھے جہاز پر چلے جاؤ۔ اُسی گودام کے ایک گوشہ مین عورتون کے لیے ایک بند کمرہ ہے جسمین ایک لیڈی ڈاکٹر صاحب معائنہ کرتی ہین اور مجھے اپنی ایک عزیزہ سے معلوم ہوا کہ اُنھون نے اُنکو دھمکی دیکر کچھ رقم بطور نذرانہ وصول کر لی۔

مین نے بعض لوگون کو لکھدیا تھا کہ بمبئی کے قیام مین اگر وہ کوئی خط وغیرہ میرے نام بھیجنا چاہین تو جنرل پوسٹ آفس بمبئی کے پتہ پر بھیجین۔ مگر سامان کی فراہمی اور لوگون سے ملاقات مین ایسا منہمک رہا کہ چار پانچ دن مین ایک دفعہ بھی ڈاک خانہ تک نہ جا سکا چنانچہ یہ معلوم کرنے کے بعد کہ جہاز کی روانگی مین کسی قدر دیر ہے معائنہ طبی سے فارغ ہوتے ہی مین ٹرام کار پر بیٹھکر ڈاک خانہ گیا اور وہان سے تقریباً نصف گھنٹہ کے اندر اندر واپس آکر جہاز پر سوار ہوا۔

دوسری منزل

جہاز پر دس بجے تک کل حجاج جن کی تعداد تقریباً پانچسو تھی سوار ہوچکے تھے لیکن بندرگاہ کے کنارے پر پانی اتنا نہ تھا کہ جہاز روانہ ہوسکتا۔ دو ڈھائی گھنٹہ کے بعد جب جوار بھاٹا آیا اور پانی چڑھا تو ایک بجے جہاز روانہ ہوا اور جب تک بندرگاہ کا ارکاٹی جو جہاز کی رہنمائی کر رہا تھا جہاز کو بندرگاہ کے باہر پہونچا کر اُتر نہین گیا۔ جہاز کی رفتار سست رہی اور اکثر حجاج صحن جہاز پر سے بمبئی کی عمارتون اور بندرگاہ کے جہازون کو دیکھتے رہے۔ مین نے اپنے لیے جو جگہ منتخب کی تھی وہ صحن کے پچھلے حصہ مین اُس مقام پر تھی جہان سامان اُٹھانے کے کرین Cranes یا آلات جر ثقیل لگے ہوتے ہین چونکہ یہ حصہ بالکل کھلا ہوا تھا اور روانگی کے بعد فوراً ہی پردے بھی نہین ڈالے گئے، اس لیے سوار ہونے کے وقت سے عصر کے بعد تک آفتاب کی تپش میرے اور اُس مقام پر دوسرے بیٹھنے والون کے لیے صبر آزما تھی۔ یہ مختصر جگہ قدرتی طور پر دو حصون مین تقسیم ہوگئی تھی۔ عین وسط مین دونون جانب کے کرین تقریباً سطح سے پانچ فٹ کی بلندی پر آویزان تھے۔ ایک جانب میرا اور رحمت شاہ کا

بستر تھا اور دوسری جانب لاہور کے ایک ٹھیکہ دار صاحب معہ اپنی اہلیہ صاحبزادی اور ایک کمسن بھتیجے کے مقیم تھے یہ کل رقبہ چاروں طرف سے محاط تھا۔ ایک سمت میں کرین کو حرکت دینے اور کرین کے رسوں کو لپیٹنے والی کلیں اس طریقہ سے لگی ہوئی تھیں کہ اُن کے درمیان تقریباً ڈیڑھ گز مربع آہنی حوض چھوٹا ہوا تھا اور ان کلوں کے نیچے کے تختے جو ایک سرے سے دوسرے سرے تک مسلسل چلے گئے تھے جہاں جہاں کھلے ہوے تھے ہمارے لیے سامان رکھنے کی جگہ فراہم کرتے تھے دوسری سمت میں وہ آہنی پشتہ تھا جس پر کرین رکھے ہوے تھے ان پشتوں کے نیچے کی جگہ خالی تھی اس لیے ہمیں اپنا پانی اور سامان خوردنی رکھنے کے لیے ایک مناسب جگہ مل گئی اس پشتہ کے عقب میں لکڑی کی ایک بڑی جعفری بنی ہوئی تھی جس میں بھیڑیں بند تھیں تیسری سمت میں ایک طویل نل لگا ہوا تھا جس کے اندر وہ زنجیر تھی جو جہاز چلانے والے عقبی پنکھوں کو مسلسل حرکت میں رکھتی ہے اور چوتھی سمت کی حد بندی بھی اسی قسم کی زنجیر سے تھی۔ بس فرق اس قدر تھا کہ جس جانب کو میں نے اپنے لیے منتخب کیا تھا اُدھر اُس نل کے اوپر ایک فٹ چوڑا آہنی پٹرا لگا ہوا تھا جس کے وسط میں ہم لوگوں نے اپنے صندوق اور بورے ایسے طور پر رکھ دیے تھے کہ دونوں کنارے آمد و رفت کے لیے دروازوں کے مانند کھلے رہتے۔ اور دوسری جانب جدھر ہمارے لاہوری ساتھی تھے زنجیر کے اوپر کوئی پٹرا نہ تھا۔ جب تک صحن میں دھوپ رہی لوگ طوعاً و کرہاً اندروں کے حجاج اپنی اپنی جگہ پر رہے یا جس رُخ دُھوپ نہ تھی وہاں اپنے اپنے چولھے جلا کر کھانا پکاتے رہے مگر جیسے جیسے دھوپ کم ہوتی گئی لوگ نیچے سے اوپر آتے گئے تا آنکہ شام تک صحن کے کسی کونہ میں آمد و رفت کا راستہ چھوڑ کر چپہ بھر جگہ نہ باقی رہی جہاں کسی نے بستر نہ لگا لیا ہو۔ ہم لوگ چونکہ ایک محاط جگہ میں تھے جہاں ہماری چٹائیوں کے بچھ جانے کے بعد صرف ذرا سی جگہ آمد و رفت کے لیے بچی تھی اس لیے ہمارے یہاں کسی نے مداخلت پسند نہ کی اور ہم جتنی مدت جہاز پر رہے اس حیثیت سے نہایت امن میں رہے۔ دن بھر تمازت آفتاب سے جو تکلیف اُٹھائی تھی شام ہوتے ہی نہایت ٹھنڈی ہوا نے اس کی تلافی کر دی اور رات بڑے آرام سے بسر ہوئی۔ دوسرے دن صبح کو پہلے صحن دھویا گیا، اسکے بعد پردے باندھ دیے گئے تو پھر دھوپ کی کوئی شکایت باقی نہ رہی۔ صحن جہاز ہر روز دھویا جاتا ہے اور اُس وقت عموماً مسافروں کو تھوڑی سی دقت ہوتی ہے بعض لوگوں کا سامان ذرا سی غفلت

مین بھیگ جاتا ہو۔ میرے قریب دو جانب چونکہ سطح صحن سے تقریباً ۹ انچہ بلند پٹرے تھے اس لیے کل سامان بڑی حفاظت سے رکھا ہوا تھا اور سواے بچھونے اور متفرق چھوٹی چھوٹی اشیا کے کسی چیز کو اٹھانے کی حاجت نہوتی تھی، دو منٹ کے اندر بچھونے لپیٹکر مین چلانے والی کل کے اوپر رکھدیے جاتے تھے اور متفرق چیزین اسی کی خالی جگہ مین، اور ڈھلائی کے وقت مین خود کبھی تو اونچے پٹرے پر کھڑا ہو جاتا تھا اور کبھی جہاز کے دوسرے کسی حصہ کی گشت لگانے چلا جاتا۔ سید احمد جعفری نے جو مسافر خانہ مین میرے ساتھ تھے اور اسی جہاز پر مکہ معظمہ جا رہے تھے اپنے مقام پر گنجایش کم دیکھکر اپنی کرسی کی آرام کرسیان میرے یہان لاکر رکھدی تھین جنمین سے ایک تو وہ دوسرے دن لے گئے اور دوسری پر اُن سے اجازت لیکر ہم لوگ بیٹھتے رہے۔ اس ذریعہ سے مجھکو اور بھی راحت ملی۔

حجاج کے ٹکٹ بالعموم بغیر خوراک ہوتے ہین اور اُنھین کھانا پکانے کے لیے جہاز پر جگہ بھی دی جاتی ہے۔ اور لکڑی بھی ملتی ہے۔ ہمایون چھوٹا سا جہاز ہے اور اسی سبب سے اس کے باورچی خانے بھی چھوٹے ہین لیکن اسی نقص کو رفع کرنے کے لیے صحن کے مختلف حصون مین کنارے کے رخ پر تین چار انچہ کے بلند چبوترے بنا دیے گئے ہین جہان لوہے کی انگیٹھیان رکھکر کھانا پکا لیا جاتا ہے پہلے روز تو لوگ عموماً بمبئی سے روٹیان اور دیگر سامان خوردنی ساتھ لائے تھے مگر دوسرے روز سے ہر طرف چولھے جلنا شروع ہوے اور صبح سے لیکر شام تک باری باری سے لوگ کھانا پکایا کرتے تھے۔ میری جگہ باورچی خانہ کے عین مقابل تھی اور اگر برابر اسی مین کھانا پکتا رہتا تو دھوئین سے کافی تکلیف ہوتی، مگر اول تو وہان گنجائش کم تھی دوسرے دھوئین سے خود پکانے والون کا دم گھٹتا تھا اس بنا پر باورچی خانہ کے اندر پکانے کے بجاے لوگ زیادہ تر باہر کی چبوترون پر پکانا پسند کرتے تھے اور ایک روز کے بعد تو باورچی خانہ بالکل ہی خالی رہنے لگا۔

مین گھر سے تنہا چلا تھا اور بمبئی سے اگرچہ رحمت شاہ کا ساتھ ہو گیا تھا مگر مین نے اُن کے ساتھ کھانے پکانے کا انتظام گوارا نہ کیا۔ اسکے علاوہ چلتے وقت اعزا نے اس قدر ناشتہ ساتھ کر دیا تھا کہ اسکے اور معقول رقم محصول ریل کی مد مین مجھے صرف کرنا پڑی جسکے بعد سواے اسکے کوئی صورت نہ رہی کہ مین اس رقم کی وصولی اور اس ناشتہ کے انبار کو ٹھکانے لگانے کے لیے جہاز پر تازہ کھانے

انتظام سے قطع نظر کروں چنانچہ جتنے دنوں میں جہاز پر رہا یہ ناشتہ ہی کھاتا رہا۔ اور اسکی مقدار اتنی تھی کہ اسکے بعد بھی ایک معقول حصہ بچ گیا جو واپسی تک کام آتا رہا بلکہ بعض چیزیں ساتھ واپس آئیں۔

جہاز پر مسافروں کو کھانے کی فکر کے سوا کوئی شغل نہیں ہے۔ عام جہازوں پر لوگ عموماً اپنا وقت گذارنے کے لیے تاش وغیرہ کھیلا کرتے ہیں۔ مگر حجاج کی جماعت میں اس کا رواج عام طور پر نہ تھا۔ جو لوگ خواندہ تھے وہ عموماً فرصت کے اوقات کتب بینی میں صرف کرتے تھے۔ ورنہ باہم بات چیت کرکے یا لیٹے لیٹے وقت گذرتا تھا۔ کچھ عابد و زاہد لوگ بھی تھے جو زیادہ تر تسبیح و مصلی سے کام رکھتے تھے پانچوں وقت اذانیں ہوتی تھیں اور متعدد چھوٹی بڑی جماعتوں میں لوگ نمازیں پڑھتے تھے۔

پینے اور کھانا پکانے کے لیے میٹھا پانی دن میں ایک بار ملا کرتا تھا۔ اس لیے ہر شخص کو اپنا اپنا برتن لیکر پانی بھروانے جانا پڑتا تھا۔ اور لکڑی بھی کبھی روزانہ اور کبھی دوسرے دن ملتی تھی۔ جسکے لیے بھی لوگوں کو جد و جہد کرنا پڑتی تھی۔ پانی اور لکڑی حاصل کرنے کے وقت اچھا خاصا ہنگامہ ہو جاتا تھا کیونکہ ہر شخص چاہتا کہ پہلے وہی حاصل کرلے۔ دینے والا ایک اور لینے والے بہت سے اور وہ بھی بے صبر نتیجہ یہ ہوتا تھا کہ بعض اوقات جہاز کا منشی جو پانی اور لکڑی تقسیم کرتا تھا گھبرا کر بھاگ جاتا۔ اور تقسیم رک جانے کی وجہ سے لوگوں کو تکلیف ہوتی۔

مجھے کھانا پکانے کی تو کوئی فکر نہ تھی۔ اور پانی بھی بمبئی سے اتنا لے لیا تھا کہ کئی دن تک چلتا رہا۔ لیکن میرے ساتھی رحمت شاہ کو کھانا پکانے کی وجہ سے دونوں چیزوں کی ضرورت پڑتی تھی لہذا پانی اور لکڑی کے جو ٹکٹ ہر مسافر کو دیے گئے تھے وہ میں نے رحمت شاہ کے حوالے کر دیے اور جب انھیں ضرورت ہوتی تو وہ اپنے اور میرے ٹکٹ کو دکھا کر لکڑی اور پانی لاتے رہتے۔ میں چائے کا عرصہ سے عادی ہوں اور جہاز پر تو ہر شخص کے لیے چاء کا استعمال ضروری ہے۔ اس کے لیے میں نے آتے ہی جہاز کے بھنڈاری سے انتظام کر لیا تھا اور وہ جس وقت ضرورت ہوتی کیتلی بھر پانی گرم کر دیتا تھا بھنڈار خانہ چونکہ جہاز کی پچھلی چھت کے بالائی حصہ پر تھا اس لیے مجھ کو چائے کا پانی گرم کرانے کے لیے دن میں کئی بار وہاں جانا پڑتا تھا مگر دو ہی تین دن کے بعد سے رحمت شاہ نے مجھے اس سے بے نیاز کر دیا۔ اب میرے پاس سوائے اس کے کوئی کام نہ تھا کہ دن بھر نوشت و خواند میں مصروف رہوں یا جہاز کے

ملاقاتیون سے بات چیت کرتا رہون۔

جہاز پر جتنے حجاج مبئی سے سوار ہوے تھے اُن مین بڑی تعداد تو بنگالیون کی تھی اور باقی مختلف صوبجات کے لوگ تھے، مگر ان مین یہ دیکھکر مجھے بہت تکلیف ہوئی کہ تعلیم یافتہ مسلمانون کی نہایت قلت تھی۔ انگریزی دان طبقہ کا نمائندہ تو میرے سوا کوئی دوسرا تھا ہی نہین لیکن عربی فارسی جاننے والے بھی انگلیون پر شمار ہو سکتے تھے۔ البتہ جاہل اور ناخواندہ لوگون کی کثرت تھی۔ انگریزی خوان جماعت کے لیے جہان مسجد کی حاضری اور پنجوقتہ نماز معاف ہے۔ وہین معلوم ہوتا ہے کہ حج کا فرئضہ بھی اُن کے ذمہ عائد نہین کیا گیا۔ گویا قرآن شریف صرف جاہل مسلمانون ہی کی ہدایت کے لیے نازل ہوا ہے۔ تعلیمیافتہ اور خصوصاً انگریزی خوان مسلمانون کو اس کی حاجت ہی نہین، اس بے نیازی کا کیا ٹھکانا ہے!

مذاق کے مطابق جہان ملنے والے نہ میسّر آئین وہان خلاف مذاق لوگون ہی مین انتخاب کرنا پڑتا ہے اور اگرچہ میری نوشت وخواند کی مصروفیتین کچھ کم نہ تھین تاہم چند گھنٹے روزانہ نئے احباب کے نذر کرنا پڑتے تھے۔ رحمت شاہ اب چوبیس گھنٹے ساتھ رہتے تھے اس لیے مجھکو اُن کے بشرے اور حرکات وسکنات پر زیادہ غور کرنے کا موقع ملا اور جب مین نے خود ان کے بیان کردہ حالات سنے اور ایک حد تک کی تصدیق اُن کاغذات سے بھی ہوگئی جو اُن کے پاس موجود تھے اور جو مین نے ایک مناسب موقع پر اُن سے مانگ کر دیکھے تو میری بدگمانی جاتی رہی۔ اور رفتہ رفتہ اُن کی غربت مزاج اور نیک نفسی کے باعث مجھکو اُن سے ایک طرح کا اُنس ہو گیا۔ اور اُس غریب نے حتی المقدور میری خدمت بھی کی۔

ہمارے پڑوسی نظام دین صاحب جو لاہور مین ٹھیکہ داری کا کام کرتے ہین نیکدل اور خوش اخلاق آدمی تھے اور اُن کا کمسن بھتیجا غلام حسین اپنی بھولی باتون اور بچپن کی شوخیون سے ہم سب کا دل بہلایا کرتا تھا۔ اِن لوگون کا تو خیر ہر وقت ساتھ ہی رہتا تھا۔ مگر ان کے علاوہ اور بھی متعدد حجاج ہماری صحبت مین شریک ہوجایا کرتے تھے جنمین ضلع پرتابگڈھ کے ایک صاحب سردار خان سے خاص لطف ہو گیا تھا۔

۲۱ راپریل کو رات مین جہاز کراچی پہونچکر بندرگاہ مین لنگر انداز ہو گیا۔ صبح سویرے جہاز کی صفائی سے فارغ ہو کر خلاصیون نے پردے کھول دیے اور کرین اوپر کو اُٹھا دیے اور دن بھر گیہون اور آٹے کے بورے جو کشتیون پر لاد کر لائے گئے تھے۔ جہاز کے اندرونی تہخانے مین بھرے گئے اِس سے اندر کے مسافرون کو بھی کسی قدر تکلیف ہوئی اور جو لوگ صحن مین فروکش تھے وہ تو دھوپ کی گرمی سے بلبلا اُٹھے

لیکن چونکہ کھانے پینے کی مختلف چیزین بیچنے والے جہاز سے متصل بہت سی کشتیون پر سوار تھے اور اُن مین سے بعض بعض آدمی جہاز کے اوپر بھی پہونچ گئے تھے اس لیے مسافرون کو ایک اچھا مشغلہ ہاتھ آگیا تھا اور ہر شخص خریداری مین یا اُس کا تماشا دیکھنے مین مصروف نظر آتا تھا۔ شام تک سب سامان بھی لاد دیا گیا اور کشتیان بھی مال بیچکر چلی گئین۔ دوسرے دن طلوعِ آفتاب کے بعد جہاز گودی کے کنارے پہونچا دیا گیا اور کراچی کے مسافر سوار ہونے لگے۔ مین نے جلدی جلدی چند خطوط لکھے اور ایک صاحب کے معرفت پولیس سارجنٹ کے حوالے کیے جس نے یقین دلایا کہ ڈاک خانہ مین ڈال دیے ہون گے صحن کی چھت پر چونکہ اب تک پردے نہین پڑے تھے اس لیے آج بھی کافی تکلیف رہی اگرچہ اسے حجاج کی دیکھ بھال سامان کی خرید اور خطوط نویسی وغیرہ مشاغل کی وجہ سے کم محسوس ہوئی۔ ظہر کے بعد جہاز روانہ ہوا اور عصر کے وقت تک کراچی کا کوئی پتہ نشان باقی نہ رہا۔ دوسرے ہی دن صبح کو پردے پڑ گئے اور جب تک جہاز پر قیام رہا پھر اس زحمت کا سامنا نہین ہوا۔

جہاز کراچی سے روانہ ہوا تو دوسرے دن مین نے الناظر کے لیے مضمون لکھنا شروع کیا۔ اتفاق سے جہاز کے ڈاکٹر صاحب اس وقت میرے پاس سے ہوکر گذرے اور مجھے مصروفِ تحریر دیکھکر میری طرف متوجہ ہوگئے۔ اور جب انھین یہ معلوم ہوا کہ مین ایک ناچیز قومی خادم ہون تو دیر تک مختلف معاملات قومی و ملکی پر گفتگو کرتے رہے اُس وقت سے وہ میرے حال پر خاص کرم فرمانے لگے اور روزانہ ملاقاتین ہونے لگین۔ اُنھون نے کراچی اور عدن مین انگریزی اخبارات خریدکیے اور مجھے بھی پڑھنے کو دیے۔ کراچی سے سندھ پنجاب اور بلوچستان کے تقریباً ساڑھے چار سو حجاج سوار ہوے اور اگرچہ ان مین بعض بڑے بڑے معزز لوگ بھی تھے مگر تعلیمیافتہ لوگون کی ویسی ہی قلت تھی۔ صرف ایک صاحب انگریزی دان تھے جو پنجاب کے رہنے والے تھے اور بلوچستان کی ریاست لسبیلہ مین ملازم تھے۔ ان صاحب سے ڈاکٹر صاحب کے یہان ملاقات ہوئی اور پھر ان کے ذریعہ سے اکثر بلوچی سردارون سے نیاز حاصل ہوا۔

کراچی سے عدن تک چھ دن کا راستہ تھا۔ جہاز ہمایون چھوٹا تھا اس کی رفتار بھی کم تھی تیز جہاز چار یا پانچ ہی دن میں پہونچ جاتے ہون گے۔ مجھے اس اثنا مین اپنا مضمون بھی ختم کرنا تھا اور بہت سے خطوط بھی لکھنا تھے اس وجہ سے مین روزانہ کئی گھنٹے لکھنے مین مصروف رہتا تھا فرصت کے اوقات مین کبھی دوسرے مسافر میرے یہان آکر جمع ہوجاتے اور کبھی مین ڈاکٹر صاحب کے یہان یا مسٹر فضل الدین

یہاں چلا جاتا اور بلوچی سرداروں سے اُن کے حالات سنتا رہتا تھا۔

سندھ کی ریاست میرپور خاص کے سابق رئیس کے چھوٹے بیٹے بھی کراچی سے سوار ہوئے تھے ان کو عدن پہونچنے سے قبل ایک تار بھیجنے کا خیال پیدا ہوا۔ سید احمد جعفری نے چونکہ اُن سے وعدہ لے لیا تھا کہ وہ مکہ معظمہ پہونچکر ان کے چچا سید امین عاصم کو اپنا معلم بنائیں گے اس لیے سید احمد نے ان کی خدمت گذاری یہیں سے اپنے ذمہ لے لی تھی۔ اور وہی میرے پاس آکر تار کا مسودہ لکھوا لیگئے۔ جہاز پر مارکونی کمپنی کا وائرلس اپریٹس (بے تار کے تار بھیجنے والا آلہ) لگا رہتا ہے اور اسی کے ذریعہ یہ تار بھیجنا مقصود تھا۔ چونکہ تار بابو انگریز تھا جو ہندوستانی زبان سے بہت تھوڑی واقفیت رکھتا تھا اس لیے سید احمد صاحب کو ایک ترجمان کی حاجت ہوئی۔ اور وہ مجھے اس خدمت کے لیے پکڑ لے گئے اسکے بعد جو کچھ اس انگریز سے گفتگو ہوئی تھی اُنھوں نے خواہش کی کہ میں خود چل کر میر صاحب کو سمجھا دُوں میر نبی بخش صاحب ہندوستانی بھی سمجھتے تھے مگر فارسی میں گفتگو کرنا زیادہ پسند کرتے تھے چنانچہ تار کے متعلق ضروری بات چیت ختم ہو جانے کے بعد اُن سے دیگر امور پر دیر تک گفتگو ہوتی رہی۔ اور جب ان کو اثنائے گفتگو میں یہ معلوم ہوا کہ میں لکھنؤ کا رہنے والا ہوں تو پھر وہ واجد علی شاہ اور اُن کی اولاد کے حالات اور لکھنؤ کی بعض عمارتوں خصوصاً قیصر باغ کے بارہ میں مجھسے سوالات کرتے رہے۔ لکھنؤ کے ساتھ اُن کو اس قدر دلچسپی تھی کہ پھر جب کبھی اُن سے ملاقات ہوتی تو وہ لکھنؤ ہی کا تذکرہ چھیڑ دیتے۔

جیسے جیسے جہاز کراچی سے دور اور عدن سے قریب ہوتا جاتا تھا گرمی بڑھتی جاتی تھی۔ ۲۸ مئی کو رات کے دس بجے جہاز بندرگاہ عدن میں لنگر انداز ہوا۔ تو دیر تک مسافر دور سے شہر کی روشنیوں کا نظارہ کرتے رہے۔ صبح سویرے ہی کشتیوں پر سامان بیچنے والے آگئے اور ہر شخص شغل خرید میں منہمک ہو گیا۔ میں نے بھی کچھ پھل اور آلو خرید لیے۔ چونکہ رحمت شاہ سے اب ربط ہو گیا تھا اکثر کھانے میں بھی شرکت ہونے لگی تھی اس لیے ترکاری پکوا لینا آسان تھا۔ عدن میں مچھلی بہت خریدی گئی میاں نظام دین اور رحمت شاہ دونوں نے مچھلی خریدی اور اپنے اپنے طور پر پکا کر مجھے بھی کھلائی۔ دس بجے دن کو جہاز روانہ ہوکر دوسرے دن اُسی وقت جزیرۂ کامران کے سامنے ٹھہر گیا۔ یہاں قرنطینہ ہر اس لیے ایک رات کے لیے جہاز چھوڑنا پڑا۔ جملہ مسافر ضروری بچھونے اور کھانے کا سامان لئے ہوئے کشتیوں پر سوار ہوکر جزیرہ کے ساحل پر اُتر گئے۔ ساحل سے تقریباً دو سو قدم کے فاصلہ پر قرنطینہ کا

کیپ ہرسنازی کمپنی کا ایک جہاز اُسی وقت جاوا کے حجاج کو لیے ہوئے پہونچا تھا۔ پہلے ہماؤن کے مسافر اُتارے گئے پھر دوسرے جہاز کی باری آئی۔ اور دونوں جہازون کے سافر جدا گانہ کمپون مین ٹھہرائے گئے۔ کیمپ کے اندر داخل ہونے سے پہلے ایک مکان مین بلائے گئے جہان ہر شخص سے کہا گیا کہ اپنے کپڑے اُتار کر وہ لنگی باندھے جو قرنطینہ ہی کی ملک تھی۔ چھوٹی چھوٹی ٹکڑیون مین لوگ مکان کے اندر جاتے۔ کپڑے اُتارتے۔ لنگیان باندھتے اور پھر ایک مقام پر لیجا کر اُن کا شمار ہوتا اسکے بعد وہ ایک ایسے کمرہ مین بھیجدیے جاتے جہان چھت مین فوارہ دار نل لگے ہوے تھے اور تھوڑی دیر کے لیے نل کھولدیے جاتے۔ بعض لوگ تو نلون کے نیچے کھڑے ہو کر غسل کر لیتے تھے بعض پر تھوڑا ہی سا پانی پڑجاتا تھا اور بعض جو اِدھر اُدھر کنارون سے لگ کر کھڑے ہوتے بالکل نہین بھیگتے تھے۔ اتارے ہوے کپڑے اور بستر ہر شخص سے لے لیے جاتے تھے اور ایک بڑے آہنی ظرف مین رکھکر اُنھین بھپارہ دیا جاتا تھا غسل خانہ سے نکل کر ہم لوگ اسی بھپارہ والے کمرے مین پہونچے جہان ہمارے کپڑے اور بستر ہمارے حوالے کیے گئے۔ عجلت مین بعض لوگون کے کپڑے اور بچھونے گڈمڈ ہو گئے۔ چنانچہ میان نظام دین کی ایک صدری اسی مین تلف ہو گئی۔ اشیاے خوردنی اور دیگر سامان جو ہم اُس کمرہ مین چھوڑ آئے تھے جہان کپڑے اُتارے گئے تھے وہان سے ملازمین قرنطینہ نے اُٹھا کر باہر رکھدیا اور جب ہم لوگ اپنے کپڑے پہن کر باہر آئے تو ہر شخص نے اپنی اپنی چیز پہچان کر اُٹھالی۔ اِس موقع پر بعض لوگون کو شکایت رہی کہ انکی چیزین اُنھین نہین ملین۔ مجھے یہان ایک خاص واقعہ پیش آیا۔ میرے دونون بازوؤن مین تعویذ کے طور پر سو سو روپیہ کے نوٹ بندھے ہوے تھے جس وقت مین نے کپڑے اُتارے تو دونون تعویذ کھول کر ہینڈ بیگ مین رکھ دیے۔ کچھ دیر بعد سردار خان صاحب نے اپنا روپیہ میرے سپرد کیا تو مین نے بیگ کھول کر اُس کو بھی رکھدیا۔ جب غسل خانہ کی طرف جانے لگا تو مجھے خیال آیا کہ عینک اور خلال تر ہو جائے گی۔ لہٰذا پھر بیگ کھولا اور یہ دونون چیزین بھی رکھدین۔ اسکے بعد جب مین نہا چکا اور اپنے کپڑے پہن کر اپنا سامان اُٹھا رہا تھا تو دفعتاً سردار خان صاحب ایک طرف سے آے اور ایک تعویذ دکھا کر مجھسے پوچھنے لگے کہ کیا یہ آپکا ہے۔ مین نے دیکھا تو کہا ہان یہ میرا ہی ہے۔ اُنھون نے کہا کہ مین نے کھدر کا دیکھ کر خیال کیا کہ آپ ہی کا ہوگا۔ اُسمین پانچ سو روپیہ کے نوٹ تھے۔ خدا معلوم یہ کس وقت میرے بیگ سے نکل کر سردار خان صاحب کے کپڑون مین جا گرا۔ اللہ تعالیٰ نے بڑا فضل کیا ورنہ غربت مین اتنی بڑی رقم

ضایع ہو جانے کی وجہ سے میرے لیے کافی دقتون کا سامنا ہوتا۔ غسل سے فارغ ہو کر سب لوگ کیمپ مین پہونچ گئے۔

کیمپ کے چارون طرف بلند جالی دار کٹہرا لگا ہوا ہے۔ اور وسط مین فوجی بارکون کی طرح چھپرا در ٹٹیون کی متعدد بارکین بنی ہوئی ہین۔ جن کے درمیان کافی فاصلہ چھوڑا گیا ہے اور اُن کے دونون جانب ڈھکے ہوے برآمدے بنائے گئے ہین۔ اِن بارکون مین تھوڑے تھوڑے فاصلہ پر بڑی بڑی کھڑکیان ہین جنمین دروازے نہین لگائے گئے تاکہ ہوا کی کسی وقت روک نہ ہو سکے۔ بارکون کے درمیان جو راستے بنائے گئے ہین اِن کے وسط مین جہان چوراہے ہین گیس کی بتیان لگی ہوئی ہین جن سے میدان اور قریب کی بارکون کے برآمدون مین روشنی رہتی ہے۔ اور بارکون کے اندر لالٹینین روشن کی جاتی ہین۔ احاطہ کے دو جانب آہنی جالی سے متصل پختہ پاخانے غسل خانے اور وضو خانہ بنا ہوا ہے جسمین پانی کے نل لگے ہوے ہین۔ مغربی سمت مین ایک وسیع بارک نماز کے لیے بنی ہوئی ہے جسمین چٹائیان بھی بچھی ہین بارکون مین کسی قسم کا فرش نہین ہے۔ جنوبی جالی کے قریب ایک پختہ بارک کسی قدر بلند کرسی کی بنی ہوئی ہے جسمین اول درجہ کے مسافر ٹھہرائے جاتے ہین۔ اور اُس سے تھوڑے فاصلہ پر ایک کمرہ مین میٹھے پانی کا ذخیرہ ہے۔ جالی کے جنوبی مشرقی کونہ پر لکڑی کا ذخیرہ رکھا گیا ہے۔ اِن دونون کے درمیان مختصر سا بازار ہے۔ جہان ضروری اشیاے خوردنی فروخت ہوتی ہین۔ دوکانون کے باہر ایک تختی پر چیزون کا مقررہ نرخ لکھا ہوا ہے۔ روٹی۔ پراٹھے۔ چاے۔ شربت۔ لمنیڈ۔ برف۔ کھجور۔ شکر۔ سگریٹ۔ تمباکو۔ دیا سلائی وغیرہ مناسب قیمتون پر فروخت ہوتی ہین۔ بکری۔ مرغیان۔ مچھلی اور انڈے بھی ملتے ہین اور اِن چیزون کی قیمتین عموماً کم ہین۔

سہ پہر کو ظہر کے وقت ہم لوگ کیمپ مین داخل ہوے۔ اگرچہ آفتاب کی تپش ناقابل برداشت تھی لیکن سمندر کی تازی ہوا کے باعث گرمی کی تکلیف بہت کم محسوس ہوئی۔ اور رات کے وقت اس سہانی فضا مین سمندر کی ٹھنڈی ہوا نے جو لطف دیا اُس سے تو ہر شخص نہایت ہی شادان و فرحان تھا میرے کرمفرما سردار خان صاحب تو جہاز کی قید اور گرمی سے اِس قدر تنگ آ گئے تھے کہ اگر اُن کو کچھ عرصہ تک اِس قرنطینہ مین رہنے کا موقع دیا جاتا تو وہ اُسے بہت خوشی سے منظور کر لیتے۔ اگرچہ فی الجملہ یہان بھی یہ قید لگی ہوئی تھی کہ تار دن کی چار دیواری کے باہر کوئی حاجی نہین جا سکتا تھا حتیٰ کہ دوسرے جہاز کے حجاج سے بھی ملاقات نہین ہو سکی۔ مگر یہ مقام ایسا صاف اور ستھرا اور ہوا دار تھا کہ ہر شخص نے اُس کو

پسند کیا۔ یہ قرنطینہ ترکی عہد کی یادگار ہی اور جنگ کے زمانہ سے انگریزی قبضہ مین آگیا ہی۔ قرنطینہ کی بارکون سے کچھ فاصلہ پر انگریزون کی مختصر فوج کا پڑاؤ ہی۔ اور اُسکے آگے تقریباً ایک میل پر عربون کی بستی ہی۔ جسکا انتظام ایک ہندوستانی مجسٹریٹ سے متعلق ہی۔ یہ صاحب شام کو ہمارے کیمپ مین بھی تشریف لائے اور اتفاق سے مجھے مل گئے تو دیر تک قرنطینہ کے انتظامات اور دیگر امور پر گفتگو ہوتی رہی۔ صبح سویرے ہی سے لوگون نے جہاز پر واپس جانے کی تیاری شروع کردی۔ کچھ دیر مین معلوم ہوا کہ ڈاکٹری معائنہ ہوگا۔ چنانچہ مختلف بارکون کے لوگ بارکون سے باہر میدان مین جمع کرکے قطار در قطار بٹھائے گئے اور جب تک کل حجاج کا معائنہ نہو لیا کوئی اپنی جگہ سے ہٹنے نہ پایا۔ گنتی اور معائنہ ختم ہوتے ہی سب لوگ اپنا اپنا سامان لیکر کنارہ کی طرف روانہ ہوے۔ اور وہان جو بڑی بڑی کشتیان کھڑی ہوئی تھین اُن پر سوار ہوکر تقریباً دس بجے تک جہاز پر واپس پہونچ گئے۔ کامران جانے کے لیے جہاز سے جس وقت حجاج کشتیون پر سوار ہوے تھے تو جہاز کے کرانی (کلارک) صاحب نے زینہ کے اوپر کھڑے ہوکر کل حاجیون سے ٹکٹ لیے۔ اور اُس وقت پہلی دفعہ جہاز والون کو معلوم ہوا کہ ۸ آدمی بے ٹکٹ کے سفر کر رہے ہین۔ یہ سب مدراس کے رہنے والے نوجوان تھے جنھون نے خدا معلوم کیسے بمبئی ہی سے روانگی سے قبل جہاز کے اندر اپنے تئین چھپا دیا تھا۔ بعض لوگون کا خیال تھا کہ جہاز کے ملازمین مین سے کسی کی شرکت سے یہ کارروائی کی گئی۔ بہرحال جب حال کھلا تو جہاز کے عمال جو کرتے مگر اب کیا ہو سکتا تھا۔ اپنی غفلت کو طشت از بام کرنا انھین منظور نہ تھا۔ اس لیے انھون نے ان لوگون سے کچھ تعرض نہ کیا۔ جہاز پر بہت سے ایسے مسافر تھے جو اپنی غربت و مسکینی کا اظہار کرکے دوسرے حجاج سے کھانا اور خیرات حاصل کرتے تھے۔ یہ لوگ بھی انھین مین شریک رہتے تھے اور کسی کو گمان بھی نہوا کہ یہ بغیر ٹکٹ سوار ہوے ہین۔ حج کا فریضہ صرف انھین لوگون پر عائد ہوتا ہی جن کو خدا نے اتنی استطاعت دی ہو کہ وہ ضروری مصارف برداشت کرسکین۔ لیکن ہندوستان سے ہر سال کثیر تعداد مین ایسے لوگ بھی حج کے لیے ضرور جاتے ہین جن کے پاس صرف جہاز کا کرایہ ہوتا ہی۔ اکثر لوگون کو تو بمبئی اور کراچی کے صاحبان خیر ٹکٹ دلا دیتے ہین اگر وہ اُن ذلتون اور حقارتون کا احساس کرسکتے جو ان مساکین کی بدولت دنیا بھر کے مسلمان حجاج کی نظرون مین عموماً اور ارض حجاز کے باشندون کی نگاہون مین خصوصاً ہندوستانی مسلمانون کی ہوتی ہی اور ان دشواریون کا اندازہ کرسکتے جو اُن کی واپسی کے انتظام مین درپیش آتی ہین تو مجھے یقین ہو کہ یہ اصحاب

اِس تھوڑے سے ثواب کو حاصل کرنا ضروری نہ خیال فرماتے اور محض جانے کا ٹکٹ دلا کر اپنی ذمہ داریوں کو ختم نہو جانے دیتے۔

مین ان مفلس ونادار لوگون کو الزام نہیں دے سکتا جو فرض نہونے کے باوجود اپنے مذہبی جوش اور مخلصانہ شوق سے مجبور ہوکر سفر حجاز کے لیے اُٹھ کھڑے ہوتے ہین۔ بلکہ حقیقتاً ان کی مذہبی دلدادگی نہایت درجہ قابل قدر ہے لیکن جن لوگون نے اس سفر کو ایک قسم کی تجارت بنا لیا ہے اور جن کی تعداد کچھ کم نہیں ہوتی وہ یقیناً صد درجہ قابل ملامت ہین۔ تاجران بمبئی وکراچی اور دوسرے مقامات کے جو صاحب خیر لوگون کو حج کرانے کا ثواب حاصل کرنا چاہتے ہین اُنھین چاہیے کہ آمد و رفت کے کرایے اور زاد راہ و دیگر مصارف ضروریہ کی کفالت اپنے ذمہ لین تاکہ ان غریبون کو بھی ارض مقدسہ مین جاکر ہر قسم کی مصیبتون سے نجات ملے اور ہم مسلمانان ہند بھی تحقیر و رسوائی سے محفوظ رہین۔ مین اس مسئلہ پر اخبار مین علیحدہ لکھون گا مگر یہان بھی یہ عرض کیے بغیر نہیں رہ سکتا کہ اس بارہ مین سب سے زیادہ علماے مذہب کو توجہ کرنا چاہیے۔

۶ رمئی کو جب جہاز کامران سے روانہ ہوا تو اکثر حجاج نے احرام باندھنا شروع کر دیے۔ ہم لوگون نے اس وقت تک انتظار کرنا مناسب سمجھا جب تک یلملم کی پہاڑی نہ آ جائے کہ مولانا رشید احمد گنگوہی قدس سرہ العزیز اور دیگر مستند علماے ہندوستان کی ہدایات کا یہی منشا ہے۔ جہاز کے کپتان سے جاکر دریافت کر لیا تھا اور اُس نے کہا تھا کہ ۷ رمئی کو شام کے ۴ بجے یلملم کی پہاڑیان دکھائی دینے لگین گی اور اُسی وقت جہاز سیٹی دیگا۔ اسکی اطلاع اپنے ساتھیون اور دوسرے ملاقاتیون کو کر دی تھی اور وہ سب لوگ ظہر کے بعد سے سیٹی کے لیے ہمہ تن گوش بنے ہوے تھے مگر جب عصر کا وقت تنگ ہونے لگا اور سیٹی نہ بجی تو انتظار سے تنگ آکر پھر کپتان کے پاس دوڑا ہوا گیا۔ معلوم ہوا کہ صبح سے مخالف باد تند جو چل رہی ہے اسکے بدولت جہاز کی رفتار کم ہو گئی ہے اور اب نصف شب مین یلملم پہونچنے کی سیٹی دی جائیگی۔ چنانچہ سب لوگون نے اطمینان سے مغرب کے بعد غسل سے فراغت حاصل کی۔ اور کپڑے اُتار کر احرام کی لنگیان باندھ لین۔ صرف سُنتہ الاحرام پڑھ کر نیت کر لینا باقی رہ گیا۔ چنانچہ ٹھیک گیارہ بجکے پچاس منٹ پر جہاز نے ایک طولانی سیٹی بجائی اور ہم لوگون نے سوتے سے اُٹھ کر جلدی جلدی وضو کیا اور دو رکعت سنت ادا کر کے احرام کی نیت کر لی۔

ایک دن قبل سے جو ہواے تُند چل رہی تھی وہ شام ہوتے ہوتے بہت تیز ہو گئی تھی اور جہاز کو

بہت حرکت دے رہی تھی۔ رات کو تو اس کا اثر چندان نہیں محسوس ہوا مگر دسویں کی صبح کو جہاز کی جنبش زیادہ ہو گئی تو ہر طرف لوگ متاثر ہونے لگے۔ جس کو دیکھو دوران سر مین مبتلا اوڑھے بیٹھے پچھے خاصے بیمار کی صورت بنا لیٹا ہے۔ بعض لوگون کو متلی اور قے بھی ہو رہی تھی حتیٰ کہ اکثر جہاز کے ملازمین بھی جو عموماً بحری سفر کے عادی ہوتے ہین پریشان نظر آتے تھے۔ چونکہ آج جہاز جدہ پہونچنے والا تھا اس لیے مین نے صبح ہی کو اٹھ کر سامان درست کر لیا تھا صرف بستر نہیں باندھا تھا۔ یہ دن ایسا تھا کہ منزل پر پہونچنے کی خوشی مین سارے جہاز پر چہل پہل ہونا چاہیے تھی، مگر جہاز کی جنبش کے باعث سب لوگ پڑ گئے تھے اس وجہ سے چہل پہل کی جگہ بالکل سناٹا چھایا ہوا تھا۔ میری طبیعت بفضلہ اچھی رہی گو سر کسی قدر بھاری معلوم ہوتا تھا۔ بہر حال خدا خدا کر کے دوپہر کو ۱۲ بجے جہاز بندرگاہ جدہ مین لنگر انداز ہوا تو لوگون کے دم مین دم آئے۔ نمازی کمپنی بمبئی کا وہ جہاز جس پر باوی حجاج سوار تھے اور جو کامران سے ہمارے جہاز کے بعد روانہ ہوا تھا ہمالون سے پیشتر بندرگاہ مین پہونچ گیا تھا اسلیے پہلے اُسی کے مسافر اُتار کر قرنطینے پہونچائے گئے۔ توقع تھی کہ شام تک ہم لوگ بھی جہاز سے اُتر جائین گے مگر معلوم ہوا کہ جدہ مین کشتیان زائد نہیں ہین اس لیے صرف ایک جہاز کے مسافر اُتارے جائین گے اور ہمین ایک شب اور جہاز پر رہنا ہوگا۔ جن لوگون کی طبیعتین جہاز کی جنبش سے زیادہ خراب ہوئی تھی اُنھین تو خواہش سکون مین یہ تعطل چندان گران نہیں گذرا لیکن مجھے کافی افسوس ہوا۔ بہر حال رضینا بالقضا کہکر رات کو سو رہے۔ ابھی صبح نہوئی تھی کہ کسی نے بیدار کر دیا۔ آنکھ کھولکر دیکھا تو ایک شخص سر پر مسلط تھا۔ مین نے سفر بحری کے اثنا مین عربی کے ضروری اور کار آمد جملے یاد کر لیے تھے مگر ان کے استعمال کا ابتک کوئی موقع نہیں ملا تھا اس لیے مجھے قدرتاً اس شخص سے گفتگو کرنے مین قدرے دقت محسوس ہوئی۔ بہر حال وہ میری ٹوٹی پھوٹی عربی سے خواہ کچھ نہ سمجھا ہو مگر مین نے اُس کی گفتگو کا یہ مطلب سمجھ لیا کہ وہ کشتی والا ہے اور ہم لوگون کو اپنی کشتی پر سوار کرانا چاہتا ہے۔ چنانچہ مین نے اُس سے کہا کہ بعد نماز فجر ہم لوگ سوار ہو سکین گے۔ اُس نے اپنا نام محمدؐ بتا کر مجھسے کہا کہ جب تم نماز سے فارغ ہو جانا تو مجھے پکار لینا۔ اِس قدر بات چیت ہو جانے کے بعد مین نے اپنے دوسرے ساتھیون کو جگایا۔ ہم سب لوگون نے ساتھ وضو کر کے اول وقت نماز فجر ادا کی۔ اور محمدؐ کو بلا کر سامان کشتی پر پہونچانا شروع کیا۔ چھوٹی چھوٹی چیزین ہم نے خود رکھدین اور وزنی اشیا محمدؐ نے اپنے ایک ساتھی کی معیت مین

اُٹھائیں اور مین معہ اپنے پڑوسیون اور اُن کے ساتھیون کے کشتی پر سوار ہوگیا۔ ہم سب دس آدمی تھے۔ یہ امر ہمکو جہاز ہی پر معلوم ہوچکا تھا کہ کشتی والے کو کرایہ ساحل پر پہونچکر اُس شرح سے دیا جائے گا جو حکومت کی طرف سے معین ہو۔ اور نیز اس امر کی بھی اطلاع ملگئی تھی کہ کشتی قرنطینہ مین ہم لوگون کو اُتار کر ہمارے سامان سمیت وہین کھڑی رہے گی۔ لہذا قرنطینہ مین ایک رات بسر کرنے کے لیے تقریباً اُسی قدر ضروری اشیا ہمین سے علیحدہ کرلی تھین جو کامران مین ساتھ گئی تھین۔ کشتی پر سوار ہوجانے کے بعد اب فکر ہوئی کہ کشتی جلد روانہ ہو تاکہ دھوپ کے تیز ہونے سے پہلے ہم لوگ قرنطینہ پہونچ جائین۔ مگر ہمارا کشتی بان دوسرے مسافرون کی فکر مین جہاز پر جاکر غائب ہوگیا تھا۔ انتظار سے تنگ آکر مین پھر اوپر گیا تو معلوم ہوا کہ ایک کشتی پر کم سے کم چبیس آدمی ہون تب کشتی روانہ ہوسکتی ہے۔ بہرحال کچھ مزید وقفہ گذرنے کے بعد محمد تقریباً ڈیڑھ درجن حاجیون کو لیکر آیا اور اُن کو سوار کرکے کشتی روانہ ہوئی۔

جدہ کا قرنطینہ دو مختصر جزیرون مین ہے جو شہر سے تقریباً چار اور پانچ میل کے فاصلہ پر واقع ہین۔ دور والے جزیرہ مین پہلے دن کے بادی حجاج اُتارے جاچکے تھے۔ اس لیے ہم لوگ قریب کے جزیرہ مین اُتارے گئے۔ کشتی کا سفر ایک گھنٹہ کے اندر طے ہوگیا۔ جزیرہ مین داخل ہوے تو وہان کوئی سرکاری میزبان نہ نظر آیا۔ ایک ضعیف العمر شخص نے ہم لوگون کو پانی کے ٹکٹ دئے جسکی ظاہری صورت سے معلوم ہوتا تھا کہ وہ اس تکیہ کا مجاور ہے۔ آگے بڑھے تو متعدد پختہ بارکین دکھائی دین جن کے گرد تارون کی بلند دیواریں تھین مگر امتداد زمانہ سے یہ تار زنگ آلود ہوکر بالکل کمزور ہوگئے اور جالیان جگہ جگہ سے پھٹ گئی تھین۔ ہم سے پہلے جو کشتیان پہونچ گئی تھین اُن کے مسافر اتر چکے تھے اور اُنھین کی مدد و رہنمائی سے ایک بارک پر ہم لوگون نے بھی قبضہ کیا۔ تھوڑی دیر مین اور لوگ بھی پہونچ گئے اور ساری بارکین بھر گئین۔ ہم لوگ چونکہ پہلے آئے تھے اس لیے ایک کونہ مین جہان تین طرف سے ہوا آتی تھی کافی جگہ پر ہمارا قبضہ ہوگیا تھا۔ اور اپنا سامان وغیرہ رکھکر پہلا کام جو مین نے کیا وہ یہ تھا کہ سارے قرنطینہ کا ایک چکر لگایا۔ جزیرہ اتنا چھوٹا ہے کہ شاید پندرہ منٹ کے اندر کل احاطہ اور تعمیرات کا سرسری ملاحظہ ہوگیا۔ کامران کی طرح یہان بھی ایک شفاخانہ کی جگہ بنی ہوئی تھی مگر اس جگہ کی ظاہری حالت بتا رہی تھی کہ برسون سے یہان انسان کا گذر نہین ہوا۔ کل چار بارکین مسافرون کے قیام کے لیے تھین اور ہم لوگون کی تعداد ایک ہزار کے قریب تھی۔ لہذا بارکون مین خوب ٹھسا ٹھس بھر چکنے کے بعد جو لوگ بچے اُن کو اپنے لیے خود جگہ پیدا کرنا پڑی۔ بارکون کے شمول مین

ایک کمرہ اسپتال کا تھا۔ جو بند پایا گیا اسکے سامنے کے برآمدہ اور پاس کے خالی کمرہ مین جولاشین چیر نے کی جگہ تھی کچھ لوگون نے قبضہ کیا۔ کچھ بھپارہ گھر کے سامنے والے مسقف برآمدہ مین ٹھہرے اور کچھ اشخاص خود بھپارہ گھر کی عمارت مین داخل ہو گئے۔ غرض جسکو جہان جگہ ملی اپنا اپنا بستر جما دیا۔ ایک طرف ایک دوکان تھی۔ جو پہلے تو بند تھی مگر جب تھوڑی دیر بعد کھلی تو معلوم ہوا کہ روٹی کھجور۔ شکر۔ تمباکو۔ تربوز خربزہ وغیرہ یہان نسبتاً گران قیمت پر مل سکتے ہین۔ اور پکے ہوے چاول اور گوشت اور مچھلی بھی ملتی تھی مگر اُن کی صورت ہی دیکھ کر انسان کی بھوک بھاگ جاتی جو لوگ جنس ساتھ لائے تھے اُنھون نے تو خیر کھانا پکا لیا۔ باقی جو لوگ بے سروسامان تھے اُن کو اسی دوکان سے کام نکالنا پڑا۔ ہم لوگ اپنے ہمراہ ضروری اشیا خوردنی لائے تھے تاہم کچھ روٹیان اور کھجور یہان بھی خریدی۔ جہاز سے روانہ ہوتے وقت میرا احرام تر ہو گیا تھا اس لیے کہ جہان کشتی کھڑی تھی وہین جہاز کی نالی کا پانی گر رہا تھا اور اسکی چھینٹون سے سارے کپڑے تر بتر ہو گئے تھے۔ مین نے اوڑھنے کی لنگی کو تو اسی وقت سمندر مین دھو کر کشتی کے اندر سکھا لیا تھا مگر پھر بھی طہارت کی طرف سے اطمینان نہوا اس لیے جزیرہ مین پہونچکر باری باری دونون لنگیان پاک کین۔ یہان ہوا اور دھوپ دونون کے درمیان سخت مقابلہ تھا۔ ہوا اس قدر تند و تیز چلتی تھی کہ آدمی اُڑا جاتا تھا اور کسی دوسری جگہ ایسی ہوا چلے تو لوگ سردی کے مارے کانپ جائین مگر یہ جگہ شہنشاہ شمس کے دارالسلطنت خط استوا سے قریب ہے اس لیے ہوا کی کچھ نہ چلی اور تمازت سے ریت کے ذرات گرم لوہے کے مانند تپنے لگے۔ اور جب کبھی ہوا کے جھونکے سے ریت اُڑ کر کسی شخص پر پڑ جاتی تھی تو وہ بیتاب ہو جاتا تھا جو لوگ بارکون کے اندر تھے اُنھین تو خیر ہوا اور دھوپ کی اس جنگ سے کوئی تکلیف نہین ہوئی مگر جو لوگ برآمدون مین پڑے ہوے تھے اُنھین کافی پریشانی ہوئی۔ خدا خدا کر کے دن گذرا اور شام ہوئی تو تپش آفتاب سے نجات ملی۔ رات کے لیے سارے کیمپ کے وسط مین ایک گیس کی بتی تھی اور بارکون کے اندر ایک ایک لالٹین جس سے اگرچہ ساری بارک مین روشنی نہین پہونچتی تھی تاہم بہت کچھ سہارا رہا۔ شدت ہوا کے باعث رات ٹھنڈی تھی اس لیے بارکون کے اندر بھی کھڑکیان بند کر کے سونا پڑا۔ صبح کو نماز فجر سے فراغت پاتے ہی کشتیون کی طرف اپنا اپنا سامان لیکر حجاج دوڑے اور مسافرون کے بیٹھتے ہی کشتیان روانہ ہو گئین ہماری کشتی کسی قدر دیر مین چلی اس لیے کہ میان نظام دین صاحب کے ہمراہ مستورات تھین جن کو سوار کرانے مین تھوڑی احتیاط کرنا پڑتی تھی۔ لیکن ہمارا کشتیبان بہت ہوشیار تھا ساحل کے قریب پہونچے تو ہم ان متعدد

کشتیوں سے آگے تھے جو ہم سے پہلے روانہ ہوئی تھیں۔ جدہ پہونچنے سے پہلے محمد نے ہم لوگوں سے بخشش طلب کی تو ہر شخص نے خوشی خوشی اُس کو انعام دیا۔

جدہ کا بندرگاہ دوسرے عام بندرگاہوں کی طرح نہیں ہے عموماً ہر جگہ ساحل کے کنارے سمندر کی گہرائی بہت کم ہو جاتی ہے لیکن بندرگاہ بنانے والے جہازوں کو ساحل کے متصل لانے کی غرض سے کہ مسافروں اور مال کے اتارنے چڑھانے میں بڑی آسانی ہو جائے کناروں کی ریت کو ہٹا ہٹا کر گہرا عمیق کر لیتے ہیں کہ اگر ہر وقت نہیں تو کم سے کم جوار بھاٹا آنے کے وقت تو جہاز ساحل تک پہونچ سکے۔ جدہ کے ترکی حاکموں نے شاید اس سبب سے کہ حفاظت ساحل کے لیے اُن کے پاس کوئی قوت موجود نہ تھی اس بندرگاہ کے کناروں کو عمیق کرنے کی ضرورت نہیں سمجھی بلکہ صرف کشتیوں کی آمد و رفت کے واسطے ایک راستہ بنا لیا ہے جس کی نشاندہی کے لیے جگہ جگہ ستون نصب ہیں چونکہ یہ راستہ بہت کشادہ نہیں ہے اس وجہ سے اکثر اوقات کشتیاں بھی ریت میں پھنس جاتی ہیں چنانچہ چند کشتیوں کے سوا عموماً ہر کشتی ریت میں پھنستی تھی۔ اور بلیوں کی مدد سے نکالی جاتی تھی۔ محمد کی ہوشیاری کی بدولت خود ہماری کشتی اس زحمت سے محفوظ رہی۔ ورنہ ساحل تک پہونچنے میں بہت دیر ہو جاتی بہ حال اسی کو ۸ بجے کے قریب ہماری کشتی جدہ کے کنارہ پہونچ گئی الحمد للہ علیٰ احسانہ منزل پر پہونچنے کے بعد ہر شخص چاہتا ہے کہ جلد سے جلد معہ سامان کے اُتر جائے۔ عورتوں کی معیت کے باعث ہماری مختصر جماعت کو یہاں بھی تعجیل مناسب نہیں معلوم ہوئی۔ لیکن جب یہ معلوم ہوا کہ سامان ابھی کشتی ہی پر رہے گا اور مسافروں کو اُتر جانا چاہیے تو پھر دوسروں کے ساتھ ساتھ ہم لوگ بھی اُتر گئے۔ اور عمال حکومت نے ہر شخص سے عہ فی کس کے حساب سے کشتی کا کرایہ وصول کر کے ہمیں اپنا سامان لینے کے واسطے محصول خانے کی طرف جانے کی ہدایت کی۔

ظفر الملک

انس بن مالک

متفق ہین بخاری و مُسلم — کہ انسؓ تھے رسولؐ کے خادم
جان و دل سے تھے محوِ خدمتِ شاہ — تھے سفر مین حضر مین وہ ہمراہ
کی بسر عُمر ظلِ حضرتؐ مین — رہے بارہ برس وہ خدمت مین
پر انسؓ کا یہ قول ہے سچا — سیّدِ پاک نے کبھی نہ کہا
اے انسؓ کام کیون کیا ایسا — کام کیون اس طرح نہ تو نے کیا
کارِ خدمت جو کچھ انسؓ نے کیا — سب وہ سرکار کو پسند آیا
کی براے انسؓ بلطف و عطا — بہرِ اولاد و مال و عمر دعا
ایک سو تیئیس ۱۲۳ انسؓ کے لڑکے تھے — ایک سو بیس ۱۲۰ سال زندہ رہے
اُن کے خرمون کے جتنے تھے اشجار — پھلتے تھے ایک سال مین دو بار
صحبتِ پاک پاک کرتی ہے — زندگی تابناک کرتی ہے
نہ پڑین شمس کی شعاعین گر — لعل ہو جاے کس طرح پتھر
بزم ساقی سے ہو جو بیگانہ — ہو نہ لبریز مے سے پیمانہ
جس سے حسنِ کمال ہو حاصل — دہر مین ہے وہ صحبتِ کامل
جس سے دونون جہانمین راحت ہے — کاملون کا وہ فیض صحبت ہے

اے جگر کاملون کی خدمت کر
صحبتِ نیک کا ہے نیک اثر

حکیم جگر صدیقی (زمیندار السلطان)

خطاب

حکومتون کا اپنے متوسلین و منتسبین کو خلعت و انعامات کے علاوہ خطابات سے سرفراز کرنے کا دستور بہت پرانا ہے۔ یونانی خطاب دیتے تھے۔ رومی خطاب دیتے تھے۔ ہندو خطاب دیتے تھے مسلمانون مین تو عہد رسالت ہی مین صدیق عتیق۔ فاروق۔ ذوالنورین۔ اسد اللہ۔ سیف اللہ۔ امین الامۃ۔ وابستگان دامن شفاعت کے لیے ذریعۂ افتخار دارین ہو گئے تھے۔ خلافت عباسیہ بوجہ اپنی جلالت قدر کے بڑے بڑے تاجدارون تک کو خطاب عطا فرماتی اور وہ تبرکاً سر آنکھون پر رکھتے تھے۔ محمود غزنوی کو اسکی فتوحات کی وجہ سے تاریخ بجا ہے اسکندر اعظم کا ہمسر ہی کہے مگر وہ اپنے علامۂ تفاخر یمین الدولہ کے طرّے کو پایان عمر تک سرمایۂ نازش سمجھتا رہا۔ ہندوستان کی اسلامی سلطنتون مین بھی ابتدا ہی سے یہ طرز نوازش بہت عام تھا۔ سلطنت مغلیہ کے آخری زمانہ مین تو خطاب باری کا طوفان اس درجہ زورون پر تھا کہ ایک ظریف رکن حکومت کے شوخ نگار قلم کو لکھنا پڑا "شانی در ہر خانہ ورائی در ہر بازار"

انگریز بھی اپنے ملک مین بہت بڑے خطاب بخش تھے مگر جب یہان آئے تو سوداگر کا روپ بھر کر آئے تھے اس لیے جب تک ترازو کی جگہ تاج نے نہ لے لی تقسیم خطابات کے لیے ہاتھ نہ اٹھ سکا۔ اگرچہ کلکتے کا گودام علی وردی خان مہابت جنگ کے مرتے ہی سلطنت کا گہوارہ بن گیا تھا مگر ہمین مطلق علم نہین کہ صاحبان عالی شان کمپنی بہادر نے اپنی ساری تجارتی زندگی مین یعنی ۱۸۵۸ء سے قبل کسی ایک ہندوستانی کو بھی اپنی طرف سے کوئی باضابطہ خطاب عطا کیا ہو۔[1]

---

[1] تاریخ کی نظرکاہ ورق گردانی کے بعد ایک مثال ملتی ہے اور وہ بھی اس کلیے کا استثنا ثابت نہین ہوتی۔ نواب مبارک علی خان ہمایون جاہ نے جو میر جعفر کے پوتے کے پوتے۔ مرشدآباد کے پنشن خوار۔ نواب۔ اور نظامت بنگالہ کی تربت کے مجاور تھے ۱۸۳۳ء مین اپنے ایک معتمد ڈبلیو چینیری (Chinery) کے ہاتھ ملکہ وکٹوریہ کے چچا شاہ ولیم چہارم (۱۸۳۰ء تا ۱۸۳۷ء) کی خدمت مین کچھ تحفے ہدایا بھیجے۔ جس کے بدلے مین شاہ ولیم نے نواب کو گرانڈ کراس آف دی رایل ہنوورین گلفک آرڈر (Grand Cross of the Royal Hanoverian Gulphic order) کا خطاب و خلعت روانہ کیا۔ نواب صاحب بہادر خلعت پہن کر اور تمغہ لگا کر بہت کچھ محظوظ و مفتخر ہوے۔ دربار کیا۔ انعام اکرام دیا۔ مگر تھوڑے ہی دن گذرے تھے کہ تمغے کے جواہرات کلکتے کے بازارون مین بکتے پھرے۔

اوروں کو خطاب دینا تو بڑی بات ہے شروع سے یہاں تک انگریز جو میدان پلاسی جیت کر اپنے آپ کو ہندوستان کا مالک مطلق سمجھنے لگے تھے خود اپنی ذات کے لیے خطاب چاہتے تو اکبر اعظم کے بے اختیار پوتے کے مفلوج و مفلس ہاتھ ہی کی طرف تکتے تھے۔ انگریزی تاریخیں تو ایسی کوئی بات کیوں لکھنے لگی تھیں جس سے اُن کا اپنا پہلو ذرا بھی دبا نظر آئے۔ فارسی تاریخوں سے پوچھو کہ کرنل ثابت جنگ بہادر کون تھے؟ یہ ہندوستان میں برطانوی قصر شاہنشہی کے معمار اول تھے جو لارڈ کلایو منتخب ہونے سے پہلے ثابت جنگ بننا ہی اپنے لیے باعث عزت سمجھتے تھے۔ اور سنو۔ دلیر جنگ بہادر یہ کون تھے؟ یہ ایڈمرل واٹسن تھے۔ اور سنو۔ امیر الدولہ فتح جنگ بہادر یہ کون تھے؟ یہ کمپنی کی افواج کے کمانڈر ان چیف جنرل کاڈرڈ تھے۔ اور سنو۔ کرنل کیلیو (Calliaud) یہ کیا تھے؟ یہ کرنل سیف جنگ بہادر تھے۔ دو اور صاحبان تھے جن کے ماں باپ نے تو ان کے نام محض ہنری اور جارج (ونسی ٹارٹ) رکھے تھے مگر ہندوستان میں آ کر قلمبن کی بابت پہلے کو شمس الدولہ نصیر الملک بہادر اور دوسرے کو ہوشیار جنگ بہادر کے ناموں سے پکارتی تھیں۔ جانتے ہو خود بدولت ناظم بنگالہ کس خطاب سے مخاطب تھے؟ عماد الدولہ جلادت جنگ وارن ہیسٹنگز بہادر جس نے ایک فاتح علی گڈھ و بھرت پور کا نام جن الفاظ کو مدتوں اپنا سرتاج بنائے رہا وہ شاہ عالم کے بخشے ہوئے خطاب ہی کے اجزا تھے۔

یہی نہیں بلکہ کمپنی بہادر کا ناظم اعلیٰ جب کبھی اپنے کسی موسل کی عزت افزائی خطاب کی شکل میں چاہتا تو اُس کے دینے کی خواہش نشین خواہ شاہ عالم یا اطاعت شعار نواب ناظم ہی سے کی جاتی مثلاً جب مرشدآباد کے جگت سیٹھ خوشحال چند کی جگہ اُس کا عزیز ہرکل چند بٹھایا گیا تو جگت سیٹھ کا خطاب دربار دہلی ہی سے منگایا تھا یا مثلاً جب موجودہ مہاراجہ قاسم بازار سر مانندر چندر نندی کے مورث اعلیٰ کانتا بابو (کرشنا کانت نندی) کو نوازنے کی ضرورت ہوئی تو وارن ہیسٹنگز بہادر نے اُس کے بیٹے ترلوکی ناتھ کو مرشدآباد کے نواب ہی سے مہاراجہ بہادر کا خطاب دلوایا تھا۔

گورنمنٹ برطانیہ اب جو خطابات دیتی ہے وہ محض بہ جلدوے کارگذاری ہی نہیں ہوتے بلکہ بہت سی صورتیں ہیں جنھیں پیش نظر رکھ کر خطابی تقسیم عمل میں آتی ہے۔ اگر ہمیں بدمزاقی کا الزام نہ دیا جائے تو ان سب صورتوں کے لیے کسی قدر تکلف و آورد سے کام لیکر ذیل کے عنوانات قائم کریں:-

صلۂ خدمت - ملازمین و متوسلین حکومت کی جا و بیجا جان فروشیوں کی داد دہی۔

ثمرۂ لیاقت - صاحبان علم و فن کی ہمت افزائی و قدر فرمائی۔

طرۂ ریاست۔ والیان حکومت و ریاست اور ارباب دولت کی علوم پرستی کا اظہار یا اُن کی مہمان نوازی و وفا شعاری کا اعتراف۔

ہدیۂ محبت۔ ممالک غیر کے بادشاہوں، شاہزادوں اور اعیان سلطنت سے تبادلۂ اخلاق۔

معاوضۂ اعانت۔ کسی غیر سلطنت یا ریاست کے کسی ایسے مدار علیہ یا رکن رکین کی تالیف و تدبین جسکے کسی فعل یا ترک فعل سے اُس سلطنت یا ریاست کے کاروبار میں نفع یا نقصان واقع ہوا یا ہوتا یا ہوسکتا ہو اور وہ نفع یا نقصان برطانوی مقبوضات یا برطانوی اغراض و مقاصد پر کوئی مفید یا مضر اثر ڈال چکا یا ڈالتا یا ڈال سکتا ہو۔ نیز ہر ایسے غیر اور بے تعلق شخص کی عزت افزائی جو برطانوی اغراض و مقاصد کی حفاظت و اعانت میں امداد و اعانت پر مجبور و مکلف نہ ہونے کے باوجود مدد دے چکا۔ یا دے رہا یا دے سکتا ہو۔

یہ تو سب کو معلوم ہے کہ سرکار جو خطابات عطا کرتی ہے اُن میں سب سے اونچا "سر" ہے لیکن یہ اصلیت شاید سب کو معلوم نہ ہو کہ "سر" اصل میں کوئی خطاب نہیں بلکہ محض ذریعۂ اظہار اعزاز خطاب ہے۔ جو شخص اپنے نام سے پہلے "سر" لکھنے کا استحقاق رکھتا ہے ضرور ہے کہ وہ نایٹ (یا بیرونٹ) کا خطاب رکھتا ہو اور جو شخص نایٹ کا خطاب رکھتا ہے وہ یقیناً اپنے نام سے پہلے سر لکھنے کا استحقاق رکھتا ہے چنانچہ سر سالار جنگ اعظم سے لیکر سر عمر حیات خان ٹوانہ تک جتنے سر ہیں سب کے سب نایٹ ہیں۔

ایسی حالت میں ضرور ہوا کہ پہلے نایٹ کی تشریح و تعریف کی جائے۔

نایٹ (Knight)

مغربی قرون وسطیٰ کے دور تاریک میں جبکہ زور حق کا مرادف سمجھا جاتا تھا جبکہ جان و مال کی حفاظت زیردست اور رقیب بازو ہی کے سپرد تھی اور جبکہ کسی شخص کا زبردست ہونا ہی اس امر کا ثبوت تھا کہ اُسے کمزور کے جان و مال اور عزت و آبرو پر ہر قسم کا اختیار حاصل ہے یورپ میں بہادری کا ایک نظام تھا جسے شوالری (Chivalry) کہتے ہیں۔

کوئی شخص جو جسم میں طاقت اور دل میں ہمت رکھتا تھا اپنی شجاعت کے جوہر اُس وقت تک نہیں دکھا سکتا تھا جب تک وہ اس نظام کے ماتحت بہادروں کے زمرے میں شامل نہ ہولے اور بہادروں کے زمرہ میں وہ صرف اُسی وقت شامل ہوسکتا تھا جب وہ باقاعدہ نایٹ بنالیا جائے[1] نایٹ بنجانے کے بعد اُسے

---

[1] نیو پاپولر انسائیکلوپیڈیا (مطبوعہ لندن ۱۹۰۶ء) جلد ۹ صفحہ ۲۱۳۔

اپنی زندگی جنگجوئی کے مصائب، نام آوری کی خواہش اور صنف نازک کی خدمت کے لیے وقف کرنی پڑتی تھی[1]۔

نائٹی[2] کی رسم یورپ کی بربریت و بت پرستی کی یادگار رہی[3] جو مسیحیت کے غلبے کے بعد بھی باد فی التغیر قایم رہی۔ جو شخص نائٹوں کے گروہ میں شامل ہونا چاہتا لازم تھا کہ وہ ایک معتد بہ زمانے تک کسی بڑے نائٹ یا رئیس کی خدمت میں پہلے خادم کی حیثیت سے اور اُس کے بعد سلاح دار کے طور پر رہ چکا ہو۔ کم از کم اکیس سال کی عمر کے جوان کو نائٹ بنایا جاتا تھا۔ خاص حالات مستثنیات میں تھے[4]۔ مخصوص رسوم کی بجا آوری کے بعد اُس سے چند عہد لیے جاتے۔ اُس کے بعد کوئی پُرانا نامی نائٹ اس کے ہاتھ میں تلوار دے کر کہتا "میں تجھے نائٹ بناتا ہوں۔ اپنے عہد پر قائم رہنا"۔ اُس وقت سے یہ نوساختہ نائٹ سرفروشی و نبرد آزمائی اور پرستاری صنف نازک کے لیے کمربستہ رہتا۔

یورپ میں نائٹی کی یہ حالت تھی کہ یکایک گیارھویں صدی کے آخر[5] میں وہ زبردست طوفان اُٹھا جس کے تلاطم سے مغربی نظام رسمی و عملی کی کوئی عمارت دیر یا جلد خَاوِیَۃٌ عَلٰی عُرُوْشِہَا ہونے سے نہ بچ سکی۔ اِس زبردست طوفان کو جس نے مغرب کے پایاب تنور سے ابل کر سارے مشرق کو اپنی لپیٹ میں لے لیا تاریخ جس نام سے یاد کرتی ہے وہ ہے "حروب صلیبیہ[6]"۔ جب حروب صلیبیہ کے ہیجان عظیم نے

---

[1] نیو پاپولر انسائیکلو پیڈیا (مطبوعہ لندن ۱۹۰۱ء) جلد ۳ ص ۳۱۹

[2] جس طرح ڈاکٹر سے ڈاکٹری، اسسٹنٹ سے اسسٹنٹی، اور مجسٹریٹ سے مجسٹریٹی بنا لیے گئے ہیں اسی طرح ہم نے نائٹ سے نائٹی بنا لیا تو قابل معافی ہیں۔

[3] ترجمہ تاریخ حروب صلیبیہ۔ مطبوعہ دلگداز پریس صفحہ ۴۸ و ۴۹

[4] نیو پاپولر انسائیکلو پیڈیا جلد ۹ صفحہ ۲۱۳ و جلد ۳ صفحہ ۳۲۰

[5] نیو پاپولر انسائیکلو پیڈیا جلد ۳ صفحہ ۳۲۰

[6] وہ مذہبی لڑائیاں جو مغرب کی تثلیث پرست اقوام نے بیت المقدس کو مسلمانوں کے قبضے سے نکالنے کے لیے گیارھویں صدی عیسوی کے عشرۂ آخر سے لیکر تیرھویں صدی کے عشرۂ ثامن تک لڑیں۔ اِن لڑائیوں کو صلیبی (کروسیڈ) اس لیے کہتے ہیں کہ جتنے سورما مقدس جھنڈے کے تلے جمع ہو کر مسلمانوں سے لڑنے جاتے وہ پوپ کے حکم سے صلیب کا تمغا اپنے سینوں پر لگاتے تھے۔ اقوام یورپ کو یہ دیکھ کر صدمہ ہوتا تھا کہ ارض مقدس جہاں خدا کے بیٹے نے (عیاذاً باللہ) نشو و نما پائی، تبلیغ مذہب کی اور بالآخر شہادت حاصل کی، جہاں مسیحیو کا زائر اپنے نجات دہندے کی قبر پر اپنا دکھ درد کہنے اور برکت پانے جاتے ہیں وہ بدین مسلمانوں کے نجس ہاتھوں میں ہے۔ پطرس راہب نے ۱۰۹۳ء میں زیارت سے پلٹ کر زائرین کے مصائب پوپ اربن ثانی کے

پاپائے اعظم کی معصوم زبان سے جہاد کا اعلان کرایا اور مسلمان دشمنان دین کے ناپاک ہاتھوں سے پاک

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۲۶) سامنے اس آب و رنگ سے بیان کیے کہ تقدس مآب کی سوکھی آنکھوں میں پانی آگیا چنانچہ پاپائے موصوف نے مارچ ۱۰۹۵ء میں شہر پیاسنزا واقع اٹلی میں ایک مجلس منعقد کی جس میں حضرت مسیح کا پیام جو پطرس راہب کے معرفت وصول ہوا تھا عیسائی دنیا کو سنایا۔ پھر نومبر ۱۰۹۵ء میں بمقام کلیرمانٹ واقع فرانس ایک دوسرا اجتماع عظیم ہوا جس میں پوپ صاحب کی برق ریز اور صاعقہ بار تقریر سننے کے بعد مسیحیت نے یک زبان ہو کر فیصلہ کیا کہ ارض مقدس اور روضۂ مبارک کو بدینوں سے چھڑانے کے لیے جو لڑائی کی جائے وہ عین خدا کی مرضی کے مطابق ہے۔ اس طرح سنہ ۴۸۹ھ مطابق ۱۰۹۶ء میں وہ آگ بھڑک اٹھی جس کے شعلے تین صدی تک تین براعظموں کے خرمن امن و عافیت کو خاک سیاہ کرتے رہے۔ ذیل میں صلیبی لڑائیوں کی ایک مختصر سی فہرست درج کی جاتی ہے:-

نمبر شمار	ابتدا	انتہا	پوپ جس کے حکم سے یا جس کے عہد میں لڑائی ہوئی	ائمۃ الکفر	فدایان اسلام دفعۃً قاتلوا فی سبیل اللہ	اسباب و نتائج
پہلی لڑائی	۱۰۹۶ء مطابق سنہ ۴۹۰ھ	۱۰۹۹ء مطابق سنہ ۴۹۲ھ	اربن ثانی، پاسکل ثانی	گاڈفرے آف بوبیلون (جسے مؤرخین عرب کندفرے کہتے ہیں)، بالڈوین برادر گاڈفرے (جسے عرب بغدوین بردوین یا بردویل کہتے ہیں)، بوہیمانڈ (جسے عرب بیمند یا بیموند کہتے ہیں)، ٹینکرڈ (جسے عرب طنکری کہتے ہیں)، ہیو آف ورمانڈوا برادر فلپ شاہ فرانس۔ رابرٹ آف فلانڈرس۔ رابرٹ آف نارمنڈی برادر ولیم ثانی شاہ انگلستان۔ ریمنڈ آف ٹولوس وغیرہ وغیرہ۔ بقول سید امیر علی یہ سات لاکھ انسانوں کا سیلاب عظیم تھا جو مغرب سے مشرق پر ٹوٹ پڑا اور بے خبر اور باہم آویز مسلمانوں کو بہا لے گیا	سلجوقی سلطان داؤد قلج ارسلان	صلیبیوں نے انطاکیہ، اڈیسہ (رہا) اور آخر کار بیت المقدس مسلمانوں سے چھین کر یروشلیم میں ایک عیسائی سلطنت قائم کر لی۔ ان لڑائیوں میں صلیبیوں کی بہیمیت بلکہ سبعیت کے حالات پڑھ پڑھ کر چاہے عیسائیت کی پیشانی پر شرم کا پسینہ نہ آئے مگر انسانیت کے جسم پر تو رونگٹے کھڑے ہوتے ہیں۔ بد اخلاقی۔ بد اعمالی بے ایمانی اور غارتگری و قتل کی بدترین شکلیں تو ہر وقت صلیبی لشکر میں عام تھیں انطاکیہ اور معرۃ النعمان کی لڑائیوں میں مردار صلیبی لشکر میں سر بازار بکتا اور انسانی گوشت ہر چولھے پر پکتا تھا اُس مقدس شہر میں جہاں مسیحی خدا مصلوب ہوا گلی کوچوں میں اسلامی خون کی سچ مچ ندیاں بہ گئیں بلکہ خود اس متبرک ہیکل میں جسے سلیمان نے بنایا اور جس آسمانی شاہنشاہت کے شہزادے نے دربار عام

سرزمین کو نکالنے کے لیے لڑائی کرنا ایک مقدس فرض مذہبی قرار دیا تو مسیحی کلیسیا نے منجملہ

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۴۸)

						کرکے دنیا کو امن و نجات کی دعوت دی ستر ہزار سے اوپر مسلمان مسجد اقصےٰ کے صحن میں بہ یک وقت ذبح کیے گئے جو سپاہی سوار ہوکر بیت المقدس کے بلوتا نے تک گئے ان کے گھوڑے گھٹنوں گھٹنوں تک اسلامی خون کے دریا میں غرق تھے
دوسری لڑائی	۱۱۴۶ء مطابق ۵۴۱ھ	۱۱۴۹ء مطابق ۵۴۴ھ	یوجینس ثالث	کنراڈ ثالث شہنشاہ جرمنی و لوئی سابع شاہ فرانس لاکھ سے اوپر فوج لیکر مشرق کو آئے لوئی شاہ فرانس کے ساتھ اسکی مشہور ملکہ الینا ربھی تھی جسکی مسافت و اقعات اندان سے حالات مولانا شرر لکھنوی سے پوچھو	عمادالدین اتابک زنگی ابن آق سنقر کے سپوت اور نامور بیٹے سیف الدین غازی اور نورالدین (جنھیں پرانے یورپی مورخین سفاڈینوس اور نوراڈینوس لکھتے ہین)	عمادالدین اتابک زنگی نے ۱۱۴۴ء مین ایڈیسہ ارہا عیسائیون سے فتح کرکے محافظ فوج وہان چھوڑی ۱۱۴۶ء مین جب اتابک کی شہادت ہوئی اس کا فرزند رشید نورالدین محمود تخت حلب پر جلوہ آرا ہوا تو ایڈیسہ کے عیسائی باشندون نے اسلامی محافظ فوج اور شہر کے مسلمانون کو شہید کردیا نورالدین نے شہر کو پھر فتح کیا اس پر یورپ سے یہ طوفان آیا مگر خاسر و خایب واپس گیا۔
تیسری لڑائی	۱۱۸۷ء مطابق ۵۸۳ھ	۱۱۹۲ء مطابق ۵۸۸ھ	گریگوری ثامن و کلیمنٹ ثالث و سلسٹائن ثالث	فریڈرک اول باربروسہ (سرخ ریش) شہنشاہ جرمنی فلپ آگسٹس شاہ فرانس، اور رچرڈ اول شاہ انگلستان بذات خاص فوجین لے کر آئے۔ کاونٹ ہنری (جسے مورخین عرب کندھری لکھتے ہین) اور اسی کے پائے کے بہت سے امرائے عظام بھی ساتھ آئے۔	سلطان صلاح الدین یوسف ایوبی رح	۱۱۸۷ء مین حضرت سلطان صلاح الدین یوسف ایوبی (رحمۃ اللہ علیہ) نے بیت المقدس کو پھر فتح کرلیا اس خبر نے پرستاران صلیب مین ہلچل ڈالدی اور تین جلیل القدر بادشاہ بے اختیار فوج لیکر آئے۔ مگر پرستاران تثلیث بھی بیت المقدس کو سلطان فاتح کے ہاتھ سے نہ لے سکے اور پانچ سال کی جان فرسائی و جان ستانی کا نتیجہ کچھ نہوا فریڈرک پہلے ہی ڈوب مرا تھا

اور طاقتوں سے اس فرقے کی طاقت سے بھی کام لیا۔ صلیبی لڑائیوں ہی نے تاریخ میں ایک

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۳۰۸)

						فلپ کی رخصت کے بعد [illegible] گیا۔ رچرڈ دونوں سے زیادہ وضعداری نباہ لیگیا۔ آخر صلح کرلی جسکے رو سے صور عکہ اور یافہ صلیبوں کے پاس رہے۔ باقی کل شہر جنہیں عیسائی اپنے مقامات مقدسہ سمجھتے مسلمانوں کے قبضے میں رہے۔
چوتھی لڑائی	سنہ ۱۱۹۶ء مطابق سنہ ۵۹۳ھ	سنہ ۱۱۹۸ء مطابق سنہ ۵۹۵ھ	سلسٹائن ثالث و انوسنٹ ثالث	تیسری ہی لڑائی کا بچا کھچا لشکر دمشق میں موجود تھا۔	سیف الدین ابو بکر ملک العادل برادر سلطان مرحوم	حضرت سلطان صلاح الدین کی [illegible] ہو چکی تھی۔ ان کی وفات کی خبر سنتے ہی عیسائیوں نے اپنی عادت کے مطابق عہد توڑ دیے اور بیروت پر قبضہ کرلیا۔ مگر ملک العادل برادر سلطان مرحوم نے یافہ و بیروت چھین لیے۔ آخر صلح ہوگئی اور صلیبی پلٹ گئے۔
پانچوین لڑائی	سنہ ۱۲۰۲ء مطابق سنہ ۵۹۹ھ	سنہ ۱۲۰۴ء مطابق سنہ ۶۰۱ھ	انوسنٹ ثالث	مارکوئیس آف مانٹ فیراٹ (جسے عرب مرکیس لکھتے ہین) بالڈوین ڈ کاؤنٹ آف فلانڈرس (جسے عرب کند افلند لکھتے ہین) گاڈفرے آف ولہارڈوین حاکمان آسٹریا و نیز شامپین وغیرہ		صلیبی بمقام وینس جمع ہوے مگر بجاے اسکے کہ سیدھے ارض مقدس آتے قسطنطنیہ کو (جس پر ہنوز عیسائی بادشاہ قابض تھا) فتح اور تباہ کرنے کے بعد واپس چلے گئے۔
چھٹی لڑائی	سنہ ۱۲۱۶ء مطابق سنہ ۶۱۳ھ	سنہ ۱۲۲۱ء مطابق سنہ ۶۱۸ھ	ہنوریس ثالث	شاہ ہنگری۔ ڈیوک آف آسٹریا ڈیوک آف بویریا۔ اور جرمنی کے دوسرے چھوٹے بڑے شاہزادے ڈھائی لاکھ فوج لیکر آے۔	سیف الدین ملک العادل اور انکی وفات کے بعد انکے بیٹے کامل اور معظم اور اشرف۔	شام کے ساحلی مقامات تباہ کرنیکے بعد مصر پہونچے اور دمیاط کا محاصرہ کیا۔ مسلمانون نے نیل کے پھاٹک کھول دیے صلیبی سیلاب مین گھر گئے اور صلح کرکے جلد واپس گئے۔

مذہبی شان پیدا کر دی[1]۔ چنانچہ اعلان جہاد کے بعد نائٹی مسیحیت کا ایک رکن قرار پائی اور عہد ظلمت کے

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۳۹)

ساتوین لڑائی	سنہ ۱۲۲۸ع مطابق سنہ ۶۲۶ھ	سنہ ۱۲۲۹ع مطابق سنہ ۶۲۷ھ	گریگوری تاسع	فریڈرک ثانی (جسے ابوالفدا نے فردریک لکھا ہی) شہنشاہ (جسے عرب مورخین ایبور یا ایبرطور لکھتے ہین جو ایمپرر کا معرب ہی) جرمنی (جسے عرب المان لکھتے ہین)	ملک الکامل	بجائے شمشیر سے کام لینے کے اپنے زبان سے کام لیا اور ناصر الدین ملک الکامل (سلطان صلاح الدین کے بھتیجے) کی کمزوری اور بدعقلی سے فائدہ اٹھا کر ایک معاہدہ صلح کی رو سے بیت المقدس لے لیا۔
آٹھوین لڑائی	سنہ ۱۲۳۹ع مطابق سنہ ۶۳۶ھ	سنہ ۱۲۴۰ع مطابق سنہ ۶۳۷ھ	گریگوری تاسع	لوئی شاہ فرانس خود نہ آسکا اپنی طرف سے امرائے فرانس بھیج دیے جن مین ممتاز امرا کے نام یہ ہین:۔ اموری کاونٹ آف مانٹ فیراٹ۔ ڈیوک آف برگنڈی بھیوبالڈ شاہ نوار	ملک الناصر داؤد بن معظم	صلیبی عکہ مین پہونچے وہان سے یافا آئے اور قصد کیا کہ غزہ تک حملہ کرین گے۔
نوین لڑائی	سنہ ۱۲۴۸ع مطابق سنہ ۶۴۶ھ	سنہ ۱۲۵۴ع مطابق سنہ ۶۵۲ھ	انوسنٹ رابع والکزنڈر رابع	لوئی تاسع (سینٹ لوئی) شاہ فرانس (جسے مورخین عرب ایدا فرنس لکھتے ہین)		سینٹ لوئی نے مصر کو جو انحطاط بغداد کے بعد مسلمانون کا مرکز ہمید تھا تباہ و برباد کرنے کی غرض سے دمیاط پر چڑھائی کی اور فتح بھی کر لیا مگر شکست کھا کر بھاگا۔
دسوین لڑائی	سنہ ۱۲۷۰ع مطابق سنہ ۶۶۹ھ	سنہ ۱۲۷۲ع مطابق سنہ ۶۷۱ھ	گریگوری عاشر	لوئی تاسع (سینٹ لوئی) شاہ فرانس چارلس آف انجو شاہ صقلیہ آئے۔ جب لوئی مر گیا تو انگلستان کا شہزادہ ایڈورڈ جو آگے چلکر شاہ ایڈورڈ اول بادشاہ انگلستان (سنہ ۱۲۷۲ع تا سنہ ۱۳۰۷ع) ہوا شریک ہونے آیا مگر جلد واپس گیا۔		یہ لشکر سلطان ٹیونس کو عیسائی کرنے کے لیے آیا تھا مگر بہت سے پرانے عیسائیون کو خاک مین ملا کر پلٹ گیا۔

یہ تھین وہ مذہبی لڑائیان جو اسلام کو "مذہب شمشیر" کا طعنہ دینے والی قومون نے محض اس غرض سے لڑین کہ امن کے شاہزادے کی اُس قربان گاہ کو جس پر وہ گنہگارون کے گناہون کا کفارہ دینے کی خاطر مصلوب ہوا تھا مسلمانون کے قبضے سے نکالیں۔ جہان تک تاریخ پر ہماری نظر تھی ہمین یہی علم تھا کہ صلیب کی چھوٹی بڑی (بقیہ حاشیہ صفحہ ۴۱ پر دیکھیے)

[1] نیو پاپولر انسائیکلوپیڈیا جلد ۳ صفحہ ۲۰۰ و ترجمہ تاریخ حروب صلیبیہ مصنفہ ٹی آئی ارچر و سی ایل کنگسفورڈ مطبوعہ شام اودھ پریس صفحہ ۱۹۹۔

پرانے مراسم و مواثیق میں حسب موقع تبدیل و ترمیم کے بعد کلیسا کے زیر عاطفت نائٹ بنائے جانے لگے جن کا رتبہ اولیاے مذہب کے مساوی تسلیم کیا گیا[1]۔ نائٹی کا امیدوار روزہ رکھتا، غسل کرتا اور عہدیداران مذہب کے روبرو اپنے گناہوں کا اقرار کرتا۔ وہ اُن الفاظ کا بھی اعادہ کرتا جو بپتسمہ دیتے وقت[2]

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۴۰) لڑائیوں کی تعداد اسی قدر ہے اور یہی خیال تھا کہ یہ سب لڑائیاں تیرھویں صدی عیسوی کی تیرہ و تار قبر میں دفن ہو چکیں اور اب اس تہذیب کے زمانے میں مذہب کی خاطر تلوار اُٹھانا ناقابل معافی جرم سمجھا جاتا ہے مگر رچرڈ اول اور ایڈورڈ اول کی وراثت کے منتظم یعنی برطانیہ عظمیٰ کے وزیر اعظم مسٹر لائڈ جارج ہمیں یقین دلاتے رہے کہ ان لڑائیوں کے شمار میں بعد رایک کے اضافہ ہوا ہے اور آخری لڑائی وہ ہے جو جنرل ایلنبی کی تلوار سے اور دسمبر ۱۹۱۷ء کو بیت المقدس فتح ہو جانے پر ختم ہوئی۔ مسٹر لائڈ جارج ایکسلنسی تو خود عیسائی ہونے کی وجہ سے صلیبی سورماؤں کی یادگار ہیں دوسری طرف وہ اس سلطنت کی زبان و دماغ تھے جو سب سے زیادہ مسلمان گردنوں کو اپنے زیر انقیاد میں رکھنے کی غیر موجبہ وجہ سے بزرگ ترین مسلم سلطنت" کہلاتی ہے۔ ان حالات میں اُن سے زیادہ کون معتبر اور طرفین کا واقف حال ہو سکتا ہے ہم خود تو بھولے بھالے اور سیدھے سادے تھے۔ ایسے کہ

خود اُٹھالاتے تھے جو تیر خطا ہوتا تھا

مگر اس معتبر اور واقف حال رکن سلطنت کے کہانے سے کیوں نہ سمجھیں اور یقین دلانے سے کیوں نہ یقین کریں کہ بیسویں صدی کی سب سے بڑی لڑائی جو برطانیہ۔ فرانس۔ اٹلی۔ امریکہ۔ یونان و بلجیم وغیرہ کی متفقہ عیسائیت نے خلافت اسلامی کے وارثان جائز ترکان آل عثمان سے لڑی صلیبی ہی تھی۔ اس یقین کے بعد کیا یہ یقین بے بنیاد ہوگا کہ صلیب پرستاران فرنگ نے اس لڑائی سے پہلے بھی جس جس بھیس اور جس جس دیس میں مسلمانوں سے معرکہ آرائی کی ہے وہ بھی صلیبی ہی کی معرکہ آرائی تھی چاہے وہ معرکہ آرائی

اسکندریہ میں ہو یا الجزائر میں
بوشہر میں ہو یا بلقان میں
بلاسی میں ہو یا پلونا میں
تل الکبیر میں ہو یا تھسیلی میں
طرابلس میں ہو یا طرابلس میں
غزنین میں ہو یا غرناطہ میں
قندھار میں ہو یا قرطبہ میں
کابل میں ہو یا کریمیا میں
اور میسور میں ہو یا مراکش میں

[1] ترجمہ تاریخ حروب صلیبیہ۔ مطبوعہ دلگداز پریس صفحہ ۴۸ و ۴۹
[2] نیو پاپولر انسائکلو پیڈیا جلد ۳ صفحہ ۳۲۰

کیے جاتے ہیں[۱]۔ پھر اُس سے طرح طرح کے عہد لیے جاتے[۲]۔ اُس کے بعد نایٹ بنانے والے پادری اُس کے دینی باپ کی تلوار اُس کے ہاتھ میں دے کر خدا، حضرت مریم۔ اور سینٹ میکائیل یا سینٹ جارج کے نام پر اُسے نائٹ کا خطاب دیتے[۳]۔ نایٹ بناتے وقت تلوار کے پھل کے چپٹے حصے سے امیدوار کی گردن چھو کر یہ الفاظ کہے جاتے۔ "میں خدا اور سینٹ میکائیل (یا باپ۔ بیٹے۔ اور روح القدس) کے نام پر تجھے نایٹ بناتا ہوں۔ وفادار رہ۔ بہادر رہ اور خوش نصیب رہ[۴]"

جو محبت نایٹ کو حضرت مریم سے ہوتی وہ متبرک سمجھی جاتی اور اُس کی شان اُس اطاعت میں نظر آتی جسے وہ ...... خاصۃً اُس نازنین کے مقابلے میں ظاہر کرتا جو اُس کے دل کی مالک ہوتی۔ ...... نایٹ غیر شخص کی منکوحہ پر بھی عاشق ہو سکتا تھا۔ اس میں کوئی مضایقہ نہ تھا[۵]۔

اگر افسانے کو تاریخی مواد میں شامل سمجھا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ مسیحیوں کے نزدیک نایٹ کا عہدہ کسی بے دین (مسلمان) کو حاصل نہیں ہو سکتا تھا۔ ایسے شخص کو یہ رتبہ عطا کرنا ایسا تھا جیسا کسی مزبلے کی عفونت کو حریر و دیبا میں لپیٹنا[۶]۔

حروب صلیبیہ کے زمانے میں نایٹوں کے جو تین زبردست اور قابل اعتنا جنگجو طبقے قایم ہوئے جنھوں نے ایک طرف تو مسلمانوں کی خون ریزی کر کے دینی برکت اور دوسری طرف فتوحات نقدی دار حاصل کر کے دنیوی ثروت حاصل کی اُن کے نام یہ ہیں:-

۱۔ نایٹس ہاسپٹلرس۔ Knights Hospitalers

۲۔ نایٹس ٹمپلرس Knights Templars

۳۔ ٹیوٹانک نایٹس Teutonic Knights

---

[۱] ترجمہ تاریخ حروب صلیبیہ۔ مطبوعہ دلگداز پریس صفحہ ۴۸ و ۴۹

[۲] نیو پاپولر انسائکلوپیڈیا جلد ۳ صفحہ ۳۲۰۔

[۳] ترجمہ تاریخ حروب صلیبیہ مطبوعہ دلگداز پریس صفحہ ۵۰۔ یہ سینٹ میکائیل اور سینٹ جارج وہی ہیں جن کے نام پر خطابی کے مخصوص طبقے قائم ہوئے جن کے حالات آگے چلکر پڑھو گے۔

[۴] نیو پاپولر انسائکلوپیڈیا جلد ۳ صفحہ ۳۲۰

[۵] ترجمہ تاریخ حروب صلیبیہ مطبوعہ دلگداز پریس لکھنؤ صفحہ ۵۰۔

[۶] ترجمہ تاریخ حروب صلیبیہ مصنفہ آرچرڈ کنگسفرڈ مطبوعہ شام اودھ پریس لکھنؤ صفحہ ۱۹۹

ہر ایک کا تھوڑا تھوڑا حال سنو۔

Knights Hospitalers

نائیٹس ہاسپٹلرس

یہ ایک نہایت مشہور مذہبی فوجی طبقہ تھا جس کا نام نیس آف سینٹ جان یا ہاسپٹلرس آف سینٹ جان۔ نائیٹس آف روڈس اور نائیٹس آف مالٹا بھی کہتے تھے۔ عربی تاریخوں میں فرقہ اسبتاریہ[1] اسی طبقہ کا نام ہے۔

شہر امیلفی واقع اٹلی کے چند تاجروں نے ظاہر لاعزاز دین اللہ ابو ہاشم علی بن حاکم[2] خلیفہ مصر کی اجازت سے تقریباً ۱۰۲۳ء میں غریب و علیل عیسائی زائروں کی خدمت کیلیے بیت المقدس میں یوحنا اصطباغی کے نام پر ایک ہسپتال اور ایک خانقاہ کی بنیاد ڈالی جب حروب صلیبیہ کا طوفان برپا ہوا تو مریضوں اور ضعیفوں کی خدمت کرتے کرتے یہ مرتاض راہب فتنہ جنگجو سپاہی ہوگئے اور جہاں ہاتھ پڑا وہاں قطعات ملک پر قبضہ کر بیٹھے۔ یہاں تک کہ ۱۱۱۸ء میں[3] انھوں نے ایک زبردست فوجی طبقے کی صورت اختیار کرلی اب خدمت خلق کے علاوہ انکا بڑا فرض "بیدینوں" کے مقابلے میں کلیسا کی حمایت قرار پایا۔[4] یہ طبقہ یونے دو سو برس تک مسلمانوں کے مقابلے میں صف آرا رہا جب سلطان جلیل ملک الاشرف ابن منصور قلاؤن نے عکہ کو (جو سو برس سے عیسائیوں کے قبضے میں تھا) ۱۲۹۱ء میں فتح کر کے لاطینی سلطنت کے کھنڈر کی اینٹیں تک نکال پھینکیں تو یہ طبقہ عکہ سے نکل کر پہلے جزیرہ قبرس پر اور وہاں سے بھی نکالے جانے پر ۱۳۰۹ء میں روڈس پر قبضہ کر کے تقریباً دو سو برس تک وہاں جما رہا جب عثمانی سلطان سلیمان ثانی رحمۃ اللہ علیہ نے ۱۵۲۲ء میں اسے روڈس سے بھی نکالا تو عرصے تک اٹلی و فرانس کے بہت سے مقامات کی خاک چھاننے کے بعد چارلس پنجم شہنشاہ جرمنی و شاہ فرانس (۱۵۱۶ء تا ۱۵۵۶ء) نے اُسے ۱۵۳۰ء میں تین جزیرے مالٹا، گوزو اور کامینو اس شرط پر دیے کہ وہ ہمیشہ "بیدینوں" سے برسرپیکار رہے[5] چنانچہ تاریخ شاہد ہے کہ اس طبقے نے اپنی مدت حیات[6] تک اس شرط کو اپنے مقدور بھر پورا کیا اور اٹھارھویں صدی عیسوی کے وسط تک ترکوں سے برابر دست و گریبان رہا۔

اب یہ طبقہ دوسرے عالم میں اپنے بانیوں کی مہمانی سے بہرہ اندوز ہے۔ ہاں اس عالم میں اس کے نام لیوا آرڈر آف سینٹ جان آف جیروسلم اور سینٹ جانس امبولنس ایسوسی ایشن رہ گئے ہیں۔ آخر الذکر کی فہرست اراکین میں بہت سے[7] اہل ہند کا نام اور اُس کے صندوق خزانہ میں "بیدینوں" کا روپیہ ہے۔

اس طبقے میں تین درجے یعنے نائیٹ (مسلح سپاہی) ائمہ مذہب (پادری) اور خدام (بیماروں اور زائروں کے خدمتی) ہوتے تھے۔ سردار اعلیٰ کا لقب گرانڈ ماسٹر تھا۔ مذہبی امور کا نظم و نسق ایک مجلس کے ہاتھ میں تھا جسے چیپٹر کہتے تھے۔ گرانڈ ماسٹر اس چیپٹر کا صدر ہوتا تھا۔ اس طبقے کے نائیٹ سیاہ لمبا چوغہ پہنتے اور سینے پر طلائی ہشت گوشہ مالٹائی صلیب لگاتے تھے[8] گرانڈ ماسٹر کے ماتحت ایک عہدہ نائیٹ کمانڈر بھی ہوتا تھا۔[9]

---

[1] اسبتار، ہسپتال کا معرب ہے جن مقامات میں عربی بولی جاتی ہے وہاں آج بھی ہسپتال کو اسبتار یا اسبتال ہی کہتے ہیں۔ [2] مصر کا ساتواں فاطمی خلیفہ جس نے ۴۱۱ھ مطابق ۱۰۲۰ء سے ۴۲۷ھ مطابق ۱۰۳۶ء تک حکومت کی۔ [3] ترجمہ تاریخ حروب صلیبیہ مصنفہ آرچر و کنگسفورڈ مطبوعہ شام اودھ پریس لکھنؤ ص ۱۲۲ [4] و [5] و [6] و [7] و [8] ترجمہ پاپولر انسائیکلوپیڈیا جلد ۶ صفحہ ۹ [9] ترجمہ تاریخ حروب صلیبیہ مصنفہ آرچر و کنگسفورڈ مطبوعہ شام اودھ پریس لکھنؤ ص ۱۲۳ خطابی نائیٹوں کے تقریباً ہر طبقے میں بھی گرانڈ ماسٹر ہوتا ہے اور تقریباً ہر مجلسی طبقہ کو اب بھی چیپٹر ہی کہتے ہیں اور بعض طبقوں میں اب بھی نائیٹ کمانڈر ہوتے ہیں نائیٹوں کے اکثر طبقوں میں اب بھی چوغہ داخل خلعت ہے اور ہشت گوشہ مالٹائی صلیبیں اب بھی تمغوں میں داخل ہیں جیسا کہ آگے پڑھو گے۔

Knights Templars
نائیٹس ٹمپلرس

برگنڈی کے ایک سورما ہیوڈی پین نے جو بارھوین صدی کے اوائل مین زیارت بیت المقدس کو آیا تھا[1] جب دیکھا کہ ہاسپٹلر نایٹ تیمارداروں کے مرنجان مرنج لباس کی جگہ فوجی وردی پہنکر خادم سے مخدوم اور مملوک سے مالک ہوگئے تو اُس کے دہان آزمین پانی بھر آیا اور اپنے آٹھ رفیق نائیٹون کی مدد سے اُس نے ۱۱۱۸ء[2] ہی مین اس طبقے کی بنیاد ڈالی۔ بالڈون ثانی شاہ یورشلم[3] نے خاص شہر مقدس

[1] ترجمہ تاریخ حروب صلیبیہ مصنفہ آرچر و کنگسفورڈ۔ مطبوعہ شام اودھ پریس لکھنؤ صفحہ ۱۲۲

[2] نیو پاپولر انسائیکلوپیڈیا جلد ۱۴ صفحہ ۶۲

[3] فتح فاروقی کے بعد بیت المقدس پر صلیبی قبضے کا منظر دیکھنے کا اتفاق آج بیسوین صدی ہی کو نہین ہوا ہے بلکہ اس سے پہلے بھی کبھی بارھوین اور تیرھوین صدیان یہی خواب پریشان دیکھ چکی ہین۔ غیر مسلم پرچم کو کنیسۂ صہیون کے منارۃ الفتح پر اڑتے ابھی کے دن گذرے ہین۔ اس سے پہلے بھی تو صلیبی جھنڈا ایک دفعہ کوہ صہیون پر پورے نوے برس اور دوسری مرتبہ کوہ زیتون پر دس برس لہرا لہرا کر تار تار ہو چکا ہے۔ تم پڑھ چکے ہو کہ صلیبی لڑائیان ۱۰۹۶ء مین شروع ہوئین۔ یہ وہ زمانہ تھا کہ خلافت عباسیہ کے قویٰ مضمحل ہو چکے تھے۔ بغداد کے تخت پر ایک شاہزادہ سالہ بچہ برائے نام بیٹھا تھا۔ شام و عراق مین سلاجقہ سیاہ و سفید کے مالک تھے۔ مصر مین بھی فاطمیین کی حکومت مین گھن لگ چکا تھا اور ان مین اور ترکان سلجوق مین اختلاف مذہب کی بیزم کشی نے عداوت کی وہ آگ جلا رکھی تھی جسکے شعلے آسمان تک جاتے تھے۔ ادھر یہ حالت اور اُدھر مسیحیون کا تازہ اتفاق اور تازہ ترجوش۔ نتیجہ یہ ہوا کہ بیت المقدس جہر دو تین سال قبل مصر کی محض برائے نام حکومت ہوگئی تھی (دیکھو سید امیر علی صفحہ ۲۲۷ نوٹ اور مختصر الاول ابن العبری صفحہ ۳۴۲ نوٹ) ۲۳ شعبان ۴۹۲ھ مطابق ۱۵ جولائی ۱۰۹۹ء کو صلیبیون کے قبضے مین آگیا اور وہان ایک مسیحی حکومت "یورشلم کی لاطینی بادشاہی" کے نام سے قائم ہوئی جو نوے سال تک رہی۔ اس نے تخت پر چھوٹے بڑے نو عیسائی بادشاہ بیٹھے جن کی فہرست درج ذیل ہے:-

۱-	گاڈفرے آف بوئیلون (جسے عربی مورخ کندفرے لکھتے ہین)	۱۰۹۹ء تا ۱۱۰۰ء
۲-	بالڈوین اول (جسے عرب بغدوین۔ بردوین یا بردویل لکھتے ہین)	۱۱۰۰ء تا ۱۱۱۸ء
۳-	بالڈوین ثانی	۱۱۱۸ء تا ۱۱۳۱ء
۴-	فلک آف انجو	۱۱۳۱ء تا ۱۱۴۳ء
۵-	بالڈوین ثالث	۱۱۴۳ء تا ۱۱۶۲ء
۶-	المری (جسے مورخین عرب المری لکھتے ہین)	۱۱۶۲ء تا ۱۱۷۳ء
۷-	بالڈوین رابع (مجذوم)	۱۱۷۳ء تا ۱۱۸۳ء
۸-	بالڈوین خامس (طفل پنجسالہ)	۱۱۸۳ء تا ۱۱۸۶ء

مین ہیکل سلیمانی سے شرقی جانب خانقاہ کے لیے زمین عنایت کی[۵۱]۔ اس طبقے والوں نے مسجد اقصیٰ کو اپنا گرجا قرار دیا[۵۲]۔ اسی وجہ سے انھین ٹمپلارس (اہل معبد) کہنے لگے۔ عرب مورخین اسی طبقے کو فرقہ داویہ کہتے ہین۔

ابتدا ہی سے جنگجوئی اور ملک گیری اس طبقے کا مطمح نظر اور "بے دین" مسلمانون کے مقابلے مین مذہب مقدس اور قبرۂ مبارک کی حفاظت وصیانت مقصد حیات تھا۔ چنانچہ عرصۂ دراز تک ہر جگہ مسلمانون کے مقابل صف آرا رہا۔ ۱۲۹۱ء مین جب ہاسپٹلرس کی طرح یہ بھی سرزمین قدس سے نکالا گیا تو جزیرہ قبرس ہی مین آیا۔ اس طبقے کی طاقت ودولت اور نخوت ورعونت یورپی طاقتون کی نظر مین شروع ہی سے

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۴۳)

۹۔ ملکہ اسبیلا بہ شرکت گے ڈی لوسگنان شوہر خود ۱۱۸۶ء تا ۱۱۹۰ء

حضرت سلطان صلاح الدین یوسف ایوبی رحمۃ اللہ علیہ ورضی اللہ عنہ نے ۲۷ رجب ۵۸۳ھ مطابق ۳ اکتوبر ۱۱۸۷ء کو بیت المقدس فتح کرکے اس لاطینی بادشاہت کا استیصال کر دیا۔ تھین یاد ہو کہ مسیحیون نے ۴۹۲ھ مین شعبان کے مہینے مین بیت المقدس مسلمانون سے چھینا تھا جمعے کا دن تھا کہ اُنھون نے مسجد اقصیٰ کو گرجا بنا کر اس کے گنبد پر صلیب چڑھائی۔ خدا کی قدرت دیکھو کہ شعبان ہی کے مہینے مین (۵۸۳ھ) جمعے کے دن مسجد اقصیٰ کے گنبد پر سے صلیب اُتاری گئی اور سلطان رحمۃ اللہ علیہ نے جمعے کی نماز مسجد اقصیٰ مین ادا کی۔ قاضی دمشق امام محی الدین بن زکی نے ایک نہایت پرجوش اور وجد آور خطبہ پڑھا۔ اس دفعہ بیت المقدس مسلمانون کے قبضے مین ۴۵ سال تک رہا۔ تاآنکہ ۶۲۷ھ مطابق ۱۲۲۹ء مین فریڈرک ثانی شہنشاہ جرمنی نے ناصرالدین ملک الکامل (برادرزادہ سلطان مرحوم ومغفور) سے ایک صلحنامہ کے رُو سے یورشلم بیت اللحم اور ناصرہ مع اور چند شہرون کے لے لیے۔ دس سال عیسائی اس صلحنامہ سے فائدہ اُٹھانے پائے تھے کہ ۶۳۷ھ مطابق ۱۲۳۹ء مین ملک الکامل کے بھتیجے الملک الناصر نے پھر یورشلم کو مع کل ازدست رفتہ شہرون کے واپس لے لیا۔ اُس وقت سے کل سرزمین قدس چھ سو بیاسی برس تک مسلمانون کے قبضے مین رہی یہان تک کہ باغی شریف مکہ نے ۲۱ جون ۱۹۱۶ء کو مکہ معظمہ پر اپنا قبضہ کرکے آزادی عرب کا اعلان کیا اور اس طرح عربون کی غداری نے صلیبیون کے لیے فتح بیت المقدس کا راستہ صاف کر دیا۔ ۲۹ جون ۱۹۱۷ء کو جنرل ایلنبی نے محاذ بیت المقدس کی کمان اپنے ہاتھ مین لی اور جنوب سے بڑھ کر ۳۱ اکتوبر ۱۹۱۷ء کو بیر شبع پہونچ گیا۔ نومبر کے مہینے مین ساحلی مقامات غزہ اور عسقلان اور یافہ لے کر ۷ دسمبر ۱۹۱۷ء کو حبرون۔ ۸ دسمبر کو بیت اللحم اور ۹ دسمبر کو یورشلم کے پھاٹک پر آ پہونچا اور ۱۰ دسمبر ۱۹۱۷ء کو شہر مین داخل ہوا۔

۵۱ نیو پاپولر انسائیکلوپیڈیا جلد ۱۴ ص ۶۲

۵۲ ترجمہ تاریخ حروب صلیبیہ مطبوعہ دلگداز پریس لکھنؤ ص ۹۵

کشمکش تھی، چنانچہ یورپی طاقتوں ہی کے ہاتھوں چودھوین صدی کے آغاز مین اس کا قلع قمع ہوگیا۔[ملے]
اِس مین بھی تین درجے نایٹ۔ مصاحب اور خدام تھے۔ بعد مین پادری بھی شامل کیے گئے۔
اس کے سردار اعلیٰ کا لقب بھی گرانڈ ماسٹر ہی تھا جو بوجہ تقدس طبقہ بادشاہ ملک کا ہمسر سمجھا جاتا تھا، اور باعتبار جلال وجبروت یورپ کے بڑے سے بڑے تاجدار کو خاطر مین نہ لاتا تھا۔[سے]
نایٹ سفید جوغہ پہنتے اور سُرخ ہشت گوشہ مالٹائی صلیب قلب پر لگاتے تھے۔[سے]

Teutonic Knights ٹیوٹانِک نائیٹس

فرڈرک ڈیوک آف سوابیا۔ فرڈرک اول باربروسہ شہنشاہ جرمنی کا بیٹا تھا جو باپ کے ساتھ تیسری صلیبی لڑائی مین شریک ہوکر مشرق مین آیا جب جون ۱۱۹۰ء مین فرڈرک باربروسہ مرا تو یہ باپ کی جگہ جرمن لشکر کا سردار مقرر ہوا اور ۸ راکتوبر ۱۱۹۰ء کو زمرۂ محاصرین مین شریک ہونے کے لیے عکہ پہونچا۔[صہ]
دوران محاصرہ مین اُس نے اِسپٹلرس اور ٹمپلرس کی دیکھا دیکھی مرنے سے تین مہینے پہلے اکتوبر ۱۱۹۰ء مین اس طبقہ کی بنیا ڈالی جس کے اراکین صرف اپنے اہل وطن ہی مقرر کیے۔
ظاہر ہے کہ طبقے کا مقصد وہی نشا ہی تھا جو صرف اِسپٹلرس اور ٹمپلرس کا بلکہ ہر صلیبی بہادر کا تھا یعنی بیدینون کے مقابلے مین مذہب کلیسا کی حفاظت وصیانت[ھ]۔ اِس مقدس مقصد کو پورا کرنے کے ساتھ ساتھ اس طبقے نے دولت وحکومت مین بڑی ترقی کی۔[ھ] پہلے اِس کا صدر مقام بھی عکہ ہی تھا جب ۱۲۹۱ء مین اور طبقون کی طرح یہ بھی ارضِ مقدس سے نکالا گیا تو پہلے وینس مین اور وہان سے ۱۳۰۹ء مین میرین برگ مین آیا۔
یہین پندرھوین صدی کے آغاز مین بد رہوا اور یہین محاق شروع ہوکر آخر مین پھر ہلال ہوگیا۔ پولینڈ سے لڑائی ہونے کے بعد مشرقی پروشیا طبقے کے ہاتھ سے نکل کر گرانڈ ماسٹر کی ذاتی ملکیت ہوگیا۔ آخر مین یہ طبقہ اپنے سابقہ جاہ وجلال کا محض لفافہ ہی لفافہ رہ گیا تھا۔ نپولین نے اس لفافے کو بھی پُرزے پُرزے ہوا مین اُڑا دیے۔ اب آسٹریا کے ایک نواب زادے کو برائے نام اس طبقے کا سردار لکھا جاتا ہے۔

ملے وسلے وسے نیو یا پولر انسائیکلوپیڈیا جلد ۱۴ ص ۶۲
صلہ نیو یا پولر انسائیکلوپیڈیا جلد ۴ صفحہ ۲۰۴
صہ نیو یا پولر انسائیکلوپیڈیا جلد ۱۴ صفحہ ۴۷
ھ ترجمہ تاریخ حروب صلیبیہ مصنفہ آرچرو کنگسفورڈ مطبوعہ شام اودھ پریس لکھنؤ ص ۱۲۹
ھ نیو یا پولر انسائیکلوپیڈیا جلد ۱۴ ص ۴۷

اِس طبقے مین بھی نایٹ (مسلح سپاہی) اہلِ مذہب (پادری) اور خدام (بیمارون اور زائرون کے خادم) تھے بلکہ ایک درجہ اخوان[1] کا زیادہ تھا۔ سردارِ اعلیٰ کا لقب بھی گرانڈ ماسٹر ہی تھا[1]

نائٹون کا لباس سیاہ تھا جسپر وہ سفید چوغہ پہنتے اور نقرئی کنارون والی سیاہ صلیب لگاتے تھے[2]۔

یہ نائٹون کے وہ ممتاز طبقے تھے جو اُس زمانہ مین جبکہ مذہبی آندھیان زور وشور سے چل رہی تھین مذہبی آسمان کے نیچے اور مذہبی زمین کے اوپر قائم ہوے۔ یہین اُنھون نے بیدینون سے جدال وقتال جاری رکھکر اپنا مقصدِ آفرینش پورا کیا۔ یہین وہ دولت وحکومت حاصل کی جسکے باعث آگے چلکر محسودِ اقران وامائل ہوے۔ جب یورپ کے تاجدار انھین ارضِ مقدس مین پھلتا پھولتا دیکھکر اپنے اپنے ملک کو سدھارے تو انھی کے نمونون پر اُنھون نے اپنے یہان بھی نائٹون کے طبقے جاری کیے۔ مگر وہان کا زمین وآسمان ہی اور تھا۔ وہان "بے دین" کہان تھے جن سے سرگرمِ جنگ رہکر انکی گرمی بازار رہتی۔ اِسکے علاوہ حکومت کو کب منظور تھا کہ ایک مستقل اور جُداگانہ خودسر اور جنگجو فوج بناکر آستین مین سانپ پالے۔ لہذا بجاے اِسکے کہ یہ طبقے بدمزاج۔ کھردرے۔ جنگجو اور مذہب کے دلدادہ سپاہیون پر مشتمل ہوتے جنکا کام سر دینا اور سر لینا ہوتا۔ خوش مزاج چکنے چُپڑے صلح پسند اور سوسائٹی کے فریفتہ رئیسون سے مرکب ہوے جن کا کام دل دینا اور دل لینا تھا۔ صلیبی نایٹ اپنی دلبری سے میدانِ رزم کو گرماتے تھے۔ خطابی نایٹ اپنی دلبری سے مجلسِ بزم کو گرمانے لگے۔ باقی ہر اعتبار سے یہ نایٹ اپنے پیش روؤن کی عکسی تصویر تھے یعنی وہی چوغہ وہی صلیب وہی گرانڈ ماسٹر وہی کمانڈر وہی مصاحبی۔ پہلی نائٹی کا محرک مذہب تھا اب اُسکی جگہ فیشن ہوا پہلے انتقام تھا اب آمتدار ہوا یون سمجھو کہ صلیبی نائٹی ایک گرجا تھی جسکے نقشے اور نمونے پر یورپ نے اپنے اپنے ڈرائنگ روم کی بنا ڈالی اور جب وہ گرجا ٹوٹا تو اُسی کے ملبے اور چلے سے ڈرائنگ روم کی عمارت مکمل کی اور اُسی کے فرنیچر اور سامانِ آرائش سے اِسے سجایا۔ چنانچہ نگاہِ تعمق فوراً بتادے گی کہ وہی گرجا کی متبرک تصویرین ہین جو دیوارون پر لٹکتی ہین وہی

[1] ترجمہ تاریخ حروب صلیبیہ مصنفہ آرچرد کنگسفورڈ مطبوعہ شام اودھ پریس لکھنؤ ص ۱۲۹

[2] و [3] نیو پاپولر انسائیکلو پیڈیا جلد ۱۴ صفحہ ۴۷

صلیبین ہین جو گوشون مین کھڑی ہین وہی قربان گاہ کی شمعین - وہی مالائین - وہی متبرک پانی اور عشاے ربانی کے پیالے ہین - جو کانس پر چنے ہوے ہین -

دولت برطانیہ نے خطابی نایٹی کے جو طبقے وقتاً فوقتاً قائم کرکے صلیبی زمانہ کی یاد تازہ کی انکی تعداد جہانتک ہمین معلوم ہو دس ہو - ان مین سے دو تو بہت قدیم انگلستانی طبقے ہین - ایک اسکاٹلینڈ کے شمول کے بعد اُسکی خاطر سے اور ایک آئرلینڈ کے الحاق کے بعد اُس کی خاطر سے بڑھایا گیا ہو ہندوستان بڑا خوش نصیب ہو کہ اُسکے ساتھ سلطنت کو جو دوہری محبت ہو اُس کا اظہار دو طبقون کی شکل مین ہوا ہے - اہل ہند کو شکرگذار رہنا چاہیے کہ کھانے کو چاہے روٹی ملی یا نہ ملی مگر پہننے کو تو ایک چھوڑ دو دو چوغے ملے باقی چار طبقے تمام ممالک محروسہ زیر قلمرو برطانیہ و نیز ممالک خارجیہ کے لیے عام ہین -

ہم نے جو یہ کہا ہو کہ ہندوستان کے نام سے دو طبقے قایم کیے گئے ہین اس سے یہ نہ سمجھنا چاہیے کہ یہ محض اہل ہند کے لیے مخصوص ہین اور ہندوستانیون یا اُن انگریزی حکام کے سوا جو ہندوستان مین ملازم و موجود ہین اور کوئی شخص ان مین شامل ہی نہین ہو سکتا بلکہ واقعہ یہ ہو کہ ہر وہ یورپی جس نے ملازمت تجارت - سیاحت یا اور کسی خفیہ یا علانیہ غرض سے ہندوستان مین قدم رنجہ کیا ہو یا ولایت ہی مین اسے ہندوستان سے کوئی مادی یا ذہنی - واقعی یا خیالی قریب یا بعید تعلق ہو یا رہ چکا ہو اور نیز ہر وہ ایشیائی جس نے کالے کوسون گھر بیٹھے اپنے آپ کو زیر عنوان "معاوضہ اعانت" مستحق خطاب ثابت کیا ہو ان دونون طبقون کا رکن بنایا جاتا ہو - چنانچہ خدیو مصر - سلاطین زنجبار و مسقط و عمان و لاہج و جوہور - شاہزادہ سلطان مسعود مرزا یمین الدولہ ظل السلطان ایران - ہز اکسلنسی حسین قلی خان مختارالدولہ ایران - ہز مجسٹی شہنشاہ کوریا - اور اس قسم کے بہت سے مغربی و مشرقی جن کے نتھنون مین کبھی ہندوستان کی ہوا اور جن کے دماغ مین کبھی ہندوستان کے دھندلے سے خیال کا بھی گذر نہین ہوا اور نہ ہوگا وہ ستارۂ ہند اور کشور ہند کے نایٹ گرانڈ کمانڈر اور نایٹ کمانڈر بن چکے ہین -

یہ بھی سن لو کہ ان دس طبقون مین سے نو پورے ہین اور ایک ادھورا - نو بھرے ہین اور ایک خالی - تفصیل سب کی آگے آتی ہو -

The Most Noble Order of the Garter
شریف ترین طبقۂ گارٹر

انگلستانی نایٹی کا طبقہ ہو - اس کی اصلیت کے متعلق دو قصے مشہور ہین - ایک یہ کہ ایڈورڈ اول

شاہ انگلستان (۱۱۸۹ء تا ۱۱۹۹ء) نے جو اہل انگلستان کی طرف سے تیسری صلیبی لڑائی مین گیا تھا محاصرہ عکہ مین اپنے سردارون کے گھٹنون پر چمڑے کے تسمے بندھوا دیے تھے تاکہ ممالک غیر کے محاصرین سے تیز کیے جا سکین[1]۔ اِس طبقہ کی بنیاد انھین مسلم نواز صلیبیون کی یاد تازہ کرنے کو ڈالی گئی ہے۔

دوسرا قصہ (جس سے طبقے کے عجیب نشان خصوصی اور عجیب ترین سجع کی لم صاف سمجھ مین آجاتی ہے) یہ ہے کہ ایڈورڈ سوم شاہ انگلستان (۱۳۲۷ء تا ۱۳۷۷ء) کے عہد مین ایک رات کسی جلسے مین ایک امیر کبیر کی زوجۂ محترمہ (کاؤنٹس آف سالسبری) ناچ رہی تھین کہ ان کا موزہ بند پنڈلی سے کھل پڑا۔ بادشاہ نے فرط تعلق سے وہ موزہ بند اپنے ہاتھ سے اُٹھا کر خاتون کے ساق سیمین پر باندھ دیا۔ موزہ بند اُٹھاتے وقت بادشاہ کی ہمہ بین آنکھ نے دیکھ لیا تھا کہ رشک و رقابت کی آگ بادشاہ بیگم کے چہرے پر نفرت و حقارت کی چنگاریان اُڑا رہی ہے۔ لہذا موزہ بند باندھتے وقت بادشاہ کی زبان سے یہ الفاظ نکلے:-

"اسے جو بُرا سمجھے اُس کا بُرا ہو"[1]

چنانچہ سرگرم رقص خاتون کا وہی موزہ بند آج تک طبقے کا نشان خصوصی اور خدمتگذار حسن بادشاہ کے الفاظ اُس کا سجع ہین۔ مورخین کا اتفاق ہے کہ اس کا قیام بہ حیثیت طبقہ شولری (نائیٹی) ۱۳۴۴ء مین ہوا۔ اب یہ طبقہ تثلیث مقدس حضرت مریم سینٹ ایڈورڈ اور سینٹ جارج کے مربع حصار حمایت مین چین کرتا ہے۔ سینٹ جارج[2] جو انگلستان کے محافظ ولی اور صلیبیون کے مربی خاص ہین (جنکے نام پر نایٹ بنائے جاتے تھے) اِس طبقے کے حامی و سرپرست ہین اِسی لیے جہان اِس کا نام آرڈر آف دی گارٹر (طبقہ موزہ بند)

---

[1] و [1] نیو یاپولر انسائیکلوپیڈیا جلد ۶ صفحہ ۹۴

[2] یہ بزرگ شہر لدا کے رہنے والے تھے جو یافہ کے قریب ہے۔ رومی شہنشاہ ڈایوکلیشن (۲۸۴ء تا ۳۰۵ء) کے زمانے مین مارے گئے۔ ۴۹۴ء مین پوپ گلاشیس نے انھین رومی کلیسا کے ولیون مین شامل کرلیا۔ ان کی وفات سے تقریباً سات سو برس بعد صلیبی لڑائیان شروع ہوئین ان لڑائیون مین ان کی روح نے صلیبی بہادرون کو مسلمانون کے خلاف بہت کچھ مدد دی چنانچہ پہلی لڑائی مین کبھی وہ انطاکیہ کے میدان مین صلیبی بہادرون کے جوش کو اُبھارتی پھرتی تھی (دیکھو حروب صلیبیہ مطبوعہ دلگداز پریس لکھنؤ صفحہ ۴۳) کبھی یورشلیم مین کوہ زیتون پر محافظان روضہ مسیح کا دل بڑھاتی تھی (دیکھو حروب صلیبیہ مطبوعہ دلگداز پریس صفحہ ۷۹) اسی بنا پر صلیبیون نے انھین اپنا مربی خاص قرار دیا اور یورپ واپس جاکر ان کی باقاعدہ پرستش رائج کردی (دیکھو نیو یاپولر انسائیکلوپیڈیا جلد ۶ صفحہ ۱۷۳) انگلستان نے بھی اِس صلیبی امداد کی وجہ سے انھین اپنے ملک کا محافظ ولی قرار دیا ہے۔ طبقہ گارٹر اور طبقہ سینٹ میکائیل و سینٹ جارج انھی کے نام پر رائج ہوا ہے۔

ہر وہاں آرڈر آف سینٹ جارج (طبقۂ دلی جارج) بھی ہر۔

ممالک غیر کے بادشاہ اور شہزادے ہمیشہ اسی طبقہ مین نایٹ بنائے جاتے ہین۔ اس مین صرف ایک ہی درجہ ہوتا ہر۔ شامل ہونے والے کو نایٹ آف دی آرڈر آف دی گارٹر کا خطاب ملتا ہر جسکا مخفف کے جی (K. G.) ہر اگرچہ خطابی قاعدے کے مطابق خطاب یافتہ کے نام سے پہلے سر اور بعد مین کے جی لکھا جانا چاہیے لیکن اس طبقے مین شامل ہونے والے یا تو ہز مجسٹی فلان یا ہز رایل ہائی نس یا ہز ہائی نس یا مارکوئیس یا ارل یا وای کاونٹ یا بیرن فلان فلان ہوتے ہین۔ اس لیے اُنھین اس چھوٹے سے "سر" کی پروا نہین ہوتی۔

طبقے کا خلعت حسب ذیل ہر:۔[۵۲]

۱۔ گلوبند۔ طلائی زنجیر جسمین چھبّیس کڑیان ہوتی ہین۔ ہر کڑی کے بعد یکے بعد دیگرے موزہ بند اور عقدِ محبت کے شکل کی۔ موزہ بند کے شکل کی ہر کڑی پر سجع منقوش۔ درمیانی کڑی مین تمغہ لٹکتا ہر۔

۲۔ تمغہ۔ طلائی قرص۔ بیچ مین سینٹ جارج کی تصویر جسمین جواہرات جڑے ہوئے۔

۳۔ ستارہ۔ ہشت گوشہ یعنی دوہری صلیب سے مرکب۔ وسط مین سینٹ جارج کی مخصوص سُرخ صلیب۔ دور پر موزہ بند کی شکل جسمین سجع منقوش۔ ٹھیک قلب کے اوپر لٹکایا جاتا ہر۔

۴۔ چوغہ۔ گہرے نیلے مخمل کا جاروب کش دامنون والا۔ جسکے سینے پر بائین جانب یعنی ٹھیک قلب کے اوپر ستارہ مع سینٹ جارج کی صلیب کے کڑھا ہوتا ہر۔

۵۔ موزہ بند۔ نیلگون فیتے کا جسکا حاشیہ سُنہرا اور متن مین سجع منقوش ہوتا ہر۔ دونون سرون پر طلائی بکسوے۔ بیچ مین طلائی آویزہ۔ بائین پنڈلی پر گھٹنے کے نیچے باندھا جاتا ہر۔

بادشاہ وقت طبقے کا بادشاہ ہوتا ہر۔ عہدہ دار ہمیشہ مقتدایان مذہب عیسوی ہی ہوتے ہین مثلاً:۔

---

[۵۱] ہمارے ایک انگریزی دان صوفی دوست نے اعتراض کیا کہ نایٹ کا پہلا حرف تو نون ہونا چاہیے یہ کاف کیون ہر۔ ہم نے سمجھایا کہ پہلا حرف کاف ہی ہر جو کتابت مین آتا ہر مگر تلفظ مین خاموش ہر۔ اس پر وہ اپنے انداز خاص مین نیم باز آنکھون سے ہماری طرف دیکھ کر مسکرائے اور سر ہلا کر فرمانے لگے: "پالیا ہر۔ پالیا ہر۔ جاتا کہان ہر یہ کاف بھی صوفی ہر کہ ہر تو موجود مگر معدوم ہر۔"

[۵۲] جیکس پیئرنس بک صفحہ ۲۰۰

ونچسٹر کا بشپ مستقل پریلیٹ Prelate
اکسفورڈ کا بشپ مستقل چانسلر Chancellor
ونڈسر کا ڈین مستقل رجسٹرار[1] Registrar

معزز ترین طبقۂ باتھ The Most Honourable Order of the Bath

یہ بھی انگلستانی نائیٹی ہی کا طبقہ ہے۔ باتھ انگریزی مین غسل کو کہتے ہین۔ نائیٹ بنتے وقت جو رسمین ادا کرنی پڑتی تھین چونکہ اُن مین ایک خاص رسم غسل کی بھی ہوتی تھی[2] لہذا اس طبقے کے نائیٹون کو نائیٹس آف دی باتھ (بہادران غُسل) کے نام سے موسوم کیا گیا[3]۔

یہ طبقہ ۱۳۹۹ء مین قایم ہوا۔ اس نے کہ ہنری چہارم شاہ انگلستان (۱۳۹۹ء تا ۱۴۱۳ء) نے اپنی تاجپوشی کے دن چھیالیس اُمرا کو نائیٹ بنا کر اس طبقے مین شامل کیا تھا۔ جب سے شاہانِ انگلستان اپنی تاجپوشی۔ شہزادون کی ولادت و ازدواج اور ایسی ہی تقریبون پر امرا و معززین کو اس مین شامل کیا کرتے ہین۔

خطاب:۔

درجۂ اول۔ نائیٹ گرانڈ کراس[4] آف دی آرڈر آف دی باتھ جسکا مخفف جی سی بی (G.C.B) ہے نام سے پہلے "سر" اور بعد مین جی۔ سی۔ بی (G.C.B) لکھا جاتا ہے۔

درجۂ دوم۔ نائیٹ کمانڈر[5] آف دی آرڈر آف دی باتھ جسکا مخفف کے۔ سی۔ بی۔ (K.C.B) ہے۔ نام سے پہلے "سر" اور بعد مین کے۔ سی۔ بی (K.C.B) لکھا جاتا ہے۔

---

[1] جیکس ریفرنس بک صفحہ ۲۰۰

[2] جیکس ریفرنس بک صفحہ ۲۰۰۔ جب اس طبقے کی بنیاد پڑی ہے تو عیسائیون کو طہارت و صفائی سے قطعاً بیگانگی تھی۔ وہ برسون تک غسل نہین کرتے تھے اور مہینون تک منھ ہاتھ نہین دھوتے تھے۔ سینٹ برنارڈ ٹیلرس کے محامد گناتے ہوئے لکھتا ہے "وہ کبھی منھ ہاتھ دھوتے ہین۔ کنگھی نہ کرنے سے اُن کے بال چکٹے اور گرد و غبار سے خاک مین اٹے رہتے ہین۔" یہی وجہ تھی کہ غسل کو اس قدر مہتم بالشان رسم سمجھا گیا۔

[3] نیو یونیورسل انسائیکلوپیڈیا جلد ۲ ص ۷۰

[4] نائیٹ گرانڈ کراس یعنی صلیب اعظم کا بہادر

[5] کمانڈر کا عہدہ ہاسپٹلرس مین بھی ہوتا تھا دیکھو ص ۴۳ ۵۹

درجہ سوم۔ کمپینین[1] آف دی آرڈر آف دی باتھ جس کا مخفف سی۔بی (C.B) ہے چونکہ خطاب یافتہ نائٹ نہیں ہوتا اس لیے صرف نام کے بعد سی۔بی (C.B) لکھا جاتا ہے۔

خلعت :۔

۱۔ گلوبند۔ طلائی زنجیر جسمیں سترہ کڑیاں ہوتی ہیں۔ نو کڑیاں تاج انگلستان کی اور باقی آٹھ گلاب[2] اور تھسل[3] اور شیراک[4] کی شکل کی۔ درمیانی کڑی میں تمغہ لٹکتا ہے۔

۲۔ تمغہ طلائی مالٹائی ہشت گوشہ صلیب۔ ایک تاج اوپر اور دو ادھر اُدھر صلیب کے گوشوں میں چار شیر۔ بیچ (جو مذہب تثلیث کا سہ آتشہ مقطر ہے) ثلاثہ واحد میں شامل ہیں[5]۔

۳۔ ستارہ جس کے وسط میں مالٹائی صلیب اور تین انگلستانی تاج ہیں۔ سینے پر لٹکایا جاتا ہے۔ بادشاہ وقت طبقے کا بادشاہ ہوتا ہے۔ اسکے ماتحت گرانڈ ماسٹر[6] ہوتا ہے۔ آج کل اس طبقے کے گرانڈ ماسٹر ڈیوک آف کناٹ ہیں۔ اس طبقے کا گرجا جہاں رسم نائیٹی ادا ہوتی ہے کلیسائے ہنری ہفتم واقع ویسٹ منسٹر ایبی (لندن) ہے اور ویسٹ منسٹر کا ڈین ہی طبقے کا ڈین بھی ہے[7]۔

The Most Ancient Order of the Thistle قدیم ترین طبقہ تھسل

اسکاٹ لینڈ کی نائیٹی کا طبقہ ہے۔ بعض محققین کی رائے ہے کہ اخایوس شاہ اسکاٹ لینڈ نے جو نویں صدی کے وسط میں حاکم تھا اتھلسٹن شاہ انگلستان (۹۲۵ء تا ۹۴۰ء) پر فتح پانے کے دن سے اگلی رات آسمان پر ایک چمکتی صلیب دیکھی جو ہوبہو ویسی تھی جس پر سینٹ اینڈریو مصلوب ہوے تھے، یہ طبقہ اسی واقعے کی یادگار میں قایم ہوا ہے مگر اصل یہ ہے کہ ۱۶۸۷ء سے قبل اس کے وجود کا پتہ نہیں چلتا۔ اُس سال جیمس دوم شاہ انگلستان (۱۶۸۵ء تا ۱۶۸۸ء) نے اس طبقے کے قواعد مرتب کرائے[8]۔

---

[1] کمپینین یعنی مصاحب کا عہدہ ٹمپلرس میں ہوتا تھا۔
[2] و [3] و [4] گلاب انگلستان کا مخصوص پھول اور تھسل اسکاٹ لینڈ کا اور شیراک آئرلینڈ کا مخصوص پودا ہے۔
[5] نیو پاپولر انسائیکلوپیڈیا جلد ۲ صفحہ ۶۰
[6] جیکس ریفرنس بک ص ۲۰۸۔ دیکھو ص ۳۴ م ۵۹
[7] نیو پاپولر انسائیکلوپیڈیا جلد ۵ صفحہ ۶۷ و ۶۸
[8] نیو پاپولر انسائیکلوپیڈیا جلد ۱۴ صفحہ ۹۴

یہ طبقہ اینڈریو ولی[1] کی خاص حمایت مین ہو۔ اسی وجہ سے اس کا نام آرڈر آف سینٹ اینڈریو بھی ہو۔ اسمین صرف ایک ہی درجہ ہو۔ شامل ہونے والے کو نایٹ آف دی آرڈر آف دی تھسل کا خطاب ملتا ہو جس کا مخفف کے۔ ٹی۔ (K. T.) ہو۔ اس کے ارکان بھی تعداد سے اونچے ہی ہین۔ خلعت حسب ذیل[2] ہو:-

۱- گلوبند- طلائی جسمین سولہ کڑیان تھسل کی ہوتی ہین۔ وسط مین تمغہ لٹکتا ہو۔

۲- تمغہ - سینٹ اینڈریو کی تصویر اپنی مخصوص صلیب لیے ہوے۔

۳- ستارہ - سینٹ اینڈریو کی نقرئی صلیب جسکے گوشون مین سے شعاعین نکلی ہین۔ وسطی حصہ سنہرا جسمین تھسل بنا ہوا اور اُس کے گرد سجع جس کے الفاظ یہ ہین:- "کوئی بے خطری سے مجھے مشتعل نہین کر سکتا"۔ ستارہ قلب پر لٹکایا جاتا ہو۔

بادشاہ وقت طبقے کا بادشاہ ہوتا ہو۔ اس طبقے کا ڈین بھی اسکاٹ لینڈ کے کسی گرجا کا پادری ہی ہوتا ہو۔

نامی ترین طبقہ سینٹ پیٹرک The Most Illustrious Order of St Patrick

آئرلینڈ کی نائیٹی کا طبقہ ہو جسے جارج سوم شاہ انگلستان (سنہ۱۷۶۰ تا ۱۸۲۰ء) سے ۵/ فروری سنہ۱۷۸۳ء[3] کو قائم کیا۔ یہ طبقہ سینٹ پیٹرک کی حمایت مین ہو جو آئرلینڈ کے ولی و مربی خاص ہین۔ اس مین بھی صرف ایک ہی درجہ ہوتا ہو۔ شامل ہونے والے کو نایٹ آف دی آرڈر آف سینٹ پیٹرک

---

[1] یعنی ایندریاس حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے حواری اور پطرس حواری کے حقیقی بھائی۔ حضرت عیسیٰ ؑ کے بعد مدتون مختلف ممالک مین وعظ و تلقین فرماتے رہے۔ عام روایت کے مطابق یہ بھی مصلوب ہوے (نیو یونیورسل انسائیکلوپیڈیا جلد اول صفحہ ۲۰۷) ان کی روح کی نسبت بھی یہ افترا و بہتان اُٹھایا جاتا ہو کہ صلیبی لڑائیون مین مسلمانون کے خلاف دلچسپی لیتی تھی چنانچہ انہی کی روح نے ریمنڈ آف طولوس کے پادری۔ پطرس بارتھولومی کو خواب مین بشارت دی تھی کہ انطاکیہ مین پطرس کی کے گرجے مین وہ اصلی برچھی مدفون ہو جس سے رومی سپاہی نے حضرت مسیح کا پہلو صلیب پر چڑھانے کے بعد زخمی کیا تھا۔ اس برچھی کی برکت سے صلیبیون کو بے دینون پر فتح حاصل ہوگی (حروب صلیبیہ مطبوعہ دلگداز پریس صفحہ ۱۷) افترا و بہتان ہم نے اس لیے کہا کہ جب خود اُستاد (حضرت عیسیٰ علیہ السلام) نے ہادی انام یعنی بانی اسلام (روحی فداہ) کی بشارت دی ہو تو شاگرد (حواری) کو اسلام اور اہل اسلام سے اس قدر بغض اور بیت المقدس سے اسلامی قبضہ اُٹھائے جانے کے متعلق اس قدر کد و کوشش نا ممکن ہو۔

[2] و [3] جیکس ریفرنس بک صفحہ ۲۰۸

کا خطاب ملتا ہی۔ جسکا مخفف کے۔پی۔ (K. P.) ہی۔

خلعت حسب ذیل ہی:[1]

۱۔ گلوبند۔ طلائی جسکی کڑیان رباب کی شکل کی ہوتی ہین۔ وسط مین ایک طلائی رباب ہوتا ہی جسین تمغہ لٹکتا ہوتا ہی۔

۲۔ تمغہ۔ طلائی قرص۔ جسکے دَور مین شیمراک کا ہار اور طبقے کا سجع ہوتا ہی۔ سجع کے الفاظ یہ ہین "کون جُدا کرے گا؟"[2]

۳۔ ستارہ۔ جسکی شعاعین نقرئی ہوتی ہین۔ بیچ مین سینٹ پیٹرک کی سُرخ صلیب۔ نیچے سجع اور تاریخ قیام طبقہ۔ ستارہ قلب پر پہنا جاتا ہی۔

بادشاہ وقت طبقے کا بادشاہ ہوتا ہے۔ اور گرانڈ ماسٹر[3] آیرلینڈ کا لارڈ لفٹنٹ۔

The Most-Distinguished Order of St. Michael and St. George
ممتاز ترین طبقہ سینٹ میکاییل و سینٹ جارج

یہ طبقہ سنہ ۱۸۱۸ع مین باشندگان جزایر یونانیہ و مالٹا اور نیز اُن اشخاص کے لیے جو بحیرۂ روم مین مناصب جلیلہ پر فائز ہین قایم ہوا تھا۔ سنہ ۱۸۶۸ع مین کل مستعمرات برطانیہ کے باشندون کے لیے اسمین توسیع کی گئی۔[4]

خطاب[5]:-

درجۂ اول۔ نایٹ گرانڈ[6] کراس آف دی آرڈر آف سینٹ میکاییل اینڈ سینٹ جارج۔ مخفف جی سی۔ ایم۔ جی (G. C. M. G.)

نام سے پہلے "سر" اور بعد مین جی سی ایم جی (G. C. M. G.) لکھا جاتا ہی۔

درجۂ دوم۔ نایٹ کمانڈر آف دی آرڈر آف سینٹ میکاییل اینڈ سینٹ جارج۔ مخفف کے سی ایم جی K. C. M. G.

---

[1] جیکس ریفرنس بک ص ۸۰۲
[2] یہ استفہام غالباً آیرلینڈ کو انگلستان سے علٰحدہ کرنے کے متعلق ہی۔ اگر ایسا ہی تو اِس کا جواب سن فینر جماعت کے اراکین اچھی طرح دے سکتے ہین۔
[3] جیکس ریفرنس بک صفحہ ۸۰۲ دیکھو ص ۲۴ ف۹ و ص ۱۵ ف۶
[4] جیکس ریفرنس بک ص ۸۰۳
[5] وٹیکرس المنیک بابت سنہ ۱۹۲۰ع
[6] دیکھو ص ۱۵ ف۷ دیکھو ص ۲۳ ف۹ و صفحہ ۱۵ ف۵

نام سے پہلے "سر" اور بعد مین کے سی ایم جی (K.C.M.G.) لکھا جاتا ہے۔

درجہ سوم۔ کمپینین[1] آف دی آرڈر آف سینٹ میکائیل اینڈ سینٹ جارج مخفف سی ایم جی (C.M.G.) چونکہ خطاب یافتہ نایٹ نہین ہوتا اس لیے صرف نام کے بعد سی ایم جی (C.M.G.) لکھا جاتا ہے۔

خلعت[2]:۔

۱۔ گلوبند۔ طلائی جسمین بائیس کڑیان ہوتی ہین۔ چھ کڑیان تاج پوش انگلستانی شیر کی شکل کی آٹھ کڑیان مالٹائی صلیب کی شکل کی چار حروف ایس ایم (سینٹ میکائیل) کی شکل کے اور باقی چار حروف ایس جی (سینٹ جارج) کی شکل کے بیچ مین ایک قرص جس پر سینٹ مارک کے دو پردار شیر آمنے سامنے کھڑے ہوے۔ دونون کے ایک ہاتھ مین انجیل اور دوسری مین سات تیرون کا مٹھا۔

۲۔ تمغہ۔ طلائی صلیب چہاردہ گوشہ۔ ایک رُخ پر میکائیل فرشتے کی تصویر جو شیطان کو پیرون تلے روندتے ہین۔ دوسرے رُخ پر سینٹ جارج کی اسپ سوار تصویر جو دیو کے نیزہ مارتے ہین۔ صلیب پر تاج انگلستان۔

۳۔ ستارہ۔ سات شعاعین وسط مین سینٹ جارج کی سُرخ صلیب جسکے اوپر سینٹ میکائیل کی تصویر۔

۴۔ چوغہ۔ نیلی ساٹھن۔ قرمزی ریشمین استر۔ بائین طرف ستارہ کڑھا ہوا۔

بادشاہ وقت طبقے کا بادشاہ ہوتا ہے اُس کے ماتحت گرانڈ ماسٹر[3] جو آج کل پرنس آف ویلس ہین۔ طبقے کا پرلیٹ نوآبادیون مین سے کسی مقام کا بشپ ہوتا ہے۔

The Most Exalted Order of the Star of India عالی ترین طبقہ ستارہ ہند

ہندوستان کی خاطر جو دو طبقے خاص طور پر وضع کیے گئے ہین اُن مین پہلا طبقہ وہ ہے جو ۲۳ فروری ۱۸۶۱ء کو قایم ہوا[4]۔

---

[1] دیکھو صفحہ ۵۲ سلہ

[2] جیکس ریفرنس بک صفحہ ۸۰۳

[3] دیکھو ص ۴۳ سلہ و ص ۵۲ سلہ و ص ۵۴ سلہ

[4] جیکس ریفرنس بک ص ۸۰۳

خطاب[1] :-

درجہ اول۔ نایٹ گرانڈکمانڈر[2] آف دی آرڈر آف دی اسٹار آف انڈیا۔ مخفف جی۔سی ایس آئی (G.C.S.I)

نام سے پہلے "سر" اور بعد میں جی۔سی۔ایس۔آئی۔ (G.C.S.I) لکھا جاتا ہے۔

درجۂ دوم۔ نایٹ کمانڈر[3] آف دی آرڈر آف دی اسٹار آف انڈیا۔ مخفف کے۔سی ایس۔آئی (K.C.S.I)

نام سے پہلے "سر" اور بعد میں کے۔سی۔ایس۔آئی (K.C.S.I) لکھا جاتا ہے۔

درجہ سوم۔ کمپینین[4] آف دی آرڈر آف دی اسٹار آف انڈیا مخفف سی۔ایس۔آئی (C.S.I)

چونکہ خطاب یافتہ نایٹ نہیں ہوتا اس لیے صرف نام کے بعد سی۔ایس آئی (C.S.I) لکھا جاتا ہے۔

خلعت :-

۱۔ گلوبند۔ جس کی کڑیاں سُرخ و سفید گلاب اور نیلو فر کے پھول کی شکل کی ہوتی ہیں۔ وسط میں تاج انگلستان جسمیں تمغہ لٹکتا ہے۔

۲۔ تمغہ ۔ بادشاہ کی تاج دار تصویر اور سجع "آسمانی روشنی ہماری رہنما"

۳۔ ستارہ طلائی باوثق شعاعوں والا۔ جسکے اندر ایک پانچ شعاعوں والا ستارہ۔

۴۔ چوغہ۔ ہلکی نیلی ساٹھن کا جسمیں سفید ریشم کا استر۔ بائیں جانب ستارہ کڑھا ہوا۔

بادشاہ وقت طبقے کا بادشاہ اور دیسرائے ہند گرانڈ ماسٹر[5] ہوتا ہے۔

The Most Eminent Order of the Indian Empire رفیع ترین طبقۂ کشور ہند

یہ دوسرا طبقہ ہے جو اہل ہند اور واسطہ داران ہند کی قدر افزائی کی خاطر وضع اور یکم جنوری ۱۸۷۸ء کو قائم کیا گیا[6]۔

---

[1] جیکس ریفرنس بک ص ۸۰۳

[2] و [3] دیکھو ص ۴۳ ۳ وص ۵۱ ۳ وص ۵۴ ۴

[4] دیکھو ص ۲۵ ۱ وص ۵۵ ۱

[5] دیکھو ص ۴۳ ۱ وص ۲۵ ۳ وص ۴۵ ۳ وص ۵۵ ۱

[6] جیکس ریفرنس بک صفحہ ۸۰۳

خطاب[1]:-

درجہ اول نایٹ گرانڈ کمانڈر[2] آف دی آرڈر آف دی انڈین ایمپایر۔ مخفف جی۔سی۔آئی۔ ای (G.C.I.E.)

نام سے پہلے "سر" اور بعد میں جی۔سی آئی ای (G.C.I.E.) لکھا جاتا ہے۔

درجۂ دوم۔ نایٹ کمانڈر[3] آف دی آرڈر آف دی انڈین ایمپایر۔ مخفف کے۔سی۔آئی۔ای (K.C.I.E.)

نام سے پہلے "سر" اور بعد میں کے سی آئی ای (K.C.I.E.) لکھا جاتا ہے۔

درجہ سوم۔ کمپینین[4] آف دی آرڈر آف دی انڈین ایمپایر مخفف سی آئی ای (C.I.E.)

چونکہ خطاب یافتہ نایٹ نہیں ہوتا اس لیے صرف نام کے بعد سی آئی ای (C.I.E.) لکھا جاتا ہے

خلعت:-

۱۔ گلوبند۔ طلائی جس کی کڑیاں ہاتھی۔ مور۔ نیلوفر اور گلاب کے شکل کی ہوتی ہیں۔ وسط میں تاج انگلستان۔

۲۔ تمغہ۔ طلائی گلاب جسکے وسط میں بادشاہ کی تصویر۔

۳۔ ستارہ۔ پانچ طلائی اور پانچ نقرئی شعاعیں۔ وسط میں بادشاہ کی تصویر۔

۴۔ جوغہ۔ ارغوانی ساٹن۔ سپید ریشمی استر۔ بائیں جانب ستارہ کڑھا ہوا۔

بادشاہ وقت طبقے کا بادشاہ اور دوسرا سے ہند گرانڈ ماسٹر[5] ہوتا ہے۔

طبقۂ شاہی وکٹوریہ The Royal Victorian Order

یہ طبقہ ۲۱ اپریل ۱۸۹۶ء کو اُن اشخاص کی منزلت افزائی کے لیے قایم کیا گیا ہے جنھون نے بادشاہ وقت کی غیر معمولی یا مہتم بالشان یا ذاتی خدمات کی تقدیم کی ہے[6]۔

---

[1] دیکھو ص ۷۰ سلہ

[2] و [3] دیکھو ص ۴۲ سلہ و ص ۵۱ شہ و ص ۵۳ شہ و ص ۷۰ سلہ

[4] دیکھو ص ۲۰ سلہ و ص ۵۵ شہ و ص ۷۰ سلہ

[5] دیکھو ص ۳۴ شہ و ص ۵۲ شہ و ص ۵۴ سلہ و ص ۵۵ سلہ و ص ۷۰ شہ

[6] جیکس ریفرنس بک صفحہ ۲۰۸

خطاب[1] :-

درجۂ اول۔ نایٹ گرانڈ کراس[2] آف دی رایل وکٹورین آرڈر۔ مخفف جی سی وی او G.C.V.O.
نام سے پہلے "سر" اور بعد مین جی۔سی۔وی۔او (G.C.V.O.) لکھا جاتا ہے۔
درجہ دوم۔ نایٹ کمانڈر[3] آف دی رایل وکٹورین آرڈر۔ مخفف کے۔سی۔وی۔او (K.C.V.O.)
نام سے پہلے "سر" اور بعد مین کے۔سی۔وی۔او (K.C.V.O.) لکھا جاتا ہے۔
درجہ سوم۔ کمانڈر[4] آف دی رایل وکٹورین آرڈر۔ مخفف سی۔وی۔او (C.V.O.)
چونکہ خطاب یافتہ نایٹ نہین ہوتا اس لیے صرف نام کے بعد سی۔وی۔او (C.V.O.) لکھا جاتا ہے۔
درجۂ چہارم و پنجم۔ ممبر آف دی رایل وکٹورین آرڈر۔ مخفف ایم وی او (M.V.O.)
صرف نام کے بعد ایم وی او (M.V.O.) لکھا جاتا ہے۔

خلعت[5] :-

۱۔ تمغہ۔ سفید چینی شدہ ہشت گوشہ مالٹائی صلیب۔ وسط مین قرمزی بیضاوی حلقہ جس مین بادشاہ کا نام سنہرا لکھا ہوا۔ اوپر شاہی تاج فیتے کے ساتھ سینے کے داہنے جانب لٹکایا جاتا ہے۔
۲۔ ستارہ۔ نقرئی ہشت گوشہ یعنی دوہری صلیب۔
بادشاہ وقت طبقے کا بادشاہ ہوتا ہے۔

The Most Excellent Order of the British Empire
خوب ترین طبقۂ کشور برطانیہ

نایٹی کا یہ جدید ترین طبقہ ہے جسے بادشاہ حال نے ۱۹۱۷ء مین اُن متوسلین و متوسلات سلطنت کی افزایش جاہ و مرتبت کے لیے قائم کیا جنھون نے برطانیہ یا مقبوضات برطانیہ کے اندر خدمات جلیلہ انجام دی ہین۔ اس طبقے مین ذکور و اُناث دونون کے لیے خطاب بخشی کا اہتمام ہے[6]۔

---

[1] جیکس ریفرنس بک ص ۸۰۳
[2] دیکھو ص ۱۵ و ص ۴۵
[3] و [4] دیکھو ص ۲۴ و ص ۱۵ و ص ۴۵ و ص ۶۵ و ص ۲۹۲ و ص ۸۵
[5] جیکس ریفرنس بک ص ۸۰۳
[6] جیکس ریفرنس بک ص ۸۰۳

خطاب[۱] :-

درجۂ اول { برائے ذکور ۔ نایٹ گرانڈ کراس آف دی آرڈر آف دی برٹش امپایر / برائے اناث ۔ ڈیم گرانڈ کراس آف دی آرڈر آف دی برٹش امپایر } مخفف ۔ جی ۔ بی ۔ ای (G. B. E.)

نام سے پہلے "سر" یا "ڈیم"[۲] اور بعد میں جی ۔ بی ۔ ای (G. B. E.) لکھا جاتا ہے۔

درجۂ دوم { برائے ذکور ۔ نایٹ کمانڈر آف دی آرڈر آف دی برٹش امپایر مخفف کے بی ای (K. B. E.) / برائے اناث ۔ ڈیم کمانڈر آف دی آرڈر آف دی برٹش امپایر مخفف ڈی ۔ بی ۔ ای (D. B. E.) }

نام سے پہلے "سر" یا "ڈیم" اور بعد میں کے ۔ بی ۔ ای یا ڈی ۔ بی ۔ ای لکھا جاتا ہے۔

درجۂ سوم ۔ برائے ذکور و اناث ۔ کمانڈر آف دی آرڈر آف دی برٹش امپایر ۔ مخفف سی ۔ بی ای (C. B. E.)

چونکہ خطاب یافتہ نایٹ یا ڈیم نہیں ہوتا اس لیے صرف نام کے بعد سی بی ای (C. B. E.) لکھا جاتا ہے۔

درجۂ چہارم ۔ برائے ذکور و اناث ۔ آفیسر آف دی آرڈر آف دی برٹش ایمپائر ۔ مخفف او ۔ بی ۔ ای (O. B. E.)

صرف نام کے بعد او ۔ بی ۔ ای (O. B. E.) لکھا جاتا ہے۔

درجۂ پنجم ۔ برائے ذکور و اناث ۔ ممبر آف دی آرڈر آف دی برٹش امپایر ۔ مخفف ایم ۔ بی ۔ ای (M. B. E.)

صرف نام کے بعد ایم ۔ بی ۔ ای (M. B. E.) لکھا جاتا ہے۔

خلعت :-

۱ ۔ تمغہ ۔ نقرئی صلیب ۔ وسط میں قرمزی حلقہ جس میں برطانیہ کی تا عدِ تصویر اور سجع "اللہ اور حکومت کے لیے"۔

---

[۱] جیکس ریفرنس بک صفحہ ۲۰۸

[۲] و [۳] دیکھو ص ۵۱ [۳] و ص ۵۴ [۴] و ص ۵۹ [۵]

[۳] ڈال کو بالکسر پڑھنا چاہیے ۔ بالفتح پڑھتے ہی خطاب کی تاثیر فوراً الٹ جائے گی۔

[۴] و [۵] دیکھو ص ۴۴ [۶] و ص ۵۱ [۷] و ص ۵۴ [۸] و ص ۵۷ [۹] و ص ۵۸ [۱۰] و ص ۵۹ [۱۱]

[۶] جیکس ریفرنس بک صفحہ ۲۰۸

۲۔ستارہ۔جو درجہ اول و دوم ہی کو دیا جاتا ہی۔ نقرئی ہشت گوشہ یعنی دوہری صلیب۔ بادشاہ وقت طبقے کا بادشاہ ہوتا ہی۔

Knights Bachelor　مجرّد نایٹ

یہ وہ نایٹ ہین جو متذکرۂ بالا طبقون مین سے کسی کے تحت مین نہین آتے اگرچہ سب سے نیچے ہین جہان تک ہمین معلوم ہوسکا مجرّد نایٹ کے سوا نہ ان کا کوئی لمبا چوڑا خطاب ہی نہ طبقہ نہ خلعت ہی نہ تمغہ۔ انگریزی حروف ابجد کے وہ پھول بھی جو خطاب یافتہ نام کو "گلستان در بغل" بناتے ہین اس بوم شورہ زار مین نہین کھلتے۔ شاید اسی لیے ان لوگون کا نام نائٹ بیچلر ہی یعنی یہ نایٹی کے پورے درجے پر فائز نہین ہین۔ پھر بھی ہمارے بہت سے برادران ملک و ملت انھیں ادھوری عزت ہی کو لاکھون کھو کر پاتے ہین۔ ہندوستان کے خطابی سرون کی مکمل فہرست دیکھو اور نہ صرف سرسری طور سے بلکہ غور سے پڑھو تب ظاہر ہو کہ ان مین کتنے خالی "سر" ہین اور تب ہی یہ واضح ہو کہ بہت سے ہندوستانی جن مین بڑی ناک والے رؤسا بھی ہین اور اونچی کرسی والے حکام بھی، بھولی گون والے وکلا بھی ہین اور بھاری جیب والے تجار بھی، اسی زنجیر کی کڑیان اور اسی ہار کی لڑیان ہین جو انگلستانی بُت تراشون اور تصویر ساز و نقالون اور ارغن نوازون کے ساتھ مسلسل و منسلک کر دیے گئے ہین یقین نہ ہو تو نمونۃً ان مین سے یہ چند دانے حاضر ہین:۔

پیشہ	نام		
بُت تراش سنگ تراش۔	سر جارج فریمپٹن۔	بُت تراش و سنگ تراش	نائٹ بیچلر
مُصوّر۔	سر جان لیوری۔	مُصوّر	"
	سر ایڈورن لٹینس۔	مصوّر و بُت تراش	"
	سر ڈیوڈ مرے۔	مُصوّر	"
	سر ولیم تھارنی کرافٹ۔	بُت تراش و سنگ تراش	"
باجے بجانیوالے دُھن قایم کرنیوالے۔ گانا سکھانیوالے	سر اے سی میکنزی۔	معلم و مرتب نغمہ	نائٹ بیچلر
	سر فریڈرک برج۔	ارغن نواز ویسٹ منسٹر ابی	"

۵ نیو پاپولر انسائیکلوپیڈیا جلد اول ص ۴۳۳ و ۴۳۵

	سر سی وی اسٹینفورڈ۔ معلم نغمہ	نایٹ بیچلر
	سر ایڈورڈ ایلگر۔ معلم و مرتب نغمہ	"
	سر ہنری جے ووڈ۔ معلم نغمہ	"
ناٹک میں حصہ لینے والے اور ڈراما لکھنے والے	سر اسکوایر بینکرافٹ۔ لندن کا بہترین ایکٹر	نایٹ بیچلر
	سر ہنری آرونسن۔ مشہور و معروف ایکٹر	"
	سر جان ہیر لندن کے نامی تھیٹروں کا مشہور ایکٹر و ڈراما نویس	"
	سر آرتھر پنیرو۔ مشہور ایکٹر و ڈراما نویس	"
	سر جانسٹن فوربس رابرٹسن نامی ایکٹر	"

بڑے خطابوں یعنی نایٹی کے دسوں طبقوں کی تفصیل تو پیش کی جا چکی، اب چند چھوٹے چھوٹے امتیازی خطابات کی فہرست درج کی جاتی ہے:۔

خطاب	مخفف	تاریخ قیام	اہلیت و وجہ حصول	تمغہ
ڈسٹنگوئشڈ سروس آرڈر The distinguished Service order	ڈی ایس او D.S.O.	۶ ستمبر ۱۸۸۶ء	عہدہ داران افواج بری و بحری کو جنکا تذکرہ مراسلت فوجی میں ہو چکا ہو بجلدوی خدمات جلیلہ	طلائی صلیب جس کے ایک رخ پر تاج انگلستان اور دوسرے رخ پر بادشاہ وقت کے نام کے حروف۔ تمغہ قلب پر لٹکایا جاتا ہے۔
امپیریل سروس آرڈر The Imperial Service order	آئی ایس او I.S.O.	۲۶ جون سنہ ۱۹۰۲ء	عہدہ داران دیوانی کو بجلدوی قدامت و دجلالت خدمات	طلائی قرص جس کے ایک طرف "بادشاہ و شہنشاہ" اور دوسری طرف بجلدوی "خدمات وفادارانہ" اور پر تاج انگلستان۔ تمغہ قلب پر لٹکایا جاتا ہے۔
آرڈر آف مرسی Order of mercy	او۔ مر O. Mer	سنہ ۱۸۹۷ء	بجلدوی رفع مصائب و تکالیف عامہ	طلائی سرخ صلیب جس پر تاج انگلستان اور پرنس آف ویلس کی کلغی وسط میں فضا و بر
آرڈر آف میرٹ Order of merit	او۔ ایم O. M.	۲۶ جون ۱۹۰۲ء	اشخاص جلیل القدر کو بجلدوی خدمات حربی و علمی و ادبی	ہشت گوشہ سرخ صلیب جس کے ایک رخ پر بجلدوی قابلیت اور دوسری طرف بادشاہ و شہنشاہ اور تاج انگلستان۔

کمپینین آف آنر Companion of Honour	سی ایچ C. H	سنہ ۱۹۱۷ء		
وکٹوریہ کراس Victoria Cross	دی سی V. C.	۲۹ جنوری سنہ ۱۸۵۶ء	عہدہ داران فوجی کو بجلدوے شجاعت	برنجی صلیب۔ جسکے وسط مین تاج انگلستان اور اُس پر قائم شیر۔ یہ صلیب قلب پر لٹکائی جاتی ہے۔
رایل ریڈ کراس Royal Red Cross	آر آر سی R. R. C.	۲۳ اپریل سنہ ۱۸۸۳ء	طبقہ اُناث کو بجلدوے تیمارداری سپاہیان مریض و مجروح	طلائی سُرخ صلیب۔ جسکے ایک گوشے پر ایمان۔ دوسرے پر امید تیسرے پر امداد چوتھے پر سنہ ۱۸۸۳ء۔ وسط مین ملکہ وکٹوریہ کی تصویر۔ صلیب قلب پر لٹکائی جاتی ہے۔
ملٹری کراس Military Cross	ایم سی M. C.	یکم جنوری سنہ ۱۹۱۵ء	ادنیٰ عہدہ داران فوج کو بجلدوے خدمات جلیلہ	نقرئی صلیب جسکے ہر گوشے پر تاج انگلستان وسط مین جارج شاہ و شہنشاہ"

خان بہادر

ولایتی طبقے اور خطاب تو سب ختم ہو چکے۔ کنٹری خطابوں مین ہم صرف خان بہادر کا تذکرہ کرنا چاہتے ہین۔ اگرچہ یہ اس قابل تو نہ تھا کہ کے۔ جی اور جی۔ سی۔ بی اور جی۔ سی۔ ایس۔ آئی کے پہلو مین جگہ پاتا لیکن اس کو کیا کیجیے کہ لکھو کھا جاہ پرست ہستیون کے زعم مین کاخ رفعت کا یہی سنگ بنیاد اور نخل عزت کا یہی ثمر بیش رس ہے۔ ہم اپنے تشنگان تمغہ اور گرسنگان خطاب دوستون کو مایوس کرنا نہین چاہتے لہذا کمخواب مین کمل کا پیوند لگانا پڑتا ہے۔

خان بہادر کی وقعت کا اندازہ اگر گز دل سے کرنا چاہو تو خیال کی آنکھ پر تصور کی دوربین لگا کر دیکھو۔ ایک وسیع میدان مین ہز مجسٹی شہنشاہ جارج پنجم کا دربار منعقد ہے۔ بارگاہ شاہی کے بائین سمت سے ایک لمبی قطار شروع ہوتی ہے جسمین ہز رایل ہائی نس پرنس آف ویلس بہادر کے تخت کے بعد شاہزادگان والا منزلت سفراے دول خارجہ اور اعلیٰ اراکین حکومت چوکیون پر بیٹھے ہین۔ اُن کے بعد برطانیہ عظمیٰ و آئرلینڈ کے ڈیوک اور مارکوئیس اور ارل اور ویکاونٹ اور بشپ اور بیرن اور بیرونٹ مع اپنے اپنے فرزندون کے

اپنے اپنے درجے کے مطابق اور اُن کے بعد کل طبقون کے نایٹ مع اپنے اپنے فرزندون کے اپنے اپنے رتبے کے موافق کرسیون پر بیٹھے ہین۔ اُن کے بعد نایٹس کے کل طبقون کے غیر نایٹ اراکین اور اُن کے بعد ہندوستان کے اضی نہین بلکہ عرضی راجے مہاراجے۔ نواب سب تپائیون پر بیٹھے ہین اور قطار کی لمبائی ہزار ہا گز تک پہونچ چکی ہو۔ اب کہین جا کر بیچارے خان بہادر گروہ کے کھڑے ہونے کا نمبر آتا ہو بشرطیکہ وہ ایسے دربار مین شامل بھی کیا جائے۔ اور بشرطیکہ کوئی اُس سے زیادہ حقدار اُس سے پہلے نہ کھڑا ہو جائے۔ قطار کی لمبائی دیکھتے ہوے ہمین یقین ہو کہ خان بہادر کو بادشاہ سے اُس سے زیادہ بُعد و فصل ہو جتنا اُسے خالق سے ہو۔

خان بہادر کو سینے پر لٹکانے کو ایک طلائی تمغہ اور نام کے ساتھ لگانے کو دو نقطے[1] ملتے ہین بس فقط تمغہ ستارے کی شکل کا ہوتا ہو جسمین دو متحد المرکز چھوٹے بڑے دایرے اور بیچ مین بادشاہ کی تاج دار تصویر ہوتی ہو۔ دونون دایرون کے فصل مین الفاظ "خان بہادر" انگریزی مین لکھے ہوتے ہین ستارے کے سر پر تاج انگلستان ہوتا ہو۔

تاجِ انگلستان

مختلف طبقون کے گلوبندون۔ تمغون اور ستارون کی ترکیب و تشکیل مین تاج انگلستان کو اس قدر دخل ہو کہ اُس کی تشریح نہ کرنے سے مبحث کے تشنہ رہ جانے کا خوف ہو۔

تاج انگلستان جسے ولیم فاتح نے ۱۰۶۶ء مین زیب سر کیا تھا سونے کا ایک سادہ حلقہ تھا جسپر پتیان بنی ہوئی تھین۔ جب سے اب تک اُسمین بہت سی تبدیلیان ہو چکی ہین۔

فی زماننا وہ سونے کا ایک چوڑا حلقہ ہو جسکے دَور پر جا بجا موتی اور جواہرات قرینے سے جڑے ہوے ہین۔ حلقے کے بالائی لب پر چار بالتائی صلیبین اور چار شہ برگے یکے بعد دیگرے کنگرون کی طرح اوپر کو اُٹھے ہوے ہین۔ ہر صلیب کے اوپر سے مقابل صلیب کے اوپر تک ایک طلائی قوس ہو جسپر موتی جڑے یا بنے ہین۔ دونون قوس سر پر تقاطع کرتے ہین۔ مقام تقاطع پر کلغی کی جگہ ایک صلیب کا مجسمہ ہو۔

---

[1] یہ لفظ بسا اوقات مخفف ہوکر دو حرف ہی رہ جاتے ہین یعنی K. B. خ۔ ب۔ اگر اُردو کے ان دو حرفون کو بے معنی رکھنا ہو تو اختیار ہو علحدہ علحدہ رہنے دو لیکن یہ دونون حرف باہم مل کر ایک بامعنی لفظ بھی بناتے ہین معنی کے لیے عربی کے کسی طالب علم یا عربی کے لغت سے مدد لو۔

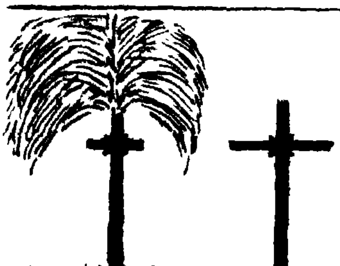
یہ معلوم نہ ہو سکا کہ کلغی والی صلیب چو رُخی ہی یا یک رُخی۔ اگر چو رُخی ہی تب تو ایک تاج کی ذرا سی تصویر آٹھ صلیبون کا مجموعہ ہو گئی لیکن اگر صرف ایک ہی رُخ صلیب کی شکل کا ہی تو ہر تاج مین کم سے کم پانچ صلیبون کے ہونے مین تو شک ہی نہین۔

صلیب

خطابون کے متعلق اتنے سفید صفحے سیاہ ہو چکے لیکن ابھی اُس چیز کا تذکرہ باقی ہی جو تمغون کی جان اور خطابون کی شان ہونے کی وجہ سے "سبب تالیف کتاب" کہی جاے تو بیجا نہ ہو گا لہذا نگاہ کو جہان اتنی تکلیف دی ہی تھوڑی تکلیف اور دو۔

عیسائی کہتے ہین کہ جب یہود حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی تعلیم سے آتش زیر پا ہوے تو یہودی

"سردار کاہنون اور قوم کے بزرگون نے یسوعؑ کے خلاف مشورہ کیا کہ اُسے مار ڈالین اور اُسے باندھ کر (متی ۲۷ باب ۱ اور ۲) قلعے کو لے گئے (یوحنا ۱۸ باب ۲۸) اور پیلاطس حاکم کے حوالے کیا (متی ۲۷ باب ۲) پیلاطس نے ..... یسوعؑ کو کوڑے لگوا کر (مرقس ۱۵ باب ۱۵) سپاہیون کے حوالے کیا (لوقا ۲۳ باب ۲۵) تاکہ صلیب[1] دی جاے (متی ۲۷ باب ۲۶) پس وہ یسوعؑ کو لے گئے اور وہ اپنی صلیب آپ اُٹھاے ہوے اُس جگہ تک باہر گیا جو کھوپڑی کی جگہ کہلاتی ہی جس کا ترجمہ عبرانی مین گلگوتھا ہی (یوحنا ۱۹ باب ۱۷) پہر دن چڑھا تھا جب اُنھون نے اُس کو صلیب پر چڑھایا (مرقس ۱۵ باب ۲۵) تیسرے پہر کے قریب یسوعؑ نے بڑی آواز سے چلا کر کہا۔ ایلی۔ ایلی لما سبقتنی یعنی اے میرے خدا۔ اے میرے خدا تو نے مجھے کیون چھوڑ دیا...... یسوعؑ پھر بڑی آواز سے چلایا (متی ۲۷ باب ۴۶ و ۵۰) کہ تمام ہوا اور سر جھکا کر جان دے دی۔ (یوحنا ۱۹ باب ۳۰)"



[1] زمانہ قدیم مین جب کسی شدید و قبیح جُرم مین کسی کی جان لینی ہوتی تو اُسے صلیب پر چڑھا کر مارتے تھے۔ یہ ہزاروں برس مین عام تھی ایک موٹی سی لکڑی زمین مین گاڑ کر اُس پر (یا کسی سیدھے درخت کے تنے پر) ایک دوسری کسی قدر پتلی اور چپٹی لکڑی زمین سے دو قد آدم اونچی باندھ یا جڑ دی جاتی۔ یہی صلیب تھی۔ مرنے والے کے جسم کو کھڑی لکڑی سے اور اُس کے ہاتھون کی کلائیون کو آڑی لکڑی کے سرون سے کس کر باندھتے اور ہاتھون کی ہتھیلیون اور پاؤن مین لوہے کی لمبی لمبی کیلین ٹھونک دیتے۔ مصلوب سخت جان ہوتا تو برچھیان بھونک بھونک کر مارتے۔ ایسی تصویرین اور بُت جنمین مسیح صلیب پر چڑھے دکھلاے جاتے ہین تیسری صدی عیسوی ہی سے بنائے جانے شروع ہو گئے تھے جن کا رواج رومن کیتھولک گرجون مین آج تک ہی۔ اِن تصویرون اور بتون مین مسیح صلیب پر مردہ لٹکے ہوے تمام جسم برہنہ صرف کمر پر ذرا سا کپڑا لپٹا ہوا اور دو کیلین دونون ہاتھون کی ہتھیلیون مین اور ایک دونون پاؤن مین (جو ایک دوسرے پر رکھے ہوتے ہین) ٹھونکی ہوئی پہلو مین

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے قتل کیے جانے کی شہادت تم نے متی، مرقس، لوقا، اور یوحنا کے الفاظ میں سُن لی (ذالک قولهم بافواههم) مگر اس کے خلاف ہمارے ہاتھ میں اتنی صاف صحیح اور زبردست شہادت ہے (والحمد لله علی ذالک) جس سے بڑھ کر صاف صحیح اور زبردست شہادت اِس کرۂ ارض پر تو کیا کرۂ اثیر کے کسی سیارے میں بھی نہیں اور اُس شہادت کی بنا پر ہمارا ایمان ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نہ قتل کیے گئے نہ صلیب دیے گئے۔

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۶۴)

زخم جس سے خون جاری ہے بنائے جاتے ہیں،"

"صلیب کو ابتدائی عیسائیوں ہی نے اپنا نشان قرار دے لیا تھا قسطنطین (شہنشاہ روم ۳۰۶ء تا ۳۳۷ء) کے زمانے سے اسے معزز ترین نشان مسیحیت سمجھنے لگے قسطنطین ہی نے اُسے اپنے پرچم پر منقوش کرایا اُس نے ہر عیسائی کے مکان کے دروازے پر صلیب بنوائی تاکہ یہودی اور عیسائی مکان میں تمیز ہو سکے اُسی کے زمانے میں گرجے صلیب کی وضع پر تعمیر ہوئے۔ اس کی ماں ہیلنا کو فلسطین میں وہ اصلی صلیب ملی جس پر مسیح مصلوب ہوئے تھے۔ اصلی صلیب کی تعظیم و تکریم و تقدیس کے متعلق عیسائیوں میں عجیب عجیب روایات مشہور ہیں۔ یوروشلم سے کوئی دو میل جانب غرب ایک گرجا ہے جسے کنیسۂ صلیب کہتے ہیں۔ مشہور ہے کہ یہ گرجا ٹھیک اُس درخت کی جڑ پر بنایا گیا ہے جس سے اصلی صلیب بنائی گئی تھی۔ اس گرجے کے اندر دیواروں پر عبارات و تصاویر کے ذریعہ سے یہ قصہ ظاہر کیا گیا ہے: "لوط (علیہ السلام) جب شہر سدوم سے بھاگ کر آئے تو اپنے ساتھ ایک شاخ یا جڑ لائے جسے اُنھوں نے یہاں نصب کیا اور وہ سرسبز ہو گئی۔ ابراہیم (علیہ السلام) کو علم تھا کہ اس درخت کی لکڑی سے وہ صلیب بنائی جانے والی ہے جو دنیا کی نجات ابدی کا باعث ہو گی۔ لہذا وہ اسے روزانہ پانی دیا کرتے تھے مگر شیطان (جو چاہتا تھا کہ مشیت الٰہی پوری نہ ہو اور انسانوں کو نجات ابدی حاصل نہ ہو) ابراہیم (علیہ السلام) کی غیر حاضری میں درخت کو کاٹ پھینکنے کی کوشش میں لگا رہتا تھا۔ جب وہ کلہاڑی لے کر درخت کاٹنا چاہتا معاً ابراہیم (علیہ السلام) اپنے علم کے ذریعے سے واقف ہو کر وہاں آجاتے اور اُسے ار بھگاتے۔" اصلی صلیب کی یہ بھی کرامت سمجھی جاتی تھی کہ اُس میں سے بے تعداد ٹکڑے کاٹ لیے جائیں تب بھی اُس کی اصلی جسامت میں کمی نہیں ہوتی اور وہ اُتنی کی اُتنی ہی رہتی۔ اسی لیے ہر گرجے والے کو دعویٰ تھا کہ اُس کے گرجے کے تبرکات میں اصلی صلیب کا ٹکڑا ہے چنانچہ ہزار ہا حاجتمند وہاں جا جا کر مرادیں مانگتے تھے۔ کروڑہا عیسائیوں کا یقین ہے کہ جسم پر یا ہوا میں صلیب کی شکل بنا دینے سے انسان خبیث ارواح و اثرات سے محفوظ رہتا ہے۔ رومن کیتھولک عیسائی عبادت کرتے وقت صلیب کی شکل بار بار ہوا میں بناتے جاتے ہیں صلیب کو چومتے ہیں۔ اُسکے سامنے سر جھکاتے ہیں۔ بپتسمہ دیتے وقت بپتسمہ یاب کی پیشانی پر نشان صلیب زمانۂ قدیم سے بنایا جاتا ہے جس کا سبب ایک قدیم مصنف یہ لکھتا ہے کہ "گوشت پر مُہر لگائی جاتی ہے تاکہ روح محفوظ رہے" یہی مصنف لکھتا ہے: "ہر کام کے آغاز سے پہلے۔ ہم جب کسی مکان میں آئیں یا وہاں سے جائیں، جب سفر کے لیے کپڑے پہنیں۔ جب غسل کرنے جائیں جب کھانا کھانے بیٹھیں جب مکان میں شمعیں لائی جائیں جب بیٹھیں یا لیٹیں غرضکہ جو کام ہم کریں پہلے صلیب کا نشان اپنی پیشانی پر بنا لیتے ہیں۔"

اُس وقت جزیرۃ العرب مین اور نہ جزیرۃ العرب مین بلکہ خود مدینہ طیبہ ہی مین یہودی بھی بہ کثرت موجود تھے اور عیسائی بھی۔ یہودی نہایت مغرورانہ تفخر سے کہتے تھے کہ ہم نے مسیح ناصری کو جس نے خدا کے بنی اور بنی اسرائیل کے بادشاہ ہونے کا دعوی کیا تھا صلیب پر چڑھا کر مارڈالا۔ عیسائی اُسی قدر مظلومانہ تفاخر سے کہتے تھے کہ ان یہودیون نے زندہ خدا کے بیٹے مسیح (متی پ ۱۶) اور اسرائیل کے بادشاہ (یوحنا پ ۴۹) کو صلیب دے دی۔ قرآن کریم نے دونون کی موجودگی مین برملا اور علی الاعلان اپنے صاف اور صریح اسلوب مین اس واقعہ کی ایسی تردید و تبکیت کی کہ کسی کو جواب مین لب ہلانے کی ہمت و جرات ہی نہ ہوسکی۔

وقولھم انا قتلنا المسیح عیسی ابن مریم رسول اللہ وما قتلوہ وما صلبوہ ولکن شبہ لھم وان الذین اختلفوا فیہ لفی شک منہ ما لھم بہ من علم الا اتباع الظن وما قتلوہ یقینا بل رفعہ اللہ الیہ وکان اللہ عزیزا حکیما ○ (سورہ نساء ۲۲)

اب تم سمجھ سکتے ہو کہ جب قصہ قتل بذریعہ صلیب ہی صحیح نہین تو پھر صلیب کی تعظیم و تکریم و تقدیس کیسی؟ یہی وجہ تھی کہ حضور نبی کریم علیہ الصلوۃ والتسلیم اپنے یہان جس چیز پر صلیب کی تصویر بنی ہوئی ملاحظہ فرماتے اُسے فوراً مٹا دیتے۔

ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کان لا یترک فی بیتہ شیئا فیہ صلیب الا نقضہ

حضرت عدی بن حاتم جب حاضر خدمت ہوے تو پہلے چونکہ وہ عیسائی تھے لہذا اُن کے گلے مین حاضری کے وقت صلیب پڑی تھی حضور نے فرمایا "اے عدی اس بت کو اپنے گلے سے اتار پھینکو" عدی نے عرض کیا یا رسول اللہ یہ عیسائیون کی صلیب کی تمثال ہے۔ اسپر حضور نے فرمایا۔ یہ بت ہی ہے۔

خطاب والون سے خطاب

بزرگو۔ بھائیو۔ عزیزو۔

خطابون اور تمغون کے متعلق تم وہ سب باتین سُن چکے جو ہمین معلوم تھین یا معلوم ہوسکین۔ خطابون کی ابتدائی و ارتقائی تاریخی حالت اُن کی ماہیت۔ اُن کی غایت۔ اُن کے تمغون اور ستارون کی شکل و صورت۔ اُن مین صلیبون اور تصویرون کی کثرت۔ صلیب کی عبادت۔ قصہ صلیب کے خلاف خدا کے

علیم وخبیر کی شہادت۔ اور تمثال صلیب سے رسولِ بشیر ونذیر کی نفرت۔ یہ سب باتین بے کم وکاست تمھارے سامنے اتمام حجت کے طور پر پیش کی جاچکین۔ اب تم اپنے دلون کو ٹٹولو کہ اُن مین اللہ، اللہ کے رسول، اور اللہ کے دین کی محبت ہے یا ان خطابون۔ تمغون اور گلوبندون کی۔ کیا تم یہ جواب دوگے کہ تمھارے دل کے تنگ گوشہ مین دونون محبتین جمع ہین؟ مگر تمھارا یہ جواب صحیح نہ ہوگا کیونکہ ایک ہی وقت مین ایک ہی جگہ ظلمات ونور اور ظل وحرور جمع نہیں ہوسکتے۔ اچھا پھر کیا یہ جواب دوگے کہ تمھارے سینے مین ایک کی جگہ دو دل ہین؟ لیکن مین تم سے کہتا ہون کہ یہ بھی صحیح نہ ہوگا کیونکہ

ما جعل اللہ لرجل من قلبین فی جوفہ　(اتل ما اوحی۔ سورہ احزاب)

لہذا اب مذبذبین بین ذالک بننے کا وقت نہیں۔ لازم ہے کہ یا تو اللہ۔ اللہ کے رسول اور اللہ کے دین کی نسبت سے اپنے دل قطعاً خالی کردو یا خطابون سے اپنے نام۔ گلوبندون سے اپنے گلے اور تمغون سے اپنے سینے۔

مسلمانو۔ کیا تم اپنے خطابون کو خطاب دہندون کی دی ہوئی عزت سمجھ کر رکھتے ہو؟

ایبتغون عندھم العزۃ فان العزۃ للہ جمیعا (والمحصنٰت۔ سورہ نساء)

پھر کیا تم اپنے خطابون کو ان کی رضامندی کے لیے رکھتے ہو؟

اللہ ورسولہ احق ان یرضوہ　(واعلموا۔ سورہ توبہ)

یا کیا تم اپنے خطابون کو اُن کے ڈر سے رکھتے ہو؟

اتخشونھم فاللہ احق ان تخشوہ　(واعلموا۔ سورہ توبہ)

اگر ان سب باتون کو سننے اور سمجھنے کے بعد بھی تم جو مسلمان باپون کے بیٹے اور مسلمان بیٹون کے باپ ہو

صلیبون کے ہار گلے مین ڈال کر

صلیبون کے تمغے اور ستارے قلب پر لگا کر

اور صلیبون کے چوغے جسم پر پہن کر

فی اعناقھم اغلالا فھی الی الاذقان فھم مقمحون　(ومن یقنت۔ سورہ یٰس)

وطبع علی قلوبھم فھم لا یفقھون　(واعلموا۔ سورہ توبہ)

اور　قطعت لھم ثیاب من نار　(اقترب للناس۔ سورہ حج)

مین ہم اور ہم کی دوہری ضمیر دون کا مرجع اپنے آپ کو بنانا ہی چاہتے ہو تو

انا للہ وانا الیہ راجعون

فترّبصوا انّا معکم مترّبصون

(واعلموا سورہ توبہ)

"ملاّ"

مضمون بالا اُس زمانہ مین رقم کیا گیا تھا جبکہ تحریک ترک موالات کل اہل ملک کی توجہ کا مرکز بنی ہوئی تھی اور خطاب یافتہ ہندوستانیون مین ترک خطاب کی تبلیغ جاری تھی۔ مُلّا صاحب نے اپنے ولولۂ دینی مین مضمون تو حسب عادت بڑی تحقیق و تلاش کے بعد لکھ ڈالا مگر گمنامی کی خواہش یا صدر جہ کے انکسار کے باعث یا بعض شکی مزاجون کے نزدیک سرکاری مہمان بنائے جانیکے اندیشہ سے اُس زمانہ مین اُس کی اشاعت کی نوبت نہ آئی۔ اب جو یہ مضمون شایع کیا جارہا ہو تو اس کی غایت تبلیغ نہین ہو کیونکہ تحریک کی موجودہ سربازاری مین ایسے خیالات مضحکہ انگیز سمجھے جاتے ہین۔ بلکہ مین اسے ضروری جانتا ہون کہ مُلّا صاحب کی محنت رائگان نہ جائے اور ادب اُردو اُن کی اس قیمتی تحریر سے محروم نہ رہے۔ اسی خیال سے مین نے اس مضمون کو علٰحدہ رسالہ کی صورت مین طبع کرالیا ہو تاکہ وہ قدردانان اُردو بھی اس سے لطف اندوز ہو سکین جن کے آستانۂ عالی تک الناظر کی رسائی نہین ہو اور اگر کوئی شخص یا جماعت آج بھی بھولے سے تبلیغ تحریک کا کام انجام دے رہی ہو اور کوشان ہو کہ لوگ خصوصاً مسلمان خطاب یافتہ اپنے اعزازات صلیبی سے دستکش ہو جائین تو اُن کے لیے یقیناً موقع ہو کہ اس رسالہ کی جسقدر کاپیان چاہین ۲ر فی جلد کے حساب سے الناظر بک ایجنسی لکھنؤ سے طلب کر لین۔

اڈیٹر

ضرورت بعثت نبی عرب (صلی اللہ علیہ وسلم)

مین یہ مناسب سمجھتا ہون کہ اپنے رہبر مطلق ہادی برحق شافع اُمت محمد مصطفےٰ احمد مجتبےٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت مسعود کی ضرورت پر اپنے ٹوٹے پھوٹے الفاظ مین روشنی ڈالنے سے پہلے نزول محمود سے پہلے کے حالات عرب اور اُن کی تقسیم۔ اُن کا مذہب اور اُن کے طرز تمدن و معاشرت کا مختصر سا خاکہ کھینچ دون تاکہ اُس ذات دالاصفات کے بعثت کی ضرورت خود بخود واضح اور صاف طور پر ذہن مین آجاوے۔

تحقیق سے یہ ثابت ہوا ہے کہ خطۂ عرب ابتدا مین تین بڑے گروہونکے مختلف اور لاتعداد قبیلون مین بٹ گیا تھا اور وہ تین گروہ یہ ہین۔ عرب العاربہ۔ عرب البادیہ۔ عرب المستعاربہ۔ ان تینون کا سلسلہ حضرت نوح کی تین اولادون سے شروع ہوتا ہے۔ عرب العاربہ۔ قدیم جغرافیہ عرب کی رو سے یمن حضر موت اور شمال مشرقی سواحل عرب مین پھیلے ہوے تھے۔ عرب البادیہ وسط عرب اور سرزمین حجاز مین اقامت گزین تھے۔ عرب المستعاربہ جن کو بنی اسمٰعیلیہ بھی کہتے ہین عراق کے متوطن تھے اور بعد مین یہ حجاز مین آبسے۔ اور صفا اور مروہ ان دونون پہاڑون کے درمیان سکونت اختیار کی۔

مذاہب عرب العاربہ جو جنوبی اور شمال مشرقی سواحل مین پھیلے ہوے تھے۔ متمدن اور شایستہ تھے انھون نے یہان سلطنتین بھی قائم کر لی تھین اور تجارت بسر اوقات کا ذریعہ تھا۔ ان مین عموماً چار مذہب پائے جاتے تھے۔ بت پرستی۔ ستارہ پرستی۔ نصرانیت اور یہودیت۔ عرب البادیہ اور عرب المستعاربہ عموماً بت پرست تھے۔ مگر بعض صابئی مذہب بھی تھے۔ لیکن ان مختلف مذہبون کے ماننے سے اُن کی جبلی عادتین اور اُن کے اجدادی اعتقادات مین بہت کم تغیر ہوا تھا۔

بت پرستی بت پرستی جو ایک نہایت قدیم مذہب ہے۔ تمام جزیرۂ عرب مین یکسان رائج تھی۔ نصاریٰ اور ستارہ پرست بھی اپنے اپنے اعتقاد کے موافق اپنے تجویز کردہ بتون کو پوجتے تھے۔ اور کعبہ مین جو بت پرستی کا مرکز اعلیٰ تھا۔ ہر قبیلہ کو اپنے بت رکھنے اور اُن کی پرستش کرنیکی آزادی تھی۔ سال مین ایک مرتبہ تمام قبائل عرب مکہ مین جمع ہوتے تھے اور اپنے اپنے بتون کی پرستش کیا کرتے تھے۔ بت پرستون مین بھی ہر قبیلہ کا ایک علیحدہ بت تھا۔ اور ایک قبیلہ دوسرے قبیلہ کے بتون کو پوجنے کا مجاز نہ تھا۔ ان مین بڑے بڑے

بُت جن کی سب پوجا کیا کرتے تھے۔ وہ ہبل۔ لات۔ اساف۔ نائلہ۔ عقعف تھے۔ اور اُن کے علاوہ مشہور قبائل۔ بنی کلب۔ بنی مذحج۔ بنی مراد۔ بنی ہمدان۔ بنی غطفان کے بُت ودّ۔ سواع۔ یغوث۔ یعوق۔ نسر عزّیٰ وغیرہ بھی ممتاز بتوں میں تھے۔ دوسرے اور قبائل کے بُت اُن سے بہت چھوٹے ہوتے تھے۔ بعض دفعہ ایسا بھی ہوتا تھا کہ کسی قبیلہ کا شخص دوسرے قبیلہ کو ذلیل کرنے کی خاطر اُس کا بُت چُرا لاتا تھا اور اپنی آستین میں چھپا لیتا تھا اور پھر ظاہر کرکے کہتا تھا کہ تمھارا بُت تم سے ناراض ہو کر ہمارے پاس آگیا ہو۔ اسپر آپس میں خوب لڑائی ہوتی تھی اور دونوں طرف کے آدمی مارے جاتے تھے۔ غرض مار دھاڑ کے بعد اپنا بُت چھین لیتے تھے۔ حج سے فارغ ہو کر قبائل ایک مقام عکاظ میں جمع ہوا کرتے تھے اور یہاں میلا لگا کرتا تھا۔ یہاں ہر شخص اپنے اپنے جوہر دکھاتا تھا اور گذری ہوئی مخالفتوں کا بدلہ بھی اسی جگہ لیا جاتا تھا۔

صابی مذہب والے اپنے مذہب کو نہایت قدیم مذہب سمجھتے تھے۔ اور اپنے آپ کو شیثؑ اور ادریسؑ وغیرہ پیغمبروں کی امت بتاتے تھے۔ اُن کے ہاں ایک کتاب بھی تھی جسکو وہ حضرت شیثؑ کا صحیفہ کہتے تھے۔ یہ لوگ دن میں سات وقت نمازیں پڑھا کرتے تھے۔ مردہ کی بھی وہ نماز پڑھتے تھے، مسلمانوں کی طرح ایک قمری مہینہ کا روزہ بھی رکھتے تھے مگر جو بُرائی رفتہ رفتہ ان میں پھیل گئی وہ یہ تھی کہ یہ ستاروں کی پرستش کرنے لگے تھے اُنھوں نے سات ستاروں کے نام کے سات ہیکل بنوائے تھے اور کعبہ کے بتوں کی بھی بہت عزت کرتے تھے۔ چنانچہ ہر سال حج کی غرض سے کعبہ کو جایا کرتے تھے۔ نصرانی جو اپنے آپ کو حضرت عیسیٰ کی اُمت کہتے تھے۔ حضرت عیسیٰ کی وفات کے بعد اُن کو خدا کا بیٹا اور اُن کی ماں کو خدا کی بیوی۔ اور سب کو گو جدا مگر ملکر ایک خدا ماننے لگے تھے۔ اُنھوں نے حضرت عیسیٰ اور مریم کی تصویریں خانۂ کعبہ میں بنائی تھیں جن کی یہ پرستش کرتے تھے۔ اور دوسرے بتوں کی بہت عزت کرتے تھے۔ چنانچہ ہر سال حج کی غرض سے خانۂ کعبہ جایا کرتے تھے۔

غرض کہنے کو تو قبائل عرب مختلف مذاہب میں تقسیم تھے مگر تھے سب ایک ہی رنگ میں ڈوبے ہوئے۔ بُت پرستی جو اُن کا اجدادی مذہب تھا وہ ان میں کسی نہ کسی رنگ میں موجود تھا۔ البتہ یہود بت پرستی کو برا جانتے تھے۔ لیکن پتھروں کے سامنے قربانی اُن کے ہاں بھی روا تھی۔ خدا کو مجسم خیال کرتے تھے۔ دنیاوی ہر چیز پر اسکے اختیار کو نہیں مانتے تھے۔ روز قیامت کا مضحکہ اُڑاتے تھے۔ وغیرہ وغیرہ۔

غرض عرب اس وقت پورے کا پورا بُت پرستی اور شرک میں ڈوبا ہوا تھا۔ کچھ تو اس وجہ سے کہ وہ اپنے آپ کو
میں کچھ بُرائی نہ دیکھتے تھے۔ اور کچھ اس وجہ سے کہ وہ اپنے پڑوس کے ان مذاہب کو جہاں وہ تجارت کی غرض سے
جاتے تھے اپنے مذہب سے جُدا اور مخالف نہ پاتے تھے۔ مصر۔ یونان جو اُس زمانہ میں نہایت متمدن
ممالک تھے۔ مشتری۔ زہرہ۔ اور آفتاب کی پرستش میں سرشار تھے۔ عیش و عشرت اور زنا کاری اُن کے
ہاں ثواب گنا جاتا تھا۔ عشق و محبت کے دیوتا کا اُس وقت ان ممالک میں نہایت گرم رواج تھا۔ اپولو
(Apollo) کی شہوت رانی اور انڈرا کلس Encradus کی شہ زوری کے قصے علم طور پر
عبادت سمجھے جاتے تھے۔ اور دوسری طرف ایران و خوارزمستان آگ تاپنے میں محو تھے۔ زردشت اور یزدجرد
کا سکہ ملک میں بہت زور و شور سے چل رہا تھا۔ عیش و عشرت زندگی کا لازمہ بن رہا تھا۔ شراب خواری
اور زنا کاری بُری بات نہیں سمجھی جاتی تھی بلکہ اسکو وہ لوگ خدا کی نعمت سمجھتے تھے۔ اور ایسا نہ کرنا
اُن کے نزدیک گویا کفران نعمت تھا اور چین و ہندوستان اسوقت خدا اکٹھے کر رہے تھے۔ پیدا کرنے کا
ایک خدا۔ غارت کرنے کا ایک خدا۔ دولت دینے کا ایک خدا۔ پانی برسانے کا ایک خدا۔ غرض وہ تیرہ گی
نکہ پوری کرنے اور ایک ایک کام ایک ایک خدا کے سپرد کرنے میں منہمک تھے۔ مختصر یہ کہ جہاں عربوں کا
دورہ ہوتا وہاں وہ کوئی بات ایسی نہیں پاتے تھے جو اُن کے مذہبی اعتقادات کے خلاف ہو۔ اور ان
مخصوص ممالک ہی پر کچھ بُت پرستی و شرک کا مدار نہ تھا۔ بلکہ تاریخ ہم کو کوئی ایسی مثال نہیں دے سکتی کہ کسی
زمانے میں دُنیا بھر میں کسی مذہب کے پیرو بت پرستی اور شرک اور اخلاق رذیلہ سے اپنا دامن بچا سکے ہوں۔

انہی اثرات نے مل جُلکر عرب کے اخلاق و عادات تباہ کر ڈالے البتہ اُن کو دوسرے ممالک کے
دورہ میں اتنا فائدہ تو ہوا کہ اُن کی تمدنی حالت کچھ سنبھل گئی اور ترقی معاشرت کا ایک نیا دور شروع ہوا
عربوں کی ابتدائی تمدنی حالت اُس وقت جبکہ مصر و یونان میں تہذیب و تمدن کی گرماگرمی تھی اس وقت
جبکہ بابل و نینوا کی حکومت کا آفتاب نصف النہار پر چمک رہا تھا۔

تاریخ بتاتی ہے کہ حجازی عرب رہنے کو وحشی درندوں کے مانند جھاڑیاں یا پہاڑوں کی کھوہیں کھانے کو
خرما اور بھیڑ بکریوں کا گوشت پہننے کو جانوروں کی کھالیں۔ شکار کرنے کے لیے لمبی لمبی نوکدار لکڑیاں
استعمال کرتے تھے۔

عرب المستعاربہ	عرب البادیہ کے بہ نسبت کم وحشی تھے رہنے کو جانوروں کے اون سے چادریں بناتے تھے

اور اُن کو تمام گردختون کے نیچے رہتے تھے۔ کھانے کو دودھ گوشت اور خرما پہننے کے لیے اُنھیں جانورون
کے اون کا ایک ہٹہ ہوتا تھا جو اُن کے جسم کو چھپا دیتا تھا البتہ سواحل عرب کے قبایل ان وحشیون کی
نسبت زاید متمدن و مہذب تھے۔ ایک تو اُن کو سرسبز و شاداب زمینین رہنے کو ملی تھین جسمین تر و خشک
میوے بکثرت پیدا ہوتے تھے۔ دوسرے ہمسایہ قومین جو یہان تجارت کی غرض سے آتی تھین ان کی بدولت
کپڑے پہننے کو اور دوسری چیزین اور ضروریات رفع کرنے کو ملتی تھین انھون نے یہان مکانات بھی بنائے
تھے۔ سلطنت بھی قائم کی تھی جو سبا کے نام سے مشہور ہوا اور اس حد تک ترقی کی کہ دوسری طرف کے عرب
ان کو آدمی نہین سمجھتے تھے اور چونکہ اُن کے نزدیک اُن روایات کا جو اس قوم کی نسبت مشہور تھین کسی
آدمی مین ہونا ناممکن تھا اِس لیے وہ اُن کو عجیب عجیب نامون سے یاد کرتے تھے۔ چنانچہ ان مین کے اکثر
قصے ابتک زبان زد ہین جیسے شداد کی بہشت قوم عاد و ثمود کے قد وغیرہ۔ غرض یہ قومین جو یمن مین آباد تھین
اورون کی بہ نسبت بہت زیادہ متمدن تھین انھون نے اپنی انجینیری سے اپنی حکومت مین ایک تالاب
بنایا تھا جس سے قحط سالی کے ایام مین اپنی کھیتی مین پانی لیتے تھے اس کی نسبت مشہور تھا کہ یہ تالاب
ایک صدی تک قائم رہسکتا ہے پھر ٹوٹ جائیگا اور اس کے ٹوٹنے سے حکومت سبا کا خاتمہ ہو جائے گا
چنانچہ بہت سے ملک یمن کے باشندے اِس خوف سے یمن سے بھاگ کر حجاز مین آبسے اور دوسری طرف
سے یہودی بابل کے حکمران بخت نصر کے ظلم سے یثرب مین جسکو اب مدینہ کہتے ہین پناہ گزین ہوئے۔ حجاز
مین متمدن اقوام کا آنا تھا کہ گویا ترقی کا دور شروع ہوا۔ اطراف کے اکثر قبایل نے ان کے رسم و رواج
سیکھ لیے اور تجارت ہی کو اپنی معاش کا ذریعہ بنا لیا۔ اُدھر یمن مین وہ مشہور تالاب ٹوٹا۔ بڑے زور کی طغیانی
آئی اور حکومت سبا کا خاتمہ ہو گیا۔ اور بچے کچھے باشندے بھی حجاز مین آبسے اور یون حجاز کی ترقی پر
مہر لگ گئی۔ سیل ارم کے بعد گویا عرب کی نئی زندگی شروع ہوئی اور ترقی کی راہین کھل گئین۔ یہودی
صابی نصرانی۔ بت پرست غرض سبھی طرح کے قبایل خصوصاً حجاز مین کثرت سے پھیل گئے۔ اور اُن کا
مرکز کیا عبادت اور کیا تجارت مین مکہ بن گیا۔ سال بھر تک یہ قبائل دوسرے ممالک سے سامان فراہم
کرتے رہتے تھے اور حج کے موقع پر جبکہ تمام قبائل عرب ایک جا جمع ہوتے تھے آپس مین تجارت کرتے تھے
اور بہت بڑا میلہ لگا کرتا تھا۔ جو میلہ عکاظ کے نام سے مشہور تھا ترقی پا کر اُنھین سلطنت قائم کرنے کا خیال
پیدا ہوا اور پہلی مکہ اُن کا امیر قرار پایا۔

عادات و اطوار عام حالات

یہ سب کچھ تو ہوا لیکن دیکھنا یہ ہے کہ اس وقت عرب کی عام حالت کیا تھی کس قسم کا قانون تھا باشندون کے اخلاق و عادات کیا تھے۔ کیونکہ اسی سوال کے حل کرنے پر ہمارے مقصد کا مدار ہے۔

تحقیق سے عرب کی قوم بہ نسبت اور قومون کے فطرتاً وحشی اور خونخوار واقع ہوئی ہے اور اس قدر ترقی کرنے کے بعد بھی گو اُن کی خونخواری نے شجاعت کا لباس پہن لیا ہے مگر بعض دفعہ بہ تقاضاے فطرت وحشت ظاہر ہو جاتی ہے۔ مگر ساتھ ہی ساتھ یہ قوم اور قومون کی نسبت بہت زیادہ سادہ مزاج رکھتی ہے۔ اُس زمانہ مین اس قوم مین اچھائیان بھی تھین اور برائیان بھی۔ مگر برائیون کی بہت کثرت تھی۔ ان مین جو اچھائیان تھین وہ بھی بیرونی اثرات سے برائیون مین نہان اور دبی ہوئی تھین۔ جس سے کوئی خاص اثر خود اُن پر بھی نہین پڑ سکتا تھا۔ کم خرچ کفایت شعار ہونا اور اس پر راضی اور قانع رہنا ایک عمدہ وصف خیال کیا جاتا تھا۔ نہایت فیاضی سے مہمان نوازی کرنا اُن کا قومی خاصہ تھا۔ مسافرون اور مہمانون سے مہربانی اور اخلاق سے پیش آنا اور اُن کی تعظیم کرنا ایک پاک فرض خیال کیا جاتا تھا اگر کوئی اس کو ترک کر دیتا تو اسکو دل سے برا جانتے اور اسکی حقارت کرتے تھے ہمسایہ کے حال پر مہربانی اور اسکی خبرگیری کرنا اور اسکے مکان اور خاندان اور مال کی نگرانی اور حفاظت کرنا نیک آدمیون کے اوصاف مین سے تھا۔ قیدیون کو چھوڑانا اور محتاجون اور بیکسون کی مدد کرنا تمام نیکیون مین افضل اور جمیع اوصاف مین سب سے زیادہ قابل ستایش خیال کیا جاتا تھا۔ ایک شریف عرب کو اپنے وعدہ کا خیال بہت زیادہ رہتا تھا۔ گھوڑے کی سواری کی بچپن مین مشق کرائی جاتی تھی۔ فصاحت و بلاغت لطافت و ظرافت بھی فضیلت کے دائرہ کی تکمیل کے لیے ضروری تھی شاعر نہایت اچھی نظر سے دیکھا جاتا تھا اور اُسکی بہت تعظیم ہوتی تھی۔ جہان ان مین یہ خوبیان تھین انتہا درجہ کی بداخلاقی اور فحش بھی پھیلا ہوا تھا۔ قصائد کے شروع مین اکثر دولتمندون کی لڑکیون عورتون اور بہنون کے نام لیے جاتے تھے۔ اور اُن کے عیوب علانیہ عام طور پر بیان کیے جاتے تھے بدکاری اور زناکاری سے نادم نہین ہوتے تھے۔ بلکہ ہر طرح کی غیر مہذب نظم مین از راہ بے شرمی اسکو مشتہر کرتے تھے شراب اور نشی چیزون کا استعمال عام سمجھتے تھے قمار بازی ان کا ہر دلعزیز کھیل تھا۔ سود خواری انکے ہان نہایت درجہ مروج تھی لونڈیون کو گانا بجانا سکھلایا جاتا تھا۔ اور وہ حرام کاری کرنے کی مجاز تھین اور اُس حرام کاری کی آمدنی آقاؤن کا حق ہوتا تھا۔ رہزنی غارتگری روزمرہ کی باتین تھین انسانون کا خون

بلاخوف ہوتا ۔ سعت ہر روز ہوا کرتا تھا ٹوٹکون مین اور شگون لینے مین اُن کا بڑا اعتقاد تھا ۔ جب کوئی مصیبت آتی تو یہ کنکریون پر کچھ پڑھ کر پھونکتے تھے اور خیال کرتے تھے کہ اُن کی مصیبت دور ہوجائیگی ، اگر کوئی کسی کو مار ڈالتا تو خون کا معزز بدلہ خون ہی سمجھا جاتا تھا اور جو لوگ خون کے بدلے کچھ لے لیتے تھے وہ نہایت حقارت سے دیکھے جاتے تھے اور برادری سے خارج کردیے جاتے تھے اُن کا اعتقاد تھا کہ اگر خون کا بدلہ خون نہ لیا جائے تو مقتول کے سر کا اُلّو راتون کو اُسکی قبر پر چیختا پھرتا تھا ۔ ہر شخص کے مرنے کے بعد قاعدہ تھا کہ اُس کا اونٹ بھی اُسکی قبر سے باندھ دیتے تھے ۔ یہان تک کہ بھوک پیاس سے وہ مرجاتا جب کوئی مرجاتا تو برس روز تک اُس کا سوگ کرتے تھے ۔ گھوڑدوڑ مین بازی لگایا کرتے تھے ۔ کسی غلام کو آزاد کرنے کے بعد بھی اُس کے مالک کو یہ اختیار ہوتا کہ جب چاہتا اس کو پھر اپنی غلامی مین لے لیتا ملزم کو نوجباری کی سزا مین جلتی ہوئی ریت پر بٹھا دیا جاتا تھا ۔ مردہ جانورون کا گوشت کھاتے تھے اور اُس کو بہت لذیذ خیال کرتے تھے ۔ اقرار یا وعدہ پورا کرنے کے لیے بتون کی یا اپنے اجداد کی روحون کی قسمین کھاتے تھے ۔ عورتین نہایت خراب اور ذلیل حالت مین تھین ۔ گاجر مولی کی طرح جتنی جو چاہتا نکاح مین لے لیتا ۔ طلاق کی رسم بھی اُن مین تھی جسکو چاہتے طلاق دیدیتے تھے ۔ اور جب چاہتے پھر اپنے نکاح مین لے لیتے ۔ مہر بھی باندھا کرتے تھے مگر طلاق دینے کے بعد عورتون کو مہر نہین دیا کرتے تھے ۔ طلاق کی ایک میعاد مقرر تھی اُسی مقررہ میعاد تک عورت کو دوسرے کے نکاح مین جانیکا اختیار نہ تھا ۔ اور جب میعاد ختم ہونے لگتی تو پھر اپنے ہی نکاح مین لے لیتے اور طرح طرح کے ظلم روا رکھتے تھے ۔ طلاق دینے کے لیے کچھ شرائط مقرر نہین تھے ۔ جب جی چاہتا طلاق دیدیتے ۔ اور پھر جی چاہتا تو نکاح کرلیتے ۔ اِس بات کو ذلت سمجھتے تھے کہ ایک عورت ایک بار کسی کی زوجیت مین آنے کے بعد دوسرے کے نکاح مین آئے ۔

عرب جاہلیت کی بیہودہ اور خراب رسمون مین سب سے زیادہ یہ تھین ۔ لڑکیون کا زندہ دفن کرنا ۔ شوہر کے مرنے کے بعد اُس کا سوتیلا بیٹا اُس عورت کا مالک ہوتا اور اُس سے نکاح کرلیتا اگر بیٹے کے مرنے کے بعد باپ اُس کی بیوی سے نکاح نہین کرسکتا تھا ۔ شوہر کے مرنے کے بعد اگر کسی عورت کا سوتیلا بیٹا نہوتا تو قریبی رشتہ دار جو بیوہ کے سر پر چادر ڈالتا ۔ اُس سے نکاح کرنے پر مجبور رہتا ۔ عورتون کو اپنے گھر سے بدون پردہ و حجاب باہر نکلنے اور مردون کی مجلسون میں پھرنے یا اپنے جسم کا کوئی حصہ مردون کو

دکھانے مین کوئی عیب نہ تھا۔ اور نہ بے حیائی تصور ہوتی تھی۔ غرض انکی کتاب الاخلاق کا ہر ورق گندگی۔ خرافات۔ بے شرمی اور بے حیائی سے مملو تھا۔ گو ہم نے اُن کے عادات و اطوار کا اُڑتا ہوا خاکہ کھینچا ہو مگر اہل بصیرت انہی واقعات سے نتیجہ نکال سکتے ہین کہ اس زمانہ کے مروجہ مذاہب مین کوئی تو ایسی بات تھی جس سے اِن باتون کا انسداد نہ ہو سکا۔ اور غالباً کوئی عاقل اِس بات سے انکار نہین کر سکتا کہ عرب اور نہ صرف عرب بلکہ تمام دنیا کو اِس کفر و ضلالت کے اندھے کنوئین سے روشن سطح پر لانے کے لیے کسی ریفارمر کی ضرورت تھی۔ مگر ہم اِس بحث کو اور واضح کرنا چاہتے ہین اور دیکھنا چاہتے ہین کہ اصول فطرت اور قانون قدرت اِس بارۂ خاص مین کیا رائے رکھتا ہو۔ آجکل کہ علوم عقلیہ کا ہر طرف دور دورہ ہے،

اصول فطرت اور قانون قدرت اور ہر چیز چھوٹی سے چھوٹی اور بڑی سے بڑی میزان عقل مین تولی جاتی ہے اور ارتقائی ترکیب پر محض اصول فطرت سے پرکھی جاتی ہو اور مقدمات استدلال سے اس کی صحت جانچی جاتی ہو اور جبکہ سچائی کا یہی معیار سمجھا گیا ہو تو ہم بھی اِس طریقہ کو نظرانداز نہین کرنا چاہتے،

محققین نے ہم کو یہ خبر دی ہو کہ دنیا کی ہر چیز ترقی پذیر ہو۔ انسان۔ حیوان۔ درخت۔ مٹی پتھر وغیرہ سب کے سب گردش مین ہین اور اپنی راہین آگے کو بناتے جاتے ہین۔ اور بقول ڈارون کے اِن چیزون کی ترقی انسانیت تک محدود ہو لیکن انسانی ترقی کی کوئی انتہا نہین۔ انسان کو ابتدائی دور مین حیوانات پر کوئی شرف حاصل نہ تھا۔ بلکہ وہ بھی انہی جیسا اک حیوان تھا۔ مگر جیسا جیسا زمانہ بڑھتا گیا تجربہ اور مشاہدہ مین ترقی ہوتی گئی اور عقل و فراست سے دو چیزون کی مماسلت سے ایک تیسری چیز دریافت کرتا گیا۔ اور ساتھ ہی ساتھ اچھائی اور بُرائی کا علم بھی ہوتا گیا۔ اور چونکہ یہ قانون فطرت ہو کہ ہر چیز اپنی میلانی چیز کو پسند کرتی ہو یعنی اپنا فائدہ اور بہتری چاہتی ہو۔ اِس لیے جب ان مین سمجھ آئی آپس مین مِل جل کر رہنے لگے اور صحبت کا چسکا پڑا تو انھین ایک ایسے اصول کی ضرورت ہوئی جس سے با امن و امان کی زندگی بسر کر سکین۔ اور جب کچھ اور زمانہ گذرا اور اُن کی سمجھ مین مزید ترقی ہوئی تو انھین ایک ایسے قانون کی ضرورت محسوس ہوئی جو اُن کی زندگی کو خوشگوار بنا دے۔ اس خیال نے اِسی جگہ لامحالہ ان سے مذہب کی حد شروع ہوتی ہو، اپنے اِس خیال کے پھیلانے کے لیے اُنھون نے اپنے گرد و پیش کی چیزون کا مطالعہ شروع کیا۔ بعض چیزین ایسی مہیب اور خوفناک دیکھین جن سے اُن کے بدن پر رعشہ آگیا اور بعض ایسی خوبصورت اور نورانی دکھائی دین کہ دل خوشی سے

بے اختیار رہو گیا مگر اپنی نادانی اور اُسکی اصلی حقیقت نہ جاننے کے باعث طرح طرح کے توہمات مین مبتلا
ہو گئے اور ان توہمات مین ہیا خاک پختگی آگئی کہ خاندانی خصائص کی طرح اعتقادی نظریہ بھی نسلاً بعد نسلاً
بطور توریث کے ایک سے دوسرے کو ملتا رہا اور تجربہ اس مین ترمیم و تنسیخ کرتا رہا۔ ترمیم و تنسیخ دو طرح پر
ہوتی رہی ایک عقلی۔ دوسری الہامی۔ عقلی مذہب کی داغ بیل تو سمجھ آنے پر ہی پڑ گئی تھی۔ تجربہ روز بروز
نئی نئی باتین بتاتا جاتا تھا جس سے اُن کے اجدادی خیال یا مذہب مین پختگی آتی گئی۔ اور الہامی
مذہب کی ضرورت اس وقت مسلم ہو گئی جب کہ بعض نہایت اہم مظاہر نے ان کی عقلون مین قصور
ثابت کیا۔ اور چونکہ یہ ایک مسلمہ مسئلہ ہے کہ جب انسان اپنے مین کسی اپنے مخالف کے دفیعہ کی قوت
نہین پاتا تو خارجی امداد اور اپنے سے بالاتر ہستی کی استعانت ڈھونڈھتا ہے۔ پس ایسے اسباب کا
فراہم ہونا بھی منجانب قدرت ضروری تھا۔ چنانچہ انھین مین ایسے مصلح پیدا ہوتے گئے جو اُن کو اُنکی
عقلون سے برتر باتین بتلاتے تھے۔ اور آسان راستہ دکھاتے تھے۔ اور چونکہ اجدادی رنگ گہرا چڑھا
تھا اور وہ نہین چاہتے تھے کہ اُن کے کسی پہلے اعتقاد مین خلل پڑے اس لیے خلل پڑنے کی بہتر
اور عمدہ راہ مین زیادہ توجہ نہین کی اگر بعضون نے پیروی کی بھی تو کچھ دنون کے بعد اپنے اجدادی
زمین عجیب عجیب اور غلط راستے اختیار کر لیے اور امتداد زمانہ نے انھین پھر اسی سڑک پر لا ڈالا جس پر یہ پہلے
چلا کرتے تھے۔ پس بالکل یہی حالت تھی عرب کی اور عرب ہی پر کیا منحصر تھا ساری دنیا کی یہی حالت
تھی۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ آیا اس بُری اور گئی گذری حالت مین کسی ایسے مصلح کی ضرورت تھی
جو ہاتھ تھام کر چاہ ذلت سے نکالتا اور ترقی کی سڑک پر ڈالدیتا اور بے شبہ اصول فطرت اور قانون قدرت
کے رو سے اس سوال کا جواب نفی مین نہین دیا جا سکتا۔ پس یہان سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ وہ اُمی عرب
جو عرب کے ریگستان مین پیدا ہوا اور ایسی قوم مین پلا بسا جو اجداداً بُت پرستی مین غرق تھی جس نے
ان کو کفر و ضلالت سے نکالکر نور وحدت سے معمور کر دیا اور جس نے ساری دنیا کے سوتے ہوؤن کو
جگا دیا بیشک وہ یکّا اور سچا مصلح تھا۔ اور چونکہ اس وقت ساری دنیا کفر و ضلالت سے بھری ہوئی تھی۔
اس لیے اس کا وجود باجود نہ صرف عرب بلکہ تمام دنیا کے حق مین باعث رحمت و برکت تھا۔

| امی وامی فداک یا رسول اللہ |

اور پھر غور کرو کہ کیا یہ معمولی انسان کا کام ہو سکتا ہے کہ عرب جیسی
جاہل اور بے ڈھنگی قوم کی فطرت کو جو اپنے جبلی اعتقادات اور رسم و رواج کے آگے کسی بڑے سے بڑے

مصلح کی نہین سنتے تھے۔ تھوڑے ہی دنون مین ایسا پلٹ دے کہ اُن کے پہلے عادات واطوار سے کچھ نسبت ہی نہ رہے کبھی نہین۔ یہ اُسی شخص کا کام ہے جو درگاہ خداوندی سے خاص اس کام کے لیے مامور ہوا تھا۔ اور کیا بغیر ایسے شخص کے دنیا کفر وضلالت سے نہین نکل سکتی تھی؟ واقعات اس کے منافی ہین۔ یہ ناممکن تھا کہ سرکار دوعالم صلعم کی بعثت کے بغیر مخلوق معرفت کی سیدھی راہ پاسکتی جسم کو جان سے۔ دل کو دماغ سے۔ قالب کو روح سے اور فعل کو ارادے سے جو نسبت ہے وہی ہم کو سرکار دوعالم صلی اللہ علیہ وسلم سے نسبت ہے جیسے جان کے بغیر جسم بیکار۔ دماغ کے بغیر دل ناکارہ روح کے بغیر قالب فضول۔ اور ارادہ کے بغیر ارتکاب فعل ناممکن ہے۔ ویسے ہی یہ ناممکن تھا کہ بغیر سرکار دوعالم صلعم کے ہم نور وحدت پاسکتے اور اس خالق ارض وسما کی خوشنودی حاصل کرسکتے۔ اور لاریب اس ذات اقدس کے ظہور سے ایمان ذات وحدت باری مکمل ہوگیا جسکی بنا پر ارشاد ہوا ہے کہ اَلْیَوْمَ اَکْمَلْتُ لَکُمْ دِیْنَکُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَیْکُمْ نِعْمَتِیْ وَرَضِیْتُ لَکُمُ الْاِسْلَامَ دِیْنًا اور اُس کے ساتھ ہی درحقیقت نبوت بھی ختم ہوگئی اور اب جو لوگ وحدانیت خدا کی ہدایت کرین گے یا کرتے ہین اس سے کچھ زیادہ نہین کرسکتے۔ مبارک ہین وہ لوگ جو اس آپؐ کی تعلیم سے بہرہ اندوز ہوچکے ہین۔ اور اپنے آپ کو مسلمان کہتے ہین اور بیشک شکر گذار ہین ہمارا ردیان روایان بھی کہ اس ذات اقدس کے باعث وحدانیت کو پایا اور نجات اُخروی کے حقدار بنے

اَللّٰھُمَّ صَلِّ عَلَی النَّبِیِّ الْمُطَہَّرِیْ　　شَفِیْعِ الْوَرٰی فِیْ یَوْمِ بُعِثَ مُحَمَّدِیْ

محمد مرزا خان آزاد

فی نعتہ

آنکہ برد از بود زروا صل علیہ وآلہ　　ہست جناب مصطفےٰ صل علیہ وآلہ
گلبن باغ فاستقم سرو ریاض قل کفی　　گوہر بحر اصطفا صل علیہ وآلہ
قاف وقار وعین علم کاف کمال ودال دین　　شین شکوہ کبریا صل علیہ وآلہ
امی افصح اللسان مخبر صادق البیان　　سالک مسلک رضا صل علیہ وآلہ
قالیا وز فرط علم قلب ؤ سے از فروغ صدق　　مردہ یکے دگر صفا صل علیہ وآلہ

تازہ کلام حسرت موہانی

(۱)

ہر چند ہو کے جان سے بیزار جائے گا — پروانہ ضرور طالبِ دیدار جائے گا
گھسنے نہ پائے گا تری محفل مین پھر کبھی — ساقی یہان سے آج جو ہشیار جائے گا
زنہار بزمِ یار سے عاشق رہے جو دُور — جب شوق اُٹھائے گا ناچار جائے گا
صبر و قرار و ہوش و خرد مال و جان و دین — ہو گا جو کچھ حضور مین در کار جائے گا
پڑا نہ ہو گی اسکے دل بے ملال کو — صدمہ فراقِ یار کا بیکار جائے گا
تری گلی مین بیٹھ کے اُٹھتے ہین ہم کہان — اور ہم اُٹھین بھی دل تو نہ زنہار جائے گا

دربان کے دورباش کا حسرت کو غم کہان
اک بار وہ بُلائین تو سو بار جائے گا

(۲)

مانوس ہو چکے تھے ازل مین فنا سے ہم — اس انتہا کو جانتے ہین ابتدا سے ہم
گویا وہ سب سُنا ہی تو دے گی وہان کا حال — کیا کیا سوال کرتے ہین بادِ صبا سے ہم
دنیا کی نامرادی پیہم کے عذر پر — محشر مین تم کو مانگ نہ لین گے خدا سے ہم
بنکر گدائے عشق گئے تھے مگر پھرے — سلطان ہو کے یار کی دولت سرا سے ہم
عرضِ کرم سے پہلے ہی بولے وہ روزِ وصل — شرمندہ ہون کہین نہ تری التجا سے ہم
اُس انجمن کے شوق مین جی کا زیان سہی — اک بار اُن کو دیکھ تو لین گے بلا سے ہم
کیا کیا ہوس کو آتی ہے خوشبوئے آرزو — آنکھین جب اپنی ملتے ہین اُن کی ردا سے ہم
محرومیان بھی جن کی ہین عنوانِ التجا — کہتے ہین وہ کہ ڈرتے ہین اہلِ وفا سے ہم

حسرت خیالِ غیر سے بیگانہ ہو گئے
مانوس ہو کے اُس نگہِ آشنا سے ہم

عہد مغلیہ مین دستکاریان

یہ مسلمہ ہر کہ حیات انسانی کے تمام شعبون کی ترقی زمانے کی رفتار کے مناسبت سے ہوا کرتی ہر چنانچہ ازل سے ابتک اسی حساب سے ضروریات وقت کے مطابق انسان ترقی کرتا چلا آرہا ہر۔ البتہ دنیا کے مختلف حصص و ممالک کے تہذیب و تمدن کا مقابلہ کرنے پر کمی بیشی سے اُن کی پستی و پیش روی ظاہر ہو جاتی ہر۔ ہندوستان کی موجودہ حالت، بادی النظر مین اگرچہ دور ماضیہ سے مادیت مین کہین زیادہ ہر تاہم دوسرے ترقی یافتہ ممالک ہمعصر کی نسبت بہت پیچھے ہر۔

اس وقت جو ایجادات و اختراعات ہمارے پیش نظر و زیر استعمال ہین اُن کا شکریہ تو جہد زوال ہر، ہے لیکن یہ شکایت اس سے بدرجہا زیادہ ہر کہ ہندوستان سے بہت پیچھے رہنے والے ملک بعد مین ترقی شروع کرنے پر بھی نہایت عروج حاصل کر گئے، پس ظاہر ہر کہ ہمارے ملک کو جس شاہراہ ترقی پر چلایا جا رہا ہر وہ در اصل سرابِ ہر۔ ڈیڑھ سو سال مین جتنی منزلین سطے ہوئین اُن سے اندازہ لگایا جا سکتا ہر کہ ابھی مقام مقصود تو کیا دوسرے ملکون کے مرتبے پر پہونچنے کے لیے بھی اس سے دو چند یا کم سے کم اتنا ہی عرصہ اور لگے گا۔ دور گزشتہ کے معلومات سے ظاہر ہوتا ہر کہ کسی وقت ہندوستان آسمان ترقی پر مثل ماہتاب تابان تھا۔ اور اُس زمانے کے تہذیب و تمدن مین نہایت بلند پایہ رکھتا تھا، مالی حالت فوجی طاقت صنعت و تجارت اور تہذیب و معاشرت، اس وقت کے اقتضا و احتیاج کے موجب بدرجۂ ممتاز تھی، چنانچہ صنعت و حرفت کے ترقی پذیر ہونے مین ملک کے تمام رؤسا و امرا بلکہ سب سے زیادہ خود شہنشاہ کا ہاتھ تھا۔

جواہرات بیشتر ہندوستان کی کانون مین دستیاب ہوتا تھا۔ اور اسی ملک مین ماہر حکاک اُن کو مجلی و مصفی کر کے حسب خواہش مختلف شکلون مین خوبصورت بنا دیتے تھے۔ بادشاہ اور اُن کے محلات کے لیے قسم قسم کا کپڑا شاہی کارخانون مین تیار کیا جاتا تھا۔ اور شاہی لوازمۂ آرایش اور دیگر معمولی ضروریات کی اشیا بھی اعلی پیمانہ پر شاہی صناع بکثرت تیار کرتے تھے۔ یہ کارخانے بڑے پیمانہ پر قائم تھے جہان سے اس قدر سامان مہیا ہوتا تھا کہ شاہی مانگ پورا ہونے کے بعد اور لوگون کو بھی قیمتاً ملجاتا تھا۔ شہنشاہ خود علاوہ

زر نقد کے ان چیزوں کو انعام واکرام میں اس قدر عطا فرماتے تھے کہ ان کارخانوں کا معتدبہ حصہ بیداوار صرف ہو جاتا تھا۔ دیگر اعیان حکومت، عمائدین سلطنت، امرا اور راجگان اپنے اپنے علاقون مین سیکڑون دستکار پیشہ ور ملازم رکھکر اپنے ضروریات کے لیے عمدہ چیزین بنواتے تھے۔ اور اکثر نادر تحفے تیار کرا کر شہنشاہ کی خدمت مین پیش کرتے تھے اور برسر دربار بادشاہ کی خوشنودی سے فایز المرام ہوتے تھے۔ توزک جہانگیری مین شہنشاہ جہانگیر نے کسی جگہ شاہزادہ خرم، وزیر آصف خان اور امیر الامرا اعتماد الدولہ کے پیشکشون کا ذکر کرتے ہوے کپڑون کے متعلق لکھا ہے کہ یہ نفیس قسم کے کپڑے انھون نے اپنے ہی کارخانہ مین تیار کرلیے ہین۔

بہت لوگ شاہی کارخانون مین ہنر سیکھنے کے لیے بھرتی ہوتے تھے اور وہان سے نکلکر سردارون اور رئیسون کے یہان ملازم ہو جاتے تھے یا خود اپنے طور پر چیزین بنا کر بازار مین فروخت کرتے تھے،

اسکے علاوہ غیر ممالک کے تجار بکثرت ہندوستان مین آتے تھے، اور افراط سے یہان کا مال باہر لیجاتے تھے۔ اشیا خوردنی و استعمالی خام و پختہ سب قسم کا مال وافر برآمد کرتے تھے پیشگی سائی دے کر یا دستکارون اور ہنرمندون کو خود ملازم رکھکر چیزین تیار کراتے تھے۔ اور ہزارہا تھان کپڑون کے پردیس مین لیجا کر فروخت کرتے تھے،

ریشم اور سوت کی رنگائی، کپڑون کا بُنتا، زری ریشمی اور سوتی کام، موٹا باریک اعلیٰ ادنیٰ جیسے کھادی یا ریزی اور تنزیب یا ململ پوت کمخواب، کارچوبی یا زربفت۔ چھینٹ اور دوسری قسم کا بیل بوٹے دار کپڑا خصوصیت کے ساتھ ہندوستان کے کئی شہرون مین بکثرت تیار ہوتا تھا۔ ان کے گوناگون اور طرح طرح کے گل بوٹے دیکھنے والون کی نظرون کے لیے فریب تماشا تھے جو اصلیت کے مشابہ ہو کر مرقع باغ و بہار بن جاتے تھے،

کاغذ و اسلحہ سازی، چوبی دستکاری، فن تعمیرات، قالین و شکر بنانا وغیرہ ہندوستان مین بہت مروج تھا، زرعی پیداوار بھی صنعت و حرفت کے دوش بدوش ایسی افراط سے تھی کہ ارزانی کے ساتھ باشندگان ملک کے لیے فراہم ہونے کے بعد سوداگران یورپ و ایران غیر ممالک کو لے جاتے تھے۔

تقریباً ڈیڑھ صدی تک مغلیہ حکومت باامن و ترقی پذیر رہی، اس کے ظل عاطفت مین نظر توجہات سے مختلف صنایع و فنون علمی و مادی ہر قسم کے جو اس وقت کے تمدن کے ممد و معاون تھے پرورش پاتے اور بڑھتے رہے۔ اختراع و ایجاد مستزاد۔

ڈاکٹر برنیر اپنے سفرنامہ مین لکھتا ہی کہ ہندوستان کے وسیع ملک کا بیشتر حصہ زرخیز ہی خصوصاً بنگال کا صوبہ مصر سے کہین زیادہ اچھا ہی، چاول، اناج اور زندگی کی دوسری ضروری چیزون کی پیداوار ہی نہین بلکہ تجارت کا بہت سا عمدہ سامان یہان تیار ہوتا ہی کیونکہ ریشم کپاس اور نیل کی پیداوار کافی ہی ملک کے بہت سے حصے خوب آباد ہین اور زمین کے قطعات مین کثرت سے کاشت کی جاتی ہی۔ اور ہنرمند لوگ اچھی اچھی صناعیان کرتے ہین۔ قالین، کمخواب، زری اور کارچوبی، تاش بادلہ اور کامدانی اور بہت سی قسم کے ریشمی اور سوتی کپڑے اور انواع و اقسام کی سونے چاندی، لکڑی، پیتل اور ہاتھی دانت کی چیزین بنائی جاتی ہین یہ سب چیزین اتنی افراط سے بنتی ہین کہ ملک کی ضرورت پوری ہونیکے بعد غیر ملکون کو برآمد کی جاتی ہین۔

یہ بات بھی پوشیدہ نہ رہنا چاہیے کہ کرۂ زمین پر سونا چاندی سکون کی صورت مین خرید و فروخت کے ذریعہ سے دست بدست چلنے کے بعد ہندوستان مین بہت زیادہ پہونچ جاتا ہی۔ اور یہان ہی رہ جاتا ہی سونا چاندی ہندوستان مین ہی بہت نکلتا ہی اور غیر ممالک سے بھی کشتیان بھر بھر کر لایا جاتا ہی لیکن اسکے تبادلہ مین یہان سے اشیا خوردنی اور کپڑے اور دوسری نفیس چیزین خرید کر پردیسی خاصکر یورپ والے لے جاتے تھے، ہندوستان مین جو چیزین باہر سے لائی جاتی تھین مثلاً ازبک سے پچیس ہزار گھوڑے ایران و عرب سے بھی کئی ہزار گھوڑے، تانبا۔ لونگین دارچینی جائفل اور رداچینی وغیرہ کی کثیر مقدار ہر سال جاپان، ملاکا۔ اور لنکا و یورپ سے مع لوگ لاتے تھے۔ ان کے معاوضہ مین بھی یہان سے ہندوستان کی عمدہ چیزین، کھانے پینے کا سامان خرید کرلے جاتے تھے۔ الغرض ہندوستان مین صنعت و حرفت، تجارت و زراعت وغیرہ اس قدر اعلیٰ پیمانہ پر تھی کہ ملک کی ضرورت ملک کی پیداوار زرعی و صناعی سے پوری ہوجاتی تھی، اس لیے ملک کی برآمد، درآمد کے مقابلہ مین بہت زیادہ تھی۔ جیسا کہ اوپر ذکر ہوچکا ہی کہ پچیس ہزار گھوڑے، گرم مصالحہ تانبا اور یورپ سے بانات لٹھا اور شیشہ کا آرائشی سامان ہی تھوڑی تعداد میں ملک مین درآمد کیا جاتا تھا، درآنحالیکہ کھانے پینے کا سامان افراط سے غیر ملکون کو برآمد کیا جاتا تھا اور پھر بھی ملک مین ہر شے ارزان میسر آتی تھی۔ سامان درآمد کی جو قیمت ہندوستان سے ادا کی جاتی تھی نہ صرف وہی بلکہ اس سے کہین زیادہ قیمت پردیسی لوگ اپنے پاس سے خرچ کرکے ہندوستان سے اناج اور کپڑے اور دوسری قسم قسم کی چیزین خرید کرلے جاتے تھے۔ اس طرح درآمد کے خرید کرنے مین جو روپیہ ملک کا خرچ

ہوتا تھا وہ بھی یہاں ہی رہ جاتا تھا بلکہ اور زیادہ روپیہ سامان برآمد کے فروخت کرنے سے دوسرے ممالک کا یہاں آجاتا تھا غیر ممالک کے سیاح اور سفیر لوگ بھی شہنشاہی دربار سے جو رخصتانہ اور خلعت پاتے تھے اسکے ساتھ زر نقد بھی ہزاروں کی تعداد میں ہوتا تھا، یہ سب روپیہ وہ لوگ یہاں کی نادر و نفیس چیزیں اور ضروری سامان خرید کر لیجانے میں صرف کر جاتے تھے۔

ولی احمد خان جے پور

امید و بیم کی تصویر

زحمتِ انتظار سے آج یہ نالہ اٹھا ہوا
آس ہی کچھ بندھی ہوئی دل ہی ذرا تھا ہوا

ذوقِ امید و بیم میں دل کا عجیب حال ہے
شوق کی لے بڑھی ہوئی جوش مگر گھٹا ہوا

شوق کی بیقراریاں دل کی امیدواریاں
شوق کا دل سے پوچھنا یار عزیز کیا ہوا

دلمیں طرب کے دلولے اور کچھ اضطراب بھی
یعنی شراب قند میں تلخ عرق ملا ہوا

سر میں توہمات کا ایک عجیب مد و جزر
عزم کبھی بڑھا ہوا دل ہی کبھی گھرا ہوا

چشم براہ کب سے ہے آرزوؤں کا جمگھٹا
دیدۂ منتظر میں ہر ایک ہے راہ جما ہوا

حوصلہ بھی بلند ہے شوق بھی تیز گام ہے
بیم کے دست برد سے دل ہے مگر بجھا ہوا

دخل کبھی شکوک کا ۔ فتح کبھی یقین کی
کشمکشِ امید و بیم معرکہ دغا ہوا

خوف سے خشک ہے زبان دلمیں امنگ تو تو ہو
چہرے پہ ہیں اداسیاں رنگ بھی ہے اڑا ہوا

جانے کو ہے خزاں ضرور آنیکو ہے بہار بھی
طرز ہوا کچھ اور ہے ابر بھی ہے گھرا ہوا

فرط سرور میں کبھی دل کا یہ حوصلوں کو حکم
منزل شوق میں رہے آج قدم بڑھا ہوا

وہم کی موشگافیاں قابل قدر گو نہ ہوں
اس کا مگر علاج کیا دل ہے ادھر جما ہوا

فضل کی دیر ہے امیر سعی بلیغ ہو چکی
فضل نہ ہو تو ہیچ ہے سب یہ کیا دھرا ہوا

امیر بدایونی

تاج محل

(۱)

اے شاہجہان۔ اے شاہنشاہ ہندوستان تو اس بات سے بیخبر نہ تھا کہ دورِ زندگی۔ عالم شباب دولت و ثروت۔ قوت و طاقت سبھی آخر کار زمانے کے لا انتہا ہی۔ ابدی سمندر مین غرق ہوجاتے ہین لیکن پھر بھی تو نے چاہا کہ تیری روحانی محبت کے جذبات صادق صورت پذیر ہوکر دنیا مین دائم و قائم رہین۔

عصائے شاہی بھی ایک ایک دن چوب خشک کی طرح ٹوٹ جاتا ہی۔ ٹکڑے ٹکڑے ہوجاتا ہی۔ پتھر ریزہ ریزہ ہوکر خاک مین ملجاتے ہین۔ مسجد۔ مندر۔ صومعہ و معبد بھی منہدم ہوجاتے ہین لیکن پھر بھی تو نے چاہا کہ ایک دل سے نکلنے والی آہ کی صدا زمین سے آسمان تک گونجتی رہے اور تیری محبت کا پیغام دلپذیر کہین لیجائے مگر تجھے یہ نہین معلوم کہ کہان؟

بیش قیمت ہیرون۔ بے بہا جواہرات کی چمک دمک ماند ہوجاتی ہی۔ قوس۔ قزح کے نظر فریب رنگ بھی دیر تک قائم نہین رہتے۔ اگر یہ غائب ہوجاتے ہین تو غائب ہوجانے دے لیکن ایک آنسو کے قطرے کو رہنے دے۔ ایک آنسو کو جو صاف و شفاف ہی۔ چمکیلا ہی۔ ایک آنسو کو جو زمانے کے دلفریب عارض پر ہی ایک آنسو کو جسے لوگ تاج محل کہتے ہین۔

(۲)

اے فانی ناچیز انسان تجھے یہان زیادہ عرصہ قیام کرنا نہین۔ اپنی دلی تمناؤن کے برلانے کی فکر کر۔ زندگی کی زیادہ مہلت نہین زمانہ زبان حال سے اس کی تصدیق کر رہا ہی۔

زندگی کے بہتے ہوئے چشمے مین تو ادھر ادھر تیر رہا ہی۔ موجون کے تھپیڑے کھاتا پھرتا ہی۔ بادِ صرصر کا کھلونا بنا ہوا ہی۔ آج تیرے پاس تمام لوازمات عیش موجود ہین۔ کل تو بے سروسامان ہوجاتا ہی۔

جب بادِ بہار اپنا دلفریب راگ چھیڑتی ہی۔ تیرے باغ مین آتش گل کے سوا کچھ نظر نہین آتا۔ جون ہی پھولون سے اپنے دامن کو بھر چکتا ہی۔ جرس بہ آواز بلند وقتِ روانگی کی اطلاع دیتا ہی اور اس وقت تو خاک بدامن رہ جاتا ہی۔

حیف۔ صد حیف۔ تو سبدِ گل کو الٹ دیتا ہی۔ گلہائے رنگین کو سر رہگذر پھینک دیتا ہی اور ذرہ آیندۂ زندگی

کے قدمون کے نیچے پامال ہوتے رہتے ہین۔

(۳)

اے شاہنشاہ تونے خوبصورتی کا ہدیہ پیش کرکے زمانہ کو دھوکا دینا چاہا۔ تونے دھڑکتے ہوے دل سے ایک غیرفانی مجسمہ حسن وخوبی اُسکے سامنے پیش کیا۔ زمانۂ انقلاب پذیر نے حیرت سے مُنھ پھیلاکر اُسکی طرف دیکھا۔ تونے موت غیرمجسّم کو غیرفانی سفید پوشاک پہنائی۔

تجھے ماتم داری اور سوگواری کے لیے کافی وقت نہ ملا۔ اِس لیے تونے اپنے اشکہاے مسلسل ایک سنگ مرمر کے پیالے مین بھرکر محفوظ کردیے۔

شب ماہتاب مین۔ گوشۂ خلوت مین تو اپنی زوجہ محبوب کا چھوٹا پیارا نام اُس کے کان مین آہستہ سے کہتا تھا۔ اِس مختصر نام کی مختصر آواز آج تک زمانے کے کانون مین گونج رہی ہی۔

(۴)

اے شاعرانہ احساس رکھنے والے شاہنشاہ یہ تیرا نیا پیغامبر جسکا جواب نہ کبھی دیکھا گیا نہ سنا گیا فضاے آسمانی مین سر اُٹھاے کھڑا ہی اور تیرا پیغام غیرمعلوم مقام پر لے گیا ہی۔ ایسے ساحلون تک جہان نظر نہین پہونچتی۔ ایسے دربر جہان نگاہ انسانی کی رسائی نہین شوق بھری نظرین برستی ہین اور مایوس ہوکر پلٹ آتی ہین۔ اُس جگہہ پر جہان کہ اب تیری محبوبہ شفق صبح وشام کے دلفریب رنگ مین جلوہ افگن معلوم ہوتی ہی۔ شب ماہتاب مین گل یاسمین کی مشام پرور خوشبو مین نمایان نظر آتی ہی۔

تیرے اِس سنگی پیغامبر نے زمانہ جیسے دربان کو دھوکا دیا اور تیرا یہ پیغام دلپذیر مین تجھے نہین بھولا ہون، مین تجھے نہین بھولا ہون، اے میری پیاری مین تجھے نہین بھولا ہون" پہونچا دیا ہی۔

(۵)

اے شاہنشاہ تو دنیا سے سدھار گیا۔ تیری وسیع مملکت خواب وخیال ہوگئی۔ تخت طاؤس مٹی مین مل گیا۔ تیرے بہادر سپاہی جنکے قدمون کے نیچے زمین کانپتی تھی زیرخاک پنہان ہوگئے۔

ان سب کی یاد کبھی کبھی دہلی کی گلیون کی خاک ہوا مین اُڑتی ہوئی دیکھکر آجاتی ہے، گویّے اب تیری تعریف کے گیت نہین گاتے۔ تیرے حرم سرا کی نوبت اب جمنا کی لہرون کے تال سُر کے ساتھ نہین بجتی۔

نازنین حرم کے چھاگل کی سامعہ نواز آواز کے بجاے ویران محل کے گوشون سے جھینگر کی کرخت آواز
سُن پڑتی ہی جو ماتم عیش کی آواز بازگشت کا مزہ دے رہی ہی۔

لیکن تیرے خوبصورت۔ سفید۔ خوشنما۔ تازہ دم۔ نہ تھکنے والے پیغامبر نے سلطنتون کے عروج وانحطاط کا مطلق خیال نہ کیا۔ ہستی انسانی کے کمال وزوال کی طرف سے بھی بے توجہ رہا ہی۔ اور تیرے پیغام محبت کو یہ آواز بلند کہہ رہا ہی "مین تجھے نہین بھولا ہون۔ مین تجھے نہین بھولا ہون۔ اے میری پیاری مین تجھے نہین بھولا ہون"

(۶)

کون کہتا ہی کہ تو نہین بھُولا ہی؟ غلط۔ سراسر غلط۔ کسی کی یاد ہمیشہ کیونکر رہ سکتی ہی۔ امتداد زمانہ کی وجہ سے دل سے خیال جاتا رہتا ہی جتنے دن گذرتے جاتے ہین اتنی ہی یاد کم ہوتی جاتی ہی۔

روح کو جو خلا مین پرواز کرنا چاہتی ہی بے حس خاک کا ڈھیر زیر زمین کیونکر چھپا سکتا ہے
قبر سے صرف اتنا ہوتا ہی کہ مرنے والے کی یادگار ایک معنی کر کے قائم ہو جاتی ہی۔

روح کو کون روک سکتا ہی۔ سپہر برین کے روشن ستارے اُسے اپنی طرف بصد اشتیاق بُلاتے ہین عالم باقی سے اُس کا بُلاوا ہی۔ غیر مرئی عالم نورانی مین اُس کی طلب ہی اُس پر زمانہ اثر انداز نہین ہو سکتا نہ وہ عرصہ ہستی کی پابند ہی۔ وہ بے روک ٹوک وسیع۔ بے پایان عالمون کی سیر کرتی رہتی ہی۔

(۷)

اے شاہنشاہ سلطنت سے تیرا جی خوش نہوا۔ دنیا کے عیش و آرام۔ ناز و نعم تیرا دل نہ بہلا سکے بقیہ تمام زندگی تجھے اطمینان قلب و سکون دل نہ حاصل ہو سکا۔

دل ناکام کی حسرتون نے تیری زندگی تلخ کر دی۔ یہی سبب تھا کہ اپنی زندگی کے آخری ایام مین تو نے شاہی شان و شوکت پر بالکل اُسی طرح لات مار دی جسطرح ایک بچہ اپنے مٹی کے گھروندے کو اپنے پانون سے بگاڑ ڈالتا ہی

تو اپنے کامون سے کہین افضل ہی۔ یہی سبب ہی کہ تو اپنے نشانات اور یادگارین چھوڑ کر عالم علوی کی طرف چلدیا۔ تو خدا جانے کہان پہونچ گیا اور یہ سب یہین کی یہین رہ گئین۔

(۸)

اُس محبت نے جو روحانی ترقی کا باعث نہو۔ اُس محبت نے جو اسفل سے اعلیٰ کی طرف نہ لیجائے۔

سرِراہ ایک تخت بچھایا اور تجھے دنیاوی عیش و عشرت کا لالچ دیکر اُس کی طرف بُلایا۔ یہ محبت غبارِ راہ کی طرح تیرے پاؤن سے لگی تھی مگر تو نے پاؤن جھٹک کر مٹی کو مٹی مین ملا دیا۔ اُس منتشر خاک مین تو نے اپنی غیر فانی دلی محبت کا بیج بویا۔ تخم سے پودا اگا جو ابدالآباد نسیم سحر کی بدولت جھوم جھوم کر یہ گیت گاتا رہے گا۔

"وہ مسافر چلا گیا۔ افسوس وہ چلا گیا۔ وہ اپنی محبوبہ کی تلاش مین ہر۔ تخت و تاج کی محبت دامن گیر نہو سکی۔ زمین و آسمان اُسے کوئی نہ روک سکا۔ عالمِ ارواح مین اُس کا خیر مقدم کیا گیا اور جب وہ روانہ ہوا تارون نے اس کی ہمت افزائی کی۔

مین اُس کی یاد مین یہان پریشان و آوارہ ہون اور وہ تمام دنیاوی افکار سے آزاد بلندیِ چرخ پر پہونچ گیا ہر"

(رابندرناتھ ٹیگور)

باسط بسوانی

غزل

جگر مجروح، مین مغموم اور دل ناتوان میرا — سوا تیرے مرے اسداب کوئی کہان میرا
نہ تھے جیتے جی رنگِ سخن اہلِ جہان میرا — فنا کے بعد ہی شاید ہو کوئی قدردان میرا
خلش تھی تجھے صیاد اسے یہ ظلم آرائی — قفس کے سامنے لاکر جلایا آشیان میرا
کسی کی خانہ بربادی سے تجھکو فائدہ کیا ہر — اُجاڑا کس لیے صیاد تو نے آشیان میرا
رہا کرتا ہر پہر دن تذکرہ اہلِ محبت مین — بنا افسانہ عبرت دلِ بے خانمان میرا
اُنھین کیا وہ بہارین عالمِ ایجاد کی لوٹین — جگر کے زخم دکھین اور نہ قلب نیمجان میرا
ابھی تو ابتدا ہے موسم گل ہے چمن والو! — ابھی سے آشیان تکتی ہر کیون برقِ تپان میرا؟
اُدھر بدلے جو تیور اشک اِدھر آنکھون مین بھر آئے — بھری محفل مین افشا ہو گیا رازِ نہان میرا
سمجھتا ہون مین اے صیاد ہر تنکے کو جان اپنی — رُلاتا ہے لہو یاد آ کے مجھ کو آشیان میرا
چمن والے مری ہستی اگر بیکار سمجھے ہین — مٹا دین شوق سے مجھکو جلا دین آشیان میرا

نظر آتا ہے ہر اک شعر غم کی مستقل دُنیا
جُدا ہے سب سے لے سرشار اندازِ بیان میرا

سرشار کسمنڈوی

خدا کا نور

یکے بعد دیگرے بادل پھٹنا شروع ہوئے۔ گہری کہر کی نقاب رفتہ رفتہ ہٹنے لگی۔ بڑے بڑے پہاڑ نیلی فام آسمان کی پشت پر صاف نظر آنے لگے۔ ہمیشہ قائم رہنے والی برف سفید سفید جمی ہوئی تھی اور پہاڑ کی اونچی چوٹیاں زیادہ بلند دکھائی دیتی تھیں لیکن ایک وسیع شعاع سنہری روشنی کی پہاڑ کے مشرقی ڈھال پر پڑنے لگی جس کی گرمی سے نرم کہر پگھل گئی اور لالۂ سرخ کھل گیا۔ . . . .

دو سیاہ اور دھندلی شکلیں اس روشنی کو دور سے دیکھ رہی تھیں اور بہت دیر سے اس تک پہونچنے کی کوشش کرتی تھیں رفتہ رفتہ ایک ساتھ روشنی میں پہنچیں۔ وہ دونوں حقیقی بھائی تھے لیکن روشنی میں قدم رکھتے ہی اُن کے تیور بدل گئے اور پیشانی پر بل پڑنے لگے۔ دونوں نے ایک دوسرے سے غصہ میں پوچھا "تیرا یہاں کیا کام ہے؟" "یہ روشنی میری ملکیت ہے" دوسرے نے جواب دیا "اے بیوقوف! تو جھوٹا ہے نہیں۔ یہ روشنی تیری نہیں میری ملکیت ہے۔ دونوں غصّے سے سُرخ ہو گئے برادری کا خیال تک جاتا رہا غصّہ اور دیوانگی میں ایک دوسرے سے لڑنے لگے۔ کس لیے؟ اس روشنی کے لیے جو درحقیقت ان کی ملکیت نہ تھی۔ لالہ اُن کے پاؤں میں دب کر ہمیشہ کے لیے ختم ہو گیا اور ایک خون کی ندی بہنے لگی۔ دفعتاً ایک سایہ اس کے درمیان حایل ہو گیا۔ یہ سایہ "موت" تھا دونوں خوف سے پیچھے ہٹ گئے۔ ایک نے دوسرے کو غور سے دیکھا دونوں کی رنگت زرد پڑ گئی اور تیزی سے وہ بھاگ گئے۔ سایہ اُن کے ہمراہ ہو لیا۔ خون زمین میں جذب ہو گیا۔ اور لالہ پھر کھل گیا۔ خدا کا نور اسی طرح پہاڑ پر قائم رہا۔ . . . .

اس نور میں دو شہزادیاں جو سر سے پا تک زر و جواہر میں لدی ہوئی تھیں دکھلائی دیں۔ ان کے درمیان ایک بردا زبچہ تھا جس کو وہ گھسیٹتی لائیں جو ناتوانی اور ضعف سے قریب مرگ تھا روشنی میں پہونچکر ایک دوسرے کے روبرو کھڑی ہوئیں ایک نے دوسرے سے غصہ کے لہجہ میں کہا بچہ کی طرف اشارہ کر کے "محبت کو چھوڑ۔ دیکھ ہم اپنے منزل مقصود پر پہونچ گئے ہیں۔ میری خوبصورتی کی وجہ سے یہ روشنی اور محبت میری ملکیت ہیں۔" دوسری نے جواب دیا "مکارہ۔ جہاں میں ہوں وہاں تیری خوبصورتی کیا حقیقت رکھتی ہے میں دنیا کی ملکہ ہوں محبت میری حلقہ بگوش ہے اور یہ نور میری وراثت ہے" سایہ پھر نمودار ہوا۔ دونوں خوف سے

زرد ہوکر مثل روح کے پرواز کر گئیں۔ مگر بچہ وہیں کھڑا روتا رہا۔

اور خدا کا نور اسی طرح پہاڑ پر قایم رہا۔ . . . .

ایک تنہا تھکا ماندہ مسافر روشنی میں نمودار ہوا وہ ننگے سر تھا۔ آنکھیں آسمان کی طرف کیے ہوے۔ وہ ٹھہرا اس نے ادھر اُدھر دیکھا اور مسکرا کر خاموش ہو گیا: اُسکے چہرے سے تھکن کے آثار نمایاں تھے اس کے ہاتھ محنت کی وجہ سے سخت ہو گئے تھے اس کا چہرہ زرد تھا مگر خوبصورت۔ اس نے ایک ٹھنڈی سانس لی اور کہا اے خدا تیرا ہزار ہزار شکر۔ . . . . یہ نور تیرا ہی۔ . . . . . بچہ روتا ہوا بڑھا اور اُس کے قدم چوم لیے۔ بچے نے ہچکیاں لیتے ہوے دریافت کیا کہ اے شخص تو کون ہی کہ اس نور کی تلاش میں تو نے اس قدر محنت اُٹھائی اور بجاے رشک اور حسد کے شکر ادا کرتا ہی۔ مسافر نے مسکراتے ہوے جواب دیا۔ میں بے یار مددگار ہوں مجھ سے سب کو نفرت ہے دنیا میں میرے پاس کچھ نہیں حتیٰ کہ مجھے کوئی آفرین کہنے والا بھی نہیں ہی تنہا ہی میں نے اس نور کو ڈھونڈھا اور دریافت کیا اس لیے میں اپنے مالک کا شکریہ ادا کرتا ہوں کہ اُس نے مجھے ناامید نہ پھرایا۔ مجھ سے انسانوں کو سخت نفرت ہی کیونکہ میرا نام "سچائی" ہی۔

دوبارہ سایہ ظاہر ہوا۔ مگر اب کی دفعہ وہ سایہ نہ تھا بلکہ ایک نور تھا جس نے پہلے نور کو دوبالا کر دیا تھا۔ تھکا مسافر اس نور کو دیکھ کر اور طاقتور ہو گیا۔ اور محبت نے اپنے لڑکپن کے آنسو پونچھے . . . .

. . . . دور بہت دور ایک شیریں آواز فرشتوں کے گانے کی سنائی دی۔ اور خدا کا نور پہاڑ پر اور زیادہ وسیع ہو گیا۔

جلیب احمد (صدیقی)

اے دانۂ تسبیح خیالت دل دانا — سر حلقۂ مستان رُخت دیدۂ بینا
یک توشہ کش وادی شوق تو توکل — یک گم شدۂ راہ خیال تو تمنا
جائے کہ شود سایہ فگن پرتو مہرت — خورشید شود مردمک دیدۂ حربا
در میکدۂ ذات درک فلاطون خم آبی — در انجمنت مغز خرد پنبۂ مینا
عیش ابد از مست تو یک خندۂ پرکار — عمر خضر از شوق تو یک آبلۂ پا
مشغول بذکر تو اگر نیست شب و روز — تسبیح حباب از چہ بود در کف دریا
گر کوہ کمر بستۂ حمد تو نباشد — تنہا نہ شود معتکف خلوت صحرا

راز الہ آبادی

بنات النعش و کہکشان

مدت ہوئی کہ دنیا ایک زبردست خشک سالی کا شکار رہوئی آفتاب کی قیامت خیز تپش نے دریا اور کنوئیں جھیل اور تالاب چشمے اور سمندر شجر و حجر سب خشک کردیے۔ وحوش و طیور، چرند و پرند حتیٰ کہ انسان بھی اس کے اثر سے نہ بچ سکے۔ درخت مرجھا گئے۔ خس و خاشاک انتہائے تپش سے جل کر سوکھ گئے یعنی تمام عالم زبان حال سے الامان و العطش پکار اُٹھا۔

انھیں گرم راتوں میں ایک رات ایک دوشیزہ پیاس سے بیتاب ہوکر اپنی بیمار تشنہ دم توڑتی ہوئی ماں کے لیے پانی کی تلاش میں باہر نکلی۔ ہرچند تگ و دو کی مگر ناکام رہی آخر تھک کر ایک سوکھی گھاس کے فرش پر بس نے تخیل کی موانست سے اپنی طرف اُسے کھینچ بلایا تھا۔ دم کے دم آرام لینے کو لیٹ گئی۔ ابھی لیٹی ہی تھی کہ نیند کی پرکیف شراب نے تھوڑی دیر کے لیے اُسے دنیا و مافیہا دونوں سے بے خبر کردیا۔

تھوڑی دیر بعد آنکھ کھلی اپنی غفلت پر نادم آنکھوں میں آنسو ڈبڈبائے اُٹھی اور جلدی سے صراحی کو اٹھا لیا۔ اس کی حیرت کی کوئی حد نہ تھی جب صراحی صاف و شفاف تازہ پانی سے لبریز ملی۔

شدت پیاس نے لب ہائے شیریں کو صراحی سے لگا دیا ہوتا اگر مریض ماں کا خیال دامنگیر نہ ہو جاتا۔ لڑکی نے صراحی کندھے پر رکھی۔ اور گھر کی سمت روانہ ہوگئی۔

پانی کے اس حیرت انگیز طریقے پر پانے کی خوشی، ماں کے خیال میں کامل استغراق۔ اپنی غفلت و تساہل پر ندامت اسکے تخیل کو اسقدر گھیرے ہوے تھے کہ راستہ میں پڑے ہوے کتے سے ٹھوکر کھائی اور صراحی سمیت زمین پر آرہی۔

بیزبان کتا، زبان نکالے، اُس کے چاروں طرف گھوم گھوم کر زبان حال سے پیاس کی شکایت اور پانی کی التجا کر رہا تھا۔ لڑکی نے ناامید ہوکر صراحی اُٹھائی تاکہ بچا کھچا پانی کُتے کو پلا دے۔

اسکے استعجاب کی کوئی انتہا نہ تھی کہ پانی کا کوئی قطرہ صراحی سے نہ گرا تھا۔ اُس نے تھوڑا سا پانی چلو میں ڈالکر کتے کو پلا دیا اور صراحی اُٹھائی تو وہ چاندی کی ہوگئی تھی گھر پہونچی، صراحی ماں کے پاس رکھی،

کٹورے مین پانی لاکر پیش کیا۔ مان نے انتہائی الفت سے کہا کہ "بیٹا! مجھے تو مرنا ہی ہو تم اپنا کلیجہ ٹھنڈا کرلو۔"

پیاس ناقابل برداشت تھی لڑکی نے تعمیل حکم مین خشک ہونٹھ پانی سے لگائے بھی نہ تھے کہ ایک اجنبی گھر مین داخل ہوا اور پانی طلب کیا۔ لڑکی نے بغیر پیے کٹورہ اسکے ہاتھ مین دیدیا۔

یکایک سات بڑے بڑے چمکتے ہوے ہیرے پانی سے تڑپ کر حسین دوشیزہ کی گود مین آگرے اور صراحی مین سے ایک صاف وشفاف پانی کی نہر جاری ہوگئی جسکا ہر قطرہ ایک چمکتا ہیرا تھا۔ رفتہ رفتہ یہ ہیرے بلند ہوتے گئے یہانتک کہ منتہائے نظر پر پہونچ گئے۔

آجتک یہ وہین قائم ہین اور دنیا اُن کو نبات النعش اور کہکشان کے نام سے یاد کرتی ہی۔

(ٹولسٹائے) عزت علی علوی

غزل

اُس یار پُر ہنر کو کس طرح نالون مین کچھ اثر بھی ہو
کیا وہ مری خبر کو آئے اسکو مری خبر بھی ہو

پانی بھی خون کی جگہ ضعف سے جسم مین نہین
رحم انھین کہان سے کہ آنکھ ہماری تر بھی ہو

جان پہ ابتو بن گئی کشمکش نیاز سے
اُسکے حریم ناز مین اپنا کہین گذر بھی ہو

تم کہو اُٹھ یہان سے جا ہم کہین کیون کسی کا کیا
تم بھی رہو رقیب بھی ہم بھی ہون یہ گذر بھی ہو

مستی حسن یار سے رہتی ہو اُن کو بے خبر
میری خبر کہان سے لین اپنی اُنھین خبر بھی ہو

شرم وحیا کا معاملہ ہو کہ یہ طے تو بس
شوخی و ناز کا سوال جان بھی ہو جگر بھی ہو

آصفِ خستہ کیون کرے شکوۂ بے توجہی
صدقے تری نگاہ کے ایک نظر ادھر بھی ہو

عبدالرحمٰن آصف

انجام رشک

سلیم فطرتاً حسن پرست واقع ہوا تھا۔ وہ دولتمند تھا۔ نوجوان تھا اور چونکہ اسکی نشو نما مالابار کی سرزمین پر ہوئی تھی۔ لہذا اس مین وہ تمام جذبات موجود تھے جو ایک تندرست مولا مین ہوتے ہین۔ وہ شریف خاندان کا چشم و چراغ۔ لیکن بری صحبتون نے چند ہی روز مین اسکی زندگی کو انگشت نمائی کے قابل بنا دیا۔ اسکی ناشائستہ حرکات مین روزا فزون ترقی ہونے لگی۔ اسکے والدین کی وہ سب امیدین منقطع ہو گئین۔ جو اسکی ذات سے وابستہ تھین۔ بیٹے کی آوارگی انھین خون کے آنسو رُلاتی تھی۔ وہ مجبور تھے۔ سلیم اب بچہ نہ تھا کہ ڈراتے دھمکاتے اور راہ راست پر لانے کی کوشش کرتے۔ وہ جوان تھا۔ بھلائی اور برائی مین تمیز کر سکتا تھا۔ با این ہمہ اُنھون نے اپنے گمراہ بیٹے کو راہ راست پر لانے کے لیے کوئی دقیقہ فرو گذاشت نہ کیا۔ لیکن اس کی آوارگی مین فرق نہ آنا تھا نہ آیا۔

اتفاقاً سلیم کے یہان ایک تقریب پیش آئی۔ برادری کی تمام عورتین اسکے مکان مین جمع تھین۔ باہر مردون کا ہجوم تھا۔ گھر والے انتظام مہمان نوازی مین سرگرم تھے۔ سلیم کا چہرہ آج متانت اور سنجیدگی کا مرقع تھا۔ وہ انتظامات خانہ داری مین غیر معمولی سرگرمی کا اظہار کر رہا تھا۔ ایک مرتبہ کسی ضرورت سے وہ اپنے کمرے مین گیا۔ اس کا کمرہ زنانے مکان سے ملحق تھا۔ کمرے کے آخری حصہ مین ایک دروازہ تھا جسکے بند کر دینے سے یہ کمرہ زنانے مکان سے الگ ہو جاتا تھا۔ آج چونکہ گھر بھر مین عورتین ہی عورتین تھین اس لیے بعض کمرے کے دروازے کے قریب بیٹھی تھین۔ اور بعض اس کمرہ مین آگئی تھین۔ سلیم کے دفعتہً آجانے کا کسی کو گمان بھی نہ تھا۔ کمرے مین جاتے ہی سلیم کی نظر ایک ناظورۂ جمال پر پڑی۔ جو اُس کی چھوٹی بہن کے ساتھ بیٹھی ہوئی گفتگو مین مشغول تھی۔ نظر ملی۔ سلیم سنبھلتا ہی رہا اور وہ جلدی سے زنانے مکان مین چلی گئی۔ گویا ایک بجلی تھی کہ چمکی اور فضا مین ایک سنہری لکیر بناتی ہوئی غائب ہو گئی سلیم اگرچہ بدسرشت انسان تھا۔ لیکن آنکھین جھک گئین۔ اور اُلٹے پاؤن کمرے سے واپس آگیا۔ شام کو اُس نے اپنی بہن سے باتون باتون مین دریافت کر لیا۔ کہ وہ سراپا ناز قاضی عبد اللطیف صاحب کے

گلشن زندگی کی ایک ناشگفتہ کلی ہی۔ اور اُس کا نام حسینہ ہی۔

مالابار مین قاضی صاحب کی کوئی معمولی شخصیت نہ تھی۔ شرافت علم اور دولت کے اعتبار سے اُن کا درجہ بہت بلند تھا۔ اور ہر شخص انھین عزت کی نظر سے دیکھتا تھا۔ بچپن مین قاضی صاحب نے حسینہ کی نسبت اپنے بھائی کے لڑکے یوسف سے مقرر کردی تھی۔ سلیم کے والدین اور دیگر اعزا نے بہت کوشش کی کہ حسینہ کی شادی سلیم سے ہوجاے۔ لیکن قاضی صاحب نے انکار کردیا پہلے تو بھائی کی ناخوشی کا حیلہ کرتے رہے۔ پھر صاف صاف کہدیا کہ مین اپنے لخت جگر کو ایک آوارہ اور جاہل شخص کے سپرد کرنے کے لیے ہرگز تیار نہین۔ اِس گفتگو کے چند ہی روز کے بعد حسینہ کی شادی اُسکے چچازاد بھائی یوسف سے ہوگئی۔

یہ شادی سلیم کے لیے ایک سانحۂ عظیم سے کم نہ تھی۔ اُسکی رہی سہی امید بھی جاتی رہی دنیا اُسکی آنکھون مین تاریک ہوگئی۔ دل یاس وحسرت کا ظلمتکدہ بن گیا اور اُس کے غم وغصہ کی کوئی انتہا نہ رہی۔ اب قاضی صاحب کے خاندان کا وجود بھی اُس کو ناگوار تھا۔ چنانچہ اس نے ایذارسانی کی سیکڑون کوششین کین۔ مگر قاضی صاحب کی شخصیت کے مقابلہ مین ہر مرتبہ ناکام رہا۔ رشک کی آگ اندر ہی اندر اُس کے دل وجگر کو کباب کر رہی تھی۔ اور بیگناہ یوسف کی زندگی بھی اس کی نظرون مین کانٹے کی طرح کھٹکتی تھی۔

اِس واقعہ کے چھ مہینہ بعد مالابار مین ایک عظیم انقلاب ہوا۔ آبادیان ویرانہ بن گئین۔ بڑی بڑی عمارتین مسمار ہوگئین۔ توپون اور گولون کی گڑگڑاہٹ سے مالابار کی فضا گونجتی رہتی تھی۔ اسوقت سفلہ منش سلیم کو اپنی کامیابی کا اچھا موقع ہاتھ آیا۔ وہ ایک انگریز افسر کے پاس پہونچا۔ قاضی صاحب کو غدار بتایا۔ اور غریب یوسف پر ایسے ایسے جھوٹے الزام لگائے۔ کہ انگریز افسر کو غصہ آگیا۔ دوسرے دن یوسف کو بھی خبر پہونچ گئی۔ سلیم کی لگائی ہوئی آگ عنقریب اُس کے خرمن ہستی کو جلا کر خاکِ سیاہ کرنے والی ہی پہلے تو وہ بہت پریشان ہوا۔ زندگی کے تمام جذبات جان کے دشمن نظر آنے لگے لیکن تھوڑی دیر بعد اسکی طبیعت مین ایک نمایان تغیر پیدا ہوا۔ اسکی آنکھین فرط غصہ سے سُرخ ہوگئین۔ اور دل مین انتقام کا جوش موجزن ہوگیا۔ وہ ایک بے اختیاری کے عالم مین اُٹھا۔ اور لپک کر کمرے سے تلوار اُٹھا لایا۔ اور یہ کہکر دیکھنے لگا۔ او بدمعاش ٹھہر جا۔ انتقام کا وقت قریب آپہونچا۔ موت تیرے سر پر کھیل رہی ہی۔ مین

اپنی گرفتاری سے پہلے تیرے ناپاک وجود کو دنیا سے پاک کردوں گا" یہ کہکر باہر نکلنا ہی چاہتا تھا کہ دفعتاً ایک حسین نازنین کمرے سے دوڑی ہوئی آئی۔ اور اسکے دامن سے لپٹ گئی۔ یوسف پر غیظ و غضب کا عجب عالم طاری تھا لیکن نازنین کے ان الفاظ نے اسکے جوش مین ایک افسردگی پیدا کردی "میرے سرتاج مجھے چھوڑکر کہاں چلے"!

یوسف نے کہا "شاید تم مجھے بزدل بنادوگی جاؤ خدا پر بھروسہ رکھو"!

نازنین نے کہا "نہیں میرے شوہر مین آپ کو تنہا نہ جانے دوں گی" یوسف کچھ کہنے ہی کو تھا کہ دروازہ پر شوروغل کی آواز معلوم ہوئی۔ اور یوسف خدا حافظ کہتا ہوا اپنا دامن چھڑاکر باہر چلا گیا۔ دروازے پر فوجی سپاہی مسلح موجود تھے۔ بیچ مین سلیم کھڑا ہوا اپنی کامیابی پر مسکرا رہا تھا۔ یوسف کی نظر سلیم پر پڑی دلمین ایک شعلہ بھڑکا اور وہی شعلہ بجلی بنکر سلیم کی خرمن حیات پر گر پڑا۔ یعنی یوسف کی تلوار پوری قوت سے سلیم کے سینہ مین اتر گئی۔ تلوار ابھی سینہ سے جدا بھی نہوئی تھی کہ بندوق کی ایک آواز ہوئی۔ اور دو خون آلودہ لاشین زمین پر گرکر تڑپنے لگین جنمین سے ایک سلیم کی تھی اور دوسری یوسف کی۔

ابھی نظرین رقص بسمل کے تماشہ مین مصروف تھین کہ ایک حسین عورت بیتابانہ گھر سے باہر آئی۔ اور "ہائے میرا سہاگ لُٹ گیا" کہتی ہوئی یوسف کی لاش پر گر پڑی۔

تھوڑی دیر مین ہنگامہ فرو ہوگیا۔ رشک و رقابت کی شورشین میٹ گئین۔ صرف فوجی حلقہ مین تین لاشین پڑی تھین جن پر عبرت و حسرت برس رہی تھی۔

ہادی ویلوری رکن حلقۂ ادب کانپور

ابنای زمانہ در پے شور و شر اند | انباشتۂ نفاق و عین ضرر اند
مانند قطار شتر این فرقۂ دون | بایکدگر اند و در پے یکدگر اند

(عنایت نامۂ راسخ)

از صحبت دوستان این دور خلاف | رمزے گویم اگر نگیری بگزاف
چون شیشۂ ساعت اند پیوستہ بہم | وانہا ہمہ پُر غبار رو ہا ہمہ صاف (شفائی)

نظرے خوش گذرے

مین ۲۱ - ستمبر کو بخیر و عافیت تمام لکھنؤ واپس پہونچا - مئی کا الناظر مجھے مکہ مکرمہ مین ملا تھا - جون اور جولائی کے پرچے دیر مین اور ایسے وقت شایع ہوے کہ مجھکو یہان پہونچنے کے بعد ملے - مین وہان حج سے فارغ ہونے کے بعد چونکہ ایک مہینہ سے زائد ٹھہر رہا اس لیے پرچہ نہ پہونچنے کی وجہ سے متفکر تھا اور اندیشہ کر رہا تھا کہ شاید کسی مجبوری سے پرچہ کی اشاعت ملتوی رہی - روانگی کے وقت جو انتظامات ایک حقیر و بے مایہ شخص کے امکان مین ہو سکتے تھے کر دیے گئے - گر وہ بھی ناکافی ثابت ہوے - اگست کا پرچہ میرے آنے کے وقت تیار ہو رہا تھا لیکن حضرت جلیبی کی سیاحت کے باعث مکمل نہ ہوا تھا - بہر حال ستمبر کی آخری تاریخون مین اُس کی تکمیل کرا دینے کے بعد مین یکم اکتوبر سے ہمہ تن توجہ ہو کر مصروف کار ہوا - اور ارادہ تھا کہ ستمبر و اکتوبر کے پرچے اکتوبر کے اندر اندر شایع کر کے نومبر سے پرچہ کو اصل وقت پر لے آؤن گا - اسی اندازہ سے کام بھی شروع ہو گیا تھا کہ دفعتہً پریسمین اور کاتب یکے بعد دیگرے ڈنگو بخار مین مبتلا ہو گئے - اور اس مجبوری مین ستمبر و اکتوبر کا مشترک پرچہ شایع کرنے کی ٹھانی - کئی کئی مہینے کے ایک پرچے یکجا شایع کرنا مجھے بذاتہ نہایت ناپسند ہے اور جہان تک مجھے یاد پڑتا ہے گذشتہ چودہ سال مین الناظر کا صرف ایک پرچہ دو مہینہ کا یکجا شایع ہوا ہے اور وہ بھی کب؟ جب حقیقتاً مین بجائے خود الناظر کو بند کر چکا تھا اور محض اپنے شفیق مکرم مولوی عبدالحق صاحب سکرٹری انجمن ترقی اُردو کے اصرار پر اُسے جاری رکھنے پر راضی ہوا - اُس وقت تک یہ مرض ہندوستانی رسائل مین اس قدر عام تھا کہ چھ چھ مہینے کے پرچے یکجا شایع کرنے مین مضائقہ نہین سمجھتے تھے مگر آج جبکہ خدا کے فضل سے ملک کے اکثر رسائل پابندی اوقات کا لحاظ کرنے لگے ہین یقیناً یہ امر نہایت درجہ رنج دہ ہے کہ الناظر کو جو پابندی وقت کیلیے کبھی خاص شہرت رکھتا تھا ایک نہین بلکہ مسلسل دو مشترکہ نمبر نکالنا پڑے ہین کیونکہ اس پرچہ کی اشاعت مین اتنی دیر ہو رہی ہے کہ اگر آئندہ دونون پرچے ساتھ نہ شایع کیے جائین تو اس کے یہ معنی ہون گے کہ عدم پابندی کے سلسلہ کو سال آئندہ تک جاری رکھنا منظور ہے - ناظرین کرام کو جو زحمت انتظار ہوئی اس کا معاوضہ تو کچھ ہو نہین سکتا اس لیے معافی کا خواستگار ہون -

اکتوبر کے آخری عشرہ مین میرے عزیز حاجی شیخ نظیر حسین تعلقدار گدیہ نے انتقال فرمایا۔ مرحوم ابتدا سے الناظر کے قدر دان رہے اور ذاتی سیرۃ کے لحاظ سے بڑی خوبیون کے آدمی تھے۔ تعلقدار تھے مگر اپنے طبقہ کے خلاف سادگی خلوص اور منکسر المزاجی کا نمونہ تھے۔ ظاہراً و باطناً مسلمان تھے اور اسلامی اخلاق و عادات کو قابل تقلید طور پر نباہتے رہے۔ شاعر تھے اور کتب بینی کا ذوق بھی رکھتے تھے۔ اُن کی اکثر نعتیہ نظمین احباب مین تقسیم ہونے کی غرض سے چھپ گئی تھین۔ تاریخ گوئی مین خاص مہارت رکھتے تھے۔ اور اپنے جوار اور حلقۂ اعزا و احباب مین اپنی خوبیون کی وجہ سے بہت محبوب تھے۔ اللہ تعالیٰ مرحوم کو اپنے جوار رحمت مین جگہ عطا فرمائین۔ اُن کے صاحبزادہ عزیزی شیخ زین العبا و سلمہ کو صحیح معنون مین اُن کا جانشین بنائین۔ اور اُن کے جملہ پسماندگان علی الخصوص اُن کے بھائیون شیخ مقبول حسین قدوائی و شیخ مشیر حسین قدوائی کو صبر جمیل عطا فرمائین۔ آمین۔

لکھنؤ مین جو انجمن اُردو بنانے کی تجویز تھی اور جس کے متعلق ایک جلسۂ عام گذشتہ مارچ مین ہوا تھا اور ایک عارضی کمیٹی قواعد و ضوابط وغیرہ کی ترتیب کے لیے بنا دی گئی تھی اسکی کارروائی چھ سات مہینے مین صرف اس منزل تک پہونچی ہو کہ اُس کمیٹی نے انجمن کا دستور العمل بنا دیا ہو اور توقع کے بالکل خلاف بغیر اسکے کہ کسی جلسہ عام سے اُس دستور العمل کی منظوری حاصل کی جاتی عارضی معتمد صاحب نے اُس دستور العمل کو چھپوا کر لوگون کو خطوط کے ذریعہ سے انجمن کے کارکن بننے کی دعوت بھی بھیجدی۔ تعجب ہو کہ لائق معتمد صاحب کو اتنی سی بات بھی معلوم نہین کہ اُنھین اِس دستور العمل کے نفاذ کی کوشش کا کوئی حق نہین۔ اور جو اسلوب انھون نے اختیار کیا ہو اس کو دیکھ کر بے اختیار یہ کہنا پڑتا ہو کہ

این رہ کہ تو میروی بترکستان ست

صاحب موصوف کو باوجود زبان اُردو سے یک گونہ نا آشنا ہونے کے جسقدر ہمدردی اور توجہ اِس تحریک مین ہو اس کا شکر گذار ہونا چاہیے مگر زیادہ شکر گذاری کا موقع اُس وقت ہوگا جب وہ کسی مستحق شخص کے ہاتھون مین اس انجمن کی مستقل خدمت چھوڑ سکین گے۔ اِس لیے کہ جس قسم کی یا انجمن ہو اور جہان وہ قایم ہو رہی ہو دونون پر نظر کرتے ہوے مین یہ صاف صاف عرض کر دینا چاہتا ہون کہ صاحب موصوف اس کام کے قطعاً نہین ہین۔ اگر صاحب موصوف لکھنؤ یونیورسٹی کے محدود دائرے

مین کام کر رہے ہوتے تو مجھے کچھ سروکار نہوتا لیکن اس شہر کے نام سے جو انجمن قائم کی جارہی ہو اُسے اپنے شہر کی عظمت و شہرت کے لائق بنانے کی طرف توجہ دلانا ضروری معلوم ہوتا ہو۔ بلکہ ایسی حالت مین خاموشی گناہ ہوگی۔ دستور العمل پر چونکہ ابھی جلسۂ عام کی مہر منظوری ثبت نہین ہوئی ہو اس لیے مین اس کی اشاعت الناظر مین نہین کرنا چاہتا۔ آئندہ دیکھا جائے گا۔

ہندوستان کا سیاسی مطلع حد درجہ غبار آلود ہو رہا ہو۔ مسلمانون کی حالت خصوصیت کے ساتھ نہایت نازک ہو اس لیے کہ اُنھین ہندوستان کے باہر جو اسلامی ممالک ہین ان کی بھی فکر دامنگیر ہے۔ خصوصاً جزیرۃ العرب کی جسے وہ اپنے ہادی دین (روحی فداہ) صلی اللہ علیہ وسلم کی وصیت کے بموجب دستبرد اغیار سے محفوظ رکھنا نہایت ضروری سمجھتے ہین۔

ہندوستان کے اندر یہ امر بطور اصول موضوعہ کے سمجھنا چاہیے کہ کسی قسم کی حقیقی ترقی اُس وقت تک ناممکن ہو جب تک اس ملک کے جملہ طبقے علی الخصوص دو بڑے فرقے یعنی ہندو اور مسلمان متحد و متفق نہون۔ اتحاد و اتفاق کے یہ معنی نہین کہ کوئی فرقہ اپنے مذہبی و معاشرتی قوانین کو بالاے طاق رکھ کر دوسرے فرقہ مین جذب ہو جائے بلکہ صحیح معنون مین اتحاد و اتفاق اُس وقت قایم ہو سکتا ہو جب ہندوستان کے کل فرقون کے درمیان کوئی ایسی مفاہمت ہو جائے جس کے ذریعہ سے ایک فرقہ دوسرے کے حقوق مین دست اندازی نہ کر سکے اور سب فرقے آپس مین رواداری اور ہمدردی کے ساتھ زندگی بسر کر سکین اور اُن امور کے انصرام مین جو دونون کے متحدہ مقاصد سے تعلق رکھتے ہین فرقہ وار تعصبات کو دخل نہ دین۔ اب سے تین سال پیشتر مہاتما گاندھی کی رہنمائی مین ہندوستان کے مختلف فرقے جس اتحاد و یکرنگی کے ساتھ کام کرنے پر آمادہ ہوے تھے اور تقریباً ڈیڑھ سال تک کام کرتے رہے اُس نے اِس بات کی حقیقت سے دوست دشمن سب کو آگاہ کر دیا ہو کہ ہندوستان کے مختلف فرقے متحد رہین تو حصول مدعا مین کوئی چیز سدراہ نہین بن سکتی۔ لیکن بدقسمتی سے یہ سبق اتنی جلد بھلا دیا گیا کہ آج اس ملک کے طول و عرض مین ہر طرف باہمی جنگ و جدل کے سوا کوئی صورت خیر نظر نہین آتی۔

کانگریس جسکو گذشتہ چند سال کے اندر ہندوستان کی قومی پارلیمنٹ کا امتیاز حاصل ہو گیا ہو اور اُس کے محترم رہنماؤن نے اس وقت تک جو کوششین قومی اتحاد کو از سر نو قایم کرنے کے لیے کی ہین

وہ اگرچہ فی الجملہ بار ور نہین ہوئین لیکن یہ امر بخوبی واضح ہو کہ اُنھون نے دیر یا بدیر اِس حقیقت کو سمجھ لیا ہو کہ ہندوستان کے اندر تمام ترقیون اور ہر قسم کی جد وجہد کی کامیابی کا راز اسی مین مضمر ہو اس لیے یہ امید بیجا نہو گی کہ وہ اپنی ان کوششون کو اسوقت تک برابر جاری رکھیں گے جب تک کہ موجودہ نفاق وافتراق ختم ہو کر کم سے کم ویسا ہی اتفاق و اتحاد قایم نہو جائے جو ۱۹۲۲ء کے ابتدائی مہینون تک نظر آتا تھا۔

لیکن کانگریس کی کوششون مین اُس وقت تک کامیابی ناممکن ہو جب تک خود کانگریس کے اندر اسکے رہنماؤن کے درمیان کامل اتحاد نہو۔ مولانا محمد علی لایق صد ستایش ہین کہ اُنھون نے دہلی کے اجلاس خاص مین اپنی اعلیٰ منزلت وقابلیت کو تمام دوسری باتون سے قطع نظر کر کے اسی ایک مقصد کے حصول پر صرف کیا اور اگرچہ اس وقت تک سوراج پارٹی کے رہنماؤن کی طرف سے کوئی بات ایسی نہین ظاہر ہوئی ہو جس سے یہ امید باندھی جاے کہ وہ جلد تر کانگریس کے اتحاد کو پھر قائم کرنے کے لیے کوئی قدم آگے بڑھائین گے تاہم یقین رکھنا چاہیے کہ مولانا محمد علی کی رہنمائی مین مہاتما گاندھی کے متبعین نے جس ایثار اور رواداری کا ثبوت پیش کیا ہو وہ رائگان نہ جائے گی۔

کونسلین جیسے ۱۹۲۱ء مین پُر ہوئی تھین ۱۹۲۴ء مین بھی پُر ہو جائین گی اور جیسی مایوس کُن پہلے ثابت ہوئی تھین آئندہ بھی یقیناً ہون گی۔ لیکن جن بزرگون کے حوصلہ وہمت پہلے دوسرے اہم کامون مین لگے ہوے تھے اُن کو کچھ عرصہ تک ضایع ورایگان کرنے کے بعد اور اُس کے بعد یقین ہو کہ جو سچے سوراجی ہین وہ پھر اپنے اصلی کام کی طرف واپس آ جائین گے۔ اور جو لوگ محض کونسل مین داخلہ کی غرض سے سوراجی بنے ہین اُن کی حقیقت بھی نمایان ہو جائے گی۔

مگر سوال یہ ہو کہ مولانا محمد علی اور اُن کے ہم مشرب تارکین موالات کو اس وقت تک کیا طرز عمل رکھنا چاہیے۔ اِس کا جواب مولانا محمد علی کی اُس گفتگو مین موجود ہو جو احمد آباد مین اخبار ینگ انڈیا کے نمائندہ سے اُنھون نے کی تھی اور وہ یہ ہو کہ ناگپور مین جو تعمیری پروگرام مہاتما گاندھی نے پیش کیا تھا اور جسکی بردولی مین از سر نو تجدید کی گئی تھی اسی پر قوم کی ساری توجہ کو منعطف کرا دیا جائے اور اگر کوکناڈا کانگریس مین قطعیتاً یہ مسئلہ صاف ہو گیا اور یہ معرض التوا مین نہ پڑا تو یقینی ہو کہ سال آئندہ کی جد وجہد بہتر نتایج پیدا کر سکے گی۔

مسلمانون کو ملکی آزادی کی تحریک مین کانگریس کی تابعیت کرنے کے سوا چارہ نہین ہے جو لوگ موجودہ منازعات باہمی کو حیلہ بناکر افتراق کے خلیج کو وسیع کرنے کے لئے نئی انجمنین بنانے کی جد وجہد کر رہے ہین اُنکے حالات سابقہ بتا رہے ہین کہ وہ قوم کی صحیح رہنمائی نہین کر سکتے۔ اور ایسی صورت مین کہ مسلم لیگ کا دفتر ہنوز قائم ہے اور اُسکے ارکان کی ایک مرتب شدہ فہرست بھی موجود ہے کوئی وجہ نہین معلوم ہوتی کہ تھوڑی سی توجہ کرکے اوسی کی پھر تنظیم نہ کردی جائے شیخ عبد اللہ صاحب جس انجمن کا خواب دیکھ رہے ہین وہ اگر صورت پذیر بھی ہو جائے تو زیادہ مفید نہ ہوگی اسلیے کہ اُنکے ہمخیال حضرات گورنمنٹ کے ساتھ اتحاد عمل کرکے صرف ہندوؤن سے جنگ زرگری کرسکین گے اور اگر کہین جمعیت احرار کی اُنکی مڈبھیڑ ہوگئی تو جسطرح مسلم لیگ کو جو ان ہی حضرات کی ساختہ و پرداختہ تھی چھوڑ بیٹھے۔ اس جدید انجمن سے بھی چندروز بعد کنارہ کش ہو جائینگے۔ اس حقیقت سے انکار نہین کیا جاسکتا کہ مسلمانون کو قلت تعداد کی وجہ سے ہندوؤن کے مقابلہ مین ہر جگہ نقصان اُٹھانا پڑتا ہے اور اُسوقت تک یہی حالت قائم رہے گی جب تک مسلمان خود اپنی حالت نہ سنبھالین گے۔ مگر حالات کی اصلاح کا یہ طریقہ نہین ہے کہ سرکاری پٹھو بنکر ہندوؤن سے لڑائی کی جائے۔ بلکہ مسلمانون کی اصلی اصلاح یہ ہونا چاہیئے کہ وہ خدا اور اُسکے رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) کی تابعیت اختیار کرین جسکے بعد دُنیا مین کسی بڑے سے بڑے سنگھٹن کا اندیشہ باقی نہین رہتا۔

[illegible]

...یائی مرحوم

- ...فا ۲ جلد
- ...فانۂ عشق
- ...و الغیب
- ...د خاتم النبیین ۸/
- ...ے سخن

...ی سجاد حسین مرحوم

- ...ی الذی ۸/
- ...ی الغلول ۸/
- ...ی چھری ۶/
- ...ری دنیا ۸/
- ...یا ملیٹ ۸/
- ...لسمی فانوس

...ت رتن ناتھ سرشار

- ...ا آزاد ۴ جلد
- ...ر کہسار
- ...دائی فوجدار
- ...یام سرشار
- ...ف لیلہ بطرز ناول

منشی جوالا پرشاد برق

- ...ر تالنی ۱۲/
- ...ار آستین ۱۲/
- ...بنگالی دلھن ۱۲/
- ...ر تاب ۱۲/
- معشوقۂ فرنگ ۱۲/

مولانا عبد الحلیم شرر

- قیس و لبنیٰ
- ایام عرب ۲ جلد
- فتح اندلس
- ماہ ملک
- حسن کا ڈاکو
- دربار حرام پور ۲ جلد ۱۰/
- مفتوح فاتح
- طاہرہ
- لعبت چین
- عزیزہ مصر
- غیب دان دلھن
- فردوس بریں ۸/
- فلپانا
- رویتہ الکبریٰ
- الفانسو ۱۲/
- شہید وفا ۸/
- حسن انجلینا ۱۲/
- ملک العزیز ورجنا ۱۲/
- آغا صادق کی شادی ۱۰/
- افسانۂ قیس ۳/
- حسن بن صباح ۶/
- تاریخ بغداد ۴/
- جنید بغدادی
- ابوبکر شبلی
- ولادت سرور عالم ۸/
- متعلمین اسلام ۱۲/
- درویش نندنی ۱۰/

مرزا داغ مرحوم

- آفتاب داغ
- مہتاب داغ
- یادگار داغ
- انتخاب داغ
- فریاد داغ

مولوی بشیر الدین احمد دہلوی

- دار الحکومت دہلی ۳ جلد
- تاریخ بیجاپور ۳ جلد
- حرز طفلان
- نشاط عمر
- عصائے پیری
- شمع ہدایت
- لخت جگر ۲ جلد
- حسن معاشرت
- اقبال دلھن

نیاز فتحپوری

- گہوارۂ تمدن
- ترجمہ گیتانجلی
- کیوپڈ اینڈ سائکی ۸/

سیماب اکبر آبادی

- خدیجۃ الکبریٰ
- بنت الرسول ۵/
- سفر الحسین

حکیم محمد علی خاں مرحوم

- الظاہر
- حسن سرور کامل
- حیرت کامل
- رام پیاری کامل
- دیول دیوی
- گورا
- جعفر عباسہ
- اختر و حسینہ کامل

منشی علی احمد شوق قدوائی

- ترانۂ شوق
- قاسم و زہرہ ۸/
- میاں عاقل و دراکسی ۴/

شبیر حسین جوش ملیح آبادی

- روح ادب
- مقالات زریں ۱۱/
- آوازۂ حق ۸/
- اوراق سحر ۵/
- جذبات فطرت ۳/

منشی تیرتھ رام

- فسانۂ لندن ۲ جلد
- وطن پرست
- منزل مقصود
- رودیکا کا خروج ۱۰/
- خونی ہیرا

جلال لکھنوی مرحوم

- مضمونہائے دلکش
- نظم نگارین
- سرمایۂ زبان اردو
- رسالہ تذکیر و تانیث ۸/
- افادہ تاریخ ۸/
- المنتخب قواعد

خواجہ عشرت لکھنوی

- لغات اردو
- اصول اردو ۶/
- جان اردو ۶/
- قواعد میر ۶/
- شاعری کی پہلی کتاب ۸/
- شاعری کی دوسری کتاب ۸/
- شاعری کی تیسری کتاب ۸/
- اصلاح زبان اردو ۶/
- گلدستۂ ظرافت
- زباندانی ۶/

صفدر مرزاپوری

- مرقع ادب
- بزم خیال
- مشاطۂ سخن

مولوی محمد حسین محوی

- ازواج الانبیا
- نسائی قربانیاں ۸/

حکیم احمد حسین الہ آبادی

- ترجمہ تاریخ ابن خلدون جلد اول
- 〃 دوم
- 〃 سوم
- 〃 چہارم
- 〃 پنجم
- 〃 ششم
- 〃 ہفتم
- 〃 ہشتم
- 〃 جلد نہم زیر طبع ہے
- 〃 دہم
- 〃 یازدہم
- سلطان صلاح الدین

مولوی سعید احمد مارہروی

- آثار اکبری
- حیات صالح ۶/
- حیات خسرو
- امرائے ہنود

مولوی سید ممتاز علی

- تذکرۃ الانبیا
- شیخ حسن ۱۲/

منشی نوازش علی خاں

- سفرنامہ ابن بطوطہ
- قسطنطنیہ
- ڈیوٹی

جسٹس محمود مرحوم
- کتاب الطلاق
- کتاب الشفعہ
- شرح قانون شہادت

مولوی محمد نذیر احمد
- حیات عزیز
- و کرم اروسی

خواجہ غلام الثقلین مرحوم
- روزنامہ سیاحت
- فلسفۂ اسلام

منشی محمد لطیف مرحوم
- اکبر
- اورنگ زیب
- لارڈ کلایو
- رنجیت سنگھ

مسٹر ظفر عمر بی اے
- نیلی چھتری
- بہرام کی گرفتاری
- چوروں کا کلب

پروفیسر ظفر الدین مراد
- تحفۂ سائنس
- خونابۂ عشق
- حکایات شرلاک ہومز

مولوی محمد علی ایم اے
- سیرۃ خیر البشر
- النبوۃ فی الاسلام
- جمع قرآن

پروفیسر نواب علی ایم اے
- تذکرۃ المصطفیٰ
- معارج الدین
- صحف سماوی
- شمع سخن ۱۰

مفتی انوار الحق ایم اے
- تذکرۃ الحبیب
- حقائق اسلام
- اثبات واجب الوجود
- تاریخ ابو البشر
- قوت خیال

پروفیسر الیاس برنی ایم اے
- اسرار حق
- معارف ملت
- مناظر قدرت
- جذبات فطرت
- علم المعیشت

سید ہاشمی فرید آبادی
- مشاہیر یونان و روم ۲ جلد
- تاریخ یونان قدیم

مرزا محمد ہادی بی اے
- امراؤ جان ادا ۱۲
- شریف زادہ ۱۰
- خونی عاشق
- خونی مصور
- خونی شہزادہ
- مثنوی امید و بیم

ڈاکٹر اقبال ایم اے
- ملت بیضا ۵
- مکمل ترانہ ۲
- شکوہ ۲
- جواب شکوہ ۴
- نالۂ یتیم
- فریاد امت ۴
- بلال ۱
- اکبر و اقبال ۳
- شمع و شاعر ۲
- خضر راہ

مولوی ظفر علی خان بی اے
- معرکۂ مذہب و سائنس
- خیابان فارس ۲ جلد
- ڈراما جنگ روس و جاپان
- جنگل میں منگل
- فلسفۂ ابن سینا ۴
- معاشرت ۱۰
- اپریل فول ۸

منشی احمد علی بی اے
- تاریخ تمدن ۲ جلد
- شباب لکھنؤ

مولوی عبد الماجد بی اے
- فلسفۂ جذبات
- پیام امن
- تاریخ اخلاق یورپ ۲ جلد
- مکالمات برکلے
- زود پشیمان ۸

خواجہ عبد الصمد اختر بی اے
- مشاہیر اسلام
- دمشق
- بغداد
- صدیق اکبر
- ترجمہ و شرح دیوان حافظ

مسٹر سجاد حیدر بی اے
- خیالستان
- زہرا ۱۳
- ثالث بالخیر ۸

مسٹر انیس احمد عباسی بی اے
- زلیخا
- نازنین آسینیا
- ہاجرہ کی کامیابی ۸
- احمد کشمیر نیا

مولوی عبد الحق بی اے
- قواعد اردو
- انتخاب کلام میر

مولوی معشوق حسین بی اے
- بجلی کے کرشمے
- محاربات صلیبی

مولوی سید سلیمان ندوی
- ارض القرآن جلد دوم
- حیات امام مالک
- خلافت اور ہندوستان
- بہادر خواتین اسلام
- اہل السنۃ والجماعت

پروفیسر عبد الباری ندوی
- مبادی علم انسانی
- برکلے کا فلسفہ
- مذہب و عقلیات

مولوی محمد حلیم انصاری ایم اے
- تمدن اسلام ۲ جلد
- اسلام و اقتصاد
- اسلام و رحمل (؟) رفاہ عام ۱۲
- جواہر قرآنی
- فتح اندلس
- فلاح دارین
- بچے کی تندرستی ۱۲

خواجہ حسن نظامی
- سیپارۂ دل
- روزنامہ ممالک اسلامیہ
- میلاد نامہ
- یزید نامہ
- محفل نامہ گیارھویں ۱۲
- کرشن جیون
- کم ڈھوت
- بیوی کی تعلیم
- آتالیق خطوط نویسی
- خطوط حسن نظامی ۱۲
- جگ بیتی کہانیاں
- فاطمی دعوت اسلام
- چٹکیاں اور گدگدیاں
- بیوی کی تربیت
- محرم نامہ

مولوی عبد الرشید الخیری
- صبح زندگی
- شام زندگی
- شب زندگی ۲ جلد
- نوحۂ زندگی ۱۲
- منازل السائرہ
- الزہرا ۱۲
- عروس کربلا
- جوہر قدامت
- یاسمین شام
- موعودہ

الناظر بک ایجنسی لکھنؤ

بسم اللہ الرحمن الرحیم

رجسٹرڈ نمبر لے ۴۶۵

رسالہ

الناظر

لکھنؤ

ایڈیٹر۔ ظفر الملک علوی

قیمت سالانہ للعہ ؍ مع محصول

الناظر پریس لکھنؤ میں چھپا

پرنٹر و پبلشر:۔ آفاق علی علوی

بسم اللہ

فہرست مضامین الناظر بابتہ ماہ جنوری ۱۹۲۵ء

نمبر ۱۶۳ جلد ۲۸

فصلی بخار و طحال کی دوا

فصلی بخار و طحال کی یہ ایک ہی دوا ہے۔ آجکل سیکڑوں اشتہار فصلی بخار و طحال کی دوا کے آپ دیکھتے ہونگے مگر اُن میں عموماً کونین کی جزو رہتی ہے۔ اسلیے یہ دوائیں بخار کو کچھ وقت تک تو روک دیتی ہیں مگر بڑے آرام نہیں کر سکتی ہیں۔ ایسے بخار کے لیے ڈاکٹر ایس کے برمن کی فصلی بخار و طحال کی دوا چند روز میں یک دم آرام کرنے کا خاص دعویٰ رکھتی ہے۔ اور عوام کے فائدہ کو مدنظر رکھ کر قیمت بھی بہت کم رکھی گئی ہے۔ اس میں تین خاص صفتیں ہیں (۱) ملیریا کے کیڑوں کو مار دیتی ہے۔ اسلیے چار پانچ ہی خوراک کے استعمال سے بخار کا آنا بند ہو جاتا ہے (۲) یہ خون کو گاڑھا کرتی ہے اور اسکی خرابیوں کو مٹاتی ہے (۳) یہ طحال کو گلاتی ہے۔ قیمت فی شیشی کلاں عہ، شیشی خورد ۱۰، محصولڈاک شیشی کلاں ۸، اور خورد ۶،

پرانے ملیریا بخار کی گولیاں

لرزہ بخار پرانا ہو جانے پر باری سے نہ آکر دن رات تھوڑا بہت چڑھتا ہے۔ جسم کا خون پانی سا ہو جاتا ہے اور آدمی کا رنگ پھیکا میلا ہو جاتا ہے۔ تھوڑی محنت سے کلیجہ کانپنے لگتا ہے۔ سانس پھولتی ہے۔ کھانے کی خواہش اور قوت بہت ہی گھٹ جاتی ہے۔ تلی کے بڑھنے سے پیٹ نکل آتا ہے کبھی منہ اور ہاتھ پیروں میں ورم آجاتا ہے اور زندگی وبال ہو جاتی ہے۔ ایسی حالت میں یہ گولیاں فائدہ کرتی ہیں اور چار پانچ ہی خوراک میں بخار کا آنا بند ہو جاتا ہے۔ قیمت پچیس گولیوں کی ڈبیہ ۱ر محصولڈاک ایک سے دو ڈبیہ تک ۶ر

کونین کی گولیاں

یہ چار گرین کی چھوٹی چھوٹی خوبصورت ٹکیاں بنتی ہیں اور سنہری پیٹنٹ ڈبیہ میں ہوتی ہیں۔ کونین کا استعمال کرنا ہو تو یہ گولیاں پاس رکھیے۔ اس میں نہ وزن کی ضرورت ہے نہ کھانے میں تلخی ہے۔ قیمت پچیس گولیوں کی ڈبیہ عہ محصولڈاک ۶ر

ڈاکٹر ایس کے برمن نمبر ۵ تاراچند دت اسٹریٹ۔ کلکتہ

ایجنٹ:۔ ڈاکٹر گنگا رام جیتلی۔ چوک لکھنؤ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الناظر

نمبر ۱۶۳ جلد ۲۸ — جنوری سنہ ۱۹۲۵ء

دیباچۂ تصوف اسلام

اب سے چند سال قبل، ہمارے عزیز دوست عبدالماجد صاحب کی فلسفیانہ تصانیف 'فلسفۂ جذبات' اور فلسفۂ اجتماع کے مقدمے، طبع و اشاعت کتاب سے پہلے، الناظر میں شایع ہوئے تھے۔ آج ہم اُنکی پہلی اسلامی تصنیف کا دیباچہ نذر ناظرین کرتے ہیں۔ کتاب غالبًا اسی ماہ میں چھپ کر شایع ہو جائے گی۔

عبدالماجد صاحب کے فلسفیانہ مضامین اور تصانیف کو دیکھ کر، کون کہہ سکتا تھا، کہ وہی قلم جو وجودِ باری تعالیٰ کو، مغربی عقلیت کے زعم میں، 'ناقابلِ تسلیم' قرار دے رہا تھا، اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو ایک دنیاوی لیڈر اور زعیم سے زیادہ بلند مرتبہ نہیں لکھ سکتا تھا، ایک روز ایسا آئے گا کہ خدائے وحدہ لاشریک کی الہامی کتاب قرآن اور اُسکے آخری رسول کی بتائی ہوئی راہ کی دعوت دینے کے لیے وقف ہو جائے گا۔ ذٰلک فضل اللہ یوتیہ من یشاء۔

عبدالماجد صاحب پر یہ رنگ، اس قدر گہرا چڑھ گیا ہے، کہ عہد سابق میں اُنھوں نے انگلستان کے نامور فلسفی 'ہکسلے' پر ایک کتاب لکھنا شروع کی تھی، کتاب مکمل نہیں ہوئی تھی، مگر اُسکے دو باب جنمیں ہکسلے کے سوانح رقم تھے، جب ہمنے الناظر کے لیے حاصل کرنا چاہے، تو عزیز موصوف نے اول تو مہینوں اس کو ٹالا، اور اسکے بعد جب، اصرار سے مجبور ہو کر، مسودہ ہمارے سپرد کیا، تو ساتھ ہی یہ ہدایت کر دی،

کہ ایک نوٹ لکھ کر، کھسلے اور اُس کی عظمت سے، اُنکی قطعاً بے تعلقی و برأت کا اظہار کردیں۔ کھسلے کے سوانح انشأاللہ آیندہ ہدیۂ ناظرین ہوں گے۔

وہ ناظرین الناظر جو عبدالماجد صاحب کی فلسفیانہ تحریروں کے شائق ہیں، یہ سُن کر خوش ہونگے کہ اُن کے فلسفیانہ مضامین کا ایک مجموعہ بھی دفتر الناظر کی طرف سے شایع کیا جارہا ہے، جسکے تقریباً نصف اجزا چھپ چکے ہیں، اور بقیہ نصف اُمید ہے کہ دو تین ماہ میں چھپ جائیں گے۔ ایڈیٹر

اسلام خدا کی طرف سے بندوں کے حق میں کامل ترین و جامع ترین پیام رحمت ہے، انسان کی ذہنی و عقلی، اخلاقی و معاشری، جسمانی و روحانی، تمام ضرورتوں کا کفیل اور ہر شعبۂ حیات میں ترقیوں کا ضامن۔ خدارسی و خداشناسی کی تعلیم اس کا اصل مقصود تھی، اِس پر اُس نے خاص طور سے زور دیا اور اس کے ذرائع و وسائل اُس نے اِس جامعیت کے ساتھ بیان کیے کہ اِن میں کسی قسم کے تغیر و ترمیم، تخفیف و اضافہ کی گنجایش نہ چھوڑی۔

مسلمانوں میں ابتدا سے ایک گروہ ایسا موجود ہے جس نے تمام مقاصد دُنیوی سے قطع نظر کر کے، اپنا نصب العین محض یادِ خدا و ذکر الٰہی کو رکھا ہے اور سلوک مقیدہ کے مختلف طریقوں پر عمل کرتا رہا ہے۔ شروع شروع میں یہ گروہ دوسرے ناموں سے ملقب رہا، ایک طویل عرصہ گذر جانے کے بعد رفتہ رفتہ اسکے مسلک کا نام مسلکِ تصوف پڑ گیا، اور یہ گروہ گروہ صوفیہ کہلانے لگا۔ اصطلاح "تصوف" کب سے رائج ہوئی؟ اس بحث کا یہاں موقع نہیں، اور نہ اس لفظ کے اشتقاق اور اسکی تحقیق لغوی کو اسوقت بیان کرنا مقصود ہے۔ یہاں کہنا صرف یہ ہے کہ اس گروہ کے اکابر قدیم پہلے مسلمان تھے پھر صوفی، وہ تصوف کو اسلام کے مقابل ایک جداگانہ مسلک نہیں سمجھتے تھے، بلکہ اسلام کے ماتحت اسی کی پاکیزہ ترین صورت کو کہتے تھے، وہ اپنے اسلام کو تصوف پر مقدم رکھتے تھے اور تصوف کو محض اس لیے عزیز و محبوب رکھتے تھے کہ وہ اُنکی نظر میں اسلام کی خالص ترین و پاکیزہ ترین تعبیر تھی۔

صفحات آیندہ میں بعض قدیم اکابر صوفیہ رحمۃ اللہ علیہم کی اصل تصانیف کی مدد سے یہ دکھانے کی کوشش کی گئی ہے کہ اِن حضرات کے نزدیک تصوف کا مفہوم اس قدر تھا کہ اتباع کتاب و سنت میں انتہائی سعی کی جائے، اُسوۂ رسول و صحابہ کو دلیلِ راہ رکھا جائے، امر و نواہی کی تعمیل کی جائے، طاعات و عبادات

کو مقصودِ حیات سمجھا جائے، قلب کو محبت و تعلق ماسوا سے الگ کیا جائے، نفس کو خشیت الٰہی سے مغلوب کیا جائے اور صفائیِ معاملات و تزکیۂ باطن میں جد و سعی کا کوئی دقیقہ فروگذاشت نہ ہونے پائے۔

حضرت شیخ جیلانیؒ بلکہ اُن کے مُریدِ با اختصاص، اور بانیِ سلسلۂ سہروردیہ حضرت شیخ شہاب الدین سہروردیؒ تک کی تصانیف میں یہ اسلامی عنصر قائم اور یہی رنگ غالب ہے۔ اس زمانہ کے بعد شیخ ابن عربیؒ[1] کے اثر سے نظام تصوف میں فلسفیانہ عنصر کو غلبہ ہونے لگا، وحدت وجود وغیرہ کے مسائل پیدا ہونے لگے۔ اور فارسی شاعری کے اثر سے ان تخیلات کو اور تقویت ہوتی گئی۔ چنانچہ مُلا جامی کی لوائح (جیسا کہ آگے چل کر اسی تبصرہ کے ذیل میں ظاہر ہوگا) ایک اچھی خاصی فلسفیانہ تصنیف کی حیثیت رکھتی ہے۔ تاہم نویں صدی کا یہ تصوف بھی اگرچہ ابتدائی صدیوں کے تصوف سے بہت کچھ منحرف ہو چکا تھا، اُن رسم پرستیوں سے کوئی مناسبت نہیں رکھتا جن پر آج اکثر خانقاہوں اور درگاہوں میں تصوف کا اطلاق ہوتا ہے۔

تصوف کی موجودہ مسخ شدہ شکل یونانی اوہام، ایرانی تخیلات، ہندی مراسم، اور دیگر غیر عناصر کا ایک معجون مرکب ہے جس کے صرف بعض اجزا اسلامی کہے جا سکتے ہیں، اور وہ بھی بڑی تلاش و دیدہ ریزی کے بعد نظر آتے ہیں۔ حاشا ثم حاشا، یہ اسلامی تصوف نہیں۔ اسلامی تصوف وہ تھا جو خود حضرت سرور کائنات صلعم کا تھا، جو ابوبکر صدیقؓ و علی مرتضیٰؓ کا تھا، جو سلمانؓ و ابوذرؓ کا تھا، جس کی تعلیم جنید بغدادیؒ و رابعہ بصریؒ دیتی رہے، جس کی ہدایت شیخ جیلانیؒ و شیخ سہروردیؒ، مرشد اجمیریؒ و محبوب دہلویؒ، خواجہ نقشبندیؒ و مجدد سرہندیؒ کرتے رہے، اور جس کی دعوت اس دور آخر میں شاہ ولی اللہ دہلویؒ کی زبان قلم دیتی رہی۔

خواجہ معین الدین اجمیریؒ سلسلۂ چشتیہ کے مسلّم مقتدا اور بزرگ گزرے ہیں۔ ملفوظات مبارک کا مجموعہ دلیل العارفین کے نام سے خواجہ قطب الدین بختیارؒ کا فراہم کیا ہوا شائع ہو چکا ہے۔ رسالہ مذکور اول سے آخر تک نماز و عبادات کی تاکید اور اتباع سنتِ رسولؐ کے فضائل سے لبریز ہے، وضو وغیرہ کے بعض معمولی سُنن کی پابندی پر اتنا زور دیا ہے کہ آج اکثروں کو فرائض میں اس کا نصف اہتمام بھی نصیب نہیں۔ اور اس باب میں اس سے بھی زیادہ قابل ذکر حضرت شیخ جیلانیؒ کی کتاب غنیۃ الطالبین ہے، جو شروع سے آخر تک بجائے کسی درویش و صوفی کے ایک ٹھیٹھ فقیہ اور عالم متشرع کی فقہی

---

[1] شیخ ابن عربیؒ شیخ سہروردیؒ کے معاصر تھے۔

تالیف نظر آتی ہے۔

سلسلۂ عالیہ چشتیہ کے ایک اور گوہر درخشاں خواجہ نظام الدین سلطان المشائخ دہلویؒ تھے جنکے ملفوظات میں سب سے زیادہ معتبر رسالہ فوائد الفواد (مرتبۂ امیر حسن علا سنجریؒ) اور حالات و سوانح میں رسالہ سیر الاولیاء (مرتبۂ میر خورد دہلویؒ) موجود ہیں۔ ان رسائل کے چند اقتباسات ملاحظہ ہوں:۔

"بندہ را پیش طلبید و فرمود کہ باید کہ مشغول پیوستہ بطاعت و عبادت باشی" (ص۲۴ فوائد الفواد مطبوعہ نولکشور)

"حکایت در جماعت متحیراں افتاد .... یکے از حاضراں حکایت کرد کہ من وقتے جائے رسیدم واں چنیں جماعت کس را دیدم دو چشم در آسماں داشتہ شب و روز متحیر ماندہ مگر آنکہ وقت نماز درمی آمد، ایشاں نماز می گذاردند وباز ہمچناں متحیر می ماندند خواجہ ذکرہ اللہ بالخیر فرمود کہ آرے انبیاء معصوم اند و اولیا محفوظ ہمچنیں باشد کہ لغتی اگرچہ شب و روز متحیر باشند اما نماز ایشاں فوت نشود" (ص۱۴۲ ایضاً)

"طائفہ کہ ظاہر ایشاں آراستہ باشد و باطن خراب، آں قوم متعبداں اند...... طائفہ کہ باطن ایشاں آراستہ و ظاہر خراب، آں مجانین اند۔ طائفہ کہ ظاہر و باطن ایشاں خراب باشد آں عوام اند۔ و طائفہ کہ ہم ظاہر ایشاں آراستہ باشد و ہم باطن آں مشائخ اند"

(ص۱۳۲۔ ایضاً) "چوں عمر عزیز سلطان المشائخ بہ ہشتاد کشید، پنج وقت نماز بجہت جماعت بالائے بام جماعت خانہ کہ عمارتے بس رفیع ہست فرود آمدے و یاران و ہشیاں و عزیزاں کہ دراں جمیع ملکوت حاضر می شدند نماز گذاردے" (سیر الاولیاء ص۱۲۴)

اکابر چشتیہ کی زندگیاں علی العموم صحیح اسلامی تصوف کا نمونہ تھیں تفصیل کسی مناسب موقع پر بیان ہوگی۔

عہد نبوت سے تقریباً ایک ہزار سال گزرنے پر، شیخ احمد سرہندیؒ پیدا ہوئے، جنھوں نے نہ صرف سلسلۂ نقشبندیہ بلکہ تمام سلاسل تصوف میں تجدید و اصلاح کا صور اس بلند آہنگی کے ساتھ پھونکا کہ اسکی صدائے بازگشت آج تک دنیائے اسلام کے در و دیوار سے آرہی ہے۔ شیخ موصوفؒ کے مکتوبات کے ضخیم دفتر ملک میں شایع ہو چکے ہیں ان میں شروع سے آخر تک، مختلف اسلوبوں اور پیرایوں پر، صرف ایک ہی دعوے کی تکرار، صرف ایک ہی دعوت کا اعادہ ہے، اور وہ یہی ہے کہ صوفیہ کو عقائد و اعمال ہر شے میں کتاب و سنت ہی کو اپنا دلیل راہ بنانا چاہیئے اور اسکے خلاف کسی کے

بھی اقوال ہوں اُنھیں مردود سمجھنا چاہیے۔ چند اقتباسات ملاحظہ ہوں :-

"بدانکہ از جملۂ ضروریات طریق سالک اعتقاد صحیح است کہ علمائے اہل سنت آں را از کتاب و سنت وآثار سلف استنباط فرمودہ اند.... واگر بالفرض خلاف آں معانی مفہومہ بکشف و الہام امرے ظاہر شود آں را اعتبار نباید کرد و ازاں استعاذہ باید نمود" (مکتوبات مجددی حصہ ۵ ص ۴۲ مطبوعہ امرتسر)

"محمد رسول اللہ محبوب رب العالمین است ہر چیز کہ خوب و مرغوب است از برائے مطلوب و محبوب است، لہذا حق سبحانہٗ تعالیٰ در کلام مجید خود می فرماید انک لعلیٰ خلق عظیم و نیز می فرماید تعالیٰ و تقدس انک لمن المرسلین علیٰ صراط مستقیم و نیز فرمودہ تعالیٰ و تقدس ان ہذا صراطی مستقیما فاتبعوہ ولا تتبعوا السبل، ملت او را علیہ الصلوٰۃ والسلام صراط مستقیم خواندہ وما سوائے او را از اخل سُبُل گردانیدہ، و اتباع آں منع فرمودہ ...... باطن متمم ظاہر است و مکمل آں سر موئے با یکدگر مخالفت ندارد ..... پس سالکانِ سُبل طریقت و حقیقت را اگر در اثنائے راہ امورے کہ بظاہر با شریعت در جنگ اند ظاہر شوند و ظاہر سازند مبنی بر سکر وقت و غلبۂ حال است، اگر ازاں مقام گذرانند و بصحو آرند آں منافات بالکلیہ مرتفع می شود وآں علوم متضادہ بہ تمام ہبا، منثوراً کردند" (ایضاً، حصہ ۲۔ ص ۳۹۲)

مکتوبات مجددی کی ایک ایک سطر اسی تعلیم سے لبریز ہے۔ دورِ آخر میں یہی دعوت شاہ ولی اللہ دہلوی نے اپنی مختلف تصانیف، وصایا، القول الجمیل، فوز الکبیر وغیرہ کے ذریعہ سے پیش کی۔ نیز ان کے صاحبزادے شاہ عبدالعزیز نے اپنی ملفوظات، فتاویٰ و اجزاء، تفسیر کے اوراق میں۔

اس رسالہ کو افسوس ہے کہ بعض وجوہ سے بہت مختصر رکھنا پڑا۔ طبع دوم کی نوبت اگر آئی تو انشاء اللہ چند مزید ابواب کا اضافہ کر دیا جائے گا۔ خدائے پاک و برتر اس حقیر خدمت کو قبول فرمائے اور دورِ حاضر کے مسلمانوں کو صحیح اسلامی تصوف کے سمجھنے اور اُس کے اختیار کرنے کی توفیق نصیب کرے۔

عبدالماجد
دریاباد۔ بارہ بنکی

ہندوستان میں مسئلۂ ارتقا

ہر ملت، ہر قوم، ہر ملک کی قدیم مقدس کتابوں میں ابتدائے عالم اور خلقت انسانی ایک نہ ایک طور پر بیان کی گئی ہے۔ اگر ہم ہندوؤں کے اوتاروں کے بیانات کو اسی قبیل سے سمجھ کر تاویلات سے کام لیں تو یوں کہہ سکتے ہیں:—

پورانوں میں زائد تر اوتاروں کا ذکر ہے۔ اوتار کے معنی نشان قدرت الٰہی یا ظہور قدرت الٰہی مانے جائیں تو پھر کوئی پیچیدگی غیروں کے لیے پیدا نہیں ہوتی۔ مسٹر ڈاروِن نے خلقت انسانی اپنے طور پر لکھی ہے اور ہندوؤں نے اپنے طور پر اس سے بہت پہلے بیان کی ہے۔ طرز بیان جدا جدا ہے لیکن ماحصل ایک ہے۔ پانی سے کائی اور کائی سے پانی کے کیڑے یا مچھلیاں ظہور میں آئیں۔ حکمائے ہند اسے یوں کہتے ہیں کہ جب کائی سے جاندار چیزیں پیدا ہونے لگیں تو فقط راستہ پر ارتقا چلا۔ گھونگھے یا سنکھ کی صورت کے جاندار پیدا ہونے لگے حالانکہ راہ راست پانی کی خلقت تھی۔ زندگی کے لیے جھگڑنا فطرتی امر ہے۔ جسے Struggle for existence یا تنازع للبقا کہتے ہیں۔

مچھلیوں نے سنکھ پر فوقیت حاصل کی تاکہ ارتقا راہ راست پر آجائے اور سنکھ کی طرح ترقی نہ ہو۔ اس لیے ابتدائے خلقت میں مچھلیوں کا گھونگھے یا سنکھ سے لڑنا اور ان پر غالب ہوکے ترقی کے میدان میں ذی روح کے لیے راستہ صاف کرنا مذکور ہے۔ یہ قدرت خداوندی ابتدائے خلقت میں "مچھ اوتار" کے نام سے موسوم کی گئی۔

پھر مچھلی سے ترقی کرکے کچھوے کی صورت ذی روح نے اختیار کی۔ اب تک تمام پانی ہی پانی تھا۔ اور کچھوؤں کی بود و باش کے لیے صرف پانی کافی نہ تھا زمین کی بھی ضرورت تھی۔ کچھوؤں نے دیتوں کو مار کر انکے منجمد خون سے زمین بنائی۔ خدا کی یہ قدرت "کچھ اوتار" کے کارناموں سے ظاہر کی گئی۔ اور یہ گویا خلقت انسانی کا دوسرا زینہ ہے۔

پھر بڑے جانوروں میں وہ تمام اندریاں جو کچھوؤں میں چھپی ہوئی تھیں خوب نمایاں ہوئیں۔

اور انکو یہ فکر ہوئی کہ پانی زمین کو تہِ آب نہ کردے۔ اور اس لیے ملائکہٴ آب سے بڑی جانوروں کی لڑائی کی صورت دکھاکر بڑی جانوروں کی قوت باراہ اوتار سے تعبیر کی گئی۔ اور زمین کو سیلاب سے بچانے کے لیے مناسب تدابیر کرنے کا نام باراہ کا ہرناکس کو مغلوب کرنا بیان کیا گیا۔ واضح رہے کہ مچھ اوتار تک زمین کا وجود نہ تھا۔ کچھ اوتار کے زمانہ میں اُس کا وجود ہوا اور باراہ اوتار کے زمانہ میں اُس کا استحکام ہوا۔

اب رفتہ رفتہ حیوانات نے صورتِ انسانی قبول کی۔ گو ابتک انسان حیوانوں سے بہت ممتاز نہ ہوے تھے۔ لیکن جو جامۂ انسانی میں تھے اُن پر خالق عالم کا ماننا بوجہ عقل انسانی لازم تھا۔ راجہ ہرن کسب بوجہ اپنی قوت و اختیارات کے منکر ہوا اور خالقِ عالم کو بھولا اور اُسکے بیٹے پرہلاد نے اُسکے خیالات کی مخالفت کی۔ اُس وقت تک عقل انسانی ایسی مکمل نہ ہوئی تھی کہ جانوروں سے اُنکی قوت بڑھی ہوئی سمجھی جاتی۔ ہرن کسب کو جس نے ہلاک کرکے پرہلاد کو اُسکے غضب سے بچایا اُسکی صورت نرسنگھ کی سی نمایاں ہوئی اور اُسے نرسنگھ اوتار کا لقب دیا گیا۔ یہاں سے انتظامِ عالم کا چوتھا دور شروع ہوتا ہے۔ اور یہ تعلیم دی جاتی ہے کہ جو انسان کسی طرح راہ راست پر نہ آئے اُسکا علاج ہلاکت ہے۔

اسکے بعد انسان نے اور ترقی کی اور ملک کا مالک بڑا راجہ بل ہوا۔ جسکی قوت ہر طرح بظاہر لازوال تھی۔ لیکن ایک چھوٹے قد والے آدمی نے جسے حکمت میں زیادہ تر دخل تھا تمام ملک سے اُسے بے دخل کردیا اور وہ "بادن اوتار" کہا گیا۔ اس سے خدا تعالیٰ کی یہ قدرت ظاہر ہوئی کہ انسان کی اصلی قوت اُسکی حکمت یا عقل ہے جو بادن اوتار میں زیادہ تر اور راجہ بل میں کمتر تھی۔

عقل اور حکمت جوہر انسانی ہیں۔ اس لیے ان کا ظہور شان کبریائی سے مکرر پرسرام اوتار کے ذریعہ سے ہوا۔ جس نے تمام حکمراں قوموں کو تہ وبالا کردیا۔ اور یہ سبق راجاؤں کو دیا کہ برہمنو یعنی ذی علموں کو وہ کبھی حقیر نظر سے نہ دیکھیں۔

راما اوتار کے ذریعہ سے حُبِّ قومی کا سبق دیا گیا۔ اور اُسکے ساتھ ہی بڑوں سے ادب کرنے کا بہترین نمونہ دکھا دیا گیا۔

جب زمانہ بہت کچھ ترقی کر چکا کرشنا اوتار کے ذریعہ سے حکمت، عدل، اور بہادری کا جو الگ الگ صفات ہیں ایک ساتھ استعمال کرنے کا نمونہ دکھایا گیا اور سری کرشن جی اس لیے خدا کے اوتار کہے گئے کہ انکے کارناموں اور تعلیمات میں خلقت انسانی بجمیع کمالات مکمل صورت میں نمایاں ہوئی۔ یعنی جس خلقت کی ابتدا مچھ اوتار کے زمانہ میں ہوئی تھی اب وہ انکے زمانہ میں مکمل صورت قدرت الٰہی میں ظاہر ہوئی۔

پوران کے اوتار ختم ہوئے لیکن ویدک پیشین گوئی پر نظر ڈال کر گوتم کو بھی بعض لوگ بدھ اوتار کہتے ہیں کہ اسکے ذریعہ سے قوم میں غرور و شان حکمرانی سے جو غیر مساوات کا خیال پیدا ہو چلا تھا اور جو ترقی کا لازمی نتیجہ تھا اُسکا استیصال بدھ کے ذریعہ سے ہوا۔ بعض لوگ کبیر صاحب کو جو حال میں گذرے ہیں اور جن کا سمادھ مگھر ضلع بستی ہے بدھ سمجھتے ہیں۔

انتہائے ترقی کا نتیجہ زوال ہے۔ اس لیے یہ خبر ہے کہ کسی بدترین زمانہ میں اصلاح قوم کے لیے ایک اوتار کلکی نام کا بھی ظہور ہوگا جو انسان کی گرتی ہوئی حالت کو پھر درست کریں گے۔

ابوالفضل محمد احسان اللہ عباسی (گورکھپور)

شکریہ

اصحاب ذیل دلی شکریہ قبول فرمائیں کہ انھوں نے الناظر کی توسیع اشاعت میں حصہ لیا۔

قاضی ضیاء الدین احمد نگینہ (گڑگانوں) ۱ خریدار مولوی ضیاء احمد ایم اے بدایوں ۱ خریدار

قاضی غلام نذیر بی اے ایل ایل بی بدایوں ۲ " مولوی محمد اسحق ناشط موسیٰ خیل (بلوچستان) ۱ "

گذشتہ چھ ماہ کے اندر ایک سو سے کم نئے خریدار احباب کی عنایت سے ہوئے ہیں۔ یعنی جتنی خواہش کیگئی تھی اُسکے نصف کے قریب۔ امید ہے کہ اس ششماہی میں بقیہ تعداد بھی پوری کر دیجائیگی۔

الناظر کا حجم اگرچہ ہمارے حوصلہ اور معاونین قلمی کی عنایت کے مقابلہ میں بالکل ناکافی ہے مگر موجودہ حالت میں کسی اضافہ کی گنجائش نہیں ہے، اسلیے نئے مسطر میں کچھ اور گنجائش نکالنے ہی پر قناعت کیجائیگی۔ البتہ جون تک اگر خریداروں کی تعداد میں معقول اضافہ ہوگیا تو انشاء اللہ حجم بڑھاکر پورے سو صفحے کردیے جائیں گے۔ وما توفیقی الا باللہ ظفر الملک

تاریخ عرب

مصنفۂ موسیو سیدیو فرانسیسی - مترجمہ مولوی عبدالغفور صاحب رامپوری و مولوی محمد حلیم صاحب انصاری ردولوی۔ تعداد صفحات (۵۷۲) ناشر:- الناظر بک ایجنسی لکھنؤ۔
قیمت:- قسم خاص (مجلد چرمی) سعہ قسم عام (مجلد پارچہ) صمہ ر

"تاریخ عرب" اصل میں مشہور و معروف فرانسیسی مستشرق موسیو سیدیو کی تصنیف ہے اور آج سے کم و بیش ۶۰ برس قبل لکھی گئی تھی، پھر تقریباً ۱۳۰۵ھ میں مصر کے سررشتۂ تعلیمات کی توجہ سے اسکو عربی میں منتقل کیا گیا، اور اب ۱۹۲۴ء میں ہندوستان میں شائع ہوئی ہے۔

کل کتاب سات مقالوں اور مختلف ابواب پر منقسم ہے۔ اور جزیرہ نمائے عرب کے جغرافیہ اور تاریخ قبل بعثت رسول کریم صلعم سے لیکر اس میں شمالی افریقیہ کے اُسوقت تک کے حالات آگئے ہیں جب آج سے ساٹھ ستر برس قبل فرانس اس سرزمین میں اپنے قدم جما رہا تھا۔ اور چونکہ کتاب کی تصنیف اور اس اقتدار و سیادت کا زمانہ بالکل ایک ہی ہے اس لیے اس میں سیاسی رنگ بھی ایک حد تک پایا جاتا ہے۔ فرانس کو اُس وقت ضرورت تھی کہ افریقیہ کے عربوں کی تالیف قلوب کی جائے اور اُن پر یہ ظاہر کردیا جائے کہ اہل فرانس نہ صرف اُنکے دوست بلکہ اُنکی گذشتہ تہذیب و تمدن اور کارناموں کے مداح ہیں۔ موسیو سیدیو کی کتاب سے یہ غرض پوری ہوتی ہے۔ اسکے بعض مقامات تو ایسے ہیں جنکو پڑھکر نہ صرف عرب بلکہ تمام مسلمان مصنف کے مداح بن سکتے ہیں۔

موسیو سیدیو یورپ کے نہایت مشہور مستشرق ہیں۔ اور اُنکی یہ کتاب ایک مدت تک مستند مانی جاتی رہی۔ بلکہ اسوقت بھی اس کا علمی درجہ کچھ کم نہیں ہوا۔ الناظر بک ایجنسی کو قابل مبارکباد سمجھنا چاہیے کہ اُس نے اسکو اُردو داں پبلک کے سامنے پیش کیا۔ لیکن ہمیں یہ دیکھکر سخت افسوس ہوا کہ باوجود مصنف کی شہرت اور عظمت کے تمام کتاب غلط بیانات، غلط واقعات اور

بے احتیاط نتائج سے بھری ہوئی ہے۔ چونکہ جو ترجمہ اس وقت ہمارے پیش نظر ہے وہ درحقیقت ترجمہ در ترجمہ ہے اس لیے یہ کہنا مشکل ہے کہ ان غلطیوں میں سے کتنی کی ذمہ داری مصنف پر عائد ہوتی ہے اور کتنی کی عربی اور اردو مترجمین پر۔ شروع کے چند صفحات میں اردو مترجموں نے غلطیوں کو حاشیۂ زیریں میں ظاہر کرکے ان کا ازالہ کر دیا ہے۔ لیکن اسکے بعد یہ اہتمام باقی نہیں رہا۔ نتیجہ یہ ہوا ہے کہ یہ غلطیاں جوں کی توں قائم رہ گئی ہیں۔ سرورق سے معلوم ہوتا ہے کہ ترجمہ مولانا سلیمان ندوی صاحب کی نظر سے بھی گذرا تھا اور آپ نے اس پر نظرثانی فرمائی ہے۔ ہم کو زیادہ تعجب اس بات کا ہے کہ مولانا نے بھی ناظرین کی توجہ ان فروگذاشتوں کی طرف مبذول نہیں کی۔ جس طمطراق سے اس وقت یہ کتاب پیش کی جا رہی ہے اس سے اندیشہ ہے کہ یہ غلطیاں بھی کہیں "مستند" نہ ہو جائیں۔

جیسا کہ اوپر بیان کیا گیا ہے کتاب عرب کے جغرافیہ اور عرب قبل اسلام کے حالات سے شروع ہوتی ہے۔ اس حصہ میں جو صفحہ ۵۰ پر ختم ہوتا ہے مصنف نے کوئی خاص طور پر نئی اور مفید بات بیان نہیں کی۔ وہی پرانے طرز پر غلط یا صحیح واقعات بیان کر دیے ہیں۔ اور انکے بیان کرنے میں بھی بعض اوقات غلطیاں کی ہیں۔ غنیمت ہے کہ مترجموں نے حاشیۂ زیریں میں ان کا ازالہ کر دیا ہے۔ بہرنوع یہ ۵۰ صفحے کسی طرح بھی ہماری پرانی معلومات میں اضافہ نہیں کرتے۔ بلکہ اگر بے احتیاطی سے پڑھے جائیں تو یقیناً خرابی کا باعث ہوں گے۔ ضرورت ہے کہ انکو مستند نہ سمجھا جائے۔ اور پڑھنے میں احتیاط کی جائے۔

ان پچاس صفحوں کے بعد مصنف نے سیرت نبویؐ پر خامہ فرسائی کی ہے۔ لیکن اس قدر بے ڈھنگی کے ساتھ کہ پڑھنے والے کو نہ تو سیرت سے کوئی واقفیت حاصل ہوتی ہے اور نہ وہ اس سے کوئی خاص نتیجہ ہی اخذ کر سکتا ہے۔ مثال کے طور پر غزوات کا حال ملاحظہ ہو (صفحہ ۶۸-۷۰) یہ واقعات اس قدر بے ترتیب ہیں کہ انکے پڑھنے سے ہرگز کوئی نتیجہ نہیں نکلتا۔ بلکہ یہ معلوم ہوتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم محض بے وجہ قریش اور دوسرے کفار عرب سے لڑتے رہے تھے اور ان لڑائیوں کا مقصد سوائے لوٹ مار کے اور کچھ نہ تھا۔ مزید براں ان واقعات کے قلمبند کرنے میں بھی غلطیاں موجود ہیں۔ مثلاً موتہ کے واقعہ کے متعلق لکھتے ہیں کہ "اللہ نے انھیں (یعنی مسلمانوں کو) فتح عنایت

کی۔ پھر خالد مسلمانوں کو لیکر مدینہ لوٹ آئے۔" اس فقرہ کا پہلا حصہ غلط ہے۔ فتح طائف کے بیان میں عجیب و غریب تناقض ہے۔ صفحہ ۸۳ پر لکھتے ہیں کہ "منجنیق سے ان پر سنگباری کی اور مغلوب کرکے انکی گردنیں ماریں۔" یہ واقعہ غلط ہے۔ مگر غنیمت ہے کہ خود مصنف نے ص۸۵ پر اسکی تردید کر دی ہے۔ "پھر بنو ثقیف کے سفیر آپ کے پاس آئے اور مسلمان ہو گئے۔"

سیرت سے آگے بڑھیے تو حضرات ابو بکر و عمر اور عثمان رضی اللہ عنہم کے زمانۂ خلافت کے واقعات معلوم ہوتے ہیں۔ لیکن ص۱۱۸ پر حضرت علیؓ اور امیر معاویہؓ کے جھگڑوں کا بیان بعض جگہ سے غلط ہے۔ اور ساتھ ہی ساتھ اس قدر مبہم ہے کہ پڑھنے والا نہ تو واقعات کو صحیح طور پر سمجھ سکتا ہے اور نہ کسی نتیجہ پر پہونچ سکتا ہے۔ بلکہ ہمارا خیال تو یہ ہے کہ اسکے پڑھنے سے غلط فہمیوں میں اضافہ ہوگا۔

بحیرہ روم کی بحری جنگوں اور قسطنطنیہ کے پہلے محاصرہ کے متعلق ارشاد ہوتا ہے:—

"اسکے بعد وہ (یعنی امیر معاویہ) مستقلاً خلیفہ ہوگئے اور ۳۱ھ میں رومیوں سے بحری معرکہ آرائیاں کیں۔ پھر انھوں نے ایک بیڑہ تیار کیا اور ۴۵ھ کے موسم بہار میں قسطنطنیہ کا رخ کیا۔ وہ بحیرۂ مرمرہ میں داخل ہوئے اور قسطنطنیہ کے مغربی جانب اترپڑے۔ وہ پیہم چھ برس تک محاصرہ کیے رہے ...... اس لیے ۶۰ھ میں شام لوٹ آئے۔" (ص۱۳۵)

یہ تمام عبارت گلفشانیوں سے پُر ہے۔ اول تو عبارت سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ حضرت امیر معاویہ ۳۱ھ میں یعنی اصلی واقعہ سے ٹھیک دس سال قبل خلیفہ ہو گئے تھے۔ دوسرے ۴۵ھ میں قسطنطنیہ کا محاصرہ شروع ہوا اور ۶۰ھ میں ختم ہوا۔ یہ تمام عرصہ مصنف کے نزدیک صرف چھ برس کا ہوتا ہے!! پھر عبارت کے پڑھنے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ امیر معاویہ خود اس محاصرہ میں شریک تھے۔ وہی اپنی فوج کو لڑاتے تھے اور وہی اسکو لیکر ۶۰ھ میں شام واپس آگئے۔ یہ سب غلط ہے۔

صفحہ ۱۳۵ پر امیر معاویہ کے قبل از خلیفہ ہونے کے حالات درج تھے اسکے بعد باب ثالث میں پھر ایکبارگی حضرت عمرؓ کے عہد کی طرف توجہ فرمائی گئی ہے۔ چنانچہ صفحہ ۱۳۷ پر لکھتے ہیں:—

"حضرت عمر ابن الخطاب فتح شام کے بعد وہاں سے حضرت عمرو بن العاص کو اپنے ساتھ لے کر واپس ہوئے کہ ان کو مصر کی طرف روانہ کریں۔ ان کا انتخاب انکے عزم و استقلال ...... کی بنا پر ہوا۔"

یہ واقعہ بالکل غلط ہے جیسا کہ عام طور پر مشہور ہے حضرت عمرو ابن العاص نے خلیفہ کی اجازت کے بغیر مصر پر حملہ کیا تھا اور اسکی تیاری کے لیے مدینہ نہیں گئے تھے۔ بلکہ فلسطین میں جو فوج ان کے پاس تھی اسی کو لیکر مصر چلے گئے تھے۔

اب چند مزید انکشافات ملاحظہ ہوں۔

آن (یعنی حضرت عمر) کی وفات کے بعد انھوں (یعنی سرداران قریش) نے حضرت عثمان کو خلیفہ بنایا۔ لیکن حضرت عثمان سے اپنی رائے کے مطابق احکام جاری کرانے کے پیرایہ میں وہ اپنی برتری ظاہر کرنے لگے۔ مگر حضرت عثمان نے انکے غلبہ کو نہ مانا اور انکے قابو میں نہ آئے۔ اس لیے انھوں نے انکی تائید اور مدد سے دست کشی اختیار کی۔ یہ دیکھ کر انھوں نے اپنی تقریروں کے زور سے ممالک اسلامیہ میں لوگوں کو آمادۂ بغاوت کر دیا جس سے آخر کار خلیفہ کا قتل واقع ہوا۔ (صفحہ ۱۵)

متذکرہ بالا فقرہ میں دیگر غلطیوں کے علاوہ یہ معلوم کرنا بھی خالی از دلچسپی نہ ہوگا کہ خط کشیدہ انھوں کی ضمیر کس کی طرف راجع ہوتی ہے۔ اور فقرے کے آخری حصہ کا مطلب مترجم صاحب کے نزدیک کیا ہے۔ اس قسم کی خامیاں ترجمہ میں اکثر جگہ نظر آتی ہیں۔ اور نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ نہ صرف مطلب خبط ہو جاتا ہے۔ بلکہ بعض دفعہ تو واقعہ کا واقعہ ہی بدل جاتا ہے۔ بہرحال اگر مترجم صاحب کا مطلب انھوں سے سرداران قریش یعنی بنی امیہ ہیں تو ناظرین خود اندازہ کر سکتے ہیں کہ یہ واقعہ کہاں تک درست ہے کہ بنی امیہ نے اپنے شیخ وسردار حضرت عثمان کے خلاف تمام اسلامی ممالک میں اپنی تقریروں سے فساد پھیلایا تھا۔ انھوں کا ایک عجیب طلسم ملاحظہ ہو:۔

پھر انھوں نے انتقام حضرت عثمان کی بنا پر حضرت علی سے جدال وقتال شروع کر دیا۔ یہانتک کہ جب وہ اس معاملہ میں بھی کامیابی سے عاجز ہو گئے تو انھوں نے ایک ایسے شخص کو علی پر لگایا کہ جس نے انھیں دھوکے سے قتل کر دیا۔ (صفحہ ۱۵)

اس فقرہ میں انھوں کا استعمال قابل رشک ہے۔ پہلے انھوں سے تو یقیناً بنی امیہ مراد ہیں لیکن اگر دوسرا انھوں بھی انھیں کی طرف راجع ہے تو یقیناً مترجم یا مصنف نے انکی فرد قرارداد جرم میں ایک اور اضافہ کیا ہے جو بعض حضرات کے لیے خاص طور پر خوش آیند ہوگا۔

اب چند ایسے تاریخی اکتشافات ملاحظہ ہوں جن کی مثال دوسری کتابوں میں نہ ملیگی :۔

"پھر زیاد ابن ابی سفیان اٹھا ...... جس نے حضرت (امام) حسن کو بھی ۴۲ھ میں زہر دیکر اور عبدالرحمن ابن خالد ابن ولید کو بھی ...... اور نیز بہت سے آدمیوں کو قتل کرادیا" (ص۱۵۱)

"یہاں عبیداللہ ابن زیاد نے جو یزید ابن معاویہ کا نائب تھا شمر کو ان (امام حسین) کی طرف بھیجا کہ انھیں قتل کردے۔ اس سے حضرت امام حسین نے کہا کہ میں تیرے ساتھ یزید کے پاس چلتا ہوں مجھے اپنے ساتھ لے چل اور نہیں تو مجھے مدینے لوٹ جانے دے مگر شمر نے نہ مانا"۔ (ص۱۵۲)

"اس لیے مدینہ والوں نے انھیں (یعنی عبداللہ بن زبیر کو) اپنا مقتدا بنالیا۔ اور جو شخص یزید کی طرف سے مدینہ کا والی تھا اُسے نکال باہر کیا" ص۱۵۳

"جب ان (یعنی عبداللہ ابن زبیر) کے بھائی مصعب ابن زبیر دمشق کی تسخیر کو گئے" (ص۱۵۳)

"جب عبدالملک ابن مروان نے دیکھا کہ اسکے طرفداروں کو حج کرنا دشوار ہے تو اُس نے بیت المقدس کو زیب و زینت دی کہ لوگ وہاں جاکر زیارت کرلیا کریں" (ص۱۵۴)

"مختار ابن ابی عبید ابن صرد کے بقیہ لشکر کو فراہم کرکے خود خلیفہ بن گیا" (ص۱۵۴)

"موسیٰ ابن نصیر کو مکہ جلا وطن کردیا" (ص۱۶۶)

"خلیفہ واثق نے اپنی عقل سے یہ مسئلہ ایجاد کیا تھا کہ قرآن مخلوق نہیں بلکہ ازلی ہے" (ص۱۸۵)

اول تو یہ واقعہ ہی سرے سے غلط ہے مگر زیادہ تعجب یہ ہے کہ خود مصنف نے اسکی تردید کردی ہے۔ چنانچہ فرماتے ہیں :۔

"معتصم اور واثق نے بھی اس (مامون) کا اتباع کیا" (ص۱۹۶)

"ظاہریہ خاندان میں سے اول ابراہیم ابن الاغلب ہوا" (ص۱۹۹)

اسی پیراگراف میں دو سطر بعد ارشاد ہوتا ہے :۔

"ان کے بعد جو تھا امیر طاہر ہوا جو خلیفہ مامون کے لشکر کا سپہ سالار تھا" (ص۱۹۹)

"علویہ خاندان میں حسن بن زید سب سے اول دیلم، جرجان، طبرستان کا والی مقرر ہوا" (ص۱۹۹)

"معتز اور معتضد کے زمانہ میں وہ دزدوں کے حملوں کی برابر مقاومت کرتا رہا اور پھر جب معتمد علی اللہ خلیفہ ہوا تو اُس کا بھائی موفق - الخ" (صفحہ ۱۱۱)

معتضد معتمد کا بھتیجا اور موفق کا بیٹا تھا۔ معتمد کے بعد خلیفہ ہوا۔ بجائے معتضد کے مہتدی ہونا چاہیے۔ اس قسم کی فروگذاشتیں کتاب میں بکثرت ہیں۔ اور انکی وجہ سے کتاب میں اور چار چاند لگ گئے ہیں۔

"۳۳۳ھ میں بابک نے جو کہ آذربائیجان میں فرقہ اسماعیلیہ کی بنیاد ڈالی" (صفحہ ۲۰۶)

اس انکشاف کا جواب دنیا نہیں دے سکتی۔

"آخر پھر لوگوں نے حجر اسود کو مکہ بھیج دیا۔ خلیفہ نے حکم دیا کہ اُسے وہیں پھر رکھدیں۔ مگر اس میں سے ایک ٹکڑا توڑ لیا اور اپنے مسکن کے دروازہ پر لگا دیا۔ یہی وجہ تھی کہ جب لوگ بیوت ملوک میں جاتے تو دو زانو مودب بیٹھتے۔ اور اسی وجہ سے خلیفہ کے مسکن کو باب عالی سے تعبیر کرتے تھے۔ بعد ازاں سلاطین قسطنطنیہ کے باب پر اس کا اطلاق ہونے لگا" (صفحہ ۲۰۰)

باب عالی کے نام اور دو زانو مودب بیٹھنے کی اس سے زیادہ لطیف توجیہ غالباً ناظرین کی نظر سے نہ گذری ہوگی۔

"چنانچہ اسی وقت سے (یعنی عبد الرحمن الداخل کے عہد سے) خلافت مغربیہ خلافت مشرقیہ سے جدا ہوگئی" (صفحہ ۲۳۵)

یہ یاد رکھنا چاہیے کہ عبد الرحمن الداخل کے اندلس پر قابض ہونے سے عبد الرحمن ثالث الناصر لدین اللہ کے نصف عہد حکومت تک نہ تو اندلس کے بنی اُمیہ نے خود خلیفہ ہونے کا دعوی کیا اور نہ انکو تاریخ میں خلیفہ کہا گیا۔ یہ تمام زمانہ امارت ہے۔ مصنف نے امارت اور خلافت میں فرق نہیں کیا۔ اور ہر جگہ اُس عہد کو بھی خلافت ہی سے تعبیر کیا ہے۔ حالانکہ یہ غلط ہے۔ ہمیں یقین ہے کہ مترجموں کی ادنیٰ کوشش سے اس غلطی کا ازالہ ہو سکتا تھا۔

"اسی غرض کے انجام کے واسطے امیر یوسف کے ساتھ علی ابن مغیث والی قیروان نے چاہا الخ" (صفحہ ۲۵۹)

علی ابن مغیث قیروان کے کسی والی کا نام نہ تھا۔ ایک شخص تھا جس کو منصور عباسی نے اندلس کے سیاسی حالات معلوم کرنے اور اگر موقع ہو تو امویوں کے خلاف بغاوت برپا کرنے کے لیے بھیجا تھا مگر وہ عبد الرحمن الداخل کے ہاتھوں شکست کھا کر قتل ہوا۔

"کیونکہ امیر پیلا دگا تھی نے عبدالرحمن اول سے بیشتر اندلس کے امراء سے ایک چھوٹی سی ریاست بالکل آزاد باقی رکھوالی تھی تاکہ نصرانی پناہ گزین ہوا کریں" (ص۲۲۴)

مذکورۂ بالا عبارت کے پڑھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ پیلا دگا تھی اور اندلس کے امرا میں نہایت دوستانہ تعلقات تھے۔ اور انھیں کی بنا پر اندلس کی اسلامی فتح کے بعد پیلا دگا نے دوستانہ طریقہ سے امرائے اندلس سے کہا کہ "بھئی تمام ملک پر تو تم قبضہ کر ہی چکے ہو۔ مگر چھوٹی سی ریاست ہمارے لیے بھی چھوڑ دو کہ بھاگے ہوئے نصرانی وہاں پناہ گزیں ہوا کریں"۔ مسلمان امرائے پیلا دگی اس درخواست کو ازراہ مروت مان لیا تھا۔ اور نصرانیوں کے لیے یہ جگہ خالی کر دی تھی۔ تاکہ آیندہ وہ ترقی کر کے اپنے محسنوں کو ملک سے نکال دیں!!! معلوم نہیں کہ اس گلکاری کی داد مصنف کو ملنی چاہیے یا مترجموں کو۔

اس قسم کے دو اور مبہم فقرے ہم ذیل میں نمونۃً درج کرتے ہیں۔ یقیناً ادنیٰ توجہ ایسے فقروں کا ابہام دور ہو سکتا تھا۔ لیکن جس صورت میں کہ وہ اس وقت کتاب میں موجود ہیں اُس سے واقعہ کا واقعہ بالکل تبدیل اور غلط ہو جاتا ہے۔ اس قسم کے فقرے اور عبارتیں کتاب میں اکثر جگہ ملتی ہیں اور کتاب کی "قدر و قیمت" کو زیادہ کرتی ہیں :-

"اسکے بعد وزیر منصور کو افریقہ کے زناتہ قبائل کی طرف جانا پڑا" (ص۲۶۰)

"پھر یہ وزیر بھی زناتہ کو مطیع کر کے اندلس لوٹ آیا" (ص۲۶۹)

حالانکہ واقعہ یہ ہے کہ منصور حاجب اور وزیر ہونے کے بعد کبھی افریقیہ نہیں گیا۔ آگے چل کر لکھتے ہیں :-

"المنصور نصاریٰ پر کامل فتوحات حاصل کرنے کی وجہ سے ایسا ہر دلعزیز ہو گیا تھا کہ مسلمانوں نے حکومت اندلس اسی کے خاندان میں منتقل کر دینے کا ارادہ کر لیا" (ص۲۸۰)

یہ تمام بیان سراسر غلط ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ منصور باوجود اپنی فتوحات، جود و سخا، شان و شوکت اور تدبر و تنظیم کے کبھی اتنا ہر دلعزیز نہیں ہوا تھا کہ عوام الناس اپنے قدیم امراء و خلفاء کے خاندان کو اس قدر بھلا دیں کہ اُسے اور اُسکی اولاد کو اپنا بادشاہ بنانے کے لیے تیار ہو جائیں۔ بلکہ حقیقت یہ ہے کہ منصور کی موت کے بعد اُسکے بیٹے عبدالملک المظفر (جس کو ہمارے مصنف نے اپنی طرف سے

المنصور ہی کا خطاب دیا ہے (ص۲۵۷) دو رخا صکر دوسرے بیٹے عبدالرحمن سنکول کی انھیں کوششوں نے اس عظیم الشان سلطنت کو عوام الناس کے ہاتھوں اس طرح برباد کیا کہ ان کا ایک فرد بشر بھی نہ بچ سکا اور انکے عالیشان محلات کی اینٹ سے اینٹ بج گئی۔

"امام مالک کا مذہب سپین میں خوب پھیلا۔ اس کے اسباب یہ ہوے کہ خلیفہ حکم مرتضے ابن ہشام بن عبدالرحمن ابن معاویہ ابن ہشام ابن عبدالملک بن مروان بن الحکم نے اپنے باپ ہشام بن عبدالرحمن کے بعد سریر آرائے خلافت ہو کر ۱۸۰ھ میں لقب المنتصر اختیار کیا تو اس نے امام ابو حنیفہ کا مذہب چھوڑ کر امام مالک کا مذہب اختیار کر لیا اور قاضی یحیی بن یحیی ابن کثیر کو اپنا مقرب خاص قرار دیا" (ص۲۴۱)

تاریخی لحاظ سے اس عبارت کا ایک ایک لفظ غلط ہے۔ اس پر بحث کرنا تحصیل حاصل ہے۔

صفحات ۴۶۴ - ۴۵۳ میں مصنف نظام نے عربی مورخوں کا ذکر کیا ہے اور انکے حالات لکھے ہیں۔ ان میں "خوبی" یہ ہے کہ نظام سنین کو غالباً مصنف نے بالکل بیکار سمجھ لیا ہے اور محض اپنی عقل و فہم پر بھروسہ کرکے جسکو چاہا ہے مقدم کر دیا ہے اور جسکو چاہا ہے مؤخر۔ مثلاً ابن خلدون۔ مقریزی اور سیوطی (ص۴۵۵) کے بعد کہیں جاکر بیچارے مسعودی، طبری، ابن اثیر اور نویری کی باری آئی ہے (ص۴۵۸)۔ پھر جس ترتیب سے ان ناموں کو مبحث کے عنوان پر لکھا گیا ہے وہ بھی ہمارے مصنف کا خاص حصہ ہے۔ اسکے علاوہ بہت سے ناظرین کو پڑھ کر تعجب ہوگا کہ:۔

"عرب مورخین میں سے ابو الفداء، ابو الفرج، اور بہاء الدین کا شمار طبقۂ اولیٰ میں کیا جاتا ہے" (ص۴۵۳)

ان تمام باتوں کا نتیجہ یہ ہوا ہے کہ آپ مورخین کے باب کے دس کے دس صفحے پڑھ جائیے۔ اور آپ قسم کھا کر کہہ سکتے ہیں کہ آپ نے سوائے دردسر، اور خزف ریزوں کے اور کچھ حاصل نہیں کیا۔ نہ تو عبارت سے تاریخ اسلامی کے ارتقا ہی کا پتہ چلتا ہے اور نہ نظام سنین کی بے قاعدگی کی وجہ سے مورخین کی تقدیم و تاخیر کا۔ ہمارے نزدیک تو اگر یہ دس صفحے نہ لکھے جاتے تو بھی کتاب کے "مستند" ہونے میں کوئی فرق نہ پڑتا ان صفحوں میں کم از کم دو باتیں نہایت عجیب و غریب پائی جاتی ہیں۔ صفحہ ۴۵۰ پر تاریخ منسوبہ مصر کا ذکر ہے اس کے ابو المحاسن ابن تغری بردی کی کتاب النجوم الزاہرہ فی ملوک المصر والقاہرہ ص۴۶۴ پر الکتبخانۃ الشرقیہ مصنفہ مصطفی بن عبداللہ

(حاجی خلیفہ) کا نام آتا ہے - اس سے حاجی خلیفہ کی مشہور و معروف کتاب کشف الظنون مراد لینی چاہیئے - ہمارے مترجموں نے ان کتابوں کے لاطینی ناموں کا ترجمہ کیا ہے - گر ہکو یہ باور کرنے میں بہت کچھ تامل ہے کہ فاضل مترجم ان دو مشہور و معروف کتابوں کے ناموں تک سے ناواقف ہیں -

دو ہی صفحے آگے چل کر ارشاد ہوتا ہے :-

"المعتقد نے بوران سے شادی کی" (ص ۴۶۶)

اس فقرہ میں کمال کر دیا گیا ہے - تفصیل اس اجمال کی یہ ہے کہ بوران مامون کے ایرانی وزیر حسن ابن سہل کی بیٹی اور مامون کی بیوی تھی - معتضد معتصم کا پرپوتا تھا - اور معتصم مامون کا بھانجا - مامون کا انتقال ۲۱۸ھ میں ہوا ہے - اور معتضد ۲۷۹ھ میں خلیفہ ہوا ہے - خدا کرے یہ غلطی کاتب یا مصحح کے سر تھوپی جاسکے - جو ذرا مشکل ہی معلوم ہوتا ہے -

تاریخ عرب کے ان نئے اکتشافات کے متعلق جو کچھ اوپر بیان ہوا وہ نہایت مختصر تھا - کیونکہ طوالت کے خوف سے اور بہت سی ایسی "ایجادوں" اور اکتشافات کو قلم انداز کر دیا گیا ہے - اگر ناظرین تکلیف کریں اور کتاب کو بنظر امعان پڑھیں تو کم و بیش ہر صفحہ پر اس قسم کی گلفشانیوں سے بہرہ اندوز ہو سکتے ہیں -

اب تک ہم نے صرف اُن باتوں پر غور کیا ہے جن کا تعلق کسی نہ کسی طرح مصنف سے سمجھا جا سکتا تھا - اور اُنکی ذمہ داری زیادہ تر اُسی پر عائد ہوتی تھی - مگر اب تصویر کے دوسرے رُخ پر غور کیجیے - ویسے تو کتاب کتابت کی غلطیوں سے اس قدر پُر ہے کہ بعض مرتبہ یہ تمنا ہوتی ہے کہ کاش انکے ازالہ کے لیئے ایک غلطنامہ کا اضافہ کر دیا جاتا - اور چونکہ یہ اُردو کی مطبوعہ کتابوں کا ایک جزو لاینفک ہوگیا ہے - اس لیئے اس کا ہونا معیوب بھی نہیں سمجھا جا سکتا - اس قسم کی غلطیوں سے قطع نظر کرکے ہم صرف اُن غلطیوں کی طرف متوجہ ہوتے ہیں کہ جن کا الزام کسی طرح بھی کاتب کے سر نہیں رکھا جا سکتا - بلکہ اُنکو التزاماً غلط لکھ کر تاریخ کا خون کیا گیا ہے - لیکن چونکہ ان کا حصر کرنا بھی مشکل ہے اس لیے چند الفاظ بطور نمونہ پیش کیئے جاتے ہیں -

صفحہ ۱۴۴ پر سب سے پہلے ہم نے عتبہ بن نافع کا نام پڑھا - خیال ہوا کہ کتابت کی غلطی ہو گر اسکے بعد جب یہی نام ہر جگہ بجائے عقبہ بن نافع کے دوہرایا گیا تو یقین آیا کہ بیچارے کاتب کا

اس میں کوئی قصور نہیں۔ اسی طرح صفحہ ۱۶۱ پر حسان (ابن لقمان) کی جگہ حسن ہے۔ اور ہر موقع پر یہی نام لکھا گیا ہے۔ صفحہ ۱۹۹ پر خاندان صفریہ کا حال درج ہے۔ لیکن ہم کو یقین ہے کہ اس نام کا خاندان کوئی نہیں گذرا۔ ہاں صفریہ خارجیوں کا ایک فرقہ ضرور ہے لیکن چونکہ اس موقع پر یعقوب ابن لیث بانیِ خاندان صفاریہ کا ذکر ہے اس لیے صفریہ سے صفاریہ" مراد" لی گئی ہے۔ یہ نام بھی التزاماً غلط تحریر ہوا ہے۔ اسی طرح بجائے سامانیہ کے سمانیہ (ص۲۰۳) امیر حمدان کے امیر ہمدان (ص۲۰۳)۔ اور تعجب پر تعجب یہ ہے کہ بجائے قرامطہ کے کرمانیہ (ص۲۰۶)۔ تاہرت کے طہرت (ص۲۴۹)۔ الحکم کے الحاکم (ص۲۵۴) ابن حمود کے ابن حامد۔ عروج کے ہروج (ص۳۲۹)۔ اور سب سے زیادہ تعجب کی بات یہ ہے کہ خود ہندوستان کے شہر کالی کٹ کے بجائے ہر جگہ کلکتہ (ص۴۰۳) درج ہوا ہے۔ اس آخری غلطی سے کتاب کے ایک حصہ میں خاص "شگفتگی" پیدا ہو گئی ہے۔ اور پہلے پہل جب یہ نام آتا ہے تو پڑھنے والا ضرور مبہوت ہو کر رہ جاتا ہے۔ یہ تمام نام تو بالالتزام غلط لکھے گئے ہیں۔ صفحہ ۳۰۶ پر حنظوطہ، ہرجہ، اور جدمویہ تین بربری قبائل کے نام ہیں۔ ہمیں افسوس ہے کہ ہم نے ان قبائل کے نام نہیں سنے۔ لیکن یہ بھی یقین ہے کہ مترجم ذرا سی کوشش میں انکی صحت کر سکتے تھے بعض دفعہ ایسا ہوا ہے کہ ایک ہی نام کو مختلف مقامات پر مختلف طور پر لکھا گیا ہے۔ اس سے جو پریشانی ناظر کتاب کو ہوتی ہے وہ ظاہر و باہر ہے۔ مثلاً اول تو سرقسطہ[1] کو سراقسطہ (ص۱۶۶)۔ سراغوسا (ص۲۹۴) اور سراغوسہ (ص۲۹۷) بھی لکھا گیا ہے۔ اسی طرح شنت یا قوب کو قدیس یا قوب کا کنیسہ (ص۲۶۸) اور کنیسہ سینٹ جاگ[1] لکھا گیا ہے۔ پڑھنے والے کو شبہ ہوتا ہے کہ یہ مختلف مقامات کے نام ہیں۔

علاوہ بریں خصوصاً شروع کے حصہ میں یونانی قیصروں اور دوسرے یوروپین لوگوں کے نام ہیں۔ یہ نام عام طور پر اُردو داں حضرات کے لیے بالکل نامانوس ہوتے ہیں۔ اور پھر انکے لکھنے کا ڈھنگ ایسا اختیار کیا گیا ہے جس سے انکی اس صفت میں بجائے کمی کے زیادتی ہو گئی ہے۔ اگر یہ نام صاف تحریر ہوتے یا ناموں کے بعد اصلی نام بھی انگریزی حروف میں لکھ دیے جاتے تو کتاب کا ایک نقص مٹ جاتا اور ناظرین کو پڑھنے میں دقت بھی نہ ہوتی۔

کتاب میں متعدد مقامات ایسے بھی ہیں جن میں مصنف نے اپنے اُن خیالات کا اظہار کیا ہے جو بغیر رد و قدح اور بحث کے تسلیم نہیں کیے جا سکتے۔ اور بعض تو ایسے ہیں کہ بالکل ناقابل قبول ہیں۔ مثلاً۔

[1] [illegible]

"خلفائے امویہ نے ان بادشاہوں کے عادات واخلاق کو اختیار کر لیا جن کے ملک پر انھوں نے قبضہ کیا تھا۔ یہاں کی رعایا ذلیل اور دنی الطبع تھی۔ اس لئے خلفاء بھی ویسے ہی ہو گئے جیسے قیاصرۂ روم وشاہان فارس تھے۔ اُنھوں نے اپنا طرز حکومت بالکل مستبدانہ کر لیا۔ (ص۱۵۲)

"اسی قساوت قلبی اور بے رحمانہ حرکت کے سبب لوگوں نے اسکو سفاح یعنی قتال کا خطاب دے دیا۔" (ص۲۵۱)

"یہ فخر خلفاء کے زمرہ میں صرف ابوجعفر المنصور عباسی کو حاصل ہے کہ اس نے سب سے پہلے عربوں کو دماغی اور ذہنی مشاغل کی طرف مشغول کیا۔" (ص۳۶۸)

تاہم وہ بنی اسرائیل کے طرز تمدن سے اس بارے میں ضرور خلاف تھے کہ مغلوب و فاتح اقوام کی عورتوں سے تناسلی اختلاط قائم کیا جائے۔ مگر اس تناسلی اختلاط کے باوجود انھوں نے اپنی عربی سرشت میں ذرہ بھر فرق نہ آنے دیا۔ (ص۳۷۰)

طاہر نے خلیفہ مامون کو مسند خلافت دلانے اور خراسان میں اسکی حکومت قائم رکھنے میں بڑی سرگرم کوشش کی تھی۔ اور شہر بغداد اور قصر خلافت کو امین سے چھین کر مامون کے حوالہ کیا تھا۔ اس لئے مامون نے اس اخلاص، وفاداری اور جاں نثاری کا صلہ یہ تجویز کیا کہ اُسے خراسان کا مطلق العنان و ذی اختیار گورنر بلکہ ماتحت بادشاہ بنا دیا۔" (ص۴۰۳)

"پھر اہل عرب نے یونانی کتابوں کا مطالعہ کیا تو نئی نئی بندشیں انکی نظر سے گذریں اور عربی زبان میں وسعت پیدا ہونے لگی۔ یہاں تک کہ ترقی کرتے کرتے یہ اہل مشرق کی علمی زبان بن گئی۔" (ص۴۳۶)

افسوس ہے کہ اس مختصر سے مضمون میں ان تمام خیالات پر مفصل بحث نہیں ہو سکتی۔ ان میں سے آخری فقرہ خصوصاً قابل غور ہے۔ یہ تو کم و بیش مسلم ہے کہ مولدین کی عربی شاعری پر ایرانی اثرات نہ صرف پڑے تھے بلکہ غالب آ گئے تھے۔ لیکن یہ نہایت ہی دلچسپ سوال ہے کہ آیا عربی ادب پر یونانیوں کا کوئی اثر ہوا تھا یا نہیں؟

باوجود ان تمام خرابیوں کے جن کا ذکر اوپر ہوا، یہ نہ سمجھ لینا چاہئیے کہ کتاب تمام کی تمام

بالکل بکار ہے۔ اسکے بعض حصے یقینی طور پر قابل تعریف ہیں۔ خصوصاً وہ حصے جن میں مصنف نے تاریخ کو چھوڑ کر عباسیوں، فاطمیوں، اور اندلس کے امویوں کے نظم ونسق اور علوم وفنون پر بحث کی ہے۔ مثلاً صفحہ ۱۸۹-۱۹۳ تک خلفاء عباسیہ کے اعمال عامہ، صنعت وحرفت وفلاحت اور فنون لطیفہ وصناعیہ کا ذکر نہایت واضح ہے۔ اسی طرح صفحہ ۲۵۵ پر عبدالرحمٰن الناصر لدین اللہ اموی کے کارنامے قابل دید ہیں۔ صفحہ ۲۷۲ پر اندلس کے عربوں کی فہم وذہانت اور اُن کے حُسنِ اخلاق کا حال خوب ہے۔ اس قسم کے مقامات کتاب میں متعدد ملیں گے۔

مگر یہ یاد رکھنا چاہیے کہ چونکہ کتاب مختصر ہے اور یہ تمام باتیں محض ضمناً بیان ہوئی ہیں اسلیے نہایت تشنہ ہیں۔ افسوس تو یہ ہے کہ خود مسلمانوں نے بھی اب تک ان باتوں کی طرف کما حقہٗ توجہ نہیں کی۔ حالانکہ ضرورت ہے کہ سیاسی تاریخ کو چھوڑ کر اس پر کام کیا جائے۔ اسلامی تہذیب وتمدن کا ابتدائی مرکز مدینہ منورہ تھا۔ وہاں سے یہ مرکز دمشق میں منتقل ہوا۔ یہ وہ زمانہ تھا جبکہ عرب اپنی فتوحات سے فائدہ اُٹھا رہے تھے۔ اور اب تک بیرونی اقوام کا اثر ان پر نہیں ہوا تھا۔ بلکہ انھوں نے اپنے لیے ایک الگ دنیا بنا لی تھی۔ یہ خالص عربی تہذیب کا زمانہ تھا۔ اور بڑا ہو یا بھلا یہی وہ زمانہ تھا جبکہ آیندہ کی عظیم الشان اسلامی تہذیب کی بنیاد قائم ہوئی۔ بہر حال ۱۳۲ھ میں عربی عہد ختم ہوا۔ اور بنی عباس کے ساتھ بغداد میں "عربی - ایرانی" عہد شروع ہو گیا۔ اس زمانہ میں اسلامی تہذیب وحکومت ایشیا میں انتہائے عروج کو پہونچی۔ مسلمان تمام دنیا میں پھیل گئے۔ اور اُن کا دارالخلافہ بغداد دنیا کی نہ صرف تہذیب بلکہ صنعت وحرفت اور تجارت کا مرکز بن گیا تھا۔ عباسی کمزور ہوے۔ اور بغداد کی یہ حیثیت بھی ختم ہونے لگی تو قرطبہ اسکی جگہ لینے کو تیار ہو گیا۔ یہ شہر یورپ میں اس سے قبل بھی تہذیب بلکہ انسانیت کا مرکز تھا۔ مگر اب بغداد کے زوال کے بعد اسکو یہ درجہ تمام اسلامی یعنی متمدن دنیا میں حاصل ہو گیا۔ اسکو زوال ہوا تو فاطمیین کے قاہرہ نے اسکی جگہ لی اور اسلامی تہذیب کی درخشاں روایات کو درخشاں تر کر دیا۔ یہ سلسلہ آخر اس شہر پر ختم ہو گیا۔ اور قسطنطنیہ کو کبھی وہ بات حاصل نہ ہوئی جو دمشق، بغداد، قرطبہ اور قاہرہ کو حاصل تھی۔ اس کم وبیش ہزار برس کے عرصہ میں مسلمانوں کی حکومت وسیادت اس سے بھی کہیں زیادہ تھی جو رومیوں کو اسکے زبردست ترین عروج کے زمانہ میں حاصل تھی۔ مسلمان دنیا کی

تہذیب و تمدن۔ تجارت، صنعت و حرفت، علوم و فنون، اور سیاست کے واحد مالک تھے ایسی حالت میں یہ ناممکن ہے کہ وہ بلا کسی قسم کے قوانین کے اتنے عرصہ تک اپنے آپکو قائم رکھ سکے ہوں۔ ایک زمانہ میں بغداد دنیا کی تجارت کا مرکز تھا۔ اور تجارتی دنیا میں اسکی وہی حیثیت تھی جو آجکل لنڈن کو حاصل ہے۔ کیا ایسی حالت میں یہ باور کیا جا سکتا ہے کہ بغداد کی تجارت بغیر تجارتی قانون کی توضیح، بغیر صرافہ، اور بغیر کسی نہ کسی قسم کے بنکوں کے قائم رہ سکی ہو گی؟ مزدور اور سرمایہ دار کی جنگ کسی نہ کسی صورت میں اُس وقت بھی موجود نہ تھی۔ اور اُس کا تصفیہ حکومت کو نہ کرنا پڑتا ہوگا؟ یا کیا یہ باور کیا جا سکتا ہے کہ مسلمانوں نے اس وقت کی تمام متمدن دنیا پر حکومت کی ہو اور وہ تمام پیچیدہ مسائل اُنکو پیش نہ آئے ہوں جو آج کل پیش آتے رہتے ہیں؟ اس قسم کی صدہا باتیں ہیں کہ جن کا جواب نہ تو اس کتاب میں ملتا ہے اور نہ اس قدر مختصر کتاب میں ملنے کی توقع کی جا سکتی ہے۔ یہ مسلمانوں کا کام ہے کہ ان مسائل کو حل کرنے کی کوشش کریں اور نفلے کے اس الزام کو مٹا دیں کہ ہارون الرشید ایک بڑے پیمانہ پر بردہ فروش تھا۔ یا پروفیسر بیوری کے اس اعتراض کا جواب دیں کہ عباسیوں نے بغداد میں بیٹھ کر جبر و تعدی سے حکومت کی اور دُنیا کا ستیاناس کر دیا۔

محمد جمیل الرحمٰن ایم اے
پروفیسر تاریخ اسلام۔ کلیہ جامعہ عثمانیہ۔ حیدرآباد دکن

مولوی جمیل الرحمٰن صاحب کا دلی شکریہ کہ اُنھوں نے میری تحریک سے اس کتاب پر نہایت آزادی کے ساتھ ریویو لکھا۔ سیدیو کی بڑی بدقسمتی یہ ہے کہ علی مبارک پاشا مترجم عربی نے کتاب کو ترجمہ کرتے وقت غالباً مختصر کرنے کے خیال سے اُس کا خلاصہ کر دیا۔ اور اُردو میں جن اصحاب نے ترجمہ کیا اُنھیں اتفاقات نے اسکی مہلت نہ دی کہ وہ کتاب پر مفصل حواشی تحریر فرماتے۔ اگر اس کے طبع ثانی کی نوبت آئی تو انشاءاللہ یہ تنقید پیش نظر رہے گی

ایڈیٹر

ملہر راؤ ہولکر

مالوہ کی فتح - پانی پت کی لڑائی

مہاراشٹر[۱] کے مختلف النسل[۲] باشندوں کو ایک مضبوط قوم بنا کر مرہٹوں کی سلطنت کا بنیادی پتھر رکھنے والا اقبالمند سیواجی چودہ سال ہوئے کہ دنیا سے رخصت ہوگیا۔ شاہنشاہ اورنگ زیب بیجاپور کی عادل شاہی اور گولکنڈہ کی قطب شاہی ریاستوں کا سات[۳] برس ہوئے کہ خاتمہ کر چکا۔ شہنشاہ کا صوبہ[۴] دار بنگالہ انگریزوں کی تجارتی کمپنی کو سخت گوشمالی دے چکا۔

فرانسیسیوں نے پانڈیچری اور چندرنگر میں قدم جمائے تھے مگر اسوقت اُن کا ستارہ زوال پر ہے اور ڈچ قوم کے سوداگر پانڈیچری پر قابض ہیں۔

پورتگال کی ایشیائی حکومت کا عروج ختم ہوگیا۔ ساحل ملابار پر اُسکے بیشتر مقبوضات ہالینڈوالوں کے تصرف میں ہیں اور دارالحکومت "گووا" کے دروازہ تک مرہٹوں اور مغلوں کا خوف ہر شخص پر چھایا ہوا ہے۔

۱ مہاراشٹر ہندوستان کے جنوب مغرب میں اس ٹکڑے کا نام ہے جسکے مغرب میں سمندر، جنوب میں دریائے کرشنا، مشرق میں وین گنگا اور شمال میں نربدا ہے۔ یہ علاقہ پہلے سلاطین بہمنی کی حکومت میں شامل تھا لیکن پندرہویں صدی سے اس صوبہ کا بیشتر حصہ پورتگال والوں کے تصرف میں آگیا تھا جسکی یادگار ابھی تک شہر "گووا" پر اس قوم کا قبضہ بدستور قائم ہونے سے باقی ہے۔ بیجاپور کے بادشاہوں نے اس ملک کے باشندوں کو اپنی فوج میں بھرتی کرنا شروع کیا اور شاہجہاں کے وقت میں ایک سردار ساہو جی بھوسلا بیجاپور کی حکومت میں جنرل تھا اور اُس نے بادشاہ دہلی کو کچھ مدد بھی دی تھی۔ اسی ساہو جی کا فرزند نامور سیواجی تھا جو ۱۶۲۷ء میں پیدا ہوا اور بیجاپور و دہلی کی حکومت سے آزاد ہوکر اس ملک کا خودمختار حاکم بنا۔ ۶ جون ۱۶۷۴ء کو اُسکے راج تلک کی رسم ادا ہوئی اور ۵ اپریل ۱۶۸۰ء کو فوت ہوا۔ ۱۲

۲ اس ملک کے برہمن، راجپوت، کُرمی، اور شنکر جاتی سب ہی مرہٹہ کہے جاتے تھے۔ ۱۲

۳ عادل شاہی ۱۶۸۶ء میں اور قطب شاہی ۱۶۸۷ء میں ختم ہوئی۔ ۱۲

۴ شائستہ خاں نے ۱۶۹۰ء میں ایسٹ انڈیا کمپنی سے بھاری تاوان وصول کیا۔ (امپیریل گزیٹیر جلد ۲ صفحہ ۴۷۰)

اولوالعزم سیواجی کا کمزور جانشین سمبھاجی شراب کے نشہ میں چور گرفتار ہوا اور پانچ برس ہوئے کہ قتل ہو چکا۔ اُس کا بھائی راجہ رام اپنے شیرخوار بھتیجے ساہو جی کی طرف سے سلطنت کا حاکم بنا لیکن چند ہی مہینے کے بعد اپنے معصوم برادرزادہ اور دارالسلطنت رائے گڈھ کو دشمنوں کے قبضہ میں چھوڑ کر کرناٹک کی طرف فرار ہو گیا اور اسوقت جنجی کے قلعہ میں پناہ گزیں ہے۔ مرہٹے مغلوں کے لشکر کو ستاتے اور انکے صوبوں پر چھاپے مارتے رہتے ہیں لیکن انکی واقعی حکومت صرف چند قلعوں اور پہاڑی علاقوں تک محدود ہے اور اُس کا انتظام رامچندر نیلکنٹھ کے سپرد ہے جو حکومت پناہ کے لقب سے راج کا کاروبار سنبھالے ہے اور موقع سے اپنے بھاگے ہوئے راجہ کو بھی مدد بھیجتا رہتا ہے۔ راجپوتانہ عالمگیر کے دبدبے خاموش ہے۔ شمالی ہندوستان میں امن ہے اور ہمالیہ کی ترائی سے تنجور تک کل جزیرہ نمائے ہند شہنشاہ کی عظمت کے آگے سر تسلیم جھکائے ہوئے ہے۔

اسوقت کون کہہ سکتا تھا کہ چند سال کے اندر اس عظیم الشان سلطنت کے ٹکڑے پارچے ہو جائینگے اور یک بیک ایسی ہوا پلٹے گی کہ ایک صدی سے پیشتر شاہجہاں اور عالمگیر کا بدقسمت جانشین آنکھیں کھو کر سیواجی کے غلاموں کا پنشن خوار بنے گا!! مگر ازل کے رجسٹروں میں یہی اندراج تھا اور قضا و قدر کے دفتر سے مغلوں کی تباہی کا فرمان صادر ہو چکا تھا اسلئے غیب سے قدرت خداوندی ظاہر ہونے کے سامان جمع ہونے لگے!!

اکتوبر ۱۶۹۴ء میں پونا سے چالیس میل کے فاصلہ پر نیرا ندی کے کنارے ایک غیر مشہور گاؤں "ہل" نام میں ایک معمولی کاشتکار کے گھر بچہ پیدا ہوا جسکی پیشانی پر خط تقدیر سے لکھا تھا کہ یہ فرزند خاندان تیمور کا غرور توڑنے اور مرہٹوں کی حکومت کو عروج دینے میں نمایاں حصہ لیگا۔

اس خوش قسمت کاشتکار کا نام کھنڈو جی تھا۔ اسکے آبا و اجداد کسی زمانہ میں متھرا کے قریب بھیڑ بکری چراتے تھے اور وہاں سے اُجڑ کر پہلے چتوڑ کے قریب میواڑ میں بسے پھر تبدیل سکونت کر کے دکن آئے جہاں وہ اسوقت "ہل" میں آباد تھے۔ اور وہ دن قریب تھا کہ ایک اقبالمند کے طفیل سے یہ گاؤں ہندوستان کی تاریخ میں ہمیشہ کے لیے یادگار ہو جائے!!

یہ ہونہار لڑکا چار ہی پانچ برس کا تھا کہ اُس کا باپ[1] مر گیا۔ رشتہ داروں نے بیوہ سے جھگڑا کیا

[1] کھنڈی راؤ موضع ہل کا مکھیا یا مکھیا کا نائب تھا۔ ۱۲

اور مصیبت زدہ ماں اپنے یتیم بچہ کو لیکر بھائی کے گھر چلی گئی - ماموں نے اپنے بیکس بھانجے کے سر پر شفقت کا ہاتھ رکھا اور بیوہ بہن کا بوجھ اُٹھانے پر تیار ہوگیا - اسکے پاس سردار کدم بندی کی طرف سے کچھ جاگیر تھی جسکے عوض میں اُسکو پچیس سوار مرہٹوں کی امداد کیلیے مہیا رکھنا پڑتے تھے لیکن بھانجا ابھی بہت کم عمر تھا اور کسی فوجی خدمت کے قابل نہ تھا اس لیئے خاندان کی بھیڑ بکری چرانے کی خدمت اسکے حوالہ کی گئی -

یہ یتیم بچہ جس کا نام ملہر راؤ تھا کئی سال تک اسی خدمت پر مامور رہا - صبح کو بھیڑوں کا گلہ لیکر جنگل کی طرف نکل جاتا - دن بھر مویشیوں کی نگہبانی کرتا اور شام کو گھر واپس آتا تھا - ایک دن بستی سے دُور کھیت کی مینڈ پر سر رکھے سوتا تھا کہ ایک سانپ اُسکے قریب آیا اور اپنا پھن اُٹھاکر لڑکے کے سر کے پاس کھڑا ہوگیا - اتفاق سے گانوں کے کچھ آدمی اُس طرف آگئے اور اُنھوں نے یہ تماشا دیکھ لیا کہ سانپ سر کے پاس کھڑا ہے مگر بچہ پر چوٹ نہیں کرتا بلکہ یوں کہنا چاہیئے کہ لڑکے کے چہرہ کو آفتاب کی شعاعوں سے بچائے ہوئے ہے - آدمیوں کی آہٹ پاکر سانپ بھاگ گیا اور ملہر راؤ بھی جاگ پڑا - مگر یہ قصہ دیہات میں مشہور ہوگیا - لوگوں نے ماموں کو یتیم بھانجے سے بیخبری کا طعنہ دیا اور سانپ کے حملہ سے محفوظ رہنا لڑکے کی خوش نصیبی کا نشان بتایا - لڑکا گلہ بانی کی خدمت سے ہٹا لیا گیا اور اُسکو لڑائی کے ہنر سکھائے گئے - تھوڑی ہی مدت میں وہ گھوڑے کی سواری اور ہتھیاروں کے استعمال میں طاق ہوگیا اور کدم بندی والے رسالہ میں بھرتی کر لیا گیا -

اب ملہر راؤ کو اپنی بہادری کے اظہار کا موقع ملا اور چند ہی روز کے بعد وہ کدم بندی کے رسالہ میں ایک بڑا دلیر اور جری سپاہی سمجھا جانے لگا -

اس عرصہ میں شہنشاہ اورنگ زیب کی وفات ہوچکی تھی اور دکن کا علاقہ سخت بد امنی کی حالت میں تھا - صوبہ دار دکن سے مرہٹوں کی روز لڑائی رہتی تھی - ایک مرتبہ کدم بندی کا رسالہ بھی میدان

ـلہ بھائی کا نام بھوج راج برگل تھا - اور وہ خاندیس کے تلودہ گانوں میں رہتا تھا - ۱۲

ـلہ کدم بندی کا خاندان کسی زمانہ میں بیجاپور کے بادشاہوں کی جانب سے "پٹیل" تھا مگر بعد کو سیواجی کے ہمراہیوں میں ہوگیا تھا اور اب کافی حیثیت رکھتا تھا - ۱۲

ـلہ یہ جنگ غالباً ۱۷۱۶ء میں ہوئی تھی اور اس میں مرہٹوں نے سید حسین علی صوبہ دار دکن کو شکست دی تھی (گرانٹ ڈف تاریخ مرہٹہ جلد ۱ - صفحہ ۳۰۲) اسوقت ملہر راؤ کی عمر ۲۰ سال کی ہوگی -

میں موجود تھا اور اس موقع پر ملہرراؤ نے نظام الملک کے ایک سردار کو ایسی جرأت اور ہمت سے قتل کیا کہ مرہٹوں کے سردار کو اس نوجوان سپاہی کی تعریف کرنا پڑی۔ ماموں کا دل بھانجے کی تعریف سے باغ باغ ہوا اور اُس نے اپنی بیٹی گوتما بائی کی شادی اُسکے ساتھ کردی۔ اس مبارک شادی نے ملہرراؤ کی بہادری دُور دُور مشہور کردی اور مرہٹوں کے حاکم اعلیٰ کو رفتہ رفتہ اسکی شجاعت و دلیری کی خبر پہونچی۔

عالمگیر کے مرنے کے بعد سیواجی کا پوتا ساہوجی مغلوں کی قید سے چھوٹ کر آیا تھا اور بادشاہ دہلی کی اجازت سے "ستارہ" میں راج کرتا تھا لیکن ریاست کا انتظام چند وزیروں کے سپرد تھا جن میں سے کاکن[۱] کے علاقہ کا ایک برہمن بالاجی وشوا ناتھ نہایت لائق اور عقلمند تھا۔ اس برہمن نے "پیشوا" کا موروثی خطاب پاکر جنوب میں مرہٹوں کی دھاک بٹھادی تھی اور "بادشاہ گر" سیدوں[۲] سے میل کرکے (جنکی داستانیں تاریخ ہند میں مشہور ہیں) اپنے ہمقوموں کو ایکبار دہلی کی بھی ہوا کھلا لایا تھا۔ اور حسن خدمات کے صلہ میں دکن میں سواراج قائم کرنے کا فرمان بھی اُس کو مل گیا تھا۔ بلکہ بادشاہ فرخ سیر کے قتل کے وقت دہلی میں موجود تھا۔ رفیع الشان اور رفیع الدرجات کی چند روزہ سلطنتیں اسکے سامنے بنیں اور مٹ گئیں اور جب آخرکار دکن واپس آیا تو محمد شاہ کی مُہر بھی اُس فرمان پر تھی جسکے رُو سے ساہوجی دکن کا خود مختار حاکم تسلیم کیا گیا تھا۔

بالاجی "پیشوا" اکتوبر ۱۷۲۰ء میں مرگیا اور اُس کا بیٹا باجی راؤ اول مرہٹوں کی سلطنت کا منتظم تھا کہ اُسکو ملہرراؤ کی بہادری اور ہمت کی خبر ملی اور اُس نے اس بلند ہمت نوجوان کو براہ راست اپنی خدمت میں رکھنا چاہا۔ ملہرراؤ کی عمر اُسوقت ۲۶ سال سے زیادہ ہوچلی تھی مگر ابھی تک کدم بندی کے رسالہ کا ایک سپاہی تھا۔ اپنے آقا سے اجازت لیکر وہ باجی راؤ کی ملازمت میں آیا اور فوراً پانچسو سوار کا افسر مقرر کیا گیا۔ لیکن قدیم ولی نعمت کی یاد تازہ رکھنے کے لیے اُس نے اپنے جھنڈے پر بندی سرداروں کا سا نشان لگایا جو دو سو برس کے بعد بھی ہولکر کے خاندان کا آج تک نشان[۳] ہے۔

---

[۱] کاکن۔ مہاراشٹر کے اُس حصہ کا نام ہے جو مغربی گھاٹ اور کوہستان اور سمندر کے درمیان واقع ہے۔

[۲] سید حسین علی اور سید عبداللہ۔

[۳] یہ نشان ایک مثلث شکل کا ہے۔ جس میں سرخ و سفید دھاریاں ہیں۔ اور بالائی حصہ پر ان ہی دو رنگوں کے پھریرے ہیں۔ ۱۲

"پیشوا" کی فوج میں عہدہ پانے کے بعد ہی وہ کانکن کی فتح کے لیئے مامور کیا گیا اور اس لڑائی میں اُس نے نیکنامی حاصل کی۔ مگر اس بلند ہمت کا سب سے بڑا کارنمایاں جس نے خاندان ہولکر کو دنیا میں مشہور کیا اور سلطنت مغلیہ کو جسم بیجان بنا دیا صوبۂ مالوہ کی فتح تھا۔

یہ صوبہ جنوب میں نربدا سے شمال میں چنبل تک اور مغرب میں راجپوتانہ و گجرات سے مشرق میں بندیلکھنڈ تک پھیلا ہوا تھا اور جس وقت سے کہ اکبر نے گجرات و مانڈو کی جداگانہ سلطنتوں کا خاتمہ کیا۔ شہنشاہ دہلی کی حکومت میں شامل تھا۔ یہ علاقہ آگرہ سے قریب اور دکن کے راستہ میں واقع تھا اسلیئے جب تک دہلی کی سلطنت کمزور نہیں ہوئی اس خطہ کا پُرامن اور بیرونی حملوں سے محفوظ رکھنا ضروری سمجھا گیا مگر عالمگیر کے بعد دہلی کی طاقت مضمحل ہوئی۔ دکن کی طرف پہلے کی سی توجہ نہ رہی اور مالوہ کے صوبہ دار بھی روز تبدیل ہونے لگے۔ محمد شاہ کے عہد میں کبھی نظام الملک یہاں کا صوبہ دار ہوا۔ کبھی گردھر بہادر کبھی محمد خاں بنگش اور کبھی راجہ جے سنگھ۔ اور عاملوں کے جلد جلد تبدیل ہونے سے حکومت کے کل پُرزے ڈھیلے پڑ گئے۔

باجی راؤ کو پیشوائی کی مسند پر بیٹھتے ہی مالوہ کے فتح کی دُھن سوار ہوئی تھی۔ اُس نے راجہ ساہو کو سمجھایا "کہ مغلیہ سلطنت کی بنیاد گل سڑ گئی ہے اس لیے مناسب ہے کہ درخت کے تنہ پر صدمہ پہونچایا جائے تاکہ ہری بھری شاخیں خود بخود گر پڑیں"۔ اور اُسکو یقین دلایا کہ "مالوہ فتح دہلی کی کُنجی ہے۔ اگر اس علاقہ پر ہم قابض ہو گئے تو آگرہ اور دہلی چند روز کے مہمان ہیں"۔ راجہ کو یہ مشورہ پسند آیا اور اُس نے مرہٹوں کی فوج کو نربدا سے عبور کرنے کا حکم دیا۔

جب بُرا وقت آتا ہے تو تباہی کے سامان ہر طرف سے ہجوم کر لیتے ہیں۔ آصف جاہ نظام الملک جو امرائے دہلی میں سب سے زیادہ قابل اور ذی وجاہت اور مالوہ و گجرات کے خراج کا ذمہ دار تھا محمد شاہ کی بد افعالیوں اور اُسکے مصاحبوں کے ناشائستہ حرکات سے آزردہ ہو کر اکتوبر ۱۷۲۳ء میں عہدۂ وزارت ہند سے مستعفی ہوا اور دکن جا کر حیدرآباد کی خود مختار ریاست قائم کی۔ بادشاہ نے مالوہ کی صوبہ داری

سلہ ملکم صاحب اپنی یادداشت مالوہ میں تحریر فرماتے ہیں کہ ہولکر اسی لڑائی میں پیشوا کے بھائی چمن جی کے ساتھ پرتگیز سے لڑنے گیا لیکن یہ واقعہ غلط ہے۔ مرہٹوں کی پرتگال والوں سے لڑائی جسکا سپہ سالار چمن جی تھا ۱۷۳۹ء میں ہوئی تھی اور اس میں بھی ملہار راؤ شریک تھا۔ اسوقت جو کانکن میں جنگ ہوئی وہ ایک غیر مشہور حملہ تھا اور اس میں چمن جی شریک نہ تھا۔

اُس سے لیکر ایک برہمن گر دھر بہادر کے سپرد کی اور اسی زمانہ میں مرہٹوں نے اپنی فوج کو مالوہ پر قبضہ کرنے کے لیئے حرکت دی۔ نظام الملک یہ سوچ کر کہ حیدرآباد اور دہلی کے درمیان مرہٹوں کا قبضہ مالوہ پر ہو گیا تو اُسکو مغلوں کے خوف سے ہمیشہ کے لیئے نجات ملجائے گی سدراہ نہ ہوا۔ اور مرہٹے بخوف نربدا کے پار ہو گئے۔

قدیم کاغذات سے ثابت ہوتا ہے کہ مرہٹوں نے ۱۶۹۰ء ۱۶۹۴ء و ۱۶۹۶ء میں بھی مالوہ پر غارتگری کے چھاپے مارے تھے اور مانڈو وہار پر بھی کچھ دنوں کے لیئے قابض ہو گئے تھے لیکن اُسوقت تک نہ تو کسی مستقل فتح کا ارادہ تھا اور نہ مرہٹوں کو ایسی قدرت تھی کہ اپنے وطن سے دُور کسی علاقہ پر تصرف کا خیال کریں۔ وہ ان موقعوں پر لوٹ مار کے لیے آئے۔ جو کچھ ہاتھ لگا کھسوٹا اور چلے گئے۔ مگر اب وہ اس صوبہ کو اپنے ملک کا ایک جزو بنانے پر مستعد تھے اور دہلی سے کسی سخت مزاحمت کا اندیشہ باقی نہ تھا۔

باجی راؤ کا لشکر ۱۷۲۳ء یا ۱۷۲۴ء میں مالوہ سے "چوتھ" وصول کرنے کے لیئے آیا اور ۱۷۲۸ء سے قبل اس صوبہ کا اتنا وسیع حصہ انکے قبضہ میں آچکا تھا کہ ملہر راؤ ہولکر کو جس نے اس علاقہ کی فتح میں سب سے زیادہ کام کیا تھا حُسن خدمات کے صلہ میں بارہ محال نربدا کے اس پار بطور جاگیر کے عطا کیے گئے۔ ۱۷۲۹ء میں باجی راؤ خود مالوہ کی طرف آیا اور صوبہ دار گر دھر بہادر کو شکست فاش دیکر قتل کیا۔ اُس کا بھتیجا اور جانشین دیا بہادر مالوہ کے باقی ماندہ حصہ پر حکومت کرتا تھا مگر ملہر راؤ ہولکر نے ۱۷۳۲ء میں مقامی زمینداروں کی امداد سے اُسکو بھی قتل کیا[1]۔ اور قریب قریب کُل صوبہ پر مرہٹوں کی سلطنت قائم کر دی۔ پیشوا نے اندور کا ضلع ہولکر کو بطور جاگیر عنایت فرمایا۔ مگر جنگ ابھی ناتمام تھی کیونکہ دہلی کے امرا اس زرخیز علاقہ کو ایسی آسانی سے ضایع نہیں کر سکتے تھے۔

سرکار دہلی سے محمد شاہ بنگش مالوہ کا صوبہ دار مقرر کیا گیا مگر چند ہی روز کے بعد اُسکو مرہٹوں سے شکست کھا کر ایک قلعہ میں پناہ لینی پڑی وہ بمشکل اپنی جان بچا کر الہ آباد بھاگا اور بادشاہ نے یہ صوبہ راجہ جے سنگھ والیِ جے پور کے سپرد کیا۔

کہا جاتا ہے کہ باجی راؤ نے مالوہ پر چڑھائی کرنے سے پہلے ہی راجہ جے سنگھ سے سازش کر لی تھی اور "پوران" سے ایک عبارت نقل کر کے غرض مطلب کے لیئے اُسکے پاس بھیجی تھی:

---

[1] یہ لڑائی تردہارنہ کے قریب ہوئی تھی - ۱۲

"تو مثل اُس بادل کے ہے جو سمندر کا پانی پیتا ہے اور پھر اُس پانی کو گرج اور تڑپ کے ساتھ زمین
کی طرف واپس کرتا ہے تاکہ گھاس اُگے اور سرسبزی ہو۔ پہاڑ ڈر کے خوف سے تیرے پاس پناہ کے
لیئے آتے ہیں۔ تو تمناؤں کا درخت ہے بلکہ تو وہ سمندر ہے جس کے فیض سے تمناؤں کا درخت اُگتا ہے
تیری گہرائی کوئی نہیں جان سکتا کیونکہ تو سمندر کی طرح بے تھاہ ہے۔
تجھکو ہر حال میں اگستؔ مُنی[۱] کو یاد رکھنا چاہیئے"۔

جے سنگھ نے اس تحریر کا پوران ہی کے الفاظ سے جواب دیا تھا۔

"برہما کی اولاد اگر میرا تصور کرے تو میں معاف کروں گا۔ یہ میرا وعدہ ہے۔ میں اسیر قائم ہوں
اگست منی اکیلا سمندر کا پانی پی گئے تو کیا حاصل ہوا۔ اگر خدا اُن دیواروں کو جو سمندر کے گرد ہیں
گرا دیتا تو دنیا تباہ ہو جاتی اور تب اگست مُنی کہاں رہتے"۔

اس سوال و جواب کے ظاہری الفاظ سے کوئی بغاوت ثابت نہیں ہوتی لیکن باجی راؤ اور جے سنگھ کا جو مطلب تھا وہ ان دونوں نے بخوبی سمجھ لیا یعنی مرہٹے اگر مالوہ پر حملہ کریں تو جے سنگھ مخالفت نہ کرے گا کہ مغلوں کی طاقت بڑی ہے اور اگست مُنی کے قائم مقامون کو انکی قدرت سے خائف رہنا چاہیئے۔!!

یہ خط کتابت معلوم نہیں کہ در اصل واقع ہوئی[۲] یا فقرہ بازوں نے قصہ تراش لیا لیکن اس میں کلام نہیں کہ صوبہ داری مالوہ پر نامزد ہونے کے بعد جے سنگھ نے بجائے مرہٹوں کو تباہ و پسپا کرنے کے بادشاہ سے سفارش شروع کی کہ یہ علاقہ پیشوا کے سپرد کر دیا جائے!! اور ۱۷۳۶ء میں باجی راؤ مالوہ کا صوبہ دار بنا دیا گیا اگرچہ ملہر راؤ بزور شمشیر اُسکو پہلے ہی فتح کر چکا تھا۔

مصاحبان شاہی نے سمجھا ہوگا کہ باجی راؤ مالوہ کی صوبہ داری کا زبانی وعدہ لیکر خاموش ہو جائیگا اور کوئی تازہ چھیڑ نہ نکالے گا لیکن اُنکا خیال غلط ثابت ہوا اور مرہٹوں نے اصرار کیا کہ مالوہ اور گجرات کی چوتھ وصول کرنے کا فرمان حسب ضابطہ عنایت کیا جائے۔ محمد شاہ کے مشیروں نے پروانہ جاری کرنے میں پس و پیش کیا تو پیشوا نے اپنے سرداروں کو دہلی کے مقبوضات پر چھاپے مارنے اور دارالسلطنت

---

[۱] اگست منی ایک رشی تھے جو ہندوؤں کے عقیدہ کے مطابق ایکبار سمندر کا سب پانی پی گئے تھے۔ ۱۲

[۲] ملکم صاحب اپنی یادداشت میں لکھتے ہیں کہ اُن سے چند مرہٹوں نے یہ قصہ بیان کیا تھا۔

آگرہ تک دعاوے کرنے کی اجازت دی تاکہ دہلی کے ارکان حکومت کو باضابطہ فرمان عطا کرنے کے لیئے یاددہانی ہوتی رہے!! مالوہ کا صوبہ مرہٹہ سرداروں میں تقسیم کیا گیا اور جنوبی حصہ جو سب سے زیادہ محفوظ تھا ملہر راؤ کو عنایت فرما کر پیشوا دکن کو واپس گیا۔

ملہر راؤ ہولکر نے راجپوتانہ اور ہندوستان پر چھاپے مارنا شروع کیئے اور اُس کا اقبال ہر مہم میں ساتھ تھا۔ ایک دفعہ محمد شاہ کی بیگم ملکۂ زمانیہ کا خیمہ و خرگاہ بھی اُس نے لوٹ لیا اور اس فتح کی دو یادگاریں مدت تک خاندان ہولکر میں محفوظ رہیں جن میں سے ایک تو رتھ تھا جسکے پردوں پر موتی ٹکے ہوے تھے اور دوسری جواہرات کی ایک کنگھی تھی جسکی قیمت کا تخمینہ ایک لاکھ کا کیا جاتا تھا۔

جس قدر فرمان کے اجرا میں دیر ہوتی گئی اُتنا ہی باجی راؤ اپنے مطالبوں کو بڑھاتا گیا یہاں تک کہ مالوہ اور چنبل کے جنوب کے علاوہ متھرا، الہ آباد، اور بنارس کے مقدس شہروں کو بھی اپنی جاگیر میں شامل کیئے جانے کا آرزومند ہوا۔ شاہی لشکر کئی بار مرہٹوں سے مقابل ہوا لیکن ملہر راؤ فنونِ حرب میں یگانۂ روزگار تھا۔ وہ مغلوں سے جم کر لڑائی نہ کرتا تھا بلکہ اچانک حملوں سے اُنکے لشکر کو تباہ کردیتا تھا اور خیمہ و خرگاہ لوٹ لیتا تھا۔

عاجز آکر بادشاہ نے مرہٹوں کو راجپوتانہ سے خراج وصول کرنے اور آصف جاہ کی قلمرو سے اپنی مرضی کے مطابق نذرانہ لینے کا اختیار دیا۔ لیکن یہ ترکیب بھی نہ چلی اور باجی راؤ صوبہ داری کا فرمان لینے کے لیے بذات خاص ہندوستان کی طرف بڑھا۔ ملہر راؤ نے جمنا پار کا ہندوستانی علاقہ بیدریغ لوٹنا شروع کیا لیکن اودھ کے صوبہ دار نواب سعادت خاں نے سلطنت کی آبرو رکھ لی اور مرہٹوں کو پسپا کیا۔ باجی راؤ نے اس خفیف مزاحمت کی کچھ پروا نہ کی اور ۱۷۳۷ء میں دہلی کے سامنے پہونچ گیا۔

اب آصف جاہ کو ہوش آیا کہ مغلوں کی عداوت سے جو اندیشہ تھا وہی اُنکی کمزوری سے ہے۔ اور جب دہلی کی سلطنت مٹ جائیگی تو مرہٹے اُس کا ملک بھی باقی نہ رکھیں گے لہذا وہ دکن سے بادشاہ کی امداد کے لیئے چلا۔ اُدھر قمر الدین خاں وزیر سلطنت اور سعادت خاں نے باہم متحد ہو کر مرہٹوں سے مقابلہ کا ارادہ کیا۔ یہ سیلاب بڑھتا دیکھ کر باجی راؤ دکن کی طرف واپس گیا اور مالوہ کی صوبہ داری بادشاہ نے آصف جاہ کے بیٹے غازی الدین کو عطا فرمائی۔ شاہی لشکر مرہٹوں کی سرکوبی

کے لیئے روانہ ہوا لیکن بھوپال کے مقام پر بعض سرداروں کی غفلت سے ایسی سخت شکست ہوئی کہ آصف جاہ کو باجی راؤ کے کل شرائط منظور کرنا پڑے - اور یہ معاہدہ[1] ہوا کہ نربدا سے چنبل تک جس قدر علاقہ ہے اور جس کا ایک جزو مالوہ بھی ہے مرہٹوں کو دیا جائیگا اور اس عہدنامہ پر بادشاہ کے مُہر و دستخط کرا دیئے جائیں گے۔ اس قول و قرار کے بعد آصف جاہ دہلی کو واپس گیا اور باجی راؤ نے ممالک مذکور پر قبضہ کرلیا۔ ابھی عہدنامہ پر شاہی دستخط نہ ہو پائے تھے کہ نادرشاہ[2] نے ہندوستان پر چڑھائی کی اور اُسکے قتل و غارت سے تمام شمالی ہندوستان نیم مردہ ہوگیا۔

جب باجی راؤ کو نادرشاہ کے خوف و ہراس سے اطمینان نصیب ہوا تو اُس نے عہدنامہ پر دستخط ہونے کا تقاضا کیا اور کہا کہ وہ دہلی پر حملہ کرکے بادشاہ سے اپنی من مانی شرطیں منظور کرا لیگا، مگر ہندوستان پر چڑھائی کرنے سے قبل آصف جاہ کے بیٹے[3] ناصر جنگ سے لڑائی ہوگئی اور ۱۷۴۰ء میں مرہٹوں کو ایسی سخت زک پہونچی کہ نظام سے صلح کرنا پڑی اور دہلی کی چڑھائی ملتوی رہی۔ باجی راؤ کو اس غیر متوقع شکست کا نہایت صدمہ ہوا اور اُس نے اپنے گُرو کو ایک خط لکھا جسکے چند فقرے[4] یہ ہیں:

"میں مشکلات میں گرفتار ہوگیا - قرضہ اور مایوسی نے مجھکو دبالیا - میری اسوقت وہ حالت ہے جسمیں آدمی زہر کھانے کو تیار ہوجاتا ہے - راجہ کی مجلس میں میرے بدخواہ جمع ہیں - اگر میں "ستارہ" جاؤں تو دشمن میری چھاتی پر کود دوں دینگے - اس وقت موت آجائے تو خدا کا شکر کروں۔"

اُسکی دعا قبول ہوئی - اور اپریل ۱۷۴۰ء میں ناصر جنگ سے شکست کھانے کے چند ہی روز بعد وہ نربدا کے کنارے دنیا سے راہی ہوگیا۔

باجی راؤ کے بعد اُسکا بڑا بیٹا بالاجی راؤ پیشوا ہوا جو ہوشیاری اور طراری میں اپنے باپ کے برابر تھا - اُسنے ایک ہی سال کے اندر ملک کے انتظامات اندرونی درست کرلیئے اور دہلی کے دربار کو

---

[1] یہ معاہدہ فروری ۱۷۳۸ء میں ہوا - ۱۲-

[2] نادرشاہ کے قتل عام و غارتگری کی داستان ہندوستان میں مشہور ہے - ایسٹ انڈیا کمپنی کے تبیعہ بنگال سے معلوم ہوتا ہے کہ نادرشاہ دہلی سے ۵ - مئی ۱۷۳۹ء کو واپس گیا - ۱۲

[3] آصف جاہ دہلی میں تھا اور اس کا دوسرا بیٹا ناصر جنگ دکن میں فوج کا سپہ سالار تھا - ۱۲

[4] گرانٹ ڈف تاریخ مرہٹہ - جلد ۱ - صفحہ ۵۶۴ - فٹ نوٹ -

مالوہ کی جاگیر کے لیئے یاددہانی شروع کی -

اُس زمانہ کے بہادر بھولے ہوئے وعدوں کی یاددہانی کاغذکے پرزوں سے نہیں کیا کرتے تھے بلکہ تلواروں، نیزوں، اور بھالوں سے قول وقرار یاد دلایا کرتے تھے - مرہٹوں نے بنگال پر حملہ کیا اور وہاں کا صوبہ دار الہ وردی خاں عاجز آکر بادشاہ سے امداد کا خواستگار ہوا - محمد شاہ کے پاس فوج کہاں باقی تھی جو بنگال کی مدد کرتا البتہ اس بہانہ سے بادشاہ دہلی کو مرہٹوں سے پُرانا عہدنامہ یاد آگیا!! مالوہ کا صوبہ مرہٹوں کے سپرد کرنا دکن کی حکومت سے ہمیشہ کے لیے دست بردار ہونا تھا - اس لیئے رنگیلے بادشاہ کو شراب کے نشہ میں بھی یہاں کا علاقہ چھوڑنے کی ہمت نہ پڑتی تھی مگر بالاجی نے حکمت عملی سے راجہ جے سنگھ کو ایسی پٹی پڑھائی کہ اُسنے چھ مہینے کے اندر مالوہ کی صوبہ داری کا فرمان ساہو جی کے نام جاری کرانے کا وعدہ کرلیا - اُدھر نظام الملک نے بھی بالاجی کو مالوہ کی نائب صوبہ داری دلانے کا اقرار کیا اور مرہٹوں نے پچاس لاکھ روپیہ کا ایک جدید مطالبہ پیش کیا تھا (جسکی بنیاد یہ قائم کی تھی کہ بادشاہ دہلی نے نادرشاہ کے خلاف مدد دینے کے لیئے اس انعام کا اقرار کیا تھا اور باوجودیکہ مرہٹے اُسوقت دہلی کو مدد نہیں پہونچا سکے لیکن انعام تو بہرحال ملنا چاہیئے !!) جسکو سنکر بھیڑیئے اور میمنے کی قدیم کہانی یاد آتی ہے مگر نظام الملک نے سلطنت کی کمزوریوں پر نظر کرکے اس رقم کے دلانے کے لیئے بھی سفارش کا وعدہ کرلیا -

جب سب طرف سے بالاجی کا پایہ زبردست ہوگیا اور محمد شاہ کے دست و بازو قابو سے باہر ہوگئے تو اُس نے مجبور ہوکر اپنی آبائی سلطنت کی خودکشی کا پروانہ جاری کیا - یعنی پیشوا کو صوبہ دار مالوہ تسلیم کرلیا اور ۲۲ - جمادی الاول سنہ جلوس (مطابق سنہ ء) کو فرمان[1] پر دستخط کردیئے - مگر اطمینان کے لیئے مرہٹہ قوم کے چار بڑے سرداروں سے جن میں سے ایک ملہر راؤ بھی تھا ضمانت لی کہ پیشوا سلطنت دہلی کے تابع رہیگا - اور اگر وہ بغاوت کرے تو یہ چاروں سردار اُسکی ملازمت سے دستکش ہوجائیں گے -

اس تاریخ سے مالوہ سلطنت دہلی سے جدا ہوگیا اور یہاں ملہر راؤ نے مرہٹوں کی مستقل حکومت

---

[1] یہ فرمان ریاست پونا کے محافظ خانہ میں آخری پیشوا کے عہد تک موجود تھا - اور اس کا انگریزی ترجمہ گرانٹ ڈف نے اپنی تاریخ مرہٹہ میں نقل کیا ہے (جلد ۲ - صفحہ ۵)

کی وہ بنیاد ڈالی جو دلّی کے تباہ ہونے، پونا کا دربار لُٹنے اور انگریزی راج قائم ہونے پر بھی نہ ہل سکی!!

خدا کی شان! ملہر راؤ جو بچپن میں بکریاں چراتا تھا آج ایسا معزز ہوا کہ اُسکی ضمانت پر بادشاہ دہلی اپنا بہترین علاقہ مرہٹوں کے سپرد کرتا ہے اور وہ اس حکومت پر قناعت نہ کرکے تخت دہلی کی بھی ہوس رکھتا ہے!!!

جس دن سے دریائے نربدا کو عبور کرکے مرہٹوں کے ہراول سپاہی مالوہ کے حدود میں داخل ہوئے ملہر راؤ اس صوبہ کی فتح کے متعلق تمام فوجی مشوروں میں شریک تھا۔ ۱۷۳۱ء میں پیشوا نے اُسکو نربدا پار کے تمام علاقہ کا حاکم بنا دیا۔ اور مالوہ پر مرہٹوں کا قبضہ دراصل اُسی کی کوشش کا ثمرہ تھا۔

اس علاقہ پر باضابطہ متصرف ہونے کے بعد اُس نے مرہٹوں کی شہنشاہی کا خواب دیکھنا شروع کیا اور نیت کی کہ مغلوں کو ہندوستان سے نکال کر پیشوا کو دہلی کے تخت پر بٹھا دے۔ اُسنے ادھر سے اٹک تک اور راجپوتانہ سے کمایوں تک دھاوے شروع کیئے۔ جس طرف سے گذرا مرہٹوں کا رعب رعایا کے قلوب پر بٹھا دیا۔ جس قدر اُسکے دبدبہ میں اضافہ ہوتا تھا اُتنی ہی بادشاہ دہلی کی ہوقعتی ہوتی تھی اور وہ آبدکے باشندے جو اکبر و جہانگیر کے جاہ و جلال کی بدولت ابھی تک دلّی کے نام پر جان دیتے تھے روز بروز وہاں کے بادشاہ سے برگشتہ ہوتے جاتے تھے۔

اس عرصہ میں مرہٹوں کا برائے نام راجہ ساہوجی مرگیا اور پیشوا کی کوشش سے راجہ رام مسبوق الذکر کا لڑکا ستارہ کا حاکم ہوا تو مالوہ کے محاصل سے ۵۰ لاکھ کی جاگیر ملہر راؤ کو عنایت کی گئی۔ مالوہ کی کل نکاسی اُسوقت ڈیڑھ کروڑ تھی اور اُس میں سے نصف ہولکر کو عطا ہوتا اور بقیہ میں سندھیا[لہ] وغیرہ

لہ رنوجی سندھیا کا خاندان کسی زمانہ میں معزز اور باحیثیت تھا مگر انقلاب زمانہ سے غریب ہوگیا تھا یہاں تک کہ رنوجی پیشوا کا کفش بردار تھا۔ ایک دن پیشوا کو راجہ ساہو کی مجلس میں دیر تک حاضر رہنا پڑا اور یہ ملازم اپنے آقا کی جوتیاں ہاتھوں سے تھامے ہوئے سوگیا۔ جب پیشوا باہر آیا تو اپنی جوتیاں ملازم کے ہاتھ میں اُسکے سینے پر رکھی ہوئی دیکھ کر اور ملازم کو نیند کی غفلت میں بھی اپنی خدمت سے خبردار پاکر بہت خوش ہوا اور اُسکو پاگاہ کے سواروں میں بھرتی کرلیا۔ رفتہ رفتہ وہ سلطنت کا ایک رکن ہوگیا۔ مالوہ کی فتح میں شریک تھا۔ اور اُس کا اقبالمند لڑکا "مادھاجی" ہندوستان کی تاریخ میں مشہور ہے۔ شاہ عالم اسی کا وظیفہ خوار تھا۔ اور گوالیار کی موجودہ ریاست اسی کے جانشینوں کے پاس ہے۔

بہت سے سرداروں کا شریک کیا جانا اس دعوے کا ثبوت ہے کہ ملہر راؤ سے زیادہ کسی سردار کی عزت پیشوا کی نظر میں نہ تھی۔ اور اُس سے زیادہ شجاع اور کار آزمودہ جنرل مرہٹوں کے ملک میں کوئی موجود نہ تھا اگر اُسکے صلاح و مشورہ پر آیندہ بھی عمل ہوتا تو یقیناً ہندوستان میں مرہٹوں کی سلطنت قائم ہوجاتی اور آج تاریخ ہند میں کچھ اور ہی دا ستان نظر آتی مگر اسکی تفصیل کا ابھی وقت نہیں آیا۔ کچھ عرصہ کے بعد اسکا انجام ظاہر ہوگا۔

مالوہ کی جاگیر کے علاوہ راجپوتانہ میں رامپورہ، بھانپورہ[1] اور ٹونک کا علاقہ بھی اُسکے قبضہ میں تھا اور دکن میں بھی کافی جائداد اُسکے پاس تھی اور اُسکی فوجی طاقت اس قدر قوی تھی کہ جب ۱۷۵۱ء میں دہلی کے وزیر صفدر جنگ کو جو اپنے باپ سعادت خاں کی جگہ اودھ کا صوبہ دار اور دہلی کا وزیر ہوا تھا روہیلوں نے ستایا تو اُس نے سلطنت کی ذلت و حقارت کا لحاظ نہ کرکے اپنے ملک کی حفاظت کے لیئے ملہر راؤ سے مدد مانگی۔ ہولکر ایسے موقع کا منتظر ہی تھا فوراً وزیر کی امداد کو پہونچا اور ایک عجیب و غریب چالاکی سے دشمن کو شبخون مار کر تباہ کردیا۔ کہتے ہیں کہ کارتھج کے مشہور سپہ سالار ہنبال نے رومیوں کو زک دینے کے لیئے یہ ترکیب کی تھی کہ رات کے وقت دو طرف روشنی کردی اور تیسری طرف سے اندھیرے میں حملہ کیا۔ رومیوں نے یہ سمجھ کر کہ وہ تین طرف سے گھرے ہوئے ہیں چوتھی طرف سے بھاگنا شروع کیا۔ ملہر راؤ کے وقت تک کارتھج کی قدیم تاریخ تو ہندوستانی کم جانتے ہوں گے اس لیئے تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ ہولکر کے دماغ میں خودبخود وہی نقشہ جما جو ہنبال[2] کو سوجھا تھا۔ اس نے ہزاروں جانوروں کی سینگوں میں مشعلیں باندھیں اور اُنکو روشن کرکے ایک طرف سے دشمن کی جانب ہانک دیا۔ دوسری سمت درختوں اور جھاڑیوں پر ہزاروں قندلیں آویزاں کردیں۔ اور تیسری طرف سے اپنی فوج

---

[1] راجہ جے سنگھ والی جے پور کے مرنے کے بعد اُسکے لڑکوں میں وراثت کے لیئے جھگڑا ہوا۔ ہولکر نے چھوٹے بیٹے مادھو سنگھ کا اس بنا پر ساتھ دیا کہ وہ اودے پور کی ایک لڑکی کے پیٹ سے ہے اور اس لیئے شرافت میں افضل ہے۔ بڑا لڑکا خودکشی کرکے مرگیا اور ہولکر کا دوست راجہ ہوا تو اُسنے ۶۴ لاکھ روپیہ نقد اور رامپورہ و بھان پورہ اور ٹونک کا علاقہ ہولکر کو نذر کیا ۔۱۲

[2] ہنبال اور ملہر راؤ کے منصوبوں کا انجام بھی یکساں ہوا۔ نہ وہ رومتہ الکبریٰ میں کارتھج کا سکہ چلا سکا نہ پیشوا کو دہلی کے تخت پر بٹھا سکا۔ مگر روما میں کچھ دم باقی نہ رہا تھا اور خلاف اُمید معاملات نے اُسکو پسپا ہونے پر مجبور کیا اسی طرح دہلی کی سلطنت میں کوئی قوت باقی نہ رہی تھی اور احمد شاہ ابدالی بھی ملہر راؤ کو زیر نہ کرسکتا اگر پانی پت کی لڑائی میں اُسکے مشورہ پر عمل ہوتا جیسا آگے بیان ہوگا ۔۱۲

لیکر حملہ کیا۔ روہیلوں نے سمجھا کہ وہ ہر طرف سے گھر گئے اور خوفزدہ ہوکر ایسے بھاگے کہ ہمالیہ کے دامن میں پناہ لی۔ اُن کا خیمہ وخرگاہ لوٹ لیا گیا۔ اودھ کا صوبہ محفوظ ہوگیا اور شاہ دہلی کی طرف سے روہیلوں کو تباہ کرنے کے انعام میں چند ورکی سرویش لکھی یعنی دس فی صدی مالگذاری وصول کرنے کا ہولکر کو فرمان عنایت ہوا۔ (ظریف کہتے ہیں کہ ؎ رسم یاں ہے نگوڑ مارنیا۔ اُلٹا دینا پڑا ہے خون بہا۔)

کہا جاتا ہے کہ جب ملہر راؤ نے روہیلوں کو اپنی تدبیر وحکمت سے تباہ کیا اور صفدر جنگ کی گلوخلاصی ہوئی تو اُس نے ہولکر سے پوچھا کہ وہ اس فتح کا کیا معاوضہ چاہتا ہے؟ وفاپرست سردار نے عاجزی سے جواب دیا کہ "میں پیشوا کا غلام ہوں اور اُسکی ماتحتی سے الگ ہوکر کوئی نفع نہیں چاہتا البتہ خاندیس میں چند ورکی دیش لکھی اگر مجھکو عطا فرمائی جائے تو میں بہت خوش ہوں گا"۔ چنانچہ یہ درخواست منظور ہوئی اور چند ورکی جاگیر دی گئی۔

ملہر راؤ کو صفدر جنگ سے کوئی خاص محبت نہ تھی۔ وہ اپنے ارادہ کی تکمیل کے لیئے وزیر کا شریک ہوا تھا۔ اور اس بہانہ سے اُس نے روہیلوں کی زبردست فوج کو کچل ڈالا۔ وہ دہلی کے امرا کے ساتھ اسوقت وہی بازی کھیل رہا تھا جو پچاس برس کے بعد ایک اقبالمند قوم نے اُسکے ہموطنوں کے مقابلہ میں دکھائی۔ اُس نے صفدر جنگ سے مل کر روہیلوں کو تباہ کیا اور پھر نظام الملک کے بیٹے غازی الدین سے مل کر صفدر جنگ کو زچ کرنے لگا۔ یہ چال پہلے سے بھی زیادہ گہری تھی۔ غازی الدین کی سازش سے حیدرآباد اور دہلی دونوں جگہ مرہٹوں کا اقتدار قائم کرنا منظور تھا۔ جب غازی باپ کے مرنے کے بعد دکن کی ریاست پر قبضہ کرنے کو چلا تو ہولکر اپنی فوج لیئے ہوئے اُسکی مدد کو ساتھ تھا! پیشوا نے بھی موقع مناسب سمجھ کر حیدرآباد میں قدم جمانا چاہے۔ اور مرہٹوں کی فوجیں غازی الدین کو بزور شمشیر حیدرآباد کی مسند پر بٹھانے کو اورنگ آباد میں جمع تھیں کہ غازی الدین[1] کا دفعۃً انتقال ہوگیا۔ فریق مخالف بغیر مزاحمت کے مسند نشیں ہوا اور مرہٹوں کو دست اندازی کا کوئی بہانہ باقی نہ رہا۔

---

[1] بعض انگریز مورخوں نے لکھا ہے کہ غازی الدین کو اُسکی ماں نے زہر دیا۔ جب یہ روایت خلاف فطرت سمجھی گئی تو دوسرے مورخوں نے اصلاح کی کہ سوتیلی ماں نے زہر دیا تھا مگر ان میں سے کسی قول کی دکن کی اسلامی تاریخوں سے تائید نہیں ہوتی۔ کیا اچانک موت بغیر زہر خورانی کے ممکن نہیں؟ خدا کو حیدرآباد کی ریاست قائم رکھنا منظور تھی ورنہ پونا کے راج کے ساتھ اُسکا بھی خاتمہ ہو جاتا!!

غازی الدین کا ایک لڑکا دہلی میں تھا اُسکو صفدر جنگ نے غازی الدین خاں خطاب اور امیرالامرائی کا منصب دلاکر باپ کا قائم مقام کیا لیکن وہ اپنے محسن کے خلاف ہوگیا اور اُسکا زور کم کرنیکے لیئے احمد شاہ کو تخت سے اُتار کر عالمگیر ثانی کو بادشاہ بنایا اور خود اُس کا وزیر بنگیا۔

محمد شاہ رنگیلے کے وقت میں نادر شاہ کے حملہ کے بعد ہندوستان پر ایک چڑھائی[سلہ] احمد شاہ ابدالی نے کی تھی (جو نادر شاہ کی موت کے بعد افغانستان کا حاکم ہوگیا تھا) اور اپنا رقبۂ حکومت پنجاب تک وسیع کرکے لاہور میں ایک نائب السلطنت قائم کیا تھا۔ اور اس طرح سے یہ زرخیز صوبہ کبھی دہلی کی حکومت سے الگ ہوچکا تھا۔ محمد شاہ کے بعد اُسکا بیٹا احمد شاہ دہلی میں تخت نشیں ہوا تو اُس نے بھی پنجاب پر دوبارہ تسلط قائم کرنے کی کوشش نہیں کی اور جب ابدالی کا نائب بقضاء الٰہی فوت ہوگیا تو اُسکے شیرخوار بیٹے کو (بولایت اسکی ماں کے) پنجاب کا حاکم رہنے دیا تھا لیکن عالمگیر ثانی کا زمانہ آیا اور غازی الدین وزیر ہوا تو اس صوبہ کو ابدالی کے پنجہ سے نکالنے کی کوشش شروع کی گئی۔ غازی الدین نے مرحوم صوبہ دار کی بیوہ سے خط کتابت کی اور اُس کی ناکتخدا بیٹی سے نکاح کا پیام دیا۔

رشتہ منظور ہوا تو وزیر اپنا بیاہ رچانے کے بہانہ سے لاہور کی طرف بڑھا۔ ۱۷۵۶ء میں یکایک شہر کو جا دبایا اور مظلوم بیوہ کو سوتے ہوئے گرفتار کیا۔ جب وہ قید ہوکر وزیر کے سامنے آئی تو غازی الدین کو کوسنے لگی اور پیشین گوئی کی کہ اُس کا آقا احمد شاہ ابدالی اس ذلت کا بدلہ لیگا۔ یہ قول بالکل صحیح ثابت ہوا۔ ابدالی اپنی متوسلہ کی بربادی سنکر مدد کو دوڑا اور پنجاب سے گذر کر دہلی کے قریب تک پہونچ گیا۔ وزیر نے خوشامد سے بیوہ کا غصہ ٹھنڈا کیا اور اُسکو بیچ میں ڈال کر احمد شاہ سے معافی مانگی لیکن وہ اپنا سفرخرچ وصول کرنے کے لیئے دہلی کی طرف بڑھا اور متھرا کو لوٹ کر جون ۱۷۵۷ء میں اپنے ملک کو واپس گیا۔ رخصت کے وقت بادشاہ دہلی نے ابدالی کی منت کی کہ اُسکو غازی الدین وزیر کے رحم پر چھوڑنا مروت کے خلاف ہے تو اپنے سامنے ہی اُس نے نجیب خاں روہیلہ کو دہلی کا امیرالامرا بنایا۔ اور اس سردار کو بادشاہ کی حفاظت کی تاکید کی۔

جیسے ہی ابدالی اقلیم ہند سے باہر ہوا غازی الدین نے دوبارہ سر اُٹھایا اور حاکم فرخ آباد احمد خاں بنگش کو امیرالامرائی کا منصب عنایت کرکے نجیب خاں کو معطل کر دیا۔ خود غازی الدین کو اتنی قوت نہ تھی

سلہ یہ احمد شاہ کا پہلا حملہ تھا جو ۱۷۴۸ء میں ہوا۔

کہ نجیب الدولہ کو زیر کر سکے لہذا اُس نے پھر مرہٹوں سے امداد طلب کی۔ اُنکی اعانت سے شہر پر متصرف ہو کر قلعہ شاہجہانی کو چاروں طرف سے گھیر لیا۔ اور مرہٹوں کا ایک فوجی دستہ نجیب الدولہ کے وطن روہیلکھنڈ پر حملہ کرنے کو روانہ کیا۔

جب بادشاہ کو قلعہ کی حفاظت سے مایوسی ہوئی تو اُس نے حکمت عملی سے اپنے بیٹے علی گوہر کو بھگا دیا اور ملہر راؤ ہولکر سے نامہ و پیام کر کے نجیب الدولہ کی جان بچائی۔ ان امور سے فراغت کے بعد بادشاہ نے قلعہ کے دروازے کھول دیئے اور غازی الدین کو اپنا وزیر تسلیم کر لیا۔ اسوقت ہولکر کی سازش سے نجیب خاں کی خلاصی ہوئی تو ہمیشہ کے لیئے ان دونوں میں ایک خفیہ دوستی قائم ہو گئی۔ لیکن ملہر راؤ کا مقصود اس امداد سے نجیب الدولہ کی ہمدردی نہ تھی بلکہ غازی الدین خاں سے برابر کی چوٹ کے لیئے ایک زبردست مخالف کا زندہ رکھنا مرہٹوں کی آیندہ کامیابیوں کے لیئے مناسب تھا۔ نجیب الدولہ سہارنپور کی طرف بھاگا اور اس تہ کو نہ سمجھ کر ملہر راؤ کا بہت ممنون ہوا اور اُس کی شکرگذاری آیندہ بہت پھول پھل لائی۔

بہرحال اس مہم کے بعد ۱۷۵۸ء میں وزیر کے مشورہ سے مرہٹوں نے پنجاب پر حملہ کیا۔ اور وہاں سے ابدالی کے نائب کو ہٹا کر دوسرا سردار پنجاب کی حکومت پر تعینات کیا۔

مرہٹوں کا دستہ جو روہیلکھنڈ کی طرف گیا تھا اُس نے نجیب الدولہ کا ملک خوب لُوٹا اور پھر اودھ کی طرف رخ کیا۔ قریب تھا کہ پنجاب سے بنگالہ کی سرحد تک کُل علاقہ مرہٹوں کے تصرف میں آجائے مگر شجاع الدولہ نے اپنی قدیم رنجشوں کو فراموش کر کے روہیلوں سے میل کیا اور نومبر ۱۷۵۹ء میں مرہٹوں کو گنگا پار ہٹا دیا۔

احمد شاہ ابدالی کو نجیب الدولہ کی معطلی اور بے بسی کی خبر ہوئی تو وہ کابل سے کوچ کر کے پھر پنجاب تک آ پہونچا۔ غازی الدین کو خوف پیدا ہوا کہ بادشاہ اُسکی زیادتی کی شکایت کرے گا اور نجیب الدولہ کی تباہی کا انتقام لیا جائے گا تو اُس نے مظلوم عالمگیر ثانی کو (بتاریخ ۲۰۔ نومبر ۱۷۵۹ء) قتل کر دیا اور دوسرے شہزادہ[1] کو تخت پر بٹھانا چاہا مگر یہ ترکیب کارگر نہ ہوئی۔ شہزادہ علی گوہر شجاع الدولہ کی پناہ میں تھا اور باوجود معزور ہونے کے وہی شاہ عالم کے خطاب سے ہندوستان کا جائز بادشاہ متصور رہا۔ اگرچہ دارالسلطنت دوسروں کے قبضہ میں تھا۔

---

[1] یہ شہزادہ کام بخش پسر اورنگ زیب کا لڑکا تھا۔

بہرحال بادشاہ کو قتل کرکے غازی الدین نے مرہٹوں کی فوجیں ابدالی کو روکنے کے لیے پنجاب کی طرف بڑھائیں۔ یہ لشکر دو حصوں میں تقسیم تھا۔ ایک پر دتاجی[۱] سندھیا اور دوسرے پر ملہار راؤ ہولکر حاکم تھا۔ رعایا غازی الدین اور مرہٹوں سے بیزار تھی اس لیئے ابدالی کے کوچ و مقام کی ان سرداروں کو صحیح خبر نہ مل سکی۔ دتاجی کی فوج پر ابدالی نے لیکایک چھاپا مارا اور اُسکے لشکر کا بیشتر حصہ کاٹ کر پھینکدیا۔ ہولکر نے دانشمندی سے چمبل کی طرف واپسی شروع کی تاکہ دشمن کی رسد روک دے۔ مگر افغانوں نے اُسکو بھی ایک دن گھیر لیا اور تباہی کے لگ بھگ پہونچا دیا۔ بڑی حکمت سے وہ اپنی فوج کا زیادہ حصہ بچاکر جنوب کی طرف بھاگا اور ابدالی دوآبہ میں داخل ہوگیا۔

باوجود اس اتفاقی ناکامی کے مرہٹوں کی قوت اسوقت شباب پر تھی۔ شمال میں ہمالیہ اور دریائے اٹک تک اُن کا دبدبہ قائم اور جنوب میں سمندر تک اُنکی حکومت تھی۔ جو صوبے اُنکی اطاعت سے آزاد تھے وہ یا تو باجگزار بنگئے تھے یا اس قدر ضعیف اور کمزور ہو چلے تھے کہ مرہٹوں کی غلامی میں داخل ہونے کو بہانہ ڈھونڈھتے تھے۔ مرہٹوں کا راجہ بدستور "ستارہ" میں نظربند تھا اور حکومت پیشوا کے ہاتھ تھی۔ فتوحات میں دوسرے سرداروں نے بھی مدد کی تھی مگر اس ترقی کا سب سے بڑا باعث ملہار راؤ ہولکر تھا جو قریب قریب ہر میدان میں کامیاب ہوتا تھا اور جس جگہ صورت دگرگوں نظر آتی تھی وہاں سے اپنی فوج کو نہایت خوبی کے ساتھ ہٹاکر دوسرے کمزور مقاموں پر حملہ کر دیتا تھا اور مرہٹوں کی سطوت و جبروت میں فرق نہ آنے دیتا تھا۔

جبکہ ہولکر شمالی ہندوستان کو مرہٹوں کی سلطنت کے لیئے صاف کر رہا تھا۔ پیشوا کا چچازاد بھائی "سدا شیو بھاؤ" دکن میں سلطنت کو وسعت دینے اور نظام کے زیر کرنے میں مصروف تھا۔ اس نے صوبہ دار دکن کو شکست دے کر بہت علاقہ اور روپیہ وصول کیا تھا اور اس مہم سے فارغ ہوکر اُس نے پیشوا کو صلاح دی تھی کہ مغلوں کو ہندوستان سے نکال دینا ہی بہتر ہے تاکہ آئے دن کے جھگڑوں بکھیڑوں سے نجات ملے اور ملک کو اطمینان نصیب ہو۔ اب مرہٹوں نے اپنا فوجی نظام درست کرایا تھا۔ اُن کا لشکر لوٹیروں کی جماعت نہ تھا بلکہ اُس میں منتخب سوار ملازم تھے اور دس ہزار قواعد داں پیادے تھے۔ ان کا توپخانہ بہت ترقی کر گیا تھا اور کل سامان جنگ اُنکے پاس مغلوں سے بہتر موجود تھا۔ سندھیا اور ہولکر کو احمد شاہ ابدالی

---

[۱] یہ دتاجی سندھیا مسبوق الذکر کا لڑکا تھا۔ ۱۲

سے زک ملی تو اُس نے مرہٹوں کی آتش غضب پر تیل چھڑکا اور پونا میں مستقل ارادہ کرلیا گیا کہ ایک دفعہ ہندوستان پر ایسی بھاری چوٹ کی جائے کہ ہمیشہ کے لیئے یہ قصہ ہی پاک ہو جائے۔ انسان تجویز کرتا ہے اور خدا کی بارگاہ سے احکام صادر ہوتے ہیں۔ آدمی کا کام صرف عمل کی نیت کرنا ہے اُسکا سرانجام پانا یا ناتمام رہنا آسمانی طاقت کے سپرد ہے۔!!

شکست و فتح نصیبوں سے ہے ولے اے میر
مقابلہ تو دلِ ناتواں نے خوب کیا

احمد شاہ ابدالی سندھیا اور ہلکر کو شکست دیکر خوش ہوا ہوگا مگر ستمبر ۱۷۵۹ء[۱] میں پونا سے اُسکی سرکوبی کے لیئے ایک زبردست فوج روانہ ہو چکی تھی جو عنقریب اُسکی خوشیوں کو مبدل بہ غم کرنے کے لیئے دہلی پہونچا چاہتی تھی!!

"سداشیو بھاؤ" مع پیشوا کے لڑکے "وشواس راؤ" کے بڑے ساز و سامان کے ساتھ دکن سے چلا تھا۔ بڑے بڑے سورما برہمن اور چُنے ہوئے سردار اُسکے ہمرکاب تھے۔ ایک مضبوط توپ خانہ اور دس ہزار بندوقچی اور توپچی جلو میں تھے جن کا افسر ایک شخص "ابراہیم گردی" نام تھا جس نے فرانسیسیوں سے فنونِ حرب کی تعلیم پائی تھی، بیس ہزار مرہٹہ سردار بیش قیمت گھوڑوں پر سوار اُسکے اشارہ پر جان دینے کو ہمراہ تھے۔ گجرات سے گیکوار اپنی فوج لیکر ساتھ ہوا۔ مالوہ سے ملہر راؤ ہولکر نے اپنی امداد شامل کی۔ بندیلکھنڈ سے وہاں کا سردار گووند پنتھ اپنے رسالہ کو لیکر حاضر ہوا۔ راجپوت سرداروں نے بھی مدد دی اور بھرتپور کے جاٹ راجہ سورج مل نے ۲۰ ہزار سپاہی پیش کیئے۔ یہاں تک کہ ہندوستان کے قریب پہونچتے پہونچتے چار پانچ لاکھ فوج ہوگئی!!

مرہٹوں کے لشکر میں اسوقت سب سے زیادہ ہوشمند اور تجربہ کار ملہر راؤ ہولکر تھا۔ اسکی عمر ۶۷ سال کے قریب ہو چکی تھی۔ وہ مرہٹوں کے قدیم عادات و اطوار اور اُنکے مجرب فنون جنگ سے آگاہ تھا۔ اُس نے دیکھا کہ "بھاؤ" کے ساتھ بڑے بڑے پُرتکلف ڈیرے اور شامیانے ہیں جن میں ریشم اور زربفت کا کام کیا ہوا ہے۔ ہاتھیوں اور گھوڑوں پر بیش قیمت جھولیں پڑی ہیں۔ سامان خوراک و اسباب عیشت کی سیکڑوں گاڑیاں ساتھ ہیں اور وہی سب ساز و سامان جمع ہے جو پچھلے زمانہ میں مغلوں کے ساتھ ہوتا تھا اور مرہٹے چھاپے مار کر اُس کو

[۱] گرنٹ ڈف۔ تاریخ مرہٹہ۔ جلد ۲۔ صفحہ ۱۲۹۔

لوٹا کرتے تھے - طرہ یہ کہ سپہ سالار تکبر و خود پسندی کے نشہ میں مست ہے اور اپنی طاقت کے زعم میں زمین پر پانوں نہیں رکھتا - کہیں ایسا نہ ہو کہ معاملہ برعکس ہو جائے - افغانی اپنے تیز گھوڑوں پر چڑھکر دھاوا کریں اور مرہٹے یا تو اس سامان سے ہاتھ دھوئیں یا اپنی جانیں گنوائیں!! اُس نے سورج مل جاٹ سے مشورہ کیا اور ان دونوں نے متفق ہو کر بہاؤ کو صلاح دی کہ توپ خانہ اور بھاری سامان بھرت پور میں چھوڑ دیا جائے تاکہ وہ کسی مضبوط قلعہ میں رکھا رہے اور سردار صرف سواروں کی جمعیت سے مرہٹوں کے قدیم اصول جنگ کے مطابق دشمن کو زچ کریں اور لڑائی کو اتنا طول دیں کہ افغان جو کئی مہینے سے ہندوستان آئے ہوئے ہیں آب و ہوا کی ناموافقت سے مجبور ہو کر اپنے ملک کو واپس جائیں -

کوئی شک نہیں کہ ملہار راؤ کا مشورہ نہایت مناسب تھا مگر بہاؤ کی قسمت میں وہ تباہی لکھی تھی جو ہمیشہ غرور کے ساتھ چلتی ہے - اُس نے قواعد داں پیادہ فوج اور توپ خانہ پر بھروسہ کرکے خدا کو فراموش کیا اور ملہار راؤ سے کہا "میں بکریاں چرانے والے کی صلاح نہیں چاہتا" پھر سورج مل کی طرف مخاطب ہو کر بولا کہ "چھوٹے زمینداروں کو بڑے بڑے ملکوں کے انتظام کی قابلیت نہیں ہوتی ہے" ملہار راؤ شرمندہ ہوا اور سورج مل کو یہ چوٹ بہت ناگوار ہوئی مگر مصلحتِ وقت دیکھ کر دونوں خاموش رہے اور بہاؤ بڑے شان و شکوہ سے دہلی کی طرف بڑھا -

دار السلطنت میں اسوقت کوئی بادشاہ نہ تھا - شاہ عالم مفرور تھا اور تھوڑی سی افغانی فوج قلعہ کی حفاظت کے لیے موجود تھی - وہ اس سیلابِ عظیم کا کیا مقابلہ کرتی - بہاؤ نے آسانی سے شہر پر قبضہ کرلیا - قلعہ میں خوب لوٹ کھسوٹ کی اور دربار عام کی چھت میں جو چاندی[1] نادر شاہ کی غارتگری سے بچ رہی تھی اسکے ہاتھ آئی -

بعض مورخ لکھتے ہیں کہ دہلی پر متصرف ہونے کے بعد بہاؤ نے پیشوا کے لڑکے وشواس راؤ کو تخت پر بٹھایا اور شجاع الدولہ کو منصب وزارت عنایت کیا - لیکن یہ روایت قطعاً غلط ہے - مرہٹوں کی کتابوں[2] سے بھی اسکی کوئی سند نہیں ملتی - ممکن ہے کہ بہاؤ کی نیت اس عمل کی ہو اور اپنے حلقۂ احباب میں اُس نے یہ خیال ظاہر کیا ہو لیکن جب تک احمد شاہ ابدالی ہندوستان میں موجود تھا اس تجویز پر

---

[1] اس چاندی کی قیمت کا تخمینہ سترہ لاکھ کیا جاتا ہے - ۱۲

[2] ڈف گرانٹ صاحب لکھتے ہیں کہ اُس نے شاہ عالم کے لڑکے مرزا جواں بخت کو بادشاہ بنایا تھا - (جلد ۲ - صفحہ ۱۴۳)

عمل کرنا بالکل غیرممکن اور خلاف قیاس تھا -

سورج مل جاٹ پہلے ہی بھاؤ سے آزردہ تھا - فتح دہلی کے بعد اُس کا چڑھا ہوا پارہ دیکھکر جاٹ نے شجاع الدولہ سے خفیہ ساز کیا اور اپنے ملک کو چلا گیا - مگر بھاؤ نے اسکی کچھ پروا نہ کی اور دسہرہ کے بعد ہی احمد شاہ سے مقابلہ کے لیئے دہلی سے روانہ ہوا - ۸۰ میل کے فاصلہ پر کنج پورہ میں ایک فوجی چھاؤنی افغانوں کی لوٹ کر اپنے خیال کے مطابق سلسلۂ فتوحات میں ایک کڑی کا اور اضافہ کیا!!

احمد شاہ اس عرصہ میں انوپ شہر کے مقام پر مقیم تھا اور شجاع الدولہ کو ہموار کرنے کی کوشش کر رہا تھا - نجیب الدولہ اور روہیلوں کی فوجیں پہلے سے اُس کے ساتھ تھیں لیکن وہ اودھ کا لشکر بھی مرہٹوں سے مقابلہ کے لیئے اپنے ساتھ رکھنا چاہتا تھا - نجیب الدولہ کے سمجھانے بجھانے سے شجاع الدولہ راہ پر آگیا اور اگرچہ مرہٹوں سے خط وکتابت کا سلسلہ اُس نے قائم رکھا لیکن جولائی سنہ ۱۷۶۰ء میں احمد شاہ کے کیمپ میں داخل ہوگیا -

جب ابدالی کو اودھ کی طرف سے اطمینان ہوا تو برسات گذرنے سے قبل اُس نے انوپ شہر کی چھاؤنی توڑی اور دہلی کی طرف بڑھا - راستہ میں خبر ملی کہ مرہٹوں نے کنج پورہ کی چوکی پر دھاوا کیا ہے تو اُس نے غضبناک ہوکر دریاے جمنا کو عبور کیا جو ابھی تک پایاب نہ ہوا تھا - اُسکی فوج کا ایک حصہ دریا کے عبور میں ضایع ہوگیا مگر اس ہمت و دلاوری کا رعب ایسا چھایا کہ ۲۶ - اکتوبر کو ایک ہلکی لڑائی[۱] کے بعد ہی مرہٹے شمال کی طرف پسپا ہوئے اور پانی پت کی دیواروں کے نیچے پناہ لیکر کیمپ کے گرد حفاظت کے لیئے ایک گہری خندق کھودی اور دمدمے اور مورچے لگائے - احمد شاہ وہاں پہونچا تو اُس نے بھی دشمن کے مقابل اپنے خیمے گاڑے -

دو مہینے تک یہ دونوں فوجیں ایک دوسرے کے مقابل پڑی رہیں اور اب اُس نیک مشورہ کا نتیجہ ظاہر ہوا جو ملہرراؤ نے سال بھر پہلے دیا تھا اور اسکے انعام میں جھڑکی پائی تھی اور طعنہ سنا تھا یعنی تختہ اُلٹ گیا - مرہٹے خود محصور ہوگئے - افغان اردگرد دیہات میں چکر لگاتے اور دشمن کو رسد اور چارہ نہیں لانے دیتے تھے - بندیلکھنڈ کا رئیس گووندپنت ہمت کرکے چارہ کی تلاش میں دُور نکل گیا تو ہزار آدمیوں کے ساتھ میرٹھ کے قریب مارا گیا اور مرہٹوں کے لشکر میں قحط پڑ گیا -

---

[۱] یہ لڑائی سونی پت کے مقام پر ہوئی تھی - ۱۲

اسوقت افغانوں کی فوج میں بروایت صحیح ۱۸ ہزار کابلی ۱۸ ہزار روہیلے سوار ۳۸ ہزار ہندوستانی پیادے اور ۸۰ ہزار توپیں تھیں۔ مرہٹوں کی جمعیت کاشی[1] رائے معتمد نواب شجاع الدولہ کے قول کے مطابق پانچ لاکھ تھی۔ لیکن اس تعداد میں غالباً کیمپ کے خلاصی اور ملازمین بھی شامل تھے۔ لڑنیوالے بہادر ۷۰ و ۸۰ ہزار کے درمیان تھے۔ اور انکے علاوہ ایک بڑی تعداد لوٹیروں کی ہمراہ تھی۔ دو سو توپیں ساتھ تھیں۔ اور ایک بہت بڑا ذخیرہ "بان" کا تھا جو مرہٹوں کا موروثی آلۂ جنگ ہے اور جسکے استعمال میں انکو خاص ملکہ تھا۔

دونوں فریق مقابلہ میں پڑے پڑے عاجز آگئے تھے۔ ہلکی ہلکی لڑائیاں ہوتی تھیں جنسے کچھ نتیجہ نہ تھا۔ سب چاہتے تھے کہ جلد ایک فیصلہ کُن جنگ ہوکر معاملہ یکسو ہو جائے لیکن احمد شاہ لڑائی کو ٹالتا تھا اور ہندوستانی سرداروں سے کہتا تھا کہ "ہر ایک کام تمہارے اختیار میں ہے اور میں کچھ دخل نہیں دیتا لیکن لڑائی کا شروع کرنا میری مرضی پر چھوڑ دو۔" اُس نے بھی اپنے لشکر کے گرد خندق بنائی تھی اور اُسکے سامنے ایک سرخ رنگ کا ڈیرا کھڑا کیا تھا جس میں طلوع آفتاب کے بعد اشراق کی نماز پڑھتا تھا اور شام کو کھانا کھاتا تھا۔ دن بھر گھوڑے کی پیٹھ پر سوار مختلف جنگی مقامات کو دیکھتا پھرتا تھا اور پچاس ساٹھ میل کا چکر ایک دن میں لگاتا تھا۔ رات کے وقت پانچ ہزار سواروں کا پہرہ شب خون سے حفاظت کے لیے قائم کرتا۔ خود اُسکی نگرانی رکھتا اور ہندوستانی رئیسوں کو آرام کی اجازت دیتا تھا۔ ایک چشمدید[2] گواہ کا بیان ہے کہ احمد شاہ کے احکام کی تعمیل اُسکے لشکر میں فرمانِ تقدیر کی طرح ہوتی تھی یعنی اُسکے حکم کا ٹلنا محال تھا۔

ایسے جفاکش اور جہاں دیدہ جنرل کے مقابلہ کے لیے ملہر راؤ کی دانشمندانہ صلاح کو نہ مان کر بھاؤ ایک متعفن نشیب میں محصور تھا۔ جہاں فاقہ سے مرے ہوئے جانوروں کی لاشیں دماغ کو پریشان کرتی تھیں اور بھوکے پیاسے سپاہیوں کا شور و ہنگامہ سرداروں کو زندگی سے عاجز بناتا تھا۔ ایک دن مصیبتوں سے تنگ آکر سب نے بھاؤ سے عرض کیا کہ اب کھانے پینے کو کچھ باقی نہیں رہا، رسد کے ذخیرے ختم ہوگئے بھوکوں مرنے سے لڑائی کی جوکھم اُٹھانا آسان ہے۔ بھاؤ نے اُنکی رائے سے اتفاق کیا اور سب نے

[1] کاشی رائے اس جنگ کا چشم دید گواہ ہے۔ اُس کی مرتب کی ہوئی داستان جنگ ایشیاٹک ریسرچز جلد سوم میں اسوقت تک محفوظ ہے۔ ۱۲

[2] کاشی رائے۔ ۱۲

لڑنے مرنے کی قسم کھائی - فوج کو حکم سنایا گیا کہ کل طلوع آفتاب سے پہلے دھاوا ہوگا -

بھاؤ کو ابھی آس باقی تھی کہ شجاع الدولہ ابدالی کا ساتھ چھوڑ کر مرہٹوں کا شریک ہو جائیگا - آدھی رات کے وقت اُس نے کاشی رائے کو خاص اپنے ہاتھ سے لکھا کہ "اب پیالہ لبریز ہو گیا اور ایک بوند کی بھی گنجایش نہیں ہے - کچھ بن پڑے تو کرو ورنہ صاف جواب دو کیونکہ اسکے بعد لکھنے پڑھنے کا وقت نہ ملے گا" کاشی رائے یہ رقعہ پاتے ہی شجاع الدولہ کے پاس گیا - اور ابھی خط سنا ہی رہا تھا کہ جاسوس دوڑتا ہوا آیا اور عرض کی کہ مرہٹے مسلح ہو رہے ہیں - شجاع الدولہ فوراً احمد شاہ کے ڈیرہ پر گیا اور پہرے والوں سے کہا کہ بادشاہ کو جگانا چاہیے - اسکی آواز سنکر احمد شاہ خود باہر نکل آیا تو ہتھیاروں سے آراستہ تھا - وہ شجاع الدولہ سے دو دو باتیں کر کے گھوڑے پر سوار ہوا اور فوج کو تیار ہونے کا حکم دیا -

جب صبح کا سپیدا پھیلنے لگا تو مرہٹوں کی فوج آہستہ آہستہ بڑھنا شروع ہوئی - توپ خانہ آگے تھا - قلب لشکر میں بھاؤ، داہنی طرف ہولکر اور سندھیا کی فوجیں اور بائیں طرف ابراہیم گردی کی قواعد داں پیادہ فوج تھی - احمد شاہ نے بھی اپنی فوج کو آراستہ کیا - بائیں طرف سندھیا اور ہولکر سے مقابلہ کے لیے نجیب الدولہ اور روہیلوں کو قائم کیا - انکے بعد نواب اودھ کو دو ہزار سواروں کے ساتھ رکھا - قلب میں حافظ رحمت خاں[له] کو اور داہنی طرف گردی کے مقابل ایرانیوں کا لشکر کھڑا کیا - انکے علاوہ دو ڈویژن منتخب سواروں کے افغان سرداروں کی ماتحتی میں فوج محفوظ کے طور پر الگ رکھے اور خود لال ڈیرے میں جا بیٹھا جو اب فوج کے پیچھے ہو گیا تھا -

مرہٹوں کے توپ خانہ نے آتشباری شروع کی اور ایرانی رسالہ کے قدم اُکھڑ گئے - ابراہیم گردی کے پیادے روہیلوں پر اس زور سے بڑھے کہ آٹھ ہزار پٹھان کام آئے - اور تین گھنٹے تک گردی میدان کا فاتح رہا - شجاع الدولہ بدحواس ہو گیا - وہ نہ لڑتا تھا نہ بھاگتا تھا - البتہ نجیب الدولہ دمدموں کی آڑ سے سواروں کی زد روکتا تھا اور بار بار چلاتا تھا کہ "سب سردار غلطی کر رہے ہیں لیکن میں ایسی خطا کر کے کہاں رہوں گا"

جب اسی حال میں دوپہر ڈھل گئی اور تقریباً ایک بجے کا وقت ہوا تو احمد شاہ اپنی فوج محفوظ لیکر قلب لشکر کی امداد کو آیا اور ہر طرف سے مرہٹوں کو گھیر لیا - اسکے بعد بھی ایک گھنٹہ تک جان توڑ

له روہیلوں کا مشہور سردار جو شجاع الدولہ کی لڑائی میں بعد کو قتل ہوا - ۱۲

لڑائی رہی لیکن اس تازہ دم فوج سے بھوکے پیاسے مرہٹے کیونکر مقابلہ کر سکتے تھے۔ سب سے پہلے جس سردار نے میدان سے بھاگنے کا ارادہ کیا وہ سپہ سالار بھاؤ تھا۔ اُس نے اپنے متعلقین ہولکر کی حفاظت میں دیے اور گھوڑے کی باگ موڑ کر سرپٹ فرار ہوگیا۔ ملہر راؤ کو فتح سے پہلے ہی مایوسی تھی لیکن اپنے خلوص اور وفاداری کے جوش سے وہ ابھی تک جان پر کھیل رہا تھا۔ جب وشواس راؤ قتل ہوگیا تو اُسنے بھی طے کیا کہ اس میدان سے اپنے لشکر کو زندہ و سلامت نکال لیجانا مرہٹوں کی آیندہ بہبودی کے لیے زیادہ مناسب ہے۔ اور اپنی ماتحت فوج کو واپسی کا حکم دیا۔ نجیب الدولہ ہولکر کا ممنون تھا اُسنے تعاقب نہیں کیا اور ملہر راؤ کی فوج اس حسرت انجام میدان سے قریب قریب بے داغ نکل گئی۔

کہا جاتا ہے کہ بیشمار مرہٹے اس لڑائی میں قتل ہوئے اور جو دشمنوں کی مار سے بھاگے انکو تعاقب کرنے والے سواروں نے قتل کیا یا دیہاتیوں نے کپڑوں اور ہتھیاروں کے لالچ سے صاف کیا۔ ابراہیم گردی زخموں سے چور گرفتار ہوا اور ایک ہفتہ کے اندر مرگیا۔ کاشی راے کا بیان ہے کہ افغانیوں نے ابراہیم کے ساتھ بیرحمی کا برتاؤ کیا اور اُسکے زخموں پر زہر کے پھائے چڑھائے۔ لیکن یہ روایت خلاف قیاس ہے۔ اُس زمانہ میں دشمن کی جان لینا ایک معمولی بات تھی۔ اگر ابراہیم سے مرہٹوں کے ساتھ دینے کا بدلہ لینا منظور ہوتا تو احمد شاہ اُسکو ایک ہفتہ تک کیوں زندہ رہنے دیتا؟

خاندان سندھیا میں سے جنکوجی زندہ گرفتار ہوا۔ اور باوجود شجاع الدولہ کی سفارش کے قتل کردیا گیا۔ مادھاجی سندھیا جسنے ملہر راؤ کے بعد ہندوستان میں بہت عروج پایا اس خونی میدان سے ایک دکھنی گھوڑی پر سوار بھاگا، اور ایک افغانی نر گھوڑے پر سوار اُسکے تعاقب میں چلا۔ گھوڑی بیسیوں کوس کی منزل ایک سانس میں کر سکتی تھی مگر گھوڑا مادہ کی بو پاکر اُسکا پیچھا نہ چھوڑتا تھا۔ جب افغانی نے تعاقب سے عاجز آکر واپس ہونا چاہا تو مست گھوڑا اُسکے قابو سے باہر تھا۔ آخر کار مادہ خوف کھاکر ایک خندق میں گرگئی اور پٹھان نے مادھاجی کے پاؤں پر ایک ایسی کاری ضرب لگائی کہ وہ ہمیشہ کے لیے لنگڑا ہوگیا۔ سندھیا کے قیمتی کپڑے اُتار لیے۔ ہتھیار چھین لیے اور اُسکو زندہ چھوڑ کر اپنے لشکر کی طرف واپس گیا۔ کچھ دیر کے بعد ایک مسلمان سقہ رانا خاں نام بیل پر پکھال لادے خندق کے پاس سے گذرا اور مادھاجی کو خستہ و مجروح دیکھ کر اپنے بیل پر سوار کیا اور حفاظت کی جگہ پہونچا دیا۔ سندھیا اس احسان کو نہیں بھولا اور سقہ کو اپنا بھائی کہتا رہا یہاں تک

کہ سندھیا کے انتہائی عروج کے وقت یہی سقہ اُسکی فوج کا ایک جنرل اور سلطنت دہلی کے وکیل مطلق کا دست و بازو تھا!!

میدان جنگ سے چند میل کے فاصلہ پر ایک لاش بے سر کی ملی۔ جسکی بابت یقین کیا گیا کہ وہ بھاؤ کی ہے۔ شجاع الدولہ کے اصرار سے اُس جسم بے سر کی کریا ہوئی۔ اگرچہ یہ معاملہ مشتبہ رہا کہ وہ لاش واقعی بھاؤ کی تھی یا نہیں۔ بڑے بڑے مرہٹہ سردار اس جنگ میں قتل ہوئے اور گرانٹ ڈف صاحب[2] کے قول کے مطابق مرہٹوں کے کاغذات سے مقتولین کی تعداد دو لاکھ معلوم ہوتی ہے۔

بالاجی پیشوا دکن سے مزید فوج لیکر بھاؤ کی امداد کو چلا تھا اور نربدا کے کنارے خیمہ زن تھا کہ اُسکو مرہٹوں کے ساہوکار کا قاصد ملا جو دکن میں گماشتہ کے تام خط لیے جاتا تھا۔ پیشوا نے خط چھین کر پڑھا تو اُس کے یہ الفاظ تھے:

"دو موتی گھل گئے۔ ۲۷ اشرفیاں کھوگئیں۔ چاندی اور تانبے کی میزان کا کچھ شمار نہیں"

اس مبہم عبارت سے پیشوا نے سمجھ لیا کہ لشکر کو شکست ہوئی۔ اُسی وقت وہ سپاہی بھی آنا شروع ہوئے جو میدان سے منہ موڑ کر بھاگے تھے۔ اور اُنھوں نے اس خیال کی تصدیق کی۔ پیشوا نے آگے بڑھنا بے سود سمجھ کر فوج کو واپسی کا حکم دیا۔ اور گمان کیا جاتا ہے کہ اسی شکست کے صدمہ سے جون ۱۷۶۱ء میں جنگ سے پانچ مہینے[3] بعد مر گیا۔

پانی پت کی لڑائی بہت زیادہ تفصیل سے بیان کی گئی لیکن ملہر راؤ کی زندگی اور نیز مرہٹوں کی تاریخ میں یہ سب سے زیادہ مہلک جنگ تھی اور اسنے ہولکر کی تمام عمر کی کوشش بیکار کر دی۔ بھاؤ کی خودسری سے یہ روز بد دیکھنا نصیب ہوا۔ اور ہولکر اپنی فوج کو اگر دور اندیشی سے بچا نہ لاتا تو ہندوستان کے ساتھ مالوے سے بھی مرہٹوں کی حکومت غائب ہو جاتی۔ اُس پر آجکل الزام لگایا جاتا ہے کہ وہ میدانِ جنگ سے بہت جلد چلا آیا اور اُسنے کوئی نمایاں خدمت اپنے قوم و ملک کی اس میدان میں نہیں کی

[1] کئی برس کے بعد ایک مکار نے بھیس بدل کر اپنے کو سداشیو بھاؤ کے نام سے مشہور کیا۔ لیکن اُس کا فریب جلد ظاہر ہو گیا۔ ۱۲

[2] تاریخ مرہٹہ۔ جلد ۲ صفحہ ۱۵۶۔

[3] جنگ پانی پت جنوری ۱۷۶۱ء میں ہوئی تھی۔ ۱۲

لیکن الزام قائم کرنیوالے بھول جاتے ہیں کہ ساری تباہی اُسکی نصیحت پر عمل نہ کرنے کی وجہ سے واقع ہوئی تھی۔ اور ایسی حالت میں جو کچھ سرفروشی اُس نے ظاہر کی وہ محض اُسکے خلوص و وفاداری کا نتیجہ تھی۔ علاوہ اسکے اگر ہولکر اپنی فوج کو صحیح وسلامت نہ لے آتا تو مرہٹے دوبارہ ہندوستان پر چڑھائی کرنے کی ہمت نہ کرتے۔ کیونکہ آیندہ جو کچھ کامیابیاں مرہٹوں کو نصیب ہوئیں وہ درحقیقت اُسی دانشمندی کا ثمرہ تھیں جو ملہار راؤ نے اپنی فوج کو بلوہ دبچا لانے میں دکھائی تھی۔

بہرحال ہولکر نہایت قلق کے ساتھ مالوہ واپس ہوا اور ہندوستان سے مایوس ہوکر اپنی ریاست کی اصلاح میں مصروف ہوا۔ اُسکے پاس مالوہ میں ۷۴½ لاکھ اراضی تھی۔ راجپوتانہ میں رامپورہ بھانپورہ اور ٹونک کی جاگیر پر قبضہ تھا۔ دکن میں ایک وسیع علاقہ تھا۔ خاندیش میں ریاست تھی۔ وادی نربدا کے جنگل اسکی املاک تھے۔ ست پوڑا اور بندھیاچل کے پہاڑوں پر اسکے قلعے تھے۔ غرض اپنی انتظامی قابلیت صرف کرنے کے لیے ملہار راو کے پاس بہت زرخیز میدان موجود تھا۔ لیکن چالیس برس تک فوج کی سرداری کرنے کے بعد اپاہج بنکر گھر بیٹھنا مشکل تھا۔ ہندوستان سے واپس آتے ہی وہ نئے پیشوا مادھوراؤ کی مدد کے لیے نظام دکن سے لڑنے گیا اور راکشس بن کی مشہور لڑائی میں مغلوں کو ایسی شکست دی کہ صوبہ آنبہ ہولکر کو جاگیر میں دیا گیا۔

سنہ ۱۷۶۴ء میں جب بھرت پور کے راجہ سورج مل نے دہلی سے سرتابی کی اور وزیر نے راجہ کو قتل کر دیا تو ملہار راؤ اپنی فوج لیکر سورج مل کے بیٹے کی مدد کو پہونچا اور دہلی پر چڑھائی کردی مگر نجیب الدولہ کو وزیر کی مدد پر دیکھ کر اُسکی آنکھ احسانمندی قدیمانہ کے وجہ سے نیچی ہوگئی اور اپنے ملک کو واپس چلا آیا۔

جب مرہٹوں کی حالت سنبھلی اور پیشوا کا چچا رگھوناتھ راؤ ہندوستان کا دوبارہ عازم ہوا تو باوجود ضعیفی کے ملہار راؤ کو چین نہ آیا اور ۷۰ برس کی عمر میں اپنی فوج لیکر ساتھ ہوا۔ مگر عمر کا پیمانہ لبریز ہو چکا تھا۔ ۲۰ مئی سنہ ۱۷۶۶ء کو عالم پور کے ضلع میں گوالیار سے تقریباً ۴۰ میل کے فاصلہ پر دنیا سے رخصت ہوگیا۔ اسی مقام پر اُسکی چھتری بنائی گئی۔ اور وہ گانوں آج تک ملہار گنج کے نام سے مشہور ہے اور ہولکر کے جانشینوں کے قبضہ میں ہے۔

اس بہادر سردار کی پرائیوٹ لائف بالکل دریافت نہ ہوسکی جسکی ساری عمر فوجی کیمپ میں صرف ہوئی ہو اُسکے خصائل کا اندازہ صرف واقعات تاریخی ہی سے ہوسکتا ہے۔ مشہور ہے کہ وضع کی سادگی اور

حلم و تواضع میں کوئی مرہٹہ سردار اُسکے مقابلہ کا نہ تھا۔ رئیسوں اور شریفوں کے ساتھ اُسکا برتاؤ بہت اچھا تھا اور اُسکی فیاضی ریاست ہولکر میں ضرب المثل ہے۔ جب کسی سپاہی سے خوش ہوتا تو حکم دیتا تھا کہ اسکی ڈھال روپیوں سے بھردو۔ دولت کی اُسکو کچھ قدر نہ تھی۔ اور کہا کرتا تھا کہ حساب کتاب میری سمجھ میں نہیں آتا۔ وہ پیشوا کا تمام عمر نیازمند وفادار رہا اور باوجود عروج پانے کے وہ دن اُسکو کبھی فراموش نہیں ہوا جب وہ کھیت میں بکریاں چَراتا ہوا سوگیا تھا۔ اور سانپ اُس کے سر کے پاس آیا تھا۔

سچ ہے کہ شریف آدمی اپنی حالت کبھی نہیں بدلتے اور میوہ سے لدی ہوئی ڈالی ہمیشہ اپنا سر زمین کی طرف جھکائے رہتی ہے۔ وفاداری، اولوالعزمی، ہمت، بہادری، سادگی، فروتنی اور فیاضی وہ خاص اوصاف ہیں جنمیں ملہر راؤ اپنے ہمچشموں سے ممتاز تھا۔ اور ہندوستان کی موجودہ نسل کو اس بہادر کی سوانحعمری سے ان خوبیوں کا سبق لینا چاہیے۔

"خافی خاں"

انعامی مضمون

دسمبر کی آخری تاریخوں میں بعض اصحاب نے اپنے مضامین ارسال فرمائے۔ ایک صاحب نے حیدرآباد سے تحریر فرمایا کہ طاعونی کیمپ میں مقیم ہونے کی وجہ سے اطلاع دیر میں پہونچی۔ اسلیے دو ہفتہ کی مہلت دیجائے۔ دوسرے صاحب نے علیگڈھ سے جوابی تار پر تین دن کی مہلت طلب کی۔ مشتہرہ میعاد میں اگر کافی مضمون وصول ہو گئے ہوتے تو یقیناً ہمیں آخرالذکر بزرگ کو مہلت دینے میں عذر ہوتا۔ مگر ۳۱۔ دسمبر تک کل نصف درجن مضامین وصول ہوئے تھے جن میں سے ایک شرائط مقابلہ کے خلاف اسقدر مختصر ہے کہ مجلس انتخاب کے روبرو نہ پیش کیا جاسکے گا۔ اس بنا پر ہم نے پہلے حیدرآبادی بزرگ کو مہلت دیدی اور پھر علیگڈھ کے تار کا جواب بھی اثبات میں لکھدیا۔ جملہ مضامین موصولہ انشاءاللہ آخر جنوری تک جانچ کرنے والے اصحاب کے حوالہ کردیے جائیں گے۔ آیندہ نمبر میں ہم اُن اصحاب کے نام بھی درج کردینگے جنکے مضامین کی جانچ کیجائے گی۔ اور جانچ کا نتیجہ انشاءاللہ مارچ کے الناظر میں درج ہو سکے گا۔

ایڈیٹر

اتحاد بین المسلمین و الہنود

تشخیص مرض و تدبیر علاج

بحمد اللہ کہ فقیر نے اس وقت تک سیاسیات حاضرہ میں حصہ لینے یا رائے دینے کی کبھی جسارت نہیں کی۔ جس کی وجہ یہ ہے کہ اِس کے لیے فقیر کے پاس نہ وقت ہے نہ دماغ اور نہ علم۔ بنا براں فقیر نے اپنے لیے کنج خمول ہی بہتر سمجھا۔ مگر مسئلۂ اتحاد بین المسلمین و الہنود کو فقیر سیاسی نہیں بلکہ ایک خالص تمدنی و عمرانی مسئلہ سمجھتا ہے۔ اِسی اعتبار سے فقیر کو ہمت ہوئی کہ اپنے افکار و مساعی کو اربابِ بصیرت کی خدمت میں پیش کرے۔

چونکہ رسالۂ الناظر بھی سیاسیات سے اجتناب اور اِس مسئلے کے اذعانِ صحیح میں فقیر کا ہم نوا و ہم خیال ہے لہذا یہ توقع بے جا نہیں کہ اس کے متعلق فقیر کے خیال و عمل کی اشاعت و اعلان میں اعانت سے دریغ نہ فرمایا جائے گا۔

فقیر نے غایتِ فکر و نظر اور کمالِ حدتِ بصر سے کام لے کر مسئلے کے مالہٗ و ما علیہ پر غور کیا ہے۔ فریقین کے صاحبانِ رائے اور واقفانِ حال سے بحث و تفحص کی ہے اور الحمد للہ کہ فقیر اُس خاص سبب کے دریافت کرنے کی کوشش میں کامیاب ہو گیا ہے جو صدیوں کی یکجائی اوطان اور یکسانی اغراض کے باوجود اِس توحش و تجنب کا داعی حقیقی ہے اور فقیر نے اپنے ظرف دماغ کے بقدر اس کا چارہ کار بھی سوچا ہے۔

⁂

تصنع موقوف و تکلف برطرف۔ امر واقعی یہ ہے کہ مسلمانانِ ہند نے باوجود اپنی قلت تعداد و استعداد کے ہندو بھائیوں کو اپنی طرف سے یکسر خائف و غیر مطمئن کر رکھا ہے۔ اگرچہ یہ صحیح ہے کہ یہ خوف و عدم اطمینان عموماً اول الذکر کے کسی فعل یا ترک فعل کا نتیجہ نہیں ثابت ہوتا مگر اسکو کیا کیجیے کہ اُن کی ہیئت کذائی۔ اُن کی اُفتادِ خیال اور صورتِ حال ہی ایسی ہے جو ہر مگانے جاہر الجثہ اور صاحب بالجنب کے لیے موجب اجتناب ہو سکتی ہے۔

باوجودیکہ اکثر ہندو ارباب علم واثر اور خود فقیر نے بہت کچھ افہام وتفہیم کی اور اطمینان وتسلی دی کہ "بھائی صاحبو! خوف واضطراب کی کیا بات ہے۔ اَنتم رجال وہم رجال۔ باوجود مالِ ممدود اور بَنین شہود۔ باوجود تفاخرِ اولاد اور تکاثرِ اموال کے تم مٹھی بھر۔ ننگے بھوکے۔ جاہل کاہل مسلمانوں سے اتنا ڈرتے کیوں ہو۔ وہ تمھارے اپنے ہیں۔ ضرورت کے وقت کام دیں گے۔ دُکھ درد میں شریک ہونگے۔ بہت سے ایسے ہیں جن کا تمھارا خون ایک ہے۔ اور ظاہر ہے کہ خون پانی سے گاڑھا ہوتا ہے۔ باقی جو ایسے ہیں جن کا تمھارا خون ملا ہوا نہیں ہے وہ بھی اسی ملک کے باشندے ہیں تم سے تعلقات رکھتے ہیں تم سے توقعات رکھتے ہیں۔ ان کا مرنا جینا بھی اسی ملک میں ہے۔ تم اُنکے پڑوسی ہو، دوست ہو۔ رنج وراحت کے شریک ہو۔ بہتر ہے کہ آپس میں بیگانے بنکر نہ رہو بلکہ یگانے بن کر رہو۔"

مگر قَذَفَ فی قلوبِھِم الرُّعبَ۔ صاف صاف عرض کرنا پڑتا ہے اور تشخیص مرض کے لیے اسباب وعلامات کو صاف صاف بیان کرنے کے سوا چارہ نہیں کہ اُنھیں سب سے بڑا خطرہ یہ ہے کہ مسلمانوں کے ہم مذہبوں کے ممالک ماورائے سرحدِ ہند سے لیکر برابر ایک دوسرے سے ملصق ومتصل دور تک چلے گئے ہیں۔ جس وقت خفیف سی تو تو مَیں مَیں بھی ہوگئی تو یہ اپنے ہم مذہبوں کو ادھر بُلا لیں گے اور اُس وقت جو گزرے گی سو گزرے گی۔

فقیر نے بھی غور کیا تو پایا کہ خطرہ بے اصل وبے بنیاد نہیں۔ پنجاب کی شمالی ومغربی حد سے لیکر جو مسلمانوں کے ممالک کثّر اللہ سوادہم شروع ہوتے ہیں تو دُنیا کے اور چھور تک جا پہونچتے ہیں۔ سرحد سے بالکل ہی ملا ہوا افغانستان ہے۔ اُسکے بعد مشرق کی طرف تو ترکستان ہے اور مغرب کی جانب ایران۔ ایران سے ملے ہوئے ایک سمت کو شام وفلسطین وعراق وجمہوریۂ ترکیہ اور دوسرے رُخ کو عرب۔ عرب سے ملی ہوئی مصر کی سرحد ہے اور مصر سے قریب طرابلس الغرب۔ طونس۔ الجزائر اور اُس کے بعد ہی ہسپانیہ والوں کا وہ سرمُنڈا حریف[1] ہے جس کی شہامت وبسالت نے دنیا کے بہت سے دیوان ہائے سیاست میں تہلکہ ڈال رکھا ہے۔ اُس کے ادھر اُدھر۔ خدا ہی بہتر جانتا ہے کہ۔ اسلامی

---

[1] حریف سے سر کو مونڈو تو حریف رہ جائے گا۔

آبادیاں کہاں کہاں تک متحد ومنتشر چلی گئی ہیں - اب تک تو مستِ الست مسلمان اپنے ہندو بھائیوں کی ہمہ گیر کثرت کو خاطر میں نہیں لاتے لیکن اگر کسی وقت اُنھوں نے اپنی ہمہ جا قلت کو محسوس کرکے حقیقت میں اپنے ہم مذہبوں کے اِس گروہ کثیر الانفار اللھم زِد فزد کو " الا رازی - الا رازی " " بیا - بیا " " تعال - تعال " " گلے - نگلیے - دریاکالے - دریاکالے " کہہ کہہ کر پکار لیا تو واقعہ یہ ہے کہ وہ ساعت اُودھم دائمر ہوگی جسکے تصور سے ہر مسلمان کانپ اُٹھتا ہے -

---

فقیر اسکے سداد وعلاج کے سوچنے پر اپنا بہترین وقت صرف کرچکا ہے - ابتداءً یہ رائے ہوئی کہ ہندوستان کے بڑے بڑے سیٹھ ساہوکاروں سے چندہ لے کر اپنے اہتمام سے درۂ خیبر اور درۂ بولان کو تنگیہ کرادے اور ہمالیہ کی دیوار پر سرتاسر بوتلوں کے ٹکڑے سمینٹ سے نصب کرادے تاکہ اِدھر سے آیاب وذہاب کا راستہ ہی مسدود ہو جائے - مگر اس میں یہ قباحت نظر آئی کہ ادھر تو میوہ جات ومغزیات کی درآمد منقطع ہو جانے سے مسلم اُمرا کو ضعف دماغ اور اُدھر اباز یرو ہلیت کی درامد مسدود ہو جانے سے ہندو ساہوکاروں کو سوءِ ہضم کی شکایت ہو جائے گی - معہذا ممکن ہے کہ اغیار تبت وکراچی کی راہ سے آجائیں - لہذا کامل غور وخوض کے بعد یہ طے کیا کہ اس امر کی کوشش کی جائے کہ یہ اسلامی آبادیاں سب اپنی اپنی جگہ سے بہت دور ہٹوادی جائیں اور ہمارے ہندوستان کی سرحد کے کنارے کنارے صدہا میل تک ایک طویل وعریض غیر مملوکہ - غیر مقبوضہ - غیر معمورہ اور غیر مزروعہ قاع صفصف پڑا رہے جس میں بشرطِ گنجائش رقم طویل وعمیق خندقیں کھُدوادی اور گچ چونے سے پختہ کرادی جائیں - اِس سے ہمیں آرام واطمینان کی نیند تو آئے گی اور بھائی بھائی میں روز روز کی بدمزگی وبے اعتباری تو جائے گی

اس کے متعلق فقیر نے بطور خود اور بصرفِ کثیر آغاز سعی کیا - فقیر کے کرم گسترواقفانِ حالات جانتے ہیں اور شہادت دے سکتے ہیں کہ فقیر نے محض اللہ تعالیٰ کے توکل اور اپنی طاقت کے بھروسے پر ہندوستان سے باہر کا دور ودراز سفر اختیار کیا تھا - اور یہ امر از راہ تفاخر نہیں بلکہ بطور تحدیث عرض کیا جاتا ہے کہ اگر ہندوستان بھر کے کسی بڑے یا چھوٹے رئیس یا امیر یا تاجر یا زمیندار یا راجہ یا مہاراجے یا سیٹھ یا ساہوکار - یا کسی کانگرس یا خلافت یا مسلم لیگ یا سنگھٹن یا تنظیم یا کسی چھوٹی یا بڑی پارٹی یا گروہ

یا سپتا نے کسی وقت یا کسی موقع پر ایک حبۂ سیاہ یا ایک پشیز (پھوٹی کوڑی) شکستہ سے اس فقیر حقیر کی امداد و اعانت کی ہو تو آج وقت ہے کہ علیٰ رؤس الاشہاد شہادت پیش کر کے فقیر کی تکذیب و تبکیت کر دے۔ ہاتوا برہانکم۔

٭ ٭ ٭

المختصر فقیر شدّ رحال کر کے مع جریب زیتون و تسبیح یشبی و گلیم پشمی و عبائے قطنی و عمامۂ کھدری بقصدِ سفر نکلا۔ تذکرۂ مصائب طریق و مہالک سبیل بے صرفہ باعثِ اطناب و تطویل ہوگا۔ اور چونکہ سطور ہذا کے ذریعہ روداد سفر کی تدوین و ترتیب پیش نظر نہیں لہذا تفصیل لاحاصل ہے۔

اس ہفتخوان کی اولین منزل مقصود چونکہ سرزمین انگوزہ و انگور تھی لہذا سب سے زیادہ صعوبت حصول پروانۂ راہداری میں پیش آئی۔ ادھر اپنے بے اطمینان ادھر پرائے بد گمان۔ حالانکہ اس مہم میں اگر فقیر کو کامیابی ہو جاتی تو اخراجات تحفظ ہند کے موازنہ میں موجودہ رقم خطیر نہ رہنے پاتی۔

٭ ٭ ٭

بارے سب مزاحمتوں کا مقابلہ کر کے فقیر افغانستان پہونچ گیا اور وہاں کے خانوں اور سرداروں۔ ملکوں اور اربابوں۔ سرخیلوں اور ملّاؤں سے ملا۔ اگرچہ انھوں نے ضیافت اسلامی کے آداب مرعی رکھے۔ نان سنگک (موٹی روٹی) و نان تنک (پتلی روٹی)۔ تکہ و کباب۔ قرت غوڑی (دہی و خشک گوشت) و قرت بانجن (بینگن)۔ پلاؤ و چلاؤ۔ شیر و پنیر مسکہ و جغرات کھلائے۔ قریات و قنایت اور کاریز و فالیز کی سیر کرائی۔ کشمش و مشمش۔ شفتالو و زردالو۔ پستہ و بادام انگور و انجیر۔ سیب و انار پیش کیے مگر باتیں بہت (آب جامہ کی) اکھڑی اکھڑی کیں۔ انھوں نے فقیر کی درخواست کو سن کر چھوٹتے ہی کہا:—

"ملّا! تمھارا ہندوستان بڑا ملک اور تم ہندی بڑا آدمی۔ ہم تمھارا ملک سے ناواقف نہیں۔ ہم جانتا ہے تم لوگ کام کا آدمی نہیں کلام کا آدمی ہے۔ تم لوگ دال روٹی۔ پوری کچوری کھا کر پان چبا کر خالی خولی چاؤں چاؤں۔ کاؤں کاؤں کرنا جانتا ہے۔ تمھارے ملک کے اندر پول کی فراوانی۔ جنس کی ارزانی اور حمل و نقل کی آسانی ہے۔ تم لوگ تجارت کرتا ہے۔ زراعت کرتا ہے۔ چاکری کرتا ہے۔ پیشہ وری کرتا ہے۔ اس طور تم دولت جمع کرتا ہے بعدہٗ باخود لڑائی کرتا ہے اور لڑائی عورت کا مانند۔ ہم لوگ تمھارا طرح نہیں۔ واللہ ہم مرد ہے۔ اگر لڑتا ہے مرد ہو کر۔ و گر ملتا ہے مرد ہو کر۔ لاکن اس سے ہمکو مطلب نہیں۔ لڑو یا ملو وہ تمھارا خوشی۔ ہمارا اس ملک سے جاتا سو ملّا سنو کہ افغان گل محمد خاں

ہیں اور گل محمد کے واسطے شاعر پہلے ہی کہہ گیا ہے۔ "زمین جنبد نہ جنبد گل محمد"۔ لہذا بابا تمہارا خوشی آئے سو کر و خان کا گنتا تو یہاں سے ہٹنے والا نہیں"۔

* * *

یہ ٹکا سا جواب سن کر فقیر اپنا سا منہ لیکر واپس ہوا اور سیدھا ایران پہونچا۔ یہ لوگ کمال تہذیب و تپاک سے پیش آئے۔ کوفتہ پلاؤ و خرما پلاؤ۔ متنجن و فسنجن۔ قلیا و قورما۔ نغرا و بورانی۔ بیفیہ و بریانی۔ شیر برنج و شیر بادام۔ صابونی و مکارونی۔ لونہ کباب و سیخ کباب۔ بادام کا غذی و انار رطلی۔ سردہ و گرمک۔ انگور شقالی و ریش بابا و ... غلاماں سب کھلائے۔ قہوہ و شیر چاء و غلیان و تریاک کی تواضع کی مگر اصل مطلب قبلہ قبلی و آری بلی۔ این و آں و چنین و چناں ہی میں ٹال دیا۔ لیکن جب فقیر نے اصرار کے ساتھ مطالبہ جواب کیا تو آخر کار اپنی مشہور لسانی و چرب زبانی سے کام لے کر فرمایا:-

"قربانِ شما۔ ہم اپنے گل گلاب و جوشاب۔ اپنے بے ستون و دماوند کان۔ اپنے تنگہ اللہ اکبر و وادیِ گل پوشاں اپنے حافظیہ و سعدیہ۔ اپنے سلطانیہ و ناصریہ۔ اپنی اس خوش آب و خوش گل گل زمین کے کس دل و جگر سے مفارقت گوارا کریں جو ہماری مقدس قومیت کا مسکن قدیم و موطن قویم ہے۔ جہاں سب سے پہلے تہذیب انسانی نے ظہور کیا۔ جس کے جاہ دروں نے تمدن یونانی و رومانی کے پرخچے اڑا دیے۔ اور جب یہاں کی خاک نیّر اسلام کے نور سے مستنیر ہوئی تو تاریخ شاہد ہے کہ اس خاک کے ذروں نے دنیا نے معلوم و سکون کے گوشے گوشے اور چپے چپے کو معمور نور کر دیا۔ بابائے ما! عشق وطن نے ہمیں اس حال کو پہونچا دیا ہم حوادث روزگار کی لطمہ خوری اور مصائب اغیار کی لگد کوبی کے لیے وقف رہے لاکن با ایں ہمہ ہم خاک پاک ایران سے مفارقت پر راضی نہ ہوئے۔ ہماری مائیں ہمیں لوریاں دیتی ہیں

تو کودک ایرانی و ایراں وطنِ تست   تو جانی و ایران چو تنِ تست

جاں را تن بے عیب بکارست لَم لَاے   لَم لاے۔ بَلَم لاے۔ بَلَم لاے

"جناب آغا! ہم تو دیار رستم و اسفندیار کو چھوڑ کر بہشت بریں بھی نہ جائیں گے کیونکہ فیضی زبان پہلے ہی ہم سے کہہ چکی ہے

"کہ در جنت نخواہی یافت   کنار آب رکنا باد و گلگشت مصلّٰی را"۔

"آغا معاف دارید! معلوم ہوتا ہے اہل ہند اپنے ملک سے عشق و شیفتگی نہیں رکھتے بلکہ اپنی خودی سے

محبت رکھتے ہیں۔ ورنہ روز روز کی باہمی ہنگامہ آرائی و آویزش کے کیا معنی جس سے مفاد ملک کو نقصان پہونچ رہا ہے۔ اگر اختلافِ عقائد و معاشرت کا عذر کیا جائے تو یہ بیکار عذر ہے۔ ہمہ ورزیہ کا سہ تمیم کا سہ وار نہ کیا ہمارے ملک میں پیروانِ زرتشت نہیں۔ مگر آپ اپنی آنکھوں سے دیکھ لیجیے کہ یہاں قدیم و جدید باشندوں اور گبر و مسلمان میں نہ فرق و امتیاز ہے نہ جنگ و جدال۔ ہم اُنکی قلت کا احترام کرتے ہیں اور وہ ہماری کثرت کا اعتبار۔ تعجب ہے کہ جب برادرانِ ہند اتنی تعداد کثیر میں ہیں تو وہ کس واسطے ڈرتے اور تنگدلی سے پیش آتے ہیں۔ اُنھیں چاہیے کہ خوف یا بخل سے کام لینے کی جگہ محبت و سیرچشمی سے کام لیں۔ ہم نہایت متاسف و متالم ہیں کہ آپ کی خواہش پر عمل نہیں کرسکتے۔"

⁂

فقیر یہاں سے بھی بے نیل مرام واپس آیا اور عرب شریف حاضر ہوا۔ وہاں کے لوگوں نے بھی سیادت و شیخوخت کا احترام کیا اور اپنی ضرب المثل مہمانداری و مسافرنوازی سے کام لیا۔ ترویقہ میں لبن و عسل۔ رطب و عنب۔ حب حب سوسی و بطیخ فرنساوی۔ برتقان و تفاح۔ جبنہ و زبدہ۔ قہوہ و شاہی۔ غدا و عشا میں خبز خمیر و خبز فطیر۔ قدر و ثرید و مرقہ و شوربہ۔ کباب و کستلاتہ۔ لحم مقلی و لحم مسلوق۔ لحم طیر و لحم صید۔ دجاج و رز۔ اور سجارہ و کبریت سے تکریم و تواضع کی مگر حرفِ مطلب کو لیت و لعل اور تمنی و ترجی ہی میں رکھا۔ آخر کار جب فقیر نے اداے جواب کے لیے پیہم تقاضے کیے تو صاف صاف کہا:۔

صلے علی النبی یا شیخ۔ تم نے کہا کہ اپنا ملک چھوڑ دو۔ ہم اِس کا جواب دیتے ہیں۔ کیا یہ ہمارا ملک نہیں۔ کیا ہم بنو اسمٰعیل نہیں؟ پھر کیا ہم بنو قیدار۔ پھر بنو عدنان۔ پھر بنو معد۔ پھر بنو مضر۔ پھر بنو کنانہ۔ پھر بنو فہر۔ پھر بنو غالب۔ پھر بنو لوے۔ پھر بنو کعب۔ پھر بنو مُرّہ۔ پھر بنو کلاب۔ پھر بنو عبد مناف اور پھر بنو ہاشم نہیں؟ اگر ہیں اور تم کو ماننا پڑیگا کہ دنیا کی تمام اقوام سے زیادہ عرب اپنے انساب سے واقف ہیں تو کیا ہم ابراہیم علیہ السلام کی ذُریت میں داخل نہیں؟ پھر کیا ابراہیم علیہ السلام نے اپنی ذُریت کو وادیِ غیر ذی زرع میں بیت المحرم کے پاس خاص اللہ تبارک و تعالیٰ کی منظوری سے سکونت نہیں دی تھی؟ کیا ہمارا ملک نافِ زمین اور دنیا کا وہ مشہور ترین ملک نہیں جس کا تذکرہ کتبِ عتیق میں ہے؟ کیا اِس ملک میں ہماری قومیت متحدہ نے آزادی کی چالیس صدیاں نہیں گزاریں؟ پھر کیا ہمارے ملک وہماری

م اور ہمارے قبیلے میں فخرِ کائنات خلاصۂ موجودات خاتم النبیین رحمۃ للعالمین نبی اکرم محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ واصحابہ وسلم پیدا نہیں ہوئے؟ کیا ہماری زبان اُم الالسنہ نہیں؟ کیا خود اللہ تبارک تعالیٰ نے ہماری زبان میں اپنا کلام پاک نازل فرما کر اُسے دنیا کی کل زبانوں کا سرتاج نہیں بنا دیا؟ پھر یا ہمارا شہر مکہ مبارک دنیا کے پردے پر سب سے پرانا شہر۔ اُم القریٰ۔ بَلَدُاً اٰمِنا۔ بلد امین۔ مولد النبی۔ ور مہبطِ وحی نہیں؟ کیا بیت اللہ شریف اول بیتٍ وُضِعَ للناس نہیں؟ کیا حِل وحَرَم دنیائے اسلام کے لیے باعث تعظیم وتکریم نہیں؟ کیا اُنکی خدمت ودربانی کا فخر ہمیں حاصل نہیں جس دربانی کو حضرت داؤد علیہ السلام اپنی زبور میں عیش وآرام کے خیموں سے بہتر بتاتے اور بیت العتیق کے آستانے پر رہنے کی تمنا کرتے ہیں؟ اگر یہ سب صحیح ہے تو ہمارے کان آج یہ کیوں سُن رہے ہیں کہ ہم اس ملک کو چھوڑ کر چلے جائیں؟ تم نے قرآن کریم پڑھا ہے؟ اگر پڑھا ہے تو کیا اُس میں یہ نہیں پڑھا اخراجُ اہلہ منہ اکبر عند اللہ؟

"پہلے ستاروں سے کہو کہ جوّ السماء چھوڑ دیں۔ طیور سے کہو کہ کرۂ ہوا چھوڑ دیں۔ وحوش سے کہو کہ جنگلوں کو چھوڑ دیں۔ مچھلیوں سے کہو کہ سمندروں کو چھوڑ دیں اور پھر یورپ اور امریکا کے باشندوں سے کہو کہ اپنے ممالک چھوڑ دیں۔ جب یہ سب تمہارے کہنے پر عمل کر لیں تو ہمارے پاس آؤ۔ اور اگر یہ نہیں تو قسم ہے فالق الحب والنویٰ اور خالق الارض والسماء کی کہ کوئی شخص ہمیں ہمارے ملک سے نکال نہیں سکتا۔ یہ ہمارا جواب ہے۔ اِعملوا ما شئتُم۔

"یا سیدی ہم بدنصیب تھے کہ ہم نے اپنے رسول روحنا فداہ کی وصیتِ آخری کی تعمیل میں تقصیر و تقاعد کیا۔ اب تو ہم نہ یہاں کا قبضہ چھوڑیں گے نہ غیر کو یہاں قبضہ کرنے دینگے۔ الملکُ ملکی والزمانُ زمانی۔ والسلام"

∴ ❖ ∴

نقیر سفرِ افغانستان وایران وعرب سے بہت خستہ وماندہ ہو گیا تھا اور اب ہر ایک باقی ماندہ ملک میں فرداً فرداً جانا نہایت مشکل تھا لہذا مصر میں ایک حفلۂ اسلامی کا اہتمام کیا گیا جس میں باقی ماندہ ممالک اسلامی کے وکلاء و نواب جمع ہوئے۔ حضرت شیخ جمال الدین افغانی کے شاگردِ خاص حضرت شیخ کمال الدین صنعانی نے بہ حیثیت صدرِ جلسہ اکابر ملت کی جانب سے جو کچھ فرمایا اُس کا ملخص یہ ہے:۔

"بحمداللہ کہ اغیار کے جگانے سے اب ہم بیدار ہو گئے ہیں اور ابھی کل ہی کی بات ہے کہ ہم نے اپنے ممالک کی سرزمین کو اپنے خون کے آخری قطرہ اور اپنی حیات کے آخری لمحے کے بدلے خریدا ہے۔ یا شیخ! تم تو تم اب تو یورپ بھی ہم سے یہ اُمید نہیں رکھ سکتے کہ جیتے جی ہم یہاں سے ایک منٹ کے لیے بھی ہٹنے اور ایک شبر زمین چھوڑنے کا نام لیں۔ اس طرف سے خاطر جمع رکھو۔ چاہے تم لوگوں کو بخار چڑھے یا اختلاجِ قلب ہو جائے ہم اپنے اپنے ملکوں سے ٹلنے اور نکلنے والے نہیں۔ اگر تمھیں ہماری طرف سے بدگمانی ہے تو ہم اطمینان دلاتے ہیں کہ ہمیں اپنے ہی معاملات سے اتنی فرصت نہیں کہ تمھارا خیال کریں۔ لیکن اگر ہمیں کبھی تمھارا خیال آتا ہے تو ہم اسلامی سچائی سے یقین دلاتے ہیں کہ وہ خیال محبت، ہمدردی اور شکر گزاری کا خیال ہوتا ہے۔ ہم سے اگر ہو سکے گا تو ہم تمھارے افکار کو رفع کرنے میں مدد دیں گے نہ یہ کہ خدانا خواستہ تمھاری پریشانیوں میں اضافہ کریں گے۔ جس طرح ہم خود اپنے ملک میں آرام و اطمینان سے رہنے کے خواہشمند ہیں اسی طرح چاہتے ہیں کہ تم بھی اپنے ملک میں اطمینان۔ امن اور آزادی سے رہو۔

"اگر تمھیں ناگوار نہ ہو تو ہم چند باتیں صاف صاف کہیں۔ ہمیں افریقہ۔ یورپ اور ایشیا کا ہر ملک کے آدمیوں سے ہر وقت واسطہ رہتا ہے ہم سب کے مزاج و طبیعت سے واقف ہیں۔ لیکن اگر ہم نہیں سمجھ سکے ہیں تو اہل ہند کو۔ خدا ہی بہتر جانتا ہے کہ تم ہندوستانی لوگ کس طبیعت کے آدمی اور کس مٹی کے بنے ہو۔ تمھارے ملک کا باوا آدم ہی نرالا ہے۔ تم مُسلم بھی ہو اور مسلم کُش بھی۔ تم محتاج بھی ہو اور مُسرف بھی۔ تم مظلوم بھی ہو اور ظالم بھی۔ تم مصیبتوں میں گھرے بھی ہو اور آپس میں لڑتے بھی ہو۔ میرے بھائی! میری بات کا بُرا نہ مانو۔ قاعدہ ہے کہ اگر کسی گھر میں آگ لگے تو گھر والے سب ایک دل ہو کر بجھانے میں مصروف ہو جاتے ہیں میں نے نہیں سُنا کہ وہ اُس وقت کو باہمی تکرار و فساد و سب و شتم یا باہمی ہمت شکنی میں صرف کرتے ہوں اور آگ بجھانے سے بے پروا ہو جاتے ہوں۔ اگر وہ ایسا کریں تو پھر سمجھا جائے گا کہ یا تو گھر میں آگ ہی نہیں یا آگ لگی ہے تو گھر اُن لوگوں کا نہیں یا کسی وجہ سے اُنھیں سامان بچانے سے دلچسپی نہیں۔ مثلاً بیمہ کمپنی سے روپیہ وصول کرنا ہے لیکن اگر یہ سب کچھ نہیں اور آگ لگی ہے تو پھر سمجھنا چاہیے کہ گھر والوں کے حواس اس قدر مختل اور دماغ اس درجہ بیکار ہو گئے ہیں کہ نقصان کا احساس ہی نہیں۔

"ہم نہیں جانتے کہ اہل ہند میں اس قدر باہمی نا چاقی کیوں ہے۔ اگر اس کا باعث اختلاف مذہب ہے تو مذہب نہیں سکھاتا آپس میں بیر رکھنا۔ مذہب تو بنی نوع انسان سے محبت سکھاتا ہے۔ اسکے علاوہ

مظلومیت و مملوکیت ایسی مشترک مصیبت اور محبت وطن اور حفاظت ملک ایسی مشترک خدمت ہے جس سے کسی باشندے کو انکار و اختلاف ہو ہی نہیں سکتا۔ اور یہ اشتراک مصیبت و خدمت بجائے خود اتحاد کا قوی محرک ہونا چاہیے۔ اگر مختلف باشندوں کی قلت و کثرت بے اعتباری کا باعث ہو تو ہماری رائے میں جس قوم کی تعداد سب سے زیادہ ہو اُس کا اور صرف اُسی کا اخلاقی اور سیاسی اور وطنی فرض ہے کہ وہ اپنے عمل سے اپنے قلیل التعداد بھائیوں کی استمالت و دلجوئی کرے۔ اُن کی نظر میں اپنا وقار و اعتبار بڑھائے اور اُنھیں یقین دلا دے کہ کثرت کسی وقت قلت کو نقصان نہ پہونچائے گی اور اُسکے حقوق تلف نہ کرے گی۔ کیا تمھارے برادران ہنود اس معمولی بات کو نہیں سمجھتے کہ جب تک قلیل التعداد اقوام والے "مزدوران خوش دل" نہ ہوں اُنھیں کیا پڑی ہے کہ "کارِ بیش" کریں۔ جب تک اُنھیں یہ خطرہ رہیگا کہ جس چھپر کے اُٹھانے میں اُن سے مدد لی جاتی ہے اُسکے سائے میں آرام دوسرے پائینگے تو وہ اُس چھپر کو اُٹھانے ہی کیوں لگے۔

"کیا ہم لوگوں کے ہاں قلت و کثرت کا سوال نہیں ہے؟ ضرور ہم میں عقل ہے ہم میں انصاف ہے ہمارا دماغ اس مسئلے کو صحیح پہلو سے سوچتا اور ہماری آنکھ صحیح زاویے سے دیکھتی ہے۔ ہم سمجھتے ہیں کہ جب گاڑی میں کئی پہیے ہوں تو ایک پہیا کبھی گاڑی کو چلا نہیں سکتا۔ اس لیے ہم سب پہیوں کو یکساں مضبوط حالت میں رکھتے ہیں۔ ہمارے یہاں بھی عیسائی۔ یہودی۔ قبطی۔ نبطی سبھی ہیں۔ دیکھو ترکی ممالک میں۔ دیکھو شام و عراق و فلسطین میں۔ دیکھو مصر میں۔ اور سب مل کر کام کرتے ہیں۔ ہم اُنکی حد سے زیادہ دلجوئی کرتے ہیں۔ اور اگر بلقان اور آرمینیا کے فسادوں کا طعنہ دو تو اب یہ راز طشت ازبام ہو چکا ہے کہ یہ ساری ریشہ دوانی و موشگافی پرانی سرزمین آسیہ بلکہ کل سرزمین مشرق کے اَلَدُّ الخصام مغرب کی تھی۔ اور اگر خدانخواستہ اب بھی کبھی اور کہیں یہ آتش لگے تو سمجھ لو کہ اُسکی چنگاری بھی مغربی آتشدان ہی سے آئی ہے۔ خدا نہ کرے کہ تمھارے ہاں بھی وہی ہنود کام نہ کر رہی ہو جو ہر جگہ آگ سلگاتی پھرتی ہے۔

مجھے مسلمانان ہند سے خصوصیت کے ساتھ کچھ عرض کرنا ہے۔ ہنود کی تنہا خوری تو مسلم ہے مگر بذل و ایثار۔ برادر نوازی و سیر چشمی۔ حریت پسندی و امن دوستی کا جو جوہر تمھاری گھٹی میں پڑا تھا اُسے آج کیا ہو گیا۔ کیا تم اپنے وطن سے دور ہو کر اپنا آموختہ سبق بھی بھول گئے؟ تم نے ہندوستان میں صدیوں اصلاح کا کام کیا ہے لہذا تم خصوصیت کے ساتھ اس "امر" کے مامور و مخاطب ہو کہ "ولا تفسدوا فی الارض

بہ اصلاح تھا۔" اگر تمھارے ہندو بھائی تمھارے ساتھ تنگ نظری اور تنگ حوصلگی کا برتاؤ کرتے ہیں تو مضائقہ نہیں۔ تم اپنی بلند نظری اور عالی حوصلگی کو ہاتھ سے کیوں دو۔ وہ تم سے ڈرتے اور بھاگتے ہوں تو تم اُن سے ملو اُنھیں کلیجے سے لگاؤ۔ وہ تم سے نفرت کرتے ہوں تو تم اُن سے محبت کرو اور ثابت کر دو کہ تم اُن کے اچھے بھائی اور اپنی مادرِ وطن کے اچھے بیٹے ہو۔ اُمید کہ ہمارا یہ پیام تم اپنے ہر بھائی تک پہونچا دوگے۔ والسلام"

ان سب ممالک میں سعی لا حاصل کرنے کے بعد فقیر وطن واپس آیا اور پھر سوچنا شروع کیا کہ کیا تدبیر کی جائے جس سے ہندو بھائیوں کا انتشار و اضطرار رفع ہو۔ چنانچہ آخری اور قطعی تدبیر یہ سوچی اور اِس کے سوا کوئی اور تدبیر سمجھ میں نہیں آئی کہ مقدس سرزمین ہند ہی کو اُسکے مقر اصلی سے ہٹا کر کہیں اور لیجایا جائے" تاکہ ماورائے سرحد کے وحشی اور اُجڈ پڑوسیوں سے پیچھا تو پاک ہو۔

وہ جو کہتے ہیں "جوئندہ یابندہ" سو فقیر نے جگہ بھی ایسی ڈھونڈھ نکالی ہے کہ باید و شاید۔ آرام بھی بہت اور پڑوسی بھی مہذب و معتبر، متمول و متیقظ۔ آب و ہوا نہایت معتدل۔ بارش بکثرت۔ کائنات الجو میں نباتات و حیوانات کی پرورش کی بدرجہ اتم طاقت۔ مگر جگہ کسی قدر تنگ ہے اور پورے ہندوستان کی سمائی مشکل۔

ہندوستان کو مع ہمالیہ اور دامنِ کوہ کی سطوح مرتفع کے لے چلنا ممکن ہی نہیں۔ کیونکہ قطع نظر گرانی کوہ بھوٹان و نیپال و سکم و کشمیر و تاہن و کلسیہ۔ اپنی ریاستی حیثیت کھوکر اپنے مقامات سے ہٹنا کیوں گوارا کریں گی۔ اسکے علاوہ سندھ و پنجاب و مشرقی بنگال و ریاست ہائے راجپوتانہ بھی تبدیل مقام کے خواہشمند نہیں اور ولسن صاحب کے اصول خود انتظامی کی رو سے کسی کو حق نہیں کہ اُنھیں خلافِ مرضی مجبور کرے خصوصًا جب اہل دیار کی مرضی کے بغیر واپسیٔ امانت ناممکن ہے تو بلا حصول رضامندی تبدیل مقام کیسے ہو سکتا ہے۔ لہذا فقیر نے حساب کیا تو ۲۵ درجہ عرض البلد کے جنوب کا کل حصہ قابلِ حمل و نقل رہا۔ مگر اس پر بھی عمل درآمد ذرا طاقت طلب اور ہمت آزما ہے۔

مسلمان اول تو ہیں ہی کتنے اور جو ہیں بھی اُن میں بیچ مرزا پھویا نوابوں اور رئیسوں اور حکام جو لیڈروں

اور مولویوں کو نکال کر باقی سب کے سب نا قدرت بیفکرے یا پست ہمت بیکارے رہ جاتے ہیں لہذا اُن سے تو کسی طاقت طلب اور ہمت آزما کام کی اُمید فضول ہے یہ وقت ہے ہندو بہادروں کی ہمت دکھانے کا کہ ہندوستان کو اُسکی جگہ سے اُٹھا کر ہاتھوں ہاتھ لے چلیں اور مشرق کی طرف رُخ کر کے آبنائے ملاکا سے گذر کر۔ بندرگاہ سنگاپور سے گذر کر۔ فرانسیسی کوچین چائنا سے گزر کر۔ ہانگ کانگ سے گزر کر۔ خلیج فارموسا سے گزر کر ٹھیک خط سرطان پر مابین درجہ ہائے ۱۲۰ و ۱۴۰ طول البلد و ۱۰ و ۳۰ عرض البلد یعنی جزیرہ فارموسا و جزیرہ ٹوکیو سیو کے درمیان خالی قطعے میں لنگر انداز کر دیں۔ یہ مقام ایک طرف ساحل چین سے متصل اور دوسری جانب جزیرۂ جاپان سے ملحق ہے اور یہ وہ مقامات ہیں جہاں قلیل التعداد آفاقیوں اور اقامت گزینوں کو مستثنیٰ کر کے تمام و کمال بدھ مذہب کے پیرووں کی آبادی ہے جو ہندو سبھا منعقدۂ بنارس کی قرار داد کے مطابق سب کی سب ہندو جاتی میں شامل و داخل ہے۔

اِس نقل مکان میں ایک خوبی یہ بھی ہے کہ اب تک ہندو بھائی بجا طور پر مسلمانوں کے سفر حج و زیارات کو مشتبہ نظر سے دیکھتے تھے اور نیز اُنھیں طعنہ دیتے تھے کہ جب تک اُن کی محبت و ہمدردی ممالک غیر اور اقوام غیر کے ساتھ ہے وہ سچے محب وطن اور اچھے خادمِ ہند نہیں ہو سکتے۔ اِس نقل مکان کے بعد چونکہ ہندووں کے مقدس مقامات مثلاً گوری شنکر۔ کیدار ناتھ۔ ہردوار۔ متھرا۔ اجودھیا اور بنارس اور مقدس دریائے گنگ و جمن ہمالیہ کے ساتھ یہیں رہ جائیں گے لہذا ہندووں کو بھی تیرتھ جاترا کے لیے وہاں سے جہاز میں سوار ہو کر یہاں آنا پڑے گا۔ اور اس کے بعد مسلمانوں پر تعریض کا موقع نہ رہے گا بلکہ فقیر کی رائے پر عمل ہو تو ہندو پنڈت اور مسلمان مولوی ایک ہی جہاز میں بیٹھ کر گھر سے نکلیں گے۔ ایک ساحل کراچی پر اُتر کر تیرتھ جائے گا دوسرا ساحل جدہ پر اُتر کر حج کر آئے گا۔ اور پھر جاتری اور حاجی دونوں اپنی اپنی گنگا جل اور زمزم شریف کی شیشیاں لیکر ایک ہی جہاز سے گھر لوٹیں گے مسلمان اپنے ہم مذہب عربوں۔ ترکوں۔ مصریوں۔ شامیوں اور افغانوں سے محبت کرنے اور تعلقات بڑھانے میں آزاد ہوں گے اور ہندو اپنے پس ماندہ بھوٹانیوں۔ نیپالیوں۔ کشمیریوں۔ سندھیوں۔ پنجابیوں۔ بنگالیوں اور اچھوتوں سے پریم بڑھانے کے مختار ہوں گے۔ اب تک ہندووں کی محبت و ہمدردی محض ہندوستانِ قدیم کی چار دیواری میں محدود و منحصر تھی اب ہندوستان قدیم و جدید میں برادرانہ کی داد دے سکیں گے اور مسلمانوں پر بدگمانی کا موقع خود بخود رفع ہو جائے گا۔ جدید ہندوستان میں ہندو اور مسلمان نہایت

کریں گے۔ محبت و پریم سے بسر اور پوجیہ مہاراج لالجپت رائے کے احکام ثلاثہ عشر پر عمل کریں گے۔

فقیر نے اپنے پندار میں تدبیر تو کمال غور و فکر کے بعد سوچی ہے مگر اس میں صرف ایک امر محل نظر ہے اور وہ یہ کہ نیا پڑوسی جاپان ابھی حال ہی میں جوان ہوا ہے لہذا جدید ہندوستان کو اپنے مال سے جو کس اور کیل کانٹے سے درست رہنا پڑے گا۔ ایسا نہ ہو کہ ذرا آنکھ چوکی ور چراغ گل گپڑی غائب۔ ہندوستان کو مغلوب ہوجانے کی پرانی عادت ہے۔

ان فی ذالک لذکرے لاولی الالباب ؕ

فقیر مصئونُ العلی (ازبو دمعاً)

بہار بلاغت

(مولفہ خان صاحب محمد قلندر علی خاں و بی ایم اے وکیل حصار (پنجاب) قیمت ۱۲)

فن تعلیم کے ماہرین با صرار کہتے ہیں کہ شرحوں کے ذریعہ سے مدارس کے طلبہ کی تعلیم کو نقصان پہونچتا ہے مگر طلبہ اپنی نادانی سے اور کچھ عام دستور کے مطابق ایک قدم بھی شرح کے بغیر نہیں بڑھانا چاہتے۔ حتیٰ کہ اردو کتاب اگر کوئی نصاب میں داخل ہوجاتی ہے تو اسکی بھی شرح کے طالب پیدا ہوجاتے ہیں۔ اور جب تک یہ ضرورت باقی ہے خواہ ماہرین تعلیم کتنا ہی چلائیں لعنت نئے طریقوں سے شرحیں پیدا ہوتی رہیں گی۔ معلوم نہیں صوبہ پنجاب کے ماہرین تعلیم کا اس بارہ میں کیا رویہ ہے مگر صوبجات متحدہ میں تو شروح کو روکنے کی کافی کوشش نظر آتی ہیں۔ پنجاب یونیورسٹی کے شعبہ مشرقی میں حدائق البلاغت وغیرہ فارسی علم بیان و عروض کی کتابیں داخل ہیں۔ کتاب زیر تبصرہ دراصل اسی کی شرح ہے البتہ توضیح مطالب کی غرض سے اور غالباً اس خیال سے کہ ایک ہی کتاب سب کتابوں کی شرح کا کام دے لائق مولف نے نہر الفصاحت چہار گلزار اور عروض سیفی وغیرہ کو بھی لپیٹ لیا ہے۔ اور امید ہے کہ انکی یہ کوشش پنجاب کے طلبہ میں بہت مقبول ہوگی۔ اردو شاعری سے دلچسپی رکھنے والوں کے لیے یہ کتاب زیادہ مفید نہیں اسلیے کہ اردو میں علم بیان اور صنائع و بدائع کی طرف توجہ ہی کم ہے۔ البتہ عروض و قوافی کا اردو شاعری سے گہرا تعلق ہے۔ اگر تمام مثالیں فارسی کی نہ دی جاتیں بلکہ ہر جگہ نہیں تو اکثر مقامات پر اساتذۂ اردو کے کلام سے فائدہ اُٹھایا جاتا تو یہ بحث زیادہ کار آمد بنجاتی۔

ایڈیٹر

کلام ریاض

کہاں سے میکدے میں آئے کیوں آئے کہاں آئے — یہی شیخ حرم ہیں بن کے جو پیر مغاں آئے

چلے ساغر، سبو اُچھلے، کہے مینا، کہاں آئے — مزا آئے، اِدھر واعظ، اُدھر پیر مغاں آئے

پُرانے یار بچپن کے ہیں قیس و کوہکن دونوں — سُنانے آج ہمکو اپنی اپنی داستاں آئے

جگہ دی تھی فلک نے سایۂ دیوار دشمن میں — یہاں بھی جان لینے تم نصیب دشمناں آئے

یہ میخانہ ہے سُنتا کون ہے پنبہ بگوشوں میں — سنے وہ قلقل مینا اگر شور اذاں آئے

مقام ایسے پڑے رستے میں جن میں ہُو کا عالم تھا — چلے تو سامنے آنکھوں کے کتنے لامکاں آئے

بکے اتنی کہ آئیں لوٹے پیپے خمکدے لدکر — حرم کی راہ میں کوئی اگر مے کی دُکاں آئے

کسی کی یاد آتے ہی مرے لب پہ ہنسی آئی — فرشتے قبر میں لینے جو میرا امتحاں آئے

کہیں صیاد دل سے آرزو جائے رہائی کی — ہوا ایسی چلے اُڑ کر قفس تک آشیاں آئے

مجھے واماندگی میں بھی بہت اپنا سہارا ہے — مرے کانوں میں آواز جرس لے کارواں آئے

یہ ہمسے ناتواں کو سایۂ دیوار نے پیسا — ہوا معلوم ہم کو آج زیر آسماں آئے

گلی سے اُنکی ہٹ کر رات کو یہ کون کہتا تھا — نہ تجھکو نیند جیتے جی کبھی اے پاسباں آئے

جُھکے خُم بھی سبو بھی جام بھی مینا بھی اے ساقی
ریاض آئے یہ میخانے میں یا پیر مغاں آئے

نعتِ سیّدِ کونینؐ

ہر موج ہوا زلفِ پریشانِ محمدؐ
ہے نورِ سحر صورتِ خندانِ محمدؐ

کچھ صبحِ ازل کی نہ خبر شامِ ابد کی
بیخود ہوں تہِ سایۂ دامانِ محمدؐ

تو سینۂ صدیق میں اک رازِ نہاں ہے
صدقے ترے اے صورتِ جانانِ محمدؐ

چھٹ جائے اگر دامنِ کونین تو کیا غم
لیکن نہ چھٹے ہاتھ سے دامانِ محمدؐ

دے عرصۂ کونین میں یارب کہیں وسعت
پھر وجد میں ہے روحِ شہیدانِ محمدؐ

واللیل ہے موجِ شکنِ زلفِ معنبر
والشمس فدائے رُخِ تابانِ محمدؐ

بجلی ہو، مہ و مہر ہو، یا شمعِ حرم ہو
ہے سب کے جگر میں رُخِ تابانِ محمدؐ

اے حسنِ ازل اپنی اداؤں کے مزے لے
ہے سامنے آئینۂ حیرانِ محمدؐ

اصغر ترے نغموں میں بھی ہے جوشِ درود اب
اے بلبلِ شوریدۂ بستانِ محمدؐ

اصغرؔ۔ (گونڈہ)

ظنِّ خام

دین میں سُود کیوں حرام ہوا
مفسدِ دیں یہ ظنِّ خام ہوا

فارغ البال ہو گئی دُنیا
فیل اپنا ہر ایک کام ہوا

قسط دیتا تھا کل جو ہنسا یہ
بینکر آج اُس کا نام ہوا

شیخ جی کا اسی تردد میں
رُخ سوئے رہگذارِ عام ہوا

اُڑتی موٹر میں اک پری دیکھی
برملا اُس کی دلبری دیکھی

زیور آرایشِ شباب نہ تھا
بلکہ دولت کا کچھ حساب نہ تھا

گنجِ قاروں کی روح لیے مگر — اُس کو منظور یہ خطاب نہ تھا
بجلیاں گر رہی تھیں لوگوں پر — کون تھا جس کا دل کباب نہ تھا
جب یہ چاہا کہ ہو بیاں کچھ حال — پھر مخاطب کو کچھ جواب نہ تھا

یعنی رقاصۂ رذیل تھی وہ
فاحشہ، بیسوا، ذلیل تھی وہ

بعد اُس کے جو طے ہوئی کچھ راہ — مل گئے مرشدِ قار آگاہ
طالبِ قحط محتکرِ بے رحم — بے حمیت عدوئے خلق اللہ
حسب دریافت ہو گیا معلوم — ہے ہوا پر بنائے حشمت و جاہ
کرتے رہتے ہیں کام غلے کا — یعنی سٹے کی مشق خاطر خواہ

تیز و مندے کے فن میں فرد ہیں آپ
ہارنے جیتنے کے مرد ہیں آپ

جس کسی سے نظر ہوئی دوچار — تھا یہی رنگ رونقِ بازار
بلکہ مائل تھا دل بسعیِ فلاح — فیصلہ کر دیا یہ آخر کار
کہ بجز اہلِ سیم و زر بفعلِ زبوں — اہلِ دنیا کو دیں سے کیا سروکار
ہاں مگر بہر حفظ رسم و رواج — حیلہ بازی ہے بالیقیں درکار

پڑھ کے دو اک سبق دبستاں میں
لائے فتووں کی فوج میداں میں

سب حلال اور حرام کچھ بھی نہیں — پیش و پس روک تھام کچھ بھی نہیں
اور اگر ہو تو از رہِ تاویل — در خورِ التزام کچھ بھی نہیں
مذہبِ بادشاہ مذہب ہے — اعتقادِ غلام کچھ بھی نہیں
فحش، فیشن میں جبکہ ڈھل جائے — اُس کا پھر اتہام کچھ بھی نہیں

مصلحِ قوم نازاں ہیں حضرت
[illegible] جبیرا ہیں حضرت

تپش - (خورجوی)

بی اماں

ناز ہے قدرتِ صانع کو تری ہستی پر
رشک کرتا ہے ترے سوز پہ اعجازِ شرر

جس پہ قربان ہوں سو زیست عدم تیرا ہے
جس پہ چلتا ہے جہاں نقشِ قدم تیرا ہے

تیری تعمیر میں سرمایۂ غیرت پنہاں
تیری فطرت میں اک احساسِ حمیت پنہاں

درسِ ایثار کچھ اس طرح پڑھایا تو نے
ایک عالم کو رہِ حق پہ لگایا تو نے

زندگی تیری صداقت کا اک افسانہ ہے
جو نہ سمجھے تری دعوت کو وہ دیوانہ ہے

ہر روش دہر کی پیغامِ اجل دیتی ہے
پر تری زیست یہ تعلیمِ عمل دیتی ہے

زندگی نذرِ رہِ ملتِ بیضا کردے
ذرۂ خاک کو ہمدوشِ ثریا کردے

آنکھ نے چوٹ ہے گو نشترِ غم کی کھائی
دیدۂ دل نہیں شرمندۂ نابینائی

نورِ حق دیکھتا ہوں خاک میں تیری مستور
جس کے ہر لمعہ میں ہو جائے فنا شعلۂ طور

خاک میں ہمتِ پرواز ابھی باقی ہے
اُڑ کے ہر بار سوئے عرشِ بریں جاتی ہے

ذرے جب شدتِ انوار سے تھرّاتے ہیں
دامنِ بنتِ پیمبرؐ سے لپٹ جاتے ہیں

جلیل قدوائی (علیگ)

سفرِ حجاز کی مختصر رُوداد

(بسلسلۂ ۱۰ دسمبر سنہ ۱۹۲۴ء)

مکۂ معظمہ کی طرح مدینۂ منورہ کے لیے بھی میرے پاس کچھ امانت اور خیرات کی رقوم تھیں۔ امانت کو بحفاظت پہونچا دینے میں تو بحمداللہ جلد کامیابی ہو گئی مگر تقسیم خیرات کا کام بہت دشوار ثابت ہوا۔ مکۂ معظمہ میں بھی رقوم کے تقسیم ہو جانے کے بعد میرا دل مطمئن نہیں ہوا تھا اور یہاں جب اُسی طریقہ پر ابتدا کی گئی تو میں برداشت نہ کر سکا اور میں نے تہیہ کیا کہ بقیہ چیزیں اور رقمیں خود مستحقین کو تلاش کر کے پہونچاؤں۔ اس غرض کے لیے مدینۂ منورہ کے فقرا و مساکین تک پہونچنے میں میرا بہت سا وقت صرف ہوا جس کی وجہ سے مسجد نبوی میں خلاف اوقات نماز زیادہ وقت تک حاضری سے محروم رہا۔ قافلہ کی واپسی کے بعد سے تقریبا ہر روز صبح کو ظہر سے قبل تک اور کبھی کبھی سہ پہر یا رات کو بھی فقرا و مساکین کی تلاش میں وقت لگ جاتا تھا۔

ایک روز نماز ظہر کے بعد سید زین العابدین صاحب مجھے اور میمن تاجر کے ساتھیوں میں سے کچھ لوگوں کو حرم شریف سے باہر لائے اور مشہد سیدنا عثمانؓ، حضرت ابوایوبؓ انصاری کا مکان، دیار حضرات عشرۂ مبشرہ، حضرت عبداللہ (حضور کے پدر) اور حضرت مالکؓ بن سنان علمبردار غزوۂ اُحد کے مزارات کی زیارت کرائی۔

عشاء کے بعد ایک دفعہ حرم نبوی سے گھر جا رہا تھا۔ طبیعت پر کسی قدر حزن طاری تھا۔ راہ میں ایک درویش صورت شخص سے ملاقات ہوئی جو حرم شریف میں پانچوں وقت نماز ادا کرنے آتے تھے۔ میں نے اپنی قلبی کیفیت کا اُن سے اپنی ٹوٹی پھوٹی عربی میں ذکر کیا۔ پہلے وہ سمجھے نہیں، بلکہ ایک مسافر و سائل جان کر اپنے گھر لے چلنے اور کھانا کھلانے پر آمادہ ہوئے۔ جب مزید گفتگو سے اُنھیں معلوم ہوا کہ طالب دُنیا نہیں ہوں تو [illegible] طرح پیش آئے۔ گھر ساتھ لے گئے۔ اور باوجودیکہ کھانا کھائے ہوئے تھا، اصرار در اصرار اور تان خطائیوں سے میری ضیافت کی اور دیر تک گفتگو فرماتے رہے۔ بات چیت سے معلوم ہوا کہ ان کا نام شیخ حسین ہے، فرقہ شاذلیہ (نا صری) سے تعلق رکھتے ہیں اور فاز (مراکش) کے رہنے والے ہیں۔ جب میں گھر جانے کے لیے رخصت ہوا تو میری استدعا و التجا کے باوجود ہمراہ تشریف لائے اور میرے گھر کے قریب تک پہونچا گئے۔ سبحان اللہ کیا اخلاق ہیں۔

دوسرے دن سید زین العابدین صاحب کی معیت میں مسجد قبا کی زیارت کرنے گیا۔ ایک درجن سے زیادہ عورتیں اور مرد ساتھ تھے۔ مسجد قبا شہر سے باہر تقریباً دو ڈھائی کوس کے فاصلہ پر ہے۔ اور چونکہ راہ غیر محفوظ ہے اسلیے حکومت کی طرف سے گاڑیوں کے ہمراہ مسلح بدو ساتھ گئے تھے۔ مسجد قبا کی زیارت کے بعد مسجد سیدنا عمرؓ سیدنا علیؓ و سیدنا ابوبکرؓ اور حضرت فاطمہ زہراؓ کی چکی کی زیارت کی اور وہاں سے بیر خاتم پر آکر پانی پیا جسمیں حضور انورؐ کی انگشتری مبارک گر گئی تھی۔ واپسی میں شہر کے اندر سیدنا عمرؓ حضرت بلالؓ اور سیدنا ابوبکرؓ کی مسجدوں کی زیارت کی۔ سیدنا علیؓ کی مسجد بند ملی اسلیے باہر ہی سے زیارت کر لیگئی۔ زیارت کے موقعوں پر ہر جگہ سید زین العابدین صاحب کچھ دعائیں عربی زبان میں بآواز بلند پڑھتے تھے اور سب لوگ ان الفاظ کی تا بامکان تکرار کرتے جاتے تھے۔ مسجد قبا میں نماز پڑھنے کا خاص ثواب ہے اسلیے وہاں تو جتنی دیر قیام ہوا میں نوافل پڑھتا رہا باقی اور سب مقامات پر بھی کم سے کم دو رکعت نفل ضرور پڑھ لی۔

مسجد قبا کا راستہ ناہموار تھا۔ نیز جن گاڑیوں پر ہم لوگ گئے تھے ان میں کمانیاں نہ تھیں۔ اسلیے آمد و رفت کی مسافت زیادہ نہ ہونے کے باوجود تکلیف اور تھکن بہت ہوئی۔ بعد ادائے نماز ظہر حسب وعدہ شیخ حسین ناصری کے یہاں حاضر ہوا۔ فوراً قہوہ سے ضیافت کی اور تقریباً دو گھنٹے تک گفتگو کرتے رہے۔ اور چلتے وقت میرے حزن کو دفع کرنے کی ترکیب بتائی۔

آج ایک بہار کے رہنے والے نوجوان سے ملاقات ہوئی۔ ان کا نام حامد رسول ہے۔ اور یہ جنگ بلقان کے زمانہ میں ڈاکٹر انصاری صاحب جو طبی مشن لیگئے تھے اسکے ایک رکن تھے۔ اب ہجرت کرکے مدینۂ منورہ میں مقیم ہیں اور طبابت کرتے ہیں۔ ان سے دیر تک عام حالات پر تبادلۂ خیال ہوا۔ رات حرم شریف میں بسر ہوئی۔ الحمد للہ

چونکہ زیارت حرمین شریفین کے سلسلہ میں مجھے اسکی فکر بھی تھی کہ مدینہ منورہ یا مکہ معظمہ میں بقیہ عمر گذارنے کی صورت پیدا ہو اسلیے مدینہ منورہ میں جن حضرات سے موقع ملتا اس بارہ میں گفتگو کی جاتی۔ مہاجرین میں سے جو اصحاب متوکلین میں ہیں اور حصول معاش کے لیے کوئی کام نہیں کرتے انکی تابعیت ایک دنیا کے کتے سے نہیں ہو سکتی۔ اسلیے ایسے اصحاب کے مشورہ سے فائدہ اٹھانا چاہتا تھا جو وہاں کسی قسم کا کاروبار کرتے ہیں۔ مولوی سید احمد صاحب سے تو تقریباً ہر روز ملاقات ہوتی تھی۔ مگر جب تک زائرین کا ہجوم رہا اس بارہ میں گفتگو کا موقع نہ ملا۔ اب انکو فرصت تھی تو صبح ہی کو میں انکے یہاں حاضر ہوا اور دیر تک اس بارہ میں بات چیت ہوئی۔ وہ خود متعدد قسم کی تجارتوں میں مشغول ہیں اور کافی تجربہ یہاں کی زندگی کا رکھتے ہیں۔ اسلیے ان کی

داروں سے مجھے بہت مدد ملی۔
ظہر کے بعد شیخ حسین ناصری کے یہاں حاضر ہوا۔ پہلے انھوں نے گرم گرم کبابوں اور عمدہ پکی ہوئی روٹی سے ضیافت کی۔ پھر دیر تک بات چیت کرتے رہے۔ اور اثنائے گفتگو میں فرمایا کہ رات کو حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت خواب میں ہوئی تو منہ چھپائے ہوئے تھے اسلیے کچھ عرض نہ کر سکا۔ یہ گویا میرے حزن کے رفع نہ ہوسکنے کی طرف اشارہ تھا۔
حافظ شبراتی صاحب سے روزانہ کئی کئی دفعہ ملاقات ہوتی اور جب ضرورت پڑتی تو وہ میرے ساتھ ہی اپنا وقت گذارتے۔ اُن کا قیام میاں مظہر کی رباط میں ہے۔ میاں مظہر صاحب حضرت مجددؒ سرہندی کی اولاد میں ایک بزرگ کامل گزرے ہیں جن کا مدینہ منورہ میں غیر معمولی ادب واحترام کیا جاتا تھا۔ یہ رباط انھیں کی بنائی ہوئی ہے اور اب اُنکے صاحبزادہ میاں احمد کے زیر اہتمام ہے۔ حافظ شبراتی صاحب نے از راہ محبت میری دعوت فرمائی۔ اکیار پہلے اُنکی ہمراہی میں اُن کا جائے قیام دیکھ گیا تھا۔ اب دعوت کھانے اپنے میزبان جناب مولوی عبد الباقی صاحب کے ہمراہ گیا۔ اور وہاں دیر تک ٹھہرا تو رباط کو اچھی طرح دیکھنے کا موقع ملا۔ یہ سرائے کی قطع کی دو منزلہ عمارت ہے جس میں چاروں طرف برآمدہ کے پیچھے چھوٹے چھوٹے کمرے ٹھہرنے والوں کے لیے بنے ہوئے ہیں۔ جن میں طلبا و مہاجرین رہتے ہیں۔ مکان کے ایک قطعہ میں خود میاں احمد صاحب کے اہل وعیال رہتے ہیں۔ صاحب موصوف کے دو بیبیاں ہیں۔ ایک رباط میں رہتی ہیں اور دوسری حرم نبوی کے قریب ایک مکان میں۔ اس رباط کے رہنے والوں کو آپ کے حلقہ میں بھی حاضری دینا ہوتی ہے۔ میرا خیال تھا کہ سلسلہ عالیہ نقشبندیہ کے بزرگ عموماً اور حضرات مجددین خصوصاً پیرزادگی کے عام طریقوں پر عمل پیرا نہیں ہوتے مگر تجربہ سے معلوم ہوا کہ خواص اور صاحبانِ دل تو ضرور ان باتوں سے بچتے ہیں ورنہ عام طور پر اُن میں بھی وہی سب کمزوریاں موجود ہیں جو دیگر سلاسل طرق میں پائی جاتی ہیں۔
میاں احمد صاحب اُسوقت موجود نہیں تھے اس لیے اُنکی قدمبوسی کا شرف حاصل نہ ہوا۔ بلکہ اُن سے ملنے کے لیے ایک دن اُنکے بازار والے مکان پر حاضر ہونا پڑا۔
آج خبر ملی کہ ڈاک آئی ہے۔ ڈاک خانہ گیا تو معلوم ہوا کہ ڈاک بازار میں تقسیم ہونے کو دی گئی ہے۔ رباط مظہری میں ایک طالبعلم یٰسین نامے رہتے ہیں جو مولوی عبد الباقی صاحب سے پڑھتے ہیں اور اس سبب سے تقریباً روزانہ آتے تھے۔ انکی زبانی معلوم ہوا ایک ہندوستانی عبد الرزاق نامی ہیں جو ڈاکخانہ سے خطوط لاکر

تقسیم کرتے ہیں۔ اُنکی تلاش میں کئی بار گیا۔ شام کو اُن سے ملاقات ہوئی تو اُنھوں نے کہا کہ دوسرے روز ڈاک دیکھکر بتائیں گے۔

رات مسجد نبوی ہی میں بسر ہوئی۔ آج شب جمعہ تھی اس لیے حرم شریف میں حاضر رہنے والوں کی تعداد میں کچھ اضافہ ہوا اور ایک بخاری بزرگ سے جن کا اسم شریف محی الدین اور طریقہ نقشبندیہ تھا۔ ملاقات ہوئی۔ چونکہ فارسی میں گفتگو ہو سکتی تھی اس لیے میں نے اُنکو جلد اپنی طرف متوجہ کرلیا اور اُنسے اپنے حزن کا تذکرہ کیا۔ اُنھوں نے بھی رفع حزن کی ایک ترکیب بتائی۔

دوسرے دن جمعہ تھا خبر ملی کہ شیخ شمس کا قافلہ دوشنبہ کو روانہ ہوگا۔ لہذا صبح کو بازار جاکر کھجور خریدی۔ بعد نماز جمعہ مولوی ضیاء الدین کے ہمراہ رباط مغربی میں گیا جو حرم شریف سے قریب ہی واقع ہے اور ناظر یا مہتمم رباط سے کچھ دیر بات چیت ہوتی رہی۔ پھر دار الضیافۃ میں جاکر مولوی محی الدین بخاری کی قدمبوسی حاصل کی۔ بڑے اخلاق سے پیش آئے۔ عصر کے وقت شیخ حسین ناصری حرم شریف میں ملے تو فرمانے لگے کہ جب تک تنبا کو مطلقاً ترک نہ کروگے تمہارا حزن دفع نہ ہوگا۔ نماز مغرب کے بعد حکیم حامد رسول کے ساتھ عمر قاشوجی کے یہاں گیا۔ یہی صاحب ہمارے مزور ہیں۔ عرصہ سے شدید علالت میں مبتلا ہیں اس وجہ سید زین العابدین صاحب کو اپنی طرف سے یہ خدمت سپرد کر رکھی ہے۔

سال میں دو دفعہ روضۂ اطہر کو غسل دیا جاتا ہے۔ غسل کی رات کو روضۂ اطہر پہ حاضر ہوکر لوگ مرادیں مانگتے ہیں اور اس غرض کے لیے کہ غسل کرنے میں شرکت ہو جائے پاک کپڑے میں برادۂ صندل وغیرہ رکھکر اور پوٹلی بناکر روضۂ اطہر کی جالی میں ڈالدیتے ہیں اور غسل کے بعد غسل کا پانی تقسیم ہوتا ہے۔ میری بڑی خوش قسمتی تھی کہ میری حاضری کے زمانہ میں غسل ہونے والا تھا۔ سید زین العابدین صاحب نے وعدہ کیا کہ غسل کا پانی لادیں گے۔ دوسرے روز کہ یوم غسل تھا صبح کو بیں دیر تک روضۂ اطہر پہ حاضر رہا۔ اُسی دن ایک صاحب جو ہندوستانی ہیں تشریف لاکر مجھ سے ملے اور یہ خواہش ظاہر کی کہ ایک خاتون کو ہندوستان بھیجنا چاہتے ہیں۔ میں اپنے ہمراہ لیجاؤں۔ مجھے اس میں تامل ہوا۔ تو فرمانے لگے کہ کم سے کم کلکتہ تک پہونچا دینا۔ مجھے منظور کرنا پڑا۔

میرا شغف بیرونی مناظر سے اُٹھ گیا تھا۔ سید زین العابدین صاحب نے اطمینان دلایا تھا کہ مل جائیگا۔ اب جو واپسی کا زمانہ آیا تو مجھ کو اُسکی فکر ہوئی۔ کئی بار سید زین العابدین صاحب سے کہا بھی

انھوں نے اپنے کسی کارکن کو میرے ساتھ جانے کی ہدایت کی کبھی خود وعدہ کیا۔ بالآخر ایک دن میں انکی معیت میں اندرونی مناخہ گیا تو دیکھا کہ شغدف تو کھلا پڑا ہے اور چٹائی جو اسپر منڈھی تھی اور صراحیوں کی زنبیلیں وغیرہ غائب ہیں۔ غنیمت ہے کہ شغدف کا پتہ چل گیا۔

شام کو اُسی طرف پھر نکلا۔ ایک جگہ تازہ انجیر فروخت ہو رہے تھے۔ دو قرش کے سولہ سترہ ملے خوش ذائقہ معلوم ہوے اور میں سب کھا گیا۔ دن میں اتفاق سے ایک جگہ بہت سے کباب اور ایک ہندوستانی مٹھائی والے کے یہاں سے کچھ مٹھائی لیکر کھائی تھی۔ ان بدعنوانیوں نے طبیعت خراب کر دی۔ گرانی سر اور نزلہ پیدا ہوگیا۔ اور دوسرے دن بخار آ گیا۔ اتفاق سے ایک شخص عبدالرحمٰن خیاط سے اُس روز ملنے کا وعدہ تھا اُسی حالت میں اُنکے یہاں چلا تو گیا مگر بخار کے کرب کی وجہ سے بہت بےچین رہا۔ اور اُن غریب کو بھی کافی پریشانی ہوئی۔ مغرب کے وقت تک تو خیر نماز کے لیے حرم شریف جاتا رہا مغرب کے بعد اس قدر اُلجھن بڑھی کہ حرم شریف جانے کا کیا ذکر نماز تک کا ہوش نہ رہا۔ زیادہ رات گذرنے پر کچھ بخار میں کمی ہوئی تو نیند آئی۔ دوسرے دن اہلیہ مولوی عبدالباقی صاحب کے مشورہ سے ایک سہل دوا پی جسکو منگو یا منقوح کہتے ہیں۔ اُسکے اثر سے دن بھر پتلے پتلے دست آتے رہے مگر دستوں کا سلسلہ شام تک بند نہ ہوا۔ نصف شب کے بعد کہیں جا کر دستوں کا سلسلہ موقوف ہوا۔ جس سے بہت ضعف پیدا ہوگیا۔

نظر سے خوش گزرے

ملک میں چاروں طرف تخفیف مصارف کی کمیٹیاں کئی سال سے مصروف کار ہیں اور سرکاری و نیم سرکاری، قومی و غیر قومی سب مجالس اِس نئی وبا میں کم و بیش مبتلا رہی ہیں۔ دفتر الناظر میں بھی تقریباً چھ مہینے ہوے تخفیف مصارف کے جراثیم داخل ہوگئے تھے مگر اب تک کچھ اثر نمودار نہیں ہوا تھا۔ نئے سال کے چہرہ نما ہوتے ہی کمیٹی نے یاد دہانی کی۔ جسکی بنا پر اعلان کیا جاتا ہے کہ جن احباب کو سالہاے ماسبق میں الناظر ہدیۃً ارسال کیا جاتا رہا اب نئے بجٹ میں اُنکے لیے افسوس ہے کہ کوئی گنجایش باقی نہیں۔ صرف الناظر کے محترم قلمی معاونین جنکے مضامین سے رسالہ کی زینت ہوتی ہے اور ہمارے وہ معاصرین کرام جنکے قابل قدر جرائد کے رکھنے کی دفتر ہذا میں گنجایش ہے اس حملۂ تخفیف سے مستثنیٰ رہیں گے۔

بعض اصحاب جن کے دل ناکام غم کھانے میں بہت بودے ہیں، نظرے خوش گزرے کی تاب نہیں لا سکتے۔ اور اب جو دفتر "انناظر" سے ایک اخبار بھی نکلنے لگا جسکا نام ہی بجائے خود تمام جھوٹے معبودوں کو لرزہ براندام کر دینے کے لیے کافی ہے تو انکے نازک دلوں پر عجیب خوف وہراس طاری ہے۔ حالت اضطراب میں باہر کے ایک روزانہ اخبار کی ہمدردی حاصل کی گئی اور جرأت مردانہ کی نمایش شروع ہو گئی ہے۔ اللھم زد فزد

احمد آباد (گجرات) سے جہاں مہاتما گاندھی کا قیام ہے ایک گلدستہ "نشتر" زیر نظر" سرپنچ افغان مولانا عیسیٰ خاں نشتر جاری ہوا ہے جو "باہتمام" حسین میاں "اڈیٹر" بمبئی میں چھپتا ہے۔ اسکے منیجر بھی نشتر صاحب ہیں۔ اس کا تیسرا نمبر ہمارے پاس بغرض ریویو آیا ہے۔ پرچہ کے شروع میں نشتر صاحب کی تصویر درج ہے نیچے انگریزی اور گجراتی میں چند سطروں کی عبارت ہے۔ گجراتی سے ہم ناواقف ہیں۔ انگریزی عبارت کا ترجمہ حسب ذیل ہے :-

"سرپنچ افغان عیسیٰ خان نشتر یعنی گجرات کے انور (انور پاشا) مہاجرین کے معاون ومحافظ، عالی مرتبت مذہبی وتمدنی رہنما جنھوں نے اپنی دولت، صحت اور راحت وآرام کو تحریک مسئلہ خلافت کو انتہائی عروج تک پہونچانے کی کوشش کی اور جو گجرات میں تحریک خلافت کے مبلغ تھے۔"

ایسے بلند قدر بزرگ قوم کے اردو صحافت میں گامزن ہونے پر جملہ خدمتگذاران اردو کی طرف سے غلغلۂ شادمانی بلند کرتے ہوئے اعتراف کرتے ہیں کہ فارسی کے مشہور مقولہ "مشک آنست کہ خود ببوید" کی تفسیر اس سے پہلے نہیں سمجھ میں آئی تھی۔

انجمن اردو کے سالانہ جلسہ کی تاریخیں ایک خوش مزاج دوست کے بقول بالے میاں کی برات کے مانند برابر تغیر پذیر ہیں۔ پہلے وسط جنوری میں جلسہ کرنے کی تجویز ہوئی تھی، پھر ۲۴-۲۵ تاریخ مقرر ہوئی۔ اب ان تاریخوں کو بھی بدلنا پڑا۔ اور ۸-۱۵ یا ۲۲ فروری میں سے کوئی تاریخ رکھی جانے گی۔ ابھی مجلس انتظامیہ کی طرف سے اعلان نہیں ہوا ہے۔ ناظرین الناظر میں سے جن صاحب کو انجمن سے دلچسپی ہو وہ مقامی اخبارات میں آخری اعلان ملاحظہ کریں۔

شہزادہ کے چوٹ کھائے ہوئے دل پر اتنا اثر ہوا کہ اپنے گلے سے موتیوں کا ہار اُتار کر اس لڑکی کو پہنا دیا۔ دیکھنے والے کھٹکے کہ عیش پرست شہزادہ شاید اس لڑکی کو اپنے رنواس میں داخل کرنے والا ہے۔ مگر یہ کون گمان کر سکتا تھا کہ راجکمار نے گلے کا ہار اُتار کر دنیا سے تعلقات چھوڑنے کا اعلان کیا ہے !!

کپل واستو کی رعایا نے خوشی منائی، شہر میں چراغاں ہوا۔ قلعۂ شاہی میں رقص وسرود کی محفل منعقد ہوئی۔ خاطرِ احباب سے راجکمار بھی بزم طرب میں شریک ہوا اور آدھی رات تک گانا سنتا رہا۔ جب مجلس برخاست ہوئی تو شہزادہ نے سوچا کہ اس وقت قلعہ کے سب محافظ شرابِ عشرت سے مست اور بے خبر ہیں۔ اس سے بہتر موقع یہاں سے فرار ہونے کا نہ ملے گا۔ چنّا رتھبان کو بلایا اور گھوڑا تیار کرنے کا حکم دیا۔ سائیس کی کیا مجال تھی کہ خلاف عادت آدھی رات کے وقت طلب ہونے کا سبب دریافت کرتا۔ تعمیل ارشاد کے لیے اصطبل کی طرف گیا اور ادھر راجکمار سفر کی تیاری کرنے لگے۔

زن طریق عشق کی پہلی راہزن ہے۔ جسودھرا کی محبت نے قدم پکڑے اور دل نے نہ مانا کہ اُسکو ایک بار دیکھے بغیر گھر سے نکل جائے۔ دبے پاؤں بیوی کے کمرہ میں گیا۔ دیکھا کہ رنگ محل ہاروں اور پھولوں سے دولھن بنا ہوا ہے اور جسودھرا اپنے ننھے بچے پر ہاتھ رکھے بے خبر سو رہی ہے۔ دل بیچین ہوا کہ بچہ کو ایک دفعہ چھاتی سے لگا لینا چاہیے معلوم نہیں کہ پھر دیدار نصیب ہو یا نہ ہو۔ آگے بڑھتا ہے تو بیوی کے جاگ پڑنے کا اندیشہ ہے اور اُس کا جاگنا ممکن ہے کہ اس وقت سفرِ عشق میں خلل انداز ہو۔

دنیوی محبت اور روحانی فرض میں جنگ ہوئی۔ محبت ہار گئی۔ اور راجکمار پژمردہ اور افسردہ لوٹ آیا۔ جب اپنے کمرہ تک پہونچا تو دُنیا آنکھوں میں تاریک ہوگئی اور بیخودی کے عالم میں پھر جسودھرا کے پاس گیا۔ اُسکے قدم اپنے ہونٹوں سے چھوے اور دل بیتاب کو یوں تسلی دی کہ یہ مفارقت چندروزہ ہے۔ موت کی جدائی البتہ دائمی ہوتی ہے۔ جوگ میں کمال حاصل کرکے پھر واپس آنا اور آج کی بیوفائی کی معافی چاہنا ممکن ہے۔

اس طرح بہلا پھسلا کر دل سے زن و فرزند کو وداع کرنے کی اجازت حاصل کی۔ گھوڑا تیار ہی

تھا۔ سوار ہوا اور ایک دم میں قلعہ سے باہر تھا۔

کہتے ہیں کہ جس وقت یہ مقدس شہزادہ گھربار، بیوی بچہ، باپ اور سلطنت کو چھوڑ کر جنگل کی راہ لینے پر تیار تھا تو شیطان سامنے آیا اور سات دن کے اندر ہفت اقلیم کا راجہ بنا دینے کا وعدہ کیا بشرطیکہ وہ اس وقت اپنے بوڑھے باپ، زچہ بیوی اور ننھے بچہ کو نہ چھوڑے لیکن راجکمار کو تلاش حق کی دُھن تھی۔ دنیا کی محبت سے دل سرد ہو چکا تھا۔ اُس نے شیطانی تجویزوں کو نامنظور کیا۔ اور گھوڑے کی رکاب پر قدم رکھا۔ شیطان افسردہ ہوکر بولا کہ "یہ انسان ہے کبھی وقت تو اس پر خواہش، حرص یا غصہ کا اثر ہوگا۔ اور وہی میری کامیابی کی گھڑی ہے!"

چنّا رتھبان بھی رفیقِ سفر ہوا۔ اور راجکمار نے گھوڑے کو ایڑ لگائی۔ یہ جولائی کا مہینہ تھا اور اُس وقت چاندنی خوب پھیلی ہوئی تھی۔ اسی ہجرت کو عقیدت کیش بودھ مہابن شکرماں یا زہدِ عظیم کے نام سے یاد کرتے ہیں۔ رات جس قدر باقی تھی سفر میں گذری اور صبح ہوتے شہزادہ رجگان شاکیہ اور کولین کے علاقوں سے باہر تھا۔ ندی انوما کے کنارے گھوڑے سے اُترا۔ اپنی زلفیں تراشیں۔ گھوڑا جس پر سوار ہوکر آیا تھا اور زیور جو اُسکے بدن پر تھا اُتار کر چنّا کے حوالہ کیا۔ اور اُسکو واپس جانے کا حکم دیا۔ چنّا کو اپنے مخدوم کی جدائی منظور نہ تھی لیکن شہزادہ کی تاکید سے مجبور ہوگیا اور چھاتی پر پتھر رکھ کر مالک کے قدم چھوڑے۔

مایا دیوی!! آپ بڑی خوش قسمت تھیں کہ یہ مصیبت کی خبر سننے اور جدائی کی سخت گھڑی دیکھنے کو زندہ نہ رہیں!! بوڑھے باپ پر اس دردناک خبر سے کیا گذری اور جاں نثار بیوی نے اپنی کیا گت بنائی؟ قلم کو تفصیل کی تاب نہیں!!

راجکمار سات دن تک انوما ندی کے قریب آم کے باغ میں تنہا مقیم رہے اور غور کرتے رہے کہ زندگی اور موت پر کیونکر قابو حاصل کرنا چاہیے۔ ایک ہفتہ کے تفکر کے بعد یہ رائے قائم ہوئی کہ پہلے رائج الوقت فلسفہ کسی ماہرِ فن سے پڑھنا چاہیے تب معلوم ہوگا کہ عقائد و رسوم میں کیا خرابیاں ہیں جنکی وجہ سے خوبصورت دنیا مصیبتوں کا گھر بنگئی ہے۔

آفتاب تاریکی میں نور لاتا ہے اور وہ پورب سے طلوع ہوتا ہے۔ علم کی روشنی تلاش کرنے کے لیے اُس نے مشرق کا رخ کیا اور مگدھ کے راج کی طرف روانہ ہوا۔

شمالی ہندوستان میں اُسوقت سولہ بڑی سلطنتیں تھیں اور ان میں سے ایک مگدھ کا راج تھا - اس کا دارالسلطنت راجگڑھ تھا اور زمام حکومت راجہ بسبسار کے ہاتھ میں تھی - گوتم اُفتاں وخیزاں راجگڑھ تک پہونچا - بسبسار نے خاطر مدارات کی اور وہاں کے نامی پنڈتوں آرادہ اور اودرک کے حضور میں راجکمار نے زانوئے ادب تہ کیا -

یقینی طور پر نہیں کہا جا سکتا کہ راجگڑھ میں کتنی مدت تک قیام رہا اور فلسفہ کے علاوہ کوئی دوسرا علم بھی تحصیل کیا گیا یا نہیں - اگر دانشمندوں کا قول صحیح ہے کہ ۴۰ سال کی عمر سے پہلے کسی کو درجۂ کمال نہیں ملتا تو آیندہ واقعات کی مدت کا حساب لگانے سے یہ نتیجہ نکالا جا سکتا ہے کہ مہاتما ۴ یا ۵ سال تک راجگڑھ میں مقیم رہے - للتا وِستارا کا مولف کہتا ہے کہ "حصول کمال سے پہلے دس سال ریاضت میں صرف ہوئے" - جپ تپ کی مدت معتبر روایات کے مطابق صرف ۶ سال ہے - لہذا یہ بقیہ چار سال جو ایام ریاضت میں شامل کیے گئے ممکن ہے کہ سلسلۂ تحصیل علوم راجگڑھ میں بسر کیے گئے ہوں -

بہرحال علوم کی تحصیل سے یہ حاصل ہوا کہ مہاتما کو مذہب مروجہ پر عقیدت نہ رہی - قربانیوں کا وسیلہ جو مقبول عوام تھا انکو قابل نفرت نظر آیا - مسئلۂ تناسخ یا آواگون اُنھوں نے تسلیم کیا لیکن اس سلسلۂ نامتناہی سے نجات پانے کی کوئی صورت فلسفہ کی رو سے دستیاب نہ ہو سکی - کیونکہ انسان جب تک زندہ ہے خواہش کا بندہ رہیگا اور ہر ایک جنم میں گناہ ضرور سرزد ہوگا جو دوبارہ دنیا میں کھینچکر لائیگا اور ممکن ہے کہ ایک روح جو اپنے نیک اعمال کے عوض میں اچھے برہمن کے گھر پیدا ہوئی ہے آیندہ قالب میں سانپ بچھو بن جائے !

وہ اپنے عقائد کی درستی کے لیے عین الیقین اور حق الیقین کے طلبگار رہتے اور فلسفہ کے دارالصحت میں اس مرض کا کوئی علاج نہ تھا - لہذا اکرم کھنڈ چھوڑ کر ویدانت پر عمل کرنے اور جوگ

لہ للتا وِستارا ایک اگلے وقتوں کی سنسکرت کتاب گوتم بدھ کے احوال میں ہے - یہ تبت میں دستیاب ہوئی اور اس کا ترجمہ ۱۸۴۸ء میں پیرس سے شایع ہوا - اس پر انگلستان کے ایک فاضل " ارنسٹ رینان " نے ریویو لکھا ہے جو اُن کی کتاب " اسباق تاریخ مذاہب " مطبوعہ ۱۸۸۶ء میں شامل ہے - اور اسی کتاب سے وہ اقتباس بھی لیا گیا ہے جو گوتم کی حیرت انگیز کیفیت ولادت کے متعلق عقیدت کیش سوانح نگار کے نام سے اوپر درج کیا گیا -

کی مدد سے صراطِ مستقیم دریافت کرنے کے لیے اُنھوں نے راجگڈھ کا قیام چھوڑا اور انسانی آبادی سے دُور اور وبلوا کے جنگل میں جو بندھیاچل پہاڑ کے شمالی دامن میں واقع تھا مجاہدہ اور مراقبہ شروع کیا۔

اُن کے "زہدِ عظیم" کی حکایت سُن کر پانچ فقیر بھی جپ تپ کے شریک ہوے اور نفس کشی، ریاضات اور مجاہدات کی کوئی حد نہ باقی رکھی۔

جنگل میں نہ اناج ملتا تھا نہ میوے۔ گھاس پات کھاتے تھے اور وہ بھی بہت کم۔ پانی میسر آتا تھا تو پیتے تھے مگر بہت تھوڑا۔ چند روز کے بعد غذا بالکل ترک کر دی تھی اور صرف ہوا پر زندگی تھی۔ چھ سال برابر ایک ہی مقام پر عبادت میں مصروف رہے مگر کشود کار نہ ہوا۔ نفس کو مغلوب کرنے کی کوشش میں روح بھی مضمحل ہوگئی اور ایک دن ضعف کی شدت سے غش کھا کر مہاتما گر پڑے۔ چیلوں نے جانا کہ خاتمہ ہوگیا اور مُکتی پراپت ہوگئی!!

دیر کے بعد ہوش آیا تو فوراً جپ توڑنے کا ارادہ کر لیا۔ پانی پیا اور کھانا مانگا۔ چیلے ڈرے کہ گروجی پر مایا کا داؤں چل گیا اور وہ قبل از وقت ترک ریاضت سے گنہگار اور بے دین ہوگئے۔ ایسے اُستاد سے فیض پانے کی کیا امید باقی تھی پانچوں چیلے بدعقیدہ ہو کر بنارس کی طرف چل دیے اور مہاتما کو جنگل میں اکیلا چھوڑا۔

اب گوتم کے دل میں بھی شک آیا اور دیر تک نفس سے محاسبہ کرتا رہا کہ اُس نے دنیا کی محبت سے ریاضت کو ترک کیا ہے یا طلب حق کی خاطر سے۔ دل نے جواب دیا کہ زندگی کے لیے غذا اور پانی لازمی ہے اس لیے تپ کا توڑنا ہی مناسب تھا۔ شک نے کہا کہ زندگی جب مصیبت کا گھر ہے تو اُسکو قائم رکھنے کی کیا ضرورت تھی۔ دل کوئی معقول جواب نہ دے سکا اور جپ تپ کے بغیر جو جنگل کی زندگی کا شغل تھا ویرانہ میں وقت کاٹنا مشکل ہوگیا۔

چھ برس سے جو بیابان گھر ہو رہا تھا اُسکو چھوڑا اور ضعف کی شدت سے قدم قدم پر ٹھوکریں کھاتا ہوا ندی نرنجارا کے کنارہ پہونچا۔ وہاں ایک دیہاتی لڑکی سجاتا نام ملی جسکو اجکبار کی حالت زار اور جسم لاغر پر رحم آیا۔ اُس نے مہاتما کو پیٹ بھر روٹی کھلائی۔ مدت کے بعد گوتم کو انسانوں کی غذا میسر ہوئی اور سجاتا کا مبارک نام ہمیشہ کے لیے تاریخ عالم کے صفحوں پر یادگار ہوگیا۔ کیا خوب

سودا نقد ہے اس ہاتھ دے اُس ہاتھ لے۔ ایک گھنے سایہ دار پیپل کے نیچے جو آج تک بُدھ کا پیڑ یا "شجرۃ العقل" کہلاتا ہے سجاتا نے شکم سیر ہو کر کھانا کھایا اور اپنی آیندہ زندگی میں ہمیشہ سجاتا کی اس غریب نوازی کا شکریہ ادا کرتے رہے۔

اسوقت ایک بھولی ہوئی کہانی یاد آگئی۔ مصر کا ایک جلیل القدر رہنما جو بادشاہِ وقت کی ہدایت کے لیے مبعوث ہوا تھا دشمنوں کے خوف سے جلا وطنی اختیار کرتا ہے اور وطن سے سیکڑوں کوس کے فاصلہ پر بھوک کی تکلیف سے خستہ و زار ہو کر ایک درخت کے سایہ میں پناہ لیتا ہے اور نہایت عاجزی سے کریم کارساز کی درگاہ میں عرض کرتا ہے کہ اسوقت جو نعمت اپنے خزانۂ غیب سے مجھکو عنایت فرمائیں اُس کا میں محتاج اور سائل ہوں۔ دعا کی تاثیر ایک لڑکی کی صورت میں ظاہر ہوتی ہے جو شرماتی ہوئی آتی ہے اور بڑی منت سے اس تھکے ماندے مسافر کو اپنے گھر لیجاتی ہے اور اپنے باپ کے دسترخوان پر بٹھا کر کھانا کھلاتی ہے!

کیا خداوند عالم کی سرکار سے غریبوں اور بیکسوں پر ترس کھانے کی خدمت عورتوں ہی کے سپرد کی گئی ہے؟ کیا تمام ازل نے مصیبت زدوں اور درماندوں کی چارہ سازی اسی جنس نازک کو عنایت فرمائی ہے؟ اے نزاکت کی دیبی! عشرت و شادمانی کے وقت تو تیرا دل ہوا میں پتہ۔ رنگ میں پانی ہے اور تجھکو خوش کرنا ہتھیلی پر سرسوں جمانا۔ تیرا راضی رکھنا پانی میں آگ لگانا ہے۔ لیکن جب ہاتھا دُکھے یا درد و مصیبت کا سامنا ہو تو بیشک تو ہی فرشتۂ رحمت ہے!!!

قدر ہر نعمت ست بعد زوال۔ دل شکستہ نامہ نگار حسرت کے پھول اور آنسوؤں کے موتی نچھاور کرتا ہے۔

زہر غم ہجر تو بجان کارگر اُفتاد   امید لقاءِ تو بہ عمر دگر افتاد

القصہ سجاتا کی مسافر نوازی کے بعد اسی درخت کے سایہ میں بدھ گیا کے تاریخی مقام پر گوتم کے دل سے وہ پس و پیش دُور ہونا شروع ہوا جو ریاضت کے ترک کرنے اور چیلوں کی ناراضی سے پیدا ہوا تھا اور اُسی دن آفتاب کے غروب ہوتے ہی تمام شکوک دل سے دور ہو گئے اور جواب مل گیا کہ زندگی کا قائم رکھنا اس لیے ضروری تھا کہ "موت اختیاری ہونا چاہیے نہ کہ اضطراری" یعنی

لے حضرت موسیٰ و صفورہ بنت شعیب علیہما السّلام

کمزوری کی وجہ سے جو موت ہوگی اُس سے زندگی کا تعلق قطع نہ ہوگا - اور اعمال کی جزا و سزا ملیگی لیکن اختیاری موت اگر نصیب ہو تو اُسکے بعد ابدی آسایش ہے اور اس مرتبہ تک پہونچنے کے لیے زندگی کا قائم رکھنا اور غذا استعمال کرنا لازمی تھا - وہ ساری رات مہاتما نے اُسی درخت کے نیچے کاٹی اور اُسکے بعد سات دن تک صائم رہے - آٹھویں روز حجاب کے پردے اُٹھ گئے اور عرفان حاصل ہوگیا - عقیدتمند سوانح نگار سکتے ہیں کہ برھما یا کسی اور فرشتہ نے تمام علوم باطنی اُنکے سینہ پر نقش کر دیے - اور انکو مشاہدہ کرا دیا کہ ریاضات شاقہ فضول ہیں - نجات ابدی کے حاصل کرنے کا راستہ رحم اور محبت ہے -

اب گوتم نے نیت کی کہ وہ اپنے جدید فلسفہ کا دنیا میں اعلان کرے اور تمام عالم کو آواگون کے پھندے سے نجات دلائے - اُسکے قدیم اُستاد آرادہ اور اودرک دنیا میں باقی نہ تھے لہذا وہ اپنے چیلوں کی تلاش میں بنارس کی طرف چلا تاکہ سب سے پہلے اُنھیں کو راہ حق کی ہدایت کرے - جنھوں نے چھ برس رفاقت کی تھی اور پھر بدعقیدہ ہو کر جدا ہوگئے تھے -

مہاتما بنارس کے قریب پہونچے تو ایک پُرانے آشنا سے ملاقات ہوئی جو اُسکے دنیا ترک کرنے اور جوگ سادھنے کا قصہ سن چکا تھا - وہ محبت سے بغلگیر ہوا اور پوچھا کہ اب کیا خیال ہے اور کہاں کا ارادہ ہے ؟ گوتم نے جواب دیا کہ تمام بُری خواہشوں پر کامل فتح حاصل ہوگئی ہے - اور مادی دنیا کی غلامی سے نجات مل گئی ہے - اب وجود کی غرض صرف یہ ہے کہ حق کی تبلیغ کی جائے اور جو علم باطنی عطا ہوا ہے اُس سے دوسروں کو فائدہ پہونچایا جائے - دوست گوتم کے بہرہ پر خوشی کے آثار دیکھکر سمجھا تھا کہ شاید جوگ سے انکا دل سرد ہوا اور اب پھر عیش دنیوی کی طرف مائل ہو گئے - لیکن یہ خشک جواب سُن کر جوش مسرت ٹھنڈا ہوگیا اور جنگل کی طرف اشارہ کرکے اُس نے کہا کہ یہ حال ہے تو آپ کا راستہ اُدھر ہے - اور خود دوسری طرف روانہ ہوا -

اس کج ادائی کا مہاتما پر کچھ اثر نہ ہوا اور شام ہوتے ہوتے اُنھوں نے "دشت غزالاں" میں اپنے قدیم رفیقوں کو ڈھونڈھ نکالا -

سست عقیدہ شاگرد اُستاد کو آتے دیکھکر تعظیم کے لیے کھڑے نہ ہوے اور آپس میں عہد کیا کہ یہ بدمذہب فقیر اگر ہمارے پاس آئے تو اُسکو صحبت میں شریک نہ کیا جائے بلکہ اُس سے بیٹھنے کو بھی

نہ کہا جائے۔ مگر جب محبت کا اوتار قریب پہونچا تو دلوں میں خود بخود عجز و انکسار جوش زن ہوا۔ غرور کی ہمتیں پست ہوگئیں خود بینی کے ارادے ٹوٹ گئے اور سب مرعوب ہو کر اُسکے قدموں پر گر پڑے۔ مہاتما نے خلعت عرفان سے سرفراز ہونے کا مژدہ سنایا اور اپنے بد کشف و کمال سے آگاہ کیا تو سب کی آنکھیں کھل گئیں۔ پانچ دن سلسلۂ وعظ و تلقین جاری رہا تب چیلوں کے قلوب صاف ہوے اور سب سے پہلے جو مہاتما پر ایمان لائے وہ یہی پانچوں نقیر تھے۔

گوتم کے مذہب پر مفصل تبصرہ تو ابھی وقت نہیں آیا مگر تسلسل داستان کے لیے مختصر طور پر اُسکے اصول اور قواعد ارکان بیان کر دینا ضروری ہے :-

"جو چیز جسم رکھتی ہے وہ مادہ سے بنی ہے۔ مادہ غیر مستقل اور فانی ہے اس لیے ہر جسم رکھنے والی چیز میں فنا کے جراثیم موجود ہیں۔

انسان حیات جسمانی رکھتا ہے اور اُس کو فنا سے چارہ نہیں ہے۔ غم۔ کمزوری۔ بیماری اور موت فنا کے مدارج ہیں۔

جب تک ناپاک خواہشیں باقی ہیں حرص، فکر اور آرزو کا ساتھ رہے گا یعنی غم اور کمزوری نصیب ہوگی۔

جسم کو تکلیف پہونچا کر خواہش کو قطع کرنے کی کوشش خطرناک ہے کیونکہ اس سعی میں اگر زندگی ختم ہوگئی تو موت اضطراری ہوگی۔ اور آواگون سے نجات نہ ملیگی۔

جو چیز انسان کا تعلق مادی دنیا سے قائم رکھتی ہے وہ دل کی بُرائی ہے۔ جب تک دل میں ذرہ برابر بھی بدی باقی رہے گی دنیا کا علاقہ قطع نہ ہوگا۔

دل کی بدی کے ساتھ نیک اعمال فائدہ بخش نہیں کیونکہ نیکی کا ثمرہ ملے گا مگر بدی کی جزا میں دوبارہ زندگی اور موت کی مصیبت جھیلنا ہوگی۔ اور اُس جنم میں معلوم نہیں کہ نیکی کی توفیق ہو یا نہ ہو۔ اس لیے بغیر جسم کو تکلیف پہونچائے اور روح کو مضمحل بنائے خواہشوں کو دُور کرنا اور دل کا تمام عیوب سے صاف کرنا نجات کے لیے ضروری ہے۔

ہر ایک خواہش کا ہلاک کرنا لازمی ہے۔ عدم وجود کی خواہش بھی اُتنی ہی خطرناک ہے جتنی کہ وجود کی !!

لہذا نیک اعتقاد۔ نیک نیت۔ نیک قول۔ نیک فعل۔ نیک زندگی۔ نیک کوشش۔ نیک خیال اور نیک مراقبے "نروان" حاصل کرنا چاہیے یعنی تمام قوائے بدنیہ بے حس کر دی جائیں اور زندگی موت کی مراوت بنا لی جائے۔

مندرجۂ بالا آٹھ نیکیوں کو عمل میں لانے اور بام "نروان" تک رسائی حاصل کرنے کے چار زینے ہیں۔ پہلی سیڑھی دل کی بیداری ہے یعنی غم اور شادی کا راز دریافت کرنے کی طلب جب تلاش حق میں مرشد کامل تک رسائی ہوگئی تو یہ درجہ طے ہوگیا۔ دوسری سیڑھی ناپاک شہوات کو ترک کرنا اور عوض لینے کا خیال دل سے نکال ڈالنا ہے۔ جب اس عہد پر ثابت قدم ہوا تو دوسرا زینہ بھی تمام ہوگیا۔ تیسری سیڑھی جہالت۔ شک۔ غصہ۔ حرص اور تمام کمینہ خصلتوں کو دور کرنا ہے۔ جب ان نقائص سے پاک ہوا تو لوح دل صاف ہوئی اور تیسرا درجہ حاصل ہوگیا۔ آخری سیڑھی عشق و محبت کا سینۂ بے کینہ پر نقش کرنا ہے جس طرح ماں اپنی جان کو خطرہ میں ڈال کر اپنے اکلوتے بچہ کی نگرانی اور نگہبانی کرتی ہے اُسی طرح طالب نجات کو ہر ذی روح پر اپنی جان نثار کرنے کو تیار ہو جانا چاہیے۔

جس دشمن کو سب سے پہلے مغلوب کرنا چاہیے وہ خواہش نفسانی ہے اور آخری ہم عالمگیر عشق و الفت کا سوتے جاگتے دھیان رکھنا ہے۔

نہ قربانی کی ضرورت ہے نہ برہمنوں کی امداد کی۔ ہر انسان کی نجات خود اُسکے ہاتھ میں ہے۔

بقول صوفی

دو قدم راہست سوئے کردگار ۔۔۔ یک قدم بر نفس و دیگر سوئے یار

مسئلۂ تناسخ اُس وقت ہندوستان میں ہر کس و ناکس کو تسلیم تھا اور انسان کا فانی ہونا روزانہ آنکھوں سے دیکھتے تھے لہذا شریعت گوتم جس کی بنیاد انھیں علوم متعارفہ پر تھی سننے والوں کے قلوب میں فوراً راسخ ہو جاتی تھی اور جو ایک بار مہاتما کی تقریر سنتا ہمیشہ کے لیے اُنکا غلام بنجاتا تھا۔

مالک الملک نے گوتم کو بھولی صورت۔ چوڑی پیشانی اور میٹھی بولی کے ساتھ رعب دار آواز اور پُر شکوہ چہرہ عنایت فرمایا تھا۔ وہ جب سقراط کی طرح اپنی منطق سے دلائل کو کاٹنا شروع

مسلمانوں کی تہذیب

یعنی مسلمانوں کی تمدنی ترقی کے
متعلق نواب محسن الملک مرحوم
کا ایک فاضلانہ لکچر۔ ۴ر
قیمت ۶ر
(خریداران الناظر سے ۵ر)

میلاد النبی

مشہور محدث حضرت ابن جوزی رحمۃ اللہ
علیہ کے اصل عربی متن کے مقابل اس کا
نہایت فصیح اردو ترجمہ
قیمت ۴ر
(خریداران الناظر سے ۳ر)

الاحسان

مصنفہ مولوی احسان الدین علوی مرحوم
جس میں لفظ صوفی کی تحقیق تصوف کی ابتدا
اور اسکی درجہ بدرجہ ترقیوں کا ذکر ہے اور آخر
میں تصوف کے تمام شعبوں کو اسلام سے تطبیق دیگئی ہے
قیمت ۸ر (خریداران رسالہ کے لیے ۵ر)

مقدمہ شعر و شاعری

مولانا حالی نے اپنے دیوان کے شروع میں جو لاجواب مقدمہ لکھا تھا وہ دوسرے ایڈیشن کے وقت
ایڈیٹر الناظر نے دیوان سے علیحدہ کر کے چھاپا ہے جس میں شعر کی حقیقت ماہیت اور شاعری کے اصول و
اساس پر بحث کر کے اردو شاعری پر ایک بسیط تبصرہ لکھا گیا ہے قیمت ۱۲ر (خریداران رسالہ سے عہ

خطاب

(از "ملا" جی)
سرکاری خطابات کے آرزومند کوشش
کرنے سے پہلے اسکو ملاحظہ فرمالیں ۴ر
(خریداران الناظر کیلئے ۳ر)

ارض نہرین

میسوپوٹیمیا یا عراق عرب کی تاریخ
مولفہ مسٹر عنایت اللہ بی اے رجسٹرار
عثمانیہ یونیورسٹی۔ قیمت ۴ر
(خریداران الناظر کے لیے ۳ر)

وکرم اروسی

مترجمہ مولوی عزیز مرزا بی اے مرحوم۔ یہ کالی داس کے مشہور و معروف ڈرامے کا اردو ترجمہ
ہے جس میں لائق مترجم نے ایک بسیط مقدمہ اضافہ کیا ہے اور ہندو ڈراما کی تاریخ اور نوعیت پر
بحث کی اور کالی داس کا موازنہ شیکسپیر اور برنارڈ شا وغیرہ سے کیا ہے۔ قیمت عہ خریداران الناظر سے عہ

تسخیر فرانس

شکسپیر کے لاجواب ڈرامہ ہنری دی
ففتھ کا اردو ترجمہ۔ از منشی تفضل حسین
صاحب ناگر۔ قیمت ۱۰ر
(خریداران الناظر کے لیے ۸ر)

سفر نامہ مصر و شام و روم

مولانا شبلی کا مشہور سفرنامہ جو ان ممالک
کے متعلق بہترین تاریخی علمی معاشرتی معلومات
فراہم کرتا ہے۔ قیمت ۸ر
(خریداران الناظر کے لیے ۶ر)

میکفرن اور لوسی

حضرت شوق قدوائی کا لاجواب
ڈراما
قیمت ۲ر
(خریداران الناظر سے ۱ر)

ملنے کا پتہ :- الناظر بک ایجنسی لکھنؤ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

رجسٹرڈ نمبر اے ۸۷۴

رسالہ

الناظر

لکھنؤ

ایڈیٹر ظفر الملک علوی

قیمت سالانہ للعہ ر مع محصول

الناظر پریس لکھنؤ میں چھپا

فی پرچہ ۱۲ر

پرنٹر و پبلشر:- آفاق علی علوی

بسم اللہ الرحمن الرحیم

فہرست مضامین الناظر بابت ماہ فروری ۱۹۲۹ء

نمبر ۱۶۴ — جلد ۲۸

مطبوعات جدیدہ

سیر انصار (حصہ اول)

جب حضرت رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم مکہ معظمہ سے ہجرت کر کے مدینہ منورہ تشریف لائے تو مکہ کے صحابہ جنھوں نے حضور کے ساتھ ہجرت کی مہاجرین کہلانے لگے اور مدینہ کے صحابہ کو انصار کا لقب ملا۔ انھیں حضرات کرام کی سوانحعمریوں کا ذخیرہ اس کتاب میں فراہم کیا گیا ہے جو حال ہی میں دار المصنفین کے زیر اہتمام شائع ہوئی ہے۔ قیمت ؏

تاریخ الحرمین شریفین

(از مولانا عبد السلام ندوی)

جس میں مکہ معظمہ و مدینہ منورہ کے تاریخی حالات، اہل مکہ و اہل مدینہ کے اخلاق و عادات اور خانہ کعبہ، مسجد نبوی، حج، قربانی، حجر اسود وغیرہ کی مفصل تاریخ بیان کی گئی ہے۔ ایک رنگین اور سات عکسی تصاویر اور ایک رنگین اور متعدد سادہ نقشے دیے گئے ہیں۔ جنکی مدد سے گھر بیٹھے حرمین شریفین کا پورا سماں آنکھوں میں آ جائیگا۔ قیمت ؏

فطرت نسوانی

یہ ایک فرانسیسی کتاب کی تلخیص ہے عربی ترجمہ کے ذریعہ سے جس میں فلسفیانہ طور پر عورت کی اخلاقی، معاشرتی اور ذہنی تاریخ بیان کی گئی ہے اور مرد اور عورت کی فطرت و اخلاق کا فلسفیانہ موازنہ کیا گیا ہے۔ از مولانا عبد السلام ندوی۔ قیمت ؏

گل رعنا

یعنی جناب مولانا حکیم سید عبد الحی مرحوم سابق ناظم ندوۃ العلما کا قابل دید تذکرۂ شعرائے اردو جس میں اردو زبان کی ابتدائی تاریخ، اس کی شاعری کا آغاز اور عہد بعہد کے باکمال شعرائے اردو کے صحیح حالات اور انکے منتخب اشعار اور انکے ہر قسم کے کلام کا نمونہ درج ہے۔ اور حال ہی میں دار المصنفین نے بڑے اہتمام سے شائع کیا ہے۔ حجم ۵۴۸ صفحے قیمت ؏

دیوان مجروح

میر مہدی مجروح شاگرد رشید مرزا غالب کا دیوان جو عرصہ سے نایاب تھا اب چھپ گیا ہے۔ جملہ اصحاب ذوق منگالیں۔ قیمت ؏

دیوان بشیر

مولوی بشیر الدین احمد دہلوی خلف الرشید شمس العلما مولوی نذیر احمد مرحوم کا دیوان۔ جس میں غزلیات اور جدید قسم کی نظمیں دونوں ہیں۔ قیمت ؏

شفیع محشر

جناب مرزا کاظم حسین محشر لکھنوی نے مناقب اہلبیت میں جو قصائد لکھے ہیں ان کا مجموعہ ہے۔ قیمت ؏

المشتہر منیجر الناظر بک ایجنسی لکھنؤ

حضرت "چلبی" کا تبصرہ

اخبار "سچ"

اگر یہ صحیح ہے، کہ مسلمانوں کی اسوقت سب سے بڑی ضرورت یہ ہے، کہ زندگی کے ہر شعبہ میں مسلک اسلام کی جانب اُنکی رہنمائی کیجاتی رہے، تو یہ بھی ضروری ہے، کہ یہ دعوت اُنکے سامنے دلنشیں پیرایہ میں بار بار پیش ہوتی رہے۔ اس مقصد کو پیش نظر رکھکر سال رواں کے آغاز سے ہفتہ وار اخبار سچ دفتر الناظر ہی سے شایع ہونا شروع ہوا ہے۔ اصلی و بنیادی مقصد صرف اسقدر ہے کہ دین و دنیا، اخلاقیات، معاشرت، تمدن و سیاست، غرض ہر شعبہ میں مسلمانوں کو اسلامی تعلیمات پر متوجہ کیا جائے، فرقہ وارانہ آمیزشوں اور بدعتوں سے الگ ہوکر اسلام کو اصلی سادہ، خالص اور حسن آمیز صورت میں دنیا کے سامنے پیش کیا جائے، اور روزانہ واقعات کی رو سے اسلام و نظام اسلامی کا، تمام نوع انسانی کے لیے سرتاسر برکت و رحمت ہونا سب پر روشن کر دیا جائے۔ پرچہ کی زبان نہایت سلیس، سنجیدہ، و عام فہم رکھی گئی ہے، تاکہ ہر طبقہ بآسانی سمجھ سکے، اور اسکا خاص اہتمام رکھا گیا ہے، کہ حتی الامکان کسی خاص شخص یا فریق کی دلآزاری نہ ہونے پائے۔

اسلامی زندگی کی ترویج میں اسوقت ملا سب سے بڑا مانع اس ملک کا محکوم و غلام ہونا ہے، اور وہ بھی ایسی حکومت کے پنجہ میں ہونا، جو ہر ہر جزئیہ میں اپنے قانون کو خدا کے قانون پر مقدم سمجھتی ہے، اور جسکے قانون میں خدا کی بتائی ہوئی سیدھی راہ پر چلنا بغاوت کے مرادف ہے۔ اس بنا پر سچ کا دوسرا مقصد اسلامیت کی راہ سے اس سنگ گراں کو دور کرنا، اور آزادی ملک کی تبلیغ کرنا ہے۔ پھر ملکی آزادی کا حصول بغیر اتحاد ملک کے ممکن نہیں، اور اسلام پڑوسی بھی ہمسایوں سے صلح و آشتی اور حسن سلوک قائم رکھنے کی تاکید کرتا ہے، اسلیے لامحالہ تمام اقوام ہند میں اتحاد و اتفاق پیدا کرنا، تیسرا مقصد قرار پایا۔ یہ تین مقاصد (جو دراصل ایک ہی مقصد، ترویج احکام اسلامی کی تین مختلف صورتیں ہیں) لیکر سچ خدا کے فضل و کرم پر بھروسہ کرکے دنیا کے سامنے نمودار ہوا ہے۔ خدا ہم سب کو سچ بولنے اور سچ کے سننے اور قبول کرنے کی توفیق عطا کرے۔"

سچ کا سالانہ چندہ تین روپیہ (سے/) بذریعہ منی آرڈر بھیجنا چاہیے۔ وی پی نہ بھیجا جائیگا۔

خادم

ظفر الملک مہتمم "سچ" لکھنؤ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الناظر

نمبر ۱۶۴ جلد ۲۸ — فروری سنہ ۱۹۲۵ء

فیہ ما فیہ

(اثر خامہ: چلپی)

دو بھائیوں کی والدہ قرآن میں کسی پچھلے نمبر میں، انھیں اوراق میں بیان ہو چکا ہے کہ خدائے حکیم و عزیز نے ایک مرتبہ ایک مظلوم و محکوم قوم کو ایک زبردست و ظالم متمدن حکومت کے پنجۂ استبداد سے نجات دلانے کے لیے "دو بھائیوں" کو مبعوث کیا تھا اور اُن دونوں برادران محترم کو شرف نبوت و رسالت سے سرفراز کیا تھا۔ ان دونوں بھائیوں کے حالات و خصوصیات کی تفصیل قرآن پاک ہی کی زبان میں اُس نمبر میں گذر چکی ہے۔ اس سلسلہ میں قرآن پاک نے ایک اور برگزیدہ ہستی یعنی ان برادران محترم علیہما الصلوٰۃ والسلام کی والدۂ ماجدہ کا ——— اور یہ خیال رہے کہ والدین کا نہیں، صرف والدہ کا ——— تذکرہ بھی فرمایا ہے، جس سے اس امر کا واضح اشارہ نکلتا ہے، کہ اُن خاتون محترم کا بھی اپنے فرزندان جلیل کے مقصدِ بعثت (مشن) سے کوئی خاص تعلق، تھا۔

ان خاتون کا شرف و احترام محض اس بنا پر نہیں، کہ وہ دو پیغمبران برحق کی والدۂ ماجدہ، دو سچے علمبردارانِ حریت کی مادر مہربان، اور دو پاکیزہ رہبران ملت کی پیدا کرنے والی اور پرورش کرنے والی

تھیں، بلکہ خود بھی ذاتی طور پر وحیِ الٰہی سے مشرف ہو چکی تھیں۔ چنانچہ حضرت موسیٰ جب خود مہبطِ وحی و الہام ہوئے، تو اُنھیں یاد دلایا گیا، کہ

اِذْ اَوْحَیْنَا اِلٰی اُمِّکَ مَا یُوْحٰی (طٰہٰ ع ۲)	اے موسیٰ جب ہمنے تمھاری والدہ کی طرف وہ وحی بھیجی، جو ہمیں بھیجنا تھی۔

اور پھر کلام پاک میں ایک دوسرے موقع پر بھی اسی انعامِ الٰہی کو یاد دلایا گیا ہے،

وَاَوْحَیْنَا اِلٰی اُمِّ مُوسٰی اَنْ اَرْضِعِیْہِ (قصص ع ۱)	ہم نے موسیٰ کی والدہ کی جانب وحی بھیجی کہ انھیں دودھ پلاؤ۔

باپ اور بیٹے دونوں شرفِ رسالت سے ممتاز ہوں، اس کی متعدد مثالیں کلام مجید میں ملتی ہیں، لیکن ماں اور اولاد دونوں براہِ راست وحیِ الٰہی سے مشرف ہوں، یہ فضیلت انھیں دونوں بھائیوں اور انکی والدہ کے نصیب میں آئی۔ ذٰلِکَ فَضْلُ اللّٰہِ یُؤْتِیْہِ مَنْ یَّشَآءُ۔ صلوٰۃ و سلام ایسی مبارک اولاد پر، اور رحمت و برکت نازل ہو ایسی محترم ماں پر۔

پُر قوت و متمدن گورنمنٹ نے قانون نافذ کر دیا، کہ مظلوم و محکوم قوم بنی اسرائیل کا کوئی لڑکا جینے نہ پائے۔ بہ الفاظِ توریت،

"فرعون نے اپنے سب لوگوں کو تاکید کر کے کہا، کہ ان میں جو بیٹا پیدا ہو، اُسے دریا میں ڈال دو۔"

(کتاب خروج۔ باب اول)

سرکارِ عظمت مدار کے اقبال کا مقابلہ بیکس و بےبس رعایا بیچاری کیا کر سکتی تھی، نتیجہ یہ ہوا کہ ہر گھر کے چراغ روشن ہوتے ہی پھونک مار مار کر گُل کیے جانے لگے، ہر کلی کھلتے ہی باغبان کے حکم سے نوچ ڈالی جانے لگی۔ عین اسی اثناء میں حضرت موسیٰ کی ولادت ہوئی۔ بچہ کیسا ہی ہو، اپنی ماں کی آنکھ کا تارا ہوتا ہے، کون ماں ہے، جو اپنے ہاتھ سے اُسکی زندگی کا خاتمہ کر سکتی ہے۔ چہ جائیکہ وہ بچہ جس پر شاہدِ ازل نے خود اپنی

وَاَلْقَیْتُ عَلَیْکَ مَحَبَّۃً مِّنِّیْ (طٰہٰ ع ۲)	محبوبیت کا پرتو ڈال کر اسکی محبوبیت میں چار چاند لگا دیے ہوں!

ممتا بھری ماں کا دل تِلملایا، بدن تھرتھرایا، کلیجہ کپکپایا، کہ بھری ہوئی گود کو ظالم حکومت کے خوف سے ابھی خالی کرنا پڑے گا۔ سکینتِ الٰہی نے ڈھارس بندھائی، اور زبانِ وحی نے فرمایا، کہ گھبراؤ

فَاِذَا خِفْتِ عَلَیْہِ فَاَلْقِیْہِ فِی الْیَمِّ وَلَا تَخَافِیْ وَلَا تَحْزَنِیْ اِنَّا رَآدُّوْہُ اِلَیْکِ وَجَاعِلُوْہُ مِنَ الْمُرْسَلِیْنَ	نہیں، بے خوف و خطر موجِ بحر کے سپرد کر دو، پھر ہماری قدرت کا تماشہ دیکھو، کہ ہم اسے دوبارہ تم سے لا ملائیں گے اور ہم اسے

(قصص، ع ۱) اس بچہ کو آزادیٔ قوم کے لیے پیمبر بنا کر بھیجنا منظور ہے!

بڑے سخت امتحان کا وقت، بڑی نازک آزمایش کی گھڑی تھی۔ اولاد، معصوم اولاد، اور پھر ایسی منوہن اور دلکش اولاد، کون ماں، خون اور گوشت کا دل رکھ کر، صبر و ضبط کے ساتھ اس حکم کی تعمیل کرسکتی تھی؟ لیکن جس ہستی میں یہ حکم دینے کی طاقت تھی اُسی میں یہ قدرت بھی تھی کہ ماں کے دل کو

واصبح فواد ام موسیٰ فرغا ان کادت لتبدی به لولا ان ربطنا علی قلبھا لتکون من المومنین (قصص، ع ۱)

موم سے پتھر، اور بجائے مضغۂ گوشت کے پنجۂ فولاد بنا دے۔ چنانچہ توفیق الٰہی معین ہوئی، اور ماں نے ارشاد خداوندی کی تعمیل میں، اپنے جیتے جاگتے، کلیجہ کے ٹکڑے، کو آغوش دریا کے سپرد کر دیا!!

اپنے ضوابط و قوانین پر مغرور، اپنی حکمت و دانائی پر نازاں، اور اپنی قوت و اقبال پر فخر کرنے والا، فرعون یہ نہ سمجھ سکا، کہ اُسکے سارے مصاحبوں اور درباریوں، وزیروں اور مشیروں، کیبنٹ اور کونسل سے کہیں بڑھ چڑھ کر، قدرت والی، حکمت والی، اقبال والی، ایک اور برتر ہستی موجود ہے، جسے یہ منظور تھا، کہ رہزن سے رہنما کا، گرگ سے پاسبان کا، زہر سے تریاق کا،

یاخذہ عدو لی وعدو لہ (طٰہٰ - ع ۲)

دشمن سے دوست کا، اور فرعون سے موسیٰ کی پرورش و پرداخت کا کام لیا جائے! چنانچہ خود فرعون اور فرعونیوں ہی نے اس بظاہر بے کس و بے بس بچہ کو موج دریا سے نکال کر اپنے آغوش شفقت میں تربیت دی۔ اور اس وقت ان "عاقل و فرزانہ" "خوش

فالتقطہ آل فرعون لیکون لھم عدواً وحزناً، ان فرعون وھامان وجنودھما کانوا خٰطئین (قصص ع ۱)

اقبال" "مدبرین سلطنت" کی عقلوں پر ایسے گہرے پردے پڑ گئے، کہ اپنے آیندہ دشمن شدید کو اپنے ہی سایۂ عاطفت میں پروان چڑھاتے رہے! اور یہ عقل پر پردے پڑ جانا صاف اُنھیں کے شامت عمل اور خدافراموشی کا نتیجہ تھا!

اور یہی نہیں، کہ اُس وقت کی شامت زدہ گورنمنٹ اپنے دشمن کو دشمن نہ سمجھ سکی، بلکہ سب کے سب مل کر اُلٹی یہ اُمیدیں قائم کرنے لگے، کہ

عسیٰ ان ینفعنا او نتخذہ ولداً وھم لایشعرون (قصص - ع ۱)

آگے چل کر اس سے بہت کچھ فائدے حاصل ہوں گے، اور جوان ہو کر یہ ہماری قوت بازو بنے گا۔ یہ تھی اُن "داناؤں" کی "دانائی"۔

چند روز کے بعد بالآخر وعدۂ الٰہی پورا ہو کر رہا، ماں کو جو تشفی دی گئی تھی، وہ سچی نکلی۔ خالی گود ایک بار پھر بھری۔ ماں اپنے بچھڑے ہوئے نورِ دیدہ سے ملی، اپنے کلیجہ کو ٹھنڈا کیا، آنکھوں کو طراوت پہونچائی اور بیٹے کو پروان چڑھتے، صابر و خوش نصیب ماں نے اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا!
فرددنہ الی امہ کے تقر عینہا ولا تحزن ولتعلم ان وعد اللہ حق ولاکن اکثرہم لا یعلمون۔ (قصص ع ۱)

دو بھائیوں کی والدہ ہندوستان میں

ان محترم ماں کے واقعات و حالات ہم نے اپنے کانوں سے سنے اور ان پر ہمارا ایمان قائم ہوا۔ ایک اور بزرگ ماں کے حالات و واقعات ہم نے حال میں آنکھوں سے مشاہدہ کیے، اور ہمارے ایمان کو مزید تقویت و تازگی حاصل ہوئی۔ قرآن کے دو بھائیوں کی والدہ کے نام کی صراحت کے بجائے، خدا نے "اُم موسیٰ" ہی کے لقب سے یاد کیا۔ ہندوستان کے دو بھائیوں کی والدہ کو بھی دنیا نے "بی اماں" ہی کے لقب سے پکارا۔ وہاں وحی الٰہی سے سرافرازی ہوئی، یہاں خدا نے ورع و تقویٰ کی فضیلت بخشی۔ پیمبران مرسل کی والدۂ ماجدہ کے شرف و احترام کی تھاہ کون پا سکتا ہے امت محمدیہ کی اس خادمہ کا یہ کمال اس دورِ تنزل میں دیکھا، کہ پچاس سال سے نماز فجر، سفر حضر، بیماری، شب بیداری، کسی حال میں نہ قضا ہونے دی! اُم موسیٰ کی اولاد غرقِ دریا ہو جانے کے بعد پیامِ حق پہونچانے کے لیے زندہ و سلامت رہی۔ "بی اماں" کی اولاد بھی مادیت و عقلیت کے بڑے بڑے سمندروں میں غوطہ کھانے کے بعد خدمت اسلام کے کام پر مستعد رہی۔ اُم موسیٰ (علیہما الصلوٰۃ والسلام) کے فرزندوں کو خدائے جلیل نے اس سفارت کے لیے چن لیا تھا، کہ ایک بڑی انسانی آبادی کو مخلوق کی غلامی سے آزادی دلا کر خالق کی غلامی میں لائیں۔ بی اماں کے دونوں فرزند بھی آج اسی اسوۂ موسوی و ہارونی کو اپنے لیے دلیلِ راہ بنائے ہوئے ہیں! اُم موسیٰ کے فرزندان محترم کا مشن جس حد تک کامیاب رہا، اُس کا نتیجہ اوراقِ لیل و نہار پر ثبت ہے، بی اماں کے فرزندوں کے مشن کا انجام لوحِ غیب میں جو کچھ لکھا ہوا ہے اُسے بھی ہر صاحب بصیرت پڑھ سکتا ہے۔

مبارک ہیں وہ بندگان الٰہی جنھیں کسی نبی مرسل کے آثارِ قدم پر چلنے کی سعادت نصیب ہو، اور مبارک ہیں وہ کلمہ گو جو اپنی روزانہ زندگی کے لیے ہر بصیرت و ہدایت "کلام مبین" ہی سے تلاش کریں!

عدل نوشیروانی سے بڑھ کر

تانجور (علاقۂ مدراس) سے خبر آئی ہے، کہ ریلوے اسٹیشن پر جو کتابوں او

اخبارات کی دوکان ہوتی ہے، اُس پر ایک "صاحب" ڈاکٹر مینسن تشریف لائے، اور دو آنہ کی قیمت کا ایک اخبار خرید کر ایک چونی مرحمت فرمائی - ہندوستانی دُکاندار زمین پر بیٹھا ہوا خود اخبار پڑھنے میں مشغول تھا، جیب میں واپسی کے لیے دو آنے پیسے تلاش کرنے لگا، اور اس تلاش میں دو منٹ اور پانچ منٹ کے درمیان کوئی مدت صرف ہوگئی - "صاحب" ایک ہندوستانی دُکاندار کی اس بدتمیزی سے کیونکر درگزر فرما سکتے" تھے، مگر اپنے دست مبارک سے اُسکی گوشمالی شروع فرمادی - دُکاندار نے عدالت میں نالش دائر کی - انگریز حاکم نے یہ ارشاد فرما کر دعویٰ خارج کردیا، کہ دُکاندار کو اُسکے فرائض پر متوجہ کرنے کے لیے مشغول خریدار کا یہ فعل بالکل حق بجانب" تھا -!

مجسٹریٹ بہادر کی یہ معدلت پروری "قانون بجانب" یقیناً ہوگی، البتہ بعض جاہل دریافت یہ کر رہے ہیں، کہ آیا فرائض پر توجہ دلانے کے اس "حق بجانب" طریقہ کا اطلاق صرف ہندوستانی دکانداروں کے کانوں اور انگریز گاہکوں کے ہاتھوں تک محدود ہے، کہ یا حکام والا مقام اور سرکار فیض آثار کو بھی کبھی اسی "جائز" طریقہ سے احساس فرائض پر توجہ دلائی جاسکتی ہے؟

کنھیا جی بندرابن میں! سری کرشن جی ہندوستان کے ایک نامور ہادی و رہبر گذرے ہیں، اور اس لیے نہ صرف ہندوؤں کے بلکہ مسلمانوں کے لیے بھی ایک واجب التعظیم بزرگ ہیں، لیکن عوام ہنود نے اپنی جہالت سے ان کے متعلق جو روایات کثرت سے مشہور کر رکھی ہیں، اُن سے یہ تصویر ذہن میں آتی ہے، کہ بندرابن کے گھنے باغوں اور سبزہ زاروں میں ایک خوش رو نوجوان خرام ناز میں مصروف ہے، سیکڑوں حسین عورتیں، اُسکے حسن صورت پر شیدا ہو کر اُسے اپنی طرف پرچا رہی ہیں، جن میں سب سے زیادہ خوش نصیب کامیاب رادھا جی ہیں، اور کنھیا جی گویا اس پرستان کے راجہ اندر ہیں!

یہ "ضعیف الاعتقادی" کا ایک "افسانہ" تھا، لیکن اسے کیا کیجیے، کہ "روشن خیالی" کے مرکز نے "افسانہ" کو "واقعہ" کر دکھایا - راویانِ صداقت شعار و ناقلانِ دیانت آثار کا بیان ہے، کہ ۲۶ - جنوری سنہ ۲۲ء کو مشتاقانِ وصال و شیدائیانِ جمال کی ہزارہا دعاؤں اور بیشمار التجاؤں کے بعد، سرو بوستانِ خوبی، گل گلشنِ محبوبی، سرور دلبران سر آمد گلرخاں، یوسف ثانی، نور یزدانی، لارڈ ریڈنگ نے سرزمین علیگڈھ پر قدم رنجہ فرمایا، اور ساڑھے دس بجے دن سے ایک بجے دن تک، ڈھائی گھنٹے کی طویل مدت تک اس خوش نصیب خطۂ ارض کو رشک فردوس و جنان بنائے رکھا! پڑوس کے اہلِ جامعہ وعدۂ فردا کے انتظار ہی میں رہے،

اور یہاں عیش امروز، حاصل ہو کر رہا۔ کیسی ہمایوں و مبارک تھی ۲۶- جنوری کی تاریخ سعید، کہ افق علیگڈھ پر اُس روز سپیدے ایک کے، دو آفتاب طلوع ہوئے! اور کیسی فرخ و فرخندہ فال تھی اس مبارک تاریخ کی مبارک دوپہر، کہ عین نماز ظہر کے وقت، ایک زندہ قبلۂ مقصود کی جانب پیشانیاں خم، لب مشغول مدح و ثنا، اور زبانیں سرگرم التجا و دعا رہیں! خسرو غریب نے انتہائی بلند پروازی سے کام لیکر ایک ”کجکلاہ“ کو اپنا ”قبلہ“ فرض کیا تھا، اُسے کیا خبر تھی، کہ پانچ سو سال بعد علیگڈھ کے شاعر مزاج، رنگین طبع، و تخئیل دوست نہیں، بلکہ سنجیدہ و متین، بزرگان قوم کسی ”کج کلاہ“ کے بجائے ایک ”صاحب ہیٹ“ کو اپنا قبلۂ عقیدت و تسلیم فرمائیں گے!

ہر قوم راست راہے دینے و قبلہ گاہے!

ناسپاران طریق محبت و ناآشنایان آئین الفت، ممکن ہے، زبان طعن کھول بیٹھیں، کہ اس قدر طویل انتظار، اس قدر شدید اشتیاق، اور اس والہانہ جوش و بیتابی کے مظاہرہ کے بعد، کسی سرو رعنا کا صرف ڈھائی گھنٹے کے لئے حدود علیگڈھ میں بسر کرنا، کیسی بیدردی و جفا پسندی تھی! لیکن کوئی محرمان اسرار و خلوتیان راز کے دلوں سے پوچھے کہ ”ڈھائی گھنٹے“ اور ”ڈھائی گھڑی“ کا سوال تو الگ رہا۔ ایک منٹ بلکہ ایک سکنڈ کی نگاہ ناز، روئے نگار کی ایک مسکراہٹ، عاشق صادق کی نظر میں کیا قیمت رکھتی ہے! یونیورسٹی کے سرکاری پرچہ کا بیان ہے، کہ جس وقت والیسرائے بہادر نے اسٹریچی ہال میں قدم رکھا، تو

”حاضرین کا اُسوقت کا جوش قابل دید تھا، جو بجائے خود اپنا اثر ڈالے بغیر نہ رہا“

کالج و متعلقات کالج کی سرزمین کو ہفتوں پیشتر سے جس شاندار طریق پر آراستہ کیا گیا تھا، اس ”فراخ حال پیمانہ پر آرائش“ ”سدا بہار پھول پتیوں“ اور ”اعلیٰ درجہ کے زریں ساز و سامان“ کی تفصیل کس کے قلم میں یارا ہے، جو بیان کر سکے، بہ قول یونیورسٹی گزٹ کے یہ کیفیت

”صرف دیکھنے سے تعلق رکھتی تھی“

اور اس سارے ساز و سامان سے، جس نے علیگڈھ کی زمین کو رشک آسمان بنا دیا تھا، کہیں بڑھ کر، اور کہیں زیادہ قابل دید،

”وہ مطمئن و مسرور مجمع تھا، جو علیگڈھ میں خدا کے فضل و کرم سے سالہا سال بعد جمع ہوا“

چند خوش نصیب ہستیوں نے اسٹیشن ہی پر شرف استقبال حاصل کیا۔ ممبران کورٹ کو یہ شرف کالج کے ایک دروازہ پر حاصل ہوا، اور پھر ارکان اسٹاف کو کالج کے اندر۔ غرض مختلف مواقع پر رسم تعارف

ادا ہوئی، وایسرائے بہادر نے سرسید کورٹ کا معاینہ فرمایا، سائنس لیبوریٹری دیکھی، لائبریری کو ملاحظہ فرمایا، سرسید کے مقبرہ اور مسجد کی زیارت کی، اسکے بعد ہال میں پہلے آیات قرآنی کی تلاوت ہوئی۔ پھر بیگم صاحبہ بھوپال نے اُردو ایڈریس پڑھا، اسکے بعد صاحبزادہ نے انگریزی ایڈریس سُنایا۔ اسکا جواب والیسرائے بہادر نے مرحمت فرمایا۔

یہ سارے مراتب ڈھائی گھنٹے سے کم کی مدت میں، جس برق رفتاری کے ساتھ طے ہوگئے، اسکے بعد علیگڈھ کی اس سرکاری زبان کو جھٹلانے کی کون جرأت کرسکتا ہے، کہ

"اس طرح وہ مبارک تقریب بخیر و خوبی اختتام کو پہنچی، جس کا ہفتوں اور مہینوں سے انتظار تھا اس میں کوئی شبہ نہیں کہ ہز ایکسلنسی کی تشریف آوری نے مسلم یونیورسٹی کی تاریخ میں ایک نیا باب کھول دیا ہے"

سُنا ہے کہ بعض محسن و معمر بزرگانِ قوم و حاملینِ روایات خلوص و وفا، جنھوں نے مدت سے کالج یونیورسٹی کی جانب رُخ نہیں کیا تھا، ابکی اسی شدید سردی میں دُور دُور سے زحمتِ سفر گوارا فرمائی، اور نادان و حقیقت فراموش دنیا پر ثابت کردیا، کہ جنکے قلوب میں خلوص و نیاز کی انگیٹھیاں گرم رہتی ہیں، اور جنکے سینے نا لہائے آتشیں اور آہ شرربار کے تنور ہوتے ہیں، انھیں موسم کی سردی سے بالکل بے نیازی حاصل ہوجاتی ہے! یہ نہ معلوم ہوسکا، کہ گوپیوں کے اس جھرمٹ میں رادھا کا پارٹ کس خوش نصیب ہستی کے حصہ میں آیا!

وہ کہیں اور سُنا کرے کوئی! ہمارے حکام والا مقام کے ارشادات عالیہ محض اسلیے ہوتے ہیں، کہ انسان ہمہ تن گوش ہوکر انھیں سُن لے، باقی اگر اسکے بعد وہ اپنے "حیوان ناطق" ہونے کا ثبوت دینا چاہتا ہے، تو یقیناً وہ انسان نہیں! اس اصول موضوعہ کے مسلم ہوجانے کے بعد کس کی مجال ہے، جو وایسرائے بہادر کے مقالۂ علیگڈھ پر کچھ لب کشائی کرسکے، لیکن سرکاری انسانیت کے دائرہ سے باہر نکل کر تو جناب وایسرائے کے حسنِ تقریر و کمال بلاغت کی داد چند لفظوں میں دی جاسکتی ہے۔ پھولے وایس چانسلر نے اپنے ایڈریس میں کچھ ذکر یونیورسٹی کی موجودہ ضروریات (لائبریری، میوزیم، وغیرہ) کا کیا تھا۔ وایسرائے کے ارشاد گرامی کا کمال یہ ہے، کہ اس قسم کی ساری ضروریات کو اپنے جواب میں سرے سے نظر انداز فرمادیا ہے، اور تفصیل نہ سہی اجمالاً چند لفظ بھی ان چیزوں کے متعلق زبان مبارک سے صادر نہیں ہوئے! بلکہ دُرفشانی کا سارا زور اسی بحث عزیز و دلچسپ پر ہے، جس سے چانسلر اور وایس چانسلر دونوں کے ایڈریس تقریباً خالی تھے۔

یعنی علیگڈھ کی گذشتہ زندگی کے خطرات اور ان میں بھی خصوصاً تارکین موالات کا حملہ ۱۹۲۰ء میں!

ملک معظم کے اِس جوانمرد و جواں ہمت نائب السلطنت کو معلوم ایسا ہوتا ہے، کہ علیگڈھ کے سارے تعلیمی شاہنامہ میں لے دے کے

"سنہز د منم دخت افراسیاب"

ہی ایک مصرعہ یاد رہ گیا ہے، اور اس نے عین اُسوقت جب مسلمانوں کے بچھڑے ہوئے گروہوں میں رفعِ اختلاف و یگانگی کی سب سے زیادہ ضرورت ہے۔ ملک معظم کی رعایا کے دو گروہوں کے درمیان ہو یا نہ ہو لیکن ملک ملوک نے پرستاروں کے دو گروہوں کے درمیان نفاق و رنجش ڈالنے کی انتہائی کوشش کر ڈالی!
ممکن ہے کہ تعزیراتِ ہند میں یہ کوئی جُرم نہ ہو، لیکن خدائے حی و قیوم کے ضابطۂ تعزیرات میں وائسرائے ہند اور کالج کی مسجد کے موذن سب برابر ہیں، آج اگر نہیں، تو کل، یقیناً یہ ظاہر ہو کر رہیگا کہ مصلحین ہمت کون تھے، اور مفسدین و فتنہ پرداز کون؟

واذا قیل لھم لا تفسدوا	اور جب اُن سے کہا جاتا ہے، کہ خدا کی زمین کو اپنی فتنہ پردازیوں
فی الارض قالوا انما نحن	کا تختۂ مشق نہ بناؤ، تو کہتے ہیں، کہ فتنہ کیسا، ہم تو امن و آئین کو
مصلحون۔ الا انھم ھم	قائم و برقرار رکھنے والے ہیں! سنو جی! حقیقی فتنہ پرداز یہی لوگ
المفسدون ولکن لا	ہیں، اور انھیں اپنی اس مفسدہ پردازی کا احساس تک
یشعرون (بقرہ۔ ۲۶)	نہیں ہوتا!

میکڈانل اور ہیوٹ

لارڈ ریڈنگ کس قدر دردمندی اور دلسوزی کی ادا کے ساتھ کالج کی پچھلی زندگی کے بعض "نہایت زبردست خطرات" کا ذکر فرماتے ہیں، اور ایک "نہایت زبردست حملہ" کی بالکل بے محل اور بلا ضرورت یاد دلاتے ہیں لیکن اُنھیں یہ یاد نہیں رہا کہ سب سے زیادہ "خطرناک حملہ" یہ نہ تھا، بلکہ وہ تھا جو آج سے پچیس سال قبل نواب محسن الملک مرحوم کے زمانہ میں محض اس قصور پر ہوا تھا، کہ کالج کے سکرٹری نے "اردو ہندی" کی سیاسی شورش میں کیوں حصہ لیا۔ اُسوقت کے حملہ آور کا اسم گرامی لارڈ ریڈنگ ممکن ہے بھول جانا قرینِ مصلحت سمجھیں، لیکن مسلمانوں کا حافظہ اسقدر ضعیف نہیں کہ سر انٹنی میکڈانل (حاکم صوبہ متحدہ) کا اسم گرامی اُس سے محو ہو جائے! پھر ایک دوسرے زبردست و خطرناک حملہ آور کا نام بھی گو لارڈ ریڈنگ کو فراموش ہو گیا ہو مگر کم از کم موجودہ وائس چانسلر کو تو بہر حال فراموش نہیں ہو سکتا، "سر جان ہیوٹ (حاکم صوبہ متحدہ) کا اسم مبارک ہے جو آج سے ۱۵-۱۶ سال قبل علیگڈھ کے بدخواہان علیگڈھ کیلئے کسقدر سخت و زبردست "خطرہ" تھے۔ وہ زمانہ قریب آ رہا ہے جب خود مسلم یونیورسٹی کے اہل حل و عقد کو دوست و دشمن "اپنے اور بیگانہ" کے درمیان صحیح شناخت ہو جائیگی، اسوقت نظر آئیگا کہ باکہ باختہ عشق در شب دیجور!

مولانا آزاد کی تحقیق و تدقیق

پنہاں تھا دام سخت قریب آشیان کے
اُڑنے نہ پائے تھے کہ گرفتار ہم ہوئے

ابھی سیر المصنفین کی جلد اول ہی شایع ہوئی ہے اور جلد دوم کی اشاعت کی نوبت نہیں آئی کہ نکتہ چینی کا بازار گرم ہوگیا۔ اور میرا تو یہ خیال ہوتا ہے کہ مولوی محمد مسلم صاحب عظیم آبادی نے الناظر بابت اکتوبر و نومبر ۱۹۲۷ء ہی کو دیکھ کر میری ناچیز تصنیف یا تالیف کی طرف عنانِ توجہ منعطف فرمائی ہے۔ بہر حال مجھے سب سے پہلے مولوی صاحب موصوف کا شکریہ ادا کرنا چاہیے کیونکہ وہ سیر المصنفین کو غلطیوں سے پاک دیکھنا چاہتے ہیں اور اپنے مفید مشوروں سے مجھے استفادہ حاصل کرنے کی ترغیب دیتے ہیں۔

اول میں آزاد کے متعلق جو کچھ میں نے انکے حالات کے تحت میں لکھا ہے اپنی کتاب سے نقل کرکے اُنکو پیش کرتا ہوں بعد ازاں اپنے مزید خیالات کا اظہار کروں گا۔

مشاعروں کی شرکت

"آپ کو اپنے اُستاد کی بدولت اکثر نامی گرامی اشخاص سے ملنے جُلنے کا موقع ملا۔ اور معرکوں کے مشاعروں میں شرکت کی۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ جو کچھ اُنکو کمال حاصل ہوا وہ حضرت ذوق کے فیض صحبت کا نتیجہ تھا۔ آزاد جو کچھ اپنے اُستاد سے سُنتے تھے یا اُنکی صحبت میں دوسرے بزرگوں کی زبان فیض ترجمان سے ادا ہوتا تھا اپنے حافظہ میں محفوظ رکھتے جاتے تھے۔ جب ہنگامۂ غدر کا خاتمہ ہوا اور آزاد کو اطمینان نصیب ہوا تو لاہور میں بیٹھکر بفراغت تمام اگلی پچھلی باتوں کو از سرِ نو یاد کیا اور اُن صحبتوں کو صفحۂ قرطاس پر دوہرایا۔ کچھ آپ بیتی تھی، کچھ جگ بیتی، غرض وہ کہانی سنائی کہ جسکو سُنکر ہر کہ و مہ اُسکا دلدادہ و شیفتہ ہو گیا۔ اور دو سو برس سے لیکر اُسوقت تک شعرا کی جتنی محفلیں قائم ہوئیں تھیں اور یہ فلک تفرقہ پرداز اُنکو درہم و برہم کرتا رہا تھا، سب کا نقشہ اِس خوبی سے کھینچکر دکھلا دیا کہ وہ تمام بزرگ چلتی پھرتی تصویروں کی طرح نظر آنے لگے۔ اس مرقع کا نام آبِ حیات ہے جسنے نہ صرف اگلے جلسوں کو تازہ کر دیا اور اُن مٹی ہوئی صورتوں میں جان ڈالدی بلکہ اپنا نام بھی زندۂ جاوید بنا دیا، اور زمانہ نے اُن بزرگوں کے طفیل میں آزاد کو بھی خلعت بقائے دوام عنایت فرمایا۔"

آگے چل کر ایک موقع پر حسب ذیل عبارت درج ہے :-

"اُردو پر آزاد کے احسانات عظیم ہیں۔ نہ صرف یہ کہ تمام صوبۂ پنجاب خاص اُردو کی واقفیت کے لیے اُن کا ممنون ہے بلکہ پنجاب کو اُردو سکھانے کے لیے جو تصنیفات و تالیفات اُنھوں نے کیں، اُس وقت اُردو زبان کو اُنکی اشد ضرورت تھی۔ پرانے سلسلہ میں اُردو کی پہلی، دوسری اور تیسری کتابیں، اُردو کا قاعدہ، قصص ہند کا دوسرا حصّہ، جامع القواعد اور نئے سلسلہ کی بھی کئی پرانی کتابیں لکھیں اور اُنھوں نے ہم کو زندہ فارسی سکھائی، ایران کے روزمرہ کی تعلیم دی۔ جو کچھ اُنھوں نے لکھا، جو محاورات اور روزمرہ اُنھوں نے ہم کو سکھائے وہ قدما کی تصانیف کے مطالعہ کے بعد اُنکی مروجہ زبان کی ذاتی تحقیق و تلاش کے نتیجے تھے۔ ایران اور تاتار وغیرہ ممالک میں جہاں فارسی بولی جاتی ہے اُنکی سیاحت موجودہ زبان کی تحصیل میں بہت معاون ہوئی۔"

اُردو کی ترقی میں آزاد کا حصہ

"دوسری مرتبہ مولانا آزاد جب ایران کے سفر سے واپس آئے تو ایک پشتارہ نوٹوں، مسودوں، یادداشت اور تحقیقات کا اپنے ساتھ لائے۔ تقریباً ۱۸۸۶ء میں وہ کتبخانۂ آزاد کی عمارت تعمیر کرا رہے تھے۔ ایک کمرہ بن چکا تھا اور فرط اشتیاق سے اُس میں چند الماریوں کی ترتیب اور خانہ بندی میں مصروف تھے۔ اتفاق سے محاورہ کی صحتِ استعمال کا ذکر چھڑ گیا۔ فرمانے لگے کہ ایک غیر زبان کے محاورہ کو صحیح اور برموقع استعمال کرنا بہت مشکل ہے اور یہ دلچسپ روایت بیان کی کہ ایک دن میں ایران کے ایک صاحب خانہ کا مہمان تھا۔ کھانا پک رہا تھا، ماں دس بارہ برس کی لڑکی کو چولھے کے پاس چھوڑ کر آپ اندر دالان میں کوئی کام کرنے لگی اور لڑکی سے کہتی گئی کہ دیگچی کا خیال رکھے تاکہ کھانا جوش کھا کر اُبل نہ پڑے۔ رفتہ رفتہ آنچ تیز ہوتی گئی۔ اب میں نے سوچا کہ چاول اُبل کر باہر نکل پڑیں گے۔ دیکھوں تو اس کیفیت کو یہ لڑکی کن الفاظ میں ظاہر کرتی ہے۔ اور فرمایا کہ میں اپنی فارسی کی لغات اور زبان دانی کے دفتروں کو اپنے ذہن میں دوہراتا تھا اور اس خیالی کیفیت کے مختلف اظہار گھڑتا تھا کہ شاید یہ کہیگی یہ کہیگی، کہ وہ وقت آ پہونچا اور میرے تمام خیالی دفتر خیالی پلاؤ ثابت ہوئے۔ جوں ہی دیگچی میں چاول جوش کھانے سے اُسکا ڈھکنا ایک طرف سے ایک آدھ انچ اوپر کو اُٹھا کہ لڑکی چیخی "اماں اماں دیگچہ سر کرده" یہ لفظ گویا میرے کانوں میں الہامی کلمہ کی طرح پڑے اور میری آنکھیں کھل گئیں۔"

محاورہ کی صحت استعمال کا ذکر

جس شخص کو زباندانی کا یہاں تک مذاق ہو، جو شخص اس قدر نکتہ رس اور صاحب تلاش ہو، جس نے

غیر زبانوں کی تحقیق میں اس درجہ کاوش اور کوشش کی ہو وہ خود اپنی زبان میں کیا کچھ نہ کر دکھاتا۔ درحقیقت امر یہ ہے کہ اُردو میں آزاد نے وہ کچھ کر دکھایا جو کہ اُن جیسے شخص سے توقع کی جا سکتی تھی۔"

دوسرے موقع پر یہ عبارت درج ہے:

آزاد کی تصنیفات پر ایک عام رائے

"آزاد کی ہر کتاب میں ایک خاص وصف ہے اور وہ یہ کہ تحقیق و تدقیق کا مادہ اُنکی ہر تصنیف میں پایا جاتا ہے۔ جو کتاب لکھی ہے نہایت سلیقہ کے ساتھ اور اپنی تلاش و جستجو کی داد دی ہے۔ زبان جو اختیار کی ہے اُس کا تو ذکر ہی کیا ہے۔ جو شیرینی اور گھلاوٹ انکی زبان میں ہے جس قدر اُسکی تعریف کی جائے کم ہے۔ تشبیہات و استعارات بکثرت پائے جاتے ہیں اور اس قرینہ سے سجایا ہے کہ بے اختیار زبان سے سبحان اللہ اور واہ واہ کے نعرے نکل جاتے ہیں۔ انکی نظمیں بھی بجائے خود اچھی ہیں لیکن دراصل وہ اقلیم سخن کے بجائے اقلیم نثر کے بادشاہ ہیں اور جو طرز خاص اُنکا ہے وہ کسی دوسرے مصنف کو نصیب نہیں ہوا۔ یہ اور بات ہے کہ کوئی شخص اُنکی تقلید میں دو چار صفحے لکھدے لیکن کتاب کی کتاب لکھ دینا نہ صرف مشکل بلکہ ناممکن ہے۔ قدرت نے انکے انداز تحریر میں وہ دلکشی پیدا کی ہے کہ دوسرے مصنف کو یہ بات مشکل سے نصیب ہوگی۔ البتہ اُن کا قلم جنبہ داری ضرور لیے ہوتا ہے۔ وہ ہندو مسلمانوں کے معاملات میں بے تعصب ہیں اور اکثر صاحب قلم اہل ہنود کا اعتراف بھی کرتے ہیں لیکن دہلی اور لکھنؤ کے معاملہ میں ضرور اُنھوں نے لکھنؤ کے بعض باکمال صاحبوں کو اپنی کتاب آبحیات میں نظر انداز کر دیا ہے۔ مولوی عبد الحلیم شرر نے اپنے ایک مضمون اُردو لٹریچر میں اسکی سخت شکایت کی ہے، اور ایک حد تک صحیح ہے۔ اسی آب حیات میں آزاد نے اپنے اُستاد ذوق کو کس قدر آسمان پر چڑھایا ہے اور جا و بیجا اُنکی مدح سرائی کی ہے۔ حالانکہ آج زمانہ نے ورق اُلٹ کر ثابت کر دیا ہے کہ وہ ہرگز اُس تعریف کے قابل نہ تھے جسکی بوچھار اُن پر کی گئی ہے۔ الحاصل آزاد فن تنقید سے دراصل ناآشنا نہ تھے لیکن اپنے محسن اُستاد کی تعریف میں رطب اللسان ہونا ہی وہ جوہر شرافت جانتے تھے۔ اور یہ نہ سمجھتے تھے کہ اپنے ممدوح کو فرشتہ بنا دینا آسان ضرور ہے لیکن وہ جوہر بشریت سے معرّی ہوجاتا ہے اور اُسکے تمام محامد اسکو انسانیت سے خارج کیے دیتے ہیں۔

آزاد کو اگر ہم کسی انگریزی مصنف سے تشبیہ دیں تو کہہ سکتے ہیں کہ وہ اپنے وقت کے لارڈ میکالے تھے اور اگر اردو زبان کی بے بضاعتی پر خیال کریں تو بلا خوف تردید کہہ سکتے ہیں کہ اُنکی تصنیفات سے اُردو کے خالی خزانہ کو مالامال

طورۂ چنگیز خانی کے کچھ کچھ ترجمے ہیں۔ فتحیاب لڑکے صاحبِ ملک اور صاحبِ زبان تھے۔ انکی حب الوطنی اور بلند نظری فارس کی زبان کو مخالفت کے کانوں سے سنتی تو عجب نہ تھا لیکن اُنکی زبان کے لیے نہ مذہبی رعایت تھی نہ علمی طاقت تھی، اس لیے ملک کی زبان کو روک نہ سکی۔

چنگیز خود ایک ملک گیر بادشاہ تھا، اولاد کو ملک داری بھی کرنی پڑی۔ لہٰذا ہمتیں ایران میں اپنی ناموری کے ایوان سجا رہی تھیں۔ نہیں! بلکہ سلطنت کی بنیاد کو مضبوط کرتی تھیں۔ وہ اس وقت ایران کے علوم و فنون کو سلطنت کا مؤید سمجھ کر ایرانی عالموں اور کاردانوں کی پرورش کرنے لگے۔ چنگیز کا پوتا ہلاکو خاں تھا۔ اسکی علمیت نصیرالدین محقق طوسی کے دامن میں پلی تھی۔ اس لیے علوم و فنون کا تربیت اور پرورش کرنے والا تھا۔ اسکے عہد میں ہر فن کے فاضل اور ماہر مصنف جمع ہوئے۔ مراغہ میں رصدخانہ تعمیر ہوا۔ زیج لکھی گئی۔ منطق، فلسفہ، اور اُسکی تمام شاخیں عرب سے آکر فارس کی خاک میں سرسبز ہوئیں اور اکثر چنگیزی نسل کے دماغ انہی خیالات سے روشن رہے

اقبال مندوں کے دربار میں علوم و فنون کے ساتھ انشاپردازی بھی اُمیدوار آئی۔ اُنھوں نے فقط اُمید کا پیٹ نہ بھرا بلکہ ذوق شوق کو چمکا کر تصنیفات کے میدان کھلوا دیے۔ اس سے اقلیم سخن میں انقلاب عظیم نمودار ہوا۔ زمین آسمان اور آسمان زمین ہوگیا۔ عالم صورت کے تماشبین اسے زبان فارسی کا نوروز کہیں گے کیونکہ استعارہ اور تشبیہ کی گلکاری اور خیالات بہاری۔ گُل، بلبل، نغمہ، چمن، گلشن، سبزہ، شبنم، مے، جام، صراحی وغیرہ وغیرہ سے کاغذی تختے گلزار نظر آتے ہیں۔ مگر آزاد قم سے کہتا ہے کہ اندر کچھ نہیں ہے۔ وہ حقیقت میں لفظوں کی بہار تھی اور معنوں کی خزاں۔" سرسری طور پر ایک جگہ سے عبارت متذکرہ بالا نقل کی گئی ہے۔ کیسی تحقیق، تدقیق، درایت، روایت تینوں باتیں موجود ہیں۔ میری رائے ناقص میں یہ کتاب کی کتاب تحقیق و تدقیق اور درایت کا اعلیٰ نمونہ ہے۔ بیشک جیسا کہ مولوی صاحب نے اپنے مضمون میں حوالہ دیا ہے آزاد نے اُسی مقام پہ غلطی کی ہے۔ مگر یہ غلطی درایت کی غلطی ہے۔ آزاد نے اس موقع پر قیاس سے کام لیا ہے۔ کہتا ہے "خانہ بربادوں کے ہاں بھی تاریخ، اخلاق، افسانے، نظم و نثر سب کچھ ہوں گے" یعنی اُسکو خود یقین نہیں کہ تھے بھی یا نہیں۔ مگر یہ نتیجہ غلط اخذ کیا کہ آتش خانوں کے ساتھ ساتھ دینی و دنیاوی کتابیں بھی ورق ورق اُڑیں اور جل کر خاک ہوگئیں۔ ہر حال میرا مطلب یہ ہے کہ آزاد بھی آخر انسان تھا اور الانسان مرکب من الخطاء والنسیان۔ پس اُس سے اگر کہیں غلطی بھی ہوگئی تو یہ بڑا ظلم ہے کہ ہم اُسکی

تمام کتاب کو لغو قرار دیں اور ناقابل اعتماد کہدیں - علاوہ ازیں روز بروز نئی نئی تحقیقات اور نئی نئی کتابوں کی کی اشاعت سے انسانی علم میں بھی اضافہ ہو رہا ہے - اس کتاب کو چھپے ہوئے تقریباً ۳۶-۳۷ سال ہو گئے ہیں - اور اسوقت کی معلومات میں اور آجکل کی واقفیت میں بہت فرق ہو گیا ہے - جو کچھ آزاد کے پاس سالہا تھا اُس نے اُس سے کام لیا - اب اگر ایک جگہ غلطی بھی ہو گئی تو کیا کیا جائے؟ اسی طرح دربار اکبری میں بھی بعض مقامات پر اُن سے غلطی ہوئی ہے - لیکن میں پھر یہی عرض کروں گا کہ انھوں نے اپنی طرف سے تحقیق و تلاش کا کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کیا - مولانا شبلی کی تصنیفات پر بھی اعتراضات کیے جاتے ہیں اور انکی غلطیاں طشت از بام کی جاتی ہیں - لیکن باوجود ان تمام باتوں کے میں ہرگز یہ نہ کہوں گا کہ مولانا شبلی نے تحقیق و تدقیق و جستجو سے کام نہیں لیا - غلطیاں ہوا کریں - ہمیشہ ہوتی آئی ہیں - ہر مصنف کے یہاں کم و بیش پائی جائیں گی - بے شک مولوی صاحب کا یہ مشورہ درست ہے کہ آزاد کی سندوں پر بھی بلاتحقیق و تصدیق اعتماد نہیں کیا جا سکتا - اور آزاد ہی پر کیا منحصر ہے، ہمکو چاہیے کہ بلاتحقیق و تصدیق کسی پر بھی اعتماد نہ کریں - پس میں اپنی اس رائے کو بدلنے کے لیے کافی وجہ نہیں دیکھتا کہ "آزاد کی کتابیں تحقیق و تدقیق، درایت و جدت وغیرہ سے بری ہیں"

آب حیات سے میں نے دور سوم کے مصنفین کے حالات لکھنے میں کوئی استفادہ نہیں کیا اور نہ کیا جا سکتا تھا - دورِ اول اور دورِ دوم میری کتاب کی جلد اول میں لکھا جا چکا ہے اور جلد اول شائع ہو چکی ہے - اب اگر مولوی صاحب کچھ حالات کے اقتباسات کے بارے میں جو میں نے آب حیات سے جلد اول میں لکھے ہیں غلطیاں ظاہر فرمائیں گے تو انشاء اللہ العزیز طبع دوم میں اُنکے دور کرنے کی کوشش کروں گا - میں نہایت خوش ہوں گا اگر مولوی صاحب موصوف سیر المصنفین جلد اول پر اپنا تبصرہ تحریر فرمائیں گے -

مجھے یہ بھی عرض کر دینا چاہیے کہ میں نے تیسرے دور کے مصنفین کا موازنہ نہیں کیا - صرف تاریخ نویسی کے اعتبار سے مولوی ذکاءاللہ، علامہ شبلی اور آزاد کا موازنہ کر دیا ہے وہ مولوی صاحب الناظر کے اوراق میں دیکھ چکے ہیں اور انھوں نے اس پر کچھ اعتراض بھی نہیں کیا - جسکے یہ معنی ہیں کہ اس بارے میں مولوی صاحب میرے ہمخیال ہیں -

مضمون طویل ہو گیا ہے - اس قدر لکھنے کا ارادہ نہ تھا - تاہم میر تقی کی بدد ماغی کو ظاہر کیے بغیر میں بھی یہ مضمون ختم نہ کروں گا -

نہیں معلوم مولوی صاحب کو یہ کیسے خیال ہوا کہ میر تقی میر کی بد دماغی کے لیے آزاد نے نکات الشعراء کی سند پیش کی ہے۔ آب حیات میں تو کہیں اِس قسم کی سند کا پتہ نہیں۔ بے شک وَلی کے بارے میں نکات الشعراء کا حوالہ دیتے ہوئے آزاد لکھتے ہیں:

"وَلی کہ بنی نوع شعرا کا آدم ہے اُسکے حق میں فرماتے ہیں" وے شاعریست از شیطان مشہور تر"

بدقسمتی سے میں نے نکات الشعراء کو نہیں دیکھا۔ اگر یہ قول مولوی صاحب اُس میں میر صاحب کے یہ الفاظ وَلی کی نسبت نہ موجود ہوں تو میر کی بد دماغی اسی پر منحصر نہیں ہے اور بہت سی باتیں ہیں۔ مولوی صاحب کِس کِس کی تردید کریں گے:—

(۱) میر صاحب دہلی سے لکھنؤ کو روانہ ہوتے ہیں۔ ساری گاڑی کا کرایہ بھی پاس نہیں۔ ایک شخص کے شریک ہوتے ہیں۔ وہ کچھ دُور چل کر میر صاحب سے بات کرتا ہے۔ میر صاحب مُنہ پھیر کر بیٹھ جاتے ہیں کچھ دیر کے بعد وہ بے غیرت پھر بات کرتا ہے۔ میر صاحب چیں بہ جبیں ہو کر کہتے ہیں " صاحب قبلہ۔ آپنے کرایہ دیا ہے۔ بے شک گاڑی میں بیٹھے مگر باتوں سے کیا تعلق ؟" اُس نے کہا " حضرت کیا مضائقہ ہے۔ راہ کا شغل ہے۔ باتوں میں ذرا جی بہلتا ہے"۔ میر صاحب بگڑ کر فرماتے ہیں " خیر آپ کا شغل ہے میری زبان خراب ہوتی ہے"۔

کیا کوئی شخص اس حکایت سے انکار کر سکتا ہے؟ جبکہ میر صاحب اپنے ہمعصر اور اُستاد مرزا رفیع سودا کی نسبت یہ گہر فشانی فرماتے ہیں:—

طرف ہونا مرا مشکل ہے میر اس شعر کے فن میں ‏ یوں ہی سودا کبھو ہوتا ہے سو جاہل ہے کیا جانے

برعکس اسکے سودا حالانکہ ایک مشہور ہجو گو شاعر ہے لیکن جینگ یا تعلی اس طرح کرتا ہے:—

نہ پڑھیو یہ غزل سودا تو ہرگز میر کے آگے ‏ وہ ان طرزوں سے کیا واقف وہ یہ انداز کیا سمجھے

سودا تو اِس غزل کو غزل در غزل ہی لکھ ‏ ہونا ہے تجھ کو میر سے اُستاد کی طرف

اہل نظر خود انصاف کر سکتے ہیں کہ میر صاحب نے جاہل کا لفظ سودا کے لیے استعمال کیا تو در حقیقت یہ اُنکی خود پرستی تھی۔ اس پر کسی مزید حاشیہ کی ضرورت نہیں۔ خود اُن کا کلام موجود ہے۔ پس معمولی شخص کے ساتھ جو اُن کا ہمسفر تھا اگر میر صاحب اس طرح پیش آئے ہوں جسکا ذکر کیا گیا تو کیا کوئی تعجب کی بات ہے۔ بلکہ یقین ہوتا ہے کہ وہ ضرور اُس غریب کے ساتھ اسی طرح پیش آئے۔

بَین بَین رہنا پسند کرتا ہوں ۔ اس لیے میں انکی خوبیاں جو واقعی ہیں ظاہر کرنا ضروری اور لازمی سمجھتا ہوں اور انکی بُرائیاں بھی شمار کرتا ہوں، لیکن چند بُرائیوں کی وجہ سے میں اُنکی خوبیوں پر خاک ڈالنا نہیں چاہتا باوجود ان تمام امور کے میں فی الواقع خود بھی سمجھتا ہوں اور دوسروں کو بھی یقین دلانا چاہتا ہوں، کہ ”آزاد کی کتابیں تحقیق و تدقیق، درایت وجدت وغیرہ سے پُر ہیں“۔

یہاں آب حیات سے چھو ساقن والا لطیفہ نقل کرتا ہوں

”اَدَروں کی چوپہری باجے چھو کی اٹھ پہری ۔ باہر کا کوئی آئے ناہیں آئیں سارے شہری
صاف صوف کر آگے رکھے جسمیں ناہیں تو سل ۔ دَروں کے جہاں سینک سماوے چھو کے وہاں موسل

یعنی یہ بادشاہوں سے بھی بڑھی ہیں، شہنشاہی گنواروں کا نام نہیں، سفید پوش آتے ہیں، پیالہ تک صاف مصفّٰے حاضر کرتی ہے جس میں تِس تنکا نہ ہو، بھنگڑ فخریہ کہا کرتے ہیں کہ وہ ایسی بھنگ پیتا ہے کہ جس میں گاڑھے پَن کے سبب سے سینک کھڑی رہے، آپ مبالغہ کرتے ہیں کہ ایسی بھنگ بناتی ہے کہ جس میں موسل کھڑا رہے ۔ خیر اُنکی بدولت چھو کا بھی نام رہگیا“

اس میں تمباکو نوشی کا کوئی ذکر نہیں، بھنگ کا ذکر ہے ۔ کیا بھنگ بھی امیر خسرو کے زمانہ میں نہ تھی؟ لہذا امیر خسرو کی یہ تک بندی غلط نہیں قرار دی جا سکتی ۔

اب یہ بات کہ آزاد نے اس تک بندی کی شانِ نزول لکھتے وقت یہ بھی آب حیات میں زہر گھول دیا ہے کہ ”جب یہ (امیر خسرو) دربار سے پھر کر آتے یا تفریحاً گھر سے نکلتے تو وہ (چھو) بھی سلام کرتی، کبھی کبھی حقّہ بھر کر سامنے کھڑی ہوتی، یہ بھی اُسکی دلشکنی کا خیال کر کے دو گھونٹ لے لیا کرتے“۔ بیشک ایک حد تک درست ہے ۔ یہ آزاد کا قطعی قیاس ہے ۔ اُس نے اپنے زمانہ کو اور امیر خسرو کے زمانہ کو یکساں کر دکھایا ہے ۔ لیکن جو اصل بات ہے اُس میں کوئی خرابی نہیں ۔ یعنی تک بندی ضرور امیر خسرو کی ہی خواہ وہ کسی وجہ سے کی گئی ہو ۔ میں یہ تو نہیں کہہ سکتا، کہ اُسوقت تمباکو نوشی رائج تھی یا نہیں ۔ کیونکہ سر والٹر ریلے کی نسبت کہا جاتا ہے کہ وہ ملکہ ایلزبتھ کے زمانہ میں تمباکو انگلستان لیکر گیا تھا ۔ اور یہ زمانہ اکبر کا زمانہ ہے ۔ بہر حال ۔ انگلستان میں ضرور تمباکو نوشی کا رواج ملکہ ایلزبتھ کے عہد سے شروع ہوا ۔ مگر ہندوستان کی نسبت یہ نہیں کہا جا سکتا کہ یہاں کب سے تمباکو نوشی کا رواج ہے ۔ ممکن ہے مولوی صاحب کے پاس یہ کہنے کے وجوہ ہوں کہ ”خسرو کا زمانہ تمباکو سے قطعاً ناآشنا تھا“ ۔ تاہم میں ضرور عرض کروں گا کہ سنسکرت

انکی کتابوں میں تمباکو کا ذکر ہے اور سنسکرت میں تمباکو کو تمال پترم کہتے ہیں۔ اگر تمباکو ہندوؤں کے زمانہ میں یہاں رائج نہ ہوتا تو سنسکرت میں اس کا نام بھی نہ ہوتا۔

با اینہمہ اس زہر کو جو آزاد نے اگلا ہے میں اس وجہ سے باور نہیں کرتا کہ امیر خسرو کی یہ شان نہ تھی کہ وہ ایک ساقن کی دوکان پر حقہ پیتے۔ آج زمانہ کا فیشن بدل گیا ہو اور بازار میں کھانا پینا معیوب نہ سمجھا جاتا ہو، لیکن غدر سے بہت بعد تک شرفا اس قسم کی باتیں معیوب خیال کرتے تھے۔ اور جبکہ ہماری شریعت خود بازار میں کھانے پینے کو معیوب سمجھتی ہے، اور گواہی ایسے شخص کی جو بازار میں کھاتا پیتا ہو معتبر نہیں سمجھی جاتی، تو ہرگز یہ یقین نہیں کیا جا سکتا کہ امیر خسرو محض دلشکنی کے خیال سے شریعت کی پابندی نہ کریں۔

مجھے مضمون کی طوالت کا افسوس ہے۔ لیکن میں آخر میں مولوی صاحب کی خدمت میں عرض کرونگا کہ میرا خیال آزاد کی نسبت، جو کچھ ہے وہ تمام و کمال پڑھ کر مجھے مطلع کریں کہ آیا انکی رائے میں یہ صحیح ہے یا نہیں اور اگر اب بھی وہ مجھ سے اختلاف کریں تو انگریزی مثل کے مطابق ہم کو اختلاف کرنے میں موافقت کر لینی چاہیئے۔

محمد یحییٰ تنہا

کس نے جلوہ یہ دکھایا شبِ تنہائی میں
بجلی اک کوند گئی قلب تمنائی میں

لوٹ جاتی ہے نظر دیکھکے جلوہ تیرا
کون سے ناز ہیں پنہاں تری رعنائی میں

آنے والا ہے کوئی دم میں وہ رشکِ محشر
فتنے مشغول ہیں کیا انجمن آرائی میں

لاکھ جانیں ہوں فدا تجھپہ خیالِ جاناں
جی بہل جاتا ہے تجھ سے شبِ تنہائی میں

جو نہ کرنا تھا کیا عشق کی خاطر ہم نے
جو نہ ہونا تھا ہوا عشق کی رسوائی میں

جو ہے مے کش اُسے ملتی ہے بلندی نصیب
گونجتی ہے یہ صدا گنبدِ مینائی میں

کاش وہ فاتحہ خوانی کو چلے آئیں یہاں
حسرتیں دفن ہیں اقدس دلِ شیدائی میں

محمد عباس اقدس حیدرآبادی تلمیذ حضرت سلیم پانی پتی

اراده

علمی و فلسفیانہ نقطۂ نظر سے نظر

اگر یہ سوال کیا جائے، کہ نفسیات (سائیکولوجی) کا موضوع کیا ہے؟ تو علمی دنیا اسکے جواب میں (۱) نفس یا روح، پھر (۲) ذہن اور آخر میں (۳) شعور کو پیش کریگی -

(۱)

تو اب سب سے پہلے یہ تحقیق طلب ہے کہ نفس یا روح کیا ہے؟ اور درک روح (motion of the soul) کی سرگذشت کیا ہے؟ اسکی دو تعریفیں ہیں

(۱) ایک تو وہ مقبول عام تعریف جو ہم تک غیر معلوم عہد قدیم سے سلسلہ بسلسلہ پہونچ کر آج تک سواد اعظم کا معتقد علیہ ہے - یعنی یہ عقیدہ کہ انسانی شخصیت علی الترتیب دو متضاد و متبائن اجزاء، روح و جسد سے مرکب ہے - ان میں سے روح جسد عنصری سے علحدہ ہوکر بھی برقرار رہنے کے قابل اور اپنے کالبد مادی کو اپنے عارضی ستقا، اتحاد کے دوران میں وہ کل خواص عطا کرنیوالی ہستی ہے جو جاندار اور بیجان میں مابہ الامتیاز ہیں -

ابتداءً روح بھی از قسم مادّہ خیال کی گئی تھی، مگر بایں لطافت کہ اُس میں اور ہوا میں وہی نسبت ہے جو خود ہوا میں اور اجسام جامد میں ہے - اور لطف یہ کہ اس الطف الاجسام سیالہ یا روح کا تمام اجزاء بدن میں سرایت تسلیم کرلیے جانے پر بھی وہ ایک قائم بالذات ہستی ہی خیال کی جاتی رہی جو موت کے بعد بھی فنا نہیں ہوتی بلکہ بخار لطیف سے بنے ہوئے، اپنے جسد مادی کی شکل میں نمودار ہوسکتی ہے اور موت ہی کی خصوصیت نہیں دوران حیات میں بھی روح کا بحالت خواب یا حال آنے اور کیفیت طاری ہونے کے مواقع میں عارضی طور پر کچھ دیر کے لیے جسم سے الگ ہوکر دوسری جگہوں میں نظر آنا ممکنات سے ہے - یہ تو متداول خیالات ہیں جنکو کسی تاریخی شخصیت کی طرف منسوب نہیں کرسکتے - اسکے متعلق یورپ میں فی الحال بھی انجمن تفحص روحی" تحقیقات میں مصروف ہے - مگر جسکی طرف سر ولیم کروکس، اور سر الیور لاج کے سے

رؤسائے الطبیعیین کے مائل ہونے پر بھی نوجوان علماء وظائف الاعضاء کے انکار میں کمی نہیں آئی۔

(۲)

(ب) دوسرے حکیمانہ آراء جو مختلف ادوار زمانہ میں ممتاز دماغوں کے غور و خوض کے قیمتی نتائج ہیں، ان میں سے ایک مو قر رائے قدماے یونان میں اجل الحکما و اعظم الفلاسفہ افلاطون الٰہی کی ہے۔ وہ روح کو جسم کی ہوائی نقل ثانی اور بخارات لطیف سے ترکیب پائے ہوئے مثنیٰ کی ہیئت میں تسلیم نہیں کرتا، بلکہ اسکے برعکس وہ روح کو مادہ کا قطعاً نقیض اور احاطۂ احساس میں نہ آنے والا اور صرف عقل و استدلال سے قابل ادراک وجود خیال کرتا ہے۔ علاوہ بریں وہ قدم روح یعنی جسم میں آنے کے پہلے اور بعد اسکے وجود و قیام کا قائل ہے اور اس دنیوی حیات مستعار کو روح کی طویل زندگانی و عمر مدید کا محض ایک چھوٹا سا لمحہ یا مختصر سا واقعہ خیال کرتا ہے۔

افلاطون کے پس آیندوں میں سب سے بڑا حکیم اسکا ارشد تلامذہ ارسطا طالیس نفسیات کی سب سے پہلی گراں قدر ترین تصنیف میں روح کی اس منقولہ اور نسلاً بعد نسل مروجی تصور اور اپنے اُستاد افلاطون کی رائے کو قبل از وقت مقدم عن الثبوت فیصلہ خیال کرکے ان دونوں رایوں کو رد کرتا ہوا اسکے برعکس مجموعہ افعال حیات اور روح کو ایک خواب کی دو تعبیریں اور ایک مفہوم کی دو اصطلاحیں قرار دینے کا ساعی ہے اسکے نزدیک کسی مخلوق کو ذی روح کہنا اسی طرز بیان کا موجز اور آسان طریقہ ہے کہ اس میں ذی حیات کی کُل یا بعض خصوصیتیں پائی جاتی ہیں۔

رہا یہ سوال کہ آیا یہ افعال حیات و وظائف زندگی ایک ایسی ہستی یا وجود قائم بالذات کی طرف قابل انتساب ہیں جو کسی اعتبار سے اجزاء مادی کے انتشار (یا موت) کے بعد برقرار رہ سکتا ہے؟ تو اس راست گو فلسفی کو اسکے جواب میں کسی غیر متزلزل رائے قائم کرنے میں اپنی عدم قابلیت کا کھُلے خزانے اعتراف ہے۔

ازمنۂ وسطیٰ میں انھیں دونوں اُستاد شاگرد کے خیالات کا معجون مرکب رائج رہا۔ غیر مادی ازلی و ابدی روح کی عقیدت کے رواج کا جو اخیر زمانہ میں افلاطونی رائے کی طرف رجحان عام کا معلول تھا۔ آخر کار قدرتی نتیجہ برآمد ہوا کہ توجہ زمانہ روح کے صرف خالص عقلی وظائف پر مرتکز بلکہ اسی میں محدود و محصور ہوکے رہ گئی۔ اور وظائف جسمانی سے جسکو معلم اول ارسطا طالیس نے جسم و روح کے مشترکہ عمل کی

(۲) لکھنؤ کے مشاعرہ میں جب پہلی بار میر صاحب شریک ہوے ہیں تو ظاہر ہے کہ اہل لکھنؤ کو کس حقارت سے میر صاحب نے یاد فرمایا ہے - اُنکے اشعار حسب ذیل ہیں جو مشاعرہ میں فی البدیہہ کہکر غزل طرحی میں داخل کیے گیے تھے :

کیا بود و باش پوچھو ہو پورب کے ساکنو　　ہم کو غریب جان کے ہنس ہنس پکار کے
دلی جو ایک شہر تھا عالم میں انتخاب　　رہتے تھے منتخب ہی جہاں روزگار کے
اُسکو فلک نے لوٹ کے ویران کر دیا　　ہم رہنے والے ہیں اُسی اُجڑے دیار کے

پورب کے ساکنو، کس حقارت سے تخاطب کیا ہے ؟

(۳) نواب آصف الدولہ کا غزل کی فرمایش کرنا، دوسرے تیسرے دن میر صاحب کا جانا، نواب کا دریافت کرنا کہ "میر صاحب! ہماری غزل لائے؟" میر صاحب کا تیوری بدل کر کہنا "جناب عالی! مضمون غلام کی جیب میں تو بھرے ہی نہیں کہ کل آپ نے فرمایش کی آج غزل حاضر کر دے"۔

کیا اس میں کوئی شک ہو سکتا ہے ؟ میر صاحب کی خصلت و عادت کو دیکھتے ہوئے اور نواب آصف الدولہ کی بُردباری کا خیال کرتے ہوئے ہرگز اس واقعہ میں شک کی گنجایش نہیں -

(۴) نواب آصف الدولہ کا حوض کی مچھلیوں سے کھیلنا اور میر صاحب کا غزل پڑھتے پڑھتے رُک جانا، اور نواب کا یہ کہدینا "جو شعر ہو گا آپ سے توجہ کر لے گا" قرین قیاس ہے اور ہرگز غلط نہیں ہو سکتا۔ اور میر صاحب کا جیب میں غزل ڈالکر گھر کو چلے آنا اور پھر جانا چھوڑ دینا بالکل ایسا ہے کہ ضرور عمل میں آیا - پھر چند روز کے بعد میر صاحب کا بازار میں نواب کی سواری کے سامنے سے گذرنا اور نواب صاحب کا محبت سے یہ کہنا کہ "میر صاحب آپ نے ہمیں بالکل چھوڑ دیا کبھی تشریف بھی نہیں لاتے"۔ اور میر صاحب کا یہ جواب دینا کہ "بازار میں باتیں کرنا داب شرفا نہیں - یہ کیا گفتگو کا موقع ہے"۔ ایسا ہے کہ ویسے شخص سے یہی توقع کی جا سکتی تھی -

یہ تو مولوی صاحب بھی تسلیم کریں گے کہ وہ اُمرا کی خوشامد لغو سمجھتے تھے - چنانچہ خود لکھتے ہیں :

مجھکو دماغ وصفِ گل و یاسمن نہیں　　میں جوں نسیم بادِ فروشِ چمن نہیں

یہ شعر خود میر صاحب کے اوصاف ظاہر کر رہا ہے، کسی مزید حوالہ کا محتاج نہیں - جو شخص اُس زمانہ میں جبکہ تمام شعراء قصیدہ گوئی اور مدح سرائی اپنا شعار کیے ہوئے تھے، اپنے آپ کو سب سے الگ رکھتا تھا تو

تو کیا تعجب کا مقام ہے اگر میر صاحب نے اس سے بھی ایک قدم آگے بڑھایا ہو اور نوابوں اور امیروں کو لعن طعن کرنا بھی فخر سمجھا ہو۔

(۵) الف - میر صاحب کا میر قمر الدین منّت کو شاگرد نہ بنانا اور یہ کہہ دینا کہ "اُردو ئے معلّی خاص دلّی کی زبان ہے - آپ اس میں تکلیف نہ کیجیے، اپنی فارسی واہی کہ لیا کیجیے"۔

(ب) سعادت یار خاں رنگین سے یہ کہہ دینا کہ "صاحبزادے! آپ خود امیر ہیں اور امیرزادے ہیں نیزہ بازی، تیراندازی کی کثرت کیجیے، شہسواری کی مشق فرمائیے، شاعری دلخراشی و جگرسوزی کا کام ہے" اور رنگین کے زیادہ اصرار پر یہ فرمانا کہ "آپ کی طبیعت اس فن کے مناسب نہیں، یہ آپ کو نہیں آنے کا۔ خواہ مخواہ میری اور اپنی اوقات ضائع کرنی کیا ضرور ہے"۔

(ج) اور یہی معاملہ شیخ ناسخ کے ساتھ گذرنا۔

ہرگز تعجب خیز نہیں۔ اور میر صاحب جس قدر کہ اپنے کمال کے خود والہ و شیفتہ تھے اُس سے یہ نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے کہ ضرور یہ واقعات صحیح ہیں۔

(۶) اژدر نامہ یا اجگر نامہ موجود ہے جس میں میر صاحب نے تمام شاعروں کو اپنے سامنے ہیچ قرار دیا ہے۔ کیا اس میں بھی کوئی شک ہے؟ اور نثار کا یہ شعر پڑھنا میر صاحب کی تعلّی و خود بینی کے خلاف ہرگز بیجا نہیں کہا جا سکتا۔

حیدرِ کرّار نے وہ زور بخشا ہے نثار ایک دَم میں دو کروں اژدر کے کلّے چیر کر

(۷) پَونے تین شاعر کا واقعہ مشہور ہے۔ اگر میر صاحب نے درد کو آدھا اور سوز کو پَونا شاعر کہہ دیا ہے تو کیا اُن سے کوئی تعجب کا مقام ہے۔

(۸) میر صاحب کی شائقین کلام کے ساتھ بے دماغی ایک معمولی بات ہے۔ پس اگر لکھنؤ کے عمائد اور اراکین کے ساتھ ایسا برتاؤ کیا گیا ہو تو ہرگز خلافِ واقعہ نہیں کہا جا سکتا۔ میر صاحب اپنے آپ کو نہ صرف اہل کمال بلکہ کچھ اس سے بھی زیادہ سمجھتے تھے۔ بلاشبہ مولوی صاحب اور یہ خاکسار اس امر میں میر صاحب کے ہمخیال ہیں۔ لیکن میر صاحب کا یہ انداز ہرگز پسندیدہ نہیں کہا جا سکتا۔

میر صاحب کا شائقین حضرات کو اول کچھ ٹالنا، پھر صاف جواب دیدینا اور کہنا کہ "صاحب قبلہ! میرے اشعار آپ کی سمجھ میں نہیں آنے کے"۔ لیکن ان شائقین بلکہ عاشقان سخن کا اپنی نارسائی طبع کا

اقرار کرنا اور پھر درخواست کرنا اور میر صاحب کا پھر انکار کرنا اُنکے گراں خاطر ہونے کے لیے کافی تھا
چنانچہ انھوں نے کہا کہ "حضرت! انوری و خاقانی کا کلام سمجھتے ہیں، آپ کا ارشاد کیوں نہ سمجھیں گے۔"
میر صاحب پھر بھی نہ پسیجے اور فرمایا "یہ درست ہے مگر اُنکی شرحیں، مصطلحات، فرہنگیں موجود ہیں اور
میرے کلام کے لیے فقط محاورۂ اہل اُردو ہے یا جامع مسجد کی سیڑھیاں، اور اس سے آپ محروم" یہ کہکر
ایک شعر پڑھا:

عشق بُرے ہی خیال پڑا ہے چین گیا آرام گیا　　دل کا جانا ٹھیر گیا ہے صبح گیا یا شام گیا

اور کہا آپ بموجب اپنی کتابوں کے کہیں گے کہ خیال کی ی کو ظاہر کرو۔ پھر کہیں گے کہ ی تقطیع میں گرتی
ہے۔ مگر یہاں اسکے سوا جواب نہیں کہ محاورہ یہی ہے۔

شعر اچھا بلکہ بہت اچھا ہے، لیکن جو اعتراض میر صاحب نے اتنے دنوں پہلے سوچا تھا اب بھی
وارد ہوتا ہے۔ اور مشکل یہ ہے کہ آج جامع مسجد کی سیڑھیوں کا بھی حوالہ دینے سے گلو خلاصی نہیں ہو سکتی
کیونکہ بقول مرزا غالب

"اے میر مہدی! تجھے شرم نہیں آتی۔ میاں یہ اہل دہلی کی زبان ہے، ارے اب اہل دہلی ہندو ہیں،
اہل حرفہ ہیں یا خاکی ہیں، یا پنجابی یا گورے ہیں، ان میں سے تو کس کی زبان کی تعریف کرتا ہے۔ لکھنؤ کی
آبادی میں کچھ فرق نہیں آیا، ریاست تو جاتی رہی باقی ہر فن کے کامل لوگ موجود ہیں ....
اللہ اللہ! دلی والے اب تک یہاں کی زبان کو اچھا کہے جاتے ہیں۔ واہ رے حسن اعتقاد۔ ارے
بندۂ خدا۔ اُردو بازار نہ رہا، اُردو کہاں، دلی کہاں، واللہ اب شہر نہیں ہے۔ کیمپ ہے، چھاؤنی ہے
نہ قلعہ، نہ شہر، نہ بازار، نہ نہر ...."

پس بجز اسکے کہ میر صاحب کی اُستادی کے لیے ہم یہ تصرف جائز سمجھیں اور آیندہ کے لیے اسے
متروک خیال کریں اور کیا کہا جا سکتا ہے۔ غرض یہ واقعہ بھی ایسا نہیں جو قابل اعتقاد سمجھا جائے!

(۹) سب سے بہتر ثبوت میر صاحب کی بد دماغی کا خود اُن کا مخمس شہر آشوب کا مقطع ہے۔ نکات
الشعرا خود انکی تصنیف ہے اور وہ خود اپنے لیے اپنی عادت و خصلت کو بُرا ظاہر نہیں کر سکتے تھے، بلکہ ہر
انسان اپنی عادتوں کو بُرا نہیں سمجھتا۔ میر صاحب ہی پر کیا موقوف ہے۔ پس اپنے مقطع میں وہ اور اور لوگوں کی
نسبت لکھتے ہیں کہ مجھکو بد دماغ سمجھتے ہیں۔ اس سے ظاہر ہوا کہ اُسوقت میر صاحب کی نسبت عام رائے

یہی تھی کہ میر صاحب بددماغ ہیں۔ اب ہزار بار تردید میں خود میر صاحب کریں یا میر صاحب کے مداحان وہوا خواہان۔ یہ بددماغی کا داغ تو اُنکی شرافت کے دامن سے مٹنے والا نہیں۔ فرماتے ہیں :۔

حالت تو یہ کہ مجھکو غموں سے نہیں فراغ	دل سوزش درونی سے جلتا ہے جوں چراغ
سینہ تمام چاک ہے سارا جگر ہے داغ	ہے نام مجلسوں میں مرا تیر بے دماغ

از بسکہ کم دماغی نے پایا ہے اشتہار

جو کچھ واقعات اُنکی نسبت بیان کیے گئے ہیں ان کی تصدیق میر صاحب کے حسب ذیل دو شعر بھی کرتے ہیں چنانچہ فرماتے ہیں (پہلا مصرعہ مجھے یاد نہیں رہا)

. . . .	مروت قحط ہے آنکھیں نہیں کوئی ملاتا یاں

خرابہ دہلی کا وہ چند بہتر لکھنؤ سے تھا	وہیں میں کاش مرجاتا سراسیمہ نہ آتا یاں

اگر میر صاحب اس بددماغی سے پیش نہ آتے تو کیا لکھنؤ میں اُنکو متذکرہ بالا شعر لکھنے کی ضرورت پیش آتی؟

(۱۰) میر صاحب کا ایک اور دلچسپ واقعہ ہے: "ایک دن نواب سعادت علی خاں کی سواری جاتی تھی۔ تحسین کی مسجد پر سرراہ بیٹھے تھے۔ سواری سامنے آئی، سب اُٹھ کھڑے ہوئے، میر صاحب اُسی طرح بیٹھے رہے۔ سید انشا خواصی میں تھے۔ نواب نے پوچھا کہ انشا یہ کون شخص ہے؟ جسکی تمکنت نے اُسے اُٹھنے بھی نہ دیا۔ عرض کی "جناب عالی یہ وہی گدائے متکبر ہے جس کا ذکر حضور میں اکثر آیا ہے۔ گذارے کا وہ حال اور مزاج کا یہ عالم، آج بھی فاقہ ہی سے ہوگا"

لالہ سری رام ایم اے مصنف خمخانہ جاوید ایک روز دوران گفتگو میں مجھ سے کہتے تھے کہ آزاد نے یہ غلط لکھا ہے۔ اور اسکی غلطی وہ اس طرح ظاہر کرتے تھے کہ نواب سعادت علی خاں کے زمانہ میں تحسین کی مسجد تعمیر بھی نہ ہوئی تھی۔ میں نے لالہ صاحب سے کہا کہ آپ نے آزاد کی یہ غلطی اپنی کتاب خمخانہ جاوید میں انکے حالات کے تحت میں ظاہر نہیں کی کہنے لگے کہ لوگ لڑنے لگیں گے اس وجہ سے خاموش ہوں۔

اب اڈیٹر صاحب الناظر تکلیف فرما کر معلوم کریں کہ تحسین کی مسجد نواب سعادت علی خاں کے زمانہ میں موجود تھی یا بعد میں تیار ہوئی ہے۔

اس واقعہ کے اظہار سے میرا یہ مطلب ہے کہ بعض لوگ آزاد کی نسبت ناقابل اعتبار ہونے کا فتویٰ صادر کرتے ہیں۔ اور اُنکی بعض غلطیاں مسلّم بھی ہیں۔ لیکن میں افراط اور تفریط دونوں کو بُرا سمجھتا ہوں اور

حیثیت سے روحانی زندگی کا مہتم بالشان ظہور خیال کیا تھا۔ قطعاً چشم پوشی کا رجحان عام سے اعم ہوگیا اور سترہویں صدی میں یہ رجحان بانیِ فلسفۂ جدید ڈیکارٹ کی تلقین میں اپنی انتہائے کمال کو پہونچ کے رہا۔ وہ بڑی جرأت سے یہ فرض کیے لیتا ہے کہ اجسام حیوانات و انسان اور انکے وظائف دقت و پیچیدگی کے سوا مشین سے کچھ بھی مختلف نہیں ہوتے وہ کل ذی حیات مخلوق میں صرف انسان ہی کو ذی روح مانتا ہے۔ اسکے نزدیک روح کا کام صرف خیال اور ارادہ کے اعلیٰ قوائے ذہنیہ کو کام میں لانا ہے۔

قوانین فطرت کے آلی (Mechanic) نقطۂ نظر سے مطالعہ نے ڈیکارٹ کو اس نتیجہ تک پہونچایا تھا اور علوم طبیعیہ کی روزافزوں ترقی اسی نظریہ کے کافی ووافی ہونے کے یقین کو اور بھی ابنائے زمانہ کے دلوں میں راسخ کرکے بہت جلد ان سے یہ سوال کرانے کا باعث ہوئی کہ جب کل حیوانات محض دقیق مشین ثابت ہو چکے ہیں تو پھر انسان باطناً و ذہناً بھی دقیق مشین کیوں نہ مان لیا جائے؟ انکو تفتیش ہوئی کہ روح کیا شے ہے اور پھر انھیں خود ہی یہ جواب بھی سوجھا کہ وہ محض وہم آفریدہ توہم ہے۔ وہم جس کا موجد اور پادری یا اوعائی رہبر اپنا اثر بڑھانے اور اپنے مشربی حقوق تسلیم کرانے کی غرض سے جسکے مؤید ہیں۔ بایں سبب ڈیکارٹ کے ساقط عن الاستحقاق تخیلات علمی گروہ کے اعتراف مادہ پرستی و ایمان بالمادہ تک منتہی ہوکر سترہویں و اٹھارویں صدی میں قبولیت عام کے حقدار بن بیٹھے اب فلاسفۂ عصر، تصور روح کو علمی وحسی اصول سے ثابت کرنے کا اعلان جنگ پاکر محجوب شش و پنج میں ہوگئے۔ اگر ایک طرف لاک کے سے چند مذہبی خیال کے فلاسفر پیچھے پلٹ کر ایمان بالروح کے لیے مذہبی ملہم من اللہ دلائل کا آسرا ڈھونڈ رہے تھے تو دوسری طرف بشپ برکلے مادہ پرستی یا اشیاء مادیہ (یعنی حامل الاوصاف ومحل مظاہر) کی محسوس حقیقت پر انسانی تیقنات کی مدلل جرح و قدح سے چھاڑ باقی کرکے بے طرح حملے کر رہا تھا۔ مگر اسی زمانہ میں ایک باثر فلسفی اسکوچ متشکک ڈیوڈ ہیوم یہ روشن دلیل پیش کرتا تھا کہ روح کا وجود ایک روایت پر مبنی ہے، جو بلا درایت آنکھ بند کرکے قبول کرلی گئی ہے۔ اسکے وجود پر نہ تو آج تک کوئی بدیہی دلیل قائم ہوئی اور نہ کبھی ہونے کا قرینہ ہے۔

یوں اٹھارویں صدی کے آخر تک فلاسفہ کے پیش نظر دو ہی نظریے: مادہ پرستی اور تشکیک تھے جن میں سے ایک نہ ایک کو اختیار کرنا ناگزیر تھا۔ خیالات کے اس ملتقی البحرین یا سنگم پر کانویل

کانٹ نمودار ہوا جو ان دونوں تاریک راستوں سے بچ نکلنے کا ایک تیسرا راستہ بتاتا ہے۔ اسکا فیصلہ کا قول ہے کہ کسی مادی شے کو محسوس کرتے وقت ہم صرف اُنکے مظاہر سے آگاہ ہوتے ہیں۔ اور یہ کہ مادی دُنیا کے مفہوم یا تعقل کی اصلیت بہت کچھ ہمارے اذہان کے زیر اثر ہوتی ہے، جسکو ہم مادی دنیا سے تعبیر کرتے ہیں۔ وہ اصل وہ کسی ایسی حقیقت کے مظاہر یا پودکی نمود ہوتی ہے جنکے اصلی و اساسی وجود کا ہم سرے سے تصور ہی نہیں کرسکتے کیونکہ ان مظاہر و نمود کی تکوین میں بڑی حد تک ہمارے اذہان کی ترکیب و ساخت کو دخل ہے یہاں تک کہ فطرت کے قوانین طبیعی بھی، جنکے بانی ہونے کے بجائے ہم اپنے کو اُنکے مکتشف ہونے کا یقین رکھتے ہیں۔ مثلاً قوانین تعلیل اور افعال طبیعی ایسے قوانین ہیں جو اس متعذر الا کتناہ، مستحیل المعرفۃ، مجہول الحقیقۃ شے سے، جسکو ہم اشیاء مادیۂ بذاتہا خیال کرتے ہیں، زیادہ ہمارے ہی اذہان کی فطرت کو ظاہر کرتے ہیں۔ اسکے علاوہ اس (عقلی دنیا اور ذہنی عالم میں کوپرنکس کے سے انقلاب انگیز) فلسفی کا خیال ہے کہ ہمارے اذہان خود بھی ہمارے بلا واسطہ مشاہدہ میں نہیں آتے اور ہمارے ادراک کی رسائی انکے بھی مظاہر ہی تک ہے آگے نہیں۔

اس لاادریت پر بھی وہ اس امر کا قائل ہے کہ گو ہم اصول سائنس سے روح کے اثبات اور اسکی حقیقت کے بیان پر قادر نہیں تاہم انسان کی اخلاقی فطرت پر غور و خوض ہمیں روح کے وجود کا غیر فانی و فائق از احساس ہستی کی حیثیت سے، یقین دلادیتا ہے۔

فلاسفۂ متاخرین کانٹ کے اس باب میں پیرو رہکر روح کے خارج از فہم ہونے کے قائل رہے اور مابعد کی۔۔۔۔ روح کے وجود کو ثابت کرنے اور حقیقت کے چہرہ سے نقاب اٹھانے کی سعی عموماً ناکام تسلیم ہوائی۔

بیان بالا یہ دکھانے کو کافی ہے کہ کیوں روح کو نفسیات کا موضوع لہ قرار دینا صحیح نہیں۔ روح ایک فطری قیاس ہے، اتنا مبہم اور احاطۂ عقلی کی گرفت سے ہر گھڑی باہر نکل پڑنے کو تیار اور حدودِ احساس میں قدم رکھنے سے بیزار کہ علوم طبیعی کی ایک وسیع شاخ کی تحدید میں کسی نہج سے اسکے اصلی تصور یا درک کو ٹھونسا ہی نہیں جاسکتا۔

-(۳)-

ان مشکلات سے جان بچانے کو بہتیرے بلند نظر حکمائے حال نے نفسیات کا موضوع "ذہن"

کو قرار دینے میں سہولت دیکھی طریقہ بھی تشفی بخش نہیں کیونکہ اگر صیغۂ فلسفہ کو چھوڑ بھی دیا جائے تو سب سے پہلے نفسیات سے بیّن ممیز اور کم و بیش آزاد اور بے لگاؤ فن۔ منطق۔ کو علم ذہن ہونے کا بیجا دعوی ہے لہذا نفسیات کو دوسرے علوم سے ممتاز رکھنے کا مقصود فوت ہو جاتا ہے۔ علاوہ بریں یہ تعریف ایسی اصطلاح (ذہن) پر مشتمل ہے جسکے مدلول علیہ کی صحیح تحدید ہو نہیں سکتی کیونکہ یہ کون ٹھیک ٹھیک بتا سکتا ہے کہ ذہن کی نوعاً یا انفراداً کیا ماہیت ہے؟ اس سوال کے ناشی ہوتے ہی فلسفہ کے چند ادق اور اکثر الاختلاف مسائل چھڑ جاتے ہیں

ان اختلافات و معارضات کو دیکھتے ہوئے حال کے چند ارباب قلم نے نفسیات کے موضوع کو شعور سے تعبیر کرنے کی تجویز سوچی مگر اسکی کیفیت بھی ملاحظہ ہو

پروفیسر میک ڈوگل او اکسفورڈ اینڈ ہارورڈ موضوع نفسیات کی لفظی نہیں صحیح معنوی تعریف کی تحقیق میں اپنے پرزور مسلح بامثال، دل لگتے دلائل و براہین سے اسکے لیے "حالات نفس" و "بیان ذہن" کی سی پیش کردہ حکمائے یورپ اصطلاحی تعریفوں کو ممتاز عہ فیہ بنا کر زمانۂ حال کی اس تحدید پر بھی کہ ہر فرد بشر کو صرف شعور ہی کا بلا واسطہ یقینی علم ہوتا ہے اس لیے نفسیات "علم شعور" کا دوسرا نام ہے دو سخت اعتراض وارد کرتے ہیں (اول) یہ کہ ہر فرد کو صرف اپنے شعور کا بلا واسطہ علم ہوتا ہے اور دوسروں کے شعور کو انکے طرز عمل سے استدلال کر کے اپنے نفس پر قیاس کر لیا جاتا ہے۔ اس کا علم یقینی نہیں ہوتا ہے ظنی ہوتا ہے اور نفسیات کا مقصود ان نتائج تک رسائی ہے جن میں خصوصیت و انفرادیت نہیں بلکہ عمومیت پائی جاتی ہو۔ تو جب اپنے مخصوص شعور کے سوا کل دوسرے انسانوں کے شعور کا علم ظنی ٹھہرا تو شعور حیوانات کا علم تو اور بھی کسی کے دسترس میں نہیں آ سکتا۔

دوسرے، شعور کے مدارسہ سے ہم پر منکشف ہو جاتا ہے کہ نہ تو کسی ایک فرد کے شعور کا اور نہ کل انسانوں کے بلا اختصاص شعور کا بیان علم بن سکتا ہے۔ کیونکہ یہ بیانات نہ تو ہمیں کسی مخصوص شعور کے کسی خاص پہلو اختیار کرنے کی وجہ سمجھنے کے قابل بناتے ہیں اور نہ رفتار فطرت کو قابو میں کرنے میں کچھ ہمارا ہاتھ بٹا سکتے بعض اہل قلم جو نفسیات کی تعریف "علم شعور" سے کرنا چاہتے ہیں اسکی وجہ ان کا ڈیکارٹ کے اس نظریہ سے اتفاق ہے جو جسم انسانی کو ایک پیچیدہ کل اور اسکے کل اعمال و وظائف کو اصول آلیہ کے تحت میں

رکھنے کا اتنا مؤید ہے کہ سیرت یا تعامل (Behaviour) کی کُل تفصیلات عام ازیں کہ وہ انسانی ہوں یا حیوانی اصولاً اسی کل کی اصطلاح میں قابل توجیہ ولائق توضیح ہو کر وظائف الاعضاء کے قلمرو میں آجاتی ہیں، اور پھر وظائف الاعضاء خود طبیعیات کی ایک مخصوص شاخ یا زیادہ سے زیادہ کیمیا و طبیعیات کا مشترکہ ثمرہ ہے اور بس۔ موجودہ کارٹیشین (Cartesshian) یا متبعین ڈیکارٹ مقلد (Descartes) خیال کو اس کل کی چلانے والی روح کا ظہور تسلیم کرنے میں اپنے فرانسیسی مقتدا کے پیرو نہیں رہے بلکہ وہ اسکے علی الرغم شعور کو فاسفورس (زہریہ) کی قسم کی ایک تنویر بتاتے ہیں جو اس کل کے ایک حصہ کے عمل سے پیدا ہوتی ہے یا وہ یہ کہتے ہیں کہ شعور ایک خاص عمل ہے جس سے ہم ادراک احساسی سے بھی زیادہ بلا واسطہ طریقہ پر باخبر اور آگاہ ہوتے ہیں۔

اب اگر یہ نظریہ متفق علیہ ہو گیا ہوتا تو نفسیات کے موضوع کی تعریف دیان شعور کی حیثیت سے بالکل موزوں ہوتی۔ گو اسوقت بھی اسکو علم کا لقب دینا اسراف بیجا اور غیر ضروری ہوتا، مگر چونکہ کائنات ذی حیات کے متعلق یہ رائے ہنوز بالکل مشکوک قدر و قیمت سے زیادہ کی مستحق نہیں، اس لیے آکسفورڈ کے سابق اور ہارورڈ جیسے مشہور امریکانی جامعہ کے موجودہ پروفیسر نے اپنے جدید تخیال ارباب علم سے متفق ہو کر اس علم کے موضوع کی ان اصطلاحات میں تعریف کرنے کی کوشش کی ہے، جسکو کسی نظریہ و مفروضات کی پہلے سے ماننے کی سرے سے ضرورت ہی نہیں پڑتی، اور جو صرف مسلم الثبوت و مانوس حقائق روزمرہ پر مبنی ہے۔

اب اگر یہ سوال اُٹھایا جائے کہ وہ کون سے امور ہیں جن کا نفسیین ہی مشاہدہ و مدارسہ کرتے ہیں اور کلیۃً کسی دوسرے علم کے تحت میں آ بھی نہیں سکتے؟ اس کا جواب دوہرا ہوگا۔

(۱) اسکا اپنا خاص شعور

(۲) کُل انسان اور حیوانات کے اعمال بالخصوص

نفسیین کا مقصود ہے اعمال انسانی وحیوانی کا سمجھنا، اُن پر قابو پانے اور حکومت کرنے کی طاقت بڑھانا۔

تو اب ہم نفسیات کو کائنات حیّہ (مخلوقات ذی حیات) کے نظری علم کی حیثیت سے تعبیر کر سکتے ہیں یہی پروفیسر ممدوح کی رائے میں صحیح بلا خوف تردید تحدید ہوئی۔ اس تعریف کو تسلیم کر تا لوٹ کر اصطلاحی

کے معیار تک عود کرنا، اور قیاسی قیود سے آزاد مسلمات عامہ سے ابتدا کرنا ہے - اس میں کلام نہیں کہ کل موجودات مدرکہ دو جماعتوں کے زیر عنوان آجاتے ہیں -

(۱) جمادات جنکی حرکت و سکنت یعنی کل تغیرات (بلا استثنا و معلومہ) ایک لخت قوانین آلیہ کے مطیع و منقاد معلوم ہوتے ہیں -

(۲) جاندار یا نامی جو اپنے ارادہ اور اختیار کا اظہار اپنی سیرت یا اعمال بالارادہ سے کرتے ہیں جب ہم کہتے ہیں کہ ان سے عمل بالارادہ کا ظہور ہوتا ہے، تو اس کا یہی مطلب ہے کہ وہ تجویز بالاختیار اور اپنے ارادہ کو عمل میں لانے اور اپنے مقاصد و غایات تک سعی پہونچنے کی اندرونی ذاتی قوت رکھتے ہیں -

لہذا غایت رسی کی سعی یا مقصد کو قوت سے فعل میں لانا سیرت، تعمد یا عمل بالارادہ کی علامت ٹھہرا اور تعمد جاندار کا خاصہ یہی معیار حیات ہے جس سے ہم سب کام لیتے اور بسہر جانداراور بے جان کے اعمال کو پرکھتے ہیں - مگر ہم میں سے اکثر اشخاص اس پر غور نہیں کرتے - بدیں وجہ اس پر ایک لمحہ بحث کرنا خالی از منفعت نہ ہوگا -

---

مثلاً (بلیارڈ) کے گیند کو اسکی جھولی سے نکال کر میز پر رکھیے - وہ ساکن ہے اور اسی طرح غیر متناہی زمانہ تک ساکن رہے گا بشرطیکہ اس پر کوئی زور عمل نہ کرے - اب اسکو کسی سمت میں ڈھکیل دیجیے - جب تک یہ سابق (momentum) ڈھکیلنے کا اثر یا تحریک ختم نہ ہو، یا فرشی بانات کی احتکاکی مزاحمت سے مڑ کر کوئی نئی سمت اصول آلیہ کے اتباع میں اختیار نہ کرنا پڑے اسوقت تک اسی سمت لڑھکتا چلا جائیگا - یہ تو حرکت آلیہ کی مثال ہوئی - اب آپ اسی سے تعمد کی مثالوں کا موازنہ کیجیے -

---

اب گینی پگ جیسے ننھے جانور کو اسکے بل سے باہر نکال کر کسی قطعہ سبزہ زار پر چھوڑ دیجیے گیند کے برعکس ایک ہی جگہ ٹھہرے رہنے کے بجائے آپ دیکھیں گے کہ وہ دوڑ کر اپنے سوراخ میں پلٹ جائیگا - پھر کسی طرف ٹھیل ٹھال کر اسکو لیجائیے تو گرفت سے چھوٹتے ہی اپنے سوراخ کی طرف بھاگے گا - اب اسکی راہ میں کوئی رکاوٹ ڈال کر آزمائیے تو اسپر چڑھ کے یا اسکے گرد گھومنے میں جھپٹنے سے اسوقت تک

جد و جہد کرتا رہیگا جب تک اسکا مقصود (اپنے بل تک پھر پہونچنا) حاصل نہ ہولے، یا اسی سعی میں اسکی طاقت و قدرت جواب نہ دے بیٹھے۔

تعمد کی یہ مثال غوامضِ حیات کے وسط پیمانہ سے لی گئی ہے اس پر امعانِ نظر اور کافی غور و وضاحت سے اعمال ارادہ اور اعمال آلیہ میں امتیاز و تفرقہ ظاہر کرنے کو کافی ہے۔

غوامضِ حیات کے اعلیٰ پیمانہ کے لحاظ سے ملاحظہ ہو:۔ کُتّے کو اُسکے گھر سے باہر کچھ دُور، بلکہ جہاں جی چاہے لیجا کر رکھیے۔ اور کتنے ہی اچھے سے اچھے سلوک اُسکے ساتھ کیجیے۔ اس پر بھی وہ بےچین رہ کر برابر نکل بھاگنے کی سعی میں لگا رہیگا۔ اور دانہ پانی چھوڑ کر سوکھ کے کانٹا ہوکے رہ جائے تو تعجب نہیں۔ اور کہیں قید سے چھوٹ جائے تو بے تکان گھر کی طرف چل پڑیگا۔ میلوں منزلیں مارتا رستہ معلوم ہوا تو سیدھی سڑک سے نہیں تو اٹکتا بھٹکتا، مگر بغیر کہیں ٹھہرے گھر ہی آکے دم لے گا۔

پیمانۂ تعمد (سیرت Behaviour) کی چوٹی کی مثال کے طور پر اُس اشرف المخلوقات کا واقعہ لیجیے جو اول درجہ کا وطن پرست، اور نشۂ حُب الوطنی میں سرشار تو ہے، مگر سدِ رمق از وقہ حاصل کرنے اور روٹی کمانے کو کسی دوسرے ملک میں ملازمت اختیار کرنی پڑی۔ وہاں وہ دیانتداری سے ان کاموں کی انجام دہی اور ان مہمات کے سر کرنے میں تو منہمک ضرور رہیگا جنکا بار اُسنے اپنے سر لیا ہے، مگر ہمیشہ یہی نیت اُسکے منصوبوں پر غالب اور یہی ارادہ اُس کا مطمحِ نگاہ و مرجع الامانی رہیگا کہ کسی طرح اتنے روپے پسماندہ ہوجائیں جو اُسکے وطن لوٹنے اور وہاں کی ضروریاتِ زندگی کو کافی ہوں۔ اور یہی اُس کے کُل اعمال بالارادہ کا محرک اول ہے، جسکے تابع کُل دوسرے محرکات ہیں۔

ہم سے یہ آخر الذکر تعمد یا روشِ تعمد چھپی نہیں رہتی۔ اگر کوئی شہر بدر، جلا وطن، ہم سے کہے کہ ہمہ دم اسکے سامنے وطنِ مالوف کا نقشہ کھنچا اور وہاں کی اُن دلچسپیوں کی تصویریں، جنکے وہاں پالنے جانے کی توقع ہے رات دن اُس کی آنکھوں میں گھومتی رہتی ہیں۔ کیونکہ ہم خوب جانتے ہیں کہ کسی امید افزا واقعہ کا تصور باندھنے اور اُسکے پر اشتیاق تمنا میں کیسا قریبی رشتہ ہے۔ اگرچہ وہ غریب شہر بدر، ایک تنگ خیال، کُند ذہن، اپنی واپسی کے لطف و لذائذ کو قبل از حصول بوضاحت سوچنے کے کتنا ہی ناقابل کیوں نہ ہو

جو محض اسی حب الوطنی کا بیار معلوم ہوتا ہے، جسکو یہ غریب الفاظ میں لانے کی قدرت نہیں رکھتا تاہم
ہم بخوبی محسوس کرتے ہیں کہ ہم نے اسکے اس طرز عمل اور حالت ذہن کو اسکے نہ بتا سکنے پر بھی کسی نہ کسی
حد تک ضرور تاڑ لیا ہے۔ اور یہی تیقن ہمیں مثال سابق میں کتے کی نسبت، اور اس سے قدرے کم اپنی
پہلی مثال کے نسبتہً ادنیٰ جانور کے بارے میں ہوتا ہے۔ اسکی کھلی ہوئی وجہ یہ ہے کہ ہم خود بھی بےچینی کا ذاتی
تجربہ رکھتے ہیں...... کسی ایسی منزل مقصود تک پہونچنے کی مسلسل سعی کا اندرونی ہیجان جسکو ہم
اپنے خیال میں لائے اور اسکے کماینبغی تعقل ہی پر قادر نہیں ہوتے بصراحت بیان کرنا تو الگ رہا وہ
تو بڑی بات ہے...... ہمکو اسکا بھی تجربہ ہوا ہے کہ کیسے ان مبہم افعال و غیر صریح اعمال میں خارجی
موانع ہمارے ہیجان سعی کو مشتعل کر دیتے اور کسی طرح اس نافہمیدہ منزل مقصود کی جانب کامیاب
پیش قدمی غیر مفہوم ہی سہی، مگر گہری تسکین خاطر کا باعث ہوتی ہے اور کیونکر صرف سمجھ میں نہ آئی ہوئی
منزل مقصود تک رسائی ہی ہماری اس بےچینی کا تنہا علاج اور اس جانسوز زہر کا کیتا تریاق ہے۔
لاریب تمہری یہ مسلّم بلا تردید مثالیں ہیں، جو صرف ہماری سعی و جہد کے اختیارات سابقہ کی تمثیلی روشنی
ہی میں سمجھی اور سمجھائی جا سکتی ہیں......... اور ان امور و حوادث کی بااصول الیہ توضیح کرنے کی
کوئی بلیغ سے بلیغ سعی ہنوز خفیف ترین تحسین و آفرین کی مستحق یا کسی حد تک ان اعمال ارادیہ کے سمجھنے
اور انکی اصلاح کرنے میں معاون ثابت نہ ہوئی یہی بات بلکہ اس سے بھی زیادہ اور بسیط اشکال تعمد
پر بھی صادق آئے گی گو انکی مصادقت قدرے قلیل الوضاحت ہی کیوں نہ ہو۔ اب ہم مرقاۃ الارتقاء
کے چند درکات نازلہ پر غور کرتے ہیں۔

طائر مہاجر (پردیسی چڑیا) فصل بہار میں انگلستان آکر جھاڑیوں کے جوف میں بسیرا لیتی ہے۔
اپنے نر کے عشقبازیوں کی داد دیتی، پھر گھونسلے بناکر انڈے دیتی، اور جب تک بچے انڈے کھٹک کر باہر
نکل نہ آئیں انکو چپ چاپ بالا پر چل کیے سیتی رہتی ہے۔ پھر اپنے مسلسل افعال سے انکی پرورش کرتی،
انکو اسوقت تک جبتک وہ اسکی دستگری سے بےنیاز نہ ہولیں، گھنٹہ گھنٹہ اور منٹ منٹ کھلاتی رہتی ہے۔
اور دوسری فصل کے آتے ہی یہ کار اہم انجام دیکر دکن کا رخ کرتی ہے اور بڑے بڑے خشکی و تری کے
قطعات، سمندر و میدان کو اپنے ان ننھے ڈینوں سے ناکھتی ہوئی اپنے شمالی وطن کو لوٹ جاتی ہے۔

وہاں فصل بہار کے انتظار میں ٹھہری رہتی ہے - اور اسکے آتے ہی اپنے پر پرواز سے ہزاروں میل کی مسافت کاٹتی - پھر انھیں مذکورالصدر ناگریزی تعلقوں میں پھیلی ہوئی جھاڑیوں میں اپنے اُسی دائرۂ اعمال کے مدور کرنے کو آپہونچتی ہے جس کا ایک قوس افریقہ میں اور دوسرا یورپ میں قدرت نے بنا رکھا ہے - بلا مغالطۂ فہم یہ بھی تعمد کی ایک قسم ہے جس کی کسی طرح اصول آلیہ سے توجیہ ہو ہی نہیں سکتی -

گو اس ناگزیر اعتراف سے مجھے بھی گریز نہیں کہ ہر قدم پر اس چڑیا کے افعال و اعمال بلحاظ تفصیل و تفریع بے انتہا مختلف ہوں گے - مگر ہمیشہ اس دائرۂ مقاصد کے ماتحت ہوں گے جس میں اسکی حیات کا مقصد اعظم، اسکی تخلیق کی غایت قصویٰ یعنی :- اسکی نوع کا استمرار اپنے صنفی قالب اور قومی سانچے میں اپنی ہستی فرداً ثانی اور نوعاً باقی کا لگاتار علی التسلسل مثلاً بعد نسل اظہار کرتا چلا جائے گا - اسکے افعال کسی وجہ پر ہوچککر روک دیے جائیں تو اسکی سعی دونی ہو جائے گی - اُس کے گھونسلے توڑ دو، وہ دوسرے بنا لیگی - اسکا ایک یا زیادہ انڈے نکال لاؤ، وہ یہ کمی پوری کرنے کو دوسرے انڈے دیدیگی - تم اسکے بچے پر حملہ کرکے دیکھو، وہ اپنی پوری طاقت سے (وہ بیچیر زہی سہی) تمھاری مدافعت کریگی - تم اُسکو بند کرکے رکھو، جب اُسکے افریقہ لوٹ جانے کا وقت آجائیگا تو اپنے قیدخانہ کی دیواروں سے مختلف غیرمختتم حرکات نے ساتھ نکل بھاگنے کو زور لگاتی رہیگی، یہاں تک کہ وہ اپنے ارادہ میں کامیاب ہو جائے یا تھک کر ہار بیٹھے - تم اُسکے نر، ناگزیر شریک زندگی کو اُس سے جدا کرلو - وہ اس غم فرقت میں گھل گھل کر جان بھی دے ڈالے تو کچھ تعجب نہیں -

ان گوناگوں اعمال کی حالت کہاں تک اس چڑیا کو نظر آتی ہے - اس امر کے یقین کرنے کی معقول دلیل رکھنے پر بھی کہ وہ ہر منزل پر اسکے ملحق منزل اور ہر قدم پر صرف ایک قدم آگے سے زیادہ دُور دیکھنے اور اپنی سعی کے نتائج بعیدہ سمجھنے سے قاصر ہے ؛ ٹھیک ٹھیک کوئی قطعی فیصلہ نہیں کرسکتے - باایںہمہ ہم کو اس میں ذرا شک نہیں کہ ان اعمال و افعال کے سلسلہ بلحاظ نوعیت ہمارے اعمال بالارادہ سے بہ نسبت دوسرے غیرعضوی و بیجان اشیا کے سلسلۂ حرکات کے، زیادہ مماثل ہے - لہٰذا انکو بھی ارادہ کا ایک مظہر اور تعمد کا ایک پرتو خیال کرنا قیاس مع الفارق نہیں ہو سکتا -

---

سلم الحیات (Scale of Life) میں ایک زینہ نیچے اُتر کر سامن مچھلی کا ملاحظہ کیجیے جو موسم مقررہ

کُھلے سمندر کے اندر خاص درجۂ عمق تک پہونچ کر کسی میٹھے دریا کے دہانے میں داخل ہوتی اور دریا کے بہاؤ پر اُلٹا زور لگاتی، کسی خاص جگہ پر انڈے دینے کے لئے، انڈوں کو محفوظ رکھنے کے لئے اسکا ارادہ شرطی سے چڑھتی چلی جاتی ہے۔ ایک تیز رو دریا کے دھارے کے خلاف چڑھنے میں ظاہر ہے کہ بہت سے آبی دھکے اُٹھانے اور بڑی زوری سے کام پڑتا ہے۔ جسکے لئے ایسے غیر مختتم مختلف النوع مساعی و جد و جہد کی ضرورت لاحق ہوتی ہے جنکی چند منٹوں کی سعی وسیع مدت سے کم میں سمائی ہوئی نہیں سکتی۔ اور اسپر طرہ یہ کہ وہ اس پُر مشقت دوران سفر میں کچھ نہیں کھاتی صرف اپنے مستتر مخزونہ طاقت اور اپنے اجزائے عضلی کو اس جانفشانی میں اپنا زاد راہ بنا کر خرچ کرتی رہتی ہے۔

کیا یہ بھی سیرت، تمدد، عمل بالارادہ کی ایک ناقابل انکار مثال نہیں؟ جبکہ کسی حد تک سمجھ سکتے ہیں تو صرف اپنے اعمال بالارادہ کی اس سے مشابہ و ہمرنگ روشنی میں ہیں۔ اور جو غیر عضوی و غیر ذی حیات کائنات سے قطعاً غیر مماثل و مطلقاً متباین ہے۔

غیر فقری حیوانات کے عالم میں بھی تحفظ اپنے اصناف کی بقا برقرار رکھنے والے اعمال بالارادہ کے سامنے یہ الفعال ہونے کی حقیقت کبری ہر طرف ہم سے دو چار ہوتی رہتی ہے۔

ایک تنہائی پسند بھڑ ہی کو لیجیے: دن بھر اپنے شکار کے پیچھے نہایت جاں فشانی سے سرگرداں رہتی ہے۔ اور جہاں کوئی موٹا تازہ، اور اپنے جثہ سے بھی کہیں زیادہ بھاری کیڑا (Caterpillar)، ہاتھ لگا اُسکو اپنے منہ میں دبا کر راہ کی رکاوٹوں کے کہیں اوپر سے، کہیں نیچے سے، اور کہیں گھما پھرا کر، گرتی پڑتی، اپنی چوٹی کا زور لگاتی، کسی نہ کسی طرح گھسیٹتی گھسٹاتی اپنے اُس گھونسلے تک، جسکو یہ دوراندیش پہلے سے تیار کر چکی ہوتی ہے، اس لقمۂ تر (کیڑے) کو اپنے انڈوں کے ساتھ بند کر کے گلی مہر لگا دینے کو ضرور ضرور پہنچا دیتی ہے تاکہ وہ اسکے اُن بچوں کی غذا کا کام دے جنکا دیکھنا بھی غریب کی قسمت میں نہیں ہوتا۔

خراطین (کیچوا) اپنے سوراخ سے باہر نکلنے پر جہاں کسی جگہ پڑا ہوا پتہ میسر آیا وہیں اُس نے اپنی گُنڈلی کھول اور سکڑے ہوئے جسم کو تان کر لانبا کرتا ہوا اس نعمت عظمیٰ کو اپنے دو میں سے ایک سرے یا جوں سے طریقہ و صنع سے اسکو اپنے بل کے اندر لیجانے میں سہولت ہو، گھسیٹ لیجائے گا۔

دوسرے اس سے بھی زیادہ سادہ بناوٹ کے کیڑے اپنے ان حرکات و سکنات سے، جو مختلف طریقوں پر خارجی اسباب اور بیرونی شرائط کے عدم تغیر پر بھی کام میں لائی جاتی ہیں، یا انکی ایسی صورت میں ان تھک سعی جب پہلی کوشش حصول مقصود میں سرسبز نہ ہو، سیرت (Behaviour) کی مخصوص علامتوں کا بصراحت اظہار کرتی ہے۔

سمک نجمی (Star Fish) کو دیکھیے۔ اس طرح پر اُلٹ جانے پر، کہ وہ پشت بہ زمین چت ہو جائے، اپنے بازوؤں سے زمین کو گرفت میں لانے کے لیے کیا کچھ غیر مختتم انواع و اقسام کی مساعی مختلفہ سے کام نہیں لیتی۔ اور اس میں کامیاب ہو کر اپنے کل اعضا و جوارح کے مشترکہ عمل سے اپنے کو سیدھا ہی کر کے چین پڑے گی۔

یہاں تک کہ کل حیوانات میں ادنی ترین واحد الخلیہ مجہری تلبہ (Protozoa) میں بھی تو سیرت، تعمد، یا عمل بالارادہ کے اصول و ضوابط مفقود نہیں ہوتے۔

متغیرہ (Amoeba) سے بڑھ کر بساطت و سادگی کیا ہو سکتی ہے، بعض پلاسم یا جیلی کا ایک نقطہ۔ مگر اس زیر آب سطح سے جس پر یہ رینگتا ہوتا ہے الگ ہو جانے پر اپنے محسّاس (Pseudopodia) لمبے کر کے کل جہات میں ٹٹولتا رہیگا۔ یہاں تک کہ ان محساسوں میں سے جہاں کوئی کسی جامد جسم سے مس پانے پایا وہیں وہ اس سے اپنے معمول بہ حرکات پھر اختیار کر لینے کو تمام جسم سے چمٹ جائیگا۔ یا اپنی ہی قسم کی کوئی دوسری چھوٹی سی چیز سے چھو جانے پر اپنے تغذیہ کے لیے اُسکو ہڑپ کرنے کی فکر سے لگا ہی کرتا ہوا بڑے استقلال سے اپنے اس شکار کا پیچھا کرتا رہے گا۔ حیوانات مزلقہ بھی ادھر اُدھر شکار کی تلاش میں تیر کی طرح نکل کر اپنے سے چھوٹے دوسرے جانوروں کا تعاقب کرتے دیکھے جاتے ہیں۔

اب ہم امثلۂ گذشتہ سے کسی قدر مختلف النوع قسم کے حقائق پر غور کرنے کی طرف اپنی اور ناظرین کی توجہ منعطف کرتے ہیں۔ ایسے مظاہر جنکو عامۃ الناس متفق اللسان ہو کر تعمد (عمل بالارادہ) کا نتیجہ قرار نہیں دیتے، کل اصناف حیوان کا سب سے اہم کام وہ گراں مایہ فریضہ، انڈے دینا، انکو دنیا میں

ایسی جگہ رکھنا، اور اُنکے لیے ایسی حفاظت مہیا کرنا ہے جو اُنکو نشو و نما پاکر اپنے اسنان کے مثل عنما نمایندہ میں مبدل ہونے کے لیے ناگزیر ہے۔ یہی وہ جلیل الشان مہم ہے جسکی انجام دہی پر قریب قریب کل اعمال حیوانی بالواسطہ یا بلا واسطہ موقف ہیں۔ اور یہی دائرۂ توالد کا پہلا قوس یا مجموعہ افعال تناسل کا پہلا حصہ ہے جس پر بقا و اجراء نسل منحصر ہے۔ اسی دائرہ کے تکملہ کی بنا انڈے سے رکھی جاتی ہے۔ وہ سلسلۂ تغیرات جسکی وساطت سے یہ تکملہ تقریباً کل وقوعات میں اتمام کو پہونچتا ہے جن حیرتناک دقت و پیچیدگی اور محیر العقول نفاست و خوبی سے لبریز ہے، حد شمار میں نہیں آسکتی۔

اس سلسلۂ تغیرات سے اگر ہم حضرت انسان کی بنائی ہوئی مشین مثلاً: جنکے ذریعہ سے اخبار چھپتے اور کپڑے بُنے جاتے ہیں انکے اعجب العجایب کارروائی کا مقابلہ کرتے ہیں تو اسکے آگے پہلے سرے کی بھدی، حد درجہ کی مضحکہ خیز اور پھوہڑ نظر آئیں۔ یوں تو اسکا ہر عمل ہماری ہر مشین کی کارگزاری سے کیا کچھ منتہاے کمال کو پہونچا ہوا تفوق نہیں رکھتا مگر انکے اعمال نشو و نما کا طریق تکمیل خالص (اعمال آلیہ) یعنی انسان کی بنائی ہوئی مشین کی کارگذاری سے نہ صرف فائق بلکہ مراحل غامض بدرجہا بعید از فہم، اور غایت مختلف و متبائن واقع ہوا ہے۔

جانوروں کے اپنے شکار کے تعاقب اور اپنی جاے سکونت کی طرف مظہر ارادہ، عود کی طرح انکے اعمال نشو و نما بھی اپنی منزل مقصود کی راہ میں رکاوٹوں پر غالب آنے اور اپنے کو اپنے ماحول میں تغیرات اور اپنے مخصوص مسالک عمل میں متعدد سے مطابق کرکے، سختی سے مشکلات میں پڑکر، یا دق کیے جانے پر بھی تلافی مافات کرکے، اپنے معمول بہ طریقہ کو پھر نئے سرے سے اختیار کرتے ہوے بالاستقلال تمام ان غایات کی طرف رجوع لاتے ہیں جو اس صنف کے دساتیر صنفی و مقتضیاتِ نوعی کے مقتضی ہیں۔

ان مظاہر کا مشین جاریہ میں بڑی دقت نظری سے مدارسہ و مشاہدہ کیا گیا ہے۔ گو ہماری واقفیت اس باب میں ہنوز کچھ ایسی ترقی نہیں کی محض ابتدائی حالت میں ہے، تاہم اتنا معلوم ہوگیا ہے کہ بعض اصناف کی اجنسہ و اجرام نامی سختی سے کاٹ کوٹ یہاں تک کہ دو حصوں میں منقسم بلکہ کلیۃً مسخ کردیے جانے پر بھی اپنے معمولی مقتضاے فطرت اور ممثل الاصالۃ تناسب اور تلازمات کو علی سبیل المعاودہ قائم کرکے پھر اپنے معتاد مسالکِ نشو و نما پر ہو رہتے ہیں۔ اور یوں اپنے صنف کے قبلۂ مقاصد اور غایۃ الغایات کو ہاتھ سے نہ دیتے ہوے اس دائرۂ افعال کو مکمل کرتے ہیں جسکا صرف ایک حصہ انکے والدین کی سعی

نے انجام دیا تھا۔ اس رفیع الوقعت لحاظ سے جسم کی بالیدگی و تعمیر بدن کے تمام نظام [illegible] غیر الارادہ اعمال بھی افعال متعمد مثلاً: چڑیوں کی آشیانہ [illegible] اور شہد کی مکھی کے چھتے بنانے والے جیسے معلوم ہوتے ہیں۔

یہاں کچھ مصنف قالب کی طرف وہی تشبیہ منسوب [illegible] رجحان جو ان کا دونوں پر غالب آتا، غیر معمولی و خلاف عادت احوال سے مطابقت کی [illegible] مداخلت و انقلاب احوال پر بھی جب تک اپنے [illegible] مخصوص [illegible] پلٹ نہیں آتا چین نہیں پاتا [illegible] فرق نمایاں ہے۔ ان دونوں اقسام اعمال میں [illegible] و مزاحمت [illegible] جس [illegible] مدارج سے جو حاصل ہو چکے ہوتے ہیں [illegible] تو پائی جاتی ہے جیسے چڑیاں یا شہد کی مکھیاں نقصان ہوتے [illegible] اور چھتے کی [illegible] کرتی ہیں بلا فرق اسی طرح جراثیم نامیہ بھی قطع [illegible] و تقسیم کر دیئے جانے پر [illegible] اسکے اندر ساخت [illegible] کا کام پھر [illegible] اور معاد مدار اپنی تدوین کی تجدید کرکے مقصود و غایت تک پہنچ کے رہتا ہے۔

کیا اتنی مشابہتوں پر بھی حیوانات کے اعمال [illegible] اعمال بالارادہ [illegible] سے خارج کرکے ان غیر عضوی، بیجان عالم میں زبردستی ٹھونس دیئے جائیں گے جنکو چھو بھی [illegible] نہیں، جہاں خالص تعلیل آلیہ اور اسباب خارجی کا دور دورہ ہے اور جہاں علل باطنہ سرے سے ناپید ہیں۔

سچ ہے کہ نشو و نما کے یہ اعمال حیاتی درحقیقت ایسی تفصیلات پر مشتمل ہیں جو طبیعیات و کیمیا کے حدود سے باہر نہیں جا سکتیں۔ مگر اس سے کیا؟ یہی بات تو کل اعمال بالارادہ پر بھی بے کم و کاست صادق آتی ہے [illegible] نہایت و تمنا [illegible] سوچے ہوئے اور پورے قصد و ارادہ سے عمل میں لائے ہوئے مقاصد انسانی [illegible] بھی بغیر [illegible] اعمال مفصلہ ہی کی اعانت سے انجام کو پہنچتے ہیں۔ بات یہ ہے کہ ان دونوں [illegible] اعمال آلیہ اور اعمال بالارادہ میں جو چیز مابہ الامتیاز ہے وہ عوامل آلیہ پر نہایت نوعی و مقصود صنفی کی طرف بالارادہ رہنمائی کے ذریعہ مساعی بالارادہ کا تصرف اور غلبہ ہے۔ اگر تم اعمال بالارادہ کے مفہوم میں [illegible] دیں کہ وہ عالم حیوانات کی تشکیل اعضا و تکوین عضو کو بھی جاری ہو جائے تو نباتات کے اعمال نمو کو بھی بہت آسانی سے اپنے احاطہ مفہوم میں لے آئے گا۔

اور اس نتیجہ تک پہونچنے کے لیے سائنٹفک دنیا میں معقول دلائل کی کچھ کمی نہیں۔ چنانچہ ماہران علم الحیات، حیوانات و نباتات دونوں کو ایک اور اسی الوجود عضویت سے ایک مدت سے مشتق خیال کرنے پر متفق ہو چکے ہیں۔ جسکو نہ حیوان ہی کہ سکتے ہیں اور نہ نبات ہی۔ اس سے زیادہ صحیح پیرایہ بیان یہ ہیں کہ وہ دونوں صفات حیوانیہ و نباتیہ کی جامع تھا جیسے سر ولیم کروکس نے ام العناصر (Prima materia) کے لیے (Protyle) اور جرمن سائنٹسٹوں نے Urstoff یا مادہ کی مقبول اصطلاح وضع کیں۔ اسی طرح جرمنی ماہرین علم الحیات نے ام الاجسام۔ جامع الحیوانیۃ و نباتاتیہ کے لیے Urmenschen [illegible] اور (Urzeuger) کا قدیم سے وزن الفاظ تجویز کیے ہیں اس سے جو شاخیں پھوٹیں ان کو Protophyta یا قادم النبات جو نباتات کی اصل ہوئے دوسری (Protozoa) یا قادم الحیوان جو مبدا حیوانات ہوا۔

یہ سچ ہے کہ زیادہ تر نباتات منتقل یا اپنے اعضا کو حرکت دینے کی صلاحیت سے کم نصیب ہیں۔ اس محرومی کے باوجود کسی نباتی عضویت ادنیٰ فزیت سے بہرہ ور ہے اسکی حرکت و سکنت تعمد عمل بالارادہ کی مقصود یہ باتوں کے اظہار میں کسی حیوانی افعال سے پیچھے نہیں رہتی جیسا کہ بہتر سے نباتات کی مجاہدی طلاع (Stamen یعنی سوزن گل) یا چند در چند آزادانہ تیرنے والے نباتات سے تفصیل کا حال رہے۔ بلحاظ اکثریت نباتات کے طرز زندگی میں حرکات متعدی و فاعلانہ کی حتیٰ تو یہ ہے کہ سرے سے ضرورت ہی نہیں پڑتی۔ اور بعد یا عمل بالارادہ کے اظہار کا لے دے کے تنہا موقع جو ان کے لیے بچ رہا وہ صرف اعضائے نمو میں ان اعمال میں استقامت الی المقصود یعنی سمت مقصود سے انحراف کی بازو دیے جانے پر بھی پھر اسکو اختیار کرلینے کی مدھش الٰہی طاقت جسکا وہ بڑی افراط سے اظہار کرتے ہیں اس انتہائے کمال کو پہونچی ہوئی پائی جاتی ہے کہ عالم حیوانات بھی اسکی نظیر پیش کرنے سے قاصر ہے۔

ڈوئیرٹ نے صنوبر کے ہادی الاغصان (پہلی شاخ) کو کاٹ ڈالے تو اب جو شاخیں بچ رہیں ان میں کی بلند ترین بہ مرور آہستہ آہستہ افقی وضع کو ترک کرتی ہوئی عمودی ہیات اختیار کر لیتی یہاں تک کہ جڑ اور کھنپائی مسلسل ایک مستقیم خط میں آجاتیں اور حصہ سفلی کے قطر میں سریع ارتقا یا دست جڑکی کمزوری پھر اصلی حالت عود کر آئے۔

بید کی کسی شاخ سے ایک چھوٹا سا ٹکڑا کاٹ کر اُسے نمناک ماحول میں رکھیں۔ شاخ کہیں پرسے لگی ہو، (اوپر سے یا نیچے سے) کسی وضع میں رکھی جائے (اُلٹی یا سیدھی) اس سے کچھ بحث نہیں پتوں کے براعم یا کلیاں اسکے موجودہ بالائی سرے سے پھوٹ کر اوپر کی جانب بڑھیں گی اور جڑیں (سور) اسکے تحتانی سرے یا اسکے قریب سے نکل نکل کے نیچے کی طرف چلیں گی۔ ہم کو اس سے انکار نہیں کہ ان میں اور اُن سے مشابہ لاتعداد لاتحصی مثالوں میں ماہران نباتات ان کثیر التعداد تفصیلات اعمال کو جبلی وساطت سے بہ شکل نوعی اور تشکیل اعضاء مداخلت بیرونی کا تدارک کر کے حصول مقصود و وصول الی الغایۃ کی صریح غرض سے سالک سلوک پر عود کرنے کی عادی ہے۔ طبیعی وکیمیاوی یعنی مادی علل کے معلول کی حیثیت سے بیان کر سکتے ہیں۔ لیکن اس سے کیا؟ اگر انفرادی تفصیلوں سے قطع نظر کر کے اس عمل نمو کو من حیث الکل دیکھیے تو نگاہ حقیقت رس میں یہ عمل ان جہد جہید اور مساعی شاقہ پر جو اسکی اصول الیہ سے توضیح کرنے یا ارادہ سے محروم ثابت کرنے میں صرف کی جاتی ہیں، استہزا کرتا ہوا انکو ہیچ انجام و مذبوحی ثابت کر کے رکھ دے گا۔ اب ہم خادم العلوم و شیفتگان صداقت کو اس اعتراف سے چارہ نہیں کہ اعمال نمو نباتات بھی انسان اور دوسرے اعلیٰ حیوانات کے ان متعمدا اعمال بالارادہ سے مشابہ اور ملتے جلتے ہیں جن کو دنیائے دانش نے اشہاد ارادہ، اظہار اختیار کا اشل الامثلہ اور نمونہ کامل تسلیم کر لیا ہے۔

اکسفورڈ اور ہارورڈ کے پروفیسر کی اتنی حقیقت رس و حقیقت رساں موشگافیوں سے جمہور کی آدھی ضیافت کر کے (جو میری عدم قابلیت سے نان بے نمک سے زیادہ پھیکی بھی مگر اپنی ذاتی خوبیوں کے لحاظ سے نقائص تدقیق کے حق میں نان نخود کی طرح غذا کی غذا اور دوا کی دوا، مصفی خون بھی اور مسمن بدن بھی۔ مزیل المغالطہ بھی اور موسع الخیال بھی ہے) اگر میں فضائے علمی میں کچھ اور بلند پروازی کی سعی میں ترفرف کرتا ہوا اُس مضمون کا تتمہ اس سے متجانس ان خیالات کو بناؤں جن سے اُردو خوان ناظرین میری محدود واقفیت میں ہنوز گوش آشنا نہیں ہوئے اور عصر حاضر کے معدن حکمت و رشاد اور مخزن جدت اجتہاد برگسوئین. [illegible] دماغ کا ابرالنجوم گراں مایہ جوہر ہے جس کا اس وقت (بقول مضمون نگار انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا طبع دوازدہم منشورہ ۱۹۲۲ء) افق شہرت پر کالشمس فی کبد السمٰی

ساعت بساعت بسرعت فائقہ شرف و صعود یورپ و امریکہ کی علمی بصارت و بصیرت کو خیرہ کیے دیتا ہے تو شاید وضع الشیٔ فی محل غیرہ نہ ہوگا۔

موعودۂ بالا قسط انشاء اللہ آیندہ فرصت میں نذرِ ناظرین الناظر کر سکوں گا۔

—سید رضا حیدر فاطمی

جذباتِ سلیم

درِ حق پر جھکا سر، دل میں اطمینان پیدا کر
حوادث سے نہ جو پسپا ہو، وہ ایمان پیدا کر

مہیا کر وہ آنکھیں جن سے دیکھے جلوہ صانع کا
سنے فطرت کے نغمے جن سے، وہ کان پیدا کر

نظر کے سامنے جلوے نئے آتے رہیں ہر دم
ذرا جنبش میں آ، پھر اور نئے ارمان پیدا کر

تری ہستی کے ذرے گر بکھر جائیں تو کیا پروا
لڑی خورشید سے آنکھیں رہیں، وہ آن پیدا کر

دمِ خنجر پہ تیرے سینہ رکھ دوں، اپنا لے قاتل
مرے سینے میں وہ جذبہ - ترے قربان پیدا کر

اڑا لے حسن بے پردہ ہزاروں بجلیاں - لیکن
رہے منظر جو شوقِ دید میں وہ جان پیدا کر

قیامت کا سماں گر دیکھنا ہے تو جوشِ تجربہ کو
تو واں کے ولولوں میں شوق سے ہیجان پیدا کر

حجاب اکبر آگے دیدۂ تر کے نہ کر پیدا
نہ دانائی سے رسم و راہ رکھ نادان پیدا کر

فضائے زہد سے تنگ آ کے لے فضائے عشق اے غافل!
جہاں دوڑیں امنگیں دل کی وہ میدان پیدا کر

فلک کی گردشوں کی زد سے جا نکلا نکل باہر
جنونِ عشق سے سر میں فراواں وران پیدا کر

حقیقت کی کرن پڑتی نہیں باطل بھرے دل پر
اندھیرا گھر میں ہے تو کوئی روشندان پیدا کر

غنیمت جان لے محوِ تمنا عیشِ حاضر کو
نہ دل میں فکرِ فردا سے کوئی خلجان پیدا کر

مگر یہ تماشے زندگی کے اے خدا کب تک؟
نئی دنیا بسا اب اور نئے انسان پیدا کر

وحید الدین سلیم

عباسیۂ بغداد

(مولانا اسلم جیراجپوری کی تاریخ الامۃ کا حصۂ پنجم)

کہتے ہیں کہ خزاں کی آمد بہار سے زیادہ دلکش ہے۔ شب ہجر کی سختی شام وصال سے زیادہ دلفریب ہے۔ مجلس ماتم عیش و طرب کے جلسہ سے زیادہ پُرلطف۔ موت کی تلخی زندگی کی شیرینی سے زیادہ حلاوت بخش اور آنسوؤں کا تار قہقہہ کے پھول سے زیادہ گراں قیمت ہے بلکہ گریۂ نیم شبی سے جو آگاہ ہوا وہ ملک نیم روز ایک جو کے عوض میں خرید نہیں کرتا۔

ممکن ہے کہ ان شاعرانہ خیالات میں مبالغہ ہو لیکن اس میں کلام نہیں کہ درد و غم کی داستان عیش و شادمانی کے بیان سے بہت زیادہ سریع الاثر ہے۔ ایک [illegible] سیکڑوں [illegible] پر ہزاروں واہ واہ قربان ہیں!!

کلیجہ تھام لوگے جب سنوگے [illegible] ئے خدا شیون کسی کا

عرب کے ابتدائی فتوحات کا سیلاب حیرت خیز تھا۔ خلافت راشدہ کی حق پرستی اور وفاشعاری رشک بیز تھی۔ بنی امیہ کے کارنامے تعجب انگیز تھے۔ ہارون اور مامون کی معدلت گستری اور علم و فضل کی قدردانی دل آویز تھی۔ لیکن درد و تاثیر کے اعتبار سے ۲۵۵ھ [illegible] رجب کی ستائیسویں یاد رکھنے کے قابل ہے جبکہ ترکوں نے خلیفۂ بغداد کے قصر کو گھیر لیا۔ معتز اس وقت حرم سرا میں تھا۔ کہلا بھیجا کہ میں بیمار ہوں باہر آنے کے قابل نہیں۔ اگر کوئی ضروری کام ہو تو تم میں سے دو ایک آدمی مجھ سے مل جائیں۔ وہ لوگ اندر گھسے اور پاؤں پکڑ کے کھینچتے اور پیٹتے ہوئے اسکو باہر گھسیٹ لائے۔ اس کا پیرہن پھٹ گیا تھا اور مونڈھوں پر خون کے نشانات تھے۔ گرمی کا موسم، دوپہر کا وقت، اور دھوپ میں تمازت تھی۔ اسی حالت میں اسکو ننگے پاؤں صحن میں پتھر کے فرش پر لا کر کھڑا کر دیا۔ وہ جلن سے جلد جلد ایک پاؤں اٹھاتا تھا اور دوسرا رکھتا تھا۔ قاضی القضاۃ بلایا گیا۔ اس نے معتز کو خلافت سے دست بردار کیا

کا حکم دیا۔ جب اُس نے دستخط کر دیا تو اُسکو وہاں سے ترکوں نے قید خانہ میں لیجا کر بند کیا اور تین دن تک بھوکا پیاسا رکھا۔ آخری وقت میں ایک گھونٹ پانی مانگتا تھا لیکن کسی نے نہیں دیا اور وہ تڑپ تڑپ کر مرگیا۔" (عباسیہ بغداد صفحہ ۳۷)

شوال ۳۲۰ھ کی اٹھائیسویں بھی خون کے حرفوں سے لکھنے کے قابل ہے جبکہ مغربی اور بربری خادموں نے خلیفہ مقتدر پر چڑھائی کی" اُن میں سے ایک نے خلیفہ پر وار کیا وہ زمین پر گر گیا۔ دوسرے نے اُس کا سر کاٹ کے نیزہ پر رکھ لیا اور اُس پر نفرین و لعنت کے آوازے بلند کیے۔ بربریوں نے خلیفہ کے تمام کپڑے یہاں تک کہ پاجامہ بھی اُتار لیا۔ کسی شخص نے برہنہ دیکھ کر ستر پوشی کے لیے اوپر سے گھاس ڈال دی۔ پھر وہیں گڑھا کھود کر اُسکو دفن کر دیا۔" (عباسیہ بغداد صفحہ ۱۰۲)

جمادی الثانی ۳۳۴ھ کی بارھویں بھی عبرت انگیز ہے جبکہ دو دیلمی خلیفہ مستکفی کے پاس گئے" اُس نے خیال کیا کہ یہ میرے ہاتھ کا بوسہ دینا چاہتے ہیں اس لیے ہاتھ اُنکی طرف بڑھایا۔ اُنھوں نے اُسکو پکڑ کر تخت سے نیچے کھینچ لیا۔ اور اُس کا عمامہ کمر میں ڈال کر پاپیادہ معزالدولہ کے پاس لے گئے۔ وہاں قید کر دیا گیا۔ دیلیوں نے قصر خلافت کو لوٹ لیا۔" (عباسیہ بغداد صفحہ ۱۳۶)

ہارون الرشید کا قیصر روم کو درشت پیام اور معتصم باللہ کا عموریہ سے سخت انتقام تو ہنس ہنس کر سنا تھا۔ اب جگر تھام کے بیٹھو مری باری آئی۔

"۳۵۱ ہجری میں دمستق (قیصر روم) عین زربہ کی طرف حملہ آور ہوا۔ ۵۴ اسلامی قلعے فتح کر لیے' اور لاکھوں مسلمانوں کو بے خانماں کر دیا۔ اسکے بعد حلب کی جانب آیا سیف الدولہ نے شکست کھائی۔ اور اُسکے اکثر اقربا مقتول ہوئے۔ دمستق نے اس کا سارا مال و متاع لوٹ لیا۔ گھر کو بھی منہدم کرا دیا۔ نو روز تک شہر کو غارت کیا۔ جس قدر سامان لے جا سکتا تھا لے گیا بقیہ کو آگ لگا دی۔ اور مسلمانوں کے بارہ ہزار بچوں کو پکڑ کر لے گیا۔

. . . .

. . . .

۳۵۴ھ میں قیصر نے مصیصہ کو فتح کر لیا۔ وہاں کے بہت سے مسلمانوں کو تہ تیغ کیا

اور بقیہ کو اپنے ساتھ لے گیا جنکی تعداد تقریباً دو لاکھ تھی - پھر طرطوس کا محاصرہ کیا - اہل طرطوس نے امان طلب کی جو اُس نے منظور کی - لیکن جب شہر کا دروازہ کھول دیا گیا تو حکم دیا کہ جو شخص جس قدر اپنا مال اُٹھا سکتا ہے لیکر یہاں سے نکل جائے - چنانچہ لوگ انطاکیہ کی طرف چلے گئے۔ اُس نے جامع مسجد کو توڑ دیا - اُس میں گھوڑے باندھے - بعض بعض مسلمانوں نے اس مصیبت میں عیسائی مذہب اختیار کر لیا - افسوسناک امر یہ ہے کہ آنکھوں کے سامنے سرحد کے مسلمانوں پر یہ واقعات گذر رہے تھے لیکن مسلمان امرا اپنے اغراض کے لیے باہم گرم پیکار رہتے اور کوئی اس دشمن کی مدافعت کی طرف توجہ نہیں کرتا تھا - ۳۵۸ھ میں قیصر شام میں آیا - طرابلس کو جلا دیا - قلعہ عرقہ کو فتح کیا - پھر حمص میں پہونچکر آگ لگا دی - اور ساحلی بستیوں کو غارت کر ڈالا - مگر کوئی مقابلہ کے لیے نہ گیا -

اس حملہ میں اُس نے جس قدر مسلمانوں کو لوٹا یا قتل کیا اُن کا شمار نہیں کیا جا سکتا - ایک لاکھ سے زیادہ اُن بچوں کی تعداد تھی جنکو پکڑ کر لے گیا - اور نوجوانوں سے سوا کسی کو گرفتار بھی نہیں کرتا تھا - بالعموم جوانوں کو قتل اور بڈھوں کو نکال دیتا تھا

. . . .

. . . .

۳۶۱ھ میں رومیوں نے رہا کو دوبارہ لوٹا - پھر جزیرہ میں نصیبین کی طرف آئے - وہاں قتل و غارت کیا - اور بستیوں کو جلا دیا - دیار بکر کو بھی تاخت و تاراج کر ڈالا - ان مقامات کے باشندے بغداد میں فریاد لیکر پہونچے اور جامع مسجد میں رومیوں کے مظالم بیان کر کے امداد کے خواہاں ہوئے - بختیار اسوقت شکار کے لیے باہر گیا ہوا تھا - اعیان بغداد رنج سے بھرے ہوئے اُسکے پاس گئے اور کہا کہ یہ وقت مسلمانوں کی حمایت کا ہے . . . . اسکے بعد بختیار نے خلیفہ مطیع سے مالی امداد طلب کی - اُس نے جواب دیا کہ جو شخص ممالک سے خراج وصول کرتا ہے اُسکے اوپر جنگ اور اُسکے اخراجات کا بار ہے - میں کچھ نہیں دے سکتا - بختیار نے دھمکی دیکر چار لاکھ درہم وصول کیے جسکے لیے خلیفہ کو حرم کے کپڑے، زیورات، یہاں تک کہ مکانات بھی بیچنے پڑے - یہ رقم جب مل گئی تو بختیار نے جنگ کا ارادہ ترک کر کے اسکو اپنی عیاشی میں صرف کیا "

(عباسیہ بغداد صفحہ ۱۲۱ لغایت ۱۲۴)

ان سب سے زیادہ دردانگیز اور عبرت خیز وہ منظر ہے جبکہ " ۵ ارمحرم ۶۵۶ھ کو ہلاکو خاں اپنے جرار لشکر کو لیکر بغداد کی طرف آیا اور اُس کا محاصرہ کیا۔ خلیفہ کے پاس مدافعت کی طاقت کہاں تھی۔ دس روز کے اندر وہ شہر میں داخل ہوگیا۔ اسکی فوج نے قتل و غارتگری شروع کی اکثر باشندے مارے گئے اور وہ بغداد جو اسلامی عظمت کا گہوارہ، خلافت و امارت کا مرکز اور مشرقی ممالک کا تاج تھا ویران ہوکر اُن متفرق جماعتوں کا مسکن ہوگیا جو ہلاکو کی فوج کے ساتھ آئی تھیں اور جن کا کوئی دین نہ تھا۔

خلیفہ پیشکش کے لیے ایک طبق جواہر لیکر حاضر ہوا۔ ہلاکو نے اُسکو اپنی فوج میں تقسیم کرادیا۔ ابوبکر بن مستعصم کو مع ایک جماعت کے پھانسی دی۔ اور خلیفہ اور اُسکے دوسرے بیٹوں اور خواجہ سراؤں کو ساتھ لیکر بغداد سے روانہ ہوا۔ پہلے ہی مرحلہ میں سب کو قتل کرادیا جس سے خلافت عباسیہ کا آفتاب جو ۵۲۴ سال سے تاباں تھا غروب ہوگیا" (عباسیہ بغداد صفحہ ۲۱۶)

دیدہ بردار اے کہ دیدی شوکت بیت الحرام　　قیصران روم بر سر خاک و خاقاں بر زمیں
خون فرزندان عم مصطفےٰ شد ریختہ　　ہم بر آں خاکے کہ سلطاناں نہادندے جبیں
اے محمدؐ گر قیامت مے برآری سر ز خاک
سر برآور دیں قیامت درمیان خلق بیں

یہ دردناک اقتباسات مولانا اسلم جیراجپوری کی تاریخ الامۃ حصہ پنجم سے لئے گئے ہیں جسمیں عہد متوکل خلیفہ دہم بنی عباس سے مستعصم باللہ آخری خلیفۂ بغداد کے قتل تک حالات درج ہیں اور جو ابھی حال میں مطبع جامعہ ملیہ علیگڈھ سے شایع ہوئی ہے۔

یہ چارسو برس کا عبرت انگیز زمانہ مسلمانوں کی عیش پرستی اور بغداد کی زوال و تباہی کا عہد ہے اور اُسکے ہر ایک ورق پر آنسو بہانے اور پتھر کے دل کو موم بنانے کا سامان مہیا ہے۔

اس دور میں سیف الدولہ حمدانی کے سے جانباز بہادر؛ الپ ارسلان اور ملک شاہ کے سے نامور فاتح، نورالدین زنگی اور صلاح الدین کے سے فدائے ملت؛ نظام الملک اور حسن بن صباح کے سے مدبر اور دانشمند بھی پیدا ہوئے بلکہ علم و فضل میں جو یدطولیٰ مسلمانوں نے اس پُرآشوب عہد

میں حاصل کیا اور جیسے زبردست فقیہ، محدث، زاہد، صوفی، حکیم اور شاعر اس تباہی کے زمانہ میں نصیب ہوئے وہ عروج و ترقی کے وقت بھی میسر نہ آئے تھے لیکن انکی آب و تاب اندھیری رات میں جگنو کی چمک دمک یا گھنگھور گھٹا میں بجلی کی چکا چوندھ تھی جو تھوڑی دیر کے لیے اُجالا کر دیتی تھی اور پھر وہی اندھیرا گھُپ ہو جاتا تھا۔ عیش و عشرت اور اُسکے لوازم امت کے خمیر میں داخل ہو گئے تھے اور ہمدردی، قوم پرستی، وفا شعاری، اور صدق و خلوص کا وجود باقی نہ تھا۔

دولت کی وہ فراوانی تھی کہ مصر کے گورنر نے اپنی لڑکی کی شادی خلیفۂ وقت کے ساتھ کی تو وہ جہیز دیا جسکی نظیر دنیا کی تاریخ میں نہیں مل سکتی۔" اُس کے بیٹھنے کے لیے سونے کا تخت بنوایا تھا جسکے چاروں گوشوں پر مرصع ستون تھے۔ اُن پر جالی دار طلائی قبہ تھا جسکے ہر ایک حلقہ میں ایک انمول موتی سونے کے تار میں لٹکتا تھا۔ جوڑوں کی قیمت کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ صرف ازار بند ایک ہزار ایسے دیئے تھے کہ ہر ایک کا صرفہ بارہ ہزار دینار تھا۔

رخصتی کے وقت مصر سے بغداد تک ہر ہر منزل پر اپنے محل کے مشابہ ایک ایک قصر تعمیر کرا کے سازوسامان سے آراستہ کر دیا اور ہر قسم کی ضروریات ان میں مہیا کر دیں ۔۔۔۔۔ اسی طرح پر مصر سے بغداد تک گویا وہ برابر اپنے باپ کے گھر میں قیام کرتی چلی آئی" (عباسیۂ بغداد صفحہ ۷۳)

یا عمرو بن لیث جب اسمٰعیل سامانی سے لڑنے چلا ہے تو "لوگوں نے کہا کہ اس وقت دریائے جیحون جوش پر ہے اُترنا مشکل ہوگا۔ اُس نے کہا کہ میں چاہوں تو اسکو اشرفیوں سے پاٹ کر عبور کر سکتا ہوں"۔ (عباسیہ بغداد صفحہ ۱۰)

لیکن اسی کے ساتھ خلیفۂ اسلام اور نائب رسول کے محل میں صرف شراب اور شربت وغیرہ کا ماہواری صرف تین ہزار دینار تھا (صفحہ ۶۵) انصاف پرستی کا یہ زور شور تھا کہ امیر المومنین کا وزیر "ایک بار گھوڑے پر سوار جا رہا تھا۔ راستہ میں ایک فریادی نے عرضی پیش کی۔ رکاب سے پاؤں نکال کر اس زور سے اُسکے سینے پر مارا کہ وہ مرگیا"۔ (عباسیہ بغداد صفحہ ۲۰) ۔ اور بوڑھی عورتوں کی یہ عزت کی جاتی تھی کہ خلیفہ مقتدر کی ماں جبکہ مرض استسقا میں مبتلا تھی اُس سے قاہر نے کہا کہ "سلطنت کی ساری دولت تم نے جمع کر رکھی ہے وہ ہمارے حوالہ کردو۔ بولی کہ میرے پاس بجز سامان وغیرہ کے کچھ نہیں ہے۔ قاہر نے اُسکو پٹوایا۔ سخت بے حرمتی کی اور ایسی بدترین سزائیں

دیں جو لکھنے کے قابل نہیں ہیں لیکن اُسکے پاس کچھ نقدی برآمد نہیں ہوئی" (عباسیہ صفحہ ۱۰۵)

نبی اُمّی کی معجزنا تعلیم نے مختلف اللون، مختلف الوطن، اور مختلف اللسان باشندوں کو ایک قوم بناکر بھائی بھائی کردکھایا تھا۔ اگر عہد اس کے سیدارہ میں شامیوں کو اذیت پہونچتی تو حجاز کے ریگستانی بدو اُس تکلیف کو اپنی مصیبت سمجھتے اور خیال کرتے تھے کہ ہزاروں کوس کے فاصلہ پر انکے ہم مذہبوں کی بے سروسامانی میں انکی پریشانی ہے

چو عضوے بدرد آورد روزگار　　دگر عضوہا را نماند قرار

لیکن تیسری صدی ہجری کے بعد یہ خیالات دفتر پارینہ ہوگئے تھے۔ مسلمانوں کو نہ مذہب کا پاس تھا نہ زبان کا لحاظ، اور نہ قوم کی ہمدردی۔ خلیفہ ناصر خوارزم شاہ کو تباہ کرنے کے لیے چنگیز خاں کو بلاتا ہے اور وزیر ابن علقمہ بغداد کی اینٹ سے اینٹ بجانے کو ہلاکو سے سازش کرتا ہے۔!!

دم گفتار نالے حلق میں چھریاں چبھوتے ہیں
زباں تک ٹکڑے ہو ہو کر مرا افسانہ آتا ہے

مسلمانوں کی بدافعالی اور بے حمیتی نے اُنکی قوم کو جو تقی اور چھٹی صدی ہجری میں شایستہ دُنیا کے لیے قابل نفرت بنا دیا تھا۔ وہ خود ایک دوسرے کی عزت نہیں کرتے تھے تو غیر مذہب والے انکی آبرو کا پاس و لحاظ کیوں کرتے؟ مولانا سلمہٗ نے "عباسیہ بغداد" کے آخری دس صفحے زوال دولت عباسیہ کے اسباب پر بحث کرنے میں صرف کیے ہیں لیکن انکی تباہی کا اصل راز جسکو مولانا نے صاف الفاظ میں ظاہر کرنا مناسب نہیں سمجھا۔ مسلمانوں کی خود غرضی، نفس پرستی، اور اخوت دینی کا فقدان تھا!! ایران، عراق، عرب، اور شام کی سرزمین بڑے بڑے فاضل، مدبر، اور شجاع پیدا کرتی ہے لیکن جماعت مسلمین کی خودغرضی کسی اصلاح کو مستحکم نہیں ہونے دیتی اور ہر ایک جدید ریاست دو نسلوں کے بعد ویسی ہی پراگندہ ہوجاتی ہے جیسی کہ اس کی پیشرو حکومتیں تھیں۔

ہرحال۔ تاریخ اسلام کا وہ غم و الم انجام عہد جو ۲۳۲ھ سے شروع ہوکر ۶۵۶ھ میں ختم ہوتا ہے، نہایت غور و تعمق سے پڑھنے کے قابل ہے اور اس عہد کی دردناک کہانی یقیناً خلافت راشدہ اور بنی امیہ کی داستان فتوحات سے بہت زیادہ موثر اور نتیجہ خیز ہے۔ طوائف الملوکی کا دور ہے۔ صوبہ صوبہ میں جداگانہ حکومتیں قائم ہیں اور نئی سلطنتیں اور جدید وزارتیں ہرروز ...

دوسرے دن مٹ جاتی ہیں۔ خواجہ آتش نے گویا اسی زمانہ کی بابت لکھا ہے کہ

خانہ تھا گنجینہ کا ہر اک قصر شہر عشق
گھر گھر تھیں بادشاہیاں گھر گھر وزارتیں

یہ خود مختاری اور سلطنت وجاہ کے ولولے جس طرح قومی ہمدردی کی معدومی ثابت کرتے ہیں، اسی طرح مسلمانوں کی دماغی قابلیت اور شجاعت کے بھی گواہ ہیں۔ دولت وعشرت نے مذہب کو پژمردہ کردیا لیکن جو روح اس نے پھونکی وہ ہنوز زندہ تھی اور ممکن تھا کہ مصائب اور پریشانیوں کا "فرشتۂ رحمت" جو بندہ کو آقا کے حضور میں کشاں کشاں واپس لاتا ہے دوبارہ اس مردہ قوم کی اصلاح کرتا اور پھر مہذب دنیا کے سامنے سر اٹھانے کے قابل بنا دیتا۔ ایسا ہوا یا نہیں؟ اسکی تفصیل کا ابھی وقت نہیں آیا۔ تاریخ الامۃ کی جلد ششم و ہفتم سے معلوم ہوگا!!

اس عہد میں تمام دنیائے اسلام جو کسی وقت ایک نظام میں منسلک اور ایک مرکز سے وابستہ تھی بالکل ایک دوسرے سے الگ ہوگئی تھی اور ساری امت کا شیرازہ بکھرا ہوا تھا۔

"(۱) اندلس میں بنی امیہ کی سلطنت تھی اور عبد الرحمٰن ناصر خلافت کا دعویدار تھا۔

(۲) افریقہ میں ادارسہ اور اغالبہ کے کھنڈروں پر دولت فاطمیہ قائم ہوچکی تھی۔ یہ لوگ بھی خلافت کے مدعی تھے۔

(۳) مصر میں دولت اخشیدی قائم تھی ......

(۴) حلب کا امیر سیف الدولہ علی بن عبد اللہ بن حمدان تھا ......

(۵) جزیرۂ فراتیہ میں ناصر الدولہ حسن بن عبد اللہ حمدانی کی حکومت تھی ....

(۶) عراق بنی بویہ کے قبضہ میں تھا ......

(۷) عمان۔ یمامہ۔ بحرین اور سواد بصرہ میں قرامطہ کا تسلط تھا ....

(۸) فارس اور اہواز میں خلیفۂ عباسی اسکے بعد علی بن بویہ عماد الدولہ کا نام خطبہ میں ہوتا تھا۔

(۹) بلاد جبل اور رے میں خلیفہ اور رکن الدولہ حسن بن بویہ کا نام لیا جاتا تھا۔

(۱۰) جرجان اور طبرستان آل سامان اور دشمگیر کے باہمی منازعات کے جولانگاہ تھے۔

(۱۱) خراسان اور ماوراء النہر جس کا صدر مقام بخارا تھا بنی سامان کے زیر حکومت تھے۔" (عباسیۂ بغداد۔ صفحہ ۱۲۴ و ۱۲۵)

یہ حالت ۶۴۳ھ میں تھی۔ جب اتابکوں کا زور ہوا تو اس سے بھی زیادہ ٹکڑے سلطنت کے ہوگئے۔ بغداد کی تباہی کے وقت اسلامی ممالک کی حسب ذیل حالت تھی :۔

"(۱) غرناطہ اندلس میں بنی نصر کی حکومت قائم ہوچکی تھی
(۲) شمالی افریقہ میں موحدین کی دولت تھی۔
(۳) الجزائر میں دولت زیانیہ یغمراس بن زیان نے قائم کرلی تھی۔
(۴) تونس میں بنی حفص میں سے ابوعبداللہ امیر تھا۔
(۵) مراقش میں دولت مرینیہ تھی اور حکمراں ابو یوسف تھا۔
(۶) مصر میں ممالیک بحری ایوبی حکومت پر قابض ہوگئے تھے اور نورالدین علی تخت پر تھا۔
(۷) یمن میں دولت رسولی تھی اور مظفر بن یوسف برسر حکومت تھا۔
(۸) صنعا میں ائمۂ زیدیہ میں سے متوکل شمس الدین امام تھا
(۹) روم میں سلاجقہ میں سے رکن الدین قزل ارسلان چہارم کا عہد تھا۔
(۱۰) ماردین میں دولت ارتقیہ کے تخت پر نجم الدین غازی تھا۔
(۱۱) فارس کے اتابکیہ سلغریہ میں سے ابوبکر بن سعد زنگی (شیخ سعدی کا ممدوح) تھا۔
(۱۲) لورستان کے اتابکیۂ ہزار اسپیہ کا بادشاہ دکلہ تھا۔
(۱۳) کرمان پر قتلغ خاتون کی حکومت تھی۔
(۱۴) ہند میں نصرالدین محمود دہلی کے تخت پر تھا۔" (عباسیہ بغداد صفحہ ۲۲۷ و ۲۲۸ تلخیص)

زوال و تباہی بغداد کے مورخ کو ان سب حکومتوں کے حالات مفصل لکھنا چاہیے تھے۔ مگر مولانا اسلم نے ان ریاستوں کا تذکرہ نہایت مجمل کیا ہے۔ سیف الدولہ۔ عضدالدولہ۔ الپ ارسلان نورالدین اور صلاح الدین اس سے بہت زیادہ توجہ کے مستحق تھے جتنی کہ ان کے حال پر "عباسیہ بغداد" میں کی گئی۔ عمر خیام۔ امام غزالی اور نظامیہ یونیورسٹی کا تذکرہ اس عہد میں لازمی تھا جو تالیف زیر بحث میں نظر نہیں آتا۔ بیت المقدس کی مکرر فتح اس عہد کا ایک مہتم بالشان واقعہ ہے۔ گر مولانا اسکی تفصیل سے بھی خاموش ہیں۔ قیاس ہوتا ہے کہ وہ دول سلجوقیہ وایوبیہ وغیرہ کے متعلق اپنی کتاب کے جداگانہ حصے مرتب کرنے والے ہیں ورنہ یہ خامیاں انکی تالیف میں دستیاب نہ ہوسکتیں۔

غرض "عباسیہ بغداد" مسلمانوں کی قوم کا ایک مرثیہ ہے اور جو کچھ اس میں لکھا ہے خوب لکھا ہے ۔ اگرچہ یہ دعویٰ نہیں کیا جا سکتا کہ اس میں نقائص نہیں ہیں ۔
بیسویں صدی میں ہندوستان کے مسلمانوں کے لیے یہ تالیف تازیانۂ عبرت ہے ۔ کاش وہ اب بھی خواب غفلت سے بیدار ہوں اور اُنکے اسلاف نے شیرازۂ اسلامی کے بکھرنے سے جو مصائب برداشت کیے تھے اُن سے آشنا ہوکر آیندہ کے لیے نصیحت حاصل کریں
مہاتما گوتم کا قول ہے کہ طلب حق میں جب مرشد کامل کے پاس رسائی ہوئی تو سلوک کی پہلی منزل تمام ہو جاتی ہے ۔ خدا کرے کہ بغداد کے اس دردناک مرثیہ کو پڑھ کر مسلمانان ہند کی اصلاح کا پہلا زینہ طے ہو جائے اور وہ اُن برائیوں کے ترک کرنے کا عہد کرلیں جو اس کتاب کے ہر ورق پر اُنکے بزرگوں کے دامن کو داغدار ثابت کرتی ہیں ۔ کتاب کی قیمت صرف عہ ہے اور "مولانا اسلم جیراج پوری ۔ جامعہ ملیہ علیگڈھ" سے مل سکتی ہے ۔ امیر احمد علوی ۔ نیمچ چھاؤنی

انعامی مضمون

اصحاب ذیل کے مضامین وصول ہوے ۔ اور شرائط مقابلہ کے بموجب ہونے کی بنا پر مجلس انتخاب میں جانچ کے لیے پیش کر دیے گئے :-

(۱) مولوی سید نجیب اشرف ندوی بی اے رفیق دار المصنفین اعظمگڈھ
(۲) منشی محمد عبد اللطیف صدیقی طالب علم ایف اے کلاس لکھنؤ
(۳) مولوی محمد یوسف متعلم مدرستہ الاصلاح سرائے میر
(۴) منشی محمد یحییٰ تنہا بی اے وکیل غازی آباد
(۵) مولوی محمد منظور، فاضل الہ آباد
(۶) مولوی محمد سعید انصاری، جامعہ ملیہ اسلامیہ ۔ علیگڈھ

جناب حکیم سید شاہ انیس احمد قادری الرزاقی (داود نگر ضلع گیا) کا مضمون صرف ۱۶ صفحے کا تھا جو شرائط مقابلہ کے سراسر منافی ہے اور اس بنا پر خارج کرنا پڑا ۔
مولوی محمد جلال صاحب توفیق نے حیدرآباد سے مہلت طلب کی تھی اور اُنکو اطلاع بھی دیدی گئی تھی کہ وہ اپنا مضمون آخر ماہ جنوری تک ارسال فرمادیں مگر اُن کا مضمون وصول نہیں ہوا ۔ واللہ اعلم کیا سبب ہے ۔
نتیجہ انشاءاللہ تعالیٰ آیندہ نمبر میں درج کیا جائے گا ظفر الملک

مغلیہ سلطنت کے زوال کے اسباب

بمبئی کے باؤلے تاجر کے قتل کے سلسلہ میں جس بازاری عورت کے ساتھ ایک ہندو والیِ ریاست کے ناجائز تعلقات کا چرچا آج کل اُردو اور انگریزی اخباروں میں نہایت شد و مد کے ساتھ ہو رہا ہے پنجاب کے ایک مُنہ پھٹ اور زبان دراز ہندو اخبار نے حال میں اُسکی طرف اشارہ کرکے مسلمانوں پر ایک نہایت سُوقیانہ چوٹ کی جس کا پنجاب ہی کے ایک مسلمان اخبار نے دندان شکن جواب دیا اور "قدیم" اور "جدید" واقعات کے حوالوں سے اِس شیشے کے گنبد میں رہکر کنکریاں پھینکنے والے ایڈیٹر کے گھر کو جوابی پتھراؤ سے چکنا چور کر دیا۔ کلوخ انداز را پاداش سنگ ست۔

ہندو اخبار نے ایسی بیہودہ بات کہکر، جو خود اُسی کی طرف پلٹ آنے والی تھی، اپنی تہی مغزی کا ثبوت دیا، لہذا وہ بات تو ہرگز اس قابل نہیں کہ کوئی سمجھدار آدمی اُسے توجہ سے سُنے اور سنجیدگی سے سوچے مگر جواب میں شاہان مغلیہ کا ذکر آگیا تھا جس نے تاریخ کے طالب علم کو پھر بھولا سبق یاد دلا دیا اور سلسلۂ خیال کہاں سے کہاں پہونچا دیا۔

ہندوستان کی بادشاہی تیمور کے خاندان میں کم و بیش سَوا تین سو برس رہی۔ مورخوں کا اتفاق ہے کہ بابر اور ہمایوں تو قصرِ سلطنت کی داغ بیل ڈالنے اور بنیاد رکھنے والے تھے اس عالی شان عمارت کو مکمل کرکے اُس میں جلال و جبروت کے ساتھ جلوس کرنے والے اکبر۔ جہانگیر۔ شاہجہاں اور اورنگ زیب عالمگیر تھے۔ عالمگیر اول کے بعد اس میں شکست و ریخت شروع ہوئی اور عالمگیر ثانی کے مرتے ہی ساری عزت زمین پر آ رہی۔ اسکے بعد جو ہوئے وہ مغلیہ سلطنت کے بادشاہ نہیں، مُغلی تکیے کے شاہ جی تھے۔

زوال اور انحطاط کے اسباب ہر مورخ بلکہ ہر شخص اپنی سمجھ کے مطابق بیان کرتا ہے۔ کوئی کہتا ہے اس کا سبب عالمگیر کا غیر مسلموں کے ساتھ ظلم و تعصب تھا۔ کوئی کہتا ہے تازہ دم قوموں یعنی سکھوں اور مرہٹوں کا عروج۔ کوئی کہتا ہے انگریزوں کی حکمت عملی۔ اصلی قوی سبب تاریخ کے صفحوں پر لکھا آنکھوں کے سامنے ہے مگر اُس پر نظر نہیں پڑتی اور پڑتی ہے تو اس بے پروائی سے کہ گویا وہ اصلی سبب ہے ہی نہیں۔

شمس العلما محمد حسین آزاد نے دربار اکبری کے اوراق پر الفاظ کا جو دربار سجایا ہے اُس میں اکبر کی

لیناروں کا بیان بہت مزے لے لے کر لکھا ہے۔ اس بیان میں ایک لفظ سے خیال ہوا کہ شاید اصلی سبب وہ سمجھ گئے ہیں، مگر اگلے فقروں نے سمجھا دیا کہ کچھ نہ سمجھے اور سمجھے بھی تو سمجھانا نہیں چاہتے۔ وہ لکھتے ہیں :۔

"یہ لیناریں بابری بلکہ تیموری و چنگیزی خون کے جوش تھے کہ اکبر پر ختم ہو گئے۔ اسکے بعد کسی بادشاہ کے دماغ میں ان باتوں کی بو بھی نہ رہی۔ بننے تھے کہ گدی پر بیٹھے تھے۔ ان کی قسمتیں لڑتی تھیں اور امرا فوجیں لے کر مرتے پھرتے تھے۔ اس کا کیا سبب سمجھنا چاہیے؟ ہندوستان کی آرام طلب خاک، باوجود گرمی کے سرد مہر ہوا، اور بزدل پانی، روپے کی بہتات، سامان کی کثرت، یہاں جو انکی اولاد ہوئی، ایک نئی مخلوق ہوئی۔" (ص ۲۰)

آزاد کی جادو نگاری اور طلسم کاری مسلّم۔ لیکن آرام طلب خاک، سرد مہر ہوا، بزدل پانی، روپے کی بہتات اور سامان کی کثرت تو آج بھی ویسی ہی بلکہ اُس سے بدرجہا زیادہ ہے جیسی اور جتنی محمد شاہ پیا کے زمانہ میں تھی۔ پھر کیا بات ہے کہ موجودہ مغربی حکمراں قوم ابتدائی کمپنی کے زمانہ سے اب تک تین سو برس پورے کر لینے پر روز افزوں طاقت کے ساتھ آج بھی باقی ہے اور بظاہر ابھی بہت دنوں رہیگی؟

تاریخ میں اکبر کے حالات پڑھو۔ چاہے وہ ابوالفضل کے قصیدہ نگار قلم کے بجائے بداؤنی کے واقعہ نویس قلم ہی کے لکھے ہوں۔ جہاں تم یہ دیکھو گے کہ اکبر جاہل تھا، بد مذہب تھا، دین الٰہی کا موجد تھا، وہیں یہ بھی دیکھو گے کہ وہ جری اور جفاکش سپاہی تھا کہ یلغاروں میں ہفتوں کی راہ دنوں میں طے کرتا تھا۔ بلند ہمت اور اولوالعزم فاتح تھا کہ برسوں میں تسخیر ہو سکنے والے ملکوں کو مہینوں میں فتح کر لیتا تھا۔ تجربہ کار اور صاحب تدبیر جنرل تھا کہ حملوں میں تھوڑی سی فوج سے ٹڈی دَل لشکروں کو زیر و زبر کر دیتا تھا۔ باخبر اور رعایا پرور بادشاہ تھا کہ جن ملکوں کو فتح کرتا تھا وہاں کا قرار واقعی انتظام کرتا اور مختلف الاقوام رعایا کو غلام بنانے کی جگہ عاشق بنا لیتا تھا۔ وہ بہادر تھا، نڈر تھا، غیر متند تھا۔

بارہ تیرہ ہی برس کا بچہ تھا کہ باپ کے مرنے پر، کھیل کود سے ہٹا کر بیرم خاں کی اتالیقی میں تخت پر بٹھا دیا گیا۔ بیرم خاں سمجھا تھا کہ لڑکے کی آڑ میں شکار کھیلے گا، مگر لڑکے کی رگوں میں صاحبقراں[1] اور ژندہ پیل[2] کا خون تھا۔ اُس نے چار ہی برس بعد بیرم کو رستہ بتا کر سلطنت کی باگ اپنے ہاتھ میں لی اور تخت پر

---

[1] امیر تیمور گورگان صاحبقراں۔ اکبر کے باپ ہمایوں کا مورث اعلیٰ۔

[2] شیخ الاسلام حضرت سید ژندہ پیل احمد جام فیشاپوری۔ اکبر کی ماں حمیدہ بانو کے مورث اعلیٰ۔

سنبھل کر بیٹھا۔ جانتے ہو اُسوقت اُسکی حکومت کی حد کہاں سے کہاں تک تھی؟ لاہور سے لیکر آگرہ کے قرب وجوار تک۔ مگر بہادر اور مدبر نوجوان شاہ نے حدود کو وسعت دینی شروع کی اور عمر بھر کی محنت اور کوشش سے ہندوستان کے چھوٹے بڑے ٹکڑوں کو کہیں تلوار سے، کہیں تدبیر سے سمیٹ کر اپنی قلمرو میں شامل کر لیا۔ یہاں تک کہ ۱۲۱۰ھ ۱۸۰۵ء میں جب مرا ہے تو، حال کی جغرافی اصطلاح میں احاطۂ مدراس، ریاست حیدرآباد اور احاطۂ بمبئی کا جنوبی مغربی حصہ چھوڑ کر، ہندوستان کا کل براعظم اور بورا افغانستان اُسکے زیرنگیں تھا۔

اسکے بعد مروّج الدین۔ عالی گہر۔ شاہ عالم کے حالات پڑھو۔ شہزادگی کے زمانے میں جبکہ تیس تیس برس کے ادھیڑ تھے، ستر برس کے بڈھے باپ کو اکیلا دشمنوں میں گھرا چھوڑ کر وزیر کے ڈر سے گھر سے نکل بھاگے۔ سہارنپور۔ فرخ آباد۔ بدایوں۔ بریلی۔ لکھنؤ کی خاک چھانتے عظیم آباد پہونچے اور میر جعفر کے ناخواندہ مہمان ہوئے۔ وہیں پڑے تھے کہ عماد الملک وزیر نے دِلّی میں بادشاہ کو قتل کر دیا۔ باپ کی موت کی خبر سُن کر جگہ سے نہ ہلے بلکہ ۱۱۷۳ھ ۱۷۵۹ء میں عظیم آباد ہی میں نام کی بادشاہی کے مالک بنے۔ شجاع الدولہ وزیر کے ساتھ ہو کر انگریزوں سے لڑے۔ کمپنی کی فوج کے ہاتھوں بکسر کے میدان میں ایسی بُری طرح شکست کھائی کہ بادشاہی کا رہا سہا بھرم کھُل گیا اور کمپنی کے اقتدار کا سکہ سارے ہندوستان میں بیٹھ گیا۔ شکست کے بعد ہی جنرل منرو کو قلم خاص سے شقۂ تہنیت لکھا جس کا مضمون یہ تھا کہ "میں خوشی سے نہیں لڑا، بلکہ وزیر کا قیدی ہوں خدا کے لیے مجھے قید سے چھڑاؤ اور معاوضہ میں بزرگوں کی ہڈیاں جتنی چاہو لے لو"۔ اسکے بعد ہی فاتح فوج کے پیچھے پیچھے الہ آباد پہونچے۔ یہاں ندی سے نکل کے کنوئیں میں گرے۔ یعنی شجاع الدولہ کی قید سے چھوٹ کر جنرل اسمتھ کی قید میں پھنسے۔ اسی حالت میں وہ تین صوبے جن کی مردم شماری تین کروڑ نفوس اور محاصل سالانہ چار کروڑ روپے تھے اور جن کی تسخیر میں باپ دادوں کو برسیں لگی تھیں اتنی دیر میں، جتنی دیر میں بقول فارسی مورخ کے "خرید و فروخت اسپ راہوار بل خر بار بردار ہم نمی تواند شد"۔ کمپنی کی نذر کر دیے۔ اور سلطنت کے تخت کے بجائے کھانے کی میز کے اوپر مسند آرا ہو کر سند عطائے دیوانی بنگال و بہار و اڑیسہ پر مہر مبارک ثبت فرمادی۔ اسکے بعد کنوئیں سے بھی نکل کر بھاگے تھے کہ آگ میں گر پڑے۔ یعنی کمپنی کی قید سے نکلے تھے کہ مرہٹوں کے ہاتھ میں گرفتار ہو گئے جو اُس وقت ہند کی سلطنت کے مالک اور اکبر کے تخت پر قابض تھے۔ مرہٹوں کی ذرا آنکھ چوکی تھی کہ پٹھان چڑھ دوڑے اور خزانہ کا روپیہ پیسہ بلکہ شہزادیوں کے ہاتھ گلے کا گہنا زیور تک ہتیا لے گئے اور جاتے جاتے غلام قادر خود بدولت

کو بینائی کی دولت تک سے محروم کر گیا۔ مدتوں اس عذاب میں گرفتار رہنے کے بعد انگریزوں کی ملکی مصلحت نے مرہٹوں کا استیصال کیا۔ جنرل لارڈ لیک نے کوٹھری سے نکالا اور تخت پر مرنے کے لیے بٹھا کر پھر تاج پہنایا گیا۔ ۱۲۲۱ھ / ۱۸۰۶ء میں اس عیش پرست، تن پرور، پست ہمت، بدعقل، متلون مزاج، ڈرپوک اور بےغیرت زندگی کا خاتمہ ہوا۔

قلم کانپتا ہے کہ یہ الفاظ اُس شخص کی شان میں لکھنا پڑے جو مجاور ہی مگر گورگانی اور صاحبقرانی جبروت کے مقبرے کا مجاور تھا۔ مگر کیا کیجیے پہلی تصویر سے مقابلہ کے لیے دوسری تصویر بھی اس طرح کھینچنی پڑی کہ سب خط و خال نمایاں ہو جائیں۔ اب غور سے دیکھو اور سچائی سے جواب دو۔ دونوں تصویروں میں کسی بات میں خفیف سی بھی مشابہت ہے؟ اگر نہیں تو کیوں نہیں؟

کیا تم کہہ سکتے ہو کہ کمزور دل عالمگیر ثانی اور بزدل شاہ عالم کے جسموں میں بھی وہی تیموری خون تھا جو شیر دل بابر اور دلیر دل اکبر کی رگوں میں بجلی کی تیزی سے دوڑتا تھا؟ تم جواب نہیں دے سکتے۔ ذرا صبر کرو۔ اس کا جواب تاریخ کے معمل میں اکبر کے جانشینوں کے خون کے تجزیہ و تحلیل کیمیاوی کے بعد ابھی دیا جاتا ہے۔

پہلے تین باتیں ذہن نشین کر لو:۔

۱۔ انسان کے جسم میں خون کی مقدار طبی قاعدہ سے کتنی ہی ہو، حساب کی آسانی کے خیال سے اُسے دو سیر مانا گیا ہے۔

۲۔ یہ فرض کر لیا گیا ہے کہ بچہ کے جسم میں آدھا خون باپ کا اور آدھا ماں کا آتا ہے۔

۳۔ فرق دکھانے کے لیے ولایتی خون کو دودھ اور ہندی خون کو گنگا جل کا نام دیا گیا ہے۔

اب دیکھو:۔

نام بادشاہ	رگوں میں مادۂ سیال کا وزن اور نام	نام رانی مع نام شہزادہ جو اُسکے بطن سے ہوا	رگوں میں مادہ سیال کا وزن و نام
جلال الدین اکبر ابن ہمایوں	دو سیر دودھ	جے پوری رانی دختر راجہ بہاری مل کچھواہہ والی ریاست جے پور[1] اسکے بطن سے جہانگیر ہوا۔	دو سیر گنگا جل

[1] منتخب التواریخ ملا عبدالقادر بدایونی مطبوعہ کلکتہ جلد ۲ صفحہ ۵۰۰ - مآثر الامرائے تیموری مطبوعہ کلکتہ جلد ۲ صفحہ ۱۱۳ - بلیس اورینٹل بائیوگرافیکل ڈکشنری لندن ص ۱۰۰ و ۱۹۱ و ۲۲۴ - امرائے ہنود ص ۷۷

نورالدین جہانگیر ابن اکبر	ایک سیر دودھ اور ایک سیر گنگا جل	بالمتی جودھا بائی دختر مہاراجہ اودے سنگھ راٹھور والی ریاست جودھپور [۵۲] اسکے بطن سے شاہجہاں ہوا	دو سیر گنگا جل
شہاب الدین شاہجہاں ابن جہانگیر	آٹھ چھٹانک دودھ اور ایک سیر آٹھ چھٹانک گنگا جل	ارجمند بانو ممتاز محل دختر آصف خاں اسکے بطن سے عالمگیر ہوا	دو سیر دودھ
محی الدین عالمگیر ابن شاہجہاں	ایک سیر چار چھٹانک دودھ اور بارہ چھٹانک گنگا جل	نواب بائی دختر راجہ راجو والی ریاست کشتوار راجوری کشمیر [۵۳] اسکے بطن سے بہادر شاہ ہوا	دو سیر گنگا جل
قطب الدین محمد معظم بہادر شاہ ابن عالمگیر	دس چھٹانک دودھ اور ایک سیر چھ چھٹانک گنگا جل	نظام بائی لال کنور [۵۴] اسکے بطن سے جہاندار شاہ ہوا	دو سیر گنگا جل
معز الدین جہاندار شاہ ابن بہادر شاہ	پانچ چھٹانک دودھ اور ایک سیر گیارہ چھٹانک گنگا جل	انوپ بائی [۵۵] اسکے بطن سے عالمگیر ثانی ہوا	دو سیر گنگا جل
عزیز الدین عالمگیر ابن جہاندار شاہ	ڈھائی چھٹانک دودھ اور ایک سیر ساڑھے تیرہ چھٹانک گنگا جل	لال کنور [۵۶] اسکے بطن سے شاہ عالم ہوا	دو سیر گنگا جل
مروج الدین شاہ عالم ابن عالمگیر ثانی	سوا چھٹانک دودھ اور ایک سیر پونے پندرہ چھٹانک گنگا جل		

تحلیل کیمیاوی کا نتیجہ تم نے اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا؟ کسی ایک واقعہ میں ذرا سی غلطی یا حساب میں ذرہ بھر فرق ہو تو کہو - سوا چھٹانک دودھ اور ایک سیر پونے پندرہ چھٹانک گنگا جل! جل جلالہٗ!!

یہ قصہ کہانی نہیں ہنسی مذاق نہیں - ٹھوس واقعہ اور ٹھیٹ سچائی ہے - تم اپنے طور پر ایک سیر پونے پندرہ چھٹانک پانی میں سوا چھٹانک دودھ کی بوندیں ڈالو اور انصاف سے بتاؤ کہ تم اس مرکب کو کیا کہو گے - کیا یہ دودھ ہو گیا ہے؟ کیا یہ پانی رہ گیا؟ کیا یہ دو سیر خالص دودھ کا کام دے سکتا ہے؟

---

۵۲ بداؤنی ج ۲ ص ۱۳۳ - مآثر الامراء ج ۲ ص ۱۸۱ - بیل ص ۲۰۲ و ۳۶۳ و ۲۰۷ - امرائے ہنود ص ۴۹ -

۵۳ مآثر عالمگیری - مآثر الامراء - خافی خاں ج ۲ ص ۲۶۴ و ۵۹۴ و ۶۰۴ - تاریخ اورنگ زیب جادوناتھ سرکار جلد اول ص ۶۱ -

۵۴ مآثر عالمگیری - بیل ص ۱۹۰ و ۲۰۰

۵۵ بیل ص ۴۹ و ۴۲

۵۶ بیل ص ۱۱۹ و ۲۶۱ و ۳۲۸

کیا یہ صاف پانی کی جگہ پینے یا نہانے دھونے میں استعمال ہو سکتا ہے؟ اگر نہیں اور ہرگز نہیں تو پھر سمجھ لو کہ سوا چھٹانک تیموری خون، ایک سیر پونے پندرہ چھٹانک مجہول ہندو خون میں مل جانے کے بعد اصلی اور صحیح تیموری خون کی حرارت۔ غیرت اور جرأت کیسے پیدا کر سکتا ہے!

ہم نے چھانٹ کر جن سات رانیوں کے نام گنائے وہ ایسی ہیں کہ اُن کے پتی بھی ملک دھاری تھے اور پِتر بھی ملک دھاری ہوئے۔ اور اس لیے نسب کا سلسلہ اوپر سے نیچے تک سیدھا چلا آیا جس سے خون کی مقدار کا صحیح حساب ہو سکا۔ ورنہ قلعہ میں تو ہندو رانیوں کی اتنی کثرت تھی کہ محل کو رنواسا کہنا زیادہ موزوں تھا!

ذیل کی فہرست پر ایک نظر ڈالو۔ اگرچہ اسکے مکمل ہونے کا دعویٰ نہیں کیا جا سکتا۔ ممکن ہے اب بھی بہت سی رانیوں کے نام رہ گئے ہوں مگر جتنے لکھے ہیں تاریخی ثبوت کے ساتھ لکھے ہیں:۔

نام بادشاہ و شہزادہ	نام رانی	تاریخی حوالہ
بادشاہ اکبر	۱۔ جے پوری رانی دختر راجہ بہاری مل کچھواہہ والی جے پور	بداؤنی ج ۲ ص ۵۰۔ ماثر الامرا ج ۲ ص ۱۱۱۔ بیل و ٹیل بائرنی ص ۱۰۸ و ۱۹۱ و ۲۴۴۔ امرائے ہنود ص ۷۰
	۲۔ دختر راجہ کلیان مل والی بیکانیر	بداؤنی ج ۲ ص ۳۳
	۳۔ دختر راجہ ڈونگر پور	ماثر الامرا ج ۲ ص ۱۱۲۔ امرائے ہنود ص ۸۸
	۴۔ تارا رانی	بیل
	۵۔ من بھاوتی رانی	بیل
بادشاہ جہانگیر	۶۔ جے پوری رانی دختر راجہ بھگوان داس کچھواہہ والی جے پور	بداؤنی ج ۲ ص ۳۴۱۔ ماثر الامرا ج ۲ ص ۱۰۲۔ خافی خاں ص ۲۴۵۔ بیل ۱۰۶ و ۲۲۰ و ۳۶۲۔ امرائے ہنود ص ۸۲
	۷۔ بال متی جودھا بائی۔ دختر راجہ اودے سنگھ راٹھور والی جودھ پور	بداؤنی ج ۲ ص ۳۴۳۔ ماثر الامرا ج ۲ ص ۱۸۱۔ بیل ص ۲۲ و ۳۶۲ و ۴۰۷۔ امرائے ہنود ص ۴۹
	۸۔ دختر راجہ رائے سنگھ پسر راجہ کلیان مل راٹھور والی بیکانیر	بداؤنی ج ۲ ص ۳۵۲۔ ماثر الامرا ج ۲ ص ۱۵۲۔ بیل ص ۳۲۵۔ امرائے ہنود ص ۲۱۴
	۹۔ دختر راول بھیم والی جیسلمیر	بیل ص ۲۳۷۔ امرائے ہنود ص ۲۸۵
	۱۰۔ دختر راجہ کیشو داس راٹھور پسر راجہ جے مل	بیل ص ۲۱۰

	۱۱۔ دختر راجہ جگت سنگھ کچھواہہ پسر مرزا راجہ مان سنگھ	ماثر الامرا ج ۲ ص ۱۷۵۔ خافی خاں ص ۲۵۹۔ امرائے ہنود۔ ص ۱۴۵۔
	۱۲۔ دختر راجہ رامچند بندیلہ والی اورچھا	ماثر الامرا۔ ج ۲ ص ۲۱۳۔ امرائے ہنود۔ ص ۱۰۰۔
شہزادہ پرویز ابن جہانگیر	۱۳۔ دختر راجہ سورج سنگھ راٹھور والی جودھپور	بیل۔ ص ۱۳۹
شہزادہ مراد بخش ابن شاہجہاں	۱۴۔ سرستی بائی	ماثر الامرا ج ۲ ص ۱۰۵۔ خافی خاں ج ۲ ص ۱۵۵۔ جادوناتھ سرکار ج ۲ ص ۹۸۔
شاہزادہ شجاع ابن شاہجہاں	۱۵۔ دختر راجہ کنور سین کشتواری	امرائے ہنود ص ۲۶۰
شہزادہ سلیمان شکوہ ولد دارا شکوہ	۱۶۔ دختر راجہ گج سنگھ راٹھور ولد راجہ سورج سنگھ	بیل ص ۱۳۹۔ خافی خاں۔
بادشاہ عالمگیر	۱۷۔ نواب بائی دختر راجہ راجو والی ریاست کشتوار	ماثر عالمگیری۔ ماثر الامرا۔ خافی خاں ج ۲ ص ۲۶۴ و ۵۹۴ و ۶۰۴۔ جادوناتھ سرکار ج ۱ ص ۶۱
محمد اعظم ابن عالمگیر	۱۸۔ دختر راجہ دیبج سنگھ والی آسام و عزیز راجہ کوچ بہار ۱۹۔ بائی اتم گیر	ماثر عالمگیری ص ۳۰ ماثر عالمگیری ص ۲۲۴
کام بخش ابن عالمگیر	۲۰۔ کلیان کنور۔ منوہر پوری رانے دختر امر سنگھ زمیندار منوہر پور	خافی خاں ج ۲ ص ۱۰۵۔ ماثر عالمگیری ص ۱۱۴
محمد سلطان ابن عالمگیر	۲۱۔ بائی بھوپ پی دختر راجہ کشتوار	ماثر عالمگیری ص ۱۴۰
بادشاہ محمد معظم بہادر شاہ ابن عالمگیر	۲۲۔ دختر راجہ روپ سنگھ راٹھور برادر عمزاد مہاراجہ جسونت سنگھ ۲۳۔ نظام بائی لال کنور	ماثر الامرا۔ ج ۲ ص ۲۷۰۔ ماثر عالمگیری ص ۳۷ و ۴۹ ماثر عالمگیری۔ بیل ص ۱۹۰ و ۳۰۰
بادشاہ جہاندار شاہ ابن بہادر شاہ	۲۴۔ انوپ بائی ۲۵۔ لال کنور	بیل ص ۴۹ و ۷۴ بیل ص ۱۹۰ و ۲۲۶۔ زبدۃ الاخبار قلمی ص ۱۰۴ و ۱۰۵
شہزادہ عظیم الشان ابن بہادر شاہ	۲۶۔ دختر کیرت سنگھ یا کیسری سنگھ	ماثر عالمگیری ص ۱۶۷ و ۱۶۲
بادشاہ فرخ سیر	۲۷۔ دختر مہاراجہ اجیت سنگھ پسر مہاراجہ جسونت سنگھ۔ جودھپور	بیل ص ۴۵ و ۱۳۰۔ زبدۃ الاخبار قلمی ص ۱۰۹۔ امرائے ہنود ص ۷۱۔ یہ آخری راجپوتنی تھی جو مغلی حرم سرا میں آئی

بادشاہ محمد شاہ	۲۸- ادروھم بائی	بیل-ص ۴۲ و ۲۸۴ و ۳۰۸ و ۴۰۷-عماد السعادت-
بادشاہ عالمگیر ثانی	۲۹- بیاں کنور	بیل ص ۱۰۹ و ۳۶۱ و ۴۳۸
بادشاہ اکبر ثانی	۳۰- لال بائی	بیل ص ۹۵- اسکے بطن سے خاتم السلاطین سراج الدین بہادر شاہ ظفر پیدا ہوئے

یہ راج کمار یاں تیموری قلعہ میں آنے کے بعد اپنے دھرم کے مطابق پوجا پاٹ کرتی تھیں- ٹھاکر جی کو جل پھول چڑھاتی تھیں، تلک لگاتی تھیں، پرکرما کرتی تھیں، ہَوَن کرتی تھیں[۵۱]-
یہ بھی سُنا ہے کہ ہندو رانیوں کا ڈولا لانے کے بعد، تیموریوں نے باستثنائے اورنگ زیب[۵۲] علی اللہ مقامہ کے، اسلامی سنتِ ختان کو بھی قلم اُٹھا دیا تھا تاکہ غیر جنسیت کا خیال تک نہ آنے پائے؟ جس نسل نے اپنے خون، اور اپنے حالات کو یہاں تک بدل دیا ہو اسکے بقا کی تم کیا اُمید رکھ سکتے تھے! کُندا برہمچاری[۵۳] کے اوتار، مہابلی مہاراج اکبر نے مسلم ہندو خون نے میل کی جو رسم قائم کی اور جس پر (اور صرف اُسی پر) اُسکے جانشینوں نے آخری وقت تک[۵۴] عمل کیا، اُس رسم نے اور صرف اُسی رسم نے تیموری نسل، تیموری خون، اور تیموری حمیت کو گنگا کی منجدھار میں ڈبو دیا!!

۵۱ قلعہ کے محل میں ایک طرف پر کھنڈر دوسری طرف مندر کے آثار اس وقت تک پائے جاتے ہیں- جس سے صاف طور سے معلوم ہوتا ہے کہ محلات شاہی میں راجاؤں کی بیٹیوں کو اپنے مذہب کے رسوم اور عبادت کرنے کی پوری آزادی حاصل تھی"- امرائے ہنود-ص ۵۰

۵۲ "سُنت سنیۂ ختنۂ تازہ نہال حشمت محمد اکبر تقدیم رسید"- ماثر عالمگیری-ص ۳۸
"سُنت ختان بادشاہزادہ محمد کام بخش زیب سرانجام و حُسن اقدام یافت"- ماثر عالمگیری ص ۱۲۷

۵۳ "اکبر کے سامنے ایک پراچین پتر اپیش ہوا کہ الہ آباد میں کُندا برہمچاری (جس نے اپنا سارا بدن کاٹ کاٹ کر ہَوَن کر دیا تھا) اپنے چیلوں کے لیے ایک اشلوک لکھ کر رکھ گیا تھا کہ ہم عنقریب ایک با اقبال بادشاہ ہوکر آئیں گے اُس وقت تم بھی حاضر ہونا- بہت سے برہمن بھی اُس پتر سے کے ساتھ حاضر ہوئے اور عرض کی کہ جب سے آج تک مہاراج پر دھیان لگائے بیٹھے ہیں- حساب کیا تو معلوم ہوا کہ اُس کے مرنے اور اکبر کے پیدا ہونے میں صرف تین چار مہینے کا فرق تھا"- دربار اکبری ص ۸۴- نیز دیکھو بداؤنی ج ۲ ص ۲۳۶-

۵۴ سب سے آخری بادشاہ سراج الدین بہادر شاہ ظفر جس عورت سے پیدا ہوئے تھے اُس کا نام لال بائی تھا- دیکھو بیل ص ۹۵-

میں کہتا ہوں کہ سلطنت مغلیہ کے انحطاط و زوال کے اسباب بادشاہوں کی کاہلی، عیش پرستی، خود پسندی، بے ہمتی، بزدلی اور نالائقی تھے اور یہ اسباب پیدا ہوئے محض خون کی خرابی (اور اس لیے خیالات کی پستی) سے۔

میرے کہنے کا یقین نہ ہو تو ایک نہایت مستند رائے پیش کرتا ہوں: فرانس کے مشہور فلسفی، مستشرق، مورخ، مصنف ڈاکٹر گستاولی بان نے اپنی بیش بہا تصنیف 'تمدن عرب' میں عروں کے تنزل کے اسباب گناتے ہوئے ایک قوی سبب اُن کا ادنیٰ قوموں کے ساتھ میل جول اور شادی بیاہ بتایا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:-

"ان مختلف اقوام .... کے ازدواج و امتزاج کی وجہ سے عربی خون کی خاصیت بہت جلد بدل گئی" (ص ۵۴۹)

"ایک ہی ملک میں مختلف اقوام کا گھُل مل جانا ہمیشہ تباہی کا باعث ہوتا ہے۔ تاریخ نے ثابت کر دیا ہے کہ ..... حکومت قائم رکھنے کے لیے ..... نہایت ضروری ہے ..... کہ فاتح قوم مفتوح قوم سے ازدواج و امتزاج نہ کرے اور اُن میں گھُل مل نہ جائے۔ عربوں نے اس ..... کا کبھی خیال نہ کیا۔ رومیوں نے کچھ دنوں اس کا خیال رکھا اور اُن کا تنزل اُسی دن سے شروع ہوا جس دن سے اُنھوں نے اس امر کا لحاظ رکھنا چھوڑ دیا" (ص ۵۵۰)

"عرب برابر اُن اقوام سے جنکے ساتھ رہتے سہتے ازدواج و امتزاج کرتے رہے .... اس ازدواج و امتزاج سے اُنکے قومی خصائص کا تلف ہو جانا ایک لازمی امر تھا۔ ...... محض یہ امتزاجِ اقوام ...... اُنکے تنزل کے لیے کافی تھا" (ص ۵۵۱)

فقیر مسعودن العلی

لعبتِ ماضی

حالِ ما ہست زبوں، تار و سیہ مستقبل — باید از ماضی شیریں سخنے یاد کنم
باد بو انشگم از مار رکھن در صحرا — چمنے از ہیں اور اق گل آباد کنم
لیک آں لعبت فرسودہ ترا نفریبد — بہ چہ لے کودکِ دل خاطر تو شاد کنم

محمد مسلم

شکستہ دل

شمشاد کے خصائل کے اس تجزیہ میں اُسکے اطوار و عادات کے اس انعکاس میں رنگ آمیزی کو ذرہ برابر بھی دخل نہیں۔ فطرت انسانی کے مختلف اشکال میں یہ صورت مفقود تو نہیں مگر کمیاب ضرور ہے۔ میں اُن چند لوگوں میں سے ہوں جن کو اس کیرکٹر کے نکات کو نگاہِ تعمق سے معائنہ کرنے کے مواقع حاصل ہوئے ہیں، اس تحریر کا ایک ایک حرف ایک ربع صدی کے تجربات و مشاہدات پر مبنی ہے کیونکہ ہم لوگوں کے اولین تعارف کو اتنا ہی عرصہ گذر چکا ہے۔ آہ! وہ بھی کیا ایام مسرت تھے جب کالج کے داخلہ پہ ہم لوگ متعارف ہوئے، جسم میں خونِ شباب تھا اور دل میں آرزوؤں کا جوش، بلند خیالات کی فراوانی تھی، افکار سے مستغنی تھے۔ اب کیا ہے؟ نہ وہ سن و سال، نہ جسم کی وہ توانائی۔ میں اُس عہد کے صرف دو روزے دوبارہ محفوظ ہونے کے لیے کیا کچھ دینے کے لیے طیار رہوں مگر اس سودے کا کرنے والا کون ہے؟ افسوس، کوئی نہیں!

عام لوگوں کی نگاہ میں شمشاد میں خوش مزاجی کا فقدان تھا۔ اور ان کی رائے تھی کہ درشتی اور تلخی اُس کے مزاج کا جزو لاینفک ہیں۔ وہ اُس کی سادگی اور صاف گوئی کو ہدفِ ملامت بناتے اور اسکو اسکی ہر حرکت کے لیے موردِ الزام ٹھہراتے مگر جمہور کی ان مخالف رائے نے اُسے کبھی اپنے نفع کیلئے بھی متفکر نہیں کیا۔ اُن حضرات کو جمہور کے روبرو سرِ تسلیم خم کرنا اپنا فرض اولیں خیال کرتے ہیں وہ انکا ناپسندیدگی سے دیکھتا تھا۔

وہ اُنکی اس رغبت کو طبیعت کے ضعف اور اخلاق کی کمزوری پر محمول کرتا اور کہتا کہ زمانہ ہمیشہ اصلیت سے ناآشنا رہا ہے اس کی اس حقیقت ناآشنائی سے مرعوب ہو جانا کیا معنی؟ اس نظریہ کو پیشِ نظر رکھنے سے وہ جمہور کی اُن سرگوشیوں سے جن کا انحصار محض سطح النظری پر ہوتا ہے، متأثر نہیں ہوا۔ شمشاد طبعی طور پر سادہ حسنِ اخلاق کا دلدادہ تھا، تصنع سے اُسے فطرتاً نفرت تھی مگر چونکہ سوسائٹی کے ہر فرد کے اخلاق میں تصنع کی آمیزش موجودہ تہذیب میں ازبس ضروری ہے لوگ اُسکے رویہ کو آدابِ محفل کے خلاف کہتے اور سرگوشیاں کرتے مگر انجام کیا ہوتا، کچھ نہیں!

ابلہانِ محفل کے وہ طالبِ خندہ، لطائف جو اُن کی نظر میں تو مذاق و دلچسپی کے تمام پہلوؤں پر حاوی ہوتے مگر حقیقتاً ظرافت کا شائبہ تک نہیں رکھتے، اُسے ازراہ اخلاق خنداں و متبسم بننے

پر مجبور نہ کر سکتے تھے۔ اسی طرح وہ کسی کے خلافِ فطرت بیانات پر کوئی کلمۂ تنقید زبان پر نہ لاتا اور بجائے اسکے کہ اکثریت کی فطرت کے مطابق تہذیب کو دخل دے کر انکو کراہۃً تسلیم کرے، انکی صداقت کو مشکوک خیال کرتا اور انکو قبول کرنے سے صاف انکار۔ یہ صاف گوئیاں لوگوں کو چراغ پا کرتیں اور اُسے بداخلاقی کا مجرم قرار دیتیں۔ افراد مجھے بھی نظر استعجاب سے دیکھتے کہ کس طرح مجھ سے اور شمشاد سے اس قدر تعلقات ہیں مگر وہ غالباً اس حقیقت سے ناآشنا تھے کہ سمندر کی متلاطم امواج جو سطح آب پر طوفان برپا کر دیتی ہیں، عمیق تہوں میں اپنا ذرا بھی اثر نہیں رکھتیں۔ عظیم الشان جہاز کا ان لہروں کے غیظ و غضب سے پتہ نہیں چلتا، کوئی شے ایسی حالت میں سطح پر متہیج ہوئے بغیر نہیں رہتی مگر پانی کے عمق میں کمزور سے کمزور چیز ان انقلابات سے متاثر نہیں ہوتی، وہ بجنسہ ساکت و خاموش رہتی ہے۔ بس اسی طرح اگر وہ شمشاد کی اس "بدتہذیبی" کو دانشمندانہ طریقے سے نظر انداز کرتے اور اُس کے پُر از خلوص دل کی گہرائیوں میں متلاشی ہوتے تو اُن پر حقیقت کا انکشاف ہوتا۔

سادگی کی اس پاسداری اور تصنع کی اس مخالفت کے سلسلہ میں یہ امر بھی قابل تحریر ہے کہ "حسنِ کامل" کی وہ متحرک تصاویر جو اپنی عشوہ طرازیوں سے ہر متنفس کو مثل دیوار مجسمۂ حیرت بنا دینا، اپنا حق تصور کرتی ہیں، اس کے سکون قلب میں کچھ بھی تغیر نہ پیدا کر سکتی تھیں۔ ایسے بتانِ ماہ رُو جنکی بے محابا نگاہیں ناز و انداز سے متاع دل پر قابض ہو جانے کے ہنر سے خوب واقف تھیں، اُسکے خیالات میں ذرا بھی ہیجان نہ پیدا کر سکتے تھے۔ خوبصورت صیاد جو اپنے فن میں شہرۂ آفاق تھے اپنے تمام جالوں کو یہاں بیکار اور اپنے اسلحہ کو ناکارہ پاتے تھے۔ اُنکے خرامِ ناز کی وہ مستانہ لغزشیں جو ہر قدم پر صدہا فتنے برپا کر دیتی ہیں، اُس کی ایک نظر غائر کی بھی اہل نہ تھیں۔ "دزدیدہ نظریں" اُسکے لیے کشش کے بجائے گریز پائی کا موجب ہوتیں۔ وہ کہتا کہ انکی ہر ادا، ہر انداز میں آمیزش تصنع ہے، اُنکی نگاہوں کے عمیق پردوں میں وہ نورِ معصومیت جلوہ گر نہیں جو ایک دوشیزہ کی پاک ملکیت ہے، اُنکے حرکات میں وہ حیا و شرم کی دلفریبی نہیں جو قدرت صنف نازک کے معصوم طبقہ کو ودیعت کرتی ہے اور اُنکی چال میں وہ معصومانہ سحر نہیں جو پاکباز ہستیوں کے لیے مخصوص ہے۔ بھولا پن اُسکے نزدیک حسن کی روح ہے اور اسکی تکمیل پر حسن حُسن نہیں رہتا اور

حسین حسین نہیں رہتا - ایک پیکرِ دلفریبی اُس وقت تک قابلِ پرستش ہے جب تک اُسے اپنے حسین ہونے کا علم نہ ہو - اس رمز سے آشنا ہو جانا معصومیت کا خون ہے اور پھر تصنع اور خودنمائی کا اُسکا جانشیں ہو جانا ایک فطرتی امر !!

لٹریچر سے اُس کا خاص شغف اور خصوصاً شاعری سے اُس کی دلچسپی بھی لائق بیان ہے - وہ حقیقی معنوں میں شاعر تھا ، اُسکی ہر نظم ایک وجدانی ذوق کی آئینہ دار ہوتی تھی ، اُسکے اشعار میں "خالِ سیہ" اور "زلفِ شکیں" کی تعریف کی اُمید رکھنا لاحاصل تھا - اُسکے نزدیک گل و بلبل کے افسانے اپنی فرسودگی سے پریشان کن ہو چکے تھے - اب موزوں طبائع کو فطرت کی طرف اپنی عنانِ توجہ منعطف کرنا تھی ، بندش کی سادگی ، خیالات کی بلند پروازی ، خوبیِ بیان ، پاکیزگیِ نظم کے شواہد پیش کرتی تھیں اور فصاحت ان سب پر گویا جلا تھی - اُسکے کلام کا مطالعہ اس امر کا مظہر ہوتا تھا کہ شاعر کے دل میں دیگر شعرا کی طرح یاس و محرومی کے جذبات متہیج نہیں ہیں - ایسا معلوم ہوتا کہ وہ دل جو اپنی تلاش میں کامراں ہو چکا ہے ، جو منزلِ مقصود پر پہونچ چکا ہے ، جو حصولِ وصل سے مطمئن ہے ، جو صرف اب کیفِ مسرت اور نشۂ آسودگی سے مخمور رہے گویا ہو رہا ہے - اور یہ حقیقت تھی کیونکہ مناظرِ قدرت اور نقوشِ فطرت ہر وقت جلوہ فرمائی میں مصروف رہتے ہیں اور اپنی عنایات میں تخصیص کا لحاظ نہیں کرتے - حسنِ بشری جس کے خیالات کا تبدل عشاق کے سروں پر رنج و محن کی سیاہ گھٹائیں چھا سکتا ہے ، اپنا پرتو مناظرِ قدرت پر نہیں ڈال سکتا - وہ نظم میں فارسی و عربی کے اُن ثقیل الفاظ کا بھی مخالف تھا جو تصنع کے وجود کے ذمہ دار ہوتے ہیں - استعارات سے خالی اور مبالغہ سے مبرا ہندی اشعار اُس پر ایک وجد طاری کر دیا کرتے تھے - زبان کی بیساختگی اُسکو مسحور کر دیتی تھی ، وہ پڑھتا اور اُسکی دلگدازی سے بیتاب ہو ہو جاتا - حقیقتہً ہندی شاعری حیات روح میں تموجات پیدا کرتی اور دل کی رگ رگ کو مضطرب کر دیتی ہے !!

میرے مطامحِ نظر شمشاد سے ایک صنف خیالات میں ہمیشہ مختلف رہے - وہ جب کبھی سہ پہر یا صبح کو میرے ساتھ چہل قدمی کے لیے جاتا ، ایسے آراء کا اظہار کرتا جس کی تائید مجھ سے نا ممکن ہوتی - مجھے یہ دیکھ کر افسوس ہوتا کہ وہ فطرت کی دلفریبی میں محو ہو جاتا ہے اور کہتا ہے کہ خوبصورتی کی اس سے بہتر نمائش کہیں اور نہیں ہو سکتی - اُس کا قول ہے کہ قدرت وہ سادہ رنگوں کی بہار دکھاتی ہے ، وہ

وہ سینری وہ نظارے پیش نگاہ کرتی ہے کہ دل عش عش کرنے لگتا ہے۔ دیکھو یہ خوبصورت سبزہ، یہ دلکش سبز وادیاں، یہ درختوں پر مرغان چمن کے چہچہے، یہ فضا میں چھوٹی چڑیوں کا پیہم رقص، یہ تمام عالم پر مائل غروب آفتاب کی طلائی شعاعوں کی جالا، یہ قوس قزح کی رنگینیاں اور یہ کہکشاں کی جلوہ آرائیاں بس حسن و دلکشی میں نظیر نہیں رکھتیں۔ فطرت پر اتنا اظہار تعشق میں مبالغہ سے تعبیر کرتا ہوں میں نیچر کی دلکشی کا قائل ضرور ہوں، میری نظریں اُس سے سُرور و نور کی تحصیل ضرور کرتی ہیں مگر یہ سب کچھ ایک حد تک ہے۔ اسکے تسلیم کرنے کے ساتھ ہی میں اس اعتراف سے بھی گریز نہیں کرتا کہ نیچر کی خوبصورتی نامکمل ہے، اُسکو دلفریبی کا معیار قرار دینا نادرست ہے، صنعت بشری مقابلۃً کامیاب ہو سکتی ہے۔ یہ حقیقت کہ انسان جب کسی میدان یا صحرا میں پہونچتا ہے، اپنی شخصیت کو ذلیل خیال کرنے لگتا ہے، اُس میں اور دیگر مخلوقات میں امتیاز باقی نہیں رہتا۔ میرے احساس خودداری کو آتشیں انگلیوں سے ٹھیس لگاتی ہے۔ ایک عمارت انسان کی قابلیت کا ادنیٰ نمونہ ہے مگر اُسکے نظارہ سے اُسے اپنی قوت ولیاقت کا احساس ہوتا ہے۔ یہ فطرت کی رنگ آمیزی انسان کی صنعت کے روبرو عرق انفعال سے نہا جاتی ہے۔ بس فرق یہ ہے کہ فطرت کی دسترس بڑے پیمانہ پر ہے انسان کی ایک مختصر پیمانہ پر۔

چار سال کی موانست کے بعد دست قسمت نے ہم لوگوں کو علیحدہ کیا۔ اوائل فراق کے زمانے میں ہم لوگوں پر کیا گذری؟ یہ کچھ ہمارے دل ہی جانتے ہیں۔ بس اس عرصہ میں زخمہائے الفت کا اندمال اُس کی تحریر کا رہین منت رہا۔ اُسکے یہاں دولت کے تبسم کا انعکاس تھا مگر برخلاف اسکے مجھے ضروریات زندگی کے تمام افکار اور کسب معاش کی تمام پیچیدگیوں سے سابقہ۔ اتفاق وقت، وہ اپنے والد کے انتقال سے اپنے کاموں میں ایسا مصروف اور میں کشمکش حیات میں ایسا مبتلا ہوا کہ مسلسل دو سال تک ملاقات نہ ہو سکی۔ اب پیمانۂ صبر لبریز ہو چکا تھا اور آرزوئے ملاقات مدارج انتہا پر تھی۔ شمشاد سے اس عرصہ میں متواتر تقاضے دعوت بھی وصول ہو چکے تھے لہذا میں نے رخت سفر درست کیا۔

میں منزل مقصود پر صبح سویرے پہونچا، وقت کی روح پروری سے دل باغ باغ تھا۔ قصبہ کے اسٹیشن پر اسٹیشن ماسٹر جھنڈی لیے کھڑے تھے۔ صورت سے مترشح تھا کہ ابھی ابھی خواب سے بیدار

بیدار ہوئے ہیں، ٹوپی کے نیچے پریشان بال ذرا ذرا نظر آرہے تھے، چہرہ پر بدحواسی کے آثار تھے۔ میں نے اپنے پہونچنے کی تاریخ سے شمشاد کو اطلاع نہیں دی تھی۔ اُس وقت اسٹیشن سے شمشاد کے مکان تک کی ہوا خوری نہایت ہی مفرح ثابت ہوئی۔ نسیم سحری کے طراوت بخش جھونکے آرہے تھے۔ سرزمین کے گوشہ گوشہ میں فطرت کے فیاضانہ تبسم کا انعکاس تھا، ذرہ ذرہ نیچر کی طلعت ریزیوں سے جگمگا رہا تھا۔ کھیتوں میں خوبصورت تیتری رقص بہم کر رہی تھیں، اور میں ناہموار سڑک پر ہچکولے کھاتا چلا جا رہا تھا۔ کچھ عرصہ بعد گاڑی ایک کوٹھی کے سامنے رک گئی۔ اس [illegible] کے اشارہ نے میرے سکون قلب کو سکتہ میں ڈال کر یک بیک ایک ہیجان [illegible] پیدا کر دی۔ نوکر نے اطلاع دی کہ سرکار اپنے باغ میں تشریف رکھتے ہیں، آپ تشریف رکھیے، [illegible] اطلاع کرتا ہوں۔ مگر مجھے اتنا صبر کہاں تھا، میرے قدم ایک بے اختیارانہ انداز سے نوکر کا تعاقب کر رہے تھے۔ [illegible] باغ کی چہار دیواری میں داخل ہوا۔ شمشاد ایک سبزہ خطہ پر اپنی عادت کے موافق خیالات میں مستغرق اور دنیا و مافیہا سے بےخبر بیٹھا تھا، اُس کے انداز نشست و طریقہ فکر میں ذرا بھی تبدیلی نہ تھی۔ مجھے دیکھتے ہی مسرور و شادمان ہو کر اپنی جگہ سے اچھل پڑا اور دوڑ کر بغلگیر ہوا۔ اُس وقت ہم دونوں کی مسرت [illegible] سے متجاوز تھی۔!!

جب اضطراری کیفیت ذرا دور ہوئی، میں نے گرد و پیش نگاہ کی تو مجھے نیچر کی پرستش کے عجیب و غریب کرشمے نظر آئے۔ یہ صحرا نما 'باغ' طلوع آفتاب کی ہموار کرنوں کے زرد نور میں غرق تھا۔ معمول کے موافق دلپسند روشیں اور خوشنما کیاریاں یہاں نظر نہ آتی تھیں۔ پھولوں کے وہ پودے جو بغیر مدد انسانی نمو سے قاصر رہتے ہیں، وہاں موجود نہ تھے۔ پانی کے وہ حوض اور حوض کے وہ فوارے جو آج کل عام طور پر پارکوں کے باعث شان ہوتے ہیں، وہاں تعمیر نہیں کیے گئے تھے۔ یہاں باغ کی 'ترکیب' ہی مختلف تھی۔ ہر چیز کو اس کی فطری راہ پر چھوڑ دیا گیا تھا۔ ایک طرف ناہموار زمین پر بغیر ترتیب و تدوین خودرو جھاڑیاں لگی ہوئی تھیں۔ جا بجا بڑے بڑے گھنے درخت سایہ فگن تھے، اُنکی پتیاں تمام حصۂ زمین پر بکھری ہوئی تھیں۔ دوسری طرف ذرا برابر زمین پر سبز مخمل کی چادر بچھی ہوئی تھی۔ قریب ہی ایک چشمہ رواں تھا۔ درختوں کی لرزاں پتیاں اور متحرک شاخیں اُس میں منعکس ہو رہی تھیں۔ سطح آب پر پتیوں کا سکوت گویا اُن کا خواب تھا۔ چھوٹی چھوٹی مچھلیاں ادھر اُدھر تیرتی پھرتی تھیں۔ ہرن ادھر اُدھر چوکڑیاں بھر رہے تھے، خرگوش اپنی قلانچوں سے 'باغ' کے عرض و

طول کی پیمایش میں مصروف تھے اور ان سب کو مرغان چمن نغمۂ آزادی سنا سنا کر اور بھی مست و مسرور بنا رہے تھے ــــــ شمشاد سے معلوم ہوا کہ اُس نے یہ باغ اپنے زیر اہتمام تعمیر کرایا ہے اور اُس میں اُن تمام تصنعات اور "اصولوں" کو نظر انداز کیا ہے جن سے نیچر کی اہانت ہوتی ہے!!

ہر چند کہ میرے خیالات اس وقت بغاوت و مخالفت پر تُلے ہوئے تھے مگر میں اس قسم کا کوئی کلمہ زبان پر لانا مناسب نہیں خیال کرتا تھا۔ شمشاد بار بار اُس مسرت کا اظہار کرتا تھا جو ہم لوگوں کی ملاقات کا نتیجہ تھی۔ میں جو ان دو سال کے عرصہ میں تنازع للبقا کی باریکیوں سے آشنا ہو چکا تھا، اپنے تجربات و مشاہدات کے بیان میں مصروف تھا۔ اب دنیا کی دوستی کے راز مجھ پر آشکارا تھے۔ "خلوص" و "خود غرضی" کے "معانی بین السطور" سے میں واقف تھا۔ وہ میری زبان سے احباب و اعزا کی بدعہدیوں کے افسانے سنتا تھا، میرے نوحۂ بال گسل اور مرثیۂ روح فرسا پر آہ سرد بھرتا تھا۔ اور کہتا تھا کہ دیکھو، میری رائے کیسی صائب تھی کہ "اس دنیا میں صرف چند نفوس قابل اعتماد ملیں گے"۔

تین سال چٹکی بجاتے گذر گئے، یہ زمانہ میرے صحیفۂ زندگی کے زریں اوراق سے تعلق رکھتا تھا، فراوانی راحت کے جملہ سامان کی فراہمی نے میرے مزاج میں استغنا کی تخم پاشی کر دی تھی۔ اس عرصہ شمشاد کا شوق سیاحت کشاں کشاں اُسے یورپ اور امریکہ لے گیا مگر جوا مر ہر اُسکے شناسا کو انگشت بدنداں کر دیتا تھا، یہ تھا کہ شمشاد ولایت سے واپس آیا تو حقیقی آزادی وہیں چھوڑ کر آیا۔ تاہم زندگی کے اس آغاز میں یہ بات بھی نمایاں تھی کہ شرف انتخاب کسی معصوم ہندوستانی دوشیزہ کو حاصل ہونے کی بجائے ایک نیلگوں چشم والی لیڈی کو حاصل تھا، جس کے حسن کی دلاویزی آجکل بغیر آمیزش تصنع کسی طرح مکمل نہیں ہو سکتی۔ اُسکے خطوط سے معلوم ہوا کہ وہ ایسے ہی سلسلہ جنبانی سے ایسے محبت بھرے دل کا مالک ہوا ہے جس میں "دکھاوے" کا شائبہ تک نہیں مگر میرا دل خود بخود اس بیان کی تردید کرتا تھا۔ آج واقعات سے روشن ہے کہ وہ تردید صداقت پر مبنی تھی!!

جب مجھے یہ اطلاع ملی کہ مسز شمشاد میاں کے تمول سے مستفید ہو کر غائب ہو گئیں میرے جذبات میں استعجاب کا ذرا بھی عنصر شامل نہ تھا۔ ہاں، اضطراب صرف اس بات کا تھا کہ شمشاد جسے معمولی دوستوں کی بیوفائی سخت رنج پہونچاتی تھی اب کتنا شکستہ دل ہوگا۔ اُسکے وطن سے بعض

بہت ستوحش خبریں وصول ہوئیں اور میرا دل ازراہ ہمدردی اُس کے دیکھنے کے لیے بیتاب ہوگیا ویسا ہی موسم تھا، مگر دل اُس سُرور سے معمور نہ تھا۔ وہی زمانہ تھا مگر وہ لطف مفقود تھا۔ نسیم سحری کے وہ جھونکے جو اُسوقت لطف اندوز ثابت ہوئے تھے، آج سائیں سائیں کرکے نکل جاتے تھے۔ فطرت نے گویا سرزمین نقدیہ سے اپنی عنایات بھی واپس لے لی تھیں۔ شمشاد سے ملنے کے وقت میرے پیر تھر تھر کانپ رہے تھے، دل کی عجب حالت تھی، ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اُسکے غم کا میرے دل میں پورا پورا عکس اُتر آیا ہے۔ مگر شمشاد کی کیا حالت ہے؟ آہ! جب وہ سین یاد آتا ہے تو سینہ میں ہوک اُٹھتی ہے۔ زانو پر سر رکھے ایک ایسی محویت میں بیٹھیا تھا کہ میرے پہونچنے کی بھی اُسے خبر نہ ہوئی۔ حرکات سے عیاں تھا کہ حواس میں فرق آگیا ہے۔ میں نے آہستہ آہستہ پکارا "شمشاد، شمشاد" تو نظر اوپر اُٹھائی۔ افسوس! وہ بڑی بڑی آنکھیں جو حُسن میں اپنا جواب نہ رکھتی تھیں، لاغری میں غائب ہوگئی تھیں، چہرہ کا سرخ و سپید رنگ زردی میں تبدیل ہوگیا تھا، جسم پوست و استخوان کا ڈھانچہ تھا۔ اُس نے مجھے نظر بھر کر دیکھا، اُس نظر بھر کر دیکھنے میں خدا معلوم کیا کیا عبارتیں پنہاں تھیں!! کسی قسم کا معالجہ مفید نہ ثابت ہوا۔ ایک عرصہ تک وہ کرب و بیچینی کا شکار رہا۔ آخر کب تک؟ اب وہ اطمینان کی نیند سو رہا ہے مگر جب کبھی اُس کی تصویر میری آنکھوں کے سامنے آتی ہے تو دل پر گویا نشتر کے چرکے لگتے ہیں۔ اگرچہ اب اُس کی جدائی کو جو اپنا رشتہ روز آخرت سے لگا چکی ہے ایک مدت گزر چکی ہے، میرے رنجہائے جگر کی وہی حالت ہے، خیالات پریشاں ہیں، دل اُسی طرح گرفتار ہے اور حسیات مجروح اسی طرح تپش افروز ہیں۔ آخر زمانہ کی لکھی ہوئی شمشاد کی چند نظمیں غم و درد کی تصویریں ہیں، اُنکے پڑھنے سے دل بیقرار ہو جاتا ہے اور احساس ہوتا ہے کہ دُکھے ہوئے دل کی صدا کتنی مؤثر ہوتی ہے!! اس سانحہ نے صنف نازک کی بیوفائی میرے دل پر منقوش کر دی ہے، اب اُس کی جلوہ فرمائیاں میرے جمود دل پر ذرا بھی اثر نہیں کرتیں۔

اظہار علی عباسی (از الہ آباد)

ایشیا کا مستقبل

روشن ترتیوں کا اب آفتاب ہوگا — عالم میں ہوگی حرکت وہ انقلاب ہوگا
جذبات کے شرارے پھیلیں گے پھر فضا میں — دل حاسدوں کا جل کر مثلِ کباب ہوگا
اقبال کے نشے میں پھر چُور ہوگا مُسلم — خونِ حمیت اُس کا مثلِ شراب ہوگا
پھر چین کی بجیگی بنسی ہمارے گھر میں — نغموں سے حُرّیت کے چھیڑا تارِ رباب ہوگا
تحقیق علم و فن کے چشمے یہاں بہیں گے — بحرِ علومِ مغرب شکلِ سراب ہوگا
مغرب اتری ادائیں ٹھنڈی پڑیں گی آخر — ق — اک دن فنا یہ تیرا عہدِ شباب ہوگا
تو اپنی ہی فضا میں زندہ نہ رہ سکے گا — ″ — مکر و فریب تیرا اب بےنقاب ہوگا
سطوت کے تیرے خیمے اکھڑینگے جابجا سے — ″ — ایوانِ جاہ و حشمت تیرا خراب ہوگا
یہ ظلم کا سمندر! یہ تیری ناخدائی! — ″ — جنگی یہ بیڑا تیرا سب غرقِ آب ہوگا
یہ خوگرِ تمدن جنگل میں جابسیں گے — بیدار یوں کا حاصل غفلت کا خواب ہوگا
بدلیگا جس سے نقشہ دنیا وہ لیگی کروٹ — آقا نہیں رہینگے خادم وہ انقلاب ہوگا
مغرب کے حکمراں سب آپس میں کٹ مرینگے — خودرائیوں کا انکی یوں سدِّباب ہوگا
مشرق کے نیستاں میں گونجے گا شیر کابل — ق — ہیبت سے جسکی زہرہ دنیا کا آب ہوگا
اسکے کھنڈر جہاں کو عبرت کا درس دینگے — ہر ذرہ اس زمیں کا کھولے کتاب ہوگا
آئے گا یاد ہم کو گذرا ہوا زمانہ — چونکیں گے نیند سے ہم کافور خواب ہوگا
تعمیر ہم کریں گے پھر قوم کی عمارت — اینٹیں سروں کی ہونگی خون اپنا آب ہوگا

رستہ بھٹکنے والے مرکز پہ آملیں گے
بے راہیوں کا انکی دور اب حجاب ہوگا

محمد امیر۔ (اورنگ آبادی) متعلم بی اے جامعہ عثمانیہ

غزلیات

نالہ سرمایۂ تسکین ہے جنوں کوش نہیں — جوشِ وحشت اثرِ نالۂ پر جوش نہیں
اے جنوں خیر ہے کیوں نالۂ پر جوش نہیں — شاید اب نالہ کشی کا بھی مجھے ہوش نہیں
بے ہشی اور ہے وارفتگیِ عشق ہے اور — مجھکو دیکھو کہ میں بیخود تو ہوں بیہوش نہیں
وعدۂ وصل سے اچھا ہے کہیں وعدۂ مرگ — بحثِ امروز نہیں تذکرۂ دوش نہیں
لیکے دل سینۂ مجروح پہ اب تک ہے نظر — چشم سفاک ہے احسان فراموش نہیں
ہے تبسم میں کچھ اس شان کا ناز و تمکیں — کہ یہ بیگانۂ مُہرِ لبِ خاموش نہیں

دوست ہو کر اُسے وعدہ کا نہیں پاس امیر
موت دشمن ہے مگر وعدہ فراموش نہیں
امیر بدایونی

زندگی میری خواب کی سی ہے — نقش بر روئے آب کی سی ہے
آب ہر ایک شعر کی میرے — صاف دُرِ خوش آب کی سی ہے
باندھ رکھی ہے اک ہوا میں نے — میری ہستی حباب کی سی ہے
تیرے ہر نازنیں کرشمے ہیں — دلفریبی سراب کی سی ہے
مصحفِ رُخ پہ خال کی صورت — نقطۂ انتخاب کی سی ہے
اُس بتِ سیمتن کے گالوں پر — ساری سرخی گلاب کی سی ہے
میرے سینہ کے آتشستاں میں — دل کی حالت کباب کی سی ہے

آج ہر بات میر صاحب کی
مستِ جامِ شراب کی سی ہے
میر ولی اللہ

دل میں خیالِ جلوۂ جاناں لیے ہوئے — بیتاب ہوں میں شورشِ پنہاں لیے ہوئے
صحنِ چمن میں ہے کوئی محوِ خرامِ ناز — ہر سانس میں بہارِ گلستاں لیے ہوئے
انوارِ عشق آج ہیں رونق فزائے دل — انداز پردہ داریِ جاناں لیے ہوئے
تاریکی نظر کا مری رہنما ہے آج — ہر ذرہ ایک شمعِ فروزاں لیے ہوئے
کھلنے لگا ہے مستیِ الفت کے ساتھ ساتھ — اک رازِ انقلاب کا ساماں لیے ہوئے

شبنم کا قطرہ قطرہ ... بھر کے — اڑنے لگا بہارِ گلستاں لیے ہوئے
ذوقِ نظر ہے تجھکو تو کر غور عندلیب — ہر خار ہے بہارِ گلستاں لیے ہوئے
اک لغزشِ خیال میں بیٹھا ہے آج عشق — صدہا نکاتِ ... عرفاں لیے ہوئے
بے پردہ خیال ہے جو دیکھتے ہیں ہم — اک شانِ خاص اور ہے انساں لیے ہوئے
شارق گلِ مراد سے محروم تا گئے
دل میں خیالِ تنگیِ داماں لیے ہوئے

صفدر علی شارق ایرانی

زخم ہوں بات مجھے حسرت ہی آتی ہے — پوچھتے کیا ہو کہ کیوں مجھکو ہنسی آتی ہے
مجھ سا دیوانہ بھی اللہ کسی کو نہ کرے — لوگ روتے ہیں مگر مجھکو ہنسی آتی ہے
تم جو ہنستے ہو تو یہ بات شکایت کی نہیں — ...لت پہ مجھے آپ ہنسی آتی ہے
داستانِ دلِ پُر درد وہ سنکر بولے — تم جو روتے ہو مگر ہمکو ہنسی آتی ہے
بے بلائے تری محفل میں چلا آیا ہوں — دل تو روتا ہے مگر مجھ کو ہنسی آتی ہے
صاف ظاہر ہے زمانے کی ... آخر — تیری محفل میں جو رہ رہ کے ہنسی آتی ہے
آج کیا بات ہے وہ گریۂ چشم نہ رہا — آج کیا بات ہے رہ رہ کے ہنسی آتی ہے
فرطِ غم نے مجھے تصویر بنایا آخر — رونا آتا ہے مجھے اب نہ ہنسی آتی ہے
خوگرِ غم کو خوشی سے نہ ہو کیونکر نفرت — رونے لگتا ہوں جو بھولے سے ہنسی آتی ہے
... آگے نہ مجھے لے جاؤ — کہ مجھے اپنے گناہوں پہ ہنسی آتی ہے
گدگداتا ہے مجھے کون یہ دل ہی دل میں — وصل کی شب جو یہ رہ رہ کے ہنسی آتی ہے
اس نے محفل سے اٹھایا تو میں ہنستا اٹھا — اس ہنسی پر بھی مجھے اپنی ہنسی آتی ہے
میرے رونے کا سبب آپ نے پوچھا نہ کبھی — کیا کہوں آپ سے کیوں مجھ کو ہنسی آتی ہے
پہلے اس بات پہ ہنستا تھا کہ کیوں روتا ہوں — اب یہ رونا ہے کہ کیوں مجھکو ہنسی آتی ہے
آہ و زاری کا کبھی آیا نہ سلیقہ باسط
ایسا روتا ہوں کہ خود مجھ کو ہنسی آتی ہے

باسط بسوانی

نظرے خوش گذرے

"فیہ ما فیہ" کے کئی نوٹ اس دفعہ عدم گنجایش کی وجہ سے درج نہ ہوسکے۔ ایک جو زیادہ ضروری ہے یہاں درج کیا جاتا ہے:۔

مبارک علیگڈھ پر خواہ مخواہ نکتہ چینی ہرگز کسی مسلمان کے لیے امر پسندیدہ نہیں ہوسکتی، بہرحال وہ بھی مسلمانوں کی قائم کی ہوئی ایک مرکزی یادگار ہے۔ بہت سے نیک نیت مخلص مسلمان اس میں پہلے بھی شریک رہے اور اب بھی ہیں۔ البتہ جو غیر اسلامی عناصر اسکی بنیادوں میں روزاول سے داخل ہوگئے ہیں، انکی بیخکنی کی کوشش کرتے رہنا بھی ہر پختہ مسلمان کا فرض ہونا چاہئیے۔ بڑی خوشی کی بات یہ ہے، کہ اسکا احساس اب الحمدللہ خود علیگڈھ والوں کو پیدا ہوچلا ہے، ضرورت صرف اسکی ہے کہ اس احساس کو زیادہ قوی اور تیز کیا جائے۔ صاحبزادہ صاحب اپنی بصیرت کے مطابق اس باب میں کچھ کوشش کررہے ہیں وہ شہیدنہ ہیں۔ حال میں وہیں کے مشہور پروفیسر فیروزالدین مراد صاحب کا ایک مضمون جو یونیورسٹی گزٹ میں ... ری کے متعلق انگریزی میں شایع ہوا ہے، اس پر مخلصانہ مبارکباد یونیورسٹی کے اہل حل وعقد کی خدمت میں پیش کی جاتی ہے۔ راقم مضمون اور گزٹ نے خدا معلوم اسکو اردو میں شایع کرنا کیوں نہ پسند فرمایا۔ بہرحال اگر علیگڈھ کے اساتذہ میں اس قدر اسلامیت پھیل جائے، جتنی کہ مضمون مذکور کے لکھنے والے کے قلب میں معلوم ہورہی ہے، تو علیگڈھ کی فضا دیکھتے دیکھتے بدل سکتی ہے اور اس سے بڑھ کر مسرت واطمینان کا موقع ہم سب مسلمانوں کے لیے اور کیا ہوسکتا ہے۔

مکرمی جناب قاضی غلام امیر آسیر بدایونی تحریر فرماتے ہیں کہ دسمبر ۲۴ء کے الناظر میں جناب شبیر حسن خاں جوش ملیح آبادی کی جو نظم "مسلم جوانمردوں سے خطاب" چھپی ہے اسمیں قافیہ عقیدہ آذری۔ سرسری۔ پیمبری ہے۔ انھیں قوافی میں جوش صاحب نے سحر سامری اور فسردہ خاطری کو بھی نظم فرمایا ہے۔ کیا اس تقیید کی صورت میں آذری کا قافیہ سامری، خاطری کسی طرح صحیح ہوسکتا ہے؟ امید ہے کہ الناظر کی معرفت جوش صاحب یا اور کوئی دوسرے شخص، جو ایسے قوافی کو صحیح سمجھتے ہوں، میرے شبہہ کو رفع فرمادیں گے۔"

انجمن اُردو کا سالانہ جلسہ یکم مارچ کو منعقد کیا جارہا ہے جسمیں انجمن کی سالانہ رپورٹ اور حسابات پیش ہوں گے، دستورالعمل میں ترمیم کی جائیگی اور عہدہ داروں اور مجلس انتظامیہ کا جدید انتخاب ہوگا۔ ادبی نمائش اور اسکے ساتھ ایک ادبی جلسہ ۲ مارچ کو ہوگا۔

کرتے تو مخالف لاجواب ہو جاتا تھا - وہ اظہارِ جذبات میں صادق البیان تھے اور یقین کامل رکھتے تھے کہ جن عقائد کی وہ تلقین کرتے ہیں ضرور سچے ہیں - اور اُنکی تبلیغ ایک منصبی فرض ہے - اُنکی بھرائی ہوئی آواز ایک عجیب ہیبت و جلال کا مظہر بنجاتی تھی جو جادو کی طرح ہر ایک بحث کرنے والے کو ہمزبان بنالیتی تھی -

چند ہی روز میں بنارس کا "دشت غزالاں" جو غالباً زمانۂ حال کے ریلوے اسٹیشن سارناتھ کے قریب تھا شریعتِ جدید کا درسگاہ بن گیا اور اُسکے معتقدوں کی تعداد اُس کثیر جماعت کو چھوڑکر شہر میں قیام پذیر تھی جنگل میں ساٹھ تک پہونچ گئی -

مبارک ہیں غربا کہ دنیا کا ہر شایستہ مذہب پہلے اُنھیں سے شروع ہوتا ہے - گوتم کے مرید بھی اب تک صرف غریب ہی تھے - اتفاق سے ایک دولتمند یشش نام اپنے عزیزوں سے خائف ہوکر گھر سے بھاگا اور تقدیر ازل کشاں کشاں جنگل میں مہاتما کے سامنے لائی - آیا اور مُنڈ گیا!! سب چیلے زرد رنگ کی کفنی پہنتے تھے یہ بھی زرد پوش ہوگیا!! اُسکی ماں اور بیوی کو خبر ہوئی وہ بھی بھاگ کر آئیں اور مہاتما کی مُرید ہوئیں - یہ دونوں پہلی عورتیں تھیں جو شاکیہ مُنی پر ایمان لائیں -

برسات کا موسم اسی جنگل میں بسر ہوا - جب سردی شروع ہوئی تو مہاتما نے اپنے ہر ایک چیلے کو جدا جدا ممالک میں اشاعتِ مذہب کے لیے روانہ کیا اور خود اور ویلوا کی طرف چلا - راہ میں دو سوداگر ملے جو کپل واستو کی طرف جاتے تھے - اُن سے بات چیت ہوئی تو وطن کا خیال آیا - باپ کو اپنی خیریت کی خبر بھیجی اور منزل مقصود کی راہ لی -

راستہ میں سینا نام ایک گانوں تھا جہاں تین بھائی علم و فضل میں شہرت عام رکھتے تھے - اور مذہباً آتش پرست تھے - گوتم نے اُنکے آتشکدہ کی عمارت میں ایک رات بسر کرنے کی اجازت چاہی مگر کشپ جو اُن بھائیوں میں سب سے بڑا تھا مانع ہوا اور عذر کیا کہ آتش خانہ کے قریب ایک زہریلا سانپ رہتا ہے جو رات کو باہر نکلتا اور سونے والوں کو ڈس جاتا ہے - مہاتما پر عشق حقیقی کا زہر چڑھا ہوا تھا وہ سانپ سے کیا ڈرتے - اپنے اصرار پر قائم رہے اور کشپ کو بھی مسافر مہمان کی خاطر سے اجازت دینا پڑی - رات ہوئی تو سانپ حسب دستور باہر نکلا مگر گوتم سے متعرض نہ ہوا جب صبح کو یہ آتشکدہ میں زندہ و سلامت پائے گئے تو انکی کرامت کا غل مچ گیا - اُسی دن اتفاق

سے ایک بڑا میلہ گانوں میں ہونے والا تھا جس میں گرد و نواح سے جاتری آتے اور کشپ کی تقریر سنا کرتے تھے۔ اب اُسکو خوف ہوا کہ اس مجمع نے گوتم کو دیکھا تو آتش پرستی کا بازار سرد ہوجائیگا مگر مہمان کو گھر سے نکالنا اتنا سخت اخلاقی جرم تھا کہ اس کا وہ مرتکب نہ ہو سکتا تھا۔ مہاتما کو اس خطرہ کی خبر ہوگئی اور وہ کسی کو اطلاع کیے بغیر اُسی دن گانوں سے باہر چلے گئے اور میلہ کے پاس نہ آئے۔ جب شام کو واپس ہوئے تو کشپ نے دریافت کیا کہ شام کو کہاں گئے تھے۔ جواب دیا کہ تمھاری فکر دُور کرنے کے لیے روپوش ہوگیا تھا۔ کشپ قدموں پر گر پڑا اور اپنی تمام جماعت کے ساتھ ایمان لایا۔

اب مہاتما بڑی شان و شوکت کے ساتھ راجگڈھ میں داخل ہوئے جہاں بارہ سال گذرے نہایت شکستہ حال گھر سے بھاگ کر پہونچے تھے۔ راجہ بمبار ہنوز تخت سلطنت پر جلوہ فرما تھا۔ اُس نے پیشوائی کی اور کشپ کو گوتم کے ہمراہ دیکھ کر متعجب ہوا۔ خلقت نے گمان کیا کہ شاید گوتم بھی آتش پرست کشپ کا چیلہ ہوگیا۔ مگر جب نیاز مند شاگرد گوتم کے حضور میں بندگی کے لیے خم ہوا تو راجگڈھ والوں کی حیرت کی کوئی حد نہ رہی۔ راجہ نے بڑے دھوم سے ان فقیروں کی دعوت کی اور ویلوانا نام ایک بانس کا باغ انکے قیام اور آسایش کے لیے وقف کیا۔ اس تاریخی باغ میں مہاتما نے بہت سی برساتیں گذاریں۔ اور یہ قاعدہ مقرر کیا کہ جاڑوں کے موسم میں ممالک کا دورہ کرتے تھے اور بارش کے ایام اسی باغ میں بسر فرماتے تھے۔ دُور دور از مقامات سے مریدین یہاں آتے اور اپنے مقدس بانی مذہب سے ضروری مسائل حل کرتے تھے۔

اب شاکیہ مُنی کی شہرت آریہ ورت کے قریب قریب کُل حصوں میں پہونچ چکی تھی۔ راجہ شدھودن کو بھی خبر ملی کہ اُسکے گھر کا اُجالا راجگڈھ میں چمک رہا ہے۔ بڑے اصرار سے فرزند کو بلوایا اور پُرانی شفقت و محبت کی باتیں یاد دلا کر تقاضا کیا کہ بوڑھے باپ کو اُسکی موت سے پہلے ایکبار اپنے دیدار کا موقع دے۔

والدین کے احکام کی اطاعت نکوکاروں کا پہلا فرض ہے۔ گوتم نے فوراً سفر کی تیاری کی۔ مریدین کا جم غفیر ہمراہ چلا اور وہ منزل بمنزل طالبان ہدایت کو فیضیاب کرتا کپل وستو کے قریب پہونچا۔ مدت کے بعد کوہ ہمالیہ کا دامن، نیپال کی ترائی، پُرفضا گھاٹیاں، اور راج محل کا خوبصورت

منظر آنکھوں کے سامنے آیا تو مہاتما کے دل پر کیا گذری؟ اسکی کیفیت وہ بیان کرے جو قوس قزح کی صحیح تصویر اُتار سکتا ہو! وطن کا کانٹا پردیس کے گلاب سے بہتر اور کنعاں کی گدائی مصر کی بادشاہی سے خوشتر بتائی جاتی ہے لیکن مہاتما نے اپنے مقرر کردہ اصول کو اس موقع پر بھی ترک نہیں کیا - بجائے شہر میں داخل ہونے کے بستی سے دور ایک باغ میں مقیم ہوئے اور اُسی جگہ رات بسر کرکے دوسرے دن کشکول گدائی ہاتھ میں لے کر بھیک مانگنے کے لیے کپل واستو میں قدم رکھا -

دستور تھا کہ فقیروں کی یہ جماعت امراسے امداد کی طلبگار نہیں ہوتی تھی بلکہ غربا کے دروازوں پر بھی خاموش کھڑی رہتی تھی اور زبان سے سوال نہیں کرتی تھی - اگر کچھ مل گیا تو لیا ورنہ آگے بڑھے - اسی رسم کی پابندی کے لیے کپل واستو میں بھی راج محل کو چھوڑ کر غریبوں کی جھونپڑیوں کی طرف گدائی کو چلی -

راجہ کو خبر ہوئی تو وہ حکومت کا دبدبہ فراموش کرکے بیتابی کے ساتھ بیٹے کے پاس پہونچا اور شکایت کی کہ رعایا سے بھیک مانگ کر باپ کے ماتھے پر کلنک کا ٹیکہ لگانا مناسب نہ تھا - گوتم نے جواب دیا کہ "مہاراج! آپ اور آپ کے گھر والے سلطنت سے تعلق رکھتے ہیں اور راجوں کی اولاد ہیں - میں اگلے وقتوں کے رشیوں اور دانشمندوں کا وارث ہوں - آپ کے لیے محلوں کا رہنا زیبا ہے، مگر مجھ کو وہی مناسب ہے جو انبیائے سلف ہمیشہ سے کرتے آئے ہیں - راج کی نعمتوں سے مجھکو کیا سروکار - میرا موروثی پیشہ تو بھیک مانگ کر کھانا ہے"

باپ نے یہ منطق نہ مانی اور زبردستی کھینچکر بیٹے کو محل شاہی کی طرف لے گیا - گھر میں قدم رکھا تو ہر طرف سے عزیزوں اور رشتہ داروں نے ہجوم کیا اور سارا قلعہ اُسی کمرہ کے اندر آ گیا جس میں مہاتما کے چرن آئے تھے -

دیدار جمال اور دریافت خیریت کے لیے سب ہوا خواہ اُمنڈ آئے مگر غم نصیب جسودھرا اپنی جگہ سے نہ ہلی -

وہ قیامت کی رات جب انتہائی مسرت کے دن مصیبت کا پہاڑ اُس پر ٹوٹ پڑا - اور جان سے زیادہ عزیز شوہر کوئی خطا تقصیر بتائے بغیر کسی طرف چلا گیا اُسکو آج تک یاد تھی - جس وقت سے چنا رتھ بان نے راجکمار کے جوگ اختیار کرنے کی خبر پہونچائی دُنیا کی عیش و راحت اُسکے لیے ختم ہو گئی -

سنگار چھوڑا، سہاگ بڑھایا، بدشگنوں کی طرح زمین پر سوتی - جوگنوں کی سی کفنی پہنتی اور رانڈوں کی طرح گن گن کر لقمے کھاتی تھی - گلاب کے پھول کھلا گئے - کندن تانبا بن گیا - اور نور میں زنگ آ گیا!!
آج لیکا نہ ویکا نہ راجکمار کے درشن کے لیے دوڑا لیکن دردِ فراق کی ماری جسودھرا اپنے کمرہ میں سر جھکائے خاموش بیٹھی رہی اور رسیلے ہوئے دل کو یوں سمجھاتی تھی کہ "پران پتی نے جوانی کے وقت مجھکو چھوڑا تو اب بارہ تیرہ برس کے بعد اپنی بگڑی ہوئی صورت دکھا کر اُنکی آنکھوں میں ذلیل ہونا کیا ضرور ہے"
بکھشوں کے ذریعہ رش کو اُس کی شکستہ دلی پر رحم آیا - مہاتما کو جسودھرا یاد آئی - اور رشتہ داروں کے مجمع میں اُنکی بیتاب نگاہیں کسی کو ڈھونڈھنے لگیں - جب کسی طرف نظر نہ آئی تو پوچھا کہ "جسودھرا زندہ ہے؟" جواب ملا کہ زندہ تو ہے مگر مردہ سے بدتر - دل پر چوٹ لگی اور دریافت حال کے لیے فوراً اُسکے کمرہ کی طرف تشریف لے گئے -

جذبۂ عشق سلامت ہے تو انشاءاللہ   کچے دھاگے میں چلے آئینگے سرکار بندھے

جان و ایمان کا مالک یکایک نظر کے سامنے آ گیا تو جسودھرا بے قابو ہو کر قدموں پر گر پڑی اور شوہر کے پاؤں آنکھوں سے لگا کر زار زار رونے لگی - پھر یہ سوچ کر کہ خاوند جوگی ہیں اور اُنکو عورت کا بدن چھونا جائز نہیں، سہمی، ڈری، ہٹی، اور الگ کھڑی ہو گئی - راجہ نے بہو کی سفارش کی اور اُسکی نفس کُشی کا حال دوہرایا - گوتم کو قلق ہوا لیکن اپنے عہد تجرد سے مجبور تھے اور سوائے تلقین صبر کے تسلی دینے کی کوئی صورت نہ تھی -
عاشق بہو نے ڈرتے ڈرتے آرزو کی کہ اُسکو بھی چیلوں کے گروہ میں شامل کر لیا جائے - مگر یہ عرض بھی قبول نہ ہوئی اور ارشاد ہوا کہ فقیروں کی منڈلی میں عورت کا ساتھ رکھنا خطرناک ہے - ستم رسیدہ بیوی مایوس ہوئی اور مہاتما محل سے رخصت ہو گئے - دوسرے دن گوتم کے سوتیلے بھائی نند کی شادی کا جلسہ تھا - مجلس عیش و نشاط مرتب تھی کہ مہاتما اُس محفل میں تشریف لائے اور معلوم نہیں نند کو آہستہ آہستہ کیا بتا دیا کہ اُس نے شادی کا لباس نوچ ڈالا اور کشکول ہاتھ میں لیکر بھائی کے ساتھ نگرودہ باغ کی طرف چلا گیا جو ان جوگیوں کا قیام گاہ تھا -
اب یہ معمول ہو گیا کہ مہاتما روزانہ بھوجن کے لیے قلعہ میں آتے تھے اور محل خاص سے کسی قدر فاصلہ

اپنے چیلوں کے ساتھ خاصہ تناول فرماتے اور پھر فرودگاہ کو واپس جاتے تھے۔ ایک دن حسبِ دستور کھانا تناول فرما رہے تھے اور شربتِ دیدار کی پیاسی یشودھرا [illegible] زیارت کر رہی تھی کہ اُس کا لڑکا راہل سامنے آگیا۔ ماں نے بیٹے سے [illegible] کہ تم اپنے باپ کے پاس جا کر اپنے ورثہ کا مطالبہ کرو

لڑکا چند قدموں کا تھا کہ باپ [illegible] جاتا تھا۔ ماں نے اشارہ سے بتایا کہ تیرا باپ وہ [illegible] آفتاب کی طرح چمک رہا ہے۔

بھولا لڑکا فوراً خوش خوش باپ کے پاس گیا اور مہاتما سے عرض کیا کہ میں آپ کا بیٹا ہوں اور اپنی میراث مانگنے آیا ہوں۔ گوتم نے آہستہ سے اُس [illegible] ہوا۔ وہ میراث میراث کرتا باپ کے ساتھ ہو لیا۔ آخر [illegible] باغ میں پہنچ [illegible] دولت عطا ہوئی یعنی سنگھ میں شریک کرلیا گیا۔!!

راجہ شدھودن کا نابالغ پوتا بھی تارک الدنیا ہو گیا [illegible] صدمہ ہوا۔ پہلے ہی گوتم کا ان سے الگ ہو چکا تھا اور اُس کا واپس آنا محال تھا!! [illegible] کہ آئندہ سے کوئی لڑکا اپنے والدین کی اجازت کے بغیر ترک [illegible] شرط کو گوتم بدھ نے مان لیا اور کپل وستو سے راجگڑھ کے لیے رخصت ہو گیا [illegible] اس وقت مہاتما کے حصول گیان سے اٹھارہ مہینے گذر چکے تھے

اس کے بعد مہاتما مدت تک زندہ رہے لیکن [illegible] نصیب ہوئی۔ یہ دوسرا موقع وہ حسرتناک دن تھا کہ راجہ شدھودن مرض الموت میں مبتلا تھے اور ان کا عزیز بیٹا آخری دیدار کے لیے بلایا گیا۔ مہاتما عین وقت پر پہونچے اور جب اس مصیبت اور رنج کی دنیا میں آخری سانس راجہ شدھودن کو نصیب ہوئی تو اُسکے شوق کی آنکھ گوتم کے نورانی چہرہ کی طرف تھی اور اس کا سر اُنکی گود میں!!

اب یشودھرا کی بیکسی اور تنہائی کا خبرگیراں کوئی نہ رہا۔ اُس نے راج محل کو چھوڑ کر جنگل کی پھرنے۔ جوگیوں کے برتن مانجھنے۔ اور فقیروں کے لیے پانی بھرنے کی خدمت قبول کرنے کا ارادہ کیا۔

یہ پھر وانکے پاس لایا۔ گوتم نے عورتوں کو رہبانیت کی زندگی بسر کرنے "سنگ" میں شریک ہونے کی اجازت دی اور جیبودھرا پہلی راہبہ تھی جو اُسکی خانقاہ میں داخل ہوئی۔

مہاتما کی زندگی کے آخری تیس سال اشاعت مذہب، تبلیغ شریعت اور ترتیب قوانین میں صرف ہوئے۔ اس زمانہ کے اقوال و افعال جو بودھ مذہب کی کتابوں میں محفوظ ہیں اگر نقل کیے جائیں تو کئی ضخیم جلدیں تیار ہوں لیکن یہ واقعات تاریخی حیثیت سے کوئی خاص اہمیت نہیں رکھتے صرف چند حکایتیں اُس عہد کی بطور رشتے نمونہ از خروارے درج کی جاتی ہیں:-

(۱) کیساگوتامی نام ایک عورت اپنے اکلوتے بیٹے کی عاشق زار تھی۔ وہ بچہ اتفاق سے مرگیا تو وہ اُسکی نعش لیے گھومتی اور ہر ایک سے اُسکے زندہ کرنے کی دوا پوچھتی تھی۔ جب کوئی نصیحت و فہمایش کارگر نہ ہوئی تو لوگوں نے بتایا کہ شاکیہ منی کو مردہ جلانے کی تدبیر معلوم ہے۔ عورت دوڑتی ہوئی مہاتما کی خدمت میں آئی۔ آپ نے فرمایا کہ بچہ کا زندہ کرنا ممکن ہے بشرطیکہ مٹھی بھر رائی مل جائے۔ اور وہ ایسے گھر سے مانگ کر آوے جہاں کوئی بیٹا، شوہر، باپ یا غلام نہ مرا ہو۔ عورت سارے شہر میں ماری ماری پھری گر کوئی گھر ایسا نہ ملا جہاں کوئی موت نہ واقع ہوئی ہو۔ اُسکی آنکھیں کھل گئیں۔ خود بخود غم کی تسلی ہوئی اور وہ بھی مہاتما کی خانقاہ میں ایک راہبہ بن گئی۔

(۲) امبا پالی ایک مشہور کسبی تھی۔ اُس نے مہاتما کی دعوت کرنا چاہی۔ کسی کو خیال نہ تھا کہ منی اُس کا ناپاک کھانا قبول کریں گے۔ فقرہ بازوں کی لعن طعن سے وہ عورت بہت دل شکستہ ہوگئی۔ یکایک مہاتما اُسکے گھر پہونچے اور خاصہ تناول فرمایا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ وہ اپنی بدکاریوں سے تائب ہوئی اور "سنگ" میں شریک کرلی گئی۔

(۳) سراوستی شہر کے پاس انتھ پنڈک کے باغ میں مہاتما مقیم تھے۔ اُن کا عزیز چیلا انند اشہر میں بھیک مانگنے گیا تھا۔ وہاں پیاس نے ستایا تو ایک کنوئیں کے پاس پانی کی تلاش میں پہونچا ایک چنڈال چھوکری پر اکرتی نام ڈول کھینچ رہی تھی۔ نندا نے اُس سے پانی مانگا۔ لڑکی نے جواب دیا کہ وہ چنڈالنی ہے اُسکے ہاتھ کا پانی کوئی نہیں پی سکتا۔ نندا نے کہا کہ بہن تیری ذات پات میں نہیں پوچھتا - اگر پانی پلا سکتی ہو تو پلا دے۔ لڑکی اس جواب پر فریفتہ ہوگئی۔ اُس نے پانی پلایا اور اس کوشش میں مصروف ہوئی کہ کسی طرح نند کے ساتھ ہی رہنا نصیب ہو۔ اُس نے

نند کو دام تزویر میں لانے کی ہر ایک سعی کی لیکن کامیاب نہ ہوئی۔ ایک روز نند کے تعاقب میں وہ مہاتما کے حضور تک پہونچی۔ باتوں باتوں میں اُس کا چوٹ کھایا ہوا دل دنیا سے پھیر دیا گیا اور وہ بھی راہبہ ہوگئی

چنڈالنی کا "سنگ" میں شریک ہونا برہمنوں کو بہت ناگوار ہوا۔ کیونکہ اس فرمان سے ذات کی قیود کا خاتمہ ہوگیا تھا اور انھوں نے گوتم کو طرح طرح سے اذیت پہونچانا چاہی لیکن خدا کی قدرت سے انکی ہر برائی بھلائی ہو جاتی تھی اور جس۔ اجہ کو وہ گوتم کے خلاف بناتے تھے چند روز میں وہی اُس کا مُرید ہو جاتا تھا۔

(۴) نند! نام ایک خوشحال اور با اثر رئیس تھا۔ اُسکے ایک خادم نے جو بودھ کا عقیدت کیش تھا مہاتما سے عرض کی کہ آپ اس عالم کو کوئی عجیب غریب معجزہ دکھائیں تاکہ وہ ایمان لائے اور اُسکے ، ، ورراست پر آنے سے شریعت کو تقویت ہو۔ گوتم نے درخواست منظور نہ کی اور کہا کہ جنکے دلوں پر مُہر ہے وہ معجزوں سے بھی ایمان نہیں لا سکتے۔ خرق عادت سے مجھ کو شرم آتی ہے!

(۵) سوپیا نام ایک فقیر مہاتما کی بدگوئی کرتا تھا اور اُسکے اصول و قواعد پر نکتہ چینی کیا کرتا تھا۔ اُس کا شاگرد برہم دُت گوتم کا معتقد تھا اور اپنے اُستاد سے نزاع کیا کرتا تھا۔ مہاتما کے چیلے سوپیا کو بُرا بھلا کہتے تھے۔ شدہ شدہ یہ خبر گوتم تک پہونچی۔ آپنے چیلوں کو نکتہ چینی پر ناراض ہونے سے منع کیا اور سمجھایا کہ بدگوئی سے سلوک کی ترقی میں فرق آتا ہے۔ نفرت نفرت سے دُور نہیں ہوسکتی بلکہ اس زہر کا تریاق محبت ہے!!

(۶) ایک کسان کی طرف گذر ہوا جو کھیت میں ہل چلا رہا تھا۔ اُس نے فقیروں کی بھیڑ دیکھ کر کہا کہ تم لوگ کچھ کمائی نہیں کرتے اور پرایا مال کھاتے ہو۔ مہاتما نے جواب دیا کہ "میں بھی کھیتی کرتا ہوں۔ ایمان بیج ہے، نفس کُشی پانی ہے، بُری خواہشیں جھاڑ جھنکار ہیں جنکی نکائی کرتا ہوں عقل ہل ہے، شرم جُوا ہے، استقلال ہل چلاتا ہے اور میں اپنے دل سے استقلال کی نگاہ رکھتا ہوں۔ میرا کھیت مذہب اور قانون ہے۔ اور پیداوار جو حاصل ہوتی ہے اُس کا نام "نروان" ہے کسان قلبہ رانی بھول گیا اور قلب صنوبری کی صفائی کرنے لگا!!

(۲۰) ایک شب مہاتما اپنے عزیز شاگرد آنند اپنے ساتھ چیلوں کی خبرگیری کو نکلے - دیکھا کہ ایک بیمار مرید نجاست میں لتھڑا زمین پر پڑا ہے اور ضعف کی شدت سے حرکت نہیں کر سکتا - آپ نے آنند سے پانی منگوایا اور اپنے مبارک ہاتھوں سے مریض کا بدن صاف کر کے اُسکو بستر پر لٹایا - پھر سب مریدوں کو جمع کر کے تنبیہ کی کہ "سنگھ" والوں کے نہ ماں باپ ہیں، نہ بیوی بچے - اگر تم لوگ ایک دوسرے کی مدد نہ کرو گے تو انکی عیادت اور تیمارداری کو کون آئے گا - جو شخص میری خدمت کرنا چاہتا ہو اُسکو لازم ہے کہ بیمار کی خدمت کرے - مریضوں کی تیمارداری عین میری خدمت ہے !!

غرض اسی طرح مسلسل وعظ و تلقین میں مہاتما نے اپنی زندگی کے آخری سال گذارے اور اسّی برس کی عمر تھی جب آپ نے کوسی نگارا جانے کا قصد کیا جو زمانہ حال میں کسیا کے نام سے مشہور ہے اور گورکھپور کے ضلع میں ایک تحصیل کا صدر مقام ہے - اس زمانہ میں یہاں ملّا قوم کا راج تھا - جسکی ایک شاخ کا دارالسلطنت پاوا اور دوسری کا کوسی نگارا تھا - کہا جاتا ہے کہ پٹنہ کے ضلع میں بہار شریف کے پاس پاواپوری جو مشہور تیرتھ کی جگہ ہے یہی قدیم زمانہ کا پاوا تھا لیکن یہ مقام کسیا ضلع گورکھپور سے تقریباً ۲۰ کوس کے فاصلہ پر ہے اور اس لیے تعجب ہوتا ہے کہ مہاتما نے بیماری کی شدت میں جس کا عنقریب تذکرہ آتا ہے اس قدر طویل مسافت کیونکر طے کی ہوگی -

بہر حال یہ مسلّم ہے کہ مہاتما ملّا قوم کی حکومت میں دورہ کرتے ہوئے پانچ سو چیلوں کے ساتھ پاوا میں تشریف لائے اور چند ٹھٹھیرے کے باغ میں فروکش ہوئے - یہاں کے رئیسوں نے ایک "سنت گھر" یا ٹاؤن ہال جدید تیار کرایا تھا اور اُنھوں نے خواہش کی کہ اس عمارت کی رسم افتتاح گوتم کے مبارک ہاتھوں سے عمل میں لائی جائے - مہاتما نے منظور کیا اور جماعت خانہ میں تشریف لیجا کر ایک پُر اثر وعظ دیا - دوسرے روز چند نے دعوت کی اور فقیروں کو چاول اور "سُکر مدھوا" کھلایا - اُنیسویں صدی عیسوی میں یورپ پہونچکر اس "سکر مدھوا" نے عجیب ستم ظریفی دکھلائی - مسیحی مترجموں نے اس لفظ کے معنی "سُوَر کا گوشت" سمجھ لیے اور عام طور پر تحریر کیا جانے لگا کہ مذہب بودھ کے مقدس بانی نے دُنیا میں جو آخری غذا کھائی وہ لحم الخنزیر تھا - لیکن حال میں تحقیق سے ثابت ہوا کہ "سکر مدھوا" سُور کے گوشت کو نہیں بلکہ شکر قند کو کہتے ہیں !!!

۱ ماڈرن ریویو - بابت ستمبر سنہ ۱۹۲۴ء صفحہ ۲۷۶ -

مسلمانوں کی تہذیب

یعنی مسلمانوں کی تمدنی ترقی کے متعلق نواب محسن الملک مرحوم کا ایک فاضلانہ لکچر۔ ۴ر

قیمت ۶ر

(خریداران الناظر سے ۵ر)

میلاد النبی

مشہور محدث حضرت ابن جوزی رحمۃ اللہ علیہ کے عربی متن کے مقابل اس کا نہایت فصیح اردو ترجمہ۔

قیمت ۴ر

(خریداران الناظر سے ۳ر)

الاحسان

مصنفہ مولوی احسان الدین علوی مرحوم جس میں لفظ صوفی کی تحقیق، تصوف کی ابتدا اور اس کی درجہ بدرجہ ترقیوں کا ذکر ہے اور آخر میں تصوف کے تمام شعبوں کو اسلام سے تطبیق دی گئی ہے

قیمت ۸ر خریداران رسالہ کے لیے ۵ر

مقدمہ شعر و شاعری

مولانا حالی نے اپنے دیوان کے شروع میں جو لاجواب مقدمہ لکھا تھا وہ دوسرا ایڈیشن کے وقت ایڈیٹر الناظر نے دولن سے علیحدہ کر کے چھاپا ہے جس میں شعر کی حقیقت، ماہیت اور شاعری کے اصول و اساس پر بحث کر کے اردو شاعری پر ایک بسیط تبصرہ لکھا گیا ہے قیمت ۱۲ر خریداران رسالہ سے ۸ر

خطاب

(از ”طا“ جی)

سرکاری خطابات کے آرزومند کوشش کرنے سے پہلے اسکو ملاحظہ فرمالیں ۴ر

(خریداران الناظر کیلئے ۳ر)

ارض نہرین

میسوپوٹیمیا یا عراق عرب کے آثار و تاریخ مولفہ مسٹر عنایت اللہ بی اے رجسٹرار عثمانیہ یونیورسٹی۔ قیمت ۸ر

(خریداران الناظر کے لیے ۶ر)

وکرم اروسی

مترجمہ مولوی عزیز مرزا بی اے مرحوم۔ یہ کالی داس کے مشہور و معروف ڈرامے کا اردو ترجمہ ہے جس میں لائق مترجم نے ایک بسیط مقدمہ اضافہ کیا ہے اور ہندو ڈراما کی تاریخ اور نوعیت پر بحث کی اور کالی داس کا موازنہ شیکسپیر اور سر زمین غیرہ سے کیا ہے۔ قیمت ۱۲ر خریداران الناظر سے ۸ر

تسخیر فرانس

شکسپیر کے لاجواب ڈرامہ ہنری دی ففتھ کا اردو ترجمہ۔ از منشی تفضل حسین صاحب ناظر۔ قیمت ۸ر

(خریداران الناظر کے لیے ۶ر)

سفرنامہ مصر و شام و روم

مولانا شبلی کا مشہور سفرنامہ جو ان ممالک کے متعلق بہترین تاریخی، علمی، معاشرتی معلومات فراہم کرتا ہے۔ قیمت ۱۲ر

(خریداران الناظر کے لیے ۸ر)

میکفرن اور لوسی

حضرت شوق قدوائی کا لاجواب ڈراما

قیمت ۲ر

(خریداران الناظر سے ۱ر)

ملنے کا پتہ:- الناظر بک ایجنسی لکھنؤ

بسم اللہ الرحمن الرحیم

ٹرڈ نمبر

سلے ۸ ، ۴

رسالۂ

الناظر

لکھنؤ

ایڈیٹر ـ ظفر الملک علوی

قیمت سالانہ للعہ ر مع محصول

الناظر پریس لکھنؤ میں چھپا

پرنٹر و پبلشر :- اسحاق علی علوی

بسم اللہ

فہرست مضامین بابت ماہ مارچ ۱۹۲۵ء

جلد ۲۸ — نمبر ۱۶۵

ظ

مطبوعات جدیدہ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الناظر

نمبر ۱۶۵ جلد ۲۸ — مارچ ۱۹۲۵ء

فیہ ما فیہ

(از خامہ: چلپی)

کہتے کیا تھے!

"اب سوال یہ ہے کہ مجوزہ یونیورسٹی کے قائم کرنے سے ہمارا اصلی مقصد کیا ہے؟ مختصر الفاظ میں ہمارا مقصد یہ ہے، کہ ہم کو ایک ایسے دارالعلوم کی ضرورت ہے، جس میں اس ملک کے سات کروڑ مسلمانوں کے لیے سچے مذہبی جوش ... پیدا کرنے کا سامان موجود ہو" صاحبزادہ آفتاب احمد خاں صاحب (رسالہ کانفرنس نمبرہ بابت مجوزہ محمڈن یونیورسٹی ص۱)

"سب سے اول ہماری تعلیمی ضرورت مذہبی تعلیم ہے ماہران مسئلہ تعلیم کا اب اس پر اتفاق ہے کہ کوئی نظام تعلیم بغیر مذہبی تعلیم کے مکمل نہیں ہو سکتا ..... اعلیٰ تعلیم سے دماغ کا صیقل اور معلومات کا خزانہ کتنا ہی وسیع کیوں نہ ہو جائے، لیکن جب تک طالب علم کو ابتدا ہی سے اپنی عبدیت کا پورا احساس اور اندازہ نہ ہو، اُس وقت تک اس زندگی کے متعلق اسکے تمام اندازے غلط بنیاد پر قائم رہیں گے" (ایضاً، ص۱۵)

"مسلمانوں کی ترقی کا دارومدار بہت کچھ حقیقی مذہبی تعلیم پر ہے ..... ہماری قوم موجودہ زمانہ کی ٹکر اور کشمکش کا مقابلہ ہرگز نہ کر سکے گی، تاوقتیکہ مذہبی روح اس میں برقی قوت پیدا کرکے اُسکی سرگرمی اور جوش کو بڑے درجہ اور پیمانہ پر نہ پہونچا دے۔ یہ تب ہی ممکن ہے، کہ قوم کے نونہال اور ہونہار بچوں کے

دل و دماغ میں ابتداء سے اصول عبدیت اور نیابت الٰہی راسخ ہو کر از سر نو زندگی کے وہ نمونے پیدا کریں جن میں رسول پاک صلعم اور خلفاء راشدین اور قرن اول کے مسلمانوں کے اوصاف کی جھلک نظر آنے لگے۔" (ایضاً، ص۱۵)

"آپ اُس رسول کریم (صلعم) کی امت ہیں جن کی نگاہ میں روئے زمین کی سلطنت اور سونے چاندی کے پہاڑ اور ہیرے جواہرات کی کانیں ایک تنکے کے برابر بھی وقعت نہیں رکھتی تھیں... اپنے مالک و خالق کی رضا جوئی ان کا اصلی نصب العین تھا۔" صاحبزادہ صاحب (رسالہ کانفرنس نمبر ص۲۵)

"وہ (رسول خدا صلعم) اپنی امت کی کامیابی کا معیار اسکو نہیں قرار دیتے تھے کہ اس میں کس قدر حکمراں ہیں، کتنے دولتمند ہیں، اور کس قدر ذی جاہ و صاحب جلال ہیں۔ وہ تو یہ دیکھتے تھے کہ انکی امت میں عبدیت کی کس قدر روح ہے، ایثار کا کس قدر خزانہ ہے، خدا ترسی میں کیا مدارج انھوں نے حاصل کیے ہیں۔" (ایضاً)

"پس آج بھی اگر مسلمان حقیقی طور پر ترقی کرنا چاہتے ہیں، تو انکو لازم ہے کہ اپنے خیالات اور اُمنگوں کو محدود دائروں سے نکال کر اخلاق محمدی کی دولت کو اپنا نصب العین قرار دے لیں قومی ترقی کا معیار اسکو نہ تصور کریں کہ ان میں کتنے ڈپٹی کلکٹر ہیں، کتنے جج ہیں، کتنے دولتمند ہیں، کتنے بی اے ہیں اور کتنے ایم اے" (ایضاً، ص۲۵)

"اس کا طریقہ صرف یہی ہے کہ ہماری قوم اب گم شدہ اخلاق محمدی کی دولت کو از سر نو حاصل کرنے کی کوشش کرے۔ جو عملی تجویز اس مقصد اعظم کو پورا کرنے کے لیے قوم کے سامنے پیش کی جاتی ہے اسی کا نام مسلم یونیورسٹی ہے۔" (ایضاً، ص۲۶)

(اپنی ضرورتوں میں) "سب سے اول میں نے مذہبی تعلیم کو رکھا ہے.... سرکاری یونیورسٹیوں کی تعلیم میں جو نقائص ہیں، ان کا بڑا سبب یہی ہے کہ ان تعلیم گاہوں میں مذہبی تعلیم کا انتظام نہیں.... جہاں تک ہم مسلمانوں کا تعلق ہے، اس میں ذرا بھی شبہہ نہیں، کہ مذہبی تعلیم ہماری ضرورت اعظم ہے۔" (ایضاً، ص۳۱)

"ہماری قوم کی تعلیم و تربیت کا جو پروگرام ہے، اُسکا سب سے مقدم جزو مذہبی تعلیم ہے ......ایسی حالت میں جبکہ سرکاری یونیورسٹیوں میں یہ چیز ہم کو نہ حاصل ہے، اور نہ ہو سکتی ہے، تو سوا اسکے اور چارہ کیا ہے، کہ ہم اپنے لیے خود انتظام کریں۔ یہی ضرورت اور غرض مسلم یونیورسٹی کی ہے۔" (ایضاً، ص۳۲)

"جب تک مذہبی تعلیم اور دینیات کے مضمون کو کم از کم اُس قدر عظمت اور وزن نہ دیا جائے جس قدر کالجوں کی تعلیم کے اُن مضامین کو حاصل ہے جو ڈگری کے امتحان کے لیے طلبہ کو لازمی طور پر پڑھنے پڑتے ہیں، تو آپ کیسے یہ توقع کرسکتے ہیں کہ نوعمر طلبہ کے دلوں میں مذہب کی وقعت قائم ہوسکتی ہے" (صاحبزادہ صاحب، سالانہ کور ص ۲۶)

"جب تک یہ نہ ہوگا، ہمارا مقصد ہرگز حاصل نہ ہوگا - اور اس زمانہ کے تعلیم یافتہ گروہ میں مذہب باوقعت نہ ہوگا - مگر یہ تب ہی ممکن ہے کہ ہماری اپنی یونیورسٹی ہو" (ایضاً)

"ہر مسلمان کی تربیت کے لیے مذہبی ارکان کی پابندی لازمی جزو ہونا چاہیے - ضرورت اسکی ہے کہ ہمارا تعلیم یافتہ گروہ نہ صرف ارکان دین ادا کرنے کا عادی ہو جائے بلکہ اُسکے دل میں اس طرز عمل کی وقعت ہو" (ایضاً، ص ۳۰)

"اسکے لیے ضرورت ہے کہ ارکان دین کی تعلیم ایسے علما کے سپرد ہو، جن کی زندگی مذہبی طرز میں قابل نمونہ ہو، نہ صرف یہ کہ وہ خود ارکان دین کے پابند ہوں، بلکہ عبدیت و نیابت الٰہی کی جھلک اُنکے طرز زندگی میں پائی جائے ..... لیکن ایسے علما اگر دستیاب بھی ہو جائیں، تو وہ محض نقد معاوضہ پر ایسی خدمت کبھی قبول نہ کریں گے تاوقتیکہ اُنکے درجہ کے مطابق انکی عزت اور وقعت نہ ہو ......

جس دارالعلوم کو ہم اسی غرض کے لیے قائم کرنا چاہتے ہیں اُسی کا نام مسلم یونیورسٹی ہے" (ایضاً، ص ۳۵)

"اصلی مرض قحط الرجال ہے، جس کا سبب اخلاقی و علمی دولت کا سلب ہو جانا ہے، اس مرض کا علاج، خارق محمدی کا از سر نو پیدا ہوتا ہے، جسکا ذریعہ سوا اسکے اور کچھ نہیں کہ ہمارا اپنا دارالعلوم ہو" (ایضاً ص ۴۰)

"عام تعلیم اور نیز مذہبی تعلیم ایک ضروری چیز ہے، اسکی عمدہ تعلیم کا انتظام اُسوقت تک نہیں ہوسکتا، جب تک نصاب تعلیم ہمارے ہاتھوں میں نہ ہو" ڈاکٹر ضیاء الدین احمد (در کانفرنس ۱۹۰۸ء بمقام امرتسر)

"اُن علوم کی جو خاص طور پر مسلمانوں سے منسوب ہیں، مثل علم کلام، و تاریخ اسلام وغیرہ کے، اور جو اسوقت زوال کی حالت میں ہیں، ترقی بلا اسلامی یونیورسٹی قائم کیے نہیں ہوسکتی" (ایضاً)

"یونیورسٹی ایسا مرکز ہوگا جس پر نہ صرف ہماری مادی ترقی کا دارومدار ہوگا، بلکہ ہمارا اخلاق، ہماری تربیت، ہمارا دین، اور ہمارا مذہب، غرض تمام خوبیاں اسی سے وابستہ ہونگی - اگر کالج پر خطر راستہ دکھاتا ہے، تو یونیورسٹی گم شدگان کو راہ پر لائے گی - (سر علی امام در کانفرنس ۱۹۰۸ء بمقام امرتسر)

"کالج اور ندوہ دو جداگانہ راہیں قومی ترقی کے لیے ہیں، ان دونوں راہوں کو ملانا ہے -

ہماری بہبودی اسی میں ہے کہ دونوں کو ملاویں، اور یہ صرف یونیورسٹی کی بدولت ممکن ہے۔" (ایضاً)

"ہم کو اسلامی فلسفہ اور دینی علوم کا بھی مطالعہ کرنا چاہیے اور تعلیم انگریزی کے ساتھ ابتداء سے مذہبی کورس بھی ضروری ہے، جس سے ہمارے بچے مسلمانیت سے خارج نہ ہوں .... جب ہماری یونیورسٹی قائم ہوگی، اُسوقت ہم اپنی دینی و دنیوی ضرورتوں کے موافق کورس تیار کرسکیں گے اور نہایت آسانی سے حسب منشا و عقائد اسلام، بچوں کو تعلیم دلاسکیں گے۔" (نواب صاحب ڈھاکہ، صدر کانفرنس ۱۹۰۸ء بمقام امرتسر)

"ہم کو ہمیشہ یاد رکھنا چاہیے، کہ ہمارا پہلا فرض ہے، کہ ہم اسلامی روح کو زندہ اور تر و تازہ رکھیں۔ ہم کو ہمیشہ اپنے اسلاف کی پاک مثالوں کو پیش نظر رکھنا چاہیے۔ اسلام کا سچا اور اصلی جوہر اسکی پاک تعلیمات، عمل کی سچائی اور روحانی تعلیم ہے۔" (سر آغا خاں، صدر کانفرنس ۱۹۱۱ء بمقام دہلی)

"ہمارا مقصد یہ ہے، کہ ہم علی گڈھ کو علم کا مرکز بنادیں ..... اور دنیا کے سرمایۂ علم میں مسلمان علماء کے ذریعہ سے اُن اسلامی علوم و فنون کا بھی اضافہ کریں، جو اسوقت روبہ تنزل ہیں۔" (راجہ صاحب محمود آباد، صدر کانفرنس ۱۹۰۹ء بمقام رنگون)

"میں اپنی ایک تحریر میں ٹرسٹی صاحبان کی خدمت میں اس مسئلہ کے متعلق لکھ چکا ہوں، کہ قائلان کلمۂ طیبہ سے عربی، اور عربی سے اہل اسلام کسی طرح جدا نہیں ہوسکتے۔ کلمۂ طیبہ کی تصدیق قلبی اور قرآن مجید کو کلام اللہ سمجھنا اُسی حالت میں ہوسکتا ہے، جب مسلمان عربی کو جانتے ہوں۔ عربی کا جاننا اہل اسلام کے لیے بمنزلہ اُنکی روح و زندگانی کے ہے۔ جسد بے روح سے کوئی کیا اُمید کرسکتا ہے۔" (خلیفہ محمد حسین، صدر کانفرنس ۱۹۰۵ء بمقام علیگڈھ)

"مجھ کو اس بات کا پورا خیال ہے کہ مدرسۃ العلوم میں مذہبی تعلیم پورے طور سے ہو، اور اسکے متعلق ایسی تجاویز کا جن سے مذہبی تعلیم کے ذمہ داروں کو مدد ملے، میں دل سے خیر مقدم کروں گا۔" (پرنسپل آرچ بولڈ، در ۱۹۰۵ء)

"مسلمانوں نے ہمیشہ اس بات پر زور دیا ہے، اور میری رائے میں وہ حق بجانب ہیں، کہ یونیورسٹی کی مکمل اسکیم میں مذہبی تعلیم کا داخل ہونا ضروری ہے ...... یہ دشواری مجوزہ بالا محمڈن یونیورسٹی کے قائم ہونے سے جاتی رہے گی۔" (پرنسپل ماریسن، در ۱۸۹۸ء)

"لارڈ کرزن کا قول ہے، کہ کوئی تعلیم جو مذہب پر مبنی نہیں، کامل نہیں ہوسکتی۔ اس مقولہ کی صداقت کسی ثبوت کی محتاج نہیں ..... اہل اسلام ابتدائی مذہبی تعلیم کو زیادہ ضروری جانتے ہیں، ان کا یہ خیال

صحیح ہے ...... میں وثوق کے ساتھ رائے دیتا ہوں کہ دینی اور دنیوی تعلیم پہلو بہ پہلو ہونا چاہیے تاکہ ایک دوسرے کے مزاحم نہ ہو۔" (جسٹس باڈم، صدر کانفرنس ۱۹۰۱ء بمقام مدراس)

"مقصود از بنا نہادن مدرسہ مخصوص از برائے مسلمانان ایں بود کہ ہم علوم متداولہ انگریزی ذا بیاموزند تا سر رشتہ کیش و مذہب اسلام ہم از دست نہ رود، و ہم علوم مذہبی را آں قدر فراگیرند کہ از مہمات و ضروریات مسائل بہرۂ وافی اندوختہ باشند۔" (ایڈریس ٹرسٹیان کالج، بخدمت امیر افغانستان، در ۱۹۰۶ء)

(سرکاری یونیورسٹیوں کے موجودہ) "نظام تعلیم میں ایک بڑا ناقابل برداشت عیب یہ ہے، کہ اپنے مذہبی عقائد و مسائل اور اپنی ملت کی مقدس تاریخ سے ہمارے نوجوان گویا بالکل اجنبی رہ جاتے ہیں .... ہم اپنی یونیورسٹی سے دو نہایت مہتم بالشان غرضیں پوری کرایا چاہتے ہیں جن میں سب اول یہ ہے کہ کوئی مسلمان لڑکا اپنے مذہبی عقائد و مسائل سے ناواقف نہ رہے، اور اپنے بزرگان دین کی تہذیب و اخلاق سے عاری نہ ہو۔" (نواب عماد الملک، صدر کانفرنس ۱۹۰۰ء بمقام رامپور)

"سب سے پہلی چیز جسکی ہم کو ضرورت ہے، یہ ہے کہ ایمان و عقائد کی تعلیم کا پورا تشفی بخش بندوبست ہونا چاہیے، اور اسکے واسطے نہ فقط معلم اور مدرس مقرر ہوں، بلکہ سخت نگرانی کے ساتھ عملی طور پر اسکو نافذ کیا جائے" (ایضاً، صدر کانفرنس ۱۸۹۶ء بمقام میرٹھ)

"حدیث پاک میں جو آپ سے یہ کہا گیا ہے، کہ اگر ضرورت ہو، تو علم کی تلاش میں چین تک جاؤ۔ تو یہ بات اس میں مفروض ہے کہ اگر آپ اپنے مذہب کی حفاظت کر سکیں، تو اسکی تلاش میں انگلستان، جرمنی، اور امریکہ کو جائیے، اور اگر یہ بھی نہ ہو سکے تو بمبئی تک ضرور جائیے، لیکن اتنا ضرور کہوں گا، کہ اپنے منصوبوں کو منصفیوں اور ڈپٹی مجسٹریٹیوں سے موڑ لیے" (میجر سید حسن بلگرامی صدر کانفرنس ۱۹۱۲ء بمقام لکھنؤ)

"دینیات کے اس اعلیٰ معیار کے ساتھ ایک اس سے ہلکا اور زیادہ عملی پیمانہ مذہبی تعلیم کا اردو میں ہونا ضرور ہے، جسکو مسلم یونیورسٹی کے ہر مسلمان طالب علم کے لیے لابد ہونا چاہیے" (ایضاً)

"مسلمانوں کی تعلیم اور انکے مذہبی تحفظ کے لحاظ سے اس امر کی نہایت ضرورت ہے کہ ایک محمڈن یونیورسٹی قائم کی جائے۔ ...... مدرسوں میں درستیِ اخلاق، درستیِ اطوار، اور تربیت اسلامی کا کوئی انتظام طالبعلموں کے واسطے نہیں ہوتا۔ لیکن ایسی یونیورسٹی میں جہاں طالبعلم تعلیم مذہبی پائیں، .... تربیت و درستیِ اخلاق کا ہر ایک سامان کافی و وافی ہوا ہے" (پرنسپل مارسین، کانفرنس ۱۹۰۰ء بمقام رامپور)

کرتے کیا ہیں!

"اب جبکہ یونیورسٹی قائم ہو چکی ہے، ہمارے مواقع عمل اور ہماری ذمہ داریاں کہیں

بڑھ گئی ہیں، میرے ناظرین معاف کریں اگر میں وہ بیان کروں، جو میں محسوس کرتا ہوں، اور جسے میں واقعہ سمجھ رہا ہوں۔ لہٰذا آہنگی کے ساتھ دعویٰ کرنا، اور کام کچھ نہ کرنا، یہ شے ہم کو بہت ہی افسوسناک پست مرتبہ تک اُتار چکی ہے۔ اگر ہم اپنے ہاں کی مذہبی تعلیم کو دیکھیں، تو ہمیں شرمندگی کے ساتھ اعتراف کرنا پڑیگا، کہ آج تک اس کا وجود ہمارے نظام عمل میں محض ایک رسمی حیثیت سے برقرار رہا ہے اور بس۔ حالانکہ اگر ہم بانیِ کالج کی دیانۃً تقلید کرتے تو اس وقت ملک کی مذہبی رہنمائی کرتے ہوتے۔ ہمارے کارکنوں کو، خواہ وہ مشاہرہ یاب ہوں یا اعزازی، جب تک انکا تعلق مسلم یونیورسٹی سے قائم ہے، قوم کی خواہشات کا نظرانداز کرنا ہرگز زیبا نہیں ...... ہمارے ہاں اُردو، علوم مشرقیہ، وعلوم اسلامیہ کے شعبے موجود ہیں اگر ان شعبوں کو صحیح طور پر اور ہمدردی کے ساتھ چلایا جائے، تو یہ ہماری یونیورسٹی اور ہماری قوم دونوں کی عظمت کے سرچشمہ قرار پا سکتے ہیں"۔ (پروفیسر عبدالمجید قریشی در علیگڈھ میگزین بابت دسمبر ۱۹۲۱ء، حصہ انگریزی صـ۵۰ و ۵۱)

"آج اگر یونین کلب میں ایک ہی موضوع پر دو تقریریں کی جائیں، ایک میں مغز بالکل نہ ہو، مگر انگریزی اچھی ہو، دوسری پرمغز ہو، مگر معمولی اُردو میں ہو، تو افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ عموماً اول الذکر ہی پسند کی جائے گی"۔ (پروفیسر فیروزالدین مراد، در علیگڈھ میگزین بابت دسمبر ۱۹۲۱ء حصہ انگریزی صـ۶۶)

"کس قدر تاسف کا مقام ہے، کہ سرسید کی اعلیٰ روایات خدمت اُردو کے ہوتے ہوئے، ہم لوگ جو اُنکے وارث وجانشین ہیں، اُردو کی طرف سے اس قدر بے اعتنائی برت رہے ہیں"۔ (ایضاً صـ۶۲)

"علیگڈھ مسلم یونیورسٹی ایکٹ کی ایک دفعہ کی رو سے، جو پندرہ شعبے مضامین تعلیم کے فوراً قائم ہونے چاہئیں، ان میں سے ایک شعبۂ اُردو بھی ہے۔ لیکن اب تک یونیورسٹی کے کارکنوں نے اس کا کھولنا ضروری نہیں سمجھا ہے۔ بلکہ قانونی دفعہ کی تکمیل کے لیے رجسٹرار ہی کو اُردو کا اعزازی ریڈر مقرر کردیا ہے جنکے سپرد تعلیم کا کوئی کام نہیں"۔ (ایضاً، صـ۶۱)

"اُردو کی طرف سے ہم جو بے التفاتی برت رہے ہیں، اسکی مثال کے طور پر ان واقعات کو دیکھنا چاہیے۔ الخ۔ (ایضاً)

"اگر واقعی نتائج کی روشنی میں دیکھا جائے، تو عبدیت کا عنصر اس تعلیم گاہ کے پیداواروں کی زندگی واخلاق میں کافی حصہ نہیں ہے۔ مسرفانہ انگریزی طرزِ معاشرت اختیار کرکے ہم نے یوروپین تہذیب وتمدن کا وہ حصہ انتخاب کرلیا ہے، جو مطلق ضروری نہیں ہے، بلکہ اُس سے حظِ نفس کی کمزوری کو مختلف شکلوں اور صورتوں میں تقویت حاصل ہوتی ہے"۔ (صاحبزادہ آفتاب احمد خاں صاحب، صدر کانفرنس ۱۹۲۲ء بمقام علیگڈھ)

" فضول خرچی کی عادت ہماری قومی یا اخلاقی کی پہلے بھی حدسے زیادہ ناگوار خصوصیت تھی لیکن اسکی موجودہ شکل تو سراسر تباہ کن ہے۔ ایسی حالت میں ہمارے وقت، توجہ، اور آمدنی کا اتنا بڑا حصہ ایسے مذاق اور عادات کی نذر ہو جاتا ہے، جن کو ضرورت ہے بڑے بڑے مکانوں کی، بیش قیمت سامانوں کی، ضد ارلباسوں کی، پُرتکلف کھانوں کی، پارٹیوں اور تفریحوں اور زنانہ حال کی دیگر فضول خرچیوں کی۔ ان سب کو ضروریات زندگی میں شمار کیا جاتا ہے۔ اسکے بعد اُن کمالات کے لیے کیا رہ سکتا ہے، جنکے بغیر ہم اس زمین پر نائب اللہ کی حیثیت حاصل نہیں کر سکتے؟" (ایضاً)

"مسلم" یونیورسٹی میں اسوقت ۱۹ شعبہ جات تعلیم قائم ہیں۔ اساتذہ کی مجموعی تعداد حسب ذیل ہے

پروفیسر	ریڈر	لکچرر
۱۵	۹	۱۹

اس اجمال کی تفصیل چند شعبوں کے متعلق حسب ذیل ہے:-

نام شعبہ	پروفیسر	ریڈر	لکچرر	ڈیمانسٹریٹر
انگریزی	۲	۱	۱	-
تاریخ	۲	-	۲	-
طبعیات	۱	۱	۱	۱
کیمیات	۲	۱	۱	۱
نباتیات وحیوانیات	-	۱	۲	۱
تعلیمات	-	-	۲	-
قانون	-	۲	۱	-
فلسفہ	۲	-	۱	-

ان شعبوں کے مقابلہ میں دو اور شعبوں کے اساتذہ کی تعداد بھی سننے کے قابل ہے۔ ان میں سے ایک شعبہ علوم اسلامیہ ہے، جس میں پروفیسر ایک بھی نہیں، لکچرار ایک بھی نہیں، ریڈر صرف ایک! دوسرا شعبہ اُردو ہے، پروفیسر کوئی نہیں، ریڈر کوئی نہیں، لکچرر صرف ایک!

یہ تعداد اساتذہ کی تھی۔ طلبہ کے اعداد اور زیادہ سبق آموز ثابت ہوں گے:-

نام شعبہ	تعداد طلبہ
انگریزی	۴۶۷
تاریخ	۳۰۰
معاشیات	۲۰۲
قانون	۲۴۱
فلسفہ	۸۹
ریاضیات	۸۲
کیمیائیات	۱۰۶
طبعیات	۶۲

انکے مقابلہ میں شعبۂ عربی میں طلبہ کی "عظیم الشان" تعداد ۳۵ ہے! سب سے زیادہ دلچسپ اور عبرت انگیز حالت شعبۂ علوم اسلامیہ کی ہے، جس میں خیر سے ایک طالب علم بھی نہیں!!

اعداد کی خاموش گویائی کے ساتھ وایس چانسلر بہادر (جناب صاحبزادہ صاحب) کا شعبۂ علوم اسلامیہ کے متعلق اپنی سالانہ رپورٹ میں حسب ذیل تبصرہ بھی قابل مطالعہ ہے :-

"شعبۂ علوم اسلامیہ کی حالت خاص توجہ و تبصرہ کی محتاج ہے، اس شعبہ میں نہ اسوقت کوئی طالب علم ہے "نہ اب تک کبھی رہا ہے۔ کہا جاتا ہے، کہ اس شعبہ کے ذمہ دار ارکان نے اب تک "علوم اسلامیہ" کا کوئی مفہوم ہی نہیں متعین کیا، اس لیے اِسوقت تک نہ نصاب تیار ہو سکا، نہ تعلیم شروع ہو سکی"۔ (رپورٹ سالانہ، وایس چانسلر مسلم یونیورسٹی بابت سنہ ۱۹۲۴ء)

سنتے ہیں کہ سعدی کی زبان سے ایک مشہور "مکتب" اور مشہور "ملا" کے "کار طفلاں" کا انجام سن کر اس دانشگاہ کے بعض دانش آموزوں نے سرے سے طلبہ کا وجود ہی نہ رکھا، کہ نہ وجود "طفلاں" ہوگا، اور نہ انکے "تمام کار" کی نوبت آئے گی!

بہرحال "قول" اور "عمل" "وعدہ" اور "ایفاء وعدہ" کے تطابق کے یہ دلربایانہ نمونے دنیا کے سامنے ہیں، انکے بعد کچھ عرض و معروض کرنا، یقیناً سوء ادب ہوگا۔ اُستاد داغ آخر کچھ سوچ ہی کر کسی کے "پاس نزاکت" کی تعلیم دے گئے ہیں، اور خود تو اپنی تعلیم پر یہاں تک عامل تھے، کہ باوجود "دل ناشاد" رکھنے کے، عمر بھر

نالہ رکتا ہوا، تھمتی ہوئی فریاد رہے

پر عامل رہے۔

اب کسے رہنما کرے کوئی!

علیگڈھ کے مشہور تارک موالات خواجہ عبد المجید صاحب نے تمام قومی مجلسوں سے قطع تعلق کرلیا۔ اس پر ایڈیٹر صاحب سچ (لکھنو) ناخوش ہیں، کہ سیدھی طرح اکبارگی بیرسٹری کیوں نہ شروع کردی، ایچ پیچ سے کام لینے، اور حیلہ جوئی کرنے سے کیا نتیجہ ہوا؟ لیکن ہمارے خیال میں یہ موقع خفگی اور ناخوشی کا نہیں، عبرت و تاسف کا ہے۔ خواجہ صاحب سے جو شخص واقفیت رکھتا ہے، وہ جانتا ہے، کہ انکی خدمات کی بنا پر انکی ذات سے کس قدر تحریک ترک موالات کے علمبرداروں کو تقویت تھی، اور انکی شخصیت کن غیر معمولی خوبیوں کی جامع تھی۔ لیکن بہرحال خدا کے کام اشخاص کے بھروسہ پر نہیں چلتے۔ خدا کو جس کام کو پلانا مقصود ہوتا ہے، وہ خود اسکے لیے اشخاص پیدا کردیتا ہے، وہ غنی مطلق اپنے بندوں کی بڑی سے بڑی شخصیتوں سے بے نیاز ہے۔ وہ جب چاہتا ہے، تو اپنے سب سے محبوب اور سب سے برگزیدہ بندہ (علیہ الصلوۃ والسلام) کو عین معرکہ جنگ میں اپنے دشمنوں کے ہاتھ سے زخمی کرا دیتا ہے۔ جب چاہتا ہے، تو سید الشہداء امیر حمزہ جیسے مخلص کو دشمنوں کے ہاتھ سے انتہائی بے دردی و شقاوت کے ساتھ قتل کرا دیتا ہے، اور جب چاہتا ہے، تو اپنی ہی فوج کے تین تین سرداروں (زید، جعفر طیار و عبد اللہ بن رواحہ) کو پے درپے جام شہادت پلا دیتا ہے۔ اُسکی شان استغنا اس سے کہیں ارفع ہے کہ اُسکے کسی بندہ کی بڑی سی بڑی خدمت کو بھی اُسکے سامنے بطور "حق" کے پیش کیا جاسکے! خیر اگر اُسکی یہی مرضی تھی کہ اس جنگ کا ایک پُرجوش و جاں باز سپاہی، عین معرکہ جنگ میں ہتھیار رکھدے، تو بجز صبر و شکر کے کیا چارہ دست؟ البتہ دعا بھی ضرور ہے کہ خدا اُس لغزش کرنے والے بھائی کو پھر از سر نو ہدایت و استقامت نصیب کرے۔ باقی اگر تحریک کی بنیاد فی الحقیقت تقوی پر ہے (تقوی بُری باتوں سے بچنے اور پرہیز رکھنے کو کہتے ہیں اور اس لحاظ سے یہ لفظ 'ترک موالات' سے بہتر ہے) تو کارساز فطرت اس جنگ کو ہر نوع و بہر صورت جاری رکھے گا، خواہ بڑی سے بڑی شخصیتیں بھی اس کا ساتھ چھوڑ دیں، جیسا کہ اسوقت ہو رہا ہے

دین خدا ہے حق کی تجلی کے واسطے　　دنیا اُٹھی ہے اپنی ترقی کے واسطے
عارف جو ہیں رہینگے وہ اللہ ہی کے ساتھ　　اللہ ہی ہے اُنکی تسلی کے واسطے

کجا می نماید کجا می زند!

گاندھی جی نے کچھ روز ہوئے اپنے اخبار ینگ انڈیا میں قتل مرتد پر اظہار خیال کرتے سلسلہ میں لکھا تھا، کہ ایسی تعلیم اگر قرآن میں موجود ہو، تو بھی اس دورِ دانش میں اسکی تائید محض اس بنا پر کہ وہ قرآن میں درج ہے، نہیں کی جا سکتی۔ مولوی ظفر علی خاں صاحب نے اپنے اخبار زمیندار میں اسکے جواب میں قلم اٹھانے کا ارادہ کیا۔ لیکن قلم اٹھاتے ہی حملہ کا رخ بدل گیا، یعنی بجائے گاندھی جی کے مذکورہ بالا دعویٰ کی تردید کے، سارا زور مولانا محمد علی کے اس دعوے کے جواب میں صرف ہونے لگا کہ قتل مرتد از روے شریعت اسلام جائز نہیں۔ کمان جب چڑھائی تھی، تو نزو پر گاندھی جی تھے لیکن جب تیروں کی بارش شروع ہوئی، تو بجائے گاندھی جی کے، مولانا محمد علی کا سینہ ہدف بنا ہوا تھا!

لوگ کہتے ہیں کہ اپنی قید فرنگ کے زمانہ میں مولوی ظفر علی خاں صاحب کلیات خسرو کے ایک قلمی نسخہ کو بہت عزیز رکھتے تھے، اور ایک غزل اکثر گنگناتے رہتے تھے، جس کا یہ شعر مشہور ہے

زہے غمزہ کز شوخی و چابکی   کجا می نماید کجا می زند

ایک مسلمان کی وفات

خورجہ کے قومی شاعر جناب تپش جن کی نظمیں اکثر اخبارات و رسائل میں اسلامی عنوانات پر نکلتی رہتی تھیں، افسوس ہے کہ مرض طاعون کے شکار ہو گئے۔ انا للہ و انا الیہ راجعون۔ مرحوم کوئی بڑے درجہ کے شاعر نہ تھے لیکن دل میں اسلام کا درد رکھتے تھے۔ انکی نظموں میں گو شاعرانہ سقم ہوتے تھے، لیکن اسلامی جذبات کی تڑپ انکے کفارہ کے لیے کافی سے کہیں زائد تھی۔ آج اُن سے سوال اس کا نہ ہو رہا ہوگا، کہ فلاں غلط محاورہ یا ترکیب کو کیوں نظم کیا؟ بلکہ جو خدمات اسلام انکے قلم سے بن پڑیں، اُن کا اجر انھیں مل رہا ہوگا۔ خدا ہر کلمہ گو کو یہ اجر نصیب کرے۔ اور مرنے والے تپش کی روح کو اپنے سایۂ مغفرت میں جگہ دے۔

اعلان

"توحید..." اب طبع ہو گیا ہے۔ کچھ نسخے زائد بھی چھاپے گئے ہیں جو صاحب چاہیں طلب فرمالیں۔ قیمت ۴ر
جو ناظرین الناظر اپنے اوراق کو کتابی صورت میں رکھنا چاہتے ہوں وہ فوراً اطلاع دیں تاکہ سرورق ارسال خدمت کیا جائے

منیجر الناظر لکھنؤ

دیوان غالب کی شرحوں پر ایک سرسری نظر

(از نجود موہانی)

بیا اے عشق رسوا کے جہانم کن کہ لیکچید سے
نفیحتہائے بے درداں شنیدن آرزو دارم

اُردو شاعری کے آدم اول ہیں حضرت امیر خسرو دہلوی اور آدم ثانی ہیں (بربنا شہرت عام) حضرت وَلی دکنی۔ متقدمین میں اقلیم سخن کا نظم و نسق میر تقی میر اور میرزا رفیع سودا کے ہاتھوں میں دیا گیا اور متاخرین میں تاجِ دارائی میرزا غالب کے سر پر جلوہ افگن ہوا

زباں پہ بارِ خدایا یہ کس کا نام آیا — کہ میرے نطق نے بوسے مری زباں کے لیے

شعرائے اُردو کے تذکروں پر بالاستیعاب نظر کرنے سے یہ حقیقت بے نقاب ہو جاتی ہے کہ میر و سودا و غالب وغیرہ کے کوس لمن الملکی بجانے کا اعزاز اُن باکمال ہستیوں کو ہے جن کا قول قول، جنکا فیصلہ فیصلہ تھا جنکی تعریف تمغائے افتخار و طغرائے اعتبار تھی۔ اور آج ہندوستان کے بچہ بچہ کی زبان پر جو ان حضرات کی یکتائی کا ترانہ ہے وہ حقیقت میں سخن سنجان ماضی و حالِ کے فیصلہ کی صدائے بازگشت ہے۔ ساحریان سحر حلال (اساتذۂ سخن) کے مرتبہ کا ادراک طبقۂ عوام کو ہونے سے رہا۔ ان سے ایسی امید رکھنا کفر کے ایمان اور ایمان کے کفر بنجانے کی اُمید ہے۔ اور بہرحال دلیل بکسری ان یگانۂ دہر ہستیوں کی معراج جلالت کی حقیقی معرفت اُسوقت تک محال ہے جب تک اہل ذوق اساتذۂ ایران کی معجزہ آرائیوں پر ایمان نہ لاچکے ہوں اور اُنکی سبزہ زار بہارستے نگاہ کا دامن گلچیں کا دامن نہ بن چکا ہو۔ خاصکر مرزا غالب کی قوتِ پرواز و قدرتِ ابداع و اختراعِ مضمون ملکۂ انتخاب الفاظ و طرز ادا کی داد اُسوقت تک دی ہی نہیں جا سکتی جب تک عرفی شیرازی نظیری نیشاپوری۔ کلیم ہمدانی۔ طالب آملی۔ شوکت بخارائی۔ فغانی شیرازی۔ بیدل عظیم آبادی۔ ظہوری ترشیزی۔ میر اکبرآبادی۔ سودائے دہلوی کا کلام پیش نظر نہ رہ چکا ہو۔ یہ واقعہ ہے کہ مرزا نے فارسی میں وہ کچھ کر دکھایا ہے جو انھیں کا

حق تھا۔ عرفی وہ ظالم ہے کہ زمین پر پاؤں ہی نہیں رکھتا۔ نظیری کی غزل ترانہ باربدی کا جواب ہے بیدل کی فکر آسمان سیر ہے۔ ظہوری کا کلام جانِ معنی و جہانِ معنی ہے۔ مرزا جب ان کا جواب لکھتا ہے تو خود وجد کرتا ہے اور نکتہ سنجوں کو سجدہ ریزی کی تعلیم۔ ان اُستادوں کی غزل پر غزل کہنے کا سہرا متاخرین میں اگر ہے تو مرزا ہی کے سر ہے۔ پھر غزل بھی ایسی کہ اُس سے بالاتر محال نہیں تو مشکل ضرور ہے۔ اب رہا دیوانِ اُردو۔ وہ جہاں مختصر ہے وہاں منتخب بھی ہے۔ ہاں یہ مانی ہوئی بات ہے

شعر اگر اعجاز باشد بے بلند و پست نیست — در ید بیضا ہمہ انگشتہا یکدست نیست

یہ دیوان بھی مرزا کے کلامِ فارسی کے خصوصیات سے مالا مال ہے۔ میں اس وقت غالب باکمال کی صرف ایک خصوصیت کا ذکر کرنا چاہتا ہوں اور وہ یہ ہے کہ مرزا اکثر جس مضمون پر قلم اُٹھاتے ہیں اُسے معراج کو پہونچا دیتے ہیں۔ ہر پہلو پر نظر رہتی ہے اور کچھ اس طرح کہہ جاتے ہیں کہ اُس کا جواب کہتے وقت نظر کردگان قدرت ایسا دسپر انداختہ نظر آتے ہیں۔ ہاتھ سے قلم چھوٹ پڑتا ہے۔ اجزائے شعور بکھرنے لگتے ہیں۔ مثلاً

حد شوق میکشی۔ گو ہاتھ کو جنبش نہیں آنکھوں میں تو دَم ہے — رہنے دو ابھی ساغر و مینا مرے آگے

حد لذت تقریر۔ دیکھنا تقریر کی لذت کہ جو اُس نے کہا — میں نے یہ جانا کہ گویا یہ بھی میرے دل میں ہے

حد نا امیدی۔ منحصر مرنے پہ ہو جس کی امید — نا امیدی اُسکی دیکھا چاہیے

بے اعتباری اہل دنیا۔ کیا کیا خضر نے سکندر سے — اب کسے رہنما کرے کوئی

مرزا کو مبداءِ فیاض سے صرف فلسفی کا دماغ اور شاعر کا قلم ہی نہیں عطا ہوا تھا بلکہ الہام نصیبوں کا دل بھی۔ جو اوروں کا آسمان ہے وہ مرزا کی زمین ہے۔ مرزا کے خیالات و جذبات و اخلاق کا پایہ اس قدر بلند ہے کہ جو اُنکے بدیہیات ہیں وہ اوروں کے نظریات بھی نہیں۔ اور یہی وجہ ہے کہ اکثر حضرات مرزا کے واردات قلب سے اس حد تک متاثر نہیں ہوتے جس حد کا اثر مرزا کی معجز بیانی نے اُن اشعار میں ودیعت رکھا ہے۔ مرزا کے اکثر اشعار وہ آئینۂ تصویر نما ہیں جن میں مرزا اپنے دل پر گذرنے والے کیفیات کا مرقع بنکر اپنا عکس ڈال چکا ہے۔ جن لوگوں پر وہی گزری یا گزر رہی ہے وہ ایسے اشعار پر نظر پڑتے ہی دل تھام کر رہ جاتے ہیں۔ مرزا کے پہچاننے والے کم تھے۔ کم ہیں۔

اور کم رہیں گے۔ ہر شخص مرزا کے کلام سے بقدر فہم لذت یاب ہوتا ہے۔ چنانچہ اس طرف اشارہ بھی کیا گیا ہے

دل حسرت زدہ تھا مائدۂ لذتِ درد　　کام یاروں کا بقدر لبِ دنداں نکلا

مرزا ایک ہی وقت میں خوش نصیب بھی تھا بدنصیب بھی تھا۔ اُسکے واردات کی دنیا الگ تھی اُس زمانہ کی دلّی اہل کمال کی سجی سجائی محفل بنی رہتی تھی مگر مرزا کی نگاہیں جن مناظر کا جواب لے کر نے لوٹتی تھیں وہ رہائش ادب کی ہیبت آفرینیاں اُن تک دوسری نگاہوں کو قدم تو بڑھانے دیتی تھیں اور مرزا غریب اس اعتبار سے مسافر در وطن تھا۔ آخر اپنے جذبات سے مجبور ہو کر حسرت بھرے لہجہ میں فریاد کر اُٹھا

بیا ورید اگر اینجا بود زباں دانے　　غریب شہر سخنہائے گفتنی دارد

تا ز دیوانم کہ سرست سخن خواہد شدن　　ایں مے از قحط خریداری کہن خواہد شدن

ہندوستان کی بدنصیبی یہ کہاں تک رو دیئے رہا سہا ادبی مذاق تک چل بسا۔ مرزا کیا کبھی اُستاد کے جگر پاروں کو کلیجہ سے کون لگائے۔ فارسی برائے نام کالجوں کے نصاب میں داخل تو ضرور ہے مگر اکثر جس طرح پڑھائی اور پڑھی جاتی ہے وہ اہل خبر سے پوشیدہ نہیں۔ اس طرح کے پڑھنے والے (باستثناء بعض) اپنے نصاب ہی کو خوب سمجھتے ہیں۔ پھر مرزا کی بلند پروازیوں کی داد کو پہونچنا اُن کے بس کی بات کہاں۔ کتابیں یوں دیکھی جاتی ہیں جس طرح زچہ تارے دیکھتی ہے۔ مگر اب زمانہ کروٹ بدل رہا ہے اور شیکسپیر پرستان ہندی نژاد اپنے اُجڑے ہوئے گھروں اور بھولے ہوئے خزانوں کی دیکھ بھال کی طرف متوجہ نظر آتے ہیں۔ اور یہ ایسا انقلاب ہے جس پر سجدۂ شکر واجب ہے اور ارباب حل و عقد نے اب اس حقیقت کو سمجھ لیا ہے کہ جب تک اپنی زبان پر قدرت نہ ہو اور زبانوں کے خزانے اپنی زبان میں منتقل نہیں کیے جا سکتے۔ ہر یونیورسٹی میں اُردو کی تعلیم ضروری قرار پاتی نظر آتی ہے۔ اب وقت آگیا ہے کہ مرزا کے دیوان کی شرح ایسی لکھی جائے کہ دیوان خود بہ زبان حال پکار اُٹھے کہ حق شرح ادا ہو گیا۔ اس سے یہ مطلب نہیں کہ کہ میں نے ایسی شرح لکھ دی۔ میں اپنی کورسوادی کا معترف ہوں مگر حسب گونیا اظہار خیال کے لیے آزاد ہے تو مجھے بھی جو کچھ کہنا تھا کہ گذرا۔

وہ جہاں برس پڑنے میں طوفان ہے وہاں داد دینے میں آندھی ہے۔ اگر کچھ شکایت فاضل شارح سے کی جا سکتی ہے تو اتنی کہ زیادہ نہ سہی غالب کو اپنا ہی سا نکتہ شناس و محقق سمجھا ہوتا اور ایراد و اعتراض کو شک یا سوال کے قالب میں ڈھال دیا ہوتا۔ میری رائے میں جہاں نکتہ سنج شارح نے وقتِ نظر سے کام لیا ہے وہاں نکتہ سنجی کا حق ادا کر دیا ہے اور اُن مقامات کی داد نہ دینا شرطِ انصاف میں کفر ہے۔ مثلاً

قفس میں مجھ سے رودادِ چمن کہتے نہ ڈر ہمدم گری ہے جس پہ کل بجلی وہ میرا آشیاں کیوں ہو
مجھ کو پوچھا تو کچھ غضب نہ ہوا میں غریب اور تو غریب نواز

ہاں جن مقامات پر سرسری نظر ڈالی ہے اور جہاں غالب باکمال کی شان فراموش ہو گئی ہے وہاں بہت کچھ کہنے کی گنجائش ہے بہت سے اشعار کی شرح اتنی ہی مشکل ہے جتنا شعر۔ کہیں کہیں بے پناہ شعر صرف داد دے کر چھوڑ دیے گئے ہیں اور ایراد کرتے وقت مرزا غالب کی جلالت قدر کا واجبی احترام نہیں کیا گیا۔

میں ادب الکاتب والشاعر و ساقی نامہ شقشقیہ کے مصنف (سید علی حیدر صاحب حیدر نظم طباطبائی) کی قابلیت علمی کو وارائے اہمیت سمجھتا ہوں انکی عروض دانی کا معترف اور پروفیسر نظام کالج حیدرآباد کی حیثیت سے اُنکی جلالت قدر کا معترف ہوں مگر کروں کیا کہ اس محل پر جناب طباطبائی کے احترام کے خیال سے ساکت رہنے کے معنی یہ نکلتے ہیں کہ مرزا نوشہ سے یگانہ عمر کی تنقیص کمال مجھے منظور ہے۔ اور یہی وہ خیال ہے جس کی بنا پر میرا ایمان خاموشی کو گناہ قرار دیتا ہے اور گناہ بھی ایسا جس کا کفارہ نہ ہو سکے۔ باقی شرحوں کے متعلق مجھے اسوقت کچھ کہنا نہیں ہے۔ میرے احباب کو مطمئن رہنا چاہیے۔ میں انشاء اللہ جادۂ انصاف سے نہ ہٹوں گا۔ غلط اعتراض کے اُٹھانے کی کوشش کروں گا اور صحیح ایراد پر سرِ تسلیم خم کروں گا۔ دنیا مجھے اپنی صحیح رائے کے سامنے سربسجدہ پائیگی میں مدت سے شرح کی داغ بیل ڈالنے کا ارادہ رکھتا تھا مگر ہمیشہ مجھے اپنی ناتندرستیوں اور مجبوریوں کا احترام سکوت پر مجبور کر دیا کرتا تھا۔ لیکن جب سے یہ سمجھ میں آیا کہ میری زندگی نام ہے ناکامیِ ابد پیوند کا میری زندگی نام ہے ناتندرستیوں کے سلسلۂ ناتمناہی کا بقول مخلص مولانا رعب اعلی اللہ مقامہٗ ؎

میرا فسانۂ غم مصداقِ ناتمامی میری شبِ مصیبت مفہومِ لاتناہی

میں نے خدا کا نام لیکر کشتی دھارے پر چھوڑ دی۔ ع۔ ہرچہ بادا باد ما کشتی درآب انداختیم۔ الحمدللہ کہ اب شرح دیوان تمام ہوگئی ہے۔ میں اب ایک غزل کا حل لکھتا ہوں اور ساتھ ہی ساتھ موجودہ شرحوں کی تنقید بھی کرتا جاؤں گا۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم

شبنم بہ گل و لالہ نہ خالی ز ادا ہے داغِ دلِ بے درد نظرگاہِ حیا ہے

جناب شوکت مغفور۔ لالہ پر جو شبنم ہے وہ ادا سے خالی نہیں۔ بیدرد کا داغ اُسکی حیا کا نظرگاہ ہے یعنی لالہ کو شبنم حیا کی نظر سے دیکھ رہی ہے کہ یہیں تو تھوڑی دیر میں مٹ جاتی ہوں اور لالہ کا داغ نہیں مٹتا۔ یہ بات ازحد قابل شرم ہے۔

تنقید۔ کاش فاضل شارح نے شعر کی شرح ہی پر بس فرمائی ہوتی۔ اس فقرہ سے کہ یہ بات ازحد قابل شرم ہے یہ بھی سمجھا جاسکتا ہے کہ لالہ کیلئے قابل شرم ہے اور یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ شبنم کے لیے۔ گمان میں سہی کوئی بات بھی الفاظ شعر کو مدنظر رکھتے ہوئی سمجھائی نہیں جاسکتی۔ شعر سے زیادہ شرح کا سمجھنا مشکل ہے

جناب حسرت موہانی۔ گل لالہ پر شبنم کے قطرے نہیں ہیں بلکہ عرق شرم ہے۔ شرم اس بات کی کہ لالہ کے دل میں داغ تو ہے لیکن درد نہیں ہے۔

حاشیہ۔ جناب حسرت وہی فرماتے ہیں جو جناب طباطبائی۔ اس لیے تنقید بھی وہیں ہو رہے گی۔

جناب طباطبائی۔ گل لالہ پر اوس کی بوندیں ایک مطلب ادا کررہی ہیں وہ یہ کہ جس دل میں درد نہ ہو اور داغ ہو وہ جائے شرم ہے۔ یعنی لالہ کے داغ تو ہے مگر درد عشق سے خالی ہے یہ بات اُسکے لیے باعث شرم ہے اور اسی شرمندگی سے اُسے عرق شرم آگیا ہے۔ مصرع میں ہے کے ساتھ نہ خلاف محاورہ ہے (نہ ہے) کے بدلے (نہیں) کہنا چاہیے۔

تنقید۔ پروردگارا یہ داغ ہوا اور درد نہ ہو کیا بلا ہے۔ اگر اس شعر کا یہ مطلب کہا جائے تو یہی سمجھ میں آئے گا کہ شاعر نے لالہ میں داغ بھی دیکھا اور شبنم بھی۔ سوال پیدا ہوا کہ ایسا ہے کیوں۔ پھر اُنکی فیور طبیعت نے خود وہی جواب دیا جو جناب طباطبائی کے حل میں مذکور ہے۔ مگر اس پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ دیکھنے والے نے یہی کیوں نہ سمجھ لیا کہ دل میں داغ ہو تو نہ رونا کیا معنی۔ یعنی جو داغ اُٹھائے گا

وہ ضرور رونے گا۔ اگر اس کا جواب یہ دیا جائے کہ شاعر شاہراہ عامہ سے الگ جاتا ہے۔ اس حالت میں داغ کیے ہوتے ہوئے درد کا ہونا ادعائے محض ٹھہرتا ہے۔ یہ صحیح ہے کہ ادعا شاعری میں ممنوع نہیں مگر جب تک لطیفہ و متین مطلب پیدا نہ ہو تکلف کی ضرورت ہی کیا ہے۔

آگے بڑھ کر ارشاد ہوتا ہے کہ پہلے مصرعہ میں ہے کے ساتھ 'نہ' خلاف محاورہ ہے۔ مگر میں با ادب عرض کروں گا کہ یوں نہ کہتا تو کیا یوں کہتا 'شبنم بگل لالہ نہ خالی ز ادا ہے' اس صورت میں اہل ذوق سمجھ سکتے ہیں کہ 'شبنم' پھر 'بگل لالہ' کے بعد 'خالی از ادا نہیں ہے' کہنا شعر کو ہیولی بنائے دیتا ہے۔ روابط کے سوا تمام شعر فارسی کے قالب میں ڈھلا ہوا ہے صرف 'ہے' کو 'ہست' سے بدل دیں تو شعر کا شعر فارسی ہوا جاتا ہے اور مصرع موزوں رہیں یہ خوب ہے جو شے جہاں کی ہے۔

بیجو دمو ہاتی۔ اہل بیدرد۔ سنگدل جسے دوسروں کی مصیبت پر ترس نہ آئے۔ نظرگاہ۔ اُمیدگاہ۔ مرزا نوشہ فرماتے ہیں کہ لالہ پر اوس کی بوندیں یہ مطلب ادا کر رہی ہیں کہ بیدردوں کے داغ ہی سے حیا کی اُمیدیں وابستہ ہیں یعنی جب اہل دل یہ منظر دیکھتے ہیں تو اُن کا خیال بیدردوں کی ایک حالتِ خاص کی طرف منتقل ہو جاتا ہے۔ جب بے رحموں (خواہ معشوق مراد ہو یا کوئی ظالم) کا دل خود کوئی صدمہ اُٹھاتا ہے۔ مثلاً کسی پر عاشق ہو جانا۔ مبتلائے فراق ہونا۔ کسی مصیبت میں پڑ جانا۔ کسی عزیز کا مر جانا۔ تو اُنکو عاشقوں یا مظلوموں کی تکلیف کا احساس ہوتا ہے اور یہی احساس اُنکو اپنے گذشتہ بیدردانہ طرز عمل پر شرمندہ کرتا ہے اور اُنکی آنکھوں میں اشک ندامت چھلک آتے ہیں یا جوش پشیمانی سے پیشانی عرق آلود ہو جاتی ہے۔ اور اِنکی یہی وہ ادا ہے کہ اہل دل اُسکے صلہ میں اُنکی تمام بُرائیوں پر خاک ڈال دیتے ہیں اور اُنکو اُس پشیمان ظالم پر پیار آنے لگتا ہے۔ اس شعر سے تو یہ کی حقیقت پر چھا نوں پڑتی ہے اور مرزا کے اخلاق کریمانہ کی تصویر آنکھوں میں پھرنے لگتی ہے۔ مصیبت بے رحموں کے لیے رحمت ہے اس لیے کہ رقت قلب پیدا کرتی ہے۔ مرزا نے فارسی میں بھی ایسا ہی کچھ کہا ہے۔

نازنیناں بحلند ارچہ جفا نیز کنند ۔۔۔ تو دوا ہے کہ نکروند حیا نیز کنند

دل خوں شدہ کشاکش حسرتِ دیدار ۔۔۔ آئینہ بدستِ بتِ بدستِ حنا ہے

مولانا شوکت۔ دل کشمکش حسرتِ دیدار سے بتِ بدستِ حنا کے ہاتھ میں آئینہ بنا ہوا ہے یعنی اُسکے

دیوانِ غالب کی شرحوں پر ایک سرسری نظر

(از نیجوؔ موہانی)

بیا اے عشق رسوائے جہانم کن کہ چندے
نصیحتہائے بے دردان شنیدن آرزو دارم

اُردو شاعری کے آدمِ اول ہیں حضرت امیر خسرو دہلوی اور آدمِ ثانی ہیں زبدہ شہنشاہ علم حضرت ولیؔ دکنی۔ متقدمین میں اقلیم سخن کا نظم و نسق میر تقی میرؔ اور میرزا رفیع سوداؔ کے ہاتھوں میں دیا گیا اور متاخرین میں تاجِ دارائی میرزا غالبؔ کے سر پر جلوہ افگن ہوا

زباں پہ بارِ خدایا یہ کس کا نام آیا کہ میرے نطق نے بوسے مری زباں کے لیے

شعرائے اُردو کے تذکروں پر بالاستیعاب نظر کرنے سے یہ حقیقت بے نقاب ہو جاتی ہے کہ میرؔ و سوداؔ و غالبؔ وغیرہ کے کوس لمن الملکی بجانے کا اعتراف اُن باکمال ہستیوں کو ہے جن کا قول قول جنکا فیصلہ فیصلہ تھا جنکی تعریف تمغائے افتخار و طغرائے اعتبار تھی۔ اور آج ہندوستان کے بچہ بچہ کی زبان پر جو ان حضرات کی یکتائی کا ترانہ ہے وہ حقیقت میں سخن سنجانِ ماضی و حال کے فیصلہ کی صدائے بازگشت ہے۔ ساحریان سحرِ حلال (اساتذۂ سخن) کے مرتبہ کا ادراک طبقہ عوام کو ہونے سے رہا۔ ان سے ایسی امید رکھنا کفر کے ایمان اور ایمان کے کفر بنجانے کی اُمید ہے۔ اور بہرحال دلیل بکسری ان یگانۂ دہر ہستیوں کی معراج جلالت کی حقیقی معرفت اُسوقت تک محال ہے جب تک اہلِ ذوق اساتذۂ ایران کی معجزہ آرائیوں پر ایمان نہ لاچکے ہوں اور اُنکی بیخزاں بہار سے نگاہ کا دامن گلچیں کا دامن نہ بن چکا ہو۔ خاصکر مرزا غالب کی قوتِ پرواز و قدرت ابداع و اختراع مضمون ملکۂ انتخاب الفاظ و طرز ادا کی داد اُسوقت تک دی ہی نہیں جا سکتی جب تک عرفیؔ شیرازی نظیریؔ نیشاپوری۔ کلیمؔ ہمدانی۔ طالبؔ آملی۔ شوکتؔ بخارائی۔ فغانیؔ شیرازی۔ بیدلؔ عظیم آبادی۔ ظہوریؔ ترشیزی۔ میر اکبر آبادی۔ سوداے دہلوی کا کلام پیش نظر نہ رہ چکا ہو۔ یہ واقعہ ہے کہ مرزا نے فارسی میں وہ کچھ کر دکھایا ہے جو انھیں کا

حق تھا۔ عرفی وہ ظالم ہے کہ زمین پر پاؤں ہی نہیں رکھتا۔ نظیری کی غزل ترانۂ باربدی کا جواب ہے بیدل کی فکر آسماں سیر ہے۔ ظہوری کا کلام جانِ معنی و جہانِ معنی ہے۔ مرزا جب ان کا جواب لکھتا ہے تو خود وجد کرتا ہے اور نکتہ سنجوں کو سجدہ ریزی کی تعلیم۔ ان استادوں کی غزل پر غزل کہنے کا سہرا متاخرین میں اگر ہے تو مرزا ہی کے سر ہے۔ پھر غزل بھی ایسی کہ اس سے بالاتر محال نہیں تو مشکل ضرور ہے۔ اب رہا دیوانِ اردو۔ وہ جہاں مختصر ہے وہاں منتخب بھی ہے۔ یہ مانی ہوئی بات ہے

شعر اگر اعجاز باشد بے بلند و پست نیست   در ید بیضا ہمہ انگشتہا یکدست نیست

یہ دیوان بھی مرزا کے کلام فارسی کے خصوصیات سے مالا مال ہے۔ میں اس وقت غالب باکمال کی صرف ایک خصوصیت کا ذکر کرنا چاہتا ہوں اور وہ یہ ہے کہ مرزا اکثر جس مضمون پر قلم اٹھاتے ہیں اسے معراج کو پہنچا دیتے ہیں۔ ہر پہلو پر نظر رہتی ہے اور کچھ اس طرح کہہ جاتے ہیں کہ اس کا جواب کہتے وقت نظر کرو کان قدرت ایجاد سپر انداختہ نظر آتے ہیں۔ ہاتھ سے قلم چھوٹ پڑتا ہے۔ اجزائے شعور بکھرنے لگتے ہیں۔ مثلاً

حد شوق مے کشی   گو ہاتھ کو جنبش نہیں آنکھوں میں تو دم ہے   رہنے دو ابھی ساغر و مینا مرے آگے

حد لذت تقریر   دیکھنا تقریر کی لذت کہ جو اس نے کہا   میں نے یہ جانا کہ گویا یہ بھی میرے دل میں ہے

حد نا امیدی   منحصر مرنے پہ ہو جس کی امید   نا امیدی اس کی دیکھا چاہیے

بے اعتباری اہل دنیا   کیا کیا خضر نے سکندر سے   اب کسے رہنما کرے کوئی

مرزا کو مبدأ فیاض سے صرف فلسفی کا دماغ اور شاعر کا قلم ہی نہیں عطا ہوا تھا بلکہ الہام نصیب کا دل بھی۔ جو اوروں کا آسمان ہے وہ مرزا کی زمین ہے۔ مرزا کے خیالات و جذبات و اخلاق کا پایہ اس قدر بلند ہے کہ جو انکے بدیہیات ہیں وہ اوروں کے نظریات بھی نہیں۔ اور یہی وجہ ہے کہ اکثر حضرات مرزا کے واردات قلب سے اس حد تک متاثر نہیں ہوتے جس حد کا اثر مرزا کی سحر بیانی نے ان اشعار میں ودیعت رکھا ہے۔ مرزا کے اکثر اشعار وہ آئینۂ تصویر نما ہیں جن میں مرزا اپنے دل پر گذرنے والے کیفیات کا مرقع بنکر اپنا عکس ڈال چکا ہے۔ جن لوگوں پر وہی گزری یا گزر رہی ہے وہ ایسے اشعار پر نظر پڑتے ہی دل تھام کر رہ جاتے ہیں۔ مرزا کے پہچاننے والے کم تھے۔ کم ہیں۔

اور کم رہیں گے۔ ہر شخص مرزا کے کلام سے بقدر فہم لذت یاب ہوتا ہے۔ چنانچہ اس طرف اشارہ بھی کیا گیا ہے

دل حسرت زدہ تھا مائدۂ لذتِ درد　　کام یاروں کا بقدر لب و دنداں نکلا

مرزا ایک ہی وقت میں خوش نصیب بھی تھا بدنصیب بھی تھا۔ اُسکے واردات کی دنیا الگ تھی اُس زمانہ کی دلّی اہل کمال کی سجی سجائی محفل ضرور تھی مگر مرزا کی نگاہیں جن مناظر لاجواب کے مزے لوٹتی تھیں دورباش ادب کی ہیبت فرنیاں اُن تک دوسری نگاہوں کو قدم نہ بڑھانے دیتی تھیں اور مرزا غریب اس اعتبار سے مسافر در وطن تھا۔ آخر اپنے جذبات سے مجبور ہو کر حسرت بھرے لہجہ میں فریاد کر اُٹھا

بیا وریدہ اگر اینجا بود زباں دانے　　غریب شہر سخنہا ے گفتنی دارد

تا ز دیوانم کہ سرمست سخن خواہد شدن　　این مے از قحط خریدارے کہن خواہد شدن

ہندوستان کی بدنصیبی پر کہاں تک روئیے رہا سہا ادبی مذاق تک چل بسا۔ مرزا کیا کسی اُستاد کے جگر پاروں کو کلیجہ سے کون لگائے۔ فارسی برائے نام کالجوں کے نصاب میں داخل تو ضرور ہے مگر اکثر جس طرح پڑھائی اور پڑھی جاتی ہے وہ اہل خبر سے پوشیدہ نہیں۔ اس طرح کے پڑھنے والے (باستثناء بعض) اپنے نصاب ہی کو خوب سمجھتے ہیں۔ پھر مرزا کی بلند پروازیوں کی داد کو پہونچنا اُن کے بس کی بات کہاں۔ کتابیں یوں دیکھی جاتی ہیں جس طرح زچہ تارے دیکھتی ہے۔ مگر اب زمانہ کروٹ بدل رہا ہے اور شکسپیر پرستان ہندی نژاد اپنے اُجڑے ہوئے گھر ون اور بھولے ہوئے خزانوں کی دیکھ بھال کی طرف متوجہ نظر آتے ہیں۔ اور یہ ایسا انقلاب ہے جس پر سجدۂ شکر واجب ہے اور ارباب حل و عقد نے اب اس حقیقت کو سمجھ لیا ہے کہ جب تک اپنی زبان پر قدرت نہ ہو اور زبانوں کے خزانے اپنی زبان میں منتقل نہیں کیے جا سکتے۔ ہر یونیورسٹی میں اُردو کی تعلیم ضروری قرار پاتی نظر آتی ہے۔ اب وقت آگیا ہے کہ مرزا کے دیوان کی شرح ایسی لکھی جائے کہ دیوان خود بہ زبان حال پکار اُٹھے کہ حق شرح ادا ہو گیا۔ اس سے یہ مطلب نہیں کہ میں نے ایسی شرح لکھ دی۔ میں اپنی کور سوادی کا معترف ہوں مگر جب دنیا اظہار خیال کے لیے آزاد ہے تو مجھے بھی جو کچھ کہنا تھا کہ گذرا۔

سخن فہم ہمیشہ کم تھے اور اب تو زمانہ کج راہ رو کی بیدادسے نایاب ہوتے جاتے ہیں - یہ لوگ سمجھتے ہیں اور وجد کرتے ہیں - اب رہے متوسطین وعوام وہ مرزا کا کلام خود تو کہیں کہیں سمجھتے ہیں باقی کے لیے ان کو موجودہ شرحوں کی ورق گردانی کرنی پڑتی ہے جن میں احباب نکتہ پرور نے بقدر قدرت دادِ سخن فہمی دی ہے - اس وقت دیوان غالب کی مندرجہ ذیل کامل یا ناقص شرحیں موجود ہیں - (۱) وثوق صراحت از والہ دکنی مغفور (۲) شرح مجددالسنۂ مشرقیہ حضرت شوکت میرٹھی مرحوم (۳) شرح مولانا حسرت موہانی زاد مجدہٗ (۴) شرح جناب نظامی بدایونی زاد مجدہٗ (۵) شرح جناب سید علی حید رصاحب حیدر ونظم طباطبائی لکھنوی زاد مجدہٗ (۶) یادگار غالب از حضرت حالی مرحوم (۷) شرح جناب مولوی عبد الباری صاحب آسی زاد مجدہٗ (۸) شرح جناب نہا زاد مجدہٗ (۹) شرح جناب واحد دکنی (۱۰) شرح حضرت سہا -

یہ وہ شرحیں ہیں جنہیں جہاں کہیں کہیں دادِ سخن فہمی دی گئی ہے وہیں بعض بعض اشعار کی شرح خواب بے تعبیر بن کر رہ گئی ہے - اور جو شخص خود نہ سمجھتا ہو اُسکے دل میں (خاکم بدہن) مرزا کی طرف سے سوءِ ظن پیدا ہوتا ہے - انشاءاللہ میری شرح کے مقدمہ میں جہاں کلام مرزا کی تنقید ہوگی وہیں ان شرحوں پر بھی مبسوط تبصرہ ہو جائے گا -

۱ (وثوق صراحت) مختصر سے مختصر اشارات کا مجموعہ ہے اور اس سے کام لینا نہایت مشکل ہے -

۲ (شرح مولانا حسرت) - میرے خیال میں مولانا کی شرح اس قدر مختصر ہے کہ اُس پر اشارات کی لفظ صادق آتی ہے - مبتدی اُس سے معتدبہ فائدہ نہیں اُٹھا سکتا - بعض مقامات پر متحیرین کی کی سی رفتار رہی - جیسی اور شرحوں میں بھی نظر آتی ہے - اور یہ مکمل شرح بھی نہیں ہے - یہ شرح مولانا نے آغازِ شباب میں لکھی تھی - جب خرد و خردہ کار کے شباب کا زمانہ آیا تو شاہدِ سیاسیات کی پرستش جزو ایمان بلکہ ایمان ہو گئی - اب جیسی نظرثانی کی ضرورت ہے ویسی فرصت کہاں - ؎

بہ ہزار شیوہ راطاعت حق گراں نہ بود لیک صنم بسجدہ در ناصیہ مشترک نخواست

(۳) (شرح جناب شوکت) - مجددالسنۂ مشرقیہ کی شرح کے متعلق بصد ادب اتنا ہی عرض کرنا ہے کہ آپ وہ پہلے شخص ہیں جس نے اس عقدۂ لاینحل کی طرف توجہ فرمائی ہے - لیکن واقعہ یہ ہے کہ یہ شرح اکثر مقامات پر کافرماجرائیوں کا طلسم ہے - اشعار کہیں کہیں مسخ ہو گئے ہیں - اگر کہیں کہیں

تحریفِ کاتب کا بھی ایسا علاج کیا ہے کہ باید و شاید۔ سب اشعار اس شرح میں بھی نہیں۔ کہیں کہیں اعتراض بھی فرمائے ہیں اُنکی تنقید کا انتظار کیا جائے۔

(۴) شرح جناب نظامی بدایونی۔ اسکے متعلق اتنا ہی کافی ہے کہ یہ شرح بعض شرحوں کی عکسی تصویر یا صدا نگار (گراموفون) کا نغمہ ہے۔ زیادہ تعرض مناسب نہیں۔

(۵) یادگار غالب۔ از حالی مغفور۔ اس میں بعض بعض اشعار کا مطلب ہے وہ بھی کسی خاص مطلب کے اظہار یا ثبوت کے لیے اور بس۔ اس سے بھی فی الحال تعرض مناسب نہیں۔

(۶) شرح جناب طباطبائی۔ اس شرح کو دیکھ کر ایک آتش مزاج ناظر کی زبان پر یہی آتا ہے کہ اگرچہ عوام میں یہ کتاب لاجواب مشہور ہے مگر میں اظہار حق میں سکوت کرنا حرام سمجھتا ہوں۔ میرے نزدیک یہی وہ شرح ہے جس نے ہرکس و ناکس کو جناب غالب کی جناب میں دریدہ دہنی کا سبق دیا۔ یہی وہ شرح ہے جس سے غالب بالکمال قبر میں تڑپ اُٹھا ہو تو جائے حیرت نہیں۔ اور یہی وہ شرح ہے جس کی بے گناہ کشی سے اشعار غالب سیاہ پوش نظر آتے ہیں اور دیکھیے اس گھر سے یہ ماتم کب نکلتا ہے۔ انتقاً حیہ مطلع کے متعلق مہمل ہونے کا فیصلہ صادر فرمایا گیا اور تا حد امکان تمام شرح میں اصلاح فرمانے اور حرف رکھنے کی سعی بلیغ سے نکتہ سنج شارح کہیں غافل نہیں رہا۔ کہیں تشبیہ مہمل بتائی گئی کہیں تخئیل لا یعنی دکھائی گئی کہیں انتخاب الفاظ کے گلے پر چھری پھرائی گئی۔ کہیں طرز ادا کے خرمن پر بجلی گرائی گئی۔ اہل دل جب اس شرح پر نظر ڈالتے ہیں تو بیساختہ علامہ فیضی علیہ الرحمہ کا یہ شعر انکی زبان پر آجاتا ہے

خوے عتاب آمیز را با لطف پیوندے بدہ ہم غمزہ را مستے بکن ہم عشوہ را پندے بدہ

اور مزہ یہ ہے کہ نا آشنایان رموز نکتہ سنجی و محرومان ذوق سلیم بعض اشعار کی شرح میں شارح کو جی کھول کر داد دیتے ہوئے دیکھ کر گمان کرتے ہیں کہ حق تنقید ادا کیا جا رہا ہے۔ مگر مجھے حیرت ہے کہ اگر تنقید کلام یہی ہے تو تنقیص کمال کسے کہتے ہیں۔ قصہ مختصر اس شرح میں انانیت و پندار کے بادل جھوم جھوم کے اُٹھے ہیں اور ٹوٹ ٹوٹ کے برسے ہیں۔

مگر بجود نا شاد نے جہاں تک اس شرح پر نظر ڈالی ہے اُسے تو یہ کہنا مناسب نظر آتا ہے کہ سادگی مزاج و جوشِ طبیعت مزاج شارح کے خاص جوہر ہیں اُس نے ہر جگہ اپنے دل کی ترجمانی کی ہے۔

وہ جہاں برس پڑنے میں طوفان ہے وہاں داد دینے میں آندھی ہے۔ اگر کچھ شکایت فاضل شارح سے کی جا سکتی ہے تو اتنی کہ زیادہ نہ سہی غالب کو اپنا ہی سا نکتہ شناس و محقق سمجھا ہوتا اور ایراد و اعتراض کو شک یا سوال کے قالب میں ڈھال دیا ہوتا۔ میری رائے میں جہاں نکتہ سنج شارح نے دقتِ نظر سے کام لیا ہے وہاں نکتہ رسی کا حق ادا کر دیا ہے اور اُن مقامات کی داد نہ دینا مشربِ انصاف میں کفر ہے۔ مثلاً

قفس میں مجھ سے روداد چمن کہتے نہ ڈر ہمدم　　گری ہے جس پہ کل بجلی وہ میرا آشیاں کیوں ہو

مجھ کو پوچھا تو کچھ غضب نہ ہوا　　میں غریب اور تو غریب نواز

ہاں جن مقامات پر سرسری نظر ڈالی ہے اور جہاں غالب باکمال کی شان فراموش ہو گئی ہے وہاں بہت کچھ کہنے کی گنجائش ہے۔ بہت سے اشعار کی شرح اُتنی ہی مشکل ہے جتنا شعر۔ کہیں کہیں بے پناہ شعر صرف داد دے کر چھوڑ دیے گئے ہیں اور ایراد کرتے وقت مرزا غالب کی جلالت قدر کا واجبی احترام نہیں کیا گیا۔

میں ادب الکاتب والشاعر و ساقی نامہ تنقیدیہ کے مصنف (سید علی حیدر صاحب حیدر نظم طباطبائی) کی قابلیت علمی کو دل سے اہمیت سمجھتا ہوں اُنکی عروض دانی کا معترف اور پروفیسر نظام کالج حیدرآباد کی حیثیت سے اُنکی جلالت قدر کا معترف ہوں مگر کروں کیا کہ اس محل پر جناب طباطبائی کے احترام کے خیال سے ساکت رہنے کے معنی یہ نکلتے ہیں کہ مرزا نوشہ سے لگاؤ نہ ہو اور ہر کی تنقیص کمال مجھے منظور ہے۔ اور یہی وہ خیال ہے جس کی بنا پر میرا ایمان خاموشی کو گناہ قرار دیتا ہے اور گناہ بھی ایسا جس کا کفارہ نہ ہو سکے۔ باقی شرحوں کے متعلق مجھے اسوقت کچھ کہنا نہیں ہے۔ میرے احباب کو مطمئن رہنا چاہیے۔ میں انشاء اللہ جادۂ انصاف سے نہ ہٹوں گا۔ غلط اعتراض کے اُٹھانے کی کوشش کروں گا اور صحیح ایراد پر سر تسلیم خم کروں گا۔ دنیا مجھے اپنی صحیح رائے کے سامنے سربسجدہ پائیگی۔ میں مدت سے شرح کی داغ بیل ڈالنے کا ارادہ رکھتا تھا مگر ہمیشہ مجھے اپنی نا تندرستیوں اور مجبوریوں کا احترام سکوت پر مجبور کر دیا کرتا تھا۔ لیکن جب سے یہ سمجھ میں آیا کہ میری زندگی نام ہے ناکامی ابدپیوند کا میری زندگی نام ہے ناتندرستیوں کے سلسلۂ نامتناہی کا بقول مخلص مولانا نادر عب اعلی اللہ مقامہٗ سے

میرا فسانۂ غم مصداقِ ناتمامی میری شبِ مصیبت مفہوم لاتناہی
میں نے خدا کا نام لیکر کشتی دھارے پر چھوڑدی۔ ۶۔ ہرچہ باداباد ما کشتی درآب انداختیم۔ الحمدللہ کہ اب شرح دیوان تمام ہوگئی ہے۔ میں اب ایک غزل کا حل لکھتا ہوں اور ساتھ ہی ساتھ موجودہ شرحوں کی تنقید بھی کرتا جاؤں گا۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم

شبنم بہ گل و لالہ نہ خالی ز ادا ہے داغ دل بے درد نظرگاہِ حیا ہے

جناب شوکت مغفور۔ لالہ پر جو شبنم ہے وہ ادا سے خالی نہیں۔ بے درد کا داغ اُسکی حیا کا نظرگاہ ہے یعنی لالہ کو شبنم حیا کی نظر سے دیکھ رہی ہے کہ میں تو تھوڑی دیر میں مٹ جاتی ہوں اور لالہ کا داغ نہیں مٹتا۔ یہ بات ازحد قابل شرم ہے۔

تنقید۔ کاش فاضل شارح نے شعر کی شرح ہی پر اکتفا فرمائی ہوتی۔ اس فقرہ سے کہ یہ بات ازحد قابل شرم ہے یہ بھی سمجھا جاسکتا ہے کہ لالہ کیلئے قابل شرم ہے اور یہ بھی کہا جاسکتا ہے کہ شبنم کے لیے۔ گران میں سے کوئی بات بھی الفاظ شعر کو مدنظر رکھتے ہوئی سمجھائی نہیں جاسکتی۔ شعر سے زیادہ شرح کا سمجھنا مشکل ہے۔

جناب حسرت موہانی۔ گل لالہ پر شبنم کے قطرے نہیں ہیں بلکہ عرق شرم ہے۔ شرم اس بات کی کہ لالہ کے دل میں داغ تو ہے لیکن درد نہیں ہے۔

حاشیہ۔ جناب حسرت وہی فرماتے ہیں جو جناب طباطبائی۔ اس لیے تنقید بھی وہیں ہو رہے گی۔

جناب طباطبائی۔ گل لالہ پر اوس کی بوندیں ایک مطلب ادا کر رہی ہیں وہ یہ کہ جس دل میں درد نہ ہو اور داغ ہو وہ جائے شرم ہے۔ یعنی لالہ کے داغ تو ہے مگر درد عشق سے خالی ہے یہ بات اُسکے لیے باعث شرم ہے اور اسی شرمندگی سے اُسے عرق شرم آگیا ہے۔ مصرع میں ہے کے ساتھ نہ خلاف محاورہ ہے (نہ ہے) کے بدلے (نہیں) کہنا چاہیے۔

تنقید۔ پر دردگارا یہ داغ ہو اور درد نہ ہو کیا بلا ہے۔ اگر اس شعر کا یہ مطلب کہا جائے تو یہی سمجھ میں آئے گا کہ شاعر نے لالہ میں داغ بھی دیکھا اور شبنم بھی۔ سوال پیدا ہوا کہ ایسا ہے کیوں۔ پھر انکی غیور طبیعت نے خود ہی جواب دیا جو جناب طباطبائی کے حل میں مذکور ہے۔ مگر اس پر یہ کہا جاسکتا ہے کہ دیکھنے والے نے یہی کیوں نہ سمجھ لیا کہ دل میں داغ ہو تو نہ رونا کیا معنی۔ یعنی جو داغ اُٹھائے گا

وہ ضرور روئے گا۔ اگر اس کا جواب یہ دیا جائے کہ شاعر شاہراہ عامہ سے الگ جاتا ہے۔ اس حالت میں داغ کے ہوتے ہوئے درد کا ہونا ادعائے محض ٹھہرتا ہے۔ یہ صحیح ہے کہ ادعا شاعری میں ممنوع نہیں مگر جب تک لطیفت و متین مطلب بے تکلف نکل آئے تکلف کی ضرورت ہی کیا ہے۔

آگے بڑھ کر ارشاد ہوتا ہے کہ پہلے مصرعہ میں ہے 'کے ساتھ' نہ 'خلاف محاورہ ہے۔ مگر میں باادب عرض کروں گا کہ یوں کہنا تو کیا یوں کہتا 'شبنم بگل لالہ نہ خالی ز ادا ہے' اس صورت میں اہل ذوق سمجھ سکتے ہیں کہ 'شبنم' پھر 'بگل لالہ' کے بعد 'خالی از ادا نہیں ہے' کہنا شعر کو ہیولیٰ بنائے دیتا ہے۔ رہا ربط۔ کیہ سوا اکثر شعر فارسی کے غالب میں دیکھا ہوا ہے صرف "ہے" کو "ہست" سے بدل دیں تو شعر کا شعر فارسی ہوا جاتا ہے اور یہ موزوں وہیں پہ خوب ہے جہاں کی ہے۔

ہیچو موہائی۔ حل۔ بیدرد۔ سنگدل جیسے دوسروں کی مصیبت پر ترس نہ آئے۔ نظرگاہ۔ اُمیدگاہ۔ مرزا فوشہ فرماتے ہیں کہ لالہ پر اوس کی بوندیں یہ مطلب ادا کر رہی ہیں کہ بیدردوں کے داغ ہی سے حیا کی اُمیدیں وابستہ ہیں یعنی جب اہل دل یہ منظر دیکھتے ہیں تو اُن کا خیال بیدردوں کی ایک حالتِ خاص کی طرف منتقل ہو جاتا ہے۔ جب بے رحموں (خواہ معشوق مراد ہو یا کوئی ظالم) کا دل خود کوئی صدمہ اُٹھاتا ہے۔ مثلاً کسی پر عاشق ہو جانا۔ مبتلائے فراق ہونا۔ کسی مصیبت میں پڑ جانا۔ کسی عزیز کا مر جانا۔ تو اُنکو عاشقوں یا مظلوموں کی تکلیف کا احساس ہوتا ہے اور یہی احساس اُنکو اپنے گذشتہ بیدردانہ طرزِ عمل پر شرمندہ کرتا ہے اور اُنکی آنکھوں میں اشکِ ندامت چھلک آتے ہیں یا جوشِ پشیمانی سے پیشانی عرق آلود ہو جاتی ہے۔ اور اِنکی یہی وہ ادا ہے کہ اہل دل اُسکے صلہ میں اُنکی تمام بُرائیوں پر خاک ڈال دیتے ہیں اور اُنکو اُس پشیمان ظالم پر پیار آنے لگتا ہے۔ اس شعر سے تو یہ کی حقیقت پر چھا نوں پڑتی ہے اور مرزا کے اخلاق کریمانہ کی تصویر آنکھوں میں پھرنے لگتی ہے۔ مصیبت بے رحموں کے لیے رحمت ہے اس لیے کہ رقتِ قلب پیدا کرتی ہے۔ مرزا نے فارسی میں بھی ایسا ہی کچھ کہا ہے۔

نازنیناں کہ بلند ار چہ جفا تیز کنند　　　زو فا لے کہ نکردند حیا نیز کنند

دل خوں شدہ کشاکشِ حسرتِ دیدار　　　آئینہ بدستِ بتِ بدستِ حنا ہے

مولانا شوکت۔ دل کشمکشِ حسرتِ دیدار سے بت بدستِ حنا کے ہاتھ میں آئینہ بنا ہوا ہے یعنی اُسکے

تغافل کو کھول رہا ہے کہ وہ حنا تو لگانے کے شوق میں بدست ہے اور یہاں حسرت دیدار میں دل کا کس قدر خون ہو رہا ہے۔ بدستِ حنا بُت کی صفت ہے۔

تنقید۔ جناب شارح نے خیال نہیں فرمایا کہ اس طرح مطلب کہنے میں شعر کا مفہوم گونگے کا خواب ہو جاتا ہے۔

جناب حسرت موہانی ۱۔ دل اور آئینہ کی رسائی قسمت کا مقابلہ کرتا ہے کہ ایک ہمارا دل ہے جو خون شدۂ کشمکش حسرت دیدار ہے اور ایک آئینہ ہے جو اُس بدست حنا کے ہاتھ میں ہے۔

۲۔ دل حسرت دیدار میں خون ہو کر بصورت حنا اُس کے ہاتھ میں آئینہ بن گیا ہے۔

تنقید۔ مطلب اول ظاہر میں تو دل کو لگتی ہوئی بات ہے مگر اس میں مصیبت یہ ہے کہ لفظ "حنا" حشوِ محض ٹھہرتا ہے۔ حالانکہ مرزا کے یہاں زوائد ہوں گے بھی تو دفع نظر بد کے لیے۔ علاوہ بریں بدست حنا یہاں بالاضافت نہیں ہے

۲۔ مطلب ثانی وہی ہے جو جناب شوکت نے لکھا ہے۔

جناب طباطبائی۔ آئینۂ دل مہندی بن گیا ہے یعنی حسرتِ دیدار نے اُسے پیس ڈالا اور اُس کے جگر کو لہو کر دیا۔ دل کو آئینہ بنا کر پھر اُسے حنا بنا دینا بہت ہی تصنع ہے اور بے لطف۔

تنقید جناب طباطبائی کی شرح پر ناطقہ سر بگریباں ہے تو خامہ انگشت بدنداں۔ رہی تنقید وہ دل لہو کیے دیتی ہے۔ دونوں کی حقیقت حل میں آئینہ ہوتی جاتی ہے۔

تمہید۔ ہے یوں کہ مرزا کا یہ شعر معشوق کی خود پرستی و محویت جمال کے متعلق جواب نہیں رکھتا مطلب صاف ہے مگر نظر کون کرے۔ بعض حضرات کو سمجھنے سمجھانے میں اس لیے دقت پیش آئی کہ اُنھوں نے بدست حنا کو اضافت سے پڑھا۔ دوسری بات یہ ہے کہ اس شعر میں تشابہات بھی جمع ہو گئے ہیں۔ مثلاً دل اور آئینہ کی تشبیہ عام ہے۔ دل خون شدہ اور حنا میں تشبیہ موجود ہے۔

حلِ از بیخود موہانی۔ دل حسرت دیدار کی کشمکش سے خون ہے۔ آئینہ بت بدست کے ہاتھ میں حنا ہے۔ یعنی دلِ پاک وصاف عاشق اس قابل نہ تھا کہ معشوق اُسے اپنا جلوہ زار بناتا اور آئینہ کا کام لیتا مگر بُرا ہو بدمستی کا کہ اس ظالم نے اُس سے حنا کا کام لیا۔ مختصر یہ کہ اُس نے دل کو اتنا ترسایا کہ لہو ہو گیا۔ اس شعر سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ خدا نہ کرے کہ کوئی قابلِ قدر چیز کسی قدر ناشناس کے ہاتھ پڑے۔

۲۔ حل بیخود موہانی۔ معشوق اپنے جمال کی دلربائیوں کے نظارہ میں ایسا محو و بیخود۔ مست و مدہوش

ہو رہا ہے کہ آئینہ اُسکے ہاتھ میں یوں بے حس و حرکت قائم ہے جیسے رنگِ حنا کفِ دست پر۔ اور حسرتِ دیدار کی کشمکش نے عشاق کے دلوں کو لہو کر رکھا ہے یعنی معشوق خود اپنا فریفتہ ہے اُسے اپنی بھی خبر نہیں وہ کیا جانے کہ کوئی مشتاقِ دید بھی ہے اور ہے تو اُس پر کیا بن رہی ہے۔

۳ - معشوق اپنے مہندی رچے ہوے ہاتھوں کو اس محویت سے دیکھ رہا ہے جس محویت سے خود پرست آئینہ دیکھتے ہیں۔ اور عشاق کا دل حسرتِ دیدار لہو کیے دیتی ہے۔

۴ - کشمکش حسرتِ دیدار مشتاقانِ دید کے دل لہو کیے دیتی ہے اور معشوق کو خود آرائی (سنگار) کا اس قدر شوق ہے کہ آئینہ اُسکے ہاتھ میں مہندی بنکر رہ گیا ہے یعنی کسی وقت آئینہ اُسکے ہاتھ سے چھوٹتا ہی نہیں۔ ایسا ہی کچھ اور ایک جگہ فرماتے ہیں

آرائشِ جمال سے فارغ نہیں ہنوز پیشِ نظر ہے آئنہ دائم نقاب میں

فریفتگیٔ معشوق کے متعلق مزید توثیق و ضیافتِ طبعِ ناظرین کے لیے دو چار شعر اور لکھے جاتے ہیں۔

لا ادری

با صد کرشمہ آں بتِ خود بیں ست میرود خود میکند خرام و خود از دست میرود

غالب

بخود رسیدنش از ناز بسکہ دشوار است چو ما بدام تمنائے خود گرفتار است

حالی

صید نا افگندہ محو دست و بازوئے خود است ایں جواں روزے شکارِ خویشتن خواہد شدن

۵ - حنا اُس بدمست کے ہاتھ میں آئینہ بنی ہوئی ہے۔ یعنی صاف ظاہر کر رہی ہے کہ عشاق کے دل کشمکش حسرتِ دیدار سے لہو ہو رہے ہیں۔ یعنی آہ وہ اپنے غرورِ حُسن سے بدمست ہو رہا ہے نہیں تو رنگِ حنا جو خون کا ہمرنگ ہے اُس پر ظاہر کر دیتا کہ عذرِ حنا کرنے سے مشتاقانِ دید کے دل لہو ہوے جاتے ہیں۔

حاشیہ - آئینہ کو باعتبارِ عدمِ حرکت حنا کہنا یا حنا کو باعتبارِ محویتِ معشوق آئینہ قرار دینا وہ داب نظم ہے جو دہی شاعروں کے سوا کسی کو نہیں ہوتا۔ شعر کے الفاظ نہیں شاطر نے سمجھ کر مُہرے ڈالدیے ہیں۔ ایک لفظ سے دوسرے لفظ کو زور پہونچ رہا ہے۔ لفظ کشمکش سے دل کے لہو ہونے کی تصویر

آنکھوں میں پھرنے لگتی ہے۔ کشمکش یہ ہے کہ محویت معشوق کا تقاضا ہے کہ اس تماشے سے درگذر و اور اور حسرت دید کہتی ہے کہ بے دیکھے پلٹنا حرام ہے۔

شعلے سے نہ ہوتی ہوس شعلہ نے جو کی　　جی کس قدر افسردگی دل پہ جلا ہے

اس شعر کے حل میں مجھے زیادہ اختلاف نہیں۔ میں جناب طباطبائی کا ایراد نقل کرکے جواب دیے دیتا ہوں۔

جناب طباطبائی۔ فرماتے ہیں "جی جلنا" اُردو کے محاورہ میں ناگوار ہونے کے معنی پر ہے۔ یہاں یہ معنی مقصود نہیں بلکہ جی کُڑھنا مقصود ہے۔ مصنف نے اپنی عادت کے موافق دل سوختن کا ترجمہ کرلیا ہے۔ فارسی میں کہیں گے کہ بربے برگیش دلم می سوزد۔ لیکن اُردو میں یہ کہنا کہ اسکی بیکسی پر دل جلتا ہے اچھا نہیں ہے۔ افسردگی دل سے اُس کا شعلۂ عشق سے خالی ہونا مراد ہے"

تنقید۔ جناب شارح نے غور نہیں فرمایا۔ مرزا "جی جلنا" غصہ آنے ہی کے معنی پر فرما رہے ہیں۔ "بیکسی پر دل جلنا" یہ مثال قیاس مع الفارق کے حکم میں ہے۔ کجا بیکسی کجا پست ہمتی۔ کسی کی بیکسی پر غصہ آتا ہے بے رحموں اور بودوں کو اور اپنی کم جرأتی پر غصہ آتا ہے اہل دل کو۔ ۲ ہاں مرزا مجتہدین فن خصوصاً میر تقی میر و مرزا رفیع سودا کی طرح فارسی محاوروں کا ترجمہ جائز ہی نہیں ضروری سمجھتے ہیں ۳ دل کی افسردگی سے شعلۂ عشق سے خالی ہونا ہی مراد نہیں بلکہ پست ہمتی مراد ہے۔ جیسے اصطلاح علم اخلاق میں بیدلی کہتے ہیں۔ دل جلنا دل کُڑھنے کے معنوں پر بھی ہے۔ مرزا رفیع سودا فرماتے ہیں ؎

بیکس کوئی موے تو جلے اُسپہ دل مرا　　گویا ہے یہ چراغ غریباں کی گور کا

حل شعر غالب از بیخود۔ دل کی بجھی ہوئی بے حوصلگی پر حد کا غصہ آتا ہے اُسکے ہاتھوں دل کی ایسی بربادی ہوئی کہ عشق کے چلتے نہ ہوتی۔ کوئی اُستاد کہتا ہے ؎

نہ زخم تازہ می خارد نہ داغ کہنہ می کاود　　بدہ یارب دلے کایں صورت بیجاں نمیخواہم

تمثال میں تیری ہے وہ شوخی کہ بصد ذوق　　آئینہ بانداز گُل آغوش کشا ہے

جناب حسرت و شوکت و طباطبائی نے پورے طور پر حق شرح ادا نہیں کیا۔ میں صرف جناب طباطبائی

کی عبارت نقل کیے دیتا ہوں۔اس لیے کہ عبارت واضح نہیں۔

جناب طبا طبائی ارشاد فرماتے ہیں کہ تیرے عکس عارض کا رنگ ایسا شوخ ہے یا تمام تمثال میں ایسی شوخی بھری ہے کہ آغوش آئینہ آغوش گل بن گیا ہے اور تیرا عکس آئینہ کو گل کی طرح شگفتہ کرکے نسیم کی طرح اسکے آغوش سے نکل گیا۔یہاں عکس کی شوخی بیان کرنے سے خود معشوق کا بچپن اور شوخ ہونا بالالتزام ظاہر ہوا۔

تنقید جناب غالب نے آئینہ کی آغوش کشائی کو گل کی آغوش کشائی .... سے تشبیہ دی تھی جس نے جناب شارح کو اپنی شرح میں عکس کو نسیم سے تشبیہ دینے پر اُبھارا اور اُس میں اتنی محویت ہوئی کہ مطلب کے ادا ہونے کی طرف توجہ فرمانے کا موقع نہ ملا۔صرف اتنا ہی نہیں کہ مرزا تشبیہ پر تشبیہ دیتا چلا جاتا ہے بلکہ اس تشبیہ سے مرزا کا خاص مطلب ہے جو حل میں بیان کیا جائے گا۔یہ مدنظر رہے کہ پھول کھلنے کے بعد پھر کلی نہیں بن سکتا۔ہاں جناب طبا طبائی کا یہ ارشاد ضرور صحیح ہے کہ یہاں عکس کی شوخی بیان کرنے سے معشوق کا چنچل ہونا بالالتزام ظاہر ہوا۔

حل بجود۔ تمثال عکس۔ تصویر۔

۱ آئینہ میں جو کھلا ہوتا ہی ہے مگر عاشق کو چنچل معشوق کی شوخیوں سے متاثر ہونے کی حالت میں ایسا نظر آرہا ہے کہ اُسکے عکس میں ایسی شوخی ہے کہ جسکے اثر سے بیتاب ہوکر آئینہ نے اسکی تمثال کو کلیجہ سے لگا لینے کے لیے گل کی طرح آغوش کھول دیا ہے۔

۲ تیری تصویر ایسی شوخ کھنچی ہے کہ آئینہ نے بیتاب ہوکر آغوش کھول دیا ہے۔چونکہ تصویر ہر وقت آئینہ ہی میں رہتی ہے۔اس لیے اُسکی شوخی بھی قائم رہتی ہے اور آئینہ بھی ہر وقت آغوش شوق کھولے رہتا ہے۔آئینہ کے متعلق میر کا شعر بھی یاد رکھنے کے قابل ہے ؎

مُنہ تکا ہی کرے ہے جس تس کا حیرتی ہے یہ آئینہ کس کا

۳ تو اتنا چنچل ہے کہ آئینہ ادھر اُٹھایا اُدھر رکھ دیا۔تیری شوخی سے بیتاب ہوکر آئینہ نے آغوش کھولا تھا اور پھر گل کی طرح کھولے ہی رہ گیا۔یعنی حیرت شوق آئینہ پر طاری ہوئی تو ہمیشہ کے لیے طاری ہوئی۔جس طرح کلی کھل جانے کے بعد پھر کلی نہیں بن سکتی۔

قمری کفِ خاکستر و بلبل قفسِ رنگ اے نالہ نشانِ جگرِ سوختہ کیا ہے

جناب شوکت - قمری جل کر راکھ کی مٹھی بن گئی اور بلبل کا رنگ قفسی یعنی سیاہی مائل ہے - اے نالہ اُنکے جگر سوختہ کا بھی کوئی نشان ہے - قمری کا رنگ خاکستری اور بلبل کا سیاہ (آہنی پنجرے کے مشکل) ہوتا ہے - اور دونوں نالہ کرتی ہیں اور نالہ ہی نے انکو جلا دیا - تمام نسخوں میں قفس رنگ بالاضافت غلط طبع ہوا ہے (بلکہ "قفسی رنگ" ہے)

تنقید - اس حل میں اے نالہ اُنکے جگر سوختہ کا کوئی نشان بھی ہے عجیب فقرہ ہے - اتنی کاوش ہوئی مگر بیت جیسی عقیم تھی ویسی ہی عقیم (بانجھ) رہی -

جناب حسرت - جگر سوختہ کا کوئی نشان سوا نالہ کے باقی نہیں ہے - پہلا مصرع بطور تمہید کے لکھا ہے کہ جس طرح قمری عشق سرو میں ایک کف خاکستر اور بلبل عشق گل میں صرف رنگ ہی رنگ رہ جاتی ہے اُسی طرح ہمارے جگر سوختہ کا کوئی نشان بجز نالہ کے باقی نہیں رہا ہے -

تنقید - اگر جناب حسرت کا حل صحیح مانا جائے تو یہ مصیبت پیش آتی ہے کہ کہنے والا کہہ سکتا ہے کہ اگر ہمارے جگر سوختہ کا نشان سوا نالے کے کچھ باقی نہیں ہے اور اتنا ہی باقی ہے تو یہ بات یعنی نالہ کشی تو بلبل و قمری میں بھی پائی جاتی ہے پھر مرزا سا نبض شناس نقطہ و معنی قمری کو کف خاکستر اور بلبل کو قفس رنگ کہکر معنی و حسن شعر میں کیا اضافہ کرتا ہے - اور جب اضافہ نہیں کرتا تو ع

ایں دفتر بے معنی غرق مے ناب اولی

جناب طباطبائی - قمری میں بسبب نالہ کشی کے کچھ خاکستر جگر پائی جاتی ہے اور بلبل میں کچھ رنگ جگر کا ملتا ہے باقی جگر کا کچھ پتہ نہیں - مطلب یہ ہے کہ نالہ کشی ایسی چیز ہے کہ جگر کو جلا کر نابود کر دیتی ہے اور قفس یعنی سینہ بھی ہے وہی معنی یہاں مراد ہیں - قمری کو کفِ خاکستر فارسی والے باندھا کرتے ہیں لیکن (۱) بلبل کو سینہ رنگ کہنا نئی بات ہے مگر بے لطف ہے (۲) نالہ کو مخاطب بنانا بھی بے مزہ بات ہے اور جگر سے بظاہر بلبل و قمری کا جگر مراد ہے - احتمال یہ بھی ہے کہ اپنے جگر سوختہ کا نشان شاعر پوچھ رہا ہے - شعر میں جہاں دوسرے معنی کا احتمال پیدا ہوا وہ سست ہو گیا -

تنقید - مفہوم شعر کے متعلق میں طول کے خوف سے کچھ نہ لکھوں گا

(۱) بلبل کو قفس سے جیسی مناسبت ہے ظاہر ہے - پھر بلبل کو قفس رنگ کہنا یا قفسی کہنا بلبل کے معنی پر ایک لطیف و جدید لفظ کا اضافہ ہے جیسے لیلیٰ کو جان مجنون کہنا - اسکی داد

اہل ذوق پر واجب ہے۔ یہ صحیح ہے کہ جس طرح سُرمئی اور اگرئی وغیرہ رنگوں کے نام ہیں اُس طرح قفسی کسی رنگ کا نام نہیں ہے مگر رنگ سیاہ کی جگہ پر قفسی رنگ کہنا اور پھر بلبل کے متعلق عذر و روا و کے قابل ہے۔ (۲) خیر نہیں نالہ کو مخاطب بنانا کیوں بے مزہ ہے اس لیے کہ غیر ذوی روح اشیاء سے جانداروں کی طرح خطاب کرنا ایران و ہند کی شاعری میں عام ہے اور انگریزی میں بھی نایاب نہیں (۳) یہ ارشاد کہ شعر میں جہاں دوسرے معنی کا احتمال پیدا ہوا وہ سست ہوگیا یہ صحیح ہے مگر جب احتمال ہو نہ۔ جب تغیر لہجہ یا کسی اور صورت سے کئی مفہوم بے تکلف نکلیں تو داد کے قابل ہیں۔ خواہ وہ مطالب مصنف کے ذہن میں شعر کہتے وقت موجود ہوں یا نکات بعد الوقوع کے تحت میں آئیں اور یہ تو شاعری کا معجزہ ہے کہ شعر دو متضاد معنی رکھتا ہو اور دونوں اپنی جگہ پر لطیف و مضبوط ہوں۔ جس طرح تصویر کی آنکھ بنانے میں مصور کا کمال یہ ہے کہ ایسی آنکھ بنائے کہ انسان جس سمت سے تصویر پر نظر ڈالے یہی سمجھے کہ صاحب تصویر مجھی کو دیکھ رہا ہے (خاص کر توریہ کے محل پر تو ایسا کلام کمالِ زباں آوری کے لیے مایۂ ناز ہے) خلاق المعانی حضرت خاقانی فرماتے ہیں

ہمسایہ شنید نالہ ام گفت   خاقانی را دگر شب آمد

اس کا حل یہ ہوگا:-

(۱) ہمسایہ نے میرا نالہ سن کر کہا، لو پھر رات ہوئی کمبخت نے کل کی رات نیند حرام کردی تھی آج کی رات بھی آنکھوں میں کٹتی نظر آتی ہے۔

(۲) ہمسایہ کا مقصود یہ ہے کہ خاقانی رات اس درد و کرب سے رو رہا تھا کہ رات کٹنے کی امید نہ تھی تعجب ہے کہ اب تک زندہ ہے

(۳) ہمسایہ ہمدردانہ لہجہ میں کہتا ہے کہ خاقانی بیچارے کی رات بڑی مصیبت سے کٹتی ہے۔ لو پھر رات ہوئی اور اُس پر وہی شدائد گذرنے لگے۔ ہائے کیسی مصیبت کی زندگی ہے۔

(۴) ہمسایہ بنظر استہزا کہتا ہے کہ لیجیے پھر رات ہوئی اور پھر وہی اُدھم مچنے لگا۔

خدائے سخن میر

جو پوچھا کہ کتنا ہے گل کا ثبات   کلی نے یہ سُنکر تبسم کیا

حل۔ کلی نے بتا دیا کہ گُل کا ثبات بقدر یک تبسم ہے۔

(۲) کلی اس بات پر مسکرائی کہ میری بہار عمر کی بے ثباتی سے مجھے کس لطیف پیرایہ میں آگاہ کیا۔
(۳) کلی پوچھنے والے کی سادگی پر مسکرائی کہ میں تو ابھی کلی ہوں میں کیا جانوں کہ گل کا ثبات کتنا ہے یہ پوچھنا ہو تو گل سے پوچھے
(۴) یہ بھی مقصد ہے کہ حضور کے نصیحت فرمانے کی ضرورت نہیں میں خود اپنی بے ثباتی سے واقف ہوں۔
(۵) مسکرانے کی وجہ یہ بھی کہہ چلے ہیں اسوقت یعنی آغاز بہار و شباب میں نصیحت کرنے جس وقت کوئی کسی کی نہیں سنتا۔

میں پھر اصل شعر لکھے دیتا ہوں:-

قمری کف خاکستر و بلبل قفسی رنگ　　اے نالہ نشان جگر سوختہ کیا ہے

حل شعراز بیخود موہانی (۱) قمری اور بلبل دونوں نالہ کش ہیں۔ قمری سوز عشق سے جل کر کف خاکستر اور بلبل خاک سیاہ ہو گئی ہے۔ اور اس طرح دونوں اپنے سوز عشق کا مرقع بنی ہوئی ہیں ان کا دعویٰ عشق مسلم ہے۔ اے نالہ میں اپنے سوز دل کے ثبوت میں دنیا کو کیا دکھاؤں۔ خالی نالہ دعوی بے دلیل ہے اور موجب رسوائی۔ کمال عشق یہ ہے کہ عاشق ہمہ تن سوز سراپا شعلہ بنکر رہ جائے۔ مقصد یہ ہے کہ میں شیدائیوں کی صف میں آتے ہوئے شرماتا ہوں اسلیے کہ میرا سوز سوز ناتمام ہے۔ مثال کے طور پر کچھ شعر لکھے جاتے ہیں۔ غالب

اُس شمع کی طرح سے جسکو کوئی بجھا دے　　میں بھی جلے ہووں میں ہوں داغ ناتمامی

سودا

سودا قمار عشق میں مجنوں سے کوہکن　　بازی اگر چہ لے نہ سکا جی تو کھو سکا
کس منہ سے پھر تو آپکو کہتا ہے عشقباز　　خانہ خراب تجھ سے تو یہ بھی نہ ہو سکا

(۲) ایک اور مفہوم۔ مصرعۂ ثانی کو اگر لہجۂ تحقیر میں پڑھیں تو صاف نکلتا ہے: انسان اشرف المخلوقات ہے ظرف اُسے اپنی حیثیت کے موافق عطا ہوا ہے۔ اے نالہ تو قمری کو کف خاکستر اور بلبل کو خاک سیاہ دیکھ کر مجھ سے میرے جگر سوختہ کا نشان پوچھتا ہے میں تجھے کیا بتاؤں میرے جگر سوختہ کا نشان ہی کیا۔ میں بلبل و قمری کا سا اوچھا نہیں۔ مجھے جیسا سوز عطا ہوا ہے ویسا ہی ضبط بھی۔ دوہا

آہ کروں تو جگ جلے اور جنگل ہو جل جائے　　یہ پاپی جیرا نا جلے کہ جس میں آہ سمائے

شیخ ناسخ علیہ الرحمہ

قسمت کیا ہر ایک کو قسّام ازل نے　　جو شخص کہ جس چیز کے قابل نظر آیا
بلبل کو دیا نالہ تو پروانہ کو جلنا　　غم ہم کو دیا سب سے جو مشکل نظر آیا

کوئی اُستاد کہتا ہے

بلبل نیم کہ نعرہ زنم درد سر کنم — قمری نیم کہ طوق بہ گردن در آورم
پروانہ نیستم کہ بہ یک دم عدم شوم — شمعم کہ جاں گدازم و سر بر نیاورم

(ت) نہ ہم میں سوزِ دل تھا جو جل کے راکھ سے رنگوں ہو گئی، بلبل سیاہ پڑ کر رہ گئی۔ مگر ہم ایسے بدنصیب ہیں کہ سوزِ دل نے کلیجہ پھونک دیا اور دنیا نے نہ جانا کہ ہم پر کیا گذری۔ دوہا

لکڑی جل کوئلہ بھئی اور کوئلہ جل بھئی راکھ — میں پاپن ایسی جلی نہ کوئلہ بھئی نہ راکھ

ف جب کوئی چیز جل جاتی ہے تو کوئلہ ہو جاتی ہے اور جب بالکل جل جاتی ہے تو راکھ ہو جاتی ہے۔ شاعر کہتا ہے کہ ایک کا رنگ خاکستری ہے دوسرے کا سیاہ۔ آخر ان دونوں میں ترجیح کس کو ہے یعنی میرے نزدیک تو قمری کو بلبل پر ترجیح ہے۔

خوئے تیری افسردہ کیا وحشت دل کو — معشوق اور بے حوصلگی طرفہ بلا ہے

جناب شوکت۔ تیری خو میں اس قدر شوخی بھری ہے کہ اسکے سامنے وحشتِ دل افسردہ ہے خوئے معشوق اور وحشت کی بے حوصلگی دونوں میرے لیے عجیب بلا ہو رہی ہیں۔

تنقید۔ اگر مطلب یہی ہے تو اس میں خوبصورتی کا نام نہیں، اسلئے کہ برہنہ لفظوں میں اسکے معنی یہی تو ہوئے کہ معشوق کی گرما گرمی، عاشق کی بیتابیوں اور امنگوں سے بڑھی ہوئی ہے۔ یہ واقعہ بھی ہو تو کہنے کی بات نہیں۔

جناب طباطبائی۔ معشوق ہو کر ایسا پھیکا پن، ایسی ٹھنڈی طبیعت نہ ناز و ادا کا حوصلہ، نہ چھیڑ کا مزہ۔ طرفہ بلا ہے۔ یعنی قابلِ نفرت ہے۔ خو سے بیدماغی و بدمزاجی مراد ہے۔ لفظ وحشت اس شعر میں مصنف نے ذوق و شوق کی جگہ پر باندھا ہے اور اصل میں وحشت و نفرت کے معنی قریب قریب ہیں وہ یہاں بنتے نہیں کیونکہ مطلب یہی ہے کہ تیری بدمزاجی سے دل کو وحشت ہو گئی، نہ کہ وحشتِ دل افسردہ ہو گئی غرض یوں کہنا چاہیے تھا کہ افسردہ کیا خواہشِ دل کو یا حسرتِ دل کو جب لفظ مطابق معنی ہوتا۔

تنقید۔ (۱) طرفہ بلا ہے کے معنی "قابلِ نفرت ہے" تو نہیں بلکہ عجب (انل) بے جوڑ یا تماشے کی بات ہے اور بس۔
(۲) وحشت کے معنی یہاں ولولے اور امنگ کے ہیں جسے معشوق اپنی زبان میں وحشت کہتے ہیں جب عاشق معشوق کو چھیڑتا ہے یا بیتابیاں کرنے لگتا ہے تو غمزہ اکثر اسکی زبان سے ایسے الفاظ نکلوا دیا کرتا ہے جیسے یا وحشت، یا پھر وحشت کی لینے لگے۔ حضرت داغ علیہ الرحمہ فرماتے ہیں

پوچھا مزاج اُس نے تو وحشت کی لے لی	آخر کو پردۂ دلِ دیوانہ کھل گیا

مرزا نے معشوق کا کہا ہوا صرف ایک لفظ یعنی "وحشت" دوہرا کر عاشق و معشوق کی خلوت، عاشق کی چھیڑ چھاڑ اور معشوق کے جواب کی تصویر کھینچ دی جس کا لطف کچھ اہلِ ذوق ہی جانتے ہیں اپنی تنقید کی توثیق کے لیے مرزا ہی کا ایک مطلع اور جناب طباطبائی کی شرح نقل کیے دیتا ہوں :- غالب

عشق مجھ کو نہیں وحشت ہی سہی	میری وحشت تری شہرت ہی سہی

جناب طباطبائی اس شعر کا مطلب یہ تحریر فرماتے ہیں یعنی تو میرے اظہارِ عشق پر کہتا ہے کہ تو دیوانہ ہو گیا ہے تو اسکا جواب یہ ہے کہ عشق مجھکو نہیں وحشت ہی سہی (۳) تیری بد مزاجی سے دل کو وحشت و نفرت ہو گئی۔ یہاں یہ فقرہ بھی عاشق کی زبان سے کچھ اچھا نہیں معلوم ہوتا خاصکر اُس صورت میں کہ الفاظِ معشوق کانوں پر ہاتھ دھر رہے ہیں۔ مراد قائل ادا کر رہی ہے طبع شاعر آمادۂ ہرب ہے۔ (۴) وحشت دل کو خواہش دل یا حسرتِ دل سے بدل تو دیں مگر مذاق سلیم کی پیشانی شکن آلود ہو جائے گی۔

حل۔ بیخود۔ تیری بے دماغی، تیرے روکھے پھیکے پن نے دل کی اُمنگوں کو کم اور دلولوں کے جوش کو ٹھنڈا کر دیا۔ معشوق ہو کر چھیڑ چھاڑ سے ایسی نفرت۔ توبہ۔

مجبوری و دعوائے گرفتاری الفت	دستِ تہِ سنگ آمدہ پیمانِ وفا ہے

بیخود۔ مجھے اس شعر کے مطلب میں کسی سے اختلاف نہیں ہے۔

حل۔ مرزا فرماتے ہیں کہ ہم حالت مجبوری میں محبت نباہ رہے ہیں۔ ہمارے پیمانِ وفا کی مثال ایسی ہے جیسے پتھر کے تلے کسی کا ہاتھ دب گیا ہو اور نکالے نہ بنے۔ اس میں ایک لطیف نکتہ یہ بھی ہے کہ عہد کرتے وقت ہاتھ پر ہاتھ مارتے ہیں۔ گویا ہم سے اور معشوق سے پیمانِ وفا نہیں ہوا ہے بلکہ مجبوری سے۔ (یہاں مجبوری ذی روح تصور کی گئی ہے)

معلوم ہوا حالِ شہیدانِ گذشتہ	تیغِ ستم آئینہ تصویر نما ہے

گذارش۔ اس شعر کے مطلب میں مجھے کسی سے اختلاف نہیں۔ ہاں اتنا عرض کر دینا ہے کہ شعر تو ادائے مطلب میں قاصر نہیں۔ نجر جمیں جناب طباطبائی نے ادائے مطلب کا کیا معیار قرار دے رکھا ہے۔

حل۔ کسی مجروح یا تماشائی کی نظروں میں معشوق (یا کسی ظالم) کی تیغ ستم کا انداز دیکھ کر اگلے شہیدوں کی تصویر پھر گئی ہے اور وہ کہتا ہے کہ تیری تلوار تلوار نہیں ایک آئینۂ تصویر نما ہے یعنی اس سے پتہ چلتا ہے کہ

اس تلوار کے گھاٹ اُترنے والوں پر کیا گزری ہوگی۔

اے پرتوِ خورشیدِ جہاں تاب ادھر بھی　　سایہ کی طرح ہم پہ عجب وقت پڑا ہے

پرتوِ خورشید۔ رحمت پروردگار۔ یا جناب رسالتمآب۔ کرم و جلوۂ معشوق۔ مرشد۔

حل۔ اے تمام دنیا کے روشن کرنیوالے آفتاب کے نور، ایک نظر کرم ادھر بھی۔ ہم پر سایہ کی طرح عجب وقت پڑا ہے۔ اس شعر میں بہت سے لطیف نکتے ہیں

(۱) دھوپ جب سایہ پر آجاتی ہے تو وہ بھی دھوپ ہو جاتا ہے۔ یعنی ہم کو اپنے رنگ میں رنگ دے

(۲) سایہ کی تشبیہ تعریف سے بے نیاز ہے۔ وہ یوں کہ سایہ کی مصیبت آفتاب کے سوا کسی کے ٹالے نہیں ٹل سکتی یعنی ہمارے درد کا علاج سوا تیرے کسی کے بس کی بات نہیں۔

(۳) آفتاب کو سایہ کے چمکا دینے میں کوئی دقت ہوتی ہے نہ تکلیف یعنی تیرے ادنیٰ سے اشارہ میں ہمارا کام بنجائے گا۔

(۴) عجب وقت پڑا ہے یعنی بہت ہی سخت مصیبت ہے جسکے اظہار کے لیے الفاظ ہی نہیں ملتے نہ کوئی اُس مصیبت کا صحیح اندازہ کر سکتا ہے۔

ناکردہ گناہوں کی بھی حسرت کی ملے داد　　یارب اگر ان کردہ گناہوں کی سزا ہے

جناب شوکت کی شرح میں یہ شعر نہیں۔ جناب حسرت نے صرف نثر فرما دی ہے۔ جناب طباطبائی نے صرف داد دینے پر اکتفا فرمائی ہے (یعنی میر تقی کو بھی حسرت ہوگی کہ یہ مضمون مرزا نوشہ کے لیے بچ رہا) حالانکہ یہی شعر بیت الغزل (غزل کی جان) ہے

حل۔ کوئی گنہگار دنیا میں اپنے اعمال کا محاسبہ کرتے وقت یا میدان حشر میں پرسش اعمال کے موقع پر کہتا ہے کہ اے میرے پروردگار اگر میرے کیے ہوئے گناہوں کی سزا دیتا ہے تو جن گناہوں کی حسرت رہ گئی (یعنی جو گناہ قدرت نہ ہونے کے وجہ سے یا تیرے خوف کے سبب سے یا تیری خوشنودی کے خیال سے نہیں کیے پہلے اُسے نکال دے پھر جو تیرا جی چاہے سزا دے لے میں خوشی سے بھگت لوں گا۔

حاشیہ۔ اس شعر میں مرزا نے انسان کے ذوق گناہ کی انتہا دکھائی ہے۔

(۲) پروردگار اگر میرے کیے ہوئے گناہوں کی سزا دیتا ہے تو جن گناہوں کی حسرت رہ گئی اور نا کامیوں نے میرے دل پر جو قیامتیں توڑ دی ہیں تو اُن سے واقف ہے۔ جو گناہ قدرت نہ ہونے کی وجہ سے میں نے

ہیں کیے اُس سے جو تکلیف میرے دل کو ہوئی ہے عجب نہیں جو وہی میرے گناہوں کا کفارہ ہوگئی ہو - اور
ہو گناہ تیرے خوف سے نہیں کیے اور جن لذتوں کو تیری خوشنودی کے لیے ترک کیا اُنکا اجر ملنا چاہیے -
فیصلہ کرنے میں یہ تمام امور مدنظر رہیں عجب نہیں جو میں جزا کا مستحق ٹھیروں سزا کیسی -
حاشیہ - مرزا نے بازپرس قیامت کے لیے قیامت کا جواب پیدا کیا ہے اور کس بلیغ انداز سے اپنا مطلب
ادا کیا ہے -

بیگانگیِ خلق سے بیدل نہ ہو غالب   کوئی نہیں تیرا تو مری جان خدا ہے

حل - اے غالب اگر تجھے دنیا نے چھوڑ دیا تو ہراساں ہونے کی کون سی بات ہے - اگر کوئی تیرا شریک
حال نہیں تو خدا تو موجود ہے - یہ شعر پڑھتے وقت ایک ایسے نااُمید و مجبور و رو کردۂ دوستاں و مبتلائے
آفات کی تصویر نظروں میں پھرنے لگتی ہے جسے اُمید کا فرشتہ تسکین دے رہا ہے -

محمد احمد مجنوں موہانی - ایم اے

اُردوے معلّٰی کانپور

مشفقی مولانا حسرت موہانی کا رسالہ اُردوے معلّٰی عرصے سے بند تھا - تاآنکہ دہلی سے ایک صاحب
نے اسی نام سے دوسرا رسالہ جاری کر دیا - جو اب بھی نکل رہا ہے - سال رواں سے حسرت صاحب نے پھر
اُردوے معلّٰی جاری کیا ہے اور جنوری و فروری دو ماہ کا مشترکہ پرچہ وصول ہوگیا ہے - علاوہ دیگر مضامین ادبی
و سیاسی کے ، چار چیزیں رسالہ میں ہر ماہ شائع ہوں گی : -

(۱) ارباب سخن کے نام سے ایک تذکرہ حسرت صاحب نے لکھا ہے اُس میں سے کسی ایک معاصر شاعر کا حال
(۲) سلسلۂ قادریہ رزاقیہ میں سے کسی بزرگ کے حالات -
(۳) کتاب نکات سخن کے ۸ صفحے
(۴) انتخاب دواوین اساتذہ

اس تازہ پرچہ میں شاہ حاتم کا جو دیوان ۲۰ صفحے پر ہے وہ ادنی درجہ کے بدیسی کاغذ پر ہے - حسرت صاحب کی یہ روش
اب دل آزاری کی حد تک پہونچ گئی ہے - وطن دوستی کی خاطر نہیں تو ادب نوازی ہی کے خیال سے اُنھیں کاغذ چھوٹا چاہیے
اُردوے معلّٰی کا سالانہ چندہ ؎ ہے - درخواست خریداری مولانا حسرت موہانی کانپور کے پتہ پر بھیجنا چاہیئے -

سیاسیات

از

محمد اجمل خاں صاحب بی اے (علیگ)

ہی خواہان اُردو باوجود عام کساد بازاری کے اپنے اپنے طور پر اس زبان کو علوم و فنون سے آراستہ کرنے کی جو کوششیں کر رہے ہیں وہ جس قدر قابل داد و ستایش ہیں ظاہر ہے۔ لیکن اس دورِ جدید میں علم السیاست پر کسی مستقل کتاب کا تصنیف یا تالیف نہ ہونا ضرور باعث تاسف تھا۔ مقام شکر ہے کہ محمد اجمل خاں صاحب کی سعی سے یہ کمی بھی ایک گونہ پوری ہوگئی۔ جہاں تک مجھے علم ہے اُردو میں یہ اس فن کی پہلی کتاب ہے۔ اور اس اعتبار سے الفضل للمتقدم کی مستحق اور ہر طرح پر قدر افزائی کی سزاوار ہے۔ خدا اسے قبول عام عطا فرمائے اور اُردو خواں پبلک کو اس سے حسب خواہ نفع پہونچائے۔

صاحب کتاب نے اپنے کو مؤلف ظاہر کیا ہے اور یہ بھی تحریر فرما دیا ہے کہ اس کتاب کا یہ دعوےٰ نہیں ہے کہ وہ ہر ایک سیاسی موضوع پر مفصل بحث کرے، بلکہ اس کتاب میں جامعیت و اختصار کے ساتھ سلطنت کے نظریہ عموی کو پیش کیا گیا ہے۔ لیکن اس باب میں گونہ کلام ہے کیونکہ اس کتاب میں مختلف نظریات اور اصولی و تاریخی بحثوں کو اس طرح جمع کر دیا گیا ہے کہ ایک اُردو خواں شخص جس نے اس موضوع پر دوسری زبانوں کی کتابیں نہ دیکھی ہوں کسی صحیح اثر کو قبول نہ کر سکے گا۔ کتاب کے چند صفحات پڑھنے کے بعد مجھے یہ خیال گذرا کہ اس کا انداز بیان بلنچلی کی کتاب کے موافق رکھا گیا ہے جب میں نے دونوں کتابوں کا مقابلہ کیا تو معلوم ہوا کہ صاحب کتاب نے بیشتر بلنچلی کا اقتدا کیا ہے۔ اور درمیان درمیان میں (اور بالخصوص ابتدائی حصص میں) بعض دوسری کتابوں سے کچھ کچھ مطالب اضافہ فرمائے ہیں اور کہیں کہیں خود بھی حسب حاجت اسلامی و ہندوستانی نقطۂ خیال کو داخل کر دیا ہے۔ لیکن اس ترتیب سے اس میں وہ خاص آسانی و سہولت باقی نہیں رکھی جو اُردو خواں پبلک کے لیے ضروری تھی۔ چونکہ اس کتاب میں بیشتر بلنچلی کی پیروی کی گئی ہے اس لیے اس نظر سے اس پر کچھ عرض کروں گا۔

بلنچلی (۱۸۰۸-۱۸۸۱) نے اپنی کتاب ۱۸۵۲ء میں ایک جلد میں شایع کی تھی۔ بعد کو اسے

بڑھا کر دو جلدیں کردیں اور پھر [illegible] میں اس میں ایک اور جلد کا اضافہ کیا۔ انگریزی میں صرف جلد اول کا ترجمہ ہوا ہے۔ اور وہی ہم لوگوں کی دسترس کے اندر ہے۔ بقول مترجمین انگریزی بلنچلی نے یورپی سلطنتوں کے متعلق اس کام کی سعی کی ہے جس کی تکمیل ارسطو نے یونانی سلطنتوں کے متعلق کی تھی اور اس میں اُس نے معقول حد تک کامیابی حاصل کی ہے (ملخصاً) اس میں شک نہیں کہ اسوقت تک انگریزی میں جتنی کتابیں علم السیاست کے متعلق لکھی گئی ہیں اُن سب میں باعتبار جامعیت بلنچلی کا پایہ بلند ہے لیکن نصف صدی میں علم السیاست نے اتنی ترقی کرلی ہے کہ بلنچلی کی کتاب کو اب عام متداول کتابوں کے بجائے امہات الکتب میں شامل کرنا چاہیے۔ یہی وہ نکتہ ہے جس میں مجھے صاحب تالیف سے اختلاف ہے کہ موصوف نے اس کتاب سے علم السیاست پر من حیث الوقت عبور حاصل کرنے کا جو مقصد پیش نظر رکھا ہے وہ کسی قدر عسیر الحصول ہوجائے گا۔ مؤلف نے یہ سعی ضرور کی ہے کہ جا بجا اضافے کے حالات جدیدہ کو عنوانات قدیمہ کے تحت میں لانا چاہا ہے۔ مگر اس میں اس وجہ سے وقت پیش آگئی ہے کہ بلنچلی نے محض اصول سیاسیات پر بحث نہیں کی ہے بلکہ تاریخی حیثیت سے یورپی سلطنتوں کا تبصرہ بھی کیا ہے اور اپنی کتاب کو کثیر التعداد عنوانوں اور زیر عنوانوں میں تقسیم کیا ہے اور ہر عنوان کے تحت میں نہایت اختصار کے ساتھ جامع الفاظ میں مطالب بیان کیے ہیں۔ اس وجہ سے ان کا خلاصہ کرنا نہایت دشوار ہوگیا ہے۔ البتہ بعض مباحث ایسے ہیں جو ہندوستان کے لیے چنداں ضروری نہیں ہیں اور انھیں حذف کیا جا سکتا ہے۔ مثلاً کتاب دوم کے ابواب ۷ لغایت ۱۲۔ مگر ہمارے صاحب تالیف نے بیشتر خلاصہ کی سعی کرائی ہے۔ اور یہی وجہ ہے کہ اکثر مباحث ناتمام سے رہ گئے ہیں اور اُن سے پوری تشفی نہیں حاصل ہوتی۔

صاحب تالیف نے بہت بڑی حد تک یہ سعی کی ہے کہ قدیم حالات کے ساتھ جدید حالات کو اور یورپی امور کے ساتھ ہندوستانی اور کہیں کہیں اسلامی امور کو بھی داخل کردیا ہے۔ اور اس کوشش میں انھیں معقول و مفید کامیابی ہوئی ہے خصوصاً غلامی کی بحث اسلامی نقطۂ نظر سے قابل دید و داد ہے باثبات کا مقالۂ اول "سیاسی معلومات" کے نام سے موسوم ہے۔ مگر اس میں صرف پانچ الفاظ پر گفتگو کی گئی ہے: سلطنت یا دولت، حکومت، قانون، ملت و قوم، اور سوارج۔ ان میں زیادہ حصہ طریق وضع قوانین کی بحث میں صرف ہوگیا ہے۔ اور دوسرے الفاظ کے متعلق بھی جو کچھ لکھا گیا ہے اس سے اصطلاح کے قائم ہونے کا نفع نہیں حاصل ہوتا بلکہ تشریحات کا فائدہ ہوتا ہے۔ سوارج کے متعلق کوئی قطعی معنی نہیں قرار دیے گئے ہیں۔ اور کیونکر قرار دیتے جبکہ خود واضعان لفظ اب تک

اسکی تعریف سے قاصر ہیں۔

کتاب کو جس طرح پر تقسیم کیا گیا ہے اسکے متعلق بھی دو چار الفاظ عرض کرنے کی جرأت کرتا ہوں بنیچلی نے اپنے کتاب کو (Book) اور (مقالہ Chapter) میں تقسیم کیا ہے۔ صاحب تالیف نے اپنی کتاب کو "باب" اور "مقالہ" میں تقسیم کیا ہے لیکن اگر "مقالہ" کے تحت میں "باب" رکھتے تو زیادہ موزوں ہوتا۔ کیونکہ عام رواج یہی ہے۔ اقلیدس کی تقسیم بھی یوں ہی ہے کہ انگریزی میں Book اور اُردو میں "مقالہ" ہے۔ مقالہ، باب، فصل، جزو، یہ سب الفاظ ایسے ہیں کہ ایک دوسرے کی جگہ رکھ دیا جائے تو کوئی لغوی اعتراض نہیں ہو سکتا مگر جب تک ضرورت شدید نہ ہو۔ رواج عام سے اختلاف سہولت عام کے خلاف ہوتا ہے۔

آخر میں اصطلاحات کا انگریزی ترجمہ دیا گیا ہے یا یوں کہیے کہ انگریزی اصطلاحات کا ترجمہ دیا گیا ہے۔ اس میں یہ دیکھ کر نہایت مسرت ہوتی ہے کہ مولف نے بہت بڑی کامیابی حاصل کی ہے۔ یہ مرحلہ اس قدر دشوار گذار ہے کہ اس کا اندازہ وہی لوگ کر سکتے ہیں جنھیں اس سے سابقہ پڑا ہو۔ مشکل در مشکل یہ ہے کہ بقول مولف سیاسیات و اخلاقیات کی اصطلاحیں بہ نسبت دیگر علوم کے زیادہ مستعمل ہیں اس لیے ان میں لامحالہ ایسے الفاظ لانا پڑتے ہیں جو بامعنی ہوں اور صحیح مفہوم پر دلالت کرتے ہوں، کیمیا وغیرہ کے مانند بے معنی الفاظ سے کام نہیں چل سکتا۔ لیکن بعض ترجموں سے مجھے کسی قدر اختلاف ہے مثلاً (Dominion) کا ترجمہ سیادت کیا گیا ہے، حالانکہ (Sovereignty) کا ترجمہ اگر سیادت کیا جاتا تو زیادہ موزوں ہوتا۔ اس آخر الذکر لفظ کا ترجمہ "استقلالیہ" کیا گیا ہے۔ مگر یہ غلطی مصری لٹریچر کی وجہ سے نادانستہ شائع ہو گئی ہے۔ استقلالیہ درحقیقت (Independence) کے معنی میں ہے اور (Sovereignty) کا ترجمہ اہل مصر نے "سلطنت" کیا ہے (Laws) کا ترجمہ فرہنگ میں سنت، شریعت، شرع دیا گیا ہے مگر اصل کتاب میں قانون استعمال ہوا ہے۔ حاشا کہ اس سے یہ مقصود نہیں کہ مولف کی محنت قابل داد نہیں۔ بلکہ کہنا صرف یہ ہے کہ چونکہ ہمارے پاس کوئی ایسا ذریعہ نہیں ہے کہ اصطلاحات قطعی قرار پا جائیں اور بلا استثنا وہی استعمال ہوں۔ اسی لیے یہ خرابی پیدا ہوئی اور پیدا ہوتی رہیگی اور جب تک متعدد کتابیں ہر فن پر موجود نہ ہو جائیں گی اور لکھنے والے باخود باہم کسی امر پر اتفاق نہ کر لیں گے اسوقت تک یہ دقت رفع نہ ہو گی۔

خلاصتہً یہ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ اسوقت اُردو زبان کی ضرورت کے لحاظ سے مناسب یہ ہے کہ یا تو حالات جدیدہ کے اعتبار سے مباحث قرار دیکر ان پر آزادانہ بحث کی جائے، یا خاص خاص

کتابوں کا ترجمہ یا خلاصہ اس طرح پر کیا جائے کہ وہ ایک ہی کتاب کا ترجمہ یا خلاصہ ہو۔ مؤلف نے جو صورت مختلف کتابوں سے التقاط کی اختیار کی ہے وہ ابتدائی حالت میں غالباً سود مند نہ ہوگی جبتک کہ مستند کتابیں اسی فن پر ایسی مہیا نہ ہو جائیں جن سے ہمارے علم پر کافی عبور حاصل ہو سکے۔

بہر حال صاحب تالیف کی محنت ہر طرح پر قابل داد و استحسان ہے۔ خدا اس کتاب کو قبول عام اور مؤلف کو آیندہ سلسلۂ تالیفات و تصنیفات کے جاری کرنے کی ہمت عطا فرمائے۔ آمین ثم آمین۔

تلمذ حسین

رباعیات

پیدا ہوئیں مستیاں مے حکمت سے
ظاہر ہوئے اسرار ازل فطرت سے
میخوار یہ کہہ اٹھے کہ خالق ہے کوئی
صانع کا پتہ چلا انھیں صنعت سے

اجسام کے پردہ میں ہے تنویر وجود
ہے حسن بشر پیکر تصویر وجود
خلقت میں نہاں ہیں ذات باری کے صفات
اشیا کی ماہیت ہے تفسیر وجود

ہے سرخی مے خودی کے افسانے میں
ساغر میں ہے جلوہ نور پیمانے میں
عالم ہو، خدا نہ ہو، یہ گفتار غلط
میخانہ ہو، ساقی نہ ہو میخانے میں

دل سوئے ریا ہو سر عبادت میں رہے
حوروں سے ہو ربط ضبط جنت میں رہے
میخانہ میں جیسے رنگ کا جمنا مشکل
ہاں شیخ فرشتوں کی جماعت میں رہے

کافور غم بے سروسامانی ہے
ترکوں میں کمال قائد ثانی ہے
ہیں لرزہ بر اندام عدو ہیبت سے
اس کے حملوں میں جوش ایمانی ہے

پھولوں کو شاق ہے جدائی میری — اک خواب و خیال ہے رہائی میری
دل تھام کے رہ جاتے ہیں مرغانِ چمن — یاد آتی ہے جب نغمہ سرائی میری

تاریکیِ قبر ہے کہ ہے دیدۂ کور — ہے گریۂ بیکسی نہ ہے یاس کا شور
یارائے فغاں شہر خموشاں میں کہاں — مانا - کچھ حسرتیں ہیں زندہ درگور

ہوں تُرک خلافت کے اثر سے آزاد — مذہب ہو سیاست کے اثر سے آزاد
سب کچھ ہو زمانہ میں مگر "ہند نہ ہو — باروت کی طاقت کے اثر سے آزاد"

ہے شاہد و مے نہ شعر خوانی کے مزے — ہیں وصل کی راتیں نہ کہانی کے مزے
وہ طعنۂ اقربا وہ رسوائیِ عشق — پیری میں یاد ہیں جوانی کے مزے

تسکیں نہ ہو گریہ کا مزا لینے سے — ساحل نہ ملے کشتیِ غم کھینے سے
ہیں دشمنِ آبرو یہ کافر معشوق — مرنا بہتر ہے انکو دل دینے سے

تخئیل کا اور چھور کس نے دیکھا — ٹیگور کا اصل زور کس نے دیکھا
آزادیِ ہند کو نہ سمجھا مغرب — "ناچا جنگل میں مور کس نے دیکھا"

ہیں مستِ ازل فضا کو ہم ڈھونڈھتے ہیں — کالی کالی گھٹا کو ہم ڈھونڈھتے ہیں
ہیں طالب فلسفہ نہ منطق کی تلاش — کیفیتِ مے میں خدا کو ہم ڈھونڈھتے ہیں

ہے غیرتِ مذہب نہ حمیت کا جوش — شمع اقبال ہو چکی ہے خاموش
شہرہ تھا کبھی دہر میں آزادی کا — اے اہلِ عرب آج ہو تم حلقہ بگوش

محمد مبین نازش بدایونی

اہلیا بائی اور ٹوکوجی ہولکر

احمد شاہ ابدالی پانی پت کے میدان سے فتحمندی کا سہرا باندھ کر لوٹ گیا اور ہندوستان کا ملک تم بیجان کی طرح چھوڑ گیا۔ یہاں سے دونوں جنگجو فریق زخموں سے چور تھے اور فاتح و مفتوح قریب قریب یکساں طور پر خستہ حال تھے۔ شاہ عالم مفرور۔ غازی الدین خاں روپوش۔ نجیب الدولہ دہلی کا امیرالامرا اور شجاع الدولہ انگریزوں سے دوستی کے پینگ بڑھانے میں مصروف تھا تاکہ اُنکی مدد سے روہیلوں کو زیر اور نجیب الدولہ کے آبائی ملک پر قبضہ کرے۔ تمام شمالی ہندوستان میں لڑنے کی سکت کسی میں نہ باقی تھی۔ پنجاب میں سکھوں نے زور پکڑا اور پورب میں ایسٹ انڈیا کمپنی نے امرائے دہلی کی باہمی مخالفت سے فائدہ اُٹھایا۔ حیدرآباد کا صوبہ دار نظام دکن اپنی قلمرو میں وسعت دینے کے لیے مرہٹوں کے علاقہ پر حملہ آور ہوا لیکن فریقین میں طویل جنگ کی قوت باقی نہ تھی۔ دو ہی میدانوں میں فیصلہ ہوگیا اور باہم صلح کرکے اپنے اپنے گھر واپس گئے۔

باجی راؤ پیشوا پانی پت کی شکست سے چند ہی مہینے بعد دنیا سے رخصت ہوگیا تھا اور اسکا لڑکا مادھو راؤ مسند نشین تھا لیکن سلطنت کا انتظام اُسکے چچا رگھوناتھ راؤ کے سپرد تھا جو ہندوستان کی تاریخ میں رگھوبا کے نام سے مشہور ہے اور جسکی بدنصیبی نے یہ کہاوت بنادی تھی کہ "جو رگھوبا کا شریک ہوا وہ تباہ یا ذلیل ہوا"۔

جنگ پانی پت سے چار برس بعد جب مرہٹوں کو دوبارہ ہاتھ پاؤں ہلانے کی ہمت ہوئی تو رگھوبا نے ہندوستان کا رخ کیا اور ملہار راؤ ہولکر اپنی فوج لیکر اُسکی مدد کو چلا لیکن چند ہی روز کے بعد یہ نامور سردار دنیا سے رخصت ہوگیا۔ اور رگھوبا کی مہم ناکام رہی۔

ملہار راؤ کے صرف ایک ہی بیٹا کنڈے راؤ تھا۔ جو جنگ پانی پت سے پہلے ہی ایک محاصرہ[1] میں قتل ہوچکا تھا۔ اس لڑکے کی شادی اہلیا بائی نام سندھیا خاندان کی ایک لائق لڑکی سے ہوئی تھی۔ اور اُس سے ایک بیٹا ملی راؤ موجود تھا۔

دادا کے مرنے کے بعد ہی ملی راؤ اندور کا راجہ ہوا۔ اور رگھوبا نے پیشوا کی طرف سے خلعت

---

[1] کنڈی راؤ کمھیری کے محاصرہ میں مارا گیا تھا۔ یہ مقام ڈیگ اور بھرت پور کے درمیان واقع ہے۔

بھیجکر اسکو ملہر راؤ کا جانشین تسلیم کرلیا۔ لیکن اُسکی صحت بہت خراب اور مزاج میں خفقانیت تھی حکومت پاتے ہی جنون کی علامتیں ظاہر ہونے لگیں۔ اور چند ہی مہینوں میں مصیبت زدہ ماں اسکی بدعنوانیوں سے عاجز آگئی۔ اہلیا بائی مذہب کی سخت پابند تھی اور برہمنوں کی خاص طور پر عزت کرتی تھی۔ لیکن راجہ کو اس فرقہ سے بغض تھا اور اُسکو برہمنوں کے ستانے میں لطف آتا تھا۔ برہمنوں کو جوڑے دان کرتا تو اُن میں بچھو رکھ دیتا تھا۔ اور روپیوں کی تھالی نذر کرتا تو زہریلے کیڑے اُس میں چھپا دیتا تھا۔ جب برہمنوں کو تکلیف پہونچتی تو وہ قہقہے لگاتا اور ماں روتی تھی!!

ایک بار راجہ کو شک ہوا کہ کوئی کاریگر محل کی ایک ناموس سے تعلق رکھتا ہے تو بغیر کسی ثبوت کے اُس بیگناہ کو قتل کروا دیا۔ اور جب کچھ عرصہ کے بعد متواتر شہادتوں سے ثابت ہوا کہ کاریگر بے قصور تھا تو اس قدر پشیمانی ہوئی کہ حسرت و افسوس نے اُسکو پاگل بنا دیا۔ اور وہ سلطنت کے ناقابل ہوگیا۔ دکھیا ماں دن رات اُسکے سرہانے بیٹھی آنسو بہایا کرتی تھی اور دوا دعا میں کوشش کرتی تھی۔ آخرکار نو مہینے برائے نام راج کرنے کے بعد فروری ۱۷۶۷ء میں ملی راؤ کی زندگی کا خاتمہ ہوگیا۔ اور ملہر راؤ کا کوئی وارث باقی نہ رہا۔

اہلیا بائی کی ایک لڑکی بھی تھی۔ لیکن اسکی شادی دوسرے خاندان میں ہوئی تھی اور وہ دھرم شاستر کے مطابق ریاست کی مستحق نہ تھی۔ دیوان نے مشورہ دیا کہ ہولکر کا ایک بعید رشتہ دار جو بہت کم عمر تھا گدی پر بٹھایا جائے تاکہ اس بہانہ سے انتظام حکومت دیوان کے ہاتھ رہے۔ مگر اُس نے غلطی کی کہ رگھوبا کو نذرانہ دینے کا وعدہ کرکے اپنا ہم رائے بنا لیا۔ اور اُسکی مدد کے بھروسہ پر اہلیا بائی کو اپنی تجویز سے اتفاق کرنے پر مجبور کیا۔

رگھوبا جس معاملہ میں شریک ہوتا اُس کا سرسبز ہونا غیر ممکن تھا۔ اہلیا بائی کو ہولکر کی ریاست میں پیشوا کا دخیل ہونا سخت ناگوار ہوا۔ اُس نے رگھوبا کو روپیہ دینے سے انکار کرکے دیوان کی شرمناک تجاویز کو نامنظور کردیا۔ اور فوجی سرداروں سے مشورہ کرکے اعلان کیا کہ ملہر راؤ کا کوئی وارث سوائے اُسکی ذات خاص کے باقی نہیں ہے۔ اس لیے وہ خود حکومت کریگی اور فوج کی سپہ سالاری کےلیے کسی سردار کو انتخاب کریگی۔

رگھوبا نے اپنی شرمندگی مٹانے کےلیے فوجی تیاریاں شروع کیں تو اہلیا بائی نے اُسکے پاس پیام بھیجا کہ "عورت پر چڑھائی کرکے دنیا میں بدنام نہ ہو۔ فتح سے عزت نہ بڑھے گی اور عورت سے شکست پانے کے بعد منہ دکھانا مشکل ہو جائے گا"

رگھوبا کو اگر سمجھ ہوتی تو وہ بدنصیبی میں کیوں مشہور ہوتا۔ اُس نے رانی کے عاجزانہ پیام کی کچھ پروا نہ کی اور ایک مظلوم بیوہ پر حملہ کے لیے فوج روانہ کی۔ اُس وقت مرہٹوں میں مادھوجی سندھیا حاکم اُجین اور جنوجی بھونسلا والی ناگپور بہت معزز و محترم تھے۔ ان دونوں نے عورت سے مقابلہ کرنا اپنی شان کے خلاف سمجھ کر فوج تو پیشوا کی خدمت میں حاضر کی لیکن لشکر کی سرداری سے انکار کر دیا۔ اور یہ عذر کیا کہ "عورت پر چڑھائی کرنا بہادری کے خلاف ہے" رگھوبا کو غیرت دلائی۔ نوعمر پیشوا مادھوراؤ نے بھی اہلیا بائی کی سفارش کی۔ اور سب طرف سے مجبور ہو کر رگھوبا اپنے ظالمانہ ارادوں سے دست بردار ہوا۔ اور جو لشکر اس رانی کے زیر کرنے کے لیے فراہم کیا تھا اُسکو نجیب الدولہ کے ستانے کے لیے ہندوستان کی طرف روانہ کر دیا۔ رگھوبا کی بدقسمتی سے اُسی وقت احمد شاہ ابدالی نے ہندوستان پر دوبارہ حملہ کیا۔ اور یہ فوج بغیر کسی نمایاں کامیابی کے مالوہ واپس آئی۔

رگھوبا کے فتنہ سے نجات پاکر اہلیا بائی نے حکومت کا انتظام باطمینان اپنے ہاتھ میں لیا اور فوج کی سپہ سالاری پر ایک کارآزمودہ سردار ٹوکوجی نامی کو جو پہلے "پگاہ" کی فوج میں افسر تھا مقرر کیا۔ یہ سردار ملہر راؤ کا رشتہ دار نہ تھا، مگر خاندان ہولکر سے تعلق رکھتا تھا۔ اور پانچ چھ پشتوں کے بعد اُسکا سلسلۂ نسب ملہر راؤ کے جد اعلیٰ ملہار جی سے ملتا تھا۔

اہلیا بائی نے ٹوکوجی کو رگھوبا کے ساتھ پونا روانہ کیا تاکہ پیشوا کے ہاتھ سے اُسکو خلعت پہنایا جائے۔ اور یہ اعلان کیا کہ دفتر و خزانہ کی نگرانی وہ خود کریگی اور فوج کا انتظام و اہتمام ٹوکوجی کے سپرد رہے گا۔

یہ سپہ سالار مالوہ میں بہت ہی کم رہا۔ اور دور دور دراز مقامات پر کبھی کبھی اُس نے اپنی ذمہ داری پر بھی کام کیا ہوگا۔ لیکن عام طور پر کل ضروری امور سلطنت اہلیا بائی کے اشارہ سے ہوتے تھے۔ جنگ و صلح کا فیصلہ اور ممالک غیر سے تعلقات بالکل رانی کے ہاتھ میں تھے۔ اُسکے وکیل پونا، حیدرآباد، سرنگاپٹم[1]، ناگپور، لکھنؤ، اور کلکتہ میں موجود رہتے تھے۔ مگر جب ٹوکوجی پونا میں ہوتا تھا تو وہی اہلیا بائی کی طرف سے پیشوا کے دربار میں وکیل سمجھا جاتا تھا۔ غرض راج کی سردار اہلیا بائی تھی۔ اور

[1] میسور میں حیدر علی نے ایک زبردست سلطنت قائم کر لی تھی۔ اور سرنگاپٹم اُس کا دارالسلطنت تھا حیدر علی کے جانشین ٹیپو سلطان کے عہد میں اس ریاست کا خاتمہ ہوا۔ اور اس کا ملک انگریزوں، نظام، اور مرہٹوں کے تصرف میں آیا۔ موجودہ ریاست میسور اسی سلطنت کا ایک چھوٹا سا ٹکڑا ہے۔ ۱۲

اُسکی زندگی بھر ٹکوجی نے اپنی عزت سپہ سالار سے زیادہ نہیں سمجھی۔

جب ٹکوجی جنوب میں ہوتا تو ست پوڑا سے دکن کا علاقہ اُسکے زیرِ نگرانی رہتا اور شمال کی جائداد اہلیا بائی کے انتظام میں آتی۔ جب وہ شمال کی طرف جاتا تو ہندوستان، بندیلکھنڈ، اور راجپوتانہ کی جاگیر اُسکے سپرد رہتی اور دکن کا کاروبار اہلیا بائی دیکھتی لیکن مالوہ اور نیماڑ کے اضلاع بہرصورت اہلیا بائی کے قبضہ میں رہتے تھے اور ریاست کا خزانہ اُسکے تصرف میں تھا۔ اُس کی ذاتی جاگیر کے علاوہ جو چار لاکھ کے قریب تھی ریاست کی آمدنی ریاست کے بہی کھاتے میں جمع ہوتی تھی۔ اور ایک ایک پائی کا حساب مرتب رکھا جاتا تھا

تقریباً تیس سال تک ٹکوجی اور اہلیا بائی کی متحدہ حکومت قائم رہی لیکن ان دونوں ذی اختیار حاکموں کے درمیان جھگڑے کا تو کیا ذکر ہے کبھی چشمک کی نوبت نہیں آئی اور انھوں نے اپنے باہمی اتفاق سے "دو بادشاہ در اقلیمے نہ گنجند" کی قدیم کہاوت میں ایک استثنا پیدا کر دیا۔

ٹکوجی ریاست کی فوج لیے ہوئے دور دور لڑتا رہا لیکن اس عقلمند رانی نے محض اپنے انصاف اور رحم کی طاقت سے ریاست کے حدود میں امن قائم رکھا۔ وہ روزانہ دربارِ عام میں بے پردہ جلوہ افروز ہوتی۔ ضروری کاغذات پر خود دستخط بناتی۔ اور ہر مدعی خاص استغاثے سنتی تھی۔ وہ طلوعِ آفتاب سے ایک گھنٹہ پہلے بیدار ہو کر پوجا پاٹ سے فراغت کے بعد کچھ دیر تک مذہبی کتابیں سنتی، برہمنوں کو خیرات دیتی اور کھانا تقسیم کرتی۔ ناشتہ کے بعد تھوڑی دیر قیلولہ کر کے دربار میں آتی تھی۔ جہاں عموماً دو بجے سے چھ بجے شام تک موجود رہتی تھی۔ اُسکے بعد دو تین گھنٹے مذہبی عبادت میں صرف کر کر نو بجے سے پھر کاروبار شروع کرتی اور گیارہ بجے رات سے پہلے بستر پر جاتی تھی۔ تیس برس تک مسلسل یہی دستور العمل قائم رہا۔ البتہ تیوہاروں کے موقع پر اس میں کچھ تغیر ہو جاتا تھا۔ باوجود سخت دماغی محنت کے وہ سوائے اناج اور ترکاریوں کے کچھ نہ کھاتی تھی اور گوشت سے پرہیز کرتی تھی، اگرچہ اُسکی قوم میں اسکا استعمال ممنوع نہ تھا۔

اسکی انتظامی قابلیت کا اندازہ اس واقعہ سے ہو سکتا ہے کہ اُسکے عہد میں بجز ایک ناکام حملہ کے جو اودے پور کے رانا نے کیا تھا کسی بیرونی دشمن کو اُسکے ملک پر چڑھائی کرنے کی ہمت نہیں ہوئی۔ اُسکے طویل دورِ حکومت میں ایک ہی برہمن وزارت کے عہدہ پر قائم رہا۔ اور اُسکے عمال بھی بہت کم تبدیل کیے جاتے تھے۔ مالگزاری کی وصولی کے لیے اُس نے زمینداروں سے بندوبست

یا اور اندور کو جو اُسکے وقت سے پہلے ایک مختصر گاؤں تھا ترقی دے کر ہندوستان کے دولتمند شہروں میں شمار کیے جانے کے قابل بنا دیا۔

ایک انگریز آفسر[1] نے جو اہلیا بائی کی وفات سے تھوڑی ہی مدت کے بعد اندور میں وارد ہوا تھا، اس رانی کے رحم و انصاف کے چند قصے لکھے ہیں، جن کا درج کرنا اس مضمون کی دلچسپی میں اضافہ کر سکتا ہے :-

(۱) ایک بار تکوجی ہولکر اپنی فوج لیے ہوے اندور کے پاس خیمہ زن تھا۔ وہاں کا ایک ساہوکار دیوی چند فوت ہوا اور اُسکے کوئی اولاد نہ تھی۔ تکوجی نے ساہوکار کی جایداد سے ریاست کا حق وصول کرنا چاہا تو ساہوکار کی بیوہ اہلیا بائی کے پاس شکایت لیکر مہیسر پہونچی۔ رانی نے بیوہ کو خلعت سے سرفراز فرمایا اور اوسکو خاوند کی جایداد کا مالک تسلیم کر لیا۔ تکوجی کو حکم دیا کہ وہ اندور سے فاصلہ پر قیام کرے اور اس شہر کی رعایا کو نہ ستائے۔

(۲) سرونج کا ایک مہاجن سُبھ کھیم داس مر گیا۔ ریاست کے عامل نے اُسکی بیوہ سے تین لاکھ روپیے کا مطالبہ کیا اور جایداد ضبط کرنے کی دھمکی دی۔ متوفی کے رشتہ داروں نے بیوہ کو ایک لڑکا گود لینے کی صلاح دی لیکن عامل اس پر بھی راضی نہ ہوا۔ بیوہ اہلیا بائی کے پاس پہونچی تو رانی نے اُسکو ایک دن بھی لیت ولعل میں نہ رکھا۔ بیوہ کو گود لینے کی اجازت دی۔ اس کے متبنے لڑکے کو اپنے زانو پر بٹھا کر خلعت، جواہر اور پالکی سے سرفراز فرمایا۔ اور سرونج کے عامل[2] کو تبدیل کر دیا۔

(۳) اہلیا بائی نے تلسی کی پتی ہاتھ میں لیکر ہولکر کا کل خزانہ نیک کاموں کے لیے وقف کر دیا تھا۔ اُس نے تمام علاقہ میں دھرم سالے اور کنوئیں تعمیر کرائے۔ جگناتھ، دوارکا، کیدار ناتھ اور رامیشورم تک جاتریوں کے آرام کے لیے اُس نے عمارتیں بنوائیں۔ اور ہر سال خیرات کے لیے تمام مقدس مقامات پر کثیر رقمیں بھیجا کرتی تھیں۔

(۴) گرمیوں کے موسم میں اہلیا بائی کے ملازم سڑکوں پر مسافروں کو پانی پلانے کے لیے تعینات رہتے تھے اور جاڑوں میں اُسکی سرکار سے محتاجوں کو لباس تقسیم ہوتا تھا۔ جنگلی جانوروں،

---

[1] میجر جنرل سر جان ملکم - ملاحظہ ہو انکی یادداشت بابت مالوہ - مطبوعہ ۱۸۲۳ء جلد اول

[2] اُس زمانہ میں حکام کی عزت برقرار رکھنے کا شاید خیال نہیں کیا جاتا تھا - اور رعایا کی خوشی سرکاری ملازموں کا عہدہ قائم رکھنے سے ضروری سمجھی جاتی تھی !!!

چڑیوں اور چیونٹیوں کی خوراک بھی اُسکے خزانہ سے مقرر تھی۔ مہیسر کے قریب کاشتکاروں کے بیل دوپہر کے وقت تھوڑی دیر کے لیے ہل چلانے سے روک دیے جاتے تھے اور رانی کی طرف سے ان جفاکش جانوروں کو پانی پلایا جاتا تھا۔ اُس نے بہت سے کھیت خرید کرکے چڑیوں کی خوراک کے لیے وقف کردیے تھے۔ زمیندار کی کوشش تھی کہ ان پرندوں کو اپنے کھیت سے بھگاتے ہیں اُن کا پیٹ بھرنے کے لیے ان کھیتوں کی پیداوار نذر کردی جاتی ہے۔

اہلیا بائی قد میں پست اور جسم کی چھریری تھی۔ وہ خوبصورت تو نہ تھی لیکن چہرہ پہ عبادت و ریاضت کا نور برستا تھا۔ وہ بہت خوش مزاج تھی اور اسکو غصہ بڑی مشکل سے آتا تھا۔ ضرورت کے موافق لکھنا پڑھنا جانتی تھی۔ لیکن اُس کا سب سے بڑا وصف یہ ہے کہ باوجود بیس سال کی عمر میں بیوہ ہوجانے کے اُس کی عصمت پر کبھی کسی قسم کا شبہ نہیں کیا گیا۔ شوہر کے مرنے کے بعد اُس نے رنگین لباس چھوڑ دیا تھا اور ایک پتلی ہنسلی کے سوا کوئی زیور اُسکے بدن پر نظر نہ آتا تھا۔ اُسکو خوشامد بہت ناپسند تھی۔ ایک برہمن نے اُس کی تعریف میں ایک کتاب لکھ کر سنائی تو اُس نے کہا کہ وہ بہت کمزور اور گنہگار عورت ہے اور ان تعریفوں کی مستحق نہیں۔ مصنف کو کچھ انعام نہیں دیا اور اُسکی کتاب محل کے جھروکہ سے نربدا میں پھینکدی!!

زندگی کے آخری حصہ میں اس شریف رانی کو ایک سخت صدمہ برداشت کرنا پڑا۔ اُسکا لڑکا ملی راؤ تو پہلے ہی مجنون ہوکر مرچکا تھا اب اُسکی لڑکی مکتا بائی بھی بیوہ ہوگئی۔ اس لڑکی کی شادی جسونت راؤ پھونسیا سے ہوئی تھی۔ اور ایک لڑکا بھی پیدا ہوا تھا جو جوان ہوکر مرگیا بیٹے سے سال بھر بعد شوہر بھی رخصت ہوا تو مکتا بائی نے اپنے خاوند کے ساتھ ستی ہونے کا ارادہ کیا۔ اہلیا بائی مزاحم ہوئی اور بہت دردسے سمجھایا کہ بوڑھی ماں کو دنیا میں بے یار و مددگار نہ چھوڑے مگر مکتا بائی نے جواب دیا کہ "ماں! تم بوڑھی ہوگئی ہو اور تمھاری عبادت کی زندگی چند سال میں ختم ہو جائے گی۔ میرا لڑکا اور خاوند دونوں گزر گئے۔ جب تم بھی چلی جاؤگی تو میں دنیا میں کس کے سہارے پر جیونگی؟ اور اُسوقت ایسی عزت کی موت نصیب نہ ہوسکے گی جیسی کہ آج ممکن ہے" اہلیا بائی لاجواب ہوئی اور اُس نے قصد کیا کہ بیٹی کی چتا اپنی آنکھوں سے دیکھے۔ وہ جلوس کے ساتھ مرگھٹ تک گئی اور چتا سے کسی قدر فاصلہ پر خاموش کھڑی رہی لیکن احتیاطاً دو برہمن اُسکے ہاتھوں کو تھامے تھے تاکہ وہ خودکشی نہ کرسکے۔

جب آگ کا پہلا شعلہ بلند ہوا اور جان سے زیادہ عزیز بیٹی کا جسم جسکو اپنی گود میں پال کر جوان

کیا تھا جھلسنا شروع ہوا تو مصیبت زدہ ماں بے تاب ہو گئی اور چیخیں مارنے لگی۔ اُسکے دونوں ہاتھ برہمنوں کے قابو میں تھے ورنہ چتا میں کود پڑتی!! اپنے ہاتھوں کو چھڑا نہ سکتی تھی لیکن غصہ اور رنج سے کئی بار کاٹ کھایا!! جب چتا سرد ہو گئی تو رانی نے ندی میں غسل کیا اور محل کو واپس گئی۔ مگر یہ غم اُسکو کبھی فراموش نہ ہو سکا اور تھوڑے ہی عرصہ کے بعد دنیا سے رخصت ہو گئی۔ اُس کی زندگی ہندوستان کی تاریخ میں عورتوں کی انتظامی قابلیت کی ایک عجیب و غریب تصویر ہے۔ وہ خود پسندی اور غرور سے بیگانہ تھی۔ مذہب کی پابند تھی مگر تعصب نہ رکھتی تھی۔ خود مختار حاکم تھی لیکن عاجزی اور فروتنی اُس کا معمول تھا۔ تمام بد اعمالیوں سے پاک تھی لیکن دوسروں کی لغزشیں معاف کرنے کو ہر وقت تیار رہتی تھی۔ اور تمام ہندوستان میں اُس وقت کوئی فرمانروا اُس سے بہتر موجود نہ تھا۔ ملک کے اندرونی انتظامات اور رانی کے ذاتی خصائل تو بیان ہو چکے اب اُسکے بیرونی تعلقات کی داستان سننا چاہیے۔ اُسکے عہد میں ہولکر کی فوج نے جو ناموری حاصل کی وہ جس طرح ٹکوجی کی شجاعت کا ثمرہ تھی اُسی طرح اہلیا بائی کی تدبیر و جفاکشی کا نتیجہ تھی۔ لشکر کا مہیا کرنا اور اسکو بہترین آلاتِ جنگ[1] سے مسلح بنانا اہلیا بائی کا کام تھا۔ اور میدان میں مصلحت و دانشمندی سے اُنکو لڑانا

[1] ریاست اندور کے پُرانے کاغذوں میں ایک اقرارنامہ دستیاب ہوا ہے جو اہلیا بائی نے ایک امریکن سٹرو انڈ سے کیا تھا اور جسکی رو سے جدید طرز کی قواعد داں فوج مرتب کی تھی۔ یہ اقرارنامہ ۱۷۹۰ء میں ہوا تھا۔ اور اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اُس وقت ایک ہزار سپاہیوں پر کس قدر خرچ پڑتا تھا:-

۱	[illegible]	۲۰۰۰	ماہوار		۲۰	حولدار	۱۲	ماہوار	فی کس
۱	کپتان	۲۰۰	"		۲۰	نائک	۸	"	"
۵	لفٹنٹ	۱۵۰	"	فی کس	۱۰	تنبورچی	۹	"	"
۹	سرجنٹ میجر	۶۵	"		۱۰	بانسری والے	۸	"	"
۹	سرجنٹ	۶۵	"	فی کس	۸۴۱	سپاہی	۶	"	"
۱	کامدان (دیسی)	۶۰	"		۲	کارکن	۳۰	"	"
۱۰	صوبہ دار	۴۰	"	فی کس	۵	ہرکارے	۵	"	"
۱۰	جمعدار	۲۰	"	"	۱۰	بہشتی	۴	"	"
					۵	مشعلچی	۵	"	"

کل میزان ۱۰۰۱ ملازم اور ماہواری خرچ ۱۰۲۳۶

(بقیہ حاشیہ برصفحہ آئندہ)

ٹوکوجی کی خدمت تھی۔

پہلے بیان ہوچکا ہے کہ اہلیا بائی نے اپنے انتخاب کیے ہوے سپہ سالار کو پیشوا سے خلعت حاصل کرنے کے لیے پونا بھیجا تھا۔ مگر وہاں مراحم خسروانہ سے سرفراز ہونے کے بعد قیام کی کچھ ہی دن نوبت آئی تھی کہ اُسکو ہندوستان جانا پڑا۔ مرہٹوں کی فوجی قوت اب کسی قدر سنبھل گئی تھی اور شمال کے مسلمانوں سے جنگ پانی پت کا عوض لینے کی آگ اُنکے سینوں میں بھڑک رہی تھی۔ بیس ہزار سواروں کی ایک منتخب فوج بخشی رامچندر کی ماتحتی میں ۱۷۶۹ء کے دسہرہ کے بعد پونا سے روانہ ہوئی۔ مہادا جی سندھیا (جسکو پانی پت کی شکست نے لنگڑا کردیا تھا) اور ٹوکوجی ہولکر پندرہ پندرہ ہزار سوار ساتھ لیکر ہمرکاب ہوے۔ انکے علاوہ لوٹیروں کی ایک جماعت ہزارہ تھی۔ جس میں عرب۔ حبشی۔ اور دوآبہ کے پٹھان اور بعض ہندو بھی شامل تھے۔

یہ عظیم الشان لشکر پہلے راجپوتانہ میں داخل ہوا اور وہاں سے دس لاکھ روپیہ بقایا نذرانہ کے نام سے وصول کیا۔ اور پھر بھرت پور کے علاقہ میں پہونچے اور وہاں سورج مل[1] جاٹ کے لڑکے کو شکست دے کر ۶۵ لاکھ روپیہ بطور تاوان جنگ کے وصول کیا۔ یہاں سے نجیب آباد پر دھاوا

(بقیہ حاشیہ صفحہ) علاوہ اس ماہواری خرچ کے ریاست کو اس پلٹن کے لیے حسب ذیل سامان مہیا کرنا لازم تھا:

۱۹۴۱ بندوقیں مع سنگین بجاب	۱۲ روپیہ	فی عدد	۱۹۴۰ کمربند بجاب	۸ ر	فی عدد
۱۹۴۱ کرتے	۴	"	" توڑے	عہ ر	"
۱۹۴۱ پگڑی	عہر	"	" پاجامے	۸ ر	"

اس خرچ کی میزان ۴-۱۴-۱۸۱۱ ہوتی ہے۔ یعنی ۱۰۰۰ سپاہی کی پلٹن پر تقریباً ۱۸۰۰۰ یکمشت اور ۱۱۳۹۶ ماہوار خرچ ہوتا تھا۔ اہلیا بائی نے اس طرح کی چھ پلٹنیں بنائی تھیں اور ان کے سردار یورپ کے قواعد اور لازم رہتے تھے

[1] مرہٹے سورج مل کے بہت ممنون تھے۔ کیونکہ پانی پت کی شکست کے بعد اُس نے بھاگے ہوے دکھنیوں کو کپڑے اور خوراک سے مدد کی تھی۔ جب دہلی کے وزیر نے جاٹوں کو زیر کرنے کے لیے ۱۷۶۳ء میں سورج مل کو شکست دیکر قتل کردیا تو ملہر راؤ ہولکر سورج مل کے لڑکے کی مدد کے لیے ۱۷۶۴ء میں ہندوستان آیا تھا اور دہلی کے محاصرہ میں شریک تھا مگر بعد کو نجیب الدولہ کی خاطر سے اُس نے جاٹوں کی اعانت چھوڑ دی اور دکن واپس گیا۔ اُسکی واپسی کے بعد سورج مل کے لڑکوں میں باہم جھگڑا ہوا اور ۱۷۷۰ء میں مرہٹے اُس جھگڑے کے تصفیہ کے لیے بھرت پور آئے تھے ورنہ جاٹوں سے کوئی مخالفت نہ تھی۔ یہاں اتفاق سے جنگ ہوگئی اور اسکے تاوان میں ۶۵ لاکھ روپیہ لینا پڑا۔ لیکن اس میں سے صرف ۱۰ لاکھ نقد لیا گیا اور بقیہ کی قسطیں مقرر کردی گئیں!!!

لڑنے کی نیت تھی مگر برسات شروع ہو گئی اور موسم بارش ختم ہونے کے انتظار میں بمقام ڈیگ خیمہ زن ہونا پڑا ٹوکوجی کو ٹھہراؤ اور نجیب الدولہ کے قدیم دوستانہ تعلقات معلوم تھے اور وہ اپنے آقا کے دوست کو بربادی سے بچانا چاہتا تھا۔ اُس نے نجیب الدولہ سے خط کتابت شروع کی تاکہ پٹھانوں کا حقِ دوستی ادا ہو اور پیشوا کی حکومت کو یہ نفع پہونچے کہ نجیب الدولہ کی معرفت ہندوستان کا جائز بادشاہ شاہ عالم جو اُس وقت الہ آباد کے قلعہ میں شجاع الدولہ اور انگریزوں کی پناہ میں ہے اپنے دارالسلطنت کو واپس بلایا جائے اور وہ پیشوا کو ہندوستان میں وسیع اختیارات عطا کرے۔

رامچندر گنیش اور مہاداجی سندھیا نے اس تجویز کی مخالفت کی۔ سندھیا نے کہا کہ "میں پیشوا کے لیے روہیلکھنڈ اور افغانوں کا ملک بزورِ شمشیر حاصل کرنا چاہتا ہوں، مجھ کو اپنے بھائی بھتیجوں کے خون کا عوض لینا ہے جو پانی پت میں مارے گئے اور اپنی ٹانگ کا بھی بدلہ نکالنا ہے جو ہمیشہ کے لیے بیکار ہو گئی۔ ٹوکوجی ان امراسے بھائی بندی کریں لیکن میں انتقام کا خیال دل سے نہیں نکال سکتا۔ بہتر ہے کہ اس معاملہ کی اطلاع پیشوا کو کی جائے اور اگر وہ ٹوکوجی کی رائے سے اتفاق کرے تب میں بھی منظور کر لوں گا"

پیشوا کے پاس قاصد بھیجے گئے اور وہاں سے جواب آیا کہ نجیب الدولہ مرہٹوں کا دوست کسی طرح نہیں ہو سکتا ہے مگر شاہ عالم کا الہ آباد سے واپس بلانا ضروری ہے اور اس کوشش میں نجیب الدولہ کی مدد سے آسانی ہو گی لہذا روہیلوں سے صلح کر لی جائے۔

درحقیقت مادھوجی کی رائے غلط تھی۔ اس وقت نجیب الدولہ پر سختی کی جاتی تو نجیب آباد بھی پانی پت کی طرح مشہور ہو جاتا۔ بہرحال پیشوا کے تصفیہ پر عمل کیا گیا اور روہیلوں کا پیامِ صلح منظور ہوا۔

نجیب الدولہ بہت بوڑھا ہو چکا تھا اور اُسکو زندگی کی کم اُمید باقی تھی۔ صلح کے بعد وہ خود مرہٹوں کے لشکر میں آیا۔ سندھیا سے بھی صفائی کی کوشش کی۔ اور اپنے لڑکے ضابطہ خاں کا ہاتھ ٹوکوجی کے ہاتھ میں دیکر دونوں خاندانوں کے موروثی تعلقات آیندہ نسل میں قائم رکھنے کی کوشش کی۔ بوڑھا باپ جانتا تھا کہ لڑکے میں حکومت سنبھالنے کی لیاقت نہیں ہے۔ اسکی آنکھیں بند ہونے کے بعد روہیلوں پر مصیبتوں کا ہجوم ہو گا اور اُس نازک وقت کے لیے ٹوکوجی سے بہتر کوئی رفیق نہیں ہے۔ مرہٹہ سردار نے نہایت خندہ پیشانی سے ضابطہ خاں کی امداد کا وعدہ کیا اور اپنے امکان بھر تمام عمر اس قول پر قائم رہا۔

نجیب الدولہ تھوڑے ہی عرصہ کے بعد مرگیا[1] اور ضابطہ خاں نے دوآبہ اور روہیلکھنڈ کی آبائی اضلاع پر قبضہ کرلیا - وہ باپ کی جگہ دہلی پر بھی متصرف ہوا - اور کہا جاتا ہے کہ قلعہ شاہی کی بعض بیگمات سو شرمناک تعلقات پیدا کیے - ٹوکوجی نے اپنے قدیم منصوبوں پر عمل شروع کیا اور شاہ عالم سے دہلی واپس آنے کے لیے نامہ و پیام کا سلسلہ جاری ہوا -

یہ ایک دردناک داستان ہے کہ اکبر و جہانگیر کا وارث شاہ عالم جو شجاع الدولہ کی پناہ اور انگریزی فوج کی حفاظت میں الہ آباد و کوڑہ پر برائے نام حاکم تھا اپنے دوستوں اور ہوا خواہوں کی نازک مزاجی سے ایسا عاجز آگیا تھا کہ اُس کو شاہی نوبت خانہ اس قصور پر بند کرنا پڑا کہ انگریزی کمانڈر کے خوابِ استراحت میں شہنائی کی آواز سے خلل پڑتا تھا !!

اللہ جس کو چاہے عزت دے اور جس کو چاہے ذلت !! یہ وہی شہنائی تھی جس کی بابت دو سو برس پہلے برنیر نے لکھا تھا کہ "یہ موثر موسیقی دل و دماغ پر ہیبت طاری کرتی ہے" جب اکبر و جہانگیر کے سے با اختیار شہنشاہ نہ رہے تو شہنائی ایسی ذلیل ہوئی کہ سوداگروں کے فوجی افسر کو اُس کی آواز ناگوار معلوم ہونے لگی !!!

بعض مورخ شاہ عالم پر اعتراض کرتے ہیں کہ وہ شجاع الدولہ کی پناہ چھوڑ کر الہ آباد سے کیوں چلا گیا ؟ مگر اُس وقت اُن کو فراموش ہو جاتا ہے کہ الہ آباد میں اُسکو کیا چین نصیب تھا جسکے چھوڑنے کا وہ قلق کرتا اور ٹوکوجی کے نامہ و پیام کو خداوندی مژدہ شمار کرتا !!

بہرحال شاہ عالم نے مرہٹوں کی حمایت کو اپنے قدیم ہوا خواہوں کی محبت پر ترجیح دی اور مرہٹوں کو بطور معاوضۂ خدمت دس لاکھ روپیہ دینے کا اقرار کرکے الہ آباد سے دو آبہ کی طرف راہی ہوا - ۱۷۷۰ء کے موسم بارش میں وہ فرخ آباد کے قریب پہونچ چکا تھا کہ سندھیا اپنے منتخب سواروں کے ساتھ اُسکے استقبال کو گیا - اور ۲۵ - دسمبر کو شاہ عالم دوبارہ دہلی میں داخل ہوا - ضابطہ خاں پہلے ہی یہاں سے فرار ہوگیا تھا اور دہلی میں مرہٹوں کی فوج امن قائم رکھنے کے لیے مقیم تھی -

ٹوکوجی نے ضابطہ خاں کو دہلی بلا کر عفوِ تقصیر کے لیے بادشاہ کے سامنے پیش کرنا چاہا مگر وہ بدنصیب محلات شاہی میں (گمان کیا جاتا ہے کہ) ایسی بدعنوانیاں کرچکا تھا کہ اُس کو منہ دکھانے کی

[1] نجیب الدولہ اکتوبر ۱۷۷۰ء میں مرا -

[2] یہ واقعہ مستند تاریخوں میں درج ہے مگر اس مقام پر ایک انگریزی کتاب کی سند لکھنا مناسب ہے - ملاحظہ ہو ایچ جی کین سی وی ای کی "مادھوراؤ سندھیا" مطبوعہ ۱۸۹۱ء - صفحہ ۵۷ -

ہمت نہ ہوئی اور نجیب آباد کے پاس اپنے قلعہ پتھر گڈھ میں بیٹھا رہا۔ جب ٹوکوجی کے بلانے سے بھی ضابطہ خاں دہلی نہ آیا تو سندھیا کو روہیلوں سے اپنا عوض لینے کا موقع ملا اُس نے وقت مناسب سمجھ کر شاہ عالم کو ساتھ لیا اور روہیلوں پر چڑھائی کر دی۔ شجاع الدولہ مدت سے روہیلوں کے تباہ کرنے کی فکر میں تھا۔ اُس نے ضابطہ خاں کو مدد نہ پہونچنے دی۔ اور بہادر نجیب الدولہ کا بدقسمت لڑکا اپنا بدحواس و سراسیمہ ہو کر بھاگا کہ اپنے اہل و عیال کو بھی ساتھ نہ لے جا سکا۔ مرہٹوں نے پتھر گڈھ پر (جسکے کھنڈر آج تک سیاحوں کو رُلاتے ہیں) قبضہ کر لیا اور بے شمار دولت اُن کے ہاتھ آئی۔

سندھیا نے اپنی شکست کے معاوضہ میں ضابطہ خاں کے لڑکے غلام قادر کو زنانہ بنوایا اور مشہور یہ کیا کہ باپ نے محلات شاہی میں جو گستاخیاں کی تھیں انکی سزا میں بیٹے کو یہ ڈنڈ دیا جاتا ہے!!

المختصر سندھیا اپنا جوش غضب ٹھنڈا کر کے راجپوتانہ کی طرف چلا گیا اور ہولکر کو پھر ضابطہ خاں کی طرفداری کا موقع ملا۔ اُس نے شاہ عالم کے وزیر مرزا نجف خاں کو زک دیکر ضابطہ خاں کو پھر امیر الامرا بنایا۔ پیشوا کو سلطنت دہلی کی سپہ سالاری کا اعزازی عہدہ اور دوآبہ کا جنوبی علاقہ دسمبر ۱۷۷۲ء میں دیا گیا۔ لیکن یہ معاملات ابھی طے نہ ہو پائے تھے کہ پونا سے پیشوا مادھوراؤ[۱] کی موت کی خبر آئی اور چند ہی مہینے کے بعد اُس کا نابالغ بھائی نرائن راؤ[۲] بھی قتل کر دیا گیا۔ پونا میں خانہ جنگی کا اندیشہ تھا اس لیے سب مرہٹہ سردار دہلی کو اُس کے حال پر چھوڑ کر گھر کی خبر لینے چلے۔

نرائن راؤ کو قتل کر کے رگھوبا خود منصب پیشوائی پر قابض ہونا چاہتا تھا لیکن اُس کی بدنصیبی ساتھ تھی۔ نارائن راؤ کی حاملہ بیوی ایک پہاڑی قلعہ میں پناہ گزیں ہو گئی تھی۔ وہاں اُسکے ایک بچہ پیدا ہوا جسکو پونا کے اراکین دربار نے پیشوا بنانا چاہا۔ رگھوبا وزیروں کی اس دلیری سے بہت ناخوش ہوا اور اُنکو سزا دینے کی نیت کی۔ لیکن فوج کے بیشتر حصہ نے رگھوبا سے مخالفت کی اور پونا کے قریب شکست پا کر وہ شمال کی طرف بھاگا۔ اور اُس وقت اندور پہونچا جبکہ سندھیا اور ہولکر نے ہندوستان سے واپس آکر وہاں اپنے خیمے گاڑ دیے تھے۔

دونوں معزز سرداروں نے رگھوبا کی داستان غم سُن کر اُس کی مدد کا وعدہ کیا اور گجرات کی طرف بڑھے تاکہ وہاں کے راجہ گیکوار کو بھی سازش میں شریک کریں۔ بمبئی میں انگریزوں کی ایک

---

[۱] مادھوراؤ ۱۸ نومبر ۱۷۷۲ء کو ۲۸ سال کی عمر میں عارضہ دق فوت ہوا۔

[۲] نرائن راؤ ۳۰ اگست ۱۷۷۳ء کو قتل کیا گیا۔

تجارتی کمپنی تھی جو کافی نو آبادیاں کی ایسٹ انڈیا کمپنی کے حکام کی تابع تھی لیکن وہ اپنی حفاظت کیلیے کچھ قواعد داں فوج مہیا رکھتی تھی اور پرتگیز
کے مقبوضات کو جو اسکے ارد گرد واقع تھے تنگ حسد سے دیکھا کرتی تھی۔ کلکتہ کی کمپنی کی طرح ہمکو بھی اپنا قبضہ حکومت بڑھانے کی ہوس
تھی مگر مرہٹوں کی دھاک نے ابھی تک اسکو پاؤں پھیلانے کا موقع نہیں دیا تھا۔ پونا کے ارکین
حکومت میں بگاڑ ہوا تو اس کمپنی کی بھی تقدیر جاگی۔ رگھوبا پرتگیز کے مقبوضات سالسٹ و بسین
اس جماعت کو دلانے کا وعدہ کرکے پندرہ سو سپاہیوں کی مدد اُن سے بھی حاصل کرلی لیکن قبل
اسکے کہ یہ اتحادی کوئی نمایاں خدمت کر سکیں اہلیا بائی نے مداخلت کی اور مادھو راؤ کی بیوہ
اور یتیم بچہ پر ترس کھا کر اپنے سپہ سالار تکوجی کو رگھوبا کا ساتھ دینے سے منع کردیا۔ سندھیا نے بھی
تقلید کی۔ اور یہ دونوں سردار رگھوبا کی اعانت سے کنارہ کش ہوگئے۔

انگریزی امداد کے بھروسہ پر رگھوبا پونا کے وزیروں سے ٹکر لڑا اور سخت نقصان اٹھا کر
دسمبر ۱۷۷۴ء میں "سورت" پہونچا۔ دوستوں نے اسکو ہاتھوں ہاتھ لیا۔ سالسٹ و بسین کے
علاوہ ایک اور زرخیز علاقہ کا وعدہ لے کر تین ہزار سپاہیوں سے مدد کی اور رگھوبا کو بزور شمشیر پیشوا
بنانے کے لیے پونا پر چڑھائی کردی۔

وزیروں نے اس نئے لشکر سے بھی مقابلہ کیا۔ اور اراس کے مقام پر سخت لڑائی ہوئی جس
میں انگریز مورخ نمایاں شکست کے بعد اپنی فتح بتاتے ہیں۔ ۲۲ دن کے بعد بہادر پیر کے مقام پر پھر
سامنا ہوا اگر مرہٹے اپنی توپیں دریا میں پھینک کر پسپا ہوگئے اور رگھوبا کو مال غنیمت میں ایک ہاتھی اور چند اونٹ ملے!!

اس عرصہ میں کلکتہ کی صدر کمپنی کی طرف سے گورنر جنرل وارن ہیسٹنگز نے "اپنا سفیر پونا
بھیجا اور وزیروں سے صلح کرنا چاہی۔ ارکین دربار نے شرط لگائی کہ رگھوبا اُنکے حوالہ کردیا جائے
اور جو علاقہ انگریزوں کو اُس نے دیا ہے واپس کیا جائے۔ ان شرائط کا ایک حصہ منظور ہوا۔
اور رگھوبا کی اعانت ترک کرنے کا اقرار کیا گیا۔ صلحنامہ پر دستخط ہوگئے جو "عہدنامہ پورن دھر" کے
نام سے مشہور ہے۔ لیکن رگھوبا اس معاملہ میں کوئی فریق نہ تھا۔ اُس نے صلح قبول نہ کی اور اپنے
دوستوں کے پاس بمبئی پہونچا جہاں اُس کی آؤ بھگت کی گئی۔ اور نومبر ۱۷۷۸ء میں دس ہزار

۱؎ ملاحظہ ہو گرانٹ ڈف کی تاریخ مرہٹہ جلد دوم صفحہ ۲۹۶ و ۳۰۰۔ یہ تسلیم ہے کہ انگریزی سپاہی بہت بے قاعدہ بھاگے
افسر کی اجازت کے بغیر فوج نے واپسی شروع کردی اور جھاڑیوں میں جا کر چھپی۔ جہاں دشمن نے موقعہ پاکر خوب قتل کیا۔
یہ بھی اقرار ہے کہ ۲۲۲ سپاہی قتل ہوئے جن میں ۸۶ یورپین اور ۱۱ افسر تھے لیکن فتح انگریزوں ہی کو نصیب ہوئی کیونکہ مرہٹے
اتنے آدمی مار کر واپس ہٹ گئے!!! نہ ہم سمجھے نہ تم آئے کہیں سے ٭ پسینہ پونچھیے اپنی جبیں سے!!!

اس کی پنشن مقرر ہوئی۔

اُدھر پونا کے اراکین میں باہم پھوٹ پڑی۔ پہلے تو پنڈت سکھرام باپو اور بالاجی جنارد ین (جو انگریزی تاریخوں میں نانا فرنویس کے نام سے مشہور رہے) متفق تھے مگر اب اُن میں بگاڑ ہوگیا۔ پونا کے حلقۂ وزرا میں یہی دونوں سردار سب سے زیادہ قابل تھے اور انکی باہمی تکرار ریاست کی تباہی کا سبب ہوئی۔

کہتے ہیں کہ پیشوا کی ماں گنگا بائی نانا فرنویس سے محبت رکھتی تھی اس لیے نانا کا پایہ زبردست سمجھ کر سندھیا نے اُس کا ساتھ دیا اور تکوجی نے سکھرام کی مدد کی۔ بمبئی کی کمپنی نے ان سرداروں کی مخالفت میں اپنا نفع دیکھا اور رگھوبا کو پیشوا بنانے کی کوشش شروع کی۔ چار ہزار انگریزی فوج کی مدد سے رگھوبا پونا کی طرف چلا۔ تکوجی اس نازک وقت پر نانا کا ساتھ دیا اور ۹۔ جنوری ۱۷۷۹ء کو طالع گانوں کے مقام پر رگھوبا کو ایسی زک پہونچی کہ وہ پھر کبھی سر نہ اُٹھا سکا۔ انگریزی فوج کا سردار بیمار پڑا۔ سپاہی بدول ہوے سامان رسد جلا دیا گیا۔ توپیں تالابوں میں پھینک دی گئیں۔ اور پونا سے ایک جدید صلحنامہ ہوا جسکے شرائط یہ تھے کہ رگھوبا انگریزوں کی حمایت سے الگ کردیا جائے، جو علاقہ انگریزوں نے حاصل کرلیا ہے واپس کیا جائے اور "بروچ" کا پرگنہ سندھیا کو دیا جائے۔

بمبئی کی شکست خوردہ فوج نے یہ عہدو پیمان کیے۔ پونا کا دربار مطمئن ہوگیا لیکن کلکتہ کی انگریزی فوج نے وسط ہند پر حملہ کردیا اور ہندیلکھنڈ کے سرداروں کو شکست دیکر "سورت" تک پہونچ گئی۔ پونا کے اراکین سے ایک جدید صلحنامہ کے لیے سلسلہ جنبانی ہوئی۔ سندھیا نے دربار پونا پر اپنا قابو رکھنے کے لیے قوم کا ساتھ چھوڑ دیا اور انگریزوں سے جداگانہ صلح کرنا چاہی۔ انکی کم ہمتی سے دوسروں نے فائدہ اُٹھایا۔ انگریزی فوج نے دارالسلطنت احمدآباد پر قبضہ کرلیا اور گوالیار کا قلعہ جو ناقابل فتح خیال کیا جاتا تھا مسخر کرلیا۔

اب سندھیا کو ہوش آیا کہ اُدھر تو ہندوستان کا راستہ بند ہوا جاتا ہے اور ادھر پیشوا کی حکومت تباہ ہوتی ہے۔ وہ اپنی فوج لیکر انگریزوں سے مقابلہ کو بڑھا۔ مگر اُسکا خیمہ و خرگاہ لُٹ گیا۔ ہاتھی گھوڑے چھن گئے اور مجبور ہوکر اُسنے انگریزوں سے صلح کی۔ جسکی ایک شرط یہ تھی کہ وہ دربار پونا سے بھی لڑائی بند کرا دے گا۔ آخر کار سندھیا کے اثر سے ۱۷۔ مارچ ۱۷۸۲ء کو "سلبائی" کے صلحنامہ پر فریقین کے دستخط ہوے۔ طالع گانوں کا صلحنامہ منسوخ اور پورندھر کا عہدنامہ بحال

کیا گیا۔ سالسٹ وغیرہ جزائر ہمیشہ کے لیے بمبئی کی کمپنی کو مل گئے۔ اور مرہٹوں کی سلطنت میں ایسٹ انڈیا کمپنی" کو مداخلت کا حق حاصل ہوگیا۔

اب مادھو راؤ کا نابالغ لڑکا پیشوا تسلیم کر لیا گیا۔ انتظام حکومت نانا فرنویس کے سپرد ہوا۔ اور رگھوبا کی پنشن[1] مقرر کر دی گئی۔ سندھیا ہندوستان واپس گیا لیکن ہولکر کو پونا کے دربار نے دکن کی خدمات کے لیے روک لیا۔

مرہٹوں نے میسور کے حاکم ٹیپو سلطان سے لڑائی شروع کی اور اس جنگ میں ٹوکوجی نے بہت شجاعت و جوانمردی دکھائی۔ اس مظلوم ریاست کی دردناک داستان بیان کرنے کا یہاں موقع نہیں البتہ ٹوکوجی کی اظہار قابلیت کے لیے اس قدر اشارہ کافی ہے کہ "کٹور کے ضلع سے ٹیپو کو خارج کرنا" "سادانور" کے محفوظ قلعہ پر تصرف کرنا اور ۱۷۸۷ء میں ۴۵ لاکھ روپیہ اور کچھ علاقہ لیکر مرہٹوں کی عظمت ٹیپو کے دل میں نقش کرانا ہولکر ہی کا کام تھا۔

غرض بارہ برس دکن میں مصروف رہنے کے بعد میسور کی لڑائی کا خاتمہ کر کے ٹوکوجی اہلیا بائی کی خدمت میں واپس گیا مگر مہیسر میں چند ہی روز قیام کی نوبت آئی تھی کہ اسکو باجی راؤ پیشوا کے لڑکے علی بہادر کی مدد کے لیے بندیلکھنڈ جانا پڑا۔ یہ لڑکا ایک مسلمان عورت سے پیدا ہوا تھا اور ماں کے مذہب پر تھا لیکن پونا کے اراکین حکومت کو اسکی خاطر عزیز تھی۔ ٹوکوجی کو اسکی امداد و اعانت کا حکم دیا گیا اور وفادار سپہ سالار نے اپنی ہمت و بہادری سے اس لڑکے کو "باندہ کا نواب" بنا دیا۔ جہاں اسکی اولاد غدر ۱۸۵۷ء تک مسند نشیں اور حاکم با اختیار رہی۔

اس مہم سے فراغت نہ ہوئی تھی کہ ٹوکوجی کو سندھیا کی مدد کرنے ہندوستان جانے کا حکم دیا گیا۔ وہاں اس عرصہ میں ضابطہ خاں کا ناقابل لڑکا غلام قادر نہایت ظلم و ستم برپا کر چکا تھا۔ شاہ عالم کو نابینا بنا کر اور اپنے ساتھ کل روہیلوں کی تباہی کرا کے ہندوستان کے سیاہ و سفید کا اختیار مادھوجی سندھیا کے ہاتھ میں پہنچ چکا تھا۔ یہ حسرت خیز کہانی ہندوستان کی تاریخ میں خون کے حرفوں سے لکھی ہوئی ہے اور اس مختصر مضمون میں اسکے دوہرانے کی قلم کو ہمت نہیں!!
اس تباہی کے زمانہ میں ہولکر کے خاندان نے ہندوستان سے بے تعلقی اختیار کر رکھی تھی۔ اور غلام قادر کے مظالم کے وقت ٹوکوجی دکن کی مہمات میں مصروف تھا جب سندھیا کے اصرار

[1] اس صلح نامہ کے بعد رگھوبا نے دریائے گوداوری کے کنارے کوپرگاؤں کے مقام پر سکونت اختیار کی مگر تھوڑے ہی عرصہ کے بعد فوت ہوگیا اور اس کی بدقسمتیوں کا سایہ اسکے لڑکے باجی راؤ پر آگیا۔

پیشوا نے ٹوکوجی کو دوبارہ ہندوستان جانے پر مجبور کیا تو مادھوجی کی طاقت اس قدر بڑھ چکی تھی کہ ہولکر اُس کا مقابلہ نہ کر سکتا تھا، ور نہ اُس کا زور توڑ سکتا تھا۔ وہ پیشوا کے حکم سے ہندوستان گیا اور شروع شروع میں سندھیا کی اعانت بھی کی۔ لیکن جب معلوم ہوا کہ دہلی کے معاملات میں دست اندازی سے مرہٹوں کا قومی فائدہ نہیں ہو سکتا ہے تو اُس نے در پردہ سندھیا کی مخالفت شروع کی اور اپنی حکمت عملی سے مادھاجی کو (جسکی تعریف میں بعض انگریز مورخ بہت رطب اللسان ہیں) ایسا عاجز کیا کہ اُس نے خود درخواست کی کہ ہولکر واپس بُلا لیا جائے۔ پیشوا بھی سندھیا کو ہندوستان میں آزاد رکھنا نہیں چاہتا تھا اسلیے ٹوکوجی کی واپسی کا حکم صادر نہ ہوا اور مجبور ہو کر سندھیا خود پونا کا عازم ہوا۔ وہ درحقیقت دہلی کا بادشاہ تھا۔ اُس نے شاہ عالم کی طرف سے پیشوا کو سلطنت کا وکیل مطلق مقرر کیا اور خلعت وکالت نذر کرنے کے بہانے سے دکن گیا۔

مادھوجی کے ہٹنے کے بعد اُسکے سرداروں سے ہولکر کھلم کھلا لڑ پڑا۔ اور لکھیری کے درہ پر سندھیا کے فرانسیسی افسروں کے دانت کھٹے کر دیے۔ اُسکی فوج کا سپہ سالار "ڈی بوائن" اپنی خود نوشتہ سوانحعمری میں تحریر کرتا ہے کہ "لکھیری سے زیادہ جی توڑ لڑائی اُس نے کبھی نہیں دیکھی۔ ہولکر کے توپخانہ نے ایسی آگ برسائی کہ اُسکا جواب دینا ناممکن تھا اور اُسکے سواروں نے اس زور سے دھاوا کیا کہ سندھیا کی فوج کو جنگل میں پناہ لینا پڑی"۔ مثل مشہور ہے کہ گھر کا بھیدی لنکا ڈھائے۔ کاشی راؤ اور ملہار جی جن میں سے ایک ہولکر کا بیٹا تھا اور دوسرا بھتیجا تھا دشمنوں سے مل گئے اور انجام کار ٹوکوجی کے لشکر کو شکست ہوئی۔ وہ اپنی باقیماندہ فوج لیکر مالوہ کی طرف واپس ہوا اور بدنامی کا داغ مٹانے کے لیے سندھیا کے دارالسلطنت اوجین کو لوٹ لیا۔ کسی کو اُسکی بہادر فوج سے بدلہ لینے کی ہمت نہ پڑی اور وہ باطمینان مالوہ میں مقیم رہا۔ یہاں تک کہ چند مہینوں کے بعد پیشوا نے اُسکو نظام دکن سے لڑنے کے لیے بُلایا۔ ۱۷۹۵ء میں مرہٹوں کے صوبہ دار دکن سے لڑائی آخری موقع تھا کہ پیشوا کے فرمان پر کُل مرہٹے سردار جمع ہوں اور ایک جھنڈے کے نیچے اکٹھا ہو کر ناموری حاصل کریں۔ لہٰذا اس جنگ کا کسی قدر تفصیل سے بیان کرنا مناسب ہے۔

میسور کی ریاست تباہ کرنے اور سلطان ٹیپو کو زیر کرنے کے لیے انگریزوں کی کمپنی نے پیشوا اور نظام دکن سے اتحاد کیا تھا اور میسور کے خلاف پچھلی لڑائی میں مرہٹوں اور مغلوں کے سپاہی دوش بدوش لڑتے تھے اس وجہ سے کچھ دنوں کے لیے مرہٹوں کے حقوق "چوتھ" اور سردیش مکھی جو آصف جاہ کے وقت سے حیدرآباد میں معین تھی معرض التوا میں پڑ گئے تھے۔ مگر جب ٹیپو سے صلح ہوئی تو مرہٹوں

نے اپنے موروثی حقوق کا مطالبہ شروع کیا۔ اور کئی کرور روپیہ کا نظام سے مطالبہ کیا۔ کچھ عرصہ تک تو نامہ و پیام جاری رہے لیکن آخرکار نانا فرنویس کے پُرزور مراسلات سے عاجز آکر نظام کے وزیر مشیر الملک نے مرہٹوں کے وکیل کو جواب دیا کہ "حساب بہت پیچیدار ہے اسکے سمجھانے کے لیے نانا فرنویس کو خود یہاں آنا چاہیے۔" وکیل نے عذر کیا کہ "نانا صاحب کے پاس کام کا بہت ہجوم ہے وہ یہاں کیسے آسکتے ہیں۔" مشیر الملک نے غصہ میں کہہ دیا کہ "میں تم کو دکھادوں گا کہ وہ یہاں کیونکر لائے جاسکتے ہیں۔" یہی دھمکی اعلان جنگ بن گئی۔ اور اگرچہ خط کتابت اسکے بعد بھی جاری رہی مگر فریقین نے جنگی تیاریاں شروع کردیں!

اب مادھوجی سندھیا کا انتقال ہوچکا تھا[1] اور اُسکے بھائی کا پوتا دولت راؤ جو سندھیا کی ریاست کا وارث ہوا نانا کی مٹھی میں تھا۔ ٹکوجی ہمیشہ سے تابع فرمان تھا؛ اور یہ دونوں سردار فوراً پونا پہونچ گئے۔ برار کا راجہ اپنی فوج لیکر پیشوائی اعانت کو آیا۔ بڑودہ کے گیکوار نے اپنی فوج خدمت کے لیے روانہ کی۔ ناگپور کا بھونسلا پندرہ ہزار سوار اور پیدل لایا۔ جنوب کے برہمن جاگیردار اور مانکری وغیرہ اپنی اپنی فوجیں لیکر جھنڈے کے نیچے جمع ہوئے اور یکم جنوری ۱۷۹۵ء کو نوعمر پیشوا نانا فرنویس کی سرپرستی میں ایک لاکھ ۳۲ ہزار سے زیادہ سوار اور پیدل لیکر پونا سے راہی ہوا۔ ٹکوجی کے مشورہ کے مطابق پرسرام بھاؤ کُل فوج کا سپہ سالار بنایا گیا اور پانی پت کی شکست سے سبق لیکر بھاری اسباب ہر کوچ پر ایک منزل پیچھے چھوڑتے ہوئے آگے بڑھے۔ بہترین سواروں کا ایک دستہ باقاعدہ پیدل اور ڈیڑھ سو توپوں کے ساتھ آگے روانہ کیا گیا اور دس ہزار پنڈاری لوٹ مار کے لیے ساتھ رکھے گئے۔ اُدھر سے نظام بھی ایک لاکھ دس ہزار جرار لیے ہوئے مرہٹوں کی سرحد کی طرف آرہا تھا۔ مہری گھاٹ کے قریب پیشوا کی ایک دستۂ فوج سے مڈبھیڑ ہوئی۔ اور یہ رسالہ مغلوں کے حملہ کی تاب نہ لاکر منتشر ہوگیا۔ دوسرے ہی روز صبح کو مرہٹوں کی پوری فوج داہنی طرف سے نمودار ہوئی۔ نظام نے اپنا ہاتھی روکا۔ خیمہ و خرگاہ بائیں طرف ہٹایا اور اپنے ایک سردار کو مرہٹوں کے مقابل کیا۔

پرسرام بھاؤ نے قلب لشکر میں اپنا مقام کیا اور پیشوا و ہولکر کی فوجیں اپنے ساتھ رکھیں۔ رگھوجی بھونسلا کو داہنے بازو پر اور دولت راؤ سندھیا کو بائیں طرف متعین کیا۔ مغلوں کے بلوچی رسالہ نے لڑائی شروع کی اور پرسرام کو گھوڑے سے گرادیا۔ سپہ سالار کی بمشکل جان بچی اور مرہٹوں کا

[1] مادھوجی سندھیا پونا کے قریب ۱۲ فروری ۱۷۹۴ء کو فوت ہوا۔

راول لشکر سراسیمہ ہو کر بھاگا۔ مگر اس عرصہ میں مرہٹوں کے دونوں بازو قریب آ گئے تھے۔ بھونسلا
نے "بان" چلانا شروع کیے جو مرہٹوں کا آبائی آلۂ جنگ تھا اور جس میں بھونسلا کو خاص مہارت تھی
پوں نے بھی آگ برسائی اور چند منٹ میں لڑائی کا پانسہ پلٹ گیا!! سوار بھاگ گئے۔ اور پیادوں
دبھی خوفزدہ ہو کر جگہ چھوڑنا پڑی۔ نظام نے اپنے لشکر کو پیچھے کی طرف ہٹایا تاکہ "کردلا" کے محفوظ
قام پر پہونچ جائے مگر آفتاب غروب ہو گیا تھا اور ہر طرف تاریکی چھا رہی تھی۔ دونوں طرف سے
ولیاں چلتی رہیں۔ یہاں تک کہ اندھیرا ایسا سخت ہوا کہ کسی کو کچھ نہ سوجھتا تھا۔ دن بھر کی تھکی ماندی
فوج لڑائی کو غیر مختتم چھوڑ کر میدان میں کمریں کھول کر لیٹ گئی اور تجویز کیا کہ آفتاب طلوع ہونے
کے بعد پھر لڑائی ہو گی۔

خدا کی شان! مرہٹوں کا ایک دستہ پانی کی تلاش میں ایک چشمہ کے پاس گیا جہاں مغلوں
ی کچھ فوج پڑی ہوئی تھی۔ مرہٹوں نے انکو دیکھ کر فیر کیے مغلوں نے جواب دیا۔ بندوقوں کی آواز
ے سارے لشکر میں کھلبلی مچ گئی اور شبخون کے اندیشہ سے نظام کے قواعد داں سپاہی ادھر اُدھر
بھاگنے لگے۔ جب چاند نکلا اور کسی قدر اُجالا ہوا تو نظام نے "کردلا" کے قلعہ میں پناہ لی۔ لیکن
اُس کی فوج کا بیشتر حصہ فرار ہو چکا تھا اور اپنے ہی خیمۂ و خرگاہ لوٹ رہا تھا!!

جب صبح ہوئی اور مرہٹے دشمن سے مقابلہ کو آگے بڑھے تو میدان جنگ بندوقوں اور
ذخائر جنگ سے پٹا ہوا تھا لیکن دشمن کا نشان نہ تھا۔ یہ خبر فوراً مشہور ہوئی اور ہر طرف سے
مرہٹے مغلوں کا سامان لوٹنے کے لیے آموجود ہوے۔ مال غنیمت کا انبار جمع کیا اور کردلا کی پہاڑی
کے سامنے جہاں نظام محصور تھا قلعہ شکن توپیں لگادیں۔

نظام نے دو دن تک نہایت بہادری اور استقلال سے توپوں کی آگ برداشت کی لیکن جب
وہ جگہ ناقابل قیام ہو گئی تو صلح کا پیام بھیجا۔ مرہٹوں نے پہلی شرط یہ پیش کی کہ مشیر الملک جس نے
نانا فرنویس کی توہین کی ہے اُنکے حوالہ کر دیا جائے۔ اور کچھ علاقہ مع تین کرور زر نقد کے بطور تاوان
کے دیا جائے۔ نظام اُس وقت بے بس اور سب شرطیں قبول کرنے کو تیار تھا لیکن اپنے وزیر کو
دشمنوں کے سپرد کرنا نہیں چاہتا تھا۔ وفادار وزیر اپنے آقا کی مصیبت دُور کرنے کے لیے جان نذر
کرنے کو آمادہ ہو گیا اور اپنی خوشی سے مرہٹوں کی قید میں جانا منظور کیا۔ ایں کار از تو آید و مرداں
چنیں کنند!!!

کہتے ہیں کہ جب مشیر الملک دو مرہٹوں کی حراست میں مشیوا کے کمپ کی طرف جا رہا تھا تو

نوجوان پیشوا راستہ ہی میں ملا۔ مشیر الملک کو گرفتار دیکھ کر نہایت متاسف ہوا اور اس نمک حلال وزیر کو عزت سے اپنے ساتھ لیگیا۔ مرہٹہ اس غیر متوقع فتح پر بہت ہی خوش تھے مگر بلند ہمت پیشوا کا یہ حال تھا اور مشیر الملک کو دیکھکر اُسکے چہرہ پر اس قدر سخت حسرت کے آثار طاری ہوگئے تھے کہ نانا فرنویس کو اُسکے قلق کی وجہ دریافت کرنا پڑی۔

اولوالعزم پیشوا کا جواب سرخی سے لکھنے کے قابل ہے۔ اُس نے کہا کہ "ہندوستانی حکومتوں کی عظمت و شوکت کا خاتمہ ہوگیا اور ان کے دن پورے ہوچکے مغلوں نے ایسی شرمناک صلح کی کہ اپنے وزیر کو بھی ہمارے حوالہ کردیا اور میرے ہم قوم اُس فتح پر خوشی منا رہے ہیں جس کے لیے اُنکو کوئی کوشش نہیں کرنا پڑی"!!

واقعی اس لڑائی میں فریقین کے دو سو آدمی بھی بمشکل قتل ہوے تھے اگرچہ بعد کو رات کی تاریکی اور کرد لا کے محاصرہ نے نظام کو بہت نقصان پہونچایا تھا۔ بہرحال اس فتح نے پانی پت کا غم غلط کردیا اور دکن کے علاقہ میں ایکبار پھر مرہٹوں کی عزت قائم کردی۔

جنگ سے فراغت کے بعد پیشوا، نانا فرنویس اور سندھیا و ہولکر وغیرہ پونا کو واپس ہوے لیکن پیشوا نانا فرنویس کی سختیوں سے تنگ آگیا تھا وہ ۲۵۔ اکتوبر ۱۷۹۵ء کی صبح کو خودکشی کی نیت سے محل کے جھروکے سے کود پڑا اور دو دن کے بعد دنیا سے رخصت ہوگیا۔

مرنے سے قبل اُس نے وصیت کی تھی کہ اسکی جگہ رگھوبا کا لڑکا باجی راؤ مسند پر بٹھایا جائے لیکن نانا کو خوف ہوا کہ باجی راؤ حکومت پاکر اپنے باپ کا بدلہ لیگا۔ لہذا وصیت کا لحاظ نہ کرکے تکوجی وغیرہ سرداروں سے مشورہ کیا گیا اور یہ رائے قرار پائی کہ سابق پیشوا کی بیوہ جسو دہا بائی کسی لڑکے کو گود لے اور اُس بچہ کی طرف سے نانا حکومت کا منتظم رہے۔ یہ صلاح دیکر تکوجی جنوری ۱۷۹۶ء میں پونا سے رخصت ہوا۔ کیونکہ مہیسر میں اہلیا بائی کا انتقال ہوچکا تھا اور ہولکر کا فوراً مالوہ واپس آنا لازمی تھا۔

ہولکر کی واپسی کے بعد باجی راؤ نے دولت راؤ سندھیا کو چار لاکھ کی جاگیر دینے کا وعدہ کرکے اپنا ہمخیال بنالیا۔ اور نانا فرنویس کو بھی باجی راؤ سے اپنے عفو تقصیرات کا پروانہ لکھوا کر اُسی کو پیشوا تسلیم کرنا پڑا۔

تکوجی کی عمر ۷۰ برس کے قریب ہوچکی تھی اور ضعیفی نے اُسکو مزید محنت کے ناقابل بنا دیا تھا۔ اُس نے مالوہ پہونچکر کل انتظام ریاست اپنے ہاتھ میں لیا۔ لیکن جو قواعد و قوانین اہلیا بائی

نے جاری کیے تھے اُن میں دست اندازی نہیں کی۔ اُسکو خبریں پہونچتی رہیں کہ پونا میں اُسکے بعد بہت انقلابات ہوے۔ سندھیا نے باجی راو کی طرفداری کی۔ مشیر الملک نے مرہٹوں کی قید سے عزت و آبرو کے ساتھ رہائی پائی۔ نظام سے جدید عہدنامہ ہوا۔ اور وہ کل علاقہ جو کرولا کی لڑائی کے بعد حاصل ہوا تھا واپس کیا گیا۔ اور نانا فرنویس نے باجی راو کو پیشوا بنادیا لیکن ہولکر نے اپنی جگہ سے حرکت نہیں کی۔ وہ پیشوائی گدی کا فرماں بردار رہا اور کسی معاملہ میں دخل نہیں دیا۔ یہاں تک کہ ۱۵۔ اگست ۱۷۹۶ء کو دنیا سے رخصت ہوگیا۔

ہمیشہ رہے نام اللہ کا

"خافی خاں"

"ہند عہد اورنگ زیب میں"

(از مہ یار جنگ مولوی مرزا سمیع اللہ بیگ میر مجلس عدالت العالیہ حیدرآباد دکن)

جناب مرزا صاحب نے "ہند عہد اورنگ زیب میں" بحیثیت مجموعی ایک قابل قدر کتاب لکھی ہے شروع کے ابواب میں انگریز سیاح کے سفرنامہ کے اقتباسات جمع اپنے اضافہ و تشریح کے دیے ہیں، وہ ہر اعتبار سے مفید، دلچسپ، اور معلومات افزا ہیں۔ اور انکی یہ کوشش صد درجہ قابل داد و ستایش ہیں۔ اور خصوصاً اس سیاح کے یہ بیش قیمت معلومات بالکل پہلی بار آئے ہیں جن سے بہ نام اورنگ زیب کے بہت سے روشن پہلو پیش نظر ہو جاتے ہیں، اور اسلامی عہد حکومت کے بہت سے دھبے دُھل جاتے ہیں۔ آخری باب جسے مرزا صاحب نے سب سے زیادہ اہم قرار دیا ہے وہ بھی بحیثیت مجموعی قابل داد ہے، اس میں سنجیدگی کے ساتھ ہندو مسلم اتحاد کی تدابیر بتائی گئی ہیں۔ ان میں سے کوئی تدبیر غلط یا غیر ضروری نہیں۔ سب مناسب و ضروری ہیں، البتہ شاید بہت دور رس نہ ہوں۔ حقیقی و پائدار اتحاد کی صرف ایک ہی صورت ممکن ہے، وہ یہ کہ دونوں قومیں اپنے اپنے مذہب سے صحیح طور پر واقف اور انکی ہدایات پر عامل ہوں۔ صحیح مذہبیت کسی قسم کے دنیوی جھگڑے باقی ہی نہ رہنے دیگی، اور اُسوقت ان مناقشات کی بے حقیقتی اور بے وقعتی ہندو مسلمان دونوں پر از خود منکشف ہو جائیگی۔ کتاب میں کمی صرف اسی کی ہے، کہ اس پہلو پر مرزا صاحب نے زور نہیں دیا ہے، بلکہ مسئلہ خلافت وغیرہ کے سلسلہ میں بعض الفاظ ایسے بھی انکے قلم سے نکل گئے ہیں جن سے شبہ ہوتا ہے کہ شاید وہ مسلمانوں کی مذہبیت کو پسند نہیں فرماتے یہ محض نفس پرستی ہے جسے مذہب کا نام دیکر لوگ آپس میں لڑ رہے ہیں، ورنہ حقیقی مذہب (خصوصاً ہمارا اسلام) تو آیتاً مستقل دعوت امن و پیام صلح کا نام ہے۔ کاش لوگ زیادہ تعداد میں مرزا صاحب کی کتاب کو پڑھیں، اور انکی سنجیدہ تجاویز پر مسلحت پر غور و عمل کریں۔

عبد الماجد۔ دریا باد۔ بارہ بنکی

دوا فروش کی بیوی

(از روسی افسانہ نگار چیکوف)

آنتان چیکوف ملک روس کا سب سے بڑا افسانہ نگار سمجھا جاتا ہے ایک صاحب نظر اہل الرائے کے الفاظ میں اُس کے آرٹ کی سب سے بڑی خصوصیت "یاسیت کا رنگ لیے ہوئے واقعیت نگاری ہے جو اُسکے قلم کے ہر نقش میں دوست بشکہ کی ہلکی ہلکی تاریکی پیدا کر دیتی ہے" ذیل میں ہم اُسکی ایک نہایت مختصر کہانی پیش کرتے ہیں جو اُسکے کمال کا بہترین نمونہ ہے، اُمید ہے کہ ہمارے ناظرین اس سے صحیح طور پر لطف اُٹھائیں گے۔ (ح - ا - ق)

قصبہ ب، جس میں صرف دو تین ٹیڑھی اور ناہموار سڑکیں تھیں، محوِ خواب تھا۔ فضا پر کامل خاموشی مسلط تھی، ہوا بند تھی، بستی کے باہر بہت دُور ایک کُتا اپنی مہین گرجدار آواز میں شور مچا رہا تھا۔ آسمان پر ہلکی ہلکی روشنی تھی، صبح ہونے والی تھی۔

ہر چیز پر نیند کا غلبہ تھا۔ کائنات اپنی مسلسل گردش سے گویا تھک کر سو گئی تھی، اگر کوئی بدبخت اب تک نہ سویا تھا تو وہ ایک دوا فروش چرنومارڈک کی نوجوان بیوی تھی۔ وہ تین مرتبہ بستر پر لیٹی اور ہر مرتبہ اُٹھ بیٹھی، اُسے مطلق نیند نہ آئی وہ گھبرا رہی تھی، نہ معلوم کیوں؟ ..... آخرکار وہ اپنے رات کے لباس میں، کمرہ کی کھڑکی سے لگ کر گلی میں جھانکنے لگی، مگر پھر بھی اُس کی پریشانی کا وہی عالم تھا۔ اس وقت وہ بےحد مغموم اور نڈھال تھی، اتنی بدحواس کہ بے اختیار رونے کو جی چاہ رہا تھا، خدا معلوم کیا بات تھی؟ .....

اُسے ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے اُسکے سینہ پر کوئی بوجھ، کوئی وزنی پتھر ہے جو بار بار گلے تک آ آ کر اُسے زار زار رونے سے روک لیتا ہے چند قدم کے فاصلہ پر دیوار سے لگا ہوا اُس کا شوہر چرنومارڈک خراٹے لے رہا تھا۔ ناک پر ایک مچھر بیٹھا ڈنک مار رہا تھا مگر اُسے سوتے میں کچھ خبر نہ تھی۔ اُس کا چہرہ بشاش معلوم ہوتا تھا، شاید وہ خواب میں دیکھ رہا تھا کہ بستی کے تمام لوگ کھانسی میں مبتلا ہیں، اور اُس کی دوکان سے دوا خریدنے آئے ہیں۔ اب اُسے کوئی چیز، کوئی آواز بیدار

نہ کر سکتی تھی۔

دوکان بستی سے بالکل باہر تھی، اس لیے دوا فروش کی بیوی کھڑکی سے دُور تک کے مناظر، سبزہ، کھیت، تالاب بہ آسانی دیکھ سکتی تھی۔ مشرق کی طرف افق روشن ہوتا جاتا تھا، اتنے میں گویا آگ کی روشنی کی طرح پیلا ہو گیا اور بالکل غیر متوقع طور پر ایک گول سرخ رنگ کا پیارا پیارا چاند جھاڑیوں کی آڑ کے پیچھے سے جھانکنے لگا، رفتہ رفتہ بلند ہوتا گیا اور ذرا سی دیر میں اُسکے چہرہ پر، کمرہ میں، سڑکوں پر چاندنی ہی چاندنی تھی۔

رات کی مہیب خاموشی میں یکایک کہیں قریب ہی ایک آہٹ سنائی دی جو رفتہ رفتہ قدموں کی چاپ میں بدل گئی۔ اُسے تھوڑی دُور پر دو آدمی ہاتھ ہلاتے ہوئے، زور زور باتیں کرتے اور اپنی چال۔ ، سڑک پر شور مچاتے ہوئے نظر آئے۔

"شاید سپاہی ہیں، جو کپتان پولیس کے بنگلہ سے اپنے گھر واپس جا رہے ہیں" دوا فروش کی بیوی نے خیال کیا۔

تھوڑے ہی عرصہ میں وہ کچھ اور قریب آ گئے، اب وہ اُنھیں بخوبی دیکھ سکتی تھی۔ ایک تو خوب موٹا تازہ قد آور آدمی تھا دوسرا ذرا دُبلا پتلا اور پستہ قد۔ دونوں قدم بہ قدم جھومتے ہوئے چلے آ رہے تھے، اُس کی دیوار کے نیچے پہونچکر اُن کے قدم سُست پڑنے لگے اور آواز بھی دھیمی ہو گئی دونوں نے اوپر کی طرف نگاہ کی اور آپس میں یوں باتیں کرنے لگے:

"کسی دوا فروش کی دوکان معلوم ہوتی ہے" ایک نے کہا

"دوا فروش کی تو ہے ہی، وہ..... مجھے یاد ہے گذشتہ سنیچر کو میں یہاں ریندی کا تیل خریدنے آیا تھا، بہت بد قطع اور عجیب شکل و ہیئت کا آدمی ہے مگر..." دوسرے نے جواب دیا۔

"اس وقت سو رہا ہوگا، اُس کی بیوی بھی سوتی ہوگی، آبٹوسو! کیا کہوں کیسی حسین عورت ہے!"

"آہ، میں دیکھ چکا ہوں، میں تو یہی کہنے کو تھا۔ ڈاکٹر! بتاؤ تو وہ اپنے بدصورت شوہر کو پسند بھی کرتی ہوگی، کیا وہ اُس سے کبھی محبت کر بھی سکتی ہے؟"

"نہیں، غالباً وہ ہرگز اُس سے محبت نہ کرتی ہوگی" ڈاکٹر نے ٹھنڈی سانس بھر کر کہا۔

"وہ اس وقت کھڑکی سے لگی سوتی ہوگی، کیوں آبٹوسو! گرمی کے مارے ہلکان ہوئی جاتی ہوگی... اُس کے لب نصف کھلے ہوں گے اور ایک پاؤں چادر سے باہر نکلا ہوا پٹی پر لٹک رہا ہوگا.... بیوقوف دوا فروش کو اپنی خوش قسمتی کی ذرا بھی خبر نہیں" اُس نے ہنستے ہوئے کہا "اُس کو

عورت اور بوتل کے درمیان کیا فرق نظر آتا ہوگا!"

"میں کہتا ہوں ڈاکٹر" افسر نے رُک کر کہا "اگر اس وقت چل کر اس دوکان سے کوئی دوا خریدیں تو کیسا ہے؟ اس بہانہ سے شاید ہم پھر اُسکو دیکھ سکیں"

"خوب سوچا!..... مگر ایسا رات میں"

"اونھ" افسر نے منہ اُٹھا کر کہا "اس سے کیا ہوتا ہے، بلکہ یہ لوگ تو رات میں خدمت کرنے سے اور بھی خوش ہوتے ہیں"

"تم کہتے ہو تو بھائی....."

دوا فروش کی بیوی تمام باتیں پردہ کی آڑ سے سنائی، اتنے میں اُس نے گھنٹی کی آواز سنی، نہایت اطمینان سے اُس نے اپنے شوہر کی طرف دیکھتے ہوئے جو بیٹھی نیند اُڑا رہا تھا اپنی پوشاک بدلی، پیروں میں سلیپر پہنی اور دوکان کے دروازہ کی طرف چلی۔

شیشوں کے دوسری جانب اُسے صرف دو پرچھائیاں نظر آئیں، روشنی تیز کر کے فوراً اس نے دروازے کھول دیے۔ اب نہ وہ مغموم تھی اور نہ نڈھال، نہ اُس کا جی رونے کو چاہ رہا تھا، مگر اُس کا دل نہ معلوم کیوں اب بھی دھڑک رہا تھا، موٹا تازہ ڈاکٹر اور دُبلا پتلا آبیٹو سوا اندر داخل ہوئے دوا فروش کی بیوی نے اب اُن کی صورتیں دیکھیں، ایک موٹا تازہ سیاہ فام تھا، چھوٹی داڑھی، بہت سست، ہلکی سی جنبش سے اُس کی پیشانی پسینہ سے تر ہو جاتی، شاید اُسے اپنے موٹاپے سے تکلیف پہونچتی تھی، دوسرا دُبلا پتلا خوش رُو اور نازک اندام تھا، مُنڈی ہوئی داڑھی زنانہ چہرہ، بڑا تیز اور نرم،

"فرمائیے، کیا حاضر کروں؟" دوا فروش کی بیوی نے لباس کو ایک ہاتھ سے اپنے سینہ پر پکڑے ہوئے سوال کیا،

"چار آنے کی وہ..... دیکھیے اُسے کیا کہتے ہیں وہ..... ہاں پیپر منٹ کی ٹکیاں عنایت کیجیے"۔ لکنت کرتے ہوئے ایک گھبرائے ہوئے لہجہ میں ڈاکٹر نے ادا کیا۔

آہستہ آہستہ دوا فروش کی بیوی نے الماری کی طرف ہاتھ بڑھایا، بوتل نکالی اور ٹکیاں تولنے لگی۔ اُس کے خریدار دیر تک اُس کی پشت پر نظر جمائے رہے، ڈاکٹر تیز نظروں سے دیکھ رہا تھا اور افسر نہایت سنجیدگی سے،

"یہ پہلا اتفاق ہے کہ میں نے کسی دواخانہ میں عورت کو کام کرتے دیکھا" ڈاکٹر نے ہمت کر کے

وشی کو توڑا،

"اس میں ہرج ہی کون سا ہے" دوا فروش کی بیوی نے بغیر اپنی نظر اُٹھائے جواب دیا "میرے شوہر کا کوئی مددگار نہیں، اور میں ہمیشہ اُس کا ہاتھ بٹاتی ہوں"

"آپ کی دوکان کیسی مختصر اور سجی ہوئی ہے! مختلف رنگ کی بوتلیں .... ڈبّے، فرنیچر... اور ہاں، کیوں آپ کو اِن زہریلی چیزوں کے درمیان نقل و حرکت کرنے سے خوف نہیں لگتا؟"

دوا فروش کی بیوی نے کوئی جواب نہ دیا اور باطمینان دوا کے پیکیٹ کو بند کیا، مُہر لگائی، ڈاکٹر کے حوالہ کیا، آبیٹوسو نے قیمت ادا کی۔

آدھ منٹ خاموشی رہی ...... دونوں ایک دوسرے کو دیکھا کیے، دروازہ کی طرف بڑھے اور پھر ایک دوسرے کو دیکھنے لگے،

"اچھا! دو آنہ کا سوڈا ابھی دیدیجیے" ڈاکٹر نے بالآخر کہا؛

اور پھر دوا فروش کی بیوی کے ہاتھ الماری کی طرف آہستہ آہستہ بڑھے، بوتل اُٹھا کر اس نے دوا تولنا شروع کی۔

"کیوں صاحب، آپ کی دوکان میں کوئی ..... ایسی دوا ....." آبیٹوسو نے اپنی انگلیاں ہلا کر رُکتے ہوئے کہا "کوئی .... ایسی چیز.... یعنی .... میرے کہنے کا مطلب یہ ہے کہ کوئی مقوی .... ؟"

"ہے کیوں نہیں" دوا فروش کی بیوی نے سنجیدگی سے جواب دیا۔

"خوب! آپ عورت نہیں فرشتہ ہیں، چار آنے کی کوئی مقوی دوا دیدیجیے"

دوا فروش کی بیوی نے خاموشی کے ساتھ سوڈے کا پیکیٹ بنایا، مُہر لگائی اور ڈاکٹر کو پیش کیا، پھر وہ دروازے سے نکل کر گھر کے اندر چلی گئی۔

"فرشتہ! ..... ویسی نہیں کہتے، حور، حور، ..... اور کیا" ایک نے چپکے سے کہا "سنو، وہ خرّاٹے، اُس کا شوہر بالکل غافل ہے، میٹھی نیند سو رہا ہے"

ایک منٹ کے بعد دوا فروش کی بیوی واپس آئی اور ایک شیشی لا کر میز پر رکھدی، وہ ابھی ابھی دوا کی کوٹھری سے نکلی تھی اس لیے ہانپ رہی تھی، کسی قدر بلند لہجہ میں اُس نے پوچھا "اور کچھ؟"

"آہستہ آہستہ" آبیٹوسو بولا "اتنے زور سے بات مت کیجیے، آپ کے شوہر کی آنکھ نہ کھل جائے"

"اس میں ہرج ہی کون سا ہے" دوا فروش کی بیوی نے پھر اپنے طمانیت خیز لہجہ میں کہا،

دوائیں خرید کر دونوں خریدار اُس سے رخصت ہونے لگے' دوا فروش کی بیوی نے اُن سے ہاتھ ملا کر ایک بھولے انداز میں کہا۔

"آپ لوگ کبھی کبھی اس طرف آ نکلا کیجیے' میں تنہائی میں کسی قدر پریشان ہوتی ہوں.... ہماری دوکان بستی سے باہر واقع ہوئی ہے" اُس کا دل اب پھر اُسی خوفناک رفتار سے ساتھ دھڑک رہا تھا۔ کیوں؟ یہ اُسے بھی نہ معلوم تھا۔

"ضرور آیا کریں گے' ضرور آتے رہیں گے" ڈاکٹر نے اپنے ساتھی کو معنی خیز نگاہوں سے دیکھ کر کہا۔

"شکریہ" دوا فروش کی بیوی بولی۔

"آپ کا تو ہر خواب میں آپ کو دیکھ رہا ہوگا ...." آبٹوسو نے چلتے چلتے ادا کیا۔

"کیسی باتیں کرتے ہیں!" دوا فروش کی بیوی نے کہا۔

"کیسی باتیں!" آبٹوسو نے دہرایا "خوب! شیکسپیئر نے لکھا ہے' وہ خوش نصیب ہے جو اپنی جوانی میں جوان رہے' اب کہیے"

"میرا ہاتھ چھوڑ دیجیے" دوا فروش کی بیوی نے ہنس کر کہا۔

آخر دونوں رخصت ہوئے مگر مُڑ مُڑ کر دیکھتے جاتے تھے' جیسے وہ کوئی چیز بھول گئے ہوں۔ دوا فروش کی بیوی فوراً اپنے کمرہ میں آئی' اور پھر کھڑکی سے لگ کر اس پریشانی' اُسی نامعلوم گھبراہٹ کا شکار بن گئی۔ اُس نے دونوں خریداروں کو دوکان سے نکل کر کوئی بیس قدم جاتے ہوئے دیکھا' چلتے چلتے وہ رُک گئے اور آپس میں کچھ باتیں کرنے لگے..... وہ کیا باتیں کر رہے تھے؟ اُس کا جی بیٹھا جاتا تھا' سر میں درد ہو رہا تھا.... آخر وہ کیا باتیں کر رہے تھے؟ اُس کا دل زور زور سے دھڑک رہا تھا'.... آخر وہ کیا باتیں کر رہے تھے؟ اُسے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ دونوں اُس کی قسمت کا فیصلہ کر رہے ہیں!

پانچ منٹ بعد ڈاکٹر آبٹوسو سے علیٰحدہ ہوگیا اور ایک گلی میں چلا گیا' آبٹوسو دوکان کی طرف پھر بڑھا.... اب وہ اُس کی دیوار کے نیچے تھا' دو قدم بڑھا' پھر پیچھے ہٹ گیا' آخرکار گھنٹی بجی۔

"کون ہے؟.... کیا ہے؟" یکایک دوا فروش کے کرخت اور غیر دلچسپ لہجہ کی آواز دوا فروش کی بیوی کے کانوں میں گونجی "گھنٹی بج رہی ہے' کوئی خریدار آیا ہے اور تم یوں ہی بیٹھی ہو؟ کیوں؟ اسی طرح کام چلے گا؟" دوا فروش کا غصہ ہر جملہ کے ساتھ بڑھتا جاتا تھا۔

"کون ہے؟ .... کیا ہے؟" دوا فروش نے دوکان کا دروازہ کھول کر پوچھا۔

"مجھے .... مجھے ....،" آبیٹو سو گھبرا گیا "دو .... چار آنہ کی دو .... پپرمنٹ کی ٹکیاں عنایت کیجیے۔"

نیم خوابی کے عالم میں، آنکھیں ملتے ہوئے، جمائی لیکر دوا فروش نے الماری کی طرف ہاتھ بڑھایا، دو منٹ بعد دوا فروش کی بیوی نے آبیٹو سو کو دوکان سے باہر نکلتے ہوئے دیکھا۔ کچھ قدم چل کر اُس نے پپرمنٹ کے پیکٹ کو زمین پر پھینک دیا۔ گلی سے اُس کا ساتھی آکر اُس سے مل گیا۔ اور ایک دوسرے سے نگاہوں میں باتیں کرتے ہوئے کہرے کے ہلکے غبار میں دونوں غائب ہو گئے۔

"میری طبیعت بہت اُلجھ رہی ہے!" دوا فروش کی بیوی نے اپنے شوہر کو خفگی کی نگاہوں سے دیکھتے ہوئے کہا "ارے میری طبیعت بہت اُلجھ رہی ہے!" اُس نے دوہرایا اور اُسکی آنکھیں نم آلود ہو گئیں "کیا کسی کو میری حالت .... کیا کوئی مجھ پر رحم .... ؟"

"میز پر چار آنے پیسے بھول آیا ہوں، اُٹھا لینا" کپڑے پہنتے ہوئے دوا فروش نے اپنی بیوی سے کہا،

یہ کہا اور بستر پر دراز ہو کر پھر سو گیا۔

جلیل احمد قدوائی (علیگ)

حواس اُڑتے ہیں ایک اک سانس پر یہ کیا زندہ ساماں ہے؟ — کہ وہ بھی ہمارے واسطے خواب پریشاں ہے
کسی آفت کا ڈر کیا زندگی سے جبکہ منہ موڑا — محبت کی ہو مشکل جو کوئی وہ مجکو آساں ہے
یہ ناگن ترانی کہ کے سب کچھ کہہ گیا کوئی — ابھی تک جو کہ اصل مدعا ہے وہ تو پنہاں ہے
خوشا قسمت اجل کا لطف اٹھایا جیتے جی میں نے — فراقِ دوست میں جو سانس ہے وہ آفتِ جاں ہے
نظر کی حسن کے ہنگاموں پر جب دل بکا اُٹھا — قیامت جسکو کہتے ہیں ترا کارِ نمایاں ہے
اُٹھا لوں لذتِ آفاتِ الفت اے اجل تھم جا — بہت خوش ہوں کہ میرے گھر میں مہماں شامِ ہجراں ہے
ملالِ عشق میں ٹپکے جو آنسو بن گئے تارے — نظر پڑتی ہے دنیا کی مراد اماں وہ داماں ہے
حقیقت خلقتِ دل کی کہوں کیا ہمنفس تجھ سے — لہو کے ایک اک قطرہ میں ایک اک درد پنہاں ہے

تعلق سجدہ کو دشتِ فنا سے کچھ نہیں محشر
وہ مجنوں کا بیاباں اور یہ میرا بیاباں ہے

مرزا کاظم حسین محشر لکھنوی

ختنہ تاریخ کی گریزاں روشنی میں

تاریخ کی نظر جہاں تک کام کرتی ہے، اس بات کا پتہ نہیں چلتا کہ ختنہ کا آغاز کب سے ہوا، اور کس ملک نے سب سے پہلے اس کی ابتدا کی۔ لیکن تاریخی عہد جب سے شروع ہوتا ہے اُس وقت سے ہر زمانہ میں اور ایک دوسری سے بےخبر ہر قوم میں اس کا رواج پایا جاتا ہے۔ کہیں فاتح مفتوح کے ختنے کرتا ہے، کہیں بے شمار ختنوں کا ہار بہادری کا تمغہ سمجھا جاتا ہے، اور کہیں مختونیت کو خدائی حکم تصور کیا جاتا ہے۔

توراۃ کا بیان ہے کہ اس کا آغاز سب سے پہلے حضرت ابراہیم نے کیا۔ چنانچہ ایک یوروپین مورخ ہارڈیک اسی بنا پر یہودیوں کے ذریعہ مصر میں اس کا رواج کراتا ہے۔ لیکن تاریخ اُسکے اس بیان کا ساتھ نہیں دے سکتی۔ وہ کہتی ہے کہ مصر میں اس کا رواج بہت قدیم زمانہ سے تھا۔ انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا میں کھڈنک کے ایک مجسمہ کے حالات لکھے ہیں جس میں ایک لڑکے کے ختنوں کا منظر دکھایا گیا ہے۔ یہ مجسمہ بادشاہ یرامی سس کے بیٹے کا ہے۔ خود توراۃ کے الفاظ سے بھی یہ ظاہر ہوتا ہے کہ ختنہ کا اُن زمانہ میں عام رواج تھا۔ کیونکہ اس میں صرف یہ حکم دیا گیا ہے، یہ نہیں بتایا گیا کہ ختنہ کیا چیز ہے اور کس طرح کیا جائے۔ اس سے صاف طور پر یہ پایا جاتا ہے کہ حضرت ابراہیم پہلے سے جانتے تھے کہ ختنہ کسے کہتے ہیں۔ مصر قدیم کی رسوم کا مصنف کن تن لکھتا ہے کہ مصر میں ختنہ کا رواج ۱۸۹۶ قبل مسیح سے بھی پہلے عام ہو چکا تھا" اور مصری کتبات بھی اسکی شہادت دیتے ہیں۔ اسکے قریب قریب ہیروڈوٹس کے شارح رائی سن اور ایک ماہر اثریات سرجان کی تحقیقات ہیں۔

بعض مورخ اس زمانہ کی معلوم دنیا کی اور قوموں میں بھی اس کا رواج پاتے ہیں۔ چین میں بھی قدیم الایام سے اس کا پتہ چلتا ہے۔ فینقیہ والے بھی اسکے عادی نظر آتے ہیں، اور جب کولمبس امریکہ جاتا ہے تو میکسیکو وغیرہ میں عام طور پر لوگوں کو مختون دیکھتا ہے۔ اس نے لکھا ہے کہ لوگوں نے مجھ سے بیان کیا کہ ہمارے ہاں یہ رسم بہت قدیم سے جاری ہے۔ ہندوستان میں بھی ایک خاص گروہ میں ختنہ کا رواج تھا۔ بحر جنوبی کے بعض جزائر میں پوری پوری بستیاں مختون ہوتی تھیں۔ اور اگرچہ اُس زمانہ میں ایسی آسانیاں نہ تھیں جیسی اب پیدا ہو گئی ہیں، یعنی اُس زمانہ میں پتھر کے چاقو اور لوہے کے ٹکڑوں سے ختنہ کیا جاتا تھا، تاہم وہ لوگ خوشی خوشی بچپن یا جوانی میں اس فرض سے سبکدوش ہوتا

ضروری سمجھتے تھے۔

جدید تحقیقات سے ثابت ہوتا ہے کہ یہ رسم ساؤتھ سی کے جزیروں، جنوبی امریکہ کی بعض قوموں، وسط امریکہ کی اقوام، ساحل ایمزان کی بستیوں، اسٹریلین قبائل، کیلی ڈونیا، میلن ریشیا، پاہن ریشیا، ہورس، ہوبڑی ڈس، اور ہائن کاٹ وغیرہ میں نہایت قدیم زمانہ سے اب تک پائی جاتی ہے۔

بعض جگہ یہ رسم صرف سرداروں اور معززوں کے ساتھ مخصوص تھی۔ چنانچہ مون ہاٹ نے اپنے سفرنامہ میں لکھا ہے کہ پاہن ریشیا میں صرف سردار ختنے کراتے تھے۔

بعض مورخ یہ بھی لکھتے ہیں کہ اس رسم کے ادا کرنے پر بڑے جشن منائے جاتے تھے۔ کےلیس کا بیان ہے کہ بسوٹو کی قوم میں ختنہ نہایت عجیب وغریب طریقہ پر کیے جاتے تھے۔ ہر سال چند مقررہ تاریخو پر ساری قوم کے نوجوان جمع کیے جاتے تھے، اور آبادی سے دور ایک مقام پر جہاں ان کے رہنے سہنے کا انتظام کیا جاتا تھا، یہ رسم ادا کی جاتی۔ ختنہ کے بعد یہ لوگ سات سات آٹھ آٹھ مہینے تک یہیں رہتے تھے۔ اس عرصہ میں ان کو فنون جنگ کی تعلیم دی جاتی تھی، اور بچپن کا نام تبدیل کرکے ایک دوسرا نام رکھا جاتا تھا۔ یہ نام پاکی اور بہادری کا خیال کیا جاتا تھا۔ اس کے بعد وہ لوگ اپنے اپنے گھروں کو واپس آجاتے تھے۔ اسٹریلیا میں بھی اس رسم کو بہت معزز سمجھا جاتا تھا۔ ختنہ کے زمانہ میں جنگ وجدل بند کردی جاتی، اور بڑے اہتمام سے اس کام کو انجام دیا جاتا تھا۔ ملایا اور یوریئو میں بھی یہ رسم بہت دھوم دھام سے منائی جاتی ہے۔ جنوبی افریقہ کی ایک قوم کوانا اور مڈگاسکر کی ایک قوم ہواس بھی اس رسم کو تہوار کی طرح سمجھتی۔ اور رقص وسرود کے جلسوں کے ساتھ ادا کرتی ہے۔

ان واقعات کے ہوتے کوئی وجہ نہیں کہ توراۃ کے ایک مشتبہ بیان پر حضرت ابراہیم کو اس ارتقائی فعل کا موجد تسلیم کیا جائے۔ البتہ انھیں یہ فضیلت ضرور دی جاسکتی ہے کہ وہ سب سے پہلے انسان ہیں جنھوں نے اس کو مذہبی حیثیت سے اختیار کرکے رواج دیا اور شریعت کے رنگ میں فرضیت مرتسم کردی۔ اسی غرض سے خود انھوں نے ۹۹ برس کی عمر میں ختنے کیے، اور اپنے خاندان کے ایک متنفس کو بھی غیر مختون نہ چھوڑا۔

یہودی کہتے ہیں کہ یہ حکم صرف بنی اسرائیل کے لیے تھا، تاکہ ان میں اور دوسری قوموں میں امتیاز رہے، لیکن نہ تو تاریخ اس کی تائید کرتی ہے اور نہ خود اُن کا عمل اس کا مؤید ہے۔ جو لوگ یہودی مذہب اختیار کرتے تھے اُن کے ختنے تو شرعاً کیے ہی جاتے تھے۔ لیکن اس سے نہ غلام بچتے تھے نہ قیدی، بلکہ وہ لوگ بھی جو یہودی رعایا بنتے مختون کردیے جاتے تھے۔ اور یہ کام بڑی دھوم دھام سے انجام

دیا جاتا تھا۔ تقریباً ہر شخص ختنے کرنا سیکھتا تھا، تاکہ وقت پہ، وقت خود یہ کام کرسکے۔ ان میں یہ مذہبی روایت چلی آتی تھی کہ ختنے کرنے والے کو کیڑے نہیں کھائیں گے۔

عیسائیوں میں اگرچہ اس کے متعلق کوئی خاص حکم نہیں ہے، لیکن پال نے صرف یہودیوں کی عداوت میں اس کی ممانعت کردی، اور گلیتی والوں کو لکھا کہ اگر انھوں نے ختنے کرائے تو انھیں مسیحؑ سے کسی شفاعت کی امید نہیں رکھنا چاہیے۔ حالانکہ پطرس اور جیمس کے سامنے پال کو علانیہ اپنی غلطی کا اعتراف کرنا پڑا، اور اُس نے اپنے ہاتھ سے اپنے ایک پیرو کا ختنہ کیا۔ تاہم اسکے بعد بھی وہ عملاً مخالفت ہی کی تعلیم دیتا رہا۔ لیکن جن ملکوں میں پال کی تعلیمات کا اثر نہیں پھیلا ہے، وہاں عیسائی بھی ایک مدت دراز سے ختنے کراتے ہیں، خصوصاً حبش کے عیسائیوں میں اس کا بہت رواج رہا ہے۔

اسلام جو اپنی اصولی تعلیمات میں اپنے اولین موسس — حضرت ابراہیمؑ کی تعلیمات کا داعی ہے، اسنے اس کو فریضۂ مذہبی سمجھا ہے، رسول اللہؐ نے اس کو اسلام کی فطرت فرمایا ہے، اور مسلمان ہونے کے ساتھ مختون ہونا بھی ضروری قرار دیا ہے۔ گو مسلمانوں میں بعض ایسے فرقے بھی ہیں جو ختنہ نہیں کراتے، لیکن وہ اخلاقی اور مذہبی حیثیت سے کسی شمار میں نہیں، اس لیے اسلام کے لیے اُن کا وجود و عدم یکساں ہے۔

"ناظر"

نہ کیونکر تیری پیدائش سے ہوں خوبرو پیدا — وہی پیدا ہے تجھ سے۔ اے صنم جس سے ہے تو پیدا
نہیں ملتا ہے وہ دیر و حرم میں سر پٹکنے سے — وہی پاتا ہے جو کرتا ہے دل میں جستجو پیدا
پتا دلبر کا میرے۔ اس زمانے میں نہ کچھ پوچھو — وہی ہے۔ قبلۂ عالم! ہوا جو قبلہ رُو پیدا
پڑا سایہ نہیں اُس پہ اگر اُس سروِ خنداں کا — ہوئی۔ اے بلبلو! گُل میں کہاں سے رنگ و بو پیدا
طلسم قدرتِ خالق کا عالم اک تماشا ہے — کہ مُشتِ خاک سے ہوتے ہیں کیا کیا ماہرو پیدا

کیا ہے قتل ظالم نے۔ مگر دستِ حنائی سے
کہ خونِ شوق میں ہے۔ سونگھ لو مہندی کی بو پیدا

مبین المظفر شوق (وکیل)

جناب عزیز کی ایک غزل

یہ میری اہم ترین جسارت ہوگی اگر میں لسان الملک جناب عزیز صاحب کے کلام پر قلم اُٹھانے کی جرأت کروں لیکن شاید میری معذرت بارگاہ مقبولیت میں باریاب ہو جائے اگر میں اس قدر عرض کردوں کہ میں نے ان چند سطور میں محض حق جوئی اور حق نمائی سے کام لینے کی کوشش کی ہے۔ عزیز صاحب کا پایہ اس سے کہیں بلند ہے کہ مجھ ایسے احقر الرائے کے الفاظ اُنکی پابوسی کر سکیں یا ذرا سا بھی نقصان پہونچا سکیں اور نہ میرا یہ مقصد ہو سکتا ہے۔ میں محض اس قدر چاہتا ہوں کہ اشعار پر ایسی نظر ڈالوں کہ کچھ مجھے حاصل ہو جائے اور میں دیکھ لوں کہ آیا میرے خیالات درست ہیں۔ اس غرض کے لیے اس سے بہتر اور کیا ہو سکتا ہے کہ انکے تازہ ترین دماغی مظاہرہ پر اجمالی نگاہ دوڑائی جائے۔ اس لیے کہ یہ خیال کیا جا سکتا ہے کہ ایسی غزل انکے کمال مشق کی دستار زیب فرق کیے ہوئی۔ ہمیں اس سے قطعی بحث نہیں کہ اُن کا مذاق شاعری کیا اور کیسا ہے۔ ہم صرف اپنے خیالات کو بندش، تراکیب، اور صرفِ محاورہ کے دائرہ ہی میں محدود رکھیں گے۔

لکھنؤ کے ایک حال کے مشاعرہ کی غزل جس کا تعلق انجمن معین الادب سے تھا [illegible] شایع ہوئی ہے مطلع ہدیۂ ناظرین ہے:

شب آخر ہم بھی آخر دیکھیے کب تک وہ آتے ہیں ۔۔۔ بصارت گھٹتی جاتی ہے چراغ اب بجھتے جاتے ہیں

نزاکت غزل کو خیال میں رکھتے ہوئے مطلع کا پہلا ٹکڑا "شب آخر ہم بھی آخر" کس قدر گرانبار ہے۔ عزیز صاحب کی غایت تو یہ معلوم ہوتی ہے کہ شب آخر ہے اور ہم بھی آخر ہیں یعنی قریب ختم ہیں اب نہ معلوم وہ کب آئیں گے۔ دیکھنا صرف یہ ہے کہ آیا وہ غایت پوری بھی ہوئی ہے۔ یہ تو ظاہر ہے کہ شب آخر ہم بھی آخر کا ٹکڑا نا مکمل ہے اور مصرعہ کی کوتاہی قسمت کی وجہ سے اس طرح نظم کر دیا گیا ہے کہ ثقیل اور مکروہ ہو گیا۔ یہ ضروری معلوم ہوتا ہے کہ "ہے" اور "ہیں" کی لفظیں شامل کر دی جائیں۔ ورنہ "آخر" اس طرح "دیکھیے" کی دُم میں لگا ہوا ہے کہ پڑھنے والا معاً "آخر دیکھیے" پڑھے گا اور گمراہ ہو جائے گا۔ جس کی اُمید ایک ہادیِ زبان سے نہیں کی جا سکتی۔

اس مطلع کے دوسرے مصرعہ میں لف ونشر غیر مرتب سے کام لیا گیا ہے۔ اور پہلے مصرعہ کے پہلے جزو کے ثبوت میں پیش کیا گیا ہے۔ اپنے ختم ہونے کا ثبوت یہ بتایا گیا ہے کہ "بصارت گھٹتی جاتی ہے" جو بالکل خلاف واقعہ ہے۔ بصارت کا گھٹنا ہرگز اسکی دلیل نہیں کہ موت کے دن نزدیک ہیں، یا آخر وقت قریب ہے۔ بصارت موت سے پچاس سال پہلے بھی "گھٹتی جاتی" نہیں بلکہ ختم ہوسکتی ہے لیکن یہ ضروری نہیں کہ موت کا ہاتھ اس ناہنجار تک زوالِ بصارت کے بعد ہی پہونچ جائے۔ زوال بصارت موت کا نتیجہ ہے لیکن نہ تو موت زوالِ بصارت کا نتیجہ ہے اور نہ ضعف بینائی موت کی علامت۔ عزیز صاحب کے کلیہ سے تو یہ ظاہر ہوتا ہے کہ جس شخص کی بصارت گھٹ جائے یا گھٹنے لگے وہ موصوف کے خیال کے مطابق قریب المرگ ہے۔ اس نظریہ کے مطابق لاکھوں فی الواقعی زندہ حضرات مردہ ہوگئے۔ اور کروروں لبِ گور۔ حالانکہ قوائے ظاہری یہ بتا رہے ہیں کہ وہ ابھی برسوں جئیں گے۔ اور نہ یہی کسی طرح ثابت ہے کہ جب آدمی مرنے لگتا ہے تو اسکی بصارت کم ہو جاتی ہے۔ ہم یہ مانتے ہیں کہ آنکھوں میں اندھیرا ضرور چھا جاتا ہے، لیکن بصارت کا کم ہونا اور آنکھوں پر تاریکی کا چھا جانا دو مختلف باتیں ہیں اور پہلے فقرہ کو موت کی علامات سے کوئی تعلق نہیں۔ برخلاف اسکے پتلیوں کا پھر جانا یا الٹ جانا، تشنج، نبضوں کا ڈوبنا وغیرہ وغیرہ موت کے لیے ضروری ہیں۔

عزیز صاحب کے ثبوت کے دوسرے ٹکڑے میں بھی ایک حد تک یہی عیب موجود ہے لیکن اسقدر نمایاں طور سے نہیں۔ اس لیے کہ چراغ کا تیل عموماً قریب صبح ختم ہو جاتا ہے اور چراغ بجھنے لگتے ہیں۔ لیکن یہ تو ظاہر ہے کہ جب ہی ہوا چلے تب ہی چراغ بجھ سکتے ہیں۔ یعنی صبح کی علامتوں میں سے چراغ کا بجھنا کوئی یقینی علامت نہیں۔ قطع نظر اسکے ایک بات اور نمایاں طور سے ظاہر ہے وہ یہ کہ مصرعہ کی ترکیب اس امر کی مقتضی ہے کہ جملہ یوں ہو۔ "بصارت گھٹتی جاتی ہے اور چراغ بجھتے جاتے ہیں"۔ اس حساب سے "اب" کی لفظ بیکار ہے اور ممکن ہے غلط اور لغو بھی ہو۔

اس غزل کا دوسرا شعر وہ معرکۃ الآرا شعر ہے جسے حضرات لکھنؤ نے مشاعرہ میں بہت پسند کیا تھا۔ ملاحظہ فرمائیے

اُٹھیں گی وہ حیا پرور نگاہیں کیا مری جانب مقابل ہے ابھی آئینہ اور شرمائے جاتے ہیں

ہم بھی عزیز صاحب کے اس شعر کی مخلصانہ داد دیتے ہیں۔ عوام الناس میں مقبول ہوجانے

کے بعد ہمارا قلم کچھ لکھتے ہوئے کانپتا ہے لیکن ہم اتنا ضرور عرض کریں گے کہ لفظ "کیا" "اُٹھیں گی" سے اس قدر دُور ہو گیا ہے کہ جملہ کو استفہامیہ بنائے دیتا ہے۔ دوسرے مصرعہ میں "وہ" یا کسی ایسی ہی لفظ کا استعمال ناگزیر معلوم ہوتا ہے۔ ممکن ہے عوام میں رائج ہو لیکن اساتذہ کے یہاں مقبول ہونا باعثِ حیرت ہے۔ اس لیے کہ پہلے مصرعہ کا فاعل "نگاہیں" ہے اور دوسرے مصرعہ میں "وہ" فاعل ہے۔ اسی لیے اسکے اظہار کی قطعی ضرورت ہے۔ تاہم اس طرح کے تمام اعتراضات شعر کی خوبیوں کو جائز مقبولیت سے نہیں روک سکتے۔

تیسرے شعر کے متعلق ہم کسی طرح یقین نہیں کر سکتے کہ لسان الہند کے قلم معجز رقم کی گلکاری ہے غالباً کاتب کی اصلاح ہوگی۔ فرماتے ہیں

شبِ غم منحصر گریہ پہ ہے اختر شماری بھی　　جب آنسو ضبط کرتا ہوں ستارے ڈوب جاتے ہیں

دوسرا مصرعہ صریحاً غلط ہے زبان اُردو تو یوں بولے گی کہ "جب میں آنسو ضبط کرتا ہوں ستارے ڈوب جاتے ہیں"۔ بہرتقدیر خواہ عزیز صاحب نے یوں ہی نظم کیا ہو یا یہ اصلاح کاتب کی جدت طبع کا نتیجہ ہو شعر کا مطلب سمجھنے میں ہمیں اہم ترین دقتوں کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے۔ اس شعر میں سوائے ظاہری اوصافِ شاعری کی نمایش مثلاً بندش، رعایت، وشوکتِ الفاظ وغیرہ کے بالکل صفر ہے۔ موجودہ خوبیاں بھی اس وجہ سے کالعدم ہیں کہ شعر کا مطلب ہی غائب ہے۔ شعر محض الفاظ کی اینٹوں اور تنظیم کے گارے کی یکجائی کا نام نہیں، بلکہ شعر وہ عمارت ہے جو اس مجتمع مصالحہ کا ایک حسین ترین نتیجہ ہوتی ہے۔ اور یہ بات ظاہر ہے کہ عزیز صاحب کا یہ شعر عمارت کے درجہ تک نہیں پہونچتا۔ کم از کم ہماری سمجھ اس شعر کا مطلب سمجھنے سے بالکل قاصر ہے۔ ممکن کیا بلکہ یقیناً یہ ہماری سمجھ کا قصور ہے۔ ہم بہترین کوشش صرف کرکے یہ ضرور مطلب نکال سکتے ہیں کہ آپ اختر شماری سے قطرہ ہائے اشک کا گرنا مراد لیتے ہیں لیکن اگر یہی مطلب ہے تو شعر کا لکھنا تحصیل حاصل ہے۔ ظاہر ہے کہ جب گریہ کریں گے تب ہی آنسو نکلیں گے، ورنہ پھر پیاز اور چاقو لے کر بیٹھا جائے اور اس طرح آنسو نکالے جائیں۔ مگر غالباً عزیز صاحب کا یہ مطلب نہیں۔ انھوں نے فی الواقعی "اختر" ہی کو کب نظم کیا ہے۔ اگر ایسا ہے تو شعر خلافِ واقعہ ہے۔ کسی کے آنسوؤں کے ضبط کرنے سے ستارے نہیں ڈوب سکتے۔ چاہے کوئی شخص گھنٹوں آنکھیں بند کیے اور دل مسوسے بیٹھا رہے۔ آسمان کے چمکنے

داسے اسی طرح جگمگایا کریں گے۔ اسکے لکھنے کی ضرورت ہی نہیں کہ شعر خلاف واقعہ نہ ہونا چاہیے۔ ہمیں تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ عزیز صاحب لفظی مناسبت کی زنجیر میں پھنس کر ایسے پابند ہوگئے کہ معنویت کو کھو بیٹھے۔ کیا اسکے علاوہ کوئی اور بھی وجہ ہوسکتی ہے کہ صرف ستاروں اور اشک کے قطروں کی مشابہت نے شعر کو مہمل کردیا ہے۔

غبار اُٹھتا ہے بھر دیتے ہیں جوش بندگی اتنا — زمیں گردوں کو ٹھکراتی ہے جب ہم سر جھکاتے ہیں

ہم عزیز صاحب کے طرز عبودیت اور شان بندگی کے معترف ہیں لیکن ہمیں یہ بھی دیکھنا ہے کہ شعر کس طرح نظم کیا گیا ہے۔ دوسرے مصرعہ کے ثبوت میں پہلا مصرعہ یوں ہے کہ "ہم جوش بندگی اتنا بھر دیتے ہیں کہ غبار اٹھ آتا ہے" قلم بجائے "غبار اُٹھتا ہے" کے "غبار اُٹھنے لگتا ہے" لکھنے جا رہا تھا لیکن ہمیں محض مصرعہ کی نثر کرنی منظور تھی اس لیے قلم کو روک لیا (کیا میرا قلم غلط لکھنے جا رہا تھا؟) ہم اس موقع سے نہایت ادب کے ساتھ گریز کریں گے اور اپنی کم مائگی کا اعتراف کر جائیں گے لیکن اب دیکھنا یہ ہے کہ آیا "جوش بندگی" عزیز صاحب کس برتن یا کس شے میں بھر دیتے ہیں۔ کیا کسی ایسی چیز کا حوالہ عزیز صاحب نے دیا ہے؟ اور کیا بغیر ایسے حوالہ کے شعر نامکمل نہیں؟ اگر ہمیں یہ معلوم ہو جاتا کہ آپ کس چیز میں جوش بندگی بھر دیتے ہیں تو ہم آگے چل کر پتہ لگاتے کہ آیا اس عمل سے غبار اٹھ سکتا ہے یا نہیں۔ اور پھر اتنا غبار کہ آسمان کو ٹھکرا دے۔ گو ہم کم بضاعتی کی وجہ سے جواہرات عزیز پرکھنے سے قاصر ہیں تاہم ہمیں کوشش بلیغ سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ آپ زمین میں جوش بندگی بھر دیتے ہیں۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ آپ یا کوئی ایسا کر بھی سکتا ہے کہ زمین ایسی ایک چیز میں جوش بھر دے۔ اور اگر یہ مان لیا جائے کہ مجازاً ایسا لکھا گیا ہے تو پھر یہ ثابت کرنا محال ہے کہ کسی کے سر جھکانے سے (جو عزیز صاحب کے خیال کے مطابق جوش بندگی بھرنے کا ذریعہ ہے) اس قدر غبار کبھی اُٹھا بھی ہے یا اٹھ بھی سکتا ہے؟ اس قدر کیا معنی کسی قدر بھی اٹھ سکتا ہے؟ آپ کا سجدہ نہ ہوا ٹھوکر ہوگئی۔ اور پھر سجدہ کہاں محض سر کو جھکاتے ہی تو ہیں۔ عزیز صاحب کا یہ بھی خیال معلوم ہوتا ہے کہ اس طرح غبار کا ایک ستون جو زمین سے آسمان تک اٹھا ہوا ہوگا وہی زمین کا پاؤں ہوگا۔ کیا ان تمام باتوں کا خیال شعر کو مضحکہ آمیز نہیں بنا دیتا اور کیا یہ شعر مہمل (؟) اور خلاف شان لسان الہند نہیں ہوتا ہم ہم اس سے منکر نہیں ہوسکتے کہ عزیز صاحب نے اس شعر میں جوش کا دریا بہانے کی بے انتہا کوشش کی ہے۔

گور غریباں تجھ پہ کس نے قدم رکھا نشاں تربت کے سطح خاک سے کیوں اُبھر آتے ہیں

عزیز صاحب کے طرز شاعری کا ایک نہایت مکمل نمونہ ہے۔ ہم اسکی داد دینے سے قاصر ہیں
زیز صاحب نے اسی مضمون کو کئی جگہ پر نظم کیا ہے اور ہر جگہ اسی قدر کامیابی سے جس قدر موصوف
سے امید کی جا سکتی ہے

ری ہستی ذرا دکھلا اُنھیں آئین خودداری مجھے بھی دیکھنا ہے تجھکو وہ کیونکر مٹاتے ہیں

عزیز صاحب نے یہ شعر بہت ہی جھنجلا کے کہا ہے۔ ہمیں اُنکے عارضی خیال پر اعتراض کی ضرورت
ہیں لیکن ایک معشوق کی ہمہ گیر شاہنشاہی کی خدمت میں ایسے خیالات گستاخانہ اور بافیانہ ہیں۔
ودداری کا صرف نہایت موزوں ہے۔

سمجھتا ہے دلِ بیتاب یہ بجلی چمکتی ہے وہ رہ رہ کر حریم ناز کا پردہ اُٹھاتے ہیں

(قربان اس نادانی کے) درست ہے کہ معشوق کی شوخیوں سے یہ بالکل بعید نہیں کہ وہ
رہ رہ کر حریم ناز کا پردہ اُٹھائے اور نہ دل عاشق سے یہ بعید ہے کہ وہ بجلی چمکتی ہوئی دیکھے۔
مگر دل کے ساتھ بیتاب کی لفظ بیکار استعمال کی گئی ہے۔ یہ بیتابی کی وجہ سے نہیں ہے کہ دل
بجلی کی چمک دیکھتا ہے یہ خود کرشمۂ حسن ہے اور اگر ایسا نہ بھی ہو تب بھی دل سمجھنے میں دھوکا
کھا سکتا ہے لیکن بیتابی کو اس سے کوئی تعلق نہیں۔ یہ لفظ غالباً محض بجلی کی مناسبت کی وجہ سے
ٹھونس دی گئی ہے۔ یہ امر بھی قابل توجہ ہے کہ "یہ" کی لفظ کس قدر بُری جگہ پر رکھی گئی ہے اسے
"سمجھتا ہے" کے ساتھ ہونا چاہیے یعنی "دل بیتاب یہ سمجھتا ہے" یہ ضرور ہے کہ اس قدر شاعری میں جائز
ہے مگر یہاں خاص موقع ہے "یہ" کے بعد ہی "بجلی" کی لفظ موجود ہے اور خیال ہوتا ہے کہ اشارہ بجلی کی
طرف ہے۔ اور اگر "یہ" "بجلی" ہی کے پیشتر ہونا چاہیے اور یوں ہی عمداً نظم کیا گیا ہے تو عزیز صاحب
کے سے بلند پایہ اور مسلم الثبوت اُستاد کی شان سے کس قدر گرا ہوا ہے۔ کوئی نومشق لکھتا تو دوسری
بات تھی۔

پریشاں دل کے ذرے ہیں ذرا انکو بہم کر لیں دیارِ عشق تجھ میں ہم بھی اک کعبہ بناتے ہیں

خوب شعر ہے۔ مگر دوسرے مصرعہ میں "تو" یا "تو پھر" یا کسی ایسی ہی یا بہتر لفظ کی نہایت
ضرورت ہے شعر کے حسن میں داغ لگ رہا ہے۔

دلِ ویراں کو دیکھو آسمان حسن کے تارو — بتاؤ کس طرح اُجڑی ہوئی بستی بساتے ہیں

خوب نظم کیا ہے مگر معشوق سے تخاطب کے لیے جو الفاظ چنے گئے ہیں وہ کچھ ناموزوں سے ہیں اس طرز تخاطب کی اور تو کوئی وجہ نہیں معلوم ہوتی بجز اسکے کہ سارے آسمان پر ایک بستی بسائے ہوئے ہیں اور ایک خانماں برباد آبادی کو دیکھ کر اُسی سے طریقۂ آبادی دریافت کر رہا ہے۔ اب رہا یہ کہ "آسمان حُسن کے تارو" جسکے معنی سوائے "حسینوں" کے اور کچھ نہیں ہو سکتے ذرا نازک سا ہے اور قبولیت قدرے مشکل امر ہے۔ حسینوں کے پکارنے میں جو علت مخفی ہو سکتی ہے وہ محض یہ کہ اُنھیں کی برباد کی ہوئی بستی اُنھیں کے آباد اپنے سے بس سکتی ہے۔ اگر اسی لیے حسینوں کو پکارا جا رہا ہے تو وہ الفاظ بیکار ہیں۔ غالباً عزیز صاحب نے اس طرف عجلت میں خیال نہیں فرمایا ورنہ قلم کی معمولی رفتار میں قبولیت کی راہ کا یہ روڑا دور ہو جاتا۔

تمھاری حسرتِ تعمیر پرائے خاک کے پتلو — شکستہ مرقد اب تک مقبروں میں مسکراتے ہیں

نہایت ہی عمدہ اور لاجواب شعر ہے اور واقعی تعریف سے مستغنی ہے۔ ہمیں اسی آئینہ کی جھلک ایک مرتبہ اور عزیز صاحب کے قابل ناز اُستاد یعنی مولانا تعشق کے ایک شعر میں مل چکی ہے جسے ہم انصاف کے خون میں ہاتھ بھرنے سے احتراز کرتے ہوئے آپ کے تفنن طبع کے لیے ضرور لکھیں گے

مٹی ٹوٹی ہوئی ہر قبر یہ ہنس ہنس کے کہتی ہے — کہ رہنا ہے قیامت تک اسی اُجڑے ہوئے گھر میں

عزیز صاحب نے مقطع خوب ارشاد فرمایا ہے اور عزیز محترم اور پھر مابعد واقعات کے تذکرہ میں جو پہلو مد نظر رکھا ہے وہ قابل ستائش ہے۔ ملاحظہ ہو

عزیز محترم کو اُنکی محفل خوب راس آئی — نکالے جاتے ہیں روز اور وہیں پھر پائے جاتے ہیں

ازہر ۔ از لکھنؤ

(بقیہ صفحہ ۶۸)

دیوان غالب کی شرح پر جو مضمون مکرمی مولوی محمد احمد بیخود موہانی بی اے کا اس دفعہ شایع کیا جارہا ہے کئی سال ہوئے کسی اخبار میں چھپ چکا ہے اور اب بعض ترمیمات اور اضافوں کے ساتھ الناظر میں شایع کرنے کی غایت یہ ہے کہ اسکے بعد بیخود صاحب کی بسیط شرح کے بعض اجزا نذر ناظرین کیے جائینگے۔ جو اس تمہید کے مطالعہ کے بعد امید ہے کہ زیادہ دلچسپی کا موجب ہوں گے

۴۔ اپریل سنہ ۱۹۲۵ء

نظرے خوش گذرے

یہ پرچہ قدرے تاخیر سے شایع کیا جارہا ہے۔ سبب یہ ہوا کہ انعامی مضامین کا پلندہ بدایوں میں کئی ہفتے رکا رہا۔ اور ۱۲۔ مارچ کو کل ارکان مجلس انتخاب کی رائیں وصول ہونے کے بعد آخری فیصلہ ہو سکا۔

انعام کے مستحق مولوی سعید انصاری قرار پائے ہیں۔ اسی نام کے ایک سابق رفیق دار المصنفین چونکہ شہرت پا چکے ہیں، اسلیے مغالطہ سے بچانے کے لیے یہ ظاہر کر دینا ضروری معلوم ہوتا ہے کہ یہ نوجوان ادیب جامعہ ملیہ اسلامیہ علیگڈھ کے طالب علم ہیں۔ عزیز موصوف اس کامیابی پر دلی مبارکباد قبول کریں۔ یہ مضمون کافی طولانی ہے اور ایک ہی دفعہ میں شایع کرنے کے خیال سے مطے کر دیا گیا کہ اپریل اور مئی کا مشترکہ پرچہ نکالا جائے۔ لہذا ناظرین کرام اپریل کے پرچہ کا انتظار نہ فرمائیں۔ اس مضمون کی اشاعت کے بعد مولوی سید حبیب اشرف ندوی اور مولوی محمد یحییٰ تنہا (غازی آباد) کے مضامین بھی الناظر میں درج کیے جائیں گے کہ بعض ارکان مجلس کی رائے میں یہ بھی لایق انعام تھے۔ بقیہ مضامین صرف مجموعہ کے ساتھ شایع ہو سکیں گے۔ مضامین کے متعلق رایوں کا خلاصہ بھی آیندہ درج کیا جائیگا۔

مولوی سعید انصاری کا مضمون کتابی صورت میں چھاپا جائے گا۔ اور تیار ہونے کے بعد رقم انعام کے ساتھ اُسکے پچاس نسخے پرنسپل صاحب جامعہ ملیہ اسلامیہ کی معرفت، اُنکی خدمت میں پہنچیں گے۔

حیدرآباد سے ایک صاحب نے جناب جوش ملیح آبادی کی تائید میں ایک تحریر بھیجی تھی۔ ندوۃ العلما کے سالانہ اجلاس اور انجمن اُردو کے ادبی جلسہ و نمایش کی مصروفیتوں میں یہ تحریر کہیں نظر سے پوشیدہ ہوگئی ہے۔ انشاءاللہ آیندہ نمبر میں تلاش کرکے شایع کی جائے گی۔

مسلسل مصروفیتوں ہی کی بنا پر ماہ جنوری وقصد مصمم کے اس دفعہ بھی روداد سفر نہ مرتب ہو سکی۔ خدا کرے آیندہ اسکی بھی تلافی ہو جائے۔

انجمن اُردو کا سالانہ جلسہ ۱۲ مارچ کو ہوا۔ دستور العمل میں ضروری ترمیم کے بعد حسب ذیل انتخابات عمل میں آئے۔

صدر ۔ مولوی عبدالماجد بی اے مصنف فلسفۂ جذبات
نائبان صدر ۔ شمس العلما مولوی کمال الدین احمد ایم اے پرنسپل چاٹگام کالج ۔ سید جالب دہلوی ایڈیٹر ہمدم و نواب سید ذکی علی خاں ہاتف لکھنوی
معتمد ۔ مرزا محمد عسکری بی اے پنشنر مترجم حکومت ہند
شرکاء معتمد ۔ سید مسعود الحسن رضوی ایم اے ایل ٹی لکچرر اردو لکھنؤ یونیورسٹی ۔ منشی احترام علی رئیس کاکوری
ارکان مجلس انتظامی ۔ ڈاکٹر بدل الرحمن ایم اے پروفیسر عربی و فارسی لکھنؤ یونیورسٹی ۔ مولوی عبدالقوی فانی ایم اے لکچرر فارسی لکھنؤ یونیورسٹی ۔ مرزا محمد ہادی عزیز لکھنوی ۔ منشی دھنپت رائے المعروف بہ پریم چند ۔ سید مقبول حسین ظریف لکھنوی ۔ خان بہادر میر سید حسین پنشنر ڈپٹی کلکٹر لکھنؤ ۔ حکیم عبدالحمید سکرٹری تکمیل الطب کالج لکھنؤ ۔ مسٹر معین الدین بی اے بیرسٹر ایٹ لا لکھنؤ ۔ ابوالکمال اسید امیٹھوی ایڈیٹر ڈسٹرکٹ گزٹ گونڈہ ۔ شیخ ممتاز حسین جونپوری منصرم عدالت ججی لکھنؤ ۔ ظفر الملک انتخابات کے بعد بعض تجاویز پیش ہو کر منظور ہوئیں جن میں سب سے اہم یہ ہے کہ سال رواں میں انجمن اردو کے لیے پانچ ہزار روپیہ فراہم کیا جائے ۔

۲۱ ۔ مارچ کو عبدالماجد صاحب کی صدارتی تقریر کے بعد جناب نواب صدر یار جنگ مولوی حبیب الرحمان خاں شروانی رئیس علیگڈھ نے ادبی جلسہ کا افتتاح ایک نہایت ہی دلنشیں اور پر مغز تقریر سے کیا جس کے آخر میں کارکنان انجمن کو بعض مفید مشورے دیے ۔ شروانی صاحب کے بعد حضرت عزیز لکھنوی نے چند اشعار جو اسی موقع کے لیے لکھے تھے پڑھے مولوی نور الحسن نیر مصنف نور اللغات نے اس بحث پر کہ "اردو نے دوسری زبانوں پر کیا تصرفات کیے" ایک بسیط مضمون کے کچھ اجزا سنائے اور ایڈیٹر الناظر نے مختصراً انجمن اردو کے مقاصد بیان کیے ۔

۲۲ ۔ مارچ کو معتمد انجمن نے ایک تقریر کے دوران میں رائے جیشور بلی بی اے تعلقدار دریاباد و وزیر تعلیم صوبہ متحدہ سے افتتاح نمائش کی درخواست کی ۔ رائے صاحب نے ایک مختصر تقریر کے بعد جملہ معزز حاضرین کے ساتھ امیر الدولہ لائبریری کی سب سے اوپر والی منزل پر جا کر نمائش کا افتتاح فرمایا ۔ تھوڑی دیر کے بعد رائے صاحب تشریف لے گئے اور یہاں جناب مولانا محمد عبدالحلیم شرر ایڈیٹر دلگداز کی صدارت میں ادبی جلسہ پھر منعقد ہوا ۔ شرر صاحب کے خطبہ صدارت کے بعد جناب عیش لکھنوی نے ایک نظم پڑھی جس میں اردو زبان کی تاریخ بیان کی گئی اور قدیم اردو شاعروں کا کلام نمونۃً شامل کر لیا گیا تھا ۔ پھر سید مسعود حسن رضوی نے اپنے طولانی مضمون کے کچھ اجزا پڑھ کر سنائے جس میں ان اعتراضات کا جواب دیا گیا تھا جو اردو شاعری پر انگریزی تعلیمیافتہ عام طور پر کرتے ہیں ۔ یہ مضمون بہت پسند کیا گیا ۔ اس کے بعد چند تجاویز پیش ہو کر منظور ہوئیں جن میں لکھنؤ یونیورسٹی اور صوبجات متحدہ کی گورنمنٹ ٹکسٹ بک کمیٹی کو اردو کی ترقی میں حصہ لینے کی دعوت دی گئی تھی ۔

نمائش ۲۱ سے ۲۴ مارچ تک صبح سے ۹ بجے شام تک کھلی رہی تا کہ شائقین کو باطمینان دیکھنے کا موقع رہے ۔ آ دن شام کا وقت خواتین کے لیے مخصوص کر دیا گیا تھا ۔

(بقیہ بر صفحہ ۶۶)

کھانے سے فراغت کے بعد تیسرے پہر کو مہاتما پاوا سے روانہ ہوئے۔ تھوڑی ہی دور گئے تھے کہ پیچش کی تکلیف شروع ہوئی۔ آنندا سے پانی مانگا اور کورکستا ندی میں آخری غسل کیا۔ جب مرض کو طول ہوا اور تکلیف ناقابل برداشت ہو گئی تو آپ نے چند ٹھٹھیرے کا شکریہ ادا کیا اور مُریدوں سے ارشاد کیا کہ ایک بار سجاتا کی ضیافت قبول ہوئی تھی جس کی برکت سے مجھکو نورِ عرفان نصیب ہوا اب چند کی دعوت پسند آئی جو دُنیا سے نجات دلا دیگی!!

اگر یہ صحیح ہے کہ "پاوا" زمانۂ حال کا "پاواپوری" تھا تو کم سے کم دس روز میں یہ جماعت گسیا پہونچی ہوگی۔ کیونکہ پیچش کی تکلیف میں دس بارہ میل بھی روزانہ چلنا مشکل تھا۔ گمان ہوتا ہے کہ یہ پاوا کوئی دوسری بستی تھی جو گسیا سے تھوڑی ہی دور واقع تھی ورنہ جاں نثار مرید اپنے مریض اُستاد کو اس قدر طویل سفر جاری رکھنے نہ دیتے اور راستہ ہی میں کسی جگہ طبیعت کی یکسوئی تک قیام کرتے۔

بہرصورت جب مہاتما کوسی نگلا کے قریب پہونچے تو ضعف کی شدت سے قدم اُٹھانا محال ہو گیا تھا۔ ہرن وتی ندی کے کنارے ایک درخت کے کنارے ایک سال کے درخت کے نیچے دکھن کی طرف منہ کرکے لیٹے دیر تک آنندا سے باتیں کہتے اور "سنگھ" کے برقرار رکھنے کے لیے ہدایتیں فرماتے رہے۔ کوسی نگلے کے رئیس مہاتما کی آمد سنکر سال کے باغ میں آئے اور اپنے بیوی بچوں کو عیادت اور تیمارداری کے لیے ساتھ لائے۔ آنندا نے ہر ایک ٹولی الگ الگ کردی اور مہاتما سے سب کا تعارف کرایا۔ مہاتما نے اُنکو نصیحتیں کیں اور خاموش ہوگئے۔

شام ہوئی تو آنندا رونے لگا۔ مہاتما نے آنکھ کھول دی۔ عزیز چیلے کو تسلی دی اور اُسکو بھی جلد "نِروان" حاصل ہونے کا مژدہ سنایا۔ سب مُریدوں کو آنندا کی خاطر داری کی ہدایت کی۔ اسکے بعد ہلکی غشی پیدا ہوگئی۔

آدھی رات کو سوبھدرا نام ایک برہمن کوسی نگلا کا رہنے والا مہاتما کی خدمت میں چند دشوار مسائل حل کرنے کو آیا۔ تیماردار حاضری میں مزاحم ہوئے مگر مہاتما نے اُسکو اصرار سے اپنے پاس بلوایا اور اُسکی تشفی کردی۔ سوبھدرا ایمان لایا اور "سنگھ" میں داخلہ کی اجازت چاہی۔ عام طور پر بغیر چار مہینے کے امتحان ریاضت کے کوئی مُرید "سنگھ" میں شامل نہیں کیا جاتا تھا مگر مہاتما نے سکے

علم سے سوبھدرا فوراً "سنگ" کا ممبر بنایا گیا۔

اسکے بعد مہاتما نے سب مریدوں کو وصیت کی کہ "میرا انتقال ہو جائے اور میں تمھاری نظر کے سامنے نہ رہوں تو یہ نہ سمجھنا کہ بودھ تمھارے ساتھ نہیں ہے۔ تمھاری ہدایت کے لیے میرا قانون موجود ہے اور اُس سے ہر مشکل حل ہو سکتی ہے" پھر انندا کی طرف مخاطب ہوئے اور فرمایا کہ "جو زندگی بخشتا ہے وہی بیماری اور موت کا بھی باعث ہے۔ اس تعلیم کو کبھی فراموش نہ کرنا۔ اپنے دل کو حق سے بھرو اور جو تم کو بتایا گیا ہے دوسروں کو سکھاؤ"۔

یہی آخری الفاظ تھے جو زبان مبارک پر جاری ہوئے۔ اسکے بعد گہری بیہوشی طاری ہوئی اور طائر روح قفس عنصری سے پرواز کر گیا۔

اب مریدین کی جماعت میں بحث شروع ہوئی کہ مہاتما کی تجہیز و تکفین کس طرح کی جائے۔ آخر کار نعش کو نقارے بجاتے ہوئے کسیا کے پورب طرف مکتا بندھن کے مندر میں لیگئے۔ اور چکرورتی راجاؤں کی لاش جس ساز و سامان سے پھونکی جاتی ہے اُسی طرح ملّا قوم کے رئیسوں نے گوتم کی کریا کی۔ چتا کی آگ کیوڑے اور گلاب سے بجھائی گئی اور ہڈیاں جمع کر کے کسیا کے ٹاؤن ہال تک پہونچائی گئیں جہاں برچھیوں کی جالی اور کمانوں کے حصارے انکو محفوظ کیا گیا۔ بہت سے چھتری راجاؤں نے اس مقدس یادگار میں حصہ مانگا لیکن وہ متبرک ہڈیاں صرف راجگان پاوا اور کوسی نگلا کو تقسیم کی گئیں جنھوں نے عالیشان گنبد اپنے حصہ رسدی پر تعمیر کیے۔ انھیں میں کا ایک گنبد حال میں کسیا کے قریب پایا گیا اور سنگین کتبہ بھی دستیاب ہوا جس نے ثابت کر دیا کہ کسیا ہی زمانۂ قدیم کا کوسی نگلا ہے۔ مگر پاوا کے متعلق ہنوز تحقیقات غیر مکمل ہے۔

برسات کا موسم آیا تو حسب دستور سابق گوتم کے سب چیلے راجگڈھ میں جمع ہوے اور راجہ مگدھ (اجاٹا سترو) کی سرپرستی میں بودھ مذہب کی پہلی کاونسل منعقد ہوئی اور کشپ اُس کا صدر انجمن ہوا۔ اُسوقت تک کوئی بدعت شروع نہ ہوئی تھی۔ لہذا کاونسل میں کوئی جدید مسائل طے نہیں ہوے۔ قانون شریعت پڑھا گیا اور حاضرین مجلس نے اُس پر عمل کرنے کا عہد کیا۔

سو برس کے بعد ویشالی کے راجہ دھرم اشوک نے دوسری کونسل طلب کی اور فرعی مسائل میں جو اختلافات پیدا ہوگئے تھے اُنکو کثرت رائے سے طے کرایا۔

تیسری کاونسل گوتم سے ڈھائی سو برس بعد مہاراجہ اشوک نے بمقام پٹنہ منعقد کی اور اسی مجلس نے "ترپی پاٹکا" مرتب کی جس میں گوتم بودھ کی سوانحمری اور اُنکے اقوال و اعمال اور احکام درج تھے یہ کتابیں تھوڑے ہی عرصہ کے بعد راجہ اشوک کے لڑکے یا بھائی مہندر نے جنوبی ممالک میں پہونچائیں جہاں انکی بیحد تعظیم و تکریم کی گئی اور آج تک لنکا، سیام، اور برما وغیرہ میں یہی مجموعۂ احکام مستند مانا جاتا ہے۔

"ترپی پاٹکا" کے مطابق مہاتما کا سنہ وفات ۲۱۸ برس قبل تخت نشینی اشوک کے تھا یعنے ۲۸۲ سنہ قبل مسیح۔ اور یہی صحیح ہے۔

چوتھی کاونسل پہلی صدی عیسوی میں راجہ کنشک نے جلھندر کے مقام پر منعقد کی اور وہاں جو اصول مذہب قرار پائے وہ کشمیر، تبت اور چین پہونچے لیکن یہ احکام اور قوانین تیسری کاونسل کے نتائج سے اس قدر مختلف تھے کہ جنوبی ممالک کا قانون ہنایانا یا "چھوٹی گاڑی" مشہور ہوا اور شمالی ممالک کا مجموعہ مہایانا یا "بڑی گاڑی" کے خطاب سے سرافراز ہوا۔ "چھوٹی گاڑی" صرف اُن نفوس کو نجات کی منزل تک پہونچا سکتی تھی جو نیک اعمال کریں اور شریعت کے مطابق خواہش نفسانی پر فتح حاصل کریں لیکن "بڑی گاڑی" ہر ایک شخص کو جو بودھ مذہب میں داخل ہو منزل مقصود تک پہونچانے کی ذمہ دار تھی!!

آج یورپ کا آفتاب اقبال نقطۂ نصف النہار پر ہے۔ تمام دنیا کو شائستگی و تہذیب کا سبق پڑھانے کا اُس نے بیڑا اُٹھایا ہے اور ربع مسکوں کے رسوم و اخلاق میں اصلاح کرنے کا بارگراں سفید آدمی کی نازک پشت پر بتایا جاتا ہے۔ وہ صرف علم و دولت ہی میں تمام عالم سے افضل نہیں ہے بلکہ فتحمندی کے نشہ میں اپنی معاشرت اور اپنے مذہب کو بھی ساری متمدن دُنیا کے لیے سزاوار تقلید اور قابل تسلیم ظاہر کرتا ہے۔ ۴۵ کروڑ بندگان خدا مذہب بودھ کے چشمۂ فیض سے تسلی پاتے ہیں لیکن یورپ کو اس اظہار خیال میں کچھ تامل نہیں کہ گوتم کا اول تو وجود ہی مشتبہ ہے اور اگر اس نام کا کوئی انسان دنیا میں تھا بھی تو وہ مفتری اور کذاب ہوگا۔ جھوٹا آدمی ایک دیوار بھی سیدھی نہیں بنا سکتا۔ بودھ مذہب کا قلعہ ڈھائی ہزار برس تک کیونکر قائم رہتا اگر اسکی

مکارِ حق پرست نہ ہوتا اور اسکی تمیز میں راستبازی کا سالہ نہ صرف کیا جاتا۔

گوتم بودھ نے جو تعلیم اپنی قوم کو دی اُسکے دو حصے ہیں اور تمام شائستہ مذاہب کی بنیاد انھیں دونوں پر ہوتی ہے یعنی اصلاح اخلاق اور علم الٰہیات یا بالفاظ دیگر اعمال اور عقائد۔ مابہ الامتیاز یہ ہے کہ کوئی شریعت عقائد کو مقدم کرتی ہے اور کوئی اعمال کو۔ بعض ملتیں عقیدتمندی نجات کے لیے کافی سمجھتی ہیں اور بیشتر مذاہب عمل صالح کے بغیر نجات ابدی محال تصور فرماتے ہیں لیکن گوتم نے اصلاح اخلاق کو اس قدر ضروری سمجھا کہ عقائد کو پس پشت ڈال دیا اور ہر طالب نجات کے لیے پہلی شرط یہ قرار دی کہ دنیا اُسکے ہاتھ اور زبان سے بے خوف رہے۔ اُسکی تعلیم کا بیشتر حصہ فلسفۂ اخلاق کی تشریح ہے اور ڈھائی ہزار برس پہلے جو قانون اُس نے مرتب کیا تھا ترقی یافتہ دُنیا اسوقت تک اُس میں کوئی قیمتی اضافہ نہ کرسکی۔

شریعت گوتم کے "دس احکام" یہ ہیں:- (۱) کسی ذی روح کی جان نہ لو (۲) چوری نہ کرو (۳) زنا نہ کرو (۴) جھوٹ نہ بولو (۵) کسی کو بُرا نہ کہو (۶) قسم نہ کھاؤ (۷) فضول گفتگو نہ کرو۔ (۸) کسی پر غصہ نہ کرو (۹) کوئی نشہ کی چیز استعمال نہ کرو۔ (۱۰) غلط عقائد کے پاس نہ جاؤ یعنے بھوت پریت، دیوی دیوتا کو نہ مانو۔

وہ پانچ پیشوں کو منع کرتا ہے:- (۱) ہتھیار بیچنا (۲) لونڈی غلام بیچنا (۳) گوشت بیچنا۔ (۴) شراب بنانا یا بیچنا (۵) زہر بیچنا۔

گوتم کی اخلاقی تعلیم کا خلاصہ یہ ہے:- (۱) دانشمندوں کی خدمت کرو اور نادانوں کی صحبت سے بچو۔ اُسکی عزت کرو جو عزت کا مستحق ہو۔ (۲) علم حاصل کرو اور عقل کی روشنی بڑھاؤ (۳) والدین کی اطاعت کرو۔ اہل وعیال کی خبرگیری کرو اور ایسا پیشہ اختیار کرو جس سے کسی کو دُکھ نہ ہو۔ (۴) خیرات کرو۔ ایمانداری سے رہو اور عزیزوں رشتہ داروں کی مدد کرو۔ (۵) گناہ سے بچو۔ شراب کے پاس نہ جاؤ۔ اور نیک کاموں سے کبھی نہ تھکو۔ (۶) عاجزی اور فروتنی اختیار کرو۔ قناعت اور شکرگزاری اپنا شیوہ بناؤ۔ (۷) مصیبت برداشت کرنے کی عادت ڈالو (۸) اپنی عصمت کی حفاظت جان سے زیادہ کرو (۹) دل پر اتنا قابو حاصل کرو کہ کسی غم و غصہ کا اُس پر اثر نہ ہو (۱۰) "نروان" حاصل ہونے سے ناامید نہ ہو اور یقین رکھو کہ

اصلاح اخلاق سے یہ مرتبہ خود بخود مل جائے گا (۱۱) نفس کو زیر کرو اور تمام عالم سے محبت رکھو
آج مسیحی دُنیا حیرت کرتی ہے کہ فلسفۂ اخلاق کے یہ زریں اصول جو اُسکے خیال کے مطابق پہلی بار
کوہ سینا پر بیان کیے گئے تھے اور جن پر عہدنامۂ عتیق کو ناز ہے یا جو اول مرتبہ یروشلم کے ایک ٹیلہ
پر ظاہر کیے گئے تھے اور جو عہدنامۂ جدید کا طرۂ امتیاز ہیں۔ تاریکی اور جہالت کے عہد میں ہندوستان
کا ایک جوگی کیونکر دریافت کر سکا ؟ مگر وہ بھولتی ہے کہ موسیٰ اور عیسیٰؑ کا خداوند رب العالمین تھا
اُس نے مصر و شام کو اپنے مقرب بندوں کے قدوم سے سرفراز لیا تو کیا اہل ہند سے اُسکو تعلق نہ تھا
اور اُنکی رہنمائی کے لیے کسی رسول کی ضرورت نہ تھی ؟ جس دانشمند ازل نے پانچسو برس کے بعد
حضرت عیسیٰ کی زبان مبارک سے بیت المقدس میں رحم اور محبت کا وعظ کہلایا وہ ہندوستان کے
گوتم کو بھی اپنا مقرب بنا سکتا تھا اور اُسکی زبان سے بھی کلمۃ الحق کا اظہار ہو سکتا تھا !! اگر یہ تسلیم
کر لیا جائے کہ انبیائے بنی اسرائیل کی طرح راجہ رامچندر، سری کرشن، پہلاد اور گوتم وغیرہم بھی
نبی مرسل تھے تو یہ معما فوراً حل ہو جاتا ہے۔
گوتم خود کہتا ہے کہ یہ اصول اُسکے ایجاد کیے ہوئے نہیں ہیں بلکہ " دنیا میں تھوڑی تھوڑی
مدت کے بعد راہ حق کی ہدایت کے لیے "بودھ" پیدا ہوتے رہتے ہیں، اور سب یکساں تعلیم دیتے ہیں
لیکن دنیا کچھ عرصہ کے بعد اُنکی نصیحتوں کو بھول جاتی ہے اور اُسوقت ایک نیا "بودھ" وجود میں
آتا ہے جو دھرم کو از سر نو زندہ کرتا ہے۔ مجھ سے پہلے ۲۴ بودھ دنیا میں رہنمائی کے لیے تشریف
لا چکے ہیں اور میرا نمبر پچیسواں ہے۔ میرے بعد ایک بودھ آئے گا جس کا نام میتریا بودھ یا رحم کا
پیغمبر ہوگا !" گوتم کے معتقد یقین رکھتے ہیں کہ وہ رحم کا پیامبر رسان ابھی تک ظاہر نہیں ہوا عیسائی
کہہ سکتے ہیں کہ گوتم نے حضرت مسیح کی آمد کی خبر سُنائی تھی اور مسلمان دعوی کر سکتے ہیں کہ "بودھ" سے
مراد وہ نبی ہے جسکی شریعت کسی ملک یا قوم سے مخصوص نہ ہو اور "میتریا بودھ" سے اشارہ اُس برگزیدہ
ذات کی طرف ہے جسکو ارحم الراحمین کی سرکار سے "رحمۃ للعالمین" کا لقب ملا۔ والغیب عند اللہ !!
علم الٰہیات پر گوتم نے زیادہ توجہ مبذول نہیں کی۔ وہ خلقت عالم و آدم کے اسباب پر
گفتگو نہیں کرتا۔ اُسکی تعلیم مادی دنیا کو موجود اور بنی آدم کو زندہ و قائم دیکھ کر شروع ہوتی ہے۔
چوبیس کروڑ دیوتا ہندوستان میں خدائی کے دعوے دار بنائے جاتے ہیں اور وہ اُن سب کی عظمت

سے یکسر انکار کرتا ہے۔ مسئلہ تناسخ کو اپنے اصول ذہن نشین کرانے کے لیے دلائل کی پہلی سیڑھی بناتا ہے لیکن آگے چل کر روح کی فنا اور بقا میں شک ظاہر کرتا ہے اور جب روح فنا ہو گئی تو تناسخ کہاں رہا؟ وہ جزا و سزا کا قائل ہے اس لیے تطبیق کرتا ہے کہ روح کے فنا ہونے کے بعد اعمال باقی رہتے ہیں اور وہی اعمال نیک یا بد صورت اختیار کرکے دنیا میں واپس آتے ہیں۔ وہ بہشت اور دوزخ کو مانتا ہے لیکن جہنم کے خوف سے اعمال بد کو ترک کرنے اور فردوس کی طمع میں نیک افعال کرنے کی رغبت نہیں دلاتا۔ اُسکی تعلیم میں ابدی عذاب کسی انسان کے لیے نہیں ہے۔ بدترین مخلوق کے لیے بھی سزا کی ایک حد ہے اور جب اُسکے گناہوں کا کفارہ ہو جائے گا تو اُسکو بھی نجات حاصل ہوگی۔ کیونکہ خالق کی محبت و شفقت ہرگز گوارا نہیں کر سکتی کہ اُسکی مخلوق دائمی مصیبت میں رہے۔ دیودت گوتم کے وقت میں ایک مدعی حکمت و ریاست تھا۔ اُس نے گوتم کو قتل کرنے کی کوشش کی۔ لیکن اُسکی بابت بھی ارشاد ہے کہ دیودت بہت بُرا ہے۔ مگر ایک ساعت رحم کی آئیگی اور اُسوقت اسکو بھی نجات مل جائیگی۔"

گوتم کہتا ہے کہ دنیا یہی ایک نہیں ہے جس میں ہم بستے ہیں بلکہ اسی صورت کے بہت سے عالم ہیں جنکی ہمکو خبر نہیں۔ ہر ایک دُنیا ایک مقررہ مدت کے بعد آگ، پانی یا ہوا سے تباہ ہو جاتی ہے مگر گناہ پھر نئی دنیا بسا دیتا ہے جسکی آبادی پہلی دُنیا کے برابر ہوتی ہے صرف وہ روحیں کم ہو جاتی ہیں جو "نزوان" حاصل کر چکی ہوں۔

وہ تلقین کرتا ہے کہ دنیا کی کوئی چیز دائمی نہیں ہے اور نہ کوئی شے اپنی قوت یا خاصیت سے وجود میں آتی ہے بلکہ موجود کی جاتی ہے۔ دوسری منزل میں وہ دنیا کا وجود ہی مشتبہ بتاتا ہے:۔

"ہم نہیں کہہ سکتے کہ دنیا کا وجود ہے اور نہ یہ کہہ سکتے ہیں کہ اُس کا وجود نہیں ہے۔ ایسا نہیں ہے لیکن اسکے خلاف بھی نہیں ہے۔ اس وجود نہیں ہے اور اس کا عدم وجود بھی نہیں ہے۔ یہ غلط نہیں ہے لیکن صحیح نہیں ہے۔ یہ صحیح نہیں ہے کہ ایسا ہے اور یہ صحیح نہیں ہے کہ ایسا نہیں ہے۔ لہذا نہ ہے نہ نہیں ہے!!!"

آخری منزل فلسفہ کی یہ ہو جاتی ہے کہ نہ انسان ہے نہ جانور نہ زندگی نہ موت نہ روح نہ جسم۔ نہ زماں نہ مکاں۔ نہ خلا نہ آبادی۔ نہ عقل نہ خیال بلکہ ان کا عدم ہی نہیں ہے اور عدم عدم کا عدم بھی نہیں ہے!! یہ فنا مطلق تھی جو گوتم تعلیم کرتا ہے اور حاصل اس فنا سے "نزوان" ہے جو "فنا" کی بھی فنا ہے!!!

گوتم یہ نہیں بتاتا کہ "فنا" کے بعد ذات باری کے ساتھ "بقا" ہوتی ہے۔ اگر ایسا ہوتا تو ویدانت اور

ماخوذ از تاریخ مذاہب مولفہ ارنسٹ ارنیان مطبوعہ لندن ۱۸۸۶ء صفحہ ۷۷، ۸۰، ۸۲، ۹۳ —

تصوف اُسکے ارشاد کو سرآنکھوں پر جگہ دیتے بلکہ اسکے فلسفہ میں اس سوال کا کچھ جواب ہی نہیں کہ "نروان" کے بعد روح اگر فنا نہ ہوئی تو کہاں رہتی ہے اور کیا ہو جاتی ہے؟ تصوف اور ویدانت کی تعلیم کا حاصل یہ ہے کہ "تو وہ ہے"۔ "تو" کی ضمیر انسان کی طرف اور "وہ" کی خالق کی طرف راجع ہے اور "ہے" ان دونوں کے ملانے کی وہ زنجیر ہے جسکی طرف ایک عارف نے اشارہ کیا ہے "گر حفظ مراتب نکنی زندیقی"۔

گوتم نے اپنی منطق سے "تو" کو فنا کر دیا "ہے" کا وجود مشتبہ بتایا اور "وہ" کی بابت اُسکی تعلیم ایسی مبہم ہے کہ اب تک سمجھی جا سکی ساکت ہے۔ یہ تو یقین نہیں آتا کہ گوتم کا سا دانشمند واجب الوجود سے منکر ہوگا لیکن اُسکے قانون میں کسی جگہ خدا کا نام جپنے کی ہدایت نہیں ہے۔ وہ اصلاح اخلاق کے لیے مراقبے تعلیم کرتا ہے جن میں سے پہلا مراقبہ قطع تعلقات کا، دوسرا طہارت کا، تیسرا مسرت کا، چوتھا رحم کا اور پانچواں محبت کا ہے۔ طالبوں کے اطمینان قلب کے لیے خانقاہیں قائم کرتا ہے اور اُسکے قواعد مقرر کرتا ہے لیکن خدا کو یاد کرنے کا اُسکے ٹائم ٹیبل میں کوئی وقت نہیں ہے۔

روسا اور دولتمند گوتم اور اُسکے ابتدائی چیلوں کی راستبازی، نکوکرداری دیکھکر بڑی بڑی جائدادیں خانقاہوں کے لیے وقف کرتے ہیں اور بےفکری کی طمع میں بہت سے بد وضع لوگ بھی سنگ میں شریک ہو جاتے ہیں۔ ذات کی قید اُٹھ جانے سے شودر اور چنڈال بھی جماعت خانوں میں آتے ہیں اور اپنی موروثی بُرائیاں ساتھ لاتے ہیں۔ رفتہ رفتہ یہ خانقاہیں اُن تمام ناپاک حرکات کا سرچشمہ بنجاتی ہیں جنکے دور کرنے کے لیے گوتم نے یہ سلسلہ قائم کیا تھا اور وہ تمام بدافعالیاں ان جماعت خانوں میں سرزد ہوتی ہیں جنھوں نے رومن کیتھولک فرقہ کے رہبانیت خانوں کو یورپ کے ازمنۂ متوسطہ میں بدنام کیا۔ یوں کہنا چاہیے کہ تاریخ تکرار کرتی ہے اور ہزار برس کے بعد یورپ میں پھر وہی تماشا ہوتا ہے جو سرزمین ہند پر پہلے کھیلا جا چکا تھا۔!!

جب کوئی معبود نہ تھا تو سفارش کے لیے کسی درمیانی فرقہ کی کیا احتیاج تھی؟ مگر چند روز کے بعد تبت اور چین میں باقاعدہ پادریوں کی جماعت تیار ہو جاتی ہے۔ گوتم کی مورت سے توجہ حاصل کرنے کی کوشش کرتے "بودھ" کو خدا بنا دیا جاتا ہے۔ خیرات، عصمت، نیکی اور عقل وغیرہ کے بُت بنائے جاتے ہیں اور اُنکے سامنے عقیدت مندوں کا سر نیاز خم ہوتا ہے۔ جنوب میں لنکا اور سیام وغیرہ کی حالت کسی قدر بہتر رہتی ہے مگر وہاں بھی پیپل کے درخت پر ہار پھول چڑھائے جاتے ہیں اور گوتم کو

کُل اختیارات خداوندی سپرد کر دیے جاتے ہیں۔ غرض وہ تمام عیوب باستثناء قربانی کے جنکی
کا گوتم نے بیڑا اُٹھایا تھا اُسی کے مذہب کا جزو بنجاتے ہیں اور اب برہمنوں کو گوتم اور اُسکے معتقدو
ذات کی قید توڑنے اور پنڈتوں کو مالی نقصان پہونچانے کا عوض لینے کا موقع ملتا ہے۔ انجام یہ کہ
میں جب چینی سیاح فاہیان ہندوستان میں وارد ہوتا ہے تو یہاں اپنے مذہب کی ترقی ختم پاتا ہے
برس کے بعد ہان تسیانگ زیارت کی نیت سے آتا ہے تو مذہب بودھ کو نہایت شکستہ حا
دیکھتا ہے۔ آٹھویں یا نویں صدی عیسوی میں برہمنوں کو اس مذہب پر پوری فتح حاصل ہو
اور جب مسلمانوں کے قدم یہاں جمتے ہیں، تو اس ملت کا نام ونشان بھی اُسکے وطن میں با
رہتا اگرچہ دور دوراز ممالک میں وہ ہنوز پھولتا پھلتا ہے۔

کہہ سکتے ہیں کہ یہ نتیجہ تھا اُس سخت خامی کا جو شریعت گوتم میں تھی یعنی خدا کی امداد
محض اپنے قوت بازو سے نجات سرمدی حاصل کرنے کی کوشش"! اہل معرفت کہتے ہیں کہ خد
اور مالک سے لو لگا دیتا کہ "وہ" اپنی محبت کی آگ سے خواہشوں کو جلا دے ورنہ نفس کو زیر
کے راستے سے خدا تک پہونچنا بہت دشوار بلکہ قریب قریب غیر ممکن کے ہے۔

گوتم کی تعلیم اس اصول کے بالکل خلاف تھی۔ وہ اپنے مریدوں کو یا تو خدا کا نام لینے
نہ کرتا تھا یا اُسکے ابتدائی چیلوں نے یہ ضروری حصہ اُسکی شریعت سے حذف کر دیا۔ جسکا نتیجہ یہ
میں یہ اخلاقی مذہب منکرین خدا کی ملت خیال کیا گیا اور "خالق" مہیا کرنے کے لیے مخلوق"
خدا بنانے پر مجبور ہوئی۔

اس فلسفیانہ مذہب کا اپنے خداپرست اور خدا کے روحانیت وطن سے بے نشا
بھی اُسکے دامن کمال پر ایک بدنما داغ ہے۔ چین و برہما کے عقیدت مندوں نے "ا
کو دل میں جگہ دی تو وہاں نہ کوئی شائستہ مذہب پہلے سے موجود تھا، نہ بھگوت گیتا کی ا
بجی تھی۔ سری کرشن اور رہپلا دکے دیس میں یہ شریعت زندہ رہتی تو البتہ جامع کمالات او
دہلی کا خطاب پانے کی مستحق ہوتی۔

میتریا بودھ! آپ اس شریعت کی تکمیل فرمائیں!!

امیر احمد علوی

ہر کام میں ... رجوع کیا جائے

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

رجسٹرڈ نمبر

سالے ۴۷۸

رسالہ

الناظر

لکھنؤ

ایڈیٹر ـ ظفر الملک علوی

قیمت سالانہ للعہ ؍ مع محصول

فی پرچہ

الناظر پریس لکھنؤ میں چھپا

پرنٹر و پبلشر :- اسحاق علی علوی

بسم اللہ

فہرست مضامین الناظر ماہ اپریل و مئی ۱۹۲۵ء

نمبر ۱۶۶ و ۱۶۷ — جلد ۲۸

کافوری جنتری ۱۹۲۵ء کلکتہ کے مشہور ڈاکٹر ایس کے برمن کے کارخانہ کی یہ مفید کارآمد جنتری اعلیٰ درجہ کے چکنے کاغذ پر چھپی ہے اور درخواست پر مفت بھیجی جاتی ہے۔

کلکتہ کے نامی ڈاکٹر ایس کے برمن کی

اصلی عرق کافور

وقت پر صلاح

جو دوست ہوتے ہیں وہ خطرہ سے بچنے کے لیے وقت سے پہلے نیک صلاح دیتے ہیں۔ ڈاکٹر ایس کے برمن کی یہ صلاح ہے کہ موسم گرما آگیا ہے اور اس موسم میں بے ترکیب کھانے پینے کے باعث ہیضہ ہونے کا خوف ہر وقت رہتا ہے۔ ہیضہ عام طور سے بے وقت آدھی رات قریب یعنی ایسے وقت میں جبکہ حکیم ڈاکٹر مشکل سے ملتے ہیں ہوا کرتا ہے۔ اسلیے اس سے بچنے کے لیے پہلے ہی ایک شیشی اصل عرق کافور منگوا کر اپنے گھر میں ضرور ڈال رکھیں جس سے آپ کو آپ کے دوست احباب اور پڑوسیوں کو وقت پر کام آئے۔ یہ عرق کافور گرمی کے دست پیٹ کے درد متلی وغیرہ کیلیے اکسیر کا حکم رکھتا ہے ۴۱ سال سے تمام ہندوستان میں دوکانداروں دوا فروشوں اور ایجنٹوں کے پاس ملتی ہیں۔ قیمت فی شیشی چھ آنہ ۶؍ محصولڈاک چھ آنہ ۶؍

پرانے سوزاک کی دوا

سوزاک پرانا ہوجانے پر پیشاب میں جلن نہیں ہوتی لیکن پیشاب رک رک کر ہوتا ہے اور کبھی کبھی مواد بھی تھوڑا تھوڑا گرتا ہے گرم چیزوں کے کھانے اور مزاج میں گرمی آجانے سے مواد زیادہ گرنے لگتا ہے اور کبھی بند بھی ہو جاتا ہے۔ ایسی حالت میں پرانے سوزاک کی دوا استعمال کرنا چاہیے۔ اگر اس حالت میں معقول علاج نہ کیا گیا تو آخر میں پیشاب کی دھار باریک پڑجاتی ہے پیشاب قطرہ قطرہ گرنے لگتا ہے۔ اور کبھی ایکبارگی بند بھی ہو جاتا ہے جس سے زندگی محال ہو جاتی ہے قیمت فی شیشی ۲؍ محصولڈاک ۶؍ دیکھیے جناب راجہ پرتھوی سنگھ صاحب امری کیا فرماتے ہیں۔ جناب من۔ آپکی سوزاک کی دوا سے بہت فائدہ ہوا۔ مجھے پانچ ماہ سے سوزاک کا مرض تھا حکیم رامچندر گوا کنسوٹر ہونت سنگھ جی رگھوبنسی۔ ویش آگرہ۔ ڈاکٹر حکیم غلام نبی خاں زبدۃ الحکما لاہور کی دوائیاں حسب دستور استعمال کیا مگر کچھ فائدہ بھی نہیں ہوا۔ آپکی دوا کے صرف سات روز کے استعمال سے بالکل آرام ہو گیا قیمت بھی اداں ہے

ڈاکٹر ایس کے برمن (پوسٹ بکس ۵۴۴) تاراچند دت اسٹریٹ کلکتہ

ایجنٹ۔ ڈاکٹر گنگا رام مہتا جی۔ چوک۔ لکھنؤ

مقدمہ ابن خلدون

علامہ ابن خلدون مغربی جسکی لاجواب تاریخ کے ترجمہ کی شہرت ہے اُس کا مقدمہ فلسفۂ تاریخ میں ایک لاجواب تصنیف کا درجہ رکھتا ہے کیونکہ اس میں اُس نے اُن اصول کی توضیح و تشریح کی ہے جو اچھی لاجواب تاریخ کے لکھنے میں اُسکے پیش نظر رہے۔ اس مبسوط مقدمہ کا ترجمہ تین جلدوں میں علیحدہ چھپا ہے۔ قیمت سعہ

جدید دنیائے اسلام

گزشتہ نصف صدی کے اندر آہستہ آہستہ اور محاربۂ یورپ کے دوران میں اور اسکے بعد سرعت اور تیزی کے ساتھ اسلامی ممالک میں جو حرکت و بیداری کے آثار نمایاں ہوئے ہیں اُنکی بنا پر امریکہ کے امریلی ... مشہور ... نے یہ کتاب مرتب کی ہے جس میں دنیائے اسلامی کے باشندوں کے حالات پر معاشرتی، مذہبی، تمدنی، سیاسی و اقتصادی حیثیت سے ... اُنکے موجودہ رجحانات تخیل اور طائر نظر کے اسباب و علل کا پتہ لگانے کی کوشش کی ہے کتاب کا ترجمہ مولوی ... الدین صاحب بی اے ... ندوی ... و جگر کا وی سے کیا ہے حجم پانچ سو صفحے سے زائد۔ قیمت ...

تاریخ خاندان عثمانیہ

ابتدائے عہد سے اس مبارک و مظفر خاندان کی مفصل تاریخ نویسی ہے مطابق مبصرین کی رائے ہے۔ کہ گزشتہ سو سال میں اس پایہ کی کوئی اسلامی تاریخ کسی اسلامی ملک میں آج تک نہیں لکھی گئی۔ جلد اول ۱۲ جلد دوم ۱۲ سالم کتاب چار روپے چار آنے۔

واقعات روم

ایک مرکیں مصنف مزاج کی تالیف کا اردو ترجمہ معہ حواشی ہے۔ اس میں سلطنت عثمانیہ کے ہر صیغہ کی ترقیات کا سلسلہ وار بیان ہے قیمت ۱۲ ر

محاربات پلیونا

غازی عثمان پاشا کا نام کون مسلمان نہیں جانتا۔ انہی کے کارناموں کی یہ مفصل تاریخ ہے جس میں ضمناً ... روم و روس کے حالات بھی پلیونا کے قیامت تک یاد رہنے والے معرکوں کے ہمراہ بیان کئے گئے ہیں۔ طبع جدید میں بہت اضافہ کی گئی ہے۔ ... طبع سوم قیمت ... معہ ... آرمینیا و دول ثلاثہ ... انگریزی ...

ٹرکی کی موجودہ حالت اور اس کی باجگذار ریاستیں

اس میں سلطنت عثمانیہ کے مقبوضہ ممالک کے علاوہ مصر ٹیونس۔ بلگیریا۔ بوسنیا ہرزیگوینا۔ قبرس و طرابلس الغرب وغیرہ کی موجودہ کیفیت معہ تشریح ضوابط اور آئین ... ہے۔ ... میں ضخامت قریباً دوگنی ہوگئی ہے قیمت عصہ

دختر وزیر

اردو داستان جنگ ہزارہ مؤلفہ مس ہملٹن لیڈی ڈاکٹر دربار کابل امیر عبدالرحمٰن مرحوم نے دربار و طریق انتظام اور جنگ ہزارہ ... منشی سلطان محمد خاں صاحب کے دربار کابل سے قطع ... حالات ناول کے پیرایہ میں قیمت صرف ۱۲۔

ترکوں کی موجودہ ترقیات اور اسلامی دنیا کا فوٹو

... کتاب ہے۔ کوئی اسلامی خطہ۔ کوئی اسلامی فلاح و ترقی کا مسئلہ نہیں جس پر اس میں مفصل بحث نہ کی گئی ہو ... تمام اسلامی ممالک کے موجودہ حالات اور جدید اسلامی تحریکوں کی مکمل ... طبع دوم قیمت ... روپے

منیجر الناظر بک ایجنسی لکھنؤ

بسم اللہ الرحمن الرحیم

الناظر

نمبر ۱۶۶ و ۱۶۷ جلد ۲۰ — اپریل و مئی ۱۹۲۵ء

فیہ مافیہ

(اثر خامہ چلپی)

دو بھائیوں کی بے بسی

تاریخ کی زبان میں آج سے ہزارہا سال قبل کا زمانہ ہے۔ لیکن یہی زمین اور یہی آسمان، یہی رات اور یہی دن، یہی آفتاب اور یہی ماہتاب اُسوقت بھی موجود ہیں، نیکی و بدی، نور و ظلمت، حق و باطل کی کشمکش جیسی آج ہے، اُسوقت بھی جاری ہے، قدرت کے قانون اور اللہ کے بنائے ہوئے دستور آج کی طرح اُسوقت بھی کارفرما ہیں۔ ایک بڑی شایستہ قوم جو ہر طرح کے انعاماتِ الٰہی سے سرافراز ہو چکی ہے، اپنی بدکرداریوں اور نافرمانیوں کی پاداش میں اسوقت مبتلائے گردش و ادبار ہے۔ خدا کی غلامی کو چھوڑ کر اس نے اپنے نفس کی غلامی اختیار کر لی ہے، نتیجہ یہ ہوا ہے، کہ ایک زبردست اجنبی حکومت کو اس پر مسلط کر دیا گیا ہے، اور وہ شامت زدہ قوم ایک ایک کر کے اُن تمام لعنتوں اور بدبختیوں کا شکار ہو رہی ہے، جو ہر محکوم و مفتوح قوم کے نصیب میں ازل سے لکھی چلی آ رہی ہیں۔ جب جفا و جور، جبر و ستم کا پیمانہ لبالب ہو کر چھلکنے لگتا ہے، تو خدائے علیم و قدیر اس قوم کی فلاح و بہبود، بیداری و آزادی، اصلاح و تجدید کے لیے اُسی کے دو فرزندوں کو، جو آپس میں بھائی ہوتے ہیں چن لیتا ہے، اور انھیں خلعت رسالت سے مشرف، اور تمغۂ نبوت سے مزین کر کے اُسکی جانب روانہ کرتا ہے۔

بیگانوں کی طرف سے اس سفارت الٰہی کا جو استقبال ہوتا ہے، اسکی داستان انھیں اوراق میں اس سے پیشتر دوہرائی جا چکی ہے۔ لیکن خود "اپنوں" کی طرف سے جو سپاس نامہ ان پیامبرانِ برحق اور علمبرداران حریت کی خدمت میں پیش ہوتا ہے، اُسکے عنوان کی عبارت یہ ہے:۔

"خدا تم کو دیکھے اور انصاف کرے، تم ہی نے ہمیں فرعون کی نظر میں اور اُسکے کارکنوں کی نگاہوں میں ایسا قابل نفرت بنا دیا ہے، کہ اُنکے ہاتھ میں تلوار دیدی ہے، جس سے وہ ہمکو قتل کریں۔" (توریت، کتاب خروج، باب پنجم، آیت ۲۱)

قوم کے یہ سچے محسن اسکے پیروں سے غلامی کی بیڑیاں کاٹنے میں دل و جان سے لگے ہوئے ہیں، اور یہ بشارت حق، اسکے حلق و دہن سے پیہم برآمد ہو رہی ہے، کہ

"میں خداوند ہوں، میں تمھیں مصریوں کے بوجھ سے نجات دونگا، اور اُنکی خدمتگزاری سے تمھیں آزاد کروں گا، اور میں اپنا ہاتھ لمبا کرکے بڑی بڑی سزائیں اُنکو دیکر تمھیں رہائی دوں گا، اور میں تمھیں اپنی قوم کروں گا، اور میں تمھارا خدا ہوں گا" (خروج، باب ششم، آیت ۶)

لیکن سنگدل قوم کا دل ذرا نہیں نرم ہوتا، اپنے محسنوں کا ادب و احترام تو الگ رہا، اسکے افراد انکی آوازوں پر کان تک دھرنا گوارا نہیں کرتے:۔

"دل تنگی سے اور محنت کی شدت سے موسیٰ کے سننے والے نہ ہوے۔" (ایضاً، آیت ۱۰)

آزادی کا پیمبر مایوس و دل شکستہ ہوکر جناب باری میں عرض کرتا ہے، کہ اجنبی و ظالم حکومت پر میری سفارت کیا اثر کریگی، جو خود میری ہی برادری والوں کا یہ حال ہے:۔

"موسیٰ نے خداوند کے آگے یوں کہا، کہ دیکھ، بنی اسرائیل نے تو میری نہ سُنی، پس میں جو نامختون ہونٹ رکھتا ہوں، فرعون میری کیونکر سنے گا۔" (ایضاً، آیت ۱۲)

مدتوں کی غلامی نے قوم کی غیرت و حمیت کو ملیامیٹ کردیا ہے، آزادی و خودداری کے جذبات فنا ہو چکے ہیں۔ "سرکار عظمت مدار" کا رعب دل و دماغ پر چھایا ہوا ہے۔ اپنے حقوق کی واجبیت، پیمبر کے وعدے، اللہ کی تائید غیبی، ان سب خیالات پر "اقبال سرکار" کی دہشت غالب ہے۔ یہاں تک کہ جب اپنے سچے سردار و رہبر کی رہنمائی میں دریائے نیل کو عبور کرکے سرزمین مصر سے قدم باہر نکال چکتے ہیں، تو بھی دھڑکتے ہوئے دلوں کو سکون نہیں نصیب ہوتا، بلکہ جوں ہی لشکر مصر تعاقب میں آتا ہوا دکھائی دیتا ہے، معاً ان جواں مردوں کے جسم لرزنے لگتے ہیں، چہرے پیلے پڑجاتے ہیں، اور زبانوں پر

دہشت کی تھرتھراہٹ اور اضطراب کی ہکلاہٹ کے ساتھ یہ الفاظ آنے لگتے ہیں، کہ اے موسیٰ

"کیا مصر میں قبروں کی جگہ نہ تھی، جو تو ہم کو وہاں سے بیابان میں مرنے کے لیے لایا؟ تونے ہم سے یہ کیا معاملہ کیا کہ ہم کو مصر سے نکال لایا؟ کیا یہی بات نہیں، جو ہم نے مصر میں تجھ سے کہی تھی کہ ہم سے ہاتھ اٹھا تاکہ ہم مصریوں کی خدمت میں لگے رہیں، کہ ہمارے لیے مصریوں کی خدمت کرتے رہنا بیابان میں مرنے سے کہیں بہتر تھا" (ایضاً، باب چہاردہم آیت ۱۲-۱۳)

یہ باہمت و حوصلہ مند و عالی ظرف افراد، فرعون اور اُسکے لشکر کو اپنی آنکھ سے غرق و ہلاک ہوتے دیکھتے ہیں، اور موسیٰ وہارون (علیہما السلام) کی رفاقت میں نصرت غیبی کو کام کرتا ہوا صریح طور پر مشاہدہ کرتے ہیں، پھر بھی طبایع، طویل غلامی کے اثر سے اس درجہ مسخ ہو چکی ہیں، کہ بات بات پر اپنے سچے سرداروں سے بدگمان ہوتے ہیں، خواہ مخواہ اپنے ان محسنوں کی دل شکنی کرتے رہتے ہیں، اور اُٹھتے بیٹھتے دونوں بھائیوں پر طعن و تعریض کرنے میں لگے رہتے ہیں، چنانچہ بیابان میں جب کھانے پینے کی تکلیف ہوتی ہے، تو

"ساری جماعت بنی اسرائیل کی موسیٰ وہارون پر جھنجلا اُٹھتی ہے۔ (ایضاً، باب شانزدہم آیت ۱)

اور کہنے لگتی ہے، کہ

"کاش ہم سرزمین مصر ہی میں ..... مارے جاتے، کیونکہ تم ہم کو بیابان میں اسی لیے نکال لائے ہو کہ سارے مجمع کو بھوک سے ہلاک کرو" (ایضاً، آیت ۳)

اسکے بعد خدا کے جو اوامر و احکام اس قوم تک پہونچائے جاتے ہیں، ایک ایک کرکے سب کی نافرمانی کرتی ہے، شعائر الٰہی کی توہین کرتی ہے، احترام یوم سبت سے انکار کرتی ہے، رزق غیبی کا ذخیرہ باوجود ممانعت شدید جمع کرنے لگتی ہے، پیمبروں کی نافرمانی کو اپنا شیوہ بنالیتی ہے، اُنکی دلشکنی اور ان پر طنز و تعریض ایک معمولی بات بن جاتی ہے، ہوتے ہوتے اُنکی جان تک کے درپے ہوجاتی ہے، بجبوراً موسیٰ کلیمؑ کو بارگاہ ایزدی میں مناجات کرنی پڑتی ہے، کہ

"پروردگار، میں اُن لوگوں سے کیا کروں، یہ سب تو ابھی مجھے سنگسار کرنے کو تیار ہیں"

(ایضاً باب ہفتدہم، آیت ۴)

جھوٹی امت کے مقابلہ میں سچے پیامبروں کی، بدبخت ناشکروں کے مقابلہ میں خوش نصیب محسنوں کی، اور غدار سپاہیوں کے مقابلہ میں حق پرست سرداروں کی، بے بسی اور بیکسی کی یہ کس قدر دردناک و عبرت انگیز مثال ہے! اور یہ کوئی استثنائی یا منفرد مثال نہیں، جب تک دونوں بھائی زندہ رہے، قوم کی طرف سے برابر عناد و سرکشی، شرارت و فساد، بدعہدی و غداری، بغاوت و نافرمانی ہی کے واقعات سے دوچار

ہوتے ہے۔ یہاں تک کہ باوجود ظرفِ نبوت، وحوصلۂ رسالت کے، ان برادرانِ محترم کی زبان تک حرفِ شکایت وکلمۂ یاس آہی جاتا ہے! بالآخر اس بدبخت قوم کو مسلسل بدکرداریوں کے پاداش میں بسزائے لعنت نصیب ہوتی ہے، جس سے ہزارہا سال گزر جانے کے بعد بھی کیفرِ کردار و پاداشِ عمل کے اٹل قوانین نجات ورہائی نصیب نہیں ہونے دیتے!

یہ صورت واقعہ، روایاتِ توریت کے مطابق ہے۔ دنیا کی مستند ترین کتاب اسی واقعہ کو اعجاز وتاثیر کی بلند تر خصوصیات کے ساتھ یوں بیان کرتی ہے، کہ اسرائیلیوں نے اپنے رہبرِ صادق سے صاف کہہ دیا، کہ ہمیں تو آپ کی اس تحریکِ آزادی سے کچھ نفع پہونچا نہیں، بلکہ ہم تو یہ

قالوا اوذینا من قبل ان تاتینا ومن بعد ما جئتنا۔ (اعراف، ع ۱۵)

دیکھتے ہیں، کہ آپ کے آنے سے پیشتر بھی ہمیں تکلیف ہی تکلیف تھی، اور اب بھی تکلیف ہی تکلیف ہے! داعیِ حق نے سمجھایا، کہ آزادی کی جنگ لڑکوں کا کھیل نہیں، مادی ذرائع وفوری کامیابی کی توقعات کے بجائے، اپنا اعتماد خدا پر رکھو، اُسی سے مدد چاہو، اور صبر واستقلال

قال موسی لقومه استعینوا باللہ واصبروا ان الارض للہ، یورثها من یشاء من عباده، والعاقبة للمتقین۔ (اعراف، ع ۱۵)

سے کام لو۔ ملک وزمین اللہ کی ہے، حکومتوں کا اُلٹ پھیر اُسی کے ہاتھ میں ہے، وہ جسکو چاہے، حکومت دے۔ ہاں یہ خیال رہے، کہ آخری کامیابی اُسی کی ہوتی ہے، جو شیطانی ترغیبات سے بچتا رہے، اور رضائے حق میں کوشاں رہے۔

اس برگشتہ بخت قوم کی نالایقی وسرکشی کی کوئی انتہا نہیں۔ اپنے سچے رہبروں کو اس نے ہر طرح ستایا، متعدد انبیاءِ کرام کو قتل کر ڈالا، احکامِ شریعت کے ساتھ توہین وتمسخر کا کوئی دقیقہ اٹھا نہیں رکھا۔ گوسالہ پرستی اختیار کی۔ کلامِ پاک کے اوراق اُسکی نافرمانیوں اور بیہودگیوں سے لبریز ہیں، خوفِ خدا وخشیتِ الٰہی سے اُن کے دل ایسے خالی ہوگئے، کہ قرآن نے انھیں

فھی کالحجارة او اشد قسوة

مضغۂ گوشت کے پتھر کے ٹکڑوں سے تعبیر کیا، بلکہ پتھر سے بھی زیادہ سخت قرار دیا، جن میں نیکی کی کوئی صلاحیت ہی نہیں! آخر میں جب داعیِ حق (علیہ الصلوٰۃ والسلام) نے اس قوم پر جو احسانات الٰہی ہوتے رہے، اُنھیں یاد دلا کر اُس سے ملکِ شام میں داخل ہونے کو کہا، تو یہ قوم صاف انکار کر بیٹھی، اور کہنے لگی، کہ ایسی زبردست و

قالوا یا موسیٰ ان فیہا قوماً جبارین - وانا لن ندخلہا حتیٰ یخرجوا منہا فان یخرجوا منہا فانا داخلون (مائدہ - ع ۴)

پُرقوت قوم سے ہمیں بھڑا دینا چاہتے ہو! ہم ایسے احمق نہیں، جو اپنی جان دینے کے لیے اُنسے جا بھڑیں! وہ لوگ اس ملک سے چلے جائیں، اسکے بعد البتہ ہم اس میں داخلہ کے لیے تیار ہیں!

انکے دو سچے ناصحوں اور محسنوں نے ہر چند انکی ہمت بندھائی، لاکھ انھیں آمادہ کرنا چاہا لیکن "مصلحت اندیش" قوم کب ان "شوریدہ سروں" کے کہنے سننے میں آنے والی تھی، اسکے قدم نہ اُٹھنا تھے نہ اُٹھے، اور زبان انکار ہی پر کھلتی رہی، یہاں تک کہ عقل و دانش، مصلحت شناسی و انجام بینی کے پتلوں نے یہ ارشاد فرمانا شروع کر دیا، کہ لے جناب موسیٰ، اگر ایسا ہی ہوئے

قالوا یا موسیٰ لن ندخلہا ابداً ما داموا فیہا فاذہب انت وربک فقاتلا، انا ہہنا قاعدون (مائدہ - ع ۴)

اور ایسی ہی ہمت ہے تو آپ مہربانی کرکے آپ خود، اور آپ کا خدا جا کر اُس ملک میں قبضہ کرائیں، اور ہم کو یہیں انتظار کے لیے چھوڑے جائیں - جب تک وہ زبردست قوم وہاں موجود ہے، اُسوقت تک ہم تو اپنی جان بازی پر لگانیوالے نہیں!

شوخ چشمی و تمرد، خیرہ سری و گستاخی کا یہ انتہائی نمونہ دیکھ کر موسیٰ کلیم کا قلب کانپ اُٹھا ہے، اور تمام قوم کے مقابلہ میں اپنے اور اپنے بھائی کی انتہائی بے بسی، بے کسی، و بے چارگی کا احساس انکے پیمانہ حلم و تحمل کو بھی چھلکا دیتا ہے، اور اُس بڑے بے نیاز کی بارگاہ میں بہ کمال نیاز عرض کرتے ہیں کہ پروردگار، میں اپنی اس قوم سے عاجز آگیا، اور میں صاف اقرار کرتا ہوں، کہ

قال رب انی لا املک الا نفسی واخی فافرق بیننا وبین القوم الفاسقین - (مائدہ - ع ۴)

بجز اپنی ذات خاص اور اپنے بھائی کے، باقی سب کے معاملہ میں اپنے تئیں بے بس پاتا ہوں پس تو ہی ہم دونوں بھائیوں اور اس بدکردار قوم کے درمیان فیصلہ کردے!

حق و باطل کا معرکہ آج بھی درپیش ہے، آزادی و اسیری، خواجگی و غلامی کی جنگ آج بھی اُسی زور و قوت کے ساتھ جاری ہے، خدا کی ایک محبوب و مقبول قوم آج بھی ایک سخت ترین دور ابتلا سے گزر رہی ہے، خدا کے بتائے ہوئے قوانین پر چلنے سے اسے بھی ویسا ہی گریز ہے، اپنی غلامی و اسیری کے ساتھ اسے بھی آج ایسا عشق ہے، کہ اپنے ہاتھوں کی ہتکڑیوں اور پیروں کی

بیڑیوں کو بار بار چومتی جاتی ہے۔ مخلوق کی اطاعت سے گردن باہر نکالنا اسے بھی ویسا ہی بار معلوم ہو رہا ہے، محکومی و غلامی کی ذلت کا احساس اس سے بھی اُسی طرح جاتا رہا ہے، کسی مقصد اعلیٰ کے لیے اپنے نفس کو تکلیف میں ڈالنا اسکے لیے بھی اُسی طرح ناممکن ہو گیا ہے، جہاد سے بے رغبتی بلکہ نفرت اسکے دل میں بھی جاگزیں ہو چکی ہے، اپنے پیمبر برحق (صلی اللہ علیہ وسلم) کے ارشادات پاک کے ساتھ تمسخر و طنز اسکا بھی شعار ہو چکا ہے، ان حالات کے درمیان اگر اسکی فلاح و بہبود، اصلاح و آزادی کی کوشش میں "دو بھائی" اپنے تئیں بیکس اور بے بس پاتے ہیں، تو کیا تاریخ عالم میں یہ کوئی انوکھا واقعہ ہے؟

علیگڈھ

عاشقان دیرینہ سال اور سخنوران باکمال کا یہ تجربہ، کہ آہ اگر دل سے نکلتی ہے، تو کسی کے حرم ناز میں روزن پیدا کر دیتی ہے، آخر ایک مرتبہ پھر صحیح ثابت ہوا۔ پچھلے نمبر میں "کہتے کیا تھے، اور کرتے کیا ہیں،" کے زیر عنوان جو کچھ عرض کیا گیا تھا، اُس پر یونیورسٹی کی ایک بڑی ذمہ دار شخصیت نے توجہ کرنا ضروری خیال فرمایا، اور اُن معروضات کے جواب میں اپنے سرکاری پرچہ میں ایک طویل مضمون شایع فرمایا ہے۔ اس توجہ فرمائی پر صد ہا شکریہ۔ اور اس سے بھی زیادہ شکر و ستایش کے قابل یہ امر ہے، کہ جواب سنجیدہ متین لہجہ میں شایع ہوا ہے۔ ورنہ پچھلے دنوں "بزرگان قوم" کی نازک مزاجی تو اس درجہ ترقی کر گئی تھی کہ ہم "خوردان قوم" کو زبان کشائی کرتے وقت اپنی عزت سنبھالنی دشوار تھی۔ اس جوابی مضمون کی زبان وہ ہے، جو عموماً بھلے آدمیوں کے درمیان استعمال ہوتی ہے۔ کاش خدا، علیگڈھ کے اکھاڑے کے شہ زور پہلوانوں کو یہ سمجھنے کی توفیق دیتا، کہ بغیر بازاری زبان اختیار کیے، شرفائی زبان میں بھی سوال و جواب کا سلسلہ جاری رہ سکتا ہے!

نفس مضمون کسی طویل بحث کا محتاج نہیں۔ فاضل مقالہ نویس سے صرف اسقدر دریافت کرنا ہے، جس قسم کی صفائی اُنھوں نے پیش کی ہے، کیا اُس سے خود اُن کا ضمیر بھی مطمئن ہے؟ کالج میں کئی پیش مقرر ہیں، نماز کے وقت حاضری کا قاعدہ مقرر ہے، غیر حاضری پر جرمانہ ہے، اس قسم کے جتنے جوابات تحریر فرمائے ہیں، کیا اُنھیں خود اُنھیں کی دیانت کافی سمجھتی ہے؟ اسوقت فوجداری عدالت میں کوئی مقدمہ نہیں پیش ہے، جو قانونی جوابات اور ضوابط کالج کی دفعات کا حوالہ دے کر کامیابی حاصل کر لیجا، محض حق و انصاف، صداقت و دیانت کا سوال ہے۔

کیا براہ کرم ارشاد ہوگا، کہ یونیورسٹی کے ذمہ دار عہدہ داروں اور اعلیٰ کارکنوں میں سے کتنے بزرگ

نماز کے پابند ہیں؟ کالج کے "مسلمان" اساتذہ میں سے کتنے، مسجد میں حاضر ہوتے ہیں؟ طلبہ کی فی صدی کتنی تعداد پابند جماعت ہے؟ ہر نماز کے وقت مسجد میں کتنے نمازی ہوتے ہیں؟ کتنے اساتذہ کا طرز معاشرت، کسی معنی میں بھی، اسلامی کہا جا سکتا ہے؟ کالج کی فضا پر فرنگیت چھائی رہتی ہے یا اسلامیت؟ "مسلم یونیورسٹی" میں کن کن "اسلامی" علوم کی تعلیم ہوتی ہے؟ "علوم اسلامیہ" کے کتنے طلبہ موجود ہیں؟ سائنس کی ایک ایک شاخ پر جو زر کثیر صرف ہوتا رہتا ہے، اسے دینیات واسلامیات کے بجٹ سے کوئی مناسبت ہے؟ کالج کے درودیوار فلسفہ وسائنس، تاریخ ومعاشیات کے لکچروں سے گونجتے رہتے ہیں، یا قرآن کی تلاوت احادیث کی روایت، واسلامیات کے درس سے؟ عزت ووقعت یورپ کی اعلیٰ ڈگریوں کی ہوتی ہے یا قرآن فہمی وحدیث دانی کی؟ کالج میں جشن عید کس روز ہوتا ہے، لارڈ ریڈنگ اور سر ولیم میرس کے ورود کے موقع پر، یا رسول خدا کے یوم ولادت، اور یوم حج پر؟ طلبہ کا مطمح نظر کیا رہتا ہے، ڈپٹی کلکٹری، بیرسٹری، انجینیری، ڈاکٹری، یا خدمت اسلام، تحقیق دین، فہم قرآن، وذوق جہاد؟ طلبہ کے دل وزبان کن سے مانوس ہیں، شکسپیر، ٹینیسن، نیوٹن، و ڈارون، کینٹ وبرگسان، مارشل و مارسن سے، یا صدیق ومرتضیٰ، بایزید وجنید، مالک وابوحنیفہ، بخاری ومسلم سے؟ دلوں میں ولولہ کس شے کا موجود ہے، زیارت کعبہ وخاک بوسی مدینہ کا، یا لنڈن وپیرس کی سیر کا؟

اس قسم کے صدہا سوالات، یونیورسٹی گزٹ کے فاضل مضمون نگار کے ذہن میں از خود پیدا ہو سکتے ہیں، اور انکے جوابات بھی، دوسروں سے بہتر وہ خود ہی دے سکتے ہیں۔ موجودہ وائس چانسلر اصلاح حال کی جو کوششیں کر رہے ہیں، اُن سے بیخبری نہیں، ان کوششوں کا پورا اعتراف ہی ہے، لیکن سوال اُنکی ذاتی کوشش سے متعلق نہیں، بلکہ کالج کی عام فضا سے متعلق ہے۔

ایک جگہ فاضل مقالہ نگار کی قوت ایمانی، آخر اُنکی مصلحت سنجیوں پر غالب ہی گئی، اور انھیں لکھنا پڑا، کہ

> "یہ دعویٰ نہیں کیا جا سکتا کہ جس اسلامی رنگ وتربیت کی ضرورت ہے، اور جسکے لیے مسلم یونیورسٹی کی ضرورت تھی، اُس میں کامیابی ہو سکی ہے"

بہ ادب گزارش ہے کہ اس اعتراف کے بعد بھی "چلبی" کی تردید میں قلم اُٹھانے کی ضرورت باقی تھی؟ اگر یہ تسلیم ہے، کہ مسلم یونیورسٹی اسلامی فضا پیدا کرنے میں ابتک ناکام رہی ہے، تو پھر آخر اختلاف کس شے سے ہے؟ یا ایڈیٹر صاحب یونیورسٹی گزٹ نے اپنے اس فلسفہ کا سب کو معتقد بنا رکھا ہے، کہ وہی شے اگر اُنکے اخبار میں چھپے تو صحیح و درست، لیکن اگر الناظر میں چھپ جائے، تو غلط ولغو؟

تم بھی وہی کہو تو کہے اک جہاں، بجا　　　　میں بھی وہی کہوں تو کہے اک جہاں غلط!

"دورِ عمل" کا ایک نادر نمونہ! مصالحت و آشتی کی کوششوں کی حد ہو چکی، نامہ و پیام میں اسقدر وقت ضایع ہو چکا، صبر و تحمل کی انتہا ہو چکی، خدا کو اپنی کبریائی پر ابتک بڑا غرہ رہا ہے، اُسے کیا خبر تھی کہ بیسویں صدی کا ترقی یافتہ انسان (جسے وہ حقارت سے ابتک اپنا بندہ کہتا آیا ہے) اپنی قوت و جمعیت، اپنے ساز و سامان، اپنی عقل و دانش پر پورا اعتماد کرکے، پوری دلیری و مردانگی کے ساتھ اُسکے مقابلہ میں صف آرا ہو سکتا ہے! چنانچہ ولایت منزل (علیگڈھ) کا مورچہ جو اُدھر عرصہ سے سرد تھا، انکی ہمہ گرما کے آغاز کے ساتھ ہی خود بھی گرما اُٹھا، اور مشہور سورما منشی طفیل احمد صاحب صب رجسٹرار نے آخرکار اپنا الٹیمیٹم (پیام جنگ) ایک عرش نشین خدا، اور اُسکے رحمۃ للعالمین رسول کو دے ہی دیا! (فاذنوا بحرب من اللہ و رسولہ) "تاریک خیال مسلمانوں" دقیانوسی مولویوں، آرزوئے جنت کی حماقت میں پھنسے رہنے والوں، کی مروت کب تک کیجا سکتی تھی، خدا پرستوں کی نام خیالیوں کی کہاں تک پروا کیجا سکتی تھی، خوش اعتقادوں کے ساتھ کبتک رواداری ممکن تھی، آخر اعلانِ جنگ ہونا تھا، سو ہو کر رہا۔ اب خدا اور رسول کی فوج کے ہر سپاہی کو پہلے گولہ کے سر ہونے کا ہر لمحہ منتظر رہنا چاہیے! خدا ہی ہے، جو بیسویں صدی میں خدا اور بندہ کے درمیان اس محاربہ عظیم کے بعد خدا کی عظمت و کبریائی کا پردہ باقی رہ جائے!

اعلانِ جنگ کا شاندار عنوان "مسئلہ سود کا عملی دور" ہے۔ گویا دورِ استدلال ختم ہو چکا، اتمام حجت ہو چکی، اور اب بجز عمل جنگ کے کوئی چارۂ کار باقی نہیں۔ دورِ استدلال کی انتہائی کامیابی کا نمونہ یہ تھا، کہ چونکہ قرآن میں "حرّم الربٰو" وارد ہوا ہے، "حرّم السود" وارد نہیں ہوا ہے، اسلیے سود کی حرمت ثابت نہیں! دورِ عمل کا منتہائے کمال یہ ہے، کہ برکاتِ سود و حصول زر کے اسرار کی تشریح کے لیے ایک پندرہ روزہ رسالہ جاری ہوگا، جسکا پہلا نمبر شایقین "بلا قیمت" طلب فرمائیں!! آج معلوم ہوا کہ ملک میں سب سے زیادہ "عملی" گروہ وہ ہے، جو اپنی اشتہاری دواؤں کی فہرست "بلا قیمت" لاکھوں کی تعداد میں شایع کرتا رہتا ہے!

"استدلال" کا نمونہ "ماضی" پیش کر چکا، "عمل" کا نمونہ "حال" پیش کر رہا ہے، ماضی و حال کے ان تجربات کے بعد، کیا "مستقبل" اسکے سوا کچھ اور بھی ہو سکتا ہے، کہ پندرہ روزہ رسالہ کی "بلا قیمت" تعداد اشاعت اور چند تائیدی خطوط شایع کرکے اپنی فتح عظیم کا بھی اعلان کر دیا جائیگا! کون کہتا ہے، کہ خدا و رسول کے محاربہ کے لیے، کسی مشین گن، کسی قلعہ شکن توپ، کسی ہوائی جہاز کی ضرورت ہوگی؟ اس مقصد کیلیے تو شبرات کی کچی پکی آتشبازی بالکل کافی ہو سکتی ہے! سچ کہا ہے اُسنے، جو ہمیشہ سچ اور صرف سچ ہی کہتا ہے، کہ جو لوگ حرام پیشوں اور ناجائز شغلوں میں پڑے رہتے ہیں، اُن پر ایک شیطان مسلط کر دیا جاتا ہے، جو انکا ابلیس و رفیق ہوتا ہے، یہ شیاطین ان لوگوں کو برابر راہ راست سے دور ہی کرتے جاتے ہیں، اور یہ لوگ اپنی جگہ پر یہ سمجھتے رہتے ہیں کہ گویا کوئی کارِ ثواب و خدمت مفید انجام دے رہے ہیں!

ومن یعش عن ذکر الرحمن نقیض لہ شیطانا فھو لہ قرین و انھم لیصدونھم عن السبیل و یحسبون انھم مھتدون (زخرف ع ۴)

عقلِ انسانی

(نفسیات کی روشنی میں)

تعلیمی ادارات میں آج کل، اور غالباً ہمیشہ سے، امتحانات کو طلبہ کی قابلیت معلوم کرنے کا معیار تسلیم کیا گیا ہے۔ چنانچہ ہر اسکول اور کالج میں سال میں کم از کم دو بار صرف یہ معلوم کرنے کے لیے امتحان لیا جاتا ہے کہ طلبہ نے کس قدر نئی معلومات حاصل کیں، اور وہ کہاں تک اُن سے فائدہ اٹھانے کے قابل ہوئے۔ پھر کالج میں ہر دوسرے سال اسی قابلیت و عدم قابلیت کی جانچ کے لیے یونیورسٹی نہایت اہتمام سے امتحان لیتی ہے اور کامیاب طلبہ کو ایک پروانہ عطا کرتی ہے جو گویا آئندہ زندگی میں کامیابی کا ضامن ہوتا ہے۔ آج کل، کم از کم ہندوستان میں، تو امتحانات کی یہ اہمیت تالیہ کے درجے تک ترقی کر چکی ہے۔ طلبہ کی آئندہ زندگی کے متعلق ان کا فیصلہ ناطق اور ان کا علم آخری سمجھا جاتا ہے۔ خیال یہ ہے کہ جو ان آزمائشوں میں پورا اُترے وہ ہر طرح لائق ہے اور اس قابل ہے کہ اس پُر ترقی دنیا میں اور قابل سے قابل افراد کے دوش بدوش اپنی زندگی بسر کرے۔ اس کے برخلاف جو ان میں ناکام رہتا ہے اُس کے لیے "مُلکِ خدا تنگ" سمجھا جاتا ہے اور "پائے گدا لنگ"۔ لیکن یہ معلوم کرنے کے لیے بہت تحقیق و تجسس کی ضرورت نہیں کہ اسکول اور کالج کی کامیابی عملی زندگی میں کامرانی کی مترادف نہیں ہوتی اور وہاں کی ناکامی کسی شخص کو ہمیشہ کے لیے بیکار نہیں بناتی۔ دنیا کے عظیم الشان لوگوں میں سے اکثر اس قسم کے ہیں جو اپنے زمانۂ طالب علمی میں کسی طرح بھی بہت ہوشیار نہ تھے۔ لیکن اُن کے کارنامے اُن کے لیے آبِ حیات تھے کہ عمرِ خضر عطا کر گئے! ولایت میں گولڈ اسمتھ، واٹ، سٹیفن، ولنگٹن، کلایو، نیوٹن، اور خود ہندوستان کے مشاہیر میں اکثر وہ لوگ ہیں جو اسکول اور کالج میں غبی، نالائق، کُند ذہن سمجھے جاتے تھے، لیکن کیا زمانہ اس وقت اُنکو نالائق کہہ سکتا ہے؟ اس کا صاف مطلب یہ ہے کہ اسکول اور کالج میں قلتِ اکتسابات عدمِ قابلیت پر دلالت نہیں کر سکتی ہے۔ خرابیِ صحت، تنگیِ معاش، فقدانِ توجہ وغیرہ ریاضی کے کسی سوال کے حل کرنے یا کسی لفظ کے ہجے کرنے میں ناکامی کا باعث ہو سکتے ہیں لیکن اس سے یہ نتیجہ نہیں نکلتا کہ ناکام شخص میں کسی قسم کی قابلیت ہوتی ہی نہیں۔ یہ صحیح ہے کہ ہر غبی و بلید اپنی جماعت میں

کمزور ہوتا ہے لیکن یہ کیا ضروری ہے کہ ہر کمزور طالب علم غبی اور بلید بھی ہے - پھر اس پر بھی غور کیجیے کہ ہندوستان میں سیکڑوں آدمیوں نے فلسفہ پڑھا اور اس میں ڈگریاں لیں لیکن اقبال اس وقت تک جوہر فرد ہے؛ پنجاب یونیورسٹی سے ہر سال کتنے ہی اشخاص مولوی فاضل اور منشی فاضل کے امتحانات پاس کرتے ہیں لیکن شبلی یگانۂ روزگار رہے؛ حیاتیات کا مطالعہ ہزاروں آدمی کر رہے ہیں لیکن ڈارون عدیم العدیل ہے۔ بہت ممکن ہے کہ ان حضرات کی تعلیمی حالت بہت کچھ اُمید افزا نہ ہو اور انھوں نے اول درجہ میں امتحانات بھی پاس نہ کیے ہوں لیکن اس وقت ہزاروں اول درجہ کی ڈگریوں والے ان کی شمع علم پر پروانہ وار قربان ہو رہے ہیں؟ آخر اس عجیب و غریب مظہر کی اصلی علت کیا ہے؟ وہ کون سی چیز ہے جس کے موجود ہونے سے ایک تیسرے درجہ میں کامیاب شدہ شخص تو دنیا میں تہلکہ مچا دیتا ہے اور جس کے نہ ہونے سے اول درجہ کا کامیاب شخص ہمیشہ کے لیے نگاہوں سے اوجھل ہو جاتا ہے؟ وہ کون سا وصف ہے جو آدمی کو لائق یا نالائق بناتا ہے؟ اگر امتحانات سے قابلیت و عدم قابلیت کی جانچ نہیں ہو سکتی تو وہ کون سا طریقہ ہے جس سے معتبر نتائج حاصل ہو سکتے ہیں؟

یہی سوالات تھے جنھوں نے آج سے بیس پچیس برس قبل شہر پیرس کے سررشتۂ تعلیم کو پریشان کر رکھا تھا۔ ان کے پیش نظر ہزاروں مثالیں اسی قسم کی تھیں جن میں ایک شخص جو اسکول اور کالج میں بدترین طالب علم تھا بعد میں یگانۂ روزگار ثابت ہوا - اور اسی طرح دوسرا شخص جو اسکول اور کالج میں چوٹی کا طالب علم تھا بعد میں بیکار ثابت ہوا - ان کو عملی زندگی میں اس کامیابی یا ناکامی کے اصلی علل و اسباب کی تلاش ہوئی؛ وہ یہ معلوم کرنا چاہتے تھے کہ مدارس میں طلبہ کی کمزوری کسی واقعی ناقابلیت کا نتیجہ ہے یا محض عدم توجہ کا - اسی غرض سے اُنھوں نے ایک ماہر نفسیات الفرڈ بینے[۱] کو مقرر کیا - اس شخص نے تھیوڈور سیمن کو اپنے ساتھ شامل کیا اور اس مسئلہ کو حل کرنے کی کوشش شروع کر دی - تھوڑے ہی عرصہ میں ان دونوں نے عقل کی آزمایش کے لیے چند نہایت آسان اور عام فہم طریقے اختراع کیے - امتحانات کی طرف سے بے اعتقادی تو پیدا ہی ہو چکی تھی، لہذا ان آزمایشوں میں ان دونوں ماہرین نے اسکول اور کالج کی تعلیم سے قطع نظر کی اور یہ معلوم کرنے کی کوشش کی کہ بچے اپنی روزمرہ کی زندگی میں کیا کچھ حاصل کرتے ہیں اور بوقت ضرورت اس سے کہاں تک مستفید ہوتے ہیں - یہی وجہ ہے کہ جن سوالات سے وہ بچوں کی عقلی ترقی معلوم کرتے ہیں وہ بالکل عام فہم ہیں، ان کے جوابات کے دینے کے لیے کسی باقاعدہ مدرسی تعلیم کی ضرورت نہ تھی - وہ دونوں اپنے تجربات اور

---

۱ Alfred Bines اور Theodore Simon

اور امتحانات میں اس قدر محتاط ہیں کہ عقل جیسی اہم اور مجرد چیز کا اندازہ لگانے کے لیے صرف ایک ہی آزمایش پر اعتماد نہیں رکھتے بلکہ وہ بچہ کو عام قابلیت دکھانے اور اس سے فائدہ اُٹھانے کے لیے بہت موقعہ دیتے ہیں۔

شروع شروع میں بنے اور ہمن نے تین برس کے بچہ سے لیکر بالغ العمر انسان تک کے لیے ساٹھ سوالات یا آزمائشات وضع کیں جو عمر کے مطابق مشکل سے مشکل تر ہوتی چلی جاتی ہیں لیکن بعد میں بنے نے کاٹ چھانٹ کر صرف چوّن باقی رہنے دیں۔ ان آزمائشات میں ہر عمر کے لیے پانچ پانچ ہیں، لیکن معلوم ہوتا ہے کہ محض سہواً چوتھے سال کے لیے صرف چار ہیں اور گیارہویں، تیرہویں اور چودھویں سال کو بالکل حذف کر دیا گیا ہے۔ ان آزمائشات کی نوعیت ذیل کی مثالوں سے معلوم ہو سکتی ہے:-

عمر تین سال

۱۔ ناک، آنکھ اور منہ کی طرف اشارہ کرتا ہے۔
۲۔ دو ہندسوں کی تکرار کرتا ہے۔
۳۔ ایک تصویر میں جتنی چیزیں ہیں اُن کے نام لیتا ہے۔
۴۔ اپنا خاندانی نام بتاتا ہے۔
۵۔ چھ مقطعات کے ایک فقرہ کی تکرار کرتا ہے۔

عمر چار سال

۱۔ بتاتا ہے کہ وہ لڑکا ہے یا لڑکی۔
۲۔ چابی، چاقو اور پیسے کا نام لیتا ہے۔
۳۔ تین ہندسوں کی تکرار کرتا ہے۔
۴۔ دو خطوط کا مقابلہ کرتا ہے۔

عمر پانچ سال

۱۔ دو وزنوں کا مقابلہ کرتا ہے
۲۔ ایک مربع شکل کی نقل کرتا ہے۔
۳۔ دس مقطعات کے ایک فقرہ کی تکرار کرتا ہے۔
۴۔ چار پیسے گنتا ہے۔
۵۔ صبح و شام میں امتیاز کرتا ہے۔

عمر آٹھ سال

۱ - ایسی دو چیزوں کا مقابلہ کرتا ہے جو اُس کو یاد ہیں۔
۲ - ۲۰ سے صفر تک اُلٹا گنتا ہے۔
۳ - تصویروں کے محذوف حصے بتا سکتا ہے۔
۴ - دن اور تاریخ بتاتا ہے۔
۵ پانچ ہندسوں کی تکرار کرتا ہے۔

عمر پندرہ برس

۱ - سات ہندسوں کی تکرار کرتا ہے
۲ - تین چھوٹی چھوٹی نظمیں سُنا سکتا ہے۔
۳ - چھبیس مقطعات کے ایک فقرہ کی تکرار کرتا ہے۔
۴ - ایک تصویر کی تعبیر کرتا ہے۔
۵ - بہت سے مختلف واقعات سے کسی مسئلہ کو حل کرتا ہے۔

اسی قسم کی آزمائشات ہر سال کے لیے مخصوص ہیں۔ امتحان لینے اور کامیابی یا ناکامی کے تعین کرنے کا طریقہ واضح کرنے کے لیے ذیل کی مثال کافی ہوگی:-

آزمائش :- تصویروں کے محذوف حصوں کی شناخت۔

ضروریات :- انسان کے چہرے کی تصویریں جن میں سے علی الترتیب منہ، ناک اور آنکھ محذوف ہے۔ ایک پوری تصویر جس کی بانہیں غائب ہوں (بنے کے بعد بعض مصنفین کا خیال ہے کہ ایک تصویر ایسی بھی ہونی چاہیے جس پر سے آنکھوں کی پلکیں غایب ہوں۔ ایک مصنف ان تمام تصویروں پر ایک میز کی تصویر کا اضافہ کرتا ہے جس کی ایک ٹانگ حذف کردی گئی ہو)

طریق استعمال :- بچے سے اس طرح سوال کیا جائے:- "اس (آدمی کے) چہرہ کی طرف دیکھو۔ (کیا تم) بتا سکتے ہو کہ اس میں کون سی چیز غائب ہے؟" اس کے بعد اور تصویروں کے متعلق اس طرح سوال کیا جائے:- "اس میں سے کیا غائب ہے؟" (ہمیشہ اُس تصویر سے شروع کرنا چاہیے جس کا منہ محذوف ہے۔ اس کے بعد وہ تصاویر جن میں سے علی الترتیب آنکھ، ناک اور بانہیں غائب ہیں دکھائی جائیں)

اگر بچہ ممتحن کے سوال کے جواب میں کہے کہ "بدن غائب ہے" تو ممتحن کو چاہیے کہ اپنے

سوال کو اس طرح دوہرائے: "میرا مطلب یہ ہے کہ چہرے میں سے کیا غائب ہے؟" اور لفظ 'چہرے' پر زور دے (یا اس طرح کہ "میں اس چہرے کی تصویر بنا رہا تھا۔ اس کو پورا کرنے کے لیے کس چیز کی ضرورت ہے؟" یا اس طریقہ سے کہ "اس چہرہ کی تصویر بناتے وقت میں کیا چیز بنانا بھول گیا ہوں؟" ایک طریقہ یہ بھی ہے کہ اس تصویر کو ترک کر کے بغیر ہاتھوں کی پوری تصویر کے متعلق یہی سوال کیا جائے۔ اور اسکے بعد اس تصویر کو پیش کیا جائے) اگر یہ صورت نہ ہو تو اس سے یہ سوال دوبارہ نہ کیا جائے۔

نتیجہ کا تعین:۔ کامیابی کے لیے تین صحیح جوابات کافی ہیں (بقول تول کے آخری تصویر کے لیے "ہاتھ غائب ہیں" یا "انگلیاں غائب ہیں" صحیح تصور کرنا چاہیئے۔ بوبرٹیگ کے نزدیک اس تمام آزمائش میں ۲۰ یا ۲۵ سکنڈ صرف ہونا چاہیے)۔

ان تصاویر کو دکھانے کی ترتیب یہ ہونی چاہیے:۔ (۱) وہ تصویر جس میں بانہیں محذوف ہیں۔ (۲) وہ جس کا منہ غائب ہے۔ (۳) وہ جسکی آنکھ نہیں۔ اور (۴) وہ جس کی ناک کٹی ہوئی ہے۔ لیکن اس میں ایک دقت یہ واقع ہو سکتی ہے کہ اگر اس تصویر سے شروع کیا جائے جس کی بانہیں محذوف ہیں تو بعد کی تصاویر میں بچہ کہہ سکتا ہے کہ جسم اور بانہیں نہیں ہیں۔

اسی طرح بہت احتیاط کے ساتھ باقی کی تمام آزمائشات بھی کی جاتی ہیں۔ اور ہر آزمائش میں کامیابی کے لیے وقت مقرر ہے اسی طرح یہ بھی مقرر ہے کہ کس عمر میں مجموعی آزمائشات میں کتنے میں کامیاب ہونا لازمی ہے۔

عقل کے درجہ کو ذہنی عمر کے لحاظ سے معلوم کیا جاتا تھا۔ اور ذہنی عمر کا تعین ان ہی آزمائشات کے ذریعہ سے ہوتا تھا۔ ایک مثال سے اسکی توضیح ہو سکتی ہے۔ فرض کیجیے کہ ہم ایک آٹھ برس کے بچے کی عقل یا دوسرے الفاظ میں ذہنی عمر کو معلوم کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ سب سے پہلے ہم اس پر وہ آزمائشات کریں گے جو آٹھ برس کی عمر کے لیے مخصوص ہیں۔ ان میں کامیابی کے بعد زیادہ عمر کی آزمائشات کی جائیں گی۔ اگر وہ ان میں ناکام رہے لیکن آٹھ برس اور اس سے کم عمر کی تمام آزمائشوں میں کامیاب رہے تو اس بچے کو لحاظ عقل و ذکاوت کے اوسط درجے کا کہا جائے گا یعنی اسکی اصلی عمر اور ذہنی عمر دونوں آٹھ ہیں۔ لیکن فرض کیجیے کہ وہ آٹھ برس کی آزمائشات کے علاوہ دس برس تک کی عمر کی آزمائشات میں کامیاب ہو جاتا ہے لیکن گیارہ برس کی آزمائشات میں پورا نہیں اترتا تو کہا جائے گا کہ اسکی اصلی عمر تو آٹھ برس ہے لیکن ذہنی عمر دس ہے یعنی وہ بہت ذہین و

ذکی ہے۔ اس کے برخلاف اگر وہ اپنی اصلی عمر کے بجائے صرف چھ برس تک کی آزمائشات میں کامیاب ہو سکتا ہے تو اسکی ذہنی عمر چھ ہوگی یعنی وہ بچہ غبی اور کُند ذہن ہے۔ بعض صورتیں ایسی ہونگی جن میں وہ بچہ اپنی اصلی عمر سے کم اور زیادہ عمر کی آزمائشوں میں سے بعض میں کامیاب ثابت ہوگا اور بعض میں ناکام۔ ایسی حالت میں اس کی ذہنی عمر کا اندازہ اوسط کے لحاظ سے کیا جاتا ہے۔ بالعموم دیکھنے میں یہ آیا ہے کہ اوسط درجہ کا بچہ اپنی اصلی عمر سے کم اور زیادہ عمر کی آزمائشات میں سے بعض میں کامیاب ہو جاتا ہے۔

بعد کے مصنفین اسی درجہ عقل کا اندازہ ذہنی نسبت سے کرتے ہیں۔ اور اسکو ہمیشہ فی صدی میں ظاہر کرتے ہیں۔ اس نسبت کو معلوم کرنے کا ضابطہ یہ تھا:۔ ذہنی عمر / اصلی عمر۔ مثلاً اگر کسی بچہ کی اصلی عمر آٹھ ہے اور اس کی ذہنی عمر چھ ثابت ہو تو اسکی ذہنی نسبت ۶/۸ یعنے ۷۵ فی صدی ہوگی۔ مطلب اس سے یہ تھا کہ یہ بچہ اوسط درجے کے بچے سے (جس کی ذہنی نسبت ۱۰۰ فی صدی ہوگی) ۲۵ فی صدی پیچھے ہے یعنی جو باتیں کہ اوسط درجے کا بچہ تین برس کی عمر میں سیکھ سکتا ہے وہ یہ بچہ چار برس میں سیکھے گا۔ اسی طرح اگر اس کی ذہنی عمر نو ثابت ہو تو اس کی ذہنی نسبت ۹/۸ یعنے ۱۱۲٫۵ فی صدی ہوگی دوسرے الفاظ میں یہ بچہ اوسط درجے کے بچے سے ۱۲٫۵ فی صدی آگے ہے یعنی جو کچھ اوسط درجے کا بچہ ۹ برس کی عمر میں سیکھتا ہے وہی یہ بچہ ۸ میں سیکھ سکتا ہے۔

بادی النظر میں ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ان امتحانات کا لینا بہت سہل ہے اور کوئی خاص بات اس میں نہیں، لیکن پروفیسر بنے لکھتا ہے کہ اسکے لیے بہت سخت احتیاط کی ضرورت ہے۔ چنانچہ اُس نے خود چند احتیاطیں بیان کی ہیں:۔

(۱) ہر آزمائش کے طریق عمل کی پابندی اشد ضروری ہے۔ سوالات کے الفاظ میں کسی قسم کا ردوبدل یا تحریف نہ ہونی چاہیے۔ یہ صحیح ہے کہ یہ تمام الفاظ بہت زیادہ ضروری نہیں لیکن مقابلہ کرنے کے لیے ان کی یکسانیت ضروری ہے۔ ایک نو آموز اور ناتجربہ کار ممتحن کے نزدیک ان الفاظ کی پابندی ضروری نہ ہو لیکن بینے کے نزدیک ان میں تبدیلی کی وجہ سے عمر کے اندازہ کرنے میں فرق پڑ جاتا ہے۔

(۲) غلطیوں پر توجہ، اور انکو معلوم کرنے کی کوشش کرنا بہت ضروری ہے۔ اس کے علاوہ جتنا وقت ہر آزمائش کے لیے مقرر کیا گیا ہے اُس کی پابندی بھی ازبس لازمی ہے۔ اگرچہ بنے اور سیمن خود بعض اوقات کمی و بیشی کو جائز رکھتے تھے لیکن اس کا انحصار آزمائش کی نوعیت پر ہے

بعض آزمائشوں میں وقت کی زیادتی سے کوئی فرق نہیں پڑتا اور بعض کے لیے زیادتی مہلک ہوتی ہے۔

(۳) دوران امتحان میں تنقید و تعلیم سے اجتناب کرنا چاہیے۔ تنقید سے بعض دفعہ طبیعت مکدر اور خود اعتمادی ختم ہو جاتی ہے۔ اور تعلیم سے بچہ کا نقطۂ خیال بالکل بدل جاتا ہے۔ اس کے علاوہ چونکہ اس میں وقت بھی بیکار صرف ہوتا ہے اس لیے بچہ کی توجہ ہٹ جاتی ہے۔ اور اُس کی دلچسپی باقی نہیں رہتی۔

(۴) یہ فرض نہ کرنا چاہیے کہ جو بچہ ان آزمائشوں میں ناکام رہے گا وہ مدرسہ کے فرائض نوشت و خواند بھی انجام نہ دے سکے گا۔ اور یہ خیال بھی نہ ہونا چاہیے کہ جو بچہ کمرۂ امتحان کے باہر ایک کام کر سکتا ہے تو وہ تقریری امتحان میں بھی کامیاب رہے گا۔

(۵) یہ یاد رکھنا چاہیے کہ عقل کی ہر ایک آزمائش جذبات کی آزمائش بھی ہے۔ عقل کی جذباتی حیثیت کو نظر انداز کر دینے سے اندیشہ ہے کہ اوسط درجہ کا بچہ سخت غبی اور بلید ثابت ہو۔ دورانِ امتحان میں خوشی، استعجاب، غرور، خود نمائی، اعتماد وغیرہ جذبات کو برانگیختہ کرنا اور فکر، خوف، غم، نفرت، شرم، ناکامی وغیرہ کے احساس کو دبانا اکثر مفید ہوتا ہے۔

(۶) کمرۂ امتحان کو شان و شوکت اور رعب و داب سے بالکل پاک رکھنا چاہیے۔ بلکہ برخلاف اسکے سلام کرکے، ہاتھ ملا کر، مسکرا کر، یا اسی قسم کے کسی اور طریقہ سے بچہ کو بے تکلف بنانا بھی لازمی ہے۔ اس سے اُس کا خوف و شرم رفع ہوتے ہیں۔

(۷) کمرۂ امتحان میں بچہ اور ممتحن کے علاوہ اور کوئی شخص نہ ہونا چاہیے کیونکہ بعض دفعہ بچہ کسی اور شخص کے سامنے بات کرتے گھبراتا ہے۔ اور بعض دفعہ یہ دوسرا شخص دانستہ یا نادانستہ طور پر اس بچہ کی مدد کرتا ہے۔

(۸) ممتحن کو چاہیے کہ بچہ کی طرف ناقدانہ یا ممتحنانہ نگاہ نہ کرے۔ نہ ایسی نظر سے دیکھے جس سے بچہ ہراساں ہو جائے۔

(۹) اگر کوئی بچہ کسی سوال کا جواب فوراً نہ دے سکتا تھا تو بتقاضے عموماً پانچ یا دس سکنڈ کے بعد اسی سوال کو دوہرایا کرتا تھا۔ اور اس اثنا میں اُسکی ہمت افزائی کے لیے چند کلمات بولتا تھا اور اسی طریقہ سے تمام سوالات کرتا تھا۔

(۱۰) خاموشی اور مسلسل و متواتر گفتگو دونوں مساوی طور پر بچہ پر بُرا اثر کرتے ہیں۔

(۱۱) جن بچوں کا امتحان ہونے والا ہو اُن کو آوارہ نہ پھرنے دینا چاہیے۔ براہ راست

جماعت سے ان کو بلانا بہتر ہے۔ اور اگر وقت کو بچانے کے خیال سے ایک بچہ امتحان کے باہر بٹھایا جائے تو کوئی کتاب یا کھلونا اسکی دلچسپی کے لیے ہونا ضروری ہے۔ اس کے علاوہ بچوں کو تاکید کرنی چاہیے کہ وہ ان سوالات کا ذکر کسی اور سے نہ کریں۔ اس کی بہترین ترکیب یہ ہے کہ غبی اور بلید بچوں کا امتحان پہلے لیا جائے کیونکہ یہ بچے باوجود کوشش کسی اور کی مدد نہیں کر سکتے۔

بنے کی ان آزمائشوں پر غور کرنے سے ہم کو ان چند خصوصیات کا علم ہو سکتا ہے۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ یہ تمام آزمائشات زبان کو سمجھنے اور استعمال کرنے کی قابلیت کو فرض کرتے ہیں۔ کیونکہ تمام سوالات زبانی کیے جاتے ہیں اور جواب بھی زبانی ہی طلب کیا جاتا ہے اس کا مطلب یہ ہے کہ یہ تمام آزمائشات صرف اُس بچہ پر [illegible] ہیں جو زبان سمجھتا اور بول سکتا ہے۔ اسکے علاوہ اسکی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ چوتھے سال کے علاوہ ہر سال کے لیے پانچ پانچ آزمائشات ہیں۔ ایک وقت میں ایک سے زیادہ بچہ کا امتحان نہیں ہو سکتا جس میں [illegible] گھنٹہ سے لیکر پورے ایک گھنٹہ تک وقت صرف ہوتا ہے۔ ذہنی عمر کا تعین ان جوابات کے مطابق ہوتا ہے جو ایک بچہ وقت معینہ میں صحت کے ساتھ دے سکتا ہے۔

ان آزمائشات کے شائع ہوتے ہی تمام ملک میں ان کی دھوم مچ گئی۔ لوگوں نے اسکو قدر کی نگاہوں سے دیکھا۔ اور حکومت نے اسکی قدر کی۔ ہر طرف ان کا شہرہ ہو گیا۔ عوام و خواص سب نے اسکے فیصلہ کو ناطق سمجھا۔ عام قابلیت کا اندازہ کرنے کے لیے ان کو سب سے زیادہ معتبر مانا گیا۔ لیکن کثرت استعمال سے اسکے نقائص روشن ہونے لگے۔ یہی وجہ ہوئی کہ خود بنے کو ان میں تغیرات کرنے کی ضرورت محسوس ہوئی۔ اور اُس نے سوالات کی تعداد کے ساتھ آزمائشات میں بھی تغیرات کیے۔ لیکن امریکی ماہرین نے ان کو بہت حیثیتوں سے ناقص پایا چنانچہ کوہلمان[1]، گوڈرڈ[2]، ٹرمین[3] اور یرکس[4] نے خاص طور پر اسکی طرف توجہ کی اور انکو نئی صورت میں ڈھالنا چاہا۔ ان ماہرین کے نزدیک ان آزمائشات میں مندرجہ ذیل بڑے بڑے نقص تھے:-

(۱) چھوٹی عمر کی آزمائشات بہت آسان اور بڑی عمر کی بہت مشکل ہیں۔ اسکے علاوہ بہت سی آزمائشیں عمر کے مطابق بھی نہیں۔

(۲) ان تمام آزمائشوں کے استعمال اور انکی تدریج کے متعلق ہدایات اس قدر عام ہیں کہ

---

[1] Kuhlman [2] Goddard [3] Terman

[4] Yerkes

ہر محقق و ممتحن اسکو اپنی طرح استعمال کرتا ہے۔

(۳) ان آزمایشوں میں زبان اس درجہ تک استعمال کی گئی ہے کہ یہ اُن بچوں کے لیے بیکار ہیں جو صاف نہیں بول سکتے۔ یا جو بالکل گونگے بہرے ہیں۔ اسکے علاوہ انکو دوسری زبانوں میں اسی خوبی کے ساتھ منتقل نہیں کیا جا سکتا۔

(۴) ذہنی عمر کے تعین کا طریقہ بالکل نامناسب ہے

ٹرمین اور سٹین فرڈ نے پہلے دو نقائص کی طرف توجہ کی اور ذہنی عمر کے تعین کرنے میں انھوں نے جرمن ماہر سٹرن کا تتبع کیا۔ اور اس طرح چوتھے نقص کو رفع کیا۔ ذہنی عمر کے تعین کے لیے اسٹرن نے وہی طریقہ اختیار کیا تھا جس کو ہم نے پہلے کہیں ذہنی نسبت کہا ہے۔ لیکن سٹرن اس کو عقلی خارج قسمت کہا کرتا تھا۔ یرکس نے نقائص (۲) اور (۴) کو رفع کرنے کی کوشش کی۔ تیسرے نقص کو بنے کی آزمائشوں میں تغیر و تبدل کرکے رفع نہیں کیا جا سکتا تھا۔ اس کو دور کرنے کی بہترین ترکیب یہ ہے کہ ایسی آزمایشیں ایجاد کی جائیں جن میں زبان کو دخل نہ ہو۔ لیکن اس کے ساتھ وہ اس قسم کی بھی ہوں کہ بنے کی آزمایشوں کی طرح بطور معیار کے استعمال کی جا سکیں۔ پنٹنر اور پٹرسن نے اس کمی کو پورا کیا اور بعد کے مصنفین و ماہرین نے اس نئے طریقۂ آزمایش میں اصلاحیں کیں۔

قصہ اصل میں یہ تھا کہ ایک موقعہ پر ان دونوں کو بعض ایسے بچوں کا امتحان لینا پڑا جو بہرے تھے۔ اسوقت بنے کے طریقہ کی کمزوری اور خامی ان پر روشن ہوئی اور وہ دونوں عملی آزمائشوں کی ایجاد میں مصروف ہوئے۔ ان کی کوشش بارآور ہوئی اور انھوں نے مختلف ذریعوں سے پندرہ آزمائشیں ایجاد کیں۔ ان آزمایشوں کی نوعیت واضح کرنے کے لیے ہم صرف تین مجملاً بیان کریں گے

ان میں سے ایک طریقہ یہ تھا کہ لکڑی کے ایک تختہ پر مختلف صورتوں کے سوراخ کیے جاتے تھے، اور بچہ کے سامنے وہ تختہ اور اُسکے سوراخوں کے ہمشکل ٹکڑے رکھے جاتے تھے اور اُن سے کہا جاتا تھا کہ ان ٹکڑوں کو انکی شکلوں کے مطابق اس تختہ کے سوراخوں میں رکھ دیں۔ شرط یہ تھی کہ اس تمام عمل میں صرف پانچ منٹ صرف ہوں اور کوئی غلطی نہ ہو۔ یہ آزمائش بہت سے بچوں پر امتحاناً کی گئی اور کامیاب ثابت ہوئی۔ دوسرا طریقہ یہ تھا کہ ایک تصویر کے بعض بعض حصے کاٹ

---

[۱] اگرچہ ان کا ترجمہ جرمنی، روس، سویڈن، ترکی اور جاپان کی زبانوں میں ہو چکا ہے۔ [۲] Stanford

[۳] Paterson [۴] Pintner [۵] Stern

دیے جاتے تھے اور وہ تصویر اور اُسکے کٹے ہوئے ٹکڑے بچہ کے سامنے رکھ دیے جاتے تھے اور وہ بچہ ان ٹکڑوں کو اس تصویر میں موزوں مقامات پر جمانے سے اس کی تکمیل کرتا تھا۔ تیسرا طریقہ یہ تھا کہ لکڑی کے چار مکعب ٹکڑے بچہ کے سامنے رکھے جاتے تھے اور تجربہ کرنے والا اسی قسم کا ایک اور ٹکڑا ان چاروں پر مختلف ترتیب اور مختلف تعداد میں مارتا تھا۔ اور بچہ سے کہا جاتا تھا کہ وہ اسی ترتیب سے اور اسی تعداد میں یہی عمل کرے۔ مثلاً اگر ان چاروں ٹکڑوں کو علی الترتیب ۱-۲-۳-۴-کہا جائے تو تجربہ کرنے والا ۱-۲-۳-۴سے مارتا تھا اور بچہ سے بھی اسی ترتیب سے مارنے کو کہتا تھا۔ اس کے بعد ۱-۲-۳-۴-۲ کی ترتیب سے پھیرا-۲-۴-۱ کی ترتیب سے: اور پھر ۱-۴-۳-۲-۴ کی ترتیب سے۔ اور ہر تجربہ کے بعد بچہ سے اس عمل کو دہرانے کو کہا جاتا تھا۔ اگر وہ بچہ تجربہ کرنے والے کی ہو بہو نقل کر سکتا تھا تو اس کو کامیاب سمجھا جاتا تھا ورنہ ناکام۔

پنسٹر، پیٹرسن، اور اُنکے ساتھیوں نے بہت تجربوں کے بعد معلوم کیا کہ جس طرح معمول کی عمر بڑھتی جاتی ہے اُسی طرح ان آزمایشوں کے کرنے میں دقت اور غلطیوں کی تعداد میں کمی آتی جاتی ہے۔ لیکن اب سوال یہ تھا کہ ان آزمایشوں کے ذریعہ سے ذہنی عمر کا اندازہ کیونکر لگایا جائے؟ یعنی ایک چھ برس کی عمر کے بچے کی ذہنی عمر کس طرح متعین ہوگی؟ اس کا طریقہ انکے نزدیک یہ تھا کہ پہلے انھوں نے چھ برس کے مختلف بچوں پر یہی امتحانات کیے ان میں ۷۵ فی صدی جو بہت ہوشیار ثابت ہوے اُنکو انھوں نے چھ برس کے بچہ کی عقل کا معیار تسلیم کیا۔ اب جو بچہ ان تمام آزمایشوں پر کامیاب ہو جائے جن میں یہ ۷۵ فی صدی بچے کامیاب ہوے تھے تو اسکی ذہنی عمر بھی چھ ہی شمار کی جائے گی یعنی وہ بچہ اوسط درجہ کا ہوگا۔ اسی طرح ہر عمر کے لیے انھوں نے معیار قائم کیے اور ان ہی کے مطابق وہ ذہنی عمر کا اندازہ لگاتے رہے۔ اسکے بعد ان کا طریقہ بالکل بنے کے طریقہ کے مشابہ ہے۔ اگر چھ برس کا بچہ اپنی عمر کی آزمایشوں کے علاوہ زیادہ عمر کی آزمائشوں میں بھی کامیاب ہو جائے تو وہ ذہین و عقیل ہے۔ اور اگر وہ اپنی عمر کی آزمایشوں میں کامیاب نہ ہو بلکہ نیچی عمر کی آزمائشوں میں کامیاب ہو تو وہ غبی اور کند ذہن ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ذہنی عمر کو معلوم کرنے میں اُنھوں نے کسی قسم کا تصرف نہ کیا۔ ان کا سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ اس قسم کی آزمایشات ایجاد کیں جن میں زبان درکار نہیں ہوتی۔ یعنی جو لکھے پڑھے اور ان پڑھ، گونگے اور بہرے ہر قسم کے بچوں پر کی جا سکتی ہیں۔

لیکن بینے کی آزمایشوں اور ان عملی آزمائشوں میں ایک ایسا نقص باقی رہ گیا تھا جس کی طرف اب تک کسی نے توجہ ہی نہ کی تھی۔ ہم نے پہلے بیان کیا ہے کہ بینے کی آزمایشوں کی ایک خصوصیت یہ کہ

کہ اس سے ہر بچہ کا صرف فرداً فرداً امتحان لیا جا سکتا ہے۔ بعینہٖ یہی حال مذکورۂ بالا علمی آزمائشوں کا ہے۔ اگر ہم کو اس جماعت کی من حیث الکل آزمائش کرنی ہے تو یہ طریقے بیکار ہو جاتے ہیں۔ اگر ہم اس جماعت میں سے ہر ایک فرد کا امتحان لیں تو وقت بہت صرف ہوتا ہے۔ لہٰذا ان طریقوں کا استعمال نہیں ہو سکتا۔ اب سوال یہ ہے کہ اگر ایک پوری قوم یا ایک فوج کی ذہنی قابلیت کو معلوم کرنا ہے تو ہم کون سا طریقہ اختیار کریں گے۔ گذشتہ جنگ کی برکتوں میں سے ایک یہ بھی ہے کہ اس قسم کا طریقہ ایجاد ہو جس سے جماعت کی ذہنی قابلیت کا آسانی سے اندازہ ہو سکتا ہے۔ ۱۸-۱۹۱۷ء میں امریکہ کے ماہرین نفسیات کی ایک مجلس نے ان آزمائشات کو باقاعدہ صورت میں پیش کیا اور اسی طریقہ سے امریکہ کی فوجوں اور رنگروٹوں کی قابلیت کا اندازہ کیا جاتا تھا۔ طریقہ یہ ہے کہ جس جماعت کا امتحان لینا مقصود ہوتا ہے اُسکے ہر فرد کو چند مطبوعہ سوالات دیدیئے جاتے ہیں اور اُن سے اُن کا جواب طلب کیا جاتا ہے۔ ہر سوال کو حل کرنے کے لیے خاص وقت مقرر ہوتا ہے کہ اس وقت میں جس قدر کام صحت کے ساتھ کیا جاتا ہے اسکے اندازے سے اس جماعت کی عقلی قابلیت متعین ہوتی ہے۔ اس طریقہ کی نوعیت ذیل کی مثال سے واضح ہو سکتی ہے:۔

شکاگو یونیورسٹی میں یہ آزمائش بہت عام ہے۔ چنانچہ وہاں کے مدارس فوقانیہ کے طلبہ کا اکثر ... طریقہ سے امتحان لیا جاتا ہے۔ طریقہ یہ ہے کہ چھ صفحات کی ایک کاپی کے ہر صفحہ پر چند قسم کے سوالات طبع ہوتے ہیں۔ یہ کاپی ہر طالب علم کو تقسیم کر دی جاتی ہے۔ اور اسکو کھولنے سے قبل کچھ عام ہدایات دی جاتی ہیں۔ مثلاً یہ کہ ممتحن کی اجازت کے بغیر کوئی طالب علم سوالات کے جوابات نہ شروع کرے۔ اسکے بعد جو سوالات کہ صفحۂ آئندہ پر ہوتے ہیں اُن کے متعلق خاص ہدایات دی جاتی ہیں اور وقت مقررہ سے اطلاع دینے کے بعد صفحہ اُلٹنے کو کہا جاتا ہے۔ چنانچہ اس کاپی کے صفحہ ۳ پر یہ آزمائش ہے:۔

(۱) ۱ ۲ ۳ ۴ ۵ ... ۶ ۷ ۸ ۹ ... ۱۰ ۱۱ ۱۲ ۱۳

(۲) ۲۹ ۲۴ ... ۱۴ ... ۹ ۴

(۳) ۲۶ ۲۲ ... ۱۴ ۱۰ ... ۲

(۴) ۶۴ ۳۲ ۱۶ ... ... ۱

(۵) ۱ ۵ ۲۵ ... ۶۲۵ ۳۱۲۵

(۶) ۴۸۶ ۱۶۲ ... ۱۸ ۶ ...

(۷) ۷ ۱۶ ۱۹ ۲۸ ۳۱ ۴۰ ... ...

(۸) ۳ ... ... ۱۸ ... ... ۳۳ ... ... ۵۳

(۹) ۷۲ ... ... ۳۷ ... ... ۲ -

(۱۰) ۸۴ ... ... ۵۴ ... ... ۳۰ ... ...

اس آزمائش کے لیے ہدایات یہ ہیں :-

اگلے صفحہ پر ہندسوں کے دس سلسلے ہیں - ان میں سے بعض ہندسوں کو حذف کر دیا گیا ہے اور ہر ایک ہندسہ کی جگہ تین نقطے لگائے گئے ہیں - ان نقطوں کو محذوف ہندسوں سے پُر کرو - ہر ایک سلسلہ ایک خاص اصول پر وضع کیا گیا ہے - مثال کے طور پر یہ سمجھو کہ ایک سلسلہ ۷ ۸ ۹ ۱۰ ۱۱ ۱۲ ۱۳ ہندسوں کا ہے - اس میں ہر ایک ہندسہ قبل کے ہندسہ میں ایک جمع کرنے سے حاصل ہوتا ہے - اب فرض کرو کہ یہ سلسلہ بجائے مذکورہ بالا سلسلہ کے اس طرح ہوتا :

۷ ۸ ۹ ... ۱۱ ۱۲ ... ۱۴

اس میں سے دو ہندسے غائب ہیں - ان میں ایک کو تم ۹ میں جمع کرنے سے حاصل کر سکتے ہو اور دوسرے کو ۱۲ میں ایک جمع کرنے سے - اسی طرح اگلے صفحہ کے محذوف ہندسوں کو مہیا کرو لیکن یہ یاد رکھو کہ اسکو حل کرنے میں سرعت اور صحت دونوں ضروری ہیں - وقت مقررہ تین منٹ -

اسی طرح ایک صفحہ پر اضدادی الفاظ کی ایک فہرست ہے - اس میں ایک لفظ کے لیے تین مختلف اضداد بیان کیے گئے ہیں - سوال یہ ہے کہ جو موزوں ضد ہو اُسکے سامنے (×) نشان کر دو - اسکے لیے بھی خاص خاص ہدایات ہیں - وقت صرف ایک منٹ ؛ ایک اور صفحہ پر چند ضرب الامثال ہیں - ان میں سے جو متحد المعنی ہیں ان پر S کا نشان کرنا اور جو مختلف المعنی ہیں اُن پر سر کا - وقت مقررہ دو منٹ - باقی دو صفحات پر بھی اسی طرح کی آزمائشات ہیں - انکے لیے بھی خاص ہدایات ہیں اور وقت مقرر ہے - اس طریقہ سے ہم تھوڑی ہی دیر میں ایک پوری جماعت کی آزمائش کر سکتے ہیں -

بعض اوقات یہ معلوم کرنا بھی ضروری ہوتا ہے کہ ایک شخص دو مختلف قسم کی آزمائشوں میں کس حد تک کامیاب ہوتا ہے ، کیا یہ ضروری ہے کہ اگر وہ ایک آزمائش میں بہت ہوشیار ثابت ہوا ہے تو اور آزمائشوں میں بھی ایسا ہی نکلے گا ؟ اگر یہ ضروری نہیں تو ان دونوں آزمائشوں میں اس کی کامیابی کے درجہ میں کیا تناسب ہے ؟ اسی مسئلہ کو اس طرح بھی بیان کیا جا سکتا ہے کہ

کیا یہ ضروری ہے کہ سب سے لمبا آدمی وزن میں بھی سب سے زیادہ ہے؟ اگر کوئی شخص ریاضی میں ہوشیار ہے تو کیا یہ لازمی ہے کہ وہ فلسفہ میں بھی تیز ہوگا؟ اس قسم کے سوالات کا جواب تین مختلف صورتیں اختیار کر سکتا ہے۔ اول تو یہ کہ انسان کے قد اور اس وزن میں اس قسم کی نسبت ہو کہ سب سے لمبا آدمی سب سے زیادہ وزنی بھی ہے اور قد کے گھٹنے کے ساتھ وزن بھی کم ہوتا جائے جب اس قسم کی نسبت ہوتی ہے تو بالعموم قد اور وزن میں بھی علاقۂ علیت فرض کر لیا جاتا ہے اور یہ اصطلاح میں **مثبت تناسب** کہلاتا ہے۔ دوسری صورت یہ ہو سکتی ہے کہ قد اور وزن میں نسبت معکوس ہو۔ یعنی سب سے لمبے آدمی کا وزن سب سے کم ہو اور قد کے گھٹنے کے ساتھ وزن بڑھتا جائے۔ اس حالت میں کسی مخالف العمل علت کی موجودگی کا شبہ کیا جاتا ہے اور اصطلاح میں اسے **منفی تناسب** کہتے ہیں۔ اسی کی تیسری صورت یہ ہو سکتی ہے کہ قد اور وزن میں کسی قسم کی کوئی نسبت نہ ہو۔ یعنی ہم محض قد کو دیکھ کر وزن کے متعلق کوئی حکم نہ لگا سکتے ہوں۔ ان کے تعلقات بالکل اتفاقی ہوں۔ ایسی صورت کو "صفر تناسب" کہا جاتا ہے۔ اس قسم کے تناسبات کو معلوم کرنے کا ایک بڑا فائدہ یہ ہے کہ ہم دو مختلف آزمائشوں کی تصدیق کر سکتے ہیں اور اس طرح ہم یہ بھی معلوم کر سکتے ہیں کہ ہمارے امتحانات عملی مواقع کے کہاں تک مطابق ہیں۔ سوال ہو سکتا ہے کہ جو اشخاص ان آزمائشوں میں اعلیٰ یا ادنیٰ درجہ میں کامیاب ہوتے ہیں کیا بحیثیت ایک ڈاکٹر یا طالب علم کے انکی کامیابی کا درجہ بھی اسکے مطابق ہوتا ہے؟ اس سوال کے جواب سے ہماری مذکورۃ الصدر آزمائشوں کی تائید ہو سکتی ہے اور اس کو صرف اس قسم کے تناسبات ہی سے معلوم کیا جا سکتا ہے۔

ان کو ہم ریاضی کے ضوابط سے معلوم کر سکتے ہیں اس کے دو مختلف طریقے ہیں۔ ایک طریقہ یہ ہے کہ مختلف آزمائشوں میں ایک شخص کا درجہ معلوم کیا جائے۔ پھر ان دونوں درجوں کے فرق کو مربع کیا جائے۔ اسی طریق سے جتنے افراد کے درجوں کے فرق کو مربع کر کے ان سب کو جمع کیا جائے اور حاصل جمع کو ۶ سے ضرب دی جائے۔ اسکے بعد مندرجہ ذیل مقابلے سے تناسب معلوم کیا جا سکتا ہے:-

$$\text{۱} - \frac{\text{۶} \times \text{مربع فرق کا مجموعہ}}{\text{تعداد افراد (تعداد افراد کا مربع - ۱)}}$$

مثلاً فرض کیا جائے کہ ہم نے سات آدمیوں پر دو مختلف قسم کی آزمائشیں کیں اور ذیل کے

نتائج حاصل ہوئے

	پہلی آزمائش میں درجہ	دوسری آزمائش میں درجہ	فرق	فرق مربع
۱-	۳	۵	۲	۴
۲-	۷	۶	۱	۱
۳-	۵	۳	۲	۴
۴-	۲	۱	۱	۱
۵-	۱	۴	۳	۹
۶-	۴	۲	۲	۴
۷	۶	۷	۱	۱
				۲۴

اب تناسب اس طرح معلوم کیا جائے گا :-

$$ا = ۱ - \frac{۶ \times ۲۴}{۷ \cdot (۴۹ - ۱)} = ۱ - \frac{۳}{۲ \times ۷}$$

$$= ۱ - \frac{۳}{۷} = \frac{۴}{۷} = +۵۷۱$$

لیکن اسپیئرمین[ل] کا طریقہ اس سے مختلف ہے۔ وہ صرف اس ترقی کو محسوب کرتا ہے جو ان افراد نے دوسری آزمائش میں کی ہے۔ ان کے تنزل کو وہ بالکل نظرانداز کر دیتا ہے۔ اس کا ضابطہ یہ ہے:-

$$ا - \frac{۶ + \text{ترقیات کا مجموعہ}}{\text{تعداد افراد کا مربع} - ۱}$$

مثلاً ہم نے بیس مختلف افراد پر دو آزمائشیں کیں اور حسب ذیل نتائج برآمد ہوئے :-

	پہلی آزمائش میں درجہ	دوسری آزمائش میں درجہ	درجہ میں ترقی
۱-	۳	۲	۱
۲-	۲	۴	۰
۳-	۴	۱۶٫۵	۰
۴-	۱۶	۱۲٫۵	۰
۵-	۱۰	۱۲٫۵	۰
۶-	۱۱	۱۵	۰

ل Spearman

	۵٫۱۲	۱۵	
۷	۱۸	۱۸ ۹	۰
۸	۵٫۱۲	۶۰	۵٫۵
۹	۱۴	۱۰	۴
۱۰	۹	۶	۳
۱۱	۵	۵	۰
۱۲	۱۶	۵٫۱۶	٫۵
۱۳	۱۹	۱۹	۰
۱۴	۱۵	۱۴	۱
۱۵	۱	۱	۰
۱۶	۶	۸	۰
۱۷	۸	۱۱	۰
۱۸	۲۰	۲۰	۰
۱۹	۷	۷	۰
۲۰	تعداد افراد:- ۲۰		مجموعہ ترقیات:- ۱۵

لہذا تناسب برابر ہے :-

$$۱ - \frac{۱۵ + ۶}{۱ - (۲۰)^۲} = ۱ - \frac{۹۰}{۳۹۹}$$

$$= \frac{۳۰۹}{۳۹۹} = + ۰٫۷۷$$

ان تناسبات کو صحت کے ساتھ معلوم کرنے کے لیے ضروری ہے کہ

(۱) دونوں آزمایشیں ہمیشہ ایک ہی افراد پر کی جائیں

(۲) اُنکی تعداد جہاں تک ہوسکے زیادہ ہو۔

(۳) افراد کا انتخاب کسی خاص اصول کی بنیاد پر نہ کیا جائے، بلکہ ان میں ہر قسم کے اشخاص ہوں۔

(۴) ہر آزمایش میں اس فرد کا درجہ نہایت احتیاط سے معلوم کیا جائے ورنہ ظاہر ہے کہ تناسب میں فرق پڑ جائے گا۔ اسی طریقہ سے معلوم کیا گیا ہے کہ پڑھنے کی آزمایشوں اور جماعات کی تحریری آزمایشوں میں … کا تناسب اپنی تقریبا مثبت، اور بچے کی آزمایشوں اور ریاضی کی قابلیت کی آزمایشوں …

۴۴ ، + کا - اسکے برخلاف مخصوص قابلیتوں کے درمیان عموماً "صفر تناسب" ہوتا ہے -

یہاں تک ہم نے عقل کے درجہ کو معلوم کرنے کے لیے مختلف آزمائشوں اور امتحانوں کا ذکر کیا ہے - ہم نے یہ دیکھا ہے کہ وہ کون کون سے طریقے ہیں جن سے عقل کا صحیح اور اصلی درجہ معلوم کیا جا سکتا ہے - اس تمام بحث میں اکثر قارئین کے دل میں یہ خیال پیدا ہوا ہوگا کہ یہ تو سب ٹھیک ہے کہ ہم عقل کی آزمایش و پیمایش کرسکتے ہیں اور ممکن ہے کہ ہمارے نتائج صحیح بھی ہوں لیکن یہ عقل جسکی آزمایش و پیمایش کی جا رہی ہے ، کیا چیز ہے ؟ یہ اعتراض ایک حد تک صحیح بھی ہے - کیونکہ جب تک ہم کو عقل کی ماہیت و نوعیت کا علم نہ ہو اُسوقت تک یہ تمام بحث بیکار ہے - ہم نے اب تک دانستہ عقل کی ماہیت کے متعلق کچھ نہیں کہا - وجہ یہ تھی کہ اگر شروع ہی میں عقل کی تعریف کی جاتی یا اس کی ماہیت کو واضح کرنے کی کوشش کی جاتی تو ہم کو بہت زیادہ کامیابی نہ ہوتی - اور اس تعریف سے عقل کی ماہیت معلوم کرنا بالکل ناممکن ہوتا - اب جبکہ ہم نے اسکی آزمایش اور پیمایش کے مختلف طریقے دیکھ لیے ہیں ہم پر یہ روشن ہو گیا کہ کن کن اور کس کس قسم کی باتوں اور کاموں سے عقل کا درجہ معلوم کیا جا سکتا ہے - لہذا اب ان آزمایشوں پر ایک نگاہ ڈالنے سے ہم کو عقل کے اجزاء کا علم ہو سکتا ہے -

سب سے پہلی بات تو ہم کو یہ معلوم ہوتی ہے کہ ان آزمائشوں میں عامل معمول سے مختلف اور متفرق معلومات کے متعلق سوال کرتا ہے اور اس سے ان سوالات کے صحیح جوابات کا امیدوار رہتا ہے - وہ اُس سے اشیاء کے نام دریافت کرتا ہے ، ایک مربع شکل کی نقل کرواتا ہے ، ایک بیان کی تائید یا تردید کرواتا ہے ، دو اشیاء کی مشابہت و اختلاف کے متعلق سوال کرتا ہے - ان سوالات سے ہم نہایت آسانی کے ساتھ اس نتیجہ پر پہونچ سکتے ہیں کہ عقل دراصل متفرق کاموں کو صحت کے ساتھ کرنے کا دوسرا نام ہے - یہ تعریف بظاہر کافی تسلی بخش معلوم ہوتی ہے لیکن اس پر ایک اعتراض یہ وارد ہو سکتا ہے کہ اگر متفرق کاموں کو صحت کے ساتھ کرنے ہی کا نام عقل ہے تو عقیل و ذہین اور غبی اور بلید میں امتیاز کس طرح ممکن ہے ؟ ایک بچہ ان آزمایشوں میں اعلیٰ نمبروں پر کامیاب ہوتا ہے اور دوسرا کامیاب تو ہو جاتا ہے لیکن ادنیٰ درجہ میں - ان دونوں بچوں میں کیا فرق ہے ؟ اگر ہم ان آزمایشوں پر غور کریں تو ہم کو معلوم ہوگا کہ جو بچہ اعلیٰ درجہ میں کامیاب ہوتا ہے اُس میں بعض خصوصیات ہوتی ہیں جو ادنیٰ درجہ میں کامیاب ہونے والے بچہ میں نہیں ہوتیں - اعلیٰ درجہ میں کامیاب ہونے والا بچہ ان خصوصیات سے فائدہ اُٹھاتا ہے اور عقیل و ذہین کہلاتا ہے - دوسرا اُن سے محروم ہوتا ہے اور اس لیے بدنام ہو جاتا ہے - ان خصوصیات کو "عقل کے عام اجزاء" کہتے ہیں - یہ اجزاء کیا ہیں ؟

اس کا جواب سطور ما بعد میں آئے گا۔
اس میں کسی کو کلام ہی نہیں ہوسکتا کہ ان تمام آزمایشوں میں کامیابی گذشتہ تجربہ پر منحصر ہوتی ہے۔ آٹھ برس کا بچہ پندرہ برس کی عمر کے سوالات کا جواب صرف اس لیے نہیں دے سکتا کہ موخرالذکر کا تجربہ بہت وسیع ہوتا ہے اور مقدم الذکر کا محدود۔ ورنہ دیسے دونوں عمروں کے سوالات کے لیے کسی خاص تعلیم و تربیت کی ضرورت نہیں ہوتی۔ صرف وہی معلومات جو عام روزمرہ زندگی میں حاصل ہوتی ہیں۔ ان سوالات کے جواب دینے کے لیے کافی ہیں۔ اور گذشتہ عمر میں تجربات کی وسعت مختلف ہوتی ہے۔ لیکن صرف یہی کافی نہیں ہوتا کہ اس بچہ کو گذشتہ عمر میں تجربات حاصل ہوے ہوں، بلکہ اس بات کی بھی ضرورت ہوتی ہے کہ وہ تجربات اس کے ذہن و دماغ میں محفوظ رہیں۔ کیونکہ اگر یہ اس طرح محفوظ نہ رہیں تو ان کا ہونا نہ ہونا دونوں برابر ہیں۔ اور اس طرح وہ بچہ کسی ایسے سوال کا جواب نہیں دے سکتا جو اسکے گذشتہ تجربہ پر موقوف ہے۔ لیکن تجربات کا ذہن میں محفوظ رہنا ذہن کی اُس قوت پر منحصر ہوتا ہے جس کو اصطلاح میں خازنیت کہا جاتا ہے۔ دوسرے الفاظ میں عقل کیلیے لیے خازنیت کا ہونا لازمی ہے۔ یعنی یہ اس کا ایک جزو ہے۔

ایک آدمی تکلیف اُٹھاکر اور بڑا مشقت سہکر روپیہ جمع کرتا ہے۔ لیکن بوقت ضرورت اُسکو سلیقہ کے ساتھ خرچ نہیں کرسکتا۔ اور اس لیے اُسکو روپیہ سے کوئی معتدبہ فائدہ نہیں پہونچ سکتا اسکے لیے روپیہ کا ہونا اور نہ ہونا دونوں برابر ہیں۔ روپیہ کا فائدہ صرف اُس وقت ہوتا ہے جب اُسکو ڈھنگ سے خرچ کیا جائے۔ بعینہ یہی کیفیت اُس شخص کی ہوتی ہے جس کا تجربہ بھی وسیع ہے اور تجربہ کی وسعت کے مطابق اُسکی معلومات بھی وافر ہیں، لیکن اپنے اس تجربہ اور معلومات سے فائدہ اٹھانا، بوقت ضرورت ان کو استعمال کرنا، اور آڑے وقت میں ان سے مدد لینا نہیں جانتا۔ اس کا تجربہ اور وسعت معلومات دونوں بیکار ہیں۔ اس کا ذہن ہر قسم کے تجربات کا خزانہ ہے، لیکن وہ گویا کنجوس کا روپیہ ہے جس کا کوئی مصرف نہیں۔ اس عالم کا علم ہے جس سے اوروں کو فیض نہیں پہونچتا۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ عقل کے لیے صرف یہی نہیں کافی ہے کہ گذشتہ تجربات ذہن میں محفوظ رہیں بلکہ یہ بھی ضروری ہے کہ اس شخص میں انکو استعمال کرنے اور کام میں لگانے کی قابلیت بھی ہو۔ اُسکو یہ بھی معلوم ہونا چاہیے کہ وہ اپنے گذشتہ تجربات میں جزئی تغیرات کرکے ایک کڑی مشکل کو ٹال سکتا ہے۔ اگر وہ ان آزمایشوں میں گرفتار ہے تو اُس میں یہ صلاحیت ہونی چاہیے کہ اپنے گذشتہ تجربات سے مدد لے کر اُن سے نجات پائے۔ عامل جو کچھ اس سے کہ دیتا ہے

وہ اگرچہ اسکے گذشتہ تجربات سے ذرا مختلف ہوتا ہے لیکن نہ اتنا کہ اس کا گذشتہ تجربہ بیکار ہو جائے۔ ان آزمایشوں میں کامیابی کے لیے ان کے اصلی نکتہ کو معلوم کرنا اور پھر اسکے مطابق اپنے گذشتہ تجربہ میں تغیر و تبدل کرنا ازبس ضروری ہے۔ جو شخص یہ کر سکتا ہے وہی اور صرف وہی اپنی عملی زندگی میں کامیاب بھی ہو سکتا ہے یا دوسرے الفاظ میں وہی عقلمند کہلانے کا مستحق ہو سکتا ہے۔ اسی تمام بحث کو اس طرح بھی بیان کیا جا سکتا ہے کہ اس شخص میں تعلقات معلوم کرنے اور ان تعلقات کے مطابق رد عمل کرنے کی قابلیت ہونی چاہیے۔ اور یہی عقل کا دوسرا اہم جزو ہے۔ اسکی بہترین اور واضح ترین مثال ان آزمایشوں میں ملتی ہے جہاں معمول سے لکڑی کے ٹکڑوں کو موزوں و مناسب سوراخوں میں رکھنے کو کہا جاتا ہے۔ اگر وہ بچہ ان لکڑی کے ٹکڑوں اور سوراخوں میں تعلقات مشابہت و اختلاف معلوم کر سکتا ہے تو کوئی وجہ نہیں کہ وہ ان آزمایشوں میں کامیاب نہ ہو۔ اس خاص آزمایش ہی پر کیا موقوف ہے زندگی کی اکثر مشکلات اسی نوع کی ہوا کرتی ہیں۔

مذکورہ بالا اجزاء کے علاوہ مصیبت، ابتلا و امتحان کے وقت گھبراہٹ، پریشانی اور ہراسانی کو دور رکھنا اور ناکامی کا مردانہ وار مقابلہ کرنا بھی ضروری ہوا کرتا ہے۔ ثابت قدمی، اور ایک حد تک ضد اور ہٹ دھرمی بھی عقل کی علامت ہوتی ہے۔ لیکن حد سے گذر جانے کے بعد تو میٹھی چیز بھی کڑوی ہو جاتی ہے۔ حد سے زیادہ ثابت قدمی اور ہٹ دھرمی بیوقوفی اور کم عقلی کی غمازی کرتی ہے۔ اگر ایک بچہ لکڑی کا گول ٹکڑا لے کر اسکو مربع سوراخ میں رکھنے کی کوشش کرے اور اس کوشش میں بہت دیر تک ثابت قدم رہے تو اسکو کوئی شخص عقلمند نہ کہے گا۔ عقلمند اسی وقت کہا جائے گا جب وہ کچھ کوشش کے بعد کسی اور ٹکڑے کو اس سوراخ میں رکھے۔ معقول فعل وہی ہوتا ہے جس میں "سعی و خطا" کی خصوصیات پائی جائیں جس میں "ثبات قدم با اختلاف مساعی" یعنی کوشش میں ثابت قدمی ہو اور کامیابی کے حاصل کرنے کے وسائل میں اختلاف۔ یہ عقل کا تیسرا جزو ہے۔

اس تمام بحث پر نظر واپسیں ڈالنے سے معلوم ہوگا کہ عقل کا درجہ دراصل منحصر ہوتا ہے تجربہ کی وسعت اور اس تجربہ کو استعمال کرنے کی قابلیت پر۔ جس شخص کا تجربہ بھی وسیع ہے اور وہ اس کو مناسب موقعوں پر استعمال بھی کر سکتا ہے وہی زیادہ عقلمند بھی ہے۔ لیکن تجربہ کو وسیع تر بنانے کے لیے جبلت استعجاب کا ہونا ضروری ہے۔ کیونکہ اس کی بدولت ہم ایک چیز یا مرقع کو دیکھ کر اسکی طرف کھنچ جاتے ہیں اور اسکی طرف توجہ کرنے سے ہماری معلومات میں اضافہ ہوتا ہے اور ہماری

حرکات میں زیادہ پختگی پیدا ہو جاتی ہے - اور یہی جیسا کہ ہم اوپر دیکھ چکے ہیں ہماری عقل کے اساسی اجزا ہیں - یعنی یہ کہ جبلت استعجاب عقل کا چوتھا جزو ہے - مختصر یہ کہ عقل میں پانچ مختلف اجزا کا ہونا ضروری ہے:

(۱) وسعت تجربہ

(۲) خازنیت

(۳) تعلقات کو معلوم کرنا اور انکے مطابق افعال و اعمال میں تغیر و تبدل کرنا -

(۴) "ثبات قدم با ختلافات مساعی"

(۵) جبلت استعجاب -

اب ہم نہایت آسانی کے ساتھ عقل کی قابل فہم تعریف کر سکتے ہیں - گذشتہ بیانات کو مدنظر رکھ کر ہم کہہ سکتے ہیں کہ "فردی تجربات کی بنا پر نئے اعمال کے نئے طریقوں کے اکتساب اور انکی تکمیل کی قابلیت کا نام عقل ہے" عضویاتی نقطۂ نظر سے اس قابلیت کیلئے ہمارے اجسام کی عصبی ساخت میں بعض شرائط کا ہونا ضروری ہے - مثلاً :-

(۱) مرکزی نظام عصبی میں متبادل عصبی راستے ہوں - یہ شرط اس طرح پوری ہو سکتی ہے کہ مرکزی عصبانیوں[1] کے ساتھ ایسے ملحقات ہوں جو انکو دیگر ادنیٰ اور اعلیٰ عصبانیوں سے ملا دیں -

(۲) ان ملحقات کے تعلقات بہت زیادہ اثر و تشکل پذیر ہوں - یعنی یہ کہ بعض اتصالی تعلقات اس قدر مستقل و متعین نہ ہوں کہ ایک عصبی تہیج ہمیشہ ایک ہی راستے میں منتقل ہو -

(۳) متبادل اتصالات[2] کی مقاومت و مزاحمت قابل تغیر ہو - یعنی اگر کسی وقت ایک راستہ بہت شدید مزاحمت کا باعث ہو تو بعد میں وہی راستہ خفیف ترین مزاحمت پیدا کرے -

انسان کے نظام عصبی کے اعلیٰ مراکز اور خصوصاً مخ کے قشر[3] میں بہت سے پیچیدہ تعلقات کا ایک

---

[1] ہمارا مرکزی نظام عصبی بہت سی ابتدائی بناوٹوں کا مجموعہ ہوتا ہے - ان میں سے ہر ایک بناوٹ کو عصبانیہ (یا انگریزی میں Neurone) کہتے ہیں - اس میں ایک خلیہ ہوتا ہے جس سے مختلف صورتوں کے ریشے خارج ہوتے ہیں - خلیہ اور اسکے ریشوں کے مجموعہ کو عصبانیہ کہا جاتا ہے - اسکی تین قسمیں ہوتی ہیں - ایک عصبانیہ احساسی ہوتا ہے جسکے ذریعے احساسی تہیج آلۂ حس سے مرکز کی طرف جاتا ہے؛ دوسرا حرکی عصبانیہ ہوتا ہے جسکے ذریعے یہ تہیج عضلات کی طرف آتا ہے - اور ایک قسم ہوتی ہے جو احساسی اور حرکی عصبانیوں کو آپس میں ملاتے ہیں - انکو مرکزی عصبانیہ کہتے ہیں - [2] دو عصبانیوں کے قریب قریب ہونے کو اتصال یا انگریزی میں Synapse کہا جاتا ہے - [3] دماغ کے دو حصے ہوتے ہیں ایک کو مخ کہتے ہیں اور دوسرے کو مخیخ - ان دونوں کے اوپر ما کستری مادہ کا ایک پتلا سا غلاف ہوتا ہے - اسی غلاف کو اصطلاح میں قشر (یا انگریزی میں Cortex) کہتے ہیں -

خلقی نظام ہوتا ہے اور اس نظام میں متبادل راستوں کی بہت بڑی تعداد ہوتی ہے جن سے مذکورہ بالا شرائط پوری ہوتی ہیں قشر کے اسی ترکیب کی وجہ سے انسان میں اور انواع حیوانات کے مقابل میں عقل زیادہ ہوتی ہے۔

انسان کی بعض صفات ذاتی ہوتی ہیں اور بعض اکتسابی۔ بعض ایسی ہوتی ہیں جو کسی خارجی احوال کے اثرات کا نتیجہ نہیں ہوتیں اور بعض کو وہ شخص اپنی کوشش سے حاصل کرتا ہے۔ انسان کا قد اور اُس کا رنگ ذاتی صفات ہیں اور گانے یا پڑھنے لکھنے کی قابلیت اکتسابی ہوتی ہے۔ عام خیال یہ ہے کہ اکتسابی خصوصیات اور صفات نسلاً بعد نسلٍ متوارث نہیں ہوتیں، اگرچہ لامارک ان کو بھی متوارث سمجھتا ہے۔ لیکن ماہرین حیاتیات بالعموم اس سے انکار کرتے ہیں۔ اسکے برخلاف ذاتی صفات متوارث ہوتی ہیں۔ عقل کو بھی ذاتی صفات میں شمار کیا جاتا ہے اور اس سے لازمی نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ یہ بھی متوارث ہوتی ہے ہم کو یہ یاد رکھنا چاہیے کہ عقل ان معلومات پر منحصر ہوتی ہے جن کو ایک شخص اپنی گذشتہ عمر میں حاصل کر چکا ہے۔ لیکن عقل کے عام اجزاء، یعنی خازنیت اور تعلقات کے جوابات دینے کی قابلیت، استقلال اور ثبات قدم وغیرہ یقیناً ذاتی ہیں۔ اس لحاظ سے کہا جا سکتا ہے کہ عقل بھی ذاتی ہوتی ہے اور اس لیے متوارث ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ کیا کوئی شہادت اس قسم کی موجود ہے جو ہمارے اس بیان کی تائید کرے؟ بعض مصنفین کے نزدیک تو عقل کے متوارث ہونے کی شہادت بالکل قطعی ہے۔

ایک شخص کا درجۂ عقل ان معنوں میں ذاتی اور خلقی کہا جا سکتا ہے کہ وہ شروع سے لیکر آخر تک اس کا ساتھ دیتا ہے۔ کلیہ یہ ہے کہ جو بچہ اوائل عمر میں تیز اور ذہین ہوتا ہے وہ اواخر عمر میں بھی تیز اور ذہین ثابت ہوتا ہے۔ اور اسکے برعکس جو شروع ہی سے غبی اور کند ذہن ہو وہ بڑا ہو کر بھی ویسے کا ویسا ہی رہتا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ بعض مثالیں ایسی بھی ملتی ہیں جن پر اس کلیہ کا اطلاق نہیں ہوتا لیکن ان مستثنیات کی تعداد اس قدر قلیل ہے کہ ان کی وجہ سے اس کلیہ کو رد نہیں کیا جا سکتا۔ ایک امیر کا غبی اور بلید بچہ باوجود کوششوں کے ذہین نہیں بن سکتا۔ اسکے برخلاف غریب کا بچہ مقویات دماغ استعمال کیے بغیر ہی دن دونی رات چوگنی ترقی کرتا ہے اس اختلاف کی آخر علت کیا ہے؟ ظاہر ہے کہ دونوں کی عقل کے درجے مستقل ہیں ان میں کوئی تغیر و تبدل نہیں ہو سکتا۔ دونوں کے عقلی خارج قسمت شروع سے لیکر آخر تک مستقل رہتے ہیں۔

Lamarck

اسکے علاوہ دو توام بچے یا ایک ہی والدین کے دو یا زائد بچے آپس میں ہمشکل ہوتے ہیں۔ ان کے ہمشکل ہونے کو بالعموم خلقی کہا جاتا ہے۔ اسی طرح وہ بلحاظ ذہنی خصوصیات بھی ایک دوسرے کے مشابہ ہوتے ہیں۔ اسکو بھی یقیناً خلقی ہی کہا جائیگا۔ وہ اجزاو جو مجموعی حیثیت سے عقل کہلاتے ہیں ذہنی خصوصیات ہیں لہذا عقل بھی ذاتی اور خلقی ہوتی ہے اور اس لیے متوارث ہے۔

اسی طرح بعض مثالیں اس قسم کی ملتی ہیں جن میں ضعف عقل خاندانی ہوتا ہے دیگر خاندانی خصوصیات کی طرح یہ بھی ہر پشت کے افراد میں پایا جاتا ہے۔ یہ ممکن ہے کہ بعض مثالوں میں کیسی مرض یا پیدایش کے وقت کسی بے احتیاطی کا نتیجہ ہو۔ لیکن عام طور پر اس قسم کے مرض یا بے احتیاطی کے بغیر بھی بچہ ضعیف العقل ثابت ہوتا ہے۔ گویا یہ خصوصیت اسکی سرشت میں ہوتی ہے۔ اور مزید تحقیقات سے یہ معلوم ہو سکتا ہے کہ اس بچہ کے خاندان میں کہیں نہ کہیں ایک فرد ایسا تھا جو ضعیف العقل تھا۔ اور اُس کا ضعف عقل اس بچہ کو بطور ترکہ و ورثہ کے ملا۔ جس صورت میں والدین اوسط درجہ کی عقل کے ہوں اور اُن کے اسلاف میں ضعف عقل کی علامات نہ ہوں تو یہ تقریباً ناممکن ہے کہ انکے بچے ضعیف العقل ہوں لیکن اگر والدین کے اسلاف میں کوئی ضعیف العقل ہو تو بچہ کا ضعیف العقل ہونا کچھ بعید نہیں اگرچہ ہو سکتا ہے کہ خود والدین میں اس قسم کا نقص موجود نہ ہو۔ اگر والدین میں سے ایک ضعیف العقل ہے تو بعض بچے ضعیف العقل ہونگے اور بعض قوی العقل۔ اور اگر دونوں ضعیف العقل ہیں تو اسکا یقین ہونا چاہیے کہ تمام بچے ضعیف العقل یا کم از کم کند ذہن ہونگے۔

بعض محققین اس ضعف عقل کو ماحول کا اثر بتاتے ہیں۔ لیکن یہ توجیہ کچھ زیادہ تسلی بخش نہیں۔ بلحاظ ماحول ایک ہی خاندان کے مختلف بچوں میں کوئی اختلاف نہیں ہوتا لیکن باوجود اس یکسانیت ماحول کے بعض بچے ضعیف العقل ہوتے ہیں اور بعض قوی العقل۔ اگر ضعف عقل ماحول کا نتیجہ ہوتا تو تمام بچے ضعیف العقل ہونا چاہیے تھے۔ اس بات کا ہم کو خیال ہونا چاہیے کہ ایک ہی والدین کے بچوں میں خلقی خصوصیات میں مشابہت کے ساتھ اختلاف بھی ہو سکتا ہے۔ چنانچہ یہ سب کو معلوم ہے کہ بلحاظ جسمانی خصوصیات کے بچوں میں بعض اختلافات ہوتے ہیں۔ بعینہ یہی حالت انکی ذہنی خصوصیات کی ہوتی ہے کہ جزئی طور پر وہ ایک دوسرے سے مختلف ہوتے ہیں بحیثیت مجموعی ایک دوسرے کے مشابہ۔

اس قسم کے دلائل سے یہ ثابت کیا گیا ہے کہ درجۂ عقل اکتسابی نہیں ہوتا۔ بلکہ خلقی یا ذاتی ہوتا ہے۔ ہماری عقل شروع سے لیکر آخر تک مستقل رہتی ہے۔ اس میں کوئی تغیر و تبدل نہیں ہوتا۔ اسکی اصلاح و تہذیب کی ہر کوشش ناکامی پر ختم ہوتی ہے۔ اس کا انحصار زیادہ تر والدین اور دیگر اسلاف پر

ہوا کرتا ہے۔

ایک عام خیال ہے کہ عقل کو دماغ کی جسامت سے بہت گہرا تعلق ہے۔ یعنی جس قدر بڑا دماغ ہوتا ہے اسی قدر زیادہ عقل ہوا کرتی ہے۔ اس میں شک نہیں کہ بالعموم ایسا ہی ہوتا ہے لیکن بطور کلیہ کے اسکو پیش نہیں کر سکتے۔ کیونکہ دماغ کی جسامت جسم کی جسامت کے مطابق ہوتی ہے۔ چنانچہ ہاتھی کا وزن انسان کے دماغ سے ساڑھے تین گنا بڑا ہوتا ہے اور ویل مچھلی کا پانچ گنا۔ انسان کے دماغ کا اوسط وزن ۱۴۰۰ گرام ہے، ہاتھی کے دماغ کا ۵۰۰۰ گرام اور ویل مچھلی کا ۷۰۰۰ گرام۔ اس کا مطلب یہ ہونا چاہیے کہ ویل مچھلی میں سب سے زیادہ عقل ہو اور اس سے کم ہاتھی میں۔ لیکن جو تعریف ہم نے عقل کی اوراق سابق میں کی ہے اسکے مطابق ہم کہاں کہہ سکتے ہیں کہ ویل مچھلی اور ہاتھی میں انسان سے زیادہ عقل ہوتی ہے؟ اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ بڑا دماغ عقل کا مترادف نہیں۔ اس خیال کے نقص کو یہ کہکر رفع کرنے کی کوشش کی گئی کہ عقل کی زیادتی جسم اور دماغ کی جسامت کی نسبت پر موقوف ہوتی ہے۔ چنانچہ بندر کا دماغ اسکے جسم کے مقابلہ میں بڑا ہے اسی واسطے اس میں اور حیوانات کے مقابلہ میں عقل زیادہ ہوتی ہے۔ انسان کا دماغ جسم کے مقابلہ میں بندر کے دماغ سے بھی بڑا ہوتا ہے۔ لہذا اس میں بندروں سے زیادہ عقل ہوتی ہے۔ لیکن تحقیقات سے معلوم ہوا کہ بعض گانے والے پرندوں کا دماغ انکے جسم کے مقابلہ میں انسان کے دماغ سے بڑا ہوتا ہے اس کا نتیجہ یہ ہونا چاہیے کہ ان میں انسان سے بھی زیادہ عقل ہو۔ لیکن یہ بھی غلط ہے۔ اسکے ساتھ ساتھ یہ بھی پیش نظر رکھنا چاہیے کہ افراد انسانی کے دماغوں کے اوزان مختلف ہوتے ہیں۔ ہیرک[1] کے خیال کے مطابق بالغ العمر مردوں کے دماغ کا اوسط وزن ۱۳۶۰ گرام اور عورتوں کے دماغ کا ۱۲۵۰۔ بے وقوفوں اور پاگلوں کے دماغوں کا وزن ۳۰۰ گرام سے لیکر ۲۰۲۸ تک پایا گیا ہے۔ اسکے علاوہ بعض نہایت قابل اشخاص کے دماغوں کا وزن اوسط سے کم پایا گیا ہے۔ اگرچہ بالعموم انکے دماغوں کا وزن اوسط سے زیادہ ہی ہوتا ہے۔ چنانچہ بائرن کا دماغ کا وزن ۱۸۰۷ گرام تھا۔ تھیکرے کا ۱۶۵۸ گرام؛ کانٹ کا ۱۶۰۰؛ شیلر کا ۱۵۸۰ گرام اور ڈانٹے کا ۱۴۲۰ گرام۔ اسی طرح انسان کی مختلف اقوام کے دماغوں کا اوسط وزن بھی مختلف ہوتا ہے۔ چنانچہ جرمن دماغوں کا اوسط وزن ۱۴۲۵ گرام ہوتا ہے؛ انگریزوں کا ۱۳۴۶ گرام اور فرانسیسیوں کا ۱۲۸۰ گرام (یعنی عام انسانی دماغ کے اوسط وزن سے کم) اس تمام بحث کا مطلب یہ ہے کہ محض دماغوں کے اوزان سے ہم عقل کا اندازہ نہیں لگا سکتے۔ بلکہ عقل کی زیادتی یا کمی کے لیے جسامت کے علاوہ کچھ اور اسباب بھی

---

[1] Herick

بھی ہونا چاہیے - چنانچہ ان میں سے ایک سبب یہ ہے کہ قشر کی بناوٹ زیادہ نازک اور دقیق ہو۔ دماغی فعلیت ہمیشہ شجریوں[1] اور "انتہائی برش"[2] پر موقوف ہوتی ہے - یہ سب کے سب جا کر قشر میں متصل ہوتے ہیں۔ انھیں کی دقت و نزاکت سے عقل میں کمی یا زیادتی ہوتی ہے - یہ ظاہر ہے کہ اس سے وزن میں کسی قسم کا کوئی فرق نہیں پڑتا - مختصر یہ کہ عقل دماغی قشر کی بناوٹ پر موقوف ہوتی ہے -

اوراق گذشتہ میں ہم نے عقل انسانی پر مختلف حیثیتوں سے بحث کی ہے - ہم نے یہ معلوم کیا ہے کہ ہم کس طرح اسکو معلوم کر سکتے ہیں، اس کی ماہیت کیا ہے، عملی زندگی میں کس قسم کی عقل کی ضرورت ہوتی ہے وغیرہ - لیکن ایک عجیب بات ہے کہ زمانۂ حال کے مصنفین حیوانات میں بھی عقل کے وجود کو تسلیم کرتے ہیں۔ اب سوال یہ ہے کہ اگر یہ خیال صحیح ہے تو عقل انسانی اور عقل حیوانی میں کیا فرق ہے؟ یا دوسرے الفاظ میں عقل انسانی اور عقل حیوانی کی امتیازی خصوصیات کیا کیا ہیں؟ اگر ان میں عقل ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ بھی گذشتہ تجربہ سے فائدہ اُٹھا سکتے ہیں۔ ان میں بھی خانہ نیت ہوتی ہے، وہ بھی تعلقات کو معلوم کرکے اسکے مطابق اپنے افعال و اعمال میں تغیر کر سکتے ہیں، ان میں بھی "ثبات قدم باختلاف مساعی" ہوتی ہے؛ جبلت استعجاب ان میں بھی کارفرما ہوتی ہے - اگر یہ صورت ہے تو عقل کو انسان کے ساتھ کہاں تک مخصوص کیا جا سکتا ہے؟ اس بحث کو شامل کرنے سے مضمون کی طوالت میں اور اضافہ ہو جائے گا - لہذا ہم اس پر کسی آیندہ فرصت میں اپنے خیالات کا اظہار کریں گے - یار زندہ صحبت باقی -

معتمد ولی الرحمن
مددگار پروفیسر تعلیم جامعہ عثمانیہ سرکار عالی حیدرآباد دکن

---

[1] عصبانیوں کے نکلے ہیں سے جو ریشے نکلتے ہیں موتے ہیں اُن میں سے بعض کی شکل درخت کے تنہ کی سی ہوتی ہے - یعنی ایک لمبا ریشہ ہوتا ہے اسکو اصطلاح میں محوریہ (Axon) کہتے ہیں - اور بعض ریشوں کی شکل درخت کی شاخوں کی سی ہوتی ہے انکو شجریہ (یا انگریزی میں Dendrite) کہا جاتا ہے - گویا عصبانیہ، محوریہ، شجریہ اور خلیہ کا مجموعہ ہوتا ہے - ہر عصبانیہ میں محوریہ صرف ایک ہوتا ہے -

[2] جب ایک عصبانیہ دوسرے کے قریب واقع ہوتا ہے تو محوریہ کا آخری حصہ ایک برش کی سی شکل اختیار کر لیتا ہے - اسی کو اصطلاح میں انتہائی برش کہتے ہیں - اسی کی وجہ سے دو عصبانیوں میں تعلقات پیدا ہوتے ہیں -

جسونت راؤ ہولکر

احمد شاہ ابدالی اور باجی راؤ کا ورق زمانہ اُلٹ چکا۔ ملہر راؤ ہولکر اور مادھوجی سندھیا کے دن گذر گئے۔ شجاع الدولہ اور نجیب الدولہ کی کہانی تقویم پارینہ ہوگئی۔ ہندوستان کا مظلوم بادشاہ آنکھیں کھو کر لال قلعہ میں نظر بند ہے۔ اور دہلی کا راج دولت راؤ سندھیا کے نائبوں کے ہاتھ میں ہے۔

چشم ما کندہ شد از جور فلک بہتر شد تا نہ بینیم کہ کند غیر جہانداری ما

پنجاب میں سکھوں نے قدم جما لیا۔ اودھ کا صوبہ دار دہلی سے باغی ہوا اور کلکتہ سے خاک لا کر اپنا کعبہ جدا بنانے کی فکر میں ہے۔ بنگال اور مدراس پر "ایسٹ انڈیا کمپنی" کی ہیبت طاری ہے۔ بندیلکھنڈ میں پیشوا کی اولاد باندہ کی نوابی پر سرفراز ہے۔ حیدرآباد کا نظام الملک "کردلا" کی پہاڑی پر کھویا ہوا علاقہ واپس لیکر سلطنت میسور کے تاراج کرنے کی فکر کر رہا ہے۔ دکن کی سب سے زیادہ زبردست قوت یعنی پونا کا دربار انقلاب کی کشاکش میں گرفتار ہے۔ مادھوراؤ پیشوا خودکشی کر چکا اور اب "نانا فرنویس" رگھوبا کے لڑکے باجی راؤ کو مسند پیشوائی پر مستقل کرنے کے لیے جوڑ توڑ لگا رہا ہے۔ اوجین کا عیش پسند دولت راؤ سندھیا نوجوانی میں مادھوجی کی کمائی پاکر داد عشرت دے رہا ہے۔ بمبئی اور کلکتہ کی تجارتی کمپنیوں کا ستارہ عروج پر ہے اور وہ دن قریب ہے کہ ہندوستانی رئیسوں کی خانہ جنگیاں زہرہ کو مہتاب بنا دیں!!

ایسے نازک وقت میں ملک کی بدقسمتی سے ایک شجاع اور مدبر فرماں روا جو اپنے دبدبے وسط ہند میں امن قائم کیے ہوئے تھا دنیا سے رخصت ہو جاتا ہے اور تیس برس سے اہلیا بائی کے سلیقۂ جہانداری اور تُکوجی کی نیازمندی اور وفاداری نے جو چین آرام مالوہ کی رعایا کو نصیب کر رکھا تھا اُسکے بھی دن پورے ہوتے ہیں۔ اندور کی ریاست میں جنگ وجدال کا عہد شروع ہوتا ہے اور ایک ایسا جفاکش جنرل میدان میں آتا ہے جسکے عروج و زوال کی دلچسپ داستان انقلابات عالم کی ایک حیرت انگیز تصویر ہے!!

تُکوجی ہولکر کے چار لڑکے تھے جن میں سے کاشی راؤ اور ملہر راؤ برادری کی بیوی سے تھے اور جسونت راؤ اور وٹھوجی ایک بیرونی محل سے۔ کاشی راؤ کے حقوق وراثت

لہ یہ درد ناک شعر خود شاہ عالم کا ہے۔ جہاں پناہ شاعر تھے اور آفتاب تخلص تھا۔

بوجہ فرزند اکبر ہونے کے فائق تھے لیکن اُس کا دماغ کمزور تھا۔ صحت جسمانی درست نہ تھی اور کھیری کی لڑائی میں اُس کا طرزِ عمل نہایت مشتبہ ثابت ہوا تھا۔ اہلیا بائی کو یقین تھا کہ یہ لڑکا ریاست کا مستقل حاکم ہونے کے قابل نہیں ہے اور اُس کی تجویز تھی کہ تُوکوجی کے بعد کاشی راؤ مہیسر میں رہے اور دفتر و خزانہ کی نگرانی جو اہلیا بائی کے ذمہ تھی اس لڑکے کے سپرد کی جائے اور فوج کی سرداری ملہار راؤ کو دی جائے۔

جب تک اہلیا بائی زندہ رہی تُوکوجی نے اس رائے سے مخالفت نہیں کی مگر اپنی مُربّیہ کی وفات کے بعد اُس کا خیال بدل گیا۔ اور اُسکے ہاتھ کے لکھے ہوئے چند خطوط دستیاب ہوئے جو اُس نے اپنی بیماری کے زمانہ میں کاشی راؤ کو لکھے تھے اور ایک میں یہ عبارت تھی کہ "میں نے سندھیا کو تمھاری مدد کے لیے ہموار کر لیا ہے۔ تم فوراً آؤ تاکہ میری زندگی میں حکومت تمھارے سپرد کر دی جائے"۔ اس ارشاد کی تعمیل میں کاشی راؤ مہیسر آیا اور خلعت ولیعہدی سے سرافراز ہوا۔ اُس کا ایک خط مورخہ "۸۔ نومبر ۱۷۹۶ء روز سہ شنبہ" ریاست میں موجود ہے جس میں اُس نے اپنے ایک دوست کو لکھا تھا کہ "میرا باپ سخت بیمار رہے اور میں تیزی سے کوچ کرکے اُسکے دیدار کو آیا ہوں۔ باپ نے مجھ کو خلعت ولیعہدی عطا فرمایا ہے۔ لیکن میرا بھائی ملہار راؤ خفا ہو کر کہیں چلا گیا۔ معلوم نہیں کہ اُس کا کیا ارادہ ہے۔ اگر پیشوا کی خدمت میں شکایت لیکر پہونچا ہو تو اُس کی نگرانی کرتے رہو"۔

تُوکوجی کا خاتمہ ہوا تو اُسکی وصیت کے مطابق کاشی راؤ مسند نشین کیا گیا مگر ملہار راؤ نے دربار پونا کے رکن اعلیٰ "نانا فرنویس" سے اپنی مدد کا وعدہ حاصل کر لیا تھا اور ریاست کی فوج کا بڑا حصہ اُسی کا طرفدار تھا۔

کاشی راؤ نے دیوان سرجی راؤ گھاٹگیا کو (جو اپنی خوبصورت لڑکی دولت راؤ کے نکاح میں دینے کا وعدہ کرکے ریاست سندھیا کے سیاہ و سفید کا مختار ہو گیا تھا) منت سماجت سے اپنا ہوا خواہ بنا لیا تھا اور پونا کے دربار میں کاشی راؤ کے حقوق بہت زور شور سے بیان کیے گئے۔ کاشی راؤ خود بھی پونا پہونچا اور وہاں نانا فرنویس اور گھاٹگیا کی مخالفت کاشی راؤ اور ملہار راؤ کی آڑ میں ظاہر ہونے لگی !!

گھاٹگیا نطرت و چالاکی میں نانا سے بہت زیادہ تیز تھا۔ اُس نے اپنے فریق کی کامیابی کے لیے یہ داؤں کیا کہ کاشی راؤ اور ملہار راؤ کے درمیان صلح کرا دی اور "بیل بھنڈارے" کی قسم کھائی گئی کہ

دونوں بھائی باہم اتفاق سے رہیں گے اور ایک دوسرے کے خلاف فتنہ پردازی نہ کریں گے۔ تاتا مطمئن ہوگیا مگر جس دن یہ عہد و پیمان ہوئے اُسی رات کو سندھیا کی قواعد داں فوج نے ملہر کا خیمہ گھیر لیا۔ جب صبح کو ملہر راؤ بیدار ہوا تو پتہ چلا کہ اُس نے دھوکا کھایا۔ قول قرار نمائشی تھے۔ اور دشمن نے موقع پاکر اُسکے ڈیرہ پر پہرا بٹھا دیا ہے۔ وہ فوراً گھوڑے پر سوار ہوا۔ مگر قبل اسکے کہ مدافعت کے لیے اپنے ہمراہیوں کو آواز دے سکے اُس کی پیشانی پر ایک گولی لگی۔ جس نے اُس کی پر ارمان زندگی کا خاتمہ کر دیا۔ اُسکے جان نثار سپاہی بھی قتل کیے گئے۔ اور اُنھیں میں ایک بہادر روی راؤ تھا جس کی حسرتناک موت تاریخ کے صفحوں پر اس وجہ سے مشہور ہوئی کہ اُسکی وفادار بیوی اپنے شوہر کی ناگہانی خبر موت سنتے ہی چیخ کھا کر زمین پر گر پڑی اور اُسی وقت اپنے مقتول شوہر کے پاس دوسرے عالم میں پہونچ گئی۔

ملہر راؤ کی جس قدر فوج پونا میں موجود تھی (اور جسکی تعداد تین چار ہزار کے درمیان تھی) منتشر کر دی گئی۔ خیمہ و خرگاہ لوٹ لیا گیا۔ اور اُسکی حاملہ بیوی کو سندھیا نے اپنی حراست میں لیلیا۔ البتہ تُکوجی کے دو لڑکے جسونت راؤ اور ایٹوجی اس قتل عام سے جان بچا کر بھاگ گئے۔[۱]

اس دغابازی کے انعام میں کاشی راؤ نے ۲۶ لاکھ کی دستاویزیں جنکا اہلیا بائی کے وقت سے ریاست اُجین پر بار تھا سندھیا کو واپس کر دیں اور گولی بارود کی قیمت کے نام سے پندرہ لاکھ روپیہ نذر کیا۔[۲]

کم عقل کاشی راؤ سمجھا ہوگا کہ بیگناہ بھائی کا خون بہا کر وہ بہ اطمینان مہیسر میں راج کرے گا لیکن اُس نے خیال نہ کیا کہ سب راجوں کا راجہ جو اپنے ایک اشارہ سے تمام دنیا کی سلطنتیں بناتا اور بگاڑتا ہے اس دغابازی و بدعہدی کو دیکھتا تھا اور اس کی سرکار میں داد خواہوں کی فریاد رسی کے لیے کسی رشوت کی ضرورت نہ تھی!!!

بترس از آہِ مظلوماں کہ ہنگام دعا کردن اجابت از درِ حق بہرِ استقبال می آید

احکم الحاکمین نے رنجیدہ و افسردہ جسونت راؤ کو اس خونی میدان سے محفوظ نکال کر ایسی بہادری

---

[۱] ڈف گرانٹ - تاریخ مرہٹہ جلد سوم - صفحہ ۱۴۸

[۲] اہلیا بائی نے اپنے ابتدائی عہد میں مادھوجی سندھیا کو ۳۰ لاکھ روپیہ قرض دیا تھا اور ۶ لاکھ روپیہ ملہر راؤ کی آشنا ہورنکا بائی سے دلایا تھا - مادھوجی نے اس قرض کی رسید لکھ دی تھی لیکن روپیہ واپس کرنے کا غالباً ارادہ نہ تھا - یہی دستاویزیں اُسوقت کاشی راؤ نے واپس کر دیں - ۱۲

اور جو اخروی عطا فرمائی کہ چند ہی روز میں کاشی راؤ اور اُسکے تمام ہوا خواہوں کو چھٹی کا دودھ یاد آگیا!!

بہرحال اسوقت تو کاشی راؤ فتحمندی کے نشہ سے جھومتا تھا۔ عاقبت کی خبر خدا جانے!!

جسونت راؤ یہاں سے فرار ہو کر گنتی کے چند سواروں کے ساتھ گرتا پڑتا ناگپور پہونچا اور وہاں کے راجہ رگھوجی بھونسلا سے پناہ چاہی۔ مگر بھونسلا کو شک تھا کہ اس مظلوم راجکمار کے پاس کچھ قیمتی جواہرات ہیں، جو ناگپور کے تخت و تاج کی زینت بڑھا سکتے ہیں۔ اور اسکے علاوہ دربار پونا اور ریاست سندھیا کے مسرور کرنے کے لیے جسونت راؤ سے بیش قیمت کوئی تحفہ نہ تھا۔ اس لیے ان سب مصالح مالی و ملکی کو پیش نظر رکھ کر بھونسلا نے اس بیکس کو گرفتار کرلیا!!

جسونت راؤ چھ مہینے تک قید خانہ میں رہا۔ مگر ہوا مٹھی میں کیونکر بند ہوسکتی ہے۔ وہ موقع پاکر بھاگا۔ لیکن پھر گرفتار ہو گیا۔

جیتے ہیں تو اک روز لپٹ جائیگا یار سے — ہمت نہیں ہارا ہے دلِ زار ابھی تک

چند ہی روز کے بعد اُس نے نگراں محافظوں کو غافل پایا اور ایسی احتیاط سے فرار[1] ہوا کہ راجہ کو خبر بھی نہ لگی اور وہ خاندیس پہونچ گیا!! وہاں گرگاؤں میں ملہرراؤ کا گرو چمنا بھاؤ رہتا تھا۔ اُسکو یہ ہمت تو نہ تھی کہ جسونت راؤ کو اپنی حمایت میں رکھ سکتا، لیکن اُس نے تین سو روپیہ نقد اور ایک گھوڑی "لنکا" نامی چیلے کی نذر کی اور مالوہ کی طرف اشارہ کرکے بتایا کہ اسکی ترقی کا راستہ اُدھر ہے۔ جسونت راؤ نے یہ امداد شکریہ کے ساتھ قبول کی۔ لیکن یکایک مالوہ میں داخل ہونے کی ہمت نہ کرکے دو تین مہینے تک لکرندہ کے بھیلوں کے ساتھ اپنی زندگی کی خبر چھپاتے رہا۔ جب یہاں بھی اطمینان کی صورت نظر نہ آئی تو بروانی ہوتا ہوا دھرم پور پہونچا جو نربدا کے کنارے ریاست دہار کا ایک مقبوضہ شہر تھا۔

انند[2] راؤ پوار اُسوقت دہار کا راجہ تھا۔ مخبروں نے اطلاع کی کہ جسونت راؤ دھرم پور

[1] جسونت راؤ اس مرتبہ ایک مسلمان سپاہی شاہ محمد نام اور ایک محرر بھوانی شنکر کی مدد سے فرار ہوا تھا۔ شاہ محمد تو چند روز میں مرگیا لیکن بھوانی شنکر کو بہت کچھ عروج نصیب ہوا - ۱۲

[2] جسونت راؤ پوار ریاست دہار کا راجہ پانی پت کی لڑائی میں کام آیا تھا، اُس کا لڑکا کھنڈی راؤ باپ کی موت کے وقت صرف ڈھائی برس کا تھا۔ ریاست کا انتظام ایک برہمن مادھو راؤ اور یکار کے ہاتھ رہا۔ اُس زمانہ میں ہمسایہ ریاستوں نے دہار کا بہت علاقہ چھین لیا۔ کھنڈی راؤ کی شادی گووند راؤ گائیکوار (دیکھیے صفحہ ۴۶)

میں ہے تو راجہ نے اپنی شرافت سے اس مظلوم کے لیے خلعت و پالکی روانہ کی اور اپنے ملازموں کو ہدایت کی کہ راجکمار کو بہ آرام دھار پہونچا دیں اور اُسکی کل ضرورتوں کی کفالت کریں۔

اُسوقت جسونت راؤ کی مفلسی کا یہ عالم تھا کہ اُسکے پاس پوشاک بدلنے کو جوڑا نہ تھا۔ اور اُسکے ہمراہی بھی نیم برہنہ تھے۔ راجہ کی مہربانی سے انکو کپڑا میسر آیا۔ اور دو تین مہینے تک جسونت راؤ کسی قدر اطمینان سے دھار میں مقیم رہا۔ اُسکے مقتول بھائی کے پُرانے نمکخوار بھی یہاں جمع ہونے لگے۔ لیکن سب شکستہ حال تھے۔ اور اُنکی اعانت جسونت راؤ کی خالی جیب پر سخت بار تھی۔

اتفاق سے اسی زمانہ میں ریاست کے سابق دیوان رنگ راؤ اوریکار نے جو بڑی مشکل سے دھار سے نکالا گیا تھا پٹھانوں اور پنڈاریوں کی جماعت لیکر راجہ پر حملہ کر دیا۔ "کسور" کے مقام پر لڑائی ہوئی اور آنند راؤ حالت بگڑی ہوئی دیکھ کر پیچھے ہٹنے لگے لیکن جسونت راؤ نے جو اُسوقت میدانِ جنگ میں اپنے میزبان کی مدد کے لیے موجود تھا ایک پرچہ لکھ کر اوریکار کے ہمراہی پنڈاریوں کے پاس بھیجا جس کا مضمون یہ تھا کہ "جسونت راؤ ہولکر پوار کے ساتھ ہے اور پنڈاریوں سے جو اُس کے گھرانے کے قدیم ہمدرد ہیں التجا کرتا ہے کہ وہ اوریکار کا ساتھ چھوڑ دیں"۔ پنڈاریوں کو پہلے تو اس خبر کا یقین نہ آیا مگر جب قاصد نے قسم کھائی تو اُنھوں نے لڑائی سے ہاتھ کھینچ لیا اور دھار کی توپیں جو اُنکے قبضہ میں آ چکی تھیں چھوڑ دیں۔ پنڈاری پیچھے ہٹ گئے مگر پٹھان بدستور لڑتے رہے۔ جسونت راؤ نے خود اُن پر فیر شروع کیا اور اوریکار کے لشکر کو سخت ہزیمت دی۔ راجہ بیحد ممنون ہوا۔ مگر جسونت راؤ نے اس خدمت کے معاوضہ میں صرف یہ انعام مانگا کہ اُسکو دھار میں پناہ دی جائے اور وہ دشمنوں کے حوالے نہ کیا جائے!!

اس لڑائی کی شہرت دور پہونچی اور سندھیا کو معلوم ہو گیا کہ مقتول ملہر راؤ کا بھائی دھار میں زندہ سلامت موجود ہے اُس نے آنند راؤ کو دھمکی دی کہ جسونت راؤ گرفتار یا خارج البلد نہ کیا گیا تو دھار کا علاقہ خاک سیاہ کر دیا جائے گا۔ آنند راؤ سخت مشکل میں تھا۔ نہ سندھیا سے مقابلہ کی طاقت تھی نہ ہولکر سے وعدہ خلافی کی جرأت۔ جسونت راؤ نے یہ عقدہ سنا تو اپنی شرافت ظاہر کی اور اعلان کر دیا کہ وہ اپنے مہربان دوست کا علاقہ تباہ کرانا نہیں چاہتا اسلیے دھار سے چلا جائے گا۔ راجہ نے دس ہزار روپیہ سے مدد کی اور سات گھوڑے بھی عنایت فرمائے۔

(بقیہ حاشیہ ص۳۵) کی لڑکی سے ہوئی اور اُنکا بیٹا آنند راؤ جو اپنے باپ کے مرنے سے چھ مہینے بعد پیدا ہوا تھا، ۱۰ سال کی عمر تک بڑودہ میں رہا وہ جب دھار واپس آیا تو یہاں کے دیوان رنگ راؤ اوریکار نے بہت مخالفت کی مگر بالآخر راجہ کامیاب ہوا اور دیوان ریاست سے نکالدیا گیا۔

جسونت بہت مغموم و افسردہ دہار سے رخصت ہوا۔ اسوقت اُسکے ساتھ صرف چودہ سوار تھے جن میں سے سات تو اُن گھوڑوں پر تھے جو راجہ دہار نے عنایت فرمائے تھے اور سات ایک دوسرے مرہٹہ سردار کے تھے جو ادجکمار کی قسمت کا شریک ہوگیا تھا۔ ان سواروں کے علاوہ تقریبًا اکیس نیم مسلح پیادے بھی اُسکے ہمراہ تھے جو اُسکے بھائی کے نمکخوار تھے اور جنکا مال و اسباب پونا میں لُٹ چکا تھا۔ یہ مختصر جماعت نہایت حسرت و فکر کے ساتھ دہار سے جا رہی تھی اور سردار سوچتا تھا کہ دنیا میں شاید اُسکے لیے کوئی جگہ امن کی باقی نہیں ہے مگر قسمت کی دیوی مسکرا رہی تھی کہ عنقریب ستارۂ اقبال طلوع ہوتا ہے اور ہمیشہ کا مسند ریاست پامال ہوا چاہتا ہے !!

ذرہ بھی چمک کے ہو ستارہ　　قائم جو زمین و آسماں ہے

جب یہ مصیبت زدہ گروہ دیپال پور کے قریب پہونچا (جو دریاے چمبل کے کنارے ریاست اندور کا ایک شہر تھا) تو جسونت راؤ نے اپنی قسمت آزمانے کے لیے اس شہر پر اچانک حملہ کردیا یہاں کاشی راؤ کے سو مسلح سوار حفاظت کے لیے متعین تھے لیکن سرکش جسونت نے اس دلیری سے دھاوا کیا کہ سواروں کے ہاتھ پاؤں پھول گئے۔ سب فرار ہوئے یا قتل کیے گئے۔ اور جسونت راؤ کو اُنکے نفیس گھوڑے مال غنیمت میں ملے۔ اُس نے شہر کے باشندوں سے بھی کچھ رقم وصول کی۔ اور اُسی دن سے غارتگری کے سلسلہ کا آغاز ہوا۔

معترض کہتے ہیں کہ یہ لوٹ مار اُسکی شرافت کے شایاں نہ تھی۔ لیکن یہ غور نہیں کرتے کہ اپنے بھائی کے خون کا بدلہ لینے اور اپنی آبائی ریاست کو سندھیا کے پنجہ سے نکالنے کی اُسکے پاس کوئی تدبیر سوا اسکے نہ تھی کہ دشمنوں سے مال چھین کر ملازم رکھے اور کاشی راؤ کو جو سندھیا اور اُسکے دیوان کے ہاتھ میں کٹھ پتلی کی طرح ناچ رہا تھا نیز دیگر ملہر راؤ کے نابالغ بچے کھنڈی راؤ کو جو باپ کے قتل ہونے کے بعد پیدا ہوا تھا اور اپنی پیدائش کے وقت سے سندھیا کا قیدی تھا آزاد کرا کے موروثی مسند ریاست پر بٹھلائے۔

سندھیا سے جسونت راؤ کو قطعی عداوت تھی اور اسوقت اندور کی کل ریاست کاشی راؤ کی نالائقی سے سندھیا کے قابو میں تھی۔ لہذا جسونت راؤ دیپال پور اور نیز دیگر اضلاع اندور کے لوٹنے میں حق بجانب تھا۔ یہ سب علاقہ دشمن کا ملک تھا۔ اور اس کی تاخت و تاراج میں اُس زمانہ کے جنگی اصول کے مطابق کوئی اخلاقی ممانعت نہ تھی۔ جسونت راؤ نے دہار چھوڑنے سے قبل ایک مُہر[1] تیار کرائی تھی جس پر "جسونت راؤ فدوی سوائی کھنڈی راؤ" کندہ تھا۔ اور یہ تاریخی واقعہ

[1] ملکم صاحب کی یادداشت مالوہ جلد ۱ صفحہ ۱۶۵۔

اس دعوے کا ثبوت ہے کہ وہ خود ریاست کا دعویدار نہ تھا بلکہ اپنے مظلوم اور بیکس بھتیجے کو اُسکے جائز حقوق دلانا چاہتا تھا۔ اور جو دشمن اس کار ثواب میں مزاحم ہوتے تھے انکو قتل وغارت کرنے میں دریغ نہ کرتا تھا۔

بہرحال دیپال پور کی لوٹ سے کچھ مال جسونت راؤ کے ہاتھ آیا اور اُس نے فوج بھرتی کرنا شروع کی جس میں پنڈاری۔ بھیل۔ افغان۔ مرہٹے اور راجپوت وغیرہ سب شامل تھے۔ وہ اِس فوج کو لیکر جاورہ اور مہدی پور گیا۔ لیکن وہاں کے عاملوں نے امداد نہ کی۔ البتہ جاورہ کے حاکم نے تو اسکو گرفتار کرنے کی کوشش کی۔ وہ یہاں سے ہٹ کر سارنگ پور پہونچا جہاں ایک سید وزیر حسن نام نے (جو پہلے ہولکر کی سرکار میں ملازم تھا) اس بہادر کا ساتھ دیا۔ اور مالوہ کے شرفا میں سے یہ پہلا شخص تھا جو جسونت راؤ کی قسمت کا شریک ہوا۔

سید کے پاس چالیس پچاس سوار اور دو تین سو پیدل تھے۔ وہ اُس نے جسونت راؤ کی خدمت میں پیش کیے اور پانچ ہزار روپیہ نقد بھی حاضر کیا۔ اور اسکے علاوہ سب سے بڑی خدمت یہ کی کہ جسونت راؤ کی ملاقات سنبھل ضلع مرادآباد کے ایک بہادر سردار امیر خاں سے کرادی جو کسی زمانہ میں پیشوا کا ملازم تھا۔ اور بعد کو ریاست بھوپال میں اپنا مستقر بنا کر مرہٹوں سے جنگ و جدل شروع کی تھی۔ اور اُسوقت پندرہ سو منتخب سوار اُسکے ہمرکاب تھے جنھوں نے قریب وجوار کے علاقہ میں آفت برپا کر رکھی تھی۔

اسی زمانہ میں جسونت راؤ کو خبر ملی کہ اُس کا بھائی اٹھوجی جو پونا سے ٹھیراؤ کے قتل کے بعد فرار ہوا تھا اور پیٹ پالنے کے لیے ڈاکوؤں کے ایک گروہ میں شامل ہو گیا تھا پیشوا کے قبضہ میں آگیا۔ اور بے رحم باجی راؤ نے اس مظلوم بیکس کو ہاتھی کے پاؤں سے بندھوا کر پہلی اپریل ۱۸۰۱ء کو شارع عام پر کچلوا دیا!!

یہ دردناک خبر سنکر جسونت راؤ کی آنکھوں میں خون اُتر آیا۔ اور اُس نے پیشوا اور سندھیا کو تباہ کرنے کی قسم کھائی۔ سید وزیر حسن کی سلسلہ جنبانی سے امیر خاں شجاع الپور آیا اور رانا گنج کے مقام پر جسونت راؤ اور امیر خاں سے پہلی ملاقات ہوئی۔ باہمی شرائط فوراً طے ہو گئے۔ امیر خاں نے وعدہ کیا کہ وہ جسونت راؤ کا ساتھ کسی حال میں نہ چھوڑے گا۔ اور ہولکر نے ایک تحریر دی کہ آیندہ جسقدر مال غنیمت حاصل ہو یا جو علاقے فتح کیے جائیں اُس میں امیر خاں کا نصف حصہ ہوگا۔

مالوہ دشمنوں کے قبضہ میں تھا اس لیے سب سے پہلے اُسی پر ہاتھ صاف کیا گیا۔ شجا علپور کے عامل سے ۰ ہزار وصول کیا۔ سوداگروں کے ایک قافلہ سے ۴۰ ہزار کا کپڑا لوٹ لیا۔ سندھیا کے علاقوں کو برباد کیا۔ ہنڈیا کو تباہ کر دیا۔ کسوارو میں کاشی راؤ کی فوج کو شکست دی اور چار توپیں چھین لیں جنھوں نے اُس کی فوجی قوت میں چار چاند لگا دیے!!

اسکے بعد مہیسر کا رخ کیا مگر کامیابی کی صورت نہ دیکھ کر ستواس گیا جہاں سات توپیں اور دستیاب ہوئیں۔ کاشی راؤ کی فوج بددل ہونا شروع ہوئی۔ اُس کا فرانسیسی افسر "شولیر ڈیوڈرینک" اپنی قواعد داں فوج لیکر جسونت راؤ سے آملا۔ اور چند مہینوں کے اندر جسونت راؤ کا پایہ اس قدر مضبوط ہو گیا کہ اُس نے کنڈی راؤ کی طرف سے حکومت اندور کا اعلان کر دیا۔

اب وہ بغیر کسی مزاحمت کے مہیسر پہونچا۔ راج محل پر قبضہ کیا اور اہلیا بائی کی جمع کی ہوئی دولت اُسکے ہاتھ آئی۔

تین مہینے مہیسر میں قیام کرکے وہ برکن چلے گیا جہاں اُسکی فوجی چھاؤنی تھی۔ ایک روز نشانہ بازی کی مشق کر رہا تھا کہ بندوق دفعتہً پھٹ گئی اور اسکی ایک آنکھ جاتی رہی۔ لیکن تیز دل راجہ کو اس تکلیف کی کیا پروا تھی صحت کے بعد ہی امیر خاں کو "نواب" کا خطاب دیکر ہاتھی گھوڑے خلعت اور جواہرات سے سرافراز کیا اور اُسکو مشرقی اضلاع سے "چوتھ" وصول کرنے کے لیے روانہ کیا۔

نئے نواب نے راجہ دیواس سے ایک لاکھ روپیہ وصول کیا "اگر" کو تاک سیاہ کر دیا۔ برسیہ۔ سرونج۔ ساگر اور انکے درمیان کا کل علاقہ لوٹ لیا۔ ساگر پیشوا کے قبضہ میں تھا اور یہاں کی فوج نے مقابلہ کی ہمت کی تھی اسلیے ہر ایک محلہ لوٹا گیا اور تیس دن تک شہر کے کسی نہ کسی حصہ میں آگ کے شعلے بلند ہوتے رہے۔ چار پانچ سو آدمی قتل ہوئے لیکن سارا شہر تباہ کر دیا گیا اور رعایا کے پاس کسی قسم کا مال نہیں چھوڑا گیا۔ یہاں تک کہ کنوؤں اور تالابوں میں بھی جال ڈال کر جو کچھ مل سکا نکال لیا۔

ساگر کے عامل نے راجہ ناگپور سے مدد مانگی۔ اور وہاں سے فوج اس قدر تیزی کے ساتھ

لہ ایک معتبر راوی کا بیان ہے کہ پچاس برس پہلے تک اندور کے قرب و جوار میں بھاٹ ایک گیت گایا کرتے تھے جس میں جسونت راؤ کے اس جسمانی نقص کی طرف اشارہ تھا۔ اُسکے چند الفاظ یہ ہیں :-

"جسونت راؤ مردانا۔ اُسے کون کہے کانا۔ بجانے سے چھید کے روٹی کھانا"

آئی کہ جب تک وہ لشکر ساگر سے چند میل کے فاصلہ پر نہ پہونچ گیا امیر خاں کو اس امداد کی اطلاع نہ دی۔ جس وقت اس لشکر کی آمد کی خبر ملی امیر خاں دو تین ہزار سوار لیکر مقابلہ کے لیے نکلا۔ لیکن اُسکی فوج کا بڑا حصہ اُس دولت کو محفوظ کرنے کے لیے جو ساگر کی لوٹ سے ہاتھ آئی تھی، بھوپال کی طرف چلا گیا۔ امیر خاں رات کو ساگر واپس آیا تو معلوم ہوا کہ ساری فوج غائب ہے۔ مجبور ہو کر اُس نے اپنے خیمہ و خرگاہ کو آگ لگا دی اور راگھڈھ کی طرف ہٹ گیا۔ اُسکے پاس نہ تو شب باشی کے لیے ڈیرا تھا اور نہ پوشاک بدلنے کو کپڑا۔ راگھڈھ کے حاکم نے مدد کی اور وہاں کے ایک ساہوکار سے بھی کچھ روپیہ لیا گیا۔ اسکے بعد امیر خاں کے بھائی کریم الدین نے شجا علپور کو لوٹ کر اس نقصان کا معاوضہ کیا۔

امیر خاں کے فتوحات دیکھ کر بعض فتنہ پردازوں نے جسونت راؤ کو بدظن کرنا چاہا۔ اور راجہ کو سمجھایا کہ یہ پٹھان مالوہ کو لوٹ کر ہولکر کے راج پر بھی قبضہ کرنے کی کوشش کرے گا۔ راجہ نے ایک سردار امیر خاں کو گرفتار کرنے کے لیے بھیجا۔ مگر اس بہادر کو کچھ خوف نہ تھا

تو پاک باش برادر مدار از کس باک زنند جامۂ ناپاک گازراں بر سنگ

وہ صرف سو سواروں کی جمعیت سے مہیسر پہونچا اور اپنی تلوار راجہ کو نذر کرکے کہا کہ "آپ سے بد باطنوں نے میری شکایت کی ہے لیکن میں تلوار آپ کی خدمت میں پیش کرتا ہوں اور قسم کھاتا ہوں کہ یہ ہتھیار ہمیشہ آپ ہی کے کام میں استعمال ہوگا۔" جسونت راؤ خاموش ہو گیا لیکن اُسکے دل میں شک باقی تھا۔ دوسرے ہی دن امیر خاں تن تنہا اُسکے حضور میں گیا اور اپنا خنجر نذر کرکے عرض کی کہ "آپ کو میری وفاداری پر شبہہ ہے تو بہتر ہے کہ اسی خنجر سے مجھ کو ہلاک کر دیں۔ میں اپنا خون معاف کرتا ہوں اور مجھ کو بہت خوشی ہوگی اگر آپ کو یقین آجائے کہ میری جان لینے سے آپ کی ریاست کو فائدہ پہونچا۔"

جسونت راؤ شرمندہ ہوا۔ امیر خاں کو گلے لگایا۔ پچھلے خیالات کی معافی چاہی اور دونوں نے باہمی مشورہ سے سندھیا سے مقابلہ کرنے کی تدبیر سوچنا شروع کی جو اس عرصہ میں جنگ کے لیے تیار ہو گیا تھا اور اُسکی فوج نے ریاست ہولکر کی طرف پیشقدمی کا آغاز کر دیا تھا۔

راجہ اور نواب نے ہمت کرکے سندھیا کی ہراول فوج کو شکست دی لیکن ستواس کے مقام پر خفیف زک اُٹھائی اور پھر پوری طاقت سے اُجین پر حملہ کیا جو سندھیا کا دار السلطنت تھا۔ آٹھ دن تک جنگ کا سلسلہ جاری رہا۔ آخرکار سندھیا کی کل فوج جو اُجین کے پاس تھی قتل ہوئی

دارالسلطنت مفتوح ہوا اور اس دولت مند شہر سے تاوان جنگ وصول کرنے کی وہی تدبیر کی گئی جو نادرشاہ نے دہلی میں اختیار کی تھی یعنی محلہ محلہ کا نیلام کر دیا گیا اور ٹھیکہ دار جسقدر روپیہ اپنے اپنے محلہ سے وصول کر سکے شیر مادر تھا!!

سندھیا نے اس غارتگری کا عوض بڑی بے رحمی سے لیا۔ اس کا سُسر دیوان سرجی راؤ گھٹگیا اندور کے تباہ کرنے پر مامور کیا گیا اور اس دختر فروش سردار کو ظلم و ستم کے آلے ایجاد کرنے اور بے زبان رعایا پر اُنکے استعمال کرنے میں خاص ملکہ تھا۔ اسکی سفاکی اور خونریزی کی عجیب و غریب حکایتیں ایک انگریز مورخ نے لکھی ہیں جنکا دوہرانا کاغذ کا گندہ کرنا ہے۔ لیکن اُن میں سے دس فی صدی بھی اگر سچی ہیں تو یہ شخص چنگیز اور ہلاکو خاں کی چھوٹے پیمانہ کی تصویر تھا!!

اس ظالم نے اندور کا رخ کیا تو جسونت راؤ اپنی کُل فوج اور تین سو توپیں لے کر دارالحکومت کی حفاظت کو چلا۔ دس دن تک ہلکی ہلکی لڑائیاں ہوتی رہیں لیکن ۱۴۔ اکتوبر ۱۸۰۱ء کو ہولکر نے فیصلہ کُن جنگ کا ارادہ کیا۔ رات کے وقت امیرخاں اور بھوانی شنکر سرداران لشکر کو حکم دیا کہ وہ دس بارہ ہزار سپاہی لے کر چکر لگاتے ہوئے طلوع آفتاب کے وقت تک دشمن کے پیچھے پہونچ جائیں اور اُدھر سے ایک توپ سر کریں جسکی آواز سُن کر سامنے کے رُخ سے بھی حملہ شروع کیا جائے اور دوطرفہ آتشباری سے مجروح ہو کر سندھیا کی فوج کا خاتمہ ہو جائے۔

یہ چال تو زبردست تھی مگر بدقسمتی سے امیرخاں کو عقب تک پہونچنے میں دیر ہوئی اور گھٹگیا کی فوج نے دھاوا شروع کر دیا۔ اسکے جواب میں ہولکر کے رسالہ کو بھی حملہ کرنا پڑا۔ گھٹگیا کے سپاہی بھاگنے لگے۔ توپیں چھوڑ دیں اور بعض نے ہتھیار ڈال دیے۔ اگر جسونت راؤ اسوقت بھی اپنی محفوظ فوج لے کر حملہ کر دیتا تو گھٹگیا کا نشان بھی نہ باقی رہتا مگر وہ امیرخاں کی توپ کے انتظار میں رہا اور چند لمحوں کے پس و پیش نے لڑائی کا پانسہ پلٹ دیا۔

سندھیا کے پیادوں نے دیکھا کہ دشمن کے صرف دو تین سو سوار اُنکے مقابلہ پر ہیں میدان میں قدم گاڑ دیے اور سواروں کو پسپا کیا۔ اب جسونت راؤ نے رسالہ کی مدد کرنا چاہی مگر وقت گذر چکا تھا اور اُسکی کوشش ناکام رہی۔ امیرخاں اور بھوانی شنکر دشمن کی پشت پر پہونچے تو دیکھا کہ

لہ ڈوف گرانٹ صاحب کی تاریخ مرہٹہ جلد سوم۔ ایک ترکیب دشمن کو ایذا دینے کی یہ ایجاد کی تھی کہ اُسکے سارے بدن پر ہوائی بان لگوا دیے اور اُنکو مشتعل کیا۔ جسم کا ٹکڑا ٹکڑا الگ ہو گیا!! توپ کو گرم کیا اور دشمن کو اُس سے باندھ دیا۔ گرمی بتدریج بڑھاتے گئے۔ یہاں تک کہ دشمن جل کر کوئلہ ہو گیا۔ وغیرہ وغیرہ

ہولکر کے لشکر کو نصف شکست ہو چکی ہے اور دن بھی بہت چڑھ گیا ہے اس لیے توپ کا فیر نہیں کیا اور اپنے دستہ کی حفاظت سوچنے لگے۔ اس عرصہ میں ایک سردار نے میدان سے بھاگنے کے لیے خیمہ و خرگاہ لدوانا شروع کردیے۔ اور یہ کم ہمتی دیکھ کر سارے لشکر کا جی چھوٹ گیا اور اندھیرا ہونے سے پہلے ہی ہولکر کی فوج ہر طرف بھاگنے لگی۔ مجبور ہو کر جسونت راؤ نے بھی منہ موڑا اور صرف چند ہمراہیوں کے ساتھ میدان سے سلامت جا سکا۔ توپیں چھن گئیں۔ سامان جنگ غارت ہوگیا۔ خیمے ڈیرے لُٹ گئے اور دارالسلطنت اندور دشمن کے قبضہ میں آگیا۔ سرجی راؤ نے پونا میں جو مظالم کیے تھے اُنکی طرف پہلے اشارہ کیا جا چکا ہے۔ اب اندور تو دشمن کا شہر تھا اور بزور شمشیر فتح کیا گیا تھا۔ یہاں ہر ایک سفاکی جائز و مباح تھی!! شہر لوٹ لیا گیا۔ اور اندور کے کنوئیں اُن شریف اور عصمت پرست عورتوں کی لاشوں سے پٹے ہوئے تھے جنھوں نے بے آبروئی سے بچنے کے لیے کنوؤں میں گر گر کر اپنی جانیں گنوائی تھیں۔ پندرہ دن تک قتل عام جاری رہا۔ ہر ایک باشندہ یا تو مارا گیا یا فرار ہوا اور شہر میں کوئی عمارت باقی نہ رہی جو مسمار نہ کردی گئی ہو۔ یہ دردناک انجام ہوا اُس خوبصورت شہر کا جسکی رونق و دولت بڑھانے کے لیے اہلیا بائی نے اپنی عمر کے تیس سال وقف کیے تھے!!!

ان نینن کا یہی بسیکھ
وہ بھی دیکھا یہ بھی دیکھ

جسونت راؤ اندور سے بھاگ کر جام پہونچا جو بندھیاچل کے دامن میں ایک محفوظ قلعہ تھا اور اپنے شکست خوردہ لشکر کی دوبارہ آراستگی میں مصروف ہوا۔ لیکن گھٹایا کی فوج نے رسد بند کردی تھی اور ہولکر کے سپاہیوں کو نہ تو خوراک مل سکتی تھی اور نہ اُنکو تنخواہ دینے کی کوئی سبیل تھی۔ جسونت راؤ نے اپنا تمام ذاتی ساز و سامان فروخت کرڈالا حتیٰ کہ عورتوں کے زیور بھی الگ کردیے اور بڑی مشکل سے ہر ایک سوار کو پانچ پانچ روپئے دے کر بقیہ تنخواہ کے لیے آٹھ دن کی مہلت مانگی اور وعدہ کیا کہ اس میعاد کے اندر کل سپاہیوں کی تکلیفیں دُور کردوں گا۔

آخر کار جو کچھ سامان باقی تھا مہیسر بھیجدیا اور صرف سواروں کو ساتھ لے کر ایک دن میں اٹھتر میل کا کوچ کیا اور اچانک رتلام کے سامنے پہونچ کر اس دولتمند شہر کو لوٹ لیا۔ فوج سے کہا کہ میرا وعدہ پورا ہوگیا تم اس شہر سے جو کچھ چاہو وصول کرلو۔ تیرہ دن خوب جشن رہا۔ بھوکے [illegible] نے رتلام کو جی بھر کر لوٹا اور جام کی تکلیفوں کا پورا معاوضہ کرلیا۔ جب گھوڑوں پر اتنا مال [illegible] لدگیا کہ اُس سے زیادہ لیجانا ناممکن تھا تو اُس نے مہیسر کی طرف کوچ کیا اور فوج سے کہا کہ "میرا [illegible]

دشمنوں کے قبضہ میں ہے۔ سپاہیوں کی تنخواہ دینا میرے امکان سے باہر ہے۔ جو لوٹ مار سے پیٹ بھرنے کو راضی ہو وہ میرے ساتھ رہے اور جو ماہواری تنخواہ چاہتا ہو وہ اپنے گھر چلا جائے۔ میں بخوشی اجازت دیتا ہوں؛ ایسے بلند ہمت اور عالی حوصلہ راجہ کا ساتھ کون چھوڑتا۔ ساری فوج نے جسونت راؤ کی ہمراہی قبول کی!!

رتلام کی تباہی نے دولت راؤ سندھیا کی آنکھیں کھول دیں۔ اب اُسکو سمجھ آئی کہ کاشی راؤ کا ساتھ دینا سخت غلطی تھی اور اُسکی حمایت سے ریاست اُجین کو نفع نہیں پہونچ سکتا ہے اس نے ہولکر کو صلح کا پیام دیا اور کاشی راؤ کو مہیسر واپس کر دیا۔

جسونت راؤ نے بھائی کو ہاتھوں ہاتھ لیا اور عزت و آبرو سے رکھا لیکن اسکو بنظر حقارت دیکھتا تھا اور کسی صلاح مشورہ میں شریک نہ کرتا تھا۔ ایک مجلس میں کاشی راؤ نے دعوے کیا کہ وہ ہولکر اور سندھیا سے صلح کرا سکتا ہے تو جسونت راؤ نے بگڑ کر کہا کہ "اپنی زبان بند رکھو تو بہتر ہے۔ اگر خدا تم کو عورت بناتا تو ہولکر کے خاندان پر بڑی مہربانی ہوتی، تم دوسرے کے گھر بیاہ دیجاتے اور وہاں بچے پیدا کرتے لیکن افسوس ہے کہ تم نے مرد کی صورت ہو کر ریاست کا ستیاناس کر دیا!!"

سندھیا نے کاشی راؤ کو واپس کر دیا اور وہ کھنڈی راؤ کو بھی آزاد کرنے پر تیار تھا بشرطیکہ جسونت راؤ اُجین کا علاقہ لوٹنا چھوڑ دے۔ لیکن ہولکر کو اپنے دو بھائیوں کے خون کا عوض لینا تھا اس لیے صلح پر راضی نہ ہوا۔ اور یہ شرط لگائی کہ سندھیا پہلے وہ علاقہ چھوڑ دے جو اُس نے ہولکر کا دبا لیا ہے تب لڑائی بند کرنے کی بات چیت ہو سکتی ہے۔

اس پیام کا کچھ جواب نہ ملا تو جسونت راؤ نے سندھیا اور پیشوا دونوں کی ریاستیں دن دہاڑے لوٹنا شروع کیں۔ پٹھانوں کو دکن کا علاقہ تباہ کرنے کو بھیجا اور خود شمال کی طرف "چوتھ" وصول کرنے چلا۔

اُس نے نیولی۔ کچرودہ۔ اور مندسور سے "چوتھ" وصول کیا۔ کوٹہ کے حاکم ظالم سنگھ سے سات لاکھ روپیہ لیا۔ اور راجپوتانہ کی ریاستیں ٹونک تک تباہ کر ڈالیں۔ سندھیا کی فوج مقابلہ کو بڑھی تو ہولکر نے اپنا رُخ بدل دیا اور میواڑ میں "ناتھ دوارہ" کا مشہور مندر لوٹ لیا۔ پجاریوں نے ناتھ جی کی مورت اور چار پانچ لاکھ کے جواہرات دوسری جگہ منتقل کر دیے لیکن جو کچھ بچا وہ جسونت راؤ نے صاف کیا اور دو سال کے اندر کئی بار اس مندر پر چڑھائی کی۔ اگر کوئی برہمن معترض ہوتا تو راجہ جواب دیتا تھا کہ "میں تو ناتھ جی سے پرشاد لیتا ہوں۔ مجھ کو کنگال بنا دیا ہے تو میری فوج

کا پیٹ ناتھ جی کو بھرنا چاہیے"۔

میواڑ کو لوٹ کر جسونت راؤ رامپورہ کی طرف گیا اور خوش قسمتی سے ہنگلیس گڈھ کے پرانے قلعہ میں اُسکو ایک دفینہ مل گیا۔ انجھرے کے راجہ نے مقابلہ کیا تو اُسکا شہر جلا دیا گیا۔ نیما ڑمیں سندھیا کی جاگیر خاک سیاہ ہوئی اور کھنڈوا جو اُسوقت بھی ایک آباد شہر تھا راکھ کا ڈھیر ہو گیا۔ برہان پور سے بھاری تاوان وصول کرکے وہ خاندیس کی طرف بڑھا اور اپنے عزیز بھائی کی حسرتناک موت یاد کرکے جس راستہ سے گذرتا پیشوا کے علاقوں کو ویران کرتا جاتا تھا۔ اس طرح عالمگیر تباہی کا طوفان بلند کرتا ہوا اور بھائیوں کا داغ دل پر لیے ہوئے وہ پونا کے سامنے پہونچ گیا۔

اللہ اللہ!! وہی جسونت جو پانچ برس پہلے بھائی کی مجروح لاش پونا میں چھوڑ کر تباہ و خستہ حال بھاگا تھا۔ یار اغیار رہتے۔ دنیا میں کوئی جگہ اُسکے لیے امن کی نہ تھی۔ اُسکا سر پیشوا اور سندھیا کے راضی کرنے کی بہترین تدبیر سمجھا جاتا تھا، آج اس شوکت و دبدبہ سے اُسی قتلگاہ کے سامنے نمودار ہوتا ہے کہ تیس ہزار جرار پسینے پر لہو بہانے کو تیار رہیں، سندھیا لرزہ براندام ہے اور پیشوا کو میدان میں منہ دکھانے کی ہمت نہیں پڑتی!! سچ ہے مالک کی سرکار میں دیر ہو اندھیر نہیں ہے۔ ملہر راؤ کا بیگناہ خون رائیگاں نہیں جا سکتا تھا! ایٹوجی کی کچلی ہوئی لاش اپنی بیکسی پر فریاد کر رہی تھی!!

آ! اے بہادر جسونت!! پونا کی دھول اُڑا دے!!!

بیدار ہو!! بمبئی کی تجارتی کمپنی! پیشوا کے ظلم و ستم کا خاتمہ کر دے!!!

داد خواہوں کی بھی نالش کا کوئی دانہ گا میرا اور آپ کا انصاف اُسی دن ہوگا

المختصر ۲۵- اکتوبر سنہ ۱۸۰۲ء کو پونا کے پاس پیشوا اور سندھیا کی متحدہ فوج سے ہولکر کا مقابلہ ہوا۔ اُس وقت ہولکر کے ساتھ ۲۵ ہزار سوار اور پانچ ہزار پیادے تھے اور پیشوا کی جماعت بھی اس سے کم نہ تھی۔ جسونت راؤ صفیں درست کرکے گھوڑے سے اُتر پڑا اور ایک ٹیلے پر کھڑا ہو کر جنگ کی نگرانی کرنے لگا۔ ساڑھے نو بجے کے قریب سندھیا کے توپ خانہ نے آتشباری شروع کی جو تقریباً ڈھائی گھنٹے جاری رہی اور قریب تھا کہ ہولکر کا رسالہ پسپا ہو جائے، اُسوقت جسونت راو گھوڑے پر چڑھا اور اپنے ہمراہیوں سے کہا کہ "آج فتح نہ پائی تو دنیا میں پھر کہیں ٹھکانا نہیں ہے۔ جسکو مرنا ہو وہ میرے ساتھ آئے اور جسکو جان عزیز ہو وہ اپنے بیوی بچوں کے پاس بھاگ جائے"۔ یہ کہہ کر اس زور سے حملہ کیا کہ سندھیا کے رسالہ کے قدم اُکھڑ گئے۔ پیادے بھاگنے لگے۔ توپچی کٹ گئے اور بیشمار سپاہی قتل ہوئے۔ سندھیا کا کل توپ خانہ اور خزانہ جنگ کے انبار ہولکر کے ہاتھ آئے۔

اور دشمن کے بقیۃ السیف آدمی بڑی مشکل سے زندہ و سلامت جا سکے۔

ہولکر کے خون میں پونا کی وفاداری شامل تھی اور باوجود اپنے دلی صدمہ کے وہ اس متبرک شہر کو اپنے لشکریوں سے پامال کرانا نہیں چاہتا تھا۔ لہذا اُس نے فوج کو شہر میں داخل ہونے سے منع کر دیا۔ اور جب لشکر کا ایک حصہ اُس طرف بڑھنے لگا تو اُس نے توپوں کے فیر سے اپنے خودسر سپاہیوں کو پونا کے لوٹنے سے باز رکھا۔

کہتے ہیں کہ اس لڑائی میں امیر خاں نے زیادہ نمایاں خدمت نہیں کی تھی اور جب وہ مبارکباد کے لیے حاضر ہوا تو جسونت نے جو اُس وقت اپنے زخموں پر پٹی بندھوا رہا تھا مسکرا کر کہا کہ "بھائی آج تم خوب بھاگے"۔ امیر خاں نے سنجیدگی سے جواب دیا کہ "میری زندگی تھی جو بچ گیا ورنہ گھوڑے کی کلغی ایک گولہ سے اُڑ گئی تھی اور میرے خاتمہ ہونے میں کچھ دیر نہ تھی"۔ ہولکر ہنس پڑا اور بولا کہ "تمھاری خوش نصیبی میں کوئی شبہہ نہیں۔ دیکھو گولہ نے گھوڑے کے کانوں کو زخمی نہیں کیا مگر کلغی اُڑا لے گیا"۔ امیر خاں اس جواب سے بہت شرمندہ ہوا اور بات آئی گئی ہوگئی۔

پیشوا شکست کے بعد فرار ہوگیا اور پونا کا دار الحکومت ہولکر کے قبضہ میں تھا۔ لیکن اُسنے اندور کی تباہی کا عوض نہیں لیا اور پندرہ دن تک کوشش کرتا رہا کہ باجی راؤ کا بھائی امرت راؤ پونا آجائے تو اُسکو مسند نشیں کرکے دار السلطنت اُسکے حوالہ کر دیا جائے۔ بہت سمجھانے بجھانے سے امرت راؤ پونا آیا۔ اُس نے پیشوا کا لقب تو اختیار نہیں کیا مگر اس بنیاد پر کہ باجی راؤ کا پونا سے فرار ہونا استعفا دینے کے برابر ہے سلطنت کا انتظام ہاتھ میں لے لیا۔ انگریزوں کی طرف سے ایک سفیر پونا میں رہتا تھا اُس نے یہ کارروائی پسند نہ کی اور بمبئی چلا گیا۔ پیشوا بھی گرتا پڑتا بمبئی پہونچا اور وہاں کی تجارتی کمپنی سے وہ معاہدہ کیا جو ہندوستان کی تاریخ میں "صلحنامہ بسین" کے نام سے مشہور ہے اور جسکے ذریعہ سے باجی راؤ نے چھ ہزار انگریزی فوج اپنے ملک میں رکھنے کی اجازت دے کر پونا کی خود مختاری کا خاتمہ کر دیا!! اُس نے ۲۶ لاکھ کا علاقہ اُس فوج کے صرف کے لیے انگریزوں کی نذر کیا اور یہ بھی وعدہ کر لیا کہ وہ آیندہ کسی سلطنت سے انگریزوں کی اجازت کے بغیر جنگ و صلح نہ کرے گا۔

یہ شرائط ایسے افسوسناک تھے کہ مرہٹوں کا انگریز مورخ گرانٹ ڈف بھی اس معاہدہ کو شرمناک سمجھ کر لکھتا ہے[۱] کہ "پیشوا نے اپنی حفاظت کی قیمت میں ملک کی خودمختاری کو قربان کر دیا"!

---

[۱] تاریخ مرہٹہ۔ جلد سوم۔ صفحہ ۲۲۶۔

یہ صلحنامہ ۳۰ دسمبر ۱۸۰۲ء کو مکمل ہوا اور سندھیا کو اس معاہدہ نے سخت قلق پہونچایا۔ اُس نے سوچا کہ ایسے ہی دو ایک عہدنامے اور ہوئے تو سب مرہٹہ سرداروں کی حکومت ختم ہو جائیگی۔ اور انگریزوں سے شکایت کی کہ اُسکے مشورہ کے بغیر "صلحنامہ پوران دھر" منسوخ کرنا نہ چاہیے تھا۔ بھونسلا اور سندھیا جنگ کی تیاری کرنے لگے اور باجی راؤ بھی در پردہ سازش میں شریک تھا

ہولکر کو اس معاہدہ سے بہت رنج ہوا۔ اور اُس نے پونا کو لوٹنا اور تباہ کرنا شروع کیا جس سے وہ ابھی تک متنفر رہا تھا۔ جس قدر مال فراہم ہوسکا لیکر وہ تو مالوہ واپس گیا اور انگریزوں کی فوج باجی راؤ کو مسند پر بٹھانے کے لیے پونا کی طرف بڑھی۔

۱۳ مئی ۱۸۰۳ء کو باجی راؤ انگریزی تلواروں کے سایہ میں پونا پہونچا اور امرت راؤ فرار ہوگیا۔ کچھ عرصہ تک تو اُس نے ناسک میں لوٹ مار کی ۔ پھر انگریزوں سے صلح کرکے آٹھ لاکھ سالانہ کی پنشن قبول کرکے بنارس چلا گیا جہاں اُسکی زندگی کا خاتمہ ہوا۔ باجی راؤ کو بھی یہی دن جلد دیکھنا تھا مگر فی الحال وہ پیشوا ہوگیا۔ اور سندھیا کی لڑائی کا تماشہ دیکھنے لگا۔

سندھیا اپنی فوج لیے ہوے برہان پور میں پڑا تھا اور بھونسلا اُسکی امداد کے لیے تیار ہو رہا تھا اور یہ دونوں جسونت راؤ کو اپنا شریک بنانا ضروری سمجھتے تھے۔ ہولکر کا جس قدر علاقہ سندھیا کے قبضہ میں تھا واپس کردیا گیا اور مظلوم "کھنڈی راؤ" بھی جو اپنی پیدائش کے وقت سے سندھیا کا قیدی تھا آزاد کردیا گیا۔ لیکن جسونت راؤ کو اب بھی سندھیا کی نیک نیتی پر اعتبار نہ تھا اور اُسکو شبہہ تھا کہ موقع پاکر دشمن اُس سے پونا کی بربادی کا انتقام لیں گے۔

ہولکر اسوقت مہیسر میں تھا۔ دولت راؤ نے لکھا کہ وہ اپنی فوج کا کچھ حصہ دکن کی طرف بھیجدے تاکہ دونوں طرف سے انگریزوں کی کمپنی پر شہ پڑے۔ امیر خاں کا رسالہ نربدا پار بھیجا گیا۔ اور آخری کشتیوں میں خود جسونت راؤ امیر خاں کے ساتھ دریا کو عبور کرنے لگا۔ مگر اُسی وقت ان دونوں میں معلوم نہیں کیا گفتگو ہوئی کہ دوسرے ہی دن امیر خاں کا رسالہ واپس بلا لیا گیا اور جسونت راؤ نے سندھیا کی مدد سے انکار کردیا۔

درحقیقت جسونت راؤ کو اُس طرز جنگ سے اختلاف تھا جو سندھیا اور بھونسلا انگریزوں کے

ـه پونا کی پیشوائی ختم ہونے کے بعد راج محل میں چند خطوط باجی راؤ کے لکھے ہوے دستیاب ہوے تھے۔ جو اس دعوے کو ثابت کرتے ہیں۔

یہ صلحنامہ ۳۰- دسمبر ۱۸۰۲ء کو مکمل ہوا اور سندھیا کو اس معاہدہ نے سخت قلق پہونچا
اس نے سوچا کہ ایسے ہی دو ایک عہدنامے اور ہوئے تو سب مرہٹہ سرداروں کی حکومت ختم
جائیگی- اور انگریزوں سے شکایت کی کہ اُسکے مشورہ کے بغیر" صلحنامہ پوران دھر" منسوخ ک
نہ چاہیئے تھا- بھونسلا اور سندھیا جنگ کی تیاری کرنے لگے اور باجی راؤ بھی درپردہ سازش
شریک تھا

ہولکر کو اس معاہدہ سے بہت رنج ہوا- اور اُس نے پونا کو لوٹنا اور تباہ کرنا شروع
جس سے وہ ابھی تک متنفر رہا تھا- جس قدر مال فراہم ہوسکا لیکر وہ تو مالوہ واپس گیا اور امرت
کی فوج باجی راؤ کو مسند پر بٹھانے کے لیے پونا کی طرف بڑھی-

۱۳- مئی ۱۸۰۳ء کو باجی راؤ انگریزی تلواروں کے سایہ میں پونا پہونچا اور امرت راؤ فرا
کچھ عرصہ تک تو اُس نے ناسک میں لوٹ مار کی- پھر انگریزوں سے صلح کرکے آٹھ لاکھ سالا
پنشن قبول کرکے بنارس چلا گیا جہاں اُسکی زندگی کا خاتمہ ہوا- باجی راؤ کو بھی یہی دن جل
تھا مگر فی الحال وہ پیشوا ہوگیا- اور سندھیا کی لڑائی کا تماشہ دیکھنے لگا-

سندھیا اپنی فوج لیے ہوئے برہان پور میں پڑا تھا اور بھونسلا اُسکی امداد کے لیے تیا
تھا اور یہ دونوں جسونت راؤ کو اپنا شریک بنانا ضروری سمجھتے تھے- ہولکر کا جس قدر علاقہ
کے قبضہ میں تھا واپس کردیا گیا اور مظلوم "کھنڈی راؤ" بھی جو اپنی پیدائش کے وقت سے
کا قیدی تھا آزاد کر دیا گیا- لیکن جسونت راؤ کو اب بھی سندھیا کی نیک نیتی پر اعتبار نہ
اُسکو شبہہ تھا کہ موقع پاکر دشمن اُس سے پونا کی بربادی کا انتقام لیں گے-

ہولکر اسوقت مہیسر میں تھا- دولت راؤ نے لکھا کہ وہ اپنی فوج کا کچھ حصہ دکن کی طر
تاکہ دونوں طرف سے انگریزوں کی کمپنی پر شہ پڑے- امیرخاں کا رسالہ نربدا پار بھیجا گیا- ۱۱
کشتیوں میں خود جسونت راؤ امیرخاں کے ساتھ دریا کو عبور کرنے لگا- مگر اُسی وقت ان دو
معلوم نہیں کیا گفتگو ہوئی کہ دوسرے ہی دن امیرخاں کا رسالہ واپس بُلا لیا گیا اور جسونت
نے سندھیا کی مدد سے انکار کردیا-

درحقیقت جسونت راؤ کو اُس طرز جنگ سے اختلاف تھا جو سندھیا اور بھونسلا نے

لہ پونا کی پیشوائی ختم ہونے کے بعد راج محل میں چند خطوط باجی راؤ کے لکھے ہوئے دستیاب
تھے- جو اس دعوے کو ثابت کرتے ہیں-

خلاف عمل میں لانے والے تھے۔ وہ ملہر راؤ کی قدیم نصیحت کا قائل تھا کہ مرہٹوں کو خیمے گاڑ کر لڑائی لڑنا مناسب نہیں ہے۔ اُنکی کامیابی اُسی وقت تک ہے کہ وہ لوٹ مار کے دھاوے کرتے رہیں اور جم کر کسی جگہ نہ لڑیں۔

اُس نے سندھیا کو صلاح دی کہ وہ توپ خانہ، پیادہ فوج، اور خیمہ وخرگاہ مالوہ میں چھوڑ دے اور صرف سواروں کی مدد سے انگریزوں پر چھاپے مارے اور اُنکی کمپنی کو ویسا ہی زچ کرے جیسا کہ کسی وقت میں اُسکے آباؤ اجداد نے اورنگ زیب کو زندگی سے عاجز بنادیا تھا۔

سندھیا نے اس تجویز پر عمل نہ کیا اور لڑائی کا وہ افسوسناک انجام ہوا جو ہندوستان کی تاریخ میں "مرہٹوں کی آخری لڑائی" کے نام سے مشہور ہے۔ اس تباہی کی تفصیل ہمارے موضوع سے خارج ہے لیکن اس کا خاص سبب یہ تھا کہ جنگ شروع ہونے سے پہلے نواب گورنر جنرل بہادر نے ایک اشتہار جاری کر دیا تھا کہ "سندھیا کے لشکر میں جس قدر انگریزی رعایا ہے وہ دشمن کا ساتھ چھوڑ کر چلی آئے تو اُسکو وہی تنخواہ ملیگی جو ریاست کے خزانہ سے دیجاتی ہے۔ اور یہ رعایت صرف انگریزی رعایا ہی کے لیے نہیں ہے بلکہ یوروپ کے کُل باشندوں کو جو سندھیا کی فوج میں ملازم ہوں اس اعلان سے فائدہ اُٹھانے کا حق حاصل ہے"[۱]

سندھیا کی قواعدداں فوج میں بیشتر سردار انگلستان یا یوروپ کے دیگر ممالک کے باشندے تھے۔ لڑائی کے وقت سب نے اپنے آقا کا ساتھ چھوڑ دیا۔ اور مرہٹوں کی فوج بےسری ہوگئی!!

سندھیا کا بہترین علاقہ شمالی ہند میں تھا۔ اور وہاں کی فوج کا سردار اعلیٰ ایک فرانسیسی افسر پیرن نام تھا۔ اُس نے لڑائی سے پہلے ہی انگریزوں سے تصفیہ نامہ وپیام[۲] شروع کردیے تھے۔ اسکی بدنیتی یا غفلت سے علیگڈھ کا مضبوط قلعہ کمپنی کے قبضہ میں آگیا۔ اور یہ بے وفا افسر عزت کے ساتھ لکھنؤ پہونچا دیا گیا!!

آخرکار مالوہ کا علاقہ بچانے کے لیے سندھیا نے دب کر صلح کرنا پڑی۔ ۳۰ دسمبر ۱۸۰۳ء کو سرجی ارجن گانوں کے پاس عہدنامہ لکھا گیا اور سندھیا کا تمام شمالی علاقہ ایسٹ انڈیا کمپنی کے تصرف میں آیا۔ دہلی مرحوم کا حسرت کدہ بھی فاتح کے حصہ میں آیا اور شاہجہاں کا بدنصیب

[۱] گرانٹ ڈف تاریخ مرہٹہ۔ جلد سوم۔ صفحہ ۲۴۲

[۲] گرانٹ ڈف تاریخ مرہٹہ۔ جلد سوم۔ صفحہ ۲۳۹

جانشین مرہٹوں کی حفاظت سے نکل کر انگریزوں کی پناہ میں پہونچا۔ اس تباہی کے دور میں قدیم شاہنشاہی شہر دہلی کا نام قلم کو خون کے آنسو رولاتا ہے۔ تذکرہ

تذکرہ دہلی مرحوم کا اے دوست نہ چھیڑ نہ سنا جائے گا ہم سے یہ فسانہ ہرگز

اب دولت راؤ نے کھوکر سیکھا کہ ہولکر کا مشورہ درست تھا اور انگریزوں سے لڑائی مرہٹوں کے قدیم اصول پر مناسب تھی۔ لیکن تیر کمان سے نکل چکا تھا اور چڑیاں کھیت کو چگ چکی تھیں اُس نے جسونت راؤ سے نامہ و پیام شروع کیا۔ اور یہ بہادر اپنی قدیم عداوت فراموش کر کے سندھیا کی حمایت پر مستعد ہوا۔ اس نے سندھیا کی اجازت لیکر مندسور سے چندہ وصول کیا اور جنگ کے لیے تیار رہا۔

لڑائی شروع کرنے سے قبل اُس نے انگریزی فوج کے سپہ سالاروں کو اپنے مطالبات لکھ کر بھیجے جن میں سے اول یہ تھا کہ ہولکر کو ہندوستان میں "چوتھ" وصول کرنے کا اختیار دیا جائے۔ دوسرا یہ تھا کہ اُسکی نانہالی جاگیر جو دوآبہ[۱] میں واقع تھی واپس کی جائے اور آخری مطالبہ یہ تھا کہ ریاست اندور کے استحکام کی ضمانت کی جائے۔ اسی کے ساتھ دھمکی بھی تھی کہ اگر اُسکے شرائط نامنظور کیے گئے تو "ہولکر کا گھر گھوڑے کی پیٹھ پر ہے اور جس طرف اُسکے سوار باگ موڑیں گے اُدھر کی دنیا تباہ ہوجائے گی"

ایسٹ انڈیا کمپنی کا آفتاب اقبال اُسوقت عروج پر تھا۔ چڑھتی دھوپ میں یہ ٹھنڈی گرمیاں کیونکر برداشتہ ہو سکتی تھیں۔ انگریزی فوج نے ہولکر کی ریاست پر حملہ کرنے کی رائے قائم کر لی۔

ہولکر نے سندھیا کے تجربہ سے سبق لیکر اپنی فوج کے تین انگریز افسروں کو جو اُسکی ملازمت چھوڑنے یا بغاوت کرنے پر تیار تھے۔ مئی ۱۸۰۴ء میں قتل کر دیا۔ اور اس خبر نے کمپنی کی آتشِ غضب پر تیل چھڑکا!!

انگریزوں کا کرنل جے پور کی طرف بڑھا کیونکہ اُسوقت ہولکر اجمیر میں تھا۔ اور اُسکی فوج کا بڑا حصہ جے پور کی سرحد پر خیمہ زن تھا۔ ہولکر نے اپنے آبائی اصول کے مطابق حملہ کرنا مناسب

[۱] اٹاوہ وغیرہ بارہ اضلاع چنبل اور جمنا کے درمیان ٹوکوجی ہولکر کے وقت سے اندور کی ملکیت تھے مگر موقع پاکر شجاع الدولہ نے ان پر قبضہ کر لیا تھا۔ اور بعد کو نواب سعادت علی خاں وزیر اودھ نے یہ اضلاع سرکار کمپنی بہادر کے نذر کر دیے تھے۔

نہ سمجھا اور پیچھے کی طرف ہٹا۔ یہاں تک کہ چمبل کو عبور کرکے اپنی ریاست میں داخل ہوگیا۔ انگریزوں نے ٹونک اور رامپورہ پر قبضہ کرلیا۔ لیکن اسکے جواب میں امیر خاں نے بندیلکھنڈ میں کمپنی کی فوج کو شکست دی۔ اور چند توپیں چھین لیں۔

ہولکر برابر ہٹ رہا تھا۔ یہاں تک کہ ایک دن موقع پاکر اُس نے کمپنی کے فوجی سردار کرنل مانسن کو بے موقع گھیر لیا۔ اب تختہ اُلٹ گیا۔ کرنل شمال کی طرف بھاگنے لگا۔ اور ہولکر نے تعاقب شروع کیا۔ مانسن بھاگتا ہوا کوٹہ تک پہونچا۔ یہ امر مشتبہ ہے کہ وہاں کے حاکم ظالم سنگھ نے انگریزوں کو مدد دی یا نہیں۔ انگریز لکھتے ہیں کہ راناے نہ تو فوج کو اپنے ملک میں داخل ہونے دیا اور نہ اُسکو رسد پہونچائی۔ لیکن جسونت راؤ کے پاس یہ باور کرنے کے وجوہ ہونگے کہ کوٹہ نے کرنل مانسن کی اعانت کی۔ اور اس قصور پر اُس نے ظالم سنگھ پر دس لاکھ روپیہ جرمانہ کیا۔

بہر حال انگریزی فوج ہزار خرابی دریاے چمبل کی طرف بڑھی۔ اپنے ذخائر جنگ تباہ کردیے اور توپیں راجہ بوندی کے سپرد کردیں۔ بڑی مشکل سے دس دن میں یہ فوج چمبل کو عبور کرسکی۔ بہت سے سپاہی دریا میں غرق ہوگئے۔ اور سب سے دردناک یہ ماجرا تھا کہ انگریزی سپاہیوں کے بیوی بچے جو عجلت اور سراسیمگی میں دریا کے اس پار رہ گئے تھے۔ بھیلوں کے قبضہ میں آگئے۔ اور اُنھوں نے سخت بے رحمی سے اُن سب کو ہلاک کیا۔ سپاہی جو دریا کے پار پہونچ چکے تھے اپنی آنکھوں سے یہ تباہی دیکھتے تھے اور کچھ نہ کرسکتے تھے !!

ہولکر بھی چمبل کو عبور کرکے انگریزوں کے تعاقب میں ہندوستان پہونچا۔ کرنل نے تمام سامان چھوڑدیا اور خوشحال گڈھ میں پناہ لی جو اُسوقت راجہ جے پور کے قبضہ میں تھا۔ جسونت راؤ نے یہاں بھی پیچھا کیا تو کرنل آگرہ کی طرف بھاگا اور اُسکے باقیماندہ سپاہی بہت بے سروسامانی کے ساتھ ۳۱۔ اگست ۱۸۰۴ء کو آگرہ میں داخل ہوے۔

ہولکر کے پاس اسوقت ۶۰ ہزار سوار، ۱۵ ہزار پیدل، اور ۱۹۲ توپیں تھیں وہ متھرا پہونچا تو انگریزوں کو یہ شہر بھی خالی کرنا پڑا۔ اگر وہ اسوقت آگرہ پر حملہ کردیتا تو کمپنی کی فوجی قوت کا خاتمہ تھا، مگر اُسکے ہمراہیوں نے دہلی پر چڑھائی کرنے اور بادشاہ کو قبضہ میں لانے کی صلاح دی۔ اور یہ مشورہ جسونت راؤ کے حق میں زہر قاتل ہوگیا۔ مرہٹوں کو دارالسلطنت کا محاصرہ

---

[1] ڈف گرانٹ تاریخ مرہٹہ جلد سوم صفحہ ۲۰۷

[2] ڈف گرانٹ تاریخ مرہٹہ۔ جلد سوم صفحہ ۲۸۱

کرنا پڑا - کمپنی کو طاقت سنبھالنے کا وقت مل گیا - ہولکر کو زچ ہو کر دلّی سے فوج ہٹانا پڑی اور پھر بازی کا نقشہ بدل گیا - ہولکر پسپا ہوا اور انگریزوں نے تعاقب شروع کیا - شاملی کے مقام پر اُس نے کمپنی کے ایک فوجی دستہ کو تنگ کیا اور دوآبہ کے دیہات کو خوب لوٹا - لیکن ڈیگ کے قلعہ کے پاس وہ بُری طرح گھر گیا اور اُسکی ۸۷ توپیں چھن گئیں - فرخ آباد کے مقام پر پھر انگریزوں نے آدبایا - اور قبل اسکے کہ ہولکر لڑائی کے لیے تیار ہو پائے اُسکے تین ہزار سپاہی قتل ہو گئے - مجبوراً وہ ڈیگ کے قلعہ میں محصور ہوا اور پہلی دسمبر ۱۸۰۴ء کو جنرل لیک نے اس گڈھی کا محاصرہ شروع کیا - جب یہاں بھی امن نصیب نہ ہوا تو ہولکر بھرت پور کی طرف ہٹا - اور وہاں کے مشہور قلعہ میں پناہ لی -

ہولکر ادھر لڑائی میں مصروف تھا اور مالوہ میں اُسکی ریاست کی حفاظت کے لیے کچھ فوج نہ تھی - انگریزوں نے دکن سے اپنے لشکر کو حرکت دے کر ہولکر کے تمام قلعوں پر قبضہ کر لیا - بمبئی کے ایک سالے نے گجرات سے آکر اندور پر اپنا پھریرا اُڑا دیا -

۲۵ - جنوری ۱۸۰۵ء سے بھرت پور کا محاصرہ شروع ہوا جو چار مہینے تک قائم رہا اور قلعہ فتح نہ ہو سکا - انگریزی فوج کو بہت نقصان پہونچا اور اسکے ۳۲۰۳ آدمی مارے گئے - جن میں سے ۱۰۳ یوروپین افسر تھے - آخر کار محاصرہ کے شدائد سے عاجز آکر راجہ بھرت پور نے صلح کے لیے نامہ و پیام شروع کیا - اور ہولکر کو مجبور ہو کر بھرت پور سے رخصت ہونا پڑا - وہ دولت راؤ سندھیا کی طرف گیا جہاں اُس کا نہایت خلوص سے استقبال کیا گیا اور انگریزوں نے باعزت صلح کرا دینے کا وعدہ کیا گیا - مگر جونت راؤ ابھی ہمت نہ ہارا تھا - وہ اپنی فوج اور توپخانہ لیکر اجمیر کے راستہ سے پنجاب کی طرف چلا تاکہ سکھوں اور افغانوں کی مدد لیکر انگریزوں سے ایکبار پھر مقابلہ کرے - مگر اُس کی قسمت کا ستارہ زوال پر تھا - سکھوں نے کچھ مدد نہ کی اور انگریزی فوج نے اُسکی واپسی کا راستہ مسدود کر دیا - ناچار ہولکر صلح پر راضی ہوا اور دریاے بیاس کے کنارے راجپوت گھاٹ کے قریب صلحنامہ لکھا گیا - جسکے رو سے اُسکی مالوہ کی کُل ریاست اور دکن کے بیشتر مقبوضات واپس کیے گئے - اور بغیر کسی تاوان کے ادا کیے ہوے اُسکو جنوب کی طرف جانے کی اجازت دی گئی -

جھکی ذرا چشمِ جنگجو بھی نکل گئی دل کی آرزو بھی
بڑا مزا اُس ملاپ میں ہے جو صلح ہو جاے جنگ ہو کر

چند مہینوں کی لڑائی نے ہولکر کو بہت نقصان پہونچایا۔ اُسکے سپاہی قتل تو کم ہوے لیکن بہت سے دغا دیکر فرار ہوگئے۔ یہ محض اُسکی بہادری کا دبدبہ تھا کہ کمپنی سے باعزت صلح ہوئی۔ ورنہ اُسکی فوج میں لڑنے کی سکت باقی نہ رہی تھی۔

بہر حال پنجاب سے واپس آکر وہ ایک مہینہ کے قریب جے پور میں مقیم رہا۔ اور وہاں کے راجہ سے آٹھ لاکھ روپیہ وصول کیا۔ جب وہ اجمیر پہونچا تو میواڑ یا مارواڑ کا راجہ مان سنگھ جسونت راؤ کے اہل و عیال لیکر حاضر ہوا۔ جو پنجاب کی طرف جاتے ہوے اُسکے سپرد کر دیے گئے تھے۔ اس خدمت کے صلہ میں اُس نے ہولکر کی امداد راجہ جے پور کے خلاف چاہی "تاکہ رانا اودیپور کی خوبصورت لڑکی سے جودھ پور کی شادی ہو جائے۔ ہاتھی ہزار لٹے تب بھی لاکھ ٹکے کا!!

جسونت راؤ کا اب بھی وہ دبدبہ تھا کہ اُس کی امداد پر راجہ جودھ پور کو اصرار تھا اور اُدھر راجہ جے پور اٹھارہ لاکھ روپیہ دینے کو تیار رہتا، بشرطیکہ ہولکر اُسکی اعانت کرے!!

اتفاق سے اسی زمانہ میں ہولکر کی فوج نے بغاوت کر دی اور یہ بہانہ لیکر جسونت راؤ نے فریقین کی امداد سے انکار کر دیا۔ فوجی بغاوت کا سبب یہ تہا کہ جسونت راؤ نے اپنا خرچ گھٹانے کے لئے دکھنی سواروں کو برخاست کرنا چاہا۔ اُنھوں نے بقیہ تنخواہ کا مطالبہ کیا جسونت راؤ نے غلطی سے اپنے بھتیجے کھنڈی راؤ کو بطور ضامن کے انکے سپرد کر دیا۔ انھوں نے موقع پاکر کھنڈی راؤ کو جسکے نام سے امور سلطنت انجام پاتے تھے واقعی راجہ بنانے کی کوشش کی۔ لڑکا عقلمند تھا۔ اُس نے فوجی سرداروں سے کہا کہ "تم میری خرابی کی فکر میں ہو۔ چند روز میں تمھاری تنخواہ مل جائے گی اور تم مجھے چھوڑ کر چلے جاؤ گے" مگر کسی نے نہ سنا۔ آخر کار وہی واقع ہوا جو اُس لڑکے کا خیال تھا۔ جے پور سے جو روپیہ وصول ہوا تھا وہ جسونت راؤ نے فوج کو تقسیم کر دیا۔ سپاہی اپنی جیبیں بھر کر گھر کو رخصت ہوے اور ایک ہفتہ کے اندر کھنڈی راؤ کا خاتمہ ہو گیا!! بلکہ چند روز کے بعد کاشی راؤ اور اُسکی بیوی بھی قتل کر دیے گئے!!!

اس بغاوت کے دوران میں امیر خاں نے بھی اپنے حقوق یاد دلائے اور وہ قدیم تحریر پیش کی جسکے رُو سے تمام مفتوحہ علاقوں میں وہ نصف کا حصہ دار تسلیم کیا گیا تھا۔ جسونت راؤ نے اپنی شرافت سے ٹونک کی جاگیر نواب کو عنایت کی اور کوٹہ کا خراج بھی اُسی کو عطا فرمایا۔ لیکن ظاہری طور پر اپنی ملازمت سے برطرف کر دیا "تاکہ امیر خاں راجہ جے پور کا نوکر ہو جائے اور اپنی تلوار کی طاقت سے رانا اودیپور کی لڑکی اُسکو دلائے!!

مہارانا کی لڑکی کشن کنور حسن و جمال میں اپنے وقت کی پدمنی تھی۔ وہ پہلے بھیم سنگھ راجہ

جودھ پور سے منسوب تھی مگر شادی سے قبل اُس کا منگیتر مرگیا۔ اور مان سنگھ وارث ہوا تو اُس نے اپنے پیشرو کی منسوبہ سے شادی کرنا چاہی۔ اُدھر جے پور کا راجہ جگت سنگھ اس خوبصورت اور نزاکت کی دیبی پر غائبانہ عاشق تھا۔ مہارانا نے جے پور کو جودھ پور پر ترجیح دی۔ مگر مان سنگھ نے لڑائی چھیڑ دی سندھیا نے جودھ پور کی مدد کی۔ جے پور نے امیرخاں کی امداد حاصل کی۔ اور دونوں ریاستیں باہمی خانہ جنگی سے تباہ ہوگئیں۔ مان سنگھ کو شکست ہوئی۔ راج پاٹ چھن گیا۔ اور دھونکل سنگھ اُس کا جانشین ہوا۔ امیرخاں جے پور کا ساتھ چھوڑ کر مان سنگھ سے مل گیا اور اُسکو دوبارہ ریاست و حکومت دلائی۔ جنگ ختم کرنے کے لیے جے پور سے اس طرح صلح کرائی کہ جگت سنگھ کی شادی مان سنگھ کی لڑکی سے اور مان سنگھ کا بیاہ جگت سنگھ کی بہن سے کرادیا۔ یہاں تک تو کچھ مضائقہ نہ تھا۔ مگر ستم یہ کیا کہ ان دونوں کی عزت برقرار رکھنے کے لیے رانا کی مابہا النزاع لڑکی کی جان لینا چاہی !

اودے پور کا ایک رکن سلطنت ان قاتلوں کا ہمخیال ہوگیا۔ اور رانا کی بہن چاند بائی نے زہر کا پیالہ کرشن کنور کے سامنے پیش کیا، اور عاجزی سے کہا کہ وہ اپنی زندگی کا خاتمہ کرکے باپ کی عزت بچائے!! اپنے چاہنے والوں کی الفت کا کُشتہ کشن کنور زہر کا پیالہ نوشجاں کرگئی اور بولی کہ "یہی بیاہ میری تقدیر میں لکھا تھا" !!!

یہ حسرت انجام ڈراما اس طرح ختم ہوا تسلسل داستان کے لیے ہم نے سارا قصہ اسی جگہ درج کردیا، ورنہ اسکے آخری سین تو کئی برس کے بعد دکھائے گئے تھے !!!

غرض امیرخاں سے قطع تعلق کرکے ہولکر بھوپورہ پہونچا۔ اور توپیں ڈھالنے کا کارخانہ قائم کیا۔ وہ خود دن بھر کام میں مصروف رہتا اور اکثر گلا ہوا پیتل اپنے ہاتھ سے سانچوں میں ڈالتا تھا۔ چار مہینے کے اندر پیتل کی دو سو توپیں اُس نے تیار کرلیں۔ فوجی نظام میں اصلاح کی۔ سپاہیوں کی ماہوار تنخواہ مقرر کی۔ اور ہندوستان کے ہر حصہ میں اُسکے ملازم فوج کے لیے گھوڑے خریدنے لگے۔ معلوم ہوتا تھا کہ وہ کسی عظیم الشان جنگ کی تیاری کررہا ہے۔ اور قسمت ساتھ دیتی تو معلوم نہیں کہ وہ کیا کرگزرتا!! مگر شراب خواری کی افراط اور کارخانہ کی سخت محنت نے اُسکے دماغ پر اثر کیا۔ پہلے حافظہ بگڑا۔ مزاج میں غصہ بڑھا۔ پھر یہ حالت ہوئی کہ وہ اشارے پر کام چاہتا تھا اور ایک منٹ کی دیر سے بیقابو ہوجاتا تھا۔ وہ صبح ہوتے ہی فوج کی قواعد دکھتا۔ سواروں سے پیادوں پر حملہ اور توپوں سے آتشباری کی مشق کراتا تھا۔ روزانہ دو بار مصنوعی جنگ ہوتی تھی، لیکن دماغ روز بروز بگڑتا جاتا تھا اور آثار جنوں ظاہر ہوتے جاتے تھے۔

جسونت راؤ کو اپنی کمزوری کا خود احساس تھا اور وہ اپنے دیوان طرام سیٹھ سے اکثر کہا کرتا تھا کہ " ایک وقت جو بات میں کہتا ہوں دوسرے وقت یاد نہیں رہتی۔ میرے دماغ کا علاج ہونا چاہیے " لیکن اُسکے رعب و داب سے کسی کو بولنے کی ہمت نہ پڑتی تھی۔ اور جبتک مرض قابل علاج تھا کوئی دوا نہیں کی گئی!!

ایک رات محلسرا میں غل مچا۔ رانیاں اور باندیاں باہر نکل آئیں۔ دیوان بلایا گیا۔ اور معلوم ہوا کہ راجہ مجنون ہو گیا۔ اور کپڑوں کی گٹھری میں اپنا بدن چھپائے بیٹھا ہے۔ ۲۰-۳۰ آدمیوں نے مل کر بمشکل گرفتار کیا۔ اور رسیوں سے باندھکر دوسرے کمرہ میں لے گئے۔ رات پریشانی میں گزری اور صبح کو سارے شہر میں یہ افسوسناک خبر مشہور ہو گئی۔ تین دن کے بعد راجہ کو ہوش آیا تو اُس نے کہا کہ میرے بھائی امیر خاں کو بلاؤ۔ مجھکو وہی اچھا کر سکتا ہے " امیر خاں کو خبر بھیجی گئی اور وہ اپنے قدیم آقا کی خدمت میں فوراً حاضر ہوا اور ایک حکیم کو بھی ساتھ لایا۔ طبیب نے چند روز کے بعد علاج سے انکار کر دیا اور کہا کہ تیماردار غفلت کرتے ہیں۔ جو پرہیز بتایا جاتا ہے اُس پر عمل نہیں ہوتا۔ اور بیمار کو وہی غذا دی جاتی ہے جسکی ممانعت کی جائے۔

دولت راؤ سندھیا نے بھی ایک وید علاج کے لیے بھیجا۔ مگر جسونت راؤ نے اُسکا مضحکہ اُڑایا۔ اور اتنا ستایا کہ وہ بھاگ گیا۔

المختصر سب تدبیریں اُلٹی ہوئیں اور دوا نے کچھ کام نہ کیا۔

از دوا کردن مرضہا می فزود   روغن بادام خشکی می نمود

سال بھر تک جنون کا زور رہا۔ اور اسکے بعد راجہ بالکل خاموش اور لایعقل ہو گیا۔ تین برس اسی حال میں گزرے۔ آخر ۲۰۔ اکتوبر ۱۸۱۱ء کو بھیورہ کے مقام پر یہ بلند ہمت راجہ اپنی زندگی کا کام ناتمام چھوڑ کر دنیا سے رخصت ہو گیا۔ اور اُسکی تشنا تلسا بائی جو دیوانگی کے دور میں منتظم ریاست تھی پورے طور پر صاحب اختیار ہو گئی۔

جسونت راؤ کا قد میانہ، جسم نہایت مضبوط، اور رنگ سیاہ تھا۔ ایک آنکھ ضایع ہو جانے سے صورت کسی قدر بگڑ گئی تھی لیکن چہرہ پر ہر وقت خوشی نمایاں رہتی تھی۔ اُسکی گفتگو میں جوش پیدا کرنے کی تاثیر تھی۔ اور اسکے پاس بیٹھنے والا کبھی افسردہ خاطر نہ ہوتا تھا۔ وہ کافی تعلیمیافتہ تھا۔ فارسی سمجھ سکتا تھا۔ مرہٹی بے تکلف لکھتا تھا۔ حساب کتاب میں خاصی مہارت تھی۔ گھوڑے کی سواری اور نیزہ بازی میں اُسکا جواب نہ تھا۔ اُس کی بہادری ضرب المثل تھی

پونا کی لڑائی میں سندھیا کے توپخانہ پر حملہ کرتے وقت زخمی ہوا - اور ایک توپچی نے اُسکو گھوڑے سے اُتارنا چاہا لیکن باوجود سعنت جراحت کے توپچی سے دست وبغل ہو گیا اور کشتی لڑتا رہا - یہاں تک کہ اُسکے ہمراہی آپہونچے - توپچی قتل کیا گیا - اور راجہ گرفتاری سے محفوظ رہا -

اُسکی زندگی کے انقلابات فسانۂ عبرت کے ورق ہیں اور انگریزی کی وہ مشہور مثل ثابت کرتے ہیں کہ " خدا صرف اُن لوگوں کی مدد کرتا ہے جو خود اپنی مدد کریں " وہ کبھی پونا سے بے یار و مددگار بھاگتا ہے اور کبھی اُجین کا دار الریاست تباہ کرتا ہے ! کبھی اندور کے میدان سے فرار ہوتا ہے اور کبھی ایک لاکھ فوج لیکر ہندوستان پر چڑھائی کرتا ہے -

اُس پر غارتگری اور لوٹ مار کا الزام لگایا جاتا ہے لیکن پیشوا اور سندھیا کے مظالم کوئی نہیں دیکھتا !! وہ اپنے پیشرو ملہر راؤ ہولکر کی تقلید میں مرہٹوں کی عالمگیر سلطنت قایم کرنا چاہتا تھا اور اُسکا کوئی ذریعہ سوائے چھاپے مارنے اور اچانک دھاوے کرنے کے نہ تھا - یہ قسمت کے کھیل ہیں کہ ملہر راؤ کو مغلوں سے سابقہ پڑا - جنکی زندگی کے دن پورے ہو چکے تھے " اور اس لیے وہ کامیاب ہوا - برخلاف اسکے جسونت راؤ کو انگریزوں سے لڑنا پڑا - جنکی قوت وشوکت کا سورج چڑھ رہا تھا - اور وہ دن قریب تھا کہ انکی مملکت میں آفتاب کا غروب ہونا ہی ممنوع ہو جائے - اس وجہ سے وہ ناکام رہا - شوق اور ہمت دونوں نے یکساں کی - بہادری اور سپہگری کے ہنر دونوں نے یکساں دکھائے لیکن تقدیر کے فرشتہ نے مغلوں کی سلطنت تو تباہ کی مگر انگریزی راج کو ہندوستان میں امن قایم کرنے کے لیے مستحکم کر دیا -

ما و مجنوں ہم سبق بودیم در دیوان عشق
او بصحرا رفت و من در کوچہا رسوا شدم

" خافی خاں "

مرزا غالب کی شاعری - انجمن اُردو لکھنؤ کے لائق معتمد جناب مرزا محمد عسکری بی اے نے مسلم اکیڈمی کی ایک محفل میں غالب کی شاعری پر جو مختصر مضمون پڑھا تھا وہ بہت پسند کیا گیا - اور علاوہ دلگداز میں شایع ہونے کے بصورت رسالہ علحدہ چھپ گیا ہے - دلدادگان کلام غالب اُسکو پڑھ کر مرزا صاحب کی جدت طبع اور غالب فہمی کا لطف حاصل کریں - قیمت ۴ر

ایڈیٹر

تعلیمات بشسٹ
و
تربیت سری امچندرجی

اتفاقاً ایک دوست کے یہاں میری نظر سے ہندو تصوف پر ایک کتاب گذری جو جوگ بششٹ کا ترجمہ ہے، اور جہانگیر کے زمانہ میں صوفی شریف صاحب کوئی بزرگ تھے انھوں نے فارسی میں کیا ہے، اور اس کا نام اطوار وصل اسرار رکھا ہے۔ خود فرماتے ہیں "در تحریر کلماتِ بششٹ و رامچندر کہ از راہ طلب عرفان بظہور رسیدہ۔ از پردہ ولباس زدے بیروں کشیدہ بہ زبان فارسی ترجمہ یافتہ" یہ صاحب معلوم ہوتا ہے کہ سنسکرت کے بڑے فاضل تھے۔ ان مضامین کو دیکھ کر میرا جی چاہا کہ الناظر کے ذریعہ چند احباب کی خدمت میں پیش کروں اور اپنے ہندو دوستوں سے مخاطب ہوکر عرض کروں کہ ایسے پاکیزہ خیال رکھنے والے لوگ کہیں کسی سے نفرت کیا کرتے ہیں؟ ہمارے بزرگوں کی جب یہ تعلیم ہے تو پھر ہندوستان میں یہ رات دن کے جھگڑے اور نااتفاقیاں کیوں ہیں؟ کیوں نہیں اپنے سرچشمہ کی طرف نظر کرتے اور اُس میں سے صاف پانی لیتے؟ خدا کا دین ہمیشہ ایک ہی رہا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ اپنے سرچشمہ سے اگر پانی لوگے تو پھر ہماری تمھاری کوئی لڑائی باقی نہ رہیگی۔

تجرید:۔ "سجدہ مجھ سے اور تعظیم دل سے ہے۔ اور اُس نور کے واسطے جو ہمیشہ ایک حالت پر قرار رکھتا ہے۔ نہ آرام کو اُسکے پاس راہ ہے اور نہ بیقراری کو۔ قید زماں و مکاں سے مبرا۔ ابتداو انتہا کے بند سے منزہ۔ سرمد۔ دائم۔ قائم۔ عین علم و معرفت ہے۔ بغیر معرفت نفس کے اُسکے پاس رسائی ممکن نہیں۔"

بششٹ جی کہتے ہیں کہ میرے ان کلمات کا مخاطب طالب راہ تحقیق ہے جسکا قصد ہونا چاہئے کہ قید عالم سے رہائی پاکر اور گُن فیکون کے بندوں سے خلاصی حاصل کرکے یگانگی اور بے رنگی کے عالم میں جلوہ گر نظر آئے اور ماسوئے کے بند سے آزاد رہے۔

بششت جی کہتے ہیں کہ جب تک عنایت بے غایت الٰہی دستگیری نہ کرے اور مدد نہ فرمائے اور ایک دانا استاد اس راہ میں ہاتھ نہ پکڑے کچھ نہیں مل سکتا۔ استادِ کامل ایک ملاح کی طرح ہے جسکی توجہ اور امداد سے اس دریائے بیکراں اور تعلقاتِ عالم فانی کے سمندر سے عبور ممکن ہے۔

بششت جی رام چندر جی سے مخاطب ہوکر کہتے ہیں کہ عالم کے تعلقات ایک مرض صعب ہیں اور اسکی دوا سوائے اسکے اور کوئی نہیں کہ دائم اس فکر میں رہے کہ ہم کون ہیں اور عالم کیا چیز ہے اور کس سے ظہور میں آیا ہے۔ اے رام چندر! جس زمین میں سایہ دار درخت نہ ہو، جہاں پانی نہ ہو، اور جس شہر میں انسان کامل نہ ہو وہاں رہنا نہ چاہیے۔ اے رام چندر۔ ہمیشہ اس کی صحبت کا جویاں و خواہاں رہنا چاہیے۔ اگر مل جائے تو اسکی خدمت کو نہ چھوڑ۔ اگر وہ بے توجہی کرے تو کچھ پروا مت کر۔ اگر نادان انسان خود بخود کسی سے کچھ کہے تو اُسے اپنی ذات سے مخاطب سمجھ اے رام چندر۔ گو عارف ہر وقت ذات باری تعالیٰ کے ساتھ مشغول رہتا ہے لیکن اہل علم کو اسکی صحبت کے بغیر مفر نہیں۔ عالم کے مصائب و محن سے نجات اگر ممکن ہے تو اُسی کی پناہ میں ممکن ہے۔ جو کچھ وہ کہے وہی عین معرفت اور کمال علم تجرید ہے۔

اے رام چندر! راہِ سلوک گو مرشد و طالب سے وابستہ ہے لیکن طالب صادق اس راہ میں بہت بھلا کہا جاتا ہے اور استاد کے فیض سے سب سے زیادہ حصہ پاتا ہے۔ معرفتِ الٰہی کا راستہ صرف طالب سے تعلق رکھتا ہے، کتب و استاد سے نہیں۔ اسلیے طالب صادق کو چاہیے کہ اس معنی کو خود اپنے میں تلاش کرے۔ اے رام چندر۔ جو نادان کہ خود اپنے آپ میں فکر نہ کرے اور خدا طلبی اور یافت الٰہی کو خود اپنی ذات میں نہ تلاش کرے اور اطراف و جوانب عالم میں تلاش کرتا پھرے اُسکی مثال اُس شخص کی سی ہے کہ گھر میں خزانہ موجود ہے اور باہر گدائی کرتا پھرتا ہے۔ اے رام چندر۔ آدمی میں ایک خاصیت ہے کہ جس طرف وہ متوجہ ہو اُسی کا رنگ اختیار کر لیتا ہے۔ پس دانا وہ شخص ہے کہ لایعنی فکروں کو اپنے پاس آنے نہ دے اور ہمیشہ یافتِ حق کی فکر میں لگا رہے۔

عالم کا محض وہم و خیال ہونا:۔ اے رام چندر۔ عالم محض وہم و خیال ہے۔ اگر تو چاہتا ہے کہ وہم و خیال کا یہ پردہ اُٹھ جائے، تو دل کو من و تو اور این و آں کے تفرقہ سے بچا۔ یہ نمودِ بے بود عالم تفرقہ باطن کے باعث ہے۔ جب پریشان خیالی دور ہو جائے گی تو یہ تفرقہ بھی زائل

ہو جائے گا۔ اے رام چندر۔ عالم کی نابودی دل کے سکون اور حبس سے پیدا ہوتی ہے۔ جب دل حرکت کرتا ہے (یعنی اُس میں پریشانی پیدا ہوتی ہے) تو عالم پیدا ہوتا ہے اور جب ساکن ہوتا ہے تو عالم ناپید ہو جاتا ہے۔ اسکی مثال آنکھ کی سی ہے۔ اگر کھولے گا تو سب عالم نظر آئے گا اور اگر بند کر لے گا تو سب ناپید ہو جائے گا۔ پس کمال ہوشیاری کے ساتھ دل کو اس تفرقہ سے یکسوئی دے تاکہ کرنے نہ کرنے، اِس اور اُس کے تفرقہ سے نجات حاصل ہوے اور یہ بات اُس وقت پیدا ہوگی جبکہ دل سے خواہشات بالکلیہ جاتی رہیں گی۔

اے رام چندر۔ یہ عالم نابود جو بود نظر آتا ہے سب تیرا اندیشہ ہی اندیشہ ہے۔ اس اندیشہ کی تشویش سے بچنے کی کوشش کر۔ عالم کی مثال ایک رسی کی ہے جو سانپ معلوم ہو رہی ہے۔ اس خیالی سانپ کا دفعیہ یافت دل سے ہوتا ہے جب وہم دل سے دور ہو جائے گا تو اس سانپ کی اصلیت ظاہر ہو جائے گی۔ پس خود اپنے اندر فکر اور دھیان کر اور اس وسوسہ کو دل سے نکال تاکہ تعلقات و حوادث زمانہ سے امان میں رہے۔

اے رام چندر۔ عالم کی نسبت حق کے ساتھ ایسی ہے جیسے شعاع کی آفتاب کے ساتھ۔ اور موج کی دریا کے ساتھ۔ لیکن نادان خیال کرتے ہیں کہ عالم حق سے اور حق عالم سے جدا ہے۔
اے رامچندر۔ مرنا اور جینا خواب اور بیداری کے مانند ہے۔ جب آدمی سوتا ہے تو سمجھتا ہے کہ بیداری کوئی چیز نہیں اور جب بیدار ہوتا ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ خواب کوئی چیز نہ تھا۔ پس دائما اُس ذات پاک پر نظر رکھ اور عالم کی بود و نابود کو نظر میں مت لا۔

آزادی:۔ اے رامچندر، آدمی کو چاہیے کہ ہمیشہ اس تخیل میں رہے کہ عالم عین علم ہے اور علم عین حق ہے اور یہی تحقیق آزادی ہے۔ اے رامچندر۔ اگر کوئی شخص چاہے کہ جو کچھ عالم کا خلاصہ ہے اُسے نصیب ہو جائے تو چاہیے کہ علائق ماسوٰے سے اپنے آپ کو پاک رکھے۔ خلاصۂ عالم یہی ہے کہ بود و نابود کی قید سے آزادی حاصل ہو۔ اے رام چندر۔ جو اپنے آپ کو دیکھنے لگا اگر اس عالم میں رہے اور اہل عالم سے ملے جُلے اُسے کوئی خطرہ نہیں۔ اُسکی نظر میں یہ عالم مٹی کا ایک ڈھیلا یا پتھر کا ٹکڑا معلوم ہوگا۔ اُسکے نزدیک مرنا جینا برابر ہے۔ اے رام چندر۔ اگر نظر بصیرت سے دیکھو گے تو ظاہر و باطن میں ایک ایسی ہستی نظر آئے گی جو تمام عالم پر محیط ہے۔ جس کسی نے خواہشات نفس کے قید سے خلاصی پائی اور کبر و مکر اور کن و مکن سے کنارہ کر لیا یقین جان کہ اس عالم کی قید سے چھوٹ گیا۔ گو اس عالم میں وہ رہے گا مگر تعلقات عالم

اُسے مشوش نہیں کر سکیں گے۔ اے رام چندر۔ آزادی اُس وقت حاصل ہوگی جب اپنی معرفت کے لیے کوشش کرے گا۔ آزادی نہ اوپر ہے اور نہ نیچے اور نہ بیچ میں۔ یہ خود اپنے اندر ہے۔

حالت دل:۔ اے رام چندر۔ دل کے تفرقہ سے سوائے قید و غلامی کے کچھ حاصل نہیں۔ اگر خلاصی چاہتا ہے تو تفرقہ کو دور کر۔ پھر وہ وقت آ جائے گا کہ دل خود معرفت دل میں لگ جائے گا۔ اے رام چندر۔ تفرقۂ دل سے مراد یہ ہے کہ نابود کو بود خیال کرے اور بود کو نابود۔ اے رام چندر۔ کیوں نہیں کوشش کرتا کہ نفس شوم کو جس سے دل میں پراگندگی پیدا ہوتی ہے گرفتار کرکے قید کرے اور قتل کر ڈالے۔ اے رام چندر۔ نفس عجیب شے ہے۔ جس نے اُسے فتح کر لیا وہ بڑے بڑے ملک فتح کرے گا۔

اے رامچندر۔ جس نے کہ نفس کو اس طرح مارا کہ میں نیست ہوں ہست صرف حق ہے، اُسے کوئی غم نہیں۔

رنج خواہش:۔ اے رام چندر۔ خواہشات نفس کو ایک جنگل سمجھو۔ جسے پھونکنے کے لیے آگ درکار ہے۔ وہ آگ فکر و دھیان ہے کہ ہم کون چیز ہیں اور کون ہیں۔ اے رام چندر۔ غیر حق سے نظر بند کر لو۔ پھر کوئی خواہش باقی نہ رہے گی۔ اے رام چندر۔ خواہش بمنزلہ ابر کے ہے جو چاند کو ڈھانک لیتا ہے اور مثل ظلمات کے ہے جو نور کو چھپا لیتا ہے اور مثل سیاہی کے ہے کہ سفیدی اس اُس میں گم ہو جاتی ہے۔ اسکے شر سے بچنے کی کوشش کر۔ اگر نفس کا تزکیہ کرے گا تو ایسا پاک و صاف ہو جائے گا کہ عالم پھر اُسے گرد آلود نہ کر سکے گا۔ جس کسی نے دوئی کے غبار سے اپنے دل کو پاک و صاف کر لیا اس پر علائق و موانع عالم پرتو نہیں ڈال سکتے۔ اور حوادث اُسے ہلا نہیں سکتے۔ اے رام چندر۔ اہل سلوک کی صحبت اور کتب صوفیہ کا مطالعہ کر تا رہ۔ اس سے معرفت نفس تھوڑی مدت میں حاصل ہو جائے گی ورنہ برسہا برس میں بھی حاصل نہ ہوگی۔ اے رام چندر۔ جب تجھے ہمہ اوست پر یقین آ جائے گا تو پھر عالم کے ناشائستہ اور زہر قاتل تجھے آب حیات ہو جائیں گے۔ اور جب یہ حالت پیدا ہو جائے گی تو قالب عنصری جو کثیف ترین اشیاء ہے روح کی صفت حاصل کرے گا۔

معرفت نفس:۔ اے رام چندر۔ تجھے چاہیے کہ ہمیشہ اس عنوان سے تصور کیا کرے کہ میں ایک دریا ہوں صاف و لطیف خنک و بے کیف۔ دانا اور اس قالب سے جدا۔ یہ قالب عنصری میرا محض لباس ظاہری ہے مگر میں قائم بہ خود ہوں۔ اے رام چندر۔ عقل و نفس۔ حواس ظاہری و باطنی بظاہر الگ الگ معلوم ہوتے ہیں لیکن اگر دیدۂ بصیرت سے دیکھے تو یہ کچھ نظر نہ آئیں گے

اور صرف وہی ایک ذات یگانہ نظر آئے گی۔ اے رام چندر۔ اگر تو اس خیال پر قرار پکڑلے کہ مجھے جنبش و حرکت نہیں ہوتی۔ ایک جگہ پر قرار رہتا ہے۔ کسی پر اعتماد نہیں۔ کسی سے امید نہیں ہم جیسے کہ تھے اب بھی ویسے ہی ہیں۔ کوئی خواہش ہماری دامنگیر نہیں۔ ہم خود مستغنی اور بے نیاز ہیں۔ سب سے آسودہ۔ کسی ایک کے بھی محتاج نہیں۔ ہمیشہ ایک ہی قرار پر ہیں۔ ہم میں کسی تغیر و تبدل کو راہ نہیں۔ سب سے آزاد اور سب کے ساتھ۔ جیسے کہ یہ آکاش ہے۔ با ہمہ و بے ہمہ ہیں اور ہمیشہ اسی فکر میں رہے اور یہ جانے کہ ہم ہست ہیں اور ہمارے سے غیر کا وجود نہیں۔ ہمیں ہم ہیں۔ اگر ایسا کرے گا تو مطلوب کو پہونچ جائے گا۔

معرفت حق:۔ جو ثنا اور شکر کہ ظہور میں آتا رہتا ہے سب حق سے حق پر ہے اور خود حق ہے۔ بس حامد و محمود (محمد) و حمد سب ایک ہیں اور حق ہیں۔ اور حق عین علم و معرفت ہے۔ ظہور اسکی صفت ہے بلکہ عین وہی ہے۔ وہ خود سب میں ساری بلکہ سب کا عین ہے۔ عین ہمہ و از ہمہ جدا۔ اے رام چندر۔ عالم کی صورت جو اس کثرت ظاہر میں نظر آتی ہے سب اُس کا لباس ہے۔ باطن وہ یگانہ ہے۔ باطن میں کسی طرف مشغول مت ہو اور یگانگی حق کے ساتھ جمے رہو۔ اے رام چندر۔ اس قالب کے بند کو تیغ معرفت و شناسائی حق سے کاٹ دو تاکہ ناسوتی کے بند سے خلاصی نصیب ہو۔ اے رامچندر۔ خواب و بیداری دونوں کو درمیان سے اُٹھا دو۔ جو صورت اصلی ہے وہ دائم ہے اُسی سے متصف رہو۔ رد و قبول دونوں کا خیال ترک کر دو اور ان تکلفات کو مت راہ دو۔ اے رام چندر۔ قالب جو گوشت پوست خون و استخوان ہے تجھے اس سے کیا نسبت۔ تو عین علم و دانش ہے اور لطیف و نورانی ہے۔ پھر تجھے کیا ہو گیا کہ ایسے امر میں مشغول ہے اور وہ ذات پاک جو معدن خیر ہے اُسے ہاتھ سے چھوڑے دیتا ہے اور گمان کرتا ہے کہ یہی قالب سب کچھ ہے اور نہیں سمجھتا کہ یہ قالب سنگ و کلوخ سے زیادہ نہیں۔

دریافت خود:۔ اے رام چندر۔ جب تو اس قالب کے تعلقات سے گزر جائے گا اور اسے نظر میں نہ لائے گا اور یہ سمجھ لے گا کہ ہمیں قالب سے کیا علاقہ اور نسبت۔ جس طرح رہے رہے۔ اور اس حالت پر تو جم جائے گا۔ اُسوقت تجھ پر ظاہر ہو جائے گا کہ جو کچھ ہے تو ہی تو ہے۔

اے رام چندر۔ جو کچھ تجھے دکھائی دے اُسے سمجھ کہ میں وہ نہیں ہوں۔ جب سب سے نفی کرے گا تو اس نفی کے بعد جو باقی رہ جائے گا وہ تو ہو گا۔ اُسوقت دیکھے گا کہ تجھی میں تیرا مطلوب ہے۔ اے رام چندر۔ جو چیز تجھے نظر آتی ہے اُس میں تین چیزیں ہیں۔ ایک تو خود ہی ظہ

عالم ہے دوم معلوم ہے اور تیسری علم۔ مگر علم تجھ سے جدا نہیں ہے اور معلوم علم سے وابستہ ہے پس درحقیقت عالم و معلوم و علم ایک ہی شے ہے۔ پھر کیوں نہیں اُسی ایک چیز کو دیکھتا کہ تو اُسکا عین ہے اور وہ ایک سے زیادہ نہیں۔

درمعرفت حال خود:- اے رام چندر۔ اپنے آپ کو اس طرح تصور کر کہ میں سب سے جدا اور سب سے الگ ہوں۔ جب اپنے آپ کو اس طرح دیکھے گا کہ ہم نہ جان ہیں اور نہ قالب۔ اور سب سے الگ ہیں۔ اور اس خیال کی ورزش کریگا تو سب کچھ تو ہی ہو جائے گا۔ اے رام چندر۔ اگر تو اپنے آپ کو جان تصور کریگا اور یہ سمجھے گا کہ قالب جو مرکب جان ہے اسکے علائق میں گرفتار ہوں تو تیری مثال اُس بڑے آدمی کی سی ہوگی جو گو تجس میں ہے مگر نہیں جانتا کہ میں کون ہوں۔ پس جو شخص کہ حق کو نہیں دیکھتا اور اپنے آپ کو جان تصور کرتا ہے وہ کبھی نہیں جان سکتا اگر یہ جان کی نسبت تیرے درمیان سے اُٹھ جائے تو خود صاحب جان ہو جائے گا۔

درکمال معرفت:- اے رام چندر۔ جو کچھ میں نے اوپر بیان کیا تجھے چاہیے کہ اسکی ورزش کر تاکہ خود تو وہ ہو جائے۔ شکر شکر کہنے سے مُنہ میٹھا نہیں ہوتا۔ گنگا جل گنگا جل کہنے سے صاف نہیں ہوتا محنت کرنے سے یہ بات حاصل ہوتی ہے۔

اے رام چندر۔ تو وہی وجود واحد ہے جو کہ تھا۔ تجھ میں دوئی کی گنجایش ہی نہیں لیکن خود تو نے اپنے آپ کو دو سمجھ رکھا ہے کہ ایک ہم ہیں اور ایک عالم ہے۔ وہاں بھلا دوئی کا کیا کام۔ اس لیے چاہیے کہ یگانگی کا تصور محکم کر اور اثنینیت کو ترک کر۔ اے رام چندر۔ اگر اپنے آپ کو "ایک" خیال کرے گا، تو تو "ایک" ہو جائے گا، اگر "بسیار" خیال کرے گا تو "بسیار" ہو جائے گا۔ جس طرح چاند کا عکس مختلف ظرفوں میں پڑتا ہے اور بظاہر کثرت نظر آتی ہے لیکن درحقیقت چاند ایک ہی ہے۔ اُس میں کثرت و تعدد نہیں۔ یہی حالت حق کی ہے۔

گر در دلِ تو گُل گذرد گُل باشی ۔۔۔ ور بلبل بیقرار بلبل باشی
تو جزوی و حق کل ست اگر روزے چند ۔۔۔ اندیشۂ کل پیشہ کنی کل باشی

حامد علی خاں

(زائد ناظم عدالت رائچور)

مختصر تاریخ جاوہ و ملحقات

(بسلسلۂ الناظر ماہ ستمبر سنہ ۱۹۲۴ء)

ملایو زبان میں اس مختصر تحریر میں ملایو زبان کی تاریخ پر بحث کرنا نہیں چاہتا۔ اور نہ یہ تبلانا چاہتا ہوں کہ اسکی ایجاد کب سے ہوئی۔ یا یہ کہ اس پر کیا کیا انقلابات آئے۔ بلکہ صرف اسکی موجودہ حالت کے متعلق کچھ کہنا چاہتا ہوں۔ آجکل یہ زبان تمام جزائر ملایا، ملاکا، سماترا، جاوا، اور تمام جزائر ندرلینڈ انڈیا کی لنگو فرانکا ہے۔ انگریزی علاقہ میں یہ زبان عام ہے۔ اور ہر ایک نو وارد کے لیے اس زبان کا جاننا لازمی ہے، ورنہ بہت سی مشکلات کا سامنا ہوتا ہے۔ لیکن ندرلینڈ انڈیا کی گورنمنٹ نے تو ملایو کو سرکاری زبان قرار دیا ہے۔ تمام سرکاری دفاتر ملایو میں ہیں۔ عام کاروبار ملایو زبان میں ہوتا ہر ہر ایک سرکاری یا غیر سرکاری ملازم کے لیے ملایو زبان کا سیکھنا، لکھنا پڑھنا لازمی ہے۔ تمام احکامات ملایو زبان میں شایع ہوتے ہیں۔ تمام عرضیاں چھوٹی عدالتوں سے لیکر ہائیکورٹ اور گورنر جنرل تک ملایو میں ہوتی ہیں۔ کسی عدالت یا حاکم کے سامنے ملایو کے لیے ترجمان کی ضرورت نہیں بلکہ عدالتی زبان ملایو ہے۔ اور تمام ڈچ آفیسر ملایو لوگوں کی طرح ملایو زبان بول، پڑھ اور لکھ سکتے ہیں اور زیادہ تر اسی ذریعہ سے اس زبان کو روز بروز ترقی ہو رہی ہے۔ آپ ندرلینڈ انڈیا کے کسی ایسے جزیرہ میں جائیے جہاں کے اصلی باشندے وحشی ہیں۔ انکی زبان علیحدہ ہے۔ اور اس جزیرہ میں ملایو لوگ بھی آباد نہیں۔ لیکن حکام سے ساتھ گفتگو کرنے کے لیے انکو ملایو زبان سکھائی جاتی ہے۔ تمام اسکولوں میں عام طور پر ملایو میں تعلیم دی جاتی ہے۔ جو وحشی عیسائی مذہب اختیار کرتے جاتے ہیں انکی مذہب زبان بھی ملایو ہے۔ الغرض اس میں شک نہیں کہ ڈچ گورنمنٹ ملایو زبان کی محسن ہے۔ اگرچہ ابھی تک اس زبان میں موجودہ علمی کتابوں کو ترجمہ کرانے کی کوئی کوشش نہیں کی گئی جس کی اشد ضرورت ہے۔ لیکن امید رکھنی چاہیے کہ نوجوان ملایو اس ضرورت کو محسوس کرکے بہت جلد اس طرف توجہ کریں گے۔ اور نئے علوم کی مفید کتابوں کے تراجم کرکے اس زبان میں علمی خزانہ جمع کرکے اپنے ملک اور قوم پر احسان کریں گے۔

جزائر ندرلینڈ انڈیا میں آپ بہت مرتبہ دو یورپین کو آپس میں ملایو زبان میں گفتگو کرتے دیکھینگے جبکہ وہ ایک دوسرے کی زبان سے ناآشنا ہوں۔ یہ زبان نہایت ہی مختصر اور آسان ہے۔ اور اسلیے

بہت جلد اور آسانی کے ساتھ سیکھی جا سکتی ہے۔ فارسی کی طرح ملایو میں مونث اور مذکر کا ضمائر وغیرہ میں کوئی فرق نہیں۔ اور تثنیہ تو عربی کی طرح کجا؟ جمع تک بھی نہیں۔ مفرد سے جمع کرنے کا نہایت آسان طریقہ یہ ہے کہ اُس لفظ کو مکرر کہا جائے۔ مثلاً بُواہ میوہ کو کہتے ہیں، بواہ بواہ میووں کو کہا جاتا ہے۔ اورنگ آدمی کو کہا جاتا ہے، اورنگ اورنگ بہت سے آدمی ہوے۔ وقس علیٰ ہذا۔ بھائی اور بہن کے لیے ایک ہی لفظ سدارا مستعمل ہے۔ جب بھائی کہنا ہو تو سدارا لالی (مرد) کہا جائے گا، اور بہن کے لیے سدارا پرمیوان (عورت) کہکر سمجھایا جائے گا۔ اسی طرح اولاد کے لیے آناک کا لفظ مستعمل ہے۔ یعنی بچہ۔ بیٹا کہنا ہو تو اناک لالی (یعنی بچہ مرد) اور لڑکی کے لیے اناک پرمیوان (یعنی بچہ عورت) کہا جائے گا۔ وغیرہ

یہ زبان بھی اُردو کی طرح مختلف زبانوں کا مجموعہ ہے۔ عموماً ملایو زبان میں ذیل کی مختلف زبانوں کے الفاظ پائے جاتے ہیں (۱) عربی (۲) ہندوستانی (۳) پرتگیز یا سپنیش (۴) ڈچ (۵) جاوانیز (۶) سنسکرت (۷) انگریزی (۸) جاپانیز اور (۹) فارسی۔ یہ ترکیب کثرت الفاظ کے تطابق سے ہے۔ کیونکہ اس زبان میں آجکل سب سے زیادہ الفاظ عربی کے ہیں۔ اسکے بعد دوسرا نمبر ہندوستانی کا ہے۔ پھر علیٰ ہذا القیاس درجہ بدرجہ دوسری زبانیں۔ اور سب سے کم فارسی۔

عربی کے الفاظ نصف کے قریب ہیں۔ جسکا سبب یہ نظر آتا ہے کہ اول تو ان ممالک میں سب سے اول عرب تاجر آئے۔ اور قدرتی طور پر انکی زبان کے الفاظ کثرت سے داخل ہوے۔ علاوہ اسکے جب پرتگیز آئے تو اسپینی زبان کے واسطہ سے بھی کچھ عربی الفاظ بعینہ اور کچھ تبدیل ہیئت کے ساتھ داخل ہوے۔ مثلاً کرسی کا عربی لفظ بعینہ پرتگیزوں کے ذریعہ سے ملایو میں داخل ہوا۔ اور قمیص کا عربی لفظ کمیجا کی شکل میں اسی واسطہ سے آیا۔ اسی طرح ہندوستانیوں کے اختلاط سے بھی ہندوستانی الفاظ کے ساتھ ایسے عربی الفاظ مستعمل ہوے جو کہ ہندوستانی میں مروج تھے۔ اور چونکہ عربوں نے تجارت کا سلسلہ جاری رکھا اور ہزاروں کی تعداد میں اس جگہ آکر رہنے لگے۔ روز بروز قدرتی طور پر عربی کے الفاظ زیادہ داخل ہوتے گئے۔ چونکہ ملایو میں بہت کم الفاظ تھے اس لیے انکو جو لفظ سب سے پہلے جس زبان سے ملا اُسے لے لیا۔ مثلاً ہفتہ کے سات دن کا عام دستور رہے، لیکن انکے ہاں پانچ دن کا ہفتہ مروج ہے۔ ان پانچ دنوں کے نام یہ ہیں: (۱) لگی (Legi) (۲) پاہینگ (Paing) (۳) پون (Pon) (۴) کلیوان (Kliwon) اور (۵) واگہ (Wage) جب عرب آئے تو سات دن کے ہفتہ کا رواج اپنے ہمراہ لائے۔ یہی سبب ہے کہ آجکل دنوں کے نام

انکے ہاں بالکل عربی ہیں۔ صرف نہایت قلیل فرق لفظ کا پڑگیا ہے۔ مثلاً عربی نام اثنین کو سینیس، ثلاثہ کو سلاسہ، اربعہ کو ربیو، خمیس کو کمیس، جمعہ کو جماہت، سبت کو سبتو اور احد کو احد یا منگو کہتے ہیں۔ منگو ایک ہفتہ کو بھی کہا جاتا ہے۔

منگولین اقوام میں بوسہ بازی کا رواج نہیں۔ یا یوں کہو کہ بوسہ انکے ہاں کوئی چیز ہی نہیں۔ جیسے جیسے ان لوگوں کا اختلاط دوسری اقوام سے ہوتا گیا بوسہ کو سمجھنے لگے۔ لیکن اس سے حظ تو ابھی تک نہیں اُٹھاتے۔ جاپانی زبان میں بوسہ کے لیے کوئی لفظ نہیں۔ لیکن چونکہ اقوام خارجہ سے جاپانیوں کا تعلق سب سے پہلے ان اقوام سے ہوا جو انگریزی بولتے تھے۔ اسلیے اب جاپانیوں نے بوسہ کے لیے انگریزی لفظ کِس (Kiss) اختیار کیا۔ جو اب انکے ہاں مروج ہے۔ اسی طرح چونکہ ان جزائر کے باشندے بھی منگولین ہیں اور بوسہ کو نہیں جانتے تھے۔ جب عرب اول اول آئے تو انکی آپس کی بوسہ بازی کی عادت دیکھ کر لوگ سمجھے نہیں کہ یہ کیا ہو رہا ہے؟ بلکہ بوسہ کو سونگھنا سمجھے اور عربی کا لفظ شم جو سونگھنے کے معنی میں آتا ہے استعمال کرنے لگے۔ جو آہستہ آہستہ شیوم اور چیوم ہوگیا۔ چنانچہ اب تک ملایو میں بوسہ اور سونگھنے کے لیے یہی لفظ مستعمل ہے اور دونوں معنوں میں کہا جاتا ہے۔ بلکہ عربوں کے اختلاط سے اگرچہ بزرگوں کے ہاتھ کو چومنا اب انکے ہاں مروج ہے لیکن یہ لوگ دراصل ہاتھ کو چومتے نہیں بلکہ صرف سونگھتے ہیں۔ لطف یہ کہ بعض یہاں کے پیدا شدہ عربوں کو بھی ملایو اقوام کی تقلید میں ہاتھ سونگھنے کا مرض پڑ گیا ہے۔ اور ممکن ہے روز بروز زیادہ ہوتا جائے۔

معلوم ہوتا ہے چائنیز کے اختلاط سے پہلے انکے ہاں مجلس یا محفل کے لیے کوئی لفظ نہ تھا اسلیے چائنیز لفظ "کونگسی" مروج ہوگیا۔ اور بعض اوقات عربی لفظ شرکت بھی استعمال کیا جاتا ہے۔ اسی طرح سنسکرت کے الفاظ مانوسیا (انسان)، کارنا (سبب)، پنڈیتھ (راہب)، راگم (گانا) وغیرہ بہت ہی کم تبدیلی کے ساتھ مروج ہیں۔ لیکن تعجب ہے کہ زنار کے لیے کوئی ہندی یا سنسکرت لفظ استعمال نہیں کیا جاتا۔ بلکہ تالی پنگانگ کہا جاتا ہے۔ حالانکہ زنار کا رواج ہندوؤں سے ہوا۔ اور لازمی تھا کہ سنسکرت کا کوئی لفظ مروج ہوتا۔

ان جزائر میں عام خوراک چاول ہے۔ اسیلیے چاولوں کے لیے انکے ہاں اپنا نام موجود ہے بلکہ بنگالی اور کشمیری زبانوں کی طرح پکائے ہوے اور کچے چاولوں کے لیے الگ الگ نام ہیں۔ کچے چاولوں کو براس اور پکے ہوؤں کو ناسی کہا جاتا ہے۔ لیکن دھان کے لیے انکے ہاں کوئی خاص نام نہ تھا۔ انگریزی غلط ملط کے سبب سے سب سے اول جو لفظ دھان کے لیے انھوں نے سنا وہ پیڈی

تھا۔ چنانچہ اب وہاں کے لیے پیڈی ہی مروج ہے۔ چونکہ روٹی یہ لوگ جانتے ہی نہ تھے نہ یہاں گیہوں ہوتا ہے۔ قرین قیاس معلوم ہوتا ہے کہ اول اول بعض ہندوستانی ان اطراف میں آئے جنھوں نے روٹی پکائی۔ اسلیے اس کا نام روٹی پڑ گیا۔ یا یہ کہ آئے تو عرب بھی لیکن وہ عرب جو ہندوستان سے ہو کر آئے تھے۔ اسلیے انھوں نے روٹی کا نام بجائے خبز کے روٹی ہی تبلایا۔ کیونکہ ان جزائر کو بھی ہند ہی کہا جاتا ہے۔ اسلیے انھوں نے ہندی ہی نام تبلایا اور وہی زبان زد ہو گیا۔ لیکن گنگ کے لیے جب ان عربوں سے نام پوچھا گیا تو شاید انھیں اتنی ہندوستانی تو آتی نہ تھی کہ ہندی نام تبلاتے، انھوں نے چاہا کہ کسی اور عجمی زبان میں انکو سمجھائیں۔ چونکہ یہ لوگ خلیج فارس سے ہو کر آئے تھے، انھوں نے گنگ کا نام گندم تبلایا۔ چنانچہ گندم ہی چلا آتا ہے۔

اسپینش یا پرتگیز الفاظ بھی معقول طور پر رائج ہو گئے ہیں۔ کھڑکی کے لیے کوئی نام نہ تھا، جندیلا (پرتگیزی) رکھ لیا گیا۔ اسی طرح گاڑی کے لیے کرتیا، نیلام کے لیے لیلانگ وغیرہ انھیں زبانوں کے الفاظ ہیں۔ ملایو میں جناب، حضور، یا صاحب کے لیے "توان" کا لفظ استعمال کیا جاتا ہے۔ اور اسی طرح بیگم یا خاتون کے لیے "نونیا" کا لفظ مروج ہے۔ دراصل یہ دونوں الفاظ بھی اسپینی زبان کے دون اور دونا سے مشتق ہیں۔ اسپینی میں دون، صاحب، جناب یا مسٹر کے معنوں میں آتا ہے۔ ملایو میں بھی دون شروع ہو گیا۔ جو بگڑتے بگڑتے "توان" ہو گیا۔ اسی طرح دونا بیگم یا میڈم کو کہتے ہیں۔ ملایو میں دونا کا تونا ہو گیا۔ جو غیر شادی شدہ معزز عورتوں کے لیے مستعمل ہونے لگا پھر انھوں نے تخصیص کر دی اور شادی شدہ عورتوں کے لیے نونیا رواج پکڑ گیا۔ لیکن ابھی تک دور دراز جزائر میں نونا دونوں کے لیے مستعمل ہے۔

ڈچ گورنمنٹ ایک کئی سو سال سے حکمراں ہے۔ اسلئے قدرتی طور پر انکی زبان کے الفاظ کثرت سے مروج ہونے چاہیے تھے۔ لیکن چونکہ ملایو زبان میں کافی ذخیرہ الفاظ کا جمع ہو چکا تھا۔ اس لیے ہالینڈوی زبان سے زیادہ تر وہی الفاظ آئے جو اول انکے ہاں موجود نہ تھے۔ مثلاً چونکہ ڈچوں کے زمانہ میں ریل اور ٹریم جاری ہوئے۔ ٹکٹ کے لیے ڈچ لفظ کرچیس جاری ہو گیا۔ اسی طرح جیبی گھڑی کے لیے ڈچ لفظ ہرلوجہ جو دراصل فرانسیسی ہے، مستعمل ہے۔ ڈچوں کے زمانہ میں یہاں دفتر جاری ہوئے۔ ڈچ لفظ کنتور دفتر کے لیے رواج پکڑ گیا۔ لیکن اب چونکہ اس طرف کے باشندے ڈچ (حاکم) کی زبان کو قدرتی طور پر فخریہ استعمال کرتے ہیں اسلیے بعض قدیمی الفاظ کو چھوڑ کر ڈچ الفاظ جگہ پکڑتے جاتے ہیں۔ مثلاً ممبر (رکن) کے لیے ملایو میں دراصل لفظ انگوتا مستعمل ہے لیکن آجکل لِد (Lid) کا ڈچ لفظ کہا

جاتا ہے - جاوی زبان کے جس طرح الفاظ ملایو میں داخل ہوئے ہیں ویسے ہی ملایو کے الفاظ بھی جاوی میں جگہ پکڑ گئے - اور یہی اس اختلاط کا نتیجہ ہے جو ان اقوام کا آپس میں تھا اور ہے -

میرے خیال میں ملایو میں جو غیر الفاظ داخل ہیں انکے لیے ذیل کا اندازہ کیا جا سکتا ہے :-

عربی	پچاس	فی صدی	۵۰
ہندوستانی	بیس	"	۲۰
سپنش پرتگیز	آٹھ	"	۸
ڈچ	چھ	"	۶
جاوی	پانچ	"	۵
سنسکرت	چار	"	۴
انگریزی	تین	"	۳
چائنیز	ایک	"	۱
فارسی	ایک	"	۱
متفرق	دو	"	۲

۱۰۰

ملایو زبان میں صرف و نحو کے بعض قواعد ہیں - لیکن نا مکمل اور اس میں اصلاح کی ضرورت ہے - اگر اس زبان کو نئے سانچہ میں ڈھالا جائے تو ایک اچھی اور کار آمد زبان ہوسکتی ہے - ملایو میں کئی ایک الفاظ ایسے ہیں جو ایک جملہ کا کام دیتے ہیں - مثلاً بلوم کے معنی ہیں ابھی تک نہیں - بکان، یہ نہیں، یا ایسا نہیں پرچوما، بفائدہ - اس سے کچھ فائدہ نہیں - مفت یا نیکی برباد گنہ لازم - ملایو میں دراصل مخاطب کیلیے کوئی مناسب لفظ نہیں انگکاؤ - کاؤ - کوبی یا کو کے الفاظ تو کے برابر ہیں - تم یا آپ کے لیے کوئی لفظ نہیں، اسلیے عام رواج انکے ہاں مخاطب کیلیے لفظ توان استعمال کرنے کا ہے - جسکے معنی ہیں جناب، حضور وغیرہ - ملایو میں اگر ساڑھے چار بجے کہنا ہو تو اسے ستنگا لیما یعنی نصف پانچ کہا جائیگا - اور یہ ڈچ زبان کا محاورہ ہے جو انکے ہاں مروج ہے - اسی طرح ساڑھے تین ڈھائی یا ڈیڑھ کے لیے علی الترتیب ستنگا، ہجیٹ، ستنگا تیگا، ستنگا دوا یعنی آدھ چار، آدھ تین، آدھ دو کہا جائیگا -

عربی کا اثر اس قدر عام ہوگیا ہے کہ نصرانی اور کافر بھی خدا کے لیے اللہ ہی کا لفظ استعمال کرتے ہیں - اللہ، استغفر اللہ وغیرہ کئی ایک الفاظ ہر ایک کی زبان پر مسلمانوں کی طرح رہتے ہیں -

رسم الخط یا طرز تحریر اگرچہ ملایو رسم الخط عربی ہے - لیکن دراصل انکے ہاں حروف تہجی صرف بیس ہیں - جو اس ترتیب کے ساتھ لکھے جاتے ہیں :-

ھ - ن - چ (چ) - ر - ک + د - ت - س - و - ل + ف - جہ

(جہ) - ج - ی - پٔ (پ) + م - گ - ب - ط - غٔ +

ان حروف تہجی میں الف نہیں - بلکہ الف کے عوض مد مستعمل ہیں - لیکن اب الف کا رواج ہوگیا ہے - وہ بھی صرف اُسوقت جبکہ الف کی ضرورت ابتداء میں ہو - یا بعض اوقات وسط میں بھی - لیکن آخر میں کبھی استعمال نہیں کیا جاتا - مثلاً اِڈا کو ادہ لکھا جاتا ہے اور پاڈا کو قلبہ جیم کے بیچ میں دو یا تین نقطے لگانے سے چاء کہلاتا ہے جو فارسی چ کی آواز دیتا ہے - اسی طرح معمولی ث یا اُسپر دو یا تین نقطے لگانے سے فارسی پ کی آواز دیتا ہے اور پاء کہلاتا ہے - ڈ کی آواز کے لیے دال کے نیچے ایک یا دو نقطے لگائے جاتے ہیں - اسی طرح ٹ کی آواز کے لیے ط کے نیچے ایک یا دو نقطے مستعمل ہوتے ہیں - پ یا ثٔ کا تلفظ عجیب ہے یعنی نیا نون غنہ - اور اسکا نام بھی یہی ہے - مثلاً سالاپ پڑھا جائیگا - سالا ما نیا - کاف پر ایک دو یا تین نقطے لگانے سے فارسی گاف کی آواز نکلتی ہے - اور عین کے اوپر دو یا تین نقطے لگانے سے نغا بنجاتا ہے لیکن آواز نگ کی نکلتی ہے مثلاً اورغ پڑھا جائیگا اورنگ -

اگرچہ خ ملایو میں بالکل مروج نہیں سوائے اُن لفظوں کے جو عربی سے آئے ہیں - لیکن چونکہ ڈچ زبان میں صرف عح خ کی آواز دیتا ہے اسلیے جس جگہ ڈچ زبان کا ایسا لفظ آئے جس میں عح ہو تو خ لکھا جائیگا جیسا کہ معلوم ہوا - ملایو کے حروف تہجی صرف بیس ہیں - گویا دنیا کی ہر ایک زبان سے کم - اگر اس رسم الخط کی اصلاح کی جائے تو ایک آسان اور مفید رسم الخط تیار ہوسکتا ہے۔

آجکل رسم الخط افرنجی کا رواج زیادہ ہو رہا ہے - کیونکہ ڈچ گورنمنٹ کے دفاتر میں عربی رسم الخط کے ساتھ ہی افرنجی رسم الخط میں بھی اعلانات شایع ہوتے ہیں - نیز ان لوگوں کے لیے جو کسی یورپین زبان سے آشنا ہوں اس رسم الخط میں آسانی ہے - اور چاینز نے بھی ملایو کے لیے یہی رسم الخط اختیار کیا ہے - اخبارات بھی کثرت کے ساتھ اس خط میں شایع ہوتے ہیں - اور اسکا رواج روز بروز زیادہ ہو رہا ہے - چونکہ ملایو میں ہندوستانی کی زیادہ تر باریکیاں نہیں ہیں اسلیے یہ زبان آسانی کے ساتھ رومن میں لکھی یا پڑھی جاسکتی ہے اور کسی قسم کی دقت محسوس نہیں ہوتی - اس علاقہ کے باشندوں کو ایک قسم کی آسانی اس میں یہ ہے کہ اسکولوں میں ڈچ اور ملایو رسم الخط ایک ہی وقت میں آجاتا ہے اور دو دو رسم الخطوں میں وقت ضائع نہیں ہوتا -

عبدالسلام رفیقی

حضرت جوشؔ کی تائید میں

جنابِ من تسلیم۔ ماہ فروری کے رسالہ الناظر میں محترمی جناب قاضی غلام امیر صاحب امیرؔ بدایونی کا ایک استفسار جو حضرت جوشؔ ملیح آبادی کی نظم "مسلم جوان مرد سے خطاب" کے قوافی کے متعلق شایع ہوا ہے نظر سے گذرا۔ اعتراض کی نوعیت کچھ اس قسم کی ہے جس سے فاضل مستفسر کا منشا بخوبی واضح نہیں ہوتا۔ خدا جانے قافیۂ مقید سے صاحب موصوف کا کیا مقصد ہے۔ آیا اُس قافیہ سے مراد ہے جس میں حرف قید آئے یا اُس سے جس میں روی مقید یعنی ساکن واقع ہوئی ہو۔ میں دیکھتا ہوں کہ ان میں نہ کوئی حرف قید ہے اور نہ روی مقید۔ غالباً حرکت ماقبل "را" کے اختلاف کے سبب سے یہ اشتباہ پیدا ہوا ہے۔ ان قوافی میں روی یعنی آخری اصلی حرف 'رے' ہے اور 'یا' وصل جسکے سبب سے روی متحرک ہوگئی ہے۔ ماہرینِ علم قوافی کا یہ مسلمہ مسئلہ ہے کہ جب روی بسبب اتصال حرف وصل متحرک ہو جائے تو اسکے یعنی روی کے ماقبل کی حرکت خواہ وہ توجیہ ہو یا اشباع بدل سکتی ہے۔ لہذا آذری۔ پیمبری۔ سحر سامری۔ افسردہ خاطری، بلا تکلف باہم قافیہ ہو سکتے ہیں۔ البتہ روی ساکن ہونے کی حالت میں ایسا نہیں چاہیے۔ اگرچہ بقول محقق علیہ الرحمہ تازی میں یہ بھی ممکن ہے۔ اپنے قول کی تائید میں چند مستند کتب کے حوالے ذیل میں درج کرتا ہوں تاکہ فاضل مستفسر کی کافی تشفی ہو جائے:۔

۱۔ میر شمس الدین فقیر علیہ الرحمہ حدائق البلاغت کے حدیقۂ رابعہ فی علم القوافی میں لکھتے ہیں کہ "اگر روی بسبب اتصال او با حرف وصل متحرک گردد اختلاف حرکت ماقبلش جائز است چنانچہ دریں دو بیت خاقانی ؎

چشمہ ساز خضر لب از لبِ جام کوثری | کز ظلمات بحر جست آئینہ سکندری
گر ز حجاز کعبہ را رخصتِ آمدن بود | در حرمِ خدائگاں کعبہ کند مجاوری
یو رسبکتگیں توئی دولت ایاز خدمتت | بندہ بہ گوہر دولتت رشکِ روانِ عنصری

و دریں بیت سعدی

نیامد در ایام او بر دلے | نگویم کہ خارے کہ برگِ گلے

اسی صورت سے بیان اشباع میں فرماتے ہیں کہ "اختلاف اشباع در جائے کہ روی متحرک آید جائز نیست"

چنانچہ دریں دو بیت سعدی۔

اے بادشاہ وقت چو وقتت فرا رسید — تو نیز باگدائے محلت برابری
مردے گماں مبر کہ بسر پنجہ ادست کتف — با نفس اگر برانی دانم کہ شاطری"

(۲) مولانا عطاء اللہ شاگرد جامی قدس سرہٗ اپنے رسالہ قافیہ کے حرف چہارم بیان توجیہ میں تحریر فرماتے ہیں کہ "حضرت اُستادی مخدومی مدظلہ العالی فرمودہ کہ توجیہ حرکت ماقبل روی ساکن است و نشاید کہ مختلف گردد مگر وقتیکہ روی متحرک شود بسبب حرف وصل چنانکہ انوری در قصیدہ کہ مطلعش ایں ست

اے مسلماناں فغاں از دورِ چرخ چنبری — وز نفاقِ تیر و قصد ماہ و سیر مشتری

سامری و عنصری را قافیہ ساختہ" اور بیان اشباع میں فرماتے ہیں کہ "حرکت دخیل در قوافی کہ مشتمل نیست بر حرف وصل جائز نیست اما در قوافی کہ مشتمل اند بر حرف وصل تجویز کردہ اند"

(۳) منشی منظفر علی خاں صاحب آسیر مرحوم رسالہ روضۃ القوافی صفحہ ۲۷ سطر ۹ میں لکھتے ہیں کہ "تغیر توجیہ در روی غیر موصول ناجائز مگر وقتیکہ موصول شود تغیر حرکت ماقبلش جائز" اور اسکے بعد مثال میں عرفی کے یہ اشعار دیے ہیں

با حسن و جمالِ تو پری را — دعوے نرسد برابری را
چشمِ تو بیک نگاہِ جادو — آموختہ سحر سامری را

(۴) مرزا محمد جعفر اوج لکھنوی مقیاس الاشعار بیان قافیہ کے باب خامس میں اختلاف حرکت ماقبل روی کے جواز کے قائل ہیں بشرطیکہ روی موصولہ ہو۔

(۵) نصیر المحققین خواجہ نصیر الدین طوسی علیہ الرحمہ بھی معیار الاشعار کے بیان عیوب قوافی میں یہ عبارت تحریر فرماتے ہیں کہ "اختلافِ توجیہ چنانکہ در اختر و عنصر و شاعر۔ اگر را متحرک شود ایں عیب مرتفع گردد"

بنظر اختصار انھیں پر اکتفا کرتا ہوں۔ امید ہے کہ محترمی بدایونی صاحب کے لیے یہ جوابات تسلی بخش ثابت ہوں گے۔

خاکسار سید محمد نقوی از حیدرآباد دکن

یہ مکتوب جیسا کہ گذشتہ پرچہ میں لکھا گیا۔ خطوط میں مل گیا تھا اور وقت پر تلاش کرنے کے باوجود ہاتھ نہ آیا۔ اس لیے اب قدرے تاخیر سے درج کیا جاتا ہے۔ ایڈیٹر

آزہر لکھنوی کی تنقید پہ تبصرہ

رسالہ النّاظر بابت مارچ ۱۹۲۵ء میں لسان الہند مولوی مرزا محمد ہادی صاحب عزیز لکھنوی کی ایک غزل کے بعض اشعار پر اعتراض کیے گئے ہیں۔ جن میں ایک بھی ایسا اعتراض نہیں جو غلط و پوچ نہ ہو۔ میں جانتا ہوں کہ ایسے غیر وقیع اعتراضات کا جواب لکھنا اُنکو غیر معمولی اہمیت دینا ہے۔ تاہم جناب آزہر کی اس خواہش کو باور کرکے کہ وہ کچھ حاصل کرنا چاہتے ہیں "انکی عبارت" کے جواب کی عبارت کرتا ہوں۔ یہ بھی امید ہے کہ دیگر قارئین کرام کی دلچسپی کا موجب ہو۔ جناب عزیز کا مطلع ہے :۔

شب آخر ہم بھی آخر دیکھیے کبتک وہ آتے ہیں   بصارت گھٹتی جاتی ہے چراغ اب بجھتے جاتے ہیں

جناب ازہر کا پہلا اعتراض یہ ہے، کہ "شب آخر" کے بعد "ہے" اور "ہم آخر" کے بعد "ہیں" ہونا چاہیے ورنہ "آخر" اس طرح "دیکھیے" کی دُم میں لگا ہوا ہے کہ پڑھنے والا معاً "آخر دیکھیے" پڑھے گا اور گمراہ ہو جائے گا۔ جسکی اُمید ایک ہادی زباں سے نہیں کیجاتی"۔

اس اعتراض کا بہترین جواب تو شاید یہ تھا "شعر مرا بہ مدرسہ کہ بُرد؟" اختصار جان فصاحت ہے، محذوفات بشرطیکہ ذہن بلا کاوش اُنکی طرف منتقل ہو جائے شعر کے معانی میں وسعت اور انداز بیان میں دلکشی پیدا کرتے ہیں۔ اور اگر سلیقہ سے برتے جائیں تو اُنکا شمار محاسن شاعری میں ہے۔ بعینہ یہی حالت جناب عزیز کے مطلع کی ہے۔ اگر روابط کو حذف نہ کیا جاتا تو شعر میں دو "ہے" اور تین "ہیں" فصاحت و روانی میں دراندازہوتے۔ مگر شاید یہ نکات اُنکی سمجھ میں نہ آئیں جو متین انشا میں "دُم میں لگا ہوا" لکھنا جائز سمجھے۔ رسالہ کے سرورق پہ جناب آزہر کے اسم گرامی کے ساتھ لفظ لکھنوی دیکھ چکا تھا۔ مجھے حیرت تھی کہ کسی لکھنو والے کے قلم سے ایسا فقرہ کیونکر نکلا، مگر خاتمہ مضمون پر جو اندراج ہے اُس سے معلوم ہوا کہ جناب آزہر لکھنوی نہیں بلکہ "از لکھنو" ہیں، میرے تاسف میں گونہ کمی ہوئی۔ خیر! یہ جملہ معترضہ تھا۔ لفظ "آخر" کے بعد ہی "دیکھیے" ہونے سے کوئی بچہ مغالطہ میں پڑے تو پڑے، ورنہ الفاظ کی ترتیب صاف بتا رہی ہے "کہ "آخر" کا تعلق ہم سے ہے نہ کہ "دیکھیے" سے۔

دوسرے مصرعہ میں صنعت لف ونشر غیر مرتب فرض کرکے جناب آزہر فرماتے ہیں کہ [illegible]

گھٹنا آثارِ موت نہیں نہ چراغوں کا بجھنا دلیلِ سحر ہے۔" بہت درست! مگر کیا اُس وقت بھی نہیں جب کوئی پہیلی کہے : "شب آخر ہم بھی آخر الخ" کیا ایسی صورت میں بھی بصارت کا گھٹنا پیامِ اجل اور چراغوں کا بجھنا عنوانِ سحر نہ سمجھا جائے گا؟ یہ جواب تو ویسا ہے جیسا کہ اعتراض۔ اب شعر کی معنوی خوبیوں اور الفاظ کے نادر انتخاب کی طرف توجہ کیجیے۔ شب وعدہ ایک ہجراں کشیدہ کسی کا منتظر ہے ("دیکھیے کب وہ آتے ہیں") رات آنکھوں میں کاٹی، آثارِ سحر نمودار ہونے لگے مگر معشوق نہیں آیا۔ اب مایوسی طاری ہوتی ہے، بصارت جواب دینے لگتی ہے اور چراغ (صرف وہ چراغ نہیں جو کسی کے آنے کی خوشی میں جلائے گئے تھے بلکہ "چراغِ داغ" بھی جو اضطرابِ شوق میں لَو دے رہے تھے، گل ہونا شروع ہوتے ہیں۔ شاعر نے اپنی قدرتِ کمال سے مضمون کو اس اہتمام اور ایسی جگہ ختم کیا کہ بعد کی کیفیتیں ہر شخص بقدرِ ذوق اپنے ذہن سے پوری کر سکتا ہے۔ بصارت کی کمی اور چراغوں کا بجھنا ان تمام کیفیتوں پر حاوی ہے جنکا ذکر مصرعہ اولیٰ میں ہے یعنی شدیدِ انتظار کے بعد مایوسی و موت، انتظارِ بے پایاں بھی زوالِ بصارت کا موجب ہوتا ہے۔ حضرت یعقوبؑ کا قصہ یاد کیجیے۔ مزید ثبوت کی ضرورت ہو تو سوداؔ کا یہ شعر پڑھیے۔

آنکھیں برنگِ نقشِ قدم ہوگئیں سفید　　　اس سے زیادہ خاک کروں انتظارِ خط

جس طرح تدریجی زوالِ بصارت، مایوسی و حرمان و اجل کا پیش خیمہ ہے اسی طرح چراغوں کا بجھنا نہ صرف صبح کا پتہ دیتا ہے بلکہ بربادیِ حسرت کی ترجمانی کرتا ہے۔ کسی نے کیا خوب کہا ہے:۔

بُجھ رہے ہیں داغِ دل تربت میں جلنے کے لیے　　　روشنی کم ہو رہی ہے نیند آنے کے لیے

یہ داغہائے دل کا بجھنا کیا ہے؟ ایک عمر آرزومند رہنے کے بعد حسرت و ناکامی و مرگ بیکسی۔

جناب ازہر دوسرے مصرعہ میں لفظ "اب" کے متعلق فرماتے ہیں کہ بیکار، اور ممکن ہے کہ غلط اور لغو بھی ہو۔

وائے بر جانِ سخن گر بسخنداں نہ رسد!

میرا دعویٰ ہے کہ اگر یہ لفظ نہ ہو تو مصرعہ ثانی اثر سے دور اور اس قدر پھیکا اور کمزور ہو جائے کہ پہلے مصرعہ سے توازن قائم ہی نہ رہے۔ یہی لفظ "اب" اُس ہلاک کرنے والی مایوسی کی طرف اشارہ کرتا ہے جو سخت انتظار کے بعد رونما ہو۔ جسکے شاہدِ عینی بجھنے والے چراغ ہیں۔

۲- اُٹھیں گی یا وہ حیا پرور نگاہیں کیا مری جانب　　　مقابل ہے ابھی آئینہ اور شرمائے جاتے ہیں

اس شعر کے خلاف جناب ازہر کا قلم کچھ لکھتے ہوئے کانپتا ہے کیونکہ عوام الناس میں بہت

مقبول ہوا! مجھے آج معلوم ہوا کہ مملکت سخن میں بھی جمہوریت پھیل گئی ورنہ شاعری عوام الناس کی دست نگر نہ تھی۔ اسکے قبول یا رد کا اختیار صرف اُنکو تھا جو خود ماہرِ فن ادب، سخن سنج، و سخن فہم ہوتے تھے۔ تاہم جناب آزہر "دبی زبان سے" فرماتے ہیں کہ لفظ "کیا" "اُٹھیں گی" سے اس قدر دُور ہو گیا ہے کہ جملہ کو استفہامیہ بنائے دیتا ہے۔ اور دوسرے مصرعہ میں "وہ" یا کسی ایسی لفظ کا استعمال ناگزیر معلوم ہوتا ہے۔ اسلیے کہ پہلے مصرعہ کا فاعل نگاہیں ہیں اور دوسرے مصرعہ میں "وہ" فاعل ہے اس لیے اظہار کی قطعی ضرورت ہے۔

ایسے اعتراضوں کا جواب کیا دیا جائے۔ اکثر استفہامیہ و انکاریہ جملوں کی شکل ایک ہوتی ہے جیسا موقع ہوتا ہے ویسے معنی لیے جاتے ہیں۔ یہ نتیجہ "کیا" کی دور افتادگی کا نہیں ہے۔ "اُٹھینگی" کے قریب ہو تو بھی یہی بات رہے گی۔ مثلاً اُٹھینگی کیا حیا پر ور نگاہیں وہ مری جانب۔ بندش بھدّی ہو گئی حاصل کچھ نہ ہوا۔ "وہ" سے مصرعہ میں جو چھیڑ چھاڑ کا مزہ ہے مفقود ہو جاتا۔ جو موجودہ صورت میں یہ معلوم ہوتا ہے کہ ایک عاشق اپنے محبوب کے ستانے کو ایک ایسا امر اُسکو سنا سنا کے بیان کر رہا ہے جو اُسے مجبور کرے کہ عاشق کی طرف غصہ سے گھور کر دیکھے۔ اگر لفظ "وہ" شامل ہوتا تو محض ایک دلکش منظر کا دوہرا دینا رہ جاتا، یہ لطفِ راز و نیاز جاتا رہتا۔

۳۔ شب غم منحصر گریہ پہ ہے اختر شماری بھی — جب آنسو ضبط کرتا ہوں ستارے ڈوب جاتے ہیں

ڈوبے جاتے ہیں بجائے ڈوب جاتے ہیں کتابت کی صریح غلطی ہے۔ مگر جناب آزہر کی اس اردو کے متعلق کیا ارشاد ہوتا ہے "زبان اُردو تو یوں بولے گی" !!! (غالباً ہمدم میں اسکی تصحیح بھی ہو چکی ہے)

اس شعر کا مطلب سمجھنے میں جناب آزہر کو اہم ترین دقتوں کا "سامنا کرنا پڑ رہا ہے"۔ اور آخرکار یہ حکم نافذ ہوتا ہے کہ سوائے ظاہری اوصاف کے بالکل صفر ہے۔ مطلب ہی غائب ہے۔ پھر چھان بین کیجاتی ہے تو ثابت ہوتا ہے کہ شعر خلاف "واقعہ" ہے کسی کے آنسوؤں کے ضبط کرنے سے ستارے نہیں ڈوب سکتے۔ چاہے کوئی شخص گھنٹوں آنکھیں بند کیے اور دل مسوسے بیٹھا رہے چمکنے والے اسی طرح چمکا کریں گے۔ اسکے بعد جناب آزہر یوں رطب اللسان ہوتے ہیں "ہمیں تو معلوم ہوتا ہے کہ عزیز صاحب لفظی مناسبت کی زنجیر میں پھنس کر ایسے پابند ہو گئے کہ معنویت کو کھو بیٹھے۔ کیا اسکے علاوہ کوئی اور بھی وجہ ہو سکتی ہے کہ صرف ستاروں اور اشک کے قطروں کی مشابہت نے شعر کو مہمل کر دیا۔"

کس قدر افسوسناک ہے یہ امر کہ شعر کا مطلب سمجھے بغیر اُسپر اعتراض کیا جائے۔ شب غم

میں اختر شماری دلیل ہجر و کرب و اضطراب ہے۔ ہجر و تنہائی کا اس سے بہتر شغلہ ہو بھی نہیں سکتا۔ کیونکہ ان چمکنے والوں میں کسی کی برق نگاہ کی جھلک ہے۔ یا یوں کہیے کہ یہ بھی کسی شاعر کی طرح کسی کے غم فراق میں آبدیدہ ہیں۔ نہ معلوم شاعر کے دل سے ستارے کیا کیا کہا کرتے ہیں۔ اختر شماری بجائے خود حزن و ملال کی نشانی ہے۔ مگر ایک مصیبت اور ٹوٹی۔ یہ اختر شماری گریہ پر منحصر کر دیگی روؤ گے نہیں تو تارے بھی نہیں گننے پاؤ گے۔ ایک شغل بیکاری رہ گیا تھا وہ بھی جاتا ہے۔ مجبوراً روتے ہیں! ان آنسوؤں نے تاروں کو زیادہ چمکدار اور اُنکی تعداد میں بیشمار اضافہ کیا۔ پھر بھی شاعر ترقی کرتا ہے اور فطرت کے ایک لطیف مشاہدہ کی طرف توجہ دلاتا ہے۔ آنکھوں میں آنسو ڈبڈبائے ہوے ہوں اور ستاروں یا کسی روشن چیز کی طرف دیکھو تو ایک چادر نور پھیل جائے گی۔ ایک نورانی کرن آکر تمھاری آنکھوں کو بوسہ دیگی۔ الغرض ستارے یا نورانی اجسام اگر آنکھوں میں اشک بھرے ہوں تو اپنی اصلی صورت میں نظر نہیں آتے۔ بلکہ ایک سیل یا شعاع نور معلوم ہوتے ہیں اس واقعہ کو شاعر اپنے انوکھے انداز میں یوں بیان کرتا ہے

جب آنکھیں بند کرتا ہوں ستارے ڈوب جاتے ہیں

میرے لیے اُتنی دیر کو ستارے ڈوب گئے۔ بندی کی چندی نکالنے والے نحویوں، منطقیوں سے غرض نہیں، رونے میں اختر شماری کہاں، مگر طبیعت گل کھلا رہی ہے، اُلٹی بات کہتے ہیں اور اُسکو ثابت کر دیتے ہیں۔ اور اس کامیابی کے ساتھ کہ حقیقت سے دور نہیں ہوتے۔

۴۔ غبار اُٹھتا ہے بھر دیتے ہیں جوش بندگی اتنا زمیں گردوں کو ٹھکراتی ہے جب ہم سر جھکاتے ہیں

اس شعر پر پہلا اعتراض یہ ہے کہ غبار اُٹھتا ہے کی بجائے غبار اُٹھنے لگتا ہے ہونا چاہیے۔ دوسرا اعتراض یہ ہے کہ جوش بندگی کس چیز میں بھرا جاتا ہے؟ یہاں اُس چیز کا ذکر نہیں۔ پھر معترض صاحب فرض کرتے ہیں کہ جوش بندگی زمین میں بھرا جاتا ہے، تو یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کسی کے بھی سر جھکانے یا سجدہ کرنے سے اس قدر غبار اُٹھتا ہے کہ وہ آسمان کو ٹھکرا دے۔ اسکی کوئی دلیل معترض صاحب نے پیش نہیں کی کہ اُٹھتا ہے کے بجائے اُٹھنے لگتا ہے کیوں ہونا چاہیے؟ میرے نزدیک اُٹھتا ہے بہتر ہے۔ ایسی صورت میں غبار کا بلند ہونا ایک غیر معمولی واقعہ معلوم ہوتا ہے۔ استمراری صیغہ سے یہ بات کہاں پیدا ہوتی ہے۔ اب شعر کا مطلب سنیے۔ شاعر نے اپنے جوش اضطراب و عبودیت کا نقشہ کھینچا ہے۔ زمین پر پیہم مضطربانہ سجدے کیے ایسی حالت میں خاک ضرور بلند ہوگی۔ اور یہ ضرور نہیں کہ وہ خاک ظاہر بین نگاہوں کو دکھائی بھی دے یا اگر دکھائی دے تو اسکا حجم اتنا

کہ اسکی ٹکر یا ٹھوکر آسمان کو ہلا دے۔ اگر آہِ مظلوم سے عرش کا ہلنا معتبر ہے تو سجدۂ اضطراب کا ایک ایک ذرۂ خاک گردوں کو ٹھکرا دے تو کیا عجب ہے۔ یہ بھی جانے دیجیے، شاعر نے ایک خیالی دنیا قائم کی ہے جس میں وہ اپنے خالق کی عبادت اس سرگرمی سے کرتا ہے اور ہر سجدہ میں (زمین میں نہیں جیسا کہ معترض صاحب کو گمان ہے) اس قدر جوش و خلوص بھرتا ہے کہ ان سجدوں کے فیض سے زمین باوجود پست ہونے کے گردوں پر فخر ہی نہیں کرتی بلکہ ٹھکرا دیتی ہے۔ ٹھکرا دینے کے اصطلاحی معنی (بے حقیقت یا کم مایہ سمجھنا) بھی ذہن میں رہیں تو شعر میں لطف زیادہ آئے۔

مادہ پرست نگاہیں ان کیفیات سے لطف اندوز نہ ہوں مگر ایک شاعر کا ذوق وجدان عش عش کرتا ہے۔ معترض صاحب اُستاد ریختہ میر تقی میر مرحوم کے اس شعر کے متعلق کیا فرماتے ہیں

دُور بیٹھا غبار میر اُس سے　　عشق بن یہ ادب نہیں آتا

۵- بتا گور غریباں تجھ پہ کس نے قدم رکھا　　نشان تربت کے سطح خاک سے کیوں اُبھرے لگتے ہیں

نہایت خوشی کی بات ہے کہ یہ شعر جناب ازہر کو بھی پسند آیا۔ مگر قابل افسوس ہے یہ امر کہ داد دینے سے قاصر ہیں۔ غالباً یہ اُن اشعار میں ہے جن کا مطلب بیان کرنے میں لطف کم ہو جاتا ہے۔ مخصوصاً جب کسی کی شوخیِ رفتار کا مذکور ہو۔

۶- مری ہستی ذرا دکھلا انھیں آئین خودداری　　مجھے بھی دیکھنا ہے تجھ کو وہ کیونکر مٹاتے ہیں

جناب ازہر نے یہ فرما کر کہ عزیز صاحب نے یہ شعر بہت ہی جھنجلا کے کہا ہے اُنکے خیالات کو حضور داور میں گستاخانہ و باغیانہ قرار دیا ہے۔

جی چاہتا ہے کہ دل کھول کر اس شعر کی تعریف کروں اور اسکی خوبیاں دکھاؤں تاکہ وہ مسائل پیش نظر ہو جائیں جن کی طرف اشارہ ہے۔ مگر فرصت کہاں اور نتیجہ کیا۔ صرف اس قدر کہنے پر اکتفا کرتا ہوں کہ گستاخی کا گمان اُس وقت ہوتا جب شاعر کہتا کہ دیکھوں مجھے کیونکر مٹاتے ہیں۔ وہ تو ہستی کو مخاطب کرکے کہتا ہے کہ مجھے یہ دیکھنا ہے کہ وہ تجھ کو کیونکر مٹاتے ہیں۔ علاوہ بریں جہاں صحبتِ راز و نیاز گرم ہوئی حفظ مراتب کہاں۔ عزیز صاحب نے تو بہت کچھ پاسِ ادب ملحوظ رکھا ہے۔ تصوف قطع نظر دو زبردست مسائل سائنس و اخلاق کی طرف اس شعر میں اشارہ ہے ایک تو مسئلۂ حفظِ قوت (Conservation of Energy) اور دوسرا کامل ارتقائے انسان جسے منزلِ فنا فی اللہ بھی کہہ سکتے ہیں۔ ان سب سے حیرت انگیز وہ کیفیت ہے کہ انسان کی ہستی اسکے سامنے مٹائی جائے اور وہ خاموش دیکھا کرے۔ اور ہستی بھی وہ ہستی جو محتاج نہ ہو بلکہ فطرت انسانی کا بہترین

نمونہ اور تمام آئین خودداری سے مسلح ہو!

۷۔ سمجھتا ہے دلِ بیتاب یہ بجلی چمکتی ہے — وہ رہ رہ کر حریمِ ناز کا پردہ اُٹھاتے ہیں

اس شعر میں لفظ بیتاب پر جناب اَزہر کو غصہ ہے کہ یہ بیکار لائی گئی۔ محض بجلی کی مناسبت سے کون کہے اور کون سمجھے کہ اس لفظ نے شعر کو حقیقت سے ہمدوش کر دیا۔ یہ دل کی بیتابی ہی تو ہے جسکے سبب سے بجلی چمکتی اور حریمِ ناز کا پردہ اُٹھتا نظر آتا ہے۔ یہ سب اسی کشمکش و اضطرابِ دل کے کرشمے ہیں، ورنہ حریمِ ناز کا پردہ اُٹھنا کیا معنی۔ یہ لفظ نکال دیجیے تو شعر لفظوں کا ڈھیر رہ جائے۔ مگر ہمارے کرم فرما اسی لفظ کو بیکار ٹھہراتے ہیں اسکا کیا علاج!

دوسرا اعتراض یہ ہے کہ لفظ "یہ" بہت بری جگہ رکھی گئی ہے۔ یہ معترض کی پسند، تعقیب ناگزیر ہے۔ میں نے تو غالب کے ہاں دیکھا ہے۔

اک گھر میں مختصر سا بیاباں ضرور تھا

حالانکہ منشا یہ تھا کہ گھر میں ایک مختصر سا بیابان ضرور تھا۔ اب بھی بری جگہ کے فیصلہ کا صرف ایک طریقہ رہ گیا۔ آیا قیودِ نظم کا خیال رکھتے ہوئے اس سے بہتر بندش ہو سکتی ہے؟ اگر ہو سکتی ہے تو دکھاؤ۔

۸۔ پریشاں دل کے ذرے ہیں ذرا انکو ہم کرلیں — دیارِ عشق تجھ میں ہم بھی اک کعبہ بناتے ہیں

جناب اَزہر فرماتے ہیں کہ خوب شعر ہے مگر دوسرے مصرعہ میں تو، یا تو پھر، یا کسی ایسی ہی یا بہتر لفظ کی نہایت ہی ضرورت ہے۔ شعر کے حسن میں داغ لگ رہا ہے

واہ ری دقت پسند طبیعت! بیچارے عزیز نے "ہم" کے ساتھ "بھی" لگاکر مصرعہ میں کافی زور پیدا کیا، مگر نقاد صاحب خوش نہیں۔ عزیز کی قسمت، اور کیا کہا جائے۔

۹۔ دلِ ویراں کو دیکھو آسمانِ حسن کے تارو — بتاؤ کس طرح اُجڑی ہوئی بستی بساتے ہیں

جناب اَزہر فرماتے ہیں کہ خوب نظم کیا ہے مگر معشوق کے تخاطب کے لیے جو الفاظ چنے گئے ہیں وہ کچھ ناموزوں سے ہیں۔ اگر ایسا ہے تو "خوب نظم کیا" چہ معنی دارد۔

معترض کے زعم میں حسینوں کو آسمانِ حسن کا تارا کہنا نازک مسئلہ ہے اور قبولیت قدرے مشکل ہے مجھے تو آسمانِ حسن کے تاروں سے زیادہ اس عبارت کا سمجھنا مشکل ہے۔ (اثر) "حسینوں کے پکارنے میں جو علت مخفی ہو سکتی ہے وہ محض یہ کہ انھیں کی برباد کی ہوئی بستی انھیں کے آباد کرنے سے بس سکتی ہے۔ مگر اس نے حسینوں کو پکارا جا رہا ہے تو وہ الفاظ بیکار ہیں۔ غالباً عزیز صاحب نے اردو

عجلت میں خیال نہیں فرمایا ورنہ قلم کی معمولی رفتار میں قبولیت کی راہ کا یہ روڑا دور ہو جاتا"۔

معترض صاحب کا جواب اُنھیں کے الفاظ ہیں۔ اگر وہ اعتراض کرنے کے اسقدر شائق نہ ہوتے بلکہ اپنا وقت عزیز شعر کے سمجھنے میں صرف کرتے تو اُنھیں معلوم ہوتا کہ حسینوں سے تخاطب محض اس لیے ہے کہ دل ویراں کو ایک نظر دیکھ لیں۔ اُن کا غرور اُبھارا جاتا ہے اُن کا خیال اس طور سے ہٹایا جاتا ہے تاکہ یہ شبہہ بھی نہ گذرے کہ جس دل ویران کو دیکھنے اور آباد کرنے کے وسائل بتانے کی فرمایش کی ہے اُنھیں کا تاراج کیا ہوا ہے۔ شعر کے الفاظ خوبصورت، معنی لطیف، بندش چُست اور انداز بیان میں ندرت ہے۔ اب اور کوئی کیا آسمان کے تارے توڑ لائے۔

۱۰۔ تمھاری حسرت تعمیر پرلے خاک کے پتلو   شکستہ مرقد احباب مقبروں میں مسکراتے ہیں

اَزہر صاحب نے اس شعر کی تعریف کرتے ہوئے جناب صفی کا ایک شعر نقل کیا ہے۔ ایسا تقابل نہایت خطرناک ہے۔ میں جناب اَزہر کو صلاح دوں گا کہ آیندہ احتراز کریں۔ لکھنؤ کے لیے یہ دونوں ہستیاں قابل فخر ہیں۔ اس موضوع پر اس سے زیادہ لکھنا نہیں چاہتا اور نہ ضرورت ہے۔ غرضکہ جناب اَزہر کے مضمون بھر میں سب سے زیادہ پُرمغز مجھے یہ جملہ نظر آیا کہ "معزز صاحب کا پایہ اس سے کہیں بلند ہے کہ مجھ ایسے اتقرالرلئے کے الفاظ اُسکی پابوسی کر سکیں یا ذرا بھی نقصان پہونچا سکیں"۔ میں اعتراف کرتا ہوں کہ ان الفاظ کا اطلاق اَزہر صاحب کی طرح مجھ پر بھی ہوتا ہے مگر میرے متعلق لفظ نقصان کو فائدہ سے بدلنا ہوگا۔

آثر لکھنوی

مجھے قفس سے الٰہی چھڑا دیا ہوتا   کسی چمن کی فضا میں اُڑا دیا ہوتا
حضور آپ ہوے مجھ سے سرگراں لیکن   مرے قصور کا بھی کچھ پتا دیا ہوتا
مجھے ہے شکوہ فقط تیری نیم سوزی کا   گلہ ہی کیا تھا جو بالکل جلا دیا ہوتا
مرے سوال پہ وہ ہوگئے ہیں چیں بجبیں   مجھے ہی صبر و قرار اے خدا دیا ہوتا
دلِ حزیں سے نکلتیں دعائیں اے ساقی   گر ایک گھونٹ ہمیں بھی پلا دیا ہوتا
عجب نہ تھا کہ ترا دل بھی نرم ہو جاتا   جو میں نے حالِ دل اپنا سنا دیا ہوتا
لگا یا دل تو ہوئی قدرِ عافیت معلوم   کسی نے پہلے ہی یارب بتا دیا ہوتا
یقین و وہم کے جھگڑے تھے تفرقے سارے
جو تو نے ایک ہی جلوہ دکھا دیا ہوتا

میر ولی اللہ

بادِ صبا

کہتی ہے بادِ صبا۔ صحرا میں جب آتی ہوں میں
سبز مخمل کا بچھونا سا بچھا جاتی ہوں میں

صحنِ گلشن میں اگر رکھتی ہوں میں آکر قدم
کھلتی پھولوں کے ہوں غنچوں کو بہلاتی ہوں میں

سیر کرنے کو نکلتی ہوں میں اکثر صبحدم
نوجوانانِ گلستاں کو جگا جاتی ہوں میں

چھوڑ کر خشکی کو آتی ہوں تری کی سمت جب
موج کے شانہ سے زلفِ بحر سلجھاتی ہوں میں

عطر بھر دیتی ہوں میں کلیوں میں ٹپکا کر انھیں
اپنی ان تر دستیوں پہ آپ اتراتی ہوں میں

جنگلوں میں تند ہو کر کرتی ہوں ہل چل بپا
گلشنوں میں ناز سے چلتی ہوں اٹھلاتی ہوں میں

فصلِ گل میں کرتی ہوں میں جب جوانوں پر گزر
عیش کے جذبات کو سینوں میں اُکساتی ہوں میں

سبزہ زاروں میں لٹا آتی ہوں شبنم کے گہر
لالہ زاروں میں پہونچکر پھول برساتی ہوں میں

عاشقوں کے کنجِ عزلت میں پہونچتی ہوں اگر
آتشِ غم کو دلوں میں اُنکے بھڑکاتی ہوں میں

کرکے روشن شمع، پروانے کو دیتی ہوں خبر
گوشِ گل تک نالۂ بلبل کو پہونچاتی ہوں میں

کرتے لاسلکی اشارے ہیں جو یہ اہلِ فرنگ
ساتھ بجلی کے پہونچکر انکو پھیلاتی ہوں میں

نیم شب میں سرد جھونکے جب گزرتے ہیں مرے
آنکھ اکثر پردہ داروں کی بھی جھپکاتی ہوں میں

میں درختوں کی رگوں میں دوڑتی ہوں بنکے خون
نو عروسانِ چمن کا رنگ جھلکاتی ہوں میں

گدگداتی ہوں حسینوں کو میں اکثر صبحدم
چپکے چپکے پاؤں معشوقوں کے سہلاتی ہوں میں

آبشاروں کو سکھاتی ہوں ترنم کوہ پر
ساتھ دیکر ان کا خود بھی ناچتی گاتی ہوں میں

ل کے فواروں کی دھاروں میں اڑاتی ہوں انھیں
چلکے چشموں کے کنارے انکو چھلکاتی ہوں میں

کرکے طے زینے پہاڑوں کے پہونچتی ہوں اگر
چوٹیوں سے برف کے تودوں کو کھسکاتی ہوں میں

کرتی ہوں شاداب میں پژمردہ پودوں کو کبھی
تشنہ لب پھولوں پہ شبنم آکے برساتی ہوں میں

آتی ہوں جب فصلِ گل میں لے کے پیغامِ بہار
[illegible] عریاں کو لباسِ سبز پہناتی ہوں میں

جب نمازِ صبح کی ہوتی ہیں آوازیں بلند
غافلانِ صبحدم کو آکے [illegible] ہوں میں

باد طوفاں بنکے جاتی ہوں جہازوں پر اگر
ایک عبرت کا تماشا سب کو دکھلاتی ہوں میں

ریگزاروں میں دکھاتی ہوں تماشا سے سراب
نیستاں میں آگ کے شعلوں کو دوڑاتی ہوں میں

عاشق و معشوق کا آتا ہے جب وقتِ وداع / اشک کے قطروں کو رخساروں پہ ڈھلکاتی ہوں میں
شاخ جو کمھلا گئی ہو اُسکو کرتی ہوں نہال / آگ جو بجھا گئی ہو اُسکو سُلگاتی ہوں میں
پھول جو خود رَو اُگا کرتے ہیں دشت و کوہ میں / اُن کی خوشبوؤں سے اک عالم کو مہکاتی ہوں میں
سینچتی ہوں آبِ باراں سے ہزاروں کھیتیاں / جھومتے بادل سمندر سے اُڑا لاتی ہوں میں
سرد ہوتی ہوں پہاڑوں سے گزرتی ہوں اگر / نیرِ رخشندہ کی کرنوں سے گرماتی ہوں میں
گدگدانے سے مرے ہوتے ہیں طائر نغمہ زن / چھیڑ دیتی ہوں اُنھیں خاموش اگر پاتی ہوں میں
سانس کے رستے اُتر کر جسمِ حیوانات میں / زندگی کی آگ کو ہر وقت دہکاتی ہوں میں

نسیم ۔

طرزِ محبت

کبھی جلوہ گر نہ ہوا اثر مری التجائے نیاز میں / ہیں غرور و ناز کی جھلکیاں وہی حسنِ شعبدہ باز میں
یہی رنج ہے کہ نوا نہیں مرے دل کے پردۂ ساز میں / جو ذرا تو ڈال دے کھلبلی کسی گل کی محفلِ ناز میں

وہ ستم شعار ہے کیا غرض مرے ذکرِ حالِ تباہ سے / ہے غضب کہ اسکی نگاہ بھی نہیں ملتی مری نگاہ سے
یہی اب تو رہتی ہے التجا مری بارگاہِ الٰہ سے / کہ وہ مضطرب ہو خدا کرے مرے شورِ نالہ و آہ سے

کوئی کیا کہے کوئی کیا کرے وہ ہیں محو شرم و حجاب میں / مجھے ان سے خوف ہے ہر گھڑی کہ بگڑ نہ جائے عتاب میں
مری التجا کو قبولیت ہو تو کیونکر اسکی جناب میں / ہے نزاکت اسکے مزاج میں میں ہوں اس سخت عذاب میں

کہوں کس زباں سے کہ بیوفا مجھے تجھ سے کوئی گلا نہیں / مرے حق میں تو نے نہ کی ہو جو کوئی ایسی طرزِ جفا نہیں
نہیں رحم دل میں ترے ذرا تجھے کچھ بھی خوفِ خدا نہیں / مرے دل میں قدرِ جفا ہے پر ترے دل میں قدرِ وفا نہیں

اقدس حیدرآبادی

انعامی مضمون

حسب وعدہ دو ماہ کا مشترکہ پرچہ شایع کیا جا رہا ہے۔ مولوی سعید انصاری جنکا مضمون انعامی مقابلہ میں اول قرار دیا گیا، تمام و کمال نذر کیا جاتا ہے۔ صاحب موصوف کو اگر نظر ثانی کا موقع دیا جا سکتا تو جہاں کہیں جلدی میں غلطیاں رہ گئی ہیں وہ شاید رفع ہو جاتیں۔ بہر حال اگر یہ مضمون پسند کیا گیا اور پھر شایع ہوا تو نہ صرف یہ غلطیاں، رفع ہو جائیں گی، بلکہ اسکے ساتھ اُن کی مرتب کردہ فہرست کتب جنکی امداد سے یہ مضمون لکھا گیا ہے، فہرست مضامین، اور ایک مختصر تمہید بھی انشاء اللہ اضافہ کر دی جائے گی۔ راقم مضمون ابھی جامعہ ملیہ اسلامیہ میں تعلیم حاصل کر رہے ہیں، اور اُنکے اس مضمون سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ آگے چل کر ہماری علمی و ادبی زندگی میں اُنکی منزلت کس قدر نمایاں ہو جائے گی۔ الناظر نے گذشتہ پندرہ سال کے اندر بحمد اللہ ملک کو ایسے متعدد اہل قلم سے روشناس کرایا ہے جن کی قلمکاریوں کا سکہ آج سارے ملک میں بیٹھا ہوا ہے اور مجھے کمال مسرت ہے کہ الناظر کے اس انعامی مقابلہ نے ایک اور جوہر قابل کو ملک کے سامنے پیش کیا

بقیہ مضامین میں سے مولوی سید نجیب اشرف ندوی بی اے کا مضمون، جسکو دوسرا درجہ دیا گیا، نہایت اعلیٰ درجہ کا ہے "صحت زبان، حسن بیان، و وسعت نظر" کے لحاظ سے مجلس انتخاب کے ایک رکن کی رائے میں اُن کا مضمون سب سے بہتر تھا، البتہ تنقید میں وہ اعتدال قائم نہیں رکھ سکے۔ انشاء اللہ الناظر کے آیندہ نمبروں میں وہ مضمون بھی نذر ناظرین کیا جائیگا اور لائق مضمون نگار کی محنت پر نظر کرکے یہ طے کیا گیا ہے کہ مضمون کے پچاس نسخے مضمون نگار کو ہدیۃً دیے جائیں گے۔

مجلس انتخاب کے جملہ ارکان نے جہاں اِن مضامین کو ملاحظہ فرما کر اپنی قیمتی رائے سے مطلع فرمایا ہے وہاں میری درخواست پر عنوان مقابلہ کے متعلق اپنے خیالات بھی ظاہر فرمائے ہیں۔ انکی تفصیل کا یہ موقع نہیں ہے۔ انشاء اللہ مجموعۂ مضامین کے ساتھ سب صاحبوں کی رایوں کا خلاصہ اور خود اپنی حقیر رائے بھی پیش کی جائے گی۔

انعامی مضمون کتابی صورت میں بھی شایع کیا جا رہا ہے۔ جو صاحب چاہیں دفتر الناظر سے طلب کر لیں۔ قیمت ۱۰ر

ظفر الملک

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اَدبِ اُردو کے عناصرِ اَربعہ

میں

عَلامہ شبلی کا درجہ

تمہید | جس طرح حیاتِ انسانی مرکب ہے اربعہ عناصر سے، یعنی آب، باد، آتش، وخاک، اسی طرح ہمارے اردو لٹریچر کی ترکیب اصلی بھی چار بڑے عناصر سے ملکر ہوئی ہے یعنی آزاد، نذیر احمد، حالی، وشبلی۔ انھیں علحدہ کرلو تو اردو ایک قالب بے جان اور ایک تہی مایہ زبان رہجاتی ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ ان میں عنصر اعظم کون ہے؟ اسی کا جواب دینا اس مضمون کا مقصد ہے۔ لیکن اصل میں اس سوال کی دو حیثیتیں ہیں (۱) ادبی (۲) علمی۔ ادبی حیثیت یہ کہ سب سے بڑا انشا پرداز کون ہے؟ اور علمی حیثیت یہ کہ کس نے سب سے زیادہ اردو کی خدمت کی؟ سب سے پہلے ہم سوال کے حصہ اول کو لیتے ہیں۔

اردو انشا پردازی کے اَدوار | یہ ایک بحث طلب امر ہے کہ آیا مصنف اپنے ماحول کا پابند

ہوتا ہے یا ماحول کو وہ اپنا پابند بنا لیتا ہے؟ تاریخ جہاں ایسے مصنفین کی فہرست پیش کرتی ہے جو اپنے گرد و پیش کے اثرات کا شکار رہوئے، وہاں اس کے اوراق میں ایسے نام بھی نظر آتے ہیں جنھوں نے ماحول سے نکلکر مستقبل پر بھی بہت کچھ اثر ڈالا۔ ہمارے یہ مشاہیر اردو بھی اس قانون فطرت سے باہر نہیں۔ اس بنا پر مذکورہ بالا مصنفین کی تصانیف کا بغور مطالعہ کرنے سے یہ صاف ظاہر ہوتا ہے کہ ان میں سے ہر ایک اپنے زمانہ کی لسانی و ادبی تغیرات کی تصویر ہے اور ہر ایک اپنا اپنا جدا رنگ رکھتا ہے۔ اگرچہ تاریخ میں بعض وقت زمانہ یا دور کی تقسیم ایک خود اختیاری فعل سمجھا جاتا ہے لیکن ایسا کرنا ضروری بھی ہوتا ہے۔ اس بنا پر ان مصنفین کی انشا پردازی کے چار مختلف دور نظر آتے ہیں۔

پہلا دور | ادب اردو کی نشو و نما کا زمانہ وہ تھا جبکہ مغلیہ سلطنت کا چراغ سحری گل ہوچکا تھا اور حکومت انگریزی کا آفتاب افق مشرق سے طلوع ہوکر سارے ہندوستان پر چمک رہا تھا۔ اسلامی حکومت کے ساتھ اسلامی زبان و علوم بھی رخصت ہوچکے تھے لیکن جاتے جاتے اپنی بہت کچھ یادگار چھوڑ گئے۔ اردو زبان کے لئے یہ بڑا نازک وقت تھا۔ اس کے مصنفین پر یہ دشوار گزار فرض عاید ہوا کہ اسلاف کے اس ترکہ میں سے صرف وہی سامان لیں جو قابل قبول اور ضروری ہوں۔ انگریزی زبان کے مصنفین آج تک اس امر کے برابر کوشاں ہیں کہ اپنی زبان سے یونانی، لاطینی، جرمن اور فرانسیسی زبانوں کے اثرات اگر یکسر مٹا نہ سکیں تو حتی الامکان انھیں کم سے کم کردیں۔ اس عہد اسلامی میں تعلیم و تعلم، درس و تدریس، شعر و شاعری سب کام فارسی یا عربی میں ہوتے تھے۔ فارسی، حکومت وقت کی زبان تھی اور عربی مسلمانوں کی مذہبی زبان سمجھی جاتی تھی۔ علاوہ ان کے سنسکرت، بھاشا اور دوسری پراکرت زبانیں بھی ہندوستان میں پہلے سے موجود تھیں جب اردو نے

ان زبانوں کی جگہ لینی چاہی، تو اسوقت یہ سوال پیدا ہوا کہ کیا لے اور کیا نہ لے ۔
پروفیسر آزاد جنھیں ان عناصر اربعہ میں اولیت کا شرف حاصل ہے، اپنے زمانہ کے
ان اثرات کا بیّن نمونہ ہیں ۔ ان کی تحریروں میں فارسی و عربی الفاظ کے علاوہ کثرت سے
تشبیہات واستعارے ملتے ہیں ۔ اس میں شبہ نہیں کہ تشبیہ واستعارہ کا استعمال متقدمین
شعرائے فارسی کے ہاں بھی تھا لیکن متاخرین نے نہ تو ان میں کوئی جدت پیدا کی اور
نہ اعتدال کو ملحوظ رکھا اور انھی کی تقلید کورانہ ہمارے اردو شعرا و مصنفین نے کی جس کا
نتیجہ یہ ہوا کہ وہی شے جو قدما کے رخ کلام کا خال تھا، اردو انشا پردازی کے چہرہ پر
بدنما مسّہ معلوم ہونے لگا ۔ پروفیسر آزاد کی ہر بات تشبیہ و استعارہ میں ہوتی ہے اور
وہ بھی اکثر غیر مشبہ تشبیہوں اور مستعار استعاروں میں ۔ ایک دوسرا اثر جو ان کی تحریروں
نمایاں ہو، وہ ہندی اور بھاشا کا ہے ۔ ہر چند کہ یہ یہاں کی اصلی زبانیں تھیں لیکن
ان سے وہی افعال و اسما لینا چاہیئے تھا جو فارسی و عربی کے ساتھ کھپ سکتے ۔
انشا پرداز یا شاعر کا ایک بڑا کمال یہ سمجھا جاتا ہے کہ وہ جس زبان اور طرز ادا میں
اپنے خیالات کا اظہار کرے، وہ زبان اور طرز ادا زیادہ سے زیادہ عرصہ تک قایم رہنے
والی ہوں ۔ سعدی اور حافظ کو آج تقریباً چھ سو برس کا عرصہ گزر گیا لیکن ان کی
زبان آج بھی ویسی ہی تر و تازہ اور بانکیت معلوم ہوتی ہے، جیسی ان کے زمانہ میں
تھی ۔ ان کے کلام و تحریر کا آج بھی ہر لفظ فارسی دانوں میں ویسا ہی گوش آشنا اور
متعارف ہے، جیسا چھ صدی پیشتر تھا ۔ پروفیسر آزاد کی وفات کو ابھی صرف ۲۸ برس
گزرے ہیں لیکن ان کی زبان میں ایک طرح کی اجنبیت اور مغایرت کی جھلک
نظر آتی ہے اور یہ کیفیت جتنا ہی پیچھے ہٹتے جائیے اسی قدر زیادہ محسوس ہوتی جاتی ہے
ان کی تحریر کے بیسیوں الفاظ آج متروک ہو چکے ہیں، سیکڑوں تشبیہیں اور استعارے
ایسے ملیں گے جن کا آج استعمال کرنا ذوق سلیم کو غالباً پسند نہ ہوگا ۔ طرز ادا میں

ایک طرح کی کہنگی اور دیرینہ پن نظر آتا ہے۔ یہ تمام باتیں بدرجہ غایت ایک تحریر میں پیش کرنا تو ناممکن ہے لیکن ان کا عام انداز بیان ظاہر کرنے کے لئے دربار اکبری سے یہ ٹکڑا ملاحظہ ہو۔

"غرض رات نے صبح کی کروٹ لی، ستارہ نے آنکھ ماری، اور شفق خونی پیالہ بھر کر مشرق سے نمودار ہوئی۔ نور کے تڑکے بادشاہی فوج کا ایک آدمی ان کے خیمے کے پیچھے جاکر بہ آواز بلند چلایا کہ سنو! بے خبرو! کچھ خبر بھی ہے؟ بادشاہ خود لشکر سمیت آن پہونچے اور دریا بھی اتر لیئے۔ اس وقت خان زماں کے کان کھڑے ہوئے۔ مگر جانا کہ آصف خاں کی چالاکی ہے۔ مجنوں خاں قاقشال کو بھونس بتا بھی نہ سمجھتا تھا۔ کچھ پروانہ کی" (دربار اکبری صفحہ ۲۳)

دوسرا دور | اردو انشاپردازی کا دوسرا دور ڈپٹی نذیر احمد سے شروع ہوتا ہے جنھوں نے خالص اردو لکھنے کی کوشش کی۔ ان کا وطن اگرچہ بجنور تھا لیکن قیام زیادہ تر دلی میں رہا اس لئے انھیں ٹکسالی زبان لکھنے کا اچھا موقع حاصل تھا۔ ان کی تمامتر کوشش یہ تھی کہ ہر واقعہ اور ہر خیال عام فہم طریقہ پر اور سہل زبان میں ادا کیا جائے چنانچہ اسی لئے وہ بالکل ٹھیٹھ اور عامیانہ الفاظ و محاورے استعمال کرتے ہیں۔ تشبیہات و استعارے ان کے ہاں کم ہیں اور جو ہیں وہ زیادہ تر دیسی لیکن اس کوشش میں وہ غالباً اس حقیقت کو نظر انداز کر گئے کہ عام بول چال اور ہوتی ہے اور تصنیفی زبان کچھ اور۔ بدقسمتی سے ادنیٰ اور اعلیٰ دو طبقے ہر زمانہ اور ہر ملک میں رہے ہیں اور اس بنا پر دو نو طبقوں کی زبانیں بھی مختلف رہی ہیں۔ انگریزی زبان میں لندن کو وہی درجہ حاصل ہے جو اردو میں دلی کو۔ لیکن انگلستان میں باوجود تعلیم عام ہونے کے لندن کے بازاروں میں جو زبان بولی جاتی ہے، وہ علمی طبقہ کی زبان سے بالکل جداگانہ ہے۔ کوئی انگریزی زبان کا مصنف اگر لندن کی بازاری زبان لکھنے کی کوشش کرتا ہے، یا بھولے سے کوئی لفظ یا محاورہ

استعمال کرلیتا ہو، تو نقادان زبان کی زد سے وہ کسی طرح بچ نہیں سکتا۔ ڈپٹی صاحب بھی روزمرہ اور ٹکسالی زبان لکھنے کے جوش میں ایسی زبان لکھ گئے ہیں، جو دلی کے بعض مخصوص محلّوں اور کوچوں میں بولی جاتی ہے۔ روزمرہ لکھنا ہرچند کہ مقبول اور پسندیدہ خیال کیا جاتا ہے لیکن وہ نہ اس قدر محدود اور ادنیٰ طبقہ کی زبان ہو کہ اس سے باہر دوسرے حلقوں میں سمجھی نہ جاسکے اور اس کے سیکھنے کے لئے انھیں دور دراز مسافت طے کرکے اس مخصوص علاقہ میں آنا پڑے۔ خود ڈپٹی صاحب نے اس خامی کو محسوس کیا اور لغات مروجہ پر اکتفا نہ کرکے انہیں اپنے ترجمۂ قرآن میں اپنے مخصوص استعمال کردہ الفاظ و محاوروں کی ایک طویل جدید فرہنگ لگانی پڑی۔

جیسا کہ اوپر ذکر ہوا، ہر قوم میں روزانہ بول چال کی زبان اور ہوتی ہے اور علمی یا تصنیفی زبان اور۔ جہاں تک ڈپٹی صاحب کے افسانوں اور ناولوں کا تعلق ہے، ممکن ہے کہ ان کی زبان زیادہ ناگوار نہ ہو لیکن اس امر پر اتفاق ہونا ممکن نہیں کہ یہ زبان سنجیدہ علمی مضامین، یا مقدس مذہبی خیالات کی بھی متحمل ہوسکتی ہے۔ ڈپٹی صاحب نے بعض آیات قرآنی کے ترجمہ کرنے میں ایسے رکیک اور سخیف الفاظ استعمال کئے ہیں جنھیں سنکر رونگٹے کھڑے ہوجاتے ہیں۔

آسان اور عام فہم زبان لکھنی اگرچہ ڈپٹی صاحب کی خصوصیت نمایاں ہو لیکن خود چونکہ عربی کے جید عالم تھے۔ زمانہ طالب علمی سے عربی زبان و ادب سے خاص ذوق رکھتے تھے، عربی کے اثر نے ساتھ نہ چھوڑا۔ دلی کی زبان لکھنے بیٹھے ہیں لیکن عربی کے غیر معروف اور مشکل الفاظ بھی جابجا لکھتے جاتے ہیں۔ کہیں کہیں مفرد کی بجائے مرکب اور وہ بھی تین چار مفردات سے مرکب الفاظ استعمال کرجاتے ہیں عربی اقوال اور ضرب الامثال کی آمد بھی کچھ کم نہیں۔ قرآن کی آیات بھی گاہ گاہ ہے آجاتی ہیں۔ یہ ہو وہ اجتماع اضداد جسے ڈپٹی صاحب باوجود کوشش کے نہ نبھا سکے اور یہ معجون مرکب

نہ تو اُن کے ادب لطیف کے لئے پورے طور پر راس آیا، اور نہ مذہبی لٹریچر ہی کے لئے۔ ان کے انداز بیان کا ہر پہلو تو یہاں پر دکھانا ممکن نہیں لیکن ان کی تحریر کا عام رنگ اس عبارت سے معلوم ہو جائے گا۔ اپنی مشہور کتاب توبۃ النصوح کی ابتداء اس طرح کرتے ہیں:۔

"اب سے دو ایک سال پہلے دلی میں ہیضے کا اتنا زور ہوا کہ ایک حکیم بقا کے کوچے سے ہر روز تیس تیس چالیس چالیس آدمی تختے لگے۔ ایک بار تو موت تو البتہ گرم تھا ورنہ جدھر جاؤ سناٹا اور ویرانی، حسرت نگاہ گرد وحشت و پریشانی، جن بازاروں میں آدھی آدھی رات کھوے سے کھوا چھلتا تھا، ایسے اجڑے پڑے ہیں کہ دن دوپہر جاتے ہوئے ڈر معلوم ہوتا ہے۔ کٹوروں کی جھنکار موقوف، سودے والوں کی پکار بند، ملنا جلنا، اختلاط و ملاقات، آمد و شد، بیمار پرسی، رسم و راہ، بازدید و زیارت، مہمانداری و ضیافت کل رسمیں لوگوں نے اٹھا دیں۔ ہر شخص اپنی حالت میں مبتلا، مصیبت میں گرفتار، زندگی سے مایوس، کفن کو زندہ، مردے سے بدتر، دل میں ہمت نہ پاؤں میں سکت، یا آ کر گھر اپنی کھٹوانٹی لیکر پڑ رہا یا کسی بیمار کی تیمارداری کی یا کسی عزیز یا آشنا کا مرنا یاد کر کے کچھ رو پیٹ لیا، مرگ مفاجات انہی دنوں کی موت تھی۔ نہ نشان نہ گمان، اچھے خاصے چلتے پھرتے یکایک طبیعت نے مالش کی۔ پہلی ہی کلی میں حواس خمسہ مختل ہو گئے۔ الا ماشاء اللہ کوئی ... بچ گیا تو بچ گیا، ورنہ جی کا متلانا اور قضا سے مبرم کا آجانا۔" (توبۃ النصوح صفحہ ...)

تیسرا دور | مولینا حالی کے پیش نظر ایک طرف پروفیسر آزاد کی وہ زبان تھی جو تشبیہات و استعاروں سے پُر، دوسری جانب ڈپٹی نذیر احمد کی زبان جو فارسی عربی اثرات کے ساتھ ساتھ دلی کے ٹھیٹھ الفاظ و محاورات سے مملو تھی۔ مولینا حالی نے ان کی ترکیب باہمی سے ایک نئی زبان پیدا کرنی چاہی جو دونو طرز تحریر کے حامیوں میں مقبول اور پسند ہو۔ ان کی تحریریں اس بات کا صاف پتہ دیتی ہیں کہ اس غرض کو

پورا کرنے کے لئے آزاد کے ہاں سے فارسیت اور عربیت لیگئی ہے اور نذیر احمد سے سادگی بیان۔ لیکن مولینا نے دونو طرز تحریر کی اصل روح لینے کی بجائے، صرف ان کی ظاہری خصوصیات کی تقلید کی ہے جس کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ زبان بلا کی پھیکی اور بے مزہ ہوگئی ہے صفحے کے صفحے پڑھ جائیے، نہ جذبات میں کوئی حرکت اور نہ قلب پر کوئی اثر۔ سر سید کی لائف کا پہلا اڈیشن کم و بیش ایکہزار صفحوں کی کتاب ہے، شروع سے اخیر تک پڑھ جائیے لیکن ایک ٹکڑہ عبارت کا بھی ایسا نظر نہیں آتا جس سے قلب پر رنج و خوشی، محبت و نفرت، درس و عبرت، کا کوئی اثر طاری ہوتا ہو۔

مولینا حالی کے ادبی شباب کا وہ زمانہ تھا جبکہ انگریزی حکومت کا پورے طور پہ تسلط ہو چکا تھا۔ انگریزی علوم و ادب، تہذیب و تمدن کا ہر طرف چرچا تھا۔ انگریزی لکھنا، بولنا ایک فخر سمجھا جاتا تھا۔ آزاد کی طرح حالی بھی اپنے اس جدید ماحول کے اثر سے محفوظ نہ رہ سکے اور اردو میں بلا تامل انگریزی زبان کے الفاظ اور فقرے استعمال کرنے لگے۔ انھوں نے اچھے خاصے اردو الفاظ کے ہوتے ہوئے انگریزی کے مفردات و مرکبات استعمال کئے ہیں لیکن یہاں بھی اسی ظاہری تقلید کا خیال رکھا گیا۔ انگریزی زبان سے جدید خیالات یا تشبیہات و استعارات کو کسیقدر تصرف کے ساتھ اردو میں لاتے تو وہی آج اس زبان کے رخ زیبا کے خط و خال بنتے یا بضرورت ایسے انگریزی الفاظ لیے جاتے جن کے ہم معنی الفاظ اردو میں نہ ہوتے تو آج اردو کے ذخیرۂ الفاظ میں ایک بیش بہا اضافہ ہوتا۔ لیکن بدقسمتی سے ظاہری تقلید نے مولینا کی زبان کو نہایت پھیکی، غیر دلچسپ اور بے اثر بنا دیا ہے۔ ذیل کی عبارت ان کے عام انداز بیان کا ایک نمونہ ہے:

"سر سید اگر گھر کے انتظام اور نون تیل لکڑی کے حساب کتاب کی طرف متوجہ ہوتے تو وہ تمام ملکی اور قومی اور مذہبی خدمات جو انھوں نے گزشتہ چالیس پچاس برس میں سرانجام کیں، وہ کون کرتا؟ انھوں نے ایسے کاموں کے لئے جو ہندوستان میں

اور خاص کر مسلمانوں میں بالکل نئے تھے اور جن پر خرچ کرنے کی ان کو بالکل عادت نہ تھی!
دس بارہ لاکھ سے کم وصول نہ کیا ہوگا۔ اگر وہ کفایت شعاری کو کام فرماتے اور اپنی پاکٹ
بالکل نہ جھاڑ دیتے تو اوروں کے کیسے میں کیونکر ہاتھ ڈال سکتے تھے۔ اگر وہ اپنے گھر کو
مہمان سرا نہ بناتے تو علی گڈھ کا ایک ویران قطعہ تمام ہندوستان کے مسلمانوں کی تعلیم کا
مرکز کیونکر بن سکتا تھا۔ اگر وہ ہزارہا روپے اپنے پاس سے صرف کرکے اطراف ہندوستان میں
چندہ کے لئے سفر نہ کرتے بلکہ اپنا سفر خرچ کمیٹی کے ذمے ڈالتے تو مسلمانوں میں جو ہر وقت
اعتراض کرنے کا موقع ڈھونڈھتے کیونکر اپنا وقار قایم رکھ سکتے تھے۔ اگر وہ یورپین
طبقہ پر ہائی لائلیٹی نہ رکھتے تو ہندوستان کے ارکان سلطنت کو اپنے کاموں کی طرف کیونکر
متوجہ کر سکتے تھے۔" (حیات جاوید، صفحہ ۲۱۳)

چوتھا دور علامہ شبلی اس سلسلہ کی آخری کڑی ہیں۔ انھوں نے آزاد کی "شاعرانہ اردو"، نذیر احمد کی "سوقیانہ اردو" اور حالی کی "پھیکی اردو" دیکھی۔ خود ایک دوربیں نظر اور نقد پسند طبیعت رکھتے تھے۔ معاملہ کی اصل تہ کو پہونچے۔ انھوں نے سوچا کہ آزاد کے تشبیہات و استعارات کی آورد اردو کی قوت برداشت سے باہر ہے۔ نذیر احمد کا عامیانہ طرز بیان اور سوقیت زبان اردوے معلّٰی کی شان سے پست تر ہے۔ حالی کی بے نمکی اور پھیکا پن انشا پردازی کے حق میں سم قاتل ہے۔ زمانہ کا بھی رنگ دیکھا کہ اب نہ وہ پہلی سی اسلامی حکومت ہو کہ فارسی و عربی کا اثر باقی رہ سکے اور نہ ہندوستان کا ہر شہر دہلی و لکھنؤ ہو، جہاں کی ٹکسالی زبان تمام ہندوستان میں بولی اور سمجھی جاتی ہو اور نہ انگریزی راج کے ساتھ انگریزی کا یہ اثر دیرپا ہے کہ انگریزی زبان کا ہر لفظ اور فقرہ قابل قبول ہو سکے، انھوں نے یہ بھی دیکھا کہ "برادران وطن" ناگری رسم خط کے ساتھ ہندی کی ترویج میں کوشاں ہیں۔ ان تمام زمانی و مکانی دشواریوں کا لحاظ کرکے علامہ شبلی نے وہ طرز ادا

زبان اختیار کی جسمیں بہ یک وقت آزاد کی شوخیِ تحریر، نذیر احمد کی روزمرہ اور حالی کی سادگیِ ادا بھی موجود ہو، مگر ہر ایک اعتدال کے ساتھ نہ اس قدر تشبیہات و استعارے کی بھرمار کہ زبان صرف شاعری کے کام کی ہو جائے، نہ اسقدر سوقیت اور عامیانہ پن کہ سنجیدہ اور علمی و مذہبی مضامین کو اس کا جامہ پہننے سے عار آئے اور نہ ایسی پھیکی اور بے مزہ کہ سامع پر کوئی اثر یا جذبہ پیدا نہ ہو۔ بلکہ اس زبان کو لیجئے اور اُسے خواہ شاعری سے نازک اور لطیف مضامین کے لئے استعمال کیجیے، خواہ علمی، مذہبی اور فلسفیانہ خیالات کو اسکے ذریعہ ادا کیجیے یا اسے ادب لطیف میں برتئے۔ ہر صنف ادب اور ہر طرز ادا میں قدرے تغیر و تبدل کے ساتھ یکساں طور پر استعمال ہو سکتی ہے۔ ایم۔ مہدی حسن ایک موقع پر تحریر فرماتے ہیں کہ :-

"غالب زندہ ہوتے تو شبلی کو اپنی "اردوے خاصہ" کی داد ملتی، جس نے ایک نوخیز بازاری یعنی کل کی چھوکری کو جسپر انگلیاں اٹھتی تھیں، آج اس لایق کر دیا کہ وہ اپنی بڑی بوڑھیوں اور ثقہ بہنوں یعنی دنیا کی علمی زبانوں سے آنکھیں ملا سکتی ہے۔ جوانیوں پر آئی ہوئی بجلی نہیں بیٹھ سکتی تھی۔ توں شعرا سے گاڑھا اختلاط رہا۔ باقتضاے سن بری طرح کھل کھیلی، ہاتھ پاؤں نکالے، اور بہتیرے بنائے بگاڑے کیونکہ ایک زمانہ شیدائی تھا لیکن یہ باتوں ہی میں سب کو ٹالتی رہی۔ بعض جگہ بے آبروئی کے سامان ہو ہو کر رہ گئے اور بال بال بچی۔ آخر آخر میں ملک کے منچلے یعنی ناول نویس تو یہاں تک ہاتھ دھو کر پیچھے پڑے کہ اسکی پردہ دری میں کچھ اٹھا نہیں رکھا تھا۔ کبھی کبھی دبی زبان سے اسے یہ کہتے سنا۔ "اری اٹھ جاؤں گی میں صحنک"۔ لیکن دفعتہً اسکی حالت نے پلٹا کھایا، کثرت فواحش باعث سنجیدگی ہو گئی۔ اچھے دن آتے ہیں تو بگڑی بن جاتی ہے۔ اب وہ مقدس علمار کی کنیزوں میں داخل ہو لیکن سنا گیا ہو خوش اوصاف شبلی سے زیادہ مانوس ہوا اور قریب قریب انھی کے تصرف میں رہتی ہے" (افادات مہدی صفحہ ۲۰۲ و ۳۰۳)

شبلی کی "اردوئے خاصہ" کی داد ایک غالب ہی سے کیوں چاہیئے '
آج اگر انصاف سے دیکھا جائے تو علامہ شبلی کی اس خدمت کا جو انھوں نے اردو کو حیات جاوید بخشکر کی ہے' ہر شخص معترف ہوگا۔ اردو زبان ان کے اس احسان سے کبھی سبکدوش نہیں ہوسکتی جنھوں نے اسکو" دنیا کی علمی زبانوں سے آنکھیں ملانے کے" قابل بنایا، جنھوں نے اسکو ملک کے "منچلوں" کی "پردہ دری اور بے آبروئی" سے "بال بال بچایا"، جنھوں نے "دکل کی چھوکری" کو "مقدس علما کی کنیزوں" میں داخل ہونے کا شرف بخشا۔ دلی اور لکھنؤ بلبل کی تذکیر و تانیث' 'کسو' اور 'تلک' کے استعمال و ترک استعمال' دشوار قوافی و ردیف اور سنگلاخ زمینوں میں شعر نکالنے میں مصروف تھے اور ایک پورب کا رہنے والا دلی سے سیکڑوں اور لکھنؤ سے بیسیوں میل دور کا باشندہ اردو کو آب بقا سے سیراب کرنے اور اس کے لئے حیات جاوید کے سامان فراہم کرنے میں سرگرم تھا۔ خوش ہوں اہل دہلی اور اہل لکھنؤ کہ اس نے "ان کی" زبان کو وہ زندگانی بخشی کہ اغیار اس کے مٹانے کی کوشش کریں گے اور وہ نہ مٹ سکیگی' اس نے اسکو وہ مرتبہ بخشا جسپر ہندوستان کی دوسری زبانیں رشک کریں گی' اس نے اسے اس قابل بنایا کہ آیندہ نسلیں اسے اپنے خیالات کے بے تکلف اظہار کا ذریعہ بنائیں گی' اس نے اسمیں قبول عام اور دیرپا قیام کے اجزا کی ایسی ترکیب دی جو آیندہ "ہندبھاشا" ہونے کا دعوی کرسکے گی۔ مولینا شبلی کا عام انداز بیان اس طرح کا ہوتا ہے:۔

"دنیا میں جسقدر حکمراں گزرے ہیں ہر ایک کی حکومت کی تہ میں کوئی نہ کوئی مشہور مدبر یا سپہ سالار مخفی تھا' یہاں تک کہ اگر اتفاق سے وہ مدبر یا سپہ سالار نہ رہا تو دفعتہً۔۔۔۔۔ فتوحات بھی رک گئیں یا نظام حکومت کا ڈھانچہ بگڑ گیا۔ سکندر ہر موقع پر ارسطو کی

پرزیتوں کا سہارا لے کر چلتا تھا، اکبر کے پردہ میں ابوالفضل اور ٹوڈرمل کام کرتے تھے، عباسیہ کی عظمت وشان براکمہ کے دم سے تھی لیکن حضرت عمر کو صرف اپنے دست و بازو کا بل تھا۔ خالد کی عجیب وغریب معرکہ آرائیوں کو دیکھکر لوگوں کو خیال پیدا ہو گیا تھا کہ فتح وظفر کی کلید انہی کے ہاتھ میں ہے۔ لیکن جب حضرت عمر نے ان کو معزول کر دیا تو کسی کو احساس تک نہ ہوا کہ کل سے کونسا پرزہ نکل گیا ہے؟۔ سعد وقاص فاتح ایران کی نسبت بھی لوگوں کو اسی قسم کا وہم پیدا ہو چلا تھا، وہ بھی الگ کر دیے گئے، اور کسی کے کان پر جوں بھی نہ چلی۔ یہ سچ ہے کہ حضرت عمر خود سارا کام نہیں کرتے تھے اور نہ کر سکتے تھے لیکن جن لوگوں سے کام لیتے تھے، ان میں سے کسی کے پابند نہ تھے۔ وہ حکومت کی کل کو اس طرح چلاتے تھے کہ جس پرزے کو جہاں سے چاہا نکال لیا اور جہاں چاہا لگا دیا، مصلحت ہوئی تو کسی پرزے کو سرے سے نکال دیا اور ضرورت ہوئی تو نئے پرزے تیار کر لئے۔" ("الفاروق" صفحہ ۲۴۴، ۲۴۵)

یہاں تک جو کچھ بیان کیا گیا وہ ان مصنفین کی انشا پردازی پر ایک اجمالی ریویو تھا اور ہر ایک کی تحریر کا ایسا نمونہ پیش کیا گیا جس سے اس کے عام انداز بیان کا پتہ چلتا ہو۔ لیکن اس امر کے تصفیہ کے لئے کہ ان میں سب سے بڑا انشا پرداز کون ہے؟ ضرورت اسکی ہے کہ سب سے پہلے انشا پردازی کا ایک معیار قایم کیا جائے اور اسکی ضروری خصوصیات بیان کی جائیں، پھر دیکھا جاے کہ کون اس معیار پر پورا اترتا ہے؟ اور کس میں وہ خصوصیات پائی جاتی ہیں اور کہاں تک؟۔

انشا پردازی کی تعریف سب سے پہلے یہ دیکھنا چاہیے کہ انشا پردازی کسے کہتے ہیں؟ اگر یہ صرف مافی الضمیر کے اظہار کا نام ہے تو اس میں حیوان و انسان دونوں برابر ہیں۔ فرق اتنا ہے کہ اول الذکر اکثر اعضا کے اشارات سے اپنے اندرونی جذبات کا اظہار کرتا ہے یا کبھی اپنی مخصوص بولی میں۔ اور انسان کے جذبات ولی موضوع

الفاظ کے لباس میں ظاہر ہوتے ہیں۔ مثلاً کتے کو جب اس کا مالک پیار کرتا ہے تو وہ محبت سے دُم ہلانے لگتا ہے۔ یا بلی جب بھوکی ہوتی ہے تو مسکینت بھری آواز سے "میاؤں میاؤں" کرنے لگتی ہے لیکن انسان جذبۂ محبت یا خواہش گرسنگی کے اظہار کے لئے موضوع کلمات زبان سے نکالتا ہے۔ چنانچہ اسی وصف کو جو حیوان و انسان کے درمیان مابہ الامتیاز ہے، عربی میں "نطق" کہتے ہیں۔ اسی بنا پر انسان کو "حیوان ناطق" کہا جاتا ہے۔ لیکن اگر نطق ہی کا نام انشاپردازی ہے تو یوں بولنے کو جاہل و عالم، دیہاتی و شہری سب بولتے ہیں مگر ہر ایک محض انشاپرداز نہیں سمجھا جاتا ہے۔ مثلاً فرض کرو کہ ایک دریا طغیانی پر ہے، ایک دیہاتی اسکو پار کرکے اپنے گاؤں کو جاتا ہے گھر پہنچکر وہ اپنے بیوی بچوں میں راستہ کی سرگزشت کا جس معمولی طریقہ پر ذکر کرے گا اُسے انشاپردازی نہیں کہا جا سکتا۔ لیکن اسی واقعہ کو جب کوئی بڑا انشاپرداز بیان کرے گا تو وہ پانی کے تلاطم، کشتیوں کے تھپیڑے کھانے، کھڑی فصلوں کے تہِ آب ہونے اور جل تھل سب ایک ہو جانے کو جس موثر طریقہ پر بیان کرے گا، اس سے سننے والے یا پڑھنے والے پر خوف و رنج اور حیرت و استعجاب کا ایک اثر طاری ہو جائیگا۔ دور کیوں جایئے، اصل لفظ کے معنی پر غور کیجیے۔ "نشا" کے لغوی معنی اُبھرنے ابھارنے، یا بلندی و ترفع، کے ہیں، چنانچہ "نشا" کے لغوی معنی میں یہ مفہوم پایا جاتا ہے اور مجازی معنی شعر کہنے یا خطبہ دینے، کے ہیں اور وہ اسی بنا پر کہ شاعر یا خطیب ایک تو خود مشتعل جذبات سے پُر ہوتا ہے، دوسرے وہ اپنے کلام یا بیان کے زور سے اوروں کے جذبات ابھارنا چاہتا ہے۔ رفتہ رفتہ یہ لفظ جذبات انگیز نثر نگاری کے لئے بولا جانے لگا۔ چنانچہ کہتے ہیں کہ فلاں شخص بہت بڑا "منشی" ہے یعنی اعلیٰ درجہ کا لکھنے والا ہے (گو اب یہ لفظ اگر کر عرف عام میں محرر یا کلرک کے معنی میں مستعمل ہوتا ہے۔)

خطابت، شاعری، وانشاپردازی کا فرق | مذکورہ بالا تشریح کے مطابق جب انشا پردازی کی غرض اصلی اثر ریزی اور جذبہ انگیزی ٹھیری تو پھر خطابت، شاعری اور انشاپردازی میں فرق ہی کیا رہا؟ (یہاں پر فنون لطیفہ کی صرف ان اصناف سے بحث ہے، جو الفاظ کی شکل میں بذریعہ تقریر یا تحریر ظاہر ہوتی ہیں ۔ اس بنا پر مصوری، سنگتراشی ونقاشی وغیرہ ہمارے دائرہ بحث سے خارج ہیں) ۔ خطابت میں زیادہ تر فوری جوش واثر کا پیدا کرنا مقصود ہوتا ہے، کوئی اتفاقی واقعہ پیش آیا اور اس کے لئے سامعین کے جذبات کو تھوڑی دیر کیلئے مشتعل کر دیا گیا لیکن جیسا ہنگامی اس جوش وخروش کا چڑھاؤ ہوتا ہے، ویسا ہی فوری اسکا اتار بھی ۔ مدوجزر کی طرح ان جذبات کو کوئی قیام نہیں ہوتا ۔ اس وقتی اثر ریزی کے لئے خطیب کو قریبی گرد وپیش کی اشیا سے ہی کام لینا پڑتا ہے، تشبیہ واستعارہ یا مثل وحکایت کے لئے اسے بعید از قیاس یا دیر فہم چیزوں سے کام لینا مناسب نہیں ۔ کیونکہ سامعین کے جذب توجہ یا غور وفکر میں ذراسی تاخیر بھی خطیب کی تمام محنت کو رائیگاں کر دیگی ۔ مثلاً ایک مقرر اپنے مخاطبین کو قتل وخونریزی کی یاد دلانا چاہتا ہے تو وہ بجائے اس کے کہ میدان کربلا کا نقشہ کھینچے یا کسی خونریز جنگ کے واقعات بیان کرے اس کا صرف یہ کہدینا کافی ہوگا "مجھے تم میں سے کتنوں کے سر تن سے جدا نظر آتے ہیں ؟ کتنوں کی لاشیں زمین پر تڑپتی دکھائی دے رہی ہیں!" یا مثلاً وہ سامعین کو صلح جوئی اور امن پسندی کی تلقین کرنی چاہتا ہے تو بجائے اس کے کہ وہ فلسفۂ امن وصلح بیان کرے، وہ ہاتھ سے اشارے کر کر کے یہ کہتا ہے کہ "تم جس غرض سے آج اس چھت کے نیچے جمع ہوئے ہو، کیا سمجھتے ہو کہ اس چپہ زمین سے ایک ائی برابر امن بھی اپنے دامن میں (دامن کو ہاتھ سے پکڑ کر) لیکر اٹھو گے؟" غرض خطابت کی جوش انگیزی اور اثر ریزی صرف وقتی اور ہنگامی ہوتی ہے ۔ یہ جوش

وخروش نہ اس سے زیادہ ٹھہرتا ہے اور نہ زیادہ ٹھہرنے کی ضرورت ہوتی ہے۔

شاعری کا مفہوم عام طور پر کلام موزوں سمجھا جاتا ہے یعنی کلام میں ایک طرح کا وزن پایا جائے۔ آگے چلکر قوافی و ردیف کی شرط بھی آجاتی ہے۔ لیکن بعض محققین کے نزدیک شاعری نام ہے تخئیل کا۔ یعنی ایسا کلام جسے شاعر کی قوت تخئیل نے نہایت لطیف اور پر اثر طریقہ پر ادا کیا ہو۔ ایک دوسرے گروہ کا خیال ہے کہ شاعری ایک طرح کی محاکات ہے اور وہ محاکات کے دائرہ کو اسقدر وسعت دیتا ہے کہ تخئیل اس سے باہر نہیں جاسکتی۔ اس گروہ کے نزدیک واقعات زمانہ یا مناظر قدرت کا نقشہ اس طرح پر پیش کیا جائے کہ کلام کے سننے والے پر وہی اثر طاری ہو جو ان واقعات و مناظر کو خود دیکھنے سے ہوتا۔ معنی کے لحاظ سے اگرچہ موخر الذکر دونو گروہ پہلے گروہ سے مختلف ہیں لیکن کلام میں وزن ہونے سے انھیں بھی انکار نہیں۔ یہ اسکو شاعری کا ایک جزو سمجھتے ہیں گو اول الذکر گروہ کی طرح اسی کو اصل شاعری نہیں قرار دیتے۔ ایک اور خاص فرق جو خطابت اور شاعری میں ہے، وہ یہ کہ شاعر کو اپنے مخاطب یا سامع سے کوئی غرض نہیں۔ وہ جن جذبات سے خود متاثر ہوتا ہے، یا جو واقعات اسکی نظر سے گزرتے ہیں، ان جذبات و واقعات کو ظاہر کردینا اسکی غرض اصلی ہے لیکن اس طریقہ پر کہ کوئی شخص جب پڑھے یا سنے تو وہ بھی انہی جذبات سے متاثر ہو۔ شاعری کی ظاہری حیثیت سے ایک خاص بات جو اسمیں ہے، وہ کسی میں نہیں۔ یعنی کلام میں وزن کے التزام اور قافیہ و ردیف کی پابندی سے ضروری و مناسب الفاظ کی آمد ہر موقع پر ممکن نہیں ہوتی اور نہ اس قید اور پابندی کی وجہ سے یہ کلام ہر شخص اور ہر وقت کے لئے مناسب اور ممکن ہوسکتا ہے۔ دوسرے، معنوی لحاظ سے شاعری میں صحت واقعات اور اظہار حقیقت کی شرط کوئی لازمی امر نہیں۔ ممکن ہے اور بہت ممکن ہے کہ اظہار جذبات کے جوش اور

تخئیل کی بلند پروازی میں صحتِ واقعہ اور حقیقت امر کا دامن ہاتھ سے چھوٹ جائے۔

ان دونو کے برعکس انشا پردازی کی غرض و غایت کچھ اَور ہی۔ اس کا مقصد خطابت کی طرح نہ تو فوری جوش و خروش کا ابھارنا ہنگامی اثر پیدا کرنا ہوتا ہی اور نہ شاعری کی طرح اظہار جذبات یا خیال آرائی ہوتا ہی۔ بلکہ وہ ایک مستقل بالذات شے ہی۔ اس کا مخاطب نہ تو کوئی انسانی مجمع ہوتا ہے اور نہ وہ تمام تر متکلم ہی سے متعلق ہوتی ہی۔ وہ اپنی اثر انگیزی میں ایک خاص ثبات اور مناسبت رکھتی ہی جو نہ بالکل وقتی ہوتی ہے اور نہ ضرورت سے زاید۔ اس کے ہاں نہ تعجیل اثر کا لحاظ ہی جس سے انشا پرداز صرف اپنے گرد و پیش کی چیزوں پر اکتفا کرے، نہ اوزان و قوافی کی قید، جس سے غیر ضروری یا نامناسب الفاظ کی بھرتی کرنی پڑے اور نہ اس کے ہاں تخئیل کی بلند پروازی اور محاکات کی شرط، جس سے صحت واقعات اور اظہار حقیقت کا دامن ہاتھ سے چھوٹ جاے بلکہ حقیقت یہ ہی کہ انشا پردازی اظہار خیالات اور تحریر واقعات کا ایسا ذریعہ ہی جو الفاظ کی بے جا نمائش اور معانی کے مبالغہ و غلو سے پاک ہے اس کے ذریعہ واقعات نہایت سیدھے سادہ طریقہ سے ادا کئے گئے ہوں۔ خیالات میں بُعد اور پیچ نہ ہو۔ تشبیہ و استعارہ کی جگہ زیادہ تر نفس واقعہ سے کام لیا گیا ہو۔ غرض یہ ایک ایسا طریقہ ہے جو ہر معمولی شخص کیلیے ممکن الحصول اور قابل عمل ہے۔

الفاظ و معانی | اسی سلسلے میں ایک نہایت لطیف اور دلچسپ بحث یہ آتی ہی کہ آیا انشا پردازی کا دار مدار الفاظ پر ہے یا معانی پر۔ ایک گروہ کا خیال ہے کہ انشا پردازی نام ہے بہترین الفاظ کے بہترین طریقہ پر استعمال کا۔ نئے معانی و خیالات ہر روز نہیں پیدا ہوتے۔ ایک ہی خیال ہوتا ہی جو مختلف انشا پرداز مختلف طریقہ پر ادا کرتے ہیں، لیکن ان میں جو فرق ہوتا ہی وہ انتخاب الفاظ اور طرز ادا کا۔ کوئی اسی خیال یا واقعہ کو اس طرح سے بیان کرتا ہی کہ پڑھنے والے پر کوئی خاص اثر نہیں پڑتا،

کسی کا طریقہ بیان اور انتخاب الفاظ ایسا ہوتا ہے کہ پڑھنے سے ایک خاص کیف اور اثر طاری ہونے لگتا ہے۔ انگریزی زبان کے جاننے والے اس نکتہ کو اس مثال سے بخوبی سمجھ سکتے ہیں۔ انگلستان کی تاریخ ہزاروں مصنفین نے لکھی ہے لیکن جو کیفیت اور اثر لارڈ میکالے کی تاریخ کے چند ابواب پڑھکر ہوتا ہے، وہ اور کسی کی تحریر سے نہیں۔

دوسرا گروہ یہ کہتا ہے کہ انشا پردازی یا حسن کلام موقوف ہے اعلیٰ معانی اور حسن خیالات پر۔ جبتک معانی میں کوئی ندرت یا خیالات میں کوئی کشش نہ ہوگی نرے الفاظ کا کوئی اثر نہیں۔ تحریر میں اثر اسی وقت ہوتا ہے جب خیالات پُر اثر ہوتے ہیں۔ ان کا قول ہے کہ "انچہ از دل خیزد بر دل ریزد"۔ دنیا کے اکثر بڑے بڑے مصلحین بڑے انشا پرداز بھی مانے جاتے ہیں۔ انگریزی لٹریچر میں زبان کے لحاظ سے انجیل کا جو درجہ ہے، وہ کسی کتاب کا نہیں۔ بعض نقادان فن مہاتما گاندھی کے طرز تحریر کو انگریزی انشا پردازی کا بہترین نمونہ سمجھتے ہیں۔

لیکن ہمارے نزدیک حقیقت یہ ہے کہ الفاظ و معنی کا تعلق جسم و روح کا تعلق ہے۔ جس طرح تنہا روح یا خالی جسم پر زندگی کا اطلاق نہیں ہوسکتا، اسی طرح لفظ کو معنی سے یا معنی کو لفظ سے جدا کرکے انشا پردازی کو باقی نہیں رکھ سکتے۔ اگر الفاظ نہایت شاندار اور پر شکوہ ہیں لیکن بے معنی، ممکن ہے کہ پڑھنے والا بادی النظر میں ان سے متاثر ہو جائے لیکن جہاں ذرا سنبھلا اور خیال معنی کی طرف گیا کہ وہ اثر ایکدم غائب ہو جائیگا۔ انشا پردازی کے متعلق اکثر غلط فہمیاں اسی قسم کی ہوئی ہیں۔ یہی حال معنی کا ہے۔ خیالات اور معانی خواہ کتنے ہی بلند اور اعلیٰ ہوں لیکن ان کے ادا کرنے کے لئے الفاظ ناقص اور غیر موزوں استعمال کئے گئے ہیں تو ان مضامین و خیالات کا کوئی اثر نہ ہوگا۔ دنیا میں کتنے ہی بلند خیالات اور اعلیٰ معانی ظاہر ہوئے لیکن اسوجہ سے مقبولیت اور رواج نہ پاسکے کہ ان کا طریقہ اظہار اور طرز ادا

پسندیدہ اور پر اثر نہ تھا۔ غرض الفاظ و معانی کا تعلق باہمی لاینفک ہے، اور انشا پردازی ان دونوں کی باہمی اور مشترک خوبی اور موزونیت کا نام ہے، جسکی بہترین مثال ہماری کتاب قرآن حکیم ہے۔

اسی بنا پر علمائے ادب نے انشا پردازی کی دو بڑی جامع اور مانع خصوصیات بیان کی ہیں (۱) فصاحت اور (۲) بلاغت جن میں سے ایک کا تعلق زیادہ تر الفاظ سے ہے اور دوسری کا معانی سے۔ اب ہم ان میں سے ہر خصوصیت اور اس کی جزئیات سے بحث کریں گے اور اسی کے مطابق ان مصنفین کی تحریروں کے نمونے پیش کرتے جائیں گے جس سے یہ واضح ہو جائے گا کہ علامہ شبلی میں یہ خصوصیات کس حد تک پائی جاتی تھیں اور ان کے دوسرے معاصرین میں اس کی کس قدر کمی تھی۔

فصاحت اور اسکی جزئیات

فصاحت میں زیادہ تر کلام یا تحریر کی لفظی حیثیت سے بحث ہوتی ہے۔ یعنی الفاظ اپنی ظاہری حیثیت سے کیسے ہیں؟ بولنے یا سننے میں وہ کیا اثر رکھتے ہیں؟ صرفی قاعدہ سے ان کا کیا درجہ ہے؟ اور تحریر بہ لحاظ مجموعی کیسی ہے؟

فصاحت کی ایک بڑی خصوصیت یہ ہے کہ تحریر کے الفاظ نہایت صاف اور شستہ ہوں۔ صفائی اور شستگی الفاظ سے مراد یہ ہے کہ ان کے بولنے میں زبان کو آسانی ہو اور سننے میں کانوں کو بھلا لگے۔ مثال کے طور پر مولینا شبلی کی یہ چند سطریں ملاحظہ ہوں:

"آج میں نے ایک عجیب دلاویز خواب دیکھا۔ عجیب اس لئے کہ دوپہر کا وقت تھا اور آنکھیں بیدار تھیں اور دلاویزی کی یہ کیفیت ہے کہ جاگے ہوئے مدت ہو چکی ہے اور اب تک آنکھوں میں وہی سماں پھر رہا ہے۔ مفصل سنئے۔ آج جمعہ کا دن ہے اور معمول کے موافق موکب سلطانی کا نظارہ گاہ تھا، میں بھی ہمہ تن شوق بنکر گیا۔ جامع حمیدیہ میں داخل ہوا۔ سلطان المعظم بڑی شوکت و شان سے آئے لیکن میں کچھ نہ دیکھ سکا کیونکہ یہ سیر صرف ان لوگوں کو نصیب ہو سکتی ہے جو گزرگاہ سلطانی پر پہلے سے موجود

ہوتے ہیں اور پھر نماز کے ختم ہونے تک جگہ سے حرکت نہیں کر سکتے۔" (مکاتیب شبلی حصہ اول صفحہ)

اسی کے برعکس تحریر کا ایک بڑا نقص یہ سمجھا جاتا ہے کہ الفاظ ثقیل اور کریہہ ہوں جن کے بولنے سے زبان پر گرانی اور سننے میں کانوں کو ناگواری محسوس ہوتی ہو۔ بعض وقت تحریر میں دو ایک ثقیل لفظ کا آجانا عبارت کو بے لطف اور بدمزہ کر دیتا ہے۔ دربار اکبری کی چند سطریں بطور مثال پیش ہیں:۔

"ایک سوار حکم شاہی لیکر دوڑا اور آواز کی طرح پہاڑ سے پھرا، معلوم ہوا کہ محاصرے کو چھوڑ کر اختیار الملک ادھر پلٹا ہے۔ لشکر میں کھلبلی پڑی۔ بادشاہ نے پھر بہادروں کو للکارا۔ نقارچی کے ایسے اوسان گئے کہ نقارہ پر چوٹ لگانے سے بھی رہ گیا۔ یہاں تک کہ اکبر نے خود برچھی کی نوک سے ہشیار کیا۔ غرض سب کو سمیٹا اور پھر فوج کو لیکر دل بڑھاتا ہوا دشمن کی طرف متوجہ ہوا۔ چند سرداروں نے گھوڑے جھپٹا ئے اور تیر اندازی شروع کی۔ اکبر نے پھر آواز دی کہ نہ گھبراؤ۔ کیوں کھنڈے جاتے ہو۔ دلاور بادشاہ شیر مست کی طرح خراماں خراماں جاتا تھا اور سب کو دلاسا دیتا جاتا تھا۔ غنیم طوفان کی طرح چڑھا چلا آتا تھا۔ مگر جوں جوں پاس آتا تھا، جمعیت کھنڈی جاتی تھی۔ دور سے ایسا معلوم ہوا کہ اختیار الملک چند رفیقوں کے ساتھ جمعیت سے کٹ کر جدا ہوا ہے اور جنگل کا رخ کیا ہے۔ وہ فی الحقیقت حملہ کرنے نہیں آیا تھا متواتر فتحوں کے سبب سے تمام ہندوستان میں دھاک بندھ گئی تھی کہ اکبر نے تسخیر آفتاب کا عمل پڑھا ہے اب کوئی اس پر فتح نہ پا سکے گا۔ محمد حسین مرزا کی قید اور تباہی لشکر کی خبر سنتے ہی اختیار الملک بے اختیار محاصرہ چھوڑ کر بھاگا تھا۔ تمام لشکر اس کا جیسے چیونٹیوں کا قطار۔ برابر سے کترا کر نکل گیا۔ اس کا گھوڑا ایک ٹھوٹ چلا جاتا تھا یہ کمبخت بھی تھوہر میں الجھا اور خود زمین پر گر پڑا۔" (دربار اکبری صفحہ ۲۲۳، ۲۲۴)

صفائی و شستگی اور ثقل و کراہت کی تمیز تو بہتر طور پر انسان کا لطیفہ سامعہ ہی

کرسکتا ہے۔ لیکن اس کے لئے کچھ اصول بھی مقرر ہیں۔ مثلاً بعض حروف ایسے ہیں جن کا تلفظ زبان سے آسانی کے ساتھ ہوجاتا ہے اور کانوں کو ان کا سننا بھی بھلا لگتا ہے جیسے بے، تے، رے، زے وغیرہ۔ بعض حروف ایسے ہیں جن کا بولنا اور سننا دونوں ناگوار ہوتا ہے جیسے ٹے، ڈال، ڑے وغیرہ۔ اسی طرح الفاظ میں بھی ان حرفوں میں سے کسی ایک کے آنے یا ان میں سے دو یا تین کے قریب قریب جمع ہوجانے، یا ایک ہی حرف کے مکرر ہونے سے ثقل وکراہت پیدا ہوجاتی ہے اور اس بنا پر زبان میں شستہ اور لطیف، ثقیل اور کریہ الفاظ ہو گئے ہیں۔ مکاتیب کی پہلی عبارت میں یوں تو شاید ہی کوئی ثقیل یا کریہ بتایا جا سکے بلکہ "دلاویز"۔ "سماں"۔ "شوق"۔ "سیر" کے آجانے سے زبان وگوش دونوں کو ایک خاص حظ محسوس ہوتا ہے۔ برعکس اس کے دربار اکبری کی دوسری عبارت میں "کھنڈرے"۔ "جھپٹا سے" "فتحوں" "بگٹوٹ"۔ "کھنڈی"۔ "ٹھور" کے الفاظ سے پڑھنے والے اور سننے والے دونوں کو ایک طرح کی گرانی اور ناگواری معلوم ہوتی ہے۔ علاوہ اس کے بعض جگہ ہائے دوچشمی، ’جے‘ اور ڈال کے قریب قریب آجانے سے یا "تھا" پر فقروں کے ختم ہونے سے عبارت میں موسیقیت باقی نہیں رہتی۔

فصاحت کی ایک بڑی خوبی روزمرہ اور بول چال کا استعمال ہے۔ روزمرہ سے مراد وہ زبان ہے جو نہایت سادہ اور عام فہم ہو اور جسے لکھے پڑھے اہل زبان استعمال کرتے ہوں۔ ظاہر ہے کہ ایسی زبان کے الفاظ و محاورات بالکل رائج الوقت ہوں گے۔ علامہ شبلی سے بڑھکر اس نکتہ کو شاید ہی کسی نے سمجھا ہو۔ انھوں نے نہ توجید اور متبحر علما کی معرب اردو اور نہ اہل زبان کی بازاری اردو لکھی، بلکہ اہل زبان کے پڑھے لکھے طبقہ کی زبان کو اپنے لئے انتخاب کیا جس کا اندازہ اس ٹکڑے سے بخوبی ہو سکتا ہے:-

"مدت سے قدمبوسی نہیں ہوئی اور بہت جی چاہتا ہے۔ سیر اتو آنا نہیں ہوسکتا اس لئے

امید کرتا ہوں کہ آپ ہی قدم رنجہ فرمائیں۔ ۱۱۔ دسمبر سے یہاں نہایت عمدہ جلسہ اور سیریں ہوگی اور ۱۷۔ دسمبر تک کالج ایک تماشاگاہ بنا رہیگا۔ پھر بیچ میں وقفہ ہوکر ۲۲۔ دسمبر سے کانفرنس شروع ہوگی۔ بہتر یہ ہے کہ آپ ۱۱۔ تاریخ تک تشریف لائیں۔ بیچ میں دلّی اور آگرہ کی سیر بھی ہو سکیگی اور آپ نہایت محظوظ ہوں گے"۔ (مکاتیب شبلی حصہ اول، صفحہ ۲۲۲)

لیکن بعض وقت روزمرہ کے مفہوم سے ایک بڑا مغالطہ پیدا ہو جاتا ہے، یعنی اکثر سادگی بیان اور سہل زبان کے یہ معنی لیے جاتے ہیں جو سوقیت اور ابتذال کے قریب تر ہو جاتے ہیں۔ خواندہ و ناخواندہ جبتک یہ دو طبقے کسی سوسائٹی میں موجود ہیں، اسوقت تک ان کی زبانوں میں بھی فرق رہیگا اور اس اختلاف مراتب کی بنا پر ہر دو طبقہ کے مستعمل الفاظ و محاورات اور اقوال و امثال بھی مختلف رہیں گے۔ ایک انشا پرداز کا فرض یہ ہے کہ انتخاب زبان کے وقت اس فرق کو ملحوظ رکھے۔

ہمارے عناصر اربعہ میں اس کے متعلق سب سے بڑی غلط فہمی ڈپٹی نذیر احمد کو ہوئی ہے، جنھوں نے روزمرہ لکھنے کے جوش میں سوقیت کو دخل دیا ہے اور وہ بھی بری طرح۔ توبۃ النصوح میں ایک جگہ لکھتے ہیں:۔

"ادھر تو نصوح اور سلیمہ دونو باپ بیٹوں میں یہ گفتگو ہو رہی تھی، اُدھر اتنی ہی دیر میں نعیمہ اور بڑی بیٹی نعیمہ میں خاصی ایک جھوٹر ہوگئی۔ نعیمہ اسوقت دو برس کی بیاہی ہوئی تھی۔ پانچ مہینہ کا پہلونٹی کا لڑکا گود میں تھا۔ ناز و نعمت میں پلی، نانی کی جہیتی، ماں کی لاڈو، مزاج کچھ تو قدرتی تیز، باپ کے لاڈ پیار سے وہی کہاوت ہوگئی کریلا اور نیم چڑھا، اور بھی چڑچڑا ہوگیا تھا۔ ساس نندوں میں بھلا اس مزاج کی عورت کا کیوں کر گزر ہونے لگا تھا۔ گھونگھٹ کے ساتھ منہ کھلا اور منہ کا کھلنا تھا کہ سسرال کا آنا جانا بند ہوگیا۔ اب چھ چھ مہینے سے ماں کے گھر بیٹھی ہوئی تھی

مگر رسی جلی پر بل نہ گیا۔ باوجودیکہ اجڑی ہوئی میکے پڑی تھی۔ مزاج میں وہی طنطنہ تھا، کوار بنے ہی میں سوا گز کی زبان تھی۔ کچھ یوں ہی سا لحاظ بڑی بوڑھیوں کا تھا، سو بیاہے سے ان کو بھی دھتکار بتائی۔ بیٹیا جنے پیچھے تو اور بھی کھل کھیلی، مردوں کا لحاظ اٹھا دیا۔ فہمیدہ نے میاں کے روبرو بیٹوں کا بیڑا اٹھاتے تو اٹھایا لیکن نعیمہ کے تصور سے بدن پر رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں اور جی ہی جی میں کہتی تھی کہ ذرا بھی اس بھڑوں کے چھتے کو چھیڑ دوں گی تو میرا سر ہونڈ کر بھی بس نہ کرے گی۔" (توبۃ النصوح صفحہ ۴۹)۔

یہ ہے اُس زبان کا نمونہ، جو اردو بولنے والی موجودہ اور آیندہ نسلوں کے بولنے اور لکھنے کے لئے پیش کیگئی ہے۔ روزمرہ ہر زبان کے ناول اور افسانوں میں ہوتا ہے مگر وہ اسقدر محدود رقبہ کی زبان نہیں ہوتی جسے دوسری جگہ کے لوگ نہ سمجھ سکیں۔ اس زبان کے بولنے اور سمجھنے کا پورا پورا لطف تو گزشتہ صدی میں دلی کے بعض محلے اور کوچے ہی کے لوگ اٹھا سکتے تھے۔

فصاحت کے سلسلہ میں ایک بڑی نازک بحث سلاست وعدم سلاست کی آتی ہے۔ بعضوں کا خیال ہے کہ سلاست و روانی بذاتہ کوئی وصف نہیں بلکہ روزانہ کے بول چال اور کثرت استعمال سے تحریر میں سلاست وروانی پیدا ہو جاتی ہے۔ کہتے ہیں کہ کلام مجید کا جب یہ وصف ابو العلا معری سے (جس نے قرآن کا جواب لکھا تھا) بیان کیا گیا تو اُس ملحد نے جواب دیا کہ "ہاں ابھی نہیں، میرا کلام بھی جب کچھ عرصہ تک نمازوں میں متواتر کثرت سے پڑھا جائے، تو اُسمیں بھی وہی سلاست وروانی پیدا ہو جائیگی۔" لیکن اس طرز استدلال میں ایک بہت بڑا دھوکا ہے۔ سلاست وروانی کا دار مدار کثرت استعمال پر ہرگز نہیں بلکہ خود الفاظ، محاورات اور ترکیبوں میں بعض ایسی خصوصیات موجود ہوتی ہیں جن سے تحریر میں سلاست یا اجنبیت پیدا ہو جاتی ہے، مثلاً بعض لفظ میں ایک طرح کی نزاکت ولطافت اور بعض میں

ایک شان وشکوہ پایا جاتا ہے جن کے آنے سے تحریر میں ایک روانی پیدا ہوتی ہے مگر بعض الفاظ بڑے اور بھونڈے ہوتے ہیں جن سے عبارت میں ایک رکاوٹ اور مغایرت آجاتی ہے ان کی خصوصیات مع مثال کے ذیل میں زیادہ تصریح کے ساتھ آئیں گی۔

تحریر میں عدم سلاست یا مغایرت کی ایک بڑی وجہ یہ ہوتی ہے کہ اکثر الفاظ ومحاورات متروک ہوتے ہیں، یا طریقۂ بیان بدلا ہوا ہوتا ہے، یا بعض وقت اسماء وضمایر کی غیر ضروری تکرار ہوتی ہے۔ ان اسباب سے تحریر میں وہ روانی اور سلاست باقی نہیں رہتی جو ایک مروجہ الفاظ اور غیر متروک انداز بیان کی عبارت میں ہوتی ہے۔ ذیل میں پروفیسر آزاد کی یہ عبارت اسکو واضح کردیگی۔ لکھتے ہیں کہ:

"سلیم شاہ کے محلوں میں ایک کشمیرن بی بی تھی، اس سے سلیم شاہ کی ایک بیٹی تھی وہ خانخاناں کے لشکر کے ساتھ حج کو چلی تھی، وہ خانخاناں کے بیٹے مرزا عبدالرحیم کو بہت چاہتی تھی اور وہ لڑکا بھی اس سے بہت ہلا ہوا تھا اور خانخاناں اپنے فرزند مرزا عبدالرحیم سے لڑکی کی شادی کرنی چاہتا تھا۔ اس بات کا افغانوں کو بہت خار تھا ایک دن شام کے قریب سہس لنگ وہاں کے تلاؤ میں نواڑے پر بیٹھا، پانی پر ہوا کھاتا پھرتا تھا۔ مغرب کے قریب کشتی سے نماز کے لئے اترا" (دربار اکبری صہ۱۹۱)۔

اس مختصر سی عبارت میں اتنے الفاظ مثلاً "ہلا ہوا"، "خار"۔ "تلاؤ"، "نواڑے" ہیں جن کا استعمال یا تو بالکل ہی ترک ہوگیا ہے، یا بعض کا موقع استعمال بدلگیا ہے لیکن اس سے بڑھکر طرز بیاں کی اجنبیت ہے۔ دیکھو کہ ابتدائی چاروں جملے ترتیباً "تھی" کے لفظ پر ختم ہوتے ہیں اور بعد کے جملوں میں "تھا" کا التزام ہے۔ اس کے علاوہ بعض الفاظ مثلاً "خانخاناں"، "مرزا عبدالرحیم"۔ اور "وہ" کی تکرار سے عبارت میں کسقدر اجنبیت معلوم ہوتی ہے۔ یہ عیب آزاد کی تحریر میں

بہ کثرت پایا جاتا ہے۔ ہزاروں متروک الاستعمال الفاظ و محاورات مثلاً "ٹخ پٹخ کر"۔ "ناک گھسنی کرنا"، "باسن"۔ "چھند پانا"۔ "کھوانا" ان کے ہاں میں سگے۔ طرز ادا میں عام طور پر ایک طرح کی کہنگی اور دیرینہ پن پایا جاتا ہے۔

اسی طرح ڈپٹی نذیر احمد کی تحریر میں اگر ایک طرف عربی کے دقیق لغات ہیں تو دوسری جانب اردو کے ٹھیٹھ الفاظ و محاورات بھی ہیں جن سے کہیں کہیں تحریر کی روانی و سلاست میں فرق آجاتا ہے۔ اول الذکر الفاظ اپنی دشواری کی وجہ سے چل نہ سکے، موخرالذکر اپنی عمومیت کے سبب ترک ہوگئے۔ عربی الفاظ و ضرب الامثال اور آیات قرآنی کے استعمال میں تو ڈپٹی صاحب اپنی کمال عربی دانی اور حافظ قرآن ہونیکی وجہ سے مجبور رکھتے جسکی مثالیں طوالت کے اندیشہ سے دینا مناسب نہیں معلوم ہوتا لیکن عامیانہ و سوقیانہ الفاظ کے استعمال کی کثرت تو افراط کی حد کو پہونچ جاتی کر جنمیں سے بعض الفاظ کا نقل کر دینا دلچسپی سے خالی نہ ہوگا۔ مثلاً "سٹک جانا"۔ "چھیڑ خانی"۔ "چھٹکنا"۔ "لتاڑ"۔ "اکڑ پھوں"۔ "کنی کاٹنا"۔ "چیلے چانٹے"۔ "تتو تھمو"۔ "چھدار کھنا" وغیرہ وغیرہ۔ یہ سنکر غالبًا اور حیرت ہوگی کہ یہ تمام الفاظ قرآن مجید کے ترجمہ میں استعمال کئے گئے ہیں۔ ان میں سے بعض الفاظ تو ایسے ہیں کہ ایک تحریر کیا ایک تصنیف میں آجانے سے نہ صرف اسکی سلاست کو بلکہ اسکی وقعت کو گھٹا دینے کیلئے کافی ہیں۔

مولینا حالی کی تحریر بھی جو سیدھی سادی زبان لکھنے کے لئے مشہور رہین، اس عیب سے پاک نہیں نظر آتی۔ ان کی تصانیف سے بھی ایک طویل فہرست ایسے الفاظ کی تیار کیجا سکتی ہے جو یا تو دقیق ہونے کے باعث رفتار زبان کا ساتھ نہ دے سکے یا حد سے زیادہ عام فہم ہونیکی وجہ سے زبان کا مذاق لطیف ان کو نہ نبھا سکا۔ عربی کے ایسے دقیق الفاظ مثلاً "منوہ بالشان"۔ "استطرادی"۔ "مطارحات"۔

"معارست"، "مارراکد" کا اردو زبان بولنے والے طبقہ میں رواج پانا دشوار تھا
برعکس اس کے ایسے عامیانہ الفاظ جیسے "تلپٹ"، "اولو"، "تیکھاپن"، "ہینجڑا"
وغیرہ وغیرہ کو قوم کا ادبی مذاق کب گوارا کر سکتا تھا!۔

یہاں تک تو عربی فارسی کے دقیق یا ہندی و بھاشا کے ٹھیٹھ الفاظ و محاورات سے گفتگو تھی جو تحریر میں مانعِ سلاست و روانی کہے جا سکتے ہیں۔ لیکن اب ایک تیسرے عنصر سے بحث ہے جو نہ صرف مانع سلاست ہو سکتا ہے بلکہ خود زبان کے حق میں مضر ہے۔ اس عنصر سے ہماری مراد انگریزی ہے۔ پروفیسر آزاد کے زمانہ میں عربی و فارسی کا بچا کھچا اثر اسقدر باقی تھا کہ انگریزی کی جو ہندوستان میں ابھی اپنے عہد طفولیت میں تھی، کچھ پیش نہ گئی اور خیر سے پروفیسر موصوف اس زبان سے کچھ ایسا واقف بھی نہ تھے۔ لیکن جوں جوں زمانہ گزرتا گیا، انگریزی حکومت کے ساتھ ساتھ انگریزی زبان بھی اپنا اثر جماتی گئی اور ایسا کیوں نہ کرتی، بادشاہ وقت کی زبان تھی۔ "یس" "ہاں" "نہیں" کہنا بڑے فخر کی بات سمجھی جاتی تھی جس کسی کو انگریزی کی ابجد بھی آتی، وہ عزت کی نگاہ سے دیکھا جاتا یہی اسباب تھے جن کی بنا پر ہمارے دوسرے اور تیسرے مصنفین (نذیر احمد و حالی) اس انگریزی کا بے طرح شکار ہوئے۔ ڈپٹی نذیر احمد کو انگریزی ملازمت کے تعلق سے اس زبان کا سیکھنا ناگزیر تھا چنانچہ انھوں نے اسے بڑے شوق سے سیکھا اور جلد سیکھ لیا۔ یہ اسی شوقِ حصول کا اثر ہے کہ انگریزی کا رنگ ان کے ابتدائی مضامین میں بہت زیادہ نظر آتا ہے خصوصاً لکچروں میں تو صریح آورد معلوم ہوتی ہے۔ کثرت استعمال کا یہ حال ہے کہ ان کے درباری لکچر کے صرف ایک صفحہ پر "سپورٹ" (کفالت کرنا) "ٹالریشن" (رواداری) "ریلیجس نیوٹریلیٹی" (مذہبی غیر جانبداری) "اناکیولیشن" (ٹیکہ)۔ "کوالٹی" (قسم یا صفت)۔ "کوانٹیٹی" (مقدا

استنے الفاظ آئے ہیں، حالانکہ ان میں سے ہر ایک کیلئے بہتر اردو کا لفظ موجود تھا۔ نہ صرف الفاظ بلکہ انگریزی امثال، فقرے اور مرکبات بھی استعمال کر گئے ہیں مثلاً "ٹوبی آر ناٹ ٹو بی" (To be or not to be) "جیک آف آل ماسٹر آف نن" (Jack of all master of none) "دی لاسٹ دو ناٹ دی لیسٹ" (The last though not the least) "اپ ٹو مارک" (Upto mark) "سینیر ممبر" (Senior member) "ریوینیو بورڈ" (Revenue Board) وغیرہ وغیرہ۔

مولینا حالی بھی اثر کا اس سے کچھ کم شکار نہ ہوئے اور یہ عیب ان کی سب سے بڑی تصنیفات حیات جاوید اور یادگار غالب تک میں پایا جاتا ہے۔ صفحے اُلٹتے چلے جائیے اور آپ کو انگریزی کے مفرد و مرکب الفاظ ملتے جائیں گے مثلاً "ورکس" (تصانیف)۔ "ایمیجینیشن" (تخیل)۔ "میٹریل" (مواد)۔ "ریفارمیشن" (اصلاح) "ججمنٹ" (فیصلہ)۔ "ایشیاٹک پوئٹری" (ایشیائی شاعری)۔ "ڈسپاٹک گورنمنٹ" (مطلق العنان حکومت) "سلف ریسپکٹ" (خودداری)۔ "پبلک اسپیکنگ" (مجمع عام میں تقریر کرنا)۔ "اِم مورل" (خلاف تہذیب)۔ اس سے زیادہ مضحکہ خیز وہ مرکبات ہیں جنمیں ایک انگریزی لفظ ہے اور دوسرا اردو۔ مثلاً "کرسچینیٹی سلطنت" (عیسائی سلطنت)۔ "کریٹکل طریقہ" (ناقدانہ طریقہ)۔ "لٹریری دنیا" (علمی دنیا) وغیرہ۔ قوسین میں دیکھو کہ مذکورہ بالا الفاظ میں سے ہر ایک کا اردو مرادف اُسی زورِ معنی کے ساتھ ملسکتا تھا، لیکن کیا اسے مذاقِ ادبی سے تعبیر کیا جا سکتا ہے کہ خواہی نخواہی اس بن بلائے مہمان کو جگہ دیگئی۔

حقیقت یہ ہے کہ انشا پرداز کو قوم کا بہت بڑا انباض اور زمانہ کا شناسا ہونا چاہئے جو سوسائٹی کے میلان طبع اور رفتار زمانہ کے رخ کو پہچان لے۔ اسے معلوم ہو جائے کہ قوم کا مذاق ادبی کیا ہونیوالا ہے اور زمانہ کس طرف کو کھینچا رہا ہے۔ علامہ شبلی

اس راز سے بخوبی واقف تھے۔ وہ جانتے تھے کہ اردو کا خمیر کچھ اور ہی ہے، اسمیں عربی وفارسی کی آمیزش صرف وہیں تک ہونی چاہیئے جہاں تک اس کے اصلی مزہ میں فرق نہ آئے وہ یہ بھی سمجھتے تھے کہ اردو دہلی اور لکھنو تک محدود نہ رہیگی بلکہ اُسے ہندوستان کے طول وعرض میں پھیلنا ہے۔ انگریزی کے اس قبول عام کو دیکھکر انھوں نے اندازہ کیا کہ یہ رنگ جمنے والا نہیں، جسدن ہندوستانی چیتے، یہ رنگ اُڑ جائیگا۔ اس لیئے اس زبان سے صرف وہی الفاظ لینے چاہئیں جو ناگزیر ہوں یا ہو اپنے ساتھ کوئی مخصوص معنی ومفہوم رکھتے ہوں۔ یہ اسی حقیقت شناسی کا نتیجہ ہو کہ علامہ شبلی کی ابتدائی سے ابتدائی تحریر اُٹھاکر دیکھئے، اِن عیوب سے بالکل پاک ہوگی۔ سردست جو پرانی سے پرانی تحریر دستیاب ہوسکی ہو، وہ مئی ۱۸۷۶ء کا لکھا ہوا ایک خط ہو جسے انھوں نے نینی تال سے اپنے والد بزرگوار کو بھیجا تھا۔ وہ لکھتے ہیں:۔

"گو میرا قلم، خامہ نقاش کی ہمسری کرے جس سے میں اس عجیب وغریب مقام (نینی تال) کی پوری تصویر کھینچ سکوں، تاہم مجھکو امید نہیں کہ اس کوشش سے عزیزان وطن کو جو میرے خط پر آنکھ لگائے بیٹھے ہوں گے، اپنے شوق وانتظار کا صلہ ملجائے۔ میں بے تکلف تسلیم کرتا ہوں کہ نینی تال ایک عجیب اور حیرت انگیز مقام ہے لیکن اگر "تعجب انگیز" اور "دلچسپ وفرحت زا" ہونا دو جداگانہ چیزیں ہیں تو مجھ ایسے ایشیائی خیال آدمی سے یہ امید رکھنا عبث ہو کہ میں اسکو "فرحت زا" بھی مان لوں گا۔ یہاں جو لوگ انگریزوں کی ہرادا پر جان دیتے ہیں، ان کا مذہب کیا پوچھنا ع ہرچہ آید در دلم غیر تو نیست،

اب حالات سنیئے کارٹ گودام تک ریل ختم ہوتی ہو اور پہاڑوں کا سلسلہ شروع ہوتا ہو۔ کارٹ گودام سے نینی تال ۲۱ میل ہے گر تمام راستہ قدرت الٰہی کی نیرنگی

"عظمت کا مرقع ہے، عرض میں پانچ چھ ہاتھ زمین چھوٹی ہوئی ہے جس پر رستہ چلتا ہے۔ باقی ایک طرف پہاڑ کی وہ ہیبت ناک دیوار ہے جس کی طرف دیکھنے سے نگاہ کانپ جاتی ہے۔ دوسری جانب نہایت عمیق ہولناک غاروں کا سلسلہ ہے اور اگر اس پہاڑ میں سخت سردی نہ ہوتی تو یہ غار بڑے بڑے اژدر اور موذی جانوروں کے دار السلطنۃ ہوتے ..." (مکاتیب شبلی حصہ اول صفحہ ۱۰۹)۔

فصاحت میں جہاں تک الفاظ کا انفرادی تعلق تھا، گزشتہ صفحات میں اس پر کافی بحث ہو چکی لیکن اب دیکھنا یہ ہے کہ بہ حیثیت مجموعی یعنی عبارت کی صورت میں انشا پردازی کی اس خصوصیت کو کہاں تک دخل ہے؟ اس کے لئے علمائے فن نے دو اصول قرار دیے ہیں ایک تو یہ کہ مضامین اور مثلیں اسقدر عامیانہ اور رکیک نہوں کہ ان سے تنفر پیدا ہو بلکہ نہایت دل پسند اور خوشکن ہوں۔ دوسرے یہ کہ تحریر نہ اتنی طول ہو کہ سنتے سنتے جی گھبرا جائے اور نہ اتنی کوتاہ کہ مطلب خبط ہو جائے۔ ان دو خصوصیات کے اندازہ کے لئے کوئی آلہ اور پیمانہ تو ہو نہیں سکتا۔ البتہ صحیح مذاق ہی اس کا بہتر اندازہ کر سکتا ہے۔ مولینا حالی نے "شعر و شاعری" میں جہاں شاعری کی تدریجی رفتار کا ذکر کیا ہے اسکو ایک مثال کے ذریعہ اسطرح واضح کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

"اسکی مثال ایسی سمجھنی چاہیئے کہ ایک باورچی نے ایسے مقام پر جہاں لوگ سالم کچے اور اَلُونے ماش یا مونگ پانی میں بھیگے ہوئے کھاتے تھے۔ انھیں پانی میں ابال کر اور نمک ڈال کر لوگوں کو کھلایا، انھوں نے اپنی معمولی غذا سے اسی کو بہت غنیمت سمجھا۔ دوسرے باورچی نے ماش یا مونگ دلوا کر اور دال کو دھو کر اور مناسب مصالح اور گھی، دال کر کھانا تیار کیا۔ اب تیسرے باورچی کو اگر وہ دال ہی کے پکانے میں اپنی استادی ظاہر کرنی چاہتا ہے، اس کے سوا اور کوئی موقع تنوع پیدا کرنے کا باقی نہیں رہا کہ وہ مقدار مناسب سے زیادہ مرچیں اور کھٹائی اور گھی

ڈال کر لوگوں کو اپنی چٹ پٹی باتوں پر فریفتہ کرے" (مقدمہ شعر و شاعری، صفحہ)

اور پھر اسی کے بعد تین چار مثالیں کے بعد دیگرے اسی مضمون کو واضح کرنے کیلئے بیان کرتے ہیں لیکن ان میں نہ تو آپس میں کوئی خاص فرق ہے اور عامیانہ پن اس قدر کہ ان کے پڑھنے سے طبیعت میں ایک طرح کی بدمزگی پیدا ہوتی ہے لیکن اسی ارتقاء شاعری کے مضمون کو علامہ شبلی صرف ایک مثال سے بیان کرتے ہیں جسے پڑھکر طبیعت سیر ہو جاتی ہے اور جی خوش ہو جاتا ہے۔ انھوں نے شاعری کی رفتار کی مثال ایک قوم کی مادی ترقی سے دی ہے، چنانچہ لکھتے ہیں :-

"مثلاً ابتدا میں رہنے سہنے کے لئے پھوس کے جھونپڑے اور خس پوش کچی دیواریں ہوتی ہیں پھر پختہ عمارتیں بنتی ہیں۔ پھر ان میں مختلف حصے، شہ نشین، دالان، صحنچیاں، بالا خانے قائم کئے جاتے ہیں۔ کمرے فرش فروش سے سجاتے ہیں، جھاڑ فانوس دیوار گیریاں لگاتے ہیں تاہم اعتدال سے آگے نہیں بڑھتے۔ پھر سنگ مرمر کی عمارتیں بننی شروع ہوتی ہیں، جواہرات کی پچی کاری ہوتی ہے، دیواروں پر طلائی نقش و نگار بنتے ہیں، اطلس و کمخواب کا فرش بچھتا ہے، دروازوں پر گوہر نگار پردے آویزاں کرتے ہیں، کافوری شمعیں جلاتے ہیں، یہ ترقی کا آخری دور ہے جس کے بعد تنزل شروع ہوتا ہے اور قوم تباہ ہو جاتی ہے" (شعر العجم حصہ، صفحہ ۱۱) ۔

دوسرے اصول یعنی تحریر نہ طول ہو نہ کوتاہ، اسکی مثال میں سیرۃ النبی کی ابتدائی چند سطریں پیش کیجا سکتی ہیں جنمیں اتنا وسیع مضمون کہ تہذیب اخلاق اور تزکیۂ نفوس کے کیا طریقے ہونے چاہئیں نہایت اختصار اور خوبی کے ساتھ بیان کیا گیا ہے۔ علامہ شبلی لکھتے ہیں کہ :-

"(اس کا) سب سے زیادہ صحیح، سب سے زیادہ کامل، سب سے زیادہ عملی طریقہ یہ ہے کہ نہ زبان سے کچھ کہا جائے، نہ تحریری نقوش پیش کئے جائیں، نہ جبر و زور سے کام لیا جائے

"بلکہ فضائل کا ایک پیکر مجسم سامنے..... آجائے جو خود ہمہ تن آئینۂ عمل ہو، جسکی ہر جنبش لب ہزاروں تصنیفات کا کام دے اور جس کا ایک ایک اشارہ ادامر سلطانی بنجائے۔ دنیا میں آج اخلاق کا جو سرمایہ ہے سب انہی نفوس قدسیہ کا پرتو ہے۔ دیگر اوراساب، صرف ایوان تمدن کے نقش و نگار ہیں" (سیرۃ النبی حصہ ۔۔۔)

اسی مضمون کو اگر پروفیسر آزاد بیان کرتے تو دفتر کا دفتر سیاہ کر ڈالتے۔ زور بیان پیدا کرنے کے لئے آسمان و زمین کے قلابے ملا دیتے لیکن نہ جانے یہ بات بھی پیدا ہوتی یا نہیں جو ان چند سطروں میں ہے۔

بلاغت اور اسکی جزئیات | انشا پردازی میں فصاحت کا جہاں تک تعلق تھا، اس کا بیان ہو چکا، اب اسکی دوسری خصوصیت، بلاغت کا ذکر ہوگا بلاغت کی پہلی شرط یہ ہے کہ اسمیں فصاحت کی تمام خوبیاں موجود ہوں۔ مطلب یہ ہے کہ کوئی تحریر یا الفاظ اسوقت تک بلیغ نہیں کہے جا سکتے جبتک وہ فصیح نہ ہوں۔ لیکن بالخصوص بلاغت کا تعلق الفاظ و تحریر کی معنوی حیثیت سے ہے۔ یعنی جو الفاظ استعمال کئے گئے ہوں وہ معانی کے لحاظ سے بالکل مناسب اور باموقع ہوں۔ نازک اور لطیف مضامین کے لئے ویسے الفاظ ہوں اور شاندار و پرشکوہ واقعات کے لئے ویسے۔ اظہار رنج و غم کے لئے درد آمیز اور غمناک اور مسرت و خوشی کے لئے سرور بخش و فرحت زا الفاظ استعمال کئے گئے ہوں۔ تاکید اور زور پیدا کرنے کے لئے الفاظ موکد اور مکرر ہوں، غرض جس واقعہ یا جس خیال کو انشا پرداز ادا کرنا چاہتا ہے، اس کا صحیح صحیح اور پورا نقشہ آنکھوں کے سامنے مناسب اور موزوں الفاظ کے ذریعہ کھینچ کر رکھ دے۔

بلاغت کا ایک بڑا کمال یہ سمجھا جاتا ہے کہ جس سماں کو انشا پرداز پیش کرنا چاہتا ہے اس کے لئے ایسے الفاظ اور ایسا طریقہ بیان اختیار کرے جس سے معلوم ہو کہ اس حالت کے وقت وہ خود موجود تھا۔ علامہ شبلی نے سیرت میں جہاں رسم قربانی سے

بحث کی ہے، حضرت اسمٰعیل کے واقعہ ذبح کو اس طرح بیان کیا ہے کہ اردو زبان میں بلاغت کی مثال اس سے بہتر ملنی مشکل ہے۔ حضرت ابراہیم اور حضرت اسمٰعیل کی باہمی گفتگو کے بعد وہ لکھتے ہیں کہ:۔

"اب ایک طرف نود سالہ پیر ضعیف ہی جسکو دعا ہائے سحر کے بعد خاندان نبوت کا چشم و چراغ عطا ہوا تھا، جسکو وہ تمام دنیا سے زیادہ محبوب رکھتا تھا۔ اب اسی محبوب کے قتل کیلیے اسکی آستینیں چڑھ چکی ہیں اور ہاتھ میں چھری ہی۔

"دوسری طرف نوجوان بیٹا ہے جس نے بچپن سے آج تک باپ کی محبت آمیز نگاہوں کی گود میں پرورش پائی ہے اور اب باپ ہی کا ہر ہر بات اس کا قاتل نظر آتا ہی۔ ملائکہ قدسی، فضاہائے آسمانی، عالم کائنات یہ حیرت انگیز تماشا دیکھ رہے ہیں اور انگشت بدنداں ہیں کہ دفعتہً عالم قدس سے آواز آتی ہے کہ

يَا إِبْرَاهِيمُ قَدْ صَدَّقْتَ الرُّؤْيَا إِنَّا كَذَٰلِكَ نَجْزِي الْمُحْسِنِينَ ۵ (صٰفٰت)

(ابراہیم تونے خواب سچ کر دکھایا۔ ہم نیک بندوں کو اسی طرح اچھا بدلہ دیا کرتے ہیں)

طفیانِ نازبیں کہ جگر گوشۂ خلیل

درزیر تیغ رفت و شہیدش نمی کنند" (سیرۃ النبی حصہ ا، صفحہ ۱۱۱)

غور کرو اور دیکھو کہ اس مختصر سی عبارت کے پڑھنے کے بعد جو نقشہ آنکھوں کے سامنے آتا ہی، کیا وہ یہ نہیں ہی کہ ایک ضعیف کہن سال شخص دل مضبوط کر کے ایک کمسن مسکین بچے کے گلے پر چھری پھیرنا ہی چاہتا ہی کہ اتنے میں آسمان سے ایک آواز آتی ہے اور وہ اپنے ارادہ سے باز آجاتا ہی۔

بلاغت کی ایک دوسری خوبی جیساکہ بیان کیگئی یہ ہی کہ الفاظ مناسب موقع و محل ہوں یعنی جنگ و جدل کے واقعات بیان کرنے کیلئے شاندار اور پر شکوہ الفاظ لائے جائیں اور حسن و عشق کی داستان کے لئے نازک اور لطیف الفاظ استعمال کئے جائیں

یہی فرق ہے جسے اگر ملحوظ نہ رکھا جائے تو کلام یا تحریر کا اثر کم حصّہ نہیں ہوتا۔ یہ فرق اردو کے دو بڑے انشاپرداز کی تحریروں سے واضح ہو جائیگا۔ علامہ شبلی، ''جنگ قادسیہ'' کا ذکر کرتے ہوے لکھتے ہیں کہ :۔

''سعد نے یہ دیکھکر کہ ہاتھی جس طرف کا رخ کرتے ہیں، دَل کا دَل پھٹ جاتا ہے۔ ضخم و سلم وغیرہ کو جو پارسی تھے اور مسلمان ہوگئے تھے، بلاکر پوچھا کہ اس بلاے سیاہ کا کیا علاج ہے، انھوں نے کہا کہ ان کی سونڈ اور آنکھیں بیکار کر دی جائیں۔ تمام غول میں دو ہاتھی نہایت مہیب اور کوہ پیکر اور گویا کل ہاتھیوں کے سردار تھے۔ ایک ابیض اور دوسرا اجرب کے نام سے مشہور تھا۔ سعد نے قعقاع، عاصم، حمال، ربیل کو بلاکر کہا کہ یہ مہم تمھارے ہاتھ ہے۔ قعقاع نے پہلے کچھ سوار اور پیادے بھیجدیے کہ ہاتھیوں کو نرغہ میں کرلیں پھر خود برچھا ہاتھ میں لیکر ربیل سفید کی طرف بڑھے، عاصم بھی ساتھ تھے، دونوں نے ایکساتھ برچھے مارے کہ آنکھوں میں پیوست ہوگئے۔ ہاتھی جھرجھری لیکر پیچھے ہٹا ساتھ ہی قعقاع کی تلوار پڑی اور سونڈ مستک سے الگ ہوگئی۔ ادھر ربیل و حمال نے اجرب پر حملہ کیا وہ زخم کھاکر بھاگا تو تمام ہاتھی اس کے پیچھے ہوئے اور دم کی دم میں یہ سیاہ بادل بالکل چھٹ گیا اب بہادروں کو حوصلہ افزائی کا موقع ملا اور اس زور کا رن پڑا کہ نعروں کی گونج سے زمین دہل دہل پڑتی تھی''۔ (الفاروق، صفحہ ۹)۔

تحریر بالا میں دیکھو کہ مضمون کی مناسبت سے الفاظ کیسے کیسے آئے ہیں مثلاً ''دل کا دل'' ''بلاے سیاہ''، ''مہیب و کوہ پیکر''، ''مہم'' ''سوار و پیادے''، ''نرغہ''۔ ''سیاہ بادل'' ''رن''۔ اسی طرح ایک جنگ کے حالات پروفیسر آزاد نے ''دربار اکبری'' میں بیان کیے وہ تحریر فرماتے ہیں کہ :۔

''عصر کا وقت تھا کہ اکبری شفقت کا دریا چڑھاؤ پر آیا۔ بہت سے بہادر انتخاب کیے کہ کشتیوں پر سوار ہوکر جائیں اور میدان جنگ کی خبر لائیں۔ قلعہ والوں نے دیکھکر اوپر سے

گولے برسانے شروع کئے اور اٹھارہ کشتیاں ان کے روکنے کو بھیجدیں ۔ بیچ منجدھار میں ٹکر ہوئی ۔ دیکھ گئے تھے کہ بادشاہ ہمارا دیکھ رہا ہے ۔ دریا کے دھوئیں اڑاتے اور آگ برساتے پانی پر سے ہوا کی طرح گزر گئے ، حریف دیکھتے ہی رہ گئے ۔ پھر بھی چڑھاؤ کی چھاتی توڑ کر جانا کچھ آسان کام نہ تھا اور کمک کو غنیم نے دریا میں روکا ہوا تھا ۔ دور ہی سے مقام جنگ پر گولے مارنے شروع کئے ۔ ان کے گولوں نے غنیم کی ہمت کا لنگر توڑ دیا اور کشتیاں ہٹانی شروع کیں اب ایک کے لاح پہلو کاٹ کر چلے ۔ اگرچہ قلعہ سے گولے پڑنے شروع ہوئے مگر یہ بھاگا بھاگ ایک موقع کے گھاٹ پر جا پہنچے اور وہاں سے کشتیوں کو چھوڑا کہ تیر کی طرح سیدھی معرکہ جنگ پر آئیں ۔ بادشاہی فوج کناروں پر اتری ہوئی تھی اور سینہ بسینہ لڑائی ہو رہی تھی ۔ افغانی سرداروں نے کوچہ بندی کر کے بھی لڑائی ڈالی مگر تقدیر سے کون لڑ سکے ۔ خلاصہ یہ کہ حاجی پور فتح ہو گیا اور بادشاہی فوج قلعے پر قابض ہو گئی " (دربار اکبری صفحہ ۲۴۲،۲۴۳)۔

اسی کے آگے فتح پٹنہ کا بیان آتا ہے جو اس سے کچھ کم قصہ نما نہیں ہے ۔ پھر اس کے بعد بنگالہ فتح کرنے کی تیاریاں ہو رہی ہیں اور آیندہ کا نقشۂ جنگ مرتب کیا جاتا ہے ۔ فن جنگ کے جاننے والے سمجھ سکتے ہیں کہ یہ کسقدر سنجیدگی طلب اور غور و فکر کا موقع ہوتا ہے لیکن آزاد کا رنگینی پسند قلم یہاں بھی گل و بلبل کی ہمنوائی سے نہیں چوکتا ۔ چنانچہ وہ لکھتے ہیں کہ :-

" خلوت کے چمن میں حکم ہوا کہ مشورت کی بلبلیں آئیں کہ بنگالہ کے لئے کیا صلاح ہے بعض کا زمزمہ ہوا کہ برسات میں ملک مقبوضہ کا بند و بست ہو، جاڑے کی آمد میں بنگالہ پر خونریزی سے گلزار کا خاکہ ڈالا جائے ۔ بعض نے نغمہ سرائی کی کہ غنیم کو دم نہ لینے دو ۔ اڑ جائیں اور حیری کٹاری ہو جائیں کہ یہی بہار ہے ۔ فتح کے گلچیں اور سلطنت کے باغبان نے کہا کہ ہاں یہی ٹھیک ہے " (ایضاً صفحہ ۲۴۴)۔

بلاغت کی ایک اور بڑی خوبی یہ سمجھی جاتی ہے کہ جب ایک ہی معنی کے متعدد

الفاظ ہوں تو اُن میں سے صرف ایسے الفاظ کا انتخاب کر لیا جائے جو معنی کے لحاظ سے وہاں سب سے زیادہ موزوں ہو۔ ورنہ یوں ادائے مطلب کے لئے تو ہر شخص لکھ لیتا ہے۔ اکثر ایسا بھی ہوتا ہے کہ مطالب کا جو ہجوم ایک لفظ میں ہوتا ہے وہ سطروں میں ادا نہیں ہو سکتا۔ ایک اچھے انشا پرداز کا بڑا وصف یہ بھی ہے کہ انتخاب الفاظ کا صحیح مذاق اسمیں موجود ہو۔ علامہ شبلی کی نقد پسند طبیعت اس نکتہ کو خوب سمجھتی تھی۔ چنانچہ وہ ایک موقع پر شیخ سعدی کے سومنات جانے کے واقعہ کو اسطرح پر لکھتے ہیں کہ:۔

"وہ (شیخ سعدی) سومنات آئے، یہاں ایک عظیم الشان تبخانہ تھا۔ پوجاریوں سے راہ و رسم پیدا کی۔ ایکدن ایک برہمن سے کہا کہ مجھکو سخت حیرت ہے کہ ایک پتھر کو لوگ کیوں پوجتے ہیں، وہ نہایت برہم ہوا اور تمام تبخانہ میں چرچا پھیل گیا۔ سب اُن پر ٹوٹ پڑے اور ایک ہنگامہ برپا ہو گیا۔ انھوں نے کہا کہ بت کے ظاہری حسن و خوبی کا میں بھی معترف ہوں لیکن جاننا چاہتا ہوں کہ معنوی کمال کیا ہے! برہمن نے کہا ہاں یہ پوچھنے کی بات ہے۔ میں نے بھی بہت سفر کئے اور ہزاروں بت دیکھے لیکن جو معجزہ اسمیں ہے کسی میں نہیں، یہ ہر روز صبح کو دعا کے لئے خود ہات اُٹھاتا ہے! چنانچہ دوسرے دن شیخ نے یہ شعبدہ خود اپنی انکھوں سے دیکھا۔ شیخ کو نہایت حسرت ہوئی اور اس فکر میں ہوئے کہ اصل راز کیا ہے؟ تقیۃً بت کے ہاتھ چومے اور بہت خشوع و خضوع ظاہر کیا۔ اور تبخانہ میں اس عقیدت کے ساتھ رہنے لگے جیسے پوجاری مندر میں رہا کرتے ہیں" (شعر العجم حصہ۲، صفحہ۴۰)۔

مندرجہ بالا عبارت میں دیکھو کہ جو خاص الفاظ استعمال ہوئے ہیں، انھیں ان کے مرادفات پر کیا وجہ ترجیح ہے۔ "راہ و رسم" کے ہم معنی اردو میں بہت سے الفاظ ہیں مثلاً 'ملاقات'، 'شناسائی'، 'دوستی'، 'جان پہچان'۔ لیکن ملنے جلنے کی ابتدا کرنے اور آمد و رفت رکھنے کا جو مفہوم "راہ و رسم" میں پایا جاتا ہے وہ انمیں سے

کسی میں نہیں۔ پھر "پتھر" کے ایک لفظ کہہ دینے سے بت کی شان میں حقارت و مذمت کا جو اظہار ہوتا ہے، اسکے لئے پجاریوں کی برہمی اور ہنگامہ آرائی کافی دلیل ہے۔ اسی مفہوم کو حقارت و مذمت کے لفظ کے ساتھ ایک سطر میں ظاہر کرتے تو اسمیں بلاغت کی وہ شان نہ رہتی۔ آگے چلکر ایک لفظ "معجزہ" کا آیا ہے جو عین اقتضائے حال کے مطابق ہے۔ اس ایک پنج حرفی لفظ میں مذہبی تقدس اور جذبات عقیدت کے جو مفہوم داخل ہیں، ان کو برہمن کی زبان سے ادا کرنے کے لئے اردو میں کوئی دوسرا لفظ ہو نہیں سکتا تھا۔ اسی کے بالمقابل سعدی کی زبان سے بت کے اسی فعل کو "شعبدہ" کے لفظ سے ادا کیا ہے۔ ان دونوں الفاظ میں عقیدت اور عدم عقیدت کا جو فرق پایا جاتا ہے، وہ فن بلاغت کا ایک باریک نکتہ ہے جس کا لحاظ شبلی سا نقاد فن ہی کر سکتا تھا۔ "شعبدہ" کے قریب المعنی الفاظ اور بھی بہت سے تھے مثلاً "کرشمہ"، "ماجرا"، "تماشا"، لیکن انمیں سے کسی میں وہ بات نہیں جو شعبدہ کے لفظ میں ہے۔ "چومنا" اور "بوسہ دینا"، ان دونوں لفظوں میں بظاہر کوئی خاص فرق نظر نہیں آتا لیکن اول الذکر سے جس عقیدت و خلوص کا اظہار ہوتا ہے، وہ دوسرے سے اُسقدر نہیں بلکہ اس سے ایک حد تک تکلف و تصنع ٹپکتا ہے اور پھر سب سے بڑی بات یہ کہ ایک خالص اردو کا مفرد لفظ فارسی کے مرکب لفظ پر بہرصورت مرجح تھا۔ بعینہ یہی فرق "پوجنے" اور "پرستش کرنے" کے الفاظ میں بھی ہے جس مذہبی عقیدت اور خلوص کو ظاہر کرنے کیلئے اور الفاظ آئے ہیں، اسی غرض کے لئے "خشوع و خضوع" کا استعمال بھی ہے جسکے بغیر لائے ہوئے کسی مذہبی عقیدت و خلوص کے خیال کا اظہار مکمل نہیں کہا جا سکتا۔

بالکل اسی واقعہ کو مولینا حالی نے بھی اپنی حیات سعدی میں بیان کیا ہے، ذیل میں ان کی عبارت کو پڑھو اور دیکھو کہ کیا انھوں نے بھی بلاغت کی ان خوبیوں کو ملحوظ رکھا ہے؟ وہ لکھتے ہیں کہ :-

"جب میں (سعدی) سومنات پہنچا اور ہزاروں آدمیوں کو دیکھا کہ ایک بت کی پرستش کیلیے دور دور سے وہاں آتے ہیں اور اس سے مرادیں مانگتے ہیں تو مجھکو تعجب ہوا کہ جاندار ایک بیجان چیز کی کس لئے پرستش کرتے ہیں۔ اس بات کی تحقیق کے لیے میں نے ایک برہمن سے ملاقات پیدا کی۔ ایک روز اس سے پوچھا کہ یہ لوگ اس بے حس مورت پر کیوں اسقدر فریفتہ ہیں؟ اور اس کے سامنے مورت کی سخت مذمت اور حقارت کی۔ برہمن نے مندر کے پجاریوں کو خبر کر دی۔ سب نے مجھکو آن کر گھیر لیا۔ میں نے مصلحتاً اسکے سرگروہ سے کہا کہ میں نے کوئی بات بداعتقادی سے نہیں کی۔ میں خود اس مورت پر فریفتہ ہوں لیکن چونکہ میں نووارد ہوں اور اسرار نہانی سے واقف نہیں ہوں، اس لئے اسکی حقیقت دریافت کرنا چاہتا ہوں تاکہ سمجھ بوجھ کر اسکی پوجا کروں۔ اس نے یہ بات پسند کی اور کہا کہ آج رات کو مندر میں رہ تجھکو اصل حقیقت معلوم ہو جائیگی میں رات بھر وہاں رہا۔ صبح کے قریب تمام بستی کے مرد عورت وہاں جمع ہو گئے اور اس مورت نے اپنا ہاتھ اٹھایا جیسے کوئی دعا مانگتا ہے۔ یہ دیکھتے ہی سب جے جے پکارنے لگے۔ جب وہ لوگ چلے گئے تو برہمن نے ہنسکر مجھ سے کہا۔ کیوں اب تو کوئی شبہ باقی نہیں رہا؟ میں ظاہرداری سے رونے لگا اور اپنے سوال پر شرمندگی اور انفعال ظاہر کیا۔ سب برہمنوں نے مجھ پر مہربانی کی اور میرا ہاتھ پکڑ کر اس مورت کے سامنے لے گئے میں نے مورت کے ہاتھ پر بوسہ دیا اور بظاہر چند روز کے لئے برہمن بنگیا۔" (حیات سعدی۔ صفحہ ۳۵ و ۳۶)

ایک اور طریقہ اقوام یا افراد کی اہلیت اور قابلیت کے اندازہ کرنے کا ایک منصفانہ طریقہ یہ ہے کہ یہ دیکھا جائے کہ وہ قوم یا اس کے افراد ابھر کر کہاں تک پہونچے؟ اُن کی بلند پروازی کی آخری حد کہاں تک پہنچتی ہے؟ ان کی ترقی کا پارہ زیادہ سے زیادہ کس درجہ پر آتا ہے اور پھر اس کے بعد باہم مقابلہ کر کے دیکھا جائے کہ ان میں کون سب سے آگے ہے؟ اب تک ہم نے انشاپردازی کی تعریف، اسکی غرض اور اسکی دو بڑی خصوصیات

فصاحت و بلاغت مع ان کی جزئیات سے بحث کی ہے اور اُن کے ثبوت میں ہر چار مصنفین کی تحریروں کے نمونے پیش کئے ہیں جس سے یہ واضح ہوگیا ہوگا کہ علامہ شبلی کا درجہ ان کے دیگر معاصرین انشا پردازوں میں کسقدر بلند ہے اب ہم اس جدید طریقہ کے مطابق ان مصنفین کی تحریروں کے منتخب اور چیدہ نمونے (جو ان کے اختراع فائقہ (ماسٹر پیس) کہے جا سکتے ہیں) پیش کرتے ہیں اور فیصلہ خود ناظرین کے مذاق ادبی اور انصاف پر چھوڑتے ہیں۔ سب سے پہلے آزاد کو لو۔ دربار اکبری میں اکبر کے خصائل و عادات بیان کرنے میں انھوں نے اپنے پورے زور قلم سے وہ کام لیا ہے جسکی نظیر ان کی تمام تصانیف میں کہیں دوسری جگہ نہیں ملسکتی۔ وہ لکھتے ہیں کہ:۔

"اسکی طبیعت کا رنگ ہر عہد میں بدلتا رہا۔ بچپن کی عمر کہ پڑھنے کا وقت تھا، کبوتر ونیں اڑایا۔ ذرا ہوش آیا تو کتے دوڑانے لگے۔ اور بڑے ہوئے گھوڑے بھگانے اور باز اڑانے لگے۔ نوجوانی تاج شاہانی لیکر آئی۔ بیرم خاں وزیر صاحب تدبیر لگگیا تھا۔ یہ سیر و شکار، اور شراب و کباب کے مزے لینے لگے لیکن ہر حال میں مذہبی اعتقاد سے دل نورانی تھا۔ بزرگان دین سے اعتقاد رکھتا تھا۔ نیک نیتی اور خدا ترسی بچپن سے مصاحب تھی۔ طلوع جوانی میں اکر کچھ عرصہ تک ایسے پرہیزگار نماز گزار ہوئے کہ کبھی کبھی خود مسجد میں جھاڑو دیتے تھے اور نماز کے لئے آپ اذان کہتے تھے۔ علم سے بے بہرہ رہے مگر مطالب علمی کی تحقیقات اور اہل علم کی صحبت کا شوق اتنا تھا کہ اس سے زیادہ نہیں ہو سکتا۔ باوجودیکہ ہمیشہ فوج کشی اور مہموں میں گرفتار تھا اور انتظامی کاروبار کا ہجوم تھا، سواری شکاری بھی برابر جاری تھی۔ مگر وہ علم کا عاشق علم و حکمت کے مباحثوں اور کتابوں کے سننے کا وقت نکال ہی لیتا تھا۔ یہ شوق کسی خاص مذہب یا خاص فن میں محبوس نہ تھا۔ کل علوم اور کل فنون اس کے لئے یکساں تھے۔ ۲۰ برس تک دیوانی فوجداری بلکہ سلطنت کے مقدمات بھی علمائے شریعت کے

ہاتھ میں رہے۔ جب دیکھا کہ ان کی بے لیاقتی اور جاہلانہ سینہ زوری ترقی سلطنت میں خلل انداز ہے تو آپ کام کو سنبھالا۔ اس عالم میں جو کچھ کرتا تھا امرائے تجربہ کار اور معاملہ فہم عالموں کی صلاح سے کرتا تھا۔ جب کوئی مہم پیش آتی، یا اثنائے مہم میں کوئی نئی صورت واقع ہوتی یا کوئی انتظامی امر آئین سلطنت میں جاری یا ترمیم ہوتا تو پہلے امرائے دولت کو جمع کرتا، ہر شخص کی رائے کو بے روک سنتا اور سناتا اور اتفاق رائے اور صلاح و اصلاح کے ساتھ عمل درآمد کرتا" (دربار اکبری، صفحہ ۱۲۰ و ۱۲۱)

ڈپٹی نذیر احمد کی تمام تصانیف میں توبۃ النصوح ان کی سب سے بہترین تصنیف سمجھی جاتی ہے، اور اس میں بھی بالخصوص وہ حصہ جہاں انھوں نے اللہ تعالیٰ کی زبان سے بندہ کی توبیخ کی ہے، روز بیان کیلئے مشہور ہے۔ چنانچہ وہ لکھتے ہیں:۔

"اگر تو ہمکو صمیم قلب سے حاضر و ناظر، سمیع و بصیر و قادر جانتا تھا، تو گناہ پر تجھکو کیونکر جسارت ہوتی تھی؟ تو بھولکر کبھی بھاڑ میں تو نہیں کودا؟ کبھی کھولتے پانی میں تو تو نے ہاتھ نہیں ڈالا؟ کبھی جلتی ہوئی آگ کو تو نے مٹھی میں نہیں لے لیا؟ مگر تو گناہوں کا نہایت بے باکی سے مرتکب ہوتا تھا۔ ضرور ہے کہ یا تو تجھکو یقین نہ تھا کہ گناہ کی سزا آتش دوزخ ہے۔ یا اگر یقین تھا تو تو اسکو دنیا کی آگ سے کمتر سمجھتا تھا۔ دنیا میں جو کچھ رفاہ، جو کچھ عیش و آرام ہم نے تجھکو بے استحقاق صرف اپنی مہربانی سے عطا کیا تھا، کیا تو نے اسکو ہمیشہ اپنی حسن تدبیر کی طرف منسوب نہیں کیا؟ جو تکلیف تجھکو دنیا میں پہنچی اگرچہ تو اپنی ہی ہاتھ سے اپنے پاؤں میں کلھاڑی مارا کرتا تھا، مگر کیا تو اسکا الزام ہماری ذات مستجمع الصفات پر نہیں لگاتا تھا۔ اے احسان فراموش! ہزاروں لاکھوں احسان میں نے تجھپر کئے اور تجھ سے اتنا نہ ہو سکا کہ بھلا منہ سے اقرار تو کرتا۔ اے ناشکر، بے شمار نعمتیں میں نے تجھ کو عطا فرمائیں مگر تجھ پر اتنا بھی اثر نہ ہوا کہ کبھی زبان پر تو لاتا۔ جتنا میں نے تیرے ساتھ سلوک کیا، اتنا ہی تو میری مخالفت پر کمر بستہ رہا، جتنی میں

تیری رعایت کرتا رہا، اسیقدر تو گستاخ اور شریر ہوتا گیا۔ اس حیات بے ثبات پر تجھ کو اتنا گھمنڈ ہو گیا تھا کہ تو اپنے تئیں ہماری خدائی سے باہر سے چلا تھا۔ اس چند روزہ زندگی پر تو اسقدر مغرور تھا کہ دائرہ عبودیت سے اپنے تئیں خارج کرنا چاہتا تھا" (توبۃ النصوح، صفحہ ۱۹۱)

مولینا حالی کی تصانیف میں تو اسقدر بلند اور پرزور عبارت ملنی مشکل تھی، البتہ ان کے متفرق مضامین میں "زبان گویا" کے عنوان سے ایک خطیبانہ پرزور مضمون ملگیا ہو جس کا ابتدائی حصہ ملاحظہ ہو:۔

"اے میری بلبل ہزار داستان! اے میری طوطی شیوا بیان! اے میری قاصد، اے میری ترجمان! اے میری وکیل، اے میری زبان! سچ بتا تو کس درخت کی ٹہنی اور کس چمن کا پودا ہو؟ کہ تیرے ہر پھول کا رنگ جدا اور تیرے ہر پھل میں ایک نیا مزا ہے۔ کبھی تو ایک ساحر فسوں ساز ہے جس کے سحر کا رُد، نہ جادو کا اتار۔ کبھی تو ایک افعی جاں گداز ہو جس کے زہر کی دارد، نہ کاٹے کا منتر۔ تو وہی زبان ہے کہ بچپن میں کبھی اپنے ادھورے بولوں سے غیروں کا جی لبھاتی تھی اور کبھی اپنی شوخیوں سے ماں باپ کا دل دکھاتی تھی۔ تو وہی زبان ہے کہ جوانی میں کہیں اپنی نرمی سے دلوں کا شکار کرتی تھی اور کہیں اپنی تیزی سے سینوں کو فگار کرتی تھی

"اے میری زبان! دشمن کو دوست بنانا اور دوست کو دشمن کر دکھانا تیرا ایک کھیل ہے جس کے تماشے سیکڑوں دیکھے اور ہزاروں دیکھنے باقی ہیں۔ ... اے میری بنی بات کی بگاڑنے والی! اور اے میرے بگڑے کاموں کو سنوارنے والی! روتے کو ہنسانا اور ہنستے کو رلانا، روٹھے کو منانا اور بگڑے کو بنانا، نہیں معلوم تو نے کہاں سیکھا؟ اور کس سے سیکھا؟ کہیں تیری باتیں بس کی گانٹھیں ہیں اور کہیں تیرے بول شربت کے گھونٹ ہیں۔ کہیں تو شہد ہے اور کہیں حنظل، کہیں تو زہر ہے

اور کہیں تریاق" (مضامین حالی، صفحہ ۲)

آزاد، نذیر احمد اور حالی کی انشاپردازی کے اختراعات فائقہ (ماسٹر پیسز) آپ نے دیکھ لئے، جو عام طور پر اردو کے انتخابات میں داخل ہیں، اب ایک میری طرف سے شبلی کی انشاپردازی کا نمونہ بھی ملاحظہ ہو، "ظہور قدسی" کے عنوان سے آنحضرت صلعم کی ولادت کا واقعہ وہ اس طرح لکھتے ہیں :۔

"چمنستان دہر میں بار ہا روح پرور بہاریں آچکی ہیں، چرخ نادرۂ کار نے کبھی کبھی بزم عالم اس سروسامان سے سجائی ہے کہ نگاہیں خیرہ ہو کر رہ گئی ہیں۔

"لیکن آج کی تاریخ وہ تاریخ ہے جس کے انتظار میں پیر کہن سال دہر نے کروڑوں برس صرف کر دیے، سیارگان فلک اسی دن کے شوق میں ازل سے چشم براہ تھے، چرخ کہن مدتہائے دراز سے اسی صبح جاں نواز کے لئے لیل ونہار کی کروٹیں بدل رہا تھا، کارکنان قضا وقدر کی بزم آرائیاں، عناصر کی جدت طرازیاں، ماہ و خورشید کی فروغ انگیزیاں، ابر و باد کی تردستیاں، عالم قدس کے انفاس پاک، توحید ابراہیم، جمال یوسف، معجز طرازی موسیٰ، جاں نوازی مسیح، سب اسی لئے تھے کہ یہ متاعہائے گراں ارزش شاہنشاہ کونین کے دربار میں کام آئیں گے۔

"آج کی صبح وہی صبح جاں نواز، وہی ساعت ہمایوں، وہی دور فرخ فال ہے۔ ارباب سیر اپنے محدود پیرایہ زبان میں لکھتے ہیں کہ آج کی رات ایوان کسریٰ کے ۱۴ کنگرے گر گئے، آتشکدۂ فارس بجھ گیا، دریائے ساوہ خشک ہو گیا، لیکن سچ یہ ہے کہ ایوان کسریٰ نہیں، بلکہ شان عجم، شوکت روم، اوج چین کے قصرہائے فلک بوس گر پڑے۔ آتش فارس نہیں بلکہ جحیم شر، آتشکدۂ کفر، آذرکدۂ گمرہی سرد ہو کر رہ گئے، صنم خانوں میں خاک اڑنے لگی، بتکدے خاک میں مل گئے، شیرازۂ مجوسیت بکھر گیا، نصرانیت کے اوراق خزاں دیدہ ایک ایک

کرکے جھڑ گئے۔ توحید کا غلغلہ اٹھا، چمنستانِ سعادت میں بہار آگئی، آفتاب ہدایت کی شعاعیں ہر طرف پھیل گئیں، اخلاق انسانی کا آئینہ پرتوِ قدس سے چمک اٹھا۔

"یعنی یتیم عبداللہ، جگر گوشۂ آمنہ، شاہِ حرم، حکمرانِ عرب، فرماں روائے عالم، شہنشاہِ کونین، عالمِ قدس سے عالمِ امکان میں تشریف فرمائے عزت و اجلال ہوا، اللّٰھم صلِّ علیہ وعلےٰ آلہٖ واصحابہٖ وسلّم۔" (سیرۃ النبی حصہ اوّل صفحہ ۱۲۲ و ۱۲۳)

(۲)

گزشتہ صفحات میں، جہاں تک سوال کے پہلے جزو کا تعلق تھا، ہم نے انشاپردازی اور اسکی خصوصیات سے کسیقدر تفصیل کے ساتھ بحث کی ہے، تاکہ انشاپردازی کا ایک صحیح مفہوم اور معیار قایم ہو جائے۔ اب تک اردو کے سب سے بڑے انشاپرداز کی تعیئن میں جو غلطی ہوتی چلی آئی ہے، اُس کا سبب یہی تھا کہ انشاپردازی کا کوئی صاف وصریح مفہوم پیشِ نظر نہیں ہوتا تھا۔ اسی غرض سے ہم نے ان مصنفین کی تحریروں سے مختلف نوعیتوں کے نمونے بھی دیے ہیں، جن سے یہ اندازہ ہوگیا ہوگا کہ علامہ شبلی کا درجہ اپنے معاصرین انشاپردازوں میں کسقدر بلند ہے! سوال کا دوسرا جزو اسقدر پیچیدہ اور بحث طلب نہیں ہے۔ کم و بیش ہر شخص سمجھتا ہے کہ اردو کے ذخیرۂ علمی میں سب سے بڑا اور بیش بہا حصہ علامہ شبلی کا ہے، تاہم ان میں سے ہر ایک کی تصانیف پر ایک سرسری نظر ڈال لینے سے اس خیال کی مزید تصدیق ہو جائیگی۔

اردو کا سرمایہ علمی ہم جیسا کہ اوپر لکھ آئے ہیں، اردو ادب (یہاں ادب سے مراد

ِرف نثر کا ذخیرہ ہے) کی ترکیب اصلی انہی چار عناصر سے ہے، یعنی آزاد، نذیر احمد،
ِلی و شبلی، یعنی اردو کا تمام تر ذخیرۂ علمی انھیں چار مصنفین کی کوششوں کا اندوختہ
ہے، باقی دوسرے مصنفین ایک حیثیتِ ثانوی رکھتے ہیں۔ لیکن دیکھنا یہ ہے کہ انمیں سے
ہر ایک کا کسقدر حصہ ہے اور کس قیمت کا ہے پروفیسر آزاد سے پہلے جنھیں ان عناصر اربعہ
میں اوّلیت کا فخر حاصل ہے اردو ادب کا سرمایہ بہت ہی مختصر اور معمولی تھا۔ پرانے
خیال کے لوگ زیادہ تر فارسی و عربی کی تحصیل اپنی تعلیم کا مقصد سمجھتے تھے، کوئی کچھ
لکھنا چاہتا، تو انھی زبانوں میں لکھتا۔ ان میں بھی فارسی کو زیادہ رواج حاصل تھا،
چونکہ پہلے حکومت وقت کی زبان رہ چکی تھی، اس کا رعب اب بھی لوگوں کے دلوں پہ
باقی تھا۔ علاوہ اس کے اسلامی اور دینی علوم بھی انھیں دونو زبانوں میں تھے۔
اگر کسی نے بڑی ہمت کی تو تھوڑی بہت انگریزی سیکھ لی، کیونکہ بعد میں یہی زبان ذریعہ
معاش ہوگئی۔ اردو کی طرف کسی نے اگر بڑی توجہ کی تو چند غزلیں اور قصیدے
لکھ لئے یا فارسی و عربی سے بعض افسانے اور قصے ترجمہ کرکے رکھ دیے۔ بعد میں کچھ
انگریزی کے ناولوں اور افسانوں کے بھی ترجمے ہوئے۔

تصانیف آزاد: غرض یہ کل سرمایہ تھا جو پروفیسر آزاد کو وراثت میں ملا، اسمیں سے
بھی شاعری کے جزو کو نکالدیجئے تو یہ ترکہ اَور بھی قلیل اور حقیر رہجاتا ہے۔ آزاد نے
اردو کی اس بے مایگی کو محسوس کیا اور لٹریچر کی ہر صنف میں اضافہ کرنے کی کوشش
کی۔ یہ اسی کا نتیجہ ہے کہ اج ان کے قلم کی مختلف اصناف ادب میں تحریری
یادگاریں باقی ہیں۔ مثلاً ادب میں افسانے، قصے اور ڈرامے ہیں۔ تاریخ میں زبان
اور لٹریچر کی تاریخ اور اشخاص کے سوانح زندگی بھی ہیں۔ علوم میں علم الانسہ
ان کا سب سے نمایاں کارنامہ ہے۔

ان کی ایک اہم تصنیف جو شاعرانہ خیال آرائیوں اور ادبی گلکاریوں کی

وجہ سے آزاد کا سب سے بڑا کارنامہ سمجھی جاتی ہے، "نیرنگ خیال" ہے۔ انگریزی زبان میں لڑیچر کی ایک صنف 'مائی تھالوجی' ہے جسمیں انسانی جذبات اور مذہبی معتقدات مشخص طور پر پیش کئے گئے ہیں۔ انسان کا تخیل اشکال وصور کو جلد گرفت کر سکتا ہے مثلاً غصہ اور رحم کو ان کے خصائص طبعی کی بنا پر ویسی ہی انسانی شکل میں پیش کیا جائے تو پڑھنے والے پر اس کا صحیح اور زیادہ اثر پڑتا ہے۔ انگریزی میں اسی طرز بیان میں ایک مشہور کتاب "ترقی زائر" (پلگرمس پروگرس) کے نام سے ہے جسمیں عیسوی مذہب کے عقاید اور محاسن اخلاق کو مادی صورتوں میں پیش کیا گیا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ انجیل کے بعد جس کتاب نے مسیحیت کے قبول کرنے کی سب سے زیادہ ترغیب لوگوں کے دلوں میں پیدا کی، وہ یہ "ترقی زائر" ہے۔ اس کتاب کے مقبول عام ہونے کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ اس کا ترجمہ دنیا کی تقریباً ۸۰ زبانوں میں ہو چکا ہے۔ اسی طرز بیان کو سامنے رکھکر آزاد نے بھی "نیرنگ خیال" لکھی ہے چنانچہ وہ خود کہتے ہیں کہ "یہ چند مضمون جو لکھے ہیں، نہیں کہہ سکتا کہ ترجمہ کئے ہیں ہاں جو کچھ کانوں نے سنا اور فکر مناسب نے زبان کے حوالے کیا، ہاتھوں نے اسے لکھ دیا" غرض اصل کتاب میں انسان کے اوصاف وخصایل، اس کے جذبات خواہ نیک ہوں یا بد، مشخص طور پر دکھائے گئے ہیں۔ مثلاً سچ، عدل، رحم، شہرت طلبی، غصہ، خود پسندی وغیرہ اپنی اپنی خصوصیات کے مطابق مرد یا عورت کی شکل میں ظاہر کیگئی ہیں۔ اخیر میں عرب، ایران وہندوستان کے مشہور ومعروف شعرا وسلاطین کی بھی جیتی جاگتی تصویریں الفاظ کا جامہ پہنا کر پیش کی گئی ہیں۔ لیکن باوجود ان سب کے "نیرنگ خیال" کو وہ قبول عام کہاں حاصل ہے جو "ترقی زائر" کو ہوئی ہے۔ پروفیسر آزاد کی تاریخی تصانیف میں "دربار اکبری" سب سے مشہور کتاب ہے۔ اس میں اکبر اور اس کے دربار کے بڑے بڑے امرا مثلاً بیرم خاں،

بیربل، فیضی، ابوالفضل، ٹوڈرمل وغیرہ کے حالات درج ہیں۔ اردو زبان میں اکبری عہد حکومت کے واقعات اس قدر تفصیل کے ساتھ ملنے مشکل ہیں۔ جہاں تک وقایع نگاری کا تعلق ہے یہ کتاب چھوٹے بڑے تمام واقعات کا احاطہ کئے ہوئے ہے لیکن واقعہ نگاری اور تاریخ نویسی میں بہت بڑا فرق ہے۔ جو اس تصنیف میں صاف نظر آتا ہے۔ اکبر اور اس کا عہد حکومت اس کے امرا اور رعایا میں کچھ ایسا مقبول ہا ہے کہ اس کے متعلق بہت سے مصنوعی مبالغہ آمیز قصوں کا رواج پا جانا کچھ بھی خلاف امید نہیں۔ اکبر کی حکمت عملی (پالیسی) ایسی مرنجاں و مرنج کی رہی ہے اور دیگر مذاہب کے ساتھ اس کا ایسا بے تعصبانہ اور روادارانہ رویہ رہا ہے، جو سترہویں صدی عیسوی میں ایک حیرت انگیز واقعہ ہے، بالخصوص ہندو مسلمانوں کے ساتھ اس کا یکساں مساویانہ سلوک اس زمانہ میں ایک افسانہ سا معلوم ہوتا ہے لیکن اسی کے ساتھ خود اس کے اسلام میں شبہ کرنا بھی کچھ کم تعجب خیز نہیں۔ یہ چند مہتم بالشان امور تھے جو بہت زیادہ نقد و بحث کے قابل تھے اور جکے محض ضمنی تذکرہ کر دینے سے اکبر کا سوانح نگار کسی طرح عہدہ برآ نہیں ہو سکتا۔ علاوہ اس کے عہد اکبری کی بعض زراعتی و اقتصادی اصلاحات بھی جن پر ہمارا موجودہ نظام زراعتی بہت حد تک مبنی بتایا جاتا ہے، کسی طرح نظر انداز کر دینے کے قابل نہ تھیں۔ اکبر کے زمانہ حکومت میں بعض علوم و ادب مثلاً ہیئت و نجوم اور فارسی شاعری کی ترقی اور اکثر فنون لطیفہ مثلاً مصوری نقاشی و موسیقی وغیرہ کی رفتار بھی بہ تفصیل ذکر کئے جانے کے لائق تھیں۔ تاریخ کا اقتضا یہ تھا کہ دیگر سلاطین مغلیہ سے جو بعد میں تخت دہلی پر بیٹھے اور غیر ملکی معاصر حکمرانوں سے (مثلاً ملکہ الزبتھ جو تقریباً اسی زمانہ میں انگلستان پر حکومت کرتی تھی) اکبر اور اسکی طرز حکومت کا مقابلہ و موازنہ کیا جاتا، تو آج دربار اکبری تاریخی حیثیت سے نہ صرف اردو بلکہ دوسری زبانوں میں بھی ایک بلند پایہ تصنیف سمجھی جاتی۔

اشخاص کی تاریخ لکھنے کے علاوہ پروفیسر آزاد نے زبانوں کی تاریخ بھی لکھی ہے
اور نہ صرف تاریخ بلکہ ایک حد تک فلسفۂ زبان کی طرف بھی توجہ کی ہے یعنی ایک زبان کا
دوسری زبانوں سے تعلق اور الفاظ کی اصل اور معنی کے تغیرات کے اسباب سے بھی
بحث کی ہے۔ یہی علم آج مدوّن صورت میں علم الالسنہ یا انگریزی میں "فیلالوجی"
کے نام سے موسوم ہے۔ اس کا شوق انھیں اہل یورپ کی غیر زبانوں میں تحقیق و تفتیش
کو دیکھکر پیدا ہوا۔ چنانچہ انھوں نے سب سے پہلے فارسی زبان کی تاریخ و تحقیق کی
طرف توجہ کی۔ اور اس کے لئے ایران اور بخارا وغیرہ کی دشوار گزار مسافت بھی
اختیار کی۔ ان ممالک میں جاکر انھوں نے وہاں کے رسم و رواج لوگوں کے عادات
واطوار کا مطالعہ کیا۔ نیز ژند، پہلوی اور دری زبانوں کے متعلق بھی بہت کچھ
معلومات حاصل کئے۔ ہندوستان رہکر سنسکرت زبان اور یہاں کے رسوم و عادات سے
کم و بیش واقفیت حاصل کی غرض ان کی اس علمی و لسانی تحقیق و کاوش کا اصل نظیر
"سخندان فارس" ہے۔ جس میں زبان فارسی کی تاریخ اور اسکی عہد بعہد کی
ترقیوں سے بحث کی گئی ہے۔ علاوہ اس کے مشہور شعرا و مصنفین کے کلام کے نمونے
بھی دکھایے گئے ہیں، ایرانیوں کے رسوم و رواج کا بھی ذکر کیا گیا ہے۔ اسی سلسلہ کی
دوسری کتاب "نگارستان فارس" ہے جسمیں رودکی سے لیکر واقف بٹالوی تک کے
مشاہیر شعرا کی سوانحعمریاں درج ہیں۔ یہ سب کچھ سہی لیکن زمانہ کی تیز رفتاری
کا ساتھ کون دیسکے؟ پروفیسر آزاد نے جہاں زبانوں کی تقسیم و تفریع کی ہے وہ علم السنہ
کی موجودہ ترقیوں کے لحاظ سے ایک ابتدائی معلومات کی حیثیت سے زیادہ وقعت
نہیں رکھتی۔ علاوہ اس کے یہ علم چونکہ واقعات نہیں بلکہ زیادہ تر قیاسات عقلی پر
مبنی ہے اس لئے اس کے نظریے دن بدن بدلتے رہتے ہیں۔ اس بنا پر آج سے
۴۰، ۵۰ برس پہلے کا کوئی نظریہ کیونکر قابل قبول ہوسکتا ہے۔ یوں الفاظ کی

باہمی مشابہت و مناسبت بتانی خواہ صُوری ہو یا معنوی، ایک دلچسپ مشغلہ ہے اور پر لطف مطالعہ بھی۔ اس نوعیت کی ایک دوسری تصنیف "آبحیات" ہے جو مصنف کی انشا پردازی، تاریخی و لسانی تحقیق، اور ادبی خصوصیت کا مجموعہ سمجھی جاتی ہے اس میں شبہ نہیں کہ اردو زبان کی ابتدائی تاریخ، اسکی عہد بہ عہد کی ترقیوں پر اردو میں اس سے پیشتر کوئی قابل ذکر کتاب موجود نہ تھی۔ اسی سلسلہ میں آزاد کا ترتیب دیا ہوا "دیوان ذوق" بھی آجاتا ہے۔ گو ذوق کے حالات اور ان کی شاعری کا تذکرہ "آب حیات" میں بھی آچکا ہے لیکن استاد ہونیکی حیثیت سے آزاد کو جو عقیدت ان کے ساتھ تھی وہ ایک مستقل تصنیف کی متقاضی ہوئی۔ لیکن ان تمام تنقیدی تصانیف میں بجائے اس کے کہ کہیں فلسفۂ شاعری اور اس کی خصوصیات سے بحث کیجاتی، صرف نمونۂ کلام اور شاعری کی تدریجی ترقی کے دکھانے پر اکتفا کیا گیا۔ کم از کم دیوان ذوق ہی میں اس ضرورت کو ملحوظ رکھا جاتا اور ذوق و غالب کی شاعری کا تفصیل کے ساتھ باہم مقابلہ و موازنہ کیا جاتا اور ہردو کی خصوصیات شاعری بیان کرکے ایک کو دوسرے پر ترجیح دیجاتی تو آج اردو لٹریچر میں ایک بیش بہا اضافہ ہوتا۔ لیکن ذوق کی بعض غیر مطبوعہ غزلوں کو شایع کر دینا کافی سمجھا گیا جو کسی طرح ہماری امیدوں کے مطابق نہیں۔

غرض باوجود ان سب کے پروفیسر محمد حسین آزاد نے اردو نثر کے دامن کو جسمیں اب تک قصے و حکایات کے سوا کچھ نہ تھا، تاریخ و ادب کے جواہر ریزوں سے بھر دیا اور سچ پوچھئے تو اردو لٹریچر کا سنگ بنیاد انھی نے رکھا اور اس حیثیت سے انھیں ادب اردو کا بانی کہا جائے تو بیجا نہیں۔

تصانیف نذیر احمد ڈپٹی نذیر احمد کی تمام تصنیفات پر نظر ڈالنے سے ایک عجیب اجتماع ضدین نظر آتا ہے۔ ایک طرف تو ان کے ناولوں اور افسانوں کا مجموعہ ہے

دوسری طرف ان کی مذہبی سنجیدہ تصانیف ہیں ۔ اصل یہ ہے کہ اعلیٰ درجہ کی عربی قابلیت اور قرآن، حدیث و فقہ پر عبور کلی ہونے کا اقتضا تو یہ تھا کہ ان کے قلم سے انہی مذہبی علوم پر کتابیں نکلتیں لیکن بعض خارجی اثرات کی کشش نے انھیں اس جادۂ مستقیم سے ہٹا دیا اور ناولوں اور قصوں کی یہ طویل فہرست جو ان کے مصنفات میں نظر آتی ہے، اسی بے راہ روی کا نتیجہ ہے ۔ ان کے تصنیفی شغلہ کا آغاز ایک عجیب طرح سے ہوا جو خود انہی کی زبان سے سننے کے قابل ہے ۔ اپنے "درباری لیکچر" میں وہ ایک جگہ لکھتے ہیں کہ "میں اپنے بچوں کے لئے ایسی کتابیں چاہتا تھا کہ وہ ان کو چاؤ سے پڑھیں ۔ ڈھونڈھا، تلاش کیا، کہیں پتہ نہ لگا ۔ ناچار ۔ میں نے ہر ایک کے مناسب حال آپ کتابیں بنانی شروع کیں ۔ بڑی لڑکی کیلئے "مراۃ العروس"، چھوٹی کے لئے "منتخب الحکایات"، بشیر کے لئے "چند پند"۔ یہ نہیں کیا کہ کتابیں سالم لکھ لیں تب پڑھانی شروع کیں ۔ نہیں بلکہ ہر ایک کتاب کے چار، چار پانچ پانچ صفحے لکھکر ہر ایک کے حوالے کر دیے ۔ مگر وہ بچوں کو ایسی بھائیں کہ جسکو پاؤ صفحے کے پڑھنے کی طاقت تھی وہ آدھے صفحے کے لئے اور جسکو ایک صفحے کی استعداد تھی وہ ورق کے لئے مستعجل تھا ۔ جب دیکھو ایک نہ ایک متقاضی، کہ میرا سبق کم رہ گیا ہے ۔ میں اسی وقت قلم برداشتہ لکھ دیا کرتا ۔ یوں کتابوں کا پہلا گھان پورا ہوا"۔ لیکن ان قلمی مسودات کو کتابی صورت میں لانے کا ڈپٹی صاحب کو کوئی خیال بھی نہ تھا ۔ انھوں نے تو یہ قصے اور افسانے اپنے بچوں کی خانگی تعلیم کی غرض سے لکھے تھے انھیں کیا معلوم تھا کہ آیندہ نسلیں ان قصے کہانیوں کو میری تصنیفات کی سر فہرست قرار دینگی بہرحال ان قلمی مسودات کا مطبوعہ صورت میں آنے کا واقعہ پہلے سے بھی زیادہ دلچسپ ہے ۔ وہ لکھتے ہیں کہ ایکدن انکے چھوٹے لڑکے بشیر کی کہین صاحب ڈائرکٹر سررشتہ تعلیم سے اتفاقیہ ملاقات ہو گئی ڈاکٹر صاحب نے بشیر سے پوچھا کہ آجکل تم کیا پڑھتے ہو؟ بشیر نے جو ان کتابوں کا نام لیا جنھے

تعجب سے کہا کہ ان ناموں کی کتابیں کوئی اردو میں نہیں ہیں۔ اس پر بشیر نے جواب دیا کہ یہ کتابیں تو ابّا نے میرے اور آپا کے لئے لکھدی ہیں۔ پھر کپتان صاحب نے کہا کہ اچھا دوڑ کر انھیں لے آؤ۔ بشیر دوڑا ہوا گھر گیا اور چند بند' مراۃ العروس اور منتخب الحکایات کے قلمی نسخے اٹھا لایا۔ ڈائرکٹر صاحب نے جب انھیں دیکھا تو مراۃ العروس کو بہت پسند فرمایا اور گورنمنٹ سے اس پر انعام دیے جانے کی سفارش کی۔ چنانچہ ڈپٹی صاحب کو اس کتاب پر ایکہزار روپیہ نقد اور ایک قیمتی ٹائم پیس انعام میں ملا۔ اس سے بڑھکر یہ کہ ان کا نام گورنمنٹ گزٹ میں نکل گیا۔ پھر کیا تھا' بقول خود انھوں نے "تصنیف کا ڈربہ کھولدیا......مراۃ العروس کے بعد بیڈ فورڈ کی طرح ایک ناول "بنات النعش" لڑکیوں کے لئے لکھا اور اسکو بھی بطمع انعام سرکار میں چلتا کیا"۔

غرض ڈپٹی صاحب کے تصانیف کی ابتدا اپنے بچے بچیوں کی خانگی تعلیم دینے کے خیال سے ہوئی' اور سرکاری انعامات نے اسمیں ان کی مزید ہمت افزائی کی۔ ان کی تمام ابتدائی تصانیف میں ان دونو میں سے کسی نہ کسی ایک جذبہ کی کار فرمائی ہوتی تھی۔ چنانچہ انھوں نے صرف ونحو میں دو رسالے اپنے لڑکے کے لئے لکھے جن کا نام مَا یُغْنِیْکَ فی الصرف اور مَا یُغْنِیْکَ فِی النَّحْوْ رکھا۔ ان رسالوں میں انھوں نے قدیم طریقۂ درس کے خلاف کسیقدر جدت سے کام لیا تھا جسے بدقسمتی سے اس زمانہ کے صرفی ونحوی مولویوں نے پسند نہ کیا اور اس پر انھیں کچھ انعام بھی نہ ملا۔ اس کے بعد انھوں نے سرکاری اعلان پر منطق میں ایک رسالہ "مبادی الحکمۃ" لکھا جو مقبول ہوا اور پانسو انعام کا مستحق قرار پایا۔ اسی زمانہ میں گورنمنٹ کی طرف سے علم ہیئت کی ایک انگریزی کتاب "گولمنز ہون" کے ترجمہ کا اشتہار مع ایکہزار انعام کے شایع ہوا تھا۔ ڈپٹی صاحب کے بعض دوستوں نے انھیں اس کام پر آمادہ کیا

چنانچہ بڑے اصرار کے بعد انھوں نے اس کتاب کا ترجمہ کرنا شروع کیا اور پورا کرکے گورنمنٹ ہند کو بھیجدیا۔ ایک عرصہ کی ردوکد کے بعد سرکار سے وہ ترجمہ مع ایکہزار انعام کے واپس ملا۔ (نہ جانے اس کے طبع ہونے کی بھی نوبت آئی یا نہیں۔) ان متفرق چھوٹی چھوٹی تصنیفات کے علاوہ ڈپٹی صاحب کے قلم سے سرکاری روئداد دوں وغیرہ کے ترجمے بھی وقتاً نوقتاً نکلتے رہے ہیں۔ بیان کیا جاتا ہو کہ تعزیرات ہند کے اردو ترجمہ میں بھی ڈپٹی صاحب کا بہت بڑا ہاتھ ہے۔

ڈپٹی صاحب کے تصنیفی مشغلہ کی ابتدا خواہ کسی طرح پر ہوئی ہو لیکن افسانہ نویسی ان کا طبعی رنگ معلوم ہوتا ہے۔ ان کے تمام ناولوں میں "توبۃ النصوح" کو غالباً سب سے زیادہ قبولیت حاصل ہوئی ہے۔ اس کے اقتباسات نہ صرف سرکاری مدارس میں پڑھائے جاتے ہیں، بلکہ پوری کتاب نو وارد انگریزی حکام کے نصاب میں داخل ہے۔ ہر انگریز مبتدی کے لئے جو اردو سیکھنا چاہتا ہے اس کتاب کا پڑھنا ضروری سمجھا جاتا ہے۔ قصے میں چونکہ صوم و صلوٰۃ کی تاکید، خیرات و زکوٰۃ کی ہدایت اور دیگر اسلامی عقاید مثلاً جنت و دوزخ جزا و سزا وغیرہ کا ذکر ہے اس بنا پر شروع شروع میں گورنمنٹ نے اپنی مذہبی غیر جانبدارانہ پالیسی کے منافی سمجھکر اسے رواج دینا مناسب نہ سمجھا تھا لیکن پھر بعد میں کوئی خاص نقصان نہ دیکھکر اسکی اشاعت کی اجازت دیدی اور اسکی وہ قدر افزائی کی کہ مسلم غیر مسلم ہر طبقہ سے اسکی مانگ آنی شروع ہوگئی۔ "ترقی نداپر" (پلگرمس پروگرس) جس کا "نیرنگ خیال" کے سلسلہ میں اوپر ذکر ہوچکا ہو، عام مضمون کے لحاظ سے "توبۃ النصوح" سے ایک حد تک بہت ملتی جلتی ہو لیکن اس میں اسلام کے ان بنیادی اور عالمگیر عقاید و مسایل کی تصریح کرنیکی کوئی کوشش نہیں کیگئی ہے جس سے یہ کتاب بے تعصب غیر مسلموں کے دلوں کو اپیل کر سکتی۔ ممکن ہو ایک محدود طبقہ میں اصلاح اخلاق اور پابندی مذہب میں

کسی حد تک ممد ثابت ہوئی ہو۔

"مراۃ العروس" جیسا کہ اوپر بیان کیا گیا، ڈپٹی صاحب نے اپنی بڑی لڑکی کے پڑھانے کے لئے لکھنا شروع کیا تھا لیکن در اصل اسکی تہ میں ایک اور مقصد نظر آتا ہے۔ یہ وہ زمانہ تھا جبکہ سلطنت مغلیہ کے چراغ گل ہو جانے سے کتنے اسلامی گھرانے بے چراغ ہو رہے تھے۔ باہر کی حالت تو جیسی کچھ تھی ظاہر تھی، گھر کے اندر اس سے بھی بد تر کیفیت تھی۔ عورتوں میں نہ کوئی تعلیم و تربیت، نہ کچھ مذہبی و اخلاقی روح اور نہ زندگی کے کوئی آثار نظر آتے تھے۔ لے دے کے کچھ پرانے رسم و رواج باقی رہ گئے تھے ڈپٹی صاحب نے اس حقیقت کو محسوس کیا کہ بچہ کی تعلیم و تربیت کی پہلی معلم ماں ہے، اس کا پہلا مکتب گھر کی چہار دیواری ہے اس لئے مردوں کی تعلیم و تربیت سے مقدم اور ضروری عورتوں کی اصلاح و تربیت ہے چنانچہ اس غرض کے لئے انھوں نے متعدد قصے اور افسانے لکھے تاکہ انھیں پڑھکر عورتیں اپنی حالت سدھاریں اور ان کی گودوں سے اچھے تربیت یافتہ بچے نکلیں۔ غرض عورتوں کے عادات و اطوار ان کی معاشرتی اور مذہبی خرابیوں اور ان کی جاہلانہ رسوم و رواج کا جس عبرت انگیز طریقہ میں اس میں ذکر ہے، اس کے لحاظ سے یہ کتاب معنًا بھی 'مراۃ عروس' ہے جسے پڑھکر عورتیں اپنی اخلاقی و مذہبی حالت درست کر سکتی ہیں۔ اس کتاب کا دوسرا حصہ "بنات النعش" کے نام سے موسوم ہے جسمیں علمی معلومات حاصل کرنے کی طرف خصوصیت کے ساتھ توجہ دلائی گئی ہے۔ "مراۃ العروس" کو تھوڑے ہی عرصہ میں ایسی مقبولیت حاصل ہوئی کہ انگریزی، بنگالی، گجراتی، بھاشا، پنجابی اور کشمیری زبانوں میں اس کے ترجمے ہو گئے۔ اس سلسلے کی سب سے آخری کتاب غالبًا "رویائے صادقہ" ہے جو بعض کے نزدیک ان کا سب سے بہتر ناول خیال کیا جاتا ہے۔ اس میں دہلی کی معاشرتی زندگی کا بہت ہی پر اثر نقشہ کھینچا گیا ہے،

لیکن ڈپٹی صاحب کی آخری قلمی یادگاریں کچھ دوسری نوعیت رکھتی ہیں اور وہی اُن کا اصلی اور فطری رنگ معلوم ہوتا ہے جو اخیر زمانہ عمر میں صاف طور پر نمایاں ہو کر رہا۔ اس سے ہماری مراد مذہبی رنگ ہے۔ حیدرآباد کے سکون بخش زمانۂ ملازمت میں ڈپٹی صاحب جب سرکارِ انگریزی کے بارِ احسان سے کسیقدر سبکدوش ہوئے اور حکومت کی برکات سے کنارہ کش ہو کر اطمینان و عافیت کی زندگی بسر کرنے لگے تو اسوقت انھیں خدا یاد آیا۔ عربی زبان وادب کا ذوق انھیں بچپن ہی سے تھا۔ کلام جاہلیت کے سیکڑوں ہزاروں اشعار اور نثر ین صفحے کے صفحے زبانی یاد تھے۔ اسی ذوق ادبی کی بنا پر قرآن کا بھی بہت حصہ یاد کر لیا تھا چنانچہ بعد میں صرف چند مہینے کی محنت سے پورے حافظ ہو گئے۔ کلام مجید سے ایک تو ذاتی شغف اور دوسرے احباب کا ایک بامحاورہ ترجمہ کا اصرار، یہ اسباب تھے جنھوں نے ڈپٹی صاحب کو اس خدمت دین پر آمادہ کیا۔ ہر چند کہ کلام الٰہی کا رعب اس جرارت کی اجازت نہ دیتا تھا لیکن آخر کار کمر بستہ ہو گئے اور تین سال کی مدت میں اس کام کو انجام دیا جو آج "مصحف القرآن" کی شکل میں ہر مسلمان کے ہاتھ میں نظر آتا ہے اور جو عرفِ عام میں "ڈپٹی صاحب کے قرآن" کے نام سے موسوم ہے۔ اس میں شبہ نہیں کہ قرآن کے ترجمے اس سے پیشتر بھی ہو چکے تھے لیکن وہ یا تو فارسی میں تھے یا تحت اللفظ اردو میں۔ ڈپٹی صاحب جو فن ترجمہ سے خوب واقف تھے، تمام دشواریوں کو بخوبی سمجھتے تھے۔ انھوں نے دیکھا کہ فارسی ترجمہ ملک کی عام ضروریات کو پورا نہیں کر سکتا اور نہ تحتِ لفظی کا طریقہ مطالب قرآنی کے سمجھنے میں مفید ہو سکتا ہے۔ اس بنا پر عام فائدہ رسانی کی غرض سے انھوں نے قرآن کا بامحاورہ اردو میں ترجمہ کیا اور ربط مطلب کے لئے قوسین میں اپنی طرف سے عبارتیں بڑھاتے گئے ہیں۔ شروع میں ہر مضمون کے آیات کی فہرست بھی دیدی ہے تاکہ کسی خاص

عنوان پر قرآن حکیم سے مواد تلاش کرنا ہو تو آسانی سے فراہم کیا جا سکے۔ غرض مسلمان جو ایک عرصہ سے زندگی کے اس دستور العمل سے ناآشنا ہو گئے تھے، ڈپٹی صاحب نے انھیں اس سے روشناس کرا کر ان پر بہت بڑا احسان کیا ہے۔ اس کے علاوہ ڈپٹی صاحب نے مسلمانوں کی عام حالت خراب دیکھ کر ترجمہ قرآن ہی پر بس نہیں کیا بلکہ ان کے معمولات زندگی اور عبادات مذہبی کی اصلاح و درستگی کے لیے انھوں نے ایک مبسوط کتاب لکھی جو "الحقوق و الفرایض" کے نام سے تین جلدوں میں ہے جس کی مجموعی ضخامت ایک ہزار صفحوں سے کچھ اوپر ہے۔ اس کتاب میں تفصیل یہ بتایا گیا ہے کہ 'حقوق اللہ' اور 'حقوق العباد' کیا کیا ہیں؟ کتاب کے پہلے حصہ میں تمام عبادات مع جزئیات کے آجاتے ہیں۔ یہاں تک کہ حج کے بیان میں مسجد حرم کے منارے اور کنگروں کی تعداد اور مسجد کا طول و عرض بھی دیا ہوا ہے۔ دوسرے حصہ میں یہ بتایا گیا ہے کہ مسلمانوں کے تعلقات والدین، استاد، ہمسایہ اور حکومت وغیرہ کے ساتھ کیسے ہونے چاہئیں۔ جہاں حکومت کے ساتھ مسلمانوں کے تعلقات سے بحث کیگئی ہے، آج ان کا مطالعہ کرنا دلچسپی اور حیرت سے خالی نہیں۔ اطاعت حکام کے لئے جو دلیلیں پیش کی گئی ہیں "انہیں سنکر ابتدائی جماعت کا ایک بچہ بھی مسکرائے بغیر نہیں رہ سکتا۔

لیکن ڈپٹی صاحب کی عربی زبان و ادب کی بے نظیر قابلیت کا صحیح اور کافی استعمال یہ ہرگز نہیں کہا جا سکتا کہ انھوں نے ایک قرآن کے ترجمہ پر اکتفا کیا یا احادیث و فقہ کے مطالب کو پھیلا کر اردو میں لکھدیا۔ ترجمے ان سے پہلے بھی ہوئے اور بعد میں ہوتے۔ حدیث و فقہ کے مسایل کی تعلیم و تلقین کے لئے عربی مدارس کے اساتذہ و طلبہ کافی تھے۔ عربی کے اس فاضل سے جو کم سے کم توقع تھی وہ یہ کہ آزاد کی طرح عربی زبان و ادب کی ایک تاریخ ہی

"سخندانِ عرب" کے نام سے تیار کر دے گا اور یہ ان کی بے مثال عربی دانی کا صحیح و بہترین استعمال ہوتا۔ ایک ایسی تصنیف کی کمی اردو زبان میں عرصہ سے محسوس کیجا رہی تھی اور مستقبل قریب میں بھی اس کے پورا ہونے کی کوئی امید نظر نہیں آتی۔

تصنیفات حالی

اردو میں جس مخصوص شعبۂ علم کی ترقی مولانا حالی کی ذات سے ہوئی ہے وہ "فن سوانح نگاری" ہے۔ حالاتِ زندگی اس سے پہلے بھی اردو میں لکھے جاتے تھے لیکن مولانا نے اس فن میں ترتیبِ واقعات کا جو طریقہ اور ان کے انداز بیان کا جو نمونہ پیش کیا ہے، وہ نہ صرف ان کی علمی زندگی کا سب سے درخشاں کارنامہ ہے بلکہ اردو میں ایک بیش بہا اضافہ بھی ہے۔ قدیم ارکے نزدیک سوانح نگاری کا دستور اب تک یہ رہا ہے کہ وہ جو حالات زندگی لکھتے تھے، وہ تصویر کا ایک رخ ہوتا تھا یعنی اس کے تمامتر محاسن اور خوبیاں ہی بیان کرتے تھے۔ اسکی زندگی کے کارناموں اور اس کے حالات پر کوئی تنقیدی نظر نہ ڈالتے تھے۔ برعکس اس کے یورپ کی سوانح نگاری کا یہ طریقہ ہے کہ ہیرو کے اوصاف حمیدہ اور اس کے کارنامے گناتے تو ہیں لیکن اس کے ساتھ کہیں کہیں اسکی لغزشوں اور کمزوریوں کی طرف بھی دبی زبان سے اشارہ کر دیتے ہیں۔ اگر ان کی نیت پر بے جا شبہ کرنے کا الزام نہ دیا جائے تو یہ کہنا غیر مناسب نہ ہوگا کہ اس سے ایک طرف ان کا مقصود اپنی نمائشی بے تعصبی و حق گوئی کا اظہار ہوتا ہے اور دوسری جانب یہ اپنے ہیرو کی عظمت اور بزرگی جتانے کا ایک دوسرا طریقہ ہے۔ بارگاہِ اخلاق سے پہلا گروہ اگر پاسداری اور بیجا حمیت کا مرتکب کہلائے گا تو دوسرا طبقہ ریا، فریب اور خدع کا مجرم قرار پائے گا۔ مولینا حالی پر جو "مناقب گوئی اور بے جا مداحی" کا الزام لگایا جاتا ہے، اس کے لیئے وہ معذور تھے

یہ دونو طریقے اُن کے پیش نظر تھے جنمیں سے انھوں نے اول الذکر کا انتخاب کیا۔ یہ گویا دو برائیوں کے درمیان انتخاب تھا اور حالی نے اگر اُسے پسند کیا جو کم بری تھی تو کیا بے جا کیا۔

مولانا حالی کی زندگی کا سب سے بڑا کارنامہ "حیات جاوید" سمجھا جاتا ہے بے جا حمیت اور پاسداری کا جو الزام اُن پر عاید ہوتا ہے، وہ اسی تصنیف کی بنا پر ہے لیکن کوئی شخص بھی جو سرسید کی جگہ پر ہوتا اور حالی جیسا رفیق اسے ملتا تو وہی واقعہ پیش آتا جو "حیات جاوید" کی شکل میں نمودار ہوا تقریبًا ایسی ہی ایک مثال ہم کو انگریزی لٹریچر میں ملتی ہے۔ ڈاکٹر جانسن نے جو انگلستان کا بہت ہی لائق اور عالی دماغ شخص گزرا ہے، جب انتقال کیا تو اس کے ایک دوست جیمز باسول نے اسکی لایف ۴ جلدوں میں لکھی جسمیں اس کی زندگی کے ہر چھوٹے بڑے واقعہ کا ذکر کیا ہے اور وہ بھی نہایت تحسین آمیز لہجہ میں۔ مولٰینا حالی نے بھی سرسید کے ساتھ وہی حق رفاقت ادا کیا، جو باسول نے جانسن کے ساتھ کیا تھا۔ قطع نظر اس الزام کے کہ اس تصنیف میں بیجا مدح سرائی اور پاسداری سے کام لیا گیا ہے، دو خصوصیات بہت ہی نمایاں طور پر نظر آتی ہیں۔ ایک یہ کہ سرسید کی زندگی کے مشہور و غیر مشہور، ضروری و غیر ضروری، دلچسپ و غیر دلچسپ ہر قسم کے واقعات کا مصنف نے استقصا کیا ہے اور دوسری بات یہ ہے کہ پوری کتاب شروع سے اخیر تک ایک اعتذار (اپالوجی) کا پہلو لیئے ہوئے ہے۔ اس کی خاص وجہ ہے۔ سرسید مرحوم اپنے وقت کے ایک غیر معمولی شخص تھے۔ ایسے زمانہ میں جبکہ ہر شخص زبان حال سے نفسی نفسی کر رہا تھا، اس شخص نے قوم کی اصلاح و ترقی کا بیڑا اٹھایا۔ مسلمانوں پر زوال حکومت کا خمار طاری تھا اور اس حالت میں وہ تعلیم و معاشرت، مذہب و سیاست سب کچھ بھلا بیٹھے تھے، سرسید نے ان

کو اس خواب گراں سے جگانا چاہا لیکن اس کوشش میں سب سے بڑا ظلم جو انھوں نے کیا وہ یہ کہ مذہب کو ہاتھ لگایا۔ مذہب مسلمانوں کو جان و مال ہر چیز سے زیادہ ہمیشہ عزیز رہا ہے۔ انھوں نے اس پر جب کبھی آنچ آتے دیکھی تو چراغ پا ہو گئے۔ عربی داں مولویوں نے جب مداخلت کرتے دیکھا تو ان پر کفر کے فتوے لگانے شروع کئے۔ دوسری طرف اسی زمانہ میں برادران وطن حکومت سے اپنے سیاسی و ملکی حقوق حاصل کرنے کے لیے جد وجہد کر رہے تھے اور اس کے مطالبہ کے لئے تمام ہندوستانی ایک قومی جماعت کانگریس کے نام سے قایم کر لی تھی۔ اور مسلمانوں کو بھی اس میں شرکت کرنیکی دعوت دی۔ سر سید نے یہ دیکھکر کہ مسلمانوں کی جماعت تعلیم میں اپنے برادران وطن سے بہت پیچھے ہے اور تا وقتیکہ وہ اس کمی کو پورا نہ کرلے، وہ انکا ساتھ جیسا کہ چاہیئے، نہیں دے سکتی۔ اس بنا پر انھوں نے کانگریس کی شرکت سے انکو علحدہ رکھنا چاہا۔ ان کے علاوہ اور بھی چھوٹے چھوٹے مسایل تھے جنمیں سر سید نے عام روش سے جدا اپنی راہ اختیار کی تھی۔ جن کا نتیجہ یہ ہے کہ مذہبی فرقہ ان پر 'نیچریت' کا الزام لگاتا ہے اور ان کی تکفیر کے درپے ہے۔ پرانے خیال کا طبقہ انگریزی اور جدید علوم کے رواج دینے پر ناراض۔ برادران وطن ان کی مسلم نواز پالیسی سے نالاں اور ان کو سرکار پرستی اور ہندو مسلمانوں میں نفاق پیدا کرنے کے اتہامات لگاتا ہے۔ غرض جو شخص اپنے اور بیگانوں دونو سے اس طرح معتوب و مطعون سمجھا جایے، اس کے سوانح نگار کا لب و لہجہ اعتذار آمیز نہ ہو تو کیا ہو سکتا ہے۔ اور رفع الزامات اور برارت کی یہی کوشش تھی جسکی بنا پر مولینا حالی نے سر سید کے متعلق چھوٹے بڑے ہر واقعہ کو جگہ دی اور ان کے ہر قول و فعل کو مستحسن اور قابل داد سمجھا۔

'ذاتیت' لکھنے میں خواہ قدیم طریقہ اختیار کیا جاسے یا جدید۔ لیکن

آتنا ضرور ہے کہ مصنف ہیرو کے انتخاب کرنے اور اس کے سوانح زندگی لکھنے میں کوئی نہ کوئی متعین مقصد پیش نظر رکھتا ہے۔ مثلاً تہذیب اخلاق اور تزکیۂ نفوس مقصود ہو تو کسی بڑے پیغمبر یا ہادی کی سوانحعمری لکھے گا۔ علمی تحقیق و تفتیش کا شوق پیدا کرنا منظور ہے تو کسی ایسے شخص کے حالات زندگی بیان کرے گا جس نے اپنی تمام عمر جستجوئے علم اور تحقیق مسایل میں صرف کردی ہے۔ یا سوانح نگاری کی دوسری صورت یہ ہے کہ مصنف اپنے ہیرو کے عام حالات زندگی بیان کرنے کے بعد اس کا سب سے نمایاں وصف اجاگر کرکے دکھائے۔ مثلاً نپولین کی لائف لکھنی ہے تو اس کے دیگر واقعات زندگی کو معمولی طور پر بیان کرنے کے بعد مصنف کا فرض ہو کہ اس کے جنگی کارنامے اور دلیری و بہادری کے واقعات کو تفصیل کے ساتھ دکھائے۔ یا مثلاً نیوٹن کی سوانحعمری میں ریاضی کے متعلق تحقیقات مسایل اور اس کے دوسرے علمی اور سائنٹیفک نظریات کا ذکر تصنیف کا غالب جزو ہونا چاہیئے غرض یہ دو نو اصول ہیں جن میں سے ایک نہ ایک کا پابند ہونا سوانح نگار کے لئے ضروری ہے چنانچہ انھیں مبادیات کی روشنی میں مولینا حالی کی طرز سوانح نگاری اور ان کی تصنیف کردہ سوانحعمریوں کو دیکھو۔ "حیات جاوید" کی تصنیف میں تو معلوم ہو چکا کہ ان مبادیات سے قطع نظر ذاتی و شخصی تعلقات کا وہ جذبہ کام کر رہا تھا جس نے باسول کو جانسن کی لائف لکھنے پر آمادہ کیا تھا۔ باقی رہیں دو تصانیف یعنی "یادگار غالب" اور "حیات سعدی"۔ ان میں مصنف کا کوئی خاص مقصد صاف طور پر نہیں ظاہر ہوتا ہے بلکہ مولینا کا ذوق ادبی ہندوستان و ایران کے ان دو بڑے شعرا کے حالات زندگی لکھنے کا متقاضی ہوا۔ کوئی شخص یہ نہیں کہہ سکتا کہ مرزا غالب کی زندگی ہندوستان کے نوجوانوں کے لئے کوئی سبق رکھتی ہے یا مرزا کے خانگی حالات اور احباب کے تعلقات کا ذکر حیات انسانی میں کسی نئے باب

کا اضافہ کرتے ہیں، بلکہ جس چیز نے غالب کو غالب کیا، وہ ان کی بے مثل فلسفیانہ شاعری ہے۔ ایسی صورت میں "یادگار غالب" کے مصنف کا سب سے بڑا فرض یہ تھا کہ مرزا کی شاعری کے مختلف دور، ان کے معاصرین میں ان کا درجہ، شاعری کے مختلف اصناف میں اُن کے کمالات پیش کئے جاتے۔ لیکن اس سے قطع نظر کرکے مرزا کے حالات زندگی اخلاق و عادات، لطایف و امثال پر تصنیف کا بیشتر حصہ وقف کیا گیا ہے۔ البتہ اخیر میں کسی قدر اردو و فارسی نظم و نثر کے نمونے دکھائے گئے ہیں۔ کتاب کے آخری چند صفحوں میں مرزا کی فارسی نثر کا مقابلہ ظہوری، علی حزیں اور ابوالفضل کی نثر سے کیا گیا ہے۔ اس کے لئے مصنف کی طرف سے یہ معذرت کہ "یہ طریقہ جس قدر مصنف کے حق میں دشوار گزار تھا اسی قدر پبلک کے لئے خاصکر اس زمانہ میں غیر مفید بھی تھا" آج کہاں تک قابل قبول ہوسکتی ہے، اس کا فیصلہ خود ناظرین پر چھوڑا جاتا ہے۔

سوانحمریوں کے علاوہ اردو نثر میں مولینا حالی کی ایک قابلانہ تصنیف "مقدمہ شعر و شاعری" ہے جس مین فن شاعری اور اسکی مختلف اصناف پر ایک حد تک فلسفیانہ اور ناقدانہ حیثیت سے بحث کیگئی ہے۔ بالخصوص اردو شاعری کے حسن و قبح اور اس کے اصل پر بہت کچھ تفصیل کے ساتھ لکھا گیا ہے لیکن اسی کے ساتھ غیر ضروری مباحث یا بے جا طوالت سے بھی بہت کام لیا گیا ہے جس سے تصنیف کا رتبہ بہت کچھ گھٹ گیا ہے۔

ہر فن کا ایک خاص موضوع بحث ہوتا ہے جس کے دائرہ سے باہر نکلنا خود مصنف اور تصنیف دونوں کی ایک بڑی خامی سمجھی جاتی ہے۔ "علم تشریح" (اناٹومی) کا ایک مصنف اگر ماہیت قلب اور اسکی نقل و حرکت سے بحث کرتے کرتے شاعری پر اتر آئے اور دل کے لئے "مدفن آرزو" اور "آماجگہ مژگاں" کی شاعرانہ

اصطلاحات استعمال کرنے لگے یا "داغہائے دل" کی تلاش میں برسوں سر مارے تو یہ اس کی کسقدر ناموزوں اور بے سود کوشش ہوگی۔ اسی طرح ایک شاعر گلاب کی تعریف کے سلسلہ میں اس کے متعلق علم نباتات (بیالوجی) کی تحقیقات شروع کرے تو اس کا یہ فعل کسقدر مضحک ہوگا گو اپنی اپنی جگہ پر علم تشریح وعلم نباتات اسی قدر ضروری اور مفید ہیں جسقدر شاعری وانشا پردازی غرض مضامین کی بعض ایسی ہی نامناسبت اور بے تعلقی ہے جو "مقدمہ شعر وشاعری" میں بھی کہیں کہیں نظر آتی ہے۔ شعر وشاعری پر بحث کرتے کرتے شعرا کے اخلاق کی اصلاح اور انھیں فن عروض کی تعلیم دینا ایسا ہی غیر مناسب اور ناموزوں معلوم ہوتا ہے جیسے علم تشریح میں قلب کی مرکزیت اور اس کے افعال سے بحث کرتے کرتے غالب کا یہ شعر پڑھنا شروع کردیا جائے کہ ؎

بہت شور سنتے تھے پہلو میں دل کا جو چیرا تو اک قطرہ خوں بھی نہ نکلا

یہ مانا کہ بعض اردو شعرا مبتذل مضامین باندھتے ہیں یا سنگلاخ زمینوں میں غزلیں لکھنے کی کوشش کرتے ہیں لیکن فلسفۂ شعر وشاعری سے بحث کرنے والے کو تہذیب اخلاق اور درس عروض سے کیا غرض۔ اس کے علاوہ بعض مثالیں جو مطالب کو واضح کرنے کے لئے پیش کیگئی ہیں انمیں اسقدر بیجا طوالت سے کام لیا گیا ہے اور بعض ان میں ایسی عامیانہ ہیں جو شاعری کے ایسے فلسفیانہ اور لطیف مباحث کے شایانِ شان ہرگز نہیں۔

تصانیف شبلی | ادب اردو کے ذخیرہ میں اب تک ہر سہ مصنفین نے جو اضافے کئے وہ تاریخ، دینیات، سوانح اور تنقید ادب پر مشتمل ہیں۔ علامہ شبلی نے ان اصناف علوم پر تو بہت کچھ بیش بہا اضافے کئے ہی لیکن ان کے علاوہ بہت سے جدید علوم وفنون کو بھی اردو سے روشناس کیا۔ ان کی تصنیفات کسی اتفاقی سبب

یا صلۂ انعام کی رہین منت نہیں بلکہ انھوں نے وقت کی ضروریات اور اردو لٹریچر کی اصل کمی کو محسوس کر کے یہ کام شروع کیا تھا۔ یہ بھی نہ تھا کہ ہنگامی طور پر کوئی خیال دماغ میں آیا اور اس پر کچھ لکھ ڈالا یا دوسروں کو لکھتے پڑھتے دیکھا اور ان کی ریس میں قلم ہاتھ میں اٹھالیا۔ بلکہ ان کے پیش نظر ایک متعین مقصد اور ان کے طریقۂ عمل کے لئے ایک مقررہ پروگرام تھا۔ انھوں نے ایک طرف زمانہ 'حال' کی ضروریات کے پورا کرنے کے لئے 'ماضی' سے سبق لیا اور دوسری طرف 'مستقبل' پر بھی نظر جمائے رکھا۔ انھوں نے دیکھا کہ جسطرح اسلامی علوم جو سلطنت عباسیہ کے زمانہ تک مذہب اور اس کے متعلقات پر مشتمل تھے' یونانی علوم وفنون کے اثر سے یکبارگی بدل گئے' بعینہ آج بھی مغربی علوم اور سائنس کے رواج نے ہمارے قدیم فلسفہ' کلام' تاریخ اور ادب کی بنیادوں کو متزلزل کر دیا ہے۔ اس بنا پر انہوں نے تصنیف وتالیف کا ایک مستقل لائحہ عمل تیار کیا' جن کے بعض اجزا ذیل میں ملاحظہ ہوں۔ وہ لکھتے ہیں کہ۔

"(۱) فلسفۂ حال کے اصول اور اس کا معتد بہ حصہ ملکی زبان میں لایا جائے

(۲) یہ بتایا جائے کہ فلسفہ حال کے کون کون سے مسایل مذہب کے خلاف ہیں پھر ان مسایل کو یا رد کیا جائے یا مذہب سے تطبیق دی جائے۔

(۳) جس قسم کے مضامین پر آجکل یورپ میں تصنیفات ہو رہی ہیں اور جن پر اسلامی تصنیفات بھی موجود ہیں انھیں موازنہ کر کے بتایا جائے کہ مسلمانوں کا طرز تصنیف کیا تھا اور یورپ کا طرز تصنیف کیا ہے۔ مثلاً تاریخ' اسمار الرجال' معانی و بلاغت' تحقیقات مذہب میں عربی زبان میں کثرت سے تصنیفات موجود ہیں۔ انھی مضامین نے یورپ میں نئے نئے اسلوب اختیار کئے ہیں' موازنہ کر کے بتانا چاہیئے کہ دونو کے مختلف خصوصیات کیا ہیں اور کسکو کس حثیت سے ترجیح ہے۔

(۴) خالص اسلامی علوم مثلاً کلام، فقہ، اصول، تفسیر وغیرہ کی تاریخ اور ان پر ریویو لکھا جائے یعنی یہ کہ یہ علوم کب پیدا ہوئے، کیونکر بڑھے، کس کس زبانیں کیا کیا باتیں ان پر اضافہ ہوئیں۔ اور کن اسباب سے ہوئیں؟ ان کا کسقدر حصہ صحیح ہے؟ کسقدر تنقید اور اصلاح کا محتاج ہے؟۔

(۵) فارسی اور عربی شاعری اور انشا پردازی کی تاریخ لکھی جائے۔

(۶) جن نئے عنوانوں پر یورپ میں مضامین لکھے جارہے ہیں، اردو زبانیں ترجمہ کے ذریعہ سے لائے جائیں۔

(۷) مسلمانوں کی تہذیب وتمدن پر تاریخانہ مضامین لکھے جائیں۔ مثلاً انتظام عدالت، انتظام محاصل، پبلک ورکس، تعلیمات، تجارت، فوجی نظم ونسق، معاشرت، غرض اس قسم کے تمام امور کی نسبت مورخانہ طور پر لکھا جائے کہ مسلمانوں نے ان چیزوں میں کہاں تک ترقی کی اور کس کس عہد میں کیا اضافہ ہوا؟"

اس پروگرام کو سامنے رکھیے اور علامہ شبلی کی تمام تصانیف کی بہ لحاظ فن تقسیم کیجئے اور پھر ہر ایک کا جائزہ لیجئے کہ انھوں نے ان دور اندیشانہ اور بلند پایہ تجاویز کو کہاں تک عمل کا جامہ پہنایا، اور جو کچھ ان سے رہ گیا، اسکی تکمیل میں اُن کے اخلاف کسقدر سرگرمی وانہماک کے ساتھ کوشاں ہیں۔ غرض علامہ شبلی کی تصانیف کی اگر بڑی بڑی تقسیم کی جائے تو وہ تاریخ اشخاص، یا تاریخ علوم یا ان دونو کے علاوہ تنقید ادب پر مشتمل ہوں گی۔

کارلایل کا ایک بلیغ فقرہ مشہور ہے کہ "تاریخ عالم صرف اس کے بڑے بڑے اشخاص کی تاریخ کا نام ہے"۔ غالباً اسی قسم کا خیال تھا جسکی بنا پر علامہ شبلی نے اسلام کی ایک مکمل اور باضابطہ تاریخ لکھنے کی بجائے "ناموران اسلام" کے نام سے ایک سلسلہ شروع کیا تھا۔ اس سلسلہ کی پہلی کڑی الفاروق سے ہے

جو خلیفہ ثانی، حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کی سوانحعمری اور ان کے علمی و عملی کارناموں کی محققانہ تاریخ ہے۔ بلکہ سچ پوچھیے تو یہ تاریخ اسلام کے روشن ترین صفحات ہیں۔ الفاروق مولینا کے مورخانہ اجتہادات اور علمی تحقیقات کا بہترین نمونہ ہے جس کے لئے انھوں نے مصر، شام اور ترکی کی خاک چھانی۔ المامون اس سلسلہ کی دوسری کڑی ہے جو ہارون الرشید کے بیٹے مامون کی لائف پر ہے بلکہ ایک طرح سے تاریخ عباسی کا ایک چھوٹا سا مرقع ہے۔ یہ دونو تصانیف اسقدر معروف ہیں کہ اس سے زیادہ کہنے کی ضرورت نہیں۔

علامہ شبلی نے نہ صرف صاحبان تاج و تخت کی سوانحعمری لکھی بلکہ اہل علم و فن کے حالات زندگی بھی درج کئے ہیں۔ اس سلسلہ میں سب سے زیادہ قابل ذکر تصنیف امام اعظمؒ کی سوانحعمری ہے جو "سیرۃ النعمان" کے نام سے مشہور ہے۔ اس میں امام صاحب کے تفقہ فی الدین اور اجتہاد مسایل سے بحث کرنے کے علاوہ علم فقہ کی تاریخ بھی لکھی ہے، یعنی یہ کہ یہ علم کب سے رایج ہوا؟ کب اسکی تدوین ہوئی؟ فقہ حنفی کے اسقدر قبول و شیوع ہونیکی کیا وجہ ہے؟ ان سب سوالات کا نہایت محققانہ جواب دیا ہے۔ لیکن اس کے علاوہ ایک بڑا کام اور بھی کیا ہے۔ اسلامی فقہ پر یورپ کی طرف سے ایک بڑا الزام یہ چلا آتا تھا کہ یہ قوانین رومہ (رومن لا) سے ماخوذ ہے، مولینا شبلی نے اس الزام کی تردید کی اور بتایا کہ امام صاحب کے وقت تک یورپ سے قانون یا فقہ پر کوئی کتاب ترجمہ نہیں آئی تھی۔ اور فقہ حنفی جو کچھ بھی ہے وہ امام صاحب کا خود اپنا اجتہاد ہے۔

علامہ شبلی کی ایک دوسری تصنیف "سوانح مولانا روم" ہے۔ مولینا روم کو اب تک دنیا ایک صاحب دل، اہل باطن کی حیثیت سے جانتی تھی اور ان کی مثنویوں کو اسرار نہانی کا خزینہ اور کشف صدر کا ذریعہ سمجھتی تھی لیکن انھیں

علامہ شبلی نے ایک دوسری حیثیت سے پیش کیا ہے۔ ان کی مثنویوں سے جس طرح صوفیائے کرام مسایل تصوف اخذ کرتے ہیں، علامہ نے ان سے عقاید و کلام کے مضامین کا استنباط کیا ہے، اور نہ صرف یہی بلکہ شاعری کی حیثیت سے بھی ان کا درجہ بہت بلند رکھا ہے۔ اسی ضمن میں طریقت، شریعت، اور معرفت کی منطقیانہ تعریفیں کی ہیں اور ان پر جس حکیمانہ انداز سے بحث کی ہے، وہ اردو کی بساط دیکھتے ہوئے بڑی چیز معلوم ہوتی ہے۔ علامہ شبلی نے تصوف اور اس سے متعلق بعض مسایل کی طرف اس کتاب میں مختصر جو کچھ لکھا ہے، انھیں "الغزالی" میں میدان کشادہ پاکر تشریح کے ساتھ بیان کیا ہے۔ امام غزالی رح کے حالات زندگی اور بھی کوئی شخص چاہتا تو آسانی کے ساتھ لکھ سکتا تھا لیکن دونو میں جو فرق ہوتا، اس کا اندازہ کسی قدر "الغزالی" پڑھکر ہو سکتا ہے جسمیں مولینا شبلی نے اس بڑے امام کے حکیمانہ اور فلسفیانہ خیالات کو اس سادہ اور عام فہم طریقہ پر بیان کیا ہے جسے پڑھکر فلسفہ پر ایک عام علم کا گمان ہونے لگتا ہے۔ اسی سلسلے میں انھوں نے تصوف کی وجہ تسمیہ، اسکی مختلف توجیہات نہایت سلجھے ہوئے پیرایے میں بیان کئے ہیں۔

"سیرۃ النبی" نہ صرف تصانیف شبلی کی اس نوع یعنی "تاریخ رجال" میں آخری تصنیف ہے بلکہ خود مولینا کی زندگی کا سب سے آخری علمی کارنامہ۔ پیغمبر اسلام کی سیرۃ لکھنی کوئی نئی یا غیر معمولی بات نہیں تھی لیکن اکثر معمولی اور پرانی باتیں اسقدر محتاج توجہ ہوتی ہیں جتنی نئی اور غیر معمولی نہیں ہوتیں سیرت یا حیات نبی پر تقریباً ہر زمانہ، ہر ملک اور ہر زبان میں جسے اسلام سے کچھ بھی تعلق رہا ہوگا، کچھ نہ کچھ ضرور لکھا گیا ہے۔ خود عربی میں ہزاروں لاکھوں تصانیف مختلف حیثیتوں سے آپ کی زندگی اور اخلاق پر موجود ہیں۔ سترھویں و اٹھارھویں صدی میں یورپ نے جب اسلام کی طرف اعتنا کیا تو صدہا کتابیں

آپ کی لائف اور کارناموں پر مختلف مصنفین کے قلم سے جرمن، فرانسیسی اور انگریزی زبانوں میں لکھی گئیں۔ ہندوستان میں بھی اس پیارے نبی کی حیات طیبہ پر کچھ نہ کچھ لٹریچر موجود ہے۔ لیکن ان سب کے باوجود بھی ایک جدید تصنیف کی ضرورت اردو میں محسوس ہو رہی تھی جو موجودہ سیرتوں یا اور کسی کتاب کے ترجمہ سے ہرگز پوری نہیں ہو سکتی تھی۔ ایسی صورت میں علامہ شبلی کا ایک ایسی تصنیف کا جو روایات کی پیچیدگی اور مغربی زہر آلود خیالات کی آلائشوں سے پاک ہو اپنے ہاتھ سے داغ بیل ڈالنا اس سے کون انکار کر سکتا ہے کہ یہ اردو کی ایک ناقابل فراموش خدمت ہے یہ صحیح ہے کہ کہ علامہ مرحوم اس کام کو اپنے عین حیات پورا نہ کر سکے لیکن حقیقت یہ ہے کہ اردو کے حق میں اسکی عدم تکمیل ہی مفید تھی اس سلسلے سے اپنے بعد ایک جماعت تو ایسی چھوڑ گئے ہیں جو نہ صرف اس کام کی تکمیل میں سرگرم ہے بلکہ اردو کی دوسری خدمات بھی انجام دے رہی ہے۔

اردو تصانیف میں علامہ شبلی نے جس نئے باب کا اضافہ کیا ہے، وہ علوم وفنونکی تاریخ ہے اب تک نہ صرف اردو بلکہ فارسی و عربی تک میں علوم و فنون کی تاریخ لکھنے کا کوئی دستور نہ تھا۔ علامہ شبلی پہلے شخص ہیں جنھوں نے نہ صرف اردو ادب بلکہ اسلامی لٹریچر میں یہ بیش بہا اضافہ کیا ہے۔ ممکن ہے ضمنی طور پر انھوں نے بعض علوم مثلاً فقہ وغیرہ کی تدریجی ترقی پر لکھنے کی کوشش کی ہو لیکن وہ علم الکلام" ان کی وہ تصنیف ہے جسمیں انھوں نے باقاعدہ طور پر علم کلام کی ابتدا، اس کے عالم وجود میں آنے کے اسباب، اسکی عہد بعہد کی ترقیوں اور اس پر خارجی حالات کے اثرات سے مفصل بحث کی ہے اور اسی سلسلہ میں اکابر متکلمین کے حالات بھی مختصر طور پر لکھے ہیں اور ان کے دقیق فلسفیانہ خیالات کی بھی تشریح کرنے گئے ہیں اصل میں یہ کتاب "الکلام" کا پیش خیمہ ہے جو اس فن پر ایک مستقل تصنیف ہے۔

اپنی عام روش سے علیحدہ اس موضوع پر قلم اٹھانے کی ضرورت اس وجہ سے پیش آئی کہ اس زمانہ میں مغربی علوم و تہذیب کا چرچا گھر گھر پھیلا ہوا تھا جن کی وجہ سے لوگوں کے مذہبی عقاید کی بنیادیں متزلزل ہونے لگی تھیں۔ سائنس کا اسقدر زور تھا کہ مذہب کوئی دن کا مہمان نظر آنے لگا، اس بنا پر بعض لوگوں نے ایک جدید علم کلام کی ضرورت محسوس کی لیکن مولینا نے مسلمانوں کے اسی قدیم کلام کو موجودہ صورت حال کے مقابلہ کے لئے کافی سمجھا اور اس غرض سے انھوں نے اس فن پر نہایت شرح و بسط کے ساتھ الکلام لکھا جسمیں مذہب کی ضرورت، اسلام کے فضایل، وجود باری کے دلایل، معجزات کا ثبوت، نبوت کی حقیقت اور یورپ کے ایک بہت بڑے الزام یعنی "اسلام مانع ترقی ہے" کا جواب اور ان تمام مسایل پر نہایت خوبی اور وضاحت کے ساتھ بحث کی ہے۔

مولانا کی تصانیف میں تیسری نوع تنقیدات ادب کی ہے جسمیں سب سے معرکۃ الآرا تصنیف "شعر العجم" ہے۔ کسی قوم کے لٹریچر کی تاریخ پڑھو، تنقید ادبی کا نمبر سب سے بعد میں آئیگا اور اسکی وجہ ہے۔ کیونکہ تنقید موقوف ہے ذخیرۂ ادبی کی فراہمی پر، تاوقتیکہ ادب کا ایک کافی سرمایہ موجود نہ ہو، تنقید نہیں ہوسکتی۔ اور اس سے بڑھکر "تنقیدات عالیہ" (ہائی کریٹی سزم) نہ صرف ذخیرہ ادبی کے وجود بلکہ قوم کی صلاحیت و قابلیت پر مبنی ہوتے ہیں۔ اردو اگرچہ اپنی زندگی کے اس قلیل عرصہ میں اسقدر ذخیرہ فراہم نہ کرسکی لیکن اس کے پڑھنے والوں میں کم ازکم وہ صلاحیت و قابلیت ضرور موجود تھی۔ اس بنا پر فارسی شاعری پر تنقیدات عالیہ اردو کے لئے نہ صرف ایک وقت کی چیز بلکہ اسکی نشو و نما میں بہت خدا تک ممد ہیں۔ اس طرز کی تصنیف نہ صرف کسی غیر زبان بلکہ فارسی تک میں موجود نہیں ہے۔ "شعر العجم" کا نام لیتے ہی اور اس کے ساتھ اس ادعا کو سنکر

بعض لوگوں کا خیال پروفیسر براؤن کی "تاریخ ادبیات ایران" کی طرف مایل ہوتا ہے لیکن یہ خیال صرف دونوں سے ناواقفیت کی بنا پر ہے۔ براؤن نے ایران کی دماغی و ذہنی تاریخ لکھنے کی کوشش کی ہے نہ کہ ایران کی شاعری پر۔ مستشرقانہ قابلیت اور وسیع النظری اَور چیز ہے اور شعر و سخن کا مذاق اور ذوق ادب کا ہونا ایک دوسری چیز۔ علامہ شبلی نے جو کچھ لکھا ہے وہ آشنائے فن ہوکر لکھا ہے جس سے براؤن قطعاً محروم تھے۔ اس نوع کی دوسری تصنیف "موازنہ انیس و دبیر" ہے جسکے شایع ہونے پر بڑی لے دے ہوئی کہ ایک غیر شخص نے اس 'ارض ممنوعہ' میں کیوں قدم رکھا۔ چنانچہ اس کے جواب میں ایک صاحب نے بڑے زور شور سے "المیزان" لکھی جسمیں انصاف کے ساتھ انیس اور دبیر کے دونوں پلّے میزان میں برابر رکھنے کی کوشش کیگئی ہے جو موازنہ میں انیس کی طرف جھک گیا تھا۔ ان مصنفانہ مناظروں سے قطع نظر کرکے اگر انصاف سے دیکھا جائے تو شعر العجم اور موازنہ دونوں اردو لٹریچر میں اپنی کوئی نظیر نہیں رکھتیں۔

سب سے اخیر میں مولینا کے متفرق مضامین کا مجموعہ ہے جو "مقالات شبلی" اور "رسایل شبلی" کے نام سے الگ الگ موسوم ہے۔ ان میں بعض مضامین تو ایسے ہیں جو اردو میں تاریخی حیثیت سے اپنا مثل نہیں رکھتے۔ مثلاً "جزیہ"۔ "کتبخانہ اسکندریہ" اور "فلسفہ یونان و اسلام"۔ اول الذکر نہ صرف اسلام میں بلکہ تاریخ ہند میں بھی ایک مابہ النزاع مسئلہ رہا ہے غیر مسلمین پر اس ٹکس کا عاید کرنا نہ صرف طلبہ کے نزدیک بلکہ اساتذہ کے زمرہ میں بھی اسلام کا ایک بڑا ظلم سمجھا جاتا تھا' لیکن مولینا شبلی نے جس محققانہ طور پر اس بے بنیاد ظلم کی بیخکنی کی ہے' اسے دیکھکر مصنف کی مورخانہ قابلیت کا غیر ستایشی اعتراف کئے بغیر رہا نہیں جاسکتا۔ اسی طرح کتبخانہ اسکندریہ کے جلانے کا الزام بھی مسلمانوں کی گردن پر ایک زمانہ سے

چلا آتا تھا۔ یہاں تک کہ بیگانے تو بیگانے یگانوں کو بھی اس ظلم کا یقین ہو چلا تھا لیکن علامہ شبلی نے اصل حقیقت کو جس طرح بے نقاب کیا ہے، وہ ان کے وسیع ذرائع تاریخی پر دسترس رکھنے کا بین ثبوت ہے۔ اس سلسلے میں ایک چیز رہی جاتی ہے اور وہ مولانا کے مکتوبات ہیں جو ان کی غیر ارادی تحریر کا نمونہ ہیں اور وہ بھی کسی طرح ادبی حیثیت سے معاصرین کے مجموعۂ مکاتیب سے کم نہیں۔ نہ صرف یہی بلکہ برعکس اور لوگوں کے مکتوبات کے علمی و تعلیمی معلومات و مشاہدات کا وہ بیش بہا مجموعہ ہیں۔

خاتمہ سوال کے دونو پہلو یعنی ادبی اور علمی کا جہاں تک تعلق تھا، ان پر کافی بحث ہو چکی۔ اور ہر ایک کے واقعات و شواہد کا دستیاب ہونا جہاں تک ممکن تھا، وہ سب پیش کئے گئے۔ اب ان پر ایک اجمالی نظر ڈالنے سے یہ واضح ہو جائے گا کہ بے شک آزاد نے اردو زبان و ادب کا سنگ بنیاد رکھا اور نذیر احمد و حالی نے اس پر بہت کچھ اضافے کئے لیکن اس تعمیر کی تکمیل جس نے کی، وہ شبلی کی ذات تھی۔

یہ صحیح ہے کہ سلطنت مغلیہ کی بنیاد بابر نے ڈالی اور ہمایوں نے اسے بہت کچھ سنبھالا لیکن جس نے سلطنت مغلیہ کو اس قابل بنایا کہ وہ دنیا کی بڑی بڑی سلطنتوں میں شمار کئے جانے کے قابل ہو سکے، وہ شہنشاہ اکبر تھا۔ اس میں شبہ نہیں کہ آزاد نے اردو کا علمی زبان کی حیثیت سے تخم رکھا اور نذیر احمد اور حالی نے اس میں سلاست و روانی کے ذریعہ اس کی نشوونما کی، لیکن جس نے اردو کو دنیا کی اور زبانوں کے ساتھ آنکھیں ملانے کے قابل بنایا وہ شبلی تھے۔ اسی طرح اردو ادب کو جس نے ہتعدد مالا مال کیا کہ وہ اپنے ہمعصر لٹریچروں کے ہم پلہ ہو سکے، وہ شبلی کی ذات تھی، بے شک آزاد نے اشخاص کے حالات زندگی لکھے اور حالی نے اسے ترتیب دیکر ایک فن کی صورت میں کر دیا لیکن شبلی نے اس فن کو جس درجۂ کمال پر پہنچایا، اس کا ثبوت "الفاروق"، "سیرۃ النبیؐ" اور "الغزالی" دیکھتی ہیں۔ آزاد نے اردو

اور فارسی شاعری کی تاریخ اور شعرا کے حالات لکھے، حالی نے شعر و شاعری پر فلسفیانہ نقطۂ نظر سے لکھا، لیکن شبلی نے چار جلدوں میں "شعر العجم" اس مورخانہ اور فلسفیانہ نقطۂ خیال سے لکھی جسکے آگے آزاد کی "سخندان فارس" اور "آبحیات" اور حالی کا "مقدمہ" دبکر رہ گیا۔ آزاد و حالی نے اپنے بعض مخصوص شعرا کو لیکر "دیوان ذوق" اور "یادگار غالب" ترتیب دیا لیکن ذوق و غالب اپنے اپنے مرتبہ سے ایک انچ آگے نہ بڑھے۔ شبلی نے جب "موازنہ" لکھا تو انیس کی تمام عالم میں ایک دھوم مچ گئی۔ نذیر احمد نے اگر کسی سنجیدہ مضمون کو ہاتھ لگایا تو مذہب کو لیا اور وہ بھی خدمت دین کے خیال سے۔ لیکن شبلی نے مذہب کو ہاتھ لگایا تو اسوقت جبکہ وہ مغربی علوم اور سائنس کے نرغہ میں تھا انھوں نے "علم الکلام" اور "الکلام" اسی غرض سے لکھی کہ مذہب کو اس کے ان دشمنوں سے بچائیں۔ اور یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ ان تصانیف نے اس سے کہیں زیادہ فائدہ پہنچایا جتنا نذیر احمد کے ترجمۂ قران اور "الحقوق والفرائض" سے ہوسکتا تھا۔ شبلی نے ایک اسلام پر اسقدر لٹریچر فراہم کردیا، جتنا ان کے دیگر معاصرین نے کسی چھوٹے سے چھوٹے مضمون پر بھی نہیں کیا۔ اور اس بنا پر اردو اپنی فارسی اور عربی بہنوں کے مقابلہ میں جسقدر ناز کرے کم ہے۔ اسلام عرب سے اٹھا، فارس اس کا عرصہ تک مسکن تھا لیکن اس کے متعلق اسقدر گرانبہا سرمایہ مرتب صورت میں عربی و فارسی میں غالباً نہ ہوگا، جتنا اس ایک اردو میں ہے اور یہ سب شبلی کا طفیل ہے۔ غرض۔

ادب کا دیکھنا ہو یا تمھیں تاریخ کا مخزن + تو شبلی سا دحیہ عصر دکھلائے زمن دیکھو

سعید انصاری، علی گڈھ ۱۳ جنوری ۱۹۲۰ء

بسم اللہ الرحمن الرحیم

رجسٹرڈ نمبر

رسالہ

الناظر

لکھنؤ

ایڈیٹر ظفر الملک علوی

قیمت سالانہ للعہ مع محصول

الناظر پریس لکھنؤ میں چھپا

پرنٹر و پبلشر:۔ اسحاق علی علوی

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اردو کی بہترین کتابیں

مرزا غالب مرحوم

- اردوئے معلیٰ
- عود ہندی
- دیوان غالب جیبی
- مکمل دیوان غالب

سید مرحوم

- خطبات احمدیہ
- آثار الصنادید
- مکمل مجموعہ لکچر
- اسباب بغاوت ہند
- سیرت فریدیہ

نواب محسن الملک مرحوم

- مضامین تہذیب الاخلاق
- مکمل مجموعہ لکچر
- التقلید والعمل بالحدیث
- کتاب المحبت والشوق
- مکاتیب
- آیات بینات

خلیفہ محمد حسین مرحوم

- اعجاز التنزیل
- سیرت نبویہ جلد

مولانا آزاد مرحوم

- آب حیات
- سبد البری
- سخندان فارس
- نگارستان فارس
- نیرنگ خیال
- سیر ایران
- دربار اکبر
- مجموعہ مکتوبات آزاد
- مجموعہ نظم آزاد
- نصیحت کا کرن پھول
- جانورستان
- بیاض آزاد
- تذکرہ علماء
- نغمہ آزاد
- دیوان ذوق مرتبہ آزاد

پروفیسر شہباز مرحوم

- زندگانی بے نظیر
- خیالات شہباز

مولوی سید ممتاز علی

- تذکرۃ الانبیا
- شیخ حسن

مولانا نذیر احمد مرحوم

- حمائل شریف مترجم
- الحقوق والفرائض
- مرآۃ العروس
- بنات النعش
- توبۃ النصوح
- موعظہ حسنہ
- رویائے صادقہ
- ایامیٰ
- فسانۂ مبتلا
- ابن الوقت
- محصنات غدر
- مجموعہ نظم بے نظیر
- مکمل مجموعہ لکچر
- منتخب الحکایات
- چند پند
- مبادی الحکمۃ

مولانا شہری مرحوم

- حیات انیس
- ایشیائی شاعری
- نوجوان بیگم
- ٹیپو سلطان
- حیدر علی سلطان

مولانا حالی مرحوم

- یادگار غالب
- حیات سعدی
- حیات جاوید
- مقدمہ شعر و شاعری
- دیوان حالی
- مسدس حالی
- مجموعہ نظم حالی
- بیوہ کی مناجات
- شکوۂ ہند

مولوی بشیر الدین احمد

- واقعات دار الحکومت دہلی
- تاریخ بیجاپور
- حرز اطفال
- نشاط عمر
- عصائے پیری
- لخت جگر
- حسن معاشرت
- اصلاح معیشت
- اقبال دلہن
- شمع ہدایت
- انشائے بشیر
- دیوان بشیر

مولانا شبلی مرحوم

- سیرۃ النبی جلد اول
- سیرۃ النبی جلد دوم
- سیرۃ النبی جلد سوم
- الفاروق
- سیرۃ النعمان
- الغزالی
- المامون
- سوانح مولانا روم
- سفرنامہ مصر و روم و شام
- علم الکلام
- الکلام
- رسائل شبلی
- مقالات شبلی
- شعر العجم جلد اول
- شعر العجم جلد دوم
- شعر العجم جلد سوم
- شعر العجم جلد چہارم
- شعر العجم جلد پنجم
- موازنہ انیس و دبیر
- مضامین عالمگیر
- اغاز اسلام
- مجموعہ کلام شبلی اردو
- کلیات شبلی فارسی

مولانا ذکاء اللہ مرحوم

- تاریخ ہندوستان جلد
- تاریخ عہد سلطنت انگلشیہ
- آئین قیصری
- کرزن نامہ
- صحیفۂ فطرت
- تعلیم الانتظام
- محاربات عظیم
- جغرافیہ ریاضیہ
- جغرافیہ طبعی
- اہل عرب کا جبر و مقابلہ
- رسالۂ علم تناسب
- معاون الحساب
- مساحت ناہموار

سید محمود مرحوم

- کتاب الاطلاق
- کتاب الشفعہ
- لکچر
- شرح قانون شہادت

مولوی سید احمد

- المدنیۃ والاسلام
- تحریر المراۃ

ملنے کا پتہ: الناظر بک ایجنسی لکھنؤ

بسم اللہ

فہرست مضامین الناظر بابت ماہ جولائی ۱۹۲۶ء

جلد ۳۱ | نمبر ۱

ط

مطبوعاتِ جدیدہ

یادگارِ انیس

(مؤلفہ منشی امیر احمد علوی بی اے)

جسکے مقدمہ میں مرثیہ اور اسکی عہد بہ عہد ترقی کی تاریخ بیان کی گئی ہے۔ میر صاحب کے حالاتِ زندگی کے ساتھ ساتھ انکے کلام کا مرزا دبیر کے کلام سے موازنہ کیا گیا ہے اور دونوں کی خصوصیات کو نمایاں کرتے میر صاحب کے شاعرانہ کمالات کی داد دیگئی ہے۔ مولف کی تحریر میں جو روانی و رنگینی ہے اس سے ناظرین الناظر بخوبی آشنا ہیں۔ قیمت ۱۲؍

التربیۃ الاستقلالیہ

(مؤلفہ مولانا عبد السلام ندوی)

فرانسیسی زبان کی مشہور کتاب "انیسویں صدی کا اسپل" مصر کے عربی ترجمہ کی وساطت سے اردو زبان میں منتقل ہوئی ہے اور اس میں خطوط کے ذریعہ اس امر پر بحث کی گئی ہے کہ تعلیم و تربیت کے کونسے طریقے اور اصول قابل ترویج ہیں لایق مترجم نے مغربی طریقوں کے مقابل میں اپنے مبسوط مقدمہ میں وہ طریقۂ تربیت و تعلیم بھی درج کردیا ہے جو اسلامی طریقہ کہا جاتا ہے اور جسکے بدولت مسلمان تمام دنیا پر چھاگئے تھے۔ قیمت ۱۲؍

وقارِ حیات

یعنی نواب وقار الملک مرحوم کی نہایت مفصل، مکمل، دلچسپ و پراز معلومات سوانح عمری جو ایجوکیشنل کانفرنس کے زیر اہتمام نواب صدر یار جنگ مولوی حبیب الرحمن خاں شروانی کے مقدمہ کے ساتھ شایع ہوئی ہے۔ حجم تقریباً ۹۰۰ صفحہ۔ قیمت ۵؍

ملنے کا پتہ

الناظر بک ایجنسی لکھنؤ

بسم اللہ الرحمن الرحیم

الناظر

نمبر (۱) جلد (۳۱) ماہ جولائی سنہ ۱۹۲۶ء

جمہوریت افلاطون

(بسلسلۂ گذشتہ)

میرے ساتھ گلوکان اور اور لوگوں نے بھی تھراسیماکوس سے اصرار کرنا شروع کیا اور کہا کہ تقریر آپ ہی شروع کیجیے۔ کیونکہ یہ معلوم ہوگیا کہ تھراسیماکوس خود تقریر کرنے کا اور اُسکے ذریعہ سے لوگوں کی تعریفیں حاصل کرنے کا مشتاق ہے۔ اس وجہ سے کہ وہ اپنے جواب کو جو اُس کے دل میں تھا اور اُس وقت تک ظاہر نہ کرتا تھا، انوکھا اور نہایت اعلیٰ درجہ کا خیال کرتا تھا مگر اس پر بھی اُس نے یہی کہا کہ سلسلۂ کلام میری طرف سے شروع ہو۔ بالآخر راضی ہوگیا اور کہنے لگا:-

ت۔ "یہ سقراط کی چالاکی ہے۔ کیونکہ وہ کسی کو معرفت دینا نہیں چاہتے، بلکہ خود لوگوں سے حاصل کرنا چاہتے ہیں، اور پھر بھی کسی کا احسان نہیں مانتے۔"

س۔ "تمہارا پہلا جملہ یعنی میں اور لوگوں سے حصول معرفت کا خواہشمند ہوں، ضرور صحیح ہے۔ دوسرا جملہ یعنی میں کسی کو اُسکی معرفت کے صلہ میں کچھ نہیں دیتا غلط ہے۔ کیونکہ جو کچھ میں دے سکتا ہوں ضرور دیتا ہوں۔ اور چونکہ میرے پاس روپیہ موجود نہیں ہے اس سے خراج تعریف دیتا ہوں۔ اور تم خود دیکھ لوگے کہ یہ میرا دعویٰ کس قدر صحیح ہے۔ کیونکہ تمھارے جواب کی، اگر وہ میرے نزدیک صحیح ہوا، میں دل سے تعریف کروں گا۔ اور مجھکو امید ہے کہ تمھارا جواب ضرور اعلیٰ درجے کا ہوگا۔"

ت۔ "اگر تم میرا جواب سننے کے اس قدر مشتاق ہو تو سنو۔ میری رائے میں انصاف صرف قوی تر کے فائدہ کا نام ہے۔ اور کچھ نہیں۔ لو اب میری تعریفیں کرنا شروع کرو۔ کیا تم کو اس سے انکار ہے؟"

س "نہیں، مگر میں پہلے تمہارا مطلب اچھی طرح سمجھنا چاہتا ہوں جو اب تک میری سمجھ میں نہیں آیا۔ تم نے ابھی کہا کہ انصاف قوی تر کے فائدہ کا دوسرا نام ہے۔ تھراسیماکوس خدارا بتاؤ کہ اس تعریف سے تمہارا کیا مطلب ہے؟ یہ تو ہرگز ہو نہیں سکتا کہ پہلوان پالیڈیماس جو ہم سب سے زیادہ قوی ہے اگر اس کے بدن کی قوت بڑھانے میں گائے کا گوشت اسکو مفید پڑتا ہے تو ہم ایسے کمزور لوگوں کی قوت بڑھانے میں بھی کیا وہ مفید ہوگا، اور اس لیے کیا اس کا استعمال ہمارے واسطے قرین انصاف ہوگا؟"

ت۔ "سقراط، تم غضب کرتے ہو۔ میرے مسئلہ کو تم بخوبی سمجھتے ہو، مگر جان بوجھ کر اس سے اغماض کرتے ہو اور اسکو ایسے الفاظ میں بیان کرتے ہو جس سے اس پر اعتراض بہت آسانی سے وارد ہو سکتا ہے۔"

س۔ "نہیں ایسا تو نہیں ہے مہربانی کرکے اپنا مطلب صاف طور پر بیان کرو۔"

ت۔ "کیا تم کو نہیں معلوم کہ بعض شہروں میں حکومت شخصی (فرد یا شخص کی حکومت) بعض میں جمہوری (جمہور یا عوام کی حکومت) اور بعض میں حکومت رؤسا (رئیسوں یا خواص کی حکومت) ہے؟"

س۔ "مجھکو خوب معلوم ہے۔"

ت۔ "تو پھر کیا ہر شہر میں قوت اعلیٰ یعنی قوی تر کے ہاتھ میں نہیں ہوتی؟"

"بیشک ہوتی ہے۔"

"مزید براں ہر حکومت ایسے قوانین بناتی ہے جو اسکے فوائد کے لیے موزوں ہوتے ہیں۔ جمہوری حکومت جمہوری قوانین، شخصی حکومت جابرانہ قوانین؛ اور دیگر حکومتیں بھی اپنے فوائد کے لحاظ سے قوانین وضع کرتی ہیں۔ لہذا اس طرز عمل سے ہر حکومت اس امر کو تسلیم کر لیتی ہے کہ جو کچھ اسکے فوائد کے مطابق ہے وہ اسکی رعایا کے لیے بھی منصفانہ ہے۔ اسی لیے جو شخص اس اصول سے انحراف کرتا ہے اسکو وہ خلاف قانون اور خلاف انصاف قرار دے کر اسکے لیے سزا تجویز کرتی ہے۔ اب حضور والا، میرا مطلب صاف ہو گیا۔ یعنی تمام اقسام کی حکومتوں میں جزو مشترک یعنی حکومت کا فائدہ انصاف کہلاتا ہے اور ظاہر ہے کہ حکومت ہی رعایا کے مقابلہ میں

قوی تر ہے۔ لہذا صحیح نتیجہ یہ نکلا کہ قوی تر کا فائدہ ہر جگہ انصاف ہے۔
س۔" اب میں تمھارا مطلب سمجھا۔ اور اب یہ دیکھنا ہے کہ تمھارا دعوے کہاں تک صحیح اور کہاں تک غلط ہے۔ اس سے ایک بات ضرور صاف ہوگئی۔ یعنی یہ کہ تم خود اسکے[1] قائل ہو کہ انصاف ایک فائدہ ہے۔ حالانکہ اور لوگوں کو تم نے اس تعریف سے منع کیا تھا۔ البتہ اس میں ایک اضافہ کر دیا یعنی اسکو قوی تر کا فائدہ قرار دیا۔"
ت۔ "یہ سچ ہے مگر یہ تو ایک خفیف سا اضافہ ہے۔"
س۔ "یہی تو دیکھنا ہے کہ یہ ایک خفیف سا اضافہ ہے یا ایک اہم چیز ہے۔ اب ہم تمھاری دلیل کی صحت کو جانچیں گے۔ یہاں تک تو ہم دونوں اعتراف کرتے ہیں کہ انصاف فائدہ سے وابستہ ہے، مگر تم اس میں اتنا جزو اور بڑھا دیتے ہو کہ وہ قوی تر کا فائدہ ہے۔ اس میں مجھکو کلام ہے۔ اور اسی وجہ سے اس مسئلہ کی تحقیق لازم آئی۔"
ت "مہربانی کرکے ضرور کیجیے۔"
س " ضرور کی جائے گی۔ اچھا یہ بتاؤ تم اس امر کو مانتے ہو نہ کہ حاکموں کی اطاعت کرنا انصاف ہے؟"
ت " میں مانتا ہوں۔"
س " کیا ہر طرز حکومت میں حکام غلطی کرنے کی قابلیت رکھتے ہیں یا وہ غلطی نہیں کرسکتے؟"
ت "وہ غلطیاں ضرور کر سکتے ہیں۔"
س۔" اسکے یہ معنی ہوے کہ وضع قوانین میں کبھی انکا کام صحیح اور کبھی غلط ہو سکتا ہے؟"
ت "اس میں کیا شک ہے؟"
س "اب صحیح' اور غلط' سے یہی مطلب ہے کہ جو انکے فوائد کے مطابق ہو اسکو صحیح کہیں گے اور جو مخالف ہو اسکو غلط۔ یا کچھ اور؟
ت " یہی مطلب ہے جو تم نے بیان کیا۔"
س " اور تم اسکے بھی قائل ہو کہ جو کچھ حکام وضع کریں اسکی اطاعت رعایا کا فرض ہے۔ کیونکہ یہی انصاف ہے؟"
ت "بے شک میں اس کا قائل ہوں۔"
س " تو اس استدلال کے بموجب صرف قوی تر کا فائدہ ہی انصاف نہیں ہے بلکہ اسکے

[1] صفحہ ۱۲۔ الناظر ماہ جولائی ۱۹۲۳ء۔

فائدہ کا خلاف یعنی اُس کا نقصان بھی انصاف ہے۔"

ت "یہ تم کیا کہہ رہے ہو؟"

س "میں وہی کہتا ہوں جو تم کہتے ہو۔ اچھا اب ہم اس نکتہ کو ذرا غور سے دیکھیں، کیا یہ تم نے ابھی تسلیم نہیں کیا کہ جب حکام اپنی رعایا پر بعض احکام جاری کرتے ہیں تو وہ اپنے فائدہ کے لحاظ سے بعض اوقات غلطی کے مرتکب ہو سکتے ہیں۔ اور پھر یہ نہیں کہا جو احکام رعایا کے واسطے جاری کیے جائیں اُنکی تعمیل۔ عایا کو کرنا عین انصاف ہے۔ کیا یہ تم کو تسلیم نہیں ہے؟"

ت "یہ تو تسلیم ہے۔"

س "تو یہ میں تم سے کہے دیتا ہوں کہ جب تک تم اسکے قائل ہو کہ رعایا کو تعمیل احکام اپنے حکام کی ہر حالت میں انصاف ہے اُس وقت تک تم اسکے بھی ضرور قائل ہوئے کہ حکام (قوی تر) کے فائدہ کے خلاف (یعنی قوی تر کے نقصان کے) احکام کی تعمیل بھی ہر حالت میں انصاف ہے جبکہ حکام مذکور اپنے فائدہ کے خلاف بلا ارادہ احکام جاری کریں۔ پس اے نہایت عقلمند تھراسیماکوس! کیا تمھارے اس استدلال سے خود تمھارے کلیہ کے برعکس نتیجہ نہیں نکلا اور کیا یہ نہیں ثابت ہوا کہ ضعیف تر کے واسطے قوی تر کے فائدہ کے خلاف کام کرنا فرض ہوا جاتا ہے؟"

ت "اس میں کوئی شک نہیں۔ یہ نتیجہ تو ضرور نکلا۔"

کلائیٹوفون نے اس موقع پر کہا "بیشک اگر تم سقراط کی طرف سے گواہی دو۔"

پ "نہیں۔ ہم کو گواہوں کی ضرورت نہیں۔ تھراسیماکوس کو تو خود اعتراف ہے کہ حکام بعض وقت اپنے فائدہ کے خلاف احکام جاری کرتے ہیں۔ نیز یہ کہ اُنکی رعایا کو ایسے احکام ماننا عین انصاف ہے۔"

کل "نہیں۔ تھراسیماکوس کا یہ قول ہے کہ حاکموں کے احکام کی تعمیل انصاف ہے۔"

پ "کلائیٹوفون تم سچ کہتے ہو۔ اور یہ بھی تو ان کا قول ہے کہ قوی تر کا فائدہ انصاف ہے۔ اور جب یہ دونوں قضیے قائم ہو گئے تو تیسرا امر یہ تسلیم شدہ ہے کہ قوی تر (حاکم) ضعیف تر (رعایا) سے بعض اوقات ایسے احکام کی تعمیل کراتا ہے جو خود اُس کے فائدہ کے خلاف ہیں۔ تو نتیجہ ان سب باتوں کا یہ نکلا کہ قوی تر کا فائدہ اور نیز اُس کا نقصان دونوں انصاف ہیں۔"

کل "مگر قوی تر کے فائدہ سے اُنکا (تھراسیماکوس کا) مطلب ہے وہ چیز جسکو قوی تر اپنے

واسطے مفید خیال کرے۔ اور اُنکا دعویٰ صرف اسی قدر ہے کہ ضعیف تر کو اسکی تعمیل ضرور چاہئے۔ اور یہی انصاف ہے"۔

پ "نہیں یہ تو اُنکے الفاظ نہیں تھے"۔

س "پولیمارکوس! اس بحث سے کوئی فائدہ نہیں۔ اگر تھراسیماکوس اپنے دعوے کو اب اُن الفاظ میں بیان کرنا پسند کرتے ہیں تو ہم کو کوئی اعتراض نہیں وہ شوق سے بیان کریں۔ تھراسیماکوس! کیا انصاف کی تعریف تم نے یہ کی تھی کہ جو چیز قوی تر اپنے فائدہ کے واسطے خیال کرے عام اس سے کہ وہ دراصل اُسکے فائدہ کی ہو یا نہ ہو اور کیا ہم اس ترمیم شدہ تعریف کو اب تمہارا دعوےٰ خیال کریں؟"

ت "نہیں ہرگز نہیں۔ کیا تمہارے نزدیک ایسے آدمی کو جو غلطی کر رہا ہے غلطی کے ارتکاب کے وقت بھی میں قوی تر سمجھوں گا؟"

س "جب تم نے یہ تسلیم کرلیا کہ حکام غلطی کرسکتے ہیں تو میں یہی سمجھا"۔

ت "سقراط! تم الفاظ کے اُلٹ پھیر کے اُستاد ہو۔ بتاؤ کہ تم اُس شخص کو جو کسی مریض کے علاج میں غلطی کرے اُس غلطی کے اعتبار سے طبیب کہوگے؟ اسی طرح اُس شخص کو جو کسی حساب کتاب میں غلطی کرے اُس غلطی کے اعتبار سے محاسب کہوگے۔ گو کہ ہم سب عام بول چال میں کہتے ہیں کہ طبیب نے علاج میں یا محاسب نے حساب میں غلطی کی مگر میری رائے میں اِن دونوں صورتوں میں وہ شخص من حیث الفن غلطی نہیں کرسکتا۔ لہذا صحیح الفاظ میں کیونکہ تم صحت الفاظ کے بڑے دلدادہ ہو، میں یوں کہوں گا کہ کوئی اہل فن غلطی کر نہیں سکتا۔ اس وجہ سے کہ غلطی بوجہ عدم علم کے ہوتی ہے۔ لہذا غلطی کا مرتکب اُس حد تک اہل فن ہی نہیں پس کوئی شخص خواہ وہ اہل فن ہو یا فلسفی یا حاکم ہو غلطی نہیں کرسکتا جب تک وہ اہل فن یا فلسفی یا حاکم ہونے کا مدعی ہے۔ ہرچند کہ عام طور پر یہ ضرور کہا جائے گا کہ فلاں طبیب یا فلاں حاکم نے غلطی کی۔ اس معنی میں تم کو میرے گذشتہ جواب کو سمجھنا چاہیے تھا۔ بہر طور صحت الفاظ کے ساتھ وہ جواب یوں ہوگا کہ کوئی حاکم من حیث الحاکم غلطی نہیں کرسکتا۔ پس من حیث الحاکم وہ جو کچھ حکم دے گا اپنے فائدہ کے لیے دے گا اور اُسی کی تعمیل اُسکی رعایا پر فرض ہوگی۔ لہذا میں بھی وہی کہوں گا کہ قوی تر کے فائدہ کے واسطے جو کچھ کیا جائے وہ انصاف ہے"

س "بہت معقول۔ تھراسیماکوس! کیا تم مجھ کو الفاظ کے اُلٹ پھیر کا اُستاد خیال کرتے ہو؟"

بہت بڑا اُستاد "

س ۔ " کیا تم خیال کرتے ہو کہ میں تم سے سوال صرف اس نیت سے کرتا ہوں کہ تم بحث میں ایک مغالطہ میں پڑ جاؤ ؟

ت ۔ " اس میں شبہ کیا ہے ۔ بہر چند مغالطہ تم کو اس چال سے کبھی کوئی فائدہ نہ ہوگا ۔ نہ تم مجھکو کسی خفیہ دھوکہ سے مغالطہ میں ڈال سکتے ہو نہ کسی علانیہ دلیل سے معقول کر سکتے ہو "

س ۔ " میرے عزیز دوست ۔ میرا ہرگز ایسا ارادہ نہیں ہے ۔ خیر تاکہ پھر اس قسم کی غلط فہمی نہ واقع ہو مہربانی کرکے صاف طور پر یہ کہہ دو کہ تمہارے اس مقولہ میں کہ " ضعیف تر کے واسطے وہ چیز کرنا جو حاکم یا قوی تر کے فائدہ کی ہو عین انصاف ہے " لفظ حاکم " اور " قوی تر " تم معمولی اور عام فہم معنوں میں استعمال کرتے ہو یا اُن اصلی اور صحیح معنوں میں جن کا تم نے ابھی ذکر کیا ؟ "

ت ۔ " میں یہ لفظ بالکل اصلی اور صحیح معنوں میں استعمال کرتا ہوں ۔ لہذا اب آپکا جتنا جی چاہے الفاظ کو اُلٹیے پلٹیے مجھکو اسکی کچھ پرواہ نہ ہوگی "

س ۔ " کیا میں ایسا خبطی ہوں کہ شیر سے کھیلوں یا تھراسیماکوس اتنے بڑے حکیم سے الفاظ میں دھوکہ بازی کروں "

ت ۔ " ارادہ تو آپ کا ایسا ہی تھا ۔ گو آپ کی حیلہ بازی چل نہ سکی "

س ۔ " اب مذاق موقوف کرو اور اتنا بتاؤ کہ اُس طبیب سے جس کو تم نے صحیح معنوں میں طبیب ٹھہرایا تھا ، تمہاری مراد روپیہ پیدا کرنے والا ہے یا مریضوں کو صحت دینے والا ؟ "

ت " مریضوں کو صحت دینے والا "

س ۔ " اور صحیح معنی میں جہازراں سے کیا مراد ہے ۔ ملاح یا ملاحوں کا حاکم ؟ "

ت " ملاحوں کا حاکم "

س ۔ " اس سے تو کوئی مطلب نہیں کہ وہ جہازراں جہاز پر بھی ہو کیونکہ وہ اپنی موجودگی جہاز سے نہیں بلکہ اس وجہ سے جہازراں کہلاتا ہے کہ وہ جہازرانی کا فن جانتا ہے اور ملاحوں پر حکومت رکھتا ہے ۔

ت " یہ سچ ہے "

س ۔ " تو پھر ان میں سے ہر ایک شخص اپنا ذاتی فائدہ بھی رکھتا ہے یا نہیں ؟ "

ت ۔ " بے شک رکھتا ہے "

س - اور اُنکے فن کی کیا یہ غرض نہیں ہے کہ وہ اپنے نفع کے جویا ہوں"

ت - بیشک ہے"

س - کیا مختلف فنون کی کوئی اور غرض بھی ہوسکتی ہے سوائے اسکے کہ اُنھیں فنوں میں انتہائی کمال پیدا کیا جائے"

ت - اس سوال سے آپ کا کیا مطلب ہے؟

س - میرا یہ مطلب ہے کہ بالفرض اگر کوئی مجھ سے یہ پوچھے کہ آیا جسم انسانی بحیثیت جسم کے کامل ہے یا اُسکو کسی مزید چیز کی ضرورت ہے، تو میں یہ ضرور کہوں گا کہ اسکو ضرورت ہے۔ چنانچہ اسی اصول کی بنا پر فن طب کی ایجاد ہوئی، اسوجہ سے کہ چونکہ جسم انسانی ناقص ہے یعنے بحیثیت جسم وہ کافی و کامل نہیں ہے لہذا فن طب جو جسم انسانی کی بیرونی اغراض کو پورا کرتا ہے وجود میں آیا۔ مجھکو امید ہے کہ اب میرا مطلب آپ کے ذہن نشین ہو گیا ہوگا۔

ت - آپ کا خیال صحیح ہے۔

س - تو اب یہ صورت ہوئی کہ کیا فن طب بالذات ناقص ہے یعنی وہ کسی مزید مدد کا خواستگار ہے یا نہیں۔ مثلاً آنکھ کا کام دیکھنا ہے اور کان کا سننا تو ان اعضا کو ایک ایسے فن کی یقینی ضرورت ہے جو انکی اغراض کی تحقیق کریں اور انکو نفع پہونچائیں۔ پس میں پوچھتا ہوں کہ کسی فن میں بحیثیت فن کوئی نقص ہے یا نہیں، اس طرح کہ وہ اپنے اغراض کی ترقی اور فائدہ کے واسطے کسی دوسرے فن کا محتاج ہو اور وہ دوسرا فن اسی طرح کسی تیسرے فن کا محتاج الی غیر نہایۃ - یا یہ صورت ہے کہ وہ فن اپنی اغراض کی آپ تحقیق کرتا ہے اور انکو فائدہ پہونچاتا ہے - یا کسی فن کے واسطے یہ بالکل غیر ضروری ہے کہ وہ اپنے نقائص اور مایحتاج کی تحقیق اور تلاش کرے کیونکہ اس میں کسی قسم کے نقائص موجود ہی نہیں، نیز اس لیے کہ کسی فن کا من حیث الفن یہ کام نہیں ہے کہ وہ سوائے اپنے کسی دوسرے فن کے فوائد کی تلاش کرے اور خود وہ حقیقی معنوں میں ہر قسم کے نقائص اور معائب سے پاک ہے - اب اس سوال کو جیسا کہ ہم نے آپ سے طے ہوئے الفاظ کے صحیح صحیح معنوں میں غور سے دیکھیے اور فرمایئے کہ ایسا ہے یا نہیں -

ت - بظاہر تو ایسا ہی معلوم ہوتا ہے -

س - تو اس سے یہ نتیجہ نکلا کہ فن طب کو اپنے مقاصد و فوائد یعنی فن طب کے فوائد کا خیال نہ کرنا

چاہیے بلکہ جسم انسانی کے فوائد کا خیال رکھنا چاہیے۔

ت۔ جی ہاں۔

س۔ اور فن شہسواری کو فن شہسواری کے فوائد کا خیال نہ رکھنا چاہیے بلکہ گھوڑوں کے فوائد کا۔ اور اسی طرح کسی فن کو خود اپنے ذاتی فوائد کا خیال نہ رکھنا چاہیے (اس وجہ سے کہ وہ تو خود مکمل ہی ہے) بلکہ کسی شے کا جس سے کہ اُس فن کا تعلق ہے۔

ت۔ بظاہر تو ایسا ہی معلوم ہوتا ہے۔

س۔ تو اب آپ یقیناً اس بات کو تسلیم کریں گے کہ ہر فن اپنے موضوع سے یعنی اُس چیز سے کہ جس سے اُس کا تعلق ہوتا ہے قوی تر ہوتا ہے۔

تھراسیماکوس نے اس مسئلہ کو قبول کیا مگر کسی قدر پس و پیش کے ساتھ۔ اسکے بعد سقراط نے کہا کہ اس سے یہ نتیجہ نکلا کہ کوئی فن یا علم اپنے سے قوی تر کے فوائد کی تحقیق اور تلاش نہیں کرتا بلکہ اپنے موضوع کی جو اس سے ضعیف تر ہے۔

اس اصول کو بھی تھراسیماکوس نے نہایت دقت کے ساتھ بالآخر تسلیم کیا۔ جب یہ اصول تسلیم ہوگئے تو سقراط نے کہا کہ کیا یہ سچ نہیں ہے کہ کوئی طبیب بحیثیت طبیب اپنے ذاتی فوائد کا خیال نہیں رکھتا بلکہ اپنے مریض کے فائدہ کا خیال رکھتا ہے۔ اس وجہ سے کہ ابھی ہم تسلیم کر چکے ہیں کہ ایک حقیقی طبیب جسم انسانی کا حکمراں یعنی اس سے قوی تر ہے نہ کہ محض کسب زر کرنے والا۔

ت۔ البتہ یہ تسلیم ہے۔

س۔ اسی طرح ایک جہازراں حقیقی معنوں میں ملاحوں کا حکمراں ہے نہ کہ خود ملاح ہے۔

ت۔ یہ بھی ٹھیک ہے۔

س۔ تو اس قسم کا جہازراں خود جہازراں کے فوائد کا جویا نہ ہوگا بلکہ ملاح کے جو اُس سے ضعیف تر ہے۔

تھراسیماکوس نے اس کلیہ کو بھی جبراً و قہراً منظور رکھا۔

س۔ پس اس سے یہ صاف نتیجہ نکلا کہ وہ لوگ جو حکومت کے منصب پر ہیں جہاں تک کہ اُس حکومت کا تعلق ہے وہ اپنے ذاتی اغراض کا نہ تو خیال کرتے ہیں نہ اُن کے جویا ہیں بلکہ اپنے محکوموں کا کہ جن سے اُن کی حکومت کا تعلق ہے۔ اور اپنے ہر قول و فعل میں وہ

ہمیشہ اُنھیں کے فوائد کا خیال رکھتے ہیں نیز یہ کہ کون چیز اُن کے واسطے اچھی اور مناسب ہے
جب بحث اس نوبت تک پہونچی اور ہر شخص کو ظاہر ہوگیا کہ عدل کی تعریف جو پیشتر
کی گئی تھی اب بالکل برعکس ہوگئی تو تھراسیاکوس نے بجائے کوئی جواب دینے کے کہا
ت۔ سقراط یہ تو بتاؤ کہ تمھاری کوئی دایہ ہے یا نہیں؟
س۔ اس سوال کا کیا موقع ہے۔ تم کو چاہیے کہ میرے سوال کا جواب دو، نہ کہ اس قسم کی مہمل
اور فضول باتیں پوچھو۔"
یہ میں اس لیے پوچھتا ہوں کہ اگر تمھاری کوئی دایہ ہوتی تو وہ تمھاری صفائی کا خیال
کرتی۔ تمھاری ناک جو بہ رہی ہے اُسکو صاف کرتی اور شاید اسی بلے تو جہی کی وجہ سے تمھاری
یہ حالت ہوگئی ہے کہ تم گلہ اور گلّہ بان میں بھی کوئی فرق نہیں کرسکتے۔
س۔ یہ کیونکر؟
ت۔ یہ اس طور پر کہ تمھارا یہ خیال معلوم ہوتا ہے کہ چرواہے اور گلّہ بان اپنی بھیڑوں اور
اپنے گلّوں کو کھلاتے پلاتے اور انکو موٹا تازہ کرتے ہیں اُنکی خبرگیری کرتے ہیں شاید کسی دوسری
نظر سے سوائے اسکے کہ اُن سے وہ خود اور اُنکے مالک فائدہ اُٹھائیں۔ اسی طرح تمھارا یہ
خیال بھی معلوم ہوتا ہے کہ ریاستوں کے مالک (مالک سے میرا مطلب اُن لوگوں سے ہے جو
فی الحقیقت عنان حکومت اپنے ہاتھ میں رکھتے ہیں) اپنی رعایا کے ساتھ ایسے چرواہوں
اور گلہ بانوں سے شاید کچھ دوسرے انداز کا سلوک کرتے ہیں یا بہ الفاظِ دیگر وہ رات دن کسی
اور خیال میں رہتے ہیں سوائے اسکے کہ وہ کیونکر اپنی رعایا سے متمتع ہوں، اور تم عدل و ظلم اور
عادل و ظالم کے حقیقی مفہوم سے اتنے نا آشنا ہو کہ تم کو یہی نہیں معلوم کہ اول الذکر حقیقت میں
دوسرے کے فائدہ کا نام ہے یعنی فائدۂ قوی تر اور حاکم کا اور خود تمھارے نقصان کا نام ہے
جبکہ تم ماتحت اور غلام کی حیثیت رکھتے ہو اور آخر الذکر یعنی ظلم اسکے برعکس ہے یعنی اُس کی
حکومت دراصل اُنھیں پر ہے جو سیدھے سادے اور منصف مزاج لوگ ہوتے ہیں اور اپنی
سادگی سے اپنے حاکم کا جو اُن سے قوی تر ہوتا ہے کہنا مانتے ہیں اور اپنی خدمات سے اُسکی
خوشی پوری کرتے ہیں اور اپنی ذاتی فوائد کی مطلق پرواہ نہیں کرتے۔ اے میرے بھولے دوست
سقراط۔ تم ذیل کی مثالوں سے دریافت کرلوگے کہ ایک عادل ہر جگہ اور ہر موقع پر بمقابلہ
ایک ظالم کے ہمیشہ خسارہ میں رہتا ہے۔ مثلاً فرض کرو کہ ایک عادل اور ایک ظالم کے

اتھ ایک مشارکت ہوتی ہے تو فسخ مشارکت پر عادل کو ظالم سے کبھی زیادہ حصہ نہیں ملتا بلکہ ہمیشہ کچھ کم ہی ملتا ہے۔ پھر معاملات سیاسی میں تم دیکھوگے کہ ادائے محصول کے وقت عادل و ہمیشہ ظالم سے کچھ زیادہ ہی دینا پڑتا ہے ہرچند کہ جائداد کی مقدار اور مالیت ایک ہی ہو اور حاصل کرتے وقت ظالم سب کچھ لے لیتا ہے اور بیچارہ عادل منہ دیکھ کے رہ جاتا ہے۔ پھر جب کبھی حکومت کا عہدہ اُن کو ملتا ہے تو یہ دیکھا جاتا ہے کہ اس میں بھی عادل ہمیشہ نقصان میں رہتا ہے اُسکے ذاتی معاملات بوجہ اسکی عدم توجہ کے ابتر ہو جاتے ہیں اپنے سخت اصولوں کی پابندی کی وجہ سے سرکاری روپیہ سے وہ کوئی فائدہ نہیں حاصل کر سکتا۔ پھر ان سب پر طرہ یہ کہ اُسکے دوست اور شناسا بھی اُس سے ناراض ہو جاتے ہیں جب کبھی وہ انصاف کے خلاف اُنکی خدمت کرنے سے انکار کرتا ہے۔ ظالم کی حالت ہر چیز میں اسکے بالکل برعکس ہوتی ہے گر ظالم سے میری مراد وہی شخص ہے جو ایک بڑے پیمانہ پر حکومت کی قوت رکھتا ہو، تم کو اپنے خیال میں ہمیشہ ایسے ہی شخص کا تصور کرنا چاہیے۔ اگر یہ جانچنا تم کو منظور ہو کہ اپنے ذاتی مفاد کے لحاظ سے ظالم ہونا یا عادل ہونے سے کتنا اچھا ہے۔ یہ حقیقت نہایت آسانی سے تم پر واضح ہو جائیگی اگر تم اپنی توجہ ظلم کی اس کامل ترین صورت کی طرف مبذول کرو کہ جس میں ظالم تو ہمیشہ شادمان اور کامیاب، اور معمول جن پر ظلم ہوتا ہے اور جو بدلہ لینے کی طاقت نہیں رکھتے ہمیشہ دلریش اور ناکام رہتے ہیں۔ یہی صورت مطلق العنان حکومت کی ہے جس میں کہ چھوٹے پیمانہ پر نہیں بلکہ بڑے اور اعلیٰ پیمانہ پر حکومت دوسروں کی جائداد کھلم کھلا یا خفیہ طریقہ سے ہضم کرتی چلی جاتی ہے اور اسکی مطلق پرواہ نہیں کرتی کہ وہ جائداد پبلک ہے یا پرائیوٹ اشخاص کی ہے، وہ دینی اغراض سے تعلق رکھتی ہے یا دنیاوی کاموں سے — وہ ایسے جرائم کا ارتکاب معمولاً کرتی رہتی ہے کہ جنکو اگر کوئی شخص واحد کرے اور گرفتار کر لیا جائے تو وہ سزا کا مستوجب اور ذلیل و خوار ہوتا ہے۔ اور جب وہی جرائم اشخاص سے سرزد ہوتے ہیں تو اس قسم کے مجرموں کو کبھی مذہب شکن کبھی انسانوں کے لے بھاگنے والے کبھی چور، قزاق، اور ڈاکو کہتے ہیں، مگر لطف یہ ہے کہ جب کوئی شخص اپنے ہم وطنوں کی جائداد کے علاوہ اُن کی ذات کا بھی مالک ہو جاتا ہے یعنی اُنکو غلام بنا لیتا ہے تو مذکورۂ بالا بُرے لقبوں کے بجائے ایسا شخص نہایت کامیاب اور خوش نصیب کہلاتا ہے۔ نہ صرف اپنے ہی شہر اور وطن کے آدمیوں کی زبان سے بلکہ تمام ایسے غیر لوگوں کی زبان سے بھی جو اُس کے ظلم کے کارنامے سنتے ہیں۔ تو اس سے ثابت ہوا کہ لوگ ظلم کو بُرا کہتے ہیں اس

وجہ سے کہ وہ اُسکے ارتکاب سے نہیں بلکہ اُسکے اعمال سے خائف ہوتے ہیں۔ اسی وجہ سے میرے عزیز دوست، ظلم اگر بڑے پیمانہ پر کیا جائے تو بمقابلہ عدل کے زیادہ قوی، زیادہ وسیع اور زیادہ شاندار چیز ہے، اور جیسا کہ میں پہلے کہہ چکا ہوں عدل قوی تر کے فائدہ کا نام ہے اور ظلم ذاتی نفع اور فائدہ کی چیز ہے۔

(باقی)

مرزا محمد عسکری

جذباتِ اثر

تیرہ بختوں پہ اگر تیری نظر ہو جائے
ظلمتِ شب سے عیاں نورِ سحر ہو جائے

ایسی صورت کوئی اے دیدۂ تر ہو جائے
دل پہ جو گزرے اُنھیں اُسکی خبر ہو جائے

آستاں بوسیِ دلدار نہیں قسمت میں
آؤ اک سجدہ سرِ راہگذر ہو جائے

وضع کا پاس رہے دیدۂ خونناب فشاں
ایک ہی رنگ میں یہ عمر بسر ہو جائے

مقتضا عشق کا، مرجائیے گھُٹ گھُٹ کے یونہی
منتیں دل کی، فقط اُنکو خبر ہو جائے

ساتھ دے نکہتِ گُل کا نفسِ سُست خرام
چھاؤں تاروں کی رہے اور سفر ہو جائے

دل رہے یا نہ رہے جان رہے یا نہ رہے
کامیاب اُنکی نگاہوں سے نظر ہو جائے

تیرا ہر نقش قدم رشکِ لیلائے بہار
کاش یہ دل بھی تری راہگذر ہو جائے

آہ سوزاں! ابھی خاکسترِ دل باقی ہے
اور دم بھر کے لیے رقصِ شرر ہو جائے

وہ کوئی نیند سے انگڑائیاں لیتا اُٹھا
چاک کیونکر نہ گریبانِ سحر ہو جائے

والے بر دل جسے ہو صورت و معنی میں تمیز
حیف وہ ذوق کہ پابند نظر ہو جائے

حاصلِ شوق ہے جب خونِ تمناؤں کا
کل جو ہونا ہے نہ کیوں آج اثر ہو جائے

اثر لکھنوی

اصلاحِ سخن

اگلے وقتوں کے لوگ کہتے تھے کہ خدا ایک پیر ایک اُستاد ایک "یک در گیر و محکم گیر" اور اسی مقولہ کو پیش نظر رکھ کر شعرائے اُردو اپنا کلام اصلاح کے لیے ایک ہی اُستاد کے حضور میں پیش کیا کرتے تھے۔ اور جب تک کوئی آفت ارضی و سماوی نازل نہ ہو دوسرے کامل کے سامنے زانوے ادب تہ کرنا سعادتمندی کے خلاف سمجھتے تھے۔ لیکن بیسویں صدی عیسوی آزادخیالی کا عہد ہے۔ بزرگوں کے اقوال ناقابل عمل قرار دیے جاتے ہیں اور ہر شے میں ایک جدت تلاش کیجاتی ہے۔ لہذا اس عہد کے شاعر کو بھی "زمانہ با تو نسازد تو با زمانہ بساز" بجائے کسی ایک شخص کے شاگرد ہونے کے مختلف اساتذہ سے اصلاح لینا اور متعدد حضرات کو اپنا والد ماجد معنوی قرار دینا موجب صد برکات تصور فرمانا واجب ہے۔ فی الحقیقت ایک اُستاد کے خود ساختہ اور جبریہ اصول و ضوابط کی پابندی، قوتِ فکر کی بلند پروازی کے لیے جانگسل زنجیر ہے، اور جب تک موقع موقع سے اساتذہ کے درمیان جنگ زرگری نہ ہوتی رہے، نہ تو اُستادوں کے جوہرِ کمال پر صیقل ہو سکتی ہے اور نہ شاگرد کو اس امتیاز کا موقع مل سکتا ہے کہ زمانۂ حال کے لاتعداد بزعم خود اُستاد شعرا میں سے کس کی نظر وسیع تر ہے؟ کون زبان پر جان دیتا ہے، اور کون طرز بیان کا شفیتہ ہے؟ کس کو تازگیِ مضامین پسند ہے اور کس کو صفائی بندش پر اصرار ہے؟ کون اُستاد صرف الفاظ خوبصورت چاہتا ہے اُن میں معنی ہوں یا نہ ہوں، اور کون جذباتِ نادر کا متلاشی ہے عبارت صرف و نحو کے مطابق درست ہو یا نہ ہو؟ میں بھول گیا! یہ تحقیق بھی بغیر "ہر بادا دش بود بلبلے" کے نہیں ہو سکتی کہ زمانۂ حال کے اساتذہ کا اخلاقی معیار کیا ہے؟ کن کن شعرا کو "شیرینی" سے ذوق ہے؟ شاگردوں کے کلام پر اصلاح کی طرف کون حضرات متوجہ ہوتے اور کون کون بزرگ ہر غزل کے ایک دو شعروں پر صاد بنا دینا اُستادی کا خطاب پانے کے لیے کافی سبب خیال فرماتے ہیں؟ بالفاظِ دیگر مختلف اساتذہ کا امتحان لیے بغیر یہ مسئلہ حل نہیں ہو سکتا کہ بعض غلط العوام ترکیبوں مثلاً "میدان محشر" وغیرہ کو کون کون ذی علم بزرگ ناجائز قرار دیتے اور کون کون زبان پرست حضرات انکے استعمال پر اصرار کرتے ہیں؟

غرض متعدد اُستادوں کو اپنا کلام دکھانے میں صدگونہ فوائد ہیں اور انھیں اغراض نیک کو مدنظر رکھ کر قدامت پرست صوبۂ اودھ کے ایک جدت پسند شاعر سید عبدالعلی صاحب شوق سندیلوی نے ایک کم تین درجن "نامور و مستند شعرا کے چمنستان سخن کی گلچینی کی" اور انکے مجموعۂ اصلاحات کا ایک خوبصورت گلدستہ بنا کر مطبع مطلع النور علی گڈھ سے شایع کیا۔ گویا کہ پرستارانِ ادب کو دعوت عام دی کہ "خوان کرم" کشادہ ہے۔ اور "نصیبی برم" سے بہرہ اندوز ہو۔

اس گلدستہ میں دس غزلیں ہیں۔ پہلے مولف کا شعر جلی قلم سے لکھا ہے بعد کو اساتذہ کی اصلاحیں اور اُنکے ارشادات درج ہیں۔ حیرت ہوتی ہے کہ زمانۂ حال کے شعرا کس قدر متغائر مذاق رکھتے ہیں۔ جس شعر پر ایک اُستاد صاد بناتا ہے دوسرا اُسکو قلمزد کرتا ہے مثلاً

(۱) شوق صاحب کا شعر ہے:۔

مقام افسوس کا ہے تجھپہ دیدی جسنے جان آخر ۔ نہ اُسکے واسطے دل سے ترے دو گز زمیں نکلی

اسکو ایک بزرگ بمعنی بتلاتے ہیں اور قلمزد کرتے ہیں۔ دوسرے سخن فہم اس شعر پر صاد کرتے ہیں۔ چار نازک خیال اصلاح کی ضرورت نہیں سمجھتے، اور ایک کہنہ مشق یوں ترقی دیتے ہیں:۔

نہ دی اُسکو جگہ کوچہ میں جس نے جان دی اپنی ۔ تیرے دل سے اُسکے واسطے دو گز زمیں نکلی

(۲) شعر ہے:۔

آہ ظالم ہو چکی اک منتظر کی آنکھ بند ۔ اب ترا آنا نہ آنا سب برابر ہو گیا

ایک زباں داں معترض ہیں کہ "ایک ہی آنکھ بند ہو گئی دوسری کیوں نہ ہوئی"۔ دوسرے نکتہ شناس ارشاد فرماتے ہیں کہ "یہ شعر روح غزل ہے" اور اس پر چار صاد بناتے ہیں۔ ۱۱۶ اساتذہ اس شعر میں اصلاح کی ضرورت نہیں سمجھتے۔

(۳) شعر ہے:۔

دوزخ ہے ہمارے بہشت جنت ۔ ہم سے وہ کہیں جدا نہیں ہے

دو اُستاد اس شعر پر صاد بناتے ہیں۔ ۱۴ شعرا اصلاح کی ضرورت نہیں سمجھتے۔ ایک صاحب مبتدا و خبر پر معترض ہیں۔ دوسرے خوش فہم فرماتے ہیں کہ "دعوے کا ثبوت پاکیزہ نہیں" اور تین نازک دماغ اس شعر کو بغیر کسی دلیل کے قلمزد کرنے کا فتوے دیتے ہیں۔ ایک صاحب کی اصلاح ہے

دوزخ بھی بہشت ہے ہماری ۔ ہم سے وہ کہیں جدا نہیں ہے

سبحان اللہ!

(۴) شعر ہے :

آخری وقت بھی کیا ساتھ نباہا دل نے　　　روٹھنا اُنکا اُدھر دم کا خفا ہو جانا

ایک اُستاد کا اعتراض ہے کہ "دل نے کیا ساتھ نباہا؟ دم کا خفا ہو جانا کیا معنی؟ دوسرے بزرگ کا ارشاد ہے "آخری وقت کون کس سے روٹھتا ہے؟ اُس وقت تو ضرور رحم آجاتا ہے" ایک اداشناس فرماتے ہیں "بازہم روٹھنا اور خفا ہونا لطف دے رہا ہے؟" مگر تین اُستاد شعر پر صاد بناتے ہیں اور چھ بزرگ اصلاح کی ضرورت نہیں سمجھتے۔

(۵) شعر ہے :-

مآل کار اپنی ہستیِ موہوم کا یہ ہے　　　حیاتِ چند روزہ وہ بھی غفلت میں گذر جانا

ایک صاحب فرماتے ہیں "حیاتِ چند روزہ ہستیِ موہوم کا مآل نہیں بلکہ اسکی حقیقت ہے۔ اس کا مآل تو صرف فنا ہے" دوسرے صاحب کا قول ہے "یہ شعر نظری ہے نحوی غلطی ہے"۔ لیکن چھ صاد بناتے ہیں اور چھ اُستاد اصلاح کی ضرورت نہیں سمجھتے۔ وغیرہ وغیرہ وغیرہ۔

اس طلسمی گلدستہ میں یہ تماشہ بھی نظر آتا ہے کہ ہمارے زمانے کے بعض مستند اساتذہ بجائے اسکے کہ شاگرد کے مضمون کو ترقی دینے اور اسقام کو دُور کرنے کی کوشش کریں، نیا شعر تصنیف کر دیتے ہیں جسکو شاگرد کے خیال سے کچھ بھی واسطہ نہیں ہوتا۔ مثلاً

(۱) مقطع ہے :-

تری بیداریاں اے شوق تھیں تمہیدِ غفلت کی　　　وہ پردہ رات کا تھا جسکو آغازِ سحر جانا

اس پر اصلاح ہوتی ہے :-

نظر میں کیوں نہ پھرتی شوق پھر تصویر محشر کی　　　کسی کا سر جھکا کر تھا غضب وقتِ سحر جانا

سمجھ میں نہیں آیا کہ شاگرد کے خیال سے اصلاح شدہ شعر کو کیا تعلق ہے! البتہ یہ اصلاح قابل تعریف ہے :-

رہی اے شوق اک تمہیدِ غفلت میری بیداری　　　وہ تھا پچھلا پہر شب کا جسے میں نے سحر جانا

(۲) مقطع ہے :-

خوبرویوں سے کہیں تم کرکے محبت اے شوق　　　نہ خدا کے لیے مصدرِ بلا ہو جانا

"ایک مسلّم الثبوت اُستاد کی اصلاح ہے :-

مرگ عشاق [illegible]

دوسرے مستند بزرگ کا فرمان ہے :-

شوق نے عشق مجازی کا یہ دیکھا انجام　　پائے بندِ رہ تسلیم و رضا ہو جانا

افسوس ہے کہ شاگرد کے مضمون سے ان ترقی یافتہ اشعار کو جو نازک تعلق ہے وہ ہم ایسے ظاہر بینوں کو نظر نہیں آسکتا !! البتہ یہ اصلاح غنیمت ہے :

خوبرویوں کی محبت ہے مصیبت اے شوق　　تم خدارا نہ گرفتارِ بلا ہو جانا

(۳) شعر ہے :-

ہو چکی جامہ دری بخیہ گری ہوتی ہے　　اے جنوں بس یہی دو شغل ہیں دیوانوں کے

اصلاح دینے والے فرماتے ہیں :

وجد کرتے ہیں بیاباں میں بگولے لاکھوں　　عرس ہوتے ہیں بڑی دھوم سے دیوانوں کے

شاگرد کے مضمون سے سوائے قافیہ کے کیا واسطہ ہے ؟

بیشک حسب ذیل اصلاح قدر کے قابل ہے :

ہے کبھی جامہ دری اور کبھی بخیہ گری　　جوشِ وحشت میں یہ دو شغل ہیں دیوانوں کے

ان "تنوعات" اور اختلافات مذاق سے لطف اندوز ہونے کے علاوہ گلدستہ کے تماشائی کے لیے عبرت حاصل کرنے اور صحتِ الفاظ کا معیار دریافت کرنے کے واسطے ایک حصہ اُس دلچسپ خط وکتابت کا بھی بطور ضمیمہ کے شامل کر دیا گیا ہے جو جناب شوق اور اُن کے بعض اساتذہ کے درمیان ہوئی ہے ۔ سچ تو یہ ہے کہ مجھ کو نظم سے زیادہ نہیں تو اُسکے برابر اس نثر میں لطف آیا، اور علم الادب ان کا یہ اصول دریافت ہوگیا کہ شعرا کی زبان میں شیرینی اس وجہ سے ہوتی ہے کہ وہ بالطبع مٹھائی کے شوقین ہوا کرتے ہیں !!

اب بادشاہ اور وزیر تو رہے نہیں جن کی "حمد و نعت" میں قصیدے لکھ کر الوان نعمت کے خوان حاصل کیے جائیں ۔ مٹھائی کھانے کا اکلوتا وسیلہ شاگردوں کی جیب ہے !!

ایک بزرگ فرماتے ہیں کہ "استاد ذوق کے وقت سے یہ معمول ہے کہ جو صاحب اصلاح لیتے ہیں اُن سے بغرض فاتحہ بزرگاں و اساتذۂ سلف اُن کی توفیق و ہمت کے مطابق کچھ زرِ نقد منگا کر مٹھائی تقسیم کر دی جاتی ہے، لہٰذا حسب توفیق بھیجیے ۔ باقی رہی اُستادی خدمت، یہ آپ جانیں اور آپ کی ہمت"۔

دوسرے اُستاد فرماتے ہیں کہ "آپ کے پیر بھائی شاگردی کی مٹھائی مانگتے ہیں"۔

تیسرے صاحب لکھتے ہیں "آپ نے جوابی لفافہ کیوں لکھا؟ کیا سندیلہ میں اب لڈو نہیں بنتے جو آدھ آنہ کا ٹکٹ لگایا ہے"۔

ایک اُستاد جو ذرا غیور ہیں تحریر فرماتے ہیں "کیا آپ بخوشیِ خاطر کچھ نذرانۂ شاگردی بھیج سکتے ہیں کہ مفید و کارآمد کتابیں شعر و سخن کی میں چھپوا سکوں"۔

دوسرے بزرگ فرمان صادر کرتے ہیں "میرے دیوان کو میرے شاگرد اپنے مصارف سے چھپوانا چاہتے ہیں، تم بھی حسبِ توفیق چندہ میں شامل ہو۔ یہ پہلا بار ہے جو ڈالا جاتا ہے"۔

ابتدائے عشق ہے روتا ہے کیا؟

غرض زمانہ حال کے شعرا کی قابلیت اور اخلاقی حالت دونوں اس گلدستہ سے نمایاں ہیں۔ حضرت شوق کی جدت پسندی قابلِ صد صاد ہے۔ خدا کرے کہ وہ اپنا سارا دیوان اسی التزام سے شایع کریں اور ادب اُردو کو منت گذاری کا موقع دیں۔

ابناءِ زمانہ کی وضع ہے کہ کتاب کے ساتھ ایک "مقدمہ" یا "دیباچہ" کی بھی پخر لگاتے ہیں لیکن حضرت شوق ہمیشہ وحدت کی جگہ کثرت پسند کرتے ہیں، اس لیے "اصلاحِ سخن" کے آغاز میں پہلے ایک "تقریب" حضرت نیاز فتحپوری کی لکھی ہوئی ہے جو خلیفۂ دشوار نویسی (گویم مشکل وگر نگویم مشکل) کے معلمِ ثانی ہیں۔ اُسکے بعد "دیباچہ" مولانا عبدالحلیم شرر کا طبعزاد ہے جو لکھنؤ و اکبرآباد کے موجودہ طرزِ نثر نگاری کے معلمِ اول ہیں۔ تیسرے نمبر پر ایک "مقدمہ" سلطان حیدر صاحب جوش بدایونی کے زورِ قلم کا نتیجہ ہے جو شوخی اور سحر طرازی میں جدید تعلیم یافتہ جماعت کے معلمِ امر ہیں۔ چوتھے نمبر پر "التماس" ہے جو خود حضرت معلم الشعراء عبدالعلی صاحب شوق کے پاکیزہ خیالات کا اظہار ہے۔ سرنامہ ہنوز شایع نہیں ہوا، اُسکے لیے غالباً عالمِ ملکوت کا کوئی معلم تلاش ہو رہا ہے۔ جو بات کی خدا کی قسم لاجواب کی۔

بحیثیت مجموعی یہ بیش قیمت کتاب اپنے طرز کی پہلی تصنیف ہے۔ اور مُلک کے لیے ایسی تالیفات کی سخت ضرورت ہے۔ خدا قبولیتِ عام نصیب کرے

این دعا از من و از جملہ جہاں آمین باد

امیر احمد علوی

تاج المآثر

تاج المآثر مسلمانوں کی فتوحات ہند اور سلطنت دہلی کی سب سے پہلی تاریخ اور مسلمانوں کے ہندوستان خاص پر تسلط حاصل کرنے کے بعد کی سب سے پہلی تصنیف ہے جو پایۂ تخت دہلی میں لکھی گئی، شہر دہلی کو پرتھی راج کی شکست کے ایک سال بعد ۵۸۹ھ میں مسلمانوں نے اپنا مستقر بنا لیا تھا لیکن سلطان شہاب الدین غوری کی زندگی تک دہلی کی حیثیت محض ایک صوبہ کے صدر مقام کی سی رہی اور یہ امر بھی یقینی نہیں ہے کہ آیا شروع شروع میں تھنکر (بیانہ) اور کول (علیگڑھ) وغیرہ مقامات کے صوبہ دار دہلی کے والی قطب الدین ایبک کے ماتحت بھی تھے یا نہیں، البتہ ۶۰۲ھ میں جب سلطان شہاب الدین غوری ملاحدہ اسمٰعیلیہ کے ہاتھ سے جہلم کے کنارے شہید ہوا، تو قطب الدین ایبک ممالک ہند کا خود مختار بادشاہ ہو گیا اور دہلی ہندوستان کی سب سے پہلی آزاد سلطنت کا صدر مقام بن گئی۔ ظاہرا اسی زمانہ میں دہلی اور دہلی کے نئے بادشاہ کی ایک علیحدہ تاریخ لکھنے کی ضرورت محسوس ہوئی اور یہ خدمت نیشاپور کے نو وارد ادیب نظام الدین حسن نظامی کے سپرد کی گئی۔ سلطان شہاب الدین غوری کا انتقال پہلی یا تیسری شعبان ۶۰۲ھ کو ہوا تھا، شاید اسی بنا پر ایلیٹ نے قیاس کیا ہے کہ تاج المآثر کی تالیف کا آغاز شعبان ۶۰۲ھ میں کیا گیا، ورنہ جو قلمی نسخہ میرے سامنے ہے اس میں صرف "در شہور سنہ اثنی و ستمائۃ" تحریر ہے۔

تاج المآثر میں تاریخی واقعات کو دوسری جنگ ترائن سے شروع کیا ہے جو فی الواقع تمام ہندوستان کی فتح کی سرآغاز ثابت ہوئی، اور عام نسخوں میں ۶۱۴ھ تک کے حالات ہیں، بہ الفاظِ دیگر یہ کل ۲۶ برس کے مقامی واقعات کی تاریخ ہے اور چونکہ مصنف خود پایۂ تخت دہلی میں موجود اور سربرآوردہ لوگوں سے میل جول اور واقعات کی تحقیق و تلاش کے بہترین مواقع رکھتا تھا اس لیے خواہ مخواہ خیال ہوتا ہے کہ تاج المآثر اس عہد کی سب سے مفید اور مستند تاریخ ہوگی، لیکن حقیقت میں ایسا نہیں ہے، بلکہ کتاب لکھنے سے مصنف کا مقصد صرف بادشاہ کی مدح سرائی اور اپنی انشا پردازی کے کمالات کا اظہار کرنا ہے، واقعات تاریخی کی تحقیق و تفصیل پر وہ چنداں اعتنا نہیں کرتا اور بحیثیت تاریخ اسکی ضخیم کتاب تشنہ اور

ناقص ہے۔
اس زمانہ کی تاریخوں میں تاج المآثر کے گمنام وغیر معروف ہونے کا سب بڑا سبب یہی ہے ورنہ اسلامی تاریخ میں بلکہ خود دنیا کی تاریخ میں مسلمانوں کا شمالی ہندوستان کو فتح کرنا اور یہاں ایک آزاد اسلامی سلطنت کا قائم ہونا بڑا واقعہ ہے۔ چنانچہ اس عہد کی لکھی ہوئی دوسری تاریخ طبقات ناصری ہمیشہ سے اہل تاریخ میں مقبول و متداول رہی حالانکہ وہ تاج المآثر سے پچاس برس بعد لکھی گئی اور ہندوستان کے متعلق اس میں جو کچھ لکھا ہے وہ سب ملاکر ضخامت میں تاج المآثر کے نصف حصہ کے برابر بھی نہیں ہے، برخلاف طبقات ناصری کے ہم دیکھتے ہیں کہ تاج المآثر اور اسکے مولف کا ہمعصر تصانیف میں تو کہیں ذکر ہی نہیں آتا اور بعد کی کتابوں میں بھی بہت سرسری حوالہ دیا گیا ہے، کشف الظنون میں آدھی سطر میں اس کا ذکر ہے اور اس میں اور روضۃ الصفا میں مصنف کا نام غلطی سے "صدر الدین" تحریر کردیا ہے۔ تاریخ گزیدہ کے آخری فصول میں یہ دلچسپ اطلاع درج ہے کہ نظامی صاحب تاج المآثر مشہور شاعر و ادیب نظامی عروضی (سمرقندی) کا فرزند تھا' (گزیدہ۔ مطبوعہ لندن صفحہ ۸۲۶) لیکن فاضل مورخ نے جہاں "تاریخ گزیدہ" کے ماخذ گنوائے ہیں اُن میں تاج المآثر کو داخل نہیں کیا۔ قریب تر زمانے میں نظام الدین بخشی اور ابوالقاسم فرشتہ تاج المآثر کا ذکر کرتے ہیں اور موجودہ نسخوں کے سنین کتابت دیکھنے سے قیاس ہوتا ہے کہ عہد اکبری میں یہ کتاب خاصی مقبول تھی۔

زمانۂ حال میں سب سے پہلے جرمن مستشرق ہیمر نے اپنی کتاب گاال ڈسآل میں تاج المآثر پر ایک مختصر تبصرہ لکھا جس میں غلطی سے مصنف کو "لاہوری" بتایا گیا ہے۔ میجر لیس (ال ال ڈی) نے ہندوستان کی تاریخوں پر ایک مضمون میں تاج المآثر کا ذکر کیا ہے (رسالہ ایشیاٹک سوسائٹی لندن ماہ جنوری ۱۸۶۸ء) اور اُن کا ارادہ تھا کہ تاج المآثر کو چھپوا دیا جائے مگر یہ ارادہ پورا نہیں ہوا، آخر میں سرہنری الیٹ نے اپنی مشہور تاریخ ہند کی دوسری جلد میں تاج المآثر پر تبصرہ اور اسکے تھوڑے سے حصہ کا انگریزی ترجمہ شایع کیا۔

سرہنری الیٹ کو تلاش کے باوجود تاج المآثر کے صرف چند نسخوں کا پتہ چلا اور وہ اسے بہت کمیاب سمجھتے تھے لیکن چند سال بعد جب میجر راورٹی نے ۱۸۷۳ء میں طبقات ناصری کا ترجمہ شروع کیا تو اُنکے سامنے تاج المآثر کے بھی چار نسخے تھے اور اب بھی یورپ کے کتاب خانوں میں اس کتاب کے کئی نسخے موجود ہیں جن میں برٹش میوزیم کا ایک نسخہ سب سے قدیم یعنی

١١٢٣ھ کی کتابت ہے

کتاب کے عام نسخوں میں جیسا کہ میں نے اوپر عرض کیا ۵۸۷ھ سے ۶۱۴ھ تک کے حالات ملتے ہیں، لیکن سرہنری الیٹ کا بیان ہے کہ نواب ضیاء الدین خاں دہلوی کے کتاب خانہ میں جو نسخہ اُنھوں نے دیکھا اُس میں ۶۲۶ھ یعنی سلطان شمس الدین التمش کی وفات سے دو سال تک کے واقعات درج تھے۔ اس نسخہ کا اب پتہ نہیں چلتا کہ کہاں گیا لیکن اگر سرہنری کا قول صحیح ہو تو بھی سچ یہ ہے کہ کتاب کا اصلی موضوع سلطان قطب الدین ہی کے کارنامے ہیں اور اُسکے انتقال کے بعد مصنف نے جو کچھ لکھا ہے اُس میں وہ ذوق وشوق اور اہتمام نہیں پایا جاتا جو قطب الدین کے حالات لکھنے میں کیا گیا ہے۔

دوسرے نسخوں کے حالات پڑھنے سے معلوم ہوتاہے کہ ہمارے زیرِ نظر کتب خانۂ آصفیہ کے نسخے اور یورپ کے نسخوں میں کوئی خاص فرق نہیں ہے۔ ہمارا نسخہ متوسط تقطیع کے (١٩ سطر فی صفحہ کے) ٧٢٢ صفحات پر مشتمل ہے اور ہمیر کے نسخہ کی مثل اسکی بھی کل سطریں تقریباً بارہ ہزار ہیں جن میں سے سات ہزار کے قریب صرف اشعار ہیں، ہمارے نسخے میں کہیں کہیں الفاظ چھوٹ گئے ہیں اور کتابت کی اکثر غلطیاں پائی جاتی ہیں۔ کتابت کا سنہ کہیں درج نہیں لیکن لکھا ہے کہ یہ نسخہ صدر الملۃ والحق مولانا محمد بن محمد الحویتی کے نسخہ سے نقل کیا گیا ہے اور کتاب کے آخر میں ان ہی صاحب کی تقریظ بھی درج ہے اور مجھے خیال ہوتا ہے کہ شاید اسی تقریظ نگار کے نام سے حاجی خلیفہ کو یہ غلط فہمی ہوئی کہ مولف کتاب کا نام صدرالدین سمجھا کیونکہ جیسا کہ الیٹ نے لکھا ہے یہ تقریظ بہت قدیم نسخوں میں بھی موجود ہے۔ فاضل تقریظ نگار نے مولف کی تعریف میں زمین آسمان کے قلابے ملائے ہیں لیکن افسوس ہے اسکی ولادت، وفات یا حالات زندگی کے متعلق کوئی کارآمد بات نہیں لکھی۔

دوسری کسی متداول تاریخ یا تذکرۂ شعرا میں مصنف کا نام نظر نہیں آتا، حالانکہ اسکے اعلیٰ درجہ کے ادیب اور قادر الکلام شاعر ہونے کے ثبوت میں تاج المآثر کا پیش کردینا کافی ہے، اور اسی کتاب میں جا بجا اس نے مختلف مضامین کے جو شعر لکھے ہیں اُنھیں جمع کیا جائے تو بہت خاصا مجموعہ مرتب ہو سکتا ہے، بہر حال اسکے ذاتی حالات سے قطع نظر کرکے ہمیں اصل کتاب پر ایک نظر ڈالنی چاہیے جسکے ابتدائی حصہ میں مصنف نے مختصر طور پر اپنا حال بھی لکھا ہے کہ وہ کس طرح نیشاپور سے دہلی پہونچا۔

حمد و نعت کے بعد مصنف نے "افتتاح سخن" کے عنوان سے جہاد کی ضرورت پر تقریر کی ہے کہ "اگرچہ ..... مناظم احوال عالم بے واسطۂ قلم محال باشد اما بے تیغ قواعد دولت و ارکانِ ملک استوار کردہ نیاید ..... احکام معدلت و قوانین انصاف بر رعایا و زیردستاں کہ ودائع آفریدگار جلت قدرتہ اند، احکام نپذیرد ..... و بہیچ وجہ قلم فتویٰ ارباب علم پاکہ میراث داران شرع نبوی اند فر و شکوہ پیدا نآید، و عقلا از جہت این معنی گفتہ اند ؎

ملک را چوں قرار خواہی داد — تیغ را بے قرار باید کرد"

اسی سلسلہ میں مولف قطب الدین ایبک کی جنگجوئی اور کشورستانی اور ہندوستان جیسے دار الکفر میں اسکی جلیل القدر اسلامی خدمات کی بڑی شد و مد کے ساتھ مدح و ستائش کرتا ہے کہ:-

"از تیغ او بجاے صلیب و کلیسیا — در دار کفر مسجد و محراب و منبر است
آنجا کہ بود نعرہ و فریاد مشرکاں — اکنوں خروش و نعرۂ اللہ اکبر است"

پھر مصنف قطب الدین کے عدل و انصاف اور سخاوت و دریا دلی کی تعریف کے بعد "شرح حال مرتب این مجموعہ" کے عنوان سے اپنے متعلق لکھتا ہے کہ "بندہ و بندہ زادہ حسن نظامی" اپنا تذکرہ کرنا چاہتا تھا لیکن رہا نہ گیا اور مختصر طور پر اپنی عبرتناک سرگذشت عرض کرتا ہوں کہ جب خراسان میں ہلچل ہوئی اور اہل معنی کی طرف التفات کم ہو گیا تو میں نے وطن سے باہر جانے کا ارادہ کیا۔ "در طلب مقصود با دوستان پند پذیر عذر مسیر تقریر کرد" لیکن پہلی دفعہ احباب کے کہنے سننے سے وہ رک گیا اور ایک عرصہ تک انتظار کرتا رہا کہ خراسان کی حالت بہتر ہو جائے، مگر فتنہ و فساد بڑھتا گیا اور خانگی آلام و افکار نے مصنف کو اس درجہ پریشان کیا کہ وہ فی الواقع رو دیا اور آخر کار اس سے قبل کہ جوانی "کہ موسم عیش و تمتع است نہایت پذیرد" اس نے ترک وطن کی ٹھان لی اور یہ سمجھ کے کہ ؎

مردم بشہر خویش ندارد بسے خطر — گوہر بکان خویش ندارد بسے بہا

وہ اپنے شیخ (۹) مولانا محمد کوفی کے مشورہ سے غزنی روانہ ہو گیا۔

مصنف نے خراسان کی ہل چل کا اجمالی طور پر اشارہ کیا ہے لیکن ظاہر ہے کہ اس سے مراد ۵۵۰ھ کے بعد کا وہی زمانہ ہو سکتا ہے جس میں سلطان سنجر کے قبائل غز سے شکست اور وفات کے بعد خراسان میں پچیس تیس برس تک طوائف الملوکی اور بدنظمی رہی، قیاس چاہتا ہے کہ ہمارے مصنف کی ولادت بھی چھٹی صدی کے اسی وسطی زمانہ میں ہوئی اور چھٹی صدی کے آخری سنین

میں جب وہ اپنا وطن چھوڑ کر غزنی روانہ ہوا ہے تو اُس کی عمر کم و بیش چالیس سال کی تھی کیونکہ اُسکے باپ نظامی سمرقندی کی مشہور و معروف کتاب چہار مقالہ سے اتنا ہمیں یقینی طور پر معلوم ہے کہ ۵۵۰ھ ہی میں نظامی سمرقندی کی عمر ساٹھ سال سے متجاوز ہو چکی تھی، اس جگہ ضمناً یہ بیان کر دینا بھی دلچسپی سے خالی نہ ہوگا کہ گو نظامی سمرقندی کا اصلی وطن سمرقند تھا اور وہ سلاطین غور کی سرکار میں ملازم ہو گیا تھا لیکن اس کی آمد و رفت بار بار نیشاپور میں رہتی تھی، اور ہمارے مصنف کے حالات سے نتیجہ نکلتا ہے کہ آخر میں نیشاپور ہی اُس کا گھر بنگیا تھا اور اُسکے اہل و عیال یہیں سکونت رکھتے تھے۔

مصنف کے غزنی آنے کا زمانہ وہ ہے جبکہ قبائل غز کے قبضہ سے چھین کر غوریوں نے اس شہر کو اپنا مستقر بنایا تھا اور سلطان معز الدین (یا شہاب الدین) غوری کی اقبالمندی اُمید دلاتی تھی کہ اسکے چچا نے جس پایۂ تخت کو جلا کے خاک کر دیا تھا وہ دوبارہ اسے معمور و بارونق بنا دے گا۔ لیکن سلطان معز الدین جس طرح ملک گیری اور اوصاف سپہ سالاری میں سلطان محمود سے کمتر ہے اسی طرح تعمیر و تنظیم بلاد میں بھی اس کا ہم رتبہ نہ تھا۔ ہمارے مصنف کو تھوڑے عرصہ کے بعد مصلحت اسی میں نظر آئی کہ غزنی کو خیر باد کہے اور "شہر دہلی کہ خطۂ کرم و قبلۂ نعم است" کا رخ کرے۔ مصنف نے خراسان سے ترکِ وطن یا غزنی سے اپنی روانگی کی کوئی تاریخ نہیں لکھی مگر ظاہر ہے کہ اس کا ہندوستان کے جدید اسلامی صدر مقام کو روانہ ہونا، فتح دہلی یعنی ۵۸۹ھ کے بعد کا واقعہ ہے۔

سفر ہندوستان کا مصنف نے شاعرانہ پیرایہ میں بہت دلچسپ حال لکھا ہے، وہ ایک تیز رفتار گھوڑے پر سوار بڑی بڑی منزلیں طے کرتا ہوا روانہ ہوا، لیکن شروع سفر میں نہایت ناہموار زمین سے گذر ہوا، راستہ کے وہ غیر معمولی نشیب و فراز جن کی اُس نے خوب ہجو کی ہے، غزنی سے دریائے جہلم تک اسے ملے ہونگے مگر اس کوہستانی علاقہ سے آگے بڑھ کر بعض بیابان ایسے آئے کہ" از نہیب آں ستارہ بر آسمان راہ گم کردے و دلیل از فضائے آں ہزار حیلہ جاں گراں بردے ....

رہے گرفتم در پیش من کہ بود دراو بجاے سبزہ سنگ و بجاے آب سراب
زمیں چو کام نہنگ و گیا چو پنجۂ شیر سپہر چوں دُم طاؤس و شب چو پر غراب"

معلوم ہوتا ہے کہ برسات کا زمانہ تھا جس میں مصنف نے مغربی پنجاب کا سفر کیا اور

پہلی مرتبہ ہندوستان کی گرمی کا مزہ چکھا، ہوا کی حدت اور آفتاب کی تمازت نے اسکے حواس بگاڑ دیے تھے کہ اوپر سے موسلا دھار بارش شروع ہوئی، راستہ میں کئی بڑے بڑے دریا ملے جن سے مصنف خوفزدہ ہوا لیکن ساتھ والے ان سب چیزوں کے عادی تھے، وہ انکے ساتھ ساتھ جس طرح ہوا انھیں عبور کر گیا، جنگل میں بڑے بڑے شیر اور غار و صحرا میں دو چار ایسے زبردست سانپ دیکھنے میں آئے جن کی پھنکار سے روز روشن شب تار بن جاتا تھا اور ہوا کے مزاج میں وبائی سمیت پیدا ہو جاتی تھی، انکی عجیب عجیب شکلیں اور نقش و نگار ایسے چمکتے تھے کہ گویا صحنِ صحرا میں کچی چاندی کے ورق بکھرے ہوے ہیں، اسی سفر میں پہلی مرتبہ مصنف نے ہندوستان کے تیزپا، رہزن پیشہ، سیاہ فام باشندے دیکھے۔

دہلی پہونچ کر مصنف سفر کی صعوبت سے علیل ہو گیا تھا، جب طبیعت درست ہوئی تو صدر عالی شرف الملک سے ملا اور اس نے مصنف کے حال پر بہت نوازش کی۔ ایک شرف الملک کا ذکر ہم طبقات ناصری میں بھی پڑھتے ہیں جو سلطان ناصرالدین کے دربار کا معزز رکن اور امیر صاحب کے عہدہ پر سرفراز تھا، لیکن "صدر عالی" سے مراد ظاہرا عدالت کا وہ اعلیٰ عہدہ دار ہے جسے بعد میں "صدر جہاں" اور "صدر الصدور" وغیرہ کے ناموں سے یاد کرتے لگے اور اس سے معلوم ہوتا ہے کہ مصنف کے دہلی پہونچنے تک چند ہی روز میں یہاں مسلمانوں کی باقاعدہ آبادی بس گئی تھی اور تنظیم و تمدن کے لوازم مہیا کر لیے گئے تھے، شرف الملک کی تعریف کے ساتھ بعض دوسرے لوگوں کی مصنف نے مذمت اور شکایت کی ہے کہ وہ ظاہرا مہر و محبت سے ملے لیکن اُنھوں نے اس سے منافقانہ برتاؤ کیا، اسے پڑھ کر حیرت ہوتی ہے کہ ایک خالص علمی مذاق کے مرنجاں مرنج نووارد کے ساتھ ایسے حسد و نفاق کی کیا وجہ ہو سکتی تھی۔

یہ تو صاف معلوم ہوتا ہے کہ ہمارا مصنف جنگی یا انتظامی خدمت انجام دینے کی صلاحیت نہ رکھتا تھا، اور نہ علوم دین میں اُسے کوئی خاص فضیلت تھی کہ کہیں عدالت کا قاضی یا کسی مدرسہ کا معلم بنا دیا جاتا، لیکن جب اُسکے بہی خواہوں نے فرمایش کی کہ "اگر کتابے پارسی کہ طبائع روزگار بسبب قصور ہمت یا قلت معرفت بداں مائل تر تواند بود تالیف کردہ شود و بیتے چند در شیوۂ مدح ابنائے زماں نظم کردہ آید لایق وقت و مناسب حال افتد ...."

تو مصنف کو بہت رنج و تاسف ہوا، فارسی زبان میں کتاب لکھنے کو اُس زمانہ کے تعلیم یافتہ

مسلمان اسی حقارت کی نظر سے دیکھتے تھے جس نظر سے سو برس پہلے ہندوستان میں اُردو تصنیفات دیکھی جاتی تھیں، اور اس میں کچھ شک نہیں کہ ہمارا مصنف عربی زبان کی نظم و نثر لکھنے پر بخوبی قادر تھا۔ پس جب فارسی کتاب اور وہ بھی محض اہل جاہ کی مدح میں لکھنے کی فرمایش کی گئی تو اُسے خواہ مخواہ علم کا ماتم کرنا پڑا کہ:-

"گہر سفتنم پیشہ بودے نبود		خریدار گوہر، چرا سفتمے
سخن گفتنم پیشہ بودے نبود		سزاوار مدحت، کرا گفتمے

قالوا اترکت شعر قلت ضرورۃ		باب البواعث والدواعی مغلق
لم یبق فی الدنیا کریم یرتجی		منہ النوال ولا ملیح یعشق

عجب از اہل روزگار و ابنائے زمانہ دارا کار کہ نتیجۂ تحصیل و ثمرۂ استفادت کلمۂ چند منظوم و تالیف کتابے پارسی شناسد

ہنر نہفتہ چو عنقا بماند زانکہ نماند		کسے کہ باز شناسد ہمائے را از خاد"

گر جس طرح سو برس پہلے انوری کو حصول جاہ کے لیے مدرسۂ منصوریہ کے علوم عالیہ کو چھوڑ کر قصیدہ گوئی پر کمر باندھنی پڑی تھی، ہمارے مصنف کو بھی چارۂ کار یہی نظر آیا کہ تعصب علم کو بالائے طاق رکھ کر عمر عزیز کو شعر و شاعری کی خرافات اور "امور خالی" اور مقدمات وہمی میں صرف کیا جائے۔

اس طول طویل تمہید کے بعد مصنف (ہمارے نسخہ کے ۷۰ ویں صفحہ سے) اصل مضمون کی طرف رجوع کرتا ہے اور جیسا کہ پہلے عرض کیا گیا ترائن کی دوسری جنگ اور فتح اجمیر و دہلی سے اسکی تاریخ شروع ہوتی ہے۔ کتاب میں بڑے بڑے تاریخی واقعات تو سب وہی ہیں جو طبقاتِ ناصری یا بعد کی دوسری تاریخوں میں عام طور پر ملتے ہیں اور اگر بعض جزئیات ایسی بھی ہیں جو دوسری کتابوں میں درج نہیں تو وہ کوئی خاص اہمیت یا دلچسپی نہیں رکھتیں کہ اس مختصر تبصرہ میں اُن پر بحث کرنا موزوں ہو، خاص اُس عہد اسلامی کی تحقیق کرنے والا مورخ غور و کاوش سے اُنھیں کسی حد تک کارآمد بنا سکتا ہے ورنہ نہایت ضروری امور کے متعلق ہمارے مصنف کی کتاب ساکت ہے، وہ مسلمانوں کے ملکی نظم و نسق، فوجی تنظیم و تعداد، جنگی ساز و سامان و اسلحہ یا تمدن و معاشرت اور بلاد و آثار کی بابت کوئی مفید معلومات بہم نہیں پہونچاتا۔ مشاہیر عہد کے حالات اور اوصاف ذاتی پر اس کی کتاب سے کوئی روشنی نہیں پڑتی، حتیٰ کہ واقعات کے سنین و تاریخ کو بھی وہ بہت کم درج کرتا ہے اور اسی طرح اہل ہند کے عقائد و رسوم عادات و اطوار کے متعلق

اس نے کوئی کام کی بات نہیں لکھی، اسکی سعی و توجہ تو تمامتر عبارت آرائی اور لفظی صنائع و بدائع پر مبذول ہے اور وہ صفحے کے صفحے محض خیالی تشبیہات و استعارات یا شاعرانہ رنگ آمیزی کی نذر کر دیتا ہے، اسکی ایک دلچسپ مثال قطب الدین کے ۶۰۲ھ میں غزنی جانے کا حال ہے جسے ہمارے مصنف نے تقریباً پچاس صفحے پر پھیلایا ہے، ساری تحریر کا مضمون صرف اتنا ہے کہ قطب الدین بادشاہ کی طلبی پر غزنی گیا ضیاء الملک وزیر کے مکان میں ٹھیرایا گیا، بادشاہ کی خدمت میں تحائف پیش لیے گئے، کچھ عرصہ تک علیل رہا اور بادشاہ نے دوبارہ اُسے اپنی ولایت جانے کی اجازت دی، بعض قرائن سے گمان ہوتا ہے کہ یہ غزنی بُلایا جانا ازراہِ عتاب تھا اور عجب نہیں کہ قطب الدین کی علالت بھی کسی حد تک مصلحت پر مبنی ہو، لیکن ہمارے مصنف نے اس بادشاہی طلبی اور دوبارہ خوشنودی کی توجیہ و توضیح پر کوئی توجہ نہیں کی بلکہ اس طویل فصل کو حسب ذیل عنوانات سے پورا لیا ہے:-

(۱) صفت اسپ و رفتار اسپ (۲) صفت زلف (۳) فصل شتاء (۴) صفت آتش (۵) صفت بیماری (۶) صفت طبیب (۷) بشارت صحت (۸) صفت باغ (۹) صفت جشن (۱۰) صفت ساقیان (۱۱) صفت حباب بر سر پیالہ (۱۲) صفت ارباب طرب (۱۳) صفت چنگ (۱۴) صفت بربط (۱۵) صفت کمانچہ (۱۶) صفت نا ے اور (۱۷) صفت دف۔

الغرض ہمارا مصنف اتنا عمدہ مورخ نہیں جتنا اعلیٰ درجہ کا انشا پرداز ہے اور میرے نزدیک تاج المآثر کی یہی دوسری خصوصیت اس قابل ہے کہ اُسے فارسی علم ادب میں ایک ممتاز مرتبہ دیا جائے، اس پہلو پر زیادہ زور دینے کی ضرورت اس لیے ہے کہ ایران میں تو تاج المآثر کو کوئی جانتا نہیں اور ہندوستان میں اسکی کمیابی اور فارسی نثر سے عام بے توجہی کے باعث کوئی اسے نہیں پڑھتا - اور افسوس ہے کہ یورپ کی سب سے جدید اور جامع "تاریخ ادبیات ایران" میں تاج المآثر کا کہیں ذکر بھی نہیں آیا ہے، حالانکہ انصاف یہ ہے کہ سعدی سے قبل نثر فارسی کے پہلے دور میں اس کتاب سے بہتر انشا پردازی کا نمونہ کہیں نظر نہیں آتا - پانچویں صدی ہجری کے ابتدائی نثر کی سب سے مشہور یادگار ناصر خسرو کا "سفرنامہ" نظام الملک طوسی کا "سیاست نامہ" اور شہزادہ کیکاوس کا "قابوس نامہ" سمجھی جاتی ہے - بیہقی کی "تاریخ" اور زین الاخبار نیز تصوف پر شیخ علی ہجویری کی تصنیف "کشف المحجوب" اسی صدی میں لکھی گئیں لیکن جیسا کہ ہر فارسی کا طالب علم جانتا ہے، ان کتابوں میں انشا پردازی کی کوئی خاص خوبی نہیں ہے

اگرچہ سفرنامہ ناصر خسرو اور قابوس نامہ کی فلسفیانہ سادگی میں ایک دلچسپی اور ہلکی رنگینی پیدا ہوگئی ہے، چھٹی صدی کے مشہور مصنفوں کی عبارت میں ہم زیادہ پختگی اور سنجیدگی پاتے ہیں جسکا قابل قدر نمونہ نظامی عروضی سمرقندی کی تصنیف "چہار مقالہ" ہے اور اگر یہی رنگ قائم رہتا یا اسکو ترقی دی جاتی تو آج فارسی ادب کے متعلق اہل ذوق کو یہ شکایت پیدا نہ ہوتی کہ اس میں ایسی نثر کی مثالیں بہت کم ہیں جو خطابت و شاعری کے عناصر سے بالکل پاک ہوں، اسکے برخلاف اس زمانہ کی عربی انشاپردازی کی دیکھا دیکھی فارسی مصنف بھی شاعرانہ عبارت آرائی و مرصع نگاری کی طرف مائل ہوگئے اور ساتویں صدی میں سعدی نے نثر کا جو معیار قائم کردیا وہ بجائے خود کیسا ہی دلکش و دلپذیر ہو، شاعرانہ ترجیع و تکلف کے اہتمام سے آزاد نہ تھا، اس مرصع اور مسجع نثر نگاری کی ابتدا چھٹی صدی میں قاضی حمید الدین صاحب مقامات حمیدی نے کی تھی، اور عہد سعدی سے قبل یہی کتاب ادب فارسی کی گل سرسبد مانی جاتی تھی، انوری نے اسکی تعریف میں جو قطعہ لکھا ہے وہ کلیات انوری میں محفوظ ہے، بعد کی شہادتوں سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ شائع ہوتے ہی یہ کتاب تمام ممالک میں جہاں فارسی کا رواج تھا مقبول و ممدوح اور غالبًا درسیات میں داخل ہوگئی تھی، مصنف تاج المآثر نے بھی زمانہ کے اسی رنگ کا ساتھ دیا ہے، لیکن اسکی شاعرانہ بیان میں جو قوت اور عبارت آرائی میں جیسا قدرتی جوش و خروش ہے پھر فقروں کی چست بندش، الفاظ کی موزونیت، بیان کی تازگی اور جدت، نئی ترکیبیں اور بدیع تشبیہات جو اس نے لکھی ہیں ان سب کے مقابلہ میں راقم الحروف کو مقامات حمیدی کسی قدر پھیکی اور محض مقامات حریری وغیرہ عربی نمونوں کی تکلف آمیز نقل معلوم ہوتی ہے، باقی مقامات حمیدی کے علاوہ فارسی نثر کی دوسری کتابیں خاص کر راوندی اور اسفندیار کی تاریخیں جو تاج المآثر کی تصنیف کے زمانہ میں لکھی گئیں صرف انشاپردازی کے اعتبار سے اس کتاب سے کوئی نسبت نہیں رکھتیں، اس لیے مضمون کے خاتمہ پر تاج المآثر کی عبارت کے چند نمونے پیش کرتے وقت میں نے مناسب سمجھا کہ مقامات حمیدی کا ایک ٹکڑا بھی جو مصنف نے "غزو و جہاد" کے مقامے میں تحریر کیا ہے نقل کردیا جائے۔

مقاماتِ حمیدی (مقامہ سوم در غزو و جہاد) کل ۳۰ صفحات

"عزم غزو درست کردم، و از ہرات قصد بُست نمودم، و تیغ یمانی بر میان، و عقیلہ (شُتر) زیر ران، زرہ داودی در بر، و مغفر عادی بر سر، کمند تابدار در پہلو، و پرند آب دار در بازو، سپر ہندی

بر پشت و نیزهٔ عربی در مشت، به آفتاب همنان و با باد همعنان، برین نمط و نسق من الفلق الی
غسق در نفقهٔ تازیان و جماعة غازیان می راندم، و قوارع (آیات) قرآن میخواندم تا آمد و شد
مسا و صباح و اختلاف غدا و رواح بدیار هند رسیدم، چچهٔ مراکب و دمدمهٔ مواکب غازیان شنیدم،
و مجاهدان راه خدا را دیدم که شکر می کردند و آواز الله اکبر بر می آوردند، دل بر شربت تیغ ابدار و
ضربت رمح جان شکار می نهادند و دست همان در گردن وداع یک گرمی نهادند، نظم:-

یُعانق بعضهم بعضًا وداعًا | وداعًا یقتضی عدم اجتماع
فما من واصل ما بعد یومًا | سوا من لیس فیه من خداع

نمونه عبارات تاج المآثر

۱- جنگ بنارس به باجیت چند که رای قنوج بود

و بدرگاه جهان پناه بعد از روزے چند که چرخ دائره کردار در مرکز خاک درگذشت و اجرام
نورانی با جسام ظلمانی زیر و زبر آمدند، پنجاه هزار سوار با ملابس زره و جوشن و مراکب چون کوه آهن
در عرض آمده، نظم:-

چو شیر پُردل و در زیر بارهاے چو پیل | چو مور بے عدد و در دست نیزه هاے چو مار
چو باد حمله بر و همچو کوه حمله پذیر | چو رعد نعره زن و همچو برق نیزه گزار
فی جحفل کالسیل او کاللیل او کالقطر | صافی موج بحر مزبد
متوقد الجنبات یعتنق القنا | فیه اعتناق تواصل و تودد
متحجز بطنی الصوارم مبرق | تحت الغبار و بالصواهل مرعد

و در سلک خدمت دلیران نامدار سبان ثریا مجتمع و منتظم گشتند و گردان نامجوے مانند کواکب صف
کشیدند، همه در جنگ چون قطب گردون تیز گرد، استوا حقر به زمین نا در و چون خط محور بر فلک
سرگردان پاے وارد و لبان صاعقه و شهاب با تیر و تر دی بی، و چون سپهر و ماه، جوشن در و سپردار،
و بکردار تیر و ناهید دو رمن دخندان رو و بشکل آفتاب و بهرام تیغ زن و خنجر گزار، و بر مثال مشتری و
کیوان روشن راے و کینه افزاے، نظم:-

بگرز آهن سا و به نیزه صخره شکن | به تیر موے شگاف و به تیغ شیر اوژن
قوم ترى ارماحهم مشنوفة | یوم الوغا بوطن الکمان

تیسرلون اسنتہ وصفائحا والموت بین صفحۃ وسنان

وبا چنین لشکرے جرار وحشمے نامدار روے بجناب رائے بنارس آوردند وچون بین العسکرین تقارب پذیرفت ومحاربہ در مواجہہ خواست افتاد رائے مالک آرائے خدایگانے کہ پرتو از عقل کل وآئینۂ عالم غیب ومطلع آفتاب نصرت وجام گیتی نمائے ظفرست چناں اقتضا فرمود کہ خسرو جہاں کشائے عدو بند با یک ہزار سوار از حماۃ بیضہ اسلام وحفظہ ثغور دین .... رواں شود واز تشاغ مخالف : نظم

اگر دو آید پیشش کند بہ نیزہ یکے وگر یک آید پیشش کند بہ تیغ دو نیم

وچون در مقدمہ ساخ خیر وطائر میموں روے نمود ودلائل نجح امارت ظفر پدید گشتہ وبہ حصول نیل مراد اصلی ویافت مقصود کلی تیقن ووثوق افزود وعزیمت خدایگانے کہ ہمتہ بہ تائید آسمانی موید است وفتح مبین ونصر عزیز از نتائج مقدمات رائے ورویت مبارک مصمم شد کہ فوجے از حشم منصور در خدمت رکاب اعلیٰ ملازم باشند ؎

در خدمت رکاب تو سر بر زمیں نہاد خورشید ز آسمان چہارم ہزار بار

ودیگر امرا وسرخیلاں واصناف متجندہ روے بہ قمع وقہر رائے بنارس آرند وآداب لشکر کشی ومراسم سپاہ آرائی تبقدیم رسانند وبر فور جمعے از سوار .... روے بموقف جنگ وجدال آوردند

فوارس طفاؤن مازال للقنا مع الشیب یومًا فی مفاقہم وحظ

سوارشاں بہ شجاعت چو حیدر کرار، پیادہ شاں بجلادت چو رستم دستاں، وچون رائے بنارس جیت چندر را کہ عمدۂ کفر وضلال ومادۂ عجب واختیال بود حرکت رایات ہمایوں نہضت ورکفت لشکر منصور روشن گشت ونقاب شک وحجاب شبہت از پیش نہاد خیال وتصورات او برخاست با لشکرے گراں وسپاہے بیکراں کہ شمار آں از عدد رمل ونمل زیادت بود وتتابع دفود وافواج نامحدود ایشاں چوں ادوار فلکی بے نہایت۔ نظم

شہاب سطوت ودریا شکوہ (و) باد نہیب زمانہ بسطت گردوں تواں وکوہ یسار

بہ پیل غرہ وارکس نیافتہ مالش زمال ست ور تنبیہ ناشدہ بیدار

بمقاومت وقتال پیش آمد..... وجوہ حشم ورؤس لشکر منصور جنگ را ساختہ وآمادہ گشتند ورایات منکوس شرکت واعلام معکوس کفر برافراختند وپیل بر صحرائے معرکہ چوں دریائے دماں

باد بجوش آمده و در زیر برگستوان مانند حصار آهنین پوشیدن گرفت، نظم:

حصارے کہ ہم زد بود منجنیقش ‏ ‏ ‏ ‏ بالا و من گر ندیدست بنگر

تو گوئی کہ طور است موسی مہابت ‏ ‏ ‏ ‏ بجاے عصا آنکرشے مار پیکر

و ارکن اللون ذی ناب له شخص ‏ ‏ ‏ ‏ ترله بیکلاً کالطور مرتفعا

و بنگ خون ریز بخون دل بهرام خضاب می کرد و به آسیب زخم روی روی پشت ماهی خسته می گردانید و خرطوم ثعبان شکل او قلاده شیر فلک می شد و منطقه جوزا و حلقه ثریا می گشت، تفتی از هیکل آن ابر صورت جهان بر نیل آگنده اند و از بالاے آن کوه پیکر سد سکندر برآورده. نظم:

چنان کوه کز وے شود کوه پست ‏ ‏ ‏ ‏ چو زنگ نهد بر سر کوه دست

چو دیوار سیاهی و چون او بلند ‏ ‏ ‏ ‏ چو آتش بخشم و چو او با گزند

زجنبش فلک باز ماند چو باز ‏ ‏ ‏ ‏ بخرطوم یازد به سوے فراز

. . . .

و از شیهه اسپ و ناله پیل ماه بر آسمان راه گم کرد و غریو کوس حربی نصر من الله بگوش موحدان رسانید و آواز سپیده مهره دم نامے روئین لبیوق بر آمد

جان دشمن چون کبوتر پر دراز تنحنحے چو نے ‏ ‏ ‏ ‏ در وغا چون نامے روئین تو آید در صفر

و فحواے ان زلزلة الساعة شیٔ عظیم حجاب شبهت از پیش جهانیان برداشت و حقیقت تکاد السموات یتفطرن منه و تنشق الارض بر دلها گشاده گشت:

والشمس فی کبد السماء من نقعه ‏ ‏ ‏ ‏ والارض من حنقه تکاد و تمود

فلک را لعل تیغ در تاب کرده ‏ ‏ ‏ ‏ جهان را دم نامے به سر گرفته

از عکس رایات رنگارنگ که با نسرین دید ارمی کرد هوے ته آورد که مانند پر تدرو و طاوس گشت و از فروغ بیرق گوناگون با سماکین راز می گفت زمین معرکه بسان گلزار و لالستان شده

بسان قبه کسرا زمین از زینت لشکر ‏ ‏ ‏ ‏ بشکل نامه مانی هوا از رایت الوان

له رایت حمرا بالنصر تخفق ‏ ‏ ‏ ‏ لها لجة فی فلکی الریح تنطق

من الذهب الابریز صیغ برازها ‏ ‏ ‏ ‏ لصید نسور النصر باز محلق

و هر دو لشکر چون دو کوه پولاد صف کشیدند و بسان دو دریاے روان از باد صرصر در تموج در آمدند و عرصه هند از سوار و پیاده چون دشت محشر تفاوت پذیرفت

وزجل تہلیل موحداں از اوج کیواں بگذشت و آواز تکبیر مجاہداں دل از شیر ژیاں بستد ؎

نعرۂ اللہ اکبر موکبت گفته بلند — آیت نصر من اللہ رایتت کرده بیاں

و فضاے معرکہ از جوشن و روزره دار آہنیں شد و ہواے رزم گاه از برق تیغ و صاعقہ خنجر آتشیں گشت، گفتی از ابر کیں بجاے مطر تیر و نیزه می بارد و از زمین جنگ بجاے نبات شل و بہلہ می روید

. . . .

و گوش تگاوراں بنوک سناں آرایش یافت و عنان سپاہزاں از چپ و راست گرداں شده و از پیچش و گردش سواراں غنبہاے جوشن چاک گشت و از مقاومت و مصادمت شیران کارزاری پیل بہ پیل جنگی اُفتاد و از نائرہ جنگ و پیکار رسلاح بر تن مرداں کار تفسید

. . . .

و ناوکِ دیده دوز حلقۂ زره و غنیبہ جوشن می درید و بیلک سینہ دوز ترک بر تارک جوشن وراں می دوخت و صاعقہ کردار بہ آتش زخم جگر مرداں کار و دلیران نامدار می سوخت و در چشم مبارزاں افزوں از خار مژگاں جاے می گرفت و مرغ روح از قفس قالب در فضاے عالم ارواح پرواز می دارد . . . .

راے بنارس کہ بہ لشکر انبوه و تنده پیلاں بسیار مغرور گشته بود و نخوت "الیس لی ملک مصر" بدماغ راه داده و از دقیقۂ الم تر کیف فعل ربک باصحاب الفیل غافل مانده، ناگاه از کشاد بندگان دولت کہ بر سپہر دو تا دیده سہی بد و زند و بر گنبد اخضر ہفت اختر ثریا کنند و بحکم آرش آسا در شب تاریک تیر موے شگافند و نوک پیکانِ تیر در تیزی خار نشانند، خدنگ مرغ صورت بحدقۂ او رسید و در ہودج آسماں سیما یک بیلیک فنا بمقتل خورده و از قد فرقدساے پیل گوں برخاک افتاد . . . . و کوکب رفعتِ او از چرخ جلالی و اوج کمال درگذشت و شاخِ حیاتش از دوحۂ ممالک بریده شد و ندائے اینما تکونوا یدرککم الموت بسمع جانش رسید و کذلک اخذ ربک اذا اخذ القریٰ و ہی ظالمة - ان اخذه الیم شدید - سراو کہ کبوتر خانۂ ہوا و ہوس گشته بود د نشیمن شاہیں سوداے فاسد و چره باز امانی و آمال کاذب شبہ و مرغ غرور و غفلت در وے بیضہ نہاده و در ہواے ملک پر و بال فتنہ و عصیاں بر آورده، افسر دار گردو آمد و تن آں بادسار کہ تشمشیر آبدار آتش حرب می افروخت پیش بارگاه دلا زال ملتم شفاه الجبابره

بر خاک ذلت و هوان انداخته شد۔

۲۔ فتح قلعهٔ تهنکر بیانه

و چون در ظل ظلیل اقبال جد ود تهنکر رسیده آمد و مرکز شرک و ضلال مخیم عز و جلال شد و اطناب سراپردهٔ شهنشاهی سر بتوق افراخت - - - - - و بندگانِ شاه همه بر مرکبان شاهین شوکت عنقا صولت سوار گشته گرد حصار الصفت کوه آهن درآمدند و پر امن قلعه چنانکه باد از میان ایشان دشوار گذشتی صف کشیدند - - - - و از جوانب و اطراف آن حصن منیع که اساس آن در استواری با سدِ سکندری دعوے برابری یل تصلف زیادتی می کرد و از بلندی برجهاے آن از بروج آسمان و اوج کیوان می گذشت و پایانِ خندق آن پشت سمک رسیده از قعر بحر محیط خبر می آورد و سر کنگرش بر روے سماک بر آمده اندوهٔ فلک اعظم نشان می داد بسان صرصر حمله ها تند می کردند - - - - - - - - - - - - - - - - -

و تیر جگر دوز درزی صفت مغفر بر سر جنگیان می دوخت و چون سوزن از حریر و پرنیان از خود و خفتان می گذشت و مانند برق و صاعقه از غلبهٔ جوشن روشن گرازه می شد و بروے سپهر چون پشت پر وین پُر از چشمه و روزن می کرد، و در یک چشم او را افزون از قطره خار پیکان می نشست - - - و در یک ساعت چهار دیوار آن حصن محکم و سدِ معظم که نشیب و فراز شب به ثری و ثریا رسیده بود و پایان خندقش و سر کنگره بماهی و ماه پیوسته و فتح نامهٔ آن نه دیدبان دیده و طلایهٔ خیال بخواب و بیداری دیده و نه وزیرِ هوش و بریدِ گوش هیچ وقت از ترجمان زبان شنیده از بسیاری نقب و حفر چون چشمهٔ زره و خانهٔ زنبور شد و از نون نعل تنگا در آن ثلمها و رخنه ها لبان و دندان هاے سین بدو راه یافت ؎

آنکه ز تاثیر سم نعل سمندش قلعه بد خواه ملک رخنه چو سین است

و با مداد و تائید و نصرت آسمانی و میامن همت، و اقبال روز افزون خدایگانے چنین قلعهٔ حصین که طریقِ استخلاص آن بر ملوک دنیا و خسروان گیتی بسته بود کشاده گشت۔

(مذاکرات)

سید هاشمی فرید آبادی

گیس کی روشنی

رابرٹ لوئی اسٹیونسن انگریزی زبان کا زبردست مقالہ نگار ہے، جسکا ترجمہ آسان کام نہیں، اسکے نادر اسلوب بیان اور پُر لطف طرز انشا کا ذائقہ کچھ اُسکی اصلی زبان ہی تک محدود ہے۔ ذیل کے مضمون میں انظار صاحب نے اُسکے نہایت دقیق خیالات اور دلپذیر اسٹائل کو اُردو میں قائم رکھنے کی تا بمقدور کوشش کی ہے۔ ایڈیٹر

شہروں کی وسعت نے روشنی کی تنظیم کا مسئلہ پیش کیا: جب قدرت اپنے عالمتاب نور کو پردۂ ظلمت میں چھپالے، یا آج کل کے سائنٹیفک اعتقادات کے مطابق جب ہمارا رقصاں سیارہ آفتاب کی طرف سے اپنا رُخ پھیر لے تو زمین کے تاریک عرض و طول میں راہگیروں کی رہنمائی کس کے متعلق ہوگی؟ چاند کی طلائی شعاعیں بیشک کبھی کبھی معین ہو سکتی ہیں، تارے اپنی ننھی چمکیلی آنکھیں کھول کر کچھ روشنی بہا سکتے ہیں، کسی گرجا گھر یا قلعہ کی نصب کردہ مشعلیں کسی حد تک مدد کر سکتی ہیں مگر سورج، چاند اور تاروں کی روشنی کے فقدان اور کمزوری نے رات کے مسافروں کو "دو منزلی طویل القامت" لالٹینوں کا رہین منت بنا دیا۔ ان "ستم ظریف روشن خانوں" کے بالائی پردوں کے سوراخ اپنی تیز شعاعوں سے لالٹین لیکر چلنے والے شخص کی آنکھوں میں چکاچوندھ پیدا کرتے تھے، اور جب وہ تیرہ و تار مقامات میں اپنے منبع نور کو ہاتھ میں لٹکائے بہل قدمی کرتا تھا "شب دیجور اور روز روشن" اسکے ساتھ ساتھ اس گہوارۂ تاریکی میں لوٹتے ہوئے چلتے تھے، سیاہی اسکے سدراہ ہوتی، ہیبت ناک شکلیں اُس کا طواف کرتیں اور "اعلان نیم شبی" کے بعد اُسے اپنی روشنی کے علاوہ کوئی شعاع نور نظر نہ آتی تھی[1]۔

---

[1] پہلے پہل جو لالٹینیں ایجاد ہوئیں وہ بڑی بھدّی اور دو منزلی ہوتی تھیں، اوپر کی منزل میں جہاں سے دھواں نکلتا تھا ٹین کی سطح میں چھوٹے چھوٹے سوراخ ہوتے تھے جن سے روشنی چھن چھن کر مسافر کی آنکھوں اور زمین پر آتی تھی۔ تاریکی اور روشنی کے دھبے اس طرح جو نکلتے تھے اُسے شاعرانہ زبان میں "شب دیجور اور روز روشن" کہا گیا ہے۔ مترجم

ان خانہ بدوش لالٹینوں کے عہد سے ملحق تیل کے چراغوں کا زمانہ ہے، انکے روشن کرنے میں دقت تھی، گل کرنے میں آسانی تھی، ہوا کے تھپیڑے ان کو بجھا دیتے تھے، شریر لڑکے انھیں توڑ ڈالتے تھے، اور پھر وہی تاریکی بے رونقی! راہگیر پیٹ کی طرف سے مطمئن مگر بستر کی فکر میں کبھی فرش زمین پر گرتا، کبھی دیواروں سے ٹکراتا، قدم قدم پر لغزش! غضب پر غضب یہ تھا کہ چراغوں کو گلیوں میں عین وسط راہ نصب کرنے کا رواج تھا، گویا تیز ہوائیں اور شریر بچے اُنکے لیے ناکافی تھے، ایک نامعلوم رشتہ میں آویزاں وہ وہاں فضا میں ہچکولے کھایا کرتے تھے اور اگر کوئی طویل القامت سپہ سالار کسی تیز رو گھوڑے پر سوار، اقالیم کی تقدیر ہاتھ میں لیے، سفر کے صعوبات سے خستہ ومجروح اُدھر سے گذرتا تو کچھ خون کچھ گالیاں اور کچھ شکست شیشہ کی جھنکار اس رواج کا نتیجہ لازمی ہوتا، راستہ تاریکی میں غرق، بعبارت سیاہی کا شکار، اور شہر ہر طرف سے تیرگی اور وحشت کی تصویر۔

ایک قدامت پسند ماضی و حال کا مقابلہ کر کے قناعت کے درس لیتا ہے، گیس کی روشنی کے زمانہ میں رہ کر وہ اُس بعید ماضی کے دھندلکے پر نظر ڈالتا ہے جس میں اُسکے اجداد گشت کرتے تھے، تو اُس کی آنکھیں خوشی سے چھلکنے لگتی ہیں، وہ انتہائی شعریت کے ساتھ اس عظیم ترقی سے متاثر ہو کے مسرور ہوتا ہے، جب شہر کو زرنگار و زر افشاں بنانے کے لیے گیس ایجاد ہوئی صحیفۂ تاریخ میں معاشرتی ترقی اور اتحاد باہمی کا ایک نیا باب کھلا۔ یہ پیش قدمی وقت کی رہین منت تھی اور اپنے "حفظ وجود" کی خود ذمہ دار، اختراع نے ایک قدم آگے بڑھایا تھا، اب دعوت میں مہمان کو کہرے کی تاریکی پریشان نہ کرتی تھی۔ نور ہر آب نظر سے پوشیدہ نہ ہوتا تھا اور روز روشن تصور کے مطابق طویل ہو گیا تھا، لوگ اپنے ایجاد کردہ تارے رکھتے تھے، نقلی گر فرزاں بر ذارو بندۂ بے دام تارے!

یہ صحیح ہے کہ اصلی تاروں کی طرح یکسانیت اُن میں نہ تھی، اور نہ اُن کا نور موم کی شمعوں کی طرح نفیس و لطیف ہوتا تھا مگر گیس کے یہ تارے اپنی قرابت کی جہت سے مشتری سے زیادہ منفعت بخش تھے۔ یہ بھی درست ہے کہ وہ اپنی آب و تاب کو سیاروں کے انداز کے مطابق یکے بعد دیگرے بے نقاب نہیں کرتے تھے بلکہ روشن کنندہ ہر شام کو دادوہش میں مصروف رہتا تھا۔ انسان کو اس طرح رسمیات فطرت کی برقراری کی جد وجہد کرتے دیکھنا کس قدر لطف اندوز تھا! اور گرچہ گیس بلند پایہ پر نہ ہو سکتی تھی اور کوئی نہ کوئی راہگیر اُس مصروف کار

کی عجلت اور اسکی آہنی نردبان کا شکار ہو جاتا تھا، تاہم عوام الناس اُسکے جوش و احساسِ
فرض کا خیال کرکے اُسے دعا دیتے: "روشنی کرنے والے کو خدا برکت دے" اور چونکہ
اُسکی تیزی و چستی روزانہ پیش نظر ہوتی تھیں، بچے بھی اس دعا کی تکرار کرتے تھے، البتہ وہ طویل
عبارت جس کا اعادہ اُنکی کم عمر زبان کے لیے دشوار تھا چند الفاظ میں تحلیل ہو جاتی تھی۔
"خدا اسے برکت دے" بیشک! اُسکی چند روزہ مشقت کے اختتام کا زمانہ کچھ دور نہیں ہے
اور اب زیادہ عرصہ تک ہم اُسے مقررہ اوقات میں تگ و تاز کرتے اور پردۂ سیاہ میں روشن
سوراخ بناتے نہ دیکھیں گے۔ اہل یونان نے تو ان امور کو ایک خیالی افسانہ میں شامل کر لیا ہوتا
——— کہ کس طرح وہ نور کی تقسیم کرتا ہے اور جب ضروریات رفع ہو جاتی ہیں دوبارہ نور کس
طرح جمع کر لیتا ہے ——— کیونکہ اُنھیں کسی کے نام کو اس طرح بقائے دوام بخشنے میں خاص
لطف آتا تھا۔ مگر یہاں تمام بہادرانہ کارگذاریوں کی طرح اُسکی مشقت بھی تحلیل کے ساتھ
رونما ہوگی اور وہ خود اس نور فتح اور تابشِ اختراع میں پوشیدہ ہو جائے گا کیونکہ انسان
کی قوت ایجاد نے ایک قدم اور آگے بڑھایا ہے، ہمارے تارے اب یکے بعد دیگرے نہیں بلکہ
یک بیک روشن ہوا کریں گے۔ ایک بے حس مزدور کسی کارخانہ میں ایک بٹن دبائے گا۔ ایک
حرکت، صرف ایک جنبش کرے گا اور بس، شہر کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک نور
پھیل جائیگا، ایک شب تاریک میں کسی بلند مقام پر کیسا عجیب منظر ہوگا جب آنکھ کی ایک
جھپک کے ساتھ تمام شہر کا نقشہ آنکھوں کے سامنے آ جائے گا ——— ایک منور اور تاباں دائرۂ
عمارات! اور اگر اس نظارہ کی اہانت کے لیے وہ ٹمٹمانے والے چراغ دوبارہ روشن کر دیے
جائیں!! برقی ستاروں کا ظہور، تمدن کی ایک دلپذیر پرواز! اہل صنعت و حرفت کی خدمت
میں یہ ایک ہدیۂ تسکین پیش کرتا ہے، ہدیۂ تسکین انکو جو اشیائے جہاں پر بغور نظر ڈالتے ہیں
اور سیر چشمی کے ساتھ حسن و متانت کا بغیر اسکے موجد یا مخرج کا خیال کیے خیر مقدم کرتے ہیں۔
ایک قدامت پسند ترقی کی تعریف میں رطب اللسان رہنے کے باوجود 'ندرت' سے خائف
رہتا ہے، اُس کا کانپتا ہوا ہاتھ قدم روکنے کی تعلیم دیتا ہے، اُسکے انداز آہستہ روی کے اشارے
کرتے ہیں، لفظ برق اُسکے لیے کلمۂ وحشت ہے، پیرس کی ایک بلند و بالا عمارت کے روبرو
ایک عجیب و غریب ستارہ نظر آتا ہے، قدامت پسند کے نزدیک وہ ایک خوفناک، وحشت خیز
اور خلاف فطرت شے ہے، اور چشم انسان کے لیے باعثِ نفرت! ایسی روشنی صرف قتل و غارت

اور جرائم کے موقعوں پر یا پاگل خانوں کے برآمدوں میں نظر آنا چاہیے، ایک ہیبت اک مجسمۂ وحشت!! نور برق پر ایک غائر نظر ڈالنے سے اُسکی نفرت اور گیس کی محبت دل میں پیدا ہو جاتی وہ گیس جو در و دیوار کو ایک سیمیں نور میں غرق رکھتی ہے، جس کی روشنی میں کھانے زیادہ پُرلطف ولذیذ ہو جاتے ہیں، بنی نوعِ انسان کو صرف آگ کی دریافت پر شاکر رہنا چاہیے، پتنگ کے ذریعہ سے اشیاے فلک کا جائزہ لینا اور طوفانی قوتوں کے حصول میں ساعی ہونا کیا معنی اگر یہ وہ نقوش حجر کی طرح ہمارے دروں پر تائے اور آویزاں ہیں اور ہم اسی برق غضب کے زیر سایہ چہل قدمی کیا کریں گے۔ کسی ایسے شخص کو توہمات میں مبتلا نہ ہونا چاہیے جو گذشتہ زمانہ کے تاریک راستوں میں باطمینان قدم اُٹھانے میں تامل کرتا تھا اور نہ اُسکو اُن شبہات کو روا رکھنا چاہیے جو ایک پیکر حسن کی عریاں باصرہ نوازی کو پوشیدہ و تنگ جلوہ باری پر ترجیح دیتا ہے۔

ممکن ہے یہ تکلیف دہ اور مضر بصارت روشنی مزید تقضیات کو دخل دیکر حقیقی اطمینان کو مفقود کر دے اس لیے جہاں لطیف مسرتوں کا ظہور ہو، جہاں لوگ مسرت قلب کے خواہاں ہوں، جہاں شرکائے بزم کے چہرے برق تبسم سے منور ہوں جہاں عشق و محبت کی دلفریبیاں اور ترنم ریز قہقہوں کی سامعہ نوازیاں ہوں، جہاں جام سرخ اور شراب آتشیں کی ضوافشانیاں ہوں، وہاں دھیمی لچیلی، نرم اور دل نواز روشنی ہی کی ضرورت ہے

داستانِ عاشق

اظہار علی عباسی

لے کر ازل ہی سے چلے ہم کشتگانِ عاشقی
نشتر بجانِ آرزو آتش بجانِ عاشقی

رہتی ہے اُسکی یاد یوں وردِ زبانِ عاشقی
مسجودِ شانِ دلبری، معبودِ جانِ عاشقی

اللہ رے سوزِ دل خوں گشتگانِ عاشقی
پنہاں ہے ہر یک خاک میں برقِ تپانِ عاشقی

کیا قصۂ جورِ فلک کیا داستانِ عاشقی
سب جانتی ہے وہ نظر دردِ نہانِ عاشقی!

اُٹھنے کو ہے اُنکی نظر ہونے کو ہے وہ آنکھ تر
ہاں، تیز کر دے یخبرا سازِ نہانِ عاشقی!

آؤ جہاں بہ ہم کریں پیدا نیا عالم کریں
تم جانِ جانِ حسن ہو ہم جانِ جانِ عاشقی!

جگر مرادآبادی

نقش موہوم

میری اور قاسم کی دوستی بہت پُرانی تھی، ساتھ ساتھ ہم دونوں کالج میں داخل ہوے اور ساتھ ہی ساتھ ہم نے ڈگریاں لیں، طالب علمی کے زمانہ سے آج تک ہم دونوں میں گہرے دوستانہ مراسم تھے، کالج میں ہماری دوستی ضرب المثل تھی، اُٹھتے بیٹھتے، سوتے جاگتے، ہمارا ساتھ ہوتا تھا، ہم دونوں ایک دوسرے کے رازدار تھے، قاسم کی زندگی کا ہر اہم اور یادگار واقعہ مجھے معلوم تھا، میری زندگی کے ہر رُخ کی اُسے خبر تھی۔

مجھے اسکے اظہار میں باک نہیں کہ ہمارے خیالات و معتقدات میں زمین و آسمان کا فرق تھا، قاسم مغرب کا باشندہ تھا تو میں مشرق کا، وہ سوسائٹی کا دلدادہ، میں صحبت سے گریزاں، وہ اکثر سوٹ میں رہتا اور میں نے اپنی عمر میں ایک دفعہ بھی سوٹ سے اپنے جسم کو آلودہ نہیں کیا، وہ آسکر وائلڈ کی "ڈورین گرے" پر جان دیتا تھا تو میں اسکی "ڈی پروفنڈس" پر مرتا تھا، وہ حافظ اور خیام کے فلسفۂ عیش و مسرت کا قائل تھا تو میں حیات کے اُس تاریک رُخ سے لرزتا تھا جسے حافظ نے ؎

شب تاریک و بیم موج و گرداب چنیں حائل

سے تعبیر کیا ہے، وہ اقبال کی "عشرتِ امروز" پر سر دھنتا تھا تو میں اُسکی اُس "نسیمِ چمن طور" کا شیدائی تھا، جو

چھیڑ آہستہ سے دیتی ہے مرا تارِ حیات
جس سے ہوتی ہے رہا روحِ گرفتارِ حیات!

یہی نہیں کہ ہمارے خیالات و معتقدات میں فرق تھا ہم لوگ عملیات میں بھی ایک دوسرے سے علیحدہ تھے، اسکے باوجود میں اقرار کرتا ہوں کہ ہم دونوں کے درمیان ایک ایسی موانست قلبی پیدا ہو گئی تھی جو آسانی سے ٹوٹ سکنے والی نہ تھی۔

ایک مرتبہ کسی تعطیل میں ہم دونوں ہم سفر ہوے، علی گڑھ اسٹیشن سے رات کے بارہ بجے ہم سوار ہوے، راستہ میں ہم دونوں مختلف مضامین پر تبادلۂ خیال کرتے رہے اور اسکے لیے مجبور بھی تھے کیونکہ ڈبے میں مسافروں کا ہجوم تھا اور وقت کاٹنے کی کوئی اور صورت نہ تھی،

مجھے معلوم تھا کہ قاسم کو بچپن میں اپنی ایک خالہ زاد بہن سے محبت تھی جسے مضمحل ہوئے شاید پانچ سال ہو چکے تھے، اب بھی اُس کی محبت کا خیال کرکے کبھی کبھی وہ بےچین ہو جاتا تھا، عرصہ سے اُس لڑکی سے ملنے کو اُس کا جی چاہتا تھا، پانچ سال کی مدت! ایک خاصا طویل لمحۂ زندگی جس میں طبیعتیں، شخصیتیں اور دُنیا کے واقعات کے رخ بدل جاتے ہیں، اس عرصہ میں اُس کی محبوبہ میں کتنا تغیر ہو گیا ہوگا، اُس کا حُسن نکھر گیا ہوگا، اُس کا جسم، اُس کا قد، اُسکے بال، اُسکی شخصیت میں تبدیلی ہو گئی ہوگی، وہ جوان ہو گئی ہوگی، بلا کی، غضب کی حسین ہو گئی ہوگی، جب وہ چھوٹے تھے اُسوقت سے اُن کے والدین کا خیال تھا کہ دونوں کو رشتۂ رفاقت میں منسلک کردیں گے، مگر عرصۂ جدائی نے ان دونوں ہی کو نہیں انکے والدین کے جذبۂ شادمانی کو بھی کسی قدر پھیکا اور پست کر دیا تھا، اس طرف کچھ دنوں سے قاسم کے والد نے اس تذکرہ کو پھر زندہ کیا تھا اور ایک آزاد خیال باپ کی حیثیت سے اُس سے رائے طلب کی تھی، قاسم کو اُمید تھی کہ اگر وہ اپنی خالہ کے یہاں جائے گا تو اب بھی وہ لڑکی اسکے سامنے آئے گی اور ان دونوں میں پردہ نہ ہوگا، کیونکہ ابتدا سے اُنکے یہاں کا یہ قاعدہ تھا اور وہ لوگ اس قدر آزاد خیال تھے کہ اس خطرہ کا گمان نہ تھا یہ شاید اسکی قابلِ رشک روشن خیالی (آپٹی مزم) کا نتیجہ تھا، میں کہتا پردہ ضرور ہوگا، کیونکہ اتنے عرصہ کی جدائی کے بعد اور خصوصاً اُسوقت جبکہ شادی جیسے نازک مسائل زیرِ غور تھے ہندوستانی ماحول میں مائیں اپنی لڑکیوں کو اتنی آزادی نہ دیں گی، وہ اسے میری مایوس خیالی (پیسیمزم) بتاتا،

اُس نے مجھ سے اصرار کیا تھا کہ ان تعطیلوں میں اُسکے ہمراہ کانپور چل کر جہاں اُسکی خالہ رہتی تھیں، میں اپنی آنکھوں سے اُن روابط کو دیکھوں جو وہاں اُسکے ساتھ قائم تھے، چھٹیوں سے قبل، اُس نے اپنی خالہ کو ایک تار کے ذریعہ سے ہماری آمد کی اطلاع دی مگر شام کو اُسکا جواب آگیا کہ وہ لوگ کانپور گئے ہوئے ہیں، قاسم کانپور چلنے کو تیار ہو گیا اور اپنے ساتھ مجھے بھی تیار کرلیا،

جاڑوں کی راتیں وہ بھی آخر دسمبر کی، اس زمانہ میں سردی ناقابلِ برداشت ہوتی ہے، میں ہر سال اس زمانہ میں بیمار پڑتا ہوں، ہوا بہت تیز اور ٹھنڈی چلتی ہے، کمرے میں بیٹھ کر بھی اس سے بچنا دشوار ہے، سرد ہوا دروازہ کی چاک کی تیلیوں کو توڑتی ہوئی، ایک مہین اور تیز سرسراہٹ ساتھ کپڑوں کے اندر داخل ہو جاتی ہے، میں سر میں کچھ نہیں لپیٹتا، میری والدہ کہتی ہیں کہ یہ ہوا کانوں کے ذریعہ سے جسم کے اندر داخل ہوکر زکام پیدا کرتی ہے، اور اسی سے دردِ سر

اور بخار شروع ہو جاتا ہے، میں نے کبھی اسکی پروا نہ کی تھی، اور آج بھی جب میں سفر کے لیے آمادہ تھا میں نے اپنے ساتھ ایک ہلکے کمبل کے سوا کچھ نہ لیا تھا۔ ریل کے ڈبّے میں ایک برتھ پر باہم دونوں بیٹھ گئے، میں نے اپنے جسم پر کمبل ڈال لیا اور اپنا پرانا وفادار پائپ سُلگا کر اُسکے میٹھے اور خوشبودار دھوئیں سے اپنے سینے کو گرمی پہونچاتا رہا، قاسم کے جسم پر ایک اُونی اُورکوٹ تھا جس کے کُھلے ہوے کالر سے اُسکی سفید ٹائی اور خاکی قمیص نظر آتی تھیں۔

ہم دونوں ایک دلچسپ گفتگو میں مشغول تھے:

"میں کبھی عورت پر اپنی شدید محبت الفاظ میں نہیں کھولتا" قاسم کہہ رہا تھا

"محبت الفاظ کے ذریعہ سے کھولی ہی نہیں جا سکتی" میں نے کہا "یہ آنکھ سے ظاہر کرنے کی چیز ہے، محبت کی لطافت الفاظ کے بار کی متحمل نہیں ہو سکتی، نازک اور حساس عورت سے تم اپنی آنکھ نہیں چھپا سکتے، وہ محبت کرنے والے میں حُسن نہیں چاہتی، وہ محبت بھری نگاہ چاہتی ہے، محبت اُس کی زندگی ہے، محبت پر وہ مرتی ہے، تمھیں یاد ہوگا، بائرن "ڈان جان" میں جولیا کی زبان بن کر کہتا ہے:

"مرد کی محبت اُسکی زندگی سے علٰحدہ ایک چیز ہے مگر عورت کی محبت اُس کا عین وجود ہے"!

"تم میرا مطلب نہیں سمجھے، میں محبت میں عورت پر اپنی نیازمندی کا اظہار نہیں کرتا، یہ کمزوری ہے جس سے ہمارے جذبۂ خودداری کو ٹھیس لگتی ہے" قاسم نے ادا کیا۔

"تم نے شاید غلط کہا" میں بولا "خودداری کا خیال اس جذبۂ لطیف کی توہین ہے، یوں کہو کہ اس طرح جذبۂ محبت کی وقعت و عظمت باقی نہیں رہ جاتی"

"میں اب بھی اپنے الفاظ پر قائم ہوں، عورت کے سامنے آہ وزاری مرد کی شانِ مظفریت کو مجروح کرتی ہے"

"عورت کے عشق میں پڑ جانا ہی مرد کی شانِ مظفریت کو مجروح بنا دیتا ہے، آہ وزاری کا سوال بے محل ہے، مظفریت کا خیال ہے تو عورت کی محبت سے بھاگو، اور جب عشق میں مبتلا ہو گئے تو۔۔۔

شرطِ اول قدم آنست کہ مجنوں باشی!"

شاید ہماری گفتگو کبھی ختم نہ ہوتی اور ہم کسی مفید نتیجہ پر نہ پہونچتے، ایک اسٹیشن پر گاڑی رُکی اور کئی مسافر اپنی جگہ خالی کر گئے، ہم انہی جگہوں پر ہم نے قبضہ کر لیا اور تھوڑی دیر کے لیے سو گئے،

صبح سات بجے ہم کانپور پہونچے، میرے بھی ایک عزیز یہاں رہتے ہیں جہاں میں شوق سے جاتا ہوں، ہم دونوں پہلے وہیں گئے، مجھے دیکھ کر سب خوش ہوے، قاسم کے لیے باہر کا کمرہ کھول دیا گیا، دس بجے تک ہم یہاں ٹھہرے اور ناشتہ اور کھانے سے فارغ ہو کر قاسم کی خالہ کے یہاں چلے، سامان یہاں ہی رکھا رہا،

ہمارا تانگہ خراب تھا، اور کانپور کی دشوار گذار اور تکلیف دہ سڑکوں پر قدم قدم پر ہچکولے کھاتا چلتا تھا، قاسم کا چہرہ سرخ ہو رہا تھا، تمتما رہا تھا، اُسکے چہرہ پر ایک خوش آیند و مبارک اُمید کی جھلک تھی، اُسکی آنکھیں چمک رہی تھیں، یہ خیال کہ وہ اپنی ماضی و مستقبل کی رفیقہ کو عرصۂ دراز کے بعد دیکھے گا اُسکے لیے حوصلہ افزا تھا، کیا یہ ممکن تھا کہ اس میلے اور کثیف شہر کے کسی گوشہ میں ایک ایسا حُسن ہو جسکے ساتھ کسی کی خوش آیند توقعات وابستہ ہو سکتی ہوں، راہ میں کاروباری لوگ ہم پر نظریں ڈالتے تھے، اُنھیں ہمارے دلوں کا قیمتی راز نہیں معلوم تھا، ایک نیم بیداری کے عالم میں، کسی خیال میں مست، میں قاسم کے وارداتِ قلبی محسوس کرنے کی کوشش کر رہا تھا، وہ مجھ سے باتیں کر کے اپنے دل کے شدید احساسات کا اظہار کرنا چاہتا تھا، میں اُسے ایک نامعلوم طریقہ پر روک کر اُنکی لطافت اور زیادہ نذر بنانا چاہتا تھا، اُسنے مجھ سے وعدہ کیا کہ وہ اپنی رفیقہ کو مجھے دکھا دیگا، میں اس پر لطف و لذیذ نشۂ خیال میں مست تھا

تانگہ سیدھا ہماری خالہ کے مکان سے ہو کر اُسکی پشت کے مکان پر پہونچکر رُکا، مکان بہت بڑا نہ تھا، مگر خوش سلیقگی میں بڑے بڑے مکانوں سے بہتر تھا، پھاٹک پر سفید اور زرد رنگ کا ملمع تھا، ستونوں پر بیلیں تھیں جن کی سبزی کے دامن میں پھولوں کی سفید کٹوریاں لٹک رہی تھیں، دروں میں لوہے اور پیتل کے تاروں کے سہارے گملے آویزاں تھے، پھاٹک کے سامنے ایک کشادہ تختۂ زمین تھا، بیچ میں ایک پختہ چبوترہ تھا، جسکے چاروں طرف چھوٹے چھوٹے پھولدار درخت تھے، مکان کا دروازہ چھوٹا اور مختصر تھا، اسکے دروازے سبز تھے، اسی دیوار کے ایک طرف ٹین کا ایک برآمدہ تھا، جسکے پیچھے ایک کمرہ تھا، کمرہ کے دروازوں پر عمدہ روغن تھا، سبز، سرخ، اور آسمانی شیشے دروازوں میں کاٹ کاٹ کر لگائے گئے تھے، کمرہ بند تھا، برآمدہ میں دیوار سے لگی ہوئی ایک آرام کرسی اور کئی چھوٹی چھوٹی کرسیاں رکھی تھیں، ایک سمت ایک پُرانی میز پر کچھ اخبارات بے ترتیبی سے پڑے تھے، اُسکے اوپر دیوار میں بجلی کا لیمپ تھا جو ایک طرف کو جھک گیا تھا، وہاں کوئی نہ تھا، ہم دونوں دیر تک کسی کا انتظار کرتے رہے،

قاسم کا اشتیاق بڑھ رہا تھا، اُس نے میز پر رکھی ہوئی گھنٹی بجائی۔

اندر سے ایک عورت برآمد ہوئی جس نے قاسم کو پہچانا، پھر کمرہ کھولا گیا اور ہم اندر داخل ہوئے، سجے ہوئے کمرے کے اسباب آرائش کو دیکھ کر میری روح میں ایک طرح کی بالیدگی پیدا ہوئی، دیواروں پر سبز رنگ، دروازوں پر سفید پھولدار پردے، آتشدان پر قسم قسم کے کھلونے، تصویریں البم اور کاسے، تصویریں اور آئینے ہر طرف آویزاں تھے، زمین پر قالین اور کھالوں کا فرش تھا، صوفے اور کوچ سے کمرہ بھرا ہوا تھا، کمرہ کا ایک دروازہ مکان میں کھلتا تھا جس سے ایک لڑکی داخل ہوئی، قاسم نے مجھے بتایا کہ وہ اُسکی رفیقہ کی بہن ہے،

لڑکی کی عمر آٹھ برس کی تھی، اُسکا جسم بھرا بھرا اور گداز تھا جس سے وہ زیادہ سن دار معلوم ہوتی تھی، اُس کا نام تمیز تھا، وہ ہلکے سبز رنگ کا ریشمی چوڑی دار پائجامہ پہنے تھی، اُسکے پیروں میں سیاہ سلیپریں تھیں، جسم پر سفید فلالین کی قمیص تھی جس پر آسمانی ساٹن کی ایک چست پھولدار صدری تھی۔ اُسکا سر کھلا ہوا تھا، اُسکی بگڑی سنوری مانگ اُسکے سنہرے چمکیلے بالوں کے سایہ میں مدھم اور مبہم نظر آتی تھی، اُسکے گلے میں لال دوپٹہ تھا جو پروائی سے ڈال لیا گیا تھا، اُس کا قد چھوٹا تھا گال سرخ اور بھرے بھرے تھے، اُسکی آنکھیں صاف اور چمکدار تھیں، اُن میں معصومیت اور شرارت کی ایک پُر لطف ملی جُلی چمک تھی، بغیر کسی رسمی تکلف و حجاب کے وہ میری گود میں آکر بیٹھ گئی،

قاسم اندر چلا گیا، اُس لڑکی کو دیکھ کر میں کچھ سوچتا رہا، شاید میں اپنے دوست کی رفیقہ کے جمال و شباب کا اندازہ کرنے لگا، وہ مجھ سے جلد ہی بے تکلف ہو گئی، جب تک میں بیٹھا میری گود سے وہ نہ اُتری، بار بار میرے ہاتھ کو اپنے ہاتھ میں وہ لے لیتی اور مجھ سے عجیب عجیب سوالات کرتی،

اندر سے پان آئے اور تمیز نے اپنے ہاتھ سے ایک پان مجھے کھلایا،

میں ڈر گیا، میں نے غور سے اُسے دیکھا، میں سمجھا شاید اسکی عمر زیادہ ہے لیکن اس دفعہ مجھے ایسا معلوم ہوا کہ وہ بہت ہی کمسن ہے، اپنے سر کا ایک بال اپنی چٹکی میں لیکر اُس نے مجھے دکھایا اور اُسکے متعلق میری رائے پوچھی، پھر وہ اپنی سادہ اور سفید ہتھیلیاں مجھے دکھانے لگی، اور مقابلہ کے لیے میری بھدی اور سخت ہتھیلیاں کھول کر وہ ہنسی، میں نے اُس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا اور دیر تک اُسے دیکھتا رہا، اُسکی کلائی سفید لوچدار اور نرم تھی، اُس میں

دونازک نازک سیاہ چوڑیاں تھیں، اُسکی اُنگلیاں ملائم اور پتلی تھیں، اُسکی ہتھیلی صاف تھی، اُس میں ہلکی لانبی لکیریں ایک جگہ پہونچ کر ملتی تھیں، میں اُس کی عمر کی لکیر کو دیکھتا رہا، وہ بہت لانبی اور صاف تھی، پھر میں نے اُس کا ہاتھ دبایا، وہ گرم تھا، اطمینان، فراغت اور اطمینان کی گرمی اُس میں سوئی ہوئی تھی،

مجھے اُس کی تیزی پر دیر تک حیرت رہی، میں نے اپنی گود سے اُسے اُتار دیا، وہ کچھ سوچ کر میری گود سے نکل گئی، دو قدم پیچھے ہٹ کر اُس نے گہری گڑی ہوئی نظروں سے مجھے دیکھا، دیر تک اس طرح خفگی کی نگاہوں سے وہ مجھے دیکھتی رہی، پھر میرے پاس سے چلی گئی،

قاسم کے ساتھ میں اپنے گھر واپس آیا، گذشتہ شب بیداری اور تکان سفر سے میں مضمحل ہو رہا تھا، چار بجے تک میں سوتا رہا، قاسم سے اُسکی رفیقہ کے متعلق میں نے کچھ نہ پوچھا، میں اسکے گھر سے کچھ بے لطف سا واپس ہوا، میرا جی کسی سے بولنے کو نہ چاہتا تھا، ایک نامعلوم گھبراہٹ، ایک اُداسی میری روح میں سرایت کر گئی تھی، قاسم نے بھی اپنی رفیقہ کے متعلق کچھ نہ کہا، شاید وہ اس ملاقات کے وسیع و بے پایاں جذبۂ مسرت کا اتنا حریص تھا کہ اسکی تقسیم اُسے ناگوار تھی،

شام کو قاسم اپنا اسباب لیجانے لگا، میں نے اُسے روکا مگر اُس نے کہا کہ اُنھوں نے اصرار کیا ہے اور ہم دونوں کو وہیں بلایا ہے، میں کیسے جا سکتا تھا، میرے انکار پر اُسنے اپنے لیے مجھ سے اجازت چاہی، اُس کے لہجہ میں ایک جذبۂ آرزو شامل تھا، میں اُسے مایوس نہ کر سکتا تھا، میں یہ کیسے روا رکھ سکتا تھا کہ میرا دوست اپنی رفیقہ سے اس قدر قریب رہ کر اُس سے اس قدر دُور رہے، یہ سخت بیدردی ہوتی، میں نے بخوشی اُسے اجازت دی اور کچھ دیر بعد اُسکے یہاں پہونچنے کا وعدہ کیا، اپنا سامان گاڑی پر رکھا کر وہ روانہ ہوگیا۔

میں اندر چلا گیا اور دیر تک وہاں رہا، جب شام ہوگئی اور تماشا کا وقت آگیا، میں نے گھر سے کچھ لوگوں کو اپنے ہمراہ لیجانا چاہا مگر اس کی اجازت نہ ملی، میں تنہا روانہ ہوا اور قاسم کے گھر پہونچا، وہ اندر تھا، میری خبر پا کر اُس نے مجھے اندر بلا لیا، ایک عجیب طرح کی حس اپنے دل میں لیے ہوئے میں قاسم کے کمرہ میں داخل ہوا، اُس نے میرے لیے چاے تیار کرائی اور طے کیا کہ چاے پینے کے بعد تماشہ میں چلیں گے۔

چاے آئی اور ہم دونوں نے پی، پان لائے گئے اور دو پان میں نے کھائے، چلتے وقت تیز بھی گئی، قاسم نے اُس سے چلنے کو کہا، میری طرف اشارہ کرکے اُسے

کہا کہ وہ میری موجودگی کی وجہ سے نہ جاتی. کوشش ضبط کے باوجود مجھے ہنسی آ گئی اور اُسے پیار کیے لینے کو بیراجی پایا، میں سمجھ نہ سکا کہ میں کیا جواب دوں، میں اپنے کو ایک عجیب بد نما حیثیت میں محسوس کر رہا تھا، دیر تک ایک غیر جانبدار طریقہ سے وہ مجھے گھورتی رہی، شاید وہ مجھ پر اپنے برقی اور چبھتے ہوئے الفاظ کا اثر معلوم کرنا چاہتی تھی۔ وہ بالکل وہی تیز تھی، شوخ اور تیز نگاہی کے ساتھ نیک اور معصوم۔ صرف سردی کی وجہ سے اُس نے اس وقت ڈوپٹہ کے بجائے ہلکے آسمانی رنگ کی ایک شال اپنے سر سے اوڑھ لی تھی، اُسکا سفید ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیکر میں نے اُس سے پوچھا:

"مجھ سے خفا ہو گئیں؟"

ایک غیر ذمہ دار نیم تلخ اور نیم خفگی کی آن لیے ہوئے تبسم کے ساتھ اُسنے میری طرف سے اپنی گردن پھیر لی،

اپنے ساتھ میں اُسے تانگہ تک لایا اور اپنے پاس میں نے اُسے بٹھایا، میں نے اس کا ہاتھ چھوڑ دیا اور قاسم سے باتیں کرنے لگا، اور اس خیال سے کہ تیز نہ سمجھے ہم نے انگریزی میں گفتگو شروع کی، مجھے یہ سُن کر حیرت ہوئی کہ اُسکی رفیقہ اپنی ماں کے ہمراہ نہیں آئی تھی، میرا دل بیٹھنے لگا،

"مگر صبح تم نے اس کا ذکر نہیں کیا" میں نے کہا

"اب اس ذکر کو جانے دو" قاسم نے جواب دیا

ہم لوگ ٹھنڈی سڑک پر آ گئے تھے، راستہ کے دونوں طرف بڑی بڑی انگریزی دکانیں تھیں، اُن کے بڑے بڑے شیشے کے دروازے، اُنکے رنگین و بیش قیمت پردے، اُنکے اسباب آرائش آنکھوں میں خیرگی اور حیرانی پیدا کرتے تھے، آدمیوں کا ہجوم یہاں کم تھا، ٹھنڈک اور روشنی یہاں زیادہ تھی، حُسن کی تازگی اور خنکی فضا میں پھیلی ہوئی تھی، موٹروں اور نازک خوشنما گاڑیوں پر عیش پسند اور حسین جوڑے یہاں تفریح کو آئے تھے،

ہمارا تانگہ "دی امپیریل سینما" پہونچکر رُک گیا،

سوار ہونے کے بعد میں نے تیز کو اُتارا، اور اُس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیے میں نے ٹکٹ خریدے، مجھے محسوس سا ہوا کہ وہ اپنا ہاتھ مجھ سے چھڑانا چاہتی ہے، مگر اُس نے اس پر زور نہ دیا، تماشا شروع ہونے میں دیر تھی، لیکن جگہیں قریب قریب بھر چکی تھیں، بجلیاں

بجلی روشنی بجلی کے قمقموں سے چھن چھن کر، تڑپ تڑپ کر عالیشان وسیع ہال پر برس رہی تھی، منقش و زرنگار چھت چمک رہی تھی، ہر طرح کا حسن یہاں جمع تھا، نیلی آنکھوں کی تڑپ سنہرے بالوں کی چمک، فضا میں لطیف سیل نور پیدا کرتی تھیں، گرم سانسیں، ٹھنڈی سانسیں یہاں برسرِ پیکار تھیں، حسن و عشق دریائے لطافت میں ساتھ ساتھ تیر رہے تھے، حرارتِ شوق کے ایک وسیع سیلان میں تمام مجمع ڈوبا ہوا تھا، رنگین و قیمتی لباسوں کی موجودگی قوسِ قزح کا سامان پیدا کرتی تھی، رنگوں کا امتیاز یہاں مشکل تھا، سحر کار روپ یہاں حسن اپنے پر ترنم اور رسیلے قہقہوں، آڑی ترچھی مسکراہٹوں، سنجیدہ و شرمگیں خاموشیوں کا سایہ اس ہال کی آبادی پر ڈال رہا تھا، بلوریں کلائیاں، آتشیں چہرے، چمکیلے بال اس دریائے لطافت میں زندگی کی لہر پیدا کر رہے تھے،

ہم تینوں پاس پاس بیٹھ گئے، میں نے تمیز کا ہاتھ چھوڑ دیا کہ وہ اپنی مرضی سے جہاں چاہے بیٹھے، وہ میرے پاس بیٹھ گئی، روشنی گل کر دی گئی، پیانو کے جھنکار اور فوٹ، وائلن کی نرم تانیں مضطرب روحوں کو تھپکنے لگیں، چارلی اپنی مخصوص ہیئت کذائی میں سامنے آیا، وہ ایک باغ میں تھا، اسکے ہاتھ میں سگرٹ تھی، اسکے داہنی طرف بنچ پر ایک بیوقوف نیم خوابی کے عالم میں اپنا منہ پھیلائے اونگھ رہا تھا، چارلی نے ادھر اُدھر دیکھ کر سگرٹ کی راکھ اسکے منہ میں گرا دی، اور بے پروائی سے دوسری طرف متوجہ ہو گیا۔

ایک قہقہہ کا شور ہال میں بلند ہوا، اس میں کس کس کی آوازیں شامل تھیں، تمیز کی مخصوص نحیف ہنسی کی آواز بھی اس تعدد صدائے تحسین میں ضائع ہوتے ہوئے میں نے دیکھی، اپنے سامعہ کے ذریعہ سے علیحدہ کر کے اپنے سینے میں لمحے میں نے منتقل کر لیا،

تماشا شروع ہوا، آج "دی وائٹ روز" کی باری تھی،

گوروں نے سیٹیاں بجانا شروع کیں۔

دو ریل ختم ہو چکے تھے کہ میں نے محسوس کیا تمیز میرے قریب آتی جاتی ہے، مجھ پر گری پڑتی ہے، اپنے پیر کبھی وہ کرسی کے نیچے گرا دیتی کبھی اٹھا لیتی، شاید تماشہ میں اس کا دل نہیں لگ رہا تھا، اپنی شال کو بار بار وہ کھینچتی تھی، شاید وہ لیٹنا چاہتی تھی، وہ تکلیف سے بیٹھی تھی سامنے دیکھنے کے بجائے وہ ادھر اُدھر دیکھتی، کبھی اسکی نظر چھت کی طرف اٹھ جاتی، اور وہ کھوئی ہوئی معلوم ہوتی، کبھی وہ کھڑی ہو کر بہت دور آگے دیکھنے لگتی، جیسے وہ معلوم کرنا چاہتی تھی

کہ نغمہ کی صدائیں کہاں سے آتی ہیں،

میں نے اپنا پائپ جلایا، وہ مجھ سے اور مل گئی، اپنے جسم کا بار میرے شانوں پر اس نے ڈال دیا، کیا اُسے نیند آ رہی تھی؟ میں نے اپنا ہاتھ اُسکے گلے میں ڈال دیا اور جیسے کوئی گلے ملتا ہے اس طرح اپنے کاندھے سے میں نے اُسے لگا لیا، اور اُسکے بالوں پر اپنے گال رکھ دئے، ایک ٹھنڈی، بھینی خوشبو اُن میں سے نکل کر میرے دماغ کو معطر کرنے لگی، دیر تک میں اُسکے بالوں پر ہاتھ پھیرتا رہا، اسکے ملائم بالوں کے جال کو، باریک بالوں کے ایک ایک تار کو اپنی چٹکی میں لیکر گنتا رہا، وہ اب بھی تکلیف میں تھی، میرے اور قریب آتی جاتی تھی، میں نے آہستہ سے اُسے اپنی طرف کھینچا اور اُسکے رخساروں کے پاس اپنا منہ لیجا کر میں نے آہستہ سے اُسے چوما، اُسکے گال برف کی طرح سرد تھے، اُسکے ہونٹ کانپ رہے تھے! اب میں سمجھا، اُسے سردی لگ رہی تھی اور اس کمزوری کے لمحہ میں وہ مجھ سے گھل جانا چاہتی تھی، آہ، اُس کی معصوم شرارت! میں نے اُسے اُسکی کرسی سے ایک نصف کھلی نصف بندھی گٹھری کی طرح اُٹھا کر اپنی گود میں دبا لیا اور قاسم کے اوورکوٹ سے اُسے میں نے ڈھانپا، اپنے قریب اُسے محسوس کر کے میں نے اُس سے بولنا چاہا مگر میں نے ایسا نہیں کیا،

تماشہ کے بعد میں نے اُسے سوتا ہوا پایا، گرمی اور آرام پا کر اُسے نیند آ گئی تھی، اُسی طرح اپنی گود میں اُسے لیے ہوئے میں گاڑی پر بیٹھا اور نیم بیداری کی حالت میں اُسے گھر تک پہونچایا،

دوسرے دن بالکل غیر متوقع طور پر مجھے کانپور سے اپنے گھر چلا جانا پڑا، قاسم سے وعدہ ہوا کہ ختم تعطیل پر واپسی ساتھ ساتھ ہوگی لیکن گھر پر مجھے کچھ غیر معمولی اہم کام رہے جسکی وجہ سے بیس دن کی تاخیر سے مجھے واپس ہونا پڑا، اور قاسم کا ساتھ نہ ہو سکا، واپسی پر میں کانپور پھر ٹھہرا، یہ معلوم تھا کہ قاسم وہاں نہیں ہے مگر میں اپنے چھوٹے ناراض و شریر دوست سے ملنے کے لیے بیتاب تھا، میں اُس مکان پر گیا، اُس برآمدے میں بیٹھا جہاں ایک مہینہ قبل قاسم کے ساتھ چلتے پہل آ کر بیٹھا تھا، کرسیاں اسی طرح اپنی پرانی جگہ پر پڑی تھیں، میز پر اخبارات بھی اُسی طرح بے ترتیبی سے پڑے تھے، بدقی لیمپ اپنی گردن جھکائے اسی طرح اپنی قدیم جگہ پر لٹک رہا تھا، پہلے کی طرح وہاں خاموشی بھی تھی، بہت دیر تک میں وہاں بیٹھا رہا، بالآخر میں نے گھنٹی بجائی، مجھے معلوم ہوا کہ وہ لوگ وہاں سے جا چکے تھے .....

اب کانپور ٹھہرنا بیکار تھا، میں دوسری گاڑی سے علی گڑھ چلا آیا، اور قاسم سے ملا، اُسنے میرے دیر میں پہونچنے کی شکایت کی لیکن اُسکے وجوہ معلوم کرکے اُسنے مجھے معاف کردیا، اُسکے پاس کانپور سے برابر خط آتے ہیں، تمیز کی خیریت اور اُسکے حالات سننے کو میرا اکثر جی چاہتا ہے مگر قاسم سے میں نے کبھی اُس کی خیریت نہیں پوچھی، اس عجیب و غریب لڑکی نے مجھے اس طرح متاثر کیا ہے کہ عرصہ تک یہ نقشِ موہوم میرے دل میں پرورش پاتا رہے گا۔

جلیل قدوائی (علیگ)

رباعیات رواں

(جذبۂ غم)

مرغوبِ دلِ جہاں ہے غم کی تاثیر
رکھتی ہیں سرشکِ جامِ جم کی تاثیر
انساں سے فرشتہ کر دیا ہے مجھ کو
اللہ اللہ! یہ الم کی تاثیر

حالِ دل کچھ خراب سا رہتا ہے
یعنی اک پیچ و تاب سا رہتا ہے
کھلتا نہیں رازِ وجہِ کلفت لیکن
ہر وقت اک اضطراب سا رہتا ہے

آسانیِ زندگی کو مشکل سمجھو
ذی روح کی ہر نفس کو منزل سمجھو
تفریحِ حواس و روح ہنسنے میں نہیں
غم کو وجہِ فراغتِ دل سمجھو

دھوکے میں جہاں کا ہر بنی آدم ہے
عنوانِ خوشی بھی سرخیِ ماتم ہے
یہ فیصلۂ نگاہِ عبرت ہے رواں
عشرت کدۂ جہاں میں غم ہی غم ہے

تقدیر کا راز فاش ہو جانے دے
ہو جائے تلفِ معاش ہو جانے دے
اک لذتِ غم پہ دو جہاں کی خوشیاں
صدقے ہو جائیں کاش ہو جانے دے

رواں ایم اے ال ال بی

مرثیہ حضرت امام حسینؓ

دیوان قائم چاندپوری کے قلمی نسخہ سے جو الناظر پریس میں زیرِ طبع ہے، ہم ذیل کا مرثیہ نقل کرتے ہیں، ناظرین دیکھیں ابتدا میں مرثیہ کا کیا رنگ تھا۔ اُس وقت تک مسدس کی شکل میں مرثیہ کہنے کا رواج نہ تھا۔

سب ایڈیٹر

اے فلک تجھ سا بھی کوئی اور بدکردار ہے
جوں حباب موج دم لینا اُنھیں دشوار ہے
قتل کرتے ہیں کسی ایسے ہی مجرم کو کبھو
ذبح کیجے سبطِ پیغمبر کو یوں تشنہ گلو
یہ میں مانوں گا ستم دُنیا میں ہوئے بیش و کم
ہو نہ اک پیاسے کو مارے پیاس کے جنگل میں یم
کس کے گھر پہ یہ غضب ٹوٹا ہے کوئی دے نشاں
اُس طرف عرضِ عطش کو اسنے کاڑھی ہو زباں
خون میں ڈوبا ہے کس کے طفلِ شش ماہہ کا تن
سر اُدھر نیزہ پہ سوکھے ہے پڑا ادھر بدن
غم میں نوشہ کے دُلھن کا کس نے دیکھا ہے یہ حال
داغ کے بچھے ہیں چھاتی پہ پریشاں سر کے بال
لاش پہ ہیں لاش سارے گھر کی اس صورت کے ڈھیر
ہے کہیں چولی بدن پر تو نہیں امن کا گھیر
لگ رہی ہے سر پہ جیدھر دیکھیے خیمہ کو آگ
سامنے آنگن میں لُٹتا ہے بھتیجی کا سہاگ
کوئی جو کہتا ہو لُٹتا ہے یہ کس کا خانماں
کون یہ دکھیا ہے پھرتے ہیں جسے یوں موکشاں

آلِ پیغمبر ہے یہ جس کو یہ ستم ہموار ہے
ایک سر ہے جسجگہ واں سیکڑوں تلوار ہے
پوچھ لیتے ہیں یہ اُس سے کیا ہے تیری آرزو
اور نہ کہیے اُس سے پانی بھی تجھے درکار ہے
پر نہ جو اُن پر ستم گذرا ہے اتنا بھی ستم
اُس گلے پر آب کے بدلے چھُری کی دھار ہے
گود میں بابا کے کس بچہ کی نکلی ہے زباں
اس طرف پیکان تیر اُسکے قفا سے پار ہے
کون ایسا مر گیا جسکو نہ کوئی دے کفن
مر بھی جاتے ہیں پر ایسی موت کسکی خوار ہے
جائے غازہ اشک خونی سے کرے چہرہ کو لال
سہرا منہ پر ہے اُسکے نے گلے میں ہار ہے
جوں پڑے ہوں خزنِ گلِ باغ میں بالا و زیر
ہے بدن عریاں کسی کے سر پہ گردستار ہے
چھپتے ہیں زینبؑ کے پیچھے آکے بچے بھاگ بھاگ
گھر میں عابدؑ سا بھتیجا خستہ و بیمار ہے
کس کی یہ عورات ہیں کرتی ہیں جو شور و فغاں
کیا خطا ایسی ہوئی جس پر یہ سب آزار ہے

اہل بیتِ مصطفےٰ یوں کیجیے اونٹوں پہ سوار
ہاتھ میں عابد کے اک بیمار کے دیجیے مہار
مجکو حیرت ہے کہ تھا جس دشت میں اُسکا گذر
وہ کفِ پا برگِ گل سے تھا جو نازک بیشتر
جائے رونا اس طرح وہ نورِ چشمِ مصطفےٰ
چشم آنسو سے بھری سینے پہ داغِ اقربا
کچھ پیمبرؐ کی بھی روئے آئے ہے تجکو حجاب
دشت پُرخار و سر پہ گرم آتا آفتاب
ہر گرہ پہ بند اُس کی صورتِ زنجیر ہے
خستہ دہشت سے بدن سارا بیابان گیر ہے
اس طرح ہر ایک قدم اُسنے جو کی چلنے میں دیر
خار کے مانند لگی ہیں بیچ اُس گلبن کو گھیر
بھر رہا ہے اس طرح سے تنگ کا آنکھوں میں نم
رنگ اڑ جاتا ہے منہ پر ضعف سے گردن ہے خم
اس مشقت ساتھ دن ہوتا ہے اُسپر جب تمام
کان کی سوجن سے تکیہ ہے تلے سر کے مدام
روتی ہے زینبؑ جب اُسکے حالِ بد کو دیکھ کر
اُولتی سے زیادہ ٹپکے ہے ہر اک مژگان تر
پیٹ پیٹ اپنا سر و سینہ یہ کرتی ہے کلام
پر میں کہتی تھی ہے تجھ پہ بوجھ اب گھر کا تمام
گر تنِ نازک پہ تیرے بیٹھ جاتی تھی مگس
یا کوئی اس دکھ میں ہے تیرا جواب فریاد رس
چھیڑ کر گذرے تھی گیسو کو ترے گر ٹک نسیم
ہو کشاکش سے ستم کشتہ نکلی لے پیرے یتیم
جس جگہ اہل حرم کرتے تھے یہ شور و فغاں

ہو نہ پوشش کچھ بدن پر اُنکی جز گرد و غبار
آ گئے سر برہنہ پہ اُسکا گھر کا جو سردار ہے
کیوں نہ جوں گردوں زمیں وہاں ہو گئی زیر و زبر
ہر قدم آزار گہ اُسکا سنانِ خار ہے
ایک سا گریہ میں تیرے سر سے لیکر تا بہ پا
آئینہ برسات میں گویا تہ زنگار ہے
کس کی تیغ کو کھودے ہے لے خانہ خراب
پاؤں میں سے کفش د سر پہ اسکے نے دستار ہے
چھالا سا ہر خار رحم ہم پا کا دامنگیر ہے
تشنگی سے منہ کھلا ہے یوں گویا سوفار ہے
ہر طرف سے آئے ہیں گھوڑوں کو ظالم پھیر پھیر
زخم سیلی سے تھا جو برگِ گل افگار ہے
پھول میں نرگس کے شبنم جس طرح رہتی ہو تھم
پاؤں رکھتا ہے جہاں ہاں حسرت یوار ہے
نے اُسے سامانِ خوابی ملے ہے وقت شام
فرش کو پہلو کے نیچے زخم دامن گیر ہے
سوت سے پانی کے اگلے ہیں پھٹے زخمِ جگر
زخمِ نو کی طرح اُسکی چشم تر خونبار ہے
جو موئے وانی مرے کس کس کا روؤں لیکے نام
سو تھکے اس دکھ میں اپنی زندگی بھی بار ہے
جوں مگس ماریں تھے سر پہ ہاتھ اپنے چند کس
سو صدا لے طوق یا زنجیر کی جھنکار ہے
ہے سے تھا صدمہ سے اُسکے گیسوؤں کا دل دو نیم
خوں سے آلودہ اب اُن زلفوں کا ہر یک تار ہے
چشم سے اک خلق کے خونابۂ دل تھا رواں

کیوں نہ ہو یہ حال اُنکا ہووے یہ آفت جہاں
آدمی بیطاقتی کرنے میں ہاں ناچار ہے
قاسم اب چپ رہ کہاں تک یہ حدیثِ جاں گسل
بہ گیا خونناب ہو آنکھوں سے اک عالم کا دل
ہے یہ ڈر ارض و سما کے اطبیق جا دیں ہل
اے خدا اتنا ترس بس یہ بھی کوئی گفتار ہے
یا امام المتقین جس روز نفخِ صور ہو
ہر کسی کو اک وسیلہ اُس جگہ منظور ہو
واں یہ بندہ بھی غلامی میں تری مشہور ہو
اس سوا اس روسیہ کو اور کیا درکار ہے

واردات

کیا طرفہ تماشا ہے ہنگامِ قدح نوشی
سو جلوے دکھاتا ہے اک پردۂ بیہوشی
طاری جو رہی دل پر وہ اور تھی کیفیت
سب کہنے کی باتیں ہیں ہشیاری و بیہوشی
اللہ ری مجبوری آداب محبت کی!
سینہ میں تلاطم ہے اور لب پہ ہے خاموشی
اے حسن حیا چھوڑ لے پیار محبوبی
اک بندۂ الفت سے یہ وعدہ فراموشی
یہ سوز دروں کب تک؟ یہ ضبط جنوں کب تک؟
کچھ اُن سے بیاں کر دے اے پردۂ خاموشی
کس حسرتِ دیرینہ کا خون ہوا یارب!
آفت کدۂ دل میں چھائی ہے جو خاموشی
پائی ہے اُن آنکھوں کی مخمور نگاہی سے
بیہوش نے ہشیاری ہشیار نے بیہوشی

جلیل قدوائی

رومان کی حقیقت اور اسکا آغاز

قصص وحکایات کی وہ صنف جسے انگریزی میں "رومانس" اور عربی میں "رومان" کہتے ہیں دراصل اہل عرب کی ایجاد ہے جسے انگریزی اور فرنچ لٹریچر نے درجۂ کمال کو پہونچایا، ہمارے عزیز دوست عزیز احمد خاں صاحب نے ذیل کے مضمون میں تاریخی حیثیت سے اس موضوع پر روشنی ڈالی ہے - یہ مضمون صرف رومان کے آغاز سے بحث کرتا ہے، مگر ہمیں امید ہے کہ کسی دوسری قسط میں عزیز صاحب اسے پایۂ تکمیل کو پہونچا دیں گے۔ سب ایڈیٹر

۱ - رومان کی خصوصیات

رومان کی تعریف، رومان کا مقصد، رومان اور شاعری کا فرق، لفظ رومان کا اشتقاق، رومان اور تاریخ میں امتیاز، حکایت کا فرق -

رومان کی تعریف ابتدا میں صرف نثری افسانوں کو رومان کا لقب نہیں دیا جاتا تھا بلکہ نظم میں بھی رومان موزوں کیے جاتے تھے، چنانچہ اطالوی شاعر جیرالڈی نے اپنے رسالہ "دی رومانزی" میں اسی خیال سے اتفاق کیا ہے، جسکی تصدیق کے لیے اس نے اپنے ہموطن شاعر اریوسٹو کے رومان کا حوالہ دیا ہے، لیکن موجودہ زمانہ کا رواج اسکے برعکس ہے، عشق و محبت اور حادثات و تجربات کے ان نثری افسانوں کے سوا کسی اور صنف ادب کو رومان کا موزوں اعزاز نہیں عطا کیا جا سکتا جو قارئین کو راہ ہدایت دکھانے اور سرمایۂ انبساط فراہم کرنے کی غرض سے ایک لطیف و پاکیزہ اسلوب بیان میں پیش کیے گئے ہوں -

رومان کو فرضی قرار دینا مناسب ہے، تاکہ اسے اصلی تاریخ سے — اور عشقیہ حادثات و تجربات سے، کیونکہ محبت رومان کا مخصوص موضوع ہونا چاہیے — تمیز کیا جا سکے۔ زمانہ کی خوش مذاقی اسے نثر میں پیش کیے جانے کی طلبگار ہے، اس لیے اسکا صنعت و لطافت سے آراستہ ہونا ضروری ہے تاکہ وہ حسن و ترتیب کے فقدان سے ایک غیر منضبط اور نامطبوع شے کی شکل اختیار نہ کرلے -

رومان کا مقصد رومان کا اصلی مقصد یہ ہے یا کم از کم ہونا چاہیے، جسے مصنف خاص طور پر پیش نظر رکھتا ہے کہ قارئین کو راہ ہدایت دکھائی جائے اور انکے سامنے

حسن عمل کو سر بلند اور فسق و فجور کو سرنگوں حالت میں پیش کیا جائے، لیکن چونکہ انسان کا دل فطرتاً (ذاتی تکبر کے زیر اثر) آگاہ کیے جانے سے ابا کرتا ہے اور ہدایت کی مخالفت کرتا ہے لہذا اسے انبساط کی ملاطفت سے اپنے دام میں پھانسنا چاہیے اور نصائح کی شہرت کو مثال کی ترغیب سے دھیما کرنا چاہیے۔

اس طرح گویا مطالعہ کرنے والے کی ضیافت انبساط، جسے ایک ماہر رومان نویس خاص طور پر اپنا مطمح نظر بناتا ہے اسکے اصلی مقصد "ہدایتِ قلب و اصلاح اخلاق" کے تابع ہے، اور رومان کی خوبی مذکورہ مقصد اور تعریف کا لحاظ رکھنے کے مطابق بتدریج برقرار رہتی ہے یا مفقود ہو جاتی ہے۔

رومان اور شاعری میں فرق

اس مقام پر رومان بصورت نظم معرض بحث میں نہیں لایا جائیگا اور نہ اس سلسلہ میں رزمیہ شاعری سے کوئی سروکار ہوگا۔ جو اگرچہ بعض اعتبارات سے رومان کی ہم قبیل ہے لیکن اپنے اسلوب بیان کے اختلاف کے علاوہ ان متغائر اجزاے ضروری سے مرکب ہے جو اس میں اور رومان میں مابہ الامتیاز ہیں، باانہمہ ارسطا طالیس کے قول کے مطابق، جسکا عقیدہ ہے کہ شاعر اپنا جوہر بجاے شعر کے افسانہ نگاری میں دکھاتا ہے، رومان نگار بھی شعرا کی صنف میں داخل کیے جا سکتے ہیں، شعر کے متعلق قدیم رومی انشاپرداز پیٹرونیس کا خیال ہے کہ اسے اپنی الہامی شان اور وسعتِ معانی کے اعتبار سے ایک عظیم الشان دائرہ میں حرکت کرنی چاہیے تاکہ اُس میں ایک ایسی پُر جلال روح دوڑ جائے جس سے وہ سراسر ہاتف غیبی کی آواز متصور ہو اور حقیقی واقعات کا ایک صحیح ترجمان ہو۔ لیکن رومان میں شعر سے کہیں زیادہ سادگی ہوتی ہے اور وہ اسکی عالی مرتبتی کی بھی ہمسری نہیں کر سکتا جو اسکی جدت بیان اور استعارات کی شان سے حاصل ہوتی ہے۔

شعر میں رفیع الخیالی سے کام لیا جاتا ہے اور وہ ہمیشہ قیاسات تک ہی محدود نہیں رہتا۔ اور بخلاف اسکے اگرچہ رومان علوِ جذبات کی طرف اتنی پیش قدمی نہیں کرتا مگر اس کا سرمایہ زیادہ تر قیاسات ہی ہوتے ہیں، شعر اپنی اختراعی شکل کے اعتبار سے زیادہ باضابطہ اور صحیح ہوتا ہے اور اس میں رومان کے بہ نسبت واقعات اور قصوں کی کم گنجایش ہوتی ہے لیکن رومان ان زوائد کو قبول کرنے کی اس وجہ سے صلاحیت رکھتا ہے کہ اس کا اسلوب بیان

شعر کے مانند بلند پایہ نہیں ہوتا اور نہ اسکے سمجھنے میں ذہن کو وسعتِ خیال سے کام لینا پڑتا ہے لہذا رومان میں مختلف النوع خیالات کی بکثرت سمائی ہوسکتی ہے

المختصر شاعری کا موضوع عموماً کوئی فوجی کارنامہ یا سیاسی کیرکٹر ہوا کرتا ہے اور کسی خاص موقع پر وہ محبت کے راگ بھی آزادی کے ساتھ الاپتی ہے، لیکن رومان کا مخصوص موضوع صرف محبت ہے اور سوائے حسن اتفاق کے جنگ و سیاست سے اُسے کوئی سروکار نہیں ہوتا۔ یہاں صرف باضابطہ رومان پر تبصرہ مقصود ہے اسلئے کہ جو رومان قدیم فرانسیسی، ہسپانوی اور اطالوی زبان میں موجود ہیں، ان کا موضوع بہ نسبت شاہبازوں کے زیادہ تر فوجی کیرکٹر ہیں۔

لفظ رومان کا اشتقاق

چنانچہ اسی واقعہ کی بنا پر جیرالڈی نے یہ رائے قائم کی ہے کہ لفظ رومان ایک یونانی لفظ سے مشتق ہے جو زور و قوت پر دلالت کرتا ہے کیونکہ اس نوع کی انشا پردازی نے شہنشاہ شارلیمن کے جنگجو درباری پالاڈنز کے فوجی کارناموں اور شجاعت آزمائیوں کے تمثیلی بیان کو اپنا موضوع قرار دیا تھا۔ باینہمہ اس بارے میں جیرالڈی سے لغزش ہوگئی جیسا کہ آئندہ صفحات کے مطالعہ سے ثابت ہوگا۔

رومان اور تاریخ میں امتیاز

ان تاریخوں کو معقول تصور کرنا کسی طرح مناسب نہیں جن میں غلط بیانی بکثرت پائی جاتی ہو۔ چنانچہ یونانی مورخوں کا امام ہیرودوٹس بھی ایسی قابل وقعت قرار نہیں دیتا۔ مشہور سیاح ہنو کی تصنیف "سفر البحر" اور سوانح نگار فنی لاسٹراٹس کی سوانح "اپولونیس" وغیرہ اسی نوع کی تاریخوں میں شمار کی جاسکتی ہیں۔ یہ تالیفات اپنے اصل میں تو درست ہیں لیکن بعض پہلوؤں سے غیر صحیح اور ناقص ہیں، بخلاف اسکے رومان اپنی اصل میں تو غلط ہوتا ہے لیکن بعض جزئیات میں صحیح، گویا اس میں کذب و صداقت کا امتزاج ہوتا ہے، اور اول الذکر، آخر الذکر کی نامکمل حالت سے زیادہ نمایاں ہوجاتا ہے، یعنی رومان میں غلط بیانی کا عنصر اس قدر غالب ہوتا ہے کہ وہ نہ صرف بحیثیت مجموعی بلکہ ہر پہلو سے سرتاپا غلط قرار دیا جاسکتا ہے۔

ارسطا طالیس آگاہ کرتا ہے کہ ایسی حزن انگیز تصنیف جسکے دلائل آشکارا ہوں اور تاریخ سے اخذ کیے گئے ہوں اس تصنیف سے زیادہ مکمل ہوتی ہے جس کا موضوع جدید اور صنعت آمیز ہو، تاہم وہ آخر الذکر کی مذمت اس بنا پر نہیں کرتا کہ اول الذکر کا پلاٹ تاریخ ہی سے کیوں نہ اخذ کیا گیا ہو مگر ناظرین تو اس حقیقت سے بیخبر ہی رہیں گے، لہذا دوسرا طریقہ بھی لطف و دلچسپی فراہم کرنے میں

ناکامیاب نہیں رہ سکتا۔

اسی اصول کا اطلاق صرف اتنی احتیاط کے ساتھ۔ رومان پر بھی ہوسکتا ہے کہ ان تاریخی تصانیف کے بہ نسبت، جن میں فاتحوں اور بادشاہوں کے کیرکٹر پیش کیے جاتے ہیں اور جن میں یادگار تجربات اور عظیم الشان خطرات کو بیان کیا جاتا ہے، ایسے رومانوں میں دلائل کی مکمل انسانوی صورت سے کام لینا زیادہ جائز ہے جن میں ارکان قصہ متباین صفات مثلاً ظرافت وغیرہ سے متصف ہوں۔ کیونکہ یہ امر قرین قیاس نہیں قرار دیا جا سکتا کہ مہتم بالشان کارنامے اور جلیل القدر واقعات دنیا کی آنکھوں سے مخفی رہیں اور مورخین ان کی جانب سے تغافل برتیں، اسکے علاوہ قیاسات کا عنصر جو تاریخ کے دائرہ سے باہر ہے، رومان کے حق میں ناگزیر ہے۔

بالخصوص ایسی تاریخیں اسوقت خارج از بحث ہیں جو سرتاپا غلط بیانی سے آلودہ ہوں اور صحیح واقعات و معلومات کے فقدان کی حالت میں مرتب کی گئی ہوں، جیسا کہ اکثر اقوام خصوصاً غیر مہذب کی خالی تصانیف ہوا کرتی ہیں، بطور مثال کے انیز اس ویڈ منفس نامی راہب کی فرضی تاریخیں پیش کی جا سکتی ہیں۔ جن میں نہایت بین طریقہ پر اس قدر شدید افتراپردازی اور غلط بیانی سے کام لیا گیا ہے کہ تعلیم یافتہ طبقہ کی نظروں میں وہ ہمیشہ مردود اور قابل لعنت رہیں گی۔

رومان اور مذکورہ بالا تصانیف کے درمیان یہ فرق ہے کہ اول الذکر جوان طبقہ سے مشابہ ہے جو اپنی معصوم چالاکی سے نقاب پوش ناچ میں اپنی تفریح طبع اور ناظرین کی دلچسپی کی خاطر اپنا بھیس بدل لیتا ہے، اور آخر الذکر اس گروہ کے مانند ہے جو کسی متوفی یا مفقود الخبر شخص کا نام اختیار کر لیتا ہے یا اس سے کوئی حقیقی مشابہت رکھنے کی بنا پر اسکی جائداد کا مالک بن بیٹھتا ہے۔

حکایت کی تعریف

آخر میں حکایات بھی ہمارے موضوع سے خارج ہیں۔ کیونکہ رومان اور حکایت میں یہ اختلاف ہے کہ اول الذکر ان واقعات کا افسانہ ہے جو ممکن الوقوع تو ہیں لیکن کبھی معرض وجود میں نہیں آئے، اور آخر الذکر ایسے واقعات پر مشتمل ہوتا ہے جو نہ تو ممکن الوقوع ہیں اور نہ کبھی وقوع پذیر ہوئے۔

اب ان تصانیف کی حدبندی ہو چکی ہے جنھیں موضوع طریقہ پر رومان کا لقب عطا کیا جا سکتا ہے۔

۲ - رومان کا آغاز

مشرق میں رومان کا آغاز، مشرقی رومان نویس، اہل مصر کی ہوا پسندی، یونان مصر کا شاگرد، عرب

کا ذوق سخن، حکایات لقمان، اہل یورپ نے عربوں سے علم عروض سیکھا، ایرانیوں کا حقیقت سے بُعد، ایران میں ایزاف کی مقبولیت، ایزاف اور لقمان کی تحقیق، ایرانیوں کی مبالغہ آمیزی، اہل ہند کا مذاق، ہندی سندباد کی تصنیف، مذہبی کتب میں رومان کا رنگ، عیسائی مذہب میں رومان کی افراط

مشرق میں رومان کا آغاز

رومان کی ابتدا مشرقی اقوام میں ہوئی، جن میں اہل مصر، اہل عرب، اہل ایران و اہل شام شامل ہیں، اس فن کے قدیم ماہر انھیں اقوام کے انشا پردازوں میں پائے جاتے ہیں، جیسا کہ ذیل کی تفصیل سے ہویدا ہوگا۔

مشرقی رومان نویس

کلیرکس، جس نے "افسانہ ہائے عشق" مرتب کیے تھے سلیشیا کا باشندہ تھا۔ جو ملک شام کے قریب ایک شہر ہے۔ آلطی کس مصنف "تجربات ربوڈینز" کے والدین شامی تھے اور خود اُس نے بابل میں تعلیم پائی تھی، ہیلیوڈورس جو تھیاگنیز اور چارک لیا کے قصۂ محبت کا مصنف تھا فونشیا کے ایک شہر ایمسا کا باشندہ تھا۔ لوشین جس نے لوشیس کا تاریخ فی الحکار" تحریر کیا تھا، شام کی بندرگاہ کو آمینا کے دار السلطنت" ساموتا" کا رہنے والا تھا، ایچلیز ٹیشیس جس نے کلی ٹوفن اور لیوپتی کے عشق کا تذکرہ لکھا تھا، سوطن اسکندریہ (مصر) تھا۔ برلام اور جوسافت کی فرضی تاریخ کا مصنف سینٹ جان تھا جو شام کے خاص شہر دمشق کا باشندہ تھا، انکے علاوہ مشہور رومان نگار ڈماشیس جسکے افسانوں کی چار جلدیں اپنی انتہائی ناقابل یقین نوعیت کے باعث قیاسات کے دائرہ سے کوسوں دور ہیں بقول فوشیس اسی شہر دمشق کا باشندہ تھا۔ اسی طرح وہ تینوں مصنف زنو ونس بھی ہیں جنکا سوئیدا اس نے ذکر کیا ہے یعنی انکے روک (شام) کا باشندہ تھا، اور باقی دونوں کا وطن سائپرس تھا جو اسی نام کی ایک قوم کا جزیرہ ہے۔

لہذا یونان کے بجائے مذکورہ بالا خطہ ہائے زمین رومان نویسوں کا معدن کہلائے جانے کے مستحق ہیں جن میں سے بعض مغرب میں منتقل ہو گئے تھے جہاں کی سرزمین اُنھیں اس قدر راس آئی کہ اُنھوں نے وہیں ڈیرا جما دیا۔

یہ امر مشکل سے قابل یقین ہے کہ ایسے انشا پردازوں کی ذکاوت شاعری، جدت طرازی اور افسانہ نگاری کی طرف کس طرح مائل ہوئی، انکے جملہ کارنامے استعارات سے آراستہ ہیں اور انھوں نے اپنے ہر خیال کو کنایہ اور تمثیل کا جامہ پہنایا ہے۔ انکی کل تعلیمات بالخصوص سیاسیات و اخلاقیات، امثال و تمثیلات کے روپ میں نظر آتی ہیں۔

اہل مصر کی اسرار پسندی

مصریوں کے نقوش سے پتہ چلتا ہے کہ وہ ایک بڑی حد تک اسرار پسندی کی طرف مائل تھے، انھوں نے اپنی ہر چیز کو تصویر کی شکل میں نمایاں کیا ہے، انکے مذہب پر بھی نقاب پڑی ہوئی تھی، جسے وہ مشکل سے اُٹھاتے تھے۔ عوام الناس کے سامنے وہ اپنی مذہبی تعلیمات کو امثال کے پردہ میں پیش کرتے تھے لیکن صرف اُن لوگوں کی آگاہی کی خاطر وہ اپنے مذہب کو اُسکے اصلی رنگ میں آشکار کرتے تھے جنھیں وہ حامل اسرار و رموز بننے کے قابل تصور کرتے تھے۔

یونان مصر کا شاگرد

یونانی مورخوں کا امام ہیرو ڈوٹس بیان کرتا ہے کہ اہل یونان نے اپنی روایات و دینیات مصریوں ہی سے حاصل کیں، نیز وہ ان قصوں کا بھی ذکر کرتا ہے جو اُس نے مصریوں سے سیکھے، اگرچہ اُس نے بطور امثال کے ان قصوں کو بیان کیا ہے لیکن انھیں کی بابت اسے کمزور خیال تصور کیا جاتا ہے، بہرحال انھیں قصوں کے ذریعے اُس نے اپنی قوم کو اُکسایا اور نتیجہ ان اوہام و تصورات کے مطابق رونما ہوا جنکے متعلق وہ تحقیق کے ساتھ بیان کرتا ہے کہ وہ علوم و فنون کے دلدادہ تھے اور جدت طرازی کے لیے تو انکی زندگی وقف تھی،

فیثا غورث اور افلاطون نے بھی اپنے فلسفہ کو انقلاب پذیر کرنے کی تعلیم اور تلبیس و اسرار کے پردہ میں اسکو مخفی رکھنے کا فن بلا شبہ انھیں مصری علما سے اُس زمانہ میں حاصل کیا ہوگا جبکہ انھوں نے مصر کا سفر کیا تھا۔

عربوں کا ذوقِ سخن

اگر عربوں کی تصنیفات کی جانچ پڑتال کیجائے تو واضح ہوگا کہ وہ بھی استعارات و تشبیہات و روماں نویسی کے بے طرح گرویدہ تھے، چنانچہ قرآن شریف بھی ان خصوصیات سے خالی نہیں نظر آتا، جسکا باعث یہ ہے کہ اسکی ترتیب میں اس مصلحت کو ملحوظ رکھا گیا تھا کہ اسکے سمجھنے میں دشواری کم ہو اور اِسکے اثرات زیادہ دیرپا ثابت ہوں۔ عربی انشا پردازوں نے ایزاف کی حکایات کا بھی اپنی زبان میں ترجمہ کیا ہے اور بعض نے عربی میں ان کا چربہ اُتارا ہے۔

حکایاتِ لقمان

لقمان نے اپنی حکایات کے باعث مشرقی تصانیف میں اس قدر بار پایا تھا کہ عربوں نے اسکے کارناموں کو متعدد مبسوط جلدوں میں مع ترجمہ ترتیب دیا تھا، چنانچہ اُس نے عرب میں اس قدر رفیع الشان شہرت اور مقبولیت حاصل کر لی تھی کہ قرآن شریف میں بھی ایک خاص سورۃ اسکی دانشمندی کو پیش کرنے کیلیے موجود ہے۔

عرب سب سے زیادہ شاعری سے متاثر نظر آتے ہیں، اور اسی میدان میں انکی عدیم المثال ذکاوت اپنی مخصوص جولانی دکھاتی ہے، ان کا یہ رجحان طبع زمانۂ مابعد میں ترقی پذیر نہیں ہوا تھا بلکہ رسول خدا (صلی اللہ علیہ وسلم) کی بعثت سے بہت قبل انکے ذوق کی خصوصیت نمایاں نظر آتی ہے، چنانچہ ان کی اس قدامت کا ثبوت انکی اپنی تصانیف میں بھی پایا جاتا ہے، یہ ایک مسلم الثبوت امر ہے کہ تمام دنیا نے بحیثیت مجموعی اتنی تعداد میں شاعر پیدا نہیں کیے جتنے کہ صرف ملک عرب کی خاک سے اُٹھے۔ اہل عرب ساٹھ شاعروں کو اس فن کا بادشاہ تسلیم کرتے ہیں جن میں سے ہر ایک بادشاہ کثرت درجہ کے شعرا کی توجہ سے آراستہ تھا، انکے جلیل القدر شعرا نے صرف "محبت" کو اپنا موضوع سخن قرار دیا تھا جن پر انکی متعدد تصانیف مغرب میں کثرت اشاعت پذیر ہوئیں۔ انکے اکثر خلفا نے بھی اس فن کی ترویج کو مناسب قرار دیا، چنانچہ خود خلیفہ عبداللہ اس فن میں ایک ممتاز درجہ رکھتے تھے، اور جیسا کہ آلکین بیان کرتا ہے اُنھوں نے تشبیہات کی ایک کتاب بھی مرتب کی تھی۔

اہل یورپ نے عربوں سے علم عروض سیکھا

عربوں ہی سے اہل یورپ نے علم عروض کی تحصیل کی، اور ظن غالب یہی ہے کہ از منۂ وسطی کی نظم "لیونین" جسے لیونیس نے موزوں کیا تھا، انھیں کی تقلید میں تیار کی گئی تھی، اس لیے کہ ہسپانیہ پر طارق اور موسیٰ کے حملے سے پیشتر یہ صنف ادب یورپ میں نہیں پائی جاتی۔ اور زمانۂ مابعد میں وہاں اس کا بکثرت رواج پایا جاتا ہے حالانکہ اسکے بخلاف اس امر کا ثبوت بھی مل سکتا ہے کہ قدیم اہل روما فن عروض سے لاعلم نہ تھے۔

ایرانیوں کا حقیقت سے بُعد

ایرانیوں نے بھی فن غلط نگاری میں عمدہ مہارت پیدا کی تھی، حالانکہ وہ کسی زمانہ میں اس سے انتہائی نفرت کرتے تھے اور اپنی اولاد کو دروغ بیانی سے سختی کے ساتھ باز رکھتے تھے، لیکن بعد میں (اگر افسانہ نویسی کو کذب و افترا پردازی مان لینا مناسب ہے) وہ اپنی تصنیفوں اور مراسلت میں اس عنصر کے شمول سے مسرور نظر آتے ہیں۔ ہمیں اس سلسلے میں سوائے انکے متقن "زرتشت" کے فرضی تجربات و سرگذشت کی مثال کی کسی مزید دلیل کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی۔

اسٹرابو ہمیں آگاہ کرتا ہے کہ اسکے علما اپنے معتقدین کے سامنے اخلاقی نکات بیان کرتے وقت اپنی موعظت پر افسانہ کی جھالر ڈال لیا کرتے تھے، ایک دوسرے مقام پر وہ رقم طراز ہے کہ ایرانیوں، مجوسیوں اور شامیوں کی قدیم تاریخوں کو اس وجہ سے کوئی رتبہ نہیں دیا جا سکتا کہ

کہ انکے مورخ حقیقت کے بہ نسبت فرضی واقعات بیان کرنے کی طرف زیادہ مائل تھے، جسکی وجہ وہ یہ تبلاتے تھے کہ اس زمانہ میں چونکہ قصہ نویسوں کو قدر و منزلت کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا، اس لیے ان مورخوں کو یقین تھا کہ تاریخ کے سانچہ میں ڈھلی ہوئی قصہ نما تصانیف کا مطالعہ عوام الناس نہایت لطف و مسرت سے کریں گے۔

ایران میں ایزاف کی مقبولیت

ایزاف کے امثال کو مقبولیت کا اعزاز عطا کرنے میں ایرانیوں نے اس غلو سے کام لیا کہ وہ اسکے مصنف کو اپنا اہل وطن بنانے میں کوئی پس و پیش نہیں کرتے تھے، ایزاف اہل یونان میں اس قدر شہرت رکھتا تھا کہ وہ ایشیاے کوچک کے شہر فریجیا کو اسکے فخر ولادت سے محروم کرکے اپنے وطن کو اس اعزاز کا مستحق سمجھتے تھے، دوسری طرف عربوں کا دعوی ہے کہ ایزاف عبرانیوں کی نسل سے تھا اور جسکے بخلاف ایرانیوں کا بیان ہے کہ وہ عربی النسل حبشی تھا، اور شہر کسووین کا باشندہ تھا، ان کل آرا کے برعکس بعض نے اس تطابق کو پیش نظر رکھ کر اپنی علحدہ رائے قائم کی ہے جو سوانح لقمان مولفہ مرکانڈ اور سوانح ایزاف مولفہ میاکزیس پلانوڈیس میں پایا جاتا ہے۔

ایزاف اور لقمان کی تحقیق

چنانچہ بقول فنی لوسترانس اول الذکر سوانح میں لقمان کے متعلق یہ بیان کیا گیا ہے کہ اسے فرشتے دانشمندی کا سبق پڑھاتے تھے اور موخر الذکر میں ایزاف کی نسبت یوں لکھا ہے کہ اس پر مریخ شہرت کی بارش کرتا تھا، جس سے بعض نے یہ خیال قائم کیا ہے کہ اہل یونان نے لقمان کو اہل مشرق سے چرا کر اپنا ایزاف بنالیا تھا، لیکن اس موقع پر اس متنازعہ فیہ مسئلہ کو طے کرنے کے بجاے صرف اشترابو کی رائے کا یہ حوالہ کافی ہے، اسکا بیان ہے کہ اہل مشرق کی تاریخیں غلط بیانی سے پر ہیں اور واقعات کی اصلیت اور بیان کی صحت سے بالکل معرا، لہذا یہ بہت ممکن ہے کہ انھوں نے متذکرہ حکایات کی اصلیت، انکے مصنف کی تحقیق، اور بقیہ دیگر امور کے بیان میں افسانہ نگاری سے کام لیا ہو، مزید براں انکے بہ نسبت اہل یونان علم التاریخ و تاریخ نویسی میں زیادہ خوش اسلوبی و تندہی سے کام لیتے تھے، اسلیے یونانیوں کی کوششوں کو زیادہ وقعت کی نظروں سے دیکھنا چاہیے، اسکے علاوہ سوانح لقمان مرتبہ مرکانڈ اور سوانح ایزاف مرتبہ پلانوڈیس سے بھی مترشح ہوتا ہے کہ ایزاف اور لقمان ایک ہی شخص کے دو نام ہیں، اسی سلسلہ میں اشترابو رقمطراز ہے کہ ایرانیوں نے لقمان کو حکیم کا لقب عطا کیا تھا، اور ایزاف کو بھی عقلمندوں میں شمار کیا جاتا تھا اور اسے طب میں ید طولی حاصل تھا، چنانچہ

مُردہ کے احیاء کے لیے چند حیرتناک ادویہ ایجاد کیے تھے۔
ایرانیوں نے ان حکایات کے شرح و بسط میں نہایت جاں فشانی سے کام لیا اور عربوں کی مانند انھوں نے ان میں حشو و زوائد کو اس قدر دخل دیا ہے کہ وہ ایک مبسوط کتاب کی صورت اختیار کر چکے ہیں، لقمان کی فراست و دانائی کا شہرہ مصر اور نوبیا جیسے دور و دراز ممالک تک پھیل گیا، جہاں اسکی زندگی اور دانشمندی کو نہایت احترام کی نظروں سے دیکھا جاتا تھا، بعد میں چل کر ترکوں نے بھی اس کی حد سے زیادہ قدر کی۔
چنانچہ مرکانڈ کی رسالے کے مطابق اُنکا عقیدہ تھا کہ لقمان داؤد علیہ السلام کے زمانہ میں گذرا ہے گویا اس حساب سے (بشرطیکہ وہ درحقیقت ایزاف ہی ہے اگر ہم یونانی علم التاریخ پر اعتماد کر سکتے ہیں) صرف چار سو پچاس کا فرق آپڑتا ہے، ترکوں کی اس رائے کا اطلاق ہیفیود پر بہترین طریقہ سے ہو سکتا ہے جو سلیمان علیہ السلام کا ہمعصر تھا، اور جو بقول کونٹی لین دراصل ان حکایات کی تصنیف کے اعزاز کا مستحق ہے جنھیں ایزاف کی جدت طبع پر محمول کیا جاتا ہے۔

ایرانیوں کی مبالغہ آمیزی

مبالغہ میں ایرانیوں کی کوئی ہمسری نہیں کرسکتا، جسکی رَو میں وہ محض غلط بیانی پر اُتر آتے ہیں، اُنھوں نے اپنے بزرگان دین کی سوانح اور اپنے مذہب کی حقیقت کو اپنی تاریخوں میں اس قدر مسخ کر دیا تھا (جسکی اصلیت اہل یونان و اہل روم کے تعلقات سے آشکار ہوتی ہے) کہ انکے کسی بیان کو مشکل سے تیقن کا درجہ دیا جا سکتا ہے۔
کسی زمانہ میں انکی یہ بیشل صفت زبان زد عام تھی (جیسا کہ اوپر بیان ہو چکا ہے) کہ وہ اُس گروہ سے شدید تنفر کرتے تھے جو اپنے اغراض و مقاصد کی اشاعت دروغ بیانی کے ذریعہ سے کیا کرتے ہیں، لیکن بعد میں وہ اس خوبی سے معرا ہو کر اس قدر پست خیال ہو گئے کہ وہ خود اس عیب کو اپنے لیے موجب افتخار تصور کرتے تھے، وہ شعر و سخن کے نہایت پُر جوش دلدادہ تھے جو خاص و عام، شاہ و گدا ہر ایک کے لیے سرمایۂ انبساط و دلچسپی تھا، کسی تقریب کی خاص تو اضع کسی شاعر کی غیر موجودگی میں ناقص سمجھی جاتی تھی، انکے معرکۂ حسن و عشق کے اذکار اور لطف و محبت کے قصے بید شہرت حاصل کر چکے تھے جن سے انکی ذکاوت رومان نگاری منکشف ہوتی ہے۔

اہل ہند کا مذاق

اہل ہند کو بھی جو ایرانیوں کے ہمسایہ ہیں، فرضی قصوں سے خاص دلبستگی تھی، اس ملک کے ایک شخص سندبر نے تمثیلات کی ایک کتاب مرتب

کی تھی جسکا عبرانی میں ترجمہ ہوا تھا اور جو اسوقت عجائبات کے کتبخانہ میں پائی جاتی ہے، جیسے سوئٹ فرقہ کے پادری پوسین نے روما میں بعض اخلاقیات کے مسائل مکالمہ کی صورت میں تحریر کر کے شایع کیے تھے۔ جو البولوم بادشاہ انڈنیرا اور ہندوستان کے قدیم فلسفی جمنو سوفسٹ فرقہ کے ایک رکن کے درمیان واقع ہوا تھا، اس مکالمہ میں آزات کی طرح اس فلسفی نے بھی اپنے خیالات کو حکایات و امثال کی شکل میں پیش کیا ہے، اور اسکے دیباچہ سے یہ مترشح ہوتا ہے کہ وہ سلطنت کے کاغذات کے ساتھ خزانۂ شاہی میں احتیاط سے محفوظ تھی، اور اسے بیرزوز طبیب خاص جو فروز شاہ ایرانی نے ہندی سے ایرانی زبان میں ترجمہ کیا، بعد ازاں کسی اور شخص نے اس کا ایرانی سے عربی میں ترجمہ کیا، پھر ایک مصنف سائیمون سیتھی نے اسے عربی سے ایرانی میں منتقل کیا، اس کتاب میں اور ان اخلاقی امثال میں جو ہندوستانی پلپے (PILPAY) کے نام سے مشہور ہیں اور جو فرانسیسی زبان میں موجود ہیں بہت کم فرق پایا جاتا ہے، بیان یہ کیا جاتا ہے کہ اس پلپے کا مصنف ایک برہمن تھا جو شاہ دبچلین کے عہد حکومت میں انڈیز کی سلطنت اور ریاست کے معاملات میں کسی اعلیٰ عہدہ پر ممتاز تھا، اس نے اپنے جملہ سیاسی اور اخلاقی اصولوں کو اس کتاب میں قلمبند کر دیا ہے جسے فہم و فراست اور علمی نکات کا ایک بیش بہا خزانہ سمجھ کر انڈیز کے بادشاہوں نے نہایت حفاظت سے رکھا تھا، اس کتاب کی شہرت اتنی دور تک پھیل گئی کہ نوشیروان شاہ ایران کو اس کا علم ہوا، جسنے اپنے طبیب خاص کی خاطر اسکا ایک نسخہ فراہم کیا اور اسکا ترجمہ اس طبیب نے ایرانی زبان میں کیا، خلیفہ ابو نصیر المنظور نے اس کا ترجمہ ایرانی سے عربی میں کرایا اور ایک دوسرا ترجمہ عربی سے ایرانی میں کرایا، ان جملہ ایرانی ترجموں کے بعد ایک جدید ترجمہ مرتب کیا گیا جو ان سب پہلے ترجموں سے مختلف تھا، اور اسی آخری ترجمہ سے فرانسیسی نسخہ کی ترتیب دیگئی۔

یہ یقین ہے کہ جو شخص اہل ہند، پرامند اور برہمنوں کے ان فرضی بزرگوں اور انکے اخلاق کے کارناموں اور انکی اشاعت پر غور کریگا اُسے اس حقیقت کے باور کرنے کے لیے کسی مزید ثبوت کی ضرورت نہ ہو گی کہ ان اقوام کو حکایات سے کس قدر دلی شغف تھا۔

مذہبی کتب میں رومان کا رنگ

چنانچہ یہ خصوصیت اس واقعہ کو صحیح تصور کرنے پر مائل کرتی ہے کہ ہوریس نے دریاے ہراسپس کو جو فرضی ہونے کا لقب دیا تھا اس کا مطلب یہی تھا کہ وہ ایک ایسی قوم کے درمیان اپنی روانی کو شروع اور ختم کرتا ہے جو

التباس و افسانہ سے بہت زیادہ وابستہ ہے، مذکورۂ بالا تمثیلات و افسانے ان اقوام کے غیر مذہبی علوم پر مشتمل ہیں۔ اور ملک شام میں انکی خیال آفرینی ہوئی، انکے تقدس مآب مصنفوں نے یہودیوں کی ظرافت طبع کا لحاظ رکھ کر اپنے آسمانی الہامات کو پیش کرتے میں حکایات سے کام لیا ہے، انکی آسمانی کتاب اسرار و رموز و عقدہ ہائے لاینحل کا ایک گورکھ دھندا ہے، یہودیوں کے ملکی و مذہبی قانون کی کتاب تالمودست میں لکھا ہے کہ بک[1] آف جاب عبرانی تصانیف کا ایک تمثیلی خاکہ ہے۔

داؤد علیہ السلام کی آسمانی کتاب، دیگر ضرب الامثال، مذہبی احکام و وظائف اور مقدس ترانے وغیرہم کُل، ایسی شاعرانہ تصانیف ہیں جن میں استعارات کی بھرمار ہے، ضرب الامثال کا مجموعہ اسوجہسے پُر از استعارات کہلائے جانے کا مستحق ہے کہ "کوئی ٹیلین" کی تعریف کے مطابق اس نوع کے ضرب الامثال ایک قسم کے استعارات ہیں جو مختصر شکل میں پیش کیے گئے ہیں، وظائف کی کتاب ایک وضع کی ڈراما نما نظم ہے جس میں نوشہ اور عروس کے جوشیلے جذبات نہایت لطیف اور چبھتے ہوئے پیرایہ میں موزوں کیے گئے ہیں۔

عیسائی مذہب میں رومان کی افراط

عیسیٰ علیہ السلام نے یہودیوں کے سامنے مشکل سے کوئی ایسی نصیحت پیش کی ہوگی جو استعارہ کے پردہ میں مخفی نہ ہو، تالمودست جسکا ذکر اوپر آچکا ہے لاکھوں حکایات پر مشتمل ہے جن میں سے ہر ایک حکایت بے سروپائی میں دوسری سے بڑھی ہوئی ہے، اکثر یہودی علمانے اپنی مخصوص تصانیف میں ان حکایات کی تشریح و تفسیر کرکے انھیں قابل فہم بنایا ہے اور اسکے علاوہ انھوں نے انکے متعلق متعدد نظمیں اور مقدمے تحریر کیے ہیں۔

ایشیائے کوچک کے شہر سائپرس اور سلیشیا کے باشندوں نے بھی بعض قصے گڑھے تھے جو اسی قوم کے نام سے مشہور ہیں۔ موخر الذکر کے میلان غلط بیانی کے باعث یونان کی ایک قدیم ترین ضرب المثل ایجاد ہوئی تھی جو ابھی تک مشہور ہے۔

المختصر مذکورہ بالا جملہ ممالک میں قصص و حکایات کا اسقدر رواج رہا ہے کہ لوشین کی تصدیق کے مطابق اہل شام و اہل عرب کے بعض مخصوص فرقوں نے اپنا واحد پیشہ انکی تشریح و تفسیر قرار دے لیا تھا۔ اور انھوں نے اپنی زندگی کے مقصد کو اس قدر باضابطہ بنالیا تھا کہ غیر ممالک میں بھی انھوں نے اپنے فن کی ترویج کی۔

عزیز احمد خاں

[1] بائبل کی وہ کتاب جس میں حضرت ایوبؑ کا قصہ ہے۔

آیولینتھی

[ایک ڈراما]

ذیل کا ڈراما جو ہمارے لیے کسی حد تک ایک نئی قسم کی چیز ہے، ڈنمارک کے مشہور مصنف ہنرک ہرٹز کے شہکار "شاہ رینی کی بیٹی" کا ترجمہ ہے، جسے اثر صاحب نے ہمارے خاص اصرار پر ہمیں عنایت فرمایا ہے۔ مسٹر گارنٹ کے الفاظ میں یہ ڈراما "دنیا کے جواہرات ادبی" میں سے ہے جس سے لطف اندوز ہونے کے لیے خشک فلسفہ اور تعلیم اخلاق سے کہیں زیادہ لطفِ نظر اور حسنِ خیال کی ضرورت ہے، اردو زبان میں جو ابتک آرٹ کے صحیح مفہوم و مقصد سے ناآشنا ہے اس قدر لطیف اور حقیقی معنوں میں "آرٹسٹک" چیز پیش کرنا ممکن ہے قبل از وقت ہو، لیکن "تقاضائے ذوق" کو کسی مصلحت پر قربان کرنا ہمارے نزدیک ایک طرح کی ناشکری ہے۔ ڈراما کی امتیازی خصوصیات، انداز بیان کی "سادہ رنگینی" پلاٹ کی دلچسپی اور اسکے کیرکٹروں کی شخصیتیں (انڈیویجولٹی) ہیں، جو اثر صاحب نے اپنے ترجمہ میں شروع سے آخر تک دلکش انداز میں قائم رکھی ہیں۔

ڈراما بالاقساط شایع ہوگا، پہلا منظر بطور قسطِ اول ہدیۂ ناظرین ہے۔

سب ایڈیٹر

اشخاص ڈراما

رینی - پرووینس کا بادشاہ
آیولینتھی - بادشاہ کی لڑکی
ٹرستان - ووڈمانٹ کا شہزادہ
سر جیوفری

سر المرک
ابن یحییٰ - مراقش کا حکیم
برٹرانڈ
مارتھا - برٹرانڈ کی بیوی

مقام - پرووینس میں وادی واکلوز
زمانہ - پندرہویں صدی عیسوی کا وسط
وقت - دوپہر دن سے لیکر شام تک

[بائیں جانب ایک منزلہ مکان جو گلاب اور عشق پیچے کی بیلوں سے ڈھکا ہوا ہے۔ کھڑکیاں غرفہ دار ہیں تاکہ تیز روشنی نہ آئے۔ مکان سے ملحق پشت پر ایک باغ ہے جس میں گرم ممالک کی طرح نباتات کی کثرت ہے۔ مکان کے سامنے کچھ درخت کھڑے ہیں باغ کے خاتمہ پر ایک دیوار ہے جس پر جھاڑیاں چھائی ہوئی ہیں۔ اس دیوار کے وسط میں ایک دروازہ ہے جو کائی لگے ہوئے پتھروں میں اس طرح چھپا ہوا ہے کہ جب تک کھلے نہیں کسی کو گمان بھی نہیں ہوتا کہ یہاں پر دروازہ ہے۔ اس دیوار کے بعد بلند پہاڑوں کا سلسلہ دور تک چلا گیا ہے]

پہلا منظر

برٹرانڈ (مکان سے نکل کر آتا ہے) گھنٹی بجی تھی! بادشاہ نے کوئی پیام بھیجا ہے!" (چٹان کی طرف جا کر چوبی دروازہ کھولتا ہے۔ سرالمرک داخل ہوتا ہے۔ برٹرانڈ اُسے وہیں چوکھٹ پر روک دیتا ہے)

سرالمرک! آپ یہاں! مگر پیچھے دب کے کھڑے ہوجیے! بس ایک قدم بھی آگے نہ بڑھائیے! کوئی اجنبی یہاں داخل نہیں ہو سکتا!

المرک ۔ میں یقیناً داخل ہوں گا!

برٹرانڈ ۔ نہیں! قسم بخدا آپ ایک انچ آگے نہیں بڑھ سکتے! آپ نے مجھے دھوکا دیا۔ گھنٹی کی آواز، اور اُسی کے ساتھ مقررہ الفاظ سُن کر مجھے یقین ہوا کہ راؤل ہوگا۔

المرک ۔ بادشاہ نے اُسکی جگہ مجھے بھیجا ہے میرے پاس بادشاہ کا خط اور انگوٹھی موجود ہے۔

برٹرانڈ ۔ بادشاہ کی انگوٹھی؟ ہاں ٹھیک۔ خط! کیا اجازت ہے کہ میں اسے پڑھوں؟ (پڑھتا ہے) " المرک سے کوئی بات چھپاؤ نہیں اور وہ جو کچھ دریافت کرے بتا دو۔"

سرالمرک اب واقعات نے دوسری صورت اختیار کر لی۔ چین بجبیں نہ ہوجیے، اگر آپ کو اس جگہ کا راز معلوم ہے تو یہ بھی علم ہوگا کہ احتیاط میرا فرض ہے۔

المرک (آگے بڑھ کر) مجھے اس جگہ کا راز معلوم ہے؟ تم کیا کہتے ہو؟ مجھے حیرت ہے کہ میں کہاں پہونچ گیا، جو کچھ مشاہدہ کرتا ہوں اُس سے میرے استعجاب میں ترقی ہو رہی ہے۔ یہ مقام تو ویرانہ میں بہشت ہے! اس معمے کو حل کرو!

برٹرانڈ ۔ ہائیں! آپ کو بادشاہ نے آگاہ نہیں کیا؟

المرک ۔ مجھے؟ نہیں تو!

برٹرانڈ ۔ تو مجھے آپ گونگا سمجھیے!

المرک ۔ نہیں بھائی! تم مذاق کرتے ہو!

برٹرانڈ ۔ حضرت میں اپنی زندگی میں کبھی اتنا سنجیدہ نہیں تھا جتنا اسوقت ہوں۔

مارتھا (مکان کے دروازہ میں نمودار ہوتی ہے) کیا سرالمرک ہیں؟

برٹرانڈ ۔ بادشاہ کی انگوٹھی لائے ہیں اور داخلہ کی

اجازت کے قبل جو الفاظ کہنا چاہیے وہ بھی جانتے ہیں مگر آگے خیر صلاح ہے۔ میرے نزدیک تو انھیں فوراً رخصت کرنا چاہیے۔

ایلمرک۔ بادشاہ سلامت تو مجھے بھیجیں اور میں چلا جاؤں!

برٹرانڈ۔ ہونگے آپ انکے فرستادہ! میں پروا نہیں کرتا۔

مارتھا۔ صبر کرو برٹرانڈ صبر کرو! (ایلمرک سے) جناب آپ کیا پیغام لائے ہیں؟

ایلمرک۔ میں یہ کہنے آیا ہوں کہ گھنٹہ بھر میں بادشاہ سلامت حکیم ابن یحیٰی کو ساتھ لیکر یہاں ورود فرمائیں گے۔

مارتھا۔ وہ مراکش کا مشہور حکیم! میں اُسے بخوبی جانتی ہوں۔

ایلمرک۔ وہی بادشاہ کے ہمراہ ہوگا اور تمھیں چاہیے کہ وہ سب سامان لیس کر رکھو جسکے واسطے حکیم ابن یحیٰی نے تم کو حکم دیا ہے۔ میں یہی کہنے کے واسطے بھیجا گیا ہوں۔

برٹرانڈ۔ بہتر! بہتر! بادشاہ سلامت اطمینان رکھیں! چند گھنٹے اُدھر حکیم صاحب یہاں آئے تھے۔

مارتھا۔ مگر جناب کیا بادشاہ سلامت نے آپ سے کچھ اور نہیں کہا؟

ایلمرک۔ انھیں تعجیل تھی اور کچھ متفکر بھی معلوم ہوتے تھے) ابن یحیٰی آیا ہوا تھا، راویل بیمار تھا لہذا مجھے علحدہ بلاکر ارشاد ہوا کہ اینجانب کو تم پر اعتماد ہے، ہمارے خواص کے ہمراہ جاؤ اور جو حکم دیا جاتا ہے اُسکی تعمیل کرو۔

مارتھا۔ کیا بادشاہ سلامت نے آپ سے بس اسیقدر کہا؟

ایلمرک۔ نہیں تو، لیکن اُنکے باقی الفاظ جیسا سے کم نہیں تھے، وہ تھوڑی دیر فکر میں ڈوبے رہے اُسکے بعد ہچکچاتے ہوئے کہا کہ دیکھو مجھے تمھاری وفاداری پر بھروسا ہے جہاں تم جانیوالے ہو وہاں میری لڑکی ملیگی۔ پھر یکایک وہ خاموش ہوگئے اور نہایت عجلت میں وہ خط لکھا جو میں لایا ہوں اور روانگی کا حکم دیدیا۔

مارتھا۔ خط؟

برٹرانڈ۔ ارے ہاں خط!

مارتھا (خط لیکر پڑھتی ہے) بیشک یہ بادشاہ کی تحریر ہے۔ برٹرانڈ، بے اعتمادی کی کوئی وجہ نہیں۔

برٹرانڈ۔ بیشک تم نے سچ کہا۔ میں خط کو بھول ہی گیا تھا۔

ایلمرک۔ اس خط سے تمھیں یہ بھی اندازہ ہوگا کہ بادشاہ کی مرضی ہے کہ میں وہ باتیں تمھاری زبان سے سنوں جن کا مجھے علم ہونا چاہیے۔ یہ لڑکی کون ہے جس کا تذکرہ تھا۔ مارگرٹ آجکل انگلستان میں ہے اور آیو لینیتھی ——

مارتھا (بات کاٹ کر) یہاں ہے

ایلمرک۔ یہاں! آیو لینیتھی تو اسپین کی ایک خانقاہ میں بچپنے سے تعلیم پا رہی ہے۔

مارتھا۔ جناب نہیں۔ وہ یہاں ہی اور نہیں تھی۔
ایلمرک۔ یہ کیا؟ یہاں! برٹرانڈ میں تمھاری منت کرتا ہوں کہ مجھے مفصل حال بتاؤ۔
برٹرانڈ۔ آپ نے اکثر اُس قضیہ کا حال سنا ہوگا جو مدت تک ہمارے بادشاہ اور دوڈمانٹ کے درمیان صوبہ لورین کی بابت رہا۔
ایلمرک۔ مجھے خوب معلوم ہے۔ لیکن اب تو وہ دیرینہ مناقشہ ختم ہوگیا۔ برگنڈمی نے شرائط صلح طے کردیے اور جیسی افواہ ہے بادشاہ رینی کی لڑکی کی شادی دوڈمانٹ کے لڑکے کے ساتھ ہوگی۔ آیو لنیتھی گود ہی میں تھی کہ نسبت طے پاگئی۔
برٹرانڈ۔ آپ کا فرمانا درست ہے۔ لیکن معاہدہ ہونے کے بعد ہی آدھی رات کو محل میں آگ لگ گئی اور آیو لنیتھی جسکی عمر سال بھر کی تھی جلنے سے بال بال بچگئی۔ اُسکی جان بچانے کا صرف ایک ہی طریقہ تھا، ہم نے اُسے کھڑکی سے نیچے پھینکا، لوگوں نے نرم تکیوں پر روکا۔ تاہم خوف یا گرنے کے صدمہ سے یا کسی اور وجہ سے اُسکی آنکھوں کی روشنی زائل ہوگئی۔
ایلمرک۔ روشنی زائل ہوگئی؟
مارتھا۔ جی ہاں۔ آپ ہماری اور اُسکے والد کی روحانی تکلیف و مایوسی کا اندازہ کرسکتے ہیں۔ ہائے ایسی بھولی اور پیاری بچی آنکھوں کی نعمت سے محروم ہو جائے۔ کیسا افسوسناک حادثہ ہے! کس قدر ناقابل برداشت! جو امیدیں اُسکی ذات سے وابستہ ہیں اُنکے منقطع ہوتے ہی پرانی عداوتیں اور رنجشیں از سرِ نو چھڑ جائیں گی، بلکہ پہلے سے بھی زیادہ سختی کے ساتھ کیونکہ دوڈمانٹ یہ کبھی گوارا نہیں کریگا کہ اُسکا لڑکا ایک اندھی لڑکی سے شادی کرے، وہ سمجھے گا کہ اسے دھوکا دیا گیا اور لڑکی صلح کے پیشتر ہی سے نابینا تھی پھر آپ اُسکے طیش کا اندازہ کرسکتے ہیں۔
ایلمرک۔ یقیناً اُسکے دل میں یہ وسوسے پیدا ہونگے۔ لیکن ہمارے بادشاہ نے کیا تدبیر سوچی؟
برٹرانڈ۔ پہلے تو اُنھوں نے اس امر کو پوشیدہ رکھا کہ لڑکی نابینا ہے، کیونکہ اُسکے بشرہ سے زوالِ بصارت کی کوئی علامت نہیں پائی جاتی، لیکن کچھ دن بعد قرطبہ سے شہرۂ آفاق حکیم ابن یحییٰ طلب ہوا جسکی فراست معجزہ کی حد تک پہونچ گئی ہے۔ وہ آیا اور ہر قسم کا علاج کیا اور ہمیں ہدایت کی کہ بہت احتیاط سے لڑکی کو پرورش کرنا چاہیے، اور پھر اُس نے علم نجوم کے زور سے اُسکا زائچہ مرتب کیا۔
ایلمرک۔ اور پھر؟
مارتھا۔ ہمیں اُمید دلائی کہ جب آیو لنیتھی کو سولھواں سال شروع ہوگا تو اُس کی آنکھوں میں روشنی عود کرےگی۔ اب وہ وقت آگیا اور ابن یحییٰ پھر بلایا گیا ہے۔ جو دوائیں وہ بتاگیا تھا دی جا رہی ہیں، لیکن اُن کا مفاد ہم پر کبھی ظاہر نہیں ہوا۔ وہ کہتا ہے کہ روشنی آنے کی ساعت

آگئی، خدا کرے ایسا ہی ہو!

ایلمرک۔ لیکن آیوکنیتھی کی زندگی عجب مصیبت میں بسر ہوتی ہوگی۔

مارتھا۔ اُسے خبر بھی نہیں کہ وہ اندھی ہے۔

ایلمرک۔ خبر بھی نہیں کہ اندھی ہے! تم یقیناً مجھے بناتی ہو۔

مارتھا۔ نہیں جناب! آپ کو خود بہت جلد معلوم ہوجائے گا کہ میں نے آپ سے جو کچھ کہا بالکل سچ ہے۔ لیکن میں آپ سے یہ التجا کرتی ہوں کہ جب آپ آیولینیتھی سے گفتگو کریں تو اس بات کا بہت خیال رہے کہ کوئی لفظ ایسی نہ کہیے جسکا اشارہ آنکھوں کی طرف ہو۔ حکیم نے اسکا نہایت سختی سے حکم دیا ہے، کسی ایسی چیز کا نام نہ لیجیے جو دیکھنے سے تعلق رکھتی ہو۔ دن کی دھوپ اور رات کی چاندنی اور تاروں کی چھاؤں کا ذکر نہ آنے پائے۔ افسوس وہ اپنی زندگی کے دن ایسی اندھیری رات میں پورے کر رہی ہے جس میں تاروں کا نام نہیں!

ایلمرک۔ کیا تم نے اس حکم کی سختی سے پابندی کی ہے؟

برٹرانڈ۔ ہم نے اُسکی عمر کی ابتدائی حصہ ہی سے یہ عادت ڈالی، اگرچہ اُسوقت اور باتیں کرتے بھی تو کوئی اندیشہ نہ تھا!

ایلمرک۔ آخر اُس کی آنکھوں کے بے نور ہونے کا راز اُس سے پوشیدہ کیوں رکھا گیا ہے اور کس کے ایما سے؟

مارتھا۔ ہمیں نہیں معلوم کہ یہ بادشاہ کی خوشی ہے یا حکیم تحیٰی کا مشورہ ہے لیکن سبب بتا سکتی ہوں آپ کو معلوم ہے کہ ایک دن تاج شاہی اُسکے زیب سر ہوگا اور اگر خیریت رہی تو اُسکی آیندہ زندگی نہایت شاندار ہوگی لیکن یہ ڈر ہے کہ اگر اُسے اپنے اندھے ہونے کا علم ہوگیا تو اُسکی لطیف روح پر حزن کا غبار چھا جائے گا، خیالات کا شیرازہ بکھر کر حواسوں کے توازن میں فرق آجائیگا۔ شگفتگی و خوش مزاجی مفقود ہوجائیگی، حالانکہ یہی چیزیں ایک ملکہ کے سب سے زیادہ خوبصورت زیور ہیں، لہذا یہ کوشش کیجاتی ہے کہ اپنی مصیبت کا اُسے علم نہ ہونے پائے،

ایلمرک۔ اسی وجہ سے وہ یہاں تمام دنیا سے چھپا کے رکھی گئی ہے تاکہ اُس سے کوئی کہہ نہ دے کہ وہ نابینا ہے؟

برٹرانڈ۔ بس یہی بات ہے۔ اس وادی میں جو کوہ واکلوز کے دامن میں پوشیدہ ہے وہ تمام دراندازنظروں سے محفوظ ہے۔ آپ جانتے ہیں کہ شاہ رینی کا خاص مشغلہ پھولوں اور پودھوں کا لگانا اور اُنکی نگہداشت ہے۔ جو کچھ آپ دیکھ رہے ہیں اُنکی ذاتی محنت کا نتیجہ ہے اور ان ہی درختوں اور بیل بوٹوں کے ساتھ اُنکی لڑکی سن شعور کو پہونچی۔ وہ یہاں کے چپہ چپہ سے واقف ہے اور بغیر کسی رہبر کے بیدھڑک ہر جگہ آجا سکتی ہے۔ اُسکی تعلیم کی طرف سے بھی بے پروائی نہیں کی گئی، سینا پرونا اور فن باغبانی سے واقف ہے، اس طرح وہ مصروف اور خوش رہتی ہے۔

اسکو شاعری کا بھی شوق ہے اور موسیقی میں بھی دخل ہے۔

ایلمرک۔ شاعری!

برٹرانڈ۔ جی ہاں! خود بادشاہ نے اُسے یہ فن سکھایا اور سکے بہترین ماہر کو بھی شرم نہ آنا چاہیے اگر آیو لنیقی کے تصنیف کیے ہوے گیت اُس کی طرف منسوب کیے جائیں۔

ایلمرک۔ یہ سب کچھ تو میری سمجھ میں آتا ہے، لیکن یہ بات میرے فہم سے خارج ہے کہ اُسے اپنے نابینا ہونے کا شک نہیں ہوتا۔ میرے نزدیک تو آپ لوگوں کا خیال ہی خیال ہے۔

مارتھا۔ چونکہ آپ ہر ہر قدم پر اپنی آنکھوں سے کام لیتے ہیں لہذا آپ کو اس قدر اچنبھا ہے۔ آواز سُن کر بھی آپ کی آنکھیں خود بخود اُس طرف پھر جاتی ہیں۔ تاریکی میں بھی آپ کو دھوکا ہوتا ہے کہ روشنی کی ایک شعاع چمک گئی، لیکن جو شخص کہ ابتدائے عمر سے کیا تعجب کہ پیدائش کے وقت سے نابینا ہو کس طرح خیال کر سکتا ہے کہ اُسکے ہم جنس دیکھتے ہیں، وہ بصارت کا مفہوم ہی نہیں سمجھ سکتا اُسے اُس حیرت انگیز قوت کا کیا ادراک ہو سکتا ہے جو آنکھوں میں ودیعت ہے۔ لیکن جس طرح ہم آنکھوں کے ذریعہ سے اپنے گرد و پیش کی چیزوں کا بآسانی احساس اور اندازہ کرتے ہیں اُسی طرح ایک نابینا شخص سماعت، لمس، واردات قلب، ہوا کی سبک خرامی اور بے شمار دیگر وسائل سے جنکا وہ مالک ہوتا ہے ہر شے کو تمیز کرتا ہے ہم اُن سے فائدہ نہیں اٹھا سکتے اور نہ سمجھ سکتے ہیں۔ آیو لنیقی کا سامنا ہونے دیجیے جو کچھ میں نے کہا آپ پر خود روشن ہو جائے گا۔

ایلمرک۔ حضرت عیسٰی کی قسم مجھے اس عجیب ہستی کو دیکھنے کا اشتیاق پیدا ہو گیا، لیکن ایک بات اور میری سمجھ میں نہیں آتی وہ بھی سمجھاؤ، صرف تم دو ذاتیں اُسکی دُنیا ہو ورنہ وہ اس پوشیدہ وادی میں تنہا ہے۔

برٹرانڈ۔ آپ کا یہ قیاس صحیح نہیں، آیو لنیقی ایسی بیکس و تنہا نہیں ہے، ان پہاڑوں کے پیچھے جیسا کہ آپ کو علم ہوگا سینٹ کلیرا کی خانقاہ ہے اور اکثر وہاں کی راہبہ عورتیں اُسکی ملاقات کو آتی ہیں، بادشاہ سلامت بھی اکثر دوستوں اور مہمانوں کو ہمراہ لاتے ہیں۔

ایلمرک۔ الغرض وہ کسی چیز کی کمی محسوس نہیں کرتی اور اپنی قسمت پر شاکر ہے۔ دنیا کے اُن دلکش مناظر اور اُن نعمتوں سے محروم ہے جو ہمارا حصہ ہیں لیکن اسے اُنکے وجود کا گمان بھی نہیں ہوتا کیا وہ تم سے کبھی ایسے سوالات نہیں کرتی؟

مارتھا۔ یہ ایسا سوال ہے جسکا جواب دینا آسان نہیں۔ بہت ممکن ہے کہ وہ اپنے بعض خیالات کا اظہار نہ کرتی ہو، وہ جانتی ہے کہ اس وادی کا ایک دروازہ ہے، جب کوئی آتا ہے تو گھنٹی بجتے سنتی ہے، اُسکی آواز سنکر اُسکے

چہرہ پر خوشی کی ایک لہر دوڑ جاتی ہے اور کان لگائے ہوئے خاموش منتظر رہتی ہے۔ تاہم وہ کبھی نہیں پوچھتی کہ دروازہ کہاں ہے اور اُس سے گذر کر آدمی کہاں پہونچتا ہے۔ کیونکہ اُسے تعلیم کیا گیا ہے کہ بہت سی باتیں ایسی ہیں کہ انکے متعلق اُسے کچھ دریافت نہ کرنا چاہیے وقت اُس پر خود ظاہر کر دیگا۔ اُسکی حالت خوردسال بچوں کی سی ہے اُنکے سامنے خدا کا اور اُسکے قادر مطلق ہونے کا نیز حیات بعد الموت کا ذکر کرو اور دیکھو کہ وہ کس طرح سنتے ہیں، حیرت سے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھتے ہیں اور عدم تیقن کا سایہ رواں دواں بادل کی طرح اُنکے چہرہ پر نمودار ہو کر غائب ہو جاتا ہے۔ اُسکے بعد ایک دلپذیر انداز سے اعتقاد کا نور اُنکی پیشانیوں سے جھلکتا ہے، وہ اُن چیزوں کے سامنے جو سمجھ نہیں سکتے سر تسلیم خم کر دیتے ہیں، اسی طرح آیولنیقی کی موجودہ حالت میں تمام وسیع دنیا ایک عظیم راز ہے جسکے پردوں کو وہ چاک کرنا چاہتی ہے اُسوقت اُس کا باپ یا خانقاہ کی نگراں راہبہ اُس سے کہتی ہیں "میری بچی صبر کر، ابھی تو بہت کمسن ہے۔ آنے والے زمانہ میں تو سب کچھ خود بخود سمجھ جائیگی" وہ اس مقولہ پر صدق دل سے یقین کرتی ہے اور خواب میں بھی یہ بات اُسکے ذہن میں نہیں آتی کہ اس خوشنما دنیا کی تمام زیب و زینت دیکھنے کو نورانی آنکھیں درکار ہیں، کیا جناب یہ ممکن نہیں ہے کہ جس وقت ہم زندگانی کے آغاز و انجام پر مایوسانہ نظر ڈالتے ہیں تو گویا ہم اندھوں کی طرح چلتے ہیں اور آیولنیقی کی طرح ہمیں احساس نہیں ہوتا کہ حقیقی روشنی سے محروم ہیں، اگرچہ صرف اعتقاد ہماری امیدوں کا انجم رہبر ہے۔

ایلمرک۔ نیک نفس مارتھا، تم نے جو کچھ کہا بالکل حق ہے لیکن یہ تو بتاؤ کہ آیولنیقی ہے کہاں؟

برٹرانڈ۔ سو رہی ہے۔

ایلمرک۔ سو رہی ہے؟ اور اسوقت؟

برٹرانڈ۔ وہ روز اسوقت ایک گھنٹہ کے واسطے حکیم کی ہدایت کے بموجب سوتی ہے۔ یہ کوئی شیریں اور قدرتی نیند نہیں ہے، لیکن میں حیران ہوں کہ آخر کیا کہوں۔ غیر مانوس اور بے ڈھنگے اور عجیب و غریب اشاروں سے ابن یحیی اُسے مسحور کر کے اُس پر خواب طاری کر دیتا ہے، اُسکے بعد اُسکے سینہ پر ایک ٹکڑا جواہر کا رکھ دیتا ہے وہ کوئی طلسم یا نقش ہے کیونکہ جب تک اُسے ہٹاتا نہیں آیولنیقی سویا کرتی ہے، ممئی میں تو کہوں، میں بہت گھبراتا ہوں۔

ایلمرک۔ ہمیں ابن یحیی کے کمال پر کامل اعتماد ہے۔

برٹرانڈ۔ بس اسی سے ڈھارس ہوتی ہے۔

(گھنٹی بجتی ہے)

مارتھا۔ برٹرانڈ! گھنٹی بجی!

برٹرانڈ۔ بادشاہ سلامت آگئے۔

(چور دروازہ سے باہر جاتا ہے)

ایلمرک۔ کیا بادشاہ سلامت اکثر یہاں آتے ہیں؟

مارتھا۔ ہاں جب اس جگہ کے قریب والے محل میں فروکش ہوتے ہیں، لیکن بعض دفعہ مہینوں نہیں جھانکتے۔

ایلمرک۔ کیا آیولینتھی جانتی ہے کہ وہ بادشاہ ہیں؟

مارتھا۔ نہیں، اور اس بات کا بہت خیال رکھا جاتا ہے، وہ اُنھیں "آبا" کہتی ہے اور ہم لوگ "ریباٹو"، یہ ایک مشہور مغنّی کا نام ہے۔

ایلمرک۔ خاموش! بادشاہ سلامت تشریف لا رہے ہیں!

(باقی)

شہید علم کی زبان سے

اثر لکھنوی

میری زندگی کے دن اُن عالی وقار رفتگانِ عدم کی صحبت میں بسر ہوتے ہیں جنھوں نے اپنی بہترین تصانیف کی بدولت حیاتِ ابدی حاصل کرلی ہے جس طرف نظر اٹھاتا ہوں زمانۂ سلف کے یہ عالی دماغ میرے پیش نظر ہوتے ہیں۔ یہ میرے سچے رفیق ہیں۔ یہ مجھ سے باتیں کرنے میں نہیں تھکتے۔ اور مجھ سے بیزار نہیں ہوتے بلکہ میری خوشی کی خاطر ہر وقت برسرِ تکلم رہنا انکا تنہا مشغلۂ تفریح ہے۔

اگر امکیطرف میں انکی بزم مسرت کا شریک ہوں تو ہی کے ساتھ انکے آلام و مصائب کا بھی حصہ دار ہوں۔ جب اس بات کا قوی احساس میرے دل کو بیچین کرتا ہے کہ میں انکا کسقدر ممنون ہوں تو میری آنکھیں احسانمندی کے کیف افزا قطرات اشک سے لبریز ہو جاتی ہیں

میرے خیالات کا وجود انھیں زاویہ نشینان ملک بقا سے وابستہ ہے میں ہر وقت انکے ساتھ ہزاروں برس پیشتر ماضی کی دلچسپ سیر میں مصروف رہتا ہوں۔ انکی نیکیاں میرے اور انکے درمیان ازدیادِ محبت کا سبب ہوتی ہیں انکی لغزشیں میرے لیے بصیرتوں کا ایک خزانہ ہیں جسمیں عبرت کے صدہا تازیانے پوشیدہ ہیں۔ میں انکی وادیِ حیات کے دلچسپ مناظر امید و بیم کا اس طرح تماشائی ہوں کہ انکے خوف کے ساتھ ہراساں اور انکی توقعات کے ساتھ شاداں ہوں۔ انکی زندگی پاک اور بے لوث ہدایات کا ایک سرچشمہ ہے جو میرے لیے کسی خضر طریقت سے کم نہیں

اے ملک بقا کے بسنے والو! میری ساری توقعات تمھارے ہی دامن سے وابستہ ہیں اور میں خوش ہوں کہ بہت جلد وہ زمانہ آنیوالا ہے جب میں اپنے نام کی انمٹ نشانیاں اسی دنیا میں چھوڑ کر تمھاری اس محفل کا شریک ہونگا جو ایک غیر محدود مدت کے لیے پنجۂ فنا سے آزاد ہے۔ (سودے)

احمد عارف (حیدرآبادی)

تنقیدیں

جلال الدین خوارزم شاہ

سید سجاد حیدر صاحب بی اے، رجسٹرار مسلم یونیورسٹی کی "رنگین نگارش" کا یہ تازہ ترین نمونہ ہے، سید صاحب اپنی مخصوص ادبی اداؤں کی وجہ سے اردو دنیا میں کافی سے زیادہ مشہور ہیں لطیف ادب کے جو پاکیزہ نمونے انکے قلم سے اردو میں نکلے ہیں وہ دادِ تحسین سے مستغنی ہیں، اور سچ یہ ہے کہ اردو زبان کی آبرو انکے نام سے قائم ہے، انکی نرم و لچیلی زبان، انکے انمل اور بے جوڑ جملے جو اپنے میں خاص ندرت و دلکشی رکھتے ہیں، اُن ہی تک محدود ہیں۔ اردو میں ادب لطیف کے بانی اور ترکی ادبیات کے شیدائی سید سجاد حیدر اردو زبان میں ترکی اسٹائل پیش کرتے ہیں، ترجمہ کے متعلق مختلف رائیں ہیں، ایک فریق قائل ہے کہ ترجمہ میں دوسری زبان کی کھٹک اور اجنبیت نہ آنے پائے، دوسرا گروہ کہتا ہے کہ اگر دوسری زبانوں کے انداز بیان کا لطف اٹھانا ہے اگر غیر زبانوں کے ادائے مطالب کے مختلف پیرایوں اور انکی مخصوص شانِ دلربائی سے لطف اندوز ہونا ہے تو ناگزیر ہے کہ ترجمہ میں حتی الوسع غیر زبانوں کی نقل کی جائے، اسی طرح زبان کی خدمت ہو سکتی ہے، کیونکہ خدمتِ زبان نام ہے زبان کو اس قدر وسیع کر دینے کا کہ وہ ہر قسم کے خیالات کے ادا کرنے پر حاوی ہو جائے۔ ظاہر ہے کہ اس طرح ترجمہ اُکھڑا اُکھڑا، بے ربط اور ناآشنا معلوم ہوگا مگر آہستہ آہستہ جب ہمارے کان اُس سے آشنا ہو جائیں گے اُس میں ہمیں ایک ندرت تو ضرور معلوم ہوگی لیکن تنفر یا استکراہ نہ پیدا ہوگا، سید صاحب اسی آخر الذکر اصول کے قائل ہیں اور بلا شبہ انھوں نے اس قسم کی ہزارہا ترکیبوں اور اس طرح کے بیشمار فقروں کو ہمارے سامنے اس طرح لاڈالا ہے کہ اب وہ ہمیں اپنے معلوم ہوتے ہیں۔

سید صاحب کی اور تالیفوں اور تصنیفوں کی طرح یہ کتاب بھی انکے مخصوص ادبی رنگ سے معمور ہے، ڈرامہ کا مصنف "نامق کمال" ترکی ادبیاتِ جدیدہ کے زندۂ جاوید بانیوں میں سے ہے اور یہ ڈراما اس کا شہکار ہے جسے ترکی زبان میں کلاسکس کی حیثیت حاصل ہے، پلاٹ اُس زمانہ کا ہے جب چنگیز خاں دنیائے اسلام پر آفتیں لا رہا تھا اور جلال الدین نے اپنے مذہب و ملت کے لیے جانفروشانہ اور با حمیت خدمات کیں، جلال کا کیرکٹر دلپذیر اور دلربا ہے، وہ ایسا مرد میدان

ہے ویسا ہی صاحب محفل: اسکے میاں کاردار اور "صحبت شب" کی تصویریں انتہائی دلچسپ ہیں، فن کے اعتبار سے ہم کہہ سکتے ہیں کہ یہ ڈرامہ تمثیل نہیں کیا جا سکتا، دنیا کی ترقی یافتہ زبانوں میں دو طرح کے ڈرامے لکھے جاتے ہیں، ایک تو وہ جو اسٹیج پر لائے جا سکیں، دوسرے وہ جو بہ قول سیدین صاحب "آرام کرسی پر لیٹ کر پڑھے جا سکیں" یہ ڈرامہ آخرالذکر نوعیت کا ہے جسکی ادیبانہ طرز انشا دماغ کو سرور اور دل کو سکون پہونچاتی ہے - ترجمہ میں اصل کی خوبیاں دیکھنا ہوں تو ذیل کی عبارت ملاحظہ کیجیے :-

"دل کی اُس وقت کی حالت جبکہ لڑکپن اور شباب کے درمیان کا زمانہ ہوتا ہے اس طرح کی ہوتی ہے گویا اک ناز نین ہے جس کا وقت معصومانہ کھیلوں اور امیدوں میں گذرتا تھا، جو ایک شیریں غفلت، ایک جاں پرور راحت میں تھی، جس کی خواب آلود انکھڑیوں کو طلوع آفتاب کا نور آہستہ آہستہ کھول رہا تھا کہ یکایک حسن کی بجلی آنکھوں کے سامنے کوندنے لگتی ہے، اب جو وہ چاروں طرف نظر ڈالتی ہے تو اپنے تئیں ایک ریاض جنت میں پاتی ہے جو ہزاروں الوان و انوار سے معمور ہے، جس ہوا میں سانس لیتی ہے وہ رائحہ حیات ہے، جس زمین پر قدم رکھتی ہے وہ روح جوہر سے بھری معلوم ہوتی ہے، رفتار عمر میں اُسے وہ لذت محسوس ہوتی ہے گویا اک نہر کی روانی کی سیر کر رہی ہے، جسکے کنارے سرو و سمن استادہ اور چاند اپنی روشنی ڈال رہا ہے اور وہ اُس سرور سے بیہوش رہتی ہے جو اُس جاودانی سعادت کے پا لینے سے حاصل ہوتا ہے جسے ہر روح "فاؤسٹ" کے بعد حسرت سے ڈھونڈتی پھرتی ہے"

اس سے زیادہ لطیف، نرم، لچکدار و رسیلی زبان سید صاحب کے ترجموں کے علاوہ اپنی زبان میں آپ کہاں پائیں گے ؟

کتابت و طباعت عمدہ، صفحات ۳۷۹، تقطیع چھوٹی، قیمت ۱۲/ - جناب مولف سے یا مسلم یونیورسٹی بکڈپو سے علیگڈھ کے پتہ پر مل سکتی ہے -

نقش امڈنگ جلال الدین صاحب اکبر کا مجموعۂ کلام ہے جو چھوٹی تقطیع کے ۱۲۵ صفحات پر محیط ہے، سرورق رنگین اور خوشنما ہے، شروع میں عابد علی صاحب عابدی اے ایل ایل بی نے ایک مختصر سا مقدمہ لکھ کر اکبر کے کلام کی خصوصیات بیان کی ہیں اسکے بعد ملک کے مشہور شعرا اور انشا پردازوں کی رائیں ہیں اور نوجوان مصنف کے فخر و مسرت کے لیے مولانا سلیمان ندوی کا یہ قول کہ "اکبر پنجاب کا حسرت موہانی" ہے ایک قابل ناز سند ہے - کتاب چھے

آغاز میں اکبر صاحب کی دلکش تصویر ہے، بحیثیت مجموعی ہمیں یہ دیکھ کر بہت مسرت ہوئی کہ اکبر نے اس قدر کم عمری میں شعر کا مذاق اس قدر پختہ اور سلیم اور لطیف کر لیا ہے، اُنکے کلام میں ایک شعر بھی ایسا نہیں جس میں سوقیانہ پن اور عریانی کی آلائش ہو، امید ہے کہ عمر کے ساتھ ساتھ آپ اور ترقی کریں گے، غزل کا رنگ ملاحظہ ہو:-

کرتا ہوں میں بیانِ ستم بر سبیلِ ذکر		ہر چند اُن سے کوئی شکایت نہیں مجھے

تجھ کو اللہ نے بخشا ہے یہ کیا حُسنِ کلام		تیرے انکار میں اقرار نظر آتا ہے

تیرا خیال باعثِ تسکینِ جان و دل		تیرا جمال رونقِ ایوانِ آرزو
میری طرف وہ دیکھ کے یوں مسکرا دیے		پھولوں سے بھر گیا مرا دامانِ آرزو

نگاہِ کرم نے ترس کر دیا ہے		مری روح کو آشنائے تمنا

سنتے رہے وہ شوق سے میری شکایتیں		کچھ بات تھی کہ اُن سے ملامت نہ ہو سکی

چھوٹی بحروں کی روانی و سلاست حسرت کے بعد اکبر کے یہاں ملے گی:-

عشق نے جب سے کر دیا برباد		خانۂ روح ہو گیا آباد
ہو رہے ہیں وہ مہرباں مجھ پہ		دے رہے ہیں قصورِ عشق کی داد
خوب دیکھیں فنا کی تصویریں		خوب دیکھا یہ عالمِ ایجاد
آہ، وہ شیوہ ہائے دلداری!		آہ یہ ظلم! آہ یہ بیداد!
میرے مٹنے سے عشق مٹتا ہے		اے جفا کیش، اے ستم ایجاد

آپ کا یہ شعر ایک عجیب دل آویز وجدانی کیفیت رکھتا ہے جو اربابِ ذوق سے مخفی نہیں:-

کچھ بات تھی کہ اُن سے محبت ہوئی مجھے		کچھ بات ہے کہ اُن سے محبت نہیں مجھے

"ایک تصویر کو دیکھ کر" میں کسی صبیحِ حسن، اور مجبورِ جسم کی تعریف میں کیفیاتِ رنگ و بو پیدا کر کے آپ کا یہ کہنا کہ

بہشت زار ہے یہ حسنِ نازنیں اُس کا		بنا ہے نور سے یہ جسمِ مرمریں اُس کا

فروغِ حسن ہے یا رنگ و بو کا طوفاں ہے کوئی کہے کہ تبسم بہارِ خنداں ہے
مہک اٹھی ہے ہوائیں ، دور خوشبو سے چمک اٹھی ہیں فضائیں نگاہ جادو سے

آپ کے لطفِ نظر کی دلیل اور نزاکتِ خیال کی آخری منزل ہے

کہیں کہیں اشعار میں اساتذہ سے توارد ہوگیا ہے جو بدگمانی پیدا کرتا ہے، مثلاً

آئے تسکین اضطراب کو وہ اور بھی کچھ چلے سوا کر کے

حسرت کا شعر ہے :-

تسکین اضطراب کو آئے تھے وہ مگر بیتابیوں کی روح کو بالیدہ کر چلے

لیکن یہ حسرت موہانی کے عمیق مطالعہ کا نتیجہ ہے جو اکبر نے عادت سے اخذ کیا ہے، کتاب کی قیمت ۱۲ ہے اور اسمٰعیل صاحب نسیم مالک ہزار داستاں لاہور سے مل سکتی ہے۔

سالومی

اُردو میں ادب لطیف کا سرمایہ اس قدر کم ہے کہ دوسری زبانوں کو پڑھنے کے بعد ہمیں اپنی زبان سے ایک طرح کا بے اعتنائی کا احساس پیدا ہو جاتا ہے، اسکے دو وجوہ ہیں، اول تو بعض ذمہ دار اہل قلم اور ارباب کمال ادب لطیف کی ترویج کو اُردو زبان کی ترقی کے منافی سمجھتے ہیں وہ علمی اور تاریخی ذخیرہ سے زبان کو مالا مال کرنا چاہتے ہیں اور اُنکے خیال میں یہی زبان کی اصل خدمت ہے، اس ذوق و شوق میں وہ اس قدر پختہ اور راسخ ہو جاتے ہیں کہ انھیں دوسری طرف توجہ کرنے کی فرصت ہی نہیں ہوتی حالانکہ دنیا کی تمام ترقی یافتہ زبانوں میں حتےکہ روسی زبان تک میں جس نے ہمارے دیکھتے دیکھتے ترقی کی ہے ادب لطیف کو بہت بلند جگہ حاصل ہے۔ ادب لطیف سب سے پہلا اور سب سے آخری زبردست شعبۂ ادب ہے جسکی پرداخت میں اُنکے بڑے سے بڑے اہل قلم اپنی زندگی وقف کر دیتے ہیں، اُنکے بڑے سے بڑے ماہران علم و فن مورخ اور سائنسٹسٹ ہمارے یہاں کی طرح ادب لطیف کو کبھی نظر حقارت سے نہیں دیکھتے نہ صرف یہ بلکہ وہ اپنے فرصت کے اوقات میں اُسی ذوق و شوق کے ساتھ اس کا مطالعہ کرتے ہیں جس طرح کہ ایک آشنائے فن آرٹسٹ، دوسری بڑی بدنصیبی ہمارے یہاں یہ ہے کہ جن لوگوں کو تھوڑا بہت سلیقہ حاصل ہے اُن کا انتخاب (چوائس) صحیح نہیں ہوتا، اور اُنھیں کی غلط تقلید میں خام کار اور جاہل نوجوان "ادب لطیف" کی آڑ میں اُردو کی تخریب کے درپے ہیں۔ ایسی حالت میں اگر ملک کے کسی گوشہ سے کوئی اچھی کتاب نکلے تو اسکی حوصلہ افزائی کرنا یقیناً سرادب سے۔ لیکن لکھنے والے شخص کا فرض ہے اُردو کی اس کس مپرسی کی حالت

میں ادب لطیف میں کسی ابتدا اور تخیل تصنیف کا اضافہ ایک خیال خام ہے، ہاں دوسری زبانوں کے ترجمے ہمارے لیے مشعل ہدایت کا کام دے سکتے ہیں۔

زیر نظر کتاب انگریزی زبان کے مشہور انشاپرداز آسکر وائلڈ کے ایک مختصر ڈرامہ کا ترجمہ ہے جس میں مجنون گورکھپوری صاحب نے زبان کی وہ تمام خوبیاں قائم رکھی ہیں جو ادب لطیف کا جوہر ہیں اور جو اصل کتاب کی امتیازی خصوصیات ہیں، آسکر وائلڈ کی یہ کتاب یورپ کی قریب قریب تمام زبانوں میں ترجمہ ہو چکی ہے ضرورت تھی کہ مجنون صاحب دیباچہ کو ذرا اور پھیلاتے اور آسکر وائلڈ کی زندگی اور اُسکے آرٹ سے اُس ہمہ گیر اور پائدار اثر کو واضح کرتے جسنے بڑے سے بڑے اہل کمال کو اس کتاب کے سامنے سر عجز خم کر دینے پر مجبور کر دیا۔ ہمیں اندیشہ ہے کہ آسکر وائلڈ کو اردو میں اچھی طرح نہیں سمجھا گیا ہے اور اس گمراہی کے سبب سے کہیں یہ کتاب ضائع ہو کر اردو زبان کی تخریب کے متعدد آلات میں سے ایک آلہ نہ ثابت ہو۔ کتاب کی طباعت و کتابت معمولی ہے، تقطیع چھوٹی۔ دفتر نگار بھوپال سے ۱۲ ر میں مل سکتی ہے۔

نغمہ انجمن اتحاد کلیہ جامعہ عثمانیہ کے کسی مشاعرہ کی غزلوں اور نظموں کا یہ مجموعہ چھوٹی تقطیع کے ۵۶ صفحات پر شائع ہوا ہے، ہمیں یہ دیکھ کر بیحد مسرت ہوتی ہے کہ اس قدر قلیل عرصۂ قیام میں عثمانیہ یونیورسٹی نے اس قدر ترقی کر لی ہے کہ ہر صنف میں اُسکے طلبا گامزن ہیں، پُر مغز اور ثقہ تصانیف و مضامین لکھنے پر جس طرح وہاں کے طلبہ آمادہ ہیں اُسی طرح شعر و سخن اور لطیف ادب کے میدان میں بھی وہ انتہائی دلچسپی لیتے ہیں، زیر نظر مجموعہ کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ "نغمہ" کے عنوان پر ۱۷ نظمیں جمع کر دی گئی ہیں، کسی ایک موضوع پر اس قدر عمدہ اور دلپذیر نظمیں جمع کر دینا ایک بھاری ادبی جدت ہے، اب ضرورت ہے کہ پرانے رنگ مشاعرہ کو رخصت کر کے بجائے غزلوں کے لوگوں کو نظموں کی طرف توجہ دلائی جائے۔ اقبال کی نظموں کو جو قبولیت عامہ نصیب ہوئی اُسکی بنا پر امید تھی کہ اردو میں "نظمیات" کا ایک روشن باب کھلے گا، افسوس ہے کہ اس میں کلی میدان صرف پنجاب کے ہاتھ رہا، اور ہندوستان کے دوسرے گوشوں بالخصوص لکھنؤ اور دہلی سے اسکی حمایت میں کوئی با اثر آواز نہ نکلی طالب علموں کی اس مختصر سی انجمن اور اسکی اس مختصر سی کتاب کی جدت طرازی سے فائدہ اٹھا کر ہمارے شعرا کو سبق لینا چاہیے۔

ہمارے خیال میں کتاب میں سب سے بہتر نظم جناب حسن الدین صاحب کی ہے، ممکن ہے

ہمارا یہ خیال غلط ہو، کیونکہ ہمنے پہلی نظر میں یہ کامیاب نظم دیکھی اور پسند کی، ممکن ہے کہ سب نظمیں ایسی ہی ہوں، ناظرین ذیل کے اشعار کو پڑھیں اور حسن الدین صاحب کے ذوقِ شعر اور علوِ خیال کی داد دیں :—

صبحدم اک مطربِ خوشگو کنارِ جوبار   نغمہ پیرائی سے مجکو کر رہا ہے بے قرار

آہ! یہ وقتِ سحر اس کی ترنم ریزیاں   دل نہ بھولے گا کبھی ایسی سرور انگیزیاں

زندگی کی لہر دوڑا دی تن بیجان میں   اک تڑپ سیماب کی سی ڈالدی وجدان میں

ہمارے شعرا کی ساری خدمتِ ادب آخری شعر میں "تن بیجان" کی ترکیب کو غلط، غیر فصیح اور خدا جانے کیا کیا ثابت کرنے پر صرف ہو جائے گی!

خود فراموشی سکھادے اسمیں وہ اعجاز ہے   نغمہ گویا شاہدِ پنہاں کی اک آواز ہے

تنگ جب ہنگامۂ ہستی سے ہو جاتا ہے دل   صدمۂ پیہم سے جسدم سخت گھبراتا ہے دل

اک ترنم میں تسلی کس قدر پاتا ہے یہ   قید سے افکار کی آزاد ہو جاتا ہے یہ

لذت اسکی جانتا ہر آشنائے درد ہے   قیمت اسکی کچھ نہیں بس ایک آہِ سرد ہے!

ذیل کے اشعار اقبال کی پُر ترنم اور فلسفیانہ شاعری کی یاد دلاتے ہیں :—

ذرہ ذرہ خاک کا جو رقص پر مجبور ہے   کون سے آہنگ سے ساری فضا معمور ہے

نغمہ سنجی صانعِ پنہاں کی ہے صنعت گری   خاک کے پُتلے میں کیوں اپنی صدا بھی ڈالدی

ساز کے پردوں میں پنہاں گا نیوالا اور ہے   زیر و بم سے روح کو تڑپا نیوالا اور ہے

گردشِ سیارہ سے آتی جو اک آواز ہے   عرش پر بیٹھا ہوا کوئی نوا پرداز ہے

نغمہ سینے میں مرے مدت سے اک بیتاب تھا   سازِ دل کے واسطے یہ عشق ہی مضراب تھا

ہر صدا محبوب کی دزدِ متاعِ ہوش ہے
پیار کی نیچی نظر بھی نغمۂ خاموش ہے!

کتاب کی قیمت آٹھ آنے ہے اور دفتر اتحاد جامعہ عثمانیہ حیدرآباد دکن سے مل سکتی ہے۔

جلیل قدوائی (علیگ)

ہندوستانی اکیڈمی

کچھ عرصہ سے حکومت کی تعلیمی پالیسی کا رجحان اس طرف ہوا ہے کہ انگریزی کے بجائے ملکی زبانوں کو ذریعۂ تعلیم بنایا جائے - چنانچہ ہمارے صوبہ میں ابتدائی تعلیم کئی سال سے اردو اور ہندی میں دی جا رہی ہے اور حکومت کی طرف سے اسی سال اعلان ہوا ہے کہ دو سال کے بعد سے ثانوی مدارس میں بھی اُردو و ہندی کے ذریعہ تعلیم دی جائے گی - اور اسکے بعد توقع کرنا چاہیے کہ اعلیٰ تعلیم بھی ملکی زبانوں ہی کے ذریعہ ہوا کریگی - حکومت کی یہ روش ہندوستانی رعایا کی خواہشات کے عین مطابق ہے اور موجودہ نظام حکومت سے خواہ کتنا ہی اختلاف کیوں نہ ہو لیکن حکومت کی یہ پالیسی بہرحال صحیح اصول پر مبنی سمجھی جانے کی مستحق ہے - اگر خدانخواستہ یہ کوئی نیا فتنہ بپا کرنے کا موجب نہ بن جائے جسکا موجودہ باہمی بدمزگیوں میں ہر لحظہ اندیشہ رہتا ہے -

صوبجات ہذا کے وہ اصحاب جنھیں ملکی زبانوں کی ترقی سے گہری دلچسپی ہے ہمیشہ اس بات پر متاسف رہے کہ دیسی زبانوں کی طرف حکومت کو کوئی التفات نہیں اور حکومت کی پالیسی میں تبدیلی نظر آنے کی وجہ سے اکثر حلقوں میں یہ خیال پیدا ہو چلا ہے کہ ملکی زبانوں کا مستقبل اب اتنا تاریک نہ رہے گا اور جو لوگ خالص علمی و ادبی مصروفیتوں میں مشغول رہنا چاہتے ہیں، اُنکے لیے کافی وسیع میدان مہیا ہو جائے گا -

صوبہ کی کونسل میں بعض اراکین نے جب حکومت کو اس ضروری کام کی طرف توجہ دلائی تو وزیر تعلیمات نے اس خیال سے پوری ہمدردی کا اظہار کیا اور اس سال نہ صرف حکومت کی جانب سے مصنف نور اللغات کو معقول مالی امداد دی گئی بلکہ ایک ہندوستانی اکیڈمی بنانے کی تجویز بھی حکومت کے زیر غور ہے - جسکا خاکہ مکرمی منشی دیا نرائن نگم صاحب ایڈیٹر زمانہ کی عنایت سے ہمیں بھی وصول ہوا ہے اور زمانہ کے مئی نمبر میں بھی شائع ہو گیا ہے - ناظرین الناظر کی واقفیت کے لیے یہ خاکہ درج ذیل کیا جاتا ہے

۱- نام - اکاڈمی کا نام "ہندوستانی اکاڈمی" ہوگا

۲- مقاصد - اکاڈمی ہندی اور اُردو ادب کی ترویج و ترقی میں ساعی ہوگی اور اپنے

مقاصد کو کامیاب بنانے کے لیے ذیل کے طریقے عمل میں لائے گی:—

(ا) علمی و معاشرتی، فنون لطیفہ و ادب کی اور دیگر اور بخل تصانیف پر انعام عطا کرنا۔
(ب) دوسری زبانوں سے ہندی یا اُردو ترجمہ یا تلخیص کا انتظام کرنا
(ج) انسائیکلو پیڈیا، لغت، سائنس کے علوم کی شرحیں وغیرہ تصنیف کرانا
(د) مذکورہ بالا اقسام کی ایسی تصانیف کی اشاعت کرنا جنھیں اکاڈمی قابلِ اشاعت خیال کرے۔

نوٹ: اکاڈمی اُردو یا ہندی میں حقیقی اور علمی طور پر ذریعہ تعلیم بننے کی صلاحیت واستعداد پیدا کرنے کی کوشش کرے گی، اکاڈمی اُن اصحاب کی کفیل ہو جانے کی اُمید کرتی ہے جو خدمت زبان کا حوصلہ رکھتے ہیں۔

۳۔ تنظیم۔ اکاڈمی کا انتظام حسب ذیل ۵۰ اصحاب کی ایک عام کونسل کے ماتحت ہوگا

۱۔ ہز ایکسلنسی گورنر صوبجات متحدہ، سرپرست
۲۔ وزیر تعلیم صدر
۳۔ الٰہ آباد، بنارس، علی گڑھ اور لکھنؤ یونیورسٹی کے وائس چانسلر صاحبان۔
۴۔ ڈائرکٹر سررشتۂ تعلیم صوبہ متحدہ
۵۔ صوبہ کی ہر دیار یونیورسٹیوں کا ایک ایک نمائندہ
۶۔ سکرٹری بورڈ انٹرمیڈیٹ و ہائی اسکول امتحانات
۷۔ ایک خزانچی جن کا تقرر وزیر تعلیم کریں گے۔

اور ۳۷ دیگر صاحبان جن کا تقرر ہز ایکسلنسی گورنر وزیر تعلیم کے مشورہ سے فرمائیں گے

(لائق مجوزہ ۳۷ میں سے ۴۸ اصحاب کے نام بھی یہاں لکھ دیے ہیں)

ان اصحاب کے علاوہ جو صاحب کم از کم دس ہزار روپیہ عطا فرمائیں وہ اکاڈمی کے اکس آفیشو ممبر کہلائیں گے۔

۴۔ انتظامی کمیٹی چندوں کی تحصیل اور خرچ کا انتظام کرے گی اور اکاڈمی کے عام معاملات مثلاً انعامات یا تراجم کے روپیہ کا انتظام، اشاعت وفروخت کتب کی دیکھ بھال کرے گی۔

۵ - انتظامی کمیٹی کے ۱۱ ممبران ہوں گے جس میں صدر اور عام کونسل کے سکریٹری شامل ہوں گے جو کمیٹی کے
اکس افیشو چیرمین اور سکریٹری شمار کیے جائیں گے - باقی ۹ صاحبان کے انتخاب کا اختیار
کونسل کو ہوگا -

۶- اکاڈمی کی ایک ادبی کمیٹی ہوگی جس میں پندرہ اصحاب شامل ہوں گے
(الف) صدر جسکا تقرر وزیر تعلیم کریں گے -
(ب) ۷ ممبران جنکا تقرر " "
(ج) ۶ ممبران جنکا انتخاب کونسل کریگی
(د) سکریٹری (اکس آفیشو)

کمیٹی اوریجنل تصانیف اور ترجموں کے لیے موضوع اور مضامین کا انتخاب کریگی اور اپنے فرائض
کے پورا کرنے کیلیے حسب ضرورت ذیلی کمیٹیاں مقرر کریگی -

۸- تمام عہدہ داران اور کونسل اور کمیٹی کے ممبران ۵ سال تک کے لیے مقرر ہوں گے -

۹- کونسل کا ایک تنخواہ دار سکریٹری اور ضروری اسٹاف ہوگا -

تجویز بالا میں امور ذیل بھی بعض حضرات کے مشوروں کی بنا پر شامل کرلیے گئے ہیں :-

(۱) اکاڈمی اُن حضرات کو جو عرصہ دراز سے ادب کی خدمت کررہے ہیں اور حقدار ہیں پنشن عطا
کرسکتی ہے -

(۲) اکاڈمی ایک مطبع کھول سکتی ہے یا محکمہ صنعت و حرفت کے سامنے مطابع کے نام پیش کرسکتی
ہے تاکہ اکاڈمی کے احکامات کی تعمیل ہوسکے -

(۳) اکاڈمی کتابوں کی دوکانیں کھول سکتی ہے یا اپنے مطبوعات کو مقبول عام بنانے کی تدابیر
اختیار کرسکتی ہے -

خیال ہے کہ اکاڈمی کے لیے دو لاکھ روپیہ سالانہ کی ضرورت ہوگی جس میں سے ایک لاکھ روپیہ
گورنمنٹ عطا کرے اور بقیہ ایک لاکھ سالانہ عطیوں کے ذریعہ سے فراہم کیا جائے -

---

ہمیں یہ بھی معلوم ہوا ہے کہ گذشتہ مہینہ میں بمقام نینی تال مشورہ کے بعد اس میں جزوی ترمیمات
کی گئی ہیں اور آئندہ موسم سرما میں اکیڈمی ضرور قائم کردی جائیگی - ترمیمات جو ہوئی ہیں اُن کے

بہت ارکین کی تعداد گھٹادی گئی ہے اور اکیڈمی کا صدر بھی وزیر تعلیمات کے بجائے کوئی غیر سرکاری شخص ہوگا۔ اور اگرچہ اسوقت اُسکا تقرر ممکن ہے کہ گورنمنٹ کی نامزدگی سے ہو لیکن آئندہ چل کر امید ہے کہ انتخاب کے ذریعہ سے ہوا کرے گا۔

ہندوستانی اکیڈمی اگرچہ ایک سرکاری یا نیم سرکاری شعبہ ہے لیکن ملک کے مقتدر اصحاب اگر اپنے اثر و رسوخ سے مناسب طریقہ پر کام لیں گے اور مفید مشوروں یا بروقت تدبیروں سے دریغ نہ کریں گے تو امید ہے کہ اس ذریعہ سے ملکی زبانوں کی ترقی میں کافی مدد ملیگی۔ گو ذاتی طور پر میں یہ رائے رکھتا ہوں کہ علمی و ادبی اداروں کے نشو و نما کے لیے آزادی کی آب و ہوا زیادہ مفید ہے۔

اُردو زبان کے ایک ادنیٰ خدمتگذار ہونے کی بنا پر میں اپنا فرض سمجھتا ہوں کہ اس موقع پر اُن تمام اصحاب کو جو اُردو کے نمایندوں کی حیثیت میں اس اکیڈمی میں شریک ہوں اس امر کی جانب توجہ دلاؤں کہ اسوقت تک اگر اُردو کی طرف اُنھوں نے کافی توجہ نہیں فرمائی ہے تو اب کہ خود حکومت کی بے التفاتی دفع ہوتی نظر آتی ہے۔ اُنھیں بھی اپنا فرض ادا کرنے میں پورا شغف و انہماک ظاہر کرنا چاہیے تاکہ اُردو علم ادب کی خدمت کا جو موقع اکیڈمی کے ذریعہ فراہم ہو رہا ہے وہ روایتی سہل انگاری کے بدولت رائگاں نہ جائے اور کسی کو یہ کہنے کی جرأت نہ ہو کہ

یاران تیزگام نے محمل کو جا لیا
ہم محوِ نالۂ جرسِ کارواں رہے

اکیڈمی کے ارکین کے نام جو اس خاکہ میں درج تھے کچھ تو طوالت کے خیال سے اور زیادہ تر اس بنا پر درج نہیں کیے گئے کہ ممکن ہے کہ ان میں سے بعض اصحاب کے نام خارج ہو جائیں۔ بہرحال جہاں تک کہ حامیان و خادمانِ اُردو کا تعلق ہے، تقریباً تمام ایسے اصحاب کے نام آگئے ہیں جو اُردو کے متعلق مفید مشورے دے سکتے ہیں۔ البتہ یہ فروگذاشت ضرور ہے کہ ملک کے نامور مصنف جناب مولانا عبد الحلیم شرر کا نام نامی درج ہونے سے رہ گیا ہے۔ امید ہے کہ اسکی تلافی کردی جائے گی۔ سرکاری یا نیم سرکاری محکموں کے قیام سے طرح طرح کے شکوک پیدا ہوتے ہیں۔ چنانچہ ابھی سال گذشتہ جب طب اور ویدک کے متعلق ایک کمیٹی وزیر تعلیم نے بنائی تو اُسوقت بھی کچھ اندیشے پیدا ہوے تھے جو بالآخر صحیح ثابت ہوے۔ اس تجویز کے سلسلہ میں بھی ویسے ہی خطرات محسوس ہوتے ہیں مگر اس امید میں کہ شاید اسدفعہ خیالات غلط ثابت ہوجائیں کم سے کم موجودہ منزل میں کچھ کہنا مناسب نہیں سمجھتا

ظفر الملک

نظرے خوش گذرے

چاہیے تھا کہ کلیاتِ قائمؔ چاندپوری، حسبِ وعدہ اس پرچہ کی روانگی سے قبل قدردانانِ النّاظر کی خدمت میں پہونچ جاتا، لیکن جس قلمی نسخے سے کتابت کی گئی، تصحیح کے وقت معلوم ہوا کہ بہت غلط ہے، اس لیے مناسب نہ معلوم ہوا کہ طباعت کی عجلت میں صحت کی طرف سے بے پروائی برتی جائے کوشش سے ایک اور پرانا قلمی نسخہ فراہم ہو گیا ہے' اور امید ہے کہ دونوں کے تطابق سے صحت کا کام بخوبی انجام پا سکے گا۔ مگر دیوان کی طباعت اب کئی مہینے میں جا کر ختم ہو سکے گی۔

اپریل سے جون تک کے پرچے شائع نہ ہو سکے، اس لیے جملہ خریداروں کے حساب میں تین مہینے کی میعاد بڑھا دی جائے گی تاکہ کسی کو شکایت کا موقع نہ ہو اور سال کے پورے بارہ پرچے پہونچ جائیں۔ کلیات تیار ہو جانے پر انشاء اللہ النّاظر میں اعلان کر دیا جائے گا، جو صاحب پسند کریں منگا لیں۔

میرے نوجوان رفیقِ کار عزیزی جلیل احمد صاحب جلیلؔ قدوائی اسی ماہ کے شروع میں لکھنؤ آگئے تھے اور اُس وقت سے برابر النّاظر کے کام میں مصروف ہیں' یہ پرچہ انھیں نے ترتیب دیا ہے۔ اور میری دستخطی تحریروں کے سوا جو کچھ ایڈیٹر کی جانب سے لکھا گیا ہے وہ بھی اُن ہی نے لکھا ہے۔ النّاظر کی ترتیب کے متعلق جو تجاویز عرصہ سے میرے ذہن میں تھیں، اب کہ ایک مستعد اور پورا وقت صرف کرنے والا رفیق میسر آ گیا ہے' انشاء اللہ آیندہ نمبر سے اُن پر عمل بھی شروع ہو جائیگا۔ اور امید ہے کہ چند ماہ کے اندر اندر النّاظر کی حالت اب سے بہت بہتر ہو جائے گی، بلکہ شاید اُس درجہ پر پہونچ جائے جو میرے نزدیک ایک علمی و ادبی رسالہ کے لیے ضروری ہے۔ قدردانانِ قدیم اگر اس موقع پر النّاظر کی اشاعت بڑھانے میں ایکا رہبر سعی فرمائیں تو بعید از لطف و کرم نہ ہوگا میں چاہتا ہوں کہ جو کوشش النّاظر کے بقا و استحکام کی اپنی بساط کے بموجب کر رہا ہوں میرے احباب بھی اُس میں شریک رہیں، اور یقین واثق ہے کہ جو بات تنہا میری جدوجہد سے نہیں حاصل ہو سکتی وہ احباب کی مشترکہ مساعی سے انشاء اللہ ضرور پایۂ تکمیل کو پہونچ جائے گی۔

النّاظر کو جاری ہوئے سترہ سال گذر چکے ہیں، اور جہاں تک مجھے علم ہے' اس صوبہ میں

نظر سے گزرے

"بلکہ غالباً سارے ہندوستان میں دلگداز، اردوے معلّیٰ، اور زمانہ کے علاوہ الناظر سے پہلے کا کوئی رسالہ اب موجود نہیں۔ اس لیے الناظر کی سفارش میں اور کچھ نہ کہا جائے لیکن حکیم شیرازی کے الفاظ میں کم از کم یہ تو ضرور عرض کر سکتا ہوں کہ

"قدیمان خود را بیفزائے قدر"

کرمفرمائے دیرینہ جناب قاضی غلام امیر آمیر بدایونی تحریر فرماتے ہیں: "ارشد تھانوی سے میں واقف نہیں ہوں۔ الناظر جنوری ۱۹۲۶ء میں اُنکی غزل چھپی ہے۔ غزل بلحاظ بندش الفاظ و سلاست مضامین لیٹ درجہ رکھتی ہے۔ شعر نمبر ۴

تیرے دیوانے بھی ہیں منتظر فصل بہار — ہات ڈالے ہوے بیٹھے ہیں گریبانوں میں

اپنی جگہ پر خاص تحسین کا مستحق ہے۔ لیکن حافظ جلیل حسن صاحب جلیل کی مطبوعہ غزل میں یہی مضمون اس طرح ادا کیا گیا ہے:

منتظر موسم گل کے ہیں ترے دیوانے — ہاتھ رکھے ہوے بیٹھے ہیں گریبانوں پہ

ردیف کا اختلاف ہے اور اُسکو دیکھتے ہوے ارشد نے "ہات ڈالے ہوے" جلیل نے "ہاتھ رکھے ہوے" اپنے اپنے محل پر صحیح لکھا ہے، لیکن ارشد صاحب سے پوچھیے کہ ایسی حالت میں اسے توارد کہیں گے یا اس سے بڑھکر کچھ اور کہنا چاہیے؟

ارشد صاحب مناسب سمجھیں تو وضاحت کرکے قاضی صاحب کے اندیشہ کو دفع کر دیں، اور انکی خاموشی کی بدولت ناظرینِ الناظر کو جو منافرت اُن سے پیدا ہوگئی ہے اگر کوئی امر مانع نہ ہو تو اُسکا بھی انسداد فرمائیں۔

حیدرآباد دکن اب ماشاءاللہ ایک اچھا خاصا تعلیمی مرکز بن گیا ہے۔ عثمانیہ یونیورسٹی اور اُسکے متعلقہ محکمۂ ترجمہ کے بدولت وہاں جو قابل لوگ جمع ہیں اُنکے ایک منتخب طبقے نے تقریباً ڈیڑھ سال سے ایک مجلس مذاکرہ علمیہ قائم کی ہے جسکے ماہانہ جلسوں میں کوئی ایک رکن کسی علمی مضمون پر گفتگو کرتے یا کوئی تحریر مرتب کرکے پیش کرتے ہیں۔ سال اول ۱۳۲۵ھ میں جو مضامین ان مجالس میں پڑھے گئے اُنکا مجموعہ اور مجلس کی اجمالی کیفیت ایک مجلد کی صورت میں شائع ہوئی ہے جسکے چکدار آرٹ پیپر اور نفاست صفائی و آب و تاب طباعت سے مولوی سید ہاشمی فریدآبادی معتمد مجلس کی خوش مذاقی اور نفاست نمایاں ہے۔ یہ مجموعہ عام اشاعت کیلیے نہیں تاہم جو اصحاب ذوق چاہیں، غالباً معتمد مجلس مذاکرہ دارالترجمہ حیدرآباد دکن سے منگا سکتے ہیں۔ چونکہ یہ مجموعہ محدود طبقہ تک پہونچ سکیگا اسلیے اسی پرچہ میں اُسکا ایک مضمون نقل کر دیا گیا ہے۔ اور حسب موقع انشاءاللہ بعض دیگر مضامین بھی شائع کر دیے جائینگے تاکہ عام شائقین محروم نہ رہیں۔ — ظفر الملک

مرزا رجب علی بیگ سرور مرحوم
- فسانۂ عجائب
- انشائے سرور

امیر مینائی مرحوم
- امیر اللغات
- صنم خانۂ عشق
- مراۃ الغیب
- محامد خاتم النبیین
- مینائے سخن
- مکاتیب امیر مینائی

جلال مرحوم
- سرمایۂ زبان اردو
- [illegible] دلکش
- نظم نگارین
- رسالۂ تذکیر و تانیث
- افادۂ تاریخ
- قواعد المنتخب

مرزا محمد عباس ہوش مرحوم
- فسانۂ نادر جہان
- پیاری سہیلی
- نثر سحر
- المیمون

منشی فضل حسین ثابت
- حیات دبیر
- حیات [illegible]

پنڈت رتن ناتھ سرشار
- فسانۂ آزاد ۴ جلد
- سیر کہسار
- خدائی فوجدار
- جام سرشار
- الف لیلیٰ چار جلد کامل
- کامنی
- بچھڑی ہوئی دلہن
- کرم دھم

منشی سجاد حسین مرحوم
- احمق الذین
- حاجی بغلول
- پیاری دنیا
- کایا پلٹ
- میٹھی چھری
- طرحدار لونڈی

منشی جوالا پرشاد برق
- مرنالنی ۱۲ر
- مار آستین ۱۲ر
- بنگالی دلہن ۱۲
- معشوقۂ فرنگ ۱۲ر
- بیتاب ۱۲ر
- موہنی ۱۰ر

پریم چند
- پریم پچیسی
- [illegible]

مولانا عبد الحلیم شرر
- جنید بغدادی
- خواجہ معین الدین چشتی
- تذکرہ مشاہیر عالم
- قدریات
- قیس و لبنیٰ
- مقدس نازنین
- ایام عرب
- فتح اندلس
- ماہ ملک
- حسن کا ڈاکو
- دربار حرام پور ۱۰ر
- الفانسو ۱۲ر
- مفتوح فاتح
- فلپانا
- زوال بغداد
- لعبت چین
- عزیزہ مصر
- جویائے حق
- بابک خرمی
- طاہرہ
- شوقین ملکہ
- یوسف و نجمہ
- گذشتہ لکھنؤ
- عاشقانہ مضامین
- آغاز و ختم سال
- سیر جہاں
- تاریخی جغرافی مضامین
- مینا بازار (حصہ اول)

حکیم محمد علی خان مرحوم
- رام پیاری مکمل
- عبرت کامل
- حسن [illegible] کامل
- اختر حسینہ
- دیول دیوی
- جعفر و عباسہ

شوق قدوائی مرحوم
- ترانۂ شوق
- قاسم و زہرہ
- عالم خیال
- گنجینہ
- سکندر نامہ

خواجہ عبد الرؤف عشرت
- زبان دانی
- اصلاح زبان اردو
- قواعد میر
- اصول اردو
- جان اردو
- شاعری کی پہلی کتاب
- 〃 دوسری
- 〃 تیسری
- فن عروض

منشی محمد احسن وحشی
- مجموعۂ [illegible]
- جام زہر

مولانا حکیم عبد الحی مرحوم
- یاد ایام
- تذکرہ گل رعنا

حکیم احمد حسین الہ آبادی
- تاریخ ابن خلدون جلد اول
- 〃 جلد دوم
- 〃 جلد سوم
- 〃 جلد چہارم
- 〃 جلد پنجم
- 〃 جلد ششم
- 〃 جلد ہفتم
- 〃 جلد ہشتم
- 〃 جلد نہم
- 〃 جلد دہم
- 〃 جلد یازدہم
- نور الدین محمود

مولوی محمد حلیم انصاری
- تاریخ عرب
- تمدن اسلام
- فتح اندلس
- ابو مسلم خراسانی
- ارمانوسہ

مولوی حبیب الرحمن خان شروانی
- سیرۃ الصدیق
- علمائے سلف
- تذکرۃ الشعراء

حافظ اسلم جیراجپوری
- سیرۃ الرسول
- خلافت راشدہ
- خلافت بنو امیہ
- خلافت بنو عباس
- عباسیہ بغداد
- علوم عرب

قاضی محمد سلیمان منصور پوری
- رحمۃ للعالمین
- سفر نامہ حجاز

مولوی خلیل الرحمن
- ترجمہ نفح الطیب
- تاریخ الاندلس جلد [illegible]
- تاریخ مولدین
- مختصر تاریخ اسلامی

مولوی محمد نثار احمد
- سیرۃ الرسول
- تاریخ افغانان
- حالات اقوام [illegible]
- حالات قسطنطنیہ
- تاریخ مراکش و مغرب اقصیٰ

منشی سید احمد [illegible]
- آثار اکبری
- حیات خسرو
- امرائے ہنود

ملنے کا پتہ: الناظر بک ایجنسی لکھنؤ

مولوی عزیز مرزا مرحوم
- خیالات عزیز
- ذکر مہدی

خواجہ عباد اللہ اختر
- صدیق اکبر
- حضرت زید ۶ر
- مشاہیر اسلام
- بغداد
- عشق
- دیوان حافظ مع شرح

مفتی انوار الحق ایم اے
- تاریخ ابو البشر
- تذکرۃ الحبیب
- حقائق اسلام

میر علی اسد بی اے
- بندگی
- کاس الکرام
- لسان الغیب جلد اول
- ” جلد دوم
- ” جلد سوم
- ” جلد چہارم

سید امین ... دہلوی
- شق زرین
- ...
- ...

مولانا حسرت موہانی
- شرح دیوان غالب
- کمل دیوان حسرت

سید سجاد حیدر بی اے
- خیالستان
- ثالث بالخیر ۸ر
- زہرا ۱۱ر

مسٹر مظفر عمر بی اے
- چھچھوندر کا کلب ۹ر
- نیلی چھتری
- بہرام کی گرفتاری
- مستقبل اسلام

پروفیسر فیروز الدین مراد
- تحفۂ سائنس
- بادل کے بچے
- خونابۂ عشق

حکیم احمد شجاع بی اے
- باپ کا گناہ
- حسن کی قیمت
- مینا ۱۲ر

منشی عبد المجید سالک بی اے
- ماہ و نجم ...
- چہار دیگر افسانے
- ...

منشی احمد علی بی اے
- تاریخ تمدن
- شباب لکھنؤ

مولوی عبد الماجد بی اے
- فلسفۂ جذبات
- مکالمات برکلے
- پیام امن
- تصوف اسلام
- زود پشیمان ۸ر

منشی محمد لطیف بی اے
- اکبر
- اورنگ زیب
- رنجیت سنگھ
- لارڈ کلائیو

پروفیسر نواب علی ایم اے
- معارج الدین
- تذکرۃ المصطفےٰ
- صحف سماوی
- شمع سخن ۱۰ر

پروفیسر الیاس برنی بی اے
- اسلام حق
- جذبات فطرت
- معاشیات
- مناظر قدرت
- علم الہیئت

مولوی سید سلیمان ندوی
- ارض القرآن
- حیات امام مالک
- خلافت عثمانیہ اور اسلام
- خلافت اور ہندوستان ۹ر
- خلافت اور دنیائے اسلام ۶ر

مولوی عبد السلام ندوی
- اسوۂ صحابہ ۲ جلد
- سیرۃ عمر بن عبد العزیز
- انقلاب الامم

مولوی عبد الباری ندوی
- مبادی علم انسانی
- برکلے کا فلسفہ

مولوی سعید انصاری
- سیر الصحابہ
- سیر الانصار
- سیر الصحابیات

مولوی عبد الرزاق ندوی
- اسوۂ حسنہ
- سفرنامہ جدید ۸ر
- شکی اور دیوب ۶ر

مولوی محمد یونس فرنگی محلی
- معراج الاجتماع
- اینہ شد

خواجہ حسن نظامی
- قرآن آسان قاعدہ
- میلاد نامہ
- محرم نامہ
- فاطمی دعوت اسلام
- ذکر غوث پاک ۱۲ر
- کرشن جیون
- سیپارۂ دل
- کم تو موت
- چٹکیاں اور گدگدیاں ۱۲ر
- اتالیق خطوط نویسی ۱۲ر
- خطوط حسن نظامی ۱۲ر
- بیوی کی تعلیم
- بیوی کی تربیت
- اولاد کی شادی
- جگ بیتی کہانیاں ۸ر
- آپ بیتی
- بچوں کی کہانیاں ۱۰ر
- سیر دہلی ۱۲ر
- سفرنامہ ممالک اسلامیہ
- غدر دہلی کے افسانے
- یزید نامہ
- طمانچہ بر رخسار یزید
- اردو کی دعائیں ۸ر
- تسکین احساس ۸ر
- روزنامچہ ہند ۱۲ر
- گھروں کی غیبی روشنی ۸ر
- اسلام کا انجام ۱۰ر
- انگوٹھی ...

مولوی عبد الراشد الخیری
- الزہرا ۱۲ر
- صبح زندگی
- شام زندگی
- شب زندگی
- نوحۂ زندگی ۱۲ر
- ذرشہوار ۱۰ر
- منازل السائرہ
- سراب مغرب
- بنت الوقت ۸ر
- قطرات اشک
- جوہر قدامت
- عروس کربلا
- یاسمین شام
- تیغ کمال
- ماہ عجم
- آفتاب دمشق
- سمنا کا چاند

نیاز فتحپوری
- گہوارۂ تمدن
- نگارستان
- صحابیات
- تاریخ الدولتین

یاس عظیم آبادی
- چراغ سخن
- نشتر یاس

از دفتر رسالہ جات

رجسٹرڈ نمبر ل ۲۷۰۸

ہوالمستعان

الناظر

ایڈیٹر۔ ظفر الملک علوی

الناظر پریس لکھنؤ میں باہتمام اسحاق علی علوی چھپا

قیمت سالانہ للعہ

قیمت فی پرچہ ۸ر

بسم اللہ

فہرست مضامین الناظر بابت ماہ اگست سنہ ۱۹۲۶ء

نمبر ۲ — جلد ۳۱

مطبوعاتِ جدیدہ

شعر الہند جلد دوم

(از مولانا عبد السلام ندوی)

جس میں اردو شاعری کے تمام اصناف یعنی غزل، قصیدہ، مثنوی، اور مرثیہ وغیرہ پر تاریخی و ادبی حیثیت سے تنقید کی گئی ہے۔ اب یہ کتاب مکمل ہو گئی ہے۔ جن شائقین نے پہلے نہ طلب کی ہو وہ بھی اب منگائیں۔ قیمت جلد اول للعہ، جلد دوم للعہ،

آئینۂ حقیقت نما

(از مولانا اکبر شاہ خاں نجیب آبادی)

اس لاجواب کتاب میں ہندوؤں اور مسلمانوں کے گیارہ سو سال کے تعلقات باہمی پر تاریخی واقعات کے ذریعہ روشنی ڈالی گئی ہے، اور اس بات کو بہ دلائل و شہادت نمایاں کیا گیا ہے کہ مسلمانوں نے اپنے عہد حکومت میں ہندوؤں کے ساتھ ظلم و ناانصافی کے بجائے بہت زیادہ محبت و مروت ملحوظ رکھی۔ اور اس وقت جو ہندوؤں کے دلوں میں مسلمانوں کی طرف سے بدگمانیاں نظر آتی ہیں یہ محض غلط تاریخوں کے رواج سے پیدا ہوئی ہیں۔ تاریخی غلط بیانیوں اور غلط فہمیوں کے لیے انشاء اللہ یہ کتاب بمنزلۂ تریاق ثابت ہوگی۔ قیمت جلد اول ع۲ر

حقیقتِ اسلام

نواب سر امین جنگ بہادر ایم اے صدر المہام پیشی حضور نظام نے کچھ خیالات اپنے صاحبزادوں کی رہنمائی کیلیے اس وقت قلمبند کیے تھے جبکہ وہ انگلستان میں زیر تعلیم تھے، اور انگریزی میں عرصہ ہوا چھپ گئے تھے اب اُن کا اُردو ترجمہ شائع کیا گیا ہے۔ انھوں نے موجودہ خیالات سائنس سے اسلام کی تطبیق اور اُس کی صداقت ظاہر کی ہے۔ قیمت عہ ر

فطرتِ اطفال

ایک انگریز فلسفی اور ماہر نفسیات کی کتاب "دی سائنٹفک ٹریننگ آف چلڈرن" کا اردو ترجمہ جس سے بچوں کی تعلیم و تربیت کے مسئلہ میں بہت مدد ملیگی۔ از مولوی حامد حسن قادری اڈیٹر اخبار سعید کانپور۔ قیمت ۸ ر

منیجر الناظر بک ایجنسی۔ لکھنؤ

بسم اللہ الرحمن الرحیم

الناظر

نمبر ۲ جلد ۱۳ اگست ۱۹۲۶ء

نظرے خوش گذرے

سر الیگزنڈر مڈیمن ہوم ممبر گورنمنٹ ہند نے لیجسلیٹو اسمبلی میں فرقہ وار فسادات کے متعلق جو بیان پیش کیا اُس سے ظاہر ہوا کہ گذشتہ تین سال کے اندر ان جھگڑوں کی بدولت دو سو ساٹھ جانیں تلف ہوئیں اور تین ہزار سے زائد اشخاص زخمی ہوئے۔ مالی نقصانات اور بربادیوں کا اس بیان میں کوئی ذکر نہیں ورنہ غالباً اُنکی تعداد کروڑوں روپیہ تک پہونچتی۔

اس اتلافِ جان اور بربادیِ سرمایہ سے ہندوؤں یا مسلمانوں کو کچھ فائدہ بھی ہوا؟ بظاہر شدھی اور سنگھٹن یا تبلیغ و تنظیم کے کارکنوں میں سے ایک بھی ایسا نہیں جو نفع کی کوئی صورت بتا سکے ہاں ملکی آزادی کی جد و جہد میں خلل پڑ گیا۔ سرفروشان و جان نثاران ملک و قوم کی قدر و منزلت میں فرق آگیا، وفاداران حکومت اور موالاتی رہنماؤں کی گرم بازاری ہو گئی اور دفتری اقتدار کی گرفت پھر مضبوط ہو گئی۔ اور غالباً یہی اس باہمی نزاع کا مقصود تھا۔

ارکین حکومت، اُنکے وفادار اور قومی سرداروں نے کامل تین سال تک اس خونیں تماشہ کو جاری رہنے دیا اور اب اپنی اپنی جگہ پر سب کوشاں ہیں کہ کسی طرح یہ لڑائی رک جائے۔ ان کوششوں اور کوششوں سے زیادہ اُنکے متعلق تقریروں اور اعلانوں کو سن سن کر اتلاف شدہ ہندوؤں اور مسلمانوں کی روحیں پکار پکار کر کہہ رہی ہیں کہ

کی مرے قتل کے بعد اُس نے جفا سے توبہ ہائے اُس زود پشیماں کا پشیماں ہونا

پنڈت موتی لال نہرو اور مولانا ابو الکلام آزاد کی تجویز ہے کہ ہندو مسلمانوں کی نزاع باہمی کو دفع کرنے کی جد و جہد کے لیے ایک جدید مجلس انڈین نیشنل یونین کے نام سے قائم کی جائے۔ ملک نے عموماً اس تجویز کو خوش آمدید کہا ہے۔ لیکن جنگجو سکھوں کے اُن سرداروں نے اس سے اختلاف کرنے اور جدا رہنے میں معلوم ہوتا ہے کہ باہم اتحاد کر لیا ہے، جنھیں اپنے فرقہ پسندانہ خیالات کی بنا پر آج ہر دلعزیزی عوام کا فخر حاصل ہے۔ یہ بات کچھ زیادہ غیر متوقع نہیں ہو سکتی، البتہ دیکھنا یہ ہے کہ اتحاد کی جد و جہد کرنے والے سرداروں پر تو اس کا کوئی یاس انگیز اثر نہیں پڑتا۔

افسوس ہے کہ یہ تحریک بہت دیر میں شروع کی گئی، اور اب بھی جس مستعدی کی ضرورت ہے اُسکے آثار نہیں نظر آتے۔ سوراجی احباب اسے پسند نہ کریں گے، لیکن اگر وہ اتنا ایثار گوارا کر سکیں کہ کونسل میں آیندہ داخلہ کی جد و جہد سے دست بردار ہو جائیں، تو اتحاد باہمی کی کوششوں میں کامیابی زیادہ یقینی ہو جائے گی۔

ہندو مسلمانوں کی لڑائی تو شاید اب ختم ہو جائے، مگر اندیشہ ہے کہ کہیں مسلمانوں کی باہمی خانہ جنگی اس سے زیادہ خطرناک نتائج پیدا نہ کر دے۔ گذشتہ سال محض ایک فرضی اور بے بنیاد خبر نے تو یہ حالت کر دی تھی کہ بمبئی اور لاہور میں باہم جھگڑا ہو گیا، اور لکھنؤ میں بھی اگر انتہائی احتیاط نہ کی جاتی تو پولیس کی لاٹھیوں سے خدا معلوم کتنے مسلمان زخمی اور شہید ہوتے۔ اور اب جبکہ واقعی جنۃ البقیع کے قبّے ڈھا دیے گئے ہیں اور بڑے بڑے بزرگان قوم تک نجدیوں کے خلاف اظہار رسالے کے لیے تیار رہیں، جتنا بھی جوش و خروش ظاہر کیا جائے کم ہوگا۔

جناب راجہ صاحب محمود آباد جو دسمبر ۱۹۱۸ء میں بمقام دہلی مسلم لیگ کے اُس اجتماع سے منہ چھپا کر چلے آئے تھے جس میں سب سے پہلے نہایت صفائی کے ساتھ حکومت پر ظاہر کیا گیا تھا کہ ترکی سلطنت، خلیفۃ المسلمین اور مقاماتِ مقدسہ کے بارے میں مسلمانانِ ہند کے اصلی خیالات کیا ہیں اور گذشتہ سات سال کے اندر قوم سے زائد حکومت کے دامن دولت سے وابستہ رہے، اب اپنے انگریز آقاؤں کی نیاز مندی سے فارغ ہو کر مسلمانوں کی قومی کشتی کے بیڑا ناخدا بننے کے متمنی ہیں۔ اور اس نزاع باہمی میں اُس فرقہ کے سالار قافلہ قرار پائے ہیں جو اینٹ اور گارے کی چند عمارتوں کی خاطر،

یا زیادہ صحیح یہ ہے کہ اس مُلک کے اندر اپنے رُو بہ تنزل اقتدار کو قائم و برقرار رکھنے کے لیے ہاتھ میں تلوار لیے بغیر ایک مسلمان تاجدار پر یورش کرنا چاہتا ہے۔ مہاراجہ صاحب سے اسکے سوا اور توقع ہی کیا ہو سکتی ہے، ایک دفعہ نہیں کئی بار آزمائش ہو چکی ہے اور ہر دفعہ آگ نے پیتل کو سونے سے الگ کرکے دکھا دیا۔ البتہ حیرت ہوتی ہے اُن لوگوں کی عقل و دانش پر جو "آزمودہ را آزمودن جہل است" کو نظر انداز کرتے ہیں، اور عبرت ہوتی ہے اُن لوگوں کی غیرت و حمیت پر جو بار بار ٹھوکریں کھانے کے باوجود اب تک ایک ایسے رئیس کو اپنا قبلۂ حاجات بنائے ہوئے ہیں جو خود مجبور اور پابند غیر ہے۔

مہاراجہ صاحب یا خدام الحرمین مجاہدین کو اسکی پرواہ کیوں ہونے لگی کہ اس کشمکش کا حجاز کی نجدی حکومت پر چاہے پرکاہ کے برابر اثر نہ ہو، لیکن خود ہندوستان کے اندر مسلمانوں کا خون مسلمانوں کے ہاتھوں بہنے لگے گا، اس لیے اُن سے کچھ عرض کرنا فضول ہے۔ مسلمانوں کی ساری توقعات اُن سرفروش رہنمایانِ ملت سے وابستہ ہیں جنھوں نے ان راجاؤں اور انکے پرجاؤں کے علی الرغم شیر برطانیہ کے آہنی پنجوں سے ترکی حکومت کو چھڑانے کی عظیم الشان جد و جہد کی رہنمائی کرکے تمام دنیا اسلام کو اپنا رہینِ منت بنا لیا ہے۔ امید ہے کہ وہ اس فتنہ کو ابھرنے نہ دیں گے، اور خواہ اُنھیں سلطان نجد کی ملوکیت سے کتنا شدید اختلافات ہی کیوں نہ ہو، لیکن اسکو کبھی روا نہ رکھیں گے کہ اصلاح کے طریقہ کو چھوڑ کر باہمی جنگ و جدل کا راستہ اختیار کیا جائے۔

حجاز کی موتمر اسلامی ختم ہو گئی۔ اُسکی مفصل روداد تو بعد میں شایع ہو گی، سردست اخباری اطلاعات سے جو کچھ معلوم ہوا ہے اُسکی بنا پر یہ پیشین گوئی کرنا کچھ دشوار نہیں ہے کہ جو درخت اسوقت لگایا گیا ہے وہ انشاءاللہ ایک دن بار آور ہوگا اور اپنے ثمراتِ نیک سے تمام مسلمانوں کو متمتع کرے گا۔

مخالفین، خواہ وہ یورپ کے عیسائی ہوں یا ہندوستان کے مسلمان، موتمر کی کارروائیوں کو ناقابلِ اعتماد قرار دینگے اور طرح طرح سے اُس کا مضحکہ اُڑائیں گے، لیکن خدا کی مرضی ہے تو یہ موتمر اب سے چند سال بعد، خود اپنے نتائجِ کار سے ثابت کردیگی کہ بلادِ اسلامی کے محترم مدبرین کا ہر سال یکجا ہوتے رہنا عظیم ترین فوائد کا موجب ہوا۔ ہندوستان کے جملہ محترم نمایندے، علی الخصوص علی برادران سزاوار صد تبریک و تحسین ہیں کہ اُنھوں نے مسلمانوں کی اس پہلی بین المللی مجلس کو ہر طریقہ پر کامیاب بنانے میں اپنے دل و دماغ کی اعلیٰ ترین قوتوں کو نہایت خوبی و خوش اسلوبی سے صرف کیا۔

فتبارک اللہ احسن الخالقین۔

ہندوستانی اکیڈمی کے بارہ میں یہ بھی اطلاع ملی ہے کہ اُسکی ادبی کمیٹی دو حصوں میں منقسم ہوگی جن میں سے ایک اُردو سے متعلق ہوگی اور دوسری ہندی سے۔ ہندو مسلمانوں کے موجودہ ناخوشگوار تعلقات اور ہندی اُردو کے قدیم قضیہ کے لحاظ سے یہ تقسیم بہت ضروری تھی۔ اور اگر اسکے ساتھ ہی یہ امر بھی ابتداہی میں طے پاجاتا کہ سوائے اُن رقوم کے جو مخصوص معطیوں سے کسی مخصوص غرض کے لیے وصول ہوں یا اکیڈمی کی مشترکہ تنظیم کے لیے درکار ہوں اکیڈمی کا عام فنڈ دونوں شعبوں پر کس نسبت سے صرف کیا جائیگا تو غالباً تصادم و اختلاف کا ایک بہت بڑا سبب دفع ہو سکتا ہے۔

اکیڈمی کی صدارت کے لیے سر تیج بہادر سپرو کا نام جو تجویز ہوا ہے، یہ ہر نہج سے موزوں کہا جا سکتا ہے۔ ملک میں ایسے ممتاز ہندو مسلمان کم رہ گئے ہیں جن کی ناطرفداری پر دونوں فریق اعتماد کر سکتے ہوں اور اس صوبہ میں جو چند بزرگ ایسے ہیں اُن میں سپرو صاحب بلحاظ علمی قابلیت و ادبی ذوق کے ممتاز ہیں۔

وہ نالۂ بلبل کو سمجھے مرا افسانہ — گلگشت میں چال اُنکی کچھ اور ہے مستانہ
ہے دوست کی یاری میں غیروں سے بھی یارانہ — کیا ناز اُٹھایا ہے اے ہمت مردانہ
کیا شیشے میں کیا مینا کیا جام میں کیا ساغر — میخانہ سجا ساقی یا ہے یہ پریخانہ
مجھ سے نہ سنا اک دن روداد کے مرتے لب — غیروں سے وہ کہتے ہیں آپ ہی مرا افسانہ
کچھ سوز محبت ہے کچھ حسن کا ساز اس میں — دل شمع سا روشن ہے ارمان ہے پروانہ
باتوں ہی میں ساقی کی سرشار ہے کل محفل — ہر بات ہے اک مینا ہر لفظ ہے پیمانہ
دشمن ہے کسی صورت سے مل جائے وہ ہرجائی — ہے اسکی تمنا میں ہر ایک سے یارانہ
رہ رہ کے مرا اُٹھنا جھک جھک کے ملیں آنکھیں — شرمیلی نگاہوں میں تھی لغزش مستانہ
اللہ کی یاد آتی رہتی تو کہاں رہتی — دل جو تھا خدا کا گھر اک بت کا ہے کاشانہ
ہیں لیکے دل تشنہ میخانے میں آیا ہوں — اے ساقی دریادل بھر دے مرا پیمانہ
اچھا نہ سنو صاحب میں بھی نہ کہونگا کچھ — اب میری خموشی سے سننا مرا افسانہ
ہے حسن پرستی ہی کام اپنا سدا یارب — دل تو نے دیا مجھکو یا عشق کا پروانہ
کس جی سے دعا مانگوں ارمان نکل جائیں — دل کا ساگھر اگر تو ہو جائیگا ویرانہ

غیروں کو جو رحم آیا کچھ ذکر کیا میرا
کس ناز سے وہ بولے کون آہ! وہ دیوانہ

آہ

منطقِ شہادت[1]

ذیل کا مضمون نامکمل حالت میں رسالۂ "صبح" آگرہ میں چھپ چکا ہے، لیکن اب پروفیسر صاحب نے تکمیل و نظرثانی کرکے النّاظر میں اشاعت کی غرض سے عنایت فرمایا ہے۔ جو شکریہ کے ساتھ درج کیا جاتا ہے۔

سب ایڈیٹر

سر ولیم ہیملٹن نے معلوماتِ انسانی کو، وسائلِ علم کی بنا پر، دو قسموں میں تقسیم کیا ہے۔ پہلی صورت تو وہ ہوتی ہے، جہاں ہم اپنی معلومات کے لیے اپنے حواس، یہ ظاہری ہوں یا باطنی، کے دست نگر ہوتے ہیں۔ دوسرے الفاظ میں ہماری یہ تمام معلومات احضاراتِ حواس کا نتیجہ، اور ان سے ماخوذ ہوتی ہیں۔ ادراکات اس قسم کی معلومات کی بہترین مثالیں ہیں۔ اگر میرے سامنے میز پر کتاب رکھی ہوئی ہو، تو اسکا علم مجھکو صرف اس طرح ہو سکتا ہے کہ میں اپنی آنکھ کھول کر اسکی طرف دیکھوں۔ یہ بھی ممکن ہے کہ میں اس کتاب کی تصویر، آنکھ بند کرکے، اپنے ذہن میں قائم کر لوں۔ لیکن کتاب کا یہ علم بھی اسکے ادراک پر موقوف ہے، کیونکہ تصویر گویا کسی اصل کی نقل ہوتی ہے، جب اصل ہی موجود نہ ہو، تو نقل، ظاہر ہے کہ غیر موجود ہوگی، اور یہ اصل ادراک کا نتیجہ ہوتی ہے۔ اسی طرح یہ بھی ہو سکتا ہے، کہ حافظہ کی مدد سے اس کتاب کے مضمون کو یاد کرنے کی کوشش کروں۔ اس صورت میں بھی ہم ادراک کو نظرانداز نہیں کر سکتے، کیونکہ حافظہ گویا ایک خزانہ ہے، جس میں ہمارے گذشتہ تجربات محفوظ رہتے ہیں، اور بوقت ضرورت کام میں لائے جا سکتے ہیں۔ جب گذشتہ تجربات ہی نہ ہونگے، تو خزانہ یقیناً خالی رہیگا۔ یہ گذشتہ تجربات ہمارے ادراکات ہیں۔ ایک اور صورت یہ بھی ہو سکتی ہے، کہ میں کتاب کا تصور قائم کرنے کی کوشش کروں۔ چونکہ اسکے لیے مجھکو بہت سی کتابوں کا آپس میں مقابلہ کرنا پڑتا ہے، لہذا یہاں بھی میں ادراک سے بے نیاز نہیں ہو سکتا۔ مختصر یہ کہ کتاب کے علم کی یہ تمام صورتیں، بالواسطہ یا بلاواسطہ فعلیتِ حواس پر موقوف ہیں۔ اسی حقیقت کو اس طرح بھی بیان کیا جا سکتا ہے، کہ یہ علم تجربے کا نتیجہ ہے۔ بغیر تجربے کے یہ تمام علم ناممکن الحصول اور عدم محض ہوتا۔ یہی وجہ ہے، کہ اس قسم کے علم کو "تجربی"، "شہودی"، یا "تجربے کا" علم کہا جاتا ہے۔

---

[1] اس مضمون کا اکثر حصہ سر ولیم ہیملٹن کے لکچرز جلد چہارم سے ماخوذ ہے۔

لیکن ہمارا تمام علم تجربے تک محدود نہیں ہوتا۔ بعض معلومات ایسی بھی ہوتی ہیں، جو حواس کی فعلیت کا نتیجہ نہیں ہوتیں، بلکہ برخلاف اسکے وہ ہمارے ساتھ پیدا ہوتی ہیں۔ یہ صحیح ہے، کہ ان کے وجود کا علم ہمکو تجربے کے وقت ہوتا ہے، لیکن یہ نہیں کہا جا سکتا کہ وہ تجربے کا نتیجہ ہوتی ہیں۔ تمام قوانین فطرت علم کی اسی قسم سے تعلق رکھتے ہیں۔ ایک بچہ، جو اپنے ہاتھ کی حرکات پر پوری طرح متصرف ہو، اپنی ناک پر کی مکھی کو اُڑانے کے لیے اپنا ہاتھ ہلاتا ہے۔ کیوں؟ صرف اس وجہ سے کہ مکھی کے بیٹھنے سے اُسکو ایک خاص قسم کا احساس حاصل ہوتا ہے۔ اب اُسکو خیال آتا ہے، کہ اس احساس کی کوئی نہ کوئی علت ہوگی، اور یہ کہ یہ احساس اُسوقت تک رفع نہیں ہو سکتا، جب تک کہ وہ علت دُور نہ ہو جائے۔ اسی غایت کو حاصل کرنے کے لیے وہ ہاتھ ہلاتا ہے۔ بعینہ یہی منشا ہے قانونِ علت و معلول کا اس قانون کا علم تجربے کے موقع پر ہوا، لیکن یہ تجربے کا نتیجہ نہیں۔ اس قسم کے علم کو خالص، ذہنی، عقلی، یا حضوری کہتے ہیں، اور یہ علم کی دوسری قسم ہے۔ علم کی ان دونوں قسموں کی خصوصیات امتیازی یہ ہیں، کہ تجربے سے ہم کو کلیات کا علم نہیں ہو سکتا۔ یہاں ہمارا معلوم لازمی طور پر کوئی نہ کوئی فرد ہوتا ہے۔ دوسرے الفاظ میں ہمارا علم واجبات کے درجے تک نہیں پہونچتا۔ برخلاف اسکے علم حضوری سے ہم کلیات تک پہونچ سکتے ہیں۔

گذشتہ تمام بحث میں ہمنے اپنے علم کے وسائل و ذرائع کو دو حصوں میں تقسیم کیا ہے، اول تجربہ اور دوم عقل۔ اب تجربہ پھر دو قسموں پر منقسم ہو جاتا ہے۔ ایک صورت تو یہ ہو کہ یہ خود میرا اپنا ذاتی تجربہ ہو، مثلاً یہ کہ میں خود اپنی آنکھ سے کتاب کو میز پر رکھا ہوا دیکھوں۔ دوسری صورت یہ ہے، کہ یہ کسی اور کا تجربہ ہو، یعنی یہ کہ کوئی اور شخص مجھ سے آکر بیان کرے، کہ اُسنے وہ کتاب میز پر دیکھی تھی۔ ان میں سے صورت اول کو "ذاتی تجربہ" اور حالتِ دوم کو "غیر کا تجربہ" کہا جا سکتا ہے۔ یہ صحیح ہے، کہ تجربے کی ان دونوں قسموں سے ہم کو کتاب کا علم ہو سکتا ہے، لیکن یہ ظاہر ہے، کہ جس قدر اعتماد اور وثوق مجھ کو اپنے ذاتی تجربے پر ہوتا ہے وہ غیر کے تجربے پر نہیں ہوتا۔ اگر ہم خود اپنی آنکھوں سے کتاب کو میز پر رکھا ہوا دیکھتے ہیں، تو ہم اس علم میں شبہ نہیں کرتے، حالانکہ بعض اوقات ہماری نگاہ ہم کو دھوکا بھی دیا کرتی ہے، لیکن اگر کوئی اور شخص آکر بیان کرے، کہ اُس نے وہ کتاب دیکھی تھی تو ہمکو شبہ ہوتا ہے، کہ کہیں وہ جھوٹ نہ بول رہا ہو۔ دوسرے الفاظ میں ہمارا ذاتی تجربہ، غیر کے تجربے کے مقابلے میں، زیادہ واضح، زیادہ صاف اور زیادہ مکمل ہوتا ہے۔ اسی طرح اس میں صداقت، یقین اور صحت کا بہت غلبہ ہوتا ہے۔ لیکن غیر کا تجربہ ذاتی تجربہ پر اس لحاظ سے فوقیت رکھتا ہے،

کہ اس میں جامعیت زیادہ ہوتی ہے، اور یہ کہ اسکے بغیر انسان اکثر ایسی معلومات سے بے بہرہ رہجاتا ہے جو اُسکے لیے بہت اہم اور ضروری ہیں۔ اسکا مطلب یہ ہے، کہ کسی چیز کے متعلق تجربی واقفیت حاصل کرنے میں ذاتی تجربہ اور غیر کا تجربہ، دونوں اپنی اپنی جگہ اہم اور فائق ہیں۔ ہم ان میں سے کسی ایک کو ترک کرکے دوسرے کو اختیار نہیں کرسکتے، اور اگر کرتے ہیں، تو صحت، صداقت اور جامعیت و افادیت کو قربان کرکے۔

ہمارا ذاتی تجربہ لازماً منحصر ہوا کرتا ہے، ہمارے ذاتی آلاتِ حس کے تہیج پر۔ اگر ان آلات میں کسی قسم کا تہیج نہ ہو، تو ہم کو کسی قسم کا ذاتی تجربہ نہیں ہوسکتا۔ دوسرے الفاظ میں اگر بچہ پیدائش ہی کے وقت سے بالکلیہ فاقد الحس ہے، تو ظاہر ہے کہ اسکی حالت کیا ہوگی۔ اُسکو کسی طرح کا کوئی تجربہ نہ ہوگا، اور اسکا لازمی نتیجہ یہ نکلے گا کہ اسکی عمر اس دنیا میں بہت تھوڑی ہوگی۔ وجہ اسکی یہ ہے کہ یہی آلاتِ حس ہیں جن کے ذریعے سے ہم مفید و مضر میں تمیز کرتے ہیں۔ ہمارے یہ آلاتِ حس بالعموم دو قسموں میں تقسیم ہوتے ہیں۔ ایک قسم وہ ہے، جن کے تہیج کے لیے ضروری ہوتا ہے، کہ مہیج انکے مقارن ہو۔ یعنی یہ کہ جب تک مہیج انکے ساتھ مس نہیں کرتا، اُسوقت تک ان میں کسی قسم کا تہیج پیدا نہیں ہوتا، اور اس لیے انکے ذریعہ کسی قسم کا علم حاصل نہیں ہوتا۔ زبان اور جلد اس قسم کے آلاتِ حس کی مثالیں ہیں۔ کسی چیز کا ذائقہ ہم کو اُسوقت تک معلوم نہیں ہوسکتا، جب تک ہم اُسکو زبان پر نہ رکھیں۔ اسی طرح کسی چیز کی سختی و نرمی، ہمواری و ناہمواری، گرمی یا سردی کا علم اُسوقت تک ناممکن ہے جبتک کہ وہ ہماری جلد کے ساتھ مس نہ کرے۔ اس قسم کے آلاتِ حس کو مقارنہ کہا جاتا ہے۔ انکے مقابلے میں بعض آلاتِ حس ہوتے ہیں، کہ اُنکے تہیج کے لیے ضروری نہیں ہوتا، کہ مہیج انکو مس کرے۔ وہ دور ہی سے اسکے اثر کو قبول کرلیتے ہیں، اور اس اثر پذیری کی وجہ سے ان میں تہیج شروع ہوجاتا ہے۔ آنکھ، ناک، اور کان آلاتِ حس کی اس قسم میں داخل ہیں۔ کسی چیز کو دیکھنے کے لیے یہ لازمی نہیں ہوتا کہ وہ چیز ہماری آنکھوں کے ساتھ مس کرے۔ ایسی حالت میں ہم اُس چیز کو مطلقاً نہیں دیکھتے۔ اسی طرح ہم ایک میل کے فاصلہ پر بیٹھ کر آواز سن سکتے ہیں، اور بو سونگھ سکتے ہیں، اس دوسری قسم کو آلاتِ بعیدہ کہتے ہیں۔

ہم نے ابھی کہا ہے کہ ذاتی تجربہ کے لیے آلاتِ حس کا تہیج لازمی ہے، اور یہ کہ یہ آلات دو قسم کے ہوتے ہیں، مقارنہ اور بعیدہ۔ اب ذرا غور و فکر سے معلوم ہوسکتا ہے، کہ مقارنہ آلاتِ حس کا دائرۂ عمل اس قدر محدود

ہے، کہ وہ بلحاظ ذرائع علم کے تقریباً بیکار رہیں۔ اس سے انکار نہیں کہ انکے ذریعہ سے علم حاصل ہوتا اور ہو سکتا ہے، لیکن اس علم کی کمیت و مقدار یقیناً بہت تھوڑی ہو گی۔ اگر ہر چیز کے متعلق معلومات حاصل کرنے کے لیے یہ ضروری ہو، کہ اس کو آلاتِ حس سے متعمل کیا جائے، تو عمر بھر میں معدودے چند معلومات ہی حاصل ہوں۔ انکے مقابلہ میں آلاتِ ابعدہ کا دائرۂ عمل وا تو وسیع ہے، لیکن یہ بھی اتنا وسیع نہیں کہ انکے ذریعہ سے ہر قسم کی اور تمام معلومات حاصل ہو جائیں۔ آنکھ، ناک، اور کان دُور کی اشیاء سے متہیج ہو سکتے ہیں۔ لیکن اگر مہیج بہت زیادہ فاصلہ پر ہو تو یہ ذرائع بھی بیکار ثابت ہوتے ہیں۔ ہم یہاں بیٹھ کر علیگڈھ کی جوبلی کی رونق کو نہ دیکھ سکتے ہیں اور نہ وہاں کی تقریروں کو سُن سکتے ہیں۔ گویا اُسکے متعلق ہم کو کسی قسم کا ذاتی تجربہ نہیں ہو سکتا۔

پھر اسکے ساتھ اسکو بھی شامل کیجیے، کہ ہمارے آلاتِ حس کی فعلیت صرف زمانہ حال تک محدود ہوتی ہے۔ ماضی و مستقبل انکے دسترس سے باہر ہوتے ہیں۔ یعنی یہ کہ گذشتہ و آیندہ واقعات کا بھی ہم کو ذاتی تجربہ نہیں ہو سکتا۔ اس میں کلام نہیں کہ ماضی کے واقعات بعض اس قسم کے ہوتے ہیں جن کا اگر ہم چاہیں تو اعادہ کر سکتے ہیں اور اس طرح اُنکو ذاتی تجربہ میں لا سکتے ہیں۔ لیکن ان واقعات کا اکثر و بیشتر حصہ ایسا ہوتا ہے جس کا کسی ممکن طریقہ سے اعادہ و تجربہ نہیں ہو سکتا۔ ہم اپنے ذاتی تجربہ سے اس بات کی تصدیق کر سکتے ہیں، کہ پانی دو مختلف گیسوں کے اجتماع سے بنتا ہے، لیکن ہیلی کے دُمدار ستارے کو بچشم خود دیکھنا کس طرح ممکن ہے؟ تمام گذشتہ واقعات کا اعادہ ممکن بھی ہو، تب بھی انکی تصدیق کہ انکو دوہرانے کا مطلب یہ ہے کہ علم کی ترقی بالکل رُک جائے۔

آلاتِ حس یا دوسرے الفاظ میں ذاتی تجربہ کے ذرائع کے ان نقائص کو بالکلیہ رفع کرنا ممکن نہیں اسمیں شک نہیں کہ جدید اختراعات کے طفیل میں ہم ہزاروں میل پر بیٹھکر کسی مغنی کا گانا سن سکتے اور اسکی شکل وغیرہ دیکھ سکتے ہیں لیکن اول تو اسکے لیے اس قدر بیش قیمت آلات کی ضرورت ہوتی ہے، جو ہر شخص مہیا نہیں کر سکتا، اور پھر یہ کہ ان تمام اختراعات و ایجادات کے باوصف اکثر باتیں ایسی رہ ہی جاتی ہیں جن کا ہمکو ذاتی تجربہ نہیں ہو سکتا۔ اگر ہم یہ فرض بھی کر لیں، کہ ان نقائص کا بالکلیہ رفع کیا جانا ممکن ہے، تب بھی دنیا میں قابل تحقیق باتیں اس قدر ہیں، کہ ان میں سے ہر ایک کے ذاتی تجربہ کے لیے عمر نوح بھی کفایت نہ کریگی۔ معمولی بات ہے کہ اگر کوئی شخص تمام دنیا کے متعلق بذاتِ خود واقفیت حاصل کرنی چاہے، تو اُسکو کس قدر وقت درکار ہوگا۔ محض سیر و سیاحت کے علاوہ بہت سی چیزیں اور باتیں ایسی ہونگی جنکی طرف علیحدہ علیحدہ توجہ درکار ہوگی۔ اسی طرح اگر ہر چیز کا بذاتِ خود معائنہ کیا جائے، اور اس کی تحقیق

کی جائے، تو اندازہ کیا جا سکتا ہے، کہ کس قدر وقت صرف ہوگا - لیکن اس سے ہر شخص واقف ہے، کہ ہماری حیاتِ مستعار اس قدر قلیل المدت ہے، کہ یہ تمام باتیں حاصل ہونا ناممکن محض ہے - اسکی مصروفیتیں اس قدر بکثرت ہیں، کہ اس قسم کی تمنا کرنا ہی حماقت کی نشانی ہے -

ان تمام باتوں کے علاوہ یہ امر بھی قابل لحاظ ہے، کہ معلوماتِ انسانی مختلف شعبوں، جنکو عرف عام میں علوم کہتے ہیں، کی حدود اس قدر وسیع ہیں، کہ کوئی شخص تن تنہا ان کو قطع نہیں کرسکتا - اُسکو یار و مددگار کی ضرورت ہوتی ہے - ہر علم کی تمام باتوں کو وہ کسی طریقہ سے بھی اپنے ذاتی تجربہ میں نہیں لا سکتا - اسکو اکثر مقدمات فرض کرنا پڑتے ہیں - انکی صداقت کا وہ اور علوم کو ضامن ٹھہراتا ہے - بعض نتائج وہ اس قسم کے چھوڑ جاتا ہے کہ اُنکی تصدیق یا تردید متاخرین کو کرنا پڑتی ہے -

اس تمام تقریر کا ماحصل یہ ہے، کہ افزائش و ترقیِ علم اُسوقت تک خواب و خیال ہے، جب تک کہ ہم اپنے ذاتی تجربہ کے ساتھ غیر کے تجربے کو بھی شامل نہ کریں - جو چیزیں کہ ہمارے آلاتِ حس کے دائرۂ عمل سے خارج ہیں اُنکے متعلق اوروں سے استفسار کریں، اُنکے بیانات پر اعتبار کریں اپنی حیات مستعار کی قلت مدت کو ملحوظ رکھکر اوروں کو اپنا شریک کار بنائیں اور انکی معلومات سے استفادہ کریں - جن گذشتہ چیزوں اور باتوں کا ہم کو ذاتی تجربہ نہیں ہوسکتا، یا جن کا اعادہ ناممکن ہے انکے متعلق متقدمین کی تحریروں کو دلیل راہ بنائیں مختصر یہ کہ ذاتی تجربہ کے نقائص کو غیر کے تجربہ سے رفع کریں، اور غیر ہی کے تجربہ سے اپنے تجربہ کی قلت کی تلافی کریں - یہی مطلب تھا ہمارے اس فقرہ کا کہ غیر کے تجربہ کے مقابلہ میں ذاتی تجربہ میں جامعیت ہوتی ہے، اور یہ جامعیت اس طرح پیدا ہوتی ہے، کہ ہم اپنے ذاتی تجربہ سے اوروں کو مطلع کریں، اور اسی طرح اور لوگ اپنے اپنے ذاتی تجربہ سے ہمکو آگاہ کریں - اسکا مطلب یہ ہے، کہ اگر ہمارے پاس اطلاع دہی کے ذرائع نہیں، اگر ہم اوروں کو اپنے تجربہ سے مطلع کرنے کے قابل نہ ہوں، اگر ہم سب ملکر معلومات فراہم نہ کریں، تو ہمارا علم ترقی ۲
نہیں کر سکتا، نہ اُس میں کسی زیادتی کی اُمید کی جاسکتی ہے - لیکن خوش قسمتی سے ہم میں یہ قابلیت اطلاع دہی بحد وافر موجود ہے - یہی وجہ ہے کہ ہم اوروں کے تجربہ سے استفادہ کرسکتے ہیں، اور ہمارے تجربہ سے یہ استفادہ اُن بیانات کے ذریعہ سے ہوتا ہے، جو ہم اپنے ذاتی تجربہ کے متعلق دیتے ہیں - ان ہی بیانات کو وسیع معنوں میں شہادت کہا جاتا ہے - ایک شخص اگر علیگڈھ جوبلی کے حالات بیان کرتا ہے، یعنی اُن تمام باتوں کا ذکر کرتا ہے، جو اُسنے وہاں دیکھیں یا سنیں، دوسرے الفاظ میں وہ اپنے ذاتی تجربہ کے متعلق بیانات دیتا ہے، اور اُنکے ذریعہ سے ہمکو وہاں کے حالات سے مطلع کرتا ہے -

وسیع معنوں میں اسے شہادت کہا جائیگا، اور بیان دینے والے کو شاہد۔
لیکن محدود معنوں میں شہادت ایسے بیان کو کہتے ہیں، جس سے ہم کچھ منتج کر سکیں۔ اس استنتاج کے لیے ہم کو اُس بیان کو صحیح تسلیم کرنا پڑتا ہے۔ ہمارا یہ استنتاج بہت سی شکلیں اختیار کر سکتا ہے، یعنی یہ سادہ بھی ہو سکتا ہے اور ملتف بھی، یقینی بھی اور فرضی بھی۔ یہ کسی قسم کا ہو بیان اسکو مبنی کیا جاتا ہے، وہ سننے والے کے نزدیک شہادت ہی ہوگا۔ میرا ایک دوست میرے پاس آکر کہتا ہے کہ اُسنے زید کو بازار میں دیکھا ہے۔ میرے نزدیک یہ شہادت ہے اس امر کی کہ زید واقعی اس شہر میں موجود تھا۔ ممکن ہے بعد میں یہ ثابت ہو، کہ میرے دوست نے شناخت کرنے میں غلطی کی، اور یہ کہ جس شخص کو اُس نے دیکھا تھا، وہ زید نہ تھا۔ لیکن اس حالت میں بھی اس بیان کو شہادت ہی کہیں گے۔ اسی بیان سے میں اور نتائج بھی اخذ کر سکتا تھا۔ مثلاً یہ کہ زید کی بیماری کی خبر غلط ہے، کیونکہ اگر وہ بیمار رہتا، تو بازار میں دکھائی نہ دیتا، یا یہ کہ اُس نے اپنا مجوزہ سفر ملتوی کر دیا۔ اسی طرح اخبار میں ایک خبر دیکھتا ہوں کہ موتمر اسلامی میں مولانا محمد علی نے "اپنی مخصوص عربی میں تقریر کی" یہ بیان شہادت ہے اس بات کی کہ مولانائے موصوف اسوقت حجاز میں ہیں۔ ہو سکتا ہے، کہ میرا یہ نتیجہ غلط ہو، اور مولانائے محترم وہاں مقیم نہ ہوں، بلکہ انگریزوں کی ولایت جاتے ہوئے راستہ میں ٹھہر کر وہاں تقریر کی ہو اور آگے بڑھ گئے ہوں۔ لیکن اس غلط استنتاج سے اس بیان کے شہادت ہونے میں کوئی فرق نہیں پڑتا۔ بعض اوقات ایک ہی واقعہ کے متعلق بہت سی شہادتیں ہوتی ہیں۔ ایسی حالت میں ہم ان تمام شہادتوں کا آپس میں مقابلہ کرتے ہیں، اور پھر اس کی صحت کو معلوم کرتے ہیں۔

بعینہ یہی کیفیت ہمارے ذاتی تجربہ کی ہوتی ہے۔ لیکن یہاں ہم یہ فرض نہیں کرتے کہ ہمارا بیان صحیح ہے، البتہ یہ کہ ہمارا مشاہدہ غلطی سے بری ہے، اور یہ کہ حواس سے صحیح صحیح واقفیت حاصل ہو سکتی ہے۔ یہ ممکن ہے کہ ہمارا مشاہدہ بعد میں غلط ثابت ہو۔ یہی علم جو ہم کو اپنے حواس سے حاصل ہوتا ہے، اوروں کے لیے شہادت کا کام دیتا ہے، یا اسی بات کے متعلق ہم اوروں کی شہادت کو شامل کر کے نتائج اخذ کرتے ہیں۔ میں ایک شخص کو پہاڑ کے دامن میں بیہوش پڑا دیکھتا ہوں۔ اس سے میں اس نتیجہ پر پہونچتا ہوں کہ وہ اوپر سے گر پڑا ہے۔ یہ بیان میرے لیے شہادت ہے، کیونکہ اسی پر میرا نتیجہ مبنی ہے۔ جب میں اُسکا ذکر اوروں سے کرتا ہوں، تو میرا بیان اوروں کے لیے شہادت بنجاتا ہے۔ اسکے ساتھ یہ ضروری ہے، کہ سننے والے مجھ کو معتبر سمجھتے ہوں۔ پھر وہ بھی میری اس شہادت سے نتائج

اخذ کرسکتے ہیں۔ ایک ڈاکٹر کسی جاں بلب مریض کو دیکھنے آتا ہے، وہ اس مریض کی حالت کو خود دیکھتا ہے، اور دوسروں کے بیانات سنتا ہے۔ اب وہ ڈاکٹر خود اپنے مشاہدہ اور اوروں کے بیانات پر اپنے نتائج کو مبنی کرتا ہے۔ اُسکا اپنا مشاہدہ اور اَوروں کے بیانات اسکے شہادات ہیں۔

یہ ظاہر ہے کہ شہادت کی ضرورت ہم کو بالعموم اُسوقت پڑتی ہے، جب وہ بات جو اُس میں بیان کی گئی ہے، خود ہمارے مشاہدہ میں آئی ہو یا نہ آسکتی ہو، اگر ہم خود علیگڈھ کی جوبلی میں شریک ہوے ہیں، تو ہم اوروں سے اسکے حالات سننے کے خواہشمند نہ ہونگے۔ اس سے یہ ظاہر ہے، کہ ہمارے استدلالات دوسروں کے مشاہدات پر نہ مبنی ہوتے ہیں، اور نہ ہونے چاہییں، کیونکہ انکی صداقت کا ثبوت ہر شخص دے سکتا ہے۔ اسکا مطلب یہ ہے، کہ شہادت ہمیشہ تجربات ہی کے متعلق ہوتی ہے، شرط صرف یہ ہے، کہ یہ ذاتی تجربات کی حدود سے خارج ہوں۔ اس لحاظ سے اب ہم شہادت کی محدود ترین معنوں میں اس طرح تعریف کرسکتے ہیں، کہ یہ کسی تجربہ کی اطلاع دہی ہے۔ اسی کو دوسرے الفاظ میں اس طرح بھی بیان کیا جا سکتا ہے، کہ شہادت مشاہدہ کیے گئے مظہر کی وہ اطلاع ہے، جو اُن لوگوں کو دی جاتی ہے، جن کے ذاتی تجربے اس مظہر کو معلوم نہ کرسکتے تھے۔ جس مظہر یا بات کے متعلق شہادت دی جائے اُسکو اصطلاحاً واقعہ کہتے ہیں، اور شہادت کی صحت کو تاریخی یقینیت۔

شہادت دو قسم کی ہوتی ہے، بلا واسطہ اور بالواسطہ۔ بلا واسطہ اسکو اُسوقت کہا جاتا ہے، جب اس واقعہ کا، جس کے متعلق شہادت جا رہی ہے، خود شاہد نے مشاہدہ کیا ہو۔ بالواسطہ اُس حالت میں ہوتی ہے، جب وہ واقعہ جس کو شاہد بیان کر رہا ہے، خود اُسکے اپنے مشاہدہ میں نہ آیا ہو، بلکہ اوروں کی شہادت پر اُسنے اسکو تسلیم کیا ہو، مثلاً میں خود علیگڈھ جوبلی میں شریک ہوں، اور وہاں سے واپس آکر میں خود اپنے مشاہدات بیان کروں۔ میرے یہ تمام بیانات بلا واسطہ شہادت میں شمار ہونگے۔ لیکن اگر میں خود وہاں کی تقاریب میں حصہ نہ لوں، بلکہ کسی اور کی کہی سُنی بیان کروں تو یہ شہادت بالواسطہ ہوگی۔ بلا واسطہ شہادت کو عینی اور بالواسطہ کو اُذنی بھی کہتے ہیں۔ یہ ظاہر ہے کہ عینی شہادت ہمیشہ اُذنی شہادت پر فائق ہوتی ہے۔ عینی شہادت میں یقین کا درجہ اُذنی شہادت کے مقابلہ میں بڑا ہوتا ہے۔ لیکن یہ یاد رکھنا چاہیے، کہ ہم ہر موقعہ پر بلا واسطہ شہادت کو عینی اور بالواسطہ کو اُذنی نہیں کہہ سکتے۔ بالواسطہ شہادت میں، جس شخص کی شہادت پر ہم ایک واقعہ بیان کرتے ہیں، اُسکو ضامن کہتے ہیں۔ مثلاً علیگڈھ جوبلی سے واپس آکر میں وہاں کے حالات زید سے بیان کرتا ہوں، اور زید عمر سے۔ اب زید کی یہ شہادت بالواسطہ ہوگی، اور میں،

جسکی شہادت پر اُسنے یہ تمام واقعات عمر سے بیان کیے ہیں، ضامن ہوں - اب ضامن خود بلاواسطہ یا بالواسطہ شاہد ہو سکتا ہے - چنانچہ ہو سکتا ہے کہ عمر زید کی زبانی واقعات جوبلی سُن کر خالد سے بیان کرے - اس صورت میں زید ضامن ہوگا، اور اُسکی شہادت ظاہر ہے کہ بالواسطہ ہے بلاواسطہ نہیں' کیونکہ وہ خود جوبلی میں شریک نہ ہوا تھا، بلکہ مجھ سے سُن کر اُسنے تمام باتیں بیان کی ہیں، ضامن اگر بالواسطہ شاہد ہو، تو شاہد متوسطہ، یا منقول عنہ کہلاتا ہے - پھر بلاواسطہ اور بالواسطہ دونوں قسم کی شہادتیں جزئی ہوتی ہیں، مکمل اور مناسب ہوتی ہیں، یا ناقص - شہادت کی ان قسموں کی تشریح ضروری نہیں - پھر مستقیم ہوتی ہیں، یا غیر مستقیم - مستقیم یہ اُسوقت ہوتی ہیں، جب اُن سے سوائے واقعہ کی اطلاع دہی کے اور کچھ مقصود نہ ہو، مثلاً علیگڈھ جوبلی کے حالات صرف اس لیے بیان کیے جائیں، کہ لوگوں کو اُن سے واقفیت ہو جائے - غیر مستقیم انکو اُس حالت میں کہتے ہیں، جب اس اطلاع دہی کی غایت کچھ اور ہو - مثلاً علیگڈھ جوبلی کے حالات اس لیے بیان کیے جائیں، کہ عوام کو مسلم یونیورسٹی کے ارباب حل وعقد کی مسرفانہ راہ وروش، اور دیگر فضولیات سے آگاہی ہو - یہاں ہماری شہادت کی غایت محض واقعات کی اطلاع دہی نہ تھی، بلکہ اسکے علاوہ کچھ اور -

یہاں تک جو کچھ کہا گیا، وہ گویا اصل بحث کا دیباچہ تھا - عنوان میں ہمنے اس بات کا اعلان کیا ہے، کہ ہم شہادت پر منطقی نقطۂ نظر سے بحث کرینگے - اس لحاظ سے ہمارا اصلی کام یہ ہونا چاہیے کہ ہم یہ دکھائیں کہ شہادت کس وقت، کن حالات میں، اور کن شرائط کے ایفا کے بعد قابل اعتبار اور لائق وثوق یا صحیح ہوتی ہے - وجہ اسکی ظاہر ہے، کہ منطق میں اُن اصول و قوانین سے بحث ہوتی ہے، جن کا اتباع صحت وسلامتی فکر کے لیے ضروری ہے - لہذا ہمارے اس مضمون کا اصلی موضوع اُن شرائط کو بیان کرنا ہے، جن کے ذریعہ سے ہم شہادت کی جانچ کر سکتے ہیں - اسی ضمن میں اُن اصول پر بھی بحث ہوگی جن سے شاہد کا امتحان ہو سکتا ہے -

سہولت تفہیم کے لیے ہم اپنے موضوع کو دو حصوں میں تقسیم کرتے ہیں - پہلے حصہ میں عام شہادت کی قابلیت اعتبار پر بحث ہوگی، اور دوسرے میں بلاواسطہ اور بالواسطہ شہادت پر علحدہ علحدہ غور ہوگا - حصہ اول پھر دو حصوں میں تقسیم ہو جاتا ہے - یعنی جب ہم یہ معلوم کرنا چاہتے ہیں کہ ایک خاص شہادت لائق اعتبار ہے یا نہیں، تو ہم کو اس مسئلہ میں ہر دو مختلف حیثیتوں سے نگاہ کرنی چاہیے - اول تو یہ دیکھنا چاہیے، کہ جس واقعہ کے متعلق شہادت دی جا رہی ہے' وہ کہاں تک ممکن الوقوع ہے - پھر یہ معلوم کرنا لازمی ہے، کہ شاہد کس حد تک ثقہ ہے - دوسرے الفاظ میں عام شہادت کی بحث

دو حصوں میں تقسیم ہوتی ہے۔ ان میں سے پہلے کو مشہود سے اور دوسرے کو شاہد سے تعلق ہے۔ ان میں سے پہلے کے مطابق امر زیر تحقیق یہ ہوتا ہے، کہ مشہود کے تعلق سے شہادت کی قابلیت اعتبار کے شرائط کیا ہیں؟ اور دوسرے کا سوال یہ ہوتا ہے، کہ شاہد کے لحاظ سے شہادت کن کن حالتوں میں لائق اعتبار ہوتی ہے۔ اب ہم اپنی تقسیم کے مطابق اور اسی ترتیب سے انکا تذکرہ کریں گے۔

مشہود، یا وہ واقعہ جسکے متعلق شہادت دی جا رہی ہے، کے تعلق سے شہادت کی قابلیت اعتبار کو معلوم کرنے کے لیے پہلی شرط تو یہ ہے، کہ وہ اطلاقاً اور اضافتاً دونوں حیثیتوں سے ممکن الوقوع ہو۔ اس بیان میں اطلاقی امکان وقوع اور اضافی امکان وقوع تشریح طلب ہیں۔ ایک واقعہ کو اطلاقاً یا بنفسہ ممکن الوقوع اُسوقت کہا جاتا ہے، جب یہ منطقی قوانین فکر کے منافی و مخالف نہ ہو۔ ایک شخص آکر شہادت دیتا ہے، کہ اُسنے ایک ایسا پرندہ دیکھا ہے، جو ایک ہی وقت میں سفید بھی تھا اور سیاہ بھی۔ اب منطق کے قانون اجتماع نقیضین کا دعوے یہ ہے، کہ ایک ہی چیز کا ایک ہی وقت میں ب اور غیر ب ہونا ناممکن ہے۔ چونکہ یہ واقعہ منطق کے اس قانون کے خلاف ہے اس واسطے اسکو اطلاقاً ناممکن الوقوع کہا جائیگا۔ جب یہ ثابت ہوگیا کہ ایک ہی پرندے کا ایک ہی وقت میں بالکل سفید و سیاہ ہونا ناممکن ہے، تو یہ شہادت بھی بیکار ہوگئی، کیونکہ مشہود اطلاقاً ناممکن الوقوع ہے۔ اسکے مقابلہ میں، اضافتاً ممکن الوقوع اُس واقعہ کو کہا جاتا ہے، جو داخلی یا خارجی ادراک کا معروض بن سکے، جو حواس یا شعور ذات پر اثر آفریں ہو سکے، اور اسی اثر کی وجہ سے اسکا علم ہو سکے۔ اس حیثیت سے جن اشیاء کا ہمکو ادراک ہو سکتا ہے (یہ اشیا بلحاظ زمان و مکان کہیں ہوں) وہ اضافتاً ممکن الوقوع کہلائیں گی۔ اسی طرح جن اشیا کی تصویر تخیل میں قائم کی جا سکتی ہے، وہ بھی اسی فہرست میں شامل ہونگی۔ لیکن جن اشیاء کا نہ ادراک ہو سکتا ہے، اور نہ اُنکی تصویر قائم کی جا سکتی ہے، اضافتاً ناممکن الوقوع کہلائیں گی۔ ان اشیاء کے متعلق تمام شہادت بالکل لایعنی اور ناقابل اعتبار ہوگی۔ اسکا مطلب یہ ہے، کہ جس شہادت کا مشہود بنفسہ، یا حضاری قواء کی معروض کی حیثیت سے، ناممکن ہو، اُسکو بلا تامل رد کر دینا چاہیے۔ لیکن یہ یاد رکھنا چاہیے، کہ ایک چیز کی محالیت کا فیصلہ دو طریقوں سے ہو سکتا ہے، ایک صورت تو یہ ہو سکتی ہے، کہ وہ چیز بحیثیت محسوس کے محال ہو، یا یہ کہ عالم مادی کے قوانین و نوامیس کے مطابق اُسکا ادراک ناممکن ہو، اس قسم کی محالیت طبیعی محالیت کہلاتی ہے۔ اسکے مقابلہ میں ایک اور حالت یہ ہو سکتی ہے، کہ اُس کا ادراک فطری یا مافوق فطری، طریقوں میں سے کسی سے بھی ممکن نہ ہو۔ اس قسم کی محالیت کو الہیاتی

محالیت کہتے ہیں۔ لیکن کسی چیز کی طبیعی محالیت کو ثابت کرنے کے لیے صرف یہ ہی دکھانا کافی نہیں ہے کہ اس چیز کے وجود کی توجیہ عام قوانین فطرت سے نہیں ہو سکتی، یا یہ کہ اس کا وجود بظاہر قوانین فطرت کے بالکل خلاف ہے۔ برعکس اسکے ضرورت اس بات کی ہوتی ہے کہ پہلے ایک عالمگیر اور اٹل قانون فطرت کے وجود کو ثابت کیا جائے۔ اب اگر وہ چیز طبیعی طور پر ممکن ثابت ہو جائے، تو وہ قانون فطرت خود بخود مسترد ہو جاتا ہے۔ اسی طرح الہیاتی محالیت کو ظاہر کرنے کے لیے صرف یہی دکھانا کافی نہیں کہ قوانین فطرت کے مطابق اس چیز کی توجیہ نہیں ہو سکتی، یا یہ کہ ایک خاص قانونِ فطرت اسکے مخالف ہے۔ اسکے ساتھ ہی یہ بھی واضح کرنا لازمی ہے، کہ ایک مافوق فطری ذات بھی اسکی تکوین وتخلیق کا باعث نہیں ہو سکتی۔ اور یہ کہ اسکے وجود کو تسلیم کرنا کسی نہ کسی اصول کے منافی ہے۔ جب ان اصول کے مطابق کسی چیز کی طبیعی یا الہیاتی محالیت ثابت ہو جائے، تو اُسکے متعلق تمام شہادت کو بلا تردد رد کیا جا سکتا ہے۔

مشہود کے تعلق سے شہادت کی قابلیتِ اعتبار کو قائم کرنے کے لیے اسکے اطلاقاً ممکن الوقوع ثابت ہونے کے علاوہ یہ بھی ثابت ہونا چاہیے، کہ وہ اضافاً بھی ممکن الوقوع ہے۔ امکان کی یہ دونو صورتیں ایک دوسرے کے ساتھ لازم وملزوم ہیں۔ ان میں سے ایک دوسرے کی غائب ہونے کی صورت میں ناقص اور بیکار ہو جاتی ہے۔ اضافی امکان سے ہماری مراد یہ ہے، کہ اُس چیز کی لازمی اور ضروری صفات میں کسی قسم کا تناقض نہ ہو (یہ تو ظاہر ہے، کہ اس چیز کے متعلق تمام غور وفکر صرف ان ہی صفات کے ذریعہ سے ہو سکتا ہے)۔ اسکے ساتھ ہی اسکو کبھی نظر انداز نہ کرنا چاہیے، کہ جن صفات کو شہادت میں بیان کیا جا رہا ہے وہ بھی تناقض سے بری ہوں۔ اس کا مطلب یہ ہے، کہ ایک شہادت من حیث الشہادت، اگر تناقض بیانات کا مجموعہ ہے، تو اسکو قابلِ اعتبار نہ سمجھنا چاہیے، کیونکہ ہر وہ چیز جو خود اپنی تنقیص کرے، منطقی حیثیت سے بالکل بیکار ہوتی ہے۔ اسکو معلوم کرنے کے لیے صرف یہ دیکھنا کافی ہوتا ہے، کہ یہ شہادت خود اپنی تنقیض تو نہیں کرتی۔ کیونکہ ممکن ہے، کہ یہ تناقض شاہد کی رائے سے پیدا ہوا ہو۔ اس قسم کے تناقض کو نظر انداز کرنے سے شہادت کی قابلیت اعتبار میں کسی قسم کا کوئی فتور ونقص واقع نہیں ہوتا۔ اسلیے اسکو نہ مسترد کیا جا سکتا ہے اور نہ اسکی تکذیب لازم آتی ہے۔ ایک چیز کے وجود کی شہادت کو صرف اس لیے رد کر دینا یقیناً غلطی ہے، کہ شاہد نے اسکی علت کے متعلق خود اپنی رائے ظاہر کی۔ مثلاً ایک شخص آکر بیان کرتا ہے، کہ فلاں مقام پر زمین شق ہو گئی ہے، اسکے ساتھ ہی وہ یہ بیان کرتا ہے، کہ ایک شخص کے سر پر جن سوار تھا، ایک عامل نے اپنے عمل سے

اس جن کو اُتارا۔ اور وہ جن اُس زمین کو پھاڑ کر غائب ہو گیا۔ اب اس شہادت کو صرف اسوجہ سے بیکار اور ناقص سمجھنا۔ کہ یہ تعلیل و توجیہ ناقص ہے، یقیناً غلطی ہے، کیونکہ زمین کا شق ہونا صحیح ہو سکتا ہو، ممکن ہے کہ اسکی وجہ وہ نہ ہو، جو شاہد نے بیان کی۔ دوسرے الفاظ میں شہادت کی جانچ کرتے وقت نفس مشہود اور اسکے متعلق شاہد کی رائے کو نہایت احتیاط سے علٰحدہ کرنا بہت ضروری ہے۔ ایسا نہ کرنے سے ممکن ہے، کہ غلط شہادت صحیح ہو جائے، اور صحیح غلط۔ شہادت کے اس نقص کو صرف اس طرح معلوم کیا جا سکتا ہے، کہ اسکے تناقض بیان کو معلوم کیا جائے۔

یہاں تک ہم نے اپنے آپ کو صرف مشہود تک محدود رکھا ہے۔ اب فرض کیا جائے، کہ مشہود اطلاقاً و اضافاً دونوں طرح ممکن الوقوع ہے، اس میں نہ طبیعی محالیت پائی جاتی ہے نہ الویاتی۔ لیکن شہادت کی صحت کے لیے صرف یہی کافی نہیں ہوتا۔ ایک شخص آکر بیان کرتا ہے کہ فلاں مقام پر بلوہ ہو گیا ہے۔ بلوے کا ہونا ناممکن الوقوع نہیں۔ اس کا وجود کسی قسم کی محالیت کو بھی مستلزم نہیں، لیکن کیا یہ ممکن نہیں، کہ اس شخص نے آکر جھوٹ بولا ہو؟ بلوے کا ہونا ممکن الوقوع سہی، لیکن اسکے امکان وقوع سے یہ کیسے لازم آتا ہے، کہ اس شخص کی شہادت بھی صحیح ہے؟ کیا ہم کو اپنی روزمرہ زندگی میں ایسی شہادتوں سے اکثر سابقہ نہیں پڑتا، جنکا مشہود ممکن الوقوع ہے، لیکن باوجود اسکے شہادت بیکار رہے۔ اس کا مطلب یہ ہے، کہ کسی شہادت کی جانچ کرتے وقت پہلے تو یہ دیکھنا چاہیے کہ مشہود ناممکن تو نہیں۔ اگر یہ ثابت ہو جائے، کہ یہ ناممکن ہے، تو شہادت کی غلطی میں کوئی شبہ باقی ہی نہیں رہتا۔ اگر اس کا امکان ثابت ہو تو پھر دوسرا سوال یہ ہونا چاہیے، کہ شاہد کہاں تک معتبر ہے؟ اُسکے قول کا کس حد تک اعتبار کیا جا سکتا ہے؟

شہادت کی ماہیت کو جن الفاظ میں ہم نے پیچھے کہیں بیان کیا ہے، اُن پر نظر غائر ڈالنے سے معلوم ہو سکتا ہے کہ یہ دراصل دو اجزا سے مرکب ہوتی ہے۔ ہم نے کہا ہے، کہ ایک واقعہ کو کسی ایسے شخص سے بیان کرنے کو شہادت کہتے ہیں، جو اس واقعہ کا بذاتِ خود تجربہ نہ کر سکتا ہو۔ اب ظاہر ہے کہ اگر میں کوئی واقعہ کسی شخص سے بیان کروں، تو لازمی ہے، کہ وہ پہلے میرے مشاہدہ میں آئے۔ اور اگر میری شہادت بالواسطہ ہے، تو اُس کا کسی اور کے مشاہدہ میں آنا لازمی ہے۔ جب تک خود مجھ کو، یا میرے منقول عنہ کو، اسکا مشاہدہ نہ ہو، میں یا وہ اسکے متعلق کوئی بیان نہیں دے سکتا۔ اسی تمام تقریر کو دوسرے الفاظ میں اس طرح بیان کیا جا سکتا ہے، کہ شہادت اصل میں مرکب ہوتی ہے مشاہدہ اور اُس مشاہدہ کی اطلاع دہی سے۔ یہی اسکے غیر منفک اور لازمی

اجزا ہیں۔ ان میں سے ایک بھی غائب ہو، تو شہادت بھی کالعدم ہو جاتی ہے۔ جب یہ مسلم ہے، تو یہ بھی ظاہر ہے کہ قابل اعتبار شاہد وہی ہو سکتا ہے، جس میں یہ دونوں قابلیتیں بدرجہ اتم موجود ہوں یعنی یہ کہ اُس میں مشاہدہ کرنے کی قابلیت ہو، اور اُس مشاہدہ کو مناسب طور پر بیان کرنے کی اہلیت۔ لیکن اسکے ساتھ ہی یہ بھی ضروری ہے، کہ وہ جو کچھ بیان کرے صدقِ دل اور خلوصِ نیت سے بیان کرے۔ اس میں مبالغہ آمیزی نہ کرے۔ جہاں تک ممکن ہو اُسکو واقعہ کے مطابق بیان کرے، یعنے جھوٹ کو اُس میں دخل نہ ہونے دے۔ مختصراً یہ کہ شاہد قابل اعتبار وہی ہو سکتا ہے جسمیں تین صفات پائی جائیں، اول قابلیت مشاہدہ، دوم اطلاع دہی کی اہلیت، اور سوم دیانتداری یا صداقت یا خلوص نیت۔ ایک شاہد واقعہ مشہودہ کے مشاہدہ کا اہل بھی ہے، اُسکی اطلاع بھی مناسب اور موزوں طریقہ سے کر سکتا ہے، لیکن شہادت میں اگر وہ اپنی طرف سے باتیں شامل کرتا جاتا ہے، یا کسی وجہ سے اصل واقعہ کو مسخ کرتا ہے، تو ظاہر ہے کہ شہادت بیکار ہو جائیگی۔ اسی طرح ایک شخص نہایت دیانتدار اور حق گو ہے، لیکن مشاہدہ کی قابلیت نہیں رکھتا، تب بھی بداہتہً اسکی شہادت قابل اعتبار نہ ہوگی۔ پھر اگر اُس میں مشاہدہ کی قابلیت بھی ہے اور دیانتداری بھی، لیکن ہاتھ میں قلم یا منہ میں زبان نہیں رکھتا، تب بھی شہادت ناقص ہو جائیگی۔ رائٹر ایجنسی ناقص شہادت کی زندہ مثال ہے۔ اسکے پاس ذی علم اور لائق نامہ نگاروں کی جماعت بھی ہے، مشاہدہ کرنے کی سہولت بھی حاصل ہے، اسکے آدمی ہر جگہ صفِ اول میں نظر آتے ہیں واقعاتِ عالم کو معلوم کرنے کے تمام ذرائع بھی مہیا ہیں، غرض اسکے ذی اہلیت ہونے میں کسی قسم کا شبہ نہیں، لیکن انکے تاروں کی جو وقعت آج کل کم از کم ہندوستان میں ہے، وہ ہر ایک پر روشن ہے۔ کیوں؟ صرف اسلیے کہ اہلیت تو موجود ہے، لیکن صداقت اور دیانت مفقود ہے۔ اسکی شہادت پر کوئی اعتبار نہیں کرتا۔ اسی طرح ایک شخص ہے، کہ جس نے تمام عمر کبھی جھوٹ نہیں بولا، واقعات کو بیان کرنے میں وہ ہمیشہ بہت محتاط رہتا ہے، اسکی ایمانداری، دیانتداری اور پرہیزگاری تمام عالم کے نزدیک مسلم ہے، لیکن اثریات سے اسکو مس نہیں، اگر یہ شخص لارڈ کارنروِن سے قبل توتن خامن کی قبر پر پہونچ جاتا، اور وہاں کے حالات بیان کرتا، تو کوئی شخص اسکو معتبر نہ سمجھتا۔ صرف اس لیے کہ وہ ذو اہلیت نہیں۔ اس تمام بحث سے یہ نتیجہ بآسانی نکالا جا سکتا ہے، کہ شاہد کی یہ دونوں، یا تینوں صفات، یعنی اہلیت مشاہدہ و اطلاع دہی، اور صداقت و دیانتداری منطقی حیثیت سے لازمی ہیں، ان میں سے ایک کے غائب ہو جانے سے شاہد اعتبار کے درجہ سے گر جاتا ہے

لیکن یہ خیال رکھنا چاہیے کہ ان دونوں صفات میں سے کسی کو دوسری کا نتیجہ نہیں کہا جا سکتا۔ اوپر کی مثالوں سے واضح ہوا ہوگا، کہ اکثر الکثیر صداقت کے ساتھ اقل القلیل اہلیت کا ہونا بعید از قیاس و حقیقت نہیں۔ اسی طرح کثیر ترین اہلیت کے دوش بدوش قلیل ترین صداقت کا ہونا بھی ناممکن نہیں۔ ہم ایک کو دوسرے پر مبنی نہیں کر سکتے۔ لیکن بالعموم اگر ایک شخص کی صداقت غیر مشتبہ ہے، تو اسکی اہلیت بھی ثابت ہو جاتی ہے کیونکہ ایک صادق القول شخص کبھی ایسی بات نہ کرے گا جو اسکو پوری طرح یاد نہ ہو، یا جسکے مشاہدہ کرنے میں اُس نے اپنی پوری توجہ صرف نہ کی ہو، یا جس کا مشاہدہ کرنے کا وہ اپنے آپ کو اہل نہیں سمجھتا۔ ہمارے اس قول سے یہ مراد نہ لینی چاہیے، کہ صادق القول شخص لازماً ہر قسم کے واقعات کا مشاہدہ کرنے کا اہل بھی ہوتا ہے۔ ایک کسان کتنا بھی حق گو کیوں نہ ہو اُسکو کسی طرح بھی کیمیاوی مشاہدات کا اہل نہیں کہا جا سکتا۔ ہماری مراد صرف یہ ہے، کہ کسان اپنی صداقت و دیانتداری کی وجہ سے لوگوں کو اس دھوکے میں نہ ڈالیگا، کہ وہ کیمیاداں بھی ہے، اور اسلیے وہ اسکے واقعات و مظاہر کا صحیح مشاہدہ کر سکتا ہے۔ اور اگر وہ ایسا کر سکتا ہے، تو جس بات پر اُسنے پورا غور نہیں کیا، یا جس بات کو وہ یاد نہ رکھ سکا، اُسکو اپنی طرف سے جوڑ کر بیان نہ کریگا۔ اسی واسطے ہم روزمرہ زندگی میں ایک صادق، مگر نااہل، کی شہادت کو کاذب، مگر اہل کی شہادت کے مقابلہ میں زیادہ قابل اعتبار نہیں سمجھتے۔ حقیقت تو یہ ہے، کہ جس واقعہ کے متعلق صرف ایک ہی شہادت میسر آسکتی ہے، وہاں ہم شاہد کی صداقت کو اُسکی اہلیت کا ضامن گردانتے ہیں۔ اگر ہم کو اسکی شہادت کا یقین ہوتا ہے تو ہم کو یہ بھی اطمینان ہوتا ہے، کہ وہ اپنی ناقابلیت یا نااہلیت کو چھپانے کا نہیں۔ اسی واسطے ہم اُسکی شہادت کو بغیر چون و چرا کے تسلیم کر لیتے ہیں۔

ہم نے ابھی کہا ہے، کہ شہادت قابل اعتبار اُسوقت ہوتی ہے جب شاہد میں مشاہدہ کرنے کی قابلیت ہو، اور اُسکو موزوں و مناسب طور پر بیان کرنے کی اہلیت۔ دوسرے الفاظ میں وہ اس واقعہ کا صحیح صحیح مشاہدہ کر سکتا ہو، اور صحت کے ساتھ اُسکو بیان بھی کر سکتا ہو۔ اس قابلیت و اہلیت کے لیے سب سے پہلی شرط تو یہ ہے، کہ وہ شخص معلومات انسانی کے اس شعبہ سے پوری پوری واقفیت رکھتا ہو جس سے وہ تعلق رکھتا ہے۔ مطلب یہ ہے، کہ اگر وہ واقعہ کیمیا سے تعلق رکھتا ہے، تو شاہد کا ماہر کیمیا ہونا ضروری ہے۔ اس مہارت کی عدم موجودگی میں شہادت معتبر نہ ہوگی، خواہ شاہد کی صداقت کسی قدر مسلم کیوں نہ ہو۔ اسی طرح نفسیاتی واقعہ کو جس خوبی، عمدگی، تفصیل اور کمال کے ساتھ ماہر نفسیات بیان کریگا اور کوئی

شخص نہیں کر سکتا۔ قانونی عدالتوں میں مار پیٹ کے مقدمات میں چوٹ چپیٹ کے متعلق سوائے ڈاکٹر کی شہادت کے اور کوئی شہادت قبول نہیں ہوتی۔ رسم الخط کی شناخت کے لیے ڈاکٹر کی رائے نہیں بلکہ رسم الخط کے ماہر کی ضرورت پڑتی ہے، اسی طرح زہر کی نوعیت معلوم کرنے کے لیے کیمیکل اگزا کی طرف رجوع کی جاتی ہے۔ وجہ صرف یہ ہے کہ یہ سب کے سب اس شعبۂ علم سے تعلق رکھتے ہیں، اور اسکے ماہر ہیں جس سے وہ واقعہ متعلق ہے، دوسرے الفاظ میں ان ماہرین کے علاوہ کوئی اور شخص اس خاص چیز کے مشاہدہ کا اہل نہیں سمجھا جاتا۔ پھر یہاں بھی ہر ایک ڈاکٹر، یا ہر ایک ماہر رسم الخط، یا ہر ایک کیمیکل اگزامنر برابر نہیں سمجھا جاتا، باوجود اس کے ان میں سے ہر ایک اپنے اپنے فن سے واقف ہے، یہ عدم مساوات نتیجہ ہوتی ہے اس بات کا کہ بعض ڈاکٹر علیٰ وجہ الکمال مشاہدہ نہیں کر سکتے، یا اُس مشاہدہ کو صحت کے ساتھ بیان نہیں کر سکتے، یا اُس مشاہدہ کو صحت کے ساتھ بیان نہیں کر سکتے۔ ان ڈاکٹروں کی شہادت ناقص سمجھی جاتی ہے ہاں جن ڈاکٹروں کی قابلیتِ مشاہدہ وصلاحیتِ اطلاع دہی بہت سے موقعوں پر ممتحن ہو چکی ہے، اُنکی شہادت میں شبہہ نہیں کیا جاتا۔ جس قدر پختہ کار اور قابل یہ ڈاکٹر ہوتا ہے، اُسی قدر زیادہ معتبر اُسکی شہادت مانی جاتی ہے، اور اگر وہ واقعہ جسکا وہ شاہد ہے، بالکل معمولی اور عام ہے، تو اُسکی شہادت کو الہام کا درجۂ یقین حاصل ہوتا ہے۔ پھر اسکے ساتھ ہم کو اس بات کی بھی تحقیق کرنی چاہیے کہ جن حالات میں شاہد نے اس واقعہ کا مشاہدہ کیا ہے، وہ ایسے تو نہ تھے جنکی وجہ سے اس کا مشاہدہ، یا اُس مشاہدہ کا بیان غلط ہو گیا ہو۔ قانونی شہادتوں میں "سلامتی ہوش وحواس" اور بلوغت کی شرط اسی طرح لگائی جاتی ہے، کہ اگر ہوش وحواس درست نہ ہوں، یا شاہد بالغ العمر نہ ہو، تو اول تو مشاہدہ ہی درست نہ ہوگا، اور اگر مشاہدہ درست ہو بھی گیا، تو اُسکا بیان یقیناً صاف اور صحیح نہیں ہو سکتا۔ یہ اس قسم کے حالات ہیں جن میں مشاہدہ، یا اسکے بیان، کی درستی وصحت بہت مشتبہ ہو جاتی ہے، اور اسی اشتباہ کی وجہ سے اس شہادت کو قبول نہیں کیا جاتا۔

منطقیوں نے مشاہدہ میں غلطی کے دو ممکن ذرائع بیان کیے ہیں۔ پہلی صورت کو وہ اصطلاحاً مغالطہ عدم مشاہدہ کہتے ہیں، اور دوسری کو مغالطۂ سوءِ مشاہدہ۔ عدمِ مشاہدہ کی پھر دو صورتیں ہو جاتی ہیں۔ انکی توضیح مثالوں سے ہوگی۔ بعض اوقات ایسا ہوتا ہے، جس شخص کا ذکر ہوتا ہے، وہ معاً آموجود ہوتا ہے، اور جس شے کو ہم خواب میں دیکھتے ہیں، وہ شے دوسرے ہی روز وقوع میں آ جاتی ہے۔ ایک ہی نوع کی بہت سی مثالوں کی بنا پر بعض لوگ خوابوں کو سچا سمجھنے لگتے ہیں۔ اسی طرح اکثر اشخاص کو نجومیوں اور رمّالوں سے آیندہ کے حالات دریافت کرنے کا شوق ہوتا ہے، اور

صرف ان مثالوں کو لیکر جن میں انکی پیشین گوئی صحیح ثابت ہوئی تھی، نجوم و رمل پر ایمان لے آتے ہیں۔ اسی قسم کی اور صورتوں میں ہوتا ہے، کہ وہ بات محض اتفاق سے صحیح ثابت ہو جاتی ہے۔ یہ لوگ اُن مثالوں کو نظر انداز کر جاتے ہیں، جن میں وہ بات ثابت نہ ہوئی تھی۔ صرف امثال موجبہ پر غور کرنے اور امثال سالبہ و مخالفہ کو نظر انداز کرنے سے یہ نتیجہ نکال لیا جاتا ہے

امثال مخالفہ کو نظر انداز کا فطری میلان اس وقت اور بھی قوی ہوتا ہے، جب امثال موجبہ کسی ایسے مسئلہ کی مثالیں ہوں، جسکو پہلے ہی تسلیم کر لیا گیا ہو، یا جو شہادت ان مثالوں سے حاصل ہوتی ہو، اُسکی تائید میں تعصب، عقیدت، تنفر، محبت وغیرہ کے جذبات شامل ہوں۔ مثلاً عوام الناس نے سحر اور عملیات کے اثر اور چڑیلوں اور بھوتوں کے وجود کو تسلیم کر رکھا ہے، تو تمام ایسی روایات، جن سے ان اشیا کے اثر، یا وجود، کی تصدیق ہوتی ہے، نہایت شوق اور اعتبار سے سُنی جاتی ہیں، اور برخلاف اسکے ہزاروں ایسی مثالیں جہاں سحر کا کچھ اثر نہیں ہوا، یا بھوت اور چڑیلوں کی کی بابت، جو روایات ہوتی ہیں، غلط ثابت ہوتی ہیں، اکثر تو نظر انداز کر دی جاتی ہیں، اور اگر اُن پر غور کیا جاتا ہے، تو دل کو اس طرح سمجھا لیا جاتا ہے کہ شاید ان موقعوں پر کسی اور اعلیٰ اور قوی تر علت نے سحر کے اثر کو زائل کر دیا ہو۔

اسکے علاوہ تعصب، عقیدت، تنفر، محبت وغیرہ جذبات اکثر اپنے معارض مثالوں کا مشاہدہ ہی نہیں کرنے دیتے۔ مثلاً عاشق اپنے معشوق میں، اور والدین اپنے بچوں میں سوائے حُسن و خوبی کے اور کچھ نہیں دیکھتے۔ اسی طرح ایک متعصب شخص کو اپنے مذہب میں سوائے خوبیوں کے، اور دوسروں کے مذہب میں سوائے بُرائیوں کے، اور کچھ نظر نہیں آتا۔ ان تمام صورتوں میں مشاہدہ بالکل غلط ہو جاتا ہے۔ تعصب وغیرہ کی وجہ سے اصلیت مسخ ہو جاتی ہے، اور ہر ایک چیز اپنی من مانی صورت میں دکھائی دیتی ہے۔

پھر تعصب وغیرہ جذبات کا صرف یہی اثر نہیں ہوتا، کہ امثال مخالفہ نظر انداز کر دی جاتی ہیں بلکہ انکی وجہ سے لوگ ایسے اقوال و مسائل تسلیم کر لیتے ہیں، کہ اگر انکا تجربہ کیا جائے، تو بالکل بے بنیاد ثابت ہوتے ہیں۔ گیلیلیو کے زمانہ تک ہر شخص یہ مانتا چلا آرہا تھا، کہ گرنے والے اجسام اور زمین تک پہونچنے کی مدت میں نسبت معکوس ہوتی ہے۔ یعنی پانچ سیر کا وزن ایک سیر وزن کے مقابلہ میں ایک خمس مدت میں زمین تک پہونچے گا۔ اس قول کی صحت کی جانچ کے لیے ایک سادہ سا تجربہ کرنا کچھ مشکل نہ تھا، لیکن کسی نے یہ تکلیف نہ اُٹھائی اور ان مسائل کو بلا چون و چرا مانتے چلے آئے۔

فطرتِ انسانی کا ایک میلان یہ بھی ہے کہ وہ اکثر کسی واقعہ کی چند نمایاں اور اول ہی اول ظاہر ہونے والی امثال کو دیکھ لیتا ہے، اور ان ہی کی بنا پر کلیہ قائم کر لیتا ہے۔ جب ہم کسی قوم، یا پیشہ، یا جماعت کے چند اشخاص میں چند مخصوص خصائل دیکھ لیتے ہیں۔ تو اکثر ایسا ہوتا ہے کہ ہم یہ ایمان لے آتے ہیں کہ تمام قوم، پیشہ، یا جماعت میں یہ خصائل پائے جائیں گے۔ اسی طرح جب کوئی شخص کسی غیر ملک میں سفر کرتا ہے، تو اکثر اسکو پہلے پہل گاڑیبانوں، قلیوں اور بھٹیاروں سے کام پڑتا ہے، اور وہ سیاح ان ہی لوگوں کے خصائل پر استدلال کرکے تمام قوم کو متدین یا غیر متدین، خوش خلق یا بدخلق قرار دے لیتا ہے۔

یہ تمام مذکورہ صورتیں مغالطہ عدم مشاہدہ کی اُس قسم سے تعلق رکھتی ہیں، جس میں بعض امثال کو غور اور بعض کو نظرانداز کرکے ایک خاص نتیجہ اخذ کیا جاتا ہے۔ اسکے علاوہ اسی مغالطہ کی ایک قسم یہ ہوتی ہے، کہ ہم کسی ایک مثال کو بھی نظرانداز نہیں کرتے، لیکن ہر ایک مثال میں ہمارا مشاہدہ غلط ہوتا ہے۔ دوسرے الفاظ میں یہاں نقص مثالوں کی تعداد میں نہیں، بلکہ اُن کی کیفیت میں ہوتا ہے۔ ایسی حالتوں میں ہوتا یہ ہے، کہ چند ایسے ضروری عوارض کو نظرانداز کر دیا جاتا ہے، جنکو واقعہ زیر مشاہدہ سے گہرا تعلق ہوتا ہے۔ ان ضروری عوارض کو نظرانداز کرکے استدلال کیا جاتا ہے۔ ڈاکٹر ڈگبی نے زخموں کے علاج کا ایک نیا طریقہ نکالا تھا، کہ جس ہتھیار سے زخم پہونچا تھا، اس پر ایک سفوف چھڑک کر اور مرہم لگا کر دو تین دفعہ صاف کیا جاتا تھا۔ اسکے ساتھ ہی اس زخم کو روئی وغیرہ رکھ کر مضبوط باندھ دیا جاتا تھا۔ اور سات دن کے بعد جب کھولا جاتا تھا، تو وہ زخم بالکل مندمل ملتا تھا۔ اس قسم کی بہت سی مثالوں کے مشاہدہ کے بعد عام خیال یہ قائم ہوا تھا، کہ وہ اندمال زخم پہونچانے والے ہتھیار پر مرہم لگانے کا نتیجہ تھا۔ لیکن حقیقت میں زخم کے اچھا ہونے کا سبب یہ تھا کہ سات دن زخم مضبوط بند رہا تھا، اور اس وجہ سے باہر کی ہوا نہ لگی تھی۔

پھر مشاہدہ میں غلطی کی وجہ ایک اور یہ ہوتی ہے، کہ جس چیز کو ہم مشاہدہ کہتے ہیں، وہ اصل میں مشاہدہ نہیں ہوتا، بلکہ استدلال کا نتیجہ ہوتا ہے۔ ہم شام کے وقت باہر نکلتے ہیں اور دیکھتے ہیں کہ سڑکوں پر دو رویہ پولیس کے سنتری کھڑے ہیں، تمام بازار سجے ہوئے ہیں، تمام دوکانیں اور مکان آئینہ بند ہیں۔ لوگوں کے ٹھٹ کے ٹھٹ لگے ہوئے ہیں، فوج کے گورے نہایت اہتمام و انہماک کے ساتھ ادھر اُدھر ٹہل رہے ہیں۔ ان تمام حالات کو دیکھ کر جب ہم گھر واپس آتے ہیں، تو بیان کرتے ہیں، کہ آج گورنر کی سواری نکلنے والی ہے۔ ہمارا مشاہدہ سواری کا نہ تھا، بلکہ اُس انتظام و اہتمام کا تھا، جو اس سواری کے لیے ہو رہا تھا۔ لیکن چونکہ ہمنے ہمیشہ اس قسم کے انتظام کو سواری کے لیے ہوتے

دیکھا ہے، اس لیے شہادت ہم نے انتظام کی نہ دی، بلکہ سواری کی دی، اور یہ شہادت ظاہر ہے، کہ مشاہدہ پر مبنی نہ تھی، بلکہ اُس نتیجہ پر موقوف تھی، جو ہم نے اُس انتظام کو دیکھ کر اخذ کیا تھا۔ ان حالات میں شہادت کا غلط ثابت ہونا بعید از قیاس نہیں۔ ممکن ہے کہ گورنر کی سواری نہ نکلی ہو، بلکہ کسی اور مصلحت سے یہ انتظام کیا گیا ہو۔

یہ سچ ہے، کہ مشاہدہ کے ان نقائص کو شہادت میں معلوم کرنا دشوار ہی نہیں بلکہ ناممکن ہے، لیکن اگر شاہد نے گذشتہ موقعوں پر اپنے آپ کو ہر قسم، یا ایک خاص قسم کے واقعات کا مشاہدہ کرنے کا اہل ثابت کیا ہے، تو ہم کو یہ اطمینان ہو جانا چاہیے، کہ وہ اپنے آپ کو ان سے محفوظ رکھ سکیگا، اور اس طرح اسکے مشاہدہ میں نہ تو امثال مخالفہ و سالبہ کو نظرانداز کیا گیا ہوگا، نہ واقعہ زیر مشاہدہ کے بعض ضروری عوارض کو ترک کیا گیا ہوگا، اور نہ یہ اصلی و واقعی مشاہدہ کا نتیجہ ہوگا۔ یہی مطلب ہے ہمارے اس قول کا کہ شاہد میں اہلیت ہونی چاہیے۔

یہاں تک صرف مشاہدہ کرنے اور اُسکو بیان کرنے پر بحث تھی، لیکن اسکے ساتھ، جیسا کہ ہم اوپر دکھا چکے ہیں، یہ بھی ضروری ہے، کہ شاہد دیانتدار اور صادق ہو۔ مشکل یہ ہے، کہ ہمکو اسکی ان صفات کا پوری طرح یقین نہیں ہو سکتا، اگرچہ اس یقین کا ظن سے بڑا غلبہ ہو سکتا ہے۔ وجہ اس کی یہ ہے، کہ اگرچہ ہم کو شاہد کے کیرکٹر اور اُسکی عادات و خصائل سے اس قدر مکمل واقفیت ہے، کہ ہم اسکی صداقت پر اعتماد کر سکتے ہیں، لیکن دل کا حال سوائے عالم الغیب کے اور کسی کو معلوم نہیں ہو سکتا۔ اس دنیا میں اکثر طاقتیں ایسی ہیں، جو بڑے سے بڑے متدین اور متقی شخص کو صراط مستقیم سے منحرف کر سکتی ہیں۔ عادات کا طبیعت ثانیہ ہونا مسلم، لیکن جب ان طاقتوں کے زیر اثر طبیعتِ اولیہ بدل جاتی ہے، تو طبیعتِ ثانیہ تو یقیناً خارج از بحث ہے۔ فطرت انسانی کی کمزوریوں کی فہرست بہت طویل ہے۔ ان ہی کمزوریوں میں سے کوئی ایک پردے کار آکر انسان کے ارادوں کو کچھ کا کچھ کر دیتی ہے۔ لیکن ہم کو اپنی روزمرہ زندگی میں شہادت پر ناچار و ناگزیر اعتماد کرنا پڑتا ہے۔ اسکا مطلب یہ ہے، کہ ہم شاہد کے خلوص نیت پر اعتبار رکھتے ہیں، اگرچہ بعض کو ہم مسترد بھی کر دیتے ہیں۔ شاہد کی دیانتداری اور صداقت کا اندازہ کرنے کے لیے ایک طریقہ تو ہم یہ اختیار کر سکتے ہیں، کہ اُسکی گذشتہ زندگی کے حالات پر غور کریں، اور یہ معلوم کرنے کی کوشش کریں، کہ وہ صداقت و دیانتداری کو محبوب رکھتا ہے یا نہیں۔ اگر رکھتا ہے، تو ہم کو اس خاص موقعہ پر بھی اسکی صداقت کا ایک حد تک یقین ہونا چاہیے۔ لیکن کیا فطرتِ انسانی کا یہ ایک معمولی اور عام مظہر نہیں، کہ ایک شخص اپنا

اعتبار بڑھانے کے لیے کچھ مدت تک تو نہایت دیانتدار رہتا ہے، اور جب اعتبار بڑھ جاتا ہے، اور ساکھ قائم ہو جاتی ہے، تو ایک ایسا ہاتھ مارتا ہے، کہ گذشتہ دیانتداری سے جو نقصان ہوا تھا، اسکو مع سود کے وصول کر لیتا ہے۔ اس بنا پر کسی کی عادتِ صداقت پر بھروسا نہ ہونا چاہیے۔ لیکن اس دنیا میں رہنا، اور اپنے ہم جنسوں سے معاملہ نہ رکھنا، یا اُن سے قطع تعلق کر لینا، بقول ارسطو کے، یا تو فرشتوں سے ممکن ہے، یا وحوش سے، انسانوں سے ممکن نہیں۔ اب اگر ابنا جنس سے تعلق رکھنا بھی ضروری ہے، اور یہ تعلق بغیر اعتبار و اعتماد کے قائم نہیں رہ سکتا، پھر یہ اعتماد و اعتبار نتیجہ ہوا کرتا ہے عادات کا، کیونکہ عادات ہی کو دیکھ کر انکا اندازہ لگایا جاتا ہے۔ وجہ اسکی یہ ہے، کہ عام خیال کے مطابق انسان اپنی عادات کا غلام ہوا کرتا ہے۔ ہر کیف باوجود ان تمام نقائص کے شاہد کی صداقت کو معلوم کرنے کا اگر کوئی ذریعہ ہمارے پاس ہے، تو عادات ہیں۔ ہاں اپنی تسلی کے لیے یہ کر سکتے ہیں، کہ اسکے ساتھ اسپر غور کر لیں، کہ شہادت دینے کے وقت کوئی ایسا محرکِ عمل تو نہیں کر رہا تھا، جسکے زیرِ اثر اُس نے اپنی عادت کو ترک کر دیا ہو۔ اگر اس قسم کا کوئی محرک ہے، تو عادت یقیناً ناقابلِ اعتبار ہو جاتی ہے۔ اپنی جان کس جاندار کو پیاری نہیں ہوتی۔ ممکن ہے، کہ وہ شاہد جو راست گوئی کا عادی ہے، کسی مستبد اور ظالم حاکم کے سامنے شہادت دے رہا ہو۔ ایسی حالت میں یہ بعید نہیں، کہ وہ محض جان بچانے کے لیے، یا تکلیف و تعذیب سے محفوظ رہنے کی غرض سے جھوٹ بول جائے، اور اس طرح غلط شہادت دیدے۔ حاکمانِ پولیس کے روبرو جو شہادتیں گذرتی ہیں، وہ اس خاص صورت کی بہترین مثالیں ہیں۔ پھر بلووں کے مقدمات میں "سرکاری گواہوں" کی شہادت اسی لیے ناقص سمجھی جاتی ہے، کہ وہ قید و بند کی مصیبت سے نجات پانے کی امید میں غلط بیانی اور دروغگوئی کر سکتے اور کرتے ہیں۔ اطمینانِ مزید کے لیے ان پر جرح کے سوالات کیے جاتے ہیں۔ اگر ان سوالات کے دوران میں کہیں اُسکی تناقض بیانی منتج ہو جاتی ہے، تو محض اس تناقض کی وجہ سے اُسکی شہادت پایۂ اعتبار سے گر جاتی ہے، کیونکہ شہادت اگر سچی ہوتی تو یہ تناقض ناممکن تھا۔

مختصر یہ کہ شاہد کی صداقت و دیانتداری کو معلوم کرنے کا پہلا ذریعہ تو یہ ہے، کہ ہم اسکے کیرکٹر کی اچھی طرح جانچ کریں۔ دوم یہ کہ ایسے محرکات کی عدم موجودگی کو ثابت کریں جنکے زیرِ اثر وہ شخص دیدہ و دانستہ دروغ گوئی پر مجبور ہوتا، سوم یہ کہ جرح کے سوالات کر کے یہ دیکھیں، کہ اس میں کسی قسم کا تناقض تو نہیں پایا جاتا۔ لیکن اسکو نہ بھولنا چاہیے، کہ ان تینوں ذرائع سے ہمکو شاہد کی صداقت، دیانتداری اور خلوصِ نیت کا پورا پورا یقین نہیں ہو سکتا۔ البتہ یقین کا غلبہ ہو جاتا ہے۔

یہاں تک ذکر تھا اُس شاہد کا جو دیدہ و دانستہ جھوٹ بولتا ہے - یہ جھوٹ جلب منفعت کے لیے ہو، یا دفع مضرت کے لیے، یا کسی اور غرض سے - لیکن بعض شہادتیں ایسی بھی ہوتی ہیں، جن میں وہ اپنی طرف سے کسی قسم کی غلط بیانی نہیں کرتا، حالانکہ یہ شہادت بالکل، یا تقریباً غلط ہوتی ہے - دوسرے الفاظ میں اسکی دروغگوئی شعوری نہیں، بلکہ غیر شعوری ہوتی ہے - بعض طبیعتیں مبالغہ پسند ہوتی ہیں، وہ اسی مبالغہ پسندی کی وجہ سے ذرا سی بات کو افسانہ کردیتی ہیں - نتیجہ اسکا یہ ہوتا ہے، کہ اصلیت بالکل مسخ ہو جاتی ہے - بعض اپنے تجربات و مشاہدات کی تفریط کی تلافی استدلال و تخیل کی افراط سے کرتے ہیں - بچوں کے بیانات میں تخیل کی رنگ آمیزی بکثرت ہوتی ہے بعض اشخاص محض اپنی شہرت اور عظمت بڑھانے کے خیال سے من گڑھت قصے بیان کرجاتے ہیں - یہ بھی عموماً ہوتا ہے، کہ واقعہ کی دلکشی اور دلچسپی بڑھانے کے لیے اُس میں اپنی طرف سے بہت سی باتیں شامل کردی جاتی ہیں - شاہد بزعم خود تمام واقعات صحیح صحیح اور بلاکم وکاست بیان کرتا ہے، لیکن یہ اثرات برابر کام کیے چلے جاتے ہیں -

انکے ساتھ اس حقیقت کو بھی شامل کرلینا چاہیے، کہ ہمارا حافظہ بہت فریب دہ ہوتا ہے - اکثر اوقات تو ایک واقعہ کی بہت سی باتیں ہمکو یاد نہیں رہتیں - بعض اوقات اس واقعہ کو بیان کرنے میں ایسی باتیں شامل کردی جاتی ہیں، جنکو اس واقعہ سے کوئی تعلق نہیں ہوتا - بسا اوقات ایسا بھی ہوتا ہے، کہ واقعات کی ترتیب مختلف ہو جاتی ہے، جس ترتیب میں کہ وہ مشاہدہ میں آئے، وہ یاد نہیں رہتی - نتیجہ یہ ہوتا ہے، کہ انکو بیان کرنے میں انکی ترتیب بالکل من گڑھت ہوتی ہے - اس میں شک نہیں کہ عام طور پر اس اختلاف ترتیب سے شہادت میں کچھ فرق نہیں آتا، لیکن بعض واقعات اس قسم کے ہوتے ہیں، جن میں ترتیب بہت ضروری ہوتی ہے - مطلب یہ ہے کہ حافظہ کی کمزوری کی وجہ سے تین مختلف قسموں کے نقائص پیدا ہوسکتے ہیں :- (۱) متعلق باتوں کا ترک کردینا (۲) غیر متعلق باتو کا شامل کردینا اور (۳) ترتیب کا مختلف ہو جانا - پھر جس طرح وقت گذرتا جاتا ہے اسی طرح ان نقائص کا احتمال اور بڑھ جاتا ہے - یہی وجہ ہے، کہ سائنس کے تمام اعتبارات میں تاکید کی جاتی ہے، کہ جو کچھ مشاہدہ کیا جائے، اُسکو فوراً تحریر میں ضبط کرلیا جائے - تاکہ ذہول کی وجہ سے کوئی بات چھوٹ نہ جائے - لیکن خرابی یہ ہے، کہ ہر شہادت میں یہ بات حاصل نہیں ہوسکتی - وہ لوگ، جن کی تحریرات آجکل کی تاریخ کا سنگ بنیاد ہیں، ہر وقت کاغذ پنسل نہ لیے پھرتے تھے - تحریری کاغذات ہمیشہ حافظہ کی مدد سے مرتب کیے جاتے ہیں - لہذا ظاہر ہے، کہ واقعہ کا جس قدر حصہ فراموشی کی نذر ہو جاتا ہے، اُسکو اپنی طرف سے پورا کیا جاتا ہے، اور اُس میں استدلال و تخیل سے مدد لی جاتی ہے - ناموافق اور

ناہموار باتیں نکال کر ایک مسلسل قصہ گھڑ لیا جاتا ہے۔ جو بظاہر اصلی تجربہ کی ہو بہو نقل نظر آتا ہے جسقدر وقت گذرتا جاتا ہے، اُسی قدر غلبہ اس تعمیری کام کا ہوتا جاتا ہے۔ ضعیف العمر اشخاص کا حافظہ خصوصیت کے ساتھ بہت خطرناک ہوتا ہے۔ دہلی کے غدر اور حیدرآباد کی موسیٰ ندی کی طغیانی کے چشمدید حالات بیان کرنے والوں کی شہادت کو اسی وجہ سے ذرا احتیاط سے صحیح تسلیم کرنا چاہیے۔ اکثر واقعات جن کو وہ بیان کرتے ہیں "ایجاداتِ بندہ" ہوتے ہیں، اور دقت یہ ہے، کہ انکو اصلیت سے علیحدہ کرنے کا کوئی وسیلہ ہمارے پاس نہیں ہوتا۔ قلیل عرصہ کا بھی اگرچہ یہی حال ہے، لیکن اس میں غلطی کا احتمال کم ہوتا ہے۔ لہذا شاہد کی شہادت کی جانچ کرتے وقت، ہم کو یہ دریافت کرنا چاہیے، کہ وہ بلحاظ زمانہ، اس واقعہ کے کس قدر قریب تھا، اور یہ کہ اُس نے کتنے عرصہ کے بعد اس کو تحریر میں ضبط کیا ہے۔ تیسرے یہ کہ اسکا حافظہ کہاں تک قابل اعتماد تھا۔ پھر نفس شہادت کے نقد و نظر سے ہم تخمینی حد تک یہ کہہ سکتے ہیں، کہ فلاں حصہ نسیان کے نذر ہو گیا، فلاں استدلال کا نتیجہ ہے اور فلاں تخیل کا۔ وغیرہ

تعصب، بغض، محبت، وغیرہ کے جذبات کے زیر اثر شہادت میں جو خرابیاں پیدا ہوتی ہیں، انکی طرف ہم پیچھے کہیں اشارہ کر چکے ہیں۔ صرف اُسی شاہد کی شہادت پر اعتبار کیا جا سکتا ہے، جو ان تمام باتوں سے بری ہو۔ یہی وجہ ہے، کہ ایک غیر جانبدار اور بے غرض کی شہادت، غرضی شخص کی شہادت پر، من حیث الشہادت، فائق سمجھی جاتی ہے۔

اگر یہ شہادت تحریری ہے، تو اس میں مصنف کی انشاپردازی کی گنجائیش رکھنی بھی ضروری ہے۔ بعض لوگ محض انشاپردازی کے زور میں آکر نادانستہ طور پر غلط بیانی کے مرتکب ہو جاتے ہیں۔ تشابیہ و استعارے، پُرشکوہ الفاظ، چست بندشیں، نئی نئی تراکیب، اور اسی قبیل کی اور چیزیں انشاپردازی کی جان ہیں، اور یہی اصلیت کو مسخ کرنے میں نمایاں حصہ لیتی ہیں۔ تاریخی ناولوں، یا نظموں کا رتبہ بطور سند کے "تاریخی کتب" کے برابر نہیں ہوتا، وجہ یہی ہے کہ مقدم الذکر میں محض زیبِ داستان کے لیے بہت سی بیکار باتیں شامل کر لی جاتی ہیں، اور مؤخر الذکر میں ضرورت شعری کی وجہ سے اصلی واقعہ میں تغیر و تبدل کر لیا جاتا ہے۔ آزاد مرحوم کی دربار اکبری اور آبِ حیات، اور شرر کے تمام تاریخی ناول اس قسم کی شہادتوں کی زندہ اور عمدہ مثالیں ہیں۔ بلحاظ انشاپردازی ان کا رتبہ خواہ کچھ بھی ہو، لیکن بحیثیت تاریخی شہادت کے یہ بالکل بیکار ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہے، کہ زبان جسکے ذریعہ سے مشاہدہ کی اطلاع دہی کی جاتی ہے، غلطی کا ایک اور ذریعہ ہے۔ ہو سکتا ہے، کہ مشاہدہ صحیح ہو، لیکن اسکو بیان کرنے میں اصلیت کا بدل جانا ناممکن نہیں۔

جب شاہد کی ان دونوں صفات، یعنی دیانتداری اور اہلیت، کی طرف سے ہمکو اطمینان ہو جائے تو شہادت بھی قابل اعتبار ہو جاتی ہے۔ بعض لوگوں کا خیال ہے، کہ ان دونوں صفات کے باوجود، اگر وہ واقعہ، جسکے متعلق شہادت دی جارہی ہے، عام اور روزمرہ تجربہ کے خلاف ہے، تو شہادت غلط ہے۔ اسی خیال کی بنا پر ہیوم نے معجزات کو ناقابل ثبوت قرار دیا ہے۔ اس کا خیال ہے، کہ یہ تمام معمولی قوانین فطرت کے خلاف ہوتے ہیں، اور ہم کو انکے مشابہ واقعات کا اس سے قبل تجربہ نہیں ہوتا۔ اسی وجہ سے اُنکے متعلق ہر قسم کی شہادت قابل اعتبار نہیں، حالانکہ وہ لوگ، جو اُنکی شہادت دیتے ہیں، اُسکے نزدیک پوری طرح اور بالکل معتبر ہیں۔ لیکن ہیوم کا یہ خیال غلط ہے۔ برخلاف اسکے ہم یہ کہہ سکتے ہیں، کہ جہاں شاہد کا اعتبار مسلم اور ناقابل انکار ہے، وہاں صرف اس سبب سے کہ وہ واقعہ غیر معمولی اور عجیب ہے، شہادت اور پُر زور ہو جاتی ہے۔ وجہ اسکی یہ ہے: کہ انکے محض ایسا ہونے ہی سے صادق القول اور ذی عقل انسان انکی طرف اور زیادہ توجہ کریں گے اور اس طرح اپنے مشاہدات کو اور زیادہ صحت کے ساتھ بیان کرنے کے قابل ہو جائیں گے۔

اب عام شہادت کی قابلیتِ اعتبار کی گذشتہ تمام بحث کو مختصراً اس طرح بیان کیا جا سکتا ہے، کہ ایک شہادت اُسوقت قابلِ وثوق ہوتی ہے، جب اُسکے مشہود و شاہد میں خاص خاص صفات پائی جائیں۔ مشہود کے لیے ضروری ہے، کہ وہ تجربہ کی اعلیٰ قوت، یعنی فہم، کے معروض کی حیثیت سے اطلاقًا اور تجربہ کے ادنیٰ قوا، یعنی حواس اور شعورِ ذات، کے معروض کی حیثیت سے، اضافتًا ممکن ہو۔ جب یہ ثابت ہو جائے، تو شہادت، من حیث الشہادت، بیکار نہیں ہوتی۔ شاہد کے لیے صداقت اور اہلیت لازمی ہے۔ اسکی صداقت اُسوقت تک غیر مشتبہ ہوتی ہے، جب تک کہ ہمارے پاس اس میں شبہہ کرنے کے کافی وجوہ نہ ہوں، یا جب خود فریبی کا عام امکان اسکی بنا ہو۔ شاہد کی اہلیت اُسوقت مسلم ہوتی ہے، جب مشاہدہ کرنے، اور اُس مشاہدہ کی اطلاع دہی، کی صلاحیت کے خلاف کچھ شکایت نہ ہو۔ عام شہادت کی قابلیت اعتبار پر اس تمام بحث کے بعد اب ہم اسکی مخصوص قسموں، یعنی بالواسطہ اور بلا واسطہ، کی طرف توجہ کرتے ہیں۔

ہم نے اس سے قبل اس شہادت کو بلا واسطہ کہا ہے، جس میں وہ واقعہ، جسکے متعلق شہادت دی جارہی ہے، خود راوی یا ناقل کا ذاتی تجربہ ہو۔ وہیں ہم نے یہ بھی کہا تھا، کہ بلا واسطہ شہادت بالواسطہ شہادت کے مقابلہ میں زیادہ مرجح اور زیادہ معتبر ہوتی ہے۔ اب گذشتہ بحث سے ظاہر ہے، کہ بلا واسطہ شہادت کی قابلیتِ اعتبار میں اُسوقت اور بھی اضافہ ہو جاتا ہے، جب شاہد و مشہود

میں وہ تمام شرائط وصفات پائی جائیں، جن کا اوراق ماقبل میں ذکر ہوا ہے۔ چنانچہ اب ہم کہہ سکتے ہیں
کہ بلا واسطہ شہادت اُسوقت معتبر کہی جا سکتی ہے، جب اول شاہد میں مشاہدہ کرنے کی قابلیت
زیادہ ہو۔ اس شہادت کی قابلیت اعتبار بحیثیہ شاہد کے مشاہدہ کرنے کی قابلیت کی نسبت سے ہوتی ہے۔
جس قدر زیادہ یہ قابلیتِ مشاہدہ ہوتی ہے، اُسی قدر زیادہ معتبرہ شہادت ہوجاتی ہے۔ دوم یہ کہ
کامل ومکمل مشاہدہ کرنے کے راستہ میں رکاوٹیں کم ہوں۔ یہاں قابلیتِ اعتبار اور مشاہدہ کرنے کے
راستہ میں نسبتِ معکوس ہوا کرتی ہے۔ یعنی یہ کہ جس قدر کم یہ رکاوٹیں ہونگی، اُسی قدر زیادہ معتبرہ
شہادت ہوتی ہے۔ یہ شاذ ہی ہوتا ہے، کہ شہادت صرف ایک حادثہ، یا ایک فرد کی محدود مشاہدہ
کے اندر حادثات کے ایک سلسلہ تک محدود ہو۔ اکثر یہ ہوتا ہے، کہ جن واقعات کے متعلق شہادت
دی جاتی ہے، انکو بسبب ترک، یا بوجہ وسعت، ایک شخص پوری طرح مشاہدہ کر ہی نہیں سکتا۔ ایک
مورخ کسی محاصرہ کے چشمدید واقعات بیان کرتا ہے، اب اگر ہم صرف اُسی ایک شخص پر بھروسہ کریں،
تو ظاہر ہے، کہ یہ تمام بیان بالکل غیر مسلسل اور جزئی ہوگا، کیونکہ اسکے لیے یہ ناممکن ہے، کہ وہ ایک ہی وقت
میں حملہ کی تمام تفاصیل کا مشاہدہ کرے۔ ہوسکتا ہے، کہ اسکے فرائض کی ادائگی نے اسکو اتنی مہلت
ہی نہ دی ہو، کہ وہ ہر جگہ پھرے، اور آنکھوں دیکھی باتیں بیان کرے۔ اسکے علاوہ بعض باتیں ایسی
ہوجاتی ہیں، جو اُسوقت نظر نہیں آتیں، مثلاً قائدین کی روزانہ مشاورت۔ پھر یہ بھی ظاہر ہے، کہ
ہر ایک شخص کسی واقعہ کی تمام اہم باتوں کو معلوم نہیں کر سکتا۔ اسی وجہ سے عینی، یا بلا واسطہ شہادت
کو خاص طور پر پرکھنے کی ضرورت ہوتی ہے، اور یہ تحقیق کرنا پڑتا ہے، کہ شاہد نے اپنے آپ کو کہاں تک
ان تمام نقائص سے بچایا ہے۔

بلا واسطہ شہادت کے معتبر ہونے کی تیسری شرط یہ ہے، کہ جو کچھ مشاہدہ میں آیا ہے وہ پوری طرح
اور صحت کے ساتھ یاد بھی رکھا گیا ہو۔ غلطی کے اس راستہ پر ہم اس سے قبل تفصیلی بحث کر چکے ہیں۔
یہ اس قسم کی دلدل ہے، کہ جس سے بمشکل کوئی شخص بچ سکتا ہے۔ فرق صرف اس قدر ہے کہ کوئی شخص
کمر تک، یا اس سے بھی زیادہ اس میں پھنسا ہوتا ہے، اور کسی کا صرف پاؤں آلودہ ہوتا ہے، لیکن اس
دلدل کے اثرات ونشانات ہر شخص پر پائے جانے لازمی ہیں۔ بفرض محال اگر کوئی شخص ایسا مل بھی جائے
تو اُسکی شہادت اُسوقت لائق یقین نہیں ہوتی جب تک کہ وہ اپنے محفوظ مشاہدہ کو معقول اور غیر مبہم
علامات کے ذریعہ سے ظاہر کرنے پر قادر نہ ہو۔ اور یہی چوتھی شرط ہے۔ ظاہر ہے، کہ دوسرے اشخاص اس
مشاہدہ سے صرف اس صورت میں استفادہ کرسکتے ہیں، کہ انکو اسکی اطلاع ہوجائے۔ اگر یہ اطلاع مبہم

اور محض علامات کے ذریعے سے کی گئی ہے، تو اسکا ہونا اور نہ ہونا دونوں برابر ہیں۔ یعنی یہ کہ کوئی شخص اس سے استفادہ نہیں کر سکتا۔ دوسرے الفاظ میں شہادت کا مقصد فوت ہو جاتا ہے۔

لیکن شہادت کے معتبر ہونے کی یہ شرائط پوری ہوتی ہیں یا نہیں؟ اس کا جواب ہم بالراست نہیں دے سکتے۔ پہلے کہیں ہم نے کہا ہے، کہ ہم انکو صرف شاہد کی صفات و خصائل کی بنا پر منتج کر سکتے ہیں۔ اسکا مطلب یہ ہے کہ شہادت کی صحت کا صحیح اندازہ شاہد کی ذاتی سیرت کے تنقیدی علم سے ہو سکتا ہے۔ اسکی عقلی اور اخلاقی صفات، اور اسکے سوانح حیات ہمارے اس علم کے مآخذ ہوتے ہیں۔ لیکن اگر شاہد کی دیانتداری اور خلوص نیت قطعی اور ناقابل شک ہے، تو بلا واسطہ شہادت بے شبہہ بالواسطہ شہادت پر مرجح ہوگی۔ وجہ اسکی یہ ہے، کہ یہ شہادت صرف اس غرض سے دی جاتی ہے، کہ اس واقعہ کی قطعیت ثابت ہو جائے، اور اس شاہد کی اہلیت پر کوئی اعتراض نہ ہو سکے۔ برخلاف اسکے اگر شاہد کی صداقت و ایمانداری مشکوک فیہ ہے، یا اگر مشتبہ ہے، بالواسطہ شہادت بلا واسطہ شہادت کے مقابلہ میں زیادہ قاطع اور قوی ہوگی، اس لیے، کہ واقعۂ مشہودہ کو ثابت کرنا اس قسم کی شہادت کی غایت نہیں۔ اسکی غایت کچھ اور ہی ہوا کرتی ہے۔ اس لحاظ سے اس واقعہ کی تکذیب کرنا اس شاہد کی نیت کا جزو نہیں ہوتا۔ اسکے مقابلہ میں اگر شاہد کی اہلیت و صداقت دونوں مسلم ہوں، تو ایک واقعہ کے متعلق ایک شاہد، یا بہت سے شاہدوں کا ہونا بالکل غیر اہم ہے، کیونکہ اس حالت میں ایک ہی شاہد کی شہادت کافی و قطعی ہوتی ہے۔ اور اگر یہ دونوں صفات مشکوک ہوں، تو جس قدر زیادہ شاہدوں کا باہم اتفاق ہوگا اُسی قدر زیادہ قابل اعتبار شہادت ہوگی۔ لیکن اس ضمن میں یہ یاد رکھنا چاہیے کہ جب ایک ہی واقعہ کے متعلق بہت سی شہادتیں ہوں، تو یا تو سب کی سب ایک دوسری سے متفق ہوں گی، یا مختلف۔ اگر تمام شاہد متفق ہیں، اور ان میں سے ہر ایک کی صداقت و اہلیت مسلّم و ناقابل شک ہے، تو وہ شہادت سب سے زیادہ قابل اعتبار ہوگی۔ لیکن اگر شاہدوں کا آپس میں اختلاف ہو، تو دو صورتیں ممکن ہیں۔ یا انکا تخالف سلبی ہوگا، یا ایجابی۔ تخالف سلبی اُسوقت ہوتا ہے، جب ایک شاہد کسی ایسے واقعہ کو بیان کرنے سے سرسری پہلو تہی کرے، جسکو دوسرے شاہد نے صاف الفاظ میں بیان کیا ہے، مثلاً کسی لڑائی کے متعلق بہت سی شہادتیں ہیں۔ ایک شاہد بیان کرتا ہے، کہ لڑائی میں بادشاہ مقتول ہوا۔ دوسرا شاہد بادشاہ کے قتل ہونے کا تذکرہ نہیں کرتا۔ اب دونوں میں یہ تخالف سلبی ہوگا۔ اسکے مقابلہ میں ایجابی تخالف اُسوقت ہوتا ہے، جب ایک شاہد دوسرے کے بیان کی صریحی تردید کرے۔ مثلاً اوپر کی مثال میں دوسرا شاہد نہایت شد و مد کے ساتھ قتل شاہ سے انکار کرتے۔ جب شہادتوں میں

محض سلبی ہو، تو اس خاموشی کے بہت سے اسباب فرض کیے جا سکتے ہیں۔ لہذا محض اس خاموشی کی وجہ سے اس واقعہ کا انکار لازم نہیں آتا۔ لیکن جب یہ ثابت ہو جائے، کہ جس شاہد نے اس واقعہ کو بیان نہیں کیا وہ اسکے وقوع پذیر ہونے سے بےخبر نہ تھا، اور اسکے ساتھ ہی یہ بھی معلوم ہو جائے، کہ وہ اسکو نظرانداز کرنے سے فعل انسانی کی ممکن صورتوں سے انکار نہیں کرتا، تو صرف ایک ہی شاہد کی خاموشی سے، باقی تمام شاہدوں کی قابلیت اعتبار کم ہو جاتی ہے۔ بعض صورتوں میں تو صرف اسی وجہ سے انکی شہادتیں بالکل غیر معتبر ہو جاتی ہیں۔ اگر یہ تخالف ایجابی ہے، تو اسکی اہمیت بہت زیادہ ہوتی ہے، کیونکہ ظاہری اور بیّن تناقض محض خاموشی کی بنا پر عدم تصدیق کے مقابلہ میں، بالعموم اور نفسہ زیادہ قوی ہوتا ہے۔ اب ایجابی تخالف کی پھر دو صورتیں ممکن ہیں۔ یا تو اسکو رفع کیا جا سکتا ہے، یا یہ بالکل ناقابل رفع ہوتا ہے۔ مقدم الذکر صورت میں شہادت کی قابلیت اعتبار میں کچھ فرق نہیں پڑتا۔ شاہدوں کے تخالف کی توجیہ ان حالات سے کی جا سکتی ہے، جو شہادت کی تشریح کر سکتے ہیں، بغیر اسکے کہ اسکو غلط ثابت کریں۔ لیکن موخر الذکر حالت میں ہر ایک شہادت دوسری شہادت کو عیب ناک اور غیر معتبر بناتی ہے۔ وجہ اسکی یہ ہے کہ اس قسم کی متناقض شہادتوں میں اگر باہمی تناقض ہے، تو یہ دونوں صحیح نہیں ہو سکتیں۔ ان میں سے ایک کا غلط ہونا لازمی ہے۔ اگر ان میں باہمی تضاد ہے، تو ممکن ہے، کہ دونوں غلط ہوں۔ جب صورتِ حالات ایسی ہو، تو متخالف شہادتوں کی زیادہ یا کم قابلیت کا سوال رہ جاتا ہے۔ اگر دونوں شاہد مساوی طور پر معتبر ہوں، تو دونوں شہادتوں کو مسترد کر دینا اولی و افضل ہے۔ اگر دونوں، بلحاظ معتبر ہونے کے مساوی نہ ہوں، تو جو شاہد زیادہ قابل اعتبار ہو، اسکی شہادت بھی زیادہ معتبر سمجھی جائے گی، اور دوسرے کی غلط۔ اگر ایک شاہد معتبر ہو، اور دوسرا بالکل غیر معتبر، تو ظاہر ہے، کہ غیر معتبر کی شہادت، بالکل بیکار ہے۔

یہاں تک بلا واسطہ شہادت سے بحث تھی۔ یاد ہوگا، کہ ہم نے پیچھے اس شہادت کو بالواسطہ کہا ہے، جس میں وہ واقعہ جسکے متعلق شہادت دی جا رہی ہے، خود شاہد کا تجربہ نہ ہو، بلکہ کسی اور شخص کا ہو۔ اس نوعیت کی شہادت کی قابلیت اعتبار مبنی ہوتی ہے اس بات پر، کہ بلا واسطہ اور بالواسطہ دونوں، شاہدوں کی اطلاع معتبر ہے۔ اب بلاواسطہ شاہد کی اطلاع کے معتبر ہونے کو ہم خود معلوم کر سکتے ہیں۔ یعنی اسکی دیانتداری اور اہلیت کے متعلق ہمیں اتنی تحقیق کر لینا ہے جتنا ہونا ممکن ہو سکتا ہے۔ اگر ہم کو پوری طرح واقفیت ہے کہ وہ راستباز ہے، اور یہ کہ اس خاص واقعہ کے مشاہدہ کرنے کا اہل بھی ہے، تو اسکی شہادت بالکل معتبر کہی جا سکتی ہے۔ لیکن یہ ظاہر ہے، کہ یہ شہادت ہر جگہ اور ہر شاہد کے متعلق میسر نہیں آتی۔ ایسی صورت میں

ہم اس شہادت کے متعلق کچھ نہیں کہہ سکتے، ایسے موقعوں پر بالواسطہ شاہد بلا واسطہ شاہد کے معتبر ہونے کا ضامن ہوتا ہے، کیونکہ بالواسطہ شاہد میں بلا واسطہ شاہد کی قابلیت اعتبار کو جانچنے، اور اسکی اطلاع کو بلا کم و کاست ابلاغ کرنے میں دیانتداری کو معلوم کرنے کی صلاحیت ہوتی ہے۔ اسکا مطلب یہ ہے کہ وہ خود کسی ایسی شہادت کا راوی و ناقل بننا پسند نہیں کرتا، اور نہ کریگا، جسکا شاہد کسی حیثیت سے ناقص ہو۔ لیکن جب بالواسطہ اور بلا واسطہ دونوں شاہدوں کی ثقاہت کافی طور پر ثابت ہو چکی ہو، تو قابلیتِ اعتبار کے لحاظ سے دونوں نوع کی شہادتیں مساوی ہوتی ہیں۔ ہم یہاں تک کہہ سکتے ہیں، کہ اگر خود بالواسطہ شاہد بلا واسطہ شاہد کی شہادت کو جانچنے کا اہل ہے، تو اسکی شہادت سے بلا واسطہ شاہد کی تصدیق ہوتی ہے۔ ایک اور صورت یہ ہو سکتی ہے، کہ بلا واسطہ شاہد کی قابلیتِ اعتبار تو ناقابل انکار ہے، لیکن اس شہادت کا دوسرا راوی یا ناقل معتبر نہیں۔ اس حالت میں بالواسطہ شہادت بلحاظ استناد کے بلا واسطہ شہادت کے مقابلہ میں کمتر ہوتی ہے، اور استناد کی یہ کمتری اسی نسبت سے ہوتی ہے جو دونوں شاہدوں کی قابلیتِ اعتبار میں ہے۔ بالواسطہ شاہد بلحاظ مکان و زمان قریب ہوتے ہیں یا بعید۔ پھر ان میں سے ہر ایک یا تو اپنی شہادت کے لیے کسی اور پر موقوف ہوتا ہے، یا غیر موقوف۔ بالعموم زمانۂ قریبہ کے شاہد زمانۂ بعیدہ کے شاہدوں کے مقابلہ میں، اور غیر موقوف شاہد موقوف شاہدوں کی نسبت زیادہ معتبر ہوتے ہیں۔ زمانۂ بعیدہ کے شاہد اس صورت میں ناقابل اعتبار ہوتے ہیں، جب ان کے اور اصل شاہد کے درمیان شاہدوں یا راویوں کا سلسلہ معدوم ہو یا ناقص ہو۔ موقوف شاہد اسوقت بلحاظ اعتبار کمتر ہوتے ہیں، جب وہ بات، جس پر انکی شہادت موقوف ہے، غلط ہو، یا ابھی تک ثابت نہ ہوئی ہو۔ بلا واسطہ شہادتوں کی طرح، بالواسطہ شہادتیں بھی کبھی مستقیم ہوتی ہیں اور کبھی غیر مستقیم۔ اسی طرح جب بہت سے بالواسطہ شاہد ہوں، تو انکی شہادت یا تو متفق ہوتی ہے یا متخالف۔ دونوں صورتوں میں شاہدوں کی قابلیت اعتبار انھیں اصول سے جانچی جاتی ہے، جن کا ذکر بلا واسطہ شہادت کے ضمن میں ہوا ہے۔

بہت سے بالواسطہ شاہد، اگر ہمعصر ہیں، تو ان کی شہادت کو افواہ کہتے ہیں۔ اور اگر ہمعصر نہ ہوں، بلکہ بلحاظ زمان متعاقب ہوں، تو ان کی شہادت روایت کے نام سے موسوم کی جاتی ہے۔ لیکن دونوں صورتوں کے لیے مشترکہ شرط یہ ہے، کہ ان کا کوئی مسلّم بلا واسطہ شاہد نہ ہو۔ پھر اگر جس بات کی افواہ ہو، یا جو بات روایت کی جائے، اس کی تکذیب نسبتہً آسان، اور اس لیے نسبتہً ممکن ہو، تو انکی قابلیتِ اعتبار بھی اسی نسبت سے کم ہو جاتی ہے۔

یہاں تک تقریری شہادت کا ذکر ہوا ہے، لیکن شہادت دینے کا صرف یہی ایک طریقہ نہیں،

یہ اکثر اور بیشتر شہادتیں تحریری ہوتی ہیں۔ اُن کو جانچنے کے اصول ذرا مختلف ہیں، جن کا ذکر اگلی صحبت میں ہوگا۔

معتضد ولی الرحمٰن ایم اے

معلم فلسفہ، جامعہ عثمانیہ - حیدرآباد - دکن -

عاشق کی التجا

اس عاشق بیتاب کو غم میں سسکتا چھوڑ کر
میرے دل صدچاک کو یوں ہی تڑپتا چھوڑ کر
سچ مچ چلی جائے گی تو؟ کیا پھر نہیں آئے گی تو؟
کہدے نہیں، کہدے نہیں!

اور آہ! کیا تو جائے گی؟ اُس دل کو تنہا چھوڑ کر
جس کی ہے تجھ سے زندگی تجھ بن ہے جو شمع سحر
جو تجھ پہ ہے ہردم فدا پڑھتا ہے جو کلمہ ترا
کہدے نہیں، کہدے نہیں!

ہے آنکھ میں جلوہ ترا اور دل کو تجھ سے کام ہے
اس سر میں ہے سودا ترا اور لب پہ تیرا نام ہے
تیری قسم مجھ کو کہیں بھاتا نہیں کوئی حسیں
کہدے نہیں، کہدے نہیں!

ہاں ہاں جا میرا کہا بیکار کیوں بدنام ہو
میرے غم و اندوہ کا کیوں تجھ پہ کچھ الزام ہو
میری دعا کو جان کر اپنی حیا کو مان کر
کہدے نہیں کہدے نہیں!

جلیل قدوائی (علیگ)

زنانِ شرق کی ہمہ گیر بیداری

اس مضمون کو آئے ہوئے بہت عرصہ ہوا، مگر تلف ہو جانے کے باعث اس قدر دیر از وقت شائع ہو رہا ہے، جس کے لیے ہم مُلّا صاحب سے معذرت خواہ ہیں۔

سب ایڈیٹر

زمین کے وہ وسعت آباد حصے جو افریقہ و ایشیا کے دو براعظموں پر منقسم ہیں، اور جنھیں براعظم یورپ و امریکہ کے مقابل "مشرق" کہتے ہیں، آج سے صدیوں پہلے انسانی آبادی کے "نیم وحشی" اور "غیر متمدن" حصے سمجھے جاتے تھے۔ لیکن اس امر واقع سے کسی کو انکار نہیں ہو سکتا، کہ عین اُسوقت جبکہ مغرب کی موجودہ تہذیب و شائستگی اور اُسکی ہمہ گیر رفعت و ترقی، اُسکی جہالت و بربریت کے تاریک ترین پردوں میں پوشیدہ تھی، یہی مشرق تھا جو انسانی تہذیب و ترقی، معاش و معاد، اور جہانگیری و جہانبانی کی درخشاں روایات کا جلوہ بردار بنا ہوا تھا۔ لیکن وقت آیا کہ مشرق کا یہی نور افگن و ضیا بار آفتاب جمود و بےخبری اور جہل و نادانی کی عمیق گہرائیوں میں ڈوب گیا۔ اور ایک بڑھتی ہوئی تاریکی نے اسکی تمام افق تابانیوں کو گھیر لیا۔ شاید مشرقی زوال و برہمی کا یہ قدرتی لازمہ تھا کہ مغرب کی سوتی ہوئی قومیں نئی اور محیر العقول بیداریوں کے ساتھ اُٹھیں، اور انھوں نے مشرق کی تمام پچھلی تابناک روایات کو چھین لیا، اور نہ صرف یہی، بلکہ اُنھوں نے جرأت و اولوالعزمی اور ذہنی تفوق کے ساتھ مشرق کی تمام ارضی وسعتوں کو فاتحانہ اقدام کے ساتھ روند ڈالا۔ اب مشرق دنیا کے اُن مقہور و مفتوح حصص ارضی میں شمار ہونے لگا جن کی عظمت و سطوت پر خدائے جلال و جلیل کا قہر و غضب نازل ہو کر اُنھیں کسی ذلیل ترین مخلوق کے زیر نگیں کر دیتا ہے۔ پس مشرق کا یہی وہ زوال تھا جسکے ساتھ اُس نے اپنی نکبت و غلامی کی کئی صدیاں گذار دیں۔ اور کوئی نہیں تھا، جو آج سے چند سال پہلے مشرق کے کھوئے ہوئے عروج و اقبال کے از سر نو جلوہ گر ہونے کی پیشگوئی کر سکتا۔ لیکن اسے نظام عالم کا ایک قدرتی انقلاب کہیے، کہ سنہ ۱۹۱۴ء کا وہ زمانہ آگیا جبکہ مغربی نظام اقتدار کی استوار بنیادیں جنبش میں آنے لگیں، اور سنہ ۱۹۱۷-۱۹ء میں ایک غیبی ہاتھ آیا جسنے یورپ کی کبھی نہ فنا ہونے والی متحدہ قوت کو "ورڈن" کی پہاڑیوں پر ٹکرا کر پاش پاش

کر دیا اور "بلجیم" "سرویا" "رومانیہ" و "مانٹی نگرو" اور "روس وشمالی فرانس" کا وہ عظیم الشان جرمن فاتح فیلڈ مارشل وان ہنڈنبرگ، جسکی قہرمانی کمانڈ نے دنیائے امن و عافیت کو لرزہ براندام کر دیا تھا، ایک مایوس و حرماں نصیب انسان کی طرح برلن واپس ہو گیا، "وائنا و ہنگری" کے اندرونی خلفشار نے خاندان ہیپسبرگ کا خاتمہ کر کے جمہوری نظام حکومت کا علم بلند کر دیا، اور برلن سے وہ انسانِ اعظم قیصر ولیم جو ہلاکو اور چنگیز خانی قوتوں کا مالک بنا ہوا تھا، سوئٹزرلینڈ کی تاریکیوں میں بند کر دیا گیا، اور اس طرح مغرب کی یہ غلغلہ انداز باہم آویزی ختم و تمام ہو گئی جو "جنگ فرنگ" کے نام سے نمودار ہوئی تھی -

اب حادثۂ فرنگ جہاں بہت سی ہلاکت باریاں اپنے ساتھ لایا تھا، وہاں وہ ایک دوسرے خطۂ ارضی کے دوبارہ عروج و ارتقاء کے لیے حیرت انگیز اثرات بھی اپنے پیچھے چھوڑتا گیا، اور جنگ مذکور کے یہ وہ بقیہ اثرات تھے جنکے ذروں سے آج مشرق کا پھر وہی آفتاب طلوع کرتا دکھائی دے رہا ہے جو صدیوں سے گہن میں آچکا تھا -

---

آپ غور کیجیے کہ ۱۹۱۴ء سے پہلے مشرقی اقوام کے عروج و کامرانی اور ان کی دوبارہ سربلندی و سرفرازی کا تصور بھی ایک مضحکہ خیز عقیدہ سمجھی جاتی تھی - لیکن یہ غلط ہے کہ مشرق کی تمام قوتیں سلب ہو چکی تھیں، اور وہ ایک کبھی دور نہ ہونے والی گراں خوابی کا شکار ہو چکی تھیں، بلکہ اصل یہ ہے کہ مشرق عروج و ترقی اور کمال و سرفرازی کی ان تمام وہبی قوتوں کو اپنے آغوش میں تربیت کر رہا تھا البتہ انکا ظہور و نمو ایک غیر معمولی حادثہ کا منتظر تھا - لہذا حادثۂ فرنگ نے بیات تخیش ان تمام پردہ پوش بیداریوں کو بے نقاب کر دیا جنکی جلوہ ریزیوں سے آج افق مشرق جگمگاتا نظر آتا ہے اور مشرق کی انھی غیر متوقع بیداریوں میں وہ ایک لطیف بیداری بھی جلوہ فرما ہے جسے مشرق کی صنف نازک سے تعلق ہے - اور آج مشرقی دماغ زنان شرق کی موجودہ بڑھتی ہوئی رو میں انسانی عظمت و برتری کی وہ تکمیل دیکھ رہے ہیں جو صنفِ نازک ہی کے ساتھ مخصوص و متعلق ہے - اور وہ لوگ اب حیرت زدہ میں ہیں جو عورت کو حیاتِ اجتماعی کا ایک غیر ضروری جزو تصور کرتے تھے - وہ دیکھ رہے ہیں اور حیرت سے دیکھ رہے ہیں کہ مشرق کے ہر حصۂ ملک میں عورت مرد کے ہمدوش و ہمرکاب حیات انسانی کے تمام شعبوں میں اپنی اُن خداداد قوتوں سے سرگرم عمل ہے، جو آج سے پہلے صرف مرد کا مخصوص سمجھی جاتی تھیں -

اب یہ معلوم کرنے کے لیے کہ زنانِ شرق نے صرف دوازدہ سالہ فرصت اور اپنے موجودہ محدود دائرۂ عمل میں کن مافوق الادراک کارناموں کا اظہار کیا، میں مشرق کے ہر ملک کی نسوانی بیداری کا ایک خلاصہ پیش کرتا ہوں :

خواتین ترکی

عہدِ رفتہ میں تو شاید عورت کی ترقی اور اُسکا منتہائے کمال چند خانگی اور معاشرتی کارگذاریوں اور ذمہ داریوں تک محدود تھا، لیکن عہدِ حاضر میں "تہذیب و تمدن" "سیاست و جہاں بانی"، اور سب سے آخر ملکی و قومی مدافعت کے خون ریز و جرأت آزما فرائض کا بوجھ بھی اس نازک ترین ہستی کے ناتوان کاندھوں پر ڈال دیا گیا ہے، لہذا مذکورہ امور و ذمہ داریوں کی حیرت انگیز تکمیل و بجا آوری میں جو مرتبہ ترکی خواتین کو حاصل ہے وہ مشرق کی کسی دوسری قوم کو حاصل نہیں، اور میں اپنے انتہائی غور و مطالعہ کے بعد یہ کہنے کے لیے تیار ہوں کہ بہ اعتبارِ عمل مشرقی ممالک میں عورتوں کا جو کارکن طبقہ سب میں اولیت کا فخر حاصل کر چکا ہے وہ "زنانِ ترکی" ہیں -

میں ترکی عورتوں کے عہدِ بیداری کی کسی قدیم ترین تاریخ کو دہرانا نہیں چاہتا، بلکہ یہ دکھلانے کے لیے کہ خواتینِ ترکی ہی زنانِ شرق کی موجودہ بیداری کی نقیب و رہنما ہیں، اُنکے اُس تاریخی مظاہرہ سے ابتدا کرتا ہوں جبکہ وہ ۱۲-۱۹۱۱ء کی مشہور جنگِ بلقان کی خوننابہ فشانیوں میں ملک و ملت کے حفظ و دفاع کی خاطر میدانِ عمل میں گام زن ہوئیں اور ترکی قوم کی یہ وہ صاحبِ عزم و ثبات بیٹیاں تھیں جو عہدِ حمیدی میں تعلیم و تربیت اور تہذیب و علمیت کے جواہر سے آراستہ ہو چکی تھیں۔ جنگِ بلقان میں جب ترکی تہذیب و قومیت پر ریاستہائے بلقان نے متحدہ اور تباہ کن حملہ کیا تو ترکی عورتیں قومی مدافعت کے لیے مردانہ وار میدانِ عمل میں آگئیں، اور اُنھوں نے داخلی انتظامات کے ساتھ ساتھ میدانِ کارزار میں مردوں کی امداد کے لیے جماعتیں اور انجمنیں قائم کیں، اور ایک ایسا متحدہ نظامِ عمل وضع کیا جس کی ترتیب و تنظیم میں مردانہ اصولِ کار کی تمام تر تکمیل کی گئی تھی، ان جماعتوں کی سرگروہ خاتون وہی خالدہ خانم تھیں جن کے لیے صدرِ اعظم دولتِ عظمیٰ انگورہ حسین رؤف بے نے ایک موقع پر کہا تھا کہ:-

"مشرق نے کئی صدی کے بعد ایک عورت پیدا کی ہے، اور وہ خالدہ ادیب خانم ہیں"

خالدہ ادیب خانم اسوقت "عثمانیہ زنانہ کالج" کی پروفیسر ادبیات و السنۂ مغرب تھیں۔ وہ اس سے پہلے ترکی میں حسبِ ذیل انجمنوں کی بنیاد رکھ چکی تھیں :- جمعیتِ اصلاح رسوم-

جمعیتہ تبلیغ تعلیم ۔ جمعیتہ پرورش اطفال، جمعیتہ امداد و اصلاح بیوگان و یتامیٰ، جمعیتہ حقوق نسواں، اب جو ملک و وطن پر حملہ ہوا، تو انھوں نے عورتوں کے ذریعہ ناموس وطن کی حفاظت اور اپنی قومی آزادی کی بقا کے لیے ذیل کی نسوانی جماعتیں بنائیں ۔

(۱) انجمن تبلیغ و اشاعت ۔ جو اندرون ملک تقریروں اور مظاہروں کے ذریعہ جنگی روح کو بیدار کرتی تھی ۔ اس جمعیتہ کی صدر سیدہ نفیسہ نزہت خانم تھیں، جو عثمانیہ یونیورسٹی سے فن تاریخ میں اعلیٰ درجہ کی کامیابی حاصل کر چکی تھیں، اور اسوقت ترکی اخبار "عالم نسواں" کی ایڈیٹر تھیں، اسی جماعت کی ایک شاخ اہل قلم خواتین پر مشتمل تھی، جو تحریر کے ذریعہ تمام دنیا سے استمداد کرتی تھی ۔

(۲) انجمن خدام جنگ ۔ اس جماعت میں وہ عورتیں شریک تھیں جو مجروحین کی خدمات انجام دیتی تھیں، اور اس مجلس کی صدر کاظم خانم تھیں، جو سینٹ پیٹرس برگ یونیورسٹی کی اعلیٰ گریجویٹ تھیں ۔

(۳) انجمن باربرداری و متفرقات ۔ اس جماعت کے متعلق متفرق خدمات تھیں، اور اسکی صدر فاطمہ خانم تھیں ۔ جنھوں نے معاشیات کی اعلیٰ تعلیم حاصل کی تھی، اور اخبار عالم نسواں کی نائب مدیر تھیں ۔

(۴) انجمن تلمیذات عثمانی ۔ یہ جماعت مدارس نسوانیہ کی طالبات پر مشتمل تھی، جو علاوہ متفرق خدمات کے مردوں کو میدان جنگ کے لیے ابھارتی تھی ۔ ان لڑکیوں کی انجمن کی صدر سیدہ نفیسہ خانم تھیں جو انسپکٹر تعلیمات نسواں بھی تھیں ۔

مذکورہ انجمنوں نے ترکی قوم کی جو خدمات انجام دیں اور ملک و ملت کو جن مصائب و خطرات سے بچایا، انکی تفصیلات سے قطع نظر ترکی خواتین کے ایک ایسے تاریخی جلسہ کا خلاصہ پیش کرتا ہوں، جسکے حاضرین میں صرف عورتوں کی تعداد چھ ہزار تھی، اس جلسہ میں ترکی عورتوں کی اعلیٰ تعلیم یافتہ، پروفیسر، ایڈیٹر، اور لیکچرار عورتوں کی ایک کافی تعداد موجود تھی، جو ترکی عورتوں کی تمدنی اور قومی بیداری کی تصدیق کرتی تھی ۔ ان میں نگار خانم مشہور ترکستانی شاعرہ جنکا ایک دیوان خاکسار راقم الحروف کے پاس موجود ہے، امیرہ نعمت خانم، حلیمہ سعدی خانم، جمیلہ محمود خانم، اور نفیسہ نزہت خانم ایڈیٹر عالم نسواں خاص طور پر قابل ذکر ہیں ۔ ان فضیلت پناہ ترکی خواتین کے ان کارناموں کو اگر میں یہاں نقل کر دوں، جن سے "عثمانی سرکاری رپورٹیں" اور بعض ترکی مطبوعات بھرے پڑے ہیں، تو ہیجان و ولولہ انگیزی کا ایک طوفان امنڈ سکتا ہے، لیکن جلسہ مذکور میں نفیسہ نزہت خانم ایڈیٹر عالم نسواں

کی ایک ایسی تقریر کے چند الفاظ پیش کرتا ہوں جسکا ایک ایک فقرہ حیات وکامرانی، اور مصائب کے وقت جرأت وشہامت، اور مردہ دلوں کی گرمی کے لیے اپنے اندر سیکڑوں شعلہ سامانیاں لیے ہوئے ہے۔ عثمانی قوم کی یہ صاحبِ علم و تاریخ خاتون جلسۂ عام میں مَردوں اور عورتوں کو مخاطب کرکے اپنی قومی حمیت اور تاریخی معلومات کے جواہر ریزے اس طرح بکھیرتی ہے:

"تم میں سے ہر فرد جانتا ہے کہ ہمارے اجداد نے یورپ کی چالیس ملین آبادی پر حکمرانی کا جھنڈا اُڑایا ہے، تم اگر توپ و تفنگ سے بھی سوال کروگے کہ جنگ و نبرد آزمائی کے ابطال و اقطاب کون ہیں؟ تو وہ جواب دیں گے "عثمانی"! جن کی خاراشگاف تلواریں دشمنوں کے سینوں میں در آنے کے لیے میانوں کی تنگ دامانی میں تڑپتی رہتی تھیں۔

جاؤ۔ ویانا کے قلعوں کی سیر کرو، ایشیا میں گشت لگاؤ، تمھیں ہر جگہ اپنے آبا و اجداد کے مناقب منقوش نظر آئیں گے، کیا تم نہیں جانتے کہ تاریخِ یورپ تو گویا عثمانیوں کی شجاعت کی تابناک شہادت ہے، اگر شاہ سویڈن شارل دوازدہم اپنی قبر سے اٹھ کر آسکتا تو وہ اسوقت بھی تمھارے سامنے سرخمیدہ ہو کر عثمانی عظمتوں کا اعتراف کرتا۔ ہم تاریخی مسلم الثبوت شجاعوں کی اولاد ہیں جن پر دشمن حملہ کرنے میں اب بھی سہم جاتے ہیں۔ باوجودیکہ کعبۃ اللہ کی خدمت اور شام و بغداد، بلادِ عرب اور اناطولیہ ہمارے زیرِ امارت ہیں، لیکن پھر بھی تمھارے دل بیقرار اور مُنہ اُترے ہوئے ہیں، اے غیور عثمانیو۔ ایسا نہ ہو کہ دشمن تمھارے اس ہراس سے فائدہ اُٹھالے، لہٰذا تم اُس پر ثابت کردو کہ ہمارے چہروں پر ہراس و بے خونی کے اثرات نہیں، بلکہ ہمارے آبا و اجداد کے خون کا عکس ہے جسنے ہمارے چہروں کو سرخ بنا دیا ہے۔

اُٹھو۔ اور ایک مرتبہ لمبغاری بزدلوں کو پھر بتلا دو کہ ہم اُن غیور عثمانیوں کی اولاد ہیں جنھوں نے مغرب کی تمام عظمتوں کو بیزانطائن میں دفن کردیا تھا۔" (مقتبس از الشعب مصر القاہرہ - ۷ فروری ۱۹۱۳ء)

ترکی خواتین کا عہد اول ختم ہوگیا۔ ۴۔ اگست ۱۹۱۴ء کو یورپ کی وہ ہولناک جنگ شروع ہوئی، جسکے برہم کن اثرات سے آج بھی دنیا کو رستگاری نصیب نہیں۔ لیکن جنگ مذکورہ کی ان تمام ہلاکت بار آویزشوں نے ترکی خواتین کی عملیت کو متاثر نہیں کیا، بلکہ وہ اسی حادثہ میں، تعلیم و معاش کے شعبوں میں مصروف رہیں، انکی تمام انجمنیں اُسی اطمینان سے کام لیتی رہیں۔ جس وقت جرمنی نے اعلان جنگ کیا اور اتحادی ٹڈی دَل فوجوں کے اقدام سے مملکت بلجیم کا چپہ چپہ دہل رہا تھا،

ترکی خواتین ایک سو کی تعداد میں جرمن درسگاہوں میں ترکی حکومت کے وظائف سے تعلیم پا رہی تھیں۔ سینٹ پیٹرسبرگ یونیورسٹی میں زیرِ تعلیم ترکی خواتین کی تعداد (۱۴۰) تھی۔ وہ سیاسی مراعات کے حصول میں قدرے کامیابی حاصل کر چکی تھیں۔ نوجوان ترکی پارٹی کے بیدار مغز رہنما نسوانی تعلیم کے لیے حوصلہ افزا جد و جہد سے کام لے رہے تھے۔ یہاں تک کہ جس وقت سنہ ۱۹۱۶ء میں عراقی حدود میں ترکی و انگریزی معرکہ آرائی ہوئی تو ترکی عورتوں کی ایک ذی حوصلہ جماعت میدانِ جہاد میں نکل آئی، اُنکی تمام اصلاحی مجلسیں دفاعِ وطن کی خدمات میں مصروف ہو گئیں، اُنھوں نے دنیا کے تہذیب میں اپنی حیرت انگیز خدمات سے نہایت بیدار کن اثرات پیدا کیے، اُسوقت بھی ترکی خواتین کی مشہور قائدہ خالدہ ادیب خانم وزارتِ جنگ کا ہاتھ بٹانے میں مصروف تھی۔ چنانچہ سنہ ۱۹۱۷ء میں ممدوحہ نے ترکی فوجوں میں جذباتِ جہاد پیدا کرنے کے لیے ایک معرکۃ الآرا ناول لکھا۔ جو وزارتِ جنگ کی طرف سے ہزاروں کی تعداد میں شائع ہو کر فوجوں میں تقسیم کیا گیا، اور جس وقت برطانی فوجوں نے مقام غازہ کی ترکی خندقوں کو فتح کیا، تو اُن میں اس ناول کے سیکڑوں نسخے پائے گئے تھے۔

اب سنہ ۱۹۱۹ء میں اتحادی فوجوں نے ترکی حکومت کے دار الصدر قسطنطنیہ پر قبضہ کر لیا اور ایشیائے کوچک کا زرخیز علاقہ یونان کے قبضہ میں دیدیا گیا جسکے اثر سے انگورہ میں ترکی احرار کی تحریکِ وطنی کا آغاز ہوا، اور ترکی خواتین جوق جوق حفظِ وطن کے لیے میدانِ عمل میں پھر گامزن نظر آنے لگیں، مارشل مصطفیٰ کمال پاشا نے ترکی خواتین کی بیداری اور حبِ وطن کے جذبات سے کام لیکر جسوقت میدانِ جنگ میں ترکی خواتین کو شرکتِ عمل کی دعوت دی تو خالدہ خانم ہی سب سے پیش پیش نظر آتی تھیں۔ وہ اپنی خداداد قابلیت کی بنا پر اپریل سنہ ۱۹۲۰ء والی پہلی انگورہ وزارت میں وزیرِ تعلیمات مقرر ہوئیں اور ستمبر سنہ ۱۹۲۱ء میں وہ مشہور یونانی حملہ میں خواتین کے ایک جرار لشکر کے ساتھ انگورہ کی حفاظت کے لیے میدانِ جنگ میں خدمات انجام دیتی رہیں۔ اناطولیہ میں ترکی زنانہ لشکروں کی تحریک پر تمام عورتیں شریکِ جہاد ہوئیں جن میں میجر عائشہ خانم، لفٹنٹ فاطمہ خانم اور کمانڈر انچیف خالدہ خانم کی تبرد آزمائی کی تہلکہ انداز شہرت ابد الآباد تک قائم رہیگی۔ یہ بہادر ترکی عورتیں اس وطنی جہاد میں اسی ہزار کی تعداد میں شریک ہوئی تھیں، اور آخر اگست سنہ ۱۹۲۲ء میں مارشل مصطفیٰ کمال پاشا نے سمرنا پر جو تاریخی حملہ کیا، اُنکے لشکروں کے عقب میں زنانہ لشکر پوری مستعدی سے مصروف پائے گئے۔ ان میدانی مجاہدات کے ساتھ ہی جو صاحبِ فضل و کمال خواتین حکومتِ انگورہ کے دوسرے محاکم انتظامی میں کام کر رہی تھیں اُنکی تعداد حسبِ ذیل تھی:

۱-	محکمۂ تعلیمات عامّہ	۳۵،
۲-	شفا خانے	۱۴،۹۳
۳-	محکمۂ ٹیلیگرافات	۳۰۱
۴-	بار برداری	۹۵۹
۵-	متفرق دفاتر	۵۰۴۳

(مقتبس از خواتین انگورہ۔ مطبوعہ دائرۂ ادبیہ لکھنؤ۔ صفحہ ۹)

تحریک انگورہ کے بعد عین اس حالت میں جبکہ کامل دس سال کی متواتر معرکہ آرائیوں کے بعد بھی ابھی ترکی نوجوں نے ہتھیار نہیں کھولے تھے، ذی حوصلہ ترکی خواتین، تمدنی، معاشی، علمی و ملکی اصلاحات میں مردوں سے آگے سرگرم عمل نظر آنے لگیں۔ فیلڈ مارشل مصطفٰے کمال پاشا کی کارکن نگرانی سے زیادہ بیدار مغز جماعت نے ترکی خواتین کے نئے عمل سے پورا فائدہ اٹھاتے ہوئے اُنھیں مراعات و ترقی کے تمام وسائل بہم پہونچائے۔ ۱۷۔ فروری ۱۹۲۳ء کو سمرنا میں ترکی خواتین کی علمی و اصلاحی سرگرمی کا وہ زبردست مظاہرہ ہوا جسکی عظمت اور رو اداری پر شرق کے بڑے بڑے مدبرین عش عش کر اُٹھے۔ سمرنا میں فیلڈ مارشل کاظم قرہ بکر پاشا فاتح آرمینیا کی صدارت میں اقتصادی کانفرنس کا اجلاس منعقد ہوا، جسکے متعدد دور تین دن تک تجاویز لوائح عمل مرتب کرتے رہے۔ اس کانفرنس میں ترکی خواتین نے جو زبردست حصہ لیا اُسکا ادنیٰ نمونہ یہ ہے کہ اس میں ترکی خواتین کی تنہا نمائندہ عورتوں کی تعداد ۵۰۰ تھی۔ ان نمائندہ عورتوں نے اقتصاد و معاد کے اہم شعبوں کے لیے (۱۳) سو دے اور (۱۷) تجاویز پیش کیں۔ شادی سے لیکر طلاق و تعدد ازدواج تعلیم، حفظان صحت، سیاسیات اور پرورش اطفال کے مہتم بالشان مسائل حل کیے گئے۔

۱۹۲۴ء میں قسطنطنیہ کے مشہور لیکچر ہال (ترک اوجاقی) میں ترکی خواتین کا دوسرا مظاہرہ ہوا، جہاں نسوانی امور خانہ داری کی تنظیم و اصلاح اور فرائض کی ترمیم و تشکیل کے لیے ترکی خواتین کی وہ عظیم الشان کانفرنس منعقد ہوئی جس میں ترکی حکومت کے بڑے بڑے وزراء، ایڈیٹر، مصور، اور عوام کے نمائندے موجود تھے، اس کانفرنس میں ترکی عورتوں کی تعداد تین ہزار تھی۔ اور اس عظیم الشان کانفرنس کی صدر علامہ نزہیہ محی الدین خانم تھیں، انکی زیر صدارت متعدد مسائل پیش کیے گئے، جن میں سے بعض یہ تھے:

(۱)　امور خانہ داری کی تنظیم

(۲) مرد و عورت کے فرائض کی تقسیم

(۳) نسوانی حقوق و مطالبات کی تعیین

(۴) حق تلفیوں پر احتجاج

(۵) تعدد و طلاق کی اصلاح

(۶) زنانہ جرائد و رسائل کا اجراء

ان عظیم و مہتم بالشان مسائل کے حل کے لیے ترکی خواتین کی جو کمیٹی اس کانفرنس نے مقرر کی تھی اس نے بڑی قابلیت سے ان امور کا حل قوانین و ضوابط کی صورت میں مرتب کر کے کانفرنس کے عام اجلاس میں پیش کیا وہ یہ تھیں:-

خالدہ ادیب خانم وزیر تعلیمات انگورہ، صبیحہ زکریا خانم، نقیہ خانم، عزیزہ خانم، نزہیہ محی الدین خانم، کانفرنس مذکور میں حسب ذیل خواتین خاص طور پر قابل ذکر و تعارف ہیں۔ بیگم حکمت خانم حکمت خانم مشہور ترکی صحافی ڈاکٹر احمد احسان بے ایڈیٹر "ثروت و فنون" کی صاحبزادی ہیں جنہوں نے زنانہ امریکن کالج میں اعلیٰ تعلیم حاصل کی ہے۔ "ثروت و فنون" ترکی زبان کا وہ مجلہ علمیہ ہے، جسکی دیدہ زیبی اور معارف پروری میں ہندوستان کا ایک پرچہ بھی مقابلہ نہیں کر سکتا۔ "ثروت فنون" کے چند نوازتین پرچے راقم الحروف کو مارچ ۱۹۲۲ء میں بمقام بمبئی اپنے ایک ترکی دوست سے حاصل ہوئے تھے جو بلحاظ مضامین و طباعت اپنا جواب نہیں رکھتے۔ صبیحہ زکریا خانم جو واشنگٹن کالج کی اعلیٰ گریجویٹ ہیں۔ عزیزہ قبرسی خانم، جو مصطفےٰ پاشا کی صاحبزادی اور زنانہ ٹریننگ کالج کی پرنسپل ہیں۔ نازلی توانیہ خانم آپ فرانسیسی زبان کی ادیب اور زبردست مقررہ ہیں۔ آپ کے والد ولی شمسی بے کسی زمانہ میں پیرس میں ترکی سفیر رہ چکے ہیں۔ سعدی خلیل خانم، جو ہز ایکسیلنسی خلیل ادہم پاشا ڈائرکٹر جنرل شاہی عجائب خانہ کی صاحبزادی ہیں۔

یہ تو وہ حالات تھے جو ترکی خواتین کی ذاتی علمیت اور کوششوں سے متعلق تھے، اب ترکی حکومت اپنی عورتوں کو تہذیب و ترقی کے جو مدارج طے کرا رہی ہے، اسکی تفصیل یہ ہے کہ ملک میں کثیر التعداد زنانہ درسگاہیں قائم کی گئی ہیں، تمام زنانہ مدارس میں فرنچ، انگریزی، جرمنی زبانیں پڑھائی جاتی ہیں جن میں فرنچ و انگریزی لازمی ہے۔ فنون لطیفہ کے متعلق اسکولوں کے ساتھ ایک زنانہ ٹریننگ کالج بھی ہے، جسکی تمام عہدہ دار ترکی عورتیں ہیں جنہوں نے یورپ سے اعلیٰ ڈگریاں حاصل کی ہیں۔ زنانہ ہائی اسکولس میں جو نصاب رائج ہے اُس کا ایک حصہ یہ ہے:

علم حفظانِ صحت، تربیتِ اطفال و امورِ خانہ داری، تاریخ، علم الاجتماع، علم الاقتصاد، سیاسیات و مذہبیات۔[1]

ترکی خواتین کی علمی و سیاسی بیداری کے یہ وہ مختصر حالات ہیں جنھوں نے اس قلیل عرصہ میں مشرق کی تمام عورتوں میں قومیت اور عملیت کی ایک نئی روح پیدا کر دی ہے، اور آج جو مشرق کے ہر گوشہ سے نسوانی تحریکات کی آوازیں سنائی دیتی ہیں وہ انھیں بیدار مغز اور روشن خیال ترکی عورتوں کے عمل کی صدائے بازگشت ہے۔

خواتینِ روس

مملکتِ روس مشرق کی وہ عظیم الشان حکومت ہے، جسکے متعلق کبھی یہ مشہور تھا کہ اُسکی حدود میں سورج کبھی غروب نہیں ہوتا، سنہ ۱۹۱۷ء کے انقلاب نے اسکے شاہنشاہی اقتدار کو ملیا میٹ کر کے ایک نئے قومی دور کا آغاز کیا۔ جس کا بانی کامریڈ لینن تھا۔ عہدِ انقلاب سے قبل روسی قوم کی حالت ایک غلام اور ماتحت قوم سے کچھ زیادہ نہ تھی، جو شاہی خاندان کی مستبدانہ پالیسی کے تحت ذلت و زوال کی عمیق تاریکی میں زندگی کے دن گزار رہی تھی، باوجودیکہ روسی باشندوں میں "کاسک" ایسی زندہ اور جنگجو قوم کے افراد ترقی کی طرف زبردست میلان رکھتے تھے، سلطنتِ روس قومی اصلاح و ترقی کے لیے سرگرمِ عمل تھے، مختلف الخیال جماعتوں میں وحدت پیدا کی جا رہی تھی، اسلامی آبادی میں خصوصیت سے تعلیم و ترقی کے اثرات موجود تھے، جو سینٹ پیٹرسبرگ کی استبدادی طاقت کے خلاف متعدد مظاہرے کر چکی تھی، لیکن روسی جماعتوں کی یہ تمام جد و جہد "زاریت" کی جابرانہ پالیسی کا شکار ہو رہی تھی، اور کوئی نہیں تھا جو قومیت اور بیداری کے لیے ان مستبدانہ حدود سے آگے قدم بڑھاتا، لیکن وقت آیا کہ قدرت نے ان تمام اندرونی بےچینیوں اور مرعوب قوتوں کے لیے ایک راستہ پیدا کر دیا۔ ۱۹۱۴ء میں جب آسٹریا نے سرویہ پر حملہ آور ہونے کا اعلان کیا تو زار کی گورنمنٹ نے سرویہ کی حمایت میں اپنی فوجوں کو گلیشیا میں جنگ آزما ہونے کا حکم دیدیا، اُدھر آسٹریا کی حمایت میں جرمن آیا تھا، فوجوں کے ساتھ روسی فوجوں پر ٹوٹ پڑا۔ لیکن اس حادثہ سے زار کی عشرت پسند زندگی میں کوئی تبدیلی پیدا نہ ہوئی، البتہ روسی قوم میں حفظِ وطن و رقومی استقلال کا ایک طاقتور جذبہ پیدا ہوا جو اُسکی آنے والی ترقی کا پیش خیمہ تھا۔ پس انھیں حوادث و حالات کے ساتھ خواتین اُٹھیں اور انھوں نے

---

[1] ان حالات میں سے بعض کے لیے دیکھو، وطن قسطنطنیہ، شہبال قسطنطنیہ، تاونلی دنیا سی، المرأۃ الجدیدہ، بیروت۔ المقتطف مصر۔

سب سے پہلے وطنی مدافعت کے فرض کو ادا کرنے کا تہیہ کر لیا، وہ ماسکو و زماتسک، ریگا، وانگا سے جوق جوق میدانِ جنگ کی طرف روانہ ہونے لگیں، جنگی ہراول کا سک خواتین تھیں۔ خواتینِ روس نے ملکی مدافعت کے لیے جو مردانہ وار اور خونریز مظاہرہ کیا اُس نے روسی مردوں میں غیرت و حبِّ وطن کے جذبات کو بے انتہا مشتعل کر دیا۔ ان بہادر روسی عورتوں نے میدانِ جنگ کے متعدد مواقع پر اپنی جان نثاری کے ثبوت دیے، جن میں آگسٹوو کا میدانِ قتال خاص طور پر قابلِ ذکر ہے۔ یہ عورتیں میدانِ جنگ کے سوا محکمۂ باربرداری، ٹیلیفون، اور جاسوسی کے فرائض میں بجید کارآمد ثابت ہوئیں۔ جن روسی عورتوں نے زنانہ لشکروں کو میدانِ جنگ میں لڑایا اُن میں سے بعض کے نام یہ ہیں، ہیلن چوبہ، ڈاول آفسکیہ، یہ مشرقی پروشیا کی زنانہ فوجوں کی کمانڈر تھی اور اسکے تین زخم کاری لگے تھے۔ اسکا تو، یہ ماسکو کے ایک نامانڈ افسر کی بیوی تھی، جو کونسز رجمنٹ کی کمانڈ کر رہی تھی۔

روسی خواتین کی مردانہ وار کارگذاریوں کے ساتھ روس کی وہ مسلمان خواتین ہیں جن کی بیداری اور جد وجہد کا لطیف ترین پہلو اُن کا ملکی اور اصلاحی معاملات میں دخیل ہونا ہے۔ گو روسی مسلم خواتین کی بیداری نہایت قدیم ہے اور مفتی موسیٰ جار اللہ، مفتی عالم جان ایسے مسلمان مصلحین اور زعماء کی جد وجہد نے روسی خواتینِ اسلام کے لیے ترقی و تمدن اور تعلیم و تہذیب کی تمام راہیں پہلے ہی صاف کر دی تھیں، لیکن زاریت کے تباہ کن اثرات نے انھیں عملی مواقع سے روک دیا تھا۔ آخر سنہ ۱۹۱۷ء کے انقلاب نے ان عورتوں کو سرگرمی کا ایک ہمت آزما موقع ہم پہونچایا، اور وہ نہایت جوش کے ساتھ میدانِ عمل میں اُتر آئیں۔ پٹروگراڈ، وارسا، بخارا، طفلس، کوہ قاف، کریمیا اور یورال میں ایک نسوانی تحریک کا آغاز ہوا، جسکا مقام اتحاد سنہ ۱۹۲۱ء میں علاقہ ماوراء النہر قرار پایا تھا جہاں روسی مسلم خواتین کی ایک متحدہ کانفرنس منعقد ہوئی جسنے مسلم خواتین کی اصلاحی، تعلیمی، اور معاشی زندگی کے تمام حالات کو منتظم کرنے کے لیے ضوابط بنائے۔ اس کانفرنس کے سب سے اہم مقاصد میں اشاعتِ تعلیم کا مقصد نہایت ممتاز و نمایاں تھا۔ اس کانفرنس نے جو رزولیوشن حکومت مرکزیہ کے پاس ارسال کیے وہ یہ تھے۔

(۱) تعددِ ازدواج کی کمی کے اسباب

(۲) کم عمری کی شادی کا انسداد

(۳) شادی کے مواقع پر مضر مراسم کا انسداد

تجاویز روس کو اطلاعاً بھیجی گئی تھیں اور انکے نفاذ و اجراء اور عمل کے لیے خود ان عورتوں نے متعدد کمیٹیاں بنائی تھیں۔ ان کمیٹیوں میں سب سے نمایاں اور کارکن کمیٹیاں داغستان، آذربائیجان، کریمیا، اور کوہ قاف کی تھیں، جنکا صدر مقام سفراپول تھا۔ ان کمیٹیوں نے تعلیم کا نہایت زبردست پروپیگنڈا کیا، جسکی وجہ سے تمام اسکول اور کالج لڑکیوں سے پُر نظر آنے لگے ۱۹۲۰ء میں ماسکو کانگریس میں مسلم خواتین کی نمایندہ جماعت کی تعداد ۲۵۵ تھی۔

آج روسی مسلم خواتین کی مذکورہ بیداری کو فروغ دینے والی اور رہنما مسلم خواتین یہ ہیں: اہلیہ اسمٰعیل معصوم لقی ایڈیٹر ترجمان حقیقت، صدر انجمن اصلاح خواتین روس، بیگم عائشہ اسکو دافانم، صدر جمعیۃ تہذیب نسواں، داغستان، بیگم دل آرا ایاگا کو داخانم، بیگم الیاسہ کمارو داخانم۔ ان حالات کے ساتھ آج روسی قوم کی عورتیں ملکی و اصلاحی معاملات سے لیکر امور خانہ داری تک کے تمام مسائل میں مردوں کے دوش بدوش مصروف عمل نظر آرہی ہیں، اور گو مخالفین بالشویک اس امر کو ثابت کرنے میں کوشاں ہیں کہ بالشویک حکومت "عورت" کے حقوق کو نہایت بیدردی سے پامال کر رہی ہے، لیکن حالات اس کے سراسر خلاف ہیں بلکہ یہ کہنا بالکل صحیح ہے کہ طبعی ارتقاء کی زبردست رَو خواتین روس کے ان بیدارکن حالات کو ایک دن دنیا کے سامنے بے نقاب کرکے رہیگی[1]

خواتین مصر ممالک مشرق میں مملکت مصر تہذیب و تمدن، فنون و معارف، اور نظم و سیاست کی نہایت قدیم روایات کی حامل ملوست ہے، لیکن جبوقت سے مصری قوم کی گردن میں انگریزی غلامی کا جُوا ڈالدیا گیا، اور اُس کی قومی خصوصیات فنا ہونے لگیں۔ اسکے سیاسی و ملکی حقوق سلب کیے جانے لگے۔ اُس نے جنگ یورپ میں انگریزوں کی امداد کیلیے دس لاکھ قومی نوجوان میدان جنگ کی بھینٹ چڑھا دیے، لیکن ان تمام قربانیوں کا بدلہ یہ ملا کہ حقوق طلبی کے جائز اور آئینی مظاہرات مارشل لا اور مشین گنوں کے فیرسے روکدیے گئے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ نوجوان مصری ملک کو غلامی کی لعنت کو یکسر فنا کردینے کے لیے اُٹھ کھڑے ہوے اور اُنکے ساتھ اُن کی مجاہد و اعلیٰ تعلیم یافتہ خواتین بھی میدان عمل میں آگئیں۔ مصر کی یہ وہ عورتیں تھیں جو باعتبار تعلیم و تہذیب تمام مشرقی ممالک میں دوسرا درجہ رکھتی ہیں۔ مصری عورتوں نے اپنی انجمنوں کی بنیادیں استوار کیں، اخبارات و رسائل جاری کیے، تحریر و تقریر سے ملکی نوجوانوں کو ملکی آزادی کے لیے اُبھارا، انگریزوں سے مقاطعہ کی تحریک کو کامیاب بنانے کے لیے بے انتہا مستعدی سے کام لیا، متعدد وفود

[1] ان حالات کے اقتباس کے لیے دیکھو اسٹیٹسمین کلکتہ مورخہ ۱۴ دسمبر ۱۹۲۲ء البدر کانپور مورخہ یکم دسمبر ۱۹۲۲ء المرأۃ الجدیدہ اکتوبر و مارچ ۱۹۲۲ء

کے ذریعہ اُنھوں نے ملکی آزادی کا مطالبہ پیش کیا۔ غرض ایک عام بیداری تھی جو مصر کی ہر تعلیم یافتہ اور نیم تعلیم یافتہ عورت میں نمو پذیر نظر آنے لگی۔ مصلحین نے ایک صدر انجمن نسواں کی بنیاد ڈالی اور اسکی جو متعدد شاخیں ملک میں اسوقت بھی مصروف عمل ہیں اُنکی تعداد (۱۱) ہے۔ انھوں نے تعلیم و تربیت کے لیے اپنی ہزاروں لڑکیاں اسکولوں میں داخل کرائیں، جسکے متعلق مصری حکومت کے سرکاری اعداد یہ ہیں: ابتدائی اسکولوں میں (۴۶۵۸۲) سرکاری اسکولوں میں (۶۹۰) صوبوں کی پرائیوٹ مجالس کے اسکولوں میں (۵۹۲۷) لڑکیاں زیر تعلیم ہیں[1]۔

مصری خواتین نے اپنی فضیلت و روشن خیالی کا سب سے بڑا ثبوت اُسوقت دیا جبکہ ۱۹۲۳ء میں اُنکا ایک زنانہ وفد آملی کی مشہور زنانہ کانفرنس میں شریک ہوا، جہاں مصری خواتین نے مغربی خواتین کو مشرقی عالم نسواں کی روز افزوں ترقی اور حیرت انگیز بیداری کے اعتراف پر مجبور کرتے ہوئے تمام مغربی خواتین کے اُن شکوک کو رفع کیا جو اُنھیں مشرقی عورتوں کے متعلق عرصہ سے متفکر بنائے ہوئے تھے۔

مملکت مصر کے سرکاری کالجوں اور اسکولوں میں اسوقت جس قدر لڑکیاں تعلیم حاصل کر رہی ہیں اُن میں ⅓ قانون، فلسفہ، معاشیات، مذہب و تاریخ، اور صحافیات کی اعلیٰ تعلیم حاصل کر رہی ہیں، بکثرت عورتیں ایڈیٹر اور ناول نگار ہیں، جو اعلیٰ اخبارات و رسائل کے ذریعہ ملک و قوم کی خدمت میں مصروف ہیں، اُنھوں نے ملکی آزادی کے لیے اکثر خونبار قربانیاں بھی پیش کی ہیں، اُنھوں نے انگریزی فوجوں اور توپ خانوں کی موجودگی میں تمام ملکی مظاہرات میں حصہ لیا، اُن میں سے متعدد خواتین اسوقت بھی سیاسی محاکم میں کام کر رہی ہیں، اور وہ کسی طرح دنیا کی مہذب ترین خواتین سے پیچھے نہیں ہیں، اور اُن میں ڈاکٹر، ایڈیٹر، قانون داں، فلسفی، مورخ اور شاعر، غرض سب ہی کچھ موجود ہیں جو مصری مطبوعات و صحائف ہی کے مطالعہ سے معلوم ہو سکتے ہیں۔ مصری خواتین کی موجودہ سرگرمیوں اور کامیاب بیداری کی روح رواں حسب ذیل خواتین ہیں: بیگم صفیہ زغلول خانم، بیگم ہدیٰ شعراویہ خانم، آنسہ مَی، بیگم غالیہ خانم، بیگم بہاوالدین وغیرہ۔ ....

یہ ممتاز مصری خواتین ہیں جو انگریزی، فرانسیسی، ترکی، اور جرمنی زبانوں کی ماہر اور بعض مصری یونیورسٹی کی فارغ التحصیل ہیں۔ یہ معزز خواتین اپنے قلم اور اپنے دماغ کی بہترین اور قابل تحسین قوتوں سے مصری خواتین کی اصلاح و ترقی میں ہمہ تن مصروف رہتی ہیں۔

---

[1] مجلہ معارف جلد ۱۷ عدد جولائی ۱۹۲۶ء

بیگم صفیہ زغلول خانم، حضرۃ سعد اللہ زغلول وزیر اعظم او قائد اعظم مصر کی اہلیہ ہیں۔ آپ اپنے موقر شوہر کے ساتھ عرصہ سے مصری خواتین کی رہنمائی فرما رہی ہیں، وہ عربی، فرنچ اور ترکی زبانوں کی ماہر ہیں۔

بیگم ہدیٰ شعراوی خانم مشہور شعراوی پاشا کی بیوی ہیں، جو عربی، فرنچ، انگریزی اور ترکی زبانوں میں کامل دستگاہ رکھتی ہیں۔ اور متحدہ مملکت مصر کی مرکزی جمعیۃ نسواں کی صدر ہیں۔

آنسہ می۔ مصر کی ممتاز ترین اخبار نویس و ناولسٹ خاتون، جو عربی، انگریزی، فرنچ، جرمنی، اطالوی، روسی، ترکی، یونانی اور عبرانی زبانوں پر کامل عبور رکھنے والی جادو نگار خاتون ہے۔

"ملا رموزی"

پیغام بہار

صحرا سے چلے ہیں سوئے گلشن　　خونیں جگران چاک دامن
پیغام بہار دے رہی ہے　　داغوں کی جھلک دلوں کی انجمن
دل کھینچ رہی ہے اپنی جانب　　نرگس کی نگہ زبانِ سوسن
پھولوں سے لچک رہی ہیں شاخیں　　خوشبو سے مہک رہا ہے گلشن
رقصاں ہے نسیم برگِ گل پہ　　شبنم میں ہے گھنگرووں کی چھن چھن
غنچوں کے بدن میں سنسنی ہے　　مستی میں چھوا صبا نے دامن
کیا سیرِ چمن کو تم گئے تھے؟　　ہے بلبل و گل میں آج اَن بَن
غصے میں بھرا ہے چپ ہے کوئی　　یہ اُس سے خفا وہ اُس سے بدظن
مانوس قفس ہوا کے اسیرو!　　منزل گہِ برق ہے نشیمن
بہتر نہیں دل سے کوئی رہبر　　بڑھ کر نہیں دل سے کوئی رہزن

دلکش نہ ہو کیوں کلام آثر کا
اک فن ہے مگر منائے فن

آثر لکھنوی

جہیز

چیخوف کی چوتھی کہانی

میں نے اپنی زندگی میں بہت سے مکانات دیکھے ہیں، چھوٹے اور بڑے، نئے اور پرانے، پتھر کے اور لکڑی کے، لیکن ایک مکان کی یاد خصوصیت کے ساتھ میرے دل میں باقی ہے، اصل میں وہ کوئی بڑی بھاری عمارت نہ تھی، وہ ایک معمولی مختصر ایک منزلہ مکان تھا۔ اس میں تین کھڑکیاں تھیں، اپنی ظاہری صورت میں وہ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے کوئی ضعیف العمر خمیدہ قامت عورت سر پر ایک ٹوپی پہنے کھڑی ہو۔ اسکی سفید دیواروں اور اسکی کھپریل کی چھتوں پر کائی جم گئی تھی، وہ چاروں طرف درختوں، سبز جھاڑیوں، اور مختلف قسم کے پھولوں کی بیلوں سے ڈھنکا ہوا تھا جو اسکے موجودہ رہنے والوں کے بزرگوں نے لگائے تھے۔ اسکے وسیع صحن کے سامنے ہی ایک راستہ ہے جس پر کوئی گاڑی نہیں چلتی اور بہت کم راہگیر آتے جاتے دیکھے گئے ہیں۔

اس چھوٹے مکان کی کھڑکیاں ہمیشہ بند رہتی ہیں، اسکے رہنے والے سورج کی روشنی کی پروا نہیں کرتے۔ روشنی انکے لیے بیکار ہے۔ کھڑکیاں کبھی نہیں کھلتیں، کیونکہ انھیں تازہ ہوا کا شوق نہیں، جو لوگ اپنی زندگی پھول اور سبزہ کے درمیان گذارتے ہیں انھیں فطرت کے مناظر سے دلچسپی نہیں ہوتی، یہ صرف سیاح اور اہل دل ہیں جنھیں خدا نے حسن فطرت کے مطالعہ کے لیے آنکھ دی ہے، باقی انسان ایسے حسن کے وجود سے بے خبر ہیں۔ لوگ اس چیز کی قدر نہیں کرتے جو انھیں افراط سے ملتی ہے۔ "جو ہمیں حاصل ہے ہم اسے جمع کرنے کی فکر نہیں کرتے" اور اس سے بڑھ کر یہ کہ ہمیں اس چیز سے محبت نہیں ہوتی۔

یہ چھوٹا مکان سبز درختوں کی جنت ارضی کے درمیان جہاں شاخوں پر آزاد و مسرور چڑیوں کے گھونسلے ہیں واقع ہے، لیکن مکان کے اندر ...... افسوس، .... گرمیوں میں یہ ہر طرف سے بند، رندھا ہوا، جکڑا ہوا رہتا ہے۔ جاڑوں میں ترکی حماموں کی سی گرمی، کہیں نام کو ہوا نہیں اور افسردگی، وحشت! .....

پہلے پہل اس مکان سے میری واقفیت اس وقت ہوئی جب بہت عرصہ گذرا میں اپنے

کاروبار کے سلسلہ میں یہاں آیا، میں کرنل کے پاس جو اس مکان کا مالک تھا اُسکی بیوی اور لڑکی کے پاس ایک خط لایا تھا، اپنی پہلی آمد مجھے خوب یاد ہے، دراصل اُسکا بھولنا ناممکن ہے۔

ایک چالیس برس کی ضعیف و کمزور عورت کا تصور کرو جو حیرت و خوف کی نظروں سے تمھیں دیکھ رہی ہو، تم گھر میں داخل ہو رہے ہو، یہاں پہلے پہل آئے ہو، نووارد ہو، ایک نوجوان آدمی ہو، اُسے خوفزدہ بنانے اور گھبرا دینے کے لیے بس اتنا ہی کافی ہے، تمھارے پاس کوئی خنجر نہیں کوئی پستول نہیں، کوئی بندوق نہیں، تم خندہ پیشانی سے مسکراتے بھی ہو مگر وہ ڈرے جا رہی ہے۔

"کس سے خطاب کرنے کی عزت و مسرت حاصل کر رہی ہوں؟" عورت کانپتی ہوئی آواز میں پوچھتی ہے۔

میں نے اپنا تعارف کرایا اور آنے کا سبب بتایا۔

اب خوف اور حیرت کی جگہ جھٹ ایک پُرمسرت اور تیز لہجہ میں "اچھا!" بولی اور اپنی آنکھیں چھت کی طرف اُٹھا دیں، اس "اچھا!" کی آواز بازگشت ہال سے کمرہ میں آئی، کمرے سے باورچیخانہ میں گئی، باورچیخانہ سے کوٹھری میں پہونچی، اور ذرا دیر میں پورا مکان "اچھا!" کی مختلف الآواز صداؤں سے گونجنے لگا۔

پانچ منٹ کے بعد میں نے اپنے کو ڈرائنگ روم میں ایک بڑی، ملائم اور گرم کرسی پر بیٹھا چاروں طرف "اچھا!" کی صدائے بازگشت سے گھرا ہوا پایا، کمرہ میں برسات کی اور بکری کی کھال کے جوتوں کی جو ایک رومال میں لپٹے ہوے میرے پاس ہی کرسی پر رکھے تھے بو آ رہی تھی، کھڑکیوں پر تن زیب کے پردے تھے اور پردوں پر بے حس و حرکت مکھیاں، دیوار پر کسی پادری کی روغنی تصویر لٹک رہی تھی، جسکے شیشہ کا ایک کونا ٹوٹ گیا تھا، اسکے برابر برابر گھر کے بزرگوں اور بڑھیوں کی تصویریں تھیں، میز پر کچھ بڑی بڑی سوئیاں، دھاگے کی ایک گرمی اور آدھا بنا ہوا موزہ، اور چند کاغذی نمونے۔ دوسرے کمرے میں دو خوفزدہ و متحیر بڑھی عورتیں فرش پر سے اسی قسم کے کچھ نمونے اُٹھا رہی تھیں،

"آپ معاف کریں گے، ہم بہت میلے ہیں" چھوٹی عورت نے کہا

مجھ سے باتیں کرتے ہوے وہ دوسرے کمرے میں جہاں اب بھی نمونے اکٹھا کیے جا رہے تھے، خجالت آمیز، دزدیدہ نظروں سے دیکھتی جاتی تھی، دروازہ بھی شرمندہ و خجل معلوم ہوتا تھا، ایک انچ دو انچ کھلتا تھا اور پھر بند ہو جاتا تھا۔

"کیا بات ہے؟" چھوٹی عورت نے دروازہ کی طرف مخاطب ہوکر پوچھا،
اندر سے ایک عورت کی آواز نے فرنچ میں کچھ کہا،
نیم فرنچ اور نیم روسی زبان میں جواب دیا گیا،
"ہم فرنچ اچھی بول لیتے ہیں" چھوٹی عورت کی خوشی سے تمتاتی ہوئی آنکھوں میں میں نے پڑھا
اسکے بعد دروازہ کھلا اور انیس برس کی ایک لانبی، پتلی لڑکی کو میں نے دیکھا وہ تنزیب کی پوشاک پہنے تھی، اسکی کمر میں ایک سنہری پیٹی تھی جس میں ایک خوشنما پنکھیا جھول رہی تھی وہ داخل ہوئی، اس نے ایک کرسی بچھائی۔ اسکے چہرہ کا رنگ اڑنے لگا، پہلے اسکی لانبی ناک جس پر چیچک کے ہلکے ہلکے داغ تھے سرخ ہوئی، پھر اسکی آنکھیں اور پیشانی چمک پڑیں۔
"میری لڑکی ہے" عورت نے مجھ سے کہا" اور منچکا! یہ ایک نوجوان آدمی ہے جو آیا ہے" وغیرہ میرا تعارف کرایا گیا۔ کاغذی نمونوں کی تعداد پر میں نے تعجب ظاہر کیا، ماں اور بیٹی نے اپنی نگاہیں جھکا لیں۔
"یہاں ایک میلہ تھا، اسٹیشن کے مقام پر" ماں نے کہا" ہمیشہ اس میلہ میں ہم مال خریدتے ہیں اور سال بھر تک کام کرتے ہیں یہاں تک کہ دوسرے سال پھر میلہ کا وقت آجاتا ہے دوسروں کی بنائی ہوئی چیزیں ہم نہیں خریدتے، میرے شوہر کی تنخواہ زیادہ نہیں ہے اور عیش کی زندگی ہم کہاں سے بسر کریں، ہر چیز خود بنا لیتے ہیں"
"لیکن اتنے اقسام کی چیزیں کون پہنے گا؟ تم تو صرف دو ہی ہو؟"
"آہ ..... پہننے کا خیال کسے ہے یہ جہیز کے لیے ہیں"
"اماں! یہ کیا کہتی ہو" بیٹی نے کہا اور وہ زرد پڑ گئی" یہ نہ معلوم کیا سمجھتے ہونگے، سچ سمجھتے ہونگے میرا ارادہ شادی کا نہیں ہے، میں کبھی شادی نہ کروں گی!"
اس نے یہ کہا تو لیکن" شادی" کے لفظ پر اسکی آنکھیں چمک پڑیں۔
چائے، بسکٹ، مکھن اور جام لائے گئے، سات بجے ہم نے کھانا کھایا، جب دوسرے میں کھانا کھا رہا تھا کہ پاس کے کمرے سے میں نے ایک زور کی انگڑائی سنی، دروازہ کی طرف تعجب سے دیکھا، مرد ہی کی انگڑائی ہوسکتی تھی۔
"یہ میرے شوہر کے بھائی ہیں" چھوٹی عورت نے میرے تعجب کو دیکھ کر کہا" سال بھر سے ہمارے ہی پاس رہتے ہیں، کسی سے نہیں ملتے، ملتے ہوئے شرماتے ہیں، یہ خانقاہ جانے والے ہیں

نوکری میں انکے ساتھ بے انصافی کی گئی، اس مایوسی نے انکے دماغ پر بہت اثر ڈالا ہے"
کھانے کے بعد چھوٹی عورت نے کپڑے دکھائے جن پر اُنکے شوہر کے بھائی نے کام بنایا تھا، منچکانے تھوڑی دیر کے لیے اپنی شرم ہٹا دی اور مجھے تمباکو کی تھیلی دکھائی جو اُس نے اپنے باپ کے لیے بنائی تھی، میرے مصنوعی تعجب اور حیرت کو دیکھ کر اُسکے چہرے پر ایک سرخی آگئی اور اُس نے اپنی ماں کے کان میں کچھ کہا، ماں اُچھل پڑی اور مجھے اُسکے ساتھ اُسکے کمرے میں جانے کی دعوت دی، وہاں مجھے پانچ بڑے ٹرنک اور کچھ چھوٹے ٹرنک اور صندوق دکھائے گئے۔

"یہ اِن کا جہیز ہے" اُسکی ماں نے آہستہ سے کہا "سب ہم نے ہی بنایا ہے"

ان صندوقوں کو دیکھنے کے بعد میں نے اپنے دونوں مہربان میزبانوں سے رخصت چاہی، اُنھوں نے مجھ سے وعدہ لیا کہ میں وقتاً فوقتاً ان کے یہاں پھر آتا رہوں گا۔

ایسا کچھ ہوا کہ میں اپنا یہ وعدہ پورا کر سکا، اپنی پہلی آمد کے سات برس بعد مجھے اس قصبہ میں ایک مقدمہ کی شہادت کے سلسلہ میں پھر آنا پڑا، اس مکان میں داخل ہوا تو میں نے وہی طمانیت خیز "اچھا!" کی آواز اپنے چاروں طرف پھیلتی ہوئی سُنی۔ اُنھوں نے مجھے پہلی ہی نظر میں پہچان لیا ..... خیر، مجھے پہلی نظر میں پہچان لینے کے اُنکے پاس معقول وجوہ ہونگے، میری پہلی آمد اُن کی خاموش و پُرسکون زندگی میں ایک مخصوص اہمیت رکھتی تھی اور جب اہم واقعات کم ہوتے ہیں تو وہ عرصہ تک یاد رکھے جاتے ہیں۔

میں ڈرائنگ روم میں پہونچا، ماں جو پہلے کے بہ نسبت زیادہ کمزور ہوگئی تھی اور جسکے بال سفید پڑنے لگے تھے، فرش پر رینگ رہی تھی، وہ کوئی نیلی چیز کاٹ رہی تھی، اُسکی بیٹی صوفے پر بیٹھی کپڑا کاڑھنے میں مشغول تھی۔

پہلے کی طرح وہاں ہلکی ہلکی نمی کی بُو تھی، کاغذ کے مختلف قسم کے نمونے تھے، وہ تصویر بھی تھی جسکا شیشہ ٹوٹ گیا تھا، مگر کچھ تبدیلی ضرور تھی، پادری کی تصویر کے پاس کرنل کی ایک تصویر لٹک رہی تھی، دونوں عورتیں ماتمی لباس میں تھیں، کرنل کی ترقی ہونے کے ایک ہفتہ بعد ہی اُس کا انتقال ہوگیا تھا،

پچھلے واقعات دوہرائے گئے ..... بیوہ نے آنسو بہائے۔

"ہمارا بہت بڑا نقصان ہوگیا" اُس نے کہا "آپ کو معلوم ہے، میرے شوہر کا انتقال ہوگیا۔ اب دنیا میں ہم اکیلے ہیں، اپنے سوا ہمارا کوئی نہیں، میرے شوہر کے بھائی زندہ ہیں، مگر اُنکی بابت

میں کوئی اچھی خبر نہیں سنا سکتی، انھیں خانقاہ والوں نے نہیں لیا، کیونکہ ——— کیونکہ وہ شراب بہت پینے لگے ہیں، اور اب اس مایوسی کی وجہ سے انھوں نے اور کثرت سے پینا شروع کردی، سوچتی ہوں، کہ ڈپٹی صاحب کے پاس جاؤں، اور شکایت کروں، کیا بتاؤں، ایک سے زائد دفعہ ہمارے صندوقوں کے قفل توڑ چکے ہیں ...... منچکا کا جہیز انھوں نے فقیروں کو بانٹ دیا، دو صندوق تو بالکل خالی کردیے، یہی حال رہا، تو میری منچکا کا تمام جہیز غائب ہو جائے گا "

" اماں، آپ کیسی باتیں کرتی ہیں؟" پریشان ہوکر منچکا نے کہا " یہ سمجھیں گے .... یہ نہ معلوم کیا سمجھیں گے .... میں شادی نہیں کروں گی ——— کبھی نہیں "

منچکا نے اپنی آنکھیں چھت کی طرف اٹھا دیں جن میں امید و آرزو کی جھلک تھی، صاف معلوم ہوتا تھا، کہ اُسے اپنی باتوں کا یقین نہیں ہے۔ ایک چھوٹے قد کا آدمی جسکے سر کے بال غائب تھے، چوہے کی طرح آہستہ آہستہ سامنے سے گذر گیا۔ اسکے شوہر کا بھائی ہوگا۔ میں نے خیال کیا۔

میں نے ماں اور بیٹی دونوں پر ایک ساتھ نظر ڈالی، وہ بہت بدل گئی تھیں، ماں کے بال سفید ہوگئے تھے، لیکن بیٹی اس طرح مرجھا گئی تھی کہ اُسکی ماں اُس کی صرف چار پانچ برس بڑی بہن معلوم ہوتی تھی

" میں ڈپٹی صاحب کے پاس جانا چاہتی ہوں" ماں نے مجھ سے کہا، اُسے یاد نہ رہا کہ وہ مجھ سے یہ کہہ چکی ہے" " شکایت کروں گی، وہ اب ہماری ہر چیز پر ہاتھ ڈالنے لگے ہیں۔ جو چیز ہم بناتے ہیں، وہ اُسے خیرات کر دیتے ہیں، کہتے ہیں ثواب لے گا۔ میری منچکا بغیر جہیز کے رہی جاتی ہے"

منچکا کے چہرہ کا رنگ پھر فق ہوگیا مگر اُس نے اس دفعہ کچھ نہ کہا۔

" اب سب سامان پھر جمع کرنا ہوگا، اللہ جانے کہاں سے آئے گا، ہم چھوٹی اوقات کے آدمی ہیں، دنیا میں ہمارا کوئی نہیں ہے "

" دنیا میں ہمارا کوئی نہیں ہے" منچکا نے دوہرایا

ایک سال گذر گیا اور قسمت نے مجھے ایک مرتبہ پھر اس مکان میں لاڈالا۔

ڈرائنگ روم میں داخل ہوتے ہوئے میں نے بڈھی عورت کو دیکھا، ایک سیاہ لباس میں لپٹی ہوئی وہ ایک صوفے پر بیٹھی کچھ سی رہی تھی، اُسکے پاس اُسکے شوہر کا بھائی ایک پیلا کوٹ پہنے بیٹھا تھا، مجھے دیکھ کر وہ اُچھل پڑا اور کمرے سے باہر چلا گیا۔

" آپ کیا بنا رہی ہیں؟" تھوڑی دیر بعد میں نے اُس سے پوچھا۔

" شلوکہ ہے، بن جائے تو پادری کے پاس لے جاؤں گی، نہیں تو یہ اسے لے بھاگیں گے

اب سب چیزیں پادری ہی کے یہاں رکھتی ہوں" اُس نے آہستہ سے میرے کان میں کہا۔
اور اپنی لڑکی کی تصویر دیکھ کر جو سامنے میز پر رکھی تھی، اُس نے ٹھنڈی سانس بھرتے ہوئے کہا:
"ہم دنیا میں اکیلے ہیں"
اور اُسکی بیٹی کہاں گئی؟ منچکا کہاں گئی؟ میں نے یہ اُس سے نہیں پوچھا، میں نے بڑھی ماں سے جو نئے ماتمی لباس میں تھی پوچھنے کی جراءت نہ کی، جب تک میں کمرے میں رہا، اور جب میں جانے کے لیے اُٹھا، منچکا مجھ سے ملنے نہیں آئی، میں نے اُسکی آواز نہیں سُنی، نہ اُسکے قدموں کی نرم آہٹ ....
میں سمجھ گیا اور میرا دل بیٹھنے لگا۔

جلیل قدوائی (علیگ)

ارشادِ جگر

نظر میں ہیچ ہے گلشن تمام دُنیا کا — نہ پوچھ حوصلہ مرغانِ رشتہ بر پا کا
اثر ہے جس میں کہ ہر موجِ کارفرما کا — وہ ایک قطرہ ہے ماحصل تمام دریا کا
نجات روح کو ملتی نہیں ہے تن سے آہ! — بنا ہوا ہے یہ مجنوں، حجاب لیلا کا
ہر ایک ذرہ سے نکلے تڑپ کے برقِ جمال — کوئی بنے تو طلبگار حسنِ معنی کا
خدا ہی رحم کرے اُس کی تشنہ کامی پر — سراب پر جسے کامل یقیں ہو دریا کا
وہ اک فریب تصور، یہ اک طلسم نظر — یہ ماحصل ہے کُل اے شیخ دین و دُنیا کا
رواں اگرچہ ہیں اس میں بھی سب وہی موجیں — مگر ہے قطرہ پہ فرض احترام دریا کا
لیے ہے محشرِ صد اضطراب پہلو میں — سکون بھی تو مرے قلبِ ناشکیبا کا
سمجھتے ہیں جسے ہم دل وہ اک مرکب ہے — امید و آرزو و حسرت و تمنا کا
کہاں میں خاک کا پُتلا کہاں وہ نفس لطیف — فریب تھا دل بیدار و چشم بینا کا
ہر ایک قطرہ انا البحر کہہ اُٹھے گا ضرور — یہی جو رنگ رہا استعارِ معنی کا

جگر مرادآبادی

جذباتِ سلیم

گریباں سے ترے کس نے نکالا صبحِ خنداں کو / کیا کس نے نہاں کی دہن کی کلیوں میں گلستاں کو
اُڑایا چٹکیوں میں میرے ذرہ نے بیاباں کو / مرے قطرہ نے پانی کردیا ہر موجِ طوفاں کو
دیئے ہیں کھول دفتر زندگی کے تیرے غمزوں نے / دیا تھا چھیڑ یہ کس نے تری چشمِ سخنداں کو
مری کشتی بھنور سے کھیلنے کا شوق رکھتی ہے / یہ کس نے کردیا خاموش یارب موجِ طوفاں کو
یہ کیا نغمہ تھا چھیڑا جو اِک اِک قلبِ مضطر نے / کہ میری لَے نے رقصاں کردیا سلمائے نیستاں کو
میں ہوں وہ قطرۂ شبنم کہ چمکا تیرے پرتو سے / لگی ہیں کھینچنے کرنیں مری مہرِ درخشاں کو
نکرتی تو اگر یہ وقت اے الفت مسیحائی / لپیٹا تھا کفن میں عقل نے جذباتِ انساں کو
مرے گوہر کو ڈھالا کس قدرت نے اپنے سانچہ میں / کہ میری آب ہردم سینچتی ہے ابرِ نیساں کو
ترے دل میں ہے تاریکی تو بھرلا لاکھوں ستارے بھی / نہ روشن کرسکیں گے اے جواں تیرے شبستاں کو
ہر اک افسردہ دل میں پھونکدو نکا روحِ بیداری / ذرا کروٹ بدلنے دو مرے خوابیدہ ارماں کو
مرے ذوقِ فنا پر زندگی ہے خضر کی قرباں / مرے تلخابۂ غم میں ڈبو دو آبِ حیواں کو
محبت کی کشش کی داستاں پوچھو زلیخا سے / نکالا چاہِ کنعاں سے اسی نے ماہِ کنعاں کو
تری صنعت پہ میں اے موسمِ گُل کیوں نہ حیراں ہوں / لپیٹا ہے لباسِ رنگ میں کس حسنِ عریاں کو
بھرا افسردگی سے ہے جو کنجِ آشیاں میرا / فلک پر ڈھونڈھتی ہیں میری آنکھیں برقِ خنداں کو
مجازی حسن کے پھولوں کو حیرت سے رہا تکتا / نہ سمجھا میں حقیقت کے تبسمہائے پنہاں کو
بہاریں بوسہ دیں خاکِ لحد کو تیری اے سعدی / ترے خونِ جگر نے کردیا رنگیں گلستاں کو
بہت منصور ہیں جو دار پر چڑھنے کے شایق ہیں / بہت یوسف ہیں اب جو ڈھونڈتے پھرتے ہیں زنداں کو
مری بیکار ہستی ہے تری زینت کا سرمایہ / بنا کر دیکھ زلف اپنی، مرے بختِ پریشاں کو
دکھاتا ہوں نظارے اپنے دل کو دین و دنیا کے / کھلونے دیکھئے، بہلاتا ہوں میں اس طفلِ ناداں کو
جھجکتا ہے اگر جلوت سے آ خلوت میں بے پردہ / تھپک کر میں سُلا دیتا ہوں ساری بزمِ امکاں کو
مری پروازِ فکر اے فقر ہو اتنی بلندی پر / کہ دنیا دُوں خوشی سے خاک میں تختِ سلیماں کو
میں اُس حسنِ لطافت بیز کا شیدا ہوں اے زاہد / سمجھ کر گرد جو دامن سے جھاڑے باغِ رضواں کو
کلیمِ طورِ معنیٰ ہوں۔ یدِ بیضا ہے دل میرا / منور کردیا جس نے مرے چاکِ گریباں کو

آیولینیتھی

[ایک ڈراما]

(گذشتہ اشاعت سے آگے)

دوسرا منظر

[بادشاہ رینی، ابن یحییٰ اور برٹرانڈ چوبدر وازہ سے داخل ہوتے ہیں، ایلمرک اور مارتھا پہلے سے موجود ہیں]

رینی - مارتھا! میں تیرے پاس نیک نفس ابن یحییٰ کو لایا ہوں۔ یہ مجھے معلوم ہے کہ آج ہی وہ ایک مرتبہ اور یہاں آچکے ہیں۔ کیا حال ہے؟

مارتھا۔ خداوند! ہر کام حضور کی مرضی کے مطابق ہوا

رینی - جو کچھ حکیم صاحب نے ہدایتیں کی تھیں انکی تعمیل کی گئی؟ کوئی بات چھوٹی تو نہیں؟ آیولینیتھی کی آنکھوں پر ہر شب سوتے وقت پٹی باندھی گئی؟

مارتھا - جی حضور!

رینی (ابن یحییٰ سے مخاطب ہو کر) یہ ایک خطرناک امتحان تھا۔ تعجب ہے کہ یہ زحمت اس نے برداشت کی۔ لیکن یہ حسن اتفاق کہ حال ہی میں مکھی نے اسکی کنپٹی میں کاٹ لیا، اس سے ہمیں ایک بہانہ ہاتھ آگیا۔ یقیناً ننھی مکھی کو دھوکا ہوا۔ اس خوشنما دنیا میں جو آیولینیتھی کی پرداختہ ہے اور جہاں وہ ایک پھول کی طرح پھولوں میں نشوونما پاتی ہے مکھی اس شوخ رنگ کے شگوفہ کو دیکھ کر چوندھیا گئی اور سمجھی کہ گلاب کی کلی سے ہم آغوش ہو رہی ہے۔ معاف کرو۔ اپنی ہی لڑکی کے متعلق اس قسم کی گفتگو گناہ ہے۔ خیر۔ تمھیں فکر ہوگی کہ اپنی محنت کا نتیجہ دیکھو۔ آیولینیتھی کے پاس جاؤ۔ برٹرانڈ! مارتھا! حکیم صاحب کو اندر لیجاؤ شاید انھیں تمھاری ضرورت ہو۔

[ابن یحییٰ مکان کے اندر برٹرانڈ اور مارتھا کے ہمراہ داخل ہوتا ہے]

کیوں ایلمرک، اس خاموش و پُرسکون وادی کو دیکھ کر تمھیں اچنبھا تو نہیں ہوا؟ یہ ایک مختصر سی بہشت ہے۔

ایلمرک - بیشک خداوندا!

رینی - حسن و علم و فن میں جو کچھ محبوب ترین ہے یہاں موجود ہے۔ کاش میں ایسا خوش نصیب ہوتا کہ اپنی زندگی انکے درمیان بسر کر سکتا اور ٹھنڈے دل سے مینگیں اور لورین اور اس طولانی نزاع کو جو وڈوانٹ سے درپیش ہے ہمیشہ کے واسطے بھول جاتا۔

ایلمرک - حضور، اسکا تو تصفیہ ہو چکا عنقریب کاؤنٹ ٹرسٹان قدم رنجہ فرمائیں گے اور ان تمام

جھگڑوں کا خاتمہ صلح و آشتی پر ہو جائے گا -
ریتی - مجھے بھی یہی اُمید ہے اور اس امید کو روز بروز تقویت ہوتی جاتی ہے - کیا میں نے تم سے نہیں کہا کہ میں جیوفری آف آریخ کا منتظر ہوں - وہ ٹورٹسان کے قلعہ میں عرصہ تک مقیم رہ چکے ہیں - اور کاؤنٹ کو کبت، شاعری اور موسیقی کی تعلیم دی ہے - جیوفری مجھ سے کہتے تھے کہ نوجوان کاؤنٹ کو شاعری سے خاص مناسبت ہے - اسکا مذاق شستہ و متین ہے - تخیل میں جدت اور خیالات میں بلندی ہے - ایک مرتبہ انھوں نے میرے سامنے ایک گیت گایا تھا جو ٹرسٹان کا موزوں کیا ہوا تھا - اُس کا موضوع بھی عمدہ تھا بندشیں بھی چست و خوبصورت تھیں انصاف مقتضی ہے کہ میں اُسکے کمال شاعری کا اعتراف کروں - حالانکہ وہ مجھ سے برسرِ پرخاش ہے اور موقع پا جائے تو تورین کو غصب کر لے - لیکن خاموش رہو، میں نے ایک آواز سنی -

[دروازہ کے پاس جا کر دیکھتا ہے]

دیکھو! ابن یحییٰ نے اُسے جگا دیا، آہستہ آہستہ اُس نے آنکھیں کھولیں - وہ کچھ کہہ رہی ہے مگر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ خواب میں باتیں کر رہی ہے - ابن یحییٰ غور سے اُسکی آنکھوں کی طرف دیکھ رہا ہے وہ طلسمی نقش پھر اُسکے سینہ پر رکھ دیا اور وہ پھر سو گئی -

ایمرک - عجیب و غریب عمل ہے!

ریتی - نہایت حیرت خیز! اس مراقش کے حکیم کو ایسی قدرت حاصل ہے کہ میں اس سے ڈرتا ہوں - وہ آ رہا ہے - ایمرک مجھے تنہا چھوڑ دو - لیکن سنو! تم محل میں جاؤ، میں یہیں ٹھہروں گا - جس وقت ٹرسٹان کا خط آئے فوراً لیکر یہیں حاضر ہو -

ایمرک - رخصت! خداوند!

[ایمرک باہر جاتا ہے اور ابن یحییٰ دوسرے دروازے سے داخل ہوتا ہے]

ریتی - کہو ابن یحییٰ - کیا تم فاختہ کی طرح زیتون کی شاخ لائے ہو؟[1] تم فکرمند ہو - میری سمجھ میں نہیں آتا کہ کیا نتیجہ نکالوں؟

ابن یحییٰ - مجھے صحت کی قوی اُمید ہے -

ریتی - کیا یہ سچ ہے؟ تم فرشتۂ آسمانی ہو جو میری مدد کو بھیجا گیا - تمھارا سیاہ چہرہ شاہ مراقش کی طرح جو ہمارے عیسیٰ مسیح کے گہوارہ کے سامنے سجدہ میں جھکا تھا اُس ستارے کا پیش خیمہ ہے جو میری تاریک راتوں کو منور کر دے گا - یحییٰ مجھے بتاؤ کہ تم نے اپنی امیدوں کو کس بنیاد پر قائم کیا ہے - اب تم کیا صلاح دیتے ہو اور کیا کرنا چاہتے ہو؟ میں بیتاب ہوں بولو! حال ہی میں میں نے ایک کتاب پڑھی جس میں تحریر تھا کہ آنکھ کی اکثر بیماریاں قدح کرنے سے اچھی ہو جاتی ہیں - میرے ابن یحییٰ - تم ایسا ہرگز نہ کرنا! تم جانتے ہو کہ آنکھ کیسی نازک چیز ہے -

[1] اشارہ ہے طوفان نوح کی طرف - فاختہ شاخ زیتون لائی تھی جس سے امید ہوئی تھی کہ ساحل قریب ہے -

کیا تمہارا دل ایسا پتھر کا ہو جائے گا کہ میری آیولینیتھی کی آنکھوں کو نشتر فولاد سے چھوؤ؟ کیا تم یہ اندیشہ نہ کروگے کہ انکی نیلگوں گہرائیوں کی رعنائی کو صدمہ پہونچ جائیگا؟ کیا تم دیکھتے نہیں کہ باوجود اس اندوہ والم کے یہ گہرے اور سیاہ چشمے کس قدر ضو فشاں ہیں۔ آہ! اُسکی آنکھیں! یہ کس طرح ممکن ہے کہ دو ایسے نورانی دائروں پر رات کی تاریکی چھا جائے۔

ابن یحییٰ ۔ اس قدر مضطرب نہ ہوجیے۔ اندیشہ کی بات نہیں ہے۔ نشتر وغیرہ اگر میں استعمال کروں بھی تو زیادہ مفید ثابت نہ ہوں گے۔

رینی ۔ تو پھر تم نے کیا طے کیا ہے؟

ابن یحییٰ ۔ اے رحمدل بادشاہ! میں معافی کا خواستگار ہوں ۔ میرا علاج میرے پیشہ کا ایک راز ہے، اور اُسکے افشا سے کوئی فائدہ متصور نہیں ہے۔ یہ آن واحد میں تشکیل پذیر نہیں ہوا ہے بلکہ برسوں راتوں کو جاگ جاگ کر اس پر دماغ سوزی کیگئی ہے۔ اب وہ موقع آگیا ہے کہ اگر خدا کی مرضی ہوئی تو مجھے کامیابی ہوگی۔ اور یہ کامیابی یا تو آج ہی رونما ہوگی یا کبھی نہیں!

رینی ۔ آج ہی! یہ کیونکر؟

ابن یحییٰ ۔ غروب آفتاب کے بعد جسوقت شفق پھولے اور صرف اتنی دھیمی روشنی ہو جسے اُسکی آنکھیں جو عادی نہیں ہیں بلا خطرہ برداشت کرسکیں میں اپنے علاج کی آزمائش کروں گا۔

رینی ۔ آہ ابن یحییٰ میں تیری التجا کرتا ہوں کہ آج نہیں ۔ ہر روز نہیں بلکہ ہر ساعت میں نے بڑے اشتیاق سے اس لمحہ کا انتظار کیا ہے لیکن جب وقت آگیا تو میرا دل ڈوبا جاتا ہے اور میں چاہتا ہوں کہ اور تعویق ہو۔ ابن یحییٰ خیال کرو کہ کس قدر خطرہ ہے۔ غروب آفتاب کے ساتھ ممکن ہے کہ میری تمام نازپروردہ آرزوؤں کا خاتمہ ہوجائیگا تم سوچ میں پڑ گئے۔ کیا توقف کروگے؟

ابن یحییٰ ۔ التوا ناممکن ہے۔

رینی ۔ تو یہ بتادو کہ کوئی خوف تو نہیں ہے؟ کیا نتیجہ میں کوئی شبہہ تو نہیں ہے؟ تم نے خاموش ستاروں کے ذریعہ سے ساعت دیکھی تھی۔ تمہارا علم اُن پر بھی حاوی ہے، کیا جواب ملا؟ ابن یحییٰ مجھے بتادو۔ جو نقشہ تم نے بنایا اُس سے فال نیک نکلتی ہے؟

ابن یحییٰ ۔ جی ہاں۔ یہ تو میں پہلے ہی عرض کرچکا ہوں۔ ستارے نیکی کی طرف مائل تو ہیں لیکن وثوق کے ساتھ نہیں کہا جاسکتا کہ بالکل موافق ہیں۔ اُن کا اثر انسان کی قسمت پر ضرور ہوتا ہے مگر فطرت اُنکی غلام نہیں ہے۔ تاہم آپ مطمئن رہیں اس بنا پر مجھے کوئی اندیشہ نہیں ہے۔ ایک اور رکاوٹ پیدا ہوگئی ہے۔

رینی ۔ رکاوٹ؟

ابن یحییٰ ۔ ہاں سرکار! اور میرا خیال ہے کہ آپ اس گتھی کو سلجھانے میں میری مدد نہ کرسکیں۔ قبل

اسکے کہ میں اپنا عمل شروع کروں آیولنیتھی کو معلوم ہو جانا چاہیئے کہ وہ نابینا ہے۔

ریتی۔ نہیں ابن یحییٰ - یہ نہیں ہوسکتا۔

ابن یحییٰ۔ ایسا ہونا چاہیے ورنہ میرا فن بیکار ہے۔

ریتی۔ نہیں نہیں۔ آہ! ہرگز نہیں۔ تم مجھے اس وحشیانہ ظلم پر مجبور نہ کروگے۔ اور ایک جھٹکہ میں غفلت کے اس پردے کو چاک نہ کروگے جو اسکی طمانیت کا موجب ہے۔ اسکی نازک روح پر اس عیب صداقت کا یکایک نہیں بلکہ تدریج اظہار ہونا چاہیئے۔ اور اگر اسکے بعد صحت نہ ہوئی تو کیا تم بھول گئے کہ کس ہوشیاری سے جسکو سننے والا باور نہ کرے گا ہمنے سالہا سال اس دردناک حقیقت کو اس سے پوشیدہ رکھا ہے۔ تمہارے ہی مشورہ سے ایسا ہوا اور تمہیں نے بتایا کہ یہ دشوار مرحلہ کس طرح طے کرنا چاہیے۔ کیا جو عالیشان عمارت تم نے اٹھائی اسے چشم زدن میں ڈھادوگے؟ بتاؤ بھلا کیوں؟ آہ کیوں!

ابن یحییٰ۔ اگر آپ متوجہ ہوکر سماعت فرمائیں تو وجہ عرض کروں۔ غالبًا آپ کا خیال ہوگا کہ بصارت کا آلہ آنکھ ہے۔ دراصل ایسا نہیں ہے۔ آنکھ صرف ذریعہ ہے۔ قوت بینائی کا سرچشمہ روح ہے اور وہ نازک اعصاب جنکا اجتماع آنکھ کے گرد ہوتا ہے، دماغ کے پوشیدہ خزانہ میں بنتے ہیں۔ آیولنیتھی کو اپنی حالت کا احساس ہونا چاہیے۔ اولاً اسکی اندرونی آنکھیں کھولنا چاہیے، قبل اسکے کہ اسکی ظاہری آنکھوں پر نور کی بارش ہو اسکی روح میں روشنی کی احتیاج پیدا ہونا چاہیے تاکہ وہ روشنی کی منتظر ہو، آرزومند ہو، کیونکہ انسان کو وہ چیز کبھی عطا نہیں ہوتی جس کا وہ متمنی نہ ہو۔ اسکی روح کی تہ میں ایک خواہش اور اسکے حصول کا ارادہ پیدا ہونا چاہیے۔ مثال کے طور پر فن شاعری کو لیجیے جسکے واسطے تمام عروض و قواعد مشہور ہے۔ یہ ایک عطیۂ فطرت ہے۔ مگر کیا ہر انسان کو مل جاتا ہے؟ نہیں صرف وہ اسکے مستحق ہوا پاتے ہیں جنکے سینوں میں خواب کی طرح ایک درخشاں دنیائے شعر آباد ہوتی ہے جسکے وہ ہمیشہ کوشاں رہتے ہیں اور انکی تشنگی کبھی نہیں بجھتی۔

ریتی۔ اچھے ابن یحییٰ۔ میں تم سے بحث میں نہیں جیت سکتا۔ میرا علم اتنا وسیع نہیں۔ لیکن رحم کی آواز میرے دل میں گونج رہی ہے اور تمہارے دلائل کو غرق کیے دیتی ہے۔ تم جو کہتے ہو ناممکن ہے اور میں ہرگز اسے منظور نہیں کرسکتا۔

ابن یحییٰ۔ آپ کی مرضی۔ میں صرف مشورہ دے سکتا ہوں اور اگر میرے مشورہ پر عمل نہیں ہوتا تو میری موجودگی یہاں بیکار ہے، لہذا اللہ نگہبان! بندہ اپنی خانقاہ کو واپس جاتا ہے۔ اگر آپ نے اپنا ارادہ بدل دیا تو میں وہیں ملوں گا لیکن ایک مرتبہ پھر غور کیجیے۔ اگر آفتاب ان پہاڑیوں کے پیچھے غروب ہوگیا تو پھر میرا تمام علم و فن کام نہیں آسکتا۔ (چور دروازہ سے باہر چلا جاتا ہے)

رینی ۔ آہ ! میں کس عذاب میں مبتلا ہوں ۔ میں نے اس امید کو کس قدر گراں خریدا اور اب ممکن ہے کہ وہ ایک لمحہ میں فنا ہو جائے ۔ کیا میں اُسکی شگفتگی کو اُس سے چھین لوں ؟ اور اُسکے بدلے تکلیف وہ یاس دیدوں ۔ اُسکے شباب کو آہستہ آہستہ کمھلاتے دیکھوں یہاں تک کہ وہ خشک ہوکر نوحۂ خزاں میں منتقل ہو جائے ؟ نہیں ! یہ ابن یحییٰ کی ہٹ ہے ۔ وہ یقیناً رام ہو جائے گا ۔ میں چین نہ لوں گا جب تک وہ میری بات نہ مانے گا اور میری مرضی کے موافق کاربند نہ ہوگا ۔

[رینی بھی باہر چلا جاتا ہے ۔ ویسے ہی مارتھا اور برٹرانڈ داخل ہوتے ہیں]

مارتھا ۔ بادشاہ سلامت ایسا معلوم ہوتا تھا کہ غصہ میں ہیں ۔ ابن یحییٰ کا بھی پتہ نہیں ۔ معاملہ کیا ہے ؟

برٹرانڈ ۔ خدا جانے کیا ہے ۔ میں یہی ڈرتا ہوں کہ کہیں عین وقت پر ابن یحییٰ کو ناکامی نہ ہو ۔

مارتھا ۔ خدا نہ کرے ۔

برٹرانڈ ۔ کاش ایسا ہی ہو ۔ لیکن میں اس شخص کے سوچ بچار اور اسکے تیوروں کو پسند نہیں کرتا ۔ اور بھئی سچی بات تو یہ ہے کہ اسکو ایسی عجیب و غریب قدرت ہے کہ میں ڈرتا ہی رہتا ہوں ۔ دیکھو لڑکی اُس کوچ پر اس طرح لیٹی ہوئی ہے گویا اُس میں دم ہی نہیں ، مگر اُسکے ہاتھ کے ایک اشارہ سے ایسا معلوم ہونے لگتا ہے کہ گویا سو رہی ہے ۔ اسکا نتیجہ اچھا نظر نہیں آتا ۔

مارتھا ۔ اطمینان رکھو ! تمھارا خوف بیجا ہے ۔ تمھیں معلوم ہے کہ جہاں اُسکے سونے کا وقت ختم ہوا اور ابن یحییٰ نے طلسمی نقش اُسکے سینے سے اُٹھایا تو وہ ہشاش بشاش اور صحیح و تندرست ہو جاتی ہے ۔ حیرت ہوتی ہے کہ یہ غیر معمولی نیند اُسے رات کی نیند سے زیادہ قوت و فرحت بخشتی ہے ۔ اور اُسکے حواسوں کو جلا دیتی ہے ۔ میں نے اکثر دیکھا ہے کہ جب وہ جاگتی ہے تو اُسکی آنکھوں کی چمک اور بڑھ جاتی ہے ۔ گویا روشنی کی چند شعاعوں کو سوتے میں چپکے سے داخل ہونے کا راستہ مل گیا ۔ میرے نزدیک تو یہ اچھی علامت ہے ۔

برٹرانڈ ۔ ممکن ہے کہ تمھارا ہی خیال درست ہو ۔ یہ وقت گذرنے پر معلوم ہو جائے گا ۔ آؤ چلیں ، ابھی بہت سے کام باقی ہیں ۔ دیکھیں الیوں نے کیا کیا ۔ اب آیولینتھی کے پاس چلو وہ سو رہی ہے اور ہماری واپسی تک نہیں جاگے گی ۔

[پشت مکان کی طرف چلے جاتے ہیں]

تیسرا منظر

[نرٹسان اور جیوفری دونوں ایک ایک ستارہ لیے ہوئے آتے ہیں ۔]

جیوفری (جو دروازہ کے سامنے ٹھہرکر) ذرا ہوشیاری سے قدم بڑھاؤ ۔ یہاں آدھی رات

کی تاریکی ہے ۔
ٹرسٹان ۔ آگے بڑھو، گرد دیکھو تو یہاں ایک دروازہ ہے!
جیوفری ۔ دروازہ !
ٹرسٹان ۔ صبر کرو! شکنی لگی ہے ۔ لے لو کھل گیا! ارے، یہ کیا نظر آتا ہے؟
(دونوں داخل ہوتے ہیں)
جیوفری ۔ اللہ اللہ! کیسی عمدہ خوشبو کا جھونکا آیا!
ٹرسٹان ۔ باغ! اور اس کوہستانی ویرانہ میں! کس سلیقہ سے آراستہ کیا گیا ہے ۔ اور کس قدر خوشنما ہے! دیکھو تو!
جیوفری ۔ میرے تو ہوش اُڑ گئے!
ٹرسٹان ۔ وہ کون شخص ہے جو اس مسحور کرنے والے خطہ کا مالک ہے ۔ تم گرد و نواح سے خوب واقف ہو اور قریب ہی رہتے ہو ۔
جیوفری ۔ مجھے مطلق علم نہیں ۔ یہ بہشت کبھی میرے خواب و خیال میں بھی نہیں آئی تھی ۔ گرم مالک کا ایسا باغ ہے اور پھول ہر طرف نگینوں کی طرح جڑے ہوئے ہیں ۔ اُن سر بلند کھجوروں کو تو دیکھو!
ٹرسٹان ۔ انکے پس پشت محل ہے ۔ کس قدر خوبصورت! اور تقریباً نصف جنبلی اور گلاب کی جھاڑیوں سے ڈھکا ہوا ہے ۔ یہاں رہتا کون ہے؟
جیوفری ۔ ایک متنفس بھی دکھائی نہیں دیتا ۔ شاید کسی مبارک رات میں جبکہ ڈائنائے ایک پریں ساتھ اپنے اندھیوں کیلئے وقف کی یہ یکایک معرض وجود میں آیا، تاکہ ان چٹانوں میں اُنکی سرست خوشیوں کا پردہ پوش ہو جائے ۔ لیکن یہاں کے باشندے فرار ہو گئے!
ٹرسٹان ۔ نہیں، یہاں انسان کی صناعی کے آثار نظر آتے ہیں ۔ اور میں کہ سکتا ہوں کہ وہ ہاتھ خوبصورت اور نازک ہیں ۔ دیکھو اُس روش پر پاؤں کے تازہ نشان ہیں ۔
جیوفری ۔ تم سچ کہتے ہو ۔ ایک چھوٹا اور نفیس نقش قدم ۔ آؤ اور آگے بڑھیں ۔ اسی کے ذریعہ سے پتہ لگائیں ۔ اس طرح ہم بھٹک نہیں سکتے ۔ وہ محل کی طرف رہنمائی کرتا ہے ۔
ٹرسٹان ۔ یہیں انتظار کرو جب تک کوئی شخص نہ آئے ۔ تہذیب مقتضی نہیں کہ یونہی دزدانہ داخل ہوں ۔ یہی کون اچھی بات تھی کہ یہاں تک بلا اجازت چلے آئے ۔
جیوفری ۔ تمہاری خوشی ۔ خدا کرے قسمت ہمارا ساتھ نہ چھوڑے ۔ میں اپنی تہذیب پر جبر اور کسی کے آنے کا صبر کے ساتھ انتظار کروں گا ۔ ابھی تک تو ستارہ موافق ہے ۔ کیوں ٹرسٹان تم نے کچھ غور کیا کہ یہ سب واقعات کس طرح ظہور میں آئے ۔ ہم دونوں خانقاہ کے قریب بلا مقصد ٹہلتے اور گیت گا گا کر وقت گزار رہے تھے کہ میں نے شاہ زینی کو جاتے دیکھا، وہ قرطبہ کے حلیم سے سرگرم گفتگو تھا ۔ اسلیے کہ اُسکی نظر ہم پر نہ پڑے، تم مجھے اپنے ساتھ کھینچ لائے ۔ چٹانوں اور جھاڑ جھنکاڑ سے کرتے ہوئے

وامن کوہ میں پہونچے، اور اتفاق سے یہ پوشیدہ راستہ مل گیا، جو عجب حکمت سے وضع کیا گیا ہے۔ تھوڑی دور تو ہم اندھیرے میں ٹٹولتے ہوئے چلے، اسکے بعد وہ دروازہ دکھائی دیا۔ لیکن یہ تو بتاؤ کہ ریمی سے تم نے احتراز کیوں کیا۔ تم تو اُس سے ملنے ہی کی غرض سے آئے تھے، اور مجھ سے وعدہ تھا کہ کل دوران ملاقات میں تمھارے ہمراہ رہوں اور تم .... اس واقعہ کو عالم جانتا ہے۔ اور اُسکی لڑکی سے تمھاری نسبت بھی قرار پا چکی ہے۔

ٹرسٹان - نسبت ! ہاں لوگ کہتے ہیں، لیکن میں مشکل سے نو برس کا تھا جب منگنی ہوئی جنگ موقوف ہو کر جب صلح کی گفتگو ہو رہی تھی، اُسوقت میرے والد نے برگنڈی کے ذریعہ سے شرائط طے کیے - لیکن جیوفری، اب میں سن تمیز کو پہونچا ہوں اور چونکہ اس معاہدہ نے باوجودیکہ ہنگام فتح کیا گیا تھا، میرے اکثر حقوق سے مجھے محروم کر دیا ہے، لہذا اس شادی کو میں نفرت کی نظر سے دیکھتا ہوں میں اپنی خوشی سے نہیں آیا، اور میری مرضی کے خلاف یہ ناگوار کام ہوگا -

جیوفری - بادشاہ ریمی کی خاطر مجھے اسکا افسوس ہے کیونکہ میں جانتا ہوں کہ اس شادی کے وعدہ سے وہ کس قدر خوش ہے، اور ہر وقت اسکا تذکرہ رہتا ہے۔

ٹرسٹان - وہ خوش ہوا کرے - کیا تم نے اُسکی لڑکی کو دیکھا ہے ؟

جیوفری - نہیں - کسی بعید مساوی خانقاہ میں اُسکی تعلیم و تربیت ہوئی ہے، اور اب وہ تم سے تعارف پیدا کرنے کے لیے بُلائی گئی ہے۔ لیکن مہربان من، ان باتوں میں ہمیں یہ نہ بھولجانا چاہیے کہ ہم کہاں ہیں ؟ اور زبردستی داخل ہوئے ہیں لیکن اس سے انکار نہیں ہو سکتا کہ یہ مقام بہت دلکش ہے سوال یہ ہے کہ کیا اسی آسانی سے ہم یہاں سے جا بھی سکتے ہیں ؟

ٹرسٹان - اندیشہ کی کوئی وجہ نہیں -

جیوفری - پس یہ بھی دریافت ہونا چاہیے کہ اس محل کے باشندے کون ہیں ؟ دروازہ پر خود حملہ کرو یا مجھے اجازت دو -

ٹرسٹان - مجھی کو جانے دو - اگر یہاں کوئی عفریت برسر حکومت ہے، تو انصاف یہی چاہتا ہے کہ پہلے میں خطرہ کا مقابلہ کروں - کیونکہ میں ہی تمھیں یہاں تمھارے خلاف منشا لے آیا - (دروازہ پر دستک دیتا ہے) (کوئی نہیں آتا)

جیوفری - دیکھو دروازہ کھلتا بھی ہے -

ٹرسٹان - اندر سے بند ہے -

جیوفری - اور زور دو، ممکن ہے کہ کھل جائے -

ٹرسٹان - یوں ہی سہی - (دروازہ کھل جاتا ہے) ارے جیوفری ! عجب شکل نظر آرہی ہے -

جیوفری - کوئی ارواح ہے ؟

ٹرسٹان - کیا ! ارواح ! شاید ایسا ہی ہو - مگر ایسی روح جو خود روشن ہے، اور پیام نور پہونچاتی ہے -

جیوفری (اندر جھانک کر) ایک خوبصورت لڑکی ایک نفیس کوچ پر لیٹی ہے - بیشک وہ سو رہی ہے -

ٹرسٹان - سو رہی ہے اور اسکی دھیمی سانس میں خاموش ترنم ہے اور گلابی ہونٹوں پر خفیف تبسم گویا وہ ہماری حیرت کو خواب میں دیکھ رہی ہے -

جیوفری - ٹرسٹان، آؤ یہاں سے بھاگیں - یہ جادو بھرا نظارہ میری روح میں تلاطم پیدا کر رہا ہے - اور اس قدر دلفریب ہے کہ سحر کے سوا کوئی اصلیت نہیں ہو سکتی - کسی جادوگر کا محل ہے - آؤ چلیں - آؤ - مجھے ایسا محسوس ہو رہا ہے کہ طلسمی سانپ ہم کو ڈس لینگے - ٹرسٹان تم ابھی سے بھوت ہوگئے - زمین نے تمہارے قدم تھام لیے ہیں اور تمہاری آنکھوں کی گردش بند ہوگئی ہے تم اُسکی طرف گھور رہے ہو - آؤ ٹرسٹان آؤ -

ٹرسٹان - جیوفری آہستہ بولو - ممکن ہے کہ خفیف ترین جنبش اُسے بیدار کر دے - میرے نزدیک اس قابل پرستش سکوت کو توڑنا گناہ ہے جو اُسکی نیند نے ہر شے پر طاری کر دیا ہے -

جیوفری - آفریں! آفریں!

ٹرسٹان - خاموش! اب ایک لفظ بھی نہ بولو - یہ جگہ مقدس ہے - (دروازہ کے سامنے گھٹنے ٹیک دیتا ہے اور ہاتھ پھیلا کر کہتا ہے) خفا نہ ہونا کہ دراندازِ اور نامحرم نگاہوں نے تجھے تیری خوابگاہ میں دیکھا -

جیوفری - اُٹھو! میں تمہارے واسطے کانپ رہا ہوں - تم پر جادو چل گیا - یہ منظر محض دھوکہ کی ٹٹی ہے - میرے ساتھ آؤ -

ٹرسٹان - میں مجبور ہوں -

جیوفری - اچھا تو سنگ مرمر کے سیل کی طرح زمین میں تو نہ گڑے جاؤ - مرد بنو - اگر یہاں سے بھاگنا نہیں چاہتے، تو اپنے دل ہی پر قابو رکھو، اور یہ دریافت کرو کہ یہ خوبصورت مخلوق کون ہے - اسے جگاؤ!

ٹرسٹان - نہیں! یہ ایک گناہِ عظیم ہوگا -

جیوفری - اگر تم نہیں جگاتے تو میں جگاتا ہوں - (داخل ہوتا ہے)

ٹرسٹان (اپنے آپ سے) لے لو! گستاخ شخص! اُسے پکار رہا ہے، اُسکا ہاتھ پکڑ لیا -

جیوفری (دوڑتا ہوا باہر نکلتا ہے) بھاگو! بھاگو! وہ جاگ نہیں سکتی - کسی سیاہ دل جادوگر کے منتروں نے اُسکے حواسوں کو جکڑ دیا ہے - آؤ! میں خوف کے مارے کانپ رہا ہوں - ہم ایسے مقدس مکان میں گستاخانہ داخل ہوئے - شاید اسکی سزا موت ہو!

ٹرسٹان مقدس مقام! یہ سچ ہے - لیکن یہاں موت نہیں، بلکہ حیات تقسیم ہوتی ہے - خیر کچھ حرج نہیں! آؤ اس جگہ سے روانہ ہو جائیں جہاں ہمیں داخل نہ ہونا چاہیے تھا - وہ سو رہی ہے - اور یہ شیوہ مردانگی نہیں کہ ہم یہاں ٹھہرے رہیں!

جیوفری - آؤ چلیں -
ٹرسٹان - لیکن ٹھہرو، جاتے جاتے ایک نظر اور دیکھ لوں دم بھر کو اسکے قریب جا کر اسکے خط و خال کو اپنے حافظہ کی لوح پر نقش کر لوں (دا‌خل ہوتا ہے)
جیوفری - دیکھو، وہ جھکا اور اسکے ہاتھ کو بوسہ دیا! کس طرح اسکی طرف دیکھ رہا ہے - اس لو اسکے گلے سے ایک فیتہ کھول لیا - خدا کا شکر ہے کہ آرہا
ٹرسٹان (آتا ہے) اب اسکا سراپا میرے دل پر نقش ہو گیا اور کبھی نہیں مٹ سکتا - آؤ چلیں، اور اس جادو سے پناہ مانگیں - تاہم میں نے عہد کیا ہے کہ یہاں دوبارہ آؤں گا اور اگر میں غلطی نہیں کرتا تو وہ میری قسم سنکر لطف آمیز طریقہ سے مسکرائی تھی اور خواب میں میرے ارادوں کو برکت دی تھی - دیکھو جیوفری میں یہ زیور لے آیا یہ کوئی قیمتی جواہر ہے جو اسکے سینہ پر رکھا ہوا تھا جس طرح "حسین" کا لڑکا مصروفِ خواب "سال" کی عبا کا ایک ٹکڑا لے گیا تھا تاکہ یہ ثابت ہو کہ بادشاہ کی زندگی اسکی مٹھی میں تھی اسی طرح یہ جواہر اس بات کا شاہد ہوگا کہ میں یہاں آیا تھا اور اپنی زندگی اس کی مٹھی میں دیکر چلا گیا درانحالیکہ وہ محوِ خواب تھی - آؤ - جیوفری!

[دونوں چور دروازہ کی طرف روانہ ہوتے ہیں، ادھر آیولینیقی مکان کے دروازہ پر آتی ہے]

(باقی)

اثر لکھنوی

غزل

شکوہ کرتے ہو کہ ملتا نہیں پیکاں میرا
تم نے کب دل سے نکالا کوئی ارماں میرا

وطن آوارہ ہوں کوئی نہیں پرساں میرا
پاس سے تکتی ہے منہ شامِ غریباں میرا

اس قدر ہوں میں شہیدانِ وفا میں ممتاز
نام لکھا ہے سرِ گورِ غریباں میرا

کام آئی مرے وحشت میں مری جامہ دری
اپنے دامن میں لیے ہیں وہ گریباں میرا

قیدِ ہستی میں کبھی پاؤں کو پھیلا نہ سکے
وسعتِ دل سے بہت تنگ ہے زنداں میرا

پردہ داریِ شبِ ہجر جنوں میں بھی رہی
صبح کے بھیس میں نکلا ہے گریباں میرا

دل میں سو رنج نہاں تجھکو بس اک پھول کا غم
سامنا کرتی ہے کیا بلبلِ نالاں میرا

مجھ کو کیا اہلِ ہنر یاد کریں گے صفدر
بعد میرے جو چھپا بھی کبھی دیواں میرا

صفدر مرزا پوری

سفر حجاز کی مختصر روداد

(سلسلۂ الناظر اکتوبر ۱۹۲۵ء)

پورا ایک سال گذرا کہ روداد کے اوراق نذر ناظرین نہیں ہو سکے جسکے لیے نادم اور عذر خواہ ہوں - اور اب اس طرح تلافی کرنا چاہتا ہوں کہ اس ششماہی میں روداد مکمل ہو جائے - اسکے بعد احباب کی خواہش ہوگی تو ساری روداد کتابی صورت میں انشاء اللہ علحدہ شائع کر دی جائیگی -
ظفر الملک

ساتویں منزل

۸ - جولائی کو مدینہ منورہ سے قافلہ روانہ ہوا تھا، جس راہ سے آنا ہوا تھا اُسکے بجائے قافلہ نے دوسری راہ اختیار کی - جب تک حوالیِ شہر کے قریب قافلہ رہا، دور سے مدینہ منورہ کی عمارتیں، مسجد نبوی کے مینار، اور روضۂ اطہر کا سبز گنبد نظر فروز ہوتا رہا، تا آنکہ مغرب تک ایک ایک کرکے سب نشانات نظر سے اوجھل ہو گئے - جس راستہ پر قافلہ جا رہا تھا، ناہموار اور پتھریلا تھا، کچھ تو اس سبب سے اور کچھ اس لیے کہ مسلسل چڑھائی تھی شغدف میں بیٹھنا زیادہ آرام دہ نہیں معلوم ہوا لیکن تازہ دم اونٹ ذرا تیز رفتاری سے چل رہے تھے، اور ضعف کا اثر بھی بہت کچھ موجود تھا، لہذا نمازیں بھی شغدف ہی پر پڑھی گئیں - منزل چھوٹی تھی اس لیے جلد طے ہو گئی اور عشا کے وقت بیر الماشی پہونچ گئے -

دوشنبہ ۹ - جولائی
بیر الماشی کا پانی مدینہ منورہ کی طرح نہایت شیریں اور ٹھنڈا تھا، ہوا بھی یہاں خوب ٹھنڈی چل رہی تھی جسکی وجہ سے تمازت آفتاب سے ذرا تکلیف نہیں ہوئی - کنوئیں سے کچھ فاصلہ پر خرمے کے درخت لگے ہوے تھے - بازار بہت مختصر تھا اور معلوم ہوتا تھا کہ عارضی طور پر محض قافلہ کی آمد سنکر کچھ دوکاندار جمع ہو گئے ہیں، کیونکہ سبزی ترکاری، تربوز، خربوزہ اور گوشت کے سوا یہاں کچھ نہیں بکتا تھا، قریب ہی ایک قلعہ کی عمارت بنی ہوئی تھی جو بالکل اُجڑا ہوا سا تھا - سہ پہر کو عصر کے قریب قافلہ یہاں سے اُٹھا - اب راستہ ہموار اور ریتلا تھا - گو دونوں جانب قریب قریب پہاڑوں کا سلسلہ دور تک چلا گیا تھا - عصر کے وقت نماز کیلیے اُترا،

عینک شغدف پر رکھدی تھی، اسلیے نماز کے بعد اپنے شغدف کو نہ پہچان سکا، اور آگے نکل گیا، دُور تک چلتا رہا اور ہر شغدف کو آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھتا رہا، کمزور پہلے ہی سے تھا، دیر تک پیدل چلنے کی وجہ سے بہت خستہ ہوگیا - ایک بدوسے دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ میرا اونٹ قافلہ کی جس ٹکڑی میں ہے، وہ پیچھے ہے - لہذا وہیں رُک گیا - کچھ دیر میں شغدف ملا تو اُس پر سوار ہوا - خستگی سے صدورجہ طبیعت نڈھال ہوگئی تھی - مگر اس راہ میں چوروں کی کثرت ہے، اس لیے عادت کے خلاف قافلہ کے ساتھ ساتھ مشعلیں روشن رہیں اور بدو برابر شور کرتے رہے اور ہوشیار رہو، جاگتے رہو، کا شور مچاتے رہے - جسکی وجہ سے اچھی طرح نیند نہ آئی - تھوڑی ہی رات سے ٹھنڈک بڑھ گئی تھی، جیسے جیسے رات بڑھتی گئی، ہوا سرد ہوتی گئی - یہاں تک کہ رضائی اُوڑھنے پر بھی سردی معلوم ہورہی تھی - اوڑھنے کا مزید سامان ساتھ نہ تھا اس لیے بہت تکلیف پہونچی - اور سردی سے بخار آگیا - قافلہ رات ہی میں غائر پہونچ گیا تھا، جلدی جلدی شغدف اُتارا اور اوڑھ لپیٹ کر سو رہا - منزل پر کچھ سردی کم تھی - کرب کی وجہ سے نیند اچھی طرح نہیں آئی، لیکن تمام جسم میں درد تھا جسکی وجہ سے ہلنے کو بھی جی نہ چاہتا تھا - نماز فجر کے بعد پھر سونے کے خیال سے لیٹا اور تقریباً ۹ بجے تک کروٹیں بدلتا رہا -

سہ شنبہ - ۱۰ - جولائی صبح کو کھانا پکانے کا وقت تھا، ضرورت تھی کہ حاجی شبراتی صاحب کو ضروری سامان بازار سے لاکر دیا جاتا، مگر میری خرابی طبیعت پر لحاظ کرکے اُن غریب نے سارا کام خود ہی کرلیا - اور جب کھانا تیار کر چکے تو مجھے بھی اُٹھایا - میں نے پہلے تو تھوڑا سا خمیرہ بنفشہ کھایا - اسکے کچھ دیر بعد کھانا، مگر منہ کا مزا خراب تھا اس لیے اچھی طرح کھانا نہ کھایا گیا -

بیر الماشی پر تو کچھ دینا نہیں پڑا تھا، مگر یہاں ۵ قرش چوکیداری کے دینا پڑے - غائر سے روانگی کا وقت آیا تو معلوم ہوا کہ پہاڑ سے پیدل اُترنا پڑے گا، کیونکہ راستہ بہت پیچیدہ اور خطرناک ہے، اونٹ سواریاں لیکر نہیں چل سکتے - میں بہت نحیف ہو رہا تھا اسلیے مجھے اس میں تامل ہوا - مگر کوئی چارہ نہ تھا - عورتیں تک شغدفوں پر نہیں بٹھائی گئیں - آگے آگے اونٹ اور پیچھے پیچھے حجاج - تھوڑی راہ طے ہوئی تھی کہ میں تھک کر بیٹھ گیا - لاچار ہوکر جمّال نے ایک خالی اونٹ پر مجھے بٹھا دیا - مگر تھوڑی ہی دُور چلے ہونگے کہ راستہ میں ایک موڑ پر ایک اونٹ گرا پڑا تھا، جسے بدوؤں نے وہیں ذبح کر ڈالا تا کہ راستہ سے لاش ہٹا کر نیچے کھڈ میں ڈال دیں - شتربان نے یہ حالت دکھا کر مجھ سے اُتر پڑنے کی خواہش کی، مجبوراً مجکو پھر اُترنا پڑا - اونٹ پر چڑھتے وقت

میں نے اپنی سلیپر حاجی شبراتی کو دیدی تھی، کیونکہ اُنکا جوتہ شغدف پر رہ گیا تھا اور ننگے پاؤں چلنے میں اُنھیں تکلیف ہو رہی تھی، اب خود مجھے ننگے پاؤں چلنا پڑا۔ دوپہر کا وقت تھا۔ تمازتِ آفتاب سے پتھریلی زمین تپ رہی تھی۔۔۔۔۔ لوے بھُنے جاتے تھے، مگر مجبوری تھی۔ حاجی شبراتی شغدف کے ہمراہ آگے جا چکے تھے۔ بہزار خرابی و تکلیف یہ راستہ طے ہوا۔ اُتار ختم ہو جانے اور ہموار راستہ آجانے کے بعد بھی کسی سبب سے اونٹ نہیں رُکے۔ یہاں تک کہ کچھ دور آگے چل کر میں ماندگی کے، باعث گر پڑا۔ میری بیچارگی کو دیکھ کر ایک بدو کو رحم آیا اور اُس نے میرے جمال سے جا کر اطلاع کی تب کہیں شغدف پر سوار ہونے کی نوبت آئی۔ تھوڑی ہی دیر میں منزل پر پہونچ گئے، خستگی کی وجہ سے رات بھر غفلت کی نیند آئی۔

چہارشنبہ ۱۱ جولائی — بیر الشہب میں قافلہ پورے چوبیس گھنٹے رہا۔ پژمردگی اور کمزوری کے باعث میں تو دن بھر شغدف کی آڑ میں لیٹا رہا۔ بیچارے حاجی شبراتی سارا کام کرتے رہے۔ پانی یہاں بھی نہایت اچھا تھا۔ اگرچہ غائر کی سی سردی نہ تھی۔ عصر کے وقت قافلہ روانہ ہوا۔ راستہ میں کسی مقام پر شب میں قافلہ بہت دیر تک رکا رہا۔ میں شغدف سے اُترا نہیں مگر بیٹھے بیٹھے بدوؤں سے دریافت کیا کہ قافلہ کیوں رکا کھڑا ہے۔ کوئی معقول جواب تو ملا نہیں، لیکن قیاس یہ چاہتا ہے کہ جن قبائل نے پہلے راستہ کا ٹیکس وصول کیا تھا اُنھیں میں سے کسی نے روکا ہوگا۔ اور جب اُنھیں یہ اطمینان ہوگیا کہ جاتے وقت معقول رقوم دی جاچکی ہیں، تب قافلہ کو آگے بڑھنے دیا۔ راستہ میں رُکے رہنے کی وجہ سے خواہ مخواہ منزل کھوٹی ہوئی اور بیر حسانی پہونچتے پہونچتے آفتاب نکل آیا تھا۔

پنجشنبہ ۱۲ جولائی تا پنجشنبہ ۱۹ جولائی — بیر حسانی سے مکہ معظمہ تک اُسی راہ سے واپسی ہوئی جس راستہ سے قافلہ آیا تھا، اور جسے سلطانی راستہ کہا جاتا ہے۔ جاتے وقت گرمی بہت تھی۔ مگر واپسی میں گرمی بہت کم رہی اور ٹھنڈی ہوائیں برابر چلتی رہیں، جس سے اندازہ ہوا کہ موسم میں تبدیلی ہوگئی ہے۔ ورنہ احرام بند ہونے کی وجہ سے زیادہ تکلیف ہوتی۔ طبیعت کی کمزوری کے باعث میں عموماً منزلوں پر لیٹا رہتا، اور سارا کام کاج حاجی شبراتی کیا کرتے۔ ضعف کے دفعیہ کی غرض سے میں نے کھچڑی کھانا موقوف کردی تھی، بلکہ ہر منزل پر گوشت لیکر شوربہ تیار کر آتا تھا۔ شوربہ کے مسلسل استعمال سے ضعف میں خاطر خواہ کمی ہوئی۔ راستہ میں کوئی خاص واقعہ پیش نہیں آیا، البتہ مستورہ میں سابقہ تجربہ کے خلاف میٹھے پانی کے ملنے سے بہت خوشی ہوئی۔ دریافت سے معلوم ہوا کہ کچھ فاصلہ پر

برساتی پانی جمع ہے وہیں سے شکیزے بھر لاتے ہیں - اس پانی کی قیمت ضرور زائد تھی -
مدینہ منورہ کی حاضری کے وقت راستہ جس قدر دیر میں اور دشواری سے طے ہوا تھا، واپسی میں اُسی قدر جلد اور آسانی سے تمام ہوا - موسم بھی نسبتاً خوشگوار تھا، اور باوجودیکہ حاجی شبراتی کے سوا کوئی اور رفیق سفر نہ تھا، طبیعت بھی ناساز تھی، لیکن کسی قسم کی کوئی تکلیف نہیں پہونچی - ہمارا جمال محسن بھی بہت شریف اور نیک تھا، اگرچہ اُسکا نوجوان لڑکا کبھی کبھی تقاضائے عمر و بربنائے شرارت سبب پریشانی بنجاتا تھا، لیکن جہاں باپ کو بیٹے کی غفلت یا شرارت کا حال معلوم ہوتا وہ بیچارہ فوراً اُس رفع شکایت کی کوشش کرتا - مکہ معظمہ پہونچنے کے بعد جب اپنے مقام پر اطمینان سے بیٹھ کر اُس سامان کی جانچ کی جو اس سفر میں ہم لوگوں کے ساتھ تھا تو پتہ چلا کہ حاجی شبراتی کے کچھ کپڑے غائب ہیں - جمال اپنا بقیہ کرایہ لینے کے لیے آیا تو اُس سے کہا گیا، اور اگرچہ اُسکو اور اُسکے لڑکے کو کپڑوں کی تلاش میں بہت کافی دوڑ دھوپ کرنا پڑی اور سوا ایک کے سب چیزیں مل بھی گئیں، پھر بھی وہ غریب اس بات پر نادم و متاسف رہا کہ ایک کپڑا ضایع ہوگیا - اور جب اُسکو بقیہ اُجرت دی گئی تو بہت خوش ہوا، اور مزید بخشش کا قطعاً کوئی مطالبہ نہیں کیا - تجربہ سے معلوم ہوا کہ بدوؤں کی وحشت اور تیزی شہر میں داخل ہونے کے بعد بہت کچھ قابو میں آجاتی ہے - جمال کا لڑکا جو راہ میں بہت شوخ و شریر نظر آتا تھا، مکہ معظمہ پہونچکر حلم و اطاعت شعاری کا مجسمہ معلوم ہوتا تھا - اس تبدیلی کا باعث غالباً حکومت کے تعزیری قوانین قرار دیے جا سکتے ہیں، جنکی وجہ سے ذرا سی شکایت پر فوراً گرفتاری ہوجاتی ہے -

آٹھویں منزل

۱۹ - جولائی کو ظہر کے وقت مکہ معظمہ پہونچے - احباب سے ملاقات ہوئی تو معلوم ہوا کہ جب قوافل مدینۂ منورہ سے واپس آئے اور شریعت صاحب تک شکایت پہونچی کہ راستہ میں حجاج سے بہت روپیہ بدو قبائل نے لے لیا ہے، تو اُنھوں نے اکثر حجاج کو بُلا کر نصف رقم واپس دیدی - میرے لیے بھی تو عدد مجیدیاں وصول کرلی گئی تھیں جو مشفقی میر عبدالعزیز صاحب سے مل گئیں -
عبدالقادر مطوف کے بیٹے حسن سکندر بھی اس اثنا میں آ گئے تھے، اُن سے معلوم ہوا کہ چچی صاحبہ، اُنکی صاحبزادی اور عزیزی انور علی سلمہٗ خلف اصغر منشی اطہر علی صاحب مرحوم و مغفور بھی آ گئے ہیں - اور حرم شریف کے قریب ہی مقیم ہیں - یہ سب لوگ میرے ہمراہ آنے والے تھے، مگر

بعض اسباب سے رُک گئے تھے اور عید بعد وطن سے روانہ ہوئے - عصر کے بعد میں ان لوگوں سے جا کر ملا، اور شام کو بعد مغرب طواف اور سعی سے فراغت کر کے سر کے بال ترشوائے اور احرام اُتارا۔

دوسرے روز جناب مولانا محمد سعید صاحب کے یہاں جا کر ہندوستان کی آئی ہوئی ڈاک وصول کی - بعد نماز جمعہ حکیم موسیٰ سے مل کر کچھ دوا لی، کیونکہ بخار اگرچہ اب نہ تھا مگر نزلہ کا زور باقی تھا۔ پھر عبدالستار عبدالجبار کی کوٹھی پر جا کر حاجی شبرانی کو اُس تحریری حوالہ کی بنا پر چودہ مدینہ منورہ سے اپنے ہمراہ لائے تھے روپیہ دلایا - اور گھر آ کر اخبار ہمدم کے پرچے اور القلم پڑھتا رہا - خطوط لکھنے کے ارادہ سے سویرے ہی ناشتہ وغیرہ سے فراغت کر کے بیٹھا تھا کہ حاجی برہان الدین صاحب تاجر ادویہ لکھنؤ آ گئے، جو معہ نذیر حسین صاحب تاجر پارچہ اور مولوی عبدالرشید صاحب فرنگی محلی کے قریب کے ایک مکان میں ٹھہرے ہوئے تھے - اُنکی معیت میں حکیم موسیٰ کے یہاں گیا اور اُن سے کچھ اور دوا لی - اور وہاں سے رباط بھوپال جا کر الطاف حسین صاحب سے ملا، اور علی میاں صاحب کا خط جو مدینہ منورہ سے لایا تھا اُنکو دیا - پھر حجی صاحبہ کے یہاں حاضری دیتا ہوا مکان واپس آیا - اور بعد نماز ظہر خطوط لکھے - شام کو بازار جا کر مجید یاں وغیرہ بھنائیں، کیونکہ دوسرے دن حج کے لیے منا جانا تھا -

مکہ معظمہ میں رویت کے مشتبہ رہنے کی وجہ سے تعین تاریخ میں دقت پیش آئی، اور جب بالآخر یہ طے پا گیا کہ ۲۳ - جولائی دوشنبہ کو حج ہوگا، تو اب اتنا وقت نہیں رہا تھا کہ اطمینان سے پورا ایک دن منیٰ میں بسر کر سکیں -

---

رسید کتب

		قیمت
۱- وقار حیات	آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس علیگڈھ	عہ؍
۲- التربیۃ الاستقلالیہ	ایضاً	؍؍ عمار؍
۳- شعر الہند حصہ دوم	دار المصنفین اعظم گڈھ	؍؍ للعہ؍
۴- آئینۂ حقیقت نما	مولانا اکبر شاہ خاں نجیب آبادی	؍؍ عگار ۸؍
۵- مثنوی مطلع الانوار (فارسی) -	مسلم یونیورسٹی پریس علیگڈھ	؍؍ سے؍
۶- بدھ اور اُسکا مت	رائے بہادر پنڈت شیو نرائن شمیم ایڈوکیٹ لاہور	
۷- رحمۃ للعالمین	مولوی حبیب حسن ردولوی	؍؍ عہ؍
۸- بچوں کا قاعدہ	مولوی سجاد مرزا ایم اے (رکنٹب)	؍؍ ۴؍

تنقیدیں

تاریخ نجد۔ از مولانا حافظ محمد اسلم جیراجپوری۔ سلطان ابن سعود نے حجاز پر جب سے چڑھائی کی ہے لوگوں کو نجد اور اہل نجد کے حالات سے ایک قسم کی دلچسپی پیدا ہوگئی ہے۔ اسی عام دلچسپی کے لحاظ سے یہ نہایت باموقع کتاب شایع ہوئی ہے جسکے مطالعے سے جزیرۃ العرب کے اس نہایت اہم جزو کے ضروری حالات سے لوگوں کو آگاہی ہو جائے گی۔ اور عام طور پر جو بے سروپا باتیں نجدیوں یا وہابیوں کے عقائد سے متعلق مخالفین نے مشہور کردی ہیں اُنکا ازالہ ہو جائے گا۔ اس مختصر تاریخ میں نجد کے مختلف حصوں کے جغرافی حالات اور اہل نجد کی عام معاشرت لکھنے کے بعد وہابیوں کی مذہبی تحریک اور آل سعود کے حکمرانوں کے مختصر کارنامے درج کیے ہیں۔ جس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہابی فرقہ کے عقائد و خیالات ایسے خطرناک نہیں ہیں جیسے کہ عام طور پر ظاہر کیے جاتے ہیں۔ بلکہ وہابی عام اہل سنت کی طرح ائمۂ اربعہؒ کو مانتے اور جزئیات فقہ میں امام احمد حنبلؒ کے اتباع کو ضروری خیال کرتے ہیں۔ چنانچہ خود محمدؒ بن عبدالوہاب بانی فرقۂ وہابیہ نے جو خط عراق کے ایک عالم عبدالرحمٰن بن عبداللہ سویدی بغدادی کے نام لکھا ہے اُس میں اپنے عقائد کو یوں واضح کیا ہے:۔

"بحمداللہ میں متبع سلف ہوں نہ کہ مبتدع۔ میرا دین وہی ہے جو اہل سنت وجماعت یعنی سلف صالح مثلاً ائمۂ اربعہ اور اُنکے تابعین کا تھا۔ میں نے لوگوں کو توحید کی تعلیم دی۔ اولیاء و صلحاء مدفون کے پکارنے اور اُن سے امداد مانگنے کو منع کیا، انکی قبروں پر نذر و نیاز چڑھانے اور سجدہ وغیرہ کرنے سے روکا، کیونکہ یہ سب حقوق اللہ کے ہیں، جو نہ کسی نبی مرسل کو حاصل ہیں نہ کسی فرشتۂ مقرب کو۔

یہی وہ تعلیم ہے جو تمام انبیاء اول سے آخر تک دیتے چلے آئے ہیں، اور اسی پر اہل سنت وجماعت قائم ہیں۔ .... میں نے اپنے متبعین پر لازم کیا ہے، کہ وہ نماز با جماعت پڑھیں، زکوٰۃ وغیرہ فرائض ادا کریں، منہیات ومنکرات، ریا کاری و شراب خواری وغیرہ سے بچیں۔ (ص۵۴ و ۵۵)

بعض روساء کو اُن سے اختلاف تھا اور اُنھوں نے عوام کو اُنکے خلاف بھڑکانے کے لیے طرح طرح کی باتیں مشہور کی تھیں جنکا ذکر اسی خط میں یوں کیا گیا ہے:۔

"منجملہ ان کے (افتراء پردازیوں کے) ایک یہ بھی ہے، جو آپ نے اپنے خط میں لکھی ہے کہ میں سوائے اپنے متبعین کے سب کو کافر کہتا ہوں اور انکے نکاحوں کو صحیح نہیں سمجھتا۔ تعجب ہے کہ کیونکر کسی عاقل کے دماغ میں یہ بات سما سکتی ہے کہ کوئی مسلمان ایسا کہے گا۔ میں اس قول سے اللہ کو شاہد گردان کر اپنی براءت کا اظہار کرتا ہوں۔ یہ تو وہی کہے گا جسکی عقل مختل ہو۔ اہل غرض سے اللہ کی پناہ۔

ایسے ہی لوگوں نے مجھ پر تہمت لگائی کہ میں کہتا ہوں کہ اگر مجھے قدرت ہوتی تو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے مزار مبارک کے قبہ کو گرا دیتا۔ دلائل الخیرات کا جلانا یا نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر درود بھیجنے سے منع کرنا بھی میری طرف منسوب کرنا خواہ کسی لفظ میں ہو سراسر کذب و بہتان ہے ....

تکفیر کی بابت جو آپ نے ذکر کیا ہے، تو میں صرف اس شخص کو کافر سمجھتا ہوں جو جان بوجھ کر دین حق سے روگردانی کرے یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر طعن کرے یا انکی تعلیمات کی طرف آنے سے لوگوں کو روکے۔ یہی لوگ میرے نزدیک کافر ہیں لیکن امت کا بڑا حصہ بحمداللہ ایسا نہیں ہے۔" (ص ۵۵ و ۵۶)

ایک دوسرے خط سے جو علمائے قصیم کے نام ہے، شیخ کے عقائد کی مزید صراحت یوں ہوتی ہے :-

"میں اللہ کو شاہد قرار دیکر کہتا ہوں کہ میرا وہی عقیدہ ہے جو فرقۂ ناجیہ اہل سنت و جماعت کا ہے یعنی اللہ۔ ملائکہ۔ کتب۔ رسل۔ بعث بعد الموت اور تقدیر پر ایمان رکھتا ہوں۔ صفات الٰہیہ کو بلا تحریف و تعطیل کے اسی طرح مانتا ہوں جس طرح وہ کتاب و سنت میں بیان کی گئی ہیں۔ نہ انکی نفی کرتا ہوں، نہ انکے الفاظ میں تحریف اور نہ انکو مخلوق کی صفات سے تشبیہ دیتا ہوں۔

* * * * * * * * *

نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی شفاعت پر ایمان رکھتا ہوں کہ وہی اولین شافع ہوں گے اور اسکے منکر کو گمراہ و بدعتی سمجھتا ہوں۔ لیکن یہ شفاعت بعد اذن و رضائے الٰہی ہوگی اور کوئی شفاعت مشرکین کے کام نہ آئے گی ..... آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو خاتم النبیین مانتا ہوں، اور کسی شخص کو اسوقت تک مومن نہیں سمجھتا جب تک کہ انکی رسالت پر ایمان نہ لائے۔ اس امت میں سب سے افضل حضرت ابوبکر صدیق پھر عمر فاروق، پھر عثمان

ذی النورین، پھر علی مرتضیٰ پھر بقیہ عشرہ مبشرہ رضوان اللہ علیہم کو سمجھتا ہوں۔ انکے بعد اہل بدر اور پھر تمام صحابہ کو.......

ابن سحیم نے میرے اوپر جو الزامات لگائے ہیں، مثلاً یہ کہ میں مذاہب اربعہ کی کتب کو باطل سمجھتا ہوں، یا یہ کہ چھ سو برس سے امتِ اسلامیہ میرے نزدیک گمراہی میں ہے، یا میں مجتہد یا تقلید سے خارج ہوں، یا علماء کے اختلاف کو بجائے رحمت کے نقمت کہتا ہوں، یا جو لوگ صالحین سے توسل کریں انکو یا بوصیری (صاحب قصیدہ بردہ) کو "یا اکرام الخلق" والے شعر کی وجہ سے کافر سمجھتا ہوں، یا نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی قبر یا اولاد کے لیے والدین کی قبروں کی زیارت کو حرام جانتا ہوں، یا غیر اللہ کے نام کی قسم کھانے والے یا ابن الفارض اور ابن عربی کو کافر قرار دیتا ہوں، یا دلائل الخیرات کو جلا دیتا ہوں اور روض الریاحین کو روض الشیاطین کہتا ہوں، ان سب کا جواب صرف یہ ہے کہ سبحانک ہذا بہتان عظیم۔

رہی یہ بات کہ میں کہتا ہوں کہ کسی شخص کا اسلام کامل نہیں ہوسکتا جبتک کہ وہ کلمہ طیبہ کے معنی نہ سمجھے، یا تقرب لغیر اللہ کے لیے نذر ماننا کفر اور ذبیحہ حرام ہے۔ یہ مسائل حق ہیں، میں انکا قائل ہوں اور ان پر کتاب و سنت سے پختہ دلائل رکھتا ہوں۔" (ص۵۶ و ۵۷)

اقتباساتِ بالا سے عیاں ہو جاتا ہے کہ جو عقائد عام طور پر وہابیوں سے منسوب کیے جاتے ہیں، یہ درحقیقت وہ باتیں ہیں جو انکے دشمنوں اور مخالفوں نے انکے زور و قوت کو گھٹانے کے لیے مشہور کردی تھیں۔ ورنہ فی الاصل وہ اہل حدیث یا غیر مقلدوں کی مانند بھی دین میں متشدد نہیں۔ حالانکہ اس زمانہ میں جو خرابیاں رائج ہیں، انکے لحاظ سے اسی قسم کے تشدد کی ضرورت ہے

نجد کی حکومت مختلف امراء کے ہاتھوں میں رہی۔ ۱۱۵۹ھ سے ۱۲۳۴ھ تک آل سعود قابض رہے، اسکے بعد سے ۱۳۰۲ھ تک آل شمر متصرف رہے۔ ۱۳۲۰ھ سے موجودہ سلطان عبدالعزیز ابن سعود حکمراں ہیں جنھوں نے رفتہ رفتہ تمام عرب و جوار کے علاقوں کو اپنے زیر نگیں کرلیا، تا آنکہ اب خاص عرب میں امام یمن کے سوا انکا کوئی حریف نہیں رہا۔

اہل نجد کی عام معاشرت (ص۱۳ لغایۃ ص۱۸) اور حکومت نجد کے حالات (ص۱۹ لغایۃ ص۲۹) کے پڑھنے سے اندازہ ہوسکتا ہے کہ اس چودھویں صدی میں اگر کسی کو اسلام کے ابتدائی عہد کا نمونہ دیکھنا ہو تو وہ نجد میں جاکر رہے۔

کتاب بہت مختصر ہے، ابتدائی تاریخ بالکل نظر انداز کردی گئی ہے اور ترتیب کے لحاظ سے بھی تاریخ کہے جانے کے بجائے نجد اور نجدیوں کے متعلق چند متفرق مضامین کا مجموعہ ہے، جس میں فرقہ وہابیہ کو

پیچاہلی صورت میں پیش کرنے کی نمایاں کوشش کی گئی ہے۔ اور اسی حیثیت سے اس کتاب کا مطالعہ مفید ہوگا۔ کتابت وطباعت متوسط درجہ کی۔ قیمت عہ ملنے کا پتہ :- مکتبہ جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی۔ ظ

فغانِ آرزو جناب انور حسین صاحب آرزو لکھنوی کا پہلا دیوان ہے، جو چھوٹی تقطیع کے ۲۹۵ صفحات پر ادبی پریس لکھنؤ نے شایع کیا ہے۔ شروع میں وصی احمد صاحب اخگر کا ایک مختصر مقدمہ ہے اسکے بعد آرزو صاحب کی تصویر ہے۔ پھر اصل دیوان شروع ہوتا ہے، آخر میں "چہل چراغ" کے عنوان سے آپ کی چالیس رباعیات ہیں اور "دل صد پارہ" کے عنوان سے متفرق اشعار۔ آرزو صاحب کا شمار لکھنؤ کے اچھا کہنے والوں میں ہوتا ہے، اور اُن کی پاک سلیس اور شیریں زبان پڑھکر خوشی ہوتی ہے۔ زبان لکھنے کا دعوے اکثر کیا گیا ہے، لیکن عام بازاری محاورات کو نظم کر دینا زبان نویسی نہیں ہے۔ آرزو صاحب کی زبان اِن آلایشوں سے پاک ہے۔ اُنکی زبان کی سادگی، گھلاوٹ اور نرمی سے لکھنؤ کا نام روشن ہے۔ بحیثیت مجموعی دیوان بہت امید افزا ہے، گو یہ سچ ہے کہ زیادہ تعداد ایسے اشعار کی ہے جو اوسط درجہ کے ہیں، اور بلند وعمدہ اشعار کی تعداد کم ہے، لیکن جو اشعار عمدہ ہیں وہ بہت عمدہ ہیں۔ جس طرح علیگڈھ کالج اپنی پچاس سالہ حیات میں اپنی طرز معاشرت اور ایک مخصوص شان بہت کم بدل سکا، اسی طرح لکھنؤ اسکول کی شاعری اپنے قدیم رنگ پر قائم ہے، اور خارجی اثرات سے بہت کم متاثر ہوئی ہے۔ آرزو صاحب کے یہاں بھی یہ لکھنؤ کا رنگ شروع سے آخر تک پایا جاتا ہے، گو جہاں کہیں اُنھوں نے پامال اور فرسودہ مضامین لکھے ہیں، اپنے انداز بیان اور قدرت ادا سے اُنھیں عام سطح سے اُٹھا لیا ہے۔ ملاحظہ ہو:

چارہ گر فکر دوا چھوڑ کے ہیں محو دعا ، ہو گیا حال کچھ ایسا کہ گماں اور ہے اب
گرتے ہی آستانے میں بیدل سے ہو گئے گم ، یہ اور کوئی شے تھی قطرہ نہ تھا لہو کا

بعض اشعار بہت ہی اچھے ہیں:

کیا حالتِ بسمل پہ ہو انگشت بدنداں ، اب کا ہے کو ہوگا اثرِ تیر ادا یاد
اپنا جو بنانا ہے تو او دشمنِ ایماں ، اتنا بھی نہ کر ظلم کہ آجائے خدا یاد
ہاں ہاں یہی ہے شانِ حجاب اے کلیم طور ! ، پردے اُٹھیں ہزار مگر سامنا نہ ہو
کہتے کہتے حالِ ضبطِ عشق آنسو گر پڑے ، ہائے وہ دعوے کہ بے تردید خود باطل ہوا
فروغِ حُسن کی بنیاد بھی ہے آتشِ عشق ، کہ شمع سوختہ تن ہو کے جاں گداز ہوئی

انتہائی قدرتِ بیان کا ذائقہ چکھنا ہو، تو ذیل کے اشعار سے دل بہلائیے:-

میٹھے میٹھے اُسکی باتیں یاد آنا خود بخود — دل ہی دل میں سوچنا، پھر مسکرانا خود بخود
دیکھو اس قدر لپیٹ کے نہ چل لے ہولے پائیں — دامن سے پھول باغِ تمنا کے گر پڑے

ذیل کے اشعار کی مخصوص لطافت اور ایک خاص طرح کی ندرت آپ کو کہیں اور نہ ملے گی :-

بنالیں سوزِ نہاں کو اُبھار کر شعلہ — بیانِ حال کو ہے اک زبان کی حاجت
چھٹے جو تم سے زمانے کو ہم نے یوں چھوڑا — کہ چاند تک نہیں دیکھا کئی مہینے سے
یہ سنتے ہی جھلا کر باہر تھا وہ پردے کے — کچھ ہے بھی پسِ پردہ یا پردا ہی پردا ہے
ادا سے بَل تیوریوں پہ لانا، بجا بجا کہہ کے مسکرانا — شکایت اس طرح سن رہے ہیں کہ جیسے انکو بھی کچھ گلہ ہے

یہ شاعری نہیں، مصوری ہے، اعجاز ہے، آخری مصرعہ کا طرزِ ادا کس قدر دلفریب ہے۔

آرزو صاحب کو بڑی بحروں میں بہت کامیابی حاصل ہوئی ہے، غالباً انکی یہ خصوصیت اور تمام خصوصیات پر بھاری ہے، ملاحظہ ہو :-

کچھ کہتے کہتے اشاروں میں شرما کے کسی کا رہ جانا — وہ میرا سمجھ کر کچھ کا کچھ، جو کہنا نہ تھا وہ کہہ جانا
ہم آنکھیں کھولے بیٹھے تھے جب سارا عالم سوتا تھا — مانند چراغ اک سوختہ تن کہ ہنستا تھا کہ روتا تھا
وہ جھونکے سرد ہواؤں کے وہ دل کے کنول کا لہرانا — تھیں آنکھیں بند زمانے کی یہ کس کو خبر کیا ہوتا تھا

"یہ کس کو خبر کیا ہوتا تھا" یہ ٹکڑا بلاغت کی جان ہے۔

پوچھو نہ بس اب وہ رازِ نہاں مدت سے جو کرد ملیں یہاں — کہنے میں اُلجھ جاتی ہے زباں لکھنے میں قلم تھراتا ہے
حیراں ہو نہ اے قاصد اسپر یہ پیام ہے شکووں کا دفتر — کہدے مری جانب سے جاکر جی اب تو بہت گھبراتا ہے

"جی اب تو بہت گھبراتا ہے" اس جانِ بلاغت نقرہ میں بلاشبہہ "شکووں کا دفتر" پنہاں ہے، رموزِ محبت کی صحیح نکتہ دانی آرزو پر ختم ہے!

ذیل کے اشعار میں اُستادِ سخن میر کا انداز ملاحظہ فرمائیے :-

سامان کیے دن بھر میں ہم اور چھوڑ کے وقتِ شام چلے — سنسان ہے گھر، سُونا بستر، دُکھ جھیل کے بے آرام چلے
گھر کیا ہے مسافر خانہ ہے گردش میں مدام زمانہ ہے — اک روز یہاں سے جانا ہے یا صبح چلے یا شام چلے

ان محاسن کے باوجود "فغانِ آرزو" کا تاریک رخ چھپایا نہیں جا سکتا، افسوس ہے اب بھی ایسے اشعار کہنے والے موجود ہیں :-

طے کر رہا ہوں راہِ عدم لیکے اُلٹی سانس — جاتا اُسی طرف ہے جدھر کی ہوا نہ ہو

ذیل کے اشعار پڑھ کر کسی بدمست، نیم برہنہ، شاہدِ بازاری کی تصویر آنکھوں میں پھرنے لگتی ہے :-

بھری جوانی اُمنگ کے دن اُڑیں نگاہیں کہ فیصلہ ہے — بخیر انجام ہو الٰہی یہ دل کا پہلا معاملہ ہے

بادۂ ہوش لُٹتا تھا ساغر تکیں تو تا — ہاتھ مارا ہے یہ کس مست کی انگڑائی نے

یہ شعر کس قدر بے مزہ ثقیل اور مکروہ ہے :-

جان چھوڑ اب اے گراں جانی غذا کیواسطے — جیتے جی مُردہ کی بو آنے لگی بیمار سے

لیکن جیسا ہم اوپر کہہ آئے ہیں ایسے اشعار کی تعداد کم ہے اور باوجود تلاش ہمیں بدرنگ و بدنما اشعار اس سے زیادہ نہ مل سکے۔ کتاب کی قیمت ۱۲؍ اور الناظر بک ایجنسی لکھنؤ سے دستیاب ہو سکتی ہے۔

گلشن حیات - مولفہ سید معین الدین احمد قیس رضوی۔ مولانا شاد عظیم آبادی ملک کے مسلم الثبوت اُستادوں میں ہیں، جن کی تمام زندگی اُردو علم و ادب کی خدمت میں گذری ہے، اور جو اپنی کبر سنی کے باوجود اب تک ملک کے جرائد کو اپنے پُرلطف اور اُستادانہ کلام سے سیراب کرتے رہتے ہیں۔ صوبہ بہار میں اُردو کی ترویج کو اس زمانہ میں جس قدر تقویت ہوئی اُس میں بہت بڑا حصہ آپ ہی کا ہے، سید معین الدین احمد قیس نے یہ کتاب آپکے اور آپ کے شاگردوں کے حالات پر لکھی ہے۔ افسوس ہے کہ حضرت شاد کی سوانح نگاری اور اُنکے کلام کی تنقید کا فرض باحسن وجوہ ادا نہیں کیا گیا واقعات کی صحت اور اُنکے جمع کرنے میں محنت کی گئی ہو یا نہ کی گئی ہو کم از کم یہ کتاب اس زمانہ کی تو معلوم نہیں ہوتی۔ مولف صاحب شاید بھول گئے کہ وہ حضرت شاد کی سوانحعمری لکھ رہے ہیں، نہ کہ کوئی ناول یا کہانیوں کی کتاب۔ اور یہ تو اُن کا خیال ہی خیال ہے کہ کتاب ہذا اپنے موضوع و مبحث کا پہلا خاکہ ہے"۔

پہلے مولف نے سر فخر الدین صاحب وزیر تعلیمات بہار کے نام نامی کے ساتھ اس کتاب کو معنون کیا ہے، اسکے بعد "عرض حال" میں بھولے پن سے "پبلک اور گورنمنٹ" کی ادب نوازی کے متعلق بہت خوش فہمی سے کام لیکر کتاب کی قدر افزائی کی التجا کی گئی ہے۔ کتاب کا آغاز اس دلچسپ خطیبانہ عبارت سے ہوتا ہے :-

> "زبان وطن کے شیدائیو! نظم سخن کے نکتہ شناسو!! میں تو کوئی ایسا سخنور شیوا زباں ہی ہوں کہ کسی صنف کمال کی طرف منسوب کیا جا سکوں؟ (!) اور نہ کوئی اعلیٰ درجہ کا ادیب و انشا پرداز تھا کہ محفل ادبائے روزگار میں بار پا سکوں، اسکے بعد زبان، ژولیدہ بیانی کی تحریر میں کشش و دل آویزی کہاں، کہ آپ جیسے سنجیدہ خیالوں اور سخن شناسوں کو اپنی طرف کھینچ لے سکے، صاحبو! ......"

کہیں کہیں ایسا معلوم ہوتا ہے گویا "فسانہ عجائب" اور "باغ و بہار" کی سرزمین کی سیر ہو رہی ہے :-

۱- اس حکایت کا گو حرف حرف با کار گر اس مختصر کتاب میں اُسکا بیان نبھنے دشوار ہے ؎

جو سُنے اُسے بھی خلش رہے جو کہوں تو ختم نہ ہو سکے　　　یہ فسانۂ زلفِ دراز کا کہیں زندگی سے دراز ہے

۲- تو پھر اس کہانی کا سنانا ؎ سورج کو چراغ ہے دکھانا -

۳- وہ صحت سے عاری اور غلط العوام کے ساتھ بازاری ہے -

ایک جگہ مولف نے حضرت شادؔ کو اس جملہ کا مرتکب بتایا ہے "شعر کی معیار یہ نہیں ہے جو تم کہہ رہے ہو" دَورِ حاضر میں شعرا کی قحط سالی (۱) کا دوسری جگہیوں رونا رویا ہے "اب تو یہاں تک نوبت آگئی ہے کہ شاعر کا وجود صفحۂ ہستی سے حرفِ غلط کی طرح اُڑ رہا ہے"

حضرت شادؔ "اس دورِ سخن کے میرؔ" تو تھے لیکن یہ خبر شاید ادبی حلقوں میں دلچسپی کے ساتھ سنی جائیگی کہ وہ مرثیہ گوئی میں مولف کے نزدیک میر انیسؔ کے ہم پلہ ہیں، اور ایک بمثل ناولسٹ کی حیثیت سے اُنکی "انگلستان و فرانس دونوں جگہوں کے اخباروں نے بجد تعریفیں لکھیں"۔

شاگردوں کے ذکر میں مؤلف نے کسی کو حتٰی کہ حضرت یاسؔ عظیم آبادی کو بھی اس قابل نہ سمجھا کہ ایک یا ڈیڑھ صفحہ سے زائد جگہ دیتے، ہاں اپنے حالات کے لکھنے میں سات صفحے سے زائد صرف کرکے اس شکایت کا ازالہ کر دیا گیا ہے۔

حضرت شادؔ کے انتخاب کلام سے جو کتاب کے آخر میں درج ہو ذیل کے اشعار بہت لطیف ہیں :-

شب کو مری چشم حسرت کا سب درد دکھ اُسنے کہہ جانا　　　دانتوں میں دبا کر ہونٹ اپنا کچھ سوچ کے اُنکا رہ جانا

مانا کہ فقط موہوم سی ملنے کی ہیں اک آس تو ہے　　　دیدار تو ہوئے دید نہ تر ہونا ہے اگر تو یہ جانا

شب کو وہ ہتھیلی سے اُنکا شرما کے چھپانا آنکھوں کو　　　برچھی کا ادا کی چل جانا، اُس تیر نگہ کا رہ جانا

ہم باغ میں ناحق آئے تھے بلبل کی حکایت کیا کہیے　　　منقار کو رکھ کر کلیوں پر کچھ اپنی زباں میں کہہ جانا

نہ آئینہ کا قصہ اور نہ حال شانہ کہتے ہیں　　　حقیقت میں جمالِ یار کا افسانہ کہتے ہیں

انھیں غزلوں پہ حال آتے ہیں میخانوں میں رندوں کو　　　انھیں شعروں کو مکیش نعرۂ مستانہ کہتے ہیں

بسے ہیں کیسے کیسے ذی شرف گورِ غریباں میں　　　بڑے بیدرد ہیں بستی کو جو ویرانہ کہتے ہیں

ہوا در در لیے پھرتی ہے اب تو میری مٹی کو　　　یہ ہے وہ خاک جو اک دن ترے تہ خونیہ ڈالی تھی

کتاب کی لکھائی چھپائی معمولی ہے - ۱۶۴ صفحات - حضرت مولف سے لودی کٹرہ، پٹنہ کے پتہ پر عہم میں مل سکتی ہے -

ن - ق

پچھلے مہینے کے رسالے

معارف

رسالہ معارف، اعظم گڈھ کے جولائی نمبر میں "فلسفۂ اخلاق" کے زیر تحت مسئلہ جبر و قدر پر نٹشے کے حسب ذیل خیالات ظاہر کیے گئے ہیں :۔

"ہم اپنے ناکافی و ناقص تجربہ اور مشاہدہ کی بنا پر "افعال" کے مابین حد فاصل قائم کرکے ایک کو دوسرے سے ممتاز کر لیتے ہیں، حالانکہ واقعہ یہ ہے کہ افعال انسانی واقعات کا کوئی غیر مربوط سلسلہ نہیں ہیں، بلکہ وہ ایک چشمۂ رواں کی طرح مسلسل اور مربوط ہیں، موجودہ افعال کی قدر و قیمت سابق اور آیندہ افعال سے الگ ہو کر متعین نہیں کی جا سکتی، یعنی قدرت و اختیار کے قائل قبل سے یہ تسلیم کر لیتے ہیں کہ افعال انسانی کی کوئی اجتماعی حیثیت نہیں ہوتی اور ہر فعل دوسرے فعل سے علٰحدہ اور ممتاز ہوتا ہے، اور نٹشے کہتا ہے کہ یہ تسلیم کرنا ہی سرے سے غلط ہے، لہذا کسی فعل کی ذمہ داری اُسکے فاعل پر عائد کرنا اور سابق روایات اور ماحول کی خصوصیات کو نظر انداز کرنا کسی طرح صحیح نہیں ہو سکتا۔"

اس سلسلہ میں علمائے اسلام کا اختلاف آرا ملاحظہ ہو :۔

"علمائے اسلام بھی "مسئلۂ جبر و قدر" میں مختلف الرائے ہیں۔ جبریہ قائل ہیں کہ انسان مجبور اور بے بس ہے، اور جو کچھ ہوتا ہے، وہ صرف خدا کی قوت و قدرت سے ہوتا ہے، انسانی ہاتھ کو کوئی دخل نہیں ہے، معتزلہ کا دعوی ہے کہ انسان کو اپنے افعال پر قدرت حاصل ہے، اور اسی پر اچھے کاموں کے واسطے ثواب اور بُرے کاموں کے واسطے عذاب ملتا ہے، اشعریہ نے "جبر و قدر" کے مابین ایک نئی راہ نکالی، یعنی انسان کو "کسب" کی قوت حاصل ہے، لیکن یہ قوت اور اس قوت کے نتائج دونوں، خدا کی مخلوق ہیں۔ اگر غور سے دیکھا جائے تو ان تینوں اقوال میں کوئی نہ کوئی مصلحت نظر آئے گی۔ جبریہ نے خداوندکریم کی عظمت و جلال کو مدنظر رکھ کر اُسے تمام جزو و کل کا خود مختار خالق قرار دیا۔ معتزلہ کی نظر حکمت پر پڑی، اور انھوں نے افعال کی نسبت بندوں کی طرف کر دی تاکہ خدائے پاک کی ذات مجمع الصفات افعال قبیحہ کی ذمہ داری سے سبکدوش ہو جائے۔ اشعریہ نے ان دونوں خیالوں کو مجتمع کرکے خدائے عز و جل کو حکمت و عظمت دونوں کا مجموعہ قرار دیا۔"

دوسرا مسئلہ "امتیاز خیر و شر" ہے، نٹشے کا خیال ہے کہ :۔

"ضمیر یا فطرت کسی فعل کو اچھا یا بُرا صرف اسلیے کہتی ہے کہ زمانہ اسکو ایسا ہی کہتا آیا ہے، ضمیر و فطرت کا کام صرف نقل کرنا ہے، اختراع کرنا نہیں۔ نٹشے کے نزدیک ہر شے میں کوئی نہ کوئی خاصیت پنہاں ہوتی ہے، جس کے نتائج صفحۂ ہستی پر نمودار ہوتے رہتے ہیں، یہ نتائج طبقۂ عوام کے لیے نفع و ضرر کے لحاظ سے اور طبقۂ خواص کے لیے "قوت و ضعف" کے لحاظ سے امتیاز خیر و شر کا باعث ہوتے ہیں۔"

علمائے اسلام اس مسئلہ پر یہ خیال رکھتے ہیں :۔

"علمائے اسلام بھی اس مسئلہ میں مختلف الرائے ہیں، اشعریہ کا اعتقاد ہے کہ خیر و شر اور حسن و قبح

کی تفریق خدائی احکام پر موقوف ہے، بعض افعال اچھے ہیں کیونکہ خداوندکریم نے انکے کرنے کا حکم دیا ہے اور بعض کام بُرے ہیں کیونکہ خدائے پاک نے اُنکے کرنے کو منع کیا ہے۔ معتزلہ کا دعویٰ ہے کہ عقل خود اچھے اور بُرے، نیک اور بد کے درمیان تمیز کر لیتی ہے۔ سچ بولنا فعل نیک ہے، اس لیے نہیں کہ خدائے عزوجل نے اسکا حکم دیا ہے، بلکہ اس لیے کہ عقل اُسے اچھا کہتی ہے۔ ڈاکہ ڈالنا بُرا ہے، مگر اس وجہ سے نہیں کہ خالق عزوجل نے اسکی ممانعت کی ہے، بلکہ اس وجہ سے کہ عقل اسے ایک فعل قبیح سمجھتی ہے۔

زمانہ جولائی نمبر میں خواجہ عبدالرؤف صاحب عشرت لکھنوی کا نہایت دلچسپ مضمون "اودھ کے شاہی میلے" شائع ہوا ہے، جو انداز بیان کی سادگی و دلکشی کے علاوہ نہایت پُرلطف معلومات سے لبریز ہے۔ خواجہ صاحب عرصہ سے اودھ کے قدیم شاہی حالات اور واقعات لکھنے میں مشغول ہیں، اور اُنکے ذرائع معلومات نہایت معتبر اور وسیع ہیں۔ عیش باغ جس کی موجودہ حالت دیکھکر آنکھیں نم ہو جاتی ہیں، نواب آصف الدولہ کے وقت میں "فردوس بر روئے زمیں" تھا، جس کا نقشہ خواجہ صاحب ان دلکش الفاظ میں کھینچتے ہیں :—

"اس باغ کی خدمت کے لیے ایک ہزار سات سو مالی مقرر تھا، جو دن رات وہیں رہتا تھا، مالیوں کے رہنے کے لیے جا بجا گمریاں بنی ہوئی تھیں۔ جا بجا فوارے چھوٹ رہے تھے۔ کنوئیں سب سنگ مرمر کے بنے ہوئے تھے۔ موتی جھیل نام وسط باغ میں ایک جھیل تھی، جس میں ہمیشہ صاف اور شیریں پانی لبریز رہتا تھا، اکثر پیراک وہاں پیرنے آتے تھے، عالیشان مسجد اور پُل کے دوسری طرف مدعا بھی ایک جھیل تھی، جسکے قریب تمام میووں کے درخت تھے، اور اس سے کچھ فاصلہ پر کھوریہ بھی ایک جھیل کا نام ہے جس میں ابتک تھوڑا بہت پانی رہتا ہے، اس جھیل کی تمام زمین کالی مٹی کی ہے اور یہاں کی مٹی برتنوں کے کام آتی ہے۔ اسکے علاوہ بہت سی غدیریں تھیں جو گرمی میں خشک ہو جاتی تھیں، آصف الدولہ کے زمانہ کا حال تو علم نہیں کہ اس باغ پر کیا جوبن تھا، ستر اسّی برس تک کا نقشہ لوگ اپنی آنکھوں سے دیکھ چکے ہیں، سُنتے سُنانے کہتے ہیں کہ آصف الدولہ بہادر کے زمانہ میں یہ باغ گرمی کے موسم میں رشک کشمیر تھا، جو کوئی سفید پوش ہوا کھانے آتا تھا، سردی سے کانپنے لگتا تھا، اگر کوئی مسافر کسی درخت کے سایہ میں دوپہر کو سو جاتا تھا تو شام تک اسکی نیند نہ بھرتی، بندر سے سیانا حیوان ہے اُس نے ایسا آرام پایا کہ اسی باغ میں ڈیرا لگا لیا"

آگے چل کر نواب صاحب ممدوح کی رحمدلی اور نیک نفسی کا نقشہ پڑھکر دل میں ایک عجیب حس پیدا ہوتی ہے :

"مالیوں نے شکایت کی کہ یوں تو ہم پرندوں کے واسطے کھٹکے لگا دیتے ہیں تو پرندوں کے ہاتھ سے پھل محفوظ رہتے ہیں، مگر کچھ دنوں سے بندر گھس آئے ہیں، اور وہ کسی صورت سے باغ سے باہر نہیں جاتے، سرکار سے بندوقیں ملیں تو ڈھکوسلا کر نکال دیں۔ حکم ہوا، وہ باغ کی پناہ میں آئے ہیں اُنھیں نکالو نہیں، انکے لیے ہماری سرکار سے بھیگے ہوئے چنے مقرر ہو جائیں گے ....."

میلوں کے سلسلہ میں علی گنج کے میلہ کا مختصر حال خوب ہے :—

"علی گنج لکھنؤ کا محلہ ہے اور دریا کے پار شروع جیٹھ کے مہینے میں پیر کے روز ہنومان جی کا میلہ ہوتا ہے، مراد پانے والے پیکرماں کرتے ہوئے یعنی زمین کو اپنے قد سے ناپتے ہوئے اپنے گھر سے مندر تک

زمین پر لیٹتے ہوے اور اُٹھتے ہوے، لنگوٹے والے کی جے پکارتے ہوے آتے ہیں اور حسب توفیق نذر چڑھاتے ہیں"

جامعہ رسالہ جامعہ دہلی کے جولائی نمبر میں "مشرق و مغرب" کے عنوان سے وہ گفتگو شایع ہوئی ہے جو ٹگور میں ڈاکٹر ٹگور اور آلدے سورانی کے درمیان ہوئی، ایک حقیقی شاعر کی حیثیت سے اطالیہ کی حسین و خوشنما سرزمین سے متاثر ہوکر ڈاکٹر ٹگور نے اس حقیقت کا اقرار کیا کہ

"اطالیہ کی خوشنمائی روز بروز میری نظر میں کھبتی جاتی ہے، اور فلورنس مجھے اطالیہ کے سب شہروں میں زیادہ خوبصورت نظر آتا ہے، لیکن مجھے اس سے زیادہ خوشی ہوتی اگر میں عمر اور شہرت کا بار دوش پر لیکر اطالیہ نہ آتا، بلکہ کیٹس اور شیلے کی طرح تو گرفتار کی حیثیت سے زیارت کرنے نکلتا، شباب اس پیام کو بہتر سمجھتا جو اطالیہ کی شاعری دے رہی ہے"

اندیشہ ہے کہ اُردو کے بعض "نادان دوست" ٹگور کے دیگر روحانی نغموں کی طرح اس مرتبہ بھی کسی غلط فہمی میں مبتلا نہ ہو جائیں، اسلیے ٹگور کے ذیل کے ولولہ خیز اور حوصلہ انگیز خیالات کو اچھی طرح ذہن نشین کر لیجیے :-

"میں اس لیے نہیں بنا ہوں کہ مارا مارا پھروں اور مجمع میں خصوصاً اہل مغرب کے مجمع میں مجھ پر انگلیاں اُٹھیں، میری زندگی اور اُسکا پیغام داخلی ہے۔ سچی زندگی تمام و کمال داخلی ہوتی ہے، لوگ جمع ہوتے ہیں کہ شاعر کو دیکھیں اور اُسکی باتیں سنیں، لیکن دیکھنے اور سننے کے بعد بھی وہ اُسے نہیں پہچانتے، کیونکہ شاعر پوشیدہ رہتا ہے، جتنا زیادہ شور ہوتا ہے، اور جتنا کثیر مجمع ہوتا ہے اُسی قدر گہرے پردے میں شاعر اپنی روح کی آڑ میں چھپ جاتا ہے اور لوگ اُسے نہیں پہچان سکتے ......"

آلدے سورانی کے اس سوال پر کہ ٹگور یورپ کے کن مصنفین کو پسند کرتے ہیں، اُنھوں نے روسی لٹریچر سے اپنی شدید عقیدت کا اظہار کیا جس میں سادگی، گھلاوٹ اور قلب کی تسکین ہے۔

آگے چل کر ڈاکٹر ٹگور نے صاف صاف کہا :-

"تم لوگ آجکل پہلے سے زیادہ کھرے، خودسر اور سخت گیر ہو اور لڑائی کے بعد تمھاری ملک گیری کی ہوس اور نااتفاقی میں ترقی ہو رہی ہے۔ لیکن تمھارے لیے اس سے بھی بڑا خطرہ یہ ہوگا کہ تم بے آہنگی کو زندگی کا ناگزیر اور اصل قانون سمجھنے کی عادت ڈالو، اور سب سے بڑھ کر یہ کہ تم اندرونی بے آہنگی یعنی روح انسانی کی خانہ جنگی کو ضروری اور اچھا سمجھو، آج ایسے لوگ موجود ہیں جن کے خیال میں بھی زندگی یہی دائمی اندرونی نقیض، یہی خیالات، جذبات اور خواہشات کی گھمسان لڑائی کا نام ہے، یہ ایک خطرناک غلطی ہے۔ تخیلی زندگی خود اپنے سے اور دوسروں سے نقیض کا نام نہیں ہے، کیونکہ زندگی کا کام یہ ہے کہ وہ ہمارے نفس میں ہم آہنگی پیدا کرے اور امن و اتحاد کی روشنی سے دنیا کو منور کردے ....."

.... ایک دن تم پر یہ راز کھل جائے گا کہ خارجی منافع کی خواہش اور اُنکا اکٹھا کرنا بے فائدہ اور خطرناک ہے، اور تمھیں اپنے گھروں اور اپنے دلوں کی تہذیب کے ضروری ہونے کا احساس ہونے لگے گا، اُس وقت تمھیں معلوم ہوگا کہ بہت سی چیزیں جنھیں تم قابل قدر سمجھتے تھے صدیوں کا کوڑا ہیں اور اسوقت

تم وہاں یہ ٹھان لوگے کہ اس کوڑے کو جو تمہارے راستہ میں حائل اور تم پر بار ہے دم بھر میں صاف کر کے پھینک دو اسوقت تم دراصل اندر اور باہر نئی مقدار میں زمین کے مالک ہو گے اُس پر عمارت بناؤگے، اور اُس میں آنے والی فصل کے لیے بیج بوؤگے۔ اُسوقت تم تہذیب کی ایک بلند سطح پر پہونچو گے اور اپنے اور دوسروں کے ساتھ ہمسائگی کا حق ادا کرنا سیکھو گے۔"

ہمایوں "اسلام کا اثر مغربی تہذیب پر" کے عنوان سے میاں بشیر احمد نے ایک سلسلۂ مضمون شروع کیا ہے جو معلومات اور مواد کے لحاظ سے نہایت دلچسپ ہے۔ اس مضمون کی تیاری میں امیر علی، ڈریپر اور "تمدنِ عرب" وغیرہ سے مدد لی گئی ہے، جس کا حوالہ صاحبِ مضمون نے جابجا دیدیا ہے۔ آجکل کے مشغول اور کاروباری زمانہ میں جبکہ مسلمانوں کی آنکھیں یورپ کی خیرہ کن روشنی میں چوندھیا کر رہ گئی ہیں، اور فرصت نہیں، کہ بڑی بڑی ضخیم کتابیں دیکھ کر حالات سے آگاہی حاصل کی جائے، ضرورت ہے کہ مستند کتابوں کے اوراق سے نکال کر مسلمانوں کے عروج و ترقی کے واقعات متفرق مضامین کی صورت میں نگاہوں کے سامنے لائے جائیں۔ لاہور کے پرچوں کے متعلق یہ خیال بالکل صحیح ہے، کہ وہ ملک کی دماغی نشوونما میں حصہ نہیں لیتے، وہ صرف تفریح اور تھکن دُور کرنے کا باعث ہوتے ہیں، ہمایوں نے یہ مضمون نکال کر اس الزام کو رفع کرنے کی بڑی حد تک کوشش کی ہے۔

ولید اول کے زمانہ میں طارق و موسیٰ کے حملوں کے وقت اسپین کی جو قابلِ رحم حالت تھی، اُسکا نقشہ سر امیر علی نے نہایت تشریح سے کھینچا ہے، ذیل کے سطور میں بھی تفصیل سے اس مسئلہ پر روشنی ڈالی گئی ہے:-

"..... نوابوں اور امیروں اور پادریوں کے طبقے ہر قسم کے ٹیکس سے بری تھے، طبقۂ متوسط کی حالت قابلِ رحم تھی، صنعت و حرفت طرح طرح کے محصولوں کے شکنجے پر، بگڑ چکی تھی اور تجارت صرف نام کو باقی رہ گئی تھی، حقوق یافتہ امرا نے ملک کو بڑی بڑی جاگیروں کی صورت میں منقسم کر رکھا تھا جہاں دنیاوی اور کلیسائی لوگ خوب گلچھرے اُڑاتے تھے اور اپنے غلاموں اور کمینوں کی محنت و مشقت سے فائدہ اُٹھا کر اُنھیں طرح طرح کے عذابوں میں گرفتار کیا کرتے تھے، عام لوگ جہالت اور توہمات کے سخت پنجوں میں پھنسے ہوئے تعلیم سے عاری اور عقل و فہم سے کوسوں دُور پڑے تھے، یہودیوں کے ساتھ حد درجہ کی سختی کیجاتی تھی، بادشاہ اور اُمرا اور پادری سب اُنکی گردن پر سوار تھے اور اُنکی زندگی کو جہنم کا نمونہ بنائے ہوئے تھے، غرض ہسپانیہ اور بالعموم یورپ کی حالت صدیوں سے اسی طور پر تھی کہ نیکیوں پر بدیوں اور علم و حکمت پر لاعلمی اور جہالت کے ہزاروں لاکھوں پردے پڑے ہوئے تھے - ....."

اسی نمبر میں مولانا تسلیم پانی پتی کے "حیاتیات" کے عنوان سے متفرق اشعار ایک مستقل درس ہیں، جن سے ہر وہ شخص جو خون میں حرارت رکھتا ہے، متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے گا:-

زندگی نام ہے حرکت کا، تم افسردہ نہ ہو — نبض کے خون کے مانند اُچھلنا سیکھو
خاک میں اُن کو ملا دیتی ہے خود بادِ صبا — قوتِ نشو و نما جب نہ رہے دانوں میں
زندہ رہنے کا انھیں حق نہیں دنیا میں تسلیم — گر ترقی کی اُمنگیں نہ ہوں انسانوں میں

نگار

"سینما اور تعلیم" کے نام سے اس نمبر میں ایک مختصر مگر دلچسپ و پُر از معلومات مضمون شائع ہوا ہے، جس کے پڑھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ سینما سے جسے ہمارے یہاں نٹ کھٹ بھروں کا "مشغلہ" اور تضیع اوقات کا سبب سمجھا جاتا ہے، مغربی ممالک میں بڑے بڑے کام لیے جاتے ہیں۔ تعلیم کا اصلی مقصد اگر یہ ہے کہ لڑکوں میں ایک خاص وسیع النظری پیدا کر کے اُنکے کیرکٹر کو مستحکم و مضبوط بنایا جائے اور اُنکے دل و دماغ میں ایک خاص تڑپ پیدا کر کے اُنکو بنی نوع انسان کی ہمدردی کا درس دیا جائے تو سینما یقیناً ایک زبردست آلۂ تعلیم ہے۔ کتابی طالب علموں کے متعلق عام طور پر یہ کہا جاتا ہے کہ طالب علمی کو خیرباد کہنے کے بعد اُنھیں ایک عمر تک دنیاوی تجربہ کی ضرورت ہوتی ہے کیونکہ انھیں جنچی تلی بصیرت تو ہوتی ہے مگر مشاہدہ نہیں ہوتا، سینما اس مرض کا علاج ہے:

"یورپ و امریکہ کے ماہرین تعلیم و تربیت کا خیال ہے کہ صور متحرکہ تعلیم و تربیت کا بہترین ذریعہ ہے اور اسی غرض کے لیے خاص خاص فلم تیار کرائے جاتے ہیں جو لوگوں کی معلومات میں اضافہ کر سکیں، چنانچہ دنیا کے تمام مشہور حوادث و واقعات کے فلم تیار کرانا اسی اصول کی بنا پر ہے تاکہ ساری دنیا اُنھیں اپنی آنکھوں سے دیکھ لے؛ ورنہ ظاہر ہے کہ دیکھنے سے جن حقیقتوں کا علم ہو سکتا ہے وہ صرف تقریر و تحریر سے نہیں حاصل ہو سکتا۔ گویا اس طرح فلم سے صحیفۂ اخباری کا کام لیا جاتا ہے

انگلستان کی وہ کمیٹی جو فلم کے احتساب کے لیے مقرر ہے اپنی رپورٹ میں ظاہر کرتی ہے کہ وہ صبی جو سینما دیکھتے ہیں اُنکی معلومات دوسرے ہم عمر طلبا سے جو سینما نہیں دیکھتے کہیں زیادہ وسیع و عمیق ہوتی ہے۔ چنانچہ جب ایسے طلبا کا امتحان لیا گیا تو معلوم ہوا کہ اُنکی معلومات صرف ایک موضوع پر حاوی نہیں، بلکہ جغرافیہ، آداب، علم طبیعی، صناعت، تاریخ، حالات اجتماعیہ، اور واقعات عالم ان سب پر اُنکو نگاہ تھی اور اسی کے ساتھ یہ بھی تھا کہ جو حقائق کتابوں کے ذریعہ سے اُنھیں حاصل ہوئے تھے وہ ایسے مستحکم طور پر دماغ میں راسخ نہ ہوئے تھے جیسے وہ حقائق جن کو اُنھوں نے سینما میں دیکھا تھا۔"

نظام المشائخ

اس نمبر میں "قربانی" کے عنوان سے محترمی مولانا عبدالماجد صاحب بی اے نے مسئلہ تنازع للبقاء پر مشرق و مغرب کے اختلاف کو یوں ظاہر کیا ہے:

"انسان کی ترکیب میں محض جسم ہی شامل نہیں بلکہ ایک شے اسکے علاوہ بھی ہے جسے روح کہتے ہیں، اور جس طرح ایک عالم جسمانیات کا ہے، ٹھیک اسی طرح ایک مستقل عالم روحانیات کا بھی ہے .... مغرب نے جسم کی فضا میں پرورش پائی اور ارتقا کا آخری مرتبہ "عقل" کو خیال کیا، مشرق نے روح کی تربیت سے فیض پاکر ارتقا کی آخری منزل "وحی" کو تسلیم کیا۔ عقل و دانش کے بہترین ثمرات ڈارون و نیوٹن، آئنسٹائن و برگسان کے نظریات کی شکل میں ظاہر ہوئے ہیں۔ وحی و الہام کی آخری بلندی محمد رسول اللہ و ابراہیم خلیل اللہ کے ہدایات کی صورت میں موجود ہے۔ عقل کی تعلیم ہے کہ جو کچھ ہے سب انسان کا ہے؛ وحی کی ہدایت ہے کہ جو کچھ ہے سب خدا کا ہے یہاں تک کہ انسان کا وجود بھی اپنا نہیں ہے۔ ایک کے سامنے صرف "آج" ہے، دوسرے کے پیش نظر "کل" ہے، ایک کو اسکی دُھن ہے کہ خزانہ میں کتنا وصول ہوا، دوسرے کو اسکی فکر ہے کہ خیرات میں کتنا صرف کیا۔"

(اقتباس نقل کیا جا چکا تھا کہ یہ معلوم ہو کر افسوس ہوا کہ ماجد صاحب کا یہ مضمون ۲۶ - جون ۱۹۲۵ع کے "سچ" سے بلا حوالہ دیے نظام المشائخ میں نقل کیا گیا ہے)۔

ج - ق

اُردو رسائل کے خاص مضامین

(جولائی ۱۹۳۶ء)

رسالۂ دلگداز لکھنؤ

۱- سلطان عالم واجد علی شاہ

رسالہ معارف اعظم گڈھ

۱- مستدرک حاکم کا مطبوعہ نسخہ
۲- فقہ اسلامی کے مذاہب اربعہ
۳- فلسفۂ اخلاق
۴- حلب و دمشق کے قدیم اسلامی مدارس

رسالۂ زمانہ کانپور

۱- کربلا (ڈراما)
۲- اودھ کے شاہی میلے

رسالہ ہمایوں لاہور

۱- شام کا اثر مغربی تہذیب پر
۲- بھنور کی دُلہن (افسانہ)

رسالۂ نگار بھوپال

۱- کیا ہندوستان ایک صناع ملک بن سکتا ہے؟
۲- رودکی

۳- سینما اور تعلیم

رسالۂ جامعہ دہلی

۱- ہندوستان کی معیشت زرعی
۲- اسلام اور تصوف اسلامی
۳- مشرق و مغرب
۴- گوری اماں (افسانہ)

رسالۂ نیرنگ خیال لاہور

۱- فنون لطیفہ
۲- سویرے جو کل آنکھ میری کھلی
۳- شارحین غالب

رسالۂ نظام المشائخ دہلی

۱- جھوٹا دولہے
۲- قربانی

رسالۂ مرقع لکھنؤ

۱- زندگی کا اصلی مذہب
۲- لسان العصر اور شاد عظیم آبادی

مرزا رجب علی بیگ سرور مرحوم

- فسانۂ عجائب
- شگوفۂ سرور

... امیر مینائی مرحوم

- ... (مکمل سیٹ)
- صنم خانۂ عشق
- ... الغیب
- خاتم النبیین ۸ر
- ... سخن
- مکاتیب امیر مینائی

... جلال مرحوم

- ... زبان اردو
- ... دلکش
- ...
- ... ۸ر
- ... تاریخ
- ... منتخب

... محمد عباس ... مرحوم

- ... نور جہاں
- ... سہیلی
- ... سحر ۸ر
- ... ۱۲ر

... افضل حسین ثابت

- ...
- ... حسین

پنڈت رتن ناتھ سرشار

- فسانۂ آزاد چہار جلد
- سیر کہسار
- خدائی فوجدار
- جام سرشار
- الف لیلیٰ بطرز ناول
- کامنی
- بچھڑی دلہن

منشی سجاد حسین مرحوم

- احمق الذین ۸ر
- حاجی بغلول ۸ر
- پیاری دنیا ۸ر
- کایا پلٹ ۸ر
- میٹھی چھری ۶ر
- طرحدار لونڈی
- طلسمی فانوس

منشی جوالا پرشاد برق

- مرزا لنی ۱۲ر
- مار آستین ۱۲ر
- بنگالی دلہن ۱۲ر
- معشوقۂ فرنگ ۱۲ر
- پرتاب ۱۲ر
- روہنی ۱۰ر

پریم چند

- پریم پچیسی
- بازار حسن

مولینا عبدالحلیم شرر

- جنید بغدادی
- خواجہ معین الدین چشتی ۶ر
- تذکرۂ مشاہیر عالم
- تحریرات
- قیس لبنیٰ
- مقدس نازنین
- ایام عرب
- فتح اندلس
- ماہ ملک
- حسن کا ڈاکو
- دربار حرامپور ۱۰ر
- الفانسو ۱۲ر
- مفتوح فاتح
- فلپانا
- زوال بغداد
- تبت بیین
- عزیزۂ مصر
- جویائے حق
- بابک خرمی
- طاہرہ
- فردوس بریں بلکہ
- یوسف نجمہ
- گذشتہ لکھنؤ
- شاعرانہ و فلسفانہ مضامین
- آغاز و ختم سال
- سیر جلیل
- تاریخی جغرافی مضامین
- بنا باز الصدید ناول

حکیم محمد علی خاں مرحوم

- رام پیاری کامل
- عبرت کامل
- حسن سپرد کامل
- اختر ...
- ...
- جعفر و عباسہ

شوق قدوائی مرحوم

- ترانۂ شوق
- قاسم و زہرہ
- ترنگ جال
- گنجینہ ۲ر
- یکفرن ...

ترجمہ ... الرشید عبد ... شرر

- زبان دانی
- اصلاح زبان اردو ۶ر
- کی ...
- اصول اردو
- جان اردو ۲ر
- شاعری کی پہلی کتاب
- „ دوسری
- „ تیسری
- نغمات اردو

منشی محمد حسن وحشی

- مجموعۂ گذشت
- جام زہر

مولینا حکیم عبدالحی مرحوم

- یادِ ایام
- تذکرۂ گل رعنا

حکیم احمد حسین الہ آبادی

- تاریخ ابن خلدون دو حصے
- „ „ „ ...
- „ „ „ ...
- „ „ „ ...
- „ „ „ ...
- „ „ „ ...
- „ „ „ ...
- „ „ „ ...
- „ „ „ ...
- „ „ „ ...
- „ „ „ ...
- سلطان صلاح الدین
- خورانِ ... لکھنؤ

مولوی محمد حلیم انصاری

- تمدن اسلام
- فتح اندلس
- ابو مسلم خراسانی
- تاریخ عرب

مولوی عبدالرحمن خان ...

- سیرۃ الصدیق
- علمائے سلف
- تذکرۃ الفقراء ...

حافظ اسلم جیراجپوری

- سیرۃ الرسول
- خلافت راشدہ
- خلافت بنی امیہ
- خلافت بنو عباس
- عجائبِ بغداد
- علوم عرب

قاضی محمد سلیمان ... پٹیالوی

- رحمۃ للعالمین
- سفرنامہ حجاز

مولوی ظفر ... آزاد

- اخبار الاندلس ...
- تاریخ ...
- مختصر تاریخ ...
- ...

مولوی محمد انشاء اللہ

- سیرۃ الرسول
- تاریخ آل عثمان
- حالات ... عثمان
- حالات قسطنطنیہ
- تاریخ ... اقصیٰ

منشی سید ... شہری

- آثار ...
- حیات خسرو
- ... ہنود

بدھ - مہاتما بدھ کی مختصر سوانح عمری اور ان کی مذہبی تعلیم نہایت دلکش انداز میں لکھی گئی ہے - قیمت ۴ر

ملنے کا پتہ: الناظر بک ایجنسی - لکھنؤ

مولوی عزیز مرزا مرحوم

خیالات عزیز ۱۲
ذکر ہر ار وسی ۸ر

خواجہ عباد اللہ اختر

صدیق اکبر ۱۲ر
حضرت زید ۶ر
مشاہیر اسلام ۱۲ر
بغداد ۱۲
دمشق ۶ر
دیوان حافظ مع شرح ۸

مفتی انوار الحق ایم اے

تاریخ ابو البشر ۸
تذکرۃ الحبیب عہ
حقایق اسلام [illegible]

پیرزادہ ولی اللہ بی اے

بندگی [illegible]
کاس الکرام ۶ر
لسان الغیب جلد اول ۶ر
" " دوم ۱۲
" " سوم [illegible]
" " چہارم [illegible]

سید راس مسعود بی اے

نصاب اردو ۸ر
جاپان کا تعلیمی نظم ۶ر
انتخاب زرین ۱۲

مولانا حسرت موہانی

شرح دیوان غالب عہ
مکمل دیوان حسرت ۱۲
سید سجاد حیدر بی اے

خیالستان ۸ر
ثالث بالخیر ۸ر
زہرا ۱۳ر
جلال الدین خوارزم شاہ [illegible]

مسٹر مظفر عمر بی اے

چوروں کا کلب ۹ر
نیلی چھتری عہ

سید مرزا ساجد

بہرام کی گرفتاری عہ
مستقبل اسلام ۸ر

پروفیسر فیروز الدین مراد

تحفہ سائنس ۶ر
بادل کے نیچے عہ
خوننابہ عشق [illegible]

حکیم احمد شجاع بی اے

باپ کا گناہ ۱۲
حسن کی قیمت ۱۲

منشی عبد المجید سالک بی اے

راہ و رسم منزلہا ۸ر
چپا دو گرا فسانے ۸ر
چتر اور ٹیگور ۱۲ر

منشی احمد علی بی اے

تاریخ تمدن ۸ر
شباب لکھنؤ ۸ر

مولوی عبد الماجد بی اے

فلسفہ جذبات ۱۲
مکالمات برکلے ۸ر
پیام امن ۸ر
تصوف اسلام عہ
فلسفیانہ مضامین ۸ر
زود پشیمان ۸ر

منشی محمد لطیف بی اے

اکبر ۸ر
اورنگ زیب ۸ر
رنجیت سنگھ ۸ر
لارڈ کلایو ۸ر

پروفیسر نور العلی ایم اے

معارج الدین ۱۲
تذکرۃ المصطفیٰ ۸ر
صحف سماوی ۶ر
شمع سخن ۱۰ر

پروفیسر الیاس برنی ایم اے

جذبات فطرت چار حصے للعہ
معارف ملت " للعہ
مناظر قدرت " للعہ
علم المعیشت ۸ر

مولوی سید سلیمان ندوی

ارض القرآن للعہ
سیرۃ عائشہ ۸ر
حیات امام مالک عہ
خلافت عثمانیہ اور اسلام عہ
خلافت اور ہندوستان [illegible]

مولوی عبد السلام ندوی

اسوۂ صحابہ ۲ جلد [illegible]
سیرۃ عمر بن عبد العزیز ۱۲
انقلاب الامم ۱۲
تاریخ الحرمین الشریفین ۱۲
انقلاب اسلام ۸ر
فطرت نسوانی ۸ر
شعر الہند ۲ جلد [illegible]

مولوی عبد الباری ندوی

مبادی علم انسانی ۸ر
برکلے کا فلسفہ ۸ر

مولوی سعید انصاری

سیر الصحابہ جلد اول [illegible]
سیر انصار ۲ جلد ۶ر
سیر الصحابیات ۱۲

مولوی عبد الرزاق ندوی

اسوۂ حسنہ ۱۲
کتاب الوسیلہ ۱۲
ترکی اور یورپ ۶ر

خواجہ حسن نظامی

قرآن آسان قاعدہ عہ
میلاد نامہ عہ
محرم نامہ عہ
فاطمی دعوت اسلام ۶ر
ذکر غوث پاک ۱۲ر
کرشن جیون ۸ر
شامی جہاد ۸ر
سیپارۂ دل ۱۲
کرشمۂ موت ۸ر
چٹکیاں اور گدگدیاں ۱۲
آتالیق خطوط نویسی ۱۲ر
خطوط حسن نظامی ۱۲ر
بیوی کی تعلیم ۸ر
بیوی کی تربیت عہ
اولاد کی شادی عہ
جگ بیتی کہانیاں [illegible]
آپ بیتی ۸ر
چھوٹی کہانیاں ۱۲ر
سیر دہلی ۱۲ر
سفرنامۂ ممالک اسلامیہ ۸ر
غدر دہلی کے افسانے [illegible]
یزید نامہ ۸ر
طمانچہ بر خسار یزید عہ
اردو دعائیں ۸ر
تسکین احساس ۸ر
روزنامچۂ ہند ۱۲ر
اسلام کا انجام ۶ر
تسخیر مہر و قہر ۱۰ر

مولوی عبد الرشید الخیری

الزہرا ۱۲ر
صبح زندگی ۸ر
شام زندگی عہ
شب زندگی ۱۲
نوحۂ زندگی ۱۲ر
دُر شہوار ۱۰ر
منازل السائرہ ۱۲
سراب مغرب ۸ر
بنت الوقت ۸ر
قطرات اشک ۸ر
جوہر قدامت ۸ر
عروس کربلا ۸ر
یاسمین شام ۸ر
تیغ کمال ۸ر
ماہ عجم ۸ر
آفتاب دمشق ۸ر
سمرنا کا چاند ۸ر

نیاز فتحپوری

گہوارۂ تمدن [illegible]
گہوارۂ تمدن [illegible]
نگارستان [illegible]
صحابیات
تاریخ الدولتین [illegible]

یاس عظیم آبادی

چراغ سخن
نشتر یاس

تاریخ اندور - یعنی مرہٹوں کے استقلال مسلمانوں کی شجاعت اور انگریزوں کی حکمت کا آئینہ از وہ خانی خان صاحب قیمت ۱۲ر

ملنے کا پتہ :- الناظر بک ایجنسی - لکھنؤ

رجسٹرڈ نمبر اے ۴۷۸

ہو المستعان

الناظر

ایڈیٹر- ظفر الملک علوی

الناظر پریس لکھنؤ میں باہتمام اسحاق علی علوی چھپا

قیمت سالانہ للعہ ر

قیمت فی پرچہ ۸ر

بسم اللہ

فہرست مضامین بابت ماہ اکتوبر سنہ ۱۹۲۶ء

نمبر ۴ — جلد ۳۱

نئی کتابیں

فرامین سلاطین

(از مولوی بشیر الدین احمد دہلوی)

اس میں خلجی، سوری، مغل، عادل شاہی اور برطانوی بادشاہوں کے ۱۸۰ نادر فرامین جمع کیے گئے ہیں۔ چھ فرمانوں کے عکسی فوٹو اور جناب مصنف اور نظام دکن کی تصویریں بھی شامل کتاب ہیں۔ فرمانوں کے پلیٹ دیکھ کر ناظرین گویا اصلی فرامین دیکھ لیں گے تاریخ کے طلباء کیلیے ایک نعمت غیر مترقبہ ہے قیمت غیر مجلد ۲ روپے

آثار دکن

(از مولوی سید علی اصغر بلگرامی ناظم آثار قدیمہ حیدرآباد دکن)

اس کتاب میں حیدرآباد و مضافات بلدہ کی ۶۰ عمارات اور دیگر آثار قدیمہ کے تاریخی حالات بہت محنت و جانفشانی سے جمع کیے گئے ہیں اور کتاب کے بیچ بیچ میں ۷۵ عمارات اور انکے کتبوں کے عکسی فوٹو بھی شامل کر دیے گئے ہیں تاریخی اہمیت کے علاوہ یہ کتاب عام شائقین کے لیے بھی بہت دلچسپ، اور حیدرآباد کی سیر کرنے والوں کے لیے ناگزیر ہے۔ قیمت ۵ر

تفسیر سورۂ اخلاص

(از مولوی غلام ربانی صاحب بی اے نائب مدیر زمیندار)

حضرت امام ابن تیمیہؒ کی لاجواب تفسیر آج نایاب ہے۔ سورۂ اخلاص کی تفسیر حاصل کر کے اسکا ترجمہ شایع کروایا گیا ہے۔ اس میں صداقت اسلام کے تمام اصولوں پر شرح و بسط سے روشنی ڈالی گئی ہے۔ قدامت مادہ، تولد مسیح کے متعلق نصاریٰ کے عقائد اور مخالفین اسلام کی دوسری باطل تاویلوں کا نہایت شافی جواب ہے۔ قیمت ۱۲

کتاب التقدیر

یہ کتاب علامہ ابن قیم کی مشہور کتاب شفاء العلیل کا سلیس اور عام فہم ترجمہ ہے۔ جس میں مسئلہ قضا و قدر پر قرآن و حدیث سے نہایت مدلل اور دلآویز بحث کی گئی ہے۔ مسئلہ تقدیر میں آجکل جو غلط فہمی پھیلی ہوئی ہے اُس کیلیے یہ کتاب بہت مفید ثابت ہوگی۔ ہر مسلمان کو اس کا مطالعہ کرنا چاہیے۔

قیمت ۱۲ر

سبد گل

از مولوی سید اولاد حسین شاعر لکھنوی۔ یہ کتاب ظفر نامہ، ہمارا وطن، گنگا، نمود صبح، تاروں بھری رات، برسات، جمال شاعر، نورجہاں، محبت، دوشیزہ، کوہسار، میدان ریت کے عنوانوں سے بارہ نیچرل نظموں کا دلچسپ مجموعہ ہے۔ قومی اور اخلاقی نظموں کے قدردان جلد طلب فرمائیں۔ قیمت ۸ر

منیجر الناظر بک ایجنسی لکھنؤ

بسم اللہ الرحمن الرحیم

الناظر

نمبر ۴ جلد ۳۱ — اکتوبر سنہ ۱۹۲۶ء

افلاطونِ الٰہی

ایک بڑے صاحب کشف وکرامات نے ایک مرتبہ اپنے مکاشفہ سے معلوم کیا کہ تمام عالم افلاطون کے انوار سے مملو ہے۔ اسی افلاطون کو افلاطون الٰہی کہتے ہیں، اس لیے کہ اس نے فلسفۂ معرفتِ الٰہی جو اپنے اُستاد سقراط سے سیکھا تھا، اپنے شاگردوں کو تعلیم کیا۔ یہ ایک یونانی النسل حکیم شہر ایتھنس کا رہنے والا تھا جو ۴۲۷ برس قبل حضرت مسیح علیہ السلام اس عالم میں آیا تھا، اور عمر کی ۸۰ منزلیں طے کرکے ۳۴۷ ق م میں رہگرائے عالم جاودانی ہوا۔ اُسکے باپ کا نام ارسطون تھا، جو آلِ قدروس سے بیان کیا جاتا ہے۔ اور اُسکی ماں کہا جاتا ہے کہ سولن کی اولاد میں سے تھی۔

ابتدائے عمر ہی سے افلاطون کو سقراط کی صحبت نصیب ہوئی۔ دیوجانس لارطوس کا بیان ہے کہ اُس کا نام پہلے ارسطاکلیز تھا، چونکہ اُسکے شانے بہت چوڑے تھے اس لیے افلاطون نام پڑگیا۔ نیز پہلے یہ شعر بھی کہا کرتا تھا جسکا سارا دفتر سقراط کی صحبت ملنے کے بعد اس نے نذرِ آتش کردیا۔ یعنی سقراط کے علم حقیقی کے سامنے اشعار اس قدر مبتذل نظر آئے کہ اسکی نظر سے بالکل گر گئے، اور اُس نے خیال کیا کہ ایسی شے کا میری طرف منسوب ہونا درست نہیں ہے۔ کہا جاتا ہے کہ سقراط کی وفات کے بعد دشمنوں کے ڈر سے یہ اور اسکے ہمراہ سقراط کے دوسرے احباب نیز حکیم اقلیدس سب نے مگارا میں جاکر پناہ لی۔ جب ادھیڑ عمر ہوئی تو ایک مقام

سفی سوس کو انتخاب کرکے وہاں اپنا ایک آشرم قائم کیا اور فلسفۂ الٰہی کی تعلیم دینی شروع کی۔ اس کی تعلیم بالکل سقراط کی تعلیم کا نقش ثانی تھی۔ بلکہ کہا جاتا ہے کہ سقراط کے کلام کو سمجھنے کے لیے یہ ضروری ہے کہ پہلے افلاطون کی کتابوں کا مطالعہ کیا جائے۔ چنانچہ اس نے جو مکالمے لکھے ہیں وہ دنیا کی عجیب کتابوں میں سے ہیں اور جو فلسفہ اُن میں بیان کیا ہے وہ ایک طرف انسان کے ذہنیات سے بحث کرتا ہے اور دوسری طرف ایسے پُر اسرار مسئلے بیان کرتا ہے جو اہل تصوف کے کلام سے مشابہت رکھتے ہیں۔ غرضکہ جس بیج کو سقراط نے بویا افلاطون نے اُسکی پرورش کی پھر اُس میں کونپلیں پھوٹیں اور ایک چھتنارا درخت بن گیا۔

اسکے شاعرانہ جذبات اور عالمگیر تخیل نے اسکے ذہنی استدلالات کو ایک بڑے دلچسپ پیرایۂ بیان میں ڈھالا ہے۔ اسکے ذہن میں سقراط کی یہ تعلیم اچھی طرح جم گئی تھی کہ حق اور بھلائی دنیا میں موجود ہے اور دونوں ایک دوسرے سے جدا نہیں ہیں۔ اس اثر نے اتنی ترقی کی کہ وہ خیر و صلاح کی وحدانیت کے خیال پر اور اس بات پر کہ اس سب کا انحصار علم پر ہے مضبوطی سے قائم ہوگیا اور تحقیق حق میں قدم آگے بڑھانا شروع کیا۔ حتیٰ کہ اس راہ میں خاص خاص اعمال خیر اور انفرادی نیکیوں کے خیال سے ترقی کرتا ہوا وہ عام نیکیوں کے تصور تک پہونچا۔ اور وہاں سے کلیات کی تہ اور کائناتِ عالم کی حقیقت اور علم کی وحدانیت اور وحدت وجود کے مسائل تک رہنمائی حاصل کی۔ مگر اُس نے اسی حد تک پہونچ کر قیام نہیں کیا اور کثرت فی الوحدت اور وحدت فی الکثرت کے تماشے بھی دیکھنے لگا۔

لیکن ان صوفیانہ ترقیات کے جد و جہد میں وہ تجربات انسانی کے واقعات کو فراموش نہیں کرتا رہا ہے۔ ایسے اخلاقی اوصاف میں جو ہر شخص کے مرکوز خاطر ہونی چاہییں وہ تصور وحدانیت و تصور خیر و تصور حق کو بھی جگہ دیتا ہے اور ساتھ ہی ساتھ اخلاق انسانی اور حکومت و سلطنت کے اصول و طرق کی تحقیقات میں بھی گامزن نظر آتا ہے۔ اسکی تحقیقات جس قدر ترقی کرتی جاتی تھی منطق اور نفسیات کے اصول ابتدائی واضح اور نمایاں ہوتے جاتے تھے اور ان حقائق کی بنیاد پڑتی نظر آتی تھی جنھیں اسکے شاگرد رشید ارسطا طالیس نے علوم کی شکل میں بہت کافی وضاحت اور تفصیل کے ساتھ بعد میں ترتیب دیا۔ افلاطون اگرچہ اصول ریاضیات کی بڑی قدر کرتا تھا مگر خود اُس نے ریاضی یا دیگر ایسے علوم کی ترقی کی طرف زیادہ میلان نہیں ظاہر کیا۔ اسی طرح وہ بقراط کے علم طب سے کافی ہمدردی رکھتا تھا مگر خود اس میدان میں نہیں آیا۔ ایسے ہی لیوسی پوس اور

ڈیاکریٹوس کے علوم کی طرف جو زمانۂ حال کے طبعیات کے مقدمات وابتدائی اصولوں پر مشتمل تھے اُس نے کوئی توجہ نہیں کی ۔

افلاطون کے مکالمات کو اگر بغور دیکھا جائے تو یہ صاف مترشح ہوتا ہے کہ اس میں دو قسم کے جذبات کا اثر زیادہ ہے یعنی انسانی ترقی کا جذبہ اور ذہن انسانی کی قوت و برتری کا ایک غیر متزلزل یقین ۔ اسکی طرف مسئلۂ تصورات کو عموماً منسوب کیا گیا ہے لیکن وہ مسلسل ترقیِ ذہنی کا صرف ایک رُخ ہے جو اس فلسفہ پر جاکر منتہی ہوتی ہے جس میں ارادہ کی رہنمائی عقل کے ہاتھ میں دی گئی ہے ۔ لیکن اشیاء فی الخارج سے جسقدر شروع ہی سے محققین یونان کو لگاؤ تھا اُسکا تقاضہ یہ ہوا ۔ نیز خود افلاطون کی شاعرانہ اُفتادِ طبیعت کا یہ اثر ہوا کہ افلاطون کے تصورات میں جو حقیقی روحانیت تھی وہ کچھ عرصہ کے لیے پردہ کے پیچھے آگئی اور اس مقام پر آکر طبیعت رُک گئی جہاں پر کلیات جزئیات سے "باقی" "فانی" سے اور "بودنی" "شدنی" سے الگ نظر آیا کرتی ہیں اور جہاں کہ حقائق موجودات کے اصول ہائے اولیں عالم حقیقی سے باہم ایک دوسرے سے بے تعلق اور علحدہ معلوم ہوتے ہیں ۔ لیکن رفتہ رفتہ پردہ اُٹھتا گیا اور حواس ظاہری و باطنی اور نوامیس عامہ اور مظہر قدرت اور قوائے متخیلہ اور عاقلہ کا تصور زیادہ واضح اور صاف نظر آنے لگا تجرید و تعمیم خیالات و پیش بینی اور استنباط کی اصل حقیقت واضح ہونے لگی اور تجربۂ انسانی کی مدد سے تصورات و تخیلات کی تصدیق ہونے لگی اور عالم خیال کے گوہر شاہوار معقولوں میں اور اظہار خیالات کی دوسری صورتوں میں منسلک نظر آنے لگے ۔ انھیں اثرات کا مدوجزر "مکالمات" میں صاف دکھائی دیتا ہے جسے تاریخ فلسفہ کا ایک رسالہ کہنا نازیبا نہ ہوگا ۔ لیکن جو خیالات کہ مکالمات میں ظاہر کیے گئے ہیں وہ کہیں کہیں بے ربط سے نظر آتے ہیں اور یہ نہیں کہا جا سکتا کہ افلاطون نے اپنے فلسفہ کی کہیں ایک باقاعدہ مرتب مثال ترتیب دی ہو لیکن یہی سب اصول و خیالات ہیں جنھیں اسکے شاگرد ارسطاطالیس نے بعد میں زیادہ حکیمانہ و عالمانہ ترتیب کے ساتھ مرتب کرکے عالم کے سامنے پیش کیا ہے ۔ معلوم ہوتا ہے کہ افلاطون اپنے اُستاد کی تعلیم اور مسائل وحدتِ وجود میں اسقدر ذہنی انہماک رکھتا تھا کہ کسی باقاعدہ علم کی تدوین کی طرف اس نے توجہ نہیں کی اور اس کام کو اپنے بعد آنیوالے حکماء کے سپرد کرتا گیا ۔

افلاطون کی تعلیم میں دو بہت زبردست قوتیں نظر آتی ہیں ۔ ایک تو حق کی محبت، دوسرے ترقی انسانی کا جوش و ولولہ ۔ کتاب "جمہوریت" میں یہ دونوں جذبات یعنی ایک ذہنی دوسرا عملی

ایک ہی جگہ سمو کر جمع کر دیئے گئے ہیں۔ مسئلۂ تصورات جو اُسکی طرف منسوب ہے اسمیں بھی بہت کچھ عمر کی رفتار کے ساتھ تغیر نظر آتا ہے لیکن باوجود ان سب باتوں کے جو ایک خیال ہر جگہ موجود اور ہر جگہ غالب ہے وہ یہی ہے کہ عقل سب سے برتر، اعلیٰ وارفع شے ہے اور خیر و حق دونوں ایک ہی شے ہیں۔ اس اصولی خیال سے بہت سے خیالات و تصورات متفرع ہوتے گئے ہیں چنانچہ نفسیات، تعلیمات و اصلاح سیاسی کے اصول اِسی طریق پر پیدا ہوئے اور اسی آب و ہوا میں بڑھے اور بارور ہوئے ہیں۔ زمانۂ حال کے حکمائے مابعد الطبیعات بھی اسکے علو مرتبت و ذہنی مدارج و حقیقی تعلیمات سے اسقدر متاثر نظر آتے ہیں کہ ان میں کا ایک نامور شخص فیریر کہتا ہے کہ اگر ہم حقائق فلسفیہ کے سمجھنے میں راہ صواب پر ہوں تو یہ سمجھنا چاہیے کہ ہم نے افلاطون کے مطالب کے سمجھنے میں غلطی نہیں کی ہے اور اگر ہم غلطی کرنے لگیں تو یہ سمجھنا چاہیے کہ ہم نے افلاطون کو صحیح طور سے اور اچھی طرح سمجھا ہی نہیں۔ اسکے شاگرد ارسطو کا اثر اُسکے مدارس کے حدود سے باہر نکل کر بہت دور تک پہنچا پھر اسلیے اسے لوگ زیادہ جانتے ہیں۔ مگر وہ اپنے اُستاد کا کسقدر رہین منت ہے، اسکا اندازہ بھی کسی نے کیا ہے؟

زینو، کرائی سیپوس اور ابیقیورس نے جسقدر علم افلاطون سے اخذ کیا ہے اُتنا خود اُنھیں بلاواسطہ نصیب نہ ہوا۔ اپلوٹارک اور رومی فرقہ اسٹوئک کے اخلاقی تصورات جنھوں نے زمانۂ جدید پر اسقدر اثر ڈالا ہے اگر افلاطون نہ ہوتا تو عالم میں نظر ہی نہ آتے۔ جدید فیثاغورثی مسائل دراصل جدید افلاطونی مسائل کی دوسری شکل ہیں جو زیادہ مرتب و مدوّن ہے۔ متشککین افلاطون کے ہی گڑھے ہوئے ہتیار استعمال کرتے ہیں۔ مذہب عیسوی پر اسکا عظیم الشان اثر پڑا ہے۔ زمانۂ جدید میں جرمنی کے ایک مشہور شلیئرمیکر نے دراصل فلسفۂ افلاطون ہی کی ناقدانہ تحصیل شروع کی اور اسکی ترجمانی اختیار کی تھی۔ اسکے بعد کارل ہرمان اور جوزف شوٹے علم ہاتھ میں لیا۔

افلاطون کا فلسفہ صوفیائے اسلام کے فلسفۂ وحدت وجود سے بہت مشابہ ہے، ذیل میں دونوں کی مثالیں دیکر اسے کسی قدر واضح کرنے کی کوشش کیجاتی ہے: افلاطون نے جن مسائل وحدت وجود کو مختصراً بیان کیا ہے صوفیائے اسلام اُنکو اشعار و امثال کے پردہ میں بیان فرماتے ہیں۔

افلاطون اس مادی دُنیا سے بالاتر ایک دوسرا حقیقی عالم تصور کرتا ہے اور اُس عالم سے بھی ترقی کرکے عالم قدس میں جاتا ہے اور وہاں فانی فی اللہ ہو جاتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ خدا اور انسان، مادہ اور روح کے درمیان ایسی کوئی خلیج نہیں ہے جسے عبور نہ کیا جا سکے۔ تمام عالم میں ایک ہی جلوہ نظر آتا ہے اور وحدتِ محض ہے اور اسکا اظہار صرف دیگر صفات کی نفی کرنے سے

ہوتا ہے۔ صوفی اس خیال کو نور، محبت، شراب، حسن، سمندر وغیرہ کے استعارات استعمال کرکے واجب الوجود کے مفہوم کو ادا کرتے ہیں، مثلاً

نہ شرقیم نہ غربیم نہ برّیم نہ بحریم　　نہ از کانِ طبیعیم نہ از افلاکِ گردانم
مکانم لامکاں باشد نشانم بے نشاں باشد　　نہ تن باشد نہ جاں باشد کہ من از جانِ جانانم

(مولانا رومؒ)

دیگر

نہ چرخ فلک حلہ دراں ماہ فروشد　　کشتیِ وجودم ہمہ در بحر نہاں شد
آں بحر کفے کرد وبہر پارہ ازاں کف　　نقشے ز فلاں آمد و جسمے ز فلاں شد
ہر پارہ کفِ جسم کز اں بحر نشاں یافت　　در حال گدازید و دریں بحر رواں شد

(منہ)

دیگر

خورشید رخت چو گشت پیدا　　ذراتِ دو کون شد ہویدا
مہر رخ تو چو سایہ افگند　　زاں سایہ پدید گشت

(منہ)

دیگر

یک گوہرے چو بیضا جوشید و گشت دریا　　کف کرد و کف زمیں شد وز دودِ او سما شد

(منہ)

دیگر

آں بود چہ بود عین آں موج　　آں موج چہ بود عین دریا

(منہ)

افلاطون کہتا ہے کہ عقل کلّی ذاتِ واحد کی سب سے پہلی مخلوق ہے۔ وہ عقل کلّی و عقل جزوی میں تمیز کرتا ہے۔ اسی خیال کی شرح ابن رشد نے کی ہے اور اسی کے متعلق یہ قول ہے کہ اول ما خلق اللہ العقل۔ پھر افلاطون کہتا ہے کہ عقل کُل سے روحِ کلّی پیدا ہوئی جو عالم مدرکات اور عقل کُل کے مابین ایک ملانے والی زنجیر کی طرح ہے۔ اسکی دو خاصیتیں ہیں۔ ایک طرف تو عقل کلّی سے فیض حاصل کرتی ہے، دوسری طرف اُس فیض کو عالم مدرکات تک پہونچاتی ہے۔ اس روح کلّی کو اہل تصوف نفس کُل یا جان کُل کہتے ہیں ؎

جان اول مظہرِ درگاہ شد　　جان جاں خود مظہر اللہ شد
بحث جاں اندر مقام دیگر است　　بادۂ جاں را قوام دیگر است
جسم را نبود بجز جاں بہرۂ　　جسم پیش بحر جاں چوں قطرۂ

صد جہت یکدگر خود بیش نیست　　جان تو تا آسماں جولاں کنیست
(منہ)

اسی خیال کو شہیدی نے نعت میں ادا کیا ہے :

اُو مرا اللہ سے واصل ادھر مخلوق سے شامل　　خواص اُس برزخِ کبریٰ میں تھا حرفِ مشدد کا

فلسفہ افلاطون یہ صدا دیتا ہے کہ وحدت محض سے تعدد کا ظہور اس لیے ہوا کہ ہر کامل شے ایک دوسری شے کے پیدا کرنے کی خواہش رکھتی ہے۔ جو شئے واحد ہے وہ اثر پذیری و نقصان و کمی سے منزہ ہے۔ اسکے جوہر میں کوئی فرق نہیں آتا لیکن اُسکی قوت بہت زبردست ہوتی ہے اور جوش مارتی رہتی ہے۔ اُسکی مثال ایسی ہی ہے جیسے درخت کے اندر کا دودھ جو اُس کے ریشہ ریشہ میں دورہ کرتا رہتا ہے۔ وہ اس سورج کی کرن کے مشابہ ہے جو فضا کو منور کرتی ہے اور ہر شئے جس قدر قربت الٰہی میں ہے اُسی قدر خدائے عزوجل کا جلوہ اپنی ذات میں رکھتی ہے اور سعی کوشش ہوتی ہے کہ اعلیٰ کی طرف ترقی کرکے اُس ذاتِ واحد کی طرف رجوع کرے جسکے بغیر وہ زندہ نہیں رہ سکتی۔ دنیا اسی جدوجہد کے لیے پیدا کی گئی ہے۔ اب ان خیالات کو اہلِ تصوف کے کلام میں ملاحظہ فرمایا جائے۔ مولانا روم کہتے ہیں۔

حق گفتش اے مردِ زماں گنجے بُدم من در نہاں　　جستم کہ تا پیدا شود آں گنجِ احسان و عطا

ولہ

چوں روح در نظارہ فنا گشت ایں بگفت　　نظارۂ جمال خدا جز خدا نہ کرد

ولہ

ما بفلک بودہ ایم یار ملک بودہ ایم　　باز ہماں جا رویم خواجہ کہ آں شہر ماست

ولہ

من خانہ تہی کردم کز رخت بپردازم　　من کاہم تا عشقت افزاید و افزوید
از بہر چنیں سودے جاں باختن اولیٰ تر　　خامش کہ جہاں ارزد لے خواجہ کہ میجوید
جانم زپے عشقت شمس الحقِ تبریزی　　بے پائے چو کشتیہا در بحر ہمی پوید

ولہ

پیش ازاں کاندر جہاں باغ و رز و انگور بود　　از شرابِ لایزالی جانِ ما مخمور بود
ما بہ بغدادِ ازل لاف انا الحق می زدیم　　پیش ازاں کیں دار و گیر و نکتۂ منصور بود
پیش ازاں کایں نقشِ دل بر آب و گِل معمار شد　　در خراباتِ حقایق عیش ما معمور بود

افلاطون اور اہل تصوف دونوں یہ کہتے ہیں کہ انسان کچھ نہ کچھ ضرور مختار ہے گو اُسکا اختیار نوامیس ازلی وابدی کے ماتحت ہے یعنی جہاں تک اسکا تعلق نفس کی اطاعت سے ہے وہ آزاد و مختار بالکل نہیں ہے مگر اُسے یہ اختیار حاصل ہے کہ جذبات کی پیروی نہ کرے بلکہ عقل کی پیروی کرے۔ چنانچہ مولانا رُوم کہتے ہیں

گوئید عشق چیست بگو ترک اختیار　　　ہر کو ز اختیار نہ رست اختیار ہست

رُوح کی دوزخ میں جسم کے اندر وہ فطرت کا ایک جزو ہے۔ حالت روحانی میں وہ عالم مثال میں ہے اُس نے اس عالم سفلی کی طرف بیشک ہبوط کیا ہے۔ لیکن عالم علوی کی طرف مراجعت کرنے کو اپنا فرض سمجھتی ہے۔ اس میں اگر کوئی کثافت یا نقصان پیدا ہو جاتا ہے تو صرف جسم کی صحبت اور اس عالم سفلی کے تعلق کی وجہ سے۔ اس کدورت وغبار کو پاک کرنے کے لیے ہر وقت وہ مضطرب رہتی ہے۔

اب اس بیسویں صدی میں فلسفہ کے بیان کے متعلق جو خاص طریقہ رائج ہے وہ زیادہ تر تاریخی پہلو لیے رہتا ہے۔ ادبی تنقید صرف اسی قدر رہ گئی ہے کہ حُسن وجمال کی مختلف شکلوں کو نظر کے سامنے عیاں کر دیا جائے اور اُن مختلف طریقوں کو ظاہر کر دیا جائے جن میں انسان کے مختلف خاندانوں اور مختلف زمانوں نے حُسن وجمال کے مسئلہ اور اصول کو حل کیا ہے۔ فلسفہ ان پیش کردہ حل وتوضیحات کی صرف ایک تصویر ہے۔ علم مذہب بھی صرف ان خود بخود پیدا ہونیوالی کوششوں کی ایک تاریخ ہے تاکہ ایک مسئلۂ ربانی کی توضیح ہو سکے۔ تاریخ بھی اسی طرح ان تمام اشیا کے علم کی ایک لازمی صورت ہے جو تغیر پذیر ہیں اور حیات مسلسل کے قوانین کے تحت واقع ہوا کرتی ہیں۔ غرضکہ ایک نقاد کی نگاہ میں قوتِ ادراک اسی طرح نوع انسانی میں نشو ونما پاتی ہے جس طرح کہ فرد واحد میں۔ افلاطون کے زمانہ میں ہر شئے پر "صفت" بودن" کے لحاظ سے غور کیا جاتا ہے لیکن اب "صفت" شدن" زیادہ نظر میں رہتی ہے اور تمام علوم مثلاً فلسفہ، قانون، سیاسیات، اور فنون و شاعری پر اسی نقطۂ نظر سے غور کیا جاتا ہے اور جو کچھ ہم فلسفہ کی تاریخ میں تلاش کرتے ہیں اُس میں خاص فلسفہ سے بہت کم اور تاریخ سے زیادہ بحث ہوتی ہے۔ فلسفۂ قدیم اپنے اندر ایک جامعیت رکھتا ہے اور اس جامعیت کو اگر ہم تلاش کریں گے تو ارسطو و افلاطون کی تصنیفات میں بدرجہ اعلیٰ پائیں گے

افلاطون نے مختلف کتابیں علوم فلسفہ وسیاسیات وغیرہ پر لکھی ہیں۔ ذیل میں ہم ان کتابوں کے نام معہ کسی قدر صراحت مضمون کے ناظرین کی دلچسپی کے لیے درج کرتے ہیں:

اپالوجیا - یعنی اجوبات - ان میں سوال وجواب کا وہ طریقہ ہے جو سقراط کے ساتھ مخصوص ہے - تعلیمات سقراط کو اُسکی اپنی شان میں دکھایا گیا ہے اور سوفسطائی طریقہ کی طرف سے لوگوں کی طبیعت ہٹانے کی کوشش کی گئی ہے - فلسفہ ونفسیات ومنطق کو جسکا بیج سقراط نے بویا تھا افلاطون نے ترقی دے کر برگ وباردار درخت بنا کر دکھایا ہے - اس رسالہ کے تین حصے ہیں (۱) حالات قبل الزام (۲) مابعد الزام وسزا (۳) بعد حکم سزا - اسکا ماحصل یہ ہے کہ موت کوئی بُری شئے نہیں ہے - وہ یا تو ایک آرام کی لمبی نیند ہے یا ایک دوسرے ہی عالم میں منتقل ہو جانا ہے. ایک اچھے آدمی کو اس زندگی میں جانے کے بعد کوئی بُرائی نہیں پہونچ سکتی - مکالماتِ افلاطون میں اُس حکیم کے فلسفہ کا غیر مرئی اور صوفیانہ رُخ ہے - سقراط نے جن چیزوں کو اشارہ کے طور پر بیان کیا تھا افلاطون نے اُسکو واضح کر دیا ہے - سقراط کی تعلیم سے یہ معلوم ہوا تھا کہ حق اور خیر دونوں کا وجود موجود ہے - لیکن اُس نے یہ توضیح مزید کی کہ نیکی ایک احد اور عالمگیر شئے ہے اور اُسکا انحصار علم شئے پر ہے - اس مسئلہ کی وہ خوب تحقیق کرتا ہے اور یہاں تک جستجو اور موشگافیاں کرتا چلا جاتا ہے کہ معمولی غور وخوض کرنے والوں کو بھی صرف فعلیوں کا علم ہی نہیں ہوتا بلکہ اُنکے اسباب ووجوہ بھی معلوم ہو جاتے ہیں اور اس راہ سے وہ ایک عام کلیہ تک پہونچ جاتے ہیں - اس راہ میں وہ خاص سے شروع کرکے عام نتیجہ پر پہونچتا ہے اور بالآخر یہ نتیجہ نکالتا ہے کہ دنیا میں ایک ایسی شئے بھی ہے جسے ایک عالمگیر نیکی یا خیر کلی کے نام سے یاد کر سکتے ہیں - ان مکالمات میں سقراط ہی کا فلسفہ نہیں ہے بلکہ افلاطون کے اپنے ذاتی خیالات بھی صاف نظر آتے ہیں - وہ افلاطون کے زمانہ کی ایک ذہنی وعلمی زندگی کی اعلیٰ درجہ کی تصویریں ہیں - مگر ان سب کی بنیاد وہی سقراطی تعلیم ہے - گو افلاطون کی اپنی موشگافیاں اور انکشافات بھی بہت ہیں اور بحثوں میں اخلاقی اور سیاسی، مابعد الطبیعی یا حکیمانہ اور صوفیانہ شاہ راہیں اختیار کی گئی ہیں - سقراط کہتا ہے کہ نیکی کی تعلیم دینا مشکل ہے - پروٹاگوراس کہتا ہے کہ یہ ممکن ہے - ان دونوں کی بحثوں میں افلاطون باریک باریک امور کی طرف اشارہ کرتا ہوا اپنے خیالات کا بھی اظہار کرتا جاتا ہے - وہ کہتا ہے کہ خارجی اور ذہنی نقطہ ہائے نظر میں بڑا فرق ہے - نیز ایسے معیاروں میں جو محض ذہنی ہیں اور ان میں جو رسمی ہیں اور رواج پا چکے ہیں بڑا فرق ہے - آدمی میں پیدا ہوتے ہی تمام اشیاء کا علم موجود رہتا ہے - قدرت کی یہ ایک ودیعت ہے جسے وہ اپنے ساتھ رکھتا ہے - یہ علم وہ اپنے ساتھ لاتا ہے گویا وہ نہیں رکھتا یعنی یہ علم ایک خاموشی کی حالت میں زاویۂ خمول میں پڑا رہتا ہے - اور اگر اس سوتے والے کو

بیدار کیا گیا اور دوسرے امور کی مدد سے اس سے کام لیا گیا تو وہ پھر نظر کے سامنے آجاتا ہے اور یاد تازہ ہو جاتی ہے پس علوم انسانی کی ترقی کے لیے مجاہدہ کی ضرورت ہے۔ تقدس و پاکی کی صفت منصف مزاجی کی صفت کا ایک جزو ہے اور اس طرح حاصل ہوتی ہے کہ خدا کی عبادت نماز و قربانی کے ذریعہ کی جائے۔ مذہب و اخلاق میں کوئی تباین نہیں ہے بلکہ ایک طرح کی مواصلت ہے۔

مینو میں وہ بیان کرتا ہے کہ روح ایک ازلی و ابدی شئے ہے ؎

روح ہمچوں صالح و تن ناقہ است　　　روح اندر وصل تن در فاقہ است
جسم را نبود بجز جاں بہرۂ　　　جسم پیش بحر جاں چوں قطرۂ
میل جاں اندر حیات و در حی است　　　زانکہ اندر لامکاں اصل وی است
(مولانا رومؒ)

اسی خیال کو فیڈو میں افلاطون ترقی دیتا ہے۔ موت سے مراد روح کی جسم سے علٰحدگی ہے اور یہی شے ہے جسکی تمنا ایک فلسفی کیا کرتا ہے۔ اس لیے کہ جسم تفکر و تصور کی راہ میں حائل ہوتا ہے اور جسمانی خواہشات سے فلسفی کی دائمی جنگ رہتی ہے جو بالآخر موت کی مدد سے ختم ہوتی ہے۔

آزمودم مرگ من در زندگی است　　　چوں رہم زیں زندگی پایندگی است (مثنوی)

فیڈو میں افلاطون ترک دنیا کی تعلیم دیتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ کسی مابعد الطبیعی تعلیم کی وجہ سے تجربۂ خارجی سے قطع نظر نہیں کرنا چاہیے۔ حس کا کام یہ ہے کہ ہم میں چھپے ہوئے علوم کی یاد تازہ کرے مگر حق کی تلاش میں منہمک رہ کر احساسات کے قبضہ و تصرف سے آزادی حاصل کرنا چاہیے۔

مکالمات سمپوزیم و فیڈروس دونوں مسائل تصوف سے روشناس کرتے ہیں۔ انکا تعلق روحانیات سے ہے اور افلاطون نے مسئلۂ عشق انسانی کو ان میں بیان کیا ہے۔ سارا عالم حسن و جمال سے وابستہ ہے۔ عشق و محبت ہی صرف ایک ایسی شے ہے جس کی طلب بغیر کسی مخصوص غرض کے کرنی چاہیے۔ ولولۂ حسن و جمال خود اپنی جگہ پر مقصود بالذات شے ہے

عشقہائے کز پئے رنگے بود　　　عشق نبود عاقبت ننگے بود

عاشق اپنے "جزوِ ثانی" کی تلاش میں منہمک نہیں رہتا بلکہ حسن و جمال کی تلاش میں رہتا ہے۔ یہ تلاش حسن و جمال ہر شے میں ہوا کرتی ہے اسلیے کہ ہر شے میں حسن و جمال ہے اور عشق موجود ہے ؎

حکمت حق در قضا و در قدر — کرد ما را عاشقان ہمد گر
لیک شمع عشق چوں آں شمع نیست — روشن اندر روشن اندر روشنی ست
بوئے آں دلبر چو پراں می شود — آں زبانہا جملہ حیراں می شود

گارجیاس میں افلاطون انصاف کے ایک اعلیٰ و برتر شئے ہونے کے خیال کی تائید کرتا ہے اپنی جمہوریت میں ایک ذہنی سیاسی جماعت قائم کرکے وہ اس انصاف کی نوعیت کی تشریح کرتا ہے - گارجیاس میں یہ بحث ہے کہ خوشامد ایک قسم کی ایسی مسرت پہونچا کر جو بلا علم کے حاصل ہوتی ہے آدمی پر اپنا اثر ڈالتی ہے - طلاقت لسانی کوئی فن نہیں ہے - اور ترغیب ایک قسم کی پوشیدہ قوت کا نام ہے - پس وہ یہ نتیجہ استخراج کرتا ہے کہ :-

(۱) ظالم آدمی اپنی خواہش پر نہیں بلکہ اپنی پسند پر عمل کرتا ہے
(۲) ظلم کرنا زیادہ بُرا ہے ظلم سہنا اتنا برا نہیں -
(۳) مجرم کے لیے سزا پانا سزا سے بچ جانے سے بہتر ہے -
(۴) علم معانی و بیان و بلاغت کا صرف فائدہ یہ ہے کہ دشمنوں کو سزا پانے سے محفوظ رکھے

رسالہ جمہوریت افلاطون کو پانچ حصوں میں منقسم کہا جا سکتا ہے - پہلے اس نے انصاف پر بحث کی ہے جو سب سے اہم مسئلہ ہے - پھر اُس نے ایک ایسی ریاست کا جو کامل کہی جاسکے نقشہ کھینچا ہے - اسی میں انصاف کے حدود و تعریف بھی بیان کرتا ہے خواہ وہ حدود بہ تعلق نفس ریاست ہوں یا بتعلق افراد ہوں جو اُس ریاست میں رہتے ہیں - پھر وہ اشتراکیت سے بحث کرتا ہے۔ اور اس پر اصرار کرتا ہے کہ صرف حکما کو بادشاہ بنایا جائے اور جو عمال و حاکمانِ وقت ہوں انھیں تہذیب اخلاق و حکمت کی تعلیم دینی چاہیے - اسکے بعد پھر وہ بیان کرتا ہے کہ ریاست و حکومت کا زوال کب اور کس طرح شروع ہوا کرتا ہے ، اسکے اسباب کیا ہیں ، اور خراب اور ظالمانہ حکومتیں کیسے کہتے ہیں - افلاطون بُرے اور بھلے دونوں پہلو بیان کرنا چاہتا ہے تاکہ ایک کو حاصل کرنے کی اور دوسرے سے بچنے کی کوشش کی جائے - پھر وہ کچھ قواعد و ضوابط نمونۃً بیان کرتا ہے - افلاطون کی تحریرات میں جو شئے عام طور پر نظر آتی ہے یعنی تصورِ اتحاد ، اس سے یہ کتاب بھی خالی نہیں ہے - اور یہ اصول کہ دماغ کو جسم کے مقابلہ میں سیاسی برتری حاصل ہے صاف صاف عیاں معلوم ہوتا ہے -

منطقی مکالمات کے طور پر اس نے بعض رسالے لکھے ہیں - اُنکے نام یہ ہیں :—

یوتھی ڈیموس - پارمی نیڈیز - تھیٹی ٹوس - سوفسٹ - اسٹیٹس مین - فلی بوس - اول الذکر میں وہ سقراط کی زبانی یہ ثابت کرتا ہے کہ ایک فلسفہ کی ضرورت ہے اور سب سے بڑا فلسفہ حکمتِ سلطنت ہے - اسی سلسلہ میں وہ سوفسطائیوں کے خیالات کی ہنسی اُڑاتا ہے - ثانی الذکر میں ایسے صفات مثلاً انصاف - حسن وجمال یا خیر و خوبی کی تعریف بمقابلہ اول الذکر کے بدرجہا زیادہ ذہنی اور مجرد عن الخارج کی گئی ہے - اسکا خیال ہے کہ ایک اصول کو تسلیم کرنے کے بعد اُس سے جو نتائج مستنبط و مستخرج ہوتے ہیں اُن کا صرف استقراء کرنا ضروری نہیں ہے بلکہ اصول مذکور کو رد کر کے جو نتیجہ پیدا ہوتا ہے اُسے بھی دیکھنا چاہیے - اس میں زینو کے سلک پر تحقیق حق یا تکمیل مسلک مذکور کی کوشش کی گئی ہے - ثالث الذکر میں نفسیاتی خیالات کو بہت زیادہ واضح اور صاف صاف ادا کیا ہے اور فلسفہ میں ناقدانہ اور مؤرخانہ طریقۂ بحث کو رواج دینا مقصود معلوم ہوتا ہے لیکن جو توازن کہ تجربہ، تصور اور انعکاس میں قائم رہنا چاہیے اُس سے سہو تجاوز نہیں کیا ہے - رابع الذکر میں پھر علم و وجود اشیا سے بحث کرتا ہے - سوفسطائی کی تعریف یہ کی ہے کہ وہ حقیقتِ اشیاء کی غیر مشابہ تصویر کھینچا کرتا ہے اور مادیت اور تمثل میں مطابقت کرنے کی کوشش کرتا ہے - افلاطون یہ پوچھتا ہے کہ آیا مختلف تصورات ایک سے دوسرے تک منتقل ہو سکتے ہیں، اور اگر یہ ممکن ہے تو کیا تمام تصورات بلا امتیاز منتقل ہو سکتے ہیں؟ نیز کیا صرف بعض اقسام یا عنوانات میں یہ شکل ممکن ہے اور بعض میں نہیں؟ - اس طرح وہ پانچ قسم کے عنوانات زیر بحث لاتا ہے - وجود - سکون - حرکت - جمع - فرق - وہ کہتا ہے کہ سکون و حرکت فی ما بین غیر قابل اتصال ہیں لیکن جس قدر عمومیت اور کلّیت فرق کو حاصل ہے اُسی قدر وجود کو بھی ہے اور ایجابی اور سلبی خصوصیتیں یہی نہیں کہ باہم موجود رہتی ہیں بلکہ انکے حدود بھی برابر برابر وسیع ہوتے ہیں - نفی - کذب، و تردید باہم الگ نہیں ہیں - ہر سلبی صفت کے ساتھ ایک ایجابی صفت کا ہونا بھی ضرور ہے - اور نفی حقیقی اور اثبات حقیقی دونوں لازم و ملزوم اور متناسب ہوا کرتے ہیں - خامس الذکر میں اُس نے سیاسیات پر زیادہ عالمانہ طریق سے بحث کی ہے - پہلے وہ بادشاہ کی تعریف کرتا ہے کہ وہ آدمیوں کا چرواہا ہے - پھر قانون اور حقیقتِ قانون سے بحث کرتا ہے اور طرزِ حکومت کی تقسیم اس طرح کرتا ہے کہ اس میں پہلی سے دوسری تقسیم اور پھر دوسری سے تیسری - علیٰ ہذا القیاس ایک دوسرے کی نسبت سے اچھے نمونہ کے مقابلہ میں بڑا نمونہ پیش کرتی ہے - وھو ہذا :- (۱) دستوری شاہی (۲) دستوری حکومت بعض

(۳) تابع قانون عمومی حکومت - (۴) قانون شکن عمومی حکومت (۵) مخالف قانون حکومتِ بعض - (۶) جبریت -

خاص الذکر میں وہ یہ بیان کرتا ہے کہ سب سے بڑی نیکی نہ تو مسرت میں ہے اور نہ علم میں۔ لیکن جہاں نیکی کا مستقر ہے وہ ایک ایسی ترکیب کا ظرف ہے جس میں ہر شے صحیح طور پر توازنِ مناسب کے ساتھ ملی جُلی نظر آتی ہے - اس میں ایک خاص اثر حسن و جمال ہے - اسکا وجود حقیقی ہے فرضی نہیں - اس میں ذہانت، علم و حکمت، فن و اصابت رائے ہر شئے موجود ہے اور وہ ایک ایسی خالص و پاک نعمت ہے جس میں دُکھ اور درد کا کہیں نام نہیں -

رسالہ طیموس میں وہ کہتا ہے کہ عالم چونکہ ایک جسم رکھتا ہے اسلیے اسکے وجود میں آنے کے لیے سبب کی ضرورت ہے اور اسکی ایک ابتدا (ازل) بھی ہے - اور اسکی ساخت ایک ایسے نمونہ پر کی گئی ہے جو ہمیشہ باقی رہتا ہے - اسکے بعد وہ یہ بیان کرتا ہے کہ تحقیق عالم میں ذہن انسانی کا حصہ اور تعلق کس قدر ہے - حاجت کے اثرات و نتائج کیا ہیں حقیقی نفسیات کے اصول کیا ہیں - اسکے بعد پھر وہ فن طب و تشخیص امراض پر بحث کرتا ہے -

افلاطون نے اپنی عمر کے اخیر حصہ میں اس امر کی کوشش کی کہ قانون ملک کا ایک ضابطہ تیار کرکے چھوڑ جائے - اس لیے اس نے ایک ضابطۂ قوانین تیار کیا جسمیں ڈورَوی اور ایونی قوانین کے بین بین ایک راستہ اختیار کیا ہے - وہ تعلیم و شادی بیاہ کے قواعد بناتا ہے - بداعتقادی و لامذہبی یعنے خدا کو نہ ماننا، قادر مطلق سے انکار کرنا ایسے بدترین بد اخلاقی سے بھرے ہوئے باطل خیالات کو قابل سزا قرار دیتا ہے - ان امور کو قابل سزا اور سخت سزا کے مستوجب خیال کرنے کی وجہ سے بعض لوگ کہنے لگے ہیں کہ افلاطون آخر عمر میں متعصب ہوگیا تھا - مگر جو لوگ کہ قید مذہب سے آزاد ہوکر محض خرافات کی قید میں گرفتار ہونا پسند کرتے ہیں انھیں کے اکثر ایسے خیالات ہیں - رواداری اور آزادی کے جو معنی آجکل لیے جا رہے ہیں یہ شاید افلاطون کے ذہن میں بھی نہیں تھے - یہ وہ شخص تھا جو سقراط کا شاگرد اور ارسطو کا اُستاد ہے - جس نے اپنے اُستاد سے علم ظاہر کے مقابلہ میں باطنی علم زیادہ حاصل کیا تھا اور کوشش کرتا تھا کہ علم ظاہری کی طرح اسے بھی منصۂ شہود پر لائے - جہاں صراحت سے بیان کرسکتا تھا وہاں اُس نے بہت صراحت سے کام لیا ہے اور جہاں اشاروں کی ضرورت تھی، اسلیے کہ عوام میں تحمل و برداشت کی قوت نہیں تھی، وہاں صرف اشاروں سے کام لیا ہے اور اپنی تحریروں کو مبہم اور مغلق رہنے دیا ہے - چونکہ تہذیب باطنی کا

واسطہ تہذیب ظاہری ہوا کرتی ہے اور تہذیب ظاہری احکام شرع کی پابندی سے حاصل ہوتی ہے اسلیے اُسنے مقصد اولین تہذیب باطنی کے بالواسطہ حصول کیلیے آخر عمر میں تدوین احکام شرع ظاہری کو ضروری سمجھا اور تمام کوششوں کو چھوڑ کر اسی ایک دھن میں آخر تک لگا رہا اور اپنے پیچھے ایک ایسی شرع چھوڑ گیا ہے جو اس کے علوے مرتبت اور اعلیٰ مدارج ذہنی و روحانی کی طرف دلالت کرتی ہے۔

اگر قرآن پاک کے اس ارشاد پر استدلال کیا جائے کہ لکل قوم ہاد ہر قوم میں ایک نہ ایک ہدایت کرنے والا آیا ہے، تو ممکن ہے کہ سقراط اپنے زمانہ اور ملک کا پیغمبر ہو۔ جو آواز کہ ہر وقت اُسکے ساتھ رہا کرتی تھی وہ اور اس خیال کو تقویت دیتی ہے۔ اور اگر یہ صحیح ہے تو افلاطون اُسکا شاگرد رشید و خلیفۂ برحق تھا جسنے ایسے علوم کا نشر و اعلا کیا جنکا سرچشمہ نبوت میں نظر آتا ہے۔
واللہ اعلم بالصواب۔

حامد علیخاں

افکار تازہ

(جانشین جلال جناب منشی انور حسین آرزو لکھنوی)

مرنے پر آہِ گرم کا بازار سرد تھا
یارب یہ تھا نفس کا تعلق کہ درد تھا

مجھ سے وفا نہ آپ سے چھوٹی کشیدگی
یہ خاکسار آپ کے دامن کی گرد تھا

پروانۂ جمال رُخ ہو شادماں رہا
پابندِ شوق بھی عجب آزاد مرد تھا

کروٹ بھی جب بدل نہ سکا ناتوانِ ہجر
پھر اور کس مرض کی دوا دل کا درد تھا

بسمل اسے ادا نے اُسے ناز نے کیا
جوہر تو ایک جا تھے اثر فرد فرد تھا

دل جلوۂ حبیب سے تھا لعلِ شبچراغ
ظاہر میں جل رہا تھا حقیقت میں سرد تھا

آرام جاں تو ہیں مگر ایذا رساں بھی ہیں
بیٹھے تھے وہ جدھر اُسی پہلو میں درد تھا

اک وقت میں تھے سوز جدائی کے دو اثر
شعلہ بنا ہوا تھا نفس جسم سرد تھا

نازک مزاجیوں سے تری قلتِ التفات
گو خون بڑھ رہا تھا مگر رنگ زرد تھا

تاثیرِ شوقِ قتل یہ مجھ سخت جاں کی تھی
پہلے سے دستِ بازوِ قاتل میں درد تھا

آیولینتھی

چوتھا منظر

[ٹرسٹان - جیوفری - اور آیولینتھی]

[آیولینتھی نابینا ہے مگر اُسکے حرکات وسکنات سے اس امر کا اظہار نہیں ہوتا - وہ بلا تکلف چلتی پھرتی ہے کبھی کبھی جیسے سننے کو ٹھہر جاتی ہے اور اُسوقت اپنے ہاتھ آگے بڑھاتی ہے گویا ٹٹولتی ہے اور صرف اسی سے اُسکے آنکھوں سے معذور ہونے کا انکشاف ہوتا ہے - اُسکی آنکھیں کھلی رہتی ہیں، مگر بسا اوقات زمین کی طرف جھکی ہوئی، اُنکو جنبش بھی کم ہوتی ہے]

آیولینتھی (دروازہ پر) مارتھا! برٹرانڈ!

ٹرسٹان - ارے یہ تو وہی ہے

آیولینتھی - یقیناً میں نے کسی کی آواز سُنی - (آگے بڑھ کر) کون ہے؟

ٹرسٹان - ایک اجنبی جو معافی کا خواستگار ہے، کیونکہ وہ بلا اجازت داخل ہوا اور آپ کے آرام اور اس جگہ کے پُر امن سکوت میں خلل ڈالا -

آیولینتھی - مجھے اپنا ہاتھ دو - تم پہلے یہاں کبھی نہیں آئے ہو نہ میں تمہاری آواز پہچانتی ہوں - راستہ میں برٹرانڈ یا مارتھا نہیں ملے؟

ٹرسٹان - مجھ سے کسی سے گفتگو نہیں ہوئی - میں یہاں اتفاقیہ پہونچ گیا -

جیوفری (علیحدہ ٹرسٹان سے) یہ جیوبرٹرانڈ کون ہے؟

آیولینتھی (سنکر) یہ تمہارے ساتھ کون ہے؟

ٹرسٹان - یہ میرے دوست ہیں، جونامُٹ اور ٹروبیڈور ہیں، اور یہاں سے قریب ہی رہتے ہیں -

آیولینتھی - میں تم دونوں کا خیر مقدم کرتی ہوں - کیا تم میرے ساتھ اندر نہیں چلوگے، وہاں باہر سے زیادہ خنکی و تازگی ہے -

جیوفری (جلدی سے) آپ کی عنایت - لیکن ہم یہیں ٹھہرے رہیں گے - (علیحدہ ٹرسٹان سے) میرے نزدیک اسی میں خیریت ہے -

آیولینتھی (جو ابھی تک ٹرسٹان کا ہاتھ پکڑے ہوئے ہے) تمہارا ہاتھ گرم ہے اور مجھے نبض کی حرکت محسوس ہو رہی ہے - کیا راستہ میں گرمی نے تمہیں تکلیف پہونچائی - پیاس تو نہیں لگی ہے؟ ٹھہرو - میں تمہارے لیے جام شراب لاؤں - (مکان کے اندر چلی جاتی ہے)

ٹرسٹان - کس قدر خوبصورت ہے - اور ہر خط و خال سے کس قدر خلق و نرم دلی کا اظہار ہوتا ہے - اور اسکی شیریں آواز!

جیوفری - اسکی آواز در اصل عجیب و غریب ہے جو دل پر اچانک قبضہ کرکے نازک مگر مضبوط زنجیروں میں جکڑ لیتی ہے - اس میں مطلق شک نہیں کہ وہ

بڑی عالی نسب ہے، لیکن احتیاط شرط ہے پیارے ٹرشان، وہ شراب لائے تو پینا نہیں۔

ٹرشان۔ میں اُسکے ہاتھ سے اجل تک بطیبِ خاطر پینے کو تیار رہوں، آپ شراب کو کہتے ہیں۔

آیو لنیتھی (ایک صراحی اور پیالہ لیکر آتی ہے) یہ شراب میرے والد ہمیشہ پیتے ہیں۔ یہ بہت تیز ہے اور میں نہیں پی سکتی۔ لیکن تم ضرور چکھو! (پیالہ بھر کر ٹرشان کو پیش کرتی ہے)

ٹرشان (پیالہ لیکر اور پیتے ہوئے) اے نازنیں خاتون، میں آپ کا جامِ صحت پیتا ہوں!

آیو لنیتھی۔ اب یہ پیالہ اپنے دوست کو دیدو اگر وہ پینا چاہیں۔ میں تمہارے لیے میوہ لینے جاتی ہوں۔ خرمے اور انگور یا اور جو تم کہو (پھل توڑکر ایک ٹوکری میں رکھتی جاتی ہے جو اُس نے میز پر سے اُٹھالی ہے)

ٹرشان (شراب کا پیالہ جیو فری کو دیتا ہے) لو جیو فری پیو۔

جیو فری۔ تمہیں اس شراب میں کوئی غیر معمولی بات تو نہیں معلوم ہوئی۔ مثلاً سستی ...... غش ......

ٹرشان۔ بس پی جاؤ۔ ڈرو نہیں۔

جیو فری۔ تو یہ ہے شراب؟ (پی جاتا ہے) اہا ہا! اصلی میلو اٹسی۔ اس سے بہتر شراب تو بادشاہ رچنی بھی نہ پیتا ہوگا (پھر پیتا ہے) اوہو ہا یا عمدہ شراب ہے جہاں ایسی حیات جاوید بخشنے والی شراب ملے بھوتوں کا گذر نہیں ہو سکتا۔

آیو لنیتھی (واپس آتی ہے) لو یہ پھل کھاؤ۔ میں انھیں میز پر رکھے دیتی ہوں۔

جیو فری۔ اے خوبصورت خاتون آپ نے ہماری ایسی ضیافت کی ہے اور ایسی نایاب و خوش ذائقہ شراب پلائی ہے کہ ہمیں کوئی شبہہ نہیں رہا کہ ہمارا میزبان ایک امیر اور شریف خاندان کا رُکن ہے۔ حسن اور شراب، شاعری و موسیقی کے انجم رہبر ہیں۔ اب آپ میرے الفاظ کو سنیے میں نے فی البدیہ ایک گیت نظم کیا ہے جو ہماری اطاعت اور احسانمندی کا ترجمان ہوگا۔ (اپنے ستار پر گاتا ہے)

ہم جانتے ہیں کہ عقاب ہے جب وہ ہوا میں
بڑے بڑے چکر کاٹتا ہے اور غرور کے ساتھ اونچے
بادلوں میں اُڑتا ہے۔

ہم جانتے ہیں کہ بلبل ہے جب موسم بہار کی
شبنم آلود راتوں میں اُسکے دلربا نغمے اُبلتے ہیں۔

شجاعت و ہنرمندی اور اعتدال نفس سے
ایک بہادر شخص تمام عالم کے دلوں پر اپنی عظمت
کا سکہ جما دیتا ہے۔

خوش آہنگ ساز پر گاکر مطرب اپنے کمال
موسیقی کا ثبوت دیتا ہے۔ محلوں اور باغوں میں
اُسکی عزت کی جاتی ہے۔

(دُھن بدل کر)

لیکن جب شریف اور خوشدل مرد اور عورتیں

کے درمیان وہ اپنا ستار چھیڑتا ہے اور اپنے
شریلے اور دلکش نغموں کی تعریف کا امیدوار
ہوتا ہے۔ جب نوعمر و قبول صورت لڑکے جامِ شراب
سب کے سامنے پیش کرکے مطرب کے خیر مقدم کا
اعلان کرتے ہیں تو شراب کے ذائقے سے وہ اندازہ
کرلیتا ہے کہ ایک شریف خاندان کے سایۂ عاطفت
میں ہے۔

آیو لینتھی۔ یہ بہت اچھا گیت ہے اور اس سے
تمہاری بلند اور غیر معمولی صلاحیتِ شعر کا اندازہ ہوتا ہے۔

ٹرسٹان۔ میرا دوست پر دواتس کے نوجوان
ٹروبیڈوروں میں مشہور ہے۔

آیو لینتھی (ٹرسٹان سے) کیا تمھیں بھی نظم و موسیقی
میں دخل ہے؟

ٹرسٹان۔ میں ایک مبتدی ہوں، لیکن آپ کی
نوازش مجھے ہمت دلاتی ہے کہ میں بھی گاؤں۔
میری نیت سے میرے الفاظ کو پرکھیے۔ (پہلے
ستار بجاتا اور پھر گاتا ہے)

شہر کے شور و غل سے پریشان ہو کر میں نے
پہاڑوں کا قصد کیا۔ تھکا ماندہ اور مضمحل تھا، دفعتہً
ایک وادی نظر آئی جس پر آفتاب اپنی شعاعیں
نچھاور کر رہا تھا، اور جہاں مختلف اقسام کے
پھولوں سے مرصع کاری کی گئی تھی۔ یہاں سکونِ
کامل تھا کسی طائر کا نغمہ تک میرے کانوں کو تکلیف
نہیں دیتا تھا انسان کی آواز یا اور کوئی صدا نہیں
آتی تھی۔ اس جادو کی وادی میں ہر چیز پر ایک

طلسمی نیند چھائی ہوئی تھی۔ ایک دروازہ کھلا
اور ایک نورانی صورت نے ستارے کی طرح
میری متحیر آنکھوں کو پُرضیا کر دیا۔ اے نازنین
تو مجھے ایک گلاب کی کلی معلوم ہوئی جس پر شبنم کے
قطرے ہوں اور کسی جادوگر نے نیند کو مسلط
کر دیا ہو۔ تیرے ساتھ گرد و پیش کی ہر شے پر
سکوت طاری تھا۔ بادِ نسیم تیرے موتی سے
رخساروں کا خواب دیکھتی تھی۔ آتشِ حنا کی آگ
دھیمی اور نرم جلتی تھی۔ کھجور کے درخت نیند میں
گُھتے ہوئے تھے اور اُنکے سر جھکے جاتے تھے۔

ہر چیز میں صرف تیرے سبب سے زندگی ہے اور
سب تیری تابع ہیں۔ اور جب تو آرام کرتی ہے
تو وہ بھی آنکھیں بند کرلیتی ہیں۔

تو جاگی اور ہوامیں، باغ میں، پھولوں میں
ایک روح دوڑ گئی۔ گویا سورج کی کرن نے
اُنھیں نیند سے جگا دیا۔

اے تو کہ گلاب کا ایک نازک پھول ہے میرے
ناقص گیت کو جو میری سچی اور دلی اطاعت کا
مؤید ہے قبول کر، کیونکہ تیرے حُسن نے اِس کو
موزوں کیا۔

آیو لینتھی (تھوڑے سکوت کے بعد جس سے معلوم
ہوتا ہے کہ کچھ سوچ رہی ہے) مجھے اپنا ستار دو!
(ستار پر گاتی ہے)

اے اجنبی مہمان میں تیری عزت کرتی ہوں
کیونکہ تیرا دل انبساط و راستی کا مسکن اور قصص و

موسیقی کا مخزن ہے۔ جس سے مجھے خاموشی و حیرت کے ساتھ مسرت ہوئی۔

تیرے گیت میں ایسا اثر ہے کہ ہوا بھی دم بخود ہو کر سُن رہی ہے۔ اور پھول خاموش کان لگائے ہوئے ہیں۔ تیرے ساز کا نغمہ سننے کو اُنھوں نے اپنی معطر سانس روک لی ہے۔ شام کے وقت اس وادی کی گھنی جھاڑیوں میں آوارۂ بے خانماں عندلیب آکر نواسنج ہوتی ہے۔ میں چاہتی ہوں کہ میرے ستار میں بھی وہی نغمے گونجیں جو اُسکی آواز میں ہیں۔ میں چاہتی ہوں کہ میرے گانے میں بھی اُسکی طرح روح کو اپنے بازوؤں پر اُڑا لیجانے کی قوت پیدا ہو جائے۔ اے اجینیو! تم نے یہ گانا کہاں سیکھا؟ کیا اسکا مولد وہاں ہے جہاں مشتاق آرزوئیں اور تمنائیں اور ٹھنڈی سانسیں شام کی خواب آلود خاموشی کے ساتھ آہستہ آہستہ اُبھرتی ہیں۔

بتاؤ کیا ہوائے لطیف کے ساکنوں نے تمھیں گانا سکھایا ہے کہ تمھاری موسیقی میں جادو کا اثر اور روانی ہے۔ تمھارے گیتوں نے میرے خیالات کو خوشی سے جھکا دیا ہے۔ میں تمھارا شکریہ ادا کرتی ہوں۔

جیوفری۔ کس قدر بلند شاعری ہے!

ڈرسٹان (آیولنیقی سے)، آپ نے ہمارے گیت کو بلبل سے تشبیہ دی ہے۔ کاش میں ان پرندوں میں سب سے زیادہ حقیر اور چھوٹا ہوتا جو اپنے آشیانے اس محل کے قریب بناتے ہیں تاکہ ہمیشہ اُن روح پرور نغموں کو سُن سکتا آپ جن کی مالک ہیں۔

جیوفری۔ اے شریف خاتون! مجھے ایک سوال پوچھنے کی اجازت دیجیے جو بار بار میری زبان تک آتا ہے۔ آپ اس جگہ تمام دنیا سے علٰحدہ رہتی ہیں اور پرووانس کے تمام شریف مردوں اور عورتوں میں سے کسی کو بھی آپ کے غیر معمولی کمالات کا علم نہیں ہے۔ وہ کون سا مبارک خاندان ہے آپ جسکی فرد ہیں اور آپ کے والد کون ہیں؟

آیولنیقی۔ ہائیں، تم میرے والد سے واقف نہیں۔ مجھے حیرت ہوتی ہے۔ کیونکہ یہاں کبھی کوئی ایسا شخص نہیں آیا جو اُن سے آگاہ نہ ہو۔

جیوفری۔ مجھے اُن کا نام بتائیے۔

آیولنیقی۔ سب لوگ انھیں ریباڈ کہتے ہیں۔

جیوفری۔ ریباڈ! ریباڈ! وہ کوئی نائٹ ہیں؟

آیولنیقی۔ نائٹ!

جیوفری۔ اِسپاہی۔ کیا وہ خود زرہ پہنتے ہیں اور سنہری مہمیزیں لگاتے ہیں۔ اُنکا مشغلہ کیا ہے؟

آیولنیقی۔ یہ تو میں نے کبھی دریافت نہیں کیا۔

جیوفری۔ تو آپ یہاں بند کیوں ہیں؟

آیولنیقی (استعجاب سے) بند!

جیوفری۔ جی ہاں مقید اور تنہا!

آیولنیقی۔ میں تنہا تو نہیں ہوں۔ تم غلطی کرتے ہو۔

جیوفری ۔ تاہم یہاں کوئی نظر نہیں آتا ۔
آیولینتھی ۔ یہ سچ کہتے ہو کہ اسوقت یہاں کوئی نہیں ہے ۔ میں نہیں سمجھ سکتی کہ سبب کیا ہے ، ورنہ میں کبھی تنہا نہیں رہتی ۔ لیکن انتظار کرو میں برٹرانڈ کو بلاتی ہوں ۔ وہ بھی خوش ہوگا کہ تم یہاں آئے ۔
(مکان کے اندر چلی جاتی ہے)
جیوفری ۔ اب معلوم ہو جائے گا کہ اس وادی کا مالک کون ہے ۔ تاہم میں اس خیال کو دور نہیں کر سکتا کہ یہاں کوئی تاریک بھید ضرور ہے اور اس وادی کا مالک پسند نہیں کریگا کہ ہم اس کی چھان بین کریں ۔ تم نے دیکھا ہوگا کہ اس دروازہ کی تیاری میں کس قدر ہوشیاری سے کام لیا گیا؟ وہ کائی اور پتھروں اور شاخوں میں چھپا ہوا ہے بند ہونے پر اس میں اور چٹان میں کوئی فرق نہیں رہتا ۔ میری صلاح مانو تو دروازہ کے قریب ٹھہرو جب تک کوئی آئے میں منتظر رہوں گا ، پھر فوراً درہ کوہ کی طرف روانہ ہو جاؤں گا اور دروازہ کو تمہارے بھاگنے کے لیے کھلا چھوڑ دوں گا ۔ تمہارے ساتھی شاید مل جائیں ۔ ممکن ہے کوئی واقعہ پیش آئے ۔ میں انھیں لیکر فوراً پہونچ جاؤں گا ۔ ٹرسٹان سنتے ہو؟
ٹرسٹان ۔ ہاں ہاں جاؤ ۔
جیوفری ۔ کیا تمہارا دل گرفتار ہو گیا اس نوجوان دوشیزہ کا جادو چل گیا؟
ٹرسٹان ۔ نہیں ، مگر میرا دم الجھتا ہے ، اور میرے حواس منتشر ہیں ۔ مجھے یقین ہوتا ہے کہ یہی پُرسکون وادی وہ مقام ہے جسکا میں عمر بھر جویا رہا ہوں ۔ آخر کار یہاں میرا بےچین اور فلک سیر غرور تسکین پالےگا ۔
جیوفری (سنجیدگی سے) مگر عزیز من یہ نہ بھول جانا کہ بادشاہ رینی تمہارا منتظر ہے ۔
ٹرسٹان ۔ میں بادشاہ رینی اور اُسکے منصوبوں کی پروا نہیں کرتا ۔ کیا ایک صوبہ کے لیے جو قانوناً اور استحقاقاً میرا ہے اور بزور شمشیر حاصل کیا گیا ہے میں اپنی آزادی کو خیرباد کہدوں گا اور اپنی قسمت کو اُس کی لڑکی سے وابستہ کر دوں گا ۔ لڑکی بھی وہ جس کو میں جانتا نہیں جسکو کسی نے کبھی دیکھا نہیں ۔ جبکہ میں —— "
جیوفری ۔ تم ہذیاں بک رہے ہو ۔ مگر یہ دورہ جلد ختم ہو جائے گا ۔ اسوقت تم پر جادو کا اثر ہے ۔ اس جذبہ کو جو تپ محرقہ سے بدتر ہے دبائے رکھو ۔
ٹرسٹان ۔ اگر یہ ممکن ہوتا تو بیشک میں سمجھتا کہ جادو ہے ۔
جیوفری ۔ خاموش! کوئی آرہا ہے ۔
(آئیولینتھی واپس آتی ہے)
آیولینتھی ۔ کیا تم ابھی وہاں موجود ہو؟
جیوفری ۔ کیا آپ ہمیں اس مکان کے مالک کے پاس لے چلیں گی؟

آیولنیتھی۔ افسوس وہ سب چلے گئے ہیں تنے
پکارا مگر کوئی نہیں آیا۔ وہ مجھے چھوڑ گئے۔
ٹرسٹان۔ لیکن وہ پھر آئیں گے۔
آیولنیتھی۔ ہاں تم سچ کہتے ہو۔ غالباً وہ انگوروں کی تاک کی طرف گئے ہیں۔ میں بھی بعض اوقات وہاں جاتی ہوں۔ اور اگر نہیں جاتی تو کوئی نہ کوئی میرے پاس موجود رہتا ہے۔
جیوفری (ٹرسٹان سے) تم یہاں ٹھہرو گے؟
ٹرسٹان۔ بیشک
جیوفری۔ بہتر۔ میں دروازہ کی نگرانی کرتا ہوں۔
(آیولنیتھی کو گردن کے اشارہ سے سلام کرتا اور باہر چلا جاتا ہے۔ آیولنیتھی سلام کا جواب نہیں دیتی)
آیولنیتھی (سنتی ہے) کیا تمہارے دوست جاتے ہیں؟
ٹرسٹان۔ وہ ابھی واپس آئیں گے۔ میں آپ سے معافی کا خواستگار ہوں اور اپنی خطا کی تلافی کرنا چاہتا ہوں۔ مگر آہ آپ ناراض نہ ہونگی جب آپ سو رہی تھیں تو میں نے آپ کے سینہ سے یہ زیور اٹھا لیا تھا تاکہ یادگار کے طور پر اپنے پاس رکھوں۔ وہ حاضر ہے۔
آیولنیتھی۔ کہاں کہاں؟ (ٹرسٹان وہ طلسمی نقش اُسے واپس دیتا ہے) زیور! اور میرا!
ٹرسٹان۔ ہاں میرا خیال تو یہی ہے۔
آیولنیتھی۔ یہ میرا نہیں ہے مگر میں تمہارے پوچھونگی۔ (نقش کو میز پر رکھ دیتی ہے)
ٹرسٹان۔ کیا میں اُمید کروں کہ آپ براہ کرم اسکے بدلے اُن شرمانے والے گلاب کے پھولوں میں سے مجھے ایک پھول توڑ دینگی۔ ان میں ایسی رعنائی ہے کہ کوئی پھول مقابلہ نہیں کر سکتا۔ یہ معلوم ہوتا ہے کہ آپ کا چربہ اُتار لیا ہے۔
آیولنیتھی۔ گلاب کا پھول؟ بیشک خوشی سے۔
(ایک سفید گلاب کا پھول توڑ کر دیتی ہے)
ٹرسٹان۔ لیکن یہ تو سفید ہے۔ مجھے وہ سُرخ گلاب کا پھول دیجیے جو آپ کی طرح خوبصورت ہے۔
آیولنیتھی۔ تمہارا کیا مطلب ہے۔ سرخ گلاب؟
ٹرسٹان (ہاتھ سے بتا کر) ان میں سے۔
آیولنیتھی۔ تم خود لے لو۔
ٹرسٹان۔ نہیں! یہی رہنے دیجیے جو آپ نے انتخاب کیا ہے اور جسے آپ کے نازک ہاتھوں نے توڑا ہے لیکن میں سچے دل سے آپ کی پسند کی تعریف کرتا ہوں۔ کیونکہ یہ سفید گلاب جسکے حلقہ میں موہوم و مرتعش پیازی رنگ محصور ہے اس خوشنما باغ کی خواب نما خوبصورتی کا مرقع ہے۔ ایک گلاب مجھے اور دیجیے مگر وہ بھی سفید ہو تاکہ ان دونوں کو اپنا طرۂ دستار بنا دوں۔ اور ہمیشہ اُنھیں آپ کا مخصوص رنگ قرار دوں۔
آیولنیتھی (ایک سرخ پھول توڑ کر دیتی ہے) لو! تمہارا یہی مطلب تھا نا؟
ٹرسٹان (چونک کر) میں نے آپ سے سفید گلاب مانگا تھا۔

آیولنیتھی - پھر؟ اور یہ؟

ٹرسٹان (علٰحدہ) یہ کیا خیال میرے دل میں آیا! (بلند آواز سے) اچھا بتائیے (دونوں گلاب کے پھولوں کو بلند کرتا ہے اور ان میں ایک اور گلاب شامل کرتا ہے جو خود اُس نے توڑا) میرے ہاتھ میں گلاب کے کئے پھول ہیں؟

آیولنیتھی (ہاتھ پھیلاتی ہے) مجھے دیدو تو بتاؤں!

ٹرسٹان - نہیں۔ بغیر چھوئے ہوئے بتائیے۔

آیولنیتھی - یوں کس طرح بتا سکتی ہوں۔

ٹرسٹان (علٰحدہ) افسوس! افسوس! وہ نابینا ہے (بلند مگر لڑکھڑاتی ہوئی آواز سے) مجھے یقین ہے کہ آپ جانتی ہیں۔

آیولنیتھی - نہیں تم غلطی کرتے ہو - اگر میں جاننا چاہتی ہوں کہ کسی چیز کی شکل کیا ہے یا تعداد میں کتنی ہے تو میں اسے پہلے چھوتی ہوں - کیا اب بھی تمہاری سمجھ میں نہیں آتا -

ٹرسٹان (گھبرا کر) ہاں بیشک - آپ کا کہنا درست ہے تاہم بعض اوقات ———

آیولنیتھی - ہاں ہاں بعض اوقات - بولو! بولو!

ٹرسٹان - میں خیال کرتا ہوں کہ ..... کہ ...... بعض چیزیں ایسی ہیں جن کی تمیز صرف رنگ سے ہوتی ہے جیسے مختلف اقسام کے پھول اور کپڑے -

آیولنیتھی - اس سے تمہارا مطلب اُنکے خواص و افعال سے ہے - کیوں؟

ٹرسٹان - نہیں بالکل یہ تو نہیں -

آیولنیتھی - تو کیا پھولوں کی شناخت اس قدر مشکل ہے - کیا گلاب گول اور نرم و نازک نہیں ہوتا - گول جس طرح ہلکی ہوا اور نرم و نازک جس طرح گرمی کی شام - کیا موگرا گلاب کا ایسا ہوتا ہے. نہیں، اُسکی خوشبو سے چکر آتا ہے جس طرح اُس شراب سے جو میں نے تم کو دی - اور پھر کیتکی - کیا اُسکی خاردار پتیاں نہیں چبھتیں جس طرح برف باری کے وقت ہوا -

ٹرسٹان (علٰحدہ) سخت حیرت ہے! (بلند آواز سے) کیا کسی نے آپ کو نہیں بتایا کہ انسان چیزوں کو اگرچہ فاصلہ پر ہوں نگاہ کے ذریعہ سے پہچان سکتا ہے؟

آیولنیتھی - فاصلہ! ہاں! اُسکی آواز سے میں پہچان لیتی ہوں کہ ننھی چڑیا چھت پر بیٹھی ہوئی ہے اور اسی طرح تمام آدمیوں کو اُنکی آواز سے - وہ تازہ دم گھوڑا جس پر میں سوار ہوتی ہوں میں اُسکو دور ہی سے اُس کے سموں کی آواز اور ہنہنانے سے پہچان لیتی ہوں - لیکن نظر؟ یہ تو مجھے کسی نے بتایا ہی نہیں - یہ کون آلہ ہے؟ کیا اس میں بڑی کاریگری صرف کیجاتی ہے یا کوئی معمولی اوزار ہے - میں اس نظر کو نہیں جانتی - کیا تم مجھے بتا سکتے ہو کہ یہ کس طرح اور کس لیے استعمال کیا جاتا ہے؟

ٹرسٹان (علٰحدہ) اے خدائے برتر! اس کو

شان وگمان بھی نہیں کہ وہ نابینا ہے۔
آیو لنیتھی (تھوڑے توقف کے بعد) تم کہاں سے آئے ہو۔ تم نے بہت سی ایسی لفظیں استعمال کیں، جنکا سمجھنا میرے لیے ناممکن ہے اور تمھاری گفتگو کی طرز بھی نئی اور عجیب ہے۔ بتاؤ کیا وہ وادی جہاں تم رہتے ہو یہاں سے بالکل مختلف ہے۔ اگر تم قیام کرسکتے ہو تو یہاں قیام کرو اور وہ باتیں مجھے سکھاؤ جو میں نہیں جانتی
ٹرسٹان۔ اے مہربان دنیادل خاتون۔ میں آپ کو وہ باتیں نہیں سکھا سکتا جنکی آپ کو احتیاج ہے۔
آیو لنیتھی۔ میرا دل کہتا ہے کہ اگر تم چاہو تو بتا سکتے ہو۔ لوگ کہتے ہیں کہ میں بے کہی نہیں ہوں اور ہر بات جلد سیکھ لیتی ہوں۔ بہت لوگ جو یہاں آئے اُنھوں نے کوئی نہ کوئی بات مجھے ضرور سکھائی تم امتحان تو کرو۔ تمھارا لہجہ نرم اور شریفانہ ہے کیا جب میں تم سے التجا کرونگی تو تم انکار کروگے؟ بولو! میں پوری توجہ سے سننے کو تیار رہوں۔
ٹرسٹان۔ افسوس! اس امر میں توجہ سے کوئی نتیجہ نہ ہوگا۔ لیکن ایک بات مجھے بتایئے۔ یہ تو آپ کو معلوم ہوگا کہ آپ کے خوبصورت جسم کا کوئی حصہ بیکار اور بلا کسی مقصد کے نہیں بنایا گیا ہاتھ اور انگلیاں چیزوں کو چھونے اور اُٹھانے کے لیے، پاؤں چلنے کے لیے تاکہ جہاں آپ چاہیں پہونچ جائیں۔ کان سننے کے لیے، زبان گفتگو کا سرچشمہ ہے۔
آیو لنیتھی۔ ہاں ان سب باتوں پر میں نے غور کیا ہے۔ مہربانی کرکے اور بتاؤ۔
ٹرسٹان۔ پھر یہ بتایئے کہ قادر مطلق نے آپکو آنکھیں کس واسطے دیں۔ یہ دو ستارے کس لیے ہیں جو اس قدر حیرت انگیز طریقہ سے چمکتے ہیں کہ دن کی معمولی روشنی کو حقارت کی نظر سے دیکھتے ہیں اور اپنے پاس نہیں آنے دیتے۔
آیو لنیتھی (اپنی آنکھوں کو چھوتی اور کچھ دیر غور کرتی ہے) تم پوچھتے ہو ان کا مقصد کیا ہے۔ تم کس طرح پوچھ سکتے ہو۔ میں نے انکے متعلق کبھی غور نہیں کیا۔ میری آنکھیں! میری آنکھیں! محسوس کرنا تو آسان ہے۔ شام کے وقت جب جب میں تھک جاتی ہوں تو میرے پپوٹے نیند سے بھاری ہو جاتے ہیں اور پھر وہاں سے نیند میرے تمام جسم میں پھیل جاتی ہے۔ میری آنکھیں بڑی کام کی ہیں۔ کیا تمھیں تجربہ نہیں کہ تمھاری آنکھیں کیا کیا ضرورتیں پوری کرتی ہیں۔ ایکدن میں گلاب کی قلم لگا رہی تھی، ایک چھوٹے سانپ نے تیزی سے آکر میری اُنگلی میں کاٹ کھایا! درد کی تکلیف سے میں رونے لگی۔ ایک مرتبہ میں کئی دن تک اُداس رہی کیونکہ میرے والد کو کوئی ضرورت پیش آگئی اور وہ نہیں آئے پھر جب وہ آئے تو اسے خوشی کے میرے آنسو نکل پڑے۔ اور اس طرح میرے دل کو جو ٹکڑے ٹکڑے ہوا جاتا تھا آرام ملا۔

پھر بھی تم دریافت کرتے ہو کہ خدائے کریم نے آنکھیں کس واسطے دی ہیں۔ جب میں تھک جاتی ہوں تو انھیں کے ذریعہ سے راحت ملتی ہے انھیں کے ذریعہ سے میرے رنج والم کا بوجھ ہلکا ہوتا ہے اور انھیں کے ذریعہ سے میری خوشی وجد میں منتقل ہوتی ہے

ٹرسٹان - میری خطا معاف کیجیے۔ میرا سوال احمقانہ تھا۔ آپ کی روح میں ایسی تابندگی پنہاں ہے کہ آپکو اُس روشنی کی ضرورت نہیں جو آنکھوں کے ذریعہ سے مہیا ہوتی ہے۔ کیا میں یہ خیال کروں کہ آپ کسی ایسی نسل سے ہیں جس میں ہم لوگوں کے علاوہ اور قوتیں بھی ودیعت ہیں۔ آپ یہاں تنہا زندگی بسر کرتی ہیں۔ یہ وادی بھی ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جادو کے ذریعہ سے وجود میں لایا گیا۔ کیا آپ زنگار شرق سے یہاں آئی ہیں۔ لیکن اگر آپ اُن لوگوں میں سے ہیں جو مشرق کو اپنی ماتا کہتے ہیں اگر آپ پر کبھی دنیا کی ناپائدار خوشیوں کا اثر ہوتا ہے تو ایک سپاہی کی پرستارانہ محبت قبول کیجیے، اور اُسکا عہد سُنیے۔ کوئی عورت چاہے وہ کتنی ہی عالی مرتبہ کیوں نہ ہو آپ کے نقش کو اُسکی روح سے نہیں مٹا سکتی۔

آیولینتھی (تھوڑے سکوت کے بعد) تمھارے الفاظ میں عجیب غریب طاقت ہے۔ مجھے بتاؤ کہ تم نے یہ ہنر کس سے سیکھا کہ ان لفظوں کے ذریعہ سے جو میری سمجھ میں اچھی طرح نہیں آتیں میرے دل کو تسخیر کرلیا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ میں ایک رستہ سے جو دکھیا ہوا نہیں ہے تنہا گذر رہی ہوں۔ پھر بھی جو کچھ تم نے کہا اُس نے دل کو موہ لیا۔ یہ کوئی آسمانی پیغام ہے۔ آہ اور باتیں کرو۔ لیکن نہیں خاموش رہو۔ مجھے دل میں اُن باتوں کو دوہرا لینے دو جو تم نے کہی ہیں۔ اُنھوں نے ایذا اور خوشی کو میرے دل میں متحد کردیا! (جیوفری گھبرایا ہوا داخل ہوتا ہے)

جیوفری- فاصلہ پر آدمی ادھر آتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔ ہمیں نہ بھولنا چاہیے کہ ہم یہاں یکہ و تنہا ہیں۔

ٹرسٹان- (آیولینتھی سے) اے شریف خاتون اب میں رخصت ہوتا ہوں۔

آیولینتھی- آہ نہیں! نہیں! تم کہاں جاتے ہو؟

ٹرسٹان - میں دوبارہ آؤنگا اور بہت جلد۔ آج ہی آؤں گا۔ لیکن آپ مجھے پہچانیں گی کس طرح۔

آیولینتھی- تمھارے لہجہ سے۔ کسی کی آواز تمھاری ایسی نہیں ہے۔ میں نے کوئی آواز کوئی گیت ایسا نہیں سُنا جس میں اتنی موسیقیت ہو، جو ایسی سُریلی اور شیریں ہو اور جو دل پر اس طرح قابو کرلے اور جو اس قدر لے دار اور پُرلطف ہو۔ تم اطمینان رکھو کہ میں مجمع میں بھی تمھاری آواز پہچان لوں گی۔

ٹرسٹان- دوبارہ ملاقات ہونے تک رخصت!

آیولینتھی- رخصت! رخصت! اگر تم دوبارہ آؤگے اور جلد۔ تم جانتے ہو کہ میں تمھاری منتظر رہونگی۔

ٹرسٹان (ذرا نو ٹھیک کر اُسکے ہاتھ کو بوسہ دیتا ہے) آپ مطمئن رہیے میں ضرور آؤنگا۔ میرا دل اصرار

کرتا ہے کہ دوبارہ آؤں - اگرچہ میں جاتا ہوں مگر اپنے خیالات کا بڑا حصہ یہیں چھوڑے جاتا ہوں اور جو کچھ زندگی باقی ہے یہیں ختم کرنے کو تیار ہوں - رخصت! (چوردروازہ سے چھوکری کے بعد باہر نکل جاتا ہے)

آیولنیتھی - سنو وہ اُن پہاڑیوں سے گذر رہا ہے جہاں اجنبی قدموں کی آواز اکثر سنائی دیتی ہے - وہ تیزی سے گذر رہا ہے - آہ خاموش! خاموش! اب پاؤں کی چاپ نہیں سنائی دیتی - ہاں پھر سنائی دی! کیا دراصل وہ واپس آئے گا، یا دوسرے مہمانوں کی طرح وہ بھی ایک مرتبہ آکر پھر نہیں آئے گا - آہ مگر نہیں! نہیں! کیا اُس نے وعدہ نہیں کیا؟ کیا اُس نے قسم نہیں کھائی کہ آج ہی واپس آئیگا - اوس گرنا شروع ہوگئی - شام قریب ہے - آہ! آج کسی طرح نہیں آسکتا - شاید کل آئے گا لیکن یہ جگہ کس قدر سونی معلوم ہوتی ہے!　　(باقی)

اختر - لکھنوی

غزل

از منشی ممتاز علی آہ، تلمیذ منشی امیر احمد امیر مینائی

دولت جو کھو چکے ہیں اُسکو تو رو رہے ہیں　　باقی جو رہ گئی ہے اُسکو بھی کھو رہے ہیں
ایسے کہاں کے منصف کب مجکو رو رہے ہیں　　وہ داغ خونِ ناحق اشکوں سے دھو رہے ہیں
دریائے غم میں یارب جو آشنا بنے تھے　　منجدھار میں وہی اب کشتی ڈبو رہے ہیں
باتیں بہت بنا کر سب ہو گئے کنارے　　وہ بھی کھسک نہ جائیں جو ایک دو رہے ہیں
رحم آئے کس کو ہم پر کون اُنسے جا کے جھگڑے　　دربار رس ہیں جتنے صاحب کے ہو رہے ہیں
ظاہر میں ہیں مسیحا باطن میں سب کے قاتل　　سہلا کے سر کو دل میں نشتر چبھو رہے ہیں
اس پر نظر نہیں کچھ کیا حال ہے اب اپنا　　اتنا سبق پڑھا ہے ماضی کو رو رہے ہیں
سورج نکل رہا ہے کچھ روشنی ہے پھیلی　　دنیا تو جاگ اُٹھی ہم اب بھی سو رہے ہیں
مژدہ تمھیں غلامو، ہے دعوتِ غلامی　　صاحب کے خانساماں جوتے بھگو رہے ہیں
امریکہ اور یورپ اپنے جہاز بھرلیں　　ایسوں ہی کے لیے تو ہم جوت بو رہے ہیں
مرحوم قوم کی پھر ہوتی ہے آہ برسی　　ق　　آیا ہے پھر دسمبر اجلاس ہو رہے ہیں
پھر پہلی جنوری کو تم جا کے دیکھ لینا　　پھر سال بھر کی کر کے نیت وہ سو رہے ہیں

شیخ محمد ملتانی ثم بیدری قدس سرہ العزیز

گنجینۂ اسرار توحید، خزینۂ نکاتِ تجرید و تفرید، والیِ ملکِ ولایت، ہادیِ راہِ ہدایت، متجلی تجلیات رحمانی، ابوالفتح شمس الدین شیخ محمد قادری ملتانی، رحمۃ اللہ علیہ، جنوبی ہند کے اکابر مشائخ قادریہ میں سے تھے۔ آپ کا مزار مبارک، محمد آباد بیدر (ریاست حیدرآباد) میں ہے اور ملتانی بادشاہ کے لقب سے مشہور ہیں۔ آپ کے والد ماجد کی ولادت ملتان میں ہوئی اور ہیں سے یہ خاندان ہجرت کرکے بیدر آیا تھا اس اب ملتانی کہلاتے ہیں۔ آں حضرتؒ کا سلسلہ نسب معدن الجواہر میں یہ لکھا ہے:۔

شیخ محمد بن شیخ ابراہیم بن شیخ فتح اللہ بن شیخ ابی بکر بن شیخ فخرالدین بن شیخ بدرالدین بن اسپیلار (سپہ سالار؟) فخرالدین بن اسپیلار بدرالدین بن اسپیلار شاہ میاں بن شاہ الغوری بن سلطان شہاب الدین غوری الغزنوی رحمۃ اللہ علیہم۔

آپ کے والد اپنے نسب کے بارے میں فرمایا کرتے تھے کہ میں ربیع الاسمٰعیلی ہوں۔ یعنے قبیلۂ ربیع کی طرف منسوب کرتے جو معد بن عدنان اور اسی سلسلہ میں حضرت اسمٰعیل علیہ السلام کی اولاد میں تھا۔ حضرت سرور کائنات علیہ الف الف تحیۃ والصلوٰۃ کے شجرۂ نسب میں اس سلسلہ کی کل کڑیاں مذکور ہیں۔ آپ کے جد امجد شیخ فتح اللہ اور والد ماجد شیخ ابراہیم قدس سرہٗ سلطان علاءالدین بہمنی ابن سلطان احمد شاہ ولی البہمنی کے زمانہ میں ملتان سے بیدر تشریف لائے۔ شیخ فتح اللہ ضعیف اور مسن تھے، چند روز میں اُن کا انتقال ہوگیا۔ شیخ ابراہیمؒ بڑے پرہیزگار اور اپنے زمانہ کے علامہ تھے۔ بادشاہ سے ملنے کی آپ نے کوشش کی۔ رشید حریر ایک عالم مقرب سلطانی تھا، اُس نے پہلے وعدہ کیا لیکن آپ کی قابلیت سے اندیشہ کرکے ٹال گیا۔ خدا کی قدرت کہ جامع مسجد میں ایک جمعہ کو بادشاہ سے خود بخود ملاقات ہوگئی۔ آپ نے چودہ علوم میں ایک کتاب تصنیف فرمائی تھی جس کا نام بادشاہ کے نام پر علائی رکھا تھا وہ نذر گزرانی۔ بادشاہ خود عالم تھا، یہ لیاقت دیکھ کر گرویدہ ہوگیا۔ اور آپ سے کہا کہ جمعہ کو آپ ہی خطبہ پڑھا یا کریں اور اگلے جمعہ کو نیا خطبہ تصنیف کرکے پڑھیے۔ آپ نے فرمایا کہ ابھی لوگ نماز کے لیے

آ رہی ہیں، کافی وقت ہے میں ابھی نیا خطبہ لکھ کر پڑھتا ہوں۔ بادشاہ کو تعجب ہوا اور آپ کو اجازت دی اور جب خطبہ پڑھا تو بہت خوش ہوا اور چھ دو موضع بطور انعام جاگیر عطا فرمائے۔ بادشاہ کی اس قدر دانی علوم کی وجہ سے آپ بیدر ہی میں رہ گئے۔ اُسکے انتقال کے بعد جب سلطان ہمایوں تخت نشین ہوا تو چونکہ وہ ظالم تھا، آپ نے اُسکے پاس آنا جانا ترک کر دیا۔ پھر جب ۸۶۵ھ میں سلطان محمد شاہ بہمنی تخت نشین ہوا تو آپ کو اپنی تعلیم کے لیے طلب کیا۔ اور قاضی شہر مقرر کیا۔ آپ نے اس عہدہ کو باکراہ قبول فرمایا مگر پہلے اٹھارہ شرطیں منظور کرا لیں۔ جن میں سے ایک یہ تھی کہ اگر آپ بھی، گو بادشاہ ہیں، شرع کے خلاف کرینگے تو حدود شرع کی پابندی لازمی ہوگی۔ بادشاہ نے ان شرطوں کو قبول کر لیا اور آپ ایک عرصہ تک قاضی شہر رہے۔

شیخ ابراہیم رحمۃ اللہ علیہ کے یہاں ایک صاحبزادے تولد ہوئے جن کا نام احمد تھا، بن رشد کو پہونچنے کے بعد اُن کا انتقال ہو گیا۔ اُنکا مزار موضع کنجر کہ بزرگ واقع بٹنچر و میں ہے۔ بیٹے کے انتقال کا باپ کو بہت صدمہ تھا۔ اسی رنج و غم کے زمانہ میں آپ نے روح پُر فتوح حضرت غوث الثقلینؒ کی طرف توجہ فرمائی۔ وہاں سے یہ اشارہ ہوا کہ تمھارے ایک لڑکا صاحب اسرار پیدا ہوگا جسکا نام ہمارے جد کے نام پر ہوگا۔ چنانچہ شیخ ابراہیمؒ کے گھر میں حمل کے آثار نمایاں ہوئے اور شیخ محمدؒ تولد ہوئے

آفریں باد بر چنیں پدرے کہ از و زاد ایں چنیں پسرے

آپ کی ولادت گاہ شہر بیدر ہے جو اس زمانہ میں اعظم البلدان محمد آباد بیدر کہلاتا تھا۔ معدن الجواہر میں ہے کہ آپ کی ولادت باسعادت کے تیسرے سال ہمایوں شاہ ظالم کی وفات ہوئی۔ ہمایوں ۵ شوال ۸۶۵ھ کو مرا ہے، اس لحاظ سے آپ کی ولادت ۸۶۲ھ میں ہوئی چنانچہ آپ کی پیدائش کا یہی سنہ قرار پایا، اور "شمس جہاں تاب" (۸۶۲) تاریخ ہوئی۔ واقعی آپ شمس جہانتاب ہی تھے۔ جسکے طلوع ہونے سے اس دہر ظلمانی کی بہت کچھ تاریکی مٹ گئی۔

ابھی آپ کمسن ہی تھے کہ والد ماجد کا سایہ سر سے اُٹھ گیا۔ آپ فرماتے ہیں کہ "میں ابھی بچہ ہی تھا اور کچھ نہیں جانتا تھا کہ والد ماجد نے عالم جاودانی کا قصد فرمایا۔ علمائے شہر اور مشائخان صاحب نفس میں سے کسی بزرگ نے میری طرف نظر ہدایت نہ فرمائی"۔ اسی اثنا میں حضرت شیخ المشائخ شیخ حسن جمیلی القادریؒ کا بنگالہ کی طرف سے یہاں آنا ہوا۔ حضرت شیخ چھوٹے

بڑوں اور سواروں پیادوں کی ایک کثیر جماعت کے ساتھ شہر بیدر کی ایک مسجد میں جو فصیل کے باہر تھی اور مسجد پاک مشرف کے نام سے مشہور تھی مقیم ہوئے اور شیخ محمدؒ کو خود طلب فرماکر بہ اشارت حضرت غوث الثقلینؓ مرید فرمایا۔

شیخ محمدؒ اپنے پیر کی صحبت میں عرصہ تک رہے اور انعام گوناگوں سے فیضیاب ہوتے رہے حتّٰی کہ شیخ حسنؒ کی مراجعت کا وقت آگیا اور آپ نہضت فرمائے بنگالہ ہوئے لیکن شیخ محمدؒ کو اسوقت تک خرقۂ خلافت و اجازت مطلقہ عطا نہ فرمائی جب تک کہ آپ کمالات ظاہری و باطنی سے بدرجۂ اتم بہرہ ور اور عمر کی آخری منزلوں کے قریب نہ پہونچ گئے۔

آپ کو حضرت غوث الثقلین قطب ربانی غوث الصمدانی سے نسبت اُویسی اور براہ راست حصول فیض و نعمت کا شرف حاصل تھا اور حضرت بندگی مخدوم شیخ بہاءالدین انصاری القادری دہلوی الدولت آبادی سے بھی جنکا مزار مبارک اب بھی دولت آباد ضلع اورنگ آباد دکن میں مرجع خاص و عام ہے اور جو سلسلۂ قادریہ کے مشائخ عظام میں سے ہیں خرقۂ خلافت اور اجازتِ مطلقہ حاصل تھی۔ حضرت شیخ بہاءالدینؒ اس زمانہ میں شادی آباد المشہور بہ مانڈو میں تھے وہیں سے آپ نے باشارت مبارک حضرت پیر دستگیر پیران پیرؓ اجازت نامہ اور خرقۂ خلافت روانہ فرمایا۔

آپ کا طریقہ تمام ترک دنیا، ذکر اسم الٰہی کیا ظاہر طور پر اور کیا پوشیدہ طریق پر اور کیا بنظر معرفتِ الٰہی۔ اور رات دن مراقبۂ توحید ہی میں رہنا اور اپنے پروردگار کی ظاہری و باطنی نعمتوں کی شکرگزاری کرنا۔ کبھی کبھی آپ پر حالت تواجد طاری ہوتی۔ ایک مرتبہ کا واقعہ آپ کے صاحبزادہ شیخ بدرالدینؒ فرماتے ہیں کہ ہم سب نہایت ادب سے آپ کے پاس بیٹھے ہوئے تھے کہ قلب مبارک پر آفتاب محبت طالع ہونا شروع ہوا اور حالت وجد و سماع ظاہر ہونے لگی۔ حتّٰی کہ ہم لوگ بھی اس شمیم اشتیاق سے مست ہوگئے۔ آپ اُسی حالتِ وجد میں الفاظ جل جلالہ زبان مبارک سے ادا فرماتے اور جس طرف متوجہ ہوتے سجدہ کرتے۔ تھوڑی دیر تک یہ بیخبری کی حالت رہی اسکے بعد رفع ہوگئی۔ ایک دوسری مرتبہ آپ سو رہے تھے کہ ہر بُنِ مو سے اللہ اللہ کی آواز نکلنی شروع ہوگئی۔ اور زوجۂ محترمہ جو قریب ہی تھیں گھبرا گئیں۔

حضرت مشرف القلوب تھے اور دوسروں کے دلوں کی باتیں اور اُنکے رات کے خواب منکشف ہوجاتے اور آپ اُنھیں بیان فرمایا کرتے تھے۔ بلادِ دکن میں آپ ہی کی ایک کامل ذات ایسی تھی جس سے انوار قادریہ اور فیوض سبحانیہ کی برکات لوگوں کو نصیب ہوا کرتی

تھیں۔ حضرت مخدوم شیخ بہاء الدین القادری الانصاری الدولت آبادی کے دو خلیفۂ اجل مشہور تھے۔ ایک حضرت شیخ محمد ابراہیم القادری قدس سرہ العزیز، دوسرے شیخ جلال الدین قادری البرہان پوری۔ ان دونوں کی ذات بابرکات سے پروردگار عالم نے خطۂ دکن کو گلزار فرمایا تھا اور سلسلۂ قادری کی ترقی کا باعث بنایا تھا۔ شیخ جمال بھتری کہتے ہیں کہ ایک مرتبہ میں نے خواب میں دیکھا کہ ایک میدان میں تمام اولیا حاضر ہیں۔ ان میں شیخ جلال برہان پوری رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ صف راستین میں ایستادہ ہیں مگر شیخ محمدؒ کہیں نہیں۔ پھر آگے چلا تو یہ دیکھتا ہوں کہ جناب پیران پیر قدس سرہ العزیز کی گود میں سر رکھے ایک تخت پر آپ آرام فرما ہیں اور ارشاد ہوتا ہے کہ انھیں ہم نے بلاد دکن پر مسلط کیا ہے۔ یہی شیخ جلال برہان پوری ایک مرتبہ آپ کے پاس سیدر تشریف لے گئے اور چند روز پاس رہے۔ آپ فرماتے ہیں کہ میں نے حضرت کو غرقًا باللہ و حرقًا فی محبۃ اللہ اور مالک حالات و صاحب کشف و کرامات پایا۔ شیخ ایوب تلواری رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ فرماتے ہیں کہ حضرت شیخی شیخ محمدؒ قدس سرہ العزیز اپنے زمانہ کے خاتم ولایت تھے۔ دنیا و مزخرفا دنیا کی طرف آپ کی طبیعت کسی نہج پر مائل نہ تھی۔ حتیٰ کہ ایک مرتبہ آپ نے فرمایا کہ جب تک جان میں جان ہے میں اور وہ دونوں ایک جگہ جمع نہیں ہو سکتے۔ آپ کی طبیعت کا تعلق نہ دنیا سے تھا اور نہ عقبیٰ سے۔ صرف اپنے مولائے والہ و شیفتہ تھے۔

شیخ ابراہیم عرف مخدوم جی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ جو آپ کے صاحبزادے تھے روایت کرتے ہیں حضرت والدی شیخ محمدؒ قادری قدس سرہ العزیز میرے کسی کام کے سلسلہ میں گلبرگہ شریف تشریف لیگئے۔ اثنائے قیام گلبرگہ میں حضرت بندہ نواز گیسو درازؒ کے مزار مبارک کی زیارت کے لیے تشریف لیگئے۔ لیکن گنبد کے دروازہ کے اندر ابھی ایک ہی پیر ڈالا تھا کہ واپس نکال لیا اور لوٹ آئے اور وہاں سے حضرت سید یداللہ حسینیؒ کے مزار پر تشریف لے گئے اور زیارت فرمائی۔ آپ سے میں نے حضرت بندہ نوازؒ کے مزار پاک سے بغیر زیارت واپس ہونے کی وجہ پوچھی تو آپ نے فرمایا کہ حضرت مزار میں تشریف فرما نہیں تھے اور اپنے رب کی طرف تشریف لیگئے تھے۔ سید یداللہ حسینیؒ موجود تھے اُنکی روح پرفتوح قبر سے ظاہر ہو کر مجھ سے ملی اور میں اُن سے ملاقات ہی کر رہا تھا کہ حضرت سیدی میران محی الدین عبدالقادر جیلانیؓ کی روح پاک نے ظاہر ہو کر مجھے اپنی طرف بلا لیا اور میں اُدھر چلا گیا۔

اس دوران میں خاندان بہمنی کا زوال شروع ہوا، اور بریدیوں کا زمانہ آیا سو بہمنیوں کے

امرا میں سے تھے اور اس خاندان جنیہ کے بعض ضعیف بادشاہوں کے زمانہ میں خود مختار حاکم بن گئے تھے ان کا سب سے پہلا حاکم قاسم برید تھا جسکو درویشوں پر اعتقاد نہ تھا۔ ایک مرتبہ اُس نے تمام مشائخین اور درویشان بیدر کو کہلا بھیجا کہ جامع مسجد میں آکر نماز پڑھیں۔ آپ بھی تشریف لیگئے۔ اور منبر کے پاس مصلے بچھا کر بیٹھ گئے۔ بعض حاسدوں نے بادشاہ سے شکایت کی کہ یہ تکبر و غرور کی وجہ سے اس مقام پر بیٹھے ہیں۔ اُس نے حکم دیا کہ وہاں سے اُٹھ جائیں۔ مگر آپ نے ارادہ نہیں فرمایا۔ حتیٰ کہ اُس نے ایک نشانی دیکھی اور خود شرمندہ ہوا اور توبہ کی کہ آیندہ کسی درویش کو ایذا نہ پہنچاؤنگا قاسم برید یہ کہا کرتا تھا کہ دکن میں بس دو محمدؒ گذرے ہیں ایک شیخ محمدؒ قادری ملتانی، دوسرے سید محمد گیسو دراز دہلویؒ

قاسم برید کی موت کا وقت جب قریب آیا تو اُسکے دو بیٹے تھے۔ چھوٹے کا نام امیر تھا۔ اختیار خاں نے جو اُس کا اتالیق تھا، آکر کہا کہ تم اب بیدر سے چلے جاؤ۔ کوئی دم میں تمہارے والد کا انتقال ہونے والا ہے۔ تمہارا بڑا بھائی جانشین ہوگا اور تمہیں قتل کرا دیگا۔ امیر برید اس اندیشہ سے باہر جانے لگا۔ بیرون شہر ایک باغ میں حضرت سیدنا شیخ محمدؒ قادری بھی قدم فرما رہے تھے۔ اُنکی خدمت میں حاضر ہوکر عرض حال کیا۔ آپ نے کچھ دیر سر گریبان فکر میں ڈال کر اُٹھایا اور فرمایا "تؤتی الملک من تشاء۔ لقب برید ترا دادم و امیری ایں دیار ترا بخشیدم" یہ بشارت سنکر امیر برید واپس ہوا اور اختیار خاں سے کل حال کہا۔ کچھ عرصہ بعد قاسم برید کا انتقال ہوگیا اور بڑے بیٹے میں چونکہ اہلیت نہ تھی اس لیے تمام ارکان دولت نے متفق ہوکر امیر برید کو بادشاہ بنایا۔

ایک مرتبہ امیر برید آپ سے ملنے حاضر ہوا اور نہایت ادب و تواضع سے سامنے بیٹھ گیا۔ آپ کچھ دیر تک مراقب رہے اور کچھ متوجہ نہ ہوئے، اسکے بعد سر اُٹھا کر فرمایا کہ مجھے دنیاداروں کی عقل و سمجھ پر حیرت ہوتی ہے کہ دنیا کی جو چیز اُنھیں حق تعالیٰ نے عطا فرمائی ہے اُسے عطائے ربانی نہیں سمجھتے اور شیخیاں مارتے ہیں۔ اور یہ نہیں جانتے کہ حق تعالیٰ جسے اپنے پاس سے دور کرنا چاہتا ہے اُسے دنیا میں مبتلا فرماتا ہے۔ جب سے دنیا کو اُس نے پیدا کیا ہے کبھی رحمت کی نظر اس طرف نہیں ڈالی۔ اہل دنیا اور دنیا داروں کا سر انجام قیامت میں معلوم ہوگا آپ کے اس ارشاد کو سنکر سب رونے لگے اور امیر برید بھی رویا۔ اسکے بعد تھوڑی دیر خاموش بیٹھ کر اجازت طلب کی۔

سلطان محمود بہمنیؒ کا جانشین گیر نعمت خاں آپ کا مُرید تھا اور جو کھانا کہ اُسکے لیے شاہی مطبخ سے آتا تھا کمال اعتقاد کے ساتھ آپ کی خدمت میں بھیجا کرتا تھا مگر آپ تمام فقیروں کو تقسیم فرما دیتے

تھے اور اُس میں سے نہ تو خود کھاتے اور نہ اپنے اہل وعیال کو کھانے دیتے۔ امیر اُمرا کے کھانے اکثر مشکوک ہوا کرتے ہیں۔ آپ کو اُن سے اس قدر پرہیز تھا کہ اپنی اولاد تک کو دینا نہیں فرماتے تھے۔

ایک مرتبہ عادل شاہ بیجا پوری نے بیدر کا قصد کیا اور اتنا فتنہ وفساد برپا کیا کہ اہل شہر نے اپنے اپنے گھر کے لوگوں کو محفوظ مقامات پر بھیجدیا۔ حضرت شیخ کے اہل وعیال نے بھی گھبرا کر عرض کی کہ ہمیں کیا حکم ہوتا ہے۔ آپ نے فرمایا کہ میں بندۂ اُمیدوار ہوں اور یہ امید ہے کہ قیامت میں جبکہ سب کے اعمال کھولے جائیں گے پروردگار عالم میرے، میرے اہل وعیال اور میری طرف نسبت رکھنے والوں کو اُس دن کی فضیحت سے بچائے گا۔ پس اس دنیا میں جو کہ اعمال کی فضیحت کا مقام نہیں ہے میں کیونکر کہوں کہ وہ مجھے رسوا کرے گا۔ حضرت کے اس استقلال کا نتیجہ یہ ہوا کہ کوئی شخص باہر نہیں گیا اور عادل شاہیوں میں سے کسی نے بھی آپ سے یا آپ کے اہل وعیال سے تعرض نہیں کیا۔

مولانا داؤد کہتے ہیں کہ ہمارے شہر میں مولانا عبدالاول ایک بڑے زبردست عالم تھے انھوں نے ایک مرتبہ مجھ سے فرمایا کہ پانچ مسئلے ایسے ہیں جو اسوقت تک مجھ سے حل نہیں ہوسکے ہیں اور میں نے بہت کوشش کی مگر کسی سے بھی اُنکا حل ممکن نہیں ہوا۔ میں نے کہا کہ حضرت شیخ محمد قادریؒ بہت زبردست اور بزرگ عالم ہیں مجھے وہ مسئلے دیجیے میں اُن سے دریافت کروں گا۔ چنانچہ وہ مسائل کاغذ پر لکھ کر میں حضرت شیخ کی خدمت میں پہونچا اور عرض حال کیا۔ حضرت نے بلا تامل اُن میں سے ہر ایک کا جواب ایسا شافی عطا فرمایا کہ مولانا عبدالاول نے جب دیکھا تو حیران رہ گئے۔

آپ امیر اُمرا اور بادشاہوں سے حتی المقدور دور رہتے تھے۔ عماد شاہ برادر نظام شاہ بادشاہ احمد نگر نے ایک مرتبہ آپ سے ملنے کی بہت خواہش کی مگر آپ نے قبول نہیں فرمائی۔ جب اُس نے بہت اصرار کیا تو آپ نے اپنے لڑکوں کو بھیجدیا۔

بیدر کے بادشاہ کے دو وزیر تھے جو دونوں بھائی تھے۔ ایک کا نام علی خاں تھا اور دوسرے کا نام قوام الملک۔ ان دونوں کے اولاد نہ تھی۔ ایک مرتبہ حاضر ہوئے اور بہت عاجزانہ طور پر دعا کے خواستگار ہوئے۔ آپ نے دعا فرمائی۔ چنانچہ قوام الملک کے لڑکا پیدا ہوا اور علی خاں کے لڑکی۔ پروردگار عالم نے آپ کی دعا کی برکت سے دونوں کی مرادیں پوری کیں۔

آپ کے صاحبزادے شیخ بدرالدین قدس سرہ العزیز فرماتے ہیں کہ شروع زمانہ میں ہمیں بہت تکلیف رہا کرتی تھی اور نہایت فقر وفاقہ گذرتے تھے۔ تین تین چار چار روز گذر جاتے کہ

طعام کی بو تک نہیں آتی تھی۔ ہم حضرتؒ کو رجوع کراتے اور حضرت تسلی و تشفی فرماتے حتیٰ کہ پروردگار نے اپنا فضل و کرم فرمایا۔

اُس زمانہ میں ایک شیخ خانخاناں تھے، اُنھوں نے حضرت بندہ نواز گیسو درازؒ کی کتاب سمر الاسرار پر ایک مرتبہ بہت سے اعتراضات فرمائے اور شیخ ابوالحسنؒ سے جو اُنکی اولاد میں تھے کہا کہ یا تو انھیں شرع شریف کے موافق بیان کر دو ورنہ اپنے جد پر کفر کا فتوےٰ دو۔ شیخ ابوالحسنؒ نے عاجز آ کر اس قضیہ کو حضرت شیخ محمد قادریؒ کی خدمت میں پیش کیا۔ چنانچہ آپ نے اُن تمام اعتراضات کی از روئے شرع ایسی توجیہ و توضیح فرمائی کہ سب ساکت و صامت رہ گئے۔ آپ کے تبحر علمی اور تصرف باطنی کا یہ ایک شمہ تھا۔

ایک مرتبہ آپ نے فرمایا کہ ذات نبوی صلعم اور مولائے کائنات حضرت علی کرم اللہ تعالیٰ وجہہٗ اور جناب غوث الثقلین سیدنا عبدالقادر جیلانیؒ یہ تینوں گو ظاہرا الگ الگ ذاتیں ہیں مگر باطناً ایک ہیں۔ خبردار ان میں فرق نہ کرنا ؎

فرزند خلف حیات ثانی است   گفتم غلط عین زندگانی است

حضرت غوث الثقلین رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا شعر ہے کہ ؎

فما مرنی من النسیم بنفحۃ   خلیلیۃ علیتہ احمدیۃ

آں حضرت کا وجود باجود حضرت سرور انبیا صلعم کی خلقت مبارک سے خمیر ہوا ہے، اسی لیے ذاتِ نبوی صلعم سے جناب کو محبت تامہ حاصل تھی۔ پس تینوں بزرگوں کو ایک ہی سمجھنا چاہیے۔ یہ الگ الگ نہیں ہیں

۹۳۵ھ جمادی الثانی میں جب بہادر شاہ والی گجرات نے بھی دکن کا قصد کیا تھا اُسوقت آپ علیل تھے لیکن شفا ہوگئی۔ دوبارہ اسی سال رمضان المبارک میں پھر علالت لاحق ہوئی اور یہ شعر اکثر زبان مبارک پر رہتا تھا ؎

ما بفلک بودہ ایم یار ملک بودہ ایم   باز ہمانجا رویم منزل ما کبریاست

لوگوں نے یہ حال دیکھ کر اضطراب ظاہر کیا آپ نے فرمایا کہ "دوست من بیماری خواہد و مرا ہم از غایت اشتیاقِ دیدار طاقت انتظار نماندہ۔" اسکے بعد وصیت و نصیحت فرمائی اور شیخ ابراہیم عرف مخدوم جی کو جو آپ ہی کے طور و طریقوں پر چلا کرتے تھے صاحب سجادہ مقرر فرمایا۔ اُنھوں نے عرض کی کہ حضور کے طریقہ پر چلنا اور استقامت برتنا مجھے دشوار ہے۔ آپ نے فرمایا کہ اگر میرے طریق باطن پر تھیں قدرت

نہیں ہے تو ظاہری طریقہ ہی پر مستقیم رہو انشاءاللہ تعالیٰ احوال باطنی کی بھی توفیق عطا ہوگی۔ پھر ستائیسویں تاریخ ماہ رمضان المبارک کو یہ وصیت نامہ تحریر فرما کر اس پر ثابت قدم رہنے کی تاکید فرمائی:

بسم اللہ الرحمن الرحیم۔ الحمد للہ الذی خلقنا و خلق حبائبنا ومریدنا وخلفائنا والصلوٰۃ والسلام علی سیدنا ونبینا محمد الہادی صلی اللہ علیہ وآلہ واصحابہ وسلم۔ اما بعد فان الوصیۃ ثابتۃ بدلیل عقلی ونقلی وفعلی ہذا اقول علیکم ان تتخذوا بالکتاب والسنۃ ثم باقوال الصحابۃ ومتابعۃ طریق حضرت شیخنا سلطان الاولیاء ورۃ البیضا قطب الوجود سیف اللہ الموجود امام المتصرفین رئیس المجبوبین شیخ الثقلین سر اللہ سید السادات سید محی الدین ابی محمد السید عبدالقادر حسنی الحسینی الجعفری الجیلانی رضی اللہ عنہ وارضاہ فی الاقوال والاحوال۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم۔ ہر طرح کی تعریف کا وہی سزاوار ہے جس نے ہمیں اور ہمارے احباب ہمارے مریدین اور ہمارے خلفاء کو پیدا کیا۔ اور درود و سلام ہو جیو ہمارے سردار و نبی محمد پر (صلی اللہ علیہ وسلم) جنہوں نے ہمیں سیدھی راہ بتائی۔ اما بعد چونکہ وصیت کرنا عقلی و نقلی و فعلی تینوں دلیلوں سے ثابت ہے اسلئے میں تم سے کہتا ہوں کہ کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ صلعم کی پابندی کرنا۔ انکے بعد صحابہ اور انکے تابعین کے اقوال۔ پھر ہمارے شیخ حضرت سلطان الاولیا درۃ البیضا قطب وجود سیف اللہ الموجود امام المتصرفین رئیس المجبوبین شیخ الثقلین سر اللہ سید سادات سید محی الدین ابی محمدؒ عبدالقادر حسنی الحسینی و جعفری الجیلانی کے طریقہ پر اقوال و احوال دونوں میں عمل کرنا رضی اللہ عنہ وارضہ

اس وصیت کے بعد یہ زبانی ارشاد فرمایا کہ فقرا کی خدمت کرو، جادۂ شریعت پر قائم رہو، خدا کی یاد کرو اور اُسکی محبت و عشق و عرفان حاصل کرنے کی کوشش کرتے رہو اور سوائے حق تعالیٰ کے کسی دوسرے کو اپنا مقصود و مطلوب نہ بناؤ اور سوائے خدائے تعالیٰ کے دل میں کوئی وہم و غم مت لاؤ۔ مردار دنیا پر نظر مت ڈالو اور باطن کو طمع کی آلودگی سے پاک و صاف رکھو۔ جس طرح مشائخ قادریہ نے معہود و مقرر کر دیا ہے اسی اسلوب و طریقہ پر عشق و عرفان کی راہ میں گام زن رہو۔ آپس میں موافقت و اتفاق رکھو۔ تم میں سے ہر ایک اپنی ماں کی خوشنودی کا طلبگار رہے اور اُنکی خوشنودی و رضا کو میری خوشنودی اور رضا جانے۔ فقرا و مسافرین اور سادات کی خدمت کرنا لازم جانو۔ کسی کا دل نہ دُکھاؤ۔ اور حسن خلق، تواضع و قناعت و توکل کو اپنا طریقہ بناؤ اور خدائے عزوجل کے ساتھ اخلاص کا اور اُسکی مخلوق کے ساتھ مروت کا معاملہ رکھو۔ دین کے کام میں سب بھائی متفق رہیں۔ پنج وقتہ نماز جماعت کے ساتھ ادا کریں اور ہمارے شیخ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے ملفوظات پر عمل کریں۔ کسی قسم کا تردد نہ کریں۔

حصول دنیا کی کوشش نہ کریں اور دونوں جہان کے مہمات میں خدائے عزوجل پر توکل واعتماد رکھیں۔
پھر آپ نے ارشاد فرمایا حضرت شیخ ابراہیم مخدوم جی میرے سجادہ پر بیٹھیں اور شیخ بدرالدین اسی طرح خانقاہ کا انتظام کریں جس طرح اب تک کرتے آئے ہیں۔

آپ نے خلافت قادریہ اور اجازت مطلقہ حسب ذیل مریدوں کو عطا فرمائی تھی:۔
شیخ ابراہیم عرف مخدوم جی۔ شیخ اسمٰعیل۔ شیخ اسحٰق۔ شیخ بدرالدین۔ میاں خدا بخش۔ مرزا موسیٰ۔ شیخ احمد۔ قاضی محمد محتسب۔ میاں حسین (بشرطیکہ یہ صاحب جادۂ شریعت پر مستقیم رہیں اور سرکاری نوکری ترک کردیں) سید نعیم اللہ۔ سید حمید مشہدی۔ شیخ عبدالکریم۔ شیخ عبداللہ عرب۔ شیخ نظام ہنوری۔ شیخ عبداللہ بجنوری۔ شیخ جنید جونپوری۔ میاں راجی محمد گجراتی۔ شیخ یوسف بیجاپوری۔ شیخ بڈھا اودگیری۔ میاں سید علاء الدین۔ سلطان شاہ۔ شیخ گھوڑ ساکن کارنجہ۔ میاں فتو ساکن گواڑہ۔ میاں حسان کوہیری۔

آپ کی طبیعت رمضان شریف کے پورے مہینہ علیل رہی۔ حتٰی کہ عید کا دن آیا۔ آپ نے ہر ایک کو عید منانے کا حکم فرمایا اور آپ خود تمام اشیاء سے فراغت حاصل کرکے ذکر الٰہی میں مشغول ہوگئے، اور مکاشفہ ومشاہدہ الٰہی کے بحر میں مستغرق ہوگئے اور اسی عالم استغراق میں بتاریخ یکم شوال ۹۲۵ھ نداء غیبی یا ایتہا النفس المطمئنۃ ارجعی الیٰ ربک راضیۃ مرضیۃ کو لبیک کہا اور عمر کی تہتر منزلیں طے کرکے اس عالم آب وگل سے عالم قدس کی طرف سدھارے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون ؎

بعلم معرفت در اہل عرفاں بجستم سال تاریخ وفاتش
محمد شاہ ملتانی ست کامل ندا آمد بموئے انگشت واصل
۹۲۵

آپ شہر بیدر میں اپنے والد ماجد شیخ ابراہیم قدس سرہٗ کے بائیں جانب دفن ہوئے۔ آپکا مزار اب تک مرجع خاص وعام اور فیض بخش عوام ہے۔

آپ کے پانچ صاحبزادے اور چار صاحبزادیاں تھیں۔ صاحبزادوں کے نام یہ ہیں:
شیخ ابراہیم عرف مخدوم جی۔ شیخ اسمٰعیل۔ شیخ اسحٰق۔ شیخ بدرالدین اور شیخ فخرالدین۔ صاحبزادیوں کے نام یہ ہیں:۔ بی بی مریم۔ بی بی عائشہ۔ یہ دونوں حضرت کی زندگی ہی میں وفات فرماگئیں تیسری صاحبزادی بواجی کہلاتی تھیں اور چوتھی بی بی اللہ دینی تھیں جنکی شادی سید محمود بن سید محمد بن حضرت بندہ نواز گیسو درازؒ سے ہوئی تھی۔ انکی بہت اولاد ہوئی

آپ کا یہ واقعہ مشہور ہے کہ ایک دفعہ سید محمد جونپوری جو اپنے آپ کو مہدی موعود کہا کرتے

تھے اور جنکے ماننے والے اب بھی حیدرآباد دکن میں بہت ہیں، محمد آباد بیدر تشریف لائے اور شہر کے باہر قیام فرمایا اور آپ سے ملاقات کی خواہش ظاہر کی لیکن آپ نے اجازت نہیں دی۔ پھر جب اُنھوں نے اصرار کیا تو اپنے چاروں لڑکوں کو اجازت دیدی کہ جاکر اُنسے ملاقات کریں۔ سید صاحب موصوف نے بہت تپاک سے صاحبزادوں کا استقبال کیا۔ تھوڑی دیر تک گفتگو رہی اسکے بعد رخصت ہوکر صاحبزادے واپس ہوئے۔ شیخ بدرالدین فرماتے ہیں کہ میں نے حضرت والد ماجد قدس سرہ العزیز سے پوچھا کہ حضور یہ صاحب اپنے آپ کو مہدی موعود کہتے ہیں۔ یہ سنکر حضرت نے کسی قدر تامل فرمایا اسکے بعد ارشاد کیا کہ جس طرح قطبیت اور غوثیت کے منازل و مقامات سلوک میں ہیں، مہدیت بھی ایک مقام ہے جس پر جناب سید صاحب فائز ہیں۔ جب اس مقام کی حالت کا غلبہ ہوتا ہے اور سکر پیدا ہوتا ہے تو اپنے آپ کو مہدی موعود کہنے لگتے ہیں

آپ انتہا درجہ کے پابند شرع شریف اور متبع سنت نبوی صلعم تھے۔ اور کسی امر میں اُسکے خلاف عمل نہیں کرتے تھے۔ لوگوں کو درویشانہ طریق پر مُرید کرتے تھے اور جس میں استعداد دیکھتے خرقۂ خلافتِ قادریہ سے ممتاز فرماتے تھے۔ آپ کا سلوک سلفِ صالحین کا سا تھا۔ جناب بڑے پیر صاحب قدس سرہ کے ملفوظات اکثر ملاحظہ میں رکھتے اور اُن پر عمل پیرا ہوا کرتے تھے۔ اور کہا کرتے تھے کہ یہ ملفوظ جامع سلوک مبتدی و متوسط و منتہی ہیں اور بالکل کافی ہیں۔ فقراء اور ضعفاء سے ہمدردی کرتے اور اُن سے بڑی نرمی اور مہربانی سے پیش آتے تھے۔ آپ کسی کا سوال رد نہیں فرماتے تھے اور جو کچھ پاس ہوتا عطا فرماتے۔ اپنے پیران عظام رحمۃ اللہ تعالیٰ ارواحھم کا عرس کیا کرتے تھے۔ خود سماع سنتے اور وجد لایا کرتے تھے۔ اکثر شب جاگتے رہتے۔ صائم الدہر اور قائم اللیل تھے۔ آپ کے روزہ کی خبر کسی کو نہیں ہوتی حتیٰ کہ اہل خانہ اور ملازمین وغیرہ تک ناواقف رہتے۔ کہا جاتا ہے کہ آپ نے نماز معکوس بھی پڑھی ہے۔ جب سوتے تو ہاتھ میں تسبیح ہوتی اور ذکر کرتے کرتے آرام فرماتے تھے۔ آپ نے کبھی کوئی جاگیر یا انعام دار اضی قبول نہیں فرمائی لیکن جو نذریں اور فتوح کہ مریدان و معتقدان با اخلاص لاتے محض اُنکی دلجوئی کے خیال سے لے لیا کرتے تھے اور سب کا سب اُسی روز فقرا کو تقسیم فرما دیتے رات تک کوئی شے باقی نہیں رہتی۔ کسی دنیا دار کی تعظیم نہ کرتے اور ملوک و سلاطین کے پاس آمد و رفت نہ رکھتے تھے۔ اگر کوئی دنیا دار آپ کی خدمت میں حاضر ہوتا تو اُسے نصیحتیں فرماتے اور دنیا کی مذمت کرتے۔ آپ پنجوقتہ نماز باجماعت مسجد میں گزارتے اور اکثر اوقات مسجد ہی میں رہتے جب مکان تشریف لاتے تو حجرہ مبارک میں مشغول بحق رہا کرتے تھے۔

آپ دُبلے پتلے۔ رنگ مائل بہ سُرخی اور اوسط قد کے تھے۔ چہرۂ مبارک منور نظر آتا تھا۔ زبان بہت فصیح تھی۔ اپنے زمانہ کے بڑے زبردست عالم تھے اور آپ کے بشرۂ مبارک سے ایک ہیبت عظیم نظر آتی تھی۔ جو کوئی آپ پر نظر ڈالتا رعب سے آنکھیں نیچی کر لیتا تھا۔

آپ سے بکثرت خوارق عادات ظہور میں آئے ہیں۔ کتاب معدن الجواہر جو شاید قاضی محمد اشرف قاضی سرکار رسید ک کی تالیف ہے اور ۱۳۲۰ھ میں مطبع گلزار دکن حیدر آباد دکن میں زیور طبع سے آراستہ ہوئی بکثرت آپ کے خوارق مذکور ہیں۔

آپ کے مزار مبارک کو کاتب حروف نے دیکھا ہے۔ نہایت اچھی حالت میں ہے لیکن اکثر تبہ کسی زمانہ میں اُسے شہید کر دیا گیا تھا۔ چنانچہ آپ کے ایک مرید شیخ شہر اللہؒ فرماتے ہیں کہ یہ خبر سن کر میں بہت متردد و متفکر تھا اسی رنج میں ایک روز بیٹھا ہوا تھا کہ عالم مراقبہ میں آپ کی زیارت ہوئی میں نے سُنا کہ آپ فرما رہے ہیں کہ تم اس ذری سی بات کے لیے کیوں پریشان ہو۔ محب و محبوب میں حالات واقع ہوتے رہتے ہیں اور ہر ساعت میں ایک نئی صفت اور ہر لحظہ میں ایک نیا مظہر نظر آتا ہے محب و محبوب کے حالات میں غیر کو دخل نہیں ہے۔ کبھی ایسا ہوتا ہے اور کبھی ویسا۔ کبھی درست کرتے ہیں اور کبھی شکست کرتے ہیں۔

اے ز خیال ما بروں در تو خیال کے رسد　　با صفتِ تو عقل را لافِ کمال کے رسد
گر ہمہ مردم و ملک خاک شوند بر درت　　دامن عزت ترا گردِ زوال کے رسد
ہست ز تشنگاہ دل جلوۂ قرب روز و شب　　لیک بجلوۂ چناں چشم خیال کے رسد
کنگر کبریائے تو ہست فراز لا مکاں　　طائر ما دراں ہوا جز بپر و بال کے رسد
زاں چمنے کہ بلبلش روح قدس نمی سزد　　گلخنیانِ خاک را بوئے وصال کے رسد
بر در بے نیازیت صد چو حسین کربلا　　تشنہ بماند و درگذر تا بہ زلال کے رسد

آیت رحمت از حرم ہست برائے حاجیاں
خسرو بُت پرست را جز خد و خال کے رسد

محمد معشوق حسین خاں

مکتوب آمیر

الناظر نمبر ۳ جلد ۱۲ میں میں نے آرشد صاحب تھانوی کا بیان واقعہ پڑھا۔ مجھے افسوس ہے کہ تھانوی صاحب کو ایک مختصر استفسار کے جواب میں اسقدر طویل و عریض مضمون لکھنے کی تکلیف برداشت کرنا پڑی۔ اپنے سوانح شاعری اور توارد کے امکانات و تجربات کو نہایت تفصیل سے بیان کیا ہے۔ آرشد صاحب سے میں نے ناواقفیت کا اظہار بھی ضرور کیا تھا جسکو وہ صحیح اور غیر ضروری سمجھتے ہیں۔ اگر مجھے اُنکی خدمت میں نیاز حاصل ہوتا تو میں براہ راست بغیر آپ کے توسط کے اُن سے التماس کرنے کی جرأت کرتا۔ فاضل تھانوی کا میرے دوست اور ہم عمر و ہم وطن اسیر احمد صاحب آسیر کے شعر کو میرا شعر سمجھ لینا کچھ زیادہ قابل تعجب نہیں ہے اکثر حضرات کو ایسا دھوکا ہو جاتا ہے۔

جناب میرے دیرینہ مراسم کی بنا پر آرشد صاحب نے یہ یقین فرمالیا ہے کہ میں ۱۴ سال سے متواتر الناظر کے قارئین میں شامل ہوں اور اسلیے آرشد صاحب سے اور اُنکے کلام سے میرا متعارف ہونا اغلب ہے۔ فاضل مضمون نگار کا یہ قیاس بھی کچھ بیجا نہیں ہے۔ لیکن امر واقعہ یہ ہے کہ شروع میں الناظر میرے پاس آتا تھا پھر ایک طویل مدت تک چند حالات کی وجہ سے میں الناظر کو نہیں دیکھ سکا۔ دو تین سال سے الناظر کو پڑھنے کا اب پھر موقع ملا ہے۔

میں نے اپنے خط میں آرشد صاحب کے کلام کی تحسین کرتے ہوئے یہ عرض کیا تھا "اسے توارد کہیں گے یا اس سے بڑھ کر کچھ کہنا چاہیے"۔ توارد سے بڑھ کر القا کا بھی درجہ ہے، آرشد صاحب کو خود ظنوا المومنین خیرا پر عمل کرنا چاہیے اور انصاف سے بھی کام لینا چاہیے۔ جب اُنکے عزیز بھائی شوکت تھانوی کی نظر میں بھی یہ توارد کھٹکتا ہوا معلوم ہوا اور اُنھوں نے بھی سفارش کی کہ آرشد صاحب اپنی بیاض سے اس شعر کو حذف فرمادیں، تو میں بھی اس استفسار پر ملامت کے قابل نہیں ہوں۔ حقیقت میں توارد معجزات سخن میں سے ہے۔ لیکن عملدرآمد یہ ہے کہ جسکا ذہن مضمون حاصل کرنے میں پیشدستی کرتا ہے دوسرا شاعر اس مضمون کو اُسی کے حق میں چھوڑ دیتا ہے۔ آرشد صاحب اگر اپنی فکر ماجد سے دست بردار ہونا نہیں چاہتے، تو چشم ما روشن دل ما شاد۔ مجھے کوئی اصرار نہیں ہے۔ صفدر صاحب اور آسیر صاحب کی ساری غزل کا توارد ایک معمہ ہے۔ جسکو میرا ذہن ابتک بھی نہیں حل کر سکا ہے۔

بہرحال میں نے اپنے خط میں ارشد صاحب کی لطافتِ کلام کا اعتراف کرتے ہوئے اگر اس توارد پر اظہارِ تعجب کیا تھا تو اُس کے معنی قریب یہ نہیں ہو سکتے کہ میں اُنھیں سرقہ کا ملزم سمجھتا ہوں۔ امید ہے کہ ارشد صاحب بھی میرے الفاظ کے وہی معنی لیں گے جو میرا اصلی مقصود ہیں۔

فقیر امیر بدایونی

دیوانِ قائم چاندپوری کا ایک صفحہ

ذیل کی دو غزلوں کی روانی و سلاست سے قائم کے مرتبۂ شاعری کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ پہلی غزل کا تیسرا اور دوسری کا چوتھا شعر کس قدر بیساختہ، نرم، اور پُرکیف ہے! جلیل قدوائی

کون چاہے ہے بتاں تم سے مدارا کے تئیں
پر تنک نرم کرو اس دلِ خارا کے تئیں

اس میں تیرے لبِ میگوں کی کہاں کیفیت
ہم نے دیکھا ہے مئے لعل دوبارا کے تئیں

دیکھ بے وجہ نہ کھو دل کو ہمارے کہ ضرور
آئینہ چاہیے خوبانِ خود آرا کے تئیں!

دینداری کا ہوں میں شیخ کی بندہ جس نے
دی جِلا کفرِ یہودی و نصارا کے تئیں

بُو سے اُس زلف کی مانوس ہے اپنا تو دماغ
لیکے ہم آگ دیں کیا عنبرِ سارا کے تئیں

ہے جو کچھ ہوش تو کر دیدۂ عبرت سے نگاہ
دیکھ کر حالتِ اسکندر و دارا کے تئیں

قائم اُس بزم میں تھا کون کہ جس نے نہ پیا
شربتِ مرگ کے اس جامِ گوارا کے تئیں

شکوہ اغیار سے نے یار کی بیزاری سے
جو ہوا ہم پہ سو اس دل کی گرفتاری سے

ہر قدم کوئے بتاں کارگہِ مینا ہے
دیکھیو بچ کے، سنبھالے ہوئے ہشیاری سے

رو کے پوچھا میں میسر ہو ترا کیونکہ وصال
ہنس کے کہنے لگا "طالع کی مددگاری سے"

شور تجھ حسن کا گر عالمِ علوی میں نہیں
مہر و مہ جھانکے ہیں کیوں پردۂ زنگاری سے!

غافل اُس لب سے بمقدور حذر اولیٰ تر
گھر اک عالم کا جلا ہے اسی چنگاری سے

ہائے ری پیچیں تری زلفوں کی سبحان اللہ
کم ہیں خوبی میں یہ کس نافۂ تاتاری سے

دار سے کاہے کو منصور نے دیکھا وہ رنج
جو بلا سر پہ مرے آئی ہے ناداری سے

ہائے قائم نہ تری آنکھ پسیجی اک دن
ابر روتا ہے سدا خوفِ سیہ کاری سے

خُلقِ حسنؓ

ایک دن راہ میں تشریف لیے جاتے تھے — سبطِ اکبرؓ جگر و جانِ رسولِ معصوم
ابنِ زہراؑ و علیؓ روحِ نبیِ عربی — محوِ ذاتِ احدی خاص خدائے قیوم
خلق اس طرح تھی اُس نورِ مجسم کے قریب — شمع کے گرد ہو جس طرح پتنگوں کا ہجوم
ساتھ میں کہتے ہوئے جاتے تھے خدامِ ادب — مانگنے والو چلو وا ہے درِ فیضِ عموم
جد پیمبرؐ سا ملا ان کو پدر حیدرؓ سا — فرش سے عرش تک اس گھر کی سخاوت کی ہے دھوم
یہی دلوائیں گے خالق سے نعیمِ ابدی — یہی پلوائیں گے جنت میں رحیقِ مختوم
آنکھیں روشن ہوئی جاتی ہیں زہے نورِ جمال — راہ گلشن بنی جاتی ہے خہے فیضِ قدوم
اسی انداز سے جاتی تھی سواری سرِ راہ — کہ بڑھا مجمعِ حضار سے اک دشمنِ شوم
جس کا سر رشتۂ ایماں کے اثر سے خالی — جس کا دل عترتِ احمدؐ کی ولا سے محروم
شان میں شیرِ الٰہی کے وہ روباہ منش — لبِ گستاخ پہ لایا کلماتِ مذموم
دیکھی ظالم کی جو تہذیب سے بیگانہ وشی — غیظ میں آ گئے انصارِ امامِ مظلوم
روک کر سب کو یہ اُس شخص سے فرمانے لگے — وارثِ خُلقِ نبی خاصۂ ربِّ قیوم
شدتِ رنج سے قائم نہیں شاید ترے ہوش — ورنہ وہ شانِ علیؓ اور یہ کلامِ مذموم
تجھکو کھانے کی ضرورت ہے تو حاضر ہے نفیر — پھیرتے ہم نہیں کافر کو بھی در سے محروم
کہ اگر راحلۂ و زاد کی حاجت ہے تجھے — دوں ابھی مرکبِ مخصوص و کفافِ مرسوم
حق دلاؤں تجھے غاصب سے اگر ہے مجبور — یا عوض لوں ترا ظالم سے اگر ہے مظلوم
دیکھ کر خُلقِ حسنؓ کو وہ ہوا حلقہ بگوش — عرض خدمت میں یہ کی از پئے آدابِ رسوم
اے تری رائے رزیں مہبطِ انوار و حکم — اے ترا قلب امیں مخزنِ اسرار و علوم
دشمنوں سے یہ مراعات زہے جوشِ عطا — منکروں سے یہ مدارات خہے فیضِ عموم
بالیقیں آلِ محمدؐ کا یہی ہے دستور — لاجرم شانِ امامت کا یہی ہے مفہوم

زہر کھانے میں دیا سبطِ نبی کو کئی بار — اثر اس کا نہ ہوا آپ کو لیکن معلوم

آخری بار دیا آب میں سمِ قاتل
اشقیا نے نہ کیا خوف خدائے قیوم

منہ تک آنے لگے کٹ کٹ کے جگر کے ٹکڑے
تن سے آنے لگا رک رک کے نفس تا حلقوم

ہوگئی آلِ محمدؐ میں قیامت برپا
مچ گئی عترت اطہار میں فریاد کی دھوم

پھول کملا گیا تاراج ہوا صحنِ چمن
چاند گہنا گیا بے نور ہوئی چشمِ نجوم

سُن کے بیت الشرف خاص سے فریادِ حرم
آئے روتے ہوئے بالیں پہ حسینؑ مغموم

عرض کی آکے برادر سے کہ لے سروِ دیں
قاتلِ شوم کا ہو نام تو آخر معلوم

گرچہ جعدہ سے بجا طور پہ بدظن تھے مگر
غایتِ حلم سے بولے یہ امامِ مسموم

اس گھرانے میں طریقہ نہیں غمازی کا
کب روا ہے جو کروں گھر میں کسی کو موسوم

ہے گماں راست جو میرا تو نہیں فکر کی جا
اُس سے خود لیگا عوض خالقِ حی و قیوم

ورنہ کیوں ہو کوئی بے جرم گرفتارِ بلا
یہ نہیں شیوۂ اولادِ نبی معصوم

ضیا ایم اے

غزل

یہ کہتے ہیں آہِ رسا کرنے والے
نہیں تیر اپنے خطا کرنے والے

سمجھ بوجھ کر او جفا کرنے والے
کہاں پھر ملیں گے وفا کرنے والے

مرے یا جیے کوئی بیمارِ الفت
سلامت رہو تم دوا کرنے والے

نہ لاتے دمِ مرگ بالیں پہ اُن کو
خدا جانے ہمدم ہیں کیا کرنے والے

ادھر آ کلیجے سے تجھ کو لگا لوں
مرے دردِ دل کو سوا کرنے والے

کبھی آکے بتخانے کی سیر کرلیں
حرم میں تلاشِ خدا کرنے والے

ستم ابتدا ہیں کیے انتہا کے
ہیم ابتدا انتہا کرنے والے

دوا سے بھی نا آشنا مجھ کو کردے
مجھے درد سے آشنا کرنے والے

خدا کی خدائی سے باہر نہیں ہیں
درِ بت پہ سجدہ ادا کرنے والے

میں قربان دردِ محبت پہ باسط
کوئی اور ہونگے دوا کرنے والے

باسط بسوانی

تنقید

تاریخ السلف مؤلفہ مولوی عبد الباری معنی مطبوعہ عزیزی پریس آگرہ، کتابت طباعت، کاغذ اور سرورق دیدہ زیب ہے۔ اس کتاب میں معنی صاحب نے حضرت خواجہ معین الدین اجمیری کے تذکروں پر بڑی محنت اور جانفشانی سے ایک آزاد مورخ کی طرح تنقید کی ہے، آپ کے سوانح کی بعض تاریخوں کی صحت فرمائی ہے، اور آپ کے ملفوظات کے متعلق مختلف روایات میں باہم تطبیق یا ترجیح کی کوشش کی ہے۔ شروع میں مولانا سید سلیمان ندوی اور مولانا عبد الباری مرحوم کے قلم سے دو دیباچے ہیں۔ "قول فیصل" کے عنوان سے حضرت خواجہ کے بہت مختصر حالات اور "اسلاف کرام" کے تحت میں اُن کے آستانہ نشینوں کے کچھ حالات بھی آگئے ہیں۔

"جہت ترتیب" کے تحت میں "واہمہ پرست معاندین کے توہمات باطلہ اور جاہلانہ طرفہ عمل" کو وجہ تالیف بتایا ہے۔ اسی باب میں اپنا نقطۂ نگاہ تحریر فرماتے ہیں کہ "ہماری یہ تالیف منصفین سے خراج تحسین حاصل کرنے سے پیشتر حاسدین کے ملامت وطعن کا نشانہ بنے گی۔ مگر ہم اس سے مستغنی ہیں۔ اس لیے کہ دنیا کا عام دستور ہے:۔ مہ نوری نشاند وسگ بانگ می زند اسی طرح خاتمۂ کتاب پر "ناقہم اور غلط بیں نکتہ چینوں" کو بھی ایک چیلنج دیا گیا ہے۔ یہ وجہ تالیف، یہ نقطۂ نگاہ اور یہ چیلنج ایک خاک نشین آستانۂ عالیہ کو کہاں تک زیب دیتا ہے، اس کا تصفیہ ارباب بصیرت بخوبی کرسکتے ہیں۔

سیر العارفین پر تنقید فرماتے ہوئے لکھتے ہیں "متفق علیہ یہ مسئلہ ہے کہ ۵۶۱ھ میں حضرت غوث پاک نے عالم فانی سے عالم جاودانی کی طرف قدم رنجہ فرمایا" اور اسی بنا پر سیر العارفین کی ولادت کی تاریخ کی تغلیط کی گئی ہے، مگر "قول فیصل" میں خود جناب مؤلف نے تاریخ وصال ۶۳۲ھ قرار دیا ہے۔ تذکرہ نویسوں ہی سے نہیں مؤرخوں سے بھی کبھی کبھی اس قسم کی غلطیاں ہو جاتی ہیں۔ اس سے قطع نظر تنقیدی حیثیت سے کتاب بہت بلند ہے۔ دنیائے اُردو حضرت سلطان الہند کی مفصل روئداد کے لیے بےچینی سے منتظر ہے۔

روئداد اُردو مرتبہ مسٹر رشید احمد صدیقی (علیگ) سکرٹری انجمن اُردوئے معلی مسلم یونیورسٹی علیگڈھ۔ انجمن اردوئے معلی (مسلم یونیورسٹی) نے اُردو کی اہمیت، توسیع اور اشاعت کے متعلق چند ضروری استفسارات شائع کیے تھے۔ بعض ہمدردان اُردو نے جو جوابات ارسال کیے انکی ایک رپورٹ "روئداد اُردو" کے نام سے مسلم یونیورسٹی جوبلی کے موقع پر قوم کے سامنے پیش کی گئی تھی۔ اس روئداد میں اُردو کی ترقی کے لیے ایک سے ایک اہم اور قابل قدر تجاویز پیش کی گئی ہیں۔ کاش انجمن اردوئے معلے اُن میں سے ایک بھی انجام دے سکتی! علیگڈھ کے پُرجوش نوجوانو! سنو، اکبر کہتا ہے:

ہماری باتیں ہی باتیں ہیں، سید کام کرتا تھا
نہ بھولو فرق جو ہے کہنے والے کرنے والے میں

بچوں کا قاعدہ مرتبہ مولوی سجاد مرزا ایم اے (کنٹب) صدر مہتمم تعلیمات صوبہ گلبرگہ۔ پتہ: دی حیدرآباد بک ڈپو، چادرگھاٹ، حیدرآباد دکن۔ قیمت ۴ر

مولوی سجاد مرزا صاحب نے اس قاعدہ کو کنڈرگارٹن کے اصول پر مرتب کیا ہے، اور بچوں کی نفسیات کے مطابق قاعدہ پڑھانے کے طریقہ میں بہت کچھ اصلاح کردی ہے۔ شروع میں "عرض" کے عنوان سے اُن جدید اصول تعلیم کی تشریح کی گئی ہے جن کو پیش نظر رکھکر یہ قاعدہ مرتب کیا گیا ہے۔ بچوں کو کتاب اور پڑھنے لکھنے سے دلچسپی پیدا کرادینا ابتدائی تعلیم کا سب سے اہم مقصد ہے، اسکے لیے یہ کتاب نہایت موزوں ہے جس میں ہجے کرانے اور رٹانے سے پرہیز کرنا سکھایا گیا ہے۔ تحریر جلی اور کاغذ اعلیٰ ہے، کہ پڑھنے میں آنکھ اور دماغ پر ذرا بھی زور نہ پڑے۔ پوری کتاب میں ۵۸ تصاویر ہیں جن سے لڑکوں کو بہت دلچسپی ہوگی۔ اور سرورق کی رنگینی نے تو کتاب کو بالکل کھلونا بنا دیا ہے۔ آخر میں حالی کی ایک آسان حمد ہے جسے بچے بہت خوشی سے حفظ کرلیں گے۔ غرضکہ ہر حیثیت سے یہ قاعدہ دوسرے جدید قاعدوں پر فوقیت رکھتا ہے، اور اس قابل ہے کہ اسکو ہر مدرسہ میں رواج دیا جائے۔

فطرت اطفال مترجمہٗ مولوی حامد حسن صاحب قادری ایڈیٹر اخبار سعید (کانپور) حجم ۶۴ صفحے قیمت ۱۲؍ ملنے کا پتہ:- مسلم ایجوکیشنل کانفرنس علیگڈھ۔

یہ کتاب "دی سائنٹفک ٹرننگ آف چلڈرن" مصنفہٗ کرسچین ڈی لارسن کا اُردو ترجمہ ہے۔ اس میں بچوں کی تربیت کے لیے بہت آسان اور قابل عمل اصول اور انکی نفسیات پر عام فہم بحث کی گئی ہے۔ بچوں کی ازجی، رجحانات طبعی، تربیت، تخیل، احساسات لطیفہ، ملکۂ تعالی، تاثرات فطری، اور تعمیر سیرت کے سات عنوانوں پر کتاب کو تقسیم کیا گیا ہے اور آخر میں انگریزی مصطلحات اور اُنکے اُردو ترجمے بھی شامل کردیے گئے ہیں۔ زبان سلیس اور پاکیزہ ہے۔

مطلع الانوار مصنفۂ حضرت امیر خسرو دہلوی، مولفۂ مولوی محمد مقتدیٰ خاں شروانی۔ حجم ۲۳۶ صفحے، کاغذ اور لکھائی چھپائی اچھی ہے۔ قیمت قسم اول عـہ، دوم ے، سوم ے۔

عرصہ ہوا مسلم یونیورسٹی علیگڈھ نے حضرت امیر خسرو دہلوی کا کلام جمع اور شائع کرنے کا بیڑا اُٹھایا تھا۔ اس غرض سے اُنکی کتابوں کی ایک فہرست تیار کرائی گئی اور مسودوں کی تلاش ہونے لگی۔ اس فہرست میں سے کئی کتابیں شایع کی جاچکی ہیں۔ زیر نظر کتاب بھی اسی سلسلہ کی ایک کڑی ہے۔ تاریخ اور ادب کے طلباء اس خدمت کے لیے مسلم یونیورسٹی کے ممنون رہیں گے۔ شروع میں چھیاسٹھ صفحے کا مقدمہ ہے، جس میں مولف نے مثنوی اور اُسکے عنوانوں کا تعارف کرایا ہے۔ اگر خسروؔ کی شاعری اور اُنکے سوانح حیات پر بحث نہیں کی گئی تو چنداں حرج نہیں۔ اس سے پیشتر کی مثنویوں کے ساتھ ان مباحث پر بہت کافی مواد شایع ہوچکا ہے۔ مگر چونکہ یہ مثنوی نظامیؔ گنجوی کی مثنوی مخزن الاسرار کے جواب میں تھی لہذا ان دونوں کا موازنہ ضروری تھا۔ ایک اور اہم فروگذاشت یہ ہوئی ہے کہ مختلف نسخوں کا مقابلہ نہیں کیا گیا ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ ہمارے یہاں ابھی تک تصنیف و تالیف کا صحیح ذوق نہیں پیدا ہوا ہے ورنہ شروانی صاحب اس اہم فرض کو آسانی سے نہ ٹال دیتے۔

خنجر محبت مصنفۂ مولوی محمد سلیمان واصف بنارسی۔ حجم ۱۶۰ صفحے۔ قیمت ۸؍ ملنے کا پتہ: ہریسن روڈ۔ کلکتہ۔

جناب واصف کے اس تاریخی افسانہ میں یہ دکھانے کی کوشش کی گئی ہے کہ ایک مسلمان پانسو ہندوؤں کے لشکر کاٹ کر نکل سکتا ہے اور دس مسلمان ہزار دو ہزار ہندوؤں کو شکست دے سکتے ہیں۔ (اہل عقیدت معاف

فرمائیں) ایسی ہی غلط فہمیاں ہماری معکوس ترقی کی ذمہ دار ہیں۔ اس وقت تو اہل ملک کو ایسے لٹریچر کی ضرورت تھی جو زخمی دلوں پر مرہم کا کام کرتا۔

سیرت نگاری کی حیثیت سے یہ ناول بہت معمولی ہے۔ فسانہ کا ماحصل یہ ہے کہ اسلامی فوج کا ایک افسر حسن، سادھو کے بھیس میں پرتھوی راج کی فوجی نقل و حرکت کا پتہ لگانے جاتا ہے اور وہیں راجکماری پاربتی پر عاشق ہو کر عرصہ تک مقیم رہتا ہے۔ کون یقین کرے گا کہ جس فوج کے افسر ایسے غیر ذمہ دار ہوں وہ ایک جرار ہند و لشکر کو فاش شکست دیگی۔ تاریخی غلطیاں بھی ہیں۔ نمونہ کے لیے آٹھویں باب کی پہلی سطر ملاحظہ ہو "پاربتی خیمہ کے وسط میں ایک کوچ پر پڑی کروٹیں بدل رہی ہے" کہاں ہندوستان کا ہندو عہد اور کہاں کوچ پر کروٹیں بدلنا! زبان پر کہیں کہیں اُردو شاعری کا تاریک سایہ پڑا ہے۔ مثلاً ایک جگہ فرماتے ہیں "فوجوں کے رعب سے دریا کا پانی تھر تھرا رہا ہے، آسمان کا عکس متزلزل نظر آرہا ہے...." پہلا باب سیدھی سادھی تاریخ ہے جسکو اصل پلاٹ سے کچھ سروکار نہیں۔ ناظرین کو یہ خشک حصہ مجبوراً پڑھنا پڑتا ہے۔ واصف صاحب نہایت آسانی سے اس باب کو نظر انداز کر سکتے تھے۔

میلاد حبیب

مولفہ مولوی حبیب حسین صاحب ردولوی۔ حجم ۱۲۸ صفحے۔ قیمت ۸ر پتہ: سجاد حسین عبد الرزاق تاجران، نواب بازار، قصبہ ردولی (بارہ بنکی)

میلاد حبیب یا تذکرہ رحمۃ للعالمین حصہ اول میلاد شریف کی محفلوں میں پڑھنے کے لیے لکھا گیا ہے۔ پہلے ۶۰ صفحوں میں نماز، روزہ، زکوٰۃ، حج، حقوق العباد، احکام خدا، اقوال رسول، سرداردو عالم میلان کل ہیں کے عنوانوں سے سات لکچر ہیں۔ پھر نظام المشائخ سے "معجزات سرور انام" نقل کر لیا ہے اور آخر میں ذکرِ ولادت شریف ہے۔ اس بے ڈھنگی ترتیب کے علاوہ نفس مضمون بھی قابل شکایت ہے۔ محفل میلاد وعظ و نصیحت کے لیے نہیں۔ اسکی غایت اصلی یہ ہے کہ رسول اللہ صلعم کے سوانح زندگی اس طرح بیان کیے جائیں کہ سامعین کو اپنی روزمرہ زندگی میں اُنکی تابعیت و تقلید کا شوق پیدا ہو۔ طباعت و کتابت معمولی ہے اور سرورق پر عین وسط میں کتاب کا اشتہار ہے۔

ماں بچہ کی نگہداشت

مولفہ مولوی محمد ظفر ایم اے ایل ایل بی وکیل گونڈا۔ مطبوعہ قیصر ہند پریس دہلی۔ حجم چھوٹی تقطیع کے ۶۲ صفحے۔ قیمت ۴ر

جناب مولف نے ایک ننھے بچہ کے انتقال کی یاد میں یہ رسالہ مجسٹریٹ ضلع کی نذر کیا ہے۔ یہ ایک قابلِ غور بات ہے کہ نئی تہذیب کے زیر اثر ہندوستان کی مائیں قدیم خانگی علاج اور اصول تیمارداری سب روز بروز بھولتی جاتی ہیں۔ لیکن جس رفتار سے پُرانی چیزیں متروک ہو رہی ہیں اُس رفتار سے صحت اور تیمارداری کے جدید اصول نہیں سکھائے جاتے۔ یہی جہالت بچوں اور ماؤں کی عبرتناک شرح اموات کی ذمہ دار ہے۔ مولوی محمد ظفر نے اسی جہالت کو رفع کرنے کے لیے یہ عام فہم رسالہ لکھا ہے جسمیں اسباب اموات، شیر خوار بچوں کی حفاظت، زچہ کی داشت اور دودھ سے متعلق مفید معلومات درج ہیں۔ ان معلومات کے ماخذ کا پتہ نہیں۔ غالباً کسی انگریزی رسالہ کا ترجمہ ہوگا۔ بہر حال کتاب بہت مفید ہے اور ہر گھر میں موجود ہونی چاہیے۔

سید

پچھلے مہینے کے رسالے

اُردو

انجمن اُردو لکھنؤ کی سالانہ کانفرنس منعقدہ ۱۹۲۴ء میں مولوی مسعود حسن ایم اے لکچرار لکھنؤ یونیورسٹی نے "اُردو شاعری پر عتراض کی نظراور تحقیق کی نگاہ" کے عنوان سے ایک محققانہ مضمون پڑھا تھا جو رسالہ اُردو کے پچھلے نمبر میں شائع ہوا ہے (جولائی کا پرچہ ستمبر میں آیا ہے اس لیے اسے ہم تاخیر سے پیش کر رہے ہیں)۔

اُردو شاعری میں ایک عاشق کے کئی رقیب ہوتے ہیں، اور معشوق عاشق سے زیادہ اُس کے رقیبوں پر مائل رہتا ہے۔ یہ ایک بہت بڑا اعتراض تھا۔ پروفیسر مسعود حسن اس کا جواب دیتے ہیں:-

غزل میں سرگذشت عشق کا بیان عاشق کی زبان سے ہوتا ہے۔ شرح اسکی یہ ہے کہ خود عاشق ہی کی نگاہ ہے جو رقیب پیدا کرلیتی ہے۔ وہ معشوق کو محبت کے دائرہ کا مرکز سمجھتا ہے۔ اُسکے نزدیک ساری دنیا کو اُس پر فریفتہ ہونا ہی چاہیے۔ اور نفس انسانی کا خاصہ ہے کہ ادھر کوئی خیال، دل میں جما، اُدھر قدم قدم پر اُسکے ثبوت ملنے لگے۔ معشوق کسی سے یا کوئی معشوق سے ہنسکے بولدیا اور عاشق نے اُسے اپنا رقیب سمجھ لیا۔ پھر رشک اور بدگمانی جو عشق کی ایک منزل کے لوازمات ہیں، عاشق کی قوت متخیلہ کو متحرک کر دیتی ہے اور خیالوں کا سلسلہ اسے نہ معلوم کہاں سے کہاں پہونچا دیتا ہے۔ وہ سوچتا ہے کہ میں نے تو معشوق کو فلاں شخص سے صرف معمولی بات چیت کرتے ہوئے یا ہنسنے بولتے ہوئے دیکھا ہے، مگر ان دونوں میں نہ معلوم کتنی بے تکلفی ہوگی، نہ معلوم کتنی محبت ہوگی، نہ معلوم کیا کیا راز و نیاز کی باتیں ہوتی ہونگی، جنسے میں بالکل محروم ہوں، اور ایک اسی شخص پر کیا منحصر ہے، نہ معلوم ایسے خوش نصیب کتنے اور ہونگے جنسے معشوق ایسی ہی رسم و راہ رکھتا ہوگا۔

.... عشق کی پُر اسرار کیفیتوں میں سے ایک یہ بھی ہے کہ جس سے بے انتہا محبت ہوتی ہے اُسی سے ملتے ہوئے ایک حجاب سا ہوتا ہے۔ خود عاشق تو اس بیباکی کے ساتھ معشوق سے مل نہیں سکتا جس طرح دوسروں سے ملتا ہے۔ مگر جب وہ معشوق کو اپنے سے زیادہ دوسروں سے بے تکلف دیکھتا ہے، تو بدگمانی اُسکے کان میں کہہ دیتی ہے کہ معشوق کو تجھ سے اتنی محبت نہیں جتنی اوروں سے ہے۔ مگر ہو سکتا ہے کہ حقیقت بالکل برعکس ہو۔

ایک اور اہم اعتراض یہ ہے کہ اُردو کی عشقیہ شاعری میں معشوق ہمیشہ طبقۂ ذکور سے ہوتا ہے۔ یہ بات خلاف فطرت بھی ہے اور مخرب اخلاق بھی۔ اسکے متعلق مولوی مسعود حسن صاحب فرماتے ہیں:-

"ہمارے شاعروں نے ایشیائی حیا کے تقاضے سے معشوق کے چہرے پر رازداری کی نقاب ڈالدی ہے کہ دیکھنے والے اُسے پہچان نہ لیں۔ یہ رازداری اکثر اس حد تک پہونچ گئی ہے کہ پہچان لینا کیا یہ سمجھنا بھی دشوار ہے کہ معشوق جنس ذکور سے ہے یا جنس اناث سے .... شعر میں معشوق کے لیے

مذکر فعل لانا معشوق کے مرد ہونے کا ثبوت نہیں ہو سکتا۔ اس دعوے کی دلیل یہ ہے کہ غزل کے جن شعروں میں معشوق کا طبقۂ نسواں سے ہونا مسلم ہے اُن میں بھی معشوق کے لیے مذکر ہی فعل یا صفت وغیرہ لاتے ہیں۔ مثلاً

خوب پردہ ہے کہ چلمن سے لگے بیٹھے ہیں　　صاف چھپتے بھی نہیں سامنے آتے بھی نہیں

یارب پڑی رہے مری میت اسی طرح　　بیٹھے رہیں وہ بال پریشاں کیے ہوے

...... تیسری وجہ یہ ہے کہ غزل میں شاعر کسی خاص شخص کا عشق کسی مخصوص شخص کے ساتھ نہیں دکھاتا۔ وہ مجرد جذبۂ عشق کی تصویریں کھینچتا ہے۔ عشق کی دنیا کے واقعات بیان کرتا ہے۔ عاشق اور معشوق کی شخصیت یا جنسیت سے اُسے بحث نہیں ہوتی بلکہ انکے باہمی تعلقات سے۔ عاشق و معشوق کا بیان تو محض اسوجہ سے کرنا پڑتا ہے کہ بغیر انکے ذکر کے عشق کا بیان ممکن نہیں۔ مثال کے طور پر یوں سمجھیے کہ اگر کوئی شخص یہ بتانا چاہتا ہو کہ سیاہی کسے کہتے ہیں تو لامحالہ اُسے کسی سیاہ چیز کی طرف اشارہ کرتا ہوگا"

معارف

اس نمبر میں پروفیسر ضیا احمد صاحب ایم اے نے "ارتقاے ادب فارسی" کے عنوان سے متاخرین کی خصوصیات پر بحث کی ہے۔ اقتباس نمونۃً پیش کیا جاتا ہے:-

اب متاخرین کے دور میں تہذیب و تمدن میں ترقی ہوگئی تھی اور اسباب تعیش کی ہر طرف فراوانی تھی، اسوجہ سے انکی قوت تخئیل نے اگلوں کی پامال روش پر چلنا اور پرانے اسلوب بیان کو برتنا پسند نہ کیا لامحالہ خیالی اور فرضی استعارات ایجاد کیے گئے اور بنا ءالفاسد علی الفاسد استعارہ در استعارہ سے کام لیا گیا اور اس طریقہ سے شاعری کی زمینوں میں مجاز کے گھوڑے دوڑنے لگے۔ یہ نیا انداز بیان لطیف ہونے کے ساتھ جبتک قریب الفہم رہا کچھ مضائقہ نہ تھا مگر عہد اکبری کے بعد مضمون آفرینوں کی ایک جماعت پیدا ہوئی جسنے شاعری کو گورکھ دھندھا بنا دیا۔ شعر کی تعریف یہ کیجاتی تھی کہ نفس کو انبساط یا انقباض ہو لیکن جلال، اسیر، شوکت، بخاری، بیدل، وغیرہ کے کلام سے "طبیعت" کو تو ضرور انقباض ہوتا ہے باقی خیر صلاح۔ گویا اس دور کا کلام بجاے اسکے کہ قلب کی تفریح کا ذریعہ ہو دماغ کی مشق کا سامان بہم پہونچاتا ہے اور اس کی تہ کو پہونچنے کے لیے اُسی کد و کاوش کی ضرورت ہوتی ہے جو ایک مسئلہ ریاضی کے حل کرنے کے لیے درکار ہے۔ نظم پر موقوف نہیں، بیدل وغیرہ کی نثر میں بھی یہی عالم نظر آتا ہے۔ خود نعمتی و عرفی وغیرہ کے معاصر ظہوری کی تصنیف دیکھ جاؤ۔ تصنع اور اغلاق کے سوا کچھ نہ پاؤگے۔ ہمیں ان باکمالوں کی خصوصیت یا انکے کمال سے انکار نہیں۔ مگر افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ اس روش خاص نے اس دور میں خاقانی جیسے تو بہت پیدا کردیے مگر سعدی جیسا ایک بھی پیدا

نہ کیا۔ غرض یہ کہ اس طریقے سے نفس مضمون واضح اور ذہن نشین ہونے کے عوض اور تاریک و مبہم ہو گیا اور تشبیہ جو محض مقصود بالغیر تھی مقصود بالذات بن گئی۔

زمانہ زمانہ کے ستمبر نمبر میں مسٹر علی عباس حسینی ایم۔اے، نے "غالب کا مذہب" کے عنوان سے ایک تاقدانہ مضمون سپرد قلم فرمایا ہے۔ جس میں انھوں نے غالب کو مذہب اثنا عشری کا پیرو ثابت کیا ہے۔ مگر غالب کے مذہب سے متعلق اسکے کلام اور خطوط میں متضاد شہادتیں ملتی ہیں۔ اگر انکی تردید بھی فرما دیتے تو بہتر تھا۔ ذیل کا اقتباس آپ کے ملاحظہ کے لیے پیش کیا جاتا ہے:۔

"مشرک وہ ہیں جو وجود کو واجب و ممکن میں مشترک جانتے ہیں۔ مشرک وہ ہیں جو مسیلمہ کو نبوت خاتم المرسلین کا شریک گردانتے ہیں۔ مشرک وہ ہیں جو نومسلموں کو ابوالائمہ کا ہمسر مانتے ہیں، دوزخ اُن لوگوں کے لیے ہے ...... مقطع نبوت کا مطلع امامت، اور امامت نہ اجماعی بلکہ من اللہ اور امام من اللہ علی علیہ السلام ہیں ثم حسنؑ ثم حسینؑ اسی طرح تا مہدی موعود علیہ السلام ......" اب اسکے بعد غالب مرحوم کی شیعیت میں شک ایک بیجا سی بات ہوگی۔ نہ کوئی ذی ہوش اس سے انکار کر سکتا ہے نہ اسکے ماننے میں پس و پیش۔ لیکن اسی کے ساتھ ہی میں یہ عرض کر دینا ضروری سمجھتا ہوں کہ غالب کی سی بے تعصب ہستیاں آجکل کی مکدر دنیا میں بھی ہمارے لیے شمع ہدایت بن سکتی ہیں، بشرطیکہ ہم اُنکے نقش قدم پر گامزن ہونے کے لیے خود بھی تیار رہیں۔ اے کاش ہندوستان سے آپس کے تعلقات میں یہ سنی و شیعہ، ہندو و مسلمان، گورے اور کالے کی تفریق اُٹھ جاتی اور ہم ایک دوسرے کو بھائی سمجھنے لگتے اور اس طرح شیر و شکر ہو کر رہتے کہ ہر مذہب و ملت کا آدمی ہم کو اپنا ہی سمجھتا اور ہم کو اپنا کہنا باعث فخر و نمود جانتا!"

نگار ستمبر کے نگار میں محمد عبد القادر سرور بی اے کا ایک ماخوذ مضمون تنظیم تمدن پر شائع ہوا ہے ایسے پُر از معلومات مضامین اُردو رسالوں میں بہت کم نظر آتے ہیں۔ مذہبی علومت (Theocracy) کی برکات پر بحث کرتے ہوئے اسیا تحریر کے متعلق فرماتے ہیں:۔

"... تحریر، پریشان کن اور غیر مفہوم اشکال اور اشاروں کے مراحل طے کرتی ہوئی آخری ہزاری قبل مسیح کے شروع میں سادہ، آسان اور پڑھنے کے قابل شکلیں اختیار کر لیتی ہے یہ وہی زمانہ ہے جبکہ یونانیوں نے پُرانے رسومات، عادات اور خرافات کے قیود کو توڑنا پھوڑنا شروع کر دیا تھا۔ یہ بات قابل یادداشت ہے کہ پرسی پولس کی چٹانوں کے کندہ کتبے جو ایک صدی قبل ماہرین آثار قدیمہ کے اُکسانے اور خط مثلث کے رازوں کو طشت از بام کرنے کا باعث ہوئے۔ اس وسیع ترین مگر کم ترین تنظیم یافتہ مذہبی سلطنت کے شہنشاہوں کی یادگاریں ہیں جن پر یونانیوں نے حیات قومی کی کشمکش میں حملہ کیا تھا۔ خط مثلث کی یہ تحقیق جو خط تصویری ہی کے اصول پر ہوئی اپنے معنوں کے افشائے راز کے علاوہ اور کئی گتھیوں کے سلجھانے میں بیحد مفید ثابت ہوئی۔ ان محنت شاقہ اُٹھانے اور خداداد

قابلیت سے کام لینے والوں کی ان تھک کوششوں کا یہ صلہ ملا کہ قدیم واقعات کی توثیق اور جدید واقعات کے انکشاف سے گویا ایک "جہانِ دیگر" وجود پذیر ہوگیا جو آج عجائب خانہ لوور میں قوانین شاہ ہامورابی کی شکل میں محفوظ ہے - یہ دونوں خط اپنی تخلیق کے وقت بلحاظ حالت ایک جیسے تھے مگر رفتہ رفتہ تاریخی اختلافات کی وجہ سے جس تہذیب کے ماحول میں انھوں نے پرورش پائی، اسکی مجسم مثال بنگئے - مصری تحریر نے اپنی بہت سی پیدائشی خصوصیات کو محفوظ رکھا اور مصریوں کی طرح اپنے پیدائشی وطن سے قدم باہر نکالنا گوارا نہیں کیا، لیکن خط مثلث وسیع ممالک میں منتشر ہوگیا۔ جن جن قوموں نے اسکو اپنی گود میں لیا، اسکو اپنے طور پر پال پوس کر بڑا کیا اور یوں اس نوجوان نے اپنی جبلّی عادتیں کھودیں - حتیٰ کہ دو ہزار قبل مسیح ہی میں، جس وقت شاہ ہامورابی کی معاشرتی تعلیمات قلمبند کیجارہی تھیں یہ تحریر آرمینیا، ایشیائے کوچک اور خود مصر کے شمالی حدود تک پہونچ گئی تھی - مصر کے خط تصویر کی ایجاد اس بات کی شہادت دیتی ہے کہ مصریوں میں نقشہ کشی کس حد تک ترقی کرچکی تھی! مصری خط، ارتقاء کے مختلف مدارج میں مختلف شکلوں میں نمودار ہونے کی وجہ سے متاخرین کے لیے کسی قدر پریشان کن بنگیا ہے - پہلے تو مصری جس شے کے متعلق کچھ کہنا چاہتے اسکی تصویر کھینچدیتے بعد میں یہ تغیر ہوا کہ مطلوبہ شے کا اظہار اسکی فرضی تصویر کے ذریعہ کیا جانے لگا - آخر کار خاص خاص چیزوں کے لیے خاص خاص علامات مقرر کرلی گئیں اور یہی حروف کا کام دینے لگیں "

ہمایوں

میجر عطاء الرحمٰن بی اے نے ہمایوں کے ستمبر نمبر میں "موجودہ فن مصوری پر ایک نظر" کے عنوان سے جدید ہندی مصوری پر ایک مختصر مگر ناقدانہ مضمون لکھا ہے - آرٹ سے دلچسپی رکھنے والے حضرات اس اقتباس کو غور سے ملاحظہ فرمائیں :-

"زیادہ تعداد ہمارے جدید مصوروں کی ایسی ہے جو انسانی اعضاء کی بناوٹ اور تناسب (Anatomy) سے بالکل بے بہرہ ہیں - مصور بننے سے قبل انھوں نے یہ ضروری علم حاصل نہیں کیا - اور اب ان نقائص کو جو اصل میں انکی ناقابلیت کی وجہ سے پیدا ہوگئے ہیں، انڈین آرٹ کی خصوصیات بناکر اسے بدنام کررہے ہیں - انسانی اعضاء تو علیحدہ رہے یوروپین مصور پھولوں، پودوں اور درختوں کی ٹہنیوں اور پتوں کا مطالعہ کرتے ہیں تاکہ مختلف اقسام کے پودوں میں جن مختلف طریقوں سے چھوٹی ٹہنیاں بڑی شاخوں میں سے نکلتی ہیں انھیں تصویر میں کماحقہٗ ادا کرسکیں، گویا وہ مصوری کے لیے علم نباتات کا بھی حاصل کرنا ضروری سمجھتے ہیں - ہمارے مصور جس زمانہ یا قوم کے افراد کی تصویر بناتے ہیں انکے عادات واطوار، طریق زندگی، بلکہ لباس تک کی طرف بالکل توجہ نہیں

کرتے - جس طرح عموماً ہمارے تھیٹروں میں ایکٹروں کے لیے ایک خاص قطع کا لباس مقرر کرلیا گیا ہے اور خواہ ڈرامہ کا محل وقوع چین ہو یا امریکہ، مصر قدیم کا واقعہ ہو، یا الف لیلہ کا قصہ یا شکسپیر کا ڈرامہ، روم‌ۃ الکبریٰ کا زمانہ ہو یا جارج پنجم کا، بادشاہ، اُمرا، فوج کے افسر، ہیرو ہیروئن، مذاقیہ اور اوسط قسم کے کیریکٹر اپنے اپنے پارٹ کے مطابق ہمیشہ وہی لباس پہنے ہوئے نظر آتے ہیں - یعنی جو لباس ایک دن خاقان پہنے ہوئے ہے، وہی دوسرے دن کنگ لیر کے بدن پر دیکھا جا سکتا ہے - اسی طرح بعض مصوروں نے اپنی تصاویر میں دکھانے کے لیے ایک خاص قسم کا لباس اختراع کرلیا ہے جیسا دنیا کے کسی ملک میں نہ کبھی پہنا گیا نہ آجکل پہنا جاتا ہے - انکی تصاویر فقط لباس سے پہچانی جا سکتی ہیں - مختلف اقوام کے خط و خال مختلف ہیں - تاتاری النسل، آریائی، افریقی اور عربی اقوام کے چہروں اور بدن کی ساخت میں بیّن فرق ہے . . . . . . اب اگر کسی قدیم یونانی دیوتا کے چہرے کے ساتھ بدن پر ہندوستانی یا ایرانی یا اختراعی لباس دکھایا جائے یا لیلیٰ کی تصویر دیکھنے سے یہ معلوم ہو کہ کسی جاپانی ماہ وش کو عربی لبادہ پہنا کر کھڑا کردیا ہے، اور بہادر راجپوت پر ہلاکو خاں کے بیٹے کا شبہہ گذرے تو ان باتوں کو مذاقِ سلیم کہاں تک گوارا کر سکتا ہے - خواہ تصویر بذات خود رنگ وغیرہ کے لحاظ سے کتنی بھی دلفریب کیوں نہ ہو - یورپ کے مصور ایک تصویر تیار کرنے کے لیے بعض اوقات دور دراز ممالک کا سفر اختیار کرتے ہیں تاکہ وہاں کے حالات کا اپنی آنکھ سے مشاہدہ کر سکیں، اور لائبریریوں سے پرانی کتب لیکر جس زمانہ کی تصویر بنانا مقصود ہوتا ہے اُس وقت کے لباس اور طرز معاشرت کی باریکیوں کے مطالعہ میں مہینوں کی کاوش صرف کردیتے ہیں -

جامعہ

دانتے اپنی نظم (Divine Comedy) ''الروایۃ الالٰہیۃ'' کے باعث دنیا کے سب سے بڑے شاعروں میں گنا جاتا تھا - یہ ایک طویل نظم ہے جس میں جنت اور دوزخ کے مناظر کی تصویر کھینچی گئی ہے - یہ تصویر اُس عہد کے مسیحی خیالات سے بالکل مختلف ہے - ایک مدت سے شارحین کو اُسکے ماخذ کی تلاش تھی مگر اب تک کامیابی حاصل نہیں ہوئی تھی - حال میں میڈرڈ یونیورسٹی کے عربی پروفیسر میگوئیل آسن نے اس کی تاویل کی ہے کہ یہ سب کا سب محی الدین عربی کی تصنیف اور دیگر اسلامی روایات سے ماخوذ ہے - عبد العلیم احراری صاحب نے اصل مضمون کا خلاصہ جامعہ میں شایع کرایا ہے - اس میں وہ تمام داخلی و خارجی دلائل آگئے ہیں جن کی بنا پر پادری موصوف نے یہ بے تعصبانہ دعوے کیا ہے - ہمیں افسوس ہے کہ طوالت کے خوف سے ہم اُن دلائل کو ناظرین الناظر کی خدمت میں نہیں پیش کر سکتے - ذیل کا اقتباس البتہ حاضر ہے : -

''اگر یہ نظریہ کہ دانتے نے ابن عربی کا نقشہ اپنے سامنے رکھا تھا، کسی طرح مسترد بھی کردیا جائے تو یہ بدیہی مشابہت یا تو ایک ناقابل حل معمہ ہے یا ایجاد کا ایک محیر العقول معجزہ - اب صرف ایک سوال باقی رہ جاتا ہے اور وہ یہ کہ کیا درحقیقت اسکا امکان ہے کہ دانتے

کو اسلامی ادب سے واقفیت رہی ہو۔ اس مسئلہ پر تین قسم کی شہادتیں پیش کیجا سکتی ہیں۔
(۱) یہ ثابت کیا جا سکتا ہے کہ عہد وسطیٰ میں مسیحی یورپ نے باہمی تعلقات کی بنا پر مسلمانوں کے مذہب، عقائد، رسم و رواج اور آخرت کے تصور کے متعلق کافی علم حاصل کر لیا تھا (۲) اسکا امکان ہے کہ دانتے نے بالواسطہ یا بلا واسطہ اسلامی ادب سے اپنی نظم کے لیے مواد حاصل کیا ہو (۳) اسکی شہادتیں موجود ہیں کہ وہ ادب اسلامی سے شوق رکھتا تھا اور اس کا اثر بھی اُس پر پڑا تھا۔ اسلام ان ممالک کی فتح کے بعد جو مرسے متصل تھے بڑی سرعت کے ساتھ اندلس، جنوبی فرانس، اطالیہ اور سسلی میں پھیل گیا۔ جنگ کے زمانہ میں بھی دو قومیں بہت جلد ایک دوسرے سے واقف ہو جاتی ہیں اور یہاں تو ایک مدت تک اسلامی اور مسیحی تہذیبیں امن کے ایام میں دوش بدوش رہی ہیں۔ عرب تجار برابر روس اور شمالی یورپ میں جایا کرتے تھے اور کبھی کبھی تو فنلینڈ، ڈنمارک، اور آئرلینڈ تک پہونچ جاتے تھے۔ اسکے علاوہ اندلس اور سسلی میں جو باہمی تعلقات تھے اُن کا پوچھنا ہی کیا۔"

قوس قزح قوس قزح کے سالانہ نمبر میں سید وقار احمد صاحب بی اے ایل ایل بی نے "مثنوی اور میر تقی میر" پر ایک ناقدانہ بحث کی ہے اور آخر میں یہ نتیجہ نکالا ہے:

"میر صاحب کی مثنویات میں کوئی بات ایسی نہیں پائی جاتی جو اقتضائے حال کے موافق نہ ہو، اور نہ ان میں کوئی ایسی بات ہے جو دوسری بات کی تکذیب کرے۔ غرض جہاں تک فن کا تعلق ہے میر صاحب کی مثنویاں خوب ہیں، مگر ان میں قصہ پن نہیں ہے۔ اسلیے دوسرے مثنوی نگاروں سے انکا مقابلہ مشکل ہے۔ مگر با ایں ہمہ ایک خاص حیثیت سے میر صاحب کا درجہ تمام مثنوی نگاروں میں بڑھا ہوا ہے اور وہ انکا اخلاقی پہلو ہے۔ میر صاحب کا درجہ غزل گوئی میں وہی ہے جو میر حسن کا مثنوی نگاروں میں ہے۔ مگر ہم میر حسن کے متعلق یہ کہے بغیر نہیں رہ سکتے کہ اُنھوں نے اخلاقی پہلو نظر انداز کر دیا۔ اُنھوں نے بدر منیر میں بادشاہ کو شرع کا پابند بتایا ہے مگر بینظیر اور بدر منیر کی ملاقات قبل از نکاح کرا دی! اسکے برخلاف ہم میر صاحب کے یہاں ایسی باتیں نہیں پاتے۔"

اسی رسالہ میں "طلسمی کتبخانہ" کے عنوان سے محمد شاہ ولی تمینی بی اے نے قصہ کے پیرایہ میں ادبی سرقہ کا نقشہ کھینچا ہے۔ ایک منظر آپ کی دلچسپی کے لیے اخذ کیا جاتا ہے۔ تمینی صاحب کتبخانہ میں خواب دیکھ رہے ہیں:

"عوام الناس کے گروہ کے گروہ اِدھر اُدھر گھوم رہے ہیں۔ جب وہ کسی کتاب کو ہاتھ لگاتے ہیں تو وہ عجیب فیشن کے لباس میں تبدیل ہو جاتی ہے اور وہ اسے پہن لیتے ہیں مگر ایک ہی قسم کا لباس زیب تن نہیں کرتے بلکہ کسی کی آستین، کسی کا دامن، کسی کا جبہ کسی کا عمامہ! اسی طرح فرد فرد ٹکڑوں سے اپنے جسم کو سجاتے ہیں، مگر اصلی چیتھڑے پھر بھی کہیں نہ کہیں ضرور نظر آ جاتے ہیں ..... اس علمی اور ادبی کارخانہ میں

اچانک ہر طرف سے چور چور کی صدائیں بلند ہوئیں ..... اُٹھائی گیرا ور مضامین کے چور مصنف اور مؤلف کتابیں بغلوں میں دبا بھاگنے لگے۔ مگر اصل مالکوں نے اُنکا تعاقب کیا اور سب کے کپڑے اُتار لیے اور اُن سب کو برہنہ تن کمرہ سے نکال دیا۔"

نظام المشائخ نظام المشائخ کے رسول نمبر میں خواجہ حسن نظامی صاحب "جمال" کے عنوان سے پیغمبر اسلام کے بعض خصائل پر روشنی ڈالتے ہوئے ہندوستان کی موجودہ افسوسناک حالت پر مندرجہ ذیل تبصرہ فرماتے ہیں -

"ہندو مسلمان سکھ عیسائی پارسی یہودی، سب ہی ایک دوسرے کے بھائی ہیں، ایک صورت اور ایک مورت کے انسان ہیں۔ سب کا پیدا ہونا ایک ہے سب کا جینا ایک طرح کا ہے اور سب کا مرنا بھی ایک قسم کا ہے - پھر کیوں باہمی کدورت میں مبتلا ہیں اور کیوں ایک دوسرے کی مخالفت پر کمر بستہ ہیں اور کیوں ایک دوسرے کی سچی اور اصلی بات کو سننا نہیں چاہتے؟

ہندوستان میں یہ سب تو لڑ رہے ہیں - ہاتھ سے، قلم سے، زبان سے، یہاں تک کہ انکے خیالات بھی اور انکے دل و دماغ بھی لڑ رہے ہیں، مگر کس بات کے لیے اور کس مقصد کے لیے لڑ رہے ہیں - اسکی خبر خود اُنکو بھی نہیں ہے اور یہ بالکل نہیں جانتے کہ اس لڑائی کو ایک دن موت آجائے گی اور عقل ایک دن ان سب کو ملا کر ایک کر دیگی - اُس دن یہ افسوس کریں گے کہ ہم کیوں لڑے، کس بات پر لڑے اور اس لڑائی میں ہم نے کیسی بے عقلی اور غیر انسانیت کی حرکتیں کیں۔"

سید

رسید کتب

۱- ادب العرب	مولوی زبید احمد ایم - اے	سے ر
۲- خطوط شبلی	مولوی محمد امین زبیری و سید محمد یوسف قیصر	عہ ر
۳- تاثر دکن	مولوی سید علی اصغر بلگرامی ناظم آثار قدیمہ	صہ ر
۴- حقیقت اسلام	نواب سر امین جنگ کے، سی، آئی، ای	عہ ر
۵- رپورٹ	مسلم ایجوکیشنل کانفرنس	

اُردو رسائل کے خاص مضامین

ستمبر ۱۹۲۶ء

دلگداز - لکھنؤ

(۱) سلطان عالم واجد علی شاہ
(۲) عنقا

زمانہ - کانپور

(۱) غالب کا مذہب
(۲) قرۃ العین
(۳) کربلا (ڈراما)

معارف - اعظم گڈھ

(۱) امام غزالیؒ اور فلسفۂ اخلاق
(۲) روشنی کی عدم جسمیت
(۳) ارتقائے ادبیات فارسی

قوس قزح - لاہور (سالانہ نمبر)

(۱) سزائے موت
(۲) جودھا بائی
(۳) دلربا دھوکا (افسانہ)
(۴) طلسمی کتبخانہ (افسانہ)
(۵) مثنوی اور میر تقی میر
(۶) قندیل احمر کی ضیاء

اُردو - اورنگ آباد

(۱) اُردو شاعری پر اعتراض کی نظر اور تحقیق کی نگاہ
(۲) نوبل انعام
(۳) ادبی بات چیت

ہمایوں - لاہور

(۱) اسلام کا اثر مغربی تہذیب پر
(۲) موجودہ فن مصوری پر ایک نظر
(۳) انتقام (افسانہ)

نگار - بھوپال

(۱) غالب کی ذہنیت
(۲) حسین کا انجام (افسانہ)
(۳) تنظیم تمدن
(۴) لارڈ رپن کا عہد حکومت

نیرنگ خیال - لاہور

(۱) انسان بندر کی اولاد نہیں
(۲) شاہان مغلیہ کے اوقات شبا روزی
(۳) اسٹیج
(۴) کوائف ترکی

نظرے خوش گذرے

۲۵-۲۶- ستمبر کو، حجاز کانفرنس کے نام سے جو جلسہ ہمارے شہر میں منعقد ہوا، وہ مہاراجہ صاحب محمود آباد و دیگر تعلقہ دارانِ اودھ کی تمام کوششوں کے باوجود کامیاب نہ ہوسکا اور بجائے اسکے کہ مسئلۂ حجاز میں مسلمانوں کے لیے کوئی متفقہ راہ عمل تجویز کیجاتی، افسوس ہے کہ مزید افتراق کی بنیاد پڑ گئی -

اعلان کیا گیا تھا کہ اس کانفرنس کی حیثیت ایک ایسے اجتماع کی ہوگی جو مسلمانوں کی تمام بڑی بڑی جماعتوں کا نمایندہ ہو مگر شروع ہی سے طریق کار ایسا اختیار کیا گیا جس نے اس قسم کے اجتماع کو ناممکن بنا دیا۔ پہلی غلطی تو یہ ہوئی کہ داعیان جلسہ میں صرف ایک خیال کے لوگ رکھے گئے - حالانکہ جب ملک کے ہر گوشہ اور ہر طبقہ کے نمایندوں کو دعوت دینا منظور تھی تو سب سے پہلے ہی کوشش ہونا چاہیے تھی کہ دعوت دینے والوں میں ہر جماعت کے ممتاز افراد شریک ہوں تاکہ جن لوگوں کو دعوت جائے اُنکو اس بات پر پورا اعتماد ہوسکے کہ یہ جلسہ واقعی ہر طبقہ کے مسلمانوں کی رائے کا نمایندہ ہوگا - دوسری غلطی یہ ہوئی کہ دعوت نامہ میں بطور اصول موضوعہ یہ امر ظاہر کردیا گیا کہ حجاز سے نجدیوں کے خراج کی تدابیر پر غور کرنا اس کانفرنس کا مدعا ہے ——— گویا مسلمانوں کی تمام جماعتیں پہلے سے اسپر متحد تھیں اور صرف حصول مقصد کے لیے تعینِ راہ کی حاجت تھی - نتیجہ یہ ہوا کہ جو لوگ اس حماقت میں مبتلا نہ ہوے تھے اُنکے لیے اس جلسکی شرکت کا کوئی موقع ہی باقی نہ رہا - تیسری غلطی یہ کی گئی کہ دعوت ناموں کے بھیجنے میں بھی پوری تنگدلی اور تعصب کا اظہار کیا گیا - جن لوگوں کے متعلق معلوم تھا کہ مخالف رائے رکھتے ہیں اُنکو یا تو سرے سے دعوت ہی نہیں بھیجی گئی یا ایسے طریقہ پر بھیجی گئی کہ وہ شریک نہ ہوسکیں -

انھیں سب فروگذاشتوں کا یہ نتیجہ تھا کہ باوجودیکہ ہفتوں پیشتر سے اخبارات میں کانفرنس کا غلغلہ مچ رہا تھا، جگہ جگہ وفود گئے اور کثیر التعداد خطوط دعوت جاری ہوے لیکن نہ تو ہندوستان کے مشاہیر میں سے معدودے چند کے سوا کسی نے کانفرنس کو سرفراز فرمایا اور نہ ملک کے کثیر التعداد کارکنوں ہی نے اُسکی شرکت گوارا کی جنکے بغیر ظاہر ہے کہ کسی تجویز کو عملی جامہ پہنانا قریب قریب ناممکن ہے - جو چند بندگان شکم مہاراجہ صاحب اور خدام الحرمین کی رضاجوئی کو اعلاے

کلمۃ الحق پر ترجیح دیتے ہیں وہ آنکھوں میں خاک ڈال کر مسلمانوں کو باور کرانا چاہتے ہیں کہ حجاز کانفرنس ہر طرح کامیاب رہی۔ حالانکہ اگر اُن سے پوچھا جائے کہ بنگال کے سب سے بڑے اسلامی صوبہ سے محسن خاں کے سوا جو ضلع بارہ بنکی (اودھ) کے باشندے ہیں، کون سے قومی کارکن یا سردار اس کانفرنس میں شریک ہوئے؟ پنجاب سے جو بنگال کے بعد مسلمانوں کی آبادی کے لحاظ سے دوسرا بڑا اسلامی صوبہ ہے، مشہور خدام الحرمین کا رکن سید حبیب شاہ کے سوا کون صاحب ایسے آئے جو پنجاب کے تعلیم یافتہ مسلمانوں کے نمایندے کہے جا سکیں، یا سرحد کے پُرجوش مسلمانوں کی نمایندگی کرنے والے کون حضرات شریکِ جلسہ ہوئے، تو ایک نام بھی ایسا نہیں پیش کیا جا سکتا جو کسی وقعت کا سزاوار ہو۔ ان تینوں اسلامی صوبوں کے علاوہ مدراس، آسام، برہما اور بہار کا بھی کوئی نمایندہ نہ تھا۔ سندھ کے اسلامی صوبہ سے صرف ایک پیر مجدد صاحب تشریف لائے، اور صوبۂ متوسط سے فرنگی محل کے ایک شاگرد مولوی حامد علی۔ خود بمبئی سے جہاں کے ایک شریف جلسہ کے صدر منتخب کیے گئے تھے، باوجودیکہ کہا جاتا ہے کہ وہ ایک مشہور مذہبی پیشوا کے حکم سے اس کانفرنس میں شریک ہوئے تھے، کوئی بڑی جماعت نہیں آئی۔ اور جو چند آدمی اُنکی ہمراہی میں آئے بھی وہ بدنصیبی سے ایسے نہیں جنکی شرکت کسی جلسہ کے لیے موجب افتخار ہو۔ صوبجات غیر کے چند اشخاص کے سوا جن میں بہار کے بعض حضرات بھی شامل تھے، باقی تمام لوگ اسی صوبہ کے تھے۔ اور اُن میں بھی اکثر و بیشتر وہی اصحاب تھے جو خدام الحرمین کے رکن ہیں یا جنھیں مہاراجہ صاحب محمود آباد کی ذاتی دوستی کا فخر حاصل ہے۔

ابھی کچھ بہت زیادہ مدت نہیں گذری جب سنہ ۱۹ء میں ایک اجتماع تقریبًا اسی قسم کا یہاں منعقد ہوا تھا جسکے اہتمام میں وقت و سرمایہ کی قلت کے ساتھ ساتھ ایک دشواری عظیم عالیجناب مہاراجہ صاحب محمود آباد کی اس عنایت سے پیدا ہوگئی تھی کہ دعوت نامہ پر دستخط کر دینے کے بعد جبکہ خطوط طبع ہو چکے تھے، کسی کا اشارہ پا کر جناب والاشان نے اپنا نام نامی دعوت دہندگان میں سے خارج کرا دیا اور منتظمین جلسہ کو مجبورًا آپ کی مالی اعانت قبول کرنے سے بھی دستکشی کرنا پڑی۔ یہ وہی جلسہ تھا جس میں درحقیقت تحریکِ خلافت کی بنیاد رکھی گئی اور ظاہر ہے کہ اس نوعیت کے جلسہ سے مہاراجہ صاحب ایسے نامور سیاسی لیڈر کو پہلو بچانے کی ضرورت محسوس ہوئی تو دوسرے عافیت پسندوں اور حکومت پرستوں سے شرکت کی کیا توقع ہو سکتی تھی۔ جو لوگ اُس جلسہ میں شریک تھے یا جنھوں نے اخباروں میں اُس جلسہ کی رُوداد پڑھی وہ بخوبی اندازہ کر سکتے ہیں کہ حجاز کانفرنس کو جہاں تک کہ صوبجات ہند

ئی مسلم آبادی کی نمایندگی کا تعلق ہے اُس اجتماع کے مقابلہ میں کیا نسبت رہی -
مقامی خدام الحرمین ارعن نے یہ اعلان کرکے بہت سے لوگوں کو مغالطہ میں ڈالدیا تھا کہ کانفرنس کے لیے تجاویز کا مسودہ جس مجلس میں ترتیب دیا جائے گا اُس میں مجلس خلافت، مسلم لیگ، جمعیۃ العلما، جمعیت تنظیم وغیرہ نصف درجن سے زائد قومی مجالس کے دو دو نمایندے لیے جائینگے اور اختتام جلسہ کے بعد بھی یہی ظاہر کیا گیا کہ مجلس مضامین میں ان قومی مجالس کے دو دو نمایندے شریک تھے - حالانکہ یہ واقعہ کے بالکل خلاف ہے - دوسری جماعتوں کا ذکر نہیں، مگر کم سے کم ان چاروں مجلسوں نے تو اپنا کوئی نمایندہ نہیں بھیجا - اور حجاز کانفرنس کے طریق کار سے اختلاف اگر نہیں تو صریح بے اعتنائی کا ثبوت ان مجالس کی بے تعلقی سے بخوبی مل جاتا ہے -
ہر حال کسی نہ کسی نوع کا ایک اجتماع ضرور ہوگیا جس نے دو دن کی متعدد نشستوں میں ایک درجن سے زائد تجاویز مسلمانان ہند کے نامۂ اعمال میں اور اضافہ کردیں - اور غالباً عالیجناب مہاراجہ صاحب بہادر، کارفرمایان مجلس خدام الحرمین اور ہمارے مکرم و محترم جناب اڈیٹر صاحب ہمدم کو پوری دلی تشفی حاصل ہوگئی ہوگی کہ تینوں کی متحدہ اور منفردہ کوششوں نے بالآخر ہندوستان کے سات کروڑ مسلمانوں کی طرف سے سلطان نجد و حجاز کے نام اعلان جنگ جاری کرادیا -
لیکن غالباً ان سب اصحاب کو یہ دیکھ کر بہت مایوسی ہوئی ہوگی کہ ہزاروں روپے کے صرف کر دینے اور اپنا اور دوسرے بہت سے لوگوں کا وقت عزیز رائیگاں کرنے کے بعد بھی مسلمانوں نے اُنکی رہنمائی کو قبول نہیں کیا - حجاز کانفرنس کی کارروائیوں پر جو تبصرہ اسلامی پریس میں ہوتا رہا ہے وہ یقیناً منتظمین کانفرنس کے لیے کچھ خوش آیند نہیں ہو سکتا - اور اگرچہ اخبارات کی اس روش عام کو دیکھتے ہوے قطعاً غیر ضروری معلوم ہوتا ہے کہ کانفرنس کی تجاویز پر کچھ لکھنے کی زحمت گوارا کی جائے، تاہم میں چاہتا ہوں کہ کم سے کم بانیان و کارکنان جلسہ کو اس بات پر دلی مبارکباد دوں کہ اُنھوں نے یہ اعلان کردیا کہ حجاز میں غیر مسلم مداخلت کسی طرح گوارا نہ کیجائیگی - اور اس طرح اُس فتنہ کا ایک بڑی حد تک سدباب ہوگیا جو وائسرائے کے پاس ڈیپوٹیشن بھیجنے کی تجویز سے پیدا ہونے والا تھا -

رہنمایان خلافت اور اڈیٹر ہمدم کے درمیان یہ امر مابہ النزاع ہے کہ اس تجویز کا سہرا کسکے باندھا جائے - محترم علی برادران اسے اپنی شرکت جلسہ کا حاصل و معاوضہ تصور فرماتے ہیں، اور جالب صاحب لکھتے ہیں کہ کانفرنس کے ارباب حل و عقد یعنی فرنگی محل و قیصر باغ کے باہمت

بزرگوں کا یہ مسلمہ مسلک ہے جس کا جلسہ سے قبل اعلان کر دیا گیا تھا۔ ہم اس بارے میں تکلم بننے سے احتراز کریں گے، البتہ یہ عرض کرنے میں تامل نہیں کہ اس اعلان سے بھی پہلے وائسرائے کے پاس ڈیپوٹیشن لیجانے کی ایک تجویز کہیں قیصر باغ یا اُسکے نواح ہی میں منظور کی گئی تھی۔ اور ہمدم کے ذریعہ سے تمام ملک میں مشتہر ہوئی۔

حجاز کانفرنس کی حاصل تجویز یہ تھی کہ جب تک نجدیوں کا اخراج عمل میں نہ آئے حج ملتوی رکھا جائے تاکہ اقتصادی دشواریوں سے تنگ آکر سلطان ابن سعود حجاز کو چھوڑ کر اپنے ملک میں واپس چلے جائیں۔ اس تجویز کی نامعقولیت کے بارے میں غالباً یہ کہنا صحیح ہوگا کہ باخبر اور سنجیدہ طبقہ میں کوئی دو رائیں نہیں ہیں۔ کیونکہ جو اخبارات نجدیوں کے حامی و ہوا خواہ ہونے کے مجرم نہیں قرار دیے جا سکتے اور قبوں کی شکست سے بدل ناخوش ہیں اور برابر سال بھر سے اپنی رائیں کا اظہار کر رہے ہیں وہ بھی اس دانشمندی کی داد دینے کے لیے تیار نہیں۔ حتیٰ کہ مولانا محمد علی صاحب باوجود نجدیوں کے اخراج کے خواہشمند ہونے اور التوائے حج کو ایک قیمی اقتصادی حربہ تصور فرمانے کے بھی اپنے اخبار میں اس تحریک کو قبل از وقت کہہ کر مردود قرار دیا۔ اور خلافت و مدینہ وغیرہ نے تو خوب ہی مضحکہ اُڑایا ہے۔

لیکن ہمارے خیال میں نہ صرف یہ تجویز قبل از وقت، خلاف مصلحت، غیر مؤثر اور بے سود محض ہے بلکہ سرتاپا ایک مذہبی فتنہ کہے جانے کی سزاوار ہے۔ ارکان اسلام کے متعلق گذشتہ پچاس ساٹھ سال کے اندر مصلحین امت کی اُس جماعت نے جو تتبع عقلائے یورپ اور اُن کے مسلمان متبعین سے اسلام کی عظمت منوانا چاہتی ہے اور اس خیال سے ہر مذہبی حکم کو محدود عقل انسانی اور اُسکے وضع کردہ قوانین طبعی سے مطابقت دینا ضروری سمجھتی ہے، طرح طرح کی دنیاوی اور مادی منفعتیں منسوب کر دی ہیں۔ لیکن فریضۂ حج کو بطور ایک اقتصادی حربہ کے استعمال کرنے کا خیال بالکل جدید انکشاف ہے۔ جسکی کم سے کم ہم کسی نہج سے بھی تائید نہیں کر سکتے کہا جاتا ہے کہ قرامطہ کے عہد میں لوبعض فقہانے التوائے حج کا فتوےٰ صادر کیا تھا۔ اُس فتوے کو اُس زمانہ کے لوگوں نے کس حد تک قبول کیا، یہ بالکل بداگانہ بحث ہے۔ لیکن کیا کوئی صاحب یہ بتانے کے لیے تیار ہیں کہ اُن فقہانے التوائے حج کا فتوے محض اس لیے دیا تھا کہ مسلمانوں کے لیے حج کرنا اُس عہد میں موجب نقصان مال و جان تھا، یا فتوے کی بنیاد اس خیال پر تھی کہ قرامطہ

فقر و فاقہ سے تنگ آکر ارض مقدس کو چھوڑ بھاگیں گے۔

ابھی تک اسی کا رونا تھا کہ مسلمانوں کی کثیر تعداد نے جن میں انگریزی خواں طبقہ اس لحاظ سے نمایاں حیثیت رکھتا ہے کہ اُسے جاہل کہنے کی جرأت نہیں کی جا سکتی اسلام کے چاروں ارکان نماز، روزہ، زکوٰۃ و حج سے تمتع اندوز ہونا چھوڑ دیا ہے اور اس سبب سے ساری برکتیں مسلمانوں سے اُٹھتی جاتی ہیں۔ اب جس فتنہ کا دروازہ اس نئی ایجاد نے کھولا ہے اُسکی بدولت قوی اندیشہ ہے کہ کچھ دنوں میں تعلیم یافتہ انگریزی خواں ہی نہیں بلکہ جاہل و ناخواندہ اشخاص تک سرے سے حج کی فرضیت ہی کے منکر ہو جائیں گے۔

جس طرح بڑے بڑے درخت چھوٹے چھوٹے بیجوں سے پیدا ہوتے ہیں اور عرصہ تک زمین کے اندر ایسے دبے رہتے ہیں کہ کوئی نہیں کہہ سکتا کہ کلّہ کب پھوٹے گا اور ننھا سا تخم درخت کی صورت اختیار کرلے گا۔ بعینہٖ اسی طرح انسانی خیالات کا نشو و نما ہوا کرتا ہے۔ آج ہمارے بعض بھائیوں نے التوائے حج کو لطیفہ ایک اقتصادی حربہ کے استعمال کرنے کا تخم بو یا ہے، ابھی لوگ اسے خلاف مصلحت، غیر موثر، ناقابل عمل اور قبل از وقت قرار دیتے ہیں، مگر کچھ تعجب نہ ہوگا اگر رفتہ رفتہ زمانہ کی عمر میں ترقی ہونے کے ساتھ ساتھ یہ خیال بھی نشو و نما پا جائے اور خدانخواستہ ایک وقت ایسا آجائے کہ حج کی صرف اقتصادی مصلحتیں لوگوں کو یاد رہ جائیں اور یہ امر ذہن سے بالکل خارج ہو جائے کہ حج کا مقصود اصلی حجازیوں کی روٹیاں نہیں بلکہ اللہ جل شانہٗ کی طاعت و عبادت ہے۔

جو لوگ استطاعت نہیں رکھتے یا سمجھتے ہیں کہ باوجود حجاز میں ازمنۂ سابقہ سے بہت زیادہ امن و امان ہونے کے آج بھی بدامنی ہے اور اپنے مال و جان کی حفاظت کا یقین نہیں کر سکتے وہ شوق سے قصد حج ملتوی رکھیں مگر یہ کیا بدبختی ہے کہ قبوں کی محبت یا وہابیت و ملوکیت سے نفرت کی بنا پر مسلمانوں کو ایک فریضۂ دینی کی بجا آوری سے روکا جاتا ہے یا روکنے کی کوشش کی جا رہی ہے۔

خدا کا شکر ہے کہ مسلمانان ہند کی اکثریت نے اس تحریک کے ساتھ وہی سلوک کیا جسکی وہ سزاوار تھی۔ اور خداوند کریم سے دعا ہے کہ مسلمانوں کو عقل اور مآل اندیشی کی توفیق نصیب ہو کہ وہ اپنے ہاتھوں اپنی بے آبروئی اور جگ ہنسائی کرانے سے باز رہیں۔

۳۰۔ اکتوبر ۱۹۲۶ء ظفر الملک

بسم اللہ الرحمن الرحیم

بہترین غزل گو

الناظر جنوری سنہ ۱۹۲۶ء کے انعامی نوٹس مین کچھ ایسی دلکشی ہی کہ اُسنے مجھ ناکارہ کو بھی اپنی طرف متوجہ کرلیا۔ اِس عمر مین مقابلہ کا ذوق اور وہ بھی نوجوان انشاپردازون سے مجھ مین موجود نہین ہی۔ اور موجود نہ ہونا چاہیے۔ انعام حاصل کرنے کا لالچ بھی مجھ افسردہ دل کو میدان مقابلہ مین نہین لے جاسکتا تھا۔ اول تو اپنے دل و دماغ کو دیکھتے ہوئے مجھے یہ اُمید ہی نہین ہو سکتی کہ مین اِس میدان کو جیت سکونگا۔ اور اگر یہ واہمہ پیدا بھی ہوجاتا تو بھی اِس گرم موسم مین مشتہرہ رقم انعام میری توجہ کو اپنی طرف مائل نہین کرسکتی تھی لیکن آجکل دنیائے شاعری مین انگریزی تعلیم یافتہ نوجوانون کی خودروی زبان اردو کو شدید نقصان پہونچا رہی ہے اور مین مدت سے اسے محسوس کررہا ہون۔ ممکن ہی کہ غزل گوئی اور غزل سرائی پر میری ناچیز تنقید اُن حضرات کی رہنمائی کا باعث ہو۔ اسی خیال سے بہ حیثیت زبان اردو کے ایک ادنےٰ خادم کے مین نے اس مضمون پر قلم اُٹھانیکی جرأت کی ہے۔

انعامی مضمون کا عنوان یہ ہی:-
عہد میر تقی میر کے بعد سے اسوقت تک غزل گوئی مین کون شاعر سب سے زیادہ کامیاب ہوا ہے۔ اسکے بعد مزید ہدایات اور شرائط لکھے گئے ہین۔

میر کے بعد سے اسوقت تک اردو شعرا کی تعداد لاکھون نہین تو ہزارون تک تو پہونچ چکی ہے۔ تبصرہ نگار کا فرض ہے کہ وہ اُن سب شعرا کے کلام اور حالات سے مطلع ہوکر اپنی قوت فیصلہ کو کام مین لائے۔ لیکن ایسی طویل اطلاعات کا بہم پہونچنا ہر شخص کے واسطے آسان نہین ہے اور کم سے کم مجھ ہیچمدان کی طاقت اور ہمت سے باہر ہے اسلیے مین حضرت میر کے عہد کے بعد ہی متصل عہد سے ایک شاعر کا انتخاب کرون گا جس نے اردو غزل گوئی مین کامیابی کا تمغۂ امتیاز حاصل کیا ہے اور رنگ تغزل کو کامیاب بنادیا ہے۔ اِس محترم شاعر کا مقابلہ بھی اُسی عہد کے ایک مشہور شاعر سے کیا جائیگا۔ ناقدین کرام مجھے معاف فرمائینگے کہ مین نے اپنی محدود معلومات کی وجہ سے اُنکے مضمون کے وسیع عنوان کو اپنے اوپر تنگ کر لیا ہے۔

اُردو شاعری اپنے دامن مین بہت سے اصناف سخن کو لیے ہوئے ہے منجملہ اُنکے غزل بھی ہے۔ غزل گوئی مین یہ آسانی ہے کہ ہر شعر مین جدا جدا مضمون ہوتا ہے بخلاف قصیدہ مثنوی اور قطعہ کے کہ ان مین ایک ہی مضمون کو ترتیب کے ساتھ اور سلسلہ کے ساتھ لکھنا ہوتا ہے لیکن ساتھ ہی اسکے غزل مین یہ دشواری بھی ہے کہ ہر شعر مین یعنے دو مصرعون مین ایک مضمون کو مکمل اور ختم کرنا پڑتا ہے۔ لغت مین غزل کے معنی ہین عورتون سے باتین کرنا۔ اصطلاحی معنی مین بھی لغوی معنی کی جھلک موجود ہے اور غزل کا مایۂ ناز عشق کے پاکیزہ خیالات ہین یعنے وصل و ہجر کی کشمکش حسن و عشق کے معرکے، شمع و پروانہ کا معاملہ، گل و بلبل کا معانقہ، بہار و خزان کا تصادم، جفا و وفا کے واردات، گھر کا بن کرنا اور بن کو گھر بنانا، قیس و فرہاد کے کارنامے، لیلیٰ و شیرین کی بے اعتنائیان، کبھی مرنا اور کبھی جینا، کبھی رونا اور کبھی ہنسنا۔ یہ مختلف اور متضاد خیالات ہین جن کو سامان غزل کہا جاتا ہے۔ اردو شاعرون نے قدم بقدم فارسی شاعری کا

تتبع کیا ہے۔ امیر خسرو یا ولی نے نظم اردو کی بنیاد قائم کی اور پھر میر و سودا نے اُس پر محل
تعمیر کیا۔ سون، سین کی جگہ سے۔ ہمن کو کے بجائے ہمکو لکھے جانے لگے۔ لیکن پھر بھی
مین نے کہا کے موقع پر مین کہا نظم کیا جاتا تھا۔ اِس زمانہ تک نظم اردو مین کافی
اصلاح ہو چکی تھی اور غزل کی شاعری کو چار چاند لگ چکے تھے فارسی اور بھاشا
کا ایک معقول تناسب سے امتزاج ہو کر اردو زبان ایک مستقل حیثیت حاصل
کر چکی تھی۔ اردو زبان اور اردو غزل نے اہل بصیرت کی نظر مین ایک وقیع اور رفیع
درجہ حاصل کر لیا تھا۔ آخر موت و حیات کی کشمکش نے اردو زبان کو اِن محسنون کی
سرپرستی سے محروم کر دیا اور وہ اِس نونہال کو دوسرون کے سپرد کرکے عالم فانی سے
رخصت ہو گئے۔ میر جیسے قادر الکلام شاعر کی وفات کے بعد ملک ہند اور بالخصوص
دہلی و لکھنؤ مین بہت سے باکمال نظم اردو اور غزل اردو کی خدمت مین مصروف رہے
جرأت، مصحفی، انشا، ناسخ، آتش، مومن، ذوق، غالب کا نام آج تک اردو غزل کے
ساتھ ساتھ لیا جاتا ہے۔ فن شاعری اُسوقت ایک فن شریف خیال کیا جاتا تھا۔ اُمرا
کی طرف سے اہل کمال کی قدر کی جاتی تھی۔ دربار دہلی اور سرکار لکھنؤ کی داد و دہش
بھی بڑی حد تک ترقی زبان اردو مین مددگار رہی۔ اردو زبان کو اپنے محسنون کا شکریہ
ادا کرتے وقت مرحوم دہلی اور لکھنؤ کو بھی فراموش نہ کرنا چاہیے۔

شیخ محمد رمضان ایک غریب چپراسی کو ۱۲۰۴ھ مین خداوند عالم نے ایک
فرزند عطا فرمایا جسکا نام ابراہیم ہے۔ دنیا مین روزانہ سیکڑون ہزارون بچے پیدا ہوتے
ہین۔ کس کو خبر تھی کہ یہ نومولود عید کا چاند بن کر اہل نظر کو اپنی طرف متوجہ کرے گا
اور شاعری کے افق پر ماہ کامل ہو کر چمکیگا۔ اِسی محترم ہستی نے ملک الشعرا اور خاقانی
ہند کے القاب سے دنیائے شاعری مین شہرت پائی۔ سودا اور میر کے بعد

غزل اردو کو بلند سے بلند درجہ پر پہونچا دیا۔ مشکل سے مشکل مضمون کو اِس آسانی سے کہدیا کہ دشوار پسند طبیعتین آج تک حیران ہین۔ بندشون مین صفائی کا رنگ دکھایا۔ مشکل اور سخت قوافی کو اِس خوبی سے اپنی جگہہ پر بٹھایا کہ تعقید بھی جو ایسے قوافی کے نظم کرنے مین لابدی ہے بھلی معلوم ہونے لگی ضرب الامثال کو نظم کے سانچہ مین ڈھال کر اپنے کمال کو ثابت کیا۔ فارسی ترکیبون سے بھی نظم اردو کو زینت دی عشق و حُسن، درد و محبت، تصوف، فلسفہ قدرت، موت و حیات وغیرہ کے مضامین سے غزل کے چمن کو سجا کر دنیائے شاعری مین سیر و تفریح کا سامان مہیا کر دیا۔ اُس عہد کے ارباب سخن نے قدر و منزلت کی اور آج تک منصف مزاج اعتراف کرتے ہین کہ ملک الشعرا شیخ ابراہیم ذوق اقلیم سخن کا مالک اور غزل اردو کا بادشاہ ہے۔ اُس کے کلام نے کبھی الفاظ کی مناسب نشست و برخاست سے سہل ممتنع کا درجہ حاصل کر لیا ہی، کبھی مضامین کی ندرت سے محال کو ممکن کر دکھایا ہے۔ سودا اور میر کے بعد یہی وہ زبردست شخصیت ہی جس نے نظم اردو مین کامیابی کا افتخار حاصل کر کے غزل کی شاعری کو کامیاب بنا دیا ہی۔ اِن دعاوی کی دلائل و براہین خود اُسکا کلام پاکیزہ ہی جو عنقریب ہدیۂ قارئین ہوگا۔ اِس نیک نیت اور باکمال شاعر کے خدمات نے شہرت کے ساتھ شرف قبول بھی حاصل کیا اور اسوقت تک بھی دنیائے شاعری مین کثرت سے اُس خرمن کے خوشہ چین زبان اردو کی خدمت کر رہے ہین۔ حاسدین اور متعصبین کبھی اُسکو شیخ رمضان کا بیٹا کہہ کر اپنا دل ٹھنڈا کر لیتے ہین۔ کبھی خلیفہ یا شیخ جی کہکر مذاق اُڑاتے ہین لیکن وہ سمجھ لین کہ خاک اُڑانے سے سورج کی روشنی فنا نہین ہوسکتی۔ ذوق کے کمال کا آفتاب ایسے بادلون سے بے نور نہین ہوسکتا۔ عرب کے مشہور شاعر متنبی کو بھی اہل حسد کے اِسی قسم کے طعن و تشنیع برداشت کرنا پڑے تھے وہ کوفہ کے ایک بھشتی کا لڑکا تھا۔ لیکن اسکی جوھر آفرین طبیعت نے آخرکار اُسکو معراج کمال پر

پہونچایا۔ اِسی طرح چیرا اسی کا لڑکا خلیفہ یا شیخ جی جو اردو شاعری کے واسطے مایۂ ناز ہے، خاقانی ہند ہو کر رہا۔ ذوق نے غزل گوئی مین جو درجہ حاصل کرلیا اُسکا کوئی اور مستحق نہین تھا۔ بقول مولانا آزاد مرحوم ذوق خاتم الشعرا بلکہ خاتم الشعرا ہی۔ قارئین کرام اب اُسکے کلام کے مختلف نمونے ملاحظہ فرمائین۔

---

(۱) ہوا یہ سینہ یکسر خارزار دشت غم میرا — کہ آیا یا بجون آغشتہ ہو کر لب پہ دم میرا
(۲) رسیدہ سایۂ ہستی سے ہون وہ آہوے وحشت — کہ ہی اک کوچۂ رم جادۂ دشت عدم میرا
(۳) وہ ہون مین گیسوئی موج محیط اعظم وحشت — کہ ہی گھیرے ہوئے رُوئے زمین کو پیچ و خم میرا
(۴) مری صورت کے معنی ہین نفخت فیہ من روحی — حدوث بے ثبات اثبات کرتا ہی قدم میرا
(۵) وہ ہون مین رہ نورد شوق پر ساتھ جاتا ہی — برنگ سایۂ مرغ ہوا نقش قدم میرا

ان اشعار مین مضامین کی ندرت اور صفائی کے علاوہ یہ بات بھی دیکھنے کے قابل ہی کہ فارسی ترکیبون کو کس خوبی کے ساتھ اردو نظم مین جگہ دی ہی۔ میرزا غالب کا بھی مطلع جو اسی زمین میں ہے ملاحظہ کے قابل ہی۔

نہ ہوگا یک بیابان ماندگی سے ذوق کم میرا — حباب موجۂ رفتار ہے نقش قدم میرا

دیوان غالب کے شارحین اِس شعر کے معنی مین بھی اختلاف کرتے ہین لیکن مطلب یہ ہی کہ یک بیاباں ماندگی (تھک کر رہ جانا) کی وجہ سے میرا ذوق دشت نوردی کم نہین ہوگا کیونکہ میرا نقش قدم حباب موجۂ رفتار ہی۔ میرزا نے ایسے الفاظ مین اِس مضمون کو ادا کیا ہے کہ ہر دماغ بآسانی اسکا لطف حاصل نہین کرسکتا۔ میرزا نے اپنے تھک جانیکے باوجود اپنے نقش قدم کو حباب موجۂ رفتار کہہ کر ذوق دشت نوردی کو قائم رکھا ہی۔ لیکن خاقانی ہند کا پانچواں شعر اِس تخیل مین کسقدر مکمل ہی۔ اپنے شوق نوردی کو عجیب صورت سے ثابت کیا ہے کہ میرا نقش قدم بھی برنگ سایہ

مرغ ہوا میرے ساتھ جاتا ہے۔ زیادہ تیز روی مین پاؤن کے نشان زمین پر نہین بنتے ہین

لکھیے اُسے خط مین کہ ستم اُٹھ نہین سکتا ۔۔۔ پر ضعف سے ہاتھون مین قلم اُٹھ نہین سکتا
آتی ہے صدائے جرسِ ناقۂ لیلے ۔۔۔ پر حیف کہ مجنون کا قدم اُٹھ نہین سکتا

مطلع کسقدر لطیف ہی ناتوانی کو کس انداز سے ثابت کیا ہی اور قادر الکلامی کی شان دکھائی ہے۔ دوسرا شعر جس کیفیت کو لیے ہوئے ہے وہ زبان سے ادا نہین ہوسکتی اس کا اندازہ صرف وہی دل کرسکتا ہی جو دردوعشق سے لبریز ہو ع

حسرت پہ اُس مسافر بیکس کی روئیے ۔۔۔ جو تھک رہا ہو بیٹھ کے منزل کے سامنے

اِس قافیہ پر شاہ نصیر کا بھی شعر ہے۔

سر معرکۂ عشق مین آسان نہین دینا ۔۔۔ گاڑے ہے جہان شمع قدم اُٹھ نہیں سکتا

شاہ صاحب نے قافیہ کو اچھا بٹھایا ہے لیکن ذوق کا شعر جسقدر بلند ہی وہانتک شاہ صاحب کے فکر کی پرواز نہین ہوسکی۔

(۱) اس تپش کا بھی مزہ دل ہی کو حاصل ہوتا ۔۔۔ کاش میں عشق مین سرتاقدم دل ہوتا
(۲) چین پیشانی اگر تیری نہوتی زنجیر ۔۔۔ نالہ دیوانہ تھا جو پابہ سلاسل ہوتا
(۳) موت نے کردیا ناچار وگرنہ انسان ۔۔۔ ہی وہ خودبین کہ خدا کا بھی قائل ہوتا
(۴) آپ آئینۂ ہستی مین ہی تو اپنا حریف ۔۔۔ ورنہ یان کون تھا جو تیرے مقابل ہوتا

ہر شعر سامان غزل کی بھری پری دوکان ہی۔ سلاست بیان اور لطف زبان نے مضمون کی آب وتاب کو دوبالا کردیا ہے۔ مطلع مین عجیب قسم کی لطافت ہی جسکی تعریف نہیں ہوسکتی۔ میرزا غالب فرماتے ہین۔

میری قسمت مین غم گرا تنا تھا ۔۔۔ دل بھی یارب کئی دیے ہوتے

یہ شعر بھی اپنے اندر بہت کچھ تاثیر رکھتا ہے۔ غالب بمجبوری کثرت غم کی وجہ سے

چند دل مانگتا ہی۔ لیکن ذوق تپش عشق کا اہل صرف دل ہی کو سمجھتا ہی اور چاہتا ہی کہ ع
کاش مین عشق مین سرتا بقدم دل ہوتا۔ دونونکی تخیل مین ایک نازک فرق ہے اور جو
لوگ شاعری کا نداق سلیم رکھتے ہین اُن کی توجہ کے قابل ہے۔

یہ حیات چند روزہ جو نہ سدراہ ہوتی — تو پھر ایک عرصہ گاہ عدم و وجود ہوتا

بندش کی لطافت اور مضمون کی بلندی جسقدر خراج تحسین وصول کرے
کم ہے۔

ساتھ آہ کے شب دل سے وہ پیکان نکل آیا — تھا کام تو مشکل مگر آسان نکل آیا

رات آہ مین یون سینہ سے اک شعلہ سا چمکا — مین نے تو یہ جانا دلِ سوزان نکل آیا

جس آسانی سے خاقانی ہند نے اِس مضمون کو ادا کیا ہے وہ اہل بصیرت کی
نظر مین ایک معجزہ معلوم ہوتا ہے۔

پانی طبیب دیگا ہمین کیا بجھا ہوا — ہر دل ہی زندگی سے ہمارا بجھا ہوا

کہتے ہین آفتاب قیامت جسے سو وہ — نکلا چراغ داغ دل اپنا بجھا ہوا

پھر دل مین آہ سرد ہوئی میرے شعلہ ور — لو پھر بھڑک اُٹھا یہ فتیلا بجھا ہوا

متبذل ردیف کو خوش فکر شاعر نے کہانتک بلند کر دیا ہے۔

میں ہوں وہ خشت کہن مدتسے اِس ویرانہ میں — برسوں مسجد میں رہا برسوں رہا بتخانہ میں

مستی و ناآشنائی، وحشت و بیگانگی — یا تری آنکھوں میں دیکھی یا ترے دیوانہ میں

ایک پتھر چومنے کو شیخ جی کعبہ گئے — ذوق ہر بت قابل بوسہ ہر اِس بتخانہ میں

ہر شعر حُسن بندش سے ایک شاہد رعنا ہے جسکا کوئی خط و خال بے موقع نہین ہر

کہتے ہین مر جائیں گر چھوٹ جائین غم کے ہاتھ سے — پر تِرے غم سے ہمین مرنیکی بھی فرصت نہیں

ایک دل اور اُسپہ اِتنے بار غم۔ اللہ رے دل — اور اِس طاقت پہ ایسا کوئی بے طاقت نہیں

پہلے شعر مین عدم امکان مرگ کو کس خوبی سے بیان کیا ہے زبان تعریف سے

قاصر ہے مرزا غالب نے بھی اسی تخیل کو نہایت لطافت سے بیان کیا ہے

کس سے محرومیٔ قسمت کی شکایت کیجیے ہمنے چاہا تھا کہ مر جائین سو وہ بھی نہوا

لیکن ذوق غم عشق مین محرومی مرگ کو ایک دلیل کے ساتھ بیان

کرتا ہے ع پر ترے غم سے ہمین مرنے کی بھی فرصت نہیں۔

دوسرے شعر مین جو ندرت ہے یہ مرحوم خاقانی ہند کا حصہ تھا دوسرے شاعر نے

نہ ایسا کہا ہے نہ کہہ سکتا تھا

دیکھ چکے عشق مین جاں وامق و قیس و فرہاد — اور ابھی دیکھیے کس کس کی قضا ہے آئین

اُس جفاکیش کے نامہ کو پڑھوں کیا قاصد — جو کہ قسمت کا لکھا تھا سو لکھا ہے اسمین

جا پڑا پاؤں پہ قاتل کے تڑپ کر کشتہ — سرد ہونے پہ بھی گرمی وفا ہے اسمین

زبان کی سلاست اور بندش کی صفائی کا اگر لطیف مضامین کے واسطے جزو لاینفک ہونا ضروری ہے تو ذوق کی سحر کلامی دیکھیے۔ اس خصوص مین اُسکا کوئی ہمعصر اُس سے بڑھ کر کیا اُسکے برابر بھی نہین ہے۔ تیسرے شعر مین گرمی وفا کو جس انداز سے لکھا ہے اُسکی تعریف زبان سے ادا نہین ہو سکتی۔

عنقا کی طرح خلق سے عزلت گزیں ہوں میں — ہوں اسطرح جہاں میں کہ گویا نہیں ہوں میں

مین وہ نہیں کہ تم ہو کہیں اور کہیں ہوں میں — میں ہوں تمھارا سایہ جہاں تم وہیں ہوں میں

اُس در پہ شوق سجدہ سے فرش زمیں سا ہوں میں — مانند سایہ سر سے قدم تک جبیں ہوں میں

یہ لحاظ لطف بیان اور حسن بندش تینون مطلعے کسقدر مکمل ہین۔ اور قوافی کو ردیف سے کس خوبی کے ساتھ بیان کیا ہے۔

جنوں نے کچھ نہ چھوڑا آخر اپنے جیب و داماں سے — نفس اک تار ہے سینہ میں سمجھو یا گریباں میں

جو لذت آشنائے مرگ ہو تا خضر تو وہ بھی — نہ پیتا آب حیوان ڈوب مرتا آب حیواں میں

قادر الکلام شاعر مشکل سے مشکل مضمون کو بھی سہل الفاظ مین ادا کر سکتا ہے اور ایسے

ہی شعر اہل نظر سے خراج تحسین وصول کرنیکا حق رکھتے ہیں

اُس سنگ آستان پہ جبین نیاز ہے — وہ اپنی جا نمازہ ہو اور یہ نماز ہے
خنجر کہین نہ یار کا بہ جائے ہو کے آب — میرے گلے میں نالۂ آہن گداز ہے

مطلع میں تشبیہ کی ندرت اور شعر میں نالۂ آہن گداز ترکیب فارسی حد سے زیادہ دلکش اور لطیف ہین۔

ذوق یہ دل ہاۓ جگر دونون جلکے خاک ہوئے — رہا ہی سینہ میں کیا چشم خونفشانکے لیے
اُمید ہو گئی ہمسایہ۔ ورنہ خانۂ یاس — بہشت تھا ہمین آرام جاودانکے لیے
بیان درد محبت جو ہو تو کیونکر ہو — زبان دلکے لیے ہی نہ دل زبانکے لیے
مومن خلاف وعدۂ فردا کی ہمکو تاب کہان — اُمید یک شبہ ہی پاس جاودانکے لیے
لیا ہی دلکے عوض جان دے رقیب تو دون — ہین اور آپکی ہو دا اگری زبانکے لیے
وہ لعل روح فزا سے کہان تلک بوسہ — کہ جوہر کم ہی یہان شوق جانفشانکے لیے
غالب بلا سے گر مژۂ یار تشنۂ خوں ہی — رکھوں کچھ اپنی بھی مژگان خونفشانکے لیے
وہ زندہ ہم ہین کہ ہین روشناس خلق اے خضر — نہ تم کہ چور بنے عمر جاودان کے لیے
زبانپہ بار خدایا یہ کس کا نام آیا — کہ میرے نطق نے بوسے مری زبانکے لیے

ایک ہی قافیون میں ذوق، مومن، غالب، کی فکر سخن سے انکی معجز نگار طبائع کی گلکاریون کا اندازہ ہو سکتا ہے۔ ذوق نے جاودان کے قافیہ کو اِس لطافت اور نظامت سے زمین شعر میں سرسبز کیا ہی کہ وہ ہمیشہ تر و تازہ رہیگا۔

غالب نے اِسی جاودان کے قافیہ کو ایک شوخ رنگ کے پالش سے بالکل نیا کر لیا ہے اور یہ غالب ہی کا حصہ تھا۔ مومن نے بھی وعدۂ فردا اور اُمید یک شبہ کا دام بچھا کر قافیہ جاودان کو پھانسنے کی بلیغ کوشش کی مگر قافیہ تڑپ رہا ہے۔ خوں فشاں کے قافیہ کو بھی ذوق نے نہایت سلیس اور لطیف پیرایہ میں ردیف سے وابستہ کیا ہی۔ میرزا غالب نے

اِس قافیہ کو ایک نئے انداز سے لکھکر شعر کا درجہ بہت بلند کردیا ہی زبان کے قافیہ پر ذوق نے جس حُسن بندش سے کام لیا ہی اور حسن آسانی سے بیان درد محبت مین اپنی معذوری کو ثابت کیا ہی وہ تحسین و آفرین سے مستغنی ہی مومن و غالب کے شعر اِس قافیہ مین بہت سُست ہین۔

پھنسے نہ حلقۂ گیسوئے تابدار مین دِل　　　بلا سے گر ہو نوالہ دہان مار مین دل

سانپ کو گیسو سے اور حلقۂ گیسو کو دہان مار سے تشبیہ دی ہے اور اِس طور پر ذوق مرحوم نے ایک کمل مطلع بنا کر یہ ثابت کیا ہے کہ سانپ کے منھ مین دل کا دیدینا بہ نسبت اسکے کہ دل کو مبتلائے عشق کیا جائے بہتر ہی۔ میرزا غالب مرحوم نے بھی اِس تخیل مین طبع آزمائی کی ہے۔

دہن شیر مین جا بیٹھیے لیکن لے دل　　　نہ کھڑے ہو جیے خوبان دل آزار کے پاس

میرزا نے دہن شیر کے بالمقابل خوبان دل آزار دوسرے مصرع مین لکھا ہی تشبیہ نامانوس بھی ہے اور بھدی بھی ہے جس سے ذوق و غالب کا فرق نمایان ہو جاتا ہے۔

دیکھا دم نزع دل آرام کو　　　عید ہوئی ذوق و نے شام کو

خاقانی ہند نے نزع کے وقت کی ملاقات اور اُسکی مسرت کا نقشہ نہایت لطیف تشبیہ مین دکھایا ہے۔ بندش بھی ایسی صاف اور مضبوط ہی کہ نثر مین بھی اِس مضمون کو ادا کرنے مین کوئی لفظ اپنی جگہ سے ہٹایا نہین جاسکتا۔ میرزا غالب مرحوم نے بھی نزع کے وقت کی ملاقات کو ایک مقطع اور پھر ایک شعر مین نظم کیا ہی۔ قارئین کرام خود ذوق و غالب کے انداز بیان اور طرز ادا سے اندازہ فرماسکتے ہین کہ اردو غزل گوئی مین کون کس درجہ پر ہے۔

غالب۔ مند گئیں کھولتے ہی کھولتے آنکھیں غالب　　　یار لائے مری بالیں پہ اُسے پر کسوقت

مند گئیں کھولتے ہی کھولتے آنکھیں ہی ہی　　　خوب وقت آئے تم اِس عاشق بیمار کے پاس

ذوق مرحوم کے کلام سے چند اشعار کا انتخاب کیا جاتا ہے جسمین مکمل محاورات اور ضرب الامثال کو نظم کرکے غزل کی شاعری کو چار چاند لگائے ہین۔ میر علیہ الرحمۃ کے بعد کے شاعر کے کلام مین محاورات کی یہ خصوصی حالت نہین پائی جاتی۔ یہ کلام صحیح طور پر سہل ممتنع کہے جانیکا مستحق ہے۔ بندش اسقدر چست ہی کہ ایک لفظ بھی اپنی جگہ سے ہٹائے جانیکے قابل نہین ہے۔ زبان اسقدر لطیف ہی کہ دوسرے فصیح الفاظ مین ان مضامین کا ادا کیا جانا ممکن نہیں ہے۔ جو حضرات غزل اردو کا مذاق سلیم رکھتے ہیں وہ اندازہ کرسکتے ہیں کہ ذوق کو غزل اردو سے اور غزل اردو کو ذوق سے کیسا گہرا تعلق ہے۔

مین ہجر میں مرنے کے قریں ہو ہی چکا تھا — تم وقت پہ آپہونچے نہیں ہو ہی چکا تھا
آنے سے مرے ٹھہر گئے آپ وگرنہ — جانے کا ارادہ تو کہین ہو ہی چکا تھا
کیا گرم تپش ہوتا تڑپ کر ترے آگے — میں سر دتہ خنجر کہیں ہو ہی چکا تھا

محفل میں شور قلقل مینائے مُل ہوا — لا ساقیا پیالہ کہ توبہ کا قل ہوا

شکر پردہ ہی میں اُس بت کو خدا نے رکھا — ورنہ ایمان گیا ہی تھا خدا نے رکھا
تلخکامی کا رہا بعد فنا بھی یہ اثر — استخوان کو مرے مُنھ پہ نہ ہما نے رکھا

نہ کرتا ضبط میں نالہ تو پھر ایسا دھواں ہوتا — کہ نیچے آسماں کے اک نیا اور آسماں ہوتا

گل اُس نگہ کے زخم رسیدوں میں مل گیا — یہ بھی لہو لگا کے شہیدوں مین مل گیا

کیا کہے کے کترا ہے کہ میں کچھ نہیں کہتا　　کہہ جو تجھے کہنا ہے کہ میں کچھ نہیں کہتا

آدمی ہو کر کمدّر کیا تصور ادراک کا　　خاک کا پتلا ہے یہ۔ کچھ تو اثر ہو خاک کا

دلکی تپش سے زخم جگر کا رات جو ٹانکا ٹوٹ گیا　　طائر جاں جو رشتہ بپا تھا فرصت پا کر چھوٹ گیا

چشم و نگہ کو تیرے سے بدنام کیوں کریگا　　مرگ و قضا کو تیرا عاشق نہ مریگا

کچھ راز نہاں دلکا عیاں ہو نہیں سکتا　　گونگے کا سا ہے خواب بیاں ہو نہیں سکتا

بادام دو جو بھیجے بٹنا بٹوے میں ڈالکر　　ایما یہ ہے کہ بھیجدے آنکھیں نکال کر
قاتل ہے کرم سے سے نمک پاش زخم دل　　بسمل ذرا تڑپ کے نمک کو حلال کر

صفحہ دھر پہ یک دل نہوا ایک سے ایک　　دل کے دو حرف ہین سو وہ بھی جدا ایک سے ایک

نہ ڈال آبلہ اسے گرمی فغاں منہ میں　　کہ چپکا بیٹھا ہوں بھر کے گھنگھنیاں منہ میں

سینہ و دل پہ مرے زخم جگر ہنستے ہین　　ہنسنے دو چارہ گرو۔ ہنستے ہی گھر بستے ہین

مرگئے پر بھی تغافل ہی رہا آنے مین　　بیوفا پوچھے ہے کیا دیر ہے لیجانے مین

جس جگہ بیٹھے ہین با دیدۂ نم اُٹھے ہین   آج کس شخص کا مُنھ دیکھ کے ہم اُٹھے ہین

کہتے تھے آنے کو خاطر سے ہماری برسون   ہوئے برسون ۔ نہوئی پر وہ تمھاری پرسن

اشکباری مری مژگان کی ذرا دیکھین تو   کتنے پانی مین ہین فوّارے ذرا دیکھین تو

بزم صنم مین حضرت دل ذکر کعبہ کیا   تھی جس چمن کی بات گئی اُس چمن کے ساتھ
گندم ہے سینہ چاک فراق بہشت مین   آدم کو کیا نہ ہو گی محبت وطن کے ساتھ

تو جان ہے ہماری اور جان ہی تو سب کچھ   ایمان کی کہین گے ایمان ہی تو سب کچھ

یہ اقامت ہمیں پیغام سفر دیتی ہی   زندگی موت کے آنے کی خبر دیتی ہی
زال دنیا ہے عجب طرح کی علامۂ دھر   مرد دیندار کو بھی دھریہ کر دیتی ہی
فائدہ دے ترے بیمار کو کیا خاک دوا   اب تو اکسیر بھی دیجیے تو ضرر دیتی ہی

ساقیا عید ہے لا بادہ سے مینا بھر کے   کہ پیاسے ہین مے آشام مہینہ بھر کے

جو تھے مژگان پر خون سب وہ خار دلنشین نکلے   جنون یہ کیسے نشتر تھے کہین ڈوبے کہین نکلے
خدا دے دوربینی اور اس چشم تصور کو   کہ لاکھون کام اس سے دور کے دوربین نکلے

خط بڑھا، کاکل بڑھی، زلفین بڑھین، گیسو بڑھے   حُسن کے سرکار مین جتنے بڑھے ہندو بڑھے

جو دل قمار خانہ مین بت سے لگا چکے — وہ کعبتین چھوڑ کے کعبہ کو جا چکے

دشنام ہو کے وہ ترش ابرو ہزار دے — یہ وہ نشہ نہین جسے ترشی اُتار دے
ایسا نہ ہو کہ آتے ہی آتے جواب خط — قاصد جواب زندگی مستعار دے
اے شمع تیری عمر طبیعی ہے ایک رات — ہنسکر گزار یا اُسے رو کر گزار دے
اس جبر پر تو ذوق بشر کا یہ حال ہے — کیا جانے کیا کرے جو خدا اختیار دے

زبان کھولینگے جبھہ بدزبان کیا بدشعاری سے — کہ مین نے خاک بھر دی اُنکے منہ مین خاکساری سے

لائی حیات آئے قضا لے چلی چلے — اپنی خوشی نہ آئے نہ اپنی خوشی چلے
دنیا نے کس کا راہ فنا مین دیا ہے ساتھ — تم بھی چلے چلو یونہین جبتک چلی چلے

تدبیر نہ کر فائدہ تدبیر مین کیا ہے — کچھ یہ بھی خبر ہے تری تقدیر مین کیا ہے

ہم بتون کو اپنے جذب دل سے کھینچ لائینگے — پر بڑے پتھر ہین یہ مشکل سے کھنچ پائینگے

جو دل سے اپنے دم آتشین نکل جائے — فلک کے پاؤن تلے سے زمین نکل جائے

ہم اور غیر یک جا دونون بہم نہونگے — ہم ہونگے وہ نہونگے وہ ہونگے ہم نہونگے

بیقراری کا سبب ہر کام کی اُمید ہے — نا اُمیدی سے مگر آرام کی اُمید ہے

اُلفت کا نشہ جو کوئی مرجائے تو جانے — یہ درد سرایسا ہے کہ سر جائے تو جانے

ہمیشہ کام مجنون کو رہا صحرانوردی سے — بسایا خانۂ زنجیر ہم نے پائے مردی سے

وقت پیری شباب کی باتین — ایسی ہین جیسے خواب کی باتین
پھر مجھے لے چلا اُدھر دیکھو — دلِ خانہ خراب کی باتین

مجھے حضرت ذوق مرحوم کی روح سے ندامت ہی کہ مین نے بہت مختصر حصہ اُنکے دیوان سے منتخب کیا۔ حالانکہ اُنکے کلام معجز نظام کا حق تھا کہ اِس سے بہت زیادہ اشعار منتخب کرکے قارئین کی ضیافت طبع کیجاتی۔ لیکن اِس محدود مضمون کی وسعت کو دیکھتے ہوئے مین معذور تھا اور معافی کے قابل ہون۔

مولوی محمد یحییٰ۔ تنہا۔ بی اے وکیل غازی آباد اپنے ایک مضمون مین آزاد مرحوم کی تبصرہ نگاری پر تنقید کرتے ہوئے تحریر فرماتے ہین "لیکن کوئی سمجھدار اور انصاف پسند شخص اِس بات کو تسلیم نہ کریگا کہ ذوق پر نظم اردو کا خاتمہ ہوگیا یا قادر الکلامی اُن پر ختم ہوگئی۔ میرزا غالب ذوق کے بہت بعد تک زندہ رہی اور آج تغزل مین اُنکا رنگ لاجواب سمجھا جاتا ہے"۔ فاضل مضمون نگار مشاہیر نثر نگارون کی انشاپردازی پر ریویو فرمارہے ہین اور اُنکی اپنی انشاپردازی مین "سمجھدار" ایک اسم فاعل قیاسی موجود ہے اُنھون نے آزاد کی انشاپردازی کو غیر معتبر قرار دیا اور تحریر فرماتے ہین "یہی وجہ ہے کہ جسقدر اسکول اور کالج کے طلبا آزاد کی تحریرات سے محظوظ ہوتے ہین۔ اور دل سے پسند کرتے ہین اُسقدر اہل علم اور مبصر اُن سے حظ نہین اوٹھاتے"

لیکن میری رائے مین آزاد مرحوم نے حضرت ذوق علیہ الرحمۃ کی بابت جو کچھ لکھا ہے وہ ذوق کے مرتبۂ شاعری سے بہت کم ہے۔ مولانا حسرت موہانی جو دیوان غالب کے شارح اور طرز غالب کے دلدادہ ہین اور غالب کو من حیث المجموع اُن کے سب ہمعصرون سے افضل بھی سمجھتے ہین حضرت ذوق کی بابت تسلیم فرماتے ہین کہ "غالب کے ہمعصرون مین اوستاد ذوق سب سے زیادہ محتاط ہین اور صرف اردو شاعری کے لحاظ سے ذوق کا درجہ غالب سے اور غالب کا مرتبہ مومن سے بلند ہی"

بہرحال۔ کل شئی یعرف باضدادہا کے اُصول پر نظر کرکے نہایت ضروری ہی کہ مین میرزا غالب کی اردو شاعری پر بھی تبصرہ کرون تاکہ اہل انصاف دیکھ لین کہ غالب مرحوم نے اردو غزل گوئی مین بعد میر کے کسقدر بلند درجہ حاصل کیا ہے اور ذوق کی غزل گوئی سے غالب کی غزل سرائی کو کیا نسبت ہی۔ مجھے میرزا سے کوئی عداوت نہین ہی بلکہ بحیثیت تبصرہ نگار کے میرزا کے معتقدین کو حقیقت حال سے مطلع کرنا چاہتا ہون اور اُمید کرتا ہون کہ وہ حضرات بھی ٹھنڈے دل سے غور فرمانے کی تکلیف گوارا کرینگے۔

میرزا غالب کی اُردو شاعری

میرزا غالب کو قدرت نے جدت طرز دماغ اور معنی آفرین طبیعت عطا فرمائی تھی۔ گو اُنھون نے اکتساب علوم مین وقت نہین گزارا کسی کے شاگرد بھی نہین تھے۔ گھر کی الماریان کتابون سے خالی تھین۔ اِن باتون سے اُنکے کمال کی تنقیص نہین ہوسکتی بلکہ یہ ثابت ہوتا ہے کہ ملکۂ مضمون آفرینی بلاواسطہ قدرت کا نمونہ تھا۔ حقیقت مین میرزا غالب فارسی کا باکمال شاعر تھا زمانہ کی ضرورتون نے اُسے اردو کا بھی شاعر بنایا۔ دربار دہلی کی وظیفہ خواری کی وجہ سے میرزا کو اردو غزل گوئی بغیر چارہ نہ تھا۔

میرزا نے نہایت بیدلی سے اس خدمت کو انجام دیا۔ جسکی تفصیل آیندہ آئیگی۔ لیکن فیض سخن سے میرزا ابھی محروم نہین رہے کبھی کبھی غزل اردو مین ایسا شعر بھی کہہ جاتے تھے جو بہ لحاظ ندرت دیوانوں کا جواب ہوتا تھا۔ مگر محض اس بنا پر انکو اردو غزل کا کامیاب شاعر قرار نہین دیا جاسکتا۔

یادگار غالب صفحہ ۱۰۵ و ۱۰۶ پر خواجہ حالی مرحوم تحریر فرماتے ہین "میرزا نے ریختہ گوئی کو اپنا فن قرار نہین دیا تھا، بلکہ محض تفنن طبع کے طور پر کبھی اپنے دلکی اُپج سے کبھی دوستونکی فرمایش سے اور کبھی بادشاہ یا ولیعہد کے حکم کی تعمیل کے لیے ایک آدھ غزل لکھ لیتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ اُن کے دیوان مین غزل کی صنف کے سوا کوئی صنف معتدبہ نہین پائی جاتی وہ منشی نبی بخش مرحوم کو ایک خط میں لکھتے ہین "بھائی صاحب تم غزل کی تعریف کرتے ہو اور مین شرماتا ہون۔ یہ غزلین کاہے کو ہین پیٹ پالنے کی باتین ہین۔ میرے فارسی کے وہ قصیدے جن پر مجھکو ناز ہے کوئی اُن کا لطف نہین اُٹھاتا۔ اب قدردانی اِس بات پر منحصر ہے کہ گاہ گاہ حضرت ظل سبحانی فرما بیٹھتے ہین کہ بھئی تم بہت دن سے کوئی سوغات نہین لائے یعنی نیا ریختہ نا چار کبھی کبھی یہ اتفاق ہوتا ہے کہ کوئی غزل کہہ کر لیجاتا ہون"۔ اِس سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ کسقدر بیدلی سے میرزا اردو غزل لکھتے تھے اور اردو غزل گوئی کس حد تک بار خاطر تھی۔ میرزا اپنے ایک طویل فارسی قطعہ مین بھی خود اپنی اردو شاعری کے بابت اظہار رائے فرماتے ہین یہ دونوں شعر زبان زد عام ہین۔

فارسی بین تا ببینی نقشہائے رنگ رنگ ۔۔۔ بگذر از مجموعۂ اردو کہ بے رنگ من ست

راست می گویم من و از راست سر نتوان کشید ۔۔۔ ہر چہ در گفتار فخر تست آن ننگ من ست

میرزا کا غزل گوئی اردو مین کیا طرز تھا اور میر علیہ الرحمۃ کے بعد میرزا سب سے زیادہ کامیاب شاعر غزل اردو کا تھا یا نہین اِس بارہ مین خود میر کی پیشینگوئی سے بہت

کچھ مدد مِل سکتی ہے۔

یادگار غالب صفحہ ۹۸۔ "خود میرزا کی زبانی سُنا گیا ہے کہ میر تقی نے جو میرزا کے ہموطن تھے اُنکے لڑکپن کے اشعار سُنکر یہ کہا تھا کہ اگر اس لڑکے کو کوئی کامِل اوستاد مِل گیا اور اُسنے اس کو سیدھے راستہ پر ڈال دیا تو لاجواب شاعر بن جائے گا ورنہ مہمل بکنے لگیگا۔"

یادگار غالب صفحہ ۱۰۱ پر خواجہ حالی مرحوم میر تقی کی پیشین گوئی کے دونون شقون کو میرزا غالب کے حق مین پورا ہونا تسلیم کرتے ہین لیکن خواجہ کی رائے مین میرزا آخر مین غلط راستہ چھوڑکر صحیح المذاق دوستونکی روک ٹوک سے اور نکتہ چین ہمعصرون کی ذردہ گیری سے صحیح راستہ پر پڑ لیے تھے گویا خواجہ کی رائے مین سامان مذکورہ میرزا کے واسطے اوستاد کامِل تھا جسکی حضرت میر نے نصیحت کی تھی خواجہ صاحب مرحوم بسیار گوئی مین کتنے ہی محتاط ہون لیکن میرزا کی شاگردی کے حقوق نے ان کے دل و دماغ پر ایک ایسا خفیہ غلبہ حاصل کرلیا تھا جسکی وجہ سے وہ دانستہ نہین تو نادانستگی سے ایک مغالطہ مین پڑ گئے اور جو رائے ظاہر فرمائی ہے وہ صحت سے دور ہے اگر میر کی پیشین گوئی صحیح ہے تو اسکی کوئی شق بھی میرزا کے حق مین پوری نہین ہوئی اور میرزا کا کلام معنے کا منت کیش نہین ہو سکتا۔ میرزا نے کبھی اوستاد کامِل کی تلاش نہین کی۔ میرزا اپنے ادعائے کمال کی وجہ سے یا ضد کی وجہ سے کبھی دوست دشمن کے مشورہ یا نکتہ چینی کی پروا نہ کرتے تھے ؎

نہ ستایش کی تمنا نہ صلہ کی پروا   گر نہین ہین مرے اشعار مین معنی نہ سہی

خواجہ کی یہ رائے بھی صحیح نہین ہے کہ میرزا نے کسی خاص زمانہ مین اپنے طرز قدیم کو چھوڑ دیا تھا۔ بلکہ میرزا کا سہل اور مشکل کلام ہر زمانہ مین پایا جاتا ہے ایسا کوئی خاص زمانہ معین نہین کیا جاسکتا کہ میرزا نے اپنے اشعار کو اغلاق کے شکنجہ سے آزاد

فرماکر محض سہل گوئی پر قناعت کی ہو؂۱۲۴۵ھ ہجری مین بقول مولانا آزاد میرزا نے بجائے اسد کے غالب تخلص کرلیا تھا لیکن جب اسد تخلص کرتے تھے اُس زمانہ کی اُن کی ایسی غزلیں موجود ہیں جن میں ثقیل اور وزنی الفاظ کا دخل نہیں ہی اور مطلب بھی اغلاق و اجمال کی دست برد سے محفوظ ہی. شاعرانہ حیثیت سے یہ اشعار دقیق ہوں یا نہوں لیکن معانی سے بیگانہ نہیں ہیں. میں صرف مطلع کا پہلا مصرعہ لکھ کر قارئین سے درخواست کرتا ہوں کہ دیوان غالب میں اِن غزلوں کو ملاحظہ فرمالیں:-

(۱) دوست غمخواری میں میری سعی فرمائینگے کیا (۲) عرض نیاز عشق کے قابل نہیں رہا

(۳) سرگشتگی مین عالم ہستی سے یاس ہی (۴) چاہیے اچھوں کو جتنا چاہیے

(۵) رونے سے اور عشق میں بیباک ہوگئے (۶) عشق مجھکو نہین وحشت ہی سہی

(۷) دیکھنا قسمت کہ آپ اپنے پہ رشک آجائے ہی (۸) دل سے تری نگاہ جگر تک اُتر گئی۔

اگر یہ کہا جائے کہ میرزا نے بہ حیثیت اسد کے ہی دشوار گوئی سے توبہ فرمائی تھی تو اُس زمانہ مین بھی جب میرزا صاحب غالب ہو چکے تھے ایسا کلام موجود ہی جو بعض لوگونکی رائے مین معانی کے لباس مین مستور ہونا نہین چاہتا۔ اِسلیے یہ ماننا پڑیگا کہ میرزا مرحوم کا دماغ جب بے کیف ہوتا تھا تو جو کچھ فرماتے تھے وہ سادہ ضرور ہوتا تھا لیکن بے کیفی بھی ظاہر ہوتی تھی۔ اور جب میرزا کا دماغ کیف وسرور سے بے قابو ہوجاتا تھا تو شعر بھی ایسے نکلتے تھے جو مطالب ومعانی کے ضرورت مند نہین ہوتے تھے اور اُس حالت مین میرزا کی بلند آفرین طبیعت جسقدر مضامین کے دریا بہاتی تھی اُن کا محدود الفاظ مین سما جانا ممکن نہ تھا۔

پھر دیکھیے انداز گل افشانی گفتار رکھدے کوئی پیمانہ وصہبا مرے آگے

یادگار غالب صفحہ ۱۰۲ "میرزا نے ریختہ مین جو روش ابتدا مین اختیار کی تھی ظاہر ہی کہ وہ کسی طرح مقبول خاص وعام نہین ہوسکتی تھی"

یادگار غالب صفحہ ۱۰۳ "میرزا کے ابتدائی کلام کو مہمل و بے معنی کہو یا اُسکو اردو زبان کے دائرے سے خارج سمجھو مگر اسمین شک نہین کہ اس سے اُنکی غیر معمولی اپج کا خاطر خواہ سُراغ ملتا ہے"

یادگار غالب صفحہ ۱۸ "وہ اِس خیال سے کہ اُنکے کلام کی قدر کرنے والے بہت کم تھے۔ اکثر تنگ دل رہتے تھے...... ایک روز قلعہ سے سیدھے نواب مصطفےٰ خان کے مکان پر آئے اور کہنے لگے کہ آج حضور نے ہماری بڑی قدر دانی فرمائی۔ عید کی مبارکباد مین قصیدہ لکھ کرلے گیا تھا۔ جب مین قصیدہ پڑھ چکا تو ارشاد ہوا کہ میرزا تم پڑھتے بہت خوب ہو"

فی الحقیقت میرزا کو اردو غزل اور اردو شاعری کے ساتھ کوئی دلچسپی نہ تھی۔ اگر میرزا کا یہ قصد ہوتا کہ وہ اردو زبان مین فارسی ترکیبونکے اضافہ سے زبان اردو کو وسعت دیں گے تو بھی میرزا مبارکباد کا مستحق تھا اگر میرزا چاہتا تو اپنی توجہ سے غزل اردو کو معراج کمال پر پہونچا سکتا تھا۔ لیکن میرزا نے فارسی شاعری کے جنون میں اردو شاعری سے شدید بیگانگی کا اظہار کیا۔ نثر اردو میں بھی کبھی کبھی اِس بے التفاتی کا ثبوت دیا جسکے نمونے آب حیات صفحہ ۴۸۳ پر آزاد مرحوم نے دیے ہین مثلاً "منشی نبی بخش تمھارے خط نہ لکھنے کا گلہ رکھتے ہین ، (گلہ دارند) "منشی نبی بخش کے ساتھ غزل خوانی کرنا اور ہم کو یاد نہ لانا" (یاد نیاوردن) "جو آپ پر معلوم ہر وہ مجھپر مجہول نہیے" (ہرچہ برشما منکشف است بر من مخفی نماند) یہ غنیمت تھا کہ اُس زمانہ میں میرزا کے ہمعصر میرزا کے کلام کو کوئی وقعت نہ دیتے تھے۔ اگر یہ ساری جماعت میرزا سے متفق الرائے ہو جاتی تو اردو زبان جو فارسی زبان سے نکلی تھی پھر فارسی زبان میں جذب ہو جاتی اور آج ادب اردو کا نام و نشان بھی باقی نہوتا۔

شروع بیسوین صدی عیسوی یا اِس سے کچھ قبل انگریزی تعلیم یافتہ نوجوانونکی

مدروان نگاہیں دیوان غالب پر پڑنے لگیں دیوان غالب کا نصف حصہ اس قدر بلیغ
ثقیل تھا کہ اگر اُسے معانی سے کوئی تعلق بھی ہو تو اسکا معلوم کرلینا دشوار تھا مولانا شوکت
مرحوم میرٹھی نے شرح لکھی لیکن مولانا کا خود اپنا کلام اسقدر دقیق ہے کہ میرزا غالب ہی
سکی شرح لکھ سکتے ہین اسلیے مولانا کی شرح دیوان غالب پر خود ایک حاشیہ کی ضرورت
تھی بہرحال اگر میرزا مرحوم کے اشعار مین معانی مستور ہیں تو وہ ابتک بھی زیر نقاب ہیں
اور مولانا میرٹھی اُن کی پردہ دری نہ کرسکے۔ دوسرے نمبر پر علامہ طباطبائی نے دیوان
غالب کی شرح لکھی گو بہ لحاظ سال تصنیف شرح کا تو دوسرا نمبر ہے لیکن بہ نظر فضل و کمال اور سن
سال کے شارحین کا پہلا نمبر ہے۔ علامہ موصوف نے تشنگان معانی کے سیراب کرنے کے
واسطے اشعار کی تشریح بھی کی۔ تنقید بھی کی۔ اور کہیں کہیں میرزا کے کلام مین اصلاح
بھی کی۔ بعض مواقع پر تعریض کے تبصرہ نگاری کا حق ادا کیا ہے۔ شاعری کے بہت سے
نکات درج فرماکر شرح کو وزنی کردیا ہے۔ یہ امر کہ شرح کامیاب ثابت ہوئی یا نہیں بہت
غور طلب ہے۔ علامہ کی شرح کی بابتہ مولانا نجو دموہانی کو بہت سے شکوک ہیں۔ الناظر اور
اودھ پنچ مین عرصہ تک یہ تذکرہ جاری رہا ہے۔ مولانا نجو دایک نوجوان اور ہونہار ادیب
ہین اُن کا ذوق سخن۔ تبحر علمی۔ اور وسعت معلومات دیکھ کر بے اختیار دل سے دُعا
نکلتی ہے خدا اِس نوجوان کو عمر کثیر عطا فرماوے اور استقلال و ہمت کے ساتھ ادب اردو
کی خدمت کرنے کی توفیق دے۔ مولانا نجو دموہانی بھی دیوان غالب کی ایک شرح
تیار کرچکے ہین جو ابھی شایع نہین ہوئی ہے اور مولانا نے اُمید دلائی ہے کہ انھوں نے
اپنی شرح میں اِس امر پر بھی روشنی ڈالی ہے کہ مشکل اشعار کی تشریح مین علامہ طباطبائی،
کہانتک کامیاب ہوئے ہین اور انکی تعریض و تنقید کیا وقعت رکھتی ہے لیکن غالب مرحوم
کے سہل کلام کی تشریح میں بھی عالیجناب علامہ طباطبائی نے ایسی بلند پروازی سے کام
لیا ہے کہ الفاظ اور معانی میں زمین و آسمان کا فرق ہوگیا ہے مین چند نمونے پیش کرکے

علامہ موصوف سے التجا کرتا ہوں کہ اگر ممکن ہو تو نظر ثانی فرما کر شرح دیوان غالب کو اِس قابل کر دیں کہ وہ بجا طور پر علامہ کی ذات سے منسوب ہو سکے۔ اِس شرح کے بعد مولانا حسرت موہانی اور حضرت سہا نے شروح لکھنے کی زحمت گوارا فرمائی ہے۔ ممکن ہے کہ دلدادگان کلام غالب اُن جملہ شروح سے اب تک مطمئن نہ ہوئے ہوں لیکن کثرت تعداد شروح و شارحین سے ایک دلیل ترجیح کلام میرزا پر دستیاب ہو گئی ہے جسکو یہ لوگ کام مین لاتے ہیں میری رائے مین اردو غزل کا حسن یہ ہے کہ سامع کے کانوں مین پہونچکر فوراً دل مین اُتر جائے۔ میرزا کا کلام نصف صدی سے زیادہ عرصہ ہوا کہ دماغون مین چکر لگا رہا ہے اور ابھی قلوب اُس سے مطمئن اور مسرور نہین ہوئے ہیں۔ اِن حالات میں اُس انجمن ادب اردو کی صدارت جو میرؔ کی وفات کے بعد قائم ہوئی تھی میرزا غالب مرحوم کو پیش نہین کیجا سکتی۔ نہ میرزا غزل اردو کے کامیاب شاعر قرار پا سکتے ہیں۔

علامہ طباطبائی کے نکتہ رس ذہن نے عجیب معجز نمائی کی ہے میرزا کا سہل کلام بھی جسکو خواجہ حالی میرزا کے شاعری کا ماحصل قرار دیتے ہین تبدیلی معانی سے "مشکل کلام" کے مد مین داخل ہوا جاتا ہے۔ مین علامہ شارح کے فضل و کمال کا احترام کرتے ہوئے چند نمونے پیش کرنے کی جرأت کرتا ہون جسکا وعدہ کیا تھا۔

میرزا غالب: پڑھتا ہوں مکتب غم دل میں سبق ہنوز ۔۔۔ لیکن یہی کہ رفت گیا اور بود تھا

علامہ طباطبائی۔ غم وہ کیفیت نفسانی ہے جو مطلوب کے فوت ہو جانے پر پیدا ہو مطلب یہ ہے کہ مکتب غم میں میرا سبق یہ ہے کہ رفت گیا اور بود تھا یعنے زمانہ عیش کبھی تھا اور اب جاتا رہا۔

راقم۔ میں مکتب غم دل مین ابھی مبتدی ہوں اور یہ سبق پڑھ رہا ہوں۔ رفت گیا۔ بود تھا۔ جس نے مکتبوں مین فارسی صرف کی پہلی کتاب صفوۃ المصادر پڑھی ہو گی اس کو اس ابتدائی

سبق کا بخوبی اندازہ ہوگا۔

میرزا غالب کیا آئینہ خانہ کا وہ نقشہ تیرے جلوے نے کرے جو پرتو خورشید عالم شبنمستان کا

علامہ طباطبائی۔ یعنی جس طرح آفتاب کے سامنے شبنم نہیں ٹھہر سکتی اُسی طرح تیرے مقابلہ کی تاب آئینہ نہیں لا سکتا۔ آئینہ خانہ کی تشبیہ شبنمستاں سے تشبیہ مرکب ہے۔

راقم۔ خورشید کے پرتو سے شبنم کا ہر قطرہ آفتاب کی طرح چمک اوٹھتا ہے۔ اسی طرح تیرے جلوے نے آئینہ خانہ کا یہ نقشہ کر دیا کہ ہر آئینہ شبنم کے ہر قطرہ کی طرح تیرے جلوہ سے منور ہو گیا یعنے ہر آئینہ مین تیرا پورا عکس نظر آنے لگا۔

میرزا غالب۔ آبرو کیا خاک اُس گل کی کہ گلشن میں نہیں ہے گریباں ننگ پیراہن جو دامن میں نہیں

علامہ طباطبائی۔ گریباں دامن میں جب ہی ہوگا جب چاک ہو جائیگا اور چاک ہو کر گل سے مشابہت پیدا کریگا۔ اور دامن کو صحن گلشن بنا دیگا۔

راقم۔ جب گریبان دامن سے جدا ہو جاتا ہے تو وہ ایک پھٹا ہوا چیتھڑا ننگ پیراہن خیال کیا جاتا ہے اسی طرح سے جن پھولوں کا چمن سے افتراق ہو جاتا ہے وہ بے آبرو ہو جاتے ہیں۔

میرزا غالب۔ ظلم کر ظلم اگر لطف دریغ آتا ہو تو تغافل میں کسی رنگ سے معذور نہیں

علامہ طباطبائی۔ یعنے تغافل تو نا آشنائی محض ہے یہ مجھے کیونکر گوارا ہو۔

راقم۔ یعنے تغافل کے معنی معذوری نہیں ہیں تو مجھپر ظلم بھی کر سکتا ہے لطف بھی کر سکتا ہے اگر لطف کرنے سے دریغ ہے تو ظلم ہی سہی کچھ تو ہو۔

میرزا غالب۔ حسد سے دل اگر افسردہ ہے گرم تماشا ہو کہ چشم تنگ شاید کثرت نظارہ سے وا ہو

علامہ طباطبائی۔ تنگ چشم ہونا حاسد کی صفات مین سے ہے۔ گرم تماشا ہو یعنے دنیا کو دیکھ۔ حاصل یہ کہ تجربہ کے بعد تجھے معلوم ہو جائیگا کہ حسد کرنا بیجا ہے۔ دنیا مین دولت کے لیے کوئی سبب نہین درکار ہے ہر جگہ یہی حال ہے۔

راقم۔ عالم کی سیر کرنا۔ حسد کا علاج تجویز کیا گیا ہے یعنے کثرت سیر و سفر سے مختلف حالتوں کے لوگوں کو دیکھنے کا موقع ملیگا اور تنگ نظری رفع ہو جائیگی۔

میرزا غالب: وارستگی بہانۂ بیگانگی نہیں اپنی سے کر نہ غیر سے وحشت ہی کیوں نہو

علامہ طباطبائی۔ یعنے وارستگی اور آزادی اس کا نام نہیں ہے کہ بیگانگی و وحشت کا بہانہ کر لیا۔ اور ہم سمجھے کہ دنیا سے آزاد ہو گئے۔ ارے بیگانگی و وحشت بھی کر تو اپنے نفس سے کر نہ غیر سے۔

راقم۔ وارستگی کو بیگانگی کا حیلہ نہ بنانا چاہیے۔ یعنی آزادمزاجی کا لازمہ بیگانگی نہیں ہے۔ خواہ کتنی ہی وحشت دامنگیر ہو لیکن دوست دشمن سے بیگانگی نہ برتنا چاہیے۔ یہ اصول با ہمہ او بے ہمہ کی تعلیم ہے۔

میرزا غالب۔ موت کی راہ نہ دیکھوں کہ بن آئے نہ رہے تم کو چاہوں کہ نہ آؤ تو بلائے نہ بنے

علامہ طباطبائی کہتے ہیں میں موت کی راہ کیوں نہ دیکھوں کہ وہ بغیر آئے نہیں رہیگی۔ یہ مجھ سے نہیں ہوگا کہ تم سے کہوں کہ تم نہ آؤ کہ پھر مجھ سے بلاتے بھی نہ بن پڑے۔ یعنے آپ ہی آنے کو منع کروں تو پھر کس منھ سے بلاؤں۔ اشارہ اس بات کی طرف ہے کہ تمھارے نہ آنے سے موت کا آنا بہتر ہے

نوٹ:۔ اس شعر کی شرح میں مولانا حسرت موہانی نے بھی دماغ پر بہت زور دیا ہے گو مولانا کی شرح بھی اصل مطلب سے بہت دور ہے لیکن انکی ذہن کاوی بھی نظر انداز کرنیکے قابل نہیں ہے مولانا حسرت کی موشگافیاں بھی قارئین کے انفراح طبع کا باعث ہونگی۔ وہو ہذا۔

مولانا حسرت۔ مجھکو موت کی راہ نہ دیکھنا چاہیے کیونکہ وہ خواہ مخواہ آئے گی۔ علاوہ اس کے موت کی خواہش کرنے میں یہ بات بھی پیدا ہوتی ہے کہ میں چاہتا ہوں کہ تم نہ آؤ اور اگر ایسے خیال کا شبہ بھی میری نسبت ہوا تو میں پھر کبھی تم کو بلانے کے قابل نہ رہونگا۔ یعنے ایسا خیال رکھکر پھر کس منھ سے تمھیں بلاؤنگا۔

مرزا رجب علی سرور مرحوم

- فسانۂ عجائب
- انشائے سرور ۶ر

امیر مینائی مرحوم

- امیر اللغات (مکمل)
- صنم خانۂ عشق
- مراۃ الغیب
- محامد خاتم النبیین ۸ر
- مینائے سخن
- مکاتیب امیر مینائی

جلال مرحوم

- سرمایۂ زبان اردو
- منشورات دلکش
- نظم نگارین
- رسالۂ تذکیر و تانیث ۸ر
- افادۂ تاریخ ۸ر
- قواعد المنتخب

مرزا محمد عباس ہوش مرحوم

- فسانۂ نادر جہان
- پیاری سہیلی ۱۲ر
- دفتر سحر ۸ر
- سیمین ۱۲ر

منشی افضل حسین ثابت

- حیات دبیر
- دربار حسینی

پنڈت رتن ناتھ سرشار

- فسانۂ آزاد ۴ جلد
- سیر کہسار
- خدائی فوجدار
- جام سرشار
- الف لیلیٰ بطرز ناول
- کامنی
- پچھڑی دلہن

منشی سجاد حسین مرحوم

- احمق الذین ۸ر
- حاجی بغلول ۸ر
- پیاری دنیا ۸ر
- کایا پلٹ ۸ر
- میٹھی چھری ۶ر
- طرحدار لونڈی
- طلسمی فانوس

منشی جوالا پرشاد برق

- مرزالنی ۱۲ر
- مار آستین ۱۲ر
- بنگالی دلہن ۱۲ر
- معشوقۂ فرنگ ۱۲ر
- پرتاب ۱۲ر
- روہنی ۱۰ر

پریم چند

- پریم پچیسی
- بازار حسن

مولانا عبد الحلیم شرر

- جنید بغدادی
- خواجہ معین الدین چشتی ۶ر
- تذکرۂ مشاہیر عالم
- مقدرات
- قیس و لبنیٰ
- مقدس نازنین
- ایام عرب
- فتح اندلس
- ماہ ملک
- حسن کا ڈاکو
- دربار حرام پور ۱۰ر
- الفانسو ۱۲ر
- مفتوح فاتح
- فلپانا
- زوال بغداد
- لعبت چین
- عزیزۂ مصر
- جویائے حق
- بابک خرمی
- طاہرہ
- فلورا فلورنڈا
- یوسف و نجمہ
- گزشتہ لکھنؤ
- شاعرانہ و فلسفیانہ مضامین
- آغاز و ختم سال
- سیر رجال
- تاریخی و جغرافی مضامین
- یہ مانا بازنا ہے ید ناول

حکیم محمد علی خان مرحوم

- رام پیاری کامل
- عبرت کامل
- حسن سرور کامل
- اخترِ حسینہ
- بیوی لیلیٰ
- جعفر و عباسہ

شفیق عماد پوری مرحوم

- ترانۂ شوق
- تماشۂ زہرا
- نیرنگ جمال
- نگینہ ۱۲ر
- میکفرن و رلوسی

الف عشرت

- خواجہ حسن و عشرت

؟

- زبان دانی
- اصلاح زبان اردو ۶ر
- قواعد میر ۶ر
- اصول اردو ۶ر
- جان اردو ۶ر
- شاعری کی پہلی کتاب
- 〃 〃 دوسری ۸ر
- 〃 〃 تیسری ۸ر
- لغات اردو

منشی محمد حسن وحشی

- مجوس گنشت
- جام زہر

مولانا حکیم عبد الحی مرحوم

- یاد ایام
- تذکرۂ گل رعنا

حکیم احمد حسین الہ آبادی

- تاریخ ابن خلدون حصہ اول
- 〃 〃 〃 دوم
- 〃 〃 〃 سوم
- 〃 〃 〃 چہارم
- 〃 〃 〃 پنجم
- 〃 〃 〃 ششم
- 〃 〃 〃 ہفتم
- 〃 〃 〃 ہشتم
- 〃 〃 〃 نہم
- 〃 〃 〃 دہم
- 〃 〃 〃 یازدہم
- سلطان صلاح الدین
- نور الدین محمود

مولوی محمد حلیم انصاری

- تمدن اسلام
- فتح اندلس
- ابو مسلم خراسانی
- تاریخ عرب

مولوی حبیب الرحمن خان شروانی

- سیرۃ الصدیق
- علمائے سلف
- تذکرۃ الشعراء حسن

حافظ اسلم جیراجپوری

- سیرۃ الرسول
- خلافت راشدہ
- خلافت بنو امیہ
- خلافت بنو عباس
- عباسیۂ بغداد
- علوم عرب

قاضی محمد سلیمان منصور پوری

- رحمۃ للعالمین
- سفر نامۂ حجاز

مولوی خلیل الرحمن

- انجام الاندلس ۲ جلد
- تاریخ سولہ دین
- مختصر تاریخ اسلامی
- عذرا

مولوی محمد انشاء اللہ

- سیرۃ الرسول
- تاریخ آل عثمان
- حالات عراق و ترکستان
- حالات قسطنطنیہ
- تاریخ مراکش و مغرب الاقصیٰ

مفتی سید احمد مارہروی

- آثار اکبری
- حیات خسرو
- امرائے ہنود

گوتم بدھ ۔ مہاتما بدھ کی مختصر سوانحعمری اور ان کی مذہبی تعلیم نہایت دلکش انداز میں لکھی گئی ہے ۔ قیمت

ملنے کا پتہ ۔ الناظر بک ایجنسی ۔ لکھنؤ

مولوی عزیز مرزا مرحوم
- خیالات عزیز
- کرم اردوسی

خواجہ عباد اللہ اختر
- صدیق اکبر
- حضرت زید ۶ر
- مشاہیر اسلام
- بغداد
- دمشق
- دیوان حافظ مع شرح

مفتی انوار الحق ایم اے
- تاریخ ابو البشر
- تذکرة الحبیب
- حقایق اسلام

میر ولی اللہ بی اے
- بندگی
- کاس الکرام
- لسان الغیب جلد اول
- " " دوم
- " " سوم
- " " چہارم

سید راس مسعود بی اے
- نصاب اردو
- جاپان کا تعلیمی نظم
- انتخاب زرین

مولانا حسرت موہانی
- شرح دیوان غالب
- مکمل دیوان حسرت

سید سجاد حیدر بی اے
- خیالستان
- ثالث بالخیر ۸ر
- زہرا ۱۲ر
- جلال الدین خوارزم شاہ

مسٹر مظفر عمر بی اے
- چوروں کا کلب ۹ر
- نیلی چھتری
- بہرام کی گرفتاری
- مستقبل اسلام

پروفیسر فیروز الدین مراد
- تحفۂ سائنس
- بادل کے نیچے
- خونابۂ عشق

حکیم احمد شجاع بی اے
- باپ کا گناہ
- حسن کی قیمت

منشی عبد المجید سالک بی اے
- راہ و رسم منزلہا ۸ر
- پچھاوا گرا فلسفے
- چترا (ٹیگور) ۱۲ر

منشی احمد علی بی اے
- تاریخ تمدن
- شباب لکھنؤ

مولوی عبد الماجد بی اے
- فلسفۂ جذبات
- مکالمات برکلے
- پیام امن
- تصوف اسلام
- فلسفیانہ مضامین
- زرد پشیمان ۸ر

منشی محمد لطیف بی اے
- اکبر
- اورنگ زیب
- رنجیت سنگھ
- لارڈ کلایو

پروفیسر نواب علی ایم اے
- معارج الدین
- تذکرة المصطفی
- صحف سماوی
- شمع سخن ۱۰ر

پروفیسر الیاس برنی ایم اے
- جذبات فطرت چھپ رہے
- معارف ملت
- مناظر قدرت
- علم المعیشت

مولوی سید سلیمان ندوی
- ارض القرآن
- سیرة عائشہؓ
- حیات امام مالک
- خلافت عثمانیہ اور اسلام
- خلافت اور ہندوستان

مولوی عبد السلام ندوی
- اسوۂ صحابہؓ ۲ جلد
- سیرة عمر بن عبد العزیزؒ
- انقلاب الامم
- تاریخ الحرمین الشریفین
- انقراض اسلام
- فطرت نسوانی
- شعر الہند ۲ جلد

مولوی عبد الباری ندوی
- مبادی علم انسانی
- برکلے کا فلسفہ

مولوی سعید انصاری
- سیر الصحابہ جلد اول
- سیر الانصار ۲ جلد
- سیر الصحابیات

مولوی عبد الرزاق ندوی
- اسوۂ حسنہ
- کتاب الوسیلہ
- ترکی اور یورپ ۶ر

خواجہ حسن نظامی
- قرآن آسان قاعدہ
- میلاد نامہ
- محرم نامہ
- فاطمی دعوت اسلام
- ذکر غوث پاک ۱۲ر
- کرشن جیون
- شامی جہاد
- سیپارۂ دل
- کم تو موت
- چٹکیاں اور گدگدیاں
- اتالیق خطوط نویسی ۱۲ر
- خطوط حسن نظامی ۱۲ر
- بیوی کی تعلیم
- بیوی کی تربیت
- اولاد کی شادی
- جگ بیتی کہانیاں
- آپ بیتی
- بچوں کی کہانیاں ۱۲ر
- سیر دہلی ۱۲ر
- سفرنامہ ممالک اسلامیہ
- غدر دہلی کے افسانے
- یزید نامہ
- طمانچہ بر رخسار یزید
- اردو دعائیں ۸ر
- تسکین احساس ۸ر
- روزنامچۂ ہند ۱۲ر
- اسلام کا انجام ۶ر
- تسخیر مہر و قہر ۱۰ر

مولوی عبد الراشد الخیری
- الزہرا ۱۲ر
- صبح زندگی
- شام زندگی
- شب زندگی
- نوحۂ زندگی ۱۲ر
- دُرِ شہوار ۱۰ر
- منازل السائرہ
- سراب مغرب ۸ر
- بنت الوقت ۸ر
- قطرات اشک
- جوہر قدامت
- عروس کربلا
- یاسمین شام
- تیغ کمال
- ماہ عجم
- آفتاب دمشق
- سمرنا کا چاند

نیاز فتحپوری
- گیتان جلی
- گہوارۂ تمدن
- نگارستان
- صحابیات
- تاریخ الدولتین

یاس عظیم آبادی
- چراغ سخن
- نشتر یاس ۸ر

تاریخ اندور - یعنی مرہٹوں کے استقلال، مسلمانوں کی شجاعت اور انگریزوں کی حکمت کا آئینہ از دوشانی خان، قیمت ۱۲ر

ملنے کا پتہ:- الناظر بک ایجنسی۔ لکھنؤ

رجسٹرڈ نمبر اے ۴۷۸

ہوالمستعان

الناظر

ایڈیٹر۔ ظفرالملک علوی

الناظر پریس لکھنؤ میں باہتمام اسحاق علی علوی چھپا

قیمت سالانہ للعہ

قیمت فی پرچہ ۸ر

بسم اللہ الرحمن الرحیم

اُردو کی بہترین کتابیں

محصول معاف
عہ کی روانگی پر آدھا اور عہ کی روانگی پر پورا

ہدیۂ تبصرے
عہ کی روانگی پر النا ظر ایک ۱ور ۱ر کی روانگی پر عہ کی کتابیں

مرزا غالب مرحوم
- اُردوئے معلیٰ عہ
- عودِ ہندی عہ
- دیوانِ غالب حبیبی عہ
- مکمل دیوانِ غالب عہ

سر سید مرحوم
- خطبات احمدیہ عہ
- مکمل مجموعہ لکچر للعہ
- اسبابِ بغاوتِ ہند ۸ر
- سیرتِ فریدیہ ۱۰ر
- خطوطِ سر سید عہ

نواب محسن الملک مرحوم
- مضامین تہذیب الاخلاق للعہ
- مکمل مجموعہ لکچر للعہ
- تقلید و عمل بالحدیث ۱۲ر
- کتابت المحبت و الشوق ۱۲ر
- مکاتیب عہ
- مسلمانوں کی تہذیب ۶ر

خلیفہ محمد حسین مرحوم
- اعجاز التنزیل للعہ
- سفرنامہ بریزرا جلد للعہ

مولانا آزاد مرحوم
- آبِ حیات عہ
- دربارِ اکبری عہ
- سخندانِ فارس عہ
- نگارستانِ فارس عہ
- نیرنگِ خیال عہ
- سیرِ ایران عہ
- ڈرامہ اکبر عہ
- مجموعہ مکتوباتِ آزاد عہ
- مجموعہ نظمِ آزاد ۱۲ر
- نصیحت کا کرنپھول ۲ر
- جانورستان ۱۰ر
- بیاضِ آزاد عہ
- تذکرۂ علماء ۵ر
- لغتِ آزاد عہ
- دیوانِ ذوق مرتبہ آزاد عہ

پروفیسر شہباز مرحوم
- زندگانی بے نظیر عہ
- خیالاتِ شہباز عہ

مولوی سید ممتاز علی
- تذکرۃ الانبیاء عہ
- فصیح حسن عہ

مولانا نذیر احمد مرحوم
- حمائل شریف مترجم عہ
- الحقوق و الفرائض عہ
- بنات النعش [illegible]
- مراۃ العروس ۱۰ر
- توبۃ النصوح ۹ر
- موعظۂ حسنہ عہ
- رویائے صادقہ عہ
- ایامیٰ عہ
- فسانۂ مبتلا عہ
- ابن الوقت عہ
- مصائبِ غدر ۱۰ر
- مجموعہ نظمِ بے نظیر عہ
- مکمل مجموعہ لکچر عہ
- منتخب الحکایات ۶ر
- چند پند ۶ر
- مبادی الحکمت عہ

مولانا شرر مرحوم
- حیاتِ انیس عہ
- ایشیائی شاعری عہ
- نور جہان بیگم ۸ر
- ٹیپو سلطان عہ
- حیدر علی سلطان عہ

مولانا حالی مرحوم
- یادگارِ غالب عہ
- حیاتِ سعدی عہ
- مقدمہ شعر و شاعری عہ
- حیاتِ جاوید للعہ
- دیوانِ حالی عہ
- مسدسِ حالی عہ و ۸ر
- مجموعہ نظمِ حالی عہ
- بیوہ کی مناجات ۲ر
- شکوۂ ہند ۲ر

مولوی بشیر الدین احمد
- واقعاتِ دار الحکومت دہلی عہ
- تاریخِ بیجاپور عہ
- تحفۂ طفلاں عہ
- نشاطِ عمر عہ
- عطیۂ پیری عہ
- لغتِ جگر عہ
- حسنِ معاشرت عہ
- اصلاحِ معیشت عہ
- اقبال دُلہن عہ
- شمعِ ہدایت عہ
- انشائے بشیر عہ
- دیوانِ بشیر عہ

مولانا شبلی مرحوم
- سیرۃ النبی جلد اول عہ
- سیرۃ النبی جلد دوم للعہ
- 〃 〃 سوم عہ
- الفاروق عہ
- سیرۃ النعمان عہ
- الغزالی عہ
- المامون عہ
- سوانح مولانا روم عہ
- سفرنامہ مصر و روم و شام عہ
- علم الکلام عہ
- الکلام عہ
- رسائلِ شبلی عہ
- مقالاتِ شبلی عہ
- شعر العجم جلد اول عہ
- 〃 〃 دوم عہ
- 〃 〃 سوم عہ
- 〃 〃 چہارم عہ
- 〃 〃 پنجم عہ
- موازنۂ انیس و دبیر عہ
- مضامینِ عالمگیر عہ
- آغازِ اسلام ۸ر
- مجموعہ کلامِ شبلی اردو ۱۰ر
- کلیاتِ شبلی فارسی عہ

مولانا ذکاء اللہ
- تاریخِ ہندوستان جلد ششم عہ
- تاریخِ عہدِ سلطنتِ انگلشیہ عہ
- کرزن نامہ عہ
- آئینِ قیصری عہ
- صحیفۂ فطرت عہ
- تعلیم الاتفاق عہ
- محاربات عظیم ۸ر
- جغرافیہ ریاضیہ ۱۲ر
- جغرافیہ طبعی ۸ر
- اہلِ عرب کا جبر و مقابلہ ۶ر
- رسالہ علمِ تناسب ۶ر
- معاون الحساب ۱۲ر
- مساحت تا ڈی ہنٹر ۱۲ر

سید محمود مرحوم
- کتاب الطلاق عہ
- کتاب الشفعہ عہ
- لکچر ۱۲ر
- شرح قانونِ شہادت عہ

مولوی سید احمد انصاری
- المدینۃ و الاسلام عہ
- تحریر المراۃ عہ

ملنے کا پتہ :- الناظر بک ایجنسی ۔ لکھنؤ

بسم اللہ

فہرست مضامین الناظر بابت ماہ ستمبر ۱۹۲۶ء

نمبر ۳ | جلد ۳۱

نئی کتابیں

نظریۂ اضافیت

(تالیف پروفیسر منہاج الدین - ایم ایس سی)
جرمنی کے نامور سائنسداں آئن اسٹائن نے سر اسحاق نیوٹن کے مشہور نظریۂ تجاذب اجسام پر ترقی کرکے ایک نیا نظریہ قائم کیاہے جسے نظریۂ اضافیت (Relativity Theory) کہتے ہیں۔ اور جسمیں تجاذب و کشش کے بغیر بھی اجسام میں حرکت کا پایا جانا ثابت کیا گیا ہے - پروفیسر منہاج الدین صاحب نے اسی نظریہ کی توضیح و تشریح پر یہ لاجواب کتاب لکھی ہے - مقدمہ میں پروفیسر آئن اسٹائن موجد نظریۂ اضافیت کے مختصر حالات اور آخیر میں انگریزی مصطلحات اور انکے تراجم کی ایک فہرست دیگئی ہے۔ کتاب پر بہت خوشنما انگریزی جلد ہے جسپر کتاب اور مصنف کا نام سنہرے حروف میں چھپا ہوا ہے۔ قیمت غیر مجلد للعہ مجلد ۱۲ آر

ہیئت جدید

(تالیف پروفیسر منہاج الدین ایم ایس سی و پروفیسر برکت علی ایم اے) مصنف نظریۂ اضافیت نے پروفیسر برکت علی ایم اے کی مدد سے ہیئت جدیدہ پر تین ضخیم جلدیں تصنیف فرمائی ہیں۔ بڑی خوبی اس کتاب میں یہ ہی کہ جا بجا ہیئت قدیم سے بھی مقابلہ کیا گیا ہے ۔ قیمت حصہ اول ۱۲ر حصہ دوم ۱۲ر حصہ سوم ۱۲ر

زینت آسماں

(تالیف پروفیسر برکت علی ایم اے و پروفیسر منہاج الدین ایم ایس سی) ستاروں کی شناخت پر اُردو میں پہلی کتاب ہے - اس کتاب میں ستاروں کے بارہ نقشے ہیں اور ہر نقشے کے ساتھ خاص خاص ستاروں کے مختصر حالات بھی قلمبند کردیے ہیں کہ ستاروں کے پہچاننے میں کوئی دقت نہ ہو۔ قیمت ۱۲ر

روح تنقید

(تالیف سید غلام محی الدین قادری زور بی اے) سید محی الدین زور کے جنکا ایک مضمون اسی پرچہ میں ملاحظہ سے گذریگا، فن تنقید پر یہ دلچسپ و مفید کتاب لکھی ہے، جسمیں مقاصد و اصول تنقید پر مشرقی و مغربی نقطہ ہائے نظر سے بہت اچھی بحث کی گئی ہے اور نمونہ کے طور پر مثنوی سحر البیان پر تنقید بھی پیش کی گئی ہے تنقیدی مضامین لکھنے والوں کے لیے بہت کارآمد ہوگی ۱۲ آر

طلسم تقدیر

مصنف روح تنقید کا ایک دلچسپ افسانہ ہے، جس میں شہنشاہ اورنگ زیب کے آخری ایام کی ایک عبرت خیز داستان بیان ہوئی ہے۔ شروع میں عبدالقادر صاحب بی اے کے قلم سے فن افسانہ نویسی پر ایک مختصر مقدمہ بھی ہے - قیمت ۸ر

بسم اللہ الرحمن الرحیم

الناظر

نمبر ۳ جلد ۳۱ — ستمبر سنہ ۱۹۲۶ء

نظرے خوش گذرے

جنوری نمبر میں نئے انعامی مقابلہ کا اعلان کیا گیا تھا۔ مضمون ایسا تجویز کیا گیا تھا کہ شعر و شاعری سے دلچسپی رکھنے والوں کی کثرت کو دیکھتے ہوئے یہ توقع شاید بیجا نہ تھی کہ انشاپردازی کے عنوان سے زیادہ طبع آزمائی کرنے والے اہل قلم کی توجہ اس طرف مائل ہوگی۔ لیکن رقم انعام کی کمی یا کسی دوسرے سبب کے بدولت افسوس ہے کہ سوائے میرے دیرینہ کرم فرما جناب قاضی غلام امیر صاحب امیر بدایونی کے اور کسی صاحب نے اس مقابلہ کے لیے مضمون لکھنے کی زحمت گوارا نہ فرمائی۔ قاضی صاحب کا اس پیرانہ سالی میں اتنی جواں ہمتی ظاہر فرمانا غایت درجہ موجبِ امتنان ہے، خصوصًا اس لیے کہ انعام کی رقم اُنکے ذوقِ نگارش کے لیے وجہِ تحریک نہیں ہوسکتی تھی۔

چونکہ اور کسی صاحب کا مضمون نہیں آیا اسلیے طباعت سے قبل اراکین مجلس انتخاب کی خدمت میں اظہار رائے کی غرض سے مضمون بھیجنے کی ضرورت نہیں رہی۔ بلکہ انشاءاللہ الناظر کے آیندہ دو نمبروں میں یہ مضمون شایع ہو جائے گا۔ اور اگر اراکین کی رائے میں مضمون لائق انعام ہوگا تو قاضی صاحب کی خدمت میں الناظر کا نذرانہ روانہ کر دیا جائے گا۔

انعامی مقابلہ کا جو مقصد تھا وہ چونکہ اس طریقہ پر نہیں پورا ہوتا، اسلیے اب جب تک بہت کافی رقم کا انتظام نہ ہو جائے یہ سلسلہ جاری نہ رہے گا۔

حجاج کی واپسی نے مسلمانوں پر انتشار و تفریق کے دروازے کھول دیے ہیں۔ اور اگرچہ ڈاکٹر کچلو صاحب اور بعض دیگر اصحاب کوشش فرما رہے ہیں کہ ہمارے رہنماؤں کے درمیان کوئی ایسی صورت مفاہمت پیدا ہو جائے جس سے آپس کی یہ تفریق رفع ہو جائے، مگر اندیشہ ہے کہ اُنکی کوششیں زیادہ بار ور نہ ہوں گی۔ بہرحال نتیجہ جو کچھ ہو، اُنکی یہ سعی لایق شکرگزاری ہے۔

ابھی تک ہندو لیڈروں کی اس نادانی پر ماتم کیا جاتا تھا کہ اُنکی بے بصیرتی سے ملکی کام برباد ہو گیا اور جو قوتیں جنگ آزادی پر صرف ہونا چاہیے تھیں وہ باہمی خانہ جنگی میں رائیگاں ہو رہی ہیں، مگر یہ کیا بدبختی ہے کہ جو لوگ اس مصیبت عظمیٰ پر غیروں کو ملامت کر رہے تھے اور باوجود انتہائی اشتعال کے صبر و سکون کے پیکر بنے ہوئے تھے وہ خود مسلمانوں کے اندر خانہ جنگی کی آگ کو ہوا دے رہے ہیں۔

خدام الحرمین کی تعمیر جن عناصر سے ہوئی ہے اُن میں غالب حصہ اُنکا ہے جو ملکی آزادی کے خیال سے بے پروا اور حکومت سے ٹکرانے کو اپنی عافیت پسندی کے خلاف جانتے ہیں اس لیے اگر وہ مسلمانوں کی باہمی خانہ جنگی کا سبب بنے تو کچھ زیادہ محل شکایت نہ تھا۔ لیکن خلافت کمیٹی کے رہنماؤں سے تو بدرجہا زائد تدبر و دانشمندی کی توقع کیجاتی تھی، مگر آج ہم دیکھتے ہیں کہ وہ خود ایک شدید قسم کی نزاع باہمی کا ذریعہ بنے جا رہے ہیں۔

حجاز کی مقدس سرزمین کے ساتھ مسلمانوں کا گہرا تعلق مسلم ہے۔ اس سے بھی انکار کرنے کی ضرورت نہیں کہ نجدیوں نے مقابر و آثار کو اپنے عقائد مذہبی کے اتباع میں مسمار کر کے ہندوستان کے کثیر التعداد اشخاص کو متاثر کیا ہے اور یہ بھی مان لیا جا سکتا ہے کہ مناسب طریقہ پر وہاں کے حالات میں اصلاح کی کوشش ہرگونہ لائق ستایش ہے۔ لیکن اس سے آگے جانے کی کوشش صریح غلطی و کج رائی ہے جسکے صرف دو ہی نتیجے ہو سکتے ہیں۔ خود اس ملک کے مسلمانوں میں نزاع قائم ہو کر ہماری مشکلات میں اضافہ کرتی رہے اور سرزمین مقدسۂ حجاز کے امن و امان کو برباد کر کے حجازیوں اور عربوں کو یورپ کی فرنگی قوتوں کی حرص و آز کے جال میں پھنسا دے۔

خدام الحرمین والوں کے نزدیک ممکن ہے کہ حجاز کا موجودہ فرماں روا اور اُسکی قوم دائرۂ اسلام سے خارج ہو، لیکن خلافت کمیٹی والے تو ایسے عقل سے بے بہرہ نہیں جو اس قسم کی خام خیالیوں کو جائز و پسندیدہ سمجھتے ہوں۔ پھر کیا ایک مسلم حکمراں سے صرف اس بنا پر جنگ کیجائیگی کہ وہ مقابر و آثار کی شکست کو اپنے مذہبی عقیدہ کی بنا پر ضروری سمجھتا ہے۔ یا لڑائی کی بنیاد یہ قرار

دی جائے گی کہ ابن سعود نے خاندان شریف کو نکال کر حجاز پر تسلط قائم کر لینے کے بعد وہاں خلفاے راشدینؓ کے نمونہ کی جمہوریت نہیں قائم کی۔

حضرت امام حسین رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے متعلق کہا گیا ہے کہ

سر داد و نہ داد دست در دستِ یزید

اور غالباً کسی مسلمان کو ایک لمحہ کے لیے بھی یہ خیال نہ آتا ہوگا کہ حضرت امام ہمامؓ سے زیادہ حریتِ دینی اور فدا کاری ملت کا جذبہ کسی مسلمان میں ہوگا یا آج ہو سکتا ہے۔ پھر کیا کوئی اسکا دعویٰ کر سکتا ہے کہ حضرت امامؓ نے حضرت امیر معاویہؓ یا اُنکے بعد یزید ابن معاویہ کی خلافت و حکومت کو شکست کرنے کی کوئی کوشش فرمائی؟ اگر ملوکیت کے خلاف حضرت امام حسینؓ علمِ جہاد ملبند کرتے اور خلفاے راشدینؓ کے نمونہ کی جمہوریت قائم کرنے کے لیے امت اسلامیہ کو دعوت شرکت دیتے تو کیا پہلی صدی ہجری کے مسلمان ایسے گئے گذرے تھے کہ خاندان رسالت کی اُس بزرگترین یادگار کی طلب دعوت کو اُسی طرح رد کر دیتے جس طرح گذشتہ محاربۂ عظیم کے زمانہ میں ترکی خلیفہ کی دعوت کو زمانۂ حال کے مسلمانوں نے ٹھکرا دیا۔ نہیں۔ ہرگز نہیں۔ بلکہ واقعہ یہ ہے کہ اُنھیں جنگ جمل کی افسوسناک داستان نہ بھولی تھی، اور وہ مسلمانوں کی خانہ جنگی کو اس سے بدرجہا بدتر جانتے تھے کہ ملوکیت کو توڑ کر پھر خلافت راشدہ کے نمونہ کی خلافت قائم کریں۔ اس لیے حضرت امامؓ شروع ہی میں اس خیال سے دست بردار ہو گئے تھے۔ پھر کیا ہمارے لیے حضرت امامؓ کے طرزِ عمل میں سوا اسکے کوئی درس عبرت نہیں کہ

اسلام زندہ ہوتا ہے ہر کربلا کے بعد

ہمارے جن بزرگوں کی رائے میں خلافتِ راشدہ کے نمونہ کی جمہوریت کا قیام ممکن ہے اُن سے اختلاف رکھنے کے باوجود ہم یہ عرض کرنے کی جسارت کریں گے کہ انکو اپنا مقصد حاصل کرنے کے لیے وقت اور حالات کے مقتضیات کو پیش نظر رکھ کر کام کرنا چاہیے۔ ہندوستان کو اگر آزادیِ کامل میسر ہوتی تو بہت ممکن تھا کہ اُنکا اشارۂ چشم حجاز کی حکومت کو تہ و بالا کر دیتا۔ مگر موجودہ حالت میں تو صرف اسی طرح یہ مقصد حاصل ہو سکتا ہے کہ سلطان ابن سعود کو اپنی مخلصانہ کوششوں سے اپنا گرویدہ بنایا جائے، انکے خیالات کی اصلاح کی جائے تاکہ وہ خود ہمارے ان بزرگوں کی طرح اسے ایک مذہبی فریضہ تصور کر کے حجاز کی عنانِ حکومت موتمر اسلامی کے سپرد کر دیں۔

لیکن سلطان کے دل کو اپنے ہاتھ میں لینے اور اُنکو اپنا ہم خیال بنانے کی یہ صورت تو نہیں ہو سکتی کہ اُنکے خلاف جنگ و جہاد کا اعلان کر دیا جائے۔ اسکا تو صرف یہی نتیجہ ہو سکتا ہے کہ انکو آپ سے

خیال و آرا کے خلاف اور ضد بڑھے، اور اگر جیسا کہ آپ کا خیال ہے وہ حکومت و اقتدار کے ہوسمند اور اپنے اور اپنے بیٹوں کے لیے سلطنتیں قائم کرنے کے متمنی ہیں تو بہت ممکن ہے کہ حصول مدعا کی تمنا میں وہ انگریزوں یا فرانسیسیوں یا اور کسی مسیحی قوت سے ساز باز کرنے پر آمادہ ہو جائیں۔

سلطان ابن سعود نے سال گذشتہ کچھ وعدے کیے تھے جنکو پڑھکر ہمارے بعض احباب اس دھوکہ میں آگئے کہ حجاز کو خاندان شریف کے قبضہ و تصرف سے نکالنے کے لیے آدمیوں اور روپیہ کی اس قربانی کے بعد جو ہر معرکۂ جنگ کا لازمہ ہیں، سلطان نجد حکومت حجاز کو بزم میلاد کی شیرینی کی طرح لوگوں پر تقسیم کر دینگے۔ اور اگر اپنے بھولے پن یا غلط توقعات کی شکست پر یہ ساری برہمی ہے تو ہمارے بزرگوں اور دوستوں کو ابن سعود سے برسر پیکار ہونے کے بجاے خود اپنے تدبر اور فراست کو مورد الزام قرار دینا چاہیے اور کم سے کم آیندہ کے لیے زیادہ ہوشیار رہنا چاہیے کہ بادشاہوں کے وعدے اور ارادے ہمیشہ اپنے حالات گرد و پیش کے لحاظ سے بدلتے رہتے ہیں۔

مختلف خیال کے اصحاب نے حجاز کے موجودہ حالات کے بارہ میں اب تک جو اطلاعیں بہم پہونچائی ہیں، انکو پڑھنے کے بعد مایوسی کی کوئی وجہ نظر نہیں آتی۔ اور اگر تدبر و خوش اسلوبی سے سلطان ابن سعود کے ساتھ اتحاد عمل کیا جائے تو اسکی قوی امید ہے کہ حجاز کا نظم و نسق ہر حیثیت سے قابل اطمینان ہو سکتا ہے۔ اور بہت ممکن ہے کہ ہمارے واجب الاحترام بزرگوں کی جو تمنائیں ہیں، ایک بڑی حد تک وہ بھی بر آئیں۔ یعنی حجاز میں ایک ایسی پائدار اور خوش انتظام حکومت قائم ہو جائے جو ایک طرف اگر اغیار کی تمام ریشہ دوانیوں اور دخل اندازی کی کوششوں کا سد باب کر دے تو دوسری طرف حجاج و زائرین کے لیے وہ تمام ممکنہ آسانیاں فراہم کر دے جو از روے شریعت اسلام جائز و مناسب ہوں۔

نجد کا بدوی سلطان مہذب فرنگیوں کا سا دل و دماغ اگرچہ نہیں رکھتا لیکن شریعت اسلامیہ کی تابعیت کرنے کی تمام اہلیتیں رکھتا ہے بشرطیکہ دنیاے اسلام کے بہترین دل و دماغ قرآن و حدیث کی روشنی میں اور مسلمانوں کے مصلحانہ طرز پر سلطان کو اپنے نیک مشوروں اور مفید تجاویز سے مدد دیتے رہیں اور اپنے مہووات ذہنی کی رو میں اس حقیقت کو نظر انداز نہ فرمائیں کہ

تو برائے وصل کردن آمدی
نے برائے فصل کردن آمدی

۲۱- ستمبر ۱۹۲۶ء

ظفر الملک

تاریخِ عرب

وحشی اقوام، مثلاً تاتاری اور افریقی کا تو ذکر ہی کیا، کہ اُنکے یہاں "لٹریچر" نہیں ہوتا۔ مگر جو اقوام گمنامی سے منصۂ شہود پر آئی ہیں، مثلاً عرب اور یوروپین، وہ اپنا کچھ نہ کچھ لٹریچر رکھتی تھیں۔ میں شاید غلطی کر رہا ہوں، کیونکہ ان دونوں اقوام کے پاس جو کچھ بھی تھا وہ کوئی چیز سینہ بسینہ تھی، یا سینے میں محفوظ۔ لٹریچر کا اطلاق اُس چیز پر کیا جاتا ہے کہ جو بقید تحریر ہو۔ ان دونوں کی یہ کیفیت نہ تھی، لیکن اِلّا ماشاءاللہ۔ بہرحال اس قسم کی اقوام کی علمی تاریخ پر اگر غور کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ ان لوگوں کی ترقی کا بنیادی پتھر تراجم ہوئے ہیں۔ میں نے بعض اقوام، مثلاً ہندی، مصری، یونانی، کا عمداً ذکر نہیں کیا۔ بظاہر تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ اُنھوں نے جو کچھ حاصل کیا وہ از خود اکتساب کردہ تھا۔ ایسی شہادت کم از کم مجھے، معلوم نہیں ہوتی کہ انکے یہاں بھی تراجم ہوئے ہوں۔ لیکن ایک نے دوسرے سے بذریعہ تلمذ، ضرور فیض اُٹھایا۔ میں اسکو بھی تراجم ہی کی فہرست میں داخل و شامل کرتا ہوں۔ ہوتا یہ ہے کہ جب کسی قوم کی خواب گراں سے آنکھ کھلتی ہے تو وہ یہ دیکھتی ہے کہ اُسکو یہ حیثیت تو حاصل ہے کہ سکندر مقدونی جیسے فاتح کے ساتھ ایک ہی تخت پر بیٹھ سکے، لیکن علمی حیثیت سے وہ بہت پستی میں ہے۔ اس احساس کے بعد وہ اپنے گرد و پیش کی اقوام پر نظر ڈالتی ہے، اور جسکو اس میدان میں آگے بڑھا دیکھتی ہے اُسکو اپنا اُستاد بنالیتی ہے؛ جس طرح عربوں نے یونان یا ہندوستان کو بنالیا، اور اُنکے علوم کو اپنے یہاں منتقل کرلیا۔ بدقسمت ہوتے عرب اگر وہ اکتساب یونانی و سنسکرت پر قانع ہو بیٹھتے اور اپنی زبان کو مالامال نہ کرلیتے۔

گو میں رہتا ہوں جھونپڑے میں، اور خواب دیکھ رہا ہوں محلوں کا۔ میں ایک مفتوح قوم کا فرد ہوں، اور جانتا ہوں کہ ایک لفظ "مفتوح" کی تفسیر دنیا بھر کی ذلت، بے شرمی، بدنامی وغیرہ وغیرہ ہے، اور ذکر کر رہا ہوں فاتحین کا۔ لیکن آخر نہ گیا وہ باغ اُومیّہ۔ میں دیکھ رہا ہوں کہ میرے فاتح میرے نہیں ہیں، اسی لیے اُنکو میری زبان کے مرنے جینے کی چنداں پروا نہیں ہے۔ انصاف کو ہاتھ سے نہیں دینا چاہیے؛ ہندوستان زبانوں اور بولیوں کا محشر ہے۔ یہاں بھانت بھانت کی چڑیاں ہیں اور بھانت بھانت کی بولیاں، ہر ایک کا دعویٰ ہے کہ اُسی کا نغمہ دلکش ہے؛ اس پر طرفہ نقار خانہ میں طوطی کی صدا کا غوغا۔ گو اُردو یہ کہ سکتی ہے کہ

تاک را سیراب کن اے ابر باراں در بہار　　　تاک تا مے میتواند شد چرا گوہر شود

اس صورت میں سرپرستی فاتح کا ذکر فضول ہے؛ لیکن اس کا کیا علاج کہ بغیر بادشاہ کی سرپرستی کے کسی علم و فن کا سرسبز ہونا، گو ناممکن نہیں مگر مشکل ضرور ہے۔ مثلاً حیدرآباد کو دیکھیے۔ اگر کسی نے زبان اُردو کی تاریخ لکھی، تو ناممکن ہے کہ حضور خسرو دکن خلد اللہ ملکہ وحشمتہ کا احسان نہ مانے۔ ہندوستان میں افراد نے اپنی سعی بازو پر بھروسہ کرکے بہت کچھ کیا، اور کر رہے ہیں؛ مگر آخر یہ حرکت مذبوحی ہی ہے، تاوقتیکہ اسے بادشاہ وقت کی سرپرستی نہ ملے۔ الحمد للہ کہ اس حرکت میں خدائے تعالیٰ نے بہت کچھ برکت عطا فرمائی اور بذریعہ تراجم اچھی اچھی چیزیں نکل رہی ہیں۔ مگر مشکل اور صعب مشکل یہ درپیش ہے کہ ہمارے ملک میں ترجموں کی کوئی قدر نہیں، ترجمہ کرنا یہاں ایک ایسی سعی ناشکور ہے کہ بیچارے مترجم کی دلشکنی تو ایک طرف، اُسکو یہ ظاہر کرتے ہوئے شرم آتی ہے کہ میں کسی کتاب کا مترجم ہوں۔ یہ کہکر اُسے جو جانگسل طعنے سننے پڑتے ہیں، وہ اُسی کا جی جانتا ہے۔ مثالوں کی کمی نہیں: میں آپ بیتی عرض کرتا ہوں، کہ میں نے اثناے سفر ریل میں ایک "تعلیمیافتہ" بزرگ کے سامنے، جو فی الجملہ اُردو کے خیرخواہ، اور اُسکی حالت پر آہ سرد بھرنے والے تھے، ایک بہترین کتاب کے ترجمہ کا ذکر کیا، اُنھوں نے زہرخند فرماکر انگریزی کا ایک ذو فقرتین فقرہ سر کردیا، جسکے معنی اُردو میں یہ ہوتے ہیں، کہ مترجم ہمیشہ دغاباز ہوتے ہیں۔ میں نے معاً دل میں یہ سوچا کہ اسکے بعد غریب مترجم کو اسکے سوا چارہ نہیں کہ وہ ریل کے نیچے اپنا سر رکھدے مگر

ایں شعلہ ہند گرم خیز است　　　اینجاست کہ آفتاب تیز است

یورپ میں، جو ہم سے صدیوں آگے بڑھا ہوا ہے، یہ کیفیت ہے کہ ایک خوش نصیب کسی کتاب کا ترجمہ کرتا ہے: لوگ اُسکو ہاتھوں ہاتھ لیتے ہیں، اخباروں میں اُس کا چرچا ہوتا ہے، رسالوں میں ریویو نکلتے ہیں، اعیان ملک اور عمائد سلطنت اُسکی قدر کرتے ہیں، بادشاہ کی طرف سے ادنی قدر یہ ہوتی ہے کہ وہ نائٹ بنا دیا جاتا ہے۔ یہ کہنے کی ضرورت نہیں ہے کہ وہ چند ہی روز میں مالامال ہوجاتا ہے۔ حالانکہ یورپ کو اب ترجموں کی چنداں ضرورت نہیں ہے، کیونکہ وہ عروج علمی کے زینہ میں ترجمہ و تالیف سے گذر چکا ہے، اور اب تصنیف کے مقام اعلا پر کوس لمن الملک الیوم بجا رہا ہے، اور بالکل بجا بجا رہا ہے۔ دیدنی ہے میری بدقسمتی کہ میں قعر ذلت میں پڑا ہوا، حضیض ادبار میں گرا ہوا اُن لوگوں کو ذلیل سمجھ رہا ہوں جو پہلے زینہ تک اپنا پیر نہیں اٹھا سکتے ہیں۔ میں پھر یہ کہتا ہوں کہ ہمارے مقابلہ میں یورپ صدیوں بڑھا ہوا ہے، اُن تک پہونچنے میں صدیاں ہی درکار ہیں۔ اس وقت

ہمارا مقصد یہ ہونا چاہیے کہ ایسا راستہ اختیار کریں جس سے ہم منزل مقصود تک جلد از جلد پہونچ سکیں۔ غور کر کے دیکھیے تو راہ سوائے اسکے نہیں کہ ہم بالفعل ترجموں کے ہو رہیں

مصلحت دید من آنست کہ یاران ہمہ کار بگزارند و سر طرۂ یارے گیرند

تالیف و تصنیف کا وقت پیچھے آتا ہے۔ پہلے مسالہ جمع کیجیے تو پھر محل بنانے کا فکر کیجیے۔

کیا یہ افسوسناک (بلکہ اگر مجھے مطعون نہ کیا جائے تو شرمناک) امر نہیں ہے کہ جو کام مسلمانوں کے کرنے کا ہے وہ عیسائی کرتے ہیں۔ پھر ستم پر ستم یہ کہ اگر انکی محنت پر کوئی غریب محنت کرکے وہی چیز مسلمانوں کے گھروں تک پہونچاتا ہے تو بجائے اسکے کہ وہ قابل شکریہ ہو محض ترجمے کے جرم میں سزائے ناقدری پاتا ہے۔ میں تسلیم کرتا ہوں کہ اس کلیہ کا استثنا بھی ضرور ہے، گر ایسے خوش نصیب انگلیوں پر گنے جا سکتے ہیں۔ میں پوچھتا ہوں کہ عرب اور مسلمانوں کی تاریخ لکھنا ایشیا کے مسلمان کا کام یا یورپ کے عیسائی کا؟ مسلمان موجد تاریخ کہلاتے ہیں، لیکن زمانۂ حال میں موسیو سیدیو "تاریخ عرب" لکھتے ہیں۔ کیا وجہ ہے کہ ہم انکے مرہون منت نہ ہوں۔ مولوی حاجی ظفر الملک صاحب علوی اسکا ترجمہ کراتے، اور دلکش شکل و صورت میں شایع فرماتے ہیں؛ کوئی وجہ نہیں ہے کہ ہم اُن کے ممنون احسان نہ ہوں۔ یہی ترجمہ اسوقت میرے زیر نظر ہے، اور اسی پر میں اپنے خیالات کا اظہار کرتا ہوں۔ مجھے بلا اظہار کسر نفسی اس کا اعتراف ہے کہ مجھ جیسا خاک نشین صحرائے گمنامی اسکا اہل نہیں ہے کہ اتنی خطیر سواری اپنے اوپر لے۔ لیکن جو حضرات دیوانہ و مجذوب لوگوں کی بڑ سے نتائج اخذ کر لیتے ہیں وہ اگر مجھے بھی اُسی زمرہ میں سمجھ لیں تو میں اُن کا ممنون ہوں گا۔

تاریخ عرب کی شان یہ ہے کہ موسیو سیدیو نے اسے اپنی زبان (فرنچ) میں لکھا، اور علی پاشا مبارک، سابق ناظم تعلیمات مصر نے اسکو عربی میں منتقل کیا۔ اب مولوی حاجی ظفر الملک صاحب علوی کی سعی سے عربی ڈھیلی ڈھالی عبا کو چھوڑ کر لکھنؤ کے تنگ و چست تن زیب انگرکھے میں جلوہ گر ہوتی ہے۔ ایک کہنے والے نے کہا کہ ترجمہ در ترجمہ میں کیا لطف ہے۔ میں نے جواب دیا کہ وہی جو مے دوآتشہ میں ہوتا ہے۔ جواب ملا کہ ہوش میں آؤ، کیا تمھارے نزدیک اس میں کوئی فرق نہیں کہ ایک بات ٹیلیفون میں خود قائل کی زبان سے سنو، اور وہی بات قاصد تم سے کہے۔ آخر اسی ہندوستان کے پنڈت نسیم (صاحب گلزار نسیم) اس تمنا کو سینے میں لیے ہوئے نہیں مر گئے کہ آپنے منہ سے جواب دیں اس جملہ معترضہ کو معنی آفریں حضرات کے سپرد کیجیے، اور ترجمہ کتاب کی طرف توجہ فرمائیے

علی پاشا کی عربی سے جناب مولوی عبد الغفور خاں صاحب رامپوری اور جناب مولوی محمد حلیم

نعمانی رودولوی نے ترجمہ کیا ہے - میرے جیسے گمنام کی ایسی قسمت کہاں کہ جناب مقدم الاسم سے شرف ملازمت حاصل ہو، جناب مولوی محمد حلیم صاحب سے مجھے عزت نیاز حاصل ہے - ان دونوں بزرگواروں کا نام نامی ترجمہ کی کافی ضمانت تھی ؛ حضرت حاجی صاحب کی احتیاط کو دیکھیے کہ علامی سید سلیمان صاحب ندوی سے صداقت نامہ لیکر مُہر کرالی - اس صورت میں ترجمہ بہترین ترجمہ سمجھے جانے کے قابل ہے بقول ع بدگماں وہم کی دارو نہیں لقمان کے پاس -

میں نے اوپر یہ شکایت کی ہے کہ ترجموں کی قدر نہیں ہوتی، مگر الحمد للہ کہ جناب حاجی صاحب بہت خوش قسمت نکلے کم از کم مجھ سے تو کہیں زیادہ خوش نصیب نکلے کہ حکیم محمد اجمل خاں صاحب کی سفارش اور منشی محمد امین صاحب کی تائید سے حضور والیہ بھوپال دامت اقبالہا کی سرپرستی نصیب ہوگئی - اگر ایک طرف میرے خیال کا بطلان ہوا، تو دوسری طرف میرا یہ قول صحیح نکلا کہ بغیر بادشاہ کی سرپرستی کے ترقی علم و فن معلوم - علیا حضرۃ نہایت غائر نظر رکھتی ہیں - اگر کتاب اور ترجمہ بہترین نہ ہوتا، تو مجھے شبہ تھا کہ اُس بارگاہِ عالیہ سے عطیۂ خاص مرحمت ہوجاتا - میں اگر تہی دامن رہا تو اسکی وجہ صاف ہے ؛ تجھ سے کیا ضد تھی اگر تو کسی قابل ہوتا -

کتاب کے شروع میں جناب مترجم عربی کا دیباچہ ہے ؛ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ کتاب "بیس برس کی محنت و جاں فشانی کے بعد لکھی گئی ہے - ظاہر ہے کہ ایسی کتاب کیوں اچھی نہ ہوگی - یہاں تک جو کچھ میں نے لکھا ہے اس کتاب کی تصدیق و توثیق کے لیے لکھا ہے، مگر میں جناب پاشا کی اس رائے سے ہرگز متفق نہیں ہوں کہ" اس کتاب سے اہل یورپ پر بہت بڑا اثر ہوا - اہل یورپ کے ذہنوں میں عربوں کی جو برائیاں جمی ہوئی تھیں وہ دفعۃً کافور ہوگئیں" - مجھے حضرات یوروپین سے تبادلۂ خیالات کا زبانی و تحریری اتفاق ہوا اور ہوتا رہتا ہے - میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ ان گورے چٹے صاحبوں کی گلیم بخت سیاہ بنی جاچکی ہے - موسیو سیدیو کے اصطباغ کے چھینٹوں سے تو کیا اثر ہوسکتا ہے، آب کوثر و تسنیم بھی اُسکو سفید نہیں کرسکتی - جب تک پادریوں، بالخصوص رومن کیتھولک کے دَم میں دم ہے اور "احمق در جہاں باقیست" اسلام اور اہل اسلام کی دشمنی اُنکے دل سے نہیں نکل سکتی - اسکے مختلف وجوہ ہیں - اقتضاء زمانۂ موجودہ سے تعصب دینی پس پردہ ہو اور ذہانت اور ہماری اہانت سب سے آگے آگئے - لیکن اگر غور کیجیے تو کم و بیش آٹھ سو برس تک ہمارا یورپ میں تفوق، شمشیر بازی اور جوتہ کاری (میرے گنوارپن کو معاف کیجیے کہ ایسا ثقیل لفظ کہتا ہوں گو صحیح کہتا ہوں) اس کا اصل باعث ہے - آپ کہیں گے کہ ہمارا یہ احسان یورپ پر

کہ ہم نے یورپ کو آدمیت کی طرف رہنمائی کی۔ لیکن پھر غور کیجیے؛ یہ کہتے ہوئے شاید آپ اسکو بھول جاتے ہیں کہ مفتوحین کی نگاہ میں چونکہ فاتحین کا سب سے بڑا جرم فتح کرلینا ہوتا ہے، اس لیے اُن پر فاتح جو احسان کرتا ہے وہ ملک نکل جانے کا کفارہ نہیں ہو سکتا، لہٰذا وہ احسان فراموش ہی ہوتے ہیں۔ تزک بابری پڑھیے۔ ہندوستان کی وہ حالت دیکھیے جو مغلوں کے حملہ کے وقت تھی۔ اور مقابلہ کیجیے اُس حالت کا جو بابر کے سپوتوں نے پیدا کر دی تھی؛ اور پھر اخوان وطن کا اپنے ساتھ سلوک دیکھیے۔ یہ برسبیل تذکرہ ہے اور برادرانہ شکایت۔ حامیان اتحاد ہندو و مسلم اسی کو لیکر مجھے مطعون نہ فرمائیں۔

فارسی کی ایک مثل مشہور ہے کہ "جبل گردد، جبلت بنگردد" اگر غور سے دیکھیے تو معلوم ہوگا کہ یہ بالکل صحیح ہے۔ جو اقوام جس نسل سے تعلق رکھتی ہیں وہ اپنی خصوصیت کو ہزارہا برس گذرنے کے بعد بھی نہیں چھوڑتے۔ اس میں شبہہ نہیں کہ جب ایک نسل میں دوسری نسل کا خون آملتا ہے تو گو ایک نسل کی خصوصیات کمزور ہو جائیں، مگر یہ نہیں ہو سکتا کہ بالکل نکل جائیں۔ سامی اقوام کی خصوصیات یہ بتائی جاتی ہیں کہ "وہ قدامت پسند ہیں، ہمیشہ قدیم رسموں کے پابند رہنا چاہتے ہیں، اپنے خیالات کے پکے ہوتے ہیں، کسی قسم کی تبدیلی یا اصلاح کی صلاحیت نہیں رکھتے۔ دیندار ہوتے ہیں، تھوڑا اور تعصب مذہبی میں بڑے بڑے کام کر گذرتے ہیں۔ فنون لطیفہ سے انھیں تعلق نہیں۔ بڑی بڑی عمارتیں بنانے کا انھیں خیال نہیں آسکتا۔" مگر قابل رشک ہیں عرب کہ جو کارنامے دوسروں، مثلاً ایرانیوں، کے ہیں، وہ بھی انھیں سے منسوب کیے جاتے ہیں۔ یہ ایک رحمت ہے کہ حضور رحمۃ للعالمین صلعم کے طفیل میں نصیب ہوئی۔ ورنہ کہاں عرب کے بادیہ نشین، اور کہاں دہلی کا "بہشت زمین لال قلعہ" یوروپین کی لکھی ہوئی تاریخوں میں اس کا خیال رکھنا چاہیے کہ اُن کی "تاریخ عرب" کل مسلمانوں کی تاریخ ہوتی ہے۔ اسی طرح زیر نظر "تاریخ عرب" ہے۔

موسیو سیدیو نے عرب کا جغرافیہ بیان کرنے کے بعد تاریخ عرب قبل از اسلام بیان کی ہے حق یہ ہے کہ جہاں تک اختصار کام دے سکتا تھا۔ اُنھوں نے حق ادا کر دیا ہے۔ عربوں کے اُنھوں نے تقریباً وہی خصائل بیان کیے ہیں، جو میں اوپر سامی اقوام کے ڈاکٹر بریس کی کتاب سے مختصراً بیان کر آیا ہوں، مگر جس بات نے کہ مجھے اُنکا ممنون کیا ہے وہ یہ ہے کہ وہ عرب کو سراپا عیب نہیں دیکھتے۔ چنانچہ وہ لکھتے ہیں کہ "وہ (یعنی اعراب قبل از اسلام) حریت و آزادی کے دیوانے عزت نفس اور شرافت کے عاشق تھے۔ بلکہ مسافرین اور درماندوں کی تواضع اور مہمانداری

کو تمام قوانین انسانیہ کا جامع قانون سمجھتے اور اس پر اپنی قوم میں بڑا فخر کرتے تھے۔ اسی کے ساتھ اپنے حقوق کے ثبوت میں صرف اپنی تلوار پر بھروسہ کرتے تھے۔ افسوس ہے کہ مصنف علام نے ذرا اور تفصیل سے کام نہیں لیا، ورنہ وہ یہ لکھنے پر مجبور ہوتے کہ فی الحقیقت یہ بادیہ نشین ایسے پاکیزہ لوگ تھے کہ جیسے بارش کی بوندیں۔ گو اس سے انکار نہیں ہو سکتا کہ ان میں عیوب بھی تھے، اور وہ کون ہے جس میں عیب نہیں ہوتے۔ انکی خصوصیات پر اگر غور کیا جائے تو عجیب متضاد صفت معلوم ہوتی ہے۔ ایک طرف تو وہ لڑکیوں کو کھود کر گاڑ دیتے ہیں، اور دوسری طرف عورتوں کی حمایت میں اپنی جانیں دیدیتے ہیں۔ دنیا کی بعض اقوام، جو اپنے آپ میں سوائے خوبیوں کے کوئی نقص نہیں دیکھتیں، شی ویلری کو اپنا مال سمجھتی ہیں؛ حالانکہ یہ انہیں بادیہ نشین اعراب (میں لفظ "اعراب" دانستہ کہہ رہا ہوں) کا مال مسروقہ ہے۔ کون کہہ سکتا ہے کہ اعراب قزاقی پیشہ نہ تھے۔ مگر انکی صفت مہمانداری کو بھی تو دیکھنا چاہیے کہ بادشاہ کا نخچیر ہرن ایک کے خیمہ میں جان بچا کر گھس آتا ہے تو تیرا بدو اپنی جان دینے پر تیار ہو جاتا ہے مگر اپنے ناخواندہ مہمان پر آنچ نہیں آنے دیتا۔ آپ فرمائینگے کہ جہالت ہے؛ میں کہونگا کہ کرامت ہے۔ فرض کر لیجیے کہ یہ تجارت پیشہ قوم وحشی تھی، لیکن خدا کے لیے ایک ہی صفت افریقیہ کے حبشیوں میں، امریکہ کے ریڈ انڈینس میں دکھا دیجیے۔ ایک طرف یہ فرزندان فطرت اتنے آزاد ہیں کہ شہروں کو زندان اور شہریوں کو قیدی سمجھتے ہیں۔ دوسری طرف یہی اپنے شیخ کے تابع فرمان نظر آتے ہیں، خواہ وہ بیٹھ پیچھے "لعنت اللہ علیک یا شیخ" ہی کہیں۔ میں نے ابھی انکے لیے لفظ "آزاد" کہا ہے۔ یہ تیرہ سو برس کا ذکر نہیں کرتا، آج کا مذکور ہے کہ اگر آزادی کے معنی آپ کو سمجھنے ہوں تو جائیے، کتاب بادیۂ عرب کا مطالعہ کیجیے مجھے خود یہ شرف نصیب نہیں ہوا، حاجی ظفر الملک جیسے بزرگوں کی زبان سے سنتا ہوں کہ یہ "ہری چگ" کمبل، بلکہ آسمان، کی چھت کے نیچے رہنے والا جب ننگی پیٹھ گھوڑے پر سوار ہو کر اور نیزہ ہاتھ میں لیکر نکلتا ہے تو ہمارے کنگ جارج کو کب خاطر میں لاتا ہے۔ آہ! یہی آزادی تھی جسکی بیخ و بنیاد کو ابو مسلم خراسانی کے ذریعہ سے اکھڑوا یا گیا۔ اور جو کچھ کہیں گڑی دبی رہ گئی تھی اُسکو برامکہ کے ہاتھ جلوا ڈالنے کی تدبیر کی گئی، اور پھر۔ اس گھر کو آگ لگ گئی گھر کے چراغ سے۔ اللہ بس باقی ہوس۔ کیا خوب کہا ہے موسیو سید یو نے "جب تک عرب اپنی معیشت بدویہ اور صحرائی زندگانی کو پسند کرتے رہے اُن میں ...... فرق نہیں آیا۔ شاید مجھے آگے بڑھ کر اسکے متعلق پھر کچھ کہنے کا موقعہ نہ ملے۔

جناب مصنف نے عربی قبائل کا ذکر جس با قل و دل طریق سے کیا ہے وہ اُنھیں کا حصہ تھا، "عرب تابعہ للعرب" کے عنوان کے نیچے وہ فرماتے ہیں کہ اسمٰعیل علیہ السلام کی اولاد جب بہت بڑھ گئی، تو یہ لوگ قبائل میں منقسم ہو کر کچھ تو بادیہ میں چلے گئے۔ خیموں میں رہنے سہنے کی بدوی عادت اختیار کر لی"۔ اگر میں غلطی نہیں کرتا تو یہ صحیح نہیں ہے۔ یہ نہیں معلوم ہوتا کہ بنو اسمٰعیل نے کبھی بدویوں کو اپنے قبیلہ میں شامل کیا ہو۔ اسی کے متصل وہ فرماتے ہیں کہ "یہ لوگ حرم کے پتھر اپنے ساتھ لے گئے۔ جہاں کہیں قیام کرتے وہاں بیت اللہ کی عظمت کے لیے اُس کا طواف کیا کرتے تھے۔ بعد میں اسی دستور کی قدامت سے وہ پتھروں کی پرستش کرنے لگے"۔ عربوں کی بت پرستی کی یہ توجیہ صحیح نہیں معلوم ہوتی۔ جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے عرب میں بُت پرستی کا بانی ابن لحُی تھا (اگر میں غلطی پر ہوں تو کوئی صاحب صحت فرمائیں) حضور سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم نے اسی جرم میں اس شخص کو بہت بُرا فرمایا ہے جسکا حقیقت میں یہ شخص مستحق تھا۔ یہ سن کر شاید تعجب ہو گا کہ یہ بلا (بت پرستی بھی عجم ہی سے عرب میں گئی تھی۔ رفتہ رفتہ بڑے بڑے آدمیوں کے بُت بنے اور پجنے لگے۔ یہ بُت کیا تھے اَن گڑھ پتھر تھے۔ اگر کہیں یہ ویسے ہی خوبصورت بُت ہوتے جیسے بُدھ مہاراج کے ہیں، یا آجکل جیسے النقل کالاصل ملکہ معظمہ یا مسٹر گلیڈسٹن کے بُت ہوتے تو جو کیفیت ہوتی اسکے خیال ہی سے رونگٹے کھڑے ہوتے ہیں۔ ان پتھروں کی توجیہ یہ بھی ہو سکتی ہے کہ کسی واقعہ کی یادگار میں پتھر گاڑے جاتے تھے وہ مرورِ زمانہ کے بعد پجنے لگتے تھے۔ غرض جہاں تک میرا خیال ہے مصنف علام کا یہ بیان صحیح نہیں ہے۔ لیکن یقیناً وہ مجھ سے زیادہ جانتے تھے۔

آگے بڑھ کر موسیو سیدیو قبل اسلام کی تاریخ کے ذیل میں بادشاہان بابل و نینوا و روم و فارس کے حملوں اور آپس کی جنگوں، کامیابیوں اور ناکامیابیوں کا تذکرہ کرتے ہیں۔ یہ حصہ نہایت دلچسپ اور پُر از معلومات ہے، اور اس قابل ہے کہ اسے بغور پڑھا اور یاد رکھا جائے۔ عکاظ کے میلہ میں جس طرح شعرا اپنے اشعار پڑھا کرتے تھے اُسکی لفظی تصویر جو مصنف علام نے کھینچی ہے، نہ معلوم وہ کہاں سے پائی۔ چونکہ یہ کتاب آج سے پچاس ساٹھ برس پہلے کی لکھی ہوئی ہے، اس میں قصائد معلقہ کی نسبت وہی فرسودہ خیال ظاہر کیا ہے کہ "وہ بیش قیمت کپڑے پر طلائی حروف میں لکھے جاتے اور حفاظت، دیرپائی اور نصحاً بعد نسلٍ باقی رہنے کے واسطے خانہ کعبہ کے دروازہ پر لٹکائے جاتے تھے"۔

عمان میں برہمنوں کے مذہب کا رائج ہونا ایک ایسی عجیب و غریب بات موسیو سیدیو نے لکھی ہے کہ حیرت ہوتی ہے۔ اچھا ہوا کہ جناب مترجم (یا ترجمان!) نے اسکو حاشیہ میں لغو بتلا دیا۔ یہ وہ غلطیاں ہیں جو یورپین علماء اپنی ذہانت کے زور میں اکثر کر جاتے ہیں

مصنف علام نے ایک بحث یہ قرار دیا ہے کہ عرب کی آس پاس کی سلطنتیں بوجہ کسریٰ و قیصر کی باہمی جنگ کے ضعیف ہو چکی تھیں۔ یہ صحیح ہے۔ مگر دیکھنا یہ ہے کہ آیا یہ سلطنتیں، یکاں یکاں، ننگے اور ننگے عربوں کے مقابلہ میں بھی ضعیف تھیں۔ کیا یہ قدیم سلاطین اُس زمانہ کے آلات حرب سے مسلح نہ تھے، اور کیا اُنکی افواج قواعد حرب سے پوری واقف نہ تھیں؟ اگر ان باتوں پر غور کیا جائے تو یہ "ضعیف سلاطین" ہرطرح برہنہ اعراب کے مقابلہ میں ہاتھی اور چیونٹی کی نسبت نہیں رکھتے تھے۔ دُور نہ جائیے، اسکو غور کر لیجیے کہ گو اسپین اسوقت عیسائی یورپ کی نسبت ضعیف ترین سلطنت ہے؛ مگر نہ اتنی کہ حضرت امیر عبدالکریم ایدہ اللہ بنصرہ العزیز (امیر ریف) کا مقابلہ نہ کر سکے۔ اگر اعراب اور اہالی ریف کے غلبہ کو اسلام کا معجزہ نہ سمجھا جائے، تو نظام کی خوبی اور ایک مقصد خاص کے لیے جان دیدینے کا کرشمہ تو ضرور ہے۔ اسی فقدان نظام اور ایک ہی نصب العین پر اتفاق نہ ہونا وہ چیز ہے کہ مسلمان اس پر جتنا روئیں بجا ہے، مگر

عرفی اگر بگریہ میسر شدے وصال صد سال می تواں بہ تمنا گریستن

ضرورت ہے فعل کی، وہ کون کرے؟

مقالۂ دوم میں حضور رحمۃ للعالمین صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات طیبہ، قرآن مجید اور دین اسلام سے بحث کی گئی ہے، اور حق یہ ہے کہ بہت خوب بحث کی ہے۔ اس میں غلط فہمیاں ہیں تعصب نہیں۔ مصنف علام کے زلات کو حاشیہ میں ظاہر کر دیا گیا ہے۔ اسکا علاج البتہ نہیں ہے کہ کتاب کے لکھے جانے سے زمانہ کئی برس ترقی کر چکا ہے، اور علمائے فرنگ کو بہت کچھ نئے انکشافات ہو گئے ہیں مگر بہرحال یہ قابل دید ہے؛ اور کوئی وجہ نہیں ہے کہ مسلمان جناب مصنف کے شکر گذار نہ ہوں۔ مقالۂ ثالث ہے "فتوحات امت محمدیہ صلی اللہ علیہ وسلم" یہیں سے تاریخ اسلام شروع ہوتی ہے۔

"تاریخ عرب" کا اگر کوئی نقص ہے تو یہ کہ وہ بہت مختصر ہے۔ باوجود اسکے اگر اس میں کوئی خوبی ہے تو یہی کہ وہ بہت مختصر ہے۔ مسلمانوں کی تاریخ اگر کوئی تفصیل سے لکھنے بیٹھے تو بڑی بڑی ضخیم جلدوں میں نہیں سما سکتی۔ موسیو سیدیو کا یہ کمال ہے کہ انھوں نے اپنے اول دول اختصار کیا ہے، کہ اس سے زیادہ بہتر اختصار نا ممکن تھا، گو اس سے بعض وقت اُلجھن ہوتی ہے۔ کارڈ سائز پر ایک بڑی فوج کا فوٹو لیکر دیکھیے، وہ اُلجھن کی تصویر ہوگی۔ چنانچہ خلافت راشدہ کا قصہ انھوں نے صرف چار مختصر صفحوں میں ختم کر دیا ہے، اور اُس زمانۂ باسعادت کے فتوحات کو دوسری فصلوں

کے لیے چھوڑ دیا ہے - ممکن ہے کہ یہ ترتیب ہمیں اسلیے اجنبی معلوم ہوتی ہو کہ ہم اسکے عادی نہیں ہیں-
امیر المومنین و امام المتقین حضرت علی کرم اللہ وجہہ اور حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کے مناقشات کے متعلق ایک بات میرے ذہن ناقص میں ہے جسکو میں یہاں ظاہر کرنا چاہتا ہوں- اگر اس میں غلطی ہو تو امیدوار ہوں کہ میری اصلاح کی جائے - اصل یہ معلوم ہوتی ہے کہ بنو امیہ اور بنو ہاشم میں ایک مدت مدید سے منافقت چلی آتی تھی - خدائے تعالیٰ نے نبوت کے لیے بنو ہاشم کو انتخاب فرمایا (واللہ اعلم حیث یجعل رسالتہ) بعض، اور بالخصوص مورخین یورپ کا، یہ خیال ہے کہ بنو امیہ نے بادلِ ناخواستہ اس نبوت کو تسلیم کیا - بہرحال جو کچھ بھی ہو، خلفائے اول و دوم (رضی اللہ عنہم اجمعین) بنو امیہ میں سے نہ تھے - خلیفۂ سوم (رضی اللہ عنہ) اس خاندان سے ہوئے - انھوں نے ناوانستہ بنو امیہ کی پرورش فرمائی - خلیفۂ چہارم (رضی اللہ عنہ) کو بوجوہ یہ ناگوار ہوا- حضرت امیر معاویہؓ کو حضور امیر المومنین سے خاندانی وجوہ پر منافست پیدا ہوئی- حضرت امام المومنین حسن رضی اللہ عنہ کا خلع، واقعۂ کربلا، وغیرہ وغیرہ اسی منافست خاندانی کا نتیجہ ہے -
مصنف علام نے یہ صحیح فرمایا ہے کہ "شوق جہاد" کے لیے بہت سی آیتیں اور حدیثیں ہمارے یہاں ہیں؛ اور سرداران فوج حملوں سے پہلے مسلمانوں کو یہ بشارتیں سناتے تھے (الفاظ میرے ہیں اور مقصد مصنف کا) لیکن یہ بات مسلمانوں ہی کے جہاد کے لیے مخصوص نہیں ہے کہ وہ قال اللہ و قال الرسول (صلی اللہ علیہ وسلم) سناتے ہیں، اور انجام کار اسکو کرکے دکھلا دیتے ہیں حیرت و حسرت ہے اُن پر جو غربا کی امداد کو ملکشی اور لاکھوں بندگان الٰہی کی خون چشی و خوں چکانی کا بہانہ بناتے اور انجام کار اپنی جوع الارض کی شہوت کو پورا کرتے ہیں - فرق اتنا ہے کہ وہ حقیقی تہذیب پھیلانے کے لیے خالق کا حکم سناتے ہیں اور یہ مخلوق کے بنائے ہوئے اقتصادی اصول کا وعظ کرکے مزدوروں کے خون سے سرمایہ داروں میں بدہضمی پیدا کرتے ہیں- انصاف پسند اصحاب سکتے ہیں کہ صواب پر کون ہے اور ثواب کس کو ملنا چاہیے -
حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے کارناموں نے کتاب میں نسبتہً زیادہ جگہ لی ہے، اور فتوحات عمر (اعظم رضی اللہ عنہ) تو اسی قابل تھے کہ انھیں تفصیل سے بیان کیا جائے - لیکن پہلے یہ سوچنا چاہیے کہ ان فتوحات کی کیا ضرورت داعی ہوئی تھی - خدائی فوجداران یورپ نے اب یہ قرار دیا ہے کہ (حضرت) "خلیفہ اول (رضی اللہ عنہ) نے عربوں کی طبائع کو دیکھا تو یہ خیال آیا کہ ان لڑاکوں کو اگر انکے مذاق کے موافق کام پر نہ لگایا گیا، تو ممکن ہے کہ یہ آپس میں

لڑمریں، اور یوں اُس دین کو صدمہ پہونچے جسکا قائم رکھنا اُنکا فرض اولین ہے - اس لیے
اُنھوں نے اور اُنکے بعد والوں نے روم و ایران پر حملہ بول دیا" بات کام کی ہے، اس سے
حضرت صدیق اکبرؓ کی دوراندیشی قابل داد بن گئی، اور دُور کی کوڑی بھی نکل آئی۔

یہ ناول موسیو سیدیو کے بعد تصنیف فرمایا گیا ہے، اسی لیے اُنھوں نے اپنی تصویر میں یہ رنگ
نہیں بھرا - ذرا غور سے دیکھیے تو حقیقت حال معلوم ہوتی ہے کہ عرب (شریف) کی آستینوں میں
دو سانپ روم اور ایران، موجود تھے - رب الافواج نے کعبہ شریف کو مسلمانوں کا مرکز قرار
دیا تھا - چند ہی روز ہوئے تھے کہ اصحاب فیل اس پر حملہ کر چکے تھے، روم و ایران تو بہت ہی
مہیب بلائیں تھیں - اس لیے مقدم تھا اس مرکز کو بچانا، دونوں طرف سے برابر کی دھمکیاں
تھیں اور دونوں کی طرف سے پورا پورا اندیشہ - کعبہ کی حفاظت کے لیے اشد ضروری تھا کہ ان دونو
کے خدشہ کو مٹا دیا جائے - کیونکہ ظاہر تھا کہ اگر یہ باقی رہے تو مسلمان اور دین اسلام باقی نہ رہیگا -
چنانچہ سب سے پہلے یہی کرنا پڑا - اُدھر مقلیہ اور ادھر لمیار تک کی فتوحات کو ذرا غور سے دیکھیے
اُسی کعبہ کو بچانے کی تدابیر کی شاخیں ہیں، باقی ہیچ - اب آپ موسیو سیدیو کی تفاصیل فتوحات کو
پڑھیے تو آپ اور زیادہ لطف اُٹھائیں گے - مگر ذرا ٹھہریے؛ مجھے ان سرباز جان نثاران اسلام سے
اپنا مقابلہ کر لینے دیجیے - آج کعبہ کو کفار کے قدموں سے نجس کرانے میں سب سے پیش پیش ہیں ہوں اور
بیچ کرنے والوں میں سب سے آگے آگے - میری تصویر علامہ سر اقبال کا ایک مصرعہ ہے کہ "بیچتا ہے
ہاشمی ناموس دین مصطفےٰ" (صلی اللہ علیہ وسلم) میری ہی سعی بازو سے

لگیے تثلیث کے فرزند میراث خلیلؑ
خشت بنیادِ کلیسا بنگئی خاکِ حجاز

رہیں ہوں کہ اس سودے پر نہ صرف نازاں، بلکہ شفاعتِ شفیع المذنبین صلی اللہ علیہ وسلم کا سب سے
بڑا اُمید وار - آہ گر از پس امروز شود فردائے - کون کہہ سکتا ہے کہ اُس صادق و مصدوق (صلی اللہ
علیہ وسلم) کا یہ قول صادق نہیں ہے کہ خیر القرون قرنی، ثم الذین یلونہم، ثم الذین یلونہم -

صفحہ ۱۲۹ پر جناب مصنف نے تحریر فرمایا ہے کہ حضرت عمر (رض) کے دل میں حضرت خالد (رض) کی
جانب سے اُس زمانہ سے کچھ رنج تھا جب سے کہ اُنھوں نے مالک بن نویرہ کو قتل کر دیا تھا" یہ واقعہ
بالکل غلط ہے مغرب کے مورخین اسی قسم کی ستمگاریاں کیا کرتے ہیں - اُن حضرات کی للہیت اور ایک
نصب العین کی جانبازی سے اگر قطع نظر کر بھی لیا جائے، تو کیا اس ناراضی کا اظہار، اور اس کا لازمی
نتیجہ ادائے فرض میں اہمال، نظام فوجی کا منافی نہیں ہو سکتا ؟ مصنف علام ابھی پانچ صفحہ پہلے

اس کا اعتراف کر آئے ہیں کہ عربوں میں نظام قائم ہو چکا تھا۔ حضرت سیف اللہ کا اُسی تن دہی سے اسلام کا ناصر رہنا اس قول کی تردید کے لیے کافی تھا۔ جناب مترجم نے اپنے حاشیہ میں اسکا دفعیہ کیا ہے۔ اس حاشیہ کے الفاظ سے مجھے اتفاق نہیں ہے کہ "حضرت عمرؓ نے دیکھا تھا کہ خالدؓ کو پیا پے فتوحات ہوتی جاتی ہیں اور مسلمانوں کے دلوں میں خالدؓ کی عظمت ضرورت سے زیادہ جمتی جاتی ہے' جس سے اسلام میں ایک بڑا فتور پڑ جانے کا اندیشہ تھا، لہذا وہ معزول کر دیے گئے۔ جناب مترجم سے میں معافی مانگتا ہوں۔ میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی شان والا کو اس سے ارفع و اعلیٰ سمجھتا ہوں کہ آپ کو وہی خیال پیدا ہو جو مطلق العنان بادشاہ عباسیوں' یا دُور نہ جائیے، جہانگیر کو پیدا ہوا حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ نے حضرت سیف اللہ رضی اللہ عنہ کی معزولی کی وجہ یہ بیان فرمائی تھی کہ وہ حملہ سخت کرتے ہیں' اور اُس میں جانوں کا نقصان زیادہ ہوتا ہے۔ (الفاظ میرے ہیں)

صفحہ ۱۳۰ پر جناب مصنف کے اس قول سے مجھے اختلاف ہے کہ یرموک کی لڑائی میں جو فوج ہرقل نے بھیجی تھی اُس میں مرتد جبلہ بن ایہم اس لیئے شامل ہوا تھا کہ وہ اُس توہین کا بدلہ حضرت عمرؓ سے لے جو اُسکی ہو چکی تھی۔ ہمارے پاس تو اسکے ثبوت موجود ہیں کہ وہ ہمیشہ اپنے ارتداد پر نادم رہا' مگر اُسے حضرت عمرؓ کی خدمت میں حاضر ہونے کی جرأت ہی نہیں پڑی ورنہ وہ توبہ کرتا۔

صفحہ ۱۳۲ پر جناب مصنف فرماتے ہیں کہ "حضرت عمرؓ نے بیت المال کے حساب وکتاب کے متعلق حضرت سیف اللہ پر الزام قائم کیا اور انکو امارتِ لشکر سے معزول کر دیا"۔ یہ واقعہ میری نگاہ سے نہیں گذرا۔ گو مجھے اپنی ناقابلیت کا اعتراف ہے۔ شاید کوئی اور صاحب اسکی تصحیح و تغلیط کر سکیں مصنف علام یہ نہیں فرماتے کہ اُن سے مطالبہ ہوا یا نہیں، یا آنکہ اُنکی جائداد ضبط کی گئی یا کیا ہوا۔ مگر اسی عبارت سے متصل ہی فرماتے ہیں کہ "حضرت خالدؓ نے اسکو برداشت کیا؛ یہاں تک کہ ۲۱ھ میں وفات پائی۔ اسوقت اُنکے ترکہ میں جو کچھ باقی رہا وہ صرف ایک گھوڑا اور کچھ ہتھیار اور ایک لونڈی تھی، باقی کچھ نہ تھا! عبارت زیر خط سے تو یہ نہیں معلوم ہوتا کہ حضرت خالدؓ نے بیت المال کا روپیہ خورد برد کیا ہو۔ حضرت سیف اللہؓ کی وفات کے ذکر پر مجھے یاد آیا کہ نزع کے وقت آپ زار و قطار رو رہے تھے۔ کسی نے پوچھا کہ "کیا موت کے ڈر سے روتے ہو؟" فرمایا کہ "اس پر روتا ہوں کہ عورتوں کی طرح بستر پہ مر رہا ہوں"۔ یعنی میدانِ جنگ میں شہید ہونا چاہیے تھا۔ کیا ایسے ہی لوگ تغلب کیا کرتے ہیں؟

صفحہ ۱۳۹ پر مصنف علام نے لکھا ہے کہ حضرت عمرو بن العاصؓ نے نہر سوئز کھودنے اور بنانے

کا ارادہ کیا تھا، مگر حضرت عمر رضی اللہ عنہ مانع ہوئے کہ اس سے مکہ و مدینہ تک رومیوں کے لیے دروازہ کھل جائیگا۔ قطع نظر اسکے کہ اس سے میرے اس خیال کی تائید ہوتی ہے کہ اسلامی فتوحات کا تمام تر منشا یہ تھا کہ کسی طرح کعبہ شریف محفوظ رہے، آج دنیا حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی پیش بینی اور دور اندیشی کو براء العین دیکھ رہی ہے۔ کون کہہ سکتا ہے کہ امیر عبد الرحمن والی کابل کی یہ وصیت کہ "ملک میں ریل نہ بنانا" ایسی ہی دور اندیشی پر مبنی نہیں ہے۔

غنیمت ہے کہ جناب مصنف نے کتبخانہ اسکندریہ کے جلائے جانے کی مختصراً تردید کر دی ہے، اس بیہودہ خیال کی اتنی تردیدیں ہو چکی ہیں کہ اب کوئی یورپین بہ بانگ دہل یہ الزام مسلمانوں پہ لگانے کی جرأت نہیں کرتا۔ ممکن ہے کہ موسیو سیدیو وہ پہلے آدمی ہوں جنھوں نے پہلی مرتبہ تردید کی ہو۔

صفحہ ۱۵۱ پر یہ واقعہ مجھے کچھ نیا سا معلوم ہوتا ہے کہ زیاد ابن ابیہ نے حضرت امیر معاویہؓ کی اس بدعت کی مخالفت کی تھی کہ خلافت کو اپنے خاندان میں موروثی کر دیں۔ کم از کم مجھے اسکا علم نہیں۔ یہ مسلم کہ حضرت امیر معاویہؓ نے زیاد کو اپنے نسب میں شامل کر لیا تھا، اُدھر زیاد کی پولٹیکل اور زباں آوری کی قابلیت بھی مسلم؛ لیکن حضرت امیر معاویہ کے جیتے جی اُسکی یہ مجال نہیں تھی کہ وہ "خلافِ رائے سلطاں" رائے رکھ سکتا۔

اس سوال کو چھوڑ کر کہ بنو اُمیہ کو سلطنت جائز طریقہ سے حاصل ہوئی یا ناجائز طریقے سے، میرا اس سے یہ خیال ہے کہ حجاج ابن یوسف ثقفی کے ساتھ مسلمانوں نے انصاف نہیں کیا۔ وہ ہمیشہ اُسکے تاریک پہلو کو لیتے رہے۔ ملکی حالت یقیناً اسی کی متقاضی تھی کہ حجاج ہی جیسا "کما شتۂ شدید" حاکم بنایا جاتا۔ یہ یقینی بات تھی کہ اگر اس شخص کا وجود نہ ہوتا تو بنو امیہ کی سلطنت شروع ہی شروع میں پارہ پارہ ہو گئی ہوتی۔ موسیو سیدیو سے یہ اُمید رکھنی تو فضول ہی کہ حجاج کے متعلق تفصیل سے کام لیتے، مگر میں مسلمانوں کے نوجوانوں سے یہ توقع رکھتا ہوں کہ حجاج کے متعلق وہ کندو کاوی سے کام لیں اور اُس غریب کی اصلی صورت نمایاں کر دیں۔ بہت ممکن ہے کہ اُسکے سیاہ چہرہ پر کوئی نہ کوئی سفید دھبا نکل آئے۔

مجھے قدم قدم پر موسیو سیدیو کی اختصار پسندی کی شکایت ہے۔ مانا کہ شروع ہی سے اُنکا مقصد اختصار رہا ہے۔ وہ مجبور تھے کہ دریا کو کوزہ میں بند کریں۔ چنانچہ شمالی افریقیہ کی فتح اور قبضہ کے لیے اُنکے یہاں دو صفحوں سے زیادہ نہ نکل سکے۔ حالانکہ یہ واقعہ ایسا ہے کہ اتنے اختصار کا متحمل نہیں ہو سکتا؛ کیونکہ یہی واقعہ منجر بہ فتح ملک اسپین ہوا۔ لیکن میں کسی ملک کے فتح کر لینے کو اتنی اہمیت نہیں

دنیا جتنی کہ اُس ملک کو قبضہ میں رکھنے اور اُسکے نظم و نسق کو دیتا ہوں۔ معہذا وہ مسلمان کافر نعمت ہے جو فاتحِ افریقیہ کے احسان کو نہ مانے؛ لیکن ذرا غور کیجیے تو معلوم ہوگا کہ اس معاملہ میں اصلی محسن حضرت موسیٰ ابن نصیرؓ ہیں (اللھم برد مضجعہ) یہی اصلی فاتح ہیں اور یہی وہاں کے ناظم۔ ممالک کے فتوحات کے بعد فاتحین کی بڑی ضرورت یہ ہوا کرتی ہے کہ وہ کہیں آرام سے اپنے پیر پھیلا سکیں۔ اور طلب معیشت کے لیے کوئی نیا میدان پائیں۔ شاید اسی کو زمانہ حال میں کالونی زے شن کہتے ہیں۔ گذشتہ جنگ عظیم کی ضرورت پر غور کیجیے تو معلوم ہوگا کہ بناء فساد محض کالونی زے شن تھی۔ اس حکمت کو اُس زمانہ میں سب سے پہلے سمجھنے والے حضرت موسیٰؓ ہی تھے کہ مصر و ایران وغیرہ باوجود اپنی وسعت کے مسلمانوں کے لیے تنگ ہے۔ اسکے لیے اُنھوں نے افریقیہ کو تاکا۔ اُسکو از سرِ نو فتح کیا، مسلمانوں کو یہاں آباد کیا۔ اصلی باشندوں کی اسلامی تعلیم کا انتظام کیا، عربوں کو تحریص و تشویق کی کہ وہ یہاں کی عورتوں سے نکاح کریں، بعض کے ہو رہیں۔ اسی بربرِ افریقیہ کے وحشیوں کو آدمی بنایا، اور عربوں کو گونہ فراغ بالی نصیب ہوئی۔ حضرت موسیٰؓ کی اصلی عظمت تو اسی واقعہ سے ثابت ہوتی ہے۔ افسوس ہے کہ مصنف علام کو یہ سب کچھ چھوڑ دینا پڑا۔

موسیو سَیدیو نے ذرا بھی تحقیق سے کام لیا ہوتا تو وہ فتح اسپین کے معاملہ میں وہی پُرانا دُکھڑا نہ روتے کہ حضرت موسیٰؓ خلیفۂ وقت کے مقہور ہوئے۔ جہاں تک میرا خیال ہے یہ واقعہ ہی غلط ہے؛ اور نہ معلوم کس (عرب یا غیر عرب) مورخ کا تصنیف کردہ ہے۔ کیا وہی شخص مقہور ہو سکتا ہے جسکو وہی خلیفہ اپنے ساتھ حج کو لیجائے؟ کیا میرے سوا کوئی اور صاحب اسکے متعلق ریسرچ کریں گے؟ میں بوڑھا ہوں اس بار کو نہیں اُٹھا سکتا۔ اگر کوئی صاحب تکلیف فرمائیں تو احسان ہوگا۔ اسی ضمن میں حضرت طارق ابن زیاد رحمہ اللہ کی آخری زندگی کے متعلق تحقیق کرنا بھی ضروری ہے۔ گو واقعیت پر مبنی نہ ہو، مگر مجھے بالکل یقین ہے کہ فاتح اندلس کی حالت ہرگز ہرگز ایسی نہیں ہوئی تھی کہ وہ پردۂ دنیا سے بالکل محو ہو جائیں؛ یہ ہو سکتا ہے کہ وہ کسی بڑی مہم پر پھر نہ بھیجے گئے ہوں۔ حقیقت یہ ہے کہ جو شخص مُٹھی بھر آدمیوں کو لیکر اتنے بڑے ملک کو فتح کر لے، اُسکے عظمت و جلال کے لیے بڑی سے بڑی مہم بھی ایسی نہیں ہو سکتی کہ اُسکا تذکرہ خاص طور پر کیا جائے۔ اگر یہ دونوں معاملے یوں ہی ڈھکے چھپے رہے اور اس روشن زمانہ میں بھی لوگ یوں ہی پُرانے مورخین کی اندھا دھند پیروی کرتے رہے تو ایک طرف ایک خلیفہ اور دوسری طرف حضرت موسیٰؓ جیسا پاک نفس فاتح و ناظم قیامت تک کے لیے بدنام رہے گا۔ کیا غیرتمند مسلمان (اگر غیرت کا بعض مسلمانوں میں نام و نشان

رہ گیا ہو) اسکو گوارا کرتے ہیں؟

موسیو سید یو نے (صفحہ ۱۷۵) یہ ستم ڈھایا ہے کہ حضرت موسیٰؒ کو خلیفہ کے ہاتھ، یا خلیفہ کے حکم سے قتل کرایا ہے۔ میں بانگ دُہل کہتا ہوں کہ یہ واقعہ غلط اور بالکل غلط ہے۔ بنواُمیہ بُرے تھے یا بھلے (اور شاید ان میں بُرائی کا عنصر غالب نکلے) مگر اتنے محسن کُش نہ تھے جتنے بنوعباس، یا کم از کم موسیو سید یو اُنکو ثابت کرنا چاہتے ہیں۔

بنواُمیہ کی سلطنت کا قصہ "پیرے بود، پسرے داشت، گم شد، باز یافت" کے اصول پر جناب مصنف نے ختم کردیا ہے؛ حالانکہ یہی سب سے بڑی مہتم بالشان سلطنت تھی۔ عباسیوں پر آتے ہیں تو مامون الرشید کا ذکر کسی قدر تفصیل سے کرتے ہیں اور انکی تعریفیں کرتے ہیں۔ مگر ہم مسلمانوں، کے نزدیک اُن کی عظمت مسلّم؛ مگر اسکو کیا کیجیے کہ اُن کا وہاں وہی رتبہ ہے جو ہمارے ہندوستان میں اکبر کا کہ بانیِ عظمت اور قاطع سلطنت ہوا۔ مامون الرشید ہی تھے کہ جنھوں نے غیرملکیوں (ایرانیوں) کو سلطنت میں دخیل کیا۔ جسکا انجام یہ ہوا کہ عباسیوں کی سلطنت پارہ پارہ ہوگئی۔ بنوامیہ ہزار بُرے ہوں مگر انھوں نے اس بدعت سیئہ کا ارتکاب نہیں کیا۔ وہ سمجھتے اور جانتے تھے کہ دوسرے کے ہاتھوں مرنے سے اپنوں کے ہاتھوں قتل ہونا بدرجہا بہتر ہے۔ مجھے اس سے انکار نہیں کہ حضرت عمر بن عبد العزیز کی متقیانہ پالیسی کی وجہ سے سلطنت اسلامی کی اقتصادی حالت خراب ہوگئی تھی، لیکن انکے بعد کے تاجداروں نے اس حالت کو بغیر پرانے ٹیکس بڑھانے اور نئے ٹیکس لگانے کے اپنے آپ کو سنبھال لیا۔ عباسیوں کی طرح یہ نہیں کیا کہ مال تو ایک طرف جان بھی غلاموں کے سپرد کردی۔ بنوامیہ میں ایسے ہوشیار پیدا ہوگئے کہ جنھوں نے اپنے آپ کو سنبھال لیا ابو عباس کچھ ایسے جال میں پھنسے کہ ان کی لاش ہی اُس سے نکلی۔

تاریخ عرب کے صفحات ۱۸۰ لغایۃ ۱۹۵ واقعی قابل دید ہیں۔ ان میں خلفاء عباسیہ کا طریق حکمرانی اور اُنکے محاسن، اعمال عامہ اور انتظامات اندرونی، صنعت و حرفت و فلاحت، فنون ادبیہ و صناعیہ اور شان و شوکت کو نہایت خوبصورتی سے مختصراً بیان کیا ہے۔

یہاں تک میں نے کتاب پر تفصیلی نگاہ ڈالی ہے اسی کو اتنا طول ہوگیا ہے کہ میر صاحب کا یہ شعر یاد آتا ہے کہ

جو اس شور سے میر روتا رہے گا تو ہمسایہ کاہے کو سوتا رہے گا

اس لیے میں آیندہ موسیو سید یو ہی اختصار کی تقلید کروں گا۔

مختلف فرق مبتدعہ کی ترقی اور اُنکی کا فرما جرائی کے ذیل میں صفحہ ۲۰۷ پر کہا گیا ہے کہ "کچھ علما ر مفتون العقل اور فلاسفہ اور صوفیہ پیدا ہو گئے جو بواسطہ اعدام جمیع شہوات نفسانی اپنی ارواح کو ہمیشہ اللہ تعالیٰ کی طرف متوجہ رکھا کرتے تھے۔ اُنکا مذہب بھی پھیلا؛ خصوصاً فارس والوں میں خوب جاری ہوا" یہ فقرے ایسے ہیں کہ ان پر بہت کچھ لکھا جا سکتا ہے؛ اور یقیناً اسکے محتاج ہیں کہ ان پر مترجمان اول و دوم میں سے کوئی حواشی لکھتا۔ مصنف نے بحیثیت مورخ اور عیسائی ہونے کے اپنے نزدیک جو کچھ لکھا صحیح لکھا۔ ...... میرا یہ منصب نہیں ہے کہ اس پر کچھ کہوں یا لکھوں، بجز اسکے کہ اس فقرہ کے بعض حصے غلط فہمی پھیلانے والے ہیں۔

علوئیین کے متعلق جو زیادہ تفصیل نہیں ملتی اسکی شکایت حضرت حاجی مولانا ظفر الملک کو ہونی چاہیے؛ اس معاملہ میں وہ ہی احق ہیں۔

صفحہ ۲۳۴ میں ایک عنوان ہے "عربی حکومت کے زوال سے عربی تمدن زائل نہیں ہوا" اسکے ذیل میں جو کچھ لکھا ہے وہ دعویٰ ہی دعویٰ معلوم ہوتا ہے، ثبوت کچھ نہیں۔ توضیحاً یہ کہا جا سکتا ہے کہ عربوں کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ ممالک مفتوحہ، حتیٰ کہ وہ ممالک بھی جو اُنکے زیر اثر رہتے رہے، یا جو اُن کے ہمسایہ تھے اُنکی زبان کو بدل کر عربی کر دیتے ہیں، یا اُن ممالک کی زبانوں پر اتنا اثر ڈالتے ہیں کہ وہ نیم عربی ہو جاتی ہے۔ مثالاً افریقیہ اور ہندوستان کو پیش کیا جا سکتا ہے۔ ممکن ہے کہ یہ اثر ہو قرآن مجید اور احادیث نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کا؛ مگر اس سے تو انکار نہیں ہو سکتا کہ بالواسطہ یہ ہوتا رہا ہے اور ہوتا رہے گا، انشاء اللہ۔ بعض مقامات پر عرب غیر ممالک کے تمدن پر بھی یہی اثر ڈالتے ہیں۔ لیکن جو امر کہ زیادہ حیرت انگیز ہے وہ یہ ہے کہ اُن کی مفتوحہ اقوام چند ہی روز میں اُنکی ایسے گرویدہ ہو جاتے ہیں کہ اپنے دست و بازو بنجاتے ہیں۔ اور انکو اور ممالک فتح کر کے دیتے ہیں شاید اس کا باعث یہی ہوتا ہو کہ مفتوحین سے اُن کا سلوک اچھا ہو؛ لیکن خواہ مجھے تنگ خیال و واہمہ پرست کہا جائے میں تو یہ کہتا ہوں کہ عربی تمدن اگر زائل نہیں ہوتا تو یہ دلیل ہے اسلام کی صداقت کی، یا معجزہ ہے اسلام کا۔ اسکے متعلق بہت کچھ کہا جا سکتا ہے۔ میں نے مثالاً دو ایک باتیں لکھدی ہیں۔

مقالۂ پنجم میں مصنف علام نے مسلمانوں کی قریباً ہزار برس کی کشش و کوشش کا خوب خلاصہ کیا ہے جو قابل دید ہے۔

جو کچھ اوپر لکھا جا چکا وہ کافی سے زیادہ ہے؛ خلاصۂ کلام یہ ہے کہ کتاب پڑھنے کے قابل ہے

خاص کر اسلامی تاریخ کے طالب علم، جو خلاصے ڈھونڈھتے پھرا کرتے ہیں، اس سے بہت فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔ کتاب کیا ہے، بقول انگریزی خوانوں کے پرڈائی جیو ہے۔

طباعت کی غلطیاں ایک مرض لا علاج ہیں، اس کی تو کیا شکایت، مگر افسوس ہے کہ امصار و رجال کے ناموں میں بہت غلطیاں ہیں، بالخصوص اندلس کی تاریخ میں۔ تعجب ہے کہ جناب مترجم اول نے اس سے اعتنا نہیں کیا۔ اور مترجمین ثانی نے تو مطلق توجہ نہیں فرمائی۔ خدا کرے کہ دوسرے ایڈیشن کی جلد نوبت آئے اور ان غلطیوں کا ازالہ ہو جائے۔

محمد خلیل الرحمن

(مترجم اخبار الاندلس وغیرہ وغیرہ)

اشعارِ نعت

پیامِ نعمت و کرم کا پیامبر بھی کریم
وہ جسکے فیض سے روشن چراغِ طور ہوا
وہ جس نے قول و عمل سے دیا یہ درسِ لطیف
محمدِ عربی کابروے ہر دو سرا ست
"زباں پہ بار خدایا یہ کس کا نام آیا"
بہر نفس ز غلاماں روان پاکش را
عبودیت کا ملا تھا جو خاص خلعت اُسے
یہ خاص معجزہ قائم رہے قیامت تک
خدا کے حکم سے ثابت ہے اہل ایماں کو

شرف نصیب ہوا جسکے دم سے حسن شہود
وہ جسکی ذات ہے رونق فزائے بزم نمود
عبادتوں کا سزاوار ایک ہے معبود
کسیکہ نیست غلامش بباد او نابود
ہوا جو نطق کو بوسہ زبان کا مقصود
رسیدہ باد ورسد ہدیۂ سلام و درود
کسی نے اُسکو بنایا نہ آج تک معبود
دعا ہے تجھ سے یہ لے خالق غفور و ودود
ہے اتباعِ محمدؐ حیات کا مقصود

ہمیشہ اُسکی محبت سے دل رہیں معمور
محبت اُسکی یہی ہے کہ ہو ہمیں بھی عزیز
نصیب آنکھوں کی ٹھنڈک اُسے نماز میں تھی
پسندِ خاطرِ مومن، پسند اُسکی رہے
رضائے دوست سے باہر نہ آرزو ہو کوئی

جو یہ نہ ہو تو ہو عالم بدم زدن نابود
ہر ایک بات جو نزدیک اُسکے تھی محمود
سرورِ دل کا سبب تھے اُسے رکوع و سجود
یہی ہے یادگار اُس کی طریقۂ محمود
یہی ہے اہل محبت کا حاصل مقصود

محمد نجم احسن

روٹیوں کا نزاع

متحدہ[1] رومانی سلطنت کا آخری شاہنشاہ تھیوڈو[2] اسی اس مرتے وقت ۳۹۵ء میں سلطنت اپنے دونوں بیٹوں میں تقسیم کر گیا۔ اس تقسیم کی رو سے مشرقی یا یونانی یا بزنطینی[3] سلطنت جسکے اجزاء ایشیا میں ممالکِ این روئے فرات، سواحل بحرۂ اسود، اور ایشیائے کوچک۔ افریقہ ملک مصر اور یورپ میں آبنائے درِ دانیال سے لیکر بحیرۂ ایڈریاٹک[4] اور دریائے ڈینیوب[5] تک کل ممالک تھے بڑے بیٹے آرکے ڈی[6] اس کو ملی جسکا پایۂ تخت قسطنطنیہ قرار پایا اور مغربی یا یونانی یا لاطینی[7] سلطنت، جس میں افریقہ میں ممالک ماورائے مصر، یورپ میں اٹلی، اسپین، فرانس، برطانیہ اور مغربی البانیا شامل تھے چھوٹے بیٹے ہونوری[8] اس کے حصہ میں آئی جس کا دار الحکومت رومۃ الکبرے (روما[9]) ہی برقرار رہا۔ یہ جسے بخرے ایسی منحوس گھڑی میں ہوئے تھے کہ یونانی اور رومانی تصور مملکت کی اینٹ سے اینٹ بج گئی مگر انھیں متحد ہونا پھر کبھی نصیب ہی نہ ہوا۔

اُس زمانے میں دین و دنیا اور مذہب و حکومت، آج کل کی طرح، ایک دوسرے کی جان کے دشمن اور خون کے پیاسے نہ تھے۔ بلکہ اُن کا چولی دامن کا ساتھ تھا۔ وہ مِل جُل کر رہنا سہنا جانتے اور امداد و استمداد سے بسر کرنا چاہتے تھے۔ اب تک چونکہ سلطنت کے کُل اجزاء باہم گر متحد اور ایک ہی فرماں روا کے زیرِ نگیں تھے اس لیے ساری سلطنت کا مذہبی سردار ایک ہی شخص مانا جاتا تھا، اور وہ رومۃ الکبرے کا اُسقف (بشپ) تھا، جو کُل جماعتِ اساقفہ میں ممتاز و معظم سمجھا جاتا تھا۔ اور اگرچہ قسطنطنیہ کا بطریق[10] مشرقی کلیسیا کا لاٹ پادری مانا گیا تھا، تاہم دنیائے مسیحیت میں سرداری اور پیشوائی کی کرسی روما کے بشپ ہی کے لیے مخصوص و مسلم تھی، چنانچہ ۴۴۵ء میں

---

(2) Theodosius — (1) United Roman Empire
(4) Adriatic sea — (3) Eastern, Greek, or Byzantine
(7) Western Roman or Latin Empire — (6) Arcadius, (5) Danube
(10) Patriarch — (9) Rome (8) Honorius

جو مجلس کلیسائی قسطنطنیہ میں منعقد ہوئی اُس نے فیصلہ کر دیا تھا کہ اقتدار اور اثر کے اعتبار سے قسطنطنیہ کے بطریق کا درجہ روما کے بشپ سے دوسرے نمبر پہ ہے - لہذا جس طرح حکومتِ ملکی کا مرکز ایک تھا اُسی طرح حکومتِ مذہبی کا مرکز بھی ایک ہی رہا -

---

لیکن ۳۹۵ء میں جب حکومت کے حصّے ہو چکے تو ناممکن تھا کہ سجادۂ مذہب ٹکڑے ہونے سے بچ جاتا - قسطنطنیہ کی دنیوی حکومت کا فرماں روا جب اپنے آپ کو روما کی دنیوی حکومت کے فرماں روا سے کسی طرح کم نہیں سمجھنے لگا تھا اور اُن ممالک میں جو اُس کے لوائے تحکم کے سائے میں تھے اپنے رقیب کی طرف سے تنفیذِ احکام کسی طرح گوارا نہیں کر سکتا تھا تو قسطنطنیہ کی دینی حکومت کا فرماں روا جبکہ وہ بھی اپنے آپ کو روما کی دینی حکومت کے فرماں روا سے کسی طرح کم نہیں سمجھنے لگا تھا اُن ممالک میں جو اُسکی روائے تقدس کے سائے میں تھے اپنے رقیب کی طرف سے تنفیذ احکام کس طرح گوارا کر لیتا - چنانچہ جو مذہبی احکام روما کے بشپ کی پیشگاہ سے یونانی سلطنت کی قلمرو کے متعلق نافذ ہوئے ، قسطنطنیہ کے بطریق کی طرف سے پہلے اُن کی تعمیل میں بے توجہی پھر پہلو تہی اور اور اُسکے بعد علانیہ سرتابی کی گئی - نتیجہ یہ ہوا کہ تفوق و اقتدار کی ناگوار بحث چھڑی اور نہایت ہی شد و مد کے ساتھ چھڑی -

---

روما کے بشپ کا یہ دعوئ تھا کہ وہ خداوند مسیح کے شاگردوں میں سب سے زیادہ ممتاز و مقدس شاگرد پطرس[1] کے تبلیغی صدر مقام روما کے لاٹ پادری اور پطرس ہی کے قائم کیے ہوے، سب سے قدیم کنیسے کے پیش نماز ہونے کی حیثیت سے، حقیقی معنی میں خلیفۃ المسیح کا سجادہ نشین، اور اس اعتبار سے مشرق و مغرب کی ساری کلیساؤں کا تنہا واجب الاحترام مقتدا اور رہنما ہے - اور اسی حیثیت و اعتبار سے دنیائے مسیحیت کی حدود کے اندر، ہر اسود و احمر اور ابیض و اصفر مسیحی پر، عام اس سے کہ وہ عالم ہو یا عامی ، اُسکی حکومت نافذ، اُسکا حکم رائج ، اور اُسکا اتباع لازم ہے -

---

اسکے جواب میں قسطنطنیہ کے بطریق کا یہ دعوے تھا کہ وہ تعمیر قسطنطنیہ کے دن ہی سے مشرقی ممالک کا اسقفِ اعظم بنایا گیا ہے اور اُسکے حیطۂ اقتدار میں انطاکیہ - قیساریہ - دمشق اور اسکندریہ

(۱) [illegible]

جیسے قدیم شہروں میں خداوند مسیح کے شاگردوں کے قائم کیے ہوئے کنیسے، حتیٰ کہ ارض مقدس کا وہ محترم خطہ ہے جس کا چپہ چپہ انبیائے سلف، خداوند مسیح اور اُسکے رسولوں کے متبرک مجاہد و مشاہد سے معمور ہے۔ اور اس اعتبار سے عظمت و اقتدار میں وہ روما کے بشپ سے بدرجہا اور بمراتب افضل و اعلیٰ ہے۔ لہذا بجائے اِسکے کہ اُسکا درجہ روما کے بشپ سے فروتر مانا جائے، مسیحی دنیا پر لازم ہے کہ ارض مقدس کے معابد و مشاہد کی حرمت کو پیش نظر رکھکر، نہ صرف قسطنطنیہ کے بطریق کا درجۂ اقتدار روما کے بشپ سے بالاتر قرار دے بلکہ یونانی سلطنت کی طرح کل رومانی سلطنت کو بھی بطریقی حدود میں شامل کر دے۔

———— ❊ ————

اسکا جواب روما کے بشپ کی طرف سے یہ دیا گیا کہ جس زمانے میں روما کی خاک مسیحی شُہَدَاء کے خون سے لالہ زار بن رہی تھی اور اُس میں سے ربانی انوار و برکات کی شعاعیں نکل نکل کر عالم کو منور و متبرک کر رہی تھیں اُسوقت قسطنطنیہ کا وجود بھی نہ تھا اور اُسکی جگہ بزنطیوم[1] اپنے اوثان و اصنام اور اباطیل و اوہام کی ضلالت میں گرفتار ہوکر دنیا میں کفر پاشی کر رہا تھا۔ روما کا تقدس اس سے ظاہر ہے کہ وہاں قصر مسیحیت کی تعمیر اُس ملبے سے ہوئی جو بے دین رومی شاہنشاہوں طامی طس[2] اور ہیڈرین[3] کے مقدس یورشلیم[4] کو تباہ کرنے کے بعد، روما میں آیا۔ یعنی جب آخر الذکر ظالم نے خداوند مسیح کے مدفن مقدس کی جگہ یونانی دیوی وینس[5] کا بتخانہ تعمیر کرایا تو مسیحی رہبان و احبار کی جماعت ہجرت کرکے اسی شہر روما میں تو آئی تھی۔ وہ واجب الاحترام ولیہ یعنے سینٹ ہلینا[6] روما ہی کی مسیحی ملکہ تو تھی جس نے ارض مقدس کے مسمار شدہ معابد و مشاہد کی مرمت اور جدید معابد و آثار کی تعمیر کرائی تھی اور جس کی آغوش تربیت میں، مسیحیت کے سب سے پہلے مدد و محب، شاہنشاہ قسطنطین[7] نے پرورش پاکر سنہ ۳۳۰ء میں شہر بزنطیوم کو مسمار کرکے اسکی جگہ شہر قسطنطنیہ کی بنیاد ڈالی، اور وہ روما کے آبائی مسیحین کی روحانی تعلیمات سے فیضیاب پادری ہی تو تھا جو نو تعمیر قسطنطنیہ کا پہلا بطریق تھا۔

---

(1) Byzantium (2) Titus (3) Hadrian
(4) Jerusalem (5) Venus (6) St. Helena
(7) Constantine (8) Eastern or Greek Church

یہ سلسلۂ بحث و نزاع ایک مدت تک جاری رہا جس میں ابتداءً متانت کے ساتھ منطقی، تاریخی، اور مذہبی استدلال سے کام لیا جاتا تھا، مگر اسکے بعد متانت و دیانت کو بالائے طاق رکھکر فریقین عالمانہ موشگافیوں سے گذر کر سب و شتم اور فقیہانہ تکفیر و تفسیق پر اتر آئے۔ یہ تلاطم دیکھ کر مسیحیت کے ارباب حل و عقد نے مناسب سمجھا کہ مجلس کلیسائی پھر منعقد کر کے اس مسئلے کو پیش کیا جائے۔ چنانچہ ۴۵۱ء میں مجلس کلیسائی منعقد ہوئی جس میں مشرقی کلیسا(1) کے بااثر مندوبین کی تعداد غالب تھی۔ اس میں فریقین کے دعاوی پر کامل غور و توجہ اور مسئلۂ اقتدار کے مالہ و ما علیہ پر کافی فکر و نظر کے بعد قطعی فیصلہ کیا گیا کہ رومۃ القدیم (روما) اور رومۃ الحدیث (قسطنطنیہ) کے بشپ دونوں ہر اعتبار سے مساوی عظمت و اقتدار کے مالک اور اپنے اپنے حدود اثر و عمل میں کامل الاختیار ہیں، اور ایک کو دوسرے پر کسی حیثیت اور کسی لحاظ سے تقدم و تفوق حاصل نہیں

مجلس کلیسائی نے جو فیصلہ کر دیا تھا چاہیے تو یہ تھا کہ اس سے اقتدار و اثر کی اس ناشدنی بحث کا تلاطم فوراً فرو ہو جاتا، اور دونوں تقدس مآب شخصیتیں اپنے اپنے مقام پر یہ کہکر خاموش ہو جاتیں کہ

تم اپنے گھر کے چاند ہو ہم اپنے گھر کے چاند

لیکن یہ مقولہ چاہے کسی وقت غلط بھی ہو جائے کہ "دو بادشاہ در اقلیمے نگنجند"، اسکی یہ ترمیم شکل ہر وقت صحیح رہیگی کہ "دو ملا در دنیائے نگنجند"۔ چنانچہ دونوں میں سے ہر ایک کو اس بات کا سخت ملال ہوا کہ فریق ثانی بجائے ماتحت قرار دیے جانے کے اُسکا ہمسر اور مساوی الاقتدار قرار دیا گیا۔ اسپر مستزاد یہ ہوا کہ اسی عرصہ میں روما کے بشپ کا اعزاز و اقتدار رومانی سلطنت میں حد سے زیادہ بڑھ گیا اور اب وہ بجائے معمولی بشپ کے تقدس مآب پاپائے(2) اعظم کہلایا جانے لگا۔ اس ترقی مدارج نے پرانی آگ پھر سلگا دی جسے ایک طرف حسد اور دوسری طرف حرص کی ہوا نے خوب بھڑکایا، اور تکفیر و تفسیق کے شعلے پھر بلند ہو گئے۔ اس مرتبہ جن مسائل پر رسالہ بازی شروع ہوئی اُن میں ایک مسئلہ خصوصیت کے ساتھ پُر لطف، دلچسپ، بصیرت افروز اور اسی لیے قابل گذارش ہے۔ مگر اُسکے سمجھنے کے لیے تھوڑی سی تمہید کی ضرورت ہے جو درج ذیل کی جاتی ہے

His Holiness The Pope (2)   Eastern Church (1)

عیسائیوں میں ایک نہایت مقدس اور متفق علیہ رسم "عشائے ربانی" ہے جسے انگریزی میں یوکرسٹ[1] اور لارڈز سپر[2] اور ہولی کمیونین[3] کہتے ہیں۔ اس رسم کی اصلیت متی[4]، مرقس[5] اور لوقا[6] کی انجیلوں کی رُو سے (نہ اسلامی تعلیمات کی رُو سے) ملخصاً یہ ہے کہ جب حضرت مسیح آخر مرتبہ بیت المقدس میں تشریف لائے تو یہودیوں کی عید فطیر کا زمانہ تھا جس میں فسخ[7] کی قربانی ہوتی ہے۔ اس دفعہ حضرت کی طرف رجحانِ عام زیادہ دیکھ کر احبارِ یہود نے طے کر لیا کہ اب جس طرح ہو آپ کی جان ہی لیکر قصہ پاک کر دیا جائے۔ چنانچہ جس رات کو صبح ہوتے فقیہوں[8] اور فریسیوں[9] نے آپ کو گرفتار کرا کے اس جرم میں کہ آپ عوام کو مذہب یہود سے روگردانی اور حکومتِ وقت سے بغاوت کی تعلیم دیتے ہیں، رومی گورنر پانطیوس پیلاطوس[10] کی عدالت سے صلیب پر چڑھائے جانے کا حکم حاصل کیا اُسی رات کی شام کو حضرت مسیح نے اپنے شاگردوں کے ساتھ آخری کھانا کھایا۔ کھانے کے دوران میں آپ نے روٹی کے ٹکڑے توڑ کر دیئے اور فرمایا "لو کھاؤ یہ ابن آدم (یعنی خود مسیح) کے بدن کے گوشت کے ٹکڑے ہیں۔ پھر پانی (یا شراب) کا پیالہ دے کر فرمایا "لو پیو یہ ابن آدم کا خون ہے"۔ عیسائی اس واقعے کے اندر ایک دقیق روحانی رمز مضمر اور ایک عمیق ربانی راز مُتکر سمجھتے ہیں اور اسکی یادگار میں عشائے ربانی کی رسم ادا کرتے ہیں جس میں پادری، دعا خوانی کے بعد، اُس روٹی اور شراب کو جو میز پر رکھی ہوتی ہے مقتدیوں میں تقسیم کرتا ہے۔ عیسائیوں کا عقیدہ راسخ ہے کہ یہ روٹی حضرت مسیح کے جسم کے اصلی گوشت میں، اور شراب اُنکے خون میں تبدیل ہو جاتی ہے اور اِس روٹی اور شراب میں کراتنا سلب امراض اور طلبِ اغراض کی طاقت آ جاتی ہے۔ تبدیلِ ماہیت[11] کا یہ مسئلہ عیسائیوں کا ایک مہتم بالشان اور معرکۃ الآرا مسئلہ رہ چکا ہے۔

اس تمہید کے بعد اب یونانی اور رومانی کلیساؤں کا مابہ النزاع مسئلہ بیان کیا جاتا ہے۔ رومی کلیسا کے مذہب کے مطابق ضرور تھا کہ جو روٹی عشائے ربانی کے لیے پکائی جائے وہ تازہ گندمے ہوئے آٹے کی ہو، بخلاف اسکے یونانی کلیسا کے مذہب کی رو سے لازمی تھا کہ وہ روٹی تازہ گندھے آٹے

---

(1) Eucharist (2) Lords Supper
(3) Holy Communion (4) St. Matthew
(5) St. Mark (6) St. Luke
(7) Pass-over (8) Scribes
(9) Pharisees (10) Pontius Pilate
(11) Doctrine of Transmigration

فطیری کی نہ ہو، بلکہ جب خمیر اُٹھ آئے تو پکائی جائے۔ بالفاظ دیگر عشائے ربانی کے لیے رومی کلیسا نے فطیری اور یونانی کلیسا نے خمیری روٹی لازمی قرار دی تھی۔ جب روما کے پوپ اور قسطنطنیہ کے بطریق میں دوبارہ بحث شروع ہوئی تو دوسرے مسائل سے بڑھکر یہی چھوٹا سا مسئلہ اُن مہات المسائل میں قرار دیا گیا جن پر نجات اور شفاعت مسیح کا دارومدار تھا۔ چنانچہ فطیری اور خمیری روٹی کی بحث کے متعلق رسالہ بازی نے مسیحی دنیا میں وہ قیامت بپا کر دی کہ ایک کلیسا والے دوسرے کلیسا والوں کے خون کے پیاسے ہو گئے۔ فطیریے علانیہ خمیریوں کو کافر کہتے تھے اور خمیریے علی العلم کھلا فطیریوں کو بیدین۔

* * *

۱۰۵۳ء میں قسطنطنیہ کے بطریق مائیکل کیرو لاریس[۱] اور روما کے پوپ لیو نہم[۲] میں آخری تحریری مناظرہ شروع ہوا، جو بڑھتے بڑھتے بہت جلد مشاتمہ تک پہونچ گیا۔ بطریق کی بحث کا پہلو یہ تھا کہ واقعۂ صلیب عید فطیر کے دوران میں ہوا جس میں یہودی فطیری روٹی کھایا کرتے ہیں، لہذا عشائے ربانی میں فطیری روٹی کے استعمال کے معنی یہ ہیں کہ خود خداوند مسیح نے شاگردوں کے ساتھ فطیری روٹی کھا کر ناپاک اور بے دین یہودیوں کی عید فطیر منائی۔ اور چونکہ اس سے خود خداوند کی ذات گرامی پر تشبہ بالیہود کا ناپاک الزام عائد ہوتا ہے لہذا جو شخص یہ عقیدہ رکھے کہ خداوند مسیح نے اپنے آخری کھانے میں فطیری روٹی استعمال کی، اور جو شخص عشائے ربانی میں فطیری روٹی کے استعمال کا حکم دے، یا استعمال کرے، یا استعمال کو جائز قرار دے، یا جو شخص ایسے عقیدے، حکم، استعمال یا جواز کو کفر و ضلالت نہ جانے، وہ قطعی کافر، بے دین اور جہنمی ہے۔

* * *

۱۰۵۴ء میں پوپ صاحب کے سفیر قسطنطنیہ پہونچے۔ پہلے تو انھوں نے بطریق اعظم سے بحث کی۔ جب اس میں ناکام رہے تو سیدھے کنیسۂ ہجیا سوفیا[۳] میں پہونچے جو بحمد اللہ کہ قسطنطنیہ میں اسلام کی تشریف آوری کے بعد جامع ایا صوفیہ بن کر اس وقت تک مہبط انوار توحید ہے۔ یہاں انھوں نے قربان گاہ پر پوپ صاحب کا وہ دستخطی فرمان آویزاں کیا جس میں خمیری روٹیوں والے بطریق اور اُس کے متبعین کو قطعی کافر اور ابدی جہنمی قرار دیا گیا۔ پھر قربان گاہ کے زینہ پر کھڑے ہو کر آسمان کی طرف ہاتھ اُٹھائے اور بآواز بلند کہا۔۔

---

(۱) Machael Kerularius (۲) Leo IX

(۳) Hagia Sophia

"مقدس باپ! مقدس بیٹے! اور مقدس روح القدس! اگر مردود خبیث آئی کیلیئو اُسکے بے دین متبعین خمیری روٹی کے متعلق اپنے عقیدۂ کفریہ سے جلد توبہ نہ کریں تو اُن سب کی ناپاک روحیں قیامت تک شیطان اور اُس کی ذریات کے حوالے! اور اُن کا ٹھکانا ہاویہ کا درکِ اسفل! آمین

بطریق صاحب کیا تھوڑے تھے۔ اُنھوں نے جس وقت یہ واقعہ سُنا تو فوراً اپنی توپیں سنبھالیں اور اپنے جرنیلوں کی مدد سے پاپائی قلعے پر دھواں دھار کفر باری شروع کردی اور پاپائی کارروائی ۱۶ جون ۱۰۵۴ء کی ہمیشہ یاد رہنے والی تاریخ کو فطیری روٹی کا حکم دینے والوں اور اُسکے جواز کا عقیدہ رکھنے اور استعمال کرنے والوں کے کفروارتداد، اور دائرۂ مسیحیت سے قطعی اور کُلّی اخراج کا برسرِ منبر اعلان کرکے ہمیشہ کے لیے یونانی اور رومانی کلیساؤں کے درمیان تفرقِ کامل[1] کی دیوار آہنیں کھڑی کردی، جو تیرہویں چودھویں اور پندرہویں صدی کے مساعی اتحاد کے باوجود آج کے دن تک سربفلک موجود ہے اور ہمیشہ رہیگی۔ انشاء اللہ تعالیٰ۔

تفرقِ کے نتائج کی تفصیل لکھنے کے لیے مسیحیت کی آٹھ سو برس کی تاریخ کے صفحات مستعار مانگنے پڑیں گے۔ لہذا صرف ایک ہی واقعہ سُن لو کہ سلطان غازی محمد خاں ثانی رحمۃ اللہ علیہ نے سنہ ۱۴۵۳ء میں جب فتح قسطنطنیہ کا عزم بالجزم کرلیا تو مشرقی سلطنت[2] کے بوسیدہ و منہدم کے مجاور قسطنطین[3] یازدہم شہنشاہ قسطنطنیہ نے جہاں یورپ کے اور بادشاہوں سے مدد مانگی وہاں پوپ نکولس[4] پنجم کے آگے بھی ہاتھ پھیلائے۔ پوپ نے اپنے ندیم خاص کارڈی نل ایسیڈور[5] کو کچھ روپئے اور سپاہی دیکر قسطنطنیہ بھیجا اور روانگی کے وقت مطلب کی بات چپکے سے کان میں کہدی کہ مشرقی کلیسا کو مغربی کلیسا میں جذب کرنے کی پوری کوشش کرے۔ جب کارڈی نل مذکور نے قسطنطنیہ پہونچکر کنیسۂ اجیا سوفیا میں مغربی طریقہ پر عبادت کی تو مشرقی کلیسا والے غیظ و غضب سے آگ بگولا ہوگئے اور صلاح لینے کے لیے ایک مشہور راہب جناڈی اوس[6] کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ اُسنے کہا

---

(۱) Schism
(۲) Eastern Empire
(۳) Constantine
(۴) Nicholas V
(۵) Cardinal Isidore
(۶) Gennadios

کہ جو شخص اپنے (یونانی) مذہب کے مقابلہ میں فطیریوں کا ذرا بھی لحاظ پاس کرے، اس پر خداوند مسیح کا سخت عذاب نازل ہوگا۔ یہ شہ پاکر قسطنطنیہ کے پادریوں، سپاہیوں، اور عام باشندوں نے بلوہ کر دیا، جس کا سرغنہ رکن حکومت گرانڈ ڈیوک نوٹارس(۱) تھا۔ چنانچہ نوٹارس اور اسکے بلوائی شرکاء علانیہ کہتے تھے کہ "سینٹ سونیا کا گرجا، فطیری کتے کے بھونکنے، (دعا پڑھنے) سے ناپاک ہوگیا۔ ہمیں اپنے معابد میں مسلمانوں کی پگڑیاں دیکھنی منظور، مگر رومانی پادریوں کی ٹوپیاں دیکھنی ہرگز گوارا نہیں" خدا کی شان، کہ کارڈینل صاحب کی پگڑی اچھلنے کے بعد، تین ہلال بھی بدر نہ ہونے پائے تھے کہ اسلامی پگڑی جس پر سنہرا ہلال جگمگا رہا تھا سینٹ سونیا کے معبد کے اندر آموجود ہوئی!

* * *

تم نے دیکھ لیا کہ خمیری روٹی جیسی نرم چیز نے مسیحیت کے ایک ہزار سال کی عمر والے تناور درخت کو کیسا بیچ میں سے چیر کر دو ٹکڑے کر ڈالا! اسکے بعد سے یہ دونوں ٹکڑے اپنی اپنی جگہ بڑھنے اور ہوا میں جھومنے لگے، اور ہر ایک میں سے پچاسوں ڈالیں نکل آئیں جو موٹی ہو ہو کر اصل درخت سے ہمسری کرنے لگیں۔ پراٹسٹنٹ(۲) شاخ تو کہیں ۱۵۲۹ء کے موسم بہار میں جاکر پھوٹی ہے۔ اس میں سے اور نیز دوسری ڈالوں میں سے بعد کو بہت سی شاخیں نکلیں، جو اس وقت سرسبز و شاداب، اور نئی نئی کلیوں اور کونپلوں، اور نئے نئے پھولوں اور پھلوں سے لدی ہوئی زمین پر لوٹ رہی ہیں۔

کَشَجَرَۃٍ خَبِیْثَۃِ اجْتُثَّتْ مِنْ فَوْقِ الْاَرْضِ مَالَہَا مِنْ قَرَارٍ۔

* * *

یہ تو تھے ان لوگوں کے حالات، جنکے متعلق فَاَغْرَیْنَا بَیْنَہُمُ الْعَدَاوَۃَ وَ الْبَغْضَآءَ اِلٰی یَوْمِ الْقِیٰمَۃِ کی وعید موجود ہے۔ لیکن کیا اس خیر الامم کے لیے جسے وَاعْتَصِمُوْا بِحَبْلِ اللّٰہِ جَمِیْعًا وَّلَا تَفَرَّقُوْا اور وَلَا تَکُوْنُوْا کَالَّذِیْنَ تَفَرَّقُوْا وَاخْتَلَفُوْا کے صاف اور صریح احکام مل چکے ہیں مقام صد عبرت اور باعث صد ہزار غیرت نہیں کہ فطیری اور روٹیوں کی طرح چھوٹی چھوٹی باتوں کو بنائے تفریق و تمزیق قرار دیکر اپنے آپ کو اُولٰئِکَ لَہُمْ عَذَابٌ عَظِیْمٌ یَوْمَ تَبْیَضُّ وُجُوْہٌ وَّتَسْوَدُّ وُجُوْہٌ کا مصداق بنائے؟ اللہم احفظنا۔

"شمع بے نور"

---

(۱) Grand Duke [illegible]

(۲) Protestant

میر انیس کی شاعری کا ایک زبردست عنصر

میر انیس کے کلام میں عورتوں کی نفسیات کے جو مرقعے پیش کیے گئے ہیں، اور انکے جذبات و خیالات کو جس زبان و اسلوب بیان کے ذریعہ سے ظاہر کیا گیا ہے، وہی انکے کلام کا زیادہ قابل لحاظ اور زیادہ بحث طلب عنصر ہے۔ موخرالذکر یعنی عورتوں کی گفتگو اور محاورات سے دیگر مرثیہ گو شعرا نے بھی بینوں میں خاطر خواہ کام لیا ہے۔ لیکن میر انیس کے یہاں اسکو جو وقعت حاصل ہے، کسی اور کے کلام میں نہیں۔ پہلے تو انکے گھر انے کی زبان ہی ایسی تھی کہ اگر وہ اپنی تمام زندگی میں اس پر ہر وقت فخر کیا کرتے تھے تو کوئی تعجب کی بات نہ تھی۔ اور پھر انکا ذاتی شوق اور کوشش جسکی بنا پر انکے ہر مرثیہ میں فصیح سے فصیح زبان اور لطیف سے لطیف محاورہ کا التزام رہتا تھا۔

معلوم ہوتا ہے کہ انکے خاندان ہی پر فطرت کی جانب سے عورتوں کے جذبات و خیالات کی ترجمانی کے لیے ایک خاص قدرت ودیعت کردی گئی تھی۔ انکے دادا میر حسن نے اپنی مثنوی (سحرالبیان) میں بدر منیر کی جو حالت پیش کی ہے، وہ بھی حد درجہ پاکیزہ ہے۔ برخلاف اسکے میر حسن سے قریب زمانہ کے دوسرے شعرا کی مثنویوں میں جہاں کہیں عورت کا مرقع پیش کیا گیا ہے، اصلیت اور پاکیزگی کا بہت کم خیال رکھا گیا ہے۔

عورت کی نفسیات، مرد کی نفسی کیفیات سے متنافر ہوتی ہے۔ وہ اگرچہ انتہا درجے کی حساس ہوتی ہے، لیکن ہر وقت صبر و استقلال سے کام لیتی ہے۔ بعض نزاکتوں کی طرف اسکی طبیعت اس قدر سرعت کے ساتھ منتقل ہو جاتی ہے اور ان سے متکیف ہونے لگتی ہے، کہ مرد انھیں بدقت تمام معلوم کرکے ان سے لطف اندوز ہو سکتے ہیں۔ اور جن باتوں کو وہ آسانی سے نہیں سمجھ جاتی، انھیں سمجھ جانے کے بعد ان پر ایسی راسخ العمل ہو جاتی ہے کہ پھر جان دیدینا گوارا کرلیگی، مگر اپنا خیال پلٹنا اسکے لیے ناممکن ہوگا۔

یہ باتیں ایسی ہیں جو ہر ملک و ہر قوم کی عورت کو اپنی ماں کے ورثہ میں ہاتھ آتی ہیں۔ لیکن بعض خصوصیات ایسی بھی ہیں جو ہر جگہ کی عورت میں مشترک نہیں ہوتیں۔ اس بارے میں سب سے زیادہ ماحول کا اثر ہوتا ہے۔ عربستان، ہند، اور جاپان کی عورتوں کی طبعیت میں (متذکرۂ بالا صفات کو چھوڑکر) حسب مدا اختلاف ہوگا۔ عورتیں تو خیر ایک محدود فضا میں مقید رہتی ہیں، ان

ممالک کے مرد بھی نفسی کیفیات کے لحاظ سے آپس میں بے حد مختلف ہیں۔

اس روشن زمانہ میں جب تمام دنیا مختلف النوع ذرائع آمد و رفت کی آسانی کے باعث قریب سے قریب تر ہوتی جا رہی ہے، اور اس کے دور دور کے ممالک ایک ہی شہر کے متفرق گلی کوچوں کی شکل میں منتقل ہوتے جا رہے ہیں، اس بات کی ان تھک کوششیں ہو رہی ہیں کہ تمام دنیا کے مختلف میلانات کو ایک اور صرف ایک ہی نقطہ پر لاکر ٹھہرا لیا جائے۔ اس میں کوئی شک نہیں اس مقصد کے حصول کے لیے جو ذریعے اختیار کیے جا رہے ہیں، وہ ایک حد تک مفید ضرور ہیں، لیکن ہمارا خیال ہے، جب تک کسی نہ کسی طریقہ سے تمام دنیا کی عورتوں کی طبیعت کو ایک نہ کر لیا جائے گا اس مقصد میں ہرگز کامیابی نہیں ہو سکتی۔

عربستان کی عورت ہندوستان کی عورت سے بالکل جدا ہوتی ہے۔ اگر ہندوستانی مرد کے سامنے ایک چینی عورت کی نفسیات پیش کیجائے اور نہ بتایا جائے کہ "یہ ایک عورت ہے" تو وہ اس قسم کی فطرت والی ہستی کو ہرگز عورت نہ سمجھے گا۔ اسی طرح فرانس یا امریکہ والوں کے آگے ہندوستان کی پردہ نشینوں کی فطرت کا مرقع بغیر "ہندوستانی عورت" لکھے پیش ہو، تو وہ اسکو ایک عجیب اور نئی قسم کی مخلوق خیال کریں گے۔ گو عورت خواہ کہیں کی ہو، جب مرد کے سامنے آجاتی ہے، اُسکے "دائرہ پرستش" کا ایک مستقل مرکز، اور تخیلات و جذبات کا ایک یقینی جولانگہ بن جاتی ہے۔ وہ اپنے جنس مقابل کے لیے (اگرچہ اُسکا ہم رنگ و ہم مزاج نہ سہی) ایک ایسا "نغمۂ سرمدی" چھوڑ جاتی ہے، جس سے متاثر ہوئے بغیر دنیا کا کوئی مرد نہیں رہ سکتا۔ اس کی مضراب ہستی مرد کے ساز فطرت کے ہر تار کو چھیڑ جاتی ہے۔ وہ اسکی عقلی، اخلاقی اور روحانی، غرض ہر قسم کی قوتوں میں ہیجان پیدا کر دیتی ہے۔

میر انیس اگر ہندوستانیوں کی نظروں کے آگے ایک عرب عورت کا مکمل نقشہ کھینچ دیتے تو اُنکے کلام کو اس قدر مقبولیت حاصل نہ ہوتی۔ کیونکہ ہندوستانی انکی پیش کردہ ہستیوں کو اپنی چیز نہ سمجھ کر ان سے غیریت برتتے، اور یہ مغایرت اُنھیں ان ہمدردیوں اور پُرخلوص محبت سے روکے رکھتی، جو آج میر انیس کا کلام پڑھنے کے بعد حضرت زہراؑ، حضرت زینبؑ، حضرت بانوؑ، حضرت صغراؑ اور حضرت کلثومؑ وغیرہ کے متعلق خود بخود پیدا ہو جاتی ہے۔ ایک زبردست مقنع کے لیے اس راز سے واقف ہو جانا ضروری تھا۔ اسی لیے میر انیس نے جن نسائی سیرتوں کو پیش کیا ہے اُن میں ایک حد معینہ تک ہندوستانی فطرت کو بھی شامل کیا ہے۔ چنانچہ جہاں تک

کا تعلق ہے اُنکے مرثیوں کی جملہ عورتیں ہندی ہیں۔ رسم و رواج کے لحاظ سے یہ سب نصف ہندی ہیں اور نصف عرب۔ اور ان سے قطع نظر کرنے کے بعد جب حضرت زہراؓ اور حضرت زینبؓ کے کردار پر نظر ڈالی جاتی ہے تو وہ بالکل عرب عورتیں دکھائی دیتی ہیں۔

مجموعۂ مراثی انیس جلد اول (مطبوعۂ نظامی پریس بدایوں) کے سب سے پہلے مرثیہ میں حضرت فاطمہؓ کا کردار پیش کیا گیا ہے۔ ایک دفعہ حضرت امام حسنؓ اور امام حسینؓ (جب دونوں بچے تھے) آنحضرت رسولِ خدا کے پاس کھیلتے کھیلتے پہونچ جاتے ہیں۔ امام حسنؓ نانا کو اپنے بھائی کا مُنہ اور اپنا گلا چومتے ہوئے دیکھ کر غصہ میں آجاتے ہیں کہ نانا نے ہمارا بھی مُنہ کیوں نہ چوما، اور روتے ہوئے گھر واپس آتے ہیں۔ حضرت زہراؓ جب اپنے چھوٹے صاحبزادے کو روتا ہوا دیکھتی ہیں تو اُسوقت انکی جو کیفیت اور انکی زبان سے جو گفتگو ظاہر کی ہے وہ ایک حد تک ہندوستانی عورت کی فطرت اور نفسیات سے متعلق ہے۔ چنانچہ ماں بچہ سے کہتی ہیں:۔

ہے ہے حسینؓ! کیا ہوا تو کیوں ہے تلملا؟
تجھ کو رُلا کے غم میں مجھے مبتلا کیا!
قربان ہو گئی تجھے کس نے خفا کیا؟

میرا کلیجہ پھٹتا ہے اے دلربا! نہ رو　　　زہراؓ ہزار جان سے تجھ پر فدا نہ رو
مرتیں نہ درد ہو کہیں لے مہ لقا نہ رو　　　بس بس نہ رو حسینؓ! برائے خدا نہ رو

کہتے کہتے آخر کار چادر سے مُنہ ڈھانپ کر خود بھی رونے لگتی ہیں اور کہتی ہیں:۔

گھر سے گئے تھے ساتھ جدا ہو کے آئے ہو
سمجھی میں، کچھ حسنؓ سے خفا ہو کے آئے ہو

تم چپ رہو وہ گھر میں تو مسجد سے پھر آئیں　　　گذری میں کھیل سے مرے بچے کو کیوں رُلائیں
اُن سے نہ بولیو وہ تمھیں لاکھ گو منائیں　　　لو آؤ جانے دو، تمھیں چھاتی سے ہم لگائیں

واری اگر حسنؓ نے رُلایا برا کیا
پوچھوں گی کیا نہ میرے بچے نے کیا کیا؟

جب لڑکا جب اپنی ماں سے کہتا ہے کہ نانا نے آج بھائی کا مُنہ چوما اور ہمارا نہیں، اس لیے ہم روکے اپنی جان گنوائیں گے۔ نہ پانی پئیں گے اور نہ کھانا کھائیں گے۔ اسپر ماں کی زبان سے حسب ذیل محبت بھرے جملے نکلتے ہیں:

ہے ہے یہ کیا کیا مجھے ہوتا ہے اب قلق صدقے گئی کرو نہ کلیجے کو میرے شق
میرا لہو بہے گا جو آنسو بہاؤ گے !
کاہے کو ماں جیے گی جو کھانا نہ کھاؤ گے

اسکے بعد صاحبزادے کو نانا کے پاس لیجانے اور وہاں کی گفتگو کا جو مرقع پیش کیا ہے، اُس میں عربی کردار جھلک جاتا ہے۔ چنانچہ مُنہ کے نہ چومنے کے متعلق کسی قسم کا شکوہ و شکایت کرنے کے بجائے حضرت فاطمہؑ (اپنے والد سے) کہتی ہیں :-

مُنہ کے نہ چومنے کا گلہ کرنے آئے ہیں روٹھے تھے یہ قدموں پہ سر دھرنے آئے ہیں

اور جب رسول خدا اثنائے گفتگو میں رونے لگتے ہیں تو یہ تاڑ جاتی ہیں اور کہتی ہیں ؎

کیوں بابا جان خیر تو ہے اسکی جان کی فاقے میں کاٹتی ہوں مصیبت جہان کی

اور جب وہ حقیقتِ حال سے آگاہ فرماتے ہیں تو اپنے باپ کے برتے پر کہتی ہیں ؎

قدرت ہے سب طرح کی شہِ مشرقین کو حضرت سے لونگی اپنے حسن اور حسین کو

پھر غصہ میں آجاتی اور کہتی ہیں کہ "کیا اِنکو قتل کرنا آسان ہے ؟ کیا اُس دن شیر حق کمر سے ذوالفقار نہیں کھولیں گے ؟ کیا میں بال کھولے ہوئے باہر نہ نکل جاؤں گی؟ اور عرش عظیم کا پایہ نہ ہلاؤں گی؟" تو حضرت فرماتے ہیں کہ اُسوقت نہ میں ہوں گا نہ علیؑ : فاطمہؑ اور نہ حسنؑ۔ تو زہراؑ کہتی ہیں کہ

ہے ہے مرے حسینؑ کو پھر کون روئے گا ہم میں سے ایسے وقت جو کوئی نہ ہووئے گا

آخرکار مذہب اور بابا جان کی خاطر سینے پر پتھر رکھنا گوارا کر لیتی ہیں، لیکن محبت سے مجبور ہو کر بابا جان سے کہتی ہیں ؎

اللہ یہ بلا مرے بچے کی رد کرے کیجے دعا کہ خالقِ اکبر مدد کرے

حضرت زہراؑ کا تو ایک ضمنی ذکر تھا۔ میر انیس نے حضرت زینبؓ اور حضرت صغریٰؓ کا نسائی کردار نہایت مکمل حالت میں پیش کیا ہے۔ ان ہی دونوں کے بیانات میں اُنھوں نے عورتوں کی فطرت سے واقفیت کی پوری قدرت دکھا دی ہے۔ حضرت صغریٰؓ کے کردار پر اب تک متعدد طریقوں سے روشنی ڈالی جا چکی ہے، اسلیے ہم اپنے اس مضمون میں اس سے قطع نظر کر کے صرف حضرت زینبؓ کی سیرت پر ایک نظر ڈالتے ہیں۔ انیس نے کئی مرثیوں اور بالخصوص مجموعہ مراثی انیس جلد اول (مطبوعہ نظامی پریس بدایوں) کے مرثیوں نمبر ۶ - ۷ - ۸ - اور ۹ میں انکے کردار کو

خاص طور پر ظاہر کیا ہے۔ ذیل میں ہم ان تمام مرثیوں کے متفرق بیانات کو ایک منضبط شکل میں پیش کرتے ہوئے انیس کی اس قسم کی صناعی پر روشنی ڈالتے ہیں۔

حضرت زینبؓ امام حسینؑ کی چہیتی بہن ہیں۔ انکو اپنے بھائی کے مقابلہ میں دنیا کی کوئی چیز عزیز نہیں۔ مدینہ سے نکلتے وقت جب محلہ کی عورتیں آکر سمجھاتی ہیں کہ

گھر فاطمہ زہرا رضؓ کا ہے اس گھر کو نہ چھوڑیں

اور رنج والم کا اظہار کرتی ہیں تو آپ فرماتی ہیں کہ صرف آپ لوگوں ہی کو اسکا رنج نہیں ہو بلکہ مجھ کو بھی ہے رنج ایسا کہ کچھ کہہ نہیں سکتی بھائی سے جدا ہو کے مگر رہ نہیں سکتی میں فاقے کر کے بھی اماں کی تربت کا سرہانہ جاتی لیکن کیا کروں بھائی کی طرف دیکھ کے میری چھاتی بھر آتی ہے۔ کیونکہ ظاہر میں تو اماں قبر میں سوتی نظر آتی ہیں لیکن جب کبھی خواب دیکھتی ہوں تو اُنھیں روتے ہوئے دیکھتی ہوں۔ اُنھوں نے مجھے مرتے وقت وصیت کی تھی کہ "حسینؑ کا نہ باپ رہے گا نہ ماں رہیگی اس لیے اسکے غم میں تو رفاقت کرنا" اب مجھے اُنکی وصیت رہ رہ کر یاد آتی ہے کہ ؎

اس دن مری تربت سے بھی مُنہ موڑیو زینب	اس بھائی کو تنہا نہ کبھی چھوڑیو زینب

گھر بھائی سے تھا، جب بھائی نہیں تو گھر بھی نہیں۔ اب خواہ رسی سے ہاتھ بندھیں یا بلوہ میں سر کھلے۔ کچھ ہی ہو، زینب بھائی کے ہمراہ ہے اور اس کوچ کے انجام سے بھی آگاہ ہے۔ غرض ایک محبت والی اور وفادار بہن اپنے بیمار و ناتوان شوہر کو مدینہ میں چھوڑ کر بھائی کی رفاقت کے لیے دو چھوٹے چھوٹے بچوں کے ساتھ اپنے گھر سے نکلتی ہے۔

کربلا پہونچنے کے بعد انتخاب قیام گاہ کے متعلق حضرت زینب اور حضرت عباس میں نہایت درد آمیز گفتگو ہوتی ہے۔ اسکے بعد اس فیاض عورت کے ایک ایثار کا موقع آتا ہے۔ اور وہ یہ ہے کہ جب کربلا میں حضرت امام حسین اپنی فوج کی تنظیم کرنے لگتے ہیں تو حضرت زینب کے صاحبزادوں کو خیال پیدا ہوتا ہے کہ فوج کی علمبرداری ہمارا موروثی حق ہے۔ اسلیے دونو آپس میں مشورہ کرتے ہیں کہ "کیوں بھائی! علم لینے کے لیے ہم ماموں سے کہیں؟ اسلیے کہ ہم دونوں طرف سے حقدار ہیں۔ ہمارے دادا اور نانا دونوں علمدار تھے"۔ بڑا کہتا ہے کہ "زنہار یہ عرض کرنے کا موقع نہیں، ماموں مالک و مختار ہیں، وہ جس کو چاہیں دیں، ہمارا بڑا عہدہ تو یہی ہے کہ ماموں پر فدا ہو جائیں، چپکے رہو اماں سن کر کہیں خفا نہ ہو جائیں"۔

حضرت زینب پردے کے پیچھے سے یہ گفتگو سُن لیتی ہیں اور فضّہ کے ذریعہ ان دونوں کو بُلا کر چھوٹے لڑکے سے کہتی ہیں کہ "تم ابھی کیا باتیں کر رہے تھے۔

سمجھے نہ کہ مادر عقبِ پردہ کھڑی ہے — گھر لٹتا ہے میرا تمھیں منصب کی پڑی ہے

میں دیکھ رہی ہوں کہ جب سے علم نکلا ہے تمھارے تیوری اور ہو گئے ہیں۔ تمھارے سِن ابھی کم ہیں، تمھارے قد ابھی چھوٹے ہیں۔ یہ کھیل نہیں، محمدؐ کا علم ہے! مانا یہ تمھارا حق ہے لیکن میں اپنے چھوٹے بھائی کو اپنے بیٹے کے برابر سمجھتی ہوں۔ یہ علم اُسی کو ملنا چاہیے ؎

بگڑوں گی گلہ گر کسی اسلوب کروگے — عباس سے کیا تم مجھے محجوب کروگے؟

دیکھو عباس کو علم ملتے ہی تم اُنھیں جاکر تہنیت علم دو ؎

کنبہ میں اگر ایک نے بھی سُن لیا یہ حال — کہتی ہوں صاف میں، مجھے ہوگا بہت ملال

صدقے گئی خلافِ ادب کچھ سخن نہ ہو — میری یہ خوشی ہے کہ جبیں پر شکن نہ ہو

اور تم اپنے ماموں کے قدموں پہ اپنے سر کو فدا کردو۔ دیکھو! اگر قاسم و اکبر تم سے پہلے میدان میں زخمی ہوئے تو پھر تم میرے فرزند نہیں تم دونوں کی ماں"۔

یہ ہے ایک عرب عورت کی فیاضی کہ اپنے بیٹوں کے مقابلہ میں اپنے بھائی کو ترجیح دیتی ہے! اور یہ ہے ایک بہادر عورت کا ایثار کہ اپنے بچوں کے موروثی حق سے اپنے چھوٹے بھائی کو سرفراز کرتی ہے!! یہی وہ مقام ہے جہاں میرانیس کی نسائی فطرت کے گہری واقفیت کا کمال ظاہر ہوتا ہے !!!

حضرت زینب کا کردار بالکل عربی ہے۔ انیس نے صرف ایک مفید حد تک انھیں ہندی نفسیات سے متعلق کیا ہے اور وہ بھی صرف بینوں میں، جہاں مجبوری تھی۔ کیونکہ بغیر اس عنصر کے مرثیہ گوئی کا مقصد (یعنی رونا اور رُلانا) فوت ہوا جاتا تھا۔ حضرت زینب کی عرب نفسیات اُس وقت بالکل نمایاں ہو جاتی ہے جبکہ کربلا کے میدان میں تمام رفقاء شہادت سے سرفراز ہوتے ہیں، اور صرف گھر والے باقی رہ جاتے ہیں۔ حضرت زینب کو بُرا معلوم ہوتا ہے کہ اب تک انکے بچوں کی لاشیں کیوں نہ آئیں؟ چنانچہ اپنے لڑکوں کے متعلق کہتی ہیں ؎

آتا ہے دم بہ دم صبح سے یاں لاشہ پہ لاشہ — انکے لیے اوروں کی لڑائی ہے تماشہ

مانگی نہ اجازت نہ سخن خوب تراشا — باتیں ہیں یہ ساری مجھے باور نہیں آتا

بہکے ہیں وہ اور تمہیں بہکے ہے کسی نے — وہ سب بھی تو پیارے تھے حسین ابن علیؑ کے

اس کی نہ خبر تھی کہ دغا وقت پہ دیں گے   میں جانتی تھی پہلے اجازت وہی لیں گے

جب صاحبزادے ماموں سے بوقت تمام جنگ کی اجازت لیکر ماں سے رخصت ہونے آتے ہیں تو یہ خفا ہو جاتی ہیں کہ یہ دونوں اب تک کیوں نہ جنگ پر روانہ ہوئے اور ماموں کے لیے کیوں نہ جانیں دیدیں۔ چنانچہ انھیں ڈرپوک اور بے وفا سمجھ کر انکی طرف دیکھنا نہیں چاہتی بلکہ :—

منہ پھیر کے کہنے لگیں یہ شاہ کی ہمشیر   غیرت کی ہے جا غیر تو ہو فدیۂ شبیر
شکوہ ہے مقدر کا کچھ ان کی نہیں تقصیر   منہ پھیریں وہ مقتل سے جو ہوں صاحبِ شمشیر
انصاف تو کیجے مجھے کیونکر نہ گلا ہو
وہ پہلے نہ بیدم ہوں لہو جن میں ملا ہو؟

یہ کس نے کہا تھا کہ ہمیں پہلے مریں گے   آفت سے یگانے ہی جو ہمت نہ کریں گے
فرزند حسنؑ مرنے کو جالیں تو یہ جائیں   عباس علی خوں میں نہا لیں تو یہ جائیں
ہمشکل علی برچھیاں کھالیں تو یہ جائیں   لاشے ابھی شہزادوں کے آلیں تو یہ جائیں
کھلتا نہیں کچھ زورِ شجاعت انھیں کیوں ہے
حضرت تو سلامت ہیں یہ عجلت انھیں کیوں ہے

کیوں روتے ہیں کیا چھن گئی سر سے مرے چادر   خالی ابھی ہونے دیں محمدؐ کا بھرا گھر
جرأت میں وہ جعفر ہیں شجاعت میں یہ حیدر   وقت آئے تو دکھلائیں گے تلوار کے جوہر
جب کوئی نہ ہوئے گا تو یہ جنگ کریں گے
کیا عیب ہے؟ پہلے نہ مرے بعد مریں گے!

کچھ منہ کا نوالا نہیں تلواروں کا کھانا   میں سمجھی تھی پہلے ہی یہ ڈھونڈیں گے بہانا
بہتر ہے کہ وفاداروں سے خالی ہو زمانا   لازم تھا اُسی وقت انھیں خیمہ میں آنا
ماں کو تو سبک کر چلے کنبے کی نظر میں   میں مٹ گئی اس رنج و مصیبت کے سفر میں
پوچھے کوئی اِن سے کہ یہ کیوں آئے ہیں گھر میں   کھولیں اسے باندھے ہیں جو تلوار کمر میں
فوجوں میں یہی طور تھے خالق کے ولی کے؟
تو ناز ہے اس پہ کہ نواسے ہیں علی کے!

توڑ آئے ہوں خیبر سے کسی در کو تو کہدیں   مارا ہو جو مرحب سے دلاور کو تو کہدیں

خوشنود کیا ہو جو برادر کو تو کہدیں — تا کو نہ بھگا آئے ہوں لشکر کو تو کہدیں

چپ کیوں ہیں جو نصرت کی خبر لیکے پھرے ہیں؟

کیا شام کے سردار کا سر لیکے پھرے ہیں؟

عورت اکثر کسی بات کو صاف سیدھے طور پر نہیں بیان کرتی۔ خصوصًا جب وہ غصہ میں ہوتی ہے تو اپنے ہر مطلب کو طعن و تشنیع کے ذریعہ ادا کرنا چاہتی ہے۔ اور صرف اسی ایک بات کو پیش نہیں کرتی جس سے وہ متاثر ہوئی ہے بلکہ اُس سے متعلقہ تمام واقعات یکے بعد دیگرے سناتی جاتی ہے۔ جب اُسکے دل پر کوئی ٹھیس لگتی ہے تو پہلے زبان سے ظاہر کرنا تو کجا وہ حتی الامکان اس امر کی کوشش کرتی ہے کہ اپنی قلبی واردات اور ذہنی کیفیات اپنے بشرے سے بھی ظاہر نہ ہونے پائیں۔ لیکن جب کسی وجہ سے وہ پھوٹ پڑتی ہے تو اسکے محیط جذبات میں ایک ایسا تلاطم انگیز ہیجان پیدا ہوتا ہے کہ غم و غصہ کے تیز و تند سیلاب اُس کی آنکھوں اور زبان سے نکلے بغیر نہیں رہ سکتے۔ اور نہ دُنیا کی کوئی طاقت انھیں بہنے سے روک سکتی ہے۔ انیس اگر اس موقعہ پر نسائی فطرت کی اس خصوصیت کو نمایاں کرکے نہ دکھاتے تو اُنکی شاعری میں بہت بڑا نقص باقی رہ جاتا۔

حضرت زینب ایک عورت ہیں، اور خاص کر عرب کی عورت۔ ان کا جوش جسقدر بڑھا ہوا نظر آئے، کم ہے۔ اور اگر انکی زبان سے مسلسل ہمت افزا اور طعن آمیز جملے نکلتے جائیں، تو کوئی تعجب کی بات نہیں۔ تعجب تو اُسوقت ہوتا جبکہ وہ ایسی نازک حالت میں بھی متاثر ہوئے بغیر رہتیں۔ بیگانوں کو شہادت کا مرتبہ حاصل کرتا ہوا دیکھ کر انکی رگِ حمیت جوش میں نہ آتی۔ اپنے بھائی، عزیز ترین بھائی کے بُرے وقت میں اپنے بچوں کو قربان کیے بغیر خاموش رہ جاتیں۔ یہ ایک عورت، عرب عورت اور بالخصوص خاندان رسالتمآب کی عورت کے لیے نا ممکن تھا!! جسکی رگ رگ میں محبت و الفت کے جذبات کوٹ کوٹ کر بھر دیے گئے ہوں، جسکی بات بات میں صداقت اور حمیت کے پھول جھڑتے ہوں، اور جسکے قدم قدم پر فیاضی اور ایثار کے نشان قائم ہوتے جاتے ہوں!! اس موقع پر انیس نے اپنی شاعری کو معراجِ کمال پر پہونچا دیا ہے۔ عورت کی اور پھر ایک عرب عورت کی نفسیات کا اس سے بہتر مرقعہ دستیاب نہیں ہو سکتا!

ماں کا غصہ دیکھ کر دونوں صاحبزادے کانپ جاتے ہیں اور نہایت عاجزی سے عرض

کرتے ہیں ؎

آرزو یہ ہوں آپ ہیں تھا یہی وسواس　　جب پڑھتے تھے ہم روکتے تھے حضرت عباس
جوڑے ہیں کبھی ہات کبھی گر دپھرے ہیں
راضی ہوئے جب پاؤں پہ اسوقت گرے ہیں

ایک مرثیہ میں دکھایا گیا ہے کہ صاحبزادے خود آکر اپنی والدہ کو اجازت جنگ کی خوشخبری نہیں سناتے بلکہ فضہ معلوم کر آتی ہے کہ "عون و محمد اب جنگ کو جا رہے ہیں" تو حضرت زینب بجائے کسی قسم کی تشویش کے خدا کا شکر بجالاتی ہیں کہ اب میرا مطلب بر آیا۔ وہ عام عورتوں کی طرح اُسوقت یہ آرزو نہیں کرتیں کہ میرے بچے جنگ سے زندہ بچ کر آئیں، بلکہ کہتی ہیں کہ "میرے بچوں کی عزت یارب! تیرے ہاتھ ہے۔ تو انکی مدد کر، کیونکہ وہ علیؑ کے نواسے ہیں، اور اب یہ خوشخبری آئے کہ دونوں مارے گئے اور ولی ابن ولی کے فدیوں میں محسوب ہوئے"۔ ایک پُرخلوص، پاکباز اور فیاض عورت کی کس قدر صحیح تصویر ہے!

حضرت زینب صرف اپنے بچوں کی قربانی پر اکتفا نہیں کرتیں، بلکہ کہتی ہیں کہ "اگر ان کا باپ (یعنی زینب کا شوہر) ہوتا تو وہ بھی آپ (یعنی امام حسینؑ) کے لیے جان دیدیتا۔ کیونکہ ہم سب پر آپ کا حق ہے۔ اور جب ہمارا حق ان بچوں پر ہے تو پھر کیوں نہ وہ اس حق کو ادا کریں"۔ چنانچہ کس خلوص سے کہتی ہیں ؎

باپ ان کا آج ہوتا جو یا شاہ نامدار!　　کرتا قدم پہ سر کو تصدق یہ افتخار
ایک اُن کے بدلے آپ کے قدموں پہ ہوتا نثار　　میرے عوض فدا کرے ایک اپنی جان زار
ان پر ہمارا حق ہے، تو ہم پر یہ حق آپ کا
یہ بھی تو حق ادا کریں کچھ اپنے باپ کا!

اسوقت حضرت امام حسین اپنی بہن کو ہر طرح سے سمجھاتے ہیں کہ "میں عون و محمد کو جنگ کی ضرور اجازت دیتا، لیکن اول تو وہ کمسن ہیں اور دوسرے یہ کہ انکے بعد جعفر طیار کی نسل کا خاتمہ ہو جائے گا، اس لیے مجبور ہوں"۔ مگر حضرت زینب اپنے بھائی کے مقابلہ میں ایک نسل کے معدوم ہو جانے کو کچھ نہیں سمجھتیں۔ یہ عالیشان جذبۂ ایثار عام عورتوں اور حضرت زینب میں حد امتیاز قائم کرتا ہے۔ جب تک عورت اَن بیاہی رہتی ہے اپنے بھائی بہنوں سے اسکو بیحد محبت رہتی ہے۔ لیکن میکے سے نکلنے اور اولاد ہو جانے کے بعد اسکو اپنی اولاد اور اپنے خاوند سے

جس قدر محبت ہوجاتی ہے، اپنے بھائی بہن سے اتنی ہرگز باقی نہیں رہتی۔ اگر اسکے بھائی اور بچے دونوں ایک ہی چیز کے خواہشمند ہوں تو اپنے بھائی پر اپنے بچوں کو ہر حال میں ترجیح دیگی۔ یہ دنیا کی تمام عورتوں کی سرشت میں داخل ہے۔ لیکن بعض غیر معمولی مردوں کی طرح بعض عورتیں بھی ایسی پیدا ہو جاتی ہیں جنکا ایثار اپنی قبیل کی اور مخلوق کے واسطے ایک خوشنما جادۂ عمل پیدا کر دیتا ہے اور جن کی محبت ساری دنیا میں ایک زندۂ جاوید نغمہ چھوڑ جاتی ہے۔ چنانچہ حضرت زینب امام حسینؑ کی چھاتی سے سر لگا کر نہایت عاجزی سے کہتی ہیں ؎

یہ ان کے باب میں اب کد نہ کیجیے ... یہ نفیر کا ہے اسے ردنہ کیجیے

ان بیانات کے بعد حضرت زینب کے کردار کا ایک زبردست عنصر پیش نظر ہوتا ہے، جو صرف ایک عرب عورت کے لیے مخصوص ہے۔ دنیا کی کوئی عورت جرأت و دلیری کے غالباً ایسے اعلیٰ جذبات و تخیلات نہیں رکھتی جیسے کہ ایک عرب کو عطا کیے جاتے ہیں۔ اس کا بچپن لڑکوں کے ساتھ ساتھ خونخوار معرکوں میں گذرتا ہے۔ اُسکی جوانی نوجوان مردوں کو اُنکے قلوب کے گرمانے، ان کی رگِ حمیت کے جوش میں لانے، اپنے گھر، اپنے قبیلہ، اپنی قوم اور اپنے ملک کیلیے جان دیدینے پر اُکساتی ہے، نیز انکی کاہلی اور پژمردگی کو بجلی بنکر مٹا دیتی ہے۔ اور اُس کا بڑھاپا عرصہ ہائے کارزار کے زخمی بچوں اور بھائیوں کی نگہداشت، بھولے بھٹکے مسافروں کی امداد، اور غریبوں، لاوارثوں کی غمخواری میں گذر جاتا ہے۔ وہ ایک ہندوستانی عورت کی طرح کسی کو اپنے گھر، خاوند، اور بچوں پر حملہ کرتے ہوئے دیکھ کر، کسی تہ خانے کے گوشہ میں چھپنے، کسی باؤلی میں ڈوب مرنے، یا کسی آگ میں جل جانے کی کوشش نہیں کرتی، بلکہ ہمت اور عقلمندی کے ذریعے ایسے طریقے اختیار کرتی ہے کہ حملہ آور کو مُنہ کی کھانی پڑے۔ میر انیس نے حضرت زینب کا کردار پیش کرتے وقت ان تمام خصوصیات کو خاص طور پر مدنظر رکھا ہے۔

حضرت زینب کے صاحبزادے جب لڑائی کے لیے نکلتے ہیں تو وہ ایک ہندوستانی عورت کی طرح رونے رُلانے کے بجائے اُنکو جنگ کی ہمت دلاتی اور جوانمردوں کے ساتھ مرنے مارنے پر آمادہ کرتی ہیں۔ اسکے متعلق چند شعر ملاحظہ ہوں ان سے صاف طور پر ظاہر ہوتا ہے کہ میر انیس کی نگاہوں میں ایک مکمل عورت کن عظیم الشان صفات سے بہرہ ور ہوتی ہے ؎

ہاں چاہیے منہ نیزہ و خنجر سے نہ پھیرو ... دو شیر ہو ... شمشیر کو کھینچو
توقیر تمہاری ہو مری ناموری ہو ... سر دونوں کے لاؤ تو میں جانوں کہ جری ہو

ہاں سب میں یہ سرتاج دلیروں کے تمہیں ہو　　ہاں صدقے گئی شیر تو شیروں سے تمہیں ہو
اس گھر کے بزرگوں کا چلن تیغ زنی ہے　　جو فقر میں کرتا ہے سخاوت وہ غنی ہے
بودے کی کہاں آنکھ، کہاں مرد کے تیور　　چھپتے نہیں لاکھوں میں جوانمرد کے تیور
ہمراہ کوئی واں سے نہیں لاتا ہے رتبہ　　جو نام پہ مرتا ہے وہی پاتا ہے رتبہ
سر بیچ کے ذی قدر کو ہاتھ آتا ہے رتبہ　　ہٹتا ہے قدم بڑھ کے تو گھٹ جاتا ہے رتبہ
مر کر نہ ہٹے قابلِ احسنت وہی ہے
جو کھیت میں سرسبز ہو ساونت وہی ہے

دریا کی طرف پیاس میں تکتے نہیں غازی　　گر شیر بھی جھپٹے تو سرکتے نہیں غازی
تلواروں میں آنکھوں کو جھپکتے نہیں غازی　　بجلی بھی گرے گر تو جھجکتے نہیں غازی
دم ہونٹوں پہ آئے تو شجاعت نہیں جاتی
مرنے پہ بھی چہرے کی بشاشت نہیں جاتی

ماں صدقے گئی گھاٹ پہ دریا کے نہ جانا　　پانی کی طرف پیاس میں گھبرا کے نہ جانا
ساحل پہ کبھی ٹھنڈی ہوا کھا کے نہ جانا　　صابر ہو تو رہواروں کو گرما کے نہ جانا
ایسے تو نہیں جو مجھے محجوب کروگے!
میں دودھ نہ بخشونگی جو پیاسے نہ مروگے

بھائی کسی ہنگام بھی بھائی کو نہ چھوڑے　　دونوں میں کوئی عقدہ کشائی کو نہ چھوڑے
اک بھائی لڑے بڑھ کے جو ہاتھ ایک کا تھک جائے　　بلوہ جو پھر اسپر ہو تو یہ ہر کمک جائے
ہاتھوں میں صفائی ہو کہ بسمل بھی پھڑک جائے　　گر صف ہو تو پیدا ہو، پہا ہو تو سرک جائے
حملوں میں سب انداز ہوں خالق کے ولی کے
پہچان لیں وہ سب کہ نواسے ہیں علی کے

اس جنگ کا چرچا مصر و شام رہیگا　　دنیا میں اگر تم نہ رہے نام رہے گا

ایک اور مرثیہ میں اسی موقع پر حسبِ ذیل طریقہ سکھاتی ہیں ـــ

فوجوں کو مرے دودھ کی تاثیر دکھانا　　دادا کی طرح جوہر شمشیر دکھانا
مظلومیت حضرت شبیر دکھانا　　تن تن کے یداللہ کی تصویر دکھانا
تلوار اگر اٹھ کے چلے سر نہ فرد ہو　　جو سامنے آجائے وہ اک وار میں دو ہو

دم ہونٹوں پہ آ جائے اگر پیاس کے مارے — غش کھا کے جو گر پڑو بھی تو دریا کے کنارے
پانی کو ترستے رُفقا مر گئے سارے — یہ آبِ رواں بند ہے ماموں پہ تمھارے
تلواریں ہیں، موجوں کی روانی نہ سمجھنا
دریا ہے لہو کا اسے پانی نہ سمجھنا

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ایک زبردست اور تجربہ کار سپہ سالار اپنے نوجوان سپاہیوں کو کسی عظیم الشان معرکۂ جنگ کے لیے جوش دلا رہا ہے۔ وہ صرف خطرناک حملہ ہی کا حکم نہیں دیتا، بلکہ اپنے کمزور مخاطبوں کو اُنکے نامور اسلاف اور بہادر افراد کے کارنامے یاد دلا دلا کر اُنکی ہمت بڑھاتا ہے اور ساتھ ہی اُنکی ناتجربہ کاری کا بھی اُسے علم ہے۔ اس لیے وہ دوران تقریر میں نہایت خلوص اور محبت کے ساتھ اُنکو نصیحتیں بھی کرتا ہے تاکہ وہ اسرارِ فتحمندی سے واقف ہو جائیں۔
حضرت زینب اپنی قومی اور خاندانی روایتوں کے مطابق اپنے بچوں کو نام آوری کے لیے آمادہ کرتی ہیں اور اس جوش و طنطنہ سے فرماتی ہیں کہ ؎

جعفر سے نمودار کے دلبر ہو، دلیرو! — حیدر سے دلاور کے دلاور ہو دلیرو!
جرار ہو، کرار ہو، صفدر ہو، دلیرو! — ضرغام ہو، ضیغم ہو، غضنفر ہو، دلیرو!
تیروں سے جو اڑ جائیں جگر توڑ کے آؤ
خیبر کی طرح کوفے کا در توڑ کے آؤ

خندق کی لڑائی کی طرح جنگ کو جھیلو — بچے اسد اللہ کے ہو، جان پہ کھیلو
تیغوں میں دھنسو، چھاتیوں سے تیروں کو لے لو — کوفے کو تہِ تیغ کرو، شام کو لے لو
دو اور جلا آئینۂ تیغِ عرب کو
لو دم کو قبضے میں تو قابو میں غضب کو

خاقان کا رہے تخت نہ قیصر کا رہے تاج — ہاں، فارس و چین و حبش و زنگ سے لو باج!
چڑھتا ہے لڑائی میں جوانمردوں کا معراج — گرتی ہے وہاں برق، جو تلوار چلے آج
بیٹے نہ ہوں تم تو یہ سپاہی کے ہنر ہیں — چمکے ہیں جہاں تیغ کے جوہر ہیں اُدھر ہیں
گھر خون میں ڈوبے ہیں گئے خون میں تر ہیں — صحبت میں مصاحب ہیں لڑائی میں سپر ہیں
وہ اور کسی سے نہ جھکیں گے نہ جھکے ہیں
عزت میں نہ فرق آئے کہ سر بیچ چکے ہیں

عون و محمد کی لڑائی کا بیان میر انیس کے رزمیہ کارنامہ کا ایک جزو لاینفک ہے جسکے بغیر انکی رزم نگاری مہتم بالشان نہیں کہلائی جا سکتی۔ حضرت زینب دم بدم بیٹوں کی جنگ کی خبریں منگاتی ہیں اور جب معلوم ہوتا ہے کہ وہ مستقل مزاجی سے لڑ رہے ہیں تو ؎

سنکر یہ بیاں شاد ہوئیں زینب خوشخو پر جوشِ محبت سے رہا دل پہ نہ قابو
ہر بی بی سے ارشاد کیا پونچھ کے آنسو میدان سے سرکے نہیں ابتک مرے گلرو
لاکھوں سے لڑے تشنہ دہن کام کیا ہے
سنتی ہوں کہ چھوٹے نے بڑا نام کیا ہے

آخرکار دونوں لڑکے ایک تہلکہ انداز لڑائی کے بعد جان دیدیتے ہیں۔ اور جب ماں کو انکی شہادت کی خبر ہوتی ہے تو بجائے آہ وزاری کے ؎

یہ سنتے ہی قبلے کی طرف جھک گئیں زینب سجدے سے اُٹھیں جب تو کہا شکر ہے یارب
طالب تھی میں جس کی وہ بر آیا مرا مطلب سب مٹ گئے دھڑکے کوئی تشویش نہیں اب
ہٹنے سے محمدؐ کی کمائی کو بچالے
سب قتل ہوں پر تو مرے بھائی کو بچالے

کس منہ سے ترا شکر کروں بار خدایا تو نے مرے دو بچوں کو پروان چڑھایا
گر بیاہ فلک نے نہ دکھایا، نہ دکھایا جو مرتبہ اعلائے شہادت ہے وہ پایا
عالم میں جو دُکھ انکے لیے میں نے بھرے ہیں
تو رحم کر ان پر کہ یہ مظلوم مرے ہیں

اور جب دوسری عورتوں کی آہ وزاری دیکھتی ہیں تو حضرت زینب صابر اور مستقل مزاج زینب با تعجب کرتی ہیں کہ یہ کونسی بڑی اور نئی بات ہوئی ہے جسکے سبب اسقدر کہرام کی ضرورت ہے۔ چنانچہ تمام بیبیوں سے مخاطب ہوکے کہتی ہیں ؎

باپ ان کا اگر ہوتا تو وہ سر نہ کٹاتا؟ زہرا کے کلیجے کے عوض برچھیاں کھاتا
بیٹوں کو یوں ہی میری طرح نذر کو لاتا بچے کوئی محسن کو نہیں دل سے بھلاتا
جو پاس ہے جسکے وہ عطائے شہِ دیں ہے
کہدے مرے ماں جائے کا حق کسپہ نہیں ہے؟

بیٹوں سے ہوئی گر تو ہوئی آج جدائی سر پر مرے دنیا میں سلامت رہیں بھائی

اک دولتِ اولاد؛ لُٹ ائی تو لُٹا ئی کیا لُٹ گیا وہ کون سی ایسی تھی کمائی؟
کیا روؤں میں دنیا میں جو دلبند نہیں ہیں
کیا اکبر و اصغر مرے فرزند نہیں ہیں؟

ایثار و محبت کی بھی ایک حد ہوتی ہے! حضرت زینب کی تشفی کے لیے یہی بہت کافی ہے کہ امام حسین، اکبر اور اصغر ابھی زندہ ہیں جن کی موجودگی میں ماتمی صف کا نام تک لینا انھیں ناگوار گذرتا ہے۔ چنانچہ یہ بھی وہ مقام ہے جہاں انیس نے اپنے رموزدانِ فطرت ہونے کا ثبوت دیا ہے ؎

چلائیں ارے چپکے رہو غُل ہے یہ کیسا! بھائی ہیں سلامت مجھے کیوں دیتے ہو پُرسا؟ ۲
ہے ہے نہ کرو مرا جو! گھبرائیں گے شبیر پھر کوئی ہے زینب کا جو مر جائیں گے شبیر؟
تم روتے ہو کس واسطے؟ میں تو نہیں روتی دامانِ مژہ بھی نہیں اشکوں سے بھگوتی؟
دل ہوتا جو ایسا ہی تو کیوں بیٹوں کو کھوتی؟ دولت کوئی ماں جائے سے پیاری نہیں ہوتی
قائم رہے اقبال محمدؐ کے خلف کا
بس نام بھرے گھر میں نہ لو ماتمی صف کا

امام حسین اور علی اکبر دونوں لاشوں کو میدانِ جنگ سے خیمہ میں لے آتے ہیں تو حضرت سب سے پہلے بھائی سے اُنکی لڑائی کے متعلق دریافت کرتی ہیں۔ اور جب امام حسین سے ان کی بہادری اور جرأت کی بیحد تعریف سنتی ہیں تو انکی اسکے بعد کی حالت کا انیس نے اس طرح نقشہ پیش کیا ہے ؎

یہ سنتے ہی سرخی سی لبِ زرد پہ آئی حضرت سے کہا آپ کا صدقہ ہے یہ بھائی ۳
کونین میں عزت مرے دلبندوں نے پائی اب شاد ہوئی ان سے ید اللہ کی جائی
آقا! مجھے پیار آتا ہے اقبال پہ انکے
بیکس ہیں خدا رحم کرے حال پہ انکے

آخر ماں ہی ہیں۔ اب انکا دل بھر آتا ہے۔ جب لوگ انھیں بچوں کے آخری دیدار کے لیے بُلاتے ہیں تو انکی نسائیت کی سوتیں ایک دم اُبل پڑتی ہیں۔ تاہم صبر سے کام لے کر ؎

فرمایا میں نہ جاؤں گی بچوں کی لاش پر
آنچ آتا کی دل کو جلائے تو کیا کروں؟

گر فرق میرے صبر میں آئے تو کیا کروں؟

بس سن چکی کہ نام کیا خوب لڑ چکے　　لاشوں پہ لاشیں لوٹ چکیں، کھیت پڑ چکے
کنبہ تمام ہو چکا، وہ گھر اُجڑ چکے　　گودوں میں جو پلے تھے وہ بچے بچھڑ چکے
اب ان کا غم نہ نار مرے گھر کی چاہیے
بی بی سلامتی علی اکبر کی چاہیے

روؤں گی میں تو پھر علی اکبر بھی روئیں گے　　صدمہ مجھے یہ ہے کہ برادر بھی روئیں گے

لیکن جب بچوں کی لاشوں کو دیکھتی ہیں تو بیہوش ہو جاتی ہیں۔ آخر صبر کی کوئی حد بھی ہے! انسان، پھر عورت اور وہ بھی وہ جسکے دونوں بچے اسکی آنکھوں کے سامنے مار ڈالے گئے ہوں، اگر متاثر ہوئے بغیر رہ سکے تو فوق الفطرت بات ہوگی! کس قدر صحیح اور پاکیزہ نقشہ پیش کیا ہے کہ حضرت زینب کو جب ہوش آتا ہے تو اُنھیں اپنے بچوں کے کفن دفن کی فکر نہیں ہوتی بلکہ ؎

ہوش آیا تو اکبر سے کہا "رانڈوں کو سمجھاؤ　　"ہے ہے نہ کرو صاحبو! اک لحظہ ٹھہر جاؤ"
عباس کی زوجہ سے یہ بولیں کہ "ادھر آؤ　　کیا روتی ہو کپڑے علی اکبر کے بدلواؤ"
ہا تو ہیں کدھر، آہ یہ کیا بیخبری ہے
سب خوں سے مرے لال کی پوشاک بھری ہے!

ایثار اور محبت کی انتہا ہے کہ اپنے بچے تو مرے پڑے ہیں، لیکن زینب کو علی اکبر کی فکر لگی ہوئی ہے۔ اُنھیں یہ بُرا معلوم ہوتا ہے کہ بن بیاہے علی اکبر نے انکی لاشیں کیوں اٹھائیں؟ انکی نسائیت کا اقتضا تھا کہ اس موقعہ پر وہ عورتوں کے عام اوہام سے بَری نہ ہوتیں۔ چنانچہ اسوقت اُنھیں ایک معمولی عورت کی طرح وسواس ہوا مگر یہ وسواس بھی ایک گہری محبت کا نتیجہ ہے ؎

زینب نے کہا کیوں مجھے وسواس نہ آئے　　ہے ہے علی اکبر اسے کیوں گود میں لائے؟
لوگو! مرے پیارے نے بڑے رنج اُٹھائے　　صدقے یہ پھوپی لاش کے لے آنے کے جائے
دو دو زخمے وہ سرِ ورواں تشنہ دہاں ہے
اس بوجھ کی طاقت مرے بچے میں کہاں ہے؟

ان دونوں نے گر جان گنوائی تو گنوائی　　بن بیاہے مرے لال نے کیوں لاش اُٹھائی
میں ماں ہیں نہ صاحب مجھے یہ بات نہ بھائی　　اکبر مری اٹھارہ برس کی ہے کمائی

دل سے نہ یہ داغِ الم و یاس مٹے گا
صدقہ اب اُتاروں گی تو وسواس مٹے گا

حضرت زینب امام حسین کے بچوں (بالخصوص علی اکبر) کی عاشقِ زار تھیں، اور اس قدر محبت کرتی تھیں کہ اکبر کا رونا تک اُنھیں پسند نہ تھا۔ اپنے ہر کام میں وہ علی اکبر کا لحاظ رکھتی تھیں۔ جب نیا چاند نکلتا تو وہ پہلے ان ہی کا چہرہ دیکھتی تھیں۔ اپنے بچوں اور شوہر کو بھی ہمیشہ انکا خادم سمجھتی تھیں۔ ایسی صورت میں وہ کب گوارا کر سکتی تھیں کہ علی اکبر عون و محمد کی لاشیں لے آئیں؟

یہاں تک تو انیس نے حضرت زینب کو ایک عربی شکل میں پیش کیا ہے۔ اسکے بعد جب بین شروع ہو جاتے ہیں تو وہ میر انیس کے لیے ایک ہندی عورت بن جاتی ہیں۔ اور چونکہ مرثیوں کی ظاہری کامیابی کے لیے اس عنصر کا شامل کرنا لازمات سے تھا۔ اس لیے انیس نے اس سے خاطر خواہ کام لیا ہے۔ اور اگرچہ اس امر میں وہ بعض جگہ جادۂ اعتدال سے متجاوز ہوگئے ہیں، لیکن یہ کوئی بڑا نقص نہیں ہے کہ صرف اسکی وجہ سے انکے شاندار شہ کاروں کی حقیقی قدر و منزلت میں کسی قسم کی کمی واقع ہو سکے۔ ان الحسنات یذھبن السیات۔

سید محی الدین قادری زور

واردات قلب

ہے آرزو کہ جلوۂ جانانہ دیکھیے
روشن جبینِ یار سے کاشانہ دیکھیے

چھٹ جائے جامِ ضبط نہ پھر ہاتھ سے کہیں
مستِ شرابِ شوق ہے دیوانہ دیکھیے

منزل کا ہوش کچھ ہے نہ ہے راہ کی خبر
لیجائے کس طرف دلِ دیوانہ دیکھیے

کس کے جمال سے چمک اُٹھے ہیں بام و در
کس سے ہوئی ہے رونقِ کاشانہ دیکھیے

رنگین جوشِ گل سے ہے پھر دامنِ بہار
پھر کہہ رہا ہے کچھ دلِ دیوانہ دیکھیے

لایا تو ہے نکال کے اُس بزم سے مجھے
لیجائے اب کہاں دلِ دیوانہ دیکھیے

دیکر نگاہِ شوق میں اُسکی ضیائے حسن
ہر ہر قدم پہ جلوۂ جانانہ دیکھیے

ذروں کو اک نظر میں گلستاں بنائیے
ملجائیں پھول خاک میں ایسا نہ دیکھیے

نکلے نہ شانِ حسن میں اک آہ تک جلیل
خاموش مثلِ نرگسِ مستانہ دیکھیے

جلیل قدوائی

بیانِ واقعہ

شاعری نام ہے جذبات کی موزونی کا — اور باقی مرے دل میں کوئی جذبہ ہی نہیں
میری اُس نظم کا مقطع ہے جو "وجہِ خموشی" کے عنوان سے ۱۹۱۴ء کے کسی نمبر میں درج الناظر ہو چکی ہے،
اور جسکے بعد سے میں ادبی دنیا سے بتدریج کنارہ کش ہوتا چلا گیا۔ غزل میں یوں بھی شاذ و نادر ہی کہتا
تھا، اس ترکِ فکر کے بعد پھر کیا نوبت آتی، ۱۹۲۵ء کے دسمبر کی آخری تاریخوں میں جبکہ دورۂ دیہات
پر تھا، ایک دلفریب شام کی لطافت منظری نے میرے سکوت شعری کو ۱۱-۱۲، سال بعد نطقِ تغزل
میں منتقل کر دیا اور حالتِ بیاختگی میں میری زبان سے نکلا ؎

تیرے دیوانے بھی ہیں منتظرِ فصلِ بہار — ہاتھ ڈالے ہوئے بیٹھے ہیں گریبانوں میں

جی چاہا، لکھوں، اب قلم کی دوسری گردش کا نتیجہ یہ تھا ؎

میری فردوس نگاہی بھی ہے تزئینِ جنوں — کہ گلستاں ہی گلستاں ہیں بیابانوں میں

پھر فوراً ہی زبان پر آیا

ہیں قدح خوار ترے مستِ الست اے ساقی — مئے وحدت ہے چھلکتے ہوئے پیمانوں میں

آخر کار، غزل مکمل ہو گئی، جو الناظر کے جنوری نمبر میں اشاعت پذیر ہو چکی ہے، اسکے بعد طبیعت جو متوجہ
ہوئی، غزل گوئی کا سلسلہ چل گیا، جو دوست بھی فرمائش کرتے ہیں اُنکے رسالہ یا اخبار کے لیے غزل
عرض کی اور پیش کر دی، ایڈیٹر صاحب مرقع کے خط کا جواب لکھنے بیٹھا، اُسی ضمن میں ایک غزل بھی
کہہ گیا، عباس کی خیریت معلوم کرنا چاہی، آخر میں قوم کے لیے غزل بھی درج کر دی، ساغر صاحب
کو ایک خاص معاملہ میں چٹھی لکھی پیمانہ کے لیے غزل بھی رکھ دی، غرضکہ میری ادبی زندگی کے دَورِ
جامہ بازی میں "فصلِ بہار کے منتظر دیوانوں" کا شعر ایک تاریخی اہمیت رکھتا ہے، جسکو پڑھنے کے
ساتھ ہی سب سے پہلے میرے چھوٹے بھائی محمد عمر شوکت تھانوی نے مجھے لکھنؤ سے خط لکھا کہ
رسالہ نقاد کا پرانا فائل دیکھ رہا تھا، جناب جلیل کی غزل نظر پڑی جسکا ایک شعر یہ ہے

منتظرِ موسمِ گُل کے ہیں ترے دیوانے — ہاتھ رکھے ہوئے بیٹھے ہیں گریبانوں پہ

لہذا الناظر میں جو آپ کی تازہ غزل شائع ہوئی ہے اسکا چوتھا شعر اپنی بیاض میں سے حذف کر دیجیے
میں نے جواب دیا، آخر کیوں؟ اگر جلیل القدر نے مجھ سے پہلے اسی مضمون کو انھیں الفاظ میں ادا

کر دیا ہے، تو صرف یہ وجہ میرے لیے اس شعر سے دست بردار ہو جانے کے واسطے کافی نہیں، اُستادِ نظام ہی اپنا شعر کیوں نہ کاٹ ڈالیں، اور میری فکرِ نارسا کو اپنے سے مقدم تصور فرمالیں، اُنکو اگر اپنی قوتِ سخنگوئی پر اعتماد ہے تو مجھے بھی اپنے کلام سے دلچسپی رکھنے والے حضرات کی طرف سے یہ سوءِ ظن نہیں ہے کہ میری نسبت توارد سے زیادہ کوئی دوسری بدگمانی کریں گے"۔

اس موقع پر ایک دلچسپ واقعہ یاد آیا، دو مہینے ہوئے میں لکھنؤ میں تھا، ایک پُرلطف صحبت میں حضرت وصل بلگرامی کے یہاں بسبیل تذکرہ مولانا عبدالباری آسی نے مجھ سے پوچھا کہ "سازِ عشق، رازِ عشق"، کوئی غزل بھوپال میں سُنی ہے؟ میں نے کہا، منشی سراج میرخاں صاحب سحر وہاں ایک مشہور اُستاد گذرے ہیں، اس زمین میں اُنکی ایک غزل بہت مشہور ہے، اور اُنھیں سے سُنے ہوئے یہ تین شعر مجھے بھی یاد ہیں :-

سینہ میں دل ہے دل میں داغ، داغ میں سوز و سازِ عشق
پردہ بہ پردہ ہے نہاں پردہ نشیں کا رازِ عشق

باندھ کے صف ہوں سب کھڑے، تیغ کے ساتھ سر جھکے
آج تو قتل گاہ میں دھوم سے ہو نمازِ عشق

فرش زمیں پہ مصطفٰے، عرش بریں پہ کبریا
پہونچا ہے دیکھنا کہاں سلسلۂ درازِ عشق

میرے اس بیان پر جرح ہونے لگی، کب سے بھوپال میں ہو؟ کیا خود سحر صاحب نے یہ شعر سُنائے تھے؟ کس جگہ پڑھے گئے تھے؟ وغیرہ۔ میں متعجب تھا اور جواب دینے پر مجبور، کہا، سنہ ۱۹۰۵ء سے وہاں مقیم ہوں، تقریباً ۱۵ سال ہوئے۔ شہید ٹونکی کے منعقدہ مشاعرہ میں غیر طرح کلام کی فرمائش متواتر پر "سحر مرحوم" نے خود یہ غزل پڑھی تھی، اور مدتِ دراز تک شہر بھوپال میں بچہ بچہ کی زبان پر اسکے اشعار رہے، آخر بات کیا ہے؟

جناب اُمید امیٹھوی بھی موجود تھے، فرمانے لگے، قنوج کے مرحوم رسالہ "پیام عاشق" میں بیس برس ہوئے یہ غزل میں نے صفدر مرزاپوری کے نام سے طبع شدہ دیکھی ہے۔ چونکہ سحر بھوپالی کی شخصیت سے میں بخوبی واقف تھا، اور کسی طرح اُنکی طرف سے بدگمان نہ ہو سکتا تھا، اسلیے خیال ہوا کہ حضرت صفدر سے جو شریکِ بزم تھے اُمید صاحب تفریح فرما رہے ہیں۔ لیکن میری حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی جب وصل صاحب اور حضرت آسی نے بطور امر واقعہ فرمایا کہ، صفدر صاحب اس غزل کو اپنی

بتاتے ہیں، اور سفر بھوپال میں جناب وصل ہی غزل مرحوم سحر کے جزو کلام کی حیثیت سے سُن آئے ہیں جس کی وجہ سے تنقیحی سوالات ہوئے تھے - میں جناب صفدر کا دیرینہ نیازمند اور انکی مشق سخن کا معترف ہوں، سحر کی کہنہ مشقی اور مقامی ہر دلعزیزی و کثرت تلامذہ سے بھی آگاہ ہوں، پوری غزل کے توارد کی عمر بھر میں یہ پہلی مثال مجھے ملی ہے، ورنہ دو دو، چار چار شعر تو ہر مہینے کسی نہ کسی رسالہ میں مشاہیر قدیم کے جدید کہنے والوں کے نام کے ساتھ دیکھنے میں آ جاتے ہیں، ماہ گذشتہ کے رسالہ اُردوئے معلے دہلی میں مولوی محمد اسمٰعیل مصنف کتب درسی کا مشہور شعر۔

هم کرتے ہیں عادت کی غلامانہ اطاعت   اصلاح پذیر اسلئے عادت نہیں ہوتی

کسی ثاقب دہلوی کی غزل کے اشعار میں شایع ہوا ہے، ساتھ کے دو اور شعر بھی مشتبہ ہیں۔ اس سے پہلے رسالۂ مذکور کی ایک غزل "جبیں کا، حسیں کا" والی زمین میں حضرت شوق قدوائی مرحوم کی مشہور غزل کا یہ شعر بہ اندک تغیر موجود تھا۔

روزن کریں نالے مرے تو کیوں وہ خفا ہوں   کمرہ ہوا جاتا ہے ہوا دار اُنھیں کا

صرف ردیف بدل دی گئی ہے - شوق صاحب بھی خوب فرماتے ہیں

لب کیوں نہ ہوں باتوں میں طرفدار اُنھیں کے   پروردہ اُنھیں کے ہیں نمکخوار اُنھیں کے
اس سے تو ہمیں کاش وہ گھر ہی میں بلالیں   کہلاتے ہیں یوں بھی پس دیوار اُنھیں کے

لطف یہ ہے کہ میں نے ایڈیٹر صاحب کو خط لکھ کر اس طرف متوجہ بھی کیا تھا مگر اُنھوں نے التفات نہ فرمایا، بلکہ اس سلسلہ میں ایک صاحب سے ذکر آیا تو کہنے لگے کہ آپ تو مضمون نگار کے دو ایک اشعار ہی کو کہتے ہیں، رسالۂ مذکور کے "مدیر اعزازی" خود اکبر حیدری صاحب پر یہ الزام عائد کیا جا چکا ہے کہ اُنکے بقول خویش ایک کامیاب غزل ؎

شمع میں اک سوز تھا اک ساز پروانے میں تھا   کس کا عنوان محبت کس کے افسانے میں تھا

جو پہلے "پیمانہ" میں شایع ہوئی، اور پھر خاص طور پر اُردوئے معلے میں نقل کی گئی ہے لکھنؤ کے کسی خوش دماغ کی فکر کا نتیجہ ہے، اور کسی دوسری پوری غزل کے کوئی اکل صاحب دعویدار ہیں۔ واللہ اعلم بحقیقۃ حال۔

اسی سفر لکھنؤ میں یہ معلوم ہوا تھا، کہ صفدر مرزاپوری اور کسی لکھنوی شاعر کے مابین ایک اور غزل بھی مابہ النزاع ہے جو بیک وقت دو مشاعروں (شاید اُناؤ اور لکھنؤ) میں اپنے اپنے نام سے ہر دو صاحبان نے پڑھی، اور اب اُس کا مجمع احباب میں چرچا ہے، گذشتہ سال کسی

ہزاہو لکھنوی نے منشی نوبت رائے نظرؔ آں جہانی کا کلام زمانہ وغیرہ میں اپنے نام سے چھپوانا شروع کر دیا تھا، مگر راز جلد ہی افشا ہوگیا، اور یہ سلسلہ جاری نہ رہ سکا۔

"بہر خدا ہمیں بھی کہیں چھاپ دیجیے" کہنے والوں کی یہ کثرت دیکھکر میرے ایک کاسب زر، زمانہ شناس دوست کو خوب سوجھی، اپنے اشتہار میں فرماتے ہیں

"قدیم و جدید رنگ کی غزلیں، نظمیں، عمدہ فسانے، قصائد، قطعات، تاریخیں، غرضکہ تمام اقسام کلام آپ کے نام سے تصنیف کی جاسکتی ہیں، کتابیں لکھی جاسکتی ہیں، ناول تیار ہو سکتے ہیں، ..... اور اب تک **ایک ہزار** غزلیں اور نظمیں وغیرہ لکھکر بھیجی گئیں"۔

اور نہایت شد و مد کے ساتھ جلی حروف میں اپنے زیر نگرانی شایع ہونیوالے رسالہ کے ٹائٹل پر مسلسل سال بھر سے اس اعلان سخن فروشی کی اشاعت کر رہے ہیں، گمان غالب ہے، کامیابی ہوئی ہوگی، اور اس "ادبی و علمی شعبہ نے جو ملکی ضروریات لطیف کی تکمیل کا بہترین ذریعہ ثابت ہوا ہے" کافی معاوضہ حاصل کیا ہوگا۔ صرف نقص ہے تو اس قدر کہ یہ سکھائے پھول دوبارہ نہیں چڑھتے، اور ایسے مصنوعی شاعروں کا بھانڈا کلام سناتے وقت پھوٹ جاتا ہے۔ زیادہ محتاط لوگ جو صرف اشاعت کلام پہ اکتفا کرتے ہیں، انکو بھی "تاڑ جاتے ہیں تاڑنے والے"۔ بالخصوص نسوانی طبقہ اس سودے میں خطرہ برداشت کر رہا ہے، اور کوئی غیر شاعرہ خواہ کتنا ہی "میں شاعرہ ہوں" کی تکرار کرے، لیکن اس کا حقیقی موضوع شعریت جمال پنہاں نہیں رہتا، اور نگاہیں پردۂ زنگاری کے اندر پہونچے بغیر نہیں رہتیں، پھر بھی یہ فیشن ایبل دوکان اُن پُرانی قسم کے شعر فروش و صنعداروں سے بہتر طریقہ پہ سپلائی کر سکتی ہے، جن کے تقاضائے قیمت کی بھونڈی اور ترفر سودہ ترکیبیں" اصلاح سخن" کے ریویو مندرجہ الناظر ماہ گذشتہ سے منظر عام پہ آگئیں، جسکے لیے ناظرین کو منشی امیر احمد صاحب علوی کا شکر گزار ہونا چاہیے۔

اسی نمبر کے "نظرے خوش گذرے" میں اڈیٹر صاحب نے اپنے کرم فرمائے دیرینہ قاضی غلام امیر صاحب بدایونی کے خط کا اقتباس دیکر مجھ سے خواہش فرمائی ہے کہ "اگر مناسب سمجھوں تو موصوف کے اندیشہ کو وضاحت ایکے دفع کر دوں" قاضی صاحب مجھ سے نا واقفیت کا رقم انکم غیر ضروری مگر صحیح طور پر اظہار فرماتے ہوئے میری غزل مطبوعہ جنوری نمبر کو" بلحاظ بندش الفاظ و سلاست مضامین بلند درجہ دیتے ہیں، اور متوارد شعر کو "خاص تحسین" کا مستحق قرار دیکر باندراج شعر قلیل اڈیٹر صاحب سے تحریک کی ہے کہ "ارشد صاحب سے پوچھیے ایسی حالت میں اسے توارد کہیں گے یا اس سے بڑھکر

بڑھ کر کچھ اور کہنا چاہیے"؟

موجودہ لیل و نہار میں جی تو یہی چاہتا ہے کہ اس "کچھ اور" میں قاضی صاحب نے جو مفہوم پنہاں رکھا ہے، اُسکا علی الاعلان اعتراف کرلیا جائے۔ لیکن میں قاضی صاحب کو فنِ شعر کا ماہر اور ایک ممتاز ادیب سمجھتا ہوں، گو صورت آشنا نہیں ہوں لیکن بحیثیت شاعر کے سنہ ۱۹۱۰ء سے واقف ہوں، جبکہ اُنھوں نے اپنی غزل

شور تھا وسعتِ دامانِ قیامت کا امیر[عہ]
بڑھ کے دیکھا تو مرا چاک گریباں نکلا

بھوپال کے اُس مشہور مشاعرہ کے لیے بھیجی تھی، جسکو میں نے قیصر بھوپالی اور سرور بدایونی نے خاص اہتمام سے منعقد کیا تھا، اور بیرونی شعراء میر نیرنگ و ڈاکٹر اقبال وغیرہ نے مخصوص طور پر اُسکے لیے غزلیں کہی تھیں۔ پس میں قاضی صاحب کے ذوقِ سلیم پر اسکا انحصار رکھتا ہوں کہ زیرِ بحث شعر کیا غزل کے بقیہ اشعار کچھ بہت زیادہ بلند اور ممتاز ہے، اور کیا ایسی غزل جو بلحاظ بندش الفاظ و سلاستِ مضامین بلند درجہ رکھتی ہو، اُس کا کوئی شعر اگر "خاص تحسین" کا مستحق قرار پائے، تو کیا رفتارِ تخیل و طرزِ بیان کی یکرنگی بھی اُس میں سے مفقود ہو جاتی ہے؟ اگر ایسا نہیں ہے تو قاضی صاحب کی سوءِ ظنی اس حد تک نہ پہونچنا چاہیے تھی کہ دوسرا ہم مضمون شعر دیکھ کر بجائے توارد کے وہ "کچھ اور" کہنے کی خواہش اپنے قلب میں پیدا فرما لیتے۔ قاضی صاحب مولانا ظفر الملک کے کرمفرمائے دیرینہ ہیں، آغاز اجراء سے یقیناً الناظر اُن کی خدمت میں جاتا ہے، میری معدودے چند نہیں بلکہ کثیر التعداد نظمیں الناظر میں چھپی ہیں، نہ بھی دیکھنا چاہا ہوگا تب بھی کافی طور پر میرا کلام اُنکے پیش نظر ہوتا رہا ہوگا، اور کچھ نہ کچھ رائے وہ میری نسبت رکھتے ہوں گے، اچھی یا بُری، لیکن یقیناً سارقِ سخن سمجھنے کے لیے کوئی مواد اُنھیں نہ ملا ہوگا، ورنہ موجودہ اندراج کی طرح پہلے بھی صفحات الناظر اُن کے لیے موجود تھے، ایسی صورت میں قاضی صاحب کی بدگمانی "ظن المومنین خیرا" کے تحت میں نہیں آتی' اور اُنھیں صحیح طور پر باور کرنا چاہیے، کہ یہ شعر کیا باعتبار الفاظ اور کیا باعتبار معانی تمامتر میرا ہے۔

اگر حافظ جلیل حسن صاحب کی غزل میں نے دیکھی ہوتی، تو ممکن تھا کہ اُنکے شعر کے مفہوم کو دماغ محفوظ کرلیتا، اور عرصۂ دراز کے بعد جب حافظے سے اُنکے شعر کی ترتیب لفظی محو ہو جاتی تو فکرِ سخن کے

[عہ] یہ شعر قاضی صاحب کا نہیں ہے، بلکہ بدایوں کے ایک دوسرے رئیس جناب امیر احمد صاحب امیر کا ہے جو آل انڈیا اُردو کانفرنس بدایوں کے سکریٹری تھے۔ ایڈیٹر

وقت یا یوں ہی اتفاقیہ طور پر اس شعر کا مضمون میرے طرزِ ادا میں صورتِ موزونی اختیار کر لیتا، اس صورت میں البتہ شعرِ جلیل میرے تنبہ کا باعث ہو سکتا تھا، خود بخود حافظہ سب کچھ یاد دلا دیتا۔ لیکن جب حقیقت یہ نہ ہو تو میں اپنے زادۂ طبع کو کیوں ضایع کروں۔ فطرت خود اس توارد کی مرتکب ہوتی رہتی ہے، اور مخلوقات میں بہت زیادہ مثالیں اسکی پائی جا چکی ہیں۔ مگر یہ ایک اصولی بحث تھی، ورنہ حقیقتاً یہ شعر مجھے کچھ زیادہ عزیز نہیں اور نہ اس قدر فرصت کہ میر و غالب کے کلام سے اساتذۂ سلف کے افکارِ عالیہ کا مقابلہ کر کے اپنی تائید میں ثبوتِ توارد فراہم کروں، اور "پیشہ ور شاعر" نہ ہونے کی وجہ سے اندیشہائے باطل کے عدمِ دفعیہ کی صورت میں میرا کوئی نقصان نہیں، میری نظمیات کا موضوع بیشتر میرے سوانحِ حیات ہیں یا پُر لطف اوقاتِ زندگی کے تاثرات، جو دلچسپیِ احباب کیلیے طبع ہوتے رہتے ہیں، دنیائے سخن میں اپنی شخصیتِ شعری کو نمایاں کرنا مقصود نہیں ہوتا۔ کیونکہ اس بازار میں یہ متاعِ ارزاں پہلے ہی بکثرت موجود ہے، اور میری جنس کا سِد کسی ہنگامۂ مزید کا باعث نہیں ہو سکتی۔ پس میرا ذوقِ سخن میرے جذباتِ ذاتی کی تسکین کے لیے ہے اور یہ قول ایک سخنگوے کلکتہ ۔۔

وہی کہتا ہوں دل جسکی مجھے تعلیم کرتا ہے نہیں ہے شاعری میری مگر وحشت بیانِ دل

میرے ایک دوست نے جو مجھ سے کہیں زیادہ بہتر کہتے اور لکھتے ہیں، میری ایک محنت سے تیار کردہ مطول نظم کو محض مجھے ستانے کے لیے اپنے نام سے بغیر میرے علم کے شایع کرا دیا، مقصود مجھے برہم کرنا تھا، میں ہنس کر رہ گیا تو تردید لکھی، اُس کی اشاعت میں نے روک دی، نتیجہ یہ ہوا کہ وہ نظم لاوارث ہو کر رہ گئی۔ وہ ہر شخص سے صحیح واقعہ بیان کرتے رہتے ہیں، اور میں اُنکی تردید۔ اب وہ اس تکلیف میں مبتلا ہیں کہ غلط طور پر ایک چیز اُن سے منسوب ہو گئی، اور میں اُن سے اپنی اذیت دہی کے (صرف اقدام) کا انتقام لے رہا ہوں۔ لیکن جس طرح اُن کا ضمیر شناسی ہے، ہر شخص اتنا ذی حس نہیں ہوتا، [illegible] میں "بے ماں کی بچی" کے عنوان سے میری ایک نظم رسالۂ الحجاب میں نکلی تھی، دو تین سال بعد ریاستِ میسور کی کسی شہرت طلب خیر النساء نے اُسے اپنے نام سے صرف عنوان بدلکر اخبار پھول میں شایع کرا دیا، ایک مناجات جو الناظر میں شایع ہو چکی ہے، اور میرے مجموعۂ نظم "حسنِ تخیل" کے شروع میں درج ہے، رحیم النساء کی طرف سے تہذیب النسواں لاہور میں نکل چکی ہے، پروفیسر تیج رام صاحب ایم اے نے گذشتہ سال مجھ سے وہ نظمیں جو بچوں کے لیے لکھی گئی تھیں، طلب فرمائیں، میں نے بھیجدیں، ایک نظم کے متعلق اُنھوں نے پوچھا کہ یہ واحد یار خاں صاحب

مجھ سے فلاں رسالہ میں کیوں چھپی ہے، میں اس کا کیا جواب دیتا۔ آگرہ کے رسالہ "عزیز" کے لیے وہ
نظم لکھی گئی تھی اور اُسی میں چھپی بھی تھی۔ سب سے زیادہ مزیدار واقعہ ۱۹۱۶ء میں سیر بمبئی سے
واپسی کے وقت پیش آیا۔ حیدرآباد سے آنے والے ایک یوسف حسین صاحب عزمؔ منماڑ جنکشن پر
میرے رفیقِ سفر ہوئے۔ مبادیاتِ تصادم کے بعد شعراء کے رسمِ قدیم کے مطابق سننے سنانے کا سلسلہ
چلا، فرمانے لگے، مطلع عرض ہے

اعتبارِ زندگانی کچھ نہیں — کچھ نہیں دنیائے فانی کچھ نہیں

میں نے کہا، سبحان اللہ، یہ تو آپ کی مشہور غزل ہے جو مجھے بھی حفظ ہے

صبحِ پیری ہنس رہی ہے آہ میں — منتظرِ شام جوانی کچھ نہیں
بول کچھ تو اے لبِ گورِ غریب — یہ زبانِ بے زبانی کچھ نہیں

چونک کر بولے، آپ نے کہاں سنی،
رسالہ العصر لکھنؤ میں کسی تھانوی نے اِس مقطع کے ساتھ اپنے نام سے چھپوائی تھی

ہستیِ بے مدعا ارشدؔ ہوں میں — شعر کے میرے معانی کچھ نہیں

مجھ سے یہ جواب سُن کر بیساختہ فرمایا، یہ مقطع ہرگز میرا نہیں ہے۔ میں نے کہا جبھی تو مہمل بھی ہے، آپ نے
کیا فرمایا تھا؟ اس پر وہ کچھ پریشان سے ہوگئے، اور بہ مشکل بولے، اسوقت ذہن میں نہیں رہا۔ مگر
صاحب سچ یہ ہے کہ لوگ بھی غضب کرتے ہیں۔

اب مجھ سے ضبط نہ ہوا، اور ہنسی آنی شروع ہو گئی، جس پر وہ کھسیانے ہوگئے۔ اور بات
ٹال کر کہنے لگے، معاف کیجیے گا، جناب کا اسم گرامی؟ میں نے کہا ارشدؔ تھانوی۔

اُف، ناظرین سمجھ گئے ہونگے کہ "عزم" صاحب کی شدتِ ندامت سے کیا کیفیت ہوئی ہوگی
مگر واقعہ یہ نہیں، اُنھوں نے جو کچھ کہا، میں ہرگز اُس کا متوقع نہ تھا۔ بولے، اچھا تو آپ ہی نے میری
غزل اپنے نام سے چھپوائی ہے۔

کاش دوسرے مسافر ہمارے ہم ذوق ہوتے، وہ اس گفتگو کو سنکر میری اُسوقت کی حالت کا
کا صحیح اندازہ کرسکتے تھے۔ مگر ذرا سے تامل کے بعد راز میری سمجھ میں آگیا۔ غریب عزمؔ، نیک نیت
تھا، اور ارتکاب سرقہ سے قطعًا بری۔ یقینًا اُس نے کسی دوست سے فرمائش غزل کی، قیاس کہتا
ہے، وہ اِن سے زیادہ طباع تھے، العصر سے غزل نقل کرکے حضرت کو دیدی۔ اب سادہ لوح شاعر
کو کوئی قوت داد سخن سے محروم نہیں کرسکتی۔ اگر اُسی وقت میرے ذہن میں یہ مقولہ بھی آجاتا

کہ "شعر گفتن چہ ضرور" تو آج قاضی صاحب کے حسنِ ظن کی بدولت غالباً اس قدر قلم فرسائی کی نوبت نہ آتی۔

امید ہے کہ سطور بالا اُس بیگانگی کے انسداد کا باعث بھی ہو جائیں گی جو میری طویل خاموشی کی وجہ سے ناظرینِ الناظر کے دلوں میں پیدا ہو گئی ہے، اور جسکے انالہ کی طرف برادر محترم مولانا ظفر الملک نے اپنے نوٹ کے آخر میں اشارہ فرمایا ہے

چہ خوش بود کہ برآید بیک کرشمہ دو کار

ارشد تھانوی

جذباتِ اثر

لاؤں کہاں سے دیدۂ بینا کہیں جسے
تو خود ہی وہ نہیں ہے کہ تجھ سا کہیں جسے

ہر چند اب وہ دل ہے نہ طوفاں طرازیاں
قطرے میں گم ہے وسعتِ دریا کہیں جسے

حیرت نے بے نقاب کیا بزمِ ناز میں
وہ جلوہ رشکِ شعلۂ سینا کہیں جسے

کچھ آج سے نہیں ہوں میں ناکامِ آرزو
دل پہ ہے ایک داغ سویدا کہیں جسے

ٹپکا ہے یادِ عیشِ گذشتہ میں آنکھ سے
وہ اشکِ نابِ ریزۂ مینا کہیں جسے

وہ دیکھنا کسی کا باندازِ دلبری
میرا سکوت نالۂ رسوا کہیں جسے

پھر گلفروشِ دیدۂ خونابہ بار ہے
اک نو بہار، جانِ تمنا کہیں جسے

افسونِ حسنِ دوست سے عالم میں چار سُو
چھایا ہوا ہے رنگِ تماشا کہیں جسے

وجہِ خودی وسیلۂ ترکِ خودی بھی ہے
نیرنگِ ہست و بود کہ دُنیا کہیں جسے

بنیاد یوں کی نذر ہوئی انتظار میں
وہ بیخودی کہ شوق کا پردا کہیں جسے

پہلو میں ایک دل ہے سو ویران اسقدر
اہلِ نظر بھی دیکھ کے صحرا کہیں جسے

رنگیں اسی سے دامنِ حسنِ دوام ہے
گو نقش بے ثبات ہے دُنیا کہیں جسے

بسمل کو نیاز میں وہ بھی گناہ ہے
اک اضطراب، شرحِ تمنا کہیں جسے

چھپتا ہے کب چھپائے سے دردِ نہاں اثرؔ
خاموش اس طرح ہو تماشا کہیں جسے

اثر۔ لکھنوی

شہیدِ چلیپا

زرغوزہ، قرطبہ، غرناطہ، اشبیلیہ، سب ایک ایک کرکے عیسائیوں کے پنجے میں جا چکے ایک بلنسیہ والے البتہ ابھی لڑے جا رہے ہیں۔ مفتوحہ صوبوں میں مسلمانوں کی حالت دیکھ کر خون خشک ہوا جا رہا ہے۔ اور شکست ہے کہ ہر دم نزدیک تر آتی جا رہی ہے کھلے میدان میں لڑنا دشوار ہوگیا تو بیچارے قلعہ میں بند ہوگئے۔ پھر بھی امان نہ ملی۔ عیسائی لشکر نے بڑھ کر شہر کا محاصرہ کر لیا اور سرنگ لگانے کی تیاریاں کرنے لگے۔ دن بھر محاصرین سرنگ کھود کر اس میں بارود بھرتے اور رات بھر میں محصورین اندر سے ساری بارود نکال لیتے۔ جب یہ حالت دیکھی تو عیسائی جنرل نے آدھی رات کو بارود میں آگ لگوادی۔ ایک دھماکا ہوا اور شہر پناہ میں ایک بڑا رخنہ ہوگیا۔ محاصرین کی ٹڈی دل فوج اس طرف بڑھی۔ بلنسیہ کے حاکم سلیم نے اپنے چند جاں نثار ساتھیوں کے ساتھ موقع پر پہونچ کر اس بڑھتے ہوئے سیلاب کو روکنا چاہا مگر اس طوفان میں نہ ٹھہر سکے اور غلامی سے موت کے خطرے کو بہتر سمجھ کر دشمن کی فوج میں گھسے اور صفیں چیرتے ہوئے نکل گئے۔ باہر نکل کر دم لیا تو سلیم نے اپنے دوستوں سے کہا "میری جان اب خطرے میں ہے۔ میں نہیں چاہتا کہ میرے ساتھ میرے رفقا بھی آفت میں پھنسیں۔ بہتر یہی ہے کہ آپ لوگ اب مجھے تنہا چھوڑ دیں"۔ ساتھیوں نے سلیم کی اس تجویز سے اختلاف کیا، مگر سلیم کے اصرار اور اپنی جان کے خوف سے انھیں جدا ہونا پڑا۔ اور علی الصباح سلیم اپنے دوستوں سے رخصت ہوکر بادلِ ناخواستہ بندر قرطاجنہ کو چل کھڑا ہوا۔

تمام دن پہاڑی علاقوں میں چلتے چلتے تھک گیا تھا۔ تاریکی کے ساتھ سردی بھی بڑھتی جاتی تھی۔ اور سلیم کے پاس اسلحہ اور بدن کے کپڑوں کے سوا کچھ بھی نہ تھا۔ سامنے کچھ روشنی دکھائی دے رہی تھی اور سلیم جلد جلد قدم اٹھا رہا تھا کہ شاید رات کو آرام کرنے کے لیے کوئی جھونپڑا مل جائے۔ درختوں اور جھاڑیوں کی آڑ میں ہوتا ہوا نزدیک پہونچا تو دیکھا کہ دو سپاہی ایک تنگ غار کے دہانے پر الاؤ لگا رہے ہیں اور اسکے اندر کمزور اور گھبرائی ہوئی آواز میں کوئی چلا رہا ہے: "رحم.... رحم.... میں مقیصور ہوں.... جلی.... جلی.... آہ.... پانی.... پانی!"

سلیم کے جذبۂ ہمدردی نے جوش مارا۔ اس نے اپنی کمینگاہ سے طپنچہ سر کیا۔ ایک سپاہی تو وہیں ڈھیر ہوگیا۔ دوسرا چونک پڑا۔ ادھر دیکھا، ادھر دیکھا، اور کچھ آہٹ پاکر سلیم پر جھپٹا۔

سلیم نے بھی تلوار سونت لی اور چند منٹ کی سخت جنگ کے بعد اُسے بھی خاک پر سُلا دیا۔ اسکے بعد وہ غار کی طرف بڑھا۔ سُلگتی ہوئی لکڑیوں کو جلدی جلدی ہٹایا تو چاند کی روشنی میں دیکھا کہ ایک حسین لڑکی بیہوش پڑی ہے۔ بڑی مشکلوں سے اُسے باہر نکال کر گھاس پر سلایا۔ دوڑکر پانی لایا۔ پلایا، مُنہ دھویا اور بیٹھ کر دامن سے پنکھا جھلنے لگا۔ بے حس و حرکت لڑکی کے گورے گورے گال لمبے لمبے سنہرے بال، خوبصورت کتابی چہرہ، سرخ پتلے ہونٹ، نازک جسم اور متناسب اعضا نے جادو کا سا اثر کیا، اُسکی آنکھیں اس حسن کی دیوی کی بلائیں لے رہی تھیں کہ لڑکی نے آنکھیں کھولیں، اور ایک نامحرم کی موجودگی سے جھجک کر اُٹھ بیٹھی۔

سلیم مبہوت بیٹھا ہوا تھا، اُسکی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ سلسلۂ گفتگو کس طرح چھیڑے۔ تھوڑی دیر کی خموشی کے بعد وہ ہمت کرکے بولا "کیا میں پوچھ سکتا ہوں آپ کون ہیں، اور اس مصیبت میں کیسے گرفتار ہوگئیں؟" لڑکی نے جو نگاہیں نیچی کیے ہوے تھی جواب دیا "مجھ بدنصیب کو زہرا کہتے ہیں۔ میرے والد عبدالرحمٰن غرناطہ میں تجارت کرتے ہیں۔ میں اپنی ماں کے ساتھ مراقش کی سیر کو گئی تھی، وہیں اُن کا انتقال ہوگیا۔ آج مہینوں سے والد صاحب کا کوئی خط ہے نہ پتہ۔ میں نے گھبرا کر گھر کا رخ کیا، آب الجیرے آگے بڑھی تھی کہ ان بے رحم سپاہیوں نے میرا پیچھا کیا۔ بھاگتے بھاگتے میں ادھر نکل آئی اور اپنی جان بچانے کے لیے اس غار میں چھپ گئی"۔ یہ کہا اور زار زار رونے لگی۔ سلیم نے بہت دلاسا دیا اور کہا "دل چھوٹا نہ کیجیے۔ خدا مددگار ہے غرناطہ تک میں آپ کو پہونچادوں گا، لیکن اب یہاں ٹھہرنا بہت خطرناک ہے۔ آئیے ہم اپنا لباس ان مردہ سپاہیوں سے بدل لیں اور فوراً روانہ ہو جائیں"۔

لباس بدل کر زہرا اور سلیم فوراً چل کھڑے ہوئے اور صبح ہوتے ہوتے غرناطہ پہونچ گئے۔ زہرا دوڑ کر باپ کے گلے لپٹ گئی۔ پھر سفر کی مصیبتیں بیان کیں۔ سلیم کا تعارف کرایا اور بڑے اصرار سے کچھ روز قیام کرنے پر مجبور کیا۔ یہ وہ زمانہ تھا کہ حکومت نے اسلامی زبان اور اسلامی رسوم کو جرم قرار دیدیا تھا۔ مسلمانوں کو قسم قسم کی اذیتیں پہونچائی جاتی تھیں۔ اُن پر طرح طرح کے مظالم توڑے جاتے تھے، ذرا سے بہانہ پر بڑی بڑی جائدادیں منضبط ہوتی تھیں، امن پسند رعیت جلاوطن کی جاتی تھی اور اُنکے علمی خزانے شارع عام پر جلائے جاتے تھے۔ مسلمانوں نے بھی سمجھ لیا تھا کہ عیسائی فرماں روا انکو مٹادینا چاہتے ہیں۔ بیچاروں نے دول عثمانیہ اور مراقش سے دردبھری التجائیں کیں، مگر مایوس ہوے۔ فرانس اور انگلستان سے مدد چاہی، ایک لاکھ آدمیوں کی کمک فراہم کرنے کی امید دلائی، پروٹسٹنٹ مذہب

اختیار کرنے کا وعدہ کیا، مگر سب فضول۔ آخر انھوں نے لڑکر جان دیدینے کا تہیہ کرلیا تھا۔ خفیہ طور پر افریقہ سے ہتھیار منگا لیے تھے اور غدر کی تیاریاں شروع ہوگئی تھیں۔

زہرا کا جذبۂ احسانمندی محبت سے تبدیل ہوگیا۔ وہ سلیم کو دل سے چاہتی، اور اُسکا ہر برتاؤ انتہائی محبت سے لبریز ہوتا۔ سلیم اُسی روز گھائل ہوچکا تھا جب اُس نے زہرا کو موت کے غار سے نکالا تھا، اور اب تو وہ جدائی کے خیال ہی سے کانپ اُٹھتا تھا۔ محبت کی آگ دونوں طرف بھڑک رہی تھی۔ پیار کی نظریں چار ہوتی تھیں، مگر محبت نے الفاظ کا جامہ نہ پہنا۔ بزرگ باپ حسن و عشق کے کرشموں کو غور سے دیکھ رہا تھا۔ ایک دن اُس نے سلیم سے کہا "میری دلی خواہش ہے کہ زہرا کی جان بچانے کے صلہ میں اُسے آپ کے دامن سے وابستہ کردوں" سلیم نے شرماکر سر جھکا لیا۔

دوسری صبح کو عبد الرحمن نے قاضی کو بلواکر خفیہ طور پر نکاح کی رسم ادا کرادی۔ شادی میں نہ نمائشی ساز و سامان تھا اور نہ بڑی بڑی دعوتیں۔ پھر بھی یہ چھوٹی سی دنیا بھی مسرت سے لبریز تھی۔ مگر افسوس یہ شادی شباب گل کی طرح مختصر تھی۔ ابھی شام ہونے میں دو گھڑیاں باقی ہونگی کہ پولیس کے چند سپاہی عبد الرحمن کے مکان میں گھس آئے۔ دولھا، دولھن، اور اُسکے بڈھے باپ کو گرفتار کرلیا۔ چند گھنٹوں کی دولھن دونوں ہاتھوں سے منہ چھپائے اپنے باپ کے پیچھے چھلکی زار زار رو رہی تھی۔ سلیم شیر کی طرح بپھر رہا تھا۔ غصہ سے آنکھیں اور رخسارے سرخ ہوگئے تھے۔ عبد الرحمن نے سمجھا بجھا کر سلیم کے غصہ کو ٹھنڈا کیا۔ اور سب بلا مزاحمت سپاہیوں کے ساتھ ہولیے۔

دوسرے دن عدالت مقدسہ میں مقدمہ پیش ہوا۔ جرم یہ تھا کہ عبد الرحمن نے قانون رائج الوقت کے خلاف اپنی لڑکی کی شادی میں اسلامی رسوم ادا کیے۔ عبد الرحمن نے بلا پس و پیش اقبال جرم کرلیا۔ وہ جانتا تھا کہ اگر اُس نے ایسا نہ کیا تو تیل میں بھیگے ہوئے کوڑے اور لوہے کی گرم گرم سلاخیں اُسے ایسا کرنے پر مجبور کردینگی۔ اس راست گوئی کا نتیجہ وہی ہوا جو ہونا تھا، یعنے تمام جائداد منقولہ و غیر منقولہ بحق کلیسا ضبط کرلی گئی۔

زہرا اپنے حسن کے لیئے "ماہ غرناطہ" کے نام سے مشہور تھی، اور اپنی نسوانی خوبیوں سے اہل غرناطہ کے دلوں میں گھر کرچکی تھی۔ اس کا باپ بھی غرناطہ کے بڑے امرا میں گنا جاتا تھا اور اپنی فیاضی اور ہمدردی کی وجہ سے ہردلعزیز تھا۔ ایسے محبوب خاندان کو لُٹتے دیکھ کر مسلمانوں کے صبر کا پیمانہ چھلک اُٹھا۔ تھوڑی ہی دیر میں مسلمانوں کا ایک مسلح جتھا عیسائی قاضی پر حملہ آور ہوا۔ پولیس نے مدافعت کی مگر اُنکو ناکامی ہوئی۔ آخر ایک فوج اُنکی کمک کو آئی۔ کایا پلٹ گئی۔ مسلمان نقصان اُٹھانے لگے

لڑنے سے باز نہ آتے۔ عیسائی جنرل نے جب یہ حال دیکھا تو مفتوحین کی سلامتی کے لیے شاہی معافی کا وعدہ سنایا۔ جان بچنے کی صورت نظر آئی تو بیچاروں نے ہتھیار رکھ دیے اور اپنے اپنے گھروں کا رُخ کیا۔

دوسرے ہی دن منادوں نے تمام مسلمانوں کو شہر کے بڑے کلیسا میں جمع ہونے کا حکم سنایا۔ لوگ ڈرتے ڈرتے جمع ہوئے تو گورنر نے شاہ فلپ کی طرف سے سب کو جلاوطنی کا حکم سنایا۔ اور بیچاروں کو مختلف گروہوں میں تقسیم کرکے بندرگاہوں کو روانہ کردیا۔ نازونعمت کے عادی، عیش وعشرت کے خوگر قیدیوں نے اپنے عالیشان محلات، خوبصورت باغات، اور بیشمار مساجد کو بڑی حسرت سے خدا حافظ کہا۔ ضروریاتِ زندگی کا بوجھ سر پر لادا، ننھے ننھے بچوں کو گود میں لیا اور دورویہ تماشائیوں کی قطاروں میں ہوکر اپنی اپنی منزلوں کو روانہ ہوئے۔

زہرا اور سلیم کا قافلہ اشبیلیہ پہونچا۔ رنج اور سفر کی صعوبتوں نے بڈھے باپ کو سفر ہی میں بیمار ڈال دیا تھا۔ منزل پر پہونچکر مسافر نے انتقال کیا۔ اللہ اللہ کیا مصیبت تھی کہ بیچاری زہرا عزیز باپ کی میت پر رونے بھی نہ پائی۔ لاش کو ایک غریب بڈھے کے سپرد کیا اور قافلہ کے ساتھ ہولیے۔ بندرگاہ پر محافظین نے قافلہ کو کپتان کے سپرد کیا۔ جہاز پر بیٹھے تو مایوس مسلمانوں میں جان آگئی۔ شکرانہ کی نمازیں پڑھیں، خوشی کے ترانے گائے، گویا اپنے چھ سو برس کے پرانے وطن کو چھوڑنے کا انھیں ذرا بھی قلق نہ تھا۔

اس ہنگامۂ مسرت میں جہاز نے لنگر اُٹھایا اور ابھی ساحل نظر سے اوجھل بھی نہیں ہوا تھا کہ عیسائی کپتان نے زہرا کو بلوا بھیجا۔ زہرا بلا خوف وہاں چلی گئی۔ کپتان نے ادھر اُدھر کی گفتگو کے بعد اُس سے کہا "تم اب بھی غرناطہ کی مہ جبینوں کی ملکہ بن سکتی ہو، تم اب بھی اپنے وطن میں رہ سکتی ہو، اور تمھاری ساری جائداد تمھیں واپس مل سکتی ہے، اگر تم میرے ساتھ شادی کرلو۔" زہرا نے فوراً جواب دیا "میری شادی بلنسیہ کے بہادر جنرل سلیم کے ساتھ ہوچکی ہے، اور عیش وعشرت اور مال ودولت کے خواب مجھے اُس سے جدا نہیں کرسکتے۔" کپتان خفیف ہوکر بولا "تمھیں میرے ساتھ شادی کرنی پڑے گی۔ اگر تم اپنی ضد سے باز نہ آؤگی تو جہاز کو واپس لیجاکر تمھارے بہادر سلیم کو بندر کی پولیس کے حوالہ کردوں گا۔" زہرا نے زور دیکر جواب دیا "پھر بھی میں تجھ سے شادی نہ کروں گی۔" کپتان لال پیلا ہوکر بولا "میں تجھے مجبور کردوں گا۔" اور کرسی چھوڑکر کمرے کے باہر چلا گیا۔

زہرا سمجھ گئی کہ اب سلیم کی خیر نہیں، وہ سجدہ میں گری اور رو رو کر دعا مانگنے لگی "مولا، تو حاضر و ناظر ہے - تو جانتا ہے کہ ہم بے گناہ ہیں، تو دیکھتا ہے کہ ہم ستائے جاتے ہیں، ہماری مدد کر - آہ! ظالموں نے ہمارا سُکھ چین لیا، مال و دولت چھینا، ہمیں وطن سے بے وطن کیا - اب جان کے درپے ہیں! خدایا! اب ہماری عزت پر حملہ کرتے ہیں! کاش اس جہاز کے ٹکڑے ٹکڑے اُڑ جاتے قبل اسکے کہ یہ پھر ساحل ہسپانیہ پر لنگر انداز ہوتا - کاش یہ موذی کپتان سمندر کے خوفناک جانوروں کی خوراک بنجاتا، قبل اسکے کہ سلیم کی موت کا خیال اس کمینے کپتان کی صحبت اختیار کرنے کے لیے مجھے مجبور کرتا - میرے مالک! تو بیکسوں کا مددگار ہے، کمزوروں کی عزت کا پاسدار ہے، اپنے حبیبؐ کے صدقہ میں غریب زہرا کی دعا قبول کر"

ابھی دعا ختم نہ ہوئی تھی کہ سلیم گھبرایا ہوا کمرے میں داخل ہوا - زہرا نے سجدہ سے سر اُٹھایا اور دوڑ کر اُسکے گلے سے لپٹ گئی - سلیم نے گھبرائی ہوئی آواز میں کہا "کپتان نے ملاحوں کو حکم دیا کہ جہاز واپس لے چلیں - ہم لوگوں نے اُسے اس حرکت سے باز رکھنا چاہا - اس میں لڑائی ہوئی - بے ناخدا کا جہاز ایک چٹان سے ٹکرا کر ٹوٹ گیا" یہ گفتگو کرتا ہوا زہرا کو تختہ پر نکال لایا - تمام مسافر حیران و پریشان ادھر اُدھر دوڑ رہے تھے - بچوں اور عورتوں کے رونے اور بلکنے سے اور بھی قیامت بپا تھی - جلد جلد جہاز نے ایک طرف کروٹ لی! - نہنگ آب نے اس لقمہ کو اپنے خوفناک منہ میں رکھ لیا!

جہاز ڈوبنے کے بعد سطح آب ذرا برابر ہوئی تو سلیم اور زہرا مستول کے ایک ٹکڑے سے لٹکے، تند موجوں کا مقابلہ کرتے دکھائی دیے - دیکھتے دیکھتے ایک موج کا تھپیڑا لگا اور زہرا کا ہاتھ چھوٹ گیا - سلیم اپنی جان سے عزیز بیوی کو بچانے کے لیے لپکا - مگر زہرا مایوسی کے عالم میں سلیم سے کچھ ایسا لپٹ گئی کہ اُس کے ہاتھ پاؤں رک گئے - اور ساحل کے قریب آکر یہ مظلوم جوڑا خوفناک تھپیڑوں کی نذر ہوگیا - آج تک دونوں عاشق کلیسائی مظالم کی پہنچ سے دور، سمندر کی تہ میں دوش بدوش میٹھی نیند سو رہے ہیں، اور بحر روم کی موجیں دن رات اُن کے مدفن پر سرد آہیں بھرتی ہیں -

سعید

قیصر باغ

بحیثیت ایک سیاح کے اگر آپ لکھنؤ میں کسی قدیم عمارت کو سب سے زیادہ پسند فرمائیں گے تو وہ قیصر باغ ہوگا۔ جانِ عالم پیا آخری تاجدار اودھ کے کمل ذوق و ندرت خیال کا بہترین نمونہ یہ عمارت ہے۔ اس عمارت کے بہت کم تاریخی حالات میسر آئے۔ ۱۸۵۰ء میں تعمیر ہوئی اس میں متعدد و بینظیر عمارات کے علاوہ زائد از ایک ہزار محلات شاہی کے قیام کے لیے مکانات بنے ہوئے تھے۔ تکمیل کے بعد اس باغ میں ایک قسم کے مخصوص اجتماع ہوا کرتے تھے۔ ایک مقررہ دن سب لوگ صندلی رنگ کے لباس میں شریک ہوکر اپنے تعیش و لطف صحبت کا ثبوت دیتے۔ سلطنت کا چراغ جب "چراغ سحری" کی حد تک پہونچ گیا اور طوائف الملوکی کی شان ہر چہار جانب پیدا ہوئی اسکی سب سے بڑی وجہ حضرت اختر (شاہ اودھ) کی طبیعت کا وہ رنگیلا انقلاب تھا جسکو بہ اصطلاح عام "عشرت پسندی" سے تعبیر کیا جاتا ہے۔

اسی زمانہ میں اس عظیم الشان باغ میں "مثنوی دریائے عشق" کے ذریعہ تھیٹر کھیلے جاتے جس میں بسا اوقات خود بادشاہ سلامت بھی ایکٹ کرتے اور اپنے حوارین سے خوب خوب کمال فن کی داد چاہتے۔ غرضکہ شاہانہ اولوالعزمیاں ہر چیز سے آشکارا تھیں۔

عمارت کی تعمیر میں ڈیڑھ کروڑ روپیہ صرف ہوا۔ پوری عمارت اعلیٰ کمال معماری کا بہترین نمونہ تھی۔ قصر کا خاص حصہ مربع مستطیل و مثنع کے احاطہ سے تعلق رکھتا تھا۔ گرد کی عمارت میں اتنی بڑی گنجایش تھی کہ ایک ہزار محلات بافراغت رہ سکیں۔ ہر عمارت میں ایک جداگانہ پائین باغ تھا، اور وسط صحن میں سب سے زیادہ پُر تکلف چمن بندی کے علاوہ صدہا قسم کے خوشنما فوارے اور متعدد خوشنما نہریں تھیں جن میں سے ایک سنگ مرمر کی نہر مع اپنے خوبصورت و عجیب پل کے ابتک موجودہ کونسل ہال کے سامنے قیصر باغ کی گذشتہ شان و شوکت کی یاد دلا رہی ہے۔ ہر روش پر مرمری مورتیں، برجیاں اور دوسری خوبصورت صناعیوں کے نمونے نصب تھے۔ تمام وسیع عمارت قسم قسم کے اسباب تعیش سے بہترین اصولوں پر آراستہ کی گئی تھی۔ اگرچہ قیصر باغ میں وہ اگلی سی شان نہیں مگر اس گئے گذرے عالم پر بھی وہ عمارت اپنا آپ ہی جواب ہے۔ گو اس سے ہم اگلی شان و شوکت کا کسی طور سے بھی اندازہ نہیں لگا سکتے۔ وہ عمارت جو گرد کے مربع مستطیل

حادی ہے وہ " تعلقداران اودھ" کو دیدیگئی ہے جنھوں نے بعض حصوں کو اپنے رہنے کے مکانات قرار دے لیا ہے ۔ بقیہ حصے بغیر چھت کی عالیشان دیواریں اور خوبصورت کھنڈر نظر آتے ہیں ۔ جن سے زمانہ کے نشیب و فراز کا ایک عبرتناک سبق ملتا ہے !

بڑے بڑے عالیشان محراب دار پھاٹک اپنے بھاری بھاری تانبے کے طلاکار دروازوں کے ساتھ جن پر دریائی پریاں اور شاہ اودھ کا معرکہ بنا ہوا ہے، ابتک قائم ہیں ۔ جب بیلی گارد تک پہونچنے کے لیے غدر میں لڑائی ہوئی ہے تو قیصر باغ وہ مقام تھا جسپر انگریزی فوج کو قبضہ کرنے کی ضرورت محسوس ہوئی، اسکی تمام عمارتیں باغیوں سے بھری ہوئی تھیں جو مال غنیمت لالا کر وہاں جمع کر چکے تھے انگریزی فوج نے داخلہ پر باغیوں کو سنگینوں سے قتل کرنے کے علاوہ تمام مال غنیمت کو اپنا بنا لیا ۔ شمالی پھاٹک جسکے نیچے بد نصیب قیدی" سر مونٹ اسٹوارٹ جیکسن" اور دیگر انگریز نہایت بیدردانہ طور پر قتل کیے گئے تھے، اُس میں سے ہو کر اگر جائیے، تو آپ کو "شاہی جلوخانہ" کے ٹوٹے پھوٹے کھنڈرات دکھلائی دینگے یہ وہ مقام ہے جہاں شاہی جلوس آکر صف بندی کرتا تھا ۔ اور اسی جگہ سے سواری نکلا کرتی تھی، اسکے داہنی طرف دوسری محراب میں جائیے، تو "چینی باغ" نظر کے سامنے آئیگا ۔ اس باغ کی خصوصیت یہ تھی کہ اس میں جس قدر بھی سامان تھا سب چینی کا نظر آتا تھا ۔ ایک اور محراب جسکے گرد سبز دریائی پریاں ہیں، وہ راستہ حضرت گنج کو لیجاتا ہے ۔ یہ باغ خاص بادشاہ کے نام سے منسوب تھا ۔ اسکے داہنی طرف" چاندی والی بارہ دری" مشہور و نفیس عمارت تھی، جسکے سقف و ستون سب چاندی کے پتروں سے منڈھے ہوے تھے ۔ یہ تمام چاندی ۱۸۵۷ء کے غدر میں تلف ہوئی ۔

غرضکہ یہ ہیں اس مٹی ہوئی تاریخی عمارت کے مختصر حالات ۔ آہ! کبھی یہ عمارت گہوارۂ عیش و عشرت اور سرمایۂ راحت و آرام تھی کسی کے جوش، ولولہ اور شوق کا مکمل نمونہ تھی، اور آج اُسکی کیا حالت ہے؟ کاش اودھ کے نامور تعلقہ دار جن کو کچھ بھی اپنے اسلاف کی یادگاروں کی قدر ہے وہ اس عظیم الشان تاریخی عمارت کی طرف پوری توجہ سے کام لیں، ورنہ اگر یہی لاپروائی اور عدم توجہ رہی تو وہ دن دور نہیں کہ یہاں ایک ویرانۂ عبرتناک کا منظر آنکھوں کو نظر آئے اور آنے والی نسلیں ہماری غفلت پر آنسو بہائیں ۔ خدا ایسا وقت نہ لائے جسکے خیال اور تصور سے بھی رونگٹے کھڑے ہوتے ہیں ۔

مسعود الرحمٰن ندوی

بارگاہِ سخن

یہ بارگاہِ شعر ہے، جھکتے ہیں سر یہاں
داغِ جگر سے ہوتی ہے پیدا نظر یہاں

چومی ہے نخوتوں نے یہ خاکِ فتادگی
ڈالی ہے رفعتوں نے فلک کی سپر یہاں

اللہ رے علوئے مراتب! زہے شرف
قدموں پہ کائنات کا رہتا ہے سر یہاں

اس راستہ کی شمع ہے جبریل کا نفس
بجھ جاتا ہے ہوا سے چراغِ خضر یہاں

ہر شے ہے اپنی صورتِ اصلی میں جلوہ ریز
ہے سازِ برگ و بر، برنگِ دگر یہاں

پڑتی ہے ضوِ جبینِ طلوع و غروب پر
کھلتا ہے رنگِ عارضِ شام و سحر یہاں

اس کشورِ خیال کی اللہ ری عافیت
شاہوں سے فاقہ مست ہیں آسودہ تر یہاں

فرماں روا دلوں پہ ہے گلبانگِ بیخودی
یعنی حدیثِ عقل نہیں معتبر یہاں

ہر گوشۂ بساط پہ تاروں کی چھاؤں میں
کرتے ہیں رقص زہرہ وش و سیمبر یہاں

پڑتی ہے آ کے قلب پہ حسنِ ازل کی ضرب
آئینہ توڑ دیتا ہے آئینہ گر یہاں

اس محفلِ لطیف کی رخشندگی نہ پوچھ
بجھتے ہوئے چراغ ہیں شمس و قمر یہاں

اللہ رے سرود، کہ اجزائے کائنات
ہر زیر و بم پہ ہوتے ہیں زیر و زبر یہاں

چلتی ہے بادِ جنبشِ کمال اس دیار میں
آتا ہے گھر کے ابرِ متاعِ ہنر یہاں

اس دائرے میں منصبِ کام و دہن ہے اور
زہراب میں ہے لذتِ شہد و شکر یہاں

ہاتھوں پہ خلد سے طبقِ زر لیے ہوئے
قدسی ادب سے آتے ہیں شام و سحر یہاں

باطل، فسانۂ کرۂ ارض و دورِ چرخ
یہ دائرے ہیں حلقۂ بیرونِ در یہاں

رنگِ شفق سے ہوتے ہیں تعمیر سقف و بام
گلبرگِ تر سے بنتے ہیں دیوار و در یہاں

پروانہ معرفت کا ہے دل کی شکستگی
پیغمبری کی مہر ہے داغِ جگر یہاں

ہے کس خیالِ خام میں پروازِ علم و فضل
ہر اک نفس ہے جنبشِ صد بال و پر یہاں

اڑتا ہے سوئے عرشِ بریں شب کو مرغِ دل
ہوتی ہیں آسمان پہ راتیں بسر یہاں

ہر سنگ میں ہے خندۂ اصنامِ آذری
ہر خار میں ہے جلوۂ گلہائے تر یہاں

ہر ذرۂ حقیر، بعید از دلبری
رکھتا ہے آفتاب کے زانو پہ سر یہاں
کیا پوچھتا ہے جوشؔ تصور کے معجزے
ہوتی ہے ہر "خیال" سے پیدا "نظر" یہاں

جوشؔ ملیح آبادی

رباعیاتِ رواںؔ

(حسن و عشق)

جب حسن سے فیضیاب ہو جاتا ہے
دل خوگرِ پیچ و تاب ہو جاتا ہے
اپنی ہستی کو بھول جاتا ہے بشر
ایسا کچھ انقلاب ہو جاتا ہے

ختمِ غمِ روزگار کر دیتا ہیں
یہ دورِ خزاں بہار کر دیتا ہیں
کوئی مقصودِ آرزو ہی نہ ملا
جس پہ دل و جاں نثار کر دیتا ہیں

اس سے بہتر کہ بادۂ کوثر دے
اک مست نگاہ عاشقوں پہ کر دے
اے مطلعِ حسن، اے بیاضِ خورشید!
پیمانۂ دل میں نورِ الفت بھر دے

ملنا کس کام کا اگر دل نہ ملے
کیا لطف سفر سے ہو، جو منزل نہ ملے
وسطِ دریا میں غرق ہونا بہتر
اس سے، کہ قریب آ کے ساحل نہ ملے

سُن، اے دامن بچا کے جانے والے
کیا کہتے ہیں اشکِ خوں بہانے والے
کس طرح ہو جمع خاطرِ خستہ دلاں
اے چاکِ جگر پہ مسکرانے والے

جب نفس پہ فتحیاب ہو جاتا ہے
انساں عظمت مآب ہو جاتا ہے
اُف، عشق کی سوزشِ دروں کی تاثیر
ہر داغِ دل آفتاب ہو جاتا ہے

رواںؔ، ایم اے، ایل ایل بی،

سفرِ حجاز کی مختصر روداد

نویں منزل

حسن سکندر نے وعدہ کیا تھا کہ علی الصباح اونٹ آ جائیں گے تاکہ ٹھنڈے ٹھنڈے روانہ ہو جائیں اور منا میں پہونچکر مسجد خیف میں پانچ وقت کی مسنون نماز ادا کر سکیں، لیکن اونٹوں کے آنے میں بہت دیر ہوئی اور ظہر پڑھ کر روانگی ہو سکی۔ چونکہ راستہ زیادہ فراخ نہیں بلکہ مکۂ معظمہ کے بازاروں میں اور بھی تنگ ہے، اور بکثرت اونٹ منا کی طرف جا رہے تھے، اسلیے اونٹ جا بجا رُکتے بھی تھے اور چلتے بھی نسبتاً آہستہ آہستہ تھے۔ منا کچھ زیادہ دُور نہیں ہے۔ ہماری جائے قیام سے دو ڈھائی کوس کا فاصلہ ہوگا مگر تقریباً نصف مسافت شہر کے اندر ہے اسوجہ سے منزل کسی قدر دیر میں طے ہوئی اور جب ہم منا میں پہونچے تو عصر کا وقت ہو چکا تھا۔ مسجد کی چار دیواری سے بالکل متصل ایک احاطہ میں ہمارے اونٹ ٹھہرائے گئے۔ جلد ہی جلدی شقدف اُتارکر اور سامان رکھکر نماز کے لیے مسجد خیف میں گئے۔ مسجد کا صحن اور نیز کعبۂ شریف کے رخ پر جو دو درجہ کا دالان ہے سب کی زمین کچی ہے۔ اور چونکہ بعض حجاج نے وہیں قیام کرنا پسند کیا اور جا بجا کھانا پکایا تھا اس لیے مسجد کی حالت ایک کارواں سرائے کے مانند ہو گئی تھی اور صحن کہیں بھی صاف ستھرا نہ تھا۔ بہرحال اپنی اپنی جانمازیں بچھاکر نماز ادا کرلی گئی۔ نماز سے فارغ ہوکر پیٹ کی فکر پڑی۔ منا میں دورویہ پختہ بازار بنا ہوا ہے۔ جس میں دوکانیں بھی ہیں اور بعض حصوں میں لوگ ٹھہرتے بھی ہیں۔ جس وقت ہم پہونچے ہیں اُسوقت بازار زائد رونق پر اگرچہ نہ تھا پھر بھی روٹی گوشت کی متعدد دوکانیں موجود تھیں۔ گرم گرم تنوری روٹیاں لیکر میں اور حاجی شبراتی، جو کہ مکۂ معظمہ سے منا تک پیدل آئے تھے، شکم سیر ہوئے۔

برادر عزیز انور علی سلمہٗ کی ران میں ایک گلٹی نکل آئی تھی جسکی وجہ سے انکو سخت تکلیف تھی اور وہ ساتھ کی مستورات کی کوئی خدمت نہ کرسکتے تھے، مکۂ معظمہ سے میں نے انکو اپنے اونٹ پر بٹھالیا تھا تاکہ اُنھیں میرے ساتھ آرام مل سکے۔ مغرب کی نماز کے بعد میں نے بعض دوسرے حجاج سے مشورہ کرنے کے بعد حسن سکندر سے کہا کہ رات ہی کو عرفات کے لیے روانگی ہو جائے

کیونکہ دیر میں پہونچنے کی وجہ سے مسجد خیف میں پانچ نمازوں کے پڑھنے کا وقت نہیں رہا تھا۔ سب لوگوں نے اس رائے کو پسند کیا اور نماز عشا سے فراغت پاتے ہی کوچ کر دیا۔ بیگم صاحبہ وغیرہ کو سوار کرانے اور اُن کا سامان قرینے سے بندھوانے کی خدمت چونکہ میرے متعلق ہوگئی تھی اسلیے ہمارے اونٹ ذرا رُکے رہے اور جب عورتیں سوار ہو چکیں تو سب سے آخر میں میں بھی اپنے شغدف میں جاکر لیٹ رہا۔ دن بھر میں کافی خستگی ہوگئی تھی اسلیے باوجودیکہ شب ماہ تھی مجھے قافلِ حجاج یا منا سے عرفات تک کی منزل کا نظارہ کرنے کا موقع نہیں ملا۔ جلد ہی آنکھ لگ گئی اور جب تک نماز فجر کے اول وقت میدان عرفات میں نہ پہونچ گئے آنکھ نہ کھلی۔ ہمارے اونٹ اُس پہاڑی سے تقریباً چند فرلانگ کے فاصلہ پر رُکے جسکا نام جبل رحمت بتایا گیا اور جہاں امام خطبہ پڑھتا ہے۔ قریب ہی بازار سجا ہوا تھا جہاں تمام ضروری سامان خورد ونوش ملتا تھا۔ نہر زبیدہ جو مکہ معظمہ میں ہے وہی منا اور عرفات میں بھی ہے۔ بلکہ یہاں شاید کھلی ہوئی ہے جس میں اکثر لوگوں نے جاکر غسل بھی کیا۔

میر عبد العزیز صاحب کو مکہ معظمہ ہی میں پیچش کی کچھ خلش ہوگئی تھی، یہاں تک آتے آتے اور زیادتی ہوگئی اور وہ چلنے پھرنے سے معذور ہوگئے۔ بازار میں جاکر کھانا کھایا اور پھر اپنے شغدفوں میں آکے بیٹھ رہے۔ دھوپ بہت سخت تھی۔ ادسپر تیز لو چل رہی تھی اور احرام کی وجہ سے نہ سر ڈھک سکتے تھے نہ سینہ کا تحفظ ممکن تھا۔ اس لیے عافیت اسی میں معلوم ہوئی کہ شغدفوں میں پڑے رہیں۔ نماز ظہر کے بعد امام مع شریف صاحب کے مسجد نمرہ سے جو مزدلفہ کے قریب ہے ظہر اور عصر کی نماز ساتھ ادا کرکے اس پہاڑی پر جو جبل عرفات کے پائین میں واقع ہے آتے ہیں اور یہیں اونٹ پر سوار ہوکر امام خطبہ پڑھتا ہے۔ حجاج میں سے جو لوگ اتنی ہمت رکھتے تھے کہ دھوپ اور لو کی تاب لا سکیں وہ پہلے ہی سے جاکر اس پہاڑی پر بیٹھ گئے تھے۔ فاصلے سے لوگوں کی صورت تو نہ دکھائی دیتی تھی مگر احرام کی سفیدی اور چھتریوں کی سیاہی ضرور نظر آتی تھی۔ مسجد نمرہ میں نماز ادا ہوتے وقت یا ہو چکنے کے وقت توپوں کے چھوٹنے کی آواز آئی جس کے بعد ہی حسن سکندر کے سالہ یوسف اور اُنکے چھوٹے بھائی نے اپنے حاجیوں کو حج کی مبارکباد دیا اور اُن سے نذرانے وصول کرنا شروع کر دیے۔ عصر کے وقت تک امام صاحب اُس پہاڑی پر پہونچ گئے۔ اور اُنکے پہونچتے ہی پہاڑی کے لوگوں میں ایک عام جنبش معلوم ہوئی۔ گویا لوگ اپنی جگہوں پر کھڑے ہوگئے۔ یا امام سے قریب ہونے کے لیے بڑھے۔ ہم لوگوں نے پہاڑی کا رخ کرکے زمین پر چٹائی بچھائی اور وہیں بیٹھ گئے۔ یہ معلوم ہوگیا تھا کہ جس وقت امام خطبہ پڑھتا ہے اور لبیک اللھم لبیک پڑھتا ہے تو جو لوگ پہاڑی پر ہوتے ہیں وہ

حاجیوں کی اطلاع کے لیے اپنے رومال ہلاتے ہیں۔ چنانچہ جب رومال ہلنے لگے تو ہم لوگوں نے بھی خوب ذوق و شوق سے لبیک پڑھی۔ جیسے جیسے آفتاب ڈھلتا گیا پہاڑی زیادہ صاف نظر آنے لگی مگر صورتیں اب بھی نظر نہ آتی تھیں۔ یوں تو ظہر اور عصر کے درمیان ہی قوافل کی واپسی شروع ہو گئی تھی مگر جب خطبہ تمام ہو گیا اور لوگ پہاڑی سے اُترے تو عام طور پر کوچ کی تیاری ہونے لگی۔ عرفات کے وسیع میدان میں جہاں ہیچ کو چاروں طرف خیمے، چھولداریاں اور شندف نظر آ رہے تھے اس وقت سوائے اونٹوں کی آوازوں یا شندفوں سمیت اونٹوں کی قطاروں کے اور کچھ نظر نہ آتا تھا۔ ہمارے جمالوں نے بھی عصر کے بعد ہی سے حی۔ حی (چلو چلو) کا ہنگامہ بپا کر دیا تھا۔ مگر میں نے کہا کہ جب تک آفتاب غروب نہ ہو جائے میں یہیں رہوں گا۔ جمالوں کی اُس وقت کی بیتابی اور بار بار روانگی کے لیے کہنا نہایت ناگوار معلوم ہوا۔ حالانکہ وہی وقت خضوع و خشوع کے ساتھ دعائیں مانگنے کا تھا۔ جب جمالوں نے بہت تنگ کیا تو میں نے کہہ کہ اور لوگ سوار ہو کر چلیں میں پیدل چلا آؤں گا، اور اپنا آہنی بیگ اُتار کے اپنے پاس رکھ لیا۔ اور غروب آفتاب تک برابر مصروف دعا خوانی رہا۔ اور جب آفتاب بالکل غروب ہو گیا تب وہاں سے اُٹھا۔ تھوڑی ہی دیر میں ایک جمال نے جو میرے پاس ٹھہر گیا تھا اونٹوں تک پہنچا دیا اور خدا کا شکر ادا کرتا ہوا میں شندف میں سوار ہو گیا۔ جبل عرفات سے مزدلفہ تک کوئی ڈیڑھ کوس کا فاصلہ ہو گا۔ اور راستہ اتنا وسیع و عریض ہے کہ چار چار یا پانچ پانچ قطاریں اونٹوں کی ساتھ ہی چلتی ہیں۔ جس کی وجہ سے اس قدر گرد اُڑتی ہے کہ مشکل راستہ میں کچھ سجھائی دیتا ہے۔ مگر تھوڑی ہی دیر میں بازار آ گیا جو لالٹینوں اور چراغوں کی کثرت سے بقعۂ نور بنا ہوا تھا۔ یہ بازار مسجد نمرہ کے قریب سے شروع ہوا تھا اور شاید یہ میلوں تک چلا گیا تھا۔ مگر دوکانیں عموماً ایک ہی سمت میں یعنے مسجد کے جانب تھیں۔ ہمارے اونٹ مزدلفہ میں ایک مقام پر اُتار دیے گئے۔ رات کے وقت اسکا اندازہ نہیں ہو سکا کہ مسجد نمرہ سے کتنے فاصلہ پر تھے۔ البتہ یہ معلوم ہوتا تھا کہ اسکے مقابل کے سمت میں پڑاؤ ہے۔ نماز عشا پڑھنے کے بعد اسی مقام پر کنکریاں چُنی گئیں۔ اسکے بعد اگرچہ رات بہت ہو چکی تھی اور اس کا بھی اندیشہ تھا کہ رات کی تاریکی میں کہیں راستہ نہ بھول جاؤں، مگر ہمت کر کے میں بازار گیا اور وہاں کھانا کھا کر چائے پی اور کچھ مٹھائی وغیرہ اور سلمہ کے لیے لیتا آیا۔ حاجی شبراتی صاحب چونکہ پیدل تھے اس لیے ہمارے ساتھ نہیں رہ سکے۔ بازار سے واپسی میں اپنے مقام تک پہونچنے میں کافی وقت ہوئی۔ اس لیے کہ ہر جانب شندفوں کی قطاریں تھیں۔ چاندنی رات تھی۔ اس لیے شندفوں کے ساتھ عموماً روشنی نہ تھی۔ زیادہ سے زیادہ ہر قافلہ میں ایک روشنی تھی۔

شقدفوں کی یکسانیت کے باعث امتیاز مشکل تھا۔ بہرحال کئی جگہ ٹھوکریں کھا کر بالآخر ایک بار اپنے شقدفوں تک رسائی ہوگئی۔ شقدفوں کے آگے بچھونا پہلے ہی بچھا لیا تھا۔ ابو سلمہ سو گئے تھے اس لیے انکو جگانا مناسب نہ معلوم ہوا اور جو کچھ کھانے کا سامان خرید کیا گیا تھا شقدف میں رکھکر میں بھی سو رہا۔ نماز فجر کے وقت اُٹھے اور نماز سے فارغ بھی نہ ہوئے تھے کہ جمال آگئے اور جلدی جلدی شقدف کسے گئے اور آفتاب نکلتے نکلتے منا کی جانب روانہ ہوگئے۔ اسوقت بھی اونٹوں کی کثیر تعداد کے چلنے سے گرد بہت اُڑ رہی تھی، پھر بھی آفتاب کی تیز روشنی میں راستہ اور گرد و پیش کا منظر صاف دکھائی دیتا تھا۔ اب بازار کا کہیں نام و نشان نہ نظر آتا تھا۔ کہیں کہیں دوکانوں کا سامان اُٹھ نہیں چکا تھا تو وہاں کچھ آثار رات کے بازار کے معلوم ہوتے تھے۔ دونوں جانب کچھ فاصلہ پر پہاڑی سلسلے تھے۔ بائیں جانب مگر ہمارے اونٹوں کے پیچھے مسجد نمرہ دکھائی دیتی تھی۔ مجھے اس مسجد میں نہ جا سکنے کا افسوس رہا۔ کوئی دو گھنٹے میں قافلہ پھر منا پہونچ گیا۔ اور اپنے مقام پر پہونچنے سے پہلے ہی ہم نے دیکھ لیا کہ راستہ ہی میں ایک جگہ مذبح ہے جہاں قربانیاں کی جاتی ہیں۔ اور دوسری جانب ایک چبوترہ پر شریف صاحب اور اُنکے ساتھیوں کے خیمے ڈیرے لگے ہوئے ہیں۔ جس احاطہ میں پہلے قیام تھا اب بھی ہمارے شقدف وہیں اُتارے گئے۔ سامان خورونوش ساتھ موجود تھا اس لیے اونٹ پر بیٹھے ہی بیٹھے ہم لوگوں نے کھانا کھا لیا تھا۔ شقدف رکھنے کے بعد پہلی فکر یہ ہوئی کہ جمرۃ العقبیٰ کے کنکریاں مار آویں۔ چنانچہ ایک ایک دو دو کر کے سب ساتھی اس غرض سے گئے۔ منا کے بازار کی سڑک کے درمیان میں دو جمرے ہیں اور مکہ معظمہ کی جانب جاتے ہوئے سرے پر داہنی سمت میں ایک جمرہ ہے جنکی صورت ایک بھدی لاٹ کی سی ہے۔ لاٹ کوئی قد آدم بلند ہوگی انکے گرد ذرا اونچی مُنڈیر کے تھالے سے بنے ہوئے ہیں جن میں کنکریاں گرتی ہیں۔ جو کنکریاں مزدلفہ میں چُنی تھیں انہی سے یہاں جمرہ کو مارا۔ مجمع بہت ہوتا ہے اس وجہ سے بازار میں چلتے وقت بھی کندھے سے کندھا چھلتا ہے اور جہاں جمرہ ہے وہاں تو ٹھٹ کے ٹھٹ لگے رہتے ہیں اور بغیر دھکم دھکا کے رمی جمار انجام نہیں پا سکتی۔ عورتوں اور ضعیفوں کیلیے یہ مرحلہ کافی دشوار ہے۔ رمی جمار سے فراغت پائی تو دھوپ کافی تیز ہو چلی تھی اسلیے تھوڑی دیر آرام کیا اور تازہ دم ہو کر قربانی کے لیے مذبحہ کی جانب روانہ ہوئے۔ چونکہ سب ساتھیوں کی طرف سے قربانی کرنے کی خدمت میرے متعلق تھی، اسلیے تقریباً چالیس راس یکلخت خرید کر ذبح کرنا پڑیں۔ ہمراہیوں میں سے دو تین آدمی میرے ساتھ تھے جنکی مدد سے جانور خریدے گئے۔ مذبح جس مقام پر ہے وہاں بڑے بڑے گڑھے اس غرض سے کھُدے ہوئے

ہیں کہ قربانی کے بعد کھالیں اور اوجھڑی وغیرہ اُن میں ڈال دیں - مگر اسکی پابندی کم کی جاتی ہے بلکہ زیادہ تر ہوتا یہ ہے کہ اُس سے ملحقہ وسیع میدان میں جہاں دور تک بکری، بھیڑ، دُنبوں اور گایوں وغیرہ کے جھنڈ کھڑے ہوتے ہیں۔ لوگ جانور خرید کرکے وہیں ذبح کردیتے ہیں اور غریب عربوں کی کثیر تعداد جو وہاں موجود رہتی ہے اور ہر قربانی کرنے والے کو گھیرے رہتی ہے۔ ذبح شدہ جانور دیدیا جاتا ہے - چنانچہ ہم نے بھی یہی کیا کہ سوائے دو دُنبوں کے جنکا گوشت ساتھ لیجانا منظور تھا باقی کُل راسوں کو ذبح کرکے وہیں تقسیم کردیا - جانوروں کی قیمت اگرچہ کسی قدر زیادہ دینا پڑی لیکن مجھے تو اُس میدان میں اُنکی اس قدر کثیر تعداد میں فراہم ہو جانے پر تعجب معلوم ہوتا تھا - میں تین چار روپیہ سے لیکر گیارہ گیارہ بارہ بارہ روپیہ تک کی مختلف مدارج کی بکریاں، بھیڑیں اور دُنبے خریدے گئے اور تقریباً تین چار گھنٹے میں قربانی کے مرحلہ سے فراغت پائی - نماز ظہر کے وقت وہیں پانی لیکر وضو کیا گیا اور نماز ادا کی گئی - جو عرب چھوکرے ذبح ہونے کے بعد راسیں مانگ لیتے تھے، اُنکے پاس عموماً چھریاں موجود تھیں اور اُنھیں چھریوں سے جانور ذبح کیے گئے - بعض وقت یہ چھوکرے کسی جانور کو پسند کرکے چاہتے تھے کہ اُنکو دیا جائے - اور ایک جانور کے کئی کئی گاہک ہوتے تھے تو دشواری پیش آتی تھی - کیونکہ وہ آپس میں بھی لڑنے لگتے تھے اور ذبح کرنے والے سے بھی اُلجھ جاتے تھے بلکہ کبھی کبھی چھین جھپٹ کرنے لگتے تھے - چنانچہ ایک بار اسی چھین جھپٹ میں ایک چھوکرے کے ہاتھ میں چھری لگ گئی اور خون نکل آیا - اب کیا تھا وہ میرے اُبھر گیا اور اصرار کرنے لگا کہ مجھے کچھ بخشش دو نہیں تو تم کو پکڑوا دوں گا - میں نے ہرچند سمجھایا مگر نہ مانا - اور بالآخر ایک مسلح عرب کو جو غالباً فوجی تھا بُلا لایا - وہ مجکو اپنے ہمراہ ایک راؤٹی میں لیگیا جو مذبح سے بالکل ہی قریب تھی اور جس میں پولیس کے کچھ لوگ بیٹھے تھے - ایک پولیس افسر نے اُسکا بیان سنکر مجھسے کہا کہ اس لڑکے کو کچھ بخشش دیدو - میں نے بھی یہ دیکھ کر کہ بہت سا وقت فضول ضائع ہو چکا ہے اور اگر اب بھی تامل کرونگا تو ممکن ہے کہ اور وقت رائیگاں جائے، اُس لڑکے کو چونی دیکر اپنی جان چھڑائی۔

جن جانوروں کو بنواکر گوشت اپنے ہمراہ لیجانا تھا اُنکی قربانی سب سے آخر میں مذبح میں کی گئی اور ایک ایک روپیہ دیکر قصاب سے گوشت بنوایا - اُس نے صرف کھال اُتار کے آلائش نکالدی اور جانور ہمارے حوالہ کردیا - گوشت کے بنانے کی وہاں کسی کو فرصت نہیں اور دو تین روپئے دیے جاتے تو شاید بنا دیتا۔

گوشت لیکر چلے تو ایک پولیس والے نے پھر روکا اور دوسری بار افسر پولیس کے یہاں

پہنچی ہوئی۔ مگر اب کی کچھ دینا نہیں پڑا۔ بلکہ یہ دریافت کر کے کہ گوشت کہاں جائے گا چھوڑ دیے گئے۔ عصر کی نماز میں نے اسی افسر کی راوٹی کے ایک جانب ادا کی اور اپنے مقام پر پہونچکر فوراً سر منڈا یا۔

مغرب سے کچھ پہلے کھانے کی فکر میں بازار گئے۔ اتفاق سے اُسی وقت شریف صاحب کی سواری مکہ معظمہ کی طرف جا رہی تھی۔ تھوڑے سے سوار آگے اور تھوڑے سے پیچھے تھے۔ بیچ میں ایک فٹن پر شریف صاحب سوار تھے، جنکے پیچھے ایک شخص خوشنما چھتر لگائے ہوئے تھا۔ دوسرے دن سنا کہ آگے بڑھ کر کسی مقام پر یہ چھتر گر گیا۔ اور لوگوں نے اسکو فال بد قرار دیکر یہ نتیجہ نکالا کہ شریف کا نیر اقبال عنقریب غروب ہونے والا ہے۔

رات کو خستگی کے باعث نیند بہت آئی۔ صبح کی نماز بھی قضا ہوئی۔ نماز ادا کر کے حاجی برہان الدین، حاجی نذیر حسین اور حاجی سلیمان صاحبان تاجران لکھنؤ کی معیت میں طواف کعبہ کے لیے روانہ ہوا۔ گدھے کرایہ پر بہت ملتے ہیں اور کرایہ بھی زیادہ نہیں۔ آمد و رفت کے لیے صرف ایک روپیہ دینا پڑا۔ مکۂ معظمہ کے حدود میں داخل ہوئے تو ایک مقام پر ستانے کے لیے ٹھہرے۔ ساتھیوں نے ناشتہ اور میں نے کھانا کھایا۔ حرم شریف میں حاضر ہو کر باطمینان تمام طواف کیا، زمزم پیا اور صفا و مروہ کے درمیان سعی کی۔

شہر میں عام طور پر سناٹا تھا۔ نہ راہگیر چلتے تھے نہ دوکانیں کھُلی ہوئی تھیں۔ کہیں کہیں کوئی دوکان کھانے یا قہوہ کی کھُلی ملتی تھی۔ طواف و سعی سے فراغت پا کر اُس گھر میں آیا جو مکہ معظمہ میں کرایہ لیا گیا تھا۔ کپڑے بدلے۔ کچھ دیر آرام کر کے چاروں آدمی منا واپس گئے۔ منا کا بازار حج کے بعد خوب رونق پر ہوتا ہے۔ کھانے پینے کی تمام اشیا کے سوا ہر قسم کی چیزیں اس بازار میں فروخت ہوتی تھیں۔ شام کو تو راستہ چلنا دشوار تھا۔ کھوے سے کھوا چھلتا تھا۔ عصر کے بعد پہلے تینوں جمروں پر رمی کی پھر مغرب تک مذبح کے میدان میں قربانی کرتا رہا۔ دُنبہ جو ایک دن قبل ذبح کیا گیا تھا اُسی کا گوشت آج کھایا گیا۔ بہت لذیذ تھا۔ دوسرے دن سویرے ہی سے روانگی کی فکر شروع ہو گئی تھی۔ کیونکہ مستورات اور ساتھی مریضوں کو طواف زیارت کرنا تھا میں نے ایک قربانی تیسرے دن کے لیے باقی رکھی تھی لہذا سویرے ہی مذبح میں جا کر ایک عمدہ دنبہ مول لیا، قربانی کی اور گوشت بنوا کر ساتھ لایا۔ چونکہ تیسرے دن بھی رمی کرنا ہوتی ہے اس لیے طے پایا کہ جو لوگ مریض ہیں وہ رمی کر کے جائے قیام پر واپس نہ آئیں بلکہ بازار کے سرے پر مل جائیں۔ اور وہیں اپنے اپنے

شغدفوں میں سوار ہوں۔ اس خیال سے جو لوگ رمی کرکے واپس آگئے تھے اُنکے ہمراہ خالی اونٹ روانہ کردیے گئے۔ اور اُنکو ہدایت کی گئی کہ بازار کے سرے پر ٹھہر جائیں۔ مریضوں کو روانہ کرکے میں بھی روانہ ہوا۔ اور رمی کرکے اور اپنے ساتھیوں کو بٹھاکر شغدف پر سوار ہو گیا۔

چونکہ اُس دن کثرت سے حجاج مکہ معظمہ واپس جارہے تھے اس لیے راستہ بہت دشوار گذار تھا۔ اور باوجودیکہ ظہر سے بہت قبل ہم روانہ ہوسکتے تھے مگر کہیں عصر کے وقت مکہ معظمہ پہونچے۔ حرم شریف کے پاس پہونچتے ہی اونٹ روک کر انور سلمہٗ کو طواف و زیارت کے لیے اُتار دیا اور میں سامان کے ہمراہ گھر آیا

تنقید

عربی طب اس مختصر رسالہ میں حکیم خواجہ شمس الدین صاحب نے عربوں کی طب پر ایک مبسوط بحث کی ہے۔ عربوں کی طب کیا تھی اُس نے کیا کیا مدارج طے کیے اور طب جدید اُس سے کیونکر پیدا ہوئی؟ علمی تاریخی نظر سے یہ چھوٹا سا رسالہ بہت ہی دلچسپ ہے۔ اسکے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ دنیا میں اس طب کے ظہور سے قبل بیماریوں کے علاج کا کیا طریقہ تھا۔ اشوری اور بابلی طب کا رواج کہاں تھا۔ یونانی طب کا کہاں دَور دورہ تھا۔ ویدک کہاں چھائی ہوئی تھی۔ جڑی بوٹیوں کا علاج کہاں کیا جاتا تھا۔ اور یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ مصر میں ولادت مسیح سے قبل طب کے قدم جم چکے تھے اور علم جراحی بھی کافی ترقی کرچکا تھا۔ غرضکہ اس قسم کے ارتقائی مدارج کا ذکر بہت شرح و بسط سے کیا گیا ہے جس میں کافی تحقیق و تدقیق سے کام لیا گیا ہے۔ لیکن ہم کو حکیم صاحب سے ایک شکایت بھی ہے کہ اُنھوں نے انگریزی الفاظ بہت صفائی سے استعمال کیے ہیں کہ اگر وہ نہ ہوتے تو بہت بہتر ہوتا۔ بہرحال رسالہ اُس "لغزش" کے باوجود بھی دلچسپ ہے۔ طباعت و کتابت بھی دیدہ زیب۔ قیمت ۶/ مصنف سے نامی پریس لکھنؤ سے مل سکتی ہے۔

طب کی تعلیمی زبان اس رسالہ کے مولف جناب مولانا حکیم عبدالحلیم صاحب پروفیسر تکمیل الطب لکھنؤ ہیں۔ اس مختصر رسالہ میں مولانا نے یہ ثابت کیا ہے کہ طب کی تعلیم عربی زبان میں ہونا چاہیے۔ مولانا نے رسالہ کو بہت دلچسپ پیرایہ میں پیش کرنے کی کوشش کی ہے

گو ہم اس رائے سے متفق نہیں ہیں کہ محض عربی زبان میں طب کی تعلیم ہونا چاہیے۔ یہ ایک مختلف فیہ مسئلہ ہے۔ اس بحث پر کبھی مستقل طور سے اپنی رائے کا اظہار کریں گے۔ بہر حال رسالہ بحیثیت مجموعی بہت ہی دلچسپ ہے۔ مصنف سے جھوائی ٹولہ کے پتہ پر بقیمت ۲؍ مل سکتی ہے۔ (م۔ ا۔ ع)

تاریخ دریاباد مؤلفہ منشی برج بھوکھن لال محب۔ قیمت فی جلد ۲؍ غالباً مؤلف سے مل سکتی ہے۔

محب صاحب فرماتے ہیں "عرصہ سے میرا ارادہ تھا کہ کچھ اپنے وطن مالوف کی خدمت کروں چنانچہ ۱۱ سال کی مسلسل اور جان توڑ کوششوں کے بعد" دریاباد کی تاریخ مرتب کی ہے۔ محب صاحب کی حب وطن اگرچہ قابل داد ہے تاہم وطن کے معنی کو اس قدر محدود کر دینا کچھ زیادہ مفید نہیں۔ اگر مؤلف صاحب ۱۱ سال ہندوستان کی خدمت میں صرف کرتے تو آج مورخین کی صف اول میں ہوتے۔ دریاباد کی تاریخ ہونے کی حیثیت سے بھی کتاب کچھ زیادہ قابل قدر نہیں ہے۔ بجائے اسکے کہ دریاباد پر ملک کے اہم سیاسی واقعات اور حادثات کے آثار اور اُن کے اسباب پر غور کرتے مولف نے دریاباد کے بہت سے خاندانوں کے خاص خاص افراد کی ایک فرہنگ بنادی ہے۔ اسے بجائے تاریخ کے کتاب رجال کہنا زیادہ مناسب ہے اور اس حیثیت سے یہ کتاب کچھ اہمیت رکھتی ہے۔

صبح وطن مصنف پنڈت برج نرائن چکبست، پتہ: انڈین پریس الہ آباد۔ صفحات ۱۸۷۔ چکبست مرحوم کا مجموعۂ کلام اس سے پیشتر بھی شایع ہو چکا ہے۔ مگر اس ایڈیشن میں مزید نظموں کا اضافہ کر دیا گیا ہے۔ یہ مجموعہ پنڈت جی کی حیات ہی میں مرتب ہو چکا تھا، اس لیے مصنف کے حالات بہت مختصر رہ گئے ہیں۔ شروع میں ڈاکٹر سر تیج بہادر سپرو کے قلم سے ایک دلچسپ مقدمہ ہے۔ "نذرانۂ روح" کے عنوان سے مصنف نے "سودائے طبیعت" کو اپنے شفیق اُستاد پنڈت بشن نرائن در کی روح سے معنون کیا ہے۔

جو شعرا اُردو شاعری کو ارتقاء قوم اور تہذیب اخلاق کا آلہ بنانا چاہتے ہیں اُن میں چکبست سب سے آگے ہیں۔ حب وطن، تاریخی کارنامے، فطرت کے مناظر، یہی اُنکی شاعری کے محرک اور موضوع ہیں۔ مسلسل نظموں کے علاوہ غزلوں پر بھی یہی رنگ چڑھا ہوا ہے۔ اسکے ساتھ ہی انکی نظمیں ہندی تلمیحات سے بھی پر ہیں۔ ہند و مسلم تمدنی اتحاد کا نقشہ کھینچ دیا ہے۔ ایک بند ملاحظہ ہو۔

گوتم نے آبرو دی اس معبد کہن کو　　سرمد نے اس زمیں پر صدقے کیا وطن کو

اکبر نے جام الفت بخشا اس انجمن کو سینچا لہو سے اپنے رانا نے اس چمن کو
سب سُور بیر اپنے اس خاک میں نہاں ہیں
ٹوٹے ہوئے کھنڈر ہیں یا اُنکی ہڈیاں ہیں

چکبست سچے شاعر تھے۔ نام و نمود کی اُنکیں ہوس نہ تھی۔ یہاں تک کہ غزلوں میں تخلص بھی نہ رکھا۔ وہ مرگئے، مگر اُنکا کلام غیر فانی ہے۔ انکی زندگی کا سب سے اہم کارنامہ "رامائن کا ایک سین" ہے جسے پڑھ کر بے اختیار منہ سے نکل جاتا ہے "اگر چکبست نے صرف رامائن کا ترجمہ کر دیا ہوتا تو یقیناً انکو تلسی داس اور ہومر کی صف میں جگہ دیجاتی۔

طباعت و کتابت اچھی ہے، مگر بعض جگہ املا کی غلطیاں رہ گئی ہیں۔ انڈین پریس سے اس قسم کی غلطیاں ناقابل معافی ہیں۔

شاہان مالوہ مؤلف مولوی امیر احمد علوی۔ پتہ انوار المطابع لکھنؤ۔ صفحات ۱۵۹ قیمت عـہ

ہندوستان میں ہند و مسلم تہذیب کی بنانے والی دہلی اور آگرہ کی مغل اور پٹھان سلطنتیں نہ تھیں بلکہ وہ چھوٹی چھوٹی خود مختار ریاستیں تھیں جو ہر کمزور بادشاہ کے زمانہ میں پیدا ہو جاتی تھیں۔ اور سو دو سو برس کی زندگی کے بعد پھر سلطنت دہلی میں ضم ہو جاتی تھیں اسلامی تمدن انھیں کے ہاتھوں ہندوستان کے گوشہ گوشہ میں پہونچا۔ اس حیثیت سے یہ ریاتیں اتنی اہم ہیں کہ تاریخ کا طالب علم کبھی ان سے بے نیاز نہیں ہو سکتا۔ امیر احمد صاحب نے شاہانِ مالوہ کے حالات لکھ کر قوم پر بڑا احسان کیا ہے۔ اُنکے طرز تحریر کا کیا کہنا۔ قابل رشک ہے۔ اور کتاب شروع سے آخر تک دلچسپی کے ساتھ پڑھنے کے لائق ہے۔ البتہ بعض امور نظر انداز ہوگئے ہیں دیباچہ میں ضمنی طور پر چند سطروں میں مالوہ کی جغرافی حالت ختم کر دی ہے حالانکہ اس پر ایک پوری فصل کی ضرورت تھی، تاکہ پڑھنے والے فتح و شکست کے اسباب اور علوم و فنون کی ترقی کے وجوہ کو اچھی طرح سمجھ سکتے۔ دوسری بہت بڑی خامی یہ ہے کہ مسلمانوں کی آمد سے پیشتر مالوہ کی تاریخ سے نامناسب لاپروائی برتی گئی ہے۔ بغیر اُسکے شاہان مالوہ کی حکومت کی قدر کرنا مشکل ہے۔ اسکے علاوہ اس کتاب میں مالوہ کی تہذیب و تمدن کا کوئی نقشہ نہیں پیش کیا گیا۔ حالانکہ مالوہ علوم و فنون کا مخزن تھا، بالخصوص فن تعمیر اور موسیقی کے لیے تو خاص اہمیت رکھتا تھا۔ ان مباحث پر مفصل بحث کی ضرورت تھی۔ ایک اور کمی یہ رہ گئی کہ باز بہادر اور روپ متی کی داستان بغیر تاریخی تنقید کے شاملِ کتاب کر لی گئی ہے۔ ان مباحث پر مواد بہت مشکل سے ملتا ہے لیکن اس دشواری کو

قصد تالیف سے پیشتر سوچ لینا چاہیے تھا امید ہے کہ مولوی بشیر احمد صاحب اسکے بعد کسی دوسری خودمختار اسلامی ریاست کی طرف متوجہ ہوں گے۔

انقلاب فرانس مترجمہ مولانا عبد الرزاق ندوی - پتہ: صدیق بکڈپو، لکھنؤ - صفحات ۱۹۲ قیمت ۱۲؍

مولانا عبد الرزاق ندوی انقلابی خیالات کے آدمی ہیں، اسلیے ہر وہ چیز جو پبلک کو انقلاب کی طرف مائل کرے، ملک کے سامنے پیش کرنا چاہتے ہیں۔ یہی خیال اس کتاب کے ترجمہ کا بھی محرک ہوا ہوگا۔ افسانہ کی حیثیت سے اسکا پایہ کچھ بلند نہیں ہے۔ "ایڈیٹر پیام و الجامعہ" کو انقلابی خیالات کی اشاعت کے لیے اس سے بہتر افسانے مل سکتے تھے۔ کہیں سے یہ پتہ نہیں چلتا کہ یہ ترجمہ کس زبان سے کیا گیا ہے، غالبًا عربی ترجمہ کو اُردو کا لباس پہنایا گیا ہے۔ بہرحال زبان میں "ترجمہ پن" نہیں پایا جاتا۔ اس کتاب کے مطالعہ کا اتنا فائدہ ضرور ہوگا کہ اُردو داں طبقہ میں اس عظیم الشان انقلاب کے حالات پڑھنے کا شوق پیدا ہو جائے گا۔ اور یہی مقصود ہے۔ لکھائی چھپائی بہت معمولی ہے۔ سرورق کو کتاب کے اشتہار سے مزین کرنے کا طریقہ ذوقِ لطیف پر گراں گذرتا ہے اگر حضرات ناشرین اس سے باز آتے تو اچھا ہوتا۔

بُدھ اور اس کا مت مترجم پنڈت شیو نرائن شمیم لاہوری - صفحات ۲۲۴ - قیمت صرف مطالعہ - مؤلف سے مل سکتی ہے۔

بُدھ مبلغ دھرم پال جی کے ارشاد کے مطابق شمیم صاحب نے یہ کتاب ایک امریکی بودھ مسٹر اسٹراس کی تصنیف "بدھ اور اُس کا مت" سے ترجمہ کیا تھا۔ یہ اُسی کتاب کا دوسرا اڈیشن ہے۔ اس کتاب میں مہاتما بدھ کی زندگی، اُن کا مذہب، اُنکے اخلاق اور سنگھا (آرڈر) کے متعلق مختصر بحث کی گئی ہے۔ اخیر میں بدھ دھرم کی حمایت کے عنوان سے چند اعتراضوں کا جواب دیا ہے۔ زبان سلیس و بامحاورہ ہے مگر انگریزی الفاظ کہیں کہیں بلا ضرورت بھی استعمال ہوے ہیں۔

جا بجا مصنف نے اس بات کا دعوٰے کیا ہے کہ بُدھ مت انتہائی رواداری کے ساتھ بغیر ایک قطرہ خون بہائے شائع ہوا۔ اسکولی کتابوں میں بھی یہی پڑھایا جاتا ہے مگر حال میں محکمۂ آثار قدیمہ نے سندھ میں کچھ ہندو دیوتاؤں کے مجسمے دریافت کیے ہیں جو بالکل لڑتے ہوئے ہیں۔ محققین کا خیال ہے کہ یہ تغیر مسلمانوں کی آمد سے بہت پیشتر کے ہیں غالبًا یہ جوش یہ بودھ مبلغین

کے ہاتھوں نے یہ بت شکنی کی ہوگی اس لیے کہ اُس زمانہ میں بودھ بھی بتوں کی پوجا نہیں کرتے تھے۔

ایک جگہ مسٹر اسٹراس فرماتے ہیں " قدیم بدھ مت بوجہ برہمنوں کی مخالفت اور محمودیوں کے تشدد کے مفقود ہوگیا "

یہ سچ ہے کہ کسی زمانے میں ایران بلکہ عراق میں بھی بدھ مذہب پھیلا ہوا تھا، مگر جس وقت اسلام کا آفتاب عرب میں طلوع ہوا ہے زرتشتیوں اور برہمنوں نے اسکو قریب قریب مٹا دیا تھا، مگر عرب اور ایران کے لوگوں نے ہندو مذہب اور بدھ مت کی مشابہت کی بنا پر ہندوؤں کو اکثر بودھ اور اُنکے دیوتاؤں کو بُدھ (بُت) کے نام سے یاد کیا۔ اسی بنا پر یورپین مورخین کو یہ غلط فہمی پیدا ہوئی۔ اور باوجود شافی تردید کے اب بھی اسکی صحت نہیں ہوئی۔

اصل کتاب سے زیادہ دلچسپ وہ ضمیمہ ہے جس میں تمیم صاحب نے بدھ مذہب کے متعلق بہت سے قیمتی معلومات اکٹھا کردیے ہیں۔ مذہبی حیثیت کے علاوہ تاریخی نقطۂ نظر سے بھی یہ معلومات بہت اہم ہیں۔ بُدھ کی پیدائش کا زمانہ (اُس زمانہ کا) ہندو فلسفہ، کاسیا، نالندا، بودھی غار، اور وجوہاتِ زوال خاص دلچسپی رکھتے ہیں۔

سیرت حضرت جعفر طیار مؤلف مولوی ابو محمد امام الدین صاحب رام نگری۔ صفحات ۴۴۔ مؤلف سے ۲/ میں مل سکتی ہے۔

مسلمانوں کا مذہبی لٹریچر بیشتر عربی اور فارسی میں ہے، اسوجہ سے مسلمانوں کی ایک کثیر تعداد اُس سے استفادہ نہیں کرسکتی۔ مذہب سے ہماری بیگانگی کا ایک اہم سبب یہ بھی ہے۔ لہذا ہر وہ کوشش جو حدیث، فقہ، تاریخ، رجال کی مستند کتابوں کو اُردو لباس پہنانے کی کیجائے مستحسن ہے۔ زیر نظر کتاب اسی قسم کی ایک کوشش ہے مولوی امام الدین صاحب رام نگری نائب مدیر رسالہ فلاح دارین (بنارس) نے پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وسلم کے ابن عم حضرت جعفر طیار کی سیرت لکھکر قوم کی خدمت انجام دی ہے۔ زبان پاکیزہ، طرز بیان دلچسپ اور ترتیب واقعات صحیح ہے۔ شروع میں خواجہ حسن نظامی صاحب کا ایک مختصر دیباچہ یا عبارت اور اسکے بعد مولف کا دیباچہ ایک ورق میں ہے۔ آخر میں سید شاہ محمد غلام محی الدین قمی کی تقریظ ہے۔ افسوس ہے کہ کتاب اسلام کے سوانح معمولی طباعت اور معمولی کاغذ پر شایع ہوں۔ یہ مسلمانوں کی بد مذاقی کی دلیل ہے۔

(سید)

پچھلے مہینے کے رسالے

دلگداز اگست کے دلگداز میں مولانا عبدالحلیم شررؔ نے "سلطان عالم، واجد علی شاہ" کے متعلق ایک مختصر مگر مفید مضمون لکھا ہے۔ اُن کا بیان چشم دید ہے، اسلیئے تاریخی اہمیت رکھتا ہے۔ ہم جانتے ہیں کہ لکھنؤ میں ابھی ایسے بزرگ ہیں جن سے سلطان عالم کے متعلق بہت سا صحیح تاریخی مواد اکٹھا ہو سکتا ہے اور اُن بیشمار اغلاط کی صحت ہو سکتی ہے جو تاریخ میں رائج ہیں۔ شرر صاحب فرماتے ہیں :-

"خود میرے والد بزرگوار کا واقعہ ہے کہ وہ ذوالفقار الدولہ بہادر کی پیشی میں خوشنویس تھے۔ بادشاہ کو خبر لگی کہ اسد باغ میں مالیوں کے جتنے اسم ہیں، اُن میں سے تھوڑوں ہی پر مالی مقرر ہیں۔ باقی فرضی نام کی تنخواہ فرضی آدمی دکھا کے لیجاتی ہے۔ نہایت برہمی کے ساتھ پیدل برآمد ہوئے اور والد کو حکم دیا کہ قلمدان لاؤ۔ اور ساتھ ہی باغ مذکور کے تمام مالیوں کو حاضری کا حکم ہوا۔ جب سب جمع ہوگئے تو ایک کرسی پر بیٹھ گئے اور والد سے فرمایا "دیکھو خدا کو حاضر و ناظر جان کر سچ سچ پڑھنا۔ بر آورد سے اسد باغ کے مالیوں کی فہرست نکالو اور ایک ایک کا نام پکارو۔" اور مالیوں کو حکم ہوا کہ جسکا نام پکارا جائے سامنے آکے دوسری طرف چلا جائے۔ اُن دنوں کسی کتاب یا رجسٹر کی صورت میں نہ ہوتی بلکہ کتوب کی طرح بیسیوں بند نیچے اوپر جڑے ہوتے۔ وہ اسد باغ کی بر آورد نکال رہے تھے کہ ہوا کا تیز جھونکا آیا، اور اُسکے بند ہاتھ سے چھوٹ کر اڑنے لگے۔ وہ اُنکے روکنے کے لیے بیٹھ گئے اور بر آورد کو سمیٹ کر مرتب کر لیا۔ جب وہ مرتب ہوگئی تو بادشاہ نے اُنکو دیکھ کر فرمایا "سنو۔ بادشاہوں کے سامنے بیٹھتے نہیں ہیں۔" وہ کھڑے ہو کر ادب آموزی کا آداب بجا لائے، اور جائزہ ہونے لگا۔

کثرتِ ممتوعات کے متعلق فرماتے ہیں :-

"بیشک ممتوعات کی کثرت تھی، اور بادشاہ پر جو فرد قرارداد جرم لگائی گئی ہے اُس میں سب سے زیادہ سنگین جرم یہی تصور کیا جاتا ہے۔ اس پر کوئی شرعی جرم تو آ ہی نہیں سکتا، اسلیے کہ بادشاہ مذہب شیعہ اثنا عشری کے پیرو تھے، لہذا اُنکے اعتقاد میں متعہ بغیر کسی حد اور قید کے شرعاً جائز ہے ..... اب رہا یہ کہ اخلاقی اور تمدنی حیثیت سے بادشاہ کو اتنی عورتوں سے متعہ کرنے کی کیا ضرورت تھی؟ اسکی حالت یہ ہے کہ وہ نہایت ہی محتاط اور پرہیزگار تھے اور مٹیا برج کی زندگی میں اُنھیں ایک گھڑی کے لیے بھی گوارا نہ تھا کہ کسی عورت پر اُنکی نظر پڑے۔ مگر شاہی محل تھا جس میں بیشمار خدمتوں، محلداروں، مغلانیوں، اور مکانداریوں، یہاں تک کہ بہشتنوں اور خاکروبوں کے ایک گروہ کثیر کے موجود رہنے کی ضرورت تھی۔ ممتوعات میں چند ہی تھیں جو ساتھ خلوت گاہ میں داخل کیے جانے کی غرض سے متعہ کیا گیا ہو۔ سب کی سب خدمتگارنیاں تھیں۔ لیکن چونکہ متعہ ہو چکا تھا لہذا جائز تھا کہ اُن میں سے کوئی پسند آئے تو خلوت میں بلا لی جائے۔

طریقہ یہ تھا کہ عام ممتوعات کو بیگم کے لقب کے ساتھ اچھے دلکش خطاب عطا ہو جاتے اور وہ خادماؤں کے شمار میں ہو جاتا۔ اگر ان میں سے کوئی حاملہ ہو جاتی تو وہ بیگمات کے زمرے سے ترقی کر کے محلات عالیات میں شامل

ہو جاتی۔ بیگم ہونے تک انکی تنخواہیں بہت تھوڑی اور خدمتگارنیوں کی سی ہوتیں جو کپڑوں کے علاوہ ماہانہ چند روپے سے دس بیس روپے تک پاتیں۔ محلات کے زمرہ میں شامل ہوتے ہی انکی تنخواہ سو دو سو روپیہ ہو جاتی، رہنے کو جداگانہ محلسرا ملتی اور انکی ڈیوڑھیوں پر خدام اور پہرہ کے سپاہی مقرر ہو جاتے۔

زمانہ میں حکیم شمس الدین احمد لکھنوی "صنعت و رعایت" کے متعلق تحریر فرماتے ہیں:—

شہ "شعرائے لکھنؤ کی روش خاص یہ رہی کہ لطفِ زبان و محاورہ کے ساتھ مضمون میں شوخی، رنگینی اور دلفریبی ہو۔ خیالات میں ایسی دقت و پیچیدگی نہ ہو جو باردماغ ہو جائے اور سلاست زبان کو برباد کر دے، اشعار میں موقع موقع سے روزمرہ صرف کیا جائے، استعارات اور تشبیہیں بکثرت مگر قریب المآخذ ہوں، کلام تعقید سے محفوظ رہے، الفاظ معانی اور مطالب میں تناسب اور رعایت کا ہر قدم پر لحاظ رہے، صحتِ زبان و محاورہ کا خیال کہیں پر چھوٹنے نہ پائے ..... مولی نے اس صنعت کو اختیار کرنے کی ایک حد قرار دی ہے اور وہ اُس سے آگے تجاوز نہیں کرتے اور حقیقت یہ ہے کہ تناسب اور رعایت کی خوبی یہ ہے کہ اس میں تکلف اور آورد نہ ہو۔ اور بلا ضرورت اور بے موقع کھینچ تان کر ایک لفظ کے لیے اسکے تمام مناسب الفاظ لاکر اکٹھا نہ کر دیے جائیں"

چل کر یوں فیصلہ کرتے ہیں:—

شاعری کے دو جزو ہیں تخیل اور زبان۔ بلحاظ اول اہل دہلی کو فضیلت حاصل ہے اور بلحاظ ثانی اہل لکھنؤ کو تفوق ہے۔ صنعت، رعایت اور تناسب بلا شبہ ہر زبان کے لیے نہایت عمدہ اور ضروری چیز ہے۔ اس سے کلام پر لطف اور بامزہ ہو جاتا ہے۔ اس سے گریز کرنا کلام کو روکھا پھیکا اور بے مزہ بنا دے گا۔ اور اس ہی حد اعتدال سے تجاوز کر جانا اسکو مہمل کر دیگا۔ یہ کہنا کہ لکھنؤ والوں کے یہاں الفاظ ہی الفاظ ہیں، تخیل اور مضمون خاک نہیں، اسی طرح غلط ہے جس طرح یہ کہا جائے کہ اہل دہلی کو زبان اور محاورہ کا شعور نہیں۔ دونوں کا اپنا اپنا طرز ہے۔ ایک دوسرے کو الزام نہیں دے سکتا۔ ہماری زبان اور ہماری شاعری دونوں کی ممنون احسان ہیں اور ہمیشہ رہیں گی"

ث کے اگست نمبر میں مولوی ضیاء احمد صاحب ایم اے کا ایک مضمون "ارتقاء ادب فارسی عہد اکبر میں" شایع ہوا ہے۔ اس اہم مبحث کے لیے یہ مضمون بہت مختصر اور تشنہ ہے۔ ونسنٹ اسمتھ نے اس ن فارسی ادبیات کو پانچ عنوانوں میں تقسیم کیا ہے (تراجم، تواریخ، خطوط، کلام نظم، کتب مذہبی اور فنی تصانیف) ر عنوان ایک طویل بحث چاہتا ہے۔ ہمیں امید ہے کہ لایق مضمون نگار معارف کے آیندہ نمبروں میں اسکی تلافی فرمائیے۔ ذیل کا اقتباس دلچسپی سے پڑھا جائے گا:—

غور کرو اکبر کا دربار کیا تھا ایک اچھی خاصی اکاڈیمی تھا! جس میں ہر فن کے ماہر سب طرف سے سمٹ کر جمع ہو گئے تھے۔ جب تک فن تاریخ دنیا میں موجود ہے، کوئی مورخ اسلامی ہند کے ان نامور بلکاؤں کو نظر انداز نہیں کر سکتا۔ کیا یہ ممکن ہے کہ زمانہ کی گردش سے شیخ مبارک ناگوری جیسے متبحر عالم یا اسکے نامور فرزندوں فیضی اور ابوالفضل کے کارنامے، شیخ عبدالحق محدث دہلوی رئیس اہل سنت کی تصانیف، شیخ یعقوب کشمیری جیسے امام تفسیر و حدیث و تلمیذ شیخ ابن حجر مکی کی تحریرات یا مشہور فلسفی میر فتح اللہ شیرازی اور زبردست متکلم قاضی نظام الدین بدخشی اور شیعہ مجتہد قاضی نور اللہ شوستری صاحب مجالس المومنین وغیرہم کی تصنیفات

صفحۂ تاریخ سے محو ہو جائیں یا مخدوم الملک ملا عبد اللہ سلطانپوری صدر الصدور شیخ عبد النبی سید محمد میر عدل اور ملا عبد القادر بدایونی جیسے اساطینِ فضل و کمال کی یاد دلوں سے مٹ جائے۔ انھیں بھی جانے دو کیا یہ قرینِ قیاس ہے کہ زمانہ فیضی، غزالی، عرفی، نظیری، ثنائی، شیری، میلی کی ترانہ ریزیاں اور خوشنوائیاں جنھوں نے دہلی اور آگرہ کے گلزاروں کو گلستانِ شیراز و اصفہان کا جواب بنا دیا تھا، یکسر بھول جائے گا؟

تلک آثارنا تدل علینا　فانظروا بعدنا الی الآثار

نگار　سید محی الدین صاحب قادری زور بی اے نے نگار میں "غالب کی ذہنیت" پر ایک سلسلۂ مضامین شروع کیا ہے۔ زور صاحب کو ادبی تنقید کا صحیح مذاق اور تنقید کو دلچسپ بنانے کا اچھا ملکہ ہے۔ زیر بحث مضمون سے خاص دلچسپی رکھتے ہیں۔ ایک جگہ مشرق اور مغرب کے فنِ تنقید میں یوں تفریق فرماتے ہیں:

"یورپ میں جب کسی شاعر کے کلام پر تنقید کی جاتی ہے تو اُسکا ایک بڑا جزو یہ سوال بھی ہوتا ہے کہ زیرِ بحث شاعر کی ذہنیت اور پیامات کس دبستان سے تعلق رکھتے ہیں؟ کیا وہ ورڈسورتھ کی طرح کائنات اور انسان کی فطرت پر گہری نظر ڈالتا ہے، یا ٹنی سن کی طرح اپنے ہی زمانے کے معتقدات اور اپنے ہی ملک و قوم کے توہمات کی ترجمانی کرتا ہے۔ یا براؤننگ کی طرح فلسفۂ حیات کے بنیادی اصولوں اور رجائیت کے عالمگیر پہلوؤں کا گہرا مطالعہ کرتا ہے۔ یا میتھو آرنلڈ کی طرح اپنے ماحول کی بدعنوانیوں سے بیزار ہو کر صدائے احتجاج بلند کرنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ اسکے برعکس جب اُردو کے کسی شاعر پر تنقیدی نظر ڈالی جاتی ہے تو اکثر یہی دیکھا جاتا ہے کہ آیا وہ ناسخ کے اسلوبِ بیان کی تقلید کرتا ہے یا آتش کے طرزِ ادا کی پیروی ...... غرض اُردو کی تمام شاعری صرف اسلوب ہی پر منحصر رہتی ہے۔"

ہمایوں　بشیر احمد صاحب نے ہمایوں میں "اسلام کا اثر مغربی تہذیب پر" کے عنوان سے ایک دلچسپ و پر از معلومات مقالہ سپردِ قلم فرمایا ہے۔ ایک جگہ اسپین کی اسلامی حکومت کا نقشہ یوں کھینچتے ہیں۔ انصاف کیجیے جدید نظریۂ حکومت کس حد تک مسلمانوں کا مرہونِ منت ہے:

"عربوں کا ہسپانیہ میں داخل ہونا اور ایک باقاعدہ حکومت کا قائم کر لینا بذاتِ خود ایک انقلابِ عظیم تھا شخصی حکومت کا خاتمہ ہو گیا اور ہر شخص کو جیسا آزادی کے حقوق دیے گئے۔ تمام عہدے ہر کہ ومہ کے لیے خواہ وہ کسی مذہب کا کیوں نہ ہو ممکن الحصول ہو گئے۔ غلاموں کو آزادی اور یہودیوں کو برابری کا رتبہ ملا۔ ڈوزی کہتا ہے کہ "ملک میں ایک عجیب و غریب انقلاب آ گیا۔ یہاں تک کہ شروع میں تو پادری بھی مطمئن تھے۔ وضعِ قوانین کے لیے ایک دیوان یا قانونی مجلس قائم کی گئی اور قانون، مسلمان، عیسائی، یہودی، دہریے، سب کو ایک نظر سے دیکھنے لگا۔

اموی خلفا کے زمانہ میں اور اُنکے بعد بھی ہسپانیہ کی حکومت متعدد شعبوں میں تقسیم کی گئی۔ اور اس میں کچھ شک نہیں کہ یورپین قوموں نے تقسیمِ حکومت کے بعض اصول اُن سے اخذ کیے۔ بلکہ سید امیر علی کا خیال ہے کہ یہ تقسیم بعض حیثیتوں میں آج کل کی حکومت کی ترتیب سے بڑھ چڑھ کر تھی۔

مرکزی حکومت صوبوں اور شہروں کی حکومت کے جزئیات میں دخل نہ دیتی تھی اور محض خراج کے مناسب طور پر جمع کر لینے پر اکتفا کرتی تھی۔ شہر بلکہ چھوٹے چھوٹے قصبے آپ اپنی حکومت کے مالک ہوتے اور ہر ایک

[illegible] وں میں تو مجالس شورا بھی ہوتی تھیں۔ فوج میں کام کرنا عربوں اور بربریوں کے لیے ضروری تھا اور خوف و خطرہ کے اوقات میں جبریہ بھرتی سے بھی کام لیا جاتا تھا۔"

[illegible] رسالہ میں کسی "کلدار" صاحب نے "سلیمیات" کے عنوان سے مولانا سلیم کی مجوزہ اصلاح رسم الخط کی روشنی میں پچیس سال بعد کی اردو کا نمونہ پیش کیا ہے:

"ایک حساب داں جج کی منہانط عجیب و غریب تھی۔ ایک مرتبہ اسکے پاس مقدمہ گیا۔ حال دریافت کیا گیا کہ دو شخص بیٹھے ہوئے تھے۔ ایک کے پاس تین روٹیاں تھیں، دوسرے کے پاس پانچ، اتنے میں ایک تیسرا جو مسافر معلوم ہوتا تھا آموجود ہوا۔ دونوں نے دعوت دی اور تینوں نے مل کر ناشتہ فرمایا۔ مسافر چلتے وقت آٹھ درہم دے گیا۔ جسکے متعلق جھگڑا شروع ہوا۔ پہلے نے تجویز کی کہ درہم آدھے آدھے بانٹ لیے جائیں۔ لیکن دوسرے نے کہا کہ روٹیوں کا لحاظ کرتے ہوئے پہلے کو تین درہم ملیں اور دوسرے کو پانچ۔"

جامعہ — ڈاکٹر ذاکر حسین خاں جامعہ میں "ہندوستان کی معیشت زرعی" کے عنوان سے ایک سلسلہ مضامین شائع فرما رہے ہیں۔ اگست نمبر میں "عطاء دیوانی" کے بعد کی حالت پر روشنی ڈالی ہے۔ ہر محب وطن ہندوستانی کے لیے ایسے مضامین کا مطالعہ ازبس ضروری ہے۔ ذیل کا اقتباس پڑھ کر اندازہ ہوگا:-

"کمپنی کو حقوق دیوانی کیا ملے سونے کی کان ہاتھ آگئی۔ اور ان تاجروں نے اس سے پورا پورا فائدہ اٹھایا۔ ہندوستان سے جو مال خرید کر باہر بھیجا جاتا تھا اس کی قیمت کوئی ساڑھے تین لاکھ پونڈ ہوتی تھی، حکم ہوا کہ دس لاکھ پونڈ کا مال خریدا جائے۔ شرکت نے طے کیا کہ سارا مال دیوانی کی آمدنی سے خریدا جائے۔ بنگال کی مجلس منتخبہ دسمبر ۱۷۶۶ء کے ایک خط میں لکھتی ہے کہ "جہاں دوسری قومیں اپنا اسباب تجارت فراہم کرنے کے لیے بڑی بڑی شرح سود پر قرض لے رہی ہیں وہاں ہم اپنے وطن کو ایک عظیم الشان مالگزاری کی حیثیت اجناس کی شکل میں بھیجتے ہیں جو قوم کے لیے اور کمپنی کے لیے خالص منافع کہا جا سکتا ہے" لکھنے والے اگر منصف مزاج ہوتے تو اتنا اور لکھتے کہ "اور ایک بدنصیب قوم کے لیے خالص نقصان"۔"

ایک دوسری جگہ تحریر فرماتے ہیں:-

"کمپنی کے تجارتی اغراض کے لیے تو روپیہ کی ضرورت تھی ہی اور اسکے لیے مالگزاری کا مطالبہ بڑھانا لازمی تھا۔ مزید براں کمپنی کے عہدہ داروں کے ذاتی اغراض بھی اس اضافہ کی حمایت میں تھے۔ کیونکہ وصولیابی کے مصارف نکال دینے کے بعد جو خالص مالگزاری بچتی تھی اُس میں سے ۲ ½ فیصدی کے حساب سے ملازمین کمپنی کو حصہ ملتا تھا۔ بڑے کے متعلق یہاں تک پتہ چلتا ہے کہ اُس میں سے ۱۲ فی صدی گورنر کو دیے جاتے تھے۔ نائب صدر کونسل کو ۲ ½ فی صدی بقیہ ارکان مجلس منتخبہ کو ۳ ½ فی صدی بقیہ ارکان کونسل کو ۱ ½ فی صدی، ریذیڈنٹ منیم دربار کو ۲ ½ فی صدی وغیرہ۔ آقا اور ملازمین کے اغراض جب اس طرح مشترک تھے تو پھر بھلا حصول مقصد میں کیوں نہ کامیابی ہوتی۔"

ار تع — مولوی صبغۃ اللہ صاحب شہید فرنگی محلی نے "اکبر کی شاعری" پر ایک طویل مضمون لکھا ہے جو مسلم اکاڈمی [illegible] ترقی نے اُسے تمام و کمال شائع کیا ہے۔ اسلوب بیان کو مد نظر رکھتے ہوئے اکبر کے پیام کی

تلاش اور اس کی تحلیل نفسی نے اس مضمون کو اور بھی قابل قدر بنا دیا ہے۔ "جناب شیخ" کے عنوان سے تحریر فرماتے ہیں:

"ایشیا کے دیگر شاعروں کی طرح ہمارے حضرت اکبر بھی شیخ سے سخت ناخوش ہیں۔ لیکن اسلیے نہیں کہ وہ شعرا کی مذمت کرتا ہے، ساغر و مینا کا دشمن اور شاہد پرستی کا مخالف ہے، بلکہ اس لیے کہ وہ انبیا کی اس وراثت سے محروم ہے جو اسکو اسکے علم نے دلائی ہے اور اس لیے کہ اپنی مسند ہدایت پر بیٹھ کر ارشاد و تبلیغ کرنے کے بدلے جدید اثرات سے متاثر ہوتا جاتا ہے۔ فرماتے ہیں:

نہیں اب شیخ صاحب کی وہ عادت — وضو کی اور مناجات سحر کی
مگر ہاں چائے پی کر حسب دستور — تلاوت کرتے ہیں وہ پائنیر کی

ایک جگہ شیخ کی بے ضرورت گوشہ نشینی اور زغمۂ کفر سے غفلت برتنے کی طرف یوں اشارہ کرتے ہیں

شیخ تثلیث کی تردید تو کرتے نہیں کچھ — گھر میں بیٹھے ہوئے والتین پڑھا کرتے ہیں

عام ظاہری حالت کا یہ خاکہ ہے

شیخ کی وہ وضع نہیں وہ شیخ کی داڑھی نہیں — دوستی مذہب سے ہے پاس قدر داڑھی نہیں

اخلاقی پستی اور دنائت کا یہ عالم ہے

خلاف شرع کبھی شیخ تھوکتا بھی نہیں — مگر اندھیرے اجالے میں چوکتا بھی نہیں

شیخ کی زن پرستی کی طرف یوں اشارہ ہے

شیخ صاحب کو نہیں شاعر رنگیں سے کام — حسن کی قید نہیں بس ہے مسمات سے کام

دوسرے شعر میں شیخ کی زن مریدی کے ساتھ اس امر کی طرف بھی لطیف اشارہ فرماتے ہیں کہ انگریزی تعلیم یافتہ جماعت اور علماء کے درمیان جو خلیج منافرت حائل ہو گئی ہے اُسکو بہت جلد پٹ جانا چاہیے، اور یہ جماعت جو سب سے زیادہ علمائے امت کی توجہ کی محتاج ہے اُنکی طرف علماء کا جلد متوجہ نہ ہونا ملک و قوم کی بڑی بدبختی ہے۔

شیخ جی گھر سے نہ نکلے اور مجھ سے کہدیا — آپ بی۔ اے پاس ہیں اور بندہ بی بی پاس ہے

ہادیان ملت جس طرح کولہو کے بیل بنے رہتے ہیں اور سیاسیات حاضرہ اور دنیا کے موجودہ تغیرات سے بیخبر رہتے ہیں، لیکن اسکے ساتھ اپنے قدیم اصول و وضع پر جو اُنکی متعصبانہ ضد ہے اور تکفیر و تفسیق امت اور سب و شتم میں یہ لوگ جس قدر آزاد ہیں اُسکا فوٹو یہ ہے

حال دنیا سے بیخبر ہیں آپ — گو تقدس مآب بیشک ہیں
شیخ جی یہ قول صادق ہے — چاہ زمزم کے آپ مینڈک ہیں

رسید کتب

۱۔ اسوۂ ناب — میر ولی اللہ وکیل ایبٹ آباد قیمت ۸/
۲۔ یاد رسول — خان بہادر مرزا سلطان احمد اکسٹرا اسسٹنٹ کمشنر لاہور ۲/
۳۔ غذائے روح — پنڈت برج لال عاشق لکھنوی مہ/
۴۔ میلاد النبی — سید نذیر علی وکیل راجگڑھ ۲/
۵۔ [illegible] — واصف بنارسی [illegible]
۶۔ [illegible]

اُردو رسائل کے خاص مضامین

(اگست سنہ ۱۹۲۶ء)

مرزا رجب علی بیگ سرور مرحوم

- فسانۂ عجائب عہ
- انشائے سرور ۶ر

امیر مینائی مرحوم

- امیر اللغات (مکمل)
- صنم خانۂ عشق
- مراۃ الغیب
- محامد خاتم النبیین ۶ر
- مینائے سخن عہ
- مکاتیب امیر مینائی

جلال مرحوم

- سرمایہ زبان اردو
- افسانہائے دلکش عہ
- نظم نگارین عہ
- رسالہ تذکیر و تانیث ۸ر
- ...لاوۂ تاریخ ۸ر
- قواعد المنتخب ۴ر

مرزا محمد عباس ہوش ...

- فسانۂ نادر جہان
- ...ری سہیلی ۱۲ر
- منتر سحر ۸ر
- ... ۱۲ر

منشی فضل حسین ثابت

- حیات دبیر
- دربار حسین

پنڈت رتن ناتھ سرشار

- فسانۂ آزاد ۴ جلد
- سیر کہسار
- خدائی فوجدار
- جام سرشار
- الف لیلیٰ بطرز ناول
- کامنی
- بچھڑی دلہن ۶ر

منشی سجاد حسین مرحوم

- احمق الذین ۸ر
- حاجی بغلول ۸ر
- پیاری دنیا ۸ر
- کایا پلٹ ۸ر
- میٹھی چھری ۶ر
- طرحدار لونڈی
- طلسمی فانوس

منشی جوالا پرشاد برق

- مرنالنی ۱۲ر
- مار آستین ۱۲ر
- بنگالی دلہن ۱۲ر
- معشوقۂ فرنگ ۱۲ر
- بدتاب ۱۲ر
- روہنی ۱۰ر

پریم چند

- پریم پچیسی
- بازار حسن

مولینا عبدالحلیم شرر

- جنید بغدادی عہ
- خواجہ معین الدین چشتی ۶ر
- تذکرہ مشاہیر عالم
- مخدرات
- قیس و لبنیٰ
- مقدس نازنین
- ایام عرب
- فتح اندلس
- ماہ ملک
- حسن کا ڈاکو
- دربار حرامپور ۱۰ر
- الفانسو ۱۲ر
- مفتوح فاتح
- فلپانا
- زوال بغداد
- لعبت چین عہ
- عزیزہ مصر
- جویائے حق
- بابک خرمی
- طاہرہ
- فتوقین ملکہ
- یوسف و نجمہ
- گذشتہ لکھنؤ
- شاعرانہ و شگفتہ مضامین
- آغاز و ختم سال
- سیر رجال
- تاریخی و جغرافی مضامین
- مینا بازار

حکیم محمد علیخاں مرحوم

- رام پیاری کامل
- عبرت کامل
- حسن سرور کامل
- اختر حسینہ
- دیول دیوی
- جعفر و عباسہ

شوق قدوائی مرحوم

- ترانۂ شوق
- قاسم و زہرہ
- نیرنگ جمال ۴ر
- گنجینہ ۱۲ر
- یکفرن وولوسی ۲ر

خواجہ عبدالرؤف عشرت

- زبان دانی ۶ر
- اصلاح زبان اردو ۶ر
- قواعد میر ۶ر
- اصول اردو ۶ر
- جان اردو ۶ر
- شاعری کی پہلی کتاب
- " دوسری ۸ر
- " تیسری ۸ر
- لغات اردو

منشی محمد حسن وحشی

- مجموس گذشت
- جام زریں

مولینا حکیم عبدالحی مرحوم

- یاد ایام عہ
- تذکرہ گل رعنا

حکیم احمد حسین الہ آبادی

- تاریخ ابن خلدون جلد اول
- " " دوم
- " " سوم
- " " چہارم
- " " پنجم
- " " ششم
- " " ہفتم
- " " ہشتم
- " " نہم
- " " دہم
- " " یازدہم
- سلطان صلاح الدین
- نورالدین محمود عہ

مولوی محمد حلیم انصاری

- تمدن اسلام
- فتح اندلس
- ابو مسلم خراسانی
- تاریخ مغرب

مولوی حبیب الرحمن خاں شروانی

- سیرۃ الصدیق
- علمائے سلف
- تذکرہ ...

حافظ اسلم جیراجپوری

- سیرۃ الرسول
- خلافت راشدہ
- خلافت بنو امیہ
- خلافت بنو عباس
- عباسیہ بغداد
- علوم عرب

قاضی محمد سلیمان منصورپوری

- رحمۃ للعالمین
- سفرنامہ حجاز

مولوی خلیل الرحمن

- اخبار الاندلس جلد
- تاریخ مولدین
- مختصر تاریخ اسلامی
- عذرا

مولوی محمد انشاء اللہ

- سیرۃ الرسول
- تاریخ آل عثمان
- حالات عراق و عربستان
- حالات قسطنطنیہ عہ
- تاریخ مراکش و مغرب الاقصیٰ

منشی سید احمد مارہروی

- آثار اکبری
- حیات خسرو عہ
- امرائے ہنود
- قیمت

گوتم بدھ - مہاتما بدھ کی مختصر سوانحعمری اور ان کی مذہبی تعلیم نہایت دلکش انداز میں لکھی گئی ہے

ملنے کا پتہ بدالناظر بک ایجنسی - لکھنؤ

مولوی عزیز مرزا مرحوم

- خیالات عزیز ۔۔
- ذکرِ ماروسی ۔۔

خواجہ سجاد اللہ اختر

- صدیق اکبر ۔۔
- حضرت حمزہ ۶ر
- مشاہیرِ اسلام ۔۔
- بغداد ۔۔
- دمشق ۔۔
- دیوانِ حافظ مع شرح ۔۔

مفتی انوار الحق ایم اے

- تاریخ دنیا البشر ۔۔
- تذکرۃ الحبیب عہ
- حقائق اسلام ۔۔

میر ولی اللہ بی اے

- بندگی ۔۔
- کاس الکرام ۔۔
- لسان الغیب طبع اول ۔۔
- " " دوم ۔۔
- " " سوم ۔۔
- " " چہارم ۔۔

سید راس مسعود بی اے

- نصاب اردو ۔۔
- جاپان کا تعلیمی نظم ۔۔
- انتخاب زرین ۔۔

مولانا حسرت موہانی

- شرح دیوان غالب عہ
- مکمل دیوان حسرت ۔۔

سید سجاد حیدر بی اے

- خیالستان ۔۔
- ثالث بالخیر ۸ر
- زہرا ۱۴ر
- جلال الدین محمد اکبر نامہ ۔۔

مسٹر ظفر عمر بی اے

- چوروں کا کلب ۹ر
- نیلی چھتری عہ
- بہرام کی گرفتاری عہ
- مستقبل اسلام ۔۔

پروفیسر فخر الدین مرحوم

- تحفہ سائنس ۔۔
- بادل سنگ نیچے عہ
- خونابۂ عشق عہ

حکیم احمد شجاع بی اے

- باپ کا گناہ ۔۔
- حسن کی قیمت ۔۔

منشی عبد المجید سالک بی اے

- ماہ در سیم نیز لباہ ۔۔
- چھپاو دیگر افسانے ۔۔
- چراغ دیگون ۱۲ر

منشی احمد علی بی اے

- تاریخ تمدن ۔۔
- شباب لکھنؤ ۔۔

مولوی عبد الماجد بی اے

- فلسفۂ جذبات ۔۔
- مکالمات برکلے ۔۔
- پیام امن ۔۔
- تصوف اسلام عہ
- فلسفیانہ مضامین ۔۔
- زود پشیمان ۸ر

منشی محمد لطیف بی اے

- اکبر ۔۔
- اورنگ زیب ۔۔
- رنجیت سنگھ ۔۔
- لارڈ کلائیو ۔۔

پروفیسر نواب علی ایم اے

- معارج الدین ۔۔
- تذکرۃ المصطفیٰ ۔۔
- صحف سماوی ۔۔
- شمع سخن ۱۰ر

پروفیسر الیاس برنی ایم اے

- جذبات فطرت چاحصے للعہ
- معارف ملت " للعہ
- مناظر قدرت " للعہ
- علم المعیشت ۔۔

مولوی سید سلیمان ندوی

- ارض القرآن للعہ
- سیرۃ عائشہؓ ۔۔
- حیات امام مالک عہ
- خلافت عثمانیہ اور اسلام عہ
- خلافت اور ہندوستان ۔۔

مولوی عبد السلام ندوی

- اسوۂ صحابہ ۲ جلد ۔۔
- سیرۃ عمر بن عبد العزیز ۔۔
- انقلاب الامم ۔۔
- تاریخ الحرمین الشریفین ۔۔
- انقلابِ اسلام ۔۔
- فطرت نسوانی ۔۔
- شعر الہند ۲ جلد ۔۔

مولوی عبد الباری ندوی

- مبادی علم انسانی ۔۔
- برکلے کا فلسفہ ۔۔

مولوی سعید انصاری

- سیر الصحابہ جلد اول ۔۔
- سیر انصار ۲ جلد ۔۔
- سیر الصحابیات ۔۔

مولوی عبد الرزاق ندوی

- اسوۂ حسنہ ۔۔
- کتاب الوسیلہ ۔۔
- ترکی اور یورپ ۶ر

خواجہ حسن نظامی

- قرآن آسان حافظ عہ
- میلاد نامہ عہ
- محرم نامہ عہ
- فاطمی دعوت اسلام ۔۔
- ذکر غوث پاک ۱۲ر
- کرشن جیون ۔۔
- شامی جہاد ۔۔
- سیپارۂ دل ۔۔
- کرم موت ۔۔
- چٹکیاں اور گدگدیاں ۔۔
- اتالیق خطوط نویسی ۱۲ر
- خطوط حسن نظامی ۱۲ر
- بیوی کی تعلیم ۔۔
- بیوی کی تربیت عہ
- اولاد کی شادی عہ
- جگ بیتی کہانیاں ۔۔
- آپ بیتی ۔۔
- پچھوں کی کہانیاں ۱۲ر
- سیر دہلی ۱۲ر
- سفرنامہ ممالک اسلامیہ ۔۔
- غدر دہلی کے افسانے عہ
- یزید نامہ ۔۔
- طمانچہ بر رخسار یزید عہ
- اردو دعائیں ۸ر
- تسکین احساس ۸ر
- روزنامچۂ ہند ۱۲ر
- اسلام کا انجام ۶ر
- تسخیر مہر و قمر ۱۰ر

مولوی عبد الرشید الخیری

- الزہرا
- صبح زندگی
- شام زندگی
- شب زندگی
- نوحۂ زندگی
- دُرِ شہوار
- منازل السائرہ
- سراب مغرب
- بنت الوقت
- قطرات اشک
- جوہر قدامت
- عروس کربلا
- یاسمین شام
- تیغ کمال
- ماہ عجم
- آفتاب دمشق
- سمرنا کا چاند

نیاز فتحپوری

- گہوارۂ تمدن
- گیتان جلی
- نگارستان
- صحابیات
- تاریخ الدولتین

یاس عظیم آبادی

- چراغ سخن
- نشتر یاس

تاریخ ہندوستان — جس میں ہندوستان کے استقلال، مسلمانوں کی شجاعت اور انگریزوں کی حکمت کا آئینہ از "خانی خان" قیمت ۱۲ر

ملنے کا پتہ:- الناظر بک ایجنسی۔ لکھنؤ

رجسٹرڈ نمبر اے ۴۷۸

ہو المستعان

الناظر

ایڈیٹر۔ ظفر الملک علوی

الناظر پریس لکھنؤ میں باہتمام اسحاق علی علوی چھپا

ت سالانہ
للعہ

قیمت فی پرچہ
۸ر

نئی کتابیں

ہملیٹ

دنیا کے سب سے بڑے ڈراما نویس شکسپیر کے شاہکار "ہملیٹ" کا سلیس و با محاورہ اُردو ترجمہ، فاضل اہل قلم منشی امتیاز علی صاحب بی اے وکیل فیض آباد کے قلم سے۔ دیباچہ میں ڈراما اور اُس کی تاریخ پر فلسفیانہ بحث کی ہے اور خلاصہ قصہ اور اُس پر تنقید بھی شامل کر دی ہے۔ ضرور ملاحظہ فرمائیے۔ قیمت ۱۲/

حوروں کا کلب

آغا بہار رضوی لکھنوی نے اس ناول میں تحیر خیز طریقہ پر اور نہایت دلکش انداز میں ایک پُر اسرار قتل کے رازوں کا انکشاف، ایک حسین عیارہ کے حیرت انگیز کارنامے، پری جمال نازنینوں کے کرشمے، بوالہوسی کے راز و نیاز، برقی ایجاد کے جلوے، با محاورہ اور سلیس اُردو زبان میں تحریر کیے ہیں۔ ہندوستانی زندگی کا یہ ادبی ناول اتنا دلچسپ ہے کہ ایک دفعہ شروع کرنے کے بعد بغیر ختم کیے ہوئے اُٹھنا مشکل ہے۔ ٹائٹل پیج ایک خوبصورت تصویر سے مزین ہے۔ قیمت صرف ۱۰/

مسئلہ حجاز

یعنی وفد خلافت ۱۹۲۶ء کی رپورٹ جس کا مجموعی حجم ۲۰۰ صفحے ہے اور جس میں آثار و مقابر وغیرہ کی ایک درجن سے زائد عکسی تصویریں ہیں۔ مرتبہ مولانا سید سلیمان مولانا شوکت علی مولانا محمد علی مسٹر شعیب قریشی۔ قیمت ۱۲/ مجلد ۱۴/

حکایات الصالحین فی محاسن المحسنین

یہ کتاب روض الریاحین مولفہ امام یافعیؒ کا اردو ترجمہ ہے۔ اس میں مشہور صوفیا اور اولیاء کے اقوال و حکایات نہایت دلکش انداز میں اور بڑے اہتمام سے بیان کیے گئے ہیں۔ قصص صوفیائے کرام پر اس سے زیادہ مستند اور بہتر کتاب نہیں ہے۔ جھوٹی سچی کہانیوں کو چھوڑ کر اسے پڑھیے کہ رسول اللہ صلعم اور صلحاء سے محبت پیدا ہو۔ قیمت ۱۲/

ذکرِ حبیب

اس نام سے ملک محمد الدین ایڈیٹر رسالہ صوفی نے جناب سید غلام حیدر علی شاہؒ جلال پوری کے مفصل حالات، کرامات اور ملفوظات سلیس اردو اور دلکش انداز میں تحریر فرمائے ہیں۔ خواجہ صاحب کی شان میں ہندوستان کے مشہور شعرا کی بہت سی دلپسند نظمیں آخر میں شامل کر دی گئی ہیں۔ جلالپور کا عام نظارہ، مزار کی رنگین تصویر، شاہ صاحب کا عکس تحریر اور اکبر و اقبال کی لکھی ہوئی دستی تواریخ وصال کا عکس بھی کتاب میں شامل ہے اور شروع میں سجادہ نشین جلالپور کے قلم سے ایک دلچسپ مقدمہ ہے۔ قیمت ۱/

ملنے کا پتہ: الناظر کتب ایجنسی۔ لکھنؤ

بسم اللہ الرحمن الرحیم

الناظر

نمبرہ جلد ۳۱ — نومبر سنہ ۱۹۲۶ء

قرآن شریف

اور

حضرت عیسیٰ کا بے باپ پیدا ہونا

موقر نگار کے فاضل ایڈیٹر جناب نیاز فتح پوری نے نگار کے گذشتہ نمبر میں ذیل استفسارات حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی ولادت کے متعلق ایک طویل مقالہ سپرد قلم کیا ہے جو تین حصوں میں منقسم ہے۔ پہلے حصہ میں فاضل مضمون نگار نے قرآن شریف سے حضرت مسیح کا بے باپ کے پیدا نہ ہونا ثابت کیا ہے۔ دوسرے حصہ میں آپ کے آسمان پر اٹھائے جانے کی تردید کی ہے اور آخر میں معجزات عیسوی سے انکار کیا گیا ہے ان تینوں مباحث میں پہلا مبحث اہم ہے۔ لہذا میں اس صحبت میں یہ ثابت کروں گا کہ قرآن شریف سے حضرت روح اللہ کا بے باپ ہی کے پیدا ہونا پایا جاتا ہے۔ چونکہ کلام اللہ کی صحت میں کسی مسلمان کو شک نہیں، اس لیے حدیث اور تاریخ کا حوالہ نہ دوں گا۔

قبل اسکے کہ میں اصل موضوع کی طرف توجہ کروں، کچھ بطریق مقدمہ عرض کرنا چاہتا ہوں۔ خرق عادت اور معجزہ کا مسئلہ، بنو عباس کی پہلی صدی سے، جبکہ فلسفۂ یونانی کے عربی میں ترجمہ ہو جانے کے باعث مسلمانوں کی ذہنیات میں کچھ تغیر پیدا ہو گیا تھا، مختلف فیہ مبحث رہا ہے۔ طرفین افراط و تفریط

کے ہمیشہ شکار رہے۔ معتزلی خیال کے نام نہاد آزاد منش اصحاب جو عقل و معقولیت کے ضرورت سے زیادہ بندے بنے ہوئے ہیں خرق عادت کو یکدم محال و غیر ممکن خیال کرتے ہیں۔ دوسری طرف خوش عقیدہ مذہبی حضرات اس قدر مبالغہ کرتے ہیں کہ معجزہ شئے مضحکہ ہوگیا ہے۔ شروع سے اب تک جو کچھ اس مبحث پر لکھا گیا ہے اُس میں بہترین، سیرۃ النبی کے تیسرے حصہ کی بحث ہے، جو درحقیقت قول فیصل اور افراط و تفریط سے خالی ہے۔ اس میں خرق عادت و معجزہ کے امکان کو بدلائل ثابت کیا ہے۔ مگر ساتھ ہی اس بات کا اعتراف کیا گیا ہے کہ صحت روایت کا جس قدر زیادہ لحاظ کیا جائے گا معجزوں کی تعداد کم ہوتی جائیگی تاہم چند معجزات ایسے ضرور ہیں جو کلام پاک اور احادیث صحیحہ سے ثابت ہیں اور جن سے کسی مسلمان کو انکار نہیں کرنا چاہیے، کیونکہ اُنکا انکار قرآن کے انکار کا مترادف ہوگا۔ ایک مسلمان کے نزدیک قرآن کے اخبار و احکام یقینی ہیں اور علوم جدیدہ کے مقرر کردہ اصول و نتائج محض قیاسی و تخمینی۔ اور یقین و تخمین میں بڑا فرق ہے۔

مولانا نیاز کی قابلیت سے یہ درحقیقت نہایت مستبعد ہے کہ وہ معجزہ کا انکار کریں۔ دس گیارہ برس ہوئے، رسالہ اُسوۂ حسنہ میں جو میرٹھ سے نکلتا تھا، اُنکا ایک طویل مضمون بعنوان معجزۂ شق القمر کئی قسطوں میں شایع ہوا تھا جس میں نیاز صاحب نے نہایت قابلیت کے ساتھ اُن سب اعتراضات عقلیہ و نقلیہ کی جو معجزۂ انشقاق قمر پر وارد کیے جاتے ہیں، تردید کی تھی۔ اُس وقت مولانا کا اعتقاد تھا کہ قانون قدرت کی حقیقت معلوم کرنے کا ہمارا ذریعۂ علم یعنی استقرا ناقص ہے، اور اس استقراء ناقص کی بنا پر قانون قدرت کے متعلق کوئی قطعی و اذعانی حکم لگانا سخت غلطی و جسارت ہے۔ چنانچہ مولانا نے آٹھ مثالیں ایسی دی تھیں جن سے استقراء کی غلطی ثابت ہوتی تھی۔ اُنکے علاوہ اور بہت سی مثالیں پیش کی جا سکتی ہیں۔ لیکن چونکہ اس صحبت میں میرا مقصود حضرت عیسیٰ کی ولادتِ بے پدر کو قرآن شریف سے ثابت کرنا ہے اسلیے فی الحال عقلیہ دلائل سے سروکار نہیں رکھتا۔ تعجب ہے کہ مولانا کی یہ مذہبی ذہنیت اس قدر جلد بدل گئی کہ مولانا اب اعتقاد بالمعجزہ کو اعجوبہ پرستی اور عقل و ہوش کی دشمنی سے تعبیر کرتے ہیں۔

مولانا اگرچہ بالفاظ صریح معجزہ کا انکار نہیں کرتے مگر اگر غور سے دیکھا جائے تو حضرت عیسیٰ کی ولادتِ بے پدری کی بابت انکو جو اختلاف ہے اُس کا منشا سوائے اسکے اور کچھ نہیں کہ وہ سائنس کے مقرر کردہ قانون الٰہی کے خلاف کسی چیز کو خواہ وہ قرآن شریف سے ثابت ہو یا احادیث صحیحہ سے، قبول کرنا نہیں چاہتے۔ قانون الٰہی کے خلاف جانا تو ہمارا ذہن بھی گوارا نہیں کرتا۔ مگر سوال تو یہ ہے کہ قوانین قدرت

سے کون سے قوانین مراد ہیں۔ وہ جو درحقیقت اس عالم میں کام کر رہے ہیں اور جن پر اس عالم کا نظام قائم ہے، یا وہ جنکو چند انسانی ہستیوں کی محدود عقل نے اپنے زعم میں معلوم کر لیا ہے؟ کیا سب قوانینِ قدرت پورے طور پر کما ہی معلوم و مشخص کر لیے گئے؟ کیا کوئی صاحب عقل سلیم اس کا جواب ایجاب میں دے سکتا ہے؟ سائنس نے حقائق عالم معلوم کرنے اور قوانین فطرت مشخص کرنے کا جو بیڑا اُٹھایا ہے وہ اُس ضعیف چیونٹی کی ناچیز کوشش سے جو تمام کرۂ زمین کے چپہ چپہ پر سفر کرکے دنیا کا حال معلوم کرنا چاہتی ہے، زیادہ وقعت نہیں رکھتا کیا کوئی شخص دعوے کے ساتھ کہہ سکتا ہے کہ جو قوانین قدرت معلوم کر لیے گئے ہیں وہ یقینی اور حقیقی ہیں؟ کیا آپ کے پاس اسکی کوئی گارنٹی ہے کہ جس طرح تحقیقاتِ قدیمہ کو تفحصاتِ جدیدہ نے باطل کر دیا ہے اُسی طرح زمانۂ آیندہ کی کاوش و جستجو موجودہ مسلمات کو غلط ثابت نہ کر دیگی۔ مثال کے طور پر عرض ہے کہ نیوٹن کا مایۂ ناز قانون ثقل ارضی جس وثوق و یقین کی قوت کے ساتھ ایک عرصۂ دراز سے سائنس دانوں کے دماغوں پر مسلط ہیں، محتاج بیان نہیں لیکن آجکل اسی قانون کو متعدد علمبرداران تحقیق و تدقیق غلط ثابت کر رہے ہیں۔ کیا اس سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ علوم جدیدہ کے معلوم کردہ قوانین قدرت یقینی نہیں۔ اسکے برخلاف اگر کسی ذاتِ انسانی کو قانون قدرت کے بنانے والے خداوند حقیقی کا رازدار سمجھتے ہیں اور یہ اعتقاد رکھتے ہیں کہ جو کچھ اُسنے کہا، وہ خدا کی طرف سے کہا، تو اسکی خبر اگرچہ ہمارے معلوم کردہ قوانین فطرت کے خلاف ہی کیوں نہ ہو، درحقیقت صحیح ہے اور قانون قدرت کے عین مطابق۔ مولانا نیاز ممکن ہے بظاہر کسی معجزہ کو نہ مانتے ہوں، مگر مسلمان ہونے کی حیثیت سے کم از کم اس معجزہ کا ماننا ضروری ہے کہ قرآن کلام الٰہی ہے جو وحی کے ذریعہ آنحضرتؐ پر نازل ہوا، اور یہ کہ یہ کتاب نقص و عیب سے پاک اور ہر نقطۂ خیال سے بے نظیر اور لاجواب ہے، اور یہ کہ آنحضرتؐ خدا کے رسول اور آخری رسول ہیں۔ اگر مولانا کے یہ عقائد نہیں تب تو وہ مسلمان نہیں۔ اور اگر وہ انکے معتقد ہیں تو وہ ضمناً معجزہ کے بھی قائل ہیں۔ یہ تمام امور بظاہر خلاف فطرۃ ہیں۔ قانون فطرت کسی ایک یا چند واقعات کے ساتھ مخصوص نہیں ہو سکتا۔ کیا انسان پر وحی آنا، خدا سے بات کرنا وغیرہ وغیرہ باتیں اس زمانہ میں عام طور پر دیکھنے میں آتی ہیں؟ کیا ایسی کتاب ہو سکتی ہے جو قرآن سے بڑھ کر ہو۔ کیا کوئی اُمّیِ محض صرف الہام ربّانی کی بدولت ایسی کتاب نادر پیش کر سکتا ہے جس کا حقیقۃً دنیا میں جواب نہ ہو۔ کیا یہ خرق عادت و معجزہ نہ تھا۔ غرضکہ قرآن شریف کے نزول اور بعثت رسولؐ پر ایمان لانا ہی معجزہ کا قائل ہونا ہے۔ یعنی اصولاً معجزہ کا وجود مان لیا گیا۔ تو پھر یہ بحث رہ جاتی ہے کہ کون کون سے معجزے قرآن پاک اور احادیث صحیحہ

سے ثابت ہیں۔ اور یہ کچھ مشکل نہیں۔ اب میں حضرت عیسیٰ کا بے باپ پیدا ہونا قرآن سے ثابت کرتا ہوں۔ مگر پہلے ایک اور مقدمہ کے ذہن نشین کر لینے کی ضرورت ہے۔

آیات قرآنیہ کی تفسیر میں بہت کچھ اختلافات پیدا کر دیے گئے ہیں۔ لیکن اگر غور سے دیکھا جائے تو قرآن پاک کے صحیح سمجھنے کے لیے مندرجہ ذیل اصول ہو سکتے ہیں:۔

۱۔ قرآن عربی زبان میں ہے، اسلیے عربی لغت، عربی صرف و نحو اور عربی اسلوب بیان کا لحاظ رکھا جائے۔

(۲) ہمیشہ وہ معنی مراد لیے جائیں جو الفاظ ظاہر سے لغت و محاورہ کے مطابق مترشح ہوں۔ البتہ اگر کہیں اصول بلاغت کے مطابق مجازی معنی مراد ہیں تو پھر لغوی معنی مراد نہ لیے جائیں۔ مثلاً "ید اللہ" سے اللہ کا ہاتھ نہیں، بلکہ اُسکی قدرت مراد ہے۔

۳۔ قرآن شریف پیش کرنے والے یعنی جناب رسالتمآبؐ نے کیا معنے بتائے اور سامعین یعنے صحابۂ کرامؓ نے کیا مفہوم سمجھا، جسکا پتہ احادیث صحیحہ سے چلتا ہے؟

۴۔ جس طرح ہر کتاب کا ایک خاص طرز ہوا کرتا ہے۔ جس سے واقفیت بھی اُس کتاب کے سمجھنے میں کافی مدد دیتی ہے۔ اسی طرح قرآن شریف کا بھی ایک خاص اسلوب بیان ہے۔ جسکو آیات قرآنیہ سمجھتے وقت نظر انداز نہیں کرنا چاہیے۔

جو لوگ معجزات کے منکر ہیں اُن کا استدلال یہ ہوتا ہے کہ خرق عادت و معجزہ خلاف قانون فطرت ہے اور اس لیے لغویات ہے اور قرآن شریف میں لغویاتیں نہیں ہیں کیونکہ وہ کلام الٰہی ہے۔ پس اگر کسی آیت یا آیات سے معجزہ کا وجود ثابت ہو تو یہ سمجھنا چاہیے کہ مفہوم سمجھنے میں غلطی ہوئی۔ الہ آباد میں مولوی ابوالفضل صاحب نامی ایک بزرگ ہیں، جنکو اس میں کچھ شک نہیں، قرآن سے خاص دلچسپی ہے۔ کئی زبانوں میں اسکا ترجمہ کر چکے ہیں۔ مگر آپ قرآن شریف کے سمجھنے میں یہی اصول پیش نظر رکھتے ہیں۔ اور جہاں جہاں عام عقائد کے مطابق معجزہ کا شائبہ ہوتا ہے وہاں علماے معتزلہ یا سر سید احمد کی تائید و تقلید میں یا اپنی ذاتی آزادانہ تحقیق کی بناپر معجزات سے انکار کر جاتے ہیں۔ اور آیات سے حسب مرضی وہ معنی مراد لیتے ہیں جن سے معجزہ کا وجود قائم نہیں رہتا۔

میں ان لوگوں سے یہ کہتا ہوں کہ آپ کے طریقہ استدلال میں سب سے بڑی قباحت یہ ہے کہ چونکہ آپ معجزہ کو لغو سمجھتے ہیں اس لیے آپ کو آیات کی تفسیر اوپر بیان کیے ہوے اصول کے خلاف کرنی پڑتی ہے۔ ہم مسلمان تو آپ کے استدلال پر کم انکم یہی سمجھ کر خاموش ہو جائیں گے کہ آپ قرآن کو

کلام اللہ تو مانتے ہیں، لیکن غیر مسلم آپ کے دور از کار معنی کب مانے گا، وہ تو آپ کے خیال کے مطابق معجزہ کو لغو سمجھ کر قرآن کو بھی (نعوذ باللہ) لغو سمجھے گا کیونکہ اسے بہت سی آیات ایسی ملینگی جن میں معجزہ کا ذکر ہوگا - پس غیر مسلم کو سمجھانے کے لیے آپ کو خرق عادت اور معجزہ کا امکان ثابت کرنا چاہیے، نہ کہ آیات کے معنی میں تصرف کریں - آیات کے معانی آپ کے تصرف سے بدل نہیں سکتے - خدا کا کلام قصائد بدر چاچ کی طرح چیستان نہیں ہے، نہ اُس نے اظہار قابلیت کے لیے اسے نازل فرمایا - اُسکا اصل نشا ہدایت عالم تھا - وہ درہ نادرہ اور مقامات حریری کے طرز پر نہیں ہے کہ ادق اور مشکل ہو - نہ اس میں قصائد خاقانی کی طرح دور از کار اور پیچیدہ تشبیہات و تراکیب ہیں، اور نہ غالب کے بعض مشکل شعروں کے مانند ہے جنکے مفہوم معین کرنے کے لیے ایڑی سے چوٹی تک کا زور لگا دیا جائے اور پھر بھی مبہم رہیں - خدا کا کلام ایسا سہل ہے کہ عرب ایسی اُمی و ناخواندہ قوم نے اُسے سنا اور مطلب سمجھ گئے - کلام کی خوبی صرف یہی ہے کہ بآسانی سمجھ میں آسکے - کلامِ الٰہی عرب کی زبان میں ہے اس لیے عربی اسلوبِ بیان اور عربی فصاحت و بلاغت کا معیار بدرجۂ اتم اس میں ملحوظ رہا ہے - تمام معانی و مطالبِ قرآن اول سے آخر تک نہایت واضح ہیں - ممکن ہے کہ کسی آیت کا مطلب ماسبق و مالحق سے علٰحدہ وضاحت کے ساتھ سمجھ میں نہ آئے مگر دیگر آیات کی مدد اور نیز سیاق کلام سے یہ دشواری رفع ہو جاتی ہے -

اس قدر گذارش کرنے کے بعد اصل مطلب کی طرف رجوع کرتا ہوں -

مولانا نیاز نے تاریخی حیثیت سے اس مسئلہ پر جو روشنی ڈالی ہے اُس سے قطع نظر کر کے اُنکے قرآنی استدلالات کو لیتا ہوں، کیونکہ یہ زیادہ اہم ہیں - اگر قرآن شریف سے حضرت عیسیٰ کا بے باپ کے پیدا ہونا ثابت ہو جائے، تو تاریخ کتنی معتبر کیوں نہ ہو، ناقابلِ التفات رہ جاتی ہے - قرآن پاک میں حضرت عیسیٰ کا متعدد مقامات پر ذکر ہوا ہے، لیکن سورۂ مریم میں مفصل ذکر ہے - وہ آیتیں "واذکر فی الکتاب مریم" سے لیکر "کن فیکون" تک ہیں - میں اُن میں سے ایک ایک آیت بتاؤں گا کہ یہ تمام آیات کیا بحیثیت مجموعی اور کیا فرداً فرداً حضرت عیسیٰ کی ولادت بے پدری کو ظاہر کرتی ہیں -

---

واذکر فی الکتاب مریم اذ انتبذت من اھلھا مکاناً شرقیاً فاتخذت من دونھم حجابا - ذکر کر کتاب میں مریم کا، جب وہ علٰحدہ ہوئی اپنے لوگوں سے ایک مشرقی مکان میں، پھر کر لیا اُنکی طرف سے پردہ - مکان شرقی سے مراد، مکان کا شرقی حصہ ہے، جہاں حضرت مریم غسل کے لیے اپنے گھر والوں سے الگ

ہو گئی تھیں۔ آیۂ فاتخذت من دونہم حجاباً سے یہی مفہوم ذہن میں قیاد رہوتا ہے، ورنہ پردہ کر بیٹھنے کی کچھ اہمیت باقی نہیں رہتی۔ کل آیت کا یہ مطلب ہوا کہ جب آپ نہانے کی غرض سے اپنے کنبہ والوں سے علیحدہ ہو کر مشرقی حصۂ مکان میں چلی گئیں اور آپ نے اپنے گھر والوں سے پردہ کر لیا، تو جیسا کہ اگلی آیت سے ظاہر ہے، ایک فرشتہ انسان کی شکل میں نمودار ہوا۔ مولانا نیاز فرماتے ہیں خواب میں، خواب کے معنی کہاں سے پیدا ہوئے؟ قرآن شریف کا اسلوب بیان ہے کہ جہاں کہیں خواب کا ذکر ہے وہاں لفظ منام وغیرہ ضرور بیان کر دیا گیا ہے۔ چنانچہ حضرت خلیل اللہ و ذبیح اللہ کے ذکر یا یوسف علیہ السلام کے قصہ میں لفظ منام موجود ہے۔

فارسلنا الیہا روحنا فتمثل لہا بشراً سویاً۔ بس ہم نے بھیجی اُسکی طرف اپنی روح جو سچ مچ انسان کی شکل میں اُنکو نظر آئی۔

قالت انی اعوذ بالرحمن منک ان کنت تقیاً۔ حضرت مریم تنہائی کے عالم میں اپنے اہل سے پس پردہ تھیں کہ اُنکو ایک اجنبی نظر آیا تو ڈر کر بولیں کہ اے شخص اگر تجھے کچھ خدا کا خوف ہے تو میں خدا کا واسطہ دیکر تجھ سے بچنا چاہتی ہوں۔ یعنی خدا کے لیے میری عصمت وعفت پر حملہ نہ کر دینا۔ ذرا غور کیجیے۔ تنہائی، گھر والوں سے پس پردہ، اور ایک اجنبی شخص کا نمودار ہونا۔ اور پھر حضرت مریمؑ کا یہ فرمانا کہ اگر تو پرہیزگار ہے تو خدا کا واسطہ دیکر میں بچنا چاہتی ہوں۔ یہ سب واقعات کسقدر باہم مناسب اور ایک ہی سلسلہ کی کڑیاں ہیں۔ کیا ان سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ حضرت مریم غسل یا کسی ایسے ہی کام کے لیے گھر والوں سے الگ پس پردہ ہو گئی تھیں۔ کیا یہ خواب کا واقعہ معلوم ہوتا ہے؟

مولانا نیاز نے ان کنت تقیاً میں 'اِن' کا ترجمہ "اگرچہ" سے کیا، جو صحیح نہیں ہے۔ عربی دان 'کے معنی اگرچہ کے ہیں' نہ کہ 'اِن' کے۔ 'اگرچہ' سے عبارت خبط ہو جاتی ہے، ممکن ہے طباعت کی غلطی ہو۔

قال انما انا رسول ربک لاہب لک غلاماً زکیاً۔ اُس نے کہا کہ میں خدا کا بھیجا ہوا تیرے پاس آیا ہوں تاکہ تجھے ایک پاکیزہ لڑکا دوں۔

مولانا نیاز ترجمہ فرماتے ہیں "خدا کا یہ پیام لیکر آیا ہوں کہ میں تجھے ایک پاکیزہ بیٹا دونگا" یعنی 'لاہب' میں ضمیر متکلم خدا کے لیے ہے۔ حالانکہ سیاق کلام بتاتا ہے کہ یہ ضمیر متکلم قائل یعنی روح کے لیے ہے۔ اس میں شک نہیں کہ فاعل حقیقی تو خدا ہی ہے، لیکن یہاں وہب غلام کی فاعلیت رسول کے ساتھ اس لیے متعلق کی گئی ہے کہ درحقیقت لڑکا دینے وہی آیا تھا۔ جیسا کہ اُردو میں کہا جائے کہ میں

فلاں صاحب کا بھیجا ہوا ہوں کہ آپ کو پانچ روپئے دوں۔ یعنی فلاں صاحب کے حکم سے میں پانچ روپئے دینے آیا ہوں۔

قالت انّیٰ یکون لی غلام ولم یمسسنی بشر ولم اکُ بغیا۔ حضرت مریم نے کہا کہ میرے بیٹا کیونکر ہوسکتا ہے حالانکہ مجھے کسی بشر نے چھوا تک نہیں اور نہ میں بدکار ہوں۔ کیا یہ خواب کا ذکر ہے؟ کوئی ایک قرینہ بھی خواب کے متعلق بتایا جاسکتا ہے؟

قال کذٰلک قال ربک ہو علیّ ہیّن ولنجعلہ آیۃ للناس ورحمۃ منا وکان امراً مقضیا۔ روح نے کہا کہ ایسا ہی ہوگا۔ تیرے رب نے کہا ہے کہ یہ (ولادت بے پدر) میرے لیے آسان ہے اور (علاوہ بریں) میں لوگوں کے لیے (اس پسر بے پدر کو اپنے قادر مطلق ہونے کی) نشانی اور اپنی طرف سے رحمت یعنے سرچشمہ ہدایت بناؤں گا اور یہ امر مقدر ہوچکا ہے، یعنی ہوکر رہے گا، ٹل نہیں سکتا۔ یہاں لفظ کذٰلک قابل غور ہے۔ مولانا نیاز فرماتے ہیں کہ اسکے یہ معنی ہیں کہ ہاں تجھے آدمی چھوئے گا اور باقاعدہ حمل کے بعد لڑکا پیدا ہوگا۔ مگر یہ معنی بوجوہ غلط ہیں:۔

(۱) قال کذٰلک انّیٰ یکون لی ولد کا جواب ہے۔ یعنی حضرت مریم نے فرمایا کہ میرے لڑکا کیونکر پیدا ہوگا حالانکہ مجھے کسی نے چھوا تک نہیں۔ اسکے جواب میں یہ کہنا کہ ایسا ہی ہوگا، ظاہر کرتا ہے کہ روح کی یہی مراد تھی کہ اللہ تعالیٰ بغیر مباشرت کے بیٹا دیگا۔ یہ معنی ذہن میں زیادہ تبادر ہوتے ہیں اور سیاق کلام کے مطابق ترہیں بجائے اسکے کہ یہ معنی لینا کہ پہلے تجھے انسان چھوئے گا اور پھر لڑکا ہوگا۔

(۲) اسکے آگے کی آیت قال ربک ہو علیّ ہیّن سے صاف ظاہر ہے کہ کسی امر مہتم بالشان یا کسی ایسے امر کے لیے جو بظاہر محال معلوم ہوتا ہے، خداوند عالم نے یہ فرمایا کہ میرے لیے یہ آسان ہے حضرت مریم کی شادی کوئی مشکل کام نہ تھا کہ اللہ تعالیٰ فرماتا کہ میرے لیے یہ آسان ہے کہ پہلے تیری شادی کراؤں گا اور پھر تیرا شوہر تجھے چھوے گا تب لڑکا پیدا ہوگا۔ سیاق کلام سے یہ مطلب یہاں چسپاں ہی نہیں ہوتا۔ علاوہ بریں، یہ آیت بعینہا دو جگہ آئی ہے، ایک سورۂ آل عمران میں اور پھر سورۂ مریم میں۔ پہلے مقام پر کذٰلک کے بعد یخلق ما یشاء اذا قضیٰ امراً فانما یقول لہٗ کن فیکون ہے، اور دوسری جگہ ہو علیّ ہیّن ہے۔ دونوں جگہ صاف ظاہر ہو رہا ہے کہ خدا کا منشا صرف یہی ہے کہ بے باپ کا لڑکا پیدا کرنا میرے لیے آسان ہے۔ میں جسکو چاہتا ہوں پیدا کرتا ہوں، اور جب کسی امر کا حکم دیتا ہوں تو کہتا ہوں کہ ہو، وہ ہوجاتا ہے۔ یعنی میری قدرت قواعد عادیہ کے ساتھ پابند نہیں۔ غرضکہ کذٰلک کے بعد یخلق ما یشاء والا جملہ منشاء خداوندی کے ظاہر کرنے میں کسی قسم کا شک باقی نہیں چھوڑتا

اگر کذالک سے مراد، شادی ہو کر مباشرت سے حمل قرار پانا ہوتا تو قدرت خداوندی کا پاس قدر زور دینے کا مناسب موقع نہ ہوتا۔ علاوہ بریں کذالک حضرت زکریا کے حق میں بھی ایسے ہی موقع پر مستعمل ہوا ہے۔ جب خداوند تعالیٰ نے حضرت زکریا کو لڑکے کی خوشخبری دی تو آپ نے فرمایا کہ اے رب کہاں سے ہوگا میرے لڑکا، حالانکہ میری عورت بانجھ ہے اور میں بوڑھا ہو گیا ہوں یہاں تک کہ اکڑ گیا (قال رب انیٰ یکون لی غلام وکانت امرأتی عاقرا وقد بلغت من الکبر عتیا، قال کذالک قال ربک ہو علیّ ہین۔) یہاں مولانا نیاز کذالک کی کیا تاویل کریں گے؟ کیا بانجھ عورت کے لڑکا پیدا ہونا، خصوصاً ایسی حالت میں جبکہ شوہر بوڑھا پھونس ہو گیا ہو، خرق عادت نہیں ہے؟ حضرت مریم کے قصہ میں تو مولانا نیاز 'کذالک' کے یہ معنی بیان کرتے ہیں کہ تجھے آدمی چھوے گا اور تیرے بچہ پیدا ہوگا۔ کیا اسی تاویل کے مطابق مولانا یہاں یہ معنی نکالیں گے کہ بڑھاپا جوانی سے بدل جائے گا اور تب بچہ پیدا ہوگا؟ اگر یہ معنی نکالتے ہیں تو بھی خرقِ عادت لازم آتا ہے۔ غرضکہ قصۂ حضرت زکریا و قصۂ حضرت مریم کی باہمی مشابہت اس درجے کی ہے کہ لفظ 'کذالک' کے معنی میں کسی قسم کے شک کی گنجائش باقی نہیں رہتی۔

(۳) ولنجعلہ آیۃً بھی قابل غور ہے۔ لفظ 'آیۃ' قرآن شریف میں آیات قرآنیہ کے علاوہ عام طور پر نشانی کے معنی میں مستعمل ہوا ہے اور نشانی بھی قدرتِ خداوندی کی۔ قرآن شریف میں کئی موقعوں پر خداوند تعالیٰ نے اپنی قدرت کی باتیں بیان کر کے فرمایا کہ یہ عقلمندوں کے لیے کھلی نشانیاں ہیں۔ غرضکہ حضرت عیسیٰ آیۃ للناس اسی وقت ہو سکتے تھے کہ اُنکی ولادت میں کوئی خاص اعجوبہ بات ہو، محض رسالت و نبوت آیۃً للناس نہیں ہو سکتی۔ چنانچہ کسی اور نبی یا رسول کو قرآن میں آیۃً للناس نہیں کہا گیا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو معجزات (عصا، اور ید بیضا وغیرہ) عنایت ہوئے تو اُنکے لیے کہا گیا ولقد اتینا موسیٰ تسع آیات بینٰت یعنی ہم نے دیں موسیٰ کو نو نشانیاں۔ غرضکہ ہُوَ علیّ ہین، ولنجعلہ آیۃً للناس، اور لفظ کذالک ان سب سے مجموعی طور پر اور نیز جدا جدا صرف یہی مطلب نکلتا ہے کہ خداوند تعالیٰ نے فرمایا کہ ولادت بے پدر میرے لیے آسان ہے۔ اگر مولانا نیاز والے معنی مراد ہوتے تو اللہ تعالیٰ حضرت مریم کے اس قول کے جواب میں کہ میرے لڑکا کیونکر پیدا ہوگا حالانکہ مجھے کسی نے چھوا تک نہیں، یوں فرماتا کہ آدمی تمھیں چھوے گا، یا اول ہم تمھاری شادی کرا دیں گے۔

---

(۴) اسکے علاوہ یہ آیت بھی پیشِ نظر رکھیے ان مثل عیسیٰ عند اللہ کمثل آدم، خلقہ من تراب

ثم قال لہ کن فیکون - یعنی عیسیٰ کی مثال اللہ کے نزدیک آدم کی سی ہے جسکو مٹی سے پیدا کیا تم عیسیٰ کے بے باپ پیدا ہونے پر کیوں تعجب کرتے ہو - خدا نے تو آدمؑ کو بغیر ماں اور باپ کے مٹی سے پیدا کیا تھا -

(۵) قرآن شریف میں حضرت عیسیٰؑ کی کنیت ابن مریم بیان کی گئی ہے - اس سے قطعی طور پر ثابت ہے کہ آپ بے باپ کے پیدا ہوئے تھے -

ان سب باتوں کو پیش نظر رکھ کر اب آپ 'کذٰلک' کے معنوں پر غور کریں تو اسلوب بیان اور سیاق کلام سب سے عیسیٰ کا بے باپ ہونا واضح ہو جائے گا -

فحملتہ - پس حمل ٹھہرا مریم کو - سیاق کلام سے بھی ظاہر ہے کہ اُسی وقت حضرت مریم حاملہ ہو گئیں - کیونکہ روحِ خداوندی، مریم کو لڑکا دینے آئی تھی، اگر معاً حمل قرار نہ پاجاتا تو 'لاھب لک غلامًا زکیًا' غلط ٹھہرتا -

مولانا نیاز فرماتے ہیں کہ کلام مجید میں قصہ یا واقعہ بیان کرنے کا یہ اسلوب ہے کہ غیر ضروری کڑیاں چھوڑ کر خاص خاص باتوں کا ذکر کر دیا جاتا ہے، تو بعض لوگ اس حقیقت کو نظر انداز کر کے یہ سمجھ لیتے ہیں کہ جس طرح سے واقعات بیان ہوئے ہیں وہ سب مسلسل اور فوراً وقوع میں آئے - مولانا کا یہ خیال صحیح ہے، مگر اس کا اطلاق یہاں غلط ہے - کیونکہ سیاق کلام بتلا رہا ہے کہ روح خداوندی بشکل انسان متمثل ہو کر حضرت مریم کے پاس جبکہ وہ کسی ضرورت سے مکان شرقی میں اپنے گھر والوں سے پس پردہ تھیں، لڑکا دینے آئی - مریم نے کہا کہ میرے لڑکا کیونکر ہو سکتا ہے، مجھے کسی بشر نے چھوا تک نہیں - تو روح نے جواب دیا کہ ولادت بے پدر خدا کے لیے آسان ہے اور یہ ہو کر رہیگا - اس صورت میں 'فحملتہ' کے معنی یہی ہو سکتے ہیں کہ حضرت مریم معاً حاملہ ہو گئیں -

فانتبذت بہ مکانًا قصیًّا - فاجاءہ المخاض الی جذع النخلۃ، قالت یٰلیتنی مت قبل ھٰذا و کنت نسیًا منسیًّا - تو آپ دُور چلی گئیں - یہاں البتہ ضروری نہیں کہ حاملہ ہوتے ہی چلی گئیں - کیونکہ حمل کا احساس کچھ عرصہ کے بعد ہوتا ہے - جب اُنکو احساس ہوا تو آپ (بدنامی کے خیال سے) دُور چلی گئیں اور پھر دردِ زہ آپ کو ایک درختِ خرما کے نیچے لے گیا - تو حضرت مریم فرمانے لگیں کہ کاش میں اس سے پہلے مر جاتی اور نسیًا منسیًّا ہو جاتی -

اول لفظ 'قصیًّا' قابل لحاظ ہے - چونکہ بغیر مباشرت کے حمل رہ گیا تھا تو بدنامی کے خوف سے آپ دُور چلی گئیں تھیں - جیسا کہ عام قاعدہ ہے - پھر وضع حمل کے وقت حضرت مریم کا یہ فرمانا کہ کاش

میں مرجاتی اور نسیاً منسیاً ہو جاتی، قابلِ غور ہے۔ ذرا سیاق کلام کو پیش نظر رکھیے۔ بلا نکاح حمل ٹھہر جانا، حضرت مریم کا شرمندگی کی وجہ سے دُور چلا جانا، وضع حمل کا وقت آنا، اور پھر حضرت مریم کی یہ تمنا کس قدر فطرت انسانی کا سچا نقشہ ہے۔ اگر یہ حمل باقاعدہ شوہر کی مباشرت سے قرار پایا ہوتا تو پھر اس تمنا کی کیا ضرورت تھی؟ اگر یہ کہا جائے کہ دردِزہ سے بیقرار ہو کر یہ خواہش کی ہو، تو میں عرض کروں گا کہ درد و دُکھ کے موقع پر انسان یہ تو کہتا ہے کہ کاش مجھے موت آجائے اور اس تکلیف سے نجات پاؤں، یا کاش موت پہلے سے آجاتی اور یہ مصیبت مجھے برداشت نہ کرنی پڑتی۔ لیکن یہ نہیں کہے گا کہ نسیاً منسیاً ہو جاتا۔ یہ تمنا انسان اُسی وقت کرے گا جب کہ نام بد چھوڑنے کا احتمال ہو تاکہ مرنے کے بعد اُسے کوئی یاد تک نہ کرے۔ حضرت مریم کا خیال تھا کہ اگر میں اس حالت میں مرجاؤں گی تو بھی نام بد باقی رہے گا، لوگ میرا ذکر کریں گے اور میرے جسم میں تھوکیں گے۔ اس لیے آپ نے صرف مرنے ہی کی تمنا نہیں کی بلکہ نسیاً منسیاً ہونا بھی چاہا۔ تاکہ نہ کوئی یاد رکھے اور نہ بُرا بھلا کہے۔

فناداہا من تحتہا الا تحزنی قد جعل ربکِ تحتک سریّا۔ وھزی الیک بجزع النخلۃ تساقط علیک رطباً جنیّاً۔ فکلی واشربی وقری عینا، فاما ترین من البشر احداً فقولی انی نذرتُ للرحمٰن صوماً فلن اکلم الیوم انسیّاً۔ اُسکو درخت کے نیچے سے آواز دی کہ رنج نہ کر، تیرے رب نے تیرے نیچے ایک چشمہ جاری کر دیا ہے، تو درخت خُرما کو ہلا، وہ تجھ پر تر و تازہ پھل گرائے گا، اُسے کھا اور پانی پی اور اپنی آنکھ ٹھنڈی کر، پس اگر تو آدمی کو دیکھے تو کہہ دے (اشارہ سے) کہ میں نے خدا کے لیے ایک روزہ رکھا ہے اور میں آج کسی سے بات نہ کروں گی۔

لفظ 'تحزنی' قابل غور ہے چونکہ آپ کو اس حمل کا بیحد رنج تھا، اس لیے اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ رنج نہ کر، یعنی بدنامی کا خیال نہ کر۔ دردِزہ کی بیقراری کے لیے 'لا تحزنی' نہیں کہا جا سکتا۔ اسکے لیے تو یہ کہیں گے کہ ذرا تحمل و ضبط سے کام لے۔ خداوند تعالیٰ نے حضرت مریم کو 'لا تحزنی' فرما کر نہ صرف ہمت بندھا دی بلکہ ایسے سامان پیدا کر دیے جسکی وجہ سے قدرۃً حضرت مریم کی تسکین ہو گئی اور وہ سمجھ گئیں کہ یہ سب کچھ منجانب اللہ ہوا۔ درخت کے نیچے سے آواز کا آنا، پاؤں کے نیچے سے چشمہ کا جاری ہو جانا اور خشک درخت خرما کا سبز ہو کر تازہ کھجوریں گرانا، اور حضرت مریم کو لوگوں کے اعتراض کا یہ جواب بتلا دینا کہ اگر تم سے کوئی کچھ کہے تو خود خاموش رہنا اور بچہ کی طرف اشارہ کر دینا۔ کیا یہ تمام واقعات حضرت مریم کی تسلی وتشفی کے لیے کافی نہ تھے۔

فاتت بہ قومہا تحملہ۔ منجانب اللہ حضرت مریم کی اس قدر تسلی وتشفی ہو جانے کے بعد وہ اپنے

لڑکے کو گود میں لیکر اپنے لوگوں کے پاس آئیں

یہاں لفظ 'تحملہ' خاص طور پر قابل لحاظ ہے۔ مولانا نیاز فرماتے ہیں کہ حضرت مریم جب عیسیٰ کو اپنی قوم کے پاس لائیں تو وہ جوان ہو چلے تھے، بچے نہ تھے۔ اور اس لیے 'تحملہ' کے معنی اُنکے نزدیک یہ ہیں کہ حضرت مریم اُنکو سواری میں بٹھا کر لائیں۔ میں تسلیم کرتا ہوں کہ لغتہً 'تحملہ' کے یہ معنی بھی ہوسکتے ہیں، لیکن ذرا غور تو کیجیے کہ یہاں کون سے معنے مراد ہونگے 'گود میں اُٹھا کر' یا 'سواری میں بٹھا کر'؟ اگر دوسرے معنے مراد ہیں، تو اسکا ظاہر کرنا فضول تھا۔ فاتت بہ قومہا' کہہ دینا کافی تھا۔ 'تحملہ' قصہ کی کون سی اہم کڑی ہے جسکو خداوند تعالیٰ نے بیان کرنا ضروری سمجھا؟ یہ کہنا ایک بیکار سی بات ہے کہ ماں اپنے بیٹے کو سواری پر بٹھا کر لائی۔ خدا کا کلام ایسے حشو و زوائد اور فضول الفاظ سے پاک ہے۔ پھر یہ سوچیے کہ ماں، بیٹے کو سواری پر بٹھا کر لائی اور خود پیدل آئی۔ بیٹے نے کیونکر گوارا کیا کہ ماں پیدل آئے۔ اگر دونو سواری پر آئے تو 'تحملہ' کی کیا تخصیص۔ غرضکہ مولانا نیاز نے جو معنی بتائے ہیں وہ بالکل غلط ہیں اور اسلوب قرآن کے شایان شان نہیں۔ اسکے مقابلہ میں 'تحملہ' کے یہ معنی کہ وہ اُسکو گود میں اُٹھا کر لائیں، کس قدر مناسب حال ہے۔ یعنی جب حضرت عیسیٰ پیدا ہوے اور اللہ تعالیٰ نے اُنکی ہر طرح تسلی و تشفی کردی تو وہ گود میں اُٹھا کر قوم کے پاس لے گئیں۔

قالوا یا مریم لقد جئت شیئاً فریا۔ یا اُخت ہارون ما کان ابوک امرأ سوء و ما کانت اُمک بغیا۔

لوگوں نے جو حضرت مریم کی گود میں بچہ دیکھا تو بولے کہ اے مریم یہ کیا شے عجیب لائی؟ یعنی نکاح بغیر یہ بچہ کیسا؟ اے ہارون کی بہن، نہ تیرا باپ خراب آدمی تھا اور نہ تیری ماں بدکار تھی۔

یہاں ایک ایک لفظ قابل غور ہے۔ ذرا دیکھیے کہ جب خاندان کی لڑکی بے باپ کا بچہ لیکر آئے گی تو قوم کس قدر مشتعل ہوگی؟ اور کیا کیا کچھ نہ کہے گی؟ ان خیالات و جذبات کو کس خوبی کے ساتھ ان مختصر سے الفاظ میں ادا کیا گیا ہے؟ قوم کہتی ہے کہ تو نے یہ کیا غضب کیا، نہ تیرا باپ بدچلن تھا نہ تیری ماں بدکار تھی، یہ بیٹا (نعوذ باللہ) حرام کا کہاں سے لے آئی؟

مولانا نے ان آیات کی اہمیت مطلقاً کچھ نہ بیان کی۔ اگر حضرت عیسیٰ بقول مولانا نیاز، باپ سے پیدا ہوے تھے، اور اُس وقت یعنی جب مریمؑ اُنکو قوم کے پاس لائیں، جوان اور پیغمبر تھے، تو سمجھ میں نہیں آتا کہ حضرت مریم سے ان سخت الفاظ میں مواخذہ کیوں کیا گیا۔ اگر اُنکو حضرت عیسیٰ کے مدعی نبوت ہونے کا مواخذہ اُن کی ماں سے کرنا تھا تو یہ کہتے کہ اے مریم تیرے ماں باپ بڑے آبا و اجداد اور مذہب کے پابند تھے، یہ تیرا بیٹا کیونکر کافر ہو کر نبوت کا دعوے کرنے لگا۔ غرضکہ مواخذہ کے

الفاظ صاف بتلا رہے ہیں کہ حضرت مریم حضرت عیسٰی کو بحالت شیر خوارگی لے گئیں تو قوم نے ولادتِ بے پدر کا مواخذہ کیا۔

فاشارت الیہ، قالوا کیف نکلم من کان فی المھد صبیا۔ حضرت مریم نے قوم کے مواخذہ کے جواب میں سابقہ تلقین الٰہی کے مطابق حضرت عیسٰی کی طرف اشارہ کیا، تو اُن لوگوں نے کہا کہ گہوارے کے بچے سے کیونکر گفتگو کریں؟

حضرت مریم نے زبان سے کچھ جواب نہیں دیا، کیونکہ آپ نے حسب تلقین الٰہی بات نہ کرنے کا روزہ رکھ لیا تھا۔ البتہ اشارہ کے ذریعہ سے قوم کو سمجھا دیا کہ میرا تو روزہ ہے نہ بول سکوں گی، خود اس لڑکے سے دریافت کر لو۔ تو وہ متعجب ہو کر بولے کہ ہم بچے سے کیا گفتگو کریں۔

یہاں یہ شبہہ ہو سکتا ہے کہ خدا کی طرف سے تو حضرت مریم کو صرف اتنا تبلایا گیا تھا کہ اگر کوئی آدمی تجھ سے پوچھے تو تو کہدینا کہ آج میرا روزہ ہے، کسی سے بات نہ کروں گی، حضرت مریم نے بچہ کی طرف اشارہ کیسے کیا۔ اس کا جواب یہ ہے کہ بہ قول مولانا نیاز، قرآن شریف کا اسلوبِ بیان یہ ہے کہ قصہ کی درمیانی غیر ضروری کڑیاں چھوڑ دی جاتی ہیں، تاکہ وہ خود بخود ذہن میں آجائیں۔ اس کلیہ کو یہاں پر استعمال کیجیے۔ خدا نے پہلی کڑی تو یہ بیان کر دی کہ درخت خرما کے نیچے خدا نے حضرت مریم کی ہر طرح تسلی وتشفی کر دی اچھی طرح بتا دیا کہ لوگوں سے کہدینا کہ میرا تو روزہ ہے میں کسی سے بات نہ کروں گی۔ آخری کڑی یہ بتا دی کہ مواخذہ پر حضرت مریم نے عیسٰی علیہ السلام کی طرف اشارہ کر دیا کہ میری طرف سے یہ جواب لیگا میرا تو روزہ ہے تو یہ بات خود بخود ذہن میں آجاتی ہے کہ خدا نے صرف اتنا ہی نہیں بتایا تھا کہ کہدینا میرا تو روزہ ہے۔ کیونکہ بات کرنیکا تو روزہ ہے، اور پھر خود ہی کہدینا کہ آج روزہ ہے، اجتماع ضدین ہے۔ خدا نے روزہ کی حالت میں اشارہ کے ذریعہ سے مافی الضمیر ظاہر کر دینے کی تدبیر بھی ضرور بتا دی ہوگی۔ یعنی کہدیا گیا ہوگا کہ تم تو خاموش ہو جانا اور بچہ کی طرف اشارہ کر دینا، لوگ مطلب سمجھ جائیں گے۔

کیف نکلم من کان فی المھد صبیا۔ خاص طور پر قابل لحاظ ہے۔ لوگوں نے کہا کہ ہم بچے سے کیا پوچھیں، تجھ سے پوچھتے ہیں، تو بتا۔ دیکھیے یہ معنی کس قدر مناسب حال ہیں۔ شروع سے آخر تک ایک ہی تلازمہ ہے اور ایک ہی نہج کا سیاق کلام، رتی بھر بھی فرق نہیں۔ مولانا نیاز فرماتے ہیں کہ اسکے یہ معنی ہیں کہ ہم اس سے کیا بات کریں جو گہوارے کا بچہ تھا۔ یہ کیا بات ہوئی، ہر شخص خواہ کتنا ہی بڑا کیوں نہ ہو جائے، وہ بلحاظ زمانۂ گذشتہ، گہوارہ کا بچہ ہی ہوتا ہے۔ اس معنی کر تو خود حضرت مریم گہوارے کی بچی تھیں۔ یہاں لفظ 'کان' کی وجہ سے شبہہ ہو سکتا ہے کہ یہ ماضی کا صیغہ ہے جسکے معنی 'تھا' کے ہیں۔ یعنی من کان فی المھد صبیا کے یہ معنی ہوسے کہ جو گہوارہ میں تھا۔ اس کا جواب یہ ہے کہ کان 'ہے' کے معنوں میں بھی مستعمل ہوتا ہے۔ قرآن شریف میں ہے کان اللہ علیما حکیما جسکے معنے

یہ نہیں ہیں کہ اللہ علیم و حلیم تھا۔ بلکہ یہ ہیں کہ اللہ علیم و حلیم ہے۔ "کان" کا یہ استعمال عام ہے۔

علاوہ بریں یہ قرآن کا کمال ہے کہ اکثر ایک آیت دوسری آیت کی تشریح و تفسیر کردیتی ہے سورۂ آل عمران کی ایک آیت ہے حضرت عیسٰی کے بارے میں ویکلم الناس فی المہد وکہلا یعنے وہ آدمیوں سے گفتگو کرتے تھے شیر خواری کے زمانہ میں بھی اور بڑے ہو کر بھی۔ اس آیت نے بالکل صاف کردیا کہ حضرت مریم حضرت عیسٰی کو شیر خواری میں قوم کے پاس لے گئی تھیں۔ کیونکہ آگے چل کر حضرت عیسٰے کے شیر خواری میں تکلم کرنے کا ذکر آیا ہے۔

قال انی عبد اللہ آتانی الکتاب وجعلنی نبیا وجعلنی مبارکا این ماکنت واوصانی بالصلوٰۃ والزکوٰۃ ما دمت حیا وبرا بوالدتی ولم یجعلنی جبارا شقیا۔ حضرت عیسٰی فوراً بول اُٹھے اور کہا کہ میں اللہ کا بندہ ہوں اللہ تعالیٰ ضرور مجھ پر کتاب نازل کرے گا اور مجھے نبی بنائے گا اور بنایا ہے اُس نے مجھے برکت والا، جہاں کہیں میں رہوں، اور مجھ کو ہدایت کی ہے نماز و روزہ کی جب تک میں زندہ رہوں اور بنایا ہے مجھے نیکی کرنے والا اپنی ماں کے ساتھ اور نہیں بنایا مجھ کو سرکش بدبخت۔

یہاں آتانی الکتاب و جعلنی نبیا قابل لحاظ ہے۔ اگرچہ یہ دونوں ماضی کے صیغے ہیں مگر مستقبل کے معنی میں ہیں۔ یعنی اللہ تعالیٰ مجھ کو ضرور کتاب دے گا اور نبی بنائے گا۔ یقین و وثوق کے موقعہ پر عام طور پر ماضی کا صیغہ مستقبل کے مفہوم میں بولا جاتا ہے۔ اُردو میں بھی تو کہتے ہیں" لو چلدیئے" حالانکہ ابھی چلے نہیں، چلنے کا ارادہ کیا ہے۔

اور پھر برا بوالدتی قابل غور ہے۔ اگر حضرت عیسٰی کا باپ ہوتا تو کیا اُنکے ساتھ نیکی کرنے کا حکم نہ ہوتا۔ کیا قرآن شریف میں کسی اور موقع پر والدین کے درمیان تفریق کی گئی ہے۔ جہاں کہیں ماں باپ کی تعظیم و تکریم کا ذکر آیا ہے کیا وہاں لفظ والدین نہیں آیا ہے۔ اسی سورۂ مریم میں حضرت مریم سے پہلے حضرت یحییٰ کے قصہ میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے وبرا بوالدیہ چونکہ یحییٰ ماں اور باپ دونوں سے پیدا ہوئے تھے اس لیے برا بوالدیہ فرمایا گیا اور حضرت عیسٰی بے باپ پیدا ہوئے تھے اس لیے برا بوالدتی صادق آیا۔

سورۂ مریم کی آیات کے مطالب آپ نے اول سے آخر تک خوب پڑھ لیے۔ اب ذرا اسلوب بیان، سیاق کلام، طرز عبارت، انتخاب الفاظ، تسلسل مضمون، سب باتوں پر ازراہِ انصاف و بے تعصبی نظر غائر ڈال کر دیکھیے اور جو کچھ ہر آیت کے متعلق عرض کیا گیا ہے اُسکو غور و خوض سے پڑھکر سوچیے کہ آیا ان آیات سے حضرت عیسٰی کا بے باپ کے پیدا ہونا ثابت ہوتا ہے یا نہیں۔

اگر محض اس خیال کی بنا پر کہ انسان کا بے پدر پیدا ہونا خلاف قانون قدرت اور اس لیے لغو و محال ہے، آپ کا فیصلہ برعکس ہو تو پھر یوں سوچیے کہ کیا آپ ولادت بے پدر کے واقعہ کو ایک حقیقی واقعہ سمجھنا پسند فرمائیں گے یا کلام اللہ کے طرز عبارت کو بجائے ہدی للمتقین ہونے کے غیر واضح، مذبذب بین المنین اور گمراہ کن سمجھنا گوارا کریں گے کیونکہ ان آیات سے اگر ولادت بے پدر کی تردید پائی جاتی ہے، تو کم از کم ان آیات قرآنیہ کی بابت (نعوذ باللہ) یہ ضرور ماننا پڑے گا کہ خود خداوند تعالیٰ کو حق کا چھپانا اور دنیا کو دھوکا دینا مقصود تھا کہ اول سے آخر تک ایسا سیاق کلام اختیار کیا کہ لفظ لفظ سے ولادت بے پدر کی تائید ہوتی ہے، مگر اصل نشا اُسکے خلاف۔ ہذا شئی عجیب۔ حضرت عیسیٰ کو جو ابن اللہ کہا جاتا تھا اُسکی وجہ یہ تھی کہ آپ بے باپ کے پیدا ہوئے تھے۔ خداوند تعالیٰ نے اس عقیدہ کی بارہا تردید فرمائی۔ لیکن کس طرح؟ مذبذب بین المنین طریقہ سے۔ کیا خدا یہ نہیں کر سکتا تھا کہ اے لوگو جسے تم ابن اللہ خیال کرتے ہو وہ توباقاعدہ اپنے انسانی باپ کے مادہمین سے پیدا ہوا ہے۔ علاوہ بریں ان دو آیتوں پر غور کیجیے:

۱۔ "المسیح ابن مریم رسول اللہ وکلمۃ القٰھا الی مریم وروح"

۲۔ والتی احصنت فرجہا فنفخنا فیہا من روحنا وجعلنٰہا وابنہا آیۃ للعالمین

دیکھیے ان دونوں آیتوں کے ایک ایک لفظ سے اُسی حقیقت کی جو سورہ مریم کی آیات میں بیان ہوئی ہے کس قدر تائید ہوتی ہے۔ اور وہ حقیقت یہ ہے کہ حضرت مریم میں خدا نے اپنی روح پھونکدی تو حضرت عیسیٰ بے باپ کے پیدا ہوگئے۔ اور اس لیے یہ دونوں ماں بیٹے دنیا کے لیے نشانی بنائے گئے کہ انکو دیکھ کر خدا کے قادر مطلق ہونے پر ایمان لائیں۔ حضرت عیسیٰ کو ابن مریم فرمایا جانا بھی خاص طور پر قابل لحاظ ہے۔ مولانا نیاز کا یہ فرمانا کہ نفخ روح حضرت مریم ہی کے ساتھ مخصوص نہیں ہے بلکہ ہر انسان کے ساتھ یہی واقعہ پیش آتا ہے، صحیح ہے۔ لیکن ہر انسان کی ولادت کا واقعہ ایسا تو نہیں ہوتا جیسا کہ حضرت عیسیٰ کی پیدائش کا قرآن شریف میں بیان کیا گیا ہے۔

قرآن شریف کی کوئی آیت اس عقیدے کے خلاف پیش نہیں کی جا سکتی۔ مولانا نیاز نے بہت کچھ زور لگا کر ایک آیت تو وہ پیش کی جس سے حضرت عیسیٰ کا حضرت ابراہیم کی آل سے ہونا پایا جاتا ہے۔ جناب نیاز فرماتے ہیں کہ اگر حضرت عیسیٰ کا کوئی باپ نہ مانا جائے تو آپ حضرت ابراہیم کی آل میں کیونکر داخل ہو سکتے ہیں؟ اسکے جواب میں عرض ہے کہ کیا ماں کی طرف سے آپ آل ابراہیم میں نہیں آسکتے؟ قرآن میں حضرت مریم کو بنت عمران کہا گیا ہے۔ ان کا آل عمران میں سے ہونا مولانا نیاز

تسلیم کرتے ہیں ۔ غرضکہ جب حضرت مریم آل عمران سے ہیں تو آل ابراہیم سے بھی ہوئیں، کیونکہ آلِ عمران آل ابراہیم سے ہیں دو دلیل سے :-

دلیل اوّل ۔ جس آیۂ قرآنی سے مولانا نیاز حضرت عیسیٰ کو حضرت ابراہیم کی آل میں ہونا قرار دیتے ہیں اُسی سے حضرت موسیٰ و ہارون کا بھی آل ابراہیم میں داخل ہونا پایا جاتا ہے ۔ اور یہ دونوں بھائی، عمران کی اولاد سے تھے ۔

دلیل دوم ۔ دوسری آیۂ قرآنی ہے :- ان اللہ اصطفٰے آدم و نوحا و آل ابراہیم و آل عمران علی العالمین ۔ اس آیۂ میں جو ترتیب اختیار کی گئی ہے اُس سے ظاہر ہے کہ آل عمران آل ابراہیم ہیں، اور آل ابراہیم آل نوح میں اور آل نوح آل آدم میں مدغم ہیں ۔

مولانا نے حضرت عیسیٰ کی ولادت بے پدر کے خلاف دوسری آیت یہ پیش کی ہے : والتی احصنت فرجہا فنفخنا فیہا من روحنا وجعلناہا وابنہا آیۃ للعالمین ۔ آپ کا استدلال ہے کہ محصنہ زنِ شوہردار کو کہتے ہیں ۔ اور حضرت مریم کے لیے ' احصنت ' کا لفظ استعمال ہوا ہے ۔ لہذا وہ زنِ شوہردار تھیں ۔

اس کا جواب یہ ہے کہ ' محصنہ ' صرف زن شوہردار ہی کو نہیں کہتے، بلکہ عفیفہ غیر منکوحہ عورت کو بھی کہتے ہیں ۔ چنانچہ قرآن شریف کے پارۂ پنجم کے پہلے صفحہ میں یہ لفظ دونوں معنوں میں مستعمل ہوا ہے ۔ والمحصنٰت من النساء سے تو شوہردار عورتیں مراد ہیں، لیکن آگے چل کر آیت ہے : ومن لم یستطع منکم طولا ان ینکح المحصنٰت الخ میں محصنٰت سے مراد یقینی طور پر آزاد عورتیں ہیں ۔ اگر شوہردار عورتوں سے مراد لی جائے گی تو اُن سے نکاح کیونکر ہو سکتا ہے ؟ علاوہ بریں لفظ ' محصنہ ' اسم مفعول کا صیغہ ہے ۔ اور یہاں احصنت فرجہا میں حضرت مریم فاعل ہیں ۔ یعنی اپنے شرمگاہ کی حفاظت کرنے والی ۔ جس سے مراد اُنکا عفیفہ ہونا ہے ۔

مولانا نے صرف دو آیتیں اپنے خیال کی تائید میں پیش کیں ۔ دونوں کا تشفی بخش جواب ہو گیا اب رہی ' کلمہ ' کی بحث ۔ یہ مولانا کا محض ادعا ہے کہ قرآن شریف میں کسی جگہ اسکے معنی لفظ یا کلام کے نہیں لیے گئے ۔ مولانا نے جس قدر آیات پیش کی ہیں اُن سب میں لفظ ' کلمہ ' کے معنی لفظ یا کلام ہی کے ہیں ۔

ان اللہ یبشرک بیحیٰی مصدقا بکلمۃ من اللہ ۔ میں کلمۃ اللہ سے مراد حضرت روح اللہ ہیں ۔ چنانچہ دوسری آیت اسکی تشریح و تائید کرتی ہے ۔ المسیح ابن مریم رسول اللہ و کلمتہ

القٰھا الیٰ مریم وروح منہ ۔ دیکھیے اللہ تعالیٰ نے حضرت عیسٰی کو کلمۃ اللہ بھی کہا ہے اور روح اللہ بھی۔ حضرت یحییٰ نے حضرت عیسٰی کی تصدیق فرمائی تھی لہذا اُنکو مصدقاً بکلمۃ من اللہ کہا گیا۔

لا تبدیل لکلمات اللہ سے اللہ کی باتیں مراد ہیں، یعنی جو کچھ اللہ تعالیٰ کہہ دیتا ہے یا کہہ چکا ہے وہ بدل نہیں سکتا۔

قل لو کان البحر مدادا لکلمات ربی میں "مداد" کا لفظ صاف بتلا رہا ہے کہ کلمات کے کیا معنی ہیں۔

غرضکہ حضرت عیسٰی کے بارے میں جس قدر آیات نازل ہوئی ہیں اُن سب کو ایک جگہ جمع کرکے مقابلۃً وموازنۃً غور کیا جائے اور باہمی تناسب اور سیاق کلام کا پورا لحاظ رکھا جائے تو ایک ایک لفظ سے حضرت عیسٰی کے بے باپ پیدا ہونے کی تائید ہوگی۔ ورنہ یہ ماننا پڑے گا کہ (نعوذ باللہ) خود خدا کو اخفاے حقیقت مقصود تھا۔ وما توفیقی الا باللہ العلی العظیم۔

زبید احمد

جب ذرا قیدِ تعیّن سے نظر آزاد کی — ہٹ کے اس دُنیا سے اِک دُنیا نئی آباد کی

کیا ہوا بدلی ہوئی ہے گلشنِ ایجاد کی — بھول جانے کو وہ بتلاتے ہیں صورت یاد کی

اے اجل اے آرزو میرے دلِ ناشاد کی — دل کی ہر دھڑکن کو خواہش ہے تری امداد کی

کچھ عجب رسمیں ہیں عشقِ خانماں برباد کی — داد لینی چاہتے ہیں مجھ سے وہ بیداد کی

حشر تک اب مجھ کو شاید ہو نہ یہ موقع نصیب — اے اجل تھم جا کہ صورت دیکھ لوں جلّاد کی

وحشتِ دل اک ذرا بڑھنے تو دے اے چارہ گر — رنگ لیا خونِ دل ہی میں قبا فصاد کی

حسن کی بیباکیوں نے آج وہ بھی کاٹ دی — داستانِ غم میں اک سرخی جو تھی فریاد کی

میری حالت دیکھ کر کچھ رحم اُن کو آگیا — موت سے حدّیں ملا دیں قیدِ بے میعاد کی

نازِ استغنا پہ اتنا اے وفا ناآشنا — ہر جفا ممنونِ منت ہے مری امداد کی

زندگی کہتے ہیں غم کو غم ہے اصل زندگی — تیری نظریں ہیں مکمل شرح اس رُوداد کی

اے وفا ناکام دل میں تیری باتوں کے نثار — پھر کوئی توجیہ کرتا محنتِ برباد کی

کس قدر مختار خوش ہے وہ اسیری پر مری
قید سے حالانکہ پابندی ہے خود صیاد کی

مختار بدایونی

فریبِ خیال

دس سال کا عرصہ گذرا جب میں جہاز پر ملازم تھا۔ میرے ہمراہ شاہد بھی اُسی جہاز پر ایک کیڈٹ کی حیثیت سے کام کرتا تھا۔ ہم دونوں لطیف الخیال اور نرم دل تھے۔ سمندر کی روح پرور اور نشاط افزا ہوائیں ہمارے قلوب میں زمانِ سابق کی یاد پیدا کرتی تھیں، پانی کی بھاری اونچی لہریں ہمارے ایام شباب کے اُس دریائے محبت کی مثال تھیں جو ہمارے سینوں میں کبھی اُبلا تھا۔ کبھی کبھی راتوں کو جب چاند اپنی روپہلی کرنوں سمیت سمندر کی سطح پر اپنی ننھی کشتی ہمارے جہاز کے ساتھ ساتھ کھیتا تھا اور تارے چُپ چاپ ہمارے جہاز کے ساتھ بہتے تھے اور ٹھنڈی، کسی دُور کی سرزمین سے آنے والی بھینی ہَوا ہمارے دل کے پردوں کو جہاز کے بادبانوں کی طرح پھیلاتی اور سمٹتی تھی ہم اچھی اچھی باتیں کرکے راتیں ختم کرتے، رات کے اُس حصہ میں جب تمام مسافر غافل اور خاموش ہو جاتے اور پانی کے متصل تھپیڑوں یا انجن کی مسلسل سنسناہٹ کے سوا کوئی آواز فضا میں پیدا نہ ہوتی۔ ہمارے دھیمے لہجے اس سکوت کے پردے میں ایک سوراخ کرتے اور جیسے اس سوراخ سے ہَوا ایک دھیمی اور تیز سیٹی بجاتی ہوئی نکل جائے اسی طرح ہماری باتوں کی آواز ایک ہلکا راگ پیدا کرتی ہوئی فضا میں پھیل جاتی تھی۔

اسی طرح کی ایک رات تھی، ہمیں کام سے فرصت مل چکی تھی اور باتیں کرتے کرتے دو بج گئے تھے، مختلف موضوع پر ہم گفتگو کر چکے تھے مگر ہمارے دماغ تھکن سے خالی تھے اور آنکھوں میں ابھی نیند نہ آئی تھی، شاہد اپنی کُہنی کے بل جہاز کے بالائی حصہ میں فرش پر میرے پاس پڑا تھا، میں لوہے کی سلاخوں سے لگا اُفق پر نظر جمائے تھا جو سکوت اور سکون کی سرزمین معلوم ہوتی تھی۔

"جس طرح سال میں مختلف موسم ہوتے ہیں اسی طرح حیاتِ عاشقہ میں بھی مختلف دَور ہوتے ہیں" میں نے کہا۔

"شاید تمھارا مطلب یہ ہے کہ محبت کبھی گھٹتی ہے کبھی بڑھتی ہے، کبھی ایک نازک تار سے لٹکی ہوئی معلوم ہوتی ہے اور کبھی جسم و جان، خیالات، معتقدات، پوری دنیا پر حاوی ہو جانا چاہتی ہے۔" شاہد نے ادا کیا۔

"سال میں بہار و خزاں، گرمی و سردی وغیرہ کے موسم ہوتے ہیں" میں نے کہا "عشق کی زندگی میں بھی مایوسی و کامرانی، شبہ و یقین، بیوفائی اور وفاداری کے دور ہوتے ہیں، کبھی معلوم ہوتا ہے کہ کامرانی و خوش بختی ہی محبت کا انجام ہے لیکن تھوڑے ہی دن بعد یہ عقیدہ باطل شروع ہوتا ہے اور یوں محسوس ہوتا ہے کہ مایوسی و بیدلی محبت کا نتیجہ کار ہے، ایسی حالت میں تمام پچھلے رنگین افسانے کمزور و مضمحل ہو کر ٹوٹ جاتے ہیں، ان میں یقین کا کوئی شائبہ نہیں رہتا، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ غم محبت ہی کی نہیں دنیا کی سب سے بڑی حقیقت ہے"۔

"ہاں"، لیکن میں سمجھتا ہوں کہ یہ ہمارے ہی احساسِ قلب یا تصورات ذہنی کا نتیجہ ہے" شاہ نے کہا "کسی خاص وقت میں ہمارے دل و دماغ پر ایسی مایوسی چھا جاتی ہے کہ واقعات کے تمام رخ بدلے ہوئے نظر آنے لگتے ہیں، واقعات میں بذات خود تبدیلی نہیں ہوتی، وہ اپنی جگہ پر ویسے ہی ہوتے ہیں جیسے کہ پہلے تھے، یا اگر تبدیلی ہوتی ہے تو کم ہوتی ہے، ہم خود کسی خاص اثر کے ماتحت اس قدر بے دل ہو جاتے ہیں کہ تمام دنیا ہمیں بدلی ہوئی نظر آتی ہے، اس اثر میں ڈوبی ہوئی معلوم ہوتی ہے جس سے ہمارا ذہن متزلزل ہوتا ہے، اسے واضح کرنے کے لیے میں اپنی جوانی کی ایک کہانی کہوں"۔

اُس نے کہنا شروع کیا:

"یہ ۱۹۰۸ء کا قصہ ہے، اُس وقت میں بائیس برس کا تھا،

جس لڑکی سے مجھے محبت تھی اُس سے میں مایوس ہو چکا تھا، میرے والدین ایک سے زائد مرتبہ صاف الفاظ میں اپنے فیصلہ کا اعلان کر چکے تھے کہ وہ کبھی اُسکے ساتھ میری مناکحت قائم نہ کریں گے، اس فیصلہ کا میرا دل متحمل نہ ہو سکتا تھا، میری محبت وہ محبت نہ تھی جو آئے دن بدلی جاتی ہے، نہ وہ محبت تھی جس کا اندازہ کم ہو سکتا ہے، وہ محبت جو دنیا میں تنہا رہنا چاہتی ہے، جو تمام دنیا پر قدرت حاصل کرنا چاہتی ہے، میرے والدین میرے جنون کے اس ہمہ گیری سے ناواقف تھے، وہ سمجھتے تھے کہ میری محبت صرف اُن اشتعال آمیز جذبات پر مبنی ہے جو نوجوانوں میں عام طور پر پائے جاتے ہیں، وہ کسی دوسری جگہ میری شادی کرنا چاہتے تھے، اُن کا خیال تھا کہ شادی میرے مرض کا علاج ہے، اور شادی میرے دل سے میری عزیز تجربہ کو نکال کر مجھے مطمئن و کامراں بنانے میں کامیاب ہوگی۔

محبت ہماری آنکھوں پر پردہ ڈال دیتی ہے، محبوب کے عیوب بھی ہمیں محاسن نظر آتے ہیں،

لیکن نجمہ اس کلیہ سے مستثنیٰ تھی، یہ نہیں کہ محبت نے میری آنکھوں پر پردہ ڈال دیا تھا اسلیے نجمہ کے عیوب بھی میری نظر میں محاسن تھے بلکہ نجمہ فی الواقع اسقدر حسین اسقدر مکمل و پاکباز تھی کہ میں اُسپر مٹتا تھا، نجمہ ایسی مکمل —— ہر صحیح معنی میں مکمل —— لڑکی تھی کہ اس سے زیادہ مکمل لڑکی کا تخیل دشوار ہے اور بس، اسی وجہ سے وہ میری رگ رگ میں، جوڑ جوڑ میں ایک زہر کی طرح چھلک گئی تھی، پیوست ہوگئی تھی، اُس سے رہائی ناممکن تھی، ہم دونوں ساتھ ساتھ کھیلے تھے، میں صاف صاف کیوں نہ کہوں، وہ میری چچی کی لڑکی تھی، بچپن سے ایک گھر میں رہنا، ایک ساتھ پڑھنا، کھیلنا، گھومنا، پھرنا، سب ساتھ ساتھ ہوتا تھا، ابتدا ہی سے وہ ایک سنجیدہ قسم کی خاموش لڑکی تھی، وہ تمام گھر میں سب سے زیادہ مجھے چاہتی تھی، اپنی پریشانیاں، اپنی ذرا ذرا سی راز کی باتیں سُنا کر مجھ سے اپنی پریشانیوں کا علاج پوچھتی تھی، میں بھی اُسے اپنی جان سے زیادہ عزیز سمجھتا تھا، اکثر تنہائی میں ہم دونوں گھنٹوں خاموش کھڑے ایک دوسرے کو دیکھا کرتے، کبھی مجھے اُس پر پیار آتا اور میں اُسکی پیشانی کے بوسے لیتا، ..... آہ! کسے معلوم تھا کہ بچپن کا یہ سادہ کھیل جوانی میں ہمارے دلوں پر نقش محبت بن جائے گا جس کا مٹانا اس قدر آسان نہ ہوگا جتنا میرے والدین خیال کرتے تھے۔

میرے والدین چاہتے تھے کہ میں وہاں کا آنا جانا بھی ترک کر دوں، اور آنا جانا ہی کیا وہاں کے تذکرے تک کبھی بھولے سے گھر میں نہ ہوتے، اور اگر اُن کا ذکر کوئی کرتا تو وہ بہت بڑا مجرم سمجھا جاتا، اُسے گھر بھر کی باتیں سننا ہوتیں، میری نجمہ اپنے والدین کے ساتھ اشرف آباد چلی گئی، زمانہ کے ہاتھوں ہم جدا ہوگئے، زمانہ کو کس کی پروا ہے، ہمارے درمیان سیکڑوں میلوں کا فاصلہ تھا، ہم عرصہ تک ایک دوسرے سے نہ مل پاتے اور اگر چار پانچ سال بعد کبھی وہاں مجھے جانے کا اتفاق ہوتا، تو اب نجمہ کو میرے سامنے نہ لایا جاتا، آہ، قریب ہونے پر بھی اس قدر دوری، ان موانع کے باوجود ہم دونوں کی آگ بھڑکتی رہی رہی اور ہم ایک دوسرے کو دیوانگی سے چاہتے رہے۔

میں سخت مصیبت میں تھا، میرے والدین اپنی ضد پر قائم تھے، اُن کا فیصلہ مایوس کن تھا، وہ میرے لیے پیام اجل تھا، میں ہمیشہ اپنا وقت علمی اور تفریحی مشاغل میں گذارتا تھا، مختلف قسم کے کھیلوں، شکار اور گھوڑے کی سواری میں شوق سے حصہ لیتا تھا، مگر اب مجھے ہر چیز سے نفرت ہوگئی تھی، مجھے تنہائی پسند تھی، تنہائی میں اپنی کتاب اپنے پہلو میں، سینے پر، یا آنکھوں کے سامنے رکھتا، کتاب ہی میری سہیلی تھی، کتاب میں میں محبت کے خواب دیکھتا، تمام علائق سے میں کنارہ کش ہو چکا تھا اندر جانا بھی میں نے کم کر دیا، باہر اپنے کمرہ میں ہفتوں پڑا رہتا مجھے اپنے والدین، اپنی بہنوں سے ملنے

بھائیوں سے نفرت ہوگئی تھی، سب مجھے دشمن معلوم ہوتے تھے، ان میں سے کوئی میری خوشی کا خواہاں نہ تھا، سب مجھے تکلیف پہونچانا چاہتے تھے، کبھی کبھی کھانا کھانے اندر چلا جاتا اور بس گھر سے اسی قدر تعلق رہ گیا تھا، مجھے بھوک بھی کم لگتی، کبھی میں تین تین وقت کھانا نہ کھاتا، اور یہ تو کیسے کہوں کہ مجھے تکلیف نہ ہوتی لیکن ہاں اس فاقہ کشی سے مجھے روحانی تسکین ہوتی، مجھے ایسا معلوم ہوتا جیسے میں محبت کے لیے بڑی قربانی کر رہا ہوں، میں ہر وقت مغموم رہتا، میرے دل میں ایک عجیب افسردگی تھی جو میرے ماحول کو بھی متاثر کرتی تھی، دنیا مجھے تاریک نظر آتی تھی، میرے رفیق مجھے اپنے دشمن معلوم ہوتے تھے، گھر کاٹنے کو دوڑتا تھا، وحشت و پریشانی ہر طرف چھائی ہوئی معلوم ہوتی، میں نے گفتگو بھی کم کر دی، گھر میں اکثر میرے خوش کرنے کو شادی کے تذکرے ہوتے مگر مجھے وہاں کی ایک بات بھی بے عیب نہ معلوم ہوتی، جو بات مجھے خوش کرنے کو کی جاتی میں اُسے ایک سخت ترین دشمنی کی حرکت سمجھتا، اس ہر وقت کی کوفت نے، ہر وقت کی خاموشی، گرانی اور بیدلی نے مجھے مایوس کر دیا، جسمانی سختیوں نے مجھے مضمحل کر دیا، مگر مجھے اپنی روح میں بالیدگی محسوس ہوتی، جب میں غم کی سختی سے بیزار ہو کر ایک آنسو بھی بہاتا مجھے ایسا معلوم ہوتا گویا میں نے کوئی بڑا کار ثواب کیا ہے، میرا دل اس قدر نازک، اس قدر رقیق ہوگیا تھا کہ بات بات پر جی اُمنڈنے لگتا، جیسے سینہ پر ایک گھٹا ہو جو نہ کھلتی ہے نہ برستی ہے اور اگر کبھی برستی بھی ہے تو صرف ایک یا دو بوند، جو میرے سینہ کے وزن کو، بوجھ کو، میری کلفت و مایوسی کو کچھ بڑھا ہی دیتی ہے، مجھے اس میں بھی ایک اطمینان، ایک سکون محسوس ہوتا، مجھے ایسا معلوم ہوتا گویا میں ہلکا ہوگیا ہوں، گویا قید جسم سے آزاد ہو کر میں ہوا بنگیا ہوں، گویا میں اوپر اُٹھتا ہوں، اُڑتا ہوں، ایک صاف شفاف بادل، ایک مجسمۂ نور و اخلاص بنکر آسمانی بلندیوں پر جھولتا ہوں۔

میرے دل پر ایک بار تھا، جب تک میں گھر پر رہتا زندگی مجھے ایک بار عظیم معلوم ہوتی، اس مسلسل و متصل کوفت سے تنگ آکر کبھی کبھی میں اشرف آباد ہو آتا، جہاں میری نجمہ رہتی تھی، جب تک وہاں رہتا، زندگی ایک مسلسل قہقہہ معلوم ہوتی، وہاں پہونچ کر حیات کا مصرف سمجھ میں آتا، اُن مختصر ایام قیام کو جو وہاں گذرتے میں حاصل زندگی سمجھتا، اب میں اسی اُمید پر جیتا تھا کہ کبھی کبھی اس طرح نجمہ کو دیکھ سکوں گا۔

ایک روز کا واقعہ سناؤں جو دراصل اس تمام گفتگو کا اصل موضوع ہے: ایک شام کو میرا رشتہ کا ایک بھائی مرتضٰی مجھ سے ملنے آیا، یہ اشرف آباد سے آیا تھا، میں نے اُس سے

ایک غیر متعلق شخص کے طور پر نجمہ اور اُسکے گھر کی خیریت پوچھی، مرتضٰی نے جب یہ کہا کہ سب نے مجھے بلایا ہے تو میرے دل پر ایک چوٹ لگی، میں نے مرتضٰی کو رخصت کیا اور وہ اندر چلا گیا۔

میں کھانا کھانے اندر گیا تو مرتضٰی وہاں موجود تھا، چلتے وقت اُس نے مجھ سے محبوب منزل چلنے کو کہا، یہ میرے ایک عزیز کی کوٹھی تھی جہاں مرتضٰی ٹھہرا تھا۔ میں نے اُس سے کچھ دیر بعد آنے کا وعدہ کیا، گھر میں ایک برہمی نمایاں تھی، اشرف آباد سے آنے والا شخص ہمیشہ گھر میں کچھ نہ کچھ برہمی پیدا کر دیتا تھا، تھوڑی دیر بعد ایک نوکر نے اطلاعاً آکر کہا کہ محبوب منزل میں اشرف آباد سے سواریاں آئی ہیں، ایک چھوٹا بچہ بھی اُنکے ہمراہ ہے، میں چونک پڑا، مجھے ایسی خوشی ہوئی کہ بھوک بالکل غائب ہو گئی، اور بے اختیار میری زبان سے نکلا "اختر ہوگا" یہ نجمہ کا چھوٹا بھائی تھا جو اپنی والدہ کے ساتھ سفر میں ہمیشہ رہتا تھا، سب کو یقین ہو گیا کہ نجمہ کی ماں آئی ہیں۔

گھر میں اس خبر نے تہلکہ برپا کر دیا، میری ماں نے چلانا شروع کیا:

"آخر کس لیے آئی ہیں؟ اپنے گھر تو میں کبھی نہ بلاؤں گی اور نہ اپنے لڑکے کو وہاں جانے دونگی، کیا تماشا ہے! ہم نے آج تک نہیں سنا کہ اُلٹے لڑکی والے شادی کا پیام دیں، اور یہ بھی سہی، آخر لڑکے سے کیا واسطہ؟ کیا ہم مر گئے ہیں؟ ہم سے باتیں کریں تو ہم اُنھیں جواب دیں، بچہ کیا جانے، وہ کچّی لکڑی ہے، جدھر جھکا دُ جھک جائے گا..... اور شاہد! تجھ سے بھی کتنی مرتبہ منع کیا کہ وہاں نہ جا مگر تو کب سنتا ہے۔ کیا تجھے لڑکیاں کہیں اور نہ ملیں گی....."

میرے باپ نے برہم ہو کر کہنا شروع کیا:-

"اور یہ دیکھو کہ آج کل کے لڑکے کس قدر شریر ہیں، بھائی میں تو واقعی دنگ ہوں، ہمارے زمانہ میں بھلا ایسی باتیں کہاں تھیں، مرتضٰی گھنٹوں یہاں بیٹھا مگر ذکر تک نہیں کیا کہ سواریاں آتی ہیں....."

ماں پھر بولیں:

"سب سکھا دیئے گئے ہیں، شاہد سے ساتھ چلنے کو تو کہا مگر یہ نہ بتایا کہ کس نے بلایا ہے.... باہر کہہ چکا ہوگا، سب پکے ہیں، خوب بنے ہوئے ہیں، میں کہتی ہوں کہ شاہد اگر تو وہاں گیا تو خدا کی قسم مرتے وقت دودھ نہ بخشوں گی، وہاں کیا میٹھا ہے، تجھے اُس سے اچھی لڑکی نہ دلاؤں تب سہی....."

اور اس سلسلہ میں نجمہ کے خاندانی نقائص، اُسکے گھر کی بد انتظامیاں، خود اُسکے معائب، بدصورتی، بدتمیزی وغیرہ بالتفصیل گنائے گئے، ماں کہتے کہتے چپ ہو جاتیں تو باپ شروع کر دیتے، باپ

تھک جاتے تو اس کی زبان چلنے لگتی،

مجھے سخت صدمہ ہوا، میں سب کچھ سن سکتا تھا مگر نجمہ کی برائی سننا میرے لیے ناقابلِ برداشت تھا، اس گفتگو سے مجھے اذیت ہوئی، میری تمام خوشی خاک میں مل گئی، سر سے پیر تک مجھے ایک طرح کی حرارت محسوس ہونے لگی، میرے سینہ پر ایک بوجھ سا چھا گیا اور قریب تھا کہ میرے آنسو میرے وارداتِ قلب کی تشریح شروع کر دیں لیکن میں نے ضبط کیا اور خاموش اُٹھ کر باہر چلا آیا، چلتے وقت سب نے کھانے کو پوچھا، یہ ایک ٹھیس تھی جس نے میرے کسی حد تک مندمل زخم سے خون جاری کر دیا، ایک آنسو میری پلک پہ سے ڈھلک کر میرے رخسار پر آ گیا، میں نے اپنی گرانی پی ڈالی اور "مجھے اسوقت بھوک نہیں ہے" کہکر غالب کے اِن نشتروں سے اپنا سینہ چھلنی کرتا ہوا باہر چلا آیا:-

رہیے اب ایسی جگہ چل کر جہاں کوئی نہ ہو
ہم سخن کوئی نہ ہو اور ہم زباں کوئی نہ ہو
بے در و دیوار سا اک گھر بنایا چاہیے
کوئی ہمسایہ نہ ہو اور پاسباں کوئی نہ ہو
پڑیے گر بیمار تو کوئی نہ ہو تیماردار
اور اگر مر جائیے تو نوحہ خواں کوئی نہ ہو

رات ہو چکی تھی، میرے کمرہ میں سبز رنگ کے گلوب سے نکل کر ٹھنڈی روشنی پھیل رہی تھی جو مجھے سخت ناگوار تھی، میں نے لیمپ کو دھیما کر دیا اور ایک برسوں کے مضمحل و نڈھال بیمار کی طرح اپنے بستر پر گر گیا، ایک گہرے سکوت میں پڑ کر آہستہ آہستہ کچھ سوچتے ہوئے اپنے دل میں اس مصرعہ کو میں دوہراتا رہا

اور اگر مر جائیے تو نوحہ خواں کوئی نہ ہو!

ایک تکلیف دہ دماغی تھکن مجھے محسوس ہونے لگی، مجھے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ میری زندگی کسی کمزور کچے دھاگے سے زیادہ کمزور رشتہ سے منسلک دُور کہیں لٹک رہی ہے اور اس قسم کی ضرب جیسی کہ اُسوقت والدہ اور والد کی گفتگو سے اُس رشتہ میں لگی ہے اُسے توڑ دینے کو کافی ہوگی، میرا دم گھُٹ رہا تھا، میری سانس اکھڑی اکھڑی معلوم ہوتی تھی، ایسا محسوس ہوتا تھا گویا میں سمندر کی موجوں کے درمیان پے در پے تھپیڑے کھاتا ہوا ڈوبا جا رہا ہوں،

نجمہ کا گھر ایک دلآویز حُسن کا مرکز تھا، اُس نے بھی اُسی مرکز سے کسبِ حُسن کیا تھا، حُسن ایک وسیع و جامع لفظ ہے اس میں ہر طرح کا حُسن شامل ہے، تمام محاسن پوشیدہ ہیں، حُسن میں دوسرا درجہ نہیں ہے، یہ ایک مکمل خواب ہے. حسین عورت کبھی نامکمل نہ ہوگی، لوگ اکثر کہتے ہیں

کہ حُسن تمام عیوب کا پردہ پوش ہے، عورت معائب کی حامل ہو اور حسین ہو تو اُسکے معائب ماند پڑ جاتے ہیں، لیکن یہ غلط ہے، حُسن بذاتِ خود ایک کرشمہ ہے، ایک مقدس و برگزیدہ کرشمہ، ایک برکت، حُسن کبھی نامکمل نہ ہوگا، یہ ایک طاقت ہے جو سب کچھ سکھا دیتی ہے، یہ اپنے ہمراہ تمام محاسن لاتی ہے، جس عورت پر یہ طاقت یہ برکت چھا جاتی ہے اُسکے محاسن بھی پورے طور پر اُس میں جذب ہو جاتے ہیں، حُسن کی لطافت کثافت کو گوارا نہیں کر سکتی، جہاں حُسن ہے عیب کا گذر نہیں، یہ دو مختلف و متضاد چیزیں ہیں جن کا اجتماع نہیں ہوگا، یہ آگ اور پھونس ہیں، حُسن کی آگ ہر چیز کو جلا دیگی، حسن رہے گا یا عیب، دونوں ایک جگہ نہیں رہ سکتے،

مجھے اُس گھر کی ہر چیز سے محبت تھی، وہاں کا ذرہ ذرہ مجھے محظوظ کرنے کی صلاحیت رکھتا تھا، نجمہ سے، نجمہ کی ماں سے، اُسکے بھائی بہنوں سے، سب سے مجھے انتہائی شیفتگی تھی، شاید حُسن میں عمر کی بھی قید نہیں ہے ورنہ کیا وجہ تھی کہ اُسکی چھوٹی بہن میں جو صرف پانچ برس کی تھی، میں حُسن کے وہ تمام لوازم مہیا دیکھتا تھا جو ایک حسین جوان عورت میں ہوتے ہیں؟ ورنہ کیا وجہ تھی کہ میں نجمہ کی ماں میں بھی جو پانچ بچوں کی ماں تھی حُسن کی انتہائی دلفریب اور قابل احترام ضروریات پاتا تھا، جو خود نجمہ کو قابل پرستش بنانے کے لیے اُس میں موجود تھے؟ میں وہاں کسی سے اپنی حسب خواہش گفتگو نہ کر سکتا تھا، میں سب سے محبت کرتا تھا یا سب سے ڈرتا تھا، یا سب کا احترام کرتا تھا، میں آج تک یہ فیصلہ نہ کر سکا، کہ وہ کیا چیز تھی جو مجھے وہاں پہونچ جانے کے بعد بات کرنے سے، نظر اُٹھانے سے، چلنے پھرنے سے روکتی تھی، میری گفتگو ایسی نہ ہوتی جیسی معمولاً ہوا کرتی تھی، میری آنکھیں اِدھر اُدھر دیکھنے میں اتنی آزاد نہ ہوتیں جتنی کہ پہلے تھیں، چلتے وقت میرے قدم اس قدر آزاد، ایسے بے پروا نہ اُٹھتے تھے جیسے میں اپنے یہاں اپنے دوستوں کے ہمراہ اُٹھاتا تھا۔ ایک شرم، ایک لحاظ، ایک عجیب قسم کی ناقابل بیان کیفیت کے زیر اثر میری ہر حرکت بدلی ہوئی ہوتی تھی، مجھے ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے قدم قدم پر مجھے کوئی دیکھ رہا ہے، گویا میری ہر بات جانچی جاتی ہے، تولی جاتی ہے، گویا مجھے یہاں امتحان دینا ہے۔

اپنے بستر پر پڑے پڑے میں رات بھر کچھ سوچتا رہا، اپنی محبت کے پچھلے واقعات کو جو منتشر صورت میں اِدھر اُدھر پڑے تھے مربوط کر کے ایک سلسلہ میں گوندھتا رہا، ایک ایک واقعہ میری نظر کے سامنے بہتا ہوا، تیرتا ہوا، چلا آتا، اور ہر واقعہ میں تازگی اور شگفتگی پیدا تھی، میں سوچ رہا تھا، کہ آج وہ آئی ہے، اُسکا بھائی بھی آیا ہے، اُس کی ماں بھی آئی ہے، وہ ماں جو مجھ سے اس قدر

وابستہ ہے جو مجھ پر اس قدر مہربان ہے، بیشک وہاں میرا انتظار ہو رہا ہوگا، لیکن مرتضیٰ نے مجھ سے کہا کیوں نہیں؟ میں نے ایک ایک بات کریدکرید کر، چھان چھان کر پوچھی بھی، مگر اس نے اسکا ذکر نہ کیا، وہاں چلنے کو بھی مجھ سے کہا مگر انکی آمد کی خبر نہ دی، یہ کیوں؟ ممکن ہے انھوں نے منع کر دیا ہو، مگر ممانعت کی وجہ؟ گھر میں ظاہر کرنے سے منع بھی کیا جاتا مگر مجھ سے پوشیدہ رکھے جانے کی کوئی وجہ نہیں معلوم ہوتی، پھر مجھے خیال ہوا کہ شاید میرے گھر کی عدم توجہی وبے التفاتی نے انھیں بے پروا وبے نیاز بنا دیا ہے، اس خیال سے میرا دل بیٹھ گیا اور میری آنکھوں سے دو قطراتِ اشک ٹپک پڑے۔

پھر میں سوچنے لگا کہ پچھلی مرتبہ اشرف آباد میں مجھ سے کتنا خلوص برتا گیا، کیا یہ سب بےکار تھا؟ کیا اب تک، اتنے عرصۂ گذاشتہ تک کے تمام مراسم یوں ایک دم منقطع ہو جائیں گے؟ کیا میں نے انکے مراسم وتعلقات کے بابت جو رائے قائم کی وہ غلط تھی؟ اگر مجھ سے علٰحدگی یا کشیدگی منظور تھی تو رفتہ رفتہ مجھے ان سرد مہریوں کا عادی بنایا گیا ہوتا، اس یکایک ستم کے پہاڑ سے تو میں چکنا چور ہو جاؤں گا، اور پھر مجھے جانے سے بھی روکا جاتا ہے، کیا واقعی وہ اسی شہر میں ہے؟ اسی شہر میں جہاں میں سڑ رہا ہوں؟ کیا وہ بھی اسی ہوا میں سانس لے رہی ہے جس میں اپنی سرد آہیں نکال کر میں اپنی زندگی گذار رہا ہوں؟

میری سمجھ میں کچھ نہ آیا، میں کبھی مایوس ہوا کبھی بشاش، تمام رات میں نے ایک کربِ اضطراب کے عالم میں کاٹی، مجھے نیند کم آئی اور ہر دفعہ میری آنکھیں ایک لرزشِ مخفی، ایک اختلاجِ قلب کے ساتھ کھل گئیں، میں نے پریشان خواب دیکھے، مہیب صورتیں میرے گرد وپیش آتی رہیں، مجھے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ میں اس رنجِ گراں کی تاب نہ لا سکوں گا، یہ کمزور وناتواں جسم میرے لیے ایک زنداں تھا جسے توڑ کر میں وہاں پہونچنا چاہتا تھا جہاں روحیں ملتی ہیں، جہاں سے روحیں آتی ہیں، میں اس دنیا سے بیزار تھا، اس دن کے واقعہ نے میری روح میں ایک عجیب بےکیفی پیدا کر دی تھی، میں تمام علائق سے کنارہ کش ہو جانا چاہتا تھا، کروٹ بدلنے میں میرے جسم کی ہڈیاں ٹوٹتی تھیں، میرا بستر میرے لیے ایک مزار تھا، ایک بوسیدہ و کمزور گورستان، ایک تنگ مقبرہ، میں اپنے رنج کیلیے ایک وسیع دنیا چاہتا تھا، ایک دوسرا عالم، میرا کمرہ میرے رنج کے لیے ناکافی تھا۔

دو دن اس طرح گذر گئے، میں اپنی عزیز تجربہ سے نہ مل سکا، اٹھتے بیٹھتے میری گھبراہٹ کیجاتی تھی، گویا میں نے کہیں سعید چھوڑی ہے، جسکے مواخذہ میں مجھے سزا بھگتنی پڑیگی، گھر میں سب

متفکر و پریشان تھے، میں نے مطلق نہ کھایا، فاقہ کشی کی انتہائی تکلیفیں برداشت کرتا رہا، اتنے دن میں صرف صبح کے وقت تازہ پانی پی لیتا تھا اور بس، میں نے طے کرلیا کہ جب تک اُسے دیکھ نہ لونگا میں کچھ نہ کھاؤں گا، اس پر میں اس قدر مُصر تھا کہ اپنی جان تک کا مجھے خوف نہ تھا، میری دماغی کیفیت یوں ہی کیا کم مضمحل تھی کہ اس پر یہ فاقہ کشی، میں بیحد ناتوان و حقیر ہو گیا، میرے جوڑ جوڑ سے جان نکلتی ہوئی معلوم ہوتی تھی، ہر سانس پر آخری سانس کا گمان ہوتا تھا، میں نے آئینہ میں اپنا چہرہ دیکھا، افسردگی و حقارت اُس پر برس رہی تھی، جیسے برسوں کا کوئی مریض ہو، میرے چہرے کا رنگ زرد پڑ گیا تھا، اور میری آنکھیں بیٹھ گئی تھیں، ناتوانی چہرے پر چھائی ہوئی تھی، مگر اس افسردگی و ناتوانی میں مجھے نورِ سعادت کی ایک جھلک نظر آتی، جسم کے ہر حصہ میں مجھے کمزوری محسوس ہوتی، مگر میرے گوشۂ قلب میں ایک مسرت کی لہر، ایک اطمینان و یقین، آسودگی و بشاشت کی ناقابلِ بیان کیفیت مجھے محسوس ہوتی، وہ احساس جس سے میرے خون میں حرارت پیدا ہوتی تھی، جسکے سہارے میں زندگی بسر کرتا تھا۔

تیسرے دن دوپہر کو مجھے تار ملا، شام کی گاڑی سے میرے ایک دوست کی آمد تھی، انھیں لینے میں اسٹیشن گیا، اسٹیشن کے راستہ میں محبوب منزل تھی جہاں جانے کو مجھے منع کیا گیا تھا۔ مگر میں کیا وہاں نہ جاؤں گا؟ ..... نہیں، تمام دُنیا کی مرضی کے خلاف میں وہاں ضرور جاؤں گا، تاکہ کسی کی ایک اُچٹتی ہوئی نظر میرے تمام تکان کو دُور کردے،

میں وہاں گیا، خستگی و بیچارگی کے باوجود میں انتہائی قوی اور مطمئن معلوم ہوتا تھا، میری تمام پریشانی میرے دل سے دور ہو گئی تھی، میں پھاٹک پر اپنی گاڑی سے اُترا، دروازہ پر میں نے ایک آٹھ برس کا لڑکا دیکھا، اختر؟ مگر نہیں، یہ کون ہے؟ یہ تو کوئی اور لڑکا تھا، مگر کوئی پوشیدہ قوت مجھے اطمینان دلاتی رہی، میں گھر کے اندر داخل ہوا، گھر میں خاموشی تھی، دالان میں میری وہ چچی تھیں جن کی یہ کوٹھی تھی، میں نے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر چاروں طرف دیکھا، پاس کے کمرہ سے ایک معمر بدقطع و بدوضع خاتون نکلی، میں نے اس سے قبل شاید انھیں بچپن میں دیکھا ہو مگر اب بھول چکا تھا، میں زیادہ تر باہر رہا تھا اور اب کچھ دنوں سے گھر کی سکونت اختیار کی تھی، میں اپنے عزیزوں سے بہت کم واقف تھا، میری چچی نے میرا تعارف کرایا، یہ خاتون اُنکی رشتہ کی ایک بہن تھیں، یہی اشرف آباد سے آئی تھیں، اُن کا نام میں نے اکثر سنا تھا،

میرے پیارے دوست! آپ اندازہ کرسکتے ہیں کہ یہ ٹریجڈی اپنے میں کتنے زبردست

مہلک اثرات پنہاں رکھتی تھی، میرا سر چکرانے لگا اور میں پاس کی ایک چوکی پر سر کے بل گر پڑا، میرا سر پھٹ گیا تھا اور میں بیہوش ہو گیا تھا"۔

شاہد نے اپنی کہانی ختم کی تو ایک گہری ٹھنڈی سانس بھری، اسوقت تک نور صبح پھیلنے لگا تھا اور ہماری جدائی کا وقت قریب تھا، میں نے جلدی جلدی حوائج ضروری سے فراغت حاصل کرکے اپنے میلے کثیف کپڑے پہن لیے اور انجن میں کام کرنے چلا گیا۔

(علیگ)

کلام امیر

چارہ بیکار رہے اُس عشق کے دیوانے کا
زندگی جسکے یہاں نام ہے مرجانے کا

دوست غم کرتے ہیں ناحق مرے مرجانے کا
یہ بھی اک باب ہے اس زیست کے افسانے کا

ابتدا یہ ہے کہ نالوں سے بپا ہے محشر
دیکھیے حشر ہو کیا عشق کے دیوانے کا

اب نہ آہوں میں وہ گرمی ہے نہ نالوں میں وہ زور
غالباً حال کچھ اچھا نہیں دیوانے کا

تاب گریہ نہیں آنکھوں کو تو خوں ہوگا دل
کام شیشے سے نکل جائیگا پیمانے کا

کھا گیا مجھکو غم عشق کہ عنخوار تھا میں
کیا یہی حسن بدل تھا مرے غم کھانے کا

جب سے آباد ہوے وحشت یاس و حرماں
دل کی بستی میں بھی کچھ لطف ہے ویرانے کا

کم نہ تھا سوز جنوں شمع میں پروانے سے
ہاں یہ کہیے کہ جنوں تیز تھا پروانے کا

ننگ پیری ہے یہ دیوانگیِ شعر امیر
شعر خوانی نہیں ہزیان ہے دیوانے کا

امیر بدایونی

آیولینتھی

(سلسلۂ سابق)

پانچواں منظر

(پہلے آیولینتھی اور مارتھا اسکے بعد بادشاہ ریتی اور ابن یحییٰ اور سب کے بعد ایلمرک آتے ہیں)

مارتھا (پشت مکان سے داخل ہوتی ہے اور آیولینتھی کو دیکھ کر جلد جلد قدم بڑھاتی ہے) میری بچی! ارے تم جاگیں کیونکر، اور یہاں کس طرح آئیں؟

آیولینتھی۔ مارتھا تم کہاں تھیں۔ میرے پاس آؤ۔

مارتھا۔ میں کھیت میں نوکروں کے ہمراہ تھی لیکن یہ تو بتاؤ کہ تمھیں —— تمھیں جگایا کس نے؟

آیولینتھی۔ میں آپ ہی جاگی۔

مارتھا۔ کیسے۔ خود سے؟

آیولینتھی۔ اور طریقہ مجھے معلوم نہیں مگر سنو یہاں اجنبی مہمان آئے تھے۔

مارتھا۔ تم ٹھٹھولی کرتی ہو۔ کون لوگ تھے؟

آیولینتھی۔ دو اجنبی جنھیں میں نے پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا اور جو پہلے یہاں کبھی نہیں آئے تھے۔ کس قدر افسوس کی بات ہے کہ تم موجود نہیں تھیں۔

مارتھا۔ بیٹی تم خواب دیکھ رہی ہو۔ دو اجنبی! کہاں سے آئے کیونکر آئے۔ ممکن نہیں۔

آیولینتھی کہاں سے آئے، میں نے یہ نہیں پوچھا کیونکہ تم نے مجھ سے اکثر تاکید کہا کہ جو مہمان آئیں انھیں سوالات کرکے پریشان نہ کرو۔

مارتھا۔ تو بیٹی وہ کون لوگ تھے؟

آیولینتھی۔ میں سچ کہتی ہوں کہ مجھے نہیں معلوم۔

مارتھا۔ کیا تم اُس وقت تنہا تھیں؟

آیولینتھی۔ میں نے تمھیں پکارا اگر تم نے جواب نہیں دیا۔

مارتھا (علیحدہ) اے خدا کیا یہ ممکن ہے (آواز بلند) ہاں بیٹی کہے جاؤ۔

آیولینتھی۔ مارتھا، اُن اجنبیوں کا ایسا کوئی شخص پہلے یہاں نہیں آیا۔ کم سے کم میری یہی رائے ہے وہ یقیناً کسی ایسی پُراسرار سرزمین سے آئے تھے جو یہاں سے مختلف ہے۔ ان کی گفتگو میں جوش تھا، اگرچہ آوازیں ہماری تمھاری طرح نرمی اور لہجہ لطف آمیز تھا۔

(بادشاہ ریتی اور ابن یحییٰ اچانک داخل ہوتے ہیں اور کچھ فاصلہ پر ٹھٹک کر سننے لگتے ہیں)

اُس نے ایک گیت سے میرا خیر مقدم کیا مارتھا، وہ ایسا گیت تھا جس میں حیرت انگیز مختلف معانی تھے۔ وہ گیت آنسوؤں کو بہلا کر میری آنکھوں میں لے آیا، اگرچہ میں مطلب ادھورا ہی سمجھی۔

مارتھا (علیحدہ) اے خدا میں یہ کیا سُن رہی ہوں (آواز بلند) لیکن یہ تو بتاؤ کہ اُس نے کیا گفتگو کی؟

آیولینیتھی۔ اوہ! بہت کچھ! بہت کچھ! جو میرے لیے نیا اور عجیب تھا۔ اُسنے کہا، لیکن افسوس میں سمجھ نہیں سکی —— اُس نے کہا کہ ہم بہت سی چیزوں کو نگاہ کے ذریعہ سے پہچان لیتے ہیں۔

مارتھا۔ اے خدا!

آیولینیتھی۔ مارتھا کیا تم بتا سکتی ہو کہ اس کا مطلب کیا تھا؟

مارتھا (بادشاہ رینی اور ابن یحییٰ کو دیکھ لیتی ہے) ارے بادشاہ سلامت!

رینی (آگے بڑھکر) میری بیٹی!

آیولینیتھی (بادشاہ رینی کی گردن میں باہیں ڈالکر) میرے اچھے اباجان آپ یہاں ہیں؟

رینی۔ تمہارے اتالیق ابن یحییٰ بھی میرے ساتھ آئے ہیں۔

آیولینیتھی۔ وہ بھی ہیں! کہاں! میں آپ کا بھی خیر مقدم کرتی ہوں۔

(رینی مارتھا کو علیحدہ لیجاتا ہے اور ابن یحیٰے آیولینیتھی سے باتیں کررہا ہے)

رینی۔ یہ کیا واقعہ پیش آیا؟

مارتھا۔ اے خدا میں کیا جانوں۔ مجھے بھروسا تھا کہ جب تک وہ جگائی نہ جائے خود سے نہیں جاگے گی، لہذا ہم لوگ کھیتوں کو چلے گئے۔ اُسوقت۔ وہی کہتی ہے مجھے یقین نہیں کیونکہ ممکن نہیں۔ کوئی اجنبی یہاں آیا اور اُس سے بات چیت کی۔

رینی۔ یہ میری ہی بوکھلاہٹ کا ثمرہ ہے۔ میں حکیم یحییٰ کے پیچھے گیا اور دروازہ کھلا چھوڑ دیا۔ ہاں مارتھا، یہ اجنبی،

مارتھا۔ وہ بہکی بہکی باتیں کرتی ہے مگر اتنا اندازہ ضرور ہوتا ہے کہ اُس اجنبی نے اُس سے اُس کے نابینا ہونے کا ذکر کیا۔

رینی۔ کیا۔ آنکھوں سے معذور ہونے کا۔ معلوم ہوتا ہے کہ خدا کو یہی منظور ہے کہ وہ قبل از وقت آگاہ ہوجائے۔ جو اُسکی مرضی۔

(ابن یحییٰ کو اشارہ سے بلاتا ہے)

ابن یحییٰ تم نے سنا؟

ابن یحییٰ۔ یہ اتفاق نہایت مسعود تھا۔ ایک اجنبی نے اسے بیدار کردیا۔ یہاں میز پر مجھے وہ نقش ملا۔ تاہم جو کچھ اسے اپنی حالت کے متعلق معلوم ہوا مبہم ہے۔ اب اُسے سب حال پورا پورا بتادینا چاہیے۔

رینی۔ یوں ہی سہی! (آیولینیتھی کے پاس جاتا ہے) میری پیاری بیٹی! جو کچھ میں کہوں اُسے غور سے سنو۔ یہ بات اب زیادہ عرصہ تک تم سے پوشیدہ نہیں رکھی جاسکتی۔ کہ تمہاری زندگی کا وہ لمحہ آگیا جسکا نہایت مستقل مزاجی سے مقابلہ کرنا چاہیے۔ کیا تم صبر کے ساتھ میری بات سنوگی؟ کیا تم کو اگر کوئی غیر متوقع صدمہ پہونچے جو تمہاری روح کو زخمی کردے، تم اُسے صبر وشکر کے ساتھ

برداشت کروگی۔

آیو لینیتھی۔ ابا جان کیسے آپ کے منہ سے سننے میں اسکی شدت بہت کچھ کم ہو جائے گی۔

ربنی۔ میں نہیں جانتا کہ اجنبی نے تم سے کیا کہا۔ لیکن میرا قیاس ہے کہ وہی کہا ہوگا جسکے پوشیدہ رکھنے میں ہم نے آج تک اتنی احتیاط کی کہ تمھاری روح میں ایک ایسی قوت کی کمی ہے جسکے بغیر تم اپنے گرد و پیش کی چیزوں کا صحیح اندازہ نہیں کر سکتیں اور یہ بینائی کی عدم موجودگی ہے۔

آیو لینیتھی۔ اس نے بھی یہی کہا تھا مگر میں سمجھی نہیں تھی

ربنی۔ اچھا مجھ سے سنو۔ ایک ایسی شے ہے جسے انسان روشنی کہتے ہیں۔ ہوا اور طوفان کی طرح یہ بلندی سے ہم تک آتی ہے اور انکی طرح بے پناہ تیزی کے ساتھ جن چیزوں کو چھو لیتی ہے اُن میں ایک نئے معانی اور نئی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے۔ اکثر اسکے ساتھ گرمی بھی شامل ہوتی ہے۔ ہم تک یہ آنکھوں کے راستہ سے پہونچتی ہے اور جب ہمیں اسکو دیکھنے کی قوت ہوتی ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ یہ عالم کیا ہے اور خدا نے اسے کیسا بنایا ہے اس طرح ہمیں اُسکے علم و قدرت کا اندازہ ہوتا ہے۔ اب تک جن باتوں کو تم نے بہت محنت سے سیکھا اور محض قیاس کیا اُن کو آنکھوں کے ذریعہ آسانی دیکھ اور پہچان سکتی ہو کہ اُنکی ضخامت کیا ہے اور شکل کیسی ہے (متاثر ہو کر) ابتدائے عمر میں تمھاری بصارت جاتی رہی اور تم اس خوبصورت دنیا اور نورانی سرزمین کو دیکھنے سے محروم ہو گئیں۔ باوجود انکی کوشش کے اس نقصان کی معقول تلافی نہ ہو سکی۔ صرف اتنا ہوا کہ ہم نے تم کو اس کمی کے علم اور صدمہ سے محفوظ رکھا۔

آیو لینیتھی۔ ابا جان یہ الفاظ حیرت میں ڈالنے والے ہیں جنکا مفہوم میری سمجھ میں نہیں آتا۔ عالم! میں جانتی ہوں کہ دست قدرت نے اُسے بنایا۔ یہ بات مجھ سے کب چھپی ہوئی تھی۔ میں اپنے پروردگار کو بھی پہچانتی ہوں کیا یہ عالم اُسکی قدرت کا ثبوت نہیں ہے۔ کیا چنگھاڑنے والا طوفان اور نسیم کی ہلکی ہلکی سانس اور وہ گرمی جو ہر چیز کو گھیرے ہوئے ہے۔ دنیا کی ایسی عمدہ ترتیب اور یہ صلاحیت کہ پودے پھیلیں اور پھولیں پھلیں، پتھر، دھات، بہتے ہوئے چشمے، چڑیوں کا سنگت میں گانا، کیا یہ سب اپنے عظیم پیدا کرنے والے کا اعلان نہیں کرتے۔ کیا آپ نے مجھے نہیں سکھایا کہ خدا نے دنیا میں کیا اور کس لیے پیدا کیا ہے۔ آپ نے یہ تک تو کہا تھا کہ آیو لینیتھی تم خود اُسکی قدرت کا نمونہ ہو۔ میں جس طرف مڑتی ہوں فطرت کی طرف یا دوسرے لوگوں کی گفتگو کی طرف خود اپنی ہستی کی گہرائیوں میں اُن خیالات میں جو خیالات سے پیدا ہوتے ہیں اور جنکا سلسلہ نا تمنا ہی ہے اُن سب میں مجھے وہی آواز گونجتی سنائی دیتی ہے۔ اور یہ سب اُسکی عظمت کا بہ آواز بلند اقرار کرتے ہیں۔

ربنی۔ (ابن یحییٰ سے علیحدہ) آہ ابن یحییٰ ہم نے اس خوبصورت عقیدہ کو مسمار کر دیا۔

آیولینتھی- ایک بات بتائیے - مجھے اپنی آنکھوں کے ذریعہ سے اس دنیا کا علم حاصل کرنا چاہیے- اُس اجنبی نے بھی جو تھوڑی دیر پہلے یہاں آیا تھا اور جس کے عجیب و غریب الفاظ میرے دل پر نقش ہیں بصارت کا ذکر کیا تھا - ابا جان دیکھنے کے کیا معنی ہیں؟ کیا میں اُسکی آواز کو دیکھ سکتی ہوں جسنے میری روح میں خوشی والم کا طوفان ایک ساتھ برپا کر دیا؟ کیا میں ان آنکھوں سے بلبل کے چہچہوں کو دیکھ سکتی ہوں جنپر میں نے اکثر غور کیا ہے اور تصور کے ذریعہ سے بہت دور تک اسکا کھوج لگانے کی ناکام کوشش کی ہے؟ شاید اُسکا نغمہ ایک پھول ہے جسکی خوشبو کا تو مجھے علم ہے مگر میں اُس کی جڑ اور شاخوں اور پتیوں سے بیگانہ ہوں۔

رینی - آہ میری پیاری بیٹی - تیرا ہر سوال میری روح کو تڑپاتا ہے - میرے کلیجہ کے ٹکڑے - میرا اعتبار اور اُس نیک ساعت کا انتظار کر جب کہ ہر بات جو اسوقت تیری سمجھ میں نہیں آتی خود بخود آشکار ہو جائے گی - لیکن یہ یاد رکھ کہ مجھے اُمید ہے اور اسی امید نے مجھے اب تک سنبھالا ہے کہ تیری بینائی تجھے دوبارہ عطا ہوگی - تیری آنکھیں کھلیں گی اور روشنی کی شعاعیں نہایت مسرت سے اُنکا استقبال کریں گی - کاش خدا ایسا کرے کہ ہمارا شریف دوست اور تیرا مہربان اتالیق ابن یحیی اپنی کوششوں میں کامیاب ہو اور وہ گھڑی آجائے جسکے واسطے وہ اپنے کمال کے زور پر تیاریاں کر رہا ہے - میرا دل کہتا ہے کہ وہ ساعت سعید بہت دُور نہیں ہے - میری پیاری بیٹی، تو ابن یحیی پر اعتماد کر اور اُسکے ساتھ مکان کے اندر جا - آرتھا تیرے ہمراہ ہوگی - پہلے تجھپر غنودگی طاری ہوگی اور اُسکے بعد .... اگر خدا کی مہربانی شامل حال رہی تو .... (جذبات سے مغلوب ہو کر خاموش ہو جاتا ہے)

آیولینتھی - ابا جان آپ کیسے ہیں - آپ کے ہاتھ میں رعشہ کیوں ہے - پیارے ابا جان آپ کو تو خوش ہونا چاہیے کہ وہ مبارک وقت آگیا جسکا آپنے اس قدر بےچینی سے اتنی مدت تک انتظار کیا - کیا آپ کو یہ خوف ہے کہ مایوسی کا سامنا ہوگا - فرض کیجیے کہ ایسا بھی ہوا تو کیا اس حالت میں میں آپ کی بیٹی چہیتی بیٹی نہ رہوں گی - وہ بیٹی جو اس وجہ سے خوش ہے کہ آپ اُس سے محبت کرتے ہیں اور اپنی خوش قسمتی پر نازاں ہے - جانے کی اجازت دیجیے -

رینی - آہ میری بیٹی! میری بیٹی!

آیولینتھی - ابا جان مطمئن رہیے - جس امر میں میرے دانا اور مہربان اتالیق نے اس قدر غور و فکر سے کام لیا ہے اُس میں کامیابی کی قطعی امید ہے - میں محسوس کر رہی ہوں کہ میں اس وقت بھی اُس غیر معمولی قوت سے واقف ہوں جسکو آپ روشنی سے تعبیر کرتے ہیں - میں محسوس کرتی ہوں کہ وہ قوت مجھ میں موجود ہے - آہ جس وقت

وہ حیرت دلانے والا اجنبی یہاں تھا۔ میرے دل میں ایک ایسے جذبہ نے جوش کھایا جس سے میں پیشتر آگاہ نہیں تھی جو لفظاً اُسکے منہ سے نکلتا تھا اُسکی آواز بازگشت میری روح میں گونجتی تھی اور اُس سے ایسے نئے نغمے بلند ہوتے تھے جنکا وہم و گمان بھی نہیں تھا۔ کیا آپ نے نہیں کہا تھا کہ روشنی کی قوت بہت تیز گام ہوتی ہے اور جس شے کو چھو لیتی ہے اُس میں ایک نئی معنویت پیدا ہو جاتی ہے اور اس میں اکثر حدت شامل ہوتی ہے ——— دل کی حرارت۔ ابا جان میں جانتی ہوں کہ روشنی کیا چیز ہے۔ اگر آپنے مجھ سے روشنی کی صحیح تعریف کی ہے تو کوئی مجھ سے کہہ رہا ہے کہ آج مجھپر اُسکا ظہور ہوگا۔ لیکن ایک معاملہ میں آپ کی رائے صحیح نہیں ہے آنکھیں نہیں دیکھتیں بلکہ بصارت کی جگہ یہاں دل کے قریب ہے۔ یہاں اسکی شیریں یادگار قائم ہے۔ اور اُس نور کو منعکس کر رہی ہے جو میری روح میں در آیا ہے۔ بیتاب امیدوں کے ساتھ میں اس روشنی سے ملنے جا رہی ہوں (مارتھا کے ساتھ گھر کے اندر چلی جاتی ہے۔

رینی (ابن یحییٰ سے جو گھر کے اندر جانے والا ہے) ابن یحییٰ ٹھہرو! کیا یہ راز کچھ تمھاری سمجھ میں آتا ہے۔ وہ اجنبی کہاں ہے جسنے اس طرح میری لڑکی کے سکون قلب میں خلل ڈالا؟ اُسکے الفاظ جذبات سے لبریز تھے۔ اسکے کیا معنی ہیں۔ تمھارا کیا خیال ہے؟

ابن یحییٰ۔ حضرت! عورتوں کا مزاج بخوبی کون سمجھ سکتا ہے؟ اور اُس کی موجودہ حالت میری تدابیر کے چنداں موافق نہیں معلوم ہوتی۔

رینی۔ صاف صاف کہو!

ابن یحییٰ۔ فرض کیجیے کہ اُسکے تمام خیالات کا مرکز یہ اجنبی شخص ہے، وہی اُسکی طبیعت پر قابو رکھتا ہے، لہذا مجھے بہت شک ہے کہ میرا فن اپنا پورا اثر کرے گا اور کوئی مفید نتیجہ نکلے گا۔ لیکن یہ بھی ممکن ہے کہ یہ دونوں قوتیں بجائے مختلف ہونے کے متحد ہو جائیں اور ایک دوسرے کو مدد پہونچائیں۔ اسی امید ضعیف پر اب دارومدار ہے۔ دیکھیے کیا ہوتا ہے۔

(گھر میں داخل ہوتا ہے)

رینی۔ خدا معلوم کون شخص آیا تھا۔ شاید برٹرانڈ کو معلوم ہو۔ (المیرک چور دروازہ سے آتا ہے)

المیرک! تم یہاں!

المیرک۔ بندگان عالی کے واسطے ایک خط لایا ہوں۔

رینی۔ ٹرسٹان کے پاس سے؟ (مُہر توڑتا ہے) اُسی کا خط ہے۔ یہ میں کیا پڑھ رہا ہوں" المیرک یہاں آؤ! وہ ہمارے پاک معاہدہ کو توڑنا چاہتا ہے۔

المیرک۔ معاہدہ سے روگردانی!

رینی (پڑھ کر) حیرت! سخت حیرت! وہ اقرار کرتا ہے کہ وہ غلطی پر تھا۔ اور تلافی کی شرائط کا انحصار مجھ پر کرتا ہے۔ تاہم آیو لینتھی

کے ساتھ شادی سے انکار ہے۔

ایلمرک۔ میں نے آج تک ایسی گستاخی نہیں دیکھی۔

رینی۔ آہ! ایلمرک۔ قسمت ہمیشہ میری مخالفت کرتی ہے۔ یہ ایک شگون بد ہے۔ خدا جانے کیا ہونے والا ہے۔ اس شادی سے مجھے نہ معلوم کیا کیا امیدیں تھیں اور اسی سے آیو لینتھی کے حصول بینائی کی اُمید بھی وابستہ تھی۔ ایک اُمید تو منقطع ہوئی اور ...... اور شاید تھوڑی دیر میں دوسری اُمید کا بھی خون ہو جائے گا۔ لیکن میں ایسی احمقانہ یا محبانہ آہ و زاری سے اپنی ذلت نہیں کروں گا۔ وہی ہوگا جو خدائے تعالیٰ نے اپنی حکمت کاملہ سے مقدر کر دیا ہے۔

یہ خط لایا کون تھا؟

ایلمرک۔ جیوفری کے ملازموں میں سے تھا۔ وہ کہتا تھا کہ ترستان اُسکے یہاں مہمان ہے۔

رینی۔ جیوفری کے یہاں؟ ایسی صورت میں تو کچھ اُمید ہوتی ہے۔ شاید وہ ——— لیکن ——— یہ غل کیسا ہوا؟ یہ دروازہ میں تلواروں کی جھنکار کیسی ہے؟

ایلمرک (دروازہ کے پاس جاکر) وہ زبردستی داخل ہو گئے

رینی۔ زبردستی! کون بدمعاش ہیں؟

ایلمرک۔ ہمارے چند نفر سپاہی ———

رینی۔ تلوار کھینچ لو۔ وہ بغیر سزا پائے بادشاہ رینی کے منہ نہیں آسکتے (باقی)

آثر (لکھنوی)

جذباتِ اکبر

اندوہِ انتظار سے فرصت نہیں مجھے ‏ یہ کس طرح کہوں کہ محبت نہیں مجھے
ہے باعثِ سکونِ طبیعت خیالِ دوست ‏ احساسِ بیقراریِ فرقت نہیں مجھے
تیری طرف سے ظلم کی غایت نہیں رہی ‏ یہ اور بات ہے کہ شکایت نہیں مجھے
ناکامیِ وفا مجھے برباد کر چکی ‏ اب کامیاب ہوں یہ مسرت نہیں مجھے
یا تیری جستجو میں اذیت کہیں نہیں ‏ یا عاشقی میں فکرِ اذیت نہیں مجھے

اکبر غلامِ عابدِ رنگیں طراز ہوں
ہرگز غرورِ حسنِ طبیعت نہیں مجھے

جلال الدین اکبر

ایشیا کا نشأۃ جدیدہ

جب ساری دنیا جہالت کی تاریکی میں مبتلا تھی تو ایشیا میں تہذیب کا آفتاب نصف النہار پر تھا۔ رفتہ رفتہ وہ آفتاب افق مغرب پر طلوع ہوا، علمی، مذہبی، اور سیاسی بیداری کی نسیم چلی اور سارے یورپ میں تہذیب کا اُجالا ہوگیا۔ مرورِ ایام کے ساتھ وہ آفتاب پھر ایشیا کی طرف بڑھ رہا ہے، اور یہاں روشنی اور حرارت کے آثار پیدا ہو رہے ہیں۔ جن اسباب نے مغرب میں تمدن کی بنا ڈالی تھی وہی آج مشرق میں کارفرما ہیں۔

اس دَورِ جدید کی ابتدا یوں ہوئی کہ ۱۸۵۳ء میں امریکہ سے کموڈور پیری کا بیڑہ وہیل کی تجارت کے لیے جاپان آیا۔ عصری تمدن اور مغربی خیالات کے نمونے دیکھ کر جاپان چونک پڑا، غفلت سے بیدار ہوا، اور نئی روشنی کے استقبال کو بڑھا۔ تجارتی منفعت کی امید پر مغربی کمپنیوں نے تمام جزائرِ جاپان میں اپنا جال پھیلا دیا۔ جاپان نے تجارت اور حکومت کا پہلا سبق انھیں سے لیا، اور بہت جلد شاہ متسوہتو کو رائے عامہ کے مطابق حکومت کرنے پر مجبور کر دیا۔ اس بادشاہ کے دَورِ حکومت میں جاپان نے اتنی ترقی کی کہ شاید کبھی کسی دوسری قوم نے نہ کی ہوگی۔ متسوہتو نے بیرونی ممالک سے تیس ہزار معلم، انجینئر، طبیب، جہازراں، اور مشیر مملکت بلائے، جو تیس سال تک جاپان کی خدمت میں مصروف رہے۔ آخر جاپان نے اتنی قوت حاصل کر لی کہ ۱۹۰۵ء میں روس ایسی عظیم الشان سلطنت کو جنگ میں شکست دے دی۔

مُردہ مشرق کی رگوں میں یہ خبر خونِ زندگی بنکر دوڑی، اور سارے ایشیا میں ترقی اور آزادی کی جد و جہد شروع ہوگئی۔ چنانچہ اس واقعہ کے دوسرے ہی سال مغربی طاقتوں کے گڑے شاہِ ایران نے اپنی رعایا کو حکومت مشروطہ کا فرمان عطا کیا، اور تیسرے سال سلطان عبد الحمید نے آزادیِ مطابع، جبری ابتدائی تعلیم، اور آئینی حکومت کا فرمان صادر فرمایا۔ ۱۹۱۲ء میں چینیوں نے حکومت کے خلاف بغاوت کی اور منچو خاندان کے نابالغ شہنشاہ کو جمہور کے حق میں دست بردار ہونے پر مجبور کر دیا۔ ۱۹۱۷ء میں اہل ہند نے ہوم رول کی تحریک بڑے زور و شور سے اُٹھائی۔ برٹش گورنمنٹ نے ہندوستان میں سُست رفتار مگر ترقی پذیر ذمہ دار حکومت قائم کرنے کا اعلان کیا جسکی پہلی قسط ۱۹۱۹ء میں مانٹیگ چیمسفورڈ کی مجوزہ اصلاحات کی صورت میں برطانوی پارلیمنٹ سے منظور ہوئی۔

اسی سال افغانستان نے بھی برطانوی اثر کا جُوا اُتار پھینکا۔ یہ سب اُسی جذبۂ وطن پرستی کے ہاتھوں انجام پایا اور پا رہا ہے جسے مغرب نے ایشیا کے گوشہ گوشہ میں پیدا کر دیا ہے۔

ترقی کے لیے سب سے ضروری شے تعلیم کی عمومیت ہے۔ اس میں شک نہیں کہ ایشیا میں تعلیم ابھی عام نہیں ہے۔ لیکن اس شعبہ میں بھی ہماری ترقی کی رفتار کچھ بُری نہیں۔ جاپان و روس کی جنگ کے بعد ہی چین نے جدید نظام تعلیم اختیار کر لیا تھا، اور اسوقت وہاں نئے اسکول اور کالج اس رفتار سے قائم ہو رہے ہیں کہ اُنکے لیے کافی عمارتیں مہیا نہیں ہوتیں۔ اور مجبوراً مندروں کی عمارتیں اسکولوں کے مصرف میں لائی جا رہی ہیں۔ اسکے علاوہ تین ہزار چینی جاپان میں، ایک ہزار امریکہ میں، اور دو سو یورپ میں زیر تعلیم ہیں۔ جاپان کے پڑھانے والی عمر کے لڑکوں میں ۹۸ فی صدی تعلیم پا رہے ہیں۔ ہندوستان میں بھی جبری عام تعلیم کا مطالبہ ہے۔ زنانہ تعلیم کے لیے جلد جلد اسکول اور کالج قائم ہو رہے ہیں۔ دو چار لڑکیاں لڑکوں کے دوش بدوش یورپین یونیورسٹیوں میں بھی نظر آ جاتی ہیں، اور ٹرکی میں تو خود وزیر تعلیمات ایک عورت ہے۔ ایشیائی طلبہ نہ صرف تعداد میں بلکہ علمیت میں بھی ترقی کر رہے ہیں۔ کتنے ہیں جن کی قابلیت کا خود مغربی اُستادوں نے لوہا مان لیا ہے، اور بہت سے تو یورپین اور امریکن یونیورسٹیوں میں درس دیتے ہیں۔ بڑی بات تو یہ ہے کہ جو طلبا اکتساب علم کے لیے ممالک یورپ کو جاتے ہیں وہ اپنے ساتھ اُن علمی جواہروں کے فوٹو، اُنکی نقلیں، اور اُن کی مطبوعہ کاپیاں اپنے ساتھ لاتے ہیں جنھیں یورپ ہماری غفلت کے زمانہ میں لوٹ لے گیا تھا۔ اور اس سے بڑھ کر یہ ہے کہ ایشیا کے مطابع علوم و فنون کی اشاعت میں یورپین نشاۃ الثانیہ کے مطابع سے بہت آگے ہیں۔ صرف ہندوستان میں اسوقت تین ہزار پانچ سو اخبارات مختلف زبانوں میں شایع ہو رہے ہیں۔ شنگھائی کا صرف ایک مشنری مطبع دس کرور صفحات سالانہ شایع کرتا ہے۔ بیروت کے عربی مطابع نے ۱۹۱۴ء تک دس پدم صفحات شایع کیے تھے اور جاپان کی سالانہ مطبوعات انگلستان اور امریکہ کی سالانہ مطبوعات کے قریب پہونچ گئی ہیں۔

اخلاقی ترقی اس سے بھی زیادہ نمایاں ہے۔ بیاسی لاکھ پونڈ کے نقصان کے باوجود افیون اور قماربازی کے خلاف چین کا زبردست جہاد ایک عظیم الشان کارنامہ ہے جسکی مثال مشکل سے ملیگی۔ ہندوستان میں عقد بیوگان کے لیے جگہ جگہ مجلسیں قائم ہو رہی ہیں۔ بچپن کی شادی جدید تعلیم کے اثر سے تقریبًا بند ہو جانے والی ہے۔ جاپان کی بچہ کُشی اور چین کی "پا بندی" قانونًا مسدود ہو گئیں۔ تمام ایشیا میں عورتوں کا رتبہ بلند ہو رہا ہے۔ پردہ کا مسئلہ ابھی متنازعہ ہے، مگر پھر بھی بعض ملکوں نے

تو بالکل بے پردگی اختیار کرلی ہے، اور جہاں پردہ باقی ہے وہاں اندر ہی اندر آزادی کی حدود بڑھتی جاتی ہیں۔ زنانہ تعلیم اور اُسکے ساتھ ساتھ زنانہ تفریحی مشاغل بھی بڑھتے جاتے ہیں۔ یہ الزام ایک حد تک صحیح ہے کہ مغربی اثر نے تعلیم یافتہ جماعت کو بے دین بنا دیا ہے۔ مگر اس شکایت کو رفع کرنے کے لیے پُرانے مذاہب کو نئی روشنی میں پیش کرنے کی کوشش کی جا رہی ہے۔ چنانچہ چین میں تاؤزم، جاپان میں شنٹو، کوریا میں شامانی، ہندوستان میں آریہ سماجی اور برہمو سماجی مذاہب، اسی کوشش کا نتیجہ ہیں۔ ذات پات کی قید سے آزادی، بُت پرستی کی مخالفت، مذہبی آزادخیالی ان مذاہب کی اہم خصوصیات ہیں

اقتصادی حیثیت سے ڈاک، ریل، تار، اور جہاز نے عہد فلاحی کا خاتمہ کرکے دَورِ صناعی کی ابتدا کی۔ اُنیسویں صدی کی دوسری ششماہی میں ہندوستان کی تجارت چوگنی، چین کی چھ گُنی اور جاپان کی سات گُنی ترقی کر گئی، اور موجودہ صدی میں اس سے بھی زیادہ ترقی ہو رہی ہے۔ چین میں دُنیا کی سب سے بڑی کوئلے کی کانیں دریافت ہوئی ہیں، جن میں امریکہ کی کانوں کا بیس گُنا کوئلہ موجود ہے۔ امریکہ اسٹیل کارپوریشن کو سن فرانسسکو میں، چین اور ہندوستان کا کوئلہ خاص فرانسسکو کے کوئلہ سے سستا پڑتا ہے۔ سن، چاول اور چاے کی برآمد میں ہندوستان دنیا کے تمام ممالک سے آگے ہے۔ اور چمڑہ، گیہوں، اور روئی کی برآمد میں اُس کا دوسرا نمبر ہے۔ ہندوستان کا نظام آبپاشی دنیا میں بہترین مانا گیا ہے اور اسکی ۳۰ ہزار میل لمبی ریلوے ساری دنیا میں چوتھے نمبر پر ہے۔

مختصر یہ کہ پیدائش گاہِ تمدن، مادرِ مذاہب، گہوارۂ اقوام، ایشیا دنیا کی آدھی سے زیادہ آبادی کو گود میں لیے ترقی کے میدان میں گام زن ہے۔ اسکی مظلوم بچیاں اور غافل بچے بیدار ہو رہے ہیں۔ دنیا کا آباد ترین اور وسیع ترین خطہ یورپین نشأۃ ثانیہ کی برسوں کی راہ کو مہینوں میں طے کر رہا ہے۔ ایشیا کا یہ نشأۃ ثانیہ یورپ کے دَورِ ترقی سے زیادہ وسیع، زیادہ عمیق، اور زیادہ قوی ہے۔ اور یقین ہے کہ یورپین تہذیب سے زیادہ عظیم الشان تمدن کا بانی ہوگا۔

سید۔

مقدس ڈاکو

(۱)

مولانا محمد علی صاحب نے اپنے اخبار ہمدرد میں جسکی عنانِ ادارت اب علاً بھی اُن ہی کے ہاتھ میں ہے خواجہ حسن نظامی دہلوی، خواہرزادہ حضرت محبوب الٰہیؒ، و فرزندِ دلبند حضرت مولا علی کرم اللہ وجہہ، و نبیسۂ حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم و نبیرۂ حضرت ابراہیم خلیل اللہ علیہ السلام کو حال ہی میں یہ نہایت ہی معنی خیز لقب عطا فرمایا ہے۔

اگست ۱۸ء میں جب مولانا ظفر علیخاں صاحب دوبارہ حیدرآباد میں بلائے گئے اور حضور نظام کے لطف و اکرام سے سرفراز ہوے، تو جن لوگوں کو اُن سے اختلاف تھا، یا یہ کہنا زیادہ صحیح ہوگا کہ جو لوگ اُن کو اس منزلت سے گرانا چاہتے تھے، اُنھوں نے حکومت ہند کا دروازہ کھٹکھٹایا۔ اس سازش میں حیدرآباد کے کون کون لوگ شریک تھے، اس پر بحث کرنا یہاں مقصود نہیں ہے۔ البتہ دو اشخاص کے کارنامے اسوقت پبلک کے سامنے ہیں۔ شیخ ضیاء الحق صاحب ایڈیٹر نے جنکو خواجہ صاحب نے اب اپنے تبلیغی اخبار منادی میں "مہذب ڈاکو" کا لقب دیا ہے اور جنکی پمفلٹ بازی کبھی خاص شہرت رکھتی تھی خواجہ صاحب کو جو غالباً اُنکے پُرانے رفیق کار تھے، اپنے خاص ذرائع معلومات کی بنا پر یہ اطلاع بہم پہونچائی کہ ظفر علیخاں صاحب حضور نظام کو پان اسلامزم (ہمدردیِ اسلام) کا سبق پڑھا رہے ہیں، اور خواجہ صاحب نے چیف کمشنر دہلی کو جاکر باضابطہ اس حادثۂ عظیم کی خبر پہونچائی۔ چیف کمشنر صاحب نے حکومت پنجاب اور حکومت ہند کو اطلاع دی اور نتیجہ یہ نکلا کہ چند روز میں مولوی ظفر علیخاں صاحب کو مع اُنکے صاحبزادہ عزیزی اختر علیخاں کے حیدرآباد چھوڑنا پڑا۔ اور حضور نظام کے متعلق حکومت ہند کا جو رویّہ آج بتایا جاتا ہے، اگر اس میں کوئی واقعیت ہے تو ایک انگریزی اخبار کے مطابق وہ پان اسلامزم بھی اُنکی فہرست الزامات میں داخل ہے جس کا سبق مہذب و مقدس ڈاکوؤں کی شہادتوں کے بموجب ظفر علی خاں صاحب نے اُنکو پڑھایا تھا۔

خواجہ حسن نظامی صاحب سے ہمیں پہلی بار ۱۹۰۳ء میں شناسائی حاصل کرنے کا موقع ملا اُسوقت تک خواجہ صاحب صرف ابن آدم تھے، خواہرزادہ، فرزند دلبند، نبیسہ و نبیرہ کی

خصوصیات کا اضافہ بعد میں ہوا ہے۔

النّاظر کے اجراء کے بعد نظام المشائخ کے مدیر اعلیٰ اور حلقۃ المشائخ کے بانی کی حیثیت میں جب خواجہ صاحب نمودار ہوئے تو فروری کے النّاظر میں نظرے خوش گذرے کے تحت حسب ذیل خیالات کا اظہار کیا گیا:-

"لیکن باوجود اُس حسن عقیدت کے (صوفیائے کرام اور اُن کے روحانی مشن کے ساتھ، نہ کہ خواہرزادہ حضرت محبوب الٰہیؒ کے ساتھ) ہم نظام المشائخ کے مدیر اعلیٰ کی روش کو اُس وقت سے نہیں دیکھتے جبکہ وہ غلطی سے مستحق بتائے جاتے ہیں اور جبکی وہ بحالت موجودہ اُمید کر سکتے ہیں

. . . .

ایک ایسے زمانہ میں جبکہ تار اور ڈاک کی بدولت رسل و رسائل اس قدر آسان نہ تھے عمدہ پختہ سڑکوں، تیز رَو ریلوں اور دخانی جہازوں کی وجہ سے نقل و حرکت کے ذرایع اس درجہ سہل الحصول نہ تھے اور دنیا کی تین چوتھائی آبادی حالانکہ اُسوقت یقیناً مشرب صوفیانہ سے نابلد محض تھی، صوفیائے کرام کی باطنی و اشراقی قوتیں دنیائے اسلام میں خونریزی و صنم گستری اور خیالات باطلہ و عقائد ناقصہ کی اصلاح و درستی کرنے سے عاری نہ تھیں، لیکن مقام تعجب ہے کہ آج ان آسانیوں کے باوجود اور فرقہ اہل باطن کے خود ساختہ نائبوں کے دعوے کے بموجب دنیا کی آبادی میں تین چوتھائی حصہ صوفی مشرب لوگوں کا ہوتے ہوئے بھی محض ابلہ فریبی اور مغربی تقلید کے خیال سے علم تصوف کی درسگاہیں قائم کرنے اور صوفیوں کی اصلاح کرنے اور اگر سارے عالم کو نہیں تو تمام مشرقی ممالک کے مسلمانوں کو مشرب صوفیانہ کی دعوت دینے اور اُنکو ایک محیط جہالت و توہم میں غرق کرنے کی کوشش میں ایڑی سے چوٹی تک کا زور لگایا جاتا ہے اور زمانہ حال کی تمام علمی، تمدنی اور سیاسی ایجادات اس غایت تظلم و تعدی کے لیے صرف ہو رہی ہیں۔"

خواجہ صاحب کے کارخانہ تجارت کے بارے میں سطور بالا لکھنے کے بعد اسی سلسلہ میں مولانا محمد علی سے یوں شکوہ کیا گیا تھا:-

"قوم کے وہ برگزیدہ نفوس جو اپنی فطری سعادت اور ملکوتی نفاہت کے باعث اس قسم کی بزرگیوں اور بازیگریوں کی اصلیت سے بے خبر رہتے ہیں اُنکا تو ذکر نہیں، لیکن افسوس معلوم ہوتا ہے اُن حضرات پر

جو اپنی عالی دماغی و روشن ضمیری سے اِن شعبدوں اور ڈھکوسلوں کے پیچ در پیچ اسرار سے واقفیت رکھتے اور علمی تجربوں اور چشمدید واقعات کے بدولت اُن کی حالت و حیثیت کا صحیح اندازہ کرنے کے باوجود محض ہر دلعزیزی قائم رکھنے کی خواہش یا اخلاقی جرأت کے فقدان سے واقعات کے چہرہ سے پردہ اُٹھانے اور حقیقتِ راز کا افسانہ سنانے کی ہمت نہیں رکھتے۔

ہمعصر کامریڈ نے اپنی ۱۳- جنوری کی اشاعت میں ایک دعوے باطلہ کی تردید کرتے ہوے اس قسم کے لوگوں کے ساتھ جو سلوک کیا ہے اُس سے ہمیں اتفاق کلی نہیں۔ ہمارے خیال میں ایسے موقعوں پر بزرگان ملت کا سکوت کرنا یا "دہن سگ بہ لقمہ دوختہ بہ" کی قدیم ہدایت پر کاربند ہونا حالات موجودہ کے لحاظ سے کبھی مناسب نہیں۔ خصوصًا اس لیے کہ آجکل کے ذہین، طباع اور پڑھے لکھے عیار "الخاموشی نیم رضا" کا مفہوم خوب سمجھتے ہیں اور بڑے ناموں کی پرستش کرنے والوں کو اس طریقہ پر فوائد بیجا حاصل کرنے میں جو ید طولیٰ حاصل ہے اُس سے ملک و قوم کو سخت خمیازہ بھگتنا پڑا ہے اور پڑے گا۔"

ایک سال بعد جب خواجہ صاحب نے میرٹھ سے اخبار توحید جاری کیا تو مئی ۱۳ء کے الناظر میں اُسکے متعلق یہ عرض کیا گیا۔

"..... اگر توحید کا ظاہری لباس تصوف کی باطنی تعلیم کے لیے مفید دکارآمد ہوسکتا تو مسلمانانِ ہند کے حق میں یہ اخبار ضرور نزول رحمت کا باعث ہوتا لیکن جب اہل باطن ظاہری تصنعات سے آراستہ ہوکر نمود و نمائش کو اکتساب برکت کا ذریعہ قرار دیں اور یخادعون اللہ والذین آمنوا وما یخدعون الا انفسھم وما یشعرون کی دل ہلا دینے والی آواز پر کان نہ دھریں تو ظاہر ہے کہ مذہب و اہل مذہب کے حق میں نتیجہ کبھی مفید نہیں ہوسکتا۔

ہم جانتے ہیں کہ ہماری آواز ان معاملات میں نہایت دھیم ہوتی ہے لیکن پھر بھی جب کبھی ہمیں موقع ملے ہم اس بارے میں اپنی رائے کا اظہار آزادی کے ساتھ کرتے رہیں گے اس لیے کہ مسلمانوں کی موجودہ ذلیل اور پست حالت کا ذمہ دار زیادہ تر وہی گروہ ہے جو انانیت و خودی کی مئے دو آتشہ کا متوالا ہوکر خدا و رسول کے ارشاد و تعلیم کو پس پشت ڈالنے اور مذہب کے ظاہری لباس سے آراستہ ہوکر سادہ لوح حلقہ بگوشان مذہب کی آنکھوں کو خیرہ کرنے میں ید طولیٰ رکھتا ہے۔

افسوس ہے کہ یہ خاکی نژاد انسان جسکی تخلیق میں ایک ناقابلِ شمار حصۂ وقت سے زیادہ اور ایک قطرۂ ناپاک کے سوا صرف نہیں ہوا ہے کتنی جلد اپنے نفس کا بندہ بن جاتا ہے۔ طرح طرح کی نیرنگیوں اور شعبدہ بازیوں سے اُس خالقِ ذوالجلال کی بیشمار مخلوق کو مصیبتوں میں پھنساتا ہے جسکی قدرت و طاقت کا اندازہ بھی امکانِ بشری سے خارج ہے اور پھر اپنی وقتی اور عارضی کامیابی سے یہ نتیجہ نکالتا ہے کہ اُس بصیر و علیم کو بھی دھوکے میں ڈال دیا ہے اور اُسوقت کو یاد کر کے نہیں لرزتا جبکہ یہ سراب، یہ بلبلا، یہ دھوکے کا طلسم باقی نہ رہے گا اور دلوں کے اندر کے راز طشت از بام کر دیے جائیں گے۔

ٹٹولتے ہیں یہاں حال کو شہ گوشۂ دل
یہاں نہیں ہے حکایت سے اور قیل سے کام
(ظفر)

ہمارے متعلق توحید کے پہلے ہی پرچہ میں یہ خیال ظاہر کیا گیا ہے کہ "ہم درویشوں کی ہستی کو ریاکاری کی ہستی قرار دیتے ہیں"۔ اور اگر مذکور الصدر خیالات کا مفہوم یا جو کچھ ہم نے اس مسئلہ پر فروری ۱۹۱۲ء کے الناظر میں نظام المشائخ پر ریویو کرتے ہوئے لکھا تھا اُسکا منشا و مطلب توحید کے طباع ایڈیٹر کی رائے میں اسی قدر ہے تو ہم کو اُن سے شکایت نہیں ہو سکتی۔ البتہ ہم دوسروں کی خدمت میں یہ عرض کر دینا مناسب سمجھتے ہیں کہ ہم اُن لوگوں کی ہستی کو ریاکاری کی ہستی نہیں قرار دیتے جو واقعی درویش ہوں، مگر وہ لوگ جو خود پرستی و خود نمائی کے سکہ ہائے مقلوب کا تبادلہ عقیدت و ارادت سے کرنا چاہیں اور مذہب ایسی مہتم بالشان چیز کو اپنے مفروضہ کشف و کرامات سے بازیچۂ اطفال بنائیں اُنکے سامنے سرِ تسلیم و نیاز جھکانا البتہ ہمارے مذہب میں ایک گناہِ عظیم ضرور ہے۔ اور خواہ ہر دلعزیز بننے کی ہمیں کیسی ہی سخت خواہش و ضرورت کیوں نہ ہو لیکن ہم اپنی فطرت سے مجبور ہیں کہ امید و بیم کی کوئی حالت ہمیں اس معاملہ میں شکست نہیں دے سکتی"

۱۹۱۱ء اور ۱۹۱۲ء میں بوہرہ فرقہ کے مشہور پیشوا ملا طاہر سیف الدین صاحب ۔۔۔۔ کی ایک تصنیف کی بدولت خواجہ صاحب اور اُن جیسے دوسرے مقدس اور مہذب ڈاکوؤں نے خوب داد قزاقی دی اور بمبئی کے احمقوں کی زرپاشی نے ملک میں ایک طوفانِ بے تمیزی بپا کر دیا تو تنگ آ کر ہمیں فروری ۱۹۱۲ء کے الناظر میں سطورِ ذیل لکھنا پڑیں:-

ریل، تار، مطبع اور اخبارات بے شبہ تمدنِ جدید کے بہترین ثمرات میں سے ہیں لیکن اُس قوم

کی قسمت کو کیا کہیے جسکے افراد ان نفع بخش اور راحت دہ چیزوں کو بھی شرارت اور نفسانیت کا آلہ بنالیں - ہم دیکھ رہے ہیں کہ کم وبیش ایک سال سے مسلمانوں کی ایک جماعت انھیں تمدن پرور آلات کے ذریعہ افراد قوم کے دلوں میں کدورت ونفرت کے جذبات مشتعل کرنے میں مصروف ہے اور اگرچہ ہم نہیں چاہتے تھے کہ اس بحث میں ہم کسی قسم کا حصہ لیں لیکن وقت، روپیہ اور قوتوں کے بیجا اسراف کے ساتھ ساتھ جب ہم محسوس کرتے ہیں کہ اس جنگ زرگری کی بدولت کثیر افراد قوم کے اخلاق بھی برباد ہو رہے ہیں تو ہم معاف کیے جائیں اگر ہم خاموشی کو گناہ سمجھ کر چند سطور تحریر کریں -

ابتدا اسکی یوں ہوئی کہ ایک صاحب محمد اسمٰعیل سریا والے جنکے دل میں غالبًا اسلام اور مسلمانوں کا درد تمام قوم سے زیادہ ہے' ایک طولانی تحریر بعض اخبارات میں اس مضمون کی شائع کرائی کہ بمبئی میں جو داؤدی بوہروں کے ایک سرغنہ ملا طاہر سیف الدین صاحب ہیں انھوں نے "ضوء نور المبین" کے نام سے ایک کتاب عربی زبان میں تصنیف فرمائی ہے اور اُس میں خدا اور رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کی نعوذ باللہ توہین کی اور تمام فرق اسلام کے خلاف سخت زہر اُگلا ہے - قومی اخبارات ورسائل عمومًا نکالے تو اس دعوے کے ساتھ جاتے ہیں کہ اُنکے ذریعہ سے قوم وملک کی خدمت منظور ہے مگر واقعہ یہ ہے کہ بعض مستثنیات کو چھوڑ کر ایک بڑا حصہ اخبارات ورسائل کا محض اُن لوگوں کے ہاتھوں میں ہے جو حصول معاش کی تمام کوششوں میں ناکام ہونے کے بعد اس غریب پرور دروازہ پر آ بیٹھتے اور اپنی تن آسانیوں کی خاطر ملک وملت کا نام لیکر بداخلاقیوں کا ارتکاب کرتے رہتے ہیں، مذہبی مناظروں اور سیاسی مجادلوں کی گرم بازاری میں تو خیر انھیں اصحاب کا بڑا حصہ تھا ہی مگر اب روز بروز نئے نئے دروازے ان بندگانِ غرض کے لیے کھلتے جاتے ہیں -

سریا والا صاحب کا یہ مضمون چند اخبارات کے سوا تقریبًا شمالی ہند کے اکثر اخبارات ورسائل میں شایع ہوا اور ہمیں ذاتی طور پر اس بات کا علم ہو گیا ہے کہ جن اخبارات ورسائل نے اس مضمون کو شایع کیا، اسکی حمایت میں نوٹ اور مضامین لکھے اُنھوں نے نہایت معقول تجارت کرلی - تجارت بُری شے نہیں ہے، لیکن جو اخبار نویس اپنی ذمہ داری محسوس کیے بغیر محض چند سکوں کے معاوضہ میں اس فتنہ کی پرورش کرتے رہے انکا ضمیر شاید اُنھیں ہم سے بہتر طریقہ پر بتا سکتا ہے کہ یہ تجارت ہے یا کیا؟

سرپاوا صاحب کا زور ختم ہوا تو ملا صاحب کے ارادتمندوں کی طرف سے اُنکی تردید اسی دھم دھم کے ساتھ شروع ہوئی - اور انھوں نے ایک طرف تو بعض ایسے اخبارات ہی کو توڑ لیا جو سرپاوا صاحب کی زرپاشیوں سے کافی طور پر مستفید ہو چکے تھے حتیٰ کہ اُن میں سے چند نے اپنی رجعت اور احمق بنائے جانے کا بانگ دہل اعتراف کرنا شروع کر دیا ہے اور دوسری طرف کسی مخلص زر سے شمیمۃ الاخلاص کے نام سے ایک رسالہ لکھوا کر کثیر تعداد میں شایع کیا -

رد عمل کی یہ کوششیں ختم نہ ہوئی تھیں کہ بمبئی کے زر و نقرہ نے دہلی کی منٹ سے ایک نیا سکہ "سیف بردین" ڈھلوا کر ملک میں رائج کرا دیا - اس رسالہ میں علما و فضلا، شاعر و ادیب، مصلح اور معلم، غرضکہ ہر طبقہ کے نمایندوں اور لیڈروں کے فتاویٰ کی صف بندی کر کے سرپاوا صاحب نے جو فساد برپا کیا تھا اُسکی حمایت کا سامان جمع کیا گیا - بیان کیا جاتا ہے کہ حکومت دہلی نے اس پمفلٹ کو پریس ایکٹ کے رو سے ضبط کر کے پوری طرح شایع نہیں ہونے دیا - لیکن جو لوگ فریقین کو اُلو بنا کر اپنی جیبیں بھر رہے تھے اُنکی تشفی کے لیے یہ کافی نہ تھا لہذا جو نسخے اس رسالہ کے شایع ہو چکے تھے اُنکی تردید کے لیے اب تک کاغذ اور سیاہی فراوانی کے ساتھ بہائی اور تاجران بمبئی کی دولت اس مٹی کی آڑ میں اُڑائی جا رہی ہے - چنانچہ کچھ دنوں پہلے خاص لکھنؤ سے ایک رسالہ اسی نوعیت کا شایع ہوا تھا - مطبع عالم افروز بمبئی نے اسکے بعد "آئینۂ صداقت" دکھایا اور اب ایک پمفلٹ "سیف الدین علیٰ رؤس المعتدین" میرٹھ سے وصول ہوا ہے -

ہم نہیں جانتے کہ یہ حماقتیں اور یہ قزاقیاں کب تک جاری رہیں گی لیکن بالحاظ اسکے کہ جن بندگانِ زر کو ان ذرائع سے کافی مالی منفعت پہونچ رہی ہے وہ ہمیں بیشمار گالیاں دیں گے ہم اپنا فرض سمجھتے ہیں کہ ملا طاہر سیف الدین کے ارادت کیشوں اور اُنکے فریق مخالف دونوں کو آگاہ کر دیں کہ آپ دونوں کو اس جنگ زرگری سے کوئی نفع پہونچنے کی توبظاہر امید نہیں، البتہ آپ کے پاس جو فاضل روپیہ ہے وہ ضرور اس حماقت میں آپ کی جیب سے نکل کر اُن لوگوں کے ہاتھوں میں پہونچ جائے گا جو آپ دونوں میں سے کسی کے دوست نہیں، بلکہ آپ کے روپیہ کے دشمن اور اس قسم کی ڈاکہ زنی میں کافی مہارت رکھتے ہیں آپ دونوں اگر گانٹھ کے پورے ہیں تو ویسے ہی بدبختی سے عقل کے کورے بھی ہیں -

ہمیں نہایت افسوس معلوم ہوتا ہے کہ اس بحث میں ڈاکٹر اقبال اور مسٹر عبد الماجد جیسے

قوم کے ایسے نا نہ افراد بھی شریک کر لیے گئے ہیں اور اسکی تمام تر ذمہ داری جہاں تک ہمیں علم ہے خواجہ حسن نظامی صاحب کے سر ہے ۔

ملا طاہر سیف الدین کے حامیوں نے جو تردیدی رسائل شایع کیے ہیں اُنکی حقیقت و نوعیت سے ہم ناواقف نہیں، اور اگر اُن میں خواجہ صاحب کا نام صاف صاف نہ لکھا ہوتا تب بھی ہمیں یہ باور کرنے کے کافی وجوہ موجود تھے کہ خواجہ صاحب بھی اس تجارتی کوٹھی کے شرکاء میں داخل ہیں ۔

جب سے خواجہ صاحب کتابوں اور دواؤں کی تجارت میں باقاعدہ طور پر منہمک ہیں ہمیں یہ توقع تھی کہ اس ذریعہ سے جو آمدنی اُنکو ہو جاتی ہوگی اس پر وہ اکتفا کریں گے ۔ بلکہ ہم اُمیدوار تھے کہ وہ کسب حلال کے ان وسائل کی موجودگی میں اپنے کمالات تصوف و روحانیت کی نمائش کو بھی رفتہ رفتہ چھوڑ دیں گے لیکن بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ خواجہ صاحب

قناعت میں عیب را کیمیا ست

کے فلسفہ پر یقین نہیں رکھتے ۔ ورنہ اس گندے کاروبار سے اپنا دامن آلودہ نہ ہونے دیتے " ....

اقتباسات بالا سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ باوجودیکہ ہمیں خواجہ صاحب سے وہ قرب مکانی حاصل نہ تھا جسکی بدولت ہم اُنکے نہاں خانۂ خلوت کے "کاروگر" کا برائی العین مشاہدہ کر کے پبلک کو بروقت اُنکے کارناموں سے آگاہ کر سکتے، پھر بھی اُنکی خطرناک روش کو سمجھنے اور اُس سے موقع موقع متنبہ کر کے پبلک کو اس جال میں پھنسنے سے بچانے کی برابر کوشش کرتے رہے ۔ اور جو رسالے ہم نے اس قدر دور بیٹھ کر اور محض اُنکی تحریری کھیلوں اور کاغذی کھلونوں کو دیکھ کر قائم کی تھی، تجربہ نے بخوبی اسکی صحت و صداقت ظاہر کر دی ہے ۔ اگر مولانا محمد علی صاحب اور دہلی کے دوسرے وہ اصحاب جنھیں اُن سے قرب حاصل ہونے کی وجہ سے اُنکے حالات کا زیادہ صحیح علم ہو سکتا تھا ابتدا ہی میں اس فتنہ کو دبا دینے کی کوشش کرتے تو مسلمانوں کو اُنکی مقدس ڈاکہ زنی سے کب کی نجات مل گئی ہوتی ۔

ملک میں اور خاص دہلی میں ایسے متعدد "ڈاکو" موجود ہیں جنکے ساتھ مروت و نیک سلوک اگر روا نہ رکھا جائے تو اُنکی زہریلی زندگی کا نشوونما ہزاروں بندگان خدا کی پریشانی و تباہی کا موجب نہ بننے پائے ۔

ظفر الملک

۱۳ - دسمبر ۲۶ء

پچھلے مہینے کے رسالے

دلگداز

مولانا عبدالحلیم شرر کا اہم تاریخی مضمون "سلطان عالم واجد علی شاہ" ابھی تک چلا جارہا ہے۔ سلطان عالم کے متعلق مشہور ہے کہ وہ دن رات ناچ رنگ میں معروف رہا کرتے تھے اسکے خلاف یہ چشم دید شہادت ملاحظہ ہو:۔

"بادشاہ کے متعلق کہا جاتا ہے کہ وہ ناچتے تھے، مگر یہ بالکل غلط اور بے بنیاد ہے۔ انتزاعِ سلطنت کے وقت بہت سی قلمی تصویریں ملک میں پھیلا دی گئیں جن میں دکھایا گیا ہے کہ وہ محلات کے غول میں کھڑے ناچتے اور بھاؤ بتا رہے ہیں، مگر مجھے خوب تحقیق کرنے سے معلوم ہوا کہ سب وضعی اور جعلی ہیں۔ جو کچھ قیصر باغ کے میلوں کے موقع پر مشہور ہے اسکی اصلیت یہ ہے کہ بادشاہ ناچتے نہیں بلکہ کھیلتے تھے۔ اصل حقیقت یہ ہے کہ وہ نہ کبھی لکھنؤ میں بعہدِ حکومت ناچے اور نہ کبھی مٹیا برج میں ناچے۔ یہ اور بات ہے کہ بکثرت ناچ دیکھنے اور موسیقی کے استاد ہونے کے باعث فن رقص میں بھی انھیں اتنی بصیرت حاصل ہوگئی تھی کہ جب کوئی ناچنے والی ناچ میں غلطی کر جاتی تو پلنگ پر بیٹھے بیٹھے دونوں ہاتھ اٹھا کے بتا دیتے کہ یوں نہیں یوں۔

گانے میں البتہ کمال حاصل تھا، اگرچہ گلا اچھا نہ تھا مگر اصول موسیقی کو ایسا سمجھتے تھے کہ بڑے بڑے گوئیے انکے سامنے کان پکڑتے۔ تاریخوں میں ہندوستان میں کئی سلمان بادشاہ موسیقی کے کامل استاد بتائے گئے ہیں مگر میں نہیں سمجھتا کہ ان میں سے کسی کو بھی اتنی اعلیٰ معلومات حاصل ہوں، جتنی واجد علی شاہ کو حاصل تھیں۔ اسکا نتیجہ یہ تھا کہ ولیعہدی سے لیکر آخر عمر تک ہمیشہ بڑے بڑے مستند گویوں کا انکے گرد ہجوم رہا، اور ان کی قدردانی میں بادشاہ سے یہ افسوسناک بے اعتدالی ظاہر ہوئی کہ ان میں سے بعض کو "دَولہ" کا خطاب دے کر امرا و شرفا کے طبقہ میں داخل کر دیا.... لیکن یہ بھی بادشاہ کی قابل تعریف بات ہے کہ خطاب چاہے جیسا اعلیٰ درجے کا دیدیا ہو، دربار و سرکار کی کوئی خدمت یا داروغگی کبھی کسی ڈھاڑی کو نہیں دی۔"

معارف

مولانا سید سلیمان ندوی، اپنے ہر سفر سے اردو دنیا کے لیے ایک نیا تحفہ لاتے ہیں، اور وہ صحیح معنوں میں تحفہ ہوتا ہے۔ سفر حجاز سے لوٹ کر مولانا ممدوح نے معارف کے صفحات کے ذریعہ "حجاز کے کتبخانے" کے عنوان سے ایک دلچسپ اور قیمتی مقالہ جمہور علمی کی نذر کیا ہے۔ مکہ معظمہ کے ایک کتبخانہ کے متعلق اس مضمون سے مختصر اقتباسات ناظرین الناظر کی ضیافت نظر کے لیے درج ذیل ہیں اور اسی ضمن میں ایک غلط بیانی کی تردید بھی ہوئی جاتی ہے۔ حرم کے دو مختلف پہلوؤں میں دو سرکاری کتبخانے ہیں۔

باب السلام کے قریب' باب الزیادۃ کی طرف' مدرسۂ محمودیہ کے پاس جو کتبخانہ ہے اُسکے متعلق سید صاحب فرماتے ہیں

"حرم کی متفرق کتابیں اس میں یکجا کر دی گئی ہیں، اور کچھ قسطنطنیہ سے سلطان نے بھیجوائیں۔ بالفعل اس کتبخانہ میں میرے اندازہ کے مطابق چھ ہزار کتابیں ہونگی، ان میں مطبوعہ اور قلمی کتابیں ہیں، یہ کتابیں .... ہر علم وفن کی ہیں اور ترتیب سے کھلی الماریوں میں چنی ہیں۔ کتبخانہ کے موجودہ ناظر داغستان کے ایک عالم ہیں، جنھوں نے مصر میں تعلیم پائی ہے۔ کتبخانہ کی ایک پرانی فہرست ہے جو ایک ضخیم جلد میں ہے اور شکستہ ہو رہی ہے۔ داغستانی صاحب نے نہایت محنت اور جانفشانی سے اسکی ایک نئی فہرست ترتیب دی ہے اور ہنوز وہ تمام نہیں ہوئی کچھ حصہ زیر ترتیب ہے، شاید کہ اب تمام ہوگئی ہے۔

قلمی کتابوں میں سیکڑوں ایسی ہیں جو ابھی طبع نہیں ہوئی ہیں۔ نادر کتابیں بھی اس میں متعدد ہیں جن میں سے ایک فرقۂ ماتریدیہ کے امام ابومنصور ماتریدی کی تفسیر تاویلات القرآن ہے۔ یہ نسخہ نہایت باریک فارسی خط میں بہت بڑی تقطیع پر ایک ضخیم جلد میں ہے .... اس کتبخانہ میں ایک اور دوسری تفسیر نظم الدرر فی تناسب الآی والسور کی متعدد جلدیں ہیں۔ اسکے مصنف امام برہان الدین ابراہیم بقاعی ہیں۔ اس تفسیر کی خاص خصوصیت یہ ہے کہ اس میں آیتوں اور سورتوں کا باہمی ربط و نسق بیان کیا ہے ....

مکہ کے قیام کے زمانہ میں ایک ہندوستانی مہاجر عالم صاحب جو بالفعل سلطان ابن سعود کے مخالف ہیں اور روایتوں کے بیان کرنے میں نہایت بے احتیاط ہیں، اُنھوں نے مجھ سے فرمایا کہ نجدیوں نے مکہ معظمہ کے داخلے کے وقت اس کتبخانہ سے ساٹھ آدمیوں پر یا ساٹھ اونٹوں پر لادکر کتابیں نجد بھیجوادیں، اور فلسفہ و منطق اور امام غزالی کی سب تصنیفیں جلا ڈالیں۔" میں اس کتبخانہ کو پہلے دیکھ چکا تھا، تاہم اُنکے کہنے پر میں نے جاکر دوبارہ کتبخانہ کا جائزہ لیا تو اس میں فلسفہ، منطق، ہیئت، ریاضیات، تصوف، حتیٰ کہ رمل و جفر کی کتابیں بھی موجود پائیں۔ امام غزالی کی تصنیفات بھی موجود تھیں۔ اور ساٹھ آدمیوں یا اونٹوں پر اگر کتابیں منتقل کی جاتیں تو کتبخانہ کی الماریاں خالی ہوتیں۔ میں نے اسی پر بس نہیں کیا، ناظر صاحب سے دریافت کیا انھوں نے ہنسکر نئی اور پرانی فہرستیں سامنے رکھ دیں۔ میں نے ابھی تحقیق نہیں ختم نہیں کی، قاضی ابن بلیہد صاحب جو قاضی القضاۃ ہیں اور جن سے ان چیزوں کا تعلق ہے، اُن سے جاکر پوچھا کہ یہ افواہ ہے، اس میں کہاں تک صداقت ہے، انھوں نے نہایت غصہ سے اسکی تردید کی اور کہا بحمداللہ ہم اہل نجد کو کتابوں کی حاجت نہیں ہمارے ملک میں سب کتابیں موجود ہیں ......

وفد خدام الحرمین کی رپورٹ میں اسی سرکاری کتبخانہ کے ذکر میں بیان کیا گیا ہے کہ انکو عینی شہادت ملی ہے کہ اس کتبخانہ کی فقہ و تصوف، فلسفہ و منطق وغیرہ کی کتابیں جلا ڈالی ہیں، یہ قطعاً غلط اور کذب محض ہے، اور کتبخانہ میں آج بھی ان کتابوں کا وجود وفد مذکور کی سنی ہوئی عینی شہادت کی تکذیب کرنے کو تیار ہے اور ہندوستان میں بھی سیکڑوں اسکے دیکھنے والے

موجود ہوں گے۔

"یہ جلۂ معترضہ تھا جو اس لیے لکھا گیا تاکہ اسلام کا کوئی آیندہ مخالف مورخ اس واقعہ کو دوسرا کتبخانۂ اسکندریہ نہ بنا دے۔"

زمانہ

ستمبر کے زمانہ میں مسٹر علی عباس حسینی نے مرزا غالب کو جس محلبت کے ساتھ مذہب اثنا عشری کا پیرو ثابت کر دیا، اسکا حوالہ الناظر کے پچھلے نمبر میں دیا جا چکا ہے۔ اس مہینے کے زمانہ میں سید عاشق علی صاحب نے مسٹر عباس کے نتیجہ کے خلاف شہادتیں پیش کی ہیں۔ اب شاید مسٹر عباس کو اپنے فیصلہ پر نظرثانی کرنا پڑے۔ ملاحظہ ہو:-

"ہر صبح کو حامد علی خاں کی مسجد میں جا کر جناب مولوی جعفر علی صاحب سے قرآن سنتا ہوں شب کو جامع مسجد جا کر نماز تراویح پڑھتا ہوں۔" (مکتوب بنام میر مہدی مجروح)

".... میاں نصیر الدین اولاد میں سے ہیں شاہ محمد اعظم کے، وہ خلیفہ تھے مولوی فخر الدین صاحب کے اور میں مرید ہوں اس خاندان کا" (مکتوب بنام میر مہدی مجروح)

".... غالب چشتی نظامی تھے شیعہ نہ تھے، اگر شیعہ ہوتے تو علی گنج شاہ مرداں کے قبرستان میں دفن ہوتے، جہاں اسوقت کے تمام شیعہ امرا دفن ہوتے تھے اور اب بھی ہوتے ہیں ..... اُنکی قبر بھی سُنّی طریقہ کی بنائی گئی ہے یعنی اُسپر اُونچا، اونٹ کے کوہان کی شکل کا خشتی تعویذ بنا یا گیا ہے۔ شیعوں کی قبریں زمین کے برابر ہوتی ہیں" (غالب کا روزنامچہ، مرتبۂ حسن نظامی)

".... لہذا کوئی گنجایش نظر بحالات و دلائل مندرجۂ بالا شک و شبہہ کی باقی نہیں رہتی جس سے غالب کو شیعہ کہا جا سکے۔ البتہ یہ ضرور تھا کہ غالب کو حقیقی اور سچی محبت و اہلبیت اطہار سے تھی۔ سیاسی محبت نہ تھی۔ اور یہی طریقہ و عقیدہ سنیوں کا ہے۔"

ہمایوں

اکتوبر کے ہمایوں میں مولوی محمد حامد دہلوی نے "ہندوستان کی پیکر نگاری" کے تحت میں مشرقی اور مغربی مصوری کے اہم اختلافات بیان کیے ہیں۔ اسے پڑھکر مشرقی اور مغربی صناعی کے نمونوں کو غور سے دیکھیے۔ شاید کچھ بصیرت حاصل ہو:-

"(۱) مغربی تصویر میں مختلف رنگوں کی دلکش آمیزش، نیز سایہ و روشنی کی صنعت قابل قدر ہے

(۲) مغربی مصور، سطح تصویر کی دلچسپ رنگ آمیزی، نیز اشکال مختلفہ کے اجتماع سے حیرت انگیز اور دل لبھانیوالا نظارہ پیدا کرتا ہے اور اپنی مجموعی تصویر کی متفرق اشیا و بعینہ انھیں کو قع پر دکھاتا ہے جو ناظر کے خاص زاویۂ نگاہ میں نظر آتی ہے۔

(۳) مغربی تصویر میں مناظر کی حدبندی خطوط سے نہیں کی جاتی، حدود کی نسبت صرف قیاس قائم کر لیا جاتا ہے۔

(۱) برخلاف مغرب، مشرقی تصویر کی خوبی صحیح، مکمل اور باریک خطوط کے وسیلہ سے

مجسم اشیاء کا اظہار کرتا ہے۔ دنیا کے مبصر ہمزبان ہیں کہ مشرقی مصور باریک خطوط کی کشش اور دستکاری میں یکتائے روزگار ہے۔

(۲) مشرقی مصور شبیہ کو خاص مدرسہ طریقہ کی پیروی میں بناتا ہے

(۳) ہندوستان کی تصویری کام کی تازگی، نقوش کی صفائی، خطوط کی باریکی، اثبات دست اور دیگر برگزیدہ وصفات میں بے مثل ہے"۔

جامعہ

مسٹر برٹرانڈ رسل کی قابل دید کتاب "مسئلۂ چین" کے ایک باب کا ترجمہ اس ماہ کے جامعہ میں شائع ہوا ہے۔ یورپ کا یہ چینی دماغ چین کی امن پسندی کی داد ان الفاظ میں دیتا ہے:۔

"اگرچہ چین بہت سی جنگوں کا معرکہ گاہ رہا ہے، لیکن چینی قوم کی طبعی افتاد مزاج بہت ہی امن پسند واقع ہوئی ہے۔ میں نہیں جانتا کہ دنیا میں کوئی اور قوم ایسی ہے جسکا شاعر چینی شاعر پوچوئی کی طرح اپنی ایک نظم (بازو شکستہ مرد ضعیف) کا موضوع اور ہیرو ایک ایسے نوآموز فوجی سپاہی کو بناتا جسنے فوجی ملازمت سے گریز و گلو خلاصی حاصل کرنے کے لیے اپنے کو بے دست و پا کر لیا تھا۔ انکی اس امن پسندی کا راز انکے مفکرانہ مذاق طبیعت میں ہے۔ نیز اس میں انکے مزاج کی اس خصوصیت کو بھی دخل ہے کہ وہ قدرتی صورت حالات میں کوئی تغیر و تصرف کرنے کی خواہش نہیں رکھتے۔ .... وہ کہتے ہیں کہ جب تم بہترین چیزوں سے لطف اندوز ہو رہے ہو تو پھر اس کے بعد بھی ترقی کی تلاش میں لب تشنہ رہنے کی کیا ضرورت ہے؟ پہلی نظر میں دیکھنے سے ایک یورپین کو اس زاویۂ نگاہ میں ضرورت سے زیادہ کاہل الوجودی معلوم ہوتی ہے، لیکن رفتہ رفتہ جبکہ عقل و دانش میں ترقی ہوتی جاتی ہے تو اسکو اپنے خیال کے متعلق شکوک لاحق ہوتے جاتے ہیں اور وہ خیال کرنے لگتا ہے کہ جس چیز کو ہم "ترقی" کہتے ہیں اسکا غالب عنصر ایک بیہودہ قسم کی تغیر پسندی ہے جو ہم کو کسی مستحسن قسم کی منزل مقصود سے کچھ بھی قریب نہیں کرتی"۔

نیرنگ خیال

جناب سید حسن برنی نے "مسلمان عورتیں اور نیا زمانہ" کے عنوان سے نیرنگ خیال میں فرنچ مستشرق موسیو کراٹ دو کی ضخیم کتاب "محققین اسلام" کے ایک باب کا ترجمہ پیش کیا ہے۔ ترک عورتوں کے متعلق تو آپ بہت کچھ سن چکے ہیں۔ بعض دوسرے اسلامی ممالک کی عورتوں کے کچھ حالات حاضر ہیں۔ یہ امر قابل لحاظ ہے کہ مصنف یوروپی نقطۂ نظر پیش کر رہا ہے۔

"تاتاریوں نے عورتوں کی آزادی میں ترکوں سے بہت بڑھکر حصہ لیا ہے۔ کریمیا میں عورتوں کو ووٹ دینے کا حق ہے۔ علاقہ قاف میں مدارس نسواں کھلے ہوئے ہیں، کانفرنسیں ہوتی ہیں اور انتخابوں کی تیاری میں عورتیں حصہ لیتی ہیں۔ علاقہ ماوراے قاف میں عورتوں نے اپنا اتحاد قائم کرکے کانفرنس منعقد کی، اور ۱۹۱۷ء اور ۱۹۱۸ء میں نمائندے بھیجے۔ سرکیشیا کی عورتیں بھی آزادی پا چکی ہیں اور نقاب ترک کر چکی ہیں .... یہ ماننا پڑے گا کہ اگر سرکیشیا کی عورتوں

میں بھی ناچ کا ایسا ہی شوق بڑھا ہوا ہے جیسا کہ اُنکی پیرس کی بہنوں کا تو واعظین کا یہ قول بالکل درست ہے - سرکیشیا کی عورتیں تعدد ازدواج کے خلاف ہیں، اس بات کو تسلیم نہیں کرتیں کہ کم عمر بچوں کی شادی کا کسی کو حق ہے - اُنکی خواہش ہے کہ شادی کے معاملہ میں انتخاب کی آزادی ہونی چاہیے کرغز کے علاقہ میں تعدد ازدواج کے خلاف حال ہی میں ایک ڈگری ہوئی ہے .....
مصر کی بھی یہی حالت ہے اور وہاں پر اسکا بہت کچھ اظہار ہوا ہے - مصر کے سرکاری طبقہ میں اکثر امیرزادیاں اور خواتین یورپ میں سیاحت کرتی ہیں اور آزادی سے یورپین طرز معاشرت کے ساتھ بسر کرتی ہیں - سلطان مصر کی والدہ ملکہ بلجیم کے ساتھ طوطن آمون کا مقبرہ دیکھنے گئی تھیں - سلطان مصر نے ۱۹۲۲ء میں ایک خاص نشان امتیاز قائم کیا ہے جو صرف عورتوں کے لیے ہے -
شمالی افریقہ میں بہت سی خواتین موجود ہیں جو ہمارے ادب سے پورے طور پر مس رکھتی ہیں - کبھی کبھی وہ ہمارے ملکوں میں سفر کرتی ہیں اور یورپین مستورات کے طریق پر لباس پہنتی اور زندگی بسر کرتی ہیں - اپنے ملک میں واپس ہونیکر وہ اپنا قومی لباس پہن لیتی اور اپنے خاندان کے طرز معاشرت کو پھر اختیار کرلیتی ہیں - انھیں اپنی فرانسیسی بہنوں کی آزادی اور خوش وقتی پر کسی قدر رشک آتا ہے "

سہیل

انجمن اُردوے معلٰی علی گڈھ کے قابل قدر سہ ماہی رسالہ سہیل کا ستمبر نمبر، نومبر میں شایع ہوا ہے، مگر اتنی تاخیر ہو جانے پر بھی ہم سہیل کو اس بزم سے غیر حاضر نہیں کرنا چاہتے - اس میں سید محی الدین قادری کا ایک قابل دید مضمون " اُردو کے اسالیب بیاں " شایع ہوا ہے - ایک جگہ مولانا نیاز فتحپوری کے اسلوب بیاں پر یوں تنقید فرمائی ہے :-

" مولانا نیاز فتحپوری کے اسلوب میں بھی نامانوس الفاظ اور عجیب و غریب ترکیبوں کی وجہ سے کہیں کہیں ابو الکلام کا رنگ جھلک پڑتا ہے - مولانا ابو الکلام کا موضوع مذہب اور حضرت نیاز کا ادبیات، اسلیے موخر الذکر کی تحریروں میں رنگینی اور شوخی جگہ جگہ نمودار ہو جاتی ہے - مولانا ابو الکلام کو باوجود اپنے فطری بانکپن کے سنجیدگی ضرور قائم رکھنا پڑتی ہے - نیاز ایک کامل فن ہونے کی حیثیت سے آزاد ہیں - وہ اپنے اسلوب میں جس قدر چاہیں رعنائی پیدا کرسکتے ہیں اور یہ رعنائی جس قدر بڑھی ہوئی ہوگی اُنکی ادبی شان میں اُتنا ہی اضافہ ہوگا - مولانا ابو الکلام کے بہ نسبت حضرت نیاز کا دائرۂ عمل زیادہ وسیع ہے - ادبیات اُردو کا ہر طالب علم نیاز کی تحریروں کی طرف نظر شوق کے ساتھ بڑھتا ہے - اور اُنکے مطالعہ کے بعد کسی نہ کسی طرح متاثر ہوے بغیر نہیں رہتا - یہی وہ امر ہے جسکو مد نظر رکھتے ہوے نیاز کی عجیب و غریب ترکیبوں اور نامانوس الفاظ سے خوف ہے کہ کہیں وہ اُردو اسلوب بیاں کے لیے مضر نہ ثابت ہوں آجکل اُردو کے دلدادہ اپنی انشاپردازی کو اکثر حضرت نیاز کے اسلوب کی پیروی کے ساتھ شروع کرتے ہیں، ...... اور لطف یہ کہ مضمون نگار حضرت نیاز کی طرح خود بھی نئے نئے

الفاظ ایجاد کرنے کے متمنی رہتے ہیں اور اس کوشش میں وہ اور بھی راہِ راست سے دُور جا پڑتے ہیں ۔ اس کا اصلی سبب یہ معلوم ہوتا ہے کہ آجکل عربی میں مہارت تامہ حاصل کرنے کی طرف بہت کم توجہ کی جاتی ہے اور عربی زبان سے واقفیت حاصل کیے بغیر اس قسم کی "جرأتِ رندانہ" یقیناً "ایجاد بندہ" سے کم نہیں ہو سکتی ۔

اسی پرچہ میں پروفیسر رشید احمد صدیقی نے اپنے مخصوص انداز سے "اُردو شعر و شاعری پر ایک نظر" ڈالی ہے شعر و شاعری پر نظر ڈالتے ہوئے شاعر کا جائزہ لیتے ہیں اور اپنے بیان کو ان الفاظ میں سپردِ قلم فرماتے ہیں:

"بعض لوگ تو یہ سمجھتے ہیں کہ محض مقررہ اصول کے ماتحت خیالات کو موزوں کر دینا شاعری ہے ۔ کچھ لوگوں کا عقیدہ ہے کہ محض الفاظ اور جملوں کو مقررہ اوزان میں ترتیب دینا شاعری ہے ۔ کچھ لوگ اور ہیں جو اسکے قائل ہیں کہ دل میں جو خیال آئے اُسکو من و عن بیان کر دینا شاعری ہے ۔ ان میں کوئی ایسا نہیں ہے جو ترتیب خیال یا کلام میں اپنی انفرادی اور مخصوص حیثیت کو داخل کرنا ضروری سمجھتا ہو ۔۔۔ پہلی اور دوسری جماعت کے لوگ تو مسلمہ طور پر لکیر کے فقیر ہیں ۔ انکے متعلق کچھ کہنا بھی بیکار ہے ۔ اور انکا کلام رائے سینا (دہلی) کی سرکاری عمارات ہیں جو اس درجہ یکساں اور سپاٹ واقع ہوئی ہیں کہ انکی امتیازی خصوصیت صرف انکی کثرت تعداد ہے ۔۔۔۔ تیسری جماعت یہ سمجھتی ہے کہ جو کچھ دل میں آئے وہ زبان پر نہ آسکے تو نہ آئے ، اگر اُسے "صفحہ قرطاس" پر ضرور آنا چاہیے ۔ یہی کمال انشا پردازی ہے جسمیں تغیر و تبدل کرنے سے آرٹ کا خون ہوتا ہے ۔ ان بزرگوں کے نزدیک انکی ہر لغزش یا بے تکلی کا جواز آرٹ میں مل سکتا ہے ۔ انکے نزدیک دو اور دو کہنا بھی آرٹ ہے اور دو اور دو چار سو کہنا بھی آرٹ ، اپنی کمزوریاں بھی آرٹ ، اور دوسروں کی بیویاں بھی آرٹ ۔ غرضکہ آپ کسی بے ڈھنگے پن کو آرٹ بنا سکتے ہیں بشرطیکہ آپ اپنی زبان و قلم ، لب و لہجہ ، صورت شکل ، یا قول و فعل کو علی الرغم تعزیرات ہند یا اڈیٹر تیغ بر سرِ کار لا سکیں ، بالفاظ دیگر بنفس نفیس آرٹ بن جائیں !"

رسید کتب

۱- نفسیات ترغیب — پروفیسر تاج الدین احمد کنتوری شایع کردہ دارالمصنفین اعظم گڈھ

۲- اقتباسات سیرۃ النبی — پروفیسر سید علی اورنگ آبادی عثمانیہ انٹرمیڈیٹ کالج

۳- براؤننگ — سید وقار احمد بی اے (عثمانیہ) نظامت منزل حیدرآباد

۴- آئین اُردو — مولوی زین العابدین صاحب فرجاد کوٹانوی ۔ میرٹھ

تنقیدیں

التربیۃ الاستقلالیہ — مترجمہ مولوی عبدالسلام ندوی۔ حجم ۳۰۸ صفحے۔ مطبوعہ مسلم یونیورسٹی پریس علی گڈھ۔ ملنے کا پتہ: دفتر آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس علی گڈھ قیمت [illegible]

ہندوستان میں اولاد کی تربیت کی طرف سے بہت بے توجہی برتی جاتی ہے اور یہ کہنا بیجا نہ ہوگا کہ ہماری مذہبی، اخلاقی، اور معاشرتی پستی کی اصلی وجہ یہی بے توجہی ہے۔ مسلم ایجوکیشنل کانفرنس نے ملک میں تربیت اولاد کی اہمیت کا احساس پیدا کرنے کے لیے کچھ لٹریچر شائع کیا ہے۔ اسی ضمن میں یہ کتاب بھی آئی ہے۔

اصل کتاب فرانسیسی زبان میں الفونس اگروس نے لکھی تھی، شیخ عبدالعزیز آفندی محمد قاضی محاکم اہلیہ مصر نے اسے عربی میں ترجمہ کیا، اور مولوی عبدالسلام ندوی نے اسکے ضروری حصوں کو اُردو لباس پہنا کر شائع کیا ہے۔ یہ کتاب افسانے کے طور پر لکھی گئی تھی۔ ڈاکٹر اراسم کسی سیاسی جرم میں گرفتار ہو کر ایک طویل زمانے کے لیے اپنی بیوی سے جدا ہو گیا ہے، جسکی گود میں ایک بچہ ہے، اور اُس بچہ کی تعلیم و تربیت کے متعلق جیل کے اندر سے میاں بیوی کے درمیان خط و کتابت ہوتی ہے۔ مولوی عبدالسلام صاحب نے خطوط کو اخذ کر کے فسانہ کو خارج کر دیا۔ گویا فسانے کا ترجمہ اُنکی شان کے خلاف تھا۔ مگر واقعہ یہ ہے کہ اس ادبی جراحی کی بدولت کتاب کی دلچسپی میں کمی ہو گئی ہے۔ بہرحال زمانۂ حمل سے عہد شباب تک لڑکوں اور لڑکیوں کی تعلیم و تربیت کے بہترین اصول جمع کر دیے گئے ہیں جنسے بچوں میں آزادی اور استقلال کی روح پیدا ہو اور جبر و تقلید کی عادتیں اُن میں نہ پیدا ہوں۔ الفونس سن تمیز سے پہلے مذہبی تعلیمات و تلقینات کو بھی ضروری نہیں قرار دیتا۔ یہ خیال شاید مشرقی دُنیا میں ناپسندیدگی کی نظر سے دیکھا جائے، مگر اسکے علاوہ پوری کتاب کا ایک ایک لفظ اس قابل ہے کہ اُسکو بار بار پڑھا جائے۔ شروع میں مترجم موصوف نے تعلیم قدیم و تعلیم جدید اختلافات پر ۹۶ صفحے کا پُرمغز اور مفید مضمون بطور مقدمہ شامل کر دیا ہے۔ جسکے مطالعہ سے کسی قدر اندازہ ہو سکتا ہے کہ مسلمانوں کے عہد عروج میں جو عظیم الشان علمی ترقیاں ہوئیں یا جیسے پاکیزہ سیرۃ لوگ پیدا ہوئے وہ کس طریقۂ تعلیم و تربیت کا نتیجہ تھا۔ چودھویں صدی میں اگر اُن طریقوں کا اتباع کامل دشوار و محال ہو تو کبھی کبھی اُس زمانہ کے حالات و خصوصیات پر تو نظر کر لینا چاہیے تاکہ اپنے اولوالعزم اور مایہ دار اسلاف کی یاد سے موجودہ تغیر شدہ حالات میں بھی کچھ نہ کچھ مدد مل سکے۔

بادۂ ناب — مصنفۂ میر ولی اللہ وکیل ایبٹ آباد۔ ضخامت ۱۵۲ صفحے۔ قیمت ایک روپیہ۔ مصنف سے مل سکتی ہے۔ طباعت و کتابت نہایت دیدہ زیب۔

یہ کتاب مولوی ولی اللہ صاحب کی فارسی رباعیات کا مجموعہ ہے۔ شروع میں چودھری محمد علیخاں وکیل ایبٹ آباد کے قلم سے ایک دیباچہ ہے۔ میر صاحب نے حسن و عشق اور گل و بلبل کے قصوں کو چھوڑ کر اپنے قیمتی خیالات کو سادہ لباس پہنایا ہے۔ ان رباعیات میں مسلمانوں کو یہ ترغیب دی گئی ہے کہ

پھر اپنے اصلی مذہب کی طرف رجوع کریں۔ اور قرآن کریم کے سادہ اصول کی پابندی کریں:۔

تیرہ شب کفر صبح ایماں روشن — تاریک رہِ فلسفہ قرآں روشن
باید کہ غلام شہِ یثرب نہ کند — کاشانۂ دل بشمع یوناں روشن

مغربی تہذیب اُن کا خیال ہے کہ روحانیت کو تباہ کردیتی ہے۔ اس لیے جگہ جگہ اُس سے احتراز کی تعلیم دی ہے:

مرد بیہودہ پیشِ بیکن و مِل — چہ حاصل باشدت زیں سعیِ باطل
میاموز حکمت از یونان و فاراب — چراغِ راہِ خود خود باش ایدل

زیادہ تر میر صاحب کے کلام پر اقبال اور اکبر کا رنگ چڑھا ہوا ہے مگر سادگی بیان بالکل اوریجنل ہے۔ ان رباعیات میں شاعرانہ صنائع وبدائع نہیں ہیں لیکن مسلمانوں کے اخلاقی، معاشرتی اور روحانی امراض کا علاج ضرور ہے۔

رپورٹ آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کے اڑتیسویں اجلاس منعقدہ ۲۶-۲۷ دسمبر ۱۹۲۵ء بمقام علی گڈھ کی رپورٹ پیش نظر ہے۔ خطبۂ صدارت میں بجائے پرشکوہ الفاظ کے کچھ کار آمد تجویزیں پیش کی گئی ہیں۔ جناب صدر نے تجارتی اور صنعتی تعلیم پر خاص زور دیا ہے۔ اور بچوں کی اخلاقی تربیت پر مفید مشورہ دیا ہے۔ اُنھوں نے صاف صاف کہدیا کہ اسلامی درس گاہیں اس لیے قائم کی جاتی ہیں کہ نئی پود کی تہذیب اخلاق کا بھی سامان کیا جائے۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ اِن اسلامی درسگاہوں کی پیداوار بھی دوسرے طالب علموں سے بہتر اخلاق کے ساتھ آراستہ نہیں ہوتی۔ اسی ضمن میں مذہبی تعلیم کی ناگفتہ حالت کا کھلے کھلے الفاظ میں اظہار کردیا ہے کاش مسلم یونیورسٹی ان الفاظ کی روشنی میں اپنی حالت کا جائزہ لیتی!

اسکے بعد سکرٹری کی سالانہ رپورٹ ہے۔ کانفرنس کی علمی خدمات میں تعلیمی وظائف اور تعلیمی لٹریچر کی اشاعت خاص طور پر قابل مبارکباد ہے۔ گو مسلمانوں کی حالت کو بہتر بنانے کے لیے یہ کافی نہیں کہا جاسکتا۔ ممالک متحدہ کی تعلیمی رپورٹ میں سوائے گورنمنٹ سے خط وکتابت کرنے کے اور کچھ نہیں۔ مگر ممالک متحدہ کی محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس ایک طویل نوم کے بعد جاگی ہے۔ آئندہ کچھ مفید خدمات کی امید کی جاسکتی ہے۔ اسکے بعد کفایت شعاری اور مسلم یونیورسٹی اور ٹکنیکل تعلیم پر دو مفید و پُر از معلومات لکچر ہیں۔ اس اجلاس کی اہم تجویزیں حسب ذیل ہیں:

ترقی تعلیم کے لیے کواپریٹو سوسائٹیوں کا قیام۔ مسلم یونیورسٹی میں صنعتی تعلیم کا اجرا۔ ابتدائی تعلیم کو مفت و جبریہ کرنا۔

ان تجویزوں کی تعمیل کے لیے "سلطان جہاں منزل" اور مسلم یونیورسٹی کی طرف ہماری آنکھیں لگی ہوئی ہیں۔

غذائے روح مترجمہ پنڈت پربھو دیال عاشق لکھنوی۔ ضخامت ۱۱۵ صفحے۔ قیمت ۸ملنے کا پتہ نولکشور پریس بکڈپو لکھنؤ یا سری مصر آشرم چھاؤنی نیچ (صوبہ متوسط)

بھگوت گیتا ہندو فلسفۂ روحانیت پر سب سے مشہور کتاب ہے۔ یورپ اور ایشیا کی اکثر زبانوں میں اسکے ترجمے ہو چکے ہیں۔ اُردو میں بھی اسکے ایک سے زائد ترجمے موجود ہیں۔ "نغمۂ روح" بھگوت گیتا کا منظوم ترجمہ ہے۔ نظم میں روانی کی کمی ہے لیکن لفظی ترجمہ کا یہ لازمہ ہے۔ اس نظم کے مطالعہ سے یہ بھی اندازہ ہوگا کہ اگر اُردو کو ہندی الفاظ سے پاک رکھنے کی کوشش کی گئی تو پھر ہندوؤں کا رہا سہا تعلق بھی منقطع ہو جائیگا۔ شروع میں ایک مبسوط دیباچہ ہے جس سے نظم کے سمجھنے میں مدد ملیگی۔ آخر میں غیر مانوس سنسکرت الفاظ کے تلفظ اور معنی درج کر دیے گئے ہیں۔ اور کتاب میں جا بجا تصویریں بھی شامل کر دی گئی ہیں۔ مصنف صاحب اپنی جانفشانی پر مبارکباد کے مستحق ہیں مگر فلسفہ کی کتابوں کا لطف ترجمہ اور پھر منظوم ترجمہ میں کہاں ممکن ہے!

فتنۂ خلق قرآن | مترجمہ ملک ابو یحییٰ امام خاں نوشہروی۔ حجم ۸۰ صفحے۔ ملنے کا پتہ: مینیجر مکتبۂ زکیٔ سوہدرہ گوجرانوالہ۔

اسلام کے اُس پُر آشوب زمانہ میں جبکہ خلیفہ مامون الرشید نے معتزلہ کی طاقت لسانی کے فریب میں آکر مسئلۂ خلق قرآن کو گویا بطور قانون نافذ کر دیا تھا۔ امام عبد العزیز سر کعب مکہ شریف سے بغداد پہونچے اور فتنۂ خلق قرآن کی پُر زور مخالفت فرمائی۔ اُسی زمانہ میں آپ نے اس مسئلہ پر کتاب الحیدہ بھی تصنیف فرمائی جسکا اُردو ترجمہ آج پیش نظر ہے۔ مغربی تعلیم اور عیسائی مشنریوں کے اثر سے اسوقت نئے تعلیم یافتہ گروہ میں کچھ شکوک پیدا ہو رہے ہیں۔ انکے لیے اس کتاب کا مطالعہ ازبس ضروری ہے۔

قادیانی نبی | مولفۂ مولوی لیاقت اللہ خاں۔ حجم ۲۸ صفحے۔ مولف سے کشمیری محلہ، شملہ کے پتہ پر مل سکتی ہے۔

اس رسالہ میں یہ ثابت کرنے کی کوشش کی گئی ہے کہ مرزا غلام احمد صاحب قادیانی کے اقوال و الہامات آپس میں متضاد اور مختلف ہیں، لہذا اُن کا کلام الہام نہیں، اور وہ خدا کے فرستادہ نہیں۔ بعض اقوال سے یہ بھی ظاہر ہے کہ مرزا صاحب دروغگوئی اور توہین انبیاء کرام کے مرتکب ہوے ہیں۔ کتاب میں کسی قسم کی بحث نہیں کی گئی ہے صرف وہ اقوال درج کر دیے گئے ہیں جنسے مذکورۂ بالا نتائج نکلتے ہیں

مصباح القوافی | مصنفۂ مولوی سید محمد نقوی۔ چھوٹی تقطیع کے سولہ صفحوں پر ۲ر میں مصنف سے (دیوان خانہ مرسی ضلع مراد آباد) طلب فرمائیے۔

جناب مصنف نے ۶۸ اشعار میں تمام القاب حروف و حرکات قافیہ اور اُن سب کی تعریفات نظم کر دی ہیں۔ طلبا کے لیے مفید ہو سکتی ہے۔ نظم مجبوراً بہت ثقیل ہو گئی ہے۔

میلاد نبیؐ | مولفہ مولوی سید نذیر علی ثاقب پانی پتی۔ ضخامت پاکٹ سائز کے ۲۲۴ صفحے۔ ملنے کا پتہ سید نذیر علی، وکیل راجگڈھ (بیکانیر)

اس کتاب میں پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کے مختصر حالات درج کیے گئے ہیں۔ مگر سوانح رسول اسقدر

مختصر ہیں کہ شاید محفل میلاد میں بھی پڑھنے کے لیے ناکافی ہوں - البتہ پیشہ ور میلاد خوانوں کے لیے عجیب ترانوں کا اچھا ذخیرہ فراہم کردیا گیا ہے -

---

نغمہ اور اسلام مولفۂ مولوی محمد علی شاہ بیکش - حجم ۴۲ صفحے - قیمت ۱۲ر

اس رسالہ میں مولف موصوف نے ساز اور سماع محضہ کے جواز پر بہت سے دلائل جمع کردیے ہیں - اس مسئلہ پر اتنی بحث ہو چکی ہے کہ موافق اور مخالف تمام دلائل پبلک کے سامنے پیش ہو چکے ہیں اور ہر فرد اپنی رائے قائم کرنے کے لیے آزاد ہے - اسلیے اب اس پر خاموش رہنا ہی بہتر ہے - شروع میں "اعتذار" کے عنوان سے مولف نے اپنی علالت کا حال بیان کیا ہے اور اسے ادبی فروگذاشتوں کا سبب قرار دیا ہے - شاید پڑھنے والوں کو اس حصہ سے بھی دلچسپی ہو!

تواریخ وصال مولفۂ شاہ غلام جیلانی رزاقی بانسوی - مطبوعہ احمد المطابع کانپور - غالباً سید ممتاز احمد صاحب سجادہ نشین بانسہ شریف سے ۳ر میں مل سکتی ہے

اس میں مشاہیر اولیا متقدمین و متاخرین کے وصال کی تاریخیں درج ہیں - مرشدوں اور مریدوں کے لیے کارآمد چیز ہے -

یادِ رسولؐ مصنفہ خان بہادر مرزا سلطان احمد صاحب - مطبوعہ مرغوب ایجنسی لاہور - ضخامت چھوٹے سائز کے ۸۰ صفحات - قیمت ۶ر

اس کتاب کے دو حصے ہیں - پہلے حصہ میں قومی اور ملی ہیرو کی اہمیت، اس کے اقسام پر بحث کر کے پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کو مسلمانوں کے روحانی ہیرو کی حیثیت سے پیش کیا ہے اور آپ کی تقلید و تابعیت کے لیے محافل میلاد کو بہت ضروری قرار دیا ہے -

دوسرے حصہ میں اسوۂ حسنہ رسولؐ اور تعلیمات نبوی پر فلسفیانہ بحث کی ہے - اسی ضمن میں احادیث کے استناد پر بھی کچھ بحث آگئی ہے - عقائد کے صحیح اصول پر نشوونما پانے کے لیے یہ کتاب بہت مفید ہے - اسکی زبان سلیس اور خیالات سلجھے ہوئے ہیں اگرچہ تفصیلی بحث نہ ہونے کی وجہ سے جابجا تشنہ رہ گئے - دلائل کی تنقید کرتے وقت اگر مغربی اسلوب بیان بھی پیش نظر رکھا جاتا تو کتاب زیادہ قیمتی ہو جاتی -

سید

خیاباں کے نام سے سید شہنشاہ حسین رضوی ایم اے ایل ایل بی وکیل لکھنؤ نے ایک رسالہ ابھی نومبر سے جاری کیا ہے - ابھی پہلا ہی پرچہ نکلا ہے اس لیے کسی قسم کی رائے کا اظہار قبل از وقت ہوگا - البتہ دلی مسرت کے ساتھ نئے معاصر کا خیر مقدم کیا جاتا ہے اور جو توقعات کہ گذشتہ سال ایک دوسرے مقامی معاصر کے اجراء سے وابستہ کی گئی تھیں اور جو افسوس ہے کہ نہیں پوری ہوئیں وہ اس پرچہ سے قائم کی جائیں تو غالباً بیجا نہ ہوگا اس لیے کہ سید شہنشاہ حسین صاحب سے زیادہ اس کام کیلیے کون موزوں ہو سکتا ہے کہ اپنے شہر کے ذی علم حضرات کو عموماً اور نوجوان تعلیم یافتہ طبقہ کو خصوصاً اُردو کی خدمت پر آمادہ کر سکیں اور اُنکے دلوں میں اپنی زبان کی الفت کا وہی جوش و ولولہ پیدا کردیں جسکی آگ خود اُنکے قلب کو گرماتی رہتی ہے - سالانہ چندہ عہ ر ہے

ظفر الملک

اُردو رسائل کے خاص مضامین

(نومبر ۱۹۲۶ء)

دلگداز۔ لکھنؤ

(۱) سلطان عالم واجد علی شاہ

معارف۔ اعظم گڈھ

(۱) حجاز کے کتبخانے
(۲) غارا یلورا
(۳) ارتقاے ادب فارسی عہد اکبر میں

زمانہ۔ کانپور

(۱) مورخین اُردو
(۲) کربلا
(۳) شہید نمایش

ہمایوں۔ لاہور

(۱) اسلام کا اثر مغربی تہذیب پر
(۲) ہندوستان کی پیکر نگاری
(۳) نیش ناتمام (فسانہ)

جامعہ۔ دہلی

(۱) ہندوستانی زراعت کی کمزوریاں
(۲) چینی و مغربی تہذیب کا مقابلہ
(۳) ہندوستان کی تعلیمی حالت

مرقع۔ لکھنؤ

(۱) شعر اور علم

ہزار داستان۔ لاہور

(۱) چاند اور تارے
(۲) گردش ایام (فسانہ)
(۳) امرا کی شاعری

نیرنگ خیال۔ لاہور

(۱) عالمگیر اعظم کا یومیہ پروگرام
(۲) مسلمان عورتیں اور نیا زمانہ
(۳) ایک خواب کی تعبیر

پیمانہ۔ آگرہ

(۱) دول اتحاد کے قرضے اور دنیا کا مستقبل
(۲) قانون تمدن اور سیاسیات ملل
(۳) لسان العصر

سہیل۔ علی گڈھ

(۱) اری ایڈنی (افسانہ)
(۲) قاصد سحاب
(۳) اُردو کے اسالیب بیاں
(۴) اُردو شاعری پر ایک نظر

علیگڈھ میگزین۔ (تعطیل نمبر)

(۱) فلسفۂ تمدن اور اسلام
(۲) یورپ ایک طالب علم کے نقطہ نظر سے

نظرے خوش گذرے

مولانا محمد علی کو ایڈیٹر الناظر سے شکایت ہے کہ ۱۹۲۶ء میں مہاراجہ صاحب محمود آباد نے "انکو پانچ ہزار روپئے ارسال فرمائے تو اس پر سختی سے اعتراض کیا گیا اور وہ باور کرانا چاہتے ہیں کہ مہاراجہ ہوں یا آغا خاں، کسی سے بھی مالی امداد قبول کرنے کے بعد وہ "متاثر" نہیں ہوتے۔ قدرت کی کرشمہ سازی دیکھیے کہ جس اخبار میں مولانا محمد علی کی یہ تحریر شایع ہوئی ہے اُسی میں مہاراجہ صاحب محمود آباد کا وہ تار بھی شایع ہوا ہے جو اُنھوں نے بحیثیت صدر مظاہرہ عام لکھنؤ، شہنشاہ جارج پنجم کے نام بھیجا ہے اور جس میں صاف طور پر لکھا گیا ہے کہ

> "یہ مسلم رعایا یورا ہیریل مجسٹی سے بطور شاہ مسلمانان ہند ملتجی ہے کہ یور مجسٹی اپنی گورنمنٹ کو ہدایت فرمائیں کہ جس انہدام کا خطرہ درپیش ہے اُسکو روکنے کے لیے وہ ضروری قدم اُٹھائے۔"

اور حجاز مقدس کے معاملات میں غیر مسلم حکومت کو مداخلت کرنے کی اس دعوت صریح کے متعلق مولانا محمد علی نے اسوقت تک اپنے اخبار میں ایک حرفِ انتباہ بھی شایع فرمانے کی ضرورت نہیں سمجھی - حالانکہ اگر اسی قسم کی ملت فروشانہ اور غدارانہ التجا سر شفیع، سر علی امام، یا سر عبدالرحیم کی جانب سے کی گئی ہوتی، تو ممکن نہ تھا کہ ہمدرد کے نصف درجن کالم اس بے غیرتی و خباثت کے خلاف انتہائی غیظ و غضب کے اظہار کے لیے وقف نہ ہو جاتے - یہی نہیں - بلکہ جب ۵ - دسمبر کو مجلس خلافت میں اُنکے ہمخیال ارکین تجاویز سازی کے دلچسپ مشغلہ میں مصروف تھے اور ایک تجویز اس مضمون کی تیار کی گئی کہ

> "مسلمانان ہند، بقیہ دنیائے اسلام کے ساتھ حجاز میں غیر مسلم مداخلت کو کسی ہیئت و صورت میں اور کسی بہانہ سے بھی برداشت نہیں کر سکتے۔"

تو اُسوقت بھی نہ مولانا محمد علی صاحب کو اور نہ اُنکے متبعین اور رفقاء کو اسکی ضرورت محسوس ہوئی کہ مہاراجہ محمود آباد کی اس روش پر کم سے کم اظہار ملامت کر دیتے - حالانکہ واقعہ یہ ہے کہ مہاراجہ محمود آباد نے اپنے اس تار کے ذریعہ اسلام اور ملت عربیہ کے ساتھ جو غداری اور مسلمانان ہند کے ساتھ جو بددیانتی و بے وفائی کی ہے اُسکے مقابلہ میں ظفر علیخاں صاحب کی مجلس خلافت سے

"بغاوت" اور ابن سعود کی مسلمانان عالم سے وعدہ خلافی بھی ہیچ ہے۔

ابھی گذشتہ ستمبر میں لکھنؤ کی حجاز کانفرنس میں کس بلند آہنگی کے ساتھ حجاز میں غیر مسلم مداخلت کو گوارا کرنے سے انکار کیا گیا تھا اور تین مہینے بھی گذرنے نہ پائے تھے کہ خود حجاز کانفرنس کے کرتا دھرتا کی طرف سے مداخلت کی التجا پیش ہو گئی۔ اور طرفہ تماشا یہ ہے کہ جس مظاہرۂ عام کے صدر کی حیثیت میں یہ التجا پیش کی گئی ہے اُس نے نہ تو اس قسم کی کوئی تجویز منظور کی اور نہ صدر کو اس مضمون کا تار بھیجنے کی اجازت دی۔ مگر مہاراجہ صاحب جنھیں خدائے قادر و توانا کے حق بندگی اور اسلام اور بانی اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کے حق غلامی سے زیادہ حکومت کے حق نمک کا پاس و لحاظ ہے دراصل مہینوں سے اسکے لیے بیتاب ہو رہے تھے کہ حکومت انگریزی کو معاملات حجاز میں جس قسم کی دخل وہی مطلوب ہے اُس کا سامان اُنکی معرفت مہیا ہو جائے اور جس طرح اُنکے ایک سالار قافلہ کی غداری نے عباسیوں کی حکومت بغداد کو تاخت و تاراج کرا دیا تھا اُسی طرح ملت عربیہ اور حجاز کی مقدس سرزمین کو تباہ و برباد کرنے کا طغرائے امتیاز اُنکو حاصل ہو جائے۔ اسلیے نہ اُنھوں نے مجالس عام کے قواعد و قانون کی پروا کی، نہ حجاز کانفرنس کی قرارداد کا لحاظ کیا، نہ مسلمانوں میں اپنی رسوائی و بے آبروئی کا خوف کیا، نہ ملت اسلامیہ کے غیظ و غضب کا اندیشہ کیا اور جو کچھ دل میں ٹھانے ہوے تھے اُسے ایک ذرا سا موقع پانے پر فوراً کر بیٹھے۔

انجمن خدام الحرمین کے باجُبّہ و دستار علما و مجتہدین سے تو اس کی توقع ہی نہیں کی جا سکتی تھی کہ وہ اپنے سرغنہ کی اس ملت فروشی و دین کُشی کے خلاف کوئی صدائے احتجاج بلند کریں گے لیکن مجلس خلافت کے غیور اراکین اور علی برادران جیسے مردانِ راہ خدا کی خاموشی غایت درجہ المناک و درد انگیز ہے۔

حجاز کانفرنس کے موقع پر ہم نے "مسلمانوں کو مشورہ" دینے کے خیال سے ایک اعلان شائع کیا تھا اور اسے بعض قومی اخبارات میں بھی شایع کرا دیا تھا تاکہ مقامی مسلمانوں کے ساتھ ساتھ بیرونی مسلمان بھی ان خیالات سے آگاہ ہو جائیں۔ مولانا محمد علی کو بدنصیبی سے یا تو اپنے متعلق یہ حسن ظن پیدا ہو گیا ہے کہ اُنکی رائے ہمیشہ صحیح ہوتی ہے یا اس خادم کے بارے میں اُنھوں نے یہ سمجھ لیا ہے کہ اُسکی رائے میں صحت کا امکان ہی نہیں ہے، اس لیے اُنھوں نے اس اعلان کو محض اس گمان پر کہ اس میں خطرات کو بہت بڑھا چڑھا کر ظاہر کیا گیا ہے اپنے اخبار میں درج کرنے سے انکار کر دیا۔ حالانکہ جس خاص خطرہ کا اس تحریر میں ذکر تھا وہ تھوڑے ہی دنوں کے اندر اب

خود اُنکے معاونِ دیرینہ ولطف فرماے خاص کی بدولت مسلمانوں کے سامنے آگیا ہے۔
نامناسب نہ ہوگا اگر الناظر کی وساطت سے اُس خطرہ کو ایک بار پھر مسلمانان ہند کے
روبرو پیش کر دیا جائے جس کا اس اعلان کے ذریعہ اظہار کیا گیا تھا۔ وہو ہذا :—

"اور اگر حج کو بند کرنے کی تجویز سے قطع نظر کرکے ہمارے بھائیوں نے برطانوی حکومت سے اس معاملہ میں دخل دینے کی درخواست کی تو اُسکا بھی یہی نتیجہ ہو سکتا ہے کہ عراق و فلسطین کی طرح خدا نخواستہ حجاز و نجد بھی انگریزی تصرف میں آجائیں انگریزوں کی پالیسی صاف ظاہر ہے۔ وہ ہر نہج سے عربوں کو اپنے تحت میں لانا چاہتے ہیں۔ خلیج فارس کے تقریباً تمام چھوٹے چھوٹے عربی سردار انگریزوں کے ماتحت ہیں۔ یمن، عسیر، حجاز و نجد کے سوا باقی سارا جزیرۃ العرب انگریزوں اور فرانسیسیوں کے قبضہ و تصرف میں ہے۔ کیا مسلمانان ہند کو اب یہ بھی گوارا نہیں ہے کہ جزیرۃ العرب کے یہ چند صوبے بھی مسلمانوں کے قبضہ میں رہیں؟ بظاہر تو ایسا ہی معلوم ہوتا ہے۔ کیونکہ اگر نجد و حجاز پر انگریزوں کا تصرف ہو گیا تو پھر یمن و عسیر کے دن آزاد رہ سکیں گے؟

پس تاریخ میں جس طرح یہ واقعہ ہمیشہ یادگار رہیگا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے نواسے اور حضرت شیر خداؓ کے جگر گوشہ امام حسین علیہ السلام اور خاندان رسالت کی اُن یادگاروں کو جو اُنکے ہمرکاب تھے میدان کربلا میں ایک مسلمان تاجدار کے ایما سے ایک اسلامی فوج نے شہید کر دیا، اُسی طرح کیا ہندوستان کے مسلمان یہ تاریخی یادگار چھوڑنا چاہتے ہیں کہ جزیرۃ العرب کی چپہ چپہ زمین کو اُنھوں نے اپنے بدنصیب ہاتھوں سے مسیحیوں کے تصرف میں دیدیا؟"

مولانا محمد علی فرماتے ہیں کہ میں نے کئی بار اُن سے (مہاراجہ محمود آباد سے) اختلاف کیا۔ ہمیں مولانا محمد علی کے دونوں اخبارات کامریڈ و ہمدرد کے مستقل مطالعہ کا ابتدا ہی سے شرف حاصل رہا ہے اور جہاں تک ہمیں یاد ہے مولانا نے کبھی بھی مہاراجہ صاحب سے اُس طریقہ پر خطاب فرمانے کی ضرورت محسوس نہیں کی جس طرح آغا خاں، امیر علی، سر شفیع اور سر عبدالرحیم وغیرہ کو وہ مخاطب فرماتے رہے ہیں۔ حالانکہ اصل حقیقت یہ ہے کہ جتنی ملت فروشی، جتنی غداری، جتنی

اسلام دشمنی اور ضمنی ایمان کُشی مہاراجہ صاحب سے ظاہر ہوئی ہے ہندوستان کے مسلمان مشاہیر میں سے کسی کا دامن بھی اس قدر داغدار نہیں ہے۔

مسلم یونیورسٹی کا چارٹر حکومت کے شرائط کے مطابق اور مسلمانوں کے مطالبات عام کے علی الرغم کس کی دسیسہ کاریوں کا رہینِ منت ہے؟

مسلم لیگ میں ۱۹۱۸ء کے اجلاس کی اہم تجاویز کو پیش کرنے کا وعدہ کرکے کون فرار ہوا تھا۔ اور کس نے حکومت کو باور کرانا چاہا کہ یہ چند شوریدہ سروں کی کارروائی ہے، ورنہ نیازمندانِ وفاکیش کو ایسی ہرزہ سرائیوں سے کیا سروکار؟

۱۹۱۹ء میں جب لکھنؤ کی آل پارٹیز کانفرنس منعقد ہو رہی تھی تو کس نے اُسکے دعوتی خط پر دستخط ثبت کرنے کے بعد اس بہانہ سے واپس لے لئے کہ علی گڈھ پارٹی کہیں اس اجتماع سے علیٰحدہ نہ رہ جائے۔ اور جب شیخ عبداللہ کے دستخط اور محترم ایڈیٹر البشیر جیسے علی گڈھ والوں کی تحریری ہمدردی حاصل کر لی گئی تو کون چھپ کر گھر بیٹھ رہا؟

۱۹۱۷ء میں دوستوں، نیازمندوں اور اہل ملک کی رائے عامہ کے اصرار پیہم کے علی الرغم کون شخص تھا جسنے مسز اینی بسینٹ کے مقابلہ میں کانگریس کی صدارت کی امیدواری سے دست بردار ہونا گوارا نہیں کیا۔ ۱۹۱۸ء میں کس نے لیگ کی صدارت پر اپنا دوبارہ انتخاب اس مقصد سے کرایا کہ رفیق خاص کو قلمدان معتمدی بھی دیا جائے۔ اور پھر کس نے لاٹ صاحب کے اشارۂ چشم پر چل کر استعفا دیدیا؟

ہندوستان کی جنگِ آزادی کے دوران میں جبکہ ترکی حکومت کا وجود اور جزیرۃ العرب کی آزادی معرض خطر میں تھی، اور ملک کو لڑکوں اور نوجوانوں سے لیکر ادھیڑوں اور بوڑھوں تک ایک ایک فرد کی ضرورت تھی، کس نے قوم و ملک سے بے اعتنائی کرکے حکومت کی غلامی کا طوق زریں اپنی گردن کو تا دمِ مرگ کے لیے پسند کیا؟ کس نے لاکھوں روپیہ اور سیکڑوں رنگروٹوں کی امداد دیکر اپنے دامن حریت کو خون آلود کیا؟ اور کس نے حکومت کے ایک خونی جلاد کی طرح سیکڑوں ہزاروں خادمانِ ملک وملت کو جیل خانوں میں بھر دیا؟

اور ان تمام جفاکیشیوں اور غداریوں کے بعد آج جبکہ مسلمانانِ ہند! اسی تفریق و انتشار کی بدولت کشتہ ہائے ناخدا، کی طرح منجدھار میں پھنسے ہوئے ہیں، کس نے مارِ آستین بنکر حجاز کی مقدس سرزمین پر فرنگیوں کو اپنا دامِ تزویر پھیلانے کی دعوت دی؟

کیا آغا خاں، امیر علی، سر شفیع یا سر عبدالرحیم وغیرہ میں سے کسی ایک وفاکیش حکومت نے بھی مسلمانوں کے جسم قومی پر اس طرح پے بہ پے تیر اندازی کی ہے؟ پھر اُن سب کے متعلق تو مولانا محمد علی کا قلم انگریزی اور اُردو دونوں زبانوں میں روانی کے ساتھ ناراضی و بے اعتمادی حقارت و ملامت، کے اظہار سے دریغ نہیں کرتا۔ پھر یہ کیا ہے کہ جناب مہاراجہ صاحب کا معاملہ سامنے آیا اور سارا جوش و خروش رخصت ہوگیا اور سارا جذبۂ و ولولہ سرد پڑگیا؟ ہم جانتے ہیں اور دل سے یقین رکھتے ہیں کہ مولانا محمّد علی دام لیکر کام کرنے کے عادی نہیں، لیکن کیا انسانی فطرت کا یہ تقاضا نہیں کہ جو شخص کسی کے لطف و کرم سے بہرہ اندوز ہو اُس کے دل میں اپنے محسن کے متعلق حُسن ظن راسخ ہو جائے اور جب کبھی کوئی نازک موقع آئے تو اُسی حُسن ظن کی بدولت انسان مغالطہ میں آجائے اور اپنے محسن کی کمزوریوں کا صحیح احساس کرنے سے قاصر رہے۔

یقین واثق ہے کہ جلد یا دیر مولانا محمّد علی صاحب اسکو جان جائیں گے کہ مہاراجہ محمود آباد کے اعلانات وطن پرستی و قوم دوستی کی حقیقت کیا ہے۔ اسی التجاے مداخلت کے بارے میں جب وہ غور فرمائیں گے کہ اس نے حجاز کے لیے کن کن روباہ بازیوں اور دسیسہ کاریوں کا دروازہ کھول دیا ہے، تو جس طرح اُنھوں نے آغا خاں کی امداد پر لات ماردی، انشاء اللہ ایک دن وہ مہاراجہ صاحب سے بھی منہ موڑلیں گے، اور جس طرح آج وہ ایک پیشہ ور عیار کی قباء کیادی کی دھجیاں بکھیر رہے ہیں، اُسی طرح بلکہ اس سے زیادہ قوت کے ساتھ وہ مہاراجہ صاحب کی بازیگریوں کو بے نقاب کرنے پر آمادہ ہو جائیں گے۔ اور جب تک وہ وقت نہ آجائے ہم اپنا فرض سمجھتے ہیں کہ وقتاً فوقتاً مولانا کو ٹوکتے رہیں۔

مہاراجہ صاحب کی التجاے مداخلت کے عواقب و نتائج کا اندازہ عام مسلمانوں کو تو ہو نہیں سکتا لیکن جن اصحاب کو برطانوی سیاست کا کچھ تجربہ ہے وہ بخوبی جان گئے ہونگے کہ یہ کتنا بڑا فتنہ ہے۔ سلطان ابن سعود کے بارے میں سب تسلیم کرتے ہیں کہ وہ اتنی قوت نہیں رکھتے کہ برطانیہ سے لڑائی مول لیں۔ یہ بھی صاف ظاہر ہے کہ برطانوی وزارت کبھی اس حماقت میں مبتلا نہیں ہو سکتی کہ حجاز پر براہ راست قبضہ کرنے پر آمادہ ہو جائے۔ لیکن ساتھ ہی اسکے ہر شخص کو معلوم ہے کہ حجاز اور سارے جزیرۃ العرب کو لطائف الحیل فرانس و اطالیہ کی آنکھ

بجا کر اپنے زیر اثر و اقتدار لانا اسکی تمنائے دیرینہ اور سیاست موجودہ کا ایک ضروری مطمح نظر ہے شریف حسین کے زمانہ میں باوجودیکہ اُس بدنصیب نے خلیفہ سے غداری کرکے مسلمانوں کے خون سے انگریزوں کے خط غلامی پر اپنے دستخط ثبت کر دیے تھے، انگریزوں کو اتنی مداخلت بھی حاصل نہ ہو سکی کہ حجاج ہندی کی خدمت کے نام سے ایک اسپتال مکہ معظمہ میں قائم رہ سکتا - لیکن عرب کے دو سرداروں کی باہمی جنگ نے جو کمزوری پیدا کی اُسکے بدولت حکومت برطانیہ کی یہ تمنا تواسی سال پوری ہوگئی - اور سمجھنا چاہیے کہ اندرون حجاز میں Peaceful penetration "مصالحانہ دخل یابی" کی بنیاد پڑ گئی - اب اسکے بعد دوسرا قدم اُٹھانے کے لیے کسی بہانہ کی ضرورت تھی جو مہاراجہ صاحب محمود آباد کی عنایت سے فراہم ہوگیا ہے -

مہاراجہ صاحب کے تار کی آڑ پکڑ کر برطانوی نمایندۂ حجاز سلطان ابن سعود کو کس جال میں پھنسانا چاہے گا؟ اسکا علم ہمیں یا دوسرے اہل ہند کو شاید عرصہ تک نہ ہو سکے گا - لیکن یہ یقینی ہے کہ مہاراجہ صاحب نے جس طرف قدم اُٹھانے کی التجا کی ہے اُسکی طرف خواہ قدم اُٹھے یا نہ اُٹھے مگر قدم اُٹھانے کی ضرورت کا اعادہ کرکے ابن سعود کے وزیر خارجہ کو ابھی خاصی گھبراہٹ میں تو مبتلا کر ہی دیا جائے گا اور اسکے پردے میں عجب نہیں کہ اندرون ملک حجاز میں دخل یابی کا دوسرا روڑا بھی رکھ دیا جائے - مسلمانوں کی آنکھیں کہیں اُسوقت کھُلیں گی جب اُنکو روڑے پر روڑا رکھے جانے کے بعد اصل عمارت کے در و دیوار نظر آنے لگیں گے - خدا نہ کرے کہ مسلمانوں میں اتنی قوت بھی باقی نہ رہے کہ وہ حجاز میں برطانوی چالبازیوں کی مضبوط سے مضبوط بُنیادوں کو یک ضرب جڑ سے نہ اُکھاڑ سکیں، لیکن مسلمانوں کی مآل اندیشی اور مصلحت بینی کا تقاضا یہ ہے کہ اجانب کی مداخلت کو مضبوط بنیادوں پر قائم ہونے سے قبل ہی وہ اُنکی ریشہ دوانیوں کا استیصالِ کلّی کر دیں -

ہمیں مسرت ہے کہ دہلی میں ایک مخالف اجتماع کرکے مہاراجہ صاحب کے طریق کار سے بیزاری کا اظہار کر دیا گیا - لیکن ہم اسے قطعاً ناکافی سمجھتے ہیں - اس شرارت کا اگر کچھ انسداد ممکن ہے تو مسلمانوں کی ہر بستی سے اگر نہیں تو کم سے کم تمام بڑے بڑے مرکزوں سے اس تار کے خلاف صدا بلند ہونا چاہیے - اور شہنشاہ جارج پنجم اور سلطان ابن سعود دونوں پر بکرّات و مرّات اس حقیقت کو واضح کر دینا چاہیے کہ مہاراجہ صاحب کے اس تار کی اصلیت اس سے زیادہ نہیں کہ وہ ایک فانیش حکومت کی ذاتی اور صد درجہ قابل نفرت خواہش ہے - تاکہ ایک طرف حکومت انگریزی کو معلوم ہو جائے کہ ہمارے آلۂ کار کی ملک میں اب کیا وقعت باقی رہ گئی ہے، اور دوسری طرف سلطان ابن سعود

بھی اس سے پوری طرح آگاہ ہو جائیں کہ اس تار کے پس پشت کوئی قوت ایسی موجود نہیں ہے جس سے اثر پذیر ہو کر برطانوی حکومت کی طمانیت رہی سکے یعنی کوئی خاص کارروائی کرنے پر مجبور ہو، مولانا محمد علی سے بھی یہ درخواست غالباً بیجا نہ ہوگی کہ وہ مہاراجہ صاحب کے اس تار پر کم سے کم اپنے خیالات کا اظہار فرمائیں، خواہ اُنکا لب ولہجہ کتنا ہی نرم، دوستانہ اور نیاز مندانہ ہو۔

---

۳ و ۴ - دسمبر کو مجلس مرکزیۂ خلافت کا جلسہ لکھنؤ میں منعقد ہوا - وفد خلافت کی رپورٹ، جس پر اس جلسہ میں بحث ہونا تھی اکتوبر کی آخری تاریخوں میں شایع ہوئی تھی، اور اسلامی پریس میں اُسپر کافی بحث ہو چکی تھی، اس لیے توقع کی جا سکتی تھی کہ جلسہ میں بیٹھ کر اراکین خلافت رپورٹ پر فضول مباحثہ میں وقت ضایع نہ کریں گے بلکہ اس رپورٹ کی روشنی میں اور باہمی تبادلۂ خیال کے بعد یہ طے کریں گے کہ آیندہ مسئلۂ حجاز میں کیا کارروائی کرنا چاہیے۔

لیکن بدقسمتی سے ہمارے نظام قومی میں ذاتی رنجشیں اور کدورتیں اور شخصی تفوق و امتیاز کا خیال اس درجہ دائر و سائر ہو گیا ہے کہ ہمارے سب کام اسکی وجہ سے ابتر رہتے ہیں۔ چنانچہ اس دفعہ مجلس خلافت کے جلسہ کا جن لوگوں کو تماشا کرنے کا موقع ملا اُنکے لیے مسلمانان ہند کی سب سے نامور مجلس کی کارروائیاں صدردرجہ دردناک و مایوس کُن ثابت ہوئیں۔

اہل ہند عموماً اور مسلمان خصوصاً انضباطِ اوقات کے خوگر نہیں ہیں - جو حالت ہمارے شخصی و انفرادی کاموں کی ہے اُسی کا عکس ہمارے تمام اجتماعی کاموں میں نمودار ہوتا ہے - جس قومی مجلس میں جایئے پہلی بات جو دل کو مکدر بنائے گی وہ اراکین وحاضرین کا وقت پر نہ آنا ہے - جلسہ کی کارروائی دیر میں شروع کرنے کا لازمی نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ضابطۂ عمل کی تکمیل کے لیے یا تو وقت میں اضافہ کرنا پڑتا ہے اور اگر اسکا موقع نہ ہو، جیسا کہ بالعموم واقع ہوتا ہے تو بس جلدی جلدی تمام کارروائیاں ختم کرنا ہوتی ہیں اور اس عجلت کے باعث اکثر و بیشتر معاملات پر یا تو کافی غور و بحث نہیں کر سکتے، یا بہت سی کام کی باتیں رہ جاتی ہیں - پھر اُس پر طرہ یہ ہے کہ بہت سے اراکین موقع اور محل کو نظرانداز کر کے فضول و لاطائل تقریروں اور لفظی و بے معنی نزاعوں میں قیمتی وقت ضایع کرتے ہیں۔ توقع تھی کہ ۲ - دسمبر تک یا زیادہ سے زیادہ ۳ - دسمبر کی صبح کی گاڑیوں سے تمام اراکین لکھنؤ پہنچ جائیں گے - اور چند کے سوا بیشتر اراکین ایسے وقت تک لکھنؤ پہنچ گئے تھے کہ حسب قرارداد بعد نماز جمعہ جلسہ کی کارروائی شروع ہو سکتی تھی، مگر صدر صاحب نے یہ تار بھیجکر کہ میں ۴ - دسمبر کو

کلکتہ میل سے پہونچوں گا، جلسہ کی ابتدائیات میں ہو۔ پہلی ہی بسم اللہ غلط کر دی۔ اور ستم ظریفی یہ دیکھیے کہ اس تار کے بعد بھی جناب صدر تشریف نہیں لائے، بلکہ ایک دوسرا تار بھیجکر یہ اطلاع دیدی کہ میں روانہ نہ ہو سکا۔ اب انتظار نہ کیا جائے۔ اس طرح پیر کے صرف سے مولانا ابو الکلام آزاد نے اپنے لیے تو اس کشمکش سے یقیناً نجات حاصل کرلی۔ لیکن مجلس خلافت کا بہت سا قیمتی وقت ضائع ہو گیا۔

بعد مغرب جناب مولوی عبد القادر قصوری نائب صدر کی صدارت میں جلسہ شروع ہوا تو پنجاب کے ایک رکن نے یہ سوال اُٹھایا کہ رپورٹ پر رئیس وفد مولانا سید سلیمان کے دستخط ہیں یا نہیں؟ معلوم ہوا کہ نہ صرف رئیس وفد نے بلکہ کسی رکن نے اس قدر باضابطگی کی ضرورت محسوس نہیں کی۔ بے شبہ سوال محض ضابطہ کا تھا، لیکن ضابطے اگر محض نظر انداز ہونے کے لیے ہیں تو مغربی طرز کی مجلسیں بنانے کی کیا ضرورت ہے، جنکا دارومدار ہی تمامتر ضابطوں پر ہے۔ بہر صورت اراکین وفد نے اپنی خطاکاری کا اعتراف کرلیا اور مجلس کے روبرو ایک مطبوعہ رپورٹ پر ——— کیونکہ مسودات یہاں موجود نہ تھے اور عجب نہیں کہ بعض حصے بمبئی میں بھی نہوں ——— دستخط فرما دیے۔ رئیس وفد نے صرف دستخط ہی نہیں فرمائے بلکہ چند سطروں کا ایک اختلافی نوٹ بھی اضافہ فرما دیا۔ جسنے ایک نئی بحث کا دروازہ کھول دیا۔ اور اس بحث میں دو نشستیں رائیگاں گئیں۔

مولانا سید سلیمان ندوی کے نوٹ پر اب کچھ لکھنا فضول ہے، خصوصاً جبکہ اُنھوں نے جلسہ کے کئی دن پیچھے، اور خدا معلوم کتنے غور و تامل، فہمایش و سرزنش، شکوہ و شکایت، یا ملاطفت و استمالت کے بعد اس بس کی گانٹھ کے لیے ایک تریاق بھی مہیا کر دیا ہے۔ البتہ اس بات پر اظہار افسوس کیے بغیر نہیں رہا جا سکتا کہ رپورٹ کے معاملہ میں رئیس وفد کا سارا طرز عمل نہایت درجہ الم آگیں، یاس افزا، اور سزاوار ملامت تھا۔

اختلافی نوٹ کی بحث کے خاتمہ پر جب شمار آرا کا وقت آیا تو رپورٹ کو رئیس وفد کے پاس مزید توضیح و تصریح کی غرض سے واپس بھیجنے والوں اور انکے مخالفین کی تعداد مساوی تھی۔ صاحب صدارت کو ایک دفعہ جماعت مخالف (پنجاب و بنگال کے اراکین) کی موافقت کر چکے تھے، اس دفعہ اُنھوں نے صوبجات آگرہ و اودھ و دہلی کے نمایندوں کے حق میں تصفیہ کر کے تلافی مافات کر دی۔

تیسری نشست میں جب ایک جزوی مسئلہ پر رائے شماری ہوئی اور لوگوں کو یہ محسوس ہوا کہ بنگال و پنجاب کے اراکین اقلیت میں ہیں تو فوراً ہی یہ تجویز سامنے آگئی کہ رپورٹ ملبطہ منظور کرلیجائے۔

اور ۴- دسمبر کی نصف شب تک جلسہ کا وقت اسی بحث کی نذر ہوگیا - اور اگر صدر جلسہ کا ایک گھنٹہ کے بحث و مباحثہ کے بعد معینہ تاریخوں کے آگے بھی جلسہ کی کارروائی جاری رکھنے پر رضامند نہ ہوجاتے تو یہ جلسہ بالکل ہی بے نتیجہ طور پر ختم ہو جاتا -

تیسرے دن جلسہ ہوا تو بسبب اسکے کہ موتمر کی شاخ ہند کے بنیادی جلسہ کا اہتمام متعلق تھا، ہمیں جلسہ کی کارروائی کے مشاہدہ کا موقع نہیں ملا، مگر احباب سے یہ معلوم ہوا کہ بحث کسی نتیجہ پر نہ پہونچنے پائی تھی اور جن مقررین نے رات کو اپنے نام لکھا دیے تھے اُنکی نوبت بھی نہ آئی تھی کہ وقت تمام ہوگیا اور جلسہ کو ختم کرنے کی تحریک پر باہم ایسی کچھ ردوقدح ہوئی کہ صاحب صدر کو تاب مقاومت نہ رہی اور وہ اپنی پگڑی دونوں ہاتھوں سے سنبھالتے ہوئے جلسہ سے اُٹھ گئے۔ اُنکے جانے کے بعد پھر جلسہ منعقد کیا گیا تو ہمارے دوست عبدالماجد صاحب منصب صدارت پر فائز ہوئے اور چند لمحوں کے اندر متعدد تجاویز پیش ہوکر منظور ہوگئیں اور قریب قریب اکثر بحث طلب امور کا تصفیہ بھی ہوگیا ——— نہیں کہا جا سکتا کہ اس سبک خرامی کے لیے صدر اور خلافت کمیٹی کو مبارکباد دی جائے یا اُن اصحاب کو جو اخبار زمیندار کی اصطلاح میں "خداوندانِ خلافت" سے موسوم ہیں -

مولوی عبدالقادر قصوری نے جو بیان اُس روز کی کارروائی کے متعلق شایع کیا ہے اور جسکے متعلق اخبار "ہمدرد" کا فتویٰ یہ ہے کہ

"باطل" است آنچہ مدعی گوید

اُس سے معلوم ہوتا ہے کہ مولوی صاحب موصوف جلسہ کو بجائے خود برخاست کرکے اُٹھے تھے۔ مگر شاید ملاحیوں کی باڑھ نے اس درجہ اُنکو مضطرب کردیا تھا کہ جس طمانیت قلب کے ساتھ نشستِ اول میں اُنھوں نے اپنا فیصلہ خلافت کمیٹی کے کارکن سید ذاکر علی صاحب کو املا کرادیا تھا اس موقع پر وہ اپنے حکم کو معرض تحریر میں نہ لاسکے - اور صدر کی اس اضطراری فروگذاشت سے فائدہ اُٹھاکر تمام کارروائیاں بظاہر ضابطہ کے بالکل مطابق انجام دے لی گئیں۔

جلسہ کی روداد "النّاظر" میں مزید گنجائش نہ ہونے کی وجہ سے یہیں ختم کی جاتی ہے - دسمبر نمبر میں جو انشاءاللہ ۱۵- جنوری سے پیشتر ہی شایع ہوجائیگا، باقی باتیں عرض کی جائینگی -

۲۰- دسمبر ۱۹۲۶ء

ظفر الملک

راقم۔ میں نے شعر کو جس طرح تحریر کیا ہے طرز کتابت سے بھی ذہن اصل مطلب کی طرف منتقل ہو جاتا ہے خلاصہ مطلب یہ ہے کہ معشوق کو مخاطب کر کے میرزا نے ایک سوال قائم کیا ہے کہ مجھکو موت کا انتظار کرنا چاہیے یا تم سے معاشقہ کرنا چاہیے اور خود ہی اسکو اسطرح سے حل کیا ہے کہ موت کا انتظار کیوں نہ کروں کہ اُسکا آنا یقینی ہے۔ یعنے موت کا انتظار ضرور کرنا چاہیے۔ دوسرے مصرعے میں کہتے ہیں کیا میں تم سے محبت کروں (تمکو چاہوں) کہ اگر تم نہ آؤ تو میں بلانے کی بھی جرأت نہیں کر سکتا یعنے بہ نسبت اسکے کہ تم سے معاشقہ کروں یہ بہتر ہے کہ موت کا انتظار کروں جسمیں وصل کا میسر آنا لابدی ہے اور تم سے معاشقہ کرنے میں وصل تو درکنار اگر تم نہ آؤ تو تمھارے بلانے کی بھی جرأت نہیں کر سکتا۔ علامہ موصوف نے دوسرے مصرعہ میں چاہوں یعنی خواہم لیا ہے حالانکہ (تمکو چاہوں) از شما محبت کنم کی جگہ ہے۔

مولانا حسرت نے جو کچھ تحریر فرمایا ہے اُس پر کسی مزید حاشیہ کی ضرورت نہیں ہے۔

میرزا غالب کا وہ کلام جسکو بے معنی کہا جاتا ہے ہر قسم کی تنقید سے مستغنی ہے۔ شارحین دیوان غالب خواہ میرزا کی ہمدردی میں یا اپنی اعلیٰ ذہنیت کے اظہار میں متواتر کوشش فرما رہے ہیں کہ میرزا کے اس کلام کو معانی سے ہم آغوش کریں ممکن ہے کہ کسی زمانہ میں کسی حد تک کوئی شارح کامیاب بھی ہو جائے۔ لیکن میں میرزا کے اس کلام کو اگر اسمیں معانی مستور بھی ہوں بے نقاب کرنے کی کوشش نہیں کرونگا۔ کیونکہ میرا نارسا ذہن اس دشوار خدمت کی انجام دہی میں معذور ہے۔ مذکورہ بالا کلام کا تذکرہ مضمون ہذا میں آیندہ "مشکل کلام" کہہ کر کیا جائیگا۔ قارئین کرام اور ناقدین عظام خود فیصلہ فرمائیں کہ یہ "مشکل کلام" اگر معانی سے بیگانہ بھی نہیں ہے تو بھی میرزا کو غزل اردو کا کامیاب شاعر ثابت کر سکتا ہے یا نہیں۔ میرزا کے کلام کا نصف حصہ تقریباً ایسا ہے جسکو "مشکل کلام" کے تحت میں داخل کر سکتے ہیں مگر میں صرف اہم شعر انتخاب کر کے نذر ناظرین کرتا ہوں۔

جز قیس اور کوئی نہ آیا بروئے کار — صحرا مگر بہ تنگئ چشم حسود تھا
شوق ہر رنگ رقیب سر و ساماں نکلا — قیس تصویر کے پردے مین بھی عریاں نکلا
بہ فیض بیدلی نومیدی جاوید آساں ہے — کشایش کو ہمارا عقدۂ مشکل پسند آیا
ہوائے سیر گل آئینۂ بے مہری قاتل — کہ انداز بخوں غلطیدن بسمل پسند آیا
سراپا رہن عشق و ناگزیر الفت ہستی — عبادت برق کی کرتا ہون اور افسوس حاصل کا
رنگ شکستہ صبح بہار نظارہ ہے — یہ وقت ہے شگفتن گلہائے ناز کا
صرفہ ہے ضبط آہ مین میرا وگرنہ مین — طعمہ ہون ایک ہی نفس جاں گداز کا
کاوش کا دل کرے ہے تقاضا کہ ہے ہنوز — ناخن پہ قرض اس گرہ نیم باز کا
شب خمار شوق ساقی رستخیز اندازہ تھا — تا محیط بادہ صورت خانۂ خمیازہ تھا۔
یک قدم وحشت سے درس دفتر امکاں کھلا — جادہ اجزای دو عالم دشت کا شیرازہ تھا
گلہ ہے شوق کو دل مین بھی تنگئ جا کا — گہر مین محو ہوا اضطراب دریا کا
اہل بینش نے بہ حیرت کدۂ شوخی ناز — جوہر آئینہ کو طوطی بسمل باندھا
یاس و امید نے یک عربدہ میداں مانگا — عجز ہمت نے طلسم دل سائل باندھا
بے مے کسے ہے طاقت آشوب آگہی — کھینچا ہے عجز حوصلہ نے خط ایاغ کا
تازہ نہیں ہے نشۂ فکر سخن مجھے — تریاکئ قدیم ہوں دود چراغ کا
بس خون دل ہے چشم میں موج نگہ غبار — یہ مے کدہ خراب ہے مے کے سراغ کا
باغ شگفتہ تیرا بساط نشاط دل — ابر بہار غم کدہ کس کے دماغ کا
لب خشک در تشنگی مرگان کا — زیارت کدہ ہون دل آزدگان کا
ہمہ ناامیدی ہمہ بدگمانی — میں دل ہوں فریب وفا خوردگاں کا
ذرہ ذرہ ساغر میخانۂ نیرنگ ہے — گردش مجنوں بہ چشمک ہائے لیلیٰ آشنا
کوہکن نقاش یک تمثال شیریں تھا اسد — سنگ سے سر مار کر ہووے نہ پیدا آشنا

برنگ کاغذ آتش زدہ نیرنگ بیتابی | ہزار آئینہ دل باندھے ہے بال یک تپیدن پر
حریف مطلب مشکل نہیں فسون نیاز | دعا قبول ہو یارب کہ عمر خضر دراز
نہ ہو بہ ہرزہ بیاباں نورد وہم وجود | ہنوز تیرے تصور میں ہے نشیب و فراز
وصال جلوہ تماشا ہے پر دماغ کہاں | کہ دیجیے آئینۂ انتظار کو پرواز
رخ نگار سے ہے سوز جاودانی شمع | ہوئی ہے آتش گل آب زندگانی شمع
زبان اہل زباں میں ہے مرگ خاموشی | یہ بات بزم میں روشن ہوئی زبانی شمع
کرے ہے صرف بہ ایمائے شعلہ قصہ تمام | بطرز اہل فنا ہے فسانہ خوانی شمع
ترے خیال سے روح اہتزاز کرتی ہے | بہ جلوہ ریزی باد و بہ پرفشانی شمع
نشاط داغ غم عشق کی بہار نہ پوچھ | شگفتگی ہے بہشت گل خزانی شمع
مخلیں بہم کرے ہے گنجفہ باز خیال | ہیں ورق گردانی نیرنگ یک بتخانہ ہم
باوجود یک جہاں ہنگامہ پیدائی نہیں | ہیں چراغان شبستان دل پروانہ ہم
درس عنوان تماشا بہ تغافل خوشتر | ہے نگہ رشتۂ شیرازۂ مژگاں مجھ سے
بیخودی بستر تمہید فراغت ہو جو | پر ہے سایہ کی طرح میرا شبستاں مجھ سے
عرض ناز شوخی دنداں برائے خندہ ہے | دعوی جمعیت احباب جائے خندہ ہے
ہے عدم میں غنچہ محو عبرت انجام گل | یک جہاں زانو تامل در قفائے خندہ ہے
کلفت افسردگی کو عیش بیتابی حرام | ورنہ دنداں در دل افشردن بنائے خندہ ہے
حسن بے پردہ خریدار متاع جلوہ ہے | آئینہ زانوئے فکر اختراع جلوہ ہے
تاکجا اے آگہی رنگ تماشا باختن | چشم وا گردیدہ آغوش وداع جلوہ ہے
دل خون شدۂ کشمکش حسرت دیدار | آئینہ بدست بت بدمست حنا ہے
قمری کف خاکستر و بلبل قفس رنگ | اے نالہ نشان جگر سوختہ کیا ہے

مندرجہ بالا کلام اور اسی قسم کے دیگر کلام کی بابت خواجہ حالی کا فتویٰ بھی نظر انداز

کرنے کے قابل نہین ہے۔

یادگار غالب صفحہ ۱۰۰ "ان اشعار کو مہمل کہو یا بے معنی مگر اسمین شک نہین کہ میرزا اسنے وہ نہایت جانکاہی اور جگر کاوی سے سرانجام کیے ہونگے۔ جبکہ اپنے معمولی اشعار کاٹتے ہوئے لوگوں کا دل دکھتا ہو تو میرزا کا دل اپنے اشعار نظری کرتے ہوئے کیون نہ دکھا ہوگا۔ ظاہرا یہی سبب تھا کہ انتخاب کے وقت بہت سے اشعار جو فی الواقع نظری کرنیکے قابل تھے اُن کے کاٹنے پر میرزا کا قلم نہ اُٹھ سکا۔ ممکن ہے کہ ایک مدت کے بعد یہ اشعار اُنکی نظر مین کھٹکے ہون مگر چونکہ دیوان چھپکر شایع ہو چکا تھا اسلیے اُنھون نے ان اشعار کا نکالنا فضول سمجھا" خواجہ صاحب اِس مشکل کلام کو جسکا مختصر نمونہ آپ دیکھ چکے موجودہ دیوان غالب میں دیکھنا نہیں چاہتے تھے اور دیوان غالب کی اشاعت ہو جانے کے بعد خواجہ صاحب کی رائے مین میرزا ایک حد تک معذور تھے ورنہ اُن کا قیاس قوی ہے کہ خود میرزا اِس قسم کے کلام کو اپنے دیوان سے خارج کر دیتے۔

لیکن اردو زبان کی بدقسمتی پر جسقدر افسوس کیا جائے وہ کم ہے یہاں تو اِس مشکل کلام مطبوعہ ہی کی وجہ سے شارحین میں کشمکش تھی میرزا غالب کی محترم شخصیت کی وجہ سے اُنکے کلام کو مہمل کہدینا بھی نامناسب معلوم ہوتا تھا اور بامعنی قرار دیا جانا بھی ناممکن نظر آتا تھا زمانہ حال مین بھوپال کی حمیدیہ لائبریری مین میرزا غالب کے کلام کا ایک قلمی نسخہ دستیاب ہو گیا جو دیوان مطبوعہ کے انتخاب سے قبل ہی بھوپال پہونچ چکا تھا۔ اِس مجموعہ مین وہ کلام بھی شامل ہے جسکو میرزا نے اپنے احباب کے مشورے سے اپنی جوہر آفرین طبع کی ملکیت سے خارج کر دیا تھا مگر ڈاکٹر عبدالرحمٰن بجنوری مرحوم کے میرزا پرست جوش نے ریاست سے کثیر رقم خرچ کرا کر "نسخہ حمیدیہ" کے نام سے اس کلام کو بھی شایع کرا دیا۔ مین نے مختلف رسائل مین "نسخہ حمیدیہ" سے منتخب کیے ہوئے کلام کو پڑھا ہے۔ میرزا نواز جماعت ڈاکٹر مرحوم کی اِس خدمت کو بہت ہی اہم قرار دیتی ہے اور مرحوم کا شکریہ ان الفاظ مین ادا کیا جاتا ہے

"اور اِس عظیم الشان ادبی اضافہ سے زبان کی محرومی کو مٹا دیا۔" مجھے حیرت ہی کہ اِس جماعت کی نظر میں معلوم نہین کہ ادبی کامیابی اور ادبی محرومی کسکے کیا معنی ہین۔ بہرحال اِس مضمون کو مکمل کرنے کی غرض سے مین ناظرین کو تصدیعہ دیتا ہون کہ چند اشعار کو ادہر ملاحظہ فرمائین اور ادب اردو کی کامیابی یا محرومی پر کوئی نہ کوئی رائے قائم کرین۔ وہو ہذا۔

نہ کہہ کہ طاقت رسوائی وصال نہیں — اگر یہی عرق فتنہ ہے مکرر کھینچ
دریا نشاط دعوت سیلاب ہے اسد — ساغر بہ بارگاہ دماغ رسیدہ کھینچ
آئینۂ امتحاں نذر تغافل۔ اسد — شش جہت اسباب ہے دہم توکل ہنوز
شکوہ و درد و داغ ای بیوفا معذور رکھ — خونبہائے یک جہاں امید ہے تیرا خیال
دیر و حرم آئینۂ تکرار تمنا — واماندگی شوق تراشے ہیں پناہیں
طلسم ہستی دل آں سوئے ہجوم اشک — ہم ایک میکدہ دریا کے پار رکھتے ہیں
صد رنگ گل کترنا در پردہ قتل کرنا — تیغ ادا نہین ہے پابند بے نیامی
اگر آسودگی ہے مدعائے رنج بیتابی — نثار گردش پیمانۂ مے روزگار اپنا
سیر ملک حسن کر میخانہ ہا نذر خمار — چشم مست یار سے ہے گردن مینا پہ باج
تمثال گداز آئینہ ہے عبرت بینش — نظارہ تحیر چمنستان بقا ہیچ
سادہ و پرکار تر غافل و ہوشیار تر — مانگے ہے شمشاد سے شانۂ سنبل ہنوز
خوں در جگر نہفتہ بہ زردی رسیدہ ہوں — خود آشیان طائر رنگ پریدہ ہوں
ہوں گرمی نشاط تصور سے نغمہ سنج — مین عندلیب گلشن ناآفریدہ ہوں
ہین چشم واکشادہ و گلشن نظر فریب — لیکن عبث کہ شبنم خورشید دیدہ ہوں

خواجہ حالی مرحوم کی چند شہادتین اور درج کیجاتی ہیں اوسکے بعد میرزا کے دوسرے حصہ کے کلام کا انتخاب مختصر پیش کیا جائیگا۔

یادگار غالب صفحہ ۱۰۱ "بہرحال میرزا ایک مدت کے بعد اپنی بیراہہ روی سے خبردار ہوئے اور استقامت طبع و سلامتی ذہن نے اُن کو راہ راست پر ڈالے بغیر نہ چھوڑا"

یادگار غالب صفحہ ۱۰۴ "میرزا کی طبیعت اسی قسم کی واقع ہوئی تھی وہ عام روش پر چلنے سے ہمیشہ ناک چڑہاتے تھے...... عامیانہ خیالات اور محاورات سے جہانتک ہو سکتا تھا اجتناب کرتے تھے"

یادگار غالب صفحہ ۱۰۸ "اُنکی غزل مین زیادہ تر ایسے اچھوتے مضامین پائے جاتے ہیں جن کو اور شعرا کی فکر نے بالکل مس نہین کیا اور معمولی مضامین ایسے طریقے میں ادا کیے گئے ہیں جو سب سے نرالا ہے۔ اور اُن میں ایسی نزاکتیں رکھی گئی ہیں جن سے اکثر اساتذہ کا کلام خالی معلوم ہوتا ہے"

خواجہ کی رائے مین میرزا کا آخر الذکر کلام جو بیراہہ روی چھوڑ کر لکھا گیا ہے میرزا کی شاعری کا اپنا طہیرہ نزاکتوں کا مخزن ہے۔ عام خیالات و محاورات سے علیحدہ ہے۔ مضامین کے لحاظ سے اچھوتا ہے۔ مین میرزا کے اس کلام کا "آسان کلام" کہہ کر تذکرہ کرونگا۔

مجھے افسوس ہے کہ آسان کلام مین عموماً وہ خوبیاں نہیں ہین جسکو خواجہ نے اپنے حُسن ظن سے میرزا کے کلام مین موجود فرض کر لیا ہے۔ میرزا کے کلام سے تخمیناً دو سو اشعار مین ایسے منتخب کر چکا ہون جنکی بندش اور تخیل عامیانہ ہے۔ مضامین پامال شدہ ہین، اور ندرت و جدت کا کہین پتہ تک نہیں ہے۔ بنظر اختصار اُن دو سو اشعار منتخبہ میں سے صرف چند اشعار منتخب کر کے قارئین کے ملاحظہ کیلیے پیش کیے جاتے ہین اور اپنی مختصر تنقید بھی اشعار کیساتھ شامل کر دی ہے اگر یہ سلسلہ آیندہ کچھ اور طویل ہوگا تو کل اشعار بھی کسی نہ کسی موقع پر شرف ملاحظہ حاصل کرینگے۔

بغل میں غیر کی آج آپ سوئے ہیں کہیں ورنہ   سبب کیا خواب میں آکر تبسم ہائے پنہاں کا

تبسم ہائے پنہاں سے میرزا نے رقیب کی بغل میں سونے کو معلوم کر لیا۔ اِس جدت کو فن

شاعری کی بیداری کہیے یا بدخوابی۔ لیکن شعر مین کسی قسم کی بلندی نہیں ہے۔

آج واں تیغ و کفن باندھے ہوئے جاتے ہیں ہم　　　عذر میرے قتل کرنے میں وہ اب لائینگے کیا

شعر…. بہ لحاظ مضمون معمولی درجہ سے بھی گرا ہوا ہے عذر لانا۔ عذر آوردن کا ترجمہ ہے
جا بھی اردو زبان میں رائج نہین ہے۔

ہر بُن مو سے دم ذکر نہ ٹپکے خوں ناب　　　حمزہ کا قصہ ہوا عشق کا چرچا نہوا

قصہ حمزہ سے مراد مشہور داستان امیر حمزہ ہے جو ایک افسانہ ہے۔ شعر نہایت
عامیانہ ہے۔

ہے خبر گرم اُن کے آنے کی　　　آج ہی گھر مین بوریا نہوا

عاشق کے واسطے بوریا نشینی مضائقہ نہیں رکھتی لیکن فرش زمین اس سے زیادہ موزوں
ہے یہاں معشوق کے لیے چٹائی کی نشست اور اُسکے نہونے پر افسوس ضرور ایک جدت ہے

تو دوست کسی کا بھی ستمگر نہ ہوا تھا　　　اوروں پہ ہے وہ ظلم کہ مجھپر نہوا تھا

میرزا صاحب نے معلوم نہین کس دل سے رقیب کی وکالت و حمایت کی ہے

پکڑے جاتے ہیں فرشتو ںکے لکھے پر ناحق　　　آدمی کوئی ہمارا دم تحریر بھی تھا

دوسرے مصرعہ میں ایسی شدید تعقید ہے جو کسی طرح قابل درگزر نہیں ہے میرزا
صاحب کہنا یہ چاہتے ہین "آدمی کوئی ہمارا بھی دم تحریر تھا"، لیکن اس بھی کو ردیف
کی خاطر کہاں پہونچا دیا۔

کافی ہے نشانی ترے چھلے کا نہ دینا　　　خالی مجھے دکھلا کے بوقت سفر انگشت

کسقدر عامیانہ تخیل ہے۔ اگر یہ شعر مبتذل نہیں ہے تو مبتذل کسے کہتے ہیں۔

مرے قدح میں ہے صہبای آتش پنہاں　　　بروئی سفرہ کباب دل سمندر کھینچ

اردو زبان ابھی تک فارسی کے ایسے ترجمہ کو جذب کرنیکے لیے تیار نہیں ہے۔ لیکن
اسے چھوڑیے یہ میرزا کے خصوصیات سے ہے میرزا نے محض آتش پنہاں کی خاطر سے سمندر کے

دل کا کباب بنا کر دسترخوان کو تو زینت دی مگر جو لوگ اردو زبان کا ذوق سلیم رکھتے ہین اُن کو بد مزہ کر دیا۔

خوب وقت آئے تم اِس عاشق بیمار کے پاس — مند گئیں کھولتے ہی کھولتے آنکھیں ہی ہہر

ایک شعر اسی مضمون کا میرزا صاحب پہلے لکھ چکے ہین بندش بہت سُست ہی مضمون بینیہ ہی معلوم نہین میرزا خود کہہ رہے ہین یا کسی دوسرے کی زبان سے کہا ہے

حیراں ہوں دلکو روؤں کہ پیٹوں جگر کو میں — مقدور ہو تو ساتھ رکھوں نوحہ گر کو میں

تخئیل تو وہی ہے جو میر کے شعر میں ہی ؎

دلکو روؤں و یا جگر کو میر — اپنی دونوں سے آشنائی ہے

لیکن میرزا نے شاید لفظ "پیٹوں" کے اضافہ سے شعر میں کوئی ندرت پیدا کی ہو۔

بھاگے تھے ہم بہت سو اُسی کی سزا ہی یہ — ہو کر اسیر داتبے ہیں راہزن کے پانون

بظاہر شعر بہت پست ہی اور مضمون مبتذل ہی لیکن میرزا کی اُپج کا کیا ٹھیک ہے ممکن ہی راہزن سے بھی معشوق مراد ہو اور پاچپی کی خدمت لازمۂ عشق ہو۔

اللہ رے ذوق دشت نوردی کہ بعد مرگ — ہلتے ہیں خود بخود مرے اندر کفن کے پاؤں

کفن کے اندر خود بخود پاؤں ہلنے کا کوئی ثبوت نہین دیا اور معمولاً خلاف واقعہ ہے

ایک نہایت مبتذل شعر جو مشہور عام ہی معلوم نہیں کس نے کہا ہی ؎

مرنے کے بعد بھی نہ گئی بانکپن کی شان — تختہ پہ بہر غسل لٹایا اکڑ گئے

شدت برودت سے اعصاب کا کھنچ جانا اور مردہ کا اکڑ جانا پھر بھی ممکن ہی لیکن میرزا نے جو کہا ہے وہ ناممکن محض ہی۔

واں پہونچکر جو غش آیا پے ہم ہی ہمکو — صدرہ آہنگ زمیں بوس قدم ہی ہمکو

ہیم کی جگہ پے ہم باضافت جائز بھی ہو لیکن واجب نہیں تھا۔ میرزا کی یہ ثقیل بندش سوائے اپچ اور ایجاد بندہ...... کے اور کوئی معنی نہیں رکھتی ہی۔

تم جانو تمکو غیر سے جو رسم و راہ ہو　　　مجھکو بھی پوچھتے رہو تو کیا گناہ ہو

میرزا نے عاشقانہ مشرب مین جس رواداری کے اصول کی تلقین کی ہے دنیائی عاشقی مین اس سے پہلے اس کا وجود نہ تھا۔ اس جذبہ رواداری کو اوپج کہنا چاہیے اور میرزا کو مصور جذبات۔

حاصل سے ہاتھ دھو بیٹھ۔ اے آرزو خرامی　　　دل جوش گریہ مین ہے ڈوبی ہوئی اسامی

آرزو خرامی کی ترکیب اور مضمون کا ابتذال دونون مکروہ ہیں۔ حاصل سے مراد لگان ہے۔ نادار کاشتکار کو ڈوبی ہوئی اسامی کہتے ہیں جس سے لگان ملنے کی کوئی امید نہین ہوتی لیکن اس زمینداری و کاشتکاری کی تخیل کو غزل اردو میں جگہ دینا غالباً میرزا نواز جماعت ایک اضافہ (اضافہ لگان) سمجھی ہوگی۔

درد سے میرے ہے تجھکو بیقراری ہائے ہائے　　　کیا ہوئی ظالم تری غفلت شعاری ہائے ہائے
کیوں مری غمخوارگی کا تجھکو آیا تھا خیال　　　دشمنی اپنی تھی میری دوست داری ہائے ہائے

"ہائے ہائے" کو ان دو شعرون میں بلکہ ساری غزل میں دیکھئے کسقدر لطف دے رہا ہے اسکے سوا شعروں میں اور کچھ نہیں ہے۔

پینس میں گزرتے ہیں وہ کوچہ سے جو میرے　　　کندھا بھی کہاروں کو بدلنے نہیں دیتے

شعر بلحاظ عوام پسندی مزید تعریف سے مستغنی ہے۔

مجھے اس سے کیا توقع بہ زمانۂ جوانی　　　کبھی کودکی میں جس نے نہ سُنی مری کہانی
یونہین دکھ کسی کو دینا نہیں خوب۔ ورنہ کہتا　　　کہ مرے عدو کو یارب ملے میری زندگانی

دونون شعروں میں اسقدر سادگی ہے کہ اگر میرزا ان شعرون کو قادرنامہ میں شامل کردیتے تو موزوں تھا۔

جس بزم میں تو ناز سے گفتار میں آوے　　　جاں کالبد صورت دیوار میں آوے
سایہ کی طرح ساتھ ہی پھرے سرو و صنوبر　　　تو اس قد دلکش سے جو گلزار میں آوے

اُس چشمِ فسوں گر کا اگر پائے اشارہ طوطی کی طرح آئینہ گفتار میں آوے
غارت گرِ ناموس نہو گر ہوسِ زر کیوں شاہدِ گل باغ سے بازار میں آوے

گفتگو کرنے کے بجائے گفتار میں آنا نظم فرما کر میرزا ایک عطیہ زبان اردو کو دینا چاہتے ہیں لیکن زبان اردو نے آجتک بھی اِس عطیہ کو قبول و منظور نہیں کیا ہے۔ میرزا پرست ہر اختراع کے مداح ہیں جو میرزا سے منور ہو۔ لیکن کسی مقلد میرزا نے بھی گفتار میں آنے کو رواج نہین دیا۔ بہ لحاظ مضامین سب شعر اسقدر عام ہیں کہ ہر شاعر جو دل و دماغ پر زور نہ دینا چاہتا ہو ایسا ہی لکھتا ہے۔

حُسنِ مہ گرچہ بہ ہنگامِ کمال اچھا ہے لیکن اُس سے مرا خورشید جمال اچھا ہے
ہم سخن تیشہ نے فرہاد کو شیریں سے کیا جس طرح کا کہ کسی مین ہو کمال اچھا ہے
قطرہ دریا میں جو مل جائے تو دریا ہو جائے کام اچھا ہے وہ جس کا کہ مآل اچھا ہے

بظاہر ان معمولی اشعار میں کوئی جدت اور اپج نہیں ہے۔

صحبتِ رنداں سے واجب ہے حذر جائے مے اپنے کو کھینچا چاہیے
چاہنے کو تیرے کیا سمجھا تھا دل بارے اب اِس سے بھی سمجھا چاہیے
دوستی کا پردہ ہے بیگانگی مُنھ چھپانا ہم سے چھوڑا چاہیے

ہر شعر کے دوسرے مصرعہ کی بندش نہایت بھدّی ہے۔ میرزا کی جدت طراز طبیعت نے اگر ان شعروں میں کوئی گلکاری کی بھی ہے تو ظاہر بین نگاہیں اُسکو ہرگز نہیں دیکھ سکتی ہیں

اِس نزاکت کا برا ہو وہ بھلے ہیں تو کیا ہاتھ آئیں تو اُنھیں ہاتھ لگائے نہ بنے

شعر مین فحش کی جھلک موجود ہے اور قلق لکھنوی کا سا شعر معلوم ہوتا ہے۔

بوجھ وہ سر سے گرا ہے کہ اُٹھائے نہ اُٹھے کام وہ آن پڑا ہے کہ بنائے نہ بنے

دونو مصرعے برابر کے ہیں لیکن یہ نہیں معلوم ہوتا کہ کونسا بوجھ سر سے گرا ہے اور کیا کام درپیش ہے خیر مضمون کچھ ہو یا نہو۔ لیکن شعر کانوں کو بھلا معلوم ہوتا ہے۔

اَسدؔ خوشی سے مرے ہاتھ پاؤں پھول گئے　　کہا جو اُس نے ذرا میرا پاؤں داب تو دے

ابھی میں راہزن کے پاؤں داب نے پر میرزا صاحب کو ٹوک چکا ہوں معلوم نہیں میرزا منشی کے خلاف پاؤں داب نے کی بتذل تخیل کی طرف میرزا کو اتنی زیادہ توجہ کیوں ہے۔

کیوں بوتے ہیں باغبان تونبے　　گر باغ گدائے مے نہیں ہے

شادی سے گزر کہ غم نہووے　　اُردی جو نہو تو دے نہیں ہے

ابن مریم ہوا کرے کوئی　　میرے دُکھ کی دوا کرے کوئی

چال جیسے کڑی کمان کا تیر　　دل میں ایسے کے جا کرے کوئی

کیا اِن اشعار میں کوئی لطافت شعری ہے۔ کیا خواجہ نے جس اُپج کو میرزا کے کلام کی خصوصیت قرار دیا ہے اُسکا اِن اشعار میں کہیں وجود ہے۔

قارئین کرام۔ ذوقؔ اور غالبؔ کے کلام کے مختلف نمونے آپ ملاحظہ فرما چکے موقع بموقع میں نے دونوں کے کلام میں مقابلہ کر کے دونوں کے تخیل کے فرق کو بھی نمایاں کر دیا ہے اب اِس سوال کا فیصلہ کہ اُن محترم شخصیتوں سے غزل اردو کس حد تک فیضیاب ہوئی زیادہ دشوار نہیں ہے میرؔا اور سوداؔ کی تعمیر میں بہت کچھ نقش و نگار باقی رہ گئے تھے جسکی تکمیل اُنکی وفات کے بعد ہوئی اِس آخرالذکر تکمیل میں سب سے زیادہ نمایاں حصہ حضرت ذوقؔ مرحوم نے لیا ہے۔ اُنھوں نے زبان کی صفائی میں حد سے زیادہ کوشش کی۔ مضامین کی کثرت و ندرت سے زبان اردو کو ایک سرمایہ دار زبان بنا دیا۔ فارسی ترکیبوں کو نہایت سلیقہ سے زبان اردو میں منتقل کیا اور جو کچھ کیا وہ خاص و عام میں مقبول ہو گیا۔ ذوقؔ کے بعد بھی ان کے تلامذین نے اِس کوشش کو جاری رکھا۔ فصیح الملک داغؔ مرحوم کے مساعی بھی غزل اردو کے واسطے بہت کچھ قابل فخر ہیں اسلیے یہ کہنا بیجا نہیں ہے کہ حضرت ذوقؔ مرحوم کے فیوض غیر فانی ہیں اور اردو شاعری خاقانی ہند کے احسانات سے آج بھی منکر نہیں ہو سکتی

میرزا غالب مرحوم کی بابت مین نے دعویٰ کیا تھا کہ اُنھوں نے اردو غزل کی شاعری کو نہایت بیدلی سے انجام دیا ہے۔ مالی ضرورتوں کی وجہ سے مجبوراً اُنھوں نے اردو شعرا کی فہرست میں شامل ہونا پسند فرمایا تھا۔ اِس دعوے کو میں نے بہترین دلائل اور براہین سے ثابت کیا ہے جو بظاہر ناقابل تردید ہیں۔ میرزا کے مشکل کلام پر مین نے خود تنقید نہیں کی ہے لیکن معتبر اور متواتر شہادتوں سے یہ ثابت کر دیا ہے کہ یہ کلام زبان اردو کے واسطے باعث عار ہے۔ بعض لوگوں کا یہ خیال ہے کہ مشکل گوئی میں کم سے کم میرزا وحید اور فرید تھے اور موجد و مجتہد کا درجہ رکھتے تھے۔ یہ بھی صحیح نہیں ہے۔ میرزا کے زمانہ مین عبداللہ خاں اوج اور مومن خاں مومن موجود تھے ان کی طبیعت بھی مشکل پسند واقع ہوئی تھی یہ حضرات بھی فارسی ترکیبون سے اور کبھی کبھی بندش کی پیچیدگیوں سے اپنے شعر کو معنی سے بعید کر دیتے تھے۔ میرزا کے سہل کلام مین اگر کچھ اشعار جدت وندرت کے حامل ہیں تو اِس سے زیادہ تعداد میں ایسے اشعار بھی موجود ہیں جو نہایت پست ہین جن کو آپ گذشتہ اوراق مین پڑھ چکے ہیں۔ میرزا کے کلام مین تنافر۔ تعقید۔ ضلع کا بھی دخل ہے لیکن میں نے اِس پر زور نہین دیا ہے اگر آپ اِسے تفصیل سے دیکھنا چاہتے ہین تو طباطبائی کی شرح دیوان غالب پڑھیے۔ بعض میرزا پرستون کا خیال ہے کہ جب تک باشوکت الفاظ شعر میں جمع نہ کیے جائین شعر بلند درجہ حاصل نہین کر سکتا لیکن اُن حضرات کو چاہیے کہ صفی لکھنوی اور عزیز لکھنوی کی شاعری کو دیکھین کہ آسان الفاظ سے شعر اور مضمون شعر کس طرح بلند کیا جاتا ہے۔ زبان اردو میر کے زمانے میں جن منزلون کو طے کر چکی تھی ذوق مرحوم نے اُس سے آگے کا راستہ صاف کیا تاکہ زبان اردو آئندہ مدارج کو طے کر کے اعلےٰ کمال پر پہونچ جائے۔ میرزا غالب نے اردو زبان کے طرز رفتار کو بہ نظر حقارت دیکھا اور موجودہ راستہ مین جھیل جھانکڑ ڈالکر اُسکو بند کرنا چاہا اور عنقریب اردو کے لیے ایک دوسرا راستہ تجویز کیا اگر زبان اردو اِس نئے راستہ پر چلنا شروع کر دیتی تو دہیں واپس پہونچ جاتی جہاں سے میر اور سودا کی رہنمائی میں ابتداءً چلنا شروع کیا تھا۔ مجھے میرزا مرحوم سے کوئی ذاتی عداوت

نہیں ہو میں نے جو کچھ گزارش کیا ہو وہ میری آزادرائے ہو۔ ممکن ہو کہ میرزا نواز جماعت میرے اِس اظہار رائے کو بہت زیادہ ناپسندیدگی کی نظر سے دیکھے لیکن مجھے یقین ہو کہ جن لوگوں کو زبان اردو کے ساتھ سچی ہمدردی ہو وہ میری محنت کی قدر کرینگے اور میری راست گوئی کی عزت فرمائیں گے۔

قارئین کرام۔ مین آپ کو یہ بھی بتانا چاہتا ہوں کہ میرزا نواز جماعت سے مین کونسی جماعت مراد لیتا ہوں اور وہ کن قسم کے اشخاص پر مشتمل ہو۔ اِس جماعت میں تین قسم کے لوگ شامل ہیں۔

قسم اول۔ یہ لوگ نہایت شریف النفس ہیں اور میرزا کی اردو شاعری کی حقیقت حال سے بخوبی واقف ہیں مگر حُسن عقیدت اور خلوص محبت کی وجہ سے میرزا کی شاعری کے تاریک پہلو پر پردہ ڈالنا چاہتے ہیں اور صرف اُنکے بہترین اشعار کو روشنی مین لانا چاہتے ہین یہ حضرات حق وصداقت سے زیادہ دور نہیں ہیں اِن میں سب سے زیادہ قابل الذکر خواجہ الطاف حسین حالی مرحوم ہیں جو میرزا کی تائید تو کرتے ہیں لیکن اُنکی تقلید نہیں کرتے مین ایسے لوگوں کو بھی قابل عزت جانتا ہوں اور اُنکا احترام کرتا ہوں۔ اِس قسم کے لوگونکی تعداد بوجہ وفات کے اب بہت کم ہے۔

قسم دوم۔ یہ حضرات میرزا کے شدید عقیدتمند ہیں اور میرزا کو اردو زبان کا بہترین شاعر سمجھتے ہین۔ لیکن زبان اردو کے ساتھ بھی سچی ہمدردی رکھتے ہیں۔اس لیے میرزا کے مشکل کلام کو معانی کے زیور سے آراستہ دیکھنا چاہتے ہیں تاکہ بجا طور پر اسکا داخلہ بزم اردو میں ہو سکے میرزا کی حمایت کے ساتھ ساتھ اُن کو موجودہ قواعد وضوابط زبان اردو سے بھی کافی ہمدردی ہو اور خلاف ورزی کو جائز نہیں سمجھتے ہیں اِسی وجہ سے میرزا کی لغزشوں کو تاویلات وتمثیلات سے حق بجانب ثابت کرنا چاہتے ہیں یہ اپنی کوشش مین کامیاب ہوں یا نہوں لیکن اِن کی ہمت قابل مبارک باد ہو۔ گومیں ان کی رائے سے متفق نہیں ہوں لیکن

ان کے ساعی زبان اردو کے واسطے کسی طرح مضرت رساں نہیں ہیں اس قسم میں مولانا محمود موہانی کی شخصیت بالخصوص قابل تذکرہ ہے۔

قسم سوم۔ یہ وہ اشخاص ہیں جنھوں نے یورپ میں یا ہندوستان میں علوم مغربی کی تحصیل کی ہو اکثر نہایت متمول ہیں۔ اردو شاعری سے انھیں اصلی ذوق نہیں ہو لیکن شکسپیر اور گیٹے کی شاعری پر مفتون ہیں۔ اپنی وضع ولباس اور خورد نوش کو انگریزی تہذیب کے حوالے کر چکے اب اردو شاعری کو مغربی شاعری پر نثار کرنا چاہتے ہیں حقیقت میں مشرق و مغرب کی شاعری میں بھی بعد المشرقین و المغربین ہو۔ یہ حضرات اپنے ارادہ میں کبھی کامیاب نہیں ہو سکتے۔ ان کی رائے میں میرزا غالب ہی ایسا شاعر ہو جو زبان اردو کے قواعد کی خلاف ورزی میں جری ہو اور صرف میرزا ہی میں شکسپیر بنے کی گنجائش ہو اسلیے یہ میرزا کو نبی اور اُسکے کلام اردو کو الہامی قـــرار دیتے ہیں یہ اپنی اکثریت اور دولت کی وجہ سے دنیائی شاعری کو مرعوب کرکے اپنا رنگ جمانا چاہتے ہیں۔ اکثر پریس اور رسائل ان کی ملکیت میں ہیں جو ملکیت میں نہیں ہیں وہ ان کے دست کرم سے مستفیض ہیں ایسی باقتدار شخصیتوں سے اختلاف کرنا اور کامیاب ہو جانا کچھ آسان نہیں ہو لیکن میں مایوس نہیں ہوں حق ہمیشہ باطل پر فتح پاتا ہے۔ یہ حضرات زبان اردو کو دوستی کے پردے میں نقصان پہونچا رہے ہیں میں ان لوگوں کا علمبردار ڈاکٹر عبد الرحمن صاحب بجنوری مرحوم کو قرار دیتا ہوں اور بجنوری مرحوم کے خیالات پر کسی قدر وضاحت کے ساتھ بحث کرنا چاہتا ہوں۔

ڈاکٹر موصوف کے جذبات عقیدت میرزا کے ساتھ نہایت راسخ ہیں مرحوم نے میرزا کے ایک شعر کو پیش کرکے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہو کہ میرزا اپنے دیوان اردو کو الہامی سمجھتے تھے۔

غالب اگر ایں فن سخن دیں بودے   آں دین را ایزدی کتاب ایں بودے

میرزا تو نہایت لطیف طرز میں یہ کہہ رہا ہو کہ فن سخن کو دین فرض کرلیں تو میرا دیوان

فارسی کتاب الہامی ہے۔ مگر ڈاکٹر بجنوری نے بغیر کسی شرط اور قید کے استعارتاً نہیں بلکہ حقیقتاً مقدس وید اور دیوان غالب (اردو) کو ہندوستان کی الہامی کتب قرار دیدیا۔

وید کی تقدیس اور الہامی تسلیم کو ہمارے بحث سے کوئی تعلق نہیں ہے اسکا شکریہ آریہ سماجون کو ادا کرنا چاہیے۔ میرزا نے اپنے کلام فارسی کو کتاب ایزدی کہکر اوسکی فوقیت مین مبالغہ کیا تھا لیکن ڈاکٹر مرحوم نے میرزا کے کلام اردو کو الہامی قرار دیکر میرزا کو پیغمبر سخن کہدیا۔ خدا بجنوری مرحوم کی لغزشوں کو معاف فرمائے یہ اُنکا کہنا کوئی شاعرانہ تخیل نہیں ہے بلکہ غالب کے ساتھ جو اُنھیں حسن عقیدت تھا اُسکا لازمہ یہی تھا۔ ڈاکٹر مرحوم اگر میرزا کے کلام فارسی پر الہامی ہونیکا فتویٰ دیتے تو بھی غلط تھا لیکن غالب کی شاعرانہ تخیل سے کچھ ملتا جلتا ضرور ہوتا۔ ڈاکٹر مرحوم نے میرزا کی تمام شاعرانہ لغزشوں کو تسلیم کرتے ہوئے بھی اُن کو حسن قرار دیا ہے ڈاکٹر بجنوری کہتے ہین "دیوان غالب مین ایسے اشعار بھی ہیں جن کا مفہوم پانے سے ذہن مطلقاً قاصر ہے تخیل عرصۂ امکان میں ہر جانب پرواز کے بعد مجبوراً واپس آجاتا ہے گویا ایک دائرہ ہے جس سے گریز نا ممکن ہے بہت سے نقاد اسکو کیف شراب پر محمول کرتے ہیں ایسا نہیں ہے۔ گیٹے کے اعلیٰ ترین کلام پر بھی اعتراض ہر جانب سے کیا گیا تھا۔ ایک دن ایکرمان نے دریافت کیا کہ اس اِشکال کا کیا باعث ہے گیٹے نے جواب دیا یہی تاریکی تو ہے جسپر لوگ فریفتہ ہیں۔ لوگ اِن مقامات پر لاینحل مسائل کی مثال پر غور کرتے ہین اور اپنی ناکامیابی سے نہیں اُکتاتے۔ انسانی طلب کی انتہا تحیر ہے اگر کسی فعل سے حیرت پیدا ہو تو وہ کمال فن ہے اور اس بات پر اصرار نہ کرنا چاہیے کہ اسکے پس پشت کیا ہے۔ لیکن بچے جب آئینہ میں اپنا عکس دیکھ کر حیران ہوتے ہیں تو نادانی سے پشت آئینہ کو بھی دیکھنے لگتے ہیں"

ڈاکٹر بجنوری دوسرے موقع پر فرماتے ہین "میرزا غالب نے بعض اوقات قواعد کے خلاف زبان لکھی ہے اسکے متعلق سید فضل الحسن حسرت اور علی حیدر طباطبائی نے چند مناسب اور

معقول اعتراضات کیے ہیں لیکن واقعہ یہ ہی کہ قواعد منطق کا خارجی پہلو ہی اور شاعری منطق سے آزاد ہی علم القواعد کا کام تقریر و تحریر میں صحت پیدا کرنا ہی کلام مین لطافت پیدا کرنا نہیں اسلیے بعض اوقات شاعر کو اپنے جذبات کے کامل اظہار کے لیے قیود سے آزادی حاصل کرنا ضروری ہی ڈاکٹر موصوف ایک جگہ لکھتے ہیں "کبھی کبھی ایک ایسا پیغمبر سخن دنیا مین آتا ہی جو نظریات اور قواعد زبان سے آزاد اور صرف روح القدس کا ترجمان ہوتا ہے۔ شکسپیر اور غالب کا کام قواعد زبان کی پابندی نہیں ہی یہ قواعد زبان کا کام ہی کہ اُن کی پابندی کرے یا اُنکی خاطر سے اپنے درسیات مین خاص ضمیمہ جات کا اضافہ کرے" ڈاکٹر بجنوری مرحوم کی راے میں میرزا غالب نبی تھا اور اُسکے کلام کا اہمال۔ الہام تھا (اہمال کو الہام سے اگر کوئی اور نسبت نہیں ہی تو کم سے کم اُلٹ پھیر کر حروف تو واحد ہیں) اور دیوان غالب (اردو) عہ نسخہ حمیدیہ کتاب آسمانی منزل من اللہ تھا (معاذ اللہ) ڈاکٹر بجنوری کو جو واہمہ پیدا ہوا ہی اسی قسم کا ایک وسوسہ ابو طیب بن حسین کوفی عرب کے ایک مشہور شاعر کو پیدا ہو گیا تھا یعنے اُسکا خیال تھا کہ وہ جو کچھ کہتا ہی ایک الہام الٰہی ہی اور ابو طیب دنیائے شاعری کا نبی ہی۔ لیکن اہل بصیرت نے اِس دعائے باطل میں اسکی ہمنوائی نہیں کی اور آج تک وہ تمام دنیا میں متنبی (بنا ہوا نبی یا جھوٹا نبی) کے نام سے پکارا جاتا ہے۔ افسوس ہے ڈاکٹر بجنوری کے ہم خیالوں نے غالب کے نبی ماننے میں ذرا بھی پس و پیش نہیں کیا بلکہ بغیر سوچے سمجھے بجنوری صاحب کی آواز پر لبیک کہا۔ بااینہمہ بھی ڈاکٹر بجنوری کا طریقہ استدلال نہایت نادر ہی اُنکی راے میں میرزا کا بے معنی یا مہمل یعنی کلام یہی معجزہ نبوت ہی (معاذ اللہ) قواعد زبان اردو کی خلاف ورزی بھی میرزا جیسے عظیم الشان نبی (معاذ اللہ) کے واسطے لازمی تھی۔ میرزا روح القدس کا ترجمان ہی اور اُسکے کلام کے لحاظ سے قواعد زبان میں ترمیم ہونا چاہیے۔ ڈاکٹر مرحوم کے اِن استدلالات پر مولانا بیخود بھی غور فرمائیں اگر اُنکی راے میں ڈاکٹر صحیح کہتا ہی تو میرزا کے کلام کو بامعنی اور باقاعدہ ثابت کرنے کی مساعی کوہ کندن و کاہ بر آوردن ہیں۔ اور یہ احتمال بھی ہے کہ اگر میرزا کے

کلام پر سے الزام ہٹ گیا تو انکا کلام الہام کے درجے سے گر جائیگا (معاذ اللہ) فی الحقیقت ڈاکٹر بجنوری مرحوم نے نہایت آسان طریقہ سے تمام اعتراضات کا قلع قمع کر دیا جو میرزا کے کلام پر وارد کیے جاتے تھے اور میرزا کو مرتبۂ نبوت سخن میں حاصل ہو گیا۔

قارئین کرام۔ آپ کا تعارف میرزا نواز جماعت سے ہو گیا۔ اس جماعت کی جدوجہد نے نثر اردو پر بھی زبردست اثر کیا ہے اور عجب نہیں کہ وہ بھی الہام (اجمال) کا درجہ حاصل کرلے۔ الناظر نومبر و دسمبر ۱۹۲۵ء میں ایک مضمون "گلابی اردو" شایع ہوا ہے۔ فاضل نامہ نگار نے اپنے نام کو اشارات میں ظاہر فرمایا ہے لیکن ع۔ ہم سمجھ لیتے ہیں مضمون خط کا عنوان دیکھ کر

اس مضمون میں نثر اردو کے چند نمونے پیش کیے ہیں شایقین خود الناظر میں مضمون کو پڑھیں بخطر طوالت ان اوراق میں اُسکے نقل کرنیکی گنجایش نہیں ہے۔ غالباً اُس مضمون کو پڑھ لینے کے بعد اس نتیجہ پر پہونچ جانا آسان ہوگا کہ اب اردو نثر کو بھی عام فہم معانی سے عار و ننگ ہے اور اگر یہ سلسلہ بغیر روک ٹوک کے جاری رہا تو کوئی شک نہیں ہے کہ زبان اردو کی حالت بد سے بد تر ہو جائیگی۔ اُس مضمون میں۔ ارتعاش ملتجی اور لرزہ مسترحم۔ تراکیب جدیدہ کو ملاحظہ فرمائینگے جو موجودہ انشاپردازوں کی خودسری اور ایجاد و اجتہاد کا ادنیٰ کرشمہ ہے۔

ان حالات کو دیکھتے ہوئے ایک خادم زبان اردو کا فرض تھا کہ وہ عام و خاص کو اُن خطرات سے آگاہ کرے جو زبان اردو کی ترقی میں سد راہ ہیں ورنہ میرزا غالب کو دنیائے شاعری سے رخصت ہوئے ۵۰ برس ہو چکے مرحوم کے کلام پر آج اسقدر سخت تبصرہ کی ضرورت نہیں تھی۔ قارئین کرام میں اپنے دعوے کا اعادہ کرتے ہوئے مضمون کو ختم کرتا ہوں اور فیصلہ آپکی رائے پر چھوڑتا ہوں

"مذوق مرحوم میر علیہ الرحمۃ کے بعد اردو غزل کا سب سے زیادہ کامیاب شاعر تھا"

نیر بدایونی

حضرت امیر بدایونی کی دو کتابیں

اسلام بجواب ترک اسلام

عبدالغفور و معرہ دھرم پال جی برہمچاری نے اپنی کتاب "ترک اسلام" میں قرآنی تعلیم پر جو اعتراضات وارد کیے تھے، قاضی غلام امیر صاحب نے مہذب پیرایہ میں قانون فطرت اور کتب وید دونوں کی رُو سے اُنکا مدلل اور مفصل جواب اس نام سے شایع کیا ہے۔ ان اعتراضات کی تردید کے ساتھ ہی ہندو قوانین مذہب کے ناقابل عمل ہونے، گوشت خوری کے جواز، قیامت، بہشت، دوزخ، فرشتے، اور معجزات پر نہایت پُراز معلومات بحث کی ہے، اور نہایت خوبی کے ساتھ تعلیم قرآنی کی افضلیت کا مسکت ثبوت پیش کیا ہے۔ قاضی صاحب نے یہ نادر رسالہ لکھ کر محض ترک اسلام کی تردید ہی نہیں کی ہے بلکہ مسلمانوں کے لیے آریہ سماجی مذہب سے ضروری واقفیت کا ذخیرہ بھی بہم پہونچا دیا ہے۔ قیمت ۱۲ ار

ریویو

اس کتاب میں قاضی صاحب نے آریہ سماج کے بانی سوامی دیانند جی مہاراج کی سوانحعمری معہ اپنی فلسفیانہ تنقید کے عوام کی واقفیت کے لیے شایع کی ہے اور مدلل طور پر ثابت کیا ہے کہ نہ سوامی جی نے توحید کا صحیح خیال پیش کیا، نہ ہندووں کو چھوت چھات اور ذات پات کی قیود سے آزاد کیا، نہ اُنکی وید کی تفسیر کوئی اہمیت رکھتی ہے، نہ اُنکا سماج عرصہ تک قائم رہنے والا ہے، اور نہ خود اُنھوں نے سنیاس کے سچے اصولوں کی پابندی کی۔ اس کتاب کے مطالعہ سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ سوامی جی خود مہارشی نہیں بن بیٹھے بلکہ ایک تعلیم یافتہ گروہ نے ہندو مت کو قابل اصلاح دیکھ کر دیانند مہراج کو مہارشی کی منزلت پر پہونچا دیا اور اپنے اصلاحی اغراض کے لیے اُنکو آلہ کار بنایا۔

یہ کتاب ہر حیثیت سے سنجیدگی کے ساتھ مطالعہ کے قابل ہے۔ قیمت عہ ر

ملنے کا پتہ

الناظر بک ایجنسی۔ لکھنؤ

اساتذۂ اُردو

دیوان ولی۔ اُردو ریختہ کے بابا آدم ولی دکنی کا دیوان پہلی بار پروفیسر حیدر ابراہیم سایانی نے شائع کیا ہے۔ قیمت ۸ر

کلیات میر۔ میر تقی میر کا ہر صنف کا کلام قیمت عہ **کلیات سودا**۔ مرزا رفیع سوداؔ کا ہر صنف کا کلام قیمت عہ

انتخاب میر۔ میر کے بہترین اشعار مع اُنکے حالاتِ زندگی و خصوصیات شاعری مرتبہ مولوی نور الرحمٰن بی اے قیمت عہ

دیوان درد۔ خواجہ میر دردؔ دہلوی کا پُر اثر کلام قیمت ۴ر **کلیات مومن**۔ حکیم مومن خاں دہلوی کا ہر صنف کا کلام۔ ۴ر

قصائد مومن۔ بتصحیح و تحشیہ مولوی ضیاء احمد ضیا ایم اے جسکے مقدمہ میں مومن کے سوانح و خصوصیات شاعری کا بیان ہے قیمت ۱۲ر

دیوان ذوق۔ مولوی محمد حسین آزاد نے اپنے اُستاد کی خصوصیات کلام کو نمایاں کرنے کے لیے اپنا کمال اُستادی صرف کیا اور بہت سی ایسی باتیں لکھی ہیں جنسے ذوق کی شاعری سے لطف اندوز ہونے میں بہت مدد ملتی ہے۔ قیمت ۶ر

دیوان ذوق۔ شیخ محمد ابراہیم ذوقؔ دہلوی کا کلام قیمت ۱۲ر **دیوان مہر**۔ حاتم علی مہرؔ کا کلام۔ قیمت عہ

قصائد ذوق (مع فرہنگ) مرتبہ ڈاکٹر محمد سلیمان جج ہائیکورٹ الہ آباد۔ غزلیات کے سوا باقی کل کلام ہے۔ قیمت عہ

انتخاب غزلیات ذوق۔ مرتبہ ڈاکٹر محمد سلیمان جج ہائیکورٹ الہ آباد۔ قیمت عہ

دیوان غالب۔ غالب کی مقبولیت کے باعث اُنکے دیوان کے حسب ذیل اڈیشن اور مختلف شرحیں بازار میں موجود ہیں۔

دیوان خورد (دیگر) ۸ر دیوان خورد غیر مجلد عہ دیوان مع نکات غالب فرہنگ عہ دیوان (رسمی) ۴ر

دیوان حمیدی مطبوعہ جرمنی للعہ دیوان حمیدی مطبوعہ ہند عہ

شرح دیوان غالب (نظم طباطبائی) زیر طبع۔ شرح دیوان (حسرت موہانی) عہ دیوان مع شرح تقطیع خورد

مطالب الغالب (سُہا علیگ) ۱۲ر شرح دیوان (عبد الباری آسی) عہ مرآۃ الغالب (بیخود دہلوی) عہ

مکمل دیوان غالب۔ مروجہ دیوان جو مرزا غالب نے خود طبع کرایا تھا اُس میں سے بہت سا کلام خارج کر دیا تھا۔ بھوپال کے کتب خانہ میں غالب کے مکمل دیوان کا قلمی نسخہ ملا جو اب نسخۂ حمیدیہ کے نام سے شائع ہوا ہے۔ ڈاکٹر عبد الرحمٰن بجنوری مرحوم کلام غالب پر ایک بسیط تبصرہ اپنے رنگ میں لکھ رہے تھے جو اُنکی وفات کے باعث نامکمل رہ گیا اور محاسن غالب کے نام سے علیحدہ چھپا ہے اس دیوان میں یہ بھی اور مفتی انوار الحق ایم اے ناظم تعلیمات بھوپال کا مقدمہ بھی ہے۔ قیمت عہ

کلیات آتش۔ خواجہ حیدر علی آتشؔ لکھنوی کا کلام (زیر طبع) **دیوان ناسخ**۔ شیخ امام بخش ناسخؔ کا کلام۔ قیمت عہ

دیوان شاہ تراب۔ شاہ تراب علی قلندر کاکوروی کا دیوان ریختہ و ہندی جو بادۂ تصوف و عرفان سے لبریز ہے۔ قیمت عہ

کلیات ظفر۔ بہادر شاہ بادشاہ دہلی کے چار دواوین کا مجموعہ۔ قیمت عہ **دیوان شیفتہ**۔ نواب مصطفیٰ خاں شیفتہؔ کا کلام (زیر طبع)

دیوان مجروح - میر مہدی مجروح شاگرد غالب کا کلام قیمت ۸ہر دیوان رند - نواب سید محمد خاں رند شاگرد آتش کا کلام - ۱۰ر

کلیات نظیر - نظیر اکبرآبادی کا ہر صنف کا کلام - قیمت عہ ر منظر عشق - نواب مرزا آفتاب الدولہ قلق مصنف مثنوی طلسم الفت کا آن دیو ۸ ر

روح نظیر - مخمور اکبرآبادی نے نظیر کی شاعری پر بسیط تبصرہ لکھا اور جدید طرز پر انکے بہترین کلام کو مرتب کیا ہے - قیمت ۸ہر

منتخب العالم - منیر شکوہ آبادی کا پہلا دیوان قیمت ۸ہر تنویر الاشعار - منیر شکوہ آبادی کا دوسرا دیوان - قیمت عہ ر

نظم دل فروز - منشی امیر اللہ تسلیم کا پہلا دیوان ۸ہر دفتر خیال - امیر اللہ تسلیم کا تیسرا دیوان - قیمت عہ ر

مرآۃ الغیب - منشی امیر احمد امیر مینائی کا پہلا دیوان قیمت عہ صنمخانۂ عشق - حضرت امیر مینائی کا دوسرا دیوان قیمت ۸ہر

محامد خاتم النبیین - امیر مینائی کا نعتیہ کلام قیمت ۸ر مینائے سخن - امیر مینائی کا مجموعۂ واسوخت قیمت عہ ر

آفتاب داغ - مرزا داغ دہلوی کا پہلا دیوان قیمت عہ ر گلزار داغ - مرزا داغ کا دوسرا دیوان - قیمت ۸ہر

مہتاب داغ (مع ضمیمہ) مرزا داغ کا تیسرا دیوان قیمت ۸ہر یادگار داغ - مرزا داغ کا چوتھا دیوان - قیمت ۸ر

مضمون ہائے دلکش - دیوان سوم میر ضامن علی جلال لکھنوی عہ ر نظم نگاریں - دیوان چہارم جلال لکھنوی قیمت عہ ر

دیوان حالی - سعدی ہند خواجہ الطاف حسین حالی کا دیوان جس سے مقدمہ شعر و شاعری جدا کر دیا گیا ہے - قیمت ۸ہر

مسدس حالی - وہ مشہور و مقبول عام قومی مسدس جسکے صدہا اڈیشن شایع ہو چکے ہیں قیمت باختلاف کاغذ و طباعت ۸ہر ۸ہر عہ ۸ر ۸ر

مجموعۂ نظم حالی - مولانا حالی کی متفرق نظمیں جو طبع دیوان کے بعد ایک مجموعہ کی صورت میں شایع ہوئیں - قیمت ۸ہر

کلیات اکبر - لسان العصر حضرت اکبر الہ آبادی کا حکیمانہ کلام جسنے ظرافت کی چاشنی نے بہت چمکا دیا ہے حصہ اول ۸ہر دوم عہ سوم ۸ہر

دیوان رنگین و انشا - دہلی کی بیگماتی زبان کا نمونہ جسکے آخر میں خود مصنف کی لکھی ہوئی فرہنگ اور انشا کا دیوان ریختی ہے قیمت ۸ہر

دیوان جان صاحب - لکھنؤ کی بیگماتی زبان کا نمونہ - شروع میں آغا حیدر حسن دہلوی کا دیباچہ بھی بیگمات کی زبان میں ہے قیمت ۸ہر

مثنوی بدر منیر - میر حسن دہلوی کی لاجواب مثنوی - قیمت ۸ر مثنوی گلزار نسیم - پنڈت دیا شنکر نسیم کی قابل دید مثنوی ۳ر

مثنوی زہر عشق مشہور و معروف مثنوی - قیمت ۸ر حزن اختر - واجد علی شاہ کی درد انگیز مثنوی قیمت ۸ر

مراثی میر ضمیر - مرزا دبیر کے استاد میر مظفر حسین ضمیر کا کلام جنھوں نے سب سے پہلے موجودہ طرز میں مرثیے لکھے - قیمت ۸ہر

مراثی میر انیس - (رسمی) ۴ جلد ۸ہر طبع اعلی (مرتبہ مولوی سید علی حیدر نظم طباطبائی) جلد اول عہ جلد دوم ۸ر

مراثی مرزا دبیر - (رسمی) ۲ جلد ۸ہر مراثی میر مونس - برادر خورد میر انیس مرحوم (۲ جلد) عہ ر

مراثی میر عشق - ۲ جلد ۸ہر مراثی مرزا دلگیر ۲ جلد عہ ر

ملنے کا پتہ

منیجر الناظر بک ایجنسی - لکھنؤ

مرزا رجب علی بیگ سرور مرحوم
- فسانۂ عجائب عہ
- [illegible]سے سرور
امیر مینائی مرحوم
- امیر اللغات (مکمل)
- صنم خانۂ عشق
- مرآۃ الغیب
- خاتم النبیین ۸ر
- [illegible]ائے سخن عہ
- مکاتیب امیر مینائی
جلال مرحوم
- سرمایۂ زبان اردو
- [illegible]ئے دلکش عہ
- [illegible] ریز عہ
- [illegible] تذکیر و تانیث ۸ر
- [illegible]ۂ تاریخ ۸ر
- قواعد المنتخب
مرزا محمد عباس ہوش مرحوم
- فسانۂ نادر جہاں
- [illegible]ی سیلی ۱۲ر
- [illegible] سحر ۸ر
- [illegible]من ۱۲ر
منشی افضل حسین ثابت
- حیات دبیر
- [illegible]حسینؑ

پنڈت رتن ناتھ سرشار
- فسانۂ آزاد ۴ جلد
- سیر کہسار
- خدائی فوجدار
- جام سرشار
- الف لیلیٰ بطرز ناول
- کامنی
- بچھڑی دلہن
منشی سجاد حسین مرحوم
- احمق الذین ۸ر
- حاجی بغلول ۸ر
- پیاری دنیا ۸ر
- کایا پلٹ ۸ر
- میٹھی چھری ۶ر
- طرحدار لونڈی
- طلسمی فانوس
منشی جوالا پرشاد برق
- مرزانی ۱۲ر
- مار آستین ۱۲ر
- بنگالی دلہن ۱۲ر
- معشوقۂ فرنگ ۱۲ر
- بدتاب ۱۲ر
- رومنی ۱۰ر
پریم چند
- پریم پچیسی
- بازار حسن

مولانا عبدالحلیم شرر
- جنید بغدادی
- خواجہ معین الدین چشتی
- تذکرۂ مشاہیر عالم
- مخدرات
- قیس و لبنیٰ
- مقدس نازنین
- ایام عرب
- فتح اندلس
- ماہ ملک
- حسن کا ڈاکو
- دربار حرامپور ۱۰ر
- الفانسو
- مفتوح فاتح
- فلپانا
- زوال بغداد
- لعبت چین
- عزیزۂ مصر
- جویائے حق
- بابک خرمی
- طاہرہ
- [illegible] ملکہ
- یوسف و نجمہ
- گزشتہ لکھنؤ
- شاعرانہ و خیالانہ مضامین
- آغاز و ختم سال
- سیر رجال
- تاریخی جغرافی مضامین
- مینا بازار [illegible] ناول

حکیم محمد علی خاں مرحوم
- ایام پیاری کامل
- عبرت کامل
- حسن پرور کامل
- اختر حبیبہ
- دیول دیوی
- جعفر و عباسہ
شوق قدوائی مرحوم
- ترانۂ شوق
- قاسم و زہرہ
- نیرنگ جمال
- گنجینہ ۱۲ر
- میکفرن او ولوسی
خواجہ عبدالرؤف عشرت
- زبان دانی ۶ر
- اصلاح زبان اردو ۶ر
- قواعد میر ۶ر
- اصول اردو ۶ر
- جان اردو ۶ر
- شاعری کی پہلی کتاب
- " " دوسری ۸ر
- " " تیسری ۸ر
- لغات اردو
منشی محمد احسن وحشی
- مجموعۂ گلگشت
- جام نو

مولانا حکیم عبدالحی مرحوم
- یاد ایام
- تذکرۂ گل رعنا
حکیم احمد حسین الہ آبادی
- تاریخ ابن خلدون حصہ اول
- " " " دوم
- " " " سوم
- " " " چہارم
- " " " پنجم
- " " " ششم
- " " " ہفتم
- " " " ہشتم
- " " " نہم
- " " " دہم
- " " " یازدہم
- سلطان صلاح الدین
- نور الدین محمود
مولوی محمد حلیم انصاری
- التمدن الاسلام
- فتح اندلس
- ابو مسلم خراسانی
- تاریخ عرب
مولوی حبیب الرحمن خاں شروانی
- سیرۃ الصدیق
- علمائے سلف
- تذکرۃ الشعراء [illegible]

حافظ اسلم جیراجپوری
- سیرۃ الرسول
- خلافت راشدہ
- خلافت بنو امیہ
- خلافت بنو عباس
- عباسیۂ بغداد
- علوم عرب
قاضی محمد سلیمان منصورپوری
- رحمۃ للعالمین
- سفرنامہ حجاز
مولوی خلیل الرحمن
- اخبار الاندلس جلد [illegible]
- تاریخ مولدین
- مختصر تاریخ اسلامی
- عذرا
مولوی محمد انشاء اللہ
- سیرۃ الرسول
- تاریخ آل عثمان
- حالات [illegible]
- حالات قسطنطنیہ
- تاریخ مراکش و مغرب اقصیٰ
منشی سید احمد مارہروی
- آثار اکبری
- حیات خسرو
- امرائے ہنود

[illegible] بدھ - مہاتما بدھ کی مختصر سوانح عمری اور ان کی مذہبی تعلیم نہایت دلکش انداز میں لکھی گئی ہے ۔ قیمت [illegible]

ملنے کا پتہ : الناظر بک ایجنسی - لکھنؤ

مولوی عزیز مرزا مرحوم
- خیالات عزیز
- ہوکرم اروسی

خواجہ عباد اللہ اختر
- صدیق اکبر ۱۲؍
- حضرت زید ۶؍
- مشاہیر اسلام ۱۲؍
- بغداد
- دمشق ۳؍
- دیوان حافظ مع شرح

مفتی انوار الحق ایم اے
- تاریخ ابو البشر
- تذکرۃ الحبیب عہ؍
- حقایق اسلام

مسٹر ولی اللہ بی اے
- بندگی
- کاس الکرام ۳؍
- امان الغیب جلد اول
- " " دوم
- " " سوم
- " " چہارم

سید راس مسعود بی اے
- نصاب اردو
- جاپان کا تعلیمی نظم ۳؍
- انتخاب زرین

مولانا حسرت موہانی
- شرح دیوان غالب عہ؍
- مکمل دیوان حسرت

سجاد حیدر بی اے
- خیالستان
- ثالث بالخیر ۸؍
- زہرا ۱۳؍
- جلال الدین خوارزم شاہ

مسٹر ظفر عمر بی اے
- چوروں کا کلب ۹؍
- نیلی چھتری عہ؍
- بہرام کی گرفتاری عہ؍
- مستقبل اسلام

پروفیسر فیروز الدین مراد
- تحفۂ سائنس ۳؍
- بادل کے نیچے عہ؍
- خونابۂ عشق عہ

حکیم احمد شجاع بی اے
- باپ کا گناہ
- حسن کی قیمت

منشی عبد المجید سالک بی اے
- راہ و رسم منزلہا ۸؍
- چھپا و دیگر افسانے
- چترا (ٹیگور) ۱۲؍

منشی احمد علی بی اے
- تاریخ تمدن
- شباب لکھنؤ

مولوی عبد الماجد بی اے
- فلسفۂ جذبات
- مکالمات برکلے
- پیام امن
- تصوف اسلام عہ؍
- فلسفیانہ مضامین
- زود پشیمان ۸؍

منشی محمد لطیف بی اے
- اکبر
- اورنگ زیب
- رنجیت سنگھ
- لارڈ کلایو

پروفیسر نواب علی ایم اے
- معارج الدین
- تذکرۃ المصطفیٰ
- صحف سماوی ۳؍
- شمع سخن ۱۰؍

پروفیسر الیاس برنی ایم اے
- جذبات فطرت
- معارف ملت
- مناظر قدرت
- علم المعیشت

مولوی سید سلیمان ندوی
- ارض القرآن
- سیرۃ عائشہؓ
- حیات امام مالک عہ؍
- خلافت عثمانیہ اور اسلام عہ؍
- خلافت اور ہندوستان

مولوی عبد السلام ندوی
- اسوۂ صحابہؓ ۲ جلد
- سیرۃ عمر بن عبد العزیزؒ
- انقلاب الامم
- تاریخ الحرمین الشریفین
- فقرائے اسلام
- فطرت نسوانی
- شعر الہند ۲ جلد

مولوی عبد الباری ندوی
- مبادی علم انسانی
- برکلے کا فلسفہ

مولوی سعید انصاری
- سیر الصحابہ جلد اول
- سیر انصار ۲ جلد
- سیر الصحابیات

مولوی عبد الرزاق ندوی
- اسوۂ حسنہ
- کتاب الوسیلہ
- ٹرکی اور یورپ ۶؍

خواجہ حسن نظامی
- قرآن آسان قاعدہ عہ؍
- میلاد نامہ عہ؍
- محرم نامہ عہ؍
- فاطمی دعوت اسلام
- ذکر غوث پاک ۱۲؍
- کرشن جیون
- شامی جہاد
- سیپارۂ دل
- کم تو موت
- چکیاں اور گدگدیاں
- اتالیق خطوط نویسی ۱۲؍
- خطوط حسن نظامی ۱۲؍
- بیوی کی تعلیم
- بیوی کی تربیت عہ؍
- اولاد کی شادی عہ؍
- جگ بیتی کہانیاں
- آپ بیتی
- بچوں کی کہانیاں ۱۲؍
- سیر دہلی ۱۲؍
- سفر نامہ ممالک اسلامیہ
- غدر دہلی کے افسانے
- یزید نامہ
- طمانچہ بر رخسار یزید عہ؍
- اردو دعائیں ۸؍
- تسکین احساس ۸؍
- روزنامچہ ہند ۱۲؍
- اسلام کا انجام ۶؍
- تسخیر مہر و قہر ۱۰؍

مولوی عبد الرشید الخیری
- الزہرا ۱۲؍
- صبح زندگی
- شام زندگی عہ؍
- شب زندگی
- نوحۂ زندگی ۱۲؍
- دُرِّ شہوار ۱۰؍
- منازل السائرہ
- سراب مغرب ۸؍
- بنت الوقت ۸؍
- قطرات اشک
- جوہر قدامت
- عروس کربلا
- یاسمین شام
- تیغ کمال
- ماہ عجم
- آفتاب دمشق
- سمرنا کا چاند

نیاز فتحپوری
- گیتان جلی
- گہوارۂ تمدن
- نگارستان
- صحابیات
- تاریخ الدولتین

یاس عظیم آبادی
- چراغ سخن
- نشتر یاس ۸؍

تاریخ اندور ــ یعنی مرہٹوں کے استقلال مسلمانوں کی شجاعت اور انگریزوں کی حکمت کا آئینہ از دہ خانی خان قیمت ۱۲؍

ملنے کا پتہ:- الناظر بک ایجنسی ــ لکھنؤ

جسٹرڈ نمبر　　　　ہوالمستعان　　　　ل ۸۰۶

الناظر

ایڈیٹر۔ ظفرالملک علوی

الناظر پریس لکھنؤ میں باہتمام اسحاق علی علوی چھپا

قیمت سالانہ
للعہ

قیمت فی پرچہ
۸ر

بسم اللہ الرحمن الرحیم

اردو کی بہترین کتابیں

محصول معاف

عہ کی روانگی پر آدھا اور للعہ کی روانگی پر پورا

ہدیۂ کتب لیجیے

۵ روپے کی روانگی پر ایک روپیہ اور ۱۰ روپے کی روانگی پر ۵ کی کتابیں

۱۴؍ — ۱؍

مرزا غالب مرحوم
- اردوئے معلیٰ
- عود ہندی
- دیوان غالب جیبی
- منتخب دیوان غالب

سرسید مرحوم
- خطبات احمدیہ
- مکمل مجموعہ لکچر
- اسباب بغاوت ہند
- سیرت فریدیہ ۱۰؍
- خطوط سرسید

نواب محسن الملک مرحوم
- مضامین تہذیب الاخلاق
- مکمل مجموعہ لکچر
- تقلید اور عمل بالحدیث ۲؍
- کتاب المحبت والشوق ۲؍
- مکاتیب
- مسلمانوں کی تہذیب

خلیفہ محمد حسین مرحوم
- اعجاز التنزیل
- سفرنامہ ہریرہ ۲ جلد

مولانا آزاد مرحوم
- آب حیات
- دربار اکبری
- سخندان فارس
- نگارستان فارس
- نیرنگ خیال
- سیر ایران
- ڈرامہ اکبر
- مجموعہ مکتوبات آزاد
- مجموعہ نظم آزاد ۱۲؍
- نصیحت کا کرن پھول ۲؍
- جانورستان ۱۰؍
- بیاض آزاد
- تذکرہ علماء ۵؍
- لغت آزاد
- دیوان ذوق ترتیب آزاد

پروفیسر شہباز مرحوم
- زندگانی بے نظیر
- خیالات شہباز

مولوی سید ممتاز علی
- تذکرۃ الانبیاء
- تنقیح حسن

مولانا نذیر احمد مرحوم
- حمائل شریف مترجم
- الحقوق والفرائض
- بنات النعش ۹؍
- مرأۃ العروس ۱۰؍
- توبۃ النصوح ۱۲؍
- موعظۂ حسنہ
- رویائے صادقہ
- ایامیٰ
- فسانۂ مبتلا
- ابن الوقت
- مصائب غدر ۱۰؍
- مجموعہ نظم بے نظیر
- مکمل مجموعہ لکچر
- منتخب الحکایات ۶؍
- چند پند ۶؍
- مبادی الحکمت

مولانا اشہری مرحوم
- حیات انیس
- ایشیائی شاعری
- نورجہان بیگم ۸؍
- ٹیپو سلطان
- حیدر علی سلطان

مولانا حالی مرحوم
- یادگار غالب
- حیات سعدی
- مقدمہ شعر و شاعری
- حیات جاوید
- دیوان حالی
- مسدس حالی ۸؍
- مجموعۂ نظم حالی
- بیوہ کی مناجات ۲؍
- شکوۂ ہند ۲؍

مولوی بشیر الدین احمد
- واقعات دار الحکومت دہلی
- تاریخ بیجاپور
- حرز اطفال
- نشاط عمر
- عصائے پیری
- لخت جگر
- حسن معاشرت
- اصلاح معیشت
- اقبال دلہن
- شمع ہدایت
- انشائے بشیر
- دیوان بشیر

مولانا شبلی مرحوم
- سیرۃ النبی جلد اول
- سیرۃ النبی جلد دوم
- ؍؍ سوم
- الفاروق
- سیرۃ النعمان
- الغزالی
- المامون
- سوانح مولانا روم
- سفرنامہ مصر و روم و شام
- علم الکلام
- الکلام
- رسائل شبلی
- مقالات شبلی
- شعر العجم جلد اول
- ؍؍ ؍؍ دوم
- ؍؍ ؍؍ سوم
- ؍؍ ؍؍ چہارم
- ؍؍ ؍؍ پنجم
- موازنۂ انیس و دبیر
- مضامین عالمگیر
- آغاز اسلام ۸؍
- مجموعۂ کلام شبلی اردو ۱۰؍
- کلیات شبلی فارسی

مولانا ذکاء اللہ
- تاریخ ہندوستان ۱۰ جلد
- تاریخ عہد سلطنت انگلشیہ
- کرزن نامہ
- آئین قیصری
- صحیفۂ فطرت
- تعلیم الانتظام
- محاربات عظیم ۸؍
- جغرافیۂ ریاضیہ ۲؍
- جغرافیۂ طبعی ۸؍
- اہل عرب کا جبر و مقابلہ ۶؍
- رسالہ علم تناسب ۶؍
- معاون الحساب ۱۲؍
- مساحت ناظرین ۱۲؍

سید محمود مرحوم
- کتاب الطلاق
- کتاب الشفعہ
- لکچر ۱۲؍
- شرح قانون شہادت

مولوی خورشید احمد انصاری
- المدینۃ و الاسلام
- تعلیم المرأۃ

ملنے کا پتہ: الناظر بک ایجنسی، لکھنؤ

بسم اللہ

فہرست مضامین بابت ماہ دسمبر سنہ ۱۹۲۶ء

نمبر ۶ — جلد ۳۱

ضمیمہ

ناظرین الناظر سے التماس

الناظر بابت جولائی لغایت دسمبر سنہ ۱۹۱۶ء کی دفتر کو سخت ضرورت ہے۔ ایک کتاب کی اشاعت تقریباً چھ ماہ سے اس جلد کے نہ ہونے کی وجہ سے رکی ہوئی ہے۔ اگر متفرق پرچے مل سکیں تو اور پوری جلد یکجائی مل جائے تو ہر صورت میں دفتر کو درکار ہیں۔ قیمتاً علیحدہ نہ کرنا چاہیں تو کوئی صاحب مستعار دیدیں۔ مصارف ڈاک دفتر سے ادا کر دیے جائیں گے، اور اپنا کام نکال کر جلد واپس کر دی جائے گی۔ مجھے امید ہے کہ احباب فوراً توجہ فرما کر ممنون بنائیں گے۔

ظفر الملک

نئی کتابیں

مضامین شرر

مولانا شرر مرحوم کے مشہور رسالہ دلگداز کے تمام مضامین اپنی نوعیت کے لحاظ سے علیحدہ علیحدہ مجلدات میں جمع کر دیے گئے ہیں اور صفائی کے ساتھ چھاپے گئے ہیں حسب ذیل مجلدات موجود ہیں :-

مضامین شاعرانہ و عاشقانہ - جلد اول ۱۲ر دوم ۱۲ر

آغاز و اختتام سال ۱۲ر

تاریخی وجغرافی مضامین - جلد اول ۱۲ر دوم ۱۲ر

مشرقی تمدن کا آخری نمونہ - یعنی گذشتہ لکھنؤ ۱۲ر

سیر رجال - مشہور اکابر کے حالات ۱۲ر

نامور خواتین کی سوانحعمریاں جلد اول عہ جلد دوم عہ

ادب و تحقیق مسائل ۱۲ر

اصلاح قوم وملت عہ

تاریخی واقعات پر خیال آرائی ۱۲ر

نظم و ڈراما عہ

معتزلہ

معتزلہ اور انکے عروج و زوال کے متعلق مولانا عبدالحلیم شرر مرحوم نے مسلم اکیڈمی لکھنؤ میں ایک محققانہ لکچر دیا تھا۔ اب اسے دلگداز پریس نے عوام کی واقفیت کے لیے شایع کر دیا ہے۔ لکچر کے اخیر حصہ میں ہندوستانی مسلمانوں کے اعتزال سے نہایت مفید بحث کی ہے اور کارآمد مشورے دیے ہیں۔ قیمت ۱۲ر

تصانیف خواجہ عشرت

ہمجولی - عورتوں میں شریفانہ خیالات اور اصول ترتیب و خانہ داری کی اشاعت کے لیے خواجہ محمد عبدالرؤف عشرت لکھنوی نے عورتوں کی زبان میں بہت سے اصلاحی افسانوں کا مجموعہ ہجولی کے نام سے شایع کیا ہے۔ ہجولی کے قصے اتنے دلچسپ ہیں کہ کتاب کو دوبارہ شایع کرنا پڑا۔ اور مصنف کو اس کتاب کا دوسرا حصہ لکھنے کی ضرورت پڑی۔ قیمت حصہ اول ۱۲ر دوم ۱۲ر

مضمون نویسی - اُردو کی زباندانی اور علم بیان کے قواعد پر محقق زبان اُردو خواجہ محمد عبدالرؤف عشرت لکھنوی نے یہ نادر کتاب تصنیف فرمائی ہے۔ اسکا مطالعہ صحیح انشا پردازی اور با محاورہ زبان لکھنے کے لیے بہت مفید ہے۔ قیمت ۸ر

چوتھی کتاب - معتمد الشعرا خواجہ محمد عبدالرؤف عشرت لکھنوی نے شاعری کے قواعد کی کئی مفید کتابیں لکھی ہیں جن سے بغیر اُستاد کے عروض و قافیہ کے اصول سمجھ میں آ جاتے ہیں اور مبتدیوں کو صحیح تقطیع میں آسانی ہوتی ہے۔ یہ کتاب اسی سلسلہ کی چوتھی کڑی ہے۔ جس میں شعر کے عیب و حسن۔ لفظی اور معنوی صنعتوں کا بیان ہے۔ یہ مفید سلسلہ ملک میں بہت مقبول ہو رہا ہے۔ قیمت ۸ر

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الناظر

نمبر ۶ جلد ۳۱ — دسمبر سنہ ۱۹۲۶ء

پانچ ناول نگار

"ذرا انسان پر غور کیجیے کہ اُس نے سیکڑوں جیتی جاگتی ہستیاں یا کیرکٹر پیدا کیے ہیں۔ ان میں سے ہر ایک، ایک دوسرے سے اصلاً یا کلیۃً جداگانہ ہے۔ اور پھر یہ سب بالکل اصلی، سچ مچ زندہ اور بیحد دلکش اور کبھی کسی صورت میں کوئی بات ان میں خلاف فطرت نظر نہیں آتی اور معمولی ادب میں اس قسم کا ایک کیرکٹر بھی پیدا کرنے کے یہ معنی ہیں، کہ آرٹسٹ ادب کی چیز پیدا کردی۔ ایسی شہرت حاصل کرلی جو صدہا سال باقی رہیگی۔ ایسا کارنامہ پیش کیا جو قدرت الٰہی کے لگ بھگ ہے۔ یہ وہ کام ہے جو ایک دیوتا کے کام کی طرح جان کا ڈالنا ہے۔"

Lafcadio Hearn, Interpretations of Literature volume II.

"میں اس بات کا دعویدار نہیں ہوں کہ کسی بڑے مصنف میں بحیثیت مصنف کے کوئی بڑی خیال کی گہرائی یا نظر کی پہنائی یا فلسفہ یا دانشمندی یا فطرتِ انسانی کا علم یا انسانی زندگی کا تجربہ ہونا چاہیے۔ حالانکہ یہ ایسے اضافی عطیے ہیں جو اگر کسی بڑے مصنف میں ہوں تو وہ اُسکو اور بھی بڑا بنا دیں گے۔ لیکن میں جس چیز کو بڑے مصنف کا امتیازی عطیہ سمجھتا ہوں، وہ وسیع معنوں میں اظہارِ خیال

کی قوت ہے۔ وہ قادر الکلام ہوتا ہے۔ یعنی کلام کے دونوں پہلو، خیال اور لفظ کا اُستاد ہوتا ہے۔ یہ دونوں پہلو اگرچہ بالکل جداگانہ ہیں، لیکن ایک دوسرے سے جدا نہیں کیے جا سکتے .... اُسکو ہر صحیح خیال کے لیے صحیح لفظ ہمیشہ مل جاتا ہے۔ اور اُسکی تحریر میں ایک لفظ بھی ضرورت سے زیادہ نہیں ہوتا۔ اگر وہ اختصار پر آتا ہے، تو اس سے کہ چند لفظ کافی ہیں۔ اگر لفظوں کی گنگا بہاتا ہے تو بھی ہر لفظ اپنے موقع سے ہوتا ہے۔ اور اُسکی فصاحت کے زبردست بہاؤ میں اُردو بہا ہے، رُکاوٹ پیدا نہیں کرتا۔ وہ وہی باتیں کہتا ہے جو سبھوں کے دلوں میں ہوتی ہیں لیکن سب ادا نہیں کر سکتے۔ اور اُسکے جملے لوگوں میں کہاوت بنجاتے ہیں اور اُسکے فقرے روزمرہ یعنی گھریلو بول چال اور محاورے بنجاتے ہیں۔"

Newman: Lectures & Essays on University Subjects: Lecture on Literature.

کہانی اور انسان

کہانی کہنے یا سُننے کی چاٹ خواہ کسی طرح بھی اولادِ آدم کو لگی ہو، واقعہ یہ ہے کہ ہے مزے کی چیز! اس چاٹ کی اگر منطقی موشگافی کے ساتھ ساتھ گہری جانچ پڑتال ہو، تو ممکن ہے یہیں بہت سی باتیں کھُل جائیں، لیکن ایک تو مضمون "زلفِ یار" کا سا طول کھینچتا جائے گا، جس میں بقول ہمارے شعرا، ایک مرتبہ اُلجھ کر نکلنا آسان نہیں، دوسرے یہاں پر مضمون کا اس پہلو سے پھیلایا جانا بھی بے جوڑ سی بات سمجھی گئی۔ یوں اگر سائنٹی فِک چھان بین نہ بھی ہو، تو میں نہیں سمجھتا اسکے یہ معنی ہو سکیں گے کہ کہانی کہنے یا سننے کی زبردست اور آفاقی (*Universal*) چاٹ سرے سے اتنی لچر ہو جائے کہ وہ ہمارے بھاویں ہی نہ ہو۔ یہ روزمرہ ظہور میں آنیوالی سدابہار ذہنی لپک قدیم الایام سے ہمارا ساتھ دے رہی ہے۔ تاریخ عالم کے ابتدائی سے ابتدائی صفحے بھی اس ذکر خیر سے خالی نہیں، پھر اس پاسداری کے تو یہ معنی ہیں کہ آپ بھی اور کچھ نہیں تو شرما شرمی ہی رواداری برتیں، یعنی یہ ضرور نہیں کہ ایک اتنی پرانی رفیق زندگی ! کو نفسیاتی نقطۂ نظر سے ہی پرکھیں تو آپ متوجہ ہوں ورنہ ایکدم سے مُنہ موڑ لیں، اُس کا پاس رفاقت تو دیکھیے کہ روزِ اول سے جو آپ کے دامنگیر ہے تو ہٹائے نہیں ہٹتی !

غرض فطرت انسانی کی یہ پرانی اور آفاقی چاٹ جو سایہ کی طرح لگی لپٹی چلی آتی ہے کبھی بھی بھلائے نہیں بھولی اور نہ بظاہر بھلائی جا سکتی ہے۔ بلکہ غور کیجیے تو زندگی کے ہر دور میں اس سے چولی دامن کا ساتھ ہے۔ حتیٰ کہ بچپنے کی معصوم گھڑیاں بھی خالی نہیں۔ جوں جوں انسان کا مذاق بدلتا جاتا ہے یہ بھی بھانت بھانت کے روپ بدلتی رہتی ہے۔ کون ایسا ہے جس نے بچپنے میں "چڑیا چڑے" کی سی تحفہ کہانی نہیں سنی؟ اس کہانی کا خصوصاً وہ چٹخارے دار مکالمہ ——

"چڑا (گھی لیکر آتا ہے) چڑیا! چڑیا! کنڈی کھول؟"

"چڑیا (کھچڑی کھا کر آنکھوں میں تیل ڈال لیتی ہے) دو موئے میری آنکھیں دکھتی ہیں——"

عجب چٹپٹی چیز ہے! ایک زمانہ ہوتا ہے کہ یہ "کھچڑی" نہیں! اس کا مزیدار ذکر ہی خوش ذائقہ بریانی سے کہیں زیادہ اچھا معلوم دیتا ہے۔ واقعی اس کہانی کے قابلِ رشک طولِ زندگی کا اس سے بڑھ کر اور کیا پکا ثبوت ہو سکتا ہے کہ گو عمر کے ساتھ ساتھ مذاق بدلتا جاتا ہے اور یہ سہانی کہانی حالانکہ بچکانی خوش فعلی نظر آنے لگتی ہے لیکن پھر بھی کچھ اتنی مجبوری سی ہو گئی ہے کہ خیال سے دور نہیں ہوتی۔ شاید ہی کوئی ایسا ہو تو ہو کہ یہ کہانی سنے اور اسکے چسکے سے اتر جائے۔ ورنہ پتھر کی لکیر کی طرح جب دیکھو ہمہ شما سب کی یاد میں موجود!

کہانی کے درجے

خیر، تو ذکر تو یہ تھا کہ کہانی والی چاٹ بجید پرانی اور بید ایشی ہے اور انسان جوں جوں ارتقائی کینچلیاں بدلتا رہا، یہ بھی بیسیوں روپ بدلتی رہی۔ اردو بولنے والی دنیا میں آج اسکی یوں رونمائی ہوتی ہے کہ بچپنے کے معصوم زمانہ میں "چڑے چڑیا" جیسی کہانیوں پر جی لوٹ لوٹ جاتا ہے: ذرا بڑھے۔ اور ذوقِ سخن بدلا تو "انوارِ سہیلی" "باغ و بہار" اور فسانۂ آزاد" کی سی کہانیاں سن کر باچھیں کھلنے لگیں، جوانی دیوانی آتی ہے: تو ایک دم سے دنیا سے ذوق ہی بدل دیتی ہے: یعنی طلسمِ شباب کی ہوش ربائیاں "ایک صنم آبا و الفت و پرستش" نظروں کے سامنے لے آتی ہیں، ہر مندر جبین نیاز کا طالب اور ہر موہنی تن من دھن چھین لینے پر آمادہ نظر آتی ہے۔ غرض چپہ چپہ سے ؎

"شہر یست پُر ز خوباں و ز ہر طرف نگارے

یاراں صلائے عام ست گر می کنید کارے"

کی گونج کانوں میں سما جاتی ہے۔ اسوقت انسان ایک ایسے عالم میں سے گویا گذرتا ہے جس میں بیخبری و حیرانی منت منت کو اپنا افسوں پھونکتی ہے۔ سرمستی جنونِ شباب کا ہاتھ پکڑ پکڑ کے ہوس

اور ولولوں کی بھری گلابیاں خالی کراتی جاتی ہے۔ مزاج کی جب یہ کیفیت ہو جائے تو جس قسم کی کہانیاں جی لبھا سکیں گی معلوم! اس لیے اگر میں غلطی نہیں کرتا اور آپ بھی بُرا نہ مانیں تو ایک بات کہوں یعنی یہی کہ حضرات شرر اور حکیم محمد علیخاں کی قریب ساری موہنی کہانیاں، ان کی اور خصوصیتیں جنھیں آگے دکھاؤں گا چھوڑ کر میری جانم میں تو یاروں کے لیے "صلائے عام" کا حکم رکھتی اور "کام" کو گرا دیتی ہیں!

لیکن یاد رہے "زندگی ایک مسلسل ارتقا ہے"۔ "جسمانی، ذہنی اور روحانی"۔ عہد شباب کی صبح جس طرح بڑھتے بڑھتے دوپہر ہوتی ہے: ڈھل بھی جاتی ہے، اور یہی بڑھاپا ہے۔ "جسکے آنے پر کوتاہ خیال اور محض مسرت پرست اوسان باختہ ہو جاتے ہیں"۔ لیکن سوچیں تو پتہ چلے کہ بڑھاپا انسانی زندگی کا بہترین زمانہ ہے، اس لیے کہ اس ارضی زندگی میں انسانی ارتقا کا یہ وہ آخری پھل ہے "جسے سوچ سمجھکر چکھا جائے تو ایک دوسری ہی زندگی کا مزہ آنے لگتا ہے۔ اچھا، یہ عالمگیر کیف کالے کوسوں دُور بھی جس خوبصورتی سے محسوس ہوا، سننے کے قابل ہے۔ سات سمندر پار سے ایک بزرگ کی آواز ان الفاظ میں ہم تک پہونچی ہے۔ سنیے گا"

ماضی کا زمانہ خواہ وہ بزم عیش ہو یا بزم غم تجربہ کا زمانہ تھا، جس سے میں تجربہ کار بنا، اور اب نفع و نقصان کی تمیز کر سکوں گا۔ جوانی کی خواہشات اور جذبات کی بھڑکتی ہوئی آگ نے اب تک آنکھیں خیرہ کر رکھی تھیں، وہ جل کر بھسم ہو گئی۔ جو کچھ اب باقی رہگیا ہے راکھ نہیں! کردار کا خالص سونا ہے"

تو خلاصہ یہ کہ زندگی کے اس اسٹیج میں بچپنے کا بھولا پن ہی چمپت نہیں ہو جاتا، جوانی والے جذبات اور ولولوں کا پردہ بھی آنکھوں پر سے اُٹھ جاتا ہے۔ نہ چڑیا چڑے ہی سی کہانیوں میں اب دل لگتا ہے اور نہ پُرجوش نازنین کی سی چلبلی، چنچل اور جذباتی (Sentimental) داستانوں ہی میں مزہ آتا ہے، بلکہ یہ جی چاہنے لگتا ہے کہ یہاں جو کچھ ہو سوچ میں ڈوبا، جچا تُلا، ٹھیک ٹھیک ہو۔ اور ساتھ ہی ماضی کا تجربہ ہمارے ہر فعل کو جہاں تک ہو سکے کُندن سا چمکاتا جائے؛ غرض طبیعت اپنے آپ اصلیت کی پرچول پر پل پڑتی ہے۔ عقل کی پختگی اور وسعتِ نظر کے لحاظ سے یہاں دوسری ہی قسم کی کہانیاں جی کو بھانے لگتی ہیں۔ لیکن ہر کلیہ کے چند مستثنیات بھی ہوتے ہیں، اس لحاظ سے یہ کہنا ناموزوں نہیں ہو سکتا کہ جس طرح عالم جوانی میں چند پتہ مار سوچنے والے ایسے نکل آتے ہیں جو شباب کے نقارخانے تک میں بھی سوچ میں ڈوبی اور تجربہ بھری کہانیاں سنتے اور خوش ہوتے،

یا اپنی طبع خداداد کے بل پر ایسی کہانیاں کہہ کر دوسروں کو خوش کرتے ہیں - اسی طرح پڑھے یا بھی
کم سواد بوڑھے بچوں اور بچکانہ منشوں سے خالی نہیں - مگر یہ میں اوپر کہہ آیا ہوں کہ ایسے لوگ
مستثنیات میں سے ہوتے ہیں - مجھے یہاں عام اصول ابھار کر دکھانا مقصود تھا، عقل مندوں
یا بیوقوفوں کی مردم شماری سے سروست کام ہی نہیں !

اچھا، خود یہ اوپر والی مستثنیات بھی اصولی رنگ میں ڈوبی ہوئی ہیں - یعنی جوں جوں علم یا جہالت کی روشنی یا تاریکی سماج کو گھیر لیتی ہے، یہی اٹل اصول بنتی جاتی ہیں - کوئی ایسا سماج لیکر دیکھ لیجیے جس پر پورا پورا علمی رنگ رچ گیا ہو، آپ دیکھیں گے کہ اس میں سلامت مذاق اور راست رائے کے لحاظ سے بیسیوں جوان بوڑھے ہیں - گویا انکے شباب کا سارا ابال آپ کو سلامتِ ذوق کے نازک نازک شیشوں میں جھلکتا اور چھلکتا دکھائی دیگا - برخلاف اسکے تصویر کا رخ "تیرگوں" آپ دیکھنا چاہیں گے تو ایک آدھ سماج ایسا بھی آپ کو ضرور مل جائے گا جو جہالت کی بسلی نکبت میں پڑا، ہاتھ پاؤں ٹکریاں مار رہا ہو، اور جو میرے خیال میں سماج کی سب سے بڑی بدبختی ہے -

حضرت سیدؒ اور اردو

اگر آپ اس اوپر والے استدلال کو مثال کے ذریعہ سے ذہن نشین فرماتے چلیں تو میرا خیال ہے زیادہ مناسب ہو - مثال کی تلاش میں بھی بظاہر زیادہ کاوش کی ضرورت نہیں - کیوں ؟ کہ خیر سے ہندوستان موجود ہی ہے ! یہ اگر زندگی کا روشن رخ نہیں دکھا سکتا تو کیا تاریک رخ سے بھی گیا گذرا ہوا ؟ اچھا، اب ہم ہندوستان کو تمثیلاً لیے لیتے ہیں - یہاں دل تو یہ شہنشاہیت کے اورنگِ جلالت پر متمکن نظر آتا ہے، جہاں غریب غریب ہر قسم کی چہل پہل ہے - مگر ساتھ ہی بربادی و تباہی کی مہالک دیکھی ہیں اور نکتہ چلا تماب کو جاتی دکھائی دیتی ہے - اور بالآخر حوادث کے ایک زوردار تھپیڑے سے تو یہ نیچے ہی آرہتا ہے - چونکہ زیادہ اونچائی سے گرا تھا، اس لیے "اسفل السافلین" کی تاریکی میں جا کر رکا - اس پر ستم ظریفی یہ ہوئی کہ بیگانہ قوتوں کے دباؤ نے اس کا رہا سہا بھی زور توڑ ڈالا - بالخصوص زبانِ اردو، جسکو پیدا ہوئے جمعہ جمعہ آٹھ روز سے زیادہ نہیں ہوئے تھے اور جس کا ابھی ادبی تتلانا بھی نہیں گیا تھا، کہ اس مصیبت میں مبتلا ہوگئی - مختصر یہ کہ واقعۂ غدر کی الٹ پلٹ میں کیا خود اردو اور کیا اردو بولنے والے دونوں کا کچومر نکل گیا - وہ تو خدا بھلا کرے ایک خوش اوصاف مردِ میدان اور سچے شیدائے وطن سیدؒ کا، جس نے اس ابتلائے عظیم سے خاص طور پر متاثر ہوکر ایکطرف تو ہمیں سہارا سہار کر قعرِ ہلاکت سے ابھارا، دوسرے علی گڈھ کی مبارک سرزمین میں ایک مادرِ علمی کو لا کھڑا کیا - جس نے اپنی گود

میں تھپک تھپک کر ادبی گھگی کو بھی دُور کیا اور ادھر ادب اُردو نے بھی چونچال ہو کر ہاتھ پیر مارنے شروع کیے۔ یہاں تک کہ سماجی چہرہ پر اُردو کے آثار صحت کا نور جھلکنے لگا۔ یہ پانچ ناول نگار جنکا اس مضمون میں تعارف کرانا مقصود ہے۔ اور انکے علاوہ بھی کئی اور مصنفین جنکا نام گِنوانا یہاں ایک بیموقع بات ہے "سیدی دَور" کے ہی پیداوار ہیں۔ پیداوار سے میرا مطلب اُس سوئی ہوئی چیٹک کا جاگ جانا ہے جس سے عام کلچر اور اس لیے زبان منجھی جائے۔

ناول غرض یادس یخیرا علی گڑھ کے آغوش محبت میں جب ادب اُردو اس طرح پل کر بڑی ہوئی اور اُس نے نئی نئی ادائیں دکھانی شروع کیں، تو بڑے بڑوں کی رال ٹپکنے لگی۔ ہر ایسا شخص جو بے ادبی معاف! ادبی خواجہ سرا نہ تھا!! اس سے ہم کنار ہونے کی آرزو کرنے لگا، اور ہندوستان میں جابجا اِسے ہاتھوں ہاتھ لیا گیا۔ سُنا گیا ہے غدر کے بعد سب سے پہلے اِن نازنیں کا تعلق مقدس سرسیدؒ سے ہوا، جنکے فیض تصرف سے یہ اپنی بڑی بوڑھیوں یعنی علمی زبانوں سے آنکھ ملانے لگی۔ اس قدر افزائی سے ایک تو بڑا فائدہ یہ ہوا کہ اسکے ادبی ناز و انداز انجان طور پر دن دُونے رات چوگنے ہوتے گئے۔ دوسرے، تھی بھی یہ بلا کی چرتر، چاہت کی جو بھر مار دیکھی، تو جو اور جہاں دلکش ادا ہاتھ لگی، اس نے جان بوجھ کر اُڑا لی۔ چاہنے والوں کی نت نئی فرمائشیں اسپر مستزاد تھیں، اس لیے کہ وہ زبان عربی، فارسی، انگریزی اور فرانسیسی کی نازک خیال نازنینوں کے جھرمٹ میں سے جب ہوتے ہُواتے آتے تو اُنھیں ساری کی ساری اداؤں کو اُردو میں ڈھونڈتے۔ اَوروں سے تو یہاں بحث نہیں، پنڈت جی سرشار، حکیم محمد علیخاں، شمس العلماء نذیر احمد، مرزا رسوا، اور شرر جیسے خوش صفات حضرات پھسل پڑے۔ سُنا ہے، ان سب کو کہانی کہنے والی ادا نے بڑی حد تک لُبھا لیا تھا۔ اور یہی وجہ ہے کہ یہ ناول (ادبی کہانی) کی طرف مائل ہو گئے۔

ادب اُردو میں "ناول" انگریزی زبان سے لیا گیا ہے۔ خود انگریزی میں یہ لفظ "نوویلس" سے مشتق ہے: جو لاطینی زبان کے لفظ "نُووَس" کا مخفف ہے۔ نووس کے معنی "نئے" کے ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ یہ لفظ بھی اطالوی زبان کے لفظ "نُووِی لا" سے لیا گیا ہے: ادب انگریزی میں انسانی افعال و کردار کے مطالعہ کا نام ناول رکھا گیا ہے۔ ناول چونکہ گذشتہ یا روزمرہ واقعات پر مبنی ہوتا ہے، اس لیے اسکو "آئینۂ زندگی" کہا جا سکتا ہے۔ اسکے کیریکٹرز اور پلاٹ اگرچہ بیشتر فرضی ہوتے ہیں مگر اصل میں یہ ہمارے کے سارے انسان کے منتخب فطرتی باتوں کے حامل ہوا کرتے ہیں۔ یعنی انسان جو کچھ دیتا، کرتا دھرتا، اور دیکھتا بھالتا ہے، انھیں واقعات میں سے سچی سچی

باتوں کی ایک خاص حیثیت سے نمایندگی، ناول کے مفہوم میں داخل ہے۔
یا یوں سمجھیے کہ ناول ایک ترقی یافتہ کہانی ہے، جو سماجی تعلقات پر مبنی ہے۔
اور نثر میں کہی گئی ہو۔ اور جو اگرچہ تاریخی نقطۂ نظر سے لفظ بلفظ تو صحیح نہیں ہوتی، تاہم اتنی لگ بھگ ضرور ہوتی ہے کہ ذرا سے ردوبدل سے وہ تاریخ بن سکتی ہے۔ فی زمانہ ناول ادب لطیف کے ڈھالنے کا نیا سانچا بن گیا ہے، لیکن اس سانچے کو ایسا شخص ہی خوبصورت بنا سکتا ہے اور اس میں ادب لطیف کو ڈھال سکتا ہے جو خود پوری طرح بھلمنساہیت میں بس گیا ہو، تاکہ وہ سماجی رسم و رواج کی نت نئی تصویریں اُتار اُتار کر اُنھیں متامانہ اور ناقدانہ دیکھ سکے، اور تجربہ کے مختلف رنگوں میں ادب لطیف کا شوخ پن شامل کر کر کے تصویروں کا حسن دوبالا کرتا جائے: یوں ناول ہو، تعلیم، سیاسی اور مذہبی تلقین، اور اصطلاحی معلومات کا بھی ذخیرہ بن چکا ہے: لیکن یہ ساری اضافی باتیں ہیں، اسکا سیدھا سادھا اور بالراست کام یہ ہے کہ سماجی زندگی کے مختلف سینوں کو یہ نفس کی پلیٹیں پر اس طرح اُتارے کہ ایک تو نیچر کے شوخ رنگوں کی قدرتی رنگا رنگی ہاتھ سے نہ جانے پائے، دوسرے یہ سارے کے سارے سین نہیں! دُرِ شہسوار ہنرمندانہ زورِ قلم کے ساتھ حسن بیان کی ایک ہی نازک لڑی میں پرو دیے جائیں!

قولِ مذکور آج مغربی دنیائے ادب کا مکمل اور محبوب تصور ہے، جسے "ناول" کا نام دیا گیا، اس میں مخیلہ اور باتوں کے ناول کے صحیح تصور کے لیے جن اساسی اور اہم اجزاء کا پتہ چلا، وہ یہ ہیں:- پلاٹ، کیرکٹر، قوتِ اظہار۔

پلاٹ

پلاٹ کو ناول کی داغ بیل کے نام سے تعبیر کیا جائے، تو میرا خیال ہے اسکی صحیح صحیح ترجمانی ہو جائے گی۔ واقع میں یہی مختلف راہوں کا وہ باکیف مجموعہ ہوتا ہے جن پر ایک ناول نگار کی پیدا کی ہوئی ہستیوں (کیرکٹرز) کو چلنا پھرنا ہے، اسکی سمجھداری اور کامیابی کی یہ نشانی ہے کہ وہ ان راہوں کو اپنے کیرکٹر کے لحاظ سے مناسب و موزوں بناتا جائے۔ اور ساتھ ساتھ جب ان سب کو ایک جا اکٹھا کرے تو پوری سلیقہ مندی سے بھی کام لے، تاکہ یہی مجموعہ باعتبار لطافت "ایک ایسا خوبصورت گلدستہ بن جائے، جس کی ساخت میں نہایت خوشرنگ و نازک نازک پھول پتیاں صرف ہوئی ہوں" ایسے پھول پتیاں جن کی نزاکت و خوشرنگی بجائے خود بھی دل لبھا ہو، مگر بحیثیت مجموعی تو ایک پُرشباب دلدار کی طرح بے قابو بنا دے!

کیرکٹر کیرکٹر کے معنی "تخیلی پیکر" پیدا کرنے کے ہیں، انکی پیدائش کا ذکر امام ڈرامہ یعنی شیکسپیر نے کیا ہے، میں اسے محترمی جناب مولوی محمد عظمت اللہ خاں صاحب بی اے کی زبانی آپ کو سنانا چاہتا ہوں، ذرا سنئیے گا کیا چیز ہے!

"کوی کی نفیس آنکھ وارفتہ سی گھومتی
نظر ڈالتی ہے زمیں پر کبھی آسماں پر
تو جوں جوں تخیل میں ڈھلتی ہیں انجانی اشیا
کے پیکر۔ کوی کا قلم اُنکی شکلیں بنا کر
مقرر بھی کرتا ہے ان خواب سی ہستیوں کا
مقام ایک بسنے بسانے کو اور ایک نام"

تو اس سے نتیجہ یہ نکلا کہ تخیلی پیکروں کا پیدا کرنا شاعری ہے، اور اگر ایک ناثر بھی اپنے میں اتنی قوت رکھتا ہے کہ تخیلی پیکر پیدا کر دے تو میرے خیال میں اس اوپر والے نتیجہ کا بھی یہ نتیجہ ہوگا کہ ایسا ناثر بھی، پیدا کرنے کی حد تک ہی کیوں نہ ہو، "شاعر نثر" کہا جا سکے گا: میں دیکھتا ہوں کہ یہاں پیدا کرنے کا ذکر چھڑ گیا ہے: اسکے سہانے پن کو دیکھتے ہوے اگر میں آگے بڑھ جاؤں تو عجب نہیں جو قارئین کرام کو بار گذرے اس لیے لگے ہاتھوں ذرا اور تفصیل وار سنا دینا مناسب ہوگا،

" پیدا ہونے کی بہترین مثال افزائش نسل ہے۔ نر اور مادہ دونوں جانب سے مادی اور نفسی عنصر میل کھاتے ہیں۔ اور اس میل کا جو نتیجہ ہوتا ہے وہ ایک تیسری شے ہوتی ہے، یعنی یہ کہنا بجا ہے کہ بچے میں ماں باپ دونوں کا حصہ ہے۔ دونوں کے حصے کیا بلحاظ مادہ اور کیا بلحاظ نفس مِل جُل کر ایک نئی چیز بن جاتے ہیں۔ بچہ ایک جداگانہ مستقل ہستی ہوتا ہے۔ یہ تصور ہے پیدائش کا۔ اب ادبیات کے میدان میں اس تصور کو نظر کے سامنے رکھ کر خیال دوڑائیے کہ یہاں پیدا کرنے کا کیا مفہوم ہو سکتا ہے۔ یہ بات تو ظاہر ہے کہ ادب میں جو چیزیں پیدا کیجا سکتی ہیں وہ گوشت پوست سے مستغنی ہوتی ہیں۔ ایک مثال لے لیجیے۔ مولانا نذیر احمد نے "اصغری" کو ادبی ہستی دی ہے۔ اصغری ایک ایسی ہستی ہے جسنے گوشت پوست میں کبھی جنم نہیں لیا۔ دوسرے الفاظ میں کہہ سکتے ہیں، کہ مولانا نے جو اصغری پیدا کی ہے وہ اس طرح پیدا نہیں کی جس طرح اُنکی اولاد پیدا ہوئی، یعنی مولانا کے

داغ نے بغیر کسی بیوی کے اصغری کو پیدا کیا۔ اب آپ کے یہ ذہن نشین ہو گیا کہ افزائش نسل کے لیے نر اور ناری کا یکجا ہونا اٹل ہے۔ ادبی ہستیوں کے لیے اس قسم کی یکجائی ضروری نہیں۔ اور یہی وجہ ہے کہ مولانا کی اصغری محض ایک تخیلی پیکر ہے لیکن اس تخیلی پیکر کی خوبی یہی ہے، کہ اس میں گوشت پوست کے سوا اور ساری باتیں ایسی ہی ہوں، جو جیتے جاگتے، سانس لیتے انسانوں میں ہوتی ہیں۔ اصغری کا احوال ایسا معلوم ہوتا ہے گویا کسی واقعی شریف بیوی کی سوانحمری ہے، جو کسی زمانہ میں گذر چکی ہے۔ اس مادی دُنیا میں سانس لے چکی ہے۔ اسکی بات چیت، اسکی چال ڈھال، اسکے طور طریقے اس طرح بیان کیے گئے ہیں۔ ان میں اس طرح جان پھونکی گئی ہے کہ اُنکو پڑھ کر ہمارے تخیل کے پردے پر ایک تصویر کھنچ جاتی ہے۔ اور تصویر بھی ایسی ہستی کی گویا ہم نے کبھی اُسکو اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے ——"

علو مطالب کی "مئے دو آتشہ" جسے ابھی ابھی آپ نے چکھا" ولایتی" کی نفیس خو لیے ہوئے ہے، اور جو ایسا معلوم دیتا ہے کہ ہارن کے خمخانہ سے ہم تک لنڈھائی گئی ہے: چنانچہ سر مضمون جو قول نقل ہوا اُس سے اس خیال کی ایک حد تک تائید ہوتی ہے؛ باز ہم حضرت خاں صاحب کی ادبی سلیقہ مندی اور لطافت ذوق نے جس آرٹسٹک انوکھے پن سے دو آتشہ سہ آتشہ کرکے اسے ادب اُردو کے جام میں چھلکایا ہے، قابلِ رشک ہے۔ ہندستان ادب کے لیے تو میرا خیال ہے یہی جام "جامِ جمشید" سے کم نہیں۔ کیوں؟ کہ اسی میں انھیں چلتے پھرتے "تخیلی پیکروں" کی معنوی پرچھائیاں نظر آجائیں گی: جنھیں "مسہری کی جد و جہد" نے نہیں! "اِی زی چیئر کے انہاک ذہنی" نے پیدا کیا ہے!

اظہار خیال کی قوت خوش کلام نیومن نے کیا خوب کہا ہے کہ خیال کی گہرائی یا نظر کی بینائی یا فلسفہ یا دانشمندی یا فطرتِ انسانی کا علم یا انسانی زندگی کا تجربہ ہی ایک مصنف کو اچھا اور بڑا مصنف بنانے کے لیے کافی وافی نہیں۔ یہ ساری اضافی خوبیاں ہیں جن سے بیشک چار چاند لگ سکتے ہیں، لیکن ایک بڑے مصنف کی امتیازی جودت اسکے اظہار خیال کی قوت ہے: یعنی وہ اتنا قادرِ کلام ہو کہ ہر صحیح خیال کے لیے اُسے ہمیشہ صحیح لفظ بھی مل جائے۔ وہ لوگوں کے دلوں کی بات کہے مگر اس طرح کہ دلوں میں اُتر جائے۔ وہ

اختصار پر اُترے تو اُسی میں چھکا دے اور اگر الفاظ کی گنگا بہائے تو قریب قریب ہر لفظ "گنگا جل" کی طرح لائقِ پرستش قرار پائے - یہاں تک کہ اُسکے جملے کہاوتیں بن بن جائیں۔

سچ بھی ہے ادبی دنیا میں تو الفاظ کی وہ کیفیت ہے جیسے مصوری میں پنسل، کہ اُٹھایا، تصویر کا خاکہ اُتارا، اور اُس میں بھانت بھانت کے رنگ بھر بھرا کے ایک سندر صورت بنا کے کھڑی کر دی - اچھا مثال کے طور یوں سمجھیے، فرض کیجیے آپ ایک ادبی مصور ہیں اور آپ کے ذہن میں ایک کیرکٹر اُبھرا اب آپ چاہتے ہیں کہ وہی کیرکٹر بجنسہ دوسرے کے ذہن میں منتقل ہو جائے، اس خیال سے آپنے ایک فن داں مصور کی طرح ان خاص خاص لائنز کو بھی چن لیا، جنکے ٹریس کرنے سے آپ اس کیرکٹر کو دوسرے کے صفحۂ خیال پر منتقل کر سکتے ہیں۔ لیکن آپ کے پاس الفاظ کی ایسی پنسلیں نہیں جن سے آپ خاکہ تیار کر سکیں یا اُس میں رنگ بھر سکیں - تو فرمائیے ایسی صورت میں کیا خاک آپ کسی چیز کی تصویر اُتار دیں گے؟ اور کیا خاک اُس میں جلت پھرت کی تدبیر کی جا سکے گی؟ غرض غرض یہ کرنا ہے کہ تخیل کی "عروس جمیل" جب حجلۂ دماغ سے باہر آئے تو کسی قسم کا گھونگھٹ نہ رہے کہ اُس سے سوا رکاوٹ کے اور کوئی حاصل نہیں! اور ساتھ ہی مناسب و موزوں الفاظ کا ایسا "لباسِ حریر" بھی زیب تن ہو کہ شوقین نگاہیں ملیں تو ل کر اس کا فرداً فرداً پورا پورا جائزۂ حسن لے لیں!

(باقی)

سید وزیر حسن دہلوی

جذباتِ احسن

اضطرابِ دلِ پُرشوق سے مجبوری ہے
عشق والوں کے لیے قرب میں بھی دُوری ہے

نہیں واقف جو وہ کیا درد کی لذت جانے
راحتِ جاں خلشِ پیہم مہجوری ہے

کلفتِ بُعد ہے لیکن گلۂ بُعد نہیں
اللہ اللہ یہ کیا عالمِ مجبوری ہے

وہ تمنا نہیں جو خوگرِ تسلیم نہ ہو
وہ محبت نہیں جسکو گلۂ دُوری ہے

مذہبِ عشق میں دعوائے محبت ہے حرام
حال صورت سے جو کھل جائے تو مجبوری ہے

دل میں اُس نام سے اک حشر بپا ہوتا ہے
قُربِ باطن تو ہے ظاہر میں اگر دوری ہے

ہے محمدؐ کی غلامی کا شرف احسن کو
دُور اُس سے خلشِ ناوکِ رنجوری ہے

محمد نجم احسن حسن

شعر الہند (حصۂ دوم)

کتاب شعر الہند کا دوسرا حصہ جو حال ہی میں چھپ کر بااصلاح قدیم زیور طبع سے مزین ہو کر شایع ہوا ہے، اسوقت میرے سامنے ہے اور ایڈیٹر صاحب الناظر کا فرمان واجب الاذعان پیش نظر۔ اس لیے ان چند سطور میں اُن خیالات کا اظہار مقصود ہے جو اس کتاب کے مطالعہ سے میرے ذہن میں آئے۔

حصہ دوم کی اشاعت سے پہلا فائدہ تو یہ ہوا کہ کتاب شعر الہند کے پہلے جزو کی اشاعت کے بعد بعض ایسے معمے جو کتاب کی نوعیت اور ترتیب کے متعلق ناظرین کے دل و دماغ کو پریشان کر رہے تھے خود بخود حل ہو گئے۔ یعنی اب سمجھ میں آیا کہ مصنف پہلے حصہ میں تو صرف شعرائے اُردو کا ذکر اور اُنکے ادوار کا بیان فرداً فرداً کرنا چاہتے تھے اور دوسرے جزو میں اُردو شاعری کی تمام مختلف انواع پر ایک عام تبصرہ۔ اور یہ تبصرہ یا ریویو بھی دو حیثیتوں سے یعنی تاریخی اور ادبی نقطۂ نظر سے۔ کیا اچھا ہوتا کہ مصنف اس ارادہ کا ذکر پہلے جزو کے دیباچہ میں کر دیتے تاکہ قارئین مختلف اور پراگندہ توجیہات اور ظنون سے اپنے دماغ کو پریشان نہ کرتے۔ دوسرا فائدہ یہ مرتب ہوا کہ کتاب مکمل ہو گئی اور جائے شکر ہے کہ مصنف کو اس قدر فرصت اور توفیق ہوئی کہ جس کام کا اُنھوں نے بیڑا اُٹھایا تھا اُسے ساحل مقصود تک پہونچا دیا اور اُردو شاعری کے تذکروں میں ایک اور اضافہ ہو گیا۔ لیکن کیا یہ اضافہ بہت بیش قیمت بھی ہے؟ یہ ایک دوسرا سوال ہے جس کے متعلق میں اپنے خیالات کا اظہار جزو اول کی تنقید لکھتے وقت کر چکا ہوں۔ اور مجھے افسوس ہے کہ جزو دوم کو دیکھ کر میرے اُن خیالات میں کوئی تغیر نہیں ہوا۔

کتاب شعر الہند کا جزو دوم ایک مختصر مقدمہ سے شروع ہوتا ہے، جس میں "اُردو زبان میں فن تنقید" کے عنوان سے یہ دکھایا گیا ہے کہ زبان اُردو میں تنقید ابتداءً صرف الفاظ و محاورات، بندش و اسلوب پر بحث تک محدود تھی۔ صرف آخری ایام یعنی دور جدید میں تنقید کے صحیح مفہوم کو سمجھا گیا اور حالی نے ایک نئے طرز تنقید کی بنا ڈالی جس میں معانی اور مطالب کی اہمیت کو کما حقہٗ تسلیم کیا گیا ہے اور اسکے بعد دیگر اُدباء مثلاً شمس العلما امداد امام صاحب مرحوم اور شبلی مرحوم نے اُن کا تتبع کیا۔

اسکے بعد پہلے باب میں اُردو شاعری کی مختلف صنفوں پر تاریخی حیثیت سے فرداً فرداً ریویو کیا گیا ہے۔ ان اصناف میں غزل، ریختی، واسوخت، قصیدہ، مرثیہ، مثنوی، ڈراما، مذہبی، صوفیانہ، اخلاقی اور فلسفیانہ شاعری شامل ہیں۔ دوسرے باب میں انواع شاعری پر ادبی نقطۂ نظر سے تبصرہ کیا گیا ہے اور غزل، خمریات، قصیدہ، فخریہ، مرثیہ، ہجو، مثنوی، سہرا، وصف اور تشبیہ و استعارہ کا بیان ہے۔ اسکے بعد چند مختصر فصلوں میں مختلف مضامین کا ذکر ہے یعنی اجزائے شعر اور محسنات شعر۔ تیسرے باب میں "ملکی سرمایہ"، "ہندوؤں کا تعلق اُردو شاعری کے ساتھ" اور "مربیان سخن" کے عنوانوں سے چند فصلیں لکھی گئی ہیں اور خاتمۂ کتاب فارسی اور دیگر زبانوں کی شاعری اور اُردو شاعری کے مقابلہ پر ہوتا ہے۔ اِن اصناف شاعری کی طویل فہرستوں پر نظر ڈالنے سے پہلا سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ وہ کس بنا پر قائم کی گئی ہیں۔ اُردو شاعری کو مختلف قسموں میں مختلف اعتبارات سے تقسیم کیا جا سکتا ہے اور زیادہ تر دو لحاظ سے۔ یعنی مضمون اور شکل نظم۔ مضمون کے اعتبار سے یہ شاعری عشقیہ، خمریہ، صوفیانہ، اخلاقی، مدحیہ، ہجویہ، وصفیہ، مذہبی اور قومی وغیرہ وغیرہ ہو سکتی ہے اور شکل کے لحاظ سے غزل، قصیدہ، مربع، مخمس، واسوخت، مثنوی، رباعی، مسدس وغیرہ۔ اور اقسام شاعری پر ریویو کرنے کے لیے یہی مناسب ہے کہ ایک خاص اعتبار سے اُنکو دیکھا جائے۔ یعنی یا تو مضمون مدنظر ہو یا شکل، ورنہ ان دونوں کو خلط کرنے سے سوائے اسکے کہ ایک اُلجھن پیدا ہو اور سلاست و وضاحت کتاب زائل ہو جائے اور کوئی مفید مطلب پورا نہیں ہو سکتا۔ مدح غزل میں بھی ہو سکتی ہے اور قصیدہ میں بھی، ہجو بھی کسی خاص شکل کی قید سے آزاد ہے۔ شراب کا بیان رباعیوں میں بھی ہو سکتا ہے اور لمبے چوڑے قصیدوں اور طویل غزلوں میں بھی۔ اسی طرح سب اصناف شاعری جو مضمون کے لحاظ سے متصور ہو سکتی ہیں مختلف شکلوں میں لکھی جا سکتی ہیں۔ اور دونوں اصناف کو ملانے کا نتیجہ بے ضرورت اعادہ اور ناپسندیدہ طوالت ہے جو کسی طرح پر بھی کتاب کی وقعت کے لیے باعثِ افزونی نہیں ہو سکتی۔

علاوہ ازیں مصنف نے بعض ایسے مضامین کو ایک مستقل صنف شاعری قرار دیا ہے جو ہرگز اس عزت کے مستحق نہیں۔ یہ سمجھ میں آنا مشکل ہے کہ چونکہ غالب اور ذوق کے دو سہرے اُردو شاعری میں موجود ہیں اسلیے سہرے کو رتبہ حاصل ہو گیا کہ وہ غزل اور قصیدے کے پہلو بہ پہلو کھڑا ہو اور مرثیہ و مثنوی سے دعوئے ہمسری کرے۔ اگر سہرے کو یہ رفعت حاصل ہو سکتی ہے تو مسدس نے کیا گناہ کیا ہے کہ اسکو یہ درجہ نصیب نہ ہو، اور مہندی کس قصور کی بنا پر اس عزت سے

محروم ہے اسی طرح اُردو شعرا نے اگرچہ شراب کی تعریف میں بہت کچھ روانیٔ طبع دکھائی ہے لیکن اُردو شاعری میں کوئی خاص صنف اس مضمون سے متعلق نہیں ہے۔ اُردو کا دامن اس ناقابل فخر قسم شاعری سے آلودہ نہیں ہے اور نہ کسی اُردو شاعر ہی نے بنت عنب کی توصیف و مدح کو کلیتہً اپنا مطمح نظر بنایا، یا پرانے یونانی شاعروں کی طرح شراب کے دیوتا بیکلس کے قدموں میں شرابی قصیدوں کے پھول اور انگوری غزلوں کے جواہر نثار کیے۔ پھر معلوم نہیں کہ مصنف کو یہ مضمون اس قدر اہم کیوں معلوم ہوا کہ اُسکو ایک علحدہ فن شاعری تصور کرکے اسپر ادبی ریویو ضروری سمجھا۔ اگر خمریات اُردو شاعری کی ایک نوع قرار پا سکتی ہے تو کوئی وجہ نہیں معلوم ہوتی کہ عشقیات، بہاریات، خزانیات اور شتائیات کا شمار بھی اسی زمرہ میں نہ ہو۔ لیکن سب سے حیرت خیز اور اچھوتی صنف شاعری جسکا بیان مصنف نے باب دوم میں کیا ہے تشبیہ و استعارہ ہے۔ یہ قسم ایک معمولی عقل و فراست کے انسان کے فہم سے بالاتر ہے اور اس لیے اسپر زیادہ لکھنا بے سود ہوگا۔

باب اول اور باب دوم کی فہرستوں کے مقابلہ سے ایک اور تعجب خیز حقیقت کا انکشاف ہوتا ہے۔ یعنی یہ معلوم ہوتا ہے کہ بعض اقسام شاعری تو ایسی ہیں کہ اُن پر ادبی حیثیت سے ریویو ہو سکتا ہے لیکن تاریخی حیثیت سے بالکل ناممکن ہے اور بعض اصناف ایسی ہیں کہ تاریخی اعتبار سے تو ہم اُن پر تنقید کر سکتے ہیں لیکن ادبی لحاظ سے نہیں۔ 'خمریات' کے متعلق تو یہ متصور ہو سکتا ہے کہ یہ صنف چونکہ مشرب تصوف سے گوناگوں تعلقات رکھتی ہے اس لیے اسکا شمار "علم سینہ" میں ہے اور تاریخ یا روایت سے اسکو کوئی سروکار نہیں۔ لیکن وصف تو غالباً (باوجود ایک لفظی مماثلت کے) کبھی تصوف کا جزو نہیں سمجھا گیا کہ اسکو بھی اسی زمرہ میں شامل کیا جائے۔ ریختی تو شاید اس قابل نہ ہو کہ ادب میں اسکو جگہ دی جائے، لیکن کیا ڈراما اور واسوخت وغیرہ بھی ایسی مبتذل اور ساقط قسمیں ہیں کہ اُن پر ادبی ریویو کی ضرورت ہی محسوس نہ ہو؟ ممکن ہے کہ بعض نوعیں شاعری کی ایسی ہوں کہ انکے متعلق کافی تاریخی مسالہ ہم نہ پہونچ سکتا ہو اور اس لیے مصنف نے تاریخی ریویو کے وقت انکو نظر انداز کر دیا ہو، لیکن ایسا کرنا ایک مصنف اور محقق مصنف کے لیے خصوصاً کسی طرح بھی مناسب نہیں ہے اور ادبی ریویو میں تو کسی صنف شاعری سے پہلوتہی کرنے کی بظاہر کوئی بھی توجیہ نہیں ہو سکتی۔ تاریخی ریویو کا نام سُن کر ہر شخص کے دل میں یہ توقع ہوتی ہے کہ وہ اُردو شاعری کی مختلف قسموں کے تدریجی نشو و نما کا ایک پُر لطف مرقع اور ایک پُر رنگ نقش ہوگا۔ لیکن باب اول کی ورق گردانی سے اُس کی توقع کو مایوسی سے دوچار ہونا پڑتا ہے۔

اس باب میں جو تاریخی ریویو ہے وہ تاریخ سے اسی طرح بے نیاز اور بے تعلق ہے جس طرح الف سے لام یا لام سے میم۔ مصنف بظاہر ادبی اور تاریخی ریویو کی حدود فاصلہ کو قائم نہ رکھ سکے اور ایک کو دوسرے سے ملا دیا۔ مثلاً غزل میں وہی پرانے دقیانوسی چار دور مذکور ہیں جنکی چار دیواری میں مولانا آزاد مرحوم کے زمانہ سے یہ فرض کر لیا گیا ہے کہ اردو شاعری محدود و مقید ہے۔ اور ان ہی دوروں کے مشہور اساتذہ کے کلام کے نمونے انکے زمانہ کی خصوصیتوں کے اظہار کے لیے پیش کر دیے گئے ہیں۔ انکے کلام کے عیوب اور محاسن بھی بہت تشریح اور تدقیق سے بیان کیے گئے ہیں۔ لیکن اگر کوئی یہ معلوم کرنا چاہے کہ کس سنہ میں غزل کی ابتدا ہوئی کس حصۂ ملک میں اور کس بادشاہ کے عہد میں، کس طرح اور کن کن وقتوں میں اس میں بتدریج ترقی ہوئی، تو وہ اس باب سے بہت کم بہرہ یاب ہو سکتا ہے۔ اور اسکو یا تو ڈی تاسی کے تذکرہ کا رخ کرنا پڑے گا یا کسی آیندہ تذکرہ کا انتظار۔ ان چار دوروں کا بیان اور انکی خصوصیات کا ذکر تو مصنف بہت شرح و بسط کے ساتھ جزو اول میں بھی کر چکے تھے اس لیے جزو دوم میں ان ہی باتوں کو کچھ اضافہ کے ساتھ دوہرا دینا کتاب کی جامعیت میں کوئی اضافہ نہیں کرتا۔ غزل پر جو ریویو ادبی اور تاریخی حیثیت سے باب اول و دوم میں کیے گئے ہیں انکا مقابلہ کرنے سے معلوم ہو جائے گا کہ میرا مقصد کیا ہے۔ یعنی جو شخص اس زحمت کو گوارا کرے وہ دیکھے گا کہ جا بجا ایک ہی قسم کے خیالات دونوں میں موجود ہیں اور بہت سے اشعار جو تمثیل کے لیے دیے گئے ہیں مشترک ہیں۔

ادبی ریویو میں غزل اور قصیدہ وغیرہ کے متعلق اصول و قوانین قائم کرنے کے لیے ادبا عرب مثلاً ابن قدامہ اور ابن رشیق کی کتابوں سے مدد لی گئی ہے۔ میرے خیال میں اردو شاعری پر یہ ایک ظلم ہے کہ اسکا معیار عرب کی شاعری کو قرار دیا جائے اور اس زر ہندی کو پرکھنے کے لیے عرب سے کسوٹی مستعار لی جائے۔ اردو شاعری عربی شاعری کی بہت کم مرہون احسان ہے، اس لیے کہ اردو کے شاعروں نے جو کچھ بھی لیا فارسی کے شعراء سے لیا، اور فارسی شاعری عربی شاعری سے اس قدر مختلف ہے کہ شاید قصیدہ کے سوا اور کوئی بھی صنف اسکی قدیم شاعری سے مماثل نہیں ہے دور آخر یعنی خلفاے بنی عباس اور انکے مابعد کی عربی شاعری بیشک فارسی شاعری سے بہت مشابہ ہے لیکن اس کی وجہ یہ ہے کہ عربوں نے ایرانیوں کی تقلید کی اور انکے طرز شعر کا تتبع کیا۔ غزل تو کبھی بھی عربی شعر میں کوئی صنف مستقل نہیں سمجھی گئی اور عربی قصیدہ بھی فارسی اور اردو قصائد سے بہت مختلف ہے۔ موخر الذکر میں مقام شکر ہے کہ لیلی اور اسماء کے ساتھ طرفہ کی اونٹنی اور

امرؤ القیس کا گھوڑا کہیں مذکور نہیں۔ معشوق کے لب جاں بخش، رخ رنگیں، اور زلف پیچاں کے پہلو بہ پہلو کہیں اونٹ کے لٹکے ہوئے ہونٹ، بھرے ہوئے گالوں یا اُبھی ہوئی پشم کا ذکر نہیں ہے۔ اردو کا شاعر کبھی بھیڑیے اور چرغ کے ساتھ نہیں سویا۔ اُس نے جلتے ہوئے میدانوں میں جھلسے ہوئے گرگٹ کو نہیں دیکھا اور نہ اپنے ممدوح یا معشوق تک پہونچنے کے لیے لق ودق میدانوں میں ببول اور جھاؤ کے درختوں کے درمیان کوسوں کے سفر ہی طے کیے۔ صرف یہی نہیں کہ اردو غزل عربی غزل (اگر اسکی مستقل ہستی مان بھی لی جائے) سے بالکل بے نیاز ہے بلکہ واقعہ یہ ہے کہ فارسی غزل سے بھی بہت مختلف ہے۔ اسکا اندازہ ہر صاحب نظر کو ہو سکتا ہے جو فارسی کے کسی مشہور غزل گو مثلاً حافظ کا مقابلہ کسی اردو کے اُستاد مثلاً میر یا داغ سے کرے۔ دریں صورت یہ عقدہ حل ہونا مشکل ہے کہ مصنف کو اُردو غزل اور قصیدہ کا بیان لکھنے میں ان ادبائے عرب کی کتابوں کا جائزہ لینے اور اُنکے مقرر کردہ اصولوں کو اُردو شاعری کی عمدگی یا رذالت کا معیار بنانے کی کیا ضرورت تھی۔ چنانچہ قصیدہ کے متعلق ابن رشیق کے خیالات نقل کرکے لکھتے ہیں کہ "لیکن ہمارے شعراء کے قصائد بمشکل ان شرائط کے معیار پر پورے اُتر سکتے ہیں" (ص ۳۳۲)

کتاب کا آخری حصہ یعنی اجزائے شعر وغیرہ کی بحث، مضمون کتاب سے کچھ تعلق نہیں رکھتا بہتر ہوتا کہ مصنف اس فن پر کوئی علحدہ کتاب تصنیف کر دیتے۔ مگر خیر جامعیت نہ ہو تفنن ہی سہی۔ لیکن "ہندوؤں کا تعلق اُردو شاعری کے ساتھ" میری رائے میں ایک بالکل بے معنی فصل ہے شاعری تو مذہب و ملت سے آزاد ہے اور سیاست سے بے نیاز۔ اُردو شاعری ہندوستان کے ایک طبقۂ کثیر کی مشترکہ شاعری ہے۔ جس طرح اردو انکی مشترکہ زبان ہے۔ اور اس طبقہ میں ہندو مسلمان سب شامل ہیں۔ پھر کوئی وجہ نہیں کہ خاص طور پر ایک فرقہ کا تعلق اس شاعری سے بیان کیا جائے اور وہ بھی اس حسنِ اختصار سے کہ تین چار صفحوں اور دو تین ناموں تک محدود ہے

تمام کتاب کو دیکھنے کے بعد مجھے ایک افسوسناک حقیقت کا اظہار کرنا پڑتا ہے یعنی یہ کہ مصنف نے اگرچہ اسکو بلاشبہہ بہت محنت و جانکاہی سے مکمل کیا ہے، لیکن اس میں کوئی نئی بات، کوئی خاص خصوصیت جو اسکو دوسرے تذکروں سے ممتاز کرے اور اُردو شاعری کے متعلق ہماری معلومات میں اضافہ کا باعث ہو نظر نہیں آتی۔ مصنف نے اپنی طرف سے بہت ہی کم لکھا ہے اور زیادہ تر اوروں کی رائے پر انحصار کیا ہے۔ چنانچہ مرثیہ کا بیان تقریباً تمام و کمال اور حرف بحرف مولانا شبلی کی کتاب "موازنۂ انیس و دبیر" سے نقل کر دیا گیا ہے۔ اور اگر کہیں اُردو اُدباء کی کتابوں

سے مدد نہ مل سکی تو عرب مصنفین سے استفادہ ضروری خیال کیا گیا۔ یہ فقدانِ رائے اور عدم تحقیق اس زمانہ کے کسی مصنف کے لیے باعث فخر نہیں ہو سکتا۔ مصنف نے شاید دو ایک جگہ پر ہی اپنی رائے کے اظہار کی جرأت کی ہے۔ مثلاً خاتمۂ کتاب میں مختلف زبانوں کی شاعری کا مقابلہ کرنے کے بعد لکھتے ہیں کہ: (اُردو شاعری) کلیۃً فارسی شاعری کی ہمسری کا دعویٰ نہیں کرسکتی۔ ..... عشق و محبت کے متعلق جس قدر لطیف و نازک اشعار فارسی میں ہیں اُردو میں نہیں مل سکتے۔ فلسفہ اور تصوف بھی جس قدر فارسی میں ہے اُردو شاعری میں نہیں ہے؟ مولانا روم، فرید الدین عطار، سنائی، عراقی، اوحدی، نظامی، امیر خسرو، اور خیام، وغیرہ کے مقابلہ میں کون اُردو شاعر پیش کیا جاسکتا ہے" لیکن افسوس ہے کہ مجھے اس رائے سے بھی اختلاف ہے۔ میرے خیال میں اُردو شاعری باوجود اپنی صغرسنی کے فارسی شاعری سے کئی میدانوں میں سبقت لے گئی ہے اور بحیثیت مجموعی اُس سے کسی طرح کم نہیں ہے۔ عشق و محبت کی باریکیاں اور فلسفہ و تصوف کے دقائق اس میں فارسی سے کم نہیں بلکہ زیادہ ہیں۔ اور اگر کسی فارسی نظم میں یہ مضامین اردو کی نسبت زیادہ اچھی طرح اور کثرت سے بیان ہوئے ہیں تو وہ مولانا روم اور اوحدی وغیرہ کی نظم نہیں ہے بلکہ نظیری اور عرفی وغیرہ کی شاعری ہے۔ یعنی وہ فارسی شاعری جس نے اُردو ہی کے ملک میں جنم لیا اور نشوو نما پائی۔ لیکن یہ ایک طویل بحث ہے اور اس مختصر ریویو میں اسکا چھیڑنا غیر موزوں۔

آخر میں مصنف کی ایک قابلیت کی داد ضرور دینا چاہتا ہوں، یعنے اُنکے ذوق شعری کی۔ کتاب شعر الہند میں جو اشعار انھوں نے مختلف شعرا کے کلام سے لیے ہیں وہ اس کا بدیہی ثبوت ہیں۔ اس طرح یہ کتاب اُردو شاعری کی مختلف اصناف کے نمونوں کا ایک بہت اچھا مجموعہ ہے اور یہی ایک خوبی کتاب کے بہت سے نقائص کی تلافی کرسکتی ہے۔ اس لیے اگر کوئی شخص اسکو بحیثیت ایک ادبی کتاب کے پڑھے گا تو یقین ہے کہ بہت کچھ روحانی حظ اور ادبی فائدہ حاصل کرسکے گا۔ اور اسی وجہ سے مجھے امید ہے کہ قابل مصنف کی محنت رائگاں نہ جائے گی اور کتاب شعر الہند بہت سے علم دوست اصحاب کے کتبخانوں کی زینت کا باعث بنے گی۔

محمد وحید مرزا

آیولینتھی

چھٹا منظر

(بادشاہ رینی، ایلمرک، ٹرسٹان جو مکمل طور پر مسلح ہے مع اپنے سپاہیوں کے۔ اُسکے بعد جیوفری مع اپنے سپاہیوں کے)

(یہ وقت وہ ہے کہ آسمان پر شفق پھول رہی ہے)

ٹرسٹان ۔ اپنے آپ کو ہمارے حوالے کردو۔ جو درہ کی حفاظت کرتے تھے اُنھوں نے ہتھیار رکھ دیے۔ کیا تم بھی اُنکی پیروی کرتے ہو؟

رینی ۔ کیا کہا؟ تو کون شخص ہے جسکے شریر ہاتھوں نے مسلح ساتھیوں کے بَل پر اِس سرزمین کو ناپاک کیا۔ آگے قدم نہ بڑھانا ورنہ خاک چھانتا نظر آئیگا

ٹرسٹان ۔ بوڑھے شخص، ذرا اپنے الفاظ کا خیال رکھ۔ میں ڈرتا نہیں لیکن مجھے یقین کامل ہے کہ یہ جگہ کسی موذی اور ناپاک طاقت کے پنجے میں ہے اسی وجہ سے تو کانپ رہا ہے (رینی دراصل غصہ سے کانپ رہا تھا) اور میرا دل شیر ہے۔ اگر تو جادوگر ہے اور یہ امید ہے کہ سحر تیری مدد کرے گا تو اسکے برتنے پر نہ بھولنا۔ حضرت پوپ نے اِس تلوار کو منزہ کیا ہے اور یہ رومال بھی پاک ہاتھوں نے آدمیاں کی خانقاہ سینٹ میری میں تیار کیا ہے اور اس زرہ کے نیچے وہ مصمم عزم ہے جو تجھ پر غلبہ حاصل کرے گا جس طرح سینٹ جارج نے اژدر کو ہلاک کیا تھا۔

رینی ۔ گمراہ شخص! تو یہاں کس لیے آیا ہے؟

ٹرسٹان ۔ تو میری بات کا جواب دے۔ کیا تو اس وادی کا مالک ہے؟

رینی ۔ بیشک، اور اسی پر میری ملکیت کا خاتمہ نہیں ہو جاتا۔ لیکن تو کون ہے؟

(جیوفری مع اپنے ساتھیوں کے داخل ہوتا ہے)

جیوفری ۔ میری آنکھیں کیا دیکھ رہی ہیں۔ شاہ رینی! (زانو ٹیک کر) میرے بادشاہ!

رینی ۔ جیوفری، تو بھی اپنے بادشاہ کے دشمن کا شریک ہے!

جیوفری ۔ خداوندا کیا ارشاد ہوتا ہے! وہ پہلے روانہ ہو گیا۔ مجھے دیر میں اطلاع ہوئی۔

رینی (ٹرسٹان سے) بتاؤ تم کون ہو۔

ٹرسٹان ۔ میرا نام ٹرسٹان آف رومانٹ ہے۔ آپ اس نام سے اچھی طرح واقف ہیں۔

رینی ۔ کیا ٹرسٹان! (جیوفری سے) کیا یہ سچ ہے؟

جیوفری ۔ حضور ایسا ہی ہے۔

رینی (کچھ سوچ کر) تو شاید تمھیں تھے جو آج ایک مرتبہ پیشتر بھی یہاں آ چکے ہو؟

ٹرسٹان ۔ ہاں جناب! مگر اتفاقیہ نہ کہ بالقصد۔ مجھے خواب میں بھی یہ شبہہ نہیں ہوا کہ یہاں آپکی عملداری ہے۔

رینی ۔ لیکن تم دوبارہ کس نیت سے آئے ؟
ٹرسٹان ۔ آپ جانتے ہیں ۔
رینی ۔ نہیں، میں نہیں جانتا ۔ تم بتاؤ ۔
ٹرسٹان ۔ کیا یہ ممکن ہے ؟ اس پھولوں سے لدی ہوئی وادی میں جہاں کی ہر چیز حیرت خیز ہے اُن سب سے زیادہ عجیب و خوبصورت ایک لڑکی ہے ۔ پردہ انس کے تمام ٹروبیڈور متفقہ کوشش کریں تو بھی کما حقہٗ اُسکی تعریف نہ کر سکیں ۔
رینی ۔ اور تم کہتے ہو کہ یہ خوبصورت لڑکی —— کھو گیا کہتے ہو !
ٹرسٹان ۔ میں بقسم کہتا ہوں کہ اُس لڑکی نے مجھ پر ایسا گہرا جادو کر دیا ہے کہ میں ہمیشہ کے واسطے اُسکا غلام ہو گیا ہوں ۔
رینی ۔ کیا تمھیں معلوم ہے کہ وہ کون ہے ؟
ٹرسٹان ۔ نہیں ۔ لیکن اُسکے چہرہ اور اُسکے الفاظ سے نمایاں ہے کہ وہ شریف و عالی نسب ہے ۔
رینی ۔ کیا تم نے غور نہیں کیا کہ قدرت نے اور تمام باتوں نے اُسکے ساتھ نہایت فیاضی برتی مگر ایک ——"
ٹرسٹان ہاں ! افسوس وہ نابینا ہے ۔ تاہم اُسکی روح میں ایک موج نور رواں ہے جو ہر تاریک شے کو منور کر دیتی ہے ۔
رینی ۔ باوجودیکہ تمھیں علم ہے کہ وہ نابینا ہے ——
ٹرسٹان ۔ تاہم میں اپنا تاجِ شاہی نہایت خوشی سے اُس کے قدموں پر رکھنے کو تیار ہوں
رینی ۔ کلیر والے میں جو پاک مورت ہے اُسی کی قسم کہ تم عجیب و غریب شخص ہو ۔ تم یہاں مسلح ہو کر زبردستی اُس چیز کے لیجانے کو داخل ہوئے جو مدت سے تمھاری تھی ۔ تاہم تم نے حقارت آمیز طریقہ سے انکار کر دیا ۔
ٹرسٹان ۔ یہ آپ نے کیا فرمایا ؟
رینی ۔ تمھیں جاننا چاہیے کہ یہ خوبصورت لڑکی جسنے تمھارے دل کو اسیر کر لیا ہے میری بیٹی ہے ۔
ٹرسٹان ۔ وہ آپ کی بیٹی ہے ؟
رینی ۔ ہاں اے نوجوان کاؤنٹ، میری بیٹی ہے اور وہی ہے جسکو تمھارے خط سے واضح ہوتا ہے تم کبھی بطور ملکہ کے قبول نہیں کر سکتے ۔ وہی ہے جسکے سبب سے تمھارے دل میں ایسی نفرت پیدا ہوئی کہ تم نے اپنی گلوخلاصی کے لیے لورین کے پورے صوبہ سے دست بردار ہونے پر آمادگی ظاہر کی ۔ وہی ہے جسکے دل پر تم نے ایسا قبضہ کر لیا ہے کہ مجھے شک ہے وہ غریب لڑکی تمھیں بآسانی بھول جائے گی ۔
ٹرسٹان ۔ مجھے اُمید ہے کہ جناب والا ایسی غیر مترقبہ خوشی کی بلا وجہ خوشخبری نہیں سناتے ۔
رینی ۔ نہیں میں نے غلط نہیں کہا ۔
ٹرسٹان ۔ لیکن وہ کیوں ——
رینی ۔ اس وادی میں بند رکھی گئی ؟ یہ تمھیں

عنقریب معلوم ہو جائے گا۔ تمھیں شاید اس امر سے آگاہی نہیں کہ تم ایک نہایت نازک موقع پر یہاں آئے ہو۔ میری پیاری بیٹی آیو لنیتھی، شاید اسی وقت جبکہ ہم باتیں کر رہے ہیں ہمیشہ کے واسطے تاریک ترین شب میں داخل یا دن کی پُر از آب و تاب روشنی میں بیدار ہو رہی ہے۔

ٹرسٹان۔ آپ ایسا کیوں فرماتے ہیں۔

رینی۔ اسی وقت حکیم ابن یحییٰ دیکھ رہا ہے کہ آیا

(مکان کے قریب جاتا ہے)

خاموش! میرا خیال ہے کہ اندر کچھ باتیں ہو رہی ہیں۔ سب خاموش رہیں، وہ بول رہی ہے۔ آہ ٹرسٹان سنو! آیو لنیتھی بول رہی ہے۔ آہ تم سنو اور مجھے بتاؤ کہ اُسکے لہجہ سے خوشی کا اظہار ہوتا ہے یا غم کا ——— لیکن کوئی آرہا ہے۔

ساتواں منظر

(علاوہ اُن لوگوں کے جو موجود ہیں پہلے برٹرانڈ اور اسکے بعد مارتھا، آیو لنیتھی اور ابن یحییٰ داخل ہوتے ہیں)

رینی (برٹرانڈ سے جو مکان سے آیا ہے) برٹرانڈ فوراً بتاؤ کہ کیا حال ہے!

برٹرانڈ۔ افسوس میں نہیں جانتا۔ وہ بیدار ہوئی اور سب عمل ختم ہو گیا۔ لیکن میں خوفزدہ ہو کر چلا آیا۔

(مارتھا تیزی سے داخل ہوتی ہی)

مارتھا۔ وہ دیکھ سکتی ہے۔

رینی۔ کیا مارتھا؟ دیکھ سکتی؟

ٹرسٹان۔ خدا کرے ایسا ہی ہو۔

مارتھا۔ خاموش! خاموش! وہ آرہی ہے۔

(ابن یحییٰ آیو لنیتھی کا ہاتھ پکڑے ہوئے داخل ہوتا ہے اور لوگوں کو اشارہ کرتا ہے کہ نظر سے اوجھل ہو جائیں)

آیو لنیتھی۔ آپ مجھے کہاں لیے جاتے ہیں۔ اے خدا میں کہاں ہوں۔ مجھے سنبھالیے۔ آہ مجھے سنبھالیے۔

ابن یحییٰ۔ بیٹی۔ گھبراؤ نہیں۔

آیو لنیتھی۔ مجھے سنبھالیے۔ ٹھہر جائیے۔ میں یہاں پہلے کبھی نہیں آئی۔ اس غیر مانوس جگہ میں کس طرح رہونگی کیا کرونگی۔ یہ کیا ہے؟ مجھے سنبھالیے۔ یہ مجھ پر ڈھایا پڑتا ہے۔ مجھے تکلیف پہونچ رہی ہے۔

ابن یحییٰ۔ بیٹی اپنے دل کو ٹھکانے کرو۔ زمین کی طرف دیکھو۔ یہی ہمیشہ تمھاری بہترین دوست رہی ہے اور اب بھی خندہ پیشانی سے تمھارا خیر مقدم کرتی ہے۔ یہی باغ ہے جس کی تم نے ہمیشہ نگہداشت کی۔

آیو لنیتھی۔ میرا باغ! میرا! افسوس میں نے نہیں پہچانتی۔ یہ پودے کس قدر خوفناک معلوم ہوتے ہیں۔ ہوشیار رہیے! وہ ہم پر گرے پڑتے ہیں!

ابن یحییٰ بیٹی ڈرو نہیں۔ یہ شاندار درخت کھجور کے ہیں جسکی تیوں اور پھلوں کو تم ایک مدت سے جانتی ہو۔

آپولینیتھی۔ آہ نہیں میں انکو نہیں جانتی (آسمان کی طرف آنکھیں اُٹھاتی ہے) یہ چمک جو مجھے گھیرے ہوئے ہے اور وہ گنبدِ عظیم جو ہمارے سروں پر ہے اُف! کس قدر بلند ہے۔ یہ کیا ہے؟ کیا یہی خدا ہے۔ کیا یہی اُسکی روح ہے جو آپ کہتے تھے تمام دُنیا پر چھائی ہوئی ہے۔

ابن یحییٰ یہ چمک روشنی کی ہے۔ اس میں بھی خدا ہے جس طرح ہر شے میں ہے۔ یہ گہرا نیلا رنگ جو اس ہوائی گنبد میں بھرا ہوا ہے آسمان ہے۔ جہاں ہمارا عقیدہ ہے کہ خدا کا عرش عظیم ہے۔ میری بیٹی۔ اپنے گھٹنے ٹیک دو اور درگاہِ باری میں ہاتھ اُٹھا کر دعا مانگو!

آپولینیتھی مجھے سکھائیے کہ کس طرح دعا مانگوں۔ آج تک مجھے کسی نے یہ طریقۂ دعا تعلیم نہیں کیا۔

ابن یحییٰ میری پیاری بیٹی، مودب ہو کر کہو کہ اے پُر از اسرار خالق تو نے مجھ سے گفتگو کی جب میری آنکھوں پر تاریکی کی نقاب تھی، اب اپنی روشنی کی شعاعوں میں جو اس دنیا کو منور کرتی ہیں میری رہبری کر اور مجھے سکھا دے کہ میں کس طرح تیرے دامن رحمت سے لپٹی رہوں۔

آپولینیتھی (مندرجۂ بالا الفاظ کو دوہرا کر) ہاں! اُس نے میری سُن لی۔ میں محسوس کرتی ہوں کہ اس نے سکون و امن کو میرے دل پر مسلط کر دیا۔ صرف وہی مجھ سے گفتگو کرتا ہے اور سابق کی طرح مجھپر مہربان ہے، گو نظر نہیں آتا۔

ابن یحییٰ اُٹھو! میری بیٹی اُٹھو اور اپنے چاروں طرف دیکھو!

آپولینیتھی۔ بتائیے وہ کون لوگ ہیں جنکے قد ایسے شاندار ہیں۔

ابن یحییٰ۔ تم اُن سب کو جانتی ہو۔

آپولینیتھی۔ آہ نہیں۔ میں کچھ نہیں جانتی۔

ریپنی۔ (آگے بڑھ کر) آپولینیتھی میری طرف دیکھو۔ تم میری بیٹی ہو۔

آپولینیتھی ابا جان۔ اے میرے خدا! اب میں آپ کو پہچانتی ہوں، آپ کی آواز اور آپ کے ہاتھ کی گرفت سے اب آپ نہ جائیے گا۔ میری خبرگیری اور رہنمائی کیجیے۔ میں اس روشنی کی دنیا میں بالکل اجنبی ہوں۔ جو کچھ میرے پاس تھا مجھ سے چھین لیا گیا ہر شے جس سے پیشتر آپکی بیٹی خوش ہوتی تھی۔

ریپنی۔ بیٹی میں نے تیرے لیے ایک رہبر انتخاب کیا ہے۔

آپولینیتھی۔ آپ کا مطلب کس سے ہے؟

ریپنی (ڈرسٹان کی طرف اشارہ کر کے) وہ دیکھ وہ تیرا منتظر ہے۔

آپولینیتھی۔ وہ اجنبی شخص۔ کیا وہ اُن حسین کلمہ فرشتوں میں سے ہے جنکا آپنے ایک مرتبہ ذکر کیا تھا کیا وہ روشنی کا فرشتہ ہے جو آسمان سے نازل ہوا ہے؟

رینی۔ یاد کرو۔ تم اُسے جانتی ہو اور اُس سے
باتیں کر چکی ہو۔
آیولینتھی۔ اُس سے؟ اُس سے؟ (اپنے
اپنے ہاتھوں سے آنکھوں کی آڑ کرکے) ہاں
اب میں سمجھی۔ اُسی کے شاندار جسم سے وہ آواز
مشابہ ہے جو کچھ دیر اُدھر میں نے سُنی تھی بتیں
مگر قوی۔ صرف وہی آواز تمام فطرت میں دَورہ
کر رہی ہے۔
اے مہربان و خوشخو ملکہ!
سُنیے! آہ سُنیے! انہیں دلکش لفظوں کے
ساتھ روشنی کی پرلطف شعاعیں مجھ تک پہونچیں اور
یہی شیریں الفاظ میرے دل کی حرارت کے ساتھ
اس طرح مل گئے کہ ایک دوسرے سے جدا
نہیں ہو سکتے۔
ٹرسٹان (آیولینتھی کو گلے سے لگاکر) آیولینتھی!
سب سے زیادہ عزیز!
رینی۔ تم دونوں کو خدا برکت دے۔ وہ
خدا جسکی حیرت انگیز صناعیوں کے لیے ہم سب
سر عبودیت خم کرتے ہیں۔

(ختم شد)

آثر۔ لکھنوی

افکارِ تازہ

جانشین جلال جناب سید انور حسین آرزو لکھنوی

دَم گھٹتے گھٹتے ضبط سے دیوانہ ہو گیا — چُپ رہتے رہتے رازِ دل افسانہ ہو گیا
دل حسنِ عارضی کا بھی دیوانہ ہو گیا — ناداں چراغِ صبح کا پروانہ ہو گیا
سرسبزیاں ہیں دیدۂ اہلِ وطن میں خار — سبزہ لہک کے باغ سے بیگانہ ہو گیا
ہر جا مرا مزار ہے اور پھر کہیں نہیں — یوں مٹ کے خاکِ کوچۂ جانانہ ہو گیا
حالِ مریضِ ہجر نے بدلی یہ صورتیں — شکوہ سے ذکر ذکر سے افسانہ ہو گیا
ساقی رُکا تو بڑھ گئی تاثیرِ جذبِ شوق — منہ تک بلند ہاتھ سے پیمانہ ہو گیا
مدت کے بعد اُٹھا ہے زنداں سے کچھ غبار — آزاد آج آپ کا دیوانہ ہو گیا
جب کہہ چکا تو راکھ کا تھا ڈھیر شمع گو — لو ختم سوزِ عشق کا افسانہ ہو گیا
جب ہوں گے اُنکے جور تو کیا ہوگا آرزو
اب تک تو کچھ نہ ہونے پہ کیا کیا نہ ہو گیا

مقدس ڈاکو

(۲)

گذشتہ نمبر میں صرف الناظر کے اقتباسات پیش کیے گئے تھے جن سے اندازہ ہوا ہوگا کہ خواہر زادۂ حضرت محبوب الہیؒ کے متعلق ہم شروع ہی سے کیا رائے ظاہر کرتے رہے ہیں ۔ اسی لیے جب مولانا محمد علی نے خواجہ صاحب کی جاسوسی کا پردہ فاش کرنے والی تحریر کا اشاعت سے قبل ایک موقع پر ذکر کیا تو کم سے کم مجھے اسپر ذرا تعجب نہیں ہوا۔ کیونکہ جس شخص کا سالہا سال سے یہ شیوہ رہا ہو کہ علانیہ تصوف کے فریب آمیز بہروپ میں مسلمانوں کو دھوکا دیکر اپنی گرم بازاری کا سامان مہیا کرتا رہے اور دن دہاڑے بھولے، بامروت اور نیک دل لوگوں کو لوٹ لیا کرے اُسکے لیے مخبری و جاسوسی کے خفیہ جرائم کچھ زیادہ سنگین نہین ہو سکتے۔ خدا معلوم گذشتہ پندرہ سال کے اندر ایسی ہی کتنی وارداتوں کا ارتکاب کیا گیا ہوگا جنکی تفصیلات اور نتائج سے اہل ملک ہنوز بے خبر ہیں ۔

ہمدرد میں اس واقعۂ مخبری کے سلسلہ میں جو طولانی مضامین شائع ہوے ہیں اُنکو ہمنے بالاستیعاب پڑھا اور اس راز کے فاش ہو جانے کی وجہ سے خواجہ صاحب کو جس رسوائی کا سامنا ہے اُسکے دفعیہ کے لیے "غریبوں کا اخبار" جو نکالا گیا اُسکے اکثر پرچے بھی ہمارے مطالعہ میں آئے اور خواجہ صاحب کا مفصل جواب جو اخبار سے علیحدہ بھی شائع کیا گیا ہے وہ بھی ہمارے سامنے ہے۔ اور غالبًا یہ کہنا بالکل غیر ضروری ہے کہ مولانا محمد علی نے خواجہ صاحب کا جو خط شائع کیا ہے اُسکی موجودگی میں نہ ہمدرد کے طولانی مقالات کی تائید مزید درکار تھی نہ خواجہ صاحب کے لاطائل جوابات سے مغالطہ کھانا ممکن ہے۔ ایسا کم ہوتا ہے کہ کوئی چور عین ارتکاب سرقہ کے وقت یا رُوداد جرم بیان کرتے ہوئے یا مال مسروقہ کو بغل میں دبائے گرفتار ہو جائے۔ لیکن جب کبھی ایسی صورت پیش آجائے تو پھر چور خواہ کتنے ہی حلف اُٹھائے یا سرقہ کے محرکات ور مال مسروقہ کے قبضہ میں آنے کے اتفاقات کی کتنی ہی علتیں بیان کرے عدالت مجبور ہوگی ، ایک بات کو بھی باور نہ کرے اور مجرم کو قانون مروجہ کے رو سے زائد سے زائد سزا جو اُس کے ختیار میں ہو بے تکلف دیدے ۔ خواجہ صاحب، اگرچہ عین ارتکاب جرم کے وقت نہیں گرفتار ہوئے

مگر اُنکے جُرم کی داستان خود اُنکے مصورِ فطرت قلم کی لکھی ہوئی رائے عامہ کی عدالت میں پیش ہو چکی ہے - اب اُنکے بچاؤ کی کوئی تدبیر نہیں - اور اُن جیسے طباع و ذہین شخص کا اتنی سی بات کو نہ سمجھنا اس بات کی دلیل ہے کہ ارحم الراحمین نے جو ڈھیل چھوڑ رکھی تھی اُسکی میعاد ختم ہو گئی - اور منتقمِ حقیقی کی سزا دہی کا وقت آگیا - ان اللہ یمہل ولا یہمل - اب نہ خواجہ صاحب کے حلف اُن کی بیگناہی کا یقین دلا سکتے ہیں نہ اُنکے رفقاء و شرکاء کی عیاریاں وابلہ فریبیاں اس بدنما داغ کو اُنکی پیشانی سے چھڑا سکیں گی - نہ مہذب ڈاکو کا مجرمِ عادی ہونا اُنکی معصومیت کی دلیل بن سکتا ہے اور نہ مولانا محمد علی پر آریوں سے سازباز، لیڈروں سے رقابت، لا مذہبیت، ملت فروشی، اور چندوں کے خورد بُرد کرنے کے انواع و اقسام کے بے حساب الزامات عائد کرنے سے اُنکی قبائے تصوف و عبائے تقدس پاک و صاف ہو جائیں گی -

خواجہ صاحب کی قسمت میں خدا کی لاٹھی سے بچنا لکھا ہوتا تو وہ اس راز کے فاش ہوتے ہی یا تو اعترافِ تقصیر کر کے رائے عامہ سے طالبِ عفو ہوتے یا کم سے کم اس تلخ گھونٹ کو پی جاتے اور کچھ دنوں کے لیے گمنامی و خاموشی میں زندگی بسر کرتے - لوگوں کا حافظہ عموماً بہت کمزور واقع ہوا ہے کچھ عرصہ کے بعد بات آئی گئی ہو جاتی - مگر غرور و انانیت یا حرص و آز نے انھیں اسکی اجازت نہ دی - اور وہ "چوری" کھُل جانے پر اور سینہ زوری کرنے لگے - جس سے نہ صرف اُنکے گناہوں میں اضافۂ کثیر ہوا بلکہ مُلک کے تعلیم یافتہ اور دردمند لوگوں کی نفرت و حقارت میں زیادتی ہو گئی - چنانچہ خود اُنکے اخباروں میں جن بے عقل سادہ لوحوں اور چالاک ہوشیاروں کی بکثرت تحریریں شائع ہوئی ہیں اُنھیں سے ہر شخص نے اندازہ کر لیا ہو گا کہ تعلیم یافتہ، معاملہ فہم اور بے لاگ لوگوں نے کہاں تک اُنکی ہمدردی و غمخواری سے اجتناب کیا —— حالانکہ ان تحریروں کے حصول میں خواجہ صاحب نے ایڑی چوٹی کا سارا زور صرف کر دیا اور بہت ممکن ہے کہ اُن کا بیشتر حصہ بھی اُن کی اپنی دوکان کے کاریگروں کی تخلیق ثابت ہو -

جو اخبارات یا اخباروں اور رسالوں کے اڈیٹر اُنکے لیے سینہ سپر کیے ہوئے ہیں اُنکے متعلق اتفاق سے وہ خود اپنے اخبار منادی میں اعلان کر چکے ہیں کہ تبلیغ فنڈ سے اُنکو ماہوار اور وقتی امداد ملتی رہی ہے - جسکے بعد ایسے لوگوں کی تائید کی کوئی وقعت باقی نہیں رہتی - کیونکہ کچھ لوگوں کو تھوڑے دنوں تک تو دھوکے میں رکھا جا سکتا ہے مگر ساری دنیا نے ہمیشہ کے لیے آنکھوں اور کانوں کو بیکار رکھنے کی قسم نہیں کھائی ہے -

روزانہ اخباروں میں لکھنؤ کا وہ بے حقیقت اخبار جسکے اجراء کا گناہِ عظیم راقم الحروف کے سر ہے خواجہ صاحب کی اگر لیس پوت کر رہا ہے تو کچھ مقامِ تعجب نہیں کہ خود منادی کے اعلان کے بموجب اُسے پچیس روپیہ ماہوار کا وظیفہ تبلیغی راجہ یا مقدس ڈاکو کی سرکار سے ملتا ہے۔ دین و دنیا کے ایڈیٹر کی خوش فہمی کا راز بھی اُس قرطاس الحساب سے بآسانی معلوم ہو سکتا ہے جو تبلیغی جریدۂ درویش میں چھپا کرتا ہے۔ اور ایڈیٹر پیشوا کے متعلق خواجہ صاحب اور پیشوا صاحب دونوں کی تحریریں خود ہمارے پاس موجود ہیں جن سے ظاہر ہوتا ہے کہ خاندانِ حضرت خواجہ باقی باللہ رحمۃ اللہ علیہ کا نام روشن کرنے والا یہ گوہر شب چراغ "علی بابا" کے جتھے کا مستقل رکن ہے اور جس شخص نے اُنکی گندی اور غلیظ تحریریں پڑھی ہیں وہ بآسانی اس حقیقت سے آشنا ہو جائے گا کہ مقدس ڈاکو کی بساطِ شطرنج پر یہ ڈھائی گھر چلنے والا مُہرہ کیا منزلت رکھتا ہے۔ اور یہی صورت تقریباً اکثر مؤیدین و معاونین خصوصی کی ہے جو بجا طور پر علی بابا کے "چالیس چور" قرار دیے جا سکتے ہیں۔ کچھ لوگ شاید ایسے بھی ہوں جو محض خواجہ صاحب کے دامِ ابلہ فریبی کا شکار ہوں یا مولانا محمد علی صاحب سے کبھی کا بدلہ نکالنے کے لیے دانستہ اس جال میں پھنس گئے ہوں۔

خواجہ صاحب نے اگر یہی ارادہ کیا تھا کہ اپنی اشتہار بازی اور پمفلٹ سازی سے وصول اُڑا کر مسلمانوں کو اندھا بنا دیں گے تو اُنھیں صاف انکار کر دینا چاہیے تھا کہ مہذب ڈاکو نے جو خط مولانا محمد علی کو دیا ہے وہ اُنکا نہیں بلکہ مہذب ڈاکو نے کسی اُن سے زائد چالاک جعل ساز سے اُنکو بدنام کرنے اور لوٹنے کی غرض سے لکھوا لیا ہے۔ ممکن تھا کہ خود مولانا محمد علی تھوڑی رد و قدح کے بعد اسے باور کر لیتے کیونکہ شیخ ضیاء الحق اور پوری اپنی پمفلٹ بازی کی وجہ سے بہت ہی ساقط الاعتبار ہیں اور بد اچھا بدنام بُرا کی مشہور مثل کے مطابق خواجہ جیسے "مقدس بزرگ" کے مقابلہ میں اُن پر اعتماد کرنا آسان نہ تھا۔ اور اگر مولانا محمد علی کو ذرا سا بھی شک پیدا ہو جاتا تو غالباً وہ اس تحریر کی اشاعت میں بہت تامل کرتے۔ مگر خدا کی باتیں خدا ہی جانے۔ جب پردہ داری کا دور تمام ہوتا اور پردہ دری کا وقت آ جاتا ہے تو چالاک سے چالاک مجرم کی عقل و ذہانت جواب دے جاتی ہے۔

مقدس ڈاکو کا جو خط "مہذب ڈاکو" نے مولانا محمد علی کو دیا اُسکی عبارت یہ ہے :—

۲۸۶

از درگاہ شریف حضرت محبوب الٰہی - دہلی ۱۲-اگست ۱۹۱۸ء

کرمی - سلام علیکم - دو خط پہونچے - ابھی دو چار دن کی اور مصروفیت ہے اسکے بعد لکھنے کی کوشش کروں گا - لکھائی کا حساب رجسٹر میں دیکھ کر مطلع کروں گا - کیا عجب ہے کہ گورنمنٹ سے لکھا ہو - میں نے چیف کمشنر صاحب دہلی سے مفصل حالات بیان کر دیے تھے اور نظام کو پان اسلام زم کے جو سبق دیے جاتے تھے اُن کی باضابطہ اطلاع دیدی تھی - اور مجھے معلوم ہوا ہے کہ اُنھوں نے پنجاب گورنمنٹ کو اس خطرہ سے آگاہ بھی کیا تھا - (یہ خط بالکل خانگی ہے - اسکو چاک کر دیجیے اور اسکی اطلاع کسی کو نہ دیجیے - یعنی میرے اس کام کی خبر سوائے آپ کے کسی کو نہ ہو)

حسن نظامی

خواجہ صاحب نے اس خط کی اصلیت یا اسکی تحریر سے انکار نہیں کیا ہے، اس لیے اسکے مطالب و منشاء کے بارے میں خواجہ صاحب اور اُنکے چیلے چاپڑوں کی حاشیہ آرائیوں کی حاجت نہیں رہتی - خط یونانی، عبرانی یا قدیم مصری زبان میں نہیں ہے کہ اُس کا مفہوم سمجھنا دشوار ہو - ہر اُردو داں شخص بآسانی اسکا مطلب سمجھ گیا ہوگا - البتہ اگر کوئی اختلاف رائے ہو سکتا ہے تو اس میں کہ یہ مخبری کس کس کے خلاف تھی اور کون کون اس ناوکِ جاسوسی کا ہدف بنے۔

خواجہ صاحب کی تحریر مندرجۂ بالا کو پڑھ کر یہ حقیقت سب سے پہلے اور نمایاں طور پر سامنے آتی ہے کہ خواجہ صاحب نے چیف کمشنر کو مفصل حالات سُنا کر باضابطہ اطلاع دیدی کہ نظام کو پان اسلامزم کے سبق دیے جا رہے ہیں - سبق پڑھانے والا کون ہے؟ اسکا تحریر سے صاف پتہ نہیں چلتا، البتہ پنجاب گورنمنٹ کے حوالے سے ظاہر ہوتا ہے کہ کوئی پنجاب سے تعلق رکھنے والا شخص ہوگا - مگر مخبری کا راز کھلتے دیکھ کر خواجہ صاحب نے اس خیال سے کہ جرم کی اصلی نوعیت پر شاید پردہ پڑ جائے، اس معلم کا نام خود ہی ظاہر کر دیا - ظفر علی خاں صاحب اپنی سابقہ لغزشوں کی بنا پر قوم کی ایک بڑی جماعت کے مغضوب رہ چکے ہیں اور اگرچہ بعد کے دورِ ابتلا

میں اپنی ثابت قدمی اور مسلسل قربانیوں سے انھوں نے بہت کچھ اپنی غلط کاریوں کی تلافی کر دی لیکن مسئلۂ حجاز میں جو اختلافات ۲۵ء اور ۲۶ء میں رونما ہوئے اُنکی وجہ سے بہت سے لوگوں کو آج بھی اُن سے شدید بیزاری و مخالفت ہے۔ اس لیے خواجہ صاحب نے غالباً سمجھا کہ اُنکا نام ظاہر کرکے وہ اپنی شیطنت کو لوگوں کی نگاہوں میں بہت کم وزن اور اس بناپر ناقابلِ لحاظ بنا دیں گے۔ مگر خواجہ صاحب کو یاد نہیں رہا کہ مخبری کرتے وقت پیش نظر مقاصد کی بدولت اُن کا دل نور ایمان سے اور دماغ عقل و ہوش سے قطعًا خالی تھا اسلیے وہ ایک ایسے جرم کا ارتکاب کر بیٹھے جو انسانوں سے ممکن تھا کہ پوشیدہ رہے مگر انسانوں کے خالق سے جو علیم و بصیر ہے مخفی نہیں رہ سکتا تھا۔ اور اس لیے اُسکا داغ ابدالآباد تک اُنکی پیشانی سے نہ چھوٹے گا۔

خواجہ صاحب نے چیف کمشنر کے سامنے ظفر علی خاں صاحب پر ایک ایسا الزام لگایا جو درحقیقت اگر سچا ثابت ہو جائے تو ظفر علی خاں کی تمام لغزشوں کا کفارہ کر دیگا۔ اسلیے کہ کسی تاجدار یا والی ریاست کو اخوت و ہمدردیِ اسلام کا سبق پڑھانا بجاے خود ایک ایسی سعادتِ عظمیٰ ہے کہ اُسکے صلہ میں خدا کے فضل و کرم سے بہترین نعمتوں کی توقع رکھنا چاہیے۔

خواجہ صاحب نے اپنے بیان میں اور اُنکے جتھے کے لوگوں نے اپنی تحریروں میں اس بات کے ثابت کرنے پر ساری قوت صرف کی ہے کہ چیف کمشنر صاحب سے جو کچھ کہا گیا وہ صرف ظفر علی خاں کے خلاف تھا۔ حضور نظام کی شکایت نہ تھی بلکہ حضور نظام کی بھلائی کے لیے یہ زحمت بھی گوارا کی گئی ورنہ کہاں مقدس ڈاکو کی محترم شخصیت اور کہاں اس قسم کی مخبری و شکایت۔ خدانخواستہ وہ یا اُنکے باپ دادا کوئی پولیس کے تنخواہ یاب ملازم تو نہ تھے۔ اب یہ محض اتفاق ہے کہ ۱۹۱۸ء میں ظفر علی خاں سے مقدس ڈاکو محض اس بناپر ناراض تھا کہ وہ دعویدارانِ تصوف کی شان میں گستاخیاں کرتے رہتے تھے۔

مگر ان بدنصیبوں سے کوئی پوچھے کہ جو شخص پان اسلامزم کے سبق پڑھانے کو جرم قرار دے اُسکو اسلام سے بھی کوئی تعلق باقی رہتا ہے۔ کیا دنیا میں اُس سے زیادہ کوئی بدبخت غدارِ ملت ہو سکتا ہے جو خود اپنے مذہب کی بنیادی تعلیم کی اشاعت کو ایک فرنگی کے سامنے جاکر قابل گرفت قرار دے۔ کیا صریح بے دینی و لامذہبیت کے اس مظاہرہ کے بعد بھی حسن نظامی کا یہ منہ ہے کہ اُس خدائے واحد کے نام کی قسمیں کھا کھا کر مسلمانوں کو اپنی معصومیت کا یقین دلائے جسکی تعلیم اخوت کے گلے پر خود اُنکی سرشت کی خباثت اور نفس کی غداری کے ہاتھوں اُلٹی چھری پھیری جا چکی ہو۔

لا حول ولا قوۃ الا باللہ -

یہ تسلیم کیا جا سکتا ہے کہ جسوقت یہ مقدس ڈاکو اپنے آقائے ولی نعمت کے پاس ظفر علیخاں کی شکایت کرنے گیا تھا اُسوقت اسکا یہ منشا شاید نہو کہ رئیس حیدرآباد کو وہ کسی آفت میں مبتلا کرے - لیکن اس سے کون شخص انکار کر سکتا ہے کہ ہوا و ہوس کی بندگی میں اُسکے ہوش و حواس بجا نہ رہے تھے اور جو کچھ اُس نے ظفر علی خاں سے انتقام لینے کی غرض سے دہلی کے فرنگی حاکم کے سامنے گفتگو کی اُسکے عواقب و نتائج پر اُس نے ایک لمحہ کے واسطے غور نہیں کیا - اور وہ ایسا کرتا ہی کیوں - اُس کا تو زندگی بھر پیشہ ہی مسخرگی و عیاری کے سوا کچھ نہیں رہا - اُس نے دیکھا کہ مسلمان مذہب و تصوف کے نام سے زیادہ آسانی و فراوانی کے ساتھ لوٹے جا سکتے ہیں اسلیے اُس نے شروع ہی سے اپنا یہی وطیرہ بنا رکھا تھا - آج جو کچھ وہ اپنی مدافعت میں لکھنے پر مجبور ہے اُس کا سبب تو صرف یہ ہے کہ اُمید کے خلاف اُس اہتمام کے باوجود یہ تحریر جس پر اسلام، ظفر علیخاں، اور نظام حیدرآباد، تینوں کے خونِ ناحق کی مہر لگی ہوئی ہے چھپ نہیں سکی اور اخبار ہمدرد کے افق پر شفق بنکر اُسکی خونخواری و غداری کی ایک عالم میں تشہیر کر رہی ہے - حیدرآباد سے اپنی برات کی فکر اگر ہے تو صرف اس خیال سے کہ وہاں سے اُسکو کثیر آمدنی تھی اور اب اُسکا ہمیشہ کے لیے دروازہ بند ہوا جاتا ہے - مہاراجہ کشن پرشاد کی عنایات بے غایات کے باوجود نظام حیدرآباد کی مخبری کا خون اُسکے چہرہ کو داغدار بنائے رہا تو ظاہر ہے کہ دکن کے بھولے بھالے لوگوں پر اسکا داؤ نہ چل سکے گا -

لیکن درحقیقت اس کا سب سے بڑا قصور یہ نہیں ہے کہ نظام کو یا ظفر علی خاں کو اُسنے نقصان پہونچایا، بلکہ اُس کا اصلی جُرم یہ ہے کہ اُس نے خود اسلام سے غداری کی اور ایک غیر مسلم کے سامنے اُس چیز کو جُرم و معصیت ظاہر کیا جو ایک مسلمان کے لیے بہترین عبادت و نیکی ہونا چاہیے -

ظفر علی خاں صاحب کی شکایت سے اگرچہ مقدس ڈاکو نے انکار نہیں کیا ہے لیکن رئیس حیدرآباد کی خیر طلبی کی آڑ میں وہ اس الزام سے بھی بری ہونا چاہتا ہے - اور اسکی تائید میں فخریہ کہتا ہے کہ

"میں نے مولانا ظفر علی خاں صاحب کی نسبت یہ نہیں کہا کہ وہ بم بنا رہے ہیں، اِنکو پھانسی دیدو - بلکہ یہ کہا کہ انکی صحبت حضور نظام کے لیے مفید نہیں ہے - یہ کہنا بے شک مولانا ظفر علی خاں کے مالی مفاد کے لیے تو مضر ہوا مگر انکو اور کوئی نقصان نہیں پہونچا"

گویا مقدس ڈاکو کے نزدیک کسی شخص کو جب تک وہ پھانسی کے تختے تک نہ پہونچا دے تب تک مخبری کی ملعون خدمت پوری طرح سر انجام نہیں پاتی ـــــ اس سے حضرت محبوب الہیؒ کے اس معنوی خواہرزادہ کی خباثت طینت کا اندازہ کرنا چاہیے کہ ایک مسلمان کو شدید مالی نقصان پہونچانے اور ریاست حیدرآباد سے نکلوا دینے کے باوجود اسے اپنی بہیمانہ شیطنت پر شرم نہیں آتی بلکہ وہ ریاست حیدرآباد کا خیرسگال بنکر اس مکروہ عیب کو بھی اپنے لیے ہنر بنا دینا چاہتا ہے۔ اور سمجھنا چاہیے کہ اگرچہ ابھی تک یہ امر پردۂ خفا میں ہے لیکن اسکو موقع ملا ہوگا تو اس نے مولانا محمد علی اور دوسرے لوگوں کے خلاف جنکو وہ بجائے خود اسلام کا دشمن سمجھتا ہے اس قسم کی خفیہ اطلاعیں بھی ضرور دی ہونگی جنسے مولانا محمد علی اور دوسرے قومی کارکنوں کو مالی نقصان اٹھانے کے بجائے اپنی عزیز جانوں سے ہاتھ دھونا پڑے

کہ خبثِ نفس نہ گردد بسالہا معلوم

اوپر عرض کیا جا چکا ہے کہ چیف کمشنر سے شکایت کرتے وقت ممکن ہے کہ مقدس ڈاکو حضور نظام کو نقصان پہونچانے کا خواہاں نہ ہوا اور یہ زیادہ سے زیادہ حُسن ظن ہے جو اس غدارِ اسلام اور مجسمۂ شیطنت کے ساتھ روا رکھا جا سکتا ہے، لیکن اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ جو کچھ چیف کمشنر سے کہا گیا اُس سے حضور نظام کو نقصان نہیں پہونچا۔

حیدرآباد کے معاملات پر کچھ ایسے تہ بہ تہ پردے پڑے ہوے ہیں کہ کم سے کم راقم الحروف کو اس بارے میں کچھ لکھتے ہوے ضرور پس و پیش ہوتا ہے۔ لیکن اگر کوئی نیا واقعہ نہ بھی پیش آتا اور وہاں کے حالات میں آج بھی ویسا ہی سکون ہوتا جیسا کہ چند سال قبل تھا، تب بھی یہ نہیں کہا جا سکتا کہ نظام کو پان اسلامزم کا سبق پڑھائے جانے کی اطلاع کسی انگریز کو دیجانے تو اس سے انگریزوں کے دلوں میں نظام کی طرف سے کوئی بدگمانی اور سوءظن پیدا نہ ہوگا۔ یہ ایک کھلی ہوئی حقیقت ہے کہ یورپ کے مدبرین عموماً اور انگریز خصوصاً پان اسلامزم سے حد درجہ بیزار اور خوفزدہ ہیں۔ چنانچہ مقدس ڈاکو نے خود اپنے بیان میں اعتراف کیا ہے کہ

"پان اسلامزم کی تحریک یورپ کی گوری قوموں کو خوفناک ہوا، اور گوری اقوام کو نگل جانے والا اژدہا نظر آنے لگی"

جو چیز انگریزوں کے خیال میں کہ وہ بھی گوری قوم ہونے کا فخر رکھتے ہیں، اژدہا نظر آتی ہو اُسکے سبق اگر اُنکے کسی یار وفادار کو دیے جاتے ہوں اور اُسکی اطلاع ایک ایسا مخبر پہونچائے

جو دنیا کو باور کرانا چاہتا ہے کہ وہ بانیِ اسلام علیہ السلام کا نواسہ ہے اور اُنکے مقربین بارگاہ سے قرابتِ قریبہ کے تعلقات اختصاصی رکھتا ہے تو ظاہر ہے کہ انگریزوں کے دلوں میں اپنے یاروفادار کی طرف سے حسنِ ظن نہ بڑھے گا بلکہ وہ اگر اپنے یار وفادار کے دشمنِ جانی نہ بن جائیں جب بھی اس میں ذرا شک نہیں کہ اُنکے دلوں میں بدگمانی اور خوف کا جاگزیں ہو جانا بالکل یقینی ہے۔ اور یہی وہ سب سے بڑی اسلامی خدمت ہے جو مقدس ڈاکو کے ہاتھوں انجام پا سکتی تھی۔

حسن نظامی کا یہ خط بہت مختصر ہے۔ چیف کمشنر صاحب سے مفصل گفتگو ہونے کا ذکر اسمیں موجود ہے اور ہر شخص اندازہ کر سکتا ہے کہ چند سطروں کے خط میں جب اس قدر زہر بھرا ہوا ہے کہ خود راقم تحریر کی دلی تمنا یہ ہے کہ خط پڑھ کر فوراً چاک کر دیا جائے اور کسی کو اطلاع نہ ہونے پائے، تو مفصل گفتگو میں خدا معلوم ظفر علی خاں اور حضور نظام کے تعلقات کو کس کس پیرایہ سے بیان کیا گیا ہوگا۔ اور چیف کمشنر نے پان اسلامزم کے اژدہے سے خوف کھا کر اللہ ہی بہتر جانتا ہے کہ گورنر جنرل اور پنجاب کے لاٹ صاحب کو دونوں کے خلاف کتنا بھرا ہوگا۔

قیاس کن ز گلستانِ من بہارِ مرا

الناظر کے نئے دور میں، جو جنوری ۱۹۲۷ء سے شروع ہوتا ہے، ذاتی افکار و تردداتِ اور مشاغل کے ہجوم و کثرت نے اس کا موقع نہیں دیا کہ خواجہ صاحب کے اُن کارناموں پر کوئی تبصرہ کیا سکتا جنکی بدولت مولانا محمد علی نے اُنکو تبلیغی راجہ کا لقب عطا فرمایا ہے۔ اسکے یہ معنی نہ سمجھے جائیں کہ خواجہ صاحب کی بازیگریوں اور شعبدہ بازیوں پر ہماری نظر نہیں رہی یا خدانخواستہ خواجہ صاحب نے اس عرصہ میں پارسائی کی قسم کھالی تھی۔ اب جو یہ سلسلہ چھڑ گیا ہے تو خدا نے چاہا خواجہ صاحب کے اس نئے اور بظاہر نہایت کامیاب سوانگ سے بھی ناظرینِ الناظر روشناس ہو جائیں گے۔ وما توفیقی الا باللہ

ظفر الملک

۲۲ - جنوری ۱۹۲۷ء

پچھلے مہینے کے رسالے

دلگداز

نومبر کے دلگداز میں مولانا عبدالحلیم شرر (مرحوم) کا ایک پُرمغز مضمون "اسلام اور فلسفہ کا سابقہ" کے زیرعنوان شایع ہوا ہے، جس میں قوم کو ایک بڑے خطرہ سے متنبہ کرکے مناسب مشورہ دیا گیا ہے۔ ناظرین الناظر کی اطلاع کے لیے یہاں اُسکا اندراج ضروری معلوم ہوتا ہے:۔

"یورپ میں مسیحیت کا نشاء ثانیہ ظہور پذیر ہوا تو اُنھوں نے اُن علوم (علوم معقول و فلسفہ) کو مسلمانوں سے لیکر رواج دینا شروع کیا تو وہی فتنہ جو اُنھوں نے پروپگنڈا کرکے اسلام میں پیدا کرنا چاہا تھا خود مسیحیت میں پیدا ہوگیا۔ سچ یہ ہے کہ اُس نے مسیحیت کو بالکل پامال کرڈالا۔ فی الحال دین عیسوی برائے نام اور ایک طرزِ معاشرت کی حیثیت سے موجود ہے مگر اُسکی سچائی پر یقین شاذونادر ہی وہاں کسی کو ہو ......

جو علوم مسیحیت کو مٹا چکے اب اسلام کو مٹا رہے ہیں۔ علماے اسلام نے اس آفت سے بچنے کے لیے جو کچھ کیا صرف اسی قدر ہے کہ اپنے چند جداگانہ مدارس قائم کردیے مگر اس سے انگریزی پڑھنے والوں پر کیا اثر پڑ سکتا ہے؟ بلکہ جو خلیج انگریزی اور اسلامی تعلیم کے درمیان ہے روز بروز زیادہ وسیع ہوتی جاتی ہے اور فرزندان اسلام کے دو متمائز و متضاد گروہ تیار ہوتے جاتے ہیں، جو دونوں ایک دوسرے کو ذلیل اور جاہل تصور کرتے ہیں۔ ایک دین پرست ہے اور ایک سائنس پرست۔

علما اور دیندار اُمرا کا فرض ہے کہ اس مشکل کو حل کریں ورنہ نہایت خراب نتیجوں کے برآمد ہونے کا قطعی اندیشہ ہے"

زمانہ

نومبر کے زمانہ میں سید اطہر حسین جعفر (مرزاپوری) نے ایک دلچسپ مضمون عراق کے آثار قدیمہ پر سپرد قلم فرمایا ہے۔ مضمون کے آخری حصہ میں تلاش آثار کی تاریخ اختصار کے ساتھ بیان کردی گئی ہے۔ اس دلچسپ حصہ کا اقتباس لاحظہ فرمایئے:۔

"اہل برطانیہ کو بابل کے آثار قدیمہ کی طرف توجہ دلانے کی ابتدا ایسٹ انڈیا کمپنی کی جانب سے ہوئی تھی۔ چنانچہ کمپنی مذکور نے رزیڈنٹ متعینہ بصرہ کو حکم بھیج کر وہاں کی اینٹوں کے نمونے لندن میں منگوائے تھے۔ لیکن جس شخص نے کہ اول اول بابل اور نینوا میں تحقیقات کی بنیاد ڈالی وہ ایسٹ انڈیا کمپنی کا رزیڈنٹ متعینہ بغداد تھا۔ جسنے ۱۸۲۱ء میں بعارضۂ ہیضہ شیراز میں انتقال کیا۔ اسکے بعد دیگر شاہیر مثلاً کرپورٹر، چزنی، رالن سن، لیبرڈ، جارج اسمتھ، رسام، اورکنگ وغیرہ اُنھیں کے نقش قدم پر چلے۔

اہل جرمنی کی جانب سے تحقیقات کی ابتدا ۱۸۹۶ء میں مقام سرغول اور الجبہ میں ہوئی جو تلو سے بالکل نزدیک ہے۔ لیکن کالڈیوی نے بابل کے ویرانوں کے کھودنے کی ابتدا ۱۸۹۹ء میں کی جسکا نتیجہ یہ ہوا کہ بنوخذ نضر (۵۶۲-۶۰۴ ق م) شہر کا ایک بہت بڑا حصہ برآمد ہوا۔

۱۸۸۸ء میں اہل امریکہ نظر آئے جہاں اُنھوں نے کھدائی کا کام نہایت جانفشانی سے شروع کیا اور اگرچہ درمیان میں اکثر رکاوٹیں پڑیں لیکن پھر بھی بہت درجہ کامیاب رہے، مگر جنگ چھڑتے ہی اُن کا کام بالکل رُک گیا۔

پچھلی نصف صدی میں ترکی حکومت کی بدولت عراق کی وہ حالت ہوگئی کہ سائنس داں کی تحقیق اور تفتیش کے کاموں میں بیحد دشواریاں پڑنے لگیں .... جس وقت کہ پاسے صاحب خورس آباد کے ٹیلوں کو کھدوا رہے تھے اُنکو زرکثیر صرف کرکے بلیاں منگوانی پڑیں تاکہ مدفون شہر کی دیواروں کو اُنکے سہارے سے کھڑا رکھا جائے۔ لیکن افسوس ہے کہ قرب وجوار کے قریوں کے باشندے ایک ایک کرکے اُن لکڑیوں کو چُرالیگئے۔ جسکی وجہ سے دیواریں مسمار ہوگئیں۔ ترکی گورنر کا خیال تھا کہ پاسے صاحب سونا نکالنے کی فکر میں ہیں۔ چنانچہ اُسنے وہاں پہرہ لگا دیا۔ اور جب سونا نہ نکلا تو پاسے صاحب کے آدمیوں کو قید کردیا ....

اسی پر مصیبت کا خاتمہ نہیں ہوا البتہ بہت سے عجائب روزگار جو خورس آباد میں نکلے تھے مع ۶۰ عدد صندوقوں کے جن میں اشوربنی پال کے محل واقع قیونجق سے برآمد شدہ چونے کی تصویریں تھیں، دجلہ میں کشتی کے غرق کردیے جانے کی وجہ سے ضایع ہوگئے۔ علاوہ اسکے وہ سارا سامان جو آبرٹ صاحب نے بابل میں کھود کر نکالا تھا یا اوروں سے مول لیا تھا مع عہد نرم سین (۳۷۵۰ ق م) کی قیمتی سنگ مرمر کی چھوٹی سی کشتی کے فرات دریا کے قریب بصرہ جاتے ہوئے غرقاب ہوگیا۔

اہل امریکہ کو مقام نفر میں بڑی بڑی مصیبتیں جھیلنی پڑیں۔ ایک مرتبہ تو عربوں نے یہ غضب ڈھایا کہ اُنکے کیمپ میں آگ لگادی۔ جس سے نصف سے زیادہ گھوڑے جلکر مرگئے۔ اور ایک ہزار ڈالر نقد عربوں کے ہاتھ آئے۔ بدیں وجہ کچھ عرصہ تک کھدائی کا کام ملتوی رہا۔ لیکن غنیمت ہوا کہ برآمد شدہ اشیاء سب بچ گئیں۔

اگر ملک عراق کی یادگاروں کو محض سطحی نظروں سے دیکھا جائے تو بھی یہ پتہ چل جائیگا کہ مورخین، علماے آثار قدیمہ، سیاحوں اور مسافروں کے لیے قدیم اور دلچسپ اشیاء کا کتنا بڑا ذخیرہ یہاں موجود ہے۔"

معارف

گذشتہ ماہ میں مولانا سید سلیمان ندوی کے مضمون "حجاز کے کتبخانے" سے مکہ معظمہ کے ایک مشہور کتبخانے کا کچھ اقتباس درج کیا گیا تھا۔ ابکی بار اُسی مضمون کی دوسری قسط

سے مدینہ منورہ کے مشہور ترین کتبخانے کا کچھ بیان پیش کیا جاتا ہے۔ یہ کتبخانہ مسجد نبوی سے متصل باب جبرئیل کے قریب قبلہ کی سمت میں واقع ہے اور عارف حکمت بے کا کتبخانہ کہلاتا ہے:-

"کتبخانے کے کمرے کے باہر والی دیوار پر عربی، فارسی، ترکی کے مختلف قطعات اور رباعیاں نہایت خوشخط وصلیوں پر لکھی ہوئی آویزاں ہیں۔ قدیم ترکی سلطنت، حجاز ریلوے اور مسجد نبوی کے نقشے بھی آویزاں ہیں۔ قطعات میں بعض قطعے خود شیخ الاسلام عارف حکمت بے کے طبعزاد ہیں منجملہ ان عربی، فارسی، اور ترکی کے منظومات کے یہ دیکھ کر کسقدر تعجب ہوا کہ ان میں ایک اردو کی نعتیہ غزل بھی کاغذ پر خوشخط لکھی ہوئی شیشے میں جڑی ہوئی آویزاں تھی۔ سینچے اردو کے اس خوش نصیب شاعر کا نام دیکھ کر اور تعجب ہوا کہ یہ دکن کے ہندو نام اور اسلام دل صوفی شاعر مہاراجہ کشن پرشاد (مدار المہام دولت آصفیہ) تھے۔ مطلع اور مقطع یہ ہے:-

یہی کہتے ہیں مدح خوانِ محمدؐ   جو شانِ خدا ہے وہ شانِ محمدؐ

شفاعت تری شاد کیونکر نہ ہوگی   کہ دل سے ہے تو مدح خوانِ محمدؐ

کتبخانے کے واقف عارف حکمت بے تیرہویں صدی کے مشہور ترک علما میں تھے ...... انھوں نے یہ زمین خریدی، اس پر یہ مختصر سی مگر نہایت صاف اور نکھری ہوئی عمارت بنوائی۔ کتابوں کے بڑے شائق اور عاشق تھے۔ اپنی جائداد کا بڑا حصہ انھوں نے ان پر صرف کیا تھا۔ یہ کتابیں اسی عمارت میں رکھیں۔ پھر مقدونیہ اور ایشیائے کوچک میں اپنی جائداد اس کتبخانے کی بقا و ترقی کے لیے وقف کی .... کتبخانے میں عربی، فارسی، ترکی کی کتابیں ہیں، زیادہ تر حصہ عربی کتابوں کا ہے۔ جلدوں کی تعداد مجھے سترہ ہزار بتائی گئی۔ ہر کتاب عمدہ جلد بندھی ہوئی، صاف ستھری، اور خوشخط ہے۔ اکثر کتابیں غیر مطبوعہ اور قلمی ہیں اور مختلف علوم وفنون سے متعلق ہیں .... کتبخانے میں قدامت کے اعتبار سے جسکی تاریخ معلوم ہے سب سے پرانی کتاب غالباً حضرت ابن عباسؓ کی روایاتِ تفسیر، جو تفسیر ابن عباس کے نام سے ملتی ہے، اُنکے آخری چند اوراق ہیں۔ یہ سورۂ فلق اور الناس وغیرہ آخری سورتیں ہیں۔ ختم پر اُسکی کتابت کی تاریخ سہ شنبہ ۱۲۔ رجب المرجب ۳۱۶ھ مرقوم ہے۔ یہ ہرن کی کھال کے کاغذ پر لکھی ہوئی ہے۔ ہرن کی کھال کو اس قدر رنگیلا اور چکنا کیا گیا ہے کہ موٹا کاغذ معلوم ہوتا ہے۔ قرآن مجید کا ایک چھوٹی تقطیع کا نسخہ ہے جو پورا شترمرغ کی کھال کے کاغذ پر ہے۔ ابتدائی اوراق ضایع ہو گئے ہیں تو وہ ہرن کی کھال پر لکھکر لگا دیے گئے ہیں۔ شترمرغ کی کھال کا کاغذ نہایت باریک ہے۔ اُس کا خط کوفی ہے اور اعراب اور شاید نقطوں سے بھی خالی ہے۔ کسی نے بعد کو سیاہی سے اُس پر اعراب اور نقطے لگا کر اُس کی خوبی کو برباد کیا ہے۔ سال تاریخ اُس پر بھی ہے

الناظر

مگر کسی نے پہلے صفحے پر لکھدیا ہے کہ بخط عثمانؓ - یہ صحیح ہو یا نہ ہو مگر اعراب اور نقطوں کے سبب سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ اعراب اور نقطوں کی ایجاد کے پہلے لکھا گیا ہوگا اعراب اور نقطے حجاج کے زمانہ میں لگائے گئے ہیں"

ہمایوں

نومبر کے ہمایوں میں مسٹر حامد حسین اعظمی نے محمد تغلق پر ایک محققانہ مضمون تحریر فرمایا ہے جس میں محمد تغلق پر جو الزامات لگائے جاتے ہیں اُن کا نہایت مدلل جواب دیا گیا ہے لائق مضمون نگار نے محمد تغلق پر الزام عاید کیے جانے کی یوں توجیہ کی ہے:-

"جس طرح سترہویں صدی میں انگلستان میں وگ (Whig) اور ٹوری (Tory) کے نام سے ملک میں دو جماعتیں قائم تھیں جن کے اختلاف نے ملک میں شور و شر برپا کر رکھا تھا بعینہ محمد تغلق کے دوران حکومت میں ہندوستان میں بھی دو جماعتیں تھیں جو سلطنت کی باگڈور کو دو متضاد سمتوں میں کھینچ رہی تھی - ایک جماعت اُن لوگوں کی تھی جنکا خیال تھا کہ ہندو یا مسلمان، پارسی یا یہودی، جو بھی حکومت کے فرائض انجام دینے کی صلاحیت رکھتا ہو اچھے سے اچھے عہدے پر جسکو وہ بخوبی نباہ سکتا ہو مقرر کیا جائے اس جماعت کا سب سے بڑا رکن خود محمد تغلق تھا ..... دوسری جماعت اُن ولائتیوں کی تھی جو چاہتے تھے کہ جتنی طرفداری ممکن ہو پردیسی مسلمانوں کے ساتھ برتی جائے - "خطرناک" ہندیوں کو ملک کے کسی انتظام میں حصہ نہ دیا جائے - اسی جماعت کے نمک خواروں میں سے برنی بھی تھا، جو اپنے وقت کا سب سے معتبر مورخ مانا جاتا ہے - ظاہر ہے کہ محمد تغلق کا انتظام سلطنت برنی کی خواہش کے مطابق نہ تھا اور یہ محمد تغلق کی سب سے بڑی بدنصیبی ہے کہ اُسکے عہد کا بہترین مورخ برنی ہے - ع ولیکن قلم در کفِ دشمن است؎

انصاف پرست مورخ اُسکو ظالم و بے رحم بتاتا ہے کیونکہ اُس نے خراج میں اضافہ کیا، دار الخلافہ کی جگہ بدل دی، تانبے کے سکّے جاری کیے - اور ظلم تو یہ ہے کہ وہ اُسکو سخی بھی کہتا ہے - مگر اسی سخاوت کو عنوان بناکر جس قدر اُسکی بُرائی کر سکتا ہے نہایت صفائی کے ساتھ بیان کر جاتا ہے - اسکی انصاف پرستی کا سب سے بڑا ثبوت یہ ہے کہ اس نے کہیں بھی یہ نہیں کہا کہ وہ کسی قدر مصنف مزاج یا کسی قدر جو یاے علم و عمل بھی تھا - اسکے یکطرفہ فیصلے کا یہی نتیجہ ہوا اور یہی ہونا بھی چاہیے کہ بہت سے مورخین کو سونے میں سُہاگہ ملانے کا اچھا موقع ہاتھ آگیا"

آگے چل کر دوآب پر خراج بڑھانے کے الزام کا یہ جواب دیا ہے:-

"محمد تغلق نے صرف دوآب بنارس اور دوآب دریاے سندھ و گنگا ہی میں خراج کا اضافہ کیا تھا اور کہیں اس تغیر کا اثر نہ ہوا اس موقع پر سوال یہ ہے کہ کیا

محمد تغلق کی حکومت ان تمام ضروریات سے بے نیاز تھی جن سے مجبور ہو کر آج کی متمدن سے متمدن حکومت آئے دن رعایا کی جیبیں ٹٹولتی ہے۔ اگر وہ بے نیاز نہ تھا اور یقیناً نہ تھا تو یہ بتاؤ کہ علاقہ دوآب سے نہیں تو اور کہاں کے لوگوں سے یہ خراج لیا جاتا۔ کیا چٹیل میدانوں اور ریگستانی علاقوں سے؟ اگر یہ سچ ہے کہ ٹیکس زیادہ تر زرخیز مقامات ہی کے لوگوں پر بڑھایا جاتا ہے تو اب اس سوال کی گنجایش ہی نہیں کہ دوسری جگہ خراج کیوں نہیں بڑھا۔ سب سے اہم بات جو ہمیں یاد رکھنی چاہیے یہ ہے کہ اتنا خراج نہیں بڑھایا گیا تھا کہ رعایا کسی حالت میں ادا نہ کر سکتی۔ لیکن بادشاہ و رعایا دونوں کی بدقسمتی سے اسی سال قحط پڑ گیا۔ رعایا مجبور ہو گئی اور خراج کے ادا کرنے میں دشواریاں پیش آئیں ورنہ بذاتِ خود خراج میں اضافہ کرنا جبکہ حکومت کو اسکی ضرورت ہو نہ تو کوئی عیب ہے اور نہ کوئی ظلم۔ یہ تو ایک منحوس موقع تھا جو آخر الذکر جماعت کو خوش قسمتی سے مل گیا جسکی بنا پر انھوں نے ملک میں جا بجا بغاوتیں پھیلانے کی کوشش کی اور جب "ناکامی کا منہ دیکھنا پڑا تو جنگل کو بھاگ کھڑے ہوئے مگر محمد تغلق نے ان مفسدوں کو گھیر لیا اور "شاہی تعزیرات" کے مطابق سزائیں دیں۔ غالباً یہ بعض مورخین کی دانستہ غلط فہمی ہے کہ محمد تغلق نے اپنی بھاگی ہوئی معصوم رعایا کو تباہ و برباد کرنے کی غرض سے یہ فوج بھیجی تھی۔ بادشاہ کو اپنی مصیبت زدہ، بیگناہ، اور امن پسند رعایا کا اتنا خیال تھا کہ اُس نے چار مہینے تک خیرات کا سلسلہ جاری رکھا۔ جسکے باعث غربا اور مفلسوں کا طبقہ زمانۂ قحط کو قحط نہ سمجھ سکا۔ رہے کسان جو خیرات نہ لے سکتے تھے اُنکو آیندہ فصل کی ترقی اور عمدہ فصل کی غرض سے سلطنت نے تقاوی تقسیم کی۔ اس سے ہم تو یہی نتیجہ نکالتے ہیں کہ اُس نے فوج بھیجی تو مفسدین کے خلاف اور پُرامن رعایا کی ہر طرح مدد کی، لیکن برنی اور برنی کے غیر متعصب، بے لوث اور انصاف پسند شاگرد بتائیں کہ یہ محمد تغلق کے استغنا و کبر کبیر کا نتیجہ ہے؟"

نگار

انگلستان کے ایک ادیب مسٹر الڈونس نے سیر ہندوستان کے بعد "دی نیشن اینڈ ایتھینیم" میں تاج کے متعلق اپنے خیالات کا اظہار فرمایا ہے۔ سارے مضمون کا ماحصل یہ ہے کہ (۱) عمارت سستی کاریگری کا نمونہ ہے (۲) چاروں مینار نہایت غیر موزوں بنائے ہیں (۳) تخیل کی فراوانی اس میں نہیں ہے (۴) اُسکے نقش و نگار غلط ہیں۔ نومبر کے نگار میں حضرت نیاز نے ان الزامات پر مختصر تبصرہ فرمایا ہے۔ اور مشرقی "ہندسۃ البناء" کے ماہروں کو مسٹر اولڈنس کے خیالات کی تنقید کی دعوت دی ہے۔ فی الحال حضرت نیاز کے تبصرہ کا اقتباس ملاحظہ فرمایئے (حالانکہ یہ بہت غیر مکتفی ہے):-

"پہلے اعتراض کے متعلق میں نہیں کہہ سکتا کہ مسٹر اولڈنس کا بیان کہاں تک صحیح ہے

کیونکہ اول تو اندر سے کھود کر میں نے دیکھا نہیں اور اگر دیکھا بھی ہوتا تو بھی میں نہ سمجھ سکتا تھا کہ اسکو سستی کاریگری کا نمونہ سمجھوں یا بیش قیمت عرق ریزی کا - علی الخصوص اُسوقت جبکہ تاریخ سے یہ امر پوری طور پر ثابت ہو چکا ہے کہ اُس عہد میں جبکہ محنت و مادّہ دونوں ارزاں اور بہت ارزاں تھے اسپر موجودہ سکّے کے لحاظ سے لاکھوں روپے صرف ہوے تھے - میناروں کی مخروطی شکل کو ناموزوں سمجھنا اُنکو نامناسب حد تک تپلا ظاہر کرنا اُنکے برآمدوں یا چھجّوں کو بدنما بتانا اگر اسکا تعلق نظر اور ذوق سلیم سے ہے تو ہمیں تعجب نہیں کیونکہ ہمارا روز کا مشاہدہ ہے کہ وہی چیزیں جو دنیا کے اکثر افراد کو اچھی معلوم ہوتی ہیں بعض کے نزدیک بُری ہوتی ہیں - لیکن اس سے نفس تاج کی تعمیر پر کوئی حرف نہیں آسکتا -

....

یہ صحیح ہے کہ تاج میں تخیل کی فراوانی نہیں ہے اور نہ ہو سکتی تھی، فاضل نقاد نے اس امر پر غور نہیں فرمایا کہ یہ عمارت مقبرہ کی ہے اور قبر یا مزار کے ساتھ انسان کا جو خیال وابستہ ہوتا ہے وہ جدت پسند نہیں ہوتا اور نہ اُسکو تنوع کی ضرورت ہوتی ہے - اس کا تعلق اک ایسے انعطاف سے ہوتا ہے جو صرف تشائم ہے اور اس میں بہار کی رنگینی مجلس نشاط کی چہل پہل کی جستجو کرنا یقیناً نقاد کی بے بصیرتی پر دلالت کرتا ہے -

رہا یہ امر کہ نقش و نگار غلط ہیں، ممکن ہے اس الزام میں کچھ صحت ہو، کیونکہ جن پھولوں کو بیلوں کو پچی کاری کے ذریعے سے دکھایا گیا ہے اُن میں وہ سایہ دکھانا جو اُسکو حقیقی پھول یا بیل کی صورت دیسکے ناممکن تھا - لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ اُبھرے ہوے پھولوں کو بڑی حد تک اصل کے مماثل بنایا گیا ہے اور سترہویں صدی کی عمارتوں میں مشکل سے کوئی عمارت ایسی نظر آسکتی ہے جس میں اس درجہ فن و نزاکتِ نقش کا لحاظ رکھا گیا ہو"

جامعہ

اُردو رسائل کے خلافِ دستور جامعہ نے اپنے نومبر نمبر میں مولوی سعید انصاری کے قلم سے اورینٹل کانفرنس کے مفید خطبۂ صدارت کا ترجمہ شایع کیا ہے - جناب صدر شمس العلماء ڈاکٹر جیون جی جمشید جی مودی، مہابھارت کے مطالعہ کی تاریخ پر بحث کرتے ہوے فرماتے ہیں :—

"پونہ میں جس طرح کا عملہ ادارت بنایا گیا ہے اُسی طرح کا ایک عملہ آج سے تین سو برس پیشتر شہنشاہ اکبر نے بھی مہابھارت کی تالیف و ترجمہ کے لیے قائم کیا تھا - اس دور اندیش بادشاہ کا خیال کم و بیش ویسا ہی تھا جیسا کہ میکس مولر نے ظاہر کیا ہے - یعنی یہ کہ تمام ہندوستانیوں کو مہابھارت پر فخر کرنا چاہیے اور اسکے متعلق ہر شخص کو کچھ نہ کچھ واقفیت رکھنی چاہیے - چنانچہ اسکی کوشش یہ تھی کہ مہابھارت کے مضامین تمام فارسی بولنے والوں تک پہونچ جائیں - ابوالفضل اور بدایونی نہایت تفصیل کے ساتھ اکبر کے اس شوق کا ذکر کرتے ہیں جو اُسے ہندوؤں کی اس اہم کتاب کے متعلق تھا اور جس کا نام اُس نے "رزم نامہ" رکھا تھا - ابوالفضل نے ہندوستان کے علوم و فنون کے متعلق بہت کچھ لکھا ہے -

انھوں نے یہاں کے فلسفہ کے نو دس مذاہب کا بہ تفصیل ذکر کیا ہے - غرض ہم کو ابوالفضل کی "آئین اکبری" اور بدایونی کی کتاب "منتخب التواریخ" سے پتہ چلتا ہے کہ اکبر نے مہابھارت کا فارسی میں ترجمہ کرنے کے لیے ایک عملہ تیار کیا تھا جس میں یہ اشخاص شریک تھے : نقیب خاں - مولانا عبدالقادر بدایونی ، شیخ سلطان تھانیسری ، ملا شیری ، اور شیخ فیضی - ترجمہ کا پورا کام ان اشخاص میں تقسیم کر دیا گیا تھا اور اسکی نگرانی اور دیکھ بھال کا کام خود یہ بیدار مغز بادشاہ انجام دیتا تھا - ان میں سے ایک کے سوا کوئی بھی ایسا نہ تھا جو اچھی طرح سنسکرت جانتا ہو ، لہذا انکی امداد کے لیے انھیں لایق پنڈت دیے گئے - یہ پنڈت سنسکرت کی عبارت کو سمجھاتے جاتے اور یہ اس کا ترجمہ کرتے جاتے تھے - بعض وقت اکبر خود بول اٹھتا اور بتاتا کہ پنڈتوں کے مفہوم کو فارسی میں بہتر طریقہ پر کس طرح ادا کرنا چاہیے - وہ اس اہم کام میں کم سے کم چار سال برابر لگے رہے جسکے متعلق ان ارکان میں سے ایک کا بیان ہے کہ " حرفِ دہ ہزار سالہ را بزبان حال موافق می سازم "۔

شہنشاہ اکبر کی اس کوشش کے متعلق میں نے یہاں اس قدر تفصیل کے ساتھ اس وجہ سے ذکر کیا ہے تاکہ میں اس بڑے کام کے لیے جسے اکبر اور میکس مولر جیسی دو بڑی شخصیتوں نے اس قدر سراہا ہے ، آپ سے اپیل کروں - ایرانی فضلا بھی مہابھارت سے بہت کچھ دلچسپی رکھتے ہیں اس وجہ سے کہ اس کے بعض واقعات شاہنامہ سے ملتے جلتے ہیں - انکی شاہنامہ گویا ایران کی مہابھارت ہے - کہا جاتا ہے کہ اکبر کی توجہ مہابھارت کی طرف اسوقت سے منعطف ہوئی جبکہ وہ اپنے ہاں شاہنامہ سنا کرتے تھے "

شمع

اکتوبر و نومبر کا شمع ایک ساتھ شائع ہوا ہے - اس نمبر میں " محمود کی سیرت اور کارنامے " پر پروفیسر محمد حبیب کا عالمانہ مضمون جو انگریزی میں لکھا گیا تھا ، بعد ترجمہ شائع کیا گیا ہے جس میں یہ ثابت کیا گیا ہے کہ محمودی حملوں کی غرض مذہبی نہ تھی - ملاحظہ ہو :-

" غزنوی فوج مجاہدین کا اجتماع نہ تھی جو مذہب کی خاطر لڑنے پر آمادہ ہوتی - وہ تو تربیت یافتہ ماہرین فن کی بھرتی شدہ تنخواہ دار فوج تھی جو ہندو مسلمانوں سے یکساں لڑنے کے عادی تھے - صرف ...... دو حملوں میں رضاکاروں کا وجود پایا جاتا ہے اور وہ بھی اس قدر قلیل تعداد میں کہ افواج باقاعدہ کے مقابلہ میں انکا شمار فضول ہے - علاوہ ازیں تیز گامی اور باقاعدگی کے ساتھ دھاوے مارنے میں بھی جیسا محمود چاہتا تھا وہ اسکے کام کے نہ تھے - سلطان میں بھلا جمہوری مشیر ہونے کی صلاحیت کہاں تھی کہ وہ جوش مذہبی سے لبریز افواج کی کمان اپنے ہاتھ میں لیتا ، اور نہ کبھی اس نے اسکا بیڑا اٹھایا - محمود میں وہ تبلیغی جوش قطعاً مفقود تھا جس کی وجہ سے وہ بیشمار " بہشت نصیب " ارواح کی قسمت پر غم سے دو آنسو بہاتا ، یا ہندوستان کو دین محمدی کی اشاعت کے لیے زرخیز میدان کی حیثیت

سے دیکھتا۔ اُس کا نصب العین بہت ہی حقیر تھا جو آسانی سے حاصل ہو سکتا تھا۔ وہ تو صرف اس پر قانع تھا کہ کافروں کا مال و متاع چھین لے۔ اُس نے کبھی لوگوں کو تبدیلِ مذہب کے لیے مجبور نہیں کیا اور ہندوستان کو بعینہٖ اُسی حالت کفر میں چھوڑا جس میں پایا تھا۔

.... ہندوستانی مناور میں بھی یورپ کے کلیسا ے روم کی طرح یہ ممکن نہیں تھا کہ کسی طاقتور من چلے کو تصرف بیجا کی تحریص سے باز رکھا جا سکتا اور نہ اسی کی توقع کیجا سکتی تھی کہ محمود جیسی سیرت کا شخص اپنے آپ کو حصول زر سے روکتا، محض اس خاطر کہ اسلام مذہبی رواداری کی تلقین کرتا ہے ورانحا لیکہ اُسکا دل دولت کی طرف اس طرح جاتا تھا جیسے مقناطیس کی طرف لوہا کھنچ آتا ہے ...... اس زمانہ کے معاصرین کے نزدیک دشمن کی عبادت گاہ کو برباد کرنا جنگ کا جائز فعل خیال کیا جاتا ہے اور یہ شکست کا بدیہی نتیجہ ہوا کرتا تھا .... اُس نے اُنکو ایک ایسا مذہب قبول کرنے پر مجبور نہیں کیا جس پر اُنکا اعتقاد نہیں تھا۔ اُسکے ہندوستانی سپاہیوں کو دارالخلافہ غزنین میں سنکھ بجانے اور بتوں کی پرستش کرنے کی مکمل آزادی تھی۔ مذہبی رواداری کا اصول جس محدود شکل میں اُسوقت رائج تھا محمود بھی اُسکا قائل تھا۔ محمود کو یہ الزام دینا کہ وہ اپنے ماسبق یا آیندہ پشتوں کے اخلاقی معیار تک نہیں پہونچ سکا کارِ عبث ہوگا۔"

"سید"

رسید کتب

(۱)	سیرت ازواج النبی	مولانا عبد الرؤف قادری	کمالی پریس کلکتہ۔ قیمت	۲ر
(۲)	کائنات روحانی	مولانا سید مناظر احسن گیلانی	کتبخانہ القاسم دیوبند "	۵ر
(۳)	دشنیت و شکنتلا	اقبال ورما سحر ہتگامی	زمانہ بک ایجنسی کانپور	۸ر
(۴)	قواعد اُردو (طبع ثانی)	مولوی عبد الحق بی اے	انجمن ترقی اُردو اورنگ آباد	عہ ر
(۵)	انتخاب کلام میر	"	"	عہ ر
(۶)	مثنوی خواب و خیال	خواجہ سید محمد میر اثر	"	۸عہ ر

اُردو رسائل کے خاص مضامین

(نومبر ۱۹۲۶ء)

دلگداز۔ لکھنؤ

(۱) اسلام اور فلسفہ کا سابقہ

معارف۔ اعظم گڈھ

(۱) حجاز کے کتبخانے
(۲) ارتقائے ادب فارسی
(۳) غار ایلورا

زمانہ۔ کانپور

(۱) عراق کے آثار قدیمہ
(۲) کربلا (ڈرامہ)

ہمایوں۔ لاہور

(۱) محمد تغلق
(۲) ایثار (افسانہ)

نگار۔ بھوپال

(۱) میر تقی میرؔ اور خارجی حالات کی ترجمانی
(۲) تاج بدترین عمارت ہے۔

جامعہ۔ دہلی

(۱) ہندوستان اور علوم مشرقی
(۲) بندوبست دوامی

نیرنگ خیال۔ لاہور

(۱) تاریخ نسل انسانی
(۲) پادری نارکیسوس (افسانہ)

قوس قزح۔ لاہور

(۱) سطائبات (افسانہ)
(۲) عہد تیموریہ میں فن مصوری

مرقع۔ لکھنؤ

(۱) کار ثواب (افسانہ)
(۲) گمراہ رہبر

شمع۔ آگرہ

(۱) محمود کی سیرت اور کارنامے
(۲) ہندوستان اور قرون وسطیٰ میں باربرداری کے ذرائع

نظرے خوش گذرے

گذشتہ جلسۂ خلافت نے اس حقیقت کو بے نقاب کر دیا کہ جب تک پھر کوئی سامان قدرت الٰہی سے ایسا فراہم نہ ہو جائے کہ قوم کے سربرآوردہ اصحاب باہمی اختلافات اور رقابتوں کو فراموش کرکے ہمہ تن اُس مصیبت کے مقابلہ میں مصروف ہو جائیں نہ آپس کی لڑائیاں ختم نہ ہونگی اور ایک جماعت کی قوت دوسری جماعت کو زک دینے کے لیے رائیگاں ہوتی رہیگی۔

اجتماعی کاموں میں کامیابی اُسی وقت ممکن ہے جب مختلف کارکن جمع ہوکر تبادلۂ خیال کے بعد قوم کی فلاح و بہبود کی تجاویز سوچیں اور اُنکو عملی جامہ پہنانے کے لیے پوری یکدلی کے ساتھ جدوجہد کریں۔ لیکن جب ساری جدوجہد کا ماحصل یہ ہو جائے کہ ایک فریق دوسرے فریق کو نیچا دکھائے اور اپنی بات کو بالا رکھنے کے لیے ایڑی چوٹی کا زور لگائے تو قومی فلاح و بہبود کی توقع رکھنا فضول ہے۔

جب تک حکومت کے مقابلہ میں آزادی کی جنگ جاری رہی مسلمانوں کی ایک بڑی جماعت باوجود طبائع اور عقائد کے اختلافات کے یکجہتی اور یکسوئی کے ساتھ مصروف کار رہی مگر جیسے ہی جنگ ملتوی ہوئی کارکنوں کے طبعی اختلافات بالائے سطح آنا شروع ہوئے۔ کارکنان خلافت ہی میں سے ایک گروہ اثر شدھی کے مقابلہ کے لیے تبلیغی میدان میں صف آرا ہوگیا۔ جس کا لازمی نتیجہ یہ ہوا کہ مجلس خلافت کو کچھ عرصہ کے لیے قریب قریب معطل ہو جانا پڑا۔ تبلیغی جوش جب ذرا مدھم پڑا تو تنظیم کے نام سے ایک نئی جماعت بنی جس نے مجلس خلافت کو اور کمزور بنا دیا۔ اسکے بعد ہی مسلمانان ہند کی بدنصیبی سے مسئلۂ حجاز نے ایک نزاعی صورت اختیار کرلی اور خدام الحرمین کے قیام نے کارکنان خلافت کی رہی سہی قوت کو فنا کر دینے کی کوشش کی اور بالآخر انحطاط و زوال کی تکمیل کے لیے خود اُس جماعت میں شدید اختلافات رونما ہوگئے جو خدام الحرمین کے معرض وجود میں آنے کے بعد بھی مجلس خلافت کے بقا میں ساعی تھی۔

جلسہ کے انعقاد سے قبل ہر کارکن کو ان اختلافات کا پورا پورا علم تھا۔ اور اس بنا پر کم سے کم مجھے توقع تھی کہ اس موقع پر ہر فریق اسکے لیے تیار ہوگا کہ حتی الامکان دوسرے فریق کے ساتھ مفاہمت کی انتہائی کوشش کی جائے اور مجلس خلافت کو تباہی سے بچا لیا جائے۔ مگر

آں غلط بود آنچہ ما پنداشتیم

نومبر کے تیسرے ہفتہ میں اتفاق سے مولانا شوکت علی اور مسٹر شعیب قریشی انتخاباتِ کونسل کے سلسلہ میں یہاں آئے اور اُن سے گفتگو آئی تو اس اجتماع کے متعلق میرے تمام خیالات یکسر بدل گئے۔ اور اس لیے میں نے بجائے خود یہ ٹھان لی کہ اگر باہمی مفاہمت کی کسی کوشش میں اعانت ممکن ہو تو کروں ورنہ کم سے کم میں اپنا دامن اس جنگ زرگری سے ملوث نہ ہونے دوں۔ چنانچہ اراکینِ خلافت کے جمع ہو جانے کے بعد پہلا موقع مولوی ظفر علی خاں صاحب سے گفتگو کا آیا تو میں نے اس بنا پر کہ مسئلۂ حجاز میں مجھے اُنکی رائے سے بہت کچھ اتفاق تھا اُن سے درخواست کی کہ وہ بجائے مقابلہ و جنگ کے سپر انداز ہو جائیں۔ کیونکہ اس طریقہ پر سلطان ابن سعود کے خلاف جنگ و جہاد کی ساری ذمہ داری علی برادران کے سر پڑ جاتی اور مجھے اُمید تھی کہ باہمی متدر کا قدم درمیان سے اُٹھ جانے تو وہ جلد اپنی غلط روی کا احساس کر لیں گے —— لیکن افسوس ہے کہ مولوی ظفر علی خاں صاحب اسکے لیے آمادہ نہ ہوئے۔ دوسرے روز میں نے ایک تجویز مفاہمت تیار کی جسکو میں سمجھتا تھا کہ دونوں جماعتیں اگر قبول کر لیتیں تو کم از کم اس بدمزگی کا بخیر و خوبی خاتمہ ہو جاتا اور میں خیال کرتا ہوں کہ مجلس خلافت جس نے موتمر اسلامی میں شرکت اور ہندوستان میں اُسکی شاخ قائم کرنا گوارا کیا عملاً اُسی راہ کو اختیار کرنے پر مجبور ہوگی جو اُس مفاہمت میں تجویز کی گئی تھی۔ مگر افسوس ہے کہ مولانا محمد علی نے ایک نہ سُنی، اور میں نے جلسہ کے روبرو اس تجویز کو لانا فضول سمجھا۔

چونکہ میں نے اس باہمی جنگ میں شرکت سے محترز رہنے کا ارادہ کر لیا تھا اسوجہ سے جب تک جلسہ میں شریک رہا میری حیثیت ایک میزبان اور تماشائی ہی کی رہی حتیٰ کہ رائے شماری کے وقت بھی میں نے کسی جانب ہاتھ نہ اُٹھایا۔ حالانکہ مولوی ظفر علی خاں صاحب کو اس بات کی شکایت کرنے کا بھی موقع ملا کہ اگر میرا ووٹ اُن کی طرف ہوتا تو اُن کی جماعت کامیاب ہو جاتی۔ اور غالباً اسی قسم کی شکایت مولانا محمد علی اور اُنکے ساتھیوں کو مجھ سے رہی۔

مغربی تعلیم اور مغربی نظامات ہمیں یہی سبق دیتے ہیں کہ تمام قومی اور ملکی کام دھڑے بندی کی بنیاد پر انجام پائیں۔ اور اب یہ وبا یہاں تک عام ہو گئی ہے کہ علما و مشائخ تک آج اسی میں مبتلا نظر آتے ہیں۔ اور ہم میں سے کوئی فرد ایسا نہیں ہے جو کم و بیش اس بلاے بد کا شکار نہ ہو۔ لیکن انسان اگر اپنی قوتِ تمیز کو بالکل ناکارہ نہ بنا دے اور ذاتی و شخصی ترجیح کے خیال

کو چھوڑ کر محض قوم و ملک کے فلاح و بہبود کو پیش نظر رکھے تو بہت کچھ دھڑے بندی کے اثرات سے محفوظ رہ سکتا ہے۔

یورپ کی پارلیمنٹوں اور اکثر مجلسوں میں اسی دھڑے بندی کے بدولت اب ہاتھا پائی کی نوبت تک آجاتی ہے جسکی بنا پر کبھی کبھی پولیس کو دست اندازی کرنا پڑتی ہے۔ اس جلسہ میں بھی بعض اوقات یہی رنگ نظر آتا تھا۔ مگر غنیمت ہے کہ لوگ اس حد تک بے قابو نہیں ہوئے۔ اور اس بارے میں سب سے المناک طرز عمل جو میں نے مشاہدہ کیا وہ ہمارے پُرجوش کارکن سید فضل الرحمٰن اور جناب مولانا محمد علی کا تھا۔

سید فضل الرحمٰن کا حد سے زیادہ متجاوز ہو جانا اور مولانا محمد علی جیسے رہنمائے قوم کا احترام ملحوظ نہ رکھنا ازبسکہ نہایت درجہ قابل ملامت ہے

چوں حفظ مراتب نہ کنی زندیقی

لیکن اس سے زیادہ لائق ماتم مولانا محمد علی کی حالت ہے۔ اُنکے ذیابطیس نے معلوم ہوتا ہے کہ اب اُنھیں بالکل بے بس کر دیا ہے۔ مشکل سے ایک منٹ بھی وہ کسی مقرر کو خاموشی کے ساتھ تقریر کرنے دیتے تھے۔ اور اس خفیف وقفہ میں بھی شاید ہی وہ کسی وقت خود خاموش رہتے ہوں۔ کم سے کم جو شخص اُنکے قریب ہوتا تھا وہ اسی سے کچھ نہ کچھ اُس تقریر کے متعلق کہتے رہتے تھے۔ پھر صدر جلسہ کے لیے جس قدر صبر آزما ان کی روش تھی شاید ہی کسی دوسرے کی ہو۔ اور میں سمجھتا ہوں کہ حالات موجودہ میں مناسب ہوگا کہ مجلس خلافت اُنھیں کو صدر منتخب کرے یا کم سے کم کسی ایسے شخص کو صدر بنائے جسے اُنکے مقابلہ میں اپنی خودداری کے تحفظ کی ضرورت نہ ہو۔ مولانا عبد القادر قصوری کو جن حالات میں صدارت کرنا پڑی خدا نہ کرے کہ کسی شریف انسان کو اس مصیبت کا سامنا ہو۔

اگر مولانا ابو الکلام نے اسی خیال سے پہلو بچایا اور اس جلسہ میں شرکت سے احتراز کیا ہو تو کون اُنکی موقع شناسی پر حرف گیری کر سکتا ہے۔

ناظرین الناظر کو بخوبی اندازہ ہے کہ سیاسی اور مجلسی کاموں کی وجہ سے الناظر اور اُسکے متعلقہ کاروبار کو کس قدر نقصانات پہونچے ہیں۔ گذشتہ سولہ مہینے میں میرا جس قدر وقت ان کاموں پر صرف ہوا اُس نے کاروبار کی ابتری کو آخری درجہ پر پہونچا دیا ہے۔ حتیٰ کہ ۱۹۲۶ء میں الناظر کے تیرہ پرچے شائع نہیں ہوسکے۔ اور الناظر بک ایجنسی کی سالانہ فہرست جس پر بہت کچھ کتابوں کی اشاعت

کا دارومدار ہے قطعًا شایع نہیں ہوئی - ایک طرف یہ ذاتی ضرورت اور دوسری طرف حالت یہ ہے کہ سارے ملک میں خانہ جنگی کی وبا پھیلی ہوئی ہے اور اندیشہ ہے کہ اسکی بدولت نہ صرف اس ملک کے باشندوں کی غلامی کی میعاد میں اضافہ ہو رہا ہے بلکہ عجب نہیں جو ہم عرب کے بقیہ تین آزاد ملکوں نجد - حجاز و یمن کو بھی یورپین طاقتوں کی غلامی میں ڈھکیل دینے کا ذریعہ بنجائیں -

کانگرس اور خلافت دونوں جماعتوں سے میرا تعلق تھا، لیکن میری اصل خدمت شروع سے خلافت کمیٹی کے تحت رہی - موجودہ حالات میں نہ کانگرس کے سامنے کوئی ایسا نظام عمل ہے جسکی اعانت میرے لیے ممکن ہو اور نہ اُس طریق کار کی ذمہ داری قبول کرنے کے لیے میں تیار ہوں جو مسئلہ حجاز میں محترم علی برادران نے اختیار کیا ہے - اس لیے میں نے کم سے کم سال رواں کے لیے مقامی کانگرس کمیٹی کی مجلس منتظمہ اور مرکزی خلافت کمیٹی دونوں کی رکنیت قبول کرنے سے احتراز کیا - اور چاہتا ہوں کہ کچھ عرصہ تک ساری توجہ اپنے کاروبار پر صرف کروں -

مجھے امید ہے کہ جو احباب عرصہ سے مجھ پر زور ڈال رہے تھے کہ میں ہمہ تن ادبی خدمت کے لیے وقف ہو جاؤں وہ اس اعلان سے خوش ہوں گے اور مجھے الناظر اور انجمن اردو کے کاموں میں فراخ حوصلگی کے ساتھ ہر قسم کی مدد دیں گے -

---

۲۴ - دسمبر روز جمعہ کی صبح کو تین روز کی علالت کے بعد اُردو کے نامور انشا پرداز و مورخ جناب مولانا عبد الحلیم شرر لکھنوی ایڈیٹر دلگداز نے انتقال فرمایا - اِنّا للہ واِنا الیہ راجعون -

مرحوم کی عظیم الشان خدمات اور آپ کے مفصل حالات انشاءاللہ بعد میں لکھے جائینگے اس وقت صرف اس حادثہ پر دلی حزن و ملال کا اظہار کرنا اور اُنکے بڑے صاحبزادے منشی صدیق حسن صاحب اور دیگر پسماندگان کو الناظر اور اُسکے ناظرین کرام کی طرف سے دلی ہمدردی کا پیام پہونچانا مقصود ہے -

---

توقع ظاہر کی گئی تھی کہ یہ نمبر ۱۵ - جنوری تک شایع ہوجائیگا، مگر مہاراجہ صاحب محمود آباد کے تار سے خاص لکھنؤ کے مسلمانوں کا اظہار بیداری ضروری تھا اس لیے ایک جلسۂ عام کے انتظام کی وجہ سے تقریبًا دو ہفتے کے لیے پرچہ اور پچھڑ گیا - خدا کرے کہ آیندہ یہ صورت نہ ہو -

۲۶ - جنوری ۲۵ء ظفر الملک

جزیرۃ العرب

عرب کو اہل عرب "جزیرۃ العرب" جزیرہ نما (جزیرہ) عربوں کا" یا مخفف طور سے "جزیرہ" کہتے اور اسی کو ایرانی اور ترک عربستان کے نام سے یاد کرتے تھے۔ اسکے شمال میں ایشیا کا بر اعظم ہے، مغرب میں بحر احمر، مشرق میں خلیج فارس اور بحر عمان ہے اور جنوب میں بحر ہند۔ صرف خاکنائے سوئز کے ذریعہ اس کا تعلق افریقہ سے ہے اور فقط باب المندب کی آبنائے اسکو افریقہ سے جدا کرتی ہے۔ مشرق کی طرف ملک عرب فارس کے ساحل تک چلا گیا ہے۔ عرب کا رقبہ یورپ کے چوتھائی رقبہ کے برابر ہے لیکن اس کا ٹھیک ٹھیک رقبہ بتانا قریب قریب ناممکن ہے، اس لیے کہ یہ ایک مسلمہ بات ہے کہ شمال میں اس کی حدود بہت کچھ مختلف ہیں۔ بعض نے اسکی حد حلب اور دریائے فرات تک بتائی ہے۔ اگرچہ عراق عرب کے میدان میں عربی قبائل صدیوں سے آباد چلے آتے ہیں پھر بھی کسی جغرافیہ نویس نے عرب کا حال دریائے فرات کی حد سے آگے نہیں لکھا ہے۔ اور نہ اس علاقہ کو جو حجاز کے نام سے موسوم ہے عرب سے ملحق سمجھنا چاہیے گو وہ عربوں سے آباد ہے بلکہ اُسکو شام سے متعلق خیال کرنا چاہیے۔ برخلاف اسکے جزیرہ نمائے سینا جسکو اکثر عربی اور یورپی عالم مصر کا ایک حصہ سمجھتے ہیں، جغرافیائی حیثیت سے عرب سے متعلق ہے۔

مغربی عرب

(طول تقریباً ۱۶ درجہ ہے) اسکے دو بڑے حصے ہیں۔ ایک حصہ کو حجاز اور دوسرے کو یمن کہتے ہیں۔ حجاز کے لغوی معنی حجز کے ہیں۔ یہ ٹھیک ٹھیک وہ سلسلۂ کوہ ہے جو تہامہ (وہ نشیبی علاقہ جو ساحل کے برابر برابر چلا گیا ہے) کو نجد (بلند علاقہ) سے جدا کرتا ہے۔ اصل میں حجاز اس سرزمین کا نام ہے جسکے مغرب میں بحر احمر ہے اور مشرق میں نجد۔ اور یہ علاقہ خلیج عقبہ کے آخری سرے سے لیکر مکہ کے جنوب میں اس مقام تک پھیلا ہوا ہے جہاں سے یمن کا علاقہ شروع ہوتا ہے۔ پہاڑ کا سلسلہ شمال سے جنوب کی طرف پار کرنے کے بعد حجاز کا انتہائی شمالی علاقہ (تبوک تک) حسما کہلاتا ہے۔ یہ کوئی زرخیز علاقہ نہیں ہے لیکن یہ بھی سچ ہے کہ اس میں بہت سی وادیاں ہیں۔ سخت بارش ہونے کے بعد ان وادیوں میں سے پہاڑی چشمے بہ بہ کر سمندر میں جا کر گرتے ہیں۔ لیکن پھر بھی یہ علاقہ زیادہ تر خشک ہی رہتا ہے۔ پہلے اس علاقہ میں جرہم قبیلہ کے افراد آباد تھے لیکن اسوقت وہ لوگ آباد ہیں جن کی نسبت یہ سمجھا جاتا ہے کہ وہ

قدیم نبطی نسل سے ہیں۔

عقبہ سے مدینہ کو جانے والی سڑک۔ یہ وہ حجاج والی قدیم سڑک ہے، جو مصر سے آکر ساحل کے کنارے ینبوع یا اور تھوڑی دور الجار تک چلی گئی ہے۔ یہ مدینہ کا قدیم بندرگاہ ہے اور مدینہ سے یہاں تک دو دن کے سفر کا راستہ ہے۔ خلیج عقبہ پر صرف مقنا کا مقام قابل ذکر ہے۔ یہاں کے باشندوں نے ۹ ہجری (۶۳۱-۶۳۰ء) میں نبی کریم صلعم سے ایک عہدنامہ کیا تھا جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ لوگ بافندے اور مچھیرے تھے۔ اب ہم الوجہ کا ذکر کرتے ہیں جہاں سے بالی عربوں (؟) کا علاقہ شروع ہوتا ہے اور یہاں چھوٹے چھوٹے جہازوں کے لیے ایک اچھا بندرگاہ بھی بنا ہوا ہے۔ اسکے قریب ہی وادی اعظم اور اسکی بہت سی شاخیں ہیں۔ اب اسکو وادی الحمد کہتے ہیں جو خیبر کے جنوب مشرق سے شروع ہوتی ہے اور وادی رما کے دہانے سے بہت قریب ہے۔ وادی الحمد پہلے جنوب مشرق کی طرف مڑتی ہے، مدینہ کے قریب گذر کر ایک بڑا چکر لگاتی ہوتی شمال مغرب کی طرف چلی جاتی ہے۔ زمانۂ قدیم میں یہ وادی ضرور بہت مشہور ہوگی۔ اب جبکہ بارش بہت زیادہ ہوتی ہے تو اس میں اکثر پانی پایا جاتا ہے۔ آگے بڑھ کر خشکی میں لیکن زیادہ تر شمال کی طرف جاکر مدین کے کھنڈر ملتے ہیں، مدین سے بادا میں ہوکر ایک سڑک سیدھی وادی القرے کو جایا کرتی تھی۔ زمانۂ قدیم میں قری خاص مقام تھا۔ اس مقام پر وہ سڑک جو مصر سے مکہ کو گئی ہے، حاجیوں کی اُس سڑک سے مل جاتی ہے جو دمشق سے آکر حسما کے پہاڑوں کے مشرق کی طرف، معان، تبوک، مجاز اور مدائن صالح کو جاتی ہے۔ اسپرنجر نے الوجہ کو حجر کا بندرگاہ بتایا ہے جو اسٹرابو کے مقام Egra سے مطابقت کرتا ہے۔ ساحل پر اس مقام کے جنوب میں الحورا واقع ہے۔ قبیلہ بالی کے عربوں کا علاقہ یہاں ختم ہوتا، اور اسی قبیلہ کے ہم رشتہ قبیلۂ جہنیہ کا ملک شروع ہو جاتا ہے حجر اور وادی القرے کے درمیان قبیلۂ عذرا کا علاقہ واقع ہے۔ یہ قبیلہ اب تک اپنے جذبہ کی بنا پر مشہور ہے۔ کہا جاتا ہے کہ جب وہ کسی سے محبت کرتے ہیں تو اُسی میں فنا ہو جاتے ہیں۔

مدینہ کے اطراف کا تمام ملک آتشیں مادہ سے بھرا ہوا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ پالمیرہ سے مکہ تک کوہ آتشیں کا رقبہ ہے اور زمانۂ قدیم میں کئی مرتبہ آتشیں مادہ برآمد بھی ہوچکا ہے۔ جہاں تک ہمیں علم ہے آخری مرتبہ ۶۵۴ھ / ۱۲۵۶ء میں آتشیں مادہ نے خروج کیا تھا۔ عربی زبان میں سیاہ آتش فشاں پہاڑوں کو حرّہ یا لابہ کہتے ہیں۔ یہ بات تو مشہور بھی ہے کہ "تمام شہر مدینہ دو آتش فشاں پہاڑوں کے درمیان آباد ہے" ان آتشیں پہاڑوں کے درمیان جو وادیاں ہیں وہ اچھی سرسبزی اور شادابی

کے لیے مشہور ہیں۔ گذشتہ صدیوں سے ان میں خاص طور پر کھجور کی کاشت ہوتی چلی آرہی ہے۔
مدینہ کے شمال میں اُحد کی پہاڑی ہے۔ مدینہ سے اس پہاڑی تک ایک گھنٹہ سے بھی کم کی
مسافت کا فاصلہ ہے۔ خیبر کا بڑا کوہِ آتش نشاں (جو وادی القریٰ کے مشرق میں ہے) جہاں سے
وادی رما شروع ہوتی ہے شہر مدینہ کے علاقہ میں شمار کیا جاتا ہے۔ صحرائے نفود کی مغربی سرحد پر،
تبوک کے مشرق میں مقام تیماء نیز دومہ کا نخلستان (دومۃ الجندل جسکو اب الجوف بھی کہتے ہیں)
واقع ہیں۔ مدینہ سے یہاں تک تیرہ دن کے سفر کا راستہ ہے اور دمشق سے دس دن کا۔ ان
مقامات کو عرب جغرافیہ نویسوں نے مدینہ کے علاقہ میں شمار کیا ہے۔

ینبوع سے جدہ تک ساحل کے کنارے کنارے سفر کیا جا سکتا ہے۔ اور جدہ سے سیدھا
مشرق کی طرف مکہ تک دو روز کے سفر کا راستہ ہے۔ یہ مقدس علاقہ (جسکو اب الحدود، حدود الحرم
بھی کہتے ہیں) مقام تنعیم سے شروع ہو جاتا ہے اور مکہ کے اُس مقام سے جہاں مسجد عائشہؓ واقع
ہے ایک فرسنگ کے فاصلہ پر ہے۔ دوسری سمتوں میں حرم کی حدود مکہ سے دُور دُور واقع ہیں۔ حرم
کی حدود کو پار کرنے سے پہلے ہی احرام باندھ لیا جاتا ہے۔ نجد اور یمن سے جو زائرین آتے ہیں،
وہ مقام قرن المنازل سے احرام باندھا کرتے ہیں۔ اس مقدس مقام کے نواح میں کسی زمانہ میں
عکاظ کا مشہور و معروف بازار لگا کرتا تھا جہاں شاعروں میں علمی مباحثہ ہوا کرتا تھا۔ قرن المنازل
سے قریب قریب ۳۶ میل کے فاصلہ پر بجانب جنوب غزوان کی بلند پہاڑی پر طائف واقع ہے۔
مکہ کے متمول لوگ گرمیوں کا زمانہ یہیں بسر کرتے ہیں۔ اس لیے کہ اس مقام کی آب و ہوا صحت بخش ہے
اور وہ تمام میوے جو جنوبی یورپ میں ہوتے ہیں یہاں بکثرت پیدا ہوتے ہیں۔ زمانۂ قدیم سے یہاں
کے انگور اور کشمش خاص طور سے مشہور ہیں۔ اصطخری نے لکھا ہے کہ حجاز میں صرف طائف ہی
ایسا مقام ہے جہاں جاڑوں میں پانی منجمد ہو جاتا ہے۔ گلیسر نے بھی اس بیان کی تائید کرتے ہوئے
تحریر کیا ہے کہ یمن کے بہت سے پہاڑوں پر بھی پانی برف کی شکل میں منجمد ہو جاتا ہے۔

وہ پہاڑیاں جو مکہ کے جنوب میں واقع ہیں۔ ان میں زمانۂ قدیم سے ہذیل کا قبیلہ آباد ہے،
اس قبیلہ میں بہت سے ذکی و ذہین شاعر پیدا ہو چکے ہیں۔ انکے قرب و جوار میں اب بھی ثقیف
لوگ آباد ہیں اور پہلے طائف انھیں کا تھا۔ یہاں پر پہاڑ کا وہ سلسلہ جو آگے جا کر سرات
کہلاتا ہے، چوڑا ہو کر بہت ہی سرسبز و شاداب علاقہ ہو گیا ہے۔ یہ حجاز کا نہایت زرخیز حصہ ہے۔
ان پہاڑوں پر یمنی عرب آباد ہیں جن کو ابن المجاور نے انکی غیر مہذب رسوم کی وجہ سے بہیمیہ کہا ہے۔

اسکے متعلق جو مثالیں اُس نے لکھی ہیں اُنکی برک ہرڈ نے بھی تھوڑی تھوڑی تائید کی ہے۔ تیرہویں صدی تک انکو بجیلیہ کے نام سے یاد کرتے تھے مگر اب انکو عسیر کہتے ہیں۔ حجاز کے سرسبز و شاداب بلند علاقہ کے مشرقی حصہ میں بنی قحطان کے افراد آباد ہیں جس میں زیادہ تر جمّال ہیں۔ یہ بہت ہی قدیم قبیلہ ہے اور اب بھی قوی اور طاقتور مشہور ہے۔ بیشتر یمنی عرب اپنے آپ کو اسی قبیلہ کی نسل سے بتاتے ہیں۔

یمن کا ملک "داہنی جانب والا" "جنوبی علاقہ" اور "زرخیز" کے ناموں سے موسوم ہے۔ یہ علاقہ نہایت قدیم زمانہ سے اپنی زرخیزی اور شادابی کے لیے مشہور چلا آرہا ہے۔ اور دو غیر مساوی حصوں میں منقسم ہے۔ ایک حصہ کو تہامۃ الیمن کہتے ہیں اور دوسرے کو نجد الیمن۔ اور اسکا جائے وقوع یہ ہے:

شمال میں نجد کا میدان مرتفع ہے اور مشرق میں مأرب۔ وسط میں صنعا واقع ہے اور جنوب میں تعز۔ تہامۃ الیمن، حجاز کے ساحلی علاقہ کا سلسلہ ہے۔ گلیسر نے موقع کا مشاہدہ کرکے لکھا ہے کہ سمندر کا پانی چونکہ بتدریج پیچھے ہٹتا جاتا ہے اس لیے یہ علاقہ دن بدن وسیع ہوتا جارہا ہے۔

مکہ سے یمن کی بلندیوں تک جو سڑک گئی ہے، وہ اُن پہاڑوں کے اطراف ہوکر جاتی ہے جنپر طائف واقع ہے اور مشہور مقامات تربہ اور تبالہ کہ سے ہوتی ہوئی بیشیہ کو چلی جاتی ہے۔ وادی بیشیہ کے زرخیز علاقہ کا بیشیہ ایک خاص شہر ہے اور یہ علاقہ جنوبی عرب تک مسلسل چلا گیا ہے۔ حجاز سے یمن کی طرف سفر کیا جائے تو یہ زرخیز علاقہ تثلیث کے قریب ختم ہوتا ہے۔ اور مقام تثلیث قریب قریب اسی عرض البلد پر واقع ہے جس پر السرین اور جرش واقع ہیں۔ یہاں سے ایک بڑی سڑک سیدھی سعدہ کو چلی گئی ہے اور اسی کی ایک شاخ مشرق کی طرف نجران کو جاتی ہے۔

سعدہ سے بجانب جنوب یمن کے دارالسلطنت صنعا کو ایک سڑک جاتی ہے۔ صنعا کے مشرق میں مأرب واقع ہے۔ وہ علاقہ جسکا مأرب صدر مقام ہے، اب الجوف کہلاتا ہے۔ الجوف کا علاقہ نجران سے مأرب کے جنوب مغرب کی طرف وادی بیحان تک چلا گیا ہے۔ اسوقت بھی معلوم ہوتا ہے کہ یہ علاقہ کسی زمانہ میں خوشحال و سرسبز و شاداب رہا ہوگا۔ ابن المجاور نے لکھا ہے کہ زمانۂ قدیم سے براقش ایک مشہور و معروف شہر چلا آرہا ہے۔ ان مقامات کو سب سے پہلے جن یورپی سیاحوں نے اپنی جانوں کو سخت خطرہ میں ڈال کر دیکھا، اُنکے نام ارنود اور ہالوی ہیں۔ جنوب کی طرف اور آگے بڑھ کر معین کے علاقہ کا ذکر حال ہی میں نیبورگ نے لکھا ہے اور وہ یہ ہے

صنعا سے ذمار (اس مقام کے گھوڑے اچھی نسل کے ہوتے ہیں) ہو کر مقام یریم پہونچتے ہیں۔ یہاں سے نصف دن کا سفر طے کرنے کے بعد حمیریوں کے صدر مقام ظفار کے کھنڈرات آجاتے ہیں۔ یہ مقام صنعا کے طول البلد اور زبید کے عرض البلد میں واقع ہے۔ یہاں سے سحول ہو کر ایک سڑک جند کو چلی گئی ہے۔ سحول کا کپڑا بہت مشہور تھا۔ جند زمانۂ قدیم میں یمن کا دوسرا صدر مقام رہا ہے۔ اور معاذ بن جبل کی مسجد کی وجہ سے بہت مشہور تھا۔ مقام جند تعز سے قریب ہی واقع ہے سحول کے قرب و جوار میں المذیخرہ کی مشہور گڑھی ہے جسکی نسبت یہ خیال تھا کہ قرمطی لوگ اسی گڑھی پر قابض رہنے کی وجہ سے یمن پر حکمراں رہے۔ جنوب کی طرف آگے بڑھ کر پہاڑوں میں تعز واقع ہے۔ زمانۂ متوسط سے لیکر اب سے ایک صدی قبل تک تعز رسولیوں کا مشہور و معروف صدر مقام رہا ہے مگر اب شکستہ حالت میں ہے۔ یہاں کے پہاڑ صبر کے نام سے مشہور ہیں۔ ابن المجاور نے ان پہاڑوں کو "یمن کے پہاڑوں کا بادشاہ" لکھا ہے۔ اور کہا ہے کہ یہ پہاڑ کافی اوقات کی کاشت اور آبپاشی کے اچھے انتظام کے لیے مشہور ہیں۔ قات کے پودوں کی کونپلیں دافع سکر ہیں بہت قیمتی ہوتی ہیں اور تہامہ کے تمام شہروں میں بکثرت بھیجی جاتی ہیں۔ ان پہاڑوں کے شمال کی جانب بحر احمر اور بحر ہند کے درمیان اب اور جبلہ کے بیچ میں جبلہ کا بلند اور پہاڑی علاقہ ہے جسکو ذو جبلہ بھی کہتے ہیں۔ یہاں سے دو چشمے دامی طور پر بہتے رہتے ہیں۔ ایک کا نام وادی زبید ہے جو بجانب شمال بہتی ہے اور دوسری وادی تبا ہے جو قدیم مخلاف میں سے بہتی ہوئی جاتی ہے اور وادی تنیم یا وادی تبن کے دہانہ کے مشرق کی جانب خلیج عدن میں گر جاتی ہے۔ منزولی نے لکھا ہے کہ ایک اور سڑک یریم سے بالکل جنوب کی طرف عدن تک چلی گئی ہے۔ گلیسر نے بیان کیا ہے کہ حدیدہ اور صنعا کو مناخہ ہوتی ہوئی ایک اور سڑک گئی ہے۔ مناخہ قہوہ کی تجارت کی خاص منڈی ہے۔

جنوبی عرب

یمن کے مشرق میں حضر موت واقع ہے۔ اب اسکا تلفظ عام طور پر حضر موت کیا جاتا ہے۔ یہ ایک پہاڑی علاقہ ہے جس میں بہت سی وادیاں (گھاٹیاں) ہیں۔ ان گھاٹیوں کے محنتی، جفاکش اور حوصلہ مند باشندے بہت سی باتوں میں سوئز کے باشندوں سے ملتے ہیں۔ بہت ہی قدیم زمانہ سے یہ لوگ ہر سال نوجوان مردوں کو دوسرے ملکوں میں روزگار تلاش کے لیے بھیجتے چلے آرہے ہیں۔ اور اسکا ثبوت یہ ہے کہ یہاں کے باشندے نہ صرف عرب آبادیوں میں پائے جاتے ہیں، بلکہ مصر، برطانوی اور ولندیزی ہند میں بھی موجود ہیں۔ ان

دونوں آخرالذکر مقامات میں جو عرب موجود ہیں وہ حضرموت ہی کے باشندے ہیں۔ جنوبی عرب کو مغرب سے مشرق کی طرف وادی الکسر برابر برابر کے دو حصوں میں تقسیم کر دیتی ہے۔ اس وادی سے ایک چشمہ دواماً بہتا رہتا ہے جو سیحوت کے قریب مشرقی سرحد پر سمندر میں گر جاتا ہے۔ دو سب سے بڑے مقامات شبام اور ریدم بھی یہیں پر واقع ہیں۔ ریدم کے جنوب مشرق کی طرف وادی برہوت کے منبع کے قریب (برہوت، برہوت نامی یہاں ایک کوہ آتش فشاں بھی ہے جس میں اب تک آتشیں مادہ نکلتا رہتا ہے اور اس وادی کا نام اسی پہاڑ کے نام پر مشہور ہو گیا ہے) حضرت ہود علیہ السلام وعلیٰ نبینا کی قبر پائی گئی ہے۔ یہ بہت مشہور پیغمبر ہوئے ہیں اور ان کا ذکر کلام مجید میں بھی آیا ہے۔ یہاں سے صحرائے اعظم شروع ہوتا ہے جو حضرموت کو شمال مغرب۔ شمال اور مشرق کی طرف سے گھیرے ہوئے ہے۔ جنوبی عرب کا بہترین بندرگاہ مکلا ہے (مکلا کے معنی محض بندرگاہ کے ہیں) اغلب ہے کہ یہ مقام وہی ہو جسکو عرب جغرافیہ نویسوں نے لسا (ارسعا) لکھا ہے۔ جس طرح یمن کے متعدد کھنڈرات اور مقبرے وہاں کی گذشتہ خوشحالی اور دولتمندی کا پتہ دیتے ہیں اسی طرح حضرموت میں بھی اسی قسم کے آثار سے یہاں کی فارغ البالی اور دولتمندی کا پتہ چلتا ہے۔

سیحوت کے مشرق کی طرف (سیحوت کا پرانا نام شاید خیرن ہے) ساحل شروع ہوتا ہے اسکو عرب جغرافیہ نویسوں نے مہرہ اور الشحر کے نام سے بھی تحریر کیا ہے۔ جنوبی عرب کی قدیم زبان میں مہرہ یا شحر کے معنی ساحل کے ہیں۔ شہر کا نام اب پہلے اس بندرگاہ کے لیے مخصوص ہے جو بجانب غرب واقع ہے۔ مرباط کے مشرق میں مشرقی سرحد ہاسک کہلاتی ہے مرباط کا ایک بہت اچھا بندرگاہ تھا مگر اب وہ ایک غیر مشہور گاؤں رہ گیا ہے۔ شہر جو اب مرباط کہلاتا ہے اس بندرگاہ کے مشرق کی طرف واقع ہے۔ زمانۂ قدیم میں مرباط قدیم صدر مقام ظفار کا بندرگاہ تھا۔ مقام ظفار اب بالکل غیر آباد ہے۔ ابن المجاور نے لکھا ہے کہ شہر ظفار ۶۱۸ھ ۱۲۲۱ء میں تباہ و برباد کیا گیا تھا۔ ابن بطوطہ کے زمانہ میں یہ ایک مشہور شہر رہا ہے۔ چنانچہ اُس نے لکھا ہے کہ یہاں (سارڈین کی قسم کی) مچھلیاں بہت ہوتی ہیں لوگ انکو کثرت سے پکڑتے اور اونٹوں کو کھلاتے ہیں۔ ان مچھلیوں کو یہاں ورق یا عذ کہتے ہیں۔ پہاڑی سلسلہ میں جو ساحل کے متوازی چلا گیا ہے لوبان کے درخت اُگے ہوئے ہیں۔ ابن المجاور نے لکھا ہے کہ اسکے زمانہ میں حضرموت اور عمان کے درمیان ہر جگہ کیاریوں کی کاشت کی نشانیاں پائی جاتی تھیں۔ بینٹ نے اس مشہور علاقہ کی نسبت جو کچھ لکھا ہے اُس سے ابن المجاور کے بیان کی تائید ہوتی ہے۔ لوبان کے درختوں کی کاشت

اب بہت محدود ہوگئی ہے۔ گرا (Gara) کے پہاڑوں اور سمندر کے بیچ میں، اس سرسبز و شاداب ساحل پر جو لوگ آباد ہیں اُنکا کچھ حصہ غیر متمدن ہے۔ اس ملک کے مشرق میں عمان تک جو ساحلی علاقہ چلا گیا ہے اُسکی نسبت کہا جاتا ہے کہ اس میں درخت اور جھاڑیاں مطلق نہیں ہیں اور اس سرزمین کے اندرونی حصہ کے متعلق ہمیں کوئی علم نہیں ہے۔

مشرقی عرب | عمان، عرب کا بالکل مشرقی صوبہ ہے، اسکا بیشتر حصہ بہت زرخیز پہاڑی علاقہ ہے اور اسکے ساحل پر بہت سے بندرگاہ ہیں۔ خلیج عمان میں مچھلیاں بکثرت ہوتی ہیں اور ساحل کے باشندے زمانۂ قدیم سے فن جہازرانی میں مشہور ہیں۔ شہر قلہات، جسکی تعمیر کی بنا بارہویں صدی میں پڑی تھی اور کسی زمانہ میں خوبصورت اور مستحکم شہر رہا ہے، اب شکستہ حالت میں ہے۔ برخلاف اسکے مسقط زمانۂ متوسط میں غیر مشہور رہا ہے، مگر اب اس ملک کا نہایت مشہور شہر ہے۔ اور خلیج فارس میں اسکے لیے نہایت عمدہ بندرگاہ بنا ہوا ہے۔ المقدسی نے مسقط کو خوبصورت شہر لکھ کر بتایا ہے کہ یہاں میوے کثرت سے پیدا ہوا کرتے تھے مگر اس شہر کا ابن بطوطہ نے ذکر بھی نہیں کیا۔ یوروپین سیاحوں نے لکھا ہے کہ بہ نسبت عدن کے یہاں گرمی بہت پڑتی اور قریب قریب ناقابل برداشت ہوتی ہے۔ غالباً اسی وجہ سے بادشاہ یا تو الرستاق میں رہا کرتے ہیں یا نزوہ میں۔ یہ دونوں مقام سرسبز و شاداب پہاڑ (جبل اخضر) میں واقع ہیں۔ ویلسٹڈ نے نزوہ کو خود دیکھا ہے، جو قدیم شہر ہے مگر اب بھی ترقی پر ہے۔ مسقط کے شمال میں قدیم صدر مقام صحار واقع ہے۔ اس شہر کا نام بالکل اسی طرح عمان پڑ گیا جس طرح دمشق عام طور پر الشام کہلاتا ہے۔ صحار میں مشرق سے بکثرت تجارت ہوا کرتی تھی۔ اسی وجہ سے المقدسی نے اس شہر کو "چین کا دروازہ" لکھا ہے۔ المجاور نے تحریر کیا ہے کہ یہ شہر اُسکے زمانہ میں ابتری کی حالت میں تھا۔ ممکن ہے کہ اسکے زمانہ کے بعد اسکی حالت اچھی ہوگئی ہو کیونکہ ویلسٹڈ نے اسکو مضبوط و مستحکم شہر لکھا ہے اور تھوڑی بہت اہمیت بھی دی ہے۔ صحار کے شمال میں جزیرہ نما کے مشرق کی طرف، راس مسندم پر شہر دبا (یا دما) آباد ہے۔ یہ شہر رسول کریم صلعم کے عہد میں بہت مشہور تھا۔ اور اب بھی شمالی عمان کا صدر مقام ہے۔ جزیرہ نما کے مقابل میں مغرب کی طرف شرجہ کے بندرگاہ کا شہر واقع ہے جو ترقی پر ہے۔ عمان کی قدیم آبادی کے متعلق ہمیں کوئی علم نہیں۔ البتہ روایات سے صرف اتنا پتہ چلتا ہے کہ بند مارب کے ٹوٹنے کے بعد قبیلۂ ازد کے افراد عمان میں آکر آباد ہوگئے تھے۔ معلوم ہوتا ہے کہ یہاں کے قدیم باشندے مازون تھے، اس لیے کہ عمان کو بعض اوقات اس نام سے بھی یاد کرتے ہیں۔ امویوں کے عہد میں اگرچہ یہاں کی کثیر آبادی عراق کو

چلی گئی تھی پھر بھی معلوم ہوتا ہے کہ ازد کا قبیلہ بڑھتا ہی رہا۔ قبیلہ طے کے افراد بھی عمان میں آکر آباد ہو گئے تھے اور انھیں کا ایک خاندان جسکو نبہان کہتے تھے، عرصۂ دراز تک بالادست رہا۔ شمالی عرب کے لوگ (بنو غافر) بھی بعد میں یہاں آکر بس گئے تھے۔ کھجور یہاں کی بہت مرغوب غذا ہے اور دوسرے ملکوں کو بکثرت بھیجی جاتی ہے

وہ علاقہ جو عمان کے مغرب اور شمال مغرب کی طرف عراق کی حدود تک پھیلا ہوا ہے۔ عربوں کے بہترین عہد میں البحرین (اب البحرین، اوال کے جزیرہ کا نام ہے) کہلاتا، یا دارالسلطنت ہجر کے نام پر ہجر کے نام سے موسوم تھا۔ دسویں صدی کے آغاز میں قرمطیوں نے اپنے رہنے کیلیے ایک مقام الاحسا (اسکا تلفظ لحسا بھی کیا جاتا ہے) کے نام سے بنوایا تھا جو ہجر سے قریب ہی تھا۔ یہی الاحسا یا لحسا، اسوقت اس علاقہ کا نام ہوگیا ہے۔ اس علاقہ کے انتہائی جنوبی حصہ کا نام اس قبیلہ کے نام سے موسوم ہے جو اس میں آباد ہے اور اس قبیلہ کا نام قواسم ہے جو مشہور بحری قزاق ہیں۔ مغرب کی طرف آگے بڑھ کر قطر کا جزیرہ نما واقع ہے۔ زمانۂ قدیم سے یہاں کے باشندے غواص اور خوفناک بحری قزاق مشہور چلے آرہے ہیں۔ آجکل جو صدر مقام ہے اسکا نام یا تو الحسا ہے یا ہفوف اور یہ نام عرب جغرافیہ نویسوں نے نہیں لکھا ہے۔ مشرق کی طرف اور آگے بڑھ کر چند گھنٹوں کی راہ پر عقیر کا بندرگاہ واقع ہے۔ معلوم نہیں کہ مبرز، جو ہفوف کے شمال میں اس سے قریب ہی واقع ہے، قدیم شہر مشقر سے مطابقت کرتا بھی ہے یا نہیں اور اس بات کا فیصلہ کرنا مشکل ہے اسلیے کہ عرب جغرافیہ نویسوں نے اس علاقہ کے متعلق جو واقفیت لکھی ہے وہ بہت ناکافی ہے۔ علاقہ لحسا کے شمال کی طرف مقام القطیف واقع ہے۔ اور یہ نام ایک مشہور بندرگاہ کے نام پر مشہور ہوگیا ہے پہلے یہاں کے ساحل کو اس بندرگاہ کے نام پر الخط کہا کرتے تھے، جہاں سے عرب لوگ اپنے نیزوں کے لیے بانس لایا کرتے تھے۔ اور اس بندرگاہ میں ہندوستان سے بانس آیا کرتے تھے۔ علاقہ لحسا میں کھجور بکثرت پیدا ہوتی ہے چنانچہ ایک عربی مثل ہجر (لحسا) کو کھجور لیجانے کے بارے میں بالکل انھیں معنوں میں مشہور ہے جس طرح نیوکیسل کو کوئلہ لیجانے کے متعلق ہمارے ہاں ایک کہاوت زبان زدِ عوام ہے۔ عبد القیس اور تمیم کے قبائل میں صدیوں تک بالادستی کے لیے جنگ رہی۔ بالآخر تمیم کا قبیلہ تقریباً دو سو برس تک برسر اقتدار رہا۔ یعنی جتنے عرصہ تک قرمطی لوگ برسر حکومت رہے اتنے ہی زمانہ تک یہ بھی صاحب اقبال رہا۔ القطیف سے مقام کویت تک ساحل کے متعلق کچھ لکھنے کی ضرورت نہیں اس لیے کہ یہ علاقہ بالکل ہموار اور رتیلا ہے۔ کویت کے معنی گڑھی کے ہیں

اسکو قُرَین بھی کہتے ہیں۔ اب اس کا تلفظ گرین (Grane) کیا جاتا ہے اسی وجہ سے
انگریزی میں اسکے ہجے (Grane) لکھے ہیں۔ یہ مقام ایک خلیج کے جنوبی آغاز پر واقع ہے اور
غالباً آئندہ زمانہ میں ایک مشہور تجارتی منڈی بنجائے گا اس لیے کہ ممالک شمر کے لیے یہ بندرگاہ
مشرق سے تجارت کے لیے سب سے قریب ہے۔ اس علاقہ کا شیخ اب عملی طور پر خود مختار ہے
پہلے یہ ترکی سیادت میں تمام اس خلیج کے مغرب کی طرف کاظمہ واقع ہے۔ یہ نہایت مشہور مقام ہے
اور اس سڑک پر واقع ہے جو بصرہ سے لحسا اور وہاں سے یامہ تک چلی گئی ہے۔

وسط عرب

یمن کے مشرق کی جانب، حضرموت اور مہرہ کے شمال کی طرف اور عمان کے
مغرب میں وسط عرب تک وسیع ریگستان ہے جسکی صرف حدود ہمیں معلوم ہیں مگر
وہ بھی نامکمل طور سے۔ یہ ریگستان نفود کے ریگستان (جو شمالی عرب میں ہے) کی طرح معلوم ہوتا ہے
یہاں پانی بمشکل ملتا ہے۔ بارش ہونے کے بعد زمین سبزہ زار بنجاتی ہے اور کثرت سے چراگاہیں
پیدا ہو جاتی ہیں۔ پھر تو بدو لوگ اندرونی علاقہ میں، اپنے اونٹوں، بھیڑوں اور تمام خاندان کو لیکر
آجاتے اور یہاں تین یا چار مہینے تک مقیم رہتے ہیں۔ انسانوں کو پانی کی ضرورت ہوتی ہے اور نہ
انکے جانوروں کو، اس لیے کہ انسان تو دودھ پر گذارہ کرتے ہیں اور چونکہ سخت سے سخت دھوپ
کی تپتی ہوئی زمین پر بھی سبزہ اس قدر رس دار ہوتا ہے کہ چوپایوں کو پانی کی مطلق ضرورت نہیں
ہوتی۔ اگر انکو پانی پینے کے لیے دیا بھی جاتا ہے تو نہیں پیتے۔ جب گرمیوں کی دھوپ سے یہاں
کا سبزہ سوخت ہو جاتا ہے تو پھر بدو لوگ اپنے اپنے اصلی مقامات پر واپس چلے جاتے ہیں۔ ریگستان
کے کنارے جو بدو آباد ہیں اُن کا ہمیشہ یہی طریقہ رہتا ہے۔ یہ بات کہ اندرون ریگستان وہ ٹھیک
ٹھیک کہاں تک جاتے ہیں، ہمیں معلوم نہیں۔ اس لیے کہ ریگستان کے کئی نام ہیں۔ مشرقی یمن اور
شمال مغربی حضرموت کے درمیان کا حصہ صیہد کہلاتا ہے۔ حضرموت کے شمال اور مشرق کی طرف
والا علاقہ الاحقاف کے نام سے مشہور ہے۔ مہرہ کے شمال کی طرف جو سرزمین ہے اسکو عرب لوگ
دبار کہتے ہیں مگر یہ علاقہ عموماً الدہنا کہلاتا ہے، یعنی سرخ زمین کا علاقہ۔ یہاں کی مٹی کا رنگ
سرخ ہے اسلیے یہ علاقہ اس نام سے مشہور ہوگیا۔ نقشوں میں اسکو "الخالی" بتایا جاتا ہے۔ یہ بات
کہ آیا اس علاقہ کے اندرونی حصہ میں کم از کم جانوروں کے لیے بھی پانی ملتا ہے یا نہیں، بالکل
غیر یقینی اور خلاف قیاس نہیں ہے اس لیے کہ مہرہ کے بدو، جنکے اونٹوں کے جہاز کا بیڑہ دنیا
بھر میں مشہور ہے، اس بات کو واقعہ کے طور پر بیان کرتے ہیں کہ انکی اونٹنیاں بعض اوقات

چین کے اونٹوں سے جفتی کھا جاتی ہیں۔ اس سے قیاس کو راہ ہوتی ہے کہ اندرونی علاقہ میں اب بھی جنگلی اونٹ رہتے ہیں کیونکہ عرب لوگ ان اونٹوں کو حوشیہ (جنگلی) کہتے ہیں۔ غالباً یہی بات مغربی عمان کے اونٹوں پر بھی عائد ہوتی ہے جو اتنے ہی مشہور ہیں جتنے کہ یہ۔ اور یہ واقعہ، کہ اس علاقہ میں ایک ایسی قوم آباد ہے جو نامعلوم زبان بولتی ہے، صحیح نہیں ہے۔ ابن المجاور نے لکھا ہے کہ یہاں کے بدوؤں نے تیرہویں صدی میں اس ریگستان کو پار کر کے بالکل داہنی جانب مرباط اور ظفار کو جانے کی جسارت کی تھی تاکہ اپنے ہاں کی پیداوار سے عراق کی پیداوار کا تبادلہ کریں۔ اس وسیع ریگستان کی شمالی مشرقی سرحد پر، (جو یمامہ کے جنوب میں تین دن کے سفر کی دُوری پر واقع ہے اور بحرین سے قریب قریب اتنی ہی دور ہے) قدیم سرسبز و شاداب اور سیراب یبرین کا نخلستان واقع ہے جسکو قرمطیوں نے تباہ و برباد کر دیا تھا۔ نخلستان کے نام پر ریگستان کا یہ حصہ بعض اوقات "یبرین کی ریت" کہلاتا ہے۔ عمان سے مکہ کو جو سڑک گئی ہے وہ اسی نخلستان میں ہو کر جاتی ہے۔ یہاں سے شمال کی طرف بحرین اور یمامہ کے بیچ میں ریگستان کا ایک ناگوار حصہ پھیلا ہوا ہے جو الدہنا یا نفود بھی کہلاتا ہے اور بعض وقت اسے "عالج کی ریت" کے نام سے بھی موسوم کرتے ہیں۔ بیان ہوا ہے کہ اس میں چراگاہیں بکثرت ہیں اور سرسبز و شاداب پہاڑوں کے سلسلے اس علاقہ میں ایک دوسرے کو قطع کرتے ہوئے چلے گئے ہیں۔ یہاں کی آب و ہوا خوشگوار اور صحت بخش ہے۔ اس ریگستان اعظم کے مغرب اور شمال مغربی کنارے پر قحطان کا علاقہ بہت نشیب میں واقع ہے جسکو پہلے فلج کہتے تھے مگر اب اسکو ایک عرب قبیلہ کے نام پر وادی دواسر کہتے ہیں۔ یمامہ کے جنوب مغرب میں اسی وادی کا سلسلہ وادی افلاج کہلاتا ہے (اسکو پہلے فلج الافلاج بھی کہا کرتے تھے)۔

اس ریگستان کے شمال کی طرف وسط کا بلند علاقہ (نجد) شروع ہو جاتا ہے۔ یہ بلند علاقہ جزیرہ نما کا قلب کہلاتا ہے اور واقعی نہایت صحت بخش اور عربوں کے لیے عرب کا بہترین حصہ ہے۔ جنوبی مشرقی صوبہ یعنی یمامہ بہت زرخیز علاقہ ہے (اسکو اکثر اصلی نجد میں شامل نہیں کرتے) یمامہ اور بحرین کو ملا کر العروض کہتے ہیں۔

یمامہ سے دو پہاڑی درّے (عینہ اور ہرکلیہ) ثرمدہ کو جاتے ہیں۔ یہ مقام وشم (وشوم) میں واقع ہے۔ اور پھر وہاں سے شمال مغرب کی طرف الشقرا کو چلے گئے ہیں۔ یہ اس صوبہ کا خاص شہر ہے۔ یہاں سے عنیزہ کو نو گھنٹے میں پہونچتے ہیں۔ عنیزہ، قصیم کے صوبہ کا خاص

شہر ہے - اس صوبہ کے شمال میں شمر کا علاقہ واقع ہے - اور بجانب مغرب مدینہ کے علاقہ میں خیبر ہے - ہم ڈوٹی کے ممنون ہیں کہ انھوں نے اس ملک کا مفصل حال تحریر کیا ہے - عنیزہ کے شمال مشرق میں دو گھنٹے کے راستہ پر شہر بریدہ واقع ہے - قصیم کے داہنی جانب بڑی وادی رُمّہ چلی گئی ہے جو خیبر کے کوہ آتش فشاں سے شروع ہو کر آئی ہے - یہ پہاڑ چھ ہزار فٹ بلند ہے اور نواح بصرہ تک چلا گیا ہے - وادی رُمّہ میں اس مقام پر پستی واقع ہو گئی ہے اور اسکی اغلب وجہ یہ معلوم ہوتی ہے کہ زمانۂ تاریخ سے بھی قبل یہ مقام کسی دریا کا گذرگاہ رہا ہو گا - اگرچہ اس وادی میں بہت سے دریا گرتے ہیں اور گو دریاؤں کے تیز دھارے کی وجہ سے اس وادی میں پانی اچھی خاصی مقدار میں آ جاتا ہے لیکن پھر بھی یہ وادی، جسکی چوڑائی کہیں کہیں ایک دن کے سفر کی مسافت کے برابر ہے، عام طور پر خشک ہی رہتی ہے - ایک صدی میں صرف دو یا تین مرتبہ اس میں حقیقی دریا کی شان پیدا ہو جایا کرتی ہے - لیکن ساتھ ہی اسکے پانی اسکی تہ میں جذب ہو جاتا اور بعض مقامات پر دکھائی بھی دیتا ہے - قصیم کے علاقہ میں جو سرسبزی اور شادابی ہے وہ اسی وجہ سے ہے - اس صوبہ کے مغرب کی طرف یہ وادی، ابان کی دو پہاڑیوں کے بیچ میں سے ہو کر گئی ہے (شعرائے قدیم نے اس مقام کا بیشتر ذکر کیا ہے) - شمالی پہاڑی سیاہ پہاڑی کہلاتی ہے اور جنوبی سرخ - یہاں پر اس وادی کی چوڑائی دو سے تین عربی میل تک ہے - نجد کا وہ حصہ جو انتہائی جنوب مشرق کی طرف واقع ہے، اب سُدَیر کہلاتا ہے - (بعض اسکا تلفظ صُدَیر، سِدر کرتے ہیں ڈوٹی نے سِدَیر لکھا ہے) جہاں نما میں زائرین کی اس سڑک پر جو بصرہ سے چلی گئی ہے اسی کا نام کا ایک مقام مذکور ہوا ہے - زمانۂ قدیم میں نجد کے مختلف علاقے مختلف قبائل کے نام پر مشہور تھے -

صوبۂ قصیم کے مغرب میں شمر کا ملک واقع ہے - اس ملک کا نام طے کے بڑے قبیلہ کے ایک خاندان کے نام پر مشہور ہوا ہے اور اسی خاندان کے نام پر یہ علاقہ "طے کے دو پہاڑوں" کے نام سے موسوم ہے -

شمر کے پہاڑ نجد کو نفود یا الدہنا سے جدا کرتے ہیں - نفود کے اصلی ریگستان کی ٹھیک ٹھیک وہی خصوصیات ہیں جو جنوب کے بڑے ریگستان کی ہیں - بارش ہونے کے بعد اس ریگستان کی سرزمین بھی سرسبز و شاداب اور رس دار سبزہ سے لہلہانے لگتی ہے - انسان اور جانور کثرت سے آ کر یہاں پر چند ہفتوں تک آباد رہتے ہیں - لیکن بعد میں جب دھوپ ہر چیز کو

جھلس دیتی ہے تو پانی کا قحط ہو جانے کی وجہ سے ملک بالکل خشک اور ویران ہو کر بھٹکے ہوئے مسافروں کے لیے سخت خطرناک ہو جاتا ہے۔ چند انگریزوں نے اس لق و دق صحرا کو عبور کیا ہے جن میں لیڈی بلنٹ اور یوٹنگ قابل ذکر ہیں۔ یوٹنگ نے لکھا ہے کہ اس علاقہ کی مٹی سرخی مائل ریت کے مثل ہوتی ہے اور اسپر نشانات بنے ہوتے ہیں "گویا ایسا معلوم ہوتا ہے کہ بڑے بڑے قدآور گھوڑوں کے گلہ نے مشرق سے مغرب تک اُس میدان کو پامال کر دیا ہے"۔ بلند ریتیلا علاقہ، جسے نِفد یا نَفَد کہتے ہیں اور جسکی جمع نفود (انفاد) ہے اس سے تمام ریگستان کی تعریف ظاہر ہوتی ہے۔ اسی طرح جنوبی ریگستان کے متعلق احقاف کا لفظ رائج ہے اور اس سے وہاں کے ریگستان کی قسم کا پتہ چلتا ہے۔ لفظ نفد جسکا کسی مستند زبان میں پتہ نہیں چلتا، شاید کثرت استعمال سے لفظ نِفد یا نَفد (جس کی جمع افناد یا نفود ہے) رائج ہو گیا ہے۔ حائل سے جوف تک (مخالف سمت میں) یوٹنگ نے آٹھ دن کے سفر میں رستہ طے کیا تھا، اور لیڈی بلنٹ نے دس دن میں۔ تین دن کے سفر کے بعد جبہ کا نخلستان آجاتا ہے۔ یہاں کی چٹانوں پر بہت سے کتبے اور نقوش پائے جاتے ہیں جن سے ظاہر ہوتا ہے کہ زمانہ قدیم سے اس مقام پر اکثر لوگ آتے رہے ہیں۔ جوف سے نو دس گھنٹے کے سفر کے بعد شقیق کا کنواں ملتا ہے اسکو یوٹنگ نے ۱۸۸۳ء میں دیکھا اور اُس وقت یہ کنواں اَٹا ہوا تھا۔ الجوف کا اسکے قدیم نام (دومہ) سے اوپر ذکر کیا جا چکا ہے۔ یہ مقام وادی سرحان پر واقع ہے۔ یہ وادی کاف میں ہو کر حوران تک پتھریلے ریگستان کے داہنی جانب آر پار چلی گئی ہے۔ یہ مقام اسوقت حماد کہلاتا ہے۔ یہ ایسا نام ہے جسکا کسی زبان میں پتہ نہیں چلتا۔ والن نے لکھا ہے کہ شاید اسکی اصلی شکل ہاد ہو جو ہمد کے فعل سے مشتق ہے اور اسکے معنی "بنجر" کے ہیں۔

عراق عرب اہل عرب اسکے مغربی حصہ کو بادیۃ الشام کہا کرتے تھے۔ مشرقی حصہ کو جو جنوب کی طرف ہے بادیۃ عراق کے نام سے پکارتے تھے اور شمالی حصہ کو بادیۃ الجزیرۃ، عراق عرب کا ریگستان اور خساف بھی کہتے تھے۔ جنوبی علاقہ کو اکثر سماوہ کے نام سے یاد کرتے تھے اس بادیہ کے ڈھالوں کو جو مغرب اور شمال کی جانب سے مشرق اور جنوب کی طرف چلے گئے ہیں بہت سے چھوٹے چھوٹے نالے قطع کرتے ہیں۔ جنکا پانی کچھ تو تالابوں میں جمع ہو جاتا ہے اور کچھ بڑے بڑے چشموں میں چلا جاتا ہے اور یہ سب جا کر دریائے فرات میں گر جاتے ہیں۔ موسم بہار میں یہاں کثرت سے گھانس اُگ آتی ہے اور کنوؤں کے قریب نخلستان کے مثل باغات پیدا ہو جاتے ہیں بعض مقامات پر زیادہ برہنہ یا پتھریلی زمین جس پر ریت کی تہ جمی ہو بالکل بنجر رہتی ہے۔ اس

علاقہ کو عبور کرکے عراق سے شام کی طرف ۱۳ھ مطابق ۶۳۴ عیسوی میں حضرت خالد بن ولیدؓ اپنی
سوارہ فوج کے ساتھ ایک مہم پر آئے تھے۔ یہ مہم درحقیقت نہایت پُرخطر تھی۔ اس علاقہ کی حدود کا
گھٹنا یا بڑھنا، ان متمدن ریاستوں کی طاقتوری یا کمزوری پر منحصر ہے جو اسکے اطراف واقع ہیں۔ ساکو
نے لکھا ہے کہ اسوقت الحص کے پہاڑ جو حلب کے جنوب میں واقع ہیں، اس علاقہ کی شمالی حد قائم
کرتے ہیں پھر بھی گرمیوں کے موسم میں بدو لوگ اپنے گلوں کو لیکر مرعش تک چلے جایا کرتے ہیں۔

آب وہوا اور پیداوار

فی الجملہ عرب میں بہ نسبت سردی کے گرمی زیادہ ہوتی ہے تاہم مرتفع میدانوں کی
راتیں گرمی میں بھی اکثر سرد ہوا کرتی ہیں اور جاڑوں میں رات کی سرد شمالی ہوا نہایت
ناگوار ہو جاتی ہے۔ شعراء مشرقی ہوا (صبا) کو نہایت خوشگوار خیال کرتے ہیں۔
برخلاف اسکے سَمُوم کا بہت خوف ہوتا ہے۔ اب اس کا تلفظ عام طور پر سِمُوم کیا جاتا ہے۔ یہ زہریلی
جھلس دینے والی خشکی کی ہوا ہوتی ہے۔ ہر قسم کی خوشحالی بارش پر منحصر رہتی ہے۔ اسی وجہ سے
اکثر بارش کو "خدا کی رحمت" کہا جاتا ہے اور پانی اور فیاضی کے خیالات اکثر مترادف ہوا کرتے
ہیں۔ بارش کے موسم کے بعد، ربیع کا زمانہ سال کا بہترین زمانہ ہوتا ہے۔ اس موسم میں ہری ہری جھاڑ
اور گھانس جانوروں کے لیے پیدا ہو جاتی ہے۔ اونٹ خاص طور پر کٹیلے پودوں کو بہت شوق
سے کھاتے ہیں۔ ان پودوں میں سعدان کا پودا انکو بہت مرغوب ہوتا ہے۔ انسانوں کو کھانے
کے لیے اس بادیہ میں جو اناج پیدا ہوتا ہے اسکو فِث کہتے ہیں۔ اب عام طور پر اسکو قمح کے نام
پکارا جاتا ہے (غالباً یہ نام قمح سے ماخوذ ہے)۔ اس غلہ کے سرخی مائل دانوں کا آٹا جَو کے آٹے
سے بہتر ہوتا ہے۔ جو حلوا پکانے کے لیے زیادہ استعمال کیا جاتا ہے۔ لوگ ضرورت کے وقت حنظل
کے بیجوں کا آٹا بھی استعمال میں لاتے ہیں۔ اس ریگستان میں کھمبہ بھی پیدا ہوتا ہے لوگ اسکو بہت
شوق سے کھاتے ہیں۔ اور مشہور و معروف سَنا بھی کھائی جاتی ہے۔ گیہوں صرف یمامہ، یمن
اور چند نخلستانوں میں پیدا ہوتا اور ہمیشہ گراں رہتا ہے اس لیے اسکی روٹی عموماً عیش و طرب
چیز سمجھی جاتی ہے۔ جَو کی کاشت زیادہ ہوتی ہے اس وجہ سے کہ اسکو گھوڑے کھاتے ہیں۔ جو
باجرہ اچھی خاصی تعداد میں پیدا ہوتا ہے۔ لحسا اور عمان میں چاول خوب پیدا ہوتا ہے۔
کے عہد میں تمباکو کی کاشت کم ہو گئی تھی اس لیے کہ انھوں نے اس فضول چیز کی کاشت کی م
کر دی تھی لیکن اب پھر اسکی کاشت میں ترقی ہو رہی ہے۔
اس بادیہ میں جو درخت پیدا ہوتے ہیں، ان میں طلح کے درختوں کے مانند گوند کے درخ

کئی قسم کے ہوتے ہیں۔ ان کی اقسام کا بیان کرنا بہت ضروری ہے۔ ان سے صمغ عربی نکلتا ہے اور انکی اقسام حسب ذیل ہیں :۔ سلم، سمر، سیال، اِثل، نبک، غضا (اس درخت کی لکڑی کا کوئلہ بہت عمدہ ہوتا ہے)۔ جنگلی کھجورا اور مہندی کے درخت بھی اس بادیہ میں ہوتے ہیں۔ عرب لوگ کھجور کے درختوں کی بہت قدر کرتے ہیں۔ اور یہ درخت واقعی اعلیٰ درجہ کے ہوتے ہیں۔ عربوں کی خاص خوراک کھجور ہے۔ مدینہ کے علاقہ میں کھجور کی قسمیں سَو سے بھی زائد شمار کی جاتی ہیں۔

قدیم شعرائے شیروں کا مسلسل ذکر کیا ہے اور ہمدانی نے تو اُن علاقوں کے نام تک بتائے ہیں جن میں وہ پائے جاتے تھے۔ ابن المجاور نے لکھا ہے کہ صنعا کے شمالی پہاڑوں میں اُسکے زمانہ میں بھی چند شیر موجود تھے۔ اور ڈوٹی نے بھی یہی اطلاع وسط عرب میں سُنی تھی۔ چیتے، تیندوے، چرغ، اور لومڑیاں بڑے شکاری جانور ہیں۔ شکار کے متعلق ہم نے ضروری باتیں اس مضمون کے اُس حصے میں لکھی ہیں جس میں ہم نے عربوں کی نسل اور طرز معاشرت کا ذکر کیا ہے۔ شکاری پرندوں میں دو قسم کے عقاب، شاہین، شکرے اور اُلو ہوتے ہیں۔ بندر یمن میں زیادہ ہیں اور غالباً دوسرے حصوں میں بھی پائے جاتے ہیں۔ کوّے عام طور پر ہر جگہ ہوتے ہیں۔ دوسرے پرندوں میں ہُدہُد، چنڈول، بلبل، چند قسم کے کبوتر، اور خصوصاً قطا قسم کے تیتر پائے جاتے ہیں۔

چوپاؤں میں سب سے زیادہ قابلِ قدر اونٹ ہیں، بغیر انکے ریگستان عملی طور پر ناقابلِ رہائش ہوجاتا ہے۔ شعرائے اسکو "خشکی کا جہاز" واقعی ٹھیک کہا ہے اس وجہ سے کہ ریگستان میں نقل و حرکت کا واحد ذریعہ یہی ہے۔ یہ قصہ کہ انسانوں کو جب پانی کی شدید ضرورت ہوتی ہے تو وہ اونٹوں کو مار کر وہ پانی بھی پی جاتے ہیں جو انکے پیٹ میں جمع رہتا ہے۔ اس قصہ کو جیکب نے پریوں کا قصہ بتایا ہے۔ لیکن طبری کی عبارت سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہاں کا یہ واقعہ بالکل اختراع بھی نہیں ہے (ملاحظہ ہو طبری صفحہ ۲۱۲۳) جہاں گھوڑوں کو اسی طریقہ سے پانی پلایا جاتا ہے۔ عربی اونٹ کے صرف ایک کوہان ہوتا ہے۔ باربرداری کے اونٹ کو بعیر کثیر تعداد کو اِبل کہتے اور سواری کے اونٹ کو ذلول (پالتو) یا (ہجین) شریف کہتے ہیں۔ اونٹ کا گوشت بہت زیادہ کھایا جاتا ہے، اُسکا دودھ بازائقہ اور مفرح ہوتا ہے، بہت پیا جاتا ہے لیکن گھی کے کام کا نہیں ہوتا۔ بھیڑ بکریوں کے دودھ سے گھی نکالتے ہیں بھیڑ اور بکری کے گلّے عرب میں عموماً رکھے جاتے ہیں لیکن گائے بھینس شاذ ہوتی ہیں صرف دریائے فرات کے نواح میں گایوں کے گلّے پائے جاتے ہیں جن کو بقارہ کہتے ہیں۔ عرب کا اصیل گھوڑا دنیا بھر میں مشہور ہے۔ چھوٹا ہوتا ہے مگر بہت خوبصورت۔ بہت تیز اور محنتی ہوتا ہے۔ اپنے آقا سے بہت محبت رکھتا ہے

صرف دولتمند لوگ ہی گھوڑا رکھ سکتے ہیں اس لیے کہ یہ گھوڑے صرف لڑائی یا تفریحی کھیل دوڑ اور شکار کے موقع پر کام میں لائے جاتے ہیں۔ علاوہ اسکے انپر صرفہ بھی زیادہ ہوتا ہے۔ مکمل طور سے تربیت یافتہ ایک گھوڑی ۲۵ اونٹوں کی قیمت کے برابر سمجھی جاتی ہے اور اسکے لیے جَو اور پانی زیادہ صرف ہوتا ہے۔ قزاقانہ تاختوں میں گھوڑوں کے واسطے اونٹوں پر پانی لیجایا جاتا ہے اور ضرورت کے وقت اکثر انکے لیے گھر کے اثاثہ کا بیشتر حصہ صرف کر دیا جاتا ہے۔ لیڈی بلنٹ اور فان اپن ہیم کے سفرناموں میں اسکے متعلق بہت سے واقعات بالتفصیل درج ہیں۔ صرف نجدہی میں گھوڑوں کو پرورش نہیں کیا جاتا بلکہ یمن کے چند حصوں مثلاً عمار اور جوف وغیرہ میں بھی انکی پرورش ہوتی ہے۔ زمانۂ قدیم سے ہندوستان میں عربی گھوڑے آتے رہے ہیں۔ حاکم شمر ہر سال چند گھوڑے براہ کویت ہندوستان بھیجا رہتا ہے۔ اگرچہ حجاز، لحسا اور یمن کے باشندے، نیز وسط عرب میں قبایۂ صلیب کے افراد بھی خچروں کو سواری کے کام میں لاتے ہیں لیکن بدو اسکی سواری کو کسرشان سمجھتے ہیں۔ دریائے فرات پر سجوزر کے وادی میں نیم بدو خچروں کے بہت سے گلے رکھتے ہیں۔

پالتو جانوروں میں حسب ذیل قابل ذکر ہیں:- معمولی کُتے، جن سے دیکھ بھال (چوکیداری) کا کام لیا جاتا ہے، بہت زیادہ گیدڑ سے مشابہ ہوتے ہیں۔ اور شکاری کُتوں کو سلوکی کہتے ہیں (یہ لفظ سلوق سے ماخوذ ہے) بلیاں، یورپی بلیوں سے بڑی ہوتی ہیں۔ شہروں میں مرغیاں بہت کم پائی جاتی ہیں، اگرچہ بادیہ میں وہ کثرت سے موجود ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ یمن میں کسی زمانہ میں بندروں سے گھر کا کام کاج کرایا جاتا تھا

عرب میں یہ بات تو مشہور ہی ہے کہ ٹڈیاں بہت نقصان کا باعث ہوا کرتی ہیں کہتے ہیں کہ انکا دورہ ہر ساتویں سال ہوتا ہے۔ جس وقت ٹڈیوں کا دَل کا دَل چھا جاتا ہے تو پھر بچے سے لیکر بوڑھے تک گھر سے نکل آتے ہیں۔ ان کا صرف یہ ہی مقصد نہیں ہوتا کہ انکا خاتمہ کردیں بلکہ وہ انکو بہت شوق سے کھاتے بھی ہیں۔ یہ لوگ ٹڈیوں کو نمک کے ساتھ اُبال کر یا بھون کر کھاتے ہیں۔ شہد کی مکھیوں کو پرورش کرنے کا یہاں قاعدہ نہیں ہے، البتہ بیشتر حصوں میں جنگلی شہد پایا پایا جاتا ہے جو خدا کی نعمت سمجھا جاتا ہے۔

نسل اور طرز معاشرت

عرب شجرہ نویسوں نے تمام عربوں کی نسل کے متعلق یہ لکھا ہے کہ وہ حضرت ابراہیم (علیہ السلام) کی اولاد ہیں، شمالی عرب تو حضرت اسمٰعیل (علیہ السلام)

کی نسل سے ہیں اور جنوبی عرب قحطان کی نسل سے - اور اس نظریہ کی بنیاد توراۃ کے بیان پر ہے۔
اس کلیہ سے یہ بھی متعلق ہے کہ "اصلی عرب" (العرب العاربہ) عاد و ثمود، عملیق وغیرہ کے قبائل
فنا ہو چکے ہیں نیز وہ قبائل جو قحطان کی نسل سے تھے وہ بھی باقی نہیں رہے اور یہ کہ حضرت اسمٰعیل
(علیہ السلام) کی نسل "العرب المستعربہ" کہلاتی ہے - یعنی وہ لوگ جو باہر سے آکر عرب میں آباد ہوئے
اور رہتے رہتے عرب بن گئے - وہ بدو بھی اصلی عرب کہلاتے ہیں جو خالص عربی زبان بولتے ہیں
جمع کے الفاظ "اعراب" اور "عربان" بھی ضمناً انکے لیے استعمال کیے جاتے ہیں - بدوی اُن لوگوں
کو کہتے ہیں جو بادیہ (کھلے میدان) میں رہتے ہیں - انکے مقابلہ میں اہل الحضرہ لوگ کہلاتے ہیں
جو مستقل سکونت رکھتے ہیں - انھیں لوگوں کو اہل الوبر اس لیے کہا جاتا ہے کہ وہ اونٹ اور بکروں
کی اُون کے بنائے ہوئے خیموں میں رہتے ہیں - انکے مقابلہ میں اہل المدر (یا الطین) مٹی کے گھروں
میں رہتے ہیں -

یہ تو ایک بدیہی واقعہ ہے کہ اہل عرب شمالی اور جنوبی قبائل میں منقسم ہیں - جنوبی قبائل یمنی
کہلاتے ہیں اور شمالی بنی نزار - عہد نبوی صلعم میں بھی بہت سے یمنی قبائل عرصہ سے شمالی علاقوں
میں آباد چلے آرہے تھے اور جنوب میں بنی نزار کے قبائل کے کچھ حصے - روایت چلی آرہی ہے کہ
سدّ مآرب کے ٹوٹ جانے کی وجہ سے یمنی قبائل خانماں برباد ہو کر شمالی اور درمیانی عرب میں جاکر
آباد ہو گئے تھے - معلوم نہیں کہ یہ بات تاریخی حیثیت سے کہاں تک صحیح ہے اس لیے کہ جو سنین
ہم تک پہونچے ہیں اُن سے ہم اس واقعہ کی صحت کے متعلق کوئی فیصلہ نہیں کر سکتے - بہر صورت
نقل وطن کے کچھ نہ کچھ دیگر اسباب ضرور معاون ہوئے ہوں گے جنکی وجہ سے اور لوگوں کو بھی ترک
وطن کرنا پڑا ہوگا -

خود مُلک عرب کی طبیعی حالت، اونٹوں کو پرورش کرنے والے عربوں کو ہمیشہ خانہ بدوشی کی
زندگی بسر کرنے پر مجبور کرتی ہے - وسطِ عرب کے شمال مشرق اور جنوب کی طرف جو ریگستان ہے،
وہ موسم باراں کے بعد غیر معمولی طور سے کوئی تین مہینے تک سرسبز و شاداب چراگاہ بنا رہتا ہے -
انسان اور جانور آکر کثرت سے اس میں آباد ہو جاتے ہیں - لیکن جب زمین بنجر ہو جاتی ہے تو یہ
لوگ اپنے اہل و عیال اور سامان کو لیکر پھر اپنے اپنے اصلی مقامات کو واپس چلے جاتے ہیں - اکثر
ایسا بھی ہوتا ہے کہ جب انکے خاص علاقہ میں پورے قبائل کی پرورش غیر ممکن ہو جاتی ہے تو قبائل کے
چند حصے دوسرے علاقوں میں جاکر بعض اوقات زبردستی آباد ہو جاتے ہیں - بدو بہت ہی کثیر الاولاد

ہوتے ہیں اور حالات کی مساعدت میں خاندانوں کا ایک چھوٹا سا گروہ بہت ہی قلیل عرصہ میں ایک طاقتور قبیلہ بن جاتا ہے۔ پھر اس صورت میں قرب و جوار کے قبائل کے لیے ترک وطن ناگزیر ہو جاتا ہے۔ چونکہ بدووں کا وہ جنوبی علاقہ جو ریگستان اور ساحلی ریاستوں کے درمیان واقع ہے، محدود ہے۔ اس لیے جنوب کے باشندوں کو بہ نسبت شمالی باشندوں کے زیادہ دور جاکے آباد ہونا پڑا۔ عہد نبوی صلعم سے بھی صدیوں قبل طے کے طاقتور یمنی قبیلہ نے شمالی نجد میں ایک علاقہ فتح کیا تھا اور اس بنا پر قضاعہ کے قبائل کو شام کے مشرق اور جنوب میں جا کر آباد ہونا پڑا تھا۔ پس شمالی قبائل، جنوب کی طرف، صرف استثنائی حالات ہی میں نقل وطن کیا کرتے ہیں۔

جنوبی اور شمالی قبائل میں مخالفت کی علت ہے، سب سے پہلی وجہ یہ ہو کہ آخرالذکر نے اول الذکر کو اپنے رسم و رواج اور معاملات میں مخل سمجھا ہو۔ جنوبی ریاستوں (یمن، حضرموت، عمان) کے باشندوں کے میل جول سے، شمالی باشندوں نے انکی زبان سیکھی اور شاید انکے رسم و رواج کی خصوصیات سے شمالی عرب مانوس نہ تھے، اس لیے وہ جنوب والوں سے ناراض ہو گئے۔ بعد میں یہ ناراضی بہت زیادہ بڑھ گئی یہاں تک کہ آخرکار اہل مدینہ، انصار (جو یمنی الاصل ہیں) اور اہل مکہ قریش (جو نزاری الاصل ہیں) میں رفتہ رفتہ نسلی دشمنی قائم ہو گئی۔ یہی دشمنی عربی حکومت کے لیے خطرناک ثابت ہوئی اور اب تک چلی آتی ہے۔

خاندان قبیلہ کی بنیاد ہوتا ہے۔ ایک عرب کے لیے قابل فخر یہ بات ہوتی ہے کہ جہاں تک ممکن ہو زیادہ تعداد میں مضبوط اور بہادر پوت پیدا کرے۔ انکے ذریعہ سے اس کا خاندان مشہور ہو کر اپنے چھوٹے چھوٹے خاندانوں پر بالادست ہو جاتا ہے جو اسکو اپنا بڑا (شیخ) سمجھتے اور اپنے تئیں اس کا بچہ تصور کرتے ہیں۔ ایسے افراد کا ایک قبیلہ بن جاتا ہے۔ اگر یہ قبیلہ طاقتور اور دولتمند ہے تو دوسرے کمزور قبائل بھی اس میں شریک ہو جاتے ہیں۔ علاوہ ازیں دیگر قبائل بھی اکثر امداد باہمی یا بڑی بڑی مہموں کو سر کرنے کے لیے آپس میں مل جایا کرتے ہیں۔ اس قسم کے قبائل کے مرکب یا مجموعہ کا ایک عمومی نام رکھ لیا جاتا ہے جو عموماً کسی خاص اور مشہور قبیلہ کے نام پر ہوتا ہے نیز یہ نام اکثر بلا سوچے سمجھے بھی رکھ لیے جاتے ہیں مثلاً بنی انمار یا بنی کلاب وغیرہ۔ تمام ماتحت قبائل کو ایک باپ یا ایک ماں کی اولاد کی طرح سمجھا جاتا ہے۔ چونکہ زمانہ قدیم میں یمنی اور نزاری قبائل میں اتنی سخت دشمنی نہ تھی جتنی کہ بعد میں ہو گئی اس لیے اکثر خاص شمالی عرب کے قبائل میں بلکہ واقعی چند یمنیوں کے خاندان ملتے ہیں اور یمنیوں میں شمالی عرب کے خاندان بھی پائے جاتے ہیں۔

محققین نے قحطان کو تمام یمنیوں کا مورثِ اعلیٰ بتایا ہے۔ یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ قحطان ایک مشہور و معروف قبیلہ کے نام سے اُس علاقہ میں اب تک موجود ہے جو جنوبی حجاز کے مشرق اور یمن کے شمال میں واقع ہے اور ریگستان اعظم تک چلا گیا ہے (ہنیٹ نے قبیلہ قحطان کو اس علاقہ کا باشندہ بتایا ہے جس میں خوشبو کے درخت اُگے ہوئے ہیں۔ اب معلوم نہیں کہ ہمارا قحطان بنیٹ کے (Kalhan) سے مطابقت کرتا بھی ہے یا نہیں۔ اور میں اسکے متعلق کوئی فیصلہ نہیں کر سکتا) اس علاقہ کے جنوب میں قبیلہ کہلان آباد ہے۔ کہا جاتا ہے کہ اس قبیلہ سے یمنی قبائل کی دو نہایت مشہور شاخیں نکلی ہیں:

قبیلۂ کہلان سے (یہ دونوں جماعتیں) متعلق ہیں یا تھیں حسبِ ذیل ملاحظہ ہو:۔

۱۔ قبیلۂ طے تقریباً دو ہزار برس تک اجاء اور سلمیٰ کے پہاڑوں پر قابض رہا۔ اس قبیلہ کے دو افراد کے نام پر یہ دونوں پہاڑ اس نام سے مشہور ہوئے۔ شامی اور ایرانیوں نے اسی مشہور و معروف قبیلہ کے نام پر تمام عربوں کو طے کے نام سے یاد کیا۔ بنی طے کا ایک خاندان (شمر نامی) جب برسرِ حکومت آیا تو اس حکمراں خاندان کے نام پر اس علاقہ کے باشندے شمر کہلانے لگے۔ خاندان شمر کے جد اعلیٰ اجاء کے پہاڑوں میں قوارن نامی ایک گاؤں میں رہتے تھے۔ اسوقت عراق عرب میں صرف چند چھوٹے چھوٹے قبائل کو قبیلۂ طے کے افراد کہا جاتا ہے جو حاکم شمر کے ماتحت ہیں لیکن ان لوگوں کو جذیہ نہیں دینا پڑتا اس لیے کہ یہ لوگ خاندان شمر کے ہم نسل سمجھے جاتے ہیں۔ قبیلۂ شمر کو ریگستان شام سے عنزہ کے قبیلہ نے نکال دیا تھا اور یہ لوگ عراق عرب میں جہاں وہ اس وقت حکمراں ہیں سترہویں صدی کے اختتام کے بعد آئے تھے۔

۲۔ ہمدان اور مذحج کے قبائل بہت عرصہ تک یمن میں آباد رہے۔ مذحج سے قبیلۂ بلحارث جو طائف کے جنوب مشرق میں آباد تھا، متعلق ہے۔ قبیلۂ بجلہ کے افراد بھی مذحج ہی کی نسل سے ہیں۔ بجلہ نے حضرت عمرؓ کے عہد میں عراق عرب کی تسخیر میں زیادہ حصہ لیا تھا۔

۳۔ بنی عاملہ اور بنی جذام کے قبائل فلسطین میں آباد ہوئے تھے۔ بنی لخم نے دریائے فرات پر حیرہ کی سلطنت قائم کی تھی۔ بنی کندہ صرف اپنے خاص وطن حضرموت میں برسرِ حکومت رہے بلکہ انھوں نے یمامہ میں بنو اسد پر بھی حکومت کی تھی۔ بنی کندہ کے امیر (حکمراں) نے بادشاہ کا لقب بھی اختیار کیا تھا۔ مشہور و معروف شاعر امراء القیس اسی شاہی خاندان سے تھا۔

۴۔ ازد کے طاقتور قبیلہ نے (جس میں بہت سے قبائل شامل تھے) عمان فتح کر کے سراۃ کے

اسی قبیلے کے ایک خاندان نامی غسان نے مشرق میں ایک
پہاڑوں میں بود و باش اختیار کر لی تھی۔ اسی قبیلے کی دوسری شاخیں خزعہ کہلاتی ہیں جو کسی زمانہ میں مکہ پر حکمراں
حکومت قائم کی تھی۔ اس خاندان کی دوسری شاخیں خزعہ کہلاتی ہیں جو کسی زمانہ میں مکہ پر حکمراں
رہی تھیں۔ یثرب (مدینہ) میں جو دو قبیلے اوس اور خزرج (انصار) آباد تھے وہ بھی خزعہ کی
نسل سے ہیں۔

قحطان سے جو دیگر نسلیں چلی ہیں اُن میں محققین قبیلۂ حمیر کو سب سے پہلے جگہ دیتے ہیں۔
اس سے قضاعہ کا بڑا اصل جول ہے۔ اور قضاعہ میں بہرا اور تنوخ کے قبائل بھی شامل ہیں۔ یہ
قبائل شمالی شام میں بہت زمانہ قبل آباد ہوئے تھے۔ جہینہ حجاز کی وادی اعظم میں آباد تھا اور
اُس کا ہم رشتہ قبیلۂ عذراء اسکی نواح میں بسا ہوا تھا۔ قبیلۂ عذرا کے افراد عاشق مزاجی میں مشہور ہیں
بنی کلب ریگستان شام میں آباد تھے اور قبیلۂ بلی شمالی حجاز میں۔ حضرت عمرؓ کے عہد میں بلی اور
جہنیہ کی بڑی بڑی جماعتیں مصر میں جاکر آباد ہو گئی تھیں۔

شمالی عربی قبائل اپنے اسلاف کے نام پر نزاری یا معدی کہلاتے ہیں۔ معدی کی نسبت روما
کی تاریخ میں مذکور ہے کہ وہ قبائل کا ایک مجموعہ تھا اور نزاری کا پتہ ۳۲۸ء کے کتبہ سے چلتا ہے جسکو
دسو دنے النمارہ میں (حوران کے مشرقی جانب) صفا کے نواح میں دریافت کیا تھا۔ اس کتبہ سے
یہ بھی معلوم ہوا ہے کہ امرء القیس بن عمرو "بادشاہ عرب" نے اسد اور بنی نزار پر حکومت کی تھی۔ اس
کتبہ میں ایاد کے قبیلہ کا نام مذکور نہیں ہے جو کسی زمانہ میں بہت طاقتور تھا مگر اسلام سے قبل ہی
معدوم ہو چکا تھا۔ قبیلۂ آیاد دو بڑی جماعتوں میں منقسم تھا۔ ایک کو ربیعہ کہتے ہیں اور دوسرے
کو مضر۔ یہ دونوں گروہ عہد اسلام سے قبل ہی فنا ہو چکے تھے۔ نیز یہ دونوں حکمراں قبیلے تھے
جو عراق عرب کو نقل وطن کر کے چلے گئے تھے، جہاں ان دونوں قبائل کے نام پر دو صوبوں کے نام
بہت عرصہ تک قائم رہے۔ ایک صوبہ کا نام دیار ربیعہ تھا جو دریائے دجلہ پر آباد تھا، اور
دوسرے صوبہ کا نام تھا دیار مضر جو دریائے فرات پر واقع تھا۔ بعد میں ان صوبوں پر بنی تغلب
اور بنی نمیر کے قبائل قابض ہو گئے تھے۔

عنزہ اور اُسکے قریبی رشتہ دار قبیلۂ اسد کے افراد جو وادی رمہ کے شمال میں ایک دا
کے قریب قریب آباد تھے قبیلۂ ربیعہ سے متعلق ہیں۔ بصرہ سے مدینہ کو جو زائرین کی سڑک جاتی
وہ اُنکے علاقہ میں سے ہو کر جاتی تھی۔ زمانۂ قدیم میں عنزہ کے افراد، قضاعہ کو عرب سے نکال
یہاں پر سر حکومت رہے ہیں اور سترھویں صدی عیسوی کے نصف آخر میں اُنھوں نے قریباً

تمام ریگستان شام کو اپنی مملکت میں شامل کر لیا تھا۔ شمال مشرق میں بنو سباعہ اور مغرب میں قبیلۂ رلہ کے افراد آباد تھے اور یہ دونوں قبیلے عنزہ سے متعلق تھے۔ عراق میں قبیلۂ اسد کے افراد اتبک موجود ہیں۔ اس قبیلہ سے وائل کا قریبی رشتہ ہے۔ وائل کی دو مشہور جماعتیں ہیں۔ ایک کو بکر کہتے ہیں اور دوسری کو تغلب۔ کلیب، وائل کے افراد پر حکمران تھا، اسکے قتل کی وجہ سے بکر اور تغلب میں جو جنگ ہوئی اُس نے ان دونوں قبائل کو فنا کر دیا۔ چنانچہ بکر اور تغلب اپنے حلیف قبیلۂ نمیر کو لیکر عراق عرب کو نقل وطن کر کے چلے گئے تھے۔ بکر تو شمالی حصہ میں جاکر آباد ہوئے تھے جو اُنکی وجہ سے دیار بکر کہلایا۔ صدر مقام آمد اتبک اسی نام سے مشہور ہے۔ تغلب اور نمیر جنوبی علاقہ میں آباد ہوئے تھے۔ یہ لوگ عیسائی تھے اور اس وجہ سے انکو عہد اسلام میں دوگنا جزیہ ادا کرنا پڑتا تھا۔ دوسرے قبائل میں بنو حنیفہ، یمامہ کے امراء اور وہ قبیلے جو شیبان کے پڑوس میں آباد تھے، بکر بن وائل سے متعلق ہیں۔ نیز عبد القیس کے افراد جو بحرین میں آباد تھے کہا جاتا ہے کہ یہ بھی قبیلہ ربیعہ میں شامل تھے۔

مضر کے گروہ میں ابتداءً سب سے ممتاز قبیلۂ قیس ہوا۔ اس قبیلہ نے ایسی شہرت پائی تھی کہ اکثر تمام غیر یمنی عرب بھی اس قبیلہ سے متعلق کہلانے لگے تھے۔ اسوقت دریائے فرات پر قیس ایک چھوٹے سے نیم چرواہوں کے قبیلہ کا نام ہے جو حاکم شمر کو خراج ادا کرتا ہے۔ اس قبیلہ کے مشرقی جانب عدوان کا قبیلہ آباد ہے اور یہ بھی حاکم شمر کا ماتحت ہے۔ پہلے اس قبیلہ کے افراد فہم کے قریب آباد تھے اور ہذیل کا قبیلہ جنوبی حجاز میں آباد تھا۔ ہوازن اور سلیم کے قبائل بھی قیس ہی کے قبیلہ سے ہیں جو نجد کے مغربی حصہ سے لیکر مکہ اور مدینہ کے مشرقی علاقہ تک قابض و متصرف تھے۔ تیسری صدی ہجری (نویں صدی عیسوی) کے اوائل میں قبیلۂ سلیم اور اُنکے پڑوسی ہلال کے افراد کثرتِ تعداد کی بنا پر ایسے ضرر رساں، اور مقدس مقامات کے لیے اس قدر خطرناک ہوگئے تھے کہ جبراً انکو مطیع کرنا پڑا تھا۔ چنانچہ ان دونوں قبائل نے مصر کو نقل وطن کرنے کا فیصلہ کرکے چلے تو دریائے نیل کے دوآبہ میں جاکر آباد ہوئے پھر وہاں سے اُنکو شمالی مصر میں جبراً بھیجا گیا تھا۔ پھر ۴۴۲ھ ہجری میں انھیں فی کس ایک اونٹ اور ایک دینار دیے جانے کی ترغیب دیکر دریائے نیل کے پار شمالی افریقہ میں آباد کیا گیا تھا۔ چنانچہ شمالی افریقہ کے بدوی عرب اکثر اپنے آپ کو انھیں دو قبیلوں کی نسل سے ہونے کے مدعی ہیں۔ ہلال کے افراد اب تک وسط عرب میں موجود ہیں۔ اس قبیلہ کے افراد امیر بن صعصعہ کے قبائل کی ایک شاخ تھے۔ جس سے

کلاب، قشیر اور عقیل کے افراد بھی علاقہ رکھتے تھے۔ قبیلہ عقیل نجد میں ابتک مشہور و معروف قبیلہ ہے۔ شام سے بغداد کو جو کاروان جاتے ہیں اُنکے لیے زیادہ تر اونٹ اور حفاظتی دستے بھی قبیلہ مہیا کرتا ہے۔ عقیل کا ایک خاندان منتفق کہلاتا ہے جو چوتھی صدی ہجری (دسویں صدی عیسوی) میں بھی طاقتور تھا اور اب بھی ہے۔ ان کا علاقہ دریائے فرات کے زیریں حصہ میں ہے۔

قبیلۂ غطفان بھی قیس کی ایک شاخ ہے۔ جماعت قیس کے دو خاص قبیلے عبس اور ذبیان باہمی جنگ کی وجہ سے مشہور ہیں۔ ان قبیلوں میں یہ جنگ گھوڑ دوڑ کے دو گھوڑوں کے سبب سے ہوئی تھی جو "داحس اور غبرا کی لڑائی" کے نام سے مشہور ہے۔ ذبیان کی خاص شاخ فزارہ تھی۔ ضبہ اور تمیم کے قبائل بھی مضر سے متعلق تھے جو نجد کے ان علاقوں میں آباد ہوگئے تھے جن میں پہلے بکر اور تغلب جاکر آباد ہوے تھے۔ تمیم کا بڑا قبیلہ تھا اور اُسکے افراد ہر طرف پھیلے ہوے تھے۔ اس نام کے خالص بدو اب عرب میں موجود نہیں ہیں (گو تھوڑے سے دریائے دجلہ کے زیریں علاقہ میں آباد ہیں) تاہم نجد کے شہروں میں آبادی کی بیشتر تعداد اپنے آپ کو اس قبیلہ سے بتاتی ہے۔ نجد میں بڑے بڑے بدوی قبائل آباد ہیں جو تمام و کمال قبیلۂ مضر سے ہیں۔ ان میں قبیلۂ حرب (مزینہ) کے افراد حجاز کے مشرق میں دونوں مقدس شہروں کے درمیان والی سڑک پر آباد ہیں۔ انکے مشرق میں عتیبہ کا طاقتور قبیلہ آباد ہے ان دونوں قبائل کو وادی رمہ ایک کو دوسرے سے جدا کرتی ہے۔ ان قبائل کے مشرق کی طرف مطیر کا قبیلہ آباد ہے۔ یمامہ کے مشرق میں بنو خالد بسے ہوے ہیں اور یہ بھی مضر سے متعلق ہیں۔ وہابیوں کے عہد میں اُنکی شہرت جاتی رہی۔ قبیلہ ہذیل کے افراد بھی [illegible] قبیلہ مضر سے متعلق ہیں۔ ہذیل کے لوگ زمانۂ قدیم سے مکہ کے قرب و جوار کے پہاڑوں میں آباد چلے آرہے ہیں اور قبیلہ کنانہ بھی قبیلۂ مضر کی ایک شاخ ہے۔ کسی زمانہ میں کنانہ جنوبی حجاز کا بہت طاقتور اور مشہور قبیلہ تھا اور اس سے قریش کا قدیم حکمراں قبیلہ بھی متعلق ہے۔

اسلامی فتوحات نے بدوی دنیا کی کایا پلٹ کردی تھی۔ بدو لوگ جنگ کے لیے بہت مضبوط فوجی دستے فراہم کیا کرتے تھے اور جب عراق اور شام میں پہلے پہل بڑی بڑی فوجی چھاؤنیاں قائم کی گئیں تو ان فوجی مرکزوں کی امداد کے لیے مشرق اور مغرب میں دوسری چھاؤنیاں بھی قائم کردی گئی تھیں جہاں بدوؤں کے اور امدادی فوجی دستے بھیجے جاتے تھے۔ اس بنا پر بعض قبائل ایسے کمزور ہوگئے کہ دوسرے قبیلوں میں شریک ہوکر وہ عرب میں اپنی خود مختاری کو کھو بیٹھے۔

ربیعہ اور مضر کے قبیلوں میں نسلہا نسل سے اس درجہ دشمنی چلی آرہی تھی کہ ربیعہ کے افراد

قبیلۂ مضر کے خلاف اکثر یمنی قبائل سے طالب امداد ہوا کرتے تھے۔

قبیلۂ ہتیم کے افراد کو، جو حجاز اور نجد میں منتشر طور سے آباد ہیں، خالص عربوں میں شمار نہیں کیا جاتا۔ یہ لوگ بہت اچھے شکاری ہیں، جانوروں کے چھوٹے چھوٹے گلّے رکھتے ہیں اور ان میں اکثر لوہار کا پیشہ بھی کرتے ہیں۔ اس قبیلہ سے شرارات کے افراد کو بھی منسوب کیا جاتا ہے جو ریگستانِ شام کے جنوب مغرب میں آباد ہیں اور سواری کے اونٹوں کو پرورش کرنا انکا پیشہ ہے۔ انکے علاقہ سے آگے بڑھ کر صلیب کے افراد "ریگستان کے خانہ بدوش" بسے ہوئے ہیں۔ یہ لوگ کسیرے ہیں اور کم و بیش شکاری بھی۔ سواری گدھے پر کرتے ہیں۔ قدیم عربی ادب میں ان کا مطلق ذکر نہیں کیا گیا۔

ایک شریف بدوی ہنر کو نفرت کی نظر سے دیکھتا ہے۔ اُسکے خیال میں جانوروں کو پرورش کرنا، تجارت کرنا، شکار کرنا ایسے پیشے ہیں جو انسان کو اختیار کرنا چاہییں۔ زراعت اور جہازرانی کو بھی وہ قابلِ توجہ نہیں سمجھتا۔ تمیم کے افراد ازد کے قبیلہ کے لوگوں کو اکثر حقارت سے "ملاح" کہا کرتے تھے اس لیے کہ اُنکے خویش و اقارب عمان میں ملاحی کا کام کیا کرتے تھے۔ قریش بھی مدینہ والوں کو حقارت کی نظر سے دیکھا کرتے تھے اس لیے کہ اہل مدینہ زراعت پیشہ تھے۔ بدووں کی خاص خوراک دودھ ہے۔ دودھ کو پکا کر وہ اکثر دہی کے شکل جما لیا کرتے ہیں۔ جو پانی ملانے سے پھر اپنی اصلی صورت میں آجاتا ہے۔ اس قسم کا منجمد دودھ سفر میں بہت کارآمد ہوتا ہے۔ مکھن کو صاف کرکے اسی طرح رکھتے ہیں۔ عام طور پر یہ بات مشہور رہے کہ بدووں کو پنیر بنانا نہیں آتا۔ بدو لوگ سوائے اُن مواقع کے جبکہ اُنکو جانور مجبوراً ذبح کرنا پڑیں، اور وہ صرف دعوت یا مہمانوں کے لیے جانوروں کو ذبح کیا کرتے ہیں۔ لیکن چونکہ خوشحال بدوی شیخ کے پاس اکثر و بیشتر مہمان آتے رہتے ہیں اس لیے اُسکے گھر والوں کو روزانہ گوشت کھانے کو مل جاتا ہے۔ مکھن، اونٹ، اور بکریوں کے اُون سے بُنے ہوئے کپڑے اور خاص کر اُس مقام کے جانور اور گھوڑوں کو (جہاں وہ پرورش کیے جاتے ہیں) بدو لوگ بازار میں لاتے اور اُنکا تبادلہ کھجور، غلہ، کپڑوں اور گھر کی روزمرہ کے استعمال کی چیزوں سے کرکے لے جایا کرتے ہیں۔ اب کافی اور تمباکو کا استعمال بدووں کے لیے ناگزیر ہو گیا ہے۔ پرانے سے پرانے خیال کے لوگوں کو بھی دنیا کی موجودہ روش کا ساتھ دینا پڑتا ہے اس لیے تیر اور کمان کی جگہ اب بندوقوں نے لے لی ہے۔ جب تک وہابی لوگ برسر اقتدار رہے، انکی مملکت میں تمباکو نوشی کی سخت ممانعت رہی۔

بدووں نے تجارت میں بڑے پیمانہ پر صرف قافلوں کے لیے اونٹوں کی فراہمی اور رہ شمن

کے حملوں سے اُنکو محفوظ رکھنے کی حد تک، حصہ لیا تھا - اس خدمت کے لیے انکو معاوضہ ملا کرتا تھا -
اب بھی طاقتور بدوؤں کو، جو شاہراہوں پر آباد ہیں حکومت کی طرف سے "تھیلیاں" یا معاوضہ
ملا کرتا ہے - شہری لوگ جو اِن بدو قبائل کے علاقہ میں سفر کرتے ہیں تو انکو (Brotherhood)
"اخوۃ" کا عہد و پیمان ان بدووں سے لازمی طور پر روپیہ کے ذریعہ قائم کرنا پڑتا ہے - کمزور قبائل
کو بھی اپنی حفاظت کے لیے اس "اخوۃ" کو مول لینا پڑتا ہے -
شکاری کتوں اور شکروں کے ذریعہ زیادہ شکار کھیلا جاتا ہے - بڑے شکاروں میں یہاں
ہرن، پہاڑی بکرے، جنگلی ہرن (جنکے وزنی اور سیدھے سینگ ہوتے ہیں) اور صحرائی گدھے
ہوتے ہیں - عرب لوگ جنگلی گدھے کا خاص طریقے سے شکار کرتے ہیں - یہ جانور بہت تیز رفتار
ہوتا ہے - ہر شخص کا یہ ہی مقصد ہوتا ہے کہ خاص طور پر جنگلی گدھے ہی کا شکار کرے - چھوٹے
شکاروں میں چند قسم کے تیتر، خرگوش، اور ایک قسم کی چھپکلی (گوہ) ہوتی ہے جسے ضب کہتے
ہیں - شتر مرغ کا شکار خاص طور سے ہیتم اور صلیب کے افراد کرتے ہیں - یہ جانور اب عرب
کے شمالی ریگستان میں رفتہ رفتہ ناپید ہوتا جا رہا ہے -
حملہ آور ہونا، بدووں کی زندگی کا ایک لازمی جزو ہوتا ہے - چنانچہ بنی امیہ کے ابتدائی
زمانہ میں ایک شاعر القطامی نے کہا ہے کہ " ہم حملہ کر بیٹھتے ہیں ضباب (مضاریوں) کے
خیموں پر اور پھر انکو وہی واقعات پیش آجاتے ہیں جنکو آنا چاہیے اور بعض وقت ہم ٹوٹ پڑتے ہیں
بکر (بن وائل) پر جو ہمارے ہی بھائی ہیں" - ہمیشہ سے یوں ہی ہوتا چلا آرہا ہے اور اب بھی
ایسا ہی ہوتا رہتا ہے - بدووں کا خاص مقصد یہ ہوتا ہے کہ کسی قبیلہ کے اونٹ، عورتوں اور بچوں
کو پکڑ لیجائیں، اگر دشمن کے ہوں تو سب سے بہتر ہے اور جہاں تک ممکن ہو خونریزی نہ کی جائے
تاکہ اُنکے قتل سے لڑائی نہ پیدا ہو - عورتیں اور بچے رہا کیے جاسکتے ہیں، مال غنیمت کو مقررہ قوانین
کے مطابق آپس میں تقسیم کر لیا جاتا ہے - شیخ کو چونکہ قبیلہ کی عظمت قائم رکھنی پڑتی ہے اور اسکے
لیے ذرائع بھی ضرور ہونے چاہییں اس لیے اُسکو بڑا حصہ ملتا ہے - برخلاف اسکے لٹے ہوئے
قبیلہ کے افراد کو نقصان کی تلافی کرنی پڑتی ہے اور اس نقصان کی تلافی میں شیخ سے زیادہ حصہ
کی توقع ہوتی ہے - خصوصاً انھیں حملوں کے لیے گھوڑوں کو تربیت دی جاتی ہے - حملہ میں حصہ
لینے والے افراد اونٹوں پر سوار ہوتے ہیں، لڑائی یا پسپائی کے وقت گھوڑوں پر سواری کیجاتی ہے
ایک اچھا گھوڑا اپنے آقا کے لیے باعث فخر ہوتا ہے لیکن اُسکے لیے زیادہ خرچ برداشت

میں تو یہ لوگ بہت تیز ہیں مگر چوری انکی نظر میں جُرم ہے - بدو، مہماں نواز ہوتے ہیں گو اکثر اسوجہ سے بھی مہماں نوازی کرتے ہیں کہ انکے مہمان انکی تعریف کیا کریں - ایک دولتمند عرب کا انتہائی نقطۂ خیال یہ ہوتا ہے کہ وہ مشہور و معروف آدمی بنجائے، لوگ اُسکو شریف کہکر ہر جگہ اُسکی تعریف میں رطب اللساں ہوں، اُسے بہادر اور فیاض مشہور کریں، ہر شخص اُس سے ڈرے اور اُسکی تعریف کرے۔

ریگستان کے اطراف کی تمام ریاستیں بدوؤں کے نواح سے ہر وقت خطرے میں رہتی ہیں - ان ریاستوں کو قوی بننا پڑتا ہے تاکہ بدوؤں کو اُنکے علاقہ میں بلا اجازت آنے کی جرأت نہ ہو- اگر یہ ریاستیں کمزور ہیں تو اُنکو امن و امان خریدنا پڑتا ہے، اور اگر اُنھوں نے ایسا نہ کیا تو پھر بدو لوگ لازمی طور پر انکی سرحدوں کو عبور کر کے ملک کو تباہ و برباد کر دیتے ہیں۔ ان حالات میں مزروعہ زمینوں کے بڑے بڑے رقبے پھر چراگاہیں بن جاتی ہیں- مثلاً جس طرح اسوقت عراق کا بڑا حصہ اور دریائے دجلہ کے آگے کے علاقے چراگاہیں بنے ہوے ہیں - یا یہ ہوتا ہے کہ سرحد پر پھر عربوں کی نئی حکومتیں قائم ہو کر تدمرا اور حیرہ کی قدیم حکومتوں کے مانند یا شام والی غسانیوں کی حکومت کی طرح، متمدن سلطنتیں بن جاتی ہیں - یا ایسی سلطنت قائم ہو جاتی ہے جیسی کہ بنی لخمیون کی حکومت، عراق میں، عہد اسلامی سے کچھ زمانہ قبل قائم ہوئی تھی - عرب کے اندرونی علاقہ میں، وہابیوں نے اپنی سلطنت میں اچھا نظم و نسق قائم کر لیا ہے - حاکم شمر کا نجد اور ریگستان کے جنوبی حصہ میں بدوؤں پر اچھا خاصا اثر ہے - سرحدی علاقوں میں بدو لوگ عموماً نصف خانہ بدوشی کی حالت میں ہیں - وہ یا تو چرواہے ہیں یا جانوروں کو پرورش کرنا اُنکا پیشہ ہے، اب بالآخر اُنھوں نے زراعت کا کام بھی شروع کر دیا ہے - یہ اُلٹی ترکیب کہ کاشتکار خانہ بدوش بھی ہو جاتے ہیں بہت ہی کم واقع ہوتی ہے اس لیے کہ ریگستان میں انکی زندگی بہت ہی مشکل سے بسر ہوتی ہے اور اور اُنکو نقصان بھی بہت برداشت کرنے پڑتے ہیں - واقعہ یہ ہے کہ ریگستان میں تو صرف بدو لوگ ہی رہ سکتے ہیں جنکو قدرت نے ایسا ہی بنایا ہے۔

دوسرے قبائل کے ساتھ متحد ہو کر، تعلقات کو مضبوط و مستحکم کرنے کا خیال عام طور پر پیدا ہوتا ہے مگر اسکی تکمیل نہیں ہوتی - اس لیے کہ ایک ہی قبیلہ میں ہمیشہ اتحاد قائم نہیں رہتا - صاحبِ حکومت کو اس وجہ سے بہت آسانی سے موقع مل جاتا ہے کہ وہ جب چاہے کسی میعاد مقررہ کے اندر ان سرکش قبائل کو یکے بعد دیگرے مفتوح و مغلوب کر ڈالے - اسی نااتفاقی کی وجہ سے وہ کسی مشترکہ مہم کو سر کرنے کے لیے اپنی اپنی فوج سے ایک دوسرے کی مدد نہیں کرتے - مسلمہ خرابیاں

جو استحادِ عمل سے آسانی رفع ہو سکتی تھیں، سالہا سال تک باقی رہتی ہیں اور پھر لوگ خود خدا کی مرضی پر چھوڑ دیتے ہیں۔

عربوں کا باورچی خانہ بہت سادہ ہوتا ہے۔ پہلے انکی روزمرہ کی خوراک، آٹے کا مرکب یا بھنا ہوا اناج اور کھجور یا دودھ کا مرکب ہوتا تھا۔ لیکن اب وہ عموماً ہرغول (فارسی لفظ ہے) کھاتے ہیں۔ یہ بھنے ہوئے گیہوں یا ہندوستانی اناج کا ہوتا ہے۔ اسکو پانی میں ڈال کر اُبال لیتے ہیں۔ جب کوئی معزز مہمان آتا ہے تو وہ اس کھانے کے اوپر مکھن، گھی، یا کچا دودھ ڈال دیتے ہیں۔ یا بعض وقت پکا ہوا گوشت بھی اُسکے اوپر رکھدیتے ہیں۔ گیہوں کی بہت پتلی روٹیاں پکائی جاتی ہیں۔ دودھ بہت پیا جاتا ہے۔ حصولِ فرحت کی خاطر کچا دودھ بھی پیتے ہیں۔ بہت سے عربوں کی خاص خوراک کھجور ہے۔

عربوں کا لباس بھی بہت سادہ ہوتا ہے۔ غربا، صرف قمیص پہنتے اور اُسکے اوپر پٹی باندھ کر عبا پہن لیتے ہیں۔ ذرا متمول عرب قمیص (جو ایک قسم کی کتان ہوتی ہے) پہنتے ہیں۔ جاڑوں میں اسکے اوپر دھاریدار صدری پہنی جاتی ہے۔ اکثر لوگ اس کے بجائے پوستین پہنتے ہیں۔ غریب لوگ عمامہ باندھتے ہیں جسکا نام کوفیہ ہے (اب عموماً اسکا تلفظ کفیہ کیا جاتا ہے) کیفیہ بالعموم سر پر باندھا جاتا ہے یہ ایک کپڑے کا ٹکڑا ہوتا ہے جو کالے فیتہ کے ساتھ باندھا جاتا ہے۔ عرب پائجامہ نہیں پہنتے صرف متمول عرب جوتے اور زیر جامہ پہنتے ہیں۔ پانی عموماً کمیاب ہے۔ اس لیے کپڑے نہیں دھوئے جاتے۔ پانی کی قلت کی وجہ سے عرب لوگ پابندی سے اپنے جسم کو نہیں دھو سکتے۔ جب کسی عرب کو کوئی تالاب مل جاتا ہے تو سب سے پہلے وہ نہاتا ہے لیکن چونکہ ایسا واقعہ کم پیش آتا ہے اسلیے شریعتِ اسلامی نے ریگستان کے باشندوں کو پانی نہ ملنے کی صورت میں مٹی سے تیمم کرنے کی اجازت دیدی ہے۔

ہر قبیلہ اپنے اونٹوں کی پہچان کے لیے ایک خاص علامت مقرر کر دیتا ہے جس سے ہر شخص اُنکو شناخت کر لیتا ہے۔ اسی قسم کی علامت اکثر قبیلہ کے علاقہ کی شناخت کے لیے چٹانوں پر بنا دی جاتی ہے۔ جو عرب لکھنا جانتے ہیں وہ اس علامت کے قریب اپنا نام کچھ اضافی عبارت کے کے ساتھ یا فقط نام لکھ دیتے ہیں۔ پہلے عرب مصوری کرتے تھے مگر اسکو دیکھ کر اُنکی ذہانت کے متعلق کوئی اعلیٰ درجے کی رائے قائم نہیں ہوتی۔ نہ انھوں نے فنِ تعمیر کو اعلیٰ پیمانہ پر حاصل کیا۔ البتہ عربوں نے فنِ زیبائش میں بہت زیادہ کمال حاصل کیا اور فنِ موسیقی کی طرف بھی متوجہ ہوئے تھے مگر اسلام نے اسکو اچھا نہیں بتایا ہے۔ یہ لوگ تقریر کے مالک ہوتے ہیں اور اس فن میں

اس درجہ بڑھے ہوئے ہیں کہ اپنا جواب نہیں رکھتے

تاریخ قدیم

عرب کے متعلق عہد اسلامی سے قبل اور اس سے بھی بہت پہلے یعنی عہد مسیحی سے بھی قبل ہمیں جو کچھ علم ہے وہ قدرتی طور سے دو خاص حصوں میں منقسم ہو جاتا ہے۔ ایک حصہ کا خاص تاریخی واقعات سے تعلق ہے اور دوسرے کا غالباً تمدن اور مذہب ہے۔

تاریخی حیثیت سے ہمیں جو علم ہے، وہ کچھ تو ملک کے کتبات سے معلوم ہوا ہے، کچھ معاصرین کی ان اطلاعات سے جو وہ ادبیات میں تحریر کر گئے، کچھ دیگر اقوام کی دیگر یادگاروں (مثلاً بابلی، اسیری، مصری، عبرانی، یونانی اور رومانی) سے اور کچھ (بعثت نبوی سے قریب ہی قبل کی صدیوں کے واقعات سے متعلق) عہد اسلام کی ابتدائی روایتوں سے بھی معلوم ہوا ہے۔ اگر (معلومات کے متعلق) ہمارے ذرائع زیادہ مکمل ہوتے اور خصوصاً علم تواریخ زیادہ قابل یقین ہوتا تو پھر ہم ایک ہزار برس قبل مسیح کے بعد سے یا اس سے بھی پہلے کے زمانہ سے غالباً ایسی تصویر پیش کرتے جو کم و بیش تاریخی معلومات سے پُر ہوتی لیکن ہم کو یہ بات بھی یقینی طور پر معلوم نہیں ہے کہ ہم جنوبی عرب کے بت سے کتبات کی گذشتہ تاریخ کے متعلق کہاں تک لکھ سکتے ہیں۔

عہد مسیحی سے دو ہزار برس سے بھی قبل کے بابلی کتبوں میں ایک بادشاہ کا نام منیم (مَن دُم) لکھا ہوا ہے جو (Magan) یا مشرقی عرب کا بادشاہ تھا۔ (اسکے نام کی زیادہ مکمل صورت منو۔ دنو بھی ہے)۔ اس خیال کے متعلق زیادہ تر یہ کہا جا سکتا ہے کہ (Magan) سمیری زبان کا لفظ تھا جسکو عربی میں معان بنا لیا گیا اور یہ کہ اسی مرکز سے (ایک ایسے زمانہ میں جس کا ہمیں علم نہیں) معان والی جنوبی عربی سلطنت قائم ہوئی تھی (جو بعد میں مَعِین کے نام سے مشہور ہوئی تھی) یا ممکن ہے کہ یہ معینی سلطنت ہو، جس نے غالباً شروع ہی میں تمام جنوبی عرب کے علاقہ کو (بشمول قتبان اور حضرموت) اپنی مملکت میں شریک کر لیا ہو۔ اسکے علاوہ ان کتبوں میں مَلُخ نامی ایک علاقہ کا بھی ذکر ہے جو اس ریاست سے آگے واقع تھا اور اس علاقہ میں غالباً وسطی اور شمالی عرب شامل تھا۔ مَلُخ کے علاقے نیز سرزمین (Magan) سے سمیریوں نے (تقریباً ۲۳۵۰ قبل مسیح میں) لکڑی، پتھر، اور دھاتیں بڑی مقدار میں اپنے مندروں کی تعمیر کے لیے منگائی تھیں۔ ہربرٹ گرم نے مَلُخ کے نام کی نسبت لکھا ہے کہ یہ لفظ توراۃ کے عملیق سے ماخوذ ہے (جو مصری نام عملوق کی ناموزون جمع ہے)۔ اُسکا یہ خیال قابل اعتراض نہیں معلوم ہوتا۔

جنوبی عرب کے کتبات کا آغاز کم از کم ۸۰۰ برس قبل مسیح سے ہوتا ہے لیکن بہت غالب

ہے کہ اس سے بھی چند صدی پیشتر سے ہو۔ ان کتبات سے زیادہ صحیح معلومات، نہ صرف علم صرف و نحو کے متعلق حاصل ہوتی ہیں بلکہ خصوصاً اصل مضمون کے بارے میں بھی ان سے صحیح واقعات کا پتہ چلتا ہے یعنی نہ صرف ان میں عہد اسلام سے قبل کی تاریخ کے صحیح واقعات مندرج ہیں بلکہ انکو دیکھ کر سامی آثار کے متعلق بھی نئی نئی باتیں معلوم ہوتی ہیں۔ ان آثار قدیمہ سے صحیح صحیح واقعات جو گذشتہ نصف صدی تک بہت ہی نایاب تھے (مگر اب ان کے متعلق ہمارے پاس تقریباً دو ہزار کتبے موجود ہیں) سب سے زیادہ ہمیں جوزیف ہالوی اور ایڈورڈ گلیسر کی سائنٹفک تحقیق و تلاش سے دستیاب ہوئے ہیں۔ یہ کتبات منطقی طور سے دو بڑی جماعتوں سے تعلق رکھتے ہیں۔ صحیح معنوں میں کچھ کتبات تو معینی جماعت سے متعلق ہیں اور کچھ جماعت سبا سے۔ جو کتبے معینی جماعت سے تعلق رکھتے ہیں ان میں بہت سے کتبے تو نہ صرف شاہانِ معان کے عہد کے لکھے ہوئے ہیں (نام کے متعلق اوپر کا بیان ملاحظہ ہو) جن کے صدر مقامات قرناؤ اور ثیل، جوف کے جنوب میں جدا جدا واقع تھے (قرناؤ تو صنعا کے شمال مشرق میں تھا اور ثیل، اُرب کے شمال مغرب میں)۔ بلکہ ان میں شاہانِ قتبان کے عہد کے کتبے بھی زیادہ تعداد میں ہیں جن کو گلیسر نے دریافت کیا تھا اور چند کتبے حضرموت کے ہیں جو اب تک دریافت ہو سکے۔ حضرموت کے دریافت شدہ کتبات کو ساتھ رکھ کر مقام شبوت کو جانا چاہیے، اس لیے کہ یہ اطلاع ملی ہے کہ وہاں اب بھی سیکڑوں کتبات دریافت کرنے کو باقی ہیں۔ یہ مقام حضرموت کا قدیم صدر مقام تھا اور یہاں بغرض تحقیق و دریافت کتبات کوئی اب تک نہیں گیا۔ برخلاف اسکے جو کتبات جماعت سبا سے متعلق ہیں وہ صحیح معنوں میں سبا کے مذہبی بادشاہوں (مکرب یا مکروب یا مُکرِب یا مُکرَّب) کے عہد، تقریباً ۱۰۰۰ ـ ۵۰۰ قبل مسیح میں لکھے گئے ہیں (یہ قدیم شاہانِ سبا کا زمانہ ہے اس میں مطلق العنان شاہی کا پہلا عہد بھی شریک کر سکتے ہیں)۔ مطلق العنان بادشاہت کا زمانہ تقریباً ۵۰۰ ـ ۱۱۵ قبل مسیح تک رہا۔ اس زمانہ میں سرکاری حیثیت سے اُرب کے بادشاہ "شاہِ سبا" کا لقب اختیار کرتے رہے۔ انکے بعد کے بادشاہ صرف قتبان اور حضرموت کے بادشاہ رہے پھر انکے بعد حمیریوں کا نیا عنصر نمودار ہوا جنھوں نے غالباً پہلے قتبان پر قبضہ کیا اور پھر اُرب پر بھی قابض ہو گئے تھے۔ انکے بادشاہ نے "شاہِ سبا" اور "ذوریدان" کا لقب اختیار کیا تھا۔ حبشیوں کے انکے چھوٹے سے حملہ کے بعد سے جو چوتھی صدی عیسوی کے وسط میں ہوا تھا، یہ مقامی بادشاہ تقریباً ۳۰۵ عیسوی سے ۵۲۵ عیسوی تک اپنے بڑے خطابات کے ساتھ مسلسل حکومت کرتے رہے

یہاں تک کہ وہ اکسومیوں سے مغلوب ہوگئے۔ ان بادشاہوں کے عہد کے متعلق بھی ہمارے پاس جنوبی عرب کے قدیم کتبات موجود ہیں۔ خصوصاً سدِ مأرب کے ٹوٹ جانے کا واقعہ ایک بہت ہی قدیم قدیم کتبہ میں لکھا ہوا ہے۔ اس کتبہ کو گلیسر نے دریافت کرکے شائع کرایا ہے۔ اسکے سنین ۵۴۳ء-۵۴۲ء سے مطابقت کرتے ہیں اور یہ کتبہ اس عبارت سے شروع ہوتا ہے:۔

"بہ قدرت وفضل وعنایت رحمانی ومسیح وروح القدس، اس کتبہ کو ابرہا، گورنر نے نصب کرایا ہے جو (گورنری پر) متعین تھا منجانب اکسومی بادشاہ رہیس زبیمان (Zubirqaman) شاہ سبا اور ذوریدان اور حضرموت اور یمانت اور اُن عربوں کا جو بلندی اور پستی کے علاقوں میں رہتے ہیں۔"

اس کتبہ میں اور دوسری باتوں کے علاوہ اُن سفارتوں کا حال بھی لکھا ہے جو شاہ روم، شاہ فارس، شاہ المنذر، شاہ حارث اور بادشاہ ابوکرب نے بھیجی تھیں۔ عہد نبوی صلعم سے تھوڑے زمانہ قبل جو دو بڑی سلطنتیں تھیں یعنی روم کی مشرقی سلطنت اور مملکت فارس، ان کا ذکر بھی ان کتبہ میں موجود ہے اور ان دونوں حریف قوتوں نے عرب کی سرحد پر حیرہ اور غسانیوں کی حکومتوں کو بطور چوکیوں کے قائم کیا تھا، اُنکا حال بھی لکھا ہے اور ان تمام حکومتوں کے مفاد اور باہمی اتحاد و تعلقات پر بھی پوری پوری روشنی ڈالی گئی ہے۔

حبشیوں کے عہد حکومت میں مذکور الصدر ابرہا نے نہ صرف حمیریوں کے آخری فرمانرواؤں کو شکست دیکر معزول کیا بلکہ سیدھا مکہ کی طرف اپنے مشہور ہاتھی کو لیے بڑھا ہوا چلا گیا۔ اسکے بعد تقریباً ۵۷۵ء میں فارس کے بادشاہ خسرو اول نے یمن کو فتح کرکے، اپنے ایک وزیر کو وہاں کا گورنر (حاکم) مقرر کیا تھا۔ لیکن آخرکار اسلام کی فتحمند قوت کے سامنے یمن بھی فتح ہو گیا تھا۔ خسرو پرویز ثانی نے فارس کی طرف سے جو آخری گورنر مقرر کیا تھا اُس کا نام باذان تھا۔ اسنے خسرو مذکور کی وفات (۶۲۸ء عیسوی) کے بعد اسلام قبول کرکے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنا شہنشاہ تسلیم کرلیا تھا۔

حکومتِ سبا کے آغاز کا زمانہ ۸۰۰ قبل مسیح کے زیادہ بعد سے نہیں دکھانا چاہیے اس لیے کہ (علم الآثار کے بہت سے نامکمل مواد سے جو واقعی کسی زمانہ میں موجود تھا) ہم جن بادشاہوں کے ناموں کی پہلے تحقیق کرچکے ہیں اُن کا ذکر تو اب یہاں کر بھی نہیں سکتے اور گو ایک ہی وقت میں اکثر باپ، بیٹے، اور بھائی برسرحکومت رہے اس پر بھی ہم کتبوں سے بہت سی نسلوں کے سلسلے قائم کرسکتے

ہیں (اکثر دادا، باپ، بیٹے اور پوتے کے سلسلے میں) اور ہر عہد کے متعلق تاریخی واقعات بھی ہم پہونچا سکتے ہیں لیکن خاص طور پر واقعات قدیم سے یہ پتہ ضرور چلتا ہے کہ چار اراکین کی حکومت کا سلسلہ اوسطاً ایک صدی کو پورا کر دیتا ہے - لہذا مذکورۃ الصدر تخمینوں (قدیم شاہان سبا کے بعد ۷۰۰ - ۵۰۰ ق م وغیرہ) کو غالباً کم سے کم سنین سمجھنا چاہیے خصوصاً (اور یہ زمانہ واقعی شاہانِ سبا اور ذو ریدان کے دوسرے دور پر عائد ہوتا ہے) اس وجہ سے کہ ہمیں اب تک تمام بادشاہوں کے ناموں کا پتہ نہیں چل سکا ہے - پس بحالت موجودہ اس سے صرف کم یا بیش ناقص نتائج نکل سکتے ہیں -

اب ایک اہم سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ معینیوں کے شاہی کتبات تاریخ کے کون سے سلسلہ میں سبائیوں کے شاہی کتبات سے مطابقت کرتے ہیں - اب سے ذرا کچھ زمانہ قبل ڈی - ایچ مُلر نے ان دونوں کتبات کے ہمعصر ہونے کے امکان کا خیال ظاہر کیا تھا - گلیسر نے اس بات کو تسلیم کیا ہے اور امر واقعہ بھی یہی ہے کہ شاہان معینی کا عہد شاہان سبا سے پہلے گذرا ہے (اور یہ کہ سبا کے پرستار بادشاہوں سے بھی پہلے یہ حکمران رہے ہیں) - ہوگو ونکلر اور راقم الحروف کی تحریر کا ماخذ خصوصاً گلیسر ہی کی کتاب ہے - پس یہ ایک قیاس ہے جسکی بنا پر قدرتی طور سے شاہانِ معینین کی حکومت کے متعلق ذرا زیادہ قبل کا زمانہ (۱۲۰۰ - ۷۰۰ ق م) پیشتر ہی سے فرض کر لینا پڑتا ہے) مگر اسکے باوجود بھی بعد میں ان دونوں کے ہمعصر ہونے کے قیاس کی پھر بہت سے عالموں نے تائید کی ہے - اور خاص طور پر ماہر زبان عربی مارٹن ہارٹ مین اور مورخ ایڈورڈ میر نے اس قیاس کی حمایت میں زور قلم صرف کیا ہے - لیکن یہ بھی سچ ہے کہ ہارٹ مین اب اس بات کو تسلیم کرتا ہے کہ شاہان معینی کا بہترین زمانہ شاہان سبا کے عہد سے پہلے گذرا ہے اور پھر وہ یہ بھی کہتا ہے کہ نہایت قدیم معینی اور سبائی کتبات ایک ہی زمانہ کے ہیں اور اس خیال کی تائید میں بوضاحت لکھتا ہے کہ معینیوں کا ایک کتبہ سبائی کتبہ کا ہم عہد ہے اور اس کتبہ میں یہ مذکور ہے کہ اہل معین، مصر، اعشور، اور عبر نہران سے خوشبو کی چیزوں کی تجارت کیا کرتے تھے اور اسی کتبہ میں ۵۲۵ قبل مسیح کی اس جنگ کا حال بھی درج ہے جو مصر اور ایک قوم نامی (Madhy) کے درمیان ہوئی تھی - اس نے (Madhy) قوم کے افراد کو ایرانی بتایا ہے -

زیادہ سے زیادہ یہ تسلیم کیا جا سکتا ہے کہ معینیوں کے سب سے بعد کے کتبات سبائیوں کے نہایت قدیم کتبات کے ہم زمانہ ہوں - اس اعتبار سے ہمیں اُن معینی کتبوں میں، جنکو دیگر

وجوہ سے بھی سب سے بعد کے سمجھتا ہوں، ایسے سبائی افراد کے متعلق اشارات ملتے ہیں جو پہلے یمن میں آکر آباد ہو گئے تھے۔ چنانچہ ایک قدیم معینی کتبہ کی عبارت سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ جماعتِ سبا کے افراد (خولان کے ایک اور دوسرے قبیلہ کے ساتھ مل کر) شمالی یمن میں آوارہ پھرا کرتے تھے یہ لوگ اس عام سڑک پر چلنے والے معینی قافلوں پر حملہ کر دیا کرتے تھے جو (رعمہ Ragmah)(نجران) اور معان کے درمیان تھی۔ اسیریوں کے شاہی کتبوں سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ ۰۰ے قبل مسیح سے کچھ زمانہ قبل سبا کا ایک بادشاہ نامی تیمرہ گذرا ہے۔ کتبہ کے متن سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ بادشاہ وسطِ عرب میں رہا کرتا تھا۔

ممکن ہے کہ شاہان معین نے اپنے عطر کی تجارت کی حفاظت کے لیے مدین کی سرزمین میں ایک نوآبادی قائم کر دی ہو۔ اس نوآبادی کا نام کتبات میں مُصران لکھا ہے۔ اس واقعہ کی تصدیق اُن معینی کتبات سے ہوتی ہے جنکو یوٹنگ نے (مقام) العُلا میں دریافت کیا ہے۔ معینی حکومت کے خاتمہ کے بعد (تقریباً ۶۵۰ ق م میں) غالباً اہل سبا، معینیوں کی مدین والی اس نوآبادی کے وارث قرار پائے ہونگے۔ یہ بات اس خیال کی تائید کرتی ہے کہ لحیانیوں کا عہد شمال مغربی عرب میں معینی سبائی عہد کے بعد شروع ہوا اور یہ کہ نبطیوں کے عہد حکومت سے قبل شاہان لحیانی برسرِ حکومت رہے اس لیے انکا زمانہ تقریباً ۵۰۰ - ۳۰۰ ق م سمجھنا چاہیے۔ یہ تو ایک تاریخی واقعہ ہے کہ ۳۱۱ ق م میں انٹی گونس نبطیوں سے برسرِپیکار ہوتا ہے جو غالباً اسوقت مصری سیادت میں تھے۔ دوسری صدی قبل مسیح کے بعد سے تمام نبطی بادشاہوں کے نام ہمیں معلوم ہیں جو قریب قریب بلا کسی وقفہ کے برسرِ حکومت رہے یہاں تک کہ آخرکار ۱۰۶ء میں انکی سلطنت کا رومیوں نے خاتمہ کر دیا۔ نبطیوں کا صدر مقام پٹرہ (رقیم) تھا لیکن مدین بھی انکی سلطنت کا ایک جزو تھا۔ اس عہد میں الیوس غالوس نے بحکم اغسطس یمن پر حملہ کیا تھا۔

سب سے قدیم عربی کتبہ جو اب تک مشرقی حوران میں دریافت ہوا ہے، وہ مقام نمارہ کا ہے۔ اس کتبہ میں بصرہ کا سنہ ۲۲۳ مندرج ہے جو ۳۲۸ عیسوی سے مطابقت کرتا ہے اور یہ کتبہ بطور یادگار کے ایک بادشاہ نامی امرء القیس بن عمر کے مقبرہ پر نصب کیا گیا تھا۔ جو بادشاہ تھا تمام عربوں کا اور سربند پہنا کرتا تھا اور یہ بادشاہ تھا دو اسد کا (یعنی جبل شمر کے قریب وسط عرب میں اسد اور طے کے قبائل کا) اور بنی نزار کا (یعنی شمالی مغربی عرب کا)۔ کتبہ کی عبارت سے آگے ظاہر ہوتا ہے کہ اس بادشاہ نے شہر نجران تک اپنی فتوحات کو

وسعت دی تھی۔ اس بادشاہ کا نام غالباً حیرہ کے اُس بادشاہ کے نام سے ملتا ہے جسکا زمانۂ حکومت عربی روایتوں میں ۲۵۰-۳۰۴ عیسوی بتایا گیا ہے۔

اب ہم بنی لخمیوں کے متعلق لکھتے ہیں جن کے بادشاہوں کا ذکر قدیم عربی نظم میں موجود ہے۔ بنی لخمیوں کے بادشاہوں کو مملکتِ ایران نے قدیم بابلی، عربی سرحد پر، بطور سرحدی چوکیوں کے عربوں کے حملوں کی روک تھام کے لیے بالکل اسی طرح تخت نشیں کیا تھا جس طرح رومیوں کی مشرقی سلطنت نے وادی جودی کے شمالی علاقہ میں غسانی خاندان کے بادشاہوں کو متعین کیا تھا تاکہ سرحد کی حفاظت ہو اور اُنکی سلطنت، عربوں کے حملوں سے (اور اُنکے پیچھے ایرانیوں کی تاخت سے) محفوظ رہے۔ بنی لخمیوں اور غسانیوں کے متعلق بلکہ خصوصاً بنی لخمیوں کے بارے میں، نیز چھٹی صدی عیسوی اور اُسکے بعد ساسانیوں کی حکومت کے خاتمہ اور فتوحاتِ اسلامی کے زمانہ تک، زیادہ صحیح واقعات ہمیں عربی روایتوں سے معلوم ہوئے ہیں۔ ہمارے پاس شاہانِ حیرہ کے مختلف درباری شعرا کی مسلسل نظمیں اور گیتوں کے ٹکڑے بھی موجود ہیں۔

عہدِ اسلامی سے قبل کی سیاسی تاریخ کے متعلق ہمیں جو کچھ معلوم تھا، اُسکا ہم نے مختصر سا خاکہ کھینچ دیا ہے۔ لیکن مشرقِ قدیم میں عربوں کو بہت زیادہ اہمیت اُنکے تمدن اور مذہب کی وجہ سے نصیب ہوئی۔

عہدِ اسلام

فتح مکہ کے بعد جب رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اسلام کی سیادت کو استوار کر دیا تو اُسوقت قریب قریب تمام سرداران قبائل اور جزیرہ نمائے عرب کے چھوٹے چھوٹے فرمانرواؤں نے اظہارِ اطاعت کی غرض سے رسول اللہ صلعم کی خدمت میں اپنے وفود بھیجے۔ اس لیے اس سال یعنی نویں ہجری مطابق ۶۳۰-۶۳۱ عیسوی کو مورخین "وفود کا سال" کہتے ہیں۔ پھر بھی عربوں کا یہ ارادہ نہ تھا کہ وہ اپنی خودمختاری کو خیرباد کہدیتے چنانچہ ۶۳۲ عیسوی میں رسول اللہ صلعم کی وفات کے بعد ہی اُنھوں نے یہ خیال کیا جاتا تھا کہ اس ناگوار سیادت کے جوے کو اُتار پھینکنے کا وقت آگیا ہے۔ عہدِ نبوی صلعم ہی میں بنو حنیفہ کے سردار مسیلمہ نے وسط عرب میں نبوت کا دعویٰ کر دیا تھا۔ اسی قسم کی کوشش قبیلہ بنو اسد میں طلیحہ نے کی تھی۔ یمن میں قبیلۂ عنس کے ایک شخص نامی اسود بن کعب نے بھی نبوت کا دعویٰ کیا تھا اور اسی قسم کی حرکت قبیلۂ تمیم کی ایک عورت سجاح نے کی تھی۔ حضرت ابوبکر صدیق رضی نے خالد بن ولید کو طلیحہ کے مقابلہ میں بھیجا تھا، اُنکے جاتے ہی اس فتنہ کا سلسلہ ا

ہو گیا تھا مگر سجاح، مسیلمہ سے جا کر مل گئی تھی۔ مسیلمہ ایک خونریز جنگ میں کام آیا اور پھر بنو حنفیہ بھی مطیع و فرمانبردار ہو گئے تھے۔ یمن میں اسود خود اپنی ہی قوم کے افراد کی سازش کا شکار ہوا۔ ۶۳۲ء میں جب اسلامی فوجیں یمن پر حملہ آور ہوئیں تو بغاوت کا بہت جلد خاتمہ ہو گیا تھا۔ غرض اس سال اسلامی ہستی کے متعلق جو خطرہ تھا وہ جاتا رہا تھا۔

حضرت عمرؓ کے عہد میں بہت فتوحات ہوئیں۔ اس زمانہ میں ایسا معلوم ہوتا تھا کہ گویا اسلام واقعی عربوں کو متحد کر کے ایک طاقتور قوم بنا دینے کے معاملہ میں کامیاب ہو گیا ہے لیکن حضرت عمرؓ کے جانشیں حضرت عثمانؓ نے اپنے خاندان کی طرفداری میں دلچسپی لی تھی اور اس بناء پر پہلی خانہ جنگی کا آغاز ہوا۔ اب یہ بات صاف ظاہر ہو گئی تھی کہ عرب لوگ، کسی سیاسی نظام جمہوریت کو اختیار کر لینے کے بجائے اپنے جداگانہ مفاد اور فرقہ واری جنگ و جدل کو ترجیح دینے لگے تھے۔ یہ سچ ہے کہ بنی اُمیہ کے پہلے فرمانروا حضرت معاویہ، خانہ جنگی کو ختم کرنے اور تمام عرب پر اپنی سیادت برقرار رکھنے میں کامیاب ہو گئے تھے لیکن اُنھوں نے اپنے صدر مقام کو شام میں منتقل کر دیا تھا جسکا نتیجہ یہ ہوا کہ انکے فرزند اور جانشیں یزید اول کے عہد میں مدینہ اور مکہ کے مقدس شہر کے باشندوں نے حکومت کے خلاف علانیہ بغاوت شروع کر دی تھی اور اس بناء پر دوسری خانہ جنگی کا آغاز ہوا تھا۔ اب یہ بات بہت زیادہ واضح ہو گئی تھی کہ اسلام فرقہ واری اختلاف سے نجات نہیں پا سکتا۔ اس بات نے شیعہ اور خارجیوں میں مذہبی مخالفت پیدا کر کے، اُنکے فرقہ واری اختلاف کو اور بھی شدید کر دیا تھا۔ خصوصاً خارجیوں کے اصول، عربوں کے مذاق کے تھے۔ اور یہی اصول بعد کے اموی خلفا کے عہد میں مسلسل فتنہ و فساد کا باعث رہے یہاں تک کہ عبدالملک نے ۷۳ھ (۶۹۲ عیسوی) میں مخالفوں کو شکست دیکر عرب میں امن و امان قائم کیا تھا۔ بالآخر خارجیوں کے اصول نے عرب کے بعض حصوں خصوصاً عمان میں قیام کی صورت اختیار کر لی تھی اور اب تک وہاں اُن کا وہی اثر باقی ہے۔

ملک عرب بنی اُمیہ اور اسکے بعد عباسیوں کے عہد میں، خلفاء کے عہد کے ایک صوبہ کے برابر رہ گیا تھا۔ اور نظم و نسق کے اعتبار سے بھی اس میں کچھ باقی نہ تھا، اس لیے کہ کوئی مرکزی حکومت نہ تھی اور نہ کوئی صدر مقام کا شہر تھا۔ جزیرہ نمائے عرب میں مختلف شہروں اور اضلاع کے نائب حکومت خود جداجدا تھے جنکا تقرر خود خلیفہ کیا کرتا تھا۔ المتوکل کی وفا

(سنہ ۸۶۱ء) کے بعد جب خلافت کا اثر جاتا رہا تو پھر ہر صوبہ دار کے لیے یہ بات ناگزیر ہو گئی کہ وہ خود مختارانہ حکومت کرے۔ مثلاً یمن میں، جو صدر حکومت سے بہت دور تھا، اس قسم کا میلان پہلے ہی سے پیدا ہو گیا تھا۔ اس قسم کی تحریکوں کے ساتھ ساتھ مذہبی حیثیت سے اکثر فرقے بھی آپس میں متحد ہونے لگے۔ مثلاً فرقۂ زیدی کے افراد سعدا اور صنعا میں متحد ہو گئے اور قرمطی لوگ بحرین میں۔ القصہ، عرب کی تاریخ کا بحیثیتِ مجموعی کوئی سوال نہیں ہو سکتا۔ وہاں تو صرف خاندانوں، قبائل اور سرداران قبائل کی تاریخ ہے جو عرب کے مختلف حصوں میں نام پیدا کر کے پھر غائب ہو جاتے ہیں۔ بغداد کی مرکزی حکومت کا اثر انتہا سے انتہا طور پر مکہ اور سرحدی علاقوں میں کبھی کبھی خود محسوس کرایا جاتا رہا لیکن جب سنہ ۶۵۶ھ (سنہ ۱۲۵۸ء) میں خلافت کو زوال ہوا تو پھر اُسوقت سے مصری سلاطین، مکہ (پر اُسوقت جب کوئی حادثہ پیش آجاتا تھا) اور بحر احمر کے ساحلی مقامات پر اپنی تھوڑی بہت حکومت جتاتے رہے۔

سلطان سلیم اول کے عہد (۹۲۶-۹۱۸ ہجری = ۵۲۰ - ۵۱۲ عیسوی) میں عثمانی تُرک نمودار ہوئے اور اُنھوں نے مقامات مقدسہ اور یمن پر اپنی سیادت کو قائم کر دیا۔ لیکن یہاں ترکوں کو زیدیوں کے مقابلہ میں قدم جمانا مشکل ہو گیا۔ اُنھوں نے اپنے اماموں کی قیادت میں بالآخر (۱۰۴۳ھ = ۱۶۳۳ء میں) ترکوں کو اپنے ملک سے نکال باہر کیا تھا۔ عرب کے باقی حصوں میں ترکی سیادت حسب سابق بحال رہی یہاں تک کہ وہابی لوگ اٹھارویں صدی کے نصف آخر میں، وسط عرب میں اُٹھے اور اس قدر جلد قوت پکڑ گئے تھے کہ بابِ عالی کو مجبوراً محمد علی سے امداد طلب کرنی پڑی تھی۔ اس امداد کے باوجود بھی وہابیوں کی قوت کو بڑی کوششوں کے بعد توڑ سکے مگر ترکوں کی سیادت عرب میں حسب سابق محض برائے نام ہی تھی۔ ترکوں نے اُنیسویں صدی کے آخر میں اپنی سیادت کو حقیقی سیادت بنانے کے لیے سخت جد و جہد کی اور عسیر اور یمن کی تسخیر کے لیے سنہ ۱۸۷۱-۷۲ء میں مہمیں روانہ کی گئیں۔ مدحت پاشا نے تو سنہ ۱۸۷۱ء میں یورش کی تھی اور ردیف پاشا نے سنہ ۱۸۷۶ء میں مشرق کی طرف سے بڑھ کر یہاں کے باشندوں کو مطیع و منقاد کر لیا تھا۔ اس حملہ کا نتیجہ یہ ہوا کہ یمن کو ترکی ولایت میں شریک کر کے صنعا کو اُس کا صدر مقام قرار دیا تھا۔ اور مشرقی عرب کے اُس علاقہ کو جتنا کہ اُسوقت تک فتح کیا جا چکا تھا بصرہ کی ولایت میں نجد کے نام سے شریک کر دیا گیا تھا۔ لیکن یمن کی نئی ولایت صرف خطرے میں آ گئی تھی اس لیے کہ وہاں کے عرب علانیہ طور سے باغی ہو گئے

تھے اور ترک مسلسل کوششوں کے باوجود بھی اُنکو مطیع نہ کرسکے تھے۔ برخلاف اسکے انگریز تمام جنوبی ساحل پر عدن سے لیکر مسقط تک اور اس سے بھی آگے بڑھ کر خلیج فارس میں اپنی سیادت کو قائم کرنے میں کامیاب ہوگئے ہیں۔ اور اُنکی سیادت کو تام حقیقی سمجھنا چاہیے اس لیے کہ انگریزوں کی مخالفت علانیہ نہیں کی جاتی ہے۔

بحالت موجودہ جزیرہ نمائے عرب کی مردم شماری نہیں مل سکتی۔ رشید بے نے اپنی کتاب "تاریخ یمن وصنعا" جلد ۲ ص ۳۵۵ میں ۱۸۷۵ء کی مردم شماری (۱۰۷۵۲۱۵۰) نفوس بتائی ہے لیکن یہ تعداد قطعی قیاس پر مبنی معلوم ہوتی ہے

(ترجمہ) محمد نجم الغنی قریشی

دارالترجمہ حیدرآباد۔ دکن

تاریخ عرب

...ب علی محمود مرحوم
- عجائب
- ...ئے سرور ۸ر

...یالی مرحوم
- ...فات (مکمل) ...
- ...خانہ عشق
- ...لیب
- ...نبین ۸ر
- ...لحن
- ...د مہربانی

...ن مرحوم
- ...زبان اردو
- ...ائے دلکش
- ...ریخ
- ...ا کمر وتانیث ۸ر
- ...اردو ...
- ...واعد ...تخب

...ر ام عباس ...ش مرحوم
- ...فسانہ نادر جہان
- ...پیاری سہیلی ۱۲ر
- ...نثر سحر ۸ر
- ...الیمن ۱۲ر

منشی فضل حسین ثابت
- حیات ...
- ...حسین ...

پنڈت رتن ناتھ سرشار
- فسانۂ آزاد ۴ جلد
- سیر کہسار
- خدائی فوجدار
- جام سرشار
- الف لیلیٰ بطرز ناول
- کامنی
- پچھڑی دلہن ۶ر

منشی سجاد حسین مرحوم
- احمق الذین ۸ر
- حاجی بغلول ۸ر
- پیاری دنیا ۸ر
- کایا پلٹ ۸ر
- میٹھی چھری ۶ر
- طرحدار لونڈی
- طلسمی فانوس

منشی جوالا پرشاد برق
- مرزا لنی ۱۲ر
- مار آستین ۱۲ر
- بنگالی دلہن ۱۲ر
- معشوقۂ فرنگ ۱۲ر
- پرتاب ۱۲ر
- روہنی ۱۰ر

پریم چند
- پریم پچیسی
- بازار حسن

مولانا عبدالحلیم شرر
- جنید بغدادی
- خواجہ معین الدین چشتی ۶ر
- تذکرہ مشاہیر عالم
- مخدرات
- قیس و لبنیٰ
- مقدس نازنین
- ایام عرب
- فتح اندلس
- ماہ ملک
- حسن کا ڈاکو
- دربار حرام پور ۱۰ر
- الفانسو ۱۲ر
- مفتوح فاتح
- فلپانا
- زوال بغداد
- لعبت چین
- عزیز مصر
- جویائے حق
- بابک خرمی
- طاہرہ
- فلورا فلورنڈا
- یوسف و نجمہ
- گزشتہ لکھنؤ
- شاعرانہ و مشتاقانہ مضامین
- آغاز و ختم سال
- سیر رجال
- تاریخی و جغرافی مضامین
- خناباز الصدیہ ناول

حکیم محمد علیخاں مرحوم
- نام پیاری کامل
- عبرت کامل
- حسن سرور کامل
- اختر حسینہ
- دیول دیوی
- جعفر و عباسہ

شوق قدوائی مرحوم
- ترانۂ شوق
- قاسم و زہرہ
- نیرنگ جہاں ۳ر
- گنجینہ ۱۲ر
- سیکفرن اور بلوکی ۲ر

خواجہ عبدالرؤف عشرت
- زبان دانی ۶ر
- اصطلاح زبان اردو ۶ر
- قواعد میر ۲ر
- اصول اردو ۶ر
- جان اردو ۶ر
- شاعری کی پہلی کتاب
- 〃 دوسری ۸ر
- 〃 تیسری ۸ر
- لغات اردو

منشی محمد احسن وحشی
- ہوس گنشت
- جام زہر

مولانا حکیم عبدالحی مرحوم
- یاد ایام
- تذکرہ گل رعنا

حکیم احمد حسین الہ آبادی
- تاریخ ابن خلدون جلد اول
- 〃 〃 〃 دوم
- 〃 〃 〃 سوم
- 〃 〃 〃 چہارم
- 〃 〃 〃 پنجم
- 〃 〃 〃 ششم
- 〃 〃 〃 ہفتم
- 〃 〃 〃 ہشتم
- 〃 〃 〃 نہم
- 〃 〃 〃 دہم
- 〃 〃 〃 یازدہم
- سلطان صلاح الدین ...
- نور الدین محمود

مولوی محمد حلیم انصاری
- تمدن اسلام
- فتح اندلس
- ابو مسلم خراسانی
- تاریخ عرب

مولوی حبیب الرحمن خاں شروانی
- سیرۃ الصدیق
- علمائے سلف
- تذکرۃ الشعراء ...

حافظ اسلم جیراجپوری
- سیرۃ الرسول
- خلافت راشدہ
- خلافت بنو امیہ
- خلافت بنو عباس
- عباسیہ بغداد
- علوم عرب

قاضی محمد سلیمان منصورپوری
- رحمۃ للعالمین
- سفرنامہ حجاز

مولوی خلیل الرحمن
- ... صحابہ ...
- تاریخ سوامی ...
- مختصر تاریخ اسلامی
- ... عذرا ...

مولوی محمد انشاء اللہ
- سیرۃ الرسول
- تاریخ آل عثمان
- ... عراق و عرب ...
- حالات قسطنطنیہ
- تاریخ مراکش و مغرب الاقصیٰ

منشی سید احمد دہلوی
- آثار اکبری
- حیات خسرو
- امراء ہنود

گوتم بدھ - مہاتما بدھ کی مختصر سوانحعمری اور ان کی مذہبی تعلیم نہایت دلکش انداز میں لکھی گئی ہے - قیمت ...

ملنے کا پتہ دارالناظر بک ایجنسی - لکھنؤ

مولوی عزیز مرزا مرحوم
خیالات عزیز
کرم اردو سی

خواجہ عباد اللہ اختر
صدیق اکبر
حضرت زید
شاہیر اسلام
بغداد
دمشق
دیوان حافظ مع شرح

مفتی انوار الحق ایم اے
تاریخ ابو البشر
تذکرۃ الحبیب
حقایق اسلام

میر ولی اللہ بی اے
بندگی
کاس الکرام
لسان الغیب جلد اول
" " دوم
" " سوم
" " چہارم

محمد مسعود بی اے
قند پارسی اردو
جاپان کا تعلیمی نظام
انتخاب زرین

مولانا حسرت موہانی
شرح دیوان غالب
تکمیل دیوان حسرت

سید سجاد حیدر بی اے
خیالستان
ثالث بالخیر
زہرا
جلال الدین خوارزم شاہ

مسٹر ظفر عمر بی اے
چوروں کا کلب
نیلی چھتری
بہرام کی گرفتاری
مستقبل اسلام

پروفیسر فیروز الدین مراد
تحفۂ سائنس
بادل کے نیچے
خرخشانۂ عشق

حکیم احمد شجاع بی اے
باپ کا گناہ
حسن کی قیمت

منشی عبد الحمید سالک بی اے
راہ و رسم منزلہا
چھپا ہوا افسانے
جواہر ریزے

منشی احمد علی بی اے
تاریخ تمدن
شباب لکھنؤ

مولوی عبد الماجد بی اے
فلسفۂ جذبات
مکالمات برکلے
پیام امن
تصوف اسلام
فلسفیانہ مضامین
زود پشیمان

منشی محمد لطیف بی اے
اکبر
اورنگ زیب
رنجیت سنگھ
لارڈ کلایو

پروفیسر نواب علی ایم اے
معارج الدین
تذکرۃ المصطفی
صحف سماوی
شمع سخن

پروفیسر الیاس برنی ایم اے
جذبات فطرت
معارف ملت
ساز فطرت
علم المعیشت

مولوی سید سلیمان ندوی
ارض القرآن
سیرۃ عائشہ
حیات امام مالک
خلافت عثمانیہ اور اسلام
خلافت اور ہندوستان

مولوی عبد السلام ندوی
اسوۂ صحابہ ۲ جلد
سیرۃ عمر بن عبد العزیز
انقلاب الامم
تاریخ الحرمین الشریفین
فقرائے اسلام
فطرت نسوانی
شعر الہند ۲ جلد

مولوی عبد الباری ندوی
مبادی علم انسانی
برکلے کا فلسفہ

مولوی سعید انصاری
سیر الصحابہ جلد اول
سیر الصحابہ ۲ جلد
سیر الصحابیات

مولوی عبد الرزاق ندوی
اسوۂ حسنہ
کتاب الرسیلہ
ترکی اور یورپ

خواجہ حسن نظامی
قرآن آسان
میلاد نامہ
محرم نامہ
فاطمی دعوت اسلام
ذکر غوث پاک
کرشن جیون
شامی جہاد
سیپارۂ دل
کرم تو موت
جگیان اور گدا گریان
اتالیق خطوط نویسی
خطوط حسن نظامی
بیوی کی تعلیم
بیوی کی تربیت
اولاد کی شادی
جگ بیتی کہانیاں
آپ بیتی
بچوں کی کہانیاں
سیر دہلی
سفرنامۂ ممالک اسلامیہ
غدر دہلی کے افسانے
یزید نامہ
طمانچہ بر رخسار یزید
اردو دعائیں
تسکین احساس
روزنامچۂ ہند
اسلام کا انجام
تسخیر مہر و قمر

مولوی عبد الراشد الخیری
الزہرا
صبح زندگی
شام زندگی
شب زندگی
نوحۂ زندگی
دُر شہوار
منازل السائرہ
سراب مغرب
بنت الوقت
قطرات اشک
جوہر قدامت
عروس کربلا
یاسمین شام
تیغ کمال
ماہ عجم
آفتاب دمشق
سمرنا کا چاند

نیاز فتحپوری
گیتانجلی
گہوارۂ تمدن
نگارستان
صحابیات
تاریخ الدولتین

یاس عظیم آبادی
چراغ سخن
نشتر یاس

تاریخ اندور - یعنی مرہٹوں کے استقلال، مسلمانوں کی شجاعت اور انگریزوں کی حکمت کا آئینہ از دو خانی خان قیمت ۲

ملنے کا پتہ:- الناظر بک ایجنسی - لکھنؤ